ایک سو پندرہ سالہ افسانوی تاریخ کے اہم اور ناگزیر افسانوں کا انتخاب

اولڈ راوینز کی جانب سے اسیرانِ علم و ادب کے لئے توشۂ خاص

سہ ماہی

لوح

سہ ماہی کتابی سلسلہ، شمارہ پنجم و ششم، جون تا دسمبر 2017

مدیر: ممتاز احمد شیخ

آغاز اُس ذاتِ بابرکت کے نام سے کہ تمام تعریفیں اسی کے لیے مختص ہیں
جو رحمان بھی ہے رحیم بھی اور ہم سب اسی کے جود و سخا کے محتاج ہیں
اور وہی ذاتِ والہ صفات ہے جو قوتِ کار کی ارزانی عطا فرماتی ہے

HaSnain Sialvi

لوح

سہ ماہی کتابی سلسلہ، شمارہ پنجم و ششم، جون تا دسمبر 2017
1901 سے لے کر لمحۂ موجود تک افسانوی تاریخ کے معتبر اور ناگزیر افسانوں کا انتخاب

مدیر: ممتاز احمد شیخ

سہ ماہی کتابی سلسلہ ''لوح''

شمارہ پنجم وششم جون تا دسمبر 2017

برقی کتابت وتزئین: طارق نوید

قانونی مشیر: عمران صفدر ملک ایڈووکیٹ

پرنٹر و پبلشرز: رہبر پبلشرز، اُردو بازار، کراچی، 021-32628383

رابطہ مدیر: 0300-8564654/051-4493270-71

قیمت: 1500 روپے

بیرون ملک: 75 ڈالر

email:

toraisb@yahoo.com

''لوح'' ملنے کے پتے

کراچی: رہبر پبلشرز، اُردو بازار، کراچی

حیدرآباد: رہبر پبلشرز، رسالہ روڈ، حیدرآباد 0222-781838

ملتان: رہبر پبلشرز، گلگشت کالونی، ملتان، 061-6511738

لاہور: رہبر پبلشرز، میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور 0423-7232278

راولپنڈی / اسلام آباد: رہبر پبلشرز، شہزاد پلازہ، گارڈن کالج روڈ، راولپنڈی 051-5773251

اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ 051-5531610

نگارشات بھیجنے کا پتہ: E-27، لین نمبر 2، نیشنل پارک روڈ، گلستان کالونی، راولپنڈی

HaSnain Sialvi

حُسنِ ترتیب

پہلا دور

دوسرا دور

تیسرا دور

چوتھا دور

پانچواں دور

چھٹا دور

☆☆☆☆☆

خامہ انگشتِ بدنداں ہے اسے کیا کہیے

(اداریہ)

حرفِ لوح

احباب کی ''لوح'' سے دلچسپی اور محبت کا یہ عالم ہے کہ پچھلے دو تین ماہ سے ہر روز بلا مبالغہ بیسیوں پیغامات موصول ہوتے رہے اور فون کے ذریعے احباب ''لوح'' کی خیر خیریت طلب کرتے ہوئے سوال کرتے رہے ''لوح'' کا افسانہ نمبر کب آ رہا ہے۔ میرے پاس اس کا کوئی شافی اور تسلی بخش جواب نہیں تھا کہ ''لوح'' کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر بنائی گئی کسی تصویر میں رنگ بھر دوں، یہ تو سر بہ سر دشوار گزار عمل گیری کا راستہ ہے۔ اس راہ میں کہیں پھول نہیں بچھے رکھے۔ ایک خوبصورت تصویر بنانے کا عمل تو خونِ جگر کا متقاضی ہے، مگر احباب کا وقت نکال کر ''لوح'' کی خبر لینا محبت، عزت اور توقیر ہی تو ہے اور ''لوح'' نے خود کو اس کا حقدار ثابت کیا ہے۔ مجھے ''حرفِ لوح'' میں بار بار وہی تکرار، وہی سوزِ دروں، وہی خاک بسر رہنے کی کہانی بیان کرنا اچھا نہیں لگتا مگر کیا کروں کہ بیان کیے بغیر کوئی چارہ ہے نہ قرار۔ ''لوح'' کے لیے دن رات عرق ریزی کرنا اس لیے ضروری ہے کہ نوجوان ادیب اس سے استفادہ کر سکیں، اسے حوالہ بنا کر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ سکیں۔ میں ہمیشہ لکھتا آیا ہوں کہ ''لوح'' کسی فوری اور ہنگامی فیصلوں اور جذبوں کی کوکھ سے برآمد نہیں بلکہ یہ میرا چالیس برس پرانا خواب ہے جسے میں نے دن کی چکا چوند روشنی میں بھی دیکھا اور رات کی تاریکیوں میں استراحت کا ساتھی بھی رہا۔ ''لوح'' نکالنے میں شاید کچھ وقت اور نکل جاتا اگر پاکستان کے تمام نامور اور اپنے قد و قامت میں کوہ گراں جرائد نقوش، فنون، اوراق اور بعد ازاں سمبل تسطیر وغیرہ کے بند ہو جانے سے ادبی دنیا میں ایک بڑا خلاء نہ پیدا ہو گیا ہوتا۔ ان جرائد کے بند ہونے سے میرے خواب کو ایک عجب مہمیز ملی کہ ''لوح'' نکالنے کا فیصلہ فطرت نے میرے دل میں ڈال دیا تاکہ ادب لکھنے اور پڑھنے والوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جا سکے جہاں کسی گروہ بندی یا نظریاتی قدغن کے بغیر خالصتاً ادبی وفنی اقدار اور معیار پر پوری اترنے والی تخلیقات اردو ادب کے قاری تک پہنچائی جا سکیں۔ ''لوح'' کی اشاعت کا آغاز کرنے سے قبل بھی میرے علم میں تھا کہ ادبی پرچہ نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا اور محض جی جلانے کی کام ہے۔ بعض قریبی احباب نے بھی میرے ''لوح'' نکالنے کے آئیڈیا سے اختلاف کیا کہ یہ ایک بے فیض اور تھینک لیس کام ہے لیکن یہ تو جی کو لگی ہوئی ایک چتا تھی اور یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ امر تھا کہ معیاری ادبی جرائد کے نہ ہونے کی وجہ سے ادیب اور قاری کا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک زمانے میں بڑے ادبی جرائد کے ساتھ ساتھ کئی معیاری ماہنامے بھی باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ تخلیقات قارئین تک پہنچتی تھیں اور یوں لکھنے اور پڑھنے والوں کے درمیان ایک رشتہ قائم تھا۔ معاشرے کے مجموعی زوال کے ساتھ ساتھ ادبی جرائد بھی ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے اور صورتحال یہ ہے کہ اگرچہ اکا دکا ادبی جریدے چھپ رہے ہیں لیکن ان کی اشاعت میں تواتر نہیں اور قارئین معیاری اور مسلسل اشاعتی پرچوں کے متلاشی ہیں۔ ایسے عالم میں ''لوح'' نے ایک روشن راستے کی بنیاد رکھی ہے اور پچھلے چار شماروں سے مجھے بخوبی اندازہ ہوا ہے کہ قارئین اب بھی اچھے اور معیاری ادبی رسالے کو خوش

آمدید کہنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ ''لوح'' کے صرف چار شماروں کو لکھنے اور پڑھنے والوں نے جو پذیرائی بخشی اور جس طرح پوری دنیائے ادب میں ''لوح'' کا پھریرا بلند ہوا اس نے میرا حوصلہ سہ چند کر دیا ہے اور میرے اندر یہ احساس در آیا ہے کہ ''لوح'' ایک ایسا مشن ہے جس کے ہم آواز اسے آگے بڑھانے میں ہمیشہ میرے ممد و معاون رہیں گے۔ پہلے بھی گزارش کی تھی کہ ''لوح'' کی اشاعت کا مقصد نہ اب ہے نہ کبھی رہے گا کہ پرانے اور نئے لکھنے والوں کا ایک گروہ بنا کر اس کا امام بن بیٹھوں اور خود کو ایک دبستان کی صورت سے منواؤں اور تعریف و ثنا کے ڈونگرے خود پر برسواتا رہوں بلکہ ''لوح'' ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو ہر اس ادیب کے لیے اپنا دامن وا کرتا ہے جو انسانی اقدار کی عظمت اور ادبی و فنی اقدار کی اہمیت کا حامل ہے۔ ''لوح'' کے چار شماروں کے بعد میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ''لوح'' عصری ادب کی ایک مستند دستاویز کے طور پر اپنی پہچان اور انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب رہا ہے مگر یہ لوح کی منزل نہیں ہے اسے دنیائے ادب میں اپنے کام کی وجہ سے اکیسویں صدی کا باکمال پرچہ ہونے کا اعزاز حاصل کرنا ہے (انشاءاللہ)۔ادب کی تمام اصناف ہی اپنے اپنے مقام پر انتہائی واجب الاحترام اور اہم ہیں مگر میرے نقطہ نظر سے دور حاضر کی سب سے بڑی ادبی صنف فسانہ طرازی ہے۔ ساری دنیا کو ہمیشہ سے کہانی کی طلب رہی ہے۔ کہانی خون کے مصفّیٰ جذبات سے تشکیل پاتی ہے جو کبھی راحت کا سامان مہیا کرتی ہے تو کبھی مغموم بھی کرتی ہے۔ اچھی کہانی آتی ہے تو دنیا بھر میں پھیل جاتی ہے، اس کو گویا پر لگ جاتے ہیں۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں کہی کہائی اور بنی بنائی کہانی سننے اور پڑھنے کو مل رہی ہے۔ اچھی کہانی سب کو یکساں طور پر مرغوب ہوتی ہے۔ اچھی کہانی کے مشاہدات سے جہاں کچھ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے وہاں کہانی سے لطف و حظ اٹھانے کے علاوہ روزمرہ کے معاملات کو سلیقے سے برتنے کا ہنر بھی ملتا ہے۔ ''افسانہ نمبر'' کا اعلان کرتے ہوئے مجھے قطعی طور پر اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام کتنا وسیع اور مشکل ثابت ہوگا اور اسے مرتب کرنے میں کیسی کیسی جان لیوا گی کے عمل سے گزرنا پڑے گا۔ جیسے تیسے بھی ہوا اپنے آپ کو سمیٹ کر ایک مشکل مگر تاریخی دستاویز مرتب کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔ یہ میرے پیش نظر رہا کہ ابتدائے داستان گوئی سے لے کر دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں کی فہرست سازی اس طرح ہو کہ کوئی ناگزیر نام رہ نہ جائے۔ اردو افسانے کا عہد بہ عہد اس طرح مطالعہ کرنا کہ اردو افسانے کے مختلف ادوار سامنے آ جائیں اور اس دوران موضوعات، تکنیک اور اظہار کے حوالے سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا کما حقہٗ احاطہ ہو سکے۔ زیرِ نظر ''افسانہ نمبر'' کے لیے مواد کی دستیابی ایک جان لیوا اور جانگسل مرحلہ تھا، خصوصاً 1947 کے بعد ہندوستانی اردو افسانہ نگاروں کی فہرست سازی اور مواد کے حصول نے پسینے چھڑا دیے لیکن الحمدللہ دوستوں نے محبت کی ایسی بارش کی کہ یہ مواد اتنا زیادہ اور وافر ہو گیا کہ اسے سمیٹنا میرے بس کی بات رہی نہ میرے وسائل اس کے متحمل تھے۔ بار بار نظر ثانی کرنا پڑی۔ نظر ثانی بجائے خود ایک کارِ گراں اس لیے بھی تھی کہ کہیں کوئی اہم نام رہ نہ جائے اور افسانوں کے رویے اور تکنیکی پہلو نظر انداز نہ ہو جائیں۔ میں نے امکان اور مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ''لوح'' کا یہ افسانہ نمبر آنے والے زمانوں میں بھی اردو افسانے کی ایک مستند دستاویز ثابت ہو۔ اس میں کتنی کامیابی ہوئی یہ فیصلہ کرنا میرا نہیں بلکہ اہل علم و فضل قارئین کی ذمہ داری ہے کہ وہی بہترین منصف ہیں۔ میں اپنے پاس ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ موجود

نہیں پاتا ہوں جنہوں نے مواد کی دستیابی میں میری بھرپور مدد کی اور پھر میں ان کا رسمی شکریہ ادا کر کے ان کی گرانقدر معاونت کی اہمیت بھی کم نہیں کرنا چاہتا، ''لوح'' ان کی اس محبت کا ہمیشہ مقروض رہے گا اور اگر اللہ نے ''لوح'' کے اس شمارے کو کامیابی اور پسندیدگی سے نوازا تو وہ میرے برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ اس افسانہ نمبر میں مضامین شامل نہیں کیے گئے، اسے شامل کرنے سے ''لوح'' کا دامن اور ضخامت نا قابل گرفت ہو جاتی اور پھر ادب کے ادنیٰ ترین طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرا یہ واضح نقطہ نظر ہے کہ اردو افسانے پر اس طرح کی سنجیدہ اور غیر جانب دار تنقید نہیں لکھی گئی جو اس کا حق ادا کر سکتی۔ زیادہ تر مضامین ادبی اور نظریاتی گروہ بندی کے حوالے سے ہی لکھے گئے ہیں جن میں ایک دوسرے کو رد کرنے یا نیچا دکھانے کی کوشش زیادہ نمایاں رہی ہے۔ میں اردو افسانے پر تنقیدی مضامین شامل کرنے سے اس لیے بھی گریزاں رہا کہ مجھے تو افسانوی صدی کا سفر طے کرنا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مختلف نظریات رکھنے والوں کے درمیان ایک نئی اور بے معنی بحث شروع کر دوں یا بالکل ہی یک طرفہ مضامین شامل کر دوں چنانچہ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ انتخاب صرف افسانوں تک محدود رکھا جائے۔ ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زیرِ نظر تاریخی شمارے میں ممکن ہے کچھ اہم اور ناگزیر نام رہ بھی گئے ہوں مگر ''لوح'' کسی ادارے اور اس کے بے شمار وسائل کی کوکھ سے نہیں نکلا بلکہ یہ تو محض ایک فرد کی ادب سے لازوال محبت کی داستان ہے جس سے کسی بھی سہو اور کوتاہی کا سرزد ہونا ناممکن نہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چیز بھی مکمل نہیں ہوتی اور بہتری کی گنجائش ہمیشہ ہی موجود رہتی ہے۔ سو کسی ممکنہ سہو کو اسی تناظر میں دیکھا جائے۔ میری اہلِ علم و فضل سے گزارش ہے کہ عاجز کی اس کوشش کو پڑھ کر خود فیصلہ کریں کہ ''لوح'' نے اردو افسانے کی ایک سو سترہ سالہ تاریخ مرتب کرنے میں کیسا تاریخی کردار ادا کیا ہے اور اور یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اردو افسانے نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں کیسا شاندار سفر طے کیا ہے۔

وما علینا الا البلاغ

احقر الانام

ممتاز احمد شیخ

پسِ تحریر: افسانوں کا انتخاب حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

شامِ شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تُو

(حمد باری تعالیٰ)

حمد باری تعالیٰ

اللہ اللہ حق اللہ

چمکے دم دم حق کا ستارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل کا سہارا اللہ اللہ حق اللہ

دھڑکن دھڑکن محوِ دعا ہے دل کی آنکھیں کھول ذرا
آنسو آنسو بول رہا ہے دل کی آنکھیں کھول ذرا
ذرّہ ذرّہ جاگ اٹھا ہے دل کی آنکھیں کھول ذرا
منظر منظر بدل چکا ہے دل کی آنکھیں کھول ذرا
کس کے اندر کون چھپا ہے توبہ توبہ **چپ** ہی بھلی
کون بشر ہے کون **خدا** ہے توبہ توبہ **چپ** ہی بھلی
حق مستوں کو حق ہے پیارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل سہارا اللہ اللہ حق اللہ

خود سے خود ہی ڈرنے والے چھوڑ کے دنیا دل کی سن
غیروں کا دم بھرنے والے چھوڑ کے دنیا دل کی سن
دنیا دنیا کرنے والے چھوڑ کے دنیا دل کی سن
اس دنیا پر مرنے والے چھوڑ کے دنیا دل کی سن
کیسا باطن، کیسا ظاہر توبہ توبہ **چپ** ہی بھلی
کون مقامی کون مسافر توبہ توبہ **چپ** ہی بھلی
راز یہ جانے حق کا دلارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل کا سہارا اللہ اللہ حق اللہ

آپ ٹلے گی پل میں مشکل عشق کو اپنا یار بنا
بولے گا ہر منظر دل دل عشق کو اپنا یار بنا

روح میں ہوگی جھلمل جھلمل عشق کو اپنا یار بنا
عشق تو ہے ایمان کا حاصل عشق کو اپنا یار بنا
کیسے بیاں ہو اس کی وضاحت توبہ توبہ چپ ہی بھلی
قبلِ قیامت، یہ ہے قیامت توبہ توبہ چپ ہی بھلی
بات کو سمجھے درد کا مارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل کا سہارا اللہ اللہ حق اللہ

فانی دنیا پہلاپڑاؤ منزل کی کیا بات کریں
بیچ بھنور کے ناؤ ڈوبی ساحل کی کیا بات کریں
دل ہی نہیں جب اپنے تن میں پھر دل کی کیا بات کریں
قصہ سمجھ میں آتا نہیں ہے حاصل کی کیا بات کریں
توبہ توبہ کرتے جائیں توبہ توبہ چپ ہی بھلی
جیتے جی ہم مرتے جائیں توبہ توبہ چپ ہی بھلی
پھر بھی نہیں ہے کوئی خسارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل کا سہارا اللہ اللہ حق اللہ

حسب موقع ، حسب بصیرت حق والوں پر کھلتی ہے
فرشی جنت عرشی جنت حق والوں پر کھلتی ہے
حق والے کی جوں جوں عظمت حق والوں پر کھلتی ہے
سمجھو تو ں توں اصل حقیقت حق والوں پر کھلتی ہے
پھر بھی لبوں کو کیسے کھولوں توبہ توبہ چپ ہی بھلی
بول کے سوچوں، سوچ کے بولوں توبہ توبہ چپ ہی بھلی
اس کا نہیں ہے کوئی کنارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل کا سہارا اللہ اللہ حق اللہ

کوئی جیتے کوئی ہارے اللہ اللہ کرتا جا
رشتے ناتے بھول کے سارے اللہ اللہ کرتا جا
بگڑا ہوا یہ بخت سنوارے اللہ اللہ کرتا جا
پاؤں پڑیں گے چاند ستارے اللہ اللہ کرتا جا

لیکن اس کی رمز حکمت توبہ توبہ چپ ہی بھلی
آئے زباں میں فوراً لکنت توبہ توبہ چپ ہی بھلی
اندر باہر اس کا نظارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل کا سہارا اللہ اللہ حق اللہ

روح کی مستی سچی مستی باقی سب کچھ جھوٹ فریب
پختہ تر ہے عرش کی بستی باقی سب کچھ جھوٹ فریب
سب سے محکم بات ہستی باقی سب کچھ جھوٹ فریب
اول و آخر رب کی ہستی باقی سب کچھ جھوٹ فریب
بات بڑی ہے منہ ہے چھوٹا توبہ توبہ چپ ہی بھلی
سوچ ہے پاپی ذہن ہے کھوٹا توبہ توبہ چپ ہی بھلی
جان پھرے ہے مارا مارا اللہ اللہ حق اللہ
روح کی منزل، دل کا سہارا اللہ اللہ حق اللہ

جان کاشمیری

☆☆☆

کرم اے شہِ عرب و عجم

(نعتِ رسولِ مقبول ﷺ)

نعتِ رسول مقبولؐ

حرم کی خاک سے چہرے کو جگمگاتے ہوئے
درود پڑھتے ہوئے منقبت سناتے ہوئے

مدینے جا کے درِ سیدہؓ پہ بیٹھتا ہوں
کہ دیکھ لیں مجھے سرکارؐ آتے جاتے ہوئے

مقامِ سجدہ گہ قدسیاں، یہ مسجد نور
وقار عظمت انسانیت بڑھاتے ہوئے

مرے حضورؐ کو دنیا یہیں پہ دیکھتی تھی
سوار دوش نبوتؐ کے ناز اٹھاتے ہوئے

یہیں بلالؓ نے پہلے پہل اذان دی تھی
نمازیوں کو خدا کی طرف بلاتے ہوئے

نواحِ شہر مدینہ میں زائروں کے لیے
ہوائیں آج بھی گاتی ہیں دف بجاتے ہوئے

یہ رشکِ تختِ سلیماں اتاق صفہ جہاں
ملائکہ بھی گزرتے تھے سر جھکاتے ہوئے

افتخار عارف

☆☆☆

HaSnain Sialvi

نعتِ رسول مقبولؐ

محبت انؐ کی سنت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
یہی مقصودِ فطرت ہے درود انؐ پر سلام ان پر
زمینوں آسمانوں میں، نہیں ہے دوسرا انؐ سا
کہ یکتا انؐ کی عظمت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
کھلا ہے فیض سے انؐ کے تلاشِ حق کا دروازہ
اب آگے اپنی قسمت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
بنائی تھی زمین پر جو مواخاتِ مدینہ نے
وہ اک تصویرِ جنت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
وہ جس سے حشر تک کی منزلیں آسان ہوتی ہیں
وہ رستہ انؐ کی سیرت ہے درود ان پر سلام انؐ پر
مکمل انؐ کی ہستی پر ہوا پیغامِ ربانی
بس اب ختمِ نبوت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
دعائیں جن کی ربِ دو جہاں مقبول کرتا ہے
جلو میں جن کے رحمت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
وہ جن کے ذکر کو رفعت خدا نے آپ بخشی ہے
انہی کی تو یہ امت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
وہ سائل کی توقع سے زیادہ اس کو دیتے ہیں
سخاوت انؐ کی عادت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
کھلا ہم پر شب معراج تاروں کی سلامی سے
وہاں بھی انؐ کی مدحت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
محمدؐ کی غلامی ہی کے دم سے ہے، ہم ایسوں کی
جہاں میں جو یہ عزت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
سرِ محشر وہ خود آئیں گے امت کی شفاعت کو
یہ ہم پر خاص رحمت ہے، درود انؐ پر سلام انؐ پر
بس اک چشمِ کرم سے درگزر کرنا، خطاؤں سے
یہی شانِ رسالت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
فضائے شہرِ آقاؐ میں جدھر دیکھیں، جہاں جائیں
عجب سی ایک فرحت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر
ہم امجد کیوں نہ اترائیں نصیبوں کی بلندی پر
ہماری انؐ سے نسبت ہے درود انؐ پر سلام انؐ پر

امجد اسلام امجد

نعتِ رسول مقبولؐ

مدینے جانے کا ہر انتظام لکھ دیا گیا
ہوا بتا رہی ہے میرا نام لکھ دیا گیا

حرم سے ہو کے جانا ہے مجھے مدینے کی طرف
سو کوچ لکھ دیا گیا قیام لکھ دیا گیا

میرے سفر کے سارے واجبات ادا کیے گئے
زیارتوں کا **ایک ایک** مقام لکھ دیا گیا

جو آپؐ کی صدا پہ آئے اور آپؐ کے ہوئے
انہی کا عشق ہے جسے دوام لکھ دیا گیا

کتاب حق، جو آخری رسولؐ لائے ہیں پڑھو
ہمارے نام آخری پیام لکھ دیا گیا

میں ان کی اتباع میں گزاروں اپنی زندگی
مرے سپرد کرنے والا کام لکھ دیا گیا

سوال عدل، امن و آشتی کے ہر جواب میں
ریاست مدینہ کا **نظام** لکھ دیا گیا

عطا کیا **خدا** نے کیا مقام و مرتبہ **مجھے**
میں انؐ کا امتی ہوں اور غلام لکھ دیا گیا

ہوا کی لوح پر عجیب شان احتیاط سے
مرا تمام نعتیہ کلام لکھ دیا گیا

سلیم کھینچتی ہے مجھ کو یاد شہر مصطفےٰ
وہاں مرے سفر کا اختتام لکھ دیا گیا

سلیم کوثر

☆☆☆

نعتِ رسول مقبولؐ

زمانے سے دانستہ بھولا ہوا تھا
اچانک ترے در کا ہوکا ہوا تھا
تری اک نظر سے ہوا تھا مصفّیٰ
میں باہر سے اندر سے لتھڑا ہوا تھا
حواسوں میں تھا جب ہوا تھا روانہ
ترے شہر آ کے مجھے کیا ہوا تھا
ضرورت نہ تھی راستہ پوچھنے کی
ترا آستاں جیسے دیکھا ہوا تھا
کرم گستری تیری ہر حال جاری
میں چاہے یونہی تجھ سے روٹھا ہوا تھا
ترے دل کی کیا بات ہے بندہ پرور!
مرا دل تو بے بات ٹوٹا ہوا تھا
میں شرمندہ تھا اپنی نادانیوں پر
ترے ہاں مرے ساتھ اچھا ہوا تھا

خالد اقبال یاسر

☆☆☆

رونقِ بزمِ دو جہاں، میرے رسول ﷺ کے سبب
خوشبو ہے کائنات میں ایک ہی پھول کے سبب
اور تو کوئی نیکیاں درج نہ تھیں حساب میں
بخشا گیا میں حشر میں عشقِ رسول ﷺ کے سبب
ظلم و ستم کے تھے خلاف، بعثت سے قبل بھی حضور ﷺ
برپا کیا یہ انقلاب، 'حلف الفضول' کے سبب
عشقِ نبی ﷺ کی بارشیں دھو گئیں ایک آن میں
دل پر تھیں جو کثافتیں، خاک اور دھول کے سبب
بارے کہ خوش نصیب ہم ان ﷺ کے وسیلے ہو گئے
اللہ کی کتاب کے ان ﷺ پر نزول کے سبب
جتنا شعور بھی ملا، ان ﷺ کے طفیل ہی ملا
ادراک و فہم کے سبب، اور نہ عقول کے سبب
میرے نصیب کھل گئے، جنت بھی مل گئی نسیم
شہرِ رسولِ پاک میں اذنِ دخول کے سبب

نسیم سحر

☆☆☆

سلام شہدائے کربلا

(بحضور امام عالی مقامؓ)

سلام

نیند بھی عرصہ بیداری ہے
کس قیادت کا سفر جاری ہے
دیکھ کس آن کے شہزادے ہیں
دیکھ کس شان کی تیاری ہے
مقتل شب میں چراغوں کا رجز
صبح سے عہدِ وفا داری ہے
لذت غم سے شنا سا ہو جائیں
یہی تہذیب عزاداری ہے
یہ ہے بازار غم شاہ جہاں
صرف اشکوں سے خریداری ہے
کسی ظالم کی حمایت کرنا
عدل کے نام پر عیاری ہے
جھوٹ کے ہاتھ پہ بیعت کرنا
کربلا والوں سے غداری ہے
ریت پر آل محمدؐ کا لہو
شمر حق کی شجر کاری ہے
سرخرو جس سے ہوا نام وفا
حضرت حر کی وفاداری ہے
دیکھنے والا تو یہ دیکھتا ہے
کس نے کس طرح سے جاں واری ہے
جینے والے کو معلوم نہیں
اس نے یہ جنگ کہاں ہاری ہے
فیصلہ ہو بھی چکا ہے کب کا
کربلا ہے کہ ابھی جاری ہے

سلیم کوثر

سلام

کھڑا ہوا ہوں نگوں سار، تار تارِ حسین
حسین ناقہء غم ہے میں ناقہ دارِ حسین
مری الگ ہے طبیعت، ترا مزاج جدا
تو اشک بار زمانہ میں اشک بارِ حسین
ابل رہے ہیں لگاتار آنکھوں سے چشمے
رواں دواں ہے زمانوں سے جوئے بارِ حسین
کوئی دمشق میں کوئی نجف میں سر کو جھکائے
کھڑے ہوئے ہیں مزاروں پہ حصہ دارِ حسین
ابھرتی جیسے چلی جارہی ہے دل میں چبھن
اترتا جیسے چلا جارہا ہے خارِ حسین
انہیں ستاروں کے اوپر ستارہ ہے اس کا
انہیں مداروں میں ہے آخری مدارِ حسین
جو کربلائے معلیٰ میں ریت اڑتی ہے
تو اور رنگ سے کھلتا ہے کشت زارِ حسین
نہ اس طرح کا میں باغی نہ صلح جو ویسا
میں شرم سارِ محمدؐ ، میں شرم سارِ حسین

اقتدار جاوید

روائت

بُرا خاوند

میر باقر علی

اکثر عورتیں شکایت کرتی ہیں کہ خاوند بُرا ہے، یہ وہ سچ کہتی ہیں، لیکن میں ان کو اس طرف متوجہ کرتی ہوں کہ پہلے وہ یہ تو دیکھیں کہ وہ بھی، بُرائی کے مادۂ حسد، غصہ، خودغرضی، خود بینی سے پاک ہیں یا نہیں۔ انسان کو شک اور شبہ مکدر نہیں کرتا جو جیسا ہوتا ہے، وہ دوسروں کو بھی ویسا ہی دیکھتا ہے، ہاں اگر تم دوسروں سے مہربانی چاہتی ہو، تو پہلے خود مہربان بنو اور انکو اگر اپنے سے سچا چاہتی ہو تو تجی پہلے خود بنو، جیسا دوگی ویسا لوگی تمہاری دنیا تمہارے خیالات کا آئینہ ہے، جیسی تمہاری صورت ہوگی ویسی ہی تمہارے سامنے آئے گی۔ اگر ہاتھ کو آگ میں ڈال دوگی، تو کیا ہوگا، جل ہی جائے گا، دنیا میں بڑی بدبختی غصہ اور حسد ہے، ان کو جتنا بڑھاتی رہوگی، یہ آگ تیز ہوتی جائے گی، جو تمہاری ذات کو جلا کر خاک کردے گی۔ اس کے خلاف محبت شرافت نیک نیتی یہ سب فرحت بخش ہیں، جس وقت انسان سمجھ گیا ان مسائل کو اس وقت اس میں مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو شخص ہر حالت میں صابر رہتا ہے اور تمام حالتوں کو ضروری لوازم زندگی جانتا ہے وہ تمام تکلیفوں کو قابو میں لے آتا ہے تو یہ تکلیفیں اس وقت نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ جس طرح سے مصیبت اندر پیدا ہوتی ہے، آرام بھی اسی طرح اندر پیدا ہوتا ہے۔

میں یہ سب تمہارے ہی واسطے لکھ رہی ہوں اور تم ہی سے یہ گفتگو کر رہی ہوں، غور سے سنو اور دل میں جگہ دو اگر تم ان باتوں کو اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کرلوگی تو تمہاری زندگی میں غضب کی تبدیلیاں نظر آئیں گی، اور تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گی۔ اکثر عورتیں ماں باپ کو الزام دیتی ہیں کہ وہ بدبختی کا باعث ہوتے ہیں، نہیں بلکہ تم ہی اپنی تکالیف کا سبب ہو کیونکہ تم ہر وقت اپنی زندگی کو بدل سکتی ہو۔

اگر تم کسی بیدرد اور ظالم آقا کی نوکر ہو اور وہ تم سے بری طرح سے پیش آتا ہے تم اس کو اپنا سبق سمجھو اور اس کے ساتھ تم شرافت سے پیش آؤ اور صبر اور تحمل سے کام لو اور جو نقصان تمھیں پہنچا ہے اس سے یہ کام لو کہ اپنے میں دینی اور روحانی طاقت حاصل کرو اور اس سے اپنے آقا کو نہایت نرمی سے سبق دو کہ وہ خود شرمندہ ہوگا اور تم میں روحانی قوت حاصل ہوگی۔ اپنے قصور ڈھونڈنے میں اپنے اوپر رحم نہ کرو، شاید غلامانہ علامتیں مل جائیں، جب تم اپنے نفس کی غلام نہ ہوگی تو کسی کی مجال نہیں جو تم کو غلام بنائے۔ جب تم نفس امارہ کو جیت لوگی تو تمام مصیبتوں پر غالب آ جاؤ گی، پھر تم خود دیکھ لوگی کہ جو تم کو ستا رہا ہے، وہ خود شرمندہ ہو کر تمہاری غلامی اختیار کرے گا، تم اس مغالطہ کو دور کرو۔ دوسرا تم پر ظلم نہیں کر سکتا تم خود اپنے اوپر ظلم کر رہی ہو، دوسرے پر الزام نہ لگاؤ، اپنے اوپر الزام لگاؤ، نیکی سے باز نہ آؤ، اگر تم نیکی کے خلاف کروگی تو صبر کی قوت تم میں سے جاتی رہے گی، جو کچھ تم کو میسر ہو اس میں مستعدی سے کام لو، ورنہ ہمیشہ کے لیے تم مصیبت میں مبتلا رہوگی، اگر تم آقا کی موافقت کروگی، تو تمہاری قوت دوگنی اور کام کی ہو جائے گی، یہ تمہارا رات دن کا مشاہدہ ہے کہ ایک لکڑی چولہے میں لگاؤ تو شعلہ نہیں دیتی جب دو لکڑیاں مل جائیں گی تو شعلہ پیدا ہوگا۔

تم اپنے خاوند کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرو اور جو میسر ہو اس پر قناعت کرو۔ اگر تمہارے پاس محل نہیں ہے تو تم اپنی جھونپڑی کو فردوس بنا سکتی ہو، اگر قالین نہیں ہے تو ہنسی خوشی اور مہر و محبت کی باتوں کا فرش ایسا بچھا سکتی ہو کہ اوپر لیٹنے سے ہر کروٹ اور ہر پہلو آرام ہی آرام ہے، اور یہ وہ فرش ہے کہ نہ جس کو بارش خراب کر سکتی ہے اور نہ دھوپ۔ تم زندگی کے تھوڑے وقت سے مفید کام لو، اگر ایسا نہ کروگی تو زیادہ وقت تم کو میسر نہ آئے گا اور تم کاہل اور بے پرواہ بن جاؤ گی۔ تمہاری سلطنت تمہارے اندر موجود ہے،

جب طبیعت کو ادھر متوجہ کروگی تو تمہاری مصیبتیں آسان ہو جائیں گی، جس قدر تم اپنے نفس کی قوتوں پر غالب رہوگی اسی قدر دنیا کے معاملات کو سمجھ سکوگی، جہالت ہی باعث تکلیف ہوتی ہے، جہالت سے تم ہر چیز کو قوت دیکر اپنے اوپر طاری کر لیتی ہو، تم دیکھو جس وقت تم کو غصہ آتا ہے تو تم اس کو رفع تو نہیں کرتیں، بلکہ یہ کوشش کرتی ہو کہ میں بڑھ کر بات کروں، تو تم ہی انصاف کرو کہ دوسرا بھی تم ہی جیسا ہے، وہ بھی ایسا ہی چاہے گا، تو کیا ہوگا کہ جھگڑا بڑھ جائے گا اور جھگڑے میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ غصہ کی ابتدا جنوں اور انتہا پشیمانی، پھر یہ بتاؤ کہ اس خرابی کا باعث کون ہوا، تم یا دوسرا اور پھر تم خاوند کو بُرا کہو، غصہ کا زہر بدن میں سرائیت کرتا ہے، جو شخص نیک بن جاتا ہے، وہ دنیا کو زیر کر لیتا ہے، جب انسان ناداری اور کمزوری کو مغلوب کر لیتا ہے تو اندر سے خود بخود ایک غیر مغلوب اور عالمگیر طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

نیک دنیا کو زیر کر لیتا ہے اور دولت مند اکثر خوشی سے محروم رہتا ہے، اکثر میری بہنیں شکایت کرتی ہیں کہ نوکر ہمارے پاس نہیں ٹھہرتا، ہُوا کچھ ہمارے نمک ہی کی یہ تاثیر ہے۔

سنو بھاگ جانے کا عیب ان میں نہیں ہے، بلکہ تم اگر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ عیب تم ہی میں ہے اس عیب کو اپنے ہی میں ڈھونڈو اور دریافت کرو کہ وہ کیا شے ہے جو دوسروں کے دلوں کو بگاڑ دیتی ہے۔ تم تو نوکروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ، ان کے آرام کا خیال رکھو، ان کی بساط سے زیادہ کام نہ لو، جو خدمت اس پر جائز ہے وہ خدمت لو بلکہ اس کے ساتھ وہ کرو کہ جیسا تم کو تمہارا سچا خیال بتائے، پھر وہ تم سے اچھی طرح سے پیش آئے گا۔ بس یہی رمز ہے، اگر اس رمز کو سمجھ گئیں تو بیڑے پار ہیں۔

اکثر کا قول ہے کہ ہمارا کوئی دوست نہیں، یہ کہہ کر وہ اوروں پر الزام تھوپتے ہیں، بلکہ وہ عیب خود ان کی ذات میں ہے۔ تم دشمنوں سے محبت کرو تو دوست خود تمہارے پاس آجائیں گے، جو شخص خود غرضی اختیار کرتا ہے وہ اپنے دشمن آپ پیدا کرتا ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ دوستوں سے گھرا رہتا ہے۔ لڑائی، طاعون، قحط، یہ تمہارے بیجا خیال سے پیدا ہوتے ہیں۔ نفرت، غصہ، خود بینی، غرور، طمع، نفس پرستی، ضد یہ سب افلاس کی جڑیں ہیں اور اس کے خلاف محبت، شرافت، رحم، فیاضی یہ سب دولت کی سوتیں ہیں۔ ہر شخص کا اندازہ اس کی محبت سے کرو، جو شخص جذبوں کو قابو میں کر لیتا ہے وہ سب کے ساتھ محبت سے پیش آتا ہے، جیسے سمندر کی تہہ سنسان ہے جہاں کسی طوفان کا اثر نہیں ہوتا، اسی طرح دل ہے، اگر اس کے اندر تم غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ دل کی تہہ امن سے بھری ہوئی ہے۔ بُری باتوں کا اثر بعد تک رہتا ہے جب آدمی قدرت کو سمجھ لیتا ہے تو اپنے کو مٹی کا پتلا نہیں جانتا، بلکہ اس کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میں کون ہوں اور کس واسطے پیدا کیا گیا ہوں، اور جسم کو جانتا ہے کہ یہ میرا مکان ہے اور میں اس کا مالک ہوں۔ تم خاوند کی ذات سے اپنے کو الگ نہ سمجھو۔ دیکھو ٹہنی درخت سے الگ ہو کر گو ساری صفات اس میں درخت کی سی، صورت، پتے، کونپل موجود ہیں لیکن تھوڑی دیر میں وہ مرجھا کر فنا ہو جائے گی۔ اسی طرح سے جب تم اپنے آپ کو الگ رکھوگی تو کیا ہوگا، جیسا ٹہنی کا حشر ہوا۔ آگ جب تک چولہے میں ہے انگارہ با ہر راکھ فقیر گھر کے اندر شاہ با ہر گدا۔ جو شخص غصے اور جذبوں سے کام لیتا ہے وہ اپنی طاقت کم کر دیتا ہے۔ خواہش مثل سمندر کے لا انتہا شے ہے۔ تم جتنا اس کے پورا کرنے کی خواہش کروگی وہ اور بھی زیادہ ہوتی جائے گی کیونکہ پانی جتنا سمندر میں آئے گا اس کا شور سوا ہوتا جائے گا۔ خواہش دوزخ کا ملک ہے کہ تمام مصیبتیں وہیں آکر جمع ہوتی ہیں اور ترک خواہش جنت ہے اور یہ دونوں تمہارے اختیار میں ہیں۔ جب تم یہ سمجھنے لگوگی کہ خواہش کی حقیقت کیا ہے تو تمام جذبوں پر غالب آجاؤگی۔ یہ سمجھ کر تم اپنے ارادہ پر قائم رہو، دو دلا شخص کامیاب نہیں ہوتا۔ تم اب تک جن وحشیانہ خواہشوں کا شکار بنی رہیں اب تم ان پر اقتدار پیدا کرو اور بدگوئی، کھل کھلا کر بلا کسی سبب کے ہنسنا لغو اور بے معنی باتیں کہ ان میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہے، ترک کرو، جوش یا جذبہ سے کام لینا گویا قوت کا کم کرنا ہے۔ جس قدر تم اپنے نفس کی قوتوں پر غالب رہوگی، اسی قدر تم دنیا کے

معاملات کو سمجھ سکو گی۔ تمہارا خیال تمہاری ایک تصویر ہے جو دوسروں کے آئینۂ دل پر پڑ کر اور وہاں سے منعکس ہو کر تم پر برا یا بھلا اثر پیدا کرے گی۔ دشمنی اور فساد اور کینہ یہ سب بدی کے گویا قاصد ہیں، جو برے خیالات کو تمہارے دلوں میں اکساتے ہیں، جب تم ان قاصدوں کو دوسروں کی طرف بھیجتی ہو تو دوسرا ان کو زبردست کر کے اور خلعت پہنا کر تمہاری طرف روانہ کرتے ہیں اور جو نیک ہیں وہ اس کے خلاف، اچھا وہ ہے جو بری قوتوں پر قادر ہو، اور برا وہ ہے جو ان قوتوں کے بس میں ہو۔ اس کے حاصل کرنے کی صورت اس سے بہتر نہیں کہ انسان اپنے کو قابو میں رکھے۔ اگر تم اندرونی قوتوں کے بس میں رہو گی تو بیرونی مدد کی محتاج رہو گی۔ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں جو روح سے پیدا نہ ہوتی ہو۔ ان سب مصیبتوں کی جڑ گناہ ہیں اور یہ کیوں ہیں کہ تم کو مختلف اشیاء کا علم نہیں، جب تک کسی شے کا علم نہیں ہوتا اس وقت تک آدمی بے قرار رہتا ہے۔ ایک بچہ شمع پکڑنے کی ضد کیا کرتا تھا اور اس کی ماں اس کو روکتی رہتی تھی۔ ایک روز ماں اس کی کسی کام کو گئی ہوئی تھی اور بچہ کا قابو چل گیا، اور اس نے دوڑ کر شمع کو پکڑ لیا، نتیجہ معلوم ہو گیا، پھر اس نے ضد نہ کی۔ جب تک اس کو شمع کے جلانے کا علم نہ ہوتا بے قرار رہتا، جب علم ہو گیا بے قراری جاتی رہی۔ تم حسد، طمع، غصہ کی تو مطیع رہو اور کامل صحت کی امید کرو تو کیا ہو گا کہ ہمیشہ بیماری کے پیچ میں مبتلا رہو گی۔ غصہ میں صحیح فیصلہ کی قوت نہیں ہوتی۔ اگر تم اپنے نفس کو نیک خیال میں لگاؤ گی خود نیک ہو جاؤ گی، جب فضول خیالات تمہارے ذہن سے نکل جائیں گے تو راحت ہی راحت ہے۔ ہم ایک جسم کے اعضاء ہیں، اگر جسم میں کسی اعضاء کو تکلیف ہو گی تو کیا ہو گا کہ تمام جسم بے چین ہو گا۔ جاہل اپنا مقصد نکالنے میں تمام دنیا کو اگر نقصان پہنچے تو دریغ نہیں کرتا، محبت تمہاری ضرورت کے وقت تمہاری پشت پناہ ہو جائے گی۔ اگر تم دل سے کام کو کرنا چاہتے ہو تو اپنی سمجھ سے فائدہ اٹھاؤ اور جو تمہارے خیال میں آیا ہے شروع کرو، جرأت یا حوصلہ جادو کا اثر رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ذہانت اور طاقت سب کچھ آ جاتی ہے۔ شروع کرنے کی دیر ہے، انشاء اللہ اختتام کو پہنچ جاوے گا۔

☆☆☆

پہلا دور

مریض

اختر اورنیوی

"خدا ایک حقیقت مطلق ہے اور "مطلقیت" کے لحاظ سے عیب وصواب کا تصور لایعنی ہے۔" "بھلائی" اور "برائی" محض اضافی لفظ ہیں۔ مگر انسانیت کے لیے خدا اور کائنات کی اضافی حیثیت ہی حقیقت کبریٰ ہے کیونکہ ہم عرش کی سطح سے نہیں دیکھ سکتے اور خدا کی طرح "محسوس" کرنے سے قاصر ہیں۔۔۔۔۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو میں نے جاوید کے روزنامچے کے ایک صفحے پر پڑھے۔ میرا عزیز دوست جاوید عرصے سے بیمار چلا آتا تھا۔ آج میں اس سے ملنے گیا تھا۔ اس کے سرہانے چند کتابیں اور ایک کھلی ہوئی ڈائری رکھی ہوتی تھی۔ پاس "فاونٹین پین" اس انداز سے پڑا تھا کہ اسے لکھتے لکھتے یوں ڈال دیا گیا ہو۔ جاوید سے باتیں کرتے ہوئے میں نے مندرجہ بالا تحریر پڑھ لی اور چونکہ ہم لوگ بے تکلف دوست تھے۔ میں نے ڈائری اٹھا کر پوری تحریر پڑھنی چاہی۔ مگر جب جاوید نے دیکھا کہ میں اس کا روزنامچہ اٹھا کر پڑھنا چاہتا ہوں تو اس نے ایک ہلکے شرمیلے پن سے یہ کہتے ہوئے ڈائری خود اٹھالی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"بہت سی باتیں دل سے ایسی کی جاتی ہیں جن کے متحمل دوسرے لوگ نہیں ہوسکتے"۔

میرے پندار کو ٹھیس لگی، میں نے جواباً کہا۔

"یا تم دوسروں کی نکتہ چینیوں کے متحمل نہیں ہوسکتے"۔

جاوید کے جذبات کو ایک ہلکی سی چوٹ آئی، اس نے منفعل ہوکر جواب دیا۔

"ٹھیک کہتے ہو ہم میں سے بڑے سے بڑا صاف گو بھی اپنے مصلحانہ دعوؤں کے باوجود گا ہے گا ہے کہنے کے قابل باتوں کو بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ سماج میں انوکھے بننے کے "حیاتیاتی" نتائج سے غیر ارادی طور پر کانپ اٹھتا ہے۔ اس کی یہ غیر شعوری جھجک خود حفاظتی کے لیے بروئے کار آتی ہے۔۔۔۔۔۔"

"تو کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں" جاوید نے مجھے ڈائری دیتے ہوئے کہا۔ روزنامچہ اٹھالینا محض ایک فطری ردعمل تھا۔ یہ ایک "انعکاسی" حرکت تھی۔ جیسے تمہاری انگلیوں کے قریب آنے سے پہلے میری پلکوں کا جھپک جانا"۔

میں نے ڈائری لے کر ایک آدھ صفحہ پڑھا اور اس کے بعد جاوید خود مجھے جگہ جگہ سے سنانے لگا۔ اسے تسکین ہو رہی تھی۔ اس کی روح کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ خیالات و واردات کا بھی بوجھ ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات جاوید کی ڈائری سے ماخوذ ہیں۔ مگر میں پہلے آپ سے اس کا تعارف تو کرادوں۔

جاوید ایک ذکی الحس شاعر تھا اور آغاز شباب میں اسے مصوری کا شوق بھی رہا تھا اور کچھ دنوں تک ڈراما نگاری اور اداکاری سے بھی شغف تھا وہ اسکول اور کالج میں نہایت ممتاز رہا۔ تقریر بھی اچھی کرسکتا تھا اور اس سلسلے میں اسے کئی تمغے بھی ملے تھے۔ یہ سب ایک بلند اور تخلیقی فطرت کی سعی اظہار تھا۔ جاوید تربیتاً مذہبی تھا۔ اور فطرتاً اخلاقی۔ مذہب سے علمی واقفیت بھی رکھتا تھا۔ اس کی تعلیم کچھ عجیب طرح ہوئی تھی۔ میٹرک کے بعد دو سال سائنس کا طالب علم رہا اور اس کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ یوں تو وہ جنم کا روگی تھا۔ مگر یہاں اس پر سل کا حملہ ہوا۔ اسے تیسرے سال میں آ کر ترکِ تعلیم کرنا پڑی۔ اس کے حوصلوں کو سخت دھکا

لگا۔ مگر اس نے سپر نہیں ڈالی۔ دو سال تک نراد یہاتی بنا رہا۔ کھیت کھلیان اور سیر و شکار بس یہی اس کا مشغلہ تھا۔ اس کی صحت بحال ہو گئی اور اس نے میڈیکل کالج کو چھوڑ کر بی۔ اے میں نام لکھا لیا۔ اسی دور میں اس نے محبت کی اور اس سے محبت کی گئی۔ شاید یہ محبت ہی کا اعجاز تھا کہ وہ ایک خطرناک بیماری سے شفایاب ہو گیا۔ وہ کسی کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ رہنے کی شدید خواہش اکثر ضامن حیات ثابت ہوتی ہے۔ بی۔ اے کے دوسرے سال میں اس کی شادی اپنی "پرستیدہ تمنا" سے ہو گئی۔ جس طرح زلزلے کی تباہ کاریوں کے بعد آفت رسیدہ لوگ ازسرِ نو مکانات تعمیر کر کے رس بس جاتے ہیں ویسے ہی جاوید بھی اپنے ارمان و تمنا کی سوکھی ہوئی بیلوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگریزی ادب میں آنرز کے ساتھ اعلیٰ نمبروں سے بی۔ اے پاس کیا۔ مگر دوران امتحان میں اس پر اس کے پرانے مرض کا شدید حملہ ہوا اور جب نتیجہ نکلا تو وہ اس حال میں تھا کہ اس کی زندگی موت سے برسرِ پیکار تھی۔

جاوید کو سیناٹوریم بھیج دیا گیا۔ حیات کے لیے انسان کو اکثر اپنے اوپر موت وارد کرنی پڑتی ہے۔ زندگی کی قیمت زندگی ہی ہے۔ سیناٹوریم ایک سطح مرتفع پر واقع تھا۔ زندگی کے ہنگاموں سے دور۔ تہذیب کی نبض یہاں دھیمی محسوس ہوتی تھی۔ اونچے ٹیلوں اور شاداب و ساکن جنگلوں کے درمیان اسپتال تھا۔ سب ودق کے مریضوں سے بھرا ہوا۔ جاوید کو ہلنے جلنے کی ممانعت تھی۔ وہ مہینوں اس طرح پڑا رہا ہے جیسے حنوط شدہ لاش۔ مگر وہ محسوس کرتا تھا اپنے دکھوں کو دوسرے کے دکھوں کو شکست تمنا کو مٹتی ہوئی صلاحیتوں کو سسکتی ضائع ہوتی ہوئی زندگی کو، دم توڑتی ہوئی انسانیت کو، اور وہ محسوس کرتا تھا تقدیر کو، اعمال کو اور خدا کو۔

جب اسے اٹھنے بیٹھنے کی اجازت ملی تو اس نے اپنی دکھی اور بیمار زندگی کو کتابوں کے کھلونے دے کر بہلانا چاہا۔ وہ پہلے بھی علم ہیئیت، علم کیمیا، حساب، علم الادویہ، تشریح، حیاتیات، افعال الاعضا، معاشیات، اور ادب و انتقاد کالجوں میں پڑھ چکا تھا اور شوقیہ اس نے فلسفہ و نفسیات و مذہبیات کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ سیناٹوریم میں وہ ادبیات، جنسیات اور اخلاقیات سے الجھتا رہا۔ اس نے لینن کی سوانح حیات بھی پڑھی۔ وہ کتابوں میں سکون کی تلاش کرتا تھا۔ اور اسے ہیجان دماغ و اضطراب دل حاصل ہوتا تھا۔ وہ جبر و قدر کی گتھیاں سلجھاتا، جزا و سزا کے متعلق رائے زنی کرتا، موت کے بعد آنے والی زندگی کے تصور میں غرق رہتا، کبھی وہ جب انسانیت کے نشہ میں چور ہو جاتا اور انقلاب کا قرنا پھونکنا چاہتا اور کبھی وہ رومان کے رنگین و خواب آسا جزیروں میں کشتی ہلال پر سوار ہو کر جاتا اور وہاں شاہدان شمیین کے مشک افشاں گیسوؤں سے کھیلتا۔

پھر وہ دور آیا کہ جاوید نے ساری کتابوں کو یہ کہہ کر پرے پھینک دیا کہ ۔۔۔۔۔ این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولٰے!

اب اسے بری طرح زندگی کی محسوس حقیقتوں کی پیاس تھی۔ اس کے اندر زندہ رہنے کی بے پناہ خواہش ابھر آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر لمحہ اپنے نفس کو یقین دلائے کہ وہ زندہ ہے۔ وہ اپنی روح کو زندگی کا اتصال جسم و جان کا اپنے ہر عضو، اپنے ہر قولے سے ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اس کی صحت بھی ترقی کر رہی تھی۔

صنف مقابل زنگار ہے۔ جب یہ زنگار زندگی کے شیشہ میں لگ جاتا ہے۔ تو ہم اس میں اپنی خودی کو دیکھتے ہیں۔ مرد اپنی خفی و جلی صلاحیتوں کو اس وقت تک رُو در رُو نہیں دیکھ سکتا جب تک اسے اس نازک و سریع الحسن "برق پیا" کا توسط حاصل نہ ہو جائے۔ جسے عورت کہتے ہیں۔ اور سیناٹوریم میں یہ صنف پائی جاتی تھی۔ نرسوں کی شکل میں وہ نرم خو، ہمدرد، آغوش کشا دختران کلیسا۔ کبھی جاوید کی پیاری بیوی ۔۔۔۔۔ اس کی چشم تصور کے سامنے انگشت اغتباہ بن کر کھڑی ہو جاتی اور اسے جھرجھری سی آ جاتی۔ مگر اس کے ساتھ کتنی محرومیاں اور بدنصیبیاں وابستہ تھیں۔ اس کی بدقسمت شریک حیات کی اور کنبہ والوں کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جاوید ان باتوں کو بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ شراب پی کر مدہوش ہو جانے کا آرزومند تھا۔ وہ ہر اس چیز سے بھاگنا چاہتا تھا جو اسے "عشرت نشہ" سے محروم کر کے "اذیت خمار" میں مبتلا کر دے۔ ان ہی دنوں عید آئی۔ مگر جاوید ہلال عید سے آنکھیں چار کرنے سے ڈرتا تھا۔ اس

کے تصور میں ہلال عید اس لب کی طرح تھا جو طنز کرتے وقت کج و خمدار ہو جاتا ہے۔

مگر کبھی ان خود فراموشیوں کے درمیان گھر سے آیا ہوا کوئی خط کشیدہ کڑھے ہوئے رومال یا تکیہ کے غلاف جاوید کے تخیل کو ماضی کے حدود میں دھکیل دیتے تھے اور شب کی تنہائیوں میں خاموش آنسوؤں کے موتی مقدس یادوں کے مندر پر چڑھاتا اور وہاں ایک دیوی محبت کی غمگینی سے زیر لب مسکراتی ہوئی براجمان ہوتی۔ اس کے جذبات دیوی کے قدموں پر سجدہ ریز ہو جاتے اور پھر اسے خدا یاد آتا۔ رحم وقدرت کے عرش پر متمکن۔ وہ بیتاب ہو کر دعائیں کرنے لگتا۔ نہیں معلوم کیا کیا اس حالت میں اسے نیند کی مہربان آغوش میں سکون، وقتی سکون حاصل ہو جاتا۔

جاوید ان ہی کیفیات میں مبتلا تھا کہ اس کی بیوی اس سے ملنے سیناٹوریم آئی۔ وہ اس افیونی کی طرح جسے پانی کے چھینٹوں سے جگایا جائے۔ جاگا مگر ایک اعصابی کرب کے ساتھ۔ شاہینہ اس ویرانے میں مہینوں ٹھہری ایک ٹوٹے پھوٹے سنسان مکان میں، جاوید اور شاہینہ روز ملتے تھے، شاہینہ جاوید کی گمراہیوں کے لیے داروئے شفا بنکر آئی اور یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے گاہے اس سے لڑ پڑتا تھا۔ اس مریض کی طرح جو زخم دھلنے کے وقت چیختا ہے۔ شاہینہ نے اس یوگی کی طرح جو اپنی تپسیا سے پرمیشور کی دیا کو جیت لیتا ہے۔ جاوید کی فریفتگیوں کو بھی ایک بار اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ لق ودق صحرا میں بھٹکتا ہوا مسافر جیسے قندیل رہبانی سے راہ پا جاتا ہے۔ ویسے ہی جاوید شمع محبت کی روشنی سے ہدایت پا گیا۔ مگر اس نور میں زخمہائے حوادث زیادہ صاف طور پر دکھائی دینے لگے۔ وہ مغموم رہنے لگا۔ نیکیوں کے ساتھ ایک مقدس مغمومیت لازمی ہے۔ اب وہ روبہ صحت ہو رہا تھا۔ سیناٹوریم کی آب و ہوا اکثر مسیحائی کر جاتی ہے۔ اس پر مستزاد وقت کی پابندی مقوی غذا اور کافی سے زیادہ آرام۔ جاوید اب حقیقی زندگی اور فرائض کے بار کو اپنے تخیل میں تول رہا تھا۔ اُف فرض کا خیال بھی کتنا وزنی ہوتا ہے۔ اور اگر فرض کے خیال کے ساتھ امید کی روشنی نہ ہوتی تو یہ کتنا روح فرسا ہو جاتا ہے؟

جاوید کے دل میں بھی امید کی روشنی نہ تھی اور وہ قطعی مایوس بھی نہ تھا۔ بلکہ اس پر ایک بے حسی سی طاری رہتی تھی۔ مگر یہ بے حسی ارادی تھی۔۔۔۔۔۔۔ دراصل اس کے نفس میں ایک کشاکش تھی بیم ورجا کی۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے نفس نے کروٹ لی۔ بے حسی کا خاتمہ ہو گیا اور اب وہ ڈرامہ نگاری و اداکاری میں غرق تھا۔ آرٹ کی تخلیق یا تو وسعت و انبساط کے عالم میں ہوتی ہے یا تحدید و پابندی کی حالت میں وہ فطرتیں جو ایک دنیا سے سیر ہو جاتی ہیں دوسری دنیا کی تخلیق کرتی ہیں اور وہ فطرتیں بھی خالق فن ہوتی ہیں جو اس دنیا کی محرومیوں سے تنگ آ کر عالم نو کی تعمیر پر مجبور ہوتی ہیں۔ سیناٹوریم میں اور بھی چند نوجوان تھے جو کم و بیش اسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک مجلس ڈرامہ قائم ہو گئی اور خاص اہتمام کے ماتحت ڈرامے کھیلے جانے لگے۔ جاوید ناظم تھا، اداکار تھا اور ڈرامہ نویس۔ نرسوں نے بھی ڈرامے کھیلے اور اب وہ بیمارستان اپنی بیشتر آبادی کے لیے رومانستان تھا۔

شاہینہ اب واپس جا چکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد جاوید پر افسردگی طاری رہنے لگی۔ وہ اپنی نئی مشغولیت میں بھی شاہینہ کو بھول نہیں سکا۔ وہ بالکل صحت یاب ہو چکا تھا۔ موسم بھی اچھا تھا۔ لہذا جاوید سیناٹوریم کو خیرباد کہہ کر وطن روانہ ہو گیا۔

اب جاوید وطن میں تھا۔ ڈیڑھ سال کی غریب الوطنی کے بعد ایک فردوس معلوم ہو رہا تھا۔ جس کی بازیافت ہوئی ہو۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ڈیڑھ سال ایک خواب دیکھتا رہا ہے، ایک ایسا خواب جس میں غمناکیاں زیادہ تھیں اور مسرتیں کم۔ اسے وطن کا ذرہ ذرہ مہرِ درآغوش معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ محسوس کرنا چاہتا تھا کہ وہ کبھی بیمار نہیں تھا۔ اس کے لیے زندگی زیادہ روشن، زیادہ پُر معنی ہو گئی تھی۔ وہ ماضی و مستقبل کو بھول کر صرف "حال" کو دوام بخشنے کا آرزومند تھا۔ مگر آفتاب نصف النہار پر کبھی نہیں رہ

سکتا۔ فریب خیال بھی حقیقت کے سامنے بکھر جاتا ہے۔ جاوید کو کچھ دنوں کے بعد اپنی محرومیوں اور حد بندیوں کا احساس بری طرح ہونے لگا۔ ''تم مریض ہو! مریض ہو! دینا کی وسعتیں تمہارے لیے بند ہیں، یہ عارضی صحت ہے، تم مریض ہو!'' یہ آوازیں اس کے کان میں آتیں۔ وہ پاگل ہو جاتا۔ ایک اضطراب، ایک ہیجان، ایک شورش اس کے دماغ میں پیدا ہوتی اور وہ چاہنے لگتا کہ ''زمانہ'' کے جگر کو چھید کر رکھ دے، ماضی کے اثرات کو حرف غلط کی طرح مٹا دے اور تقدیر و خداوند تقدیر کو معطل کر دے وہ ان حدود کو بھی توڑ دینا چاہتا تھا، جن کے اندر وہ معمولی حالت میں رہنا پسند کرتا۔ بے عملی اس کے لیے ناممکن تھی۔ وہ مختلف مشاغل میں منہمک رہنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے دل میں اعتماد پیدا ہونا شروع ہوا۔ یہ امید کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے قبل تو وہ امید کرنے سے بھی ڈرتا تھا۔ جیسے کوئی جوشش چشم کا مریض آفتاب کی کرنوں سے خوف کھائے۔ مگر جب آنکھیں اچھی ہونے کو آتی ہیں تو کمرے کی کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں۔ اور پھر سنہری دھوپ کی طلب ہوتی ہے۔ تقدیر جاوید کے ساتھ تھی۔ اور اس کی صحت بہت اچھی طرح قائم، اس کے دل کی کھڑکیاں بھی کھلنے لگیں۔ اور اس کے اندر امید کی کرنیں داخل ہو رہی تھیں۔ جاوید اب آشا کی روشنی میں اپنی زندگی سدھارنے کا متمنی تھا۔

اس نے ایم۔ اے کی تیاری شروع کر دی اور شریک امتحان ہو کر نہایت شاندار طور پر ایم۔ اے پاس بھی کر لیا۔ اس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ اسے میدان عمل مل گیا تھا اور مستقبل میں نئی وسعتیں اس کی جولانگاہ بننے والی تھیں۔ ان دنوں وہ سرگرم عمل تھا۔ وہ علم و ادب کی خدمت میں مشغول تھا اور معاش کی تلاش بھی کر رہا تھا۔ آخرالذکر امر میں اسے ناکامی ہوئی۔ بعض نوکریاں اسے اس لیے نہیں ملیں کہ وہ سینا ٹوریم سے واپس آیا ہوا مریض تھا۔ جاوید کی امیدوں کا طلسم ٹوٹنے لگا اور وہ کسی شکستہ کی طرح بے سہارا ہو جاتا، اگر ادب کی جل پری اس کی محبوبہ نہ ہوتی۔

ابتلاء و آزمائش جاوید کے لیے مقدر تھی۔ وہ عروس ادب کے گیسوؤں سے کھیل ہی رہا تھا کہ یک بیک اس پر وجع المفاصل کا شدید حملہ ہوا۔ درد اضطراب کے عذاب میں وہ ایک ماہ تک مبتلا رہا۔ جوڑ جوڑ میں درد، بند بند میں سوزش۔ وہ بستر پر جنبش کرنے سے بھی قاصر تھا۔ وہ ''درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری'' کی تفسیر تھا۔ دکھ بے کلی اور خوف اس پر ہر وقت طاری رہتے۔ موجودہ مرض کا عذاب اور گذشتہ بیماری کے اعادہ کا خوف جاوید کے لیے سوہان روح ہو رہا تھا۔ اسکے لیے رات اور دن یکساں تھے کیونکہ مارے درد کے سو نہیں سکتا تھا۔ بخار سے بھنا ہوا، زندگی کا ایک مکروہ سوانگ بنا وہ بستر پر سکڑا اسکڑا یا، کراہتا، چیختا پڑا رہتا، بے آس، مضطرب، مضمحل وہ گھلتا جا رہا تھا۔ جلتا جا رہا تھا، فنا ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہستی ایک دردناک کراہ بن کر فضا میں گم ہو جائے گی۔ اس کا چہرہ بعض اوقات شدید طور پر مشتمل نظر آتا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ اور وہ غیر واضح طور پر بڑبڑاتا ہوا سنائی دیتا۔

شاہینہ ایک وفا سرشت ہستی تھی۔ اس کا دل یکسر سوز و گداز تھا۔ محبت کرنے کے بعد اس کے اندر ایک خاص نوع کی الوہیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہی اس کی مصیبتوں میں کام آئی۔ شادی نام تھا اس کے لیے ابتدائے آلام کا۔ لیکن دکھوں کو اس نے ایک تیاگی کی طرح برداشت کیا۔ وہ سینا ٹوریم کے ویرانوں میں مہینوں جاوید کے لیے جوگن بنی رہی۔ اور اب بھی وہ زاہد شب زندہ دار کی طرح اس کی خدمت میں مشغول تھی۔ لیکن جاوید گاہے گاہے شاہینہ کی خدمتوں سے چڑ جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہینہ ایسی نہ ہوتی۔

ایک ماہ کی اذیتوں کے بعد جاوید اچھا ہونے لگا۔ صحت اور بیماری کے درمیان کا عرصہ بھی کافی وسیع تھا۔ وہ بہت لاغر ہو گیا، زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے سے زیادہ عاجز۔ وہ ابھر رہا تھا کہ اسے پھر مٹایا گیا۔ اس کے دل میں ایک خاموش خلفشار اٹھ رہا تھا۔ وہ اپنی روح پر مذہب و اخلاق کے بندھنوں کو کمزور پا رہا تھا۔ وہ ایک بے امید بے مستقبل انسان تھا، تقدیر کے تلوں کا شکار،

امید نہ ہو تو ایمان کی بقا معلوم۔ اس کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا، اس کے اعمال کے پیچھے کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔ وہ ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ بغیر کسی تمنا کے بغیر کسی خوف کے۔ وہ خدا کو بھول جانا چاہتا کیونکہ خدا کو برا کہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بعض اوقات اس کی مذہبیت ابھر کر اس کے نفس کو فرض کی طرف متوجہ کرنا چاہتی۔ پھر ایک تاریکی پیدا ہوتی اور اس کی روح پر چھا جاتی۔ اس تاریکی میں سے کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا کہ ''اعمال کی سزا صرف اس لیے ہے کہ انسان صاحب ارادہ ہستی ہے۔ مگر ''ارادہ'' خدا تو نہیں کہ بغیر سبب کے پیدا ہو جائے۔ ''ارادہ'' خود خدا ہے تو نتیجہ ایک ہی ہوا۔ ''ارادہ'' نفس کی ایک کیفیت ہے اور یہ کیفیت اندرونی کیمیاوی اور برقی تغیرات نیز بیرونی تحریکات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نا قابل تسخیر غیر شعوری قوتوں کے سامنے ارادہ کی بے بسی روزمرہ کا مشاہدہ و تجربہ ہے۔ ارادہ ہمارے افعال و اعمال پر بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود ارادہ نفس تحت الشعور کا غلام ہے اور اس تحت الشعوری قوت کی تخلیق زمانہ اور ماحول کرتا ہے''۔ اس آواز پر جاوید زیادہ کان دھرتا، ان ہی دنوں اس نے سیاسیات اور اشتراکیت کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے لکھے ہوئے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں زیادہ نظر آنے لگیں۔ باوجود مجبوری و معذوری پر ایمان لانے کے وہ سارے نظام سے بغاوت کرنی چاہتا تھا۔ اور خدا سے بھی۔ مگر آخرالذکر امر کی اس میں تاب نہ تھی۔ اس پر اس دور میں اور بھی مصائب آئے اور بیکاری کی مصیبت و لعنت ان پر مستزاد۔ جاوید کا خاندان معاشی تنگی میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ان ہی پریشانیوں میں اس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا اور وہ تنہا ایک صحت افزا مقام کو چلا گیا۔ روپے کی تنگی کے سبب وہ ایک نہایت ہی معمولی مکان میں ٹھہرا۔ وہ مسکن مکان سے زیادہ ایک جھونپڑا تھا۔

۔۔۔۔۔۔۔ جاوید کی زندگی ان دنوں ایک سادھو کی سی بسر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی کٹیا سے باہر اگر نکلتا بھی تھا تو جنگل کے متصل میدان میں اور رات کو آسمان کی چھت کے نیچے کھاٹ پر پڑا رہتا۔ اس کا ایک وفادار مقامی ملازم اس کے پاس سوتا تھا۔ ماحول کا اثر طبیعت پر بہت پڑتا ہے۔ فضا کی معصومیت جاوید کی روح میں سرایت کر رہی تھی۔ وہ اپنے اندر ایک پاکیزگی محسوس کرتا تھا۔ اور اپنے نفس میں تیاگ کی کیفیت کو بیدار ہوتا ہوا پاتا تھا۔ وہ مقام آبادی سے بہت دور تھا، ہر طرف فطری مناظر تھے۔ اور کھیتوں کا ابدی سکون۔ فطرت کی آغوش میں، جاوید ماں کی محبت کی قسم کا ایک روحانی فیض کا تجربہ کر رہا تھا۔ اس کے ذہنی و روحانی زخم مندمل ہو رہے تھے۔ حیات کی کامرانیوں اور ناکامیوں کو وہ یکساں ''مایا'' سمجھنے لگا تھا۔ یہ احساس اسے وجدانی طور پر ہوا۔ اور اسے ایک روحانی بصیرت بخش گیا اور ایک آسمانی مسرت۔ مئی کی ایک گرم دوپہر کو جاوید اپنے جھونپڑے میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ یک بیک اس کے دل پر رقت طاری ہوئی اور وہ رونے لگا اور خوب رویا پھر وہ اٹھا اور خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ عرصہ سے اس نے نمازیں ترک کر دی تھیں۔ اب وہ نہایت خلوص سے قائم الصلوٰۃ ہو گیا۔ یہ قابل رشک زندگی بسر کرنی چاہتا تھا کہ شاہینہ اور جاوید کے چند عزیز گھر سے آئے۔ جاوید کو گھر تبدیل کرنا پڑا۔ وہ پہلے تو بہت خوش ہوا لیکن کچھ عرصے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کا سکون مٹتا جا رہا ہے۔ دنیا پھر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اور جاوید کے لیے دنیا کے پاس کیا تھا، محرومی، پستی اور بیماری!

دوسرے مکان میں جا کر جاوید کی رگ مقابلہ پھڑک اٹھی۔ وہ دنیا کی ہر شے سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ اور زندگی کے اصول و ضوابط میں ایک ایسی تبدیلی کا آرزومند تھا جس میں اس کے لیے کوئی جگہ ہو۔ وہ موت و حیات کے آئین کو یکسر بدل دینا چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شاہینہ سے اور اپنے اعزاء سے بات بات پر الجھنے لگا۔ جا و بے جا اسے جوش آ جایا کرتا۔ اس کی روح آثار حیات کی سرخی و رونق کو قریب پا کر آمادۂ پیکار تھی۔ دنیا اس کے لیے خطرے کا نشان تھی۔

جاوید صرف ایک دو ماہ کے لیے برائے تبدیل آب و ہوا اس جگہ آیا تھا۔ مگر اسے یہاں چار ماہ رہنا پڑا۔ وہ یہاں صحت کی ترقی کے لیے آیا تھا مگر اسے حرارت رہنے لگی۔ ڈاکٹروں کو باعث حرارت کا پتہ نہ چلا۔ کبھی سل کے زخموں کے ہرا ہو جانے کا شبہ

ہوتا۔اور کبھی وجع المفاصل کی تحریک کا طبی مشورے کے ماتحت اسے زیادہ وقت پلنگ پر گزارنا پڑتا۔سیر کی اسے مطلقاً اجازت نہ تھی۔ دوائیں بھی بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔جاوید نہایت صبر و ضبط سے اس سزا کو برداشت کر رہا تھا۔اس کے اعزا ہو واپس چلے گئے تھے۔ صرف شاہینہ رہ گئی تھی۔وہ اکثر شاہینہ سے بیزار رہتا۔اور نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی۔مگر وہ ان دنوں خدا سے بیزار نہ تھا۔وہ صبر و رضا کی تصویر بننی چاہتا تھا۔وہ اپنے دل کے اندر اٹھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتا تھا اور روک رہا تھا۔سیلاب کی راہ میں رکاوٹ شدید کف پیدا کردیتی ہے۔جاوید کا مزاج کف آلود ہو رہا تھا۔اس کی فطرت کی سطح پر سنجیدگی خشونت،طنز اور استہزاء کا کف اٹھتا رہتا تھا۔ شاہینہ رنجیدہ تھی کہ جاوید اس سے بہیمانہ برتاؤ کیوں کر رہا ہے۔اسے توقع نہ تھی کہ وہ ایسا بے درد ہو جائے گا۔مگر وہ ایسا ہو گیا تھا۔اس کی فطرت کی لطافت اس طرح غائب تھی جیسے جیٹھ کے مہینہ میں کھیتوں سے سبزی مفقود ہو جاتی ہے۔شاہینہ رونے لگتی۔جاوید بہت دیر تک بے حسی سے اس کے رونے کو دیکھتا رہتا اور کچھ تلخ و تند باتیں کہہ دیتا۔شاہینہ ایک آئینہ تھی جس میں جاوید اپنی بے دست و پائی،دست نگری،نکھٹو پنی کی شبیہ دیکھتا تھا اور جھلا کر اس شیشہ ہی توڑ دیتا تھا جس میں ایسی بڑی مشکل نظر آتی تھی۔یہ آئینہ اس کی خودی کا منہ چڑا رہا تھا۔

اسی طرح مہینے گذر رہے تھے۔برسات آئی اور وہ ساری سطح مرتفع دیوانہ وار چلنے والی سرد تند ہواؤں کی بازی گاہ بن گئی۔ ایک روز زوروں کی بارش ہوئی۔جھڑی تو بہت دنوں سے لگی ہوئی تھی۔ہر طرف نمی تھی۔فضا ابر آلود ہو رہی تھی۔بارش جو ذرہ تھمی تو جاوید قریب کی بستی کی طرف چل دیا۔ایک ہفتہ عشرے سے اسے ٹہلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔وہ روبہ صحت تھا۔ان دنوں اس پر ایک مذہبی کیفیت طاری تھی۔وہ مقامی جنگلی اقوام کے افراد کو مذہب کی تبلیغ کرنے گاؤں گیا تھا۔راہ میں اسے بارش نے آلیا اور واپسی کے وقت وہ بھیگتا ہوا آیا۔دوسرے روز اس نے تمام جوڑوں میں درد محسوس کیا اور پھر اسے شدید بخار آگیا۔وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔اسی بخار و درد کی حالت میں دست بدست دیگرے و پابدست دیگرے وہ وطن کو لوٹ آیا۔اور شہر کے جنرل اسپتال میں داخل ہو گیا۔وہ کیف رضا و صبر کی حالت میں ان اللہ مع الصابرین کی لذت کو محسوس کر رہا تھا اور اپنے اندر ایک بالیدگی پا رہا تھا۔ ہر چند کہ وہ اسپتال میں تھا پھر بھی وہ خوش تھا۔اور اس کا غم ہلکا ہوتا رہتا تھا۔دو روز کے بعد اس کا بخار اتر گیا تھا اور درد رفع ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایک دو ہفتہ میں وہ اچھا ہو جائے گا اور آزادی سے ہر جگہ آسکے گا۔

ٹھیک چودھویں روز اس نے پھر جوڑوں میں درد محسوس کیا اور اسے حرارت ہو گئی۔ڈاکٹر آیا اور اس نے دل کا معائنہ خاص طور پر کیا۔''درجہ حرارت زائل ہونے کے بعد بستر پر تین ماہ کامل آرام'' ڈاکٹر نے سینہ پر سے اسٹیتھیسکوپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''کل سے وجع المفاصل کا انجکشن لینا شروع کرو''۔ڈاکٹر چلا گیا۔اور جاوید پر بجلی سی گری۔اس نے اپنے چند دوستوں سے جو میڈیکل کالج میں اس کے ہم جماعت تھے اور اب ڈاکٹر ہو چکے تھے پوری کیفیت دریافت کی۔ہر چند کہ ان لوگوں نے اسے بہت تسکین دی مگر وہ اتنا تو سمجھ گیا کہ وجع المفاصل کے مزمن ہو جانے سے اس کے قلب کی پہلی حرکت کمزور ہو گئی ہے۔اور عضوی اختلال کا خوف ہے۔اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔اس کا دماغ کچھ سوچنے سے ڈرتا اور اس کا دل محسوس کرنے کے فرض سے گریز کرتا تھا اور آنکھیں آنسو بہانے سے قاصر تھیں۔دن بھر وہ اسی حالت میں پڑا رہا رات کو مریضوں کی کراہوں کے درمیان جاگتا رہا۔صبح کو آفتاب نکل رہا تھا۔مگر اس کی زندگی کے لیے کوئی روشنی نہیں تھی۔اسے اپنی علالت کے سات طویل سال ایک تاریک رات کی طرح محسوس ہو رہے تھے جس میں کبھی کبھی بجلیاں کوندی تھیں۔اسے دو ایک قدم آگے بڑھانے کیلئے اس کے انجام کی طرف اور وہ انجام اب آ گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔زندگی شکن عمیق غار! موت کا خیال آتے ہی اس کے سارے جسم میں ایک خوفناک جھرجھری دوڑ گئی۔ کوئی سہارا نہیں! کوئی آسرا نہیں''۔اور اگر وہ زندہ بھی رہا تو ایک مجہول،اپاہج،دکھی زندگی بسر کرنے کے لیے۔اس کی صلاحیتیں فنا کی

جائیں گی۔اسے سسک سسک کر کراہتے ہوئے بیماری کی قید میں دم توڑنا ہوگا۔ یہ صبر وضبط، یہ ہمت اور ارادے، یہ استقلال وامید سب لاحاصل! اسپتال میں اس کے چاروں طرف زندگی کا شور تھا۔ مگر روگی جیون کا، دکھی زندگی کا، ''سارکوما'' کے مریض گھل گھل کر مر رہے تھے، ہر طرف درد وزخم تھا۔ ہر سو آہ و بکا تھی۔ اس کے پلنگ کے سامنے ایک نمونیہ کا روگی تین روز سے حالت نزع میں تڑپ رہا تھا۔ موت کا وحشیانہ رقص اور اس کے دلدوز قہقہے فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ حیات سسک رہی تھی۔ درماندگی و ہلاکت کے پنجے پھیلے ہوئے تھے اور مسرت منہ چھپا کر گریہ کناں تھی۔ جاوید اسی طرح موت کی بازیگاہ میں ایک ماہ پڑا رہا۔ اس کا مرض کابوس کے بھوت کی طرح اس کے سینہ پر سوار تھا۔ اس روح فرسا ماحول سے اکتا کر جاوید اپنے ایک عزیز کے مکان میں منتقل ہوگیا۔ جس روز وہ جا رہا تھا ایک سگ گزیدہ اسٹریچر پر اس کے وارڈ میں لایا گیا۔ اس کا آخری وقت تھا وہ وہیں زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سر دھن دھن کے اور اپنے جسم کو ناخنوں اور دانتوں سے مجروح کرتے ہوئے مر گیا۔ جاوید کی روح پیچ وتاب کھانے لگی۔ اور اس نے زیر لب کہا ''انتقال روح کا کتنا رحیمانہ طریقہ'' ایک بدقسمت بندہ اپنے آقا سے بیزار تھا۔ جس مکان میں اب جاوید تھا۔ وہیں شاہینہ بھی تھی۔ ان دنوں وہ شاہینہ کو نہایت ہی ترحم کی نظر سے دیکھنے لگا۔ شاہینہ تو سر بسر گریہ تھی۔ اس کی نمازیں ایک طویل فریاد ہوتی تھیں۔ جاوید میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا ہوگئی جسے وہ محسوس کرتی تھی۔ جب کبھی بھی جاوید کو درد کی ٹیس اٹھتی اس کا چہرہ غیض وغضب سے تمتما اٹھتا۔ مگر اس کے لب خاموش رہتے۔ ایک اندرونی جذبہ اس کی روح کو کھا رہا تھا۔ اگر اس کی ڈائری نہ ہوتی تو اس جذبہ کی حقیقت سے کون واقف ہوسکتا تھا سوائے اس کے جس کے خلاف یہ تھا۔

''انسانوں کی یہ وسیع آبادی ایک وحوش خانہ ہے۔ جہاں جانور صرف اس لیے رکھے جاتے ہیں کہ انہیں ''تماشا گاہ'' میں ایک دوسرے کو خون پلوا کر ہلاک کیا جائے۔ قیاصرہ روم خدا کے نقال تھے۔ خوردبینی، ادنیٰ واعلیٰ جانور اور انسان اس ''تماشا گاہِ ہستی'' میں ایک دوسرے سے جنگ کر کے خدا کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتے، اور اپنے لیے موت کماتے ہیں۔ ان کی پرداخت بھی صرف اسی لیے کی جاتی ہے۔ یہ امراض کے حملے اور جرم کشی، یہ شکار ذبح اور جانوروں کا انسانوں کو کاٹنا اور پھاڑ کھانا۔ یہ وطنی قتال حق وباطل کی آویزشیں، یہ رنگ ونسل کے جھگڑے سب خونیں تماشے ہیں جن کی کل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور آخرت! کون جانے جسے مذہب ''خیر کل'' سمجھتا ہے وہ ''شر کل'' ہو اور اجر غیر ممنون محض وعدۂ فردا!'' یہ ہیں جاوید کی ڈائری کے الفاظ۔ معاذ اللہ! اس کی روح اس کے جسم سے زیادہ بیمار تھی!

ایک روز جاوید کو جوڑوں میں شدید درد اٹھا۔ اس کی گردن مارے درد کے تڑخ رہی تھی۔ بخار بھی تھا۔ شاہینہ اسے منہ دھلانے آئی اور اسے کروٹ پھرانے لگی۔ جاوید کی گردن میں ٹیس اٹھ رہی تھی۔ وہ کروٹ پھیرنے سے عاجز تھا۔ جب بھی گردن کو جنبش دیتا رگ اور پٹھے میں ٹپک پیدا ہوجاتی۔ یک بیک اسکی رگیں تن گئیں اور چہرہ پر گرم خون تیزی سے دوڑ گیا۔ اس نے اپنی گردن کو جھٹکتے ہوئے کروٹ پھیر لی اور بولا ''اف خدا!'' یہی جملہ بہت دنوں سے اس کے قلب میں گھٹ رہا تھا۔ اسے جرأت اظہار نہ تھی۔ اعلان کفر بھی شہادت ایمان کی طرح ہمت طلب ہے۔ شاہینہ حیرت وغم کے سمندر میں ڈوب رہی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ مگر اس کی آنکھیں مسترحمانہ انداز میں کہہ رہی تھیں ''جاوید!''

پہلے تو جاوید کی خودی کو تسکین ہوئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اس نے ایک چٹان کو سرکا تو دیا مگر وہ چٹان اس کے سر پر آگئی اور اسے پیسے ڈالتی ہے۔ اس پر ایک پسپا سپردگی اور ایک مظلومانہ بے توجہی کی کیفیت طاری رہی اور شاہینہ! وہ کانپ رہی تھی۔ گھلی جا رہی تھی اور اسکی دعائیں زیادہ گریہ در آغوش ہوگئی تھیں۔ جاوید کو بستر سے اٹھنے تک کی اجازت نہ تھی۔ بستر ہی اس کی ساری کائنات تھی۔ اور وہ کیسی تاریک تھی! وہ اپنے چاروں طرف ایک خلد محسوس کر رہا تھا۔ ایک لامتناہی خلد۔ اس کے دل

میں بھی ایک خلد تھا۔ خارجی خلد سے زیادہ ہیبتناک، زیادہ ناقابل فہم، زیادہ بے معنی۔ اس کے لیے زندگی کا کوئی اثباتی مقصد نہیں تھا بے کیف لا حاصل، رائیگاں زندگی! کوئی ہاتھ اس کے دل کو تسکین دینے والا، کوئی لب اس کی روح کو محبت کا پیغام پہنچانے والا نہ تھا۔ ہر طرف ایک مہیب اور بھیانک خاموشی تھی۔ ہر سو سرد مہری۔ جاوید ایک مجہول، بھائیں بھائیں کرتی ہوئی تاریکی میں غرق تھا۔ زندگی سے زیادہ تلخ اور موت سے زیادہ خوفناک تاریکی۔ وہ اس بے پایاں، ابدی تاریکی میں دھنسا جا رہا تھا۔ اور تاریکیاں اس پر گھری ہوئی جاتی تھیں۔

شاہینہ ان تاریکیوں کو دیکھ رہی تھی اور لرز جاتی تھی۔ وہ جاوید کے جسم و روح کی نجات کی متمنی تھی، دردانگیز شدت کے ساتھ مگر وہ مجبور تھی، یکسر مجبور! ایک روز وہ دعا و عبادت سے فارغ ہو کر جاوید کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرہ پر ایک قدسی نور تھا۔ اور اس کی آنکھیں امید کی تابانی سے چمک رہی تھیں۔ اس نے محبت و شیرینی کے ساتھ جاوید سے کہا، ''آپ کب تک اپنے مالک سے روٹھے رہیں گے؟'' جاوید کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ خود خدا کی آواز تھی۔ جو اسے پکار رہی تھی۔ اس نے اپنے قلب میں اس کی بازگشت سنی۔۔۔ ''آپ کب تک اپنے مالک سے روٹھے رہیں گے''۔ محبت کی ایک پکار کے ساتھ جامد خاموشیاں مٹ چکی تھیں۔ تاریکی چھٹ رہی تھی۔ اور وہ اپنے اندر اور باہر نور کی فاتح کرنوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی روح خدا کی پکار کا جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے حلق میں دعائیں اٹک رہی تھی۔ اور اس کی پلکوں پر آنسو تل رہے تھے۔ شاہینہ بولی، ''دعا کیجئے! میری خاطر دعا کیجئے!!'' جاوید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس کے لب ہل رہے تھے۔ مہر ٹوٹ چکی تھی، برف پگھل چکی تھی! جاوید و شاہینہ دونوں رو رہے تھے۔ اور دعا و التجا کے اہتزاز سے ان کے لب کانپ رہے تھے۔ شاہینہ نے جاوید کے سر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور جاوید کا ہاتھ اس کی گردن میں حمائل تھا۔

۔۔۔اور خدا کی محبت کا ہاتھ ان پر سکون کی بارش کر رہا تھا۔

☆☆☆

فٹ پاتھ

اعظم کریوی

شہر میں سڑکوں کی دونوں طرف کی دنیا ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی۔ کہیں بھرے بازار کے درمیان سڑک یوں نرمی سے بل کھاتی ہوئی گذرتی ہے جیسے مشتاقوں کے ہجوم میں حسن سر محفل۔ آمد و رفت کی کثرت سے کھوئے سے کھوئے چھلتے ہیں۔ کہیں شاندار رہائشی محلوں سے اس کا گذر ہوتا ہے۔ دو طرفہ نئی وضع کی کوٹھیاں، سبزہ زارا حاطے، دھنک کی طرح رنگ برنگی ہنستی ہوئی کیاریاں، جدید فیشن کے لباس، ناز فرماتی ہوئی ساریاں، نغمہ زن بالا خانے اور دھوم مچاتی ہوئی موٹریں اور کہیں مفلوک الحال حلقوں کا جگر چیرتی ہوئی یہ سڑکیں یوں تیر جاتی ہیں جیسے اُپی ہوئی تلوار۔

بڑی سڑکوں کے حاشیوں پر فٹ پاتھ کا وجود ان کے وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ سڑکوں کی بہ نسبت فٹ پاتھ کی دنیا ذرا آہستہ خرام کرتی ہے۔ سڑک ندی کے درمیانی دھارے کی طرح ہوتی ہے اور فٹ پاتھ موج ساحل آشنا کی مثال۔ مگر فٹ پاتھ کی دنیا حرکت وسکون دونوں کے مناظر پیش کرتی ہے۔ لہٰذا زیادہ دلچسپ ہے۔ رہروں کے علاوہ فٹ پاتھ کی آغوش میں بہت سی ہستیاں ہوتی ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور اشرف المخلوقات بھی، جی ہاں اشرف المخلوقات بھی جس پر حوریں رشک کریں اور جن کے سامنے فرشتے سجدے میں گریں۔

میونسپلٹی کے ٹین اپنی الابلا، کوڑے کرکٹ، بھارن کے ساتھ ایسے دکانداروں کے پلنگ جو صرف نفع کمانا، قانون کو دھوکا دینا اور ساری دنیا کو اپنا سمجھنا جانتے ہیں۔ صرف پلنگ ہی نہیں، بنچ، کرسیاں، ٹوکرے، دیودار کے بکس وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستانی وزیروں کی طرح موٹے تازے، ہچکتے دمکتے مگر مجبور و پابہ گل لیٹر بکس اور حیوانات میں بکریاں، گائیں گھوڑے، گدھے، کتے اور سب کے سہاپتی سانڈ دوسروں کی کمائی کھانا خود بیکار رہنا اور دندنانا۔ ویسے ساہوکاروں، کارخانہ داروں اور زمینداروں کی طرح، سانڈ بھی کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ نباتات میں میوے کی بڑی دکانوں سے پھینکے ہوئے چھلکے اور ایسی ٹوکریوں کے بیر، خراب وخستہ کے لیے اور آدھی سڑی ہوئی نارنگیاں جن کی پوری کائنات ایک گوشے میں سما جاتی ہے۔ غرض یہی ہستیاں فٹ پاتھ کی رونق ہوتی ہیں۔ مگر جو اشرف المخلوقات نہ ہوتا تو آسمان و زمین، جمادات، نباتات و حیوانات کہاں ہوتے۔ فٹ پاتھ پر اشرف المخلوقات بھی ہوتے ہیں۔ مسلسل سدا لگائے ہوئے فقیر، اپاہج بھک منگے، بھٹکتے ہوئے کوڑھی جو اپنے ٹھنڈے ہاتھوں کو دکھا کر صرف سوالیہ اشارے کرتے ہیں۔ ایسے زار و نزار محتاج جو برائے نام سا چیتھڑا سامنے بچھا کر بے حس و حرکت لیٹے رہتے ہیں۔ نصف درجن سے زیادہ گندے اور ادھ موئے بچوں والی عورت جو بیر یا شکر قند، رکشا والوں اور قلیوں کے ہاتھ بیچتی ہیں۔ ایک پلہ نما بچہ ربود کرتی سے ڈھکی، ڈھلکی ہوئی خشک چھاتیوں کو اس طرح چاٹتا ہوا جیسے کوئی غریب جو آم کے پھینکے ہوئے چھلکوں کو رس گل جانے کے بعد بھی چاٹ لینا پسند کرے۔ میلے برقعے کے اندر سے نکیاتی ہوئی سائلہ عورت۔ چائے کی پھینکی ہوئی سیٹھی سے بننے والی چائے بیچنے والے اور ان کے گرد بیکار اور تھکے ہوئے مزدور۔ اور راتوں کو انہیں فٹ پاتھوں کے سینوں کی دبی ہوئی آگ دہک اٹھتی ہے۔ خالی خولی ہانڈیوں میں چند دانے ابلتے ہیں۔ پانی کے ابال کی آواز دھرتی کی کراہ معلوم ہوتی ہے۔ بھوکے پیٹوں کو جگا کر فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والے سونے کی نقل کرنے کے لیے زمین پر دراز ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کا چکر چلتا رہتا ہے اور قسمت کے بہانے برداشت کر لیا جاتا ہے۔

آج میں آپ کو فٹ پاتھ ہی سے متعلق ایک کہانی سنانے والا ہوں۔ نہ جانے کتنی بن کہی اوران سنی کہانیاں فٹ پاتھوں سے گرد راہ کی طرح لپٹی ہوئی ہوں گی۔

دس سال کی عمر کا ایک لڑکا میرے مکان کے سامنے سڑک کے چھوٹے سے پل پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں پھیلائے ہوئے، بے پروا آزاد، کمر میں لنگوٹی کسی بے شرم کی یونہی سی لاج کی طرح چپکی ہوئی۔ گردن سے ایک میلا، ڈھیلا، ڈھالا، چور چور کسی کا اتارن کرتہ جھول رہا تھا۔ شکستہ کرتے کے چاکوں کو ایک حد تک چھپانے میں سیاہ مرزئی مدد دے رہی تھی، جو خود بھی اکثر جگہ خندۂ دنداں نما کی شکل پیدا کر رہی تھی۔ یہ مرزئی بھی یوں تھی جیسے چھوٹے تکئے کا خول پہنا دے۔ کرتا جانگھ تک آتا تھا اور سامنے پھٹے ہونے کے سبب جسم زیریں کی عریانی کو دور کرنے کی بجائے، اس کے ننگے ہونے کا پردہ فاش کر رہا تھا اور اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور اس کے سیاہ ہاتھ پاؤں پر گرد کی تہیں نمایاں طور پر جمی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ زمین کی خاک اور جسم کے پسینے نے مل کر یہ ابٹنا تیار کیا تھا۔ وہ شاید بہت دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔ سہ پہر کی دھوپ نے جابجا پسینہ چلا کر ابٹنے کو ہلکا کر دیا تھا۔ سر کے بال پسینے میں چپک رہے تھے۔ وہ سنہری دھوپ سے لطف اٹھا رہا تھا۔ دنیا سے لاپروا ہو کر وہ اپنی مرزئی کے اوپر کی چلٹیریں مار رہا تھا اور گاہ گاہ اپنا بدن تیزی سے کھجا لیا کرتا تھا۔ میرا محلہ شہر کا ایک خاموش حصہ تھا۔ دو جانب کالج کے کوارٹر تھے، تیسری جانب دریا اور چوتھے جانب درمیانی اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے کچھ مکانات، وہ نا جانے ادھر کیسے آنکلا۔ شاید پکنک کے لیے روزمرہ کے ہنگاموں سے تنگ آ کر محض یونہی آج اس کی ٹانگیں ادھر ہی اسے لے آئیں۔ جاڑے کے دن تھے۔ دسمبر کا مہینہ اسے دھوپ میں بڑے اطمینان وسکون سے بیٹھا دیکھ کر یہ اثر ہوتا تھا جیسے کوئی بچہ ماں کی گود میں عالم رنج وحسرت کو بھول کر آسودگی وطمانیت کے ساتھ بیٹھا ہوا ابدیت کے ساتھ رشتہ جوڑ رہا ہو۔

میرا ملازم اسے بلا کر میرے مکان کے اندر لے آیا۔ پہلے تو اس نے پکار تک نہ سنی۔ وہ اتنا محو تھا۔ شور کرنے سے وہ چونکا، مگر شان سے پل ہی پر بیٹھا رہا۔ جب اسے اندر بلایا گیا تو اس نے بہت ہی مشکوک تیور سے ماحول کو بھانپا اور پھر چلٹیریں مارنے لگا۔ خوشامدیں کرنے، چمکارنے اور دلاسے دینے پر مشکلوں سے وہ کشاں کشاں یوں اندر لایا گیا جیسے چھتر کے میلے سے ایک نئے اڑتے ہوئے گریزاں بچھڑے خرید کر کوئی کسان ڈریاتا ہوا لیے جا رہے ہو۔

شاید وہ کچھ بہرا بھی تھا اور اس کی دونوں آنکھوں میں پھولیاں تھیں۔ ایک میں زیادہ، دوسری میں کم۔ وہ گھر کی چار دیواری کے اندر گھبرایا گھبرایا سا معلوم ہو رہا تھا۔ نوگرفتار پرندے کی طرح، سائبان سے دوڑ کر وہ انگنائی میں چلا گیا اور کنوئیں کی منڈیر پر لاپروائی سے بیٹھ گیا۔ گردن نیچی کئے ہوئے وہ شرما کر دانت نکالے آہستہ آہستہ ہنس رہا تھا۔ اسکے دانت پیلے پیلے تھے۔ پھسی سے اٹے ہوئے جیسے دانتوں پر سونا چڑھایا جاتا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے کھانا دیا۔ وہ بہ مشکل کھانے پر راضی ہوا مگر جب کھانے لگا تو بھوکے کتے کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ صحن میں بیٹھا بیٹھا جب وہ رکابی صاف کر چکا تو تیزی سے گرسنہ بھڑیئے کی طرح وہ باورچی خانے میں گھس گیا اور کھانے کی مزید چیزیں تلاش کرنے لگا۔ تابے، ہانڈیاں، پیالے، ٹکریاں سب اس نے الٹ پلٹ کرنی شروع کیں، باورچی نے اسے ڈانٹ بتائی، ہم لوگوں نے اسے سمجھایا کہ یہ بدتمیزی ہے اور کھانا ہو تو مانگ کر کھایا کرو۔ مگر یہ باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ اس وقت تک بے چین رہا جب تک اسے کچھ اور کھانے کو نہ مل گیا۔

دوبارہ کھا کر بھی اس کے تقاضے جاری رہے۔ ہم لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اب رات کو کھانا پیٹ بھر پھر ملے گا۔ وہ کچھ مایوسی اور جھلاہٹ کے عالم میں رکابی سے دال اور شوربا چاٹنے لگا۔ چاٹ واٹ کر رکابی کو ایک طرف نہایت ہی بے توجہی سے سرکا دیا اور کنوئیں کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گیا۔ بے تعلق سا، بے حس، بے فکر، وہ بہت ہی کم باتوں کا جواب دیتا تھا۔ ہم لوگوں کو گملوں

اور چمن کی آبپاشی کے لیے ایک ایسے چھوکرے کی ضرورت تھی جو اوپر کے اور کام بھی کر دیا کرے، اس لونڈے کو ہم نے خداداد سمجھا۔ کم دانے گھاس میں یہ بہت سے کام کر دیتا۔ خود غرضی اور جذبہ ترحم نے مل کر ہم میں یہ شدید خواہش پیدا کی کہ کسی طرح یہ باد آورد ہمارے ہاں ٹک جائے۔ ہم لوگوں نے اسے سمجھانا شروع کیا کہ وہ نوکر ہو کر یہاں اگر رہ جائے تو اسے خوب کھانے کو ملے گا، اچھے صاف صاف کپڑے پہننے کو ملیں گے اور پیسے بھی۔ وہ چپ سنتا رہا۔ کبھی کبھار اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنس دیتا۔ عجیب طرح کی بے تعلق، بے جذبے کی کھوکھلی سی ہنسی۔ ہم لوگوں نے اسے نہانے کو کہا، وہ فوراً تیار ہو گیا۔ اسے نہانے کو کپڑا دھونے والا صابن دیا گیا۔ اس نے اسے سونگھا اور منہ بنا لیا۔ پھر ہنستا ہوا نہانے کے لیے کل پر بیٹھ گیا۔ اسے ایک پرانا ہاف پینٹ اور ایک پرانی قمیص دی گئی۔ اس نے خوش خوش انہیں پہنا۔ بٹن لگاتے وقت اسے بڑا لطف آ رہا تھا۔ کئی بار بٹن کھول کھول کر انہیں لگائے۔ وہ جدت کا لطف لے رہا تھا۔ اپنے کرتے اور مرزئی میں اس قسم کی نامعقول بندشیں نہیں تھیں۔ نہا دھو کپڑے بدل کر وہ سیدھا باورچی خانے میں گھس گیا اور اب کے اس نے باورچی سے بہ منت کچھ اور کھانے کو مانگا۔ چند سوکھی روٹیاں اسے دے دی گئیں اور اس نے انہیں ہفتوں کے بھوکے کی طرح دو تین لقموں میں ختم کر دیا۔ کھا کر وہ اٹھا اور اپنے پھٹے پرانے کرتے میلی چکٹ لنگوٹی اور چیلڑوں سے اٹی ہوئی مرزئی کو لپیٹ لپاٹ کر سنبھال کے آنگن کے ایک گوشے میں ٹوٹے ہوئے گھڑے پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا میرے پاس آیا۔ اور غیر متوقع جرأت سے اس نے سوال کیا۔

''کتنا مشارا دو گے؟''

میں نے کہا۔۔۔''ٹھکانے سے کام کر۔ کھانا، کپڑا، مشاہرہ سب ملیں گے''۔

کہنے لگا ''نہیں بول دو کتنا ملے گا؟''

میں نے ہنس کر کہا ''ابے تو مشاہرہ لے کہ کیا کرے گا؟ خوب بھر پیٹ کھایا کر اور پیسے لے لیا کر دو ایک''۔

''اونہہ! تب ہم نہیں رہیں گے''۔

''مشاہرہ بھی ملے گا تو گھبراتا کیوں ہے؟ تیرا گھر کہاں ہے؟'' میں نے اسے تسلی دی۔

مجھوڑ پور جلع''۔

میں نے دریافت کیا ''ماں باپ ہیں؟''

اس نے کہا ''نہیں! کوئی نہیں!'' اور نفی میں زور سے سر ہلاتا رہا۔

''بھائی بہن؟''

''کہہ تو دیا کوئی نہیں''۔ وہ بگڑ سا گیا۔

''اچھا تجھے مشاہرہ دوں گا۔ میرے پاس جمع کرانا، اس سے بہت سے کپڑے بنا لینا اور مٹھائیاں کھانا''۔

''نہیں مشاہرہ ہاتھ میں لیں گے''۔

''ہاتھ میں لے کر کیا کرے گا؟ پھینک دے گا، اور کیا! یا گر جائیں گے روپے کہیں''۔

''نہیں! ہم کو مکان بنانا ہے''۔ اس نے شان و وقار کے ساتھ کہا۔ میں بھی چونک گیا اور سب لوگ ہنسنے لگے۔ اسے چوٹ سی لگی کہنے لگا۔

''میرے بھی مکان ہے جی! جلجلہ میں گر گیا ہے تھوڑا۔ دو کوٹھڑی ہے! اس کے سیاہ چہرے پر خون نے دھچے ہوئے توے کا رنگ پیدا کر دیا۔

میں نے کہا ''اچھا بنانا مکان ۔ تیرے ہاتھ میں روپے دونگا''۔ وہ خوش ہوگیا اور ہنسنے لگا۔اس نے یہ بھی نہ پوچھا پھر کتنا مشاہرہ ہوگا۔اس کے دل میں بھی حسرتِ تعمیر اور تمنائے ملکیت تھی۔اسی حسرت، اسی تمنا کے پورا ہونے کا تصور ہی اتنا خوش آئند تھا کہ وہ سرمست ہوگیا۔

وہ مکان کے بیرونی احاطے میں جا کر بیٹھ رہا۔جب اسے کسی کام کے لیے بلایا جاتا تو وہ چلا آتا اور کام کو ادھورا ہی چھوڑ کر پھر باہر احاطے میں جا بیٹھتا۔اسے ایک دو بار سمجھانے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔ہم لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ ابھی زور دینا ٹھیک نہیں چپ ہو رہے کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔اب رات ہو چلی اور اور وہ مزے میں صحن میں بیٹھا رہا۔کھانا کھانے کے لیے اندر آیا اور پھر باہر چل دیا۔بڑی دقتوں سے اسے سلانے کے لیے اندر لایا گیا۔اب وہ کوٹھری کے اندر سونے پر رضامند نہیں۔ رات بھر وہ سائبان ہی میں سوتا رہا۔غضب کی سردی تھی مگر وہ تو کھلی فضا کا پنچھی تھا۔اسے اوڑھنے کے لیے ایک کمبل دے دیا گیا جسے اس نے نہایت استغنا کے ساتھ سرسری طور پر لے لیا۔

صبح ہوتے ہی وہ احاطے میں جا پہنچا۔صرف قمیص اور ہاف پینٹ پہنے ہوئے اسے بلا کر چولہے کے پاس باورچی خانے میں بٹھایا گیا۔وہاں وہ چپکا بیٹھا رہا۔جب ہم لوگوں کے ناشتے کے بعد اسے روٹی کھانے کو مل چکی تو میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''ہم جا کے چادر لی آویں؟''

میں نے پوچھا ''کہاں ہے تیری چادر؟''

اس نے نہایت صفائی سے جواب دیا ''فٹ پاتھ پر''۔

''ارے فٹ پاتھ پر کہاں؟''

''جہاں ہم روج سوتے تھے۔حاطہ کے ٹٹی میں لٹکا کے رکھ دیا ہے''۔

اب وہ جانے کے لیے بے چین تھا۔میں نے کہا۔۔۔'' تجھے دوسری چادر مل جائے گی مت جا!''

مگر اس نے ایک نہ سنی اور جانے پر مصر ہوا۔ملازموں نے اسے زبردستی روکنا چاہا تو وہ زور زور سے رونے لگا۔

میں نے آخرش اسے جانے کی اجازت دے دی۔وہ چھلانگ لگا کر احاطے کے اندر چلا گیا اور وہاں سے یک بیک لوٹ کر اندر آیا۔اس نے صحن کے گوشے میں جا کر قمیص اتار دی۔اپنا میلا سا ربود کرتہ اور مرزئی پہنی اور ہاتھ میں لنگوٹی کا چیتھڑا لے کر باہر جانے لگا۔

میں نے اسے کہا ''ارے یہ کیا! اپنی چادر لے کر تو واپس نہیں آئے گا کیا؟''

وہ بلا جواب دیئے پھرتی سے احاطے سے باہر نکل گیا اور پھاٹک سے باہر ہو کر دوڑتا ہوا بھاگا۔یہ جا وہ جا۔

فٹ پاتھ اسے آواز دے رہا تھا۔اس نے اپنی ماں کی آواز سن لی۔کل کا بھولا بچہ اپنے گھر لوٹ چکا تھا۔

☆☆☆

یہ مرد

اوپندر ناتھ اشک

کسی قسم کے احساس کے بغیر گوبند نے چپ چاپ لکشمی کی چارپائی کے اردگرد پردے لگا دیئے، پردے۔۔۔۔۔ جو لکڑی کے فریم میں سفید کپڑا لگا کر بنائے گئے تھے۔ اور حسب خواہش کھولے یا بند کیے جا سکتے تھے۔ تب مس سلطانہ اور بکیٹی تیز تیز چلتی ہوئی آئیں۔ اور انکے بعد متین اور سنجیدہ ڈاکٹر صاحب اپنے بھاری قدم آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے پردوں کے اندر چلے گئے۔

کچھ لمحہ تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف چھت پر لگے ہوئے سفید پردوں والے پنکھے اپنی پوری رفتار سے گھر گھر کرتے رہے۔ اور جون کی تپتی دوپہر اپنی نیم وا آنکھوں سے غنودگی کی سی حالت میں چپ چاپ پڑی رہی۔

یکایک پردے کے پیچھے سے کچھ اکھڑی اکھڑی سانسوں کی آواز آئی، پھر لکشمی کے بہکے بہکے الفاظ اور پھر سلطانہ کی لمبی سانس! ڈاکٹر نے کہا ''سٹریچر لے آؤ! اور یہ کہہ کر پردے کے پیچھے سے نکل کر وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے گئے۔ ان کے پیچھے رومال سے آنکھیں پونچھتی ہوئی سلطانہ نکلی۔ دوسری بیمار عورتیں تجسس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کے نکلتے ہی رشیدہ نے پوچھا۔۔۔ ''کیوں؟''

''ختم ہوگئی!''۔۔۔ بھرے گلے سے سلطانہ نے جواب دیا۔

''آخری وقت کیا کہتی تھی؟''۔۔۔ سرتی بولی۔

''صرف ایک بار کھنہ صاحب کو یاد کیا اور بس!'' اور یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی سلطانہ جلد جلد سٹریچر لینے کے لیے چلی گئی۔

لکشمی اپنے خاوند کو کھنہ صاحب، کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ وہ لاہور ہی میں ملازم تھے اور ہر ساتویں دن با قاعدہ اسے دیکھنے آتے تھے۔ کوئی ایسے خوش شکل تو نہ تھے مگر ایسے بھی نہیں کہ بدصورت کہے جا سکیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ آدمی بے ساختہ ان کی طرف کھنچ جاتا تھا اور پھر اتنی باتیں کرتے تھے، اتنے قہقہے لگاتے تھے کہ جب وہ آ جاتے تو ہسپتال کی اس خاموش اور ساکن فضا میں زندگی سی دوڑ جاتی۔ فقط لکشمی ہی ان کے آنے کا انتظار کرتی ہو یہ بات نہیں۔ اس کھلے اور کشادہ کمرے میں لوہے کی سخت، بے درد چارپائیوں پر لیٹی ہوئی بخار، حرارت، دوا، پرہیز کی باتیں سن سن کر عاجز آئی ہوئی دوسری بیمار عورتیں بھی ان کے آنے کی راہ دیکھا کرتی تھیں۔ وہ باتیں چاہے اپنے رشتے داروں سے کرتی ہوں، لیکن کان ان کے ادھر ہی لگے رہتے تھے اور لکشمی وہ تو نہ جانے یہ سات دن کیسے کاٹتی تھی؟ ہنستی تھی، دوسروں کو ہنساتی تھی، لیکن اس تمام ہنسی ٹھٹھے میں اپنے خاوند کا انتظار جیسے اس کے دل کے کسی نامعلوم گوشے میں چھپا رہتا تھا اور کون جانتا ہے کہ یہ ہنسی قہقہے، ہسپتال میں ایک بار طلوع ہو کر پھر غروب ہی نہ ہونے والے، دنوں کا کاٹنے کا محض بہانہ نہ تھے۔ یہ بات بھی نہیں اسے اپنے خاوند سے اتنی محبت اس مہلک بیماری کے دنوں میں ہوئی، اسی دن، جب شادی کے بعد ایک مہینہ گذار کر وہ اپنے میکے واپس آئی تھی تو اس کی سہیلیوں نے جان لیا تھا کہ بستی کی آزاد فضا میں دن رات کھیلنے والی، گلی محلوں کو اپنے قہقہوں سے گونجا دینے والی لکشمی اب محبت کی زنجیروں میں جکڑی گئی ہے۔

جب سہیلیاں اسے چاروں طرف سے گھیر کر بیٹھ گئی تھیں تو اس نے فخر سے کہا تھا ''ان کی بات پوچھتی ہو؟'' وہ تو مجھے پل بھر کے لیے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ کتنی کتنی دیر میری طرف دیکھتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں۔۔۔۔۔''

فرطِ حیا سے اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا اور پھر سہیلیوں کے اصرار پر اس نے گلاب بن بن کر کہا تھا۔ کہتے ہیں" تم تو سورگ کی دیوی ہو، میں تمہاری پوجا کرتا ہوں"۔

ستیا کی رشک بھری آنکھوں نے تب دیکھا تھا کہ اس کی یہ بات اپنے خاوند سے ہر ہندو عورت کو جو محبت ہوتی ہے، اس کی ہی مظہر نہیں، بلکہ اس حقیقت پر مبنی تھی جس کی تائید اس کا رواں رواں کر رہا تھا۔ تب اپنے خاوند کے بے التفاتی کا دھیان آ جانے پر ایک سرد آہ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل گئی۔

ساوتری نے اپنے حسد کا اظہار ایک دوسرے ہی طریق پر کیا۔ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔۔۔" ہاں بہن، انہیں محبت کیوں نہ ہوگی، ایک بار ہاتھ سے گنوا کر ہی آدمی کسی چیز کی قدر کرنا سیکھتا ہے"۔

اس فقرے میں جو طنز پنہاں تھا اس کی طرف دھیان دیے بغیر سادہ لوح لکشمی نے مسرت کی رو میں سہیلیوں کو اپنی اس ایک مہینے کی ازدواجی زندگی کی بیسیوں کہانیاں سنا ڈالی تھیں۔ کس طرح اس کے شوہر اس پہ جان چھڑکتے ہیں۔ اسے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند نہیں کرتے۔ دفتر میں نہ جانے کیسے وقت گزارتے ہیں؟" پہلی بیوی"۔۔۔۔ وہ کہتے ہیں" وہ تو گنوار اور بیوقوف تھی۔ تمہیں پا کر تو میں نے زندگی کی مسرتیں پالی ہیں"۔

تارا نے تب ہنستے ہوئے کہا۔۔۔" ساس کو یہ سب کچھ کیسے بھاتا ہوگا؟"

"ان کے دل کی میں کیا جانوں"۔ لکشمی نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ لیکن میٹھی تو وہ ایسی ہیں جیسے مصری۔ بولتی ہیں تو رس گھول دیتی ہیں۔ میری تو عادت تم جانتی ہو سوتے سوتے دن نکل آتا ہے۔ مگر انہوں نے اس کا کبھی برا نہیں مانا۔ وہ خود چار بجے علی الصباح اٹھ کر نہا دھو، پوجا پاٹھ کر، گھر کا سب کام ختم کر دیتی ہیں۔ میں کچھ کرنے کی کوشش بھی کروں تو کہتی ہیں" تمہیں ہی تو کرنا ہے بہو، میں کب تک بیٹھی رہوں گی"۔

اور اس دن بستی میں لکشمی کی رحم دل اور فرض شناس ساس اور محبت کرنے والے ہنس مکھ خاوند کی کہانی گھر گھر پھیل گئی تھی اور شادی شدہ لڑکیوں نے دعا کی کہ ان کے خاوند اور ساسیں بھی ایسی ہی بن جائیں اور کنواری لڑکیوں نے دل ہی دل میں کہا 'بھگوان ہمیں بھی ایسا ہی گھر ور دینا'۔

ربڑ کے پہیوں والا سٹریچر چپ چاپ مشرقی دروازے سے داخل ہوا گوبندا سے دھکیل رہا تھا۔ اور مس سلطانہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کا ہمیشہ ہنسنے والا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جیسے اسی کے کسی قریبی رشتہ دار کی موت ہوگئی ہو۔ موتیں، ہسپتال میں ہمیشہ ہی ہوا کرتی ہیں۔ اور ہسپتال کے ملازم اس درجہ ان کے خوگر ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے سب کام کسی قسم کے احساس کے بغیر کئے جاتے ہیں۔ لیکن لکشمی سے سلطانہ کو محبت سی ہوگئی تھی۔ سلطانہ پر ہی کیا موقوف، سب کو اس سے انس ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے کتنے ہی واقعات ایک عجیب سادگی سے بیان کئے تھے۔ اپنی ساس کے متعلق اس کے دل میں جو بلند خیالات تھے انہیں ہوا ہوتے دیر نہیں لگی۔ وہی زبان جو پہلے رس کی دھاریں بہاتی تھی بعد کو زہر بھی اگلنے لگی۔ کھنہ صاحب تب ملازم نہیں ہوئے تھے۔ مگر گھر کی سیاسیات میں وہ ماہر تھے۔ اپنا کام چالاکی سے نکالنا جانتے تھے۔ ماں کے سامنے چپ رہتے لیکن تنہائی میں کہتے" لکشمی ان سب قصوروں کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں" اور تب اسے ساس کی جھڑکیاں، طعنے کوسنے، گالیاں بالکل بھول جاتیں اور خاوند سے اس کی عقیدت کئی گنا بڑھ جاتی۔ وہ ساتھ ہیں تو پھر چاہے سارا جہان خلاف ہو جائے، وہ سب کی مخالفت خوشی خوشی جھیل لے گی۔ جی نہ چاہتے ہوئے بھی، ساس کو خوش کرنے کے لیے اس نے بھگوتی درگا کی پوجا سیکھی اور اپنی سہل انگاری کو چھوڑ کر محنت سے کام کرنے کی عادت بھی ڈالی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ساس کے تیور نہ بدلے۔ اس کی جھڑکیاں، طعنے،

کوسنے بدستور جاری رہے مگر لکشمی نے سب کچھ ہنس ہنس کر سہنا سیکھ لیا تھا۔ ہاں ایک بار جب جلتا ہوا گھی گر جانے سے اس کے ہاتھ جل گئے تھے اور ابھی آرام بھی نہ آنے پایا تھا کہ اس کی ساس نے کپڑوں کی بھری گٹھڑی اس کے سامنے رکھ دی تھی، تو اس کی ہمیشہ مسکرانے والی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کپڑے دھوتے دھوتے اس کے چھالے پھوٹ گئے تھے۔ تب اندر کمرے میں جا کر وہ خوب جی بھر کر روئی تھی اور جب کھنہ صاحب آئے تھے تو اس نے کہا تھا" مجھے اس نرک سے چھٹکارا دلاؤ۔ ماں اگر دھن والی ہے تو کیا اسی لیے یہ نرک کی اذیتیں برداشت کئے جائیں۔ تمہارے ساتھ تو مجھے سوکھی روٹی پسند ہے۔ مگر یہ ظلم تو اب نہیں سہا جاتا"۔

کھنہ صاحب نے اسے تسلی دی تھی اور مستقبل کے تصورات کا ٹھنڈا پھاہا اس کے جلتے ہوئے زخموں پر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے کیا کیا کچھ نہ کہا تھا۔ جب وہ ملازم ہو جائیں گے تو اسے اپنے ساتھ لاہور لے جائیں گے۔ ماں تو نواں شہر ہی میں رہے گی اور وہاں لاہور میں۔۔۔ انار کلی، مال، لارنس، باغ، سنیما، تماشے، نمائشیں اور ان ہی مسرت بخش تصورات میں گم ہو کر وہ اپنے چھالوں کی ٹیس، اپنے دل کا درد سب کچھ بھول گئی تھی۔ لیکن سنگدل قسمت! جب وہ دن آیا اور کھنہ صاحب لاہور ہی میں سول سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے تو وہ دق جیسی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا سٹریچر پردے کے پیچھے پہنچا اور کچھ لمحے بعد سفید چادر میں لپٹا ہوا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لے کر دونوں طرف بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے ہوتا ہوا مغربی دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر صاحب برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ وہیں سے انہوں نے کہا" مردہ خانے میں لے جاؤ۔ تب تک کھنہ صاحب آ جائیں گے۔ لہنا سنگھ تو کب کا گیا ہوا ہے"۔

پل بھر کے لیے بیمار عورتوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔

لکشمی کا نحیف و ناتواں دق سے مرجھایا ہوا، موت کی اس سفید چادر میں لپٹا ہوا مدقوق جسم سب کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ دق کی ان سب مریضاؤں کا بھی تو آخر یہی حشر ہوگا۔ موت سے بھی زیادہ اندوہ ناک ہے، اپنے ہی جیسی بیماری سے کسی کو مرتے دیکھنا اور خود تل تل کر کے مرنا بہتوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور بعض کے آنسو بہنے لگے۔

پردے کے پیچھے سے نکل کر مس بٹی غسل خانے میں ہاتھ صاف کرنے چلی گئی تو ہمیشہ دوسروں کا دکھ درد بٹانے والی رحم دل سلطانہ نے اس غم ناک ماحول کو کچھ بدلنے کی کوشش کی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا ہمیشہ، جب کوئی مریضہ اس بھیانک بیماری کے ہاتھوں نجات پائی تھی اور کمرے میں موت کی اداس خاموشی چھا جاتی تھی تو مس سلطانہ اپنے میٹھے، تسلی آمیز لہجہ میں اپنی دلچسپ باتوں، اپنے حیرت انگیز قصوں سے اس موت کی خاموشی کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ برس ڈیڑھ برس سے لکشمی بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی آئی تھی۔ لیکن آج وہ خود ہی موت کی گہری خاموشی میں سما گئی تھی۔

گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے۔ ٹمپریچر لینے کا وقت ہو گیا تھا۔ دل میں اٹھتے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو زبردستی روک کر، دوا میں پڑے ہوئے تھرمامیٹر کو ہاتھ میں لیے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ رشیدہ کی چارپائی کے پاس پہنچی۔ لیکن آج سعی بسیار کے باوجود وہ لکشمی کی موت کو ہنسی کے پردے میں نہ چھپا سکی۔

رشیدہ نے کہا۔ مس صاحب لکشمی بھی چلی گئی۔

تھرمامیٹر کو رشیدہ کی زبان کے نیچے رکھ کر سلطانہ نے ایک لمبی سانس لی۔ اور نبض کی رفتار دیکھنے کے لیے اس کی کلائی ہاتھ میں تھام لی۔

سُرتی نے کہا" آخری وقت تک اپنے خاوند کا نام اس کی زبان پر رہا۔ کیوں مس صاحب! کھنہ صاحب بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتے ہوں گے؟"

''ہوں گے کیا۔ کرتے ہیں''۔ سلطانہ نے رشیدہ کی کلائی کو چھوڑ کر کہا ''لکشمی کو مرنا بھی اسی لیے سہل ہو گیا۔ میں تو سوچتی ہوں، محبت کرنے والا خاوند جس خوش قسمت کے پاس ہے، موت اسے کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ بے ہوش ہونے کے کچھ دیر پہلے جب اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا آخری وقت بس اب نزدیک ہی ہے تو مجھ سے اس نے کہا تھا۔۔۔۔ ''مس صاحب جانے وہ کیوں نہیں آئے؟ اس بار تو انہیں آئے پندرہ دن ہو گئے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کاش وہ میرے پاس ہوتے''۔ پھر خود ہی ہنس کر بولی ''مس صاحب میں بھی کتنی بیوقوف ہوں وہ نہ بھی آئیں تو وہ مجھ سے دور ہیں کیا؟ میرے دل میں تو ہر وقت انہیں کی تصویر رہتی ہے۔ اور میں ہی ان سے کیا دور ہوں؟ کئی بار انہوں نے کہا ہے ''لکشمی! تم تو ہر وقت میرے پاس رہتی ہو۔ بار ہا کام کرتے کرتے تمہارا خیال آ جانے سے غلطی ہو جاتی ہے'' اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مرتے دم بھی جب اسے ہوش آیا تو خاوند کا نام ہی اس کی زبان پر تھا''۔

یہ کہتے ہوئے بھیگی آنکھوں کو پونچھ، گھڑی دیکھ کر سلطانہ نے تھرمامیٹر رشیدہ کے منہ سے نکال لیا اور حرارت نوٹ کرنے کے لیے چارٹ اٹھایا۔

سرتی نے پوچھا ''لیکن مس صاحب یہ گہنوں کی بات کیا تھی۔ جب بھی کھنہ صاحب آتے تھے۔ ان کا ذکر ضرور چھڑ جاتا تھا۔ جب سے گہنے لے گئے۔ بس ایک بار ہی تو پھر آئے''۔

تھرمامیٹر کو دوا میں ڈال کر اور دوسرا اٹھا کر سرتی کو دیتے ہوئے اس نے کہا ''میں نے پوچھا نہیں، لیکن جب لکشمی آئی تھی تو سب گہنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔ اسکی ساس نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک بھی گہنا ساتھ لے جائے۔ آخر ہسپتال میں اتنے گہنوں کا کام بھی کیا ہے؟ بازو بند، چوڑیاں، ملا، لاکٹ کوئی ایک گہنا ہو تو گنہاؤں۔ نہ جانے کیوں اسے گہنوں سے اتنی محبت تھی۔ ساس تو مرتے دم تک نہ لے جانے دیتی۔ لیکن کھنہ صاحب اپنی ماں کو سمجھا بجھا کر لے آئے تھے۔ یہاں مریضوں کو گہنے پہننے کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا کہ انہیں ساتھ نہیں لانا چاہیے تھا۔ اب بھی بہتر ہے کہ انہیں کھنہ صاحب کے حوالے کر دو لیکن وہ گہنے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی تھی۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے گہنے ایک لوہے کے صندوقچے میں بند کر کے چابی اسے دے دی۔ اور صندوقچے کو ہسپتال کے سیف میں رکھ دیا۔ اس چابی کو وہ لحظہ بھر کے لیے بھی جدا نہ کرتی تھی۔ لیکن جب بیماری بڑھ گئی اور تن بدن کا بھی ہوش اسے نہ رہا اور جب ایک دن کھنہ صاحب کے کہنے پر میں نے اسے سمجھایا کہ گہنے تمہارے ہی نام بینک میں جمع کرائے جا سکتے ہیں تو اس نے چابی دے دی۔ یہی ایک بات لکشمی میں مجھے عجیب نظر آئی لیکن شاید انہی کے ذریعے وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھتی تھی۔ اسی رات اس نے مجھے پاس بلا کر کہا تھا۔۔۔۔ ''مس صاحب اب میں بہت دیر تک زندہ نہیں رہوں گی''۔

سرتی کی زبان تھرمامیٹر کی وجہ سے دکھنے لگی تھی۔ آخر اس نے خود ہی اسے نکال کر مس سلطانہ کو دے دیا۔ چونک کر سلطانہ نے تھرمامیٹر لے لیا اور ٹمپریچر دیکھنے لگی۔

سرتی نے کہا ''یہ تو ٹھیک ہے مس صاحب، لیکن گہنے لینے کے بعد کھنہ صاحب نے ہر ہفتہ آنا کیوں چھوڑ دیا؟ دو ہفتے گذر گئے انہیں آئے ہوئے''۔

رشیدہ بولی ''بیمار نہ ہو گئے ہوں۔ نہیں تو گرمی سردی، بارش، دھوپ انہوں نے کسی بات کا کبھی خیال نہیں کیا۔ باقاعدہ ہر ہفتے آتے رہے اور میں تو سوچتی ہوں مس صاحب لکشمی کی موت کی خبر سن کر ان کے دل پر کیسی گذرے گی؟ اپنی بیوی سے کسی کو ہی ایسی محبت ہو گی''۔

تب شاید سٹریچر مردہ خانے میں پہنچا کر گوبند واپس آیا اور اس کے پیچھے ڈاکٹر صاحب بھی آئے۔ پردے کے پاس پہنچ

کر گوبند نے پوچھا۔ ''کپڑوں کو لپیٹ دوں ڈاکٹر صاحب''۔ڈاکٹر صاحب اس کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ بولے ''ہسپتال کی چادروں کو ڈس انفکٹر میں ڈال دو اور باقی کا سامان پڑا رہنے دو۔ابھی شاید کھنہ صاحب یا ان کا آدمی آ جائے۔ ہاں گدے باہر دھوپ میں ڈال دو''۔

اسی لمحے برآمدے کے پاس سیڑھیوں پر سے سائیکل پھینک کر ہانپتا ہوا پسینے سے تر لہنا سنگھ اندر آیا۔ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

لہنا سنگھ نے سر ہلایا۔اس کی سانس پھول رہی تھی۔ جواب نہ بن پڑتا تھا۔

ذرا تلخی سے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا'' ملے یا نہیں؟ کہا نہیں۔تم نے کہ لاش کو آج شام سے پہلے لے جائیں''۔

تھوک نگل کر لہنا سنگھ نے کہا'' وہ تو شادی کرنے اپنے گھر چلے گئے ہیں''۔

۔۔۔۔ٹھن سے ٹمپریچر کا چارٹ مس سلطانہ کے ہاتھ سے فرش پر گر پڑا اور رشیدہ نے جیسے گھبرا کر چیختے ہوئے کہا۔۔۔مس صاحب! مس صاحب!

☆☆☆

شطرنج کی بازی

پریم چند

نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔ کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ امور سیاست میں، شعر و سخن میں، طرز معاشرت میں، صنعت و حرفت میں، تجارت و تبادلہ میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکین سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے۔ شعراء بوس و کنار میں مست اہل حرفہ کلابتو اور چکن بنانے میں، اہل سیف تیتر بازی میں، اہل روزگار سرمہ و مسی، عطر و تیل کی خرید و فروخت کا دلدادہ غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، علم و حکمت کے کن کن ایجادوں میں مصروف ہے، بحر و بر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں، اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں تیتروں میں پالیاں ہو رہی تھیں کہیں چوسر ہو رہی ہے۔ نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ ہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظ نفس کے لیے نئے لٹکے نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقراء خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک اور چنڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ارباب نشاط سے قلم بند کرتے تھے۔ فکر کو جولاں، عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لیے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں۔ جو اس دلیل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ ہاں جہلا انہیں جو چاہیں سمجھیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکر معاش سے آزاد تھے۔ آخر اور کرتے ہی کیا۔ طلوع سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے پھر انہیں خبر نہ ہوتی تھی کہ کب دوپہر ہوا کب سہ پہر اور کب شام۔ گھر سے بار بار آدمی آ کر کہتا تھا کھانا تیار ہے یہاں سے جواب ملتا تھا چلو آتے ہیں۔ دستر خوان بچھاؤ، مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے۔ یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے میں ہی رکھ جاتا تھا۔ اور دونوں دوست دونوں کام ساتھ ساتھ کر کے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا۔ اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا اس لیے انہی کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے۔ ہرگز نہیں۔ محلّے کے ہر گھر کے نوکر چاکروں میں، مہریوں ماماؤں میں بڑی حاسدانہ حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے گھر کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے نہ دنیا کے کام کا بس اسے دھوبی کا کتا سمجھو گھر کا نہ گھاٹ کا۔ برا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ حالانکہ انہیں اس کے موقع مشکل سے ملتے۔ وہ سوتی ہی رہتی تھیں کہ ادھر بازی جم جاتی تھی۔ رات کو سو جاتی تھیں۔ تب جا کر مرزا جی گھر میں آتے تھے۔ ہاں جولاہے کا غصہ داڑھی پر اتارا کرتی تھیں۔ نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں کیا میاں نے پان مانگے ہیں، کہدو آ کر لے جائیں۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لے جا کر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھلائیں۔ یہاں ان کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔ مگر لطف یہ تھا کہ انہیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی

میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب کو نکھٹو، بگاڑو، ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا۔ تو ماما سے کہا جا کر مرزا جی کو بلا لا۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لا دیں۔ دوڑ جلدی کر سر پھٹا جاتا ہے، ماما گئی تو مرزا جی نے کہا چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا جا کر کہہ کہ ابھی چلیے ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس چلی جائیں گی۔ کچھ ان کے آنکھوں دیکھا راستہ نہیں ہے۔ مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتیوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی۔ بولے کیا ایسا دم لبوں پر ہے۔ ذرا صبر نہیں آتا۔ حکیم صاحب چھو منتر کر دیں گے کہ ان کے آتے ہی آتے درد سر رفع ہو جائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا ''ارے جا کر سن ہی آئیے نہ۔ عورتیں نازک مزاج ہوتی ہیں۔ مرزا جی ہاں کیوں نا چلا جاؤں دو کشتیوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی ہے۔

میر صاحب جی اس بھرو سے نہ رہیے گا۔ وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے کے دھرے رہ جائیں اور مات ہو جائے۔ پر جایئے سن آیئے کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لیے ان کا دل دکھایئے گا۔

مرزا جی: جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کر دوں۔

میر صاحب: میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جا کر سن آئیں۔

مرزا جی: ارے یار جانا پڑے گا۔ حکیم کے یہاں درد ورد خاک نہیں ہے۔ مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے۔

میر صاحب: کچھ بھی ہو ان کی خاطر کرنی ہی پڑے گی۔

مرزا جی: اچھا، ایک چال اور چل لوں۔

میر صاحب: ہرگز نہیں، جب تک آپ سن نہ آئیں گے مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحبہ نے کراہتے ہوئے کہا تمھیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے کہ کوئی مر بھی جائے، پر اٹھنے کا نام نہیں، شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے۔ نوج کوئی تم جیسا نرموہیا ہو۔

مرزا۔ کیا کروں۔ میر صاحب مانتے ہی نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے گلا چھڑا کر آیا ہوں۔

بیگم۔ کیا جیسے خود نکھٹو ہیں ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں کہ سب کا صفایا کر دیا۔

مرزا۔ بڑا لتی آدمی ہے۔ جب آ کر سر پر سوار ہو جاتا ہے تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ دھتکار کیوں نہیں دیتے کتے کی طرح۔

مرزا۔ سبحان اللہ برابر کے آدمی ہیں۔ عمر میں، رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے۔ ملاحظہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ تو میں ہی دھتکارے دیتی ہوں۔ ناراض ہو جائیں گے۔ کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی (ماما سے) عباسی، شطرنج اٹھا لا۔ میر صاحب سے کہہ دینا میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ اب پھر منہ نہ دکھایئے گا۔

مرزا۔ ہائیں ہائیں کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ کیا ذلیل کراؤ گی۔ ٹھہر عباسی، کمبخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔

بیگم۔ جانے کیوں نہیں دیتے۔ میرا لہو خون پیئے جو روکے، اچھا اسے روک لیا۔ مجھے روک لو تو جانوں۔ یہ کہہ کر بیگم صاحبہ خود جھلاتی ہوئی دیوان خانہ کی طرف چلیں۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے۔ خدا کے

لیے تمہیں شہید کر بلا کر قسم۔ میری ہی میت دیکھے جو ادھر قدم رکھے لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی، دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں۔ **یکا یک** نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رک گئے۔ وہیں سے اندر کی طرف جھانکا حسن اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب نے حسب ضرورت دو چار مہرے تبدیل کر دیئے تھے اس وقت اپنی صفائی جتانے کے لیے باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے پھر کیا تھا بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مراد ملی۔ اندر پہنچ کر بازی الٹ دی۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے کچھ باہر تب دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی مہرے باہر پھینکتے جاتے دیکھے پھر چوڑیوں کی جھنکار سنی تو سمجھ گئے بیگم صاحبہ بگڑ گئیں۔ چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا تم نے غضب کر دیا۔

بیگم۔ اب موا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلا سمجھ لیا ہے۔ اتنی لو اگر خدا سے ہوتو ولی ہو جائے۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں میں یہاں چولہے چکی میں سر کھپاؤں، لونڈی سمجھ رکھا ہے، جاتے ہو حکیم صاحب کے یہاں کہ اب بھی تامل ہے۔

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں کے بدلے میر صاحب کے گھر پہنچے تو معذرت آمیز لہجہ میں بادل پر درد ماجرا کہہ سنایا۔

میر صاحب ہنس کر بولے۔ اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب دردسر کا پیغام ماما لائی تھی کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں۔ مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ اف اتنی تمکنت آپ نے انہیں بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے ہیں۔ خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انہیں کیا مجال۔ میرے یہاں دیکھئے کبھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔

مرزا۔ خیر اب یہ بتائیے اب جماؤ کہاں ہوگا۔

میر۔ اس کا کیا غم ہے اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے۔ بس یہیں جمے گی۔

مرزا۔ لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا، تب تو اتنی خفگی تھی گھر سے چلا آؤں گا تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔

میر۔ اجی بکنے دیجئے۔ دو چار دن میں خود بخود سیدھی ہو جائیں گی۔ ہاں آپ بھی ذرا تن جائیے۔

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ اس لیے وہ ان کے مشغلہ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی انہیں جانے میں دیر ہو جاتی یا کچھ الکساتے تو سردد یہ مستان یا ددہانیدن کے مصداق انہیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں۔ لیکن جب ان کے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں حرج پیدا ہونے لگا۔ تو انہیں بڑی تشویش دامن گیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ جھانکنے کو ترس جاتی تھیں۔ سوچنے لگیں کیونکر یہ بلا ٹلے۔

ادھر نوکروں میں بھی یہ کانا پھوسی ہونے لگی۔ اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھا نہ سروکار۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا کبھی پانی لانے کبھی برف لانے کا کبھی تمبا کو بھرنے کا۔ حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا۔ دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی، اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

محلے والے ہردم ہمیں لوگوں کوٹو کا کرتے ہیں۔ شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہتیں مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا پر کیا کروں میرا کیا بس ہے۔

محلّہ میں دو چار بڑے بوڑھے تھے وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خیریت نہیں ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے، یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگی۔ لچھن برے ہیں۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دھاڑے لٹتی تھی پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھچی چلی آتی تھی اور یہاں سامان عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ، نقال، کتھک، ارباب نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقنوں کی دوکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصاف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قرصہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اس کی ادائیگی کی کسی کو فکر نہ تھی یہاں تک کہ سالانہ خراج بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔ ریزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا، دھمکیاں دیتا، مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی تھی۔

خیر میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گذر گئے نت نئے نقشے حل کیے جاتے، نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کیے جاتے، کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہو جاتی، تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی۔ پر یہ شکر رنجیاں بہت جلد رفع ہو جاتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے میر صاحب بساط اٹھا کر اپنے گھر میں آبیٹھتے اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر مل بیٹھتے، نیند ساری بدمزگیوں کو دور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آ پہنچا۔ میر صاحب کے حواس اڑے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دروازے بند کر لیے اور نوکروں سے کہا گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے کہا گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔

خدمت گار۔ میں یہ نہیں جانتا گھر میں سے یہی جواب ملا ہے کیا کام ہے۔

سوار۔ کام تجھے کیا بتاؤں حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لیے کچھ سپاہی مانگے گئے ہیں۔ جاگیردار ہیں کہ مذاق ہے۔

خدمت گار۔ اچھا تشریف لے جائیے، کہہ دیا جائے گا۔

سوار۔ کہنے سننے کی بات نہیں۔ میں کل پھر آؤں گا اور تلاش کر کے لے جاؤں گا اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی سے بولے اب کیا ہوگا۔

مرزا۔ بڑی مصیبت ہے کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔

میر۔ کمبخت کل پھر آنے کا کہہ گیا ہے۔

مرزا۔ قہر آسمانی ہے اور کیا کہیں سپاہیوں کی مانگ ہو تو بن موت مرے، یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی تپ چڑھ آتی ہے۔

میر۔ یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھئے۔

مرزا۔ بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملیے ہی نہیں دونوں آدمی غائب ہو جائیں، سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہوگی۔ حضرت اپنا سا منہ لے کر لوٹ جائیں گے۔

میر۔ بس بس آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔

ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں۔ تم نے خوب بہروپ بھرا۔

اس نے جواب دیا۔ ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چرلی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے۔ صبح کا گیا پھر رات کو آئے گا۔

اس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے۔ ڈبے میں گلوریاں بھرے گومتی پار ایک پرانی ویران مسجد میں جا بیٹھے جو شاید عہد مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں تمباکو، مدریا لے لیتے اور مسجد میں پہنچ، دری بچھا حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انہیں دین دنیا کی فکر نہ رہتی تھی۔ کشت شہ پٹ لیا۔ ان الفاظ کے سواان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ کوئی چلہ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا تھا۔ دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرات گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نانبائی کی دکان پر کھانا کھا لیتے اور چلم حقہ پی کر پھر محو شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انہیں کھانے کی سدھ نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی تھیں۔ کمپنی کی فوجیں لکھنو کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں۔ شہر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لے کر دیہاتوں میں بھاگے جارہے تھے۔ پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غم دزدا۔ اور غم کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہوجاتے۔ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ محلے والوں کو بھی ان کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنو کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی۔ مرزا صاحب انہیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنو پر تصرف کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ قرض کی ملت میں سلطنت ہضم کرلینا چاہتی تھی، وہی مہاجنی چال چلی جس سے آج ساری کمزور قومیں پابہ زنجیر ہورہی ہیں۔

میر صاحب انگریزی فوجیں آرہی ہیں۔

مرزا۔ آنے دیجیے۔ کشت بچائیے یہ کشت۔

میر۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خیال تو کیجیے شہر کا محاصرہ ہوگیا تو گھر کیسے چلیں گے۔

مرزا۔ جب گھر چلنے کا وقت آئے گا۔ تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات۔

فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بچھادی۔ مرزا جی بولے آج کھانے کی کیسی رہے گی۔

میر۔ آج روزہ ہے کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے۔

مرزا۔ جی نہیں۔ شہر میں نا معلوم کیا ہورہا ہوگا۔

میر۔ شہر میں کچھ نہیں ہورہا ہوگا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہوکر آرام کررہے ہوں گے۔ حضور جان عالم بھی استراحت فرماتے ہوں گے یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہوگا۔

اب کے دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے اب کے مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اسی اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کردیئے گئے تھے۔ اور فوج انہیں گرفتار کیے لیے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ نہ کشت خون یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی سسرال جاتی ہے۔ بیگمیں روئیں۔ نواب زادے، مامائیں، مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ازل سے کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہوگی۔ کم از کم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ یہ وہ اہنسا نہ تھی۔ جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں۔ یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں۔ لکھنو کا فرمانروا قیدی بنا چلا جاتا تھا اور لکھنو عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا۔ حضور عالی کو ظالموں نے قید کرلیا ہے۔

میر۔ ہوگا۔ آپ کوئی قاضی ہیں یہ لیجیے شہ۔

مرزا۔ حضرت ذرا ٹھہریے۔ اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی۔ حضور عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہوں گے۔ لکھنو کا چراغ آج گل ہوگیا۔

میر۔ رونا ہی چاہیں۔ یہ عیش قید فرنگ میں کہاں میسر۔ یہ شہ۔

مرزا۔ کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے کتنی سخت مصیبت میں ہے بلائے آسمانی۔

میر۔ ہاں ہے ہی۔ پھر کشت بس دوسری کشت میں مات ہے۔ بچ نہیں سکتے۔

مرزا۔ آپ بڑے بے درد ہیں۔ واللہ ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے حضور جان عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدر دان نہ رہا۔ لکھنو ویران ہوگیا۔

میر۔ پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے۔ پھر حضور پرنور کا ماتم کیجیے یہ کشت اور مات، لانا ہاتھ۔

نواب کو لیے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی مرزا جی نے نئی بازی بچھا دی۔ ہار کی چوٹ بری ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا آیئے نواب صاحب کی حالت زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں۔ لیکن مرزا جی کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب ہوگئی تھی۔ وہ شکست کا انتقام لینے کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔

شام ہوگئی مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کر دی۔ ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نماز مغرب ادا کرنے لگیں۔ پر دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا وہ خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے اب چوتھی بازی کا بھی رنگ اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کرکے خوب سنبھل کر طبیعت پر زور دے دے کر کھیلتے تھے۔ لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی کہ ساری بازی بگڑ جاتی۔ ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے تھے، ٹھمریاں گاتے تھے، چٹکیاں لیتے تھے، آوازیں کستے تھے، ضلع اور جگت میں کمال دکھاتے تھے ایسے خوش تھے گویا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا ہے۔ مرزا صاحب ان کی یہ خوش فہمیاں سن سن کر جھلا جاتے تھے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے آپ چال نہ تبدیل کیا کیجیے۔ یہ کیا کہ چال چلے اور فوراً بدل دی۔ جو کچھ کرنا ہو ایک بار خوب غور کرکے کیجیے۔ جناب آپ مہرے پر انگلی کیوں رکھے رہتے ہیں۔ مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجیے۔ جب تک چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرے کو ہاتھ نہ لگایا کیجیے۔ حضرت آپ ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی سند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگے۔ اس کی مات سمجھی جائے۔ پھر آپ نے چال بدلی مہرہ وہیں رکھ دیجیے۔

میر صاحب کا فرزین پٹا جاتا تھا۔ بولے میں نے چال چلی کب تھی۔

مرزا۔ آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجیے۔

میر۔ اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوا کب تھا۔

مرزا۔ آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوئیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔ فرزین پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر۔ دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتا۔

مرزا۔ یہ بازی آپ کی مات ہوگی۔

میر۔ میری مات کیوں ہونے لگی۔

مرزا۔ تو آپ مہرہ اس گھر میں رکھ دیجیے جہاں پہلے رکھا تھا۔

میر۔ وہاں کیوں رکھوں، نہیں رکھتا۔

مرزا۔ آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میر۔ ہرگز نہیں۔

مرزا۔ رکھیں گے تو آپ کے فرشتے، آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بات بڑھ گئی۔ دونوں اپنے لیک کے دھنی تھے۔ نہ یہ دبتا تھا نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشاء ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔ مرزا جی نے فرمایا اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے۔ وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کئے آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلیے گا۔ ریاست شے دیگر ہے۔ جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔

میر۔ گھانس آپ کے ابا جان چھیلتے ہوں گے۔ یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گذر گئیں۔

مرزا۔ اجی جائیے۔ نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گیری کرتے کرتے عمر گذر گئی۔ اس طفیل میں جاگیر پا گئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چڑھ آیا ہے۔ رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔

میر۔ کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوں گے۔ ہمارے بزرگ تو نواب کے دستر خوان پر بیٹھتے تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔

مرزا۔ بے حیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی۔

میر۔ زبان سنبھالیے، ورنہ برا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کی عادی نہیں ہیں کسی نے آنکھ دکھائی اور ہم نے دیا تلا ہوا ہاتھ بھنڈار کھل گئے۔

مرزا۔ آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے۔ تو سنبھل جائیے۔ تقدیر آزمائی ہو جائے۔

میر۔ ہاں آجاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے۔

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکالیں۔ ان دنوں ادنا اعلیٰ سبھی کنار، خنجر، قبض، شیر پنجہ باندھتے تھے۔ دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی۔ مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لیے، سلطنت کے لیے، قوم کے لیے کیوں مریں، کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں۔ مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا، بلکہ وہ قومی ہو گئے تھے۔ دونوں پینترے بدلے لکڑی اور گتکہ کھیلے ہوئے تھے۔ تلواریں چمکیں چھپا چھپ کی آواز آئی اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے۔ دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لیے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری، انہیں دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لیے اپنی گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ بازی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے تھے۔

چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بوشیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سر بسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے جس میں سنگ و خشت کا ثبات بھی نہیں۔

☆☆☆

میوہ فروش

حامد اللہ افسر

سیٹھ فاروق بمبئی کے مشہور تاجروں میں تھے۔ان کے مال و متاع کا اندازہ مشکل تھا۔ان کے مقدر کی قسم کھائی جاتی تھی۔مٹی میں ہاتھ ڈالتے تو سونا ہو جاتی۔وہ بمبئی کی سب سے بڑی جہاز راں کمپنی کے مالک اور ایک بین الاقوامی بینک کے سب سے بڑے حصہ دار تھے۔اس کے علاوہ ان کی ایک کپڑے کی مل احمد آباد میں بھی تھی۔اور وہاں کا مشہور ترین دیا سلائی کا کارخانہ انہیں کے روپے سے چل رہا تھا۔سیٹھ صاحب یوں تو بمبئی کے روشن خیال طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔مگر بخیل اور متکبر مشہور تھے۔ایک پیسہ بھی خیرات نہ کرتے۔خدا کے غریب، نادار بندوں کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔اس کے برخلاف نورانہ، سیٹھ صاحب کی بیوی بڑی دین دار اور مخیر تھی۔یوں تو وہ ایک غریب گھرانے کی بیٹی تھی۔مگر بہت کشادہ طبیعت۔کبھی کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتی تھی۔گھر کے اخراجات میں سیٹھ صاحب بہت تنگ دل تھے۔نورانہ گھر میں تنہا تھی۔کوئی بات کرنے والا نہ تھا۔میاں بیوی کے مزاج میں بعد المشر قین تھا۔انس و محبت کا پتہ نہ تھا۔میاں بیوی ایک ستار کے دو ایسے تار تھے جو ہم آہنگ اور ہم ساز نہ ہو سکتے تھے۔

2

جنگ یورپ کو ختم ہوئے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے۔دنیا اقتصادی الجھنوں میں گرفتار تھی۔بڑے بڑے زبردست بنکوں کی بنیادیں ہل رہی تھیں اور نئی نئی قسم کے کاغذی سکے جاری ہو رہے تھے کہ یکایک سیٹھ فاروق کے بین الاقوامی بینک کا دیوالہ نکل گیا۔ساری ملیں کارخانے اسی میں ہضم ہو گئے۔تمام جائیداد ہاتھ سے نکل گئی اور جو شخص تاجروں کا بادشاہ کہلاتا تھا وہ آن کی آن میں فقیر ہو گیا۔

چار روز سے سیٹھ فاروق کا پتہ نہیں۔سارے بمبئی میں کہرام مچ رہا تھا۔کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔جتنے منہ اتنی باتیں۔اکثر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ مطالبات پورے نہ کر سکتا تھا، اس لیے روپوش ہو گیا۔لیکن حقیقت یہ نہ تھی۔مطالبات کی پوری رقم ادا ہو جانے کے بعد ایک مکان رہ گیا تھا۔نورانہ پر ان تمام واقعات کا بڑا گہرا اثر ہوا۔مال و متاع کے جانے کا اسے غم نہ تھا کہ اس نے اس نعمت کی کبھی بہار نہ دیکھی تھی۔اسے جو کچھ غم تھا وہ سیٹھ صاحب کی روپوشی کا تھا۔نورانہ اور سیٹھ صاحب کی شادی کو بیس برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔آپس میں محبت نہ تھی، لیکن کوئی خاص اختلاف بھی نہ تھا۔مدت کے ساتھ سے ایک قسم کی ہمدردی اور رفاقت بھی موجود تھی۔خلاف امید جدائی نے عورت کے سینے میں محبت کے خاموش جذبات کو مشتعل کر دیا۔

نورانہ پچھتا رہی تھی" میں نے ان کی قدر نہ جانی۔میں نے ان کی کوئی خدمت نہ کی۔گھر میں سکھ اور چین نصیب ہوتا تو وہ آج اس طرح خود کو دنیا میں تنہا سمجھ کر کہیں چلے نہ جاتے۔میں بغیر ان کے اس گھر میں کیوں رہوں۔در و دیوار کھانے کو آتے ہیں خدا جانے وہ کب آئیں گے۔ممکن ہے میرے منہ میں خاک وہ کبھی نہ آئیں۔اب کیا کروں اور کہاں جاؤں۔۔۔نہیں، میں اپنے شوہر سے جدا نہ رہ سکوں گی۔ان کا پتہ کس سے پوچھوں؟ مگر پتہ کی کیا ضرورت ہے تلاش اور طلب صادق کو پتہ کی ضرورت نہیں۔پردہ! اب پردہ کس کے لیے کروں؟"

3

اس واقعہ کو پانچ سال ہو گئے۔لوگ سیٹھ فاروق کا نام بھی بھول گئے۔گویا وہ دنیا میں تھا ہی نہیں۔رات بھر کی بارش کے

بعد صبح نمودار ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبک اور ہلکی ہلکی لطیف ہوا نہا کر آ رہی ہے۔ سورج کی کرنوں نے شام پور کے بازاروں کی دیواروں پر ایسا ملمع کر دیا تھا کہ جس میں زندگی کی جھلک معلوم ہوتی تھی۔ ایک میوہ فروش میلا سا تھیلا لٹکائے، ہاتھ میں انگوروں کی پٹاریاں لیے ''کابل کا میوہ'' بیچتا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور راحت کا اثر نمایاں تھا۔ یہ سیٹھ فاروق تھا۔ فاروق نے اس قصبے میں اپنا نام بدل دیا تھا۔ داڑھی بڑھالی تھی۔ اس کو 'عارف'' کے نام سے قصبہ کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہ دن میں دو گھنٹے پھل اور مختلف میوہ جات گلیوں میں پھیری لگا کر فروخت کرتا تھا۔ اول اول اسے چار پانچ گھنٹے تک گشت لگانا پڑا، لیکن اب اس کے گھر سے نکلتے ہی لوگ جوق جوق ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور وہ بہت جلد سودا فروخت کر کے اپنی جھونپڑی میں داخل ہو جاتا ہے۔ میوہ فروشی سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ اس کے گزارے کے لیے کافی تھا۔

عارف کو سچی راحت نصیب تھی۔ اس کی سادہ زندگی مسرت اور شادمانی سے ہم کنار تھی۔ لیکن اب تکلیف دہ خیال نے اس کی خوشی کو ملال سے بدل دیا تھا۔ وہ نورانہ کے لیے بے چین تھا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا'' میں نے کم بخت نورانہ پر ظلم کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کبھی آرام و آسائش سے زندگی بسر نہ کر سکی۔ اور وطن چھوڑتے وقت بھی میری خود غرضی نے مجھے اس کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا''۔ عارف ایک مرتبہ بھیس بدل کر بمبئی گیا بھی تھا۔ لیکن وہاں نورانہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ صرف یہ معلوم ہوا کہ سیٹھ فاروق کے غائب ہو جانے کے بعد وہ بھی کہیں چلی گئی۔

4

ایک روز کا ذکر ہے کہ عارف میوہ فروش صبح کے وقت اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت میلے اور پیوند لگے کپڑے اور ایک پرانی چادر اوڑھے گھونگھٹ نکالے ہوئے آئی اور گڑگڑا کر کہا'' عارف، خدا نے تیری دعا میں اثر دیا ہے، تو خدا کا نیک بندہ ہے، میں دکھیاری ہوں۔ میرا خاوند پانچ برس سے لاپتہ ہے۔ تو خدا سے دعا کر وہ مجھے میرے عزیز شوہر سے ملا دے۔ یہ عورت نورانہ تھی۔ عارف نے نورانہ کی آواز نہ پہچانی۔ شاید یہ ہو کہ مصیبتوں کے ہجوم نے نورانہ کی آواز پر بھی کچھ اثر کیا ہو۔

مگر اتنا ضرور ہوا کہ عارف کے دل پر چوٹ سی لگی اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہیں کھو گیا ہے۔ آخر اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر کہا'' بی بی تم کون ہو۔ کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارے خاوند کا کیا نام ہے۔ وہ کیوں چلا گیا؟''

نورانہ نے یہ آواز ضرور کہیں سنی ہے۔ وہ جھجکی مگر پھر سنبھل کر بولی ''خدا کے نیک بندے، میرے خاوند کا نام سیٹھ فاروق ہے''۔

عارف:'' کون! کیا تو نورانہ ہے؟ نورانہ! نورانہ! جسے تو عارف میوہ فروش سمجھ رہی ہے وہ خود تیرا بچھڑا ہوا خاوند فاروق ہے''۔

☆☆☆
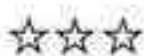
ڈھائی سیر آٹا

حیات اللہ انصاری

پروائی چل رہی تھی اس لیے مولا کو بائی نے پکڑ رکھا تھا اور وہ آٹھ دس روز سے کام پر نہیں جا سکا تھا۔ دو تین روز تک جو دو چار پیسے جمع تھے، وہ خرچ ہوئے اور پھر ادھار پر کام چلتا رہا۔ دو چار روز کے بعد بنیا بھی حیلے حوالے کرنے لگا۔ مجبوراً ایک دن مولا ٹانگ میں ذرا آرام پا کر صبح تڑکے ٹوکری لے کر مزدوروں کے بازار گیا۔ جن کاریگروں کے ساتھ کام کر چکا تھا، ان میں سے ایک نے جس کا کام لگا ہوا تھا، اس کو ساتھ لے لیا۔ یہ دن بھر اینٹ گارا ڈھوتا رہا۔ شام کو ساڑھے چار آنے پیسے ملے جسے لے کر گھر چلا۔ راستے میں ایک آنہ بنیے کو قرض کا ادا کیا، ایک آنہ مکان کے کرایہ کے لیے رکھ لیا اور ایک پیسہ کل کے چنے کے لیے بچا لیا۔ باقی بچے نو پیسے۔ اس میں سے ایک پیسے کے آلو، ایک کا باجرے کا آٹا، پانچ پیسے کے ڈیڑھ سیر چاول اور ایک پیسے کی دال، ایک پیسے کی لکڑی لے کر ایک لمبی سی گلی میں گھس گیا جو آگے چل کر اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ وہاں ابھی سے اندھیرا تھا۔ اس گلی میں برابر کئی کئی کوٹھریاں بنی تھیں۔ دو ایک سے دھواں نکل رہا تھا جو ٹھنڈا ہو کر گلی میں بھر رہا تھا۔ ان میں سے ایک کوٹھری کے سامنے مولا کی بیوی منی جس سے شادی تو نہیں ہوئی تھی مگر پندرہ برس سے تعلقات میاں بیوی ہی کے ایسے تھے، دو لڑکیاں اور ان دونوں سے چھوٹے دو لڑکے جاڑے کے مارے پاس پاس بیٹھے مولا کا انتظار کر رہے تھے۔ سبھوں نے خوش ہو کر اس کو گھیر لیا۔ یہ تھکا ہوا بہت تھا۔ آتے ہی ٹاٹ پر لیٹ گیا اور پوٹلی رکھ کر بولا:

"سب لیتا آیا ہوں"

بیوی چولہے کے پاس گئی جو اس کوٹھری میں ایک طرف بنا ہوا تھا، آگ سلگائی اور دال چاول پکنے کو چڑھا دیے۔ لڑکے اور لڑکیاں چولہے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور دال چاول پکنے کی دل خوش کن کھدر کھدر سننے لگے۔ ان لوگوں کے لیے اس سے بہتر اور کوئی راگنی نہیں ہو سکتی تھی۔

کمرے میں سیل اور میلے کپڑوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہاں دھواں بھی بھرنے لگا مگر سب کا دھیان چولہے کی طرف تھا۔ لڑکے بھوک سے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ دال چاول جلد سے جلد پک جائیں، اس لیے وہ بار بار بہت سی لکڑی چولہے میں لگا دیتے۔ یہ دیکھ کر ان کی ماں ڈانٹ بتاتی۔

"کم بختو! کل کھانا کیسے پکے گا؟"

بڑی لڑکی جس کی پلکیں بال خورے نے غائب کر دی تھیں، چولہے کے پاس بیٹھی برابر بدن کھجلاتی جاتی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لکڑی کی ڈوئی سے دال اور چاول نکال کر چٹکی سے ملتی تھی۔ اس وقت لڑکے پوچھتے تھے۔

"کتنی دیر ہے؟"

"بس تھوڑی دیر اور ہے"۔

یہی جواب آدھ گھنٹہ تک چلتا رہا۔ مولا ایک پرانی دری اوڑھے جس میں سینکڑوں چھید تھے، ٹاٹ پر چپ چاپ لیٹا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا:

"جیسے نیند آ رہی ہے"۔

اتنے میں کسی کے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگی۔ کوئی مزدور تھا جو تاڑی پی کر اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ جب غل غپاڑہ زیادہ ہوتا تھا تو آس پاس کے لوگ جا کر معاملہ رفع دفع کرا دیتے تھے۔ اس وقت یہ غل سن کی منی بولی:

''ان لوگوں کے یہاں روز روز یہی رہتا ہے۔ نہ معلوم کیسے کمینے ہیں''۔

مولا: ''ہونہہ۔۔۔ چاول گلے نہیں اب تک؟''

منی نے دیکھا تو چاول گل گئے تھے۔ اس نے اتار کر ایک طرف رکھ دیے۔ ہانڈی بند تھی مگر ابال میں ہانڈی کے کگروں پر کچھ چاول آ گئے تھے۔ چھوٹے لڑکے ببو نے ان میں سے دو تین چاول پونچھ کر کھا لیے۔ دوسرا لڑکا منو فوراً بولا:

''ہونہہ۔ میں بھی''۔

اس نے اور زیادہ کھا لیے۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہونے ہی والی تھی کہ منی نے دونوں کو ڈانٹا:

''کم بختوں میں ذرا صبر نہیں۔ میں کہتی ہوں۔۔۔۔''

تھوڑی دیر لڑکے منی کی بات پوری ہونے کے منتظر رہے۔ جب وہ کچھ نہیں بولی تو پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب دال کا سب کو بڑی بے صبری سے انتظار تھا۔ آخر ایک لڑکی بولی:

''اماں اب گھونٹ دو''۔

ماں نے دال کو دیکھا تو وہ تھوڑی بہت گل گئی تھی۔ زائد انتظار کون کرتا۔ اس نے دال گھونٹ کر نمک ڈالا اور اتار لی پھر تین تامچینی کی پلیٹیں جن کی چینی تقریباً بالکل اڑ چکی تھی اور ایک مٹی کی رکابی سامنے رکھی۔ پہلے ایک بڑی پلیٹ میں چاول نکالے اور اس پر دال ڈال کر مولا کے سامنے رکھ دیے۔ مولا بہت بے صبری سے کھانے لگا۔ سب بچے اب ٹکٹکی باندھ کر منی کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہے تھے۔ اس نے مٹی کی تھالی میں چاول نکال کر دونوں لڑکیوں کے بیچ میں رکھ دیے اور پھر تامچینی کی پلیٹوں میں برابر برابر چاول نکالے، اس پر دال ڈالنے لگی۔

ببو: ''منو کی پلیٹ میں اتنا اور ہماری پلیٹ میں اتنا''۔

منی نے تھوڑی سی دال اس کی پلیٹ میں اور ڈال دی۔

منو: ''اماں ہم بھی''۔

ماں نے دو چار چاول اس کی پلیٹ میں بھی ڈال دیے اور پھر باقی چاولوں کو دال کی ہانڈی میں الٹ کر کھانے لگی۔ ابھی چولہے میں کچھ کوئلے باقی تھے جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے اور چلتے ہوئے جبڑے دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹے لڑکے کھاتے جاتے اور پلیٹ کی طرف دیکھ کر اندازہ کرتے جاتے کہ ابھی اتنا اور ہے، اتنا اور ہے۔ آخر منو اپنی پلیٹ پونچھ کر بولا:

''بس کھا چکے''۔

مولا بھی چاول ختم کر چکا اور بولا:

''چاولوں میں خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ ذرا سے کھالو اور پیٹ بھر گیا اور روٹی کا یہ ہے کہ سیر بھر آٹے کی ہو تو کچھ نہیں اور دو سیر ہو تو کچھ نہیں''۔

ببو: ''اماں! صبح کیا پکے گا؟''

اماں: ''میں کہتی ہوں ان لوگوں کی نیت کبھی نہیں بھرتی۔ ابھی کھا چکا ہے اور ابھی پوچھ رہا ہے کہ کل کیا پکے گا''۔

منی نے بانس کے پلنگ کے نیچے سے جو کوٹھڑی کا چوتھائی حصہ گھیرے ہوئے تھا، ایک پان دان نکالا، جس کا پیندا گھس

گیا تھا اور سب کلھیاں ایک دفتی پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ پان دان منی کی ماں کا تھا اور اس کو بہت پیارا تھا۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتی تھی کہ میں کسی گھر میں اوپر کا کام کاج کرنے کو نوکر ہو جاؤں تو سب سے پہلے اسی کو ٹھیک کراؤں گی۔ منی نے ایک پان کے چار ٹکڑے کیے۔ ایک خود کھایا، ایک مولا کو دیا اور دونوں لڑکیوں کو۔ پھر کوٹھڑی کے بیچ میں ایک ٹاٹ کا پردہ ڈال دیا جس سے اس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک طرف پلنگ ہو گیا اور دوسری طرف ٹاٹ کا فرش۔ پلنگ پر منی اور مولا لیٹ گئے اور ٹاٹ پر دونوں لڑکے اور دونوں لڑکیاں۔ سردی تیز ہو گئی تھی۔ مولا اور منی نے تو وہی دری اوڑھ لی۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی نے موٹی چادر اور کسی نے ٹاٹ کا ٹکڑا دوہرا کر کے اوڑھ لیا اور پھر چڑیا کے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے چپک کر لیٹ رہے۔ کوٹھڑی کے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی، اس لیے مولا نے اٹھ کر اس کو بند کر دیا، ہوا کی آمد و رفت بند ہو گئی اور کوٹھڑی میں حبس کی وجہ سے گرمی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد منی بولی:

''آج منشی جی پھر آئے تھے اور کہہ گئے ہیں کہ نواب صاحب نے حکم دیا ہے کہ جس پر کرایہ چڑھا ہو، اسکو کوٹھڑی سے فوراً نکال دو''۔

مولا: ''نکال دیں گے، نکال دیں گے، جب سنو، یہی ہے۔ آ ئیں، آ کر نکالیں۔ ہم جاڑوں میں بچوں کو لے کر کہاں جائیں۔ ہوا کریں وہ بڑے آدمی۔ ہم تو نہیں نکلیں گے۔ کہہ دو جب کرایہ جمع ہو جائے گا۔ دے دیں گے۔ ضرور دیں گے۔ مر جائیں تو بات دوسری ہے۔ بڑے آئے ہیں نکالنے والے''۔

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ہو گئی پھر مولا بولا:

''منشی جی کے یہاں کی نوکری کا پتہ چلا''۔

منی: ''وہ کہتے ہیں چھوٹی لڑکی سے میرا کام نہیں چلے گا۔ ایسی لڑکی ہو جو جھاڑو بہارو کرے اور دو گھڑے پانی اٹھا کر رکھ دے''۔

اس کے بعد منی ذرا رک کر پھر آواز نیچی کر کے بولی:

''میں کہتی ہوں کہ جوان لڑکی کو کیسے بھیج دوں۔ اس موئی کا بھی دیدہ ہوائی ہے۔ پانی بھرنے جاتی ہے تو ٹھٹھا کرتی ہوئی''۔

مولا: ''جائے گی تو حرام زادی اپنے سے جائے گی۔ ایک چلی گئی تو کیا کر لیا؟ لڑکا ہوتی تو چار آنہ روز کما لاتی''۔

مولا کی بڑی لڑکی بھاگ گئی تھی اور سال بھر سے پتہ نہیں تھا۔

منی: ''کیا کر لیا؟ موئی تھی ہی ایسی۔ ایسی نہ ہوتی تو جاتی کیوں؟ لڑکے کب اچھے نکلتے ہیں؟ کس نے لا کر ماں باپ کو کھلایا ہے؟ ادھر کمانے کے قابل ہوئے، ادھر چل دیئے۔ بھورے کو دیکھو۔ ٹھیلا چلاتا ہے۔ دس آنے روز پاتا ہے اور سب اڑا دیتا ہے''۔

منی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی جس کو کبھی کبھی ان لوگوں کی کھانسی کی آواز توڑ دیتی تھی۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ بازار میں چہل پہل تھی مگر یہاں سوتا پڑ گیا۔

جب مولا کی آنکھ کھلی تو اس نے منی کو جاگتا پایا۔ وہ پانچ منٹ تک یونہی پڑا رہا، پھر کراہتا ہوا اٹھا اور بولا:

''سردی کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ بدن جیسے تختہ ہو گیا۔ بیڑی کہاں ہے؟''

منی نے اٹھ کر ایک کونے سے ایک بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر دی۔ مولا نے ایک بیڑی سلگائی اور پینے لگا۔ بیڑی جب تک چٹکی سے پکڑنے کے قابل رہی اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑی، پھر پلنگ سے اٹھا اور لوٹا لے کے باہر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد سردی سے کانپتا ہوا اندر آیا اور لوٹا رکھ کر بولا:

''ایک بیڑی اور۔ اتنا دن چڑھ آیا، دھوپ کا پتہ نہیں''۔

مولا نے ایک بیڑی اور سلگائی پھر ٹوکری اٹھا کر بیڑی پیتا ہوا باہر چلا گیا۔

مولا کے جانے کے دو گھنٹے بعد منی لڑکوں اور لڑکیوں کو لے کر باہر نکلی اور کوٹھڑی میں کنڈی لگا کر ٹہلنے چلی۔ کچھ دور پر

دوسرے مزدوروں کی عورتیں دھوپ میں بیٹھی بک بک کر رہی تھیں، یہ جا کر ان میں شریک ہوگئی۔ لڑکے اور چھوٹی لڑکی آنکھ بچا کر ادھر ادھر ہو رہے۔

تین چار گھنٹے کے بعد منو آیا اور ماں سے کہنے لگا:

"ماں رے! بھوک لگی ہے"۔

منی ویسے ہی باتوں میں مشغول رہی۔ گویا یہ سننے والی بات ہی نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بو آیا اور اس نے بھی اسی فقرے کو سنایا مگر منی نے ادھر بھی توجہ نہ کی۔ اس وقت وہ کسی شریف گھرانے کی عورتوں کی بدچلنی بہت جوش وخروش سے بیان کر رہی تھی۔ اس جوش میں یہ فخر پوشیدہ تھا کہ چھوٹی ذات سہی مگر میں ایسی نہیں ہوں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک لڑکا یا دونوں کے دونوں اپنی صدا لگا دیتے۔ اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب چھوٹی لڑکی بھی کہیں سے آئی اور ماں کے پاس بیٹھ گئی، پھر چپکے سے بولی:

"اماں چلو"۔

منی: "ابھی سویرا ہے۔ ذرا ٹھہرو"۔

دس منٹ اور گزرے اب تو بو ماں کا کندھا پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور رونی آواز سے رٹ لگا دی۔

"کھانا دو۔ کھانا دو۔ کھانا دو"۔

منی تھوڑی دیر تک یہ ریں ریں سنتی رہی، پھر اس کو ڈانٹ دیا جس پر بو بھوں بھوں رونے لگا۔ آخر یہ بڑبڑائی ہوئی اٹھی۔

"میں کہتی ہوں۔ یہ سب غارت ہوں یا میں غارت ہوں، زندگی دوبھر ہے"۔

منی نے کوٹھڑی میں آ کر آگ سلگائی اور باجرے کے آٹے کی پانچ ٹکیاں پکائیں۔ دو چھوٹی اور تین بڑی، ان پر ذرا ذرا سا گڑ رکھ کر چھوٹی دونوں لڑکوں کو دیں اور بڑی ایک خود لی اور دو دونوں لڑکیوں کو دیں۔ ان لوگوں کا کھانا تین چار منٹ کے اندر اندر ہی ختم ہو گیا اور پھر یہ سب لوگ گھومنے چلے گئے۔

شام کو مولا جب مزدوری کے پیسے لیے پلٹ رہا تھا تو اس کی نگاہ گلی کے کونے پر پڑی۔ دیکھا تو دو ڈھائی سیر آٹا یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ اس نے قریب جا کر آٹے کو چٹکی میں اٹھا لیا۔ گویا یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ آنکھیں دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں۔ جب یقین آ گیا تو متحیر کھڑا رہ گیا۔ دل کہتا تھا کہ اٹھا لے چلو۔ مگر ایک تو یہ ڈر تھا کہ شاید کوئی کچھ کہے اور دوسری یہ جھجک کہ اس کے ساتھی مزدور بھی پیچھے آ رہے ہوں گے۔ اگر وہ مجھے آٹا اٹھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آخر اٹھانے کی ہمت نہیں پڑی اور یہ چل کھڑا ہوا مگر ہر قدم پر رفتار سست ہوتی جاتی۔ دس قدم چل کر بھونچکا سا کھڑا ہو گیا جیسے چوراہے پر پہنچ کر راستہ بھول گیا ہو۔ سوچ رہا تھا کہ کوئی دوسرا مزدور اس آٹے کو ضرور اٹھا لے گا۔ مجھے نہیں ملے گا اور اس کو مل جائے گا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا گہرا ہو گیا کہ مولا خیالی آٹا اٹھانے والے مزدور کو حد سے زیادہ رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور یہ سوچتا ہوا آٹے کی طرف واپس آیا کہ بلا سے کوئی ہنسے تو ہنس لے، بیوی بچے تو آٹا پا کر خوش ہو جائیں گے۔ مولا کے قدم اتنی جواں مردی سے آٹے کی طرف بڑھ رہے تھے گویا وہ کسی ڈوبتے لڑکے کو دریا سے نکالنے جا رہا ہے۔ آٹے کے پاس پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اپنا انگوچھا پھیلا دیا اور آٹا اٹھانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔

"کیا لوگ ہیں! اناج اس طرح پھینک دیا۔ پیروں تلے الگ آئے، نالی میں الگ جائے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مرغی چڑیاں کھالیں"۔

جس بات کا ڈر تھا وہی ہوئی۔ پانچ چھ مزدوروں کی ایک ٹولی پاس سے گزری اور یہ عجب تماشا دیکھ کر چار مزدور کھڑے ہو گئے۔

ایک: ''کیا مل گیا مولا''۔

مولا: ''کچھ نہیں۔خراب آٹا ہے مگر ہے اناج۔پیروں تلے آ رہا تھا۔ میں نے کہا مرغی بکری کھالیں تو سوارث ہو جائے''۔

دوسرا: ''کیا گلی کی پڑی ہوئی چیز! کہیں نظر گذر نہ ہو''۔

پہلا: ''اٹھالے مولا، اٹھالے،اس کو بکنے دے،کام آ جائے گا''۔

مولا گردن جھکائے اپنے کام میں مشغول رہا۔ یہ لوگ چل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور پہنچ کر ایک مزدور نے تان لگائی:

''سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا''۔

دوسرا اس کے تان ہی کی اثنا میں بولا:

''غریب ہی سہی مگر ہم گلی سے گرا پڑا نہیں اٹھاتے''۔

یہ مزدور بڑائی کی لے رہے تھے مگر حقیقت میں ان میں سے ہر ایک کو مولا کی خوش نصیبی پر کہ اتنا آٹا یوں ہی پڑا مل گیا، رشک وحسد ہو رہا تھا۔

اس آٹے کا بھی عجب قصہ ہوا۔

دس بجنے کے قریب تھے مگر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔ شوکت میاں اسکول جانے کو تیار تھے۔ان کی پھوپھی نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں ڈلوا دیں اور چار کباب تل دیے پھر جلدی سے ان کو میز پر چن ،شوکت میاں کو کھانا کھانے کے لیے آواز دی،شوکت میاں ایک ہاتھ میں کتابیں لیے دوسرے ہاتھ سے شیروانی کے بٹن لگاتے کھانے کے کمرے میں گھس گئے اور بلا ہاتھ دھوئے کھانا شروع کر دیا۔مگر پہلا ہی نوالہ منہ میں رکھا تھا کہ ایسا منہ بگاڑ لیا گویا کونین پی گئے ہوں۔ جلدی سے وہ نوالہ پانی کے سہارے پیٹ میں پہنچا دیا اور پھر روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔ چبایا اور پھر منہ بگاڑ کر بولے:

''پھوپھی جان! آٹا خراب ہے''۔

''آٹا خراب ہے!! کیا؟''

''شاید اکرا گیا''۔

پھوپھی نے بھی روٹی کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا، پھر بولیں:

''تمہاری باتیں! اکرا گیا! کچھ روٹیاں جلدی پکنے سے دھواں گئیں''۔

شوکت میاں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ جلدی سے کتابیں اٹھا کر بھاگتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیگم صاحبہ دھوپ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھیں۔اپنے بیٹے کو اتنی جلدی کھانے کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر بولیں:

''کیا بات ہے؟''

شوکت میاں کی پھوپھی: ''کچھ نہیں۔ذرا روٹیاں دھواں گئیں''۔

بیگم صاحبہ: ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شوکت میاں کب تک فاقے سے اسکول جاتے رہیں گے۔ذرا روٹیاں میں تو دیکھوں!''

شوکت میاں کی پھوپھی ایک پلیٹ میں روٹی رکھ کر سامنے لائیں۔بیگم صاحبہ نے ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولیں:

''یہ دھواں گئی ہیں۔ میں کہتی ہوں بہن تم کو کب عقل آئے گی۔اکرایا ہوا آٹا میرے بچے کے سامنے رکھ دیا۔ جہاں میں ذرا غافل ہوئی، بس ولدر پنا ہونے لگتا ہے''۔

اس فقرہ کا نشانہ پھوپھی تھیں۔ یہ بے چاری شوکت میاں کے باپ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ دس برس سے بیوہ تھیں اور ان

کا یا ان کی لڑکی کا بجز اس گھر کے اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ بظاہر تو یہ ایک غریب بہن کی طرح رکھی جاتی تھیں مگر حقیقت میں یہ ''صدر ماما'' یا نوکروں کے انچارج کی خدمات انجام دیتی تھیں اور ہر قسم کی بدنظمی کی براہ راست ذمہ دار تھیں۔ بیگم صاحبہ کا الزام سن کر بولیں:

''اے میں نے تو بھلے کی سوچی تھی۔ چھوٹی مٹکی میں آنا تھا۔ میں نے کہا یہ کیوں پڑا رہے۔ کام ہی آ جائے''۔

''یہ نہ ہوا کہ دیکھ لیتیں آٹا کیسا ہے؟ وہ تو روٹی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے، خیراتن''۔

ان کی آواز پچیس گز کا فاصلہ طے کر کے اسی کڑک سے باورچی خانے پہنچی۔

خیراتن: ''جی بیگم صاحبہ۔۔۔ پکار رہی ہوں''۔

بیگم صاحبہ: ''سب آٹا نالی میں پھینک دے۔ بڑے گرے سے آٹا نکال کر پکا''۔

شوکت میاں کی پھوپھی اس حکم کی تعمیل کرانے دوڑیں اور باورچی خانے میں آ کر بڑبڑانے لگیں۔

''نالی میں پھینک دو۔ نالی میں پھینک دو۔ سچ ہے کہ جب چیز ہوتی ہے تو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ اناج بڑی چیز ہے بہن، بڑی چیز''۔

خیراتن: ''ہاں گندھا گندھایا آٹا۔ سب محنت اکارت''۔

شوکت میاں کی پھوپھو: ''تم پھینکو وینکو نہیں۔ لیتی جاؤ بکری کو کھلا دینا۔ ہاں اور دیکھ مٹکی میں ابھی ڈھائی سیر آٹا ہوگا۔۔ دو آنے دس پیسے کا مال ہے۔ وہ بھی تم لیتی جاؤ۔ میں پھینکوا کر کیا کروں گی''۔

خیراتن چاہتی تو تھی کہ آٹا لے جائے مگر یہ سوچ کر کہ پھوپھی مری بچھیا برہمن کے نام کر کے احسان کرنا چاہتی ہیں۔ بولی:

''ہاں آٹا لے جا کر کسی کونے میں ڈال دوں گی۔ پیروں تلے نہ آئے۔ اب ہے کس کام کا''۔

پھوپھی نے اس ڈر سے زیادہ باتیں نہیں کیں کہ کہیں خیراتن آٹا لے جانے سے بالکل ہی انکار نہ کر دے اور اس طرح ذرا سا احسان کرنے کا جو موقع مل رہا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ فوراً کوٹھڑی کے اندر جا کر آٹا اپنے ایک میلے دوپٹے میں باندھ لائیں اور بولیں:

''ذرا دوپٹے کا خیال رکھنا۔ پھٹنے نہ پائے اور شام ہی کو اپنے ساتھ لیتی آنا''۔

خیراتن نے پوٹلی کی طرف ایک نظر ڈالی اور جیسے کام کر رہی تھی کرتی رہی۔ جب گھر جانے لگی تو پکی موئی روٹیاں۔ گوندھا ہوا آٹا اور آٹے کی پوٹلی سب سامان لے کر گھر آئی۔ خیراتن کی بڑی لڑکی نے، جو شوہر سے لڑائی ہونے کی وجہ سے مستقل ماں کے پاس رہتی تھی، اس سامان کا حال پوچھا۔ جب خیراتن نے قصہ بیان کیا تو اس نے روٹی چکھی اور پھر بولی:

''کھانے کے قابل نہیں۔ کڑوا ہو گیا''۔

''بکری کھالے گی''۔

''اس کا دودھ نہ گھٹ جائے گا؟''

خیراتن نے اٹھ کر روٹیاں بکری کے سامنے ڈال دیں۔ اس نے ایک روٹی تو کھالی مگر اس کے بعد منہ ہٹا لیا۔ پھر ان لوگوں نے لاکھ چمکارا مگر وہ ادھر متوجہ بھی نہیں ہوئی اور ہوتی کیسے؟ وہ تو بیگم کے یہاں کے بچے کھچے مرغن کھانوں پر پلی تھی۔ اس وقت بھی پیٹ اسی سے بھرا تھا۔

اب خیراتن سوچ میں پڑ گئی کہ آخر آٹے کا مصرف کیا ہو۔ بیٹی نے تجویز پیش کی۔

''دلارے کی نظر اتار کر چوراہے پر ڈال دو''۔

یہ تجویز معقول تھی۔ اگر آدھ سیر تک آٹا ہوتا تو اس پر ضرور عمل کیا جاتا مگر اک دم سے ڈھائی سیر آٹا اس طرح پھینکنے پر خیراتن کے دل نے گواہی نہیں دی۔

رات کو جب خیراتن کام کاج سے واپس آئی اور اطمینان سے کھانا کھا کر لیٹی تو یہ مسئلہ اٹھا کہ آٹے کا کیا ہو۔ دوستوں اور عزیزوں کی فہرست دہرائی مگر کوئی کام آتا شخص نظر نہ آیا۔ صبح ایک فقیر نے صدا لگائی۔ خیراتن نے موقع غنیمت جانا اور فوراً پاؤ بھر آٹا نکال کر بھیک دینے لگی۔ فقیر تھا شہر کا۔ آٹا دیکھ کر بولا:

''مائی فقیر کو خراب چیز نہ دیا کرو۔ اللہ بھلا کرے''۔

یہ کہہ کر چلتا ہوا۔ خیراتن آٹا لیے بڑبڑاتی اندر آئی۔

''موئے موئے فقیر۔ بھیک مانگنے چلے ہیں''۔

اب پھر وہی مسئلہ۔ آٹے کا کیا ہو؟ سہ پہر کو ایک عورت دو بچوں کو ساتھ لیے ان کے گھر میں آئی اور اس نے اپنی کتھا یوں سنائی:

''میں کوئٹہ کی رہنے والی ہوں۔ زلزلے میں میرا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے باغ تھے۔ بڑے بڑے مکانات تھے۔ شوہر اور لڑکے تھے مگر سب تباہ ہو گئے اور میں دکھیا دربدر گھوم رہی ہوں''۔

خیراتن کو اور اس کی بیٹی کو ان تینوں کے حال پر بڑا ترس آیا اور سب آٹا اٹھا کر یکمشت ان لوگوں کو دے دیا۔ عورت غریب ان آدمیوں سے خلاف توقع اتنا آٹا پا کر متعجب ہوئی مگر عورت تھی۔ ان عورتوں کے خلوص میں اس کو شک ہوا۔ ذرا دور، گلی میں جا کر اس نے پوٹلی کھولی اور جب حقیقت معلوم ہوئی تو خوب بڑبڑائی، کوسنے دیے اور آٹا گلی میں ڈال کر چلتی ہوئی۔ اس کو خراب آٹے کی کیا پرواہ ہوتی؟ اس کی جیب میں آج کی تحصیل کے روپیہ کھنک رہے تھے۔

شام کے وقت منی مولا کا انتظار کر رہی تھی اور بو اس کے کندھے سے لگا ریں ریں کر رہا تھا۔

''اماں بھوک لگی ہے، اماں بھوک لگی ہے''۔

منی: ''دوپہر کو تمہیں اور منو کو برابر کی ٹکیاں دی تھیں۔ دیکھو وہ کہاں روتا ہے''۔

منو ایک لال کنکوے کا پھٹا کاغذ سر پر لپیٹے ایک لکڑی ہاتھ میں لیے سپاہی بنا ٹہل رہا تھا۔ یہ سن کر بولا:

''اماں کل اور کم دینا۔ تب بھی ہم نہیں روئیں گے''۔

منی: ''اب بتا بو۔ وہ دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے''۔

بو غیرت میں آ کر خاموش ہو گیا مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر ویسی ہی ریں ریں کرنے لگا۔ اب منی کہنے لگی:

''رو نہیں۔ دیکھو تمہارے ابا آتے ہوں گے اور تمہارے لیے چیز لاتے ہوں گے''۔

اتنے میں مولا آٹے کا پوٹلا لیے کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ منی نے پوٹلا کھولا اور دیکھ کر حیرت سے بولی:

''گیہوں کا آٹا۔۔۔۔ کہاں ملا؟''

جب سے مولا بیمار تھا ان لوگوں نے گیہوں کی روٹی نہیں کھائی تھی۔ اسے دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔

مولا: ''مل گیا۔ دیکھو کتنا ہے؟''

منی دوڑ کر کہیں سے ترازو مانگ لائی اور آٹا تولنے کے لیے بیٹھی۔ ایک سیر تولا اور اس کو ایک کپڑے میں رکھ دیا پھر دوسری بار ترازو بھرا۔ نتیجہ دیکھنے کو سب انتہائی ذوق و شوق سے منتظر تھے جیسے لڑکے اسکول میں امتحان کا نتیجہ سننے کے۔ آخر منی بولی:

''سوا دو سیر سے کم نہ ہوگا۔ کتنا اچھا آٹا ہے۔ چل چھوکری۔ دیکھ اس کے گھن چن۔ پہلے چراغ جلا۔ اندھیرا بہت ہے''۔

ایک لڑکی نے دوڑ کر ایک میلی سی لالٹین اٹھا کر جلائی اور پھر دونوں بیٹھ کر گھن چننے لگیں۔ دونوں چھوٹے لڑکے غل مچانے لگے۔
''گیہوں کا آٹا۔۔گیہوں کا آٹا''۔
منی تھوڑی دیر چپ رہی، پھر چلا کر بولی:
''چپ رہو کم بختو، کان پھاڑے ڈالتے ہو''۔
اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک چھوٹی لڑکی کے کھانسنے کی آواز یا بڑی لڑکی کے بدن کھجلانے کی کھر کھر کے سوا کوئی آواز نہ آئی۔ پانچ منٹ بعد منی نے حکم سنایا۔
''بس اب صاف ہوگیا۔ آدھا آٹا کل کے لیے رکھ دو''۔
مولا: ''اب رکھوگی کیا۔ آج ہی پکالو۔ سب جی بھر کے کھالیں''۔
دونوں لڑکے: ''ہاں، ہاں۔۔۔۔میری اماں''۔
منی آٹا گوندھنے لگی۔ آٹے میں اب بھی گھن موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر اسکو کچھ شک ہوا۔ اس نے آٹا نکال کر چکھا پھر ذرا منہ بنا کر بولی:
''نمک ڈال کر پکانے والا ہے۔ دو پیسے کا تیل لے آؤ تو آج پوریاں پکیں۔ دو پیسے کے آلو بھی لے آؤ۔۔۔۔ارے لڑکو، ذرا جا کر بقاتی کے یہاں سے کڑاہی تو لانا''۔
دونوں لڑکے بے تابانہ کڑاہی لینے دوڑے اور ان کے پیچھے چھوٹی لڑکی چلی۔ مولا بنیے کے یہاں سامان خریدنے گیا۔ ذرا دیر میں لڑکی کڑاہی لے کر آ پہنچی اور پیچھے پیچھے دونوں لڑکے چیختے ہوئے:
''ہم لے جائیں گے۔ ہم لے جائیں گے''۔
منی نے کوٹھری کے باہر نکل کر کڑاہی مانجی۔ مولا لکڑی وغیرہ لے کر آیا۔ لڑکیوں نے آگ بنائی۔ سب لڑکے چولہا گھیر کر بیٹھے اور کڑاہی چڑھائی گئی۔ منی نے ایک مٹی کی رکابی میں ایک بڑی سی روٹی بنائی۔ کڑاہی میں دو قطرے تیل ڈالا۔ جب وہ کڑ کڑانے لگا تو اس نے روٹی ڈال دی۔ وہ چڑ سے بولی۔ تیل کی بو کوٹھری میں پھیل گئی۔ لڑکے کھانسنے لگے۔ پوریاں پکتے دیکھ کر سب کے چہروں پر بحالی آگئی۔
منو: ''آہاہا۔ کیسی اچھی خوشبو نکلی''۔
منی نے روٹی دوسری طرف الٹی۔
منو: ''کیسی لال لال۔ اماں یہ ہم کھائیں گے''۔
ببو: ''نہیں ہم۔ ہم''۔
منی نے پوری اتاری، پھر کڑاہی میں دو قطرے ٹپکائے اور دوسری پوری ڈال دی۔ اسی طرح اس نے ایک گھنٹے میں دھیمی دھیمی آنچ میں سب پوریاں نکال لیں۔ کھانے میں بہت دیر ہوگئی تھی مگر خوشی میں کسی کو محسوس نہیں ہوا۔ پوریاں پکا کر منی چلائی:
''ارے آلو لاؤ۔ آلو لاؤ۔ کسی نے ابھی تک کاٹے ہی نہیں، میں کہتی ہوں یہ چھوکریاں کسی کام کی نہیں۔ سب کھڑی تماشا دیکھ رہی ہیں''۔
جلدی جلدی آلو کے پتلے پتلے قتلے کاٹے گئے اور پھر کڑاہی میں پکنے کے لیے چڑھا دیئے گئے۔ یہ انتظار بے شک کھل گیا۔ سب خاموش بیٹھے چولہے کو تاک رہے تھے۔ صرف کھانسی کی آواز خاموشی توڑ دیتی تھی۔ آخر آلو تیار ہوگئے۔ تیار کیا ہوگئے ذرا

ملائم پڑ گئے۔ منی نے مٹی کی رکابیاں نکالیں اور سب میں دو دو پوریاں اور ان پر تھوڑے تھوڑے آلو رکھ کر سب کے سامنے بڑھا دیئے۔ اب جوان لوگوں نے خیال کیا تو ببو سو رہا تھا۔

منی: ''ببو اٹھ، اٹھ، دیکھ پوریاں تیار ہو گئیں''۔

لڑکیاں: ''اے ببو۔ ببو''۔

ببو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور رونے کی نیت سے پورا منہ کھول کر ایک چیخ لگائی مگر ابھی چیخ پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کی نگاہ پوریوں پر پڑ گئی۔ جن کو دیکھ کر رونا بھول گیا۔ سب ہنس ہنس کر پوریاں کھانے لگے۔

منو: ''اہاہا۔ کتنے مزے کی ہیں''۔

چھوٹی لڑکی: ''اماں سالن ہوتا!''

بڑی لڑکی: ''ہاں اور پلاؤ متنجن نہ ہوتا۔ گدھی''۔

پھر خاموشی ہو گئی۔ یہ لوگ خوب مزے لے لے کر کھا رہے تھے جس سے اچھا خاصا شور پیدا ہو گیا تھا۔ جب پوریاں ختم ہو گئیں تو منی نے آدھی آدھی سب کو اور دیں اور خود بھی لی۔ اب مولا نے آٹا ملنے کا قصہ بیان کیا۔ اس پر منی بولی یہ بھی خدا کی دین ہے۔ میں ببو سے کہہ رہی تھی کہ آج تمہارے ابا چیز لاتے ہوں گے۔

ببو: ''اماں ہم گرما گرم پوری والے بنیں گے اور خوب پوریاں کھائیں گے''۔

منو: ''ہم سپاہی بنیں گے اور سب کو پکڑ پکڑ کر جیل خانے بھیجا کریں گے''۔

ببو: ''ہم تم کو پوریاں نہیں دیں گے''۔

منو: ''ہم تم کو خوب پیٹیں گے اور پکڑ کر تھانے میں بند کر دیں گے''۔

ببو: ''ہم۔۔۔۔ ہم تمکو''۔

ببو کی سمجھ میں نہیں آیا، کہ کیا کہے۔ ان نے منو کا منہ چڑھا دیا۔ اس پر منو نے ایک گھونسا رسید کیا۔ مولا نے دونوں کو ڈانٹا۔ ''کم بختو! آج تو خوب ٹھونس ٹھونس کر کھایا ہے، آج تو چپ رہو''۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ مولا بولا:

''خدا ایسا ہی روز پیٹ بھر دے''۔

جب یہ لوگ سونے لیٹے تو ببو بولا:

''اماں، آج تو کہانی کہو''۔

لڑکیاں: ''ہاں، ہاں۔۔۔۔ بادشاہ زادے والی''۔

منی کی بھی طبیعت مگن تھی۔ وہ کہنے لگی:

''ایک تھا بادشاہ۔۔۔۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔۔۔۔''

☆☆☆

محروم وراثت

علامہ راشد الخیری

محمد احسان تحصیلدار کے دونوں بچے محسن اور رضیہ تھے تو حقیقی بہن بھائی، مگر نہ معلوم احسان کس طبیعت کا باپ تھا کہ اس کی وہی نظر محسن پر پڑتی تو محبت میں ڈوبی اور رضیہ پر پڑتی تو زہری بجھی۔ سمجھدار پڑھا لکھا، مگر ظالم کی عقل پر ایسے پتھر پڑے تھے کہ دیکھ کر خوش ہوتا نہ سوچ کرنا دم، محسن کی تعلیم پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا، مگر رضیہ غریب کو استانی بھی میسر نہ تھی، کچھ اس لیے نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کا مخالف تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی کمائی میں اس کو حقدار نہ سمجھتا تھا، محسن کے پاس جوتی کے آٹھ آٹھ دس دس جوڑے اور رضیہ کے پاس صرف ایک اور وہ بھی مہینوں کی ٹوٹی پھوٹی تو نہیں، مگر ٹوٹی سے بدتر، محسن کے پاس ایک نہیں درجن بھر سوٹ اور رضیہ کے پاس انے گنے دو دو پٹے اور لطف یہ کہ جو کچھ بھی رضیہ کو میسر تھا وہ اس کا حق یا باپ کی محبت نہیں صرف صفیہ کا اصرار تھا۔ ورنہ واقعات تو یہی کہتے تھے کہ رضیہ کھلے سر اور ننگے پاؤں بھی پھرتی تو احسان کو ملال نہ ہوتا، باپ کی اس لاپرواہی اور بے وفائی پر بھی وقت رضیہ کے ساتھ تھا، صفیہ جہاں شوہر کی اس کمی پر افسوس کر رہی تھی وہاں اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمیشہ اس نقصان کی تلافی کی اور جہاں تک بھی ممکن ہوا اس کی تعلیم و تربیت میں انتہائی کوشش کرتی رہی۔ رضیہ کی فراست اس کا شوق اس کی سعادت مندی۔ صبر اور خاموشی ماں کے دل میں گڑی جاتی تھی، وہ اس کے یا اس کے باپ کے سامنے نہیں تنہائی میں اکثر روتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عید کے موقع پر اس لیے کہ کچھ عزیز آنے والے تھے، شاموں شام احسان نے بیوی اور بچے کے لیے سب سامان منگوایا، احسان، محسن، رضیہ چاروں ایک جگہ بیٹھے تھے۔ احسان ایک ایک چیز اٹھا اور دکھاتا جاتا تھا اور متوقع تھا کہ بیوی اور اس کے بچے اس انتخاب کی داد دیں۔ احسان جس وقت ایک چیز دکھانے کے بعد صفیہ، رضیہ اور محسن کی صورت دیکھ کر داد طلب کرتا اس وقت صفیہ اس ڈھیر کو کبھی شوہر کو اس امید پر دیکھتی اور تکتی کہ شاید اس ڈھیر سے یا شوہر کے منہ سے رضیہ کے لیے کوئی چیز رضیہ کے نام نکلے، مگر پوری نو چیزیں چار صفیہ اور پانچ محسن کی ختم ہوگئیں لیکن رضیہ کے نام کی چیز نہ ڈھیری سے نکلی نہ اس کا نام باپ کے منہ سے نکلا۔ محسن نے باپ کی محبت اور کوشش کی داد دی۔ دل کھول کر دی اور پیٹ بھر کر دی۔

مگر صفیہ کے سامنے اس وقت ایک اور ہی سماں تھا۔ وہ اوپری دل سے تعریف کرتی ہوئی اٹھی، ساتھ ہی خیال آیا کہ اللہ غنی مسلمان بچیاں جو ماں کی چوکھٹ پر چندروزہ مہمان ہیں۔ بھائیوں کے مقابلے میں اتنا حق بھی نہیں رکھتیں کہ پانچ کے مقابلہ میں ایک چیز آجاتی، میں جانتی ہوں کہ رضیہ کے پاس سب کچھ ہے۔ اور میں نے حیثیت سے زیادہ اور ضرورت سے بڑھ کر اس کا سامان کرلیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب باپ ہی کی کمائی ہے لیکن اس کے واسطے اگر ایک چیز بھی اس وقت آجاتی تو اس کا دل کتنا بڑھ جاتا۔ باپ اس کی خوشی دو چار روپے میں بھی مول نہ لے سکا، محسن خدا اس کی عمر دراز کرے آگے اور پیچھے آج اور کل مالک اور مختار ہے، لیتا ہے اور لے گا، مگر رضیہ کہاں اور یہ گھر کہاں؟

صفیہ شوہر کے پاس سے ایک خفیف بخار دل میں لے کر اٹھی تھی، مگر کمرے تک پہنچتے پہنچتے بلبلا گئی، اور اس خیال کے آتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ جانتی تھی کہ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیر رہے ہیں، اور چاہتی کہ اس حالت کو ظاہر نہ ہونے دے، مگر اس جذبہ محبت نے جو ماں کے آغوش میں پلا تھا بے قابو کر دیا اور بچی کی صورت دیکھنے کو منہ پھیرا۔ ایک ساکت مجسمہ تھا جو رضیہ کی صورت میں گم سم باپ کے سامنے بیٹھا زمین کو دیکھ رہا تھا۔ ماں نے بچی کی خاموش صورت دیکھ کر اس کے دل کی کتاب

پڑھی اور ٹھنڈا سانس بھر کر آگے بڑھی، احسان بیوی کا یہ رنگ دیکھ کر حیرت میں ادھر آیا اور کہنے لگا۔

''بس وہی ایک پیٹنا کہ رضیہ کا کچھ نہ آیا، اس کے پاس سب کچھ موجود ہے''

بیوی: موجود تو محسن کے پاس بھی ہے۔

میاں: محسن کی اس کی کیا برابری۔

بیوی: کیوں؟

میاں: وہ گھر کا مالک۔۔یہ پرایا دھن۔

میاں: اس کے علاوہ کنواری بچی کو جول گیا وہ غنیمت ہے۔

(۲)

محسن بی۔اے میں کامیاب ہوا تو رضیہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھی اور ایک یہی کیا ماں کی توجہ اور کوشش نے انسانیت کے تمام جوہر اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کی شادی ساتھ ساتھ ٹھہری، مگر اس احتمال سے کہ موروثی جائیداد رضیہ کی سلطنت سے پرائے قبضہ میں نہ جائے۔احسان نے اس کے نکاح سے قبل قریب قریب تمام جائیداد وقف علی الاولاد کی آڑ میں محسن کے حوالے کی اور رضیہ کو محروم کر دیا۔صفیہ نے بہتراغل مچایا، مگر یہ تو بڑا کام تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بیویوں کی مخالفت کا شوہروں کے مقابلہ میں جو نتیجہ ہوسکتا ہے مسلمان اس راز سے اچھی طرح آشنا ہیں، صفیہ کو بڑا صدمہ یہ تھا کہ اس کی اپنی جائیداد بھی جو میکے سے ملی تھی اس سلسلہ میں فنا ہو رہی تھی۔

مسلمان قلم کی طاقت اور اپنی زبان کے زور سے جھٹلا لیں، مگر ہے کوئی مسلمان جو ایمان سے کہہ سکے کہ بچوں والی بیوی، بہو اور داماد والی یا ہونے والی، شوہر کی اتنی مخالفت کے بعد کہ ایسی دستاویز پر دستخط نہ کرے اس گھر میں خوش رہ سکتی ہے؟ احسان کے پنجرے میں رضیہ ہر چند پھڑ پھڑائی مگر معاشرت اسلامی کا موجودہ لاسہ اتنا تیز اور اتنا گہرا تھا کہ جتنی تڑھی اتنی ہی چپکی، گھر میں ہفتہ بھر قیامت بپا رہی اور اس کے بعد احسان نے اندر کی آمد و رفت قطعاً بند کر دی۔ صفیہ برس چھ مہینہ کی بیاہی نہ تھی۔ بیس بائیس برس کی گھر میں نہایت ہی استقلال سے شوہر کا مقابلہ کیا۔اس حالت اور ایسے موقعوں پر مسلمان مردوں کے پاس نکاح ثانی کا حربہ چلتا ہوا ہتھیار ہے۔مگر صفیہ اس کو بھی خاطر میں نہ لائی اور میاں سے صاف کہہ دیا کہ گھر اگر موم اور نون کا ہے کہ دھوپ سے پگھلے اور پانی سے بہے، تو میں کہاں تک روکوں گی۔بسم اللہ آج نہ کیا کل اور کل نہ کیا پرسوں۔

مطالبہ حقوق نسواں کو لغو اور فتنہ قرار دینے والے مسلمان جو کچھ فرمائیں ہمارے سر اور آنکھوں پر، مگر خدا را وہ بتائیں کہ اس موقعہ پر جب احسان نے ہر طرف سے ناکام ہو کر فیصلہ کیا کہ وہ رضیہ کے نکاح ہی کا خاتمہ کر دے اور تمام عمر بیٹی کو وداع نہ کرے۔تو صفیہ کیا کرتی؟ اس فیصلہ نے صفیہ کی گردن شوہر کے سامنے جھکوا دی۔اس کی اکڑ، اس کا استقلال، اس کی ضبط سب فنا ہو گئے اور اب جائیداد اور جائیداد کی تقسیم تو الگ رہی، اس کو نکاح ہی کے لالے پڑ گئے اور یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے غریب بچی کی عمر تباہ و برباد ہوتی ہے۔اس نے کاغذ پر دستخط کیے اور اس طرح رضیہ ماں باپ کی جائیداد سے محروم، وداع ہو کر سسرال رخصت ہوئی۔

(۳)

محسن بی۔اے کے بعد قانون میں کامیاب ہوا، رضیہ ایک بچہ کی ماں بنی، صفیہ حج سے فارغ ہوئی، احسان پر فالج گرا اور وہ ہلنے کے قابل بھی نہ رہا، اس وقت گھر کا مالک اور سپید و سیاہ کا مختار، جائیداد کا منتظم محسن تھا۔اور گو آمدنی معقول تھی۔اللے تللے نے مقروض کیا اور نوبت یہاں تک آئی کہ جس گھر میں دس پانچ ہزار روپیہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔اس میں سو پچاس بھی مشکل سے

نکل سکتے تھے۔صفیہ کی دوراندیشی تھی کہ کچھ روپیہ اپنے پاس لگا رکھا تھا۔باقی زیور سے مدد لی اور حج کرلیا۔واپس آئی تو محسن کا یہ رنگ دیکھ کر سناٹے میں رہ گئی مگر جولڑ کا زندہ باپ کو مردہ سمجھ رہا تھا وہ ماں کو کیا خاطر میں لاتا۔محسن کی بعض دفعہ پریشانیاں اور پریشانیاں ہی نہیں،فضول خرچیاں ماں کو سخت خلجان میں ڈال دیتیں۔اور وہ اب یہ سمجھ گئی تھی کہ عنقریب یہ مجھ سے روپیہ طلب کرتا ہے۔اس لیے گھر کی برابر والی مسجد کی تعمیر اس کے واسطے بہت اچھا موقع تھا۔اس نے فوراً شوہر کے کان میں بات ڈال کر جو کچھ زیور بچا تھا،مسجد کی نذر کیا۔مگر یہ خبر احسان ورصفیہ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ تھی کہ فالج کا دورہ ایسا سخت ہوگا،اور سنگ دل بیٹا محسن،عاشق زاد باپ کو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلادے گا۔صفیہ کے پاس ابھی تھوڑی بہت کھرچن موجود تھی،اس کے طفیل اتنا تھا کہ معمولی علاج جاری رہا،ڈاکٹر حکیموں کی فیس نکل رہی تھی اور نسخے بھی آرہے تھے،ورنہ محسن نے ایک دن کو کیا ایک گھڑی بلکہ ایک لمحہ کو بھی نہ پوچھا کہ کیا ہوا اور کیا ہورہا ہے۔جب متواتر باپ نے بلایا تو کھڑے کھڑے آیا اور ایک آدھ بات کی اور چلتا ہوا۔

اس کے پندرہ روز اسی طرح گزرے،اٹھ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا۔اس موقع پر صفیہ نے ایسی خدمت کی جو شریف بیویوں سے توقع کی جاسکتی ہے اس کو سوا رونے کے اور کوئی کام نہ تھا۔رات رات بھر اور دن دن بھر پٹی پکڑے بیٹھی رہی۔اس کی نیند اور بھوک دونوں اڑ چکی تھیں اور اسی کا صدقہ تھا کہ حکیم ڈاکٹر آرہے تھے اور علاج ہورہا تھا۔بالآخر ڈاکٹر نے بجلی کا علاج تجویز کیا۔جس کا تخمینہ چار ہزار روپے کے قریب تھا۔احسان اور رضیہ دونوں کو یہ شبہ بھی نہ تھا کہ محسن باپ ہی کا روپیہ جس کی بدولت وہ نواب بنا پھر رہا تھا۔باپ کی زندگی اور راحت سے عزیز کرے گا۔

صبح سے بلاتے بلاتے شام ہوگئی دنیا بھر آئی مگر محسن نہ آیا۔خدا خدا کر کے شام کو لوٹا تو باپ نے اپنے منہ سے ساری کیفیت سنائی۔اور بغیر جواب دیئے چلا،تو ماں پیچھے پیچھے گئی اور کہا۔

''میاں پھر بجلی کے علاج کا انتظام کرو''۔

ایک ایسی نظر سے،جس میں تعجب اور غصہ دونوں شامل تھے،محسن نے ماں کو دیکھ کر کہا۔

''تمہاری عقل جاتی رہی ہے۔اول تو روپیہ ہی نہیں ہے۔اور اگر ہوتا بھی تو علاج فضول ہے،میں نے معلوم کرلیا ہے کہ موت یقینی ہے،اگر کچھ روز کو بچ گئے تو اور سو بان روح ہونگے''۔

صفیہ کا قدم آگے نہ اٹھ سکا،دہم ہوگئی،زبان سے ایک لفظ نہ نکلا! اس کو تو کچھ نہ کہہ سکی مگر اپنے دل میں کہا کہ ایسے ناہنجار لڑکے کی ماں،زمین شق ہو اور سما جائے۔اب میں جا کر کیا جواب دونگی،کھڑی سوچتی رہی تھی کہ رضیہ کا خط ملا۔

اماں جان!

آداب عرض کرتی ہوں۔

جب سے ابا جان کی بیماری اور ان کی کیفیت سنی ہے دل ہوا ہورہا ہے،ہائے میرے ابا جان کو کیا ہوگیا،میں تو بھلا چنگا چھوڑ کر آئی تھی۔مجھ بدنصیب کو تو ابھی معلوم ہوا ہے۔اے اللہ! کیا کروں؟ ڈپٹی صاحب کچہری میں ہیں جس طرح ہوگا آج ہی رات کو یا کل فجر حاضر ہوں گی۔میرے آنے کا ذکر نہ کیجیے خفا ہوں گے۔میں سامنے نہ جاؤں گی،دور ہی سے شکل دیکھ لوں گی۔

''اچھی اماں جان! علاج میں کمی نہ کرنا''۔

آپ کی فرمانبردار بیٹی

رضیہ

رضیہ علی الصباح میکے پہنچی۔ باپ کی حالت اور مفصل کیفیت سن کر الٹے پاؤں واپس گئی رات کے دس بجے تھے، احسان یہ سن کر کہ محسن نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا، انگاروں پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ مگر مجبور تھا کہ ہلنے کی طاقت نہ تھی۔ اور کوئی دم کا مہمان تھا آنکھیں بند تھیں کہ ایک ہاتھ نے اس کا مفلوج ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ احسان نے آنکھ کھولی تو دیکھا۔ رضیہ سامنے کھڑی ہے اور آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

وہ یہ سمجھ کر کہ باپ کو میری صورت سے تکلیف نہ ہو ہاتھ جوڑتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔ تو صفیہ نے کہا۔

رضیہ یہ چار ہزار روپیہ لائی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے جو پانچ ہزار روپے اس کو نقد دیئے تھے اس میں سے یہ لے لیجئے اور علاج کیجئے۔

جس رضیہ کی صورت سے باپ کو نفرت تھی۔ جس پر ایک پیسہ بھی صرف کرنا گراں تھا۔ اس کا سر اس وقت باپ کے قدموں میں تھا۔

اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔

''ابا جان یہ آپ ہی کا روپیہ ہے۔ میرا نہیں ہے''۔

آج احسان کو معلوم ہوا کہ بھولی بھالی بچیاں کیا چیز ہیں، اس نے بچی کو بلا کر اپنے سینے سے لگایا اور آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔

☆☆☆

نشے کی پہلی ترنگ

سجاد حیدر یلدرم

جوان! بیس سال کا جوان ہے۔ وہ گردبادِ حیات، تاثراتِ روحانیہ، مرأتِ وجدان کن کو کہتے ہیں، اس سے بالکل بے خبر ہے۔ حظوظاتِ نفسانیہ میں شدت سے منہمک اور ہوا و ہوس سے مغلوب! جہاں بزمِ عیش دیکھی ادھر ہی کو دوڑنا، کہیں آہنگِ طرب سنا، اسی میں شریک ہونا، جہاں معلوم ہوا کہ کوئی مجلس مستانہ ہے، وہیں کے ہو لیے مگر شراب نہیں پیتا اور اسے آبِ زہرناک تصور کرتا ہے۔ صرف سوسائٹی اور یارانِ جلسہ میں رہنے کا بہت شوق ہے اور کھانے کا تو دشمن ہے۔ رکابی میں کسی چیز کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہر دلعزیز ہونے کی بہت خواہش ہے اور ہر شخص کے ساتھ ملاطفت سے پیش آنا چاہتا ہے۔ غرض کہ بزم آرا، شوق افزا ہے۔

ناتجربہ کاری اور بےفکری کے خیالات رات دن اس کی خدمت میں فخر کے ساتھ حاضر رہتے ہیں۔ اس میں تعجب کیا ہے؟ جوانوں کے لیے دل لگی چاہیے! وہ بھی اپنا دل بہلاتا ہے۔ وہ بھی روایت پرور افکار کا محکوم ہے۔ کچہری ہفتہ میں دو تین دن جاتا ہے باقی تمام وقت لایعنی اشغال میں صرف کرتا ہے۔ دن بھر میں سو سو محلوں کے چکر لگاتا ہے اور ہر جگہ ایک محبوبہ سودا انتمار رکھتا ہے۔

خوش ہے! حیات کے مسائل مہمہ میں سے ایک بھی اسے اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ اندیشہ و اضطراب کے اسباب مہلکہ سے بری ہے، مستقبل زمانہ کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ حال میں اپنی عمر کو ایک آہنگِ عاشقانہ کے ساتھ گزارتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے اور پہنتا ہے، معیشت نے اس آوارہ مزاج پر اپنا دستِ تغلب نہیں ڈالا۔ اپنے خیال میں وہ گویا اس سوچ میں ہے کہ حیات مسعودانہ کب اور کس طرح منتظم کرے!

محاکماتِ فکریہ اور مناقشاتِ وجدانیہ کو محکومِ تعب اور آرام سوز سمجھ کر ان سے کلیتہً مجتنب ہے۔ ہفتے یکے بعد دیگرے گزر جاتے ہیں اور وہ گھر میں نہیں آتا۔ گھر والے اس غیر حاضری پر کس اندیشہ و خلجان میں مبتلا ہوں گے، اس سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دیتا۔ اگر وہ پریشان ہیں تو میں کیا کروں؟ میں بچہ نہیں ہوں۔ اگر غیر حاضر رہتا ہوں رہنے دیں۔

وہ شفقت پناہ عورت جسے ماں کہتے ہیں آنکھوں میں آنسو بھر کے اس کی خوشامد کرتی ہے وہ تین چار منٹ کے لیے متاثر ہو کر اپنی حالت پر افسوس کرتا ہے، مگر پرانی ہوائے محبت اس نقش کو بہت جلد زائل کر دیتی ہے، وہی فکر، وہی شرب اپنی فرمانروائی پھر شروع کر دیتے ہیں۔ جو شخص کہ چند ساعت پہلے اپنی والدہ کے حضور میں محجوبیت اور ندامت کے ساتھ حاضر تھا، اب وہی اپنے پرانے شبانہ اشغال میں شریک ہونے کے لیے موجود ہے۔ شام کو دستر خوان کے گرد جمع شدہ خاندان میں ایک شخص کی عدم موجودگی۔۔۔۔ اپنے جگر پاروں کو دیکھتی ہے۔ بڑے بھائی کی غیر حاضری کی وجہ سے دلگیر ہو کر چھوٹے بچے تہالکِ معصومانہ سے کہتے ہیں:

"اماں! ہم کھائیں؟ بھائی تو آئے نہیں؟"

بغیر کسی لطف اور لذت کے پیٹ میں کھانا ڈال کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

سب پڑوسی نوجوان کے انجام سے ڈرتے ہیں، اس کی اصلاح کے متعلق اس کی ماں سے سوال کرتے ہیں، مگر افسوس! ماں بےچاری کیا کرے۔ وہ نصیحت سنتا ہی نہیں۔ ہم کہہ نہیں چکے ہیں کہ وہ ہوا و ہوس سے مغلوب ہے، اس کو اس کے مشاغل سے

باز رکھنا سخت مشکل ہے۔ ہوس نے اپنا سکہ جما رکھا ہے، برائیاں حکمرانی کر رہی ہیں اور طالع مساعد ہے اور موفقیت زیادہ! جوان کو ماں نے ایک تقریب سے دوسرے شہر میں بھیج دیا ہے کہ شاید اسی ذریعے سے اس کی آشفتہ مزاجی میں کمی ہو۔

وہ چلا گیا، مگر کیا اس کی حرکات مجنونانہ میں کوئی کمی ہوئی؟ غلط، غلط، تخفیف نہیں ہوئی بلکہ صرف ایک عارضی سکون نے اس کے دماغ کو فعالیت شہوانیہ سے سکتے میں ڈال دیا اور ''امور معیشت کیا چیز ہیں اور حیات ساعیانہ کسے کہتے ہیں'' یہ اسے بتانا شروع کیا۔ اس کی خواہشیں زائل نہیں ہوئیں۔ صرف ذرائع مفقود تھے۔

حیات ماضی اس کے تخیل سے وابستہ تھی۔ ہاں، کبھی کبھی یہ بھی خیال دل میں جاگزیں ہو جاتا تھا کہ سئیات کس قدر آرام سوز اور طاقت فرسا ہیں۔ ان خیالات سے اس کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ مسائل مہمہ حیات پر غور کرنے سے اس کی حالت بحران تک پہنچ جاتی تھی اور اس زمانے میں بلاکسی کے پاس بھیجنے کے ارادے کے وہ عجیب خط لکھتا تھا، جن میں لذت اشتغال، محظوظیت خدمت، نشوۂ آرام سے بحث ہوا کرتی تھی۔

انسانی طبیعت کا مختلف زمانے میں مختلف حالتوں میں ہونا، کیا کیا تبدلات پیدا کرتا ہے آج جو غضب و تکدر اور اندیشوں میں ڈوبا ہوا ہے، وہی کل نشوہ رخندہ و بہجت سے ہم آغوش ہے، جو شخص ابھی ابھی حیات سفلیانہ سے متنفر ہے، تھوڑی دیر بعد سفالیت کے درجے سے بھی نیچے پڑا ہوتا ہے۔ ابھی جو اصلاح نفس سے بحث کر رہا ہے، کچھ تعجب نہیں جو کچھ عرصے کے بعد وہی تعر معاصی میں گرا ہوا ملے، یہ محقق ہے۔

جوان کا بھی یہی حال ہوا۔ اس کی الجھن رفع کرنے کے لیے اس کے چند دوست نما دشمنوں نے صلاح دی کہ شراب پیو۔ نوجوان اس کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ سرخوش لوگوں کے احوال رذیلانہ دیکھ کر اسے شراب سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب کس طرح پی سکتا ہے، یہ ہرگز نہ ہوگا۔۔۔

افسوس اس ارادے پر ثابت قدم نہ رہا اور ان دوستوں کے اصرار کو رد نہ کر سکا۔ ان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ سب لوگ سنجی قہوہ خانے کے سامنے والے مے خانے میں گئے۔ پہنچتے ہی اس کے دماغ میں ایک کریہہ بو داخل ہوئی۔ یہ مے خانہ نہ تھا بلکہ مزبلہ گاہ معلوم ہوتا تھا۔ چھت بغیر چمنی کے لیمپ کے دھوئیں سے بالکل کالی ہو گئی تھی، ہر کونے میں مکڑی کا ایک بڑا جالا بنا ہوا تھا۔ زمین ایک بالشت گہری کیچڑ میں دبی ہوئی تھی۔ میز کی جگہ پر ایک پرانا مستعمل مٹی کے تیل کا صندوق رکھا ہوا تھا جو تختہ کہ کوچ کا کام دے رہا تھا، اس پر ایک متعفن کریہہ المنظر ناٹ (جس نے نہ معلوم کس وقت سے پانی کا منہ نہ دیکھا تھا) پڑا تھا۔ شیشے، برتن، پیالے میل کی وجہ سے نظر نہ آتے تھے۔ تین چار عیاش ایک میز کے گرد احاطہ کئے ہوئے پی رہے تھے۔ یہ بھی اس زمرۂ بدمستی میں شامل ہو گئے اور جا کر بیٹھ گئے۔

جوان نے ایک مدید اور اسرار انگیز نظر سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک معنی وار نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور کانپ کر پوچھا:

یہاں کیا ہوگا؟

جواب ملا: ''عیش و طرب''

جوان نے ایک قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھوں میں ایک برق تہور چمکی۔ اس نے پوچھا:

''پھر؟''

جواب دیا گیا۔ ''پئیں گے''

''یہاں؟''

''ہاں''۔

کانپ اٹھا، محتشم، مکلف عشرت جگہوں میں جب ایک قطرہ منہ میں نہیں ڈالا تو اس مردار و نفرت انگیز مقام میں کیوں کر پی سکے گا۔ اس آب زہرناک کو جو گہری کائی میں دبے ہوئے پیپے سے نکل رہی تھی کیونکر اپنے معدے میں اتار سکتا تھا۔ غرض کہ جوان کی حالت ایسی ہوگئی کہ گویا وہ ہرگز نہ پیے گا لیکن ۔۔۔۔ لیکن بات دے چکا تھا، اب کیا ہو سکتا تھا؟ اپنی بات کی سچائی پر اس نے کبھی تکرار کی تھی؟ اب اس کے خلاف اس کے امکان سے خارج تھا۔ خیر، خیر نہ پیے گا۔ اس آب پر اصظرار کو منہ میں نہ ڈالے گا۔

خدمت گار نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے ان کے بیچ میں قدح اور شیشے رکھنے شروع کیے۔ اس بیت القوۃ، اس دارالخباثت میں پینے سے مزہ کیونکر آ سکتا تھا؟ جوان نے پھر سب کی طرف دیکھا، اتنے میں ایک تیز آواز نے کہا:

''پانی لاؤ''۔

یہاں پانی کہاں؟ یہاں پانی سے مراد لوازم نوشا نوش ہیں، جوان کسی طرح اپنے رفیقوں میں شریک نہ ہو سکتا تھا اور وہ ''آپ کی صحت، آپ کا شرف'' کہہ کہہ کر اصرار کر رہے تھے۔ مگر وہ پیالہ ہاتھ میں نہ لیتا تھا۔ چہرے پر تموجات عصبیہ، اور حسیات نفرت ظاہر ہوتے تھے، مگر افسوس سے نہ کہتا تھا۔

تردد و خلجان و پریشانی کے ساتھ ہاتھ میں پیالہ لیا گیا۔ ایک لرزش خفی تمام جسم میں دوڑ گئی، جیسے بڑی سردی معلوم ہو رہی ہو۔ اس طرح کہ اس کے دانت بجنے لگے۔ بڑھا ہوا ہاتھ بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ اصرار اور رجا نے اس دست متردد کو پھر بڑھایا، مگر منہ تک لے جانے کی حالت میں یکایک پھر ٹھہر گیا۔ اختلاجات وجدانیہ کی تاب نہ لا سکا اور کہا:

''نہ پی سکوں گا''۔ مگر ابھی پیالہ ہاتھ میں ہے۔

''کیا جاہیے کیا ہو؟'' دو معنی دار نظروں نے اسے گھور کے دیکھا اور پیالہ خالی کر دیا گیا۔ اس کے جسم میں ایک حرارت آئی اور اسے اپنے پر اختیار نہ رہا۔ دوسرے پیالے نے حرارت میں تخفیف کی، شیشہ خالی کیا گیا، اور اب اسے نشۂ بدمستی کا احساس ہوا۔

کیا تم یقین کرو گے؟ متاسف ہے، آیا پینے سے؟ شاید، اور شاید اس وجہ سے کہ اچھی جگہوں میں نہ پی اور پی تو یہاں۔

نشۂ خمار نے فریفتہ کر دیا۔ میدان پا کر پینا شروع کر دیا۔ یہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بات، پہلے ہی مرتبہ کے نہ پینے میں ہے۔۔۔ اس کے بعد کچھ نہیں ہوتا!

جوان اس وقت سے اپنی زندگی زہریلی کر رہا ہے۔

☆☆☆

وزیرِ عدالت

سدرشن

ایک دن شام کے وقت جب کہ آسمان پر بادل لہرا رہے تھے۔ ایک اجنبی ششو پال، برہمن کے دروازے پر آیا اور لجاجت آمیز لہجے میں بولا ''کیا مجھے رات کاٹنے کے لیے پناہ مل سکے گی؟'' ششو پال اپنے گاؤں میں سب سے غریب تھے۔ تاہم اجنبی کو دروازے پر دیکھ کر ان کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ انہوں نے کہا ''یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آیئے تشریف لایئے''۔

ششو پال کے لڑکے نے اجنبی کی خاطر مدارت کی۔ اجنبی اس پر لٹو ہو گیا۔ اس نے برہمن سے کہا ''آپ کا لڑکا بڑے کام کا ہے۔ اس کی خدمت سے میرا جی خوش ہو گیا''۔ ششو پال نے اس طرح سر اٹھایا۔ جیسے کسی نے سانپ کو چھیڑ دیا ہو۔ اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا ''تم ہمارے مہمان ہو۔ ورنہ برہمن ایسے الفاظ سننے کی تاب نہیں رکھتے''۔ اجنبی نے اپنی غلطی پر نادم ہو کر کہا ''شما کیجئے! میرا مطلب یہ نہ تھا۔ گر آج کل وہ برہمن کہاں ہیں۔ اب تو آنکھیں ان کے لیے ترستی ہیں''۔ ششو پال نے جواب دیا ''برہمن تو اب بھی ہیں۔ کمی صرف کشتریوں کی ہے''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا''۔

ششو پال نے ایک عالمانہ تقریر شروع کر دی۔ اجنبی حیران ہوا کہ ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں ایسا متبحر بھی موجود ہے۔

''مجھے خیال نہ تھا کہ گودڑ میں لال چھپا ہے۔ مہاراج اشوک کو معلوم ہو جائے تو وہ آپ کو بہت بڑا عہدہ دے''۔

ششو پال (مسکرا کر) آج کل بڑی بے انصافی ہو رہی ہے۔ جب دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے اجنبی (پینترا بدل کر) ''شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں''۔

ششو پال۔ ''رہنے بھی دو میں سب جانتا ہوں''۔

اجنبی۔ ''نقص نکالنا آسان ہے مگر کچھ کر کے دکھانا مشکل ہے''۔

ششو پال۔ ''اگر مجھے موقع ملے تو دکھا دوں انصاف کسے کہتے ہیں''۔

اجنبی۔ ''اگر میں اشوک ہوتا تو آپ کی خواہش پوری کر دیتا''۔

دوسرے دن مہاراجہ اشوک کے دربار میں ششو پال کی طلبی ہوئی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ ششو پال کے لیے یہ طلبی کا حکم پیام مرگ ہے سب کو یقین تھا کہ اب ششو پال زندہ نہ لوٹیں گے۔ شام ہو گئی تھی۔ جب ششو پال پاٹلی پتر پہنچے تو ان کو شاہی محل میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تک انہیں خیال تھا کہ شاید ان کے افلاس کی کہانی یہاں تک پہنچ گئی ہے، اس لیے مہاراج نے کچھ دینے کے لیے بلایا ہو گا۔ لیکن جب نوکر نے کہا مہاراج آ رہے ہیں تو ان کا کلیجہ دھڑ کنے لگا۔ اتنے میں مہاراجہ اشوک شاہانہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور مسکرا کر کہا۔ برہمن دیوتا غالباً آپ نے مجھے پہچان لیا ہو گا۔ ششو پال گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اجنبی مہمان راجہ اشوک تھا۔ اگر چہ مہاراجہ کو دیکھ کر وہ بہت ڈرے۔ مگر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

ششو پال۔ ''مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی مہاراج ہیں۔ ورنہ میں ایسی آزادی سے کبھی گفتگو نہ کرتا''۔

مہاراج۔ ''ہوں''۔

ششو پال۔ ''لیکن میری بات میں رتی بھر مبالغہ نہ تھا''۔

مہاراج۔ ''لیکن آپ کی غلطی تھی''۔
ششو پال۔ ''نہیں میں ثبوت دے سکتا ہوں''۔
مہاراجہ۔ ''میں آپ کی آزمائش کرتا ہوں۔ دیکھوں تم کیسے انصاف کا ڈنکا بجاتے ہو۔ کل صبح سے تم وزیر عدالت ہو۔ سارے شہر پر تمہارا اختیار ہوگا۔ اور تم امن کے ذمہ دار سمجھے جاؤ گے''۔

ایک ماہ گزر گیا۔ وزیر عدالت کے انتظام اور انصاف کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے۔ ایک امیر نے ایک عالی شان مکان پر دستک دی۔ دریچہ سے ایک عورت نے سر نکال کر پوچھا۔
''کون ہے؟''
''میں ہوں۔ دروازہ کھول دو''۔
''مگر وہ یہاں نہیں ہے''۔
''پرواہ نہیں تم دروازہ کھول دو''۔
''دروازہ نہیں کھل سکتا۔ شہر پر ششو پال کی حکومت ہے''۔
''میں دروازہ توڑتا ہوں''۔

امیر نے تلوار نکال کر دروازے پر حملہ کیا، ایک پہرہ دار نے آکر اسے روکا، دونوں میں مقابلہ ہوا اور پہرہ دار قتل ہوگیا۔ اب تو امیر کا خون خشک ہوگیا۔ اس نے پہرے دار کی لاش کو ایک طرف پھینکا اور بھاگ گیا۔

ششو پال کے تقرر کے بعد یہ پہلا وقوعہ تھا۔ اس نے سرگرمی سے تحقیقات کی، مگر قاتل کا پتہ نہ لگا۔ آخر مہاراجہ نے اسے بلا کر کہا تم کو تین دن کی مہلت ہے۔ اگر اس عرصہ میں قاتل نہ پکڑا گیا تو اس کی جگہ تم کو پھانسی دی جائے گی۔ رات کا وقت تھا۔ مگر ششو پال کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ شہر کے اس گنجان حصہ میں گھوم رہا تھا جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ یکا یک ایک مکان کے دریچے سے ایک عورت نے جھانک کر باہر دیکھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عورت نے آہستہ سے پوچھا ''تم کون ہو؟ پہرے دار؟'' ششو پال نے جواب دیا ''نہیں میں وزیر عدالت ہوں''۔ ''ذرا ٹھہرو'' کہہ کر عورت کھڑکی سے غائب ہوگئی۔ اور روشنی لے کر دروازے سے نمودار ہوئی۔ اور وزیر عدالت کو اپنے کمرے میں لے جا کر ایک چوکی پر بٹھایا اور کہا ''یہ آخری رات ہے؟'' ششو پال نے جواب دیا ''ہاں آخری رات''۔ عورت تلملا کر کھڑی ہوگئی اور بولی ''میں سب کچھ جانتی ہوں۔ قاتل جس کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں اس کا نام نہیں لے سکتی۔ ایک دن جو وہ آیا تو وہ گھر میں نہ تھی۔ قاتل نے میری بات کا یقین نہ کیا۔ اور دروازہ توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ پہرے دار نے روکا تو اس کے ہاتھ سے مارا گیا''۔ وزیر عدالت نے قاتل کا نام پوچھا تو اس عورت نے سہی ہوئی کبوتری کی طرح چاروں طرف دیکھا اور اس کے کان میں کچھ کہہ کر جلدی جلدی اسے رخصت کر دیا۔

مہاراجہ اشوک نے کڑک کر ششو پال سے کہا ''میعاد گزر گئی۔ کہو مجرم کا پتہ لگا؟'' اس نے کہا کہ ''ہاں میں نے معلوم کرلیا ہے کہ مجرم کون ہے۔ لیکن شاستروں میں راجہ کی ذات مقدس تسلیم کی گئی ہے۔ اسے ایشور ہی سزا دے سکتا ہے۔ وزیر عدالت کو اختیار نہیں کہ اس کو سزا دے۔ اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ قاتل کے بت کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور مہاراج کو تنبیہ کر دی جائے''۔ یہ کہا اور ششو پال نے عدالت کی مہر اشوک کے سامنے رکھ دی اور اپنے گاؤں واپس جانے کی اجازت مانگی لیکن اشوک نے اس کی طرف احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''آپ کی جرات تاریخ ہند میں یادگار رہے گی۔ یہ بار آپ ہی اٹھا سکتے ہیں''۔

☆☆☆

نابینا بیوی

سلطان حیدر جوش

میرے گھر کے برابر دیوار بیچ، ایک قاضی صاحب کا مکان تھا۔ بیچارے ایک زمانے میں بڑے متمول آدمی تھے مگر ریاست کی زندگی خصوصاً ملازمت انقلاب کی تصویر ہوا کرتی ہے۔ ذرا راجہ صاحب کے کان بھرے اور بے قصور پر آفت برپا ہوگئی۔ اسی طرح ان شریف قاضی صاحب کے تمول نے افلاس کا پہلو بدلا، اور فقط پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کی قلیل رقم بہ ہزار دقت بچ بچا کر رہ گئی۔ اسی پر صبر شکر کے ساتھ قانع تھے اور اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتے تھے۔ عربی اور فارسی کی قابلیت کے لحاظ سے دور دور تک ان کا شہرہ تھا، اور باہر سے اکثر اشخاص مشکل مسئلے حل کرانے آتے تھے۔

قاضی صاحب کی صاحب زادی کی شادی کی تقریب جب ہوئی تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا مگر چند دو چند ضروریات کی وجہ سے میں شامل نہ ہوسکا۔ مگر ہمسایہ تھا، واقعات کی خبر برابر مل گئی۔ معلوم ہوا کہ دولہا کو پہلے سے اس لڑکی کی نسبت جس سے اب اس کی قسمت وابستہ ہونے والی تھی کچھ بھی معلوم نہ تھا، اور عین نکاح کے وقت نہ معلوم کس بات کے علم پر اس نئی روشنی کے شیدا نے شادی سے قطعی انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اور آخر کار برات واپس آ گئی۔ اس کے بعد خود دولہا سے میری راہ و رسم ہوگئی اور اس کی وجہ اس نے غریب لڑکی کی بدچلنی بیان کی۔ یہ سن کر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے خراب ہونے لگے، اور میں نے ان سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ راستہ میں بھی ان سے کترا کر نکل جاتا۔ وہ دراصل مجھ سے محبت کرتے اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچے دوست تھے۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے، اب گرمی کا موسم آ پہنچا۔ میری والدہ ضعیفہ تو صحن میں سویا کرتی تھیں۔ مگر میں اکیلا چھت پر لیٹا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خوب یاد ہے جمعہ کا دن تھا۔ چلچلاتی گرمی تھی۔ پہر بھر دن سے ہوا بند تھی دونوں وقت ملتے ہی مارا مار کر کے میں نے کھانا کھایا اور سیدھا کوٹھے پر جا پڑا۔ چاروں طرف اجلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور تارے اکا دکا نظر آتے تھے۔ دو تین گھنٹے یوں ہی کروٹیں بدلتے اور ہاتھ پاؤں مارتے کٹے۔ خدا خدا کر کے ۱۱ بجے ہوا ذرا سرسرائی اور کچھ جان میں جان آئی۔ نیند کی غنودگی میں یکایک مجھے یہ معلوم ہوا کہ کوئی میرے سرہانے بول رہا ہے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر آدمی تو آدمی پرچھائیں تک دکھائی نہ دی۔ اتنے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک دردبھری آواز قاضی صاحب کی چھت سے آئی۔ ”خدا جانے کیونکر بدنامی ہوتی ہے۔ مگر خیر رب العالمین خوب جانتا ہے، مجھے کسی سے غرض ہی کیا! پاک پروردگار!! میں نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو۔ مجھ دکھیاری اندھی کو کون قبول کرے گا؟ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ میں پاک ہوں اور باعصمت ہوں۔ آپ سے میں یہ چاہتی ہوں کہ میری بدنامی نہ ہو، اور برا کہنے والوں کا منہ تو بند کر دے“۔ ان درد بھرے جملوں کے بعد پھر کوئی آواز قطعی نہ آئی۔ یہ الفاظ میرے چوٹ کھائے ہوئے دل کے ساتھ نمک کا کام کر رہے تھے، اور میری ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ صبح ہوتے ہی میں جناب والد صاحب کی اجازت پر ایک دوست کے ذریعے سے پیغام بھیجا اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو دینا چاہا۔ مگر ان سچے اور پاک باز انسان نے اس کے جواب میں آبدیدہ ہو کر کہا کہ ”ان سے کہہ دینا، ابھی صاحب زادہ ہو، ناتجربہ کار ہو۔ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو۔ وہ بدنصیب لڑکی اندھی ہے۔ میں تمہارے والد کا نیازمند ہوں۔ قیامت کے دن انہیں کیا منہ دکھاؤں گا؟“

بمشکل تمام میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کرلیا، اوراس مصیبت زدہ نابینالڑکی سے چپ چپاتے شادی کرلی۔اب وہ میرے گھر میں آئی اور میری بیوی بن کر رہنے لگی۔اس کی خصائل کی نسبت میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صبر، قناعت، سچائی، ہمدردی، محبت اور پاکبازی کی مجسم تصویر تھی۔اکثراوقات پچھلی رات کبھی میری آنکھ کل جاتی۔تو میں ایک عجیب موثر نظارہ دیکھتا وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا میں مشغول ہوتی اور ہزار ہزار طرح سے پہروں میری ترقی، آرام اور آسائش کے لیے دعائیں مانگتی حتی الامکان میں اس کی خوشی کا خیال از حد رکھتا۔جب تک میری والدہ ضعیفہ زندہ تھیں۔میری نابینا بیوی کو میرے حاضر و غائب میں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچی۔مگر انہوں نے بھی ایک دن اس دار فانی کوالوداع کہا اوران کے صدمے نے میری ہمت پست کردی۔اب گھر میں صرف ایک خادمہ تھی اور ڈیوڑھی پر ایک نوکر۔والدہ صاحبہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی خادمہ نے اسے تکلیف پہنچانی شروع کی۔مگر میں سچ عرض کرتا ہوں، کبھی بھول کر بھی اس نے خادمہ کی شکایت مجھ سے نہیں کی، اور مجھے قطعی اس بات کی اطلاع نہیں ہوئی۔

ایک روز اتفاقیہ خلاف معمول دوپہر کو گھر میں واپس آیا۔جبکہ میری بیوی کھانا کھارہی تھی اور خادمہ دستر خوان کے پاس بیٹھی تھی۔سالن وغیرہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا، اوراس ماما کو برا بھلا کہنے لگا کیونکہ پورے خرچ پر بھی کھانا بہت خراب تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے اچھا کھلاتی تھی اور میری غریب نابینا بیوی کے سامنے روکھی سوکھی روٹیاں اور بچا کھچا سالن رکھ دیتی تھی اور باقی سب اچھا اچھا تیر کر جاتی تھی۔اسی دن سے میں صبح کو جب تک میری قابل رحم بیوی ضروریات اور نماز سے فارغ نہ ہو لیتی تھی، باہر نہ جاتا، اور دوپہر سے پہلے واپس آ کر کھانا اسی کے ساتھ کھاتا۔پھر شام سے ہی گھر میں آپڑتا اور تمام رات کہیں نہ نکلتا۔اس کی سچی محبت اور راست بازی نے اس قدر میرے دل میں گھر کرلیا تھا کہ اکثر ماما کے نہ ہونے پر میں خود کام کرتا۔اس کے لیے وضو وغیرہ کے لیے پانی لانے میں مجھے عار نہ تھا۔اس طرح گھر میں گھسے رہنے کی وجہ دوست احباب مجھ پر فقرے کسنے لگےاور میرے ہم عمر میرا مذاق اڑانے لگے۔مگر میں نے پروانہ کی اور میرے معمول میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔

اسی اثنا میں ان نئی روشنی کے نوجوان کی جس نے میری نابینا بیوی پر جھوٹا الزام لگایا تھا بڑی دھوم دھام سے شادی ایک متمول لڑکی سے ہوگئی۔مشکل سے ایک برس گزرا ہوگا کہ شکر رنجی ہوئی اور بڑھتے بڑھتے خانہ جنگیوں کی نوبت آئی۔تمام شہر میں افواہ پھیل گئی کہ ان کی بیوی آوارہ ہے۔انہوں نے اس کو نکال دیا۔اس نے میکے پہنچتے ہی نان نفقہ اور مہر کی نالش ٹھونک دی، اور نئی روشنی کے نوجوان کو چھٹی کا کھایا ہوا یاد آگیا۔غرض خوب عرضی پرچہ ہوتا رہا۔ان پر بیوی کی ڈگری ہوگئی۔اب انہوں نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے منت سماجت کی اور صلح ہوگئی۔ان کی بیوی گھر میں آگئی۔مگر تھوڑے عرصے کے بعد پھر وہی نکا فضیحتی شروع ہوگئی۔بہر حال ڈگری کے خوف سے وہ غصہ دباتے اور بیوی کی جوتیاں کھاتے رہتے۔

اس دارناپائیدار کے قانون کے موافق مجھ بدنصیب پر ایک اور مصیبت آئی۔میری نابینا بیوی کو بخار آنے لگا میں نے ڈاکٹر، حکیم، ملا، سیانے، دوا، ٹھنڈائی، گنڈا غرض کچھ نہ چھوڑا۔مگر بخار میں کمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔میں نے بالکل ہر جگہ کا آنا جانا چھوڑ دیا۔وہ برابر چھ مہینے تک بیمار رہی۔میں نے ہر قسم کی خدمت کی۔یہاں تک کہ چوکی پر لے جانا۔دوائی پلانا وغیرہ میرا روزانہ معمول تھا۔کئی بار میرے اگالدان اٹھاتے ہی ابکائی آئی، اور جونہی میں نے اگالدان سامنے کیا اس نے ڈالنا شروع کیا جس سے میرے ہاتھ بھی بھر گئے۔اگر چہ میں شہر میں نازک مزاج مشہور ہوں۔لیکن بخدا کبھی مجھے ایسی کراہت نہیں آئی کہ محبت پر غالب آتی۔

ایک دن اس نے متواتر بارہ گھنٹے آنکھ نہ کھولی اور مجھے از حد تشویش ہوئی۔رات کے تقریباً نو بجے جبکہ اس کا سر میرے زانو پر تھا۔اسے ہوش آیا۔اس نے چھوٹتے ہی کہا۔"تم اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے اور مجھے شرمندہ کئے جاتے ہو؟ میں اس

شرمندگی سے مر جاؤں تو اچھا ہے۔ تمہیں ماما پر اعتبار نہ ہو تو اپنی شادی کسی سے کرلو۔ وہ گھر کا انتظام خود کرے گی، اور تمہیں اس قدر دردسری نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے سوکن کا خیال ہوگا۔ تمہارا یہی ایک احسان کہ تم نے میرا سر تاج بننا منظور کیا، ایسا ہے جس کا میں کسی طرح بدلہ نہیں دے سکتی۔ تم نے میرے ساتھ شادی کرکے واقعی اپنے اوپر بڑا ظلم کیا۔

کچھ نہ پوچھئے کہ ان الفاظ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میرے خون میں چکر آیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ قاضی صاحب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اس لیے اس نے اپنی والدہ کو بلایا اور درد بھرے الفاظ کے ساتھ مہر معاف کردیا، اور میں روتے روتے بے ہوش ہوگیا۔ اسی دن سے ہچکی لگ گئی۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے ''اگر تم کو تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہوگا''۔

☆☆☆

طمانچہ

علی عباس حسینی

ڈاکٹر قیوم کی اور میری ملاقات اس زمانے کی تھی جب ان کا الہ آباد میں طوطی بولتا تھا۔ ہر شخص ان کی عیسیٰ نفسی اور مسیحائی کا قائل تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام اور ان کے کارنامے تھے۔ لوگ کہتے مرتے ہوئے کو بچانا ہو تو قیوم کو بلالو، وہ قم باذن اللہ کہہ کر اسے اٹھا کر کھڑا کر دیں گے۔ خود وہ بڑے خوش عقیدہ مسلمان تھے، قرآن کے حافظ، صوم وصلوٰۃ کے پابند، خیرات وزکواۃ پر سختی سے عامل، ادھر حال ہی میں حج بھی کر آئے تھے اور جماعت میں قیادت اور سیاست میں لیڈری بھی کرنے لگے تھے۔۔۔۔

میں اس زمانے میں وہاں محکمہ مال میں تھا اور ڈاکٹر صاحب سے میرا میل ملاپ اپنے بچہ نسیم کے علاج کے سلسلہ میں بڑھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اسے دیکھتے، تقریباً ایک ماہ برابر آئے اور ہم میں بجائے سوداگر اور خریدار کے دو دوستوں کی طرح کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ عورتوں کا بھی آنا جانا ہو گیا تھا اور ہم نے ایک دوسرے کے طور طریقے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے صرف ایک لڑکی بارہ برس کی سعیدہ نامی تھی، وہ بڑی حسین وذہین تھی۔ وہ کسی انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے برابر موٹر پر آتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی الہ آباد کی مستورات کی قائد اعظم تھیں۔ انہیں نے ان میں سیاسی بیداری پیدا کی تھی اور برابر اسی کوشش میں لگی رہتی تھیں کہ وہ عورتوں کو بالکل مردوں کے حقوق دلوا دیں۔ پرانے ڈھنگ کے لوگ ڈاکٹر صاحب سے اگر کچھ خفا تھے تو صرف اسی وجہ سے۔ وہ کہتے ''انہوں نے بے مہار چھوڑ دیا ہے''۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ''میں نے کام بانٹ لیا ہے میں مریض کی دیکھ بھال اور قوم کی خدمت کرتا ہوں، وہ گھر کا انتظام کرتی ہیں اور عورتوں کے حقوق کیلئے لڑتی ہیں۔ میں ان کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر لیتا، وہ میرے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتیں''۔

میں چونکہ ان کی نجی زندگی سے واقف تھا۔ اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا آپس میں بڑا میل تھا۔ اور ان کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار تھی۔ کوٹھی کا انتظام بہت اجلا تھا۔ روشیں لان، پھول سب قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ فرنیچر اعلیٰ قسم کا تھا اور مختلف کمروں میں جو چیزیں رکھی تھیں ان سب میں فن آرائشگی سے واقفیت پائی جاتی تھی۔ بیگم صاحبہ نماز سے فراغت پاتے ہی ہر چیز کی صفائی اپنی نگرانی میں کراتی تھیں اور نوکروں پر اس کی بڑی تاکید رکھتی تھیں کہ گھر میں کہیں ذرا سا بھی خس وخاشاک نہ دکھائی دے۔ میں ان کے اجلے کارخانے سے اس قدر متاثر تھا کہ اپنے گھر والوں کو ہمیشہ ان کے ضبط پر ابھارا کرتا تھا۔ انہیں کی تاسی میں میرے ہاں کی مستورات اور بچے بہت کچھ سدھر گئے تھے اور میرے ہاں بھی صفائی کا بہت خیال رکھا جانے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میرا تبادلہ میرٹھ ہو گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ عجب نہیں کہ اگر میں کہیں قریب بھیجا گیا ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کے ہاں آنا جانا برابر رہتا، لیکن میرٹھ کے تبادلے نے اور دونوں کے پیشوں کی مشغولیتوں نے دو چار برس میں ہمیں ایک دوسرے سے بے خبر بنا دیا۔ کوئی دس برس کے بعد جو الہ آباد آنا ہوا تو میں نے نہ تو ڈاکٹر قیوم کا نام لوگوں کی زبان سے سنا اور نہ ان کا کوئی خاص ذکر، دو ایک ملنے والوں سے پوچھا تو وہ ''ہاں اچھے ہیں'' کہہ کر بات ٹال گئے۔ مجھے ایک کاوش سی ہوئی اور میں ایک دن شام کو ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔

وہاں دیکھا تو لوہے کا خوبصورت پھاٹک، اس طرح زنگ آلود اور بے مرمت کھلا ہوا ہے جیسے کوئی اس مکان کا پرسان حال ہی نہیں ہے۔ اندر جو داخل ہوا نہ وہ روشیں ہیں، نہ گملے، نہ پھول، نہ لان، صفائی کا نام نہیں، ہر طرف سوکھی پتیاں پڑی کھڑکھڑا رہی ہیں۔ برآمدے میں کوئی نوکر بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نے گھبرا کر آواز دی ''ارے بھئی ڈاکٹر صاحب ہیں''۔

اندر کمرے سے کسی نے کہا ''کون صاحب ہیں اندر آیئے''۔
اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک گول میز پر ایک لالٹین چل رہی ہے، اور اسی پر دو گلاس ایک لوٹا اور ایک بوتل رکھی ہے۔ ایک صاحب خاصے سن رسیدہ نیکر اور قمیض پہنے کرسی پر بیٹھے ہیں اور ان کی بغل میں ایک اور ٹوٹی کرسی رکھی ہے۔ میں بوتل اور گلاس دیکھ کر ٹھٹکا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا ''کیا ڈاکٹر قیوم صاحب یہاں نہیں رہتے؟''
وہ بولے ''میں ہی قیوم ہوں، کیا ارشاد ہے؟''
میں اسی طرح گھبرایا ہوا بڑھا۔ انہوں نے قریب سے دیکھ کر مجھے پہچان لیا۔ وہ مسکرا کر بولے ''اخاہ نذیر صاحب ہیں۔ آیئے بھائی، آپ کیسے ادھر آ نکلے؟''
میں اسی طرح گھبرایا ہوا بڑھا۔ انہوں نے خاموشی سے مصافحہ کیا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس طرح شکستہ تھی کہ میں گرتے گرتے بچا۔ وہ جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر بولے ''آپ اس پر بیٹھیے یہ نسبتاً اچھی ہے''۔ میں نے کہا ''نہیں اب تو میں اس کی کل پا گیا، سنبھل کر بیٹھوں گا''۔
انہوں نے باصرار اپنی ہی کرسی پر بٹھایا۔ پھر دوسری پر خود بیٹھ کر وہ بولے ''کیوں بھئی نذیر کیا میں اتنا بدل گیا ہوں کہ تم بھی نہ پہچان سکے؟''
میں نے کہا ''بالکل کایا پلٹ ہے، نہ وہ بنگلہ، نہ وہ صفائی، نہ وہ فرنیچر اور نہ وہ آپ''۔
انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''ہاں زندگی اس کا نام ہے''۔
میرے پیٹ میں جیسے چوہے دوڑنے لگے۔ میں نے پھر بھی مشرقی اخلاق کا خیال کر کے یہ پوچھنا ضروری سمجھا کہ ''بیگم صاحبہ کیسی ہیں، اور آپ کی صاحبزادی سعیدہ؟''
انہوں نے اس سوال پر بوتل اٹھالی اور بڑے اطمینان اور بے باکی سے گلاس میں بہت سی شراب انڈیلی پھر لوٹے سے اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر وہ پورا گلاس پی گئے۔ انہوں نے نیکر کی جیب سے سگریٹ اور دیا سلائی کی ڈبیاں نکالیں۔ ایک سگریٹ مجھے دی، ایک خود لی، پھر انہیں جلا کر وہ بولے ''بیگم صاحبہ اور سعیدہ دونوں بہشت سدھاریں''۔
مجھے بے حد رنج ہوا اور میں نے تکلیف دہ استعجاب سے پوچھا ''ہائے، یہ کب؟''
وہ مسکرائے ''جی میری مراد وہ بہشت نہیں ہے جس کا ذکر مذہبی کتابوں میں ہے''۔
میں اور بھی گھبرا گیا۔ میری کچھ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ میں انہیں مدہوش سمجھوں یا پاگل۔ وہ میری پریشانی کو سمجھ کر پھر مسکرائے اور بولے ''جی میں مدہوش بھی ہوں اور پاگل بھی لیکن جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ حقیقت ہے۔ بیگم صاحبہ اور ان کی صاحبزادی اپنی بنائی ہوئی بہشت میں ہیں اور میں خود ساختہ جہنم میں''۔
میں نے کہا ''خدا کے لیے معمے نہ بجھوایئے۔ مجھے بتایئے کہ معاملہ کیا ہے؟''
انہوں نے کہا ''ارے بھئی کچھ بھی نہیں۔ بیگم اور ان کی صاحبزادی اب میرے ساتھ نہیں رہتیں ہیں، اب وہ بنگلور میں ہیں اور میں یہاں''۔
میں نے پوچھا ''ارے یہ کب سے اور کیوں؟''
وہ اب کے پھر مسکرائے اور میں نے محسوس کیا کہ ان کے بال ہی سفید نہ ہوگئے تھے بلکہ ان کے چہرے پر سیکڑوں جھریاں پڑ گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چہرے بھر پر دانے ہی دانے نکل آئے تھے جنہیں نشتر لگا کر مندمل تو کرا دیا گیا تھا مگر ان

کے نشانات نہ مٹائے جاسکے تھے۔

وہ بوتل اٹھا کر بولے "کیا کیجئے گا سن کے، بڑی لمبی داستان ہے۔ آیئے شغل کریں"۔

میں نے کہا "مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ لیکن خدارا یہ ضرور بتایئے کہ آخر یہ بھرا گھر کیسے اجڑا"

انہوں نے پھر گلاس بھر کر چڑھا لی اور تر ہونٹ چاٹ کر کہا، "اچھا تو جب آپ مصر ہی ہیں تو سنئے۔ آپ کے جانے کے کچھ دنوں بعد تک زندگی ویسی گزرتی جیسی گزر رہی تھی۔ بس فرق اتنا البتہ ہوا کہ میں اپنے کاموں میں اور زیادہ منہمک رہنے لگا۔ سعیدہ کا سن اور اس کی تعلیم بڑھتی گئی اور بیگم گھر اور باہر کے معاملات پر حاوی تر ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ سعیدہ کا اٹھارہواں سال آیا اور اس نے انٹر میجیٹ پاس کرلیا۔

جس دن میں نے اس کا نتیجہ اخبار میں دیکھا اسی دن میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے اب اس کی شادی کر دینی چاہیے۔ ماشاء اللہ اٹھارہ برس کا سن تھا، بچپنے اور بھولے پن کی باتیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی تھیں، گھر انگریزی تعلیم، پردہ تو خیر ہمارے گھر میں رائج تھا ہی نہیں۔ میری بیوی ماشاء اللہ اس گروہ کی قائداعظم تھیں جس نے اس پرانی ریت کے تار پور بکھیر دیے تھے۔ میں ہمیشہ سے غیر جانبدار رہا۔ میرا ذاتی رجحان تو وہی تھا جو مسلمانوں کے شریف گھرانوں کا ہمیشہ رہا ہے۔ مگر میں بحث کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ سے سعیدہ کی ماں کی خواہش و خوشی پر کوئی پابندی عائد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سچ پوچھئے تو مجھ کو اپنے مشاغل سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ میں ان معاشرتی مسائل میں دلچسپی لے سکتا۔ سعیدہ جب چار سال کی تھی تو میں نے اس کی تعلیم کے لیے ایک مولوی مقرر کر دیا تھا۔ وہ بلا کی ذہین تھی۔ چند ہی سال میں اردو کی چھوٹی کتابیں اچھی طرح پڑھنے اور سمجھنے لگی تھی۔ مولوی صاحب نے اسے دو تین ابتدائی مذہبی کتابیں بھی پڑھا دی تھیں اور نماز بھی سکھا دی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ وہ ذرا اور بڑھے تو فارسی عربی بھی شروع کرادوں اور انگریزی کی بسم اللہ کرادوں، مگر اس کی مادر گرامی نے اپنی جگہ پر کچھ طے کیا اور جلدی سے کنونٹ میں اسے داخل کرا آئیں۔ اس نے وہاں پڑھنا شروع کیا اور چند ہی سال میں اپنی ماں سے زیادہ اچھی انگریزی بولنے لگی۔ جونیئر اور سینئر کیمرج میں اول درجے میں پاس ہوئی۔ اب انٹر میجیٹ میں بھی اس نے وہی درجہ حاصل کیا۔ اس کی وجہ سے مزاج میں ذرا نخوت آ گئی تھی۔ ماں کو تو اب کوئی چیز ہی نہ سمجھتی تھی۔ وہ اس کے لیے اس سے کمتر درجے کی سہیلی ہو کر رہ گئی تھی۔ میرا اب تک لحاظ و خیال تھا وہ بھی اس لیے کہ میں پھر بھی اس سے زیادہ پڑھا لکھا تھا اور اپنے کو لیے دیئے رہتا تھا۔ اسی عدم دخل در معقولات نے اب تک میرا وقار قائم رکھا تھا۔ بیگم کی یہ حالت تھی کہ اب سن زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ان میں قدامت پسندی نسبتاً زیادہ پیدا ہوگئی تھی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر خوردہ گریاں کرتی تھیں۔ یہ بھلا سعیدہ کو کہاں پسند، وہاں تو یہ گھمنڈ تھا کہ میں ان سے زیادہ پڑھی لکھی سمجھدار ہوں۔ یہ بھلا بیسویں صدی کی باتیں کیا جانیں۔ ان کے خیالات دقیانوسی اور ان کی باتیں صدیوں پرانی۔ ماں اور بیٹی کے مراتب کا لحاظ پچھلی صدی میں کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ بچوں کو یہ بات نہ معلوم تھی کہ وہ ماں باپ کے حظ نفس کا نتیجہ ہیں۔ پوسنے پالنے اور تربیت میں جو مصائب برداشت کئے گئے اور کئے جاتے ہیں اس کے لیے فطرتاً والدین مجبور ہیں۔ بچوں پر کوئی احسان نہیں۔ حیوانات بھی ایک مدت تک اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں۔ وہی حالت انسان کی بھی ہے۔ اصل میں یہ مصیبتیں جو اٹھائی جاتی ہیں وہ بھی جذبہ نفس پرستی و خودی پر مبنی ہیں۔ سارے مصائب اس لیے جھیلے جاتے ہیں کہ ایک چیز ہماری ہے، ہماری لڑکی، ہمارا لڑکا، وہ دوسرے بچوں سے اچھا کھائیں اور پہنیں، وہ بڑے ہو کر ہمیں فائدہ پہنچائیں۔ سعیدہ کہتی 'امی میں نے تو آپ سے نہیں کہا تھا کہ مجھے پیدا کریں۔ آپ مجھ سے بدلے کی کیوں توقع کیجئے۔ احسان بدلے کی نیت سے نہیں کیا جاتا اور اگر معاوضہ لینے کی نیت تھی تو پہلے ہی سے کوئی معاہدہ کرلیا ہوتا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ کی بے عقلی کی باتیں مان لوں اور اپنی

ہجولیوں میں نکوبنوں''، بیگم اپنے کو کوستی کاٹتی اٹھ کے میرے پاس آتی۔اور میرے کاموں کا حرج کر کے ہزاروں شکائیتں کرتی تھیں۔ مجھے مجبوراً اپنا کام بند کر دینا پڑتا تھا۔تھوڑا بہت انہیں سمجھا بجھا کے جب دھیرا کرتا اور صاحبزادی کو بلواتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کالج چل دی یا کسی ہجولی سے ملنے گئی ہیں۔میں مجبوراً اپنے کام میں لگ جاتا اور سارا قضیہ بھول جاتا تھا۔لیکن دماغ کے کسی کونے میں یہ خیال برابر کھٹکتا رہا کہ اب لڑکی سیانی ہوگئی ہے،اسی ماں کے روکے نہیں رکتی،ضرورت ہے اس کے پاؤں میں شادی کی بیڑیاں ڈال دی جائیں۔میں نے اسی لیے دو تین دن کے بعد ایک روز تنہائی میں بیگم سے سعیدہ کی شادی کا ذکر چھیڑا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی اس امر پر غور کر چکی تھیں۔اس لیے کہ میرے منہ سے شادی کا لفظ سنتے ہی بولیں''خیر آپ کو خیال تو آیا، میں تو سمجھی تھی کہ مریضوں کی دیکھ بھال سے آپ کو اتنی بھی مہلت نہ ملے گی کہ آپ بیٹی کے بیاہنے کے متعلق سوچ سکیں گے''۔مجھ کو بیگم کے ان طعنوں سے رنج ہوا۔اس لیے نہیں کہ مجھے واقعی ان باتوں سے دلچسپی تھی۔لیکن محض اس لیے کہ میں فرض شناس ضرور تھا۔میں اپنے فرائض سے اچھی طرح آگاہ تھا۔میں جانتا تھا کہ باپ کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اولاد کے تعلیم یافتہ ہوجانے کے بعد ان کے گھر بسانے کی فکر کرے۔مگر سعیدہ کے معاملے میں میں نے غیر جانبداری برتنے کی وجہ سے سکوت کیا تھا۔ جس طرح کی انگریزی تعلیم اسے دلائی گئی تھی وہ مجھے پسند نہ تھی مگر وہ بیگم کی لاڈلی بیٹی تھی اور انہیں کی خاص ملکیت۔میں نے اسی لیے شروع ہی سے دخل اندازی نہیں کی تھی۔اب بھی محض اس خوف سے بولا تھا کہ کہیں صاحبزادی کی آزادی اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ خاندان کی شرافت اور باپ دادا کی عزت میں دھبہ لگ جائے۔بہر نوع میں نے بیگم کے طنز کا جواب نہیں دیا۔بلکہ اپنے مرنجاں مرنج اصول پر عمل کر کے ان سے کہا''ہاں اس سے قبل بھی خیال آیا مگر اس وقت وہ پڑھ رہی تھی۔پھر کمسن بھی تھی۔اب بحمدہ دونوں باتیں نہیں ہیں''۔

وہ بولیں''جی ہیں کیوں نہیں،صاحبزادی فرماتی ہیں میں ابھی ایم۔اے تک پڑھوں گی''۔

مجھے علم دوست ہونے کی حیثیت سے یہ بات اچھی معلوم ہوئی مگر دل میں جو وسوسہ راسخ ہو چکا تھا اس نے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ''اچھا تو وہ بیاہی جانے کے بعد بھی بی۔اے،ایم اے کر سکتی ہیں،کون مانع ہے؟''

بیگم نے کہا''شادی بیاہ کے بعد پھر کسی نے پڑھا ہے کہ وہی پڑھ لے گی؟''

میں نے کہا''ایسا تو نہیں ہے۔پڑھنے والیاں پڑھ ہی لیتی ہیں۔کئی ایک ہندو خواتین کی بابت مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ان کے کئی کئی بچے ہیں،مگر اب تک تعلیم حاصل کررہی ہیں''۔

بیگم نے کہا''ہاں تو پھر وہ گھر کا انتظام بھی خوب ہی کرتی ہوں گی، بچہ پڑا بلک رہا ہے گھر میں ماماں دائیاں راج رچ رہی ہیں اور بی بی ہیں کہ فلسفہ یا تاریخ کا یونیورسٹی میں سبق لے رہی ہیں۔یہ بھی بھلا کوئی گھریلو زندگی ہوئی،نہ میاں سے مطلب،نہ بچوں سے مطلب،اور نہ گھر کے انتظام سے بس موٹی کتابیں ہیں،یونیورسٹی کے پروفیسر اور طلباء ہیں اور بیوی صاحبہ ہیں''۔

میں نے دیکھا کہ بیگم زنانی فطرت کے مطابق اپنی بات کی تائید میں انہیں باتوں کو آج مصائب کی شکل میں پیش کر رہی ہیں جو آج سے کچھ ہی دن پہلے وہ محاسن میں شمار کیا کرتی تھیں۔میں نے کہا''شاید تم یہ بھول گئیں کہ بعینہ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو سوسائٹی میں گھومتی پھرتی ہیں۔انہیں بھی نہ بچوں سے مطلب ہے،نہ میاں سے اور نہ خانہ داری کے بکھیڑوں سے، پھر ایسی حالت میں جو گھر کا انتظام ہوتا ہے وہی پڑھنے والی عورتیں بھی کہہ سکتی ہیں''۔وہ کچھ اور کہنے کو تھیں کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک کے کہا''خیر ان باتوں کو جانے دو۔سوال اس وقت سعیدہ کی شادی کا ہے۔تم نے کوئی اس کے لیے سوچا ہے؟''

وہ بولیں''اے لو، میں اتنی دیر سے یہی تو کہنا چاہتی ہوں مگر تمہاری بحث سے چھٹی ملے جب تو میں منہ کھول سکوں۔میں

نے تو جہاں آدھی بات کہی اور تم نے فوراً منطق فلسفہ چھانٹنا شروع کر دیا، بات کا بتنگڑ بنا دیا اور اصل بات بھول کے بیٹھ رہے۔۔۔‘‘

میں نے کہا ’’اچھا بھئی یہ بری عادت میری ہی سہی مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے آخر سوچا کیا ہے؟‘‘

انہوں نے میرے الزامات کی فہرست یوں قطع کر دیئے جانے پر آزردہ ہو کر کہا۔ ’’ارے میں سوچتی کیا خاک، ایک دن آپ کی لاڈلی بیٹی کو سمجھانے کے طور پر میں نے کہا کہ تو اب جوان ہوئی، چار دن میں بیاہی جائے گی۔ اب ذرا ہڑدنگا پن کم کر، تو وہ تڑاق سے بولی کہ ’’میں شادی ہی نہیں کرنے والی، تم اس طرح کا خیال دل ہی سے نکال ڈالو‘‘۔ سو میں اس وقت سے چپ مار کے بیٹھ گئی۔ اس پر سنتی ہوں کہ آج کل کالج کی لڑکیوں نے مل کر ایک انجمن کنواریوں کی بنائی ہے جس میں شادی نہ کرنے کی قسمیں لی گئی ہیں۔ صاحبزادی بھی اس ممبر ہیں‘‘۔ میں نے اس خبر کو ایک مردانہ وار ’’ہوں‘‘ کے ساتھ سنا۔ بس بیگم کو غصہ آ ہی گیا۔ ترش ہو کر بولیں ’’میں یہ ہوں ٹوں تو جانتی نہیں، میں تو یہ جانتی ہوں کہ اب آپ کی بی لاڈلی کسی کی مان کی نہیں، تمہیں مریضوں سے فرصت نہیں اور بیٹی ہے کہ نئے نئے کلب ہیں، نئی نئی انجمنیں ہیں، اسے نت نئے فیشن کا گاؤن یا ساری چاہیے، نئے بوٹ ہوں، نئے ساتھی ہوں۔ صاحبزادی آج کل ٹینس کھیل رہی ہیں، کل بال میں ناچ رہی ہیں، پرسکیٹنگ میں جارہی ہیں۔ پرسوں گھوڑے پر سواری ہو رہی ہے۔ میں تو بوڑھی کھوسٹ قدامت پرست ۵۷ء کی پیدا ہوں، مجھے ۳۴ء کی باتیں کیا معلوم۔۔۔۔‘‘ میں آزادی خواتین کی قائداعظم کی زبان سے یہ باتیں سن کر زیر لب مسکرا دیا۔ بس بیگم برس پڑیں ’’مجھے یہی باتیں تو ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ گھر بگڑا جا رہا ہے۔ لڑکی کے اطوار سدھارے نہیں سدھرتے۔ وہ بالکل بے کہے کی ہو رہی ہے۔ ماں کو ایڑی چوٹی پر سے قربان کرتی ہے۔ بازاری لونڈوں کے ساتھ اچکتی پھرتی ہے، بات بات پر زبان لڑاتی ہے، شادی کے نام سے ناک بھوں چڑھاتی ہے، بالکل چہ خاچہ ہانک ہو رہی ہے مگر باوا جان ہیں کہ فدا ہیں، لڑکی کا ذکر آیا نہیں کہ بتیسی نکل پڑتی ہے، واری قربان ہونے کو تیار ہوئے جاتے ہیں۔۔۔‘‘ میں نے دیکھا بے طرح لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ چپکا اٹھ کے مطب میں چلا آیا۔ وہ گھنٹوں یونہی بڑبڑایا کیں اور دن بھر منہ تھوتھائے رہیں۔

شب کو دس بجے کے قریب سعیدہ گھر پلٹی، ماں کے ٹوکنے پر کہ اتنی دیر باہر رہنا مناسب نہیں، یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی کہ ’’میں کوئی بچہ نہیں ہوں‘‘ میں نے ان کے تیور تو دن ہی میں دیکھے تھے، اس وقت صاحبزادی کی چتونیں بھی دیکھیں۔ جوان لڑکی، انگریزی تعلیم یافتہ، سچ کہوں مجھے بھی برا معلوم ہوا مگر میں نے فوری تدارک مناسب نہ سمجھا، مگر شب بھر آرام کی نیند نہیں سویا، طرح طرح کی الجھنیں ہوتی رہیں سوال یہ تھا کہ ہم جس زمانے میں پیدا ہوئے تھے، ہم نے اسی قسم کی تعلیم و تربیت پائی۔ لڑکیاں تو خیر، بن بیاہے لڑکے بھی دس بجے شب تک ماں باپ کی اجازت کے بغیر باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ مگر آج کل کے زمانے میں اس طرح کی پابندیاں اور قیدیں قابل مضحکہ سمجھی جاتی تھیں، لڑکی کو اسی زمانے میں زندگی بسر کرنا تھی، اس کی ماں کے اصرار سے اسے تعلیم بھی اسی زمانے والی دی گئی تھی۔ اب اگر وہ اپنے حقوق پر ضد کرتی تھی تو اس پر پابندیاں عائد کرنا آیا صحیح بھی ہے یا نہیں۔ عقلاً تو والدین کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ صرف معاشرتی اور اخلاقی طور پر البتہ۔ مگر یہ چیزیں اضافی ہیں، جو باتیں آج نامناسب معلوم ہوتی ہیں، کل انہیں کا عام چرچا ہو جاتا ہے اور وہی انسب شمار کی جاتی ہیں، جن امور کو آج سوسائٹی میں مردود سمجھا جاتا ہے، کل وہی مرغوب ہو جاتی ہیں، ایسی حالت میں اولاد کی تعلیم میں ’’زمانہ با تو نہ بازد تو با زمانہ بساز‘‘ پر عمل کرنا چاہیے، پھر مشرق و مغرب کی پسندیں بھی مختلف ہیں۔ ایشاء میں باعصمت بیویاں مرغوب ہیں، یورپ میں تجربہ کار عورتیں پسند خاطر، اب ترجیح کسے دی جائے۔ ہم ایشیائی ضرور ہیں مگر ہمارے بچے اسی حد تک ایشیائی ہیں جہاں تک رنگ کا تعلق ہے ورنہ ان کا لباس، ان کی وضع، ان کی معاشرت اور ان کے خیالات بالکل مغربی ہیں، سعیدہ کے معاملے میں تو مجھے ذاتی تجربہ تھا کہ وہ کسی طرح اپنے حقوق کے مسئلہ میں کسی یورپین لیڈی سے پیچھے نہ تھی، اب اس کا تدارک کیا تھا۔ کہ شروع ہی سے ایسے ماحول میں ڈال دی گئی تھی جو سوائے ہندوستان میں ہونے کے اور

کسی نہج سے ہندوستانی نہ تھا۔ پھر اگر اس کے دل سے والدین کی عزت، خاندان کا وقار، مذہب کا خیال بالکل مفقود ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بڑی حد تک قائد اعظم آزادی نسواں اور تھوڑی حد تک میں خود تھا۔ بیگم تو اس لیے کہ وہی اس تعلیم کی ذمہ دار تھیں، میں نے جب ان سے فارسی و عربی پڑھانے کی ترغیب دی تھی تو وہ بہت سختی سے مجھ سے بولی تھیں کہ ''لڑکی کی تعلیم کے بارے میں آپ کی رائے نہیں سننا چاہتی، میں اسے اس طرح کی کتابیں ہرگز نہ پڑھاؤں گی جن میں ''الرجال قوامون علی النساء'' کی ہر جگہ تعلیم دی گئی ہو۔ میں اسے آج کل کی جیتی جاگتی آزاد خاتون بناؤں گی، وہ پچھلی صدی والی ہماری طرح کی نیم مردہ شخصیت نہ ہوگی''۔ میں نے اسی روز سے اس معاملہ میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا۔ میں خود اپنے کو اس لیے ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ میں قدامت پرستی کی آب و ہوا میں تربیت یافتہ ہونے کے بعد بھی بیگم کو راہ راست پر نہ لا سکا اور میں نے انہیں خود مختار آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اور اس نیکی اور سیدھے پن کا ثمر یہ ملا کہ بیگم الٹے خفا تھیں کہ میں لڑکی کو نہیں ڈانٹتا اور بیٹی علیحدہ آزردہ کہ ابا جان سائنس سے واقف ہو کر بھی اماں جان کو نہیں روکتے کہ وہ اپنے سے زیادہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی کے ہر فعل میں اٹھتے بیٹھتے مین میخ نہ نکالیں۔ غرض میں نے اپنی خواہشات کا جوان دونوں کی خوشی کے لیے خون کیا یہ اس کا پھل تھا۔ میں انہیں الجھنوں میں شب بھر پڑا رہا۔ صبح کو نماز کے بعد خداوند عالم سے ہدایت کی دعائیں کرتا رہا۔ اس کے بعد ماماؤں سے یہ تاکید کر کے کہ صاحبزادی صاحبہ جب اٹھیں تو میرے پاس بھیجدی جائیں۔ اپنے مطب میں چلا گیا۔ وہاں مرضاء کے ہجوم میں میں ان تمام جھگڑوں کو بھول گیا۔ تقریباً دس بجے جب میں حسب معمول کھانے اور باہر جانے کے لیے کمرے سے نکلا تو مجھے سعیدہ کا جھگڑا یاد آیا اور میں نے بیگم سے پوچھا کہ ''وہ کہاں ہے؟'' وہ اپنے منقبض لب ولہجہ میں بولیں ''مجھے کیا معلوم کہ کہاں تشریف لے گئی ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب سو کے اٹھیں، جلدی جلدی چائے پی ظہورن ماما نے کہا ''بی بی، آپ کو آپ کے ابا جان نے مطب میں بلایا تھا، کہا تھا بٹیا جب جاگیں تو میرے پاس بھیج دینا''۔ صاحبزادی بولیں ''تو بوا میں اس وقت تو ابا جان کے پاس جانے سے رہی، میں ایک صاحب سے ساڑھے آٹھ بجے ملنے کا وعدہ کر آئی ہوں۔ سوا آٹھ ہو گئے ہیں، پندرہ منٹ میں مشکل سے ان کے ہاں پہنچوں گی، ابا جان سے بندگی کہہ دینا اور کہہ دینا کہ میں اب واپس ہو کے ان سے ملوں گی۔ اس وقت تو مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا ہے''۔ مجھ سے نہ بولیں نہ چالیں، نہ یہ بتایا کہ وہ موا کون سا کام ایسا لگا تھا کہ اس میں پانچ منٹ کی دیر باپ سے کھڑے کھڑے ملنے کے لیے بھی نہیں کی جا سکتی تھی، فوراً موٹر منگوائی اور چلی گئیں۔ میں نے کہا ''تو موٹر بھی گئی۔ اب میں مریضوں کو دیکھنے کیونکر جاؤں گا؟'' بیگم بولیں ''اب تم تانگے پر ٹخ ٹخ کرتے جاؤ۔ موٹر تو سرکاری سواری میں ہے!''

میں نے چپ چاپ کھانا منگوایا اور کپڑے پہن کر کرایہ کے تانگہ پر مرضا کو دیکھنے نکل گیا۔ ساڑھے چار بجے جب پلٹا تو معلوم ہوا کہ صاحبزادی کلب گھر تشریف لے گئیں۔ وہاں آج کوئی ٹورنا منٹ ہے، میں نے اخبار پڑھا، چائے پی، نماز پڑھی، پھر مغرب کا انتظار کرنے لگا۔ جب اس سے بھی فراغت کر چکا تو شام کے مریضوں کو دیکھنے لگا، نو بجے کھانا کھایا، صاحبزادی اب تک پلٹی نہ تھیں۔ آج مجھے وحشت نے گھیرا، موٹر کو دریافت کرایا، معلوم ہوا موجود ہے۔ کلب گھر ہی سے واپس کر دیا گیا تھا۔ میں سوار ہوا اور ڈرائیور سے سعیدہ کے اڈے پوچھتا ہوا تلاش کے لیے نکلا مختلف انگریزی سینما گھروں میں دیکھا، سعیدہ وہاں نہ تھی۔ قریب ہی ایک جگہ اسکیٹنگ ہو رہی تھی۔ ٹکٹ خرید اندر گیا دیکھا تو ایک اینگلو انڈین لونڈے سے چپکی ہوئی صاحبزادی صاحبہ ناچنے میں مشغول ہیں۔ میں غیرت سے گڑ گیا۔ میری آنکھوں میں دنیا سیاہ ہوگئی۔ مگر جب سعیدہ کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ اس انبساط و مسرت سے مسکرا دی جیسے اس کی عین تمنا یہی تھی کہ میں اسے اس طرح ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ ناچتا ہوا دیکھوں۔ میں غصے سے پیچ و تاب کھاتا کھڑا تھا کہ اتنے میں وہ ناچ ختم ہوا اور سعیدہ اس نوجوان کو ساتھ لیے میرے پاس آئی اور بہت ہی بے تکلفی سے بولی ''ہلو ابا جان، آپ یہ آج مریضوں کو چھوڑ کر کہاں آ نکلے؟ میں آپ سے اپنے ان دوست کو ملانا چاہتی ہوں میرے والد، مسٹر ٹامسن'' میں نے مسٹر

ٹامسن سے ہاتھ ملایا ہی تھا کہ دوسرے نوجوانوں نے آ کر سعیدہ کو گھیر لیا، ہر ایک ان میں سے اس کا خواہش مند تھا کہ اب کی مس صاحبہ انہیں کے ساتھ ناچیں۔ میں نے اس ہنگامے کو دیکھ کر ان نوجوانوں سے ذرا ترش روئی سے کہا ''جی آج آپ حضرات کو انہیں معاف ہی کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ میں انہیں ایک بہت ضروری کام کی وجہ سے گھر سے لینے آیا ہوں''۔ سعیدہ نے میرے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھا اور خاموش میرے ساتھ ہولی۔ موٹر میں اس نے کئی بار مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کی مگر میں نے صرف ''ہوں، ہاں'' کر دی۔ میں نے جو سماں آج اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس سے میری قدامت پسندی کو حد درجہ سخت دھچکا پہنچا تھا، میں موٹر میں برابر اپنے جذبات پر قابو پانے اور سعیدہ کے مسئلے کو محض عقلی پہلو سے دیکھنے اور طے کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اپنے دل سے باپ بیٹی کا خیال نکال دیا۔ اس سے اس جذبے کے ماتحت کسی قسم کی اطاعت نہیں چاہتا تھا، لیکن میں اس کی کفالت کرتا تھا اور اس حیثیت سے مجھ کو اس کے افعال پر ایک حد تک سنسر کا حق تھا۔

جس وقت ہم مکان پر پہنچے تو بیگم بھی تخت کے چوکے پر بیٹھی بیٹی اور میرا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر بولیں ''بارے آپ پلٹے تو، میں تو سمجھی کہ آج بیٹی کے ساتھ باپ نے بھی رات بھر سیر و تفریح کی ٹھہرائی۔۔۔۔۔'' بیگم نے یہیں تک اپنے روزمرہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ دفعتہً انہوں نے میرا چہرہ دیکھا اور یکبارگی چپ ہو گئیں۔ میں نے ان کے چوکے کے قریب جو کرسیاں پڑی تھیں اس میں سے ایک کی طرف سعیدہ سے اشارہ کر کے کہا ''تشریف رکھیے'' اور دوسرے پر خود بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ہمارے درمیان ایک عجیب طرح کا سکوت رہا۔ بالآخر سعیدہ ہی نے ابتدا کی اور اپنی پرانی بے پروائی سے بولی ''یا اللہ یہ آج کیا ہے کہ اس شد و مد کے ساتھ مجھے تلاش کرنے خود ابا جان نکلے اور پھر اس طرح پکڑ کر لائی گئی ہوں جیسے میں کوئی مجرم ہوں، کسی کی کوئی چوری کی ہے یا خون کر کے بھاگی ہوں۔ آخر ہے کیا؟'' میں نے بجائے اس کی باتوں کا جواب دینے کے ابتدا سوال سے کی۔ پوچھا ''آج صبح میں نے تمہارے پاس کہلا دیا تھا کہ مجھ سے مطب میں مل کر کہیں جانا، تم میرے حکم کے خلاف مجھ سے بے ملے کیوں چلی گئیں؟''

وہ بولی ''مجھ سے ایک صاحب نے ساڑھے آٹھ بجے ملنے کا وعدہ تھا۔ مجھے دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے چلی گئی۔ اگر میں آپ کے پاس جاتی تو ان سے وعدہ خلافی ہوتی، اور وہ دل میں کہتے کس قدر جھوٹی عورت ہے!''

میں نے کہا ''ہاں لیکن یہ بھی تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ باپ سمجھے گا کس قدر غیر مطیع لڑکی ہے''۔

بیگم بولیں ''اور پھر ایسی ہی جلدی تھی تو میں کیا مر گئی تھی، میں تو سامنے بیٹھی دیکھ ہی رہی تھی مجھی سے کہہ دیا ہوتا''۔

میں نے آج پہلی دفعہ بیگم سے سختی سے گفتگو کی۔ میں نے کہا ''بہتر یہ ہوگا کہ آج صاحبزادی سے آپ مجھ ہی کو گفتگو کر لینے دیں۔ میں ان سے اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔۔۔'' بیگم اور کچھ کہنا چاہتی تھیں میں نے غصہ سے کہا ''میں جو کہہ چکا ہوں وہی اس گھر میں آج ہوگا۔ آپ خاموش رہیں گی۔۔۔ ہاں صاحبزادی تو آپ نے اپنے ملنے والے سے وعدہ کا خیال تو کیا لیکن باپ کے حکم کا خیال نہ آیا؟''

سعیدہ نے کہا ''ابا جان میں سمجھی تھی کہ آپ نے یونہی کسی کام سے بلایا ہوگا، مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کا حکم ہے''۔

میں نے کہا ''اچھا اس وقت آپ کو ضروری کام تھا۔ پھر چار بجے آپ نے انتظار کیا ہوتا''۔

وہ بولی ''جی اس وقت میں ٹینس کھیلنے کا وعدہ کر چکی تھی!''

میں نے کہا ''اچھا تو پھر اس وعدے کو بھی پورا کر کے آپ نے یاد فرما لیا ہوتا''۔

وہ بولی ''کلب میں سب کے سب مل گئے اور یہی طے پایا کہ چلو اس وقت اسکیٹنگ کے لیے چلیں، چنانچہ وہی کپڑے پہنے وہاں چلی گئی''۔

سعیدہ اس وقت تک میرے سوالات کا جواب کچھ خوفزدہ، کچھ خجالت آمیز انداز میں دے رہی تھی، میرا غصہ بھی اس کے جوابات سے کم ہوتا جاتا تھا۔ ممکن تھا کہ بیگم اگر میرے حکم کے مطابق خاموش رہ جاتیں تو آج ہماری زندگیاں اس طرح برباد نہ ہوتیں کہ مجھے آپ کو اپنی روداد سنانی پڑتی مگر وہ تو ہمیشہ حاکم بننے کی عادی تھیں محکوم تو وہ آج تک کبھی بنی ہی نہ تھیں۔ اس لیے میرے حکم پر جوان کو استعجاب ہوا تھا اس نے ان کو تھوڑی دیر کے لیے خاموش کر رکھا تھا۔ اب وہ اثر زائل ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ رعب جمانے والے انداز سے ہماری گفتگو میں دخل انداز ہوگئیں اور پہلا ہی فقرہ اس طرح کے طنز میں بولیں کہ سعیدہ بیٹی کی جگہ ایک بالکل ہی ہم رتبہ و ہم درجہ عورت بن بیٹھی۔ بیگم بولیں ''ہے ہے لڑکی تو تو نے اب کھلے بند غیر مردوں کے ساتھ ناچنا بھی شروع کر دیا؟''

میں نے جھلا کر بیگم کی طرف دیکھا۔ ان کی صورت سے حد درجہ تحقیر و نفرت کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے پلٹ کر سعیدہ کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر خجالت و شرمندگی کی جگہ غصے کے آثار نمایاں تھے۔ ماں کے جواب میں اس نے ہونٹ چبا کر کہا ''امی جن باتوں کے متعلق آپ کو علم نہ ہو اور آپ نہ سمجھتی ہوں ان کے بارے میں آپ طنز نہ کیا کریں تو بہتر ہوگا!''

یہ صاف صاف ماں کو جاہل بنانا تھا۔ بھلا بیگم اس کی کہاں تاب لاتیں، ان کا غصہ بالکل بھڑک اٹھا، وہ بولیں ''چھوکری اب تو بہت چل نکلی ہے، اٹھتے بیٹھتے ماں کو جاہل بیوقوف کہہ دینا تیرے نزدیک کوئی بڑی بات ہی نہیں تیرے دیدوں کا تو پانی ڈھل گیا ہے، نہ حیا ہے، نہ شرم ہے، نہ غیرت ہے، نہ شرافت، سب دھو کے پی ڈالی ہے۔۔۔''

وہ اتنا ہی کہنے پائی تھیں کہ سعیدہ اپنی کرسی سے اٹھ کے کھڑی ہوگئی۔ وہ میری طرف مڑ کے بولی ''ابا جان میں ان سے باتیں نہیں کر سکتی، میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں جب آپ تنہا ہوں، مجھے بلا لیں میں ہر بات کا معقول جواب رکھتی ہوں۔ آپ کی خدمت میں گزارش کر دوں گی''۔

بیگم کی واقعی اس سے زیادہ کیا ذلت ہو سکتی تھی کہ ان کی بیٹی انہیں کے منہ پر یہ کہے کہ وہ انہیں قابل گفتگو تک نہیں سمجھتی۔ بس آپے سے باہر ہوگئیں۔ چیخ کر بولیں ''ہاں بی بنوخ میں تو بات کرنے کے قابل بھی نہیں رہی، مالزادی میرا ہی کھاتی ہے، میرا ہی پہنتی ہے، میرے ہی گھر میں رہتی ہے اور اس پر کس ڈھٹائی سے کہتی ہے، میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں، جیسے اس کے خصم کا بنوایا ہوا کمرہ ہے۔۔۔''

سعیدہ نے اپنے کمرے میں گھس کر کواڑ دھڑ سے بند کر لیے، میں نے بیگم سے کہا ''میں نے تم سے پہلے ہی دخل در معقولات دینے کے لیے منع کیا تھا، مگر تمہاری زبان بھلا کہاں رک سکتی ہے۔ خیر اب خاموش رہو۔ صبح تمام باتوں کا تدارک کیا جائے گا۔۔۔''

اس پر وہ مجھ پر پل پڑیں۔ خیر میں ہمیشہ سے ان کی باتیں سننے کا عادی تھا۔ آج بھی چکنا گھڑا بنا رہا۔ جب وہ میری خاموشی سے عاجز آ کر رونے لگیں تو مجھے مجبوراً دو چار الفاظ ان کی تائید میں کہنے پڑے۔ میری گفتگو سے انہیں بہت ڈھارس ہوئی اور وہ کسی طرح سو رہیں۔ صاحبزادی نے اپنے کمرے میں جا کر کیا کیا اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ چونکہ وہ جوان تھیں۔ لہٰذا ان کا غصہ بھی زیادہ تیز رہا ہوگا اور وہ رات بھر نئی نئی اسکیمیں اسی کے متعلق سوچتی رہی ہوں گی کہ ماں باپ کو کس طرح عاق کر کے ہم دونوں سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کریں۔

قصہ مختصر رات تو جوں توں کٹی صبح سویرے ہی میں نے جب ماما سے دریافت کیا کہ صاحبزادی کیا کر رہی ہیں تو معلوم ہوا کہ اپنے ٹرنکوں میں کپڑے رکھ رہی ہیں اور اسباب اس طرح باندھ رہی ہیں جیسے کہیں سفر کا ارادہ ہے۔ مجھے یہ سن کر بے حد غصہ آیا۔ اس لیے کہ اس کے صریحی معنی یہی ہوتے تھے کہ اس تمام جھگڑے میں قصوروار ہم ہی لوگ تھے اور وہ بالکل بے قصور۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے دل میں اپنی ماں کے ساتھ ساتھ میرا بھی ڈر نہ تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کوئی باپ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد نہ ان

سے ڈرتی ہے اور نہ اس کی پروا کرتی ہے میں بھی اسی خاصہ انسانی کا شکار تھا۔ میں نے ایک ماما سے کہا کہ صاحبزادی سے کہو کہ مجھ سے آ کر مل جائیں۔ تھوڑی دیر میں صاحبزادی کھٹ کھٹ کرتی تشریف لائیں اور عادتاً سلام کے لیے جھک گئیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سعیدہ کی اس معمولی تہذیب نے میرے دل میں اس کی طرف سے کتنی گنجائشیں پیدا کر دیں۔ جوان بیٹا ہو یا بیٹی، پیری کا سہارا ہی نہیں بلکہ اپنی امیدوں کی تکمیل کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ماں باپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کی صورتوں میں پھر سے جوان ہیں۔ انہوں نے جس منزل تک پہنچنے کے لیے اتنے دکھ بھرے تھے وہ منزل اب ان کے سامنے ہے۔ ان کا تھکے ہوئے مسافروں کی طرح بے ساختہ یہ جی چاہتا ہے کہ ان جوان بازوؤں پر بھروسہ کر کے آرام کی نیندیں سو رہیں۔ انسان و حیوان میں یہی فرق ہوتا ہے۔ حیوان فطرت سے مجبور ہو کر اپنے بچوں سے بس ایک خاص مدت تک محبت کرتے ہیں۔ جہاں وہ زمانہ ختم ہوا اور انہوں نے انہیں اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد وہ انہیں پہچانتے تک نہیں۔ اس لیے کہ وہ نہ تو انہیں اپنے مقام مسکونہ میں، نہ اپنی غذا میں، اور نہ اپنی تفریح میں بخوشی شریک و سہیم بنا سکتے ہیں، وہ ان سے ڈرتے ہیں اور انہیں اپنا رقیب، اپنا مد مقابل، اپنا کفو بنانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ انسان ان سے مختلف ہے، اسے اپنے بچوں کو دیکھ کر ہمیشہ ایک خوشی و مسرت محسوس ہوتی ہے۔ پھر اگر ایک ہی لڑکی ہو، وہ بھی جوان، خوبصورت، ذہین، تعلیم یافتہ اور جب وہ شاخ گل کی طرح سلام کے لیے جھکے تو مجھ سے خشک باپ کے دل میں بھی محبت کے سوتے کیوں نہ پھوٹ بہیں؟ میرا غصہ کافور ہو گیا اور میرا دل اس کی محبت سے اسی طرح لبریز ہو گیا جس طرح اس دل جس دن کہ اس نے پہلی دفعہ ماں کے سکھانے پر تتلا کے 'ابا جان' کہا تھا'' ڈاکٹر صاحب نے رک کر پھر گلاس بھرا انڈیلی اور چڑھالی۔ پھر وہ ایک میلے سے رومال سے چہرے سے پسینہ پونچھ کر بولے ''خیر میں نے اپنے جذبات سے مجبور ہو کر اسے کھینچ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ''میں یہ کیا سنتا ہوں کہ تم اپنا سامان باندھ رہی ہو، کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے؟''

وہ سر جھکائے ہوئے بولی ''جی ہاں میری ایک دوست ہیں مس روفس ان کے ہاں جاؤں گی''۔

مجھے جو اس فقرے کو سن کر تکلیف ہوئی اسے میں نے اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ مسکرا کر پوچھا ''کیا مس روفس کسی دوسرے شہر میں رہتی ہیں؟''

وہ بولی ''جی نہیں یہیں''۔

میں نے کہا ''تو ان کے ہاں جانے کے لیے اسباب لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ سر اٹھا کر بولی ''ابا جان میں اب اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔ امی کی رات کی باتوں کے بعد میرے لیے ایک منٹ بھی اس گھر میں قیام محال ہے''۔

مجھے اپنے ایک دوست کی ایک بات یاد آ گئی۔ انہوں نے انگریزی تعلیم کے اثرات کی بحث کے سلسلے میں ایک بار کہا تھا ''سب سے زیادہ فوری اثر جو نوجوانوں پر اس تعلیم کا ہوتا ہے وہ افراط خود پسندی ہے، چنانچہ جس قدر آسانی سے آپ ان نوجوانوں کی ''انسلٹ'' ہوتے دیکھیں گے وہ کسی مشرقی تعلیم یافتہ کے ہاں نایاب ہے''۔

سعیدہ بھی اسی افراط خود پسندی کا شکار تھی۔ جاہل ماں نے اس کی شب میں سخت ترین توہین کی تھی۔ اب اگر شاید بیگم گھٹنے ٹیک کر بیٹی سے معافی مانگیں تو عفو کی امید کی جا سکتی تھی۔ ورنہ سعیدہ اتنی سخت توہین کے بعد ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنا کیونکر پسند کر سکتی تھی۔ میں اپنے دوست کا قول یاد کر کے مسکرایا اور میں نے سعیدہ کو دھیما کرنے کے لیے کہا ''بیٹی وہ تمہاری ماں ہیں۔ ماں کے تھوڑے بہت حقوق ہوتے ہیں''۔

وہ تڑاق سے بولی۔ ''ماں کو اس طرح کا کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ بیٹی کے معاملات میں اس طرح دخل اندازی کرے۔

میں کوئی جاہل، بیوقوف، اندھی عورت نہیں کہ انہیں مجھے صلاح اور مشورے دینے کی ضرورت ہے۔ میں خود اپنا برا بھلا سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے ان کی نصیحت فصیحت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ آخر وہ مجھے اس طرح ڈانٹنے والی کون ہوتی ہیں؟''

میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی سخت ضرورت ہے کہ صاحبزادی سے اولاد و والدین کے متعلق کچھ گفتگو کر لی جائے۔ میں نے اسی لیے پوچھا ''اچھا بیٹی یہ تو بتاؤ کہ تمہارے اوپر ہمارے کچھ حقوق ہوتے ہیں یا نہیں؟''

وہ تھوڑا رک کے بولی ''ابا جان سچ پوچھیے تو والدین کے اولاد پر کچھ بھی حقوق نہیں ہوتے یہ تو فطرت و سوسائٹی ان سے ان کی عشرت پرستی و نفس پرستی کا بدلہ لیتی ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا سارا بار ان پر ڈال دیتی ہے۔ اصل میں یہ کام حکومت کا ہے۔ لیکن حکومت چونکہ اپنے فرائض کما حقہ ادا نہیں کرتی اس لیے اس نے والدین کو حقوق دے رکھے ہیں۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ہر فرد پر صرف اتنا فرض ہے کہ وہ ایک اچھا شہری بنے۔ اس پر ایک مطیع بیٹا اور ایک تابعدار بیٹی بننا فرض نہیں ہے''۔

میں نے غصہ سے پوچھا ''تو آپ نے انہیں اصول پر عمل پیرا ہونے کا قصد فرما لیا ہے؟''

اس نے بہت ہی اطمینان سے کہا ''جی ہاں میں وہی کروں گی جو صرف عقلی حیثیت سے درست ہے''۔

میں نے غصہ کو ضبط کر کے پوچھا ''تو آپ نے تمام عواقب و نتائج پر نظر کر لی ہو گی؟''

اس نے ایک بے حس پتھر کی طرح کہا ''جی ہاں، میں نے سب کچھ سوچ سمجھ لیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں اپنی ذاتی آزادی کو آپ کے مفروضہ حقوق پر قربان نہیں کر سکتی''۔

میں نے اس خیال سے کہ لڑکی ناکردہ کار ہے اور باوجود کتابی علم کے وہ جنسوں کے فرق سے اچھی طرح آگاہ نہیں اور نہ ان نقائص یا کمالات کو سمجھتی ہے جو فطرت نے عورت میں ودیعت کئے ہیں۔ ذرا اور صاف الفاظ میں پوچھا ''صاحبزادی آپ نے ان خطروں کو بھی محسوس کیا جو اس دنیا میں چاروں طرف موجود ہیں اور جن کے نتائج اخلاقی حیثیت سے بڑے خراب نکلتے ہیں''۔

وہ بڑی دیدہ دلیری سے بولی ''ابا جان، صنفوں کے تعلقات معاشی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ ان سے اخلاقیات کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر میں نے تو عہد کیا ہے کہ میں عمر بھر شادی ہی نہ کروں گی۔ ہاں اگر کسی وقت فطرت سے مجبور ہوئی تو میں اس حرکت سے پہلے ضبط تولید کے تمام اصولوں پر کاربند ہو لوں گی''۔

میں ایک بار کانپ کے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ آج کل کے زمانے میں باپ بیٹی میں اس طرح کی گفتگو اور وہ بھی تعلیم یافتہ خاندان میں کوئی عجیب بات نہیں ہے لیکن میں اپنی قدامت پسندی کا ہمیشہ سے مقر رہا۔ اسے میری جہالت سمجھئے یا دناعت مگر میں نے اس لڑکی سے چیخ کر کے یہ کہا کہ ''اچھا تو مجھے تمہارے ان پاکیزہ خیالات کے سننے کے بعد صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر تم آج اس گھر کے باہر جاؤ گی تو پھر کسی حالت اور کسی صورت میں اس گھر میں واپس نہیں آ سکتی ہو!''

سعیدہ کا پھول سا چہرہ تمتما اٹھا، وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے کچھ عجیب بے پروائی سے منہ بنا کے گردن کو حرکت دیتی اور یہ کہتی میرے کمرے سے باہر چلی گئی ''مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی رائے نہیں بدل سکتی''۔

میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہو گئی تھی۔ میں نے اٹھارہ برس سے جسے بڑے ریاضوں سے پالا تھا، جس کی ذرا سی خوشی کے لیے سیکڑوں تکلیفیں اٹھائی تھیں، جس کے لیے راتوں کو جاگا تھا، جس کو آرام سے رکھنے کے لیے سیکڑوں طرح کی ذلتیں برداشت کی تھیں۔ آج اس کی یہ احسان فراموشی کہ وہ باپ کو باپ اور ماں کو ماں کہنا اور سمجھنا اپنی ذلت اپنی توہین سمجھتی تھی۔ کیا دنیا اس کی آنکھوں میں سیاہ نہ ہونا چاہیے تھی۔ کیا میرے اسلاف شرافت نسبی پر اسی لیے نازاں تھے کہ ان کے خاندان کی ایک لڑکی عصمت و عفت کو حد درجہ حقیر و ذلیل سمجھے اور اس کی حفاظت اپنی تعلیم کے منافی جانے؟ ایک طرف تو عصمت

مآبوں کی تاریخوں میں زریں فہرست اور دوسری جانب میری لڑکی، ایک ہی لڑکی، وہ لڑکی جس پر میں نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا، جسے بیٹے سے کسی طرح کم نہ سمجھا تھا، جس کی موجودگی میں کسی دوسری اولاد کی خواہش نہ کی تھی، اس کے یہ جذبات وخیالات!
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!

میں اپنے خیالات میں اسی طرح محو تھا کہ دفعتاً بیگم اپنے مخصوص بے ساختہ پن کے ساتھ تشریف لائیں اور آتے ہیں مجھ سے اس طرح مخاطب ہوئیں کہ جیسے دنیا میں جتنے واقعات رونما ہو رہے تھے ان سب کا ذمہ دار میں ہی نحیف وضعیف تھا۔ وہ بولیں
''اور سنا آپ نے وہ صاحبزادی آپ کی! گھر چھوڑ کر تشریف لے جا رہی ہیں''۔

میں نے کہا'' جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں سمجھا چکا، اب آپ جا کے سمجھائیں''۔

وہ بولیں ''میں سنوں تو آخر کیا ہوا''۔

میں نے کہا'' بھئی خدا کے لیے میرا سر نہ کھاؤ، اسی چھوکری سے جا کے پوچھو''۔

وہ پاؤں پٹکتی بڑبڑاتی چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں نے سنا کہ بیگم دھاڑ رہی ہیں ''مالزادی، پاجن، سڑن، دیوانی، چرخا، میں مٹی کا تیل چھڑک کر تیرے سارے کپڑوں میں آگ لگا دوں گی۔ چونٹا پکڑ کے قینچی سے کاٹ کے پھینک دوں گی، بڑی آئی ہے وہاں سے لاٹ صاحب کی بچی بن کے، بڑی دماغ والی ہے تو سارے کپڑے میرے اتار دے تو کہاں سے کما کے لائی تھی؟ کس نے تجھے بنوا دیا تھا؟ میں تیری ماں نہیں، میں نے تو اپنے پیٹ سے بچھو جنا ہے، تیرے باپ نے کیا تیرا بگاڑا ہے؟ اتنی دیدہ دلیر، یہ پڑھی لکھی ہے موئی! باپ دادا کی ناک کٹوائے گی، کمینی بے غیرت، بے حیا، چربانک، پاجی!''

میں لپکا ہوا پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ صاحبزادی ساری زیب تن کئے، اپنے ہاتھ سے بکس کھینچ کھینچ کے کمرے سے باہر نکال رہی ہیں کہ ماں کے کوسنوں نے انہیں غیرت دلا دی وہ تمام چیزوں کو کمرے میں پھینک کے ماں کی طرف پلٹ پڑیں اور ماں کی آخری گالی پر انہوں نے تڑاق سے اتنے زور کا طمانچہ دیا کہ ان کا منہ پھر گیا۔ میں'' ہائیں ہائیں'' کہتا ہوا جو بڑھا تو بیگم تھرا کے ادھر گریں۔ ادھر سعیدہ کھٹ پٹ کرتی باہر چل دی۔

میں نے جلدی سے بیگم کو اٹھایا۔ وہ بالکل اسی طرح کانپ رہی تھیں۔ جس طرح بحری کے پنجوں سے چھوٹا ہوا کبوتر، میں نے انہیں سمجھایا بجھایا، تسلی دلاسا دیا، لیکن وہ بار بار اپنا گال سہلاتی اور یہی کہتی تھیں'' میں زندگی بھر اپنا دودھ نہ بخشوں گی، آج وہ میرے گھر سے نہیں گئی اس کا جنازہ گیا ہے، میں نے آج سمجھ لیا کہ وہ مر گئی''۔

غرض وہ سارا دن عجیب پیچ وتاب، پریشانی واضطراب میں گزرا، قریب شام ایک بہرا ایک پارسل اور ایک خط لا کر دے گیا۔ خط اور پارسل بیگم کے نام تھے۔ انگریزی میں لکھا تھا۔

''ڈیر میڈم!

حامل رقعہ کے ہمراہ جو پارسل جا رہا ہے اس میں تمام وہ چیزیں ارسال ہیں جو میں پہن کر آپ کے گھر سے آج نکلی تھی۔ امید کہ آپ انہیں پا کر خوش ہوں گی۔ اب میرے پاس آپ کا کوئی چھلا تک نہیں ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں صبح اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکی اور آپ کی اس طرح کی تادیب پر مجبور ہو گئی جس کی آپ بہت دنوں سے مستحق تھیں۔

آپ کی وفادار'' سعیدہ''

بیگم نے خاموشی سے خط پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں بیگم سے اس معاملے میں کچھ زیادہ خوش نہ تھا کہ آج

صاحبزادی جو گل کھلا رہی تھیں وہ انہیں کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ پہلے ہی دن سے انہوں نے لڑکی کے دماغ میں آزادی، حقوق نسواں اور صنفوں کی مساوات کی مغربی قلمیں لگا دی تھیں۔ انگریزی تعلیم امی جان کے بے جا لاڈ پیار، اور مغربی معاشرت نے اس پودے کو خوب ہرا بھرا کر دیا تھا۔ میں نے درمیان میں اگر کبھی ٹوکنے کی جرات کی تھی تو ڈانٹ دیا گیا تھا۔ آج صاحبزادی نے ماشاءاللہ ماں کو ان کی عنائیتوں کا پورا پورا بدلہ دیا تھا، مجھے ایک غیر جانبدار کی طرح اس واقعہ سے زیادہ اثر نہ لینا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے اسے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں سے وہ بدتہذیبی کرتے دیکھا تھا جس کا ازالہ ناممکن تھا۔ بیگم کی کیسی ہی زیادتی سہی، لیکن وہ پھر بھی میری بیوی تھیں اور اس نالائق سعیدہ کی ماں۔ وہ ایک عصمت مآب خاتون تھیں اور ان میں وہ تمام جوہر موجود تھے جو انسانیت کے زیور ہیں۔ وہ ذرا مزاج کی جھکی اور زبان کی تیز ضرور تھیں لیکن وہ حد درجہ غیور، نیک مزاج، ہمدرد اور ملنسار عورت تھیں۔ میں نے اسی لیے تمام عمر ان کی بات در رکھی، کبھی خود ان کا مقابلہ نہ کیا، کبھی ان کی بات کا سختی سے جواب نہ دیا۔ آج ایک چھوکری نے جسے ہم نے پالا، پوسا پڑھایا لکھایا، ایسی بیوی پر ہاتھ اٹھایا اور میرے سامنے طمانچہ مارا، لوگ کہتے ہیں "لاٹھی مارے پانی نہیں جدا ہوتا"۔ لیکن اس طمانچے نے آج دلوں کو جدا کر دیا تھا۔ سعیدہ کی میرے دل میں ذرہ برابر محبت نہ رہی تھی۔ میری عقل کہتی تھی، میرا دل کہتا تھا کہ اگر اتنی محبت و شفقت سے ہم درندہ جانور سے بھی پیش آئے ہوتے تو وہ اٹھارہ برس میں ہمارے قدم چاٹنے لگتا۔ ہمارے اوپر جان دیتا اور سخت سے سخت موقع پر کام آتا۔ یہ لڑکی جانوروں سے بھی بدتر نکلی۔ میرا غصہ، صبح سے دل میں گھٹتا ہوا غصہ دم بدم بڑھنے لگا۔ جی چاہتا تھا، کوئی چھوٹا آدمی سامنے آجائے اور اسے پیٹ چلوں، کوئی چیز ایسی مل جائے جسے توڑ ڈالوں، بیگم ہی کچھ الجھیں اور میں انہیں جی بھر کر پھنکارلوں۔ مگر وہاں تو بیگم سسک رہی تھیں۔ اب بھی بار بار گال سہلاتی تھیں اور ادھر دیکھتی تھیں جدھر کمرے میں لڑکی کے بکس بکھرے پڑے تھے۔

مجھ سے یہ سماں دیکھا نہ گیا۔ میں نے ماما دائیوں جو صبح سے بیگم کو گھیرے بیٹھی تھیں ڈانٹ کر کہا "کھڑی کیا دیکھتی ہو۔ اس کمرے کو بند کر کے قفل ڈال دو اور کنجی مجھے دے جاؤ"۔ میں پاؤں پٹکتا ہوا مطب کی طرف چلا تو ظہورن نے جو سب سے بوڑھی تھیں بیگم کی طرف بڑھ کر کہا "نہ جانے کس کا سایہ ہو گیا بٹیا کو۔۔۔۔"

بیگم نے چیخ کر کہا "ارے وہ حرافہ مر گئی۔ خبردار جو آج سے کسی نے اس کا نام لیا اس گھر میں!"

میرا خود بھی ایسا ہی کچھ جذبہ تھا اور میں نے بھی اپنے دل میں ایسا ہی کچھ ختم کر لیا تھا۔ اتفاق سے مطب جو پہنچا تو وہاں ایک صاحب بہادر ایسے بھی آ گئے جن کی بیوی درد زہ سے تڑپ رہی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی تمام مریضوں کو دیکھ کر نسخے لکھے، پھر ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی ڈاکٹرنیاں پہلے ہی سے کیس خراب کر چکی تھیں۔ میں جب پہنچا ہوں تو بچہ مر چکا تھا اور بیچاری ماں بے ہوش پڑی تھیں۔ میں نے باپ سے اجازت لے کر بچے کو کاٹ کر نکال دیا اور ماں کو ہوش میں لا کر دوا دے کر سلا دیا۔ اتفاق یہ کہ جب لاش پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ بچی ہے۔ دل نے کہا کہ چلو اچھا ہی ہوا، نہ جانے یہ بھی کوئی سعیدہ نکلتی۔ پھر خیال آیا اگر پیدا ہوتے ہی وہ بھی یونہی مر جاتی تو کیا دل میں اتنا درد ہوتا جتنا آج ہو رہا ہے؟۔۔۔۔ نا جانے میں اور کیا کیا سوچتا مگر مریضوں کو دیکھنا تھا، اس زمانے میں مسیحا نفس کہلاتا تھا۔ فرصت ہی نہ ملی کہ دماغ اپنے جھگڑوں کو سوچ سکے۔

تیسرے چوتھے دن بیگم کی چند دوستوں نے سعیدہ اور ان کے درمیان صفائی کی کوشش کی لیکن لڑکی نے ایسی ایسی باتیں کیں کہ سب ہار کر بیٹھ رہیں اور وہ ایک ہفتہ بعد نرسنگ سیکھنے مدراس چلی گئی۔ میں نے تو سینہ پر صبر کی سل رکھ لی اور اس طرف جانا ہی چھوڑ دیا جدھر اس کا بند کمرہ تھا۔ لیکن بیگم مجبور تھیں ان کو سارا گھر دیکھنا ہی پڑتا تھا۔ اس لیے ان کے دل پر نہ جانے کیا کیا گزرتی رہی ہوگی۔ گو وہ زبان سے کچھ نہ کہتی تھیں۔ لیکن ان کا غصہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ بلا مبالغہ ہر تیسرے دن پرانے ملازم نکالے اور نئے

رکھے جانے لگے۔ گھر کی صفائی اور تلاوت قرآن اپنی حدوں سے نکل گئیں۔ دن بھر ان میں لگی رہتیں لیکن شام کو بلاناغہ بائیسکوپ جاتی اور کبھی کبھی تو دو دو کھیل دیکھ کر پلٹتی تھیں۔۔۔۔ انہوں نے کچھ نئی سہیلیاں بھی پیدا کر لی تھیں اور ان کے ہاں سے تحائف اور خطوط برابر آتے جاتے رہتے تھے۔

انہوں نے رک کر پھر شراب انڈیلی، میں نے ذرا گھبرا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ پھر عجیب طرح درد سے بولے:۔

''سچ کہتا ہوں، اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دل میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مل کر اس کو بالکل ہلکی اور بے اثر بنا دیتے ہیں!''

ساری ہی پی گئے۔ پھر چٹخارے لے کر بولے 'اب کہاں تک اس الم انگیز داستان کو بیان کروں۔ سال بھر یونہی گزر گیا۔ میرے ہاں زخم اب بھر چلا تھا۔ مجھے کچھ مساوات سی ہو چلی تھی، لیکن بیگم کے ہاں یہ نئی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اب ملازموں کی جگہ مجھ سے ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتی تھیں۔ میں ہمیشہ ان کی خفگی ٹال جاتا تھا۔ لیکن میرے دل میں ان کے لیے روز بروز گنجائش کم ہوتی جاتی تھی۔ دو مرتبہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ شب میں سوتے سوتے اٹھیں اور بڑی خاموشی سے سعیدہ کا کمرہ کھول کر گھنٹوں اس میں بیٹھی بیٹی کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہیں ایک دن ان کے نام ایک خط آیا لکھا تھا:۔

''امی تسلیم

آپ مجھ سے خفا تو بہت ہوں گی۔ مگر میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ میرے بچہ ہونے والا ہے اور نہ میرے پاس پیسہ ہے اور نہ میرا کوئی یار و مددگار ہے۔ سب اپنی غرض کے بندے نکلے۔ اگر آپ جلد سے جلد نہ آگئیں تو آپ اپنی سعیدہ کو جیتی نہ پائیں گی۔

آپ کی نالائق سعیدہ''

بیگم خط پڑھ کر پہلے تو بہت بگڑیں بنیں۔ پھر جلدی جلدی سفر کے لیے سامان درست کرنے لگیں۔ میں جب گھر پلٹا تو میں نے بکس اور ہولڈال باہر رکھا دیکھ کر ان سے پوچھا'' آپ کہاں تشریف لے جارہی ہیں؟'' انہوں نے میری طرف خط بڑھا دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے اباؤ اجداد کی روحیں میرے سامنے کھڑی ہیں اور میرے فیصلے کی منتظر ہیں۔ کیسا روشن کیا خاندان کا نام اس لڑکی نے! اللہ رے دیدہ دلیری! کس صفائی سے لکھتی ہے''میرے بچہ ہونے والا ہے'' بس مجھ پر بھوت سوار ہو گیا۔''تو آپ جارہی ہیں؟''

وہ بولیں ''ہاں''۔

میں نے کہا'' تو عمر بھر کے لیے جتنے اسباب کی ضرورت ہو، وہ سب لیتی جائیے گا''۔

انہوں نے ذرا تعجب سے دیکھ کر پوچھا'' کیوں؟''

میں نے کہا'' اس لیے کہ آپ بھی اس حرافہ کے پاس جانے کے بعد میرے گھر میں پلٹ کے نہیں آسکتی ہیں''۔۔۔۔

اور میں غصہ سے کواڑ بھیڑتا ہوا پھر مطب میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لائیں، سفر کے لیے تیار، ہاتھ میں چھتری اور بٹوہ لیے ہوئے۔ میں نے خاموشی سے ان کی صورت دیکھی۔

وہ بولیں ''میں جارہی ہوں''۔

میں نے پوچھا'' آپ نے سب کچھ سوچ لیا ہے؟''

وہ بولیں ''جی ہاں، میں ماں ہوں، میں آپ کو چھوڑ سکتی ہوں، مگر بیٹی کو نہیں!''

میں نے کہا ''بہت خوب، پھر یہ پرس حاضر ہے، جتنا جی چاہے لے لیجئے''۔ میں نے اپنا پرس ان کی طرف میز پر پھینکا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے برسوں کا غبار ایک ساتھ نکل پڑا۔ بیگم بگولہ بن گئیں۔ ''رکھو اپنا پرس، میں تم سے نجس مرد کا کوئی پیسہ لینا حرام سمجھتی ہوں۔ تم کو اپنی شرافت اور نجابت پر بڑا گھمنڈ ہے تم نے کیا اپنی جوانی میں دوسری عورتوں کو نہ تا کا تھا کہ آج تم نے میری سعیدہ کو میرے منہ پر حرافہ کہا۔ میرا ہی دل تھا کہ میں نے تمہارے سے مرد کے ساتھ زندگی نباہی۔ سعیدہ شروع ہی میں نہ ہو گئی ہوتی تو میں کب کی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہوتی۔ تم اور تمہارے مریض! لہو، پیپ، مرہم، پٹی، فنائل اور اینٹی سپٹک کی بو۔ تم کیا جانو کہ عورت کیا چاہتی ہے۔ وہ اپنے میاں کی زندگی کی کیونکر شریک و سہیم بننا چاہتی ہے، وہ کیونکر سیر و تفریح، بازار اور جلسوں میں اسے ساتھ لے کر نکلنا چاہتی ہے۔ تم تو کوڑھیوں، مفلوجوں، لنگڑوں، لولوں اور بیماروں کی کراہ سنتے سنتے، اس قدر سخت دل اور گراں گوش ہو گئے ہو کہ تمہیں میری آہوں کی آہٹ تک نہ ملی۔۔۔۔۔ شکر خدا کا کہ سعیدہ نے بغاوت کی۔ نام میرا رکھا۔ لیکن اصل میں تمہارے ہی خلاف یہ جہاد تھا۔ تم اور تمہاری شرافت۔ تم اور تمہاری بیوی اور بیٹی۔ پرس دیتے ہیں، جیسے یہ رزاق و خدا ہیں۔ لے جاؤ اپنا پیسہ۔ رکھو اس کو سینے سے لگا کے!''

انہوں نے پرس جھٹکے سے پھینکا۔ وہ میز پر اچھل کر منہ پر اس طرح پڑا کہ جیسے کسی نے طمانچہ مارا ہو۔ ناک میں بھی چوٹ آئی اور خون نکلنے لگا۔ میں نے اف کر کے جلدی سے رومال ناک پر رکھ لیا۔ بیگم نے بلا قصد اس طرح مجھے مار بیٹھنے پر ''اوئی'' کہا اور وہ سراسیمہ ہو کر بھاگیں اور جلدی سے موٹر میں بیٹھ کر چل دیں۔۔۔ وہ خاموش ہو کر پھر شراب انڈیلنے لگے۔ میں نے پوچھا ''آپ نے پھر ان کی خبر نہ لی''۔

کہنے لگے ''کچھ شامتیں آئی تھیں''۔۔۔۔ پھر رک رک کر بولے ''سعیدہ بنگلور میں نرس ہے اور لہو، پیپ، فنائل اور اینٹی سپٹک سے نفرت کرنے والی بیگم اس کا حرامی لڑکا کھلاتی ہیں، اور میں۔۔۔۔ یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے!''

۔۔۔۔۔ اور انہوں نے بوتل آخری قطرے تک انڈیل لی؟

☆☆☆

ہرجائی

قاضی عبدالغفار

مشرب رندانہ، مزاج محرور، طبیعت آزاد، عقائد لا مذہبی کی طرف مائل اور پیشہ اخبار نویسی۔ جنگ یورپ شروع ہو چکی تھی۔ میرا اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اور اس زمانہ میں بہت مقبول تھا۔ حکومت کی ٹیڑھی نظریں مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ میں بھی چھیڑ سے باز نہ آتا، اور کچھ نہیں تو میدان جنگ کی خبروں پر سرخیاں ایسی ہی لکھتا تھا جیسے سانپ بچھوؤں کے ڈنک اتحادیوں کی فتح کو بھی شکست بنا دیتا تھا اور دشمن کی شکست بھی میرے اخبار کے کالموں میں ''شاندار مدافعت'' کے نام سے یاد کی جاتی تھی!۔۔۔ پھر کیا تعجب ہے کہ حکومت مجھ سے حد درجہ نا خوش تھی۔

غضب یہ ہوا کہ اسی زمانہ میں افغانستان کی طرف سے خطرات پیدا ہونے لگے۔ افغانوں سے میرے تعلقات وسیع تھے لہٰذا اب تو خفیہ پولیس کی نگرانی مجھ پر اتنی سخت ہوگئی کہ اگر گھر میں بیٹھ کر روٹی بھی کھاتا تو نوالوں کی صحیح تعداد پولیس کے رجسٹر میں درج ہو جاتی تھی!۔۔۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے۔

میرا معمول یہ تھا کہ ہر شنبہ کی شام کو چند دوستوں کے ساتھ شہر کے باہر ایک لکھ پتی دوست کے باغ کی صحبت عیش میں شریک ہوا کرتا تھا، یک شنبہ کا پورا یوم تعطیل وہیں گذرتا تھا، دوشنبہ کی صبح کو میں شہر واپس آتا تھا۔ یہ باغ ایک نوجوان بوہرے سوداگر کا تھا اور اس صحبت احباب میں میرے ایک خاص ہم نفس کلکتہ کے ایک نوجوان بیرسٹر تھے جواب ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ہر ہفتہ کم از کم ۲۴ گھنٹہ، اس طرح بسر ہوتے کہ کچھ موسیقی کا شغل ہے کچھ لطیف اغذیہ ہیں اگر چاندنی رات ہے تو باغ کے وسط میں مرمریں حوض کا کنارہ ہے، کبھی قوالی ہے، کبھی ناچ اور گانا ہے، ہوحق ہے اور اس کے تمام یا اکثر ملحقات!!

اس طرح شنبہ کی شام کو ایک دفعہ ہم سب وہاں گئے، یک شنبہ کو دن بھر شطرنج اور تاش کا شغل ہوتا رہا، رات کو ایک مشہور مغنیہ نے اس محفل کو اپنی موجودگی سے نوازا، دو بجے تک گانا ہوتا رہا جوانوں کی محفل میں اگر شام سے صبح تک طبلہ نہ کھڑکے تو پھر وہ محفل ننگ جوانی ہے!! مگر ''بی صاحبہ'' تھکی ہوئی تھیں، دو ہی بجے گھر چلی گئیں۔ کچھ دیر تو ہم سب لب حوض پڑے ہوئے خود ہی گایا بجایا کیے اس کے بعد جوانی پر نیند غالب آئی، صبح سب کو شہر واپس جانا تھا، اس لیے اپنے اپنے بستر پر جا پڑے۔۔۔

اکی چھوٹا سا پہلو کا کمرہ تھا، جس میں دو بستر لگے ہوئے تھے، ایک پر میں اور ایک پر میرے دوست بیرسٹر صاحب، موسم قدرے گرم تھا اس لیے کمرہ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا۔ لیمپ کی بتی نیچی کر کے اس کو فرش پر رکھ دیا، ہم دونوں سو گئے!۔۔۔

صبح کو تین اور چار بجے کے درمیان میری آنکھ دفعتاً کھلی اور یہ محسوس ہوا کہ گویا کوئی تیسرا شخص کمرہ میں داخل ہوا ہے۔ صبح کاذب کی روشنی کمرے میں لیمپ کی دھیمی روشنی سے مل کر ایک عجب قسم کا غیر قدرتی نور پیدا کر رہی ہو۔۔۔ میں نے دیکھا کہ بالکل سفید۔۔۔ از سرتاپا۔۔۔ لباس پہنے کوئی صاحب کمرہ کے اندر داخل ہو رہے ہیں، وہ آہستہ آہستہ میرے پلنگ کی طرف بڑھتے آتے تھے۔ ان کا حلیہ اور ان کی وضع قطع ذہن نشین کر لیجیے۔

لمبی اور گھنی داڑھی۔۔۔ سفید براق۔۔۔ چہرہ نہایت نورانی۔۔۔ سرخ وسفید۔۔۔ چہرہ کا انداز مغلئی۔۔۔ سفید لانبا کرتا، کمر سے ایک سفید پٹکا بندھا ہوا۔۔۔ سفید شلوار، پاؤں میں۔۔۔ مجھے یاد نہیں کہ کس رنگ کا۔۔۔ پنجابی جوتا۔۔۔ قد میانہ بلکہ میانہ سے بھی کچھ کم۔۔۔ اس وضع قطع کا انسان۔۔۔ بالکل خواجہ خضر!۔۔۔ اور پھر ہمارے گھر میں!! ہمارے تمام تخیلات سے کس

قد ردور اور بعید تھا!۔۔۔ میں ذرا چونکا اور ایک لمحہ ان کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا رہا، پھر ذرا گھبرایا اور گھبرا کر چلایا، ''کون ہے؟ کون ہے؟'' اتنے زور سے میری آواز بلند ہوئی کہ کمرہ گونج گیا اور برابر پلنگ پر نوجوان بیرسٹر صاحب گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ ''کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟'' انہوں نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔۔۔ اس سوال و جواب میں دو منٹ بھی بہ مشکل صرف ہوئے ہوں گے لیکن وہ سفید پوش پیر مرد جہاں کھڑے تھے وہیں غائب ہو گئے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کب گئے، کدھر گئے، کیونکر گئے۔ بہر حال ایک عکس کی طرح وہ میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں نے جب یہ ماجرا نوجوان بیرسٹر صاحب سے کہا تو وہ جھنجھلا گئے۔

''لاحول ولاقوۃ، نیند خراب کر ڈالی، جب ہی تو تم سے کہتا ہوں کہ ذرا کم کھایا کرو، اناڑی کی بندوق کی طرح پیٹ بھر لیتے ہو، بدخوابی ہوتی ہے تو دوسروں کو بھی بے آرام کرتے ہو!''

میں نے جب اصرار کیا کہ میری نظر نے دھوکہ نہیں کھایا تو وہ اور بگڑے:۔

''کہیں تمہارے دادا صاحب تو قبر سے اٹھ کر تشریف نہ لائے ہوں! پوتے کے دیدار کے لیے ترس رہے ہوں گے بچارے! خدا جانے کہاں کہاں ڈھونڈ کر یہاں تک پہنچے۔۔۔ جاؤ دیکھو باہر باغ میں نے رہے ہوں!!''

میں نے پھر کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے زانو کا ایک تکیہ نکال کر میرے سر پر مارا ''الو!'' اور یہ کہہ کر کروٹ لے لی۔

صبح کو ہم لوگ شہر آ گئے، میں دس بجے اپنے دفتر میں آیا۔ یہ وقت میری، تنہائی مصروفیت کا وقت ہوتا تھا اس لیے کہ ۱۲ بجے اخبار کی آخری کاپی پریس کو جاتی تھی۔ لہٰذا دفتر کے اہلکاروں کو عام ہدایت تھی کہ کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے، میرے کمرہ میں نہ بھیجا جائے۔۔۔ ۱۱ بج چکے تھے اور ابھی مجھے ایک ضروری نوٹ لکھنا باقی تھا کہ چپراسی نے اندر آ کر اطلاع دی کہ کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کو جھڑکا:

''تمہیں معلوم نہیں کہ میں اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا؟''

چپراسی نے عذر کیا کہ باوجود منع کر دینے کے وہ صاحب ملاقات پر مصر ہیں۔ بہت ہی جھلا کر میں نے کہا اچھا بلاؤ۔۔۔ دروازہ کا پردہ اٹھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہی رات والے ''خواجہ خضر'' مسکراتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔۔۔ یک لمحہ میں غرق حیرت ہو کر بدحواس ہو گیا، پھر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''آیئے، آیئے، تشریف لایئے'' میں نے بہت ہی ذوق وشوق کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔

''معاف کیجیے میں اس وقت حرج کارکرنا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں، صرف یہ بتا دیجیے کہ مکان پر آپ سے کب اور کس وقت ملاقات ہو سکے گی، تخلیہ میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں'' ۔انہوں نے بہت آہستہ آہستہ اور نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ یہ الفاظ ادا کیے مگر میں تو اب ان سے باتیں کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ ''نہیں صاحب! مجھے فرصت ہے، تشریف تو رکھیے'' میں نے کہا۔ انہوں نے فرمایا ''جی نہیں، اس وقت تو میں نہ ٹھہروں گا صرف ملاقات کا وقت مقرر کرنے آیا تھا۔''

غرض یہ کہ تقریباً پانچ منٹ تک میری طرف سے اصرار اور ان کی طرف سے انکار ہوتا رہا۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ وہ بعد مغرب میرے مکان پر تشریف لائیں۔۔۔

اس دن بعد مغرب میری بے چینی اور بے تابی انتظار نا قابل بیان تھی۔ سات بجے، آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے، دروازے پر کھٹکا ہوتا تھا تو میں اوپر کی منزل سے سڑک تک دوڑتا ہوا آتا تھا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، شاید دس دفعہ اسی طرح اوپر کی منزل سے اترا اور چڑھا!! کبھی اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتا۔ کبھی کوئی کتاب اٹھائی، کبھی کمرہ میں ٹہلنے لگتا۔ آنکھیں دریچے کے باہر، کان آواز پر لگے ہوئے۔۔۔ رات کے ۱۲ بج گئے مگر وہ نہ آئے! مایوس ہو کر بستر پر لیٹ گیا، پھر بھی نوکروں سے کہہ دیا کہ دروازہ کا خیال رکھیں

کوئی آواز دے تو فوراً کھول دیں۔۔۔۔

ساری رات گزر گئی، وہ نہ آئے، صبح کو میں دفتر میں گیا۔ یہ امید تھی کہ شاید دفتر میں پھر تشریف لائیں۔ دن بھر انتظار کے پیچ و تاب میں دل لگا کر کام بھی نہ کر سکا۔۔۔ لیکن وہ نہ آئے! پھر شام کو گھر پر انتظار رہا، ایک دوست کے یہاں جا کر کھانا کھانے کا وعدہ کر چکا تھا، مگر معذرت کہلا بھیجی، دو چار بے فکرے ہی ہی ہاہا کرنے کے لیے آئے، ان کو ٹال دیا۔ لیکن وہ حضرت پھر بھی نہ آئے!۔۔۔ دو تین چار اسی طرح دس پندرہ دن گذر گئے۔ پیشہ کے کاموں اور یاروں کی صحبت میں بڑے میاں کا تصور دھندلا ہو چلا۔۔۔ دس پانچ دن میں بالکل ہی بھول جاتا اگر ایک عجیب تر واقعہ پیش نہ آجاتا۔ جس نے اس معمہ کو اور بھی زیادہ الجھا دیا۔۔۔

دس پندرہ دن بعد، ایک روز شام کو میں اپنے دو ہم پیشہ دوستوں سے ملنے گیا۔ ایک ان میں سے بمبئی کے بہت مشہور اور مقدس ''حضرت مولانا'' اور ''پیرومرشد'' تھے۔ اور دوسرے ایک جدید قسم کے ایڈیٹر۔ میں جب ان ''حضرت مولانا'' کے مکان پر پہنچا تو وہ دوسرے دوست بھی وہاں موجود تھے۔۔۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، ہوتے ہوتے کچھ روحانیت کا تذکرہ چھڑ گیا، باتوں باتوں میں مجھے وہ باغ والا واقعہ یاد آ گیا میں نے کہا'' آپ دونوں صاحبوں کو ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں ایک عجیب واردات ہے مگر مجھ پر ہنسیے گا نہیں، واقعہ بالکل سچا ہے، دماغ میرا بالکل صحیح ہے۔۔۔'' اس تمہید کے ساتھ میں نے وہ واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ جب میں نے صبح کے قریب پیر مرد کا کمرہ میں آنا بیان کیا تو ایڈیٹر صاحب نے قطع کلام کر کے مجھ سے سوال کیا۔

''بتائیے، کس دن اور کس وقت، ٹھیک ٹھیک بتائیے''۔

میں نے ان کو دن اور وقت بتایا اور پھر اپنا قصہ شروع کیا، پیر مرد کا غائب ہو جانا، صبح کو دفتر میں آنا پھر شام کو آنے کا وعدہ کر کے جانا اور پھر کبھی نہ آنا۔ جب میں یہ قصہ بیان کر رہا تھا تو دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں صاحب حیران ہو ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھتے جاتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے بھی ہوتے جاتے ہیں۔

''کس وقت وہ دفتر میں آئے تھے اور کیا گفتگو کی تھی انہوں نے؟ ذرا مفصل فرمائیے''۔ حضرت مولانا نے سوال کیا۔ میں نے وقت بھی بتا دیا اور لفظ بہ لفظ گفتگو بھی دہرا دی۔

''ذرا ان کا حلیہ تو پھر بیان کیجئے''۔ ایڈیٹر صاحب نے فرمائش کی۔

میں نے حلیہ بھی مفصل دہرایا۔

''کیا سمجھے آپ''۔ مولانا نے ایڈیٹر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آپ کیا سمجھے؟'' ایڈیٹر صاحب نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''عجیب!'' مولانا نے فرمایا۔

''عجیب؟'' ایڈیٹر صاحب نے فرمایا۔

میں حیران ہو کر دونوں کا منہ تک رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے شب میں بدہضمی کی وجہ سے خلل دماغ کا دورہ ہوتا ہے تو ان دونوں کو دن میں بھی یہ شکایت لاحق ہو جاتی ہے!!۔۔۔

میں نے کہا'' کچھ تو فرمائیے، یہ اشارے کنائے کیسے؟''

''کہہ دو!'' مولانا نے ایڈیٹر صاحب سے کہا۔

''کہہ دوں؟'' ایڈیٹر صاحب نے مولانا کو جواب دیا۔

ایڈیٹر صاحب سنبھل بیٹھے، انہوں نے کہا ''سنیئے جناب یہ عجیب وغریب واقعہ ہے۔ جو واقعہ آپ نے سنایا بالکل یہی واقعہ مجھ پر گذر چکا ہے، مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میرے پاس بھی وہ پیر مرد ٹھیک اسی شب میں اسی وقت آئے تھے جس وقت وہ آپ کے پاس آئے تھے، اور پھر اسی طرح کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی ہوتے غائب بھی ہو گئے تھے۔۔۔ مگر عجیب تر جو بات ہے وہ یہ ہے کہ صبح کو بھی وہ میرے دفتر میں ٹھیک اسی وقت اور اسی طرح آپ کے دفتر میں، وہی باتیں جو انہوں نے مجھ سے کیں جو آپ سے کیں، اسی طرح مجھ سے وقت مقرر کرا کے گئے جس طرح آپ سے۔۔۔ اور یہ توارد تو دیکھئے کہ میں نے بھی اسی دن وہی وقت مقرر کیا جو آپ نے مقرر کیا تھا۔۔ مگر وہ پھر آج تک ٹوٹ کو نہ آئے جس طرح آپ منتظر ہیں میں بھی سراپا انتظار ہوں!۔۔۔ اتنا کہہ کر ایڈیٹر صاحب نے رومال سے چہرہ کا پسینہ خشک کیا پھر فرمانے لگے:۔

''یہ واقعہ دوسرے ہی دن میں نے مولانا سے بیان کر دیا تھا۔۔۔ پوچھیے مولانا سے۔۔۔ میرے آپ کے درمیان ایک خفیف جزو کا بھی کوئی اختلاف نہیں!۔۔۔ عجیب، عجیب!!

ہم تینوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔۔۔۔

میں نے کہا ''تصور اور تو ہم کے توارد کی یہ ایک عجیب مثال ہے''۔

''تصور اور تو ہم؟'' مولانا نے تعجب کے لہجہ میں فرمایا۔

''تصور اور تو ہم! آپ اس واقعہ کو تصور اور تو ہم سمجھ رہے ہیں۔ نہیں صاحب! نہیں! نہ یہ تصور ہے اور نہ تو ہم نہ توارد! روحانیت کی ایک ماورائے عقل وفہم کارفرمائی ہے! آپ تو مادہ پرست ہیں روح کے ان معجزات اور تصرفات کو کیا خاک سمجھیں گے، لیکن آپ کو قائل ہو جانا چاہیے۔۔۔ اب تو قائل ہو جانا ہی چاہئے کہ اس عالم ظاہر کے علاوہ کوئی باطن بھی ہے جہاں ایسی باتیں بالکل ناممکن ہیں۔۔۔''

میں نے کہا ''مولانا! دماغ کے اندرونی دنیا میں ایسے عجائبات کا ظہور ناممکن نہیں۔ اس علم کے ماہرین، اس قسم کے واقعات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔۔۔''

''خدا کے لیے حضرت!'' مولانا نے بگڑ کر فرمایا۔۔۔ ''ماہرین اور مبصرین کا ذکر چھوڑیئے۔ ان کم بختوں نے زندگی تلخ کر دی ہے، روز کلیات قائم کرتے ہیں، روز ان کو توڑتے ہیں، دیواریں بناتے ہیں اور گراتے ہیں۔ عقل کے چکر نے ان کو گھن چکر بنا دیا ہے۔ ''روحانیت'' کی لطیف دنیا میں جو کچھ ہوا کرتا ہے اور ہو سکتا ہے اس کو یہ احمق کیا جانیں۔۔۔''

میں نے کہا ''خاک ڈالیے اس بحث پر، مگر یہ تو بتائیے کہ وہ خواجہ خضر جنہوں نے مجھے بھی سونے سے جگایا اور ایڈیٹر صاحب کو بھی بیک وقت۔۔۔ حالانکہ میں اور ایڈیٹر صاحب اس وقت ایک دوسرے سے کم از کم ۱۵ میل کے فاصلہ پر سو رہے تھے۔۔۔ اور پھر وہ دن میں بھی بیک وقت دونوں کے پاس آئے تھے، کوئی ان کا مقصود بھی تھا یا محض دل لگی تھی؟۔۔۔

''کوئی پیام لائے ہوں گے، کوئی بات کہنا چاہتے ہوں گے، یا محض اپنی صورت دکھا کر تمہیں متنبہ کرنا چاہتے ہوں گے۔۔۔ یا کوئی اور منشا ہوگا۔۔۔ کیا معلوم کسی کو!'' مولانا نے میرے اعتراض کا۔۔۔ اپنے خیال میں بہت ہی مختتم جواب دیا!!

بحث کچھ اور بڑھتی لیکن پاس کی مسجد سے اذان کی آواز آئی اور مولانا نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔

میں اور ایڈیٹر صاحب راستے بھر یہی ذکر کرتے ہوئے آئے۔۔۔ وہ بھی حیران، میں بھی حیران! ''کچھ بھی ہو'' میں نے کہا ''وہ پیر مرد ہیں بہت ہرجائی!''۔۔۔۔

☆☆☆

سمن پوش

''شہید زخم شمشیر تغافل اجرہا دارد''

مجنوں گورکھپوری

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی۔ ناصر کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا، جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہوگئی تھی، اور مبصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں اس پیکر جمال میں محو ہو گیا جو صفحہ قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ جنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا، گویا وہ کہہ رہی تھی ''ٹھہرو! اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو''۔ اس کے رخسار گلابی تھے، بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالم محویت سے چونکا۔ ایک لرزش خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ ناصری جو اپنا سامان نقاشی لینے دوسرے کمرہ میں چلا گیا تھا واپس آ گیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصر کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ نہ اب ہے۔ میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذب نظر صورت سامنے تھی جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی، میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔

آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ کی طرف سے جا رہا تھا۔ یکایک میرے قلب کی حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہو گئی۔ میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ مجسمہ کے پاس بنچ پر بیٹھا ہوا کون پڑھ رہا تھا۔ وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی! اس کے گلے میں وہی چنبیلی کا ہار تھا۔ جس کے ساتھ وہ بلا ارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اس کی طرف بڑھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ باوجود دماغ کی پریشانی کے میں نے اس قدر جائزہ لے لیا کہ اس کا چہرہ زرد تھا، جسم کی ساخت نازک تھی، رنگ میں صباحت تھی، دوش تک وہ عریاں تھی، اس کی بلوری گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے، اور وہ ان کو برابر کرتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ ارضی کو دیکھ رہا تھا یا نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی، اس لیے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لیے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں

کانپنے لگا، کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات، عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس نے مجھ کو مشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر سے مجھ پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا اور ایک تانگہ میں بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں اپنے احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشانہ بنتا، لہٰذا میں نے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے ''نگار خانہ'' میں دیکھ آیا تھا اور جس کی اثر آفرینیوں نے کس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا صرف شاد کیشی کا، ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔ سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے ''سمن پوش نازنین'' کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچاتا اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیے، چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو تماشہ کی غایت کی طرف دھیان تھا، نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش، میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کیے ہوئے ارچسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی، وہ تنہا تھی، اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا ''اس کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کیے ہوئے بیٹھی ہے؟'' وہی جس کے گلے میں ہار ہے۔

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی اور سر ہلا کر جواب دیا ''نہیں تو! کہاں بیٹھی ہے؟''

''بالکل سامنے''۔ میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا، آرچسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے''۔

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا۔ ''خواب تو نہیں ہیں دیکھ رہے ہو؟ آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے''۔ اس نے مجھ سے کہا ''کوئی عورت نہیں!'' اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''شاید مجھ کو مغالطہ ہوا'' اور فوراً بحث بدل دیا۔ جب تک میں تھیٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی دردمند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی، آج اس کے سامان آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی ایک خوبصورت پنکھا جس کو کبھی کبھی جنبش دے دیتی تھی۔ جب تماشہ ختم ہوا اور سب چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ بھی اٹھی اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی ہجوم میں غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر پھر اس کی جھلک دیکھی، اس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ ''کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے ازسرِنو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا واہمہ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے''۔ میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ ''لیکن اس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لیے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو''۔

اسی کشمکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا۔ یعنی میری دہشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی، عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالم اجسام سے، کسی نہ کسی غرض

سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن ''سمن پوش'' اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اس کی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لیے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی۔ اے کیا تھا اور دور تعطیل سے گزر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ ختم کر کے کم و بیش ہر شخص کو گزرنا ہوتا ہے یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم۔ ایس۔ سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسب معاش کی فکر سے بے نیاز اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال ہی میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور ان لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب ان کی مسرتوں میں شرکت کریں۔ سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی معاف نہ کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف ہو سکتا تھا جب کہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر الم ناکیوں سے ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں، بہر حال سائرہ کو میری طرف سے حسن ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحت ناک لمحے میری معیت میں گزریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کاٹنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا میں نے فوراً سامان درست کرلیا، میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

''جمال منزل'' واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی۔ جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لا کر اتارا تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا، جس نے ایسے دیہات میں اس ''فردوس ارضی'' کو اپنے لیے تعمیر کرایا ہوگا۔ اس میں ذوق علیم اور حسن لطیف کہاں تک رچا ہوگا۔ اس کے علاوہ ''جمال منزل'' سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لیے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا اور پھر بھی ان کو میری نظر نہیں آئی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔ شمیم نے کہا ''تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، نقاش تھا اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لیے بیتاب ہو گے، اس کا نام ''جمال الدین'' تھا''۔

''جمال الدین'' میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈرامہ ''ہذیان محبت'' بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

سائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں۔ اس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا ''آپ نے برا کیا۔ سہیل بھائی کے لیے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دھننے کا سامان فراہم کر دیا۔ ابھی وہ سفر سے ماندہ و خستہ چلے آرہے ہیں۔ آپ نے ان کو راحت شب سے بھی محروم کر دیا''۔

میں نے مسکرا کر کہا ''نہیں! نہیں! قصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہوگیا''۔

''میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، سنا ہے اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ علم کیوں قتل کر دیا۔ جمال الدین اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور غالباً ڈیڑھ سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعریوں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں اور ان کا کسی رو میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز نہیں''۔

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجہ سے تمسخر و استہزاء پایا جاتا تھا، میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا ''شمیم! تمہاری گفتگو نے تو مجھے بہت دکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی، یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں، یہ مرض عالمگیر ہے، جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔ تم جو دل کو ایک پارہ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے، تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو، بتاؤ تم نے اتنی عمر ضائع کر کے کون سی نئی بات حاصل کی؟''

آنچہ دل نام کردہ ای بہ مجاز
روبہ پیش سگان کو انداز

شاید ہر شخص جو انسانوں، حیوانوں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو غلاف قلب (Pericardium) میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے، مگر تم کو کیا کہوں، بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انہیں خود فریبیوں میں مبتلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ کارلائل نے اسی لیے ایسے لوگوں کا نام منطق تراش (Logic Choppes) رکھا ہے۔ اسی لیے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقا کا سدباب ہوگیا۔ وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو بہت صائب رائے اس بارے میں دی ہے۔

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، ورنہ آج میمتھ کی طرح یہ مخلوق بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی جو ''انسان'' کہلاتی ہے۔

میرے ہیجان کا دور شروع ہوگیا۔ میں انسان کا ''جہل مرکب'' نہیں برداشت کر سکتا یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے اس لیے جہاں سوئی سے کام لینا چاہیے۔ وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں اور سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل ہمیشہ مجھ سے متنفر ہو جایا کرتا ہے، چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لیے ہوئے ہیں۔ شمیم نے میری

رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا اگر ان کی والدہ درمیان میں نہ بول دی ہوتیں۔ اچھا اب بے کار بحث کو جانے دو ایک لطیفہ اور سنو گانے والوں میں مشہور ہے کہ ''جمال منزل'' روحوں کا مسکن ہے اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا بھی کیا تھا مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ **معتقدات** کا کیا اثر ہوسکتا ہے''۔

میں نے اپنے دل میں کہا ''نہ جانے گانے والے جاہل ہیں یا آپ''۔ شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے، انہوں نے کہا ''مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا''۔

''غلط خیال ہے'' میں نے جواب دیا میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے، اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہوگا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا''۔

رات زیادہ ہو چکی تھی ہم ایک دوسرے کو ''شب بخیر'' کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا ''آپ کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے، دیکھئے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، آج کے مبحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا''۔

میں نے ہنس کر جواب دیا ''سائرہ، بچوں کی سی باتیں نہ کرو'' اور آکر بستر پر لیٹ رہا، نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔ میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا، گرمی کی سہانی رت تھی، پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے میں اٹھ بیٹھا، شمیم نے کہا ''ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں، یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے؟''

''کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو گرم نہیں کئے؟'' میں نے پوچھا۔

شمیم ہنس دیئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے ''تم شاید رات بھر سوئے نہیں'' اچھا چلو ہوا کسل دور کر دے گی''۔

''ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی'' یہ کہہ کر میں شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

باغ کو میں نے امیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا، قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے علوئے تخیئل کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پرداخت کرنے وہاں کوئی نہیں، تالاب کے چاروں طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی ''سمن پوش'' یاد آ گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں پھر عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کوئی خاص بات نہیں'' میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا ''اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں'' میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا۔ چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے۔ لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی اس پر گھاس اگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی، میں نے بیٹھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر ناہید لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے میرے ایماء پر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا، دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا اس لیے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا، اور زمانے کی رگڑ نے نقوش کو کافی متاثر کیا تھا میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور غور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں۔ لیکن کچھ بس نہ چلا۔ شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا تا کہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا، آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبدالعلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چائے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز ''ناہید کا مزار'' رہا۔

مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا۔ جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم، فونوگراف، تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں، مگر یہاں اس کی کوشش کرنا ''بت پرستوں کے شہر میں نماز'' کے لیے جہاد کرنے سے کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے۔ مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح پر نظر ثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا۔

نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے، رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ بدستور جاری تھا، کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرہ سے سگریٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی ''سمن پوش'' اس وقت میں نے حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا نہ ہراس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

''تم یہاں کس لیے آئی ہو؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔ ''اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟''

اسی طرح اس نے پھر ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''اس لیے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے''۔

''کیا تم سکون سے محروم ہو؟''

''یک قلم''۔ یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

''اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی ہیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔ ''میرے لیے دعا کیجیے۔ جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لیے دعا نہیں کی۔ بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا'' اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

''تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

اب ''سمن پوش'' قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا میں سمجھ گیا۔

''قتل'' میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

''کسی کو اس کا صحیح علم نہیں'' اس نے کہا ''آپ میرا پورا افسانہ حیات سننا چاہتے ہیں تو سنئے! میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے''۔

''ہاں۔۔۔''

''تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟'' میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے، گویا اپنی داستان کو دہرانا اس کے لیے بڑی آزمائش کا کام تھا۔

''ذرا صبر کیجیے تو میں کوشش کر کے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کر دوں'' اس نے کہا ''میرا قاتل میرا شوہر ہے لیکن اس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی۔ اس کو دھوکا ہوا جس کا مرتے دم اس کو علم نہ ہو سکا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس کی مثال اس دور مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ سمجھئے وہ مجھ کو پوجتا تھا۔

آپ خاموش سنتے جایئے۔ میرے لیے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہوگیا اور اس ویرانہ کو آباد کر کے بیٹھ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا میرے دونوں جہاں تیری آنکھوں میں ہیں۔ ''جمال منزل'' اس نے میرے لیے بنوائی تھی اور میں! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، دن رات سب اس کی تجلیاں ہیں۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اس کے طفیل ملی ہے۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرض اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برآ نہیں ہوسکتیں''۔

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے، وہ دم لینے کے واسطے رک گئی، میں بے خودی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

''میں پارسی تھی یعنی آتش پرست'' اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان شروع کر دیا ''اور ایکٹنگ میرا ذریعہ معاش لیکن اگر چہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا تھا، مجھے کسی سے بھی انس نہ ہوا تھا۔ جمال نے مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کیا۔ اس کو مجھ سے محبت پیدا ہوگئی۔ اس کے ایک ایک لفظ، اس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بو آتی تھی۔ میں بھی اس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی ہستی مجھ کو دنیا سے نرالی نظر آئی۔ اس کی ہنسی میں ہمیشہ دکھ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں پپیہے کی سی دلدوز تاثیر تھی، سوز و گداز اس کے خمیر میں تھا۔ وہ سراپا تصویر درد تھا۔ میرا میلان ٹریجڈی کی طرف تھا اس لیے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا''۔ وہ پھر اس مرتبہ زبان تر کرنے کو رکی۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہذا خاموش منتظر رہا۔

''میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟'' اس نے نہ جانے کس حال سے پوچھا۔ اس کا چہرہ اس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا''۔

''بالکل نہیں! میں اس گھڑی کا مشتاق تھا''۔ میں نے جواب دیا۔

''میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔'' اس نے مترحمانہ لہجہ میں کہا۔ ''ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی''۔

''ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل لمحہ مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لیے وقف کر دی۔ وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ اس نے میری تصویریں کھینچیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہے۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا۔ میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ یکا یک زمانے نے ایسی گردش کی کہ بات کی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے، بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے پردہ رہتی تھی۔ جمال نے اگر چہ تنہائی اختیار کر لی تھی، تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آ جایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شیدا مشہور تھا، ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں آ کر رہا کرتا تھا۔ فیروز کی طبیعت متبذل اور عامیانہ تھی اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنی گئی تھیں مگر جمال اس کی ہولناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا، شاعر یا صناع انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گزرتی تھیں، اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لیے اور بھی مطمئن

تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتاپور جانا پڑا، رات کو آٹھ بجے جب کہ اس کی واپسی کا وقت تھا، میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے کے متصل ہے بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی دفعتاً مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ روشنی کم کیوں کر دی؟" میں سوال ختم کرنے نہ پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور دل میں خوفناک مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا مگر کم بخت پر بہیمت کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لیے نہیں بلایا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی۔ اس کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ فیروز پھر میری سمت بڑھا لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے جس وقت اس نے یہ دیکھا اس وقت میں نے اپنے کو فیروز کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔ جمال اف اف کرتا ہوا اپنے اسٹوڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی غضب ناک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوش غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی اس نے مجروح شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا "دغاباز! تیری زندگی کا ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے" مجھ میں پندار ایسا تھا کہ "دغاباز" خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی بریت کے لیے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب جذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لیے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا۔

ناہید کے آنسو گرنے لگے۔ میں تڑپ گیا، چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پونچھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا۔

"آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے۔ مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شکسپیر کے مشہور ڈرامہ "اتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ میں گھنٹوں "ڈسڈیمونا" پر شک کرتی رہی۔ میں نے جمال سے کہا تھا کہ کاش! مجھے اس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا۔ اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھی چلتے چلتے اس نے کہا "ہاں ایک بات بھول گئی۔ جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے۔ مجھے مار کر اسے تسکین نہ ہوئی اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کرا دیا۔

وفا آموختی از ما بکار دیگران کردی
ربودی گوہرے از ما نثار دیگران کردی

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجیے۔

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام
گر بخود ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کا سانس لے سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے تو جا کر اس پیش قبض کو بھی دیکھ لیجیے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا اور جو ''اسٹوڈیو'' میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے سمن مزار تک اس کو جاتے دیکھا، جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا ''اسٹوڈیو'' رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں سے ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں اس لیے کہ تم مجھ کو کبھی دیوانہ یا فاترالعقل نہیں سمجھو گی۔

میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرایا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی۔ لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لیے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا دعائی اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے۔ کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطقی اپنے اصول، موضوع اور علوم متعارفہ لیے ہوئے بیٹھا رہ جاتا تھا اور ہم دیکھ لیتے تھے کہ ''ضدین'' کا اجتماع اور ''نقیضین'' کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو مل، اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔ اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے، لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائیگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی صناعی نہیں ہے جس کا نام مجھے بتایا گیا۔ بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

☆☆☆

گناہ کا خوف

محمد علی ردولوی

عبدالمغنی صاحب نے مختاری کے پیشے میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ ڈپلوما والے وکیل بیرسٹر کیا کریں گے۔ بڑے بڑے زمیندار، تعلقدار، مہاجن خوشامدیں کرتے تھے۔ کمشنری بھر میں کون ابتدائی مقدمہ ایسا ہوتا تھا جس میں عبدالمغنی صاحب دو فریق میں سے ایک کے مددگار نہ ہوں۔ ان کی ترتیب دی ہوئی مسل دیکھ کر چوٹی کے وکلا دنگ رہ جاتے تھے اکثروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر اس شخص نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا ہوتا تو یہ ہائی کورٹ کے بہترین ایڈوکیٹس میں سے ہوتا۔

عبدالمغنی صاحب نے بلا کا دماغ پایا تھا۔ پر نہیں کٹے تھے۔ صوبہ بھر میں کہیں کا مقدمہ ہو اور کیسے ہی پیچیدہ معاملات ہوں۔ اگر فریق مقدمہ ان تک پہنچ گیا تو سب مشکلیں حل ہو گئیں۔ زبان میں نہ معلوم کیا جادو تھا اور نہ معلوم کیسے اکھڑ یا دتھے کہ آدمی کو رام کر لینا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جہاں صلح کا موقعہ ہوا دوسرے فریق کے دل میں جگہ کر کے صلح کرادی۔ جہاں لڑائی کا موقع ہوا مخالف فریق کے بہترین آدمی توڑ لیے۔ کوئی دوسرا ہزار دو ہزار میں کال نکالے یہ سو دو سو میں کامیاب ہو جائیں۔

وکیل نہ ہونے کا خود ان کو کبھی افسوس کرتے نہیں سن۔ اور افسوس کرنے کا موقعہ ہی کہاں تھا۔ کام اتنا تھا کہ فضول خیالی گھوڑے دوڑانے کا موقعہ بھی نہیں ملتا تھا۔ وکیلوں کے یہاں ایک محرر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہی بڑا ہوا جس کے یہاں دو ہوئے۔ ہائی کورٹ کے اونچے اونچے وکلاء کے ساتھ دو تین جونیئر لگے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں بیس کام کرنے والے تھے اور پھر نہ جونیئر کا سوال نہ سینئر کا۔ خالی ہر شخص کی فطری قابلیت دیکھ کر کام سپرد کیا جاتا تھا۔ جو اپنا کام سمجھ کر کرتا تھا۔ ان کے جلسے میں مقدمہ کے ہر پہلو کے اسپیشلسٹ موجود تھے۔ حسب حیثیت با موقع اعتبار کرنے والے دیدار و چشم دید گواہ مہیا ہو سکتے تھے۔ ان کے جلسے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سو پچاس برس کا سادہ کرم خوردہ کاغذ نکال دیں۔ دھواں دے کر نئے کاغذ کو پرانا بنا دیں۔ تین دن کے اندر حاشیہ کو دیمک سے چٹوا دیں، متن ویسے کا ویسا ہی رہے

دستاویزوں میں سے الفاظ غائب کردیں اور عبارتیں اس طرح داخل کردیں کہ بڑے سے بڑا تحریر شناس دھوکہ کھا جائے۔ ان کے ملنے والوں میں ایک منشی صاحب تھے جو بائیں ہاتھ سے اور پاؤں سے بھی لکھ لیتے تھے اور شان خط بدل دیتے تھے۔ ہفت قلم تھے۔ اس معنی میں نہیں کہ نسخ نستعلیق شکستہ وغیرہ وغیرہ لکھ لیتے تھے بلکہ اس رو سے کہ مختلف لوگوں کے انداز خط کی ایسی نقل اتارتے تھے کہ خود لکھنے والا اگر کچھ دن بعد دیکھے تو نہ جانے۔

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اکثر ضرورت ہو تو مسل گھما دیں ریل پر سے، کچہری کے احاطے سے، گھر سے یا جہاں سے بہترین موقع ہو۔ بستے سے ضروری کاغذ غائب ہو جائے، باقی ویسے ہی رکھے رہیں۔ بالکل اسی طرح کا بستہ رکھ دیا گیا اور گواہ گھر سے کا جل کا چور اصلی بستہ لے گیا۔ اپنے یہاں کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص کی خود تعریف کرتے تھے کہ انہوں نے وہ جرات کی اور صفائی کا وہ کمال دکھایا کہ دوسرا ہوتا تو پاؤں کانپ جاتے اور دھر لیا جاتا۔ ایک بہت بوڑھے فریق مخالف عبا قبا پہنے۔ جاڑوں کے دن، بغل میں بستہ دبائے اپنے وکیل کے پیچھے کھڑے بحث سن رہے تھے ان کی بغل سے بستہ نکل گیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی لگے رہتے تھے جو لڑائی بھڑائی میں بند نہ تھے مگر یہ سب دوسروں کے لیے کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مقدمہ بازی میں اور عشق بازی میں سب کچھ جائز تھا۔

مگر خود اپنے لیے عبدالمغنی صاحب ان تمام باتوں سے علیحدہ رہتے تھے۔ مقدمات معاملات کی اور بات ہے۔ مثلاً بیان ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان زمیندار تھا جو بالغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی پر مقدمہ چلانے والا تھا، سب سامان لیس تھا۔ صرف دعویٰ داخل کرنا تھا۔ اسٹامپ خرید لیا گیا تھا۔ میعاد میں صرف تین دن باقی تھے اگر وہ دعویٰ ہو جاتا بڑے بھائی کا دیوالیہ نکل جاتا اور یہ بھی زیر بار ہو جاتا۔ بڑا بھائی ان کے پاس آیا۔ عبدالمغنی نے شکار کے بہانے سے اس لونڈے کو پھانسا اور تین دن کے بجائے چار دن کے لیے اس کو نہ جانے کہاں الوپ کر دیا۔ کسی کو خبر تک نہ لگی۔ میعاد نکل جانے کے بعد چھوڑ دیا اور کچھ ایسی چالیں چلے کہ وہ لونڈا جس بے جا کا دعویٰ کرنا کیسا ان واقعات کا ذکر کرتے ڈرتا تھا۔ یوں بلا وجہ کسی کا رواں کبھی نہیں ستایا۔ نہ اپنے ذاتی معاملات میں ان کو کسی کے ساتھ زیادتی کرتے دیکھا۔ محلّہ میں ہر شخص سے یگانگی کا برتاؤ تھا اور کون ایسا تھا جس کی خدمت انہوں نے نہ کی ہو، اپنی بات کے دھنی تھے اور ارادے کے ایسے مضبوط تھے کہ جس بات پر قائم ہو گئے پھر اس سے نہیں ہٹتے تھے چاہے کچھ ہو جائے۔

ایک مرتبہ طاعون آیا۔ بیماروں کی خبر گیری، غریبوں کی تیمارداری، میتوں کا دفن کروانا، سب اپنے ذمے لے لیا۔ طاعون کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں مگر یہ ہر جگہ پل پڑتے تھے۔ نہ معلوم کتنے مردے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارے، لوگوں نے کہا انجکشن لے لو مگر انہوں نے پرواہ بھی نہ کی۔ اس کے مرشد نے ایک تعویذ بھیجا تھا وہ تو ضرور کرتے کے نیچے گلے میں ڈال لیا تھا۔ اور سورۂ تغابن کی مزاولت رکھتے تھے اور بس۔ طاعون کی بلا ختم ہونے کے بعد عبدالمغنی کا اثر اردگرد اچھا خاصا بڑھ گیا تھا۔ اول تو ایسے آڑے وقت میں لوگوں کے کام آئے تھے۔ دوسرے رفتہ رفتہ کچھ جائیداد بھی پیدا کر لی تھی، بہت سی دوکانیں بنوالی تھیں، جن میں کرایہ دار بساتے وقت کرایہ کا خیال اس قدر نہیں کیا جاتا تھا جتنا اثر بڑھانے اور لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کا چنانچہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے الیکشن میں ان کا کنڈیڈیٹ اور ان کی پارٹی ہمیشہ جیتتی تھی۔ انہیں وجوہ سے اگر مختار صاحب کسی سے کوئی بات کہہ دیں تو اس کو ٹالنا مشکل ہو۔ چنانچہ ان کے مکان کے قریب ایک زمین تھی جو ایک شخص نے مول لی تھی۔ عبدالمغنی اس کے خواہش مند تھے۔ یہ اراضی ان کے بھی موقع کی تھی اور اس کے بھی مگر ان کے رعب کی وجہ سے وہ انکار نہ کر سکا۔ اسی زمین پر انہوں نے ایک مختصر سا مکان بنوایا تھا جو ابھی تیار ہوا تھا، اور خیال تھا کہ مہمانوں کے لیے وقف رہے گا۔ نماز روزے کے بڑے پابند تھے مگر اسی کے ساتھ زاہد خشک بھی نہ تھے۔ دوست احباب کے ساتھ چوک بھی چلے جاتے تھے۔ خود ان کے گھر پر بھی اس طرح کی صحبتیں آراستہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے کمرہ میں کونے میں بایاں اور تان پورہ بھی رکھا رہتا تھا مگر یہ سب دوسروں کی خاطر اور آشنا پرستی میں گوارا کرتے تھے۔ خود ہمیشہ بے لوث رہتے تھے حسن پرستی تلکو جائزہ جانتے تھے۔ مگر تر دامنی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ ریاست پور میں کسی زمانہ میں مختار تھے اس سلسلہ کو منقطع ہوئے برسوں گزر گئے تھے لیکن ان کے نام کا مختار نامہ آج تک پڑا تھا۔ رئیس صاحب کی جائیداد چوتھائی نہیں رہ گئی تھی کچھ اسی وجہ سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے رئیس صاحب کو مشورہ دیا کہ مختار نامہ صاحبزادے کے نام ہو جائے۔ یہ سب کچھ تھا، مگر آج تک رئیس کو اپنا آقا ہی سمجھتے تھے، اور جو کام ہوتا تھا اپنا سمجھ کر کرتے تھے۔ رئیس صاحب کے بیٹے اور یہ قریب قریب ہم سن تھے جس وقت کا یہ واقعہ بیان کرتا ہوں، عبدالمغنی صاحب چالیس اکتالیس برس کے رہے ہوں گے اور شہامت علی رئیس صاحب کے بیٹے کا سن ۳۵ برس کے قریب ہوگا۔ آدمی ذرا شوقین مزاج تھے مقدمات کی پیروی میں بہت آیا کرتے تھے:

فکر بازاری بھی، ہر وقت ہی درباری بھی اک مصیبت ہے جوانی بھی زمینداری بھی اور چونکہ عبدالمغنی صاحب کی وجہ سے کھانے اور قیام کی جگہ سے بے فکر تھے، اس لیے شوق بھی آزادی سے پورا ہوتا تھا۔ عبدالمغنی صاحب کے گھر میں ان کا کمرہ علیحدہ تھا جو سڑک کی

طرف کھلتا تھا۔اس لیے اگر رات کو انہوں نے کسی کو بلایا بھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔عبدالمغنی صاحب سے کوئی تکلف نہ تھا خود ان کا دل چاہا یا شہامت علی کی خاطر سے منٹ دو منٹ کو چلے بھی آئے اور یہ دیکھ کر کہ خاصدان میں پان اور لوٹا، گلاس پانی کا، گھڑا سب موجود ہے چلے گئے۔

شہامت علی جب مقدمہ کے سلسلہ میں آتے تھے تو عموماً دو تین دن رہتے تھے اور جب شہر کے قیام کا کوئی عذر معقول نہ رہ جاتا تھا تو چلے جاتے تھے۔ایک مرتبہ خلاف عادت کئی دن رہے چہرے کی کچھ پریشانی کچھ فکرمندی سے عبدالمغنی کو پتہ چلا، پوچھنے لگے خیر تو ہے۔

شہامت علی۔یار کیا کہیں، یہ سامنے درزی کی دکان نہیں ہے اس کوٹھے پر ایک رنڈی آئی ہوئی ہے۔کہیں باہر کی ہے۔ میں نے ایکی ہی دورے میں دیکھا ہے۔بھئی ہم تو کھیت رہے مگر وہ ظالم کسی طرح رنگ پر آتی ہی نہیں۔کچھ ہم نے بھی حماقت کی کہ اپنے دل کا راز اس پر ظاہر کر دیا۔اس کے بعد اب تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ گھسن خان کو درمیان میں ڈالا مگر وہ پابندی کا عذر کرتی ہے۔اور یہاں یہ حال ہے کہ خواب وخور حرام ہے۔رات کی نیندیں اڑگئی ہیں اور جو ہم کوشش کرتے ہیں وہ اور کھنچتی جاتی ہے۔

عبدالمغنی۔ان اونچی رنڈیوں میں یہی تو خرابی ہوتی ہے کہ یوں خاطر مدارات میں لگاوٹ سب کچھ کریں گی مگر معاملے کی بات پر عجیب مزاج کی لینے لگتی ہیں۔اور اگر کہیں جھوٹ موٹ کی نتھ پہنے ہوئیں تو آشنائی نہ ہوئی قلعہ ہی فتح کرنا سمجھئے۔چھوٹتے ہی بی نائکہ صاحب کہتی ہیں۔نا صاحب، ابھی مری بچی کم سن ہے کچھ دن آئیے جائیے، اٹھئے بیٹھیے،لڑکی سے مانوس ہو جائیے، آپ اس کی طبیعت پہچان لیں وہ آپ کے مزاج سے واقف ہو جائے پھر لونڈی کو عذر ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اگر پیشے میں آچکی ہے تو نوکری کا سوال پہلے ہی دھرا ہے مستقل تعلق کیجئے، پابند کیجئے اور خود بھی پابند ہو جائیے۔پھر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ادھر تعلق ہوا نہیں، ادھر عیاشی کے گزٹ میں نام چھپا نہیں۔اگر بڑے بڑے لوگوں کے نام سے یہ اپنے کو نہ منسوب کریں تو اعلیٰ طبقے والی کہلائیں کیوں کر اگر چوری چھپے تعلق کیجئے تو اس میں بھی جب تک مہینوں حاضری نہ دیجئے اور ایک کی جگہ چار خرچ نہ کیجئے کام نہیں چلتا۔تمہارے معاملے میں اتنا غنیمت ہے کہ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔باہر والے کی رسائی چوری چھپے کبھی کبھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں دام بھلے چنگے ہاتھ آجاتے ہیں اور عام طور سے کمانے کا نام بھی نہیں ہوتا۔خیر چلو ذرا ہم بھی دیکھیں۔اسی طرف سے نیا مکان بھی دیکھتے آئیں گے۔آج کئی دن سے نہیں گئے۔تخت، پلنگ، کرسیاں وغیرہ تو پہنچ گئی ہیں ذرا دیکھنا ہے کہ کس طرح سے سجا جائے اس طرف سے کھڑے کھڑے وہاں بھی چلنا مکان کی آرائش وغیرہ میں تمہارے سلیقے کے ہم ہمیشہ سے قائل ہیں۔

اس رنڈی کے یہاں پہنچ کر میاں عبدالمغنی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہ کہا، مگر شہامت علی کا ایسا ادب ولحاظ کیا گویا یہ ان کے ادنیٰ ملازم ہیں۔ایک ایک گلوری نوش کی اور رئیس صاحب کی طرف سے کچھ دے کر دونوں آدمی اٹھ آئے۔ لیجئے صاحب وہاں رنگ ہی بدل گیا ادھر یہ لوگ رخصت ہوئے اور ادھر نائکہ نے استاد گھسن خاں کو بلایا کچھ سرگوشیاں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملہ روبراہ ہو گیا۔ پیغام بھیجا کہ لونڈی کو حکم میں کبھی عذر تھا نہ ہے۔صرف بات یہ ہے کہ رات میں دوسرے کی پابندی ہے، دن کو جب چاہے گھڑی دو گھڑی کے لیے طلب کر لیجئے۔

اب دقت یہ آن پڑی کہ رات کے لیے تو ان کا کمرہ مناسب تھا مگر دن کے لیے بالکل ناموزوں تھا۔عبدالمغنی کے اعزاء، نوکر چاکر،لڑکے سب ہی موجود تھے۔مناسب یہی معلوم ہوا کہ وہی نو تعمیر مکان تخلیہ کے لیے کام میں لایا جائے۔

عبدالمغنی کچہری جا چکے تھے۔ چنانچہ شہامت علی نے ایک لڑکے کو دوڑایا کہ عبدالمغنی سے اس مکان کی کنجی مانگ لائے،

یہ بھی کہلا بھیجا کہ جب فرصت ہو تو خود بھی چلے آئیں۔ کنجی تو انہوں نے بھجوادی اور خود تھوڑی دیر میں آنے کو کہا۔ کلید مراد ہاتھ آگئی، اب عبدالمغنی کو کون یاد کرتا ہے۔ انہوں نے نوکر کو تو اس رنڈی کے یہاں بھیجا اور خود کنجی جیب میں لے کر اس نئے مکان کی طرف چلے۔ سب سے پہلے نل کھول کر دیکھا کہ پانی آرہا ہے۔ اس کے بعد پلنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ نواڑ کی پلنگڑیاں متعدد بچھی ہوئی تھیں۔ اونھ، تکیہ بچھونا نہیں ہے نہ سہی، لوٹا بھی نہیں ہے۔ مگر شیشے کی الماری میں جگ اور گلاس تو ہیں۔ یار کچھ پان منگوانے چاہییں۔ نوکر جب آئے گا تو وہ ہی لے آئے گا۔ شہامت علی صاحب کی بے تابی بیان کر کے اپنے پڑھنے والوں پر ناتجربہ کاری کا اتہام لگانا نہیں چاہتا۔

قصہ مختصر کچھ انتظار کے بعد معشوقہ محبوبہ تشریف لائیں۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے استقبال کیا۔ نوکر کو گلوریاں، برف، لیمنڈ، لینے کو بھیجا اور پاس تو بٹھا لیا مگر نوکر کی واپسی کے انتظار میں دست ہوس اور زیادہ نہ بڑھایا۔ ہاں جو باتیں اظہار شوق کی بالکل پیش پا افتادہ تھیں ان کا ذکر نہیں مگر نگاہ نوکر کے دھڑکے میں در ہی سے لڑی رہی۔ اتنے میں نوکر بھی آگیا اور اس کے ساتھ میاں عبدالمغنی بھی دھر دھمکے ان کو دیکھ کر شہامت علی صاحب کے چہرے پر مسرت، خلوص اور شکر گزاری کا اشتہار لگ گیا۔ مگر عبدالمغنی صاحب کے چہرے پر خلاف بعید اور سنجیدگی متانت بلکہ اس سے بھی بالاتر وہ کیفیت ظاہر تھی جو اس وقت ہوتی ہے۔ جبکہ آدمی مروت کو توڑ کر کسی دوست کے خلاف دوٹوک فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہامت علی کا دل دھک سے ہو گیا۔ رنڈی کے دوسرے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی مگر عبدالمغنی نہ بیٹھے۔ ایک دو سیکنڈ چپ کھڑے رہے اس کے بعد کہنے لگے۔ یار سنو۔ تم جانتے ہو کہ ہماری چیز جان مال دوستوں کے لیے وقف ہے مگر ابھی مکان میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ابھی اس گھر میں میلاد شریف نہیں ہوا ہے۔

☆☆☆

کیمیا گر

محمد مجیب

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے، دہلی پہنچے تو انہیں حکم ملا کہ جون پور کی طرف کچھ اور نو واردترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا خالد پورنام رکھا گیا تھا، مسلمان آبادی کی بنیاد ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالد پور میں جا بسے۔ رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آ گئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہوگئی۔ حکیم مسیح نے دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہوگئے، اور ترکستان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں ملنے لگا۔ ان کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرادی جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں، وہ اونچ نیچ دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار تھے۔ تجربے نے انہیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دیئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہوتا ہے، مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیب کے اخلاق سے کتنا۔ ان کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض ان کی توجہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح باوجود اپنی ہردلعزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے، کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی، کچھ ہندوستان کی فضا، مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ دنیا جتنی دیکھنی تھی دیکھ چکے ہیں کیونکہ ہندوستان سے واپس جانا ممکن نہیں اور وہ یہیں مریں گے اور یہیں دفن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو نہ اپنے جیسے آدمی سمجھ سکتے تھے نہ ہندوستان کو اپنے وطن جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بیوی اور ان کے سسرال کا بھی تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کئے نہیں برخاست کرتے تھے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلے پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا، اور ہندو ان کی اس قدر عزت، ان سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سسرال والوں کا ہم خیال ہونا ناممکن ہو جاتا، لیکن ان لوگوں کے تعصب کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح گھل مل سکے جیسا کہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا اور نہ ہندوستان کے زمین و آسمان کو اپنا وطن بنا سکے، عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لیے بھی طبیعت میں سکون پیدا کر سکیں، وہ اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گزرتے گئے، حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے، اور ان کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔

''کاش مجھے ایک ایسا کیمیا گر ملتا'' انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا ''جو میری فطرت میں اس سرزمین سے

مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا''۔

اس کے جواب میں ان کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا۔

''جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے اب بڑھاپے میں کیمیا گر کی تلاش ہے۔ جو ارادے کا کمزور ہو اس کی مدد کرنا قادر مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے''۔

حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی ان کے مطب میں، ایک ہیضے کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لیے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں ہیضے کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہیے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گی اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہنچے اور انہوں نے یہ اطلاع دی کہ وباء کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے تو سب نے اسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحتیں سمجھانے کی بہت سی دلیلیں سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بیوی ان سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ تمام نوکر چاکر بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور ان کی بیوی رو پیٹ رہی ہیں۔ پہلے تو انہیں یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی ہیضے کا شکار بنا ہے۔ مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہیں کا ماتم ہو رہا ہے ان کی بیوی نے محض اس اندیشے میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود رونا دھونا نہیں شروع کر دیا تھا بلکہ تمام محلے اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی اور ہر ایک کو رو رو کر ان کے ارادے کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان کے خسر اور سالے آ گئے اور انہیں گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا اور دوسرا ڈانٹتا تھا، اور دونوں اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کہہ کیا رہے تھے، اور قبل اس کے کہ حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے خدا اور رسول اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں، ان کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ وہ اسی قابل ہے کہ دق اور ہیضے میں ہلاک ہو اور کسی مسلمان کو اس کو بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں نہ ڈالنی چاہیے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب و غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے سوچ رکھی تھیں ان سے کام لینا چاہا مگر ان کے خسر اور سالے نے ان کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اٹھے:۔

''ارے وہ بیچارہ تو کچھ کہتا ہے نہیں، وہ خود جانے پر تیار ہے''۔

حکیم مسیح پھر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی جو اپنے فریق کو مضبوط پا کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں:۔

''آپ لوگوں کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہو گا جب یہ خود اپنی زبان سے کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے''۔

''چلیں گے کیوں نہیں''۔ حکیم مسیح کے سالے نے کہا ''تم سامان تیار کراؤ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لے جائیں گے''۔

یہ کہہ کر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں

قائل کرنے کے لیے بہت سے مسلمان ہمسائے موجود تھے، بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر ان کا زندہ رہنا دشوار تھا۔ یہ لوگ باری باری سے کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے کبھی فرداً فرداً مگر حکیم مسیح نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کرلیا تھا کہ ان کا خالد پور کے باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلا جانا ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتہ داروں پر۔ لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالد پور میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا ہوگا، ان کے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہو گئے ہوں گے، وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہو جائے گا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے، اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور ان کے جنازے کی نماز تک پڑھنے کے لیے کوئی مسلمان نہ ہوگا۔ خالد پور چھوڑنا ان کے لیے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا مگر ایسی زندگی برداشت کرنا ایک شدید اخلاقی جرم کی سزا بھگتنے سے بھی انہیں زیادہ دشوار معلوم ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انہیں زندگی کے مسائل سے جلد سبکدوش کیا جائے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اس کے ساتھ تھے۔

ان کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا بجھا کر منا لیں گے، لیکن بدقسمتی سے ان کی کوئی تدبیر نہ چلی۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گذشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں مگر ان کا تخیل قابو سے نکل گیا اور ہر لحہ ایک نیا صدمہ پہنچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں ان کے دروازے کو کھڑے کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی بچہ رویا اور انہیں یاد آیا کہ ناگہانی موت کیسی بلا ہوتی ہے، خالد پور میں کتنے بچوں کی مائیں اس وقت ہاتھ مل مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح نہ چلے گئے ہوتے تو ان کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم مسیح کی آنکھوں میں بارہا آنسو بھر آئے، سر چکرانے لگا، لیکن واپس جانے کی ہمت انہیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلے نے خالد پور سے کوئی دس کوس پر جا کر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے تھے، لیکن انہیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح نصیب نہ ہوگی اور ہوا بھی یہی۔ کچھ دیر کے لیے تو ان پر غفلت سی طاری ہوگئی جس سے ان کا تکان جاتا رہا، لیکن پھر وہ پریشان خواب دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے، کبھی گھوڑے پر سوار ایک غار میں پھاند پڑتے تھے جس کی تہ میں ایک خوفناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں، ایک تیز آندھی آئی جس میں ان کا گھوڑا کئی مرتبہ زمین پر سے اڑ گیا، اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں، ان کے سامنے ایک پتلی لمبی سی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں کی گھٹا میں گم ہو جاتی ہے، سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کہیں ختم نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کا رخ وہی تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا، پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً ستانے کے لیے منڈیر پر بیٹھا ہے، انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور آگے بڑھ گئے، مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد ان کا گھوڑا رک گیا اور ایڑ اور چابک بھی اسے جگہ سے نہ ہلا سکے، واپس جانے پر وہ تیار تھا، آگے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مردہ لے جانا بھی مشکل ہوگا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اس کا مزاج درست کرنے کے لیے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔ کہ کچھ دیر اسی مسافر سے باتیں کر لیں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوش حال کاریگر کا سا تھا، یعنی ایک نیچی موٹے سوت کی دھوتی، اور اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی اور ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھ دی

تھی۔اس کے کندھوں اور پیٹھ پر ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔مسافر کا قد بہت لمبا تھا، سینہ چوڑا، پٹھے تنے اور ابھرے ہوئے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولاد کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا، اس کی داڑھی کے لمبے سیدھے بال، اونچی پتلی ناک، چوڑی پیشانی، چہرے کا نمایاں سکون سب اسی وہم میں ڈالتے تھے کہ اس کا جسم آہنی ہے مگر آنکھوں کو دیکھ کر یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی اور محبت تھی جو اس کے جسم کی مضبوطی، اس کے قدوقامت پر حاوی تھی اور اسے دیکھنے والا فوراً سمجھ جاتا تھا کہ وہ اس کا دوست اور ہمدرد ہے اور یہ مجسمہء طاقت، مجسمہ محبت وایثار ہے۔حکیم مسیح پر بھی ان باتوں کا اثر ہوا۔وہ جواب میں مسکرادیے اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔آخر کار انہوں نے پوچھا۔

''اے آہنی جسم کے مسافر تو کہاں جارہا ہے؟''

مسافر نے پہلے سر جھکالیا، پھر ان سے آنکھ لڑا کر مایوسی کے لہجے میں کہا:۔

''خالد پور!''

''مگر وہاں تو ہیضہ ہے''۔

''ہاں، میں اسی لیے جارہا ہوں''۔

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے، لیکن مسافر نے انگڑائی لی اور انہیں اس خوب صورت مردانہ جسم پر رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا، انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:۔

''اے مسافر! کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟''

مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا ''مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور ہمیشہ رہے گی جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی وہ خدا کو زیادہ عزیز ہوگی، اگر میں نے اس کی راہ میں جان دی''۔

حکیم مسیح پھر چپ ہوگئے۔مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کا قول پکا ہے۔انہیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور پختہ ارادے پر رشک آیا۔لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ شخص دنیا میں اکیلا ہو اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لیے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔کچھ وہ اپنا بچاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

''اے مسافر! کیا دنیا میں تجھ سے محبت کرنے والا نہیں؟''

''محبت کا جواب محبت ہے جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔مگر محبت مجھے کبھی بھلائی سے نہیں روکتی''۔

آخری جملہ حکیم مسیح کے سینے میں تیر کی طرح لگا اور وہ بے تاب ہوگئے۔انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

''اے مسافر تو کہاں سے آیا ہے؟''

''میں خدا کا بندہ ہوں، کسی ملک کا باشندہ نہیں''۔مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔''جس ملک میں میرا خدا مجھے پہنچادے وہی میرا وطن ہے۔اس کی خدمت میرا فرض ہے''۔

''لیکن تیرا مکان تو ضرور کہیں ہوگا؟''

''دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی، بچے کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں، جہاں نیند لگی، میں سو جاتا ہوں''۔

''مگر مسافر! تیرے بیوی بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟''

''عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میرے اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کے قدموں میں گرتا اور اس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں، ہمت نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چل میری رہبری کر۔ میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں''۔

''مگر مسافر، ہیضے کا علاج محبت سے کیونکر ہو سکتا ہے؟'' حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے پر تیار تھے۔ بدن پسینے سے شل ہو گیا تھا۔

''محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے، محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے، ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے، انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہوتی ہے تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے''۔

حکیم مسیح نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگے۔

''حکیم مسیح'' مسافر اچانک بول اٹھا ''مسلمان کوئی کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں بنتا، اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں۔ مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو، ان پر سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو۔ تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے''۔

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکیے بھیگ گئے تھے۔ لیکن ان کو اب نہ اپنی سرخ آنکھوں کی پرواتھی نہ تھکے ماندے جسم کی، انہوں نے ''یا رسول اللہ'' کا نعرہ مارا، پلنگ پر سے اچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دیئے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سن کر خالد پور کی آبادی میں اودھم مچ گئی۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ ہیضے سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آ گئی، جس نے بھی یہ خبر سنی اپنا دل مضبوط کرنے کے لیے ان کے مطب میں بھاگا ہوا گیا اور اس نے حکیم مسیح کو دوا خانے کے دروازے پر بیٹھا ہوا پایا، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، شرمندگی سے ان کی نظریں نیچی ہو گئیں، مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوا لی۔

ادھر سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کو تیسرے پہر ''یا رسول اللہ'' کا ایک نعرہ سنا تھا لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں۔ اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لیے شوہر کے ساتھ مرنے کے لیے خالد پور چلیں۔

جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دوا خانے کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے نہ کھانا کھایا ہے۔ بال پریشان ہیں، آنکھیں سرخ۔ لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ خبر بھیجنا چاہا مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں دیر لگی اور جب وہ پہنچ بھی گیا تو حکیم صاحب نے اسے نہ پہچانا نہ اس کی بات سمجھے، رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا، لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود مطب پہنچیں۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے، لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں، حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:۔

۔۔۔۔۔ محلے میں کچھ عورتیں بیمار پڑی ہیں، میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمارداری کے لیے کوئی نہیں، آپ وہاں چلی جائیں۔۔۔۔''

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی، پچھلے دنوں کی تکان کا نام ونشان نہ تھا۔ آنکھیں اب بھی سرخ تھیں، مگر چہرے سے نور برس رہا تھا، کپڑوں پر کچھ مٹی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی۔ وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے جس محلّہ کا حکیم مسیح نے نام بتایا تھا وہاں پہنچ گئیں۔

خالد پور میں دو مہینے ہیضے کا دورہ رہا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جسے وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت ان کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھنے میں اور ان کے لیے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی انہیں اطمینان دلانے کے لیے کافی نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جنازے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد کریں۔ مگر اس کام کے لیے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی، یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا، جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں، اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانے میں حکیم مسیح اور ان کی بیوی اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ غیروں کے ذریعے سے انہیں ایک دوسرے کی خبر پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے بھی انہیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے ملاقات کے لیے فرائض ترک کرنے کی اجازت نہ دی، مگر ان کے دلوں میں اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ مایوسی خودغرضی یا خوف ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے اور وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکے۔

آخر کار ہیضے کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے، مریض کم ہوئے، کام کم ہوا، فرصت کا وقت بڑھا، مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ دو دیوار وہم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان میں کھڑی کر دی تھی نیست ونابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لیے آتے تھے۔ ماہران فن قدر دانی اور ہمت افزائی کے لیے، مظلوم شکایت کے لیے اور جھگڑالو انصاف کے لیے، ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا، لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے، اور دل میں اس کا افسوس واپس لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں، جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا۔

خالد پور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح یا ان کی بیوی کو علم نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو، لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوا ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا، لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے، انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کہیں اور ہیں۔ اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں، اسی محبت کا ایک دھندلا عکس ہے، جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں، وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے۔ خود بخود نہیں پیدا ہوئی، اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی ان کی انسانیت کا جوہر ہے، اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے، تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی، اس لیے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ ہیضہ انہیں بہت زیادہ مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالد پور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی، وہ

اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے، بلکہ مسجد اپنے خرچ سے بنوانے کی خواہش ظاہر کی، لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا، انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے تھوڑے دنوں میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تیار کر لی، جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اسے دو سچے حق پرستوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ رکھنے کے لیے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے، اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ، کبھی دو، اور کبھی ساری رات گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے سے ذرا دیر ہو گئی، وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، ان کی بیوی پڑھ رہی تھیں، حکیم مسیح ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں، اور اس سے ان کے چہرہ پر ایسی رونق آ گئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے، دیکھتے دیکھتے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے، نہ اس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد پور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر سے ایثار کی مصیبتیں جھیل سکتے تھے، اس بیچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی نہیں میسر ہوئی، مگر اس پر بھی وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی، آہنی جسم والے مسافر کی طرح حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے، اور اس سے التجا کی کہ اپنی محبت سے ان کی ہمت دگنا کرے، ان کے فرائض یاد دلاتی رہے، اور انہیں ادا کرنے کی طاقت بخشے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں۔ اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں، انہوں نے وجہ پوچھی، حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے، پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا۔

''تم کو شاید یاد ہو، میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیا گر کی آرزو کی تھی، جو اس ملک کو میرا وطن بنا دے، اس قوم میں مجھے کھپا دے، دیکھو اس کیمیا گر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنا دیا''۔

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہنچ گئے تھے، ان کی بیوی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما، ان کے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی، اور پھر دونوں اپنے کیمیا گر کے تصور میں محو ہو گئے۔

☆☆☆

منگل کی کہانی

ملک راج آنند

(پچھلے سال میں منگل گیا تھا جہاں پانچ دریاؤں کی سرزمین کے ایک قدیمی دریا پر بند تعمیر کیا گیا ہے۔ عجب سہانا اور دلکش منظر تھا۔ دوپہر کے روشن سورج نے گویا نمرود کے پانی میں آگ لگا دی ہو اور تپتی ہوئی زمین سورج کی روشنی میں پگھلا ہوا سونا نظر آ رہی ہو۔ اونچے اونچے بند گویا آسمان سے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ اس دلکش منظر کو دیکھ کر میری زبان سے بے ساختہ گھریلو پنجابی زبان کا ایک جملہ نکلا۔۔۔ ''جنگل میں منگل ہو رہا ہے''۔ قریبی پاور ہاؤس کے ایک کارندہ نے میرا جملہ سنا اور اس نے شمالی علاقہ کے مہاجر لہجہ میں کہا۔۔۔ عنقریب یہاں ہریالی پھیل جائے گی اور اسے اس آب حیات سے سینچا جائے گا۔ اسکے لب ولہجہ اور جملے کی ساخت سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ یقیناً شاعر ہے۔ اور چند لمحوں بعد میں نے اسے ہیر گنگناتے سنا۔ ہیر اور رانجھا کی مشہور عشقیہ داستان مجھے بہت بھلی لگی اور میں نے اس سے کچھ اور سنانے کی فرمائش کی، اس نے تفصیلاً منگل کی کہانی سنانی شروع کی۔ وہ کہانی میں اس کی زبان میں سنانا چاہتا ہوں، اس کا نام بالی بھاٹ تھا اس نے جس انداز میں یہ کہانی بیان کی اس میں موجودہ دور کی داستان گوئی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔)

۔۔۔۔۔ ہمارے ملک کے تمام دیوی دیوتاؤں میں شکتی (طاقت) کا مقام بلند ترین ہے۔ بلاشبہ سب کچھ شکتی ہے۔ جسم وروح آسمان وزمین اور وہ پانی جوان کے اتصال سے لہریں مارتا ہے۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ لیکن کالی کے گاؤں پر اس حقیقت کا انکشاف کیونکر ہوسکتا؟ اس لیے کہ روح پر جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اپنی عزیز ترین شے بھی برباد کرنے پر تل جاتی ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت یا بچہ۔ جب اس پر ظلمت کا تاریک اور خوفناک سایہ منڈلاتا ہے تو خوف و ہراس سے گھر کر بھلا کون اپنے مخصوص دیوتا کو تلاش کر سکتا ہے؟۔۔۔ اور جب ظلمت کی قوتیں ہمارے اردگرد کی چیزوں کو دھندلا دیتی ہیں گویا ہمیں دن کے تسلط سے آزاد کرنا چاہتی ہوں تو درحقیقت وہ ہمیں جہنم کی گہرائیوں اور تاریکی اور ملک الموت کے چنگل میں دھکیل دیتی ہیں اور ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ گویا ہم اپنے اندر کسی شے کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ طاقت حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے ہوں جس کے سہارے ہم اس مستقبل کا سامنا کر سکیں گے۔ جسے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ آج کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ میرے بھائی کہ ہم میں کارہائے نمایاں انجام دینے کی صلاحیت ہے۔ ممکن ہے میں کسی چیز کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہوں۔ لیکن بجلی کے بارے میں تو میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تو میرا خیال ہے کہ یہ عظیم کارنامے ایک اچھی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہیں جو اس لیے عمل میں لائے جا رہے ہیں تا کہ انسان تمام بندشوں سے آزاد ہو جائے۔ ترقی کرے اور اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روشن مستقبل کی داغ بیل ڈالے۔۔۔۔ لیکن بھلا کوئی روشنی کی کرن مردہ دلوں اور تاریک ذہنوں میں کیونکر پہنچا سکتا ہے؟

''بھلا تمہاری بنائی ہوئی برقی قوت کالی کی قوت کا کیونکر مقابلہ کر سکتی ہے''۔ گاؤں والے کہتے۔۔۔۔ کالی ماتا جن کے نام سے یہ گاؤں منسوب ہے۔ سمنٹ اور لوہے کی یہ دیو قامت عمارتیں جو تم اس بند کے سلسلے میں تعمیر کر رہے ہو۔ درحقیقت ہماری

مقدس دیوی کی بے عزتی کرنے کے مترادف ہیں۔ازل سے اس دیوی نے چاند، سورج اور ستاروں کی گردش کو اپنی گرفت اور اپنے قابو میں رکھا ہے۔اس سرزمین کا چپہ چپہ کالی دیوی کے روپ سے جگمگا رہا ہے۔۔۔ہمارے ہاں بہترین فصلیں ہوتی رہی ہیں افراط اناج ہوتا رہا ہے۔یہاں تک کہ تم مہاجر لوگ یہاں پہنچ کر ہمارے غلہ کو نگلنے لگے۔ہمارے بچوں کے منہ کی روٹی چھیننے لگے!اور اب یہ لوگ۔۔۔جو یہاں برسر اقتدار ہیں یہ کہنے کی حماقت کرتے ہیں کہ ہمارا یہ گاؤں۔یہ کالی۔۔۔اس مصنوعی جھیل میں غرقاب ہو جائے گا جو وہ لوگ یہاں تعمیر کر رہے ہیں۔اور اس لیے وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں سے ہجرت کر جائیں۔قبل اس کے کہ یہاں پانی پانی ہو جائے۔اور ان نہروں میں پانی لہریں مارنے لگے۔۔۔۔یہ صحیح ہے کہ وہ ہمیں معاوضہ دینے پر تیار ہیں۔اور چندی گڑھ کے قریب ہمیں قابل کاشت زمین بھی دے رہے ہیں۔یہاں ان لوگوں نے بیرک نما کوٹھریاں بنا رکھی ہیں۔اس مقام پر جہاں پہلی بار چندی دیوی دھولادر پہاڑ کی چوٹیوں سے اتر کر میدانوں میں داخل ہوئی تھی۔۔۔بدمعاش۔۔۔۔غنڈے۔۔۔نشہ اقتدار میں دھت۔۔۔۔جنھیں نہ تو مذہب کی عظمت و احترام کا دھیان ہے۔نہ دیوی دیوتاؤں کی عزت کا۔۔۔۔اور پھر طرفہ ستم یہ ہے کہ اس ملک کا وزیر اعظم خود برہمن ہے۔۔۔۔دیکھو لوگو۔۔۔ظلمت منڈلا رہی ہے۔۔۔۔اور گو کہ اس بڑے بند کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری رہا اور وہ وقت نزدیک آ گیا جب مصنوعی جھیل۔۔۔منگل ساگر کا لہریں لیتا ہوا پانی کالی کے گاؤں کو غرقاب کر دیتا لیکن گاؤں والے وہاں سے ہجرت کرنے پر راضی نہ ہوئے۔۔۔اور اس طرح یہاں میری نظروں کے سامنے وہ ڈرامہ کھیلا گیا جس کا خوشگوار انجام تو تم دیکھ سکتے ہو۔لیکن اس کے مختلف مناظر کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔اور خود میں آج یہاں بیٹھ کر تمھیں بڑے اطمینان کے ساتھ اس جدوجہد کی کہانی سنا سکتا ہوں۔لیکن ان اہم لمحات کی تصویر کشی اتنی آسان نہیں۔۔۔عجیب لمحات تھے وہ میرے بھائی جب گاؤں والے موت، زندگی، آبادی، خوش حالی اور بربادی کی کشمکش میں مبتلا تھے۔اور جس سے ہم اس لیے کامراں و کامیاب نکل آئے کہ ہم نے اس سے چندے عقل سے کام لیا۔۔۔بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ غلہ کی قیمت خدا نہیں طے کرتا اور مصنوعی بارش کے ذریعہ قحط سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔۔۔۔لیکن کالی دیوی کے مخلص پجاریوں کو ان باتوں پر اعتقاد نہ تھا۔وہ لوگ تو تقدیر پرست تھے اور اس قسم کی باتیں سن کر دیوی دیوتا کے قہر نازل ہونے کی بددعائیں مانگتے تھے۔۔۔ان لمحات میں جب ان لوگوں کے لب پر بددعائیں تھیں، گالیاں تھیں اور وہ لوگ موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے۔میرے منہ سے صرف ایک ہی جملہ۔وہی جملہ جو ہم انتہائی کرب و اذیت کے عالم میں زبان پر لاتے ہیں۔۔۔۔۔''اوماتا''۔

''تو میرے پیارے بھائی بالی'' میں نے بات کاٹ کر کہا'' مجھے اس کشمکش کی داستان تفصیل سے سناؤ''۔

شاعر نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں موندلیں۔گویا وہ ان تکلیف دہ لمحات کے درمیان سے دوبارہ گزر رہا ہو ان لمحات کا تصور کر رہا ہو۔جب کالی کا گاؤں موتی ساگر جھیل کے لہریں لیتے ہوئے پانی میں ڈوبنے والا ہو۔اور پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔سکندر اعظم کی طرح جس کی ایک آنکھ آسمان کی جانب اٹھی ہوئی گویا آسمانی فہم و فراست سے استفادہ کر رہی ہو اور دوسری آنکھ زمین کی جانب جھکی ہوئی ہو۔۔۔پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

''تم ایک چھوٹے بچے کی مانند حیران و پریشان اور تفصیل جاننے کے لیے بیتاب ہو۔اگر میری کہانی سن کر تمہارے دل میں انسانوں کے لیے جذبہ ترحم امڈ آئے تو میں اپنی کہانی سناؤں اور نتیجہ تو تم خود بھی اخذ کر سکتے ہو!''

۔۔۔۔۔۔اس چٹان کے دامن میں جہاں اب موتی ساگر جھیل کا زندگی بخش پانی لہریں مار رہا ہے کالی کا وہ گاؤں آباد تھا جس کا میں نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔اس کی کل آبادی محض ستر نفوس پر مشتمل تھی۔ان میں پانچ ایسے افراد تھے جنھیں تم بدمعاش کہہ سکتے ہو۔لیکن یہ پانچ افراد وہ تھے جن کی باتوں کی اس گاؤں میں جہاں کے رہنے والے تمام جاہل تھے بڑی عزت تھی۔اور جو کئی ماہ تک گاؤں والوں کو ورغلا کر روشنی سے دور رکھنے میں کامیاب رہے۔یہ پانچ افراد یوں سمجھو گویا اقتدار ظلمت کے نمائندے تھے۔

اس ٹولی کا سربراہ جو گاؤں کا زمیندار بھی تھا اور جس کے قبضہ میں کئی بیگھ زمین تھی دیرد تھا۔ تقریباً اسی سال کو بڈھا جو اپنی زمینوں اور خود اپنی طویل زندگی سے جونک کی مانند لپٹا ہوا تھا۔ اس کا ایک بدقماش بیٹا تھا۔ پرکاش۔ جس نے ایک بار اپنی ماں کے زیورات چرا کر انبالہ میں فروخت کر دیئے تھے۔ اسے باپ اور ماں کے ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار نے ناکارہ اور نکما بنادیا تھا۔ اس کی ماں اسے گھڑوں مٹھا اور سیروں مکھن ساگ اور باجرے کی روٹی کے ساتھ کھلایا پلایا کرتی تھی۔ اس بدچلن پرکاش نے ایک بار اپنی چھوٹی بہن یشودھا کو صرف اس جرم میں بہت پیٹا تھا کہ بیچاری میری زبان سے ہیر سننے کے لیے تھوڑی دیر کنوئیں کی جگت پر رک گئی تھی۔ اس جنگ اور کشمکش کے دوران جس میں کالی کے گاؤں والے اس وقت مبتلا تھے پرکاش نے وہ قابل نفرت کردار ادا کیا جس کی مثال پنجاب میں نہیں مل سکتی۔

تباہی اور بربادی کی فوج کا دوسرا سپہ سالار گاؤں کا سنار رام جوایا تھا۔ جس کی پگڑی کا طرہ ہمیشہ ہوا میں پھڑ پھڑاتا رہتا۔ اور خود اس کے جسم کی مانند اکڑا رہتا۔ اس کے ابرو اور پلکیں اس آگ کی لپٹ سے جل گئے تھے۔ جو اس کی دکان کی بھٹی سے ہمہ وقت نکلا کرتی تھی۔ جہاں وہ بیٹھ کر اس سونے کو گلایا کرتا جو غریب گاؤں والے اس کے پاس رہن رکھ جاتے۔ اس کی آنکھوں پر حرص وآز کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور پچپن سال کی طویل عمر کے باوجود اس کا ذہن شرارتوں کی بھٹی بنا ہوا تھا۔ وہ اتنا چالاک تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوتی کہ اس کا داہنا ہاتھ غریب گاؤں والوں کا کتنا سونا چرا لیتا ہے یا بہی کھاتہ کی تحریروں کے کرتب سے گاؤں کی کتنی زمین ہر سال ہضم کر جاتا ہے۔ اس کا بیٹا دھرم دیو۔ اگر چہ دیرد زمیندار کے بیٹے پرکاش کی مانند بدمعاش اور۔۔۔ بدچلن نہ تھا لیکن زرد و بدوضع اور بڑا ابا تونی تھا۔ اور اپنی چھترائی ہوئی مونچھوں کو ہر وقت یوں اینٹھتا رہتا گویا وہ بہت گھنی ہوں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ اپنی مونچھوں کو صرف خود اعتمادی بحال کرنے کی غرض سے اینٹھتا رہتا تھا۔

ان کے علاوہ ایک چالاک اور شاطر نوجوان تھا جس کا نام تاراچند تھا اس نے۔۔۔۔۔ شہر جا کر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی تھی اور قانون کی تعلیم حاصل کر کے وکیل بننا چاہتا تھا۔ لیکن امتحان میں کامیاب نہ ہوسکا حالانکہ اس نے اس غرض سے اپنی ماں کی زمین بیچ ڈالی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ تاراچند اس لیے تلخ مزاج بن گیا ہے کہ اسے سرکاری ملازمت نہ مل سکی لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جو اپنے مفاد کی خاطر اپنی ماں تک کو بیچ ڈالے۔ اور اگر کوئی فائدے کی امید ہو تو اپنے گاؤں کو بھی آگ لگا دے۔ اسی بے حسی سے جس سے اس نے اس گاؤں میں اختلاف کی آگ بھڑکا دی تھی۔ اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ گاؤں والے اس آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے ملک میں جھوٹے پیغامبروں، عطائی معالجوں اور بڑے بڑے وعدے کرنے والوں کی بہتات ہے اور ان کی چرب زبانی کے سامنے ہم لوگ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ان تینوں کے علاوہ دو کسان تھے جو سگے بھائی تھے۔ ایک کا نام تھا جرنیل سنگھ اور دوسرے کا کرنیل سنگھ۔ دونوں سرکاری فوج سے حوالدار اور لانس نائیک کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ دونوں نے ملازمت کے سلسلے میں دور دراز مقامات کے سفر سے بھی کوئی تجربہ یا عقل حاصل نہیں کی تھی۔ اور دونوں کے لیے اس دوگز زمین کے نقصان کو بھول جانا دشوار تھا جو انہیں تقسیم ملک کے وقت فسادات کی وجہ سے لائکپور میں چھوڑنی پڑی تھی۔ حالانکہ ہزاروں افراد بڑی بڑی جائیداد اور عمارتیں نہر واگہ کے شمال کی جانب کے علاقے میں چھوڑ آئے تھے۔

ایک نوجوان جس کا نام بھارت رام تھا اور جو شدھی بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا اور جس نے پٹیالہ میں ایک موٹر گیرج میں مستری کا کام سیکھ لیا تھا۔ ان تمام بدمعاشوں کی ٹولی سے الگ تھلگ تھا۔ وہ ہمیشہ عقلمندی کی باتیں کرتا اور گاؤں والوں کو سچائی کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کرتا رہتا۔ اس نے ہمارا ساتھ دیا اور جب میں گیت گاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا تو وہ میرے ساتھ ڈھولک بجا رہا تھا۔

میرے ہونٹوں پر وہ جملے تھے جنہوں نے گاؤں والوں کو تباہی کے غار میں جانے سے بچالیا۔

''آخر ہوا کیا تھا؟'' میں نے تفصیل جاننے کے خیال سے دریافت کیا۔

''عجلت نہ کرو میرے بھائی''۔ بالی نے جواب دیا۔ ''بھگت کبیر نے کہا ہے کہ جو کھانا دھیمی آنچ پر آہستہ آہستہ پکتا ہے وہ انتہائی لذیذ ہوتا ہے۔ میں تمہیں پوری کہانی سناؤں گا۔ بشرطیکہ تم صبر واطمینان سے سننے پر تیار ہو''۔

''اچھا بھائی سناؤ''۔ میں نے کہا۔

اس نے کہنا شروع کیا ''ابتداء میں کالی کے گاؤں والوں کو کچھ معلوم نہ ہوا کہ کیا ہونے والا ہے۔ یہ لوگ اپنی عادت کے غلام تھے۔ اوران کے مخصوص دیوتا۔ ان کا سب کچھ تھا۔ یہ لوگ رسم ورواج کے بندھنوں میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جو چیزیں ان کے آباؤاجداد کے لیے بہتر موزوں اور فائدہ مند تھیں وہی ان کے لیے بھی سودمند تھیں۔ انہیں اس کا بھی احساس نہ تھا کہ درحقیقت ان کی ضرورتیں کیا ہیں وہ لوگ اپنے آباؤاجداد کے دستور اور رواج پر آنکھیں بند کر کے چلنا جانتے تھے۔ اور خود کو مصیبت اور پریشانی میں جکڑا ہوا دیکھ کر حیرت واستعجاب سے آسمان کی جانب دیکھا کرتے تھے۔ لیکن ہمہ وقت آپس میں لڑنے جھگڑنے میں مصروف رہا کرتے۔

زمیندار دیرد کا خیال تھا کہ رام جوایا زرگر نے پورے گاؤں کی زندگی میں زہر گھول دیا ہے اور رام جوایا کو خیال تھا کہ گاؤں کی تباہی اور بربادی کا ذمہ دار بابو تاراچند ہی۔ اے ہے جو بڑا باتونی تھا اور پنجابی زبان میں انگریزی الفاظ کی ملاوٹ کر کے باتیں کرتا تھا۔ دوسروں پر رعب جمانے کی خاطر کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ اور جو گاؤں کے تمام بزرگوں کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینے کا خواہشمند تھا۔ متوسط الحال کسان جرنیل سنگھ اور کرنیل سنگھ تمام وقت اپنی زمینوں پر کاشت میں مشغول رہتے۔ اس لیے انہیں کچھ سوچنا تو درکنار سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ لیکن جب کبھی انہیں ذرا بھی فرصت نصیب ہوجاتی تو وہ اپنے اس خیال کا اظہار کرتے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ زمیندار دیرد اور زرگر رام جوایا گاؤں کی سربراہی سے دست بردار ہو کر کسی نوجوان کو چودھری بن جانے دیں۔ ان تمام ''ہوشمندوں'' کو اپنے بیٹوں سے شکایت تھی کیونکہ وہ سب بیوہ شدھی کے بیٹے بھارت رام مستری کے ہمراہ نظر آتے تھے جو انہیں اپنی پھٹ پھٹی پر بٹھا کر سیر کرایا کرتا تھا۔

اور اس طرح گاؤں کے بوڑھوں کے منہ حیرت واستعجاب سے کھلے رہتے۔ جب وہ بڑی بڑی تیز لائیٹوں کو روشن دیکھتے۔ یہ روشنیاں رات کو زیرِ تعمیر بند کی حفاظت کی خاطر جلائی جاتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر گاؤں کے بڑے اس زمانے کو کوسنے دیتے جب وہ لوگ کلجگ کے نام سے موسوم کرتے اور جس میں انسان دن اور رات کی تمیز اور فرق کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اور جب وہ لوگ مستر بھارت رام کو اپنی پھٹ پٹی پر سوار اور پیچھے کی سیٹ پر گاؤں کے کسی نوجوان کو بیٹھا بند کی جانب جاتے ہوئے دیکھتے تو انہیں مستری بھارت رام پر بند کی تعمیر کرنے والوں سے بھی زیادہ طیش آتا۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ بند کی تعمیر میں کام کرنے والے مزدوروں کو اس مزدوری سے جو وہ انہیں دیتے آئے ہیں کہیں زیادہ اجرت دی جاتی ہے تو ان کے دلوں میں غیظ وغضب کا طوفان امنڈنے لگتا۔

ان لوگوں نے یہ کام چرب زبان بابو تاراچند ہی۔ اے کے سپرد کیا کہ وہ منگل کے تحصیلدار کے پاس جا کر صورت حال سے آگاہ کرے اور گاؤں والوں کے شدید احتجاج کا اظہار کرے۔۔۔۔۔۔ افسوس کہ انہیں اس حقیقت کا احساس نہ تھا کہ تاراچند انتہائی خودغرض انسان ہے اور اپنی خودغرضی سے دوسروں کی پریشانی اور مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔

تاراچند ہی۔ اے فخر سے سینہ پھلا کر تحصیلدار سے ملنے گیا اور اپنی فتح پر اکڑتا ہوا واپس آیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''سرکار ہمیں اس گاؤں کو چھوڑ کر چنڈی گڑھ کے قریب آباد ہونے کے لیے معقول معاوضہ دینے کو تیار ہے۔۔۔۔اور میں نے تحصیلدار سے وعدہ لے لیا ہے کہ ہمیں کوہ ہمالیہ کے دامن میں بہترین اور زرخیز قطعہ زمین دیا جائے گا۔۔۔۔۔''

''معاوضہ؟'' دیرو نے حیرت بھرے لہجہ میں کہا۔

''اپنے گھروں کو چھوڑ کر جانے کا معاوضہ''۔رام جوایا نے طنزاً کہا۔

''چنڈی گڑھ کے قریب جا کر آباد ہونا''۔جرنیل سنگھ نے تاراچند پر قہر آلود نظریں ڈالیں۔الو کے پٹھے۔کیا تو ہمارا جانب سے اس بات پر رضامندی ظاہر کر آیا ہے کہ ہم لوگ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔۔۔۔یہ گاؤں۔۔۔''

''یہ گاؤں جس میں دیوی کا اوتار ہے''۔دیرو نے جملہ پورا کیا۔

بشرطیکہ چنڈی گڑھ میں دی جانے والی زمین اتنی ہی اچھی ہو جیسی ہم لائل پور میں چھوڑ آئے ہیں۔۔۔۔کرنیل سنگھ نے کہا۔۔۔''لیکن یہ پڑھا لکھا جاہل بھلا زمین کی قدر و قیمت کیا جانے۔۔۔''۔

''دیکھو لوگو! ظلمت منڈلا رہی ہے''۔رام جوایا نے لقمہ دیا۔''اس بے وقوف نے ہمیں فروخت کر دیا ہے اور یہ تو اپنی ماں کو بھی بیچ ڈالے اگر تحصیلدار کوئی منفعت بخش پیشکش کرے''۔

''چاچا!'' تاراچند نے کہا ''میں نے نہ تمہیں فروخت کیا ہے نہ گاؤں کو نہ خود اپنے آپ کو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں خود تمہارا ہم خیال ہوں کہ اپنے آباؤاجداد کے وطن کو اس خوبصورت گاؤں کو چھوڑ کر جانا گناہ ہے اور وہ بھی چنڈی گڑھ جہاں صبح سے شام تک گرد و غبار کا طوفان اٹھتا رہتا ہے جہاں لوگ مضبوط ترین مکانات بھی خریدنے پر آمادہ نہیں ہیں اس لیے کہ کسی قسم کا مکان بھی گرد و غبار سے پاک و صاف نہیں رہ سکتا۔۔۔۔ یہ انجینئر دفتر میں بیٹھ کر ٹائپ مشین پر گیہوں کی کاشت کرنا چاہتے ہیں۔ سر پھرے کہیں کے!''

''تو عقلمند بابو'' دیرو نے طنزیہ کہا۔''اسی وقت سرکار کو عرضی لکھ بھیجو کہ فوراً یہاں کی تعمیرات کا سلسلہ بند کر دے اور ہمیں سکھ و چین سے رہنے دے''۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے''۔رام جوایا نے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے''۔کرنیل سنگھ اور جرنیل سنگھ نے کہا۔

گو کہ تاراچند بی۔اے چنڈی گڑھ جانا چاہتا تھا اس لیے کہ اسے امید تھی کہ وہ وہاں جا کر سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔لیکن وہ خاموش رہا۔اور ان بزرگوں کے حکم کے مطابق اس نے ایک عرضی تحریر کی جس میں پرزور الفاظ میں کالی گاؤں کو مصنوعی جھیل کے پانی میں ڈبو دینے کی اسکیم کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔

کچھ عرصہ تک وہ لوگ سرکار کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔لیکن جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہوگا سرکاری دفاتر میں کاغذات عام طور سے ادھر ادھر ہوتے رہتے ہیں۔شاید اس لیے کہ دفاتر میں فائلوں کی کثرت ہوتی ہے اور سرکاری ملازمین میں سے کوئی بھی ان فائلوں کی ذمہ داری لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔یہ کلرک لوگ ہمیشہ درخواستوں پر نوٹ لکھ کر کسی دوسرے کے پاس چلتا کر دیتے ہیں اور اس طرح یا تو وہ درخواست غائب ہو جاتی ہے یا کسی کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اس پر ایک نظر بھی ڈال سکے اور بیشتر درخواستیں افسر بالا تک نہیں پہنچ پاتیں۔۔۔۔اور درخواست دہندہ کو کوئی جواب نہیں ملتا۔لہٰذا کالی کے گاؤں والوں کی عرضی کا جواب آنے میں بھی کافی تاخیر ہوئی۔

اوراس دوران میں بند کی تعمیر کا کام جاری رہا۔ایک شب رام جوایا اپنی بیوی دھرمی کو ساتھ لے کر کالی دیوی کی پوجا کے لیے گیا۔اس نے ایک ناریل اور چاندی کا ایک روپیہ سرخ پتھر کی دیوی پر چڑھایا اور دعا کی کہ دیوی فوراً ظاہر ہو جائے اور اپنی غیر مرئی قوتوں سے زیرِ تعمیر بند کو تباہ کر دے اور اس گاؤں کو تباہی سے بچائے جو خود اس کے نام سے منسوب تھا۔گوکہ دیوی ظاہر نہیں ہوئی لیکن دھرمی نے بند کو تباہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور آدھی رات کو بند کے قریب کی تیز لائٹوں سے بچتی بچاتی بند کے قریب پہنچ کر جادو منتر جگانے لگی اس نے چوراہے پر مٹی کا دیا جلایا اور اس کے ارد گرد سواستکا کی شکل میں شکر اور چاول چھڑک دیا۔ کچھ دیر تک وہاں بیٹھ کر منتر پڑھنے کے بعد وہ خاموشی سے گھر واپس چلی آئی۔

لیکن دوسری صبح بند کی تعمیر کا کام بدستور جاری رہا!

جب اس کی بیوی نے اسے رات کی بات بتلائی اور اپنے منتر کی ناکامی کا اعتراف کیا تو رام جوایا نے غصے سے دانت پیس لیے اور چونکہ رام جوایا کی بیوی دھرمی نے دیرد زمیندار کی بیوی سے بھی اپنے منتر پڑھنے کا تذکرہ کیا تھا۔اس لیے اس کی ناکامی کی خبر سن کر دیرد نے لوہے کی وزنی کرین کو شیطانی کرامات کا نام دے کر گالیاں دیں۔

کرنیل سنگھ اور جرنیل سنگھ بھی آپس میں صلاح ومشورہ کر رہے تھے اور کوئی ایسی تدبیر سوچ رہے تھے کہ جس کے ذریعہ بند کی تعمیر کو تباہ کر دیا جائے اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ تعمیر کا کام ختم ہوتے ہی مصنوعی جھیل میں پانی بھر آئے گا۔اور تمام گاؤں کو ڈبو دے گا۔اور انہیں ایک بار پھر ہجرت کرنی پڑے گی۔لہذا سردار کرنیل سنگھ نے سردار جرنیل سنگھ سے کہا۔ بھائی میرے علم میں ایک ایسا تیزاب ہے جسے ایک بوتل میں بھر کر بڑے انجینئر کے سر پر پھینک دیا جائے تو انجینئر فوراً ہلاک ہو جائے گا اور اس کے مرنے کے بعد بند کی تعمیر کا کام خود بخود رک جائے گا۔

گو جرنیل سنگھ نے سر کی جنبش سے اتفاق رائے کا اظہار کیا لیکن اس کے دل میں یہ شبہ بدستور موجود رہا کہ محض انجینئر کے ہٹ جانے سے بند کی تعمیر کا کام نہ رک سکے گا۔ بہر حال اس نے اپنے شبہ کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

کرنیل سنگھ اپنی بات کا دھنی تھا لہذا اس نے اگلی شام کو اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانا چاہا۔اور اندھیرے میں چھپتا ہوا انجینئر کے بنگلے پر پہنچا۔اس وقت انجینئر کھانا کھا رہا تھا۔کرنیل سنگھ نے پوری قوت سے تیزاب بھری بوتل انجینئر کے سر پر کھینچ ماری اور دم دبا کر بھاگا۔انجینئر کی خوش قسمتی سے بوتل نہیں پھٹی اور اس کا چہرہ مسخ ہونے سے بچ گیا۔

پولیس نے سرگرمی سے اس واقعہ کی تحقیقات کی اور کرنیل سنگھ کو ہتھکڑی پہنا کر عدالت میں پیش کیا۔مجسٹریٹ نے سردار کرنیل سنگھ کو اس کے ساتھیوں اور مزید شرارتوں سے باز رکھنے کے لیے اسے انبالہ جیل بھیج دیا۔

ہمارے ملک کی ایک پرانی کہاوت ہے کہ اپنے مفاد کی خاطر ایک انسان دوسرے انسان کو برباد کرنا چاہتا ہے لیکن جب خود اسے دوسرے برباد کر دیتے ہیں تو وہ برباد ہو کر دوسروں کو برباد کرنا چاہتا ہے۔اور جب تک اس کا شیطانی جذبہ ختم نہیں ہو جاتا وہ ہر وقت اسی سوچ اور موقع کی تاک میں رہتا ہے۔

چنانچہ دیرد، رام جوایا، جرنیل سنگھ اور بابو چندن بی۔اے سر جوڑ کر بیٹھے اور چند گھنٹوں کے غور وخوض کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کرنیل سنگھ کی گرفتاری اور قید کا بدلہ ضرور لینا چاہیے۔انہوں نے طے کیا کہ بند پر کام کرنے والے تمام مزدوروں کو کام چھوڑ دینے پر مجبور کیا جائے۔انہوں نے زمیندار کے بیٹے پرکاش، رام جوایا کے بیٹے دھرم دیو اور کرنیل سنگھ کے بیٹے سدرشن اور درشن کو تنبیہ کی کہ وہ لوگ مستری بھارت رام کی پھٹ پھٹی پر سیر کے لیے جانا فوراً بند کر دیں، یہ پھٹ پھٹی جو پورے گاؤں کی نیند خراب کرتی رہتی ہے یقیناً شیطان کی ایجاد ہے۔

گاؤں کے غریب مزدور جو بند کی تعمیر میں کام کر کے مناسب اجرت پا رہے تھے۔ یہ تجویز سن کر پس و پیش میں پڑ گئے۔ اگر وہ لوگ کام چھوڑ دیں تو اچھی اجرت سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ اور اگر کام جاری رکھیں اور گاؤں کے بزرگوں کا کہا نہ مانیں تو ممکن ہے کالی دیوی انہیں تباہ و برباد کر دے۔ لہٰذا ان لوگوں نے سوچا کہ چل کر مستری بھارت رام سے جو کرین کا فورمین تھا صلاح و مشورہ کریں۔

''میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کس غرض سے میرے پاس آئے ہو'' مستری بھارت رام نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ ''لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں اور میں اس وقت تک کام کرتا رہوں گا جب تک بند کا کام مکمل نہ ہو جائے۔ اگر تم لوگ اپنی زندگی آسودگی سے گزارنا چاہتے ہو تو ان بزرگوں کی غلط باتوں پر کوئی دھیان نہ دو۔ دل لگا کر کام کرو۔ اور برے وقت کے لیے کچھ رقم پس انداز کر لو۔ ہاں اگر یہ مشورہ قبول نہیں تو جا کر رام جوایا کے کھیت پر کام کرو اس لیے کہ تم لوگ رام جوایا کے ہاتھوں اپنا جسم اور اپنی روح فروخت
کر چکے ہو''۔

اور تمام مزدوروں نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ لوگ بدستور بند کی تعمیر میں لگے رہیں گے۔

گاؤں کا چودھری دیرو، رام جوایا زرگر، سردار جرنیل سنگھ اور بابو چندی۔ اے گاؤں والوں کے فیصلے کی خبر سن کر آگ بگولہ ہو گئے۔ انہیں گاؤں کے غریب مزدوروں کی اس جرأت پر کہ وہ لوگ گاؤں کے معتبر اور بزرگ ہستیوں کی حکم عدولی کریں گے۔ بڑا طیش آیا اور انہوں نے فوراً یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ان باغی گنواروں کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔

اور حسن اتفاق کہ اسی موقع پر سرکار کی جانب سے گاؤں والوں کی درخواست کا جواب موصول ہوا جس میں انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ لوگ ہجرت کی تیاری کریں اور انہیں متبادل جگہ اور معقول معاوضہ فوراً دیا جائے گا۔ اور ایسے زرخیز قطعات زمین دیئے جائیں گے جہاں وہ لوگ فوراً ہی فصلیں بو سکیں گے۔ قبل اس کے مصنوعی جھیل کے پانی کالی کے گاؤں کو زیر آب کر دے۔

اور سرکار نے فوراً ہی اپنے وعدوں کی تکمیل کا انتظام کر دیا۔ منگل کا تحصیلدار ایک لاکھ روپے لے کر کالی کے گاؤں پہنچا اور اس نے اعلان کیا کہ یہ رقم معاوضہ کے طور پر گاؤں والوں میں تقسیم کی جائے گی۔ اس کا بیشتر حصہ گاؤں کے پانچ بڑوں کو ملے گا۔ اور بقیہ رقم حصہ رسد گاؤں والوں میں تقسیم کی جائے گی۔

گاؤں کے بڑوں نے آج سے پہلے اتنی بڑی رقم کا ہے کو دیکھی تھی۔ چھوٹے کسانوں اور مزدوروں کا تو تذکرہ ہی بے کار ہے۔ چاندی کے سکوں کی چمک دمک دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان لوگوں سے بڑی عجلت سے کاغذات پر نشان انگوٹھا لگایا اور معاوضہ کی رقم وصول کر لی۔ سیٹھ رام جوایا نے ہندی میں اور بابو تارا چند بی۔ اے نے انگریزی میں دستخط کئے۔

لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کچے مکانات کا معقول معاوضہ مل جانے کے بعد ان لوگوں کے دل سے وہ جذبہ نفرت فنا ہو گیا جو بند اور اس کی تعمیر کرنے والوں کے خلاف تھا؟ انہیں اس وعدہ پر کوئی بھروسہ نہ تھا کہ نئی جگہ پر زرخیز زمین ملے گی۔ جب تک وہ لوگ اپنی آنکھوں سے چنڈی گڑھ کے کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی بالیاں نہ دیکھ لیں۔

چاندی کے سکوں کو صندوق میں بند کر کے اور صندوق پر وزنی تالا ڈال کر وہ لوگ کالی دیوی کے مندر میں گئے اور دوزانو ہو کر کالی دیوی کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی برکت اور مہربانی سے انہیں سرکار پر فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ان لوگوں نے دعا کی کہ کالی دیوی کڑکتی ہوئی بجلی کا روپ دھار کر بند کو تباہ و برباد کر دے۔

اور اس کے بعد وہ لوگ اپنی دعاؤں کے قبول ہونے اور کسی معجزے کے رونما ہونے کا انتظار کرنے لگے!

لیکن سورج بدستور چمکتا رہا۔ نہ بادل اُمڈے نہ بجلی چمکی اور تعمیر کا کام پہلے سے زیادہ تیزی سے ہوتا رہا۔ کیونکہ سرکار کی خواہش تھی کہ اپریل کے اختتام تک کام مکمل ہو جائے۔

اور چونکہ گاؤں کے بڑے سوائے کچی مٹی پر اپنی آمد و رفت سے پگڈنڈی کا نشان بنانے کے بند کا اور کچھ نہ بگاڑ سکے اس لیے نوجوانوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔

ہوا یہ کہ ایک مرتبہ پرکاش نے مستری بھارت رام سے اس کی پھٹ پھٹی سیر کو جانے کے لیے مانگی۔ چونکہ پرکاش کو پھٹ پھٹی چلانا نہ آتا تھا اس لیے بھارت رام نے پھٹ پھٹی دینے سے انکار کر دیا اور پرکاش کو بھارت رام اور بند کے خلاف کاروائی کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

پرکاش نے زرگر رام جوایا کے بیٹے اور کرنیل سنگھ اور جرنیل سنگھ کے بیٹوں کو اس بات پر اکسایا کہ سب لوگ مل کر بھارت رام کو راستہ میں پکڑ لیں اور زدوکوب کریں اور اس کی پھٹ پھٹی چھین لیں۔

دھرم دیو نے اس اسکیم میں ان کا ساتھ دینے پر کسی جوش کا اظہار نہ کیا۔ لیکن سدرشن سنگھ نے جس کا باپ کرنیل سنگھ انجینئر پر تیزاب پھینکنے کے جرم میں انبالہ جیل میں قید تھا بدلہ لینے کے ارادے سے فوراً ہی اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ ان لوگوں کو بھارت رام کی اس حرکت پر بھی غصہ تھا کہ وہ سارا دن کرین پر بیٹھا گاؤں والوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ اور شام کو بھی ان کے ہمراہ سیر و تفریح یا باغ سے آم چرانے کے لیے نہیں جاتا۔

تینوں لڑکے منہ اندھیرے اٹھ کر جھلملاتے تاروں کی چھاؤں میں بند کو جانے والی پگڈنڈی کے قریب کھڑے ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ بھارت رام الصباح ڈیوٹی پر جانے کے لیے وہاں سے گزرے گا۔ جب انہیں دور سے پھٹ پھٹی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تو وہ سب قریب کی جھاڑیوں کے پیچھے اپنے شکار پر جھپٹنے والے شیر کی مانند چھپ کر کھڑے ہو گئے۔

لیکن جب مستری بھارت رام کی پھٹ پھٹی ان کے قریب آئی تو قبل اس کے کہ وہ لوگ اس پر حملہ کر سکیں گرداڑاتی ہوئی پھٹ پھٹی تیز رفتاری سے گزر گئی اور سوائے گالیاں بکنے کے اور خاک پھانکنے کے وہ لوگ اور کچھ نہ کر سکے۔

احساس ناکامی سے طیش میں آ کر وہ لوگ گاؤں واپس آئے اور یہ طے کیا کہ گاؤں کے مزدوروں سے یہ کہہ دیں کہ انہیں بھارت رام مستری نے بتایا ہے کہ آج بند کی تعمیر کا کام بند رہے گا کیونکہ آج تعطیل ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر گاؤں کے سادہ لوح مزدوران کے چکمے میں آ کر کام پر نہ گئے تو کام بند ہو جائے گا۔ اور بھارت رام کے افسران کو جب یہ معلوم ہوگا کہ مزدور بھارت رام کے بہکانے اور غلط اطلاع دینے کی وجہ سے کام پر نہیں آئے تو وہ لوگ بھارت رام کو ملازمت سے علیحدہ کر دیں گے۔

دوسرے دن جب تمام مزدوروں نے بھارت رام سے دریافت کیا کہ اس نے یہ غلط اطلاع کیوں دی تھی کہ کل تعطیل تھی اور کام بند تھا تو بھارت رام جو کم گو قسم کا انسان تھا صرف اتنا ہی کہا کہ اس نے کسی سے یہ نہیں کہا تھا۔

گاؤں کے سادہ لوح مزدوروں کو نہ جانے کیوں یہ شبہ ہوا کہ بھارت رام جھوٹ بول رہا ہے پہلے تو اس نے غلط اطلاع دے کر انہیں بیوقوف بنایا اور اب انکار کر کے انہیں دھوکہ دے رہا ہے۔ اس شبہ کا فائدہ اٹھا کر نوجوانوں نے گاؤں کے سادہ لوح مزدوروں کے دل میں بھارت رام کے خلاف شدید جذبۂ نفرت بھڑکا دیا۔ جب ماہ کے اختتام پر ان لوگوں کی ایک دن کی اجرت غیر حاضری کی بناء پر کاٹ لی گئی تو وہ لوگ غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے اور اس موقع پر پرکاش نے انہیں اکسایا کہ وہ لوگ بدلہ لینے کے لیے کرین کے سائے میں کھڑی ہوئی بھارت رام کی پھٹ پھٹی توڑ ڈالیں۔

بند کے چوکیدار نے ان لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ لیکن بھارت رام نے سفارش کر کے انہیں آزاد کرا دیا۔
دنیا میں مختلف قسم اور خیال کے انسان رہتے ہیں لیکن ان میں درحقیقت صرف دو قسم کے کردار ہوتے ہیں اس لیے کہ سوچنے اور محسوس کرنے کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ کچھ لوگ صرف ظاہر پر نظریں ڈال سکتے ہیں اور بقیہ کچھ لوگ باطن پر نظر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بھارت رام اس خیال کا حامی تھا کہ گاؤں والوں کے گردنوں کو جھکانے سے زیادہ ان کے دلوں کی تبدیلی۔۔۔۔ضروری تھی۔
اور عملی زندگی میں باطنی تبدیلی حاصل کرنا زیادہ دشوار ہے۔ بھارت رام نے حالانکہ ان مزدوروں کو آزاد کرا دیا تھا لیکن اس کے اس حسن سلوک کا بھی گاؤں والوں پر کوئی خوشگوار اثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس گاؤں والے اور زیادہ طیش میں آ گئے۔ یہ سوچ کر کہ ان پر رحم و کرم کا اظہار کر کے بھارت رام نے لاٹ صاحب بننے کی کوشش کی ہے۔
لہٰذا ان لوگوں نے گاؤں کے بزرگوں پر زور دیا کہ وہ لوگ بیوہ شدھی اور اس کے بیٹے بھارت رام کو برداری سے خارج کر دیں اور ان کا حقہ پانی بند کر دیں۔ چنانچہ گاؤں کی تمام عورتیں یکجا ہو کر گاؤں کے مندر میں پوجا کے لیے گئیں اور دعا کی کہ شدھی بیوہ مر جائے۔
منگل بند پر دیو قامت مشین کی گھڑ گھڑاہٹ روز بروز بڑھتی رہی اور ایک دن انجینئر کی جانب سے اعلان ہوا کہ اگلے دس دن کے اندر جھیل میں پانی بھر آئے گا۔ اور کالی گاؤں زیر آب ہو جائے گا۔ اس بار تحصیلدار کے علاوہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر بھی آئے تا کہ گاؤں والوں کو ہجرت پر راضی کر سکیں اور ان لاریوں میں جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے ان کا سامان لدوا کر انہیں چنڈی گڑھ پہنچا دیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے ایک طویل تقریر کی اور غالباً اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے پنجابی زبان بولنے کی کوشش کی۔ گو کہ گاؤں والے اس کے لب و لہجہ اور غلط تلفظ پر ہنستے رہے لیکن ان پر اس اپیل کا بھی کافی اثر ہوا جو ڈپٹی کمشنر نے وزیر اعظم کے نام پر ان سے کی تھی۔ اس نے کہا کہ گاؤں والوں کو چاہیے کہ وہ پورے ملک کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح نہ دیں۔
لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں اور ان کی خاموشی سے یہی اندازہ ہوا کہ ابھی ان کے دلوں میں چور ہے۔ صرف سردار جرنیل سنگھ نے زبان کھولی کہ ''اگر آپ کو ہمارا اتنا ہی خیال ہے تو پھر آپ نے ہمارے بھائی کرنیل سنگھ کو جیل میں کیوں ٹھونس رکھا ہے؟''
ڈپٹی کمشنر نے فوراً جواب دیا۔ ''اگر تمہیں صرف یہی ایک شکایت ہے تو میں ابھی کرنیل سنگھ کی رہائی کا حکم دیتا ہوں۔ وہ کل ہی رہا کر دیا جائے گا اور اس کی بقیہ سزا کی معیاد معاف کر دی جائے گی''۔
اور یہ سوچ کر اس نے بازی جیت لی ہے وہ ریسٹ ہاؤس چلا گیا اور بید کی کرسی پر بیٹھ کر وہسکی سے دل بہلانے میں مصروف ہو گیا۔
دوسرے دن کرنیل سنگھ رہا کر دیا گیا۔ اس کے گاؤں واپس آنے پر گاؤں والوں نے خوب خوشیاں منائیں اور ڈھولک پیٹے۔ افسروں نے سوچا کہ اب گاؤں کے بڑے راضی ہو گئے ہیں اور وہ لوگ پنچائیت بلا کر گاؤں والوں کو حکم دیں گے کہ برگد کے درخت کے نیچے کھڑی ہوئی لاریوں پر اپنا سامان لادنا شروع کریں۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس گاؤں کے بڑوں نے یہ اعلان کیا کہ کرنیل سنگھ کی غیر مشروط رہائی دراصل ان کے حسن تدبیر کی دوسری فتح ہے جو کالی دیوی کی مہربانی سے انہیں افسران پر حاصل ہوئی ہے۔
یہ دیکھ کر ڈپٹی کمشنر اور چیف انجینئر شرما نے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور مستری بھارت رام کو صلاح و مشورے کے لیے طلب کیا کہ آخر گاؤں والوں کو کیونکر راضی کیا جائے۔

بالآخر ڈپٹی کمشنر نے اپنی کار منگوائی اور اعلان کیا کہ وہ واپس جا کر مزید پولیس بھیجے گا تا کہ گاؤں والوں کو جبراً لاریوں میں بھر کر چنڈی گڑھ لے جایا جائے۔ یہ سن کر بھارت رام کھڑا ہو گیا اور اس نے ہمت کر کے کہا ''حضور کیا ہم برائی کا جواب برائی سے دے کر برائی ختم کر سکتے ہیں۔ اس طرح تو ہم بدی کے سلسلے کو طویل کرتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے مہاتما گاندھی کے اس قول پر غور کیجیے کہ انسان کو دکھ تکلیف کو صبر و سکون سے قبول کرنا چاہیے۔ اس گاؤں میں صرف ایک ہی شخص ایسا ہے جو گاؤں والوں کے دلوں کو تبدیل کر سکتا ہے اور وہ انہیں گاؤں چھوڑنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اور اس شخص کا نام بالی ہے جو پاور ہاؤس میں ملازم ہے''۔

''بھلا بالی کیونکر کامیاب ہوا جب کہ دوسروں کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہو چکی تھیں''۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے بالی مسکرایا اور اپنی دیہاتی قمیص کے اندر سے چار مینار سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور چند لمحوں تک سگریٹ کے تمباکو کا ذائقہ چکھتا رہا۔ میں اس کہانی کا انجام جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ اس لیے میں نے دوسری بار کہا۔

''بھائی آگے سناؤ''۔

''بڑی آسان ترکیب تھی''۔ بالی نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔

''دوسرے دن ڈپٹی کمشنر کے پاس جا کر میں نے کہا ''غریب پرور۔ شاید میں یہ معجزہ دکھلا سکوں۔۔۔۔''

''میں معجزوں کا قائل نہیں''۔ ڈپٹی کمشنر نے سختی سے کہا۔

''معاف فرمایئے حضور۔ غالباً میں نے غلط لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ مجھے ایک ڈھولک منگوا دیں اور اس مستری کو میرے ہمراہ کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں گاؤں والوں کو چنڈی گڑھ جانے پر آمادہ کر لوں گا۔ آپ شہر کے رہنے والے ہیں اور شاید آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ ابھی پورا ہندوستان محض ایک گاؤں ہے۔ آپ شہری زبان میں گفتگو کرتے ہیں جب کہ گاؤں والے صرف گاؤں کی زبان سمجھ سکتے ہیں''۔

ڈپٹی کمشنر اور تحصیل دار کو میری باتوں پر اعتبار نہ آیا لیکن چیف انجینئر شرما نے کہا۔۔۔ اچھا۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ بھارت رام کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اگر تم نے کل صبح واپس آ کر ہمیں خوش خبری نہ سنائی تو میں تمہاری گردن مروڑ ڈالوں گا''۔

''اور تم نے جا کر یہ معجزہ کر دکھایا؟''۔ میں نے پوچھا۔

''میں نے کوئی معجزہ نہیں دکھلایا بھائی۔ صرف ایک چھوٹی سی ترکیب کام کر گئی''۔

''کون سی ترکیب؟''

''بھائی جب زندگی میں الفاظ بے معنی ہو کر رہ جائیں تو کسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے نئے طریقے دریافت کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور ان نئے طریقوں کو نیا لباس پہنا کر نئی سج دھج سے پیش کرنا پڑتا ہے۔ اور ایک ایسا لب و لہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو انسان کے دل و دماغ کے بجائے اس کے شکم پر اثر انداز ہو اس لیے ہمارے تمام مہاتما، دھرم آتما اور رشی منی، ہاتھ میں طنبورہ لے کر گاؤں گاؤں اس کے گن گاتے رہے۔ جس نے ان کے تجربے میں ان کے دل و دماغ اور شکم پر یکساں اثر چھوڑا تھا۔۔۔

اور میں تمام رات جاگتا رہا، اور چند ایسے نئے الفاظ تلاش کرتا رہا جو میرے دل کی پکار بن کر سننے والے کے دل کو تسخیر کر سکیں اور دوسری صبح میں بھارت رام کو ساتھ لے کر گاؤں کی جانب چل پڑا۔ اس کے گلے سے ہار کی مانند ڈھولک لٹک رہی تھی۔ جب اس نے ڈھولک کی تھاپ سے گاؤں والوں کو خواب سے بیدار کیا تو میں نے اپنا نیا گیت گانا شروع کیا:۔

۔۔۔اٹھو۔ اٹھو۔ بھائیو اٹھو۔

بتوں کی غلامی نے ہمیں کچل کر رکھ دیا ہے۔

ہمارے گھر کھنڈر بن رہے ہیں اور ہماری راہوں میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔
چاروں طرف سے ننگے پاؤں چلنے کی آوازیں اور دل کی وسعتوں سے نکلی ہوئی بددعاؤں کا شور سنائی دے رہا ہے۔
ڈھولک کی آواز اور میرا دکھ بھرا گیت سن کر گاؤں والے میرے گرد جمع ہو گئے۔
''بھینگی بھینگی والا احرامی، صبح صبح ہماری نیند خراب کر رہا ہے''۔ پرکاش نے کہا۔
''کمینہ، ذیلیل بالی، الیکٹریشن''۔ درشن سنگھ نے کہا۔
''سور کا بچہ''۔ سدرشن سنگھ نے کہا۔
''لیکن میرے بچو۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جو کچھ بالی کہہ رہا ہے اس میں حقیقت اور سچائی گونج رہی ہے''۔ کرنیل سنگھ نے کہا۔
''اس کی آواز میں بلا کا سوز ہے''۔ جرنیل سنگھ نے کہا۔
''ہاں میں نے اسے ہیر گاتے ہوئے سنا ہے''۔ دھرم داس نے کہا 'اوئے۔ ہیر سنا''۔
۔۔۔۔لیکن میں نے ہیر نہیں سنایا بلکہ اپنے اسی گیت کو دہرایا۔
''ارے سن لیا سن لیا ہم نے''۔ ویرو چیخا۔۔۔۔''اب کوئی بھجن سنا۔ بھگوان کے گن گا تا کہ بھگوان خوش ہو کر اس گاؤں پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔ ہماری کھیتیاں شاداب ہوں اور یہ شیطانی تعمیر کا کام ختم ہو جائے''۔
''ہاں ہاں۔ کالی دیوی کا شبھ گیت گا، تا کہ ہمیں آسائشیں میسر ہوں''۔
''اچھا، میں دیوی کے گیت گاؤں گا، میں نے کہا۔ اور فی البدیہہ ایک نیا گیت گانے لگا۔

او۔ دیوی۔ اوان داتا
ہم پر رحم و کرم کی نظر کر
او شکتی دیوی۔ جو کالی کا اوتار بن کر اس گاؤں میں ظاہر ہوئی
او رجواب منگل کے بڑے بند کے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے۔۔۔

''ناستک ہو گیا ہے یہ''۔ ویرو چلایا۔
''دیوی دیوتاؤں کی برائی کر رہا ہے''۔ رام جوایا چیخا۔
''سالا جھوٹا ہے''۔ تارا چند بی اے نے کہا۔
۔۔۔لیکن میں ان گالیوں سے بے نیاز ہو کر گاتا رہا۔۔۔۔

او دیوی۔ اوان داتا
جو کالی کے روپ میں اسی گاؤں میں ظاہر ہوئی
او رجواب سیال روپ میں ہماری تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے آئی ہے
ماتا۔ جو برقی طاقت کا روپ دھار کر بند میں داخل ہو گئی ہے۔
تم شان سے چلتی ہوئی آہستہ آہستہ آؤ گی
اور بجلی کی قوتوں کو انسان کی بھلائی کے لیے آزاد کر دو گی
اور تمہارے قدموں میں نئے انکھوے پھوٹیں گے، نئی پتیاں لہرائیں گی
آموں کے درختوں پر بور آئیں گے

پھولوں میں نئی خوشبو ہوگی
بھنورے نیا گیت گنگنائیں گے
چڑیاں چہچائیں گی
خوشبو سے لدی بسی ٹھنڈی ہوا
جھیل کے پانی کو تھپکی دے گی
اور دھان کے کھیت لہلہااٹھیں گے
مسرتوں کو لیے تہوار آئیں گے
اور عیش وطرب کے راہ کی تمام رکاوٹیں دور ہوجائیں گی
منگل ساگر کے پانی کی لہریں تمام داغ دھبے دھوڈالیں گی۔۔۔۔

''اوئے۔واہ۔واہ'' کرنیل سنگھ فرطِ مسرت سے چلایا۔

''اوئے۔بلے۔بلے''۔جرنیل سنگھ نے ترنم سے کہا۔

''اس کی آنکھیں بھینگی ہیں لیکن آواز بڑی اچھی ہے''۔رام جوایا نے کہا۔

''ہمارے درمیان ایک شاعر ہے۔اور ہمیں اس کا علم بھی نہ تھا''۔تاراچند بی۔اے نے کہا۔

''آؤلڑکو۔میرے ساتھ مل کرگاؤ۔مستری بھارت رام کی ڈھولک کی تھاپ پرزندگی کا گیت گاؤ۔

او دیوی۔اوان داتا
جو کالی کے روپ میں اسی گاؤں میں ظاہر ہوئی ہے
اور جواب سیال روپ میں ہماری تکلیفوں کودور کرنے آئی ہے
اوشکتی ماتا جوبرقی طاقت کا روپ دھار کر منگل بند میں داخل ہوگئی ہے

اور تمام لڑکے میرے ساتھ لے ملاکر گانے لگے۔اور رفتہ رفتہ گاؤں کے بڑے بوڑھے بھی ہچکچاتے ہوئے شامل ہوگئے اور خود فراموشی کے عالم میں گانے لگے۔

ان لوگوں نے نہ صرف میری آواز اور لے کا سوز گداز قبول کرلیا بلکہ ان لوگوں نے میرے گیت کے بول اور اس کے مفہوم کو بھی قبول کرلیا۔اور میرے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس جا کر چنڈی گڑھ جانے پر رضامندی کا اظہار کردیا۔۔۔۔اس لیے کہ انہیں یقین آچلا تھا کہ جس دیوی نے کالی کا روپ دھار کر اس گاؤں پر مسرتوں کی بارش کی تھی اب برقی طاقت کا روپ دھار کر منگل بند میں داخل ہوچکی تھی۔

☆☆☆

دو گھنٹے جہنم میں

نیاز فتح پوری

صبح تک میں خود بھی اپنے آپ کو ایسا بیمار نہ سمجھتا تھا کہ وصیت کی فکر کرتا یا ان سب نا تمام کاموں کا انتظام کر جاتا جن کو میں کبھی اپنی ۴۰ سال کی عمر میں پورا نہ کر سکا تھا اور نہ شاید کبھی انجام تک پہنچا سکتا، خواہ اتنی ہی عمر اور کیوں نہ مل جاتی۔ صرف کبھی کبھی قلب کے حوال میں درد کی چمک محسوس ہوتی تھی اور میں سینہ پکڑ کر بیٹھ جاتا، دوپہر تک مجھے اور سب کو یہی یقین رہا کہ ریاح کا تکاثف ہے، فکر کی بات نہیں، لیکن جب شام کے وقت درد کے شدید و متواتر حملوں نے تشویش پیدا کی تو ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔

یہ میرے پرانے رفیق تھے۔ ان کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ اس زمانہ میں لوگ تداخل فصلین کے وقت بھی اس قدر بیمار نہیں پڑتے جتنے پہلے اچھے موسم میں صاحب فراش ہو جاتے تھے، ہمیں شک نہیں کہ آدمی ذہین تھے تجربہ کار تھے، لیکن معلوم نہیں کیوں وہ ہمیشہ مفلوک الحال رہے۔ بہر حال وہ اس کی تاویل یہی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی نبض دیکھی آنکھوں کے پپوٹے چیر کر معائنہ کیا، زبان نکلوا کر اس کا رنگ دیکھا اور پھر آلہ سینہ پر رکھ کر ضربات قلب کی حالت دیکھی اور حد درجہ مایوسانہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر میرے اعزہ اور تیمارداروں سے کہا کہ "آپ لوگ اگر چند منٹ کے لیے باہر چلے جاتے تو بہتر تھا"۔ میں اس وقت سکون کی حالت میں تھا۔ جب تنہائی ہو گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ بہت جری آدمی ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ گھبرائیں گے نہیں اگر میں یہ کہوں کہ آپ جلد سے جلد اپنی وصیت مرتب کر لیجئے اور جو ہدائتیں اپنے پسماندگان کو کرنا ہیں کر دیجئے، کیونکہ آپ کے قلب کی حالت بہت نازک ہے اور مشکل ہی سے شاید دو گھنٹے وہ اپنا کام کر سکے"۔

اس میں کلام نہیں کہ میں فطرتاً بہت جری ہوں اور بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی کبھی نہیں گھبرایا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس قدر ناگہانی طور پر صرف دو گھنٹے کا نوٹس، اس دنیا سے چلے جانے کا دیا جس میں میں نے اپنی زندگی کے چالیس سال اس قدر انہماک و تعلق شدید کے ساتھ بسر کر چکا تھا۔ میں واقعی گھبرا گیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا کہ واقعی میں کمزور طبیعت کا انسان نہیں ہوں لیکن یہ غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ کہا جائے کہ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ میرا خیال کیا یقین تھا کہ کم از کم ۸۰ سال ضرور جیوں گا کیونکہ میری صحت اچھی تھی میرے قواء صحیح تھے، بیمار بہت کم پڑتا تھا، پورے دو من کا وزن رکھتا تھا اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ مجھے دنیا میں بہت سے کام کرنا تھے اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ فطرت اس قدر ظالم ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے قبل از وقت اٹھا لے درآنحالیکہ میرے رہنے سے اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اس لیے جب میں نے یہ سنا کہ ۸۰ سال میں دفعتہً ۴۰ سال کم ہو گئے ہیں اور میں اپنے تمام کاموں کو ادھورا چھوڑ جانے پر مجبور ہوں، تو میری تمام جرأت و ہمت مفقود ہو گئی اور میری حالت اس کبوتر کی سی ہو گئی جو باز کے پنجہ میں پہنچ کر بازو پھٹ پھٹانے کی بھی قوت کھو بیٹھتا ہے، سب سے پہلے مجھے اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ اس صدمہ کو کیونکر برداشت کریں گی۔ بیس برس کی معیت کا یوں دفعتہً ختم ہو جانا، ان کو کس قدر بیتاب کر دے گا، اس کے بعد میں نے سوچا کہ میرے دو بچے جن کی تعلیم بھی ابھی پوری نہیں ہوئی کیا کریں گے۔ میری چھوٹی بچی جو مجھی کو دیکھ کر جی رہی ہے، کیونکر زندہ رہ سکے گی، روپیہ اپنی بے احتیاطوں کی وجہ سے کبھی پس انداز نہیں کر سکا، کاروبار کی حالت درست نہیں او ہو بھی تو اس کا چلانے والا کون ہے، بیمہ کی رقم بھی اتنی نہیں کہ بیوی بچوں کے لیے معقول سہارا ہو سکے۔ الغرض یہ تمام ہولناک خیالات مجسم ہو کر سامنے آ گئے اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ جسم کے ریشہ ریشہ میں کسی نے برف پگھلا کر بھر دیا ہے۔ سرو پیشانی سے ٹھنڈا پسینہ بہہ بہہ کر ٹپکنے لگا اور ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے پڑ

گئے گویا ان کی جان نکل گئی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی جواب دوں لیکن زبان نے کام نہ دیا اور میں بے ہوش ہوکر وہیں پلنگ پر گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے مطلق خبر نہیں کہ میں کب مرا اور کس وقت قبرستان میں پہنچایا گیا۔

دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ سامنے سے ایک بڑا شعلہ چلا آ رہا ہے، لیکن تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اس کی روشنی بالکل نہیں پھیل سکتی اور گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے تو معلوم ہوا کہ میں کسی گڈھے کے اندر بند ہوں اور جگہ اس قدر تنگ ہے کہ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ وہ شعلہ بڑھتے بڑھتے قریب آیا اور دو حصوں میں تقسیم ہوکر میرے دونوں پاؤں کے اوپر قائم ہوگیا۔ اب گرمی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور کیفیت یہ تھی کہ جسم پسینہ کے ہاتھ گھلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹنے چاہے کہ کہیں یہ دونوں شعلے مجھے جلا نہ دیں لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں روشنیاں طول میں بڑھنے لگیں، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک بہت لمبی سلاخ سی بن گئی اور عجیب قسم کی بھیانک سے چہرے ان میں سے پیدا ہوکر میری طرف گھورنے لگے۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہوگئیں اور عجیب قسم کی ہیبت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ کہیں نکیرین یہی تو نہیں ہیں، جن کا ذکر میں نے کتابوں میں دیکھا تھا، اور اس خیال کے آتے ہی میں نے ایسا محسوس کرنے لگا گویا نہایت ہی وزنی گرز سر پر مار رہے ہیں اور میرا دماغ پاش پاش ہوا جا رہا ہے۔ میں چیخ اٹھا کہ ''خدا کے لیے مجھے کیوں مارتے ہو؟'' انہوں نے کہا کہ ''آج تو ہمیں خدا کا واسطہ دلاتا ہے لیکن یہ تو بتا کہ کبھی تو نے بھی خدا سے کوئی واسطہ رکھا تھا، تو نے اس کو ہمیشہ ایک قوت سمجھا اور قوت بھی مجبور قسم کی جو مقررہ اصول کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی۔ پھر آج کیا ہوا جو اس کی پناہ میں آنا چاہتا ہے''۔

اب مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ ''یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ بات کا جواب بھی نہیں سنتے اور مارنا شروع کر دیتے ہو۔ مجھ سے سوال کیا ہے تو اس کا جواب سن لو پھر مارنے نہ مارنے کا تمہیں اختیار ہے''۔

وہ لفظ ''انسانیت'' سن کر بہت ہنسے، ان کی ہنسی بہت ہی مہیب قسم کا زہر خند تھی، اور بولے کہ ''اے بیوقوف انسان اور انسانیت یہ سب دنیا اور مادی عالم کی اصطلاحیں ہیں یہاں ان کا استعمال درست نہیں۔ پھر یہ کہ ہم انسان کب ہیں جو ہم سے انسانیت کی توقع رکھتا ہے۔ ہم لوگ فرشتے ہیں فرشتے۔ یوں ہی گرز چلاتے چلاتے نہ معلوم کتنا زمانہ گزر گیا ہے اور دشمنی کی وہ آگ جو آدم کی پیدائش کے وقت سے مخفی طور پر ہماری مخلوق میں انسان کی طرف سے بھڑکتی آ رہی ہے، اسے اسی طرح بجھایا کرتے ہیں۔ بے شک ہم نے آدم کو سجدہ کیا تھا، لیکن وہ سجدہ مجبوری کا تھا نہ کہ دل کی خوشی کا''۔

میں یہ خیال کرکے کہ ان کی گفتگو سے تو کچھ خدا کی طرف سے بھی بیزاری پائی جاتی ہے بہت خوش ہوکر کہا کہ ''سچ کہتے ہو، واقعی تمہاری سخت توہین کی گئی کہ خاک کے پتلے کے سامنے جھکنے پر مجبور کئے گئے۔ اس لیے اگر تم مجھے مہلت دو، تو میں تمہیں خدا کی بندگی کے عذاب سے نجات دلانے کے لیے آمادہ ہوں اور سچ پوچھو تو خدا تمہیں کو ہونا چاہیے کہ تمہارے گرز سے سام ونریمان، رستم و اسفندیار کا کلیجہ دہل سکتا ہے۔ میں نے تو خدا کا واسطہ صرف اس عادت کی بنا پر دلایا تھا جو دنیا کی زندگی میں پڑ گئی تھی اور جس سے مقصود گفتگو میں زور دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اچھا تو مجھے اٹھاؤ اور اس تاریک غار سے باہر نکالو تا کہ میں آزادی سے سانس لے کر سوچوں کہ کیونکر تمہاری خدائی دنیا میں قائم ہوسکتی ہے''۔

وہ یہ سن کر بہت ہنسے اور بولے کہ ''ساری عمر میں تو ہی آج پہلا مردہ ایسا ملا ہے جو ہمیں بہکا کر خدا سے منحرف کرنا چاہتا ہے۔ احمق تجھے نہیں معلوم کہ ہماری تمام حرکتیں مشین کی طرح ہیں اور ہم کو سوچنے کا اختیار ہے، نہ اس کے علاوہ کچھ کرنے کا۔ جو بے اختیارانہ طور پر ہم سے سرزد ہوتا رہتا ہے، زیادہ بک بک نہ کر، اٹھ جہنم تیرا انتظار کر رہا ہے، اور آگ کے شعلے تجھے ڈھونڈ رہے ہیں''۔

اب مجھ کو پہلی مرتبہ واقعی طور پر معلوم ہوا کہ میں مر گیا ہوں اور جہنم کا نام سن کر پھر میرے حواس نے جواب دینا شروع کیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نکیرین غائب ہیں اور میرے گلے میں ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے جو مجھے تپتے ہوئے ریگستان کے اوپر سے گھسیٹتی ہوئی کسی طرف لیے جا رہی ہے۔ ادھر ادھر جو میں نے نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ دور دور فاصلہ پر مجھ ایسے سینکڑوں مردے گھسیٹے جا رہے ہیں ان میں کوئی چیخ رہا ہے کوئی تڑپ رہا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو میری طرح بالکل خاموش ہیں اور حد درجہ بے چارگی کے ساتھ گھسیٹے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دور چل کر میں نے دیکھا کہ ہر مردہ کی سمت رفتار بدل گئی ہے اور اب میں تنہا رہ گیا ہوں، وہ زنجیر دفعتہً مجھے غار تک پہنچا کر غائب ہو گئی اور میں اس کے اندر تیزی سے جانے لگا جیسے کوئی اژدھا اپنی گرم و مسموم سانس سے کھینچ رہا ہو، مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک اس طرح گھسٹتا رہا۔ دفعتہً یہ کشش بھی دور ہوئی اور میں نے اپنے آپ کو ایسے میدان میں پایا جو حد نظر تک وسیع تھا اور آگ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سرخ آندھی چھائی ہوئی ہو۔ جا نجا چنگاریوں کے بگولے بلند ہو رہے تھے اور کہیں کہیں آگ کے فیل پیکر شعلے جن میں سے بعض بالکل تاریک تھے اور بعض بالکل سفید، اس طرح اٹھ رہے تھے جیسے طوفان میں سمندر موجیں لے رہا ہو۔ پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ زبان باہر نکل پڑی تھی، تالو چٹخا جا رہا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں سے کھولتا ہوا پانی ہی میسر آ جائے لیکن بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ پر عذاب ہی ہونا ہے، تو وہ کیوں نہیں شروع ہو جاتا، اور کیوں نہیں مجھے آگ میں ڈال دیا جاتا کہ جل بھن کر خاک ہو جاؤں اور اس تکلیف سے نجات پاؤں۔ ناگہاں ایک فرشتہ سامنے سے اڑتا ہوا نظر آیا۔ جس کے پر و بازو شعلے کی طرح چمک رہے تھے اور جس کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے کھولتا ہوا تانبہ۔ اس چہرہ میں صرف ایک آنکھ چاندی کی طرح درمیان میں چمک رہی تھی جس کے اندر سے کبود رنگ کی شعاعیں، ببول کے کانٹوں کی طرح نکل نکل کر جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں وہ میرے سامنے آ کر قائم ہو گیا اس حال میں کہ اس کا سارا جسم ایسا نظر آتا تھا جیسے گندھک کے ڈھیر میں آگ دے دی گئی ہو۔

اس نے کہا "تمہارے لیے یہ حکم ہوا ہے کہ فی الحال چند دن تک جہنم میں آزاد چھوڑ دیے جاؤ اور سوائے اس ایذا کے جو یہاں کی فضا میں ازخود تمہیں پہنچ جائے کوئی اور عذاب مسلط نہ کیا جائے"۔

یہ کہہ کر فرشتہ دھوئیں کی شکل اختیار کر کے فضا میں ازخود تحلیل ہو گیا اور میں حیران کہ آزادی بھی ملی تو کہاں جا کر، لیکن اس خیال سے کہ خیر فردوس کی پابندی سے بہر حال جہنم کی آزادی بہتر ہے، آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اب بجائے چٹیل میدان کے نہایت وسیع قلعہ کا سا حصار سامنے تھا۔ میں اس پھاٹک پر تھا جو سرنگ کی طرح بالکل گول تھا دفعتہً دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک طرف نہایت وسیع جھیل کھولتے ہوئے پانی کی تھی جس میں نئے مردے لا کر غوطہ دیے جا رہے تھے اور اس طرح گویا سب سے پہلے ان کی چربی نکالنے کی رسم پوری ہو رہی تھی۔ عفونت سے دماغ پھٹا جا رہا تھا اور چیخ و پکار سے کلیجہ دہلا جاتا تھا۔ داہنی نگاہ گئی تو بہت سے آہنی مکان نظر آئے جن کی دیواریں بلند تھیں لیکن شعلے ان کے اوپر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہر مکان کا ایک دروازہ تھا، لیکن بہت تنگ اور اس کے اندر سے بھی دہکتی ہوئی آگ اس طرح نظر آتی تھی جیسے انجن کی بھٹی دروازہ کھلنے کے بعد۔

سب سے پہلے مکان کے دروازہ پر آتشیں حروف میں ابلیس کے نام کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ لیکن یہ مکان مکین سے خالی تھا کیونکہ قیامت کے دن تک یہ دنیا میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اندر صرف دھواں سا اٹھ رہا تھا اور آتش کدے ہنوز روشن نہیں کیے گئے تھے۔

اس کے پاس ہی دوسرے مکان پر فرعون کا نام درج تھا۔ یہ نام دیکھتے ہی تمام وہ جھگڑے سامنے آ گئے جو اس کے اور موسیٰ کے درمیان پیدا ہوئے تھے اور بیتابانہ اندر داخل ہو گیا دیکھا کہ ایک نہایت ہی مہیب شکل کا انسان بیتابانہ ادھر ادھر دوڑتا پھر رہا

ہے تمام جسم میں اس کے سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں اور وہ ان کے زہر کی تکلیف سے بے چین ہو کر قریب ہی ایک گڑھے میں جس کا پانی سرد معلوم ہوتا ہے کود پڑتا ہے لیکن اس کے کودتے ہی آگ لگ جاتی ہے اور پھر وہاں سے گھبرا کر باہر نکل آتا ہے۔ میں نے چاہا کہ کھڑے ہو کر کچھ حالات دریافت کروں لیکن اس کی بے تابی کسی ایک جگہ لحہ بھر کے لیے بھی ٹھہرنے کی اجازت نہ دیتی تھی، اس لیے میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ سامنے اس کے عذاب کا مفصل پروگرام دیوار پر منقوش تھا اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہزار طرح کے عذابوں میں یہ صرف دوسرے قسم کا عذاب تھا جو ایک ہزار سال تک اسی طرح قائم رہے گا اس کے بعد تیسرے عذاب کا زمانہ آئے گا، پھر چوتھے کا یہاں تک کہ یہ ہزار قسم کے عذاب پورے ہو جائیں گے تو پھر دس لاکھ سال کا دوسرا پروگرام بنایا جائے گا۔

میں گھبرا کر یہاں سے نکلا تو قریب ہی قریب ہامان وشداد کے مکان نظر آئے لیکن میں اندر نہیں گیا اسی طرح قارون، نمرود سامری، ضحاک وغیرہ کی عذاب گاہوں سے گزر گیا، لیکن جب دفعتہً میری نگاہ کلیوپٹرا کے بورڈ پر پڑی تو ٹھہر گیا کیونکہ مجھے اس کی زیارت کا شوق تھا اور میں چاہتا تھا کہ دیکھوں اس میں وہ کونسی بات تھی جس نے مصر قدیم کو دیوانہ بنا رکھا تھا اندر گیا تو سب سے پہلے ایک آتشیں آبشار نظر آئی جو ایک سنگین مورت پر تیزی کے ساتھ گر رہی تھی۔ جس وقت اس آبشار کی دھار اس بت پر پڑتی تھی تو فوارہ کی شکل میں اس سے چنگاریاں بلند ہونے لگتی تھیں۔ یہ بت کیلوپیٹرا کا تھا، بلند وبالا، پر شباب، آشفتہ گیسو، اور سر سے پاؤں تک بالکل عریاں و بے پردہ۔ میں حیران تھا کہ اگر کلیوپیٹرا کو پتھر بنا کر مبتلائے عذاب کیا گیا ہے تو اس کو خدا کے جمالیاتی ذوق کی رعایت کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دفعتہً وہ بت شق ہوا اور اس کے اندر سے ایک عورت انسانی شکل وصورت اور خدوخال کی نمودار ہوئی۔ اس کے تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے آبلہ موتی کی طرح جھلک رہے تھے، لبوں سے خون کے قطرے اور آنکھوں سے عنابی رنگ کے آنسو ڈھلک ڈھلک کر آبلوں پر رنگین خط ڈالتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔ گلے میں سفید انگاروں کا ایک ہار پڑا ہوا، آگ کی لپیٹ سے جنبش میں آ کر جسم سے مس کرتا تھا اور ہر بار اس کے گورے جسم پر ایک سرخ نشان چھوڑ جاتا تھا۔ اس عالم میں بھی اس پر ایک شاہانہ جمال کا رنگ پیدا تھا۔ اور قیصر وانطانی اگر اس حال میں بھی اسے دیکھ لیتے تو شاید اس سے دوبارہ مل جانے کے گناہ میں ایک عمر دوزخ اور بسر کرنے کے آمادہ ہو سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی وہ نگاہیں دیکھوں جن سے مسحور ہو کر انسان خوشی سے جام زہر پی جایا کرتا تھا۔ اس کی لانبی لانبی پلکیں خون تو ضرور ٹپکاتی رہیں لیکن اس کی نگاہوں نے بلند ہو کر فضا کو مسموم نہیں کیا۔ تھوڑی دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ بت پھر شق ہوا اور اس کے اندر کلیوپیٹرا سمانے لگی۔ یہ غالباً اس کے لیے سب سے بڑا عذاب تھا۔ کیونکہ جتنا حصہ اس کے جسم کا پتھر میں تبدیل ہوتا جاتا تھا اسی قدر زیادہ اس کے چہرہ سے کرب وملال کے آثار ظاہر ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جب گردن تک وہ پتھر کی ہوگئی تو ایک ایسی چیخ اس کے منہ سے نکلی جیسے سینکڑوں من بوجھ کے نیچے دب گئی ہو اور پھر دفعتہً اس کا چہرہ بھی اسی سنگین حالت میں منتقل ہو گیا۔ دوزخ میں آنے کے بعد یہ پہلا منظر تھا جس نے بجائے غم وغصہ کے ملال کی کیفیت میرے اندر پیدا کی۔

یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے نینوا وبابل کی اس مشہور رقاصہ کا مکان جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہاروت و ماروت کو مبتلائے حسن کر کے اس نے اسم اعظم سیکھ لیا تھا اور آسمان پر زہرہ بن کر اڑ گئی تھی۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ آسمان پر اڑ جانا غلط خبر تھی بلکہ وہ قصر جہنم میں ہاروت و ماروت کے ساتھ پھینک دی گئی تھی، میں اس کے بھی دیکھنے کا شائق تھا اس لیے اندر گیا۔ یہاں میں نے نہایت ہی تاریک دھواں دیکھا، جس میں چنگاریاں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں۔ دیر تک آنکھیں ملنے کے بعد اسی تاریکی میں دور ایک عورت نظر آئی جو انگاروں پر لوٹ رہی تھی اور جسم سے چربی اور خون کے جو قطرے ٹپک ٹپک کر آگ پر گرتے تھے تو سخت عفونت پیدا ہوتی تھی۔ میں یہاں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکا اور فوراً ناک بند کر کے باہر نکل آیا۔

میں یہاں سے نکل کر کہاں گیا، اور کن کن لوگوں کو عذاب میں مبتلا پایا، اس کی تفصیل کسی آئندہ صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب اس طبقہ میں پہنچا جو صرف شاعروں کے لیے مخصوص تھا تو میر، مصحفی، ناسخ، آتش وغیرہ خدا معلوم کن کن شاعروں سے مل کر غالب کے پاس پہنچا، تو وہاں ایک عجیب وغریب لطیفہ انہوں نے سنایا کہ:۔

جب میرے اعمال کا محاسبہ ہوا اور دوزخ کے قابل نہ سمجھ کر جنت کے ایک نہایت ہی حقیر حصہ میں لے جا کر ایک ایسے حجرہ میں بند کر دیا جہاں سوائے ایک خشک گملے کے اور کچھ نہ تھا تو مجھ سے دریافت کیا کہ تم اپنی بہت سی آرزوئیں نامکمل چھوڑ کر آئے ہو اور تمہارے بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت ہنوز داد طلب پڑی ہوئی ہے اس لیے بتاؤ ان میں سے کوئی ایک آج پوری ہو سکتی ہے۔ میں نے فرط مسرت میں گھبرا کر کہہ دیا کہ "کوئی ایک" میرے منہ سے یہ نکلا ہی تھا کہ فردوس کے اس حجرہ کو اٹھا کر یہاں دوزخ میں ڈال دیا۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ میری کونسی آرزو تھی جو اس طرح پوری کی جارہی ہے کہ ناگہاں سامنے دیوار پر یہ مصرعہ نظر آیا کہ:۔

دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے اوپر اس مصرعہ کی وجہ سے یہ عذاب نازل کیا گیا ہے۔ خیر یہ تو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ نہ آیا کہ اس شعر کا پہلا مصرعہ "طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ" خدا کو سنایا گیا یا نہیں ظاہر ہے کہ وہاں تک یہ بات نہیں پہنچی ورنہ مجھے تو فردوس سے بھی بلند کوئی چیز ملنی چاہیے تھی نہ کہ ایسا حقیر وکثیف حجرہ جو اگر جہنم میں نہ ڈال دیا جاتا تو میں خود اس کے اندر آگ جلا کر اس کی گندگی وعفونت کو دور کرتا، میں سمجھتا ہوں کہ ان ظاہر پرست ملاؤں نے یہاں بھی اپنا اقتدار قائم کر دیا ہے اور افسوس کہ اب فردوس بھی رہنے کے قابل جگہ نہ رہی"۔

میں نے یہ سن کر کہا کہ "آپ کا یہ خیال غالباً درست نہیں، کیونکہ میں نے تو آج ایسے ایسے مولویوں اور تہجد گزار بزرگوں کو دوزخ میں جلتے اور سسکتے دیکھا ہے کہ ان کی نسبت کبھی گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اعلیٰ علیمین سے ایک قدم نیچے اتریں گے"۔

یہ سن کر وہ بہت متحیر ہوئے اور بولے کہ پھر تو دوزخ بھی رہنے کے قابل نہ رہی۔ تمام عمر ان کے صلاح وتقرے کے وعظ نے مجھے دنیا میں چین نہ لینے دیا۔ فردوس کا حال معلوم نہیں کہ وہاں میں نے کچھ دیکھا نہیں۔ جہنم میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہ عذاب یہاں بھی موجود ہے۔ لاحول ولاقوۃ کہو تم یہاں کس سلسلہ سے آئے ہو"۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے ابھی تک بالکل اس کا علم نہیں۔ فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا ہوں آئندہ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے، ڈرتا ہوں کہ شاعروں کے سلسلہ میں کہیں جگہ نہ دی جائے کیونکہ ان پر جس قسم کے عذاب ہوتے میں نے دیکھا ہے وہ حد درجہ توہین آمیز ہے۔ ان کے ہر ہر جھوٹے شعر کی ایک تمثالی صورت عذاب کی صورت میں پیش کی جاتی ہے اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شاعر کس کس طرح جھوٹ بولتا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے یہ شعر:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

کسی واقعہ کی بنا پر کہا ہے یا نہیں لیکن اگر یہ شعر جھوٹ کہا گیا ہے تو یقیناً یہ حرکت آپ کو یہاں کرنا پڑے گی اور ایک ہزار سال تک جو یہاں کی ریاضی کی اکائی ہے برابر آپ کو کسی نہایت ہی مردہ شکل والے کے پاؤں دابنا پڑیں گے۔ الغرض میں اس وقت سے کانپتا ہوں جب شعراء کے زمرہ میں مجھ پر عذاب نازل کیا جائے۔ ہر چند اس کا اندیشہ کم ہے کیونکہ اول تو میں نے شعر ہی بہت کم کہے ہیں اور جو چند کہے بھی ہیں تو وہ شعروں میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔

وہ اس کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ دفعتاً اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ نوچنے لگے، سینہ زخمی کرنے لگے میں نے خیال کیا

کہ یقیناً یہ بھی کوئی عذاب ہے اور دیر تک سوچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ داد ہے ان کے اس شعر کی:۔

تا بند نقاب کہ کشود ست غالب
رخسار بہ ناخن صلہ داریم و جگر ہم

میں یہ دیکھ کر یہاں سے دبے پاؤں باہر چلا گیا اور سوچتا رہا کہ دیکھئے اب کب تک غریب غالب اس حال میں مبتلا رہتا ہے۔

جہنم کے کتنے طبقات ہیں اس کا علم مجھے نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہر گروہ و جماعت کے لیے ایک ایک حصہ مقرر ہے۔ مثلاً ایک حصہ جہنمی بادشاہوں کا ہے جن میں سے صرف فرعون کا حال میں نے لکھا، دوسرا حصہ حکماء اور علماء کا ہے جن میں سے ارسطو، افلاطون، فیثا غورث وغیرہ سینکڑوں کو مختلف عذاب میں میں نے مبتلا دیکھا، ایک حصہ مولویوں، متقیوں اور نمازیوں کا بھی ہے، اور یہ دیکھ کر مجھے کتنی حیرت ہوئی کہ ان میں سے بعض ایسے ایسے اکابر بھی مبتلائے عذاب تھے جنہوں نے دنیا میں اپنی مستقل شریعتیں قائم کر رکھی تھیں، لیکن سب سے زیادہ ہنسی مجھے اس وقت آئی جب میں نے اپنے محلّہ کے ایک مولوی کو بھی یہاں دیکھا اور وہ مجھے دیکھ کر سخت شرمندہ ہوا۔ کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ کافر اور جہنمی کہا کرتا تھا اور اپنے آپ کو رضوان کے بیٹے سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے آزاد پھرتا دیکھ کر اسے بڑا رشک آیا، لیکن میں نے کوئی طعن آمیز فقرہ استعمال نہیں کیا، کیونکہ اس کی حالت خون اور پیپ پیتے پیتے بہت سقیم ہوگئی تھی اور اس کی زبان پر ببول کے کانٹوں کی طرح سینکڑوں خار پیدا ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے وہ زبان کو اندر نہ لے جا سکتا تھا۔

جب بادشاہوں، امیروں، فلسفیوں، مولویوں، شاعروں اور مصنفوں کے طبقات سے گزر کر میں اس حصہ میں پہنچا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا تو مجھے سخت تکلیف ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے قطب مینار سے اٹھا کر مجھے نیچے پھینک دیا۔ میں چونک پڑا اور آنکھ کھلی تو دیکھا بیوی بری طرح رو رہی ہیں بچے تڑپ رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ کفن لا کر میرے غسل کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ٹھیک پانچ بجے شام کو ڈاکٹر صاحب نے میری دو گھنٹے کی زندگی کا اعلان کیا تھا اور ۷ بجے شام کو دو گھنٹے بعد جو میری آنکھ کھلی تو میں زندہ تھا۔

☆☆☆

دوسرا دور

مہاوٹوں کی ایک رات

احمد علی

گڑ! گڑ! گڑ ر! الٰہی خیر! معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ کہیں چھت تو نہیں گر رہی! گڑ ڑ ڑ ڑ!
اس کے ساتھ ہی ٹوٹے ہوئے کواڑوں کی جھریاں ایک تڑپتی ہوئی روشنی سے چمک اٹھیں۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ساری عمارت کو ہلا ڈالا۔ سُوسُوسُوسُو! کیا سردی ہے! یخ جمی جاتی ہے، برف جمی جاتی ہے، کپکپی ہے کہ سارے جسم کو توڑے ڈالتی ہے۔
ایک چھوٹا سا مکان ۲۴ سے ۲۴ فٹ اور اس میں بھی آدھے سے زیادہ میں ایک تنگ دالان اور اس کے پیچھے ایک پتلا سا کمرہ، نیچا اور اندھیرا۔ کوئی فرش تک نہیں۔ کچھ پھٹے پرانے بوریئے اور ٹاٹ زمین پر بچھے ہیں جو گرد اور سیل سے چپ چپ کر رہے ہیں۔ کونوں میں بقچیوں اور گودڑ کا ڈھیر ہے۔ ایک اکیلا کاٹ کا ٹوٹا ہوا صندوق، اس پر بھی مٹی کے برتن جو سالہا سال کے استعمال سے کالے ہو گئے ہیں، اور ٹوٹتے ٹوٹتے آدھے پونے رہ گئے ہیں۔ ان میں ایک تانبے کی پتیلی بھی ہے، کنارے جھڑ چکے ہیں! برسوں سے قلعی تک نہیں ہوئی، گھستے گھستے پیندا جواب دینے کے قریب ہے۔
چھت ہے کہ کڑیاں رہ گئی ہیں اور اس پر بارش! اللہ کیا مہاوٹیں اب کے ایسی برسیں گی کہ گویا ان کو پھر برسنا ہی نہیں؟ اب تو روک دو! کہاں جاؤں، کیا کروں؟ اس سے تو موت ہی آجائے۔ تو نے غریب ہی کیوں بنایا یا اچھے دن ہی نہ دکھائے ہوتے۔ یا یہ حالت ہے کہ لیٹنے کو جگہ نہیں، چھت چھلنی کی طرح ٹپکی جاتی ہے۔ بلی کے بچوں کی طرح سب کونے جھانک لیے۔ لیکن چین کہاں؟ میرا تو خیر کچھ نہیں، بچوں نگوڑے ماروں کی مصیبت ہے۔ نہ معلوم سو بھی کیسے گئے ہیں۔ سردی ہے کہ اُف! بوٹی بوٹی کانپی جاتی ہے! اور اس پر ایک لحاف، اور چار جانیں! اے میرے اللہ ذرا تو رحم کر! یا وہ زمانہ تھا کہ محل تھے، نوکر تھے، فرش اور پلنگ تھے۔ آہ وہ میرا کمرہ! ایک چھپر کھٹ سنہری پردوں سے زرق برق، مخمل کی چادریں اور شنیل کے تکیے۔ کیا نرم نرم توشک تھی کہ لیٹے سے نیند آجائے۔ اور لحاف؟ آہ! ریشمین چھینٹ کا، اور اس پر ٹھپے ٹھپے کی گوٹ۔ اناکیں، مامائیں کھڑی ہیں بیوی سر دباؤں؟ بیوی پیر دباؤں؟ کوئی تیل ڈال رہی ہے، کوئی ہاتھ مل رہی ہے۔ گدگدا گدگدا بستر، اوپر سے یہ سب چونچلے، نیند ہے کہ کہکشانی کپڑے پہنے سامنے کھڑی ہے۔۔۔۔۔ سبز شیشوں پر نیلے اور سرخ اور نارنجی عکس، بڑے بڑے ہشت پہل جواہرات کے سابوت ڈلے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ دسترخوان پر چاندی کی طشتریاں، ایک جھلملاہٹ، قورما پلاؤ، بریانی، تنجن، باقرخانیاں، میٹھے ٹکڑے۔۔۔۔۔ ایک باغ درختوں سے گھرا ہوا، جن کی کاہی پتیوں پر تاروں کی چمک شبنم میں اور تارے چمکا رہی ہے۔ واہ وا! کیا کیا خوش نما پھل ہیں۔ آم، منہ لال کلیجہ بال، ماں کا بغدو بچہ۔ سیب کیسے خوبصورت ہیں۔ اندھیرے اندھیرے درختوں میں سرخ اور گلابی اور پستئی لٹکے ہوئے ہیں، ڈالیوں سمیت جھکے ہوئے ہیں۔ ارے بیر تو دیکھو کیسے موٹے موٹے اور عنابی ہیں، شجنیورے لے کے سے۔ ایک نہر، اندھیری رات میں چاندی کی چادر بچھی ہوئی ہے، شاید دودھ ہے۔ کہیں جنت تو نہیں؟ ایک کشتی بڑی آہستگی سے، بطخوں کی نزاکت سے بہتی ہوئی، جلدی آؤ، جلدی بیٹھ جاؤ، بہشت کی سیر کرائیں، کیا بیویاں ہیں، پاک صاف، بلور جیسی گوری؟ اُجلے براق کپڑے، نزاکت ایسی جیسی ہوا کی، کشتی بہتے ہوئے چراغ کی طرح پانی پر چلی جا رہی ہے۔ دونوں طرف کھلے کھلے میدان۔ جو ہری ہری دوب سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بیچ بیچ میں پھولوں کے رنگین تختے اور پھلوں کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جانور چہچہا رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں، تو کیا یہ جنت ہے؟ کیا ہم جنت میں ہیں؟ ہاں، بہشت، خدا کے نیک اور پیارے بندوں کی

جگہ۔ کشتی کچھ چھوٹے چھوٹے سیپ کی طرح چمکدار اور گنبدوں کی طرح گول مکانوں کے سامنے سے گزری۔ کیا خوبصورتی اور کیا چمک ہے! نگاہ تک نہیں ٹھہرتی۔ تھکتے تو نہ ہوں گے؟ کیا ان میں مجھ کو بھی جگہ ملے گی؟ خدا کے نیک اور سچے بندوں کے لیے میں، پاک بندوں کے لیے۔ پیٹ میں ایک کھرچن، کلیجہ میں ایک کھچاؤ! انتڑیاں بل کھا رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ گود میں کسی نے کچھ رکھ دیا۔ یہ ایک موتی کی طرح سفید اور سیب کی طرح بڑا پھل تھا۔ ڈنڈی میں دو ہرے ہرے پتے بھی لگے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ڈال سے توڑا گیا ہو۔ آہا، کیا مزہ ہے! کاش کہ اور ہوتے۔ گود بھری ہوئی تھی۔ کشتی دو پہاڑوں کے بیچ سے گزر رہی تھی ایک موڑ تھا، تھوڑی دیر میں جب موڑ ختم ہوا تو یکا یک دور کے ایک اونچے پہاڑ سے بجلی سے زیادہ تیز روشنی کی لپٹیں آگ کی طرح اٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، آنکھیں چکا چوند ہو کر بند ہو گئیں۔ اندھیرا گھپ تھا۔ ایک شور کی آواز، گرج سے بھی زیادہ تیز آنے لگی۔ صور پھنک رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کشتی والی بیویاں ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ اتنے میں پھر ایک تیز روشنی ہوئی۔ سورج گر رہا تھا۔ یکا یک قریب ہی سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ رہا ہو۔ ایک زلزلہ آ گیا۔ کشتی ٹوٹ گئی اور سب دریا کے اندر ڈوب رہے تھے۔

گڑ ڑ ڑ ڑ! ٹپ ٹپ کی آواز چاروں طرف سے آ رہی تھی۔ اماں، اماں! ابھی کانوں میں سنسناہٹ باقی تھی۔ دل گزوں اُچھل رہا تھا۔ کیا ہے بیٹا، کیا ہے؟ ڈر لگ رہا ہے۔ یہ آواز کاہے کی تھی؟ کچھ نہیں بیٹا، گرج ہے۔ تینوں بچے چمٹے ہوئے ایک کونے میں سکڑے پڑے تھے۔ ٹپکا ان کے لحاف تک پہنچ چکا تھا۔ مریم کی طرف کا کونا بھیگ گیا تھا۔ بیچاری نے اٹھ کر بچوں کو اور پرے سرکایا۔ اب وہ بالکل دیوار کے برابر پہنچ گئے تھے۔ یا اللہ اگر ٹپکا اسی طرح بڑھتا رہا تو اب کے بھیگنا ہی پڑے گا۔ اماں سردی لگ رہی ہے، صدیقہ اس کے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے اس کو چمٹا کے لٹا لیا۔ روئی نہیں تو دوئی ہی سہی۔ اُدھر دونوں لڑکے چمٹے پڑے تھے لپٹے ہوئے، جیسے سانپ درخت سے لپٹ جاتا ہے۔

یا اللہ رحم کر۔ خدا غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے، ان کی آہ سن لیتا ہے۔ کیا میں غریب بھی نہیں؟ خدا سنتا کیوں نہیں؟ ہے بھی یا نہیں؟ آخر ہے کیا؟ جو کچھ بھی ہے بڑا جلاد ہے اور پھر بڑا بے انصاف ہے۔ کوئی امیر کیوں؟ کوئی غریب کیوں؟ اس کی حکمت ہے، اچھی حکمت ہے کوئی جاڑے میں اینٹھیں، لیٹنے کو پلنگ تک نہ ہوں، اوڑھنے کو کپڑے تک نہ ہوں، سردی کھائیں، بارشیں سہیں، فاقے کریں، اور موت بھی نہ آئے۔ کوئی ہیں کہ لاکھوں والے ہیں، ہر قسم کا سامان ہے، کسی بات کی تکلیف نہیں، اگر وہ تھوڑا سا ہم کو ہی دے دیں تو ان کا کیا جائے گا؟ غریبوں کی جانیں پل جائیں گی۔ لیکن ان کو کیا پڑی۔ کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس۔ ہم کو بنایا کس نے؟ اللہ نے؟ تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا؟ کس لیے بنایا؟ رنج سہنے اور مصیبت اٹھانے کے لیے؟ ارے کیا انصاف ہے! وہ کیوں امیر ہیں، ہم کیوں غریب ہیں؟ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے گا۔ مولوی تو یہ ہی کہتے ہیں۔ عاقبت کس کی، بھاڑ میں جائے عاقبت تکلیف تو اب ہے، ضرورت تو اب ہے، بخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہو اور دوا دس برس بعد ملے گی؟ بعض (باز۔ خ۔ ع) آئے ایسی عاقبت سے۔ جب کی جب بھگت لیتے، اب تو کچھ ہو۔ غربت میں غریب رہنے کی تسلی، مایوسی میں مایوس امید، مصیبت میں تکلیف سے قانع رہنے کا ذریعہ۔ اور مذہب ہے کہ وہ بھی یہی سکھاتا ہے، یہ ہی پڑھاتا ہے، پھر کہتے ہیں کہ علم کا خزانہ ہے اور پھر افلاس کا بہانہ ہے۔ بے وقوفوں کی عقل ہے، آگے بڑھتے ہوؤں، اوپر چڑھتے ہوؤں کو پیچھے کھینچتا ہے، ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔ غریب رہو، غربت ہی میں خدا ملتا ہے۔ ہم نے تو پایا نہیں۔ امیروں سے کیوں نہیں روپیہ دلوا دیتا؟ دولت کا کیا ہوگا، صرف اتنا چاہیے کہ اوقات بسر ہو جائے، آخر امیر ہی دولت کا کیا کرتے ہیں؟ تہ خانوں میں پڑی زنگ کھاتی ہے۔ کسی خرچ کا بھی ٹھیک نہیں، جو ہے بے تکے پن سے اٹھتا ہے، لٹتا ہے۔ سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا

دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو مل جائے۔لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے، اس کے تو خزانے پُر ہیں، بیٹھے بٹھلائے روپیہ مل جاتا ہے۔اس کو کیا، موت تو ہماری ہے جب پڑے تو جانے، اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو بلبلاتا ہے۔ابھی تو۔۔۔۔۔

اماں!

ہاں بیٹا کیا ہے؟

اماں بھوک لگی ہے۔

بھوک! مریم کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔یا الٰہی کیا کروں! بیچارے بچے۔۔۔۔میاں یہ بھی کوئی بھوک کا وقت ہے؟

بھوک نہ ہوئی دیوانی ہوگی۔سو جاؤ صبح ہوتے کھانا۔

نہیں اماں میں تو ابھی کھاؤں گا، بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔

نہیں بیٹا، یہ کوئی وقت نہیں، لیٹ جاؤ۔وہ دیکھو کڑک ہوئی۔بچہ بیچارہ کڑک کی آواز سنتے ہی سہم کر لیٹ گیا۔کہاں سے لاؤں؟ کیا کروں؟ بارش نے تو دن بھر نکلنے بھی نہ دیا کہ کسی کے ہاں جاتی اور تھوڑا بہت جو کچھ مل سکتا لا کر سیتی، بیچاری فیاض بیگم کے بھی جانا نہ ہوا، وہ ہی بیچاری بچا کچھا جو کچھ ہوتا ہے برابر دے دیتی ہیں۔اب جو اگر کل بھی کہیں سے کام نہ ملا تو کیا ہوگا؟ آخر کہاں تک مانگ کے لاؤں؟ دیتے دیتے بھی لوگ اکتا جاتے ہوں گے۔

اماں! بھوک لگی ہے، دیکھو تو پیٹ خالی پڑا ہے، کل دن سے نہیں کھایا اور نیند بالکل نہیں آتی، کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔بیچاری آخر کو اٹھی اور دیولے کی مدھم روشنی میں ٹٹولتی ہوئی صندوق کی طرف گئی کہ اگر کچھ مل جائے تو بچے کو دے۔آخر تو صرف پانچ برس کی جان ہے! کاش میں نے ان بچوں کو جنا ہی نہ ہوتا، میں تو مر گر کے کاٹ ہی لیتی، لیکن ان کی تکلیف تو دیکھی نہیں جاتی۔ایک سوکھی ہوئی روٹی ایک ہنڈیا میں پڑی پا گئی اس کو توڑ کر پانی میں بھگویا اور بچے کے سامنے لا کر رکھی۔پیٹ بڑی بُری بلا ہے۔بیچارہ کتے کی طرح چٹ گیا۔تھوڑی کھانے کے بعد بولا اماں! ذرا سا گڑ ہو تو دے دو۔

مریم پھر کھڑی ہوگئی کہ شاید گڑ کی ڈلی بھی مل جائے۔اتفاق سے ایک چھوٹی سے ڈلی پا گئی۔بچے نے جو کچھ ہو سکا کھایا۔دو چار نوالے جو بچے تھے مریم اپنے ضبط نہ کر سکی اور تھوڑا تھوڑا کر کے کھا گئی۔

کڑک اور چمک رک چکی تھی۔بارش بھی کم ہوگئی تھی۔پھر صدیقہ سے چمٹ کر لیٹ گئی اور اکیلی تھی۔

آہ! کاش کہ وہ ہوتے! آہ وہ ہوتے۔وہ، وہ، وہ۔رات کو آتے کچھ نہ کچھ لیے چلے آتے ہیں۔کیا لائے ہو؟ حلوا سوہن ہے۔وہ ہی نگوڑا پپڑی کا ہوگا۔تم جانتے ہو کہ مجھے حبشی پسند ہے۔لو! پھر چیخنے لگیں دیکھا تو ہوتا۔آہ! وہ جھگڑے اور وہ ملاپ، ساون اور بھادوں کے ملاپ۔کیا دن تھے، اب تو ایک خواب ہیں۔پھر چاندنی راتوں میں پھول والوں کی سیر۔آہ! وہ سیجیں، کیا مہک تھی دماغ پھٹا جاتا تھا، اور اب تو وہ باسی پھول بھی نہیں، مرجھائے ہوئے پھول بھی نہیں۔اے کاش وہ ہوتے۔وہ ٹانگیں، ایک سرسبز درخت، گوشت اور ہڈی اور گودے کا۔اس کا رس خون سے زیادہ گرم، اور اس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم، ایک تنا سبک اور مضبوط اور دو ڈالیں اور۔۔۔۔۔۔ایک تنا، ایک دوسرے میں پیوند، ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی، ایک دوسرے میں ایک دوسرے کی روح، جڑی ہوئی، بل کھاتی ہوئی، ایک دوسرے کی جان، اور ایک دوسرے میں ایک تیسری روح کی امید، ایک پوری زندگی کا خزانہ، ایک لمحہ کا سرمایہ، پر نیستی میں ہستی کی طاقت، آہ! وہ ٹانگیں، دو ٹانگ بل کھاتے ہوئے، اوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر مست پڑے ہیں۔ایک سوئی کے ناکے میں تاگا اور دو انگلیاں تیز تیز چلتی ہوئی، سپاٹے بھرتی ہوئی، نرم نرم روئیں دار مخمل پر گل کاریاں کر رہی

ہیں۔ ایک مکڑی اپنی جگہ قائم جالا بن رہی ہے، اوپر نیچے ہل رہی ہے، کچھ خبر نہیں نہ مکھی جال میں پھنس چکی ہے، اور لعاب ہے کہ تار بنا جاتا ہے، جال بُنا جاتا ہے۔ ایک ڈول کوئے کی گہرائی میں لٹکا ہوا، تہ تک پہنچا ہوا، اس کے ملائم ریت کی گرمی محسوس کر رہا ہے۔

پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے دائرے جو بڑھتے بڑھتے سارے میں پھیل گئے، دیواروں سے ٹکرانے لگے، باہر جانے لگے، اندر واپس آنے لگے، ایک سنسنی اور حرارت سارے میں پھیلا رہے ہیں۔ دو جڑواں درخت، ایک پیپل اور ایک آم، ایک ہی جڑ میں اگے ہوئے، ایک ہی تنے سے پیدا، ایک ہی زندگی کے ہمراز، تھے کہ اگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا، ایک دوسرے کی تسلی، ایک ہی ہوا میں سانس لیتے، ایک ہی سوت کے پانی سے جیتے تھے۔ آہ! وہ جسم۔ اور اب تو پیپل کو بجلی نے جلا ڈالا، جڑ سے مسل ڈالا! مگر آم ہے کہ قسمت کا مارا ابھی تک کھڑا ہے۔ کاش کہ اس پر بجلی گری ہوتی۔۔۔۔ لنجا، اکیلا، مرجھایا ہوا، چچڑی کی جان ابھی تک ٹھوکریں کھانے کو زندہ ہے۔ اگر وہ ہوتے۔۔۔۔۔

لحاف میں ایک حرکت، صدیقہ نے ایک کروٹ لی۔

آہ! زمانہ کسی کے بہلاوے میں نہیں آتا، کسی کے پھسلاوے میں نہیں آتا اور میں ایک اکیلی ہوں، آہ! میں اکیلی ہوں۔ اس سے تو زندگی کا لطف دیکھا ہی نہ ہوتا جو آج یہ تنہائی محسوس نہ ہوتی۔ میرے دل میں کوئی جگہ خالی نہ ہوتی، محبت کی جگہ۔ امید بھی کیا جھونٹے جھلاتی ہے۔ کبھی پاس آتی ہے، کبھی دور جاتی ہے۔

لیکن امید کا ہے کی؟ اب تو ایک مایوسی ہے کہ سارے میں پھیلی ہوئی ہے، بادلوں کی طرح اُمڈی ہوئی ہے۔ وہ سُوت کی رسی جھولا، چار ہم جولیاں* ٹھرے کے ایک ایک کنارے پر دو دو، اور پینگ ہیں کہ درخت کو ہلائے ڈالتے ہیں، گھنگور گھٹاؤں میں گھسے جاتے ہیں۔ جھولا کن نے ڈالو رے آموریاں۔ واہ! انوری اور کشور، بس اتنے ہی پینگ لے سکتی ہو؟ دیکھو میں اور کبری کتنا بڑھاتے ہیں۔ چکر نہ آجائیں جب ہی کہنا۔۔۔۔۔ پھر ایک ہنسی کا غل، اور پھر ایک قہقہوں کا شور۔۔۔۔۔۔ آہ! اب تو زندگی ایک ہوا ہے۔ باغ ارم اور حوروں کی خوش فعلیاں، پھولوں کے ہار اور اوس کا جھومر۔ نہ وہ بیر کی ڈالی! کہاں میرا آشیانہ؟ پھر ایک تپتی ہوئی چٹان بنجر اور سخت، اور اس کے پہلو سے زندگی۔ لیکن پھر ایک نئی ہستی، پھر ایک نئی آن، منوسلویٰ کے مزے، دودھ کی شیریں نہروں میں نہانا، اور ان میں کھیلنا۔ پھر دن عید، رات شب برات۔ لیکن آہ! زمانہ کی ایک کروٹ۔۔۔۔ ابلیس اور گیہوں اور نیستی، تنہائی، تنہائی، ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا، کاش کہ وہ ہوتے۔۔۔۔ ارے آدم!۔۔۔۔۔ نہ پھر اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ پھر وہ ہی خوشی اور خرمی۔ ایک قیامت بپا ہے۔ نفسی نفسی کا عالم، اسرافیل کا شور، دجال ہے کہ سب کو پھسلا رہا ہے۔ میں تو اسی کے پاس جاؤں گی، امید تو ہے۔ آہ! یہ تنہائی، کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں۔ نہ تسلی نہ تشفی نہ دلاسا۔ تنہائی، تنہائی۔ رات اندھیری اور بھیانک رات، ارے لا دو کوئی جنگل مجھے۔۔۔۔۔ جنگل۔۔۔۔ مجھے۔۔۔ بازا۔۔۔ با۔۔۔ بازار۔ مؤو۔ اُوجھ۔۔۔۔۔۔

رات۔

☆☆☆

گرمیوں کی ایک رات

سجاد ظہیر

منشی برکت علی عشاء کی نماز پڑھ کر چہل قدمی کرتے ہوئے امین آباد پارک تک چلے آئے۔ گرمیوں کی رات، ہوا بند تھی۔ شربت کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے پاس لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لونڈے چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے۔ بیلے کے ہار والے ہر بھلے مانس کے پیچھے ہار لے کر لپکتے۔ چوراہے پر تانگہ اور یکہ والوں کی لگاتار پکار جاری تھی۔

''چوک! ایک سواری چوک! میاں چوک پہنچا دوں!''

''اے حضور کوئی تانگہ وانگہ چاہیے؟''

''ہار بیلے کے! گجرے موتیے کے!''

''کیا ملائی کی برف ہے''۔

منشی جی نے ایک ہار خریدا، شربت پیا اور پان کھا کر پارک کے اندر داخل ہوئے۔ بنچوں پر بالکل جگہ نہ تھی۔ لوگ نیچے گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ چند بے سرے گانے کے شوقین ادھر اُدھر شور مچا رہے تھے، بعض آدمی چپ بیٹھے دھوتیاں کھسکا کر بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں اور رانیں کھجانے میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں وہ مچھروں پر بھی جھپٹ جھپٹ کر حملے کرتے جاتے تھے۔ منشی جی چونکہ پائجامہ پوش آدمی تھے انہیں اس بدتمیزی پر بہت غصہ آیا۔ اپنے جی میں انہوں نے کہا کہ ان کم بختوں کو کبھی تمیز نہ آئے گی، اتنے میں ایک بنچ پر سے کسی نے انہیں پکارا۔

''منشی برکت علی!''

منشی جی مڑے۔

''اخاہ لالہ جی آپ ہیں، کہیے مزاج تو اچھے ہیں!''

منشی جی جس دفتر میں نوکر تھے لالہ جی اس کے ہیڈ کلرک تھے۔ منشی جی ان کے ماتحت تھے۔ لالہ جی نے جوتے اتار دیئے تھے اور بنچ کے بیچوں بیچ میں پیر اٹھا کر اپنا بھاری بھرکم جسم لیے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی توند پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے جاتے اور اپنے ساتھیوں سے جو بنچ کے دونوں کونوں پر ادب سے بیٹھے ہوئے تھے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ منشی جی کو جاتے دیکھ کر انہوں نے انہیں بھی پکار لیا۔ منشی جی لالہ صاحب کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

لالہ جی ہنس کر بولے ''کہو منشی برکت علی، یہ ہار وار خریدے ہیں، کیا ارادے ہیں؟'' اور یہ کہہ کر زور سے قہقہہ لگا کر اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف داد طلب کرنے کو دیکھا۔ انہوں نے بھی لالہ جی کا منشا دیکھ کر ہنسنا شروع کیا۔

منشی جی بھی روکھی پھیکی ہنسی ہنسے ''جی ارادے کیا ہیں ہم تو آپ جانئے غریب آدمی ٹھہرے، گرمی کے مارے دم نہیں لیا جاتا، راتوں کی نیند حرام ہو گئی، یہ ہار لے لیا شاید دو گھڑی آنکھ لگ جائے''۔

لالہ جی نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنسے ''شوقین آدمی'' ہو منشی، کیوں نہ ہو!'' اور یہ کہہ کر پھر اپنے ساتھیوں سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

منشی جی نے موقعہ غنیمت جان کر کہا ''اچھا لالہ جی چلتے ہیں، آداب عرض ہے'' اور یہ کہہ کر آگے بڑھے۔ دل ہی دل میں

کہتے تھے کہ دن بھر کی گھس گھس کے بعد یہ لالہ کم بخت سر پڑا۔ پوچھتا ہے ارادے کیا ہیں! ہم کوئی رئیس تعلقدار ہیں کہیں کے کہ رات کو بیٹھ کر مجرا سنیں اور کوٹھوں کی سیر کریں، جیب میں کبھی چوّنی سے زیادہ ہو بھی سہی، بیوی، بچے، ساٹھ روپیہ مہینہ، اوپر سے آدمی کا کچھ ٹھیک نہیں، آج نہ جانے کیا تھا جو ایک روپیہ مل گیا۔ یہ دیہاتی اہل معاملہ کم بخت روز بروز چالاک ہوتے جاتے ہیں۔ گھنٹوں کی جھک جھک کے بعد جیب سے ٹکا نکالتے ہیں اور پھر سمجھتے ہیں کہ غلام خرید لیا، سیدھے بات نہیں کرتے، کمینے نیچے درجے کے لوگ ان کا سر پھر گیا ہے۔ آفت ہم بیچارے شریف سفید پوشوں کی ہے۔ ایک طرف تو نیچے درجے کے لوگوں کے مزاج نہیں ملتے، دوسری طرف بڑے صاحب اور سرکار کی سختی بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی دو مہینے پہلے کا ذکر ہے، بنارس کے ضلع میں دو محرر بیچارے رشوت ستانی کے جرم میں برخواست کر دیئے گئے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے غریب بیچارہ پستا ہے، بڑے افسر کا بہت ہوا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ہو گیا۔

''منشی جی صاحب'' کسی نے بازو سے پکارا۔ جمن چپراسی کی آواز۔

منشی جی نے کہا ''اخاہ تم ہو جمن''۔

مگر منشی جی چلتے رہے رکے نہیں۔ پارک سے مڑ کر نظیر آباد میں پہنچ گئے۔ جمن ساتھ ساتھ ہو لیا۔ دبلے پتلے، پستہ قد مخمل کی کشتی نما ٹوپی پہنے، ہار ہاتھ میں لیے آگے آگے منشی جی اور ان سے قدم دو قدم پیچھے صافہ باندھے، چکن پہنے قوی ہیکل، لمبا چورا چپراسی جمن۔

منشی جی نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس وقت جمن کا میرے ساتھ ساتھ چلنے میں کیا مقصد ہے۔

''کہو بھئی جمن، کیا حال ہے۔ ابھی پارک میں ہیڈ کلرک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ بھی گرمی کی شکایت کرتے تھے''۔

''اجی منشی جی کیا عرض کروں، ایک گرمی صرف تھوڑی ہے مارے ڈالتی ہے، ساڑھے چار پانچ بجے دفتر سے چھٹی ملی۔ اس کے بعد سیدھے وہاں سے بڑے صاحب کے ہاں گھر پر حاضری دینی پڑی۔ اب جا کر وہاں سے چھٹکارا ہوا تو گھر جا رہا ہوں، آپ جانئے کہ دس بجے صبح سے رات کے آٹھ بجے تک دوڑ دھوپ رہتی ہے، کچہری کے بعد تین دفعہ دوڑ دوڑ کر بازار جانا پڑا۔ برف، ترکاری، پھل سب خرید کے لاؤ اور اوپر سے ڈانٹ الگ پڑتی ہے، آج داموں میں ٹکا زیادہ کیوں ہے اور یہ پھل سڑے کیوں ہیں۔ آج جو آم خرید کے لے گیا تھا وہ بیگم صاحب کو پسند نہیں آئے، واپسی کا حکم ہوا۔ میں نے کہا حضور! اب رات کو بھلا یہ واپس کیسے ہوں گے لو جواب ملا ہم کچھ نہیں جانتے کوڑا تھوڑی خریدنا ہے۔ سو حضور یہ روپیہ کے آم گلے پڑے، آم والے کے ہاں گیا تو ایک تو تو میں میں کرنی پڑی، روپیہ کے آم بارہ آنے میں واپسی ہوئے، چوّنی کی چوٹ پڑی مہینہ کا ختم، اور گھر میں حضور قسم لے لیجئے جو سوکھی روٹی بھی کھانے کو ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کونسا منہ لے کر جورو کے سامنے جاؤں''۔

منشی جی گھبرائے آخر جمن کا منشا اس ساری داستان کے بیان کرنے سے کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ غریب تکلیف اٹھاتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں۔ مگر منشی جی کا اس میں کیا قصور؟ ان کی زندگی خود کون بہت آرام سے کٹتی ہے۔ منشی جی کا ہاتھ بے ارادے اپنی جیب کی طرف گیا۔ وہ روپیہ جو آج انہیں اوپر سے ملا تھا صحیح سلامت جیب میں موجود تھا۔

''ٹھیک کہتے ہو میاں جمن، آج کل کے زمانے میں غریبوں کی مرن جسے دیکھو یہی رونا روتا ہے، کچھ گھر میں کھانے کو نہیں۔ سچ پوچھو تو سارے آثار بتاتے ہیں کہ قیامت قریب ہے۔ دنیا بھر کے جعلیے تو چین سے مزے اڑاتے ہیں اور جو بیچارے اللہ کے نیک بندے ہیں انہیں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کرنی ہوتی ہے۔

جمن چپ چاپ منشی جی کی باتیں سنتا ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ منشی جی یہ سب کہتے تو جاتے تھے مگر ان کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جاتی تھی۔ معلوم نہیں ان کی باتوں کا جمن پر کیا اثر ہو رہا تھا۔

''کل جمعہ کی نماز کے بعد مولانا صاحب نے آثار قیامت پر وعظ فرمایا، میاں جمن سچ کہتا ہوں، جس جس نے سنا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بھائی دراصل یہ ہم سب کی سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہے، خدا کی طرف سے جو کچھ عذاب ہم پر نازل ہو وہ کم ہے۔ کونسی برائی ہے جو ہم میں نہیں؟ اس سے کم قصور پر اللہ نے بنی اسرائیل پر جو جو مصیبتیں نازل کیں ان کا خیال کر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر وہ تو تم جانتے ہی ہو گے''۔

جمن بولا ''ہم غریب آدمی منشی جی، بھلا یہ سب علم کی باتیں کیا جانیں، قیامت کے بارے میں تو میں نے سنا ہے مگر حضور آخر یہ بنی اسرائیل بیچارے کون تھے''۔

اس سوال کو سن کر منشی جی کو ذرا سکون ہوا۔ خیر غربت اور فاقے سے گزر کر اب قیامت اور بنی اسرائیل تک گفتگو کا سلسلہ پہنچ گیا تھا۔ منشی جی خود کافی طور پر اس قبیلے کی تاریخ سے واقف نہ تھے مگر ان مضمونوں پر گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔

''ایں! واہ میاں جمن واہ، تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل کس چڑیا کا نام ہے۔ میاں سارا کلام پاک بنی اسرائیل کے ذکر سے تو بھرا پڑا ہے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سنا ہے؟''

''جی کیا فرمایا آپ نے؟ کلیم اللہ؟'

''ارے بھئی حضرت موسیٰ۔ مو۔۔۔۔۔۔۔سا''۔

''موسا۔۔۔۔۔۔وہی تو نہیں جن پر بجلی گری تھی؟''

منشی جی زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ اب انہیں بالکل اطمینان ہو گیا۔ چلتے چلتے وہ قیصر باغ کے چوراہے تک بھی آپہنچے تھے۔ یہاں پر تو ضرور ہی اس بھوکے چپراسی کا ساتھ چھوٹے گا۔ رات کو اطمینان سے جب کوئی کھانا کھا کر نماز پڑھ کر، دم بھر کی دلبستگی کے لیے چہل قدمی کو نکلے، تو ایک غریب بھوکے انسان کا ساتھ ساتھ ہو جانا، جس سے پہلے کی واقفیت بھی ہو، کوئی خوشگوار بات نہیں۔ مگر منشی جی آخر کرتے کیا؟ جمن کو کتے کی طرح دھتکار تو سکتے نہ تھے کیونکہ ایک تو کچہری میں روز کا سامنا، دوسرے وہ نیچے درجے کا آدمی ٹھہرا، کیا ٹھیک، کوئی بدتمیزی کر بیٹھے تو سر بازار خواہ مخواہ کو اپنی بنی بنائی عزت میں بٹہ لگے۔ بہتر یہی تھا کہ اب اس چوراہے پر پہنچ کر دوسری راہ لی جائے اور یوں اس سے چھٹکارا ہو۔

''خیر بنی اسرائیل اور موسیٰ کا ذکر میں تم سے پھر کبھی پوری طرح کروں گا، اس وقت تو ذرا مجھے ادھر کام سے جانا ہے۔۔۔۔ سلام میاں جمن''۔

یہ کہہ کر منشی جی قیصر باغ کے سنیما کی طرف بڑھے۔ منشی جی کو یوں تیز قدم جاتے دیکھ کر پہلے تو جمن ایک لمحہ کے لیے اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اس کی آنکھیں ایک بے معنی طور پر ادھر ادھر مڑیں۔ تیز بجلی کی روشنی، فوارہ، سنیما کے اشتہار، ہوٹل، دوکانیں، موٹر، تانگے، یکے اور سب کے اوپر تاریک آسمان اور جھلملاتے ہوئے ستارے۔ غرض خدا کی ساری بستی۔

دوسرے لمحہ میں جمن منشی جی کی طرف لپکا۔ وہ اب کھڑے سنیما کے اشتہار دیکھ رہے تھے اور بیحد خوش تھے کہ جمن سے جان چھوٹی۔

جمن نے ان کے قریب پہنچ کر کہا ''منشی جی!''

منشی جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ساری مذہبی گفتگو، ساری قیامت کی باتیں، سب بیکار گئیں۔ منشی جی نے جمن کو کچھ جواب نہیں دیا۔

جمن نے کہا ''منشی جی اگر آپ اس وقت مجھے ایک روپیہ قرض دے سکتے ہوں تو میں ہمیشہ۔۔۔۔۔''

منشی جی مڑے ''میاں جمن میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت تنگی میں ہو مگر تم تو خود جانتے ہو کہ میرا اپنا کیا حال ہے۔ روپیہ تو روپیہ ایک پیسہ تک میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر میرے پاس ہوتا تو بھلا تم سے چھپاتا تھوڑا ہی تھا تمہارے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی پہلے ہی جو کچھ ہوتا تمہیں دے دیتا''۔

باوجود اس کے جمن نے اصرار شروع کیا ''منشی جی! قسم لے لیجئے میں ضرور آپ کو تنخواہ ملتے ہی واپس کر دوں گا، سچ کہتا ہوں حضور اس وقت کوئی میری مدد کرنے والا نہیں۔۔۔۔۔''

منشی جی اس جھک جھک سے بہت گھبراتے تھے۔ انکار چاہے وہ سچا ہی کیوں نہ ہو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ شروع سے چاہتے تھے کہ یہاں تک نوبت ہی نہ آئے۔

اتنے میں سنیما ختم ہوا اور تماشائی اندر سے نکلے۔

''ارے میاں برکت، بھئی تم کہاں؟'' کسی نے پہلو سے پکارا۔

منشی جی جمن کی طرف سے ادھر مڑے۔ ایک صاحب موٹے تازے، تیس پینتیس برس کے۔ انگرکھا اور دو پلی ٹوپی پہنے، پان کھائے، سگریٹ پیتے ہوئے منشی جی کے سامنے کھڑے تھے۔

منشی جی نے کہا ''اخاہ تم ہو! برسوں کے بعد ملاقات ہوئی، تم نے لکھنؤ تو چھوڑ ہی دیا؟ مگر بھائی کیا معلوم آتے بھی ہو گے تو ہم غریبوں سے کیوں ملنے لگے!''

یہ منشی جی کے پرانے کالج کے ساتھی تھے۔ روپے، پیسے والے رئیس آدمی، وہ بولے:

''خیر یہ سب باتیں تو چھوڑو، میں دو دن کے لیے یہاں آیا ہوں، ذرا لکھنؤ میں تفریح کے لیے، چلو اس وقت میرے ساتھ چلو تمہیں وہ مجرا سنواؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ میری موٹر موجود ہے، اب زیادہ مت سوچو، بس چلے چلو سنا ہے تم نے کبھی نور جہاں کا گانا؟ اہاہاہا کیا گاتی ہے، کیا بتاتی ہے، کیا ناچتی ہے، وہ ادا، وہ پھبن، اس کی کمر کی لچک، اس کے پاؤں کے گھنگھرو کی جھنکار! میرے کان پر، کھلے صحن میں، تاروں کی چھاؤں میں، محفل ہوگی۔ بھیروی سن کر جلسہ برخاست ہوگا۔ بس اب زیادہ نہ سوچو، چلے ہی چلو۔ کل اتوار ہے۔۔۔۔۔ بیوی! بیگم صاحبہ کی جوتیوں کا ڈر ہے، اگر ایسا ہی عورت کی غلامی کرنا تھی تو شادی کیوں کی؟ چلو بھی میاں! لطف رہے گا، روٹھی بیگم کو منانے میں بھی تو مزہ ہے۔۔۔۔۔۔''

پرانا دوست، موٹر کی سواری، گانا ناچ، جنت نگاہ، فردوس گوش، منشی جی لپک کر موٹر میں سوار ہو لیے۔ جمن کی طرف ان کا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ وہاں اسی طرح چپ کھڑا ہے۔

☆☆☆

دلّی کی سیر

رشید جہاں

''اچھی بہن ہمیں بھی تو آنے دو' یہ آواز دالان میں سے آئی، اور ساتھ ہی ایک لڑکی کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

ملکہ بیگم ہی پہلی تھیں جو اپنی سب ملنے والیوں میں پہلے پہل ریل میں بیٹھی تھیں۔ اور وہ بھی فریدآباد سے چل کر دہلی ایک روز کے لیے آئی تھیں۔ محلّہ والیاں تک ان کی داستان سفر سننے کے لیے موجود تھیں۔

''اے ہے آنا ہے تو آؤ! میرا منہ تو بالکل تھک گیا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں ہی بار تو سنا چکی ہوں۔ یہاں سے ریل میں بیٹھ کر دلی پہنچی اور وہاں ان کے ملنے والے کوئی نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے۔ مجھے اسباب کے پاس چھوڑ یہ رفو چکر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی برقعہ میں لپٹی بیٹھی رہی۔ ایک تو کمبخت برقعہ، دوسرے مردوے۔ مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں، اور اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکر پر چکر لگاتے ہیں۔ پان کھانے تک کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آوازے کسے، اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جائے، اور بھوک وہ غضب کی لگی ہوئی کہ خدا کی پناہ! دلی کا اسٹیشن کیا ہے بوا قلعہ بھی اتنی بڑا نہ ہوگا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی اسٹیشن ہی اسٹیشن نظر آتا تھا اور ریل کی پٹریاں، انجن اور مال گاڑیاں۔ سب سے زیادہ ڈر مجھے ان کالے کالے مردووں سے ڈر لگا جو انجن میں رہتے ہیں۔

''انجن میں کون رہتے ہیں؟'' کسی نے بات کاٹ کر پوچھا۔

''کون رہتے ہیں؟ نہ معلوم بوا کون! نیلے نیلے کپڑے پہنے، کوئی داڑھی والا، کوئی صفاچٹ۔ ایک ہاتھ سے پکڑ کر چلتے انجن میں لٹک جاتے ہیں، دیکھنے والوں کا دل سن سن کرنے لگتا ہے۔ صاحب اور میم صاحب تو بوا دلی اسٹیشن پر اتنے ہوتے ہیں کہ گنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گٹ پٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں۔ کم بختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا ''ذرا منہ بھی دکھا دو''۔

میں نے فوراً۔۔۔۔۔۔

''تو تم نے کیا نہیں دکھایا؟'' کسی نے چھیڑا۔

''اللہ اللہ کرو بوا۔ میں ان موؤں کو منہ دکھانے گئی تھی۔ دل بلیوں اچھلنے لگا'' تیور بدل کر ''سننا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو''۔

ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایسی مزیدار باتیں فریدآباد میں کم ہوتی تھیں اور ملکہ کی باتیں سننے تو عورتیں دور دور سے آتی تھیں۔

''ہاں بوا سودے والے ایسے نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔ صاف صاف خاکی کپڑے اور کوئی سفید، لیکن دھوتیاں کسی کسی کی میلی تھیں ٹوکرے لیے پھرتے ہیں، پان، بیڑی سگریٹ، دہی بڑے، کھلونا ہے کھلونا، اور مٹھائیاں چلتی ہوئی گاڑیوں میں بند کئے بھاگے پھرتے ہیں۔ ایک گاڑی آ کر رکی۔ وہ شور غل ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے، ادھر قلیوں کی چیخ و پکار ادھر سودے والے کان کھائے جاتے تھے، مسافر ہیں کہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں اور میں بیچاری بیچ میں اسباب پر چڑھی ہوئی۔ ہزاروں ہی کی تو ٹھوکریں دھکے کھائے ہوں گے۔ بھئی جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، گھبرا گھبرا کر پڑھ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے ریل چلی تو مسافر اور قلیوں میں لڑائی شروع ہوئی:

''ایک روپیہ لوں گا''۔

''نہیں، دو آنہ ملیں گے''۔

ایک گھنٹہ جھگڑا ہوا جب کہیں اسٹیشن خالی ہوا۔ اسٹیشن کے شہدے تو جمع ہی رہے۔ کوئی دو گھنٹہ کے بعد یہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دکھائی دیئے اور کس لاپرواہی سے کہتے ہیں ''بھوک لگی ہو تو کچھ پوریاں وریاں لا دوں، کھاؤ گی؟ میں تو ادھر ہوٹل میں کھا آیا''۔

میں نے کہا کہ ''خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دو، میں باز آئی اس موئی دلی کی سیر سے۔ تمہارے ساتھ تو کوئی جنت میں بھی نہ جائے، اچھی سیر کرانے لائے تھے''۔ فرید آباد کی گاڑی تیار تھی اس میں مجھے بٹھا اور منہ پھلا لیا کہ:

''تمہاری مرضی، سیر نہیں کرتیں تو نہ کرو!''

☆☆☆

تیسرا دور

ازلی بدنصیب

اختر انصار دھلوی

اس کے بدترین اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ جس بات سے وہ ڈر رہا تھا وہ بالآخر ہو کر ہی رہی اور اس کو ایک مرتبہ پھر اپنے ازلی بدنصیب ہونے کا پکا یقین ہوگیا۔

وہ خوشی جو کچھ دنوں سے اس کے دل میں اجالا سا کیے ہوئے تھی خود اس کے لیے حیرت کا باعث تھی بلکہ حیرت کے ساتھ ساتھ خوف کا باعث بھی تھی۔ حیرت اس بات پر کہ جب زندگی بھر انتہائی جانفشانی اور بے پناہ جدوجہد کے باوجود اس کو کوئی جاندار اور دیرپا خوشی نصیب نہیں ہوئی اور ازلی تقدیر ہر موقع پر اس کی کوششوں کو خاک میں ملاتی رہی تو پھر اب یہ خوشی کیسی جو ادھر دو تین سال سے اس کے سر پر اپنی نورانی چادر تانے ہوئے تھی؟ اور خوف اس بات کا کہ کہیں یہ خوشی بھی حسب معمول عارضی اور گریز پا ثابت نہ ہو اور آخر آخر اسے یہ پتا چلے کہ جو کچھ تھا وہ جلوۂ سراب تھا یا نمودِ سیمیا کی جھلک۔ اٹھتے بیٹھتے طرح طرح کے ہول اس کے دل میں سمایا کرتے اور وہ یہ سوچ کر اندر ہی اندر لرزتا رہتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ناگہانی مصیبت آسمان سے نازل ہو کر اس ایوان مسرت کو جو بتدریج بلند ہو رہا ہے زمین سے ملا کر رکھ دے، اور یوں تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہے، جیسا کہ عمر بھر ہوتا رہا ہے۔

وہ جس زمانے میں پیدا ہوا، پلا اور بڑھا۔ وہ آج کے زمانے سے بہت مختلف تھا۔ برتھ کنٹرول سے اس زمانے کے والدین ناواقف تھے۔ اور فیملی پلاننگ کی اصطلاح تو شاید ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ عام طور پر بارہ چودہ سال یا زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں لڑکے کی شادی ہو جاتی تھی اور بچوں کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس کی شادی بھی نوعمری میں ہوگئی اور جب اس کے باپ نے پینتالیس سال کی عمر میں اچانک انتقال کیا تو اس وقت تک وہ پانچ بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ پانچ اس کے اپنے بچے اور پانچ چھوٹے بہن بھائی جو باپ کی اچانک موت سے بے سہارا ہو کر رہ گئے تھے۔ سب ملا کر دس ننھی ننھی جانیں تھیں جو عمر بھر کے لیے جونکوں کی طرح اس کی رگ جاں میں پیوست ہوگئیں۔ پھر ایک ماں، ایک بیوی اور ایک وہ خود۔ گویا کل تیرہ افراد تھے جن پر یہ خاندان مشتمل تھا۔ تیرہ کے ہندسے کو منحوس خیال کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہو یا محض توہم پرستی، کم سے کم جہاں تک اس کا تعلق تھا اس نحوست نے اپنا پورا اثر دکھایا۔ یعنی اس بوجھ نے اس کو عمر بھر پنپنے نہیں دیا۔ بالخصوص اس لیے کہ اس کا باپ دیوالیہ ہو کر مرا تھا۔ وہ بمبئی کے اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ کا شناور تھا اور تالاب کی بڑی مچھلی طرح چھوٹی مچھلیوں کو منہ کا نوالہ بنانا، اور ہزاروں نہیں لاکھوں اِدھر سے اُدھر کرتے رہنا اس کا زندگی بھر کا مشغلہ رہا تھا۔ انجام کار اسٹاک ایکسچینج خود شکاری بن کر اس بڑی مچھلی کو ہڑپ کر گیا۔ مطلب یہ کہ ایک دن ادھر اس کا دیوالہ نکلا اور ادھر اس کے قلب کی حرکت بند ہوئی۔ ایک بھرا پرا خاندان یاس والم کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ سب سے بڑے لڑکے نے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اور ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر کے اس ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو کھیلنے اور کنارے سے لگانے کی جان توڑ محنت میں مصروف ہوگیا۔ اس وقت وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ جان توڑ محنت عمر بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

اب یوں کہنے کو دولت وثروت کے بارے میں کچھ بھی کہا جائے۔۔۔ کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے، اور دولت ڈھلتی پھرتی دھوپ چھاؤں ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں، اور مایا کے جال میں پھنسنا سب سے بڑی حماقت ہے، وغیرہ وغیرہ۔۔۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں دولت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ جب پیٹ نہ صرف دو وقت کی روٹی بلکہ اچھی سے اچھی غذا چاہے اور

بدن عمدہ سے عمدہ پوشش کا مطالبہ کرے، اور جسمانی راحت و آرام کے تقاضے دس بیس نہیں، سو پچاس نہیں، سینکڑوں اور ہزاروں سے بھی متجاوز ہوں اور نہ صرف راحت و آرام، بلکہ عزت، وقعت، سماجی مرتبہ، دنیوی حیثیت، یعنی ہر چیز دولت سے متعین ہوتی ہو، تو اعلیٰ اقدار کا راگ الاپنا اور دولت و ثروت کو ہیچ و پوچ بتانا ایک فضول اور بے معنی فلسفہ آرائی کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ بمبئی جیسے متمول شہر میں رہنے والا وہ نوجوان بھی جو ایک معمولی فرم میں معمولی سی نوکری کر کے ایک لمبے چوڑے کنبے کی کفالت کا بار اٹھائے ہوئے تھا، عمر بھر بے حد استقامت کے ساتھ دولت کو اپنا مطمحِ نظر بنائے رہا۔ لیکن دولت بھی اسی استقامت کے ساتھ اس سے دور بھاگتی رہی۔ وہ کبھی کچھ پس انداز نہیں کر سکا۔ اندوختے کا خانہ اس کے یہاں ہمیشہ خالی ہی رہا۔ جو کماتا وہ خرچ ہو جاتا۔ اگر کچھ بچتا تو ھل من مزید کی متواتر گونج اور بس! وہ اکثر یہ بھی سوچتا کہ ایسا کیا ساتھ ہے اور اپنے پاس وقت بے وقت کے اخراجات کے لیے دو چار سو روپے بھی کبھی نہیں ہوتے۔ کتنی خطرناک زندگی ہے یہ! اگر کبھی کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا ہوگا اور کیا کچھ نہ بیت جائے گی۔ یہ اور ایسے ہی ہولناک خیالات اس کے دماغ پر اکثر چھاپہ مارتے، لیکن روپیہ جمع کرنے پر وہ پھر بھی کبھی قادر نہ ہو سکا۔ اس کی ذمہ داریاں ہی کچھ ایسی تھیں۔ باپ کے مرنے کے بعد پہلے تو کئی سال تک بھائی بہنوں کا بوجھ ڈھوتا رہا۔ ان کی پرورش، ان کی تعلیم، ان کی شادیاں۔۔۔ یہ کوئی معمولی بوجھ نہیں تھا۔ پھر اپنے بچوں کی ضروریات توجہ کا مرکز بنیں اور جب انہوں نے اسکول سے کالج اور یونیورسٹی کی طرف ہجرت کی تو اس بوجھ سے تو اس کی کمر سچ مچ دوہری ہو گئی۔ سب سے بڑے لڑکے کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ وہ اس لڑکے کی تعلیم پر دل کھول کر خرچ کرتا رہا کیونکہ وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر یہ لڑکا لکھ پڑھ کر ڈاکٹر ہو گیا تو اپنے پردادا کی روایت کو زندہ کرے گا، اور کیا عجب ہے کہ ایک دن اپنے پردادا ہی کی طرح بمبئی کے بہترین اور قابل ترین ڈاکٹروں اور سرجنوں کی صف میں جگہ حاصل کرے! خیر، تو بچوں کی تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ان کی شادیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور ابھی اس سے نجات نہیں ملی تھی کہ اولاد کی اولاد نئے نئے روپ دھار کر اور پینترے بدل بدل کر سامنے آنے لگی، غرضیکہ ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس نے اس غریب کو عمر بھر سر اٹھانے کی مہلت نہیں دی۔ ان حالات میں ہنڈیاں تو کیا جمع ہوتیں، بس اتنا ہی بہت تھا کہ پردہ ڈھکا رہا اور ہزار ناکامیوں اور صد ہزار محرومیوں کے باوجود شُم پشتم گزر بسر ہوتی رہی۔

البتہ اب ادھر چند سال سے کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے تھے کہ اس نے نام خدا کچھ پس انداز کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ تین چار سو روپے ماہوار کی بچت کر کے وہ بیس پچیس ہزار روپے جمع کر چکا تھا اور سوچتا تھا کہ اس رقم کو جلد سے جلد لاکھ دو لاکھ نہیں تو کم سے کم ساٹھ ستر ہزار تک تو پہنچا ہی دے اور پھر بمبئی کے مضافاتی علاقے میں ایک چھوٹا موٹا فلیٹ خرید لے، اور اس کے بعد کار اور ریڈیوگرام اور فریج کی طرف بھی متوجہ ہو، تاکہ جب وہ مرے تو اس کی اولاد یہ تو نہ کہے کہ ہم بھی کس کنگال کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر جو بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ زراندوزی کے اس مشغلے میں اس کو ایک نیا اور انوکھا لطف محسوس ہو رہا تھا، کچھ ایسا عجیب و غریب لطف جو بعض اوقات اس کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا کہ میں نے زندگی بھر خود کو اس لطف سے کیوں محروم رکھا اور کیوں اس لطف کی خاطر اپنی اہم سے اہم ضرورت کو قربان نہیں کر دیا۔ پھر چونکہ وہ اس مزے سے زندگی بھر ناواقف رہا تھا اس لیے اب حریصانہ طور پر اس کو تا زیست جاری رکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لطف و لذت کے اس حصول کے ساتھ ساتھ ایک موہوم سا خوف بھی اس کو گھیرے رہتا تھا۔۔۔ یہ خوف کہ کہیں کوئی ناگہانی آفت آسمان سے نازل ہو کر اس خوشی کا گلا گھونٹ کر نہ رکھ دے، اور ہمیشہ کی طرح وہ پھر تقدیر کے ظلم کا شکار ہو کر رہ جائے۔ بڑھتی ہوئی دولت کا مزہ اور نامعلوم مستقبل کا خوف، ان دو متحارب جذبوں کی کشمکش اس کے پورے وجود کو اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھی۔

ایک دن، رات کو اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا جس کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی، اور پھر وہ رات بھر نہیں سو سکا۔ ایک بے نام خوف اس کے دماغ پر مسلط ہو گیا۔ اور ایک عجیب گمنام سا اضطراب اس کے دل میں کروٹیں لینے لگا۔ صبح تک وہ ایک دعا

پڑھتا رہا جس کو وہ ایسے موقعوں پر پڑھنے کا عادی تھا۔ دن نکلا تو خواب گاہ سے باہر آیا اور مکان کے بیرونی برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ ابھی دن کی روشنی اچھی طرح نہیں پھیلی تھی کہ ایک ٹوٹا پھوٹا شخص کاغذات کا ایک پلندہ اپنی بغل میں دبائے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کو اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ منہ اندھیرے اس انجانے، اجنبی، شکستہ حال شخص سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے کوفت محسوس کی اور کوفت کے ساتھ ساتھ رات کے ڈراؤنے خواب والا خوف و اضطراب بھی ایک بار پھر محسوس کیا۔ اتنے میں وہ شخص اس کے بالکل قریب آ گیا اور انتہائی مسرت کے انتہائی بھونڈے اظہار کے ساتھ سخت بوکھلائے ہوئے انداز میں اور عجیب و غریب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اس پر تہنیت و مبارک باد کی بوچھاڑ کرنے لگا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس اجنبی کی طرف دیکھتا رہا اور اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔

''مہاراشٹر اسٹیٹ لاٹری کا پہلا انعام آپ کے نام نکلا ہے!'' بالآخر اجنبی نے اعلان کیا۔

اب بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

اجنبی نے مزید وضاحت کی ''وہ ٹکٹ جو آپ نے مجھ سے خریدا تھا اس پر پانچ لاکھ روپے کا انعام نکلا ہے۔ مبارک ہو جناب! مبارک ہو!''

اب اسے یاد آیا۔ یہ وہ ایجنٹ تھا جس سے اس نے کچھ دن پہلے چلتے چلاتے ایک روپے والا اسٹیٹ لاٹری کا ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

''پانچ لاکھ روپے اور ایک نیو برانڈ ایمبیسڈر کار! جی جناب!'' ایجنٹ نے پھر کہا۔ ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟'' اور یہ کہہ کر وہ اس سے لپٹ گیا اور پھر جھک کر اس کے پیر دبانے لگا۔

وہ اس خبر کو سن کر چند لمحے تو کچھ مبہوت سا رہا۔ پھر اچانک اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر موجزن ہوئی لیکن پھر فوراً اسے وہ خوشی یاد آئی جو آہستہ آہستہ روپیہ جمع کر کے اس کو حاصل ہو رہی تھی جو در حقیقت اس کی زندگی کی پہلی کامرانی تھی، اور جس کی وہ دن رات خیر منایا کرتا تھا۔ اس نے ایک دھچکے کے ساتھ محسوس کیا کہ وہ جس محل کی تعمیر کر رہا تھا وہ اڑا اڑا دھم کر کے زمین پر آ رہا۔ گویا بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ تقدیر جو اس کی گھات میں تھی وار کرنے سے باز نہ رہی اور اس دفعہ بھی اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایجنٹ یہ سمجھا کہ انعام ملنے کی خبر نے صاحب کے دماغ پر برا اثر ڈالا۔ وہ اس کے گھر والوں کو مطلع کرنے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن اس نے اپنے مراقبے کی سی حالت سے بیدار ہو کر اسے روک دیا اور سختی کے ساتھ منع کیا۔ اس کا یہ رنگ دیکھ کر ایجنٹ صاحب وہاں سے چل پڑے۔ غالباً اس کے پڑوسیوں یا کچھ دوسرے لوگوں کو مطلع کرنے کے ارادے سے۔

چنانچہ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کے پڑوسی، شناسا اور کچھ دوست بھی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اب تو سب ہی اسی کے دوست تھے!۔۔۔۔۔۔۔ اچھلتے کودتے، چیختے چلاتے اور مبارک بادیوں کے ڈونگرے برساتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔

وہ بدستور ہاتھوں میں اپنے سر کو تھامے ہوئے بیٹھا رہا اور یہی سوچتا رہا کہ آخر میں ان کو کس طرح بتاؤں کہ تقدیر جیت گئی اور میں ہار گیا۔ میں ازلی بدنصیب ہوں! مجھے اپنی جدوجہد میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ تیرہ کا ہندسہ منحوس ہے۔۔۔۔۔ انتہا سے زیادہ منحوس!

☆☆☆

جسم کی پکار

اختر حسین رائے پوری

اسلم کی آنکھ دیر سے کھل چکی تھی لیکن وہ دم سادھے ہوئے بستر پر پڑا رہا۔ کمرے کے اندر بھی اتنا اندھیرا نہ تھا جتنا کہ باہر۔ کیوں کہ دنیا کپاس کے کافوری کفن میں لپٹی ہوئی تھی تاہم اکادکا کوے کی چیخ پکار اور برف پر رینگتی ہوئی گاڑیوں کی مسوسی ہوئی آوازا سے جتلا رہی تھی کہ سویرا ہو گیا۔

وہ چپ پڑا رہا۔ مبادا اس کے آغوش میں سوئی ہوئی بے خبر عورت جاگ نہ جائے۔ دھند لکے میں وہ اس کے مرمریں جسم کی نزاکتوں کو دیر تک دیکھتا رہا۔

یہ جسم جو آج تک اس کے لیے راز سربستہ رہا اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھا اور یہ دوری کبھی عبور نہ ہو سکے گی کیونکہ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ شام کو وہ اس شہر سے رخصت ہو جائے گا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔ زمان و مکان ان دونوں کے درمیان سات سمندروں اور نہ جانے کتنے سالوں کی دیواریں کھڑی کر دیں گے اور آہنی نقاب اتنی ہی حوصلہ شکن ہو گی جتنی ان دونوں کے جوان جسموں کی دُوری۔

اسلم کا دماغ پھر اسی حیرت میں اور دل اسی وسوسہ میں مبتلا ہو گیا جن کی ادھیڑ بن میں وہ مہینوں سے گرفتار تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے اپنی روح کو اس عورت کی روح سے ہم آہنگ پایا تھا۔ اس کا آوارہ تخیل دونوں روحوں کو رقص گاہوں میں سیر کناں پاتا تھا۔ دونوں کے دلوں کا احساس ایک تھا اور دونوں کے دماغ ایک دوسرے کے ہمدم لیکن ان کے اجسام ان مچھلیوں کی طرح تھے جو ایک حوض میں تیرتی ہوئی بھی الگ الگ تڑپتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے سے آشنا نہیں ہوتیں۔

اکثر دونوں جسم ایک دوسرے کو پکارتے تھے ان کے دل زور سے دھڑکتے ان کے سانس پھول جاتے۔ رگوں میں ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ لہو رقص کرتا ہاتھ مچلتے حسرت سے ایک دوسرے کو بھینچتے اور نوچتے لیکن یک بیک ان کے کھلے ہوئے آغوش بند ہو جاتے۔ عورت کے جسم سے کوئی راز ٹھنڈے پانی کی طرح ٹپکتا اور جسم کی پکار کو سرد کر دیتا۔

کتنی راتیں انہوں نے اسی طرح بسر کی تھیں۔ اس کلفت کے باوجود انہیں ایک دوسرے کی قربت عزیز تھی۔ جب اپنی ناکام کاوشوں کے بعد اسلم کا جسم تھک چکتا تو وہ چپ چاپ اپنی محبوبہ کے خوابیدہ سینے کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کرتا اور اس عجیب و غریب محبت کی نوعیت کو سمجھنے سے اپنے آپ کو قاصر پاتا۔

ایسا نہیں تھا کہ عورت کی نسلی تحت الشعور کو اس کے انجان جسم سے جھجک ہو۔ اسلم کی گردن پر وہ بوسہ اب تک دہک رہا تھا۔ جو پہلی صحبت شبانہ میں ثبت ہوا تھا۔ اور اس کی ہر ہر رگ عورت کے سیمیں بازوؤں کے شکنجہ میں کسی ہوئی تھی۔ ایسا بھی نہیں کہ عورت کی خواہش مردہ ہو چکی ہو۔ وہ ایک تندرست حیوان کی طرح جوانی کے رس میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پھر یہ کیا چیز تھی۔ اس نے کتنی بار امیلیا سے پوچھا تھا کہ ان کی زندگی کا وہ تیسرا اور نہ معلوم عنصر کیا تھا۔ یہ سوال منہ سے نکلتے ہی امیلیا کو ہنستا ہوا چہرہ اداس ہو جاتا، اور وہ بات ٹال جاتی اور کبھی جھوٹ موٹ افلاطونی دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی کہ اسلم کی محبت ابھی خام ہے کیونکہ اس کا مدار شہوت پر ہے۔

اسلم دل میں بہت جز بز ہوتا۔ حوا کی بیٹیوں سے وہ اتنا واقف تو نہ تھا۔ کیا اس نے یورپ کی گلیوں میں اپنی جوانی کو

دونوں ہاتھوں سے نہیں لٹایا تھا؟ کیا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ توپوں اور طیاروں کی گھن گرج میں اگر کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ جوان جسموں کا بے آواز کورس ہے۔ اس کی اپنی روح کو کتنی عورتوں کی مسکراہٹوں اور آنسوؤں نے داغ دار کیا تھا۔ اور اب وہ ایسی چھلنی ہو چکی تھی کہ اس میں بڑے بڑے سنگریزے بھی نہیں رک سکتے تھے۔

کتنی بار امیلیا کے اس لاینحل رویہ نے اسلم کو بیزار کیا اور وہ اسے جھڑک کر غصہ کی حالت میں کسی رقص گاہ یا شراب خانہ میں جا بیٹھا۔ عورتوں کے جھوٹے پیار اور شراب کے جھوٹے نشہ سے اس نے اپنی بے قراری اور بیزاری کو سکون دینا چاہا لیکن جب کبھی رات بیتے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اس نے امیلیا کو اپنے بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ اس کی آنکھوں میں ملامت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی خاموش التجاء ہوتی کہ اسلم شرم سے عرق عرق ہو جاتا۔ اور اپنی نفس پرستی پر اسے غصہ آنے لگتا۔

اسلم کی حیرانی کی انتہا نہ رہی تھی اس نے بازار کی ان کثافتوں کو محض اس لیے چھوا تھا کہ اس عورت سے انتقام لے۔ جیسے کوئی ضدی بچہ اپنی ماں کو دق کرنے کے لیے گندی نالی میں لوٹنے لگے لیکن امیلیا پر اس بے راہ روی کا کوئی اثر نہ ہوا تھا اور اس کی ۔۔۔۔۔۔۔۔ پراسرار چتون میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔

آج صبح کے دھند لکے میں لیٹے لیٹے اسلم یہ سب سوچتا رہا اور اس کے خود غرض جسم نے پھر پوچھا کہ اس محبت کا حاصل کیا تھا۔

ہولے ہولے اندھیرا چھنتا جاتا تھا۔ بادل اور کہاسہ کی غلافی تہوں کو چیر کر سورج کی مدھم روشنی فضا میں تیرنے لگی تھی۔

اسلم چپکے سے اٹھا اور لبادہ اوڑھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

یورپ میں آج اس کا آخری دن تھا۔ بفرض محال وہ دوبارہ اس سرزمین کو واپس بھی آیا تو وہ خود بھی بدل جائے گا اور یہ یورپ بھی نہ رہے گا۔ یہ اونچے اونچے مکان اور ان میں گنگناتی ہوئی رنگ رلیاں!!! ان کا نشان تک باقی نہ رہے گا۔ اسلم کا دل بھر آیا اور اپنی روایتی سرد مہری کے باوجود وہ رو پڑا۔ اس نے اس یورپ سے نفرت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی دولت پرستی اور حیوانیت کو وہ دن میں کئی بار کوسا کرتا تھا۔ وہاں کی عورتوں نے اسلم کو لطف پہنچایا تھا لیکن اس کی عزت حاصل نہ کر سکی تھیں۔ یورپ کے قیام میں ہر روز اس کی روح کو زلزلہ کے سے جھٹکے لگتے تھے اور وہ جانتا تھا کہ اس رنگا رنگ سطح کے نیچے لاوے کا دریا بہہ رہا ہے جو جانے کس آن ابل پڑے۔ یورپ کے انتشار و اضطرار، ہیجان و ہنگامہ کی وجہ سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ اور اس کے اس سوال کا جواب کوئی نہ دے سکا تھا کہ یہ بھاگم بھاگ، یہ دھکم دھکا کس لیے؟ تیز دوڑنے سے آدمی اپنی بے چینی کو بھول سکتا ہے لیکن اسے یوں سکون تو نہیں مل سکتا۔

پھر اس زندگی کا کون سا پہلو اسے عزیز تھا جس کی یاد میں وہ رو رہا تھا۔ جس طرح کسی پیارے کی قبر سے جدا ہوتے ہوئے کوئی بے اختیار رو پڑے۔

کیا وہ اس لیے رو رہا تھا کہ یورپ میں اسے اپنی غلامی کے احساس نے نہیں ستایا اور کسی نے اس کی خودداری کو جھٹکا نہیں لگایا۔ اور یا وہ اس لیے رو رہا تھا کہ واپس جا کر پھر اس پستی اور جہالت کی دنیا میں رہنا ہے، جہالت اور پستی اور اوہام کے دلدل میں جہاں جتنا ہاتھ پاؤں مارو، اتنا ہی پیچھے دھنستے جاؤ۔ اسلم نے دل ہی دل میں کہا معلوم نہیں، ان میں سے کون سی بات سچی ہے اور کون سی جھوٹ۔ لیکن میں شاید اس عورت کی جدائی سے ہراساں ہو رہا ہوں جس نے مجھے خوشی اور غم کی انتہا سے آشنا کیا اور اچانک یہ خیال بجلی کی طرح اسلم کے دل میں کوند گیا کہ اب تک کسی عورت نے اسے گہرا زخم نہیں دیا تھا۔ اداسی اور بے قراری ہاں، تردد اور پریشانی وہ بھی سہی۔ مگر غم، گہرا غم جو برف کے تودے کی طرح دماغ و دل پر مسلط ہو جاتا ہے اور ایک عمر تک بوند بوند ٹپک ٹپک کر انسان کے جوش عمل کو سرد کرتا رہتا ہے، وہ غم مجھے اس سوئی ہوئی عورت نے دیا ہے اور اب میں اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

اس مسلسل کرب سے نجات حاصل کرنے کی امید موہوم لے کر اسلم اپنے دیس لوٹ رہا تھا۔ مہینوں وہ اسی روح فرسا

کش مکش میں الجھا رہا تھا۔ کوہ آتش فشاں پر لرزتے ہوئے یورپ میں اس عورت کی خالی آغوش اور یا اپنا دیس جہاں جسمانی اور روحانی غلامی کے سوا اگر کچھ تھا تو ان قدیمی بندھنوں سے لڑنے کا جذبہ۔

باہر پیاری دھوپ پھیلنے لگی۔ پلنگ پر ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی اور کسی کی اداس آواز نے کہا ''پیارے! یہاں آؤ''۔ اسلم آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے روئیں روئیں پر امیلیا کی نگاہوں کا بوسہ محسوس کیا۔

پھر وہ اٹھی اور جلدی سے لبادہ کا تسمہ لپیٹتے ہوئے بولی ''تم بھی تیار ہو جاؤ۔ گاڑی تو چار بجے جاتی ہے نا؟ تمہارے ساتھ آخری بار ذرا سیر ہو جائے''۔

دونوں نے چپ چاپ منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے سڑک پر نکل آئے۔

''آؤ باغ کی طرف چلیں ۔۔۔ نہیں، باغ میں ان دنوں سوکھے پیڑوں کے سوا کیا ہوگا ۔۔۔۔ خیر یونہی ٹہلیں۔ کسی جگہ جانا کیا ضرور ہے''۔

اور ہر گام پر انہیں اپنا ماضی یاد آیا۔ وہ خاموش تھے لیکن انہیں ساری پچھلی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس جگہ بارش سے بچنے کے لیے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے۔ اسلم نے سگریٹ سلگانے کے لیے جیب سے ماچس نکالی وہ ہاتھ سے چھوٹ کر کیچڑ میں گر گئی اور اسلم بے جلا سگریٹ ہونٹوں میں دبائے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہمسایہ لڑکی نے اپنے بیگ سے ماچس نکال کر کہا ''یہ لیجیے'' یہ ان کی ملاقات کی ابتدا تھی۔

اور لو، اس نکڑ پر وہ پھول والی اب بھی کھڑی ہے۔ اس کی آنکھوں میں وہی شرارت ہے۔ کئی مہینے گزر گئے، دونوں اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ مالن نے سفید پھولوں کا گچھا ان کی طرف بڑھا کر کہا تھا ''محبت کے پھول'' دونوں ہنس پڑے۔ اسلم نے وہ گچھا لیا اور امیلیا کے بالوں میں ٹھونس دیا اس پر وہ شرما کر بولی ''جانتے ہو آج کے دن یہ پھول عاشق اپنی محبوبہ کو دیتے ہیں''۔

''تو پھر مضائقہ کیا ہے؟''

''لیکن ہم تو اس منزل سے گزر چکے ہیں۔ ہم دوست ہیں''۔

ان کے مرغوب کیفے کے سامنے وہی جانا پہچانا ملازم پیٹر اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیتا کھڑا ہے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل جاتا ہے۔ سلام کر کے وہ بے پوچھے ان کے لیے میز ٹھیک کرنے لگتا ہے اور اندر جا کر پکارتا ہے ''موسے یندو کے لیے چائے''۔ روز یہی ہوتا ہے اور روز کی طرح دونوں ہنس پڑتے ہیں۔

چائے پیتے وقت بھی دونوں کچھ نہیں کہتے۔ یا تو جو کچھ انہیں کہنا تھا وہ سال بھر کی مدت میں کہہ سن چکے اور یا جو کچھ کہنا ہے اس کے بیان کا سلیقہ انہیں نہیں آتا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ آج کے بعد ان پر جو بادل سایہ کریں گے ان کے رنگ مختلف ہوں گے۔ انہیں جو ہوا پنکھا جھلے گی اس کی لہک بھی الگ ہوگی اور اس وقت اسلم اپنے کو اس خیال سے باز نہ رکھ سکا کہ وہ دونوں ایک قالب کبھی نہیں ہوئے اور وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس واحد عورت نے اسے غم محبت دیا اسے وہ جانتا ہے۔

نہ وہ یہ چاہتی ہے کہ اسلم ہمیشہ یہیں رہے۔ بلکہ اس کے اصرار ہی نے اسلم کو اپنے وطن کی طرف منتقل کیا ہے۔ نہ وہ اسلم کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ درخت کی طرح انسان بھی ایک خاص مٹی کا عادی ہوتا ہے اور اگر اس کی جڑ کھود دی جائے تو وہ مرجھا جاتا ہے۔

یہ خاموشی انہیں کھائے جاتی ہے۔ خاموشی کے دوران میں جسم کی پکار سنائی دیتی ہے جو ایک دھیمی سرگوشی سے شروع ہو کر

اپنی لے کو بڑھاتی ہوئی ایک دردناک چیخ میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اسے بھولنے کے لیے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن گفتگو کے موضوع کتنے بے معنی اور محدود ہیں۔ موسم کی اداسی، راہ چلتوں کی بے مقصد چاٹ پھرت اور چائے کی بدمزگی کے علاوہ وہ اور کوئی موضوع چھیڑتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اور حیرت کا مقام ہے کہ وہ جس شے سے ڈرتے ہیں وہ ان کا اپنا جسم ہے۔

اور وقت ہے کہ گزرتا چلا جاتا ہے۔ یا وقت نہیں بلکہ ہم خود گزرتے جاتے ہیں۔ گویا ہم پتنگوں کی طرح وقت کی جلتی ہوئی لو پہ گرتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔

امیلیا کا بے جان جسم بدستور حرکت کرتا رہا لیکن ہر آن بیتے ہوئے دن اسے آواز دیتے رہے۔ دوسرے صبح کو آئینہ کے سامنے بیٹھے بیٹھے وہ انتظار کرتی رہی کہ کسی کے جانے پہچانے ہاتھ اس کی آنکھوں کو بند کر لیں گے۔ چائے پیتے وقت وہ اس شکایت کی منتظر رہی کہ چائے بہت ہلکی ہے اور ریڈیو کی موسیقی اسے جانے والے کی طنزیہ تنقید کے بغیر بالکل بے رس معلوم ہوئی۔ آسمان کا نکھرا ہوا نیلا پن اسے کھائے جا رہا تھا۔ کون اسے اب کس دور دیس کے نیلے آکاش لمبے چوڑے میدانوں اور گھنے گھنے جنگلوں کے افسانے سنائے گا؟

اسے بند بند میں، رگ و پے میں ایک قسم کی کیمیائی تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس کا ذہن جو یوں رستا تھا اب سوچنے سے انکار کرنے لگا۔ پپوٹے آپ ہی آپ آنکھوں پر ڈھلنے لگے۔ ہاتھ پاؤں یوں نڈھال ہو گئے گویا کسی بہت بڑی مہم سے واپس آئے ہیں۔ گویا وہ سال بھر سے بہت بڑا بوجھ اٹھائے چل رہی ہو اور یہ نیچے اترنے کی بجائے پاش پاش ہو کر اس کی ہستی میں محلول ہو گیا ہے۔ اور اب اس کی ہستی خود اس کے لیے بار ہو گئی ہو۔

امیلیا سوچنے لگی کہ کیسی عجیب بات ہے، یہ کیسی محبت تھی جو گھن کی طرح ہم دونوں کی شخصیتوں کو چاٹنے لگی۔ ان دونوں کی باہمی کشش کا مقناطیس ممکن ہے وہی نوائے سوختہ ہو جو ان جسموں سے نکل کر کبھی غزل اور کبھی نوحہ گاتی ہے۔ لیکن شروع میں تو وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ان کی محبت کا مرکز دردِ انسانی ہے جو خودی کے بندھنوں کو توڑ کر ساری مظلوم انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

امیلیا کے کانوں میں اسلم کی پر جوش تقریریں گونج اٹھیں۔ اس کی آتشیں تحریروں کے خیال سے اس کا بجھا ہوا دل دہک اٹھا۔ اسے یاد آیا کہ اول اول کسی بیکار یا بھکاری کو دیکھ کر اسلم کی آنکھوں سے کیسی چنگاریاں نکلا کرتی تھیں۔ کھاتے کھاتے ان کے تصور سے نوالہ اس کے گلے میں اٹکا کرتا تھا۔ اسپین ہو یا چین، ہندوستان ہو یا جاوا، اس کا دردمند دل سب کے دکھ کو یکساں سمجھتا تھا۔ امیلیا کو وہ دن یاد آیا جب اسپینی جمہوریوں کے جلوس میں وہ جھنڈا لیے چل رہا تھا اور پولیس اسے پکڑ کر حوالات لے گئی تھی۔ روتے روتے امیلیا کا برا حال ہو گیا تھا۔ لیکن اسلم نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ تمہارے آنسو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ نسل و قوم یا رنگ و مذہب کے اوہام اسے چھو کر بھی نہ گئے تھے۔ اور وہ ان کی نوعیت کو سمجھنے سے اچھوتے بچوں کی طرح قاصر تھا۔

اس وقت تک امیلیا مرد کی محبت تو دور رہی اس کی شخصیت سے بھی ناواقف تھی۔ پہلی مرتبہ اس نے ایک ایسے مرد کو دیکھا جس میں آسمان کی سی وسعت تھی۔ اور جب وہ اس کے سائے تلے آ کر کھڑی ہوئی تو وہ اسی طرح متحیر ہو گئی جیسے کہر آلود شمال کا انسان گرم ممالک کی دھوپ میں۔ مگر بہت جلد اس کی نسوانی جبلت نے بتلا دیا کہ یہ مرد عورت کے پیار کا پیاسا ہے۔ اس پیاس نے اسے بہت سے کنوئیں جھنکوائے ہیں اور اس پیاس کو بھولنے کے لیے اس نے خیالات اور تصورات کا ایک طلسم کھڑا کر لیا ہے۔ انسانی ہمدردی کا نقاب پہن کر یہ پیاس دزدیدہ نگاہوں سے ادھر ادھر کسی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ امیلیا کو دیکھتے ہیں اسلم نے اپنی مشعل پھینک دی، نقاب اتار دی اور اس کے جسم کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔

یہ تگ و دو آہستہ آہستہ شروع ہوئی۔ اور پھر اس کی شدت بڑھ گئی۔ امیلیا کا دماغ جو ابھی ابھی جاگا تھا مبہوت ہو گیا لیکن

ان نے جسم کو بے بس نہ ہونے دیا۔ امیلیا یہ کبھی نہ بھولی کہ اس مرد کے جذبات اس کے پاس امانت ہیں اور جب کبھی اس کے اپنے جسم نے جواب دینے کی کوشش کی، امیلیا نے اس کی آواز کو سختی سے کچل دیا۔

اس مرد میں وہ جوبگولوں کی سی دیوانگی تھی، امیلیا کو اسی سے محبت تھی اور وہ کسی قیمت پر اس دیوانگی کے سودے کے لیے تیار نہ تھی۔

اب چلتے پھرتے، سوتے جاگتے امیلیا سوچا کرتی ہے کہ اس کی یہ مزاحمت صحیح تھی یا غلط۔ دونوں کی زندگی تشنہ رہ گئی۔

دونوں شاید باقی عمر ماضی کا غم آگیں بار اٹھائے زندہ رہیں گے۔

لیکن اگر ایسا نہ ہوتا اگر وہ اپنے عاشق کے جسم کی پکار کو سن لیتی تو کیا ہوتا۔ ناشپاتی کے نازک پھولوں کو ہتھیلی پر مسلتے ہوئے امیلیا نے کہا کہ دو ہی باتیں ہوسکتی تھیں۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ شاید مجھ سے بھی جلد دب جاتا اور یا لوہے کی طرح میرے جسم کے مقناطیس سے چپک کر رہ جاتا۔ دونوں صورتوں میں اس کے خیال و عمل کی آگ بجھ جاتی اور ہم دونوں ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے اور پھر ہماری محبت حال و مستقبل میں زندہ نہ رہتی۔ بلکہ ماضی میں مدفون ہوتی۔

اور اب۔ امیلیا نے ہزارویں مرتبہ اپنے آپ سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا اس لیے آج کیا کرتا ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی روح کے ریگستان میں کسی گم کردہ راہ کی طرح بھٹک رہا ہو اور یا وہ درصل کلوکساں اور نھتو مزدور (اسلم نے کچھ ایسے ہی مضحکہ خیز نام گنائے تھے) کوئی دنیا کا پیغام سنا رہا ہو۔

اور میں ۔۔۔۔۔؟ امیلیا نے اپنے آپ سے پوچھا کہ میں کیا ہوں۔ ہندسہ کے بغیر صفر کی قدر کیا ہے۔ مرد بغیر عورت ۔۔۔ جسم بغیر جسم۔ روح بغیر روح۔

اس کے دل پر اداسی اور گرانی سی رہتی ہے۔ اس کا دل بار بار مچلتا ہے کہ کاش! وقت اس مدت کو حرف غلط کی طرح مٹا دے۔ اور پھر بازگشت کر کے وہیں پہنچ جائے جہاں رم جھم برکھا میں پیڑ تلے اس نے اسلم کی سگریٹ سلگائی تھی۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اسلم کے جمے ہوئے قدموں کو ڈگمگانے نہ دے گی اس کے ایمان پر غبار نہ آنے دے گی۔

مگر وقت ہے کہ گزرتا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ یا وقت نہیں بلکہ ہم خود گزرتے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

ممتا

احمد ندیم قاسمی

پنجاب سے مجھے برطانیہ کے ایک افسر نے بھرتی کیا اور چین کے ایک جزیرے ہانگ کانگ بھیج دیا، جہاں چینی بستے تھے اور انگریز گورنر راج کرتا تھا۔ مدتوں سے ہانگ کانگ پولیس کے لیے پنجاب سے سپاہیوں کے گروہ کے گروہ تو برآمد کئے جاتے ہی تھے۔ لیکن اب ادھر یورپ میں ہٹلر نے جنگ چھیڑ دی تھی اور انگریز وہاں بہت عدیم الفرصت ہو رہا تھا، اس لیے ہانگ کانگ پولیس کے لیے پنجابی نوجوانوں کی مانگ دگنی ہوگئی تھی میں کچھ ایسے گٹھے ہوئے جسم کا جوان نہیں ہوں۔ فوجی بھرتی میں کئی بار منہ کی کھائی ہے۔ مگر اب کے ڈاکٹر نے میری باہر نکلی ہوئی پسلیوں سے نظریں بچا کر میرے لمبے قد کی تعریف کی اور کہا کہ اتنے دراز قد نوجوان سپاہی کو دیکھتے ہی چینی بالشیے دہل کر مر جائیں گے۔ ہانگ کانگ پولیس میں چھ فٹ سے کم قد کے نوجوانوں کو بھیجنا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے اور اس سیاسی غلطی کی تصحیح کا جذبہ ہانگ کانگ لے آیا۔

میں نے پرانے ہانگ کانگی سپاہیوں سے سن رکھا تھا کہ ہانگ کانگ میں بڑے مزے ہیں۔ ہر اس ملک میں پولیس کے مزے ہیں جس پر کوئی دوسرا ملک راج کرتا ہے اور ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ پستہ قد گدا گر چینی عورتوں کو سڑکوں اور بازاروں کی پٹریوں سے بھگا دو اور جب ان کی گودوں میں سے ان کے بچے پاؤں سے جوتوں کی طرف نکل جائیں تو ان کو گندے چیتھڑے کی طرح چٹکی سے پکڑ کر ان کی ماؤں کی طرف اچھال دو اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں آ کر اس روپہلی خدمت کی سنہری سند حاصل کر لو۔ کولون اور اصل چین کی سرحد پر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو اور اس کا بوجھ ہلکا کر کے اسے پھر چین میں دھکا دے دو۔ لیکن جب ہمارا جہاز سنگاپور پہنچا تو ایک مدراسی نے ہوائی اڑا دی کہ ادھر مشرقی سمندروں میں بھی جنگ ہونے والی ہے۔ جہاز کے انگریز کپتان نے یہ افواہ سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غلط افواہ پھیلانے کے جرم میں مدراسی جہازی کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور سنگاپور ہی میں انگریز پولیس کے حوالے کر دیا۔۔۔ تاکہ افواہ زیادہ نہ پھیلنے پائے۔

جب ہم ہانگ کانگ پہنچے تو فضا سرگوشیوں میں چھلکتی معلوم ہوئی۔ جنگ ہونے والی ہے، جنگ ہونے والی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں زبانیں پیدا ہوگئی تھیں اور لوگ یوں تیورا تیورا کر چلتے تھے جیسے قدم قدم پر ان کے سینے کے اندر ہی گولی چل جاتی ہے۔ ہانگ کانگ اور کولون کی بل کھاتی سڑکوں کی پٹریوں پر بیٹھے ہوئے چینی پناہ گزین افق کی طرف یوں تکتے رہتے تھے جیسے طیاروں کے انتظار میں ہیں۔ ان کے پھٹے ہوئے ہونٹوں اور اچٹتی ہوئی پٹریوں میں ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا ''جو کچھ ہونے والا ہے وہ ایک دم سے کیوں نہیں ہو چکتا''۔

بھوکے پیاسے چینی بچوں کے ہجوم روٹی کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔ ایک انگریز حکمران نے انتظامیہ کے ایک اجلاس کے دوران میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اتنے بہت سے بچوں کا کفیل ہونا حکومت کا فرض نہیں۔ جن بچوں کے ماں باپ زندہ ہیں ان کے گلے میں کتوں کی طرح پٹے ہونے چاہئیں اور گلے میں پٹے کے بغیر جو لڑکا دکھائی دے اسے کولون کی سرحد پر لے جا کر اصلی چین میں دھکا دے دینا چاہیے۔ پولیس کے لیے پیدل سیر کرنے والے صاحب لوگوں کی آسائش کی خاطر پٹریاں صاف رکھنے کا کام سخت دشوار ہو رہا تھا۔ مورچے کھدر رہے تھے۔ پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ عمارتوں کے حسن کو ریت کی بوریوں نے چھپا لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ سارے کا سارا ہانگ کانگ زیر تعمیر ہے۔

کہتے ہیں ایک زمانے میں ہانگ کانگ کی روشنیاں جب سمندر میں ڈبکیاں لگاتی تھیں اور پھر جب پانی ان روشنیوں کو اوپر انہی روشنیوں کی طرف اچھال دیتا تھا تو پرانے بوسیدہ جسموں میں بھی انگڑائی کی اینٹھن رینگنے لگتی تھی۔ مگر اب ہانگ کانگ اور کولون کا درمیانی سمندر ساری دنیا کے اندھیرے کا منبع معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں دن کی تربیتی پریڈ سے تھک ہار کر بیرک میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ادھر ادھر کی مزے مزے کی باتیں سوچنے کی کوشش کرتا مگر اندھیرے اور سناٹے کی دہشت میرے کانوں میں بمباروں کی بھنبھناہٹ بن کر گونجتی اور میں اپنی ماں کو یاد کر کے رو دیتا۔

دن کو بھی جب میں لوگوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور فق چہرے دیکھتا تو یوں محسوس کرتا تھا جیسے یہ سب کے سب اپنی مائیں کھو بیٹھے ہیں اور انہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مجھے بار بار اپنی ماں یاد آتی تھی مگر دن کے ہنگاموں میں اس تصور سے بار بار کترا کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا البتہ رات کو یہ تصور میرے ذہن میں اور میری آنکھوں سے چمٹ کر رہ جاتا اور میں تکیے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح روتا رہتا۔

ماں نے مجھے ہانگ کانگ آنے سے روکا تھا اور کہا تھا ''ہانگ کانگ تو وہاں ہے جہاں سے آگے سنا ہے دھرتی ختم ہو جاتی ہے۔ بیٹا تم دلی کلکتہ میں ہوتے تو میں تمہیں خوابوں میں ٹٹول لیتی، پر تم تو ہانگ کانگ جا رہے ہو۔ تمہارے میرے درمیان سمندر اور پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے اور پھر میرے لال لام اگر ادھر بھی ہونے لگی اور تمہارے دشمنوں پر بھی کوئی آنچ آ گئی تو بتاؤ میں یہاں اس اجڑے پجڑے گاؤں میں کس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھوں گی۔ نہ جاؤ میرے بیٹے، مجھے بھوکوں زندہ رہنا آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں، وہاں تمہارے کپڑے کون دھوئے گا؟ تمہارے بالوں میں تیل کون ڈالے گا؟ تمہاری آنکھ میں سے گری ہوئی پیک کون نکالے گا؟ تمہارے چولے کے بٹن کون ٹانکے گا؟ ۔۔۔۔۔۔ اور پھر پچھلے سال کی طرح تمہارے دشمنوں کو نمونیا ہو گیا، تو؟ پچھلے سے پچھلے سال کی طرح، میری زبان کوئلہ ہو جائے، اگر تمہارے دشمنوں کے آدھے سر میں درد اٹھا تو تمہاری کنپٹیوں میں روغن بادام کون ملے گا؟ نہیں بیٹا نہ جاؤ چلو میرے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤ۔ بھوکوں مریں گے پر اکٹھے تو مریں گے۔ اور بیٹا تم ہانگ کانگ میں ہوئے اور ادھر میں مر گئی تو میری قبر میں تمہارے حصے کی مٹھی بھر مٹی کون ڈالے گا۔ جو مولوی جی کہتے ہیں ماں کی قبر اندھیرے میں جھولی بھر ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہے، بتاؤ۔۔۔۔۔۔''

لیکن میں چلا آیا تھا اور جب آتے وقت میں نے ماں کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی کوئی جھری ایسی نہ تھی جس میں آنسو ندی بن کر پھیل نہ گئے ہوں۔ آنسوؤں میں ڈوبا یہ چہرہ جیسے میری پتلیوں میں گھس گیا تھا۔ رات کو بیرک میں مجھے اس فق چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور پھر میں ماں کی جمی ہوئی نظروں سے ڈرنے لگتا اور حواس باختہ ہو کر اس سے سرگوشی کرتا تھا ''ماں تمہاری پلکیں جھپکتی ہی نہیں۔ تمہاری پتلیاں تو ہلتی ہی نہیں، تم کیسے دیکھ رہی ہو ماں!'' اور یہ سوال میں اس لیے پوچھتا تھا کہ مجھے میری ماں چینی پناہ گزینوں کی طرح افق کی طرف تکتی نظر آتی تھی۔ جہاں سے کہتے ہیں ایک منٹ میں ایک ہزار بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو نمودار ہونا تھا۔

اور پھر ایک دن یہ نظریں افق پر جمی رہ گئیں۔ بمبار کسی اور سمت سے آ نکلے۔ پیانو اور آرگن کی صداؤں میں لپٹا ہوا ہانگ کانگ بموں کے دھماکوں سے بلبلا اٹھا۔ طیارہ شکن توپیں چند مرتبہ بھونکیں اور پھر گردنیں نہوڑا کے تھکے اژدھوں کی طرح پلٹ گئیں۔ بجلی اور تار کے اکھڑے ہوئے کھمبے بلندی پر سے پٹخنیاں کھاتے ہوئے گرے اور سڑکوں پر بکھرے ہوئے، پناہ گزینوں کا بھیجہ چاٹتے ہوئے ساحل پر بکھر گئے۔ شہروں کی عمارتوں نے اپنی جگہ بدل لی۔ دیواروں کے ملبے باغیچوں میں آن گرے تو باغیچے کی جھاڑیاں ہال کمرے میں بکھر گئیں۔ ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے ایک پنجابی سپاہی کے پیٹ میں بم کا ایک سپلنٹر پیوست ہو گیا۔ انتڑیاں

باہر نکل آئیں، موت کے کرب میں اس نے چند بل کھائے تو اس کی انتڑیاں اس کی گردن میں پھنس گئیں اور ایک انگریز افسر نے بموں کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی تصویر اتار لی۔ ہم غیر تربیت یافتہ سپاہیوں کو پناہ گاہوں میں دھکیل دیا گیا۔ جہاں انگریز بچے اور انگریز مائیں تک ''ممی ممی'' کراہ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی انگریز عورت پناہ گاہ کے دروازے کے پاس سے ہر چہرے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تلے کھڑے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی کو مسلے جا رہی تھی اور جب وہ آخری چہرہ پڑھ چکی تو ''میرا بیٹا'' کہہ کر دھم سے گر پڑی اور ہم سب کے منہ لٹک گئے۔

جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ آئے اور قابض ہو گئے اور میں جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا جنگی قیدی بنا دیا گیا۔ اس روز میں خوب خوب رویا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی ماں کو کھو بیٹھا ہوں، جیسے جنگ نے میری باہنوں سے میری ماں کو کھسوٹ لیا ہے، جیسے اب تک میں ہانگ کانگ میں اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا تھا مگر اب اس کی لاش کو دفن کر کے خالی ہاتھ رہ گیا ہوں۔ باوجود ہزار کوشش کے اب ماں کا فق چہرہ بھی میرے سامنے نہیں ابھرتا تھا۔ اس چہرے کے مانوس نقوش دھندلا گئے تھے، ہر طرف جیسے غبار اڑنے لگا تھا۔

چند روز تک اسی کیفیت میں قیدیوں کے باڑے میں بند پڑا رہا۔ میرا بند بند ٹوٹ چکا تھا اور جسم بالکل کھوکھلا ہو گیا تھا۔ کبھی بھولے سے سر ہلایا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پتھر ایک کان سے لڑھک کر دوسرے کان سے ٹکرا گیا ہے۔ بعض اوقات پھیپھڑوں میں سانس جاتی تھی اور وہیں کی ہو رہتی تھی اور میں سینے پر گھونسا مار کر دوسری سانس لے پاتا تھا۔

مگر جلد ہی میں اس قید سے مانوس ہو گیا اور پھر جاپانیوں سے مانوس ہونے میں تو مجھے کوئی دیر نہ لگی۔ میری قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ ایک دن ایک جاپانی سے میں نے ایک بٹن کی بھیک مانگی تو اس نے میرے سینے کے بالوں کا ایک گچھا ایک جھٹکے سے توڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا ''اسے باندھ لو'' ٹوٹے ہوئے بالوں کی جڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے خون نے جاپانیوں سے مانوس ہونے کی پہلی منزل طے کرا دی۔ حکم ملا کہ سب قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ حکم دینے والا جاپانی افسر الٹے قدموں پیچھے ہٹا تو ایک چھوٹے سے گڑھے نے اسے لڑکھڑا دیا، اس کی ٹوپی گر پڑی اور عینک کا ایک بازو کان سے ہٹ کر لٹکنے لگا۔ میرے قریب کھڑا ہوا سربلند مسکرا دیا۔ ''مسکراتا ہے؟'' ایک جاپانی افسر نے سوال کیا اور پھر ایک گولی سن سے آئی، سربلند کی پسلیوں کو توڑتی باہر نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں مر گیا۔ پھر جب جاپانیوں کو بے تحاشا ہنستے سنا تو ہوش آیا ہنسی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ گولی سربلند کے جسم سے نکل کر اس کے عقب میں کھڑے ہوئے وارث کے پیٹ میں گھس گئی تھی اور سربلند پیچھے گرا تھا تو وارث منہ کے بل گرا تھا اور موت کے کرب میں دونوں نے ایک دوسرے کے جسم نوچ ڈالے تھے اور وارث کی موت جاپانیوں کے لیے لطیفہ بن گئی تھی۔ اس روز سے ہم سب نے ایکا ایکی جاپانیوں سے مانوس ہونے کی آخری منزل طے کر لی۔ حکم ملے تو مسکراؤ حکم ملے تو نظریں اٹھاؤ۔ حکم ملے تو خشک گلے تر کرنے کے لیے منہ کا لعاب نگلو اور اگر حکم نہ ملے تو مٹی کے مادھو کی طرح جس انداز اور جس رخ سے کھڑے ہو کھڑے رہو۔ اور پھر میں جینے کے معاملے میں بہت لالچی ہو گیا تھا۔ میں ہر قیمت پر جینا چاہتا تھا کہ کبھی تو جنگ ختم ہو گی، کبھی تو کوئی جہاز مجھے اپنے سینے پر بٹھا کر سنگاپور سے گزرتا ہوا ہگلی میں داخل ہو گا اور ریل گاڑی مجھے کلکتے سے پنجاب لے جائے گی، جہاں میں اپنی ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤں گا اور قیامت تک یونہی بیٹھا رہوں گا۔ جینے کے اسی لالچ کے سبب میں نے جاپانیوں کے حضور میں کبھی کوئی گستاخی نہیں کی۔

کافی دنوں تک ہم ہانگ کانگ ہی میں اپنے نئے حاکموں کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ہم ایسے سدھ گئے تھے کہ ہم نے سرکس والے ہاتھیوں کو مات کر دیا تھا۔ ایک روز ہمیں ایک جاپانی افسر نے بتایا کہ ہانگ کانگ کے قریب ہی ساحلی جزیروں میں

سے ایک چھوٹے سے جزیرے پر سوڈیڑھ سو چینی مچھیروں نے جاپانی سرکار کے خلاف ایک محاذ بنالیا ہے اور اب وہ ہانگ کانگ تک چھاپا مارنے کی سوچ رہے ہیں۔ ان کی گوشمالی کے لیے ہانگ کانگ سے جاپانی فوجیوں کا ایک دستہ بھی جانے والا تھا۔ جس میں وفادار اور تابعدار قسم کے قیدیوں کو بھی جانا تھا۔ ظاہر ہے اس دستے میں میرا نام سرفہرست تھا۔ رات دو بجے ہم سب ایک دخانی کشتی پر سوار ہوئے۔ آج ہوا معمول سے زیادہ خنک ہو رہی تھی اور میری قمیض کے کھلے گریبان میں جیسے اولے سے بھر گئے تھے۔

ایک دوسرے میں گھستے سمٹتے ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے۔ نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیئے تھے۔ اتنی اجلی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی کی پیالی کی طرح نمودار ہو گئی۔ اس کے عین وسط میں چند جھونپڑے تھے اور چہار طرف ساحل کی سمت سے آتی ہوئی ان گنت پگڈنڈیاں، ان کے قریب آ کر غائب ہو رہی تھیں۔ جھونپڑوں کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ ان کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔ ان کے پیچھے جھاڑیوں کا ایک دائرہ اور پھر سب کے آخر میں ساحل کی سنہری ریت اور سانس لیتے ہوئے سمندر کا دائرہ۔ سارا منظر کچھ عجیب مصنوعی سا لگتا تھا، بالکل کھلونا سا اور جب سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی طرف دیکھتا تھا تو میرے قدموں تلے چینی کی یہ پیالی تیرتی اور ڈولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیر تک انتظار کرنے کے باوجود ابھی تک ہمیں جھونپڑوں کے آس پاس کوئی بچہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی جھونپڑے سے دھواں تک نہیں اٹھتا تھا۔ کسی بوڑھے کے کھانسنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔ صرف ایک کتا گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ تنگ آ کر دستے کے جاپانی لیڈر نے اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کر دیا اور پھر ہم سب دبک کر زمین سے چمٹ گئے۔ مگر یہ فائر بھی جھونپڑوں کے آس پاس زندگی کا کوئی ثبوت نہ ابھار سکا بس اتنا ہوا کہ کھیلتا ہوا کتا کان کھڑے کر کے ایک لمحہ ہماری طرف دیکھتا رہا اور پھر جھونپڑوں میں بھاگ گیا۔ چڑیاں بہت سی ڈاروں کی صورت میں مشرق کی طرف کچھ یوں اڑ گئیں جیسے ابھرتے ہوئے سورج میں گھس کر دم لیں گی۔

اب ہم نے ہلہ بول دیا۔ جھونپڑوں کے قریب آ کر ہم نے اکٹھے بہت سے فائر کھول دیئے اور پھر جاپانی افسر نے کڑک کر چینی زبان میں کہا ''اگر کوئی اندر ہے تو فوراً باہر آ جائے ورنہ اس کے بعد ہم اندر آ کر کسی کو جیتا نہ چھوڑیں گے''۔

اور پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو صرف جنوں پریوں کی کہانیوں ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے وہاں تک تمام جھونپڑوں میں سے پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہوئے بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اتنی بہت سی تعداد میں ایک دم باہر نکل آئیں جیسے وہ اسی حکم کے انتظار میں تھیں۔ آن کی آن میں ہمارے سامنے جھریوں بھرے چہرے، لٹکتی ہوئی جھلیوں اور بجھی ہوئی آنکھوں کی قطاریں تن گئیں اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ اس وقت کا سناٹا ہولناک تھا۔ ابھرتے ہوئے سورج کی وجہ سے ہم سب کے سائے ڈراؤنی حد تک لمبے ہو کر گھس کے قطعوں پر جیسے لیٹ گئے تھے اور عورتیں زیر لب کوئی جاپ کر رہی تھیں۔ کچھ ایسی پراسرار فضا پیدا ہو گئی جیسے ابھی ابھی ایک پل میں چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر جائے گی اور الٹ کر سب کو سمندر میں گرا دے گی۔

جاپانی افسر کے حکم سے ہم نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ پھر جاپانی لیڈر آگے بڑھا اور گرج کر بولا ''مرد کہاں ہیں؟''
ایک لمحے تک خاموشی رہی جیسے توپ میں گولا بھرا جا رہا ہے۔

پھر ایک بالکل سفید بالوں والی بڑھیا ایک قدم آگے آگئی اور بولی:

''روز کے کام پر گئے ہیں''۔

''روز کے کام پر'' لیڈر رکٹر کا ''یعنی جاپانی سرکار کی جڑیں کھودنے کے لیے چین کے ساحلوں پر فسادیوں کے اڈے بنانے؟''

''جی نہیں'' بڑھیا بولی ''مچھلیاں پکڑنے!''

''اور بچے اور بوڑھے؟'' افسر نے پوچھا ''اور تمہاری لڑکیاں؟''

''آج ہم مچھیروں کا سالانہ میلہ ہے'' بڑھیا اسی انداز سے بول رہی تھی ''سب ادھر پانیوں میں خوشیاں منائیں گے اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''ادھر آؤ'' لیڈر نے بڑھیا کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے کھینچا اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔ دوسرے افسر نے اس کی پیٹھ پر اپنے ریوالور کا فائر کر دیا۔ وہ چیخی اور یوں تڑپی جیسے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ پھر وہ چت گر پڑی اور دو ایک بار تن کر ٹھنڈی ہوگئی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جیسے ہم سب کو گھورنے لگی۔ سب عورتیں چہروں کو ہاتھوں سے چھپا کر رہ گئیں اور میں نے اپنے ہونٹ کے ایک گوشے کو اس زور سے کاٹا کہ کرچ سے میرے دانت میرے ہی گوشت میں اتر گئے۔ چڑیوں کے غول جو شاید پلٹ کر آئے تھے روتے ہوئے ہانگ کانگ کی طرف اڑ گئے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والے سمندری پرندے کچھ یوں منتشر ہو کر ادھر ادھر اڑ گئے جیسے گولی انہی کے ہجوم میں سے گزری ہے۔

دور کے جھونپڑوں میں دو کتے بھونکنے لگے۔

ہم پنجابیوں کو عورتوں کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر جاپانی جھونپڑوں میں گھس گئے خوب خوب اٹھا پٹخ کی اور گالیاں بکیں۔ میں چینی عورتوں کے چہروں کو باری باری دیکھتا رہا، ان کی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی موت کے خوف سے یا جانے کس احساس سے کانپے جا رہی تھی اور ان کی ذرا ذرا سی آنکھیں کہیں دور ہٹ کر سوچ رہی تھیں۔ جاپانی جھونپڑوں سے نکل کر دور گول ساحل کی طرف چلے گئے تھے اور جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔

اچانک ایک عورت زمین پر بیٹھ گئی میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا زیر لب جاپ جاری کر دیا مجھے اپنی ماں یاد آگئی۔ میں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگا اور کچھ یوں ظاہر کیا جیسے میں ان سب سے بے پروا ہو گیا ہوں۔ آنکھوں کے گوشوں میں سے میں نے دیکھا وہ عورت پھر زمین پر بیٹھ گئی اور دوسری عورتوں کی ٹانگوں میں چھپتی ہوئی آگے کھسکنے لگی۔ مردہ بڑھیا کے پاس آ کر اس نے نہایت خوفزدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے لاش کے چہرے پر ایک بڑا سا کپڑا پھیلا کر وہ پیچھے ہٹی اور اپنی جگہ پر آ کر کھڑی ہوگئی۔

میں نے ضبط کی کوشش کی، کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیا مگر میری آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت تھوڑا سا آگے آ کر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی پلکیں جھپک گئیں اور اکٹھے بہت سے آنسو اس کی جھریوں میں ندیوں کی طرح بہ کر پھیل گئے۔ سمندر کی ٹھنڈی نم آلود ہوا میرے کھلے گریبان سے فائدہ اٹھا کر میری پسلیوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ میں نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا، ان سب کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔ میں بڑھیا کی لاش کی طرف دیکھنے لگا، ہوا کے جھونکے نے اس کے منہ پر سے کپڑا اڑا دیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا سرا اٹھایا اور اس کے گرد کپڑا لپیٹ دیا۔ ایک جاپانی سپاہی چنگھاڑتا ہوا آیا اور میری کمر میں ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ لاش کا منہ ڈھانپنے

والی عورت کے سوا دوسری سب عورتوں نے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لیے اور میں کمر کی چوٹ کو سہلاتا کھڑا ہو گیا۔ جاپانی سپاہی نے لاش کے سر پر سے کپڑا نوچ ڈالا۔ مری ہوئی بڑھیا کا ذرا سا سفید جوڑا کھل کر اس کے کھلے دھانے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پھیل گیا اور سب جاپانی واپس آ گئے۔

دستے کے لیڈر نے عورتوں کے سامنے بڑے غصے سے ایک تقریر کی اور کہا:

''معلوم ہوتا ہے کہ ہانگ کانگ میں بھی تم لوگوں کا خفیہ گروہ کام کر رہا ہے اور انہی میں سے کسی نے تمہیں ہمارے چھاپے کی خبر دی ہے۔ ورنہ یوں نوعمر لڑکیاں، بچے، جوان اور بوڑھے جزیرے پر سے غائب نہ ہوتے۔ لیکن ہم یہاں سے جائیں گے نہیں۔ ہم آج سارا دن ان کا انتظار کریں گے اور جب وہ آئیں گے تو تمہارے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں، بہنوں، شوہروں، بیویوں اور باپوں کو تمہارے سامنے گولیوں سے اڑا دیں گے اور پھر تمہیں بھی سمندر میں دھکیل دیا جائے گا''۔ وہ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا اور آخر ہم جنگی قیدیوں کو ان نئے قیدیوں کی نگرانی پر مقرر کر کے سب جاپانی دور درختوں کے دائرے میں چلے گئے اور اپنے اپنے تھیلوں سے شراب کی بوتلیں نکال کر قہقہے مارنے اور ناچنے گانے لگے۔

عورتیں ہمارے حلقے میں بیٹھ گئیں۔ بادل گھر آئے تھے جن کی وجہ سے سورج غائب تھا۔ اتنی دیر بعد بھی وہی منہ اندھیرے کا منظر جاری تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا میرے سینے میں برمے کی طرح گھسی جا رہی تھی۔ میں گریبان کے دونوں حصوں کو ملاتا تو میرا ہاتھ سن ہو جاتا اور جب چھوڑتا تو سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا۔ بڑھیا کی لاش کی موجودگی کے احساس سے بھی جسم کی کپکپی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عورتوں کا زیرلب جاپ جاری تھا۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے چہرے پر آنسوؤں کی بجائے زردی سنڈ رہی تھی اور وہ منہ کھولے مجھے گھورے جا رہی تھی۔

دیر تک یہی کیفیت جاری رہی۔ جب ایک جاپانی سپاہی ہمارے پاس آیا اور بولا کہ فی الحال ایک اور قریبی جزیرے پر جانے کا فیصلہ ہوا ہے اس لیے کچھ دیر کے بعد ادھر روانہ ہوں گے اور جب تک یہ عورتیں ہم سب کے لیے کھانا تیار کریں گی۔ اس نے عورتوں کو کھانا پکانے کا حکم دیا اور ہمیں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔

عورتیں اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلی گئیں۔ بادل گرجنے لگا، ہوا میں جمی ہوئی برف کے ٹکڑے اڑنے لگے جو میرے سینے سے نکیلے پتھروں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور میں اپنے گھروندے کے اس گوشے کو یاد کر رہا تھا جس میں دبک کر ہم ماں بیٹا سردیوں کا بشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ اپلوں کا دھواں ہمارا احاطہ کیے رکھتا تھا اور ماں بار بار میرے سینے پر اپنی چادر پھیلا کر کہتی تھی ''سینے کو سردی سے بچائے رکھو بیٹا ہوا میں جو نمونیا ہوتا ہے وہ سینے ہی کی راہ پسلیوں میں اترتا ہے۔۔۔۔۔۔''

آنسوؤں میں بھیگا ہوا ماں کا چہرہ ایک مدت کے بعد بڑی وضاحت سے میرے سامنے ابھرا۔ جھریوں میں پھنسے ہوئے آنسو بجلی کی چمک سے جگمگا اٹھے تھے۔ بجلی کانپ رہی تھی اور یہ چہرہ میرے قریب آ رہا تھا۔

وہ عورت جس نے لاش کا چہرہ ڈھانپا تھا، آہستہ آہستہ میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور وہ بار بار پلٹ پلٹ کر جاپانیوں کی طرف دیکھتی تھی جو دور ابھی تک ناچ اور گا رہے تھے۔ اس کے چہرے اور میری ماں کے چہرے میں کتنی مماثلت تھی، بڑھاپے میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ اس وقت ان کی جھریوں میں بھی آنسو پھیل رہے تھے۔ قریب آ کر رک گئی اور چینی زبان میں آہستہ سے بولی:

''قیدی ہو؟''

میں زبان سے کچھ نہ بولا صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولی ''میرا بیٹا جلدی میں تھا، میں پکارتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ سنی، اس کی قمیص میں بھی تمہاری طرح ایک بھی بٹن نہ تھا''۔

میں چونکا۔

وہ بولتی چلی گئی ''تمہاری ماں ہے نا؟''

میں اب کے بھی کچھ نہ بولا، صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر بچے کی طرح رونے لگا۔

وہ آگے بڑھ کر میری قمیص میں بٹن ٹانکنے لگی اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری میرے ایک گال پر بوسہ دیا اور میری قمیص سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی۔

اور میں ایک لمحے کے لیے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر کر الٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گرا پڑا ہوں!!

☆☆☆

بدلتا ہے رنگ آسماں۔۔۔

اشرف صبوحی

ایک بوڑھا ٹانگوں سے اپاہج، ایک بڑھیا اندھی اور ایک سات آٹھ برس کی لڑکی بازاروں میں گا کر بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ آگے مرد ہاتھوں کے بل گھسٹتا ہوا چلتا۔ اس کی کمر میں بندھی ہوئی رسی کے سہارے عورت اور پیچھے پیچھے لڑکی خبر نہیں کون تھے۔ ہندو یا مسلمان۔ غریب محتاج بھکاریوں کی ذات کیا۔ گانا کیا تھا لاچاریاں تھیں مگر آواز میں کچھ ایسا رس اور بولوں میں ایسی کشش تھی کہ جو سنتا آنکھوں میں آنسو بھرے بغیر نہ رہتا۔ جہاں وہ جاتے بھیڑ لگ جاتی تھوڑے دن کے بعد بڈھے بڑھیا تو غائب ہو گئے، صرف لڑکی رہ گئی۔ اسے شاید گانا نہیں آتا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ آواز ملاتے ملاتے لے آ گئی تھی۔ وہ فقط ”ایک پیسہ دو خدا کی راہ پر“ دہرایا کرتی۔ کچھ تو اس کی آواز کا کھٹکا، کچھ اس کی موہنی صورت اور کچھ اس کا بچپن۔ ناممکن تھا کوئی اسے دیکھے اور ترس نہ آئے۔

لیکن ہمارے یہاں جتنے بھکاری ہیں اتنے ہی یہاں کے دان پن کرنے والے کٹر ہیں۔ کیا مجال کہ کسی اصلی بھوکے کا پیٹ بھرے اور دھوکا دیئے بغیر کوئی روٹی کا ایک ٹکڑا تو لے لے۔ بجاروں کو کھلائیں، کتوں کو پوریاں دیں، کوؤں کی مہانی کریں، چیونٹیوں کے بلوں میں آٹا ڈالیں، امیر مہنتوں، پیٹو چوبوں کو جمائیں اور نہ پوچھیں تو ان دکھیاروں کو جن کا کوئی آسرا نہیں۔ مٹیلے فقیر، حرام ڈیل مسٹنڈے، طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر مذہب کے نام پر مزے اڑائیں مگر خدا کے لاوارث بندوں کی کہیں بات نہ پوچھی جائے۔ یہ دین دنیا کے ٹھکیدار، میراثی ڈھونگئے خانقاہوں میں بادشاہت کریں، یتیم خانوں میں اینڈیں اور جنہیں کوئی فیل مچانا نہیں آتا، جو سوال کرنا بھی نہیں جانتے، وہ سر چھپانے کے لیے کسی کا دوار، مکان کا ایک کونا، سڑک کی پٹڑی ڈھونڈتے ہیں اور نہیں ملتی۔

لڑکی دن بھر بھیک مانگتی اور رات کو جہاں دوسری فقیرنیاں سوتیں یہ بھی جا پڑتی۔ وہ عام بھکارنیوں کی طرح ہر ایک کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی تھی۔ اجلے پوشوں بھلے مانسوں سے مانگتی۔ گاتے گاتے خاموش کھڑی ہو جاتی۔ منہ دیکھنے لگتی۔ یہی اس کا سوال تھا۔ کوئی دے دیتا لے لیتی ورنہ صدا لگاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ لالچی نہ تھی۔ چٹوری نہ تھی۔ اس لیے کبھی کبھی دو چار آنے اس کے پاس جمع ہو جاتے۔ مگر دنیا کی عجب حالت ہے۔ بھکاری ہوں یا دیالو کوئی کسی کو دیکھ کر خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر دولتمند کو دولتمند سے بیر ہے تو فقیر بھی فقیر کا لاگو نہیں۔ جب اس کے پاس کچھ پیسے ہوتے اور یہ سو جاتی تو آس پاس والے چرا لیتے۔ چرانے کا موقع نہ ملتا تو زبردستی چھین لیتے اور یہ بیچاری بروں کی جان کو روتی رہ جاتی۔ اس کا معمول تھا کہ صبح کو گیارہ بجے تک کاٹ کے پل پر مانگا کرتی اور دوپہر کے بعد سے گھنٹہ گھر کے پاس آ جاتی۔

شوکت ایک دس بارہ برس کا لڑکا، نٹوؤں کے کوچہ کا رہنے والا۔ کشمیری دروازے کے مدرسہ جایا کرتا تھا۔ پل پر سے آمد و رفت تھی۔ دس بارہ سال کے لڑکے کی کیا بساط لیکن ہونہار روا کے چکنے چکنے پات۔ شریفوں کا بچہ، جیسی اس کی صورت پیاری پیاری ویسے ہی اس کے اطوار۔ یہ آتے جاتے اس لڑکی کو دیکھا کرتا اور لڑکی جب وہ گزرتا اس پر نظر جمائے رہتی۔ لڑکی نے اسے بچہ سمجھ کر کبھی اس سے بھیک نہیں مانگی، مگر لڑکا دوسرے تیسرے دن پیسہ دو پیسے جو اس کے پاس ہوتے ضرور دے جاتا۔ ایک دن مینہ برس رہا تھا، لڑکی پل پر کھڑی بھیگ رہی تھی شوکت اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا، اکنی تھی۔ کچھ سوچا اور کہنے لگا ”لڑکی تمہارا کیا نام ہے؟“

لڑکی: میں اپنا نام نہیں جانتی۔

شوکت: تمہارا نام کسی نے نہیں رکھا؟
لڑکی: کون رکھتا؟
شوکت: تمہارا کوئی نہیں؟
لڑکی: ہوتا تو اس طرح کیوں پھرتی؟
شوکت: تم بھیک کیوں مانگتی ہو؟
لڑکی: جب کوئی نام رکھنے والا نہیں تو روٹی کون کھلائے۔ بھیک نہ مانگوں تو کیا کروں؟
شوکت: میں تمہارا نام رکھ دوں؟
لڑکی: تمہارا جی چاہتا ہے تو رکھ دو۔ پھر تمہیں روٹی بھی کھلانی پڑے گی۔
شوکت: میں تمہیں جمیلہ کہا کروں گا۔
لڑکی: بہت اچھا!
شوکت: تو اب تم بھیک نہیں مانگا کرو گی؟
لڑکی: نہیں۔
شوکت: پھر کھاؤ گی کہاں سے؟
لڑکی: جس نے نام رکھا ہے وہی کھلائے گا!

مدرسہ کا وقت ہوگیا تھا۔ شوکت نے اکنی لڑکی کے ہاتھ پر رکھی اور چلا گیا۔

اب شوکت کا معمول ہوگیا تھا کہ آتے اور جاتے دو چار باتیں جمیلہ سے ضرور کرتا۔ جو کچھ اس کے پاس ہوتا کل کا کل اسے دے جاتا۔ جمیلہ نے بھی صدا لگانی چھوڑ دی اور صاف ستھری رہنے لگی۔ اگر کوئی بھیک دیتا تو بھی نہ لیتی۔ صبح سویرے پل پر پہنچ جاتی۔ شوکت گزر جاتا تو کمپنی باغ میں کہیں جا بیٹھتی۔ مدرسے کی چھٹی سے پہلے پھر آ جاتی۔ مدرسے کے دوسرے لڑکے شوکت کو فقیرنی سے باتیں کرتا دیکھ کر ہنستے مذاق اڑاتے، پھبتیاں کستے لیکن وہ کوئی پروا نہ کرتا۔ اسے جمیلہ کی بھولی بھولی باتوں میں ایسا مزا آتا کہ جب تک اس کے پاس کھڑا رہتا نہ مدرسہ یاد آتا نہ گھر۔ جمیلہ کی دنیا بھی بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے شوکت جیسا نیک محبت کرنے والا کب کوئی دیکھا تھا۔ سدا لوگوں کی گالیاں، جھڑکیاں اور ٹھوکریں ہی کھائی تھیں۔

اس میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمیلہ آٹھوں پہر شوکت کے خیال میں رہنے لگی۔ صابن خریدتی، کپڑے دھوتی، باغ میں سے اچھے اچھے پھول چنتی، ہار بناتی یا شوکت کا انتظار کرتی۔ شوکت آتا تو وہ اپنے ہاتھوں کا گوندھا ہوا ہار اس کے گلے میں ڈالتی اور خوش ہوتی۔ اتنے میں شوکت نے مڈل کا امتحان دیا۔ اول نمبر پاس ہوا۔ شام کو جمیلہ اپنے دستور کے مطابق پھولوں کا ہار لیے کھڑی تھی کہ شوکت بھاگا ہوا جمیلہ کے پاس آیا اور ہنس کر کہنے لگا۔ ''جمیلہ! میں پاس ہوگیا۔ لاؤ میرے گلے میں ہار ڈالو''۔ جمیلہ نے خوش ہو کر جواب دیا ''میں نے دعا مانگی تھی اب مجھے مٹھائی کھلاؤ''۔ شوکت نے جھٹ جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر جمیلہ کو دیا اور بولا ''لو خوب مٹھائی کھاؤ۔ تمہاری دعا اللہ نے قبول کی۔ لیکن جمیلہ یہ تو بتاؤ کہ تم اس طرح بے گھر بے در کب تک پھرا کرو گی؟''

جمیلہ: پھر کہاں جاؤں۔ کوئی ٹھکانہ بھی ہو۔ اب تم میرے لیے دعا مانگو۔ میں بھی تمہارا منہ میٹھا کروں گی۔
شوکت: اچھا آج میں اماں جان سے کہوں گا۔ وہ ضرور تم کو اپنے ہاں رکھ لیں گی۔

گھر آ کر شوکت نے امتحان میں پاس ہونے کی خوشخبری سنائی۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں نے بلائیں لیں۔ باپ

نے پیار کیا۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ جب اس سے فرصت ملی تو شوکت نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر جمیلہ کی داستان سنائی اور کہا ''اماں جان بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بیچاری یتیم کا کوئی نہیں۔ اس کو اپنے ہاں رکھ لو۔ ثواب ہوگا۔'' اس نے پہلے تو ٹالا کہ ''میاں بازار کی پھرنے والی کا کیا اعتبار خدا جانے کون ہے۔ بچوں کی سی باتیں نہ کرو''۔ مگر جب شوکت بسورنے اور ایک ساں ضد کرنے لگا تو بچے کا دل کڑھنے کا خیال کر کے کہنے لگی ''اچھا میاں ایسا ہی ہے تو کل اسے ساتھ لیتے آنا۔ دیکھوں وہ کیسی ہے۔ اگر کوئی کام کی ہوئی اور کوئی فی نہ نکلی تو رکھ لوں گی''۔

دوسرے روز اتوار تھی۔ مدرسہ بند تھا۔ شوکت نے سوچا کہ آج وہ پل پر تو شاید نہیں آئے گی۔ باغ میں کہیں ہوگی۔ چلو تلاش تو کرو۔ کسی طرف مل ہی جائے گی۔ یہ خیال کر کے شوکت ٹہلتا ہوا باغ میں پہنچا۔ دیکھتا کیا ہے کہ سڑک کے کنارے چمپا کے ایک درخت کے نیچے جمیلہ بیٹھی ہوئی گرے ہوئے پھولوں سے کھیل رہی ہے۔

شوکت: جمیلہ۔ جمیلہ! اٹھو گھر چلو۔ میں نے اماں سے کہا تھا۔ انہوں نے تمہیں بلایا ہے۔

جمیلہ: مجھے بلالیا ہے۔ اب میں تمہارے پاس رہوں گی۔ تمہاری دعا بھی اللہ نے قبول کر لی۔

شوکت: اللہ سب کی دعا قبول کرتا ہے۔

جمیلہ: تم بھی مجھ سے مٹھائی مانگو۔

شوکت: لاؤ کھلاؤ۔ مگر تم کہاں سے کھلاؤ گی؟

جمیلہ نے اپنی ساڑھی کے پلے میں بندھا ہوا وہی روپیہ نکالا جو ایک دن پہلے اسے شوکت نے دیا تھا۔ اور مسکرا کر کہا ''لو پیٹ بھر کر مٹھائی کھاؤ۔ معصوم جذبات کی یہ نمائش جس قدر دلفریب تھی اسی قدر نتیجہ خیز۔ شوکت جمیلہ کی اس ادا سے بے حد متاثر ہوا۔ دونوں گھر چلے۔ آگے آگے شوکت اور پیچھے جمیلہ۔

شوکت کی بھولی صورت، پیاری وضع، صاف ستھرے پن پر ایسی ریجھی کہ دیکھتے ہی فوراً رکھ لیا۔ اسی دن اپنے پرانے کپڑوں کو کتان چھانٹ کر ایک جوڑا بنا دیا۔ جب گھر سے چھٹکارہ ملتا گھنٹوں اس سے باتیں کرتی۔ جہاں اولاد کم ہوتی ہے وہاں چھوکریاں چھوکرے زیادہ قدر سے رکھے جاتے ہیں۔ پھر جمیلہ جیسی لڑکی، شرافت چہرہ سے برستی تھی، کوئی کام بے ڈھنگا نہیں، ادب سے رہنا، سلیقے سے کھانا پینا۔ باتیں کرتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ لیکن جمیلہ کو چونکہ شوکت سے خاص دلچسپی تھی۔ شوکت کی خدمت کے سوا اسے کوئی دوسرا کام اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے کمرہ کو صاف کرتی۔ اس کی میز کو جھاڑتی، کپڑے پہناتی، جوتوں پر پالش پھیرتی۔ وہ کھانا کھاتا تو پنکھیاں اڑاتی۔ کتابیں درست کر کے رکھتی۔ صبح سے لے کر رات کو سونے تک اس کا یہی مشغلہ تھا۔ شوکت کو لکھتے پڑھتے دیکھ کر جمیلہ کو پڑھنے لکھنے کا شوق بھی ہوگیا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔ جتنا وقت بچتا سبق لینے اور یاد کرنے میں صرف کرتی۔

شوکت کے والد کسی تجارتی کوٹھی کے منیجر تھے۔ شاید کوئی تہوار تھا۔ کوٹھی میں چھٹی تھی۔ اتفاق سے ان کے کوئی رشتہ دار ملنے آئے۔ جمیلہ صحن میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے جمیلہ کی طرف اشارہ کر کے شوکت کے والد سے پوچھا ''یہ کون ہے؟''

شوکت کے والد: کسی فقیرنی کی لڑکی ہے۔ شوکت کہیں سے پکڑ لایا تھا۔۔۔

رشتہ دار: صورت سے تو کسی بھلے مانس کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔

شوکت کے والد: بھلے مانس کی ہوتی تو یوں ٹکڑ گداؤں کے ساتھ پھرتی۔

رشتے دار: خدا کسی پر برا وقت نہ ڈالے۔ یہ شریف گردی کا زمانہ ہے۔

شوکت کے والد: کیسا ہی زمانہ ہو، شریفوں کی اولاد ذلیل کام کبھی نہیں کرتی۔
رشتے دار: جناب آپ کیا کہتے ہیں۔ مصیبت سب کچھ کرا دیتی ہے۔
شوکت کے والد: باتیں تو واقعی اس کی ایسی ہی ہیں۔
رشتے دار: دیکھیے نا کس ٹھسے سے بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔
شوکت کے والد: جی ہاں۔ وقت کی خوبی ہے۔ شریفوں کے بچے پڑھنے سے بھاگتے ہیں اور چھوٹی قوموں کا یہ حال ہے۔ مجھے اب اس کی حرکتوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ شوکت جوان ہو چلا ہے۔ موقع دیکھ رہا ہوں۔ اس کا گھر میں رہنا مناسب نہیں۔

یہ گفتگو بہت آہستہ ہو رہی تھی لیکن فقیرنی کا نام سنتے ہی جمیلہ چونکی ہو گئی۔ اس نے ساری باتیں سن لیں۔ ایک ایک لفظ تیر کی طرح اس کے کلیجے میں اتر گیا۔ اس نے بڑی حسرت سے شوکت کے والد کی طرف دیکھا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئی۔ سارا دن گزر گیا۔ نہ اس نے روٹی کھائی نہ شوکت سے ہنسی بولی۔ پوچھنے والا کون تھا۔ شوکت یا شوکت کی ماں۔ کھانے کو کہا تو جی متلانے کا بہانہ کر دیا۔ چپ چپ رہنے کا سبب دریافت کیا تو ہوں ہاں کر دی۔ رات آئی۔ مایوسیوں نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ دل کا چراغ بجھ چکا تھا۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی۔ آخر میں کون ہوں۔ شریف اور رذیل میں کیا فرق ہوتا ہے۔ شوکت کے والد کہتے ہیں اگر میں شریف کی جائی ہوتی تو بھیک نہ مانگتی پھرتی۔ شریف کو کوئی اپنے دامن میں نہ چھپائے۔ اس کو شریف بننے کا موقع نہ دے۔ اس کی بھوک پیاس میں مدد نہ کرے تو وہ بھیک مانگ کر بھی پیٹ نہ بھرے۔ یونہی مر جائے۔ کیوں؟ اس کی جان نہیں۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میں شریف ہوں۔ میرے ماں باپ شریف تھے۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا نہ سہی۔ ان کی شرافت کا اثر مجھ میں موجود ہے۔ میں نے بڑی بھول کی کہ شوکت کی باتوں میں آ گئی۔ کیا کرتی۔ اس نے مجھے موہ لیا تھا۔ خیر۔ اب میں دکھا دوں گی۔ مجھے ثابت کرنا ہوگا۔ شریف کے والد صاحب! جمیلہ بھکارن اور بھکاریوں کی اولاد نہیں۔ شریف اور شریف زادی ہے۔

دل سے یہ باتیں کرتے کرتے ایک دفعہ ہی وہ کھڑی ہوئی۔ ''اسی لیے وہ مجھے ذلیل سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کا دیا ہوا ٹکڑا کھاتی تھی اور اب ان کی روٹیوں پر پڑی ہوں۔ بس پھر اس میں میرا کیا قصور۔ کمزور لاوارث چھوٹی سی لڑکی تھی۔ ہاں اب بھی اگر میں پرایا ہاتھ تکوں، دوسروں کی کمائی پر زندہ رہوں تو ضرور رذیل۔ میں ہی نہیں بلکہ میری سات پشت ذلیل''۔ منہ ہی منہ میں کہتی ہوئی اپنی کوٹھڑی سے نکلی۔ شوکت کے کمرے کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے اپنے من کے دیوتا پر دور ہی سے جل چڑھایا اور دبے پاؤں دروازہ کی کنڈی کھول گلی میں آ گئی۔ رستوں سے انجان نہ تھی۔ باغ کی دیوار کی کھڑکی سے ہو کر آنریری مجسٹریٹوں کی کچہری کے پاس ایک درخت کی چھاؤں میں باقی رات گزار دی۔

شوکت نے ساری رات رنگ برنگ کے پریشان خواب دیکھے۔ اس نے دیکھا کہ جمیلہ کو ابا نے مارا ہے اور وہ رو رہی ہے۔ اتنے میں کسی نے اسے آواز دی اور وہ مینا بن کر اڑ گئی۔ برسوں اس کی خبر نہیں ملی۔ پھر یکایک وہ اماں جان کے پلنگ پر آ بیٹھی۔ میں پکڑنے کو دوڑا۔ وہ ہاتھ آ گئی۔ پنجرے کی تیلیاں ٹوٹی ہوتی تھیں۔ میں نے جوڑیں۔ وہ ہنسی۔ سارا گھر ہنسنے لگا۔ آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ جمیلہ کی کوٹھڑی کے کواڑ بند تھے۔ طبیعت اچھی نہیں۔ شاید سو رہی ہو۔ آہستہ سے آواز دی۔ جواب نہ ملا تو جھریوں سے جھانک کر دیکھا۔ اندھیری کوٹھڑی میں کیا سوجھتا۔ کواڑوں کو دھکا دیا۔ کھل گئے۔ پلنگ خالی تھا۔ کہاں گئی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ تکیہ کے اوپر کھلا ہوا ایک کاغذ دکھائی دیا۔ اٹھایا تو جمیلہ کی تحریر تھی۔ پڑھا ٹوٹے پھوٹے حرفوں میں لکھا تھا ''شوکت! یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری جمیلہ بھاگ گئی۔ وہ بھاگی نہیں۔ اپنی شرافت کا ثبوت دینے جا رہی ہے۔ لوگ ہر محتاج کو ذلیل سمجھ لیتے ہیں۔ اللہ میں سب قدرت ہے۔ اگر جیتی رہی تو تمہارے پاس پھر آ جاؤں گی۔ تمہیں رنج تو بہت ہوگا مگر میری

بھلائی کے لیے صبر کرنا''۔

گھر میں جمیلہ کے غائب ہونے پر کیا باتیں بنیں۔ محلے والوں نے کس قسم کی افواہیں اڑائیں اور شوکت کے دل پر کیا گزری۔ نہ ماں باپ کے خیالات پر اس کا کچھ اختیار تھا نہ غیروں کی زبان پر اختیار۔ سنتا تھا اور راونکھا ہو کر رہ جاتا تھا۔ آخر کب تک؟ ہفتے دو ہفتے یہ چرچا ہو کر رہ گیا۔ سب اپنی اپنی جگہ خاموش ہو گئے۔ شوکت کی بے چینی میں بھی کمی آ چلی۔ عمر کی خامی، تعلیم اور دوسرے مشاغل نے جمیلہ کو ذرا دور کر دیا۔ اس کی تصویر کسی قدر دھندلی ہو گئی۔ مدرسے جاتا۔ جمیلہ یاد آتی۔ کالج میں داخل ہوا تو بھی پل درمیان تھا۔ ہر فقیرنی پر جمیلہ کا شبہ ہوتا۔ لیکن صرف اس قدر کہ ٹھنڈا سانس لیا اور گزر گیا۔ اسی طرح کئی سال امتحان کی خوشخبریاں لائے۔ مٹھائیاں بٹیں۔ مبارکبادیں سنیں۔ نہ سنی تو جمیلہ کی آواز۔

رفتہ رفتہ شوکت جوان ہوا۔ ایم۔ اے، ایل ایل بی کیا۔ منصفی کا امتحان دیا اور خدا کی قدرت کہ اپنے شہر میں جج بن کر کرسی پر بیٹھا۔ پہلے تو تعلیم کے شغل میں دماغ کو زیادہ فرصت نہ تھی کہ جمیلہ کے تصورات کو اجاگر کرتا۔ اب جو زندگی نے عملی صورت اختیار کی شباب کے ولولے پیدا ہوئے تو محبت کی دبی ہوئی آگ از سرِ نو بھڑک اٹھی۔ جمیلہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے رہنے لگی۔ ماں باپ کی پہلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ بچہ پروان چڑھے۔ پھر شوق ہوتا ہے کہ اس کا سہرا دیکھیں۔ بہو بیاہ کر لائیں۔ چنانچہ شوکت کی شادی کا بھی فکر ہوا۔ ایسے اچھے برسرِ روزگار، نک سک سے درست لڑکے کی بات کون پھیرتا۔ بیسیوں خوبصورت سے خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ لیکن شوکت کے سامنے جب کبھی ذکر آتا وہ ٹال دیتا اور ماں باپ منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اس کا دل ڈانواڈول تھا۔ اس کے پاس جمیلہ کی تحریر موجود تھی۔ اس کو یقین تھا کہ جمیلہ دھن کی پکی ہے۔ اس کی روپوشی کوئی معنی ضرور رکھتی ہے۔ وہ آئے گی۔ مجھے بھی اس کا انتظار کرنا چاہیے۔

زمانہ اپنے پروں پر اڑتا چلا جاتا تھا۔ سوسائٹی میں شوکت کی ہر دلعزیزی بڑھ رہی تھی۔ شادی سے اسے برابر انکار تھا۔ والدین کو طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو چلی تھیں۔ شوکت جاہ و چشم کا مالک۔ حسین، بظاہر نہایت نیک، اندھیرے گھر کا چراغ، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا۔ باپ تو خیر مرد تھا، شوکت کی شادی سے بے پرواہی نے اسے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ لیکن بڑھیا ماں اس صدمے سے بیٹھ گئی۔ آخری نسبت جو اس نے اپنے مرحوم بھائی کی لڑکی سے لگائی تھی اور جو اس کے خیال میں شوکت کا پورا جوڑ تھی۔ جب سرسبز ہوتی معلوم نہ ہوئی۔ شوکت نے کوئی توجہ نہ کی تو اس پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بیمار رہنے لگی۔ ضعیفی، بیٹے کا جاپا گھلتے گھلتے ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ ہزاروں علاج بدلے۔ شہر بھر کے بڑے بڑے حکیم ڈاکٹر بلائے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ شوکت نے روپیہ ٹھیکری کر دیا۔ کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھی۔ ہر وقت ماں کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ اسے ہاتھ سے دوا پلاتا۔ پاؤں سہلاتا۔ رات دن تیمارداری کی ہر خدمت انجام دیتا۔ پھر بھی افاقہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اطبا مایوس تھے۔

اسی اثناء میں کسی نے شوکت سے کہا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کہیں سے نئی آئی ہے۔ اس کی حذاقت کے شہر بھر میں چرچے ہیں۔ آج تک جس مریض پر ہاتھ ڈالا ناکام نہیں رہی۔ نہایت شریف عورت ہے۔ غریبوں کا علاج مفت کرتی ہے۔ چند ہی روز میں اس نے وہ نام پیدا کیا ہے کہ سارے مقامی ڈاکٹر اس سے مشورہ لینے لگے ہیں۔ شوکت یہ سنتے ہی بے تاب ہو گیا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ مطب کا یہ کیا وقت تھا۔ لیکن ضرورت کے لیے وقت کا کیا لحاظ۔ فوراً موٹر میں بیٹھ ڈاکٹرنی صاحبہ کے مکان کا پتہ لگا وہاں پہنچے۔ دروازے پر لیڈی ڈاکٹر مس جمیلہ کی تختی دیکھی۔ پرانے زخموں میں ٹھیس لگی۔ دربان سے اطلاع کرائی۔ اندر گئے، ایک سرو قد، جوانی میں سرشار، نقاب پوش عورت کو دیکھا۔ مریضہ کو دیکھنے کی درخواست کی وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ موٹر میں بیٹھے اور مکان پہ آئے۔ ڈاکٹرنی صاحبہ نے مریضہ کا معائنہ کیا۔ دوا دی اور صبح پھر آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

خدا کی قدرت کہ رات ہی بھر میں شوکت کی والدہ میں زندگی کے آثار پیدا ہو چلے۔ نیند بھی آئی اور کرب و بے چینی میں بھی فرق رہا۔ صبح ابھی سورج نکلا ہی تھا کہ مس جمیلہ کی موٹر دروازے پر آ گئی۔ شوکت اپنے کمرہ سے نکل کر استقبال کو چلے۔ مگر وہ ان سے مخاطب نہ ہوئی۔ سیدھی اندر چلی گئی۔ شوکت کیسے ہی سادہ مزاج سہی، شہر میں حاکم تھے۔ رؤسا امراء سب ان کی عزت کرتے تھے۔ ڈاکٹرنی صاحبہ کی یہ بے رخی دیکھ کر ان کے غرور حکومت کو ٹھیس لگی۔ وہ کچھ غصے اور کچھ رنج میں بھرے ہوئے پیچھے پیچھے ماں کے پاس پہنچے۔ ان کی حالت اب بہتر تھی۔ مس جمیلہ نے مریضہ کی نبض دیکھی۔ نسخہ بدلا اور یہ کہہ کر کہ "دوا میرے دواخانے سے منگایئے گا" چلنے لگی۔ تو شوکت نے اپنی فیاضی دکھانے یا اس کو مرعوب کرنے کے لیے دو وقت کی فیس کے بدلے جو زیادہ سے زیادہ بتیس روپے ہوتے سو روپے کا نوٹ دینا چاہا۔ مس جمیلہ نے نوٹ لینے سے انکار کیا۔ شوکت کو بہت برا معلوم ہوا۔ ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھ کر وہ بولی "آپ ناراض نہ ہوں مجھ پر اس گھر کا بہت حق ہے۔ شکر ہے کہ میری دعائیں اللہ نے قبول کیں۔ میرے لیے بڑی دولت آپ کی مہربانیاں ہیں"۔ اور جلدی سے موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔

مسٹر شوکت حیران تھے کہ یہ کس قماش کی عورت ہے۔ نہ اس پر میرے حاکم ہونے کا اثر ہے نہ روپے کا لالچ۔ مغرور البتہ کہہ سکتے ہیں۔ شاید اسے اپنے حسن کا غرور ہو۔ اگر یہ ہوتا تو نقاب پوش نہ رہتی۔ غالباً اس کو اپنے کمال پر ناز ہے لیکن ڈاکٹر اور وکیل کو اتنا اکل کھرا اور بدماغ نہ ہونا چاہیے۔ نہ کسی سے بات چیت نہ مریض کو تسلی تشفی۔ ہوا کی طرح آئی اور چلی۔ میں نے بات کرنی چاہی مجھ سے بھی اینٹھی رہی۔ خیر والدہ کو تو اس نے زندہ کر دیا۔ سب جواب دے چکے تھے۔ اس کے اس احسان کا بدلہ تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا۔ اچھا۔ اس نے یہ کیوں کہا کہ اس گھر کا مجھ پر بہت حق ہے، اور اس کی وہ کیا دعائیں تھیں جو اللہ نے قبول کیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے ٹالنے اور ایک جج پر احسان رکھنے کی غرض سے یہ فقرے گھڑے ہوں ورنہ ہمارے گھر کا اس سے کیا تعلق۔ شوکت صاحب انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے۔ ملازم نے دوا کی شیشی اور ایک لفافہ لا کر دیا۔

شوکت: اچھا دوا لے آئے، اتنی جلدی۔

ملازم: حضور موٹر میں گیا موٹر میں آیا۔

شوکت: گئے تو ڈاکٹرنی صاحبہ کے ساتھ تھے۔ آئے کس طرح؟

ملازم: ڈاکٹرنی صاحبہ نے کہا کہ دوا کی جلد ضرورت ہے۔ میری موٹر تمہیں پہنچا آئے گی۔

شوکت: عجیب! اور خط کیسا ہے؟

ملازم: ان ہی نے دیا ہے کہ اپنے صاحب کو دے دینا۔

دوا اندر بھیج کر شوکت نے خط کھولا۔ لکھا تھا "جج صاحب! رات کو بجلی کی روشنی اور آج دن کے اجالے میں آپ کی زیارت ہوئی۔ جی بہت چاہا کہ آپ سے باتیں کروں مگر ہمت نہ ہوئی۔ ایک فقیرنی میں اتنی جرأت کہاں کہ شہر کے جج سے آنکھیں ملا کر گفتگو کر سکے۔ کل سویرے میں پھر آؤں گی۔ (آپ کی جمیلہ)

خط پڑھ کر شوکت کا دل بے قابو ہوگیا۔ دیوانوں کی طرح اچھلنے لگے۔ دوڑے ہوئے گھر میں گئے۔

شوکت: اماں جان! آپ جانتی ہیں یہ ڈاکٹرنی کون ہے؟

والدہ: کوئی عیسائی ویسائی ہوگی۔ مگر میاں میرے حق میں تو غیبی فرشتہ ہوگئی۔

شوکت: اے بی نہیں۔ عیسائی ویسائی کیسی یہ تو جمیلہ ہے۔

والدہ: کون جمیلہ؟

شوکت: وہی جس کو میں پل پر سے لایا تھا۔

والدہ: ہونے ہی کو ہو رہی ہے۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے تو پہچانا ہے۔ وہ بیچاری خدا جانے کہاں اپنی تقدیر کو رو رہی ہوگی۔

شوکت: اللہ کی قسم جمیلہ ہے۔

والدہ: ہاں اس کا نام بھی جمیلہ ہوگا۔

شوکت: وہی جمیلہ جو تمہارے ہاں رہتی تھی اور ابا جان کا طعنہ سن کر چلی گئی تھی۔

والدہ: سچ! تم نے کیوں کر جانا۔ وہ تو۔۔۔

شوکت: ابھی ابھی دوا کے ساتھ اس نے ایک خط بھی بھیجا ہے۔

والدہ: جب ہی اس نے ہم سے فیس نہیں لی۔ بڑی گن ماننے والی شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔اصل سے دغا نہیں کم اصل سے وفا نہیں۔ لیکن بیٹا مجھے ابھی یقین نہیں آتا۔

صبح کو حسب وعدہ جو مس جمیلہ آئی تو شوکت نے دانستہ اس سے بات نہ کی۔ جب وہ مریضہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی تو چپکے سے اس کی نقاب اتار لی۔ شوکت کے والد بھی موجود تھے۔ فرط ندامت سے ان کی آنکھیں جھک گئیں اور شوکت خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔ اب جو جمیلہ چلی تو شوکت بھی ساتھ تھے۔ دونوں کی محبت مستقل۔ دونوں کی زندگیاں بنی ہوئی، دونوں کے دامن پاک، دونوں اپنے مختار۔ سر جڑنے میں کیا دیر تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر مس جمیلہ مسز شوکت بن گئیں۔ ماں کو تو بیٹے کی دلہن سے غرض تھی۔ ہاں باپ نے بہت سے روایتی عیب نکالے۔ کنبے والوں میں مطعون ہونے کا ڈر دکھایا، بگڑے رہے لیکن وہ جو کہتے ہیں ایک چپ سو کو ہرائے۔ شوکت کی خاموشی اور جمیلہ کی شریف فطرت نے آخر صرف والدین ہی کو نہیں بلکہ سارے کنبے کو اپنا لیا اور آج جیسی پرامن زندگی دونوں کی گزر رہی ہے خدا حوا کے بیٹے بیٹیوں کو نصیب کرے۔

☆☆☆

جگا

بلونت سنگھ

ماجھ کے علاقے میں بھیکن ایک چھوٹا سا غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے۔ زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی مگر یہاں ایک بات تھی، وہ یہ کہ بعض اوقات کوئی غیر معمولی خاص حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر رومان پرور ہوتی کہ سسی پنو، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے۔ اب کے قرعہ گورنام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کے مانند تھی، چینی کی مورت، چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم ہو جاتے لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پر شباب دوشیزہ کی پرزور حس ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش سے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی آواز سنائی دے جائے۔

ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہیں سمجھتی تھی اور اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی۔ وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندار حسن پیدا نہیں ہوا تھا لہٰذا جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا، یہی سمجھتا کہ گورنام اسی سے محبت کرتی ہے۔ ایک مرتبہ شنگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ وہ گورنام کو بھگا لے جائے گا۔ اسی وقت دلیپ سنگھ وہاں سے گزرا۔ دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گورنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے، اس نے سن لیا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بلا دیا۔ (کسی کی تضحیک کرنے کے لیے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بھق بھق کی آواز نکالنا)۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا "تو نے بکرا کیوں بلایا؟"

شنگارے نے تہبند کس لی اور خم ٹھونک کر مقابلے پر آ کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں، قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھم گتھا ہو جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا ٹخنہ اتر گیا لیکن اس کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گورنام کا دعویدار پیدا ہونا ناممکن تھا۔ رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا۔ گاؤں پر پراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی۔ اتنے میں ایک سکھ سانڈنی سوار پیپل کے نیچے آ رکا۔ اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ وہ بلبلا کر مچلی پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمول بات نہیں مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرے کی رگیں بھری ہوئی، آنکھیں سرخ انگارا، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا، گریبان کا تسمہ کھلا ہوا اور اس کے سینے پر گھنے بال نمایاں۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی تھی۔ (ایک تیز خم دار ہتھیار جو لاٹھی کے سر پر چڑھایا جاتا ہے)

آتے ہی اس نے قریب ہی موجود رہٹ کے پاس چپ چاپ کھڑے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے۔ اس نے جوتے اتارے، تہبند اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے پیچھے ہٹا، پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا جھال کے نیچے کیا۔ اس کی گوری کلائی پر کچ کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یکجا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑا ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھایا، کولہے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشین خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔ مرد نے پہلے ایک پاؤں اور لو (جہاں پانی گرتا ہے) سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا تو وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیے ہوئے اروڑی پر کھڑا ہو گیا جہاں ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اپلے رکھے تھے۔

جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اپلا نیچے گرا دیا۔ جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اسی وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیاں روند کر چلے آ رہے ہیں۔ لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا ''تو کون ہے؟''

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا تھا۔ اس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجے میں اپنا سوال دہرایا: ''تو کون ہے؟''

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے؟ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: ''میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں''۔

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا ''تیرا کیا نام ہے؟''

دوشیزہ کی آنکھیں پر آب ہو گئیں، بولی ''گورنام''۔

''تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟''

''میری ماں ہے، بے بے، ویر، چاچا، باپو بھی رہتے ہیں''۔

''مجھے اپنے گھر لے چل''۔ مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تجھ سے ڈر لگتا ہے''۔

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے دلہن کی طرح آراستہ اپنی سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجے میں پوچھا ''کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو کیا؟''

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا ''لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے''۔

''کیوں؟'' مرد نے اجڈ پن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحے کے لیے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا پھر بولی ''تم ہنستے کیوں نہیں؟''

''ارے یہ بات؟'' یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا جیسے کوئی پانی سے لبریز منکا زمین پر انڈیل دے۔اس کے قہقہے کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گورنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔اس کی ممٹی تو بہت دور سے **نظر** آتی تھی۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا اور گورنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔انہیں دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا''واہ گورو جی کا خالصہ۔سری واہ گورو جی کی فتح''۔

''واہ گرو جی کا خالصہ،سری واہ گرو جی کی فتح''۔

اجنبی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولا:''میں دور سے آرہا ہوں،رات زیادہ گزر چکی۔میں آج یہیں ٹھہروں گا''

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کو دیکھنے لگا۔وہ بہت خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھا **مگر** اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا''میں ہر طرح سے **خدمت** کے ۔۔۔'' پیشتر اس کے وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے،اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازے کے **اندر** داخل ہو چکا تھا۔

اگر چہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا **مگر** گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس امر کا ثبوت تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہیں۔گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے،چار کے سوا۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔**ایک** بچہ سینے سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔صحن مویشیوں کے موت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔اک طرف کھرلی کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔بھینس اور کھل کپ سانی کی بو چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔**ایک** طرف خراس،دوسری طرف تنور اور اسکے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیا، یہ بڑے بڑے اپلے،کونے میں کپاس کی چھٹریاں،چولہے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار،ایک کمرے سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ساتھ ہی تاگے میں پروئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے لیے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازے سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا۔تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف **ایک** کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام آسکتے تھے،اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔وہاں **ایک** چارپائی ڈال دی گئی۔ چار خانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گورنام نے کپاس کی چھٹریوں کا **ایک** گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔جس وقت تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے سرک گئی۔لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اسکے حسین چہرے پر پڑ رہی تھی اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری،ایک کٹورے میں شکر گھی،ڈیلوں کا اچار،دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گورنام اسے دینے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سروں میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گورنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کے تکیے کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا **ایک** کنٹھا نیچے گر پڑا۔گورنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا''گورنام!بس جا رہی ہو گیا؟''

گورنام حسب معمول دل فریب طفلانا انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتی ہوئی آگے جھک کر آہستہ سے بولی ''سب لوگ سو جائیں تو یہاں آؤں گی''۔

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شرینہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیووں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈ منڈ بیریوں پر بئیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔ ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔۔۔

نکل کے مل بابو!

ساڈا او نجھنے دا ویلا ای

نکل کے مل بابو!

اتنے میں گورنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں کھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔ اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گورنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گورنام دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر اس نے اپنی باتوں سے خود ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان کی آواز میں بولی، ''کیوں تم یہ زیوارت کہاں سے لائے ہو؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں، جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار دیتے ہیں''۔ یہ کہہ کر گورنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی، جیسے سچ مچ کا کوئی قاتل اس کا گلا دبانے آرہا ہو۔

''مت گھبراؤ، تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تمہیں کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ''۔

گورنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی ''تم کتنے اچھے ہو۔ یہ زیورات تو تم نے اپنی بیوی کے لیے لائے ہونگے نا؟''

''ہاں''۔

گورنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے بڑے اشتیاق سے پوچھا ''تمہاری بیوی کیسی ہے؟''

''مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی''۔

''اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو؟''

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی؟ بنے گی بھی یا نہیں''۔

گورنام نے دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر آنکھیں جلد جلد جھپکاتے ہوئے ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا ''ہاں، تم کالے ہو ذرا''۔ اجنبی کے سینے میں جیسے کسی نے گھونسا مار دیا۔ مگر گورنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔ تبھی وہ بولا۔ ''یہ زیور تم لے لو''۔

گورنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا اور پوچھا ''پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟''

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا،لڑکھڑاتی زبان میں بولا ''پھر میں تم سے لے لوں گا''۔
گورنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔اس کی باچھیں کھل گئیں۔تالی بجا کر بولی ''میں انہیں اپلوں میں چھپا دوں گی۔کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیور پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی''۔کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا ''گورنام، تم بھی تو مجھے کچھ دو''۔
گورنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا اور بولی ''میرے پاس کیا ہے؟''
گورنام چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر سوچتی رہی۔پھر اس نے گلے سے کوڑیوں اور خربوزے کے رنگ رنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔وہ اپنا یہ حقیر تحفہ دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔
تھوڑی دیر بعد گورنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا ''یہ میری انگلی میں پہنا دو۔دیکھوں، کیسی لگتی ہے''۔
اجنبی نے اپنے کالے کالے، میلے کچیلے چوڑے ہاتھوں میں گورنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔گورنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔زلفوں نا ے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپی جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔جب وہ لڑکی کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں۔اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں میں کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔
گورنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی ''اماں کھانس رہی ہے۔اب میں جاتی ہوں''۔اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔گورنام نے آگے جھک کر لفرتی آواز میں پوچھا ''جاؤں کیا؟''
اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔علی الصباح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔اجنبی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔گورنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھناسی کا دیا۔جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گورنام رونے لگی۔اجنبی نے آہستہ سے کہا ''روتی کیوں ہو؟''
''تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔تم مت جاؤ''۔
اجنبی ہنس پڑا۔''میں پھر آؤں گا''۔
باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔وہ اجنبی کو رخصت کرنے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔اس نے اجنبی سے پوچھا ''کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟''
''ہاں!'' اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر جواب دیا۔پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا ''اور تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے، کسی سے بھی کیا تو تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے''۔بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔
اجنبی سانڈنی پر سوار ہوا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا ''آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا''۔
جگا ڈاکو، اصل میں سردار جگت سنگھ ورک وہ خوفناک شخص تھا جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں گزر گیا۔بہت سی زمین کا مالک تھا۔امرا پر ہاتھ صاف کرتا تھا۔غریب خوش تھے۔اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔اب ۳۰ برس سے اوپر سن تھا۔موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہیں تھا۔دور دور تک اس کی دھوم تھی۔علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا۔اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، دہن شعلہ اور وہ خود قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنالیے تھے۔نوجوان انہیں جھوم جھوم کر گایا کرتے۔ایک واقعے کا ذکر یوں ہوتا ہے:

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکے پل تے
پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کل ٹٹ گئے۔۔۔جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے زبردست ڈاکا ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا۔اس کا ذکر یوں ہوتا:

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے

لیکن اب اس طویل، تاریک اور ہیبت ناک شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا تھا جس نے اس کی نظریں خیرہ کر دیں۔اور وہ تارا تھی، گورنام!

گورنام بیچاری نادان چھوکری، اسے عشق ومحبت کا پتا ہی نہ تھا۔اسے لوگ انکھیوں سے دیکھتے، وہ ہنس دیتی۔اس کا جذبہ پندار حسن وشباب کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ابھی اسے اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ دانستہ شکار کھیلے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لیے مخصوص ہے۔وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ وہ شاہین جسے زخمی کرنے کے لیے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا، وہ اسے چھو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے غلط انداز تیر کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔اس نے اپنے آپ کو ایک متمول زمین دار ظاہر کیا۔باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اسے دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔گورنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔جگے کے دل میں خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتے کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے؟ اس نے کبھی اس سے محبت جتانے کی کوشش نہیں کی۔وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نا معلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گورنام کیا رویہ اختیار کر لے؟

وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔کبھی کبھی اسے خود سے نفرت ہونے لگتی۔صورت تو پہلے ہی اس کی مکروہ تھی مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔مگر گورنام تھی کہ اس نے کبھی اس سے اظہار نفرت نہیں کیا۔وہ نہایت مہر ومحبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔اگر وہ اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہتا تو بیٹھ جاتی۔اگرچہ اس نے آج تک اسے چھونے کی جرات نہیں کی تھی۔گورنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑ کا پیدا کر دیتی۔ملکوتی جمال اس کا سر، سرنگوں کر دیتا۔صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔یہاں تک کہ لوگوں نے حیرت سے سنا کہ جگے نے ڈاکا زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے میں گزر گیا۔جگا صبح وشام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گردوارے میں جا کر سیوا کرتا اور ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

جگے نے باپو سے منت کی کہ گورنام کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔اس نے ڈاکا زنی ترک کر دی ہے اور جو کچھ اس نے لوٹا، وہ سب بڑی توندوں والوں کا تھا۔غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہیں تھا۔وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ انہیں دینے کو تیار تھا اور باپو کو ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔لیکن گورنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے۔کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اسے چاہتی تھی اور

جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔
جگا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اول تو آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی مگر اسے کوئی نہیں پہچانتا تھا، جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ گورنام کی زبان سے بھی عشق کا اقرار کروالے۔ خواہ اسے یہ نہ بتائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن غروب آفتاب کے بعد وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتا چلا کہ گورنام ساتھ والے گاؤں میں جلاہوں کو سوت دینے گئی ہوئی تھی۔ جگے نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ پگڑی ذرا کج کی، شملہ ذرا اور بلند کیا پھر سب کی نظریں چرا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود ڈاڑھی پر اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا گھر سے نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ فرلانگ تک چلا گیا۔
ہر طرف دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔ دور سے اسے ایک صورت دکھائی دی۔ اس نے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً تھی بھی گورنام۔ جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔
گورنام قریب آتے ہی مسکرادی لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی، بولی "میری تو گردن ٹوٹ گئی"۔
"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے من بھر کا بوجھ اس کے سر سے یوں اٹھایا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھادے۔
"اپلے اور کیا ہوتا؟" گورنام نے اپنی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آرہی تھی، تو راستے میں اپلے چننے لگی، یہاں تک کہ شام ہوگئی"۔ دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔
آج جگے نے گورنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا کیونکہ گورنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ "گورنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی ڈاڑھی پر ٹپک پڑی، اس نے آستین سے پونچھا، پھر بولا "گورنام! میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں"۔
گورنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الھڑ نہیں رہی تھی مگر جگے سے کافی مانوس تھی۔ اسی لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔ جگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے شانہ ہلا کر پوچھا "کیوں گورنام! کس سوچ میں ہو؟"
گورنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا "میں بہت پریشان ہوں۔ میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تمہیں سب حال سناؤں لیکن۔۔۔"
"لیکن کیا؟"
"شرم آتی تھی"۔ گورنام نے کچھ جھینپ کر جواب دیا۔
جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ مونچھ کے نیچے مسکرا کر بولا "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"
گورنام چپ رہی۔ جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ بار بار اصرار کرنے پر گورنام نے بتایا "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں"۔

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ شادی تو کبھی کی ہوتی ہے''۔

گورنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''وہ کسی روپے پیسے والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں کسی اور سے۔۔۔'' یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اٹھا شملہ چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا؟ پھر سینہ پھلا کر کہا ''نہیں گورنام! جسے تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہوگی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا۔۔۔ہاں۔۔۔مگر وہ ہے کون؟'' جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔ گورنام نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانے اور صندوق جیسا سینہ چھو کر یک گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ جگا گھبرا گیا۔ اس نے اسے چمکارا، دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گورنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی ''تم ضرور میری مدد کرو گے۔ میں ان سب کے ہاتھوں سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام۔۔۔'' جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا ''اس کا نام ہے دلیپ۔۔۔دلیپ سنگھ''۔

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔ اس کا چہرہ یکا یک بھیانک ہو گیا۔ ''دلیپ سنگھ اس کا نام ہے''۔ گورنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ گورنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''گھر جاؤ'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا ''تم فوراً واپس چلی جاؤ''۔ اس نے کرخت لہجے میں گرج کر کہا۔

گورنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی۔ آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی۔ معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا ''دلیپ سنگھ؟۔۔۔'' اب موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔ یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی، نہ چاند کی چاندنی۔ پل بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی دیتے پڑتے جیسے دو منہ والا کوئی دیو انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہو، یا جیسے کسی مردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں، جن کی پتلیاں کوے نوچ کر کھا گئے ہوں۔ قریب ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلے پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص ادھر سے گزرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی خونی پل رکھ دیا گیا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دل دوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود سر کے بغیر نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سنار کا کام کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اس کی تیار کردہ گل قند خوب بکتی تھی۔ وہ نوجوان تھا۔ خوش رو، خوش وضع، مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں، گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران، آنکھیں شربت سے لبریز کٹورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوتے تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا! الغوزہ خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی

شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے جاتا ہے، تو یہ واقعہ وارث شاہ کی ہیر سے بڑے دردناک لے میں گایا کرتا تھا۔ بلکہ اس میں دور دور تک اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا مگر خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات وہ جگہ اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریک بھیانک شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی۔ اس نے ذرا بلند آواز میں چھیئی گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اسے تسکین ہوئی۔ اس کا گدھا پل سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پل کے درمیان میں تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ اچانک کسی شے کی چبھن محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی اس کا کرتا پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوی پیچھے سے دلیپ کی قمیض میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

''تم کون ہو؟'' دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

''ادھر آ''۔ بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا۔ یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا ''مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا؟ ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے۔ اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے؟''

''بے شک میں وہی ہوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نوعمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا تھا اور قتل تو میں نے بہت کیے ہیں، اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں اور آج مجھے بارہواں قتل کرنا ہے''۔

دلیپ کو اس کے اجڈ پن پر تعجب ہوا، بولا ''میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ تم تو میرے محسن ہو''۔

''تو گورنام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے تو نے شدگارا سنگھ کو اسی پل پر زخمی کیا تھا۔ آج تیرا میرا فیصلہ ہوگا''۔

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا اور بولا ''اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے''۔

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا ''میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا''۔

اجنبی نے گرج کر جواب دیا ''تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات! اگر تو واقعی اپنے باپ ہی کے تخم سے ہے تو میرے سامنے آ''۔ یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ دلیپ نے وہ ڈنڈا اس کے منہ پر دے مارا جو گدھا ہانکنے کے لیے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی، ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا، اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکا اس کے منہ پر رسید کیا جس سے جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔ اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ کر اس کی داڑھی تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھار چھوٹ رہی تھی۔

منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔ پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا ''اس طرح نہیں دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی

طفلانہ حرکت کرنا نہیں چاہتا''۔ یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا عین اصل جگہ آ گیا۔ دلیپ جگے کا نام سن کر خوف زدہ ہو گیا۔ جگا اپنی چھوی پکڑ کر بولا ''تیرے پاس چھوی ہے؟''

''نہیں''۔

''تلوار ہے؟''

''نہیں''۔

''صفاجنگ؟''

''نہیں''۔

''مگر لاٹھی تو ہے، وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی ہے''۔ دلیپ تعجب کے مارے چپ چاپ کھڑا تھا۔
''جا!'' اجنبی نے پکار کر کہا ''لاٹھی لے آ۔ میں نے سنا ہے کہ تو علاقے بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہیں مرنے دے گی''۔

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک اس کا پالا نہیں پڑا تھا۔ جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی۔ وہ دونوں پھر ایک دوسرے کو للکارتے میدان میں کود پڑے۔ ان کی للکار سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑ پھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہوا ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا، چست و چالاک، نو آموز اور جوان چھوکرا، بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔۔۔ جگا بھاری بھرکم، قوی ہیکل، کہنہ مشق دیو۔ موٹا ہونے کے باوجود اب بھی جس وقت سرک لگاتا، تو ایسا معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا ''ایک''۔

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا ''دو''۔

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا ''تین!'' یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا ''او سنبھل بے چھوکرے، اب جگا وار کرتا ہے''۔

پسینے کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیے کے مانند حلق سے خوفناک آواز نکالی پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر آگے کی طرف اچک کر بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا مگر کہنہ مشق استاد کا وار کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کا سر توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینے تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارے پر جا گرا۔ کچھ دیر تک تڑپتا رہا پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسی معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔ قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔ زرد چاند بدلی سے نکل آیا تھا مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی صاف کی۔ منہ ہاتھ دھویا، کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ دلیپ کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کر کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعے کے پچیس دن بعد ۔ ۔ ۔ دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔ گورنام کے ہاں سبھی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخا کات رہی تھیں۔ بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔ اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

سب لوگ حیران تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گورنام کا ہونے والا خاوند وہ خود تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لیے وہ خاموش رہے۔ ''اور وہ شخص یہ ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زدہ خاموشی طاری ہو گئی۔ گورنام نہ معلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اسے شرما جانا چاہیے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا ''اگر گورنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح تمہیں آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تمہیں قتل کر ڈالتا مگر مردوں سے مجھے محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گورنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں، امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہیں کرو گے''۔

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔ جگا بلند آواز میں بولا ''باپو، اماں، بے بے! میں ان کی شادی کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور انہیں بہت سی زمین بھی دوں گا''۔

باپو اصل قصہ بھانپ گیا لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا؟ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا ہے۔ دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اسے گھیر لیا تھا، اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے۔ وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور انہیں بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اسے اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ گورنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''تم کتنے اچھے ہو۔ ۔ ۔ تم یہیں ہمارے پاس رہا کرو''۔

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار کر رو پڑے مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا بگولے کی طرح دروازے سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد رات کے وقت گورنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا، کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے، ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دیو پیکر صورتیں اور چمکتی ہوئی چھویاں عجب منظر پیش کرتی تھیں۔ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گورنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی ''باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے''۔

''نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں''۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینے سے لگایا۔ پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا ''آج جگا ڈاکو ڈاکا ڈالنے جا رہا ہے''۔

☆☆☆

یادرفتگان

حجاب امتیاز علی

(رات کے سناٹے میں)

کچھ خبر ہے تجھ کو اے آسودہ خواب لحد
شب جو تیری یاد میں ہم تا سحر رویا کئے
رونے والے تیرے تجھ کو عمر بھر رویا کئے
روزوشب رویا کئے شام و سحر رویا کئے

پیارے رفیق! مجھے ڈر ہے کہ آج کی رات بھی۔۔اپنی الم انگیزی اور ماتمی نشانات کے سبب کتاب زندگی کا اک یادگار باب بنے گی! کیونکہ دریچہ کھلا ہوا ہے۔اور گرم ممالک کا زرد چاند آسمان پر چمک رہا ہے۔

کھڑکی کے پاس ہی رات کی اس اداس تنہائی میں اک الواپنی ویران آواز میں کچھ گنگنا رہا ہے۔آہ شاید قصہ ماضی کو دہرا رہا ہے۔اس کے لہجے مرے ماتمی خوابوں کو از سرنو بیدار کر رہے ہیں۔مری اشکبار روح کو آمادہ گریہ کر رہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔۔۔اور آہ اس کا احساس بھی کس درجے مایوس کن ہے۔کہ سوائے اس زرد چاند کے جو اس وقت آسمان پر فرشتے کی پیشانی کی طرح چمک رہا ہے۔اس دنیا میں میرا کوئی رفیق نہیں۔سچا رفیق۔۔!۔۔کیونکہ ہر طرف موت کی سی خاموشی طاری ہے اور مرے پاس تسکین دینے والی کوئی چیز موجود نہیں! سامنے بہت سے اونچے اونچے پہاڑ نظر آرہے ہیں۔پر ان پر بھی آج کی دہشت انگیز رات کی تنہائی میں درندے بھی چلتے پھرتے نظر نہیں آتے۔گویا میں آزمائش کے لیے نیچر کی طرف سے تنہا چھوڑ دی گئی ہوں۔

پروردگار! ترے آدم نے بھی دنیا میں پہلے پہل اتنی تنہائی محسوس نہ کی تھی جتنی اس وقت میں کر رہی ہوں۔

کمرے میں۔۔۔اک طرف کونے میں تپائی پر موم بتی کے پاس ہی اک ٹائم پیس رکھا ہوا ہے۔جس کی ''ٹک ٹک'' درودیوار سے ٹکرا کر مجھ غم نصیب کی طرف آتی ہے۔اور مرے بربط خیال کو چھیڑ چھیڑ کر اس میں سے عجیب ہولناک دہشت خیز راگ پیدا کر رہی ہے۔

آہ رفیق! مرا دل اس تنہائی ویرانی، اداسی میں دھڑک رہا ہے اور وہ بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے۔میں ڈرتی ہوں کہ وہ ساکت ہو جائے گا۔میں ڈرتی ہوں کہ میں اس المناک تنہائی کے احساس سے رو پڑوں گی۔اور بہت دیر تک روتی رہوں گی۔ اور اگر کچھ دیر میں یونہی اپنے جزیرۂ خیال میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دی گئی اور تاریکی میں میں نے کوئی روشنی نہیں دیکھی، کسی انسانی ہاتھوں کو ہموارانہ طریق پر اپنی طرف بڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، تو بے شبہ آج رات میں اپنی جان فنا کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گی۔آہ مری ناشاد روح!

معبود!! کیسی سنسان اور گرم رات ہے!!! مشرقی ممالک کی اک پرفسوں، مگر تنہا اور ویران رات!! اداس اور غمگین رات!! چاند چمک رہا ہے، مگر اس کی روشنی میں مجھے عجب قسم کی تاریکی نظر آرہی ہے! کائنات کی آوازیں، شورشیں، آخر کدھر

غائب ہوگئیں؟ مرے مالک!! آخر کدھر چھپ گئیں؟ آخر میں تنہائی کی اس مصیبت کے لیے نیچر کی طرف سے کیوں منتخب کر لی گئی؟۔۔۔کیا اس لیے کہ میں اک حساس دل اور افسانہ پسند روح والی عورت ہوں؟

آہ رفیق۔۔۔۔اس وقت مجھے یادِ رفتگان بے طرح ستانے لگی! آہ میں دیوانی ہو جاؤں گی، رات کی تاریکی مرے تخیل کو ان غیر آباد اجڑے مکانوں کی طرف لے جا رہی ہے، جو کبھی مری اور مرے رفتگانِ خاک کی قیام گاہیں تھیں۔ جنکے آج پردہ دنیا پر نہ ہونے سے یہ روشن کائنات میرے لیے اندھیر ہو رہی ہے اور یہ چمکتا ہوا چاند بے ضیا نظر آ رہا ہے۔ پھلے پھولے گلشن اجڑے ہوئے کھنڈر معلوم ہو رہے ہیں۔

مجھے ڈر ہے میں نیچر کی اس آزمائش میں پوری نہ اتر سکوں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دامن صبر وضبط کو چاک کر دوں گی۔اور بے اختیار بچوں کی طرح مچل مچل کر رونے لگوں گی۔

اس وقت مری خواہش ہے۔آہ کس قدر غمگین، مگر زبردست خواہش ہے۔کہ تم آؤ اور مجھے مری اس تنہا اور غضب کی المناک رات میں صبر کی تلقین کرو۔آہ کاش تم آؤ۔۔۔اور مجھے ہمت بندھاؤ۔

محبوب روح!۔۔۔مری پیاری روح! اے بچھڑی ہوئی روح!

اگر تم نہ آؤ گی تو مجھے یقین ہے کہ آج رات میں اپنے پریشان خیالات سے متاثر ہو کر اور غمگین جذبات کو برداشت نہ کر سکتے ہوئے، آہ بیچاری میں۔۔۔غش کر جاؤں گی!۔۔۔یا سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے تک بالکل پاگل ہو جاؤں گی۔

ہائے مجھے اب یاد آتا ہے کہ تم بھی اس دنیا میں موجود نہیں، پھر کیوں کر آؤ گی؟ کھوئی ہوئی روح! کیوں کر آؤ گی؟ ہم دونوں میں اک زبردست خلیج حائل ہے جو کبھی ہم کو اس فانی دنیا میں ملنے نہ دے گی تاوقتیکہ میں تمہارے پاس آ جاؤں! میں اپنی الم انگیز زندگی پر آہیں بھرا کروں گی۔ پر آہ، تمہیں دیکھ نہ سکوں گی۔۔۔! مگر یہ تو بتاؤ کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ مضبوط پتھر ہٹ جائے اور تم مسکراتی ہوئی اس تنگ و تاریک قبر سے باہر نکل آؤ۔۔۔؟ مری رفیق کیا یہ ممکن نہیں؟

آج رات بھر مجھے نیند نہ آئے گی، اور غمگین خواب مجھے ستائیں گے! جانے مجھے آج کیا ہو گیا ہے، لحظہ بہ لحظہ رفتگانِ خاک کی یاد مری روح مری جان کو بے طرح تڑپا رہی ہے بے چین کر رہی ہے۔آہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہمیشہ کے بچھڑے ہوؤں کی یاد مجھے بے موت مار ڈالے گی! نیند بھلا کیونکر آئے؟ کیونکہ جونہی میں آنکھ بند کرتی ہوں مرے بچھڑے ہوئے خواب، میری بے چاری روح کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے لگتے ہیں۔ مرا تخیل آج سے کئی سال قبل کے واقعات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مجھے ساحل ''سیں تھوم'' پر تمہاری روح کھڑی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے پھر بھلا نیند کیونکر آئے؟

مجھے اس رات کے رنگ ڈھنگ سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ رات۔۔۔آج کی رات۔۔۔۔۔آج ۱۲ جولائی ۱۹۳۰ء کی رات بھی مری زندگی کی تاریخی راتوں میں جگہ پائے گی۔

آہ! اس سلسلے میں مجھے اپنی گذشتہ مختصر زندگی کی چند یادگار راتیں یاد آتی ہیں، مگر مرا تخیل اور مری یاد، جہاں تک کام کرتے ہیں مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ گذشتہ راتیں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عبرت انگیز، دردناک، دہشت خیز ہیں۔

اک وہ رات یاد آتی ہے جبکہ تمہارا رشتہ حیات اس دنیا سے منقطع ہوا تھا۔ تمہارا طائر روح، زندگی کا آخری راگ گا کر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا تھا، ہائے، میں اس رات کا ذکر کیونکر کروں؟ مری زبان مرا قلم، مری روح،۔۔۔۔ناتواں، مجروح اور بے قرار ہے۔۔۔مختصر یہ کہ لوگ تم کو تمہاری ''ابدی قیام گاہ'' میں پہنچا آئے اور معبود جانے وہاں تم پر کیا بیتی؟ پر آہ، مجھ سے نہ پوچھو، للہ مجھ سے نہ پوچھو، تم پوچھو گی تو میں بے اختیار رو پڑوں گی، اس لیے بخدا نہ پوچھو، کہ وہ رات، وہ پہلی رات تمہاری موت کی رات

مجھ پر کیسی گذری؟

اس کے بعد زندگی کی اک دوسری رات یاد آتی ہے!

چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا، ہوا خاموشی میں ڈوب گئی تھی۔ستارے تو مشق تیراک کی طرح بادلوں کے عمیق سیاہ سمندر میں ڈوب ڈوب کر نکل نکل کر ڈوب جاتے تھے۔۔۔ مگر مری خوشیوں کا ستارہ ہمیشہ کے لیے ڈوب چکا تھا!۔۔۔ موت کا تصور مری روح کے تبسم کو فنا کر رہا تھا میری تصوری آنکھ قبر کے سیاہ اور سر د گڑھے کو آنے والی تقدیر سمجھ کر صبر و شکر کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اونچے اونچے سیاہ سرو اور بے رونق اداس ناشپاتی کے درخت یاس کے عالم میں چپ چاپ کھڑے تھے۔۔ اور مرے اطراف چند بھورے بھورے غمگین پتھر نظر آرہے تھے۔۔۔ جنکے نیچے انسانی ڈھانچ، آہ! وہی ڈھانچ۔۔۔۔ جو کبھی کسی کی مرکز تمنا، سجدہ گاہ آرزو ہونگے، آج بے گوشت و پوست دبے پڑے تھے!

آہ اس سرزمین میں ہمارے ہم جنس صدیوں سے اک افسوسناک بے ہوشی کی حالت میں پڑے موت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔۔۔ تقدیر نے اس بے ہوشی کو تم پر بھی مسلط کر دیا تھا، میں تنہا تمہاری اداس، بے در و دیوار ''ابدی قیام گاہ'' کو کھڑی تک رہی تھی۔ اور رات آہستہ آہستہ گزرتی جاتی تھی!۔۔۔ کبھی کبھی جنگلی گلاب، اور زرد پھولوں کی بیل میں ہوا سرسراہٹ پیدا کر دیتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان مدت کے سونے والوں نے ایک لمبی سانس لی!۔۔۔ زرد بیلیں اونچے پیڑوں پر چڑھی ہوئی تھیں، اور افسردہ گھاس ان قبروں کی محافظت کر رہی تھی۔ جن کے اندر انسانی زندگی کے عجیب وغریب افسانے پوشیدہ ہیں! آہ میں اس رات کو مدت العمر نہ بھولوں گی!

میں نے آسٹریلیا کے ٹو بیٹر، اور۔۔۔ کانین ڈائل کی روحانی کتابوں کا مطالعہ کیا، میں نے روحانی ریسرچ سوسائٹی کی ممبری قبول کر لی، پر آہ۔۔۔

باتیں یہ سب درست، بجا یہ تسلیاں
لیکن دلِ حزیں پہ کسے اختیار ہے

لوگ کہتے ہیں کہ موت عارضی نیند ہے، مصنوعی سکوت ہے، بے معنی جدائی ہے، اگر ایسا ہوتا، اگر واقعی ان مصنفین کا کہنا سچا ہوتا تو پھر مرے دل کو اطمینان نصیب ہو جاتا ہے، مگر قرار کیونکر آئے؟ مرے غم نصیب دل کو بھلا قرار کیونکر آئے؟ موت خوہ مصنوعی نیند ہو، عارضی جدائی ہو، بے معنی سکوت ہو، آخر جدائی ہے! اور پھر ایسی جدائی جو زندگی بھر برداشت کی جاتی ہے جو انسان کی خوشیوں کو پامال کر دیتی ہے۔

دیکھو! اب مجھ سے لکھا نہیں جاتا!

مرا دل دھڑک کر ساکت ہونے کے قریب ہو رہا ہے۔ مرا سر چکرانے لگا، رات کے دو بج گئے، ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی۔ الو بھی اپنا دکھڑا رو چکا، اور موم بتی کا شعلہ ٹمٹما رہا ہے!

مجھے اب چپ ہونے دو۔ مجھے یونہی چھوڑ دو۔ یاد رفتگاں میں تڑپنے، سسکنے کے لیے یونہی چھوڑ دو۔

☆☆☆

نیلی ساری

خواجہ احمد عباس

بمبئی: چونتیس کم عمر لڑکیاں تین قحبہ خانوں میں سے پچھلے ہفتے برآمد کی گئیں۔ ان میں سے تین کے چہرے کو ایذا پہنچانے کے لیے تیزاب سے جلا دیا گیا تھا۔ پولیس نے پانچ عورتوں کو رنڈی خانوں کو چلانے اور طوائفوں کی آمدنی پر رہنے کے جرم میں گرفتار کرلیا ہے۔ (ایک خبر)

حضور۔ میں سچ کہوں گی، سب سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔ مگر وقت ہے آپ کے پاس اور آپ کے سماج کے پاس میری باتیں سننے کے لیے؟

میرا نام سلیمہ ہے۔ میرے والد کا نام۔ خدا ان کی مغفرت کرے کریم بخش تھا۔ میرے والد کیا کرتے تھے۔ سچی بات یہ حضور کہ وہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ کسی زمانے میں زمیندار رہے تھے۔ بعد میں جب زمینوں پر سیلنگ لگی تو ان کے بدلے میں جو معاوضے کے کاغذات ملے ان کو بیچ کر کھاتے رہے۔

میری جائے پیدائش شکوہ آباد کی ہے۔

شکوہ آباد یو پی کا ایک قصبہ ہے۔ آگرے کا قصبہ کیا ہے پرانے کھنڈر جیسے مکانوں کا ایک مجموعہ ہے۔

انہیں میں سے ایک کھنڈر جیسے مکان میں میرا جنم ہوا تھا۔

میری ماں میری پیدائش کا بوجھ برداشت نہ کرسکیں۔ میرے پیدا ہوتے ہی مرگئیں بیچاری۔ پھر میرے والد نے دوسری شادی کرلی۔

میری سوتیلی ماں کا نام کریمن تھا۔ وہ ذات کی نائن تھی۔ مگر شکل وصورت کی ذرا اچھی تھی۔ جب ہی تو میرے والد نے بیوی کے مرنے کے دو مہینے بعد ہی اس سے نکاح پڑھوالیا۔ محلے والے یہ بھی کہتے تھے کہ ان کا معاملہ کریمن کے ساتھ پہلے سے چل رہا تھا۔

کریمن میری سوتیلی ماں ضرور تھی مگر ایمان کی بات یہ ہے حضور کہ اس نے کبھی سوتیلی ماں جیسا سلوک نہیں کیا مجھ سے۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے مجھے اسکول پڑھنے بھیجا۔ وہ مجھے ہمیشہ سنیما ساتھ لے جاتی تھی اور ہر طرح کے ناز اٹھاتی تھی۔

جب تک میں پندرہ برس کی ہوئی تو سنیما کی پکی شوقین بن چکی تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ شکوہ آباد جیسے مردہ قصبے میں اور کوئی تفریح کی جگہ بھی تو نہیں تھی۔ جب تک میں کوئی فلم دیکھتی رہتی تو ایسا لگتا کہ میں دوسری دنیا میں ہوں۔ ایک حسین رومانی دنیا جس میں سب مرد خوبصورت تھے۔ نہ صرف ہیرو بلکہ ویلن بھی۔۔۔ اور سب عورتیں اور لڑکیاں حسین تھیں اور سب نے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ فلموں سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ حضور مگر خاص طور سے یہ سیکھا کہ اپنی زندگی کی کٹھنائیوں اور محرومیوں سے سنیما کے اندھیرے میں کیسے بچا جاسکتا ہے اور کچھ بھی سیکھا۔ مثلاً ہیروئن کی طرح کپڑے پہننا۔ ان کے جیسے بال بنوانا یا کٹوانا۔ اس زمانے میں میرا ماتھا بھی بڑا تھا اور فرنج یعنی کٹے ہوئے بالوں کی جھالر میرے چہرے پر بھی اچھی لگتی تھی۔

اگلے دن ہی میرے خالہ زاد بھائی محمود علی نے جو مجھ سے عمر میں پانچ چھ برس بڑے ہوں گے، پہلی ہی جھلک میں پہچان لیا کہ میں نے ''لوان شملہ'' دیکھ کر ہی اپنے بال کاٹے ہیں۔ اس لیے وہ ہلکے سے مذاق میں کہنے لگے ''کیوں سلیمہ 'لوان شملہ' تو دیکھا 'لوان شکوہ آباد' کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' اتنی بے شرمی کی بات سن کر میرا سارا چہرہ گلابی ہوگیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب

دوں؟ میں جلدی سے وہاں سے بھاگ گئی۔محمود بھائی بھی دو چار پھبتیاں کس کر وہاں سے چلے گئے۔ہاں جاتے جاتے اتنا کہہ گئے کہ وہ دو دن کے بعد علی گڑھ جا رہے ہیں۔کسی کو سنیما چلنا ہو تو ان کے ساتھ وہ کل چل سکتا ہے۔میں نے اماں سے پوچھا۔میں کریمن کو اماں کہتی تھی ''چلو گی اماں؟'' اماں نے کوئی بہانہ کر دیا۔ابا تو سنیما جانے کو تیار نہیں تھے۔اماں نے کہا ''اپنے گھر کا ہی تو لڑکا ہے تو اس کے ساتھ چلی جا۔برقع اوڑھ کے''۔

اگلے دن میں محمود بھائی کے ساتھ سنیما ہولی۔رات کا وقت تھا۔وہ بھی آخری دسمبر کی رات۔کڑاکے کی سردی تھی۔تانگے میں بیٹھی تو محمود بھائی پاس بیٹھے تھے۔ان کا ہاتھ نہ جانے کس طرح میرے برقعے کے اندر آ گیا۔میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے ''اف تمہارے ہاتھ تو بالکل ٹھنڈے ہو رہے ہیں' ذرا اپنے ہاتھوں کی گرمی مجھے پہنچاتے رہے۔تھوڑی دیر میں میرے ہاتھ بھی ان کے ہاتھوں کی طرح جلنے لگے۔

سنیما آ گیا تو وہ تانگے والے کو پیسے دے کر مجھے اندر ہال میں لے چلے۔میں حیران رہ گئی۔جب میں نے دیکھا انہوں نے ایک باکس ریزرو کر رکھا تھا۔یہاں ہم دونوں اکیلے تھے۔اس لیے فلم شروع ہونے پر محمود بھائی نے میرا برقع اتار دیا اور آہستہ آہستہ ان کا بازو میرے گرد حمائل ہو گیا۔فلم کافی بکواس تھی مگر ہیرو ہیروئن کی محبت کے بہت سین تھے جو میرے لیے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔

جو نکتے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے،محمود بھائی کا ہاتھ میری تربیت کرتا رہا۔ایک سین تھا جس میں ہیروئن گر پڑتی ہے۔ہیرو گھبرا کر بھاگتا ہے اور زمین پر بیٹھ کر پوچھتا ہے۔

''چوٹ لگی ہے؟''

ہیروئن منہ بنا کر کہتی ہے ''بہت لگی ہے''۔

''کہاں'' ہیرو پوچھتا ہے۔

''یہاں'' وہ ٹخنے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے۔وہ ٹخنہ دبانے لگتا ہے۔

پھر وہ کہتی ہے ''یہاں'' اور گھٹنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وہ گھٹنا دبانے لگتا ہے۔

پھر وہ کہتی ہے ''نہیں۔وہاں نہیں۔۔۔یہاں''

''کہاں'' وہ پوچھتا ہے۔

وہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے ''یہاں''۔

ہیرو کے ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف بڑھتے ہیں۔۔۔بڑھتے ہیں پھر ایک دم رک جاتے ہیں۔مگر محمود بھائی کا ہاتھ نہیں رکا اور میں نے بھی لذت بھرے درد کو محسوس کر کے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔

اگلے دن تو محمود بھائی علی گڑھ چلے گئے اور میں ان کی یاد کو سینے سے لگائے اسکول چلی گئی۔اسکول سے لوٹی تو دروازے پر ہی میں نے برقع اتارا اور اندر گھس رہی تھی کہ بندو سقے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔وہ اندر سے خالی مشک کندھے پر لٹکائے باہر نکل رہا تھا اور میں اندر جا رہی تھی۔ہم دونوں کا معانقہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔دو پل کے لیے ہم ایک دوسرے کے مقابل ٹھٹھک کر رہ گئے۔میں نے دیکھا کہ سقے کا لونڈا مجھ سے ذرا ہی بڑا تھا اور جس کے ابھی مونچھیں بھی نہ نکلی تھیں،منہ پھاڑے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔میں بھلا سقے کے لونڈے کو کب خاطر میں لانے لگی تھی۔پھر بھی گھبراہٹ میں اس کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔پھر چونکی ہو کر اندر چلی گئی اور یہ واقعہ دوپہر کے سناٹے میں کھویا رہا۔کسی نے ہم کو دیکھا نہیں تھا لیکن نشہ حسن میں ڈوبی ہوئی میری خوشی کا کیا ٹھکانہ

کہ کل محمود بھائی جس صورت پر مر مٹے تھے، آج اس صورت کو دیکھ کر ایک سانولا سلونا سقے کا لونڈا گھن چکر ہو گیا تھا۔

سقے کے لونڈے کو میں کب منہ لگانے والی تھی مگر مجھے یہ اچھا لگتا تھا کہ میرے حسن کے پجاریوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے موقع ملتا میں کسی نہ کسی بہانے سے بندو کے سامنے آ جاتی یا اسے اپنی ایک جھلک دکھا کر فوراً پردہ کر لیتی جیسے غلطی سے سامنا ہو گیا ہو۔ وہ بے چارہ تو یہ امید ہی کبھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ معاملہ آگے بڑھے گا۔ ایک شریف زادی سے چھیڑ چھاڑ کی پاداش میں ابا اسے مار مار کے ادھ موا نہ کر ڈالتے۔ مگر اس آنا کانی میں مجھے بڑا مزہ آتا۔ وہ مرے یا جیے مجھے کیا غرض؟

گرمیوں کی چھٹی میں محمود بھائی پھر شکوہ آباد آئے۔

کبھی خالہ اماں کے گھر جانے کے بہانے ہم ان کے ہاں ملتے۔ کبھی کچھ نہ کچھ بہانہ نکال کر وہ ہمارے ہاں آ جاتے۔ کبھی سنیما ہم اماں کو ساتھ لے کر چلے جاتے اور کبھی کبھی ہم خود ہی سنیما چلے جاتے۔ اس دن میں نیلی ساڑی پہنتی، نیلا میرا محبوب رنگ تھا اور محمود کو بھی بے حد پسند تھا اور تب "باکس" میں بیٹھ کر ہی پکچر دیکھتے۔ بلکہ پکچر برائے نام ہی دیکھی جاتی۔

ایک بار وہ سقے کا لونڈا بندو ہمیں وہاں مل گیا اور میں نے محمود بھائی سے کہہ دیا کہ وہ بیچارہ میرا شکار ہو گیا ہے۔

"بہت خوب" محمود بھائی بولے "تو شادی کر ڈالو"۔

"اس سے شادی کرے میری جوتی"۔

"پھر کس سے شادی کرو گی؟"

"آپ کو معلوم ہے"۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بالکل ہیروئن والے انداز میں کہا۔

"پھر تو اماں سے بات کرنی ہی پڑے گی"۔ وہ ہنس کر بولے۔

اور میں نے ان کے بازو میں گھس کر کچھ کھسر پھسر کی۔

"سچ! پھر تو دیر نہیں کرنی چاہیے"۔

"ہاں محمود۔ ورنہ میں مر جاؤں گی"۔

"ارے مریں تمہارے دشمن"۔

اس سے تیسرے دن محمود ہمارے گھر آیا اور ابا کو بیٹھک میں دیکھ کر اور اماں کو سوتا پا کر مجھ سے آہستہ سے بولے "اماں انکار کر رہی ہیں"۔

"کیوں؟ مجھ میں کیا برائی ہے؟"

"تم میں کچھ برائی نہیں ہے۔ مگر اماں کہتی ہیں خالہ کریمن نائی خاندان سے ہیں۔ سقے نائیوں میں پٹھان لوگ شادی کرنا نہیں چاہتے"۔

"سقے نائیوں کا ذکر کیوں کیا؟"

"آہستہ بولو! اماں اٹھ جائیں گی۔ سقوں میں شادی کرنے کے تم بھی خلاف ہو۔ ہو نا؟"

"ہائے اللہ اب کیا ہو گا؟ مجھے تو ابھی سے ابکائیاں آنے لگی ہیں۔ نہ جانے کب بھانڈا پھوٹ جائے"۔

"فکر کیوں کرتی ہو میری جان؟ ہم تو ابھی نہیں مرے۔ بس دو چار دن انتظار کرو۔ پھر میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں"۔

اور وہ چلا گیا۔

اس کے بعد میں اس سے کبھی نہیں ملی

تین دن بعد جب بندو پانی کی مشک ڈالنے آیا تو نظر بچا کر ایک لفافہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ڈال گیا۔ اس کی

یہ ہمت؟ میں نے سوچا۔مگر خط کے اوپر پتا محمود کی لکھائی میں تھا۔
میں نے اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے لفافہ کھولا۔اندر بس تین سطریں تھیں۔
''جان من۔آج تم آدھی رات کے بعد کسی ٹرین سے آگرہ آجاؤ''۔
میں وہاں تمہیں ملوں گا۔وہاں میں نے قاضی کا انتظام کر رکھا ہے۔
تمہارا محمود

نوٹ:''نیلی ساری پہننا''۔
میں نے خط کوئی بار پڑھا۔بالکل ''مسلم سوشل'' کی فلمی سچویشن تھی۔میں نے بھی ویسی ہی تیاری کی جیسی مسلم شوشل فلم کی ہیروئن کرتی ہے۔
دو تین جوڑے کپڑے نکالے جو میرے پاس بہترین تھے۔کاٹن کی نیلی ساری رات کو پہننے کے لیے نکالی۔جوزیور بھی میرے پاس تھے ان کو اٹیچی میں رکھا اور سر درد کا بہانہ کر کے سویرے ہی سے لیٹ رہی۔
گرمی کی راتیں تھیں اور چبوترے پر میرے والد اور والدہ سو رہے تھے۔میں نیچے صحن میں اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔پاس ہی بوڑھیا فتو اپنی کھاٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔ہوش میں ہوتی بھی تو کیا کرتی۔بیچاری بہری تھی اور آنکھوں میں موتیا بند اترا ہوا تھا۔
سو جب رات کے بارہ بجے تو میں چپکے سے اٹھی۔کوٹھری میں جا کر نیلی ساری پہنی۔برقع اوڑھا۔اٹیچی کیس ہاتھ میں لیا اور (ننگے پاؤں جوتیاں ہاتھ میں اٹھائے ہوئے تھے) باہر نکل گئی۔
گلی کے موڑ پر پہنچی تھی کہ سامنے بندو کھڑا دکھائی دیا۔یہ کمبخت یہاں اس وقت کیا کر رہا تھا؟ پاس گئی تو دیکھا کہ وہ تو میرے راستے میں اڑا کھڑا ہے۔''بی بی جی۔آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟''
''تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟''
''یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے۔اس نمک کا حق پورا کر رہا ہوں۔بی بی جی واپس چلی جائیے''۔
میں برقع میں سے منہ نکالے دراتی ہوئی سیدھی چلی گئی۔آخر وقت پر وہ راستے سے ہٹ گیا۔۔۔۔
''بی بی جی۔۔۔مت''۔وہ وہیں کھڑا تھا اس لیے اس کی آواز پوری نہ آئی۔۔۔۔
''بی بی جی۔۔۔''
''بی بی۔۔۔۔''
پھر وہ آواز جو شاید میرے ہی ضمیر کی آواز تھی۔آنا بند ہو گئی۔
اسٹیشن پہنچ کر میں نے دو بجے والی گاڑی سے آگرہ کا ٹکٹ خریدا اور ایک زنانہ درجے میں بیٹھ گئی۔
آگرہ پر حسب وعدہ محمود میرا انتظار کر رہا ہوگا۔انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی دلچسپ ہوتی ہیں،وہاں وہ میرے انتظار میں اسٹیشن کی گھڑی دیکھ رہا ہوگا کہ چار بجیں اور گاڑی وہاں پہنچے۔اور یہاں میں بھی اسی انتظار کا شکار ہوں اور چلتی ہوئی ٹرین کے بند شیشے میں سے مستقبل کی جھلکیاں مجھے نظر آ رہی تھیں۔
گاڑی آگرہ اسٹیشن پر پہنچتی ہے۔
چلتی ہی گاڑی میں سے میری نظریں دراز قامت محمود کو ڈھونڈ ھ نکالتی ہیں۔
''محمود''میں آواز دیتی ہوں۔

وہ ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگتا ہے۔ ڈنڈا پکڑ کر درجے میں گھس آتا ہے۔ سب لوگوں کے سامنے بھینچ کر مجھے گلے لگالیتا ہے۔

''سلیمہ! میرا اچھی سلیمہ! تم آگئیں نا؟''

اس کی ایک دن کی بڑھی ہوئی داڑھی مجھے اپنے گالوں پر اچھی لگتی ہے۔

گاڑی ٹھہر جاتی ہے۔

وہ میرا اٹیچی کیس سنبھالتا ہے۔ مجھے پلیٹ فارم پر اتارتا ہے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کان میں کہتا ہے'' قاضی جی۔ ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ پورے سو روپے کا وعدہ کیا ہے ان کو دوں گا اس بے وقت کی شادی کا''۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور ٹیکسی گھڑ گھڑ کرتی ہوئی روانہ ہوگئی۔

رات کے دھندلکے میں شہر کی روشنیاں عجیب عجیب لگ رہی تھیں اور ٹیکسی ایسی چلتی ہے جیسے ریل چل رہی ہو۔ کیا لوہے کے پہیے لگے ہیں اس میں۔

ارے یہ سب تو میرا تخیل تھا۔ ابھی تو میں ٹرین ہی میں تھی اور اس کی گھڑ گھڑاہٹ میرے کانوں میں۔ باہر آگے کے شہر کی دھندلی روشنیاں ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین میں سے دکھائی دے رہی تھیں۔ اس بار ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی۔

میں نے نیچے اترنے کے بعد پہلے جھانک کر دیکھا۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں کوئی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے دوسرے سروں کے اوپر سے جھانکتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ اترنے والے مسافر، چڑھنے والے مسافر، خوانچے والے ریلوے بابو گھمسان کا عالم تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس بھیڑ میں کوئی کھو جائے۔

میں جان کر کھلے دروازے میں کھڑی رہی تاکہ میں خود بھیڑ میں نہ کھو جاؤں اور محمود کو دور سے دیکھ کر پہچان جاؤں۔ مگر ٹرین چلنے لگی اور محمود نہ آیا۔ میں چلتی گاڑی سے اتر گئی۔ اب پلیٹ فارم تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

دور دور تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔۔۔۔۔۔۔

سوائے ایک پستہ قد آدمی کے جو مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جو شاید اسی طرح ہر اکیلی لڑکی کو گھور کر دیکھتا ہوگا۔ میں جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی زنانہ ویٹنگ روم میں داخل ہوگئی۔ سوچا محمود کو بھی شاید کہیں دیر لگ گئی ہوگی۔ چند منٹ میں آتا ہوگا۔ تب تک میں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤں۔

ویٹنگ روم سے باہر نکلی تو اسی پستہ قد آدمی کو گھورتے دیکھا۔ وہ میلی سی پتلون پر ایک دھاری دار بش شرٹ پہنے تھا۔ اب وہ میری طرف بڑھا۔

میں ادھر ادھر دیکھ کر واپس جانے والی تھی کہ وہ آدمی بولا ''سنیے'' میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ سوچا شاید محمود نے اسے مجھے لانے کے لیے بھیجا ہو۔

''آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟''

''جی ہاں''

''کس کا؟''

''محمود علی صاحب کا۔ آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''نہیں تو۔ میں انہیں نہیں جانتا۔ میں تو بومبے فلم کمپنی سے ادھر فلم اسٹار کے قابل لڑکے اور لڑکیاں کھوجنے آیا ہوں۔۔۔

آپ دیکھنے میں قبول صورت دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید آپ کو دلچسپی ہو؟''

''جی نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے سوائے محمود علی صاحب سے ملنے سے۔ اگر کوئی لمبے سے صاحب کسی لڑکی کو ڈھونڈنے آئیں تو آپ مہربانی کر کے انہیں ادھر بھیج دیجئے'' یہ کہا اور میں اندر چلی گئی۔

وہ آدمی سگریٹ جلا کر سامنے ٹہلنے لگا۔

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں مگر فلم اسٹار بننے میں کسے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے سوچا ممکن ہے یہ آدمی جھوٹا ہو۔۔۔یا ممکن ہے سچ بولتا ہو۔ محمود آئے گا تو اس سے مشورہ کروں گی۔ مگر صبح سے شام ہوئی اور محمود نہیں آیا۔

میں نے وہیں کھانا منگوا کر کھایا۔

اب میں نے سوچا کسی وجہ سے علی گڑھ جانا پڑا ہوگا محمود کو۔ ممکن ہے یونیورسٹی کھل گئی ہو۔ سو میں رات کی گاڑی سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگئی۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ یا شاید نہیں ہوا کہ وہ پستہ قد آدمی بھی اسی گاڑی میں سوار ہوا۔ مگر پھر اس نے مجھ سے کوئی بات کرنے کی جرات نہیں کی۔ علی گڑھ کے اسٹیشن پر میں اتری۔ مجھے تعجب ہوا، یا شاید نہیں ہوا کہ وہ آدمی بھی اترا۔ رات کا وقت تھا۔ میں ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گئی اور صبح کا انتظار کرنے لگی۔ محمود کے ہوسٹل کا پتہ میرے پاس موجود تھا۔ صبح ہوتے ہی میں ایک سائیکل رکشہ پر سوار ہو کر وہاں پہنچی۔ یونیورسٹی سنسان پڑی تھی۔ اس کے کمرے میں اکثر کمروں کی طرح قفل لگا ہوا تھا۔

مگر برابر کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔

اس میں سے چک ہٹا کر ایک نوجوان باہر نکلا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

''آپ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں شاید؟''

''ہاں اپنے کزن محمود علی خاں صاحب کو''۔

''محمود کی کزن ہیں آپ؟ پڑوسی ہونے کے ناطے میرا فرض ہے آپ کی سیوا کروں۔ وہ تو ابھی واپس نہیں آیا۔ میں ہی اکیلا ہوسٹل میں ہوں۔ میرا کمرہ حاضر ہے۔ رکشا والے کو رخصت کیے دیتا ہوں''۔

نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کی چمک مجھے اچھی نہیں لگی اور میں ''جی نہیں شکریہ'' کہہ کر برآمدے سے اتر کر رکشا میں آ کر بیٹھ گئی۔

''چلو واپس، اسٹیشن''۔

جب واپس پہنچی تو اس پستہ قد آدمی کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ شام کر ٹرین سے میں شکوہ آباد چلی آئی۔ رات کو پہنچی۔ وہ آدمی بھی اسی ٹرین میں سوار ہوا۔ مگر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

رات کو شکوہ آباد پہنچ کر تانگے پر سوار ہو کر میں نے گلی کے نکڑ پر تانگہ کو رکوایا کیونکہ اب پیسے میرے پاس ختم ہو گئے تھے۔ سوچا گھر جا کر ماں باپ سے کہوں گی۔ کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی اور ان سے تانگے کا کرایہ دلوا دوں گی۔ مگر ڈیوڑھی تک ہی پہنچی تھی کہ ارادہ بدل گیا۔

اندر سے ابا اور کریمن بوا کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''اس لڑکی کو کبھی سوتیلی بیٹی نہیں سمجھا۔ اپنی بیٹی سے بڑھ کر پالا اور یہ ہمارے خاندان کی ناک کٹوا کر بمبئی چلی گئی فلم اسٹار بننے''۔

''ہاں بھئی۔ تو میں سینما دیکھنے کو اسی لیے منع کرتا تھا۔ محمود کہتا تھا کہ کب سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اس سے کہتی

تھی دونوں ساتھ چلیں گے۔ تم ہیرو بننا۔ میں ہیروئن بنوں گی۔ مگر وہ شریف کا بچہ ہے۔ اس نے منع کر دیا تو کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے اب!''

''دو چار مہینوں میں ٹھوکریں کھا کر آ جائے گی، اپنے چہیتے باپ کے پاس''۔

''کیا منہ لے کر آئے گی۔ اب آئی تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا اس کی۔۔۔۔''

میں یہیں تک سن پائی تھی کہ مجھے فوراً تانگے کا خیال آیا۔ دبے پیروں وہاں سے لوٹی۔

''واپس اسٹیشن چلو'' تانگے والے سے کہا۔

مگر راستے بھر سوچتی گئی کہ پیسا کیسے ادا کروں گی۔ شاید کوئی زیور گروی رکھنا پڑے۔ مگر اس وقت رات کو گروی کون رکھے گا؟

مجھے تعجب ہو۔۔۔۔ یا شاید نہیں ہوا۔۔۔ کہ پستہ قد آدمی اسٹیشن کے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ اس نے تانگہ رکتے ہیں اس کا کرایہ چکا دیا۔

''آپ نے اچھا کیا وقت پر آ گئیں۔ متھرا کی گاڑی آنے والی ہے۔ وہاں سے فرنٹیئر میل پکڑنی ہے ہمیں''۔

اس نے میرا ٹکٹ نہیں خریدا۔ اس کے پاس میرا ٹکٹ پہلے سے موجود تھا۔ گاڑی آنے سے پہلے صرف اتنا کہا ''آپ مجھ پر بھروسہ رکھیے۔ آپ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ زنانے ڈبے میں آپ سفر کریں گی۔ آپ کو کمپنی والوں کے سپرد کرتے ہی میں تو کلکتہ چلا جاؤں گا۔۔۔ کچھ بنگالی چہرے بھی لانے ہیں''۔

وہ اپنے قول کا پکا نکلا۔

مجھے زنانے درجے میں سوار کرا کے خود مردانے درجے میں بیٹھ گیا۔ جب گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر رکتی تھی تو چائے اور کھانے کو پوچھنے آ جاتا تھا۔

اور ہاں ایک بار بہت سے فلمی پرچے مجھے دے گیا اور کہنے لگا ''اب دیکھیے، اگلے مہینے ان سب میں آپ کی تصویریں چھپیں گی''۔ اور میں نے سوچا محمود ان سب پرچوں کو پڑھتا ہے دیکھ کر کتنا جلے گا۔

میں نے اٹیچی کیس کو تکیہ بنا کر برقع رات کو اوڑھ لیا۔ لیکن بمبئی پہنچتے پہنچتے اب وہ غیر ضروری ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے وہیں ٹرین کے ڈبے میں چھوڑ دیا۔

بمبئی پہنچ کر اس نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا۔ خود ڈرائیور کے پاس بیٹھا اور کہا ''میرین ڈرائیو چلو''۔

''کیا کمپنی کا دفتر وہاں ہے؟''

''ہاں یہی سمجھو۔ اسٹوڈیو تو ہمارا دادر میں ہے۔ یہ سیٹھانی جی کا فلیٹ ہے۔ وہ تمہیں اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہیں''۔

''تمہاری کمپنی کی مالکن عورت ہے؟''

''ہاں۔ جب ہی تو ہم جب کسی لڑکی کو لے کر آتے ہیں تو راستے بھر اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے''۔

''کیا نام ہے تمہاری سیٹھانی کا؟''

''مس للیتا کماری۔ پہلے وہ بھی ہیروئن ہوتی تھیں مگر کسی اور نام سے کام کرتی تھیں۔ اب ذرا موٹی ہو گئی ہیں، سو کمپنی کھول لی ہے''۔

فلیٹ کے دروازے پر بورڈ لگا ہوا تھا ''مس للیتا کماری۔ فلم پروڈیوسر''۔

مگر میں نے دیکھا ایک جنگلہ بھی لگا ہوا ہے۔ دروازے کے باہر گیلری میں جسے ایک چوکیدار نے کھولا اور پھر بند کر دیا۔

قفل لگا دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب تو ہوا مگر میرے پستہ قد ساتھی نے اطمینان دلا دیا۔ ''سیٹھانی جی بہت وہمی ہیں۔ ہمیشہ چوروں سے ڈرتی ہیں۔ کوئی ان کے ہیرے جواہرات چرا کر نہ لے جائے''۔

ایک بڑھیا روم میں لے جا کر بٹھایا گیا۔

پستہ قد آدمی برابر کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ بند کرلیا۔

نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ پرکھ رہا ہے۔ مگر کمرہ خالی تھا کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دروازہ پھر کھلا اور وہی پستہ قد آدمی ایک موٹی عورت کے ساتھ داخل ہوا جو کسی زمانے میں بہت خوبصورت رہی ہوگی۔

''اچھا نیلی ساری''۔

''جی۔ اچھا گڈ بائی اور گڈ لک''۔

اور یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔

اور سیٹھانی میری طرف آئیں۔ مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بڑے پیار سے میرے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو تم تھکی ہوئی ہو کچھ کھا پی کر آرام کرو۔ رات کو تمہارا ٹیسٹ لیں گے۔ مجھے یقین ہے تم کامیاب ہوگی اور للیتا کماری کا نام روشن کرو گی''۔

یہ کہہ کر انہوں نے تالی بجائی۔

ایک نوکرانی ایک ٹرے میں کچھ مٹھائی اور دودھ کا گلاس لے کر آئی۔

''کھاؤ پیو''۔

''آپ نہیں کھائیں گی؟''

''نہیں۔ میں ابھی کھا پی کر اٹھی ہوں۔ یہ سب تمہارے لیے ہے''۔

یہ کہہ کر انہوں نے مٹھائی کی ایک ڈلی میرے منہ میں ڈال دی۔ کہنے لگیں کہ یہ شگون کی مٹھائی ہے۔ مٹھائی کا مزہ تو اچھا تھا مگر اس میں کچھ کڑواہٹ ملی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا پستہ و بادام شاید کڑوا ہوگا۔

پھر انہوں نے دودھ کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

''پیو میری جان'' انہوں نے بڑے پیار سے دودھ اپنے ہاتھ سے پلایا۔ دودھ خوشبودار تھا۔ گلاب کی سی خوشبو تھی۔ مگر ساتھ میں ہلکی سی کڑواہٹ بھی تھی۔ سیٹھانی نے اپنا ہاتھ نہ ہٹایا جب تک میں نے دودھ کا گلاس ختم کرلیا اور پھر ان کی آواز ایک دوسری دنیا سے آئی ''اور بھول جاؤ سب کچھ۔ اب تمہاری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔۔۔''

ایک لامتناہی رات میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی۔

دیکھتی ہوں کہ ایک ہاتھ میرے باپ نے پکڑا ہوا ہے۔ دوسرا ہاتھ میری سوتیلی ماں نے۔

ایک ٹانگ محمود نے پکڑی ہوئی ہے۔

دوسری ٹانگ اس پستہ قد آدمی نے جو مجھے بمبئی لایا تھا۔

اور سیٹھانی کی نگرانی میں میرے بدن میں یہ لمبے لمبے آگ کے سوئے گھونپے جا رہے ہیں۔

اور میرے بدن میں سے سارا خون پانی بن کر نکل رہا ہے۔

نہ جانے کتنی دیر یہ خواب دیکھتی رہی۔

اس کے بعد جب ہوش آیا تو میں ایک گدے دار پلنگ پر پڑی تھی۔

میرے سر کے نیچے ایک مخملی تکیہ تھا۔

جب میں نے اپنی ٹھوڑی کھجانے کے لیے اپنا ہاتھ ہلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ٹانگ سکوڑنی چاہی تو ٹانگ بھی پائے سے بندھی ہوئی ہے۔ دوسری ٹانگ بھی۔ سر بھی۔ اسی طرح کسی چین سے باندھا گیا ہے کہ میں صرف سامنے سے دیکھ سکتی ہوں اور پیراہن کے بغیر آرام دہ سولی پر چڑھا دی گئی ہوں۔

اتنے میں سیٹھانی میرے سامنے کھڑی تھی۔

کہنے لگی ''عیش وآرام کروگی یا تکلیف اٹھاؤ گی اس کا فیصلہ تم پر ہے؟ دیر یا سویر سب رام ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ہو جاؤ گی۔ مگر ابھی یا کچھ اور دیر کے بعد؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟''

''میں چاہتی ہوں اس خوبصورت بدن کو انسانیت کو آرام پہنچانے کے لیے استعمال کرو۔ جو مجرد ہیں ان کے لیے ایک رات کی بیوی بنو۔ جو اپنی بیویوں کی بدصورتی سے بھاگے ہوئے ہیں ان کے بدن کو تسکین پہنچاؤ۔ جو سیاسی، سماجی، اقتصادی ذمہ داریوں میں دبے ہوئے ہیں ان کا دل بہلا کر ان کو اس قابل بناؤ کہ وہ ہمارے سماج کی ذمہ داریاں اٹھا سکیں''۔

''تم چاہتی ہو کہ میں رنڈی بن جاؤں''۔ میں نے سوال سیٹھانی سے کیا اور اپنے آپ سے بھی ''ارے میں ماں بننے والی ہوں۔ ماں!''

''تم کبھی نہیں بنو گی۔ اس بار بھی نہیں۔ کسی بار بھی نہیں۔ دیکھنا چاہتی ہو یہ آپریشن کس نے کیا ہے؟ اور بغیر کسی لوہے کے آلے کے؟''

اتنے میں اس کے اشارے پر ایک کے بعد ایک آدمی آتا گیا اور میرے پائنتی کھڑا ہو کر میری نگاہ کے دائرے سے اوجھل ہوتا گیا۔

ہندو، مسلمان، سکھ، کرسچین، پوربی بھیا، مدراسی۔

نہ جانے کہاں کہاں سے یہ مسٹنڈے اکٹھے کیے گئے تھے۔۔۔

اب مجھ میں چیخنے چلانے کی طاقت نہیں تھی۔ میرا کلیجہ منہ کو آیا اور ایک ابکائی کے بعد میں نے قے کر دی اور بے ہوش ہو گئی۔

جب پھر ہوش آیا تو میری باقاعدہ ٹریننگ شروع ہوئی۔

ایک بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا میں کوڑے پڑے تھے اور کھانا بند۔

دو بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا میں منہ کالا کرانا تھا۔

تین بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا ایسڈ منہ پر پھینکنا تھا۔ اس کا مظاہرہ میرے سامنے ایک معصوم بلی پر کر دیا گیا تھا جو ایسڈ سے جل کر لوٹ پوٹ کر وہیں میرے سامنے ڈھیر ہو گئی۔

میں نے ایک درخواست کی کہ مجھے یہ بتا دو کہ اس پستہ قد آدمی نے مجھے پہچانا کیسے کہ یہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے۔ جواب ملا ''تمہاری نیلی ساری سے۔ تمہارے عاشق نے دو سو روپے لے کر یہ اطلاع دی تھی کہ اس ٹرین سے تم آؤ گی اور یہ کپڑے پہنے ہو گی''۔

یہ سننے کے بعد میں تیار ہو گئی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا۔

اگر میں بتاؤں کہ اگلے چھ برس تک کیا ہوا تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔

میرے گاہکوں میں کون نہیں تھا؟

افسر، بڑے بڑے بیوپاری، راجا، مہاراجا، نواب، فلم اسٹار، فلم پروڈیوسر، پہلے میرے ساتھ ایک آدمی جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر بھروسا ہونے لگا۔ پھر مجھے جو روپیہ ملتا تھا اس میں سے ایک تہائی اپنے پاس رکھنے کی اجازت مل گئی۔

میں اپنا پرانا نام بھول گئی۔ نیا نام ہی کافی تھا۔ ''نیلی ساری'' میرے پاس ہر شیڈ کی نیلی ساریاں تھیں۔ شیفون کی نیلی ساری۔ کنجی ورم کی نیلی ساری۔ جارجٹ کی نیلی ساری۔۔۔ اور سوٹ کیس کے سب سے نیچے کاٹن کی نیلی ساری۔

ایک دن مجھے چھٹی تھی۔ (جمعہ کو یہ چھٹی میں ضرور لیا کرتی تھی)

اس دن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے جو ہو جانے کی سوجھی اور نہ جانے کیوں میں نے وہی پرانی کاٹن کی نیلی ساری پہنی۔ جوہو پہنچ کر میں نے ناریل کا پانی پیا۔ بھیل پوری کھائی۔ کوئی مجھے جانتا نہیں تھا اور میں اپنی گمنامی کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ ادھر ادھر گھومتی رہی۔

ایک جگہ ایک آدمی ریت کے پتلے بنا رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی پھیلی ہوئی چادر میں بیس پیسے پھینک دیئے۔ اس کے آگے کو بڑھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ زمین سے دو الٹی ٹانگیں اگ آئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی بے چارے کو الٹا زمین میں گاڑ دیا گیا ہے۔ پاس ہی چادر پھیلائے ایک آدمی پیسے اکٹھا کر رہا ہے۔ میں نے اسے ایک روپیہ دیا اور پوچھا یہ آدمی کب نکلے گا۔ اس نے کہا سورج چھپتے اسے یہاں سے نکالوں گا۔ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر برسوں تپسیا کی ہے تب جا کر یہ کمال حاصل کر پایا ہے کہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دیے کر دن بھر الٹا لٹکا رہتا ہے۔

مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ سورج جب سمندر میں ڈوبنے لگا تو پھر وہاں پہنچ گئی۔

وہ ڈھونگی ڈھول بجا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، ''دیکھو، دیکھو دنیا کا سب سے بڑا کمال۔ بارہ گھنٹے ریت میں دفن رہ کر آدمی زندہ ہو رہا ہے۔۔۔۔''

ٹانگوں میں حرکت پیدا ہو رہی تھی اور پھر وہ آدمی جو ایک نیکر پہنے ہوئے تھا۔ نکل آیا اور میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تو اپنی آنکھوں میں سے ریت نکال رہا تھا۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ پیسے کھنا کھن گر رہے تھے۔ اور میں منہ پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ جیسے سچ مچ کوئی مردہ زندہ ہو گیا ہو اور میں ایک معجزہ دیکھ رہی ہوں کیونکہ میرے سامنے شکوہ آباد کا دہقے کا لونڈا کھڑا تھا، بندو۔

تالیاں بجنی بند ہو گئیں۔

لوگ اڑتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ بندو اور اس کا ساتھ پیسے بٹورنے لگے۔ آدھے اس آدمی نے لیے آدھے بندو نے۔ پھر اس آدمی نے کہا ''اچھا بے میں چلتا ہوں۔ کل یہ تماشا چوپاٹی پر جمائیں گے''۔

یہ کہا اور وہ چلتا بنا۔

اور میں وہیں کھڑی بندو کو دیکھتی رہی۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ آگے بڑھ کر میری طرف دیکھتا رہا۔

میں نے کہا ''بندو''۔

اس نے کہا ''جی بی بی جی''۔

''تم شکوہ آباد سے کب آئے؟''

''چھ سال ہو گئے''۔

''سب خیریت ہے؟''

اس کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ سب خیریت نہیں ہے۔
''ابا تو خیریت سے ہیں؟'' میں نے کرید کر پوچھا۔
''ابا تو جنت کو سدھارے''۔
میں نے دل ہی دل میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔
''یہاں کہاں رہتا ہے؟''
اس نے کہا'' مہالکشمی کے پاس ایک جھونپڑی میں''۔
''مجھے وہاں لے جا سکتا ہے؟''
''بی بی جی۔۔۔'' اس کا چہرہ خوشی اور تعجب سے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔
''تمہاری بی بی ساتھ رہتی ہے کیا؟''
''بی بی جی میری شادی نہیں ہوئی''۔
''پھر تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں''۔
اس کا حال تو یہ تھا کہ شادی مرگ نہ ہو جائے۔
''چلیے بی بی جی''۔
''چلو''
سو ہم مہالکشمی والی جھونپڑی میں آ گئے۔ جھونپڑی ان پائیوں سے اچھی تھی جو سڑک کنارے پھیلے ہوئے تھے اور جن میں بے گھر لوگ آباد ہو گئے تھے۔ اور وہ لوگ ان سے اچھے تھے جو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر سونے کے لیے مجبور تھے۔ جھونپڑی میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹیا تھی۔ میں اس پر ایسی سوئی جیسے دنیا کی خبر نہ ہو۔ چھ سال کے بعد میں سچ مچ کی چھٹی منا رہی تھی۔
صبح کو میں نے دیکھا بندو جھونپڑی کے باہر سو رہا تھا۔
میں نے اسے اٹھایا۔
اندر آیا پوچھا'' مجھے تو بہت اچھی نیند آئی۔ تم بھی اندر کیوں نہیں آ گئے؟''
''بی بی جی۔ اندر تو ایک ہی چارپائی تھی اور آپ اس پر ایسی تھکی ہاری سو رہی تھیں جیسے ایک بچہ سو رہا ہو''۔
''مجھے تو ساتھ سونے کی عادت ہے۔ تم ہی آ جاتے''۔
''بی بی جی۔''
''نام بتاؤں دو چار کے؟ اور میں بتانے ہی لگی تھی۔ مگر اس نے اتنی لجاجت سے ''بی بی جی'' کہا کہ میں چپ رہ گئی۔
پھر وہ کہنے لگا۔'' قاضی جی جب نکاح پڑھا دیں گے تب ٹھیک ہے''۔
''قاضی جی!'' مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔
''قاضی جی!'' میں ہنستی رہی۔
اس کے چہرے پر ایسا بھولا پن تھا کہ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔
''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں پچھلے چھ برس سے کیا کرتی رہی ہوں؟''
''بی بی جی۔ میں نہیں جاننا چاہتا''۔

''۔۔۔۔۔۔کہ ایک ایک رات میں ۔۔۔۔''

''بی بی جی۔خدا کے لیے چپ رہیے۔ میں نہیں جاننا چاہتا۔۔۔قاضی جی نکاح پڑھا دیں گے پھر جو جی چاہے مجھے بتا دینا''۔

''قاضی جی''اور مجھے پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور میرے منہ سے نکل گیا''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایک ستے کے لونڈے سے بیاہ کروں گی؟''

یہ سن کر وہ چپ ہو گیا اور باہر چلا گیا۔

دو گھنٹے کے بعد کھانے کی چیزیں لے کر آیا اور میرے سامنے رکھ دیں۔ بغیر ایک لفظ کہے اپنا کھانا باہر لے گیا اور وہاں ہی کھایا۔

میرا جی تو اکیلے کھانے کو نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی جب بھوک لگی تو زہر مار کر لیا۔ سہ پہر تو وہ آیا اور کہنے لگا''میں جا رہا ہوں۔تم جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔میرے آنے تک کسی کے لیے نہ کھولنا''۔

''تم کہاں جاؤ گے؟''

''روزی کمانے''۔

''سر ریت میں دے کر الٹے لٹکنے کو تم روزی کمانا کہتے ہو''۔

میں جانتی تھی وہ کیا جواب دے گا۔ میں اس جواب کو سننا چاہتی تھی کہ وہ کہے کہ ہر آدمی کو اپنے اپنے ڈھنگ سے روزی کمانا پڑتی ہے۔کوئی ریت میں سر دیتا ہے کوئی۔۔۔۔۔مگر اس نے کچھ نہیں کہا اور چلا گیا۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کھٹیا پر لیٹی رہی۔

تھوڑی دیر میں باہر سے سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔

میں نے ایسی سیٹیاں پچھلے چھ برس میں بہت سی تھیں۔ میں ان کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ دو ایک نے دروازے پر ٹھک ٹھک بھی کی لیکن کسی کو ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ پرانی لکڑی کا دروازہ جو رسی سے بندھا ہوا تھا لات مار کر توڑ دے اور اندر چلا آئے۔ غریب بھی برائی کرتے ہیں اور امیر بھی۔مگر غریب کی برائی میں امیروں کی سی بے حیائی نہیں ہوتی۔

وہ رات کو دیر میں آیا اور کچھ کھانا ساتھ لایا۔

میں نے کہا''کیا ہوا؟''

اس نے کہا''وہی جو تم نے دیکھا تھا۔شاید تمہارے آنے کی برکت ہے''۔

''برکت!''میرے جی میں آیا کہ کہوں کچو کے کیوں دیتے ہو۔مگر اس نے ایسے بھولے پن سے کہا تھا کہ میں چپ رہی۔

اس رات میں سوچتی رہی کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا کر رہی ہوں۔چھٹی پر ہوں چھ برس ہو گئے محنت کرتے کرتے کچھ دن تو چھٹی کروں۔۔۔یہاں جھونپڑی میں کون مجھے ڈھونڈنے آئے گا؟

پندرہ روز دو تین بجے جاتا اور رات گئے آتا۔

نہ میں اس سے پوچھتی کیا ہوا؟

نہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ میں نے کیا کیا۔

نہ ہی اس نے پہلے دن کے بعد کبھی قاضی جی کی بات چھیڑی۔

وہ اپنے میلے کچیلے بستر کا ڈھیر لپیٹا اور باہر جا کر بچھا دیتا۔مگر وہ میرے لیے نئی دری، نئی چادر، نیا تکیہ لے آیا تھا۔کھٹیا کو بھی ٹھوک پیٹ کر ٹھیک کر لیا تھا۔

میں اس کھٹیا پر اکیلی سوتی تھی۔

وہ باہر فٹ پاتھ پر اکیلا سوتا تھا۔

اس طرح تین ہفتے بیت گئے۔

میری پڑوس میں دو تین عورتوں سے دوستی ہوگئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا اور میں بمبئی میں نوکری ڈھونڈنے آئی تھی۔ یہاں آکر بندو سئے سے ملاقات ہوگئی تھی۔ جس نے اپنی جھونپڑی میں پناہ دی تھی۔ جھوٹ بولنے کی مجھے عادت ہوگئی تھی۔

پھر ایک دن اسے آنے میں دیر ہوئی تو میں نے سوچا کہ ''آج اس سے کہوں گی کہ تم یہ کام چھوڑ دو''۔ وہ کہے گا ''روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ آتا ہے مجھے''۔

میں کہوں گی ''مجھے بھی روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ آتا ہے۔ مگر میں چھوڑنے کو تیار ہوں''۔

پھر وہ کہے گا ''قاضی جی کو بلا لاؤں''۔

مگر وہ اس رات نہ آیا۔

اگلے دن نہ آیا۔

تیسرے دن نہ آیا۔

میں نے پڑوسی عورتوں سے کہا۔ انہوں نے اپنے مردوں سے کہا۔ انہوں نے کہا وہ معلوم کریں گے۔ اس آدمی سے پوچھیں گے جس کے ساتھ وہ کام کرتا ہے۔

رات کو ایک آدمی ان میں سے آیا اور کہنے لگا،

''بندو تو جیل میں ہے''۔

''جیل میں! کیوں کیا کیا اس نے؟''

''ریت میں دفن ہونا خودکشی کے برابر ہے۔ سپاہی کو ہفتہ نہیں کھلایا اس لیے وہ آتم ہتیا کے جرم میں پکڑ لے گیا۔ دوسرا آدمی بھاگ گیا۔ اب بندو جیل میں ہے۔ ضمانت پر ہی باہر آسکتا ہے''۔

''کتنی ضمانت دینی ہوگی؟''

''دو ہزار روپے''۔ اس آدمی نے کہا جیسے دو لاکھ روپے ہوں۔ مگر میں نے سوچا۔ اس سے کہیں زیادہ تو میں نے بچا کر رکھے ہیں۔ شاید پانچ چھ ہزار تو ہوں گے۔ مگر وہ تو پیڈر روڈ والے فلیٹ میں ہیں۔ (ہماری جائے رہائش بدلتی رہتی تھی)

میں اسی شام کو پیڈر روڈ والے فلیٹ میں پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی للیتا کماری آگ بگولہ ہوگئی۔

''میں تو سمجھی تھی تو مرگئی یا کوئی بھگا کرلے گیا تجھے''۔

میں نے آواز کو قابو میں کرتے ہوئے کہا ''میں جا رہی ہوں۔ اپنا روپیہ لینے آئی ہوں''۔

یہ کہہ کر میں اندر اپنے کمرے میں گئی اور اپنا سوٹ کیس کھول کر روپے اور اپنا زیور نکالا۔ یہ کر رہی تھی کہ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک مسٹنڈا پیچھے کھڑا ہے ہاتھوں پر لمبے لمبے کالے ربڑ کے دستانے چڑھائے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک بوتل ہے جس میں مجھے معلوم تھا تیزاب رہتا ہے۔

''کیا کر رہی ہے حرام زادی؟''

چھ سال کے بعد آج نہ جانے کہاں سے مجھ میں ہمت آگئی۔ میں بولی ''اپنا روپیہ اور زیور لے جا رہی ہوں اور دیکھتی

ہوں، کون مجھے روکتا ہے؟''

اس بدمعاش نے اپنے سڑے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا'' تو جاؤ میری جان''۔

اور جب میں اس کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے میرے منہ پر تیزاب کا وار کیا۔

جانتی تھی تیزاب کا اثر کیا ہوگا۔ میں دو ایک عورتوں کو دیکھ چکی تھی جو اپنا گلا سڑا چہرہ لیے اپنی زندگی کے آخری دن اس چکلے میں گزار رہی تھیں کیونکہ کہیں اور وہ اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں، مگر میں تو مرنے کے لیے ہی تیار تھی کیوں نہ اس ظالم کو بھی ساتھ لیتی جاؤں۔ میں نے اپنے چہرے کی ناقابل برداشت اذیت کے باوجود اس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اس کے سر پر دے ماری۔ بوتل ٹوٹ گئی اور آدھا تیزاب جو اس میں تھا وہ اس آدمی کے چہرے پر گر پڑا۔ ایک غضب کی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور اس چیخ کا نکلنا تھا کہ اس کے کھلے ہوئے منہ میں بھی تیزاب گر گیا اور وہ آدمی پھر نہ چیخ سکا۔

میرا منہ جل رہا تھا۔ پھک رہا تھا۔ مگر وہ روپیہ اور زیورات بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اسے لے کر میں باہر آئی تو دیکھا کہ پولیس کی ریڈ ہوئی ہے۔ للیتا کماری بڑے ٹھسے سے صوفے پر بیٹھی پولیس انسپکٹر سے بات کر رہی تھی۔ ''انسپکٹر صاحب میری تو ڈانس کلاس کی ابھی چھٹی ہے۔ اس لیے لڑکیاں اپنے اپنے گھر جا رہی ہیں۔۔۔۔ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔۔ کیا منگاؤں آپ کے لیے۔۔۔۔ ٹھنڈا یا گرم۔۔۔۔؟

''انسپکٹر صاحب''۔

اب میں ان کے سامنے کھڑی تھی اور تیزاب میرے منہ پر بہہ رہا تھا اور میرے گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔

''اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں۔۔۔۔۔ یا شاید مر جاؤں۔ میں ایک بیان دینا چاہتی ہوں''۔

بس حضور یہی سب کہا تھا اس بیان میں میں نے۔ میرا چہرہ جس پر پٹیاں بندھی ہیں اب اس قابل نہیں ہے کہ آپ دیکھیں لیکن ایک زمانہ تھا لوگ اس چہرے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ بس مجھے یہی کہنا ہے آپ سے۔۔۔۔ اب اجازت دیجئے۔

بندو میرا انتظار کر رہا ہے۔

وہی ایک آدمی ہے جو انسان کا چہرہ نہیں دیکھتا۔ اس چہرے کے پیچھے جو روح ہے اس کو دیکھتا ہے اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اس کے پاس جانا ہے کیونکہ قاضی صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

☆☆☆

۔۔۔اور بنسری بجتی رہی

دیوندر ستیارتھی

برگد سے کتنی ہی ڈاڑھیاں لٹک رہی تھیں ۔۔۔بل کھاتے بھیانک سانپوں کی طرح!

گھنے، سایہ دار درخت نے اس سنسان جگہ کو سڑک سے چھپا رکھا تھا کہیں کہیں گھاس اگ رہی تھی۔ جیسے جوانی سے ذرا پہلے کسی نوجوان کو مسیں بھیگ رہی ہوں۔ایک طرف ہموار ڈھلوان چلی گئی تھی اور دوسری طرف ایک ٹیکرا تھا۔ جو ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کنواری دھرتی کا ابھرا ہوا سینہ ہو۔

پرے کھیتوں میں دھوپ تھی، ہنسی تھی اور سرور کی لہریں۔فصل کے دانہ دانہ میں دھرتی کا دل دھڑکتا تھا اور کھیتوں کی مٹی سے اناج کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی۔ جیسے گائے کے سانس میں سے دودھ کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔اور شرمیلی دلہن کی طرح زندگی دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھی۔

دور۔۔۔تا حد نگاہ سبزہ بچھا ہوا تھا اور آسمان پر سیلانی پرندوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ان کی خانہ بدوش طبیعت ان کے بازوؤں میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رو پیدا کرتی رہتی۔آدمی انہیں دیکھتا اور اپنی زندگی کے لیے نئے تاثرات حاصل کرتا۔کس نے سکھائی یہ پرواز ان آزاد بے فکر پرندوں کو سینکڑوں نہیں ہزاروں میلوں سے، بلند برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں کو پار کرتے وہ میدانوں کی طرف نکل آتے ہیں۔سال کے سال مقررہ موسم میں کس نے سکھایا آدمی کو ہل چلانا اور دھرتی سے اناج کے جواہر پیدا کرنا۔سال بسال، ہر فصل پر کھیتوں کی کوکھ سے آدمی کی خوراک کا جنم ہوتا ہے۔ دنیا کی وسیع گود میں زندگی کھیلتی رہتی ہے ۔۔۔متواتر، اٹوٹ کھنڈرے پن سے! کون جانے اس کا آغاز کیسے ہوا اور کب؟ اور کیا یہ کبھی ختم بھی ہوگی؟

اس سنسان ٹیکرے پر ایک اہیر بنسری بجا رہا تھا۔گائیوں نے چرنا چھوڑ دیا۔بنسری کے جادو بھرے نغمے نے ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دی۔ ڈھلوان پر سے وہ اوپر چڑھ آئیں۔ جنگل کے ہرن اور مور بھی دوڑے آئے اور مست ہو کر بنسری کا نغمہ سننے لگے۔

سنسار اور اس کی دلچسپیوں سے بے خبر ہو کر اہیر لگاتار اپنا نغمہ الاپ رہا تھا۔بنسری میں اس نے اپنا دل ڈال دیا تھا۔ جیسے وہ بانس کا بنا ہوا آلہ موسیقی نہ تھا بلکہ ایک دوشیزہ تھی جو اپنے محبوب کے عمیق ترین احساسات کی ترجمانی کر رہی تھی۔ جب سے اس نے اپنے گانے میں ایک حقیقی پناہ پالی تھی۔اسے اپنی بنسری سے ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا لگاؤ ہو گیا تھا۔بار بار وہ سوچتا کہ بنسری اس کی دلہن ہے جو اس کے ہونٹوں کے لمس کے لیے ترستی رہتی ہے۔

گائیں مست ہو رہی تھیں، مور بھی اور ہرن بھی۔ جیسے ان کی کوئی مدت کی پیاس بجھ رہی ہو۔کوئی مدت کی بھوک مٹ رہی ہو۔یہ کسی نئی زندگی کا نغمہ تھا اس کی ایک ایک تان پر وہ جھوم رہے تھے۔یہ نغمہ شاید زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ زندگی ایک ہے، سدا اس کا دور جاری رہتا ہے۔

اور پھر آسمان کے پرندے بھی اس ٹیکرے پر اتر آئے۔ یہ دوستی کا نغمہ تھا۔اس کی ہر لے عشق، حسن اور شباب سے مل کر بنی تھی۔بڑا میٹھا میٹھا رس تھا۔بیچ بیچ میں ایک درد سا بھی۔۔۔ایک ابدی درد! کھیتوں کا سارا سنگیت درختوں کی سب سرگوشیاں، جھرنوں اور دریاؤں کے بہتے پانی کے سارے بول تیز ہوا کی سنسناہٹ۔گائیوں کے دلوں کی دھڑکن، تیز سانس اور سرسر کی آواز

جوان کے دودھ دوہے جانے سے پیدا ہوتی ہے۔۔۔ یہ سب کچھ شاید اس نغمہ میں سما گیا تھا۔ اور پھر زہری سانپ بھی اس ٹیکرے پر چڑھ آیا تھا۔

سانپ کی خصلت ہے کاٹنا۔ مگر وہ تو پیار کا نغمہ تھا۔ سنتے سنتے وہ کئی بار چونک اٹھا۔ اس کے کٹھور سر میں زہر حرکت کرنے لگا۔ لیکن اسے اپنے جسم میں ایک جھرجھری سی محسوس ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔۔۔ نغمہ نے اس کے زہر پر فتح پالی تھی۔

نغمہ کی تانیں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ چاروں طرف ایک پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی کی ساری نفرت کون جانے کن گہرائیوں میں گم ہو چکی تھی۔ پوربی ہوا بھی تھم گئی۔۔۔ یہ شاید اس کی اطاعت کا ثبوت تھا۔

سانپ کا برہنہ جسم چمک رہا تھا۔ پھن پھیلا کر وہ رقص کر رہا تھا۔ وہی ابدی رقص اس وقت وہ اپنے زہر سے بے خبر تھا۔ سانپ کا یہ رقص کوئی مصنوعی رقص نہ تھا۔ یہ پیار کے نغمہ سے پیدا ہوتا تھا۔ سانپ کی آنکھوں سے بدستور آنسو گر رہے تھے۔ وہ بھی دل رکھتا تھا، صرف زہر ہی نہیں۔ اور وہ دل کا درد سمجھتا تھا۔۔۔ زندگی کی رگ رگ میں حرکت کرنے والا لطیف درد!

دور پوربی افق پر اک کالی بدلی چھا رہی تھی۔ پرے کھیت سے ایک کسان کی دلہن گا اٹھی۔ ''اری او رکالی بدلی! تم میری دھرم کی بہن ہو۔ دیکھو، پیاری بدلی، پہلے میرے باپ کے کھیتوں پر برسیو، اور پھر سسرال کے کھیتوں پر! چوکنا مت، بہن دلی! جیسے میں کہتی ہوں، ویسے ہی کرنا پیاری!''

اور امیر نے اپنے لبوں سے بنسری ہٹائی، نغمہ بند ہو گیا۔ اس کے کان کھیتوں سے آتے ہوئے گیت کی جانب متوجہ ہو گئے۔ گائیں ٹیکرے سے نیچے اتر رہی تھیں۔ ہرن بھی جا رہے تھے، اور مور بھی۔ پرندوں کو بھی آسمان کی بلندیاں یاد آ گئی تھیں۔

زہری سانپ بدستور پھن پھیلائے رقص کر رہا تھا۔ اہیر ڈرا نہیں۔ وہ مسکرایا۔ یہ اس کے نغمہ کی دلکشی کا ثبوت تھا۔ وہ خوش تھا۔

اور کسان دلہن نے پھر گایا ''نیم پر، ہری ہری نیم پر میری بہن جھولا جھول رہی تھی۔ ہائے! میری ماں رو پڑی، میں بھی رو پڑی۔ بہن کو کالے ناگ نے ڈس لیا تھا''۔

کسی ناگن نے ڈس لیا تھا۔ جھولا جھولتی کنواری کو؟ کیا یہی سانپ تھا۔ وہ ناگ جو اہیر کے پاس پھن پھیلائے جھوم رہا تھا؟ اسے تو رونا آتا تھا۔ اب تک اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور جب کوئی روتا ہے اس کا زہر مر جاتا ہے!

زہری سانپ ٹیکرے سے نیچے اتر رہا تھا۔

اس کے بند بند میں ایک غیر معمولی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جذبات کی رو میں وہ بہت دیر تک رقص کرتا رہا تھا۔ ضرورت سے زیادہ۔

یہ نغمہ نہ تھا، ایک منتر تھا، ورنہ وہ وہاں کیوں جاتا؟

اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ لہو پہلی چال سے چلنے لگا۔ وہ پھر وہی پہلا سانپ تھا جس کی خصلت ہے کاٹنا۔ اور اس کے تاثرات کی خبر صرف اسی کو ہی تھی۔

جب وہ کھیت کی مینڈھ کے پاس پہنچا تو اس نے سانپن کی لاش بدستور پڑی دیکھی۔ اب وہ بدبودار ہو رہی تھی۔ سانپ کا دل بے چین ہو گیا۔ لاش کے گرد اس نے پانچ چکر کاٹے اور پھر ٹکٹکی لگا کر مردہ سانپن کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا اس کے سر میں زہر پھر جاگ اٹھا۔

یہ سانپن اس کی محبوبہ بنی، اس کے پیچھے پیچھے چلا کرتی تھی۔ چاندنی راتوں کے کتنے ہی کیف آور لمحے دونوں نے بارہا ایک ساتھ گزارے تھے۔ اس کی صحبت میں زندگی کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی، کتنی ملائم اور چمک دار۔۔۔ سانپن کے جسم کی

طرح، اور خود اس کے اپنے جسم کی طرح جب کہ کینچلی ابھی ابھی اتار کر پھینکی گئی ہو! کتنی ہی بار اس نے اپنی زبان سانپن کی زبان پر رکھ کر اسے اپنی دائمی محبت کا یقین دلایا تھا۔ تب وہ کیا جانتا تھا کہ ایک دن اسے یوں اپنی محبوبہ کے بے حس جسم پر آنسو گرانے ہوں گے۔

اس کا زہر اور بھی بھڑک اٹھا۔ اپنا پھن لاش کے نزدیک لا کر اس نے اسے پھر سونگھا۔ اور اس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ جلنے لگی۔

فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پوربی ہوا کے لمس سے غصہ ور سانپ کا بند بند ایک نئی قوت محسوس کرنے لگا۔

کسی شہزادے کی چاندرانی سے سانپ کی محبوبہ کیا کچھ کم تھی؟ اس چاندرانی کو کوئی مار ڈالتا تو قاتل کو پکڑنے کے لیے حکومت ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی۔ اور اگر سانپ بھی اپنی محبوبہ کے قاتل کا دشمن بن گیا تو کونسی بڑی بات ہوگئی؟

پہلے بھی ایک دن اہیر نے بنسری پر اپنا نغمہ چھیڑا تھا اور سانپ اور سانپن نغمہ کی آواز سے مست ہو کر اس ٹیکرے کی طرف چل پڑے تھے، جہاں اہیر اپنی لے کی نرم نرم تھپکیوں سے گائیوں کا من رجھا رہا تھا۔

اور جب سانپ اور سانپن پگڈنڈی کے کنارے کنارے جارہے تھے۔ کسی شریر راہی نے اپنی پرانی عادت کے مطابق سانپن کو نشانہ بنا دیا تھا سانپ کافی آگے آگے جارہا تھا، ورنہ اگر اسے اسی وقت اپنی محبوبہ پر کیئے گئے اس ظلم کا پتہ چل جاتا تو وہ اسی وقت اس ظالم راہی کو موت کی نیند سلا دیتا۔ اب وہ راہی کہاں چلا گیا تھا؟ پچھلے غصہ کی یاد نے انتقام کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔

پہلے سانپ نے سمجھا کہ سانپن کی موت کی ذمہ داری اہیر یا اس کے نغمہ پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔ اور جب سے اس نے اس کی سب سے زیادہ دودھ دینے والی گائے کی پچھلی ٹانگوں میں لپٹ کر اس کا میٹھا میٹھا دودھ پینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کی یاد کچھ کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔

مگر سانپن کی لاش دیکھ کر سانپ کے لہو کی ایک ایک بوند نفرت کی آئینہ دار بن گئی۔ اور وہ سب شانتی جو اسے بنسری کا نغمہ سن کر حاصل ہوئی تھی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔

وہ راہی اب نہیں ملتا تو نہ ملے۔ وہ اس اہیر کا خاتمہ کر ڈالے گا اور اس کے نغمہ کو ہمیشہ کے لیے بند کر دے گا۔ نہ اس دن اہیر نے نغمہ چھیڑا ہوتا نہ وہ اپنی محبوبہ سمیت ٹیکرے کی جانب چل پڑتا اور وہ راہی جس نے سانپن پر پتھر پھینکا، ضرور اس اہیر کا بھائی بند ہوگا۔۔۔ آدم کا بیٹا، سانپوں کا ابدی دشمن!

کسی دوسری سانپن سے وہ آسانی سے پیار کرسکتا تھا اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے میں اسے کیا تکلیف ہوسکتی تھی۔ آدمی بھی ایک عورت کے مرجانے پر دوسری عورت کا دم بھرنے لگتا ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ انتقام کے جذبہ سے منہ موڑ لیتا۔

آخر زہر کا مفہوم کیا ہے؟ مارنا! انتقام لینا! زہر بنا ہی ہے مارنے کے لیے، آدمی کو سانپ سے ڈرنا چاہیے، سانپ کے انتقام سے، زہر سانپ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے اس کا زہر بھی مرتا نہیں۔ جھوٹے امرت سے تو سانپ کا زہر ہی ہزار بار اچھا ہے۔ اس کی زبان ناپاک ہے تو ناپاک ہی سہی مگر کیا وہ امرت کی ڈینگیں مارنے والوں سے انتقام لینا بھی چھوڑ سکتا ہے؟ اس کے سر میں زہر سوتا رہتا ہے جب تک کہ کوئی اسے جگا نہیں دیتا۔

زہری سانپ بہت جلد اہیر کے ہاتھ سے بنسری گرا دینا چاہتا تھا ہمیشہ کے لیے۔ تاکہ پھر کبھی اس کا نغمہ فضا میں نہ گونج اٹھے اور اسے اس کے ارادے سے کون روک سکتا تھا؟

پچھم کی طرف قوس قزح کمان کی طرح تنی ہوئی تھی۔

سانپ ٹیکرے کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اہیر سو رہا ہے۔ بڑا اچھا موقع تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اس کے

قریب جا پہنچا۔ اس نے چھتری کی طرح پھن پھیلا لیا۔ اہیر کے پاؤں کا بوسہ لے لیا۔

اہیر پھر کبھی نہ جاگا۔ گائیں بدستور ٹیکرے کے قریب چر رہی تھیں جہاں ہری ہری گھاس زندگی کا کوئی خاموش نغمہ سنتی ہوئی تیزی سے اگ رہی تھی۔

زہری سانپ نے اہیر کو ایسے غصہ سے کاٹا تھا کہ وہ درد کے ایک شدید احساس سے تڑپا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلی ناک سے خون بہنے لگا اور وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

سانپ خوش تھا۔ اس نے اپنے ابدی دشمن کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اوپر آسمان پر چاند نمودار ہو رہا تھا۔ سانپ نے چاند کی جانب دیکھا اور اس کے من میں بسی ہوئی خودنمائی بول اٹھی۔ آدمی تو آدمی ضرورت پڑے تو وہ چاند کو بھی ڈس سکتا ہے۔ سانپن کی یاد اب اسے رلاتی نہ تھی۔ وہ تو شہید ہو گئی۔ اور اس نے انتقام لے کر اپنی نسل کی لاج رکھ لی۔ وہ شیطان بن گیا تھا۔

زہر کہتا ہے۔ اور زندگی! مجھ سے ڈر۔ کون جانے زہر کا آغاز کیسے ہوا اور کیا کبھی زہر ختم بھی ہو جائے گا؟ مگر زندگی کا سانس ہمیشہ جاری رہنا ہے جیون تو امر ہے۔

پوربی ہوا چل رہی تھی اور وہ مردہ اہیر کے نیچے پڑی ہوئی بنسری میں سے گزر کر نغمہ پیدا کر رہی تھی مگر ہوا اداس تھی اور نغمہ کی غمگینی اور دلسوزی فضا کی وسعتوں میں بکھر رہی تھی۔

برگد کی ڈاڑھیاں برابر لٹک رہی تھیں۔۔۔ بل کھاتے بھیانک سانپوں کی طرح! پوربی ہوا کے جھونکے ڈاڑھیوں کو ہلا رہے تھے اور ان کی سرگوشیاں بھی غمگین اور دل سوز ہو رہی تھیں۔

نغمہ گونج رہا تھا۔ سانپ حیران تھا۔ کون بنسری بجا رہا ہے۔ اہیر تو مر گیا۔ وہ چاروں طرف حیران نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ بار بار پھن پھیلاتا تھا۔ یہ نغمہ ضرور بند ہو جانا چاہیے کسے سوجھی ہے یہ شرارت؟ کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ میں اس کا بھی اسی طرح بوسہ لے سکتا ہوں۔۔۔ وہی بوسہ جس نے اہیر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا؟

کس نے پھونکی زندگی میں اتنی خودنمائی؟ شروع میں یہ آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے۔ جیسے درختوں پر بور نمودار ہوتا ہے کیا امرت میں بھی اتنی ہی خودنمائی ہوتی ہے، جتنی کہ زہر میں؟

زہری سانپ نے سمجھا کہ اہیر کے سب بھائی بند۔۔۔ آدم کے بیٹے بنسریاں بجا رہے ہیں۔ اس کے کالے چمکدار جسم کا بند بند دکھنے لگا۔ نہیں وہ ڈرے گا نہیں اور مقابلے سے بھاگے گا نہیں۔ اس کا زہر اور بھی کڑوا ہو رہا تھا جیسے بسنت میں اہیر اور بھی خوشبودار بن جاتا ہے اور میٹھا بھی۔

مگر وہ اکیلا ہے اور آدم کے بیٹے لاتعداد۔ مقابلہ سخت ہے تو کیا ہوا وہ ڈٹ کر لڑے گا۔۔۔ مر جائے گا یا سب کو مار ڈالے گا۔۔۔ پہلے سب اہیروں کو، اور پھر آدم کے باقی بیٹوں کو! اور اگر سب کے ہاتھوں سے بنسریاں نہ گرا دیں، نغمہ نہ بند کر دیا، تو اس کا نام ناگ نہیں۔

ہری ہری گھاس سے گزر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ختم ہونے والے پہاڑی سایوں کی طرح۔ برگد کا درخت وہیں کھڑا تھا اور ٹیکرا ابھی نغمہ بدستور جاری رہا۔ سانپ کے ذہن میں وقت کے لمبے سائے اپنا عکس ڈالتے رہے۔

اور وہ ہمیشہ کی وقت خدا کا انصاف کہاں تک تھا جب ایک شریر راہی نے پگڈنڈی کے کنارے سانپن کا سر پتھر مار کر توڑ ڈالا تھا۔ اب اگر خدا بھی اسے انتقام لینے سے منع کرے گا تو وہ ایک نہ سنے گا۔ خدا ہو گا اپنے گھر میں وہ بھی۔۔۔۔ ہو سکتا ہے! سانپ پر اب اس کا حکم نہیں چلنے کا۔ وہ سانپ چاکھی ہے اور شیطان بھی! اگر خدا میں ذرا بھی طاقت ہے تو وہ اس نغمہ کو ہی بند کر دیتا؟

خدا بھی غریبوں اور کمزوروں کو ڈراتا ہے، اکھڑ اور غدر کے سامنے اس کی بھی کوئی پیش نہیں جاتی! اور سانپ ضرور کوئی ایسی راہ نکال ہی لے گا جس سے وہ آدمی تو آدمی خدا اور آدمی کی مشترکہ طاقت کا بھی مقابلہ کر سکے۔ اکیلا آدمی تو ہرگز اس کے سامنے کھڑا ہونے کی تاب نہ لا سکے گا۔

ایک دن سانپ سو کر اٹھا تو وہ خوشی سے ناچنے لگا مگر پھر بہت جلد اس کی خوشی سنجیدگی میں بدل گئی جیسے الہام کے بعد آدمی کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

پاتال کے سارے سانپ دھرتی پر آ گئے۔ زہری سانپ یہ جانتا تھا کہ پاتال کے ان سب سانپوں کی طاقت سے وہ ایک ایک آدمی کو بنسری نہ گرا سکے گا مگر وہ خوش تھا کہ وہ اس کی دعوت پا کر بغیر کسی پس و پیش کے بھاگے چلے آئے تھے۔ وہ ان سب سانپوں کو اپنی طرح طاقت ور بنا دے گا۔

پچھم کی طرف قوس قزح تنی ہوئی تھی۔ آدم کے بیٹے اسے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ یہ کسی بڑھیا کا جھولا ہے جیسا کہ وہ اپنی بڑھیا دادی سے سنتے آئے تھے مگر انہیں یہ بھی تو یاد تھا کہ جہاں سے یہ جھولا اوپر اٹھتا دکھائی دیتا وہاں افق کے قریب ہی زہری سانپ کا بل بھی ہے۔ سانپ سے بچیو۔ بچہ دادی اماں اور ماں کی یہ نصیحت آدم کے ہر بیٹے کی یاد تھی۔

زہری سانپ نے کھانے میں کسی طرح اپنے زہر کا بیشتر حصہ ملا دیا اور یہ کھانا کھانے کے بعد سب سانپ اسی کی طرح مہلک بن گئے۔

رو رو کر اس نے اپنی داستان الم سب سانپوں کو سنائی اور انسان اور اس کے نغمہ کے ابدی دشمن بن جانے کی تلقین کی۔

سب سانپ رضا مند ہو گئے۔ باہمی مشورہ سے انہوں نے ایک پنج سالہ پروگرام مرتب کیا جس میں وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں گے اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو ڈسیں گے۔

ادھر اولاد آدم نے بھی سانپوں کے اس پروگرام کا بھید پا لیا۔ انہوں نے اپنی عورتوں کے مشورہ سے زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان کی نسل قائم رہے اور جہاں تک بس چلے گا وہ اپنی لاٹھیاں برسا کر سانپوں کے سر کچلتے رہیں گے۔۔۔ انہیں کبھی دودھ نہ پلائیں گے۔

سانپ اور سنپولیے انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کی سعی کرتے رہے۔

گھنے سایہ دار برگد نے اس سنسان جگہ کو اب بھی سڑک سے چھپا رکھا تھا۔ کہیں کہیں گھاس اگ رہی تھی، جیسے جوانی سے ذرا پہلے کسی نوجوان کی مسیں بھیگ رہی ہوں۔ ایک طرف ہموار ڈھلوان چلی گئی تھی اور دوسری طرف ایک ٹیکرا تھا۔ جیسے وہ کنواری دھرتی کا ابھرا ہوا سینہ ہو۔۔۔ اور بنسری بجتی رہی!

☆☆☆
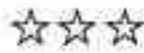
اپنے دکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

شادی کی پہلی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چکلی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا تو اندو سامنے شالو میں لپٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابی، دریاباد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی، عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں، اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ جب اسے بیچ رات کے نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا۔ ''کہاں، لیے جا رہی ہو مجھے؟''

ان عورتوں کے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ دھرتی کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یوں سمجھتی ہیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہو۔ جس کی طرف سے بارش کے لیے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں۔ جادو ٹونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدن کالکا جی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ پر اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامت اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔۔۔۔ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹھک گیا، جبھی اس نے سوچا۔۔۔ اندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں ہے جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالو میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہی اس نے فرض کر لیا، یہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھڑی کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا۔ مدن نے سوچا تھا، وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی، لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا۔ جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اس لمحے کی منتظر ہو اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ جیسی دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھنگھریالے بال۔۔۔۔۔۔

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یوں ہی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرہ پھر سے اوپر اٹھا لیا اور شرابی کی سی آواز میں کہا۔۔۔۔ اندو!''

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز میں پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات

کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یارو مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور اتنا سا کہا۔۔۔ ''جی!''۔۔۔۔۔ اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی۔ اب جو چلی سو چلی۔ وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری۔ ان کے مزاج کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی۔ ''جتنی دیر زندہ رہی بیچاری'' مدن نے کہا ''بابو جی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں ہی رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بِل پر سوتے رہے اور آخر کار ایک دن۔۔۔ 28 مارچ کی شام۔۔۔'' اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا ادھر اور سسکی سے ذرا ادھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو بھی اپنے پن سے ادھر اور بیگانے پن سے ادھر پہنچا دیا تھا۔۔۔ مدن اندو کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا۔۔۔ ''میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں۔ اس لیے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں۔۔۔ میں اب تمہاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں''۔

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبرے اور کچھ دریا دلی کے ملے جلے شبدوں سے کہا۔

''کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا''۔

''پکی بات؟'' اندو بولی۔

مدن نے کچھ اتاؤلے ہو کر کہا۔۔۔ ہاں، ہاں۔۔۔ کہا جو پکی بات''۔

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا۔۔۔ میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے۔ اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے دکھ مجھے دے دو''۔

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ بھی اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹایا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ ''دیئے'' لیکن اس سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کی اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریاباد والی پھوپھی جو اپنے ''نولکھے ہار'' کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے جن کو ان کے جے پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے مل گئی تھی جو شاید بدحواسی میں مدن کے بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے۔

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابی کی بغل ہی میں گھسی رہتی۔ گلی محلے کی کون سی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے، دیکھے تو کتنی دیر دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ

پرانی ہونی لگی لیکن کالکا جی کی اس نئی آبادی کے لوگ آج بھی آتے جاتے مدن کے سامنے رک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انہیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی۔ لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انہیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آلیا تھا اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے پر تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اس پر مدن جلد ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔۔۔۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے بہو۔۔۔۔ بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور آج وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن ان سب سے بڑا تھا۔ کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابی کے سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا۔۔۔۔ ''کھاؤ تم۔۔۔۔'' وہ کہتا۔۔۔ ''وہ بھی کھائیں گے'' اور پھر رسوئی میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے ''رہنے دو بہو، برتن صبح صاف ہو جائیں گے''۔ اندو کہتی ''نہیں بابو جی، میں ابھی کیے دیتی ہوں چھپاکے سے''۔ تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے ''مدن کی ماں ہوتی بہو تو یہ سب تمہیں کرنے دیتی؟۔۔۔'' اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو، چکلی بھابی اور دریاباد والی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا۔ جب سے اندو اسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اٹھتا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا، پاس آتا نہ دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے ایسے میں بابو جی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور ڈانٹتے ہوئے کہتے۔۔۔۔ ''ارے جانا۔۔۔ بھابی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا تو؟'' اور دلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی اس کے ''میں تو بھابی کے ساتھ سوؤں گی'' کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پر دلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی، آدھی پکی نالی میں جا گری، اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ ''بابو جی!'' اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔۔۔ ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچی کو چھاتی کے ساتھ لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک بستر پر سلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکئے ہی تکئے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بازو۔ چوٹ تو ایک طرف، کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اسے دکھا بھی رہی تھیں اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے سے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ہائے رے منی! تیری ساس مرے۔ کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں تیرے گالوں پر!''۔۔۔ منی نے منی ہی کی طرح کہا ''گڑھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی!''

''ہاں منو!'' اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصہ تھا۔ وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ بولا۔۔۔ میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے''۔

''کیوں اچھا ہے'' اندو نے پوچھا۔

"ہاں، نہ اگے بانس نہ بجے بانسری۔۔۔ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا" اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا۔۔۔"تم جاؤ جی سو رہو جا کے، بڑے آئے ہو۔۔۔آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نا، رسوئی میں تمہارا کیا کام؟"

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے ڈاک گھر میں چٹھیاں سارٹ ہوتی ہیں۔ لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی جب منی کو سلانے کے لیے اندو کی لوری سنائی دی۔"تو آ نندیا رانی، بورائی مستانی۔۔۔"

۔۔۔وہی لوری جو دلاری منی کو سلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لپیٹنے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے۔ دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر گرتی پڑتی، روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولہے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے، پھر باہر لپک جاتی ہے اور بانہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے۔۔۔۔"لوگو! میں لٹ گئی"۔ اب اسے دوپٹے کی پروا نہیں، قمیص کی پروا نہیں۔ مانگ کا سیندور۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں سب ننگے ہو چکے ہیں۔ جذبات اور خیالات کے طوطے تک اڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ حالانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا۔۔۔ادھر اندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی، جیسے کھکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی، دوپٹہ اور دبی دبی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا۔۔۔وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔ "اندو"۔۔۔اور پھر چپ ہو گیا۔ اس ادھیڑ بن میں وہ بورائی، مستانی نندیا اس سے بھی لپٹ گئی۔ ایک اونگھ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی پڑوسی سبطے کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اٹھا۔ پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کھجاتے دو تین جمائیاں لے کر لیٹ گیا۔۔۔سو گیا۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں درست کرنے کے لیے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے پر محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا، پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندو کی آگ سے پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصے کا کارن بن گیا۔ جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"سو، تم۔۔۔۔۔آ گئیں؟"

"ہاں!"

"منی۔۔۔۔سو مر گئی؟"

اندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔۔"ہائے رام!" اس نے ناک پر انگلی رکھتے، ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔۔۔"کیا

کہہ رہے ہو؟۔۔۔ مرے کیوں بے چاری؟۔۔۔ ماں باپ کی ایک ہی بیٹی''۔

''ہاں!''۔۔۔ مدن نے کہا۔''بھابی کی ایک ہی نند''۔ اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔۔۔''زیادہ مت منہ لگاؤ اس چڑیل کو''۔

''کیوں، اس میں کیا پاپ ہے؟''

''یہی پاپ ہے''۔ مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا۔''پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے، دفان ہی نہیں ہوتی''۔

''ہا''۔۔۔ اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔ بے چاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں پرسوں ایک دن چل ہی دے گی۔ اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ، بھائی، بہن، چچا، تایا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہوگئی اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں، جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بانبی ہے، جس میں کوئی ناگن رہتی ہے۔ اور جب تک وہ پکڑ کو پھنکوائی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے کیلنے والے، نھن کرنے والے، دانت پھوڑنے والے ماندری بلوائے گئے۔ بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ساگر۔۔۔ آخر ایک دن اتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی۔ جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دلہن بیٹھی تھی۔ پیچھے گھر میں ایک سر پر بجتی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی۔

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا۔۔۔''تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمہیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے''۔

''ہاں!'' اندو نے اثبات سے کہا۔

''یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا''۔

''تمہارا مطلب ہے میں۔۔۔''

''دکھاوا ہے یہ سب۔۔۔ ہاں۔۔۔''

''اچھا جی؟'' اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا''یہ سب دکھاوا ہے میرا''۔ اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کے مدن کے پاس آ گئی اور سختی سے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔۔۔''تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو۔۔۔ ہوا کیا ہے تمہیں؟''

شوہرانہ رعب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آ گیا۔۔۔''جاؤ جاؤ۔۔۔ سو جاؤ جا کے مدن نے کہا۔۔۔ مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔

''تمہیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے''۔ اندو بولی۔''زندگی بھر لینا ہے''۔ اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہے۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی۔

''پھر مجھے پھاپھا کٹنی کہو گے''۔

''وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں''۔

''ٹھہرو۔۔۔تمہاری تو۔۔۔۔'' یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا'' کیا کہا؟'' اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرایا۔ مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی۔

''تم مرد لوگ کیا جانو۔۔۔۔جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بھائی اور کیا بہن۔۔۔۔'' اور پھر ایکا ایکی دور دیکھتی ہوئی بولی۔

''میں تو دلاری منی کا بیاہ کروں گی''۔

''حد ہوگئی''۔ مدن نے کہا'' ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں''۔

''تمہیں ایک ہاتھ کی دکھتی ہے ناں؟'' اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی'' ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو۔۔۔۔'' مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور پھر جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی۔۔۔'' اب کھولو بھی، اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی''۔ جبھی مدن نے آنکھیں کھولیں۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں، کوئی اور بیٹھی ہے۔ وہ کھو سا گیا۔

''میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے''۔ اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔'' تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟۔۔۔یاد نہیں اپنا وچن؟۔۔۔۔تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو''۔

''ایں؟'' مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا۔ لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ساتھ ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی۔

مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا۔ خواب کے تاروں سے بنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکا چوند جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہیں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرف عام میں بیوی کہلاتی ہے لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا، ننگا پن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ وہ شاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی۔ عزت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور۔۔۔۔

۔۔۔۔مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوتے جنہیں سکھانے کے لیے وہ انہیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا ایک عجیب کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پلکوں کے سامنے رکھ دیتا اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا۔ اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز، سامنے پڑا ہوتا استعمال کے لیے پاس، ابتذال کے لیے دور۔۔۔۔کبھی اندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے۔۔۔۔

''ہائے جی! گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟''

مدن کہتا''۔۔۔چھوٹے سمجھتے نہیں، بڑے سمجھ جاتے ہیں''۔

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی۔ آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا

کردی۔ لیکن مجبوری تھی۔ بچے سب دلی میں، مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے انہیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارن پور بھیج دیا۔ دھنی رام کی دنیا چہک اٹھی۔ کہاں انہیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے بچوں ہی کی طرح جہاں کپڑے اتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انہیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور السائی ہوئی رتی، اندو، تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہوگئی تھی۔ وہ رسوئی میں یوں پھرتی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کے اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دھام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے جو آنگن میں سینکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے کھڑا تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں۔ جھولا کن نے ڈارورے امریاں۔ اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں۔ ادھیڑ عمر کی بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہوگئی ہے۔ جبھی وہ منہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے اور اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقعہ پا کر اس کی شلوار کو، جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انہیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے تو نگاہ نیچی کرنے میں بہو کے محرم پر جا پڑتی۔ تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور یوں شتابی کمرے سے نکل بھاگتے جیسے کہیں سانپ کا بچہ بل سے باہر آگیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اوم نمو بھگو تے واسو دیوا۔۔۔۔

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے۔۔۔ "ہم تو دھنیہ ہوگئے، امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا"۔ اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے، دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل۔ نگاہ قریب آتی تو انہیں موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولہے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جا رہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا سبھی ایک سے جڑواں۔۔۔۔ تو ام۔۔۔ اوم نمو بھگوتے۔۔۔۔

آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دن سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اندو سے کہا "بی بی! میرا بیٹا آر ایم ایس میں قلی رکھوا دو۔ اللہ تم کو اجر دے گا"۔ اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہوگیا، وہ بھی سارٹر۔۔۔ جو نہ ہو سکا اس کی قسمت آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت دودھ کو باٹی میں پھینٹ، گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آجاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی۔۔۔ "نہیں بابو جی مجھ سے نہیں پیا جاتا"۔

"تیرا تو سسر بھی پیئے گا"۔ وہ مذاق سے کہتے۔

''تو پھر آپ پی لیجیے نا!'' اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصے سے برس پڑتے۔۔۔''تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی''۔

''ہو۔۔۔۔۔۔ہوں۔۔۔۔۔۔'' اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے۔ روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے اور۔۔۔''لے یہ پڑا ہے۔۔۔تیری مرضی ہے پی۔۔۔نہیں مرضی تو نہ پی''۔ کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام دلاری منی کے ساتھ کھیلتے تھے۔ دلاری کی بابو جی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پیٹ پر منہ رکھ کر پھکلوا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابو جی اور منی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسار ہے تھے تو منی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔''دودھ تو کھراب ہو جائے گا بابو جی۔۔۔بھابی تو پیتی ہی نہیں''۔

''پیئے گی، ضرور پیئے گی بٹیا!''۔۔۔بابو جی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں''۔ ابھی یہ فقرہ بابو جی کے منہ میں ہی ہوتا کہ ایک طرف سے ''ہش۔۔۔ہے خصم کھانی''۔ کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا، بہو بلی کو بھگار ہی ہے۔۔۔اور پھر غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو۔۔۔بھابی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن، بابو جی کے پاس آتا اور کہتا۔۔۔

''بابو جی۔۔۔۔بھابی رو رہی ہے''۔

''ہائیں''۔ بابو جی کہتے اور پھر اٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے۔۔۔''جا۔۔۔تو سوجا؟؟؟؟ وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ''۔

اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو جی دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور بھگوان سے پوچھتے ''چاندی کے ان کھلتے، بند ہوتے ہوئے پھولوں میں ہمارا پھول کہا ہے؟'' اور پھر پورا آسمان انہیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں مسلسل ایک ہاؤ ہو کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے۔۔۔جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!'' اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے۔ گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی غرض کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں، مدن نے بابو جی کے ایک دوست سے تصدیق کی ہوئی چٹھی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار۔۔۔جوابی۔۔۔

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی ''اتنا منہ پھلائے بیٹھے ہو، میں نے کیا کیا ہے؟''

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔۔۔''چھوڑ۔۔۔۔دور ہو جا میری آنکھوں سے۔۔۔۔کمینی۔۔۔۔''

''یہی کہنے کے لیے اتنی دور سے بلوایا ہے؟''

''ہاں''۔

''ہٹاؤاب''۔

''خبردار۔ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔تم جو آنا چاہتیں تو کیا بابوجی روک لیتے''۔

اندو نے بے بسی سے کہا۔''ہائے جی۔تم بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انہیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلوا کر بابوجی پر بڑا ظلم کیا ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب کچھ نہیں۔۔۔ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں''۔

''اور میرا جی؟''

''تمہارا جی۔۔۔۔تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو''۔اندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔''بابوجی تم سے بہت خوش تھے؟''

''ہاں!''اندو بولی۔۔۔۔''ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں''۔

''یہ نہیں ہو سکتا''۔

''اپنی قسم!''

''اپنی نہیں،میری قسم کھاؤ''۔

''تمہاری قسم تو میں نہ کھاتی۔کوئی کچھ بھی دے''۔

''ہاں!''مدن نے سوچتے ہوئے کہا''کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں''۔

''سیکس؟''اندو نے پوچھا''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے''۔

''ہائے رام!'' اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔''گندے کہیں کے شرم نہیں آئی بابوجی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟''

''بابوجی کو شرم نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے؟''

''کیوں؟''اندو نے بابوجی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا''وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے''۔

''کیوں نہیں۔جب بہو تم ایسی ہو''۔

''تمہارا من گندہ ہے''۔اندو نے نفرت سے کہا''اسی لیے تو تمہارا کاروبار بھی گندے بروزے کا ہے،تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا تو کیا وہ بھی۔۔۔وہ تھا نگوڑا۔۔۔۔جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے''۔اور پھر اندو بولی۔''بابوجی کو یہاں بلا لو۔ان کا وہاں جی بھی نہیں لگتا۔وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟''

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔گھر میں اماں کی موت نے مدن کے بڑے ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر اسی پر کیا تھا۔اسے اچھی طرح سے یاد تھا،ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر دیتا۔۔۔۔اوم نمو بھگواتے داسو دیوا۔دوم نمو۔۔۔اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی

چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جب کہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا ''ابھی رہنے دو بابو جی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکے ہیں''۔

تیسرے چوتھے روز بابو جی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں ڈھل گئے تھے۔ لکھا تھا ''بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے۔۔۔ تمہاری ماں کے دن۔ جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الہڑ تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے ادھر ادھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندق، وہی بیسیوں خلجگن۔۔۔ میں بازار جا رہا ہوں، آ رہا ہوں، کچھ نہیں تو دہی بڑے یا ربڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا خالی ہے۔ اور پھر ایک آدھ سطر اور ڈھل گئی۔ آخر میں لکھا تھا ''دفتر سے لوٹتے سمے یہاں کے بڑے بڑے کمروں میں داخل ہوتے سمے میرے من میں ایک ہول سا اٹھتا ہے۔۔۔'' اور پھر۔۔۔۔ ''بہو کا خیال رکھنا، اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا''۔

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی، سانس کھینچی، آنکھیں پھیلاتی، شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بولی۔۔۔ ''میں مر گئی، بابو جی کو کیسے پتہ چل گیا؟''

مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''بابو جی کیا بچے ہیں؟۔۔۔۔ دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے''۔

''ہاں مگر''۔ اندو بولی۔ ''ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں؟''

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی نہیں شروع کیا تھا۔ اور پھر جیسے بابو جی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی۔۔۔۔۔

''تمہاری سسرال سے شیرینی آئے گی''۔

''میری سسرال؟۔۔۔ او ہاں''۔ مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے اور چلا آیا ہے''۔ اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟''

''تم۔۔۔۔ یہ سب قصور تمہارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں''۔

''تمہیں پسند نہیں؟''

''ایک دم نہیں''۔

''کیوں؟''

''چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے''۔

''کیا یہ جندگی کا مجا نہیں''۔ اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ ''مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا؟ پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں۔ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاوروں پر چوٹیاں باندھتی، شرم وحیا کو تج کر دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی، شمشانوں میں مسان جگاتی۔۔۔۔''

''اچھا! اچھا''۔ مدن بولا۔۔۔۔ ''تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تھوڑی عمر پڑی تھی؟''

''ہوگا تو!'' اندو نے سرزنش کر انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمہارا نہیں میرا ہوگا۔ تمہیں تو اس کی جرورت نہیں۔ پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں''۔

اور پھر خجل اور کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پالنے کے سلسلے میں، اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی ''وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب پیچھے ہوگا، پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں ۔۔۔۔۔ مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا''۔

مدن جیسے خائف ہو گیا۔ ''یہ خوبصورت چیز'' جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے، مر جائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا ۔۔۔۔ ''تجھے کچھ نہ ہوگا اندو ۔۔۔۔ میں تو موت کے منہ سے بھی چھین کر لے آؤں گا تجھے ۔۔۔۔ اب ساوتری کی نہیں، سیہ دان کی باری ہے''۔

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے۔

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا۔ البتہ سہارنپور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اندو رونے لگی۔ سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں موند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا ۔۔۔ اوم نمو بھگوتے ۔۔۔

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی ۔۔۔۔ ''بابو جی! چلے آؤ ۔۔۔۔ بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی ۔۔۔'' لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے۔ ان کے بارے میں دن بدن مدن کا احساس جرم بڑھنے لگا ۔۔۔ ''اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑتا؟''

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی ۔۔۔۔ مبارک ہو بابو جی ۔۔۔ لڑکا ہوا ہے''۔

''لڑکا؟'' مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا۔ ''بی بی کیسی ہے؟''

بیگم بولی ''خیر مہر ہے۔ میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے ۔۔۔۔ زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا؟''

''او'' ۔۔۔۔ مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی ۔۔۔۔ ''تمہارا اندر کیا کام؟'' اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں تسلی سے یا شاید اس لیے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا کہ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے دروازے لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں ۔۔۔۔ زچگی کے لیے چکلی بھابی تو نہ آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ تو بہت چھوٹا تھا البتہ دریاباد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام، رام کی رٹ لگا دی تھی۔ اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اتنا فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ۔۔۔۔

''اندو ٹھیک ہے نہ پھوپھی ۔۔۔۔؟''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے''۔ پھوپھی نے تین چار پانچ بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی کے بچے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منی کے پاس لیٹ گئی۔ اوندھی۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا۔۔۔۔ پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح تک کانپ اٹھی ہے؟۔۔۔۔

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں سے کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک مرگھلی سی آواز آئی۔

''ہا۔۔۔۔۔۔ ئے''۔ اور پھر بچے کے رونے کی آواز۔۔۔۔۔

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبایا۔ کتوں کو اندر آنے سے روکا، لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو۔۔۔ نند اور جسودھا۔۔۔۔ اور دوسری طرف نند لال۔۔۔۔ اندو نے بچے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے سے انداز میں بولی۔۔۔ ''بالکل تم ہی پر گیا ہے''۔

''ہوگا''۔ مدن نے ایک اچٹتی سی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا''۔۔۔۔۔ میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا تم بچ گئیں''۔

''ہاں!'' اندو بولی۔ ''میں تو سمجھتی تھی۔۔۔۔۔۔''

''شبھ شبھ بولو''۔ مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تو جو کچھ ہوا ہے۔۔۔۔۔ میں تو اب تمہارے پاس بھی نہ پھٹکوں گا''۔ مدن نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

''توبہ کرو''۔ اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھ سے پکڑ لیے۔۔۔۔ اور اندو نحیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچے کو تلاش کر رہی تھی جو اب اس سے پرے باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔

اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور اب دیوی بن کر دیا اور کونا کے پرساد بانٹ رہی ہے۔۔۔۔ مدن نے اندو کے منہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے۔۔۔۔ جبھی ایکا ایکی اندو نے دونوں ہاتھ چھاتیوں پر رکھ لیے۔

''کیا ہوا؟'' مدن نے پوچھا

''کچھ نہیں''۔ اندو تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے بھوک لگی ہے''۔ اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے؟۔۔۔ بھوک؟''۔۔۔۔ مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''دیکھتے نہیں؟'' اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی۔ ''سب گیلا ہو گیا ہے''۔

مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے گلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔

پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے مجھے دے دو''۔
مدن نے ہاتھ پنگوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے وہ مرا ہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔۔ ''تم جاؤ۔۔۔۔۔ باہر''۔
''کیوں۔۔۔۔ باہر کیوں جاؤں؟'' مدن نے پوچھا۔
''جاؤ نا''۔۔۔۔۔ اندو نے مچلتے اور کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی''۔
''ارے؟'' مدن حیرت سے بولا۔ ''میرے سامنے۔۔۔۔ نہیں پلا سکے گی؟'' اور پھر نا سمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی۔۔۔۔ اتنی خوبصورت اندو آج تک نہ لگی تھی۔
بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انہیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بری حالت ہوتی۔
کئی علاج کئے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنی کے برابر گولی پندرہ بیس کی تعداد میں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انہیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے سے ہی بالٹی ایک چوتھائی ہوگئی تھی۔ رات انہیں متلی سی ہونے لگی اور انہوں نے پکارا۔
''بہو! ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے''۔ بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے ایک ابکائی کیا آئی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انہوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔
منے کو پیدا ہوئے کل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منہ نوچ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اتار کے رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔
''لوگو! میں لٹ گئی کی جگہ اس نے ایک دلدوز آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔ ''لوگو! ہم لٹ گئے''۔
گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا، اس کا ابھی مدن کو پوری طرح سے اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منہ میں آ گیا، وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر، اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا۔۔۔۔ دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے کندن، دلاری منی اور پاشی یوں چلا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بوٹ چونچیں اٹھا اٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پروں کے نیچے سمیٹتی تھی تو اندو۔۔۔۔۔۔
نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دنیا میرے لیے ختم ہوگئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اٹھا اور اٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔
سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا، میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟۔۔۔ اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔
باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتہ دار، محلے دار

سن سے رہ گئے۔

پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کرلاٹھی مارنی پڑی۔۔۔۔ عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنویں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی، رات کے گھر آنے پر پھر سے ہوس میں ڈھل گئی۔۔۔۔ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جنک دلاری نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔۔۔۔ اس رات اگر اندو اپنا آپا یوں مدن پر وار نہ دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر مدن خود اپنا دکھ بھول گیا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا۔۔۔۔ کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔۔۔۔ مجبوراً چل نکلا۔

ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر چھوٹے کو چھاتی سے لگائے، اندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے منا طرح طرح کی ضد کرتا جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اندو کا خط آیا۔ مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آرہی ہے، اسے کوئی مارتا تو نہیں؟۔۔۔ مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل، ان پڑھ عورت۔۔۔۔ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟۔۔۔ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے؟''

سال گزر گئے۔ پیسے کبھی اتنے نہ آئے تھے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گزارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دقت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آجاتا۔ کندن کا داخلہ دینا ہے، دلاری منی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندو ایک طرف سے مسکراتی ہوئی آتی اور کہتی۔۔۔۔ ''کیوں دکھی ہو رہے ہو؟'' مدن اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا۔۔۔۔ ''دکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی اے کا داخلہ دینا ہے۔۔۔۔ منی۔۔۔۔۔'' اندو پھر ہنستی اور کہتی۔۔۔۔ ''چلو میرے ساتھ''۔ اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو، مدن سمیت، ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہا کرتا۔۔۔۔ ''مرو گی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا'' اور اندو کہتی ''ہاں لے جاؤں گی''۔ پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

''یہ کہاں سے آگئے؟''

''کہیں سے بھی آئے۔۔۔ تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ۔۔۔۔''

''پھر بھی؟'' ''تم جاؤ اپنا کام چلاؤ''۔

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی ''میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے''۔ اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی ''میں چور لٹیرا ہوں۔۔۔۔ تم نہیں جانتے؟ سخی لٹیرا۔۔۔۔ جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے گریب گربا کو دے دیتا ہے۔۔۔۔'' اسی طرح منی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور بکے۔ قرضہ چڑھا اور پھر اتر بھی گیا۔

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی ''ہتھ بھرا'' کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور بابو جی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے

بابوجی سے کہا ''تم بہو کے ہاتھ کی پکی کھا کر آئے ہو، اس کا سکھ بھی دیکھا ہے، پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔۔۔''
اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شوتک پہنچا۔ انہوں نے اس کے حق میں فیصلہ دیا اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کھوکھ میں پڑی اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی بھڑ جاتی۔۔۔۔۔ مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں الجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچے ہی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے، مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا ہی اندو کی بات کو رد کر دے لیکن آخر بھی سر جھکائے ہوئے اندو کی شرن میں آتے تھے اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی عورت تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے الٹ چھوٹی بھابی رانی، ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چاچا کی معرفت جائیداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائیداد تو ایک طرف، اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آ گئیں اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اندو کا اپنا گھر دنوں ہی میں جگ مگ، جگ مگ کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں سبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے۔ وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی اور بچی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اٹھتی۔ ''تو مجھے جینے بھی دے گی۔۔۔۔ ماں؟''
اور بچی چلا چلا کر رونے لگتی۔

مدن اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور مدن نے بہت سا روپیہ اندو سے بالا ہی بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابوجی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔

گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے پاس پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہی۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا اور وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا۔ اوپر طبل نے اس کی آواز ڈبو دی۔۔۔۔۔

مدن کو اس کے تصور کے خدوخال ملے۔ لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا۔ پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پر مارا۔ اس کو اٹھا کر سبطے نے بیگم کے منہ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خونیں تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک، اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا

اور بیج اٹھائے اور اندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیے۔

ایک اندو کی بجائے دو اندو ہو گئیں۔ایک تو اندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مدن کہیں جاتا بھی تو گھر سے ہو کر۔۔۔۔نہادھو، اچھے کپڑے پہن، مگھئی کی ایک جوڑی جس میں خوشبودار قوام لگا ہو، منہ میں رکھ کر۔۔۔۔لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا۔گالوں پر روج لگا رکھی تھی۔لپ اسٹک کے نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لیے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں الجھ کر رہ گئیں۔

''کیا بات ہے آج؟'' مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں''۔اندو نے مدن سے آنکھیں بچاتے ہوئے کہا۔۔۔''آج فرصت ملی ہے''۔

شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ چہرے پر چھائیاں چلی آئی تھیں۔ناک پر ایک سیاہ سی کاٹھی بن گئی اور بلاؤز کے نیچے، ننگے پیٹ کے پاس چربی کی دو تین تہیں دکھائی دینے لگی تھیں۔آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔یوں بنی ٹھنی، کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔۔۔۔

''یہ نہیں ہو سکتا''۔مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا۔اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا۔جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی۔۔۔۔یہاں جو غلط خط لگے تھے شرابی کی آنکھوں کو نہ دکھ سکے۔۔۔اندو سچ مچ خوبصورت تھی۔آج بھی پندرہ سال کے بعد پھولاں، رشیدہ، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں۔۔۔۔پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر!

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا۔گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری اترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا۔۔۔ادھر بچی بھی رونے لگی۔ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔

مدن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں۔کھولیں تو بچی سامنے کھڑی تھی، جوان عورت بن کر۔نہیں، نہیں، وہ اندو تھی۔اپنی ماں کی بیٹی۔اپنی بیٹی کی ماں جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج خس کی خوشبو نے بوکھلا دیا۔ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔اس لیے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے ٹپکتا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا۔۔۔۔۔لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا، اس نشے میں اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔

''اندو''۔۔۔۔مدن نے کہا۔۔۔۔۔اور اس کی آواز شادی کی رات والی آواز سے دو سر اوپر تھی۔۔۔۔اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔''جی'' اور اس کی آواز دو سر نیچے تھی۔۔۔پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی۔

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔

پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا، اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ کیا؟''۔۔۔۔۔مدن نے چونکتے ہوئے کہا۔۔۔''تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں''۔

''یونہی''۔اندو نے کہااور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔۔۔۔''رات بھر جگایا ہے اس چڑیل میانے''۔

بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا دم ساد ھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔
مدن نے پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔''ہاں مگر۔۔۔یہ آنسو؟''

''خوشی کے ہیں''۔اندو نے جواب دیا۔''آج کی رات میری ہے''۔اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی وہ
مدن سے چمٹ گئی۔ایک تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا۔۔۔۔۔''آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے، اندو!
میں نے ہمیشہ چاہا تھا۔۔۔۔۔''

''لیکن تم نے کہا نہیں''۔اندو بولی۔''یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا''۔''ہاں!''مدن بولا۔۔۔۔
''اپنے دکھ مجھے دے دو''۔

''تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے''۔

''میں نے؟''مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔۔۔''میں کیا مانگتا؟ میں جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔
میرے عزیزوں سے پیار۔انکی تعلیم، بیاہ شادی یہ پیارے پیارے بچے۔۔۔۔۔''یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا''۔

''میں بھی یہی سمجھتی تھی''۔اندو بولی۔۔۔۔''لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں''۔

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں''۔پھر اندو نے رک کر کہا۔۔۔''میں نے بھی ایک چیز رکھ لی''۔

''کیا چیز رکھ لی؟''

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتی ہوئی بولی۔۔۔۔''اپنی لاج۔۔۔۔۔اپنی خوشی۔۔۔۔۔اس وقت تم
بھی کہہ دیتے۔۔۔۔اپنے سکھ مجھے دے دو۔۔۔۔۔تو میں۔۔۔۔۔اور اندو کا گلا رندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی۔۔۔۔۔''اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔۔۔۔۔''

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔وہ زمین میں گڑ گیا۔یہ ان پڑھ عورت؟ کوئی رٹا ہوا فقرہ؟
نہیں تو۔۔۔۔۔یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں
برادہ چاروں طرف اڑ رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے بولا۔''میں سمجھ گیا اندو''۔

پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی
جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

یزید

سعادت حسن منٹو

سن سنتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح موسم میں خلاف معمول چند دن خراب آئیں اور چلے جائیں۔ یہ نہیں کہ کریم داد، مولا کی مرضی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اس طوفان کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ وہ کئی بار بھڑا تھا۔ شکست دینے کے لیے نہیں، صرف مقابلہ کرنے کے لیے۔ اس کو معلوم تھا کہ دشمن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔ سچ پوچھیے تو اس کے متعلق یہ
صرف دوسروں کا خیال تھا ان کا جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جاں بازی سے لڑتے دیکھا تھا۔ ورنہ اگر کریم داد سے اس بارے میں پوچھا جاتا کہ مخالف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یا مرد کی توہین سمجھتا ہے تو وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال کر دیا ہے۔

کریم داد، جمع، تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔ سن سنتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ لوگوں نے بیٹھ کر حساب لگانا شروع کیا کہ کتنا جانی نقصان ہوا ہے، کتنا مالی، مگر کریم داد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ رحیم داد اس جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی لاش خود کریم داد نے اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی اور ایک کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر دفنائی تھی۔

گاؤں میں اور بھی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ سینکڑوں جوان اور بوڑھے قتل ہوئے تھے، کئی لڑکیاں غائب ہو گئی تھیں۔ کچھ کی بہت ہی ظالمانہ طریقے پر بے آبروئی ہوئی تھی۔ جس کے بھی یہ زخم آئے تھے، روتا تھا۔ اپنے پھوٹے نصیبوں پر اور دشمنوں کی بے رحمی پر، مگر کریم داد کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ اپنے باپ رحیم داد کی شہ زوری پر اسے ناز تھا۔ جب وہ پچیس تیس، برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح بلوائیوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا اور کریم داد کو اس کی موت کی خبر ملی تھی تو اس نے اس کی روح کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا تھا "یار تم نے یہ ٹھیک نہ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ہتھیار اپنے پاس ضرور رکھا کرو"۔

اور اس نے رحیم داد کی لاش اٹھا کر کنوئیں کے قریب گڑھا کھود کر دفنا دی تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ کے طور پر صرف یہ چند الفاظ کہے تھے۔

"گناہ ثواب کا حساب خدا جانتا ہے۔ اچھا تجھے بہشت نصیب ہو!"

رحیم داد جو نہ صرف اس کا باپ تھا بلکہ ایک بہت بڑا دوست بھی تھا۔ بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ لوگ جب اس کی افسوس ناک موت کا ذکر کرتے تھے تو قاتلوں کو بڑی گالیاں دیتے تھے مگر کریم داد خاموش رہتا تھا۔ اس کی کئی کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں تھیں۔ دو مکان جل کر راکھ ہو گئے تھے مگر اس نے اپنے ان نقصانوں کا کبھی حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف اتنا کہتا تھا "جو کچھ ہوا ہے ہماری اپنی غلطی سے ہوا ہے"۔ اور جب کوئی اس سے اس غلطی کے متعلق استفسار کرتا تو وہ خاموش رہتا۔

گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریم داد نے شادی کر لی۔ اسی مُیار جیناں کے ساتھ جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔ جنیاں سوگوار تھی۔ اس کا شہتیر جیسا کڑیل جوان بھائی بلووں میں مارا گیا تھا۔ ماں، باپ کی موت کے بعد ایک صرف وہی اس کا سہارا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنیاں کو کریم داد سے بے پناہ محبت تھی مگر بھائی کی موت کے غم نے یہ محبت اس

کے دل میں سیاہ پوش کر دی تھی، اب ہر وقت اس کی سدا مسکراتی آنکھیں نم ناک رہتی تھیں۔
کریم داد کو رونے دھونے سے بہت چڑ تھی۔ وہ جیناں کو جب بھی سوگ زدہ حالت میں دیکھتا تو دل ہی دل میں بہت کڑھتا۔ مگر وہ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا۔ یہ سوچ کر کہ عورت ذات ہے ممکن ہے اس کے دل کو اور بھی دکھ پہنچے۔ مگر ایک روز اس سے نہ رہا گیا۔ کھیت میں اس نے جیناں کو پکڑ لیا اور کہا۔۔۔ ”مردوں کو کفنائے دفنائے پورا ایک سال ہو گیا ہے اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرا گئے ہوں گے۔۔۔۔ چھوڑ میر جان! ابھی زندگی میں جانے اور کتنی موتیں دیکھنی ہیں۔ کچھ آنسو تو اپنی آنکھوں میں جمع رہنے دو“۔
جیناں کو اس کی یہ باتیں بہت ناگوار معلوم ہوئی تھیں۔ مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس لیے اکیلے میں اس نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر اس کی ان باتوں میں معنی پیدا کئے اور آخر خود کو یہ سمجھنے پر آمادہ کر لیا کہ کریم داد جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہے۔۔۔۔!
شادی کا سوال آیا تو بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی مگر یہ مخالفت بہت ہی کمزور تھی۔ وہ لوگ سوگ منا منا کر اتنے نحیف ہو گئے تھے کہ ایسے معاملوں میں سوفی صدی کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک نہ جمے رہ سکے۔ چنانچہ کریم داد کا بیاہ ہو گیا۔ باجے گاجے آئے، ہر رسم ادا ہوئی اور کریم داد اپنی محبوبہ جیناں کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔
فسادات کے بعد قریب قریب ایک برس سے سارا گاؤں قبرستان سا بنا تھا۔ جب کریم داد کی برات چلی اور خوب دھوم دھڑکا ہوا تو گاؤں میں کئی آدمی سہم سہم گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ کریم داد کی نہیں، کسی بھوت پریت کی برات ہے۔ کریم داد کے دوستوں نے جب اس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا ہنستے ہنستے ہی اس نے ایک روز اس کا ذکر اپنی نئی نویلی دولہن سے کیا تو وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔
کریم داد نے جیناں کی سوہے چوڑے والی کلائی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا ”یہ بھوت تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ چمٹا رہے گا۔۔۔۔ رحمان سائیں کی جھاڑ پھونک بھی اتار نہیں سکے گی“۔
جیناں نے اپنی مہندی میں رچی ہوئی انگلی دانتوں تلے دبا کر اور ذرا شرما کر صرف اتنا کہا ”کیمے، تجھے تو کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا“۔
کریم داد نے اپنی ہلکی ہلکی سیاہی مائل بھوری مونچھوں پر زبان کی نوک پھیری اور مسکرا دیا۔۔۔ ”ڈر بھی کوئی لگنے کی چیز ہے!“
جیناں کا غم اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ کریم داد اس کی جوانی کا نکھار دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور جیناں سے کہتا ”خدا کی قسم جیناں، تو پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں تھی، اگر تو اتنی خوبصورت اپنے ہونے والے بچے کے لیے بنی ہے تو میری اس سے لڑائی ہو جائے گی“۔
یہ سن کر جیناں شرما کر اپنا تھلیا سا پیٹ چادر سے چھپا لیتی۔ کریم داد ہنستا اور اسے چھیڑتا ”چھپاتی کیوں ہو اس چور کو ۔۔۔۔۔۔ میں کیا جانتا نہیں کہ یہ سب بناؤ سنگھار صرف تم نے اسی سور کے بچے کے لیے کیا ہے“۔
جیناں ایک دم سنجیدہ ہو جاتی ”کیوں گالی دیتے ہو اپنے کو؟“
کریم داد کی سیاہی مائل بھوری مونچھیں ہنسی سے تھرتھرانے لگتیں۔ ”کریم داد تو بہت بڑا سور ہے“۔
چھوٹی عید آئی۔ بڑی عید آئی۔ کریم داد نے یہ دونوں تہوار بڑے ٹھاٹ سے منائے۔ بڑی عید سے بارہ روز پہلے اس کے گاؤں پر بلوائیوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا باپ رحیم داد اور جیناں کا بھائی فضل الٰہی قتل ہوئے تھے۔ جیناں ان دونوں کی موت کو یاد کر کے بہت روئی تھی! مگر کریم داد کو صدموں کو یاد رکھنے والی طبیعت کی موجودگی میں اتنا غم نہ کر سکی جتنا اسے اپنی طبیعت کے مطابق

کرنا چاہیے تھا۔

جیناں کبھی سوچتی تھی تو اس کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی زندگی کا اتنا بڑا صدمہ کیسے بھولتی جا رہی ہے۔ ماں باپ کی موت اس کو قطعاً یاد نہیں تھی۔ فضل الٰہی اس سے چھ سال بڑا تھا۔ وہی اس کا باپ تھا وہی اس کی ماں تھا اور وہی اس کا بھائی۔ جیناں اچھی طرح جانتی تھی کہ صرف اسی کی خاطر اس نے شادی نہیں کی۔ اور یہ تو سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ جیناں ہی کی عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی تھی۔ اس کی موت جیناں کی زندگی کا یقیناً بہت ہی بڑا حادثہ تھا۔ ایک قیامت تھی جو بڑی عید سے ٹھیک بارہ روز پہلے اس پر یکا یک ٹوٹ پڑی تھی۔ اب وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو اس کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس کے اثرات سے کتنی دور ہوتی جا رہی ہے۔

محرم قریب آیا تو جیناں نے کریم داد سے اپنی پہلی فرمائش کا اظہار کیا اسے گھوڑا اور تعزیے دیکھنے کا بہت شوق تھا، اپنی سہیلیوں سے وہ ان کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی۔ چنانچہ اس نے کریم داد سے کہا ''میں ٹھیک ہوئی تو لے چلو گے مجھ گھوڑا دکھانے؟''

کریم داد نے مسکرا کر جواب دیا ''تم ٹھیک نہ بھی ہوئیں تو لے چلوں گا۔۔۔ اور اس سور کے بچے کو بھی!''

جیناں کو یہ گالی بہت ہی بری لگتی تھی چنانچہ وہ اکثر بگڑ جاتی تھی۔ مگر کریم داد کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا پرخلوص تھا کہ جیناں کی تلخی فوراً ہی ایک ناقابل بیان مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی تھی اور وہ سوچتی کہ سور کے بچے میں کتنا پیار کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کی افواہیں ایک عرصے سے اڑ رہی تھیں۔ اصل میں تو پاکستان بنتے ہی یہ بات گویا ایک طور پر طے ہو گئی تھی کہ جنگ ہوگی اور ضرور ہوگی، کب ہوگی اس کے متعلق گاؤں میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ کریم داد سے جب کوئی اس کے متعلق سوال کرتا، تو وہ یہ مختصر سا جواب دیتا۔ ''جب ہونی ہوگی ہو جائے گی۔ فضول سوچنے سے کیا فائدہ!''

جیناں جب اس ہونے والی لڑائی بھڑائی کے متعلق سنتی تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ وہ طبعاً بہت ہی امن پسند تھی۔ معمولی تو تو میں میں سے بھی سخت گھبراتی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ بلووں میں اس نے کئی کشت و خون دیکھے تھے۔ اور انہی میں اس کا پیارا بھائی فضل الٰہی کام آیا تھا۔ بے حد سوچ کر وہ کریم داد سے صرف کہتی ''کیسے، کیا ہوگا؟''

کریم داد مسکرا دیتا ''مجھے کیا معلوم۔ لڑکا ہوگا یا لڑکی''۔

یہ سن کر جیناں بہت ہی زچ بچ ہوتی مگر فوراً ہی کریم داد کی دوسری باتوں میں لگ کر ہونے والی جنگ کے متعلق سب کچھ بھول جاتی۔ کریم داد طاقت ور تھا، نڈر تھا، جیناں سے اس کو بے حد محبت تھی۔ بندوق خریدنے کے بعد وہ تھوڑے ہی عرصے میں نشانے کا بہت پکا ہو گیا تھا۔ یہ سب باتیں جیناں کو حوصلہ دلاتی تھیں، مگر اس کے باوجود تنجنوں میں جب وہ اپنی کسی خوف زدہ ہمجولی سے جنگ کے بارے میں گاؤں کے آدمیوں کی اڑائی ہوئی ہولناک افواہیں سنتی تو ایک دم سن سی ہو جاتی۔

بختو دائی جو ہر روز جیناں کو دیکھنے آتی تھی۔ ایک دن یہ خبر لائی کہ ہندوستان والے دریا بند کرنے والے ہیں۔ جیناں اس کا مطلب نہ سمجھی۔ وضاحت کے لیے اس نے بختو دائی سے پوچھا ''دریا بند کرنے والے ہیں؟۔۔۔ کون سے دریا بند کرنے والے ہیں؟''

بختو دائی نے جواب دیا ''وہ جو ہمارے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں''۔

جیناں نے کچھ دیر سوچا اور ہنس کر کہا ''موسی تم بھی کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو، دریا کون بند کر سکتا ہے۔۔۔ وہ بھی کوئی موریاں ہیں''۔

بختو نے اپنے جھریوں والے ہاتھ سے جیناں کا پیٹ ٹٹولتے ہوئے کہا ''یہی دریا بند کرنے والی'' پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر اس کی قمیض کھینچی اور اٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز سے کہا ''اللہ خیر رکھے تو بچہ آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیے''۔

کریم داد گھر آیا، تو سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریاؤں کے متعلق پوچھا۔ اس نے پہلے بات ٹالنی چاہی، پر جب جیناں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا تو کریم داد نے کہا ''ہاں کچھ ایسا ہی سنا ہے''۔

جیناں نے پوچھا ''کیا؟''

''یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کر دیں گے''۔

''کیوں؟''

کریم داد نے جواب دیا ''کہ ہماری فصلیں تباہ ہو جائیں''

یہ سن کر جیناں کو یقین ہو گیا کہ دریا بند کیے جا سکتے ہیں چنانچہ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا ''کتنے ظالم ہیں یہ لوگ''۔

کریم داد اس دفعہ کچھ دیر کے بعد مسکرایا ''ہٹاؤ اس کو یہ بتاؤ موسی بختو آئی تھی''۔

جیناں نے بے دلی سے جواب دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔''آئی تھی''۔

''کیا کہتی تھی؟''

''کہتی تھی آج سے پورے دس روز کے بعد بچہ ہو جائے گا''۔

کریم داد نے زور کا نعرہ لگایا ''زندہ باد''

جیناں نے اسے پسند نہ کیا اور بڑبڑائی ''تمہیں خوشی سوجھتی ہے جانے، یہاں کیسی کربلا آنے والی ہے۔

کریم داد چوپال چلا گیا۔ وہاں قریب قریب سب مرد جمع تھے۔ چودھری نتھو کو گھیرے، اس سے دریا بند کرنے والی خبر کے متعلق باتیں پوچھ رہے تھے۔ کوئی پنڈت نہرو کو پیٹ بھر کے گالیاں دے رہا تھا۔ کوئی بد عائیں مانگ رہا تھا۔ کوئی یہ ماننے ہی سے یکسر منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ بدلا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ مل کر مسجد میں دعا مانگی جائے۔

کریم داد ایک کونے میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ ہندوستان والوں کو گالیاں دینے میں چودھری نتھو سب سے پیش پیش تھا۔ کریم داد کچھ اس طرح بار بار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہو رہی ہے۔ سب بیک زبان ہو کر یہ کہہ رہے تھے کہ دریا بند کرنا بہت ہی اوچھا ہتھیار ہے۔ انتہائی کمینہ پن ہے، رذالت ہے عظیم ترین ظلم ہے بدترین گناہ ہے، یزید پن ہے۔

کریم داد دو تین مرتبہ اس طرح کھانسا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ چودھری نتھو کے منہ سے جب ایک اور لہر موٹی موٹی گالیوں کی اٹھی تو کریم داد چیخ پڑا۔ ''گالی نہ دے چودھری کسی کو''۔

ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری نتھو کے حلق میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی، اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم داد کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کر رہا تھا ''کیا کہا؟''

کریم داد نے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا ''میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو''۔

حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے بڑے تیکھے لہجے میں کریم داد سے کہا ''کسی کو؟ کیا لگتے ہیں وہ تمہارے؟'' اس کے بعد وہ چوپال میں جمع شدہ آدمیوں سے مخاطب ہوا ''سنا تم لوگوں نے۔۔۔ کہتا ہے گالی نہ دو کسی کو۔۔۔ پوچھو اس سے وہ کیا لگتے ہیں اس کے؟''

کریم داد نے بڑے تحمل سے جواب دیا ''میرے کیا لگتے ہیں؟ میرے دشمن لگتے ہیں''۔

چودھری کے حلق سے پھٹا پھٹا سا قہقہہ بلند ہوا اس قدر زور سے کہ اس کی مونچھوں کے بال بکھر گئے۔ ''سنا تم لوگوں نے دشمن لگتے ہیں اور دشمن کو پیار کرنا چاہیے۔ کیوں برخودار؟''

کریم داد نے بڑے برخودارانہ انداز میں جواب دیا ''نہیں چودھری میں یہ نہیں کہتا کہ پیار کرنا چاہیے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گالی نہیں دینی چاہیے''۔

کریم داد کے ساتھ ہی اس کا لنگوٹیا دوست میراں بخش بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا ''کیوں؟''

کریم داد صرف میراں بخش سے مخاطب ہوا ''کیا فائدہ ہے یار۔۔۔ وہ پانی بند کر کے تمہاری زمینیں بنجر بنانا چاہتے ہیں اور تم انہیں گالی دے کر یہ سمجھتے ہو کہ حساب بے باق ہوا۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو''۔

میراں بخش نے پوچھا ''تمہارے پاس کوئی جواب ہے؟''

کریم داد نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ''سوال میرا نہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کا ہے۔ اکیلا میرا جواب سب کا جواب نہیں ہوسکتا۔۔۔ ایسے معاملوں میں سوچ سمجھ کر ہی کوئی پختہ جواب تیار کیا جاسکتا ہے۔۔۔ وہ ایک دن میں دریاؤں کا رخ نہیں بدل سکتے۔ کئی سال لگیں گے لیکن یہاں تو تم لوگ گالیاں دے کر ایک منٹ میں اپنی بھڑاس نکال باہر کر رہے ہو''۔ پھر اس نے میراں بخش کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا ''میں تو اتنا جانتا ہوں یار کہ ہندوستان کو کمینہ، رذیل اور ظالم کہنا بھی غلط ہے''۔

میراں بخش کے بجائے چودھری نتھو چلایا ''لو اور سنو؟''

کریم داد، میراں بخش ہی سے مخاطب رہا۔ ''دشمن سے میرے بھائی رحم و کرم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ لڑائی شروع ہو اور یہ رونا رویا جائے کہ دشمن بڑے بور کی رفلیں استعمال کر رہا ہے ہم چھوٹے بم گراتے ہیں، وہ بڑے گراتا ہے۔ تم اپنے ایمان سے کہو یہ شکایت بھی کوئی شکایت ہے چھوٹا چاقو بھی مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بڑا چاقو بھی۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں''۔

میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو نے سوچنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی جھنجھلا گیا ''لیکن سوال یہ ہے کہ وہ پانی بند کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہمیں بھوکا اور پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔

کریم داد نے میراں بخش کے کاندھے سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور چودھری نتھو سے مخاطب ہوا ''چودھری جب کسی کو دشمن کہہ دیا تو پھر یہ گلہ کیسا کہ وہ ہمیں بھوکا پیاسا مارنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بھوکا پیاسا نہیں مارے گا۔ تمہاری ہری بھری زمینیں ویران اور بنجر نہیں بنائے گا تو کیا وہ تمہارے لیے پلاؤ کی دیگیں اور شربت کے مٹکے وہاں سے بھیجے گا۔ تمہاری سیر و تفریح کے لیے یہاں باغ باغیچے لگائے گا''۔

چودھری نتھو بھنا گیا ''یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟''

میراں بخش نے بھی ہولے سے کریم داد سے پوچھا ''ہاں یار یہ کیا بکواس ہے؟''

''بکواس نہیں ہے میراں بخشا'' کریم داد نے سمجھانے کے انداز میں میراں بخش سے کہا ''تو ذرا سوچ تو سہی کہ لڑائی میں دونوں فریق ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ پہلوان جب لنگر لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں اتر آئے تو اسے ہر داؤ استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔۔۔۔۔''

میراں بخش نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلایا۔ ''یہ تو ٹھیک ہے!''

کریم داد مسکرایا ''تو پھر دریا بند کرنا بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے یہ ظلم ہے مگر ان کے لیے روا ہے''۔

''روا کیا ہے۔۔۔ جب تیری جیب پیاس کے مارے لٹک کر زمین تک آجائے گی تو میں پھر پوچھوں گا کہ ظلم روا ہے یا

ناروا۔۔۔جب تیرے بال بچے اناج کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے تو پھر بھی کہنا کہ دریا بند کرنا بالکل ٹھیک ہے''۔
کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا میں جب بھی یہی کہوں گا چودھری۔۔۔تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف وہ ہمارا دشمن ہے کیا ہم اس کے دشمن نہیں۔اگر ہمارے اختیار میں ہوتا، تو ہم نے بھی اس کا دانہ پانی بند کیا ہوتا۔۔۔لیکن اب کہ وہ کر سکتا ہے اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ سوچیں گے۔۔۔بیکار گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔دشمن تمہارے لیے دودھ کی نہریں جاری نہیں کرے گا چودھری نتھو۔۔۔اس سے اگر ہو سکا تو وہ تمہارے پانی کی ہر بوند میں زہر ملا دے گا، تم اسے ظلم کہو گے، وحشیانہ پن کہو گے اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمہیں پسند نہیں۔۔۔۔عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں بندھوائی جائیں۔۔۔۔۔اس سے کہا جائے کہ مجھے بھوکا پیاسا نہ مارنا، بندوق سے اور وہ بھی اتنے بور کی بندوق سے، البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کر سکتے ہو۔اصل بکواس تو یہ ہے۔۔۔۔۔۔ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو''۔
چودھری نتھو جھنجھلاہٹ کی آخری حد تک پہنچ گیا۔''برف لا کے رکھ میرے دل پر''۔
''یہ بھی میں ہی لاؤں''۔ یہ کہہ کر کریم داد ہنسا۔میراں بخش کے کاندھے پر تھپکی دے کر اٹھا اور چوپال سے چلا گیا۔
گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر سے بختو دائی باہر نکلی۔کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پوپلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔۔۔۔۔
''مبارک ہو کیمے۔چاند سا بیٹا ہوا ہے اب کوئی اچھا سا نام سوچ اس کا؟''
''نام؟'' کریم داد نے ایک لحظے کے لیے سوچا''یزید۔۔۔۔یزید!''
بختو دائی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔کریم داد نعرے لگاتا اندر گھر میں داخل ہوا۔ جیناں چارپائی پر لیٹی تھی۔ پہلے سے کسی قدر زرد، اس کے پہلو میں ایک گل گوتھنا سا بچہ چپڑ چپڑ اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری فخریہ نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک گال کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔''اوئے میرے یزید!''
جیناں کے منہ سے ہلکی سی متعجب چیخ نکلی۔۔۔۔۔''یزید؟''
کریم داد نے غور سے اپنے بیٹے کا ناک نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہاں یزید۔۔۔۔یہ اس کا نام ہے''۔
جیناں کی آواز بہت نحیف ہوگئی۔''یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیمے؟۔۔۔۔یزید؟''
کریم داد مسکرایا''کیا ہے اس میں؟ نام ہی تو ہے!''
جیناں صرف اس قدر کہہ سکی''مگر کس کا نام؟''
کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا''ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو۔۔۔۔اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا۔۔۔۔۔یہ کھولے گا!''

☆☆☆

گوری ہو گوری

رفیق حسین

چوماسہ کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچار کھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے۔ ٹر، ٹر، ٹر، پیپل کے سوکھے ڈگالے پر الو کہتا تھا۔ ہک ہو۔ ہک ہو۔ ہک ہو۔

بسنتی نے کروٹ لی۔ پھر منہ پر تھپڑ مارا۔ بولی "ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں"۔

پیپل پر الو بولا۔ ہک ہو۔ ہک ہو۔۔۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی 'مری جائے۔ پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا"۔

ہک ہو، ہک ہو۔

"اجی او جی۔ اجی او جی۔ اٹھونا۔ گھگو بولے۔ سو ہے ڈرلاگے"۔

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹکا، بولا۔ "سون دے ری، اری نا کھائے لے تو ہے"۔

"اٹھو جی اٹھو۔ مو ہے ڈرلاگے۔ تنی اڑائے دے۔ اوانھو"۔

مادھو 'ادھ سے تو راڈر"۔ کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا۔ جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر پھر نیچے دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ چھوٹی چمنی کی دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھل جھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا "جوا ہوا رے!"

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی۔ "اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام۔ بھیر کا کو جگالو! ارے رمکلیا کو جگالو۔ اری او رمکیا۔۔۔ سوئے جات رے۔ ارے اٹھ اٹھ او بھیرکا"۔

آٹھ برس کی دبلی پتلی رمکلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیرکا جاگا۔ دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے "اری مئیا ری"۔ مو ہے لیے لے باپورے۔ اری مئیاری"۔

"چپ کرو چپ۔ مادھو نے ڈانٹا"۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دور کہیں سے آواز آرہی تھی۔ گڑپ شل شل شل۔ گڑپ۔ شل شل شل۔

گھگو بولا۔ ہک ہو۔

بسنتی روتی ہوئی چلائی۔ ارے پریتم بھیا آئی گئی۔ ارے مورے بچے کی جورے"۔

کھٹولے سے کود۔ پانی میں چھپ چھپاتے بچے ماں سے چمٹے۔ ماھوا اٹھا، دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی۔ "اجی جاوت کہاں ہو جی"۔

باہر سے آواز آئی۔ "مادھو بھیا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اٹھ رے اٹھ"۔

شڑپ، گڑپ، شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم مم۔ میں۔ بکری بولی۔ ماں۔ ہاں آں۔ کہیں گئیاں چلا رہی تھی۔ بارہ گھر کے گوجر پردے میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ اٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا۔ کوئی چلاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیاں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے چون کی ٹکی اٹھائی۔ تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ مٹکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔ اسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا۔ پھر وہ بھی گھومی، دری، بچھورا، کھتری سب کچھ اس پر تھا۔ لو وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا ''بھاگو بھاگو۔ او بسنتی نکل، ارے مادھو بھاگ''۔

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اچکا۔ رانوں تک آیا۔

''بھاگو بھاگو۔ مادھو بھیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکلت کا ہے نا ہیں''۔ باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی۔ ''ارے مورے گڑوے۔ ارے موری ہنسلی تو نکال لے رے''۔

''چل چل تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لیے لوں۔ اڑہنا پچھورا تو دبائے لوں''۔

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا، دروازے پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ ''چالو۔ چالو۔ سب چھوڑ دو جان ہی بچائے لو۔ چالو۔ چالو''۔

اس گڑبڑ میں، جلدی میں، گھبراہٹ میں، اندھیرے میں دری، پچھورے کپڑوں کے لیے پکارتی، ناج اور ناج کی کٹھیوں کے لیے پکارتی۔ برتنوں اور زیوروں کے لیے پھڑکتی بسنتی نے یہ بھی کہا۔ ''بھیا رے رمکلیا کو لو لے لے رے''۔ لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا۔ ''موں اٹھا رے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہرے''۔

پانی کی شل شل، رات اندھیری۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک، کمر کمر، سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی، پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا۔ دوسرا سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا۔ دوسرا ابھارتا تھا، شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پردے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہو کر پون میل کے فاصلے پر دور ریل کی اونچی پٹری کا رخ کیا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور بھیکا ان کے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو جی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اٹھا لیا تھا ان کو اس کا اطمینان تھا۔ مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی۔ جو کہ گاؤں سے باہر کنوئیں کے پاس بنگلیہ پر اس کے سالے کے ساتھ رہتے تھے۔ بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کے لیے بیتاب تھی۔ ادھر تو وہ اکلا ہی رہتا ہے۔ نہ جانے جاگا کہ نا ہیں۔ کا جانے آیا کہ نا ہیں۔ مادھو نے گرتی ہوئی جرو کو سنبھالتے ہوئے دہرایا۔ ''کو جانے جاگا کہ نا ہیں۔ کا جانے بروے کھولے کہ نا ہیں''۔

اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ ادھر ادھر دور اور نزدیک آوازیں ان کی آ رہی تھیں۔

''جانکی ہو جانکی''۔

''آرے رہوں دادا''۔

''مرلی رے مرلی''۔

''بھلارے بھلا۔ چالے چالو''۔

مادھوبھی بار بار سالے کو پکارتا تھا۔''ناگا اور نا گا''۔اور جواب نہ آتا تھا۔اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا۔''لین کے لگے نریا ہے نریا''۔کوئی بولا''سنبھلے سنبھلے نکلے چالو''۔کسی نے کہا''ڈرتے رہو بھیا ڈٹے رہنا بھیا۔آ گئی لین''۔

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی۔''مادھو بھیا ہو۔کوؤ مادھو بھیا۔دیکھو؟''۔

کسی نے جواب دیا''بڑا دکھوئی یا۔ہاتھ لوتو لوکت نا ہیں''۔

مادھون نے جلدی سے پکار کر جواب دیا''بھلی ہے بھلی۔آت ہوں۔بردے لے آیا رے؟''

ناگا چلایا''بسنتی کتے بولت نا ہیں!''

''ارے ہے رے مورے ساتھ،بردے کتے چھوڑے؟ لے آیا رے؟''

''آئے جاؤ،آئے جاؤ''۔آر۔کے۔آر کی لائن پاس آ گئی تھی۔ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈکراتی بھینسیں،چلاتی گائیں،ممیاتی بکریاں،روتے بچے،سہمی عورتیں،پکارتے مرد،سب بھیگے،سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔اندھیری رات میں سونی پٹری آباد ہوگئی۔لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کردیا کہ کون کون آ گیا ہے۔اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔جانور سب موجود تھے۔آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کرمی کم تھے۔بچوں میں رمکلیا کم تھی۔

بسنتی نے رمکلیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کردیا۔دونوں کرمی بھائیوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا کیونکہ ایک تو دونوں تیراک تھے۔دوسرے کافی اونچے مکا کے کھیت میں بہت مضبوط اور اونچے مچان پر رہ سوئے ہوئے تھے۔

رمکلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔سب دلاسہ دیتے تھے۔ہر کوئی سمجھاتا تھا۔رو دھونا،صبر کرو۔شاید دونوں کرمیوں میں سے ہی کوئی آ گیا ہوگا کسی درخت پر ہی لیکر بیٹھ گیا ہو۔چمار کا لڑکا بھی وہیں تھا۔اس نے ہی تو کہا تھا گوری لے لے گا۔وہی اس کو لے کر کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔پر ممتا کی ماری دکھیاری چپ کیسے ہوتی۔اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ناگا ہچکیاں لیتا تھا۔اور وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی اراتی تھی۔تو کاں آن ھ،تو کاں آن ھ۔یہ بھی دکھ بٹی ماں ہے۔ارے کوئی جانے نا جانے۔بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔دکھیا روتی ہے۔تو کاں آن ھ۔

روتی ہچکیاں لیتے ہوئی،بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔بسنتی نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور روئی۔

''گوری رے۔موری رمکلیا۔۔۔۔ایھ ایھ ایھ ایھ

گوری رے اب تو ہے کون چرائے۔۔۔۔ایھ ایھ ایھ ایھ

گوری رے اب تو ہے کون کھلائے۔۔۔ادھا ادھا ادھا ادھ

گوری رمکلیا تو گئی رے۔۔۔۔ادھا ادھا ادھا ادھ

گوری توری رمکلیا۔۔۔۔ایھ ایھ ایھ ایھ

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی۔تو کاں آس ھ

کوئی جانے نہ جانے دل کی لگی رام جانے۔گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے کر آخری صبح ہی کر دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پردے کی طرف اٹھ گئیں۔سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔اس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا۔لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔آموں کے درخت تو تھے۔مکان بہہ چکے تھے۔اور اگر کوئی بچا کھچا مکان ہوگا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔سامنے تو باغ ہی باغ تھا۔جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے مل رہے تھے۔اور پھر ان کے پار۔میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا نالہ تھا پانی کا تیز دھارا تھا تیزی سے چل رہا تھا۔لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی لنگوٹی کس پانی میں کود پڑے۔تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے۔وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی موجود تھے، رمکلیا نہ تھی۔چمار کو تیرنا نہ آتا تھا اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ان لوگوں نے ایک پٹیلا ڈھونڈھ لیا تھا جو کہ درختوں میں الجھ کر تیرتا ہوا رہ گیا تھا۔سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پٹیلے پر دونوں ہاتھ کا سہارا لے اور یہ لوگ کھیتے ہوئے اسے لے جائیں مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے۔ڈر کے مارے مرا جائے پانی میں اترے ہی نہیں۔ بہت سمجھایا خوشامد کی، لیکن راضی نہ ہوا۔اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آگیا۔ چمار کے درخت پر چڑھ کر اور اس کی گردن پکڑ، مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہوگیا۔پٹیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہولیا۔اور سب باری باری پٹیلے کو ڈھکیلتے ہوئے لے چلے۔ رستے میں کسی نے کہا" لے اب بہائے رے۔سانچی سانچی ناہیں ڈبوئیں دیں تو ہے اتے ہی"۔ بیچارے نے سب اگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارا ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ مادھو اور اس کی بیوی بچوں کو نکالنے گئے تھے اور بسنتی کے چلانے پر اس نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لے گا۔لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس ہی سے لوٹ آیا، باہر آیا تو وہ لوگ نہ ملے۔پانی اور بڑھ گیا تھا۔آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی۔درخت پر چڑھ گیا۔یہ سن کر سب نے کہا" ڈبورے دوا ایسے پاپی کو۔کیا کرنا لے جا کر ایسے ڈشٹ کو"۔

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پٹری پر اتار ہی دیا۔

وہاں سیوا سمیتی کے سچے خدمت گار۔کانگریس کے ذرا بڑے اور ذرا مغرور، تھوڑا کام اور بہت باتیں کرنے والے لیڈر، لال صافے والے پولس کے اینٹھتے اکڑتے سپاہی موجود تھے۔مددان کی سب ہی اپنی طرح کر رہے تھے۔تیل، گھی، آٹا، لکڑی، دال، سیوا سمیتی والے لائے تھے۔امن انتظامات پولیس والوں کی طرف سے تھے۔چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان کانگریس والوں کی طرف سے تھا۔تھوڑی ہی دیر میں ہنسی خوشی کھانے پکنے لگے۔کڑھائیاں چڑھ گئیں۔پوریاں تلی جانے لگیں۔دو چار جن کے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں ان کی مرہم پٹی ہوئی لیکن بسنتی کے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا۔مادھو اور ناگا خود ہی پریشان تھے۔ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اس کے ساتھ روئی تھی۔اب وہ بھی نہ تھی۔کا جانے بھاربھئے کیسے چال گئی۔

جب تک اندھیرا رہا۔ہڑپ، گڑپ، گڑاپ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا۔اور روتے روتے بے دم گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں، نہ گاؤں ہے۔آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ایک کونے پر خود بیٹھی ہے، دوسرے کونے پر کالا سانپ کنڈلی مارے بل کھایا بیٹھا دوہری

زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ جس میں سے اکا دکا پیڑ کہیں کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ آدھا ڈوبا آدھا نکلا طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی اور پھر چلائی۔ ڈری، سہمی اور چاروں طرف اس نے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی اور دوسرا کالا ناگ تھا۔ اور پانی ہی پانی تھا۔ جس میں پھرکی ایسے گھومتے کٹورے بنتے تھے اور ہڑپ ہڑپ کرکے غائب ہو جاتے ہیں۔

رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موند لی تھیں اور ''اری منیا ری، او میری منیا''۔ کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی ''تو کاں آں ھ''۔

رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

''تو کاں آں ھ''۔ آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے۔ ''ہرے رام گوری بولے''۔ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا ''گوری ہو گوری''۔

جواب آیا۔ ''تو کاں آں ھ''۔

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکلیا نے پھر پکارا وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دور سے ایک اور آواز آئی۔ ''او ماں آں ھ''۔

باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی ''گوری ہو گوری''۔

گوری ہو گوری۔

ارے گوری رے آئے جا۔

ہائے رے منیا ناہیں آوت۔

گوری ہو گوری۔

گوری منیا آئے جاری''۔

لیکن گوری نے رخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رمکلیا کی طرف دیکھا۔ ارا کر بولی اور پھر ادھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آ گیا۔ جہاں سر شام وہ اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچے کی آواز کا جواب دیتی تیرتی ہوئی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی، اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آ کر اپنی کمر اور پیٹ سے اسے ڈھکیلا۔ ایک طرف چلی۔ بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ سمجھ گئی۔ بچہ چھ فٹ زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسی سے بندھا ہوا تھا اور رسی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی۔ لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلاتے بچہ تو وہیں چھوڑا اور پھر رمکلیا کی طرف رخ کیا۔

رمکلیا رونے چلانے کی تھکن، ڈراور خوف اور آخر میں انتہائی ناامیدی کا اب تک مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آ کر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رمکلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی دم، کھردری گرم گرم زبان سے اس کا منہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا ''گوری مئیا، گوری مئیا'' کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رمکلیا چھت سے گھسٹ پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور چمٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس آ گئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکر لگائے اور چلی۔ جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی۔ رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رمکلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اس لیے یہ دونوں بہاؤ ہی کی طرف تیرتے چل دیے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے۔ لیکن جہاں گاؤں والے تھے تین میل دور یہ نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دیئے تھے۔ اور جب گاؤں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا نہ رمکلیا تھی۔ بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کھچا حصہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رمکلیا، پیچھے بچھڑا۔ ''اوماں آں ھ'' کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو ہلچل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی تھی، کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی۔ اور گائے کہتی تھی۔ ''تم، ماں آں ھ۔ ہم۔ ماں آں ھ''۔

آواز آئی۔ ''بول گوری میاّ کی جے''۔

پچاس آوازوں نے جے پکاری۔

پھر آواز آئی۔ ''بول گئو ماتا کی جے''۔

☆☆☆

کام چور

سید فیاض محمود

مئی کے دن تھے۔ صبح تین بجے کا عمل تھا۔ گھر کے سب لوگ صحن میں سو رہے تھے۔ رات بھر مارے حبس کے آنکھ نہیں لگی تھی۔ اس وقت کہیں سے بھولی بھٹکی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آنے لگے تھے۔ اس ہوا میں اگر خنکی نہ تھی تو کم از کم حدت بھی نہ تھی۔ لوگ جو کروٹیں لیتے لیتے تھک گئے تھے، اب پاؤں پسار کے سو گئے۔ گزشتہ دن کی تکان جو اس قیامت کی رات میں دور نہ ہوئی تھی، اب تازہ ہوا جسم کے بند بند سے اڑا لیے جا رہی تھی۔ دماغوں پر ایک پر کیف سکون طاری ہو رہا تھا۔ تمام صحن میٹھی نیند میں مدہوش تھا کہ اتنے میں پہلے آہستہ پھر ذرا زور سے اور پھر ذرا اور زور سے اور پھر بلند آواز سے ننھے نے رونا شروع کیا۔ بیوی گہری نیند میں سو رہی تھی، ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ننھے کی ٹانگیں اور پھر بازو رونے کے ساتھ ہی ہلنے شروع ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی حرکت میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ سرکتا سرکتا ماں کے پیٹ سے نزدیک تر ہو گیا اور اس کی ٹانگیں ماں کے جسم پر پڑنے لگیں۔ ساتھ ساتھ ننھے نے پوری آواز سے چیخنا شروع کر دیا۔ آخر مرغوب جاگ اٹھا۔ پہلے دو ایک منٹ تو اسے اپنی گھبراہٹ کی وجہ معلوم نہ ہوئی پھر اسے ننھے کے رونے نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے کہا "اماں! اماں! اور پھر اور زور سے "اماں" بارے بیوی کو ہوش آیا۔ ہڑبڑا کے جاگیں "کیوں؟ کیا ہے؟"

"ننھا مدت سے رو رہا ہے۔ سونے نہیں دیتا"۔

بیوی نے پہلے تو ننھے کو نیم خوابی ہی کی حالت میں تھپکنا چاہا۔ مگر ننھا چپ نہ ہوا۔ پھر ایک کہنی کے سہارے ذرا اوپر ہو کر دوسرے ہاتھ سے ننھے کو اٹھایا۔ دیکھا تو کپڑے خراب کئے ہوئے تھا۔ انہوں نے آواز دی "کریمن! اری او کریمن! مگر کریمن سب سے دور اپنی چارپائی پر چت لیٹی آرام سے سو رہی تھی۔ آخر بیوی نے کہا "اس کم بخت پر خدا کی مار لاکھ سر پٹکو جاگتی ہی نہیں۔ خدا جانے اسے سانپ کیوں سونگھ جاتا ہے۔ او کریمن، اے، اے کریمن! مگر کریمن کہاں۔"

تھک کے بیوی بالکل اٹھ بیٹھیں، دونوں ہاتھوں سے ننھے کو اٹھایا۔ سرہانے اسٹول پر لیمپ مدھم سا جل رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کے بتی کو اونچا کیا۔ دیکھا تو ننھے کا بچھونا سب لت پت تھا۔ اپنے جاگنے پر، اس بے وقت کی تکلیف پر اور باقی سب کے سوئے رہنے پر، بیوی کو بہت غصہ آیا،

آواز دی "مرغوب او مرغوب" وہ بیچارہ ابھی کچی نیند میں تھا پھر چونک پڑا اور ذرا ترشی سے بولا "کیا ہے؟"

"ذرا اٹھ کے اس نامراد کو جگا تو دو۔ مردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہے"۔ مرغوب طوعاً و کرہاً اٹھا۔ جا کے کریمن کے کندھے کو ہلایا جب اس سے کچھ اثر نہ ہوا تو ذرا زور زور سے اسے جھنجھوڑا اور آوازیں بھی دیں۔ خیر کریمن کی آنکھ کھلی۔ جب چارپائی سے پاؤں نیچے رکھا تو بیوی نے غصے سے کہا ادھر آ مردار! میں گھنٹا بھر سے آوازیں دے رہی ہوں تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پانی لا میں ننھے کو دھوؤں۔ کریمن آنکھیں ملتی ہوئی گھڑونچی سے جو صحن میں پڑی تھی لوٹا بھر لائی اور ننھے کو دھلوایا پھر بیوی کے کہنے پر غلیظ پوتڑے بستر سے اٹھائے اور نئے بچھائے۔ باورچی خانے میں جا کر ہاتھ دھوئے اور اپنے بستر پر آ کے لیٹ رہی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ صبح کے چار بج رہے ہوں گے، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ صحن میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سانس لینے کی آوازوں پر بھی سکوت نے غلبہ پا لیا تھا۔ بیوی کے بائیں طرف کی ایک چارپائی پر ایک تین برس کا بچہ اٹھ بیٹھا اور اماں

اماں کہہ کر چلانے لگا۔ جب دھیمی آواز سے کچھ نہ بنا تو اونچی آواز سے پکارنا شروع کیا۔ بیوی کی آنکھ کوئی بیس منٹ ہوئے لگی تھی کہ اب اور حملہ شروع ہوا۔ خیر اب کے جلدی جاگ اٹھیں۔ پوچھا کیا ہے؟ جواب ملا ''پانی''۔ اس پر بیوی نے آواز دی ''کریمن او کریمن!''

''جی''۔

''اری تو ایک آواز سے نہیں اٹھ سکتی۔ پہروں کوئی جگاتا رہے پھر کہیں اٹھتی ہے۔ بشیر کو پانی دے دو پیاس سے ہلکان ہو رہا ہے''۔ کریمن نے اٹھ کر بشیر کو پانی پلایا۔ اور پھر گلاس کو گھڑونچی پر رکھ، جا کے سو رہی۔

اتنے میں پانچ بھی بج گئے۔ ہوا بدستور چل رہی تھی۔ اب تو اس کے جھونکوں میں کچھ خنکی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لیے سونے والوں میں سے بعض نے پائنتی سے چادریں اٹھا کر اوڑھ لی تھیں اور بے فکری کی نیند کے مزے لے رہے تھے کہ صحن کے ایک کونے سے کھانسنے کی آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ پہلے تو آہستہ جیسے کوئی گلہ صاف کرتا ہو، پھر رک رک کے، پھر پوری آواز سے۔ مگر آواز میں توانائی نہ تھی، کھانسی کے ایک حملے کے بعد حلق سے ایک آدھ تکلیف کا سانس بھی نکل جاتا تھا۔ یہ بیوی کی ساس تھیں۔ جوتی پاؤں سے ٹٹول کر پہنی اور چارپائی کی پٹی پر دونوں ہاتھوں کو دبا کے اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھیں۔ اس وقت آسمان سے تاریکی غائب ہو چکی تھی۔ بیوی کے سرہانے لیمپ بدستور جل رہا تھا۔ اسے بجھایا بجھا کے اسے وہاں سے اٹھا کے صحن کی اس الماری میں جہاں لیمپ رکھے جاتے تھے رکھ دیا پھر ادھر ادھر اپنے لوٹے کے لیے نظر دوڑائی کیونکہ ان کا لوٹا مخصوص تھا کوئی اسے چھو نہیں سکتا تھا مگر وہ لوٹا نظر نہ پڑا۔ باورچی خانے میں بھی دیکھا، وہاں بھی نہ دکھائی دیا۔ باہر گھڑوں کے پاس بھی نہ تھا۔ حیران ہوئیں کہ لوٹا کہاں گیا۔ پہلے تو کسی اور لوٹے کی فکر میں نظر اٹھائی۔ مگر پھر جی نہ چاہا اس لیے صحن کے دوسری طرف کریمن کی چارپائی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اسے جگایا۔ وہ اٹھی، اٹھ کے بڑی بی بی کو سلام کیا اور پھر ان سے استفسار کے جواب میں لوٹا ڈھونڈنے چلی۔ صحن میں اس نے دیکھا، کہیں نہ تھا، بڑی بی بی نے پوچھا۔ ''آخر تم رات برتن دھو کے سوئی تھیں یا نہیں؟''

''جی''۔

''تو میرا لوٹا بھی دھویا ہوگا''۔

''جی ہاں آپ کا لوٹا تو میں نے بہت احتیاط سے صاف کیا تھا۔ دیکھوں تو شاید باورچی خانے میں رکھ دیا ہوگا''۔ باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے کچھ کھڑکھڑاہٹ کے بعد بڑی بی بی کا لوٹا نکال لائی۔ صحن اب کافی روشن ہو گیا تھا۔ پہلے تو سوچا کہ تھوڑا سا اور سو لیا جائے پھر یاد آیا کہ رات برتن بہت سے تھے۔ اس لیے ان کو دھوتے دھوتے دیر ہو گئی تھی اور گھڑے نہیں بھر کے سوئی تھی۔ نیند تو بہت آ رہی تھی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں مگر بیوی کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ اس لیے اپنا بستر لپیٹ، چارپائی اٹھائی اور دیوار سے لگا دی۔ بستر کو فالتو سامان والی کوٹھڑی میں رکھ آئی۔

صحن کے ایک کونے میں ہاتھ سے چلا کر پانی نکالنے کا نل لگا تھا اس کے پاس گھڑے اٹھا لائی اور نل سے ایک، دو، تین حتیٰ کہ پانچ گھڑوں کا پانی نکالا۔ اٹھا اٹھا کے انہیں اپنی جگہ پر رکھا پھر صحن میں آئی اور بیوی کے پائنتی سے ننھے کے مستعمل ہوتے ہوئے پوتڑے لیے اور انہیں ایک طرف ایک تسلے میں ڈال آئی پھر ادھر جا کر وہ کپڑے جو رات کو دھلوا کے سکھانے کے لیے رسیوں پر ڈال رکھے تھے۔ اٹھا لائی۔ انہیں تہ کر کے بیوی کی پائنتی پر رکھ دیا۔ پھر ہاتھ منہ دھویا۔ گیلے گیلے ہاتھ بالوں پر پھیر کے جو جو بال سوتے میں بکھر گئے تھے انہیں جما دیا، مگر چونکہ رات گرمی کی وجہ سے بہت بے آرامی سے گزری تھی اور کروٹوں اور سر کے ہلنے جلنے سے بال کچھ معمول سے زیادہ بکھر گئے تھے، اس لیے وہ اپنی اسی سامان والی کوٹھڑی میں جہاں اس کا صندوق اور اس کی ایک آدھ

دوسری چیز رکھی تھی، گئی اور ایک میلی سی دو تین ٹوٹے ہوئے دندانوں والی کنگھی نکال لائی۔ ابھی وہیں کھڑی کھڑی چوٹی کھول رہی تھی کہ صحن سے آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ ''او کریمن اری او کریمن! کہاں غارت ہو گئی؟'' کنگھی کو وہیں چھوڑ چوٹی کو باندھتی ہوئی ''جی آئی'' کہہ کر باہر نکل آئی۔ دیکھا تو بڑی صاحبزادی رقیہ اور میاں اصغر جاگے ہوئے ہیں اور وہیں سے چلا رہے ہیں ''او کریمن، او کریمن، ارے کہاں مر گئی؟'' کریمن نے کہا ''جی میں تو یہیں تھی۔ کمرے میں بستر رکھنے گئی تھی''۔ رقیہ بولیں ''اری کیوں جھوٹ بکتی ہے، لیا ٹن کہیں کی تو تو بال بناتی آئی ہے''۔

''نہیں تو بی بی جی میں نے بالوں سے کنگھی تک نہیں چھوئی''۔ توبہ کر ری توبہ! تو تو چٹیا لپیٹتی چلی آ رہی تھی، جھوٹی کہیں کی، پانی لا منہ دھوئیں، تو مجھے بھول جاتی ہے، مجھے سکول جانا ہے، اب چھے بجے کھلتا ہے، چھ بجے!''

دوسری طرف میاں اصغر بولے ''کریمن میرے کپڑے نکال لا۔ مجھے بدلنے ہیں؟''

رقیہ ''خود اٹھ کے کیوں نہیں پہن لیتا، سستی کا مارا ہوا''۔

اصغر ''تو آپا تمہیں کیوں نہیں پانی اٹھ کے لے لیتیں اور ابھی تو کسی نے آگ تک نہیں جلائی، میں آج کھا کے کیا جاؤں گا۔ اماں، اے اماں! اٹھو بھی نا، اب سکول کا وقت ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا''۔

بیوی بھی جاگ اٹھیں۔ کہنے لگیں ''ابھی تو بہت سویرا ہے، کیوں اتنا شور مچایا ہے؟'' ''شور کس نے مچایا ہے؟ میں تو آپ کو جگا رہا تھا یہ آپا ہی صبح سے چلا رہی ہیں''۔ ''بکو مت اصغر! اٹھتے ہی تو تم نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے کیا کیا؟''

''تو اماں کریمن سے کہو نا کچھ کرے۔ میں کھا کے کیا جاؤں گا؟''

''او کریمن''۔

''جی! بیوی!! ابھی آئی۔ میں بی بی جی کے لیے صابن تولیہ لا رہی ہوں''۔

رقیہ نے کہا ''اماں یہ کریمن ایک کام میں دس گھنٹے لگاتی ہے۔ آپ اسے کچھ کہتیں بھی نہیں''۔

بیوی نے رقیہ کو تو کچھ جواب نہ دیا کریمن سے کہا ''مرغوب کو جگا دے''۔ رقیہ منہ دھو رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ رات کی گرمی کی وجہ سے کپڑے بدن سے چپک رہے ہیں۔ رات پسینا بہت آتا رہا ہے۔ اس لیے منہ ہاتھ دھونا چھوڑ کر کریمن کو حکم دیا کہ غسل خانے میں صابن اور تولیہ رکھ آئے، وہ ادھر گئی، آپ اندر سے سکول کے کپڑے نکال غسل کرنے چلی گئی۔ مگر اصغر اور مرغوب کو کون نہلائے، انہوں نے منہ ہی دھونے پر اکتفا کیا اور اندر جا کر جلدی جلدی کپڑے پہنے، کریمن نے رقیہ سے فراغت پا کر جلدی جلدی آگ جلائی اور دو چار روٹیوں کا آٹا گوندھ لیا۔ اتنے میں اصغر اور مرغوب ناشتے کے لیے سر ہو گئے۔ انہیں معمول کے مطابق چھوٹے چھوٹے نمکین پراٹھے پکا دیئے اور ساتھ دہی دے دیا۔

رقیہ کے لیے اب لسی بنانی تھی، کیونکہ وہ پراٹھے کے ساتھ ہمیشہ لسی پیا کرتی تھی۔ مگر کریمن تو روٹی پکا رہی تھی، لسی کون بنائے؟ رقیہ نے شور مچانا شروع کیا۔ ''میری لسی کہاں ہے؟ میری لسی نہیں بنائی؟ کریمن نے پہلے کیوں نہیں بنائی؟''۔۔۔۔ خیر یہ گزری کہ اب تک رقیہ کی دادی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اس لیے بیوی نے ان سے کہا۔ ''اماں رقیہ کی لسی ذرا بنا دو اس نے شور مچا رکھا ہے''۔ دادی اماں نے کریمن سے پوچھا ''بلونی کہاں ہے۔'' اس نے کہا ''باورچی خانے میں''۔ وہاں بڑی بی بی کو نہ ملی تو پھر شور ہوا۔ ''یہ کریمن کبھی چیز جگہ پر رکھتی بھی ہے یا نہیں اس پر خدا کی مار، ابھی کل تو یہاں دیکھی تھی، یہاں پڑی تھی، یہاں۔۔۔'' کریمن نے کہا ''باورچی خانے میں برتنوں کی الماری کے اوپر کے خانے میں رکھی تھی کسی دیگچی کے پیچھے ہو گئی ہو گی''۔ بارے بلونی ملی، لسی تیار ہوئی۔ رقیہ نے ناشتہ کیا۔ ادھر اصغر اور مرغوب نے بھی اپنا اپنا پراٹھا ختم کر لیا۔ اتنے میں رقیہ کے سکول کی ملازمہ آ گئی۔ وہ

اس کے ساتھ سکول چلی گئی۔ ادھر لڑکے بھی اپنے سکول کو روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد بیوی جی اٹھیں۔ اٹھ کے پہلے شب خوابی کا میلا پاجامہ تبدیل کیا پھر ہاتھ منہ دھو کر اپنی ساس سے بالوں میں کنگھی کرائی۔ اتنے میں کریمن چولہے کے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس سے کہا گیا کہ بستر بڑھائے۔ اس نے سب بستر اندر رکھے اور چارپائیاں اٹھا کر ایک طرف رکھیں پھر دالان کے آگے سے اور چولہے کے قریب قریب سے جھاڑو دی۔ تھوڑی دیر میں مہترانی آگئی اس نے کہا بی بی پہلے پوتڑے دھلوا لیجئے۔ اس لیے کریمن سے پھر کہا گیا کہ پانی بھر بھر کے مہترانی سے کپڑے دھلوائے۔ چنانچہ آدھ گھنٹے سے زائد وقت اس کام میں صرف ہو گیا۔ بیوی کا اور اپنا ناشتہ بڑی بی بی نے تیار کر لیا تھا کیونکہ بیوی تو فقط تھوڑا بہت گوندوں کا حلوا جو بنا کر رکھا ہوا تھا، کھایا کرتی تھیں، باقی رہیں بڑی بی بی انہوں نے دہی سے ایک آدھ چپاتی کھالی۔

کریمن نے اس اثنا میں مہترانی کا گھڑا بھر دیا جس سے وہ نالیاں وغیرہ صاف کیا کرتی تھی۔ بعد میں اس نے ہاتھ وغیرہ دھو کے، نوکر کو آواز دی۔ اس سے گوشت اور میتھی پالک کا ساگ لانے کو کہا۔ خود گھر کا آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔ آج اسے کچھ فرصت سی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ بڑے میاں دورے پر جا چکے تھے اور آج ان کے ناشتے کی تیاری کا کام نہیں تھا۔ اتنے میں نوکر سوا سلف لے آیا۔ اس نے آواز دی کہ سودا لے لیجئے۔ کریمن آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس لیے نہ اٹھی۔ بیوی نے نوکر کی دوسری آواز پر خفا ہو کر کہا "کیوں ری اٹھتی کیوں نہیں اور کون تیرا ابا واا ٹھ کے جائے۔ سنتی نہیں وہ دیر سے کھڑا آوازیں دے رہا ہے"۔ کریمن اٹھنے کو ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا "میں لے آتی ہوں تو گوندھتی رہ"۔ جب آٹا گوندھ لیا تو مسالہ پیسا، آگ جلائی اور گوشت چڑھا دیا۔ اب میتھی چن رہی تھی کہ آواز آئی "کریمن بھاگ کے آئیو، جلدی آ جلدی"۔ کریمن چلی جا رہی تھی کہ پھر بیوی جی پکاریں "اری آتی ہے کہ نہیں ادھر ننھے نے سارا بستر خراب کر دیا ہے"۔ بارے کریمن نے جا کے ننھے کو دھلوایا۔ نیچے کے کپڑے بدلوائے اور پھر سبزی کاٹنے لگی۔

کریمن کو اب شدت کی بھوک لگ رہی تھی کیونکہ صحت مند جسم ہونے کے باعث صبح ہی سے پیٹ خالی سا لگتا تھا۔ آج رات کی باسی روٹی بھی کوئی نہ بچی تھی اور صبح کے پراٹھوں کے بعد جو دو ایک چپاتیاں پکائی تھیں۔ وہ بڑی بی بی نے کھالی تھیں پھر بھی شاید ایک آدھ ٹکڑا بچا کچھا رہ گیا ہو اس لیے میتھی چھوڑ وہ باورچی خانے میں جانے کو تھی کہ بیوی جن کی آنکھیں دن بھر اور لوگوں کے کام میں گڑی رہتی تھیں پکاریں "اب کہاں سیر کے لیے جا رہی ہے۔ یہ میتھی جلدی جلدی صاف کر۔ لڑکے آدھی چھٹی میں ابھی آ جائیں گے"۔ کریمن نے کہا "جی ذرا دیکھنے چلی تھی کوئی ٹکڑا بچا ہو، بھوک لگ رہی تھی"۔ بولیں "تجھے ہر وقت بھوک ہی لگی رہتی ہے"۔

کریمن نے ساگ کاٹ کر دھویا اور دیگچی میں ڈال دیا۔ اب ذرا ایک لمحے کی فرصت ہوئی تھی کہ بیوی نے کہا "کریمن یہ لڑکیوں کے تکیوں کے غلاف بہت میلے ہو گئے ہیں۔ انہیں اتار کے لا اور ان کا ٹرنک بھی اٹھا لا میں تجھے دھلے ہوئے غلاف نکال دوں"۔ چنانچہ غلاف بدلے گئے۔ بڑی بی بی نے پوچھا "دھوبن کپڑے نہیں لائی بہت عرصہ ہو گیا ہے کیا ہوا اسے؟" بیوی نے کہا "اس کی لڑکی بیمار ہے شاید اس لیے دیر ہو گئی ہو۔ کریمن جا تو رحیم کو آواز دے۔ اسے دھوبی کے ہاں بھیجیں اور وہاں اندر سے میلے کپڑے بھی اٹھا لا کپڑوں والی کاپی بھی لا کپڑے لکھوں"۔

چنانچہ کپڑے لکھے گئے۔ رحیم سے جو کبھی کا ڈیوڑھی میں کھڑا تھا کہا کہ "دھوبن سے جا کر کہہ دے کہ آ کے کپڑے لے جائے پندرہ دن ہوئے خبر ہی نہیں لی"۔

کپڑے رکھ، ابھی چولہے کے پاس بیٹھی ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا "کریمن ذرا میرے بالوں میں کنگھی کر دے، اندر سے اٹھا لا میری کنگھی۔ جانے سر میں کمبخت کھلی کیوں ہوئی جا رہی ہے"۔ کریمن نے اٹھ کر بڑی بی بی کی کنگھی چوٹی کی۔ خیال آیا کہ اب تو ذرا فرصت ہے۔ اپنے بالوں میں کنگھی کر لوں۔ اس لیے اپنی کوٹھڑی میں گئی اور وہاں بال بنا کے چوٹی باندھ رہی تھی کہ بی بی جی

نے آواز دی ''کریمن دیکھو سالن کو، کہیں جل نہ جائے''۔ کریمن آ کے پھر پکانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اب دس بج گئے تھے۔ اصغر اور مرغوب آ گئے، انہیں جلدی سے روٹی پکا کر دی پھر باقی آٹے کی روٹیاں پکائیں۔ آگ بجھائی، پرات دھوئی، پھر بیوی اور بڑی بی بی کو کھانا دیا۔ رقیہ کے لیے الگ سالن نکال کے رکھا اور باہر رحیم کو روٹی دی، بعد اس کے آپ روٹی کھائی۔ اب سورج سر پر آ چکا تھا۔ سارا صحن تپنا شروع ہوگیا تھا۔ اس لیے سب برتن اٹھا وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

بڑی بی بی نے اور بیوی نے کھانا کھا کر کریمن سے برتن اٹھانے کو کہا۔ ان کے برتن باہر کے برتن جمع کیے۔ انہیں مانجھا مگر برتنوں کو کریمن آہستہ آہستہ دھو رہی تھی اس ڈر سے کہ اگر جلدی جلدی دھو کے فارغ ہوگئی تو دیکھتے ہی بیوی کوئی نہ کوئی کام دے دیں گی لیکن ابھی دھو ہی رہی تھی کہ ننھے میاں کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے برتنوں کو ادھر ادھر ذرا زور سے فرش پر رکھنا شروع کیا کہ آواز سن کر بیوی سمجھ جائیں کے برتن مانجھ رہی ہے۔ مگر بیوی کیوں ننھے کو بہلانے کے لیے گود میں لے کر ادھر ادھر پھرتیں، وہیں سے آواز دی ''او کریمن، او کریمن ادھر آئیو''۔ کریمن ہاتھ دھو کے گئی تو حکم ہوا کہ ننھے کو ذرا لے کر پھر، پنگوڑے میں بھی چپ نہیں ہوتا۔ کریمن نے پوچھا ''بیوی دودھ کے لیے تو نہیں روتا؟'' بیوی بولیں ''تو مت مشورے دیا کر، دودھ میں نے اسے دس دفعہ پلایا ہے، اب دودھ نہیں پیتا۔ معلوم نہیں اسے کیا خلل ہے؟ اسے لے کے ٹہل یہیں دالان میں''۔

یہ تھا دوپہر بھر کا کا۔ بی بی رقیہ جب اسکول سے آئیں تو انہیں کھانا دیا کچھ دیر پنکھا جھلتی رہی، مگر بیوی نے کہلا بھیجا۔ کریمن ادھر گئی ہی تھی کہ رقیہ نے پھر چیخنا شروع کیا۔ ''اور کریمن، کریمن!'' وہ بیوی کے دالان میں، انہیں پنکھا جھل رہی تھی کیونکہ دوپہر کی گرمی میں وہ تو سوگئی تھیں، مگر کریمن کو حکم دے دیا تھا کہ پنکھا جھلتی رہ۔ صبح پانچ بجے سے اٹھی ہوئی تھی۔ ابھی تک سو دفعہ اندر باہر نکلی ہوگی۔ بدن چور ہو رہا تھا۔ پنکھا جھلتے جھلتے ذرا اونگھ گئی تھی کہ رقیہ کی آواز نے چونکا دیا۔ اب جواب دیتی ہے تو خطرہ ہے کہ بیوی جاگ نہ اٹھیں اور نہیں دیتی تو بی رقیہ سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ ناچار اٹھی اور رقیہ کے کمرے میں گئی۔ وہاں یہ کام تھا کہ ان کے کمرے کے دروازے بند کر کے باہر سے چکیں چھوڑ دی جائیں اور کہیں سے انہیں پنکھا ڈھونڈھ کے لا دیا جائے کیونکہ انکے پنکھے پر تو ہر وقت چور لگے رہتے ہیں۔

پنکھا تلاش کرتی پھرتی تھی کہ بیوی کو مکھیوں نے تنگ کیا انہوں نے ننھے کے اوپر تو ململ کا ایک دوپٹا ڈال دیا تھا چونکہ کریمن انہیں پنکھا جھل رہی تھی۔ اس لیے خود ویسے ہی پڑی تھیں۔ اب مکھیاں جو منہ ناک پر بیٹھنے لگیں تو وہ جاگ اٹھیں۔ کریمن کو کٹنی مالزادی سب کچھ بنا دیا۔ خوب خفا ہوئیں۔ خیر گزری کہ ننھا سو رہا تھا۔ آواز بہت اونچی نہیں نکالتی تھیں ورنہ شامت ہی آجاتی۔ کریمن آئی اور ساری دوپہر بیوی کے سرہانے پیڑی پر بیٹھی اونگھتی ہوئی پنکھا جھلتی رہی۔ بہت دیر ایک جگہ بیٹھنے سے پاؤں بھی سو گئے مگر بیٹھی اونگتی رہی۔

سہ پہر کے وقت پھر نفل وغیرہ کا سامان کرنا تھا۔ کسی کے لیے لسی بنائی۔ کسی کو خربوزے منگوا کے دیئے اور بیوی کو حریرہ بنا کے دیا پھر شام کو سودا منگوایا۔ مسالا پیسا، ہنڈیا چولہے پر رکھی، سالن پکایا، روٹی پکائی۔ باقی دن اسی طرح گزر گیا۔ اس میں بی بی رقیہ کے کمرے میں جھاڑو دینا بھی شامل تھا کیونکہ ان کی چاندنی پر کسی نے میلا پاؤں رکھ دیا تھا۔ رقیہ نے اس کو اندھی، گدھی اور جو جو کچھ ان کے زبان میں آیا کہا اور یہ بھی کہا کہ ہمارے سر پر یہ عذاب معلوم نہیں کیوں سوار ہے۔ ایک آواز تو کبھی سنی ہی نہیں، دس آوازیں دو تو کچھ سنتی ہے اور پھر کام ایسا بددلی سے کرتی ہے کہ نہ ہونے سے بدتر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اماں نے اسے کیوں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال سر شام کریمن نے صحن میں چارپائیاں بچھا دیں۔ ان پر سب کو کھانا کھلا کے، برتن جمع کر کے انہیں صاف کیا۔

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ کریمن نے ابھی ابھی برتنوں سے فراغت حاصل کی تھی۔ اب کمرا صاف کر رہی تھی۔

ٹانگیں ایسی بوجھل محسوس ہو رہی تھیں جیسے ان میں سیسہ بھرا ہوا ہے۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں لہذا اس نے سوچا کہ پانی صبح اٹھ کے بھروں گی اب تو نل نہیں چلایا جائے گا اور پھر اس کے چلانے سے شور ہوگا اور سوچا کہ گھڑونچی کے گھڑے تو ابھی خالی نہ ہوئے ہوں گے کیونکہ سہ پہر کو دیکھے تھے آدھے آدھے بھرے ہوئے تھے۔ اس لیے اپنی چارپائی بچھانے چلی۔ آج ہوا بند تھی مگر کل جتنا حبس نہ تھا۔ چارپائی تو بچھالی، اندر سے بستر لانا دوبھر ہوگیا۔ بہر حال لے آئی اور بچھانے کے ساتھ جو پڑی تو ایک ہی منٹ میں سوگئی۔

ابھی رقیہ اور اصغر جاگ رہے تھے۔ اپنے اپنے سکول کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میاں اصغر کو پانی کی ضرورت ہوئی۔ وہ اٹھ کر لوٹا بھرنے گیا تو دیکھا کہ گھڑے میں پانی نہیں ہے۔ بس اس نے چلانا شروع کیا۔ ''گھڑوں میں کبھی پانی ہوتا ہی نہیں۔ معلوم نہیں بہشتی کیوں نہیں رکھ لیتے۔ روز دیکھتا ہوں پانی نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں؟'' اصغر کی دادی غالباً جاگ رہی تھیں کہنے لگیں ''بیٹا باورچی خانے میں سے لے لو'' مگر اصغر کیوں جاتا۔ وہیں سے گیا اپنی والدہ کے سرہانے اور لگا انہیں جھنجھوڑنے ''اماں! اماں! اے اماں!!'' ان کی ابھی ابھی آنکھ لگی تھی یکلخت جو جاگنا پڑا بہت غصہ آیا۔ کہنے لگیں ''ہے ہے تجھے صبر بھی نہیں پڑتا۔ کسی کو سونے بھی دیتا ہے کہ نہیں؟ سارا دن گرمی سے آنکھوں پر نیند حرام رہی اب ذرا سوئی تھی کہ جلاد سر پر آن سوار ہوا''۔

''تو میں کیا کروں''۔ اصغر نے جھلا کے جواب دیا۔ ''گھڑوں میں پانی بھی ہو، مجھے صحت خانے جانا ہے''۔

''تو میرے سر کیوں ہوا ہے نامراد، کریمن مردار سے کہہ وہ نواب زادی تو سر شام ہی سو جاتی ہے۔ اسے کہہ تجھے پانی نکال کے دے۔ ایسی کاہل بھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ توبہ ایسی نیند کی پیاری ہے کہ پانی تک نہیں رات کو بھر سکتی۔ اٹھا اس کام چور کو! او کریمن۔۔۔۔۔ او کریمن۔۔۔۔۔ اے کریمن''

☆☆☆

تانتیا

شوکت صدیقی

کرفیو کی رات تھی۔ پت جھڑ کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ ویران گلیوں میں کتے رو رہے تھے۔ کیسانوا ہوٹل خاموشی میں اونگھتا ہوا نظر آرہا تھا۔ رقص گاہ کے ہنگامے سرد تھے۔ جام منہ اوندھائے پڑے تھے۔ باورچی خانے کی چمنی سے نہ دھواں نکل رہا تھا، نہ چنگاریاں اڑ رہی تھی۔ باہر گلی میں کھلنے والی باورچی خانے کی کھڑکی بھی بند تھی۔ تانتیا دیوار کی اوٹ میں خاموش بیٹھا تھا۔

جب بازاروں کی چہل پہل اجڑ جاتی اور رات گہری ہو جاتی تو تانتیا اس تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوتا۔ دھوئیں میں الجھی ہوئی باورچی خانے کی پھیکی پھیکی روشنی دیکھتا۔ اور کھڑکی پر ابھرنے والے انسانی سائے کا انتظار کرتا لیکن جب دیر تک کوئی نظر نہ آتا تو وہ جھنجھلا کر چلانے لگتا۔

''ابے کیا اپنے باپ کو بھول گئے۔ سالو! یہ انتظاری کب تک ہوگی؟'' باورچی خانے میں بیرے ٹھٹھا مار کر ہنستے، خانساماں کھڑکی سے گردن نکال کر کہتا ''ارے مرا کیوں جاتا ہے، کوئی میز تو خالی ہونے دے''۔ تانتیا مطمئن ہو جاتا۔ جھوم کر نعرہ لگاتا۔

''واہ کیا بات ہے تیری۔ جیو میرے راجہ''۔

بوڑھے خانساماں کو راجہ کہلوانے کا ارمان تھا یا کوئی جذبہ ہمدردی، یا محض احساس برتری کہ خانساماں کو برابر یہ خیال ستاتا رہتا کہ باہر اندھیرے میں تانتیا بیٹھا ہے، سردی بڑھتی جارہی ہے، اس کے الجھے ہوئے میلے بال اوس میں بھیگتے جارہے ہیں، اس کی بھوکی آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہیں۔ وہ ولایتی شراب کی تیز مہک پر جان دیتا ہے۔ اس کی تلخی اسے مرغوب ہے۔ خانساماں اپنے کام میں الجھا رہتا، بیرے مستعدی سے آکر آرڈر پر آرڈر سناتے اور خانساماں کو تانتیا کا خیال ستاتا رہتا۔ رقص گاہ میں قہقہے کھنکتے رہتے، جام ٹکراتے رہتے، آرکسٹرا کے نغمے تھرتھراتے رہتے پھر کوئی میز خالی ہوتی، پھر کوئی بیرا جھوٹی پلیٹوں میں بچا کھچا کھانا لے کر آتا، کسی گلاس میں بچی ہوئی شراب لے کر آتا۔ خانساماں بچے کھچے کھانے کو ایک پلیٹ میں انڈیل کر ذرا قرینے سے لگاتا اور اس پر گلاس کی جھوٹی شراب چھڑک دیتا، آگے بڑھتا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو جاتا، تانتیا اسے دیکھتے ہی بے تابی سے جھپٹتا، لیکن خان ساماں پیچھے ہٹ کر تانتیا کی بے صبری سے لطف اٹھاتا ''سالے اتنی جلدی، بیٹا اصلی شراب پڑی ہے، یوں تھوڑی ملے گی''۔ تانتیا کی گرسنہ آنکھیں چمکنے لگتیں، ہونٹ پھڑ پھڑانے لگتے اور بکھری ہوئی مونچھیں دانتوں سے الجھنے لگتیں۔ وہ خوشامد کرنے لگتا۔

''ارے کیوں جلا رہے ہو، پیٹ میں آگ لگ رہی ہے''۔

خان ساماں کو معا بیروں کے سنائے ہوئے آرڈر یاد آجاتے، منیجر کی ڈانٹ ڈپٹ یاد آجاتی، وہ جلدی سے ہاتھ باہر نکالتا اور پلیٹ تانتیا کے ہاتھ میں تھما دیتا، تانتیا پلیٹ لے کر فوراً دونوں ایڑیاں جوڑتا اور ایک ہاتھ اٹھا کر خالص فوجی انداز سے سلیوٹ کرتا، مزے لے لے کر ہر چیز کھاتا، پاس کھڑے ہوئے آوارہ کتوں کو دھتکارتا۔ خانساماں کو زور زور سے گالیاں دیتا اور خانساماں بے وقوفوں کی طرح ہنستا رہتا۔ شاید اسے گالیاں کھانے کا بھی ارمان تھا۔

لیکن آج کھڑکی بند تھی۔ تانتیا چلایا بھی، خوشامد بھی کی اور گالیاں بھی دیں۔ بوڑھے خانساماں کو نہ راجہ کہلوانے کا ارمان پیدا ہوا، نہ رگ ہمدردی پھڑکی، نہ احساس برتری نے ستایا اور نہ گالیوں پر اسے ہنسی آئی۔ چند گھبرائے ہوئے بیروں کے ساتھ وہ بھی

باورچی خانے میں سہما ہوا بیٹھا رہا۔

کھڑکی کھل نہ سکی۔ تانتیا نے مایوس ہو کر اندھیرے میں گلی کے فرش کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سوکھے ہوئے ٹوسٹوں کے کچھ ٹکڑے اسے مل گئے۔ اس نے ٹکڑوں کو منہ میں بھر کر چبانا شروع کر دیا۔ باسی مکھن کے کھٹے پن پر اسے شراب کی تلخی یاد آ رہی تھی، نزدیک ہی ایک مریل کتا مزے سے ہڈی چچوڑ رہا تھا۔ تانتیا کو اس کے اس طرح ہڈی چچوڑنے پر الجھن ہونے لگی۔ اس نے جل کر اس کے ایک لات جمادی۔ ''یہاں تو بیٹھے ترس رہے ہیں اور یہ سالے موج اڑا رہے ہیں''۔ کتا چیختا ہوا بھاگا۔ اور اس کی چیخیں فلک بوس عمارتوں سے ٹکرا کر گلی کی گہرائیوں میں گونجنے لگیں۔

گلی کے نکڑ پر لیمپ پوسٹ کی بتی جل رہی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں پولس والوں کے سائے نظر آئے۔ وہ گشت پر نکلے تھے۔ اچانک کسی نے چیخ کو پوچھا ''کون ہے گلی میں؟'' ساتھ ہی ٹارچ کی تیز روشنی تانتیا کے جسم پر پڑی۔ وہ بدحواس ہو کر دوسری سمت بھاگا۔ بندوق چلنے کی تیز آواز خاموشی میں ابھری۔ گولی تانتیا کے پیر کے پاس سے چھلتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دیواروں کے اندھیرے میں دبکتا ہوا اس سڑک پر آ گیا جو کشادہ بھی تھی اور روشن بھی۔

تانتیا گھبرا کر ایک کوٹھی کے کھلے ہوئے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ اس نے لان عبور کیا اور بیرونی برآمدے میں پہنچ گیا، سب دروازے بند تھے، مگر کونے والے کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی، وہ اس پر چڑھ کر اندر کود گیا اور جھٹ کھڑکی بند کر دی۔

جب پولیس والوں کے بھاری، بھاری بوٹوں کی آوازیں دور ہو گئیں اور سڑک پر سناٹا چھا گیا تو وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا تھا۔ روشن دان سے روشنی کی ہلکی ہلکی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے دیکھا دیوار کے پاس ایک لمبی میز تھی۔ اس پر کچھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں، کچھ کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ سگریٹ کا ایک ڈبا بھی موجود تھا، کمرہ خالی تھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ کوٹھی کے دوسرے حصے میں بھی نہ کوئی آہٹ تھی اور نہ آواز۔ خاموشی بہت گہری تھی، وہ میز کے پاس چلا گیا۔ سگریٹ کا ڈبا اٹھا کر کھولا، صرف ایک سگریٹ نکالی اور پھر اسی طرح میز پر رکھ دیا۔ مگر اس نے سگریٹ سلگائی نہیں، بلکہ برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکنے لگا۔ وہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں بھی دھندلی روشنی تھی۔ فرش پر پرانے اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار کے پاس دو خالی پلنگ پڑے تھے۔ سامنے کھونٹی پر ایک پرانا گاؤن لٹک رہا تھا۔ تانتیا نے اس کو چھو کر دیکھا۔ گاؤن اونی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ تانتیا کو سردی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اس نے گاؤن اتارا اور اسے پہن لیا۔ ٹہلتا ہوا دوسرے کمرے میں اس طرح چلا گیا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ اس کمرے میں روشنی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پکارنے لگا۔

''ارے کوئی ہے یہاں؟''

''کوئی ہے یہاں؟''

''کوئی ہے؟''

تینوں مرتبہ اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر خاموشی میں ڈوب گئی۔ وہ کھویا، کھویا سا آگے بڑھا اور ایک صوفے پر جا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے تھکان محسوس ہوئی۔ اس کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ بھوک سے زیادہ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ وہ خوابیدہ نظروں سے آتشدان پر رکھے ہوئے دھات کے مجسمے کو دیکھنے لگا۔ مجسمہ اسے اپنی طرح تنہا اور اونگھتا ہوا معلوم ہوا۔

وہ اٹھ کر آتشدان کے پاس گیا، مجسمے کو اٹھایا اور پھر اس طرح گھبرا گیا جیسے وہ کوئی پراسرار طاقت تھی جو دھات میں سمٹ کر منجمد ہو گئی تھی۔ جیسے وہ صدیوں سے بھٹکا ہوا کوئی راہی تھا جو نڈھال ہو کر ٹھہر گیا تھا۔ تانتیا نے چوکنا نظروں سے ہر طرف دیکھا،

کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ دیواروں کا سبز رنگ بڑا خوابناک معلوم ہو رہا تھا۔ خاموشی بہت گہری تھی اور تانتیا کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ مگر اس نے آرام نہ کیا۔ دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا۔ اس میں اندھیرے بھی تھا۔ باہر سے آنے والی روشنی کو کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے نے روک رکھا تھا۔ تانتیا نے اندھیرے سے وحشت زدہ ہو کر پردے پر ہاتھ مارا اور اسے نوچ کر پھینک دیا۔ روشنی اچانک کمرے میں پھیل گئی۔ تانتیا مسکرانے لگا۔ اس کمرے میں کوئی پلنگ نہ تھا۔ اور فرش بہت ٹھنڈا تھا۔ تانتیا کے برہنہ پیروں کے تلوے سنسنانے لگے۔

سامنے دیوار سے لگی ہوئی دو الماریاں تھیں۔ اس نے ایک کو کھولا۔ الماری میں میلے کپڑے بھرے تھے۔ اس نے جھنجھلا کر کپڑوں کو اٹھایا اور باہر پھینک دیا۔ پھر الماری کو اطمینان بخش نظروں سے دیکھنے لگا۔ الماری اتنی کشادہ تھی کہ وہ اس میں دبک کر سو سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کیا نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ ایک بار پھر سب کمروں میں جائے۔ اس نے الماری بند کر دی۔ دروازے کے ایک پٹ میں آئینہ آویزاں تھا۔ الماری کا دروازہ بند کرتے ہی آئینہ سامنے آ گیا۔ اس نے اپنا عکس دیکھا، الجھے ہوئے مٹیالے بال، بکھری ہوئی گھنی مونچھیں، گندی بے ترتیب ڈاڑھی اور اس دھندلے، دھندلے چہرے پر چھائی ہوئی ویرانی۔ اس نے خود کو پہچان کر بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ناگواری سے دھات کا مجسمہ اٹھایا اور آئینے پر دے مارا۔ آئینہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور الماری کے پیچھے سے چودہ پندرہ برس کی ایک کم سن سی لڑکی چیخ کر باہر آ گئی۔

تانتیا نے خوف زدہ ہو کر کہا ”کون ہے ری تو؟“

لڑکی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں نمو ہوں“۔

تانتیا کی سراسیمگی جاتی رہی۔ اسے خود پر غصہ آیا کہ وہ اس کمزور لڑکی سے ڈر کیوں گیا۔ جھنجھلا کر چیخا۔

”حرامزادی! تو یہاں کیا کر رہی تھی؟“

لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا ”میں تو ڈر کر یہاں چھپ گئی تھی“۔

تانتیا پوچھنے لگا ”تو یہاں اکیلی ہی ہے اور کوئی نہیں؟“

لڑکی نے بتایا ”ڈاکٹر ساب شام ہی کو چلے گئے۔ میں نے کہا مجھے بھی اپنے ساتھ موٹر میں لیتے چلو۔ لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے بھی کیسے جاتے۔ ہوائی جہاز میں دو ہی آدمیوں کی تو جگہ تھی“۔ یہ بتاتے بتاتے لڑکی کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت چھا گئی۔ ”وہ بھی چلے گئے، بی بی جی کو بھی لیتے گئے اور بابا کو بھی لے گئے“۔

لڑکی اداس ہو گئی۔

تانتیا نے پوچھا ”یہ بابا کون تھا؟“

لڑکی کا چہرہ نکھر گیا۔ اداسی کا غبار چھٹ گیا، چہک کر بولی ’ان کا ننھا، بہت بھولا بھالا تھا۔ بڑا پیارا سا، بالکل ربڑ کا سا لگتا تھا، آؤ تم کو بھی دکھا دوں“۔ وہ برابر والے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ تانتیا خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکی نے کمرے میں داخل ہو کر دیوار پر لگی ہوئی ایک خوبصورت بچے کی تصویر دکھائی، جو ایک لڑھکتی ہوئی گیند کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنسی کی دھوپ تھی اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

لڑکی کہنے لگی ”دیکھو! کتنا پیارا ہے!“

تانتیا سوچنے لگا کہ بچہ جس گیند پر لپک رہا ہے وہ گیند نہیں نمو ہے۔ نمو جواب اسے نہیں مل سکتی۔ نمو جو اس کے لیے اداس ہے۔ لیکن بچہ ہنس رہا تھا۔ وہ کیوں اداس ہو۔ اس کو کوئی اور نمو مل جائے گی۔ تانتیا نے سوچتے سوچتے غضب ناک ہو کر ہاتھ بڑھایا،

تصویر ایک جھٹکے سے کھینچی اور فرش پر پٹک دی۔
لڑکی خوفزدہ ہوکر بولی ''یہ کیا کیا تم نے؟''
تانتیا کہنے لگا ''تو بالکل الو کی پٹھی ہے۔ یہ بھی تو اسی ڈاکٹر کا بیٹا ہے جو تجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا''۔ لڑکی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی تصویر اٹھائی اور اسے گہر نظروں سے دیکھنے لگی۔ تانتیا سوچنے لگا کہ یہ لڑکی واقعی الو کی پٹھی ہے اور اس کا اپنا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے، اس کے پیر کے ناسور میں ٹیس اٹھ رہی ہے۔ اس نے نمو سے کہا ''اے لڑکی! ذرا کڑوا تیل لے آ، میں اپنے پیر کے زخم پر ملوں گا''۔
نمو اس کے قریب آگئی۔
''کیا ہوا تمہارے پیر میں؟''
تانتیا نے بتایا ''ناسور ہوگیا ہے''۔
لڑکی اس کے زخم میں دلچسپی لینے لگی ''تو اس کا علاج کیوں نہیں کرواتے''۔
تانتیا نے بتایا ''بہت علاج کروایا، ہسپتال میں بھرتی ہوگیا۔ پر یہ ڈاکٹر ہوتے ہی بدمعاش ہیں۔ سالوں نے علاج تو کچھ کیا نہیں، کہنے لگے کہ تم اپنا پیر گھٹنے پر سے کٹوا دو۔ نہیں تو ساری ٹانگ سڑ جائے گی۔ میں بھی ایک ہی سیانا نکلا۔ جس روز انہوں نے آپریشن کا انتظام کیا، میں رات ہی کو وارڈ کی کھڑکی پھاند کر بھاگ آیا۔ پھر کسی ڈاکٹر واکٹر کے پاس نہیں گیا۔ اپنا تو کڑوے تیل سے ہی کام چل جاتا ہے''۔
نمو نے جھٹ شلوار چڑھا کر اپنی پنڈلی دکھا دی ''دیکھو یہ کتنا بڑا نشان ہے۔ میرا تو اتنا بڑا گھاؤ ڈاکٹر ساب نے اچھا کر دیا''۔
تانتیا سوچنے لگا کہ اس کا اپنا پیر بڑا گھناؤنا ہے۔ اس پر چیتھڑے لپٹے ہیں۔ ناسور سے پانی بہہ رہا ہے اور نمو کی پنڈلی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے چہرے پر کنواریوں کا اچھوتا پن ہے، نرمی ہے، جوانی کی شگفتگی ہے۔ پھر نمو، نمو نہ رہی صرف ایک لڑکی، ایک عورت رہ گئی۔ تانتیا سوچتا رہا کہ اس گھر میں سب کچھ اس کا ہے۔ یہ خوبصورت کمرہ، یہ نرم نرم صوفہ، یہ لہراتے ہوئے پردے، یہ نکھری نکھری صاف شفاف دیواریں، اور یہ نمو صرف ایک لڑکی، ایک عورت، اور عورت کو بھی اس نے اتنے قریب نہیں پایا تھا۔
نمو نے تانیا کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی وحشت کو دیکھا اور گندی گندی آنکھوں کا وہ انداز جسے دیکھ کر وہ شرما بھی گئی، گھبرا بھی گئی۔ اس نے جھٹ اپنی پنڈلی چھپا لی۔ تانتیا جھنجھلا کر نمو کی طرف بڑھا وہ خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹنے لگی۔ تانتیا کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔ اس نے جھپٹ کر نمو کو بے ڈھنگے پن سے دبوچ لیا۔ اس کے لباس کو تار تار کر دیا۔ اس کے رخساروں کو چبا ڈالا۔ اس کی نرم نرم چھاتیوں کو، اس کی گداز بانہوں کو اور اس کے تمام جسم کو دانتوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ نمو دہشت زدہ ہوکر اسے دیکھتی رہی پھر چیخنے لگی پھر وہ بے ہوش ہوگئی۔
نمو کا برہنہ جسم فرش پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ دانتوں کے نشان تھے۔ رخسار نیلے پڑ گئے تھے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی، باہر زمستانی ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔
تانتیا نے نمو کے برہنہ جسم پر پرانا گاؤن ڈال دیا اور اس کے قریب بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔
تانتیا بیٹھا ہوا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ دھوئیں کے پیچ و خم لہراتے رہے۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ یکایک رات کے گہرے سناٹے میں ملی جلی انسانی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا۔ تانتیا بیٹھا ہوا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ شور بڑھتے بڑھتے قریب آگیا۔ پھر کوٹھی کے احاطے کی چاردیواری پھاندنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں

قدموں کی آہٹیں رک رک کر ابھرنے لگیں۔ پھر کچھ لوگ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر آ گئے۔ وہ سب بلوائی تھے ان کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ بلم تھے اور لاٹھیاں تھیں۔ چہروں پر ڈھاٹے بندھے تھے۔ تانتیا نے ان کو دیکھا اور اس طرح اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا جیسے وہ ان کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا جیسے وہ ان کو ہمیشہ سے جانتا تھا۔

پھر ان میں سے کسی نے پوچھا ''ابے تو کون ہے؟''

''تانتیا''۔

''ہندو ہے یا مسلمان؟''

''یہ تو میں نے بہت مدت سے سوچنا چھوڑ دیا کہ میں کون ہوں؟ تانتیا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''کیا بکتا ہے؟'' ایک بلوائی نے بڑھ کر اس کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا '' ٹھیک ٹھیک بتا''۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں''۔ تانتیا نے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر وہ مطمئن نہ ہوئے۔ تانتیا کے گال پر ایک اور کرارا تھپڑ پڑا۔ کسی نے ڈپٹ کر پوچھا ''سیدھی طرح بتاتا ہے کہ نہیں''۔ اس نے جھلکتا ہوا خنجر اس کے سامنے کر دیا ''اسے دیکھا ہے''۔

تانتیا خاموشی سے اٹھ کھڑا ہو گیا اور اپنی میلی چیکٹ پتلون کے بٹن کھولنے لگا۔ انہوں نے اسے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ''یہ کیا کر رہا ہے؟''

''پتلون اتار رہا ہوں''۔

''پتلون کیوں اتار رہا ہے؟''

''تاکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تصدیق کر لو کہ میں کون ہوں''۔ تانتیا نے مسکین سی شکل بنا کر کہا اور ایسی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو تم نے مجھے اب تک نہیں پہچانا، پھر انہوں نے جیسے اسے پہچان لیا۔ ''اچھا تو یہ تو ہے! ہم سے پہلے ہی یہاں پہنچ گیا''۔ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے نمو کی جانب ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

تانتیا نے کہا ''لڑکی!!!'' اور وہ مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز بھی تھا اور بے باکی بھی۔

وہ نمو کے جسم کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے گاؤن ہٹا دیا اور حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا ''ارے یہ تو بالکل ننگی ہے''۔ سب جھک کر دیکھنے لگے۔

وہ جھکے ہوئے بھوکی نظروں سے اسے دیکھتے رہے!

پھر کسی نے ان میں سے کہا ''ارے یہ تو مر گئی ہے۔ کیا دیکھ رہے ہو؟''

سب علیحدہ ہو کر بکھر گئے۔ نمو کے جسم پر گاؤن ڈال دیا گیا۔ اور وہ تجسس انگیز نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگے پھر کوئی بول اٹھا۔

''ڈاکٹر سالا سب کچھ لے گیا۔ اب یہاں کیا دھرا ہے''۔ وہ تانتیا کی طرف دیکھنے لگے۔

''ابے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ سالے کیا تو بھی جل کر مر جانا چاہتا ہے''۔

ایک بلوائی نے تانتیا کو دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ ''چل بھاگ یہاں سے''۔

تانتیا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا ''تو مار کیوں رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے، میں کوئی یہاں بیٹھا رہوں گا''۔

تانتیا مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوٹھی سے نکل کر باہر آ گیا۔

باہر آ کر تانتیا نے محسوس کیا کہ سڑک وہی ہے۔ جھلملاتی ہوئی روشنیاں وہی ہیں، سامنے ڈاکٹر کی کوٹھی بھی وہی ہے اور یہ

کوٹھی اس کی نہیں ہو سکتی کمرہ اس کا نہیں ہو سکتا، نرم نرم صوفہ اس کا نہیں ہو سکتا، لہراتے ہوئے پردے اس کے نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف تانتیا ہے، گاؤن اس نے نمو کو اوڑھا دیا تھا، دھات کا مجسمہ پھینک دیا تھا اور سگریٹ ختم ہو چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر کی کوٹھی سے دھواں اٹھنے لگا شعلے لال لال زبانیں نکال کر ابھرنے لگے۔ دروازے چیخ چیخ کر شور مچانے لگے پھر کوٹھی کے اندر نمو کی گھٹی ہوئی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ تانتیا کوٹھی کی طرف پلٹ پڑا، نمو ابھی زندہ تھی اور نمو اسے ابھی چاہیے بھی تھی۔

تانتیا شعلوں سے الجھتا ہوا کوٹھی میں گھس گیا۔ نمو کے پاس پہنچا۔ نمو دیکھتے ہی اس سے چمٹ گئی۔ تانتیا نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ وہ اسے لے کر باہر نکلنے لگا۔ اس کے چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ شعلے بھڑک رہے تھے۔ لکڑیاں چیخ، چیخ کر گرتیں تو چنگاریاں دور تک بکھر جاتیں، وہ شعلوں کے درمیان سے گزرتا، دھوئیں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ جھلس گیا تھا۔ ڈاڑھی جل کر اور خوفناک ہو گئی تھی۔ نمو نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ قصے کہانیوں کے بھوتوں کی طرح بھیانک معلوم ہوا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ تانتیا اسے اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ایک بار پھر سڑک پر آ گیا اور فٹ پاتھ پر دیواروں کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

تانتیا دیواروں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ اس کے چہرے پر جلن ہوتی رہی۔ اور نمو بازوؤں سے چمٹی رہی۔ پھر ایک پولیس لاری اس کے پاس آ کر رک گئی۔ دو کانسٹیبل اتر کر نیچے آئے اور اس کو ٹھہرالیا۔

''کہاں سے آ رہا ہے؟''

تانتیا نے نمو کو سامنے کر دیا ''میں تو اس لڑکی کو آگ سے نکال کر لا رہا ہوں''۔

انہوں نے گاؤن اٹھا کر دیکھا۔ نمو خوفزدہ نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ تانتیا نے جھٹ ہاتھ ہٹا دیا۔ ''اے اس کو نہ کھولو، یہ بالکل ننگی ہے''۔

وہ ہنسنے لگے۔ ''تو سالے اس کو لیے کہاں جا رہا ہے؟''

تانتیا نے حیرت سے پوچھا ''کیوں؟''

وہ بے باکی سے ہنسنے لگے ''ابے اسے کھڑا تو کر''۔

تانتیا نے نمو کو فٹ پاتھ پر کھڑا کر دیا، نمو بالکل چپ تھی، تانتیا بھی چپ تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے نمو کا بازو پکڑ کر ایک طرف کر لیا۔

''یہ ہمارے ساتھ لاری میں جائے گی۔ رات بھر تھانے میں رہے گی اور صبح رفیوجی کیمپ میں پہنچا دی جائے گی''۔

وہ نمو کو لے کر لاری کی طرف چلنے لگے۔ نمو اب بھی خاموش تھی۔

تانتیا کہتا رہا ''یہ میرے پاس رہے گی۔ میں نے اس کو آگ سے بچایا ہے۔ اسے میرے پاس رہنا چاہیے''۔

مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ نمو کو لاری میں بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے لاری کا انجن اسٹارٹ کیا اور وہ آگے بڑھ گئی۔ تانتیا لاری کو خوابناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ لاری دور ہوتی گئی نمو دور ہوتی گئی۔ نمو جس کا جسم لہراتے ہوئے پردوں کی طرح نرم تھا، جس کے چہرے پر کنواریوں کا اچھوتا پن تھا۔ نرمی تھی اور جوانی کی پھوٹتی ہوئی شگفتگی تھی۔ نمو صرف ایک لڑکی، ایک عورت، جسے اس نے اپنے قریب محسوس کیا تھا۔ جسے اس نے چھو کر دیکھا تھا۔

لاری اندھیرے میں اوجھل ہو گئی۔ تانتیا نے غصے سے فرش پر تھوک دیا اور پولیس والوں کو گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

تانتیا سڑک پر تھکا ہوا سا چلتا رہا مگر وہ جاتا بھی کہاں، سامنے مکان جل رہے تھے، شعلے لہرا رہے تھے۔ دھوئیں کے بادل

بلندیوں پر پھیلتے جارہے تھے، جلتے ہوئے مکانوں سے انسانی چیخیں ابھر رہی تھیں۔ وہ آگے نہ گیا ایک نیم کشادہ سڑک پر مڑ کر نشیب میں اتر گیا۔ قریب ہی گندا نالا تھا جو سڑک کے نیچے سے گزرتا تھا۔ تانتیا نالے کی پلیا کے نیچے گھس گیا۔

پلیا کے نیچے اندھیرا تھا۔ کیچڑ تھی اور بڑی تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ماچس جلا کر دیکھا قریب ہی ایک برہنہ لاش پڑی تھی۔ لاش پھول کر اکڑی تھی۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں کچھ اس طرح پھٹی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں دیکھو مجھے کتنی بے دردی سے قتل کر دیا گیا، میں نے انتقام نہیں لیا۔ مجھے انتقام لینا چاہیے تھا۔

وہ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف چلا گیا۔ جہاں زمین خشک تھی وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

تانتیا اندھیرے میں بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ اس کے چاروں طرف تاریکی ہے۔ کیچڑ ہے اور قریب ہی ایک لاش پڑی سڑ رہی ہے۔ جس کی زبان باہر نکل آئی ہے اور آنکھیں پھٹ گئی ہیں، باہر تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔

ایک آدمی گھبرایا ہوا پلیا کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ تانتیا اسے دیکھتا رہا۔ مگر جب وہ اندر آ کر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا تو تانتیا نے کہا ''وہاں کیچڑ میں کیوں کھڑے ہو، ادھر آ جاؤ۔ یہاں زمین صاف ہے''۔

وہ خوف سے چیخ کر بولا ''تم کون ہو؟''

تانتیا نے جل کر کہا ''میں کوئی بھی ہوں، کیچڑ میں کھڑے ہونے کا شوق ہے تو وہیں کھڑے رہو، نہیں تو ادھر چلے آؤ''۔

وہ تانتیا کے قریب آیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

ذرا ہی دیر بعد اس نے تانتیا سے پوچھا ''تم ہندو ہو یا مسلمان؟''

تانتیا جھنجھلا کر بولا ''میں کوئی بھی ہوں۔ ابے ہندو مسلمان کے بچے پہلے یہ بتا کہ کوئی سگرٹ وگرٹ بھی ہے؟''

''میرے پاس سگریٹ نہیں ہے، نہ جانے کس طرح جان بچا کر بھاگا ہوں، تمہیں سگریٹ کی پڑی ہے''۔

تانتیا ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ ''ابے جا بے تو بھی یونہی رہا''۔

اجنبی ذرا دیر خاموش رہ کر بولا ''یہاں تو بڑی بدبو ہے''۔

تانتیا نے ماچس جلائی اور سڑتی ہوئی لاش دکھلانے لگا ''دیکھو یہ کوئی مرا ہوا آدمی پڑا سڑ رہا ہے''۔

وہ خوفزدہ ہو کر تانتیا کے نزدیک سرک گیا پھر آہ بھر کر رقت انگیز لہجے میں بولا ''ہائے بے چارہ!''

''یار دکھ تو مجھے بھی ہو رہا ہے پر یہ سرکار بھی الو کی پٹھی ہے۔ اتنا گوشت بے کار سڑ کر جا رہا ہے''۔ تانتیا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ''یہی پچھلی جنگ کی بات ہے ہم لوگ برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کے خلاف لڑ رہے تھے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جاپانیوں نے ہیڈ کوارٹر والی سڑک بمباری کر کے تباہ کر دی۔ سڑک بند ہوئی تو ہمیں راشن ملنا بند ہو گیا۔ بس پوچھو نہ کہ کیا بیتی۔ ہم نے سامان لے جانے والی گاڑیوں کے خچروں کو مار مار کر کھانا شروع کر دیا۔ مگر خچر کا گوشت بہت خراب ہوتا ہے۔ سالا ہضم ہی نہ ہوتا تھا۔ پھر ہوائی جہازوں سے راشن پھینکا جانے لگا۔ اس میں ہمیں ایسا گوشت ملتا جسے سکھا کر ڈبوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ سچ کہتا ہوں کیا مزے کا گوشت ہوتا تھا۔ اب تمہیں بتاؤ کہ روز جو اتنے بہت سے آدمی بلوے اور فساد میں مر رہے ہیں، کتنا گوشت بیکار جا رہا ہے، سرکار اس کو سکھا کر کیوں نہیں رکھ لیتی۔ کال کے دنوں میں کام دے گا پھر کال تو یوں بھی پڑ رہا ہے، کتنے ہی بھوکوں کا بھلا ہو جائے گا۔ کہو استاد کیسی کہی؟'' تانتیا نے اس کی پیٹھ پر زور سے دھپ مارا ''ابے تو تو بہت تگڑا ہے! مرے گا تو بہت سا گوشت نکلے گا اور ڈھیر چربی بھی نکلے گی''۔

اجنبی خوف سے اچھل پڑا۔ اس کی جیبیں روپوں کی جھنکار سے کھنک اٹھیں۔

تانتیا نے جھٹ اس کی گردن دبوچ لی ''ابے تیرے پاس تو بڑی رقم ہے، لا نکال''۔
وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا ''میری گردن تو چھوڑ دو'' ۔ تانتیا نے اس کی گردن چھوڑ دی۔
وہ گڑگڑانے لگا ''مجھ ستائے ہوئے کو ستا کر تمہیں کیا ملے گا؟''
تانتیا ہنسنے لگا ''سیدھی سی بات ہے رقم ہاتھ لگے گی اور کیا'' ۔ وہ دھکا دے کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ دونوں ہاتھوں سے گردن دبا کر کہنے لگا ''ابے سیدھی طرح نکالتا ہے یا گھونٹ دوں گلا''۔
وہ بدحواس ہو کر بولا ''سب کچھ اندر کی جیب میں ہے نکال لو''۔
تانتیا نے اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ نوٹ نکالے، روپے نکالے اور ریزگاری تک نکال لی۔
وہ خوشامد کرنے لگا ''میرے پاس کچھ تو چھوڑ دو''۔
تانتیا پھر ہنسنے لگا ''ابے بہت دن تم نے ٹھاٹھ کئے ہیں، کچھ دن یونہی سہی''۔
''تمہارے دل میں ذرا رحم نہیں، میرا گھر جل رہا ہے، سب کچھ لٹ گیا، بیوی کو بھی مار ڈالا، بچوں کو بھی قتل کر دیا، میری جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے، اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے، عزت تو تھی وہ بھی برباد ہو گئی''۔ وہ آدمی بڑا اداس معلوم ہو رہا تھا۔ مگر تانتیا ہنستا رہا ''ابے تو اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے، تیری لڑکیوں کو کوئی نہ کوئی تو لے ہی جاتا، کوئی اور نہ لے گیا وہ لے گئے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟''
اجنبی خاموش بیٹھا رہا۔ اسے تانتیا سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر اسے اپنی جان بھی پیاری تھی وہ وہیں بیٹھا رہا۔ تانتیا نے اسے پھر چھیڑا۔
''ابے خاموش کیوں بیٹھا ہے، کچھ باتیں ہی کر''۔
وہ جھنجھلا کر بولا ''تم نے آج تک لوگوں کو دکھ ہی پہنچایا ہے یا اور بھی کچھ کیا ہے''۔
تانتیا نے تلملا کر کہا ''ابے! میں نے کیا کیا ہے، میں نے چلچلاتی دھوپ میں سڑکوں پر محنت کی ہے، کڑکڑاتی سردیوں میں پہرے داری کی ہے۔ فوج میں بھرتی ہو کر گولیاں کھائی ہیں۔ چوریاں کی ہیں۔ جیل کاٹی ہے، مار کھائی ہے، گالیاں سنی ہیں''۔ تانتیا تیزی سے بولتے بولتے اچانک بے نیازی سے ہنسنے لگا۔ ''اور اب میں بھوکوں مرتا ہوں، شرابیوں کا بچا کچھا کھانا کھاتا ہوں، گوشت کے ایک ایک ٹکڑے کے لیے کتوں سے لڑتا ہوں، سردی میں سنسان سڑکوں پر ٹھٹھراتا پھرتا ہوں۔ بتاؤ استاد تم نے یہ سب کچھ کیا ہے اور نہیں کیا تو تمہاری ایسی کی تیسی'' ۔ تانتیا نے اس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا۔ ''سالا! الو کا پٹھا! خواہ مخواہ رعب جھاڑتا ہے''۔
وہ آدمی سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ مگر تانتیا سے اب اکتا چکا تھا۔ اس آدمی سے اکتا چکا تھا۔ اندھیرے اور گھٹن سے اکتا چکا تھا۔ وہ اٹھا اور پلیا کے نیچے سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ خزاں کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ رات اور گہری ہو گئی تھی۔ ویران عمارتوں کی پشت پر چاند کی زرد، زرد روشنی ابھر رہی تھی۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے سوکھے درخت تارِ عنکبوت کی طرح الجھے ہوئے نظر آ رہے تھے، تانتیا درختوں کے نیچے چلنے لگا خشک پتے اس کے قدموں کے نیچے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہے تھے۔
سنسان سڑک پر اس کا سایہ بھوتوں کی طرح ڈراؤنا معلوم ہوتا، وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پھر ایک موڑ پر کسی نے ٹوکا۔
''کون آ رہا ہے؟''
تانتیا نے گھبرا کر دیکھا ایک فوجی سپاہی رائفل سنبھالے ہوئے اس کی طرف آ رہا تھا۔ تانتیا پلٹ کر دیواروں کے سایوں میں دبکنے لگا۔

مسلح فوجی نے للکارا "ہے!! ٹھہر جاؤ"۔
مگر تانتیا نہ رکا۔اس نے اپنی چال اور تیز کر دی۔
ناگاہ، رات کے پرہول سناٹے میں رائفل چلنے کی آواز گونجی۔ گولی تانتیا کی پسلیوں کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔سپاہی اس کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔
تانتیا نے اس کی طرف دیکھا، ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا "جوان! تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے کبھی میں بھی اتنا ہی سچا نشانہ لگاتا تھا، پر ان خوبیوں کی کون قدر کرتا ہے، جنگ ختم ہو گئی اور میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا"۔تانتیا نے ہاتھوں میں دبے ہوئے نوٹ، روپے اور ریزگاری سب کچھ سڑک پر **پھینک** دیا۔فوجی اپنی رائفل سنبھالے ہوئے حیرت سے دیکھتا رہا۔
تانتیا اس کی بے نیازی پر بھنا گیا۔جل کر بولا "اے دیکھ کیا رہا ہے، اس کو اٹھا لے، سالے اکڑتا کیوں ہے، کہیں ایک دن تیرا بھی یہی حال نہ ہو، اب اس وقت یہ رقم کام آئے گی"۔
فوجی نے جھنجھلا کر تانتیا کی کمر پر زور سے لات ماری اور روپیہ اٹھا کر چل دیا۔
تانتیا کے زخم سے خون بہتا رہا، اس کا جسم سنسان سڑک پر پھڑکتا رہا، ہوائیں سسکیاں بھرتی رہیں اور ویران گلیوں میں کتے روتے رہے۔
یہ کرفیو کی رات تھی، فسادات کی رات تھی، تانتیا کی زندگی کی آخری رات تھی۔تانتیا مر گیا لیکن اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک بھوک زندہ تھی۔

☆☆☆

پہلی لڑکی

عصمت چغتائی

جب صبح ہی صبح جھکی ہوئی نظروں سے ماتھے پر ذرا سا آنچل کھینچ کر حلیمہ نے بیگم کو سلام کیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں، خیر سے صاحبزادے کی طرف سے جو جان کو دھگدا لگا ہوا تھا۔ وہ تو دور ہوا۔ فوراً دریائے سخاوت میں ابال آ گیا چھ جوڑے جو اسی مبارک موقعے کے لیے تیار رکھے تھے۔ عنایت ہوئے۔ ہاتھوں میں نوگریاں، گلے میں تھسی اور طلائی ایران، جو صنوبر کی موت کے بعد چھوٹے میاں کی باندی کے لیے سینت لیے گئے تھے اپنے ہاتھ سے بیگم نے دے دیئے تیل، پھلیل، سرمہ، مسی اور اب تو نگوڑے پاؤڈر کا بھی فیشن چل گیا ہے۔ سب ہی کچھ مہیا کیا گیا صاحبزادے کو رنڈی میں بیگم کا مزہ ملنا چاہیے۔ باجرے کی روٹی بھی اگر چہ گھی سے کھائی جائے تو پراٹھوں کا لطف دیتی ہے۔

منہارن بی نے سرخ سبز چوڑیاں پہنائیں، غریب حلیمہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہی۔ منہارن بی کی گندی دعاؤں پر پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ مردان خانے سے ملحقہ چھوٹا سا گھر چھمن میاں اور ان کی باندی کے لیے جھاڑ پونچھ کر سنوارا گیا۔۔۔۔ باندی بھی عارضی بیوی ہوتی تھی۔ صاحبزادے کی خدمت گزاری سے جو وقت ملتا وہ سلائی کڑھائی اور گھر کی سجاوٹ میں صرف ہوتا۔ بھاری کام نہیں لیے جاتے زیادہ سے زیادہ گلوریاں بنا دینا، پان دھونا، سپاری کتر دینا، اپنے کپڑوں کے علاوہ میاں کے کپڑے دھوبی کو دینا لینا، کاج بٹن کا خیال رکھنا، غسل کروانا اور ایسے ہی ہلکے پھلکے کام۔ تبھی تو باقی چھوکریاں نواب زادوں کی باندیوں کو بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتیں، باسی سڑے کھانوں کے بجائے صاحبزادے کے ہاتھوں تر نوالے ملتے تھے۔ صاف ستھرا بستر، اپنے کام کے بعد مزے سے پیر پھیلائے سوئے اور چھمن پر تو سب لونڈیاں مرتی تھیں۔ بالکل اللہ میاں کی گائے تھے کبھی کسی کو ننگی ننگی نظروں سے گھورا تک نہیں۔ سب ہی کو ارمان تھا کہ اللہ ان نے نصیب میں بھی چھمن سرکار جیسا نواب زادہ لکھا ہو۔ گویوں نے پکڑ کر اسے سچ مچ دلہن بنا ڈالا۔ مہندی لگائی، خوب مل مل کر نہلایا، نگوڑی روپڑی۔ گندہ دھن چھوکریوں نے اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔

چھمن میاں کی خوشی تو نجم بٹیا کے ہار پھول سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوئی۔ زوردار رت جگا ہوا۔ نایاب بوبو مسجد میں طاق بھرنے گئیں۔ مقطع داڑھی دار مولوی نے میلاد مبارک پڑھا۔ رات کو شاندار دعوت ہوئی۔ گھر میں مراثنیں اور باہر قوال آئے۔ بڑے سرکار تو مجرے کی بھی ضد کر رہے تھے مگر ان کی منہ چڑھی رنڈی کسی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ تو پھر شادی کے سر کیا سینگ ہوتے ہیں! سچ پوچھیے تو کیا نہیں ہوا۔ جہیز بھی ملا۔ منہ دکھائی ہوئی۔ بس نکاح کے دو بول نہیں پڑھے گئے۔ ویسے چھمن میاں تو ہر سانس میں نکاح کے وعدے کرتے ہیں مگر نایاب بوبو کا کہنا ہے۔

"ان نواب بچوں کے وعدے پانی کا بلبلہ ہوتے ہیں۔ ویسے بنو جوتیں کھانے کا شوق ہو تو نکاح کرلو نکاح۔ ایک چھوڑ دس کرو، پر رہو گی باندی کی باندی۔۔۔۔ بیگم بننا تھا تو کسی نواب زادی کی کوکھ سے جنم لیا ہوتا"۔

شیرمال، شامی کباب اور بریانی کھا کر بیویاں گلوں میں گلوریاں دبا کر گاؤ تکیوں کے سہارے ہو بیٹھیں تو اللہ رکھے چھمن میاں اور خرمہ بٹیا کی شادی کا ذکر نکل آیا۔ حلیمہ، جو پاس بیٹھی گلوریاں لگا رہی تھی کتھے کی چمچی چونے میں اور چونے کی کتھے میں ڈالتی رہی۔ مریم باجی کی سالگرہ بھی اچانک ہو گئی۔ ویسے تو وہ جون میں پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن نومبر کوئی بہت فاصلے پر نہ تھا۔ دراصل یہ

دعوت انیس میاں کے کہنے پر ہوئی تھی۔ وہ مریم کے لیے ایک بہت لائق لڑکا ڈھونڈ کر لائے تھے، آج اسے ایک شاندار دعوت کے بہانے سے مریم سے ملایا جا رہا تھا۔

مریم سفید جھاگ سی ساڑھی میں واقعی کوئی مقدس روح لگ رہی تھی آج ان کی رنگت موم جیسی بے جان ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں انجانی اداسیاں تھیں۔ فرید احمد اسے مسحور ہو کر تک رہے تھے۔ نہ جانے انیس نے مریم کے کان میں کیا کہہ دیا کہ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ شادی کے لیے تیار نہیں تھیں۔ فرید احمد کو انیس گھیر کر لائے تھے۔

''مجھے شادی نہیں کرنا''۔ مریم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

''اے لڑکی دیوانی ہوئی ہے تمہارے پاپا بہت اچھی سروس دلوا دیں گے۔ لڑکا غریب گھرانے کا ہے مگر سید ہے۔

''وہ سید ہو یا شیخ، مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا''۔ وہ روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی تھیں۔ حرمہ کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں۔ سب آ چکے تھے، صرف منصور غائب تھے اور جب وہ میلی قمیص پہنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا پھیرتے بھری محفل میں آن دھمکے تو جی ہی جی میں اس کی ہتک ہو گئی۔

''اے لڑکے کہاں غائب تھا؟ ایسی کون سی نوکری ہے کہ دن ہے تو کام رات ہے تو کام۔ آج اتوار کو بھی کام تھا؟''

''اے ممانی بیگم نوکری نہ نوکری کی دم۔ بیگار ہے بیگار۔ تنخواہ نہیں ملتی''۔ افضل میاں نے تشریح کی۔

''اوئی خدا کی مار اس نوکری پر شاید اپنی مستقل نہیں ہوئے؟''

''اکابی تنخواہ کا تو ذکر ہی نہیں۔ مستقل ہو کر بھی نہیں ملتی''۔

''اے لوگو یہ کیسا اندھیرا ہے لڑکا دن رات کام میں جتا ہوئے ہے اور کوڑی نہیں ملتی۔ اے بھیا کیا اللہ واسطے کا کام ہے؟''

''اللہ واسطے کا کیوں شیطان واسطے کا کہو۔ یہ جو آئے دن شہر میں لاٹھی گولی چلتی ہے یہ ان ہی کی عنایت کا نتیجہ ہے''۔ حیدر چچا نے قہقہہ لگایا۔

''اے تو یوں کہو پولیس میں ہے۔ پر بھیا پولیس میں تو بڑی آمدنی ہے''۔ ایک چندھی سی نانی اماں بولیں۔

''اے اکابی تم ٹھہریں سدا کی کوڑھ مغز، تمہارے پلے نہیں پڑے گی یہ بات''۔

''کاہے تو سر کھپا رہی ہو؟ مزے سے چھالیا کاٹو چھالیا''۔

''اکابی یوں سمجھو کہ پولیس کی لاٹھیوں کے لیے کھوپڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس یہ لوگ کھوپڑیاں تھوک میں سپلائی کرتے ہیں''۔ حیدر چچا بولے۔

''اے ہے لڑکے یہ کیا سڑ پٹا ہے۔ ڈھنگ کی کوئی نوکری کیوں نہیں ڈھونڈتا؟''

اکابی بولے چلی گئیں۔

''آپ نوکر رکھ لیجیے اکابی۔ منصور نے اس کے پاس گھس کر کہا۔

''اے چل دیوانے''۔

''سچ اکابی۔ آپ کا پاندان مانجھا کروں گا، وضو کا لوٹا بھرا کروں گا اور۔۔۔۔۔۔ پان کٹی میں پان کوٹ کر کھلایا کروں گا''۔

''کیا مطلب؟ کتنی نوکریاں تم اکیلے کرو گے؟''

''نہیں صاحب میں اکیلا نہیں کروں گا۔ یہی کوئی دو ڈیڑھ لاکھ نوکریاں دلوا دیجیے۔ فی الحال کافی رہوں گا''۔

''آپ مذاق فرما رہے ہیں؟''۔ حیدر چچا نے طنز کیا۔

''نوکری تمہیں چاہیے یا پورے شہر کو؟'' مختار صاحب بولے۔
''جی عرض تو کیا کہ دو ڈیڑھ لاکھ بیکار ہیں شہر میں''۔
''اماں گھاس کھا گئے ہو۔ کیا کسی نے ساری دنیا کا ٹھیکہ لیا ہے''۔ افضل میاں چڑ گئے۔
''اوہ، تو آپ کا مطلب ہے صرف مجھے نوکری دلوائیں گے؟''
''اور نہیں تو بقول افضل میاں ٹھیکہ نہیں لیا''۔ حیدر چچا بولے۔
''تو آپ نے میرا ٹھیکہ لیا ہے؟''
''ایں؟'' چچا سٹپٹائے۔
''یعنی کیا مطلب؟''
''بھئی، وہ ہم نے سنا ہے کہ تم۔۔۔ یعنی کہ تم اور۔۔۔ ہمارا مطلب ہے حرمہ اور لاحول ولا قوۃ۔ اماں افضل میں تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ''
''آپ کو مریم بی بلاتی ہیں''۔ اس نازک موقعے پر بیرے نے آکر عزت رکھ لی اور منصور ''معاف کیجئے گا'' کہہ کر باہر آ گیا۔
''منصور میاں ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہیں، آخر نوکری سے کیوں انکار ہے؟''
''انکار تو نہیں'' منظور خود کو نوابوں کے نرغے میں دیکھ کر سٹپٹا گیا۔
''مل جائے تو کرو گے؟''۔ حیدر چچا بولے۔
''آ۔۔۔ آ۔۔۔ جی ہاں''۔
''بھئی نوکری حماقت ہے، پیسہ بنانا ہو تو بزنس کرو''۔
''خاص طور پر آپ کی بزنس''۔ رشید نے دبی زبان سے کہا۔
''یار رہنے دو جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ جائیں گے''۔ منظور نے کہنی ماری۔ پھر حیدر چچا سے کہا:
''جی آپ بالکل درست فرماتے ہیں''۔
''اور تم چاہو تو انگلینڈ کی نیشنلٹی دلوا سکتے ہیں تمہیں''۔
''چچا آپ کیوں انگلینڈ جا کر نہیں رہتے؟''۔ رشید نے پوچھا۔
''یہ تمہاری چچی اماں ہائے توبہ مچانے لگتی ہیں''۔
''اے ہے کون اتنی دور جا کے مٹی پلید کرائے۔ مرو تو فرنگیوں کے ہاتھوں عاقبت خراب ہو''۔ چچی نے تشریح کی۔
''بیگم اس کی تم چنتا نہ کرو، ہم انشاءاللہ پلین چارٹر کرا کے تمہاری میت لے آئیں گے''۔
''خدا نہ کرے، مریں اس کے دشمن۔ توبہ!'' اکا بی بگڑنے لگیں۔
''اماں بزنس۔۔۔ ڈیم بورنگ۔۔۔ بنیا پن''۔ منجھلے ماموں اپنی نویلی انگریز بیگم کے ساتھ آتے ہی میدان میں کود پڑے۔ پچھلے سیزن میں شملہ گئے تو بھتے چڑھ گئیں، یہ کیسے یہ ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ انکے عزیز ترین دوست مسٹر رب کی بیوی تھیں۔ گرمیوں میں انہیں تو توڑ کرنا تھے۔ بیگم کو شملے بھیج دیا۔ وہ منجھلے ماموں یعنی لیفٹیننٹ مختار کے ہاں ٹھہریں۔ دل ہی تو تھا۔ آ گیا، منجھلی ممانی کو طلاق دینی پڑی اور ایڈنا رب فی الحال تو ایڈنا مختار ہیں۔
''مرد آدمی کے لیے تو بس ایک ہی جوب ہے۔ ملٹری''۔ منجھلے ماموں نے منصور کی پیٹھ پر ایک دھپ مارا۔

''یار میں چلا''۔ منصور نے چپکے سے رشید سے کہا۔
''میاں وہ باڈی نکلے گی چند سال میں کہ کیا بتایئے۔ کیا سال آم توڑنے کی مگھی بنے ہوئے ہو''۔ انہوں نے اس بھونڈے پن سے منصور کے لمبے قد کا مذاق اڑایا کہ حرمہ بٹیا جل کر رہ گئیں۔ بات آگے بڑھتی مگر اشرف مختار کو اسی وقت اس کمرے میں لے جانے کے لیے آ گئے جہاں پینے پلانے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ رشید اور منصور بھی کیوں چوکتے۔ وہاں بھی بحث چلتی رہی۔ دو تین پیگ کے بعد منصور نے کہا۔
''اچھا صاحب میں نوکری کے لیے تیار ہوں، فرمایئے کتنے لوگوں کو آپ نوکریاں دلواتے ہیں''۔
''شرم نہیں آتی!'' حرمہ نے آستین پکڑ کر برآمدے میں کھینچ لیا۔
''مگر مریم باجی''۔
''نہیں۔ میں نے بلایا تھا''۔
''کیوں؟''
''ذرا قمیص دیکھئے کیا روشنائی سے بیل بوٹے چھاپے ہیں''۔
''صبح ہی تو پہنی تھی۔ پن لیک کرنے لگا''۔
''اور کل اسے رشید بھائی جان پہن چکے تھے۔ اتنے لوگ جمع ہیں آپ کو اچھا لگتا ہے کہ لوگ مذاق اڑائیں کسی کا۔ رشید کی گودڑ الماری میں سے اس نے ایک قمیص نکال کر دی۔
''جلدی سے بدل کر آ جایئے''۔
''جو حکم محترمہ کا''۔ منصور بڑے اچھے موڈ میں تھا۔
اوپر اپنے کمرے میں مریم سسکیوں سے رو رہی تھی انیس ان کی انگلیاں چوم کر سمجھا رہے تھے۔ ''ڈارلنگ بے بی، دنیا داری تو نباہنا ہی پڑے گی ویسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم میری ہو اور میری رہو گی''۔
''مجھے ڈر لگتا ہے انیس''۔
''اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ہنی''۔
''اسے پتا چل گیا تو؟'' اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔
''بڑا اگاؤدی سا ہے، اسے کیا پتا چلے گا؟ دیکھا نہیں تم نے کس بری طرح گھور رہا تھا تمہیں؟''
''گدھا کہیں کا!'' مریم غصے سے کانپ اٹھی۔
''ارے نہیں، غریب گھر کا لڑکا ہے بے چارا، اس نے تم جیسی قتالہ عالم لڑکیاں کہاں دیکھی ہوں گی۔ تمہارے پیر دھو دھو کر پیئے گا''۔
''میں زہر کھا لوں گی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوگا''۔
''میری جان کیوں رائی کا پہاڑ بنائے دیتی ہو''۔
''میں رنڈی نہیں ہوں، آج اسکی کل دوسرے کی''۔
''ہائے سویٹ بے بی، حالات تم جانتی ہو، ورنہ ذرا سوچو میرے دل پر کیا گزر رہی ہے! مصلحت اسی میں ہے''۔
''تو آپ طلاق کیوں نہیں لے لیتے! کیا فائدہ ڈھونگ رچانے سے؟'' مریم جل گئی۔

''کاش طلاق لے سکتا۔ ہماری سول میرج ہوئی تھی، دوسرے میرے اوپر اتنا قرض ہوگیا ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ یہ قرضہ کسی طرح چک جائے پھر میں کوئی نوکری تلاش کروں گا پھر تم کھلے بندوں میری ہو جاؤ گی۔ دوسری صورت کے لیے بھی تم تیار نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر میرا دوست ہے مگر اب تو بہت دیر ہوگئی میری جان''۔

''آپ مجھ سے بور ہو چکے ہیں پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں''۔ مریم رونے لگیں۔

''یہ تمہارا وہم ہے بے بی''۔

''تو پھر وہ لڑکی جس کے ساتھ آپ گھومتے پھرتے ہیں!''

''اوہ تم تو حد کرتی ہو بھئی بزنس کے سلسلے میں''۔

''میں خوب جانتی ہوں آپ کی بزنس''۔

''دیکھو ڈارلنگ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم تو ہماری بیگم سے بھی چار ہاتھ آگے نکل گئیں۔ اس نے تو میرے اوپر بھی پہرے نہیں بٹھائے''۔

''وہ خود جو ہر جائی ہیں، آپ کو کس منہ سے منع کرسکتی ہیں''۔

''میں بھی تو تمہیں منع نہیں کرتا، جانی مجھ سے زیادہ براڈ مائنڈڈ انسان تمہیں کہیں نہیں ملے گا''۔

''ہاں، آپ میرے دولہا ڈھونڈ کر لائے ہیں''۔

''مگر بے بی تم کوئی فرق نہیں پاؤ گی تم۔ آئی ایم رئیلی میڈ اباؤٹ یو۔ اچھا اب من بھی جاؤ''۔

انیس نے اتنا گدگدایا کہ وہ ہنس پڑی۔

آج الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ مئے ارغوانی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ بجائے حرمہ کے آج منصور کی نظریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ان نگاہوں میں اسے اپنی فتح کا عکس نظر آ رہا تھا۔ آج اس نے نہایت چست قمیص اور تنگ موری شلوار پہنی تھی۔ فاختہ کے پروں جیسا شفاف کا دوپٹہ نام چار کو کندھوں پر پڑا تھا۔ ساڑھے تین پانچ سینڈل پہن کر وہ منصور کے کان کی لو تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے کئی بار انجان بن کر منصور سے اپنے کو ناپا۔ کس قدر موزوں جوڑی تھی۔

چیدر چچا منصور کے پاس بیٹھے بڑے زور شور سے کوئی بالکل بے تکی بحث کر رہے تھے۔ جب ان پر چڑھنے لگتی تھی وہ ہر بات کی کاٹ کرنے لگتے تھے، حتیٰ کہ خود اپنی کاٹ شروع کر دیتے تھے۔ کبھی ایک دم کمیونسٹوں کے خلاف محاذ بنا لیتے اور منصور یا رشید کو گھیر کر الجھنے لگتے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا بھر کے کمیونسٹوں کی بے عنوانیوں کے یہی جواب دہ ہیں۔ اسوقت ان کے لہجے میں ہائیڈ روجن بم گرجنے لگتے۔ کبھی ایک دم پلٹا کھا جاتے اور خود کمیونسٹوں سے بھی زبردست کمیونسٹ بن جاتے کیونکہ کسی زمانے میں وہ بال بال سرخ ہوتے بچے تھے۔

''ارے ماں تم لوگوں سے بہتر کمیونزم تو ہمارے دفتر میں موجود ہے۔ پچھلے مہینے ہمارے چپراسی کی لڑکی کی شادی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا کہ سرکار صرف دو منٹ کے لیے آ جایئے۔ میری لاج رہ جائے گی۔ بس جناب ہماری بیگم کا دل موم کا تو ہے ہی پگھل گیا۔ فوراً ساڑھی لے کر پہنچی۔ حالانکہ تحفے صرف برابر والوں کو دیئے جاتے ہیں۔ مگر میں نے کہا: کیا چپراسی انسان نہیں؟ اور پھر مسلمان بھی ہے۔ کیا نیچ لوگوں کے دل نہیں ہوتا؟ بیگم تم ضرور تحفہ دو، خیر صاحب گئیں بیگم اور دیا تحفہ''۔

منصور اور رشید سمجھ گئے کہ ضرور یہ وہی ساڑھی ہوگی جس کے بارے میں مریم اور حرمہ کہہ رہی تھیں پرانے گوٹے والے نے دس روپے لگائے تھے۔ چچی بیگم یوں ٹھاٹ سے نئے ڈبے میں سجا کر لے گئیں کہ براتی دنگ رہ گئے۔

منصور، چچا سے باتیں کرنے میں منہمک تھا مگر اس کے ہاتھ ان کے پیچھے سے گزر کر ان کے دوسرے بازو پر بیٹھی ہوئی حرمہ کے ریشمی بالوں میں بھٹک رہا تھا۔

''چاند خان چپراسی خوشی کے مارے پاگل ہو گیا۔ میرے پیر پکڑ لیے غریب نے، بتائیے صاحبزادے اسلام میں کمیونزم میں کیا فرق ہے؟ اللہ پاک فرماتا ہے اپنے غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرو''۔ چچا ہانک رہے تھے۔

''جی بجا فرماتے ہیں آپ''۔ منصور سوچے سمجھے جواب دے رہا تھا۔ اس کی روح اس وقت اس ہاتھ میں کھینچ آئی تھی جو حرمہ کے بالوں سے پھسل کر گردن پر لرز رہا تھا وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا قبلہ میں قطعی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہوں مگر خدارا ایسے گردن موڑ یئے کہ حرمہ ڈر کر دور ہو جائے۔

''اللہ پاک فرماتا ہے جو دنیا میں میرے نام پر ایک درم دے گا اسے عقبیٰ میں ستر ہزار درہم ملیں گے۔

''سودا برا نہیں''۔ منصور نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔ حرمہ نے اس کی انگلی میں باریک سی چٹکی لی اور وہ اچھل پڑا۔ چچا چونکے ہو گئے۔ حرمہ چھپ سے اٹھ کر بھاگی انہوں نے گردن موڑی تو منصور بھی غائب تھا، بے چارے حیران رہ گئے۔ انہیں شبہ بھی نہ تھا کہ یہ دونوں انہیں ٹٹی بنائے پیٹھ پیچھے چوہے پکڑ رہے تھے۔

کسی نے دونوں کو پائیں باغ کی طرف جاتے نہ دیکھا۔ سوائے فرخندہ بانو کے، ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور دل نے ٹھیس محسوس کی یا ایک جھلک چھمن میاں نے دیکھی جو دیر سے آنے کی معذرت کر رہے تھے۔ اگر چھمن کبھی چوری چوری اس کی طرف دیکھتے بھی تو یوں جیسا چوہا بلی کو دیکھتا ہے۔ حرمہ ان سے چڑی ہوئی بھی تھی مگر آج تو وہ بڑے بانکے ترچھے لگ رہے تھے۔ جسم پر بوٹی بھی آ گئی تھی۔ بال بھی برل کریم لگا کر سنوارے گئے تھے۔ ضرور حلیمہ نے بنا سنوار کر سسرال بھیجا ہوگا!

سارے خاندان کو معلوم تھا کہ حلیمہ چھمن پر دو آتشہ بن کر چھا گئی ہے۔ چھمن کی دلہن کو بڑے تیر و تفنگ استعمال کرنے پڑیں گے۔ انہیں تو دنیا میں سوائے حلیمہ کے دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔ کیا وحشت ہے! کیا سرور ہے! پانی کا سا لطف کہ روز پینے کے بعد بھی ہمیشہ کے لیے پیاس نہ بجھتی۔

چھمن نے آج بے باکی سے حرمہ کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی نظروں میں منگیتر کی حیثیت سے کوئی پیغام نہ تھا۔ برادرانہ دلچسپی کا اظہار ضرور کیا۔ حرمہ نے مسکرا کر انہیں ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور باغ کی طرف بھاگ گئی۔

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، وہ سیدھی غسل خانے میں جا کر منہ پر سرد پانی کے چھپکے مارنے لگی۔ جب دل کی دھڑکن ذرا قابو میں آئی بال ٹھیک کرنے کے لیے وہ مریم کے کمرے میں چلی گئی۔ بجلی جا لگی تو دھک سے رہ گئی۔

مریم کی نازک پلنگڑی پر سفید جھاگ جیسی آب رواں کی ساڑھی موجیں مار رہی تھی جس کے اتار چڑھاؤ میں پتلون زدہ ٹانگیں غوطہ زن تھیں۔ وہ گرتی پڑتی الٹے پیروں بھاگی دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی وہ تیزی سے زینے پر سے اترنی لگی۔ آخری سیڑھی پر اس کا پیر دوپٹے میں الجھا اور وہ اوندھے منہ منصور کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں گری۔

حرمہ کو بدحواس دیکھ کر منصور بھی پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے اسے سنبھال کر پوچھا۔ حرمہ ایک دم سسک کر رو پڑی اور اپنا منہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اس قربت نے آگ پر تیل کا کام کر دیا مولسری کے تناور درخت کے نیچے دونوں پگھل کر بہہ گئے۔

''اف! یہ لڑکیوں کی قمیض کہاں سے کھلتی ہے؟ ہزاروں بٹن لاکھوں ہک!''

ڈرائنگ روم میں نوجوان لڑکے لڑکیاں میوزیکل چیئر کھیل رہے تھے۔ ان کے قہقہے اور تالیوں کی آواز دور کسی دنیا سے

آرہی تھی۔کائنات سنسان تھی۔سوائے دو دلوں کی دھڑکن کے۔

منصور نے دھند لکے میں حرم کے نیم پیاسے ہونٹ اور چاہت سے سلگتی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔اسے کے کاغذ جیسے سفید گالوں پر موتی اب تک چمک رہے تھے۔ابلی چاندنی جیسا کنوارا سینہ کنول کے پھولوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ٹھنڈی زمین پر دھکتی ہوئی حرمہ اور چار بڑے پیگ کا نشہ!

آنکھیں۔۔۔۔معصوم بھوکی آنکھیں انجانی خواہشات سے چھلکتی آنکھیں حرمہ کی آنکھیں۔۔۔۔منصور کی آنکھیں!اس کی محبوبہ کی آنکھیں!پیارے دوست کی آنکھیں۔

جیسے زور سے کسی نے اسے دھکیل دیا۔وہ بچوں کی طرح سہم گیا اور کہنیوں میں منہ چھپالیا۔وہ شیر جو دو پل پہلے زور و شور سے گرج رہا تھا دبک کر غار میں واپس لوٹ گیا۔ڈرتے ڈرتے حرمہ نے اس کا ہاتھ چھوا۔اس کے گالوں پر لمبے لمبے آنسو بہہ رہے تھے۔سینے میں سسکیاں ابل رہی تھی۔

دیر تک دونوں خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔جب سانسیں ٹھہر گئیں حواس واپس آئے تو منصور نے اس کے دونوں سرد ہاتھ اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر رکھ لیے۔

اس حرکت میں وحشیانہ خواہش تھی ،نرم و نازک پیار تھا۔

جب دونوں شوروغوغا کی طرف واپس لوٹے تو ایسا معلوم ہوا ساتھ ساتھ کوئی خواب دیکھ کر آئے ہیں۔عمداً ایک دوسرے سے دور دور، دو نازک بلبلوں کی طرح الگ الگ کہ کہیں ٹکرا کر پھوٹ نہ جائیں۔مریم سے آنکھ ملانے کی حرمہ کو ہمت نہیں ہو رہی تھی۔انیس سے اسے گھن آرہی تھی۔مگر اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مریم فرید سے بڑے شرارت بھرے انداز ے میں میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔انیس دونوں کی باگیں تھامے ہانک رہے تھے۔

چھمن معافی مانگ کر جا چکے تھے اور ان کی پیاری امی اور رنایاب بو بو بڑبڑا رہی تھیں:

”اے میں قربان!کیوں فکر کرتی ہیں؟ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات!اللیاں لگیں کہ موئی صاحبزادے کے جی سے اتری“اور حرمہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس گدھے نے حلیمہ کو چھوڑ دیا تو وہ اس کے منہ پر تھوک دے گی۔

☆☆☆

بہروپیا

غلام عباس

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری عمر بس کوئی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ ہم جس محلے میں رہتے تھے وہ شہر کے ایک بارونق بازار کے پچھواڑے واقع تھا۔ اس جگہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ یا غریب غربا ہی آباد تھے۔ البتہ ایک پرانی حویلی وہاں ایسی تھی جس میں اگلے وقتوں کی نشانی کوئی صاحبزادہ صاحب رہا کرتے تھے، ان کے ٹھاٹھ تو کچھ ایسے امیرانہ نہ تھے مگر اپنے نام کے ساتھ ''رئیس اعظم'' لکھنا شاید وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ادھیڑ عمر بھاری بھرکم آدمی تھے۔ گھر سے باہر ذرا کم ہی قدم نکالتے، ہاں ہر روز تیسرے پہر حویلی کے احاطہ میں اپنے احباب کے جھرمٹ میں بیٹھ کر گپیں لڑانا اور زور زور سے قہقہے لگانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

ان کے نام کی وجہ سے اکثر حاجت مند، یتیم خانوں کے ایجنٹ اور طرح طرح کے چندہ اگاہنے والے ان کے دروازے پر سوالی بن کر آیا کرتے۔ علاوہ ازیں جادو کے پروفیسر، رمال، نجومی، نقال، بھاٹ اور اسی قماش کے دوسرے لوگ بھی اپنا ہنر دکھانے اور انعام اکرام پانے کی توقع میں آئے دن ان کی حویلی میں حاضری دیا کرتے۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، ایک بہروپیا بھی طرح طرح کے روپ بھر کر ان کی حویلی میں آیا کرتا، کبھی خاکی کوٹ پتلون پہنے، چمڑے کا تھیلا گلے میں ڈالے، چھوٹے چھوٹے شیشوں اور نرم کمانیوں والی عینک آنکھوں پر لگائے چٹھی رساں بنا ہر ایک سے بیرنگ خط کے دام وصول کر رہا ہے۔ کبھی جٹادھاری سادھو ہے، لنگوٹ کسا ہوا، جسم پر بھبوت رمائی ہوئی، ہاتھ میں لمبا سا چمٹا، سرخ سرخ آنکھیں نکال نکال ''بم مہادیو'' کا نعرہ لگا رہا ہے۔ کبھی بھنگن کے روپ میں ہے جو سرخ لہنگا پہنے، کمر پر ٹوکرا، ہاتھ میں جھاڑو لیے جھوٹ موٹ پڑوسنوں سے لڑتی، بھڑتی آپ ہی آپ بکتی جھکتی چلی آ رہی ہے۔

میرے ہم سبقوں میں ایک لڑکا تھا مدن۔ عمر میں تو وہ مجھ سے ایک آدھ برس چھوٹا ہی تھا مگر قد مجھ سے نکلتا ہوا تھا، خوش شکل بھولا بھالا مگر ساتھ ہی بچوں کی طرح بلا کا ضدی۔ ہم دونوں غریب ماں باپ کے بیٹے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اسکول کے بعد کبھی وہ میرے محلے میں کھیلنے آ جاتا، کبھی میں اس کے ہاں چلا جاتا۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مدن صاحبزادہ صاحب کی حویلی کے باہر سڑک پر گیند سے کھیل رہے تھے کہ ہمیں ایک عجیب سی وضع کا بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ اس نے مہاجنوں کے انداز میں دھوتی باندھ رکھی تھی، ماتھے پر سیندھور کا ٹیکا تھا۔ کانوں میں سنہری بالے، بغل میں ایک لمبی سی سرخ بہی داب رکھی تھی۔ یہ شخص حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر پل بھر کو رکا، پھر اندر داخل ہو گیا۔

میں فوراً جان گیا، یہ حضرت سوائے بہروپیے کے اور کون ہو سکتے تھے۔ مگر مدن ذرا ٹھٹکا۔ اس نے بہروپیے کی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے ذرا چھیڑنے کو پوچھا:

''مدن جانتے ہو ابھی ابھی اس حویلی میں کون گیا ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں''۔

''بھلا بتاؤ تو؟''

''کوئی مہاجن تھا''۔

''یہاں کیوں آیا؟''

''میں کیا جانوں۔ تمہارے اس رئیس اعظم نے کچھ قرض ورض لیا ہوگا اس سے''۔

''ارے نہیں پگلے یہ تو بہروپیا ہے بہروپیا!''

''بہروپیا؟'' مدن نے کچھ حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''بہروپیا کیا ہوتا ہے؟''

''ارے تم نہیں جانتے۔ یہ لوگ طرح طرح کے روپ بھر کر امیر امراء کو اپنا کمال دکھاتے ہیں اور ان سے انعام لیتے ہیں''۔

''تو کیا یہ شخص ہر روز آتا ہے؟''

''نہیں، ہفتے میں بس دو ایک ہی بار۔ روز روز آئے تو لوگ پہچان جائیں۔ بہروپیوں کا کمال تو بس اسی میں ہے کہ ایسا سوانگ رچائیں کہ لوگ دھوکا کھا جائیں اور سچ سمجھنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ کسی شہر میں دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے''۔

''کیا ان کو ہر دفعہ انعام ملتا ہے؟''

''نہیں تو۔ یہ جب پندرہ بیس مرتبہ روپ بھر چکتے ہیں تو آخری بار سلام کرنے آتے ہیں، بس یہی وقت انعام لینے کا ہوتا ہے''۔

''بھلا کتنا انعام ملتا ہوگا انہیں؟''

''کچھ زیادہ نہیں، کہیں سے ایک روپیہ کہیں سے دو روپے اور کہیں سے کچھ بھی نہیں۔ یہ رئیس اعظم صاحب اگر پانچ روپے بھی دے دیں تو بہت غنیمت جانو۔ بات یہ ہے کہ آج کل اس فن کی کچھ قدر نہیں رہی۔ اگلے وقتوں کے امیر لوگ تو اس قسم کے پیشے والوں کو اتنا اتنا انعام دے دیا کرتے تھے کہ انہیں مہینوں روزی کی فکر نہ رہتی تھی۔ مگر آج کل تو یہ بے چارے بھوکوں مر رہے ہوں گے اور۔۔۔۔۔۔''

میں کچھ اور کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں وہی بہروپیا مہاجن بنا ہوا حویلی کے پھاٹک سے نکلا۔ مدن جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ بہروپیا ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر بازار کی طرف چل دیا۔

بہروپیے کا پیٹھ موڑنا تھا کہ مدن نے اچانک میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا:

''اسلم آؤ اس بہروپیے کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں رہتا ہے، اس کا گھر کیسا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی میک اپ روم تو ہوگا ہی، شاید اس تک ہماری رسائی ہو جائے، پھر میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی اصلی صورت میں کیا لگتا ہے''۔

''مدن دیوانے نہ بنو''۔ میں نے کہا ''نجانے اس کا ٹھکانہ کدھر ہے۔ ہم کہاں مارے مارے پھریں گے۔ نجانے ابھی اس کو اور کن کن گھروں میں جانا ہے۔۔۔۔''

مگر مدن نے ایک نہ سنی۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا لے چلا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کے مزاج میں طفلانہ ضد تھی۔ ایسے لوگوں کے سر پر جب کوئی دھن سوار ہو جائے تو جب تک اسے پورا نہ کرلیں نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔ ناچار میں اس کی دوستی کی خاطر اس کے ساتھ ہو لیا۔

یہ گرمیوں کی ایک شام تھی، کوئی چھ کا عمل ہوگا، اندھیرا ہونے میں ابھی کم سے کم ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگانے لگا۔ ہمارا علاقہ شہر کے عین وسط میں ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے اگر بہروپیے نے آدھے شہر کا احاطہ بھی کرلیا ہو تو ابھی آدھا شہر باقی ہے جہاں اسے اپنے فن کی نمائش کے لیے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر زیادہ نہیں تو دو گھنٹے تو ضرور ہی ہمیں اس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک سے دوسرے بازار میں گزرتا جا رہا تھا۔ راستے میں جب کبھی کوئی بڑی حویلی یا کسی مکان کا

دیوان خانہ نظر آتا تو وہ بلاتکلف اندر داخل ہو جاتا اور ہمیں دو تین منٹ باہر اس کا انتظار کرنا پڑتا۔ بعض بڑی بڑی دکانوں میں بھی اس نے حاضری دی مگر وہاں وہ ایک آدھے منٹ سے زیادہ نہ رکا۔

شفق کی کچھ کچھ سرخی ابھی آسمان پر باقی تھی کہ ان حاضریوں کا سلسلہ ختم ہو گیا کیونکہ بہروپیا اب شہر کے دروازے سے باہر نکل آیا تھا اور فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

ہم نے اب تک بڑی کامیابی سے اپنے کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ اس میں بازاروں کی ریل پیل سے ہمیں بڑی مدد ملی تھی مگر اب ہم ایک غیر آباد علاقے میں تھے جہاں اکا دکا آدمی ہی چل پھر رہے تھے۔ چنانچہ ہمیں قدم قدم پر یہ دھڑکا تھا کہ کہیں اچانک وہ گردن پھیر کر ہمیں دیکھ نہ لے۔ بہر حال ہم انتہائی احتیاط کے ساتھ اور اس سے خاصی دور رہ کر اس کا تعاقب کرتے رہے۔

ہمیں زیادہ چلنا نہ پڑا۔ جلد ہی ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں فصیل کے ساتھ ساتھ خانہ بدوشوں اور غریب غربا نے پھونس کے جھونپڑے ڈال رکھے تھے۔ اس وقت ان میں سے کئی جھونپڑوں میں چراغ جل رہے تھے۔ بہروپیا ان جھونپڑوں کے سامنے سے گزرتا ہوا آخری جھونپڑے کے پاس پہنچا جو ذرا الگ تھلگ تھا۔ اس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی تین برس ہو گی اور ایک پانچ برس کا لڑکا زمین پر بیٹھے کنکریوں سے کھیل رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے بہروپیے کو دیکھا، وہ خوشی سے چلانے لگے: ''ابا جی آ گئے! ابا جی آ گئے!'' اور وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بہروپیے نے ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، پھر وہ ٹاٹ کا پردہ سرکا کر بچوں سمیت جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ میں نے مدن کی طرف دیکھا۔

''کہو اب کیا کہتے ہو؟''

''ذرا رکے رہو۔ وہ ابھی مہاجن کا لباس اتار کر اپنے اصلی روپ میں باہر نکلے گا۔ اتنی گرمی میں اس سے جھونپڑے کے اندر کہاں بیٹھا جائے گا''۔

ہم نے کوئی پندرہ بیس منٹ انتظار کیا ہو گا کہ ٹاٹ کا پردہ پھر سرکا اور ایک نوجوان آدمی ململ کی دھوتی کرتا پہنے پٹیاں جمائے، سر پر دو پلی ٹوپی ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھے جھونپڑے سے باہر نکلا، بوڑھے مہاجن کی سفید مونچھیں غائب تھیں اور ان کی بجائے چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر زیب دے رہی تھیں۔

''یہ وہی ہے''۔ یکبارگی مدن چلا اٹھا۔ ''وہی قد، وہی ڈیل ڈول''۔

اور جب ہم اسے کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو اس کی چال بھی ویسی ہی تھی جیسی مہاجن کا پیچھا کرنے میں ہم نے مشاہدہ کی تھی۔ میں اور مدن حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اب کے اس نے یہ کیسا روپ بھرا؟ اس وقت وہ کن لوگوں کو اپنے بہروپ کا کمال دکھانے جا رہا ہے؟

وہ شخص کچھ دور فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، پھر ایک گلی میں ہوتا ہوا دوبارہ شہر کے اندر پہنچ گیا۔ ہم بدستور اس کے پیچھے لگے رہے۔ وہ بازار میں چلتے چلتے ایک پنواڑی کی دکان پر رک گیا۔ ہم سمجھے کہ شاید پان کھانے رکا ہے مگر نہ تو اس نے جیب سے پیسے نکالے اور نہ پنواڑی نے اسے پان ہی بنا کے دیا، البتہ ان دونوں میں کچھ بات چیت ہوئی جسے ہم نہیں سن سکے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ پنواڑی دکان سے اتر آیا اور بہروپیا اس کی جگہ گدی پر بیٹھ گیا۔

پنواڑی کے جانے کے بعد اس دکان پر کئی گاہک آئے جن کو اس نے سگریٹ کی ڈبیاں اور پان بنا بنا کر دیئے۔ وہ پان بڑی چابکدستی سے بناتا تھا جیسے یہ بھی کوئی فن ہو۔

ہم کوئی آدھے گھنٹے تک بازار کے نکڑ پر کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہے، اس کے بعد ایک دم ہمیں سخت بھوک لگنے لگی اور ہم وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے۔

اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آٹھ نو بجے تک سو کر کل کی تکان اتاروں گا مگر ابھی تو رکا تڑکا ہی تھا کہ کسی نے میرا نام لے لے کر پکارنا اور دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا تو مدن تھا۔

میں پیچ وتاب کھاتا سیڑھیوں سے اترا۔

''اسلم جلدی سے تیار ہو جاؤ''۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''جلدی کرو، کہیں بہروپیا صبح ہی صبح گھر سے نہ چل دے''۔

اور اس نے مجھے ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ میرا دل فوراً پسیج گیا۔

جب ہم کبھی دوڑتے، کبھی تیز تیز قدم اٹھاتے فصیل کی طرف جا رہے تھے تو مدن نے مجھے بتایا کہ رات بھر وہ بہروپیے کو خواب میں طرح طرح کے روپ میں دیکھتا رہا، پھر صبح کو چار بجے کے قریب آپ ہی آپ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کے بعد پھر اسے نیند نہ آئی۔

ابھی سورج نکلنے نہیں پایا تھا کہ ہم بہروپیے کے جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے۔ پچھلی رات ہم نے اندھیرے میں اس علاقے کا صحیح جائزہ نہ لے سکے تھے مگر اب دن کی روشنی میں ہمیں ان جھونپڑوں کے مکینوں کی غربت اور خستہ حالی کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ بہروپیے کے جھونپڑے پر ٹاٹ کا جو پردہ پڑا تھا اس میں کئی پیوند لگے تھے۔

ہم دو تین بار اس کے جھونپڑے کے سامنے سے گزرے۔ ہر بار ہمیں اندر سے بچوں کی آوازیں، دو ایک نسوانی آوازوں کے ساتھ ملی ہوئی سنائی دیں، آخر کوئی دس منٹ کے بعد ایک شخص بوسیدہ سا تہمد باندھے، بنیان پہنے، ایک ہاتھ میں گڑوی تھامے جھونپڑے سے برآمد ہوا۔ اس کی داڑھی مونچھ صاف تھی۔ سانولا رنگ، اس کو دیکھ کر اس کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔

وہ شخص آگے آگے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے کچھ دور فصیل کے ساتھ ساتھ چلے۔ آگے ایک باڑا آیا جس میں کچھ گائیں، بھینسیں کھونٹوں سے بندھی ہوئی تھیں، وہ شخص اس باڑے کے اندر چلا گیا اور میں اور مدن باہر ہی اس کی نظروں سے اوجھل ایک طرف کھڑے ہو گئے جہاں سے ہم اس کی حرکات وسکنات کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے ایک بھینس کو پچکارا، پھر وہ زمین پر بیٹھ کر اس کے تھنوں کو سہلانے لگا، اس کو دیکھ کر ایک بڈھا جو بھینسوں کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک بڑی سی بالٹی لے آیا۔ اب اس شخص نے بھینس کو دوہنا شروع کیا۔ ہم اگرچہ اس سے کچھ دور کھڑے تھے مگر دودھ کی دھاروں کی آواز دھیمی سن سکتے تھے۔

جب وہ ایک بھینس کو دوہ چکا تو دوسری کی طرف گیا، پھر تیسری کی طرف، اس کے بعد گایوں کی باری آئی۔ اس نے دو تین گایوں کو بھی دوہا، جن کے دودھ کے لیے بڈھے نے ایک اور بالٹی لا کر رکھ دی تھی۔

اس کام میں کوئی ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ بڈھے نے اس کی گڑوی کو دودھ سے بھر دیا جسے لے کر وہ باڑے سے نکل آیا۔ ہم پہلے ہی وہاں سے کھسک لیے تھے جب وہ ذرا دور چلا گیا تو میں نے مدن کو چھیڑنے کے لیے کہا:

''لو اب تو حقیقت کھل گئی تم پر۔ چلو اب گھر چلیں۔ ناحق تم نے میری نیند خراب کی''۔

''مگر بھیا وہ بہروپیا کہاں تھا۔ وہ تو گوالا تھا گوالا۔ آؤ تھوڑی دیر اور اس کا پیچھا کریں''۔

میں نے مدن سے زیادہ حیل و حجت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے ہم نے اس کا ٹھکانہ تو دیکھ ہی لیا تھا اب وہ ہماری نگاہوں سے کہاں چھپ سکتا تھا۔

جب ہمیں اس کے جھونپڑے کے آس پاس گھومتے آدھ گھنٹہ ہوگیا تو ہمیں ایک تانگہ فصیل کے ساتھ والی سڑک پر تیزی سے ادھر آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ تانگہ بہروپیے کے جھونپڑے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس میں کوئی سواری نہ تھی جو شخص تانگہ چلا رہا تھا اس نے تانگے کی گھنٹی پاؤں سے دبا کر بجائی۔ اس کی آواز سنتے ہی ایک آدمی جھونپڑے سے نکلا، اس نے کوچوان کا سا خاکی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر تانگے والا تانگے سے اتر پڑا اور یہ شخص تانگے میں آ بیٹھا اور راسیں تھام گھوڑے کو بڑی مہارت سے ہانکنے لگا۔ جیسے ہی تانگہ چلا پہلے شخص نے پکار کر کہا۔

''تانگہ ٹھیک دو بجے اڈے پر لے آنا''۔

دوسرے شخص نے گردن ہلائی۔ اس کے بعد ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تانگہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں اور مدن یہ ماجرا دیکھ کر ایسے حیران رہ گئے کہ کچھ دیر تک ہماری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ آخر مدن نے سکوت کو توڑا۔

''چلو یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ یہ شخص دو بجے تک کیا کرے گا۔ اتنی دیر تک ہمیں بھی چھٹی ہوگئی۔ اب ہمیں ڈھائی تین بجے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے''۔

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سچ یہ ہے کہ اس بہروپیے کے معاملے سے اب خود مجھے بھی بہت دل چسپی پیدا ہوگئی تھی اور میں اس کی اصلیت جاننے کے لیے اتنا ہی بیتاب ہوگیا تھا جتنا کہ مدن۔

ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر تین بجے سے پہلے ہی پھر بہروپیے کے جھونپڑے کے آس پاس گھومنے لگے۔ جھونپڑے کے اندر سے بچوں اور عورتوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کسی مرد کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس سے ہم نے اندازہ کرلیا کہ بہروپیا گھر واپس پہنچ گیا ہے۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور اب کے بہروپیا ایک اور ہی دھج سے باہر نکلا۔ اس نے سیاہ چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر کالی پگڑی جو بڑی خوش اسلوبی سے باندھی گئی تھی۔ گلے میں رنگ برنگی تسبیحیں، ترشی ہوئی سیاہ داڑھی، شانوں پر زلفیں بکھری ہوئی۔ اس نے بغل میں لکڑی کی ایک سیاہ صندوقچی داب رکھی تھی معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے ایک صوفی درویش کا سوانگ بھرا ہے۔ مگر ابھی کل ہی تو وہ مہاجن کے روپ میں شہر کا دورہ کر چکا تھا اور کوئی نیا روپ بھرنے کے لیے اسے دو تین دن کا وقفہ درکار تھا، پھر آج کس لیے اس نے یہ وضع بنائی ہے؟ اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ ہم چپکے چپکے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، وہ شخص جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا شہر میں داخل ہوگیا۔ وہ کئی بازاروں میں سے گزرا مگر خلاف معمول وہ کسی حویلی یا دکان پر نہیں رکا۔ معلوم ہوتا تھا آج اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اور داد پانے کا کچھ خیال نہیں ہے۔

تھوڑی دیر میں ہم جامع مسجد کے پاس پہنچ گئے جو شہر کے بیچوں بیچ واقع تھی اور جس کے آس پاس ہر روز تیسرے پہر بازار لگا کرتا تھا اور اتوار کو تو وہاں بہت ہی چہل پہل رہا کرتی تھی، میلہ سا لگ جاتا تھا۔ پھیری والے ہانک لگا لگا کے طرح طرح کی چیزیں بیچتے تھے، بچوں کے سلے سلائے کپڑے، چنریاں، ٹوپیاں، کنگھیاں، چٹلے ازار بند، عطر پھلیل، اگر بتی، کھٹمل مارنے کا پوڈر، مٹھائیاں، چاٹ، علاوہ ازیں تعویذ گنڈے والے، جڑی بوٹی والے اور ایسے ہی اور پیشے والے اپنی انوکھی وضع اور اپنی مخصوص صدا سے اس بازار کی رونق بڑھاتے تھے۔

ہمارا بہروپیا بھی خاموشی سے ان لوگوں میں آ کر شامل ہوگیا۔ اس نے اپنی سیاہ صندوقچی کھول کر دونوں ہاتھوں میں تھام

لی۔اس صندوقچی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں قرینے سے رکھی تھیں۔اس نے کچھ شیشیاں صندوقچی کے ڈھکنے پر بھی جمادیں، پھر بڑے گمبھیر لہجے میں صدا لگانی شروع کی:

''آپ کی آنکھوں میں دھند ہو، لالی ہو، خارش ہو، ککرے ہوں، بینائی کمزور ہو، پانی ڈھلکتا ہو، رات کو نظر نہ آتا ہو تو میرا بنایا ہوا خاص سرمہ ''نین سکھ'' استعمال کیجئے''۔

''اس کا نسخہ مجھے مکہ شریف میں ایک درویش بزرگ سے دستیاب ہوا تھا۔خدمت خلق کے خیال نے قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔یعنی صرف چار آنے فی شیشی''۔

''یہ سرمہ اسم بامسمیٰ ہے۔اس کے لگاتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔آیئے ایک سلائی لگوا کر آزمائش کر لیجئے۔ اس کے کچھ دام نہیں۔

سرمہ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

میں اور مدن حیرت زدہ ہو کر بہروپیے کو دیکھنے لگے۔ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا مگر اس نے سچ مچ سرمہ فروشی شروع کر دی تھی۔دو تین آدمی اسکے پاس آ کھڑے ہوئے اور اس سے باری باری آنکھوں میں سرمے کی سلائی لگوانے لگے۔

ہم جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ہم نے بہروپیے کو اس کے اصل روپ میں دیکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

☆☆☆

تائی ایسری

کرشن چندر

میں گرانٹ میڈیکل کالج کلکتہ میں ڈاکٹر کا فائنل کورس کر رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی شادی پر چند روز کے لیے لاہور آ گیا تھا۔ یہیں شاہی محلے کے قریب کوچہ ٹھاکرداس میں ہمارا جہاں آبائی گھر تھا میری ملاقات پہلی بار تائی ایسری سے ہوئی۔ تائی ایسری ہماری سگی تائی تو نہ تھی، لیکن تھیں کہ انہیں دیکھ کر ہر ایک کا جی انہیں تائی کہنے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ محلے کے باہر جب ان کا تانگہ آ کے رکا اور کسی نے کہا "لو تائی ایسری آ گئیں" تو بہت سے بڈھے، جوان، مرد اور عورتیں انہیں لینے کے لیے دوڑے۔ دو تین نے سہارا دے کر تائی ایسری کو تانگے سے نیچے اتارا، کیونکہ تائی ایسری فربہ اندام تھیں اور چلنے سے یا باتیں کرنے سے یا محض کسی کو دیکھنے ہی سے ان کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ دو تین رشتہ داروں نے یک بارگی اپنی جیب سے تانگہ کے کرائے کے پیسے نکالے۔ مگر تائی ایسری نے اچھی پھولی ہوئی سانسوں میں ہنس کر سب سے کہہ دیا کہ وہ تو پہلے ہی تانگہ والے کو کرایہ کے پیسے دے چکی ہیں اور جب وہ یوں اپنی پھولی سانسوں کے درمیان باتیں کرتی کرتی ہنسیں تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ دو تین رشتہ داروں کا چہرہ اتر گیا اور انہوں نے اپنے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "یہ تم نے کیا کیا تائی؟" "ہمیں اتنی سی خدمت کا موقع بھی نہیں دیتی ہو!" اس پر تائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت سے چٹکی لی اور سے جھلتے ہوئے مسکاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

تائی ایسری کی عمر ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی، ان کے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے اور ان کے بھرے بھرے گول مٹول گندمی چہرے پر بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کا پھولی پھولی سانسوں میں معصوم باتیں کرنا تو سب کو ہی اچھا لگتا تھا۔ لیکن مجھے ان کے چہرے پر ان کی آنکھیں بڑی غیر معمولی نظر آئیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ دھرتی کا خیال آیا ہے۔ میلوں دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا خیال آیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ ان آنکھوں کے اندر جو محبت ہے، اس کا کوئی کنارہ نہیں، جو معصومیت ہے اس کی کوئی اتھاہ نہیں، جو درد ہے اس کا کوئی درماں نہیں۔

میں نے آج تک ایسی آنکھیں کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھیں جو اس قدر وسیع اور بے کنار ہوں کہ زندگی کا بڑے سے بڑا اور تلخ سے تلخ تجربہ بھی ان کے لیے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ رکھے۔ ایسی آنکھیں تو اپنی پنہائیوں میں سب کچھ بہا لے جائیں، ایسی انوکھی، معاف کر دینے والی، درگزر کر دینے والی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں۔ تائی ایسری نے کاسنی شاہی کا گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ جس پر سنہری گوٹے کا لہریا چمک رہا تھا۔ ان کی قمیض بسنتی ریشم کی تھی، جس پر زری کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر دوہرے ململ کا قرمزی دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں میں سونے کے گوکھرو تھے۔ جب وہ گھر کے دالان میں داخل ہوئیں تو چاروں طرف شور مچ گیا۔ بہوئیں اور خلائیں اور نندیں اور بھاوجیں، موسیاں اور چچیاں سب تائی ایسری کے پاؤں چھونے کو دوڑیں۔ ایک عورت نے جلدی سے ایک رنگین پیڑھی کھینچ کر تائی ایسری کے لیے رکھ دی اور تائی ایسری ہنستے ہوئے اس پر بیٹھ گئیں اور باری باری سب کو گلے لگا کر سب کے سر پر ہاتھ پھیر کر سب کو دعا دینے لگیں۔

اور ان کے قریب ہیرو مہری کی بیٹی سوتری خوشی سے اپنی باچھیں کھلائے زور زور سے پنکھا جھل رہی تھی۔ تائی ایسری گھر سے رنگین پھچی کی ایک ٹوکری لے کر آئی تھیں جو ان کے قدموں میں ان کی پیڑھی کے پاس ہی پڑی تھی۔ وہ باری باری سے سب کو دعائیں دیتی جاتیں اور پھچی والی ٹوکری کھول کر اس میں سے ایک چونی نکال کر دیتی جاتیں۔ کوئی ایک سو چونیاں انہوں نے اگلے

بیس منٹ میں بانٹ دی ہوں گی۔ جب سب عورتیں اور مرد، لڑکے اور بچے بالے ان کے پاؤں چھو کر اپنی اپنی چونی لے چکے تو انہوں نے اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے پنکھا جھلنے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور اسے پوچھا "تو کون ہے؟"

"میں سوتری ہوں"۔ بچی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"آئے ہائے جے کشن کی لڑکی ہے؟ میں تو بھول ہی گئی تھی تجھے۔ آ جا گلے سے لگ جا۔۔۔!"

تائی ایسری نے اس کو گلے سے لگالیا، بلکہ اس کا منہ بھی چوم لیا اور انہوں نے اسے اپنی بچی والی ٹوکری سے نکال کر چونی دی تو گھر کی ساری عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں اور موسی کرتارو اپنی نیلم کی انگوٹھی والی انگلی نچا کر بولی "تائی، یہ تو جے کشن کی بیٹی سوتری نہیں ہے، یہ تو ہیرو مہری کی بیٹی ہے"۔

"ہائے میں مرگئی"۔ تائی ایسری ایک دم گھبرا کر بولی، ان کی سانس پھول گئی۔ "ہائے اب تو مجھے نہانا پڑے گا۔ میں نے اس کا منہ چوم لیا۔ اب کیا کروں"۔ تائی ایسری نے اپنی بڑی بڑی حیران نگاہوں سے مہری کی بیٹی سوتری کی طرف دیکھا، جواب اس طرح دھتکارے جانے پر سسکنے لگی۔ یکایک تائی کو اس پر رحم آ گیا۔ انہوں نے پھر اسے بانہہ سے پکڑ کر چمٹا لیا۔

"ناں !ناں !تو کیوں روتی ہے۔ مجھے تو اپنے دھرم کے کارن نہانا ہی پڑے گا۔ پر تو کیوں روتی ہے۔ ایک چونی اور لے"۔

تائی ایسری سے دوسری چونی پا کر مہری کی بیٹی سوتری اپنے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔ تائی ایسری نے ایک بازو اٹھا کر پرے دالان میں گزرتی ہوئی ہیرو مہری کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

"نی ہیرو۔ میرے اشنان کے لیے پانی رکھ دے۔ تجھے بھی ایک چونی دوں گی"۔ اس پر ساری محفل لوٹ پوٹ ہو گئی۔

تائی ایسری کو کئی لوگ چونی والی تائی کہتے تھے۔ کئی لوگ کنواری تائی کہتے تھے۔ کیونکہ یہ بھی مشہور تھا کہ جس دن سے تایا یودھ راج نے تائی ایسری سے شادی کی تھی اس دن سے آج تک وہ کنواری کی کنواری چلی آ رہی تھیں، کیونکہ سنانے والے تو یہ بھی سناتے ہیں کہ تایا یودھ راج نے اپنی شادی سے پہلے جوانی میں اتنی خوبصورت عورتیں دیکھ ڈالی تھیں کہ جب ان کی شادی گاؤں کی اس سیدھی سادی لڑکی سے ہوئی تو شادی کے پہلے روز ہی وہ انہیں بالکل پسند نہ آئی۔ جب سے انہوں نے شادی کر کے انہیں بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا مگر کسی طرح کی سختی نہیں کرتے تھے۔ تایا یودھ راج ہر ماہ پچھتر روپے اسے بھیجتے تھے۔ وہ گاؤں میں رہتی تھی اپنے سسرال کے ہاں اور سب کی خدمت کرتی تھی اور تایا یودھ راج جالندھر میں لوہے کا بیوپار کرتے تھے اور کئی کئی سال اپنے گاؤں میں نہیں جاتے تھے۔ میکے والوں نے کئی بار آ کر تائی کو لے جانا چاہا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ میکے والوں نے یہ بھی چاہا کہ ان کی شادی پھر سے کر دی جائے۔ مگر تائی اس کے لیے بھی راضی نہ ہوئیں۔ وہ ایسے انہاک سے اپنے سسرال کے لوگوں کی خدمت کرتی رہیں کہ سسرال والے خود انہیں اپنی بیٹی اور بہو سے زیادہ چاہنے لگے۔ تایا یودھ راج اور ساس بھی اس حد تک چاہنے لگی تھی کہ انہوں نے اپنے سارے گہنے پاتے نکال کر تائی ایسری کی تحویل میں دے دیئے تھے۔ ویسے بہت سی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی آتا ہے کہ جوانی میں کیسی رہی ہوں گی۔ مگر تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی یہ خیال بھی نہ آیا۔ ہمیشہ یہی خیال آتا ہے کہ تائی ایسری شاید بچپن سے بلکہ جنم ہی سے ایسی پیدا ہوئی ہوں گی۔ پیدا ہوتے ہی انہوں نے اپنی ماں کو ہاتھ پھیلا کر آشیرواد دی ہو گی اور شاید بڑے میٹھے مہربان لہجہ میں یہ بھی کہا ہو گا۔ تجھے میرے لیے دکھ اٹھانے پڑے، اس لیے یہ لو ایک چونی!

شاید اسی لیے اپنے شوہر سے بھی ان کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ تایا یودھ راج ہماری رشتہ داروں کی نظر میں شرابی، کبابی اور رنڈی باز تھے۔ وہ لوہے کے بڑی بیوپاری تھے تو کیا ہوا، انہیں اس طرح سے تائی ایسری کی زندگی برباد نہ کرنا چاہئے۔ مگر جانے کیا بات تھی، تائی ایسری کو قطعاً اپنی زندگی برباد ہونے کا کوئی غم نہ تھا۔ ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں اس بات کا

بھی علم نہیں ہے کہ کسی نے ان کی زندگی برباد کی ہے۔۔۔۔ ہر وقت ہنستی کھیلتیں باتیں کرتیں، ہر ایک کے سکھ اور دکھ میں شامل ہونے اور خدمت کرنے کے لیے تیار نظر آتیں۔ یہ تو بالکل ناممکن تھا کہ پڑوس میں کسی کے ہاں خوشی ہو اور وہ اس میں شریک نہ ہوں، کسی کے ہاں کوئی غم ہو اور وہ اس میں حصہ نہ بٹائیں۔ تائی ایسری کے شوہر امیر تھے، مگر وہ خود تو امیر نہ تھیں۔ پچھتر روپے جو انہیں ماہوار ملتے تھے وہ انہیں ہمیشہ دوسروں پر خرچ کر دیتی تھیں۔ مگر وہ سستے زمانے کے پچھتر روپے تھے۔ اسی لیے بہت سے لوگوں کے دکھ درد، دور ہو جاتے تھے۔ مگر لوگ ان سے انکی وقت بے وقت کی مدد کی وجہ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی بہت سے مواقع آتے تھے، جب تائی ایسری کی جیب میں ایک چھدام تک نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی لوگ بے مزہ نہ ہوئے بلکہ یہی کہتے سنے گئے کہ تائی ایسری کے چرن چھو لینے سے ہی دل کو شانتی مل جاتی ہے۔

مگر جتنی اچھی تائی ایسری تھی، تایا یودھ راج اتنے ہی برے تھے۔ تیس برس تک تو انہوں نے تائی ایسری کو اپنے ماں باپ کے گھر گاؤں میں ہی رکھا اور جب ان کے ماں باپ دونوں ہی مر گئے اور گھر خالی ہو گیا، گھر کے دوسرے افراد بڑے ہو گئے اور شادیاں کر کے اور اپنے گھر بسا کے دوری جگہوں پر چلے گئے تو انہیں بادل نخواستہ تائی ایسری کو بھی جالندھر بلوانا پڑا۔ مگر تائی ایسری چند دنوں سے زیادہ نہ رہ سکیں۔ کیونکہ پکا باغ کے معزز پٹھانوں کی ایک لڑکی سے تایا یودھ راج نے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ میں انہیں جالندھر سے بھاگ کر لاہور آنا پڑا، کیونکہ پکا باغ کے پٹھانوں نے آ کر تائی ایسری سے کہہ دیا تھا کہ صرف تمہاری وجہ سے ہم نے اسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر والے کو لے کر کہیں چلی جاؤ ورنہ ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اور تائی ایسری اس واقعہ کے چند روز بعد ہی تایا کو لے کر لاہور آ گئیں۔ محلہ ونجاراں میں انہوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے یہاں بھی تایا یودھ راج کا بیوپار چند مہینوں میں چمک گیا۔ اسی اثناء میں انہوں نے شاہی محلے کی ایک طوائف پچھی سے دوستی کر لی اور ہوتے ہوتے یہ قصہ یہاں تک بڑھا کہ اب انہوں نے مستقل طور پر اسی پچھی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا اور محلہ ونجاراں میں قدم تک نہ دھرتے تھے۔ لیکن تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں اس امر کا اتنا سا بھی ملال ہوا ہوگا۔

یہی وہ زمانہ تھا، جب تایا یودھ راج اور پچھی طوائف کا قصہ زوروں پر تھا۔ انہی دنوں ہمارے بڑے بھائی صاحب کی شادی ہوئی۔ شادی میں تایا یودھ راج تو شریک نہ ہوئے لیکن تائی نے رشتہ داروں، مہمانوں اور برات کی خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیا۔ ان کی خوش مزاجی سے پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سلجھ گئیں۔ چہرے پر چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں اور جبینیں شکنوں سے صاف اور منور ہوتی گئیں۔ اس میں تائی کی کاوش کو کوئی دخل نہ تھا۔ سکون کی شعاعیں گویا خود بخود انکے جسم سے پھوٹتی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی ہر ایک کا غصہ اتر جاتا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ الجھنیں خود بخود سلجھ جاتیں۔ گھر بھر میں بشاشت بکھر جاتی، ایسی تھیں تائی ایسری۔

میں نے تائی ایسری کو کبھی کسی کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی قسمت کا گلہ کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں ایک بار ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی اور وہ واقعہ اسی شادی سے متعلق ہے۔

بڑے بھائی صاحب تو رات بھر شادی کی بیری پر بیٹھے رہے۔ صبح کے پانچ بجے شادی کے بعد لڑکی والوں نے اپنے گھر کے ہال کو جہیز کا سامان دکھانے کے لیے سجا دیا۔ پرانے زمانے تھے۔ اس زمانے میں صوفوں کی بجائے رنگین پڑھیاں دی جاتی تھیں۔ اور منقش پایوں والے پلنگ دیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ڈرائینگ روم کو بیٹھک یا دیوان خانہ کہا جاتا۔ میرے بڑے بھائی کے سسر ملٹری میں ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ چونکہ وہ پہلے ہندوستانی ایگزیکٹو آفیسر تھے اس لیے انہوں نے جہیز میں بہت کچھ دیا تھا اور ساری ہی نئے فیشن کی چیزیں دی تھیں۔ ہماری برادری میں پہلی بار جہیز میں صوفہ سیٹ دیا گیا۔ ساری برادری میں اس صوفہ سیٹ کی دھوم مچ گئی۔ دور دور کے محلوں کی بھی عورتیں ''انگریجی پیڑھیوں'' کو دیکھنے کے لیے آنے لگیں۔ تائی ایسری کے لیے بھی صوفہ سیٹ

دیکھنے کا پہلا موقعہ تھا۔ پہلے تو بڑی حیرانی سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس پر ہاتھ پھیر کر من ہی من میں کچھ بڑبڑاتی رہیں۔ آخر کار ان سے رہا نہ گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

''وے کاکا۔ اس کو صوفہ سیٹ کیوں بولتے ہیں؟''

اب میں اس کا جواب کیا دیتا۔ سر ہلا کر کہنے لگا ''مجھے نہیں معلوم تائی!''

''اچھا تو اس کی دو کرسیاں چھوٹی کیوں ہیں اور وہ تیسری کرسی لمبی کیوں ہے؟''

میں پھر لاجواب ہو گیا۔ خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

تائی دیر تک سوچتی رہیں۔ پھر یکا یک جیسے ان کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔ ان کا چہرہ، ان کی معصوم سی مسکراہٹ سے روشن ہو اٹھا۔ بولیں: ''۔۔۔۔ میں بتاؤں؟''

میں نے کہا ''بتاؤ تائی!''

وہ ہم سب کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولیں ''دیکھو، میرا خیال یہ ہے کہ یہ لمبا صوفہ تو اس لیے بنا ہے کہ جب دونوں میاں بیوی میں صلح ہو تو وہ دونوں اس لمبے صوفے پر بیٹھیں اور جب ان دونوں میں لڑائی ہو تو الگ الگ ان دو چھوٹے صوفوں پر بیٹھیں۔ سچ مچ یہ انگریز بڑے عقل مند ہوتے ہیں جبھی تو ہم پر حکومت کرتے ہیں''۔

تائی کی دلیل سن کر محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ مگر میں نے دیکھا کہ تائی یہ سوچ کر اور بات کہہ کر چپ سی ہو گئیں۔ کیا اس وقت انہیں اپنا اور اپنے خاوند کا جھگڑا یاد آیا تھا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

میں نے جب غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک پل کے لیے مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا ہو۔

کلکتہ سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں نے وہیں ایک بنگالی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور دھرم تلے میں پریکٹس کرنے لگا۔ کئی سال کوشش کرتا رہا مگر پریکٹس نہ چلی۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی کے اصرار پر لاہور چلا آیا۔ بھائی صاحب نے کوچہ ٹھاکر داس کے نکڑ پر مجھے دوکان کھول دی اور میں اپنے گھر میں یعنی اپنے محلے میں اپنی برادری ہی کے سہارے پریکٹس چلانے لگا۔ کلکتہ میں، میں بالکل اناڑی تھی اور زندگی کا تجربہ بھی نہ تھا۔ یہاں آ کر جب آٹھ دس برسوں میں گاہک کو پھانسنے کی ترکیب سمجھ میں آئی تو پریکٹس خود بخود چل نکلی۔ اب دن رات مصروف رہتا تھا۔ بچے بھی ہو گئے تھے۔ اس لیے زندگی سوت کی انٹی کی طرح ہی مدار پر چکر کھانے لگی۔ ادھر ادھر جانے کا موقع کم ملتا تھا۔ اب تو کئی برس سے تائی ایسری کا منہ نہ دیکھا تھا مگر اتنا سن رکھا تھا کہ تائی ایسری اس مکان میں محلّہ ونجاراں میں رہتی ہیں اور تایا یودھ راج شاہی محلے میں اسی پچھی کے مکان میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی دوسرے تیسرے مہینے تائی ایسری کی خبر لینے آ جاتے ہیں۔

ایک روز میں صبح کے وقت مریضوں کی بھیڑ میں بیٹھا نسخے تجویز کر رہا تھا کہ محلّہ ونجاراں کے ایک آدمی نے آ کر کہا ''جلدی چلیے ڈاکٹر صاحب، تائی ایسری مر رہی ہیں!''

میں اسی وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس آدمی کے ساتھ ہو لیا۔ محلّہ ونجاراں کے بالکل اس آخری سرے پر تائی ایسری کا مکان تھا۔ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر لیے جب میں آہنی سلاخوں والے موکھے سے گزر کر ان کے نیم تاریک کمرہ میں داخل ہوا تو وہ بڑے بڑے تکیے کا سہارا لیے پلنگ سے لگی بیٹھی تھیں۔ ان کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور انہوں نے بڑے زور سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف گویا اپنے دل کو پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہی وہ پھولے پھولے سانسوں میں مسکرانے لگیں۔ بولیں ''تو

آ گیا پتر۔ اب میں بچ جاؤں گی''۔

''کیا تکلیف ہوگئی ہے تائی؟''

''ہوتا کیا، موت کا بلاوا آ گیا تھا۔ دو دن مجھے سخت کس (بخار) رہی۔ پھر ایکا ایکی جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ (بیان کرتے کرتے تائی کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے لگیں) پہلے ٹانگوں سے جان گئی۔ ٹانگوں کو ہاتھ لگاؤ تو ٹھنڈی یخ، چٹکی بھر و تو کچھ محسوس نہ ہو، پھر دھیرے دھیرے میری جان کمر سے نکل گئی اور جب میری جان اوپر سے بھی نکلنے لگی تو میں نے زور سے اپنے کلیجہ کو پکڑ لیا''۔ تائی اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف اپنے دل والے حصے کو اور زور سے پکڑ کر بولیں ''تو میں نے زور سے اپنے کلیجہ کو پکڑ لیا اور چلائی، ارے کوئی ہے، کوئی ہے تو جائے اور جے کشن کے بیٹے رادھا کشن کو بلا کے لائے، وہی مجھے ٹھیک کر سکتا ہے۔۔۔۔ اب تم آ گئے ہو، اب۔۔۔۔۔ اب میں بچ جاؤں گی''۔ تائی ایسری نے مکمل طمانیت سے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ تائی کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''تائی ذرا اپنا یہ ہاتھ ادھر کرو، تمہاری نبض تو دیکھوں''۔

ایک دم تائی دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولیں ''ہائے رے تم کیسے ڈاکٹر ہو، تجھے اتنا نہیں معلوم کہ اس ہاتھ سے تو میں نے اپنی جان پکڑ رکھی ہے، اس ہاتھ کی نبض تجھے کیسے دکھا سکتی ہوں''۔

تائی چند ہفتوں میں اچھی ہوگئیں۔ انہیں بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ جاتی رہی تو پھر اٹھ کر گھومنے لگیں اور اپنے پرائے سب کے سکھ دکھ میں بدستور شریک ہونے لگیں۔ لیکن جب وہ اچھی ہوئیں تو اس کے چند ماہ بعد ہمارے تایا یودھ راج کا انتقال ہوگیا۔ وہیں پھپھی کے گھر شاہی محلے میں ان کا انتقال ہوا۔ وہیں سے ان کی ارتھی اٹھی کیوں کہ تائی نے اس کی لاش کو گھر لانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تائی نہ ارتھی کے ساتھ گئیں نہ انہوں نے شمشان گھاٹ کا رخ کیا نہ ان کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک نکلا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے اپنے سہاگ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ رنگین کپڑے اتار کر سپید دھتی پہن لی اور ماتھے کی سیندور پونچھ کر چولہے کی راکھ اپنے ماتھے پر لگالی۔ مگر ان کے دھرم کرم میں اور کسی طرح کا فرق نہ آیا بلکہ اپنے سفید بالوں سے وہ اب اس سفید دھتی میں اور بھی اچھی لگ رہی تھیں۔ مگر تائی کی عزت اس قدر تھی کہ ان کے سامنے زبان کھولنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی!

چند برس اور گزر گئے۔ اب میری پریکٹس اس قدر چمک اٹھی تھی کہ میں نے محلّہ ٹھاکر داس کے شاہ عالمی گیٹ کے اندر کوچہ کرماں اور روچھووالی کے چوک میں بھی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ صبح میں محلّہ ٹھاکر داس میں بیٹھتا تھا، شام کو وچھووالی میں، زندگی کچھ اس نہج سے گزر رہی تھی کہ تائی ایسری کو دیکھے ہوئے ڈیڑھ دو برس گزر جاتے تھے مگر گھر کی عورتوں سے تائی ایسری کی خبر ملتی رہتی تھی۔ تایا یودھ راج نے اپنے بینک کا روپیہ تو پھپھی کو سونپ دیا تھا۔ مگر جالندھر کی دکان اور مکان تائی ایسری کے نام لکھ گئے تے۔ ان سے ہر ماہ تائی ایسری کو ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ کا آجاتا تھا۔ وہ بدستور اسی طرح محلّہ ونجاراں میں رہتی تھیں اور دن رات اپنے دھرم کرم میں ڈوبی رہتی تھیں۔

ایک روز اتفاق سے جب میں شاہی محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو مجھے تایا یودھ راج کی یاد آ گئی اور ان کی یاد سے پھپھی کی یاد آ گئی۔ کیونکہ پھپھی بھی تو اسی شاہی محلّہ میں کہیں رہتی تھی اور جب پھپھی کی یاد آئی تو میرا ذہن فوراً تائی ایسری کی طرف منتقل ہو گیا اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ غالباً بارہ پندرہ مہینوں سے میں تائی ایسری کو دیکھنے نہ گیا تھا۔ میں نے سوچا میں کل یا پرسوں پہلی فرصت ہی میں تائی ایسری کو دیکھنے جاؤں گا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاہی محلے کی ایک گلی سے میں نے تائی ایسری کو نکلتے دیکھا۔ قرمزی شاہی کے بجائے اب وہ سیاہ شاہی کا گھاگرا پہنے تھیں جس پر نہ گوٹہ تھا نہ لچکا۔ قمیض بھی سفید رنگ کی تھی اور سر پر انہوں نے سفید ململ کا دوہرا دوپٹہ لے رکھا تھا۔ جس میں ان کا گول مٹول چہرہ بالکل میڈونا کی طرح معصوم اور پراسرار نظر آ رہا تھا۔

جس لمحہ میں نے انہیں دیکھا اسی لمحہ انہوں نے بھی مجھے دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی وہ شرما سی گئیں اور فوراً مجھ سے کترا کر واپس گلی میں جانے لگیں کہ میں نے فوراً انہیں آواز دے دی۔ میری آواز میں ایک ایسی حیرت تھی جو ایک چیخ سے مشابہ تھی۔ یہ تائی ایسری یہاں طوائفوں کے محلے میں کیا کر رہی تھیں؟

"تائی ایسری!" میں نے چلا کر کہا "تائی ایسری!" میں نے پھر آواز دی۔

میری آواز سن کر وہ پلٹ آئیں۔ سامنے آ کر ایک گنہگار مجرم کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ ان کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔

"تائی ایسری تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟" میں نے کچھ حیرت سے کچھ غصے سے ان سے کہا۔

وہ اسی طرح سر نیچا کئے آہستہ آہستہ جھجکتے جھجکتے بولیں "وے پتر! کیا بتاؤں وہ۔۔۔۔وہ۔۔۔۔ میں نے سنا تھا کہ پچھی بیمار ہے، بہت سخت بیمار ہے۔ میں نے سوچا اسے دیکھ آؤں۔۔۔۔!"

"تم یہاں پچھی کو دیکھنے آئی تھیں؟" میں نے غم اور غصے سے تقریباً چیخ کر کہا۔

"پچھی کو۔۔۔۔ پچھی کو۔۔۔اس بدذات چھنال کو؟۔۔۔۔جس نے۔۔۔۔جس نے!"

تائی ایسری نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور میں کہتے کہتے رک گیا۔۔۔۔"نہ کاکا! اس کو کچھ نہ کہو۔۔۔ کچھ نہ کہو۔۔۔!" تائی ایسری نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں:

"مرنے والے کی یہی ایک نشانی رہ گئی تھی۔ آج وہ بھی چل بسی!"

سن ۴۷ء کے فسادات میں ہم لوگ لاہور چھوڑ کر جالندھر میں پناہ گزیں ہوئے کیونکہ یہاں پر تائی ایسری کا گھر تھا۔ خاصہ کھلا دومنزلہ گھر تھا۔ اوپر کی منزل انہوں نے اپنے رشتہ دار پناہ گزینوں کو دے ڈالی تھی۔ نچلی منزل میں وہ خود رہتی تھیں۔ ہر روز وہ ریفیوجی کیمپوں میں سیوا کرنے جاتیں اور کبھی کبھار دو ایک یتیم بچے اٹھا لاتیں۔ چار پانچ ماہ ہی میں انہوں نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ کیونکہ انکے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ پچھواڑے کے آنگن اور سامنے دالان میں انہوں نے مختلف پناہ گزینوں کو سونے اور کھانا پکانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہوتے ہوتے ایک اچھا گھر سرائے میں تبدیل ہو گیا۔ مگر میں نے تائی ایسری کے ماتھے پر کبھی ایک شکن نہیں دیکھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی باہر سے اس طرح آتی تھیں جیسے وہ گھر ان کا نہ ہو، ان پناہ گزینوں کا ہو جنہیں انہوں نے اپنے گھر میں رہنے کی خود اجازت دی تھی۔ عورتوں میں شخصی جائیداد کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ مگر میں نے عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی ایسا کوئی فرد مشکل ہی سے دیکھا ہوگا جسے تائی ایسری کی طرح شخصی جائیداد کا اس قدر کم احساس ہو۔ قدرت نے ان کے دماغ میں شاید یہ خانہ ہی خالی رکھا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لیے وقف تھا۔ جالندھر آ کر وہ صرف ایک وقت کھانا کھانے لگی تھیں۔ میں ان کی ان حرکتوں سے بہت چڑتا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنی قیمتی پریکٹس لاہور میں کھودی تھی۔ میر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بھی وہیں رہ گئی تھی اور اب میرے پاس سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ میرے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے نہ روپیہ پیسہ تھا، نہ کھانا پینا تک کا ہو سکتا تھا۔ جو ملا کھالیا، جب ملا کھالیا، نہ ملا تو بھوکے رہ گئے۔ انہی دنوں مجھے خونی بواسیر لاحق ہو گئی۔ دوائیں تو میں نے طرح طرح کی استعمال کیں کیوں کہ میں خود ڈاکٹر تھا۔ مگر اس بے سروسامانی میں علاج کے ساتھ پرہیز ضروری ہے وہ کہاں سے ہوتا نتیجہ ہوا کہ میں دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا۔ کچھ روز تک تو میں نے تائی سے اپنی حالت کو چھپائے رکھا مگر ایک دن انہیں پتہ چل ہی گیا۔ فوراً گھبرائی گھبرائی میرے پاس پہنچیں اور مجھ سے کہنے لگیں۔۔۔۔۔"کاکا۔ میں تم سے کہتی ہوں۔ یہ خونی بواسیر ہے یہ ڈاکٹری علاج سے ٹھیک نہ ہوگی۔ تم ایسا کرو، کرایہ مجھ سے لو اور سیدھے گوجرانوالہ چلے جاؤ، وہاں محلہ سنیاراں میں چاچا کریم بخش جراح رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی دوائی ہے جس سے خونی بواسیر ٹھیک ہو جاتی ہے۔

تیرے تایا کو بھی آج سے بیس سال پہلے یہ تکلیف ہوگئی تھی اور چاچا کریم بخش ہی نے ٹھیک کر دیا تھا۔ دس دن میں وہ ٹھیک ہو کر گوجرانوالہ سے واپس جالندھر گئے تھے''۔

یہ سن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے کہا'' تائی تجھے معلوم ہے اب میں گوجرانوالہ نہیں جا سکتا''۔

''کیوں نہیں جا سکتا۔ ٹکٹ کے پیسے میں دیتی ہوں''۔

''ٹکٹ کا سوال نہیں ہے، گوجرانوالہ اب پاکستان میں ہے''۔

''پاکستان میں ہے تو کیا ہوا، کیا ہم دوا دارو کے لیے وہاں نہیں جا سکتے! وہاں اپنا چاچا کریم بخش۔۔۔۔!''

میں نے تائی کی بات کاٹ کر کہا'' تائی تجھے معلوم تو ہے نہیں، خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔ مسلمانوں نے اب اپنا دیس الگ کر لیا ہے، اس کا نام پاکستان ہے۔ ہمارے دیس کا نام ہندوستان ہے۔ اب نہ ہندوستان والے پاکستان جا سکتے ہیں نہ پاکستان والے یہاں آسکتے ہیں۔ اس کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت ہوئی!''

تائی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ بولیں'' پاس کورٹ؟ کیا اس کے لیے کچہری جانا پڑتا ہے؟''

''ہاں ہاں اس کے لیے کچہری جانا پڑتا ہے''۔ میں نے جلدی سے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ اب اس بڑھی کو کون سمجھائے۔

''نہ بیٹا۔ کورٹ جانا تو اچھا نہیں ہے۔ شریفوں کے بیٹے کبھی کچہری نہیں جاتے مگر وہ چاچا کریم بخش۔۔۔۔!''

''بھاڑ میں جائے چاچا کریم بخش''۔ میں نے چلا کر کہا۔

بیس سال پہلے کی بات کرتی ہو، جانے وہ تمہارا چاچا کریم بخش آج زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔ مگر تم وہی اپنا چاچا کریم بخش رٹے جا رہی ہو''۔

تائی روتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مجھے اپنی تنگ مزاجی پر بے حد افسوس ہوا۔ کیوں میں نے اس معصوم عورت کا دل دکھایا۔ اگر تائی آج کی زندگی کی بہت سی دشواریوں کو نہیں سمجھ سکتی ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟

دراصل میں ان دنوں بہت تلخ مزاج ہو چلا تھا۔ کالج کے دنوں میں، میں اکثر انقلاب کی باتیں کیا کرتا تھا۔ پھر جب زندگی نے مجھے کامرانی بخشی اور میری پریکٹس چل نکلی تو انقلاب کا جوش سرد پڑ گیا اور ہوتے ہوتے یہ لفظ میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ اب جالندھر آ کر جو یہ افتاد پڑی تو میری دل میں پھر سے انقلاب کے خیال نے کروٹ لی اور میں اپنی طرح کے چند جوشیلے اور لٹے پٹے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر پھر سے اسی تلخی، تیزی اور تندی سے انقلاب کی باتیں کرنے لگا۔

یہ سب لوگ اکثر تائی ایسری کی دوسری منزل میں میرے کمرے میں ملتے۔ چائے کا دور چلتا اور دنیا جہان کی باتیں ہوتیں اور میں جوش میں اپنا مکا ہوا میں لہرا کر کہتا۔ ہم سے انصاف کی توقع بھی نہیں ہے۔ یقیناً اس ملک میں پھر ایک انقلاب آئے گا اور ضرور آکر رہے گا وہ انقلاب!

ایک دن تائی ایسری نے ہماری باتیں سن لی تو گھبرائی گھبرائی اندر آئیں۔ بولیں:

''بیٹا۔ کیا مسلمان یہاں پھر آئیں گے؟''

''تو تم یہاں کس انقلاب کا ذکر کر رہے ہو جو یہاں آئے گا؟''

تائی نے انقلاب کو مسلمان سمجھا تھا، جب یہ بات ہماری سمجھ میں آئی تو ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''کتنی بھولی ہے ہماری تائی، اری تائی، ہم تو اس انقلاب کو لانا چاہتے ہیں''۔

مگر تائی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر بولیں۔

"اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں"۔

تائی نے میری مدد کرنے کے لیے اپنا سوا تولے کا ایک گوکھرو بیچ دیا۔ اس رقم کو لے کر میں اپنی فیملی کے ساتھ دہلی آ گیا۔ کیونکہ جالندھر میں افراتفری تھی اور غیر یقینی سی حالت ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ دہلی آ کر میں نے پھر سے پریکٹس شروع کر دی۔ چند سالوں ہی میں پریکٹس پھر چمک اٹھی۔ میں قرول باغ میں پریکٹس کرتا تھا اور قرول باغ لاہور کے بہت سے ریفیوجیوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو مجھے جانتے تھے۔ ہولے ہولے میں نے اپنا اڈا ٹھیک سے جما لیا۔ پریکٹس چمک اٹھی۔ دس سال میں، میں نے قرول باغ میں اپنی کوٹھی کھڑی کر لی۔ اب میں انقلاب کی باتیں بھول بھال گیا۔ میری خونی بواسیر بھی ٹھیک ہو گئی اور تلخی کے بجائے مزاج میں شگفتگی عود کر آئی جو ایک ڈاکٹر کے مزاج کے لیے از حد ضروری ہے۔

تیرہ سال کے بعد گزشتہ مارچ میں مجھے ایک عزیز کی شادی میں جالندھر جانا پڑا۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں، میں تائی ایسری کو بالکل بھول بھال گیا تھا۔ رشتہ دار تو اس وقت یاد آتے ہیں، جب مریض نہ ہوں۔ لیکن جالندھر پہنچتے ہی مجھے تائی ایسری کی یاد آئی۔ ان کے احسانات یاد آئے۔ وہ سونے کا گوکھرو یاد آیا، جسے بیچ کر میری پریکٹس چلانے کی رقم بہم پہنچائی گئی تھی اور وہ رقم میں نے آج تک تائی ایسری کو ادا نہیں کی تھی۔ جالندھر اسٹیشن پر اترتے ہی میں سیدھا تائی ایسری کے گھر چلا گیا۔

شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہوا ایندھن کے دھوئیں، تیل کی بو اور گھر واپس آتے ہوئے بچوں کی آوازوں سے معمور تھی۔ جب میں تائی ایسری کے ساکن کی نچلی منزل میں داخل ہوا۔

گھر میں اس وقت تائی کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے گھر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے گھی کا دیا جلائے پھول چڑھا کر ہاتھ جوڑ کر واپس گھوم رہی تھی، جب کہ انہوں نے میری آہٹ پا کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں" میں نے کمرہ میں قدم آگے بڑھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

تائی دو قدم آگے بڑھیں مگر مجھے پہچان نہ سکیں۔ تیرہ برس کا عرصہ بھی ایک عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں وہ بے حد نحیف ونزار ہو گئی تھیں۔ ان کا چہرہ بھی دبلا ہو گیا تھا اور وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی تھیں۔

"میں رادھا کشن ہوں"۔

"جے رادھا کشن ہوں"۔

"جے کشن داکا کا؟" تائی کی آواز بھرا گئی۔ ممکن تھا وہ جلدی سے آگے بڑھنے کی کوشش میں گر پڑتیں۔ مگر میں نے انہیں جلدی سے تھام لیا اور وہ میرے بازو سے لگ کر رونے لگیں۔ انہوں نے میری بلائیں لیں، میرا منہ چوما، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں:

"اتنے دن کہاں رہے بیٹا؟ اپنی تائی کو بھی بھول گئے؟"

انتہائی شرمندگی سے میرا سر جھک گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ تائی نے میری پریشانی کو فوراً بھانپ لیا جلدی سے پھولے پھولے سانسوں میں اکھڑے اکھڑے لہجہ میں بولیں "سروج راضی خوشی ہے نا؟"

"ہاں تائی"۔

"اور وڈا کاکا؟"

"ڈاکٹری میں پڑھتا ہے"۔

"اور نکا؟"

''کالج میں پڑھتا ہے''۔

''اور شانو اور بنو؟''

''وہ دونوں بھی کالج میں پڑھتی ہیں۔ کملا کی میں نے شادی کر دی ہے!''

''میں نے بھی ساوتری کی شادی کر دی ہے۔ پورن اب رڑکی میں پڑھتا ہے۔ نمی او بنی کے ماں باپ مل گئے تھے وہ آ گران کو چھ سال کے بعد لے گئے تھے۔ کبھی کبھی ان کی چھٹی پتری آ جاتی ہے۔ میرے پاس اب صرف گوپی رہ گیا ہے۔ اگلے سال وہ بھی ریلوے ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے چلا جائے گا''۔

یہ تائی کے ان یتیم بچوں کی داستان تھی جو انہوں نے فساد میں لے کر پالے تھے۔

میں نے ناخن سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے کھجاتے کہا ''تائی وہ تیرا قرضہ مجھ پر باقی ہے، کیسے بتاؤں کتنا شرمندہ ہوں، اب تک نہ بھیج سکا، اب دلی جاتے ہی بھیج دوں گا''۔

''وہی گوکھر والا!''

''اچھا وہ؟'' یکا یک تائی کو یاد آیا اور وہ بڑے میٹھے انداز میں مسکرانے لگیں۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں ''وہ تو تیرا قرضہ تھا بیٹا، جو میں نے چکا دیا!''

''میرا قرضہ کیا تھا تائی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ زندگی دوسروں کا قرضہ ہے بیٹا''۔ تائی سنجیدہ ہو کر بولیں ''اسے چکاتے رہنا چاہیے۔ تو کیا اس سنسار میں خود پیدا ہوا تھا؟ نہیں، تجھے تیرے ماں باپ نے زندگی دی تھی تو پھر تیری زندگی کسی دوسرے کا قرض ہوئی کہ نہیں؟ پھر یہ قرضہ ہم نہیں چکائیں گے تو یہ دنیا آگے کیسے چلے گی۔ ایک دن پرلے (قیامت) آ جائے گی۔۔۔ بیٹا۔ اسی لیے تو کہتی ہوں، میں نے تیرا قرضہ چکایا ہے تو کسی دوسرے کا قرضہ چکا دے۔۔۔ ہر دم چکاتے رہنا، جیون کا دھرم ہے''۔ تائی اتنی لمبی بات کر کے ہانپنے لگیں۔

میں کیا کہتا۔ روشنی سے سایہ کہہ بھی کیا سکتا ہے؟ اسی لیے میں سب کچھ سن کر چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ ہو گئیں۔ پھر آہستہ سے بولیں ''اب میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے ورنہ تیرے لیے کھانا پکاتی۔ اب گوپی آئے گا تو کھانا بنائے گا تیرے لیے۔ کھانا کھا کر جانا۔۔۔۔۔ میں۔۔۔''

''نہیں تائی اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں بھی تیرا ہی دیا کھاتے ہیں''۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں یہاں تیج پال کی شادی پر آیا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھا تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ اب شادی والے گھر جاؤں گا''۔

''بلاوا تو مجھے بھی آیا ہے۔ مگر دو دن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نہیں جا سکتی۔ شگن میں نے بھیج دیا تھا، تم میری طرف سے تیج پال کے سر پر پیار دینا!''

''بہت اچھا تائی''۔۔۔۔ کہہ کر میں تائی کے چرنوں میں جھکا۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے گلے لگا لیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر سو سو دعائیں دے کر بولیں۔

''بیٹا میرا ایک کام کرو گے؟''

''حکم کرو تائی''۔

''کیا کل تم صبح آ سکتے ہو؟''

''کیا بات ہے تائی۔ اب میں تمہیں مل کے تو جا رہا ہوں''۔

تائی جھجکتے جھجکتے بولیں ''میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔ رات میں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا جنم جلا اندھیرا چھایا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم صبح کسی وقت دن میں آجاؤ تو میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گی۔ تیرہ سال سے تجھے نہیں دیکھا ہے کاکا!''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''آجاؤں گا تائی!''

دوسرے دن بارات کے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ صبح ہی ہم لوگوں کو پیشوائی کے لیے اسٹیشن پر جانا تھا۔ وہاں سے لوٹتے وقت مجھے یاد آیا۔ میں ان لوگوں سے معذرت کر کے تائی ایسری کے گھر کی طرف ہولیا۔ گلی کے موڑ پر مجھے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لوگ سر جھکائے ملے۔ مگر میں جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا آگے چلا گیا۔ مکان کی نچلی منزل پر مجھے اور بہت سے لوگ روتے ہوئے ملے۔ معلوم ہوا آج صبح تائی ایسری کی موت واقع ہو گئی اور جب ہم اسٹیشن گئے ہوئے تھے وہ چل بسی۔

اندر کمرے میں ان کی لاش پڑی تھی۔ ایک سفید چادر میں ملبوس، چہرہ کھلا رہنے دیا تھا۔ کمرہ میں کافور اور لوبان کی خوشبو تھی اور ایک پنڈت ہولے ہولے وید منتر پڑھ رہا تھا! تائی ایسری کی آنکھیں بند تھیں اور انکا معصوم بھورا بھورا چہرہ، پرسکون خاموش اور گہرے خوابوں میں کھویا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تائی ایسری کا چہرہ نہ ہو، دھرتی کا پھیلا ہوا لامتناہی چہرہ ہو۔ جس کی آنکھوں سے ندیاں بہتی ہیں۔ جس کی ہر شکن میں لاکھوں وادیاں اپنی بستیوں کو اپنی آغوش میں لیے مسکراتی ہیں۔ جس کے انگ انگ سے بے غرض پیار کی مہک پھوٹتی ہے، جس کی معصومیت میں تخلیق کی پاکیزگی جھلکتی ہے، جس کے دل میں دوسروں کے لیے وہ بے پناہ ماتا جاگتی ہے جس کا مزہ کوئی کوکھ رکھنے والی ہستی ہی پہچان سکتی ہے۔

میں ان کے پاؤں کے قریب کھڑا ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکا یک کسی نے آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔۔۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے سامنے ایک بائیس تئیس برس کا نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی روئی ہیں۔ ابھی پھر رو دیں گی۔

اس نے آہستہ سے کہا ''میں گوپی ناتھ ہوں''۔

''میں تیج پال کے گھر آپ کو ڈھونڈنے گیا تھا۔ مگر آپ اسٹیشن پر گئے ہوئے تھے''۔

وہ پھر بولا۔

میں پھر بھی چپ رہا!

گوپی ناتھ دھیرے سے بولا ''صبح تائی نے آپ کو بہت یاد کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔ اس لیے وہ مرتے مرتے بھی آپ کا انتظار کرتی رہیں۔ آخر جب انہیں یقین ہو گیا کہ مرنے کا وقت آن پہنچا ہے اور آپ نہیں آئیں گے تو انہوں نے مجھ سے کہا جب میرا بیٹا رادھا کشن آئے تو اسے یہ دے دینا''۔

یہ کہہ کر گوپی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میری ہتھیلی پر ایک چونی رکھ دی۔

چونی دیکھ کر میں رونے لگا۔

مجھے نہیں معلوم۔ آج تائی ایسری کہاں ہیں، لیکن اگر وہ سورگ میں ہیں تو وہ اس وقت بھی یقیناً رنگین پیڑھی پر بیٹھی اپنی کچھی سامنے کھول کر بڑے اطمینان سے دیوتاؤں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں چونیاں ہی بانٹ رہی ہوں گی۔

☆☆☆

بلائے ناگہاں

مسز عبد القادر

حیدر میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلہ میں رہتے تھے اور دونوں نے ایک ہی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ سکول چھوڑنے کے بعد اس نے کٹھ کی تجارت اختیار کی اور اس تجارت کی وجہ سے اس کی بیشتر زندگی کافرستان میں گزری، اب وہ ایک دولت مند شخص کی حیثیت سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔۔۔ مگر باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اسے کسی کام میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ سوسائٹی سے متنفر تھا سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ رکھتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس کی افسردگی کا راز معلوم کروں مگر موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ فصل کے موقعہ پر میرا اپنے حصہ داروں سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا۔۔۔ وہاں جا کر میں زمینداری کی بندھنوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ دو سال تک چھٹکارا نہ ہوا۔ اس عرصہ میں حیدر سے میری خط و کتابت جاری تھی۔ اس کے خطوں سے اکثر وحشت اور مایوسی کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ دو سال بعد جب میں واپس آیا تو میں نے سنا کہ حیدر بالکل گوشہ نشین ہو گیا ہے۔

دو تین دن تو گھر کے معمولی کام کاج میں صرف ہو گئے۔ تیسرے دن شام کے قریب میں اس کے گھر گیا۔ میرا لڑکا میرے ہمراہ تھا۔ حیدر کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کا رنگ مٹیالا اور جلد بدنما طور پر خشک ہو رہی تھی۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے خوف ہراس کی علامات ظاہر تھیں۔۔۔ مجھے دیکھ کر ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر کھیل گئی۔ میں اسے دیر تک حیرت سے تکتا رہا۔ میری حالت سے آگاہ ہو کر وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا ''کیا دیکھ رہے ہو؟'' میں خاموش رہا۔ وہ دوبارہ بولا ''آؤ! تم نہیں جانتے میری زندگی کس عذاب میں ہے میں نے آج تک اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا۔ مگر اب زیادہ دیر تک یہ میرے دل میں پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں''۔

سلیم کمرے سے ملحقہ لائبریری میں رنگین پنسلوں سے تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ حیدر کہنے لگا سکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو کافرستان میں کٹھ کی تجارت کرتا تھا۔ یہ شخص انتہائی نیک نفس اور دوست نواز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا اور تجارت کا کام انجام دینے میں اسے بہت دقت ہوتی تھی۔ اس لیے اسے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے ماتحت کافرستان کے علاقہ میں دورہ کر کے کٹھ فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے۔۔۔ ان دنوں میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ میں بالکل ناتجربہ کار تھا تاہم اس نے مجھے دیانت دار اور محنتی پا کر تجارت میں حصہ دار بنا لیا اور میں نے اپنا کام اس قدر شوق اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر ہماری تجارت چمک اٹھی۔۔۔ انہی ایام میں ایک دفعہ میں اپنے کوہستانی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا رستہ بھول کر ایک غیر آباد علاقہ میں پہنچا۔ گو یہ علاقہ نہایت سرسبز تھا، میوے سے لدے ہوئے درخت ہماری خوراک کے لیے بکثرت موجود تھے اور پیاس بجھانے کو چپہ چپہ پر حیات بخش چشمے جاری تھے لیکن رات کو سر چھپانے کے لیے جگہ ملنی دشوار تھی۔۔۔ تمام دن ہم جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ حتیٰ کہ شام قریب ہو گئی۔ شکست خوردہ آفتاب دن بھر کی خجالت سے زرد ہو کر لیلائے شب کی سیاہ زلفوں میں منہ چھپانے لگا۔ جنگلی پرندے شور و غل مچاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کے اردگرد طواف کرنے لگے اور گھنے درختوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا۔۔۔ ہم اندھا دھند آگے بڑھتے گئے یکا یک جنگل ختم ہو گیا۔

ہم تاریک فضا سے باہر نکلے تو افق کے دلکش مناظر سے ہماری آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ہم ایک شاداب و زرخیز میدان

کے کنارے کھڑے تھے۔ کہیں دور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی ہم اس طرف بڑھے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔۔۔۔ جھونپڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ دود کش سے دھوئیں کے یلغارے نکل رہے تھے اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشگوار مہک اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے دستک دی۔ ایک خشک رو منحوس صورت شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا پھر ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا۔۔۔۔ اس خوفناک قہقہے سے میرا دل دہل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے مجبور ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہولیا۔ جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت ردی تھی۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر سیاہی مائل گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بٹھایا اور خود ہمارے کھانے کے بندوبست میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے بھنا ہوا گوشت اور مکی کی روٹیاں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا بستر ایک طرف لگا دیا مگر میرا دل سونے کو نہ چاہتا تھا۔ مجھے اس منحوس صورت آدمی کی آنکھوں میں شقاوت مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہوہ لے آیا۔ نیند کو دور کرنے کے لیے میں نے خوب قہوہ پیا۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے۔ میں نے چاہا کہ ملازم کو خبردار رہنے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ جھنجھوڑا مگر بے سود۔ مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ارد گرد کی چیزیں دھندلی نظر آنے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔۔۔۔ رات کو مجھے نہایت خوفناک خواب دکھائی دیئے۔ میں نے دیکھا کہ چند دیوزاد آدمی مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے کہیں جا رہے ہیں۔ یکا یک میرے سر میں سخت ٹیس اٹھی۔ ایک تشنجی کیفیت سے میرے پٹھے اینٹھنے لگے۔ دوران خون سر کی طرف زیادہ ہونے سے دماغ پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اف! خدا کی پناہ! میں نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ بدن کے روئیں سوئیوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور دل ایک بڑے کلاک کی مانند ٹک ٹک کرنے لگا۔۔۔۔۔۔ آہ! میں ایک تیرہ و تار ڈراونی غار میں ایک لمبی سی چوبی میز پر چت پڑا ہوا تھا۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ اور سرہانے کی طرف ایک زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ تھرکتی ہوئی روشنی میں دیواروں پر مہیب سائے ناچ رہے تھے۔ غار دوزخ کی بھٹی کی طرح لال اور گرم تھی۔ سخت گرمی سے میرا سر چکرا رہا تھا۔ میز کے قریب ایک دیوزاد آدمی کھڑا تھا۔ جس کا بالوں سے بے نیاز سر ایک پشاوری تربوز کی طرح بڑا تھا۔ اس کا سرخ چہرہ جس پر جلادوں کی طرح بڑے بڑے سیاہ لمبے گل مچھے تھے، انگاروں کی لال روشنی میں خون سے رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا شکاری چاقو پکڑے کسی کو کچھ احکام دے رہا تھا۔ انتہائی وحشت سے میری زبان حلق میں دھنس گئی اور سانس رک رک کر آنے لگی۔۔۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ جسے سنتے ہی سرخ چہرہ جلاد نے اپنا مضبوط ہاتھ اٹھایا اور چاقو سے میرے سر میں گھاؤ لگانے لگا۔ میں شدت خوف سے پہلے ہی نیم جان ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ایک آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ ایک طرف آبنوسی ڈیوٹ پر رکھے ہوئے پیتل کے بڑے چراغ میں بھلپل جل رہا تھا جس کی کیف آور روشنی عطر کے قرابے لنڈھا رہی تھی۔ چاند کی حسین کرنیں کھلی کھڑکی سے داخل ہو کر فرش زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ میرے سر اور گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے سب واقعات یاد آنے لگے اور غار والا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا میں نے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ سرہانے کی طرف ایک سایہ سا دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔ فوراً کسی نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہا طالع مند نوجوان تمہیں اپنی زندگی اور جوانی مبارک ہو۔ تمہاری اس طویل اور مسلسل غشی نے مجھے تمہاری زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ مگر آج

آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔ دلجوئی کے الفاظ سن کر میں نے مطمئن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ ایک چالیس سالہ وجیہہ اور شکیل آدمی تھا۔ اس نیک دل انسان کی بڑھی ہوئی ہمدردی اور ان تھک خدمت گزاری سے میری صحت بہت جلد عود کرنے لگی۔ اور میں بتدریج صحت یاب ہوگیا۔۔۔۔ دوران علالت میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن کا نام جواں بخت ہے اور وہ ایک قبیلے کا سردار ہے۔ میرے استفسار پر جواں بخت نے مجھے ایک عجیب وغریب داستان سنائی۔ اس نے کہا" اس علاقہ میں کئی ایک ایسی وادیاں ہیں جو ہنوز دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پراسرار ہے کہ کوئی اجنبی ان میں داخل نہیں ہوسکتا اور ہر وادی میں جدا جدا قبیلے آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی جس میں میرا قبیلہ بھی آباد ہے اسی طرح کی ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ایک اور ایسی ہی پوشیدہ وادی ہے جس میں ایک رہزنوں کا قبیلہ آباد ہے۔ ان کی سردار ایک عورت ہے۔۔۔۔۔۔۔ جس نے جوانی کا جوہر ایجاد کیا ہے۔ اٹھارہ سے پچیس سال تک کی عمر کے نوجوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کیمیاوی طریقے سے حاصل کرتی ہے اور اس جوہر کے اثر سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جوان اور نوخیز نظر آتی ہے۔ اس جوہر کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض سے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح نوجوانوں کو اس کے لیے فراہم کریں۔۔۔۔ ان اسیر نوجوانوں کو اس کے ملازم منشیات سے بے ہوش کر کے خفیہ غاروں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت انکے سروں سے جوہر کشید کرتی ہے"۔ میں نے پوچھا" آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" اس نے کہا" جوانی میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ لیکن میرے قبیلے کو اس غار کا کسی طرح کھوج مل گیا اور اس نے شب خون مار کر مجھے عین اس وقت چھڑایا جب کہ ایک سرخ چہرہ جلاد میرے سر کو زخمی کر رہا تھا۔۔۔۔" جواں بخت نے کلاہ اتار کر اپنا سر مجھے دکھایا جس پر جا بجا بڑے بڑے سفید داغ تھے۔ پھر کہنے لگا" میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ جب کوئی نو وارد ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور میں چھاپہ مار کر ان نوجوانوں کو بچالیتا ہوں۔ مگر وہ عورت احتیاطاً غاریں بدلتی رہتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں چنانچہ جس دن رہزن تمہیں اس ڈائن کے پاس لے جا رہے تھے۔ مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا۔ جس پر میں نے کئی ایک غاروں میں تمہیں تلاش کیا اور آخر کار ایک غار پر حملہ کر کے تمہیں نجات دلوائی۔ میں کئی دفعہ اس عورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر وہ ہر دفعہ میرے ہاتھ سے بچ کر صاف نکل جاتی ہے۔ کاش مجھے اس وادی کا رستہ معلوم ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لیے دنیا کو اس ڈائن کے وجود سے پاک کر دوں۔

میں تقریباً چھ ماہ جواں بخت کی وادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ واپسی کا ارادہ کیا مگر اس کی بے لوث محبت میرے لیے زنجیر پا ہوگئی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر کے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ کچھ سوچ کر بے دلی سے کہنے لگا تم شوق سے جاسکتے ہو مگر تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر جانا ہوگا۔ میں نے گھبرا کر کہا" کیوں؟" وہ لجاجت سے بولا" عزیز من تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اس لیے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو ان خفیہ راستوں کا راز بتانا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ اگر اس اصول میں بے قاعدگی کی وجہ سے نقصان کا خطرہ ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے تو وہ شب خون مار کر وادی میں گھس آتے ہیں اور قبیلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ گو مجھے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ ان کے قائم کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔ میں نے افسردگی سے کہا" تو پھر میں یہاں کبھی نہ آسکوں گا؟"" میرے خیال میں کبھی نہیں"۔ اس نے کہا۔ میں نے کہا" لیکن آپ کی ملاقات"۔ وہ میری بات کاٹ کر بولا" یہ بھی تقریباً ناممکن ہے"۔۔۔۔۔۔ اس ناگوار گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا۔ مجھے اس سے دلی الفت تھی۔ اس لیے اس

کے فیصلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی اور میرے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ رویا تو نہیں مگر اس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ اس کے اضطراب کا شاہد تھا۔ وہ گاؤ تکیے پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے شگفتہ چہرے پر ساوی تجلیاں نمایاں تھیں۔۔۔ کامل وقفہ کے بعد اس نے سر اٹھایا اور اپنی نکھری ہوئی منور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت ملامت سے کہنے لگا "ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے اگر تم میرے مذہبی طریقے پر قسم اٹھا کر میری برادری میں شامل ہو جاؤ تو میرے قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا"۔ میں نے ان شرائط کو فوراً منظور کر لیا۔۔۔ دوسرے دن جواں بخت نے اپنے قبیلے کی دعوت کی اور سب کے سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جواں بخت کی چھنگلیا سے چند قطرے خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے، پھر اپنی خاص زبان میں اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری وجہ سے جواں بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو روحیں مجھے بھی وہی سزا دیں۔ اس کے بعد نیم عریاں کاہن کی ہدایت کے بموجب میں نے اس مقدس خون کو چکھا اور اس رسم کے اختتام پر جواں بخت نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گلے ملے اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگلے دن مجھے وادی کا راز بتا دیا گیا اور جاتی دفعہ جواں بخت نے تاکید کی کہ جب تک میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز نہ کر جائے اس علاقہ میں اکیلا یا کسی اجنبی کے ہمراہ سفر نہ کروں۔ جواں بخت کے خاص آدمی مجھے اس جگہ پہنچا گئے جہاں میرے حصہ دار کا ہیڈ کوارٹر تھا۔۔۔۔ یہ خطہ جواں بخت کی وادی سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا حصہ دار جو میری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا مجھے زندہ سلامت پا کر بہت خوش ہوا۔۔۔ جواں بخت کی دوستی سے میری تجارت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ جواں بخت کی وادی میں کٹھ بہت کثرت سے پائی جاتی تھی۔ اس کے آدمی ہمیشہ کٹھ پہنچاتے رہتے انہیں آدمیوں کے ساتھ میں بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے جواں بخت سے ملنے جایا کرتا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر گئی۔ اب میں بغیر محافظوں کے بے کھٹکے اس علاقہ میں سفر کرنے لگا۔۔۔ ایک دفعہ میں جواں بخت کو ملنے جا رہا تھا، راستے میں ایک چھوٹی سی کوہستانی سرائے میں میری ایک خوش پوش مسافر سے ملاقات ہوئی یہ شخص بڑا باتونی تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ فلاں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ اس ندی کے کنارے جو نشیبی گھاٹی کے عمق میں ہے اس نے پریوں کو گاتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے جھٹلا دیا۔ مگر دوسرے دن سفر کرتے ہوئے راستے میں مجھے اس ندی کا خیال آیا جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا۔۔۔۔ ندی کے کنارے گیا تو کہیں دور پار سے ہلکی ہلکی دلکش آواز جو نسیم بہار کی نرم رولہروں پر مستی بکھیر رہی تھی۔ سن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ برساتی ندی میں پانی بہت کم تھا۔ میں بآسانی اسے عبور کر کے پار کے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب گیت کہیں قریب ہی سنائی دیتے تھے۔۔۔ یہ نشاط انگیز راگنی مجھے اپنی طرف اس طرح کھینچ رہی تھی جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ جنگل کے وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنایا گیا ہے اور اس میدان میں ایک خوشنما جھونپڑی ہے جس کے ارد گرد خوش رنگ پھلواڑیوں کی بساط بچھی ہوئی ہے۔ قریب گیا تو فرط حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔۔۔ سوسن کی پھلواڑی میں ایک پری جمال حسینہ ایک پہاڑی ساز پر دلکش لے میں گیت گا رہی تھی اور چند کوہستانی لڑکیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے اس کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ اس حسینہ کو دیکھ کر میں پھڑک گیا۔ اس کی بڑی بڑی خوشنما صدفی آنکھوں سے ایک ایسا کیف کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ جس کی تیز رو میں میرے ہوش و حواس تک بہہ گئے۔۔۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے راگ رنگ ختم کر دیا۔ حسینہ نے مجھے بلا کر بڑے اخلاق سے اپنے قریب بٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں باتیں کرنے لگی۔ جب میرے حواس قدرے درست ہوئے تو میں نے اس حسینہ وغیرہ کا نام دریافت کیا۔ کہنے لگی میرا نام مہ لقا ہے۔ میں ایک کوہستانی رئیس کی لڑکی ہوں۔ والدین کے انتقال پر میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ یہ جگہ کبھی میرے باپ کی شکار گاہ تھی۔ یہاں اپنی کنیزوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔

میں نے تمام دن اس حسینہ کی صحبت میں گزارا۔ خوشی کے لمحے چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں۔ حتیٰ کے دن کی ڈھلتی چھاؤں وقت کی رفتار کا پتہ دینے لگی۔ مہ لقا سے رخصت ہو کر جواں بخت کی وادی کی طرف ہولیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے نا آشنا تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا دل اس لڑکی کو دے چکا ہوں۔ جواں بخت کی ملاقات کے بعد میں اپنے ڈیرے پر واپس آیا تو مہ لقا کی جدائی دن بدن مجھے شاق گزرنے لگی۔ بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں مگر دل نہ مانتا اور آخر کار اپنے کاروبار سے بددل ہو کر زیادہ تر جواں بخت کے پاس رہنے لگا۔ جواں بخت میری اس تبدیلی پر متعجب تھا لیکن میں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپائے رکھا۔۔۔۔ مہ لقا کی جھونپڑی جواں بخت کی وادی سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ اس لیے اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ اکثر جائے رہائش دریافت کیا کرتی۔ مگر میں نے کبھی اس سے جواں بخت کا ذکر نہ کیا۔ اسے ہمیشہ اپنے ڈیرے کا پتہ دیتا جو میرے کاروبار کا مرکز تھا۔ یہ سن کر وہ بدگمانی سے منہ پھیر لیا کرتی۔ کیونکہ وہ ڈیرا یہاں سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔۔۔۔ ایک دن جب کہ میں اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا وہ بے اختیاری سے کہنے لگی ''تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کر سکتی ہوں جب کہ تم اپنی جائے رہائش تک مجھ سے چھپا رہے ہو'' ۔ندامت سے جھٹ بے سمجھے بوجھے میرے منہ سے نکل گیا'' دوسرے کا راز میں نہیں بتا سکتا''۔ میرے اس جواب سے وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی'' آہ آپ مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے''۔۔۔۔ درحقیقت آنسو عورت کا زبردست ہتھیار ہے۔ جسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط ارادے کا مرد بھی زیر ہو جاتا ہے۔ آہ، میں بھی ان صدفان گوہر بار۔۔۔۔ کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور ان خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب کر لیا۔ افسوس میں نے اپنا مقدس عہد توڑ کر اسے اس وادی کا راز بتا دیا۔

رات کسی بدعہد گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی۔ جس کی نحوست سے کائنات دھواں دھار ہو رہی تھی۔ تیسری تاریخ کا نیا چاند افق کی تاریک گہرائیوں میں کھو چکا تھا۔ ستارے سیاہ بادلوں میں گم ہو چکے تھے۔ تمام دنیا ایک کالے دیو کی مٹھی میں بند معلوم تھی۔ جواں بخت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر میری آنکھوں میں نیند مفقود تھی۔ ایک نا معلوم خطرہ مجھے قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مبہم خوف سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں جہنمی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بے چینی سے چکرا رہا تھا۔۔۔۔ آدھی رات کے قریب یکا یک ایک گرجدار آواز سے تمام وادی گونج اٹھی۔ اس پر ہول آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آہ یہ اس مہیب نقارے کی آواز تھی جس پر خطرے کے وقت چوٹ پڑتی تھی۔ خطرے کے الارم پر تمام قبیلہ بیدار ہو گیا۔ جواں بخت کے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے نہایت عجلت سے ہتھیار لگائے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔۔۔۔ یک دم رہزنوں کا ایک زبردست گروہ جواں بخت کے محل پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کمال بہادری اور جوانمردی سے لڑا مگر رہزنوں کے ٹڈی دل کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ وہ مجروح ہو کر گر پڑا۔ رہزنوں نے اس کے ساتھ ہم سب کی مشکیں کس لیں اور ہمیں برق رفتار گھوڑوں پر لاد کر وادی سے نکال لائے۔۔۔۔ ابھی وہ وادی سے نکلے ہی تھے کہ جواں بخت کا باقی قبیلہ تعاقب کرتا ہوا آ پہنچا۔ چند میل کے فاصلے پر دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے ادھر میدان کارزار گرم ہو رہا تھا۔ ادھر ہم قیدیوں کو ایک غار میں پہنچا دیا گیا جس میں الاؤ جل رہا تھا۔ اور ایک بپھرے ہوئے شیر کے پنجرے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں حیرت و استعجاب سے اچھل پڑا آہ وہ مہ لقا تھی۔۔۔۔ وہ غصے سے دانت پیس رہی تھی۔ حالت غیظ میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ایک کونے میں وہی خوش پوش مسافر کھڑا تھا جو کبھی مجھے سرائے میں مل چکا تھا۔ جس نے مہ لقا کے اشارہ ابرو پر جواں بخت کی مشکیں کھولیں اور اسے خوفناک شیر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ مہیب شیر نے آناً فاناً جواں بخت کو اپنی مضبوط رانوں میں دبوچ کر ہلاک کر دیا۔ عین اسی وقت رہزنوں کے لشکر میں بھاگڑ پڑ گئی اور حملہ آور مار دھاڑ کرتے ہوئے غار کے قریب پہنچ گئے۔ خطرے کو بھانپ کر مہ لقا فوراً غار

سے باہر نکلی اور اپنی جماعت سمیت جنگل میں غائب ہوگئی۔ حملہ آور جب غار میں داخل ہوئے تو انہیں جواں بخت کا حسرت ناک انجام دیکھ کر ازحد صدمہ ہوا۔ اس کی لاش واپس وادی میں لائی گئی۔ جہاں نہایت احترام سے اسے سپرد خاک کیا گیا۔ چالیس دن تک اس کا قبیلہ سوگ مناتا رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جب کہ تمام قبیلہ جمع تھا۔ نیم عریاں کاہن نے کہا کہ ''میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ تم میں سے غدار کون ہے۔ لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ غدار سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم لوگ مقدس خون پر جواں بخت سے وفاداری کی قسم اٹھا چکے ہو اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جواں بخت کی عمر اس وقت پچاس سال کے قریب تھی۔ اس لیے پچاس کی عمر میں غدار پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑے گی۔ اور وہ شیر کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔'' نیم عریاں کاہن کے اس اعلان سے سب کے دل دہل گئے۔۔۔ کاہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ حوصلہ کر کے دل کو برقرار رکھا اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔ میں مجرم تھا۔ میرا سکون قلب رخصت ہو چکا تھا۔ اب تجارت میں بھی میرا دل نہ لگا۔۔۔۔۔ میں تجارت چھوڑ کر اپنے دیس چلا آیا۔ چونکہ جواں بخت کی بدولت میں نے بے شمار دولت کمائی تھی۔ میں امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نیم عریاں کاہن کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاسواں سال شروع ہوا ہے خوف سے مجھے زندگی وبال ہوگئی ہے۔ رات کو شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے خوفناک سائے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ملک الموت کے سرد پاؤں کی چاپ محسوس کرتا ہوں''۔ روحیں میرے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جواں بخت کی کفن پوش لاش مجھے بلاتی ہے اور اسی خوف سے گوشہ نشین ہو رہا ہوں''۔۔۔۔ حیدر کی داستان سن کر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں وہم ہوگیا ہے ورنہ ایسی قسمیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ اور نہ تم نے جان بوجھ کر غداری کی۔ ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ یہاں شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔ میں بہت دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب میں اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ سلیم لائبریری میں سو رہا ہوگا۔۔۔۔ میں لائبریری کی طرف گیا تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ابا میں نے چچا کی تمام باتیں سنی ہیں۔ وہ بہت ڈرپوک ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے ڈرتے ہوئے کہا سلیم ایسا نہیں کہا کرتے۔ وہ شوخی سے بولا وہ درحقیقت بہت ڈرپوک ہے۔ دیکھو میں نے اسے ڈرانے کے لیے دیوار پر کیا بنایا ہے۔۔۔۔ میں نے دیوار کی طرف دیکھا سلیم نے اس پر اپنی رنگین پنسل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر میں بے اختیار ہنس دیا اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

چونکہ رات کو میں دیر سے سویا تھا۔ اس لیے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ حیدر کی موت کی خبر پہنچی۔ اسے رات کو کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔ میں اس وقت حیدر کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پولیس جمع تھی۔ حیدر کی لاش بستر پر نہایت ابتر حالت میں پڑی تھی۔ اس کی شاہرگ کے قریب ایک بہت بڑا گہرا زخم تھا اور کسی درندے کے خون آلود پنجے بستر کی سفید چادر پر صاف نمایاں تھے۔۔۔۔ میں سراسیمگی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لائبریری میں جا نکلا۔

اچانک مجھے سلیم کی بنائی ہوئی تصویر کا خیال آیا۔ مگر دیوار کی طرف دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔

سلیم کی بنائی ہوئی شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی۔

☆☆☆

ساتواں چراغ

میرزا ادیب

گرمی ہو یا سردی شمالی پہاڑی کی بلندیوں سے سرد ہوائیں مسلسل نیچے اترتی رہتی ہیں۔ کبھی تو بڑی بوجھل ہوتیں اور کبھی نسبتاً ہلکی۔ یہ ہوائیں جب بھی اس بے آب وگیاہ علاقے میں سے گزرتی تھیں تو کہیں بھی ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ کیونکہ کوئی دیوار، درختوں کی کوئی قطار ان کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ برابر آگے بڑھتی چلی جاتیں اور گو بابا صاحب کے مقبرے تک پہنچتے پہنچتے ان کی رفتار کبھی کبھی مدھم بھی پڑ جاتی تھی تاہم جس وقت بھی وہ اس مقبرے کی بوسیدہ دیواروں سے ٹکراتی تھیں تو دیکھنے والے کو فوراً یہ احساس ہو جاتا تھا کہ یہ دیواریں فی الفور زمین بوس ہو جائیں گی، مگر برسوں سے ہواؤں کا یہ عمل جارت تھا اور مقبرے کی یہ کمزور دیواریں بدستور اپنی اپنی جگہ پر کھڑی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں کہیں کہیں رخنے پڑ گئے تھے اور ہواؤں کے جھونکے ان رخنوں میں سے گزر کر ٹوٹے پھوٹے مزار کو چھوتے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔

یہ بابا صاحب کون تھے؟ ان کی یہ ابدی قیام گاہ کب تعمیر ہوئی تھی اور ان دیواروں نے کب سر اٹھایا تھا؟ ان باتوں کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

بابا صاحب کے مقبرے سے ڈیڑھ میل دور جنوب کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں جی جی پور کے نام سے ضرور آباد تھا۔ لیکن اس گاؤں کا بوڑھے سے بوڑھا آدمی بھی ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

اس گاؤں کو آباد ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت نہیں بیتی تھی۔ اس سے پہلے یہاں پانی ہی پانی تھا۔ پھر جب اس پانی کو مصرف میں لانے کے لیے ایک قریبی نہر میں منتقل کر دیا گیا تو دلدلی علاقہ سورج کی تمازت سے سوکھ کر اس قابل ہو گیا کہ یہاں لوگ کچے پکے مکان بنا سکیں اور اردگرد دیہات میں رہنے والوں نے میلوں پھیلی ہوئی اس زمین کو دیکھا جہاں وہ آسانی سے مکانات تعمیر کر سکتے تھے، کھیت بنا کر فصلیں اگا سکتے تھے تو وہ ادھر آنے لگے اور چند ہی سال میں یہاں اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔

اس گاؤں کا نام جی جی پور کیسے پڑا؟ اس سلسلے میں گاؤں کے پرانے لوگ بتاتے تھے کہ جب ان میں سے کسی نے سب سے پہلا مکان بنایا تو یہاں ایک جھونپڑی میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا جو بالعموم نیم عریاں حالت میں دکھائی دیتا تھا۔

اس شخص نے بتایا کہ وہ بابا صاحب کا مرید خاص تھا۔ چنانچہ وہ دن کا سارا وقت تو اپنی جھونپڑی ہی میں بسر کرتا تھا اور جیسے ہی شام کی تاریکی فضاؤں میں پھیلنے لگتی تھی بابا صاحب کے مزار پر چلا جاتا تھا اور تمام رات وہیں گزار دیتا تھا۔

بابا صاحب کو ماننے والے لوگ مزار پر کچھ نہ کچھ نذر و نیاز چڑھاتے رہتے تھے۔ یہ شخص اس میں سے تھوڑا سا حصہ وصول کر کے باقی زائرین ہی میں بانٹ دیتا تھا اور یوں اس کے لیے قوت یا صحت کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔

گاؤں کا نام اسی شخص کی نسبت سے مشہور ہوا تھا۔ اس کا حقیقی یا پیدائشی نام کیا تھا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اور نہ وہ کسی کو اپنے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کا خواہش مند ہی تھا۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے فقرے پر جی جی کہتا تھا، یوں کہنا چاہیے کہ جی جی اس کا تکیہ کلام تھا۔ اس کے پاس عقیدت سے آنے والوں نے اسے بار بار جی جی کہتے سنا تو اس کا نام ہی جی جی میاں لینے لگے اور اس طرح یہ گاؤں جی جی پور مشہور ہو گیا۔

گاؤں والے جی جی میاں کا بہت احترام کرتے تھے اور جو کچھ وہ کہتا تھا اسے صحیح تسلیم کر لیتے تھے۔ اس جی جی میاں نے

گاؤں کے خاص خاص لوگوں کو بتایا تھا کہ بابا صاحب بڑے اونچے درجے کے بزرگ تھے۔ **مگر** طبیعت کے لحاظ سے تھے جلالی۔ بڑی جلدی جلال میں آجاتے تھے اور بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بلا تکلف جھڑک دیتے تھے۔

شاید انہی جی جی میاں نے بتایا تھا اگر بابا صاحب کے مزار پر ہر جمعرات کو مٹی کا **ایک** چراغ جلایا جائے تو ساتویں جمعرات کو جب آخری چراغ جلایا جائے گا تو چراغ **چلا**نے والے کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔

چراغ جلایا جاتا تھا مگر ابھی اسے مزار پر رکھا ہی نہیں جاتا تھ کہ شمالی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد **ہوائیں** اسے بجھا دیتی تھیں۔ گاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جسے اس کا علم نہیں تھا اور جس کے دل میں یہ یقین جاگزیں نہیں تھا کہ ساتویں جمعرات کو چراغ جلانے والے کی آرزو ضرور پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس آزمائش پر پورا اترنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ اول تو پہلی جمعرات ہی کو چراغ کی لو شمالی ہواؤں کے حملے سے سیاہ پوش ہو جاتی تھی اور اگر پہلے دو تین چراغ صحیح سلامت مزار تک پہنچ بھی جاتے تھے تو ان کے بعد جو چراغ جلایا جاتا تھا وہ ضرور بجھ جاتا تھا۔ عام یقین یہ تھا کہ اب تک جو کوئی شخص بھی یکے بعد دیگرے سات چراغ جلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ بابا صاب کی جلالی طبیعت کی کارفرمائی ہے۔ ورنہ شمالی پہاڑوں کی بلندیوں سے آنے والی سرد ہواؤں کا یہ کہاں حوصلہ کہ وہ عین اس لمحے دیوار کے روزنوں سے اندر آئیں جب مزار کے قریب چراغ جلایا جاتا ہو۔ یوں ساتواں چراغ جلانے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی تھی البتہ بعض لوگوں کی زبانی یہ بات سنی جاتی تھی کہ کافی مدت ہوئی ایک بار ایک دھوبن نے مزار پر ساتواں چراغ بھی جلا دیا تھا اور اس کی مراد بھی پوری ہو گئی تھی۔ اس کا بیٹا جو قتل کے مقدمے میں ماخوذ تھا پھانسی کی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

اس حقیقت کی تصدیق اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ ماں اور بیٹا دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

اگر کوئی شخص مقبرے کے اندر جانے کی بجائے اس کے اردگرد گھومتا تو اسے بے شمار ٹوٹے ہوئے مٹی کے چراغ نظر آجاتے۔ یہ وہ چراغ تھے جو مزار پر دو دو تین تین یا زیادہ سے زیادہ چار چار کی تعداد میں جلے تھے اور چونکہ یہ چراغ جلانے والے وہ شرط پوری نہیں کر سکے تھے یعنی سات جمعراتوں تک سات چراغ نہیں جلا سکے تھے اس لیے ان کے چراغ مزار سے اٹھا کر باہر **پھینک** دیئے گئے تھے تا کہ نئے مرادیں مانگنے والوں کو بھی قسمت آزمائی کا موقعہ ملتا رہے۔

یہ چراغ باہر کون **پھینک** دیتا تھا اس سوال کے مختلف جواب دیئے جاتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ بابا صاب کے واحد مرید جی جی میاں جو ایک روز چپ چاپ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر اس طرح غائب ہو گیا تھا کہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہی آدھی رات کو باقاعدہ یہاں آتا ہے اور چراغ باہر **پھینک** دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شمال سے آنے والی سرد ہوائیں ہی ان چراغوں کو دھکیلتی ہوئی دروازے سے باہر لے جاتی ہیں اور یہ چراغ اس عمل کے دوران ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

جی جی گاؤں کا سب سے متمول آدمی ناصر خاں تھا جس کی زرعی اراضی بیس مربعوں پر مشتمل تھی اور جس کی حویلی کے دالان میں سو کے قریب چارپائیاں بچھائی جا سکتی تھیں۔ ناصر خاں ان آباد کاروں میں سے تھا جو سب سے پہلے یہاں آئے تھے۔ آدمی تجربہ کار اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے حال کے آئینے میں مستقبل کے واضح خدوخال دیکھ لیے تھے وہ کشتیا جا کر یہاں آیا تھا یعنی اس نے اپنی تھوڑی سی شہری جائیداد فروخت کر دی تھی اور ہمیشہ کے لیے اس اجاڑ مقام پر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ اس نے وقت سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اراضی پر اپنی ملکیت جمالی تھی۔ پیسہ پاس تھا غریب لوگوں کو اپنا مزارع بنالیا اور اس طرح اس کی دولت اور ذاتی وجاہت میں دن رات اضافہ ہونے لگا۔

گاؤں کے لوگوں کی تو بیشتر آبادی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بابا صاب کے مزار پر جا کر چراغ جلانے کی شرط پوری کرنا

بہت مشکل ہے اس لیے وہ لوگ ادھر کا رخ ہی نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اپنے کٹھن سفر پر روانہ ہو جاتا تھا۔ لیکن چوتھے پانچویں چراغ کے بجھ جانے پر اس کی اپنی طبیعت اس طرح بجھ جاتی تھی کہ وہ پھر زندگی بھر ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ البتہ شہر سے کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا اور جو بھی آتا تھا وہ سیدھا ناصر خاں کی طرف جاتا تھا اور ناصر خاں اس وقت اس کے رہنے سہنے کا بندوبست اپنی حویلی میں کر دیتا تھا اور پہلے دن کے بعد اس سے یکسر بے نیاز ہو جاتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ مہمان دو تین جمعراتیں ہی یہاں بسر کرے گا اور جاتے ہوئے ملے گا بھی نہیں۔

مہینے میں ایک دو قسمت آزما ضرور آ جاتے تھے۔ کوئی مرد تو شاذ ہی آتا تھا۔ عام طور پر عورتیں اور وہ بھی عمر رسیدہ آتی رہتی تھیں مگر اس مرتبہ ایسا ہوا کہ تین مہینے گزر گئے اور ناصر خاں کی حویلی کے بڑے پھاٹک پر کسی نے بھی دستک نہ دی۔ نہ جانے گاؤں والوں کو اس سے اپنی اجتماعی زندگی میں ایک خلا کیوں محسوس ہونے لگا تھا۔ چوپال میں جب بھی کچھ لوگ بیٹھتے تھے تو ہیر رانجھا یا زیتون نامہ سننے سے پہلے اس کمی کا تذکرہ ضرور کرتے تھے اور ناصر خاں کے منشی منظورے کو تو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ چنانچہ اس نے حویلی کے چوکیدار سے کہہ دیا تھا۔

''چاچا رات کو آرام سے سو جایا کر۔ بابا صاب کے مزار پر کوئی نہیں آئے گا''۔

اور چوکیدار چاچا مرزہ نے یہ بات پلے باندھ لی تھی۔ وہ اس امر سے بے نیاز ہو گیا تھا کہ جمعرات کو کوئی شخص مٹی کا چراغ اور ماچس لے کر حویلی سے نکلے گا اور آدھی رات سے پہلے پہلے لوٹ آئے گا۔ وہ پھاٹک کے پہلو میں رکھے ہوئے بنچ کے اوپر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تھا اور پھر اونگھتے اونگھتے سو جاتا تھا۔

چوتھے مہینے کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جاگیردار ناصر خاں اپنی سفید گھوڑی سے نیچے اترا اور اسے مرزہ کے حوالے کر کے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بوڑھیا نے جس کا لباس میلا کچیلا تھا اور جس نے ہاتھ میں ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا، پھاٹک کے پاس ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

ناصر خاں بارہا ایسے لوگوں سے پھاٹک کے سامنے مل چکا تھا اس لیے یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی کہ یہ عورت کس مقصد کے ساتھ آئی ہے اور اس سے کیا توقع رکھتی ہے۔

''ٹھیک ہے''۔ ناصر خاں نے رٹا رٹایا جملہ بوڑھیا کی طرف پھینک دیا۔

ناصر خاں جب یہ جملہ زبان سے نکالتا تھا تو اسے کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چوکیدار مہمان کو ساتھ لے کر اسے حویلی کے ایک کمرے میں پہنچا دیتا تھا اور اس وقت اس کے قیام تک کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیتا تھا۔

ناصر خاں پھاٹک کے اندر چلا گیا تھا۔ معمول کے مطابق بوڑھیا کو چوکیدار کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانا چاہیے تھا مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا تو اب کیوں ہو رہا تھا۔ ناصر خاں چند قدم چل کر رک گیا۔

''مرزہ''۔ اس نے چوکیدار کو پکارا۔

چوکیدار نے بوڑھیا کو چلنے کا اشارہ کیا اور وہ چلنے لگی۔

ناصر خاں نے پھاٹک کے اوپر جلتے ہوئے سو پاور کے بلب کی روشنی میں بوڑھیا کو دیکھا۔ اس چہرے میں اسے ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ ایسی کیفیت اس نے اس دھوبن کے چہرے پر بھی دیکھی تھی جو مزار پر ساتواں چراغ جلا کر مراد پا چکی تھی۔

''تو کون ہے؟'' جاگیردار کے لہجے میں کرختگی تھی۔

''میں ۔۔میں'' بوڑھیا بس یہی لفظ کہہ سکی۔
وہ گھور گھور کر اسے دیکھ رہا تھا۔
''اماں! تو کرتی کیا ہے؟''
''پتر میں تو بس''۔
ناصر اس کے قریب آ گیا۔
''تو بھی؟''
بوڑھیا اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔
''اماں تو بھی ساتواں چراغ جلالے گی''۔

بوڑھیا کے چہرہ جو پہلے تذبذب کا تاثر لیے ہوئے تھا اس پر ایک ایسا نور جھلملانے لگا جو طلوع آفتاب کے وقت مشرقی افق پر تھوڑی دیر کے لیے برقرار رہتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

ناصر خاں چند لمحے وہاں ٹھہر کر چلا گیا۔

بوڑھیا کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظر سب سے پہلے مٹی کے ان چند چراغوں پر پڑی جو ایک طرف ایک چھوٹی سی میز کے اوپر پڑے تھے۔ چراغوں کے پاس کچھ روئی بھی نظر آ رہی تھی۔

میز کے علاوہ کمرے کے اندر ایک چارپائی بھی تھی۔ ٹین کا ایک لوٹا، ایک دیگچی اور اس قسم کی گھریلو استعمال کی کچھ اور چیزیں بھی موجود تھیں۔

چوکیدار بجلی کا بلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بوڑھیا دروازے کے قریب رک کر کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ اسکے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔ اس نے اپنا تھیلا میز کے اوپر رکھ دیا اور اس کی انگلیاں ان چراغوں کو چھونے لگیں جن میں تیل کی ایک بوند بھی نہیں پڑی تھی۔ اسے یکا یک خیال آیا کہ جو بھی یہ چراغ لایا ہوگا وہ کتنی آس کے ساتھ آیا ہوگا اور پھر مایوس ہو کر چلا گیا ہوگا۔

اسے اپنا خیال آ گیا۔ وہ ایک ایسے کپڑے کی طرح تھی جس کو دھو کر پوری طرح اس کا پانی نہ نچوڑا گیا ہو اور اس حالت میں سبز گھاس پر بکھیر دیا گیا ہو۔

دھوپ کی شدت کپڑے کے اس باقی پانی کو بھی چوس لے گی۔

اس کا سر گھومنے لگا اور وہ چارپائی پر گرنے ہی والی تھی کہ جاگیردار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے ''وہاں تو بھی ساتواں چراغ جلالے گی'' اور اس کے باطن میں پھر ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔

جمعرات آنے میں دو دن باقی تھے۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے تھیلے میں سے ساری چیزیں میز پر انڈیل دیں۔ ان میں کڑوے تیل کی ایک بڑی بوتل تھی۔ دس بارہ مٹی کے چراغ اور روئی کا ایک بنڈل۔

جس وقت وہ تھوڑی تھوڑی روئی لے کر بتیاں بنا رہی تھی تو ایک دم اسے احساس ہوا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر نہیں، موچی دروازے کے اندر اپنے چھوٹے سے جدی مکان میں ہے اور ہانڈی چولہے پر رکھ کر پرانے مونڈھے پر بیٹھی دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہے جہاں وہ چہرہ نظر نہیں آتا جو نو سال پہلے غائب ہو گیا تھا۔

شوہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا چراغ دین ہی اس کا واحد سہارا تھا۔ بارہ سال تک وہ بڑا ذمے دار بیٹا بنا رہا۔ ماں کو کبھی اس سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی۔ محلے کے بیسیوں گھروں تک جانا، وہاں سے میلے کپڑے لانا، ہر ہفتے ان سب کپڑوں کی

لدیاں بنا کر دریا پر لے جانا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر انہیں دھونا اور پھیلی ہوئی ریت پر سکھانے کے لیے پھیلا دینا، شام کے بعد انہیں اپنے بیل پر لاد کر گھر لے آنا اور رات کو گیارہ بارہ بجے تک ان پر استری پھیر کر الگ الگ گاہکوں کے کپڑے تہ کر کے رکھ دینا اور دوسرے روز صبح سے لے کر تیسرے پہر تک گھر گھر کپڑے پہنچا کر اجرت وصول کرنا، یہ سب کام وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ کرتا رہتا۔ ان سب کاموں میں اس کی ماں بھی برابر اس کی مدد کرتی رہتی تھی مگر وہ چاہتا نہیں تھا کہ ماں کی بوڑھی ہڈیوں کو تکلیف دے۔

تیرھواں سال شروع ہوا تو نہ جانے کس طرح اسے جوئے کی لت پڑ گئی۔ کئی دن اور کئی راتیں حوالات میں بھی گزار دیں۔ لیکن یہ لت دور نہ ہو سکی بلکہ بڑھتی چلی گئی۔ ایک رات وہ بڑی دیر سے گھر میں آیا۔ صبح اسے ایک ہمسائی نے بتایا کہ اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس آ رہی ہے۔ اس نے ابھی کلیجے کا ایک ہی لقمہ دہی میں لتھڑا کر حلق سے اتارا ہو گا کہ جلدی سے پاؤں میں جوتے ڈال کر سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ ماں پیچھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔

اس کے بعد اس کی ماں اس کی صورت نہ دیکھ سکی۔

اس کی زندگی کے سب سے خوشگوار اور مسرت بخش وہ لمحے ہوتے تھے جب وہ دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے بیٹے کے بیل کی گھنٹیوں کی آواز سنا کرتی تھی۔ یہ بیل شام کے بعد واپس گلی میں داخل ہوتا تھا اور گلی میں داخل ہوتے ہی اس کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر وہ تیزی سے دروازے پر آ کھڑی ہوتی اور جب تک ایک ایک کر کے ساری لدیاں اندر رکھوا نہیں لیتی تھی اسے چین نہیں پڑتا تھا۔

وہ سارے کام مزے لے لے کر کرتی تھی۔ استری میں سے بجھی کچھی راکھ باہر نکالتی تھی، لمبے چوڑے تختے پر جس کے اوپر ایک ایک کپڑا اچھا کر استری کی جاتی تھی، اس کی چادر بدل دیتی تھی، کوئلوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈال کر یہ اندازہ کر لیتی تھی کہ ان سے کام چل سکتا ہے یا نہیں، نیم سوختہ کوئلے رکھ کر باقی راکھ ملے باہر پھینک دیتی تھی۔

چراغ ابھی گھر سے دور ہی ہوتا تھا کہ وہ صدقے جاواں واری جاواں کہہ کر اس سے جا کر لپٹ جاتی تھی۔

مگر پچھلے نو سال سے اس کے گھر میں اور اس کے دل میں تاریکیاں ہی تاریکیاں چھا چکی تھیں۔

اپنے بیٹے کو پانے کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ سیانوں نے جو کچھ کہا تھا وہ کر چکی تھی مگر اب وہ تھک چکی تھی۔ بالکل مایوس ہو چکی تھی کہ اس نے بابا صاب کی کرامت کا حال سنا اور وہ اسے آخری سہارا سمجھ کر جاگیردار کے یہاں آ گئی۔

اس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں اور اس کی انگلیاں متواتر حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے سامنے بتیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

اتنی ساری بتیاں۔ اچار ڈالنا ہے؟

یہ الفاظ جاگیردار ناصر خاں نے کہے تھے جو شاید جب سے حویلی بنی تھی تیسری مرتبہ اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔

بوڑھیا نے ایک نظر بتیوں پر ڈالی اور پھر ناصر خاں کو دیکھنے لگی جس کی مونچھوں کے بال جھک کر ٹھوڑی کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میں نے سنا ہے تمہارا بیٹا نو سال سے غائب ہے''۔

بوڑھیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ناصر خاں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے بوڑھیا سے پوچھا۔

''فاطمہ''۔

''فاطمہ'' ناصر خاں نے چند سیکنڈ بوڑھیا کو گھور کر دیکھا اور پھر یوں سر ہلانے لگا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی تصدیق ہوگئی ہے۔

''کوئی تکلیف؟''

بوڑھیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کمرے سے باہر ناصر خاں کا منشی ہاتھ میں حساب کتاب کے لمبے لمبے رجسٹر لیے اپنے مالک کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ناصر خاں کی اس پر نظر پڑی تو دروازے کی طرف جانے لگا۔

جمعرات کی شام کو جھکڑ چلنا شروع ہوگیا تھا۔ بوڑھیا نے چراغ میں بتی اور تیل ڈالا دوسرے ہاتھ میں ماچس پکڑی بسم اللہ کہہ کر تنہا مزار کی طرف روانہ ہوگئی۔

کسان کھیتوں سے لوٹ رہے تھے اور ان کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بوڑھیا کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ سنسان راستوں سے گزرتی ہوئی وہ مقبرے کے اندر داخل ہوگئی۔ اندر داخل ہوتے وقت بھی اس کے کانوں میں بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز گونج رہی تھی اور وہ ان سرما کی ہواؤں سے بے نیاز تھی جس کے جھونکے مقبرے کی دیواروں سے ٹکرا کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔

اس نے تیلی کو ماچس کے کنارے پر رگڑا، آہستہ سے اسے بتی کی لو کی طرف بڑھایا۔ ایک ہلکی سی روشنی پھوٹ پڑی۔ جلتا ہوا چراغ اسے مزار کے ایک طرف رکھ دیا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور چند لمحوں بعد انگلیوں سے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کر کے جلتے ہوئے چراغ پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

وہ قدم اٹھا رہی تھی مگر اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے، کہاں جا رہی ہے۔ یکا یک حویلی کے چوکیدار نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا مائی صاب؟''

بوڑھیا نے اپنی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی اور پھاٹک میں سے نکل گئی۔

کمرے میں جا کر اس نے ماچس میز کے اوپر رکھ دی، چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کے اندر آتے وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اس کے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس وقت وہاں جا کر اس کے دونوں پٹ کھول دیئے اور ٹکٹکی باندھ کر ادھر دیکھنے لگی۔

دوسری، تیسری، اور پھر چوتھی جمعرات بھی گزر گئی اور بادشمال کے سرد جھونکے اس کے جلائے ہوئے چراغوں کی لوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔

پانچویں جمعرات کو جب اس نے چراغ جا کر مزار کے پہلو میں رکھا اور مدھم روشنی میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اس احساس کے باوجود اس کے نم آلود ہونٹ لرزتے رہے۔

دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر وہ مڑی اور اس نے دیکھا کہ ایک جلتا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک دھندلا سا چہرہ دکھائی دینے لگا جس کے گرد دوپٹہ لپٹا ہوا تھا۔

دو تین لمحوں کے لیے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے ہونٹ لرزتے رہے اور پھر دونوں کی نظریں جھک گئیں۔

ہوا تند و تیز تھی۔ اوپر کسی اڑتے ہوئے پرندے کی چیخ فضا میں تحلیل ہوگئی۔ وہ جب حویلی کے پھاٹک پر پہنچی تو اس مرتبہ

چوکیدار مرزہ نے کوئی سوال نہ کیا اور پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا۔
''یہ کون ہے؟'' اس نے چارپائی پر لیٹ کر خود سے سوال کیا۔
''کوئی ہوگی، میری طرح بدنصیب، دکھیاری''۔
چھٹی جمعرات کو وہ بابا صاحب کے مزار کے پاس پہنچی تو اسے مزار کے پہلو میں ایک جلتا ہوا چراغ نظر آیا۔ اس چراغ کے ساتھ پانچ اور چراغ تھے جو بجھ چکے تھے مگر لگتا تھا اس چھٹے چراغ کی لو سے جو مدھم سی روشنی پھوٹ رہی ہے وہ ایک روشن لکیر کی طرح ان کے اوپر پھیل گئی ہے۔
اس نے اپنا چراغ جلایا اور چراغوں کے پہلو میں رکھ دیا اور جب دونوں ہاتھ پھیلا کر سینکڑوں بار دہرائے ہوئے الفاظ اپنے ہونٹوں سے نکالنے لگی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ نیچے کر کے اپنی جھولی کے کناروں کو پکڑ لیا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی جھولی میں گرنے لگے۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سامنے دیکھا اس کا چراغ جل رہا تھا اور دوسری طرف دوسرا چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس نے یکایک محسوس کیا کہ دونوں چراغوں کی لویں اس کے آنسوؤں میں سے گزرتی ہوئی آنکھوں کے اندر چلی جا رہی ہیں۔
وہ دیر تک جھولی پھیلائے کھڑی رہی۔
اس رات وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہی اور جب آثار سحر نمودار ہونے لگے تو مقبرے سے باہر نکل آئی۔
باہر نکلتے وقت اس نے ایک لمحے کے لیے پلٹ کر دیکھا۔ ذرا فاصلے پر دونوں چراغ روشن تھے۔
آخر ساتویں جمعرات آ گئی۔
دور عشاء کی نماز کی اذان بلند ہوئی تو اس نے چراغ بتی اور ماچس سنبھالی اور بسم اللہ کہہ کر چلنے لگی۔
اوپر ستارے چمک رہے تھے، اور ہوا خاصی تیز تھی۔ وہ خاموش، ویران راہ پر قدم اٹھائے مقبرے کی طرف جا رہی تھی۔
کسی قریبی علاقے میں شدید بارش ہوئی تھی جس کا پانی بہتا ہوا نشیبی حصوں میں آ کر جابجا ٹھہر گیا تھا۔ کہیں کہیں یہ پانی زیادہ گہرا تھا اور اسے بڑی مشکل سے آگے بڑھنا پڑتا تھا۔
جب وہ مزار کے قریب کھڑی تھی تو اس کے دل میں ایک ہیجان برپا تھا اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور سانس جیسے سینے میں رک سا گیا تھا۔
اس نے ماچس کی تیلی جلائی۔ چراغ کی لو کی طرف بڑھائی اور چراغ روشن ہوگیا۔
یہ چراغ آہستہ آہستہ مزار کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ ایک آہ اس کے کان تک جا پہنچی تھی۔
اس نے سامنے دیکھا۔ مزار سے کچھ اوپر ایک بجھا ہوا دیا اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک ایسا چہرہ جو اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس پر سکتے کا عالم طاری ہو۔ ایک گرم گرم لہر اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔
اس کا ہاتھ مزار کی طرف حرکت کرنے کی بجائے اوپر جانے لگا۔ دوسرے لمحے میں بجھا ہوا چراغ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور اس کا جلتا ہوا چراغ اس مایوس عورت کے ہاتھ میں جو ایک کھنڈر کی دیوار کی طرح جھکی ہوئی تھی۔
تین چار لمحوں ہی میں یہ سب کچھ ہوگیا۔
بجھا ہوا چراغ لے کر وہ ایک سیکنڈ بھی وہاں نہ ٹھہری۔ مقبرے سے باہر آ گئی اور مشرق کی طرف چلنے لگی۔

ہوا کے تندو تیز تھپیڑے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ بار بار اس کے قدم لڑکھڑا جاتے تھے۔ مگر وہ برابر چلی جارہی تھی۔ آگے ہی آگے کسی منزل کا تصور کیے بغیر جیسے دور سے کسی نے اسے اشارہ کردیا ہو اور وہ کہیں بھی رکنا نہ چاہتی ہو۔

پھر بارش ہونے لگی اور بارش کے بھاری بھاری قطرے چراغ کے کناروں پر اور چراغ کے اندر گرنے لگے۔ جب یہ قطرے چراغ کے کناروں سے لگتے تھے تو ٹن کی ہلکی سی آواز آنے لگتی تھی۔

اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اس کے تھکے ہوئے ضعیف پاؤں میں ایک نامعلوم سی قوت آگئی۔

بارش کے قطرے گر رہے تھے۔ آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن۔

وہ کہیں بھی نہ رکی۔ تیز و تند ہوائیں برابر چل رہی تھیں۔ بارش بڑھتی جارہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بارش تھم گئی مگر ہواؤں کی تندی و تیزی میں کوئی فرق نہ آیا۔

صبح ہوگئی تھی۔ کسان اپنے اپنے بیلوں کو لیے کھیتوں کی طرف جارہے تھے۔

اچانک ان کے قدم رک گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھیا چلی جارہی ہے اور طوفانی ہواؤں میں اس کے ہاتھ میں تھما ہوا چراغ جل رہا ہے۔

بوڑھیا کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس نے چراغ کی طرف ایک لمحے کے لیے بھی نہیں دیکھا تھا وہ چلی جارہی تھی اور اس کے دائیں بائیں اور پیچھے حیران و سراسیمہ لوگ قدم اٹھا رہے تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کے وسطی حصے میں ایک نوتعمیر شدہ مقبرے کی دیواریں کھڑی ہیں۔

قصبے کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہاں ایک بزرگ خاتون دفن ہے۔ جس کا چراغ طوفانی ہواؤں میں بھی جلتا رہا تھا۔ اس لیے اسے چراغ بی بی کہتے ہیں۔

ہر روز عقیدت مند یہاں آتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کے بچے گم ہوگئے ہیں۔

مزار کے سرہانے ایک مٹی کا چراغ ساری رات جلتا رہتا ہے۔

☆☆☆

سمے کا بندھن

ممتاز مفتی

آپی کہا کرتی تھی: سنہرے، سمے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنے سمے پہچان، سنہرے۔ اپنے سمے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی۔ آلنے سے نہ گرتی، سمجھ تو گئی۔ پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھن کی۔ آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی تیرے پنڈے کی چھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی، کٹھالی میں پڑے بنا۔ پھر یہ چھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی، کہاں سے آئی تھی۔ کوئی لایا تھا۔ بالپن ہی میں آپی کے ہاتھ بک گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی کی سرتال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا اُمڈ اُمڈ آیا۔ چھپائے نہ چھپتا تھا۔ آپی بولی: نہ ڈھیے، چھپا نہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپانا۔

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی "یہ کیا کر رہی ہے بٹی؟ سیانے کہتے ہیں، جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دیکھنا نہیں۔ دکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن، منظر بن۔ اور جو دیکھے بھی تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال۔ اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سمے دیکھ سنہرے۔ ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے۔ دکھ کا سمے ہے۔ شام بھئی گھن شام نہ آئے"۔ آپی گنگنانے لگی "یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کا سمے ہے۔ پگلی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہوگا۔ پچھلے پہر تک"۔

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولہ پھنسا ہوتا تھا۔ "ٹھا" کر کے کھلتا تھا۔

بولی "سنہرے، بوتل کھول، گلاس میں ڈال۔ چٹکی بھر نمک گھول اور مجھے پلا دے۔ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی، دیکھ لڑکی، یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جاگ اٹھے۔ ہم میں نہیں۔ دوجے میں اٹھے۔ دوجے میں جھاگ اٹھانا یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت دوجا بلبلے ہی بلبلے۔ اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں دھرنا۔ ٹھمک نہ کرنا۔ ٹھمک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک کا سمے گیا۔ پائل نہ جھنکارنا۔ پائل کی جھنکار بیرن بھئی۔

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی "سنہرے، میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں، اوپر کی نہیں، سنی سنائی نہیں، پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتے ہیں، بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گری ہو، چھلکا نہ ہو۔ جو بتی ہو۔ جگ بتی نہیں۔ آپ بتی ہو۔ ہڈ بتی۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا"۔

آج کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں، پتا نہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں۔ چلے جاتی ہیں۔ جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں۔ پیلی، روپا اور میں۔ پیلی بڑی، روپا منجھلی اور میں چھوٹی۔ پیلی میں بڑی آن تھی۔ پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی جیسے ٹیا رس بھری رہتی ہے۔ مورتی سمان۔

روپہ سریہی سرتھی۔ تاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سرتیاں سمرتیاں۔ اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے۔ اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جلا دیتے۔ تبھی میں تھی۔ آپی کہتی تھی سنہرے، تجھ میں دکھ کی بھیگ ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے۔ پگلی دوجے کو ڈبویا کر، خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا منہ اٹھایا اور چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے بیٹھک پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولتیے آتے تھے۔ پر ایسے بدمزہ ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو پڑے اچھالیں۔ لڑکیو تم دا چھلنا۔ جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں وہ منہ کے بل گرتی ہیں۔ اور جو گرگئی وہ سمجھ لو نظروں سے گرگئی۔ پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی۔

آپی کی بیٹھک میں نظریں نہیں چلتی تھیں۔ کان لگے رہتے تھے۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ برہا کا ہوتا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ وہاں تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہمارے ہاں ٹھاکر بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آسکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا۔ اندر جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم، گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا۔ سنگت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی بجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھتا۔ پیتا ضرور تھا، پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا الٹا مدھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتی۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا نہ ہو، بھیتر کا ہو۔ بوتل ایک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

ڈرو سکھیو ڈرو۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ یوں ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجہ کے روبرو نیچ کھڑا ہو۔ بوتل کا خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ ڈرو سکھیو ڈرو بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بوتل کا تو کام کاج جوگا نہیں چھوڑتا۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے ''گاٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی''۔ گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ پھر کہو، پھر بولو کا جاپ کیے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کی۔ سمے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی ''شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو''۔

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ ''نہ آپی'' وہ بولا۔ ابھی تو رات بھیگی ہے۔ آپی بولی ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہیں۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی رہا کیا؟ ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔ ''آپی یہ سمے کا گورکھ دھندا کیا ہے؟''

آپی بولی ''لڑکیو سمے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سمے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پیو۔ پلاؤ۔ ملو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ بس تین بجے تک۔ پھر بھور سمے اس کا سمے ہے۔اس کا نام جپو۔ اسے پکارو۔ فریاد کرو۔ دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سمے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے اس کے سمے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو وہ راضی ہو گیا تو بھی ماری جاؤ گی۔ اور دیکھو اس کے سمے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرو کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے ان جانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولے ''بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہو گی ادھر حویلی میں۔ صرف اپنے ہوں گے، گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ میرے گاؤں''۔

آپی سوچ میں پڑ گئی۔ بولی ''روپہ ماندی ہے۔ وہ تو نہیں جا سکے گی۔ کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز''۔

''خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟'' وہ بولا۔

''تو کسی اور منڈلی کو لے جا''۔

''اونہوں ٹھاکر نے منہ بنا لیا'' خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق مکھ تو ہو''۔

''میں کس لائق ہوں جو ان کا نام منہ پر لاؤں''۔

''بس اک تیری ہی بیٹھک ہے باقی جہاں پوتر تا ہے۔ جہاں ل جسم کا نہیں من کا ٹھکانا ہے''۔

آپی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپہ کا دھیان رکھنے کے لیے پیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی۔

رات بھر وہاں حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں، بہوویں، بیٹیاں، ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھو بھجن منڈلی تھی اور خواجہ کے گیت ''خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار'' سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپی کا ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا، شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔ پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ میں حیران میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں۔ میری آنکھیں کیوں بھر بھر آئیں خواہ مخواہ۔ سو میں بنا سوچے گائے چلی گئی۔ آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی رہی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اس کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتا تھا کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ، زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں، پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دیالو ہے۔ اتنا نیڑے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر ٹھاکر بولا ''سنہری بائی، بس اک آخری فرمائش: خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے۔ دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا''۔

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ گئی۔ اور میں ہی نہیں ساری محفل رنگ رنگ ہوگئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنادیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں، میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بیٹھک بے گانہ دکھتی نہ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ استاد نکو خاں بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ سر پیٹتا۔ گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھمر ناچ جو پتے پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ بھیں بھیں کر روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پہلی حیران، روپہ کا منہ کھلا، آپی چپ، یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی بس پتر، تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانا پانی ختم ہوگیا۔ تو نے اس کے سمے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔

''پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے''۔

''جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا''۔ روپہ بولی۔

''اس بھیڑ میں جائے'' آپی بولی۔ ''یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں، یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی۔ بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی''۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہوگئی۔ دل میں اک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی۔ تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تیل کی مالش کروں۔ اس کے لیے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیانیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے، کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی ''اب کیا حال ہے دھیے؟'' میں نے رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا''۔

بولی ''وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟''

''اونہہ۔ کوئی نظر میں نہیں۔''

''ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟''

''نہیں آپی''۔

''کوئی بات نہیں'' وہ بولی ''جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا''۔

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی بولی ''خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟''

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول تو کیا کہتی ہے؟ منہ مانگا دوں گا''۔

میں نے کہا ''دے دے۔ سال کے لیے بخش دے۔ جیسی تیری مرضی''۔ آپی ہنسنے لگی۔ پھر بولی ''چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر''۔

''اونہوں'' میں نے سر ہلایا۔''نہیں آپی۔انہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔دیکھنے کا مطلب''۔
''کتنی دیر کے لیے مانوں؟''
''جیون بھر کے لیے''۔
''سوچ لے، جو اباش نکلا تو؟''
''پڑا نکلے۔کیسا بھی ہے جیسا بھی نکلے''۔
اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہوگیا۔زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔آپی نے رد کر دیا لوٹا دیا۔بولی ''سودا نہیں کر رہی۔اپنی دھی وداع کر رہی ہوں۔اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے۔سنبھال کر رکھیو''۔
حویلی یوں اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔
ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ساز و سامان تھا۔آرائش تھی۔قالین بچھے ہوئے تھے۔صوفے لگے ہوئے تھے۔قد آدم آئینے۔جھاڑ فانوس سبھی کچھ۔پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔
برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے۔مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے، کہاں ہے، کیوں ہے۔
اوپر سے شام آرہی تھی۔سے کو سے ٹکراتی۔اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔یادوں کے دیئے جلاتی۔بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی۔دبے پاؤں۔مدھم۔یوں جیسے پائل کی جھنکار بیرنیا ہو۔
دور، اپنے کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نگاہیں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا۔یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔
دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا تھا۔ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا۔پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔
جنت بی بی، جو چھوٹی چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی، دو تین بار برآمدے کے پرلے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔
ارے نوکر کمین چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ کیوں؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔اپنی اولاد بھی تو تھی نہیں۔
جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گا؟
ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی بڑی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھ رہتی ہے۔سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔جب سے یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے۔اور پھر ٹوٹتی رات سمے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انہیں پیار ضرور آتا تھا۔پر اس

کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی، پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ الجھے الجھے خیال الجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اب اس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا۔ سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''میں ہوں پٹواری، چھوٹی چودھرانی جی''۔

''تو جا، جا کر بڑی چودھرانی سے مل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟''

''آپ ہی سے کام ہے''۔ وہ بولا۔

''تو بول کیا کہتا ہے؟''

''گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انہیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیں''۔

''ٹھہرا دو''۔ وہ بولی۔

''نوکر چاکر، بندوبست''۔ وہ رک گیا۔

''سب ہو جائے گا''۔

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پوچھا ''کہاں سے آئے ہیں؟''

پٹواری بولا ''اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں''۔ اک دھماکہ ہوا چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا ''جنت یہ جو دو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں، ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟''

جنت بولی ''لو چھوٹی چودھرانی وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں ہو جاتا ہے''۔

''تو تیار ہو جا۔ جنت ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں''۔

''چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے''۔

''تو چل تو سہی''۔ چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار!''

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کون ہے؟ اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا ''سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اس کمرے میں مشغول ہیں''۔

''ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے''۔ چھوٹی چودھرانی بولی۔

''تو پھر؟'' سفید ریش گھبرا گیا۔

''ایک سوال پوچھنا ہے''۔ چودھرانی نے کہا۔

''سائیں بابا اس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے''۔

''سائیں بابا نے جواب نہیں دینا۔انہوں نے پوچھنا ہے''۔وہ بولی۔

''کس سے پوچھنا ہے؟'' خادم بولا۔

''اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں''۔یہ سن کر سفید ریش خادم سن ہوکر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

''ان سے پوچھو'' چھوٹی چودھرانی نے کہا ''ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟''

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی ''کہو وہ عورت پوچھتی ہے تو نے بیٹھک کے گملے سے اک بوٹا اکھیڑا۔اسے بیل بنا کر ایک درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ''۔وہ رک گئی۔کمرے کی خاموشی اور گہری ہوگئی۔''اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔بیل مٹی میں رل گئی۔وہ بیل پوچھتی ہے بول میرا جیون کس کام آیا؟'' یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔

''تیرا جیون کس کام آیا۔تیرا جیون کس کام آیا''۔سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔

''تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟'' وہ رک گیا۔کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہوگئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

''میری طرف دیکھ'' سفید ریش خادم نے کہا۔''سنہری بائی، میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔مجھے نہیں پہچانتی؟ میرا تیرا سارنگی نواز تھا۔دیکھ میں کیا تھا کیا ہوگیا''۔

چھوٹی چودھرانی سے منہ سے ایک چیخ نکلی ''استاد جی، آپ؟'' وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

عین اسی وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

''سنہری بی بی'' وہ بولا ''مجھ سے پوچھ تیرا جیون کس کام آیا؟''

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔''ٹھاکر'' وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا ''اب ہمیں پتا چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا''۔اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔بولا ''بی بی ہمیں آشیرباد دے''۔

☆☆☆

چوتھا دور

پھول کی کوئی قیمت نہیں

آغا بابر

لوگ بابا مراد کو اٹھا کر ادھر لے گئے جدھر بھیڑ کم تھی۔ منہ میں پانی ٹپکایا تو آنکھیں کھل گئیں۔ وہ پھول بیچنے والوں کی دکانوں کے قریب سڑک پر چت پڑا تھا۔

ایک پھول فروش نے کہا ''پانی کا گلاس پی لے۔ لو لگ گئی ہے''۔

مراد پانی کے چند گھونٹ حلق میں اتار کر کمر پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی جتانے والے سے بولا ''میں ہسپتال میں اپنا خون دے کر آ رہا تھا کہ چکر آیا۔۔۔''

''کوئی بات نہیں اٹھ بیٹھ''۔

لوگوں نے اسے سہارا دے کر فیروز دین پھول فروش کے کھوکھے پر بٹھا دیا۔ فیروز دین کی ڈاڑھی اور چہرے کا رنگ بالکل موتیے کے ان پھولوں کا سا تھا، جن کی ڈھیریاں اس کے سامنے کیلے کے سبز پتوں پر دھری تھیں۔ فیروز دین کی آنکھوں میں ایک ایسی گھلاوٹ فہم اور دلداری تھی جو زندگی کا لیل و نہار دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے سے میسر آتی ہے۔

کلیاں اور پھول رات بھر ستاروں کے گیت سنتے ہیں۔ ظلمت اور اجالے کی آنکھ مچولی دیکھتے ہیں اور خاموش فطرت کے بھیدوں کی کنوئیاں لے لے کر کھلنے لگتے ہیں تو کھلتے ہی چلے جاتے ہیں، جیسے پھول کا فرض منصبی یہی ہے۔ ابھی کوئی فیروز دین سے شادی کے ہار اور ابھی کوئی جنازے کے ہار لے جاتا ہے مگر پھول اپنی چشم حیران کو متکلم نہیں ہونے دیتا۔ فیروز دین جس کی آنکھوں میں زندگی کی دھوپ چھاؤں دیکھ دیکھ کر فہم اور پھولوں کی معصوم صحبت سے چہرے پر تقدس کا ایک نورانی پرتو جھلک رہا تھا، ہار گوندتے ہوئے بولا ''دتو ہسپتال میں خون کسے دے کر آیا ہے؟ کوئی بیمار ہے؟''

مراد بولا ''میں بیروزگار ہوں۔ گھر میں فاقہ آ رہا تھا۔ خون کا ٹھیکیدار مجھے ہسپتال لے گیا۔ ہسپتال والوں نے میرا خون لیا جس کے بدلے میں ٹھیکیدار نے مجھے یہ دس روپے دیئے''۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نہ پا کر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ خدا تجھے کہیں کا نہ رکھے۔ نوٹ کوئی نکال کر لے گیا۔

اس کا چہرہ پتھر کی طرح جامد ہو گیا۔ اس کی ساری اداسی پتلیوں کے نقطوں میں سمٹ آئی۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

فیروز دین نے اسے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا۔ ''بابا جی کوئی بات نہیں۔ حوصلہ کرو۔ لو یہ پھول سونگھو۔ پھول فروش نے گلاب کی ڈھیری میں سے ایک سرخ پھول اٹھا کر مراد بابا کے ہاتھ میں دے دیا جو اس نے بنا سونگھے فیروز دین کے آگے پھینک دیا اور خلا میں ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

لوگ باگ اپنے اپنے کاموں سے چلے جا رہے تھے۔ خوانچہ فروش اپنی اپنی صدا لگا رہے تھے۔ تانگے اور موٹر کاروں کے شور سے بازار کی فضا بھری ہوئی تھی۔ فیروز دین کے ہاتھ ایک ساختہ پرداختہ طریقے سے موتیے کی کلیوں میں گلاب کا ایک ایک پھول مقررہ فاصلوں پر گوندرہے تھے پھر اس نے ہار کو گرہ لگائی اور مراد کے پیلے چہرے کی طرف دیکھا۔ دھاگہ توڑ کر بولا:

''او گامو سوے۔ پوا گرم دودھ کا لا ملائی ڈلوا کر''۔

اسی کھوکھے سے گام سولا اٹھا اور پاؤ بھر دودھ پیالے میں ڈلوا کر لے آیا۔ فیروز دین پھول فروش نے اپنی واسکٹ کی جیب سے پیسے نکال کر گام سولے کو دیئے، پھر ایک گاہک کو پھولوں کے ہار دینے لگا۔

مراد نے گرم گرم دودھ ایک ایک گھونٹ کر کے پیا اور اس دوران دیکھتا رہا کوئی گاہک ایک پھل فروش سے ہار کے دام پوچھتا تو دوسرا پھول فروش بالکل چپ رہتا۔ دخل نہ دیتا۔ نہ سستے دام بنا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتا۔ پھول فروش فقط اسی گاہک سے براہ راست بات کرتا جو اس کی دکان پر آ کر سودا لیتا۔ یہ دیکھ کر اسے سری اوجھری والا بازار یاد آ گیا۔ جہاں ایک ایک دکان دار گاہک کو آوازیں دے دے کر اس کا برا حال کر دیتا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ہسپتال تو ادھر ہے مگر تم ادھر سے آ رہے تھے؟''

مراد نے کہا ''میں سری اوجھری والے بازار سے آیا تھا'۔

''سودا لینے گئے تھے؟'' فیروز دین نے پوچھا۔

''نہیں اپنی بپتا پوری کرنے۔ میرا ایک جوان لڑکا ہے۔ پہلوانی کرتا تھا، اس نے ایک دن اکھاڑے سے نکل کر ٹھنڈے پانی سے نہالیا، ٹانگیں جڑ گئیں۔ لاکھ علاج کیے کچھ نہیں ہوا، گھر میں بیکار بیٹھا رہتا تھا۔ کسی مہربان نے سری اوجھری والے بازار میں اوجھریاں دھونے پر نوکر رکھوا دیا۔ میرا دوسرا بیٹا جو سبزی کی ریڑی لگاتا ہے بائیسکل پر اسے دکان پر چھوڑ آتا، جہاں وہ بیٹھا اوجھریاں دھوتا رہتا۔ بیس روپے مہینہ ملتا۔ دو مہینے نوکری کی پھر اسے ابکائیاں آنے لگیں۔ اب پھر گھر میں بیکار بیٹھا ہے۔ ایک مہینے کی تنخواہ ابھی تک دکان دار کے ذمہ رہتی ہے، وہ لینے گیا تھا، اس نے پھر ٹال دیا۔ سوچتا ہوں اگر وہ بیس روپے بھی جیب میں ہوتے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاتے''۔

''چلو سر صدقہ سمجھو''۔

مراد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ سر صدقہ کس کا میاں جی! ہم تو لوگوں کی زکوۃ پر پلتے ہیں۔ میری بیوی روز تغارہ اٹھا کر گوبر چگنے چلی جاتی ہے۔ ادھر ادھر سے گوبرا اٹھا کر لاتی ہے۔ اوپلے تھاپ کر بیچتی ہے۔ کیا کیا مصیبتیں بتاؤں۔ بیٹی کا میاں الگ ناراض ہو کر اسے چھوڑ گیا ہے، کس کس کا رونا روؤں۔ زندگی مصیبتوں کی پوٹ ہے میاں جی''۔

فیروز دین نے ٹین کی چھوٹی بالٹی میں ایک ہاتھ ڈبو کر چلو میں پانی نکالا اور بڑے ہی نفیس طریقے سے ہاروں گجروں اور پھولوں کی ڈھیری پر پچکارا دے ڈالا۔ پھر اسی گیلے ہاتھ کو اپنے نورانی چہرے پر پھیرا اور دلداری کے لہجے میں بولا:

''میں ایک مشورہ دوں۔ تمہارا نام کیا ہے بابا جی؟''

''بابا مراد''۔

''شام کو مجھ سے دو چار درجن ہار اور گجرے لے جایا کرو۔ مال روڈ پر کوئی ٹھکانہ بنالو، جہاں تمہاری بکری ہو جائے۔ درجن ہار بیچو، چونی لے لو۔ درجن گجرے بکیں تو اٹھنی دوں گا۔ تم دن بھر جو بھی کام کرو اپنا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ جی بسے سے کہہ کر تمہارے بیس روپے بھی قصائی سے دلوا دوں گا''۔

''جی بسا کون؟''

''اوجھری بالے بازار کا کمیٹی ممبر ہے۔ اگر منظور ہے تو کل دس روپے ضمانت لے کر آ جانا''۔

پھول فروش نے جی بسے سے کہلوا کر بیس روپے قصائی سے دلوا دیئے۔ مراد نے دس روپے ضمانت کے پھول فروش کی ہتھیلی پر رکھے اور تین درجن موتیے کی کلیوں کے ہار لے کر مال روڈ پر آ کر گھومنے لگا۔ بڑی مشکل سے ڈیڑھ درجن ہار بکے۔

اگلے روز فیروز دین پھول فروش نے مراد کا حوصلہ بڑھایا اور کہا پہلے روز ڈیڑھ درجن ہار بیچ لینا گھاٹے کا سودا نہیں۔ تم کوئی ہوٹل ڈھونڈلو۔ وہیں جمے رہو۔ عورتیں آئیں تو سامنے جا کر ڈٹ جاؤ۔ ہار نہ لیں تو گجرے دو۔ گجرے نہ لیں تو ہار دو۔ نیا کام ہے پرشرماؤ نہیں''۔

بابا مراد نے دیکھا کہ چوک کے ساتھ مال روڈ پر جو کیفے ہے، وہاں بہت لوگ آتے ہیں۔ ابھی دھوپ ہی تھی کہ وہ ہار اور گجرے لیے جا کھڑا ہوا۔ ایک موٹر کار آ کر رکی وہ آگے بڑھ کر بولا:

''موتیے کے ہار جی۔ گجرے بیگم ساب''۔

لڑکی صرف دو ہار اور دو گجرے لے کر بولی۔ واپسی پر اور لیں گے۔ کہیں جاؤ گے تو نہیں''۔

یہ کہہ کر لڑکی فرش پر ٹپ ٹپ چلتی اپنے خاوند کے ساتھ کیفے میں داخل ہوگئی۔ اس کی تاکید کی اثر انگیزی نے مراد بابا کو ادھر ادھر نہ ہلنے دیا۔ بونی اچھی ہوئی کہ اس کے اور ہار بھی بکنے لگے۔ اب صرف چار ہار تیلی پر لٹک رہے تھے کہ وہ لڑکی اور اس کا میاں باہر نکلے۔ لڑکی نے وہ دونوں ہار جو لیے تھے، اپنے جوڑے پر لپیٹ رکھے تھے۔ مراد ہار لے کر آگے بڑھا۔

لڑکی بولی ''صرف چار رہ گئے۔ گجرے سب کے سب بک گئے''۔

مراد چاروں ہار اس لڑکی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا ''آپ بھاگوان کی بونی ہوئی تھی کیسے نہ بکتے جی''۔

جب اس کے ہاتھ میں ہاروں کی خالی تیلی رہ گئی تو اس کے کندھے کا بوجھ اتر گیا۔ جیسے پھولوں کا بھی کوئی بوجھ ہو۔ لڑکی ٹپ ٹپ کرتی اپنے میاں کے ساتھ موٹر کار میں جا بیٹھی اور پھر موٹر کار نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

شام ڈھلے مراد نے تین روپے اپنی بیوی کے ہاتھ پر جا دھرے تو اس کے مردنی چہرے پر خوشی کی ایک کرن پھوٹ آئی۔ اور وہ فیروز دین پھول فروش کو دعائیں دینے لگی۔ معذور تاجا پٹیری پر جکڑا بیٹھا تھا۔ اس کا بھائی بالا سبزی فروش بھی آ گیا۔ مراد کی بیٹی کھٹولی پر اپنے دو بچوں کو جو سو رہے تھے پنکھیا ہلا رہی تھی۔ سب کے چہروں پر خوشی کے پھول کھل رہے تھے کہ بابا کا اچھا روزگار لگ گیا۔ معذور تاجا جو گھر پر بوجھ بنا ہوا تھا اپنی جگہ خوش۔ بالا یوں خوش کہ سبزی کی ساری آمدن اونٹ کے منہ میں زیرہ بنی جا رہی تھی۔ شاید اب اسے کچھ بچت ہونے لگے۔ دو بچوں والی بیٹی یوں خوش ہو رہی تھی کہ وہ خوامخواہ کا بوجھ بن کر گھر آ بیٹھی تھی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے سبب محلے میں کسی کا بھانڈا برتن بھی نہ مانجھ سکتی تھی۔

ایک دم گھٹا اُمڈ کر آئی اور بادل گرجنے لگا۔ بدرو سے سخت سڑاند اٹھی۔ مراد نے انگنائی کے سامنے پڑا ہوا گندا ٹاٹ اٹھا دیا۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا کھٹ سے اندر چلا آیا۔ اسے فوراً بیوی کے اپلوں کا خیال آیا ''تاجے کی ماں بارش آ رہی ہے تمہارے اپلے۔۔۔''

''میں نے شام کو سنبھال لیے تھے۔ دو پینگڑے تو بیچ بھی دیئے''۔

دراصل مراد بابا ہر پھر کے مال روڈ پر ہار بیچنے کے واقعہ کو بار بار سنانا چاہتا تھا اور گھر کا ہر فرد بار بار سننا چاہتا تھا۔

سوائے بالے کے جو اپنی چارپائی ہر روز بدرو کے پار اپنے دوستوں کے پاس جا بچھاتا تھا۔ سب اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے پڑے تھے، نیند کسی کو نہ آئی تھی۔ بادل کی وجہ سے سڑک پر کھمبے کی روشنی کا دائرہ تنگ ہو گیا تھا۔ مراد کی بیوی نے لیٹے لیٹے کہا ''تم نے جس بیگم طاب کی آج بونی کی کل بھی اس کے پاس ہار بیچنا''۔

مراد لیٹے لیٹے کہنے لگا ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا''۔

مراد کی بیٹی جو دو بچوں کو کھاٹ کے درمیان لٹائے خود پٹی پر لیٹ رہی تھی۔ کہنے لگی:

''ابا بے غم دیکھنے میں کیسی ہوگی؟'' مراد بولا

'' لمبے قد کی جوان لڑکی۔ کیا بتاؤں جیسی آپ ویسا میاں۔۔۔''

''سورج چاند کی جوڑی ہوئی نا''۔ اندھیرے میں مراد کی بیوی کی آواز آئی۔

''میں نے غور سے دیکھا کب۔ سب بیگمیں ایک جیسی تو ہوتی ہیں''۔ مراد بے چارہ بیگم کا سراپا بیان نہ کر سکا اور اس کی بیٹی اپنے تصور میں کوئی حلیہ مرتب نہ کر سکی۔

اگلی شام یہ جوڑا دیر سے آیا۔ مراد پھرتی سے آگے بڑھا اور بولا 'ہار موتیے کے''۔

لڑکی نے چھ ہار اور بارہ گجرے خرید کر موٹر کار میں رکھ لیے۔ اس کے میاں نے کار کو بند کیا اور وہ ہوٹل میں جانے کے لیے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ مراد نے دیکھا مناسب نقوش اور عمدہ لباس نے ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا تھا جو بیک وقت پر کشش اور پر تمکنت تھی۔ چال میں ایک سبک رفتاری اور دھیما پن جیسے آہستہ آہستہ پھول کھلتا ہے، ہونٹ ایسے جیسے پھول برسانے والے اگر بند بستہ۔ کونوں میں مسکراہٹیں جیسے بچپن شوخی شرارتوں میں گزرا ہو۔ بابا مراد اس لڑکی کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ اس نے غور کیا۔ ایک بچے نے اس کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ کتنی پر اسراریت تھی اس لڑکی میں۔ اس نے سوچا آج وہ گھر جا کر پورا نک نقشہ بیان کر سکے گا۔ ''ہار موتیے کے''۔ وہ صدا لگاتا دوسری موٹر گاڑیوں کی طرف چل دیا۔

رفتہ رفتہ ہوٹل میں آنے والے اس صدا سے مانوس ہو گئے اور اب بابا مراد بھی سب کو پہچاننے لگا۔ کون کون پھولوں کا شوقین ہے۔ کون بیگم کتنے پھول خریدتی ہے۔ گجرے ساتھ لے جائے گی یا پہنے گی۔ ہار جوڑے پر سجائے گی یا کلائی پر لپیٹے گی، اسے اپنے گاہکوں سے آگاہی ہوتی چلی گئی۔

شہر بھر کی غلاظت بہالے جانے والی سڑاند سے بھری بدرو پر بسنے والا یہ کنبہ ابھی کنجڑے بساطی اور آٹے دال والے کا پورا قرض چکا پایا تھا کہ مراد کی بیٹی کے بچے کو سوکھے کی بیماری لگ گئی۔ اس کی ٹانگیں سوکھنے لگیں اور بچے کے چہرے پر مردنی سی چھانے لگی۔ تاجا جو خود اپاہج اور معذور تھا، بہن کی بیٹی کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ مراد کی روزانہ بہت آمدن ہوتی تو ڈھائی تین روپے ہوتی۔ اس سے مہنگی دوا خریدنا محال تھی۔ قرض لینا یوں محال تھا کہ جن سے قرض لیا جا سکتا تھا۔ وہ پہلے والے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کر رہے تھے۔ جمعہ کے جمعہ اس کی بیٹی بچے کو دم کرانے لے جاتی اور پیر صاحب کو پانچ روپے نذرانہ دینا پڑتا۔ رات کو سارا کنبہ چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کھا کر پڑ رہتا۔ بازار میں ڈیوٹی پر لگا ہوا نیا سپاہی بالے کو الگ پریشان کر رہا تھا۔ بلا اجازت ریڑھی لگانے پر روز جرمانے کراتا۔ گھر کا ہر فرد ایک نہ ایک پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ایک جمعہ کو سویرے سویرے بابا مراد اپنی بیٹی اور نواسے کو دم کرانے کے لیے اٹھا تو اس کا سینہ جل رہا تھا۔ پانی پینے کے لیے گھڑے کی طرف بڑھا تو دیکھا جو تین ہار رات کو بچ رہے تھے وہ گھڑے کی گردن میں لپٹے پڑے تھے۔ اس نے وہ تین ہار اٹھا لیے اور بیمار نواسے کو لے کر چل دیا۔

راستے میں اس نے بیٹی سے کہا آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ بیٹی بولی۔ بابا آپ کو تو کچھ نہ ہو۔ سارا گھر تو آپ کے دم سے چل رہا ہے۔

نذرانہ کے ساتھ بابا مراد نے تین ہار بھی پیر صاحب کے سامنے رکھ دیے۔ پیر صاحب نے دو ہار اپنے سامنے پڑے رہنے دیئے۔ ایک اٹھا کر اس عورت کے گلے میں ڈال دیا جس کو آسیب کا سایہ بیان کیا جاتا تھا۔ اسے کے گلے میں ہار ڈال چکنے کے بعد پیر صاحب نے عورت کا ماتھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کچھ پڑھا، پھر ان کے دونوں ہاتھ عورت کے رخساروں پر خاصی دیر رکے

رہے جیسے وہ گالوں کی گرمی محسوس کر رہے ہوں، پھر سینے پر سے ہوتے ہوئے ناف تک اور پھر گھٹنوں تک پہنچ کر ہوا میں اٹھ گئے اور انہوں نے منہ سے چھوکی آواز نکالی۔

بابا مراد نے عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی مستانی آنکھوں میں ایک کرن سی پھوٹی اور منہ سے ٹھنڈی سی آہ نکلی۔ بابا مراد نے محسوس کیا اس عورت کے گلے میں پڑتے ہی اس کا ہار کس طرح اپنی شخصیت بدل گیا۔ کیا پھول کوئی پراسرار شے ہے۔ کیا پھولوں میں کوئی بھید ہوتے ہیں، وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ پیر صاحب نے اپنے سامنے سے ایک ہار اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا:

''کتاب اللہ پر چھوڑ نا''۔

یہ ہار بھی ایک دم اپنی شخصیت بدل گیا۔ جو ہار پیر صاحب کے سامنے پڑا تھا، اس کی تیسری شخصیت تھی جو دونوں سے الگ تھی۔ کیا پھول کوئی حروف ہیں جن سے کوئی ایسی زبان بنتی ہے جس کی بلاغت صرف نکہت گل کی وساطت سے سمجھ میں آتی ہے۔ کیا پھول کے پردے میں کوئی بھید چھپے ہوتے ہیں۔ کھوکھوں پر بیٹھنے والے تمام گل فروش اس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے ہار نہیں گوندر ہے بلکہ ایک ایک راز اور ایک ایک بھید کو چھید چھید کر دھاگوں میں پروئے جا رہے ہیں۔ یہ ہار ایسی عبارتیں ہیں جو پردہ گل سے بنتی ہیں، جسے صرف پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں۔ ایسے معنی ہیں جو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ ہر پھول کی ایک شخصیت ہے جو قائم بھی ہے، نہیں بھی۔

اگلی سہ پہر کو جب وہ سرکنڈے پر ہار اور گجرے لٹکائے ہوٹل کے سامنے پہنچا تو اس نے جھجکتے جھجکتے ایک بیگم سے کچھ روپے قرض مانگنے چاہے مگر زبان گنگ ہوگئی۔ اتنے میں اس خاص بیگم کی کار آ کر رکی۔ خاوند بیوی اترنے ہی والے تھے کہ بابا مراد ہار لے کر آگے بڑھا۔ بیگم بولی:

''بابا کیا حال ہے؟ آج تمہارا چہرا اترا ہوا کیوں ہے؟''

مراد ہاروں والا سرکنڈا آگے کرتے ہوئے بولا:

''بیگم ساب میرا نواسہ سخت بیمار ہے۔ میری لڑکی بے آباد بیٹھی ہے۔ داماد بسا تا نہیں۔ آپ آج سارے ہار لے لیں۔ مجھے کچھ پیسے کی ضرورت ہے۔ بیگم نے بابا کر طرف ہمدردی سے دیکھا اور بولی ''کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟''

اس نے سرکنڈے سے دو ہار اور گجرے اتار لیے۔ پرس میں سے دو دس دس روپے کے نوٹ نکال کر بولی:

''بیس روپوں سے کام ہو جائے گا''۔

''خدا زیادہ دے۔ خدا خوش رکھے۔ خدا آپ کے بیٹے کو سلامت رکھے''۔

بابا مراد کو اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اسے یوں جانے بوجھے بغیر بیس روپے کی رقم دے سکتا ہے۔ وہ باقی ہار بیچنے بھول گیا۔ چند منٹ منڈیر پر بیٹھ کر اٹھ بیٹھا اور موٹر گاڑی والے ڈرائیوروں سے اس بیگم کا پتہ پوچھنے لگا جو چند روپوں سے اس کے شعور میں دھیرے دھیرے داخل ہوتی چلی جا رہی تھی۔

آج رات پھر گندی بدرو پر واقع گنجان گلی کے تنگ مکان میں گھر کے تمام افراد بابا مراد کے حالیہ واقعہ کو بار بار سننا چاہتے تھے اور وہ بار بار سنانا چاہتا تھا کہ بیگم کی آنکھوں میں کس طرح ہمدردی تھی کہ اس نے پوچھے بنا بیس روپے نکال کر اس طرح دے دیئے جیسے وہ اسے عرصہ سے جانتی ہو۔ مراد کی بیوی بولی:

''دنیا میں خدا ترس لوگ ابھی موجود ہیں''۔

بے آباد بیٹی فرشتہ سیرت بیگم کے لیے جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگنے لگی اور معذور تاجے کے چہرے پر شکرانے کے

جذبات اس طرح آشکارا ہونے لگے جیسے وہ بیگم کی ذات کی اہمیت اور اثر انگیزی کے حلقہ میں اپنے آپ کو بتلا کر دینے میں خوشی اور آسائش محسوس کرر ہے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان بیس روپوں سے بچے کے لیے ٹیکے خرید لیے جائیں۔ پھر چند دنوں میں بیگم کی کوٹھی پر جا کر مراد بابا کو بیس روپے واپس کر دینے چاہئیں۔

بالے نے بارہ روپے پچاس پیسے جمع کر کے باپ کو دے دیئے۔ مراد نے ساڑھے سات روپے اپنی پونجی اس میں ڈالی اور پتہ پوچھتا پاچھتا سلطان حبیب کی کوٹھی پر جا پہنچا جو بیگم کے میاں کا نام تھا جو ہوٹل کے ڈرائیوروں سے اسے معلوم ہوا تھا۔ ملازم کے ذریعہ اندر اطلاع کرائی کہ پھول بیچنے والا آیا ہے۔

بیگم مسکراتی ہوئی برآمدے میں آئی اور بولی ''باباجی آپ کس طرح آن پہنچے''۔

مراد مٹھی میں پکڑی ہوئی رقم مودبانہ انداز میں بڑھاتے ہوئے بولا'' بیگم صاحب اس روز پھولوں کی قیمت آپ نے بہت زیادہ دی تھی۔ واپس کرنے آیا ہوں''۔

وہ بولی ''پھول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی باباجی۔ واپس لے جاؤ''۔

گندے نالے پر پھٹے حالوں رہنے والے افراد آج پھر اس واقعہ پر حیران، خوش اور مسرور تھے کہ دنیا میں کیسے ہمدرد، خدا ترس، اور غم کو بانٹ لینے والے لوگ موجود ہیں۔ بیگم برآمدے میں آئی تو کیا بولی، بابا مراد کی بیوی پوچھتی اور پھر مراد بار بار دہراتا۔ ہر بار مراد کی بیٹی بڑے دھیان سے سنتی۔ بابا مراد کہتا'' میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بیگم جب چلتی ہے تو زندگی کی خوشیاں اس کے ساتھ چلتی ہیں، جب بولتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں۔ وہ آپ ایک شگفتہ اور تر و تازہ پھول ہے۔ اس کا چہرہ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے''۔

بابا مراد کی غمزدہ بیٹی کی آواز پھڑ پھڑائی ''ہائے میں کس طرح بے غم کو دیکھوں۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے اسے دیکھنے کو''۔ اس کے خیال میں بیگم دکھ اور سکھ، درد اور راحت کا ایک ایسا رشتہ تھا جو پوری کائنات ہے اور وہ اس کائنات کو لمحہ بھر کے لیے دیکھنا چاہتی تھی بلکہ خود اس میں سما کر منہا ہو جانا چاہتی تھی۔

فیصلہ یہ ہوا کہ اگلے اتوار بابا مراد فیروز دین گل فروش سے موتیے کی کلیاں لے کر آئے گا اور اس کی بیوی اور بیٹی ہار گوند کی گیلی ململ میں لپیٹ کر بابا مراد کے ہاتھ بیگم کو تحفہ بھیجیں اور پھر کسی روز اسے سلام کرنے جائیں۔

اتوار سے دو روز پہلے جب بابا مراد جمعہ کی نماز پڑھنے گیا تو بیوی نے اسے فیروز دین کو پھولوں کی یاد دہانی کرانے کو کہا۔ بازار سے دھاگے کی نئی گولی منگائی۔ ہار گوندنے کے لیے بالا باریک سوئیاں خرید لایا۔ مراد نے بیوی کو بتایا کہ کس طرح ہر روز تڑکے تڑکے کیاریوں سے پھول توڑے جاتے ہیں اور گل فروشوں کے گھر چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں پھولوں سے بھر جاتی ہیں، اور فیروز دین نے اتوار کو صبح صبح اپنے گھر آ کر اسے پھول لے جانے کو کہا ہے۔

ہفتہ کی شام کو جب بیگم سلطان حبیب نے بابا مراد سے چار گجرے اور دس ہار خریدے تو وہ گھر جا کر بولا'' مجھے آج معلوم ہوا کہ بیگم جو اتنے گجرے اور ہار خریدتی ہے وہ جا کر اپنی ملنے والیوں کو تحفہ دیتی ہے۔ کتنا اچھا طریقہ ہے۔ آج بیگم کے میاں نے جو کہا کہ فلاں فلاں کے لیے بھی لے لو، تو جب مجھے معلوم ہوا''۔

مراد کی بیوی بولی ''اچھی بات ہے۔ بیگم کے طفیل ہمارے ہار کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں، کس وقت پھول لینے جاؤ گے؟''

بابا مراد نے جواب دیا'' نماز پڑھ کر نکل جاؤں گا۔ صبح کے وقت ریڑھے بہت ہوتے ہیں کسی پر بیٹھ جاؤں گا''۔

بابا مراد اگلے روز اذان ملتے ہی نماز کے لیے مسجد کی طرف چل دیا اور اس کی بیوی تغارہ اٹھا کر گوبر ڈھونڈنے اور اکٹھا کرنے چل دی۔ بابا کی بیٹی نے چولہا جلا کر روٹیاں پکائیں۔ بچوے پر سے چائے کی پتیلی اتاری، اپنے بچوں کو پلائی۔ معذور تاجے

کے آگے جو مونجھ کی پیڑی پر جڑا بیٹھا تھا روٹی اور چائے کا پیالہ رکھا۔ بالا صبح صبح سبزی منڈی جا چکا تھا۔ جہاں وہ کچھا پنے معمول کے مطابق کھا پی لیتا تھا۔ وہ ابھی فارغ ہوئی تھی کہ اس کی ماں آن پہنچی۔ تغارہ رکھ کر بولی ''بیٹی میں آج زیادہ دور نہیں گئی۔ مجھے بھی چائے دے دو، پھر ہم دونوں کو ہار گوندنے ہیں۔ تیرا ابا آتا ہی ہوگا''۔

دیکھتے دیکھتے جب کافی دن نکل آیا تو مراد دروازے کا ٹاٹ اٹھا کر اندر داخل ہوا اور بولا ''فیروز دین نے مجھ سے پھولوں کا روپیہ تو لے لیا مگر کلیاں بھی وہ دیں کہ دیکھا کرو''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کلیوں کا لفافہ چنگیر میں الٹ دیا۔ اس کی بیوی کلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی ''میں بازاری ہاروں کی طرح چھوٹے چھوٹے نہیں، ان کے تو لمبے لمبے ہار پروؤں گی''۔

جون کا مہینہ، بیٹی نے ململ کی گیلی صافی میں ہار لپیٹ کر دیئے، بیگم کی کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے دس بج گئے۔ صافی کا کپڑا سوکھ گیا۔ وہ سوچنے لگا، ہار دیتے ہوئے یہی کہوں گا کہ یہ ہار بازاری نہیں ہیں آپ کے لیے خاص طور پر بنا کر لایا ہوں، کتنے لمبے ہیں۔ بازاری ہار کی طرح چھوٹے چھوٹے نہیں۔ پھر وہ سوچتا بیگم خود بخود دیکھ کر پہچان لے گی کہ یہ ہار گل فروشوں کے ہاتھوں کے نہیں۔ گھر ہستنوں کے بنے ہوئے ہیں۔ گھر سے باہر جو موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں ان کو دیکھ کر وہ کپڑے کی صافی کو خواہ مخواہ چھپانے لگا اور گاڑیوں کی اوٹ میں سے ہوتا ہوا صدر دروازے میں سے داخل ہو گیا۔ اندر خاموشی کا عالم تھا۔ لوگ باگ ادھر ادھر چپ چاپ کھڑے تھے۔ نوکر پیشہ دیوار کے ساتھ لگے سہمے کھڑے تھے ایک سے پوچھا ''کیا ہوا؟''

بولا ''بیگم فوت ہو گئیں''۔

کب؟

''رات'' دماغ کی رگ پھٹ گئی''۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ وہیں کا وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ماں باپ پہنچ گئے ہیں۔ خسر اور ساس کا انتظار ہے۔ اس نے دیکھا برآمدے کے ایک کونے میں بیگم کا میاں اپنے سر کو ہاتھوں میں پکڑے گم صم بیٹھا ہے۔ نعش کو برف کی سلوں کے درمیان رکھا ہوا ہے۔ باغیچہ میں دھوپ آ گئی ہے۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتیں پیڑوں کے سائے میں کھسک گئی ہیں۔ گھر کا کوئی پرانا نوکر مرنے والی کے بیٹے کو کندھے سے لگائے کوٹھی سے باہر لے گیا۔ دو سال کے بیٹے کے چہرے پر عجب طرح کا خوف ڈر دکھائی دے رہا ہے۔ یہ اس کا بیٹا ہے جس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹوں کی کھلاوٹ رہتی تھی۔ وہ ذرا اور آگے کو کھسک گیا۔ اس کی بیگم برف کی بلوریں سلوں میں ساکت لیٹی پڑی تھی۔ رنگ دار دوپٹہ اور پھول دار قمیص پہنے ہوئے ایک بے جان اور بے حس جسم تھا، جس کے سر کے باریک بالوں کی لٹوں کو اس کی ماں ہاتھوں میں لے لے کر اس کا لمس محسوس کر رہی تھی او رچپ چاپ زار زار رو رہی تھی۔ نعش کے پاس سٹول پر بجلی کا پنکھا تیز تیز چل رہا تھا۔ ساتھ والی کوٹھیوں کی بیگمیں برآمدے کے پاس پہنچتیں تو ان کے منہ سے نکلتا ''اللہ اتنی جوان موت کسی کو نہ آئے''۔ یہ کہنے کے ساتھ ہی ان کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں جنہیں وہ دوپٹے کے پلو سے پوچھنے لگتیں۔ نعش کی طرف دیکھتیں اور بے ساختہ ان کے منہ سے ہائے ہائے نکلتا۔ اتنے میں کوٹھی میں کہرام مچ گیا۔ سلطان حبیب کا باپ اور ماں صدر دروازے سے داخل ہوئے۔ مرنے والی کے باپ کے منہ سے ایک کربناک فریاد نکلی ''میری بیٹی کو تو نے امانت کہا تھا۔ کہاں ہے میری امانت، میری امانت مجھے واپس دے دو''۔ پھر لڑکی اور لڑکے کا باپ بغل گیر ہو کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سلطان حبیب اپنی ماں کے گلے لگ کر زار زار رونے لگا۔ پھر وہ بہو کے سرہانے کھڑی ہو کر بین کرنے لگی اور اپنے بال نوچنے لگی۔ بابا مراد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ وہی پر شباب لڑکی بے جان و بے حس مردہ پڑی تھی جس کے انتظار میں وہ بے چین اور مضطرب رہتا تھا۔ جو اس کے شعور میں دھیمے دھیمے جذب ہوتی چلی گئی تھی۔ جس کے ہاتھوں گجرے بیچ کر

اسے اصلی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ جس کا ذکر وہ گھر جا کر گھنٹوں کیا کرتا تھا۔ جس کے لیے آج وہ ہار لے کر آیا تھا۔

وہ دور کونے میں جا کر تنہا بیٹھ گیا اور چاروں طرف بتر بتر دیکھنے لگا۔ اتنے میں مردہ نہلانے والی آن پہنچی۔ کفن دفن کا انتظام ہونے لگا۔ مراد اور زیادہ اداس ہوگیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر صدر دروازے کے قریب باہر آن بیٹھا اور سوچنے لگا بیٹھوں کہ چلا جاؤں۔ میرا اس گھر میں کوئی واقف نہیں۔ شوق سے پھول خریدنے والی آج خود مرجھا چکی۔ اس کا میاں مجھے نہیں پہچان سکتا۔ مجھے کوئی نہیں جانتا۔ جو جانتی تھی اگلے دیس سدھاری، میں کس کے لیے رکوں۔ مگر وہ بیٹھا رہا جیسے کسی انجانی طاقت نے اسے جکڑ رکھا۔

اندر سے ایک دم چیخ و پکار اٹھی۔ عورتوں کی آہ و بکا سنائی دی۔ کسی نے کہا کلمہ شہادت۔ اس نے دیکھا عزیز و اقارب کندھوں پر جنازہ اٹھائے کوٹھی سے باہر نکل رہے ہیں۔ وہ بھی کندھا دینے کو اٹھا اور پھر ہجوم کے ساتھ ساتھ ایک اجنبی بنا قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں وہ صرف قبر کو مٹی دینے کے لیے اٹھا اور پھر آ کر وہیں ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس بیری کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

جب سب جا چکے اور چھڑکاؤ کی ہوئی تازہ قبر کے پاس دو حافظوں نے قرآن خوانی شروع کر دی تو بابا مراد اٹھا۔ قبر کے قریب آیا قبر پر پھولوں کی چادر پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے اپنی ململ کی صافی کھولی۔ پھولوں کے ہار نکالے۔ منہ سے اللہ اکبر نکلا اور اس نے وہ تمام ہار قبر پر ڈال دیئے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل لرز گیا کہ یہ ہار اتنے ہی لمبے تھے جتنی قبر۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مغفرت کے لیے دعا مانگی اور جتنی آیتیں اسے یاد تھیں، پڑھ ڈالیں۔

تھکا ہارا بھوکا پیاسا ناٹ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو دو پہر ڈھل چکی تھی۔ کوٹھڑی کی دہلیز پر اپاہج تاجا بیٹھا تھا۔ ''بڑی دیر کر دی بابا جی''۔

تاجے کی آواز سن کر گھر کے باقی افراد بھی آ گئے۔ مراد نے کوٹھی پر پہنچنے سے لے کر قبرستان اور قبرستان سے گھر تک سب کچھ کہہ سنایا۔ کبھی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں کبھی آواز رندھ جاتی۔ سب افراد غمگین اور اداس ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ جس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا، وہ خالی خالی نظروں سے دیوار کی طرف ہی دیکھتا چلا گیا، جو زمین کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ زمین کی طرف ہی دیکھنے لگا۔ ان کے جذبات حزیں ایسے تھے جیسے کوئی گھر کا فرد مر گیا ہو۔ اسے پھٹے پرانے مفلس گھر میں بیگم کا ذکر بیگم کی بات ہوتی تو ہر فرد بار بار پوچھتا اور بابا مراد خوشی سے بار بار دہراتا۔ آج کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ جیسے سب باتیں ختم ہوگئیں۔ سب ذکر جاتے رہے، سب کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔

مرنے والی کے میکے یا سسرال کے رشتے دار جب بھی قبرستان کی اس سڑک پر سے گزرتے رک جاتے اور قبر پر جا کر فاتحہ ضرور پڑھتے۔ یہ دیکھ کر ان کو ہمیشہ حیرت ہوتی کہ پختہ قبر کے ارد گرد ہمیشہ کسی نے جھاڑو دیا ہوتا۔ طاقچہ میں بجھی ہوئی موم بتی پڑی ہوتی۔ کبھی تازہ کبھی مرجھایا ہوا ہار پڑا ہوتا۔ پھول قبروں پر ہوتے ہیں ہیں مگر پھولوں کے گجرے کون ڈال جاتا۔

بابا مراد نے اپنا معمول بنا لیا کہ ہفتے میں کم از کم دو بار تو ضرور قبر پر ہار اور گجرے چڑھا آتا۔ فاتحہ پڑھتا۔ جھاڑو دیتا۔

وہ ایک دن اپنی بیوی بیٹی اور معذور تاجے کو قبرستان لے گیا۔ اس کی بیوی اور بیٹی جب تک تسبیح پڑھتی رہیں وہ اور معذور تاجے تکیے میں گورکنوں سے قبروں اور قبروں میں مدفون افراد کی باتیں سنتے رہے۔ اس کے بعد قبرستان والوں سے مراد کی واقفیت روز بروز بڑھتی گئی۔

بڑی سڑک کے ناکے پر جہاں سے قبرستان کے تین راستے تین سمتوں میں نکلتے تھے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری اور رنگنائی تھی جس میں ایک ریڑھے والا اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ بیوی کا اپنا جدی مکان تھا۔ ایک دن وہ ریڑھے والے کے گھر جا نکلا۔ اپنے متعلق تعارف کرایا کہ پھول بیچتا ہوں۔ میری ایک درخواست ہے میں چاہتا ہوں تمہاری انگنائی میں باہر جو درخت

ہے اس کے نیچے پھولوں کی ایک ٹوکری رکھ لیا کروں۔ ناکے سے قبرستان کی تین پگڈنڈیاں نکلتی ہیں۔ قبروں پر آنے والوں کو پھولوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرا ایک معذور بیٹا ہے۔ جس کی ٹانگیں جڑ گئی ہیں۔ اسکو صبح یہاں لا کر بٹھا دیا کروں گا شام کو لے جایا کروں گا۔ درخت کے نیچے سایہ ہے بیٹھا رہا کرے گا۔ پھولوں کی جو بکری ہوگی، آدھی تمہاری آدھی اس کی۔

وہ بولا ''بابا جی پھولوں سے کیا بکری ہوگی۔ تم چھابا لگانا چاہتے ہو لگا لو''۔

اگلے روز مراد نے ایک روپیہ کی گلاب کی پتیاں چھابے میں ڈال کر تاجے کو وہاں بٹھا دیا۔ جس نے شام کو دو روپے بنا لیے۔ بابا مراد اگلے روز پھول اور پتیاں زیادہ لے آیا۔ سب بک گئیں۔ جمعرات کو اور بھی زیادہ بکری ہوئی۔

اب کسی ہفتے بکری کم ہوتی کسی ہفتے زیادہ۔ جو پتیاں بچ جاتیں۔ بابا مراد بیگم کی قبر پر رکھ آتا۔ اس دوران ریڑھے والے نور نے محسوس کیا کہ تاجا معذور ہوتے ہوئے بھی کام چور نہ تھا۔ کسی نہ کسی کام میں ہاتھ بٹا دیتا تھا۔ چھوٹی بچی کو پلنگڑی پر بٹھا دیا جاتا تو تاجا پنکھی ہلاتا رہتا۔ سلا دیا جاتا تو وہ مکھیاں اڑاتا رہتا۔ حقہ ہر وقت تیار۔ آیا گیا رک جاتا۔ نور بھی شام کو آتا تو بیری کے درخت کے نیچے تاجے کے پاس بیٹھ کر حقہ پیتا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا۔ صبح انے لگتا تو گھوڑے کا مصالحہ بنانے کو دے جاتا۔ گھسیارا گزرتا تو تاجا اس سے بھاؤ کر کے نور کے گھوڑے کے لیے عام نرخ سے سستا گھاس خرید رکھتا۔ ایکا ایکی چھوٹی بچی تاجے سے مانوس ہوگئی۔ اس کی گود میں پڑی رہتی اور تاجا بان کی پیڑی پر بندھا جکڑا بیٹھا رہتا۔

تاجا رومال میں لپٹی ہوئی اپنی روٹی صبح صبح اپنے ساتھ لے آتا۔ شام کو اس کا بھائی بالا بائیسکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر لے جاتا۔ مگر اب تو کبھی نورا سے روٹی کا بھی پوچھ لیتا اور بیوی اسے چائے کا گلاس بھی دے دیتی۔

ایک دن گاؤں سے نور کی ساس کی بیمار کی اطلاع آئی۔ اس کی بیوی بچوں کو لے کر گاؤں جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ نور نے کہا وہ اتنے دن روٹی بازار سے کھالے گا۔ تاجا بولا ''بھائی نور تم کو پہلے ہی بہت کھانسی آتی ہے۔ تم بازار سے کیوں کھانے کو کہہ رہے ہو۔ میں روٹی پکا لیا کروں گا سارا دن بیکار ہی تو بیٹھا رہتا ہوں۔ گھر نہیں جاؤں گا، یہیں پڑا رہوں گا۔

بالا لینے آیا تو تاجے نے بتا دیا کہ وہ یہیں رہے گا جب تک نور کی بیوی گاؤں سے نہیں آجاتی۔ یہ سن کر اگلے روز بابا مراد آگیا، بیری کے نیچے پھولوں کا چھابا کھوکھے پر رکھا تھا۔ تاجا چولہے کے سامنے بیٹھا دیگچی مانجھ رہا تھا۔ مراد نے دیکھا قبروں کے لیے کوئی پھول لینے آتا تو تاجا چولہے کے پاس سے ہی بیٹھا بولتا ''کتنے کے چاہییں۔ چار آنے کے آٹھ آنے کے؟ جی آپ ہی لے لیں، پیسے وہیں رکھ دیں بوری کے نیچے۔ میں کیا بتاؤں جتنے ہونے چاہییں مناسب۔ چار آنے کے لے لیں، پھول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جی''۔

یہ جملہ سن کر بابا مراد کے سینے میں تیر لگا۔ یہ جملہ کس نے کہا تھا۔ جس نے کہا تھا وہ منوں مٹی کے نیچے پڑی تھی۔ مرنے والی کی بےبسی کے ساتھ ہی اسے اپنے بیٹے کی بےبسی اور معذوری کا خیال آیا جس کی صورت اچھی تھی جس کا پہلوانی بدن تھا، مگر ٹانگیں ماری گئی تھیں۔ اب معذور اور ناکارہ ہو کر مٹی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا یہ جملہ تاجے کے دماغ میں کس طرح محفوظ رہ گیا، کس کونے میں چھپا ہوا تھا کہ آج آپ ہی آپ زبان سے ادا ہوگیا۔ جب تک تاجا بیٹھا سبزی بناتا رہا۔ ہنڈیا پکاتا رہا۔ آٹا گوندھتا رہا۔ مراد کھوکھے کے پاس بیٹھا سوچتا رہا، حقہ گڑگڑاتا رہا اور قبروں پر جانے والی بیبیوں کے پاس پھول بیچ کر پیسے بوری کے نیچے رکھتا رہا۔

جب اس کا اپنا وقت ہار بیچنے کا قریب آنے لگا تو وہ گلہ تاجے کے سپرد کر کے رخصت ہوا۔ اگلے روز آیا تو تاجا پھر اسی طرح چولہے کے سامنے بیٹھا وہیں سے ہدایات دے دے کر پھول بیچ رہا تھا۔ بابا مراد نے رومال کھول کر لپٹی ہوئی ایک تختی نکالی اور

اسے چھابے میں رکھ دیا۔لکڑی کی تختی پر لکھا ہوا تھا۔ پھول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

''لے بولتا جااب بیٹک وہیں سے۔کوئی پڑھا ہوا بابو آ گیا تو آپ ہی پڑھ لے گا''۔

''کل کی آمدن بھی اتنی رہی جتنی میرے وہاں گلے پر بیٹھنے سے تھی۔آمدن میں کوئی فرق نہیں پڑا بابا''۔

''میرا خیال تھا کہ کم پڑ جائے گی۔جبھی میں یہ لکھوالایا۔تمہاری ماں پوچھتی تھی تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟''

تاجا بولا''کونسی تکلیف۔نورے نے تو کھلا گھر مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔میں معذور اپاہج کہاں بھاگ سکتا ہوں''۔

مراد نے کہا''ایسا نہ کہہ بیٹا۔تو تو کئیوں سے اچھا ہے۔دوڈھائی کی کار کر لیتا ہے''۔

بابا مراد اور تاجا بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک ریڑھے والے نے سڑک پر ریڑھا کھڑا کیا اور انگنائی سے سیدھا چولہے کی طرف آ کر بولا''نور کی بیوی فیروزاں کہاں ہے؟''

''گاؤں گئی ہوئی ہے۔اس کی ماں بیمار تھی''۔

''اسے اطلاع کردو کہ نور کی ٹرک سے ٹکر ہو گئی ہے،گھوڑا مر گیا ہے۔وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے''۔

ہمیں ہسپتال لے چلو''۔

وہ بابا مراد اور تاجے کو اپنے ریڑھے پر بیٹھا کر ہسپتال پہنچا۔نور کے سر پر پٹیاں بندھی تھیں،وہ بالکل بے ہوش پڑا تھا۔بابا مراد نے اس کے کسی ملنے والے کا پتہ کر کے نور کی بیوی کو حادثہ کی اطلاع پہنچائی۔جب وہ واپس آئے تو ٹوکری کے پھول آدھے ختم ہو چکے تھے۔تختی کے نیچے ملے جلے بارہ آنے پڑے تھے۔بورا اٹھائی تو اس کے نیچے سے ایک روپیہ ستر پیسے ملے۔

یہ دوروپے چھ آنے کے پھول ان کی غیر حاضری میں بکے تھے۔

بابا مراد نے رات ہسپتال میں نور کے سرہانے گزاری جو بالکل بے ہوش پڑا رہا۔صبح روتی چلاتی اس کی بیوی ہسپتال پہنچی اور شام کو نور نے دم دے دیا۔وہ بھی اسی قبرستان میں دفن ہوا۔

جب نور کی بیوی کو اس کی ماسی چند روز کے لیے اپنے ساتھ لے گئی تو تاجا گھر کی نگہداشت کرتا رہا۔دن کے وقت بابا مراد اس کے پاس آ بیٹھتا،سہ پہر کو چلا جاتا۔نور کی بیوی آئی تو تاجا دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔بولا''نور بنا میں سخت اداس ہو گیا ہوں''۔

فیروزاں زار زار رونے لگی اور بولی''کیا مجھ سے زیادہ اداس ہو گئے ہو۔ان بچوں سے بھی زیادہ اداس ہو گئے ہو''۔تاجے نے چھوٹی کو اپنی گود میں بٹھا کر پیار کیا اور اپنی صدری سے بیس روپے نکال کر فیروزاں کو دیتے بولا''یہ اپنے پاس رکھو''۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور بولا:

''مرنے والا میرا دوست تھا۔میں معذور ہوں مگر پھول بیچ کر ان بچوں کا گزارہ چلاؤں گا''۔

چند روز گزرے تھے کہ بابا مراد کو باری کا بخار آنے لگا۔

ایک روز پھولوں کی کچھ مرجھائی پتیاں چھابے میں بچی پڑی تھیں۔تاجے نے فیروزاں سے کہا''یہ لے جا کچھ نور کی قبر پر ڈال آ کچھ اس بی بی کی قبر پر،جہاں بابا جایا کرتا ہے۔اتنے دنوں سے وہاں جھاڑو بھی نہیں دیا ہوگا۔وہ بھی دے آنا''۔

فیروزاں واپس آئی تو تھر تھر کانپ رہی تھی،جیسے بخار چڑھ رہا ہو،بولی''میرے اوپر کوئی موٹا کپڑا ڈال دو''۔

''کیوں''۔

''میں نور کی قبر پر پھول ڈال کر بی بی کی قبر پر پہنچی۔ایک بابا قبر پر فاتحہ پڑھ رہا تھا۔سبز چغہ ہاتھ میں تسبیح۔میں نے اسے دیکھا اس نے مجھے،پھر وہ میرے قریب سے گزرتا ہوا چلا گیا۔میں نے پھول قبر پر رکھے۔پھر جھاڑو دیا۔جب جھاڑو کونے میں

رکھنے لگی تو دیکھتی ہوں وہی بزرگ ایک سرکنڈے کے پیچھے کھڑا مجھے دیکھ رہا ہے، پھر وہیں غائب ہو گیا۔ میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگی"۔

تاجا خبر گیری بھی کرتا رہا۔ بچوں کو بھی سنبھالتا رہا۔ روٹی ہانڈی بھی کرتا رہا۔ پھول بھی بیچتا رہا۔ رات پڑتی تو چھابے کو پیڑی کے نیچے رکھ دیتا۔ صبح ہوتی تو چھابا گلاب کی پتیوں سے بھرا ہوتا پہلے دن اس نے سوچا بابا بیمار ہے، اس کو خیال آیا ہوگا۔ اس نے پھول صبح صبح بالے کے ہاتھ بھجوا دیئے ہوں گے۔ اگلے روز پھر ایسے ہی تیسرے روز پھر یہی۔ چوتھے روز فیروزاں کا بخار اتر گیا۔ بولی "تمہارا ابابا بیمار تھا، پھول کون لاتا رہا"۔

تاجے نے جواب دیا "صبح صبح بالا دے جاتا تھا"۔

بڑے دنوں بعد بیماری سے اٹھ کر جب بابا مراد آیا تو بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ فیروزاں نے لاکر اس کے آگے گرم گرم چائے رکھی۔ مراد نے اسے دعائیں دیں اور تاجے سے کہنے لگا "میں تمہیں اچھی خبر سناؤں۔ تمہاری بہن کی اپنے خاوند سے صلح ہوگئی ہے۔ اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ تمہاری ماں نے خوشی میں تمہارے لیے پنجیری بھیجی ہے"۔

اس نے پنجیری کی پوٹلی کو ہاتھ میں پکڑ کر آہستہ سے کہا "بابا اتنے دن تم نے تو مجھے پھول نہیں بھیجے؟"

"نہیں تو"۔

"فیروزاں پوچھے تو بس یہی کہنا، بالا دے جاتا تھا"۔

"پر اتنی رازداری کیوں؟"

"میں رات کو خالی چھابا پیڑھی کے نیچے رکھ دیتا تھا۔ صبح گلاب کی پتیوں سے بھرا ہوتا تھا۔ فیروزاں نے ایک دن پوچھا تو میں نے کہا صبح صبح بالا آ کر دے جاتا تھا"۔

بابا مراد آہستہ سے بولا۔ "بس یہ بات ہم دونوں میں رہے۔ تیسرے تک نہ پہنچے"۔

تاجے نے مزید رازداری سے کہا "اب تو اس نا کہ پر پراسرار بیری کے درخت کے نیچے جہاں گلاب کی پتیوں کا چھابا پڑا ہے اور پھول کسی نادرہ کاری کے زور پر آپ ہی آپ بکتے ہیں، ایک اکھاڑہ کھد چکا ہے، جہاں لڑکے کسرت کرتے ہیں، اور ٹانگوں سے ایک معذور شخص انہیں بڑی توجہ سے کسرت کے گر بتاتا دکھائی دیتا ہے۔

کوٹھڑی کے آگے بندھی بھینس کا دودھ دوہتی ایک عورت نظر آتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں کا رشتہ کس طاقت نے چکایا تھا۔

☆☆☆

زرد چہرے

ابراہیم جلیس

آصف کی بہن جوان تھی اور پانچ سال سے اپنے دولہا کا انتظار کررہی تھی۔ جانے اس کا دولہا کون تھا؟ کیسا تھا کہاں کا رہنے والا تھا اور کب آنے والا تھا۔ آصف کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جب تک اس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے پیلے پیلے پھول کھلے ہیں۔ اس کا دولہا کبھی نہ آئے گا۔ کیوں کہ دولہے گیندے کے پھولوں کو مطلق پسند نہیں کرتے۔ وہ تو گلاب کے سرخ سرخ پھولوں پر جان دیتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں ہاجرہ، پروتما، زہرہ، شہلا اور سعیدہ کے گالوں میں کتنے بڑے بڑے سرخ گلاب تھے۔ اوران کے دولہے کتنی جلدی کتنے اضطراب اور کتنی بے تابی سے آ کران سرخ سرخ پھولوں کو توڑ موڑ کر لے گئے۔ اب سارے محلے میں صرف ایک ہی پھول رہ گیا تھا۔ گیندے کا پیلا پیلا پھول۔ اس کی بہن جو پورے پانچ سال سے خوابوں میں، تصور میں، خلاؤں میں اپنے دولہا کو دیکھ رہی تھی ممکن ہے خوابوں میں اس کا دولہا دکھائی دیتا ہو۔ تصور میں چلا آتا ہو اور خلاؤں میں اس کی طرف بڑھتا ہو۔ لیکن وہ تو دھرتی پر رہتی تھی۔ خوابوں، خلاؤں اور تصور میں آنے والے دولہے دھرتی پر کیسے اتر سکتے ہیں۔ وہ تو خوابوں کی نرم نرم سطح پر ہی چل پھر سکتے ہیں۔ دھرتی تو ان کے لیے بڑی سخت کھردری اور پتھریلی ہوتی ہے۔

سارے محلے میں مشہور تھا کہ اس کی بہن کو دق ہوگئی ہے۔ لیکن شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ دق وق کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک مرض ہے طویل کنوارا پن جو بہت ممکن ہے طویل ہوتے ہوتے دق کے گلے میں بھی بانہیں ڈال دے۔ جوں جوں اس کی بہن کا کنوارا پن لمبا ہوتا جاتا تھا وہ بھی اس کی فکر میں گھل گھل کر سوکھ سوکھ کر لمبا ہوتا جاتا تھا۔ ہڈیوں کا لمبا ڈھانچہ۔

بہن کی مانگ میں افشاں چننے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا۔ جب باپ بغیر کسی بیماری کے اچانک مرگیا تو اس نے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تیس روپیہ ماہوار کی کلرکی جیسی ادنیٰ غلامی بھی چاروناچار قبول کر لی۔ اگر اس کی بہن نہ ہوتی ۔۔۔ یا جوان نہ ہوتی یا وہ مفلس نہ ہوتا، اپنے مشہور قوم پرست باپ کی طرح وکالت یا کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرتا۔ اس کی طرح خود بھی حکومت سے ٹکریں لیتا رہتا۔ لیکن جس کا باپ مرگیا ہو جس کی آمدنی تیس روپیہ ماہوار ہو، جس کی بہن کنواری ہو اور جس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے زرد پھول کھلے ہوں وہ کیا حکومت سے ٹکر لے سکتا ہے۔ وہ کیا دفتر سے جیت سکتا ہے۔

مگر اس کی بہن تو ابھی عورت بننے سے پہلے معمہ بن گئی تھی۔ وہ بیچارہ تو اس کے لیے صبح سے شام تک دفتر کی میز پر جھکا رہتا۔ صاحبوں کی پھنکاریں سنتا اور مہینے کے مہینے تیس روپے اپنی بہن کی ہتھیلی میں رکھ دیتا اور اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تک نہ آئی۔ اس کے پیلے پیلے گالوں میں لہو کی ایک مدھم سی دھار ایک ہلکی سی شہابی رو تک نہ رینگتی۔ اس بات پر وہ جھلا اٹھتا اور بات بے بات اس کو جھڑکی دیتا لیکن جب پیلے پیلے پھولوں پر شبنم کی بوندیں رینگنے لگتیں تو وہ ان بھیگے ہوئے پھولوں کو اپنے میلے دبیز کوٹ کے لمبے لمبے کالروں میں چھپا کر خود کو بھی رونے لگتا۔ کیونکہ شبنم کی بوندوں سے دھل کر ان پھولوں کی زردی خطرناک حد تک نکھر جاتی۔

مگر وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی بہن کے دولہا کو خوابوں، تصوورات اور خلاؤں سے گھسیٹ کر اس دھرتی پر لے آئے گا کیونکہ دولہے بڑے لالچی ہوتے ہیں۔ پھول خواہ کتنا ہی معمولی اور پیلا کیوں نہ ہو اگر اس کو سونے اور چاندی کے گلدان میں رکھ کر پیش کرو تو دولہے آنکھ بند کر کے وہ گلدان لے لیتے ہیں۔ اس لیے وہ کلرکی کے علاوہ اخباروں،

رسالوں کے دفاتر میں بھی آدھی آدھی رات تک کام کرنے لگا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی۔ پچاس روپیہ۔ ساٹھ روپیہ۔ ستر روپیہ۔

صبح بالوں میں کنگھا کرتے وقت وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتا کہ آدھی آدھی رات تک کام کرنے سے اس کے اپنے گالوں کی سرخی مدھم پڑ رہی ہے۔ لیکن اب اس کو اس سرخی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو جانتا تھا کہ یہی سرخی اس کی بہن کے رخساروں میں داخل ہو جائے اور بس اور اگر یہ نہیں ہوسکتا تو وہ اپنی بہن کو سونے اور چاندی کے جگمگ جگمگ کرتے زیوروں سے ایسا سجائے گا کہ ہاجرہ، پروتما، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے دولہوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ وہ اپنے بے مصرف فضول مسکرانے والے سرخ گالوں سے متنفر ہو جائیں گے۔ اور جب شہر کی سڑکوں پر سے دولہا اس کی بہن کے گلے میں پڑے ہوئے جڑاؤ ہار کو پکڑے اس کو باجوں ڈھولوں اور تاشوں کے شور اور گیس لیمپوں کی سپید چمک دار روشنی میں فاتحانہ انداز میں کھینچے لیے جائے گا تو وہ ہاتھ مل مل کر اپنی جلد بازی اپنی بیوقوفی اور اپنی حماقت پر پچھتاتے رہیں گے۔

جس مہینے اس کی آمدنی پچاس روپے ہوگئی اس کے گالوں کی شفق بالکل ہی ڈوب گئی۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی زرد رنگ کے شیشوں والی کھڑکی سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی میں کھڑا ہے۔ اس کے دوست احباب جب اس کے پیلے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے تو کڑوا کڑوا مذاق کرتے، علاج کراؤ اپنا۔ کوئی لڑکی تم سے شادی کرنا پسند نہ کرے گی۔ جوانی ساری عورت بغیر ہی گزر جائے گی۔ وہ مسکرا دیتا۔ اب اس کے ہونٹ بہت مسکرانے لگے تھے۔ بار بار مسکراتے تھے۔ ایک مہینے میں اس کو پچاس روپے ملتے تھے اور وہ پچاس دفعہ مسکراتا تھا۔ ''ارے کوئی لڑکی شادی کرے نہ کرے اس کی بلا سے۔ جوانی صرف عورت کی آغوش میں گزار دینے کے لیے تو نہیں ہے جوانی حجلۂ عروسی اور عورت کی خلوتوں میں بسر کرنے کے لیے تو عطا نہیں ہوئی۔ جوانی تو الف لیلیٰ کے سورماؤں کی طرح آتال پاتال چھاننے کے لیے ہے''۔ اور پھر بقیہ جملے وہ اپنے دل ہی دل میں چپکے چپکے کہتا۔

''جوانی زندگی سے لڑنے کے لیے ہے۔ اپنی جوان بہنوں کی مانگ میں سہاگ کی افشاں بھرنے کے لیے ہے۔ ان کے شرمیلے لالچی رنگ و بو پر جان دینے والے دولہوں کو آسمان سے دھرتی پر گھسیٹ لانے کے لیے ہے۔ میں جو اپنی بہن کا حجلۂ عروسی بناؤں گا وہ تاج محل سے زیادہ شاندار ہوگا''۔

چند ہی مہینوں بعد وہ سو سوا اور سوا سو روپے ایک ایک مہینے میں کمانے لگا۔ صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ جانِ عزیز رونے بسورنے لگی تھی۔ لیکن وہ اندھا دھند دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں روپوں کے پیچھے دوڑتا رہا۔ اپنی نیندیں اپنے تصور کے جزیرے اپنے سپنے اور اپنی جوانی یعنی برجیس جہاں کو بھی بھول گیا۔ اس کی برجیس جہاں جس سے اس کو ایک دبی دبی ڈھکی ڈھکی اور چور محبت تھی۔ جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نکلے ہوئے تیروں نے اس کے ننھے سے دل میں بے شمار آنکھیں پیدا کر دی تھیں۔

ایک دن وہ بہت تھکا ہوا گھر لوٹا اور چارپائی پر گر کر بری طرح کھانسنے لگا۔ اس کی بہن نے اس کے جوتے کے تسمے کھولے اس کا میلا دبیز کوٹ نکالا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر نیلگری کے تیل سے اس کے سینے کی مالش کرنے لگی۔ اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بے زبان مجبور بہن کے پیلے پیلے افسردگی سے کمھلائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ''میری اچھی گڑیا! باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو کیا ہوا میں اپنے سائے سے تیرے ہاتھوں کو ایسی لال لال ہاتھوں سے بھر دوں گا کہ تو۔۔۔۔ ہاں تو جا اسی بات پر میرے لیے اچھی سی چائے بنالا''۔ بہن ایک حزیں یاس بھری مسکراہٹ سے منہ چھپا کر چلی گئی۔ اپنے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگا دیکھنے سے بالکل ہی مایوس ہوگئی تھی۔

مسرت کے موقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے وہ اپنے سائے کا باپ کے سائے سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا باپ تو کھاتے پیتے پرانے ہندوستان کا ایک بھاری بھرکم انسان تھا۔ چھ فٹ لمبا، تین فٹ چوڑا۔ اور اس کی آمدنی بیٹے کی آمدنی سے گنا زیادہ تھی۔

اس کے سائے میں اٹھارہ انسانوں کا ایک خاندان پل رہا تھا۔ کئی غریب رشتہ دار کی مانگوں میں سہاگ افشاں چنی گئی تھی۔ اب یہ ڈینگیں مارنے والا ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھیر۔ میلا دبیز کوٹ اتار دینے پر اس کا سایہ ٹیلیفون کے کھمبے کی طرح اتنا پتلا اور منحنی تھا کہ ایک ہی دبلی پتلی نرم و نازک بہن جوانی میں دھوپ اور حدت سے نہیں بچتی تھی۔ وہ تو اس دھوپ میں جیسے جل رہی تھی۔ ابل رہی تھی۔ بالکل اس دیگچی کی طرح جس میں پکتے ہوئے چائے کے پانی میں ابال آ رہا ہو ہاں جب وہ روپوں سے پھولی ہوئی جیبوں والا دبیز کوٹ پہن لیتا تو اس کے بڑے بڑے کالروں میں منہ چھپا کر جوانی، حدت دھوپ سبھی کچھ بھول جاتی تھی۔ بھائی کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت اور سوکھتے ہوئے جسم کو دیکھ کر بہن نے آخر جی کڑا کر کے، شرم کی کینچلی اتار پھینکتے ہوئے ایک روز کہہ دیا۔ ''بھیا! آپ کی زندگی میری زندگی ہے۔ آپ پر سے میری جیسی ہزار بہنیں وار کر پھینکی جا سکتی ہیں۔ آپ میرے لیے کیوں اپنی زندگی، اپنی جوانی اس طرح برباد کر رہے ہیں۔ مجھے آپ جیسے پیارے بھائی کے قدموں میں بڑی آرام اور چین کی زندگی حاصل ہے۔ میں کہیں اور جانا نہیں چاہتی۔ میں۔۔۔ میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں آپ شادی کر لیجئے۔ گلاب کے پھول جیسی بھابی بیاہ لائیے۔ میں آپ دونوں کی خدمت میں ہنستے مسکراتے گزار دوں گی۔ آپ دونوں کے ہوتے مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے؟''

اس نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر محبت اور لطافت سے گنگناتا ہوا ایک نرم طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

''پگلی! میں جانتا ہوں کہ تو اتنی پیلی ہے کہ تیرے جسم میں لہو کی بہت تھوڑی بوندیں ہیں۔ ان بوندوں میں کبھی تلاطم پیدا نہ ہوگا تو چاہے یا نہ چاہے۔ لیکن دنیا والوں کے لیے تیری شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اگر تو مصلیٰ پر بیٹھ کر قسم کھائے تو بھی کوئی تیری پاک دامنی کا یقین نہیں کرے گا''۔

اس نے بھی جی کڑا کر کے شرم کو بالائے طاق رکھ کر کہہ دیا۔ اس وقت اس کے جی میں آئی کہ یہ بھی کہہ دے ''تو جھوٹی ہے۔ تجھے شادی کی ضرورت ہے۔ میں خود تیری چارپائی سے ابلتی ہوئی دبی دبی بھیا تک آہیں سنتا ہوں۔ بے شمار کروٹوں سے چرچراتی ہوئی چارپائی سے تیری پیاسی جوانی کی چیخیں سنتا ہوں۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کر۔ تو نے یہ صرف گھر کی چاردیواری دیکھی ہے مگر میں نے بہت بڑی دنیا دیکھی ہے۔ اٹھائیسویں برس میں سر میں سفید بال، گردن میں جھکاؤ اور آنکھوں میں یاسیت کا دھندلکا، یہ کیا ہے؟ میں نے دنیا دیکھی ہے تو تو صرف چوبیس برس کی ایک کنواری ہے۔۔۔۔''

پھر اس کی زندگی میں ایک بڑا ہی چمکیلا دن طلوع ہوا۔ اپنی بہن کو سر سے پاؤں تک سونے اور چاندی کے زیوارت سے جگمگا دیا۔ اس کی مانگ کو کہکشاں سے زیادہ چمکیلا بنا کر سنوارا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ایسی سرخ سرخ مہندی لگائی کہ شفق تک شرما کر پہاڑوں کے پیچھے چھپ گئی۔ سبز رنگ کی سلمیٰ ستارہ ٹنکی ہوئی بنارسی ساڑھی اور سونے کے پیلے پیلے چمکتے زیور، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سبز رنگ کے گلدان پر پرانے ہندوستان کے کسی مشہور نقاش نے بڑے فنکارانہ انداز سے منسبت نگاری کی ہو اور اس میں گیندے کا ایک پھول شرما رہا ہو۔ اس پھول کی پتیاں شبنم کی لاتعداد بوندوں سے بھیگ رہی تھیں وہ خود بھی روتا ہوا مصنوعی خوشی سے مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ پھپکتے ہوئے دلاسے دے رہا تھا ''ارے! دلہنیں کہیں روتی ہیں، کہیں روتی ہیں۔۔۔۔ ہونہہ۔۔۔۔'' اور تاشوں، نفیریوں، ڈھولوں کا شور فضاؤں میں بلند ہو ہو کر اس پر ٹھٹھے لگا رہا تھا کہ دیکھو یہ آنسو پونچھنے والا خود بھی تو آنسو بہا رہا ہے۔ ہاہاہا۔۔۔۔ ڈھم ڈھم۔۔۔۔ پیں پیں پیں پیں۔ تررت ترترر۔۔۔۔''

بہن کے چلے جانے کے بعد اس کی زندگی، اس کا گھر سبھی سنسان پڑ گئے تھے۔ اس کی بہن کی چارپائی اب بالکل چپ چاپ اکیلی پڑی تھی۔ وہ اب آہیں نہیں بھرتی تھی اور نہ اس سے کسی پیاسی جوانی کی چرچراتی ہوئی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ اب ہوٹلوں میں کھانا کھا رہا تھا۔ کسی دیگچی میں کھاہی نہ آتا تھا۔ مگر ہاں اس کی گردن اب پھر سے اونچی ہو گئی تھی۔ کتنے سال سے اس کی

بہن کی وزنی جوانی اس کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہی تھی۔ اب تو بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ فخر سے گردن اٹھا کر سڑکوں پر چلتا تھا۔ بات بات پر گردن پیچھے **پھینک پھینک** کر قہقہے لگاتا تھا۔ کتنے عرصہ سے اس کے قہقہے اس کے حلق میں رکے ہوئے تھے۔ محفوظ تھے۔ اب وہ شاذونادر ہی زمین کی طرف دیکھتا۔ اب اس کو زمین کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جتنا سونا چاندی اور روپیہ پیسہ اس کی بہن کی شادی کے لیے ضروری تھا اس نے زمین کے حلق میں انگلی ڈال کر سب اگلوا لیا تھا۔

اب وہ دن میں ایک بار ضرور اپنی بہن کو دیکھنے اس کی سسرال چلا جاتا اور نہایت مسرور گھر لوٹتا کہ بہن کے گالوں میں گلاب کی سرخ سرخ کلیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ آج کل یا پرسوں میں کلیاں کھل کر بڑے بڑے لال پھول بن جائیں گے۔ اور اس کا دولہا ان پھولوں کے گرد مست مخمور اور مسرور بھنورے کی طرح منڈلایا کرے گا۔ اس مزیدار خیال سے خوش ہو کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا، جیسے وہ تنہا فاتح ہے جسے نہ آسمان شکست دے سکا اور نہ زندگی۔ البتہ اس کو ساری زندگی میں اگرچہ صوف ایک غم تھا کہ وہ برجیس جہاں کو اپنا نہ بنا سکا۔ اگرچہ کہ برجیس جہاں ابھی تک کنواری تھی لیکن اس کا کنوارہ پن ایک ٹرونی کی طرح تھا جس کو جیتنے کے لیے چند خاص خاص شرائط مقرر تھیں۔ آصف نے برجیس جہاں کے باپ کو اس کے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے کہلوا بھیجا کہ وہ برجیس جہاں سے محبت کرتا ہے۔ برجیس کے باپ نے جواب دیا کہ شادی کے لیے محبت اتنی اہم نہیں۔ بیوی کے لیے اچھا مکان، اچھی غذا، اچھے کپڑے زیادہ ضروری ہیں۔ آصف کے رقیب نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔

''میرے تین مکانات ہیں وہ تینوں برجیس کے نام لکھ دوں گا''۔

''میری آمدنی چار سو روپے ماہانہ ہے''۔

''میری جواہرات کی دکان ہے برجیس ساری عمر جگمگاتی رہے گی''۔

''میری پنشن پندرہ سو روپے ماہانہ ہے۔ میں برجیس کو کشمیر کی جنت میں لے جاؤں گا''۔

آصف ہار گیا اس کے دفتر میں ہیڈ کلرک نے وہ ٹرافی جیت لی۔ آصف کی جان تمنا جیت لی۔

محبوبہ کے چھن جانے کے بعد آصف کو کسی دوسری محبوبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اس کی جوانی کے خلاء میں اس کو اتنا سناٹا سکوت اور ڈر محسوس ہوتا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔ کہ اس مہیب سناٹے میں دفعتاً کانچ کی چوڑیاں بجنے لگیں پازیب کی میٹھی میٹھی جھنکار پیدا ہو۔ دوپٹے سرسرانے لگیں پھر پھر۔ پھر اب پھر محبوبہ نہ سہی کوئی عورت ہی سہی جو اس کی زندگی میں مہمان کی طرح ہی کیوں نہ آئے۔

اور جلد ہی ایک عورت اسے مل گئی۔ شہر میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے لیے ایک مشن آیا ہوا تھا۔ اس میں بہت سی لال پریاں تھیں۔ ان کے جسم جیسے سپید سپید شیشوں سے بنائے گئے تھے۔ اور اندر گہرا سرخ رنگ بھر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بھوکوں اور ننگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے ویران راستوں جیسے مذاہب کو چھوڑ کر اس شاہراہ پر چلنے لگے۔ جہاں قدم قدم پر ہوٹلیں اور سرائیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پینا، روپیہ پیسہ، عورتیں۔ آصف کو ان نعمتوں میں صرف ایک ہی نعمت چاہیے تھی۔ فاکس۔ واللہ کیا عورت تھی مس فاکس پہلی بار آصف نے اس کو امپیریل پوسٹ آفس سے نکلتے دیکھا تھا۔ بھرا بھرا جسم، لمبا قد اور اس کے مصور نے اس کو رنگنے میں جیسے سارا گلابی رنگ صرف کر دیا تھا۔ اس کے گالوں پر میٹھے سیبوں کے بجائے پارک شائر کے کسیلے ٹماٹر تھے۔ پوسٹ آفس سے نکل کر جب وہ اپنی سائیکل پر چڑھ رہی تھی تو اس کی پنڈلیوں کی تھرکتی ہوئی لال لال مچھلیوں کو دیکھ کر اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ مر گیا ہے۔

اس نے قومی نسلی تعصب کو دل ہی دل میں دھتکار بتائی اور ایک صاف دل سے اعتراف کرنے لگا کہ واقعی دنیا کے دوسرے ملکوں نے عورت کی اصلی قدر جانی پہچانی ہے۔ یہاں ہندوستان میں تو عورت کی مٹی پلید ہوگئی۔ اس مٹی کو تو صرف گیندے زعفران بنفشے اور سورج مکھی کے پھول ہی اگانے لگے ہیں۔ دوسرے تیسرے دن اس نے مس فاکس سے راہ و رسم بڑھالی اور جوانی پھر لوٹ آئی۔ وہ اب اپنی بہن کو بھی بہت کم یاد کرنے لگا۔ گلاب کا پھول سامنے ہو تو گیندا کہاں یاد آتا ہے۔

ایک دن مس فاکس آرکسٹرا پر الیہ فراقیہ گیت الاپ رہی تھی اور آصف اس شاعر کو جس نے ایسا گیت لکھا دل ہی دل میں کوستا ہوا چپ چاپ سن رہا تھا کہ اچانک اس کو گیندے کا پھول یاد آ گیا کیوں کے دروازے سے اس کی بہن کا لالچی شوہر داخل ہوا اور پھر آصف کو دیکھ کر ٹھنکار کا جھجکا لیکن جب مس فاکس مسکراتے ہوئے اس کو بلانے لگی تو آصف صوفہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مس فاکس آصف کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر ہنس پڑی یعنی ''وہ تو روز یہاں آتا ہے''۔ اس شام وہ اپنی بہن کے گھر گیا۔۔ اس نے اس سے ایک لفظ نہ پوچھا۔ سگریٹ پیتا رہا اور اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ جو بار بار ہلکی ہلکی سی کپکپاہٹ سے کھل جاتے تھے۔ اس کی جھکی جھکی پلکیں اور پلکوں کی گھنیری چھالوں میں کانپتے ہوئے تارے دیکھے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے انہیں گالوں پر اس نے سرخ سرخ لکیروں کا ایک جال بنتے دیکھا تھا آج وہ جال اور عورت کا رنگ بھی تغیر پذیر ہے۔ کیسا بے اعتبار، کیسا ناپائیدار اور کیسا عارضی ہوتا ہے۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کا دماغ ایک دم ساکت ہوگیا تھا۔ اس کو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ہنس رہا ہے تو کیوں ہنس رہا ہے رو رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے۔ اب شاید اس احساس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی نے اس کی ہڈیاں نکلے ہوئے سینے پر ایک ایسا گھونسا لگایا تھا کہ وہ تین دن تک چارپائی سے نہیں اٹھ سکا کھانستا رہا۔ بال نوچ نوچ کر روتا رہا۔ کبھی ہنستا رہا۔ کبھی گاتا رہا اور چوتھے دن جانے اس کے جی میں کیا آئی اپنا پرانا رفیق وہی میلا کوٹ پہنے باہر نکلا اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ شعلے لپک رہے تھے جیسے کسی کو جھلس ہی دیں گے۔ چینی ریستوران کے چوراہے پر نکھری ہوئی شام اپنا سفید بھیگا ہوا دوپٹہ پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ بس اسٹاپ کے ستون سے کندھا ٹیکے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر توڑ رہا تھا۔ ایک بھاری بھرکم پنجابی عورت کو اپنے دبلے پتلے منحنی پستہ قد شوہر کے ساتھ جھک جھک کر باتیں کرتا دیکھ کر تو وہ بڑی زور سے ہنس پڑا۔ پنجابی عورت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے شوہر کا غصہ رفع کرنے لگی۔

''کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے''۔

''ہوں!'' وہ ان کے قریب جا کر کہے۔

''نہیں نہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ پاگل تو گاندھی ہے۔ نہیں جناح پاگل ہے۔ نہیں فقیرا ہی پاگل ہے۔ وہ مزدوری کرتا ہے ہو ہو ہو۔۔۔۔''

پنجابی عورت چوراہے پر کھڑے پولیس مین کو دیکھنے لگی اور اسی اثنا میں سامنے سے مس فاکس سائیکل پر آتی دکھائی دی اور آصف ''اے ڈارلنگ حسینہ تیرا انتظار کب سے تھا'' کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اس کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی سائیکل پر سے اتر پڑی۔ پھر جانے کیا ہوا۔ چینی ریستوران کا سارا چوراہا غضبناک چیخوں سے گونج رہا تھا۔ مار ڈالا۔ ہاں مار ڈالا۔ خون! دوڑو پکڑو۔ مارو۔ جب چیخیں مدھم ہو کر بھنبھنانے لگیں تو آسمان کے پہلے ستارے نے دیکھا کہ مس فاکس خون میں سمنٹ روڈ پر پڑی ہوئی تھی اور خون کی دھاریں اس کی مرمریں لمبی پتلی دلاویز گردن سے نکل نکل کر بہہ رہی تھیں۔ آصف کو دو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنا خونی چھرا فضا میں اٹھا کر چیخ رہا تھا۔

''دیکھو سارا چوسا ہوا خون بہہ رہا ہے۔ اب میری بہن کے رخساروں پر گیندے کے پھول کبھی نہ کھلیں گے۔ ہاں اہل

وطن۔ سارا چوسا ہوا خون۔ میں نے فاکس کو مار ڈالا ہے۔ اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ ہاں اہل وطن''۔

پولیس انسپکٹر آصف کے گردنیاں دے رہا تھا اور لوگوں کی چہ چہ۔۔ چہ چہ زبانیں چل رہی تھیں۔

''واہ بڑا بہادر ہے۔ عورت کو مار ڈالا!!''

''پاگل معلوم ہوتا ہے کوئی''۔

''ہائے رقابت!!'' شاید کوئی شاعر بولا۔

''اجی کوئی انقلابی معلوم ہوتا ہے''۔ شائد کوئی کلرک بولا۔

''کمبخت ان نمک حرام انقلابیوں کی وجہ سے ہی دیش کو آزادی نہیں ملتی''۔ شاید کوئی بنیا بولا۔

پولیس انسپکٹر غصہ کے رعشہ سے کانپتی ہوئی آواز میں اسے گردنی دیتے ہوئے بول رہا تھا۔

''بدمعاش! ذلیل!! کمینہ!!''

آصف چیخ رہا تھا'' مار ڈالا ہے اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ سارا چوسا ہوا خون مس فاکس کو مار ڈالا ہے''۔

سپاہی گردنیاں دے دے کر اس کو آکسفورڈ اسٹریٹ پر ڈھکیلتے لے جانے لگے۔

''ہاں اہل وطن۔۔۔''

☆☆☆

یادوں کے دریچے سے

ابوالفضل صدیقی

توجیہ اہل سیاست اور محققین تاریخ کیا کریں مگر ہم جیسے عامی اپنے تجربوں کی بناء پر سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر سلیقہ خواجگی میں راسخ وطاق اور خوئے غلامی تراشنے میں فطین ومشاق انگریز حکومت کو سستی انفرادی اور سطحی حق کوشی کا کریڈٹ بہر حال جاتا ہے، خواہ برٹش رویہ کے تحت یہ ایمانداری بھی پالیسی ہو، ورنہ تاریخ عالم کے بوجھ بجھکڑ تاریخ عالم کے سالوں صدیوں کے اعداد و شمار کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں کہ عمل و ردعمل کی فطری منطق کے تحت تاریخ کے پہیہ کا آفاقی مزاج چلا آرہا ہے کہ ہر ایسی تاریک مدت کے بعد جیسی اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کے اندر گزری بہر حال امن و آشتی اور حق گوشی و انصاف کا دور آتا رہا ہے۔ چلیے مان لیں تو پھر کہنا پڑتا ہے کہ انگریز قوم نے باوجود اجنبی، اور دوسری نسل ہونے کے ہندوستان کے اندر اسے ڈھنگ کے ساتھ برتا۔

یہاں انگریز قوم اور برطانوی دور حکومت کی قصیدہ خوانی منظور نہیں، جو کچھ رائے ہے وہ تمہیدی سطور میں عرض کر دی، بات بر سبیل تذکرہ اس صدی کے اوائل سالوں کی کہنی ہے، جب انگریز حکومت کے تیور بتا رہے تھے کہ ہندوستان کے اندر بھی ملکہ برطانیہ عظمیٰ کی کم وبیش آٹھ دس پشتیں جلوس تخت نشینی ہی منائیں گی اور اسی نتیجہ پر برطانوی مدبرین اور ہندوستانی انگریز پسند دانشور پہنچے ہوئے تھے اور انگریز مخالف کا کھلم کھلا تو وجود ہی نہ تھا۔ تو کبھی کبھی نو آبادیاتی انگریز ناظم عامل لال قلعہ اور جامع مسجد تک پہنچی ہوئی تہذیب اور تاج محل و اعتماد الدولہ تک پہنچے ہوئے تمدن کے درمیان وہ حرکتیں کر بیٹھے جو افریقہ کے جنگل نشینوں اور ایشیا کے صحرا نشینوں کے ساتھ چلا رہے تھے اور پھر بیچارے دہی کے دھوکے کپاس بھی چبا جاتے اور یہ یوں بھی ہوتا کہ سپر جینس ہونے کا خناس کھوپڑی کے اندر بٹھا دیا جاتا، اور ہچو من دیگرے نیست، دائیں بائیں، اوپر نیچے، آگے پیچھے دور دور تک نظر بھی نہ آتا۔

یورپ کی رنگ ساز انڈسٹری کے لیے نیل کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی سے برٹش گورنمنٹ کو خام مال کی لوٹ کھسوٹ میں افیون کی برآمد اور ایشیا میں کہیں (غالباً چین میں) منڈی ہاتھ آئی جس کی کاشت ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں ہندوستان کے اندر ہوتی بھی اور برٹش دور بھر ”کرائی جاتی رہی“ کرائی جاتی رہی؟“ یوں کہ اس کی پیداوار کا باضابطہ لائسنس جاری ہوتا اور انفرادی طور پر لائسنس مراد کاشتکاروں اور گورنمنٹ کے درمیان کل خرید وکل فروخت کا سال بہ سال معاہدہ ہوتا رہتا جو گورنمنٹ کی جانب سے ایک اونچا گزٹیڈ آفیسر او پم ایجنٹ کیا کرتا۔ اعلیٰ ترین یک جائی، قطعات اراضی فرداً فرداً ہر کاشتکار کے ہم سوانہ مقبوضے پیائش کیے جاتے، پیداوار کی تخم ریزی سے بھی قبل تخمینہ کر کے زر پیشگی تقسیم ہوتا۔ یوں او پم ایجنٹ کو اپنے ہم رتبہ افسران مال کی نسبت معائنہ موقع وغیرہ امور میں زیادہ دورے کرنے پڑتے۔ ڈسٹرکٹ او پم بالعموم تجربے کار ڈپٹی کلکٹر رینک کا عہدیدار ہوتا اور کبھی کبھی نسلی گورا ولایت امپورٹیڈ نیا سویلین بھی نامزد کر دیا جاتا جس نے پڑھا ہوتا تو انگریزی کتابوں میں کہ گرم ممالک کے اندر ایک پودا Popy ہوتا ہے لیکن یہ گورا افسر ہندوستان کی سرزمین پر قدم دھرتے ہی چودہ طبق روشن، ہر کار کا اہل کار اور ہر فن مولا تصور ہو جاتا۔ ماتحت دیسی عملے کا رویہ سب ہی کے ساتھ اور ان صاحب بہادروں کے ساتھ خاص پر تعاون رہتا۔ افیون کے علاوہ دوسری فصلوں کے اوقات شدید موسم کے امکانات اور تیوہار ملحوظ خاطر رہتے۔ ان عرصوں میں دورے ملتوی رہتے اور او پم ایجنٹ اور عملہ ہیڈ کوارٹر میں دفتری کام کیا کرتا۔ اونچی سطح پر اس زمانے میں بجز پولیس اور انجینئرنگ کہیں رشوت کا چلن نہ تھا۔ نچلی سطح پر اس محکمے میں مواقع بھی نہ تھے۔

مسٹر نیدر سول ڈسٹرکٹ او پم ایجنٹ نے فہرست تعطیلات دیکھ کر ماتحت عملے کو دورے کا پروگرام بنانے کا آرڈر دیا، لیکن یہ دسہرہ اور دیوالی کی درمیانی مدت تھی، اس عرصہ میں کنوار کی پورن ماشی پڑتی تھی جو ''شرت پورنما'' (سال کی روشن ترین پورن ماشی) کہلاتی ہے اور چڑھتے چاند کے تقریباً پندھرواڑے بھر دیہات کے اندر گانا بجانا ہوتا ہے۔ فہرست تعطیلات میں اس تیوہار کی قسم، مدت اور تاریخ کا ذکر نہ تھا۔ لیکن ناظر نے اس کی دیہاتی مصروفیت کا حوالہ دیا اور سر دست دورہ ملتوی کرنے کی عرض داشت کی لیکن صاحب بہادر نے نیٹو اہل کار کو غرا کر چپ کرا دیا۔

مسٹر نیدر سول Nether Sole تازہ ولایت جواں سال، فوج کے سپلائی شعبے کے نکلے اسکاٹ نسل او پم ایجنٹ تھے۔ گاؤں کے قریب اک دو فرلانگ پر کیمپ تھا، چھوٹی چھوٹی راوٹیوں کا دیسی عملہ کا جھمگٹا ایک جانب کو اور صاحب بہادر کا شاندار خیمہ وخواب گاہ سول لائن ذہنیت وقاعدہ کے مطابق ذرا پرے کو جس سے ملحق صرف اردلی کی چھولداری تھی۔ ادھر بستی میں پر کھوں والی بڑی چوپال پر لق ودق چبوترہ اور وسیع دالان بھرے ہوئے تھے۔ گھڑے اور ڈھول کے ساز پر گیت ابل رہے تھے۔ بستی اور آس پاس دیہات کا بڑا اکھٹ تھا۔ گھروں میں نوخیز بیٹیاں، نوبلیں بہوئیں ڈھولکی اور مجیروں پر اپنے گیت گا رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں میٹھے اور نمکین پکوان بنا رہی تھیں۔ خریف کی فصل کٹ کر کھیتوں سے نئی نئی آئی تھی۔ ربیع کی تخم پری کے لیے گیہوں، چنا، کھیتوں بخاریوں سے نکالا تھا اور بچا پڑا تھا۔ جوار باجرے ماش گڑ کھانڈ، تل سرسوں، جنس اعلیٰ اور گیہوں، چنے کی ریل پیل تھی۔ خریف کے کھیت خالی ہو کر اور ربیع کے رقبے ابھی حال میں بوائی ہو کر سب کھلے تا حد نگاہ میدان ہی میدان تھے۔ اور فرصت ہی فرصت تھی اور شرت پورنما کی شب ماہتاب تھی۔ شیتل خنک چاندنی کے پیار لیا، تمام عالم مطلع انوار ہو گیا، کھلے میدانوں میں ہرنیاں چوکڑی بھر اٹھیں، گھنیرے باغوں میں مور اترا اترا کر ناچ پڑے، پپیئے ارغنوں بجانے لگے اور کوئلیں کوک پڑیں۔ چوپال کا ساز ونغمہ بلند تر ہوا، فضا بسیط میں چاندی کی افشاں بھر گئی تا حد نگاہ میدانوں پر سونے کا پتر چڑھ گیا، دنیا ہم مستی، تمام آہنگ ونغمہ ہو گئی، جو ہڑوں اور جھاڑوں سے پارہ کے فوارے اچھل پڑے، ندیوں اور نالوں میں چاندی کی لہریں چل پڑیں، فطرت اور خلوص بغل گیر ہو گئے۔ چاندنی کے پیار کے ساتھ دیہاتی جشن ماہتاب پورا پا ہو گیا اور درخشانی اور خنکی میں ساز وآہنگ بھرپور جوش میں آ گئے۔

صاحب بہادر نے بیرون خیمہ ماحول سے بے نیاز رات کے کھانے پر معمول کے دو تین چھوٹے بڑے وہسکی کے پیگ لگا لیے تھے۔ پینے والے شائقین کہتے ہیں کہ شراب کا عمل اقسام اقسام کے علاوہ خطے خطے کے لوگوں پر متنوع ہوتا ہے۔ بعض پی کر مہکتے ہیں اور سرور میں اور بھی زیادہ حاضر دماغ وفرازانے ہو جاتے ہیں، کچھ چھک کر بہکتے ہیں اور اچھے بھلے جیسے خود ساختہ دیوانے ہو جاتے ہیں، کچھ مسخرے شوخ طبع اپنی پوزیشن، قانون اور اخلاق سے ماورا سمجھتے ہوئے شراب پی کر بھی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ زبان لڑکھڑاتی اور قدم ڈگمگاتے ہیں، اور تمام بدن ڈانواں ڈول کرنے کا ایکٹ کرتے ہیں اور اس میں انہیں لطف آتا ہے۔ اور صاحب تو اول الذکر قطار کے تھے، زیادہ سے زیادہ آنکھوں میں سرور آ جاتا اور نہ غم دنیا اور نہ غم جاناں، سنگل ٹن انگریز، فکر وغم ہو تو غلط ہو۔ بستر پر دراز ہوئے تو بستی سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ سرور میں مخل اور شاید نیند میں حارج محسوس ہوئی، سلیقہ حاکمیت بیدار ہوا اور رولنگ ریس کا شعور تو ازلی وجبلی ہے اور انگریز میں آفاقی، اور ہندوستان کے اندر تو ہر دور میں جیسے تازہ ہو اور سورج کی روشنی کے بھاؤ پر سوتے میں بھی جاگتا رہا ہے۔ اور منوجی اسے تیز تر اونکھار کر درجہ بدرجہ منزل بہ منزل پیش کر گئے ہیں اور آدمیوں آدمیوں کے درمیان پیدائشی مقدر بنا گئے ہیں۔ صاحب بہادر کی برنیست کی ٹیک اور شخصی حکومت کا غرور شعور سے اچھل کر بروئے کار آیا۔ اردلی کو حکم دیا یہ شور بند کراؤ۔ اردلی لپکتا ہوا پہنچا تو حکم تو نہ سنایا کم بخت انہیں میں سے تھا، گانا سننے بیٹھ گیا۔ ادھر صاحب بہادر نے کچھ دیر انتظار کیا تو حکم عدولی کا شعور بیدار ہوا اور کچھ دیر یوں ہی شور ہوتے گزری تو حکم عدولی برٹش پرسٹیج میں خلل کا شور جاگ پڑا اور یہ ٹیپ کا بند اس کے

احساس تحفظ کے فرض منصبی میں جا پہنچا جو انگلستان چھوڑتے ہوئے سروس کی حلف وفاداری کی اہم مشق تھی، ایکشن نے کروٹ لی اور اسکاٹ النسل فوجی سویلین کے اندر نشہ فرض منصبی کی ادائیگی کی تحریک بن گیا جو یوں بھی ہندوستان کے اندر ہر گورے کا اولین منصب ہے۔ چنانچہ ہورگوراروبارا انگلستان سے عازم مشرق ہوکر اس تحفظ میں از سوڈان تا امرتسر، کانپور دہلی وغیرہ لارڈ کچنر، جنرل ڈائر اور کون و کیا کیا نہیں، غرض علامہ اکبر الہ آبادی کی ترکیب میں لفٹیننٹ گورنر ہو جاتا کرتا تھا اور سات خون معاف اور مسجد کی بیخ و دین تو در کنار، قبر کی مٹی اکھیڑ کر دریائے شور میں بہا دینے پر تلا رہتا تھا۔ ڈسٹرکٹ اور پم ایجنٹ صاحب بہادر ہوں، یا ضلع کے تاج برطانیہ کے نمائندے کلکٹر صاحب بہادر، یا تخت برطانیہ کے سنگین بردار چوکیدار سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب بہادر، خواہ اپنی ماں بیوی اور بیٹے کے تحفظ کے کتنے ہی وسیع القلب وصاحب نظر وشوخ و بے پرواہ ہوں، لیکن برٹش پرسٹیج کے تحفظ میں قومی کریکٹر۔۔۔۔کے تحت بلا کے حساس ہوتے ہیں۔ شور بند نہ ہوا تو حکم عدولی کا احساس جاگا اور یہ دل ہی دل میں برٹش تحفظ کا احساس فرض سے جا ملا اور دبا میٹ ہارس وہسکی کا نشہ گھٹی ہوئی بھنگ کی ترنگ میں بدلگام اور چھٹ کر بے راہ ہوگیا اور بھنگ کی خنک اور وہسکی کا سرور حکومت کے نشہ میں ملفوفہ بن گیا۔ برتھ رائٹ کا تحفظ وحق بڑے زور سے سننا پڑا۔ اور بھنگی کی سمجھ میں تو ''ہونی اور انہونی'' اور ''ان ہونی'' ''ہونی'' ہوا کرتی ہے۔ پردہ پر ننگا، ولایتی ساخت کا بنا ہنٹر اتارا، یوں اپنے تئیں ایٹم بم سے مسلح ہوئے۔ آگے آگے بے خودی، پیچھے پیچھے ہوش، چل ہی تو پڑے اور برٹش حق، ہندوستانی ناحق پر کوڑے کا قانون چلانے کے لیے ہاتھ میں لہراتے یک دم چوپال کی اوپر والی چودھویں سیڑھی پر مرگ برگام کی صورت نمودار ہوئے۔ بھیڑوں کے گلے میں بھیڑیا اور گوریوں کی تنگ میں شکرا، بھاگڑ پڑی تو سیڑھیوں پر تو دعا کا مقام اور دریاؤں کا ٹھور تھا۔ ملک الموت کا قبضہ، نومیٹ اونچے کرسی والے چبوترے پر سے جس کا جدھر کو منہ اٹھا۔ آس پاس گلیاروں کو پھاند پڑا اور پہلی چاپ پر جیسے بو سونگھ کر صاحب کا اردلی پھاندا۔ تاہم بوڑھا نمبردار چودھری علاقے بھر کی چار چار کوس غیر متنازعہ مقدر شخصیت اپنی گھاسی سفید مونچھوں، چہرہ اور جھریوں کے سہارے، اس پندار میں کہ اس پر اینگلو انڈین قانون کی کوئی دفعہ لاگو نہیں۔ اس جٹ، ناخواندے مہمان کی پیشوائی، معافی خواہی کے انداز میں ہاتھ جوڑے جھکا ہوا، پاؤں پکڑتا رینگتا بڑھا تو عمل و ردعمل کی منطق بے منطقی میں اس خوش آمدید کے جواب میں بوٹ کی ٹھوکروں سے فیئر ویل کیا اور اوپر سے تانت کے ہنٹر کی بارش سے تڑاق پڑاق جواب نیاز مندی دیا۔ مجمع تین نسلوں سے مزین تھا۔ پہلی نسل کے افراد سات بیٹوں بھتیجوں کا باپ تایا چچا اور ان سات کے پانچ پانچ نوجوانوں پوتوں کا دادا، اور ان پانچ کے ایک ایک پوتے کا پردادا۔ اول الذکر تینوں نسلیں تو آبائی چوپال کے چبوترے پر سے تنگ و تاریک گلیوں کو پھاند گئیں، لیکن چوتھی اونچ نیچ دیکھے بغیر اور آگا پیچھا سوچے گھوم پڑی، جیسے زمین ازلی گردش کرتے کرتے الٹی پھرکی سے گئی۔ سورج مغرب سے طلوع ہوا۔ ارزل خاک بگولہ بن کر آسمان سے جا ٹکرائی اور آسمان کا پیالہ الٹ کر سیدھا ہوگیا۔ ایلپس کی جولیس، ٹیمنس کی روانی رکی اور ہمالیہ بندھیاچل کی برفانی چوٹیاں لودے اٹھیں۔ ولایتی مردار تانت اور کھٹیلی کڑواتیلی پلائی کالی لاٹھیوں کا مقابلہ ہی کیا، نوخیز لونڈوں نے جیسے مونچھ کے گھٹے کی طرح موگلی سے کوٹ کر رکھ دیا۔

اور بڈھا تو شاہنامہ فردوسی کا ان پڑھ شارح تھا۔ فردوسی کا ہیرو رستم بیل تن، روئیں تن شہزادہ اسفندیار کو مار کر داستان کے اختتام المیہ سے بچ نہ سکا، اور اپنے ربیب رادہ برادر کے ہاتھوں چاہ اندر چاہ گر کر ہلاک ہوا۔ اور سرکاری اہل کار تو ہر دور میں روئیں تن شاہزادہ اسفندیار رہا ہے اور اس دور میں سب سے زیادہ ہے، جسے پھول کی چھڑی سے چھونے والا زرد انتقامی کے ساتھ تاخت و تاراج ہوا ہے۔ اب تک رائی اور رعایا، صاحب بہادر اور بڈھے کے درمیان یک نہ شد دو شد، چوٹوں ٹھوکروں اور ہنٹروں کے درمیان یک طرف مار پیٹ تھی مگر اب بڑھ کر ایک مثبت ایک گیارہ ہوئی اور تین تیرہ ہوگئی اور بڈھے کو سب بارہ باٹ ہوتے نظر آئے۔ نوخیز اٹھا کر بچوں نے جد امجد کی بیں بیں کیا کرتے ہو!! نہ اس کان سنی ہی نہ اس کان اڑائی ہی۔ جاگتی آنکھوں کے خواب

کابوس کی بڑبڑاہٹ، صدا بہ صحرا ہوگئی۔ صاحب بہادر اس وقت قتل مقتول اور خود کو حق بجانب قاتل سمجھ کر ہی ہاتھ روکا اور آن کی آن میں تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری کی جلدوں کے شیرازے اکھیڑ کر ورق ورق بکھیر دیئے۔

کہتے ہیں بابا نے قانون سولین اعظم نے روم کے لیے قانون بنایا تو اس میں ماں باپ کے قاتل کے لیے سزا مخصوص نہ کر سکا۔ اسی طرح پاپا نے صاحب تعزیرات ہند لارڈ میکالے انگریز ہوتے ہوئے ہندوستان کے اندر انگریز کو مارنے والے کی سزا متعین نہ کر سکے، کیونکہ دونوں ہی عظیم مقننوں کے وہم و گمان میں جب کہ روم اور اب ہندوستان کے اندر ایسے ارتکاب جرم کا امکان نہ تھا۔ مگر لارڈ کچنر نے درویش سوڈان کی ہڈیاں اکھیڑ کر خاکستر کیں اور راکھ دریائے شور میں بہادی تو انتقام فطرت میں اس ظالم کی ارزل خاک کے لیے زمین نے اک دوگز پیوند لینا گوارا نہ کیا اور جیتی زندگی دریائے شور ہی نے کچا نگلا۔۔۔۔۔

اردلی تو ایک ہی گرو گھنٹال ہوتے ہیں، ناسزا جیسے اپنے صاحب بہادر کی بونیچے والی سیڑھی سے لے کر بھانپ گیا۔ اور جب تک صاحب بہادر اوپر والے پٹہ پر پہنچیں، کم بخت عیار نے حق نمک میں مدد کی بجائے الٹی چبوترے پر سے جست لگائی۔ جیسے چھلاوہ ہوگیا۔ اور کتے کے لتاڑی لومڑی کی طرح ڈبکی دے کر اپنی چھول داری میں آ دبکا اور پھر نظر پڑا تو استغاثہ کے وکلاء کا رٹایا سبق طوطے کی طرح عدالتوں میں پڑھتا اور صفائی کے وکیلوں کی طرح جرح میں پھنسا، اگز بیٹ میں اپنے صاحب بہادر کا ٹوٹے دستہ کا ہنٹر شناخت کرتا۔ جارح وکیلوں کے درمیان بہ حلف بیان دیتا "خدا کو حاضر ناظر جان کر نہیں کہتا ہوں بلکہ جو کچھ کہتا ہوں سچ نہ کہوں گا، جھوٹ کہوں گا، اور نہ کوئی جھوٹ بات چھپاؤں گا۔ خدا میری مدد کرے یا نہ کرے۔ اور ثبوت کا اہم گواہ، صفائی کی جوگالی کا تختہ مشق چارہ بنا، بیچارہ۔۔۔۔!"

رہا ماتحت عملہ، اس ہڑبونگ کو اکھٹ بڑھنے کا آخری شور سمجھ کر اطمینان سے بیٹھا رہا۔ تاہم ذرا معمول سے قبل، لیکن جو گزری وہ سمجھا نہیں اور پھر خاموشی اور سناٹا صبح کو، جب بیرا ارلی ٹی لے کر پہنچا تو بستر خالی اور صاحب ندارد، اور پھر تو آرے آرے ہوگئی۔ تھانہ، شفاخانہ، پنچی اور افواہوں اور حاشیہ آرائیوں میں اڑ کر برٹش پارلیمنٹ تک جا گونجی۔ بگ بین کی زنجیر عدل جیسے خودکار انداز میں بج اٹھی، قصر بکھنگم کے میناروں سے بنیادوں تک بازگشت اندر بازگشت۔۔۔!

۱۸۵۷ء کے ترپن برس بعد برٹش بلڈ ہندوستان کی مٹی میں جذب ہونے کی تکرار ہوئی تھی۔ صاحب کلکٹر بہادر کی آنکھیں اور ملکہ وکٹوریہ وایڈورڈ ہفتم کی قبریں اور چھاتیاں پھٹی رہ گئیں۔ نیٹوز خاندان میں کہرام پڑ گیا۔ ویسے صاحب بہادر سنگل ٹن آدمی تھے۔ مرجاتے تو خیر مار پیچھے پکار تو ایسی ہوتی، جیسی آج ہوئی اور خیر پادری بھی رقیق آوازوں میں برکتیں تو بھیجتے۔ لیکن رونے والا انگلستان میں ہو تو ہندوستان میں تو دور دور نہ تھا۔ البتہ تعزیرات ہند نے بڑے بڑے خوبصورت انداز میں انگڑائی لی اور ضابطہ فوجداری نے اپنے منتشر اوراق چوپال کے چبوترے پر سے جلدی جلدی بین کر مضبوط شیرازہ بندی کی اور جورس پروڈینس پوری توانائی کے ساتھ حرکت میں آیا۔

تھانے دار انچارج اور افسر دوئم برق رفتار گھوڑوں پر سوار موقع واردات پر پہنچے۔ افسر دوئم کو تو وہیں چھوڑا، اور انچارج وقوعہ کی سنگینت کے زیر نظر روزنامچہ اول کے اندراج کے لیے سادہ ورق لے کر صدر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس بہادر کے حضور صبح تڑکے ہی حاضر ہوا۔ ادھر افسر دوئم نے مسٹر اوپم ایجنٹ صاحب بہادر کی سسکتی ہوئی لاش اپنے اور ان کے عملے کی مدد سے شفاخانہ پہنچائی۔ جہاں سے سول سرجن نے میڈیکل معائنہ رپورٹ میں ۲۵ ضربات آلہ کند کی تحریر کیں، جن میں پانچ شدید تھیں۔ دو پسلیاں داہنی جانب کی اور تین بائیں جانب کی کمپل اور داہنے پاؤں اور بائیں ہاتھ کی ہڈیاں کمپاؤنڈ فریکچر تھیں۔ ایس پی کلکٹر صاحب بہادر اور ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کونسلر نے سر جوڑ کر مضمون رپورٹ اول مرتب کیا اور منشی جی رپٹ نویس تھانہ نے، تھانہ اصطلاح میں اسے قلم سے اندراج کر کے "اچھی طرح کیس گانٹھ" دیا۔

اور دوسرے روز علی الصبح نور ظہور کے وقت روزنامچہ عام "روزنامچہ خاص کی تمام خانہ پریاں" تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری کی دونوں ضخیم جلدیں لارڈ میکالے کے منہ پر الٹی مار اور تھانہ کا پورا دفتر غرق مے ناب اولی کر کے چل پڑے۔ صرف تھانے کی پوری نفری اور جتنی سنگین فیکلس اور ہتھکڑیاں مال خانے میں موجود تھیں ساتھ لے لیں اور تین کنستر مٹی کا تیل ۔۔۔۔ اور خس پوش گاؤں کا شکاری وحشی دور والے انداز میں ہانکنے کے لیے محاصرہ کیا۔ ہوا کے رخ کے موافق بستی کے تین اطراف سے مٹی کا تیل چھڑکا اور چوتھی سمت ہتھکڑی ہاتھ میں آویزاں نفری لگا دی اور پھر ایک دم ان تینوں سمتوں سے دیا سلائی دکھلا دی۔ اور یا تو پوری بستی لذت خواب ہی میں تھی یا تین سمت سے بھڑکتی آگ کے شعلوں سے بچنے کے لیے چوتھی سمت پولیس کے چنگل میں آپوں آپ، اپنے پاؤں بھاگ کر پہنچ گئی۔ اور یوں آٹھ درجن، بوڑھے، جوان، نوجوان اور نوخیز باندھ کر کشاں کشاں پولیس تھانے کی دونوں حوالات بھر لیں۔ آگ کے متنوع عمل میں، اور اسی کے تحت ایک فرقہ آتش پرست ہوگیا۔ لیکن جناب زرتشت کو بھی اپنے معبود کے اس پہلو کا پتہ نہ تھا کہ یوں بھڑک اٹھنا ہیبت طاری کرتا ہے اور حکومت کی دھاک بٹھاتا ہے اور پھر ہم خرما ہم ثواب سزا کا بھی اولیں ذریعہ ہے اور فوری ریڈی جسٹس کا اجتماع۔ اور پولیس کا ایسے سنگین وقوعوں میں جن میں خود پولیس والے کسی افسر یا ایڈمنسٹریشن کے کسی اہل کار کے ساتھ مزاحمت بکار سرکار، معمول تھا اور یہ بالعموم افسران بالا کے اشارہ پر بھی عمر میں ایک آدھ بار ہوتا تھا۔ رپٹ میں وکیل سرکار کے مشورہ سے زمین آسمان کے مضبوط قلابے ملے ہوئے تھے۔ عدالت کے لیے بغاوت کے حدود چھوتی ہوئی فرد جرم کی گنجائش تھی ۔ادھر دروغا جی نے اپنا کچا گینگ کیس (Gang Case) چلا دیا۔ موقع واردات ربڑ کی طرح کھینچ دیا۔ بہرحال گنجائش تھی بھی۔ مجمع ناجائز طور پر حلقہ پر چاروں سمت محیط ہوسکتا تھا۔ بلکہ سرحدی تھانوں تک بھی امکان تھا۔ کوئی بھی شریک جرم ہوسکتا تھا۔ لہذا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوکر اپنے پورے ممالک محروسہ پر تو بہر حال پھیلا ہی دیا۔ وہ جو گھر میں روٹی پہ روٹی دھر کر کھا رہا تھا وہ بھی اور جو کر گزارا تھا وہ بھی۔ رشوت کا تو نام بدنام تھا، استحصال بالجبر سے کوئی بچ نہ سکا۔ تھانہ داروں کی جیبیں چھن چھنا پڑیں، سپاہیوں کی بغلیں بج اٹھیں۔ اونٹ تو خیر پکڑے گئے لومڑیاں بھی لدنے سے نہ بچیں، کمر ٹوٹ گئی۔ کسی کو بھاگ کر بھی پناہ نہ ملی۔ جرم سے زیادہ وقوعہ کی ہیبت عظیم تھی۔ ضربات خفیف وشدید اور گورا جسم، بغاوت اور اقدام قتل اور گوری حکومت۔ پھر ہم خرمہ ہم ثواب، ترکی کے ہاتھ پڑا، تازی کے کان ہوئے۔ خوف میں خانہ ساز گواہوں کی کھیتی خودرو انداز میں اگتی چلی گئی۔ اچھے اچھے پسندیدہ داستان گو قسم کے گواہان ثبوت کی قطار ایستادہ ہوگئی۔ برساتی مینڈک ٹرٹرا پڑے۔ وہ جو کہتے ہیں سو برس کے بوڑھوں کی یادوں میں ایسا سنگین وقوعہ نہ تھا کہ کسی حاکم کا یہ سواگت ہوا ہو اور کرۂ ارض پر چالیس ولایت میں برٹش پرسٹیج کا سورج غروب ہونا تو درکنار، مقدر اقبال نصف النہار پر تھا اور اس ڈیڑھ لاکھ مردم شماری کے ضلع پر یہ خیرگی، تین انگریز اپنی اندھیاریاں چڑھانے پوقدے چلائے چل رہے تھے۔

ویسے تو سب انہیں کے تھے، رنگون سے پشاور تک اور لنکا سے گلگت تک ضلع ضلع کے تاج برطانیہ کے محافظ، نمائندے اور برٹش پرسٹیج کے محافظ کلکٹر صاحب بہادر ہوں یا صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر لیکن تیسرے ڈسٹرکٹ وسیشن جج صاحب بہادر کو ملکہ عالیہ، کبھی کبھی اس تحفظ کے ضمن میں ذرا انکھیوں سے دیکھ لیتیں، جو قلم ہاتھ میں لیے روبرو تھے۔ ویسے خیر سے سب ان کے تھے لیکن آخرالذکر تھے تو ان کے مگر شاید ان کے اپنے نہیں۔ اور یہ تیسرے مسٹر تھرسٹن صاحب بہادر ڈسٹرکٹ وسیشن جج تھے۔ ویسے سب کے سب امپورٹیڈ اور ان کے اپنے برآمد، درآمد کردہ تینوں کے تینوں ان کی سول سروس اکیڈمی لندن کے کڑھے نکلے، آئی سی ایس ہی تھے لیکن مسائل مختلف۔

قتل ڈکیتی کے سنگین مقدموں میں پولیس کو تفتیش کرتے کئی کئی ہفتے لگ جایا کرتے تھے لیکن یہ کیس ہفتہ اندر چالان ہوکر عدالت ابتدائی کمٹنگ مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوگیا، تاکہ گرم لوہا سرخ ہی سرخ پٹ جائے اور بیٹھی دھاک مدھم نہ ہو پائے۔ ویسے بیچارہ کمٹنگ مجسٹریٹ لیٹر بکس ہوتا ہے اور فائل سیشن جج کو دوسطری تجویز کے ساتھ بڑھا دیتا ہے۔ اور جہاں تک زبانی شہادت کے

معتبر نامعتبر ہونے کا سوال ہے، یہ خالصتاً سیشن جج کا اختیار تمیزی ہوتا ہے۔حتیٰ کہ عدالت العالیہ تک اس میں قلم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ یہ فاضل سیشن جج کے روبرو ہوتا ہے۔اور یہ وہ زمانہ تھا جب سنتے ہیں کہ اسٹیشنوں پر بعض بنچیں اور ریل کے بعض کمپارٹمنٹ For Europeon only مخصوص تھے اور موری گیٹ تال مری وغیرہ پہاڑی مقدمات میں بعض دکانیں جیب بھرے کانوں نے اپنے اوپر کھسیٹے سے بند کر رکھی تھیں اور No trough fare اور Not at home تو تختیاں عام سی بات تھی۔اور اب کیس مسٹر تھرسٹن کے روبرو زیر سماعت تھا۔ان کے روبرو دائیں بائیں چار اسیسر ساتھ سن رہے تھے۔لیکن صما بکما بولنے کے مجاز نہ تھے اور سننا تو غیر اختیاری عمل ہے، تاہم حاضر دماغ ہو کر سمجھنا نہیں۔اسیسر صاحبان واجبی حرف شناس پڑھے ہوئے لیکن ستم یہ تقریباً سب ہی اس نواح کے جہاں وقوعہ عمل پذیر ہوا۔لہذا اصل واقعہ سے پوست کندہ واقف۔اور ستم بالائے ستم یہ کہ پھر شریف، نیک چلن اور غریب کبھی کبھی سمجھ دار بھی اور پھر نتیجہ میں فدوی۔وہ سمجھنے پر مجبور جو حضور سمجھیں اور پھر رائے ظاہر ہے جو حضور کی وہ فدوی کی۔۔۔تاہم فیصلہ میں ان کی رائے عالیہ کا رسمی تذکرہ ہونا ضروری ہوتا جو وہ عدالت کے ڈرامہ اسٹیج اور ایکٹنگ سے سمجھتے اور اصل واقعہ کو بھول جانے پر دیا کرتے۔

جرم یوں تو سنگین تھا اور پورے ضلع میں افواہوں اور چرچوں نے سنگین تر بنا دیا تھا۔عام خیال یہ تھا کہ جج صاحب بھی وہی کریں گے جو کلکٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔ایک اونچا گورا وکیل گورنمنٹ نے بڑے مشاہرہ پر ہائی کورٹ سے بلایا تھا۔ملزمان نے ضلع کے مانے ہوئے بڑے بڑے وکلا صفائی کے لیے حاصل کئے تھے۔مسٹر تھرسٹن یوں تو مرمریں بت سنگین قسم کے جج تھے، لیکن کبھی سر اجلاس بول پڑتے تو بڑے بڑے بیرسٹروں، وکیلوں کو زچ کر دیتے، اور یوں اظہار رائے ہو جاتا۔یوں فیصلہ بھی باضابطہ سنانے سے قبل ہی سنائی پڑ جاتا۔تاہم یہ مقدمہ پورے انہماک کے ساتھ سماعت کیا، ثبوت وصفائی کی شہادتیں خاموشی کے ساتھ سنیں اور بالعموم ایسا کیا نہیں کرتے، لیکن شاید مقدمہ کی اہمیت کے زیر نظر معائنہ موقع کرنے پہنچے تاہم رخ کا اندازہ نہ ہوا۔ جانبین نے شہادت ختم (Evidence Close) کرنے کا اعلان کیا تو جانبین کی بحث، ثبوت کے دلائل اور صفائی کے جوابات سنے، البتہ جانبین نے دو ایک چرت اور چبھتے ہوئے سوالات اور جملے ادا کئے، مگر جواب الجواب کا وقت آیا تو دوسرا پروسیجر اختیار کیا۔ وکلا فریقین اور اسیسروں کو کمرۂ اجلاس سے ساتھ لے کر چیمبر میں گئے اور ان سب کو ایک قطار میں بٹھا کر جیسے وکیل بنے خود سامنے کھڑے ہو گئے۔بلاشبہ یہ طریقہ کورٹ پروسیجر میں عجیب سا اقدام تھا، تاہم قانون کے منافی بھی نہ تھا۔عدالت کو اختیار تھا اور فاضل مجوز نے لائق بیرسٹر کی طرح پوری کیس اسٹوری پیش کرنا شروع کی تو نتیجہ اور فقرے پر پہنچنے کا تو اندازہ نہ ہوا لیکن ایسے معلوم ہوا کہ جیسے ہم زاد کی طرح ہر ہر مرحلہ میں مستغیث اور ملزمان کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہے ہوں اور ہر مقام پر تو ناظر و تماشائی تھے ہی تمام ترحیات اور رد عمل میں شریک تھے، اور لطف یہ کہ یہ تمام کیس کی روئیداد سے اخذ کیا تھا، ورنہ معائنہ موقع کرنے پہنچے تھے تو بستی سے آتشزدگی کے نشانات بھی معدوم ہو چکے تھے، کیونکہ گھروں کی معمول کی لسائی لپائی ہو چکی تھی۔

کیمپ میں رات کو صاحب بہادر کے ساتھ اکل وشرب میں بھی شریک تھے اور پھر جیسے صاحب بہادر کے سرور، میں مخل اور نیند میں حارج بستی کے شور میں شریک تھے اور صاحب بہادر کا اردلی کو حکم بھی سنا کہ" شور بند نہ ہو کہ چوپال پر کیتوں کا ابال اور ڈھول وکھڑے کے ساز اور مجمع بھی کانوں سنا اور آنکھوں دیکھا تھا اور جب شور بند نہ ہوا تو صاحب بہادر کے دماغ میں حکم عدولی کا دھواں گھٹتے بھی دیکھا، جو اپنے سرور و نیند کے بجائے برٹش پرسٹیج میں خلل بن کر دماغ کو چڑیا اور تحفظ میں احساس فرض کی صورت دل کا معاملہ ہو گیا اور یہ تمام سرسراہٹیں جیسے او پم ایجنٹ سے نکل نکل کر جج کو سنائی پڑتی اور تمام نظارے دکھانے پڑتے ہوئے۔اور یہ سب کے سب سماعت مقدمہ کے ذریعہ کاروائی مقدمہ کے دوران اجلاس میں بیٹھے بیٹھے کی اخذ کیس اسٹوری تھی جو کیس اسٹوری کی صورت جیسے آنکھوں دیکھی بیان کی اور پھر کیمپ سے چوپال تک ہنٹر کے قانون سے آراستہ صاحب بہادر کے ساتھ پہنچے۔اور پھر وہ

ہوا جس ان ہوئی میں یہ مقدمہ ہو رہا تھا اور آرگومینٹ ختم ہوتے ہی اسٹینوگرافر کو جج منٹ فوراً کا ذرا تازم دم املا کرا دیا، جس کا پہلا جملہ یہ تھا ''ایسے ہی انگریز ہیں جیسے مسٹر نیدرسول (خاندان کا برٹش نام) جنہوں نے برٹش جیسی مہذب و شائستہ قوم کو مشرق میں ملعون کیا اور ایسے ہی عہدہ دار حاکم ہیں جیسے مسٹر نیدرسول او پم ایجنٹ جنہوں نے دنیا کی عظیم حق پسند عادل انگریز حکومتوں کو جنگلوں اور ایشیا کے صحراؤں کے درمیان خوار و رسوا کیا، اور اس سے قبل مسٹر--- ایڈمنسٹریٹر--- نے اور مسٹر--- و ایڈمنسٹریٹر --- نے---- مقام --- پر اور پرسنل ---- میجر ---- نے --- معرکوں میں راہب شکرے اور ریڑ بیک چوچ پنجے تراش دینے کے لطیفہ کی طرح ہوئی جس کے نتیجہ میں برٹش حکومتوں کو چھوٹی چھوٹی بغاوتوں سرکشوں کا سامنا کرنا پڑا اور برٹش قوم تاریخ عالم میں ظالم و جابر کے لقب سے ملعون و بدنام ہوئی جو یقیناً نہیں تھی اور یہ ان جیسے کھردرے ہاتھوں کے طفیل ہوا جسے مسٹر نیدرسول او پم ایجنٹ قانون کا ہنٹر پکڑے انصاف کرنے جا پہنچے تھے جس کے نتیجہ میں میری یہ تجویز شاید مزید ہوا خیزی کی موجب ہو، جو حکام اور رعایا سب ہی کی امیدوں اور اندیشوں کے منافی ہوگی، لیکن حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اس شاخسانہ میں امن و امان اور داخلی حق و انصاف ترویج و قیام کی ذمہ دار اور لیس پولیس نے اپنی گورنمنٹ کا پرسٹیج ساکھ قائم رکھنے اور شاید اپنا مزید رعب دھاک بٹھانے کے لیے آتشزدگی، حبس بے جا جرائم کا ارتکاب کیا اور کون جانے یہ بھی ایڈمنسٹریٹر جٹس میں مقامی بڑے ایڈمنسٹریرین کے اشارہ مرضی ورنہ چشم پوشی کی امید پر مبنی ہو۔ لیکن ایسے کوئی نام نہ فائل میں ہیں اور نہ دوران مقدمہ میرے روبرو کسی صورت میں کوئی صاحب پیش ہوئے لہٰذا میں محض شبہ کے تحت اظہار رائے سے بھی قانونی طور پر قاصر ہوں، لیکن مرتبین روزنامچہ اور چالان کنندہ مسمان سردار سنگھ اور راج بہادر تھانہ داران حلقہ جو بیان حلفی، تصدیق تحریر ہر صورت میں میرے سامنے پیش ہونے، خلوص کار اور کارگزاری خاص میں ۹۶ نام نہاد ملزمان ---- نام چالان کرنا پڑے یہ بھی غالباً برٹش پرسٹیج کے تحفظ کے تحت ہوا اور برٹش پرسٹیج کی عمل داری عام آتشزدگی کے ذریعہ بٹھانی پڑی جو ---- مقام پر سنہ ---- میں --- ایڈمنسٹریٹر کو کرنا پڑی تھی۔ اور حیرت تو یہ کہ ذمہ دار فاضل کمنگ مجسٹریٹ نے مستغیث کے جسم کی پچیس ضربات اور مارنے والوں کی چھیانوے تعداد تناسب کے بغیر بلا شمار فی ضرب پانچ پانچ ملزم جیسے بلا کئے ''اعداد شمار'' آنکھیں میچ کر جھٹ پٹ میرے روبرو کر دیا۔

میں فائل سے نام غائب اور اپنے اجلاس کے اندر غیر موجود چھوٹے بڑے افسروں کے متعلق شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے کچھ نہیں کر سکتا، حتیٰ کے مشتبہ لوگوں کے نام بھی ظاہر کرنے سے قانوناً معذور ہوں، ان کے متعلق بجز اس کے محکمہ جاتی تحقیقات کے لیے گورنمنٹ کو ریفر کروں، اور تھانہ داروں کے متعلق صوبائی انسپکٹر جنرل پولیس کو نام بھیج دوں، البتہ گواہان ثبوت جو سب کے سب جھوٹے ہیں اور خوف و دباؤ کے تحت کشاں کشاں لائے گئے ہیں ان کی سفارش کرتا ہوں کہ حسب دفعہ ۱۹۳ ضابطہ فوجداری کیس نہ چلایا جائے تو المنسب ہے، اگرچہ وہ خود ذمہ دار ہیں اور ایسی صورت میں قانون معاف نہیں کرتا۔ مسمیان، جسیر سنگھ، بل بیر سنگھ، رن بیر سنگھ وغیرہ کو باعزت بری کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ ہنٹر کے مقابلہ پر لاٹھیوں سے تحفظ حق خود اختیاری استعمال کرنے میں بڑھ چڑھ کر اقدام کر گئے، لیکن پھر یہ بوڑھے جدامجد کی تحقیر و مار پیٹ کے تحت، فطری اشتعال فوری Graveand Sudden Provocation کے تحت عمل پذیر ہوا جو قتل کے جرم میں بھی قابل معافی ہے۔ اس کے علاوہ ۹۶ میں سے ان پانچ کو بھی ممیز نہیں کر سکتا جو اصل اقدام کے مرتکب تھے، لہٰذا سب کو بری کرتا ہوں۔ تاہم کسی ہرجانہ کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ فریقین کو ہائی کورٹ میں حق اپیل ہے۔

☆☆☆

آنسو سچ بولتے ہیں۔۔۔؟

احمد زین الدین

گاؤں کی ایک شدید تپتی ہوئی دوپہر کا ذکر ہے۔

میں برسوں بعد سرحد پار اپنے آبائی گاؤں کے نیم پختہ مکان کی ڈیوڑھی کے باہری دروازے پر کھڑا کھانے کے بعد جوٹھے ہاتھ دھو رہا تھا اور میری نظریں ان چوزوں پر جم گئی تھیں جو سیلی زمین پر گرے ہوئے دال چاول کے ٹکڑوں کو چن چن کر بڑی بے صبری سے حلق کے نیچے اتار رہے تھے۔ مرغی بھی دانوں پر لپکتی مگر اپنے حصے کا رزق چھن جانے پر اپنے ہی بچوں کو بڑی بے دردی سے چونچ مارتی اور رگیدتی۔۔۔!

دوسری جانب ذرا فاصلے پر کھڑا گھر کا وفادار کتا، زبان نکالے گرسنہ نگاہوں سے یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا اور کبھی کبھی اشتہا سے مجبور ہو کر وہ اپنی لمبی زبان کو ہونٹوں پر پھیر لیتا۔ پھر وہ بڑی بے بسی سے بیٹھ کر ٹکڑے کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں میری نظر نیم کے نسلوں پرانے دیوہیکل پیڑ کے تنے پر جا کر ٹھہر گئیں جس کی آڑ میں ایک اجنبی کھڑا ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کبھی ٹیوب ویل اور کبھی دانہ چگتے چوزوں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اور بھوکوں کے اس تکون کے باہر میرا وجود بڑا بے جوڑ اور مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔۔۔!

ابھی میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اتنے میں روٹی کا بڑا سا ٹکڑا کتے کو ڈالتے ہوئے آپا کی نظر اس اجنبی شخص پر پڑی۔

"بے چارہ۔ بھوکا پیاسا لگتا ہے۔ پانی پینے کا انتظار کر رہا ہے شاید!"

انہوں نے ٹیوب ویل کی طرف دیکھا جہاں محلے کے ہندو مسلمان لڑکے پانی بھرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے مگر بے بی گلے سے نہانے میں اس قدر مگن تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ آپا سے رہا نہ گیا۔

"اے بے بی، کتنا نہاؤ گی۔ چل ہٹ۔ دوسروں کو موقع دے"۔

نانی کی غصہ بھری آواز سن کر وہ بھاگتی ہوئی دوسرے دروازے سے آنگن میں آگئی اور ڈر کے مارے کچھ دیر دھوپ میں کھڑی رہی۔ تب بچوں نے پہلے اس پیاسے کو اوک سے پانی پلایا۔ میں سگریٹ جلانے کے لیے پیچھے مڑا۔ آپا مطمئن ہو کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں جہاں رعنا برتن سمیٹ رہی تھی۔

میں سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ابھی اس شخص کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے باہر سے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو وہی شخص پیٹ پکڑے منہ پر کپڑا رکھے بے اختیار زار و قطار رو رہا ہے۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟ کیا تکلیف ہے؟"

مگر وہ روئے چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور کراہنے لگا۔ میں نے آپ کو آواز دی، انہوں نے بدحواس ہو کر کہا، "بھیا، اسے اندر لے آؤ۔ جانے کیا تکلیف ہے"۔

میں نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ بڑی مشکل سے چل کر ڈیوڑھی میں آیا اور چوکی پر بیٹھ گیا اور سسکیوں سے رونے لگا۔ وہ اپنی تکلیف نہیں بتا رہا تھا جس سے ہماری پریشانی اور بڑھتی جا رہی تھی۔

"کچھ بولو بھیا، کھانا کھاؤ گے؟" آپا نے دلاسا دیتے ہوئے پوچھا اور جلدی سے جو کچھ بچا تھا، لینے چلی گئیں۔

رعنا پانی کا جگ اور گلاس لے آئی، ''پیٹ میں مروڑ کے ساتھ بھوک سے درد ہو رہا ہے شاید! کھالو بھیا، کھالو''۔انہوں نے سینی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ پھر کئی بار کہنے کے بعد وہ کھانا کھانے لگا اور میری نظریں اس کے وجود کا جائزہ لینے لگیں۔

دبلا پتلا، کمزور سا نوجوان جس کے تن پر سرمئی رنگ کا میلا کچیلا کرتا، چھوٹے پائنچے کا مٹیالہ پاجامہ، سر پر بدرنگ سی دو پلی ٹوپی، دھاری دار گمچھا، ستے ہوئے چہرے پر چھوٹی سی خشخشی داڑھی اور آنکھوں میں اداسی کا گہرا سناٹا، بھوک اور غربت نے جس سے جوانی کا سارا کس بل چھین کے جینے کے لیے صرف آنسو دے دیے تھے جسے بہا بہا کر وہ صرف اوروں کی طرح زندگی جیے جا رہا تھا۔ آپا اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔ رعنا اور اس کے بچے کچھ دیر اسے غور سے دیکھنے کے بعد اسارے میں چلے گئے تھے۔ ایک سوگوار سی خاموشی کچھ دیر پھیلی رہی۔ میری نظریں اس کے وجود پر جمی تھیں اور ذہن سوچ رہا تھا کہ آدھی صدی بیت جانے کے بعد بھی یہاں کے ایک طبقے کو بھوک اور افلاس سے چھٹکارا نہیں ملا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا بلکہ اب تو جان کی قیمت بھی نہیں رہی، آئے دن دنگا فساد!

کھانے کے بعد وہ ذرا پرسکون نظر آیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اسے بولنے پر آمادہ کرنا چاہا۔

''عبدل نام ہیج''۔

''اتنا کیوں رو رہے تھے؟''

''پانی پیتے ہی پیٹ میں مروڑ اٹھا تھا نا۔ تین دن سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا اور اماں کی یاد آ گئی تھی۔۔۔''

''اماں کی یاد؟ یعنی۔۔۔؟''

''میں اپنی اماں کا علاج کرانے ایودھیا سے بکسر آیا۔ وہ کینسر کی مریضہ تھیں۔ کسی نے بتایا تھا کہ یہاں اچھا اور سستا علاج ہوتا ہے۔ چند دن دوا دارو کے بعد وہ کچھ ٹھیک ہو رہی تھیں مگر اچانک جانے کیا ہوا کہ ایک رات وہ ہم کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں بہت رویا بیٹا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی میت کو ایودھیا کیسے لے جاؤں۔ پیسے ختم ہو چکے تھے۔ کہاں کہاں نہیں علاج کرایا۔ لکھنؤ بھی گئے۔ ابھی علاج چل ہی رہا تھا کہ ایک دن خبر آئی کہ ایودھیا میں بلوائیوں نے میرے محلے کے سارے مسلمانوں کے گھر جلا دیے ہیں اور میرا گھر بھی لوٹ کر آگ لگا دی۔ بیوی کے ساتھ زیادتی کی، پھر اسے مار ڈالا۔ بچے بھاگ کر پڑوس میں چلے گئے تھے اس لیے بچ گئے ورنہ وہ بھی۔۔۔''

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں اس کی بپتا سن رہا تھا مگر میرا ذہن ان واقعات میں الجھ گیا تھا جو سرحد پار کرتے ہوئے میرے قافلے والوں کے ساتھ بھی پیش آئے تھے۔ خاندان کے خاندان قتل کر دیے گئے اور سب کو بے سروسامانی کے عالم میں خالی ہاتھ شعلوں کے درمیان سے جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا۔ وقت پھر وہی کچھ دہرا رہا ہے۔ میرا دل رونے لگا۔

''بچے دادی سے بہت مانوس ہیں۔ میں انہیں کیا جواب دوں گا''۔ وہ دیوار کو گھورنے لگا۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ دروازے پر بھوکے پیاسے بیٹھے دادی کا انتظار کر رہے ہوں۔ پھر بہت سے بچے میری نظروں کے سامنے آ گئے۔

سب کے چہرے پر وہی اداسی تھی اور ان کی معصوم نظروں کے سامنے لق و دق میدان کی روح فرسا ویرانی۔

وہ بتا رہا تھا، ''اماں کے کفن دفن کا بندوبست میت کے گرد جمع ہونے والے مقامی لوگوں نے کیا۔ ہندو مسلمان سبھوں نے چندہ دیا۔ پھر وہیں دفنا دیا گیا''۔

اس کے آنسو اب بھی رواں تھے۔ ماں کے بچھڑنے کے غم، بچوں کی جدائی، بیوی کی ہلاکت، بے گھری، بے سروسامانی، خوف، بے یقینی، طویل سفر اور زادِ راہ کچھ بھی نہیں۔ گویا آنسو ہی اس کا سرمایہ تھے۔ میں اس کے بارے میں سوچ کر اداس ہو گیا۔ شاید ان نوجوانوں کا یہی مقدر ہے!

''بکسر اسٹیشن پر میں ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ بڑی بھیڑ تھی بھیا اور طرح طرح کے لباس میں لوگ آ جا رہے تھے جیسے ہندوؤں کا کوئی تہوار ہو''۔

''لگن کا موسم ہے نا! شادی بیاہ ہوتا ہے، بارات ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں باجے گاجے کے ساتھ جاتی ہے۔ تم یہیں کے ہو، تم کو کچھ نہیں معلوم؟'' میں نے اسے بتایا۔

''شہر میں یہ سب کہاں ہوتا ہے اب''۔ اس نے انجان بن کر کہا۔ ''پھر جب بہت دیر ہو گئی اور گاڑی نہیں آئی تو میں وضو بنانے چلا گیا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے مسافر کو سامان پر نظر رکھنے کے لیے کہہ دیا۔ پھر جب نماز پڑھ کر واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ میرا سامان وہاں موجود تھا اور نہ وہ مسافر۔ بستر بند میں کرائے کے پیسے تھے جسے جیب کتروں کے ڈر سے میں نے جیب میں رکھنے کی بجائے تکیہ کے غلاف میں چھپا رکھا تھا اور ابھی تک ٹکٹ بھی نہیں خریدا تھا۔ خالی جیب اور خالی ذہن میں اسے پورے پلیٹ فارم پر ڈھونڈتا رہا۔ بھوک سے برا حال تھا۔ تھک ہار کر میں اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ کافی دور آنے کے بعد جب مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا تو میں تھک کر ایک درخت کے سائے میں ستانے کے لیے بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اب مجھ میں آگے جانے کی ہمت نہ تھی۔ گھر اور بچوں کا خیال ستا رہا تھا، مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اللہ میری مدد کر، مجھے کسی طرح گھر پہنچا دے، یہی میرے دل کی آواز تھی۔ پھر بہت دیر کے بعد سامان سے لدا ایک ٹرک میرے قریب آ کر رکا۔ ڈرائیور پیشاب کرنے کے بعد میرے قریب آیا اور اس نے پوچھا، ''کہواں جایئے گا بھیا، کاہے روَت ہووا!''

''ماں مر گئی ہے۔۔۔!''

''کونو ٹھکانہ بتاوا۔ ہم تو ہرا کے چھوڑ دیب''۔

''ہمارا گھر تو ایودھیا میں ہے۔ مگر کونو ایسے گاؤں پہنچاوا جہاں ٹھکانا مل سکے''۔

اس نے مجھے ٹرک میں بٹھا لیا۔ راستے بھر میری بپتا سنتا اور افسوس کرتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اس بستی کے قریب یہ کہہ کر اتار دیا کہ یہاں چند گھر مسلمانوں کے ہیں، تمہیں پناہ مل جائے گی۔ سنا ہے اس بستی میں کوئی پردیسی بھی آیا ہوا ہے''۔

میں نے چونک کر آپا کی طرف دیکھا، ''اسے یہ کیسے معلوم ہوا۔۔۔؟''

عبدل ہمارے چہرے کی طرف دیکھ کر خاموش رہا۔

آپا نے بتایا، ''وہ یقیناً اسی دیار کا رہنے والا ہوگا۔ بات یہ ہے بھیا کہ جب کوئی پردیس یا کسی دوسرے شہر سے بہت دنوں بعد آتا ہے تو ایک دوسرے کو خبر ہو جاتی ہے۔ راہ چلتے ہوئے جب ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں والوں سے ملتے ہیں تو کسی نئی بات کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ کسی کو کچھ بتانے یا خبر پھیلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو خود بخود پھیل جاتی ہے۔ اس میں اتنی حیرانی کی ضرورت نہیں''۔

لیکن ان کی یہ بات سننے کے باوجود بھی مجھے حیرت ہو رہی تھی اور میں ان کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

وہ مسکرا کر کہنے لگیں، ''تم اپنا بچپن بھول گئے۔ تم بھی تو ایسی باتیں اپنے ہمجولیوں سے سن کر ہمیں بتایا کرتے تھے''۔

''اچھا۔۔۔'' میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوچا اور اس گاؤں کی گلیوں میں بھٹکنے لگا جو سب کچھ لٹ جانے اور روقت کی

طنابیں کھنچ جانے کے باوجود بھی میرے اندر آباد ہے۔ وہ مکھیاں اڑاتے ہوئے پنکھا جھلنے لگیں۔ عبدل بڑے انہاک سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔

''تمہارے کتنے بچے ہیں؟'' میں نے اس کے چہرے پر قدرے سکون دیکھ کر پوچھا۔

''دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی''۔ اس نے گہری اداسی سے کہا اور کچھ بے چین سا دکھائی دیا جیسے اب جانا چاہتا ہو۔

آپا نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ رعنا خلاف توقع بڑی دیر سے خاموش بیٹھی تھی، اٹھ کر اسارے میں چلی گئی اور اپنی چھوٹی بیٹی بے بی کو جو مسلسل شرارت کیے جارہی تھی ڈانٹنے لگی۔

آپا کا مطلب سمجھ کر میں نے جیب سے کچھ روپے نکالے اور اسے دیتے ہوئے پوچھا'' کرائے اور سفری خرچ کے لیے کم تو نہیں ہوں گے؟''

اس نے جھجکتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''لے لو بھیا، لے لو۔ شرمانے کی ضرورت نہیں۔ آخر تم گھر کیسے جاؤ گے۔ بچے انتظار کر رہے ہوں گے''۔

''ہاں ٹھیک ہے''۔ جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

روپے جیب میں رکھتے ہوئے عبدل جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی اور آپا میرے جذبہ ترحم اور نیکی سے نہال ہو رہی تھیں۔ وہ نیم کے سائے سے گزر کر گلی کی نرم دھوپ میں بائیں جانب مڑ گیا۔ آپا اسے جاتا ہوا دیکھ کر دعائیں دے رہی تھیں۔

''ماموں آنگن میں آ جایئے۔ دھوپ جا چکی ہے، اچھی ہوا چل رہی ہے''۔ رعنا نے آنگن میں چھڑکاؤ کر کے چارپائی بچھاتے ہوئے آواز لگائی

میں سگریٹ جلا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

''ارے ماموں زیادہ مت سوچیے۔ اس گھر میں ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ سارے دکھیاروں کو بس یہی گھر نظر آتا ہے۔ ہماری اماں کے دم سے یہ رونق ہے نا ماموں''۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور کن انکھیوں سے آپا کو دیکھا۔

انہوں نے گھڑونچی پر رکھے کورے مٹکے سے ٹھنڈا پانی پیتے ہوئے کٹورے کی اوٹ سے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر رہ گئیں۔ وہ اس کی پیٹ پوچھنی اکلوتی بیٹی تھی جو منہ لگی اور تیز طرار بھی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے اس کی خاص ہنسی میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''رہنے دیں ماموں۔ اماں ناراض ہو رہی ہیں''۔

''کیوں؟ مجھے تو بتاؤ''۔

''ارے ماموں کیا کیا بتائیں۔ چلیے آپ کہتے ہیں تو بس ایک بات سن لیجیے۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک انگوٹھی والے بابا آئے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری انگلیوں میں یہ بڑے بڑے پتھر پہن رکھے تھے۔ بڑے بڑے بال، لمبا جبہ پہنے، ڈراونی شکل، سر پر ہری پگڑی، ننگے پاؤں، ہاتھ میں ڈنڈا۔ ایسی ہی بھری دوپہر یا تھی۔ پہلے انہوں نے پیٹ بھر کھانا کھایا۔ پھر لمبی ڈکار لے کر اپنی تھیلی میں سے قسم قسم کے پتھر نکال کر سب کی خاصیت بتائی۔ اماں کی ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھا۔ پھر گھر اور بال بچوں کی قسمت بدل جانے کا یقین دلا کر اماں کی جمع پونجی لے گئے۔ اس دن سے اماں انگوٹھی پہنے گھر کی خوشحالی کا انتظار کر رہی ہیں۔ اس گاؤں میں بجلی تو دن بھر رہتی نہیں، گرمی سے آپ کا برا حال ہے۔ گاؤں والے ساری رات جاگ کر کرنٹ آنے اور موٹر چلا کر ٹیوب ویل سے کھیتوں

میں پانی دینے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھلا آپ ہی بتائیے کہ ایسی صورت میں بھلا خوشحالی کہاں سے آئے گی۔ گرمی کی شدت سے ہم سب کا برا حال رہتا ہے۔ مکھی مچھروں کی بھرمار ہے۔ اماں دن بھر پنکھا جھلتی ہوئی اچھے دنوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ بھیا کا کام بھی چھوٹ گیا ہے''۔

آپ کی سادگی اور نیک دلی پر اسے ہنسی آ گئی۔

''بزرگوں کی شان میں ایسا نہیں کہتے'' ۔آپا نے برا مناتے ہوئے ٹوکا۔

''میری اماں سچ مچ بڑی بھولی ہیں ماموں۔ یہ نہیں جانتیں کہ دنیا کتنی بدل گئی ہے، دھوکہ، فریب عام سی بات ہے۔ سب کے آنسو سچ نہیں بولتے''۔

''اچھا اچھا عاقلہ بوا، اپنی بکواس بند کر۔ اللہ تو دیکھ رہا ہے نا! کوئی کسی کی قسمت تھوڑے ہی لے جائے گا'' ۔انہوں نے زچ ہو کر کہا اور وضو بنانے چلی گئیں۔

میں رعنا کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات کیسے آئی۔ کیا واقعی آنسو۔۔۔

آپا عصر کی نماز سے فارغ ہو کر عبدل کے لیے بڑی دیر تک دعا مانگتی رہیں۔ ان کے لفظوں کی ہلکی ہلکی گونج میرے کانوں کی راہ دل میں اتر رہی تھی اور ذہن کے وسوسے دور ہو رہے تھے۔ مصلے سے اٹھ کر انہوں نے میرے سر پر پھونک ماری۔ پیشانی کو چوما اور میری واپسی کے دن انگلیوں پر گنتے ہوئے روہانسی ہو گئیں۔ میرا دل ان کے پیار سے بھر آیا۔ وہ پاندان لے کر میری چارپائی کی پائنتی بیٹھ گئیں۔

میں لیٹا، کھلے آسمان کو دیکھ رہا تھا، بادل اڑے جا رہے تھے۔ وہ پان لگاتے ہوئے رقت بھری آواز میں میرے طویل سفر کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ لمحے ٹھہر گئے تھے۔ میں بھاری دل کے ساتھ ان کی ایک ایک بات کا جواب دیتا رہا۔ اس رات میں ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ دن بھر کے واقعات ستاتے رہے۔

صبح سے ہی گھر میں چہل پہل اور غمگین اداسی تھی۔ خاندان کے لوگ اور پڑوسی الوداعی ملاقات کے لیے آ جا رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں جدائی کے آنسو تھے۔ میں بوجھل قدموں سے ملنے والوں کو گلے لگا کر دوبارہ آنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ آپا اور رعنا کو تسلی دے رہا تھا۔ دل کی عجیب کیفیت تھی۔ آنے کی خوشی سے جانے کا غم کتنا بڑا ہوتا ہے۔ گھر کے چند افراد مجھے اسٹیشن چھوڑنے آئے۔ پلیٹ فارم پر بڑی بھیڑ تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں پردیس واپس جانے والوں کو رخصت کرنے کے لیے لوگ جمع تھے۔ سب کے چہرے اداس تھے اور اپنوں کی آنکھوں سے جدائی کے آنسو رواں تھے۔ عجیب رقت آمیز منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اتنے میں اسی بھیڑ میں میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو ذرا فاصلے پر، گڑگڑا کر کسی پردیسی کو اپنی بپتا سنا رہا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی مگر آواز مانوس سی لگ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اسے دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور خیال نے پوری شدت سے میرے ذہن کو جکڑ لیا۔ کہیں یہ وہی شخص تو نہیں جس کی مدد میں نے کی تھی۔ مگر شاید نہیں۔ وہ تو اپنے بچوں کو گلے لگا کر دلاسا دے رہا ہو گا۔ ابھی میں اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ وہ پردیسی سے رقم لے کر پلٹا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں۔ میں ہکا بکا اسے دیکھنے لگا۔ وہ ٹھٹھکا۔ رعنا کی باتیں ایک دم میرے کانوں میں گونج اٹھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لوں۔ اتنے میں عجیب انداز سے بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ میری جانب بڑی تیزی سے لپکا اور پھر میرے پاؤں پر گر پڑا۔

☆☆☆

خاموشی کے حصار میں

احمد یوسف

غنی نے لکھا تھا،''عطا کا خط آیا ہے، وہ اس ماہ کے آخر تک اپنی بیوی بچوں کے ساتھ آ جائے گا۔ آج ۱۰ تاریخ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ۲۵، ۲۶ تک بیٹا، بہواور بچے آ جائیں گے۔۔۔ گھر میں بہار آ جائے گی''۔

سجاد نے غنی کے خط کی ان سطروں کو بار بار پڑھا اور ہر بار اسے ایک نیا لطف آیا۔ پتہ نہیں کیوں اسے یہ محسوس ہوا کہ یہ خبر غنی کے بیٹے عطا نے نہیں بھیجی ہے، بلکہ اس کے بیٹے مختار نے اسے بھیجی ہے۔

لیکن جب اسے یاد آیا کہ مختار اور اس کے بچوں کو گئے تو ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں، اور ابھی تو اسے پورے دس مہینے اور ان کا انتظار کرنا ہوگا، تو اس پر ایک بے کیفی سی طاری ہوگئی۔۔۔ کیسی محرومی ہے۔

ایک بیٹا ہے، وہ سعودی میں ہے، ایک بیٹی ہے وہ اپنے شوہر کے ساتھ پونا میں ہے۔۔۔ بیٹا سال بھر بعد آتا ہے، تو بیٹی کیوں نہ سال بھر بعد آئے؟ کتنی بار کہا کہ سال میں دو بار تو آیا کرو۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنی پریشانیوں کا قصہ چھیڑ دیتی ہے، بچوں کا اسکول، ان کے امتحانات، میاں کی مصروفیتیں، ان کا ٹور، موسم کی سختیاں۔۔۔ اور آتی جب ہی ہے، جب مختار آتا ہے۔ بس مہینے ڈیڑھ مہینے کے لیے۔۔۔ اب اس مختصر سی مدت میں کس سے بات کی جائے، کس کی بات سنی جائے، کس کے بچوں کو پیار کیا جائے اور کس کے بچوں کو گود میں کھلایا جائے۔

پھر آنے کے چار دنوں بعد ہی انہیں اپنی اپنی سسرال یاد آ جاتی ہے۔۔۔۔ چھ گھنٹے کی راہ بیٹے کی سسرال ہے، اور دو گھنٹے کی راہ بیٹی کی سسرال کی۔۔۔

مصیبت تو یہ ہے کہ اب اس دنیا میں کوئی کسی سے گلے شکوے بھی نہیں کر سکتا۔ اگر مختار سے کہا جائے کہ بیٹا سال بھر بعد تو مہینے ڈیڑھ مہینے کے لیے آتے ہو، اس میں بھی ہفتے دس دن کے لیے سسرال چلے جاتے ہو تو کہتا ہے۔۔۔''پاپا سوچیے، عابدہ کے گھر والوں کا بھی تو حق ہے ہم لوگوں پر''۔ اس پر میں کہتا ہوں،''وہ تو صحیح ہے بیٹا لیکن اب تم ہی سوچو۔۔۔'' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے آگے مجھ سے کچھ کہا بھی نہیں جاتا۔ بہو کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔

عندلیب بھی ہفتے دس دن کے لیے سسرال جانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اس سے تو یوں بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ داماد برا مان جائیں گے۔۔۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم لوگ اس سے کچھ درخواست ضرور کرتے ہیں۔۔۔ دونوں ہی عجیب طوفانی انداز سے آتے ہیں اور طوفانی انداز سے چلے جاتے ہیں۔۔۔ داماد زیادہ تر اپنے گھر میں رہتے ہیں، اسی لیے عندلیب کچھ دنوں اپنی سسرال میں رہ کر ایک بچے کے ساتھ میرے یہاں چلی آتی ہے۔۔۔ ادھر بہو بھی زیادہ وقت اپنے میکے میں رہنا چاہتی ہے۔۔۔ بس ایک کشاکش سی رہتی ہے۔

عندلیب سے جب بھی یہ کہا کہ بیٹی تم مختار کے ساتھ کیوں آتی ہو، اگر اس کے آنے کے چھ ماہ بعد آؤ، تو ہمارے گھر، سال میں دوبار عید منائی جائے، تو اس نے ہمیشہ مجھے یہ کہہ کر لا جواب کر دیا،''واہ پاپا، پھر بھیا سے ملاقات کیسے ہوگی؟''

دریا کے ایک کنارے پر اگر ہم کھڑے ہیں تو دوسرے کنارے پر عندلیب اور اس سے کچھ فاصلے پر مختار کھڑا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب اسی کنارے پر آ ملتے ہیں، جلدی جدا ہونے کے لیے۔ اس کے بعد ہم ہوتے ہیں اور محرومی اور تنہائی کا

نہ ختم ہونے والا کرب۔۔۔

فاطمہ کو دیکھو تو سال بھر بچوں کے آنے کی تیاریاں کرتی رہتی ہے، جب مٹر کا سیزن ختم ہونے کو آتا ہے تو خدا جانے کتنی مٹر چھیل کر ان کے دانے پولی تھین میں بھر کر رکھ دیتی ہے، پھر اس طرح دس پندرہ کیلو ہرے چنے بھی تھیلوں میں بھر کر ڈیپ فریزر میں ڈال دیتی ہے کہ اگر عندلیب کو مٹر کا پلاؤ پسند ہے تو مختار کو ہرے چنے کی قبولی۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب عندلیب اور مختار آتے ہیں تو دونوں ایک ہی بات اپنی ماں سے کہتے ہیں ''امی کیوں ہم لوگوں کے لیے اتنی پریشانیاں مول لیتی ہیں؟'' اس پر مختار کہتا ہے، ''ناشتے میں تو امی مجھے میدے کی خوب پھولی پھولی کچوریاں، آلو کی خوب سرخ سرخ بھجیا اور کرچھل میں تلا ہوا انڈا پسند ہے۔۔۔'' ادھر عندلیب کہتی ہے، ''امی دن کے کھانے میں باسمتی چاول ہو، ارہر کی دال، ہری مرچ کا دو پیازہ اور لیموں کی نمکی۔۔۔ میری تو جان جاتی ہے اس کھانے پر''۔

تب فاطمہ بگڑ کر کہتی ہے، ''ٹھیک ہے تو اس بار سردیوں میں تم لوگوں کے لیے مٹر اور ہرے چنے نہیں رکھوں گی''۔ اس پر دونوں ماں سے لپٹ جاتے ہیں، ''نہیں امی ایسا غضب نہ کیجیے گا''۔

سجاد سوچتا، کاش یہ سارے مناظر آنکھوں کی دنیا میں مستقل سکونت اختیار کر لیتے، لیکن یہ کہاں ہوتا ہے، تب وہ دھیرے سے اپنی آنکھوں کو خشک کر لیتا ہے۔

بچے آ جاتے ہیں تو کچھ چھوٹی موٹی تقریبات بھی ان کے آنے سے ہو جاتی ہیں۔ عندلیب نے لکھا تھا، چھوٹے کا عقیقہ میں اپنے گھر سے کروں گی، میں نے ان سے بھی کہہ رکھا ہے، بس بھیا آ جائیں گے تو وہیں آ کر یہ پروگرام بناؤں گی۔

مختار نے لکھا تھا، ''پاپا ساجد کا مکتب آپ ہی کو کرنا ہے۔ اقرا باسم۔۔۔''

چلیے دو تقریبات تو ہو گئیں۔ اگر یہ سب نہ بھی ہوا تو میلاد النبی کی تقریب تو ہو ہی جاتی ہے۔

''سچ یہ ہے کہ روشنی ہی روشنی کو کھینچ لاتی ہے''۔

بچے آتے ہیں تو گھر بھر دیتے ہیں، کپڑے لتے، چھوٹی چھوٹی مشینیں۔ مسالہ پیسنے کی مشین، جوسر، وی سی پی اور ویڈیو کیسٹ۔۔۔

تین چار سال پہلے مختار ڈیپ فریزر لے آیا۔ کہا بھی میں نے کہ بیٹا کیا ہوگا ان چیزوں کا، خاصی ڈیوٹی دے کر لاتے ہو۔ اس پر مختار نے ذرا درشت لہجے میں کہا، ''پاپا یہ سب نہ کہا کیجیے۔ آپ لوگوں کی دعاؤں سے اللہ کا فضل ہے''۔

ظاہر ہے ڈاکٹر ہے، لمبی تنخواہ پاتا ہوگا، لیکن یہ سب تو فضول کا خرچ ہے۔ عندلیب بھی جب آتی ہے تو دنیا بھر کی چیزیں پونا اور بمبئی کے بازار سے خرید کر لے آتی ہے۔

کیا بچے ہیں۔۔۔ آتے آتے گھر کو بھر دیتے ہیں، اور جاتے جاتے دلوں کو خالی کر دیتے ہیں۔ کیا خاک اڑتی ہے ان کے جانے کے بعد۔۔۔

فاطمہ تو ان کی روانگی سے ہفتے بھر پہلے ہی سے رونا شروع کر دیتی ہے۔ عندلیب سمجھاتی ہے، امی کیا کریں ان کی سروس ہے نہ، آپ تو جانتی ہی ہیں بندگی بیچارگی۔ خورشید میاں بھی سمجھاتے ہیں، امی ہم لوگ ادھر آنے کو پریشان ہیں۔ اگر آ گئے تو کوشش کریں گے کہ اسی شہر میں پوسٹنگ ہو جائے۔ مختار بھی اپنی امی کو چپ کرانے کی سعی کرتا ہے۔ امی اتنی سمجھ دار ہو کر بھی دل کو چھوٹا کرتی ہیں۔ اور یہ کہہ کر چپکے سے کسی بچے کو فاطمہ کی گود میں بیٹھا دیتا ہے۔ بیٹا دادی کو پیار کر لو۔۔۔

مختار بہت پیسے بھیجتا ہے۔ لیکن سجاد سوچتا، پیسوں سے دکھ کا مداوا تو نہیں ہوتا۔ کسی خط میں بیماری آزاری کے متعلق لکھا، یا

مختار سے فون پر کچھ بتایا، تو پھر دوسرے ہی دن اس کا دوست ڈاکٹر رام پرکاش آجاتا ہے۔ آتے ہی پوچھتا ہے، ''پاپا امی آپ لوگ کیسے ہیں، کل ہی رات مختار کا فون آیا تھا۔۔۔'' دیکھ بھال کر، دوائیں دے کر چلا جاتا ہے۔ پھر مختار کا خط آتا ہے، تو پھر دنیا بھر کی ہدایتیں ہوتی ہیں اس میں، اور تب اگلے مہینے کے ڈرافٹ میں دو ڈھائی ہزار فاضل آجاتے ہیں۔ اب اسے کون سمجھائے کہ یہ وہ دکھ نہیں ہے جو پیسے سے کم ہو جائے۔

یہ لوگ چلے جاتے ہیں، تو پھر گھر میں کون رہ جاتا ہے؟ ایک میں ایک فاطمہ، ایک تیرہ چودہ سال کا ضلع ویشالی کا رہنے والا لڑکا قاسم، جو بازار کا کام کرتا ہے اور جو ٹی وی کے ڈراموں کا بڑا شوقین ہے۔ باہر سے آئے ہوئے ڈراموں کے کیسٹ وی سی پی پر دیکھا کرتا ہے، اور کوئی کام نہ ہو تو دھیمے سروں میں نئی سے نئی فلموں کے گانے گاتا رہتا ہے۔ وہ جب سال میں ایک بار لمبی چھٹی لے کر اپنے گھر جاتا ہے تو بڑا برا لگتا ہے، کہ اس کے رہنے سے گھر میں آدمی کی آواز تو سنائی دیتی ہے۔ ایک باورچن بھی ہے جو دن چڑھے آتی ہے اور سرِ شام گھر چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھار دو چار دنوں کے لیے بھائی بہنوں کے بچے یا کوئی رشتہ دار آجاتا ہے تو لگتا ہے کوئی بولنے چالنے والا آیا، ورنہ یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔

قصہ یہ ہے کہ ہر آشنا کے پاس مصائب کا دشت ہے، اس لیے کیا کوئی کہیں آئے جائے۔۔۔ ویسے اگر کبھی کوئی آگیا، تو اسی کے ساتھ بیٹھ کر گھڑی دو گھڑی ہنس بول لیے، تھوڑی دیر کے لیے دل بہل گیا۔

رہی فاطمہ تو وہ اتنی چڑچڑی ہوگئی ہے کہ ذرا کچھ بات کرو تو کاٹنے کو دوڑتی ہے۔۔۔ مختار ڈاکٹر ہو کر دو سال رہا اور پھر ایک انٹرویو دے کر سعودی چلا گیا۔۔۔ اس میں میرا کیا قصور؟ داماد ایم بی اے کر کے بمبئی کی کسی بڑی فرم میں ملازم ہو گیا، پھر وہاں سے پونا چلا گیا، تو اس میں میری کون سے غلطی ہے۔۔۔؟ لیکن نہیں، آپ ہمیشہ منہ سیئے بیٹھے رہتے ہیں۔۔۔ ارے بھائی تو میں کیا کرتا۔ مختار اپنی مرضی کا مالک ہے اور داماد پر کسی کو کیا اختیار؟

تنہائی کا دکھ میں بھی جھیل رہا ہوں، تنہائی کا دکھ وہ جھیل رہی ہے، لیکن اس کا تو عجیب حال ہے۔

خط نہیں آتا ہے تو اس میں میری کاہلی کا دخل ہوتا ہے، پوسٹ آفس جا کر دریافت نہیں کرتے ہیں حالانکہ ہر دوسرے تیسرے دن میں پوسٹ آفس کا چکر لگا آتا ہوں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ مختار اور عندلیب کا فون برابر آتا ہے۔ وہ دونوں ہم لوگوں کو طرح طرح سے سمجھاتے رہتے ہیں ماں سے کہتے ہیں کہ اگر آپ پریشان ہوں گی تو بابا بھی پریشان ہوں گے۔ اور مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر آپ پریشان ہوں گے تو امی بھی پریشان ہوں گی۔

بچوں کی تصویریں آتی رہتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر فاطمہ کا تو عجب حال ہو جاتا ہے، چومنا چاٹنا، بلائیں لینا۔ کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، پھر تصویریں الماری میں حفاظت سے بند کر کے رکھ دی جاتی ہیں۔ کئی بار کہا کہ البم میں لگا لو، لیکن فاطمہ کو تو اب میری کوئی بات پسند ہی نہیں آتی۔

پیسے کی اللہ کے فضل سے کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ سات ساڑھے سات ہزار مختار کے یہاں سے آجاتے ہیں، ساڑھے تین ہزار کے قریب میری پنشن ہوتی ہے، اپنا گھر ہے۔ بس دو چار آدمیوں کے کھانے پینے کا جو بھی خرچ ہو۔

علاج معالجے کا یہ حال ہے کہ جہاں ہم لوگوں کی بیماری کی خبر مختار کو ملی، اس نے ڈاکٹر رام پرکاش کو فون کر دیا۔ اور دوسرے دن ہی وہ دیکھنے پہنچ گیا۔ البتہ کچھ دن پہلے جب فاطمہ کو گردے کی تکلیف ہوئی تھی تو میں نے خود ڈاکٹر رام پرکاش کو فون کر کے بلایا تھا۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھ بھال کے بعد کچھ دوا لکھ دی اور کچھ ٹیسٹ بتائے، پھر دوسرے دن ایک اسپیشلسٹ کو لے کر پہنچ

گیا۔ دونوں نے گردے میں پتھری ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ لیکن دونوں کا خیال تھا کہ کچھ دن آپریشن کو ٹالا جا سکتا ہے، شاید دواؤں سے ہی فائدہ ہو جائے۔

دوسرے دن فاطمہ کو آرام ملا تو میں نے دیکھا کہ وہ کروندے کی جیلی تیار کر رہی ہے، شام تک جیلی تیار ہو گئی تو مجھے ایک طشتری ملی۔ اس کے بعد دو ڈھائی کلو جیلی اس نے شیشوں میں بند کر کے رکھ دی۔ کروندے کی جیلی مختار اور عندلیب دونوں کو پسند ہے۔۔۔اور بچے تو ہر میٹھی چیز پر جان دیتے ہیں۔

مختار اور عندلیب مشکل سے ڈیڑھ مہینے رہتے ہیں، لیکن فاطمہ کی تیاریاں دیکھنے والی ہوتی ہیں، کیا نہیں بنتا ہے ان کے لیے، چٹنی، اچار، مربے، حلوہ، ساس اور جانے کیا کیا۔۔۔فریزر میں انواع واقسام کی کھانے کی چیزیں رکھی رہتی ہیں۔

کوئی دو ماہ بعد آج پھر غنی کا خط آیا ہے۔

''عطا پچھلے ہفتے بچوں کو لے کر چلے گئے۔۔۔پھر وہی زندگی ہماری ہے''۔

خط لے کر میں فاطمہ کے کمرے میں آیا تو دیکھا وہ کیلنڈر کے سامنے کھڑی کچھ حساب کتاب کر رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی:

''مختار کو آنے میں ابھی آٹھ مہینے سات دن اور ہیں''۔

☆☆☆

چاند تاروں کا لہو

اختر جمال

جب تم اپنا جام اسکاچ سے بھرتے ہو یا جب تم جوتے کے تلے سے کیڑا مکوڑا کچل کر چلتے ہو یا پھر جب تم اپنی گھڑی دیکھتے ہو یا پھر جب تم اپنی ٹائی درست کرتے ہو اس لمحہ

لوگ مر رہے ہیں

شہروں میں جن کے عجیب نام ہیں گولیوں کی بوچھاڑ ہے آگ

کے شعلوں میں گھرے ہوئے لوگ جنہیں یہ نہیں معلوم کہ آخر کیوں؟

لوگ مر رہے ہیں

چھوٹے چھوٹے دیہاتوں اور شہروں میں جنہیں تم نہیں جانتے نہ وہاں
چیخ و پکار کا وقت ہے اور نہ خدا حافظ کہنے کا موقعہ ہے

لوگ مر رہے ہیں

جب تم چناؤ کر رہے ہو ان لیڈروں کا جو باتیں کر کے بھول جاتے ہیں
اب خوف و نفرت ہے پڑوسی بھائی بھاگ رہا ہے ہابیل کا دیا ہوا
سبق تاریخ دھرا رہی ہے

لوگ مر رہے ہیں

جب تم سامنے لگے ہوئے سکور بورڈ کو پڑھ رہے ہو یا پھر
جب ہر بار نیا سکور دیکھتے ہو یا پھر جب تم تالی بجاتے ہو
یا اپنے بچے کو لوری سناتے ہو

لوگ مر رہے ہیں

وقت ایک خونی درندہ بن گیا ہے جس کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں
اور جو مر گئے ہیں اور جو مارے جا رہے ہیں وقت انہیں
بتائے گا کہ کون سا قبیلہ باقی ہے اور وہ جو باقی ہے
کیا وہ تمہارے جیسا ہے؟

لوگ مر رہے ہیں

نوبل انعام یافتہ شاعر برو ڈسکی کا یہ نثری ترجمہ اس نظم کا ہے جو اس نے بوسنیا کی تباہی سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔
بوسنیا۔۔۔ ہماری دنیا کی وہ حد جہاں مشرق اور مغرب ملتے ہیں۔ اونچے سرسبز پہاڑ اور نیچے بستیاں جن کے فن تعمیر

میں مشرق اور مغرب سر جوڑے دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں کی تہذیب، تمدن، موسیقی، علم و ادب ہر شعبہ زندگی میں مشرق اور مغرب کا یہ ملاپ نظر آتا ہے اور سب سے زیادہ یہاں کے خوبصورت لوگوں میں! یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب، مصر، یونان اور روم کا سارا حسن، اسی خطہ میں سمٹ آیا ہے۔ انسانی چہرے نہیں زمین پر چاند ستارے اتر آئے ہیں۔ مذاہب مختلف ہوتے ہوئے بھی مذہبوں کی اقدار تو ایک ہی ہیں یہ بات کبھی یہاں کے لوگوں کے میل جول کو دیکھ کر سمجھ میں آتی تھی۔ لوگ علم و ادب اور موسیقی کے شیدائی تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے گھر کا راجہ تھا اور راجہ کہلانے پر فخر کرتا تھا۔ اور راجہ کا مطلب بادشاہ نہیں بلکہ شریف آدمی سمجھا جاتا تھا وہ بھی ایک ایسا ہی راجہ تھا۔

اس کا نام حامد پاسک تھا۔ اس کا کنبہ ان لوگوں کی اولاد میں سے تھا جو فرڈاننڈ اور اس کی ملکہ کے ظلم سے تنگ آ کر سپین چھوڑ کر اس سرزمین میں آباد ہو گئے تھے۔ خلافت عثمانیہ کے زمانے سے ہر مذہب کے لوگ میل جول اور محبت سے یہاں رہ رہے تھے وہ سب لوگ جو ظلم و ستم کا شکار ہوتے یورپ سے ہجرت کر کے اس جگہ آباد ہو جاتے۔ یہ بستی ایک پناہ گاہ تھی۔ مارشل ٹیٹو کے عہد تک یہ فضا قائم تھی یا کمیونزم کا آہنی پنجہ یوگوسلاویہ کو جوڑے ہوئے تھا۔

جب اولمپک کے کھیل اس بستی میں ہوئے تو دنیا نے اس خوبصورت بستی کا نام سنا اور ٹی وی پر اس کی جھلکیاں دیکھیں۔ دور دراز جگہوں کے کھلاڑی سونے کے تمغوں سے زیادہ خوبصورت یادیں اپنے ساتھ لے گئے۔

پھر ایک دن اچانک بستی میں شور اٹھا کہ "پاپک" آ گئے "پاپک" آ گئے۔ پاپک وحشی، ظالم اور شیطان صفت لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ حامد پاسک اپنے گھر سے یونیورسٹی جانے کے لیے نکلے تو انہوں نے اچانک دو پہاڑیوں پر سے مشین گنوں کی آواز سنی اور بستی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ مرد عورتیں بچے سب ہی ان گولیوں کی زد میں تھے۔ تھوڑی دیر میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ سب اتنے اچانک طریقے سے اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بستی کی فوج اور نوجوان مقابلے کو نکلے۔ مگر پاپک جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھے اور فوج کے پاس ان کے مقابلے کا سامان نہ تھا۔ نوجوان نہتے تھے اور پھر وہ اتنی اونچی جگہوں سے بستی پر حملے کر رہے تھے کہ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کی مہلت سے پہلے لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ بموں کی بارش کے بعد جلتے ہوئے مکانوں سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اور شعلوں میں گھرے ہوئے لوگ مرد عورتیں، بچے بوڑھے بے بسی سے بھاگ رہے تھے۔ نہ اندر پناہ نہ باہر پناہ۔۔۔! جو آگ کے شعلوں سے بچ جاتے وہ سڑک پر جا کر گولیوں کی بوچھاڑ سے ڈھیر ہو جاتے۔۔۔!

حامد پاسک اپنے ہی محلہ میں بے بسی سے گھومتے رہے اور سوچتے رہے کہ ان حالات کا کس طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

حامد پاسک نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ امریکہ میں گزارا تھا۔ وہ ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ساجد ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ جب وہ ایک لمبے عرصہ بعد وطن آئے تو مٹی کی مہک نے انہیں روک لیا۔ اور دونوں بھائیوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وطن واپس آ کر کم آمدنی میں ہی خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کریں گے۔

حامد پاسک کا ایک بیٹا ڈاکٹر تھا اور بیٹی سائنس دان بننے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ سب سے چھوٹی بیٹی آرٹسٹ تھی۔ چھوٹے بھائی کے دونوں بیٹے فوج میں چلے گئے۔ وہ بہت اچھے کھلاڑی بھی تھے۔ دونوں بھائیوں نے قریب قریب ہی گھر بنائے تھے اور یہ کنبہ محلّہ بھر میں ہر دلعزیز تھا۔ ان کے رشتہ دار دور دراز دیہاتوں میں تھے اور جب وہ شہر آتے تو یہ محسوس کرتے کہ حامد پاسک کا گھر انکے خاندان کا مرکز اور نشان ہے۔

مگر اب جب سارے بوسنیا میں آسمان آگ برسا رہا تھا انہیں اپنے رشتہ داروں کی کوئی خبر نہ ملتی تھی۔ بس جب وہ کار کی

بیٹری سے ریڈیو سنتے تو ٹمٹماتی ہوئی شمعوں کی مدھم روشنی میں یہ خبر سنتے کہ بوسنیا میں تہذیبی صفائی ہو رہی ہے۔اس قتل عام کو دنیا Ethnic Clearing کا نام دے رہی ہے اور ٹی وی اور ریڈیو یہ خبریں سنا رہے ہیں کہ سرب کروٹ اور مسلمان لڑ رہے ہیں۔یا پھر بار بار یہ سنتے کہ مسلمان مر رہے ہیں۔حامد پاسک اکثر سوچتے کہ سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود انسانی ذہن اور سوچ کیوں نہ آگے بڑھ سکی۔وہ جو اپنے آپ کو تہذیب کی معراج پر سمجھ رہے ہیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ انسان مر رہے ہیں جو کروٹ سرب اور زیادہ تر بوسنیا کے رہنے والے ہیں۔انہوں نے پہاڑوں سے برسنے والے آتشیں گولوں سے اپنے ان پڑوسیوں کو بھی مرتے دیکھا تھا جو سرب اور کروٹ تھے۔۔۔وہ جو ایک تہذیبی وحدت اور مضبوط رشتہ میں بندھے ہوئے تھے۔مسلمان عیسائی اور یہودی سب مل جل کر رہ رہے تھے۔ایک دوسرے کے تہوار اور غمی خوشی میں شریک ہوتے تھے۔یکا یک ایک دوسرے کے جانی دشمن کیوں بن گئے؟ وہ اور ان کے ساتھی ایک دوسرے سے یہ سوال کرتے جس کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ہٹلر نے جب عظیم تر سرب ریاست بنانے کا خواب دیکھا تھا تو جرمنوں کو اپنے علاوہ دوسرے لوگ کم تر نظر آتے تھے اور اب عظیم سرب ریاست بنانے کا خواب دیکھنے والے اور عظیم کروشیا کی بنیاد رکھنے والے اس اکائی کو توڑنا چاہتے تھے جس کا نام بوسنیا تھا۔۔۔اور اسی لیے انہوں نے یوگوسلاویہ کے ٹکڑے کئے تھے۔

اور اب بڑا ٹکڑا کس کے پاس آتا ہے۔۔۔اس کی جنگ تھی اور مہذب دنیا اس کو تہذیبی صفائی کہہ کر آسانی سے درگزر کر رہی تھی۔یہ بات حامد پاسک اور ان کے ساتھیوں کو سمجھا رہی تھی کہ بڑی طاقتیں کمزور کی مدد کے نام پر بھی اپنے مفاد کے لیے جنگ کرتی ہیں۔اگر تیل کے بادشاہوں کی لڑائی ہو تو یو این او کسی شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتی ہے اور سارے اتحادی لڑا کا طیارے جمع کر سکتی ہے مگر جہاں مظلوموں کا خون بہہ رہا ہو نہتے لوگ مر رہے ہوں انہیں ہتھیار فراہم نہیں کر سکتی۔اقوام عالم اپنے ضمیر کی لعنت سے مجبور ہو کر روٹی کے ٹکڑے البتہ پھینک سکتی ہیں۔وہ جھوٹے وعدوں پر کہ بڑی طاقت کی مدد آنے والی ہے ایک عرصہ تک تکیہ کیے رہے۔۔۔پھر بھیانک سچائی کا سامنا کرنے کی ہمت ان سب میں آ گئی۔"گولی لگنے سے پہلے روٹی کھالو"۔۔۔روٹی کے ٹکڑوں پر جھپٹنے اور اٹھانے والے اور زیادہ گولیوں کا نشانہ بنے جیسے قصائی ذبح کرنے سے پہلے پانی پلاتا ہے اسی طرح اقوام متحدہ مرنے سے پہلے روٹی دینا چاہتی ہے۔معصوم بچے بموں کی بارش میں اسکول بس میں سوار ہو کر جا رہے تھے اقوام متحدہ کو بچوں پر ترس آیا تھا کہ انہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے۔مگر راستہ میں بس پر بمباری ہوئی اور کئی بچے دم توڑ گئے۔زخمیوں کو بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹایا جا سکا۔۔۔حامد پاسک اور ساجدہ نے اپنے سارے گھر کو ہسپتال کی شکل دے دی تھی مگر دوائیں ختم ہو گئی تھیں اور شہر کی دکانیں جو کھنڈر بن گئی تھیں ان میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں اور نہ دوائیں تھیں۔پھر بھی امدادی مراکز قائم کر کے لوگ کام کر رہے تھے۔مٹی کا تیل تک نہ ملتا تھا۔بجلی کٹ چکی تھی اور اب لوگ اپنے گھروں کا فرنیچر جلا کر چولہا جلا رہے تھے اور روشنی کر رہے تھے۔سخت سردی طوفانی بارش کے بعد جب برف باری کا سلسلہ شروع ہوا تو ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں میں ڈالی گئی پلاسٹک کی چادروں نے کام دینا چھوڑ دیا۔ان سب تکلیف دہ حالات کے باوجود گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے کتنے بچے گولیوں کی زد میں آ کر ہلاک ہو چکے تھے اور ان کے ننھے بستے خون آلودہ پڑے تھے۔اور ٹیٹو اسٹریٹ پر چلنے والے لوگ جب پہاڑوں سے آنے والی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے سر اور کمر کو جھکا کر چلتے تو وہ مارشل ٹیٹو کو یاد کرتے۔شاید وہ اس آزادی کے اہل نہ تھے۔انہیں ابھی ایک لمبا سفر کر کے جمہوریت کا اہل بننا تھا۔۔۔کمیونزم کے آہنی پنجہ نے انہیں جوڑ کر توڑ رکھا تھا۔۔۔! لکھنے پڑھنے اور بولنے کی آزادی! یہ سب باتیں بہت خوبصورت ہیں مگر اس وقت تک جب انسان کو جان کا خوف نہ ہو! لاشوں کے ڈھیر جلی ہوئی دکانیں اور مکان ساری بستی انسانوں کا نہیں بھوتوں کا مسکن ہوتی تھی۔بوڑھی عورتیں۔۔۔جوان عورتیں۔۔۔مرد اور بچے سب کے زخم پکار رہے تھے ہمیں

روٹی نہیں ہتھیار دو۔۔۔ہم مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے جوانوں کو ہتھیار دو کہ ہماری عزت کی حفاظت کریں۔ وہ نہتے نوجوان جو بغیر ہتھیاروں کے مقابلہ کرنے کو نکلے تھے ہزاروں کی تعداد میں قیدی بنا لیے گئے تھے۔ یو این او کے امن کے رکھوالے اکثر جب روٹی لے کر جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ بھوکے بھوک پیاس سے آزاد ہو چکے ہیں۔ **مگر** مہذب دنیا کا ضمیر روٹی کے ٹکڑے دے کر مطمئن ہے۔

حامد پاسک اور ان کے بیٹے سعید پاسک اپنے آبائی گاؤں جا کر اپنے لوگوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ جب انکے بچے کتابوں کے اوراق سے آگ تاپ رہے ہیں تو وہ کسی کی کیا مدد کر سکتے تھے۔ جب انہوں نے ٹرانسٹر پر نشیب میں بسنے والوں کا حال سنا تھا ان کی پریشانی اور بے چینی حد سے بڑھ گئی تھی۔ ان کے گاؤں کی سب عورتیں سرب فوجیوں کے کیمپوں میں پہنچا دی گئی تھیں۔ اور ان کے تار تار لباس اور برہنہ زخمی جسم اور لاشیں دنیا کے ٹی وی دکھا رہے تھے اور یہ سب درندگی تہذیبی صفائی کے نام پر دکھائی جا رہی تھی۔ وہ سب بے بسی سے سوچتے اگر مہذب دنیا انہیں مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار دے دیتی تو ان کی بے بسی کا یہ تماشا دنیا کیسے دیکھتی۔۔۔!

انہیں یہ معلوم تھا کہ دور دراز علاقوں سے لوگوں کو اپنے گھروں سے نکال نکال کر محفوظ مقام پر پہنچانا ظالموں کے لیے علاقہ خالی کرنے کا منصوبہ ہے۔۔۔۔۔ وہ سب نشیبی دیہاتوں کے لوگ جو ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے ٹرکوں اور بسوں میں سوار ہو کر "محفوظ آسمان" کے نام پر قائم کئے گئے علاقے میں لے جائے جا رہے تھے۔ جانتے ہوئے بھی گولیوں کی بوچھاڑ تھی اور آسمان اور زمین کا کوئی کونہ انہیں ایسا نظر نہ آتا تھا جسے محفوظ کہا جا سکتا۔۔۔!

ایک صبح جب ڈاکٹر ساجد اپنے ہسپتال کے لیے دوائیں تلاش کرنے گھر سے نکلے تو یو این او کے امدادی مرکز تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک سرب سپاہی کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور دکانوں کا سامان لوٹا جا چکا تھا۔ سرب فوجی کھا پی رہے تھے ٹوٹے ہوئے دروازے اور کھڑکیوں کے شیشوں کی کرچیاں سڑک پر دور دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ساجد کی لاش کچھ دیر تک سڑک پر پڑی رہی۔ مگر جب ان کے کنبہ کے لوگ ان کی تلاش کر رہے تھے تو ڈاکٹر کے پرانے مریض اور جان پہچان کے لوگ ان کی لاش لے کر گھر پہنچ چکے تھے۔ بھائی کی موت سے حامد پاسک اور ان دونوں کے کنبوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ بڑی مشکل سے رات کے کسی حصہ میں عزیزوں اور دوستوں نے ان کا جنازہ قبرستان لے جانے کا انتظام کیا اور جب نماز جنازہ پڑھی جا رہی تھی تو دو پہاڑوں پر سے مسلسل گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔

حامد پاسک جب اپنے بھائی کو مٹی میں سلا کر لوٹے تو انہوں نے راستہ میں جا بجا لاشیں دیکھیں جن میں سے بہت سوں کو اٹھانے والے بھی شاید ختم ہو چکے ہوں گے۔ اور ان پر کوئی رونے والا باقی نہ ہوگا اور انہوں نے سوچا ڈاکٹر ساجد کی بے لوث خدمت کا خدا نے انہیں شاید یہ اجر دیا ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی ان کے لیے کچھ لوگ دعا مانگ رہے تھے۔۔۔!

حامد پاسک کے بیٹے نے اپنے چچا کے ہسپتال کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں اور تازہ ترین حالات میں جو بھی طبی مدد لوگوں کو پہنچائی جا سکتی تھی وہ انہیں دی جا رہی تھی۔ جو بیٹی آرٹسٹ تھی وہ اب اپنے رنگوں کو چھوڑ کر لوگوں کی مرہم پٹی میں لگی ہوئی تھی اور اس نے اپنی ہم عمر لڑکیوں کی ایک ٹولی بنائی تھی جو اس کے ساتھ مل کر نرسنگ کا کام کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر ساجد نے ان سب کو جس راستے پر لگا دیا تھا اس دن کے بعد وہ اور زیادہ محنت سے ان کے مشن کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

ایک دن حامد پاسک نے یہ روح فرسا خبر سنی کے ان کا قصبہ پنر اور تباہ ہو گیا اور پندرہ ہزار مسلمان شہید ہوئے اور ان کی عورتیں اور لڑکیاں سرب کیمپوں میں پہنچا دی گئی ہیں۔ انہوں نے یہ خبر بھی سنی کہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مشکل ترین راستوں سے محفوظ مقامات پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امدادی ٹوکریاں اور سامان جو یو این او پہنچا رہی تھی پہلے ہی روکا جا چکا تھا۔ اور

بھوکے پیاسے لوگ جنگلوں میں پھر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ سیوریج کے جو پائپ کھلے ہوئے تھے ان میں سے بھی راہ نکال کر لوگ جا رہے تھے۔۔۔۔اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نہتے مقابلہ کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی جو پھر قیدی بنا کر لے جائے جا رہے تھے۔۔۔۔

حامد پاسک کو اپنے ہی قریبی شہروں اور قصبوں کا حال دور دراز بی بی سی کی خبروں سے معلوم ہوتا جو وہ کار کی بیٹری سے اپنے ریڈیو کو چلا کر سنا کرتے تھے۔۔۔اور تباہی منہ کھولے ہر طرف راستہ چلتے دکھائی دیتی تھی۔

وہ گھر جوان کے دوستوں اور عزیزوں کے تھے جن میں لکڑی کی خوبصورت نقاشی کیئے ہوئے طغرے آویزاں تھے۔۔۔ پیانو کی آواز سنائی دیتی تھی۔۔۔اور گھر جن کی چمنیوں میں سے اٹھتا ہوا دھواں بھی مکینوں کی راحت سکون اور خوشی کی خوشبو میں بسا ہوا ہوتا تھا اب ان گھروں کی چھتیں چھلنی تھیں۔۔۔سامان لوٹا جا چکا تھا۔ٹوٹے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں میں پلاسٹک کے پردے جھول رہے تھے اور جو کوئی مکین باقی تھا وہ اس طرح رہتا تھا جیسے اپنے گھر میں نہیں بھوتوں کے ڈیرے میں آ گیا ہو۔ یو این او اور مہذب اقوام کے باضمیر لوگ چلا رہے تھے کہ یہ تو ان لوگوں کو جڑ سے صاف کرنے اور ختم کرنے کی کاروائی ہے۔محض جنگ نہیں ہے۔سرب اور کروٹ اپنے اپنے حصے کی جنگ لڑ رہے تھے اور بوسنیا کے نہتے لوگوں کو مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار نہ دے سکتے تھے۔

حامد پاسک یہ سوچا کرتے تھے کہ یو این او نے مرتے ہوئے لوگوں کو روٹی دینے کی ذمہ داری بھی نہ لی ہوتی تو اچھا تھا مگر ہر طرف سے بے آسرا لوگوں کو خدا کے آسرے پر چھوڑ دینے سے شاید دنیا کا ضمیر مطمئن نہ ہوتا۔ اب انہیں یہ سکون ہے کہ وہ مشکل حالات میں روٹی اور دواؤں کا انتظام کرتے ہیں اور کبھی کبھی سرب جب گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں تو یو این او کا کوئی امن کا رکھوالا بھی زخمی ہو جاتا ہے۔۔۔لیکن امن کہاں ہے جو کوئی رکھوالی کرے گا ان سب کو جنگ کی رکھوالی کرنے والا کہنا چاہیے کیونکہ دو سال سے یو این او جنگ کی تباہی کی رکھوالی کر رہی ہے۔امن کی رکھوالی کرنی ہوتی تو مظلوموں کے ساتھ ظالموں کا مقابلہ کرنے والی فوج بھیجتی۔حامد پاسک اپنے دوستوں سے اکثر کہتے کہ بڑی طاقتیں صرف اپنے مفادات کی رکھوالی کرتی ہیں۔پھر بھی وہ دیکھتے کہ اکثر بھولے بھالے لوگ یہ آس لگائے تھے کہ امریکہ اپنے بمبار بھیج کر مدد کرے گا اور پھر لڑائی بند ہو جائے گی۔

وقت نے سب کی خوش فہمیاں دور کر دیں بھیانک اور تلخ حقیقت کہ قیامت میں اپنے سوا کسی کا کوئی نہ ہوگا سامنے آ چکی تھی۔

حامد پاسک کو اپنے بھائی کے دونوں بیٹوں کی فکر تھی۔ایک سربوں کی قید میں تھا اور دوسرے کی انہیں کوئی خبر نہ تھی۔وہ نوجوانوں کی امدادی ٹولی بنا کر فوج کو رسد پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔پھر ایک دن حامد پاسک کے ایک سرب شاگرد نے انہیں خبر دی کہ ان کے عزیزوں کا پتہ اور میں کوئی پتہ نہ چل سکا لیکن ان کے بھتیجے کی منگیتر کو ان عورتوں میں دیکھا گیا تھا جن کو سرب قیدی بنا کر لے گئے ہیں اس خبر سے گھرانے کی بے چینی اور دکھ بڑھ گیا۔ان کے سرب شاگرد نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ نوجا کو کیمپ سے نکالنے کی پوری کوشش کرے گا اس کا بڑا بھائی فوج میں اچھے عہدے پر تھا۔حامد پاسک دکھ سے سوچتے رہے اور وہ جن کا خدا کے سوا کوئی نہیں ،کوئی بچانے والا نکالنے والا نہ ہوگا وہ سب عورتیں ان کا کیا ہوگا۔ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور انہوں نے سب کے لیے دعا کی۔''خدایا انہیں عزت کی زندگی یا عزت کی موت دینا؟''

حامد پاسک اور ان کے بھائی ڈاکٹر ساجد کو ملنے والوں میں ہر مذہب اور ملت کے لوگ تھے۔اور خصوصاً بوسنیا اور سارایا گو کی تہذیبی زندگی میں یہ رنگا رنگی اس زندگی کا ایک مزاج اور حصہ تھی۔ان کے ادارے اسکول، تہوار، محفلیں، دفاتر سب اس رنگا رنگ تہذیب کا ثبوت تھے۔ مذہب ان کی نجی زندگی کا خدا سے ایک رشتہ تھا جو ایک دوسرے سے محبت کرنا سکھاتا تھا۔اور ایک مسلمان کی حیثیت سے حامد پاسک اور ان کے کنبہ نے یہی سیکھا تھا کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے اور تمام پیغمبر صاحب نور تھے جن کو مانے بغیر مسلمان کا ایمان بھی کامل نہیں ہوتا اور وہ اپنے بچوں کو قرآن شریف کا ترجمہ سناتے تو سمجھاتے کہ قرآن پاک میں

ہے کہ ہر سرزمین میں خدا نے اپنے رسول بھیجے ہیں بہت سوں کا ذکر قرآن میں کیا ہے اور بہت سوں کا ذکر نہیں کیا! حامد پاسک کے دل میں عجیب سا درد اٹھ کھڑا ہوتا جب وہ یہ سوچتے کہ تمام مذاہب نیکی بھلائی اور خیر کی تعلیم دیتے ہیں۔ سچ اور جھوٹ، نیکی اور بدی میں تمیز سکھاتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ مذاہب کا نام لے کر ہی لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں۔

حامد پاسک نے دیکھا تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں سرب لڑائی سے پہلے بوسنیا سے جانے لگے تھے۔ شاید ان کو عظیم سرب مملکت کے خواب کی تعبیر سمجھائی گئی تھی مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بہت سے سرب اور کروٹ ایسے بھی ہیں جو اب تک بوسنیا چھوڑنا نہیں چاہتے اور بوسنیا اور سارایا گو کے اداروں اور اخباروں میں کام کر رہے ہیں اور سرب گولیوں کی زد میں آ کر مر رہے ہیں، وہ سب اپنے ملک کو ایک وحدت دیکھنا چاہتے ہیں مگر عجیب بات ہے جب یو این او یا کوئی مصالحت کرانے والی بڑی طاقت بات چیت کرتی ہے تو مسئلہ کے حل کے لیے صرف ان کی رائے معلوم کرتی ہے جو لڑ رہے ہیں جو امن سے رہنا چاہتے ہیں ان کی بات کوئی نہیں سنتا! کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ وہ سالہا سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں کیا اسی طرح اکٹھے رہنا چاہتے ہیں؟ پچاس لاکھ سے زیادہ لوگ بوسنیا میں ہلاک کر دیئے گئے۔ اور لاکھوں گھر بار چھوڑ کر در بدر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ''محفوظ آسمان'' کی اسکیم بھی ایک ایسا پناہ گزین کیمپ بن جائے گی جس کے زخم وقت کے ساتھ ساتھ ناسور بن جائیں گے۔ یو این او جہاں بھی امن قائم کرنے گئی۔ زمین پر بسنے والوں کو اپنی زمین سے جلاوطن کر کے اس نے پناہ گزین کیمپ بنا دیئے۔ فسلطین، کشمیر، افغانستان اور اب بوسنیا کے لوگوں کے پناہ گزین کیمپ! اور یو این او کی فوج سالہا سال ان پناہ گزین کیمپوں کی کیسے نگرانی کرے گی۔ جب کہ وہ طاقتیں جو اپنے آپ کو عظیم مہذب طاقتیں کہتی ہیں ان کے ہاں بھی غربت اپنی انتہا پر ہے۔ بدامنی اور لوٹ مار عام ہے۔ نسلی اور مذہبی منافرت بھی پردوں کے پیچھے سے جھانکتی رہتی ہے۔

کبھی کبھی حامد پاسک سوچتے تھے کہ وہ زمانہ اچھا تھا جب ذرائع ابلاغ نے دنیا کو ایک گھر کی طرح نہیں بنایا تھا اور ہر آدمی کا گاؤں ہی اس کا گھر ہوتا تھا۔ اسے بس اپنے گاؤں کی خبر ہوتی تھی اور اپنے گاؤں کی ذمہ داری سب گاؤں والوں کی ہوتی تھی اور جھگڑوں کا فیصلہ گاؤں کی پنچایت کرتی تھی۔ یو این او سب کی پنچایت نہ بن سکی۔ وہ تو بڑی طاقتوں کے مفادات کی باندی بن گئی ہے حالانکہ چاند پر قدم رکھنے والے نے دنیا کو ایک گاؤں بنا دیا ہے!

حامد پاسک جب اپنے دوستوں کی محفل میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو سب کو متفق پاتے تھے۔ اور وہ سوچتے تھے کہ جنگ کی ہولناکیوں نے انہیں حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ وہ اب کسی طرف نہیں دیکھنا چاہتے اور وہ آسمان کی طرف دیکھتے اور خدا کو پکارتے۔۔۔!

وہ رات قیامت کی رات تھی جب نوجا سرب قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے اس کے لیے چلنا مشکل تھا۔ مار پیٹ سے اس کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ اس کا چہرہ بھی زخم لیے ہوئے تھا اور اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں خوف و ہراس تھا اس کے سرب شاگرد نے اپنا بڑا سا کوٹ اس کے اردگرد اس طرح لپیٹ دیا تھا کہ اس کی برہنگی چھپ سکے اور اسے سردی نہ لگے۔ وہ بات کرنے کے قابل نہ تھی۔ ان کے شاگرد نے بتایا کہ اسے جس حالت میں پایا وہ لے آیا ہے۔

نوجا کا منگیتر یوسف دور دراز جنگلوں میں بوسنیا کی نہتی فوج میں کہیں لڑ رہا ہوگا۔ اسے کوئی خبر نہ ہوگی کہ اس کی منگیتر کس حال میں ہے مگر اسے یہ معلوم ہے کہ بوسنیا کی عورتوں اور لڑکیوں پر قیامت ٹوٹی ہے اور معصوم بچے کس ظلم کا شکار ہوئے ہیں۔ ان سب کو یہی غم تھا کہ ہمارے پاس ہتھیار ہوتے تو ہم اپنی عزت کی حفاظت کر سکتے۔

حامد پاسک اوران کے کنبہ کے لوگ اپنی ہونے والی بہو کی حالت دیکھ کرتڑپ اٹھے وہ کتنی آرزوؤں سے اسے بیاہ کرگھر لانے کا سوچا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ساجد اور حامد پاسک کا منگنی کی تقریب میں کنبہ کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہر روز جانا اور وہاں عزیزوں میں چند دن گزارنا سب کو یاد تھا۔ ڈاکٹر ساجد اور حامد پاسک کی بیوی باہم بیٹھ کر دلہن کے لباس کے متعلق سوچا کرتی تھیں کہ وہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق بہت اچھے اچھے تحائف اور چیزیں لے کر دلہن کو بیاہنے جائیں گی۔ سب کے کتنے ارمان تھے۔ اوراب نوجا تارتار خون آلود لباس میں زخموں سے چور خودان کے گھر تک چل آئی ہے!

اس رات شدید سردی اور برف باری تھی۔ حامد پاسک کے کنبہ کے لوگ گھر کو گرم رکھنے کے لیے اپنا قیمتی فرنیچر باری باری جلا چکے تھے۔ اکثر آگ میں جلتے ہوئے نقاشی کے کام کو وہ سب حسرت سے دیکھتے اور سوچتے کہ کاش وہ اس کو جلائے بغیر سردی کا مقابلہ کر سکتے۔ اوراب کتابیں باقی تھیں حامد پاسک روسی اور فرانسیسی ادب کے شیدائی تھے مگر اب انہوں نے ٹالسٹائی اور دوستووسکی اور سب انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں کی کتابیں نکال کر دے دیں اور کہا ان کو پھاڑو اور آگ جلاؤ۔۔۔۔۔اور انکے پسندیدہ ادیب جل کر ان سب کو راحت دے رہے تھے۔ وہ زندہ رہ کر بھی تو لوگوں کو اسی طرح راحت دیتے رہے تھے!

پڑوس کی کچھ عورتیں گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود اپنے اپنے گھروں سے آ گئی تھیں اور کچھ نہ کچھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ نوجا کے لیے دودھ بڑی مشکل سے فراہم کیا جا سکا۔ حامد پاسک کی بیوی اس کا سر اپنی گود میں لے کر اسے چمچے سے بمشکل دودھ پلا رہی تھیں اور اپنے آنسو پی رہی تھیں۔ مرہم پٹی کے بعد کپڑے پہن کر جب اس نے اپنے اردگرد محبت کی اتنی گرمی محسوس کی تو آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا اور پھر عجیب طرح کے کرب کو محسوس کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس روز جو بھی آتی وہ ڈاکٹر ساجد کی بیوی اور گھر کی دوسری عورتوں کے گلے لگ کر روتی حالانکہ میکے والے بیٹی کو رخصت کر کے روتے ہیں، سسرال والے بہو کے آنے پر نہیں روتے۔ مگر یہ عجیب سماں تھا کہ نہ آنے والوں کے آنسو تھمتے تھے، نہ سسرال کے لوگ سنبھلتے تھے۔ عورتیں، مرد، بچے سب ہی تو رو چکے تھے۔ مگر جب نوجا کو ہوش آیا تو وہ سب آنسو پی کر خاموش ہو چکے تھے۔ اور اس کے اردگرد اس طرح بیٹھے تھے کہ جیسے کوئی بھی خاص بات نہیں ہوئی ہے۔ نوجا ابھی بات کرنے کے قابل نہ تھی۔ چند دن بعد بات کر سکے گی، ابھی تو اسے یہ بھی نہیں یاد کہ اس کی منگنی کی انگوٹھی اس کی انگلی سے کس درندے نے نوچی تھی۔ شاید انگلی کا گہرا زخم ہی کچھ بتا سکے اور زخم کے ہونٹوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

یوسف کو اپنے ایک ساتھی سے یہ خبر ملی کہ اس کی محبت اور زندگی نوجا کس حالت میں اس کے گھر پہنچی ہے تو وہ بے چین ہو گیا اسکے ساتھیوں نے کہا کہ سارایا گو سے رسد کا انتظام پہاڑی راستوں سے گورنے کے لیے جو لوگ آتے جاتے ہیں اچھا ہے کہ وہ بھی رسد لانے والوں کے اس قافلہ میں شامل ہو کر جائے اور نوجا کو دیکھ آئے۔ اس طرح اسے تھوڑی سی چھٹی مل گئی اور وہ گھر آ گیا۔

راستہ بھر یوسف یہ یاد کرتا رہا کہ وہ پنراور جا کر پہلی بار جب نوجا سے ملا تھا اور دور دراز خاندان کی یہ خوبصورت اور ہنس مکھ لڑکی پہلی ہی نظر میں اسے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے بھی گئی مگر ایک رکھ رکھاؤ اور وقار کے ساتھ وہ اس کے ساتھ رہی۔ اس کے انداز میں اس کے کردار کی عظمت ہمیشہ جھلکتی رہی۔ بوسنیا کی بوڑھی عورتیں ہمیشہ سروں پر اسکارف لپیٹے رہتی تھیں مگر لڑکیاں اسکارف کم ہی لیتی تھیں۔ نوجا سے مل کر یوسف کو یہ احساس ہوا کہ شریف اور باحیا لڑکیوں کے خوبصورت ریشم جیسے بال بھی شاید اسکارف کا کام کرتے ہیں، انہیں چھونے کی اس میں ہمت نہ ہوئی وہ اپنی نظروں سے ہی ان کی خوبصورتی اور نرمی کو محسوس کرتا رہا اور اس کی نیلی آنکھیں وہ جھیلیں نظر آئیں جن میں وہ اترتا چلا گیا۔ ان کے درمیان جو ایک فاصلہ رہا شاید وہ فاصلہ ان کی محبت کو اور بڑھاتا رہا اور پھر جب ماں نے اس سے نوجا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا ”اب تک کوئی لڑکی اسے نوجا سے زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوئی“۔ اور اس کی ماں نے یہ بات خوشی خوشی اس کے باپ کو بتائی اور رشتہ ہو جانے کے بعد کنبہ کے سب ہی افراد

منگنی کے لیے پنزاور گئے تھے۔اس نے دکھ سے نو جا کے گھر کا خوبصورت باغ اور اس کے کنبہ کے لوگوں کو یاد کیا اور سوچا جانے وہ سب مارے گئے یا ان میں سے کوئی زندہ بھی ہے۔ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہ تھا کیونکہ پورا قصبہ ہی تہذیبی صفائی کی نظر ہو چکا تھا۔اور آہستہ آہستہ وہ تہذیبی صفائی کے نام پر تمام انسانی قدروں پر جھاڑو پھیر رہے ہیں اور پورے بوسنیا میں یہ عمل جاری ہے!

جب وہ نو جا کے سامنے گیا تو نو جا نے دکھ اور شرم سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور اس سے کہا کہ ''اب وہ اس کے لائق نہیں رہی۔ وہ تو اپنی زندگی کو ختم کرنا چاہتی تھی اس کے پیٹ میں سرب کا بچہ پل رہا ہے اور حرام کو جنم دینے سے پہلے اس کی آرزو ہے کہ وہ مرجائے''۔ یوسف نے سب کچھ سن کر اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور کہا ''اب کوئی یہ ہاتھ نہ چھڑا سکے گا''۔اور وہ جو اس کے قریب بھی نہ آئی تھی سب کے سامنے اس کی گود میں سر رکھ کر روتی رہی۔

چند روز بعد حامد پاسک نے چند قریبی عزیزوں اور دوستوں کی موجودگی میں ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔کنبہ کی عورتوں نے کھجور ملا کر سادہ سے کیک بنا لیے اور مہمانوں کی خاطر کی اور گھر کے وہ خوبصورت قالین جن پر جگہ جگہ پانی کے ٹپکے کے نشان پڑ گئے تھے ان پر گھرانے اور پڑوس کی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر کا بڑا سا پیانو ابھی تک سلامت تھا اور حامد پاسک کی بیٹی ہلکے سروں میں کوئی ایسی دھن بجا رہی تھی جس میں غم اور خوشی دونوں مل گئے تھے۔

بیاہ کے دوسرے دن جب یوسف اپنے گھر سے رخصت ہوا کہ سامان رسد کے ساتھ جا کر ان بھیڑیوں کا مقابلہ کرے جو تہذیبی صفائی کے نام پر بوسنیا کی عورتوں کی عزت لوٹ رہے ہیں اور انسانوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ وہ بچے عورتیں اور مرد جن کو وہ سفر میں جگہ جگہ زخموں سے چور موت سے بدتر حالت میں زندہ رہتے ہوئے دیکھ آیا تھا اس کی نظروں کے سامنے تھے اور اپنا فرض ادا کرنا اسے عبادت معلوم ہوا۔وہ سب سے رخصت ہو کر جلد از جلد محاذ پر جانا چاہتا تھا۔

یوسف نے رخصت ہوتے وقت نو جا سے کہا کہ ''تمہارے پیٹ میں جو بچہ پل رہا ہے اس کا نام میرے مرحوم باپ کے نام پر ساجد رکھنا۔اس سے ایک سرب سمجھ کر نفرت نہ کرنا وہ جو تمہارے وجود میں پل رہا ہے وہ تمہارا بچہ بھی ہے اور اس لیے وہ میرا ہے۔وہ ہماری محبت کی نشانی بنے گا''۔

نو جا کے زخم تو بھر چلے تھے مگر دل کا زخم بہت گہرا تھا وہ سرب کیمپ میں جو کچھ اپنے اور دوسری عورتوں کے ساتھ ظلم دیکھ آئی تھی وہ اسے بھلا نہ سکتی تھی۔مگر وہ چند لمحے جو انہوں نے اکٹھے بسر کیے تھے ان لمحوں نے اسے اتنی مضبوطی اور ہمت دے دی کہ وہ اپنا سر سیدھا کر کے کھڑی ہو گئی۔محبت انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے اور زندگی کی ضامن ہے اور نفرت تباہی اور موت ہے۔ نو جا نے سوچا کہ وہ تباہی اور موت کے منہ میں سے نکل کر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے مگر اس کا گھر۔۔۔۔۔ سارا یا گو۔۔۔ کیا یہ سب اس آگ سے محفوظ رہ سکیں گے جو چاروں طرف لگی ہوئی ہے؟

اس نے ہمت اور حوصلہ کو یکجا کر کے سوچا کہ وہ مقابلہ کرے گی اور اس زندگی کو بچا لے گی جو اس کے اندر پل رہی ہے اس لیے کہ سرد اور اندھیری زمین میں کوئی بیج نہیں پنپ سکتا جب تک کہ سورج کی نرمی اور گرمی اس تک نہ پہنچے اور اس نے سوچا سورج اس سے دور جا رہا ہے مگر اس کی محبت اس کے وجود میں پل رہی ہے۔

☆☆☆

امّی

اشفاق احمد

وہ بڑے صاحب کے لیے عید کارڈ خرید رہا تھا کہ اتفاقاً اس کی ملاقات امی سے ہوگئی۔

ایک لمحے کے لیے اس نے امی سے آنکھ بچا کر کھسک جانا چاہا لیکن اس کے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے اور وہ اپنی پتلون کی جیب میں اکنی کو مسلتا رہ گیا۔ اچانک امی نے اسے دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ''او سودی، تم کہاں؟''

اس نے فوراً اپنی جیب سے ہاتھ نکال لیا اور ایک عید کارڈ اٹھا کر بولا۔ ''یہیں، امی، میں تو یہیں ہوں''۔

''کب سے؟'' امی نے حیرت سے پوچھا۔

''تقسیم کے بعد سے امی میں بھی یہاں ہوں اور ماں اور دوسرے لوگ بھی''۔

''لیکن مجھے تمہارا پتہ کیوں نہ چلا۔ میں نے تمہیں کہیں بھی نہ دیکھا''۔

اس کے جواب میں وہ ذرا مسکرایا اور پھر عید کارڈ کا کنارہ اپنے کھلے ہوئے ہونٹوں پر مارنے لگا۔ دکان کے لڑکے نے بڑے ادب سے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے میز پر پھیلے ہوئے دوسرے کارڈوں میں ڈال کر اندر چلا گیا۔

امی نے اپنا پرس کھولتے ہوئے پوچھا ''اب تو تو اپنی ماں سے نہیں جھگڑتا؟''

مسعود شرمندہ ہوگیا۔ اس نے عید کارڈوں پر نگاہیں جما کر کہا۔ ''نہیں تو۔۔۔۔ میں پہلے بھی اس سے کب جھگڑتا تھا''۔ امی نے کہا ''یوں تو مت کہہ۔ پہلے تو بات بات پر اس کی جان کھا جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فساد برپا کر دیتا تھا''۔

اس نے صفائی کے طور پر امی کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر جواب دیا۔ ''جب تو میں چھوٹا سا تھا، امی۔ اب تو وہ بات نہیں رہی نا''۔

لیکن اس جواب سے امی کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''تیرا دوست تو یو۔ کے چلا گیا، انجینئرنگ کی تعلیم پانے۔ یہ عید کارڈ اسی کے لیے خرید رہی تھی''۔

''کہاں؟ انگلینڈ چلا گیا!'' اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''جبھی تو وہ مجھ سے ملا نہیں۔ میں بھی سوچ رہا تھا اسے کیا ہوا۔ یہاں ہوتا اور مجھ سے نہ ملتا۔ کیسی حیرانی کی بات ہے''۔

امی نے آہستہ سے دہرایا ''ہاں انگلینڈ چلا گیا۔ ابھی دو سال اور وہیں رہے گا۔ یہ عید کارڈ اسی کے لیے خریدا ہے''۔ اور اس نے کارڈ آگے بڑھا دیا۔ اس پر غریب الوطنی، دوری اور ہجر کے دو تین اشعار لکھے تھے۔

مسعود نے اسے ہاتھ میں لیے بغیر کہا ''لیکن یہ عید تک اسے کیسے مل سکے گا۔ عید تو بہت قریب ہے''۔

امی نے وثوق سے کہا ''ملے گا کیسے نہیں۔ میں بائی ایئر میل جو بھیج رہی ہوں''۔

''لیکن بائی ایئر میل بھی یہ وقت پر نہ پہنچ سکے گا''۔ مسعود نے جواب دیا۔

امی نے کہا ''تو کیا ہے۔ اسے مل تو جائے گا۔ ایک آدھ دن لیٹ سہی''۔ اور مسعود کے کچھ کہنے سے پیشتر امی نے کہا ''کبھی ہمارے گھر تو آنا۔ تمہاری دیدی نے ایم۔ اے کا امتحان دے دیا ہے۔ ضرور آنا۔ عید پر چلے آنا۔ ہم اکٹھے عید منائیں گے''۔

جب امی مسعود کو اپنا پتہ لکھا کر چلنے لگی تو اس نے اپنا فون نمبر بتاتے ہوئے کہا ''آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر لینا۔

میں اکثر دورے پر رہتی ہوں، لیکن عید کے روز میں ضرور گھر پر ہوں گی۔"

مسعود نے پتے کے ساتھ ایک کونے پر فون نمبر بھی لکھ لیا۔ امی نے ایک مرتبہ پھر اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا اور اپنی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے دکان سے نیچے اتر گئی۔ مسعود نے پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اکنی کو چٹکی میں پکڑ لیا اور بڑے صاحب کے لیے عید کارڈ انتخاب کرنے لگا۔

مسعود کی ماں نے اپنے خاوند کی موت کے ایک سال بعد ہی اپنے کسی دور کے رشتہ دار سے شادی کر لی تھی۔ اول اول تو اس کی دوسری کا مقصد مسعود کی تعلیم وتربیت تھی لیکن اپنے دوسرے خاوند کی جابرانہ طبیعت کے سامنے اسے مسعود کو تقریباً بھلا دینا پڑا۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں جب مسعود کو اپنے چچا سے فیس مانگنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کئی دن یونہی ٹال مٹول میں گزار دیتا۔ پیسوں کے معاملے میں اس کی ماں بالکل معذور تھی۔ گھر کے معمولی اخراجات تک کے لیے اسے اپنے خاوند کا منہ تکتے رہنا پڑا اور وہ اپنی کم مائیگی اور تہی دستی کا غصہ مسعود پر اتارا کرتی۔ ہر صبح اسے چولہے کے پاس بیٹھ کر چائے کی پیالی اور رات کو ایک باسی روٹی کے ساتھ یہ فقرہ ضرور سننا پڑا۔ "لے مر لے۔ تیری خاطر مجھے کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑا"۔ یہ جملہ گو مسعود کو بہت ہی ناگوار گزرتا لیکن ہر روز ناشتے کے لیے یہ بل کچھ ایسا بڑا بھی نہ تھا اور فیس ادا کرنے کے دن تو اس بل میں اچھا خاصا اضافہ ہو جاتا۔ اس کا چچا حقہ پیتے ہوئے کہتا "پڑھتا وڑھتا تو ہے نہیں۔ یونہی آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ میں نے تیری ماں سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ تجھے ڈاکٹر بیگ کے یہاں بٹھا دیں تاکہ کچھ کمپاؤڈری کا کام ہی سیکھ لے۔ آگے چل کر تیرے کام آئے گا لیکن پتہ نہیں وہ کن خیالوں میں ہے"۔ مسعود دونوں بانہیں سینے کے ساتھ لگا کر آہستہ سے جواب دیتا۔ "کام تو اچھا ہے جی، لیکن پہلے میں دسویں پاس کر لوں پھر۔۔۔"

اور چچا صاحب طنز سے مسکرا کر ایک باچھ ٹیڑھی کر کے بیچ میں بول اٹھتے "بس بس جیسی کو کو ویسے بچے! یہی بات تیری ماں کہا کرتی ہے۔ اسے جب معلوم ہوا گر خود کما کر تیری روز روز کی فیسوں کی چٹی بھرے، کتنی فیس ہے تیری؟"

مسعود ذرا سہم کر جواب دیتا "چار روپے تیرہ آنے جی!"

"اچھا اس مرتبہ تیرہ آنے کا اضافہ ہو گیا"۔

"کھیلوں کا چندہ ہے جی! ماسٹر جی نے کہا تھا کہ۔۔۔۔"

"تو کہہ دے اپنے ماسٹر واسٹر سے کہ میں کھیل نہیں کھیلتا اور تجھے شرم نہیں آتی کھیلیں کھیلتے ہوئے۔ اونٹ کی دم چومنے جتنا ہو گیا ہے اور کھیلیں کھیلتا ہے"۔

مسعود آہستہ سے کھنکار کر جواب دیتا "میں تو کچھ نہیں کھیلتا جی، پر ماسٹر جی کہتے ہیں کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دینا پڑے گا"۔

"یہ اچھا رواج ہے"۔ اس کا چچا سر ہلا کر کہتا "کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دو۔ سکول ہے کہ کمشنر کا دفتر۔ چندہ نہ ہوا وار فنڈ ہوا"۔

چونکہ عام طور پر ایسی بات کا جواب مسعود کے پاس نہ ہوتا، اس لیے وہ خاموش ہی رہتا۔ اس کے بعد چچا پاس ہی کھونٹی پر لٹکتی ہوئی اچکن سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر کہتا۔ "لے پکڑ۔ اپنی ماں کو بتا دینا اور سکول سے لوٹتے ہوئے باقی کے تین آنے مجھے دفتر دے جانا"۔

خوف، نفرت اور تشکر کے ملے جلے جذبات سے مسعود کی آنکھیں پھٹتیں، بند ہوتیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتیں اور وہ نوٹ اپنی مٹھی میں دبا کر ماں کو بتانے دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتا اور اس کا چچا اپنے کمرے میں حقہ بجاتے ہوئے ہانک

لگا تا ''فیس دے دی ہے جی تمہار شہزادے کو۔ ڈپٹی صاحب کو!'' یہ سنتے ہی مسعود ایک دم رک جاتا اور جی ہی جی میں اپنی ماں کو ایک گندی سی گالی دے کر وہ الٹے پاؤں اپنی کوٹھڑی میں جا کر بستہ باندھنے لگتا۔ چچا جیسے بیہودہ آدمی سے شادی کر کے اس کی ماں اس کی نگاہوں میں بالکل گر چکی تھی اور وہ چچا کی طعن آمیز باتوں کا بدلہ ہمیشہ اپنی ماں کو گالی دے کر چکایا کرتا۔

تفریح کی گھنٹی میں درختوں کے سائے تلے اپنے کھیلتے ہوئے ہم جولیوں کی دعوت سے انکار کر کے اسے سیدھا گھر بھاگنا پڑتا۔ خاصہ دان تیار ہوتا جسے اٹھا کر وہ جلدی جلدی اپنے چچا کے دفتر پہنچتا اور اسے ان کی کرسی کے پاس رکھ کر بغیر کچھ کہے سکول بھاگ آتا۔ عرصہ سے اس کی تفریحی گھنٹیاں یونہی ضائع ہو رہی تھیں۔ صرف اتوار کے دن اسے اپنے چچا کے دفتر نہ جانا پڑتا، لیکن اتوار کو کوئی تفریح کی گھنٹی نہیں ہوتی۔

آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحان سے پہلے اس کے یہاں ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا جس کا نام اس کی ماں کے اصرار کے باوجود مقصود کی بجائے نصر اللہ رکھا گیا۔ اس بھائی کی پیدائش نے مسعود سے اس کی ماں کو قطعی طور پر چھین لیا اور اس کی حیثیت گھر میں کام کرنے والے نوکر ہی ہو کر رہ گئی، جو اپنا اصلی کام ختم کرنے کے بعد پڑوس کے دروازے کی اونچی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بچے کھلایا کرتا ہے۔ نصر اللہ کی آمد کے دن سے مسعود کا چچا دن میں بار بار ڈاکٹر بیگ کا وظیفہ کرنے لگا اور مسعود کی ماں سے تقاضا کرتا رہا کہ چونکہ اب نصر اللہ ہو گیا ہے، اس کے اخراجات بھی ہوں گے، اس لیے مسعود کو سکول سے اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں بٹھا دینا چاہیے لیکن اس کی ماں نہ مانی اور سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسعود کے سکول میں موسم کے طلسماتی کارڈ بیچنے ایک آدمی آیا اور اس کی وجہ سے مسعود کی ملاقات امی سے ہوئی۔ گلریز اپنی بیوہ امی کا ایک ہی لڑکا تھا اور مسعود کا ہم جماعت تھا۔ جماعت بھر میں مسعود کی دوستی صرف گلریز سے تھی۔ دونوں کو ننھی ننھی ٹوکریاں بنانے کا خبط تھا۔ پڑھائی کے دوران میں اگر کبھی انہیں فرصت کے چند لمحات میسر آ جاتے تو وہ سائنس روم کے دروازوں سے چمٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں سے ادھ سوکھی لمبی لمبی رگیں توڑتے اور کھیل کے میدان میں ہری ہری گھاس پر ٹوکریاں بنانے لگتے، جس میں گلاب کا ایک پھول یا چنبیلی کی چند کلیاں مشکل سے سما سکتیں۔ مسعود دستی والی ٹوکری بھی بنا لیتا تھا لیکن گلریز سے ہزار کوششوں کے باوجود بھی ایسی ٹوکری نہ بن سکتی تھی اور وہ مسعود کی بنائی ہوئی ٹوکری لے لیا کرتا۔ ہاں تو جس دن ان کے سکول میں موسم کے طلسماتی کارڈ بیچنے والا آدمی آیا، مسعود کی ملاقات امی سے ہوئی۔ سفید کارڈوں کے بیچوں بیچ گلابی رنگ کا ایک بڑا سا سرخ دائرہ تھا، جس پر ایک خاص مصالحہ لگا ہوا تھا! کارڈ بیچنے والے نے بتایا کہ جیسے جیسے موسم تبدیل ہوتا رہے گا، اس دائرے کے رنگ بھی بدلتے رہیں گے۔ جوں جوں گرمی بڑھتی جائے گی، گلابی دائرہ سرخ ہوتا جائے گا اور جب سردی کا زور ہوگا تو یہ گلابی چکر بسنتی رنگ کا ہو جائے گا اور جس دن مطلع ابر آلود ہوگا اور بارش برسنے کا امکان ہوگا تو یہ چکر خود بخود دھانی رنگ کا ہو جائے گا۔ کارڈ کی قیمت دو آنے تھی۔ کلاس میں تقریباً سب نے وہ کارڈ خریدے اور جن کے پاس دو آنے نہ تھے، انہوں نے بات اگلے دن پر اٹھا دی۔

گھر سے خاصہ دان اٹھاتے ہوئے مسعود نے ہولے سے کہا ''اماں، مجھے دو آنے تو دو میں۔۔۔۔''

مگر اس نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا ''میرے پاس کہاں ہیں دو آنے۔ کبھی مجھے پیسے چھوتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ کون لالا کے میری جھولیاں بھرتا ہے جو تجھے دونی دوں''۔

مسعود نے مایوس ہو کر خاصہ دان اٹھا لیا اور چپ چاپ دروازے سے باہر نکل گیا۔۔۔۔ دفتر پہنچ کر اس نے خاصہ دان کرسی کے پاس رکھ دیا اور خلاف معمول وہاں کھڑا ہو گیا۔ اس کے چچا نے فائل میں کاغذ پروتے ہوئے عینک کے اوپر سے دیکھا اور ترش رو ہو کر پوچھا ''کیوں؟ کھڑا کیوں ہے؟''

''کچھ نہیں جی''۔ مسعود کا گلا خشک ہو گیا۔
''کچھ تو ہے''۔
''نہیں جی کچھ بھی نہیں''۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔
''تو پھر فو جیں کیوں کھڑی ہیں؟''
''جی ایک دونی چاہیے۔۔۔اماں۔۔۔میں۔۔۔سکول میں جی۔۔۔۔۔ماں۔۔۔''
''بلوں ماں'' اس کے چچا نے غرا کر کہا۔'' تجھے دونی دوں! تجھے ناواں دوں! میرے بورے جو ڈھوتا رہا ہے۔ میرے ساتھ جو کھیلتا رہا ہے''۔
مسعود شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا'' میں میں۔۔۔اماں نے۔۔۔اماں نے۔۔۔جی سکول۔۔۔سکول میں۔۔۔''
''ہوں''۔ اس کے چچا نے گھرج کر کہا'' تجھے پیسے دوں! تجھے دونیاں دوں۔ کیوں؟ مجھے بین سنا تا رہا ہے۔ مجھے نبض دکھاتا رہا ہے۔ تجھے پیسے دوں۔ ہوں تجھے دونی دوں۔۔۔ تجھے۔۔۔''
مسعود نے ایک نگاہ خاصہ دان کو غور سے دیکھا جو واقعی ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا اور پھر اپنے چچا کو اسی طرح ہوں ہوں کرتے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچہری کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھا چپراسی آپ ہی آپ کہے جا رہا تھا ''ہوں! تجھے پیسے دوں! تجھے ناواں دوں۔ میرے بورے جو ڈھوتا ہے۔ ہوں تجھے پیسے دوں''۔
اور راستہ بھر مسعود کو ایسی ہی آوازیں آتی رہیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے ٹخنوں کے درمیان چھوٹا سا گراموفون لگا ہوا ہو اور جس کا ریکارڈ اس کی رفتار کے مطابق گھومتا ہو۔ مسعود نے سڑک کے کنارے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا اور ریکارڈ اونچے اونچے بجنے لگا۔'' تجھے پیسے دوں، تجھے پیسے دوں، میرے بورے جو میرے بورے جو''۔ مسعود نے گھبرا کر راہ چلتے لوگوں کو غور سے دیکھا کہ وہ بھی تو یہ ریکارڈ نہیں سن رہے اور پھر اپنی رفتار بالکل سست کر دی۔ گراموفون کی چابی ختم ہو گئی اور ریکارڈ سسکنے لگا۔'' تجھے پیسے۔۔۔دوں۔۔۔تجھے ناواں۔۔۔دوں۔۔۔میرے۔۔۔بورے۔۔۔جو۔۔۔۔'' اور سکول تک یہ باجا یونہی بجتا رہا۔
سکول بند ہونے پر گلریز نے خود ہی اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی کہ طلسماتی کارڈ اپنے کمرے میں لٹکا کر اور سارے دروازے بند کر کے دیکھیں گے کہ گرمی سے دائرہ سرخ ہوتا ہے کہ نہیں۔ یہ تجسس مسعود کو کشاں کشاں ان کے گھر لے گیا۔ گول گول غلام گردش والے برآمدے کے ایک کونے میں سفید رنگ کی ساڑھی باندھے ادھیڑ عمر کی ایک دبلی سی عورت جالی کے دروازے کو دھاگے سے ٹانکے لگا رہی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا اور کندھوں پر سلیٹی رنگ کی بنی ہوئی ایک اونی شال پڑی تھی۔ مسعود نے ایک نظر اس کے ننھے سے وجود کو دیکھا جس سے سارا برآمدہ بھرا بھرا معلوم ہوتا اور سیڑھیوں پر ٹھٹک گیا۔ اسے اس طرح دم بخود دیکھ کر گلریز نے بے تکلفی سے بستہ چارپائی پر پھینک کر کہا۔'' آؤ۔آؤ'' اور پھر سیمنٹ کے فرش پر تیزی سے اپنے بوٹ گھسیٹتا وہ اس عورت کے پاس جا کھڑا ہوا اور چلانے لگا'' امی امی! میں نے ایک چیز خریدی۔ ایک نئی چیز، جادو کا کارڈ۔۔۔۔۔ دیکھو امی''۔ اور اس کی امی نے گردن موڑ کر اور کارڈ ہاتھ میں لے کر کہا'' اچھا ہے۔ بڑا اچھا''۔ اور پھر اس کی نگاہیں برآمدے میں رینگتے ہوئے اس لڑکے پر پڑیں، جس نے ٹخنوں سے اونچی میلی شلوار پہن رکھی تھی اور جس کی خاکی کینوس کے جوتوں سے اس کی انگلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ گلریز نے شرماتے ہوئے کہا۔'' یہ میرا دوست مسعود ہے۔ امی یہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ یہ میرے ساتھ اس کارڈ کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھنے

آیا ہے''۔

امی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے غور سے مسعود کو دیکھا۔ خوش آمدید کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور وہ بڑے پیار سے بولی ''تم نے کارڈ نہیں خریدا مسعود؟''

اور مسعود کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کی برسوں کی واقف ہو۔ مسعود اس کے صحن میں کھیل کرا تنا بڑا ہوا اور وہ مسعود کو لمبی لمبی کہانیاں سنا کر ہر رات کہا کرتی رہی ہو۔ ''اب تم سو جاؤ''۔

گلریز نے اپنے کارڈ کے دائرے پر فخر سے انگلی پھیرتے ہوئے کہا ''ان نے نہیں خریدا امی۔ اس کے پاس دونی نہیں تھی۔ اس کے پاس کبھی بھی پیسے نہیں ہوئے''۔

امی نے کہا ''تو اچھا دوست ہے۔ اس نے نہیں خریدا تو تو نے دو کارڈ کیوں نہ خرید لیے؟ تیرے پاس تو پیسے تھے''۔

گلریز نے گھبرا کر جواب دیا ''باقی پیسوں کی تو میں نے برفی کھالی تھی اور ایک آنے کی پنسل خریدی تھی''۔

امی نے کہا ''تو تجھے اپنے دوست سے برفی پیاری ہے''۔

''نہیں جی۔ امی'' گلریز شرمندہ ہوگیا اور اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ کے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں سرخ رنگ کے صوفے پر ایک لڑکی سویٹر بن رہی تھی۔ اس کے پہلو میں چینی کی ایک چھوٹی سی رکابی میں کھلیں پڑی تھیں۔ گلریز نے اندر داخل ہو کر کہا ''دیکھو، دیدی، دیکھو، میرے پاس جادو کا کارڈ ہے''۔

اور دیدی نے سلائیوں سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا ''اچھا ہے''۔

مسعود دیدی کا رویہ دیکھ کر باادب ہوگیا اور گلریز خفیف ہو کر جالی کا دروازہ زور سے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ دیدی نے ماتھا سکیڑ کر کہا ''آہستہ'' اور پھر سوالیہ نگاہوں سے مسعود کو دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ مسعود نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہولے سے آگے بڑھا۔ دھیرے سے جالی کا دروازہ کھولا اور اسے بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ بند کرتے ہوئے گلریز کے پیچھے چلا گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر گلریز نے کارڈ میز پہ ڈال کر کہا ''دروازہ بند کر دیار۔ کمرہ گرم ہو جائے گا تو کارڈ رنگ بدلے گا''۔

دروازہ بند ہوگیا۔ وہ دیر تک کارڈ پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہے مگر اس کا رنگ تبدیل نہ ہوا۔ مسعود نے کہا ''گلریز میاں، گرمی کم ہے اس لیے رنگ تبدیل نہیں ہوتا۔ باورچی خانے میں چولہے کے پاس کارڈ رکھیں گے تو یہ ضرور سرخ ہو جائے گا''۔

جب باورچی خانے میں پہنچے تو امی گوبھی کاٹ رہی تھیں۔ گلریز نے ایک چوکی چولہے کے پاس کھینچ کر اس پر کارڈ ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا رنگ ٹماٹر کی طرح سرخ ہوگیا۔

امی سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ جب وہ اسے پھلوں اور بسکٹوں والی چائے پلا کر گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئیں تو باورچی خانے سے چرائی ہوئی چونی مسعود کی جیب میں انگارے کی طرح دہکنے لگی اور وہ جلدی سے سلام کر کے ان کے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس دن کے بعد سے امی نے اسے اپنا بیٹا بنالیا اور وہ سارا دن ان کے گھر ہی رہنے لگا۔

تقسیم کے بعد جہاں سب لوگ تتر بتر ہوگئے، وہاں امی اور مسعود بھی بچھڑ گئے اور پورے تین سال بعد آج ان کی ملاقات عید کارڈوں کی دکان پر ہوئی تھی۔

مسعود نے اپنی کوٹھڑی تو نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ دفتر کے بعد کا تقریباً سارا وقت امی کے یہاں گزارنے لگا۔ دیدی نے واقعی ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ متکبر ہوگئی تھی۔ بریکٹ پر ایک بڑے سے پھول دان میں وہ سرکنڈوں کے پھول لگائے موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتی۔ اس کی آواز جو پہلے نرگس کے ڈنٹھل کی طرح ملائم تھی، خشک اور کھردری ہوگئی تھی۔ یوں تو

وہ دن بھر میں مشکل سے ہی چند جملے بولتی لیکن جب بات کرتی تو یوں لگتا گویا خشک اسفنج کے ٹکڑے اگل رہی ہو۔امی جب بھی اس سے بات کرتی، بڑے ادب اور رکھ رکھاؤ سے کام لے کر۔واقعی دیدی نے ایم۔اے کا امتحان دے دیا تھا۔

امی نے کئی مرتبہ مسعود سے اس کی ماں اور چچا کے بارے میں پوچھا،لیکن اس نے کبھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ ''یہیں کہیں رہتے ہیں۔مجھے علم نہیں''۔

دفتر سے فارغ ہو کر مسعود سیدھا امی کے یہاں پہنچتا اور رات کو دیر تک ادھر ادھر کی بے معنی گپیں ہانکتا رہتا۔دیدی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی۔وہ دو تین مرتبہ تیز تیز نگاہوں سے امی اور مسعود کو گھورتی اور پھر ٹھپ سے کتاب بند کر کے اندر کمرے میں چلی جاتی۔جب دیدی مسعود کی پہنچ سے باہر ہو جاتی تو وہ زور زور سے قہقہے لگا کر اس کی پڑھائی میں مخل ہونے لگتا۔امی کو پتہ تھا کہ وہ جان بوجھ کر دیدی کو تنگ کر رہا ہے،لیکن اس نے کبھی بھی مسعود کو منع نہیں کیا۔ایک رات جب اسے باتیں کرتے کرتے کافی دیر ہو گئی تو امی نے کہا ''اب یہیں سو رہو۔اس وقت اتنی دور کہاں جاؤ گے''۔تو مسعود وہیں سو رہا اور اس رات کے بعد وہ مستقل طور پر اسی کے یہاں رہنے لگا۔

چچا کی بخیل فطرت اور ماں کی لاپروائی اس کی آزادانہ زندگی پر ایک عجیب طرح سے اثر انداز ہوئی۔وہ پہلے جس قدر گم صم رہتا تھا،اب اسی قدر ہنسوڑ ہو گیا تھا اور اپنے بچپن کی غریبی کا مداوا کرنے کے لیے اس نے جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا۔پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتے ہی وہ تنگ و تاریک کوچوں میں سے گذرتا ہوا اس اندھی گلی میں پہنچ جاتا جس کے آخر میں پرانے چھپر اور پھونس کے ڈھیر پڑے ہوتے۔پھونس کو ایک طرف ہٹا کر مسعود اندھیرے بھٹ میں داخل ہوتا جس کے پیچھے کچی اینٹوں کی ایک غلیظ سی کوٹھڑی کڑوے تیل کا دیا اپنی آغوش میں لیے اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔چیتو، بھمبیری اور ڈھلمن نشہ پانی کیے فرش پر لیٹے ہوتے اور ریاں چھوٹے سے دروازے کے ٹوٹے ہوئے پٹ سے پشت لگائے ہولے سے کہتی ''آ گیا، راجہ نل آ گیا''۔اور پریل شروع ہو جاتی۔مسعود کا ذہن اور مقدر مل جل کر ایسے ایسے معرکے مارتے کہ ہارنے کی نوبت کم آتی اور جب تک مسعود کی جیبیں خالی نہ ہو جاتیں اسے کل نہ پڑتی۔وہ تاش پھینٹے جاتا،نقدی کی ڈھیریاں لگائے جاتا اور پریل کھیلے جاتا حتیٰ کہ اس کے مخالفوں کے پاس ایک چھدام بھی نہ رہتا یا اس کی جیبوں کا استر مردہ گائے کی زبان کی طرح باہر لٹکنے لگتا۔

امی کو پتہ تھا کہ مسعود نوکر ہو کر بڑا ہی زندہ دل اور چست ہو گیا ہے لیکن اس بات کا اسے علم نہ تھا کہ پریل کھیلتے ہوئے اس کی انگلیاں بھی قینچی کی طرح چلنے لگتی ہیں۔ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو امی اس کا بستر بچھا کر آدھی رات تک اس کا انتظار کرتے ہوئے سوچا کرتی کہ گلریز بھی یونہی آوارہ گردی کرتا ہو گا اور اس کی لینڈ لیڈی اس کا انتظار اسی طرح کیا کرتی ہو گی۔پھر مسعود اور گلریز آپس میں گڈمڈ ہو جاتے۔امی اور لینڈ لیڈی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتیں اور شفقت لاابالی کا انتظار کرنے لگتی۔دیدی اپنے بستر پر ایک دو مصنوعی کروٹیں بدل کر آتش بار نگاہوں سے امی کو گھورتی اور پھر منہ دوسری طرف کر کے دم سادھ لیتی۔

مسعود جب پھاٹک کے قریب پہنچتا تو پنجوں کے بل چلنے لگتا۔شور مچانے والے پٹ کو آہستہ سے دھکیلتا اور پھر اندر داخل ہو کر اسے اسی طرح بند کرنے لگتا کہ امی پکار کر پوچھتی۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''کہیں سے نہیں امی''،وہ سہم جاتا۔

''نہر پر دوستوں کے ساتھ گپیں مار رہا تھا''۔

''یہ تمہارے کون سے ایسے دوست ہیں ذرا میں بھی تو دیکھوں''۔

''میرے دفتر کے ساتھی ہیں امی۔ دفتر کی باتیں ہورہی تھیں''۔اور وہ آرام سے آکر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا اور اپنے بوٹ کھولنے لگتا۔امی خاموشی سے اٹھ کر اندر آجاتی اور کٹ کیٹ کا پیکٹ اس کے بستر پر پھینک کر بے پروائی سے کہتی ''میں آج بازار گئی تھی اور تیرے لیے یہ لائی تھی۔آدھی اپنی دیدی کے لیے رکھ لینا''۔

اور جب وہ بستر پر لیٹنے لگتا تو امی کہتی ''یہ تو اپنے بالوں پر اتنا تیل کیوں تھوپ لیتا ہے۔ لے کے سارے تکیے تیلی کی صدری بنادیئے ہیں۔صبح ہونے دے تیرے سر پر استرا پھرواتی ہوں''۔

اور مسعود کوئی جواب دیے بغیر سفید چادر اوڑھ کر مردے کی طرح سیدھا شہتیر لیٹ جاتا تو امی جل کر کہتی ''تجھے کتنی مرتبہ کہا ہے یوں نہ لیٹا کر۔یا تو کروٹ بدل یا ٹانگوں میں خم ڈال۔اس طرح لیٹنے سے مجھے وحشت ہوتی ہے''۔

مسعود کروٹ بدل کر سوجاتا اور لینڈ لیڈی اطمینان کی سانس لے کر لباس تبدیل کرنے چلی جاتی۔

امی گلریز کا ہر خط مسعود کو ضرور دکھاتی اور پھراتنی مرتبہ اس سے پڑھوا کر سنتی کہ مسعود کو الجھن ہونے لگتی اور وہ خط پھینک کر باہر چلا جاتا۔گلریز کے ہر خط میں یا تو روپوں کا مطالبہ ہوتا یا گرم کپڑوں اور دیگر معمولی معمولی چیزوں کا جن کا بندوبست امی بڑے انہاک سے کیا کرتی۔پارسل سیے جاتے۔ان پر لاکھ کی مہریں لگتیں اور پھر مسعود کو انہیں ڈاک خانے لے جانا پڑتا۔

تنخواہ ملنے میں ابھی کئی دن پڑے تھے۔کھمبیری مسعود کو سڑک پر مل گیا۔اس نے بتایا کہ ان کی چوکڑی میں ایک بڑا مالدار کباڑیا رکنا داخل ہوگیا ہے جو صرف ہزاروں کی بازی لگاتا ہے۔مسعود کے استفسار پر کھمبیری نے بتایا کہ وہ ہر روز اپنے ایک گماشتے لالو کانے کے ساتھ کھیا میں آتا ہے اور نشہ پانی کرکے چلا جاتا ہے۔مسعود نے ڈاک خانے کے پچھواڑے جاکر گرم سوٹ کا پارسل کھولا اور ماسٹر غلام حسین کی دکان پر جاکر ڈیڑھ سو روپے میں بیچ دیا۔اس رات وہ گھر نہیں گیا۔اس کا بستر تمام رات ٹھنڈا رہا اور اس کی پائنتی پر پڑی سفید چادر امی کی طرح ساری رات اس کا انتظار کرتی رہی۔صبح جب وہ گھر پہنچا تو نہ اس کے پاس روپے تھے اور نہ پارسل کی رسید۔امی نے رات بھر غائب رہنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیے بغیر اس پوچھا ''پارسل کروادیا تھا؟''

''کروادیا تھا''۔اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

''اور رسید؟'' دیدی نے پوچھا۔

مسعود نے گھور کر دیدی کو دیکھا اور کہا ''رات میں جس دوست کے یہاں سویا تھا رسید وہیں رہ گئی''۔

امی نے چائے کی پیالی بناتے ہوئے پوچھا ''چھ روپے میں کام بن گیا تھا''۔

''نہیں''۔مسعود نے آہستہ سے کہا۔''ساڑھے سات روپے کے ٹکٹ لگے۔میں نے ڈیڑھ روپیہ ادھار لے لیا تھا''۔

اور ڈیڑھ کا لفظ آتے ہی چائے اس کے حلق میں پھنس گئی۔

مسعود کو معلوم تھا امی کی تنخواہ تین چار سو کے لگ بھگ ہے۔اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ ایک پارسل کے نہ پہنچنے سے وہ مر نہیں جائے گی۔

ایک دن جب دیدی کے ڈریسنگ ٹیبل سے پچیس روپے گم ہوگئے تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔اس نے بلا سوچے سمجھے امی سے کہہ دیا کہ یہ کارستانی مسعود کی ہے۔امی بجائے خفا ہونے کے رو کر کہنے لگی ''آج تو مسعود پر الزام دھرتی ہے کل مجھے چور بتائے گی۔۔۔۔۔وہ بھلا تیرے پیسوں کا بھوکا ہے؟''

لیکن دیدی نہ مانی اور ماں بیٹی میں خوب خوب تکرار ہوئی۔شام کو نہ امی نے کھانا کھایا اور نہ دیدی نے،لیکن اس رات مسعود کا پانسہ بھاری رہا اور اس نے اپنے ساتھ کھمبیری اور چیتو کو بھی نان کباب کھلائے۔

گلریز کا خط آ گیا تھا کہ اسے پارسل نہیں ملا۔ ڈاک خانے میں پوچھ گچھ ہوئی۔ رسید کی ڈھنڈیا پڑی لیکن نہ رسید ملی نہ پارسل کا پتہ چلا اور امی ڈاک خانے کو رو پیٹ کر خاموش ہو رہی، لیکن اس مرتبہ نہ تو اس نے گلریز کا خط مسعود کو دکھایا اور نہ ہی اس سے پڑھوا کر سنا۔ اس نئے روپے نے مسعود کو یونہی تجسس میں ڈال دیا۔ اس نے ایک دو مرتبہ امی سے خط کے بارے میں پوچھا بھی لیکن وہ یہی کہہ کر خاموش ہو گئی کہ ''میں کہیں ڈال کر بھول گئی ہوں''۔ خط گھر ہی میں تو تھا، جاتا کہاں، مسعود کی تفتیش نے اسے امی کی میز سے ڈھونڈ نکالا۔ گلریز نے لکھا تھا ''پارسل مجھے نہیں ملا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ یہاں سردی بڑھتی جا رہی ہے اور میں سخت پریشان ہوں لیکن سب سے بڑی پریشانی روپے کی ہے۔ مجھے نئی کلاس میں داخلہ لینا ہے جس کے لیے مجھے کم از کم دو ہزار روپوں کی ضرورت ہوگی، لیکن امی تم یہ دو ہزار روپیہ کہاں سے لاؤ گی۔ مجھے علم ہے کہ تمہارے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ پر میں کروں بھی تو کیا! تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک ہی ڈگری لے کر آ جاؤں۔۔۔۔''

اس کے آگے مسعود نے کچھ نہ پڑھا۔ خط تہہ کیا اور دراز میں رکھ کر دفتر چلا آیا۔ اسے امی کی تنخواہ کے بارے میں علم تھا اور اس کے اندوختہ کے متعلق بھی اندازہ تھا لیکن گلریز کے اس خط نے اس کے سارے اندازوں پر پانی پھیر دیا۔ سارا دن وہ بے شمار ننھے ننھے سوالوں میں گھرا ٹائپ کرتا رہا اور آخر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ امی نے گلریز کو بھی دھوکے میں رکھ چھوڑا ہے تاکہ وہ غیر ملک میں عیاشیوں پر نہ اتر آئے۔ شام کو وہ معمول سے پہلے گھر پہنچ گیا۔ پھاٹک پر تانگہ کھڑا تھا۔ دیدی کہیں باہر گئی ہوئی تھی اور امی اندر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ مسعود دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ امی اپنے بڑے سیاہ ٹرنک سے زیور نکال نکال کر انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی اور پھر اپنے پرس میں ڈالے جاتی۔ ٹرنک بند کر کے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے سنہری انگوٹھی اتار کر بھی اسی پرس میں ڈال لی۔ جب وہ اٹھ کر چلنے لگی تو مسعود نے اندر داخل ہو کر کہا ''کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟''

امی گھبرا گئی۔ اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے کام لیتے ہوئے کہا ''اچھا ہی ہوا تم آ گئے۔ میں بازار جا رہی تھی۔ تھوڑا سا کپڑا خریدنا ہے۔ تم گھر پر ہی رہنا تمہارے لیے کٹ کیٹ لاؤں گی''۔

مسعود نے کہا ''امی ہمیں تو آج اس لیے جلدی چھٹی ہو گئی ہے کہ ہمارے دفتر کی ٹیم ریلوے کلب سے فٹ بال کھیل رہی ہے اور میں چھاؤنی جا رہا ہوں۔ میں گھر پر رہ کر کیا کروں گا۔ دینو جو یہاں موجود ہے''۔

امی نے کہا ''اسے میں ساتھ لیے جا رہی تھی لیکن خیر اب وہی گھر پر رہے گا۔۔۔ تم چائے پی لینا۔ تمہارے لیے انڈے ابال کر میں نے تھرموس میں رکھ دیئے ہیں''۔

امی چلی گئی۔ مسعود نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور خود کرسی پر دراز ہو کر اخبار دیکھنے لگا۔ دینو چائے تپائی پر رکھ کر تمبا کو لینے چلا گیا۔ مسعود نے اسی طرح اخبار گود میں ڈالے ایک پیالی پی۔ تھرموس کھول کر ایک انڈا نکالا اور بغیر نمک لگائے کھا گیا۔ دینو کو بازار گئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اس کے لوٹ آنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ مسعود اٹھا۔ دیدی کے ٹرنک سے کروشیا نکالا اور امی کے کمرے میں جا کر اٹیچی کیس کھولنے لگا۔ اوپر ہی قرمزی رنگ کی ایک ریشمی ساڑھی کی تہہ میں پچاس روپے پڑے تھے۔ روپے اٹھا کر اس نے جیب میں رکھ لیے اور پھر تالا بند کرنے لگا، لیکن زنگ آلود پھاٹک کے کھلنے پر وہ چونک پڑا اور گھبراہٹ میں کروشیا بھی جیب میں ڈال کر باہر آ گیا۔ مسعود نے دینو کو گھورتے ہوئے پوچھا ''اتنی دیر کر دی تھی۔ کہاں چلا گیا تھا؟''

''جانا کہاں تھا''۔ دینو نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ ''بنا بنایا تمبا کو دکاندار کے پاس تھا نہیں، میں اگلی دکان پر گڑ لینے چلا گیا''۔

''اچھا''۔ مسعود نے بے پروائی سے کہا۔ ''امی سے کہہ دینا میں ذرا دیر سے آؤں گا اور کھانا نہیں کھاؤں گا''۔

سپرنٹنڈنٹ کے یہاں پہنچ کر مسعود نے اپنے چہرے پر مسکینی کے ایسے آثار پیدا کئے کہ وہ پسیج گیا اور اس نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر ڈیڑھ سو روپیہ لا کر مسعود کو دے دیا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہنے لگا ''مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ دو سو روپے اس وقت میرے پاس نہیں۔ شاید یہ رقم تمہاری والدہ کو موت کے منہ سے بچا سکے''۔ اور جب مسعود اٹھ کر جانے لگا تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا ''جنرل وارڈ کے انچارج ڈاکٹر قدیر میرے واقف ہیں۔ کہو تو انہیں ایک رقعہ لکھ دوں''۔

مسعود نے تشکر آمیز لہجے میں کہا ''اگر ایسا کر دیجئے تو میری دنیا بن جائے۔ خواجہ صاحب میرا اس جہان میں سوائے میری ماں کے اور کوئی نہیں''۔

سپرنٹنڈنٹ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تمہاری والدہ راضی ہو جائے گی''۔

اور جب مسعود رقعہ لے کر بنگلے سے نکلا تو رات چھا چکی تھی اور سڑکوں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس نے ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور سڑکوں پر یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ نو بہار ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا اور پھر ریلوے اسٹیشن پر چلا گیا۔ شرفاء کے کمرے میں جا کر اس نے ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا اور دیر تک آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا۔ جب وہ اسٹیشن سے نکلا تو نو بج چکے تھے۔ اس نے تانگہ باغ کے قریب چھوڑ دیا اور پیدل چلنے لگا۔ سڑکوں کی چہل پہل کم ہونے لگی۔ سیر کرنے والوں کی ٹولیاں باغ سے نکل کر خراماں خراماں گھروں کو جا رہی تھیں۔ چوراہوں کے سنتری جا چکے تھے اور سنیماؤں کے سامنے کی رونق اندر ہال میں سمٹ گئی تھی۔ مسعود نے اندھیری گلی میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر پھونس اٹھا کر گھپا میں داخل ہو گیا۔ ریاں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سلفہ بھرے سگریٹ کا دم لگا کر بولی ''آگیا راجہ نل آگیا''۔

رکنے کباڑیئے نے کھنکار کر کہا ''آنے دو۔ آگے کون سے ننگ بیٹھے ہیں''۔

لالو نے اپنی کانی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''لال اوئے۔ پہلی تاریخ سے پہلے کیسے درشن دیے۔ ابھی تو چاند چڑھنے میں کافی دیر ہے؟''

مسعود مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

چیتو نے کہا ''لے، بھمبیری، چاند مکھن، چاند ہیرا۔ چاند چڑھ گیا چڑھ گیا۔ نہ چڑھا نہ چڑھا نشہ جو ہوا''۔

اس پر سب ہنسنے لگے۔

جب مسعود جوتا اتار کر دری پر بیٹھ گیا تو رکنے نے پوچھا ''پھر کچھ ہو جائے چھوٹی سی بازی؟''

''لے واہ، چھوٹی کیوں لالا''۔ کانے نے کہا۔ 'بازی ہو تو اگڑ بم ہو نہیں تو نہ سہی''۔

رکنا بولا۔ ''ہم تو اگڑ بم ہی کھیلتے ہیں، لیکن بابو ذرا نرم ہے، اس لیے لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے''۔

لالو کانے کو یہ بات بہت بری لگی۔ اس نے کہا ''شرع میں کیا شرم۔ بازی میں کیا لحاظ۔ بازی وہ جس میں چھڑس ہو جائے''۔

مسعود نے کوئی جواب دیئے بغیر دو سو کے نوٹ نکال کر دری پر رکھ دیئے اور چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ دئے کی لو اونچی کر دی گئی اور بازی شروع ہو گئی۔ آخری پتا دری پر پھینک کر مسعود نے رکنے کے آگے سے دو سبز نوٹ اٹھا کر اپنے نوٹوں میں رکھ لیے اور انہیں آگے دھکیل دیا۔

ریاں نے گردن پھیر کر کہا ''تیرے صدقے، انگوٹھی بنوا دے''۔

ڈھلن نے ڈکار کے کر کہا ''تیرے صدقے، کنواں لگوا دے۔ الٹا لٹک کر مالک سے ملوں گا''۔

رکنے کباڑیئے نے صدری سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیے اور جھلا کر لالو سے کہنے لگا ''کانے بیمبڑ

پنکھا تو کر، گرمی سے جان نکل رہی ہے''۔
کانا نیمڑ پنکھا کرنے لگا تو مسعود نے ہاتھ سے اشارہ کر کے آہستہ سے کہا ''ذرا ہولے۔ دیا نہ بجھ جائے''۔
اور بازی پھر شروع ہوگئی۔
دیدی بستر پر بے معنی سی کروٹیں بدل رہی تھی اور اس کے قریب آرام کرسی میں دراز امی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے تپائی تھی جس پر مسعود چائے پی کر گیا تھا اور اب اس تپائی پر امی کا پرس اور کٹ کیٹ کا ایک پیکٹ پڑا تھا۔ دیدی جاگتے میں بڑبڑا رہی تھی اور امی خاموشی سے اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سن رہی تھی۔
بازی ختم ہوگئی اور مسعود نے رکنے کے چار سو سمیٹ کر اپنے نوٹوں میں ملا لیے۔ کانے نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے رکنے کو دیکھا اور بولا۔ ''لالا!''
رکنے نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟ ابھی تو بڑی مایا ہے۔ بابو کو جی بہلانے دے''۔ اور اس نے دو سو کے نوٹ نکال کر آگے رکھ لیے۔
مسعود نے کہا ''یوں نہیں۔ تخت یا تختہ''۔ اور پھر سارے نوٹ آگے دھکیل دیئے۔
رکنے نے کہا ''یوں تو یوں سہی''۔ اور چھ اور سبز نوٹ نکال کر اگلے نوٹوں پر ڈال دیئے۔ تاش کے پتے پھر انگلیوں میں ناچنے لگے۔
امی نے چور آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا اور ہولے سے کہا۔ ''ابھی تک آیا نہیں، پتہ نہیں کیا وجہ ہے''۔ پھر اس نے کٹ کیٹ کے پیکٹ کو انگلی سے دبا کر دیکھا جو گرمی کی وجہ سے ذرا لجلجا ہوگیا تھا۔ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر امی نے کٹ کیٹ کے پیکٹ پر چھڑکا اور پھر کرسی پر دراز ہوگئی۔ دیدی نے قہر آلود نگاہوں سے امی کو دیکھا اور پھر کروٹ بدل لی۔
آخری پتہ پھینکنے سے پہلے مسعود نے رکنے کے نوٹ پھر اٹھا لیے اور پتہ چوم کر اس کی گود میں پھینک دیا۔ لالو کانا دم بخود پنکھا کیے جا رہا تھا۔ چیتو، ڈھلن اور بھمبیری فرش پر سوئے ہوئے تھے اور ریاں دیوار کے کے ساتھ لگی اونگھ رہی تھی۔
رکنے نے لالو کی طرف دیکھا اور شرمندگی ٹالنے کے لیے دو نوٹ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیے۔ مسعود نے کہا ''بس دو سو! کوئی اور جیب دیکھ، لالا۔ شاید اس میں سبز ے پڑے ہوں''۔
لیکن رکنا کوئی اور جیب دیکھنے پر رضا مند نہ ہوا۔ لالو کانا بولا۔ ''کل سہی بابو۔ بولتی بند ہو جائے گی۔ لے یہ ایک دس روپے کی گر جس یاروں کی بھی رہی''۔ اور اس نے رکنے کے دو سو پر دس اور رکھ دیئے۔۔۔ تاش بانٹی جانے لگی۔
امی نے دیدی کے سرہانے تلے ہاتھ پھیر کر اس کی گھڑی نکالی اور اپنے آپ سے کہا۔
''ایک بج گیا''۔
پھاٹک ذرا سا ہلا۔ امی تیز تیز قدم اٹھاتی ادھر گئی۔ اس نے بولٹ کھولنے سے پہلے چوڑی دراڑ میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ایک خارش زدہ کتا پھاٹک کے ساتھ اپنی کمر رگڑ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر آ کر پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔
بازی ختم ہوگئی اور مسعود نے دو سو دس روپے اٹھا کر اپنے نوٹوں میں شامل کر لیے اور رکنے سے پوچھا۔ ''اور؟'' رکنے نے معنی خیز نگاہوں سے لالو کو دیکھا اور منہ پونچھ کر بولا۔ ''بس!''
نوٹوں کی گڈی بنا کر مسعود نے سامنے کی جیب میں ڈال لی۔ جوتا پہن کر کھڑا ہوگیا اور سوئے ہوئے بیچاروں پر نگاہ ڈال کر بولا ''اچھا، استاد، پھر سہی پہلی تاریخ کو''۔
رکنے اور لالو نے کوئی جواب نہ دیا اور مسعود خاموشی سے چل دیا۔ پھونس سے گذر کر اس نے تازہ ہوا میں ایک لمبا سانس

لیا اور اندھیرے کی گود میں مڑتی ہوئی بے جان گلی کو دور تک محسوس کیا۔ پھر وہ اپنے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ تو کل اٹھارہ سو ہوئے اور گلریز نے دو ہزار مانگے ہیں۔ باقی دو سو کا بندوبست کیوں کر ہوگا اور وہ ابھی باقی دو سو کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے گلے میں صافہ ڈال کر اسے زمین پر گرایا۔ گرتے ہیں ایک تیز دھار چاقو کا لمبا پھل اس کے سینے سے گزر کر دل میں اتر گیا۔

ایک آواز نے کہا ''کانے بیمبڑ یہ کیا کیا۔۔۔۔نوٹ نکال نوٹ''۔

کانے بیمبڑ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالنے کی کوشش کی مگر چاقو کا پھل نوٹوں کو پروتا ہوا پسلیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس نے زور لگاتے ہوئے کہا۔ ''لالا نکلتے نہیں''۔ اور جب لالا نوٹ نکالنے کو جھکا تو گلی کے دہانے پر سپاہی سیٹیاں بجانے لگے اور وہ دونوں مسعود کو یونہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔

مسعود نے زور لگا کر چاقو باہر نکالا اور اسے پرے پھینکا۔ پھر اس نے خون آلود نوٹوں کی گڈی جیب سے نکالی اور اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اٹھ نہ سکا۔ پیٹ کے بل لیٹ کر اس نے نوٹ دائیں ہاتھ میں پکڑ لیے اور اپنا ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ کہنی کو زمین پر دبا کر اس نے آگے گھسٹنا چاہا لیکن جونہی کہنی اس کے پہلو سے آ کر لگی اس کا ہاتھ زمین سے جا ٹکرایا اور اس کی جیب سے ایک کروشیا نکل کر باہر گر پڑا۔ مٹھی میں پکڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''امی۔۔۔۔می۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔امی۔۔۔۔۔''لہو کی آخری بوند زمین پر گری اور اس کی مٹھی ڈھیلی ہوگئی۔

امی نے ٹھنڈے پانی میں انگلی ڈبو کر ایک قطرہ کٹ کیٹ پر ٹپکاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا ''ابھی تک آیا نہیں!''

☆☆☆

اُجلا انسان، میلی روحیں

افسر آذر

اس نے ایک مرتبہ پھر انسانوں کے اس سیلاب کو دیکھا جو سڑک پر مسلسل امڈ رہا تھا۔
ہر شخص کے چہرے پر اس کو آسودگی اور اطمینان کی لہریں نظر آئیں۔۔۔ ہر شخص کے چہرے پر، جن میں شام کے اخبار بیچنے والے لڑکے تھے، فٹ پاتھ پر معمولی اشیاء بیچنے والے دکاندار تھے، وہ بوڑھا تھا جس کے چہرے کے نقوش بڑھاپے کی جھریوں نے چھپا لیے تھے اور جو اپنی گدلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے پان سگریٹ کا چھوٹا سا خوانچہ لیے بیٹھا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا بھکاری تھا جو اپنے بدن کو زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر آگے بڑھاتا تھا۔ وہ پاگل عورت تھی جو سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو گالیاں دے رہی تھی۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس وہ جوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں جن کے دل و دماغ میں ہر روز نئی محبتوں کے جوالا مکھی پھٹے رہتے تھے اور ہر روز ایک نئی محبت کی تلاش میں رہتے ہوئے ان کی روحوں میں بے چینی اور اضطراب کروٹیں لیتے رہتے تھے۔
اور جب اس کا یہ احساس کہ ہر شخص آسودہ اور مطمئن ہے، شدید تر ہو گیا تو ایک دم اسے اپنے وجود کا خیال آیا اور پر صرف تنہائی کا احساس ہی اس کے ذہن پر باقی رہ گیا۔۔۔ دنیا میں وہی اکیلا ایسا ہے جس کو یہ آسودگی اور اطمینان میسر نہیں۔ پتھر کے بنچ پر بیٹھے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر آس پاس نظریں دوڑائیں لیکن اطمینان اور آسودگی کی لہر نے جو ہر شخص کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی اسے پھر شدید احساس تنہائی میں مبتلا کر دیا۔
لیکن سب سے بڑی مصیبت تو اس کے لیے شرافت اور پاکیزگی کے وہ تاثرات تھے جو اس کو لوگوں کے چہروں پر نظر آ رہے تھے!
وہ صرف ایک آدمی چاہتا تھا۔ صرف ایک! جس کے چہرے پر شرافت اور پاکیزگی کی علامات نہ ہوں۔ لیکن اس کے سامنے تو معصوم، پاکباز اور فرشتہ صفت لوگوں کا گروہ تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ زمین کو چھوڑ کر جہاں ہر طرف دھوکہ، ریا اور کمینگی پائی جاتی ہے، فرشتوں کی دنیا میں نکل آیا ہے جہاں روحوں میں نفاست اور پاکیزگی۔۔۔ ہوتی تھی۔ اس خیال کے ساتھ اس کو پھر احساس تنہائی نے آ دبوچا۔ فرشتوں کی آسمانی دنیا میں ایک زمینی انسان کا وجود۔ غلاظت سے بھری ہوئی روح کے ساتھ اس کا اپنا وجود۔
پھر اس کی آنکھوں میں ایک سیاہ دھبہ جم گیا۔ جس میں اس کا اپنا وجود مقید تھا۔ اس کے چاروں طرف دوڑتی بھاگتی زندگی کے مختلف روپ تھے۔ ہر شخص کا اپنا ایک جاذب نظر رنگ تھا۔ ہر شے خوبصورت رنگوں کے حسین امتزاج کا مظہر تھی۔ اس رنگ برنگی قوس وقزح کے حسین اور دل پذیر رنگوں کی دنیا میں ایک سیاہ دھبہ اکیلا اور تنہا اس رنگ برنگے ماحول کے درمیان بے چارگی سے بے حس وحرکت مہمان ناپسندیدہ کی طرح پڑا ہوا۔ پھر اچانک وہ رنگوں کی دنیا سے نکل آیا۔
انتہائی غلیظ، انتہائی مکروہ میل کی چادر میں لپٹا ہوا ننگا جسم لیے ایک ہٹا کٹا فقیر ایک آنکھ سے اندھا کریہہ آواز میں بھیک مانگ رہا تھا۔ ''اللہ ہی دے گا''۔ لیکن اس کریہہ آواز میں بھی اس کو عجیب سی پاکیزگی کا احساس ہوا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھا اور وہ اکنی جس کو بڑی دیر مٹھی میں مسلنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پسیج گئے تھے۔ اس فقیر کو دے دی۔
یہ اکنی اس کو کسی شخص نے بھکاری سمجھ کر دی تھی۔ جس کے چہرے پر بڑے بڑے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گلے میں

سرخ رومال بدن پر گہرے رنگوں کی چارخانے کی قمیض، کھلا ہوا گریبان جس میں سے پیلے رنگ کا بنیان جھانک رہا تھا جس پر کیوپڈ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اور ٹانگوں میں گہرے نیلے رنگوں کی پتلون جس کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے۔

نہ معلوم فٹ پاتھ سے وہ کیا چیز خرید رہا تھا۔ اس نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کی نظر تو دس دس کے نوٹوں پر جم کر رہ گئی تھی جو اس نے پتلون کی ایک جیب سے نکالے تھے اور جس میں سے ایک نوٹ دکاندار کو دیا تھا۔ یہ شخص اس کے معیار پر پورا اترا تھا۔ اس دکان سے جب وہ ایک بنڈل بغل میں دبا کر آگے بڑھا تو اس کے قدم لاشعوری طور پر اس کے پیچھے اٹھنے لگے۔

اس شخص کی چال میں لا ابالی پن تھا جب کبھی کوئی لڑکی سامنے سے آتی تو وہ ہونٹوں کو سکیڑ کر سیٹی بجاتا۔ اور جب لڑکی اس کے قریب سے گزر جاتی تو وہ دو ایک مرتبہ پیچھے مڑ مڑ کر شاید اپنی سیٹی کے اثر کو دیکھتا۔ لیکن ہر مرتبہ اس کو مایوسی ہوئی کسی بھی لڑکی نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ اس کی سیٹی کی آواز کو کسی نے بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔

''یہی ٹھیک ہے''۔ اس نے دل میں سوچا۔ وہ ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس شخص نے ایک جوان پٹھان لڑکی کو جو ہر راہ گیر سے پیسے مانگتی تھی ایک روپیہ دیا تھا اور کچھ دیر تک اس سے نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتا رہا تھا اور اتنی دیر تک وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔

یہ شخص اس معیار پر پورا اترا تھا جو اس نے اپنے نزدیک کسی بدمعاش کے لیے قائم کیا تھا اس کی چال اس کے اطوار، عادات، لباس اور وہ عامیانہ پن جو اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ ''یہی ٹھیک ہے''۔ اس نے پھر اپنے دل میں سوچا اور تیزی سے بڑھ کر اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کو طے کر لیا۔

''بابو''۔ اس نے کہا۔ وہ شخص ٹھہر گیا۔ ''بابو۔۔۔'' اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اس جملہ کو نہ دہرا سکا جو اس نے بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا۔ ''بابو۔۔۔ میری بیوی ہے۔۔۔'' اور پھر سوچنے لگا۔ باوجود لاکھ کوشش کے وہ ایک جملہ، وہ چند الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل سکے جو اس نے بڑی محنت سے منتخب کیے تھے۔ پھر وہ خجالت سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

اس شخص نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسیاں اور بھوک سمٹ آئی تھی اور شاید اسی احساس سے اس شخص نے اس کے ہاتھ پر ایک آنہ رکھ دیا اور آگے بڑھ گیا۔

''ایک آنہ۔ بیوی کی قیمت، مگر وہ تو۔۔۔ وہ تو''۔ اس نے بے ربطگی سے سوچا۔ ''تو یہ بھی شریف نکلا''۔ اور گہری سرد سانس ہوا میں بکھر گئی۔

یہی ایک آنہ تھا جو اس غلیظ میلے کچیلے فقیر کو دے چکا تھا۔ ''اللہ ہی دے گا۔۔۔'' کی صدا بھاگتی دوڑتی ہوئی دنیا کی پرشور آواز میں معدوم ہو گئی تھی۔ آدمیوں سے پُر، اس پرشور ماحول میں بھی اس کو تنہائی کا احساس تھا۔ تنہائی، اکیلا پن، سناٹا جو اس کے گرد پھیل گیا تھا۔ سناٹا جس میں اس کو کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

بہر حال مطلوبہ آدمی، باوجود کوشش کے ابھی تک اس کو نہ ملا تھا۔ طویل تلاش اور جستجو میں ناکام ہونے کے بعد پانچ بجے سے وہ پتھر کی اسی بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوپہر کی تمام دھوپ اس کے سر پر گزری تھی۔ اور جب اس کے پیروں نے بالکل ہی جواب دے دیا۔ اور پیٹ میں دوزخ کے دہانے کھل گئے تو وہ لڑکھڑا کر اسی بنچ پر گر گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بنچ پر دھوپ تھی اور چند ہی قدم کے فاصلے پر دوسری بنچ پیڑ کے سائے تلے خالی پڑی تھی! لیکن اس کی ٹانگوں کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر اسی تپتی ہوئی بنچ پر تپش کی وجہ سے دو تین مرتبہ پہلو بدل کر ساکن ہو گیا تھا۔

اور اب ہر طرح بجلی کی روشنی تھی سورج نہ معلوم کب کا ڈوب چکا تھا اور سڑک پر چراغاں ہو رہا تھا۔

پھر اس کو یاد آیا ابھی اسے آدمی تلاش کرنا ہے۔ بھی تو اس کو وہ جملہ کہنا ہے جو وہ اس شریف آدمی سے نہ کہہ سکا تھا، جس نے اس کو ایک آنہ دیا تھا۔ یہ جملہ اس نے کتنی تحقیق و تجسس کے بعد معلوم کیا تھا جس کا انتخاب کرنے میں اس کو کتنی مصیبت محسوس ہوئی تھی۔ پھر اچانک یہ جملہ اس کے ذہن میں یوں اتر گیا گویا وحی۔ اور پھر اس کو نروان حاصل ہوا۔ لیکن اس نروان نے اس کی روح کو شکستی نہ دی۔ بلکہ اس کے دل کی تاریکیوں اور ذہن کے گوشوں میں جالوں کا جمگھٹا ہو گیا۔

دوسرا مرحلہ اور بھی کربناک تھا۔

اس جملہ کو کسی اور شخص سے کہنے کے لیے خود کو تیار کرنے تک وہ کتنی روحانی اور ذہنی اذیتوں اور تکلیفوں سے گزرا تھا وہ خود ہی جان سکتا تھا۔ اس کی روح اس کا دماغ اس کا وجود، اس کے تصورات جھلس رہے تھے اور اب وہ ساکن و ساکت اور خاموش بیٹھا تھا۔ مضطرب اور بے چین انسانوں کے اس سیلاب سے علیحدہ جو چاروں طرف سے امڈ رہا تھا۔ آج دنیا میں سب شریف تھے، سب فرشتے تھے۔ جن کی روح گناہوں سے پاک تھی۔ جن کے چہروں پر تقدس اور پاکیزگی کی ضیاء تھی۔ اور آنکھوں میں عظمت و وقار کا جلال اور وہ خود کیا تھا! ذلیل، مکروہ اور گناہ گار نہ اس کی روح میں پاکیزگی تھی نہ جسم میں کوئی احساس تصور میں نہ تخیل میں۔

پھر اس نے اس پہلو پر دوسرے زاویوں سے سوچنا شروع کیا۔

یہی تو فرشتے ہیں۔ یہی تو وہ پاکباز ہیں جنہوں نے آج اس حد تک مجبور کر دیا ہے۔ ہونہہ سب کمینے ہیں۔ سب شریف بنتے ہیں۔۔۔ سب۔ اور پھر اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک غلیظ گالی ان فرشتہ صورت انسانوں کے لیے نکلی لیکن نہ معلوم کیوں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔

لیکن اس طور سوچنے کے باوجود بھی اس کو کسی آدمی کا انتخاب کرنا آسان نہ ہوا۔ ہر شخص جو اس کے قریب کھڑا ہوتا یا گزرتا تو وہ اس کو بہت غور سے دیکھتا اور مایوس ہو جاتا اور جب کوئی دوسرا آدمی اس کی نظر کے اس انداز کو تعجب اور حیرانی سے دیکھتا تو وہ خجل اور شرمندہ سا ہو جاتا۔

''تو سالا یہ بھی شریف ہے!'' وہ سوچتا اور پھر کسی دوسرے آدمی کو تا کنے لگتا۔ اس کے انداز میں کسی فاحشہ کی نظروں کا سا انداز تھا۔ ایک حریصانہ جذبہ جو ابھی تک محض جذبہ ہی تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر صبح سے گزری ہوئی باتیں دل میں دہرائیں جن کو وہ کئی مرتبہ دل میں دہرا چکا تھا۔ اور ہر مرتبہ اس نے روح کے لیے ایک نیا جہنم پایا تھا۔۔۔ ہر مرتبہ اس کے ذہن پر زہریلے بچھو یلغار کرتے۔ بھوک کے باوجود اس کا چہرہ آگ میں جھلس رہا تھا۔ سرخ ہو رہا تھا، پھر سرخی مدھم پڑتی گئی۔ ایک تاریک سایہ اسکے چہرے پر پھیل گیا جس طرح جلتے ہوئے انگاروں پر بتدریج راکھ کی تہہ جم جاتی ہے۔

پھر اسنے اپنے پیٹ سے آواز اٹھتی محسوس کی۔ آج پیٹ بھی باتیں کر رہا تھا اس نے قمیض کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنے پیٹ کو سہلایا جو کمر سے لگ چکا تھا، مگر وہ خاموش نہ ہوا۔ بھوکے بچے کی طرح بلکتا ہی رہا۔ چیختا ہی رہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا بلکتے ہوئے بچے کی چیخیں اس کے لیے نا قابل برداشت تھیں۔

شہر کی بارونق سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے وہ کھڑا ہوا تھا کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ایک دوست جو مل میں اس کے ساتھ کام کرتا تھا، کھڑا تھا۔ اور اچانک وہ ماضی میں کھو گیا۔ جب طویل بیماری کے بعد وہ مل میں کام پر گیا تو اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ منیجر نے کہا تھا کہ تمہاری صحت اس قابل نہیں کہ ہم تمہیں دوبارہ کام پر رکھ سکیں۔ اس نے بہت منت سماجت کی تھی۔ بہت کچھ یقین دلایا تھا کہ وہ کام کر سکتا ہے۔ لیکن کان بہرے ہو چکے تھے پھر وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔۔۔ اور

جب ملازمت اور اچھی کارکردگی کا سٹرٹفکیٹ اسے دیا گیا تو وہ چونکا۔ اس نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن احساس کی شدت سے زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ اب وہ بیکار ہو گیا ہے، اب وہ بیکار ہو گیا ہے، پھر اس کی صحت ہر جگہ آڑے آئی۔ وہ صرف ایک ہی کام کر سکتا تھا۔ مختلف ملوں میں اس نے اسی کام کے لیے کوشش کی لیکن اس صحت کو کیا کرتا جو طویل بیماری نے اس سے چھین لی تھی۔ اس کھال کو کیا کرتا جو ہڈیوں سے چمٹ گئی تھی۔ ان پسلیوں کو کیا کرتا جو اس پتنگ کے کانپ ٹھڈے معلوم ہوتے تھے جس کا کاغذ گل گیا ہو، ان آنکھوں کو کیا کرتا جو سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں، ان گالوں کو کیا کرتا جن میں اتنے گہرے گڑھے تھے کہ ہر طرف ایک ایک انڈا آسانی سے سما سکتا تھا، ان نسوں کو کیا کرتا جن میں خون کے محض سانس کی وجہ سے دھڑکن معلوم ہوتی تھی! جب کہ مل خون چاہتی ہے، گوشت چاہتی ہے، محض ہڈیاں، محض سانس، محض کانپ ٹھڈے تو وہ کچرا ہیں جو روزانہ بھنگی جھاڑو سے جمع کر کے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتا ہے۔

اس کا دوست کہہ رہا تھا ''یار اب تو کھانسی نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ ہر دم کھوں کھوں۔ منیجر نے کہا ہے کہ اسپتال جا کر دکھاؤں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ٹی۔ بی کے جراثیم دوسرے مزدوروں میں پھیلیں۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ یہ جراثیم مجھ میں کیسے داخل ہوئے۔ میں تو مل میں سب سے زیادہ صحت مند تھا۔ ان سے کہو کہ مل میں وہ مشینیں لگائیں جو روئی کے اڑتے ہوئے ریشوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں تو کان پر جوں نہیں رینگتی۔ بھیا روئی کا ریشہ پہننے کے لیے ہوتا ہے! کھانے کے لیے نہیں اور جب تم انہیں سانس کے ذریعے کھاؤ گے تو یہ پھیپھڑوں کے گرد جالا نہیں بنے گی تو اور کیا کرے گی''

وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ تنہائی کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔ ''تو کیا اب وہ تمہیں بھی علیحدہ کر دیں گے؟

''دیکھو! کیا پتہ کیا ہو''۔

''ہاں تمہیں نوکری بھی ملی یا نہیں؟''

''نہیں حالانکہ مجھے دق نہیں ہے۔ لیکن کمزوری۔۔۔'' پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا دوست سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔

مل میں جہاں وہ کسی زمانے میں ملازم تھا وہ تمام دن لوگوں کی باتیں سنتا۔ جن میں شدید جنسی بھوک کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ آوارہ عورتوں کے قصے وہ یوں مزے لے لے کر بیان کرتے گویا کوئی لذیذ چیز کھا رہے ہوں۔ اس ماحول کی اسی فضا کو سوچ کر اس نے سمجھا تھا کہ ایسے لوگ اس کو آسانی سے مل جائیں گے لیکن اب تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ایسے لوگ تو غائب ہی ہو گئے تھے۔ اپنی اس بے چارگی پر وہ اس وقت رونا چاہتا تھا، لیکن معدے کی آگ نے آنسوؤں کے سوتوں کو خشک کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے سر کو جھٹکا۔ نفی کے انداز میں سر کو ہلایا۔ ''نہیں۔ نہیں! میں یہ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کر سکوں گا''۔ سر کو تیزی سے جھٹکنے کی وجہ سے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ بچہ زور زور سے رونے چیخنے لگا۔ وہ ایک مرتبہ پھر دورخ میں جل رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا سڑک میں گم ہو گیا۔ ایک آدمی کی تلاش میں جس سے وہ یہ کہہ سکے۔

''صاحب مال چاہیے ایک دم فرسٹ کلاس''۔ یہ جملہ وہ شریف آدمی سے نہ کہہ سکا تھا۔

پھر رات کے سائے گہرے ہو گئے۔ سڑکیں خاموش ہو گئیں۔ انسانوں کا سیلاب کہیں گم ہو گیا۔ آسمان سے تیزی سے شبنم گرنے لگی اس خنک نمی میں اس کو یوں محسوس ہوا گویا تارے اور بھی نکھر گئے ہیں۔ ان کو روشنی اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ حالات تبدیل ہونے کے ساتھ ماحول کتنی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ اس نے سوچا فضا میں اس کو آسودگی اور اطمینان کی لہروں کی آوازیں ابھرتی محسوس ہوئیں۔ اس کا دل مطمئن تھا، ذہن آسودہ اور روح پر نور کی بارشیں ہو رہی تھیں۔

جب وہ اپنے مکان میں داخل ہوا تو کمرے میں پیلی پیلی اداس سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

"دروازہ بند کرو"۔ اس نے بیوی سے کہا۔

"کیوں کوئی اور نہیں ہے؟" بیوی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

اسکے سر پر گویا ایک ہتھوڑا پڑا۔ "نہیں کوئی اور نہیں ہے"۔ اس نے جواب دیا اس کی بیوی دروازہ بند کرنے چلی گئی اور وہ ایک مرتبہ پھر صبح کی باتیں دل میں دہراتا رہا۔ صبح جب وہ دونوں اٹھے تھے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انہیں معلوم ہوا کہ رات بھر بھوک کی شدت سے وہ نہیں سو سکے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ باوجود لاکھ کوشش کے اس کو نوکری نہیں ملی تھی۔ باوجود لاکھ خوشامد کے اس کو قرض نہ ملا تھا۔ دکان سے سودا ادھار نہ ملا تھا۔ تو مجبور ہو کر اس نے بیوی کے سامنے ایک نہایت گھناؤنی تدبیر رکھی تھی اس کی بیوی نے بھی کوئی مخالفت نہ کی۔ شاید وہ بھی اسی پہلو پر سوچ رہی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

"لیکن آدمی؟"

"وہ میں لایا کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔

اس کی بیوی دروازہ بند کر چکی تھی۔ اس نے تیزی سے کہا، "خدا نے ہمیں بچا لیا۔ مجھے نوکری مل گئی ہے لو یہ کھانا میں نے بھی ابھی تک نہیں کھایا۔ بھلا میں تمہارے بغیر کھا سکتا تھا! پھر اس نے بیوی کو زور سے بھینچ لیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے جسم سے علیحدہ کر دیئے۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی! ایسی مردنی جو فاقہ کی زردی سے بالکل علیحدہ تھی۔ وہ پلنگ پر گر پڑی اور سسکیوں اور آہوں کے درمیان اٹکتے ہوئے ہذیانی انداز میں کہا۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ ہم نہیں بچ سکے۔ میں نے کھانے کا انتظام کر لیا تھا"۔

اس کو اچانک یوں محسوس ہوا گویا وہ پھر پستیوں میں گرا ہے۔ سیاہ دھبے نے پھیل کر اس کے وجود کو ڈھانپ لیا۔ ایک گمبھیر احساس تنہائی۔ وہ کرب واذیت۔

☆☆☆

میراث

اقبال مجید

جب ٹیپو سلطان کا گھوڑا ٹی نگر سے گزرا اور بان گنگا کے پل کے قریب پہنچا تو ایک جلیبی والے کو دیکھ کر گھوڑا اچھل گیا۔ تھکے مارے گھوڑے نے بہت دنوں سے جلیبیوں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ بدکا اور دولتیاں اچھالنے لگا۔ ٹیپو اپنے گھوڑے کو بہت چاہتا تھا۔ پس اس نے جلیبی والے کو آواز دی اور آدھا کلو جلیبیاں اسی وقت خرید لیں۔ جلیبی والے نے ایک اخبار میں تول کر جلیبیاں دیں، ٹیپو اترا اور اپنے گھوڑے کو تازی تازی جلیبیاں کھلانے لگا۔ جلیبیاں ختم ہوئیں تو ٹیپو کی نظر اخبار کے ٹکڑے میں ایک خبر پر پڑی۔ ٹیپو کو خبر کی سرخی نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ سرخی کچھ اس طرح تھی۔

''ولایت سے شیواجی کی تلوار بھوانی کی واپسی کا مطالبہ''

ٹیپو نے شیواجی کے چرچے مڈل اسکول میں سن رکھے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ شیواجی بے جگر انسان تھا اور اس کے توپ خانے میں مسلمان توپچیوں کو بڑے اچھے اچھے عہدے ملے ہوئے تھے جنہوں نے بہت سی جنگوں میں شیواجی کے ساتھ میدان جنگ میں شجاعت کا ثبوت دیا تھا اور مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے لیکن جہاں تک اس کے علم میں تھا شیواجی کی تلوار ایک اچھی تلوار ضرور تھی۔ لیکن اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کے کھو جانے پر افسوس کیا جائے۔ پھر یہ کہ شیواجی ایک سردار تھا اس کے قبضے میں نہ جانے کتنی تلواریں رہی ہوں گی تو پھر یہ بھوانی کون سی تلوار تھی جس کی واپسی کے لیے۔۔۔

یکا یک ٹیپو سلطان کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک دم سے اسے ایک فلم یاد آ گئی جو بنارس کے گھاٹوں پر پوجا پاٹ کرانے والے کچھ پنڈوں پر بنائی گئی تھی اور اس میں ایک موٹا سانگڑا سا آدمی ہاتھ میں ایک بھیانک سی تلوار لیے ایک مسافر کی گردن مارنے سے پہلے ''جے بھوانی'' کا ڈراؤنا نعرہ لگاتا ہے۔ قریب تھا کہ ٹیپو سنیما ہال سے اٹھ آتا کہ اس کے دوست نے اس کو سمجھایا کہ یہ حقیقت نہیں فلم ہے۔

اس دن بھی اس کو بھوانی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا زبردست تجسس پیدا ہوا تھا اور رات کو وہ بدھوارے کے چوراہے پر یہی سوچ کر گیا تھا کہ بھوانی کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔

''کون خان۔۔۔؟ یہ بھوانی کیا شے ہے؟'' آخر کو اس نے پہلی فرصت میں اپنے سب سے پہلے ملاقاتی سے جو ابھی ٹھیک سے تہمد سمیٹ کر پٹیا پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا یہ سوال داغ دیا۔

ٹیپو کا ملاقاتی ایک بردکاٹ پٹھان تھا۔ بڑھا ہوا شیو ایک آنکھ قدرے چھوٹی، وہ ہمیشہ بیڑی الٹی جلا کر پیتا تھا اور کثیر الاولاد ہونے کے سبب زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہا کرتا تھا۔ اس کے کان میں لفظ بھوانی جیسے ہی پڑا تو اس نے تیور بدل کر ٹیپو کی طرف دیکھا اور سرد آہ کھینچ کر بولا۔

''سلطان کوئی اور بات کرو پٹھان، آپن کو اس لفظ سے ڈر لگتا ہے''۔

''ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے''۔ سلطان نے بھی اپنے دل کی بات کہہ دی۔۔۔

''پر دادا تجھے کیوں ڈر لگتا ہے؟''

سلطان کا ملاقاتی کوئی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ اس کا کل اثاثہ ایک کرائے کا مکان، ایک دبلی پتلی گھوڑی اور ایک

ٹوٹا پھوٹا تانگہ تھا۔ ریاست کے نوبت نقاروں کے درمیان اس نے آنکھ کھولی تھی، اپنے شہر کی وہ چڑھائیاں جن پر وہ کسی زمانے میں پڑ کھیرا سے ریلوے اسٹیشن تک ٹرین کے ساتھ ساتھ اپنا تانگہ دوڑاتا تھا اور ہمیشہ ریل گاڑی سے آگے نکلتا تھا، اپنے وطن کی وہی گھاٹیاں اب اسے ڈراتی تھیں اور وہ ان گھاٹیوں کو کھلے بندوں کوسا کرتا تھا۔

''برا کیا خان''۔۔۔وہ بدبدایا۔''قسم قرآن کی پان کی دکان رکھ لے پر تانگہ نہ چلائے''۔۔۔اس نے ایک آہ کھینچی۔۔۔''کتنے دن چلے گی گھوڑی''۔

سلطان سب سنتا رہا۔

''کتنے دن چلے گی گھوڑی؟۔۔۔ارے خان چماروں سے بدتر ہیں، انہیں بینک لون دے دیتا ہے آٹو رکشا خرید لیتے ہیں''۔

سلطان سب سنتا رہا اور سوچتا رہا بھوانی کے بارے میں کہ اس کا ساتھی پھر گویا ہوا۔

''دن بھر اڈے پر کھڑا جانور اونگھتا رہتا ہے۔ شام کو گھر کیا لے جاتے ہو؟ بولو کیا لے جاتے ہو؟''

سلطان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

''دادا میں نے پوچھا تھا کہ تجھے بھوانی سے ڈر کیوں لگتا ہے؟'' سلطان نے اس کو ٹوک دیا۔

''وہی تو بتا رہا ہوں خان۔۔۔ارے خان پٹھان جیسے دل لرز گیا۔۔۔سڑک پر مزے مزے چلا رہا تھا تانگہ، حرامی سڑے گھوڑی کے تھوتھن پر سپاٹا مارتا ہوا نکل گیا دھواں اڑاتا''۔

''کون؟'' سلطان نے سوال کیا۔

''ایک آٹو''۔ جواب ملا۔ نگاہ پڑی تو اس کی پیٹھ پر لکھا تھا۔۔۔''جے بھوانی'' قسم قرآن کی ایسی طبیعت بگڑی کہ تانگہ اسی وقت گھر واپس لے گیا اور جانور کھول کر پڑ رہا''۔

''پر میں تو شیواجی کی ایک تلوار کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا نام ہے بھوانی''۔

''ہوگی''۔ سلطان کا ساتھی برا سا منہ بنا کر بولا۔

''ولایت میں ہے۔ انگریز لے گئے تھے''۔ سلطان نے اطلاع دی اور بولا۔''اس تلوار کو ولایت سے واپس مانگا جا رہا ہے''۔

''ہاں تو دے دیں گے وہ، ان کے کس کام کی''۔

''اس تلوار میں کیا خاص بات تھی دادا۔ اسے واپس کیوں مانگا جا رہا ہے''۔

سلطان کے ساتھی کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ دوڑ گئی۔۔۔''تیری مقعد میں اتارنے کے لیے مانگ رہے ہیں''۔

پھر اس نے انگڑائی لی اور بولا۔۔۔''چلوں، جانور مالش بوت لے رہا ہے ان دنوں''۔

سلطان صبر و قناعت کی زندگی گزارنے والا ایک معمولی تانگے والا تھا۔ بچپن میں مڈل کے امتحان میں فیل ہوا۔ جوانی میں اکھاڑے میں ایک کشتی مارنے پر ٹیپو کا لقب پایا۔ بچپن اور جوانی کے بیچ کسی دن بس چپکے سے اس کے ہاتھ میں گھوڑے کی راس پکڑا دی گئی۔

سلطان کے حافظے میں سب کچھ تر و تازہ تھا۔ ابھی کچھ ہی سال پہلے کی بات ہے جب شہر میں آٹو رکشا نہیں چلتے تھے۔ جب سڑکیں اتنی چوڑی نہ تھیں، جب گھاٹیاں اتنی اونچی نہ تھیں، جب فاصلے اتنے زیادہ نہ تھے۔ جب پیرا گوٹھ میں نئے نئے سندھی آئے تھے، جب پٹیاں ٹوٹی نہیں تھیں۔ جب خوف اتنا پاس نہیں تھا اور جب وسوسے اتنے دلیر بھی نہیں ہوئے تھے، جب بیالوگ اتنی

گھٹیا سگریٹ نہیں پیا کرتے تھے اور جب سیٹھ ساہوکار خسارہ دکھانے کے لیے اور شریفوں کی پگڑی اچھالنے کے لیے اردو کا اخبار نہیں نکالا کرتے تھے۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ وہ اپنے گھوڑے کے سموں پر مکھن ملتا تھا اور چاندرات میں دوسو روپے اپنے ہاتھوں سے خرچ کرتا تھا۔

سلطان شہر کے بہت سے سمجھدار اور شریف لوگوں کو جانتا تھا۔ ایک دن وہ ابراہیم پورہ سے گزرا تو گھر ومیاں کی دکان پر اسے شہر کے کچھ مہذب اور خوش فکر لوگوں کا جماؤ دکھائی دیا۔ سلطان ان میں سے اکثر چہروں کو پہچانتا تھا۔ پہنچا سلام کر کے ایک سے بولا۔

''میاں معاف کرنا ایک بات بتاؤ گے؟''

''ہاں ہاں''۔۔۔ سلطان کو جواب ملا۔

''بوت دنوں سے سوچ رہا ہوں یہ بھوانی کیا چیز ہے''۔

''بھوانی'' ایک نے کہا۔

''بھوانی'' دوسرے نے کہا۔

سلطان نے جن صاحب سے سوال کیا تھا انہوں نے سوال کو دوسرے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو خان ان کے سوال کا جواب دو۔ پوچھتے ہیں بھوانی کیا چیز ہے؟'' ایک خوش فکر نے چٹکی لی ''ارے خان بھوانی نہیں جانتے۔ یہ ایک طرح کی بیماری ہے، پیٹ میں اتر جاتی ہے تو آدمی زیادہ کھانے لگتا ہے''۔

یہ سن کر سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ سلطان وہاں سے کھسیانا ہو کر چل پڑا اور کچھ دور تک اس جرگے میں بیٹھے ہوئے کرخندار خاں، بابو خاں، شاعر خاں، بے روزگار خاں، صحافی خاں اور مدرس میاں کے چھوڑے ہوئے قہقہے سلطان کا پیچھا کرتے رہے۔

یہ بازار کے لوگ کہ نہ تو یہ سفاک لوگ تھے، نہ چالاک لوگ تھے، نہ بے بس لوگ تھے، نہ تو انہیں بھولا ہی کہا جا سکتا تھا اور نہ موقع شناس تو پھر ان بازار کے سیدھے سادھے لوگوں میں یہ وصف کہاں سے پیدا ہو گیا تھا کہ جس بات کو جب چاہتے ہنسی میں اڑا دیتے۔ یکایک سلطان کو لگا کہ انہوں نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ وہ جھنجھلایا ہوا پلٹا اور ان لوگوں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ خاموشی سے سلطان کی طرف دیکھنے لگے تو وہ اداس ہو کر بولا۔

''آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں''۔ انہیں سلطان کا یہ سوال اچھا نہیں لگا لیکن چونکہ سلطان پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی اس لیے ایک نے کہا۔

''کیوں بھائی کیا اب ہنسیں بھی نہیں۔۔۔۔''

''پر میں نے تو بس ایک سوال ہی کیا تھا''۔

سلطان کو سنجیدہ دیکھ کر ایک صاحب جن کے کان میں آلہ لگا تھا قدرے سنجیدگی سے بولے۔

''بھائی سلطان تمہارے پاس تو ایک ہی سوال تھا نا''۔

''جی ہاں''۔

''لیکن ہمارے پاس سینکڑوں سوال ہیں''۔

''لیکن آپ لوگ ہنس کیوں دیئے؟''

''ہنس اس لیے دیئے سلطان بھائی کہ تمہارے سوال کا جواب تو ہم سے مل گیا لیکن ہمارے سوالوں کا تو کوئی الٹا سیدھا جواب بھی نہیں دیتا اور سلطان بھائی تم ہی انصاف کرو (کہ انصاف تمہارے بس میں نہیں) انصاف کرو کہ جس کے سینہ میں سینکڑوں

سوال ہوں اور اس کو ایک سوال کا بھی جواب نہ ملے اور ہر پل، ہر گھڑی وہ نر اور مادہ سوالات آپس میں صحبت کر کے ہزاروں کی تعداد میں بچے جنتے چلے جائیں اور سینہ پھٹنے لگے اور سانس رکنے لگے اور دم گھٹنے لگے اور گھر بھی اچھا نہ لگے اور بیوی بچے کاٹنے کو دوڑیں اور سفید پوشی لازمی ہو اور کلاہ کو کج رکھنا بھی ضروری ہو اور ہر دستر خوان کے ایک ایک لقمے کا حساب رکھتے رکھتے آنکھیں ڈبڈبا آئیں تو سلطان میاں آدمی کو ہر وقت ہنستے رہنا چاہیے۔ جب کوئی سوال کرے تب بھی ہنس دینا چاہیے اور جب کوئی جواب دے تب بھی ہنس دینا چاہیے"

یہ آدمی جو بہت بول رہا تھا بہت خاموش رہنے والا آدمی تھا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ اس آدمی کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے عینک کے پیچھے چمکتی ہوئی دو آنکھیں نم دیدہ ہو گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے اس کو جلدی سے پانی پلایا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

ٹیک اٹ ایزی۔

ٹیک اٹ ایزی۔

سلطان کھڑا اس بہت زیادہ بولنے والے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ آدمی سلطان کی آنکھوں میں نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"سیدھی بات یہ ہے کہ تم بھی خائف ہو اور سیدھی بات یہ ہے کہ خوف ہم کو بھی ہے اور سلطان بھائی اچھا یہ ہے کہ تمہارے پاس تمہارے خوف لفظ نہیں رکھتے اور برا یہ ہے کہ ہمارے پاس اس خوف کے لیے اتنے الفاظ موجود ہیں کہ ہم نے گھبرا کر ہنسنا شروع کر دیا ہے۔ تم بھولے اور ناسمجھ ہو اس لیے مارے جاؤ گے، ہم حرامزادے اور کمینے ہیں اس لیے مارے جائیں گے۔ نجات دونوں طرف نہیں ہے۔ اس لیے سلطان بھائی جب بھی موقع ملے بھینسے کے کباب کھاؤ، اپنی عورت کے ساتھ برا کام کرو، پھر ایک بیڑی جلاؤ اور ہنستے ہوئے چلے جاؤ۔ تمہیں قسم ہے اپنے اکلوتے لڑکے کی اس کے علاوہ اگر کچھ کیا تم نے تو سمجھنا اپنی ماں کے ساتھ برا کام کیا تم نے۔۔۔ سالے۔۔۔ حرامی۔ ہم سے پوچھتا ہے کہ بھوانی کیا چیز ہے"۔

ٹیک اٹ ایزی۔

ٹیک اٹ ایزی۔

اس روز سلطان بار بار جیسے چونک پڑتا۔ چوک میں سٹے کا نمبر لگاتے وقت اس نے اپنی میلی سی قمیص میں جب ہاتھ ڈالا تو ہر بار ایک روپے کے نوٹ کے بجائے کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا کوئی بلہ یا الیکشن میں کھڑے ہونے والے کسی نمائندے کا پمفلٹ یا کسی اپیل کا پھٹا پرانا پرچہ نکلا۔ اس نے سب کو خوب خوب گالیاں دیں۔ پھر اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے کے دانے کے پیسوں میں سے سٹے کا نمبر لگایا۔ دو گرم گرم سموسے کھائے اور بدھوارے کے چوراہے پر پہنچ کر سولہ گٹی کھیلنے لگا کہ عشاء کی نماز کی اذان مائکروفون پر سنائی دی۔ اسے جیسے جھٹکا سا لگا اور وہ بے چین بے چین سا چالیس چلنے لگا۔ آخر کو اس سے نہیں رہا گیا تو وہ اپنے مقابل سے پوچھ بیٹھا۔

"بھائی میں یہ بھوانی کیا چیز ہوتی ہے"۔

"بھوانی تو ہندو ہوتی ہے"۔ اس کے مقابل نے جواب دیا۔

"یہ تو اپن کو بھی پتہ ہے کہ یہ ایک دیوی کا نام ہے"۔

"عید کے روز میں مراد آباد میں تھا"۔ اس کا مقابل بولا۔ "وہاں میں نے راتوں میں کئی بار یہی نام سنا تھا۔۔۔ ایسا لگتا

تھا خان جیسے کلیجہ باہر آ جائے گا۔ بڑے بوڑھے بتاتے ہیں کہ 47ء میں بھی ایسے نعرے کبھی نہیں لگے۔

''کیا کہتے تھے وہ لوگ؟'' سلطان نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ جواب ملا۔

''وہ کہتے تھے جے بھوانی''۔

''کون خان؟ ایسا کیوں کہتے تھے؟''

''اس لیے کہ ہم ڈر جائیں، اور ہم ڈرتے تھے۔ قسم قرآن کی میاں حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو گئے۔ اللہ کی پناہ کیسی راتیں تھیں، کیسے دن تھے''۔

سلطان کی طبیعت اچٹ گئی۔ وہ بچے کھچے پیسوں سے گھوڑے کے لیے دانہ لے کر گھر چلا گیا۔

دوسرے روز جمعہ تھا اور سلطان زندگی میں شاید تیسری یا چوتھی بار جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد گیا۔ وہاں اس نے وعظ میں کچھ اس طرح کی باتیں سنیں کہ انسان کو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے، کسی کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے۔ اور اپنے دل سے سارے خوف نکال دینا چاہیے۔ نماز ختم ہونے پر اس نے راستے میں ہی امام صاحب کو جالیا اور ان سے بولا۔

''میاں میں کیا کروں؟''

''کیا بات ہے؟''

''پتہ نہیں پر بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں بس ایک ڈر سا لگا رہتا ہے ہر وخت''۔

''کیا کام کرتے ہو؟''

''تانگہ چلاتا ہوں''۔

''کتنے بچے ہیں؟''

''بس ایک لڑکا ہے''۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''سلطان''۔

''ماشاءاللہ۔ کتنا اچھا نام ہے تمہارا۔ جس کا نام سلطان ہو وہ کبھی ڈر سکتا ہے بھلا۔ تم اپنے گلے میں علیؓ شیر خدا کا نام ہر وقت پہنے رہا کرو۔ سارے ڈر ختم ہو جائیں گے۔ وہ تم کو ہر آفت سے بچائیں گے''۔ یہ کہہ کر امام صاحب آگے بڑھ گئے۔

سلطان نے بعد میں پتہ لگایا کہ یہ نام کہاں ملے گا تو اس کو معلوم ہوا کہ جمعراتی بازار میں پھول متی نام کی ایک بیوہ کی چھوٹی سی طغروں کی دکان ہے وہاں یہ نام مل جائے گا۔ ایک دن سلطان اتفاق سے پھول متی کی دکان کے سامنے سے گزرا تو ٹھہر گیا۔ بوڑھی بیوہ کسی گاہک سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''حاجی صاحب! مجھ بیوہ کو اور تھوڑی کاٹنی ہے۔ تم سب کا ہی سہارا ہے۔ دکان کا کرایہ پائی پائی ادا کر دوں گی۔ چار دن کا سے اور دے دو''۔

سلطان نے سوچا پھر موقع ملے یا نہ ملے طغرہ لیتا ہی چلے۔ یہ سوچ کر وہ پھول متی کی دکان پر گیا۔ دکان پر اس وقت پھول متی کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ننگے سینے کی پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر سوجن تھی۔ وہ بار بار دمے کے مریض کی طرح سانس لے رہا تھا۔ یکایک سلطان کی نظر لڑکے کے گلے میں لٹکی ہوئی کسی چیز پر پڑی۔ اس نے غور سے دیکھا وہ ایک طغرہ تھا جس پر خوبصورت حروف میں لکھا تھا۔ ''جے بھوانی''۔ سلطان نے وہاں طرح طرح کے طغرے دیکھے۔ سب میں ایک ہی طرح کی

کاریگری تھی، ایک ہی طرح کا مال تھا۔ ''یا علیؑ'' سلطان کی نظر یکا یک ایک طغرے پر پڑی جسے سلطان نے آنکھوں سے لگا کر خرید لیا۔

رات اپنے بستر پر سلطان طغرے کی ڈوری کے سرے پکڑے۔ اسے کچھ دیر دیکھتا رہا اور چاہتا تھا کہ اسے اپنے گلے میں پہن لے کر اس کی نظر اپنے بڑے لڑکے پر پڑی جو پاس ہی زمین پر ایک پھٹی دری بچھائے سو رہا تھا۔ سلطان چپکے سے اپنی چارپائی سے اٹھا اور اس نے وہ طغرا اپنے بچے کے گلے میں باندھ دیا۔ اور اس پیار سے اپنے بچے کو دیکھنے لگا جیسے اس نے دوسری بار اپنے باپ ہونے کا حق ادا کیا ہو۔ پہلی بار اس کو یہ احساس تب ہوا تھا جب اس نے بچے کی نازک ہتھیلیوں میں اول اول گھوڑے کی لگام تھمائی تھی۔

☆☆☆

آگہی کے ویرانے

اقبال متین

ہم سڑک پر بیٹھے ہوئے ایسے لوگ ہیں جو شاید کسی حادثے کے منتظر ہیں اور انتظار سچ پوچھیے تو ہم کرنہیں رہے ہیں بلکہ زندگی اور وقت نے سازش کر کے ہمیں ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے جہاں بہر حال کسی کا انتظار کرنا ہے۔ دراصل یہ انتظار امید وبیم کے دوراہے پر وقت کی کسی سازش کا دوسرا نام ہے اور جب یہ سازش مکمل ہولے گی تب وہ حادثہ وقوع پذیر ہوگا اور کون جانے تب بھی نہ ہو۔

جب وہ یہ بات اپنے اس دوست سے کہہ چکا جو دور دیس سے آیا تھا تو پھر وہ خاموش ہوگیا۔ اس نے یہ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس کی پچھلی ساری زندگی کے چوکھٹے میں اس کے الفاظ کا دیا ہوا یہ چھوٹا سا نامکمل پوٹریٹ فٹ بھی ہوا ہے یا نہیں اور وہ دوست جو اس کی زندگی سے تھوڑا بہت واقف تھا بات کو کہاں تک سمجھ سکا ہے۔

جب وہ دوست جا چکا اور ساتھ ہی اس کی قد آور بیوی بھی اس کے پہلو بہ پہلو روانہ ہوئی تو وہ سوچنے لگا۔

اس کے دوست نے بڑے اطمینان سے کہا تھا کہ جب وہ لنچ کے لیے آفس سے گھر آتا ہے۔ تو اس کی بیوی کھانا تیار لیے بیٹھی رہتی ہے اور یہ لازم ہوتا ہے کہ کھانا اسے گرم ملے۔ ٹھنڈا کھانا وہ کسی قیمت پر برداشت ہی نہیں کر سکتا۔۔۔ ایک آدھ بار بھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے تو پھر وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

ایک چھناکے سے کھانا کی پلیٹ دیوار سے ٹکرا سکتی ہے۔

وہ عمر بھر گھر میں کھانا نہ کھانے کی بات کر کے جھوٹا ہاتھ نیپکن سے پونچھتا ہوا گھر سے دندناتا نکل سکتا ہے۔

اس کی بیوی اتنا رو سکتی ہے جیسے اس کے بعد رونے کو کچھ نہیں رکھے گی۔

اور جب وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا اس کی بیوی بڑی بڑی آنکھوں میں محبت کی مجبوریاں چھپائے اسے دیکھ رہی تھی اور جو مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی اس کی تہہ میں کسی ایسے ڈھکے چھپے سکون کا احساس تھا جو عورت کے ذہن میں مرد کی فوقیت کو تسلیم کر لینے کے بعد عورت کا مزاج بن جاتا ہے۔

اور جب وہ یہ کہہ رہا تھا کہ رات جب میں کلب سے لوٹتا ہوں تو یہ جاگتی رہتی ہوں۔۔۔ سوتی رہیں تب بھی اٹھ جاتی ہیں اور ٹھنڈی چیزیں گرم کر کے مجھے کھلاتی ہیں۔ جب تک میں کھاتا رہوں میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی ہیں۔

اور جب اس کا دوست یہ باتیں کر رہا تھا تو اس کو اپنے گھر کی رسوئی میں ایک بھگونے میں رکھا ہوا وہ خشکہ یاد آیا جس میں سے پھدک کر ایک چوہیا نکل بھاگی تھی اور جمے ہوئے سالن کا وہ کٹورا جس پر جھینگر اس طرح بھاگ رہا تھا جیسے اسے چوہیا کا تعاقب کرنا ہو، اور سارے انقلابی نظریوں کی گرمی اس کے ذہن میں ٹھنڈے کھانے کی پھپھوندی بن گئی تھی۔

لیکن اس کے پردیسی دوست کی قد آور بیوی بڑے فخر سے مسکرا رہی تھی اور دونوں ہی مطمئن مطمئن سے نظر آتے تھے۔

اس کا ذہن آج بھی اس شرمساری کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس کے ساتھ بھی یہی سب کچھ کیا جائے جو اس کے پردیسی دوست کی بیوی اس کے دوست کے ساتھ کرتی رہتی تھی۔۔۔ وہ کیسے لوگ ہیں۔ جو ان باتوں پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

لیکن اس کے گھر کا تو عالم ہی جدا تھا۔ وہ سوچنے لگا اسی کے نظریوں کو اپنا کر اسی کے لوگ اسی کے گھر میں اسی کو بھول گئے تھے اور اب وہ تنہا تنہا۔ اکیلا اکیلا رہ گیا تھا اس کا یہ پردیسی دوست دراصل سو فی صد ہندوستانی ہے لیکن جب وہ لندن گیا ہے تو زن و

شوہر کے پرانے ہندوستانی تصورات و تعلقات کو اپنے ساتھ لے گیا ہے اور لندن میں بھی اسی پر کاربند ہے۔

یہاں اس کے گھر کا عالم یہ ہے کہ اس کی بیوی اپنے بچوں کی کسی اردو کتاب کو ہاتھ لگانے میں بھی اپنے ددھیال کی اہانت محسوس کرتی ہے کیوں کہ اس کے پپا گیارہ سال کی عمر میں لندن گئے تھے۔۔۔ لوٹے تو پتلون کی جیب خالی تھی اور ہاتھ میں لندن کی خاک کے سوا کچھ نہ تھا۔ کچھ تو انگریزی سے پیار کا یہ سبب تھا کہ پپا لندن ہو آئے تھے اور جب وہ گڑیا جیسی منی سی تھی تو مماں کا چہرہ دیکھنے کو ملتا ہی نہ تھا مس ڈالفن ڈیفل ساتھ سوتی تھیں جو گورنس تھیں۔ دن بھر گٹ پٹ کرتیں اور صلیب پر چڑھے عیسیٰ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سر جھکانے سے اس پروگرام کا آغاز ہوتا۔

بات کچھ اس طرح تھی کہ نیچے بارہ دری میں جھبے والے مرشد رہتے ہوئے اور اوپر بنگلے پر جھبے والے پادری کا قیام تھا پپا لندن سے لوٹے تھے تو سارے لندن کو وہیں چھوڑ آئے تھے۔ ساتھ کچھ نہیں لائے یہاں تک کہ وہ ٹیکنیکل علم بھی نہیں جس کے لیے وہ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی روح بالکل مشرقی تھی جسے جبراً مغرب میں قید کیا گیا تھا۔ اپنے دیس کو آئے ہیں تو ایسے آئے ہیں کہ بھک سفید اچکن، بھک سفید پاجامہ، اور بھک سفید براق سی شیروانی پہناوا ہوا۔ لمبے لمبے دستر خوانوں پر کنبے کے ساتھ آلتی پالتی مار کر یوں نوالہ توڑا جیسے افرنگ کا چھری کانٹا چھونے سے انگلیاں فگار ہوں گی۔۔۔ اذان ہوئی تو نماز کے لیے کپڑے کی سبک سی گول جالی دار ٹوپی اوڑھ لی۔ کوئی محترم دن آیا تو مولود پڑھوانا یا گھر والوں کو لے کر خود مولود پڑھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ ایک ایک بج گیا۔ دو دو بج گئے۔ کبھی کبھی تو صبح ہو گئی۔

السلام اے دیں کے سلطاں السلام

یہ تو ہوتا رہا نیچے بارہ دری میں۔۔۔ دین کے سلطاں پر سلام پر سلام پر اس کی امت نے بھیجے۔ ادھر بنگلے پر ڈالفن ڈیفل نے مولود کی آوازوں سے چونک کر اٹھتے ہوئے بچوں کو گھر کی دی۔۔۔ سو جاؤ فادر گاڈ نانٹی بے بیز کو اچھا نہیں مانگتا۔۔۔ ماں باپ دین کے سلطان پر سلام بھیجتے رہے۔ اولاد عیسیٰ کے ساتھ صلیب پر چڑھتی رہی۔ معاشرے اسی طرح ٹوٹتے ہیں۔ جب لوگوں کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ مانگے کے ذہن مانگے کی تہذیب تو نہیں بن سکتے۔ ان کی شکست و ریخت اصلیت سے ٹکرا کر تو ہوتی ہی ہے لیکن اس میں یوں بھی ہوتا ہے کہ اصلیت بھی مسخ ہو جاتی ہے۔ یہی سب کچھ اس کی بیوی کے ساتھ بھی ہوا۔ پپا تو اب صرف انگریزی میں پکارے جانے کی حد تک رہ گئے تھے۔ بچے پپا اور ممی کو گڈ مارننگ کر لیتے تو پھر دوسرے دن گڈ مارننگ ہوتی بقیہ سب کچھ ڈالفن ڈیفل کرتی۔

ممی خوش تھیں کہ چلو 'صاب' لندن سے آیا ہے تو لندن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بنگلے کے لیے لے آیا ہے۔ اس طرح پپا اور ممی جب اپنے بچوں کو لندن کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں رکھ کر مطمئن ہو گئے تو ایک مستقبل مر گیا اور پھر مولود شروع ہو گیا۔

چاہیے مجھ پہ **عنایت** شہہ دیں تھوڑی سی
دیجئے قبر کو یثرب میں زمیں تھوڑی سی

نہ پپا کو یثرب میں زمین ملی نہ بچوں کو انگلستان ملا۔ اپنی زبان جس میں تتلانا سیکھا تھا ڈالفن ڈیفل کے ہاتھوں بے موت ماری گئی اور پھر انہیں گٹ پٹ بھی تو نہ آئی۔۔۔ صرف ہندوستانی کھلونوں میں کسی گرجا گھر کے بنے ہوئے دماغ فٹ کر دئے گئے تھے وہ بھی اسی طرح کہ فٹنگ برابر نہ ہوئی تھی۔

دوست جا چکا تھا۔ اس کی قد آور بیوی بھی اپنی مشرقی تہذیب کو پلو میں باندھے اس کے پیچھے جا چکی تھی۔۔۔ وہ سوچنے لگا اب یہ دوستی تو اس قدر رقیبی رشتے میں بدل گئی ہے لیکن اس کا ذہن آج بھی دوستی کی اصطلاحوں میں ہی سوچتا ہے۔ اپنے دوست سے مل کر وہ غیر ارادی طور پر اپنی بیوی سے اس کا تقابل کرنے لگا۔ آخر ان دونوں بہن بھائی میں یہ بعد المشرقین کن حالات کا پیدا

گردہ ہے۔۔۔؟

دونوں نے صلیب پر چڑھے عیسیٰ کے آگے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سر جھکایا ہے تو ڈالفن ڈیفل نے پہلے مسکراہٹ پھینکی پھر چاکلیٹ پھینکے۔

مولود کی آواز پر رات گئے وہ نیند سے چونکے ہیں تو ڈالفن ڈیفل نے دونوں ہی سے کہا ہے کہ ''فادر گاڈ ناٹی بے بیز کو اچھا نہیں مانگتا''۔

لیکن اپنی بیوی کے ساتھ مغربی ملک کو جانے والا اس کا دوست صلیب پر چڑھے عیسیٰؑ کو یہیں چھوڑ گیا اور مولود کی آواز میں نیند سے چونکانے والا جتنا تاثر تھا اپنی قد آور بیوی کے کانوں میں اس طرح بھر دیا کہ وہ آدھی رات کو بھی چونک کر اٹھی تو اپنے شوہر کا کھانا گرم کرنے کے لیے چولہے کی طرف بھاگی۔اور اس کے دوست نے اسی میں بہتری سمجھی کہ اس کی بیوی مغربی ماحول میں رہ کر ''فادر گاڈ کی ناٹی بے بی'' ہی بنی رہی اور لندن میں رہ کر یثرب کی زمین تلاش کرتی رہی کہ اسی میں اس کے دوست کی بھلائی تھی۔

جب اس نے اپنی ٹھنڈی دیگچی سے پھدک کر بھاگتی ہوئی چوہیا کو یاد کیا تھا۔کٹورے سے نکلتے اس جھینگر کو یاد کیا تھا جو چوہیا کا پیچھا کر رہا تھا۔جب اس کو اس کھانے کے خیال سے گھن آتی تھی جو وہ کھا چکا تھا تو اس نے نظریاتی تسکین کو جواز بنا کر خود کو مطمئن کرنا چاہا تھا۔۔۔یہ تو زیادتی ہے۔صریحاً زیادتی۔خود رات گئے لوٹیں بھی اور یہ بھی نہ سوچیں کہ بیوی کی نیند خراب ہوگی، الٹی وہی مجرم ٹھہرے کہ کھانا گرم نہیں رکھا۔

پھر اسے وہ راتیں یاد آئیں جو اس نے بیرونی برآمدے میں گزار دی تھیں کہ کسی کی نیند نہ ٹوٹے اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سوچا۔۔یہ بھی تو زیادتی ہے کہ باورچی خانے کی گندگی میں کھانا اس طرح رکھ دیا جائے کہ بیک وقت چوہیا بھی کھائے، تم بھی کھاؤ اور جھینگر بھی کھائے۔۔۔سلیقے سے یہی چیزیں میز پر بھی تو رکھی جا سکتی تھیں۔۔۔کوئی اس کے دل کے چور کو پکڑ کر مین میخ نکالتا۔۔۔

لیکن آخر کار اس نے خود کو قصور وار ٹھہرایا۔سب کچھ تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔تمہارے ہی انقلابی نظریوں نے تمہاری سیدھی سادھی گھریلو زندگی کا حسن نوچ کر پھینک دیا ہے۔تم نے الٹی سیدھی جو باتیں سیکھی تھیں اس کا پرچار خود ہی اپنے گھر میں کیا۔وہ زندگی جو تجربوں سے دور تھی۔۔۔وہ زندگی جو انقلاب کے رومانی تصور میں ہر تہذیبی قدر سے ٹکرا ٹکرا جاتی تھی، آج اسی زندگی کا جنازہ اپنے کندھے پر رکھے تم سوچ رہے ہو، اسے کہیں دفنایا بھی تو نہیں جا سکتا۔۔۔!! کہ اب تو یہی ہماری زندگی کے اصلی خدوخال ہیں۔

تم اپنی زمین کھو چکے ہو۔

اور اس بے زمینی کا احساس تمہیں اس وقت ہوا جب تمہارے اچھے دن تیزی سے بیت گئے تھے۔خوش حالی میں آنکھ کھولے ہوئے بچے جب شعور کی طرف بڑھے تو باپ اس قدر مجبور محض تھا کہ وہ جب چاہے اس کی ہنسی اڑا سکتے تھے۔اپنی اولاد کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو بروقت پورا نہ کر سکے تو ہر باپ تقدس کی بلندی سے نیچے اتار دیا جاتا ہے۔۔۔اور ماں سے نظریاتی اختلافات کی بنیاد اہم حصہ ادا کرے تو پھر اس کی قسمت میں کھڈ بھی ہیں کھائیاں بھی۔ہمارے معاشرے میں باپ معاشی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس سے ہٹ کر اس کا وجود، وجود محض ہے۔وہ اپنے گھر کو خوش حالی دے سکتا ہے تو گھر بھر کی محبتیں اس کے ساتھ ہیں۔وہ ان خوشیوں کی ودیعت کا اہل نہیں ہے تو پیار کے لیے ترس ترس کر رہ جانا اس کا مقدر ہے۔باپ اور اولاد کا اس سے ہٹ کر کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔۔۔اور ماں جب چاہے اس رشتے کے بخیے ادھیڑ سکتی ہے۔۔۔عورت معمولی سی شے نہیں ہے اور عورت ماں بن جائے تو ناقابل تسخیر ہے۔

چاہیے مجھ یہ عنایت سہے دیس توری سی

چاہیے کھبر کو یشرف میں جمیں توری سی
ممی۔۔۔ممی۔۔۔ممی نانابابا یہی گاتے تھے نا۔
نہیں رے وہ نہیں گاتے تھے۔۔۔گاتے تھے ان کے حالی والی۔۔تیرا نانا تو گیارہ برس کا تھا کہ لندن چلا گیا۔۔۔اور جب آیا تو۔۔۔
ممی۔۔۔نانا ممی تو یہی بولتی ہے۔
یہ سب گاتے ہوں گے نانا ممی کے 'کٹنے' کے لوگ جو میرے باپ کو گھیرے رہتے تھے۔ یہ نانا ممی ہی نے تو زندگی کا ناس مار دیا ہے۔
نہیں، ممی، نانا ممی نے کبھی مجھے نہیں مارا۔۔۔وہ تو مجھے پیار کرتی ہے۔۔۔ماربلس دلاتی ہے۔گلاب کی امرتیاں دلاتی ہے۔۔۔لیکن ممی میں یہ گاتا ہوں تو نانا ممی کبھی روتی ہے کبھی ہنستی ہے۔
اور اس نے پھر تان اڑائی۔
سہےدی توری سی
یشراف میں جمی توری سی
اور جب اس نے منے کو اٹھا کر چوما تو اس کا جی چاہا کہ منے کو اس کی ضرورتوں کا احساس ہونے سے پہلے خوب خوب چوم لے۔
منے نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔
کلفی ملائی کھلاؤ۔
اور وہ کھسیانا سا اپنی جیب میں منے کے باپ کو تلاش کرنے لگا جو اسے نہیں ملا۔
اور اس کے بعد وہ اپنے آپ کو ڈھونڈھتا رہ گیا۔۔۔اپنی ہی تلاش میں سرگرداں جب وہ خود کی کھوج میں اپنے ماضی تک جا نکلا تو بے شمار آئینے اس کی راہ میں ٹوٹے پڑے تھے اور جب جھک کر اس نے ان آئینوں کے ٹکڑوں کو سمیٹنا چاہا تو ہر ٹکڑے میں اس کو اپنا چہرہ نئے روپ میں ملا۔۔۔ناک، کان، آنکھیں سب ہی اپنی جگہ پر تھے لیکن چہرے کا مجموعی تاثر دوسرے سے اس حد تک مختلف تھا کہ یہ چہرے ایک دوسرے کو پہچاننے کے لیے تکے جا رہے تھے۔
بہت تلاش کرنے پر کچھ دیر کے لیے اس کی نگاہ ایک چہرے پر ٹھہر گئی۔اس نے پلکیں جھپکائیں جیسے آنکھوں کی بے خوابی کنکر بن گئی ہو۔۔۔
تو تم ہو۔۔۔چلو کالج کے کسی گوشے میں بیٹھ کر تم سے باتیں کروں۔
لیکن اس نوجوان چہرے نے نفرت سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔تم کب تک اپنے آپ سے باتیں کرتے رہو گے۔۔۔تمہیں تو ہو جنھوں نے اپنے رومانی انقلابی نظریوں میں الجھا کر مجھ میں انسان کو پہچاننے کی صلاحیت ہی سرے سے مفقود کر دی۔۔۔میں کالج سے نکلا تو ہر چیز میں میں نے بنیادی اچھائیاں تلاش کیں۔
لیکن یہ بنیادی اچھائیاں کیا ہوتی ہیں!
کیا وہ لڑکی جو تمہاری محبوبہ دل نواز تھی بنیادی اچھائی تھی!!
کیا تمہارے سارے آئیڈیل بنیادی اچھائیاں تھے!
لیکن ان کی صورتیں ملتی جلتی تھیں۔۔۔۔بے حد من موہنی!!
اور اب آئینے کے ایک ٹکڑے میں ایک چہرہ اس کی نظروں کے آگے ٹھہر گیا تو یہ وہی لڑکی تھی جس کو اس نے جان کی

بازی لگا کر اپنایا تھا۔

اللہ نے صورت اتنی پیاری سی دی تھی کہ صورت دیکھنے کے بعد اس کے بھیتر جھانکنے کو ہوش کہاں رہے تھے۔اور وہ تو یوں دیوانہ ہوا تھا کہ ہوش کھو بیٹھا تھا۔آج کی زندگی جب اس کی ہڈیوں کا گودا کھسوٹ کرنا چننے لگی تو اس نے کتنی ہی بار سوچا۔

وہ اسے پا نہ سکا تو؟

کیا زندگی اتنی ہی اذیت دہ ہوتی جتنی آج ہے!

آج تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔جب چاہا آسمان کو زمین پر اتار دیا۔۔۔جب چاہا زمین کو اٹھا کر آسمان پر دے مارا۔منٹ بھر میں کسی کی توصیف کے پل باندھے۔منٹ بھر میں اسی کو پاتال میں **پھینک** دیا اور ہر صورت میں مگن ہو گئی۔اس کے مزاج کی یہی بے تعلقی دراصل اس کی کامیابی کا راز تھی۔زبان کی کاٹ کہتے ہیں تلوار کی کاٹ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ہوتی ہوگی۔نہیں بھی ہوتی ہوگی۔۔۔اسے ان ساری باتوں سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔گھاؤ لگا کر اتنی آسانی سے بھول جاتی۔۔۔اب بیٹھے تڑپا کرو۔۔۔زخم مندمل ہو جائے تو خوش ہو لو۔۔۔اسے نہ زخم ہرے کرنے کا دکھ ہے نہ اندمال کی خوشی۔۔۔یہ اپنا اپنا معاملہ ہے۔۔۔نپٹا کرو۔۔۔اور وہ پھر اسی لڑکی کی تلاش میں نکل پڑا جو بظاہر اس کے پاس ہی تھی۔

جب اس نے تن من وار کر پاگلوں کی طرح اس کو چاہا تو کبھی یہ نہ سوچا کہ یہ منہ مری لڑکی جو اپنے چھوٹے بھائی کی ہر زیادتی کو آنسو کی صورت بو لیتی ہے اور سسکیوں کی فصل اگ آنے پر خود ہی کاٹ بھی لیتی ہے۔۔۔دراصل ایسی کھیتی نہیں ہے جس میں محبت مہک مہک کر لہلہاتی ہے۔۔۔بلکہ چھوٹے بھائی نے جب ممی کی محبت کو اپنی ملکیت کے طور پر یکہ وتنہا قبول کر لیا تو پھر کوئی مدمقابل نہ تھا۔۔۔بات پوری بھی نہ ہوئی کہ مان لی جاتی۔۔۔خواہش کا دوسرا نام خواہش کی عدم تکمیل ہی تو ہے۔۔۔یہاں تو یہ ہوتا کہ ممی خواہشیں پیدا کرتی ہی ان کی تکمیل کے لیے تھیں۔۔۔اور بڑا بابا ممی کی اقلیم محبت کو خواہشوں کے گھوڑے دوڑا دوڑا کر تاراج کرتا۔اب یہ اس کا مزاج ہو گیا تھا۔۔۔کون تھا جو آڑے آتا اور اپنے وجود کی دھجیاں بکھرتا دیکھ کر بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھ سکتا۔۔۔سو اس نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔بڑی بہن تھی۔بڑے بابا سے بڑی۔۔۔اسی ممی اسی پپا کی بیٹی۔۔۔اسی ڈالفن ڈیفل کی پروردہ جس کا فادر گاڈ ناٹی بے بیز کو اچھائیں مانگتا،لیکن بڑے بابا نے جب سارے گھر کو آئینے دکھلائے تو پہلے پہلے اس نے اپنی صورت پہچاننے سے انکار کر دیا۔

میں بھلا یہ کیوں ہوتی۔۔۔؟

میری رگوں میں بھی وہی لہو ہے جو تمہاری شریانوں میں ہے بڑے بابا۔۔۔یہ مت بھولنا۔

لیکن اسے دیر میں معلوم ہوا کہ لہو کے رگوں اور شریانوں میں ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔لہو رگوں اور شریانوں میں نہیں تو کیا ناخنوں میں ہوگا جن ناخنوں سے اس نے اپنی ہستی کا منہ نوچ کر رکھ دیا۔۔۔ویسے سنتے ہیں بہادر شاہ ظفر کا خون غوثو میاں بھڑ بھونجے میں بھی ہے۔۔۔تاریخ میں ایسی کوئی بات درج نہیں لیکن خود غوثو میاں نے ہم سے یہ بات رازداری میں کی تھی تو گلا رندھ گیا تھا۔۔۔اب گلا تو اس کا بھی رندھا رندھا سا رہتا۔۔۔بھیگی ہوئی آنکھیں دکھائی نہ دیں تو رندھا ہوا گلا چغلی کھاتا ہے۔۔۔سرے سے کوئی بات ہی نہ کرے تو اور بات ہے۔۔۔اب اس نے بھی جیسے چپ چپ رہنا سیکھ لیا تھا۔۔۔آئینے میں اپنی صورت پہچان لی تھی۔۔۔بس ایک بار ہمت کر کے بڑے بابا کو اتنا سمجھا دینا چاہا کہ اپنی حکومت ممی ہی پر چلاؤ۔پپا کا سایہ سر سے کیا اٹھا ممی کی مت ہی ماری گئی۔تم ان کی ہم سری تو کر نہیں سکتے۔پپا پپا تھے۔ممی ممی ہے اور تم تم ہو۔۔۔لیکن جب اس نے یہ بات کہہ دی تو اس کو سب ہی چہرے یکساں نظر آئے۔۔۔پپا پپا تھے نہ ممی ممی ہیں نہ تم تم ہو۔۔۔ہم نے کب کس کو پہچانا۔۔۔اصلی چہرہ تو بس ڈالفن ڈیفل کا تھا جسے فادر گاڈ نہ جانے کہاں اٹھا لے گیا۔پپا کی آنکھیں بند ہوئیں تب بھی ڈولفن چار ماہ بغیر تنخواہ کے رہی۔۔۔پھر

کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے اپنے علیحدہ بچے پیدا کرنے کا پرامس کیا اور اس کی 'ٹک ٹائی' بن گئی۔۔۔اسکے بعد جب ممی نے دیکھا کہ لندن تو ہیڈ ماسٹر اٹھا لے گیا اور بچوں کے پپا نے یثرب کی تمنا میں جنت کی راہ لی تو انہوں نے اپنی عقل کا تاج بابا کے سر پر رکھ دیا۔۔۔دوسرے بھائی بہن تو پیدا ہی اس لیے ہوئے تھے کہ مانگنے کی زندگی جئیں۔۔۔انہوں نے کچھ اس طرح سمجھوتہ کر لیا جیسے خود ممی اور بڑے بابا ان کی بے نیازی اور قلندریہ سے سمجھوتہ کر رہے ہیں۔۔۔لیکن وہ اکیلی رہ گئی۔ورثے میں جتنی ضد مل سکتی تھی سمیٹ لائی تھی وہ۔۔۔اجداد کے مزاج کا ورثہ تقسیم ہوا تھا تو ساری انانیت اور ضد، ساری خود پسندی اور خوش فہمی ایک بڑے بابا ہی کے حصے میں کیسے آتی۔۔۔اس نے بھی آواز بلند کی اور جو جو مل سکتا تھا بھر لیا۔۔۔بس یہی ورثہ اس کے لیے آفت جاں ٹھہرا جو اس نے دو چار حملوں میں بڑے بابا کی فوقیت تسلیم کی۔ورنہ دوسرے بھائی بہنوں کی طرح قلندری کا پیشہ بھی اسی گھر سے چلا تھا جسے اپنانا اس کے بس میں نہ ہوتا تب بھی وہ پہلے ہی حملے میں زیر ہو جاتی۔لیکن اپنا کس بل آزمائے بغیر اس سے رہا نہ گیا۔۔۔اور جب پندار ٹوٹا تو وہ بڑے بابا کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔۔۔سب سے زیادہ سرکش، سب سے زیادہ فرماں بردار اور اس فرماں برداری کی ٹھنڈک کے نیچے سرکشی کی بارود کیموفلاج ہو گئی تھی۔اور جھیل کی سطح پر نظر آنے والے کنول، تہہ میں چھپی کیچ اور جھاڑ پھوس پر اس طرح چھا گئے تھے کہ بارود برف بن گئی تھی۔

اور ایسے میں اپنے رومانی انقلابی نظریوں کے نشے میں جھومتا جھامتا وہ برفائی ہوئی بارود سے چمٹ گیا۔

معاشرہ فرد میں بھی سانس لیتا ہے۔گھر میں بھی، شہر میں بھی۔۔۔اور اب تو ایک تہذیب مر رہی تھی، دوسری جنم لے چکی تھی اور غوں غوں کر رہی تھی۔جاگیرداری چاندی کے برتن کھو چکی تھی اور اب اناج کی فکر میں تھی۔کسان کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ فصل کاٹنے والے ہاتھ فصل کے مالک ہوں بھی تو کیا ہوتا ہے۔۔۔ذہنی بعد کی اس خلیج کو پاٹنا اب کسی کے بس میں نہ تھا کہ مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ نے ڈھولک پر تھرکتے ہوئے گیتوں اور رہٹ پر اڑتی ہوئی تانوں سے کہا 'اب چپ ہولو'۔

وقت کے اس موڑ پر ترقی پسندی کا اثاثہ لے کر جب وہ ازدواجی زندگی میں داخل ہوا تو عورت اس کے پاس مظلوم تھی۔ اس کو اس کے سارے حقوق دلانا از حد ضروری تھا اور جیسے یہ سارا کام اسی کو تفویض کیا گیا تھا۔

کہاں دلہن بنی بیٹھی تھیں کہ شمی آپا جگ بھر میں گھومتی پھرے ہیں۔

اجی سنا بھی وہ جنگو میاں کی لونڈیا کو لیے لیے گھومے ہے تمہارا انقلابی۔نہ پردہ نہ نقاب، مت ماری گئی ہے لونڈے کی۔

لو بھئی اب تو وہ اکیلی بھی گھومے پھرے ہے۔دھرا رہ جائے گا انقلاب۔

اور جب اس نے سمجھانا چاہا کہ سنے بھی محبوبہ دلنواز کچھ ہماری تہذیب بھی ہے۔ہماری اپنی تہذیب۔۔۔وہ آپ سے کچھ LIMITATIONS بھی چاہتی ہے۔اس کا اپنا بھی آپ سے کچھ مطالبہ ہے۔اس کے دائرے میں رہ کر ہی اپنی نسوانی آزادی کا لطف اٹھائیں دیوار ڈھانے میں اور دیوار پھلانگنے میں جو فرق ہے وہ فرق تو ملحوظ رکھنا ہی ہوگا۔

لیکن ڈالفن ڈیفل کا فادر گاڈ ناٹی بے بیز کو اچھائیں مانگتا تھا۔

پپا یثرب کی زمین جنت میں خرید چکے تھے۔

بڑے بابا نے ممی کی اقلیم محبت کو خواہشوں کے گھوڑوں سے تاراج کر دیا تھا۔

اور اس کی فرمانبرداری کی ٹھنڈک کے نیچے سرکشی کی بارود کیموفلاج ہو گئی تھی۔

اور جب برف پگھلی اور نیچے دبی گیلی بارود کو محبت کی حدت نے آنچ بتائی تو چھوٹے سے ایک گھر کی چھوٹی سی زندگی تہس نہس ہو کر رہ گئی اور ایک نوجوان ذہن کی ترقی پسندی اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں اپنے آدرش کی انگلی تھامے ٹھوکریں کھاتی پھری

اور ایک رومانی انقلاب گھر کا اثاثہ اٹھا اٹھا کر بازار میں پھینکتا رہا۔ اور جب اس کے حواس بجا ہوئے تو اس نے دیکھا۔

کچھ گنے چنے وہ لوگ جو ان نظریات کا پرچار کرتے تھے نوجوانوں کی امامت کرتے تھے وہ انقلابی پرچم کو بڑی احتیاط سے تہہ کر کے دروازے کے پٹ کے پیچھے چھپا دیتے ہیں، تب کہیں گھر میں قدم رکھتے ہیں۔

ان کی بیویاں گھر کی چار دیواری میں ٹنگی ہوئی ایسی کھونٹیاں ہیں جن پر وہ پتلون بھی لٹکا سکتے ہیں تہہ بھی جب ضرورت ہو کپڑے اتارے اور کھونٹی پر ٹانگ دیے۔ جب جی چاہا ہاتھ بڑھا کر کھونٹی کو بوجھ سے نجات دی۔ اپنی عریانی کو ڈھانپا اور باہر نکل پڑے۔۔۔ چلتے چلتے وہ پرچم اٹھالیا جو کواڑ کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔

لیکن اس نے یہ سارے گر سیکھے نہیں تھے کہ کسی طرح ذہن کو الکٹرسٹی کے اس بورڈ کی طرح استعمال کرنا چاہیے جس میں کئی کھٹکے لگے ہوں۔

گھر کا کھٹکا جس سے بیوی بچوں کو اندھیرے یا اجالے ملتے ہوں۔

باہر کا کھٹکا جس سے دوستوں اور اپنی مجلسی زندگی کو اندھیرے یا اجالے ملتے ہوں۔۔۔ سیاسی کھٹکا۔۔۔ ادبی کھٹکا۔۔۔ یہاں تک کہ کھٹکوں کا کھٹکا۔۔۔!

اور یہ کھٹکے اس وقت اس کی سمجھ میں آئے جب اس نے اپنا سارا بورڈ ہی اپنے گھر والوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اور پھر اس دن اس نے بڑے رشک سے اپنے اس چہیتے انقلابی شاعر کو دیکھا جس کا یوم اردو محل میں منایا گیا تھا۔۔۔ اور جب وہ فتح و کامرانی سے لدا پھندا۔ پھولوں کے ہاروں میں ڈھکا چھپا ایک خوبصورت سی اونچے گھرانے کی شوقین شاعرہ کے ساتھ روانہ ہو چکا جو ہندی میں سوچتی اور انگریزی میں شاعری کرتی تھی۔۔۔ اور پھر جب اس کے عقیدت مند اس کے دوست احباب اس کے فن کے پرستار سبھی جا چکے تو اس نے دیکھا کہ شاعر کی بیوی اور اس کی بیٹی گیٹ پر کھڑے رکشا چکار رہے تھے آج کی مسرتوں میں ان کا فخر شرمسار تھا اور دو ایک نوجوان رکشا کی فراہمی کے نام پر ڈھکی چھپی ہمدردی انہیں دینے کی فکر۔۔۔ میں تھے۔

اس نے سوچا، کیا ویٹ نام، ہنگری اور چیکوسلواکیہ ایک ہی دروازے سے برآمد ہوتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ایک ہی دروازے میں داخل ہو جاتے ہیں۔۔۔ ہم سچائی کو کہاں پکڑ سکتے ہیں۔۔۔ اس دروازے پر بھی نہیں۔ جہاں شاعر کی بیوی رکشا چکار ہی ہے۔ اس گیٹ پر بھی نہیں جس سے پھولوں سے لدے شاعر کا موٹر روانہ ہوا ہے۔۔۔

پھر وہ اپنی ہی حماقت پر مسکرانے لگا۔ سچائی پکڑی ہی کیوں نہ جائے۔۔۔ اس کو کھوجنا ضروری ہی کیا۔۔۔

جینے کا یہ بھی تو ایک طریقہ ہے کہ ڈالفن ڈیفل کے فادر گاڈ سے یثرب کا کوئی تعلق نہیں۔ کسی ذہن کی، کسی ترقی پسندی سے کسی گھر کی چار دیواری کا کوئی تعلق نہیں۔

اردو محل کا ویت نام سے کوئی تعلق نہیں۔ ویت نام کا ہنگری سے کوئی تعلق نہیں اور ہنگری کا چیکوسلواکیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ سب کے کھٹکے جدا جدا ہیں۔ سب کے کھٹکے الگ الگ۔ اور اس نے سارے کھٹکے آف کر دیئے۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف چلا۔ اس لیے کہ گھر دور تھا اور جیب خالی تھی۔ اور رکشا والا اس کا نہ خونی رشتہ دار تھا، نہ ذہنی۔۔۔ اور کون رشتہ کس کے کام آیا ہے۔

لیکن یہ سب جان کر بھی اس کی اداسی کا سبب کیا تھا؟

☆☆☆

کمندِ ہوا

الطاف فاطمہ

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستیم اسیرِ کمندِ ہوا
نداریم غیر از تو فریاد رس
کہ توئی ---- کہ توئی ----

اور بس ۔۔۔۔ اس سے آگے کے الفاظ اگر مجھے بھول گئے ہیں یا میں ان کو بھول گئی ہوں تو ان کی یادآوری کی کوئی ضرورت بھی نہیں ۔ یادآوری قطعی فضول اور لاحاصل حرکت ہے جو انسانوں پر روز و شب لیکن بالکل بے ضرورت طور پر مسلط رہتی ہے ۔

ہماری خالہ اماں کا گھر تہ خانے والا مکان کہلاتا تھا ۔ سبب اس کا یہ کہ اس محلے میں صرف یہی وہ واحد مکان تھا جس میں تہہ خانہ تھا ۔۔۔۔ ان دنوں (یا شاید اب بھی وہی دستور ہو) وہاں کا یہی طریقہ تھا کہ مکانوں کو ان کے مالکوں کے نام، نمبروں یا خود اپنے کسی نام جیسے بیت فلاں یا فلاں فلاں منزل کے بجائے اس کی کسی نمایاں خصوصیت کے حوالے سے مشہوری حاصل ہوتی تھی ۔ پتھر والا مکان، لال مکان، گے والا مکان (گماّ اینٹوں سے بنا ہوا) چبوترے والا مکان ۔ غرض بے شمار مکان بے شمار ناموں سے پکارے جاتے تھے ۔ سو یہ تہہ خانے والے مکان کے نام سے مشہور ہو گیا ۔ اس کا تہہ خانہ بہت کشادہ بہت روشن اور بے حد ٹھنڈا تھا ۔ اندر اترو تو بالکل یوں لگتا تھا جیسے ائیر کنڈیشنڈ ہو ۔ اس کی پچھلی دیوار میں جو گلی سے متصل تھی کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں (ہم ان کھڑکیوں کے ساتھ وعدہ وسل پر بیٹھے بیٹھے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کے گلی میں آتے جاتے پھیری والوں سے کھٹا میٹھا چورن، فالسے، کلائی پر باندھنے والی نقلی گھڑیاں اور دھوپ کے نقلی چشمے خریدا کرتے تھے) ۔ یہاں پر بیٹھ کر خریداری کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی کہ ہم یہاں بیٹھے کون سی بلو اسٹینڈرڈ اشیاء خرید رہے ہیں ۔ خصوصاً لال سبز اور پیلے کمپٹ (کمپٹ حرف عام میں یعنی پھیری والوں کی زبان میں لیمن ڈراپس کا دیسی نام تھا) ۔ وہ تو ہم سب کے سامنے لے کر چوس ہی نہ سکتے تھے کہ اتنی بیماریوں اور خرابیوں کی نوید سنا سنا کر ڈانٹا جاتا تھا: ٹونسی لائٹز ہو جائے گا اور پتا نہیں کون کون سی قباحتیں بیان ہوتیں ۔ پھر وہ کمبٹ کبھی نہ لینے کا وعدہ لے کر اس کے عوض پیکٹوں اور خوبصورت ڈبوں میں بند لیمن ڈراپس دلوائے جاتے ۔ مگر وہ کمپٹ، ان کا مزا ہی اور تھا ۔ وہ یقیناً گھٹیا اور دیسی طریقے سے ہی تیار ہوتے ہوں گے اس لیے کہ وہ زیادہ کھٹے اور بہت تیز تیز رنگوں کے ہوا کرتے تھے ۔ وہ اب بھی یاد آتے ہیں ۔ اچھا تو وہ بات تو بیچ ہی میں رہ گئی ۔ اس کھڑکیوں کے مقابل کی دیوار میں ایک دیوار گیر الماری تھی جس کے اندرونی پٹاؤ کنکریٹ سے تیار کیے گئے تھے اور دروازے کسی مضبوط لکڑی کے تھے جن کا روغن گہری براؤن رنگت کا تھا ۔ اس دیوار گیر الماری کا طول کم اور عرض زیادہ تھا ۔ تہ خانے کی شمالی اور جنوبی دیواروں میں اونچے اونچے طاق تھے جن کی محرابیں کسی خوبصورت بیل اور اس کے پھول پھل سے سجی ہوئی تھیں ۔ یہ بیل اور اس کے پھل پھول تعمیری مصالحے سے ابھارے اور نکالے گئے تھے ۔ (اس وقت تو نہیں سوچا تھا پر اب خیال آتا ہے کہ وہ مستری کیسے ہوا کرتے ہوں گے جو اتنی دل جمعی سے پتھر اور کنکریٹ میں ایسے نقش و نگار ابھارتے تھے ۔ یقیناً اپنی کارکردگی پر بہت مطمئن اور خوش رہا کرتے ہوں گے) ۔ تہ خانے کے وسط میں دری چاندنی کے فرش پر سرخ

اونی قالین بچھا رہتا تھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ سفید لٹھے کے اجلے اجلے غلافوں سے منڈھے گاؤ تکیے اور مکیئیاں دھری رہتی تھیں۔ (بڑے گاؤ تکیوں پر بچے سوار ہوکر گھوڑا گھوڑا کھیلتے اور اس حرکت پر بڑوں سے ڈانٹیں بھی کھاتے تھے)۔

تہہ خانے میں اترنے والی سیڑھیاں اس باورچی خانے کے پہلو سے نکلتی تھیں جس کا دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ شاید اس مقصد سے کہ مرد خانساماں ڈیوڑھی سے براہ راست داخل ہوسکے۔ باورچی خانے کا محل وقوع اس انداز کا تھا کہ گھر کے صحن یا کسی بھی گوشے سے دیکھنے والوں کو یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ ادھر کہیں کوئی باورچی خانہ اور اس کے ساتھ والا اسٹور بھی ہے۔ دراصل اس گھر میں دو باورچی خانے تھے۔ دوسرا اندرون خانہ کا، وہ باورچی خانہ جس کے در صحن میں کھلتے تھے۔ میرا خیال ہے کیوں نہ اس گھر کا مکمل نقشہ بیان کردوں جو ذہن کے نہ جانے کس گوشے میں اس طرح محفوظ رہتا ہے جیسے کسی دبیز اور گہری دھند کے پردے کے پیچھے چھپا ہوا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ گھر یعنی وہ تہہ خانے والا مکان اب اپنے موقع محل پر موجود ہی نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ وہ اب ڈھا دیا گیا ہو۔ وہ بھی اور اس کے متصل لال مکان بھی۔ ہاں لال مکان جس کی کھڑکی تہہ خانے والے مکان کے اندرونی باورچی خانے میں کھلتی تھی اور جس کا صحن کیا تھا کہ ایک خانہ باغ اور پائیں باغ کہیے جسے جہاں امرود، آڑو اور لیچی کے پیڑ خوش رنگ رسیلے پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ وہ لال مکان جس کے صحن کے آخری نکڑ پر بچوں کے پڑھنے والے کمرے کی چھت پر انگور کی بیل پھیلی ہوئی تھی اور ڈیوڑھی کے ساتھ والے کچے قطعہ میں موٹے موٹے پیپیا کیلوں کا خوبصورت جھنڈ کھڑا رہتا تھا اور جب وہاں جایا کرتے تو گاؤں نِنا (گاؤں والی نِنا) اور بچے والی نِنا مل کر اپنے ہاتھوں سے موٹی پھلوں کے گچھے اتارتیں اور انگور کے خوشے کاٹ کر کچی چینی کی پلیٹوں اور قابوں میں سجا کر آنے والے بچوں کی خاطر مدارات کرتیں اور اب اگر لال مکان باقی بھی رہ گیا ہوگا تو وہ اس کے خوبصورت مکین خصوصاً وہ دونوں دراز قد کمان سی ابروؤں کے سائے میں خوبصورت غلافی آنکھوں والی نِنائیں کہاں ملیں گی۔ بات یہ ہے لوگ تو مرکھپ جاتے ہیں اور گھر باقی رہ جاتے ہیں (بشرطیکہ ان کی جگہ پلازے نہ کھڑے ہوجائیں) مگر کہاں، لوگ بھی کہاں مرتے ہیں۔ سب باقی رہتے ہیں بالکل ہشاش بشاش تندرست و توانا۔ وہی اسی دھند کے دبیز پردے کی اوٹ میں بڑے آرام سے سکون سے گزر بسر کررہے ہوتے ہیں اور دھند چھٹتی ہے اندر ہی اندر جب چاندنا سا پھیلتا ہے اور دھوپ چیخ کر سامنے آتی ہے تو سب کچھ نکھر کر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ سارے در و بام اور سارے لوگ اور میں ابھی اس وقت بھی اس ایک نام، لال مکان کے سہارے نکلتی صبح صادق کے اجالے میں ان کو دیکھتی ہوں۔ اونچی کرسی اور محرابوں والے دالان کے دروں میں وہ دونوں کھڑی ہیں، نفیس پاپلین یا سلک کے ہلکے آبی، انگوری اور کاسنی رنگ غراروں پر سفید چکن کے کرتوں کے گریبانوں میں چمکتے سونے کے بٹن اور سفید جنگل باڑی کے چنے ہوئے ڈوپٹے اپنے کاندھوں پر ڈالے محرابی دروں میں نصب خاموش مگر جاندار مجسمے۔ ان کے چاندی سے سفید بالوں کے بڑے بڑے جوڑے، مسکراتے لب اور خوش آمدید کہتی آنکھوں کی چمک۔ اور اجلے اجلے پیروں میں سیاہ قینچی والی نرم چپلیں اور آخری در میں لٹکتا ہوا بڑا سا پنجرہ اور اس میں اچھلتا پھڑ پھڑاتا ہوا کاکاتوا تک بہت واضح اور صاف نظر آتا ہے۔ ہاں مگر بات لال مکان کی تو تھی ہی نہیں۔ بتانا تو تہہ خانے والے مکان کا نقشہ تھا۔ پر کیا کیا جائے یہ بات سے بات نکلتی ہی چلی آتی ہے لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ دونوں مکان ایک دوسرے سے اتنے متصل ان میں رہنے والوں کی قرابتیں ایک دوسرے سے اتنی نزدیک کہ ایک کا ذکر کرو تو دوسرے سے صرف نظر کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اچھا تو میں ایسا کروں کہ اب اس کا پورا حدود اربعہ، محل وقوع اور نقشہ آپ کے ذہن میں اچھی طرح جم جائے اور آپ بھی جب چاہیں اس دھند کے دبیز پردے کے پیچھے سے نکال روز روشن کی طرح اس کا نظارا کرسکیں۔

فائدہ کیا؟ کیوں کیا فائدہ!

بھئی فائدہ! یہ کہ ہم تاج محل کے چھوٹے چھوٹے چربے، مرقعے، سنگ مرمر سے بنی ہوئی تاج کے روضے کی مکمل نقلیں

شکلیں خرید کر ڈرائنگ روموں کی زینت کیوں بنائی جاتی ہیں؟ فرعون کی ممیاں، تاج محل، اہرام مصر اور ایفل ٹاور کی نقلوں کو آتشدانوں اور شیلفوں پر کیوں سجاتے ہیں؟

ہاں تو خالہ اماں کا تہہ خانے والا مکان جس علاقے میں واقع تھا وہ ان کا ننھیالی محلّہ تھا۔ ان کے ددھیال کے بیشتر افراد اور خود ان کے اپنے والد کی اولاد کے گھر، جدید طرز کی کوٹھیوں بنگلوں اور کوٹھوں کی طرز پر بنے ہوئے، شہر کے جدید بھی اور ایسے قدیم علاقوں میں بھی تھے جو سول لائنز کی براہ راست زد میں آتے، لیکن خالہ اماں کا گھر نہ صرف اپنی ننھیال کے قدیم محلے تھا بلکہ خالص مشرقی طرز پر تعمیر ہوا تھا۔ اور یہ بھی ایک بات تھی کہ ان کے گھر سے متصل لال مکان بھی ان کے ننھیالی اور قریبی اقربا کا تھا۔

اب میں یوں کرتی ہوں کہ اس گھر میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو اس ٹیکرے کی طرف لے کر چلتی ہوں جس کے عین مقابل تہہ خانے والا مکان اور لال مکان واقع ہیں۔ ٹیکرے سے اتر کر ان مکانوں میں داخل ہونے سے قبل تارکول سے پختہ کی ہوئی سڑک کے اس ٹکڑے کو عبور کرنا پڑے گا جو مرکزی سڑک کا وہ ذیلی حصہ ہے جو باہر سے گھوم کر اس محلے میں اتنا تنگ ہو کر داخل ہو گیا ہے کہ جس میں سے ایک لمبی چوڑی کار گزرتی ہوتی تو کسی دوسری سواری گزرنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ دراصل ایسے راستے کو ہی عرف عام میں گاڑی بھر رستہ کہا جا سکتا ہے۔ چلئے اب ہم ٹیکرے پر آ گئے ہیں لیجیے۔ آپ نے دیکھا، یہ سطح اور چوکور ہے۔ اس وقت یہ سوچنے یا اس کے بارے میں پوچھنے کی ہمیں نہ مہلت تھی نہ فرصت کہ عمر کے اس دور کی اپنی مصروفیتیں اور بکھیڑے ہوتے ہیں۔ سر اٹھانے اور دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی۔

اور واقعی اب میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ ٹیکرے والی اس دیوار کے اس طرف کیا ہوگا؟

کہنے کی بات یہ ہے کہ اب ایسے سوالوں کا کیا فائدہ اور کیا تک؟ مگر یہ سوال اور نہ جاننے پر قلق اپنی جگہ پر برقرار ہے۔

اچھا اب آپ دیکھیں یہ جو ٹیکرا ہے نا اس کے دائیں جانب (اگر آپ کی پشت دیوار کی طرف ہے تو) صرف اینٹوں سے بنا ہوا ایک تنگ تنگ سا مستطیل مکان ہے جس کا صدر دروازہ کسی بھاری اور مضبوط لکڑی کا ہے۔ دست برد زمانہ اور مرور ایام نے اس دروازے کی لکڑی کے اوریجنل رنگوں کو کب کا ختم کر کے اس کو ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ نیلگوں سرمئی رنگ۔ قدامت اور موسم زدگی نے اس کی لکڑی کی چکنی ہمواریت کو ختم کر کے اس پر موٹے موٹے ریشوں کے ابھار پیدا کر دیے ہیں۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ دروازہ کتنا موسم زدہ رہا ہوگا (یہ بھی خوب ہے کہ ساری سوچیں اور سارے خیال ذہن میں اب اس وقت اٹھتے ہیں جب کہ ان کے بارے میں سوچنے کی کوئی افادیت باقی نہیں) اور یہ جو دیوار میں کافی کافی فاصلے پر تین عدد آہنی سلاخوں والے جنگلے نظر آتے ہیں یقیناً یہ تین عدد کمروں میں نکالے ہوئے دریچوں کے جنگلے ہیں۔ اس گھر میں ہیگی یعنی مرزا ہیگا اور ان کی بیگم ہیگی رہتے ہیں۔ اب یہاں ایک اور وضاحت لازم آ گئی ہے۔ وہ یہ کہ اب سے کچھ بلکہ کافی پہلے جب پھول اور کلیوں کے اسٹیج پر ہیگا کی تپلی نظر آئی تو نہ صرف مجھے یہ احساس ہوا بلکہ اس سبھوں کو حیرت ہوئی کہ اس ہیگا اور ان مرزا ہیگا کے درمیان حیرت انگیز مشابہت بلحاظ صورت بلکہ ان کے تکیہ کلام ہیگا کے بھی حوالے سے موجود ہے۔ ہیگا کا اصل نام کیا تھا، ان کا پیشہ کیا تھا، ذریعہ آمدنی کیا رہا ہوگا؟ وہی بات کہ یہ سب سوال بہت بعد از وقت اٹھے، یعنی ایسے وقت کہ اب ان کا حتمی جواب دینے والے بھی موجود نہیں۔ (پتا نہیں زندگی کی اتنی ہاؤ ہو میں کہ آپ جسے پولیوشن کثافت اور شور شرابا کہیے انسانوں کو ایسی فرصت کیسے ملتی ہے کہ ان گئی گزری باتوں کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی ان کے بارے میں اندر سوال اٹھتے رہیں)۔ اب ہیگا کے سلسلے میں اس وقت ایک بات کی سختی سے تاکید کی جاتی تھی (ہر گھر میں) کوئی بچہ ہیگا کو صرف ہیگا نہیں کہے گا۔ ان کا ہیگا نانا کہہ کر مخاطب ہونا ہے اور ان کے تکیہ کلام کا یا ان کے خیالات اور اوٹ پٹانگ باتوں پر ہنسنا یا ان کا مضحکہ ہرگز نہیں اڑانا۔ تو خیر ہم لوگ تو کیا ان سے مذاق کرتے یا ان کی باتوں پر ہنستے (صاف بات یہ ہے کہ ہمیں تو کوئی اعتراض ہوتا نہیں تھا) البتہ یہ تاکید اور تنبیہ ان نوجوان لڑکوں کے لیے تھی جو اس

وقت ہائی اسکول، کالج یا یونیورسٹی کے مرحلوں میں شریک اور شامل تھے۔ہاں تو میں اب تک یہی سوچتی ہوں کہ یہ جو پھول اور کلیوں کی اسٹیج پر ہیگا کی پتلی نمودار ہوئی تھی (افسوس کہ مدت سے نظر نہیں آئی) تو کیا اس کی تخلیق میں کسی ایسے ہی کا مشورہ، تجربہ یا مشاہدہ تو شامل نہیں۔اور میرا خیال یہ ہے کہ ضرور ہے کہ ایسی ہی کوئی بات ہے۔اس لیے کہ وہ تو جوان لڑکے جن کو تاکید اور تنبیہہ کی جاتی تھی نہیں مانتے تھے اور ان کے پیچھے لگے رہتے تھے اور ان کو شبہ بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ ہیگا نانا، ہیگا نانا کر کے جوان کے آگے پیچھے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی افیون کا کوٹہ تک فراہم کر دینے کے بعد ان کے خیالات (خصوصاً فرنگیوں کے بارے میں) کس کس طرح اگلوا لیتے ہیں۔ہیگا کی نظر میں یہ صاحبزادہ اتنے معتبر اور قابل اعتماد کہ وہ اپنے دل کی ہر اچھی بری بات اور سوچ بے جھجک ان کے سامنے کہہ دیتے۔حقیقت یہ ہے ہیگا کی ذات ہی ان کا گڈ پاسٹ ٹائم تھی۔ویسے تو اپنی پڑھائی وغیرہ سے بہت مخلص تھے۔

خیر ہیگا ایک مستقل اور جداگانہ موضوع ہے۔جس پر لکھا جا سکتا ہے۔قابل ذکر بات اس سلسلے کی بس یہی ہے کہ ان لڑکوں کے نزدیک ہیگا صرف دل بہلاوے کی ایک کٹھ پتلی نہ تھے بلکہ ان کو پورا احساس تھا کہ ہیگا گوشت پوست کا ایک زندہ انسان بھی ہے جس کے اپنے دکھ بھی ہیں۔سو انہوں نے ہیگا ہیگی کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی ایسی لاٹھی نہیں جوان بوڑھے دموں کا سہارا بن سکے۔وہ ان کی ضروریات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔نہ صرف یہ کہ ہیگی کے لیے امور خانہ داری کی خریداری اور سودا سلف لا کر دینے میں بھی دریغ نہ کرتے بلکہ بیماری دکھی میں ان کے دوا علاج کی پوری ذمہ داری بھی خود اٹھاتے۔یہ اور بات تھی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہتا اور کوئی دن نہ جاتا کہ ہیگا نانا زچ ہو کر اپنی چھڑی اٹھا کر کسی نہ کسی صاحبزادے کی پٹائی بھی نہ کر دیتے ہوں۔

اچھا اب یہ تو تھا ٹیکرے کا وہ حصہ جہاں ہیگا کا گھر تھا اور خود یہ ٹیکرا کیا تھا؟ ایک کمیونٹی سنٹر کہ جس کو نہ کوئی چلاتا تھا نہ اس کے استعمال کا کوئی معاوضہ ادا کرنا ہوتا تھا۔محلے میں ہونے والی شادی غمی کی تقریبات میں اس کی مرکزی حیثیت ہوتی تھی۔یعنی ٹیکرے کی دائیں جانب (وہی دیوار کی طرف پشت ہو تو) لال مسجد تھی جس کے حجروں میں امام اور موذن کے علاوہ دینی مدارس کے ایسے طلباء، جو افغانستان، بخارا، کاشغر، سمرقند، مدراس، کلکتہ، ڈھاکہ وغیرہ سے آتے اکثر یہاں مقیم رہتے۔خوراک کا انکی انتظام محلے کے ہر گھر میں یکساں طور پر رہتا تھا اور بجائے اس کے کہ طالب علم گھر گھر کھانا بٹورتے پھرتے ہر گھر سے سینیوں میں کھانا لگا کر ان کے حجروں پر پہنچا دیا جاتا۔اب یہ دیکھئے کہ ہر گھر ایک طالب علم کی ذمہ داری ہوتی۔بغیر کسی دباؤ یا اپیل کے خود کار طور پر یہ نظام بڑی خوبی سے چلتا رہا۔برسوں برسوں اور ہو سکتا ہے آج بھی یہ چلن جاری ہو۔اس لیے کہ فرنگی محل، مدرسہ فرقانیہ اور ایسے ہی کئی مدارس تو اپنی جگہ موجود ہوں گے ہی اور ان میں طلباء بھی ہوتے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ نہ حکومت کو اس سے دلچسپی ہوگی نہ وہ اس سے کوئی آس لگاتے ہوں گے۔اچھا تو لال مسجد کے قرب کی بناء پر اسی ٹیکرے پر شامیانے تلے سے اہل محلہ کے جنازے مسجد تک لے جائے جاتے ہیں۔اسی طرح شادی بیاہ، عقیقے اور ایسی ہی تقریبات کے کھانے اسی ٹیکرے پر پکتے اور اس ٹیکرے کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اللہ بندے سے لے کر شہر کے ایک سے ایک نامی رکابدار نے اس پر کرسی رکھوا کر براتوں اور ولیموں کی دیگیں چڑھائی اور اتروائیں تھیں۔اسی ٹیکرے پر صبح کے ناشتوں کے لیے کشمیری چائے کے دیگچے تیار ہوتے اور اسی پر لگے تندوروں میں سے گرم گرم باقر خانیاں اور شیرمالیں نکال کر اندر بھیجی جاتیں، اور یہ تو خیر مسلمہ بات تھی کہ ایک گھر کی شادی کی ہر تقریب اور ہر دن میں پورے محلے کی شرکت لازمی تھی۔سو ٹیکرے پر لگے شامیانوں تلے پڑی کرسیوں پر لوگ ہر گھر سے آ آ کر بیٹھتے اور وہ سارے بھیا لوگ وہیں تنبوؤں اور شامیانے تلے جھپا جھپ ناشتہ کر کے اپنی اپنی سائیکلوں پر اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا رخ کرتے۔اور والدائیں بچہ لوگ کو بھی باہر ٹیکرے کی طرف ہنکا دیا کرتیں:

"جاؤ۔بھائیوں کے ساتھ ناشتہ کرو"۔ٹیکرے پر شامیانے تلے ناشتہ کرتے ہوئے چھوٹے بھیا بڑے بھیا اور نہ جانے

کون کون سے بھیا فوراً بچوں کو اپنی تحویل میں لیتے۔ اپنی نگرانی میں ناشتہ منگوا کر دیتے۔ ذرا سی بھی بدتمیزی پر چشموں کے شیشوں کے پیچھے سے گھورتے اور دبی دبی آوازوں میں گھرکیاں اور جھڑکیاں دیتے جاتے:

''بدتمیزی نہ کرو''۔

''صبر سے بیٹھو۔ گڑبڑ کرو گی تو دونوں کانوں کے بیچ میں تمہارا سر کر دیں گے ہم''۔

بس اسی دھمکی سے جان نکلتی تھی۔ ان دنوں خوش رنگ گلابی گلابی کشمیری چائے کی سمجھ نہ آتی۔ بالکل نمکین الا ئچی لونگ، دارچینی کی خوشبو والی چائے لگتا تھا سالن میں بالائی ڈال کر پی رہے ہیں۔ لیکن دونوں کانوں کے بیچ سر ہونے کے ڈر سے گھونٹ دو گھونٹ پینا پڑتی۔ نظر بچا کر پیالی میز کے نیچے ڈال دیتے تو پھر ہمیں سادہ چائے بھی مل جاتی۔

بڑی ہنستی مسکراتی ہوا کرتی تھیں وہ صورتیں جواب نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں۔

اچھا تو اب کیا خیال ہے، تیکرے سے اتر نہ جائیں۔ جی وہ چند قدم چل کر سیدھے تہہ خانے والے مکان کے صدر دروازے پر کھڑے ہو جائیں۔ کھڑے کیوں ہو جائیں اندر ڈیوڑھی میں نہ چلیں؟ ہاں جی یہ جو ایک بہت کشادہ سا ہال نما کمرہ ہے اسی کو ڈیوڑھی کہتے تھے اور ڈیوڑھی میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو صدر دروازے کے ساتھ والی چار عدد دیڑھیاں طے کرنا پڑیں گی۔

ہاں تو یہ آ گئی، ڈیوڑھی، ڈیوڑھی کیا ہے ایک کشادہ طویل مستطیل راہدار کہیے جس کے دائیں طرف ایک کشادہ بیٹھک ہے۔ اتنی کشادہ کہ کوئی نشست یا اجلاس منعقد کیا جائے تو کم از کم پچیس کرسیوں کی گنجائش آسانی سے نکل آئے۔ دراصل یہ کمرہ تہہ خانے پر تعمیر کیا گیا ہے اور تہہ خانے کے اندرونی نقشہ ہی پر تیار ہوا ہے یعنی وہی گلی کی جانب کھلنے والی سلاخوں والی کھڑکیاں، کھڑکیوں کے مقابل دیوار میں بالکل ویسی ہی الماریاں، سیاہی مائل بھورے رنگ کے دروازوں والی۔۔۔۔ ان میں سے ایک الماری کی شلفوں پر چھوٹے بڑے کلا مجید، رنگ برنگ خوبصورت جزدانوں میں گرداتے ہوئے رکھے رہتے تھے۔ درمیانی خانوں میں مختلف سائزوں کی تختیاں، سیاہ روشنائی کی دواتیں جن کی روشنائی میں پڑے ہوئے کپڑوں میں سے مرے ہوئے چوہوں کی سی بدبو آیا کرتی (پر یہ بات ہے کہ اسی بدبو والی روشنائی سے تختی پر لکھے جانے والے حروف بڑے روشن اور چمکیلے ہو کر ابھرتے)۔ تو ہاں بات ہو رہی تھی ڈیوڑھی کے بغلی کمرے کی۔ دراصل یہ کمرہ بیرونی بیٹھک کی بجائے درس و تدریس کے لیے زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ جہاں ظہر کی نماز کے بعد گھر کے بچے مولوی صاحب سے کلام مجید کے سبق پڑھتے اور سہ پہر کے بعد ماسٹر صاحب بچوں کو پکڑ کر بیٹھ جاتے اور انگریزی حساب اور جغرافیہ کے علوم کے خزانے زبردستی ان کے اندر انڈیلنے کی کوشش کرتے۔ ان کا پلنگ اسی کمرے کے ایک گوشے میں لگا رہتا تھا۔ دیوار کے ساتھ والی دوسری الماری میں ان کی کتابیں اور کپڑے قرینے سے لگے رہتے تھے۔ اب ایسا ہے کہ ماسٹر صاحب کی بھی تھوڑی تفصیل اور وضاحت ہو جائے تو مناسب ہو۔ وہ یہ کہ عموماً ایسے گھروں کی بیرونی بیٹھکوں میں کالج یا یونیورسٹی کا کوئی نہ کوئی ایسا طالب علم مقیم رہا کرتا جو ہوسٹل کی رہائش کے اخراجات کا متحمل نہ ہو سکتا تھا اور کسی معتبر حوالے یا تعارف کی بناء پر ان بیٹھکوں میں اس کے قیام و طعام کا مستقل بندوبست ہو جاتا اور اس تمام بندوبست کا معاوضہ فقط اتنا ہی ہوتا کہ وہ گھر کے بچوں کو شام کے وقت پڑھا دیا کریں۔ اور خیر یہ تو ظاہر تھا ہی کہ جب بچے ایک دفعہ ان کی شاگردی اور تحویل میں آ جاتے تو ان کی نگرانی اور اتالیقی کے جملہ فرائض وہ از خود اپنے ذمے لے لیتے۔ ذرا سی بدتمیزی یا بے راہ روی پر بڑے بھائیوں کی طرح گھورتے ڈانٹتے اور کان نوچنے سے بھی باز نہ آتے۔ نہ جانے ان بیٹھکوں میں قیام کرنے والے کتنے ماسٹر نما طالب علم کالجوں اور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر قابل ذکر منصبوں اور عہدوں پر فائز ہوئے اور کتنے ہی مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے عازم انگلستان (ان دنوں امریکہ جا کر پڑھنے کا تصور بھی بعید تھا) ہوئے۔ ان بیٹھکوں میں ان کے کئی کئی سال مقیم رہنے کے باوجود کسی قسم کا کوئی مسئلہ یا

الجھن کھڑی نہ ہوتی تھی۔ اور ہاں گھریلو ایمرجنسیوں میں خصوصاً بچوں سے متعلق ایمرجنسی میں یہ بہت کارآمد ثابت ہوتے مثلاً اسکول میں نام لکھوانا یا کوئی بچہ بیمار ہوجائے تو اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے، دوالانے کے علاوہ بچوں کے کورس کی خریداری بھی اکثر ان ہی کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ خاتون خانہ کا ان سے پردہ ہوا کرتا تھا لیکن وہ ان کو اپنی والدہ ہی کی جگہ سمجھتے تھے۔ اور وہ بھی ان پر کڑی نگاہ رکھنا اپنے فرائض میں شامل سمجھتی تھیں: ''آج یونیورسٹی سے اتنی دیر سے کیوں آئے؟'' رات کو مقررہ وقت سے زیادہ باہر رہنے پر ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا لیکن اس کا فائدہ یہی ہوتا تھا کہ وہ لوگ بخیر و عافیت صحیح و سالم فارغ التحصیل ہوکر جاتے اور زندگی کے دھارے میں شامل ہوجاتے۔ ایک بات ہے کہ ابھی تک ہم اسی ڈیوڑھی میں پہنچ پائے ہیں اور اس کے اس بغلی کمرے سے آگے نہیں جا پا رہے ہیں۔ خیر، ورنہ میرا اپنا تو یہی خیال تھا کہ اس تہہ خانے والے مکان کو اندر کا کونا کونا دکھاؤں اور چپے چپے سے متعلق زندگی کے اس طرز اور منظر کو سامنے لاؤں جو وقت کی دھول کی دبیز تہوں میں گم ہوگیا، ایسا کہ اب کبھی کسی کو نظر آ ہی نہیں سکے گا، آثار قدیمہ کا بڑے سے بڑا ماہر اس دور کے تمدنی اور معاشرتی انداز کا سراغ تو لگا سکتا ہے زمانے کے تغیر اور بدلتی ہوئی چال کی نشان دہی تاریخ کے اوراق سے ہوسکتی ہے لیکن ایک وقت اور زمانے کے طرز حیات، ان کی ثقافت اور ثقاہت کی روح کو کشید کرکے کسی شیشی میں محفوظ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو صرف دیکھنے والوں کی نظر اور یادوں میں محفوظ رہا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ آنکھیں بھی ایک کے بعد ایک مندتی چلی جاتی ہیں اور وہ سب کچھ عدم کی گہری گھائیوں میں دفن ہوجاتا ہے۔ ایسی چیزوں کے بقاء اور تسلسل کی ضمانت گل پاشی اور پیوندکاری کے عمل میں ہے بالکل جنگلی حیات کے تسلسل کی طرح۔ تو اب ہم بور کرتے ہیں کہ فی الحال ابھی اسی ڈیوڑھی میں رہتے ہیں۔ یہ جو بیٹھک کی دیوار ہے اس ساتھ درمیانی سائز کا بان کا پلنگ بچھا ہوا ہے اور اس کی ادوائن ایکدم کسی اور تنی ہوئی ہے۔ سرہانے کی طرف دری اور تکیہ (جاڑوں میں یہ بستر لحاف اور توشک پر مشتمل ہوتا ہے) مشتمل بستر لپٹا ہوا رکھا ہوتا۔ کونے میں لکڑی کی ایک چھوٹی اور نیچی سی مضبوط کواڑوں والی الماری ہے جس کے مختلف خانوں میں مختلف قسم کا سامان ہے۔ سب سے نچلے خانے میں چائے کی (جاپانی پھولدار) چند پیالیاں، سلور کی دو درمیانی دیگچیاں، دودھ کی اور چائے کا پانی پکانے والی دیگچیاں، چینی کی بوتل وغیرہ سلیقے سے لگی ہیں۔ الماری کے قریب انگیٹھی رکھی ہے۔ تو جناب یہ ہے کلو خان کی اقامت گاہ۔ کلو خان یہاں کب سے ہیں کب نہیں تھے، یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہم نے تو ان کو آنکھ کھول کر یہیں اسی کونے بالکل اسی انداز سے مقیم دیکھا۔ خالہ اماں کے یہاں ہمارا آنا بھی تو سال دو سال پیچھے ہے لیکن پٹیالے میں بھی کھیلتے کودتے اگر کبھی اس ڈیوڑھی کا تصور ذہن میں آیا تو ساتھ ہی خان بھی اسی جگہ قائم نظر آئے۔ اور یہاں آکر بھی تو یوں ہی لگتا جیسے ہم ہمیشہ سے گھر کے معمول اور دستور میں شامل ہیں۔ گھر کے بچوں (اصل باشندوں) کے درمیان روٹین کا حصہ وہی علی الصباح باورچی خانے کے ساتھ والی کشادہ اور ہوادار صحنچی میں تختوں پر بیٹھ کر بالائی، سموسوں اور خستہ ٹکیوں کا ناشتہ کرنا۔ اور اگلے ہی دن سے مولوی ماسٹروں کے سامنے بیٹھ کر اسباق میں شریک ہونا۔ تختیاں لکھنا اور لمبی لمبی سلیٹوں پر ریاضی کے سوال حل کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ذرا ذرا بات پر تنازعے کھڑے کرنا اور مار پٹائی نوچ کھسوٹ کا سلسلہ اسی دیرینہ تسلسل سے باندھ لینا۔ مثلاً اگر ہم نے ایک کوئی بات پٹیالے کی کردی کہ ہمارے پٹیالے میں تو یوں ہوتا ہے تو ہمارے خالہ زاد فوراً اس پر گرہ لگانے بیٹھ جاتے کہ ہمارے یہاں یہ ہوتا ہے۔ بڑھتے بڑھتے بات نوچ کھسوٹ کشتم کشتا پر جا پہنچتی۔ جیسے مثلاً اگر منہ سے نکل گیا کہ ہمارے پٹیالے میں تو اصطبل ہے اور اصطبل میں گھوڑے ہیں تو وہ فوراً اس کا توڑ کرتے۔

''یوں تمہارے وہاں ڈھوڑے ہیں تو کیا ہمارے یہاں ٹو شیر ہے''۔

''جھوٹے کہیں کے۔ شیر تمہارا نظر تو نہیں آرہا ہے''۔

''ٹو تمہارے ڈھوڑے کب نظر آرہے ہیں''۔

''تم ہمارے ساتھ چلو پٹیا لے تو دکھا دیں گے۔مگر پہلے تم اپنا شیر تو دکھاؤ''۔

پھر وہ فرماتے ''شیر تو تہہ خانے میں بند ہے''۔

''چلو، پھر کیا ہوا۔تہہ خانے میں چل کر دیکھ لیتے ہیں۔چلو آؤ''۔

ہماری آمادگی پر ان کو فوراً یاد آ جاتا کہ ''سردیوں میں تو تہہ خانے میں تالہ پڑا ہوتا ہے''۔

''چلو،تم کھڑکی میں سے دکھا دو''۔(سچی بات یہ ہے اس وقت کچھ کچھ یقین بھی ہو رہا ہوتا کہ ہو سکتا ہے شیر تہہ خانے میں موجود ہو)۔

''بات یہ ہے کہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔اس کو تو سردی لگ گئی تھی۔بیمار ہو گیا تھا۔ہم نے اس کو زو(چڑیا گھر) بھیج دیا''۔

نوبت یہاں تک پہنچ کر غصہ تو آنا ہی ہوتا ہے۔

''جھوٹے۔گپ باز''۔پیٹھ پر دھموکے(دونوں طرف سے)ایک کے بال دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر صورت حال گتھم گتھا ہونے لگتی۔

بڑوں میں سے کوئی نہ کوئی آ کر صورت حال پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ حکم دیتیں:''چلو جاؤ کلوخان کے پاس''۔

اب پوچھنے کی بات یہ ہے کہ آخر کلوخان جیسے نمانے شخص میں وہ کیا بات تھی کہ جس کی بنا پر مائیں اپنے بچوں کو کلوخان کی تحویل میں دے کر بے فکر ہو جاتی تھیں؟ تو اس سوال کا جواب دینے کے لیے کلوخان کی پوری اور مکمل ذات کو سامنے لانا پڑے گا۔

وہ اسم با مسمیٰ تھا یعنی خاصی کالی کل جھنویں رنگت، ناٹا قد اور چوکھونٹا سراپا، پھیلی اور بیٹھی ہوئی ناک(یقیناً کسی دراوڑی، بھیل یا کول قبیلے سے تعلق کی بناء پر) چوڑے چوڑے ہاتھوں کی انگلیاں ٹیڑھی میڑھی اور گانٹھوں دار تھیں۔تن پر سستے مارکین کا پاجامہ اور ڈوریے کی قمیض یا موٹی ململ کا بند گلے کا کرتا۔کلوخان کے گلے میں سیاہ رنگ کا ایک ڈورا پڑا رہتا جس میں چاندی کا باریک بنا ہوا تنکا اور چاندی کی ایک بہت چھوٹی سی چمچے نما چیز پڑی رہتی تھی۔وہ اس تنکے کو خلال اور چمچی نما چیز کو کن کھدنی کہتے تھے۔خلال سے وہ اپنے دانت کریدتے اور کن کھدنی سے کان کھجاتے اور اس کے اندر کی میل نکالتے تھے۔اس کے علاوہ کلوخان کے کرتے کی جیب میں ایک میلا سا ڈوریوں والا بٹوا بھی رہتا تھا جس میں وہ کتری ہوئی چھالیہ،تمباکو کے علاوہ لونگ اور چھوٹی الائچیاں رکھتے تھے۔ویسے تو ان کے پاس ایک چھوٹا پٹاری پاندان بھی تھا جس کی قلعی ختم ہو کر سیاہی مائل سرمئی ہو گئی تھی۔یہ پاندان ایک چھوٹے سے نعمت خانے پر دھرا رہتا تھا۔دراصل کلوخان ہمارے مرحوم خالو ابا(جو محکمۂ انہار میں ڈپٹی تھے)کے پیش خدمت تھے۔ان کی اچانک وفات اور اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بے در اور بے گھر ہو گئے تھے۔اب دنیا میں ان کا کوئی ٹھکانہ تھا نہ پرسان حال۔ظاہر ہے کہ اب اس ڈیوڑھی کا یہ گوشہ ہی ان کا مستقل ٹھکانا تھا۔ان کا کام بس اتنا ہی تھا کہ سودا سلف لا دیں یا وقت بے وقت ادھم برپا کرنے والے بچوں کو کنٹرول کریں۔اس کا معاوضہ ایک مختصر سی رقم کے علاوہ دو وقت کا کھانا تھا جو انہیں مل جاتا تھا۔صبح شام کے علاوہ وقت بے وقت کی خواہش کے تحت بننے والی چائے کا خرچہ ان کے اپنے ذمے تھے جو وہ اپنی پنشن کی حقیر سی رقم سے نکالتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ کلوخان کے بارے میں اس ساری تفصیل سے وہ کیا خاص بات نکلی کہ جس کی بناء پر وہ مائیں، جو بچوں کی تربیت، رکھ رکھاؤ اور اخلاق اور عادات کے سلسلے میں بہت محتاط ہوا کرتی تھیں، اپنے بچوں کو کلوخان کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاتی تھیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کوئی ایسی قابل ذکر بات تھی ہی نہیں۔وہ تو ایک صاف ستھرا رہنے والا سفید پوش تھا جس کے اندر کوئی بھی مکروہ یا ناپسندیدہ لت یا بات موجود نہ تھی۔لتوں میں جو شدید قسم کی لت کہی جائے وہ تھی دودھ پتی کی چائے یا پھر بڑے اہتمام سے پان کھانا۔کلوخان دودھ پتی کی چائے کے شوقین ہی نہیں دھنی تھے۔گرمی میں بھی صبح شام کے علاوہ رات اور دوپہر کے

کھانے کے بعد چائے کا ایک پیالہ پئے بغیر رہ ہی نہ سکتے تھے اور جاڑے کے موسم کی تو بات ہی کیا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ان دنوں تو ان کی انگیٹھی میں آگ روشن ہی رہتی تھی جس پر سلور کی جھم جھماتی دیگچی میں چائے ابلا کرتی تھی۔

جہاں تک بچوں کی ان سے دل بستگی کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ کلو خان کے نزدیک بچوں کی صحبت سے زیادہ اہم اور دلچسپ کوئی مشغلہ نہ تھا اور بچوں کے لیے وہ کیا تھے؟ میرا نہیں خیال کہ ان کو ٹیلی ویژن سے مماثلت دی جا سکتی ہے۔ ہنسی کا گول گپا، جادو کی پٹاری، طلسمات کی ایک دنیا اور ہزار داستان، الف لیلہ کی شہرزاد اور۔۔۔ اور۔۔۔ کیا بتاؤں؟ در پردہ ایک ماہر نفسیات، معلم اخلاق اور مست خدا درویش اور یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ کیا کبھی کسی نے ایسی کالی کلو ٹی جھنویں صورت، پہاڑی بلے جیسی تکونی آنکھوں، پھڈی ناک، ٹیڑھے میڑھے پان آلودہ ناہموار دانتوں اور ناٹے قد والی چوکھوٹی شخصیت کو ان تمام صفات سے منسوب کیا ہوگا جو میں نے ان کے بارے میں بیان کی ہیں؟ وہ ہوں یا نہ ہوں لیکن ہمیں تو ان کی صحبت میں بیٹھ کر کچھ یوں ہی لگتا تھا۔ ایک دم ہنسی کا گول گپا کہ بچہ لوگ ان کے پاس جاتے ہی کھل کھل ہنسنے لگتے تھے۔ اور کلو خان بچہ لوگ کو کہانیاں سنانے سے پہلے ان کی خاطر مدارات جی بھر کر کرتے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے تو وہ اپنی صدری یا کرتے کی جیب سے ایک عدد کپڑے کی تھیلی برآمد کرتے اور سب بچوں کو اپنی چارپائی پر حلقہ بنا کر بیٹھ جانے کا حکم دیتے اور بچے بالکل مسمریزم کے معمولوں کی طرح چارپائی پر حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے اور بڑی بے چینی اور بے تابی سے تھیلی کی طرف ندیدے پن سے دیکھتے ہوئے۔ اور اب وہ آہستہ آہستہ تھیلی کا منہ کھولتے کھولتے ایک منتر کی طرح وہ مخصوص بول دہراتے جن کو ہر روز بڑی باقاعدگی سے سننے کے باوجود سنتے ہی ہنسی کے مارے لوٹنا شروع کر دیتے اور ساتھ ہی کلو خان تھیلی میں سے نکال نکال کر مٹھی مٹھی بھر چنے ہمارے ہاتھوں میں دیتے دیتے فرماتے ''تو ہاں تو بچوں سناؤ اپنی بانی'' اور ہم سب جھوم جھوم کر اونچی اونچی آوازوں میں کورس کے طور پر کہنا شروع کرتے:

''کریما بہ بخشا کے بھونجے چنے
جو بچوں نے مانگے تو دو دو بٹے
جو باگڑ بلے نے مانگے تو جوتے پڑے''۔

باگڑ بلے کے لفظ پر تمام بچے کنکھیوں سے کلو خان کے چہرے بشرے کو دیکھ دیکھ کھوں کھوں کر کے ہنسنا شروع کر دیتے۔ کلو خان نے کوئی دھوپ میں تو اپنے بال سفید کیے نہ تھے۔ خوب جانتے تھے کہ بچوں کے مافی الضمیر میں کیا ہے۔ اسی دم کو بچہ آواز نکالتا:

''جو باگڑ بلے نے مانگے تو جوتے پڑے
جو کلو نے مانگے۔۔۔ جو کلو نے مانگے''۔

فوراً ہی کلو خان ٹکڑا لگاتے:

''جو کلو نے مانگے تو گھونسے پڑے''۔

بچے دھم ہو جاتے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم کسی طرح گوارا نہ کر سکتے تھے کہ کوئی کلو خان کو گھونسے تو الگ بات ہے ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ کلو خان ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو کر کہتے ''دیکھو بچو یہ جو بانی ابھی ہم نے کہی ہے وہ تو ہماری ہے۔ مگر اصل بانی اور ہے اور وہ بھی یاد کر لو۔ ہاں بھئی منہ زبانی یاد کرنا پڑے گی۔ اور میں تم کو اب گرما گرم چائے بنا کر پلاتا ہوں''۔

اپنی چھوٹی سی انگیٹھی روشن کر کے وہ دیگچی میں دودھ پتی کے ساتھ لونگ اور سبز الائچی پکانے بیٹھ جاتے۔

''ہاں تو بچو جب تک چائے پکے تم میرے پیچھے پیچھے اصل بانی بولو۔'' ہم سب ان کی آواز میں آواز ملا کر کہتے:

''کریما بہ بخشائے برحال ما
کہ ہستیم اسیر کمند ہوا
نداریم غیر از تو فریاد رس
توئی عاصیاں را خطا بخش و بس''

اب اس وقت اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی ہوش مند ہوتا تو کلو خان سے اتنا تو سوال کر لیتا کہ کلو خان آپ تو چٹے ان پڑھ ہیں۔ آپ کو فارسی کی یہ بانی کس نے سکھائی۔ پر وہ تو عجب بے ہوشی بلکہ مدہوشی کا عالم تھا۔ اتنی سدھ بدھ کس کو تھی کہ ایسی باتیں کر کے کلو خان کو بھی مکدر کرتا اور اپنے آپ کو بھی پریشان۔ پر اب مجھے اس کا جواب واضح طور پر مل چکا ہے کہ میں سوچتی ہوں کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب گھروں میں بندا پنے تختوں کے چوکوں یا چارپائیوں پر بیٹھی بڑی بوڑھیاں تک اپنی دن بھر کی گفتگو میں بے شمار مرتبہ فارسی کے مقولے، فارسی کے ضرب الامثال اور اشعار بے تکلف اپنی مادری زبان کی طرح بولتی اور استعمال کرتی تھیں۔ ہما شما اور آئے گئے ان پڑھ لوگوں کی زبانوں پر ان گنت فارسی الفاظ چڑھے ہوتے تھے اور وہ کسی نہ کسی حد تک ان کا مطلب بھی اخذ کر سکتے تھے۔ تو ہاں بات یہ ہو رہی تھی کہ ہم مٹھیوں میں دبے ہوئے موٹے موٹے سوندھے سوندھے سنہرے اور گرما گرم چنے پھانکتے چباتے رٹے لگاتے:

''کہ ہستیم اسیر کمند ہوا کہ ہم ہستیم اسیر کمند ہوا''

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت کمن ہوا کا ہمارے آس پاس گزر نہ تھا۔ بس لگتا تھا کہ یوں ہی یہ گرما گرم موٹے موٹے سوندھے سوندھے سنہرے سنہرے چنے ان کے کالے کالے چھلکوں سمیت چبانا اور اوپر سے کلو خان کی دودھ پتی لونگ الا ئچی والی چائے پی لینا ہی زندگی کی معراج ہے۔ ایمان سے آج بھی اگر دودھ پتی والی چائے پینے کو مل جاتی ہے تو اول ہی گھونٹ مجھے خالہ اماں کے تہہ خانے والے مکان کی ڈیوڑھی کے اس گوشے میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے جس کے فقط ایک گوشے میں اپنے نام جھام کے ساتھ کلو خان مقیم ہیں۔ جی! بالکل مجھے اقرار ہے کہ میں نے مقیم کے بعد صیغہ حال استعمال کیا ہے۔ اس لیے میں سچ کہتی ہوں کہ کلو خان اب تک وہیں اسی گوشے میں موجود ہے اپنی تمام خصوصیتوں اور عادتوں سمیت۔ اور پہلے تو کبھی اپنے اس کونے کو چھوڑ کر وہ ادھر سے ادھر ہو بھی جاتا ہوگا لیکن اب وہ وہاں ہمہ وقت موجود ہے۔ پتھر سے بنے ہوئے مجسمہ کی طرح اپنی جگہ اپنے مقام پر گڑا ہوا مضبوطی سے نصب ہوا۔ اپنے ناٹے اور گھٹے ہوئے قد، کل جھنویں رنگت، تکونی تکونی اور اپنی پھیلی پھیلی دراوڑی ناک سمیت۔ بظاہر چپ چاپ لیکن اندر ہی اندر ہلتے ہوئے ہونٹوں سے کہتا ہوا: نداریم غیر از تو فریاد رس۔۔۔۔اس ہوا و ہوس سے بھری دنیا میں کون کس کا فریاد رس ہوتا ہے۔ صومالیہ، موغادیشو ہو، بوسنیا ہو یا پھر خستہ و درماندہ نشاں کشمیر کی مرغزار اور گلرنگ وادیوں اور بے شمار کدلوں سے اٹھتی ہوئی نحیف و نزار چیخوں کی صدا۔ کمند ہوا سے جکڑی ہوئی اقوام غالب نے بڑی سختی سے اپنے کانوں کے سوراخوں میں اپنی مضبوط انگلیوں کو ٹھونس رکھا ہے۔۔۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا ہے۔۔۔ اور شاید عاصیوں کے فریاد رس اور خطاء بخش نے بھی آدم زاد کی من مانیوں سے روٹھ کر اپنا منہ ادھر کو (نہ جانے کس طرف کو) موڑ رکھا ہے۔ تو پھر گھبرا کر، بوکھلا کر میں اس طرف کو جا نکلتی ہوں جہاں کی تنگ گلی کے داخلے کے ساتھ ساتھ ہی تکیرا ہے۔ تکیرے کے خاتمے پر بائیں ہاتھ ہیگا کا مختصر سا لکھوری اینٹوں والا خستہ اور درماندہ مکان ہے اور بائیں جانب نکڑ پر کھڑی لال مسجد ہے۔ میں گلی کے اندر داخل ہو کر چلتی چلتی تکیرے کے عین مقابل تہہ خانے کی کھڑکیوں کی سلاخوں کے پاس چپ چاپ کھڑی رہتی ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلتا کہ میں کس راہ سے اندر داخل ہوئی ہوں۔ خالہ

اماں کے صحن کی کیاریوں میں گل عباس کھل رہا ہے۔ بہت تیز گلابی، کاسنی اور بسنتی پھولوں کی مہک ہر سو پھیل رہی ہے۔ اور موتیے کے مضبوط پودوں پر موٹی موٹی موتیا کلیوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، اور اونچی بلکہ بہت اونچی دیوار پر بیل پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے پہلے بھی اس بیل کا نام نہیں معلوم تھا۔ بس پھول اچھے لگتے تھے اس کے۔ صحن سے چل کر اونچی کرسی والے برآمدے کے وسط میں لگے تختوں کے چوکے پر خوش رنگ جازم بچھی ہے۔ دیوار کے ساتھ اجلے اجلے غلاف میں کسا گاؤ تکیہ لگا ہے اور دالان کے اندرونی گوشے کے ایک درے میں ایک جانب رنگین پایوں والی نیچی سی پلنگڑی پر شفاف بے داغ اور بے شکن بستر لگا ہے۔ ایک جانب نماز کی چوکی لگی ہے۔ مخملی جانماز کا ایک کونا الٹا ہوا ہے اس خیال سے کہ کہیں شیطان اس پر نماز پڑھنے نہ کھڑا ہو جائے۔ برآمدے کے ساتھ والے کمروں کی سادہ اور ستھری آرائش ویسی ہی پرسکون ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نیم تاریک سی فضا کا سکون مجھے تندا سا کئے دے رہا ہے اور میں ناوقت سو جانے کے خوف سے برآمدے سے اتر کر صحن کے دوسری جانب صحنچی میں جا کھڑی ہوتی ہوں۔ ہر شے اسی طرح اپنی جگہ موجود ہے۔ بڑا سا جالی دار نعمت خانہ، کھانا کھانے والی طویل چوکی، برتنوں سے آراستہ دیوار گیر الماری اور خوبصورت نقش ونگار والا چائے کا سماوار رکھا ہے جس کے نچلے حصے میں انگارے دہک رہے ہیں۔ اور ٹونٹی سے بھاپیں نکل رہی ہیں، خوشبودار چائے کی لپٹیں۔ گھر بھر میں ایک نفس بھی موجود نہیں۔ برآمدے کے آخری درے سے لٹکتا طوطے کا پنجرہ خالی ہے۔ پنجرے کی کھڑکی کھول دی ہے کسی نے۔ میں کسی کو بھی تلاش نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ باورچی خانے کی کھڑکی سے ادھر لال مکان میں انار پر کلیاں پھول بن بن کر کھل رہی ہیں۔ کیلے کے جھاڑ میں لگے کیلوں کی گاچھ کو کسی نے کاٹا بھی نہیں اور وہ جھاڑ میں لگے لگے ہی پک کر پیلے پڑ گئے ہیں اور لیچی کے پیڑ کی ڈالوں سے لٹکتے سرخ سرخ رسیلے لیچی کے گچھے بالکل تیار ہیں۔ پر ادھر بھی درختوں سے پھل اتار اتار کر کھلانے والی نانیاں جانے کدھر کو نکل گئی ہیں۔ موسم کے ساتھ ساتھ اڑ جانے والی مرغابیوں کی ڈاروں کی غول میں راہ بھٹک کر کہیں کی کہیں پہنچی ہوں گی اب تو۔

میں وہیں سے مڑ کر چلتی چلتی ڈیوڑھی میں آ جاتی ہوں۔

''پرندو کا کوئی اعتبار بھی تو نہیں، پرندے تو اڑ ہی جاتے ہیں''۔ جیسے کوئی کہتا ہو۔

لیکن یہ کیا! یہ کلو خان تو اسی طرح اپنے اسی کونے میں مقیم ہے۔ وہی سامان، وہی بھاری بھاری پایوں والا پلنگ، وہی دری میں لپٹا بستر اور چارپائی تلے رکھا ٹین کا صندوق جیسے کوئی مسافر تیار بیٹھا ہو، اگلی گاڑی پکڑنے کی خاطر۔

میرے قدم بھاری پڑ رہے ہیں۔ چلتے چلتے تھک جو گئی ہوں۔ دل بھی تو بہت بھاری بھاری ہے۔ جیسے کوئی مال گاڑی بہت سے اسباب سے لدی پھندی دھک دھک چلتی ہو۔

میں کلو خان کے پلنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی ہوں۔ وہ پلنگ پر اسی جگہ اسی طرح جما بیٹھا ہے۔ سر سے تراشے ہوئے سنگین اور بدصورت مجسمے کی طرح۔ میں نے اپنے آپ کو کلو خان سے کہتے ہوئے خود سنا ہے: ''کلو خان، میں آپ ہی آئی ہوں مجھے کسی نے شرارتیں اور غل غپاڑہ کرنے پر سزا کے طور پر آپ کے پاس نہیں بھیجا ہے۔ کلو خان، جی بہت اداس ہے۔ دل بہت بھاری ہے۔ آپ دیکھ رہے ہونا کہ کیا کچھ ہو رہا ہے؟ دیکھو، کوئی کسی کی نہیں سن رہا ہے اور لوگ بہت بول رہے ہیں۔ خون بہت بہہ رہا ہے۔ ہر طرف بساند ہے، سڑاند ہے اور فضا میں گھروں کے جلنے کی بو ہے اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ''یہ کثافتیں ہیں۔ کارخانے بند کر دو، فیکٹریاں جلا دو۔ تیسری دنیا کو تمام کثافتوں سے پاک کر دو''۔

کلو خان کے سرمئی مجسمے کے سر کو جنبش ہوئی ہے جیسے کہتا ہو 'سب سمجھتا ہوں''۔ اس کے گلے میں سیاہ ڈورے میں بلا ہوا چاندی کا خلال اور کان کھدنی اسی طرح چمک رہا ہے اور وہ اپنی جیب سے تھیلی نکال رہا ہے۔ مجھے پتا ہے تھیلی میں بھنے ہوئے

سوندھے سوندھے چنے ہیں جن میں کشمش اور شکر چڑھے الائچی دانے ملے ہوئے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اب چنے باہر آئیں گے اور کلو خان کی آواز سنائی دے گی:

''کریما بہ بخشا کے بھونجے چنے۔ جو بچوں نے مانگے تو دو دو بٹے۔ جو باگڑ بلے نے مانگے تو۔۔۔تو۔۔۔۔''

مگر سنو تو، یہ کلو کے سرمئی مجسمے کے ہلتے ہونٹوں سے کیا صدا آتی ہے اور آتی ہی چلی جاتی ہے:

''کہ ہستیم اسیر کمند ہوا۔ اسیر کمند ہوا۔۔۔۔''

اور اب میں نے چونک کر ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا ہے۔ سی این این کی نیوز ریڈر کے منہ سے نیوز آئی ٹم کے آخری الفاظ یوں سنائی دیے ہیں:

"Nearly 3000 people have died in Bosnian operations".

ساری رات

انور عظیم

دوسرا گلاس بھی خالی تھا۔ میرا گلاس، جو پہلا گلاس نہیں تھا، خالی ہو رہا تھا۔ میں نے دوسرے گلاس کو بھی بھر دیا اور انتظار کرنے لگا۔ اس کا جس کے آنے کا انتظار تھا۔ اس کا جس نے آنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔

چھت پر چاندنی سو رہی تھی۔ ہوا جاگ رہی تھی اور رات کا دل دھڑک رہی تھی کبھی کبھی رات گہری سانس لیتی تھی اور خاموش ہو جاتی تھی۔ میں خاموش نہیں تھا میں بول رہا تھا لیکن کوئی میری آواز سن نہیں رہا تھا۔ خالی گلاس، جس کو میں نے چند لمحے پہلے بھر دیا تھا اب بھی خالی خالی آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ چاند میرے گلاس میں اتر آیا تھا اور آہستہ آہستہ پگھل رہا تھا۔

"بہت انتظار کرایا تم نے۔ تمہارا جام کب سے بھرا ہوا ہے۔ رات بیت رہی ہے۔ پیو نہ پیو جتنی رات اب باقی ہے، بہت ہے"۔ میں نے کہا، اس سے جس کے آنے کا مجھے انتظار تھا۔ گلاس بھرا ہوا تھا، لیکن مجھے خالی نظر آرہا تھا۔

"ہاں بہت ہے"۔ اس نے کہا جس کے انتظار میں میں شام سے چھت پر بیٹھا تھا، پی رہا تھا سگریٹ کے کش اڑا رہا تھا۔ تمباکو اور وہسکی کی خوشبو میری روح میں بسی ہوئی تھی۔

"تم بہت اکیلے ہو"۔ اس نے کہا جو نہیں آیا تھا۔ اس کے ہونٹ مڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھیگی بھیگی چنگاریاں جھلملا رہی تھیں۔ ہونٹ اور مڑ گئے اور اس نے میری طرف جھک کر کہا "تم بہت اکیلے ہو"۔

اس کے لہجے میں کتنا کدورت بھرا چٹخارہ تھا۔

مجھے اپنے آپ پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ چہرہ ٹھنڈا تھا۔ نمی نے چہرے پر جالے سے بن دیئے تھے۔ گلاس کے باہر بھی، میرے چہرے کی طرح نمی کے جالے پگھل رہے تھے۔

یکا یک میرا چہرہ گرم ہونے لگا۔ سانس جلنے لگی۔ "میں سب کچھ بدل سکتا ہوں۔ اس کے پرخچے اڑا سکتا ہوں جس کا مجھے انتظار ہے۔ میں اس چھت سے کود سکتا ہوں۔ اور نیچے گر سکتا ہوں۔ گر کر کہاں جا سکتا ہوں۔ نیچے پاتال ہے۔ یہ چھت بھی پاتال ہے پاتال سے پاتال میں۔ یہ گرنا بھی کوئی گرنا ہے"۔

اس کے ہونٹ اور مڑ گئے۔ چوٹ کھائے ہوئے جھینگر کی طرح۔ جھینگر بول رہے تھے۔ جھینگروں کی آواز سن کر، نیچے اصطبل میں گھوڑے ہنہنانے لگے۔ آواز آواز کو جگاتی ہے۔ خاموشی خاموشی کو تھپکیاں دیتی ہے۔ میں نہ آواز ہوں، نہ خاموشی۔ میں کیا ہوں۔ اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ جھینگر غائب ہو گئے۔ اس نے ہنس کر کہا "تم اپنی آواز سے ڈرتے ہو"۔

میں اس کی آواز کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی گیا۔

"پیو پیو، ابھی رات باقی ہے"۔

"ہاں ابھی رات باقی ہے۔ جام بھی باقی ہے، تم بھی باقی ہو"۔

دوسرے گلاس پر انگلیوں کی گرفت کبھی سخت ہو جاتی تھی کبھی ہلکی۔ کبھی انگلیاں پگھلنے لگتی تھیں، کبھی برف کی طرح جم جاتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کانچ کی دیوار بھی پگھل گئی ہے جسے میں گھورے جا رہا تھا۔

میں جھکا۔ میں نے انگلیوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ خالی گلاس کتنا سرد تھا۔ ہونٹوں کی طرح۔ اور وہ انگلیاں جن کی گرفت

میں گلاس تھا۔ انگلیاں بھی کتنی سرد تھیں۔ برف کی انگلیاں، برف کی آنکھیں، برف کے ہونٹ، برف کا چہرہ، برف کی مسکراہٹ، میں نے خالی گلاس کو پھر شیشے کی میز پر رکھ دیا۔ انگلیوں سمیت جن میں نہ جانے کتنے ڈنک چھپے ہوئے تھے۔ میں نے سارے ڈنک اپنے ہونٹوں میں چھپالیے اور چپ چاپ اپنی کرسی میں سما گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا، ربڑ کی آستین کی طرح، اور گلاس میں پگھلتے ہوئے چاند کو پی گیا۔ بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی، پھر جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ۔۔۔ وہ سامنے بیٹھا ہے۔ رات کا دھندلکا میری روح سے چھن رہا ہے اور ستاروں کی گرد کی طرف سفر کر رہا ہے۔ وہ سامنے بیٹھا ہے اور انگلیوں سمیت اس گلاس کو خالی کیے جا رہا ہے جو شروع سے خالی تھا اور جس پر انگلیوں کی گرفت سخت تھی۔ جس کے سارے ڈنک میں نے اپنے ہونٹوں میں چھپا لیے تھے۔

بینک میں "ٹوکن" جس طرح ایک کے اوپر ایک رکھے جاتے ہیں، مینار کی طرح، اسی طرح اس کے اعضاء ہوا میں تیر رہے تھے، لیکن ایک کے اوپر ایک۔ پھن پھیلائے ہوئے سانپ کی طرح، جس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے ہوں لیکن جس کا ہر ٹکڑا زندہ ہو اور ایک کے اوپر ایک، لہرا رہا ہو۔

میں انگلیوں کو چھوتا ہوں، میرے ہونٹ خوشبو کا پیچھا کرتے ہیں۔ ہاتھ کا سفر، بانہوں کا سفر، گردن کا سفر اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ چہرہ، وہ چہرہ، کہیں نہیں ہے۔ میرا چہرہ اور اس کا چہرہ، دونوں غائب ہیں۔ سفر ختم ہوا۔ وہ ہنستی ہے، یہ اس کی ہنسی ہے۔ میں ہنسی کو دیکھتا ہوں۔ آواز جو دکھائی نہیں دیتی، چہرہ بن گئی ہے۔ میں اس آواز کو چومتا ہوں۔ اب ایک سفر اور شروع ہوتا ہے جو چہرے سے آگے جاتا ہے کیونکہ آواز وقت ہے۔ وقت جو وقت سے آگے جاتا ہے۔

گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ سارے تانگے والے یہیں رہتے ہیں۔ وہ وہیں رہتے ہیں جہاں گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ جہاں گلی کوچوں کا اندھیرا ہے۔ وہ اپنے گھوڑے سے بھی زیادہ تھکے ہوئے ہیں اور بے ہوش ہیں جو اپنے زمانے سے آگے نکل جاتے ہیں وہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ میں ہوں یا گھوڑے، ایک ہی بات ہے۔

ان جان لیوا انگلیوں نے، جو ہوا سے زیادہ سبک ہیں، گلاس کو چھوڑ دیا ہے۔ انگلیوں سے چھوٹتے ہی گلاس بجھ گیا ہے، چراغ کی طرح۔ ساری رات چاند بجھا رہا ہے۔ ساری رات۔

اب کیا ہوگا۔ تم نے گلاس چھوڑ دیا ہے۔ گلاس کتنا خالی ہے۔ گلاس کی دیوار پر نمی کس طرح پسیج رہی ہے۔ اور تم کتنی بے لباس ہو۔ سچائی کی طرح۔ مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے۔ مجھے لباس سے زیادہ تم پسند ہو۔ بے لباس سچائی۔ سچائی نڈر ہے۔ اسی لیے تم اتنی خوبصورت ہو۔

ساری کھڑکیاں دور دور تک اندھی آنکھوں کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ کمروں کی آنکھیں باہر دیکھتی ہیں۔ میں ان آنکھوں کے اندر دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ان کمروں کے اندر۔ ایک کمرے وہ ہیں۔ ایک کمرہ میں ہوں۔ تم اس کمرے میں کتنی اکیلی ہو۔ مجھے تمہارا یہ اکیلا پن بہت اچھا لگتا ہے۔ کھویا ہوا چہرہ، کھوئی ہوئی بانہیں، کھوئی ہوئی باتیں۔ ایک کمرہ تم ہو۔ میں اس کمرے میں کتنا اکیلا ہوں۔ ہر طرف گھٹن ہے۔ ساری کھڑکیاں بند ہیں۔ اور میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم کسی طرح آ نہیں چکتیں۔ نہ جانے کیا قصہ ہے۔

رات گرد کی طرح اڑ رہی ہے، سورج کی طرف۔

یہ سب محض خیال ہے۔ باتیں۔ ان ہی باتوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ اس چھت تک جس کے نیچے اصطبل ہے، جہاں گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ تھکے ہوئے گھوڑے۔

میں بھی تھک گیا ہوں۔

تم پھر آ گئے۔ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے۔ وقت، کیسا وقت۔ تم نے بلایا، میں آ گیا۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ تم اب جاؤ۔ میں اس وقت اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم اکیلے کب ہو۔ وہ کون ہے۔ وہ کوئی نہیں۔ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ میں بھی نہیں، تم بھی نہیں، لیکن یہاں کوئی تو ہے۔ دوسرے گلاس پر انگلیوں کے نشان کیسے ہیں۔

وہ نتھنے پھلا کر انگلیوں کو سونگھتا ہے۔ گلاس کی دیوار پر نشان جاگتے ہیں۔ آہستہ آہستہ انگلیوں میں خون دوڑ رہا ہے۔ اس کا جسم تن گیا ہے۔ اس کی زبان نکل آئی ہے۔ اس کی دم سخت ہوگئی ہے۔ لوہے کی دم۔ وہ گلاس کو سونگھتا ہے اور چھت کو پنجوں سے کریدتا ہے۔ اس کے پنجے بھی لوہے کے ہیں۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی ہیں۔ اس کے منہ سے، زبان سے، جھاگ ٹپک رہا ہے۔ پوری چھت پر جھاگ ہے۔ میں چلتا ہوں۔ جھاگ پر پھسلتا ہوں، اور گرتا ہوں۔ اٹھتا ہوں اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ بھونکتا ہے۔ گلاس کو سونگھتا ہے۔ دم ہلاتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔

میرا دل دھک دھک دھک کر رہا ہے۔ اچھی مشین ہے یہ دل۔ غریب دل۔ رفریجریٹر کی طرح کام کیے جاتا ہے۔ مشین کا موٹر گرم اور چیزیں ٹھنڈی۔

تم میرے پاس آؤ۔ چہرہ نہیں ہے تو نہ سہی۔ تم تو ہو۔ تم اور تم اور تم۔ یہ سارے سال، مہینے، دن، کتنے میلے، کتنے شکن آلود ہیں۔ ڈالوان کوردی کی ٹوکری میں۔

اس وقت ساری باتیں یاد آ رہی ہیں۔ یادیں ستاروں کی طرح جھلملاتی رہتی ہیں۔ رات بھر ہم بھی ان کے ساتھ جھلملاتے رہتے ہیں، رات بھر۔

تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا۔۔۔ شاید وہ تمہاری زندگی کا سب سے کمزور لمحہ تھا۔۔۔ کیا کہا تھا میں نے۔ تم نے کہا تھا میں بہت انوکھا انسان ہوں۔ میں نے پوچھا تھا۔۔۔ کیوں؟ تم نے ہنس کر کہا تھا۔۔۔ تم بہت شریف آدمی ہو۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ میں نے ساری رات باتوں میں کاٹ دی تھی۔ ہاں مجھے یہ سمجھنے میں بہت دیر لگی کہ راتیں باتیں کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔

تم بہت زور زور سے سانس لے رہی ہو۔ منہ پر رومال مت رکھو۔ کھانسی بھلا رومال روکے رکتی ہے۔ تم پیاسی ہو۔ خالی گلاس۔ اور تمہارا چہرہ خالی گلاس میں ہے۔ میرے گلاس میں چاند ہے۔ تمہارے گلاس میں چہرہ ہے۔ چہرے پر وقت نے جھریاں بنا دی ہیں۔ وقت اپنے چہرے پر جھریاں بنتا رہتا ہے۔ وقت خالی گلاس میں ہے۔ وقت کو اسی طرح پہچانا جاتا ہے۔ ہر شخص وقت کو اپنے گلاس میں انڈیل کر پی جاتا ہے۔ آنکھوں میں کتنا کاجل بھر لیا ہے تم نے۔ ہونٹوں کو لپ اسٹک نے کتنا پھیکا بنا دیا ہے۔ ہاتھوں پر رگیں جونکوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔ تمہارے دانت کتنے میلے ہو گئے ہیں۔ وقت کی طرح۔۔۔ جس میں ہم زندہ رہے، جو ہم سے چھو کر میلا ہو گیا۔ ہم وقت کو اپنی زندگی کے اس میل کے سوا اور کچھ نہ دے سکے۔ رات کا چل چلاؤ ہے۔ وقت کم ہے۔ تمہارے گلاس میں بھی جو خالی ہو رہا ہے۔ میرے گلاس میں بھی جو خالی ہو رہا ہے۔ اب تم آئی ہو تو بھلا کیا آئی ہو۔

تم گلاس کے اندر سے مجھے دیکھ رہی ہو۔ کاجل بھری آنکھوں سے، اور تمہارے چہرے کی جھریاں جالے کی طرح اڑ رہی ہیں اور تمہاری آنکھوں پر جھول رہی ہیں۔

ہاں سب ٹھیک ہے۔ بینک کی نوکری، معاشقے، فلم دیکھنے کے لیے ملاقاتیں۔ میزوں کے نیچے پیروں اور گھٹنوں کا ملاپ، کافی کے ساتھ، وہسکی کے ساتھ، موٹی موٹی گالیاں، دھکم پیل زندگی اس ریلے میں بہتی ہوئی اس چھت تک پہنچ گئی ہے۔ کتنی رشوتیں، کتنی بے ایمانیاں، کتنی چغلیاں۔ سب لباسوں میں چھپی ہوئی، تمہاری جھریوں کی طرح جس کو وقت نے تمہارے چہرے میں چھپا

دیا تھا اور جن کو وقت ہی نے ابھار کر چہرے پر پھیلا دیا ہے۔ اب جھریوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ چہرہ کہیں کھو گیا ہے۔ تمہارا بھی اور میرا بھی۔ سارا غازہ، سارے رنگ، ساری خوشبو۔۔۔ سب کچھ چہرے کے ساتھ کھو گیا ہے۔ اب چہرے کی تلاش بیکار ہے۔

گلاس میں پڑا ہوا چہرہ خوشی میں چیختا ہے۔ جھریاں کانپتی ہیں۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں کان جل رہے ہیں۔ گلا خشک ہوا جا رہا ہے۔ میں انگارے چبا رہا ہوں۔

اتنی بڑی، اتنی لمبی زندگی، اتنا چھوٹا سا چہرہ، اتنا چھوٹا سا گلاس اور اتنا خوفناک قہقہہ۔

میں نے دوسرا گلاس اٹھالیا۔ ایک ہی چوٹ سے گلاس کا سر ٹوٹ گیا۔ ٹوٹا ہوا کنارا دانتوں کی طرح چمکنے لگا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دانت پیس کر ٹوٹے کنارے کو اپنی کلائی پر رکھا دانت گوشت میں چبھے۔ میں نے گلاس گھما دیا۔ کلائی ادھڑ کر رہ گئی۔ میں نے گرم پھواروں کو گلاس پر، میز پر، چھت پر گرتے دیکھا۔ گرم پھواریں، جن کا کوئی رنگ نہیں تھا، میری رگوں سے پھوٹی تھیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ چھت ویران تھی۔ آسمان کی طرح جن پر ستارے بجھ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ستاروں کی گرد نے مجھے گھیر لیا۔

گلاس کے ٹوٹ جانے کا مجھے افسوس ہے جس میں تمہارا چہرہ ڈوب گیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم کہیں ہو اور مجھے دیکھ رہی ہو۔ اور میں صرف اس لیے مسکرا رہا ہوں کہ میں تمہاری آنکھوں کے سفر سے ڈرتا ہوں۔ میری مسکراہٹ تمہاری آنکھوں کا راستہ روکے کھڑی ہے اب تمہاری آنکھیں مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔

میں گلاس اٹھاتا ہوں اور منہ سے لگاتا ہوں۔ میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اب یہ گلاس بھی خالی ہے۔

☆☆☆

ایک رات

اے حمید

رات سر پر آئی تھی اور میں شہر کی سڑکوں پر بے یار و مددگار پھر رہا تھا۔

پچھلی رات سے میرے پیٹ میں سوائے پانی اور چائے کی پیالی کے کچھ نہ گیا تھا۔ علاوہ ازیں میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی اور آخری سگریٹ میری انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ امید کی آخری کرن بھی بجھ رہی تھی۔

اتنے بڑے شہر میں میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں نومبر کی سرد رات بسر کی جا سکے۔ اس سے پیشتر جبکہ راتیں خوشگوار تھیں میں ایک باغ میں سویا کرتا۔ پھر نومبر شروع ہو گیا اور میں ریلوے ویٹنگ روم میں آ گیا۔ یہاں بوڑھے چوکیدار سے واقفیت ہو گئی۔ میں اس کے بیٹے کو انگریزی پڑھا دیا کرتا اور وہ مجھے آرام سے لمبے بنچ پر ٹھنڈے گدے پر سونے کی اجازت دے دیتا۔ مگر وہ بچہ اس قدر نکما اور ضدی تھا کہ مجھے مجبوراً ڈرائینگ روم کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہاں سے میں نے سیدھا خدا کے گھر کا رخ کیا جہاں تین دن تک تو مولوی صاحب لحاظ ہی کرتے رہے لیکن چوتھے روز انہوں نے بھی لمبی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے فرما دیا۔

''برخوردار۔ ماں باپ کا دل دکھانا گناہ ہے۔ اپنے گھر جاؤ''۔

اور میں چپکے سے اپنے گھر چلا آیا۔ یعنی پھر انہی لمبی چوڑی سڑکوں پر جو مجھ غریب کی راہ میں ہر قدم پر بچھی جاتی تھیں اور جن کی اڑتی ہوئی گرد میں دو ماہ سے پھانک رہا تھا۔

جس سڑک پر میں چل رہا تھا وہ کافی کھلی اور بارونق تھی۔

کنارے کنارے سبز قمقموں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ جن کی پھیکی روشنی میں گذرنے والوں کے چہرے مدقوق دکھائی دے رہے تھے۔ لوگ گرم کپڑے پہنے جگمگاتی ہوئی دوکانوں میں خرید و فروخت میں مشغول تھے۔

کافی دیر ادھر ادھر آوارہ گردی کرنے کے بعد جب سردی، تھکن اور بھوک نے میرے اعضاء پر مردنی سی طاری کر دی تو میں نے پھر خدا کے گھر کا رخ کیا۔ مسجد کے بڑے دروازے میں کھڑے ہو کر میں نے دیکھا کہ صحن بالکل خالی تھا اور بڑے کمرے کے محرابی دروازے پھولے ہوئے نمدوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جوتا باہر اتار کر، صحن کا ٹھنڈا فرش عبور کر کے میں نمدہ اٹھا بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔

گرم اور پر سکون فضا کے نرم لمس نے لپک کر میرے تھکے ہارے سرد جسم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور میں گرتے گرتے سنبھلا۔

کمرہ بالکل گرم حمام بنا تھا۔ زمین پر بھورے رنگ کی چٹائیاں قرینے سے بچھی ہوئی تھیں۔ منقش چھت سے قیمتی جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ اور سنگ مرمر کے منبر پر مٹی کے آبخورے میں گلاب کے پھول رکھے تھے۔ جن کی دھیمی دھیمی خوشبو فضا میں تیر رہی تھی۔ ایک کمزور لیمپ کی گدلی گدلی روشنی میں مسجد کا یہ کمرہ اس کے صحن کی طرح بالکل خالی پڑا تھا۔ جس جگہ میں گھٹنے چھاتی سے لگائے، اپنا سر بازوؤں کے حلقے میں چھپائے، سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے قریب ہی جوتے رکھنے کا ڈبہ تھا۔ میرا ذہن شاں شاں کر رہا تھا اور نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔

اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ آنے کے بعد اس اجنبی شہر میں، میں دو ماہ سے دربدر پھر رہا تھا اور میرا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایک بار پھر اپنے آپ کو خدا کے گھر میں پا کر میرا دل چاہا کہ ہاتھ باندھ کر بصد عجز و نیاز اس کے حضور میں ایک عرض کروں۔

میں پوچھوں کہ میں نے اس کے کس پیغمبر کی توہین کی تھی، جس کی پاداش میں مجھے بھوک، سردی اور ذلت کے سنگلاخ میدانوں میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

میں نے نظریں اٹھا کر منبر کی طرف دیکھا، جہاں مٹی کے آبخورے میں سجے ہوئے پھول مجھے بے زبان قیدیوں کی مانند دیکھنے لگے۔ میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔ لیکن میرا جسم دکھ رہا تھا اور بھوک کی وجہ سے انتڑیاں پیٹ میں کانٹے دار تاریں بن کر چبھ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کاش میں اتنا چھوٹا بن جاؤں کہ جوتے رکھنے والے ڈبے میں دبک کر سمٹ جاؤں اور ساری عمر وہیں پڑا رہوں اور کبھی باہر نہ نکلوں۔ میں نے بازوؤں کے حلقے میں سے ایک آنکھ کھول کر ڈبے کو دیکھا۔ اس میں ایک بھی جوتا نہ تھا۔ مجھے فوراً اپنے جوتے کا خیال آ گیا جس سے مجھے خاص لگاؤ تھا اور جس نے خستہ حالی کے باوجود ہر حالت میں میرا ساتھ دیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ اندر لانا بھول گیا تھا۔ جی میں آئی کہ اسے باہر سے اٹھا کر اندر لے آؤں ورنہ وہ ٹھنڈ میں پڑے پڑے اکڑ جائے گا۔ لیکن اس گرم فضا سے نکل کر ٹھنڈے صحن کو عبور کرنے کے خیال ہی سے میرے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی میں اور اکٹھا ہو گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں ابھی کوشش ہی کر رہا تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ میں زیادہ سمٹ گیا۔ خاموش کمرے میں کسی کے بوجھل قدموں کی چاپ سنائی دی جو بتدریج میرے قریب پہنچ کر رک گئی۔

''کون ہو تم؟'' اس آواز میں ترشی اور کھردراپن تھا۔

میں نے سر اٹھایا۔ ایک مولوی صاحب جن کا قد ٹھگنا، جسم بھدا اور ڈاڑھی مہندی رنگی تھی میرے اوپر جھکے کھڑے مجھے اپنی سرخ سرخ غلافی آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔ کھردری آواز پھر بلند ہوئی۔

''کون ہو میاں؟''

اور میں نے سر جھکا لیا۔

''جواب کیوں نہیں دیتے خدا کے بندے؟'' اس دفعہ آواز کڑوی اور کرخت تھی جیسے کوئی نیم کے تنے پر کلہاڑی چلا رہا ہو۔

''میں آدمی ہوں جناب''۔

''بھئی آدمی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ مگر تم ہو کون؟''

''مسلمان ہوں''۔

''پھر وہی بات۔۔۔۔ خدا کے بندے مسجدوں میں مسلمان ہی آتے ہیں لیکن اصل میں تم کون ہو؟''

میں جھلا گیا۔

''میں ہوں خانہ بدوش۔۔۔۔ دیوندر ستیارتھی کی کتاب کا سرورق''۔

''لاحول ولا، مولوی صاحب نے چکرا کر میری بات کاٹ دی۔ تم ہندو ہو گیا؟''

''جی نہیں حضور۔۔۔۔ میں مسلمان ہوں۔ پردیسی ہوں اور یہاں رات بسر کرنا چاہتا ہوں''۔

''پناہ گزین ہو؟'' مولوی صاحب نے اور جھک کر پوچھا۔

''کچھ سمجھ لیجئے''۔

مولوی صاحب ایک دم سیدھے کھڑے ہو گئے۔

''تعجب۔۔۔ خدا کے بندے تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا؟ برخوردار اگر ایسی ہی بات ہے تو کسی سرائے میں جاؤ، کیمپ

میں جاؤ۔ خدا کا گھر ہرایرے غیرے کے لیے نہیں ہے اور پھر اس مسجد میں آئے دن چوریاں ہوتی ہیں۔ کبھی پمپ کی ہتھی نہیں ہے تو کبھی نلکے کی ٹونٹی غائب۔۔۔۔ ان پناہ گزینوں کا کچھ ایسا تانتا بندھا ہے کہ جینا مشکل ہو گیا ہے۔ نہیں نہیں میاں! اپنا راستہ پکڑو۔ مجھے بڑا دروازہ بند کرنا ہے"۔

میں دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ کم بخت یہ تو بڑا ہی اجڈ قسم کا مولوی تھا۔ مجبوراً اٹھا۔ گرم فضا میں دو تین لمبے لمبے سانس بھر کر معدہ گرم کیا اور صحن میں آ گیا۔ سرد ہوا اور ٹھنڈا فرش میرے استقبال کو آگے بڑھے اور میں نے جلدی سے کوٹ کا پھٹا ہوا کالر چڑھا لیا اور ہاتھ جیبوں میں داب لیے ۔ باہر پڑے پڑے میرا جوتا واقعی اکڑ گیا تھا۔ تسمے باندھتے ہوئے میرا دل چاہا کہ کسی نہ کسی طرح پمپ کی ہتھی یا نلکے کی ٹونٹی کھول کر لے اڑوں مگر مولوی صاحب میرے سر پر ہی کھڑے تھے۔ اس امید کا بھی گلا گھونٹ کر میں چپ چاپ مسجد کے بڑے دروازے سے باہر آ گیا۔

باہر اب کافی سردی ہو گئی تھی اور لوگ تیز تیز قدم اٹھائے شاید اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ گھر۔۔۔۔ جہاں ان کی مائیں بہنیں بیویاں اور گرم کھانے اور گرم بچھونے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے سرد آہ بھری اور سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

ابھی تھوڑی دور ہی چلا ہوں گا کہ دفعتاً کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"معاف کیجیے گا۔ آپ کے پاس دیا سلائی ہوگی؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سلیٹی رنگ کے لمبے کوٹ میں ملبوس، سیاہ گھنگھریالے بالوں اور تیکھی ناک والا ایک نوجوان شخص مجھے چمکیلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ضرور ہوگی"۔

اس کا رنگ سنہرا گندمی تھا اور چہرے پر شرافت عیاں تھی۔ سگریٹ سلگاتے وقت اس کی سیاہ بھنوئیں اکٹھی ہو گئیں اور تیکھی ناک چمک اٹھی۔ دیا سلائی واپس کرتے ہوئے وہ ذرا سا میری طرف جھک کر بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایک ہی سگریٹ تھا"۔

"کوئی بات نہیں"۔

اور وہ اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑاتا میرے ساتھ چل پڑا۔

اس کی چال پُروقار اور متوازن تھی۔ جیسے وہ فوج کا کپتان ہو اور رات کے وقت شہر میں گشت کرنے نکلا ہو۔ اس کے چوڑے اور مضبوط شانوں کا لطیف جھکاؤ اس کی رفتار میں دلکشی پیدا کر رہا تھا۔ ہم خاموشی سے چلتے گئے۔ ایک چوک کے پاس پہنچ کر غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیوں جناب اس شہر میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں کرایہ ادا کیے بغیر رات کاٹی جا سکے؟"

وہ ٹھٹھک گیا۔ ایک پل کے لیے رک کر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"کیا واقعی بے گھر ہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔۔۔ بالکل بے گھر"۔

"تو میرے ساتھ آئیے"۔

اتنا کہہ کر وہ زیرلب مسکرایا اور مجھے ساتھ لیے ایک طرف گھوم گیا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ شخص مجھے اپنے گھر لیے

جا رہا ہے۔ اس کا گھر بھی اتنا ہی دلکش ہوگا جتنی کہ اس کی چال ڈھال ہے۔ میں دل ہی دل میں اسے کے گھر کا نقشہ قائم کرنے لگا۔ ایک خوبصورت کھڑکیوں والا گھر جس کے کمروں کی دیواروں پر پھولدار کاغذ منڈھے ہوں گے اور جس کے باورچی خانے میں قسم قسم کے کھانے پک رہے ہوں گے۔ ہم دونوں ایک فرنیچر سے بھرے ہوئے ڈرائینگ روم میں بیٹھ جائیں گے۔ وہ میز کے دراز سے پلیئرز تھری کا ڈبہ نکال کر میرے آگے رکھ دے گا اور گھنٹی بجا کر نوکر کو بلائے گا۔ نوکر دروازے والا پردہ اٹھا کر نمودار ہوگا اور وہ نوکر سے کہے گا۔

''دیکھو شبراتی ہمارے مہمان کے لیے۔۔۔''

مگر نوکر سے کچھ کہنے کی بجائے اس نے میری طرف جھک کر کہا۔

''یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں بھی آپ ہی کی ناؤ میں سوار ہوں۔ یعنی میرے پاس بھی اس شہر میں رات کاٹنے کی کوئی جگہ نہیں''۔

مجھ پر جیسے کسی نے گرم پانی کا تسلا انڈیل دیا اور ڈرائینگ روم کے قیمتی فرنیچر اور پلیئرز تھری کے سارے سگرٹوں کا ستیاناس ہوگیا۔۔۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا آدمی بھی میری طرح بے گھر ہوسکتا ہے۔

''خیر یہ باتیں چھوڑیئے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ رات کہاں نکا جائے۔ اتفاق سے میری جیب میں چند آنے محفوظ ہیں آپ کی جیب میں کچھ ہے؟''

میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر جلدی سے پاسنگ شو کی خالی ڈبی نکال کر پیش کر دی۔ جس پر وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔۔۔ کس قدر صحتمند اور پرعزم تھا اس کا قہقہہ!

مجھے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا ہے اور اندر بہترین کھانے، بہترین سگریٹ اور بہترین بستر میرا انتظار کر رہے ہیں۔

''کوئی پروا نہیں۔۔۔ ہم کہیں نہ کہیں پڑ رہیں گے۔ کیا ہوا اگر ہماری جیبیں خالی ہیں''۔

''بے شک''۔

میں نے جلدی سے لقمہ دیا۔ جیسے مجھے یقین ہو کہ اگلے چوک میں ہم کسی کے ہاں مہمان بننے والے ہیں۔

اب ہم شہر کے گنجان حصے میں آ گئے تھے۔ بازار میں چند ایک پان سگریٹ بیچنے والوں کی دوکانیں ہی کھلی تھیں۔ ایک جگہ حلوائی دوکان کے سامنے کڑاہی رکھے اسے کھرچ رہا تھا اور قریب ہی دو کتے اپنی دمیں ہلا ہلا کر ایک دوسرے پر غرا رہے تھے۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے یہاں ایک چائے خانہ رات بھر کھلا رہتا ہے''۔

میرے ساتھی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسی بازار میں؟''

''میرا خیال ہے اسی بازار میں۔۔۔'' وہ ذرا رکا۔ پھر فضا میں کچھ سونگھ کر ایک طرف نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''یہ چائے کی خوشبو تھی۔۔۔ شاید وہ رہا چائے خانہ''۔

ذرا فاصلے پر ایک دوکان کے ادھ کھلے دروازے میں سے پھیکی پھیکی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ یہی وہ چائے خانہ تھا جہاں میرا ساتھی رات بسر کرنا چاہتا تھا۔ ہم لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ دروازے کا آدھا پٹ کھلا تھا اور بقیہ آدھا حصہ ایک مستطیل وضع کے چبوترے نے روک رکھا تھا۔ چبوترے میں بنی ہوئی انگھیٹیاں دہک رہی تھیں اور ان پر رکھی ہوئی میلی کچیلی

کیتلیوں میں سے بھاپ اڑ رہی تھی۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کا مریل سا آدمی بیٹھا، سر پر گلوبند لپیٹے، ایک کیتلی میں چمچ پھیر رہا تھا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمارے شانوں پر گرم کمبل ڈال دیئے ہوں۔ مجھے مسجد کا نمدوں سے ڈھکا ہوا بڑا کمرہ یاد آ گیا۔۔۔ چائے خانے کی دیواروں کی سفیدی دھوئیں کے باعث گدلی ہو رہی تھی ادھر ادھر پڑی ہوئی چند کرسیوں اور میزوں کے علاوہ درمیان میں بوسیدہ سی دری بچھی ہوئی تھی جس پر تین آدمی میلی میلی چادروں میں منہ سر لپیٹے خاموشی سے حقہ پی رہے تھے۔ وہ یوں ایک دوسرے پر جھک کر بیٹھے تھے جیسے کسی خفیہ جماعت کے آدمی ہوں اور وہاں چھپ کر میٹنگ کر رہے ہوں۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہ جگہ نسبتاً صاف تھی۔ ہمارے ساتھ والی کرسی پر ایک جہلمی سپاہی میز پر سر رکھے بازو پھیلائے سو رہا تھا۔ لکڑی کی چھوٹی سی کنگھی اس کے لمبے بالوں میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی لال پگڑی اس کے آگے پڑی تھی۔ وہ یوں سر بسجود تھا گویا اس پگڑی کی پوجا کر رہا ہو۔

سامنے والی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بنچ پر کوئی شخص پھٹے پرانے لحاف میں گھسا میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز چائے خانے کی خاموش فضا میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے اس آدمی کی میٹھی نیند پر رشک آنے لگا۔

پرانی پیالیوں میں چائے انڈیلتے وقت مجھے اپنے ساتھی کی کلائی سے بندھی ہوئی سنہری گھڑی دکھائی دی جو رات کے پونے بارہ بجا رہی تھی۔

''میں کبھی کبھی یہاں رات بسر کرنے آ جاتا ہوں''۔

اس نے ایک پیالی میری طرف سرکا کر کہا۔

''رات کاٹنے کے لیے اس سے اچھی جگہ شہر بھر میں کہیں نہیں۔ تم کچھ پیو نہ پیو، یہاں آ کر بیٹھے رہو۔ اگر نیند آ جائے تو اس سپاہی کی طرح آرام سے سر رکھ کر سو جاؤ۔ تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔ پیسہ لگے نہ کسی کا احسان اٹھا۔ اور رات بھی مفت میں کٹ گئی''۔

وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ چائے ایسی تھی۔ گرم اور خوشگوار۔۔۔ وہ ہونٹ پیالی کی باریک سطح سے لگائے مزے مزے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ چند گھونٹ پی کر اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور ملازم لڑکے کو آواز دی۔

''آدھی ڈبی گولڈ فلیک''۔

جب لڑکا باہر نکل گیا تو وہ کہنے لگا۔

''میں ہمیشہ بہترین سگریٹ پیتا ہوں۔ اور اگر میری جیب خالی ہو تو کچھ نہیں پیتا۔ میں تمہیں بھی یہی کہوں گا۔ ہمیشہ بہترین سگریٹ پیو اور بہترین عورت سے محبت کرو۔ لیکن چائے کسی ایسی ہی جگہ بیٹھ کر پیو۔ جو مزہ اور تسکین تمہیں یہاں نصیب ہوگی اسے تم شہر کے بڑے سے بڑے ہوٹل میں بھی نہ پاؤ گے۔ یہاں تمہیں سکون اور ذہنی آسودگی کا احساس ہوگا۔ جس شہر میں ایسے چائے خانے نہیں ہیں میرے خیال میں وہ سگریٹ کی خالی ڈبی ہے۔ بانجھ عورت ہے۔ سٹاک ایکسچینج کی مارکیٹ ہے اور یا کسی انشورنس کمپنی کا دفتر ہے۔''

میں اپنے ساتھی کی گفتگو میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے پہلے کہاں تھا اور اس کے بعد کہاں جائے گا؟ اور جب میں نے اس سے اتنا پوچھا تو اس کے چہرے پر افسردہ سا تبسم پھیل گیا اور وہ پیالی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھنے لگا۔ اس کی خاموشی زیادہ گہری اور پرسکون ہو گئی۔ جیسے وہ اپنے گمشدہ ماضی کی تاریک ڈھلوانوں میں اتر گیا ہو۔ سر اٹھا کر اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی غمگینی جھلک رہی تھی۔ کھلی پیشانی پر دو تین سلوٹیں زخموں کے نشان سے بن کر ابھر آئی تھیں۔

''اس سے پہلے میں ہندوستان میں تھا۔ میں اگرچہ پناہ گزین ہوں مگر مجھے اس نام سے چڑ ہے، نفرت ہے،،،، میں تقریباً اڑھائی مہینوں سے بھوک، افلاس اور گمنامی کے بیکراں سائبیریا میں بھٹک رہا ہوں۔ میں ایک جلاوطن ہوں۔۔۔ مجھ سے میرا گھر، میرا وطن میرا ماحول جدا کر دیا گیا ہے۔ میں نے زندگی بھر میں کوئی رات اس طرح چائے خانوں میں نیند اور بیداری کے درمیان لٹک کر نہیں گزاری۔ یہ کل کی بات ہے کہ میرا اپنا گھر تھا، میری اپنی ایک سلطنت تھی۔ چھوٹی سی سلطنت۔۔۔ چھوٹا سا گھر۔۔۔ شہر کی پرشور فضا سے باہر، پرانے باغ کے عقب میں سفیدے اور املتاس کے لمبے درختوں میں گھرا ہوا تنہا، پرسکوں اور خاموش۔۔۔ جس کے روشندان عشق پیچاں کی نرم نرم بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اور جس کی اونچی نیچی ڈھلوانی چھتوں پر درختوں کے گہرے گہرے سائے تھے۔ مارچ کے شروع میں املتاس کی شاخوں پر زرد پھولوں کے گچھے جھولنے لگتے اور ان کی دھیمی دھیمی مہک گھر بھر میں پھیل جاتی۔ ہمارا گھرانہ، میری بیوی، ماں اور دو بچوں پر مشتمل تھا۔ ہم امیر نہیں تھے۔ پہلے ہمارا گھر گنجان شہر کے اندر ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا۔ اس گلی میں جہاں دھوپ کبھی نہ آئی تھی۔ ہم کئی سالوں سے مقیم تھے لیکن میرے دل میں ایک ننھی سی خواہش مدت سے پرورش پا رہی تھی۔۔۔۔ کہ اس گندے اور تاریک ماحول سے باہر چمکیلی دھوپ اور کھلی آزاد فضا میں میرا اپنا ایک گھر ہو۔۔۔۔ چھوٹا سا گھر جس کے ہمسائے گہری چھاؤں والے درخت اور پھول اور خوش الحان پرندے ہوں۔ جہاں زندگی کا نام ایک ایسا خواب ہو جو تاروں کی چھاؤں میں گھاس اور پتوں پر لیٹ کر دیکھا جائے۔ اور جس کا شہر کی گندگی، متعفن اور اندھیری گلیوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس خواہش، اس آرزو کی تکمیل کے لیے میں اپنے کاروبار کی ترقی میں دن رات جٹ گیا اور کچھ عرصہ بعد میری آرزو کی دلہن کی مانگ سیندور سے بھر گئی اور ایک روز ہم ان پرانی اور تاریک گلیوں کو خیرباد کہہ کر اپنے نئے گھر میں اٹھ آئے۔۔۔ گھٹی گھٹی سرد اور بیمار فضا سے نکل کر کھلی اور روشن فضا میں آنے پر ہم بے حد مسرور اور تازہ دم تھے۔ میری بیوی دن بھر نئے گھر کی آرائش میں لگی رہتی۔ آج کھڑکیوں کے لیے جالی دار پردے بن رہے ہیں تو کل گملوں میں عشق پیچاں کی بیلیں لگائی جا رہی ہیں۔ ہمارے آس پاس کئی اور بھی گھر تھے۔ جن میں رہنے والے بڑی بڑی ملوں اور فرموں کے مالک تھے لیکن ہمارا ان سے کوئی میل جول نہ تھا۔ ہمارے ملنے والے اسی اندھیری اور گندی گلی کے لوگ تھے جن کی ڈھیلے ڈھالے جسموں اور زرد چہروں والی عورتیں اکثر میری بیوی کے پاس آیا کرتی تھیں۔ ہم انہی لوگوں میں سے تھے۔ اگر کچھ فرق تھا تو محض اتنا کہ وہ اپنے تاریک گھروندوں میں رہتے ہوئے مطمئن اور کسی بہتر ماحول کی جستجو سے بے نیاز تھے لیکن ہمارے دلوں میں اس ماحول سے گذر جانے کی آرزو تھی، تڑپ تھی، لگن تھی۔۔۔۔ کاش ہر آدمی کے دل میں اس تڑپ اس لگن کی شمع روشن ہو جائے پھر تم دیکھو گے کہ تمہارا شہر کچھ عرصہ گزر جانے پر کتنا دلکش اور خوبصورت ہو گیا ہے اور اس شہر کے باسی کس قدر صحتمند اور مسرور۔۔۔

میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ ہمارا گھر ہمیں بڑا پیارا تھا اور اپنا کمرہ شاید مجھے اس گھر سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ میری الماری دنیا کی چنی ہوئی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ میرے ملنسار بھی زیادہ تر اپنے پرانے محلے کے آدمی تھے درزی، عطار، نانبائی، کپڑا اور جوتے بیچنے والے، غریب طالب علم اور مسکین کلرک۔۔۔۔

یہ لوگ اگرچہ بے جان، غریب اور زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے تاہم ان سے مل کر ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ایک عجیب طرح کا سکھ اور آنند نصیب ہوتا تھا۔ یہ سکھ اور آنند مجھے ان بڑی بڑی ملوں کے مالکوں اور ان کے لونڈوں سے مل کر کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ لوگ احمق، چھچھورے اور ہر لحاظ سے گھٹیا قسم کے تھے اور ان کی عورتوں ایسی سج دھج مجھے کبھی نہ بھائی تھی''۔

وہ یہاں تک پہنچا تھا کہ لڑکا سگریٹ لے آیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور مزے مزے اس کے کش لینے لگا۔ میں خیال ہی خیال میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی بیوی کھڑکیوں کے لیے جالی دار پردے تیار کر رہی ہے۔ اور وہ صحن کے باغ

میں پودوں پر جھکا ہوا ان کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہے۔ مکان کی سرخ رنگ کی ڈھلوانی چھتوں پر درختوں کی پرسکوں چھاؤں ہے۔ املتاس کی شاخوں پر زرد رنگ کے پھول انگوروں کے گچھوں کی مانند لٹک رہے ہیں۔ گھر کے اندر سجے ہوئے خوبصورت اور سادہ کمروں میں ایک تسکین بخش خاموشی چھائی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں، برامدے میں بیٹھی کچھ سی رہی ہے۔ ایک لڑکا نیکر پہنے، پانی سے بھرا ہوا جگ لیے باورچی خانے کی طرف جا رہا ہے۔ جہاں سے مسالے دار کھانوں کی تیز تیز خوشبو مجھ تک با آسانی پہنچ رہی ہے۔

میرے پیٹ میں ناف کے نیچے کوئی شے سکڑ کر لکڑی کے ٹکڑے کی طرح مجھے چبھنے لگی۔ میں نے جلدی سے اپنی پیالی کے دو لمبے گھونٹ بھرے اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گہری اور ہموار آواز میں بولا۔

"پھر فسادات شروع ہو گئے۔ ہمیں آزادی مل گئی اور ہمارے پیارے گھر کو آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سپرد کر دیا گیا۔ ہم لوگ بمشکل جانیں بچا کر پاکستان پہنچ سکے۔

اب ہم پاکستان میں ہیں۔ میری ماں، بیوی اور بچے میرے ساتھ نہیں وہ لوگ یہاں سے تیس میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں مقیم ہیں۔ انہیں وہاں چھوڑ کر میں یہاں پھر کاروبار کی فکر میں چلا آیا ہوں۔ ہفتہ بھر سے اس پرائے دیس کی سڑکوں پر دربدر پھر رہا ہوں اور ابھی تک میرا کوئی کام نہیں بن سکا۔ مگر میں ناامید نہیں ہوں۔ آج نہیں کل، کل نہیں تو پرسوں۔۔۔۔۔ ایک نہ ایک دن اس خستہ حال، بھولی بھٹکی ناؤ کو کسی نہ کسی گھاٹ ضرور جا لگنا ہے۔

مجھ سے میرا گھر چھن گیا ہے۔ میرے املتاس کے درخت، زرد پھولوں کے فانوس اور بیلوں سے ڈھکے ہوئے روشندان بچھڑ گئے ہیں۔ روشن اور کھلی فضا سے اچھال کر کسی ان جانی طاقت نے مجھے ایک دفعہ پھر گندی اور اندھیری گلیوں کے تعفن میں پھینک دیا ہے۔ لیکن مجھے اس کا زیادہ افسوس بھی نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پچھلی تمام باتوں کو بھلا کر مجھے آگے نظر ڈالنی ہے، پیچھے مڑ کر دیکھنے سے مجھے سوائے ناکامی تاسف اور غم کے اور کچھ نہ ملے گا۔

میرے تاریک شب و روز میں سے تم شاید ہی کوئی ایسا لمحہ نکال سکو جو میں نے اپنی منزل کی طرف قدم اٹھائے بغیر گزار دیا ہو۔ پہاڑ کی بلندیوں سے پاتال کی تہوں میں گرنے والی ندی کی مانند مجھے راستے کی تمام سنگیں روکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سمندر سے جا ملنا ہے۔

ہاں۔۔۔۔ میری زندگی کو وہیں سکون نصیب ہوگا۔

آج میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ رات بسر کرنے کے لیے جگہ نہیں۔ مگر کل اسی شہر کے باہر، میرا ایک اپنا مکان ہوگا۔ جس کی ڈھلوانی چھتوں پر پہلے گھر کی طرح میرے پسندیدہ درختوں کی چھاؤں ہوگی۔ روشندانوں پر میں خود اپنے ہاتھوں سے عشق پیچاں کی لچکیلی بیلیں چڑھاؤں گا۔ کھڑکیوں کے لیے جالی دار پردے میری بیوی بنائے گی اور جس کے پائیں باغ میں رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے پودے صاف اور چمکیلی دھوپ میں جھوم رہے ہوں گے۔ اور ان جھومتے ہوئے پھولوں کے درمیان میرے بچے آزادی، روشنی اور محبت کی گود میں پروان چڑھیں گے۔

آج ان میں سے کوئی ایک شے بھی میرے پاس نہیں۔ مگر کل ان میں سے ہر ایک شے میری عملداری میں ہوگی۔ میں زندگی کی کہر آلود رہگزر پر کھڑا، دونوں بازو پھیلائے بےتاب نگاہوں سے اس آنے والی، کل کا منتظر ہوں۔ اس کشتی کی مانند جو گھاٹ پر کھڑی، اپنے بادبان کھولے، موافق ہواؤں کا انتظار کر رہی ہو"۔

میرا ساتھی رک گیا۔ سلگتے ہوئے سگریٹ کا دھواں دبلی پتلی لکیر کی شکل میں اوپر اٹھنے لگا۔ کسی اچانک آ جانے والے مہمان کی طرح اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولا۔

''کل رات بھر میں شہر کے اندر گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ چپ چاپ رات کے سائے میں ان گلیوں کی مٹر گشت نے مجھے بڑا مزہ دیا۔ لیکن آوارہ کتوں اور پہرے داروں نے مجھے جلد ہی وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔

مجھے ہر گلی میں داخل ہوتا دیکھ کر پہرے دار اپنا وزنی لٹھ زور سے زمین پر پٹختا اور للکار کر اگلے پہرے دار کو خبردار کر دیتا۔ اور اگلا پہرے دار تیسرے کو میری آمد کی اطلاع دے دیتا۔ اس وقت کبھی تو مجھے اپنے تئیں چور ہونے کا گمان ہو رہا تھا اور کبھی پہرے داروں کے جمعدار کا، جو رات کے وقت ان کی دیکھ بھال کو نکلا ہو۔۔۔ میں سوچتا ہوں لوگ ایک دوسرے سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں؟ انہوں نے اپنے گھروں میں ایسی کون سی شے چھپا رکھی ہے جس کی حفاظت کے لیے وہ رات بھر پہرے داروں کی چیخ و پکار سنتے رہتے ہیں۔ تم میری اس بات پر دل میں ضرور ہنس رہے ہوگے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں انسان جس قدر ترقی کر رہا ہے وہ زیادہ بزدل اور ڈرپوک ہوتا جا رہا ہے اور ایک وقت آئے گا جب ایک انسان دوسرے انسان کو محض چھونے ہی سے موت کی نیند سلا دے گا۔۔۔ وہ دور انسانی ترقی کا عروج ہوگا۔ مگر ہمیں ان باتوں سے کیا؟ اس دور کے آنے تک ہماری ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہوں گی''۔

وہ زیرِ لب مسکراتا رہا۔ چائے خانے کی گھٹی گھٹی فضا میں اس کے خاموش الفاظ سگریٹ کا دھواں بن کر ہمارے سروں پر کاہلی سے تیرنے لگے۔ جہلمی سپاہی اپنی سرخ پگڑی کے آگے سر جھکائے بدستور سو رہا تھا۔ سامنے والی بنچ پر لحاف میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ خراٹوں کی راگنی پل بھر کے لیے رکی اور لحاف پھر ساکت ہو گیا۔ دری پر بیٹھے ہوؤں میں سے ایک آدمی وہیں دہرا ہو کر سو گیا تھا۔ دوسرے آدمی نیند بھری آواز میں رک رک کر باتیں کر رہے تھے۔ ہماری میز تک ان کی مدھم بھنبھناہٹ ہی پہنچ رہی تھی۔ الفاظ نہیں۔۔۔ باہر چبوترے کی انگیٹھی پر جھکا ہوا، چھٹی ہوئی سرخ قمیص والا قلی بے دلی سے جلدی جلدی چائے ختم کر رہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں گاڑی کا تصور تھا جو سامان اور مسافروں سے لدی پھندی، دھیرے دھیرے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔

قہوہ خانے کا مالک گدی پر اکڑوں بیٹھا اپنی غلافی آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ اس کے سوکھے ہوئے چہرے پر افیون کا پیدا کیا ہوا پھیکا پن تھا۔ اور وہاں سے بیچارگی اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔ اگرچہ چائے نے کسی حد تک میری بھوک کا گلا دبا دیا تھا۔ پھر بھی میری آنکھیں گرم گرم بھاپ سی خارج کر رہی تھیں۔ میں نے دو تین بار جلدی جلدی آنکھیں جھپکیں اور میرا ساتھ مجھے مہربان نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

''اگر نیند آ رہی ہے تو بے شک اپنا سر میز پر رکھ کر سو جاؤ۔ تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا''۔

میں کھسیانا سا ہو کر آنکھیں ملتا ہوا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرا ساتھی مسکرانے لگا۔

''میں جانتا ہوں تم یونہی اس شہر کی خاک نہیں چھان رہے۔ تمہارا اس سردی میں بے گھر بے آسرا پھرنا اور فاقہ کشی کے مصائب جھیلنا بے مقصد نہیں ہے۔ تمہارے دل میں بھی امید کی ایک ننھی سی جوت جل رہی ہے۔ اس جوت کی مدھم سی چمک میں نے اسی وقت دیکھ لی تھی جب دیا سلائی مانگنے کے لیے میں تمہاری طرف جھکا تھا۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو میرے رات بھر کے دوست کسی حالت میں بھی جی نہ چھوڑنا۔ تم جوان ہو۔ تمہارے بازوؤں میں طاقت اور خون میں گرمی ہے۔ اپنے حالات کو اس طاقت اور گرمی کی کٹھالی میں ڈال کر انہیں ٹھوس اور قوی تر بنا لو۔ ہمیشہ بلند، مضبوط اور خوبصورت چیزوں کے متعلق سوچو اور زندگی کے اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو، خواہ تمہارا کردار کتنا ہی غیر اہم اور مختصر کیوں نہ ہو''۔

اتنا کہہ کر اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ نیند روئی کے دھنکے ہوئے نرم نرم گالوں کی مانند مجھے اپنی پلکوں پر برستی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی وقت ایک جھکولا سا آتا اور مجھے اپنا آپ ہلکے پھلکے دودھیا بادل کی طرح پچھلے پہر کی پھیکی روشنی

میں نرم ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا محسوس ہوتا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ تمباکو کا کڑوا پن جیسے میری آنکھوں میں اتر آیا۔ دفعتاً دری پر بیٹھے ہوؤں میں سے کوئی غمگین اور مدھم سروں میں گانے لگا۔

رہا کردے مجھے صیاد ابھی فصل بہاری ہے

اس آواز میں درد اور تڑپ تھی۔ بلندیوں سے گرنے والی آبشار کی طرح مضطرب اور بے چین آواز نے چائے خانے کی رگی رگی سی فضا میں ایک درد انگیز تموج پیدا کر دیا۔ گیت ختم ہو گیا مگر گیت کا ہر بول، بے زبان فریادی بن کر جیسے ہمارے بیچ میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

میرا ساتھی بڑے غمناک لہجے میں بولا۔

"یہ ایک عجیب بات ہے۔ شعر و شاعری سے ذرا سا بھی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود کسی وقت کوئی درد بھری لے سن پاتا ہوں تو دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ میں نے کبھی کسی کی یاد میں آنسو نہیں بہائے۔ مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ پھر نہ جانے یہ کس انوکھے درد کا اثر ہے جو کبھی کبھی آنسوؤں کی نمی بن کر میری آنکھوں پر امڈ آتا ہے۔ خاموشی اور یکسوئی کے ویران لمحات میں کئی بار ایک اچھوتے غم کا احساس ہوتا ہے یہ غم رقص کرنے والی خوبصورت دیوداسیوں کی مانند مجھے اپنے طلسمی حلقے میں لے لیتا ہے اس وقت مجھے اپنا آپ کسی غیر فانی نغمے کی لے میں ڈھل کر کائنات کی ازلی و ابدی موسیقی سے ہم آہنگ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

میں نہیں جانتا اس غم کا چشمہ میری روح کی تاریک گہرائیوں میں ایکبارگی کہاں سے پھوٹ نکلتا ہے۔ میں صرف اس قدر جان سکا ہوں کہ نگاہوں سے اوجھل رہنے والے گمنام نشیبوں میں اس غم کے بادل دھیرے دھیرے اوپر اٹھ کر میرے دل کی چوٹیوں پر نمودار ہوتے ہیں اور جی کھول کر برس چکنے کے بعد خود بخود سرکتے ہوئے ان دیکھے سمندروں کی جانب روپوش ہو جاتے ہیں۔ یہ اجنبی اور انوکھا سوگ مجھے بڑا عزیز ہے۔

اس غریب الوطنی کے دور میں جبکہ میں اپنا سب کچھ لٹا کر تمہارے پاس اس چائے خانے میں بیٹھا اپنی داستان بیان کر رہا ہوں تو میرا دل زخم خوردہ ہرنی کی طرح درد اور تکلیف کی شدت سے نڈھال ہے جو شکاری کا زہر آلود تیر اپنے پہلو میں لیے کسی جھیل کے کنارے اکیلی کھڑی، بے چینی سے ادھر ادھر تک رہی ہے۔

یہ سوگ، یہ کرب، یہ بے کلی اور یہ اضطراب میرا اور میری روح کا ایک حصہ ہے۔ یہ مجھ سے کبھی الگ نہ ہوگا۔ یہ میرے بازوؤں کی قوت اور خون کی حدت سے، دکھائی نہ دینے والے جنگلی عقاب کی مانند یہ ہمیشہ میرے دل پر محو پرواز رہے گا"۔

اس کی آواز دھیمی ہو کر ڈوب سی گئی۔ وہ چپ ہو گیا۔ جیسے رقص کرنے والی سیم تن دیوداسیوں کے ہجوم نے اسے اپنے طلسمی حلقے میں لے لیا ہو۔ اس نے انگلی کی خفیف سی جنبش سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور راکھ کا پھول میز پر گرتے ہی کھل اٹھا۔

نرم نرم، دھنکی ہوئی روئی کے گالے بدستور میری پلکوں پر گر رہے تھے۔ کوئی غیبی ہاتھ، نرم اور مہربان ہاتھ مجھے محبت سے تھپکنے لگا اور میرا بوجھل سر خود بخود میز کی مٹیالی سطح سے جا لگا اور ہلکے پھلکے بادل کا دودھیا ٹکڑا، پچھلے پہر کی پھیکی روشنی میں نرم ہواؤں کے دوش پر سوار مشرقی لالہ زاروں کی سمت اڑنے لگا۔ اور میں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرا ساتھی غائب تھا۔ دری پر تینوں آدمی میلی کچیلی چادروں میں گٹھڑیاں بنے سو رہے تھے۔ سامنے والی بنچ پر لحاف بدستور ساکت تھا اور خراٹوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ملازم لڑکا کرسیاں ایک طرف لگائے فرش پر جھاڑو دے رہا تھا۔ چائے خانے کا مالک بھٹی میں سلاخ پھیر رہا تھا۔ جہلمی سپاہی کی میز خالی تھی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور باہر نکل آیا۔

باہر سرد رات ڈھل رہی تھی اور نیلے نیلے آسمان پر ستارے زیادہ شوخ اور زیادہ چمکیلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ

مسجد کا سفید گنبد سحر کے کافوری اجالے میں مصری کے کوزے کی طرح تاریکی میں جھلک رہا تھا۔
اگرچہ بھوک میری پنڈلیوں میں درد بن کر اتر آئی تھی اور میری آنکھوں میں لمبے لمبے سائے چل پھر رہے تھے پھر بھی میرا انگ انگ تازگی، شگفتگی اور مسرت کی ایک والہانہ کیفیت سے لبریز تھا۔
جیسے میں صبح کا ایلچی ہوں اور اس گندے شہر کے گھٹے گھٹے تنگ اور بے جان ماحول میں، زندگی، حرارت، روشنی اور آزادی کا پیام لے کر شبنم کے ہمراہ اتر آیا ہوں۔
میں نے بازو کھول کر بھر پور انگڑائی لی۔ میرا بھوکا، مگر سخت جسم گرم ہو کر جیسے شعلے میں بدل گیا اور مجھے اپنے ساتھی کے الفاظ یاد آ گئے۔
''تمہارے بازوؤں میں طاقت اور خون میں گرمی ہے۔ جی نہ ہارو۔ ہمیشہ بلند، مضبوط اور خوبصورت چیزوں کے متعلق سوچو اور زندگی کے اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو خواہ تمہارا کردار کتنا ہی غیر اہم اور مختصر کیوں نہ ہو''۔
اور میں سینہ تانے، آنکھوں میں بھوک اور آہنی ارادے کی چمک لیے شہر کے دروازے میں اس تند و بلا خیز لہر کی مانند داخل ہو رہا تھا جو بڑی سے بڑی چٹان سے ٹکرا جانے کا عزم لیے ہوئے ہو۔

☆☆☆

نیو ورلڈ آرڈر

بانو قدسیہ

ڈرائینگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔

طاہرہ گیلری میں کھڑی تھی۔ یہاں ان کا ڈور پلانٹ، دیواروں کے ساتھ سجے تھے۔ فرش پر ایرانی قالین کے ٹکڑے تھے۔ دیوار پر آرائشی آئینہ نصب تھا۔ لمحہ بھر کو اس آئینے میں طاہرہ نے جھانک کر دیکھا۔ اپنے بال درست کئے اور کھلے دروازے سے ڈرائینگ روم میں نظر ڈالی۔

ابھی ڈنر شروع نہ ہوا تھا اور مہمان کچھ کھڑے کچھ بیٹھے قسم قسم کا ڈرائی فروٹ اور چپس کھاتے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اخباروں کے رسیا سیاسی پیش بندیاں کر رہے تھے۔ کچھ صاحب دل صاحب کرامت بنے معاشرے کے عبرتناک انجام کی پیش گوئیوں میں مصروف تھے۔ بزعم خود دانشور فلسفیانہ دور اندیشیوں میں محو خود کلامی کے انداز میں ساتھیوں پر رعب گانٹھ رہے تھے۔ بوڑھے، بوڑھیاں ماضی کی یاد میں مگن NOSTALGIA کا شکار مبتلائے ہوئے انداز میں موجودہ عبوری دور کے نقائص بیان کرنے میں ساری قوت لگا رہے تھے۔ خوش وقتی کے طالب انکل سے کبھی ادھر کبھی ادھر ہونے والی گفتگو میں موج میلہ منانے میں مشغول تھے۔ مہمان باتوں میں ایک دوسرے کو بہلا رہے تھے۔ رگیدر ہے تھے۔ شیشے میں اتار کر ہم خیال بنانے کے شغل میں تھے۔

طاہرہ اسی مجلس دوستاں کے خلاملا کو چھوڑ کر گیلری میں آگے نکل گئی۔

یہ ڈنر مسرت اور سعید بھائی نے اپنی شادی کی سالگرہ منانے کے لیے دے رکھا تھا۔ نہ جانے کیوں طاہرہ ڈرائینگ روم سے آگے دادی اماں کے بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ اس نے جمہ گوٹھ میں رہ کر کئی باتیں سیکھی تھیں۔ اچار گوشت پکانا، ڈوپٹوں کو ٹائی اینڈ ڈائی کرنا اور گھر میں داخل ہوتے ہی بزرگوں کو سلام کرنے جانا۔۔۔۔۔ آخری عادت بیس پچیس سال لاہور رہ کر کمزور پڑ گئی تھی لیکن اس کے سندھی پلاؤ اور اچار گوشت کی ابھی تک دھوم مچی تھی۔

پچھلے چھ ماہ سے اسے احساس جرم کھائے جا رہا تھا۔ وہ جب بھی سعید بھائی کے گھر آئی کبھی دادی اماں کو ملنے کی تکلیف نہ کرتی۔ لیکن اس رات بیڈروم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اندر چلی گئی۔

دادی اماں کڑھائی کیا ہوا ڈوپٹہ اوڑھے خالی ذہن صوفے پر بیٹھی تھی۔

''کون ہے۔۔۔۔۔۔؟'' آدھی سوئی آدھی جاگی، آدھی مری آدھی زندہ دادی نے اپنی گدلی آنکھیں پھرا کر پوچھا۔

''کون ہے بھی۔۔۔۔۔؟''

''میں دادی میں۔۔۔'' اسی میں، نے پچھلے چھ ماہ سے دادی کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا۔

''بھائی میں کون۔۔۔۔؟''

دادی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پہچاننے کے مرحلے میں تھی۔

''دادی جی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ طاہرہ! گرو۔۔۔۔۔۔۔ مسرت کی دوست''۔

''وعلیکم سلام، لیکن مسرت کون ہے۔۔۔۔؟'' ایک اور سوال دادی نے ہوا میں پھینکا۔

''آپ کی بہو، دادی جی۔۔۔۔ سعید بھائی آپ کے بیٹے کی بیوی۔۔۔۔''

''اچھا۔۔۔کون سی بہو۔۔۔؟'' سوال دادی اماں کا پیچھا سارا دن نہ چھوڑتے۔ان ہی سوالوں کی مدد سے وہ اپنی گڈ مڈ دنیا میں ایک ربط قائم کرنا چاہتی تھی۔

''چھوڑیں دادی ماں، ایک ہی تو بہو ہے آپ کی۔۔۔۔''

دادی ماں شرمندہ سی ہوگئی۔ سر جھٹک کر بولی۔۔۔''ہاں تو اچھا۔۔۔بیٹھو۔۔۔۔۔۔تم طاہرہ ہونا۔۔۔۔۔''

''جی بالکل۔۔۔''

دادی ماں ایٹ ایز ہوگئی۔ اس کی عمر نہ سمجھنے کی تھی نہ سمجھانے کی۔ پل بھر پہلے کی بات بھی اسے یاد نہ رہتی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جوانی کے کچھ واقعات اسے ازبر تھے۔ ان کی تفصیلات کو وہ کبھی نہ بھولتی اور بار بار ان کو دہرانے پر بھی رتی بھر فرق ان کے بیان میں نہ آتا۔

طاہرہ دل میں شرمندہ ہونے لگی۔۔۔۔ یہ کیسی مصروفیات ہیں جو ہمیں اپنے بنیادی فرائض بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو کہ ہو دوسرے تیسرے مسرت کے گھر آتی رہی اور دادی ماں کا اسے خیال تک نہ آیا۔

''آپ کو مبارک ہو دادی جاں۔۔۔۔۔'' طاہرہ نے احساس جرم تلے کہا۔۔۔۔''کیسی مبارک۔۔۔۔۔؟'' دادی نے پوچھا۔

اسی وقت مریم کپڑے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کون ہے۔۔۔۔؟''

''میں دادی ماں۔۔۔۔اپنی درسری کا کیک لائی ہوں۔۔۔۔'' مریم نے کہا۔

''کیک۔۔۔؟ وہ کیوں۔۔۔۔'' بھولی بھلائی دادی ماں نے پوچھا۔

''بس جی آپ کیک کھائیں۔۔۔۔کیوں کیسے کے بکھیڑے میں نہ پڑیں۔۔۔۔بڑا سوفٹ چاکلیٹ کیک ہے، دادی چبانا نہیں پڑے گا۔۔۔۔''

مریم نے ٹرے تپائی پر رکھ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی حکم کے تحت آئی ہے۔ اپنی خوشی سے کیک نہیں لائی۔ دروازے میں رک کر مریم بولی۔۔۔''آنٹی طاہرہ پلیز آپ اندر آجائیں۔۔۔۔امی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔۔۔۔۔''

مریم دادی کو دیکھے بغیر چلی گئی۔۔۔۔۔۔۔تیس برس کی یہ لڑکی بڑی تندرست، پر اعتماد اور صاحب رائے تھی۔ وہ اپنی زندگی دو فیز میں بانٹ چکی تھی۔ کچھ عرصہ وہ آئس کریم۔ کوک۔ برگر، چائنیز کھانے، ملائی ملی سلادیں، چیز کیک اور مرغن دعوتی کھانے کھاتی۔ اس کی جلد چمکدار۔ نچلا حصہ گھوڑے کی طرح مضبوط، ہاتھ پاؤں لچکیلے اور چال میں کتھک ناچنے والی کی سی پھرتی آجاتی۔ ان دنوں میں وہ مائیکل انجلز کا ماڈل لگتی۔ صحت کے اشتہار بنے۔ ابھی کچھ ہی دن گزرتے تو اسے انچی ٹیپ اور وزن کرنے والی مشین یاد آجاتی۔ اس کی سہیلیاں ملنے والیاں بھی جلد ہی یاد دلاتیں کہ کمر پر ٹائر بڑھ رہے ہیں اور وہ ماڈل گرل سے زیادہ مڈل کلاس کی گرہستن نظر آتی ہے۔ اب مریم ڈائٹنگ پر اتر آئی۔ صرف جوس پر اکتفا کرتی۔ کبھی کسی سلمنگ پارلر سے کھانے کا پروگرام بنالاتی۔ خوب ورزش سے بدن تھکاتی۔ وزن گھٹانے کا ہر LAD استعمال کرتی۔ ایسے ہی جنونی عہد میں اس نے ورزش کے لیے ایک ورزشی سائیکل بھی خرید لی تھی۔ اپنے جسم پر غیر معمولی جور و ستم کرنے کی وجہ سے وہ اینورکسیا کی مریض نظر آتی۔۔۔۔آنکھیں اندر دھنس جاتیں رنگ سنولا جاتا، اٹھنے بیٹھنے میں چستی نہ بڑھتی، سر میں درد ٹھہر جاتا اور سب سے بڑی بات ایسے دنوں میں جب وہ ڈائٹنگ کے فیز میں ہوتی اسے بہت غصہ آتا۔ وہ سیلولر فون کی ایک کمپنی میں مارکیٹنگ اسسٹنٹ تھی۔ ڈائٹنگ کے دنوں میں اس کا جھگڑا مارکیٹنگ منیجر، باقی اسٹاف خاص کر فون آپریٹر اور لفٹ مین سے ہوتا۔ ان دنوں میں اس کی سیلز بھی کم ہو جاتی اور اسی وجہ سے

اس کی کارکردگی کو ہیڈ آفس کے نوٹس میں لایا جاتا۔ان دنوں میں اسے سب سے زیادہ غصہ اپنی ماں پر آتا جو پچھلے دس بارہ سال کی کوشش کے باوجود اس کے لیے ایک معقول رشتہ بھی تلاش کرنے سے معذور رہی ہیں۔ایسے ماں باپ کا کیا فائدہ جو اسے بیٹوں کی طرح پیروں پر کھڑا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن زندگی کے لمبے سفر کے لیے سہارا مہیا نہ کر سکے۔

''یہ کون تھی۔۔۔۔۔؟''دادی نے کیک کو غور سے دیکھ کر پوچھا۔

''مریم۔۔۔۔۔دادی جی''۔

''مریم۔۔۔؟وہ کون ہے؟''

دادی کی عمر سمجھنے سمجھانے کی نہ تھی۔

''یہ۔۔۔۔۔۔یہ کیوں چلی گئی فوراً۔۔۔۔''

''دادی جی۔۔۔۔۔آپ کی پوتی اتنی تندرست وتوانا ہے اتنی ایزی جی ہے اس میں کہ وہ کسی جگہ زیادہ دیر تک کر بیٹھ نہیں سکتی۔۔۔۔۔اس کا اندرا سے لڑائے پھرتا ہے۔۔۔۔''

آج کل مریم تندرستی کے فیز میں تھی!

''جب میں اس کی عمر کی تھی تو اس کا باپ سات برس کا تھا۔اس کی ماں کو کچھ فکر نہیں،بیٹی دھرتی دہلائے پھرتی ہے یا تو کھانے کو کم دے۔۔۔۔۔ہماری اماں ہمیں کبھی انڈہ کھانے کو نہیں دیتی تھیں اور یہ پورا چکن روسٹ کھاتی ہے سالم۔۔۔۔کہیں باندھ دے اسے طاہرہ۔۔۔صبح کار لے جاتی ہے نہ جانے کہاں کہاں پھرتی ہے ماری ماری۔۔۔''

بھبھول رنگت دادی کے پاس طاہرہ بیٹھ گئی۔آج اسے اس مرن مٹی پر پیار آ رہا تھا۔بوڑھی دادی کے ہاتھ کی نسیں انگلیوں سے بھی نمایاں تھیں۔طاہرہ نے دادی کا ہاتھ پکڑ کر سوچا کبھی اس دادی کو دیکھنے کے لیے کسی کی آنکھیں ترستی ہوں گی۔وہ راستوں میں، کھڑکیوں سے،دروازوں کی آڑ سے،پر اشتیاق نظروں سے دادی کو گھورتا ہوگا۔۔۔۔۔دادی بھی اپنے گورے چٹے رنگ،دراز قد،لمبے بالوں پر نازاں ہوگی۔بناؤ سنگھار کی چیزوں سے دادی نے بھی ٹوٹ کر پیار کیا ہوگا۔کپڑے لتے پر جان دی ہوگی۔دادی کو دیکھ کر یہ سوچنا مشکل تھا کہ یہ چرمر،پانسہ پلٹی،بلا بدتر،بساندھی سی چیز پر کبھی کسی نے جان بھی وار دینے کو معمولی بات سمجھا ہوگا۔۔۔۔دادی بھی دلہن بنی ہوگی۔اس کے ہاتھوں پر بھی مہندی کے گل بوٹے ابھرے ہوں گے۔اس نے بھی شرما لجا کر کسی کو اپنی محبت کا تعویذ بنایا ہوگا۔ حسن۔۔۔۔عشق۔۔۔۔غیرت شہرت نہ جانے کیا کیا وقت کی لہروں پر بہہ گیا۔جس محبت کا چرچا بکھیڑا،اشانتی جوانی ہڑپ کر جاتی ہے، وہ محبت بڑھاپے میں کہاں جاتی ہے۔۔۔۔۔دادی کو تاکنے جھانکنے والے جو آج اسے دیکھ لیں تو اس کا کیا آگت سواگت کریں۔۔۔۔ کیا محبت اس درجہ جسم کی مرہون منت ہے۔۔۔۔۔وہ بھی نوجوان جسم بلکہ نوجوان خوب صورت جسم۔۔۔۔

انسان کی ساری خوبیاں بڑھاپے میں کہاں جاتی ہیں۔۔۔۔۔کہاں اور کیوں۔۔۔۔۔؟

''تم ہی ذرا میری بہو بیٹے کو سمجھاؤ،بیٹی بھی مشین کی طرح ہے بہت جلد پرانی ہو جاتی ہے۔۔۔۔ابھی تو مریم پر آنکھ ٹکتی ہے پھر پھسلے گی۔۔۔۔سن طاہرہ تیرا ملنا ملانا بہت ہے۔۔۔۔۔تیرا میاں وہ۔۔۔۔۔''وہ پھر گم ہو گئیں۔

''ڈاکٹر ہے جی۔۔۔۔۔''

''لو میں کوئی بھولی ہوں فضل کو۔۔۔۔میرا بلڈ پریشر چیک کرنے آتا ہے۔بہت لوگ آتے ہیں اس کی کلینک پر کوئی بر تلاش کرو تم دونوں مریم کے لیے۔۔۔۔میری بہو تو اُوت ہے اُوت۔۔۔۔۔''

شادی بیاہ کی بات ہو یا سسرالی رشتے داروں کی غیبت۔۔۔دادی ماں کی سوچ فوراً سیدھی ہو جاتی،پھر نہ کوئی تفصیل

بھولتی نہ یادداشت اڑنگے لگاتی۔ اچانک دادی اماں نے کچھ اسی ڈھب سے فلسفیانہ انداز میں مربوط گفتگو کی کہ طاہرہ بھی بیا بنے جوگ مریم کے فکر میں گھلنے لگی۔

گولڈن اپنی درسی کا فنکشن رات ساڑھے بارہ بجے ختم ہوا۔ اس کے بعد بھی چند مہمان سیاسی صورت حال کو باہم ڈسکس کرتے رہے۔ عورتوں میں غیبت کا سیشن شروع ہوا۔ بڑی باریک بینی کے ساتھ اپنے ہی جنس کو باہم تکا بوٹی کرتے ہوئے وہ بہت خوشی محسوس کر رہی تھیں۔۔۔۔ آخر مہمانوں کو وداع کرنے جب سعید بھائی اور مسرت باہر کاروں تک آئے اور آخری جوڑا طاہرہ اور ڈاکٹر فضل اگروکارہ گیا تو طاہرہ نے موقع غنیمت جان کر پوچھا۔۔۔ ''مسرت بھلا مریم کی عمر کیا ہے۔۔۔؟''

مسرت نے کان کھجلا کر کہا۔۔۔ ''اسی جون میں تیس کی ہوجائے گی۔۔۔۔''

ڈاکٹر فضل اگرو بھی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھے تھے۔ گاڑی بند کر کے باہر آگئے۔ اب یہ چاروں گاڑی کے اردگرد کھڑے مریم بوٹی پھڑکنی کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

''بھئی کچھ بیٹی کے متعلق بھی سوچو کہ یہ اپنی اپنی درسریاں ہی منانے میں مگن رہو گے۔۔۔۔'' ڈاکٹر فضل اگرو نے کچھ مذاق کچھ سنجیدگی سے کہا۔

سعید بھائی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے۔۔۔ ''لو ہم نہیں سوچتے بھلا۔ ہم نے تو اتنا سوچا، اتنا سوچا کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ مرد کی طرح کماتی ہے کسی کی محتاج نہیں۔۔۔ سوچ رہی ہے باہر جا کر پی ایچ ڈی کر آئے۔۔۔۔''

''اور شادی۔۔۔ وہ سعید بھائی، وہ کون کرے گا۔۔۔؟'' طاہرہ نے سوال کیا۔

''تم تو الٹا ہمیں چور سا بنا رہی ہو طاہرہ۔۔۔۔ اس کو تو کوئی پسند ہی نہیں آتا۔۔۔ اوپر سے نوکری کر لی ہے، ہنستے بولنے کو وہاں ہم عمر مل جاتے ہیں جوب پر۔۔۔ اگر بن گائے پالے دودھ ملے تو یہ بتاؤ گائے کیوں پالے مریم کس لیے۔۔۔۔ کسی قسم کی DEPENDENCY تو رہی نہیں مرد پر، پھر شادی کیوں کرے، مرد عورت کا رابطہ ہو، ماں بچے کا رشتہ ہو دوستی ہو۔۔۔ بھائی جہاں کسی کی محتاجی ہی نہ ہو، وہاں جھنجھٹ ہی کیوں مول لے کوئی۔۔۔'' مسرت بولے گئی۔ یوں لگتا تھا وہ اندر ہی اندر اپنی کوششوں سے تھک چکی تھی۔

''اچھا بھائی آپ لوگ مجھے بتائیں کیسا لڑکا پسند کرے گی ہماری مریم۔۔۔؟''

''ایک تو وہ کہتی ہے کہ لڑکا دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہو۔ امریکن ایکٹر جیسا نہ سہی، پر لوگ باگ اس کے قد، رنگ، شکل پر پھبتیاں نہ کسیں''۔

''سنا تو یہی ہے کہ مرد کی شکل میں اس کی کمائی دیکھی جاتی ہے لیکن خیر۔۔۔ اکیسویں صدی کا ورلڈ آڈر یہی ہو گا۔۔۔ اور۔۔۔''

اب سعید بھائی کھنگارے اور دبی آواز میں بولے۔۔۔'' دوسرا بھئی کھاتا پیتا ہو، شادی کے بعد وہ سارے سکھ مریم کو مل سکیں جو اس کے بوڑھے ماں باپ نے دے رکھے ہیں۔ وہ کسی کنگلے کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں شامل ہونا نہیں چاہتی، وہ جن کمفرٹس کی عادی ہے وہ اسے ملنی چاہییں''۔

''رائٹ۔۔۔'' طاہرہ نے سمجھنے کے انداز میں کہا۔۔۔'' میں سمجھ گئی لڑکا سیلف میڈ نہ ہو یہی مطلب ہے نا۔۔۔۔ نہ سیلف میڈ ہونے کے خواب دیکھے۔۔۔۔ بنا بنایا ہو۔۔۔''

''سمجھو نا طاہرہ۔۔۔ ٹھیک کہتی ہے مریم۔۔۔ بھلا تمیں چالیس برس مریم نے مرد کو بنانے میں گزارے۔ تو اس نے

کیا انجوائے کیا۔۔۔'' محبت سے ڈاکٹر فضل اگرو نے کہا۔

طاہرہ نے تعجب سے ڈاکٹر صاحب پر نظر ڈالی۔ جب ڈاکٹر صاحب سے اس کی شادی ہوئی تھی تب فضل اگرو معمولی ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ وہ کیمبل پور کے ڈپٹی کمشنر کی بیٹی تھی۔ پر ماں نے بڑی محبت سے سمجھایا تھا کہ ڈاکٹر دین کا پابند اور شرافت کا پاسدار ہے۔ رزق کا اللہ مالک ہے وہ ہر جگہ بہم پہنچائے گا۔ پہلی پوسٹنگ کوٹری جنکشن سے آگے جمعہ گوٹ میں ہوئی۔ یہاں نہ کوئی سوشل لائف تھی نہ جگمگاتے بازار گلیاں۔ طاہر کو ڈاکٹر فضل اگرو کے ساتھ وقت گزارنے کا کنواں بھر پانی میسر آیا جس میں ڈول ڈول ڈال کر وہ اپنی تنہائیاں سیراب کرتی رہی۔ سندھی ڈاکٹر نفیس آدمی تھے۔ لطیف بھٹائی کے سچے عاشق، بابا بلھے شاہ کے شیدائی۔۔۔۔ نہ تو انہوں نے طاہرہ کی زندگی میں زہر گھولا، نہ ہی طاہرہ نے بھی کیمبل پور کی زندگی کو یاد کر کے آنسو بہائے۔ اتنی فراغت، تنہائی، غریبی کے ہوتے ہوئے وہ ساتھ رہنے کو زندگی کی سب سے بڑی عیاشی سمجھتے رہے۔ شاید طاہرہ پرانے خیالات کی تھی یا ممکن ہے فضل اگرو کے ساتھ ہی وقت ایسے گزرا کہ وہ سمجھنی لگی ساتھی کو کھلا کپڑا ہونا چاہیے۔۔۔ اس کی کتر بیونت۔۔۔ سجاوٹ ناپ سب کچھ اپنے دوسرے ساتھی پر چھوڑنا چاہیے۔

''اچھا جی اور کچھ۔۔۔'' تھوڑی سی ہار کر طاہرہ بولی۔

''ہاں بھئی ہاں۔۔۔ یاد آیا۔ اس کا EXPOSURE ضرور ہو۔ کنویں کا مینڈک نہ ہو اپنے ہی گن گانے والا۔۔۔ بلکہ اگر ہو سکے تو انٹرنیشنل لیول کا EXPOSURE ہو۔ بھلا ایسے آدمی کا بھی کیا فائدہ جو کراس کلچر نہ جانتا ہو۔ چھوٹی کھوپڑی والے سے کیا لینا۔۔۔؟'' سعید بھائی بولے۔

طاہرہ نے کہنا چاہا کہ زیادہ EXPOSURE بھی کبھی کبھی خطرناک ہو سکتا ہے لیکن طاہرہ کو علم تھا کہ سعید بھائی بڑے باتونی تھے ان کے پاس ڈسکوری، اکونومسٹ، نیوز ویک، ٹائم، ایشیا ویک، جیوگرافیکل میگزین اور ایسے ہی کئی رسالے مروجہ علم اور انفارمیشن سے بھرے آتے تھے وہ کئی ملکوں کی سیاحت بھی حکومتی خرچ پر کر چکے تھے۔ ایک وقت تھا جب وہ پرائم منسٹر کی تقریریں بھی لکھتے تھے اور سیاسی حالات پر ان کی بصیرت ثقہ بند تھی۔۔۔۔ لیکن یہ سارا لکھنا پڑھنا، انفارمیشن سے پر دماغ وہ اس لیے ترو تازہ رکھتے کہ انہیں بولنے کا شوق تھا۔ وہ پنٹا گون سے لے کر سی آئی تک اور کلوننگ سے لے کر چیونٹی پر ریسرچ تک سب پر گفتگو کر کے محفل کو ہراساں اور حیرت زدہ کرنے کا فن جانتے تھے۔

مریم بھی سعید بھائی کی طرح بڑی پڑھا کو تھی۔ اس کے پڑھنے لکھنے کے پیچھے بھی یہی تحریک تھی۔ وہ بھی ہم چشموں کو اپنی انفارمیشن سے دنگ کرنا چاہتی تھی۔ مردم بیزار مریم لوگوں کو پسند کرنے میں خاصی دقت محسوس کرتی۔ کوئی لڑکی اس کے معیار پر پوری نہ اترتی۔ کیوں کہ لڑکیاں عام طور پر فیشن، بازار، بیوٹی پارلر، گھر کی آرائش، چغلی غیبت سے آگے گفتگو روانی سے چلانا نہ جانتی تھیں۔ اردو میڈیم کی پڑھی ہوئی لڑکیاں خاص طور پر اس کے پیمانے پر پوری نہ اترتیں۔۔۔۔ خراب انگریزی لب و لہجے رکھنے والیاں اسے جھلاہٹ میں مبتلا کر دیتیں۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک پرانی سہیلی سے مریم بازار میں ملی۔ اس وقت مریم بڑے اسٹائل سے ملک شیک پی رہی تھی۔

ایک سیاہ کار زناٹے سے گزری پھر کچھ آگے بڑھ کر سکر چیں مارتی کار رکی اور پوری اسپیڈ سے REVERSE میں لوٹی۔ مریم تھوڑا سا گھبرا گئی۔ اخباروں میں دہشت گردی کے واقعات پڑھتے پڑھتے اس کا دھیان اب خیر کی طرف کم ہی منعطف ہوتا تھا۔ کار اس سے تھوڑی ہی دور جا کر رکی۔ ایک نوجوان عورت اس میں سے برآمد ہوئی۔۔۔۔ سیاہ لباس، سیاہ چشمہ، سیاہ سویٹر، چہرہ بلیچ شدہ، بالوں میں STREAKS، چہرے پر میک اپ ماسک کی طرح چڑھا ہوا۔۔۔۔ مریم کی سہیلی کسی بیوٹی کلینک کا ماڈل نظر آ رہی تھی۔

آصفہ نے بھاگ کر آئس کریم چاٹتی مریم کو جھپی میں لے لیا۔ پھر اسے گھما پھرا کر دیکھا۔ محبت سے دائیں گال کو چوما اور بڑے جذبے سے بولی۔۔۔۔ ''بھائی مریم کہاں ہوتی ہو تم۔۔۔ میں نے تو کئی دوستوں سے پوچھا۔ کسی کے پاس سے نہ تمہارا فون نمبر ملا نہ ایڈریس۔ اولڈ گرلز کے فنکشن میں بھی تم نہیں آئیں۔ کمال ہے۔۔۔۔ ''تم تو مکمل طور پر بلیک آؤٹ ہوگئیں سنگدل''۔

''میں تو یہیں تھی لاہور میں۔۔۔۔۔ میرا تو مستقل ایڈریس بھی وہی ہے جو کالج میں تھا'' ۔آصفہ نے ابرو اٹھا کر تعجب سے کہا۔۔۔۔ ''یہ کالج والے بھی عجیب ہیں۔ایک اولڈ اسٹوڈنٹ کا پتہ نہیں کر سکے''۔

پھر آصفہ نے کار میں اچھل کود کرتے اپنے بچوں کو ڈانٹ پلائی۔۔۔۔۔ ''دو منٹ تم لوگ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔کیا قیامت آگئی، چپ چاپ بیٹھو ورنہ پٹائی ہوگی۔۔۔۔'' بچوں پر برس کر وہ تازہ مسکراہٹ لیے مریم کی طرف متوجہ ہوئی۔۔۔۔۔

''یار اس کارٹون چینل نے تو بچوں کی سائیکالوجی ہی بدل دی ہے لیونارڈو آرام سے بیٹھو۔۔۔۔ ماما آرہی ہے۔۔۔''

پتہ نہیں بچے تین تھے کہ چار لیکن سارے ہی تھوڑی دیر کے لیے دبک گئے۔

''تمہارے کتنے بچے ہیں مریم۔۔۔۔'' آصفہ کی جانب سے سوال آیا۔ جب بھی یہ سوال مریم سے پوچھا جاتا تھا وہ عجیب طرح کی خفت محسوس کرتی گویا وہ جسمانی طور پر کسی قسم کی نااہلیت میں مبتلا تھی۔

چند لمحے توقف کے بعد مریم بولی۔۔۔۔ میرے بچے۔۔۔۔؟ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔۔۔۔''

''تت تت تت۔۔۔۔ بھئی جلدی کرو، زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ یہ بے حیا مرد لوگ بھی نوجوان بلونگڑیاں پسند کرتے ہیں۔۔۔۔ تم کیا سوچ رہی ہو آخر۔۔۔۔؟''

مریم کچھ ہل سی گئی۔۔۔۔ ''سوچ کچھ نہیں رہی میرے مطلب کا آدمی ابھی ملا نہیں۔۔۔۔۔ ایویں کیویں کے ساتھ زندگی خراب ہوگی۔۔۔۔''

آصفہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ پھر ٹاپک بدل دیا۔ تھوڑی دیر وہ پرانی سہیلیوں، کالج کی پروفیسروں، سیاسی حالات کی باتیں کرتی رہیں۔ اتنی دیر میں بچوں نے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ بھس میں شادی کی چنگاری ڈال کر اللہ حافظ کہتی ملین ڈالر کی مسکراہٹ بکھیرتی آصفہ اپنے سوپر مین، مائیکل انجلو، نوٹنڈو، بیٹ مین لے کر رخصت ہوگئی۔

بہت سارے وعدوں کے باوصف دونوں پھر ایک دوسرے کو مل نہ پائیں۔ موجودہ عہد کی زندگی نے جہاں اور بہت ساری چیزوں کو ختم کر دیا تھا۔ وہاں ذاتی فراغت کی موت کا باعث بھی ہوئی تھی۔ کھاتے پیتے گھرانوں میں بنک، مارکیٹ، سوشل فنکشن، فیشن، سیاحت کے لیے تو وقت تھا لیکن کتاب پڑھنے، میل جول کے لیے وقت نہ چھوڑا تھا۔ بچے بوڑھے بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ مصروفیت ہی اس قدر تھی کہ معاشرے کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور وہ بدل بدلا کر رہ گیا۔ آصفہ سے ملاقات کے بعد مریم سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ کہیں اب واقعی دیر نہ ہوگئی ہو۔ آصفہ کے بچے دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

اب تک جتنے امیدوار وہ مسترد کر چکی تھی سب کو سنی سنائی پر REJECT کیا تھا۔ کبھی کسی سے ملاقات نہ کی تھی۔ اس قدر ضرور ہوا کہ مریم بر دکھوے کی رسم پر مان گئی اور پہلی بار مسرت نے سکھ کا سانس لیا کہ کم از کم مریم نے اتنی حامی تو بھری کہ ٹرولی دھکیلتی اندر ڈرائینگ روم میں آجائے گی۔ ساری عمر تو وہ اسے چیپ حرکت سمجھتی رہی۔ اب خود بر دکھوے میں شامل ہو کر جواب دے گی۔ فوراً مسرت نے فون ملایا اور رحلیہ نویس طاہرہ سے تفصیل کے ساتھ مریم کی پسند اور ناپسند کی اطلاع دی۔

ڈاکٹر فضل اگر وبھی اب تک مریم کے معاملات کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ مریضوں کو اب وہ ایک اور نظر سے دیکھتے پرکھتے اور پھر گھر پر طاہرہ کو انفورم کرتے۔ یہ دونوں بڑے دوا اور دو چار قسم کے پریکٹیکل لوگ تھے لیکن ذرا سے چھوٹے واقعے نے انہیں گویا مریم کے گوڈ

فادر اور گوڈ مدر بنا دیا۔

ان ہی دنوں ایک شائستہ سے بزرگ طاہرہ سے کلینک پر ملے۔ یونس صاحب دس سال ہوئے سول سروس سے ریٹائر ہو کر کئی بیماریوں کی سنگت میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ باریش سرخ و سفید دراز قد پیر مرد ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر آتے۔ تمام مریض بھگت جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرتے۔ انہیں بلڈ پریشر اور شوگر کی تکلیف تھی ہی لیکن اس کے علاوہ جوڑوں کا درد، گلے کی شکایت، قبض، اسہال، نیند کی کمی، گیس ایسی کئی علتیں بھی ساتھ تھیں جن کی وجہ سے عام طور پر انہیں ڈاکٹر فضل اگرو کے پاس آنا پڑتا۔

''یہ میری بیوی ہے سر طاہرہ۔۔۔۔''

''سلام علیکم سلام علیکم''۔ یونس صاحب بولے۔

''آپ تو غالباً سب سے بعد میں دکھائیں گے؟'' ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا۔

''جی جی۔۔۔۔'' بوڑھا یونس کلینک کو غالباً کلب کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا۔

''تو آپ اور طاہرہ وہاں صوفے پر بیٹھیں، میں کافی بھجواتا ہوں۔۔۔۔۔''

طاہرہ اور یونس صاحب لمبے صوفے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جلد ہی طاہرہ کو احساس ہوا کہ یونس صاحب کی زبان بات کرنے کو ترسی ہوئی ہے۔

''میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں۔ وائف پچھلے سال فوت ہو گئیں۔ اب شدید تنہائی ہے۔۔۔۔ بارہ کنال کی کوٹھی۔۔۔۔۔ غسل خانے ریلوے اسٹیشن کے غسل خانوں سے مشابہہ ہیں۔ کسی کا شاور چلتا ہے تو رکتا نہیں۔۔۔۔۔ ڈبلیو سی ایسے رستے ہیں کہ ٹائلز میں اورنج رنگ کا زنگ لگ گیا ہے۔۔۔۔ ٹائلیں چکٹ۔۔۔۔۔ پردے گرا چاہتے ہیں۔ قالینوں پر چلو تو مٹی دھب دھب اٹھتی ہے۔ جب گھر والی نہ رہے تو گھر کہاں رہتا ہے''۔

''بچے وچے۔۔۔۔ یعنی کوئی بہو وغیرہ۔۔۔۔'' کافی کا چھوٹا سا گھونٹ پی کر طاہرہ نے سوال کیا۔ لیکن بن سنے یونس صاحب بولتے چلے گئے۔۔۔۔ ''دو مالی رکھے ہیں۔ آپ کسی دن ڈاکٹر صاحب کو لے کر آئیں۔ سارا گھر جھاڑ جھنکار بن چکا ہے۔ ہمارے ابا شکاری تھے۔ گیلری، ڈرائینگ روم، کھانے کے کمرے میں حنوط شدہ شیر چیتے، ہڑیال ٹنگے ہیں۔ کہیں دیواروں پر، کہیں سیڑھیوں پر۔۔۔۔ یوں لگتا ہے ہم جانوروں کے میوزیم میں آ گئے ہیں۔۔۔۔۔''

''تو آپ انہیں اٹھوا کر کسی علیحدہ کمرے میں رکھوا دیجئے۔۔۔۔''

جھریوں بھرے بڈھے نے سفید ہاتھوں کو مل کر جواب دیا۔۔۔۔ ''اب ہم ٹھہرے پرانے آدمی، اتنی آسانی سے ماضی کے ساتھ رشتے بھی نہیں توڑ سکتے۔ جہاں ابا ان جانوروں کو لٹکا گئے ہیں، وہیں بھلا لگتا ہے۔۔۔۔۔ اگر اٹھوا دیئے تو ہم ہی بے وفائی کریں گے ابا کے ساتھ۔۔۔۔''

''کوئی بیٹی۔۔۔۔۔ بہو۔۔۔۔۔؟'' طاہرہ نے پھر پوچھا۔

لیکن وہ اپنی روانی میں بولتے گئے۔۔۔۔۔ ''رات کے وقت باہر نکلیں کمرے سے تو لگتا ہے جانوروں میں جان پڑ گئی ہے۔ کوٹھی کے خالی کمروں میں دندناتے پھرتے ہیں حنوط شدہ۔۔۔۔''

''لیکن۔۔۔۔ آپ کسی کو ساتھ رکھیے نا۔۔۔۔ یہ تو بری بات ہے''۔ اب طاہرہ، یونس صاحب پر بھی ویسا ہی ترس کھانے لگی جیسا اسے مریم پر آتا تھا۔

''میں نے شکاگو خط لکھ دیا ہے اپنے بیٹے کو۔۔۔۔وہ ڈاکٹر ہے وہاں۔۔۔۔اکلوتا ہے بڑا سعادت مند۔۔۔۔سب کام دام چھوڑ کر آ رہا ہے۔اس کے آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔''

طاہرہ کو اس بوڑھے کی رجائیت پر ترس آ گیا۔۔۔۔اگر ڈاکٹر واپس بھی آ جائے تو اس بات کی کیا گارنٹی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

آواز گرا کر یونس صاحب بولے۔۔۔''کسی کسی رات کو لگتا ہے کہ جانوروں میں جان پڑ گئی ہے اور وہ خالی کمروں میں دندناتے پھرتے ہیں۔۔۔۔اچانک ریچھ کی ڈفلی بجنے لگتی ہے۔۔۔۔شیر گرجتا ہے۔چیتوں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔۔۔۔عجیب قسم کا خوف آتا ہے۔۔۔۔''

طاہرہ کو یونس صاحب کی حالت پر خوف آنے لگا!

کافی کی پیالی تپائی پر رکھ کر یونس صاحب آہستہ سے بولے۔۔۔۔۔''میرا خیال ہے کہ بیٹی کے پاس کراچی چلا جاؤں، وہ بڑے اصرار سے بلاتی ہے۔۔۔۔لیکن گھر جوائی کی کیا عزت ہوتی ہے بھلا گھر سسرے کس باغ کی مولی۔۔۔۔''

پیرمرد نے اپنے اوپر ہنسنا چاہا لیکن اس کا منہ تھک سا گیا۔یونس صاحب کو ایک مدت کسی سے بات کیے ہو چکی تھی۔اسی لیے وہ سرپٹ زبان سے اپنی تنہائیوں کی داستان بغیر کوما، فل اسٹاپ کے سنانا چاہتے تھے۔

''کیا آپ کا بیٹا یہاں ایڈجسٹ ہو جائے گا۔۔۔۔؟''

یونس صاحب نے مسکرا کر کہا۔۔۔۔''پہلے مشکل یہ تھی کہ وہ شادی پر رضامند نہیں تھا۔اب مان گیا ہے۔آیا اس کی بیوی اسے اپنے وطن میں ایڈجسٹ کرائے گی۔۔۔؟''

طاہرہ کے دل کی گھنٹی بجی۔۔۔پالیا۔۔۔۔اس نے اندر ہی اندر ارشمیدس کی طرح نعرہ لگایا۔۔۔۔۔شکاگو کا ڈاکٹر۔۔۔ہڈیوں کے علاج کا ماہر۔۔۔بارہ کنال کی کوٹھی۔۔۔۔نہ کوئی ساس نہ نندیں۔۔۔۔اکیلا ایک سسر وہ بھی چندروزہ۔۔۔آزادی ہی آزادی۔۔۔۔راج ہی راج۔۔۔تمہاری تو گرینڈ پرکس لاٹری نکل آئی مریم۔

ڈاکٹر معظم کے آنے سے پہلے طاہرہ اور مسرت کی لمبی ملاقاتیں اور فون پر لمبی باتیں ہوئیں۔۔۔۔۔سعید بھائی اور ڈاکٹر فضل اگرو بھی پہلے کی نسبت ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ملنے لگے۔وہ سب ایک طرح کے یوفوریا میں مبتلا تھے۔حتیٰ کہ دادی ماں بھی اپنی سہاگ رات، شادی کا جوڑا، سسرالی رشتے داروں کو بار بار یاد کر رہی تھیں۔ویسے تو لگتا تھا کہ الزائمر کی مریضہ تھیں اور پل بھر پہلے کی بات یاد نہیں رکھ سکتیں لیکن ان دنوں وہ پرانے ڈھولک گیت سنا کر سب کو حیران کر دیتیں۔

شام ڈھل رہی تھی جب ڈاکٹر معظم اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ تھامے اندر آیا اور سعید بھائی کے پاس خاموشی سے بیٹھ گیا۔دراز قد، پراعتماد، گورا چٹا وجیہہ، دھیمی آواز میں بولنے والا، شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔تھوڑی دیر بعد جب مریم ٹرولی دھکیلتی اندر آئی تو اس نے بھرپور نگاہوں سے ڈاکٹر معظم کو دیکھا لیکن ڈاکٹر نے لمحہ بھر کو بھی نگاہیں اٹھا کر مریم کی جانب نہ دیکھا۔ڈاکٹر فضل اگرو سے وہ بڑے تحمل کے ساتھ کسی مریض کی کیس ہسٹری ڈسکس کرتا رہا۔مریم کو اگر ڈاکٹر نے دیکھ لیا تھا تو وہ محض اتفاقاً تھا۔گھر لوٹنے سے پہلے یونس صاحب نے طاہرہ کو اپنی رضامندی سے بھی مطلع کر دیا۔

رات گئے سعید بھائی کا فون آیا۔نیم سوئی نیم جاگی۔طاہرہ اس کال کے لیے تیار نہ تھی پہلے اسے خیال آیا کہ کوئی رانگ نمبر رنگ ہے۔سعید بھائی کی آواز سن کر اس نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ لڑکے والوں کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری جانب سے سعید بھائی کی آواز آئی۔۔۔۔''ہم لوگ بڑے شرمندہ ہیں طاہرہ بہن۔۔۔۔۔بلکہ مسرت تو مارے شرم کے فون بھی نہیں کر پائیں۔۔۔۔۔ہمیں افسوس ہے کہ۔۔۔۔۔ہم یہ شادی نہیں کر پائیں گے۔۔۔۔۔''

''لیکن کیوں سعید بھائی۔۔۔آخر وجہ؟''

سعید بھائی کی آواز آئی۔۔۔۔''دیکھیے ڈاکٹر معظم کا بھی کوئی خاص قصور نہیں ہے۔ملک سے باہر جا کر کچھ لوگوں پر رد عمل ہو جاتا ہے،اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے وہ زیادہ مذہب پرست ہو جاتے ہیں۔اپنی پہچان قائم رکھنے کو وہ ضرورت سے زیادہ RIGID ہو جاتے ہیں۔لیجیے جو شخص امریکہ میں رہ کر زکوۃ دیتا ہے۔۔۔۔۔بینک کا سود نہیں لیتا۔۔۔۔عورتوں سے آشنائی نہیں رکھتا۔۔۔۔وہ تو پکا فنڈا منٹلسٹ ہوا ناں''۔

طاہرہ ذرا سی چڑ گئی۔۔۔۔''کمال ہے سعید بھائی۔غیر مسلم جو مرضی کہیں،آپ تو ڈاکٹر معظم کو کچھ نہ کہیں جی۔۔۔۔اس کی تو دنیا بھی سنور گئی اور آخرت بھی۔۔۔۔''

سعید بھائی کی آواز میں کچھ کھر درا پن آ گیا۔۔۔۔''اب اس جوانی میں داڑھی رکھے بیٹھا ہے تو بیوی کو بھی تو حجاب پہنائے گا نا۔۔۔۔۔ہم اس سے کیا امید رکھ سکتے ہیں''۔

طاہرہ کو دھچکا لگا۔۔۔۔اس قدر خوب صورت،باپ پرست۔۔۔۔۔شائستہ آدمی پھر کب ملے گا؟''

''بات یہ ہے طاہرہ بہن۔۔۔۔سب کچھ ٹھیک ہے۔ہمیں معظم پسند بھی آیا ہے لیکن اس نے ساری شام نظریں نیچی رکھیں۔مریم کی جانب غور سے دیکھا تک نہیں۔اب جو خود شرع کا اس حد تک پابند ہو،وہ بیوی سے بہت زیادہ توقعات رکھے گا۔ہم نے مریم کو اتنی تعلیم اسی لیے تو نہیں دلوائی کہ وہ اکیسویں صدی میں اپنی نانی دادی کی زندگی گزارے''۔

''آپ کی ساری باتیں مجھے بڑی فروعی لگ رہی ہیں سعید بھائی۔۔۔۔میں واقعی آپ کی بات سمجھی نہیں۔۔۔۔''

تھوڑی دیر فون پر خاموشی رہی پھر سعید بھائی کھنکار کر بولے۔۔۔۔''طاہرہ ہمارا یہ خیال ہے یعنی مسرت،مریم اور میرا۔۔۔۔۔کہ مذہب کے پیروکار عام طور پر بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں کے ساتھ اول تو رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔شخصی آزادی قدم قدم پر مجروح ہوتی ہے۔میرا خیال ہے کہ جو شخص مذہب کے فریم ورک میں رہتا ہے وہ نہ تو اچھا انسان ہوتا ہے نہ شوہر۔۔۔۔۔ہم ڈاکٹر معظم کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتے۔آپ مہربانی فرما کر انہیں طریقے سے انکار کریں۔بس ان کی دل آزاری بھی نہ ہو۔۔۔۔اور انکار بھی ہو جائے۔۔۔۔۔اس کے ابا کو میں خود سمجھا لوں گا۔۔۔۔۔میرے نزدیک دل آزاری سب سے بڑا گناہ ہے۔

ڈاکٹر معظم جیسے لوگ نہ خود آزاد ہوتے ہیں نہ کسی اور کو آزادی دے سکتے ہیں۔یہ خواہشات کو پورا کرنے کے بجائے انہیں دبانے کے درپے رہتے ہیں۔ہم اپنی بیٹی کی شادی اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خوش رہے۔گرفتار مذہب کا ساتھی بنا کر اسے آزمائشوں میں نہیں ڈالنا چاہتے۔انسان اپنی خواہشیں بھی پوری نہ کرے تو وہ یہاں آیا کیوں ہے۔۔۔۔۔؟''

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

صبح تک طاہرہ کروٹیں بدل کر سوچتی رہی کہ یونس صاحب کو کیا کہہ کر انکار کرے۔۔۔۔۔وہ بیچارے تو مریم کو دیکھ کر سمجھنے لگے تھے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔کیا نیو ورلڈ آڈر میں مذہب کی گنجائش نہ تھی۔۔۔۔۔کیا ایسے لوگ جو مذہب سے وابستہ تھے آگے نہ بڑھ سکتے۔۔۔۔؟

☆☆☆

ہیرا پھول

جمیلہ ہاشمی

''پتہ نہیں تمہیں کیوں یاد نہیں رہتا کہ جب میں شہ کہوں تو اس کا مطلب ہے تمہارا بادشاہ زد میں ہے اور تمہیں۔۔۔۔
اس کی فکر کرنا چاہیے''۔

میں کیا کروں اگنی دا مجھے یاد ہی نہیں رہتا۔ مجھے یہ ہارنے جیتنے کا کھیل بکواس لگتا ہے۔ میرا بادشاہ اگر زد میں آ گیا ہے تو تم جیت گئیں۔ اب بساط اٹھا دو۔ ''اگر تم یہ کھیل نہ سیکھ سکے۔ اپنے مہروں کو بچانے کی تمہیں فکر نہ ہوئی تو مانو تم نے کچھ بھی نہ سیکھا۔ دیکھو بات سنو اب پھر سے یاد کرو گھوڑا ڈھائی چال چلتا ہے''۔ دا نے اٹھ کر آنگن میں بکھری چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔

''اندو۔ اندو''۔ اس نے پھر پکارا۔ پورب کی ہوا ہے اور کالے بادل پانی لائے ہیں''۔

میں نے جھانک کر دیکھا۔ گھٹائیں سرمئی اندھیرے کو سیاہ کئے دیتی تھیں تیز ہوا اور بہار کی بسنتی باس کے ساتھ بھیگی ہوئی مہک تھی جیسے پانی کے کندھوں پر اڑتی آئی ہو۔

''دا میری سمجھ میں یہ سب نہیں آسکتا یہ ڈھائی چال کیا ہوئی بھلا؟ میں بساط اٹھا کر پھینک دوں گا''۔

''سنو جی مجھ سے یہ نہیں چلے گا جب تک تم اسے سمجھ نہیں چکتے میں تمہیں کبھی بھی جانے نہیں دوں گی۔ رات کی کہانی ختم اور اپنے ساتھ تو تمہیں ہرگز نہیں سلاؤں گی۔'' اگنی دا ضد کی بہت پکی ہے اور جب کبھی میں اور وہ کسی بات پر جھگڑتے ہیں جیت اسی کی ہوتی ہے۔ اب کئی دنوں سے یہ شہ اور بات۔ پیادے اور فیل چل رہے ہیں۔ لمبی ہونکتی ہوئی دو پہروں میں جب بھی نیند آنے لگتی دا بساط بچھا کر بیٹھ جاتی اور مجھے سونے نہیں دیتی۔ وہ کہتی ہے میں بہت سی چالیں بیک وقت سوچوں تا کہ اسے دے سکوں۔ اور میں صرف ایک چال سوچ سکتا ہوں۔ پھر اگنی دا کے سامنے بیٹھے مجھے تو اس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ میں جیت یا ہار اور پھر یہ جھنجھٹ کو وزیر کو بچاؤ۔ فیل کو بچاؤ۔ پیادے کو بچاؤ۔ رخ کو بچاؤ۔ دا چاہتی ہے میں اس کے مہرے پیٹوں مگر میں یہ کھیل کسی نہ کسی طرح جلد ختم ہو، چاہے میں ہی کیوں نہ پٹ جاؤں''۔

اگنی دا مجھے اتنا کٹھور بنانا چاہتی ہے اتنا سخت کہ میں ہر آفت سہہ لوں۔ سردی اور گرمی مجھ پر اثر نہ کریں۔ میری چیزوں کی کرنے کی طاقت بہت ہو، بے انداز مگر میں کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھتا ہوں۔ سیاہی بجلی کے لہریوں سے اور گہری ہوئی جاتی ہے۔ کواڑ ہوا کے زور سے دھڑ دھڑائے جا رہے ہیں۔ بوندوں کی چاپ چھت پر سنائی دے رہی ہے۔ وہ ہولے ہولے پھوار بن کر ٹھنڈک بن کر۔ میں چاہتا ہوں ہوا کو پکڑ لوں۔ مٹھیاں بھر بھرا سے اپنے گرد بکھیروں اور بادلوں کی روئی میں دھنتا چلا جاؤں وہاں جہاں دا کہتی ہے پاتال ہے۔ لمبی تانوں والے راگوں کا ایک قافلہ سا چل رہا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے اور تاریکی میں سنسناتی گولیاں سی ادھر ادھر اڑ رہی ہیں۔ یوں جیسے رات کے پرندے ایک سی بولی بول کر ایک دوسرے کو کھوج رہے ہیں جیسے میں ہیرا پھول کھوجتا ہوں۔

''ہیرا پھول کے بنا کوئی عزت دار نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس شہر کی گلیوں میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتا۔ ہیرا پھول کے بنا کوئی کسی کو نہیں پہچان سکتا اور پھر تم؟''

اگنی دا کی آواز ''تم'' کہتے کہتے جانے کیوں اتنی سخت ہو جاتی ہے۔ حکم دیتی ہوئی میرے دفتر کو دہلاتی ہوئی؟''

''کیوں دا اگر مجھے ہیرا پھول کھوجنے پر بھی نہ ملے''۔ میں دا سے کسی نہ کسی سطح پر صلح کر کے اپنا مطلب اسے بتانا چاہتا ہوں۔

''سارے آدمی اس پھول کو کھوجنے نکلتے ہیں ورنہ ان کا جینا مرنا سب برابر ہے''۔ دا بات کرنے کے سارے راہ بند کر کے خود اس راہ پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ جس پھول کے کھوجنے کے لیے مجھے تیار کرتی ہے جانے وہ کن باغوں میں کھلتا ہے؟

پتہ نہیں وہ پھول اب آفتاب اور مہتاب میں سے کسی کے پاس ہو جو میری طرح اگنی دا کے نہیں میری ماں اور میرے چاچا کے بیٹے ہیں۔

ماں بھی ایک سندر سپنا تھی دھان پان سی جیسے کہانی کی پری ہو۔ ڈری ڈری سہمی سہمی سی جیسے کسی دیو کی قید میں کوئی راجکماری ہو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لیے جانے اسے دیکھ کر رونا کیوں آنے لگتا تھا۔ پھر وہ آتی بھی تو سپنے کی طرح تھی۔ زیادہ دیر نہ رکتی اس نے کبھی مجھے زیادہ پیار نہیں کیا۔ ایک جب وہ مجھے اپنے قریب کھینچ رہی تھی تو اگنی دا نے کہا تھا۔

''بہو کیا تمہیں اچھا لگتا ہے کہ یہ تمہارے بنا رہ نہ سکے''۔

ماں کے ہاتھ ایک بے بس کی طرح اس کے پہلوؤں میں گر گئے تھے۔ اس کی کاجل سے سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور وہ کوشش کر رہی تھی کہ آنسو گریں نہیں۔

اگنی دا نے کہا تھا۔

''جاؤ بہو اگر کاجل پھیل گیا تو تم کیا جواب دو گی؟''

ماں کے جانے کے بعد میں نے دا سے پوچھا تھا ''تمہیں ماں اچھی نہیں لگتیں نا تم اسے یہاں آنے کیوں نہیں دیتیں؟''

دا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا ''بیٹے رات کے بعد دن ہوتا ہے۔ اندھیرے کے بعد اجالا ہوتا ہے۔ وقت کا انتظار کرو بیٹے اور ایسی بہت سب باتیں جن کی سمجھ نہ مجھے تب تھی نہ اب ہے۔ پر دا نے مجھے ایسی کھوج پر کیوں لگایا ہے جس کا کوئی انت نہیں۔ بھلا ہیرا پھول کیسا ہے۔ کون جانے اور آخر میں جانے پھول کس کے ہاتھ لگے۔

خالی اور لمبی دوپہروں میں اگنی دا نے مجھے صحیح نشانہ باز بنانے کے لیے کتنی محنت کی تھی۔ آج جو میں آواز پر نشانہ لگاتا ہوں وہ نہیں چوکتا تو یہ سب اگنی دا کی محنت ہے جو اس نے میرے ساتھ کی تھی۔ اس دن بھی میں نے دونوں بازوں کو لڑتے دیکھ کر نشانہ لیا اور پھر غرور سے میں نے زمین پر بیٹھی اگنی دا کی طرف دیکھا مگر وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی وہ اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے میں لیے بیٹھی تھی۔

میں بھاگ کر اس کے گلے سے لٹک گیا۔ ''دا دیکھتی ہو میں نے کیا کیا ہے؟ دیکھا میرا نشانہ؟'' پھر اس کا رنگ یوں زرد ہو گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ ''بیٹے تم نے کیا کیا ہے۔ بیٹے تم نے یہ کیوں کیا ہے۔ ابھی وقت نہیں آیا بیٹے مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ میرے بچے تم نے تو باز کی ٹانگ توڑ دی ہے۔ اب میں کیا کروں گی تمہیں کہاں چھپاؤں گی''۔

پھر میں نے اپنے چچا کو دیکھا کہ جھومتا ہوا آیا ہے۔

''ہوں'' کر کے اس نے مجھے اور دا کو دیکھا اور پھر اس کی نظر اپنے زخمی باز پر پڑی وہ ساری لمبی داستان عجیب طرح سے اندھیرے میں ہے۔ روتی ہوئی اگنی دا چیختی ہوئی ماں اور زمین پر پٹخنیاں کھاتا ہوا میرا اپنا جسم۔ ایک عجیب آواز سے میں دیواروں دروازوں فرش پر لگ رہا تھا۔ کچھ محسوس ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ جیسے میں کوئی اور ہوں جسم سے باہر پرے اور فرش پر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے کسی پتھر کے جسم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ چیخیں بھی میں نے اپنے کانوں سے سنیں پھر ہولے ہولے سب کچھ تھم

گیا۔ کوئی آواز نہیں آتی تھی!

پر آج تک بھی جب مجھے کوئی ٹھوکر لگی ہے جب بھی میں زخمی ہوا ہوں مجھے سدا یہی لگا ہے جیسے یہ میں نہیں کوئی اور ہے جس پر یہ سب بیت رہی ہے مجھے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ آنکھ کھلی ہے تو میں نے ماں کو اپنے پر جھکے دیکھا وہ رو رہی تھی اور ہاتھ مل رہی تھی اس کے وہ ہاتھ جیسے چاندنی کو گوندھ کر بنائے گئے ہوں۔ اس کے سفید چہرے پر کاجل پھیلا ہوا تھا اور اس کے بال کھلے تھے۔ میں نے زمانوں کے بعد اسے دیکھا تھا وہ مجھے بہت اچھی لگی۔

''تم کیسے ہو بیٹے میرے میرے بیٹے میرے لال'' اس کی آواز مجھے ایسی سہانی لگی جیسے گھنٹیوں کی مدھم سی سنسناہٹ ہو وہ آواز میرے خون میں ایسی سنسناہٹ پیدا کرنے لگی جیسی سیاہ گھوڑے پر بیٹھ کر تاریک رات میں سرد ہوا کے تھپیڑے کھانے سے ہوتی ہے۔ یہ میری ماں تھی۔ میرا جی چاہا وہ مجھے گلے سے لگا لے۔ اگنی دا کی طرح وہ مجھے اپنے سینے سے چمٹائے، میں اس میں سما جاؤں!

مگر اگلے ہی لمحے ایک باندی نے کہا ''رانی آپ چل کر سنگار کرلیں وہ بے بسی اور بے چارگی کی نظر جیسے نظر نہ ہو خون کا آنسو ہو۔ مجھے اپنا دل ٹھہرتا ہوا معلوم دیا۔ پھر اگنی دا نے کہا ''بہو تم جاؤ میرے بچے پر دیا کرو''۔

ماں نے بڑی منت سے دا کی طرف دیکھا اور جھک کر میرا ماتھا چوم لیا۔

وہ جگہ جہاں ماں کے ہونٹ پڑے تھے وہ جگہ میرے اپنے ماتھے پر اتنی پوتر لگتی ہے کہ مجھے کبھی کبھار اپنے آپ پر مندر ہونے کا شبہ ہوتا ہے!

ان دنوں گھٹائیں جھوم کر آتی تھیں اپنے کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی میں سے مجھے جو آکاش دکھائی دیتا وہ سیاہ ہوتا۔ ہوا ایک عجیب طرح کے زور سے چلتی جیسے اپنے ساتھ سب کچھ برباد کردے گی۔

میں بہت کمزور تھا اور پھر دا مجھ سے بات بھی بہت کم کرتی تھی اس گھڑی کے بعد سے وہ مجھ سے آنکھ بھی نہیں ملاتی تھی۔ اپنے سفید ہلتے سر کو اور جھکائے تقریباً دوہری ہوتی جب وہ کمرے میں ادھر سے ادھر چلتی تو میں اسے دیکھتا رہتا۔ کبھی میرے لیے دوا لا رہی ہے کبھی میرے جسم کو سینک رہی ہے۔ مجھے چادر میں لپیٹ رہی ہے ان بوڑھے ہاتھوں میں گرمی بھی نہیں تھی میرے زخم مندمل ہونے میں ہی نہیں آتے تھے۔ کبھی میں درد کی شدت سے رونے لگتا تو دا بہت خفا ہو کر میری طرف دیکھتی۔

''بیٹے یہ تم ہو، روتے ہوئے کیا اچھے لگتے ہو؟''

''دا یہاں یہاں دکھ جو ہوتا ہے''۔ میں زور سے کہتا اور چوٹوں کو چھونے کی کوشش کرتا۔

''تمہیں تو جانے کیا کچھ سہنا ہے ابھی اور تم اتنی سی بات نہیں سہار سکتے؟'' وہ چوٹ کی جگہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی۔

''دا کیا اس سے بھی زیادہ دکھ ہو سکتا ہے؟ کیوں مجھے کیوں دکھ ہوگا بھلا؟'' میں بے یقینی سے پوچھتا۔ ''کئی جسم بہت سخت بنائے جاتے ہیں جو بہت کچھ سہہ سکیں'' دا بڑے رسان سے کہتی ''تم کس شے سے بنی ہو دا'' میں نے اسے اپنے کمزور ہاتھ سے چھو کر کہا۔

''میں نے بہت کچھ سہا ہے ابھی بہت کچھ سہنا ہے۔ ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا''۔ اس نے ہولے سے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھتا اور جی ہی جی میں کہتا ''دا مجھے دھوکا دے رہی ہے خود مجھے کہتی ہے کہ جھوٹ نہیں بولو پاپ ہوگا۔ پر خود تو پاپ سے ذرا نہیں ڈرتی۔ یہ کاغذ کی طرح کے مڑے تڑے کھڑکھڑاتے ہوئے ہاتھ سفید سر اور پوتوں کے بوجھ سے بند ہوتی آنکھیں۔ چلا تو اس سے جاتا نہیں اور اپنے آپ کو سخت کہتی ہے۔ ایک ٹھوکر لگنے سے گر جاتی ہے، ہوا میں اڑ سکتی ہے اور پھر میں سوچنے لگا، کیسے ہو

اگر دا اڑ جائے اور برگد کی شاخ میں اٹک جائے اور زور زور سے رونے لگے اور میں جوا تنا بہادر سور بیر ہوں یوں چٹکی بجاتے میں اسے نیچے اتار لاؤں اور کہوں ''دیکھا تم نے اب بتاؤ کون سخت بنا ہے تم یا میں؟''

میں زور زور سے ہنسنے لگا تو دا نے کہا ''بیٹے یوں نہیں ہنستے جب تک کوئی بات نہ ہو''۔

''تمہیں کیا پتہ کیا بات ہے۔ دا میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ میں تم کو درخت سے اتار کر لا سکتا ہوں!''

دا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا ''میں تو تمہاری باندی ہوں بیٹے۔ تم مجھ سے بہت بڑے ہو پھر بھی مجھے اسی جگہ پر بھٹکنا ہے اور تمہیں آگے جانا ہے!''

''کہاں آگے جانا ہے دا۔ تم مجھے اپنے سے دور کیوں بھیج رہی ہو؟''

''کیونکہ تمہیں اپنے پھول کی کھوج میں نکلنا ہے۔ پھول جس کا رنگ کبھی کم نہیں پڑتا، پھول جس کی باس سدا رہنے والی ہے اور جس کا رنگ کبھی مدھم نہیں ہوتا''۔

''دا تم مجھے اکیلا کیوں بھیجنا چاہتی ہو۔ تم خود میرے ساتھ کیوں جانا نہیں چاہتیں؟ میں تمہارے بنا بھلا کہاں جاؤں گا؟''

''میرے بیٹے'' اس نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ سر پر رکھ کر مجھے کہا تھا ''تمہیں ہر چیز کے لیے اپنے کو تیار کرنا ہوگا، بیٹے تمہاری زندگی بہت کٹھن ہوگی، بچے، بہت ہی کٹھن!'' اس کا ہاتھ بالوں میں کانپ رہا تھا۔

''دا تمہارا نچڑا ہوا کمزور ہاتھ کیوں ہے ماں کی طرح کا خوبصورت کیوں نہیں!''

''ابھی تمہیں ان ہاتھوں کی ضرورت ہے ہاں جب تم بڑے ہو جاؤ گے؟''

''ہاں دا جب میں بڑا ہو جاؤں اور اس نیلے گھوڑے پر ہی تو چڑھ سکوں گا۔ بتاؤ نا مجھے نیلے گھوڑے پر کب چڑھنے دو گی؟''

''جب تم بدلہ لے سکو گے اپنے باپ کی موت کا بدلہ''۔ اس کی آواز بمشکل سنی جا سکتی تھی۔ تمہیں اپنے چاچا سے، آفتاب سے ماہتاب سے بدلہ لینا ہے، بیٹے انہوں نے تمہارے جواں باپ کو یوں مسل دیا جیسے وہ کوئی چیونٹی ہو۔ انہوں نے ذرا ترس نہیں کھایا''۔ سن سن کر کے خون میری رگوں میں دوڑنے لگا۔ کان جلنے لگے اور سر گھوم گیا۔

''ماں تم نے آج سے پہلے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟''

آج سے پہلے اور اب بھی وقت کہاں ہے بیٹے؟ مگر مجھے قول دو کہ تم بدلہ لو گے تم۔'' ''تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''ضروری نہیں کہ سب تمہیں سمجھ آئے، ساری باتیں کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کرتیں۔ مگر راستے انہیں اندھیروں سے گزرتے ہیں''۔ اگنی دا نے اٹھ کر دیا بجھا دیا۔ ''اندھیرے میں مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے''۔ میں نے منت سے اسے کہا۔ مجھے لگا جیسے باہر کی ساری آوازیں تھم گئی ہوں۔

''مجھے قول دو اس اندھیرے کی طرح کی بے یقینی سے مجھے اور اپنے کو نکالو گے۔ تم عزت کا پھول لے کر دن کی روشنی میں نکلو گے''۔ اس کی آواز مضبوط تھی اور سخت کوڑے کی طرح مجھے لگ رہی تھی۔

پھر ہولے ہولے باہر کی ساری آوازیں تھم گئیں میرے اندر صرف پیاس تھی اور کوئی مجھے سینے سے لگائے تھا۔

دیا جلا کر اگنی دا نے ہمیں دیکھا۔ میں ماں کو دیوانہ وار چوم رہا تھا یہ میری ماں تھی۔ آفتاب مہتاب کی نہیں میری ماں۔ میں اس ایک گھڑی کے بدلے لاکھوں اگنی دا قربان کر سکتا تھا۔ ماں کے آنسو میرے بالوں میرے ہونٹوں پر گر رہے تھے اور میرا جی چاہتا تھا میں اس کے سینے میں سما جاؤں۔

ماں نے اٹھتے ہوئے کہا "اگنی کیا تم مجھے کبھی معاف نہیں کرسکتیں میں اس کی ماں ہوں!"

اگنی دا نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بہو تمہیں مجھ سے شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے تم اس کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے چاچا کی سہاگن بھی تو ہو، آفتاب اور مہتاب کی ماں ہو، یہاں کے حاکم کی بیوی ہو، میرا کیا منہ ہے کہ میں تمہیں معاف کرسکوں۔ میں ایک ادنیٰ باندی ہوں مگر اس کے باپ نے میرا دودھ پیا تھا وہ اسی طرح مجھے پیارا تھا جس طرح تمہیں تمہارے بیٹے ہیں۔ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اور اس کی رگوں میں اس کا خون ہے بہو۔ خون خون کے لیے جاگے گا بہو!"

ماں کھڑی تھی، وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور بین کرنے لگی۔

"اگنی دوسری بار مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنا سہاگ لٹا سکوں!"

دا نے بہت ہولے سے کہا "میرے بیٹے نے تمہارا کیا لیا تھا، تمہیں کونسا دکھ پہنچایا تھا، اور جب اس کی یاد کا دامن بھی میلا نہیں ہوا تھا تو تم نے دوسرے سہاگ کی خوشیاں کیں۔ تم نے کیسے پور پور سنگار کیا تھا جیسے پہلی بار سہاگن بننے جا رہی تھیں"۔

ماں نے کہا "اگنی میں تمہارے پاؤں پکڑتی ہوں میرے بیٹے کو وہ سب نہیں بتاؤ جو اسے معلوم نہیں!"

اگنی دا نے بہت نفرت سے کہا "کیا تم سمجھتی ہو یہ سدا بچہ ہی رہے گا وہ جوان ہو کر ان اونچی نیچی جگہوں میں گھومنا نہیں چاہے گا اور یہ گلیاں اس سے کچھ نہیں کہیں گی اور پھر تمہارا سہاگ جو اس کے خون کا پیاسا ہے؟ یہ یہاں کیا بن کر رہ سکے گا بہو۔ اسے جانا ہے بہو"۔ وہ چپ ہوگئی جیسے سانس ٹھیک کرنے کو رکی ہو۔

ماں کا سر اس کے گھٹنوں پر رکھا تھا اور بالوں کی سیاہی میں دیئے کی لو سے شعلے سے پروئے لگتے تھے اور اس کی لمبی چوٹی تاروں سے گندھی لگتی تھی دیئے کی لو کی اوٹ سے پرے اگنی دا تھی۔ اس کا سفید سر اور بھی جھک گیا تھا۔ وہ کانپ رہی تھی جیسے تیز ہوا کی لہروں پر بہتا کوئی تنہا زرد پتا ہو۔

اگنی دا نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا "بہو عزت کی کتاب کا سبق اسے بھی پڑھنے دو۔ اگر تمہارے نصیب میں یہی بدا ہے تو اسے کون مٹا سکتا ہے میں جو ایک باندی ہوں اس سے دغا نہیں کرسکتی تم تو اس کی ماں ہو"۔

ماں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر چہرے پر سکون تھا۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "دا ٹھیک کہتی ہے بیٹے جو عزت کی راہ ہے اس پر چلو، چاہے اس راہ پر کوئی بھی آئے اس کی پروا نہ کرو۔ میں ماں ہو کر تم سے دھوکہ کیسے کرسکتی ہوں؟"

اور آج بھی وہ مجھے دکھائی دیتی ہے میری یادوں کے پردے پر وہ اسی طرح ابھرتی ہے آنسوؤں سے بھری آنکھیں جیسے پانی کی جھیلیں ہوں۔ چہرے کے مقابلے میں بالوں کی کالی گھٹا سے بھی گہری سیاہی اور جوش سے سفیدی میں جھلکتی ہوئی جو چہرے کو پھولوں کے رنگ کا بنائے دیتی ہے۔

اسکول جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ میں اور احسن ٹیلوں کے پرے اپنے سیاہ گھوڑے کو خوب تیز دوڑاتے ٹیلوں میں آنکھ مچولی کھیلتے۔ صحرا اپنی ساری وسعتوں سمیت ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہوتا۔ چرواہوں کی بانسریوں کی صدائیں اور جانوروں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں مجھے سپنوں میں سنی آوازوں کی طرح جان پڑتیں۔ لانے اور پھوگ، جنڈی اور لائی کی جھاڑیوں میں مدھری خوشبو اور پھر بسیرا کرتی کاونتیوں اور چڑیوں کے شور سے ٹیلے آباد ہوتے۔ ہم دونوں اس بھول بھلیاں میں گم ہو جاتے۔ کبھی ڈاہر پر گھوڑوں کو دوڑاتے چلے جاتے۔ میرا سانس رکنے لگتا۔ زمین گھوڑوں کے سموں کے نیچے لوہے کی طرح بجتی اور ان کی دمیں ہوا میں یوں اٹھی ہوئی ہوتیں جیسے وہ کسی سانچے میں ڈھلے کھلونے ہوں۔ پھر ہم دونوں خاموش ہو کر چلنے لگتے اور سورج

ہمارے سامنے غروب ہونے لگتا۔ بادلوں میں آگ لگتی اور ریت کے ذرے اس سرخ رنگ میں نہا جاتے، جھاڑیاں سرخ روشنی سے بھر جاتیں اور پرندے بسیرا کرنے کے لیے تیز تیز پر مارتے اپنے ٹھکانوں کو لوٹتے۔ پھر ہولے ہولے ہوا گھلنے لگتی۔ بادل اتنے سرخ ہو جاتے تھرتھراتے سیال کی طرح جیسے آگ پر تپائے جا رہے ہوں، شعلہ رنگ مرغولے سے اڑتے اور سب کچھ خون میں نہا جاتا اور سورج کے سفید تھال میں آگ لگ جاتی۔ ریت کے پہاڑ اور ٹیلے دھوئیں کی سیاہی میں ڈوبنے لگتے۔ کالی رات کے دھواں دھواں دامن دن کو ڈھانپنے بڑھتے اور خاموشی کی لہریں سی پھیلتی جاتیں۔

دیئے کی لو میں کتابوں کے ورق پلٹتے دیکھ کر دا کہتی "جانے ان کتابوں میں وہ سب لکھا ہے کہ نہیں جو میرا جی چاہتا ہے تم سیکھو"۔

"تمہیں تو کبھی پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ کتابوں میں کیا لکھا ہے!" میرا سر غرور سے تن جاتا۔ "ہیرا پھول کی کہانی تو ان میں ہوگی؟" وہ کتابوں کے صفحے بڑی آس سے الٹتی پلٹتی۔ "تم تسلی رکھو دا گھوڑے پر چڑھنا، نشانہ لگانا، یہ سب تو مجھے آ ہی گیا ہے، کسی دن جب میں چاچا کے برابر اونچا ہو جاؤں گا تو دیکھنا میں ہیرا پھول لے کر گھر پلٹوں گا" اور اگنی دا ٹھنڈا سانس بھر کر کہتی "کیا ہی اچھا ہوتا اگر پھول لانا اتنا آسان ہوتا!"

سردی گھوم گرج کر پڑ رہی تھی جب مجھے اسکول بھیجا گیا۔ اس رات دا دیر تک مجھے کچھ سمجھاتی رہی مگر میں بستر میں دبکا لیٹا تھا اور چوکھیا دیئے کو دیکھ رہا تھا جس کی لو کبھی بڑھتی اور کبھی درزوں سے اندر آنے والی ہوا کے رخ پر جھک جاتی تھی جو باہر برگد کی شاخوں میں شور مچاتی بڑے زوروں میں تھی جیسے کوئی منہ زور گھوڑا ہو۔ جھنگھاڑتی ہوئی وہ اپنا سر دروازوں سے دے مارتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا اگنی دا کی کہانیوں کے سارے دیو آزاد ہو کر گھوم رہے ہیں۔

ہجوم میں مل کر چلنے میں مزہ بھی آتا ہے مگر آدمی اکیلا ہی ہوتا ہے اپنے اندر کے وسیلوں کے سہارے صحرا میں گھومنے والے خانہ بدوش کی طرح راہوں کی تلاش میں اور اپنے بچاؤ میں لگا رہا اور اسی لیے جب بورڈنگ اسکول میں بھیج دیا گیا ہوں تو میں نے ضد نہیں کی اور رو رو کر میڈم کو پریشان نہیں کیا اور اگلے دن راؤنڈ پر آنے والے سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا "تم اداس تو نہیں ہو" تو میں نے کہا تھا "میں ٹھیک ہوں بالکل"۔

میں نے اپنے طرز عمل سے انہیں خاصا مایوس کیا۔

کبھی کبھار گھر سے کوئی ملنے آتا تو ہم ملاقات کے کمرے میں بیٹھے اپنے سامنے تکتے رہتے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا "ماں کیسی ہے؟" مگر پھر اندر سے مجھے کوئی روکتا۔ وہ آفتاب اور مہتاب کی ماں تھیں بھلا میں اس کی خیریت کیوں پوچھتا؟

پہلی ٹرم کے ختم ہونے پر مجھے کوئی لینے نہیں آیا۔

خالی کمروں میں ہوا سائیں سائیں کرتی رہی۔ برطانوی وضع کی اس پرانی عمارت میں جس کا سنگ بنیاد ڈیڑھ صدی پہلے رکھا گیا تھا لڑکوں کو انتہائی شان و شوکت سے رہنے کی تربیت دی جاتی۔ انہیں دنیاداری کے سب طریقوں کے ساتھ انگریزی کا صحیح تلفظ اور مکمل لہجہ سکھایا جاتا۔ استاد تیرنا سکھاتے ہوئے انگریزی بولتے۔ میڈم انگریزی میں صبح بخیر کہتی۔ چپڑاسی سے لے کر پرنسپل تک سب اسی زبان میں بات کرتے۔ خاص لباس پہن کر گھوڑوں پر سواری کی جاتی۔ شہر کے ان ہنگاموں میں بھلا گھوڑے کب بھاگ سکتے ہیں اور میں کہتا بیکار ہی یہاں بھجوایا گیا ہوں۔ یہاں وہ جوش اور گرمی کہاں تھی جو خون کو رگوں میں چلنے کی حد تک گرم کر دے۔

دا کی کہانیوں میں تو ہیرا پھول کسی اور دیس میں، کسی اور کونے میں کھلتا تھا۔ کتنی ہی وادیوں، آگ کے سمندروں اور جنگلوں کے پار ایک ویران سے اجاڑ باغ کے کسی تنہا چھپے ہوئے کونے میں ٹہنی پر اکیلا پھول تھا۔۔۔۔۔۔ اور میں یہاں تھا۔ اور پھر

دا کی کہانیاں میرے ذہن میں عجیب طرح گڈمڈ ہو جاتیں۔ کبھی راتوں کو میرے سارے بادشاہ اور پیادے مل کر بھاگ کھڑے ہوتے اور بساط خالی رہ جاتی۔ میں یہ تماشا دیکھتا مگر کچھ کر نہ سکتا۔ پھر دا کی آواز اندھیرے کے پار سے سنائی دیتی۔

"پتہ نہیں تمھیں کیوں پتہ نہیں چلتا جب میں شہہ کہوں تو اس کا مطلب ہے تمہارا بادشاہ زد میں ہے اور تمھیں اس کی فکر کرنا چاہیے"۔

پھر ماں کی صورت دکھائی دیتی، جو خوابوں کے اجالوں میں نکھری نکھری اور اپنی لگتی، مگر میں اور میڈم کینوس پر سیاہ گھوڑوں، نیلے گھوڑوں، بھاگتے گھوڑوں کی تصویریں بناتے رہتے اور سڑک پر سے موٹریں گذرتی رہتیں۔ درختوں میں کوئلیں کوہو کو ہو بولتیں اور آم کے درختوں تلے نظر نہ آنے والی خوشبوئیں ڈولتیں۔ میری منزل ابھی دور تھی اور راستے پر کوئی دیا بھی تو نہ تھا۔ جانے میری منزل کہاں تھی، ہیرا پھول کون سے دیس میں اگتا تھا۔

☆☆☆

بیک لین

جوگندر پال

لال پگڑی والے نے مجھے روک لیا ہے۔

کہاں جا رہے ہو؟

میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کیا بتاؤں۔

جاؤ، خبردار، جو ادھر ادھر آنکھ اٹھائی۔ ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ۔

چلو، چھٹی ہوئی۔ یہ لوگ نا معلوم کیوں مجھے روک روک کر خبردار کرتے رہتے ہیں۔ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ ہمیشہ اپنی ناک کی سیدھ میں چلتا ہوں۔ کوئی کسی طرف بھی منہ کرے۔ چلنا تو اسے اسی طرف ہوتا ہے جدھر اس کی ناک منہ کئے ہو۔ موٹی سی بات ہے پر غریب بے چارہ بولے تو کیا بولے؟ میں سر ہلا ہلا کر گویا لال پگڑی والے کو بار بار سلام کرتے ہوئے ناک کی سیدھ میں چل رہا ہوں اور شرمندہ ہوں کہ کچھ نہ کرنے پر بھی پکڑا گیا ہوں۔

ٹھہرو۔

اس کی آواز پر میرے پیر چلتے چلتے میری مرضی یا نا مرضی کے بغیر ایک دم ٹھہر گئے ہیں۔ میں ہوں کیا، جو اپنی مرضی سے رکوں یا چلوں؟

اس نے تیزی سے میرے قریب آ کر پوچھا ہے۔ اس جھولے میں کیا ہے؟

میں اپنے کام پر نکلتا ہوں تو چادر کا جھولا بنا کر دائیں کندھے سے لٹکا لیتا ہوں۔

بولو۔

میں نے گھبرا کر جھولے کو پیٹھ کی طرف پھیر لیا ہے۔ اتنا پردہ تو بنا ہی رہنا چاہیے کہ دل پھوٹ پھوٹ کر کھال کے باہر نہ آنے لگے۔

بولتے کیوں نہیں؟ جھولے میں کیا چھپا رکھا ہے؟

لال پگڑی والے نے جھپٹ کر جھولے کو تیز تیز ٹٹولا ہے اور پھر منہ لٹکا کر گویا ہوا ہے، یہ تو خالی ہے۔

اس کا منہ غصے سے پھول کر پھٹا پرانا فٹبال سا بنا ہوا ہے، منو کباڑیے کے پاس لے جاؤں تو اس حالت میں بھی چونی دے ہی دے گا۔ خوف زدہ ہونے کے باوجود میں شاید مسکرا دیا ہوں۔

ہنس کیوں رہے ہو، مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟

میں نے ''نہیں'' کہنے کے لیے بڑے ادب سے سر ہلایا ہے مگر کسی بے وقوف کو جھوٹ موٹ یقین دلایا جائے کہ وہ بے وقوف نہیں تو اسے اپنی بے وقوفی پر اور غصہ آنے لگتا ہے۔

تم بدمعاشوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ خالی جھولا لٹکائے موقع کی تاک میں گھومتے پھرتے ہو۔

یہ بات اس کی جھوٹی نہیں مگر سبھی لوگ یہی تو کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے دل میں جھولا لٹکائے اسی تاک میں مارے مارے پھرتے رہتا ہے، کیا معلوم کب کیا ہاتھ آ جائے؟

بھاگ جاؤ، ورنہ خون پی جاؤں گا۔

میں یہ سوچتے ہوئے آگے ہولیا ہوں کہ ہزار غصے کے باوجود جنگلی جانور بھی پئیں تو پانی ہی پیتے ہیں۔ پھر آدمی کیوں اپنا پارہ چڑھتے ہی آدمی کے لہو کا پیاسا ہو جاتا ہے؟۔۔۔آج سویرے کی بات ہے کہ کھانے کے لیے روٹی کی پوٹلی کھول کر میں نے جو ذرا پیٹھ موڑی تو فقیرے نے روٹی پر جھپٹا مار کر اسے منہ میں لے لیا اور بھاگ نکلا۔۔۔فقیرا میرا کتا ہے جو میری غیر حاضری میں میری جھونپڑی کی رکھوالی کرتا ہے۔۔۔اس کے پیچھے میں نے گالیوں کی پوری فوج چھوڑ دی مگر وہ سب سے بچ کر صاف نکل گیا۔ بتانے میں یہ جا رہا ہوں کہ فقیرے کو گالیاں بکتے ہوئے میری زبان دانتوں میں آ کر کٹ گئی اور لہولہان ہو گئی اور۔۔۔ پتہ نہیں بھوک لگی ہوئی تھی یا کیا؟ لہو کا ذائقہ مجھے بڑا اچھا لگا اور میں کافی دیر انجانے میں اپنا لہو بڑے مزے سے حلق سے اتارتا رہا۔ اپنی خوراک کا بندوبست اگر اپنے ہی بدن سے ہوتا رہے تو سارے جھنجھٹ سے چھٹکارا ہو جائے۔۔۔

اپنے خیال کی رو میں، میں یہاں کوٹھیوں کے آگے سڑک پر آ گیا ہوں، میرا یہاں کیا کام ہے؟ سڑک کی دونوں طرف پالش کیے ہوئے پتھر کی خوبصورت کوٹھیاں ہیں اور ان کے آگے چار ایک فٹ کے باہری دیواروں تک پتھر ہی کے فرش پر باغیچے لگے ہوئے ہیں جن کے رنگ برنگے پھولوں نے دیواروں سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا ہے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کر کے ہنسنے لگے ہیں۔

میں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا ہے۔

میرے پیروں کے نیچے سڑک اتنی صاف ہے کہ اس پر چلتے ہوئے اپنا بدن مجھے دھبہ سا لگا ہے۔ ہاں، اتنے صاف ستھرے آس پاس میں میرا کیا کام؟ ایک میں ہی میں یہاں اس قدر گندا معلوم ہو رہا ہوں مانو کسی کوٹھی والے نے اپنا کوڑا کرکٹ کوٹھی کی پچھلی گلی کی بجائے آگے کی طرف پھینک دیا ہو۔ منو کباڑیے سے میں نے کئی بار کہا ہے، کباڑ کم ہے تو مجھے بھی اس میں ڈال کر لے لو، پر دام پورے دو، مگر منو مجھے صاف جواب دیتا ہے، دام تو چیز کے ہوتے ہیں، تم کس کام کے؟ سو میں ان کوٹھیوں کی پچھلی گلیوں میں ان کے ڈھیروں گند میں سے اس کے کام کی چیزیں چن چن کر اپنا جھولا بھرتا رہتا ہوں۔

میں پچھلی گلی میں داخل ہونے کے لیے مڑ گیا ہوں اور وہاں پہنچ کر نتھنوں میں مانوس بو باس گھستے ہی مجھ میں دم پیدا ہونے لگا ہے۔ ان جانی پہچانی بوؤں کے دھکم دھکا میں میرا جی چاہتا ہے کہ بے اختیار ہنستا چلا جاؤں۔ پچھلے ہفتے اسی کیفیت میں میری ہنسی تھمنے میں نہ آ رہی تھی کہ ایک مرغ وہاں، وہی ہے۔ وہ مرغ اپنی مرغی کے پیچھے بھاگتے ہوئے اچانک اچھل کر میرے کندھے پر آ بیٹھا اور سانس کے سارے در کھول کر بانگ دینے لگا۔ اور مجھے لگا کہ اس پھڑ پھڑاتی بانگ کے پروں تلے میں انڈے کا انڈا اپنے آپ پھوٹ گیا ہوں اور اندھیرے سے باہر آ کر اجالے کی جل تھل میں نہانے لگا ہوں۔

بابو کتا بھی میرے پیچھے پیچھے گلی میں آ پہنچا ہے۔ بابو کو اس کا نام میرا ہی دیا ہوا ہے اور کچھ دینے کو میرے پاس ہے ہی کیا؟ یہاں کے نوکروں اور کتوں کو بابو کہہ کے بلاتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ایک بار چار نمبر والوں کے نوکر کا منہ اپنے گھر والوں کی گالیاں کھا کھا کے پھولا ہوا تھا کہ میں نے بڑے پیار سے اس سے کہا، دوائی کے دام نہ ہوں بابو، تو بیماری کو ہنسی خوشی جھیلنے سے بھی آدمی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ وہ بے چارہ رونے لگا۔۔۔روؤ نہیں بابو۔۔۔بابو۔۔۔بابو۔۔۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ بابو کتا بھی پاس ہی کھڑا ہے۔ اس نے مجھے اس کا نام اس لونڈے کے حوالے کرتے ہوئے پایا تو غصے میں چھلانگ لگا کر نردوش کی پنڈلی کو اپنے دانتوں میں لے لیا۔ بابو جہاں بھی ہو میرے یہاں پہنچتے ہی بو پا کر دم ہلاتے ہوئے چلا آتا ہے۔

مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر وہ اپنے بند منہ سے غرایا ہے۔

ہاں، ہاں، دیکھ لیا ہے بابو، کہو کیسے ہو؟

میں نے اس کی طرف سر اٹھایا ہے اور اس کے منہ میں ایک سالم ڈبل روٹی دیکھ کر میرا پیٹ خالی ڈھول کی طرح تھئی تھئی

بجنے لگا ہے۔۔۔آؤ۔

میں گلی کے بیچ میں ہی بیٹھ گیا ہوں اور اس نے منہ کھول کر ڈبل روٹی میرے آگے مٹی میں گرادی ہے۔

او بے وقوف، مٹی میں کیوں گرادی ہے؟ کھانے والی چیزوں کو تو آنکھوں میں اٹھار کھتے ہیں۔

میں نے ڈبل روٹی سے مٹی جھاڑ کر آدھی اس کے آگے ڈال دی ہے اور آدھی پر اپنا منہ مارتے ہوئے مجھے یاد آیا ہے کہ آج میں نے چھوٹو کے ہاتھ فقیرے کو روٹی بھیجی تھی۔ بھوکا آدمی ہے اس نے آپ ہی کھالی ہوگی۔ میں ہنسنے لگا ہوں، خالی پیٹ میں ڈبل روٹی اترنے سے یا اپنے اس خیال پر، کہ جسے ہم کتا کہتے ہیں اس کی تو بھوک سے جان نکل رہی ہوتی ہے مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ آدمیوں کی طرح پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو جائے اور اگلی کو ہاتھوں کی طرح باندھ کر ہم سے اپنی اجرت کی بھیک مانگتا رہے۔ میں نے گویا فقیرے کو پیار کرنے کے لیے بابو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا ہے اور اس بے زبان نے بھونک کر مجھ سے پوچھا ہے، اور لاؤں؟

مجھے معلوم ہے کہ باہری سڑک پر جب وہ چڑ چڑا اور بڈھا حلوائی گدی پر بیٹھے اونگھنے لگتا ہے تو بابو موقع پاتے ہی اس کے تھالوں سے کچھ نہ کچھ اچک لیتا ہے۔ بڈھا بے چارہ ہر چیز گنتی سے رکھتا ہوگا مگر اس کے کم پڑ جانے پر اپنے بوڑھے حافظے اور جوان بیٹے کو کوستا ہوگا۔ حرام کی اولاد آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ سارا کام سنبھال لے تو میں کیوں ہڈیوں کو کوٹ کوٹ کر لڈو بناتا رہوں۔ تین چار دن پہلے میری جیب پیسوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے بابو سے کہا، آؤ آج بڈھے کو پیسے دے کر کھاتے ہیں۔ بابو میرے آگے آگے گویا سوٹ بوٹ پہن کر ہولیا اور بڈھے کی دکان پر اس نے بڑی شان سے بھونک لگائی، دو ڈبل روٹیاں دو۔ جلدی!

بابو نے پھر سے پوچھا ہے، بس، یا اور لاؤں؟

نہیں، اتنی ہی بہت ہے، آؤ، اب اپنا کام کریں۔

سب سے پہلے میں کوڑے کے ڈرم کو الٹ دیتا ہوں اور بابو میری سہولت کے لیے پنجے مار کر کوڑے کو خوب پھیلا دیتا ہے اور پھر میں اپنے مطلب کی چیزیں چن کر کوڑا اکٹھا کر کے ویسے ہی ڈرم میں ڈال دیتا ہوں۔

ہر کوٹھی کا ڈرم الٹتے ہیں ان لوگوں کی ساری گندگی میری آنکھوں میں آجاتی ہے۔ خدا بچائے میرا دھندہ ہی یہی ہے۔ مجھے معلوم ہے اوروں کی گندگی کھیارنا اچھا کام نہیں، گند ڈھپا ڈھپا نہ رہے تو روگ ہی پھیلتے ہیں مگر کیا کروں؟ ان کے کوڑے کے ڈھکنے نہ کھولتا رہوں تو بھوکوں مروں۔

آؤ!۔۔۔ میں نے تین نمبر والوں کا ڈرم الٹ کر بابو سے کہا ہے۔ مجھے پہلے ہی سے پتہ ہے کہ اس ڈرم سے ردی کاغذ، شراب کے خالی ادھے اور پوے اور سگریٹ کے بے حساب ٹکڑے نکلیں گے۔ منو کباڑیا کہتا ہے کہ اخبار کا کاغذ لایا کرو۔ کہاں سے لے جاؤں اخبار کا کاغذ؟ گھر والے کو خبروں کی ٹوہ بھی تو ہو۔ اسے تو اتنا بھی علم نہیں کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ پروفیسر صاحب جب رات دن اپنی الم غلم سوچوں سے کورے کاغذ کالے کر کر کے ردی کی ٹوکری بھر رہے ہوتے ہیں تو ساتھ کے کمرے میں ہی ان کی بیوی جوان نوکر کو گرما رہی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے میں خالی بوتلوں کو اٹھا کر جھولے میں ڈالنے لگا ہوں، کیا مجال، کسی بوتل میں شراب کی ایک بوند بھی باقی ہو۔ سالا نوکر بوتل میں رہی سہی کو بھی پانی میں گھول کر غٹ غٹ چڑھا جاتا ہے۔ نہیں تو اتنی بوتلوں میں سے بوند بوند بھی جمع کر لیا کروں تو ہفتے میں ایک بار تو میرا جلسہ ہو ہی جایا کرے۔ ہاں، اس دن مجھے اس ڈرم سے ایک پورا ادھ کھلا ادھا مل گیا تھا۔ انجانے میں پھینک دیا ہوگا ورنہ اس ماں کے یار کے ہتھے چڑھ جاتی تو اسے کیا اپنے باپ کے لیے یہاں ڈال جاتا؟ میں اسی دم کام دھندا چھوڑ کے خوشی سے ہانپتے ہوئے سیدھا اپنی جھونپڑی میں چلا آیا اور خالی پیٹ بوتل خالی کر کے سارا دن اور ساری رات فرش پر اوندھا پڑا رہا۔ فقیرا غصے سے غرا غرا کر میرا بدن کنکناتا رہا مگر نشے میں مجھے یہی لگتا رہا کہ میرے نصیب کھل گئے ہیں اور دودھیا

چام سے لدی ہوئی گھروالی سچ مچ کہیں سے میرے ساتھ بسنے کو آ گئی ہے اور میرے بدن کو چوم چاٹ کر میری جنم جنم کی تھکان چوسے جا رہی ہے۔ دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو فقیرے نے مجھے دل کھول کر سنائیں۔ میں پہلے تو اسے شرمندگی سے سنتا رہا پھر سر اوپر اٹھائے بغیر اس سے کہا، اب چھوڑ دبھی باپ مورے، جو ہو گیا سو ہو گیا۔۔۔ پروفیسر کی ردی سوچوں کا پلندہ باندھتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو بتایا ہے کہ اتنا بوجھل ہو گیا ہے پر منو تو دس پیسے قیمت لگانے پر بھی راضی نہ ہوگا۔ اب میں نے سگریٹ کے ٹکڑوں پر آنکھیں لگالی ہیں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں کہ جب تک انگلیاں نہ جلتی ہوں گی، اپنے اردگرد دھوئیں کے غبار گھیرے کرتا جاتا ہوگا۔ ارے بھئی، کچھ سوچنا ہی ہے تو باہر آ کے سیدھا سیدھا دیکھ کے سوچو، جس کے لیے سوچیں بنی ہوئی ہیں، یہ کیا کہ اپنی سوچوں کے بارے میں ہی سوچتے چلے جاؤ۔ میں نے دو چار سگریٹ کے ذرا بڑے ٹکڑے چن کر جیب میں رکھ لیے ہیں۔ ایک ایک دو دو کش تو نکل ہی آئیں گے۔۔۔ ارے بس۔۔۔ میں نے بابو سے کہا ہے اور ملبے کو واپس ڈرم میں ڈالنے کے لیے اکٹھا کرنے لگا ہوں۔

ابھی تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ میں آپ ہی اپنے دماغ میں بولے جا رہا ہوں، دراصل ہو یہ رہا ہے کہ کوئی مینڈک اگلے گھر کی ڈھکی ہوئی نالی کی سڑانڈ میں پھدکتے ہوئے بے تحاشہ ٹرٹر کیے جا رہا ہے اتنے میں میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سانپ کہیں سے سائیں سائیں وارد ہو کر اس کے پیچھے نالی میں جا گھسا ہے۔

کیوں بھونک رہے ہو بابو؟ مینڈک کو جان پیاری ہے تو جو دیکھتا ہے اسے چپ چاپ دیکھتا رہے۔ دیکھ کر ٹرٹر کیوں کرنے لگتا ہے؟ ایک بات یاد رکھو بابو۔ یہ ساری دیواریں اس لیے حفاظت سے کھڑی ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے سدا چپ رہتی ہیں۔ بولنے لگیں تو اسی دم ڈھے جائیں۔ اچھا، یہ بتاؤ اس گھر کی عورت رات کو اتنی دیر سے کہاں سے آتی ہے؟ جن کے ساتھ آتی ہے ان کی گاڑی ذرا فاصلے پر رکوا لیتی ہے اور بلی کی طرح پنجوں پر چلتی ہوئی پچھواڑے سے اپنے گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔ نہیں، مورکھ، اس کے شوہر کو سب کچھ معلوم ہے۔ وہی تو اس کی غیر حاضری میں بچوں کو سنبھالتا سلاتا ہے۔ جب وہ لوٹتی ہے تو دروازہ کھولتے ہی وہ اس کا وہ ہاتھ اندر کھینچ لیتا ہے جس پر اس کا ہوا لٹک رہا ہوتا ہے۔ اتنی دیر تک راہ تکنے کے بعد اب کہیں بے چارے کی باری آتی ہے کہ بیوی کے ساتھ سوئے۔ نہیں، چپ، ہمیں کیا لینا دینا ہے؟ کلرک آدمی ہے تو کیا؟ کتنی آن بان سے رہتا ہے۔ ہاں، دفتر کی تنخواہ پر تو گزر بسر بھی نہ ہو۔ جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اتنی شاندار کوٹھی میں رہتا ہے اور اپنا سارا کوڑا روز کے روز صاف کر کے باہر پھینک دیتا ہے۔ ہاں، تم ٹھیک ہی کہتے ہو بھائی، اس سے تو اچھا ہے کہ رال۔ ٹپکا ٹپکا کر اوروں کا کوڑا چھوڑتا رہے۔

اس کوٹھی کا ڈرم اکثر خالی ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے پچھواڑے کا بھی آگا صاف دکھانے کے لیے اپنی گندگی آس پاس والوں کے ڈرموں میں ڈال دیتے ہیں۔ میں اس ڈرم کو کھولے بغیر آگے بڑھ جاتا ہوں مگر پھر خیال آتا ہے کہ ایک نظر دیکھ ہی لوں، ڈرم میں بالوں کے ایک سنہری کلپ نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری ہے، شاید سونے کا ہے۔ میں نے تیزی سے اسے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ نہیں تانبے کا ہوگا۔ مجھے سونے کی پہچان ہے، نہ تانبے کی۔ منو کباڑ یہ تو کھرا سونا بھی لے تو تانبے کی دام پر ہی لے۔ میں نے کلپ کو اپنی جیب میں ڈال لیا ہے اور سوچنے لگا ہوں کہ رلدو کی جورو کے بالوں میں اس کی سج دھج کیسے لگے گی۔ اگر سونے کا ہے تو ایک نہیں، دس بار سودا پکا کر کے دوں گا۔ میرے قریب ہی ایک جھونپڑی میں رلدو بھی اپنی جورو سے پیشہ کرواتا ہے۔ مگر اس کی یہ خوبی ہے کہ وہ کھلے کھلے سب کچھ کرتا ہے۔ ارے بھائی۔ ایک دن وہ مجھے بتا رہا تھا، جب مجھے شک ہونے لگا کہ میری عورت کے لچھن ٹھیک نہیں تو میں اسے ویشیا سمجھ کر ہی اس سے پیش آنے لگا۔ کسی دوسری کے پاس جاؤں تو پورا سولے کے بھی اتنا خیال نہ رکھے۔ وہ تو کئی سو دیتی بھی ہے اور میرے پسینے پر خون بھی بہاتی ہے۔ سمجھے؟۔۔۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ہے کہ میں کیا سمجھوں۔ کوئی مل جائے تو سمجھ میں بھی آ جائے۔

یہ دیکھ کر کہ میں اسی نالی کے منہ پر کھڑا ہوں جس میں وہ سانپ داخل ہوا تھا میں ڈر کے مارے اتنا تیز تیز آگے ہولیا ہوں کہ قریب ہی ایک مرغی میری ٹانگوں میں سے پھڑ پھڑا کر میرے آگے نکل گئی ہے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے لگا ہے کہ میں رلدو کی جورو کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔

اگلے ڈرم کا کوڑا ابھر بھر کے نیچے زمین پر بکھرا ہوا ہے۔ ڈرم کو الٹنے سے پہلے میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا ہوں۔ اور ابھی میری آنکھیں زمین پر اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ رہی ہیں کہ اس کوٹھی والوں کی نوکرانی یکلخت دروازے سے نکلی ہے اور میرے سر پر گھر کا فضلہ اس طرح الٹ دیا ہے جیسے کوڑے کے ڈھیر پر ہی کوڑا پھینک رہی ہو۔ میں اس وقت تک سانس روکے ڈھیر کا ڈھیر پڑا رہا ہوں جب تک اس نے واپس اپنے دروازے میں داخل ہو کر اندر سے چٹخنی نہیں چڑھا لی ہے اور پھر بدن جھٹک کر کھڑا ہو گیا ہوں اور ڈرم کو ٹیڑھا کرتے ہوئے بابو کو اشارہ کیا ہے کہ اپنا کام شروع کر دے۔

اس ڈرم کے گھر والے دو بھائی ہیں جو کپڑے کا بیوپار کرتے ہیں۔ بڑا بھائی دولت کے نشے میں کھویا ہوا ہے اور چھوٹا ہے ہی پاگل، بڑا نیچے رہتا ہے اور چھوٹا پہلی چھت پر، اور سب سے اوپری چھت پر ایک کمرہ ہے جس میں ان دونوں کی بوڑھی اور اپاہج ماں رہتی ہے۔ کئی بار بوڑھیا کی رونے کی آواز سن کر میں اپنا کام روک کر سر اٹھائے اوپر دیکھنے لگتا ہوں اور میری نظر آنکھوں سے نکل کر بوڑھیا کے پاس جا پہنچتی ہے۔۔۔ یہ دیکھو، تمہارے لیے گڑ کے چنے لایا ہوں ماں۔ دانت نہیں ہیں تو گڑ ہی چوس لو۔ کھیر؟ کھیر کہاں سے لاؤں ماں؟۔۔۔ ان بھائیوں کے نوکر نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ بوڑھیا ہر وقت کھیر مانگ مانگ کر روتی رہتی ہے اور چپ ہوتی ہے تو آسمان کی طرف سر اٹھا کے اس طرح منہ کھول کر ہلا رہی ہوتی ہے۔ جیسے اوپر سے منہ میں کھیر ٹپک رہی ہو۔ اپنی ماں کو تو یہ بھائی ترسا ترسا کر مار رہے ہیں مگر ان کے ڈرم میں اتنی جھوٹن ہوتی ہے کہ دس لوگوں کا آرام سے پیٹ بھر جائے۔ منو کباڑیا جس دن مٹھی گرم نہیں کرتا اس دن میں یہیں سے اپنے پیٹ کا ایندھن چن لیتا ہوں۔ منہ بنا بنا کر کھانا شروع کرتا ہوں مگر کھاتے ہوئے جو مزہ آنے لگتا ہے تو اس وقت تک بابو کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا جب تک خوب سیر نہ ہو جاؤں۔ دونوں کی بیویاں آپ تو کھٹ مٹھی ہیں ہی، کھانا وہ اپنے سے بھی کھٹ مٹھا بنا لیتی ہیں، اسی لیے دونوں بھائیوں کے پیٹ اتنے پھولے ہوئے ہیں۔ اپنے نوکر بیتا کو انہوں نے نکال دیا ہے۔ وہ مجھے بیڑیوں کے دھوئیں میں ان کی دھواں دھواں باتیں بھی سناتا تھا۔ اچھا ہی ہوا جو وہ چلا گیا ورنہ میں اپنا کام دھندہ چھوڑ کر اس کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔ بڑا بھائی اپنے پگلے بھائی کو اس طرح ڈانٹتا رہتا ہے جیسے اپنے بیٹوں کو، مگر اس کی بیوی کو جہاں تہاں اکیلا پا لیتا ہے تو ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں آتا۔ چھوٹی کے پانچوں کے پانچوں بچے بڑے بھائی کے ہیں۔ بیتا نے مجھے بتایا تھا۔۔۔ لو اور بیڑی پیو!۔۔۔ اور سناؤں؟ بڑی بھی اپنے آدمی سے کم نہیں۔ اس نے اپنے باؤلے دیور کو ایسے رام کر رکھا ہے کہ اس کی سمجھ میں اور کچھ آئے نہ آئے وہ اپنی پیاری بھابی کی بات کو فوراً بھانپ جاتا ہے۔ بڑی کے دونوں چھوٹے بچوں کا منہ ماتھا ہو بہو اپنے باؤلے چچا کا سا ہے۔ اس بالی عمر میں بھی وہ اتنے گمبھیر اور سخت ہیں کہ انہیں دور سے دیکھ کر ہی پگلے کو دو دو باپ نظر آنے لگتے ہیں اور خوف سے اس کا پیشاب نکل جاتا ہے۔

بتیا کو بھائیوں نے اس لیے نکال پھینکا تھا کہ رن بھومی کے تیور دیکھ کر ایک دن اس بے چارے کی کھوپڑی الٹی ہو گئی اور وہ بڑی کو ماں کہنے کے باوجود اسے لوٹ کا مال سمجھ بیٹھا اور اپنے باؤلے مالک کی طرح منہ میں انگوٹھا ڈال کر اس کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔ پر چھوٹی ہو یا بڑی، مال تو بھائیوں کا ہی تھا۔ بیتا کو مار مار کر باہر نکال دیا گیا شریفوں کے گھروں میں غنڈوں کا کیا کام؟ جاؤ۔۔۔ جاؤ، جو یہاں کرنا چاہتے تھے اپنی ماں بہن سے کرو۔

میں ان کی گندگی کو چھوڑ چھوڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ منو کباڑیئے نے مجھے بتایا تھا کہ بڑے دکانداروں کے ڈرم دھیان سے

دیکھا کرو۔ یہ لوگ کالا دھندہ کرتے ہیں اور جب پولیس کے چھاپے کا ڈر ہو تو جان بچانے کے لیے نوٹوں کی گڈیاں بھی کوڑے میں پھینک دیتے ہیں۔ نا معلوم مجھے کیوں یقین سا ہے کہ کبھی نہ کبھی ضرور مجھے یہاں سے نوٹ ہی نوٹ ہاتھ آئیں گے مگر اتنے سارے نوٹوں سے میں کیا کروں گا؟ منو کباڑیے کے پاس لے جاؤں گا؟۔۔۔ وہ تو سارے نوٹوں کی کل قیمت بھی روپے دو روپے سے زیادہ نہیں لگائے گا۔۔۔ اب تو خوش ہو فجو؟ قیمت سے پورے پچیس روپے زیادہ دے رہا ہوں۔

آج مجھے بھائیوں کے یہاں سے کچھ بھی نہیں مل رہا۔ چھوٹی اور بڑی کی ماہواری کی سوکھی کترنیں ان کی جھوٹن میں بھیگ رہی ہیں، یا پھر زردہ کے چند ٹکڑے ہیں جنہیں میں نے صاف کر کے تھیلے میں پھینک لیا ہے، ہر گھر کے ڈرم سے چند ایک ٹھیک ٹھاک ٹکڑے مجھے ضرور مل جاتے ہیں۔ کئی بار تو کوڑی سے بھی اوپر ہو جاتے ہیں۔ میں انہیں بھی منو کو ہی تھما آتا ہوں۔ انہیں صابن سے دھو کر لایا کرو فجو۔ میں تو ایسے ہی لے جاتا ہوں۔ اتنے پیسے بھی نہیں دیتا کہ دیسی صابن کا ایک ٹکڑا ہی مل جائے۔ اپنے سر سے دھوؤں؟ چھوٹی اور بڑی کے بالوں کے گچھوں کو بھی صاف کر کے میں نے جھولے میں ڈال لیا ہے۔ منو بولتا ہے سنہری بال لایا کرو۔ سنہری بال لانے کے لیے ولایت جاؤں؟ جو ملتا ہے وہی لے کر شکر کرتے جاؤ منو بھائی۔ عورتوں کی بدھی بھرشٹ ہوتی جا رہی ہے۔ یہی حالت رہی تو سب کی کھوپڑیاں گنجی ہوا کریں گی۔ پھر سنہری تو کیا، سفید بال بھی دیکھنے میں نہ آئیں گے۔۔۔ اچانک مجھے اوپر سے بھائیوں کی بوڑھیا کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی ہے۔ دونوں بیٹے چوری چوری ایک دوسرے کی بیوی کو لیے پڑے ہوں گے، بوڑھیا کی خبر کون لے؟

میں سوچنے لگا ہوں کہ بوڑھیا اگر اپنے گھر والوں کے لیے کوڑا ہو کر رہ گئی ہے تو اسے ڈھپ سے باہر کوڑے کے ڈرم میں کیوں نہیں ڈال دیتے؟ میں خیال ہی خیال میں بوڑھیا کو پونچھ پانچھ کر اپنی جھونپڑی میں لے آیا ہوں۔۔۔ لو بھائی فقیرے، دیکھو ہم دونوں کی ماں آئی ہے۔ میری جھونپڑی میں رکھا ہی کیا تھا جس پر پہرہ دیتے رہتے تھے؟ گھر تو اب بھرا ہے۔ جب بھر کے اب ماں کی دیکھ ریکھ کیا کرو۔۔۔ لو، ماں، تمہارے لیے یہ گڑ کے چنے لایا ہوں۔۔۔ گڑ کے چنے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور میں فقیرے پر اکثر اس لیے چڑنے لگتا ہوں کہ مجھے گڑ کے چنا کھاتے دیکھ لیتا ہے تو بے اختیار بھونکنے لگتا ہے۔ ارے بھئی، تمہیں اچھے نہیں لگتے مگر مجھے تو کھانے دو۔۔۔ کھاؤ ماں۔ دانت نہیں تو گڑ ہی چوس لو۔ اور لو۔

ماں گڑ کے چنوں کا گڑ چوس رہی ہے اور اس کا ذائقہ میرے خالی منہ میں گھل رہا ہے اور فقیرے میرا مذاق اڑانے کے لیے بھونک رہا ہے۔۔۔ ارے چل ہٹ!۔۔۔ کتے کی ذات، تمہیں کیا پتہ، آدمیوں کا کھانا کیا ہوتا ہے؟ تم کھاؤ، ماں۔ اور دوں؟۔۔۔ نہیں، میرے ماں نہیں ہے، کبھی نہ تھی۔۔۔ میرا باپ؟ ماں ہی نہ تھی تو کس نے اسے گلے لگا کر مجھے پیدا کیا ہوگا؟ کسی ملبے میں سے آپ ہی آپ کلبلاتے ہوئے پھوٹ پڑا ہوں گا۔۔۔ لو ماں اور لو۔۔۔

میں یونہی کوڑا رولے جا رہا ہوں۔ وہاں کچھ ہو تو ملے۔ بڑی ٹھنڈی سانس بھر کے میں گھٹنوں کے سہارے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور ابھی چند ہی قدم چلا ہوں کہ کسی بچے کے رونے کی نحیف سی آواز سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے بڑے دھیان سے اپنے آس پاس دیکھا ہے۔ کوئی بھی تو نہیں۔۔۔ آواز پھر آئی ہے۔ اور ہم دونوں جانور، بابو اور میں۔ ایک دم ایک سمت ہو لیے ہیں اور ایک کھلے ڈرم کے پاس آ کھڑے ہوئے ہیں جس میں کوڑے کی سیج پر ایک نوزائیدہ بچہ اپنی پیٹھ پر لیٹے ننھے منے ہاتھ پیر مار رہا ہے اور اسے دیکھ دیکھ کر مجھے لگا ہے کہ میری چھاتیاں دودھ سے بھر کر پھول گئی ہیں اور میں نے اسے اپنی آنکھوں کی ساری نرمی سے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور سوچنے لگا ہوں کہ کیا سے آ گیا ہے۔ سنگدل اپنی نسلوں کو پیدا ہوتے ہی کوڑے میں ڈال دیتے ہیں!

☆☆☆

موم کی مریم

جیلانی بانو

آج بھی کمرے میں لیٹا میں خیالی ہیولوں سے کھیل رہا تھا۔

اور جب بھی اندھیرا چھا جاتا ہے تم نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو جیسے تم نے تاریکی کی کوکھ سے جنم لیا ہو۔ مجبوراً مجھے جلے ہوئے سگریٹ کے راکھ کی طرح تمہیں بھی ذہن سے جھٹک دینا پڑتا ہے۔

میں نے کبھی تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے، کبھی تمہاری آواز پر نظمیں نہیں لکھیں، کبھی تمہاری یاد میں تارے گننے کا پروگرام نہیں بنایا، پھر میں تمہیں کیوں یاد کیے جاؤں! زندگی میں تم سے اتنی دور رہا کہ کبھی اس رنگ و بو کے سیلاب میں غرق نہ ہو سکا جو تمہارے چاروں طرف پھیلا رہا۔ ہمارے بیچ جھوٹی عقیدت اور مضحکہ خیز احترام کی خلیج حائل رہی۔۔۔ پھر آج تم اپنی آہوں اور سسکیوں سے کون سے جذبے جگانا چاہتی ہو!

مجھے آج صبح ہی عائشہ کے خط سے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے۔ لیکن میں اس موت پر اظہارِ افسوس نہ کر سکا اور نہ جانے کتنے بادل بنا برسے گزر جاتے ہیں۔ کتنے نغمے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنے انسان ایک لمحے کی خوشی ڈھونڈتے مر جاتے ہیں۔ پھر تمہاری موت تو میرے سامنے کئی بار ہو چکی ہے حالانکہ مادی طور پر تم چلتی پھرتی نظر آتی تھیں، بالکل یونہی جیسے آج میرے کمرے میں آ بیٹھی ہو۔

مگر اس وقت میں تمہارے خیالی وجود سے باتیں نہیں کر رہا ہوں کیونکہ جب تمہاری جانی پہچانی سسکیاں تمہارے وجود کا یقین دلا رہی ہوں تو میں اسے واہمہ کیسے سمجھ لوں! تمہارا اور اندھیرے کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے تم جہاں جہاں بھی گئیں چراغ گل ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھیرے میں لیتے گئے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصور نور کا ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ تقدس اور معصومیت کی لکیریں! جن کے اندر مریم کی روح کو محصور کر دیا گیا ہے (عورت کی روح کو کیسے کیسے شکنجوں میں کسا گیا؟) اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح میرے کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا ہے تمہارے آنسوؤں چمک رہے ہیں جیسے کسی برہمن نے دریا کی سطح پر چراغوں کی قطار چن دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اجالے کی امید قائم رکھی ہے۔

ہم مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی عیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے جشن مناتے آئے ہیں۔ تمہارے متعلق لوگوں نے جو کہانیاں مشہور کر رکھی تھیں وہ بالکل سطحی تھیں اسی لیے میں نے حقیقت کی روشنی میں آکر تمہیں سمجھنا چاہا۔ تم کیا تھیں؟ اماوس کی رات کو ٹوٹنے والا ایک ستارہ جو اپنی آخری جھلک سے بہت دلوں میں امید کی ایک کرن جگا کر غائب ہو جائے۔ ایک تند لہر جو اپنے زعم میں ساحل کے پرخچے اڑانے کے ساتھ خود بھی مٹ گئی ہو۔

آج جب تم اپنے گناہوں کی لمبی فہرست سمیت خود ہی میرے کمرے میں آ گئی ہو، مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تم ایک عام لڑکی ہونے کے باوجود دوسروں سے کس قدر مختلف تھیں۔ تم ایک مسحور کرنے والا جادو بن گئیں جو کتنے ہی خریداروں کو کھینچ لایا، مگر سونگھا ہوا پھول سمجھ کر سب واپس چلے گئے۔

دوکان دار کے نزدیک وہ چیز کتنی حقیر ہو جاتی ہے جسے گاہک الٹ پلٹ کر پھر دوکان میں رکھ دے۔

شیشے کے کیس میں بند رہنے والی گڑیا۔۔۔ آج تم اتنی صاف صاف باتیں سن کر حیران کیوں ہو رہی ہو جبکہ تم نے آس

پاس کے شیش محل چکنا چور کر ڈالے تھے اور سماج کی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار تم سب لڑکیوں کو آنگن میں دھما چوکڑی مچاتے دیکھ کر امی نے کہا تھا۔

''اونہہ مت روکو نگوڑی ماریوں کو۔۔۔ کنواری لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں کون جانے کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہوگا''۔

اس وقت اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے تمہاری زندگی کی پوری فلم دیکھ ڈالی۔

جب تم کسی ناصر، شاہد، کلرک سے بیاہ رچا کر آنسو پونچھتی ڈولے میں سوار ہو کر چلی جاؤ گی۔ ہر سال ایک منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور آٹھویں یا دسویں منے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مر جاؤ گی۔۔۔ ہر لڑکی اپنی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے مگر تم نے اپنی انفرادیت سے ایک نیا راستہ ڈھونڈنا چاہا، جس کی سزا میں تم پر موت وزندگی حرام ہوگئی۔

تم منجھلے چچا کی دسویں یا گیارہویں اولاد تھیں اور نامراد لڑکی۔۔۔

''اونہہ لڑکی ہے تو کیا، نصیب اچھے ہوں، لڑکے کون سا فیض پہنچاتے ہیں۔ ماں باپ کی موت پر آنسو بہانے والی تو بیٹی ہی ہوتی ہے''۔

اور اپنی موت کے نوحہ گر کے پیدا ہوتے ہیں کسی نے تمہیں خوش آمدید نہ کہا۔ اپنے آس پاس کے اس ماحول نے تمہیں زیادہ حساس بنا دیا۔ حقارت بھری نظروں نے تمہاری خودداری کو بھڑوں کے چھتے کی طرح چھیڑ دیا اور تم نے کچھ کرنے، کچھ پانے کی قسم کھالی۔ تمہارے متعلق بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ جاہل، بد دماغ، بدصورت اور مغرور جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا۔ لیکن تم ایک ننھی سی چڑیا کی طرح اترا اترا کر کہتیں ''جو میرے پاس ہے وہ راجہ کے محل میں نہیں''۔ اسی انانیت پسندی سے تم ایک ایسا شعر بن گئیں جس کے غالب کے شارحین کی طرح، ہر ایک نے الگ معنی نکالنے چاہے، مگر پھر بھی بہت کم حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکے اور میں نے بہت دور ہو کر بھی سمجھنا چاہا۔۔۔ یہ سچ ہے میں نے دوسرے مردوں کی طرح تمہاری دوشیزگی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔۔۔ کبھی اپنے نزدیک نہیں آیا کہ تمہارے تنفس کی رفتار سے کوئی راز پاسکوں۔۔۔ پھر بھی اس شعر پر میں نے کافی ریسرچ کی، دماغ کی لیبارٹری میں دو سال تک تجربے کیے مگر کچھ نہ سمجھ سکا۔ ایک بار مجھے اپنی جانب جھکتے دیکھ کر تم نے کہا تھا۔

''احمد بھائی میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور یہ نہیں چاہتی کہ کوئلوں کی دلالی میں آپ بھی اپنے ہاتھ کالے کر بیٹھیں''۔

مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو کوئلے کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ پر کالک مل لی تھی، تاکہ ان کے سفید دامن سیاہی سے ملوث نہ ہوں۔۔۔ تم میری بہت عزت کرتی تھیں۔ ایک نوجوان مردگی، جو تمہارے ذرا سے سہارے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ جس نے اٹھارہ سال کی عمر میں تم کو کئی بار فریب دیئے۔ منزل کے قریب لاکر بھٹکا دیا۔ بدنامی کی کوٹھری میں ڈھکیل کر ہر دروازہ بند کر دیا۔ پھر تم نے اپنی رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں اور بیچ چوراہے پر اپنے سب ظاہری لباس نوچ پھینکے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ تم میری عزت کرتی رہیں اور میں تمہیں سمجھنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ جذبات کے انجکشن قطعی بے اثر ہو گئے ورنہ ممکن تھا ایک دن میری خودداری تمہارے قدموں پر پڑی بخشش کی طلب گار ہوتی اور تم اطہر کی طرح مجھے ایک چٹان پر چھوڑ کر کہتیں۔

''میں نے تمہیں پانے کے لیے بہت سی ٹھوکریں کھائیں مگر تمہارے چھونے سے پہلے اتنی بلندی پر پہنچ گئی کہ جب تم وہاں پہنچے تو میں سراب بن چکی تھی''۔

گھبراؤ مت تم نے یہ الفاظ اطہر یا ریاض سے خود نہیں کہے لیکن آج تک تم نے اور کون سی باتیں زبان سے ادا کی

ہیں۔۔۔تم تو اس گونگی کی طرح ہو جسے اپنا مفہوم ہمیشہ عملی طور پر سمجھانا پڑتا ہے۔۔۔بظاہر تم کتنی معمولی سی تھیں۔چھوٹے چھوٹے کاندھوں تک لہراتے ہوئے بال، جن کی باریک باریک آوارہ لٹیں چہرے کے گرد ہالہ بنائے کانپتی رہتیں۔معمولی سا قد۔دبلا پتلا دھان پان سا جسم، جیسے تیز ہوا کے جھونکے بھی تمہیں اڑا کر لے جائیں گے۔جیسے تمہاری جانب ہاتھ بڑھایا تو چھوئی موئی کی طرح کمہلا جاؤ گی۔ایک واہمہ سی۔ادھورا خاکہ۔کتنے ہلکے ہلکے تھے تمہارے خدوخال۔پتلے خمیدہ لب جو ہمیشہ سرد مہری سے بند رہتے۔ ہر چیز کو تجسس سے دیکھنے والی ہمدرد آنکھیں، جو اپنے سارے گناہوں کو آشکارا کرنے کو تیار رہتیں اور اسی خیال سے بات کرتے وقت بار بار بند ہو جاتیں تاکہ ان کی گہرائیوں کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔اور ہر لمحہ بدلنے والا رنگ، جو کبھی شعلہ کی طرح دہکنے لگتا۔کبھی مٹی کی طرح میلا پڑ جاتا۔جب تم بات کرتیں تو تمہارے نقوش بالکل نہ بدلتے کتنی مشکل بات تھی تمہارے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگانا!

اس معمولی سی شکل وصورت ہی نے تو گھر میں تمہیں ایک ناقابل التفات چیز بنا دیا۔اپنی خوبصورت سعادت مند بہنوں کے مقابلے میں تمہاری کوئی قیمت نہ تھی۔

خرید وفروخت کے اس بازار میں صرف اچھی صورت والی لڑکی کے اونچے دام لگتے ہیں۔چچا اور چچی کے لیے یہ خیال سوہان روح تھا۔

مجھے آج سے تین سال پہلے والی جاڑوں کی ایک صبح یاد آ رہی ہے۔تم اس وقت نہا کر آئی تھیں۔نسرین اور عائشہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی سوئٹر کا نمونہ بنا بنا کر ادھیڑ رہی تھیں۔نومبر کی لطیف دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی تھی۔چچی نیچے بیٹھی نئے لحافوں کو نگند رہی تھیں۔اس وقت تمہارے گلابی دوپٹے، بھیگے بال اور نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی شعر یاد نہیں آیا۔کوئی تشبیہ دماغ میں نہیں ابھری۔عائشہ، نسرین، اور فرزانہ کے فروزاں حسن نے تمہارے چراغ کو ٹمٹمانے بھی نہیں دیا۔کتنی کمتر تھیں تم، مغرور اور اپنے حسن کیا اس جمگھٹ میں تمہاری کہانی کتنی پھیکی اور مختصر ہوگی۔

انہیں دنوں مسلسل بے کاری نے مجھے نئی نئی راہوں سے واقف کرایا۔گھر سے بہت دور ایک ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہوا تو عائشہ کے خط سے پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا۔تم لڑکیوں کو خط لکھنے کیلئے بھی تو کوئی بات نہیں ملتی۔

عائشہ کے خط بھی اس کی طرح خاموش اور لیے معصوم ہوتے ہیں۔جن میں ابا کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے، زیوروں کے ڈیزائن اور اسکول کی سہیلیوں کے رومان تک، ہر چیز کا ذکر تفصیل سے ہوتا۔ساتھ ہی مجھے بھی ایسا ہی مزے دار لمبا خط لکھنے کی ہدایت کرتی۔

میری بہن جو نہیں جانتی تھی کہ میں رومانوں، سرگوشیوں اور رنگینیوں سے کتنا دور تھا۔لیکن وہ میری مسلسل خاموشی کے باوجود، ایک ہنگامہ پر گھر کے کمرے میں بیٹھی، بار بار منہ پر جھک آنے والی لٹوں کو پیچھے جھٹک کر لکھتی رہی" آپ نے اور سنا بھائی جان! قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ امجد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو قدسیہ نے خود آ کر کہہ دیا کہ وہ امجد سے بیاہ نہیں کرے گی۔سنا ہے چچا ابا زہر کھانے والے ہیں۔سارے خاندان میں تھو تھو ہو رہی ہے"۔

اس دن بہت دن کے بعد میں جیل کی منحوس کوٹھری میں مسکرا دیا تھا۔اس دلیرانہ جرات پر غائبانہ تمہاری پیٹھ ٹھونکی تھی اور محسوس کیا تھا کہ جس خول میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہیں وہ جگہ جگہ ٹوٹ رہا ہے۔جی چاہا چچا ابا کو ایک زہر کی شیشی فوراً پارسل کر دوں تاکہ وہ صرف ارادہ کر کے ہی نہ رہ جائیں۔تم پھر ایک بار میرے سامنے آ گئی تھیں۔جھنجھلا کر سوئٹر ادھیڑتی ہوئی۔پھر میں اس واقعہ کو بھول گیا۔عائشہ اپنے خطوں میں لکھتی رہی کہ تمہارا اور ریاض کا رومان چل رہا ہے۔اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش مت کرو۔۔۔مجھے معلوم ہے کہ تم نے اس محبت کو کامیاب بنانے کی کتنی کوشش کی۔۔۔لیکن ریاض تمہارے یہاں کا لے پالک تھا۔

تمہارے دستر خوان کے ٹکڑوں پر پلا تھا۔ پھر چچا ابا کو اس محبت کی سن گن ملی تو ریاض کو گھر ہی سے نہیں بلکہ شہر سے نکال دیا گیا۔ اور تم نے بڑے تحمل سے محبت کی اس لاش کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا۔۔۔ لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ مردار کھانے والے گدھ، جو ایسے موقعوں کی تلاش میں پھرتے ہیں اس لاش کو باہر کھینچ لائے۔ جی بھر کے لطف اٹھایا اور چیر پھاڑ کے پھینک دیا۔ تمہاری بیماری کو بڑے معنی پہنائے گئے۔ یعنی یہ سب ریاض کی امانت کو ٹھکانے لگانے کے بہانے ہیں اور تم اپنے بند کمرے میں نہیں پڑی رہتیں بلکہ ریاض کے ساتھ فرار ہو چکی ہو۔

یہ افواہیں میں نے بہت دور بیٹھ کر سنیں اور ہر بات کو یقین کے خانے میں ڈالتا گیا۔ یہ کوئی ناقابل یقین بات بھی تو نہ تھی۔ بقول عائشہ کے تم اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور تم نے ساری دنیا کو ٹھکرا کر اپنی من مانی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔۔۔ پھر تم جیسی محبت کی ماری لڑکیاں اس سے زیادہ اپنی اہمیت کا ثبوت کیا دے سکتی ہیں۔

اس کے بعد جب میں رہا ہو کر گھر آیا تو تم وقت کا اہم موضوع بن چکی تھیں یا عائشہ کے الفاظ میں کچھ کرنے کی دھن میں اپنا رہا سہا وقار بھی کھو چکی تھیں۔

اس دوران میں تم اپنے ماسٹر سے محبت کر چکی تھیں۔ جو تمہیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک سیدھا سادا خطرناک حد تک شریف انسان، جو اپنی مظلومی اور بے چارگی ظاہر کر کے دوسروں سے رحم کی بھیک مانگتا تھا۔

پہلے اس نے تمہیں عزت اور شرافت کے سبق پڑھائے، اپنی بے چارگی اور دکھ کے افسانے سنائے۔ اس کی محبوبہ نے اسے دھوکہ دیا تھا۔ محض غریبی کی وجہ سے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ (یہ محبوباؤں کے دھوکہ دینے کا دکھڑا ابھی کتنا فرسودہ ہو چکا ہے)۔

پھر اس کی پیاسی دنیا میں تم نے اپنی ہمدردی کے چند قطرے برسانا چاہے۔ اپنے اپنے طرز عمل سے اس کا دکھ کم کرنا چاہا۔ اپنے غم کی کہانی بھی اسے سنا ڈالی۔ کورس کی کتابوں کو ایک جانب سمیٹ کر تسکین و تسلی کے سبق پڑھائے جانے لگے۔

تمہارا ماسٹر بیمار ہو گیا اور چچا ابا نے دوسرا ماسٹر رکھنا چاہا تو تم نے انکار کر دیا۔ تم اس ماسٹر سے پڑھنا چاہتی تھیں۔ اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر جانے پر مصر تھیں۔ یہ ساری باتیں گھر کے چھوٹے بچوں تک نے مجھے سنائیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہیں اس ماسٹر سے محبت نہیں صرف ہمدردی تھی۔ یہ انسانیت کا جذبہ ہی ایک رات چپکے سے اٹھا کر تمہیں ماسٹر کے گھر لے گیا اور جب تم دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں تو چچا ابا کے ڈنڈے کی ضرب سے بے ہوش ہو گئیں۔

پھر مہینوں گھر والے تمہارے سائے سے اچھوتوں کی طرح بچتے رہے۔ گھر کی لمبی لمبی ناکوں والی عورتوں نے برادری میں نکلنا چھوڑ دیا۔ چچا ابا نے وقت سے پہلے پینشن لے لی اور تم سارے خاندان پر کلنک کا جھومر بن کر لہرانے لگیں۔

لڑکیوں کو تمہارے قریب بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر تم شان بے نیازی سے رہتی تھیں۔ ''گنگاری گنگا تو کہاں لہرائے؟ میں پاؤں بھی تو ڈبوؤں!''

اور بیچ آنگن میں کھڑے ہو کر تم نے اماں سے کہا ''میرا جو جی چاہے گا کروں گی یا پھر آپ لو مجھے مار ڈالیے''۔

پھر سب نے دوسری بات سے اتفاق کر لیا۔ سب نے تم پر فاتحہ پڑھ ڈالی۔ مگر شمیم ماموں اس فاتحہ میں شریک نہیں ہوئے۔ رفتہ رفتہ دوسرا غم بھی بھولنے لگا۔ کچھ شمیم ماموں کی ناز برداریوں نے اسے مٹا ڈالا۔ وہ تم پر بے حد مہربان تھے۔ عائشہ کہتی تھی ''شمیم ماموں کی عذرا بھی تو قدسیہ کی کلاس فیلو ہے جیسی ان کی بیٹی ویسی قدسیہ۔ پھر وہ کیسے ایک لڑکی کو گھل گھل کر مرتا دیکھیں''۔ شمیم ماموں بڑی مدت سے بیوی بچوں سے قطع تعلق کیے بڑی رنگین زندگی گزار رہے تھے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ ان کی بیوی کبھی اچھی ساری نہ باندھ سکیں۔ (ایک بار عائشہ نے لکھا تھا کہ بہترین ساری باندھنے پر تم انعام لے چکی ہو!) وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کے تمہیں

سیر کرانے جاتے ہیں۔ تمہارے صدقے میں سارا گھر سنیما دیکھتا، پکنک پر جاتا، موٹروں میں گھومتا، تم کوئی اعلیٰ ڈگری لینا چاہتی تھیں اور چچا ابا تمہیں تنہا ہوسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ اس لیے بے چارے شمیم ماموں اپنی وکالت کے بے شمار اہم کام چھوڑ کر بارہ بارہ بجے رات تک فارسی اور اردو شاعروں کا کلام پڑھاتے۔ عشق و تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار کا مطلب تم سے پوچھتے اور ان میں چھپے ہوئے نکتوں کی وضاحت پر جھوم جھوم اٹھتے۔

سب سے ٹھکرائے جانے سے پہلے تم خود ہی کسی سے بات نہ کرتی تھیں۔ دن بھر پلنگ پر اوندھی پڑی نہ جانے کیا کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بات نہ کرتا تو شکایت نہ کرتیں۔ شمیم ماموں سر پر ہاتھ پھیرتے تو منع نہ کرتیں۔ ہاتھ پکڑ کر موٹر میں بٹھا دیتے تو بیٹھ جاتیں۔ ممکن ہے تم سے ان کی ویران زندگی نہ دیکھی گئی ہو اور انسانیت کے تقاضے نے مجبور کیا ہو!

پھر تمہاری یہ روش کتنی تعجب خیز تھی۔ ممانی کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا اور سب کی سوالیہ نظریں تمہارے چہرے پر گڑ گئیں۔

ایک رات جب تم شمیم ماموں سے پڑھ رہی تھیں، کمرے میں کچھ شور سا ہوا اور تم بغیر دوپٹے کے کمرے میں بھاگتی ہوئی آئیں اور پلنگ پر گر کر رونے لگیں۔

پیچھے پیچھے گھر کے سب لوگوں کی لمبی قطار تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے تماشہ دیکھنے لگا۔ چچی نے اپنی دانست میں تمہاری پیٹھ پر بڑے زوردار دھمو کے رسید کیے اور بہت سی مرغابیاں کڑکڑانے لگیں۔ جواب میں سسکیاں روک کے تم نے بڑی مشکل سے کہا ''میں جدھر بھی جاؤں سب مجھی کو برا کہتے ہیں مجھے کیا معلوم کہ وہ اتنا کمینہ۔۔۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ کوئی مرد ماموں نہیں ہوتا صرف کمینہ ہوتا ہے۔ جو عورت سے سب کچھ لینے کے بعد بھی اسے جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے علاوہ کچھ بھی نہیں دے سکتا۔

شمیم ماموں نے سوچا ہوگا کہ اگر ریاض یا ماسٹر تمہیں کوئی امانت نہ دے سکا تو وہ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں، جبکہ وہ کسی رشتہ سے تمہارے ماموں بھی بنے ہوئے تھے۔ پھر تو انکی بیوی نے یہ خبر شہر بھر عام کر دی کہ تم چاہو تو بیوی بچوں والے مردوں کو بھی بہکا دو۔ شمیم ماموں جیسا پرہیز گار انسان تمہیں دیکھ کر بہک گیا۔

کسی میوزیم میں رکھی ہوئی لاکھوں سال پرانی ممی کی طرح تم ایک نمائش کی چیز بن گئیں۔ چھتوں کو پھلانگتی ہوئی یہ بات سارے شہر کا گشت لگا کر تمہارے ماتھے پر چپک گئی۔ عورتیں اور لڑکیاں دور دور سے بچے کولہوں پر ہاتھ ٹکائے ناک پر انگلی رکھے تمہیں دیکھنے کو آتیں۔ مردوں کی محفلوں میں بلند قہقہوں اور فحش گالیوں کے دوران تمہارا نام آ جاتا تو خود بھی اس لٹنے والے باغ میں جانے کو طبیعت مچل اٹھتی۔ اطہر اسی مال غنیمت کی امید میں آیا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی، جو اپنی آوارگی کے سبب حوالات تک ہو آیا تھا۔ متوسط طبقے کا ایک بے کار نوجوان، جسے بیکاری نے متاڈالا تھا اور سب اس سے مایوس ہو گئے تھے۔ متفقہ طور پر یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی اسے بیٹی نہ دے گا۔ باہر کی تفریحوں کے علاوہ وہ کئی بار گھریلو لڑکیوں کو جھانسا دے چکا تھا بلکہ راحت کے متعلق تو یہ مشہور تھا کہ محض اطہر کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کا گھر چھوڑے بیٹھی ہے۔ مگر اتنے سیاہ کارناموں کے باوجود وہ تمہاری جانب سے مایوس نہیں لوٹا۔ ساری دنیا سے دھتکارا ہوا، منہ پھٹ، بے رحم، چیخ چیخ کر باتیں کرنے والا اطہر۔۔۔ جسے ابا روز گھر سے نکال دیتے، امی کوسنے دیتیں اور عائشہ اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ جاتی۔ اگر بہنوں کے بھائی قابل فخر نہ ہوں تو وہ کتنی بدنصیب نظر آتی ہیں۔ خوبصورت کماؤ بھائیوں کے بھروسے پڑی تو وہ نہ جانے کتنی ناکوں کو اپنے سامنے رگڑوا سکتی ہیں۔ عائشہ کی ساری توجہ میری جانب مرکوز ہو گئی تھی۔ میری خشک اور بے ربط زندگی میں لڑکیوں کے لیے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی اپنی اصول پسندی، اور صاف گوئی کی وجہ سے میری شخصیت کو کافی اہمیت حاصل تھی۔

تمہاری بارگہہ میں اطہر کو کیسے شرف نیاز بخشا گیا! یہ بات سب کے لیے حیران کن تھی۔ وہ تو اپنے خوبصورت جسم اور بے باک لہجے سے معمر کے سر کرآتا تھا لیکن تم نے ہمیشہ بیمار دل اور بیمار ذہن تلاش کیے تھے۔

یہاں پر مجھے اپنی پچھلی ریسرچ بے کار معلوم ہوئی اور اسے اٹھا کر پھینکنے سے پہلے میں نے تم سے راہ و رسم بڑھانا چاہی۔ مجھے گھر میں بہت کم رہنے کا اتفاق ہوتا تھا خصوصاً تم سے کبھی بے تکلف بات کرنے کی فرصت نہ ملی۔ اس ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے بہت دور رہے۔ تم مجھ سے ہمیشہ چھپنا چاہتی تھیں، کیوں کہ پہلے دن ہماری ملاقات نے بڑی تلخ فضا پیدا کردی تھی۔

اس دن ہم ناشتے کی میز پر ملے تھے۔ تم شاید میرے متعلق عائشہ سے پہلے ہی سن چکی تھیں اور مجھ تک اپنے کارنامے پہنچانے سے گریز کررہی تھیں۔ احتیاط سے سر پر پلو ڈالے نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھیں جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے آئی ہو۔ عائشہ نے میری طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا تھا ''بھائی جان دیکھئے، یہ ہیں قدسیہ''۔ عائشہ کی طنزیہ نظروں کو تم نے پکڑ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر خشک لہجے میں کہا ''تو احمد بھائی مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟'' اور تم چائے کی پیالی رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

برسات کی ایک شام کو ہلکی ہلکی رم جھم نے موسم بڑا پرکیف بنا دیا تھا۔ حسب عادت دھوئیں سے خیالی ہیولے بنا رہا تھا۔ عائشہ، پروین، چھوٹی بھابی، اور فرزانہ قریب بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں اور کسی فلم پر زوردار بحث ہو رہی تھی۔ ایک ہیرو دو لڑکیوں سے بیک وقت محبت کرتا ہے اور ڈائریکٹر ہر بار اس کی محبت کو سچی بنانے پر مصر ہے۔ عائشہ کے خیال میں یہ محبت کی توہین تھی یا ہیرو کی بوالہوسی۔ تم ان کے قریب بیٹھی، سیاہ ساٹن کے ایک ٹکڑے پر ننھے ننھے آئینے ٹانک رہی تھیں۔ جن کی شعاعوں نے تمہارے چہرے پر مشعلیں جلا دیں تھیں۔ اپنی رائے کو وزنی بنانے کے لیے عائشہ نے مجھ سے پوچھا ''آپ بتایئے بھائی جان، کیا محبت ایک سے زیادہ بار کی جاسکتی ہے؟''

اور میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا ''قدسیہ سے پوچھو''۔ تمہارے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔ چہرے پر جلتی ہوئی مشعلیں بجھ گئیں اور شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

بھابی اور فرزانہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں۔ پروین بات ٹالنے کو گنگنانے لگی اور عائشہ نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے اس خوبصورت شام کا زرلباس نوچ کر پھینک دیا۔ رم جھم شور مچانے والی بوندیں آنسوؤں کے دھارے بن گئیں اور کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

''آج موسم کتنا خوش گوار ہورہا ہے''۔

''ہونہہ''۔

''جی چاہ رہا ہے کہیں باہر گھومنے جائیں''۔

''تو جایئے''۔ تم حسب عادت مختصر جواب دے رہی تھیں۔

''مگر کوئی ساتھ چلنے والا جو نہیں۔ اطہر نے وعدہ کیا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ بہت غیر ذمہ دار اور جھوٹا ہوگیا ہے یہ لڑکا''۔ اطہر کی برائی کرکے میں نے تمہارے چہرے پر کچھ ڈھونڈھنا چاہا، تمہاری آنکھیں کھلی ہوئی کتاب پر تھیں اور ہاتھ ٹیبل کلاتھ کی شکنیں درست کرنے میں مصروف، پھر بڑے طنز کے ساتھ تم نے کہا۔

''اتنے سہانے موسم میں تو وہ کسی بار میں بے ہوش پڑے ہوں گے! آپ لوگ تو انہیں اچھی طرح جانتے ہیں نا''۔ یہ تم

کہہ رہی تھیں۔تم ۔۔۔۔جس کے متعلق مشہور تھا کہ تم سارے خاندان کی عزت جوتے کی نوک پر اچھال کر تم نے اطہر سے شادی کر لی ہے۔سب سے چھپا کر اسے روپے دیتی ہو وہ شراب پی کر آتا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرتی ہو۔اتنے برے انسان پر تمہاری یہ عنایتیں کیوں تھیں۔جبکہ پچھلی زندگی میں کئی نا قابل اعتبار مرد دھوکہ دے چکے تھے۔۔۔۔؟ تمہارے متعلق پھیلی ہوئی بدنامیوں کے درمیان مجھے اپنی رائے بڑی مضحکہ خیز لگی۔اسے میں نے دماغ سے کھرچ دیا۔تم سب کیلئے نا قابل فہم بن گئیں۔بھول بھلیوں کی طرح تمہارے گرد مکر وفریب کے جو جال بچھے ہوئے تھے مجھے ان سے نفرت ہوگئی۔پھر ایک دن بڑا حواس باختہ سا میں تمہارے کمرے میں آیا۔

''میں تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں قدسیہ۔اگر تم اجازت دو تو۔۔۔تو'' اپنی گھبراہٹ پر میں خود متعجب تھا۔اس دن تمہارے چہرے پر میں نے پہلی بار خوف کی پرچھائیاں دیکھیں،جن پر حیرانی غالب تھی۔تم یوں کھڑی ہوگئیں جیسے شمیم ماموں جھپٹنا چاہتے ہوں۔تم نے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کر کہا۔

''آپ بھی مجھے جاننا چاہتے ہیں احمد بھائی! میں آپ کی عزت کرتی ہوں پھر آپ کیوں کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے کرنا چاہتے ہیں''۔اور تم پیچھے دیکھے بغیر باہر بھاگ گئیں تھیں۔

ان دنوں اتفاق سے مجھے تمہارا ایک خط ہاتھ لگا جو تم نے شاید ریاض کو لکھا تھا مگر اسے نہ بھیج سکیں،یا شاید بھیجنے کو لکھا ہی نہ تھا کیونکہ یہ تو تمہاری روح کی پکار تھی۔جسے ریاض جیسا بے وقوف انسان کبھی نہ سن پاتا۔اس کی محبت میں تمہاری برتری اور پرستش کا جذبہ غالب تھا اور تم اسے روح کی بلندی کبھی نہ دے سکتی تھیں۔بھابی کا نھا راشد ناؤ بنوانے کو یہ خط تمہاری اٹیچی سے نکال لایا تھا۔اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لیے میں نے اسے واپس رکھوانا چاہا مگر ایک بار پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔

میری جانب ملامت آمیز نظروں سے نہ دیکھو۔

ان دنوں میں تم پر ریسرچ کر رہا تھا۔بیسویں صدی کا ایک نکما انٹلکچوئل۔

تمہارا یہ خط بہت سی ڈھکی چھپی حقیقتوں کو سامنے لے آیا اور میری رائے پھر ڈگمگانے لگی۔

اس خط میں لکھا تھا کہ تم نے بچپن سے ہر دل میں اپنے لیے نفرت اور حقارت پائی اور کسی نظر میں برتری حاصل کرنے کا یہ جذبہ ہی تمہیں ریاض کی جانب لے گیا۔جو تمہاری طرح سب کی جانب سے دھتکارا ہوا گھر کا دوسرا فرد تھا۔ریاض کی نیازمندی نے اسے گہرا کر دیا اور گھر والوں کی مخالفت نے اسے جنگل میں لگی آگ کی طرح بھڑکا دیا۔پھر تم نے ہر قیمت ادا کر کے اسے پانے کا ارادہ کر لیا،مگر ریاض کے قدم اس دشوار راستے پر لڑکھڑا گئے۔ابا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ گیا۔

خط کے آخر میں تم نے اسے خوب ذلیل کیا تھا۔۔۔بزدل تو سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔مگر ابھی ہماری محبت شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔میری عزت پہلے ہی کون سے جھنڈے پر چڑھی بیٹھی ہے۔۔۔میں تجھے وہ دے ہی نہ سکی جو میری زندگی کا آدرش تھا۔کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی جہاں میرا بھی ہاتھ نہ جاتا۔۔۔اب میری روح اس وسیع سمندر میں ایک تنکے کو تلاش کرتی پھرے گی۔

اب تم اس تنکے کی تلاش میں خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔تم،جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھیں،کسی کی تیز نگاہوں سے سلگ سکتی تھیں،پھر اپنے چاروں طرف لپکنے والے شعلوں میں کیسے کھڑی تھیں۔

دوسرے دن تمہارے سامنے میں نے اطہر کو خوب ڈانٹا!''کل تم مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود کیوں نہیں آئے میں

یہاں انتظار میں بیٹھا رہا اور جناب بقول قدسیہ کے کسی بار میں جمے رہے''۔
اطہر کے قہقہے رک گئے وہ یوں چپ ہوگیا جیسے میں نے اسے پھانسی کا حکم سنایا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ بڑا پشیمان سا میرے پاس آیا۔
اور اس نے میرے متعلق کیا کہا۔ اسے میری عادتوں کی خبر ہے۔ وہ بہت رنجیدہ ہے؟ زندگی میں پہلی بار میں نے اطہر کو شرمندہ دیکھا تھا وہ بھی کسی کی شکایت سننے کو تیار تھا۔ اس سے متاثر ہوسکتا تھا۔
''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ فریب دیتے آئے ہو اور قدسیہ ہمیشہ فریب کھاتی آئی ہے''۔
''آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں بھائی جان؟'' اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔
''قدسیہ کے بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ بڑی بدنصیب لڑکی ہے۔ میں سچ مچ بہت برا ہوں اور قدسیہ کو فریب دے کر بھی نقصان میں رہوں گا''۔
اطہر باہر چلا گیا اور تم ایک بار پھر میرے سامنے نئی گتھیاں لے کر آ گئیں۔ اطہر کون سا راستہ اختیار کر رہا تھا۔ وہ بے رحم انسان جو اپنے مفاد کے آگے کسی پر رحم نہ کرسکتا تھا۔
تم مجھے وہ کسوٹی نظر آئیں جس پر سونا اور پیتل دونوں واضح شکل میں چمک اٹھتے ہیں۔۔۔ دوگنا ہوں کے اتصال سے اتنا پاک جذبہ بھی وجود میں آتا ہے؟ پھر تمہاری کہانی کا باقی حصہ نہ دیکھ سکا۔ میری مصروفیتیں مجھے آندھرا لے گئیں اور وہاں سے مجھے کلکتہ جانا پڑا۔ کلکتہ کی ہنگامہ پرور زندگی اور پر جوش سرگرمیوں نے تمہاری محبت کی نیم مردہ رینگتی ہوئی کہانی بھلا دی اور گھر میں ہونے والے یہ چھوٹے چھوٹے حادثے ذہن کے کسی کونے میں تھک کر سو گئے۔
ایک بار عائشہ نے لکھا کہ اطہر کی مسلسل نافرمانیوں کے سبب ابا نے اسے عاق کر دیا ہے اور وہ گھر سے چلا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ تم اچانک گھر سے غائب ہوگئیں۔ کسی نے مجھے بتایا کہ تم دونوں لکھنو میں رہتے ہو۔ چچا ابا تمہیں واپس بلانے پر تیار نہیں ہیں۔ اس سے آگے کی کہانی مجھے کسی نے نہیں سنائی۔ مگر میں اس بات کا منتظر رہا کہ اب اطہر اپنا الو سیدھا کر کے بمبئی جائے گا جہاں کئی برسوں کے بعد میں تمہیں ایک فلم میں دیکھوں گا! ہیروئن کے پیچھے! ایکسٹراؤں میں کولہے مٹکاتی ہوئی، کوئی آوارہ سا گیت تمہارے لبوں پر ہوگا، جو تمہارے چہرے، پنڈلیوں اور چھاتیوں کی نمائش کرے گا۔ تم جھوٹ کا ایک خول ہوگی۔ سلولائیڈ کی گڑیا، جس کی ہر جنبش دوسروں کے تابع ہوتی ہے۔ تم اپنی خودداری کی لاش پر ناچ رہی ہوگی۔
ایک حد سے زیادہ جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان یوں ہی کھائیوں میں گر کے دم توڑ دیتی ہے۔ مجھے تم دونوں کے نام سے نفرت ہوگئی۔ عائشہ نے ایک بار لکھا بھی کہ قدسیہ نے لکھنو کے کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی ہے۔ اطہر بیمار ہے اور وہ دونوں بڑی تکلیف سے دن گزار رہے ہیں۔ لیکن میں نے سختی سے لکھ دیا کہ اب میں قدسیہ کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اطہر کی یہ تبدیلی جتنی نفرت انگیز تھی اتنی ہی تعجب خیز بھی۔
کسی کی شادی کی خبر سن کر بھی وہ مذاق اڑایا کرتا تھا ''ایک ہی راگ کیسے سنے جاتے ہیں۔ میں تو دو ہی دن میں پاگل ہوجاؤں''۔ پھر اس نے دو سال تک اس راگ کو کیسے سنا؟ امی اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہیں۔ ان کی زندگی کے دونوں پھل کڑوے نکلے۔ میں تو خیر اپنی آزاد زندگی سے انہیں کوئی فیض نہ پہنچا سکتا تھا مگر ابا یہ بھی برداشت نہ کر سکے کہ اطہر کی زندگی اچانک پلٹا کھائے وہ ایک دم شریف بن جائے اور کسی اچھی پوسٹ پر لے لیا جائے۔
پھر امی کے آنسوؤں نے ابا سے کئی خط لکھوائے جن میں اطہر کو خاندانی عزت اور بے شمار دولت کا واسطہ دیا گیا تھا اور

تمہیں اطہر کی محبت کا۔ اور آج عائشہ نے لکھا ہے:

''بھائی جان! آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہیے! کیوں کہ آئندہ کوئی اس کی بات نہ ہوگی جو میں آپ کو سناؤں آج تنہا اطہر بھائی کو ابا گھر لے آئے ہیں قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مر چکی ہے''۔

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا۔

یہ اپنی اپنی قسمت کا قصور ہے۔ ادھر منہ کرو۔ تمہارے چمکتے آنسو کیا کہہ رہے ہیں۔

کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مر گئیں! اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہہ سکیں اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہو سکا۔ اطہر سے بھی نہیں۔ تمہیں اپنی شکست پر آنسو بہانا چاہیے کیوں کہ اطہر کو تم نے وہ تحفہ دے دیا ہے جس کے لیے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چاپ اندھیرے میں کھو گئیں۔ اب تمہاری روندی ہوئی سسکیاں اور جھلملاتے ہوئے آنسو ہی مجھے تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

تم آج پھر گھٹی گھٹی آہوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لیے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو لیکن میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ جلتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر تمہارے خیال کو ذہن سے جھٹک دوں۔

☆☆☆

ہوا بند کیوں ہے؟

حسن منظر

پہلی بار جب پہرے والا سپاہی سلاخوں کے باہر سے گذرا تو احمد کو وہ خیال آیا۔ دوسری دفعہ وہ اسے آواز دینے کو ہوا اور ہونٹ کھول کر رہ گیا۔ اس کے بعد سپاہی نے متواتر کئی پھیرے کئے، لیکن احمد کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ بالآخر جب اس نے آواز دی تو وہ اتنی مدھم تھی کہ جیل کی اس کوٹھری میں بازگشت بھی نہ پیدا کر سکی۔۔۔۔جیسی آواز سوتے میں ڈر جانے کے بعد منہ سے نکلتی ہے، بلکہ کوشش کے باوجود نہیں نکلتی۔

کوٹھری کے باہر بجری کٹی ہوئی سڑک پر کہرا چھایا ہوا تھا۔ دور سے، دور ہوتی ہوئی فل بوٹوں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ اگر کوٹھری کے باہر سائبان نہ ہوتا تو چاند بذات خود نظر آ جاتا۔ لیکن اب صرف اس کی چھایا احاطہء نگاہ میں آتی تھی، اور سڑک پر درختوں کے سائے کے چلنے سے پتہ چلتا تھا کہ آسمان پر بادل بھاگ رہے ہوں گے۔ باوجود کان لگا کر سننے کے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ لوگ ابھی جاگ رہے ہیں یا سو گئے۔

جیل میں لوگوں کو کام ہی کیا ہوتا ہے جو رات گئے تک جاگیں۔ جو باتیں، جو کتھا کہانی سنانی ہوتی ہے وہ بہت پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ قیدی سر شام سو جاتے ہیں۔ سنتری جاگتے ہیں اور اکتائے سے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے وہ محرر جس نے آخری خانہ پری کی تھی ابھی جاگتا ہو اور لیمپ کے پاس سر نیہوڑائے اونگھ اونگھ کر کچھ لکھ رہا ہو۔ لیکن وہ جگہ یہاں سے دور تھی۔ زندگی کی اکیلی پہچان اس وقت کتوں کے بین پر مشتمل تھی۔۔۔۔ جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔

ایک بار پھر سے بھاری بوٹوں کی چرچراہٹ نزدیک آنی شروع ہوئی۔ ایکا ایکی گھپ اندھیرا چھا گیا، اور ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا احمد کے جسم کو چھوتا ہوا گذرا جیسے اندھیرا پڑے قبرستان سے گذرتے ہوئے کسی نے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے جسم کو پیچھے سے آ کر چھو دیا ہو۔ کوئی پل جا رہا ہے کہ بارش شروع ہو جائے گی اور سپاہی اپنی کابک میں جا چھپے گا۔

احمد نے گھبرا کر فیصلہ کر ڈالا۔

اس نے ٹھنڈی سلاخوں میں سے اپنے سر کو باہر نکالتے ہوئے زور سے آواز دی۔

''دیکھو۔ بات سنو!''

دوسرے ہی لمحے اس نے محسوس کیا فاصلہ تھوڑا تھا، اتنی اونچی آواز کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ الفاظ مصنوعی سے تھے۔

سپاہی نے ٹھٹھک کر پوچھا ''کیا ہے؟''

''مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے''۔

''ڈر! تمہیں؟''

''ہوں'' احمد نے سلاخیں پکڑے پکڑے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پھر؟ کیا حکم ہے؟ تاشے باجے بجواؤں؟ تمہاری بھابی کو بلواؤں؟''

احمد نے آخر جملے کو ان سنا کرتے ہوئے پوچھا۔

''باہر کہر ہے نا؟''

''ہونہہ کہر!'' سپاہی نے بندوق دروازے سے تھوڑی ہٹا کر دیوار سے ٹیکتے ہوئے کہا۔''بارش ہونے والی ہے کہ کہر ہے''۔
''مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے''۔
''تو پھر کیا کروں۔ ناچوں؟ گاؤں؟'' سپاہی نے پنڈلیوں پر پھیلے ہوئے رگوں کے جال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ رہا۔ بس اکیلے سے جی گھبراتا ہے''۔
''تو پھر ڈھول ڈھمکا کہاں سے آئے؟'' سپاہی نے کہا۔
''یہ جگہ سب سے الگ تھلگ کیوں ہے؟''
''جیل میرے مشورے سے نہیں بنی تھی۔ جی چاہے تو سپرنٹنڈنٹ صاحب سے پوچھ لینا''۔
''مجھے بارک میں کیوں نہیں لے چلتے؟''
''میں داروغہ ہوں'' سپاہی نے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا۔
احمد زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس خیال سے کہ مبادا وہ کچھ اور کہے۔ سپاہی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔
پھر ڈرتے ڈرتے احمد نے کہا۔
''مجھے یہاں ڈر لگتا ہے''۔
''پھر وہی بات۔ ڈر لگتا تھا تو جیل کیوں آئے؟'' سپاہی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
''تم تھوڑی دیر یہاں ٹھہر جاؤ، مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے''۔
سپاہی نے دور جاتے ہوئے کہا'' مجھے تم سے ڈر لگتا ہے''۔
اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔
ڈیوٹی روم میں محرر نے زور سے چائے کی آخری چسکی لی اور پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔
''وہی لڑکا جس نے اپنی بھابی کو قتل کیا ہے؟۔۔۔۔ چائے کچھ ٹھنڈی تھی آج''۔
''پچھلے سال اسی کوٹھری میں میں نے ایک آدمی کو دہشت سے مرتے ہوئے دیکھا تھا''۔ پہرے کا سپاہی بولا۔''رات کو میں گشت کر رہا تھا، پچھلے پہر چیخنے کی آوازیں آئیں۔ جب ہم بتی لے کر گئے تو وہ اینٹھا ہوا پڑا تھا، ناخن جنگلی کبوتروں کے رنگ کے تھے، اور باچھیں نیچے کو کھنچ گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم میرے سامنے ہوا تھا۔۔۔ سن رہے ہو یا نہیں؟''
''سن رہا ہوں'' محرر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''سوائے اس کے کہ اس کے پیٹ میں کیچوئے بھرے پڑے تھے اور کچھ نہیں ملا۔ کیچوئے بھوک سے بلبلا رہے تھے، کم سے کم ان کے لجلجانے سے تو ایسا ہی دکھائی پڑتا تھا''۔
محرر بڑے عاقلانہ انداز سے بولا'' لوگ کہتے ہیں اندھیرے میں انسان کو اپنا آپ نظر آتا ہے۔ جیسے اندھیرا ایک آئینہ ہو اور اس میں پچھلی تمام برائیاں، سارے گناہ صاف دکھائی دیں۔ دن ہوتا ہے تو دوسرے ہی دوسرے دکھتے ہیں، دوسروں پر غصہ آتا ہے، اپنا آپ غائب ہو جاتا ہے۔ روشنی سے ضمیر چندھیا جاتا ہے۔
عام آدمی ہو سکتا ہے جب اکیلا ہو اور اندھیرے میں تو اس کا دل دہشت سے پھٹ جاتا ہو۔ ان ہتھیاروں کو اپنا آپ نظر آتا ہے لیکن ان کے دل نہیں پھٹتے۔ ورنہ اتنے آدمیوں کو روز پھانسی دے کر نہیں مارنا پڑتا۔ اسے ڈر ور کچھ نہیں لگ رہا ہے، اپنا آپ نظر آ رہا ہوگا، یار تمہارے سگریٹ میں سے ہمیشہ چنبیلی کے تیل کی بو آتی ہے''۔

''اس لڑکے کو اندھیرے میں اپنا آپ نظر آتا ہو یہ بات ٹھیک نہیں ہے''۔ سپاہی نے محرر کے سامنے والی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔''ابھی تو اس کے داڑھی بھی ٹھیک سے نہیں نکلی ہے''۔

''داڑھی کا قتل سے کوئی رشتہ نہیں، جن کے داڑھی ہوتی ہے وہ بھی قتل کرتے ہیں، جن کے نہیں ہوتی وہ بھی''۔ محرر نے معمرانہ انداز سے جواب دیا۔

سپاہی نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا''میرا مطلب عمر سے ہے بھیا۔ تم خود سوچو اس کی عمر کیا ہے۔ سترہ یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ۔ اٹھارہ برس کا تھا تو میں اپنی عورت کو اپنی بیوی کہتے ہوئے شرماتا تھا''۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

سپاہی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں پچھتاوے کی بات کر رہا تھا''۔ محرر نے بے رحمی سے کہا۔''پچھتاوا انہیں ہوتا ہے جن کا دل معصوم ہو!''

''میں بھی پچھتاوے کی بات کر رہا ہوں۔ پچھتاوے کی بھی عمر ہوتی ہے''۔ سپاہی نے چڑ کر کہا۔

''اچھا جاؤ پہرے پر جاؤ''۔ محرر نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور آنکھوں پر پانی کا چھپکا مارنے چلا گیا۔

کمرے سے باہر نکل کر سپاہی نے دیکھا بارش ہو کر تھم چکی ہے اور جیل کی سڑکوں پر کیچڑ کھڑی ہے۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ محرر دن رات اردو کے رسالے پڑھ پڑھ کر اپنے ساتھیوں کے سامنے دور کی لیتا تھا۔ وہ خود شعر کہتا تھا اور اچھا شعر سن کر داد بھی اونچی آواز میں دے سکتا تھا۔ اس وقت سپاہی کو اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ پچھتاوے کے اس بے رحم تجزیئے نے اسے بڑے کٹھور روپ میں اجاگر کر دیا تھا۔

جس کوٹھری میں احمد تھا وہ جگہ سب سے الگ تھلگ تھی۔ اس کوٹھری کی پشت پر وہ نالہ کھلتا تھا جس کے منہ پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ بادل چھٹ گئے تھے اور چاند، پورنماشی کا پورا چاند، بڑی تیز رفتاری سے آسمان میں بھاگ رہا تھا۔ ہوا کے سوا ساری کائنات حرکت میں تھی۔ یہی آخری چیز تھی جسے سوچ کر سپاہی نے احمد کی کوٹھری کی طرف جانے کا ارادہ تقریباً ترک کر دیا۔ ہوا کے نہ ہونے نے!

اسے معلوم تھا اس وقت اگر وہ احمد کی نظر پڑ گیا تو اس کا پہلا سوال ہوگا:

''ہوا کیوں بند ہے؟''

بارش سے نہائی ہوئی سڑک پر چلتے ہوئے سپاہی نے کوٹھریوں کے اندر نگاہیں گڑھو کر دیکھا۔ مُیالے کمبل اوڑھے کچھ قیدی سو رہے تھے۔ کہیں پر گھپ اندھیرے میں بیڑی کا جلتا ہوا سرخ سرا ایک بار نیچے غوطہ کھا کر دوبارہ اوپر لوٹ آیا۔ تب ہی ایک مری مری سی آواز آئی:

''آج ہوا کیوں بند ہے؟'' جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ہو۔

''یہ تو حضرت میکائیل سے پوچھو''۔ سپاہی نے دلچسپی لیتے ہوئے قدرے توقف سے کہا۔

''شاید بارش کی وجہ سے ہوا ٹھہر گئی ہے''۔ احمد نے لجاجت سے کہا۔''بارش ہوئی ہے نا! بارش کے بعد عام طور پر ہوا رک جاتی ہے''۔

''جب تمہیں ہر بات کا جواب خود معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہو۔ لیٹ کر سو رہو۔ میرا وقت کیوں برباد

کرتے ہو؟''

''وقت کیسے برباد کررہا ہوں بھائی؟ مجھے معلوم ہے بارک میں کوئی خطرناک قیدی نہیں ہے۔ دوسری کوٹھریاں تین چار دن سے خالی پڑی ہیں۔ صبح ہی جمعدار سے میں نے پوچھا تھا یہاں کون کون خطرناک قیدی ہیں؟ جو سب سے خطرناک قیدی ہے وہ میں ہوں۔ پھر اگر تھوڑی دیر، چاہے اپنی بندوق ہی لیے، تم میری کوٹھری کے سامنے ٹھہر گئے تو کیا ہوا۔ اس طرح وقت اچھا گذر جاتا ہے''۔

سپاہی نے بوٹ کے تلوے کو لگر سے رگڑتے ہوئے کہا ''وقت تو تمہارا ختم ہی ہو چکا ہے۔ اس کے اچھے یا برے گزرنے کا کیا سوال ہے''۔

پھر اس نے محسوس کیا یہ بات مجرم کے کہنے کی تھی۔ ایک آدمی سے۔۔۔۔ بلکہ ایک لڑکے سے۔۔۔۔ جس کا وقت ختم ہو چکا ہے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ خفت مٹانے کے لیے اس نے دل میں کہا ''توبہ یہاں کی مٹی کتنی چکنی ہے، ایک بار تلے سے چمٹ جائے چھٹنے کا نام نہیں لیتی''۔

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نے کہا ''جب تلے سے کوئی چیز چمٹی ہوئی ہو تو چلنے میں عجیب بے چینی سی رہتی ہے جیسے دانتوں میں کچھ پھنسا رہ جانے پر معلوم ہوتا ہے''۔

''ہاں آدمی بے کل ہو جاتا ہے''۔ سپاہی نے کہا۔

''مجھے یہاں بے حد ڈر لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے جب کوئی آس پاس نہ ہو''۔

''موت کا خیال آتا ہے؟''

احمد خاموش رہا۔

''نہیں'' سپاہی نے دیوار سے بندوق ٹیکتے ہوئے کہا ''بھابی اندھیرے میں سے جھانکنے لگتی ہے؟''

''اوں ہونہہ''

''پچھلے سال جو آدمی یہاں دہشت سے مر گیا تھا کسی نے اس کی کہانی تمہیں سنائی ہے؟''

''نہیں''۔

''پھر لیٹ کر سو رہو۔ نیند آجائے گی''۔

احمد سلاخیں پکڑے پکڑے زمین پر بیٹھ گیا۔ سپاہی نے ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے پوچھا۔

''احمد آخر سچی بات کیا ہے؟ تم نے اپنی بھابی کو قتل کیوں کیا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم''۔ احمد نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

''اصلی بات بغیر کسی سے کہے ہی مر جاؤ گے؟''

''پتہ نہیں'' احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''لوگ کہتے ہیں تمہارے بھائی کو اب بھی تم سے بڑی محبت ہے؟''

احمد خاموش رہا۔

سپاہی نے بیزار ہو کر بندوق اٹھائی اور آگے چل پڑا۔

احمد نے چونک کر کہا ''مجھے بے حد ڈر لگ رہا ہے بھائی، یہاں ہوا بالکل نہیں ہے۔ کھڑکی ہوا کے رخ۔۔۔''

سپاہی نے دور ہوتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تمہارے شیش محل میں نہ روشنی ہے نہ پنکھا"۔
تھوڑی سی دیر اور ٹھہر جاؤ"۔ احمد نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔
"میں جا کر پنکھا کھینچنے والے قلی کو بھیجتا ہوں"۔ دور سے سپاہی کی تمسخر آمیز آواز آئی۔ پھر بجری پر بوٹوں کے چلنے کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔
کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ جیسا قبروں کے اندر ہوتا ہے اور وہ سیلن جو سالہا سال سے بے مکین عمارتوں کا خاصا ہوتی ہے۔
سپاہی کے چلے جانے کے بعد احمد پہلے تو کچھ دیر سلاخوں کو پکڑے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر گھبرا کر اس نے اپنی پشت کی طرف کھڑکی کو دیکھا۔ بہت سے سوال تانیے کو لہروں کی طرح آگے پیچھے اس کے ذہن سے ہو کر گزر گئے جن میں پچھلی رات کا خواب بھی تھا۔
لیکن ایسے اندھیرے میں اس کی نو عمر بھابی نے جس کے پیٹ میں پہلا بچہ تھا اسے آ کر تنگ نہیں کیا۔ موت جو یقینی تھی اس کا وہ دہشت ناک روپ بھی اس کے سامنے نہیں آیا جسے سوچ کر ہی بہت سے پیغمبر اور فاتح روپڑتے تھے۔
وہ کون آدمی تھا جو پچھلے سال دہشت سے یہاں مر گیا تھا؟ احمد ایک کونے میں دبکنے لگا، لیکن سلاخوں والی کھڑکی اور سلاخوں والا دروازہ ایسا لگتا تھا چوپٹ کھلے ہوئے ہیں!
پچھلی رات جھپکی آنے پر اس نے دیکھا تھا اس کے پتھر جیسے سر میں آر پار ایک سوراخ ہے، جس میں سے ایک سانپ باہر کو سر نکالتا ہے۔ احمد نے لکڑی سے جوں ہی سانپ پر وار کیا، سانپ نے اپنا سر اندر کر لیا۔ لکڑی اس کی کنپٹی پر پڑی۔ درد کی تکلیف سے پتھر کے سر نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔
احمد کی آنکھ بھی کھل گئی۔
اس نے ڈرتے ڈرتے گردن لمبی کر کے سلاخوں میں سے باہر جھانکا۔ اور دوبارہ گڑمڑی مار کر بیٹھ گیا۔ اس گھپ اندھیرے میں وحشت تھی۔ اندھیرا نہ قتل کی واردات دوبارہ سنا رہا تھا، نہ پھانسی پانے کے خوف کو اس پر مسلط کر پایا تھا۔ ویسے بھی پھانسی کا جسمانی خوف فی الحال بے معنی تھا، کیوں کہ اس نے کبھی کسی کو پھانسی چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔
کہیں ایک الو اپنی بھدی آواز میں دو تین بار چیخا۔ احمد نے اپنے پورے جسم کو سن ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ یہی اندھیرے کا گم بودگی، بے کلی اور دہشت کا پیغام تھا۔
دھیرے دھیرے کوٹھری میں بھی چاندنی پھیل گئی۔
احمد نے کھڑے ہو کر کھڑکی کی دہلیز پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ایک جلی ہوئی موم بتی کا، سیمنٹ پر پھیلا ہوا موم اور ایک پرانا بلیڈ معلوم نہیں کب کی یہ دو چیزیں وہاں پڑی رہ گئی تھیں۔ کئی بار وہ سونے کے لیے لیٹا اور جوں ہی غنودگی طاری ہونے لگتی آنکھ کھٹکے سے کھل جاتی تھی۔ جیسے کھڑکی کی طرف یہ کوٹھری غیر محفوظ ہے۔ کوئی جھانک رہا ہے۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر وہ دروازے کی سلاخوں تک آیا۔ کتنی ہی بار وہ کھڑکی تک گیا۔۔۔ جس طرح بچے رات کو پلنگ سے نیچے پیر رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور ڈر کے باوجود کبھی کبھی لٹک کر نیچے جھانکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔
صبح جب سپاہیوں نے آ کر اسے دیکھا تو اس کے ہاتھ کھڑکی کی سلاخوں کو مٹھیوں میں بھینچے ہوئے تھے۔ ناخن جنگلی کبوتر کے رنگ کے تھے۔ باچھیں نیچے کو لٹک گئی تھیں، اور اس کا جسم اینٹھا ہوا تھا۔ بے نور آنکھیں کھڑکی کے باہر نالے کی طرف گھور رہی تھیں۔

صبح کے دس بجے احمد کا پوسٹ مارٹم پیر بخش نے کیا جو اس سے پہلے اس کی بھابی کا پوسٹ مارٹم بھی کر چکا تھا۔ اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ لاش پر چاقو چلاتے ہوئے اس کے کان ڈاکٹر اور پولیس کے سپاہی کی گفتگو پر رہتے ہیں۔ ہر پوسٹ مارٹم کا مطلب اس کے نزدیک ایک نئی کہانی ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اگر اس کا بس چلے تو وہ کہانی کے فراق میں پورے شہر کو پوسٹ مارٹم کی میز پر لا لٹائے۔

جیل کے محرر نے کہا ''تعجب ہے اس لڑکے کے پیٹ سے بھی کیچوے نکلے!''

ایک بڑھیا نے جو اپنے کسی رشتے دار سے ملنے آئی تھی کہا۔

''آٹے میں مٹی ملی ہوتی ہے بھیا۔ جب پیٹ میں مٹی ہوگی تو کیچوے آپ ہی رہویں گے''۔

ساڑھے دس بجے ایک لمبا تڑنگا آدمی لاش لینے اکیلا آیا اور بیل گاڑی پر لاش کو لاد کر چلا گیا۔ لاش پر پڑی ہوئی خشک گھاس گاڑی سے دور تک گرتی چلی گئی کیوں کہ ہوا تیز تھی۔

لوگوں نے کہا وہ مرنے والے کا بڑا بھائی تھا جس کی بیوی کو مرنے والے نے قتل کیا تھا۔

گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا اور وہ آدمی بہلی کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔

کہا جاتا ہے، قتل کی وجہ اسے معلوم تھی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں نہیں، صحیح وجہ اسے بھی نہیں معلوم۔

لیکن اس بات کی اہمیت ہی کیا ہے؟

☆☆☆

ماتمِ شہرِ آرزو

حمید اختر

صمد خاں کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی لہرائی۔

انہوں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ وہ پھر سامنے سے گزر رہی تھی ویسی ہی مست خرام، اپنے آس پاس سے بے نیاز، جیسے پوری دنیا کو روندتی ہوئی۔

زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ چکنے والے صمد خاں کی ساری حسیّں بیدار ہو گئیں۔ ایک ٹھنڈی اور بوجھل آہ بھرتے ہوئے انہوں نے خود ہی اپنی حالت زار پر افسوس کیا۔ اپنی بے بسی پر خود کو لعن طعن کرتے ہوئے وہ جسم کے روئیں روئیں میں بجلیاں بھری ہوئی محسوس کر رہے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تیس پینتیس برس پہلے اپنے عنفوان شباب میں کسی حسین چہرے، کسی گدرائے ہوئے جسم، کسی نشیلی چال یا کسی کی مدھ بھری آنکھ کو دیکھ کر تشنج اور نشے کی ملی جلی کیفیت ان پر طاری ہو جایا کرتی تھی۔

مگر وہ تو چڑھتی ہوئی جوانی کے دن تھے۔ یہ آج پچپن برس کی عمر میں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا مگر اس کا جواب ان کے پاس موجود نہیں تھا۔

خان صمد خاں بڑے وجیہہ انسان تھے، سرخ و سفید رنگ، چھریرا بدن، لمبا قد اور تیکھے نقوش کے مالک ہزاروں افراد میں پہچانے جاسکتے تھے۔ ان کی وطن واپسی بیس برس بعد ہوئی تھی۔ یہاں وہ ایک بڑے شہر کے نزدیک واقع قصبے میں چوراہے پر واقع اپنے ایک دوست کے مکان کی بالائی منزل میں رہائش پذیر تھے۔ ان کا یہ دورہ ان کے کام کے سلسلے میں تھا۔ بیس برس سے وہ ایک عالمی ادارے کے ساتھ منسلک تھے جس کا کام تیسری دنیا کے ملکوں کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں کوائف جمع کرنا تھا۔ صمد خان نے تیسری دنیا کے ملکوں میں بڑھتی ہوئی شہری آبادیوں سے پیدا ہونے والے مسائل پر ایک تھیسس لکھا تھا۔ اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جن ملکوں کے مسائل سے متعلق انہوں نے یہ جائزہ تیار کیا ہے انہی میں سے کسی میں جا کر وہ کم از کم تین ماہ قیام کریں اور اس مدت کے خاتمے پر ایک باب کا اضافہ کر کے یہ تھیسس متعلقہ اداروں کے حوالے کریں، چونکہ اس میں دیہات سے شہروں میں منتقل ہونے والے افراد کی روز افزوں تعداد اس طرح پیدا ہونے والے مسائل کا زیادہ ذکر تھا اس لیے انہوں نے اپنے ہی وطن واپس آ کر ایک بڑے شہر کے قریب واقع گاؤں میں تین ماہ کے لیے قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بیس برس قبل وہ جن حالات میں ملک چھوڑ کر گئے تھے ان میں ان کا واپس آنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہ تھا۔ ان کا تعلق ایک چھوٹے موٹے زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کا بچپن گاؤں میں گزرا۔ شہر کے اچھے تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے دوران میں اور اس کے بعد بھی گاؤں سے ان کا تعلق بہت مضبوط رہا۔ مزاجاً اور طبعاً وہ ملک کے دیہی ماحول کا حصہ رہے۔ گاؤں کی کھلی فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں، شیشم اور سوہن کے درختوں، سرکنڈے کی لہلہاتی جھاڑیوں، دھان کی گہری سبز بالیوں، زمستانی ہواؤں میں چاندنی راتوں میں پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیت کو صمد خاں نے شعوری طور پر شاید کبھی اپنی زندگی کا حصہ نہیں مانا تھا، مگر یہ ساری چیزیں ان کے وجود میں رس بس گئی تھیں۔ ایسے رشتے انسان سوچ کر قائم نہیں کرتا، وہ خود بخود قائم ہو جاتے ہیں اور زندگی اور مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جوانی کی سرحدوں میں داخل ہونے کے بعد صمد خاں کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ سحر آگیں فضا گویا مجسم ہو کر زندہ جسموں میں ڈھل گئی تھی۔ انہیں اپنے آس پاس کی ہنستی کھیلتی گاتی گنگناتی جوانیوں نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ عنفوان شباب کی

سرمستی میں وہ برسوں یہ ازلی کھیل کھیلتے رہے۔ یہ اس ماحول اور اس میں پلنے والے حقوق یافتہ طبقے کے متعلق خاندانوں کے لیے معمول کی بات تھی جن کے مردوں کی جھولیوں میں الھڑ جوانیاں ازخود گر جاتی تھیں۔

شادی کے بعد ان کی جولانیوں میں ٹھہراؤ آ گیا۔ ان کی بیوی خوش قامت اور حیرت انگیز تیکھے نقوش کی ایک خوبصورت اور دل لبھانے والی عورت تھی اور وہ اسی فضا کا حصہ تھی جس میں صمد خاں کی تربیت ہوئی تھی۔ عورت کا جو تصور ان کے ذہن میں جوانی کے ابتدائی دنوں میں نقش ہو گیا تھا اور جس سے وہ عمر بھر نجات حاصل نہیں کر سکے ان کی بیوی اسی کا ایک خوبصورت تراشیدہ نمونہ تھی۔ انہوں نے خاندانی روایات کے برعکس بیوی سے عشق کیا اور اس کی مسحور کن شخصیت کے طلسم کے اسیر ہو گئے۔ انہیں اس کے گداز جسم سے سرسوں کے پھولوں، نیشکر اور دھان کے پودوں کی مہک آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ پاس ہوتی تو صمد خاں کے ذہن میں گلاب کھل اٹھتے۔ سرسوں پھول جاتی، شیشم کی ٹہنیاں جھک جاتیں اور ساری فضا ملی جلی خوشبوؤں سے معطر ہو جاتی۔ فاطمہ ایک بھرپور اور مکمل عورت تھی، ایسی عورت جو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی فضا،، زمین آسمان چاند ستاروں سبھی کو پس پشت ڈال دیتی ہے، جس کے وجود کے سامنے میلوں پھیلے ہوئے ساحل سمٹ جاتے ہیں اور جو مجرد حقیقت کی شکل میں ہر جگہ اور ہر محفل کے پیش منظر میں رہتی ہے۔

صمد خاں نے خوشیوں بھرے یہ دن زیادہ دیر نہیں چلے، قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ فاطمہ ایسی بیماری میں مبتلا ہو گئی جس کا ان دنوں کوئی علاج نہیں تھا۔ دو تین ماہ بیمار رہنے کے بعد شادی کے ٹھیک تین برس بعد صمد خاں کو داغ مفارقت دے گئی۔ بیوی کی موت کے تقریباً دو برس بعد تک وہ وطن میں ہی رہے، بچہ کوئی نہیں تھا اس لیے خاندان والوں نے دوسری شادی کی بہت کوششیں کیں۔ بہت رشتے آئے، بڑی بڑی خوبصورت خواتین کی تصاویر انہیں دکھائی گئیں مگر ان کے اندر شاید کبھی کچھ ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے دوسری شادی قبول نہیں کی، پڑھنے لکھنے کے وہ پہلے سے عادی تھے، اب زیادہ توجہ اسی طرف دینے لگے۔

ان کی زندگی بظاہر بے مقصد تھی۔ وہ بھری دنیا میں تنہا ہو گئے۔ ان کے آس پاس پھیلی ہوئی بھری پری دنیا ان کے لیے بے معنی ہو گئی، اس زمانے میں کتابیں ہی ان کی رفیق تھیں، کبھی کبھار محض وقت گزاری کے لیے انہوں نے اپنے ملک یا اس خطے کے بارے میں اخباری مضامین بھی لکھے، مگر زندہ رہنے اور اس جہان رنگ و بو سے حظ اٹھانے کی اہلیت سے وہ گویا محروم ہو چکے تھے۔ ایسے وقت میں ان کے اخباری مضامین کی وجہ سے ایک عالمی ادارے کی طرف سے انہیں کچھ تحقیقاتی کام کرنے کی پیش کش ہوئی تو انہوں نے اسے بلا تامل قبول کر لیا اور وطن چھوڑ کر یورپ چلے گئے۔ پیرس اس ادارے کا ہیڈ کوارٹر تھا اس لیے اپنے بیس برس کے اس قیام کا زیادہ حصہ انہوں نے پیرس ہی میں گزارا۔ اس طویل مدت میں البتہ وہ وقتاً فوقتاً سیر و تفریح کے لیے فرانس سے باہر بھی گئے۔ انہوں نے یورپ کے سبھی صنم کدوں کی روشنیاں دیکھیں، متعدد بار امریکہ بھی گئے۔ یورپ اور امریکہ کی کھلی زندگی کے سحر نے انہیں اپنی گرفت میں ضرور لیا، مگر ان کے اندر کا مرد ان سے بے نیاز ہی رہا، خود ان کے اپنے دفتر میں فرانسیسی خواتین کی ایک پوری کھیپ موجود تھی جن کی اکثریت کو کسی بھی معیار حسن کے حوالے سے خوب صورت، جاذب نظر اور پرکشش قرار دیا جا سکتا ہے، ان میں سے کچھ فرانسیسی تہذیبی روایات کا قابل قدر نمونہ تھیں۔ جو مہذب پڑھے لکھے دانشور صمد خاں کے دل کو بہت لبھاتی تھیں۔ کچھ خواتین از سرتاپا جسم ہی جسم تھیں، پھر پیرس کے نائٹ کلبوں، اس شہر نگاراں کی شاہراہوں پر مست خرام شکاری عورتوں، پیشہ ور طوائفوں اور خود ان کی جسمانی وجاہت کی اسیر ہونے والی عورتوں کی بھی کمی نہ تھی جو صمد خاں کے دیہاتی مزاج سے پوری مطابقت رکھتی تھیں، مگر گھر سے نکلنے کے بعد سے انہیں عورت ذات سے جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس ہیجان اور جسمانی کشش کے زیر اثر کبھی نہیں آئے جس کا جادو انہوں نے اپنی جوانی میں برسوں جگایا تھا۔ جسم کی مانگ کے تحت کبھی کبھی انہوں نے کچھ عورتوں کے قریب جانے کی کوشش بھی کی، مگر پھر ایک حد سے آگے بڑھنے کی کوشش میں انہیں دنیا کی یہ حسین ترین عورتیں نقلی سی معلوم ہونے

لگتیں۔ بارہا انہیں ایسا لگا جیسے گوشت پوست کی بنی ہوئی زندہ عورت کی جگہ وہ خوشبو کی کسی بوتل کے ساتھ لیٹے ہوئے ہیں۔ عورت کے بدن کے ساتھ ان کے ذہن میں جس قسم کی چیزوں کا تصور آغاز جوانی میں پختہ ہوگیا تھا وہ ان کے دماغ سے کبھی نہیں نکلا۔ وہ سرسوں، دھان کی بالیوں اور شیشم کے پتوں اور کیکر کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو کو زندہ جسم میں سمو کر دیکھنے کے عادی تھے، اپنی بھربھری مٹی سے الگ ہو کر یورپ کی سنگلاخ زمین پر انہیں کسی عورت میں یہ ساری چیزیں نہیں نظر آسکیں۔ اس بیس برس کے دوران میں بہت سی عورتوں کے ساتھ ان کا میل جول رہا۔ ان پڑھ، پڑھی لکھی، خوب صورت، لفظ بولنے والیاں، محفلوں میں اپنی گفتگو سے جادو جگانے والیاں، مہذب، غیر مہذب، بلا جھجک حرف مدعا زبان پر لانے والیاں، غرض کہ ہر قسم کی عورتیں ان کے آس پاس، آمنے سامنے، صبح سے شام اور رات سے طلوع سحر تک ہمیشہ موجود رہیں، مگر صمد خاں دور کا جلوہ دیکھتے رہے۔ انہیں ایسا لگتا جیسے یہ سب دیکھنے کے لیے ہیں۔ قربت کے لیے کبھی ان کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی بھی تو وہ دیرپا نہ ہوسکی۔ یہ گریز پا لمحات کبھی کبھی ان کو اپنی گرفت میں لے لیتے، مگر جلد ہی وہ اپنی اصلی اور مستقل کیفیت میں واپس آجاتے۔ آخر کار انہوں نے زندگی کے اس حسین رخ سے تقریباً کنارہ کشی کر لی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

وطن واپس آکر انہوں نے ایک بڑے شہر سے دس بارہ میل دور واقع ایک قصبے میں رہائش کا فیصلہ کیا۔ اس قصبے میں ان کا ایک پرانا دوست تھا جو اپنا آبائی مکان چھوڑ کر شہر میں جا بسا تھا۔ یہ خالی مکان انہیں آسانی سے مل گیا۔ گاؤں کے چوراہے پر واقع تھا۔ انہوں نے اس کی بالائی منزل کو اپنا بسیرا بنالیا۔ یہاں سے وہ چاروں طرف دیکھ سکتے تھے۔ یہیں بیٹھ کر چھ ہفتوں میں انہوں نے اپنی رپورٹ کا خاصا بڑا حصہ مکمل کرلیا تھا۔ یہ رپورٹ گزشتہ دو ہفتے سے ویسے ہی رکھی تھی اس لیے کہ دو ہفتے سے قبل ہی ان کی نظر اچانک اس بے نام قیامت پر پڑی تھی، دن بھر کے کام کے بعد وہ بالاخانے کی کھڑکی سے سرِ شام اپنے گھونسلوں کی طرف پلٹتے ہوئے پرندوں، دور حد نظر پر بہتے ہوئے سست رو دریا کی روانی، دھان کی گہرے سبز رنگ کی لہلہاتی ہوئی بالیوں اور گنے کے کھیتوں میں سرسراتی ہوئی ہوا کو گویا اپنی طرف کھینچ رہے تھے کہ ان کی نظر سامنے سے آتی ہوئی اس عورت پر پڑی جو اس سارے منظر میں ایک پینٹنگ کی طرف فٹ ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ اور قریب آئی تو انہوں نے دیکھا کہ معمولی کپڑے کا لباس اس کے جسم کو سنبھالنے میں ناکام ہے۔ اس کی چال صمد کو بے حال کر گئی اور جب وہ اور قریب آگئی اور اس نے بوجھل پلکوں کو اٹھا کر دو نشیلی موٹی اور نگراں آنکھوں سے ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے آگے بڑھ گئی تو انہیں اپنے آپ کو سنبھالنے میں دشواری محسوس ہونے لگی، وہ تیز تیز سانسیں لینے لگے، کھڑکی میں سے دور تک وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور وہ ساری خوشبوئیں ان کے وجود میں سرایت ہوتی رہیں جو برسوں پہلے وہ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ یہ کوئی الھڑ مٹیار نہیں تھی بلکہ ان کے اندازے کے مطابق پچیس برس یا اس سے بھی زیادہ عمر کی ایک بھرپور عورت تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد ان کے لیے کام جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترے اور ساری شام گاؤں میں ادھر ادھر گھومتے رہے کہ شاید کہیں اس کی جھلک نظر آجائے، مگر وہ کہیں نہیں تھی، رات بھر وہ جاگتے رہے اور اس کے بارے میں سوچتے رہے۔ رات بھر وہ اپنے آپ کو مطعون بھی کرتے رہے کہ انہیں یہ کیا ہوگیا ہے، مگر اس بے چینی اور اضطراب میں ایک لذت آزار بھی تھی، وہی لذت جو جوان دلوں کو بے چین رکھتی ہے اور جس سے وہ برسوں پہلے محروم ہو چکے تھے۔ وہ رات بھر سوچتے رہے کہ عمر کے اس حصے میں یہ آتش فشاں کہاں سے پھٹ پڑا ہے۔ اس راکھ میں چنگاریاں کہاں سے پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ اجنبی عورت ان کے جسم و روح پر کیوں مسلط ہوگئی ہے، ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اگلے پندرہ روز انہوں نے کوئی کام نہ کیا۔ اپنی رپورٹ نامکمل چھوڑ کر وہ دن بھر اس کا انتظار کرتے تھے۔ بار بار آئینہ دیکھتے، ان کا فیصلہ تھا کہ گو وہ پچپن برس کے ہوگئے ہیں مگر دیکھنے میں اپنی عمر سے بہت چھوٹے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک لمبے، چھریرے بدن

کے خوبصورت آدمی تھے، رنگ بھی سرخ و سفید تھا، انہی دنوں انہوں نے اپنے سوٹ میں کہیں مدت سے پڑی ہوئی خضاب کی ٹیوب نکال کر سفید بالوں کو سیاہ کرلیا۔ اس ساری تیاری کے بعد ان کا زیادہ وقت کھڑکی میں بیٹھے ہوئے باہر دیکھنے میں گزرتا۔ نوکر کو صرف کھانے اور چائے کے وقت گھر میں آنے کی اجازت تھی اس لیے وہ اس محاذ پر تن تنہا ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ عورت دن میں ایک دو بار ضرور وہاں سے گزرتی اور اسی طرح دراز پلکوں کی اوٹ سے موٹی موٹی نشہ آور آنکھوں کو وا کیے صمد خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی مسکراتی ہوئی آگے نکل جاتی۔ اس کے آنے اور جانے کا کوئی رخ متعین نہیں تھا، اس چوراہے پر وہ کبھی ایک راستے سے آتی تو کبھی دوسرے اور تیسرے سے، اسی طرح اس کے جانے کی سمت بھی غیر متعین تھی۔ وہ کبھی ایک طرف مڑ جاتی، تو کبھی دوسری طرف کو نکل جاتی، مگر خان صمد خاں کے لیے اس کا یہ دیدار گویا نشے کی کیفیت رکھتا تھا۔ آج بھی سرِ شام یہی ہوا۔ وہ آئی اور صمد خاں کو ہلاتی جھنجھوڑتی اور بے حال کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور دیر تک بے حس و حرکت بیٹھے رہے، سوچتے رہے وہ کون ہے، کہاں سے آتی ہے، کہاں جاتی ہے۔ اس کے بارے میں کسی سے معلوم کرنے کی ان میں جرات نہیں تھی، وہ اس مہم کو خود ہی سر کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے جانے کے بعد یکایک انہیں محسوس ہوا کہ وہ بہت وقت ضائع کر چکے ہیں، کام مکمل کرنے کے لیے ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو مطعون کرتے ہوئے اپنے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ اگلے روز سے وہ اپنی رپورٹ پر کام شروع کر دیں گے۔ کرسی سے اٹھ کر انہوں نے دو ہفتے سے بند پڑی فائل اٹھائی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اب کام کہاں سے شروع کرنا ہے انہوں نے رپورٹ کا مطالعہ شروع کر دیا۔

یہ دیکھ کر انہیں ایک گونہ اطمینان ہوا کہ پہلے پانچ ہفتوں میں وہ کافی کام مکمل کر چکے تھے۔ شہر کے بڑھنے پھیلنے کے بارے میں انہوں نے اس کی ابتدا اپنے ذاتی مشاہدات اور احساسات بیان کرنے کے ساتھ کی تھی۔ ابتدائی حصے میں انہوں نے لکھا تھا کہ یہ وہ شہر تو نہیں ہے جیسے وہ بیس برس قبل چھوڑ کر گئے تھے۔ اس وقت اس شہر کی حدیں متعین تھیں۔ اب یہ اپنی حدیں توڑ کر چاروں طرف بڑھ رہا ہے۔ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس وقت اس میں بسنے والوں کا اپنا ایک مزاج بھی تھا جو اب کہیں نظر نہیں آتا۔ یہی نہیں وہ قصبہ جس میں وہ چار پانچ ہفتوں سے مقیم تھے نہ گاؤں رہا تھا نہ شہر سا تھا، وہ اپنا حسن، پاکیزگی اور معصومیت سبھی کچھ کھو چکا ہے، شہر اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور میلوں کا فاصلہ طے کر کے اب اس کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ یہ گاؤں چوبیس برس قبل اپنی ضرورتوں میں خود کفیل ایک سویا ہوا خاموش سا، آبادی کا ایک جزیرہ تھا اب شہری زندگی کا حصہ نظر آتا تھا۔ چاروں طرف بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ بازار میں دکانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ چائے کی بہت نئی نئی دکانیں کھل گئی تھیں، قرب و جوار غلاظت کے ڈھیر تھے، وہ جہاں بادِ شمال درختوں کے پتوں سے سرسراتی ہوئی گزرتی تھی، جہاں سے کئی رات بانسری کی مدھر تانیں بلند ہوتی تھیں اور جہاں کی فضا میں پھولوں، پتوں اور گنے کے کھیتوں سے ابھرنے والی مہک کا راج تھا اب وہاں کثیف دھوئیں، بے ہنگم آوازوں اور فضا کی آلودگی میں دم گھٹتا تھا، شہری اور دیہی زندگی کی حدیں ختم ہو رہی تھیں۔ صمد خاں نے یہاں آنے کے بعد صبح دم ہاتھ سے چلنے والی چکی یا دودھ بلونے کی آوازیں سننے پر اپنے کان لگائے مگر یہ آوازیں اب ناپید ہو چکی تھیں۔ اس گاؤں میں اب کوئی چکی نہیں چلتی تھی بلکہ یہاں پر بھی تھیلے کے آٹے کا رواج تھا۔ دودھ اب پھیلتے ہوئے شہر کو سپلائی کیا جا رہا تھا۔ اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں جب انہوں نے باہر نکل کر اپنے آس پاس کا جائزہ لیا تو دودھ بلونے، چکی چلنے یا بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں معدوم ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ اب اس گاؤں کے باہر آس پاس کھیت اجڑ چکے تھے۔ اب یہاں فصل اور کھیت برائے نام نظر آ رہے تھے جگہ جگہ نئی آباد ہونے والی بستیوں کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔

شہر اس بستی کی طرف عفریت کی طرح بڑھا آ رہا تھا۔ زمین کے قدرتی حسن کو روندتا ہوا، روئیدگی اور تازہ صحت بخش ہوا

کو پامال کرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اس علاقے سے گھاس، پودے، پھول فصلیں سب ختم ہو رہے تھے۔ خودرو جھاڑیوں، زندگی بخش جڑی بوٹیوں اور لہلہاتے ہوئے پودوں کی جگہ گندگی کے ڈھیر جا بجا پڑے ہوئے تھے، درخت کٹ رہے تھے۔ جھکی ہوئی شاخیں غائب ہو رہی تھیں۔ اب یہاں جھینگروں کی صداؤں اور بانسری کی تانوں اور بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی صداؤں کی جگہ سیمنٹ کی بوریاں، اینٹوں کے ڈھیر، سنگ دل مشینیں، مکسر، لوہے کے ڈھانچے اور جالیاں بکھری پڑی تھیں، زمین کا سینہ جگہ جگہ سے چھلنی ہو رہا تھا، بنیادیں کھودی جا رہی تھیں۔ سیوریج کے پائپ جگہ جگہ پڑے تھے اور پھیلتے بڑھتے ہوئے شہر کی ان نئی آبادیوں میں گندے پانی کی نالیاں، غلاظت اور بدبو سے بھری ہوئی نظر آتی تھیں، جگہ جگہ خلق خدا رزق کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی تھی، بے ڈھب مکانوں کے حصوں میں نئی دکانیں اور چائے خانے تعمیر ہو رہے تھے، ہوشیار لوگ پختہ مکانوں دکانوں یا محض چھولداریوں میں میز کرسیاں بچھائے جائداد کی خرید و فروخت کرتے نظر آ رہے تھے۔ اپنی کوکھ سے انسانوں کے لیے رزق پیدا کرنے والی زمین محض ان کا بوجھ اٹھانے پر مامور کی جا رہی تھی۔

صمد خاں نے اس صورت حال کا بھرپور تجزیہ کیا تھا اور اس نئی صورت حال کے اثرات اور مختلف معاشرتی مسائل پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ ان کی نظروں کے سامنے پرانی دنیا ٹوٹ پھوٹ رہی تھی اور ایک نئی مگر بے ہنگم دنیا ابھر رہی تھی جو خالص خوشبوؤں اور زمین کی ازلی مہک سے محروم تھی۔ زرعی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بڑی قیمتوں پر بک رہے تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے سیکڑوں سے زیادہ رقم کبھی دیکھی تک نہیں تھی لاکھوں روپے پا رہے تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ یہ لاکھوں دنوں میں اڑ جائیں گے۔ پھر جہاں مالک زمین بیچ کر بڑی بڑی رقمیں پا رہے تھے وہاں اس زمین پر محنت مزدوری کر کے پشتوں سے رزق کمانے والے ہزاروں افراد بے روزگار ہو کر شہر کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں کچھ جسمانی مشقت اختیار کر کے پیٹ بھرنے کے قابل ہو جاتے تو کچھ بھیک مانگنے پر مجبور ہوتے یا پھر جرائم پیشہ افراد کے ہتھے چڑھ جاتے۔ صمد خاں نے اپنے ادارے سے سفارش کی تھی کہ یہ ادارہ مالی تعاون سے اس توڑ پھوڑ کا سدباب کرے، ان کے خیال میں دیہات سے شہر کی طرف آبادی کی منتقلی سے جو مسائل پیدا ہو رہے تھے اس سے سارے ملک کا سماجی ڈھانچہ تہس نہس ہو کر رہ جائے گا، یہ حالت اسی علاقے تک محدود نہیں تھی ملک کے ہر حصے میں ایسی ہی صورت حال تھی۔

صمد خاں کو خود اپنی یہ رپورٹ پڑھ کر افسوس ہو رہا تھا کہ یہ کام اتنے دنوں سے رکا پڑا ہے۔ وہ کس چکر میں پھنس گئے ہیں، کچھ ہوا بھی نہیں، اس سے نکل کر اپنا کام پورا کرنا چاہیے، یہ سوچتے سوچتے ان کا دل بیٹھ گیا۔ وہ بت حیلہ جو پھر ان کی نگاہوں میں بس گیا۔ ان کے سارے ارادے، فرض شناسی اور کام مکمل کرنے کے عزائم دھرے کے دھرے رہ گئے۔ یکا یک انہوں نے محسوس کیا کہ یہ عورت ان کے ارادوں، پروگراموں، ان کے آس پاس کی دنیا، بڑھتے پھیلتے ہوئے شہر، زمین آسمان، غرض کہ ہر شے سے بڑی ہے، عظیم ہے، برتر ہے اور اس وقت ان کے لیے صرف وہی ایک حقیقت ہے باقی کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کا کام، ان کی عملی رپورٹ، تھیسس، ذمے داریاں، فرائض سبھی کچھ فروعی ہے۔ انہوں نے سوچا وہ اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ صمد خاں نے یہ فیصلہ کر کے بند آنکھیں کھولیں اور فائل کو بند کر کے سامنے پڑی ہوئی میز پر پٹخ دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی سے پاس آئے اور باہر پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھنے لگے۔

شام ہو رہی تھی، اندھیرا پھیل رہا تھا، دور شفق پر بہت سے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ گاؤں کی گلیوں میں دھول اڑ رہی تھی، کچھ فاصلے پر بازار میں لوگ چائے خانے پر بیٹھے گپیں لگا رہے تھے۔ ان بہت سی بے ہنگم آوازوں کے جنگل میں صمد خاں نے محسوس کیا کہ وہ نئی اور پرانی دنیا کے دوراہے پر کہیں گم ہو گئے ہیں، انہیں اپنا ماضی یاد تھا اور نہ مستقبل کا پتہ، اس گاؤں اس بڑھتے ہوئے شہر

اور اس بھری ہوئی دنیا میں انہوں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا۔ اس موجود لمحے سے آگے کیا ہے، انہیں آئندہ کرنا ہے، یہ سب کچھ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، باہر اندھیرا پھیل رہا تھا لیکن ان کے اندر اس سے کہیں زیادہ گہرا، مہلک اور جان لیوا اندھیرا رچ بس چکا تھا۔ فلم کے مناظر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے جوانی کے زمانے کی محبوباؤں، بیوی، پیرس کے شبستانوں میں ملنے والی طرح دار عورتوں کی کھیپ گھوم رہی تھی۔ مگر یہ سب کچھ بے ربط تھا۔ انہیں اپنی موجودہ زندگی ہی نہیں گزری ہوئی زندگی بھی بیکار اور بے معنی محسوس ہو رہی تھی، کھڑکی سے کمرے کی طرف واپس پلٹتے ہوئے گلی کے سرے پر انہیں پھر وہی سراپا حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ بت بنے اسے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے، وہی قیامت کی چال، وہی لباس سے نکلتا ہوا جسم، وہی دراز پلکیں اور وہی موٹی نشیلی گہری اور بولتی ہوئی آنکھیں یکا یک ان کی ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر قبل ان پر طاری ہونے والی افسردگی ختم ہو گئی، وہ بے چارگی اور درماندگی جس نے انہیں لپیٹ میں لے رکھا تھا اب اس کا احساس تک نہ تھا جھٹپٹے میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی کھڑکی کے سامنے آ کر اس کی رفتار کم ہو گئی ہے اور لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ ان کی آنکھیں اس سے ملیں اور پھر شاید اضطراری طور پر انہوں نے سر ہلا کر اسے اوپر آنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ ایک دم تیس پینتیس برس پیچھے چلے گئے۔ دو چار روز آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے ایسے ہی اشاروں سے ملاپ کا کھیل انہوں نے جوانی میں بہت کھیلا تھا۔ آج پھر وہی صمد خاں بے غمی کے برسوں کی گرد جھاڑتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا تھا، وہ اپنی عمر، اپنا منصب، اپنا مقام سب کچھ بھول کر پھر وہی پرانے نوجوان بن گئے تھے۔

انہوں نے دیکھا کہ دائیں بائیں دیکھتی ہوئی بدن چراتی ہوئی اپنے آپ کو سمیٹتی سیڑھیاں چڑھ رہی ہے ان کی سانس رک گئی، ٹانگیں کانپنے لگیں اور سردی کے موسم میں ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، یہ گزرے ہوئے دنوں کی واپسی تھی، وہ اپنی پرانی دنیا میں لوٹ آئے تھے۔

وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی اور ان کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔ اب وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی، صمد خاں کے مقابلے میں وہ بالکل پریشان نہیں تھی۔ بالآخر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

کافی دیر خاموشی رہی، صمد خاں اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا خود سن سکتے تھے، ان کا جسم تپ رہا تھا، زبان بند تھی عورت نے اشارے سے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے مشینی انداز میں اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ صمد خاں کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔ یہ کھیل انہوں نے بہت کھیلا تھا، مگر اس وقت ان کی منہ زور جوانی ان کی ڈھال بنتی تھی، اگرچہ ان کی جسمانی کیفیت آج بھی وہی تھی، مگر عمر اور تجربے نے ان کو محتاط بنا دیا تھا۔ وہ غور سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ قریب آنے پر اور بھی زیادہ خوبصورت اور بھی زیادہ بھرپور اور گداز نظر آ رہی تھی اس کے جسم میں اردگرد کی فضا کی ہر چیز تحلیل ہو چکی تھی، سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی اس عورت کی سانسوں میں اس مٹی کی، دھان اور سرسوں اور چنبیلی کی مہک پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ صمد خاں اس کو سامنے پا کر سب کچھ بھول چکے تھے، انہیں اس حقیقت اور اس عورت کے وجود کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ ان کے ذہن میں کوئی سوچ، کوئی فکر، کوئی پریشانی نہیں تھی۔ آج انہیں زندگی کی ایک ہی حقیقت کا سامنا تھا مگر ان کی زبان بند تھی۔

صمد خاں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو ان کا پورا جسم تپ اٹھا۔

''میں آپ کو روز دیکھتی ہوں۔ آپ یہاں دن بھر کیا کرتے رہتے ہیں؟'' آخر اس عورت نے کمرے میں پھیلی ہوئی سنگین خاموشی کو توڑا۔

''اس بات کو چھوڑو، یہ میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو۔ کہاں رہتی ہو، اور تمہارے گھر والے کون ہیں؟'' صمد خاں نے بڑی مشکل سے زبان کھولی۔

''یہ میں بھی پھر بتاؤں گی۔ آپ یہ بتایئے، آپ نے مجھے اوپر کیوں بلایا ہے؟''

صمد خاں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھے، وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بالآخر انہوں نے اپنی آواز کی ساری مٹھاس سپردگی اور عجز سے کام لیتے ہوئے کہا۔ مجھے تمہارا نام معلوم نہیں ہے، مگر تم بہت خوبصورت ہو۔ میں روز تمہیں اس کھڑکی سے گزرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ تمہیں دیکھنے کے بعد میں اپنا سب کچھ بھول گیا ہوں۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا، تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا تم میرے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو؟''

عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

صمد خاں کے ذہن کی تاریکی چھٹ گئی ایک دم سے گویا ان کے سامنے ساری دنیا روشن ہوگئی۔ انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''تم میرے ساتھ رہوگی؟''

''کتنی دیر کے لیے؟''

''تم یہ کیوں پوچھتی ہو؟''

''اس لیے کہ کم وقت کے کم پیسے ہوں گے، رات بھر رکھنا ہے تو زیادہ پیسے ہوں گے''۔

☆☆☆

ادھ کھایا امرود

خان فضل الرحمٰن خان

کوئی دوسرے کے ادھ کھائے امرود کو کیوں کھانے لگا۔ جب لنکا کا کوٹ ایک مرتبہ سر ہو چکا، اس کے جید پھاٹک کھل ٹوٹ چکے، تو اس پر یورشیں کرنے میں کیا تک تھی۔ اور حسن جہاں افراز مینو کو اس کمتری کا احساس تھا۔ سو یہی وجہ تھی کہ ہم حدیقہ والی کوٹھی کے شرقی برآمدے کی طرف شام کی چائے پر بیٹھے تو وہ کہ جس کی نظریں کبھی نچلی نہ ہوا کرتی تھیں، جب وہ سامنے بیٹھی ہوا کرتی تو ایسا محسوس ہوا کرتا تھا جیسے اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کھلونے ہوں۔ اس کی آنکھیں گویا اڑتی تتلی کے پروں کی طرح رنگ پر رنگ پیش کرتی رہتیں تھیں۔ لیکن آج اس کی آنکھوں میں نچلا پن تھا۔ اور حزیں سنجیدگی۔ ایک مرتبہ چائے پیتے ہوئے میرے منہ سے ذرا سپر سپر کی آواز نکل گئی تو وہ مجھے جھپکانے کے لیے ذرا ذرا سے سپر سپر کر کے چائے پینے لگا لیکن وہ تو ایسی خاموش رہی جیسے ماں بیٹھی ہو۔۔۔ وہ اخبار نویس اور پارلیمانی سکریٹری سے بھی زیادہ حاضر جواب تھی۔۔۔۔ مگر آج تو کھسیانت سے اس کا منہ سیاہ ہوا تھا۔

باہر بجلی چمک رہی تھی بادل ایسا گھٹا ہوا تھا کہ جیسے برسنے پر پانی نیزوں چڑھ جائے گا۔ کوٹھی کے جنوبی حصہ میں جو لوکاٹوں کی ٹکڑی تھی۔ اس کے اندھیروں میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں بول رہی تھیں۔ شرقی برآمدے کے آگے کھڑے ثمر آور جھمکدا سینددوے آم ہریالے ماحول میں تجل معلوم ہو رہے تھے۔ مینو کا چہرہ بھی انہیں آموں ایسا تھا۔ پچھلے سال انہیں دنوں جب تھوڑا سا برسنے کے بعد دکھنا بادلوں کو چھتر بتر کر رہی تھی تو انہیں آموں کے درمیان میں نے اس عشوہ گر سے سوال کیا تھا۔

''آپ کو گندھرپ کے معنی آتے ہیں؟''

''نہیں''۔

''اس کا مطلب ہے عشقیہ شادی، کیا آپ کو یہ پسند ہے؟''

''۔۔۔۔ پہلے پیار اور بعد میں شادی؟''

''اچھا مینو تو اگر یوں ہو جائے۔۔۔ پہلے پیار بعد میں شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار، اور۔۔۔۔''

''۔۔۔۔ اصل مقصد وصل دوامی ہو؟''

''چندے خاموش رہیے ہمیں آپ کی باتیں پسند نہیں، ہم آپ کے پاس سے ابھی ابھی جایا چاہتے ہیں۔ پھر یہ اڑنگ بڑنگ باتیں فضاؤں کو سناتے رہیے گا''۔

''مجھے مضطرب چھوڑ کر نہ جائیے۔۔۔۔۔ نہ جائیے''۔

''قرائن بتاتے ہیں کہ آپ دماغی توازن کھو چکے۔ سراسیمگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے قیام مباح نہیں''۔

''آپ جیسی شستہ اور کتابی زبان کوئی نہیں بول سکتا''۔

''ہمیں مرزا غالب نے بھی یہی کہلا بھیجا تھا''۔

''دل چاہتا ہے کہ آپ کی باتیں ہی سنے جائیے''۔

''لیکن آپ کی جانب ہمارا میلان طبیعت ہی نہیں''۔

''آپ سلام ناز کر کے تشریف لے جا سکتی ہیں''۔

''ہمیں یہ بھی گوارا نہیں''۔
''کچھ گوارا بھی ہے''۔
''کچھ بھی نہیں''۔
''کیوں کیا خطا کیا قصور!''
''نہ خطا نہ قصور، یہ ہمارا مقتضائے طبیعت ہے''۔
''جب سے تم منکر ہوئیں۔۔۔۔دل ڈوبا جا رہا ہے''۔
''دھڑام سے گرنے کی آواز تو ہمیں بھی آتی تھی''۔
''بدلی کی چھاؤں میں پھوار پڑتی ہوتی اور ہم دونوں تی منزلہ کی بارہ دری میں بیٹھے ساون کے نیزوں چڑھے ندی نالوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے''۔
''آپ کے سفلی احساسات آپ کو مبارک''۔
''آپ کو برشگالی رات میں جھینگر بولتے ہوئے کیسے لگتے ہیں''۔
''جیسے بھی لگتے ہیں۔۔۔۔آپ ہرزہ سرائی جاری رکھیے۔ہم چلے''۔
مینو میری عزیز تھی، بدر بھی عزیز تھا۔ان دونوں کی رسم منگنی تو نہ ہوئی لیکن ویسے ہر طور سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔بدر کو مجھ پر اس لیے ترجیح دی گئی کہ اسے فوج میں کمیشن مل گیا تھا مجھے انتخابی بورڈ والے اس لیے نہ لیتے تھے کہ مجھ میں کچھ کچھ امردینے کا شائبہ تھا۔صدر بورڈ نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ اس سے تو پانچ میل کی دوڑ بھی نہ دوڑی جائے گی۔میرے متعلق ان کا اندازہ قطعی غلط تھا۔شکار میں بدر نے مجھ سے زیادہ جفاکشی کبھی نہ دکھائی تھی۔بلند ستانی جنگلوں میں میں نے جیٹھ کے روزے رکھتے ہوئے شکار کھیلا تھا۔اور بدر نے پیاس اتنی محسوس کی تھی کہ اس نے اکثر تیسرے پہر سے پہلے ہی روزے توڑ دیئے تھے۔
یہ ابھی چھ مہینے کی بات تھی۔بقرعید کا مہینہ تھا۔محرم سے اگلے چاند میں بدر اور مینو کی شادی ہو جانے والی تھی کہ میں اپنے ایک اور عزیز اور بے تکلف دوست جمالی کے ساتھ کوٹلہ شاہی میں بیٹھا ہوا تھا، جاپانیوں کے جذبہ خودکشی پر گفتگو ہو رہی تھی۔باہر گرد اٹھانے والا اندھیاؤ چل رہا تھا۔فضا ایسی ہو رہی تھی جیسے شیطان اس میں قدیم روما کے زمانے کی رتھیں گھڑ گھڑ چلا رہے ہوں۔ہم تیسری منزل پر تھے میرے طبیعت اتنی چلبلا رہی تھی جیسے میں کھڑکی کھول کر سر کے بل سرک کے کھڑنجے پر گر پڑوں گا۔میرے آزار کا کوئی علاج دکھائی نہ دیتا تھا۔پھر جمال نے کہا۔
''میں یونانی، اوڈیس اور شیواجی مرہٹہ سے زیادہ چالاک ہوں، تمہاری مینو سے شادی میری ذمہ داری ہے۔اس کی شادی سیکنڈ لفٹیننٹ بدر سے کبھی نہ ہو سکے گی۔گو وہ ہمارے خاندان سے ہے اور تم نہیں، سیکنڈ لفٹیننٹ بدر کو اس کی ضرورت تم سے زیادہ نہیں ہے جو اندھیاؤ چل رہا ہے، میں اسے تو روک نہیں سکتا، البتہ یہ شادی ضرور روک دوں گا۔
جمالی نے یہ بہادرانہ الفاظ تو استعمال کر دیئے تھے۔اور وہ تھا بھی بڑا ہی سچا اور روادار انسان لیکن میرے دل میں اسی وقت سے یہ الجھن پیدا ہو رہی تھی کہ جمال اپنا قول کیسے پورا کرے گا۔مینو کا حاصل کرنا میرے لیے قطب تک پہنچنے سے کم نہ تھا۔اب جمالی کے قول نے بھی ایک ایسے ہی قطب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ان قطبین تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ مجھے نظر تو نہ آتا تھا۔
جمالی کے آبا و اجداد کبھی ملک کے تاجدار رہ چکے تھے۔ان کی جائے پیدائش شاہی کوٹلہ میں تھی جس کے جنگی دروازے تھے۔اور گھوگس بھی تھی۔ہمارے بزرگ ان کے سپہ سالار تھے۔ہمارا قیام حدیقہ میں تھا۔۔۔حدیقہ چہار دیواری والے باغ کو کہتے

ہیں۔ حسن جہاں افروز کا تعلق شاہی کوٹلہ والوں سے تھا۔ ان دونوں خاندانوں میں رشتے بیاہ ہورہے تھے۔ جمالی کے والد کا تنازع خطاب اور پنشن کے سلسلے میں دوسرے خاندانی دعوے داروں سے چل رہا تھا۔ اور جب ملک کی آخری بڑی عدالت نے فیصلہ جمالی کے والد کے حق میں کر دیا تو شاہی کوٹلہ میں ایک زبردست مجلس جشن وسماع برپا ہورہی تھی، چوٹی کی گائن طوائفیں بلائی گئیں تھیں اور سبزہ زار چوگان میں گندمری دار درباری شامیانے نصب تھے۔

بیگمات اور معزز مہمان خواتین نوبت خانے کے بلند پھاٹک میں بیٹھی رقص وسرود سے بہرہ ور ہورہی تھیں۔ سامنے باگی کے کپڑے ایسا جھینا جھینا سرخ پردا پڑا ہوا تھا۔ مرغول دار پھاٹک کے پیچھے شمال میں سنگ مرمر کے کھلے فرش پر میز کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر طرح طرح کے ٹھنڈے مشروبات اور پان سجے ہوئے تھے۔ کہ خواتین جب چاہیں آئیں۔ حسب ضرورت شربت وغیرہ نوش جان کریں پان کھائیں، الائچی سپاری، اور زردہ چاندی کے نقشین چوگھڑوں میں رکھا تھا جس کسی کو تشنگی محسوس ہوتی یہاں آتی اور جو چیز چاہتی ہے پیتی۔ اس مرمرین صحن کے ہر دو جانب شرق وغرب لال پتھر کی مرغول دروں والی ایک منزلہ عمارت تھی۔ دروں پر زری دار بینگنی پردے پڑے تھے۔ یہاں بستروں کا انتظام تھا اور اندر عود ولوبان، دارچینی اور دیگر مشمومات سے خلوت گاہیں معطر تھیں۔ جو کوئی تھک جائے یہاں آکر آرام کر سکتی تھی۔ اس چوگردہ عمارت کے شمال میں جو سہ دریاں تھیں، وہاں کنیزوں کے آرام کرنے کا بندوبست تھا۔ صحن سے جو حویلی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے سہ منزلہ پر بیٹھے ہوئے جمالی نے کہا تھا۔ ”یہ جو اندھیاؤ چل رہا ہے میں اسے تو نہیں روک سکتا۔ البتہ یہ شادی ضرور روک دوں گا“۔ میں سبزہ زار چوگان میں نصب درباری شامیانے میں بیٹھا اسی سہ منزلہ کی طرف کبھی کبھی نظریں اٹھاتا ہوا سوچ رہا تھا۔ ”کیا جمالی اس شادی کو روک سکتا ہے؟ جس طرح چلتا ہوا اندھیاؤ نہیں رک سکتا، اسی طرح یہ بھی نہیں رک سکتی“۔

جب رات کی کمر ٹوٹی اور چاند نے مسجد سے گنبد پر سے کھسکنا کیا مشروبات کی دیکھ بھال کرنے والی کچھ کنیزیں تو شمالی سہ دریوں میں سوگئیں اور کچھ بلند پھاٹک کے پیل پایوں کے پاس بیٹھ کر گانا سننے لگیں تو حسن جہاں افروز مینو کو پیاس نے ستایا۔ وہ چمک دار وصلی جوتا بلا جراب پاؤں میں پہنے ہوئے صحن میں آئی۔ اس کے پاؤں گورے پن کی اور چکناہٹ میں سنگ مرمر کو مات کر رہے تھے۔ اس نے برف میں لگی ہوئی بوتل تیلی سے پی اور کچھ شربت گلاس سے پیا۔ اس وقت اس کے ذرا بھیگے بھیگے ہونٹ واقعی آب و آتش کی آمیخت کا سماں پیدا کر رہے تھے۔

وہ واپس جانے ہی والی تھی کہ ایک لمبے تڑنگے مضبوط آدمی نے اسے اس طرح اٹھالیا جیسے چڑی مار کبوتر کو دبوچ لے۔ حملہ آور اسے پردے پڑی ہوئی شرقی استراحت گاہ میں لے آیا۔ حملہ آور کی گرفت اتنی کڑی تھی کہ وہ مینو کو تڑپنے بھی نہ دے رہا تھا۔ پھر وہ خوب ہلکاں کی گئی۔ اس کا جھاڑ کا آزار بند چاقو سے کاٹ ڈالا گیا۔ سنہری شلوار ایسے ہلکے رنگ کی جیسے عطر ہو۔ تار تار ہو چکی تھی کامدار قمیص کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ حملہ آور نے اندر جاتے ہی روشنی گل کر دی تھی۔

پھر ایک کنیز نے صحن میں شور مچانا شروع کر دیا۔ ڈاکو، ڈاکو بیگم مینو۔ بیگم مینو۔ دوڑیو، دوڑیو! اس شور پر بلند دروازہ میں بیٹھی تمام مستورات صحن میں ڈھوک آئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اخفائے واردات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناممکن تھا حسن جہاں افروز مینو تو گویا چھاپے میں چھپ گئی تھی۔ اس کے بدنامی کا ٹیکہ لگ چکا تھا۔ مردوں تک خبر پہنچ گئی بے چاری خستہ اندام، دریدہ ملبوس، حسن جہاں افروز مینو کچھ ہی منٹ میں ایسی بن گئی تھی۔ جیسے ڈربے کا دروازہ بند ہو گیا ہو۔ کوئی مرغی باہر بیٹھی رہ جائے، رات کے سناٹے میں باہر بلاؤ پھانے لگے تو وہ چیخ پکار ہو کہ ہمسایوں کے بچے تک میں ہڑبڑ کر جاگ پڑیں۔ مینو کے عطر ایسے ہلکے سنہرے رنگ کی شلوار سرخ ہورہی تھی، چولی کے بٹن اور تکمے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کا زعفرانی دوپٹہ، رومال، کانوں کا ایک جواہر جڑ آویزہ اور اس کے چہرے کی وغد

غاہٹ یہ سب غائب تھے۔ تشہیر اتنی ہو چکی تھی کہ اس سے کوئی بھی نہ دریافت کرتا تھا۔ اس کے منہ میں بولی بھی نہ تھی۔ امرود ادھ کھایا ہو چکا تھا۔ لنکا کے کوٹ کے جید پھاٹک کھل چکے تھے۔ کنیزیں بار بار حاشا رحمان، حاشاللہ کہتی پھر رہی تھیں۔

سیکنڈ لفٹیننٹ بدر اور حسن افروز جہاں بیگم مینو کی شادی عشق و محبت کی اساس پر نہ ہو رہی تھی۔ جو اس کی بناء پر عشق و محبت ہوتی تو اس کا توڑنا مشکل ہوتا اور مینو اس واقعے کی مجرم بھی گردانی نہ جا سکتی تھی۔ جو کوئی راہ جا رہا ہو۔ لیکن کوئی دوسرا اسے زبردستی پکڑ کر کچھ دیر کو راہ سے گمراہ کر دے۔ تو اسے بے راہ تو نہیں کہہ سکتے۔ پر یہاں تو مسئلہ ہی دوسرا در پیش تھا۔ عورت کی عصمت ایک مرتبہ گئی تو سدا کے لیے گئی۔ ادھ کھائے امرود کا کوئی گاہک نہ تھا۔ گو رشتہ قطع کرنے کی کوئی باقاعدہ اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ لیکن بدر کی طرف سے یہ رشتہ منسوخ سمجھا گیا تھا۔ جس طرح سے ہٹلر کو کسی لیے ملک پر حملے کرنے سے پہلے الٹی میٹم کی ضرورت محسوس نہ ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح بدر کی جانب سے اس ضمن میں کوئی اعلان متوقع نہ تھا۔ اب میرے امتحان کی گھڑی آن پہنچی تھی کہ میرا دعویٰ محبت فرضی تھا؟ کیا میں نے صرف بڑ ماری تھی۔ شاہی کوٹلہ میں بدر یا کوئی اور ادھ کھائے امرود کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا تو کیا ہم اہل حدیقہ بھی انہیں کی پیروی کر رہے تھے؟

حادثے کے اگلے دن ہی مجھ سے ملے بغیر جمالی پہاڑ پر چلا گیا تھا اور نہ اسی سے اپنے دل کی بات کرتا۔

ادھر مینو کو یہ معلوم تھا کہ میں اس کا خویش ہوں۔ اگر دنیا میں اس کی کسی مرد ذات سے کچھ تھوڑی بہت بے تکلفی تھی تو صرف مجھ سے تھی۔ میں نے خلاف تہذیب و اخلاق اس سے محبت کا اظہار تک کر دیا تھا۔ رواج کے مطابق ان دونوں خاندانوں میں بیٹی والے کسی صورت بھی بیٹے والوں کو رشتہ کی پیشکش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس تھوڑی بے جا بے تکلفی اور منہ پھٹ پنے کی آڑ لیتے ہوئے جو میری مینو کے ساتھ تھی، وہ چاہتی تو میرا جذبہ محبت للکار تو جا سکتا تھا کہ "کہیے محبت و جبت اب بھی باقی ہے یا اس کا مرغا بن چکا"۔ اب اس کا امن میرے دل میں تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ میری چھوٹی بہن اور اپنی سہیلی کی معمولی سی علالت کی خبر پا کر عیادت کو پہنچی تھی۔ گوگل پارہ خانم کو صاحب فراش ہوئے دو دن ہو چکے تھے لیکن اسے نزلے کا معمولی بخار اور آدھے سر کا درد ہی تو تھا۔

چنانچہ شام کی چائے پر جب باہر بجلی چمک رہی تھی اور بادل ایسا گھٹا ہوا تھا جیسے اب برسا، اب برسا میں اس ترک طناز کی مدامی خنداں اور تنقیدی نگاہوں میں نچلا پن دیکھ کر یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ آج یہاں کس مقصد کے لیے پہنچی ہے۔ میرے دل کو یہ تسلی ہو رہی تھی کہ وہی شاخ گل جس کے لیے میں کب سے دل پر ہاتھ دھرے فقیروں کی طرح پلہ پسارے پھر رہا تھا، وہ شاخ گل شجر سے کٹ کر کسی دوسرے کے پلے میں گرنے کو اس طرح لٹک چکی ہے جیسے کسی کا زخمی ہاتھ گلجنڈرے سے کھل کر لٹک گیا ہو۔ آج وہ پلہ جس میں وہ گرا چاہتی تھی، نیچے سے ہٹا لیا گیا تھا۔ اب اسے گرنا تھا تو جوتوں کی جگہ زمین پر یا شجر پر ہی لٹکے لٹکے سوکھ جانا تھا۔ میرے خیال میں اب وہ اتنی عاجز آ چکی تھی کہ اس پس پر میری طرف جھکے کہ میں اسے گرد آلودگی سے بچانے کے لیے اپنا پلہ پسار لوں گا۔

میں نے اسے پورے ایک سال سے نہ دیکھا تھا۔ ہماری آخری ملاقات حدیقہ ہی کے سیندوریئے آموں میں ہوئی تھی۔ جب وہی عشقیہ شادی کا ذکر آیا تھا۔ زیادہ عرصہ گذر جانے کے سبب اب میرے دل میں اس کی وہ تڑپن باقی نہ رہی اور میں اسی لیے متذبذب تھا کہ ایک گرے ہوئے موتی کا مول کروں یا نہ کروں پر آج جو میں نے اس کی مضمحل مضمحل صورت اور نچلی نچلی آنکھیں میز کے دوسری طرف سے دیکھیں تو اوسان بجا نہ رہے۔ میں سوچنے لگا جو وہ مجھ سے سوال کرے "کہیے اب آپ اس نظریئے پر قائم ہیں کہ پہلے پیار اور پھر شادی؟" تو کیا میں اس کا یہ جواب دوں گا۔ "میں اب اس نظریئے پر قائم نہیں ہوں"۔ نہیں میرا جواب تو یہ ہونا چاہیے "مینو مجھے اب بھی تمہاری ویسی ہی آرزو ہے"۔

تو ہم شام کی چائے حدیقہ والی کوٹھڑی کے شرقی حصے میں پی رہے تھے جس کے آگے جھمکدار طوطا پری آمون کی زیبائش تھی۔گل پارہ خانم کا بستر علالت انتہائی جنوبی کمرے تھا۔مینو چائے پی کر اسی کے پاس چلی گئی تھی۔بڑی جنوبی کھڑکی کے پاس صوفہ اس طرح سے رکھا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھ کر باہر دیکھ سکتے تھے۔مینو اسی صوفے پر بیٹھی پیانو بجا رہی تھی کیونکہ گل پارہ خانم کے آدھے سر میں درد ہو رہا تھا۔اور مینو یہ کہا کرتی تھی کہ وہ ایسا پیانو بجاتی ہے کہ کیسا ہی دردسر ہو آرام ہو جاتا ہے،مریضہ کے دردسر کو آرام ہوا ہو یا نہیں،البتہ مینو نے پیانو بجا کر میزبان کو سلا ضرور دیا تھا۔اور تکلف میں سونا بھی آرام کے مترادف ہے،مینو نے یہ غزل چھیڑی ہوئی تھی۔

اس کو پا کر بھی اسے پانے کی حسرت چاہیے
وصل میں بھی چاشنیء درد فرقت چاہیے
گو ہیں ان معصوم آنکھوں میں ہزاروں خوبیاں
کچھ شرارت بھی مگر حسب ضرورت چاہیے
اجنبیت جن کی فطرت، بے رخی جن کا شعار
کچھ نہ کچھ ایسوں سے بھی صاحب سلامت چاہیے

لوکاٹوں کے گھنیرے گھنیرے ماحول میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں اب بھی بول رہی تھیں۔میرا دل مینو سے باتیں کرنے اور دیکھنے کو چاہ رہا تھا۔یہ بات اسے خاص طور پر اور فوراً ہی سنا دینی تھی کہ میں اب بھی اپنے نظریئے پر قائم ہوں اور میں وہی سوختہ سامان ہوں جسے تم یا تمہارے گھر والے مسترد کر چکے ہیں۔

میرے قدم مجھے خود بخود لوکاٹوں کی ٹکڑی میں لے گئے اور خود بخود یا شاید مجھے کھڑکی سے وہاں دیکھ کر مینو بھی ٹیوب ویل کے پاس سے ہوتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔وہ اس جھٹ پٹے کے وقت میرے ساتھ تنہا تھی۔اوپر اب بھی سانجھ چڑیوں نے طوفان بدتمیزی مچا رکھا تھا۔مینو کی وہاں پہنچنے کی علت میری سمجھ میں یہی آتی تھی کہ اسے مجھ سے دریافت کرنا تھا'' کہ کہیے اب کیا ارداہ ہیں''۔ ہم چند منٹ لوکاٹوں میں ٹھہرے ہوں گے،یہ اس نے کچھ کہا ہو لیکن چڑیوں کی بم چیخ نے کچھ نہ سننے دیا،اور جب میں نے کچھ سنا ہی نہ تھا تو جواب کیا دیتا لیکن میں کچھ سنوں یا نہ سنوں۔وہ کچھ کہے نہ کہے۔مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ میری طرف شادی کا ہاتھ بڑھا رہی ہے۔

مینو رات بھر حدیقہ میں ٹھہر کر صبح شاہی کوٹلہ لوٹ گئی۔اس کی اس بے توقع آمد نے میری چاہت کو ہزار گنا رنگ دے دیا تھا۔جب امید بر آنے لگے تو طبیعت بھڑک ہی جایا کرتی ہے۔میں نے گل پارہ خانم کے ذریعے والدین سے کہلوایا،کہ وہ مینو کے لیے ابتداء کریں لیکن وہ تو یہ رشتہ ذرا بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔والدہ برملا کہتی تھی وہ تتلی جسے ہمارے پھولوں پر سایہ ڈالنا گوارہ نہ تھا۔تو جب کسی کل چڑے نے اس کے پروں میں بھمبا کا کھول دیا تو اب وہ ادھر کیوں اڑ کر آنے لگی۔فوجیوں کی کمی نہیں وہ اب بھی کوئی اور فوجی ڈھونڈ لیں''۔بس وہی ادھ کھائے امرود کا مسئلہ درپیش تھا یہ لوگ مینو کو کسی صورت بہو بنانے کو تیار نہ تھے۔

میں نے مینو کو چٹھی لکھی،اس میں کوئی القاب نہ تھا۔

مینو!

تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں تمہارے لیے کب سے بے قرار پھرتا ہوں۔حالانکہ تمہارے والدین مجھے مسترد کر چکے ہیں۔۔۔۔اب کیا ہوگا؟ادھر میرے گھر والے بھی نہیں مانتے تم ہی کوئی ترکیب لڑاؤ۔یہ نہ مانیں تو نہ مانیں میں اس ضمن میں آزاد

ہوں اور تم بھی۔۔۔۔۔

مینو نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔تو میں نے فون پر بات کی۔

''میرا خط پہنچ گیا ہوگا؟''

''جی۔۔۔''

''اور جواب؟''

''ایسے خط شرمندہ جواب نہیں ہوا کرتے آپ سے خط و کتابت روا نہیں''۔

''تو پھر میرے گھر والے تو راضی نہیں''۔

''کیوں؟۔۔۔قصور؟''

''جب تک ہمارے والدین رضا مند نہ ہوں''۔

''تو میں کب تک یوں بیٹھا روتا رہوں''۔

''جب تک پن کال نہ پڑ جائے''۔

جب میں نے یہ داستان شاہی کوٹلہ کے اسی سہ منزلہ پر بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی بھینی بھینی مگن ہوا میں سانس لیتے ہوئے جمالی کو سنائی تو اس نے کہا۔

''عالی خان! سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے میری عدم موجودگی میں کوئی جادو چلاتے ہوئے میرے والدین کو درست کر لیا۔لیکن جب مینو کے گھر پیغام رسانی کی گئی تو وہ نہ مانتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس طرح لڑکی سسرال میں خوش نہ رہ سکے گی۔ حدیقہ والے ہمیشہ سوچتے رہیں گے کہ''اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آ چکا ہے۔ یہ عفیفہ نہیں،اور اسی لیے ہمارے لائق بھی نہیں ہے اسے کیوں سر منڈھا گیا۔ یہ کچوکے کس سے برداشت ہو سکیں گے؟'' شادی اب پھر جوکھوں میں پڑ گئی تھی۔ جمالی مینو کے گھر جانے کو تیار نہ تھا،البتہ اس نے اس کنیز کو وہاں بھیجا جس نے مرمریں صحن میں اس رات شور مچایا تھا۔اس کنیز کے ساتھ ایک مفصل خط مینو کا دوپٹہ، رومال اور کانوں کا ایک جواہر جڑاؤ آویزہ بھی تھا۔اس واقعے کی تہہ میں جمالی کی تیز ذہنیت کارفرما تھی۔ یہ تکلف اس نے میرے لیے پیدا کیا تھا۔حسن جہاں افروز بیگم مینو سمپورن تھی۔امرود کے کسی کے ہونٹ تک مس نہ ہوئے تھے لنکا کے کوٹ میں تا حال ایک ٹانکی نہ پڑی تھی۔ یہ سارا کھیل جمالی نے اپنی بات پوری کرنے کو رچایا تھا۔

اب عفیفہ کا رشتہ بدر سے بھی ہو سکتا تھا لیکن اس طرف جو سرد مہری برتی گئی اس نے پالا جیتا دیا۔ بدر بہت تڑپا لیکن اس نے تو چراغ سے اپنی بتی خود ہی نکال لی تھی۔اب وہ چراغ دوسرے کی بتی سے روشن ہونے والا تھا اور یہ روشنی یقیناً زیادہ اجلی اور دیرپا ثابت ہونے والی تھی۔سیکنڈ لفٹیننٹ بدر کو دوسرا موقع کون دیتا۔

جھر جھرے جھر جھرے سفید بادلوں میں نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔صحن چمن میں موسری کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے تیلیا نیلے بازؤں اور سفید پیٹ والے پہاڑی کستورے ٹرٹر کرتے ہوئے کوٹھے کے پیش گاہ پر اڑتے بیٹھتے پھر رہے تھے۔ان کی ٹرٹر سے چاؤ کی خوشی پھوٹ رہی تھی۔ میں شام کے وقت لان میں سوگی اور کسمسایہ بیٹھا پیڈسٹل پنکھے کی ہوا کھا رہا تھا کہ جمالی نے آ کر مجھے یہ فرحت آمیز خبریں سنائیں۔اور میں نے اس کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر از راہ تشکر چوم لیا جو اس کی کوشش نہ ہوتی تو معاملہ پھر کھڑاک میں پڑ گیا تھا۔ مجھے اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ جنگلی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا پھرنے لگوں۔

جب اہل حدیقہ اور شاہی کوٹلہ والوں کی باہمی غلط فہمیاں دور ہو گئیں تو میں اور مینو دلہا دلہن بن گئے، میں نے اول

ملاقات میں اس سے کہا۔

''پہلے پیار پھر شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار''۔

''پہلے تو میرا **نظریہ** اس سے کچھ مختلف تھا۔ اب اپنا **نظریہ** کوئی **نظریہ** نہیں رہا''۔

''کس لیے''۔

''اس لیے کہ اب تو شرعاً و عرفاً جو آپ کا **نظریہ** ہے، وہی میرا بھی ہے!''

''پہلے تو آپ مجھے لاجواب کر لیے دیا کرتی تھیں''۔

''اب آپ ہی وہ دستورالعمل چھوڑ چکی ہیں، اب تو لاریب آپ کی رضا میری رضا ہے۔ اور وہ جو پہلے مجھ میں دغل فصل معلوم ہوا کرتا تھا وہ دغل فصل ہرگز نہیں تھا مجھے تو آپ سے بڑی نزدیک کی نسبت تھی آپ تو شہ رگ سے بھی زیادہ میرے قریب ہیں۔ لیکن میری جبلت تربیت، وضع داری نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ میں آپ کو جواب یا صواب نہیں دے سکتی تھی۔ مسیح مرد ہونے کے باوجود جب مصلوب کیے گئے تو چلائے تھے۔ آٹھ پہر ضبط کی سولی پر ہونے کے باوجود میرے منہ پر نالہ و فریاد نہ تھا۔ میں اپنے ضبط کی خود آپ کی داد دیا کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی میرا قدم بھی ڈگمگانے لگتا تھا۔ مثلاً جب آپ سپر سپر چائے پی رہے تھے تو آپ نے مجھے قتل ہی تو کر ڈالا تھا۔ آپ کے سپر سپر کرتے ہوئے ہونٹ کی جنبش کیا بتاؤں کیسی معلوم ہوتی تھی، بس میں بتا نہیں سکتی''۔

''پر آپ تو مجھے چڑانے کے لیے خود بھی سپر سپر چائے پینے لگی تھیں''۔

''آپ نے وہ سپر سپر تو ملاحظہ فرمائی تھی لیکن یہ ملاحظہ نہ فرمایا تھا کہ میں اپنے ہونٹ بھی تو کاٹ رہی تھی''۔

''لیکن جو کہیں آپ کی شادی اس فوجی سے ہو جاتی تو کیا آپ کو پھر بھی میرا خیال رہ سکتا تھا؟''

''کبھی کبھی نہ رہ پاتی جو میں اس کی ذرا سی سرسراہٹ محسوس کرتی تو اسے اس طرح علیحدہ کر دیتی جیسے ترازو کے پلڑے سے تولا ہوا بوجھ، اور میں اپنی طبیعت بدر سے ذوق و شوق کے ساتھ باندھ لیتی''۔

☆☆☆

سہرا

خدیجہ مستور

کل ساجد میاں کا نکاح تھا مگر خوشی کی بجائے ان کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے بار بار کہہ رہے تھے۔ ''اے بڑی بجیا آپ اچھی طرح سن لیں میرا بستر ہمیشہ کی طرح اماں بی کے کمرے میں بچھا رہے گا۔ اسے کوئی نہیں ہٹائے گا اور آپ بھی سن لیں چھوٹی بجیا، اب آپ میرا بستر اٹھوانے کی بات نہیں کریں گی، کیا سمجھیں آپ؟''

''تو کیا تم اب بھی دودھ کی بوتل نہیں بھولے؟'' چھوٹی بجیا کی کترنی جیسی زبان چلتی اور وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگتیں۔ اور ساجد میاں دانت پیس کر رہ جاتے۔ گھر میں ایسی دھما چوکڑی مچی تھی کہ کوئی کسی کی بات نہ سمجھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔ رشتے ناطے کی بھاوجوں اور خاندان کی ڈھیروں لڑکیوں کا جھمگٹ ڈھول پیٹ پیٹ کر گائے چلے جا رہا تھا ''پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا۔۔۔''

اپنا سہرا سن کر بھی ساجد میاں کی آنکھوں کی وحشت کم نہ ہوئی۔ ایسا لگتا کہ سہرا گلاب کے پھولوں کی بجائے کانٹوں سے گوندھا گیا ہے اور وہ کانٹے ان کی آنکھوں میں چبھ رہے ہیں۔ موٹی موٹی بادامی پتلیوں والی بے چین آنکھیں گھوم پھر کر اپنی اماں بی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی، نڈھال، لٹا لٹا سا چہرہ، پیروں پر لحاف ڈالے اپنے بستر پر بیٹھی تھیں مگر جب لڑکیاں لہک کر گاتیں ''دوڑ کر سہرے کی اماں نے بلائیں لے لیں'' ارے اماں نے بلائیں لے لیں۔ تو ان کے بچے کھچے ہلتے ہوئے دانت سہرے کی لڑی کی طرح ہونٹوں پر بکھر جاتے۔

''میں کتنی بار کہوں کہ اب آپ تھک گئی ہیں، ذرا دیر کو سو جایئے۔ میں بھی لیٹ جاتا ہوں''۔ ساجد میاں اپنے بستر پر بیٹھ کر جوتوں کی ڈوریاں کھولنے لگے۔

''لو بھلا میں کیسے سو جاؤں۔ ابھی تو بہت سے کام پڑے ہیں چھوہاروں کے تھال پوشوں پر گوٹا ٹانکنا ہے۔ سہرے اور پھولوں کے زیور کا آرڈر دلوانا ہے۔ سہرا گھٹنوں سے نیچا ہو، لڑکیاں تو بس گانے بجانے میں جتی ہوئی ہیں''۔

اب بھلا اماں بی سے کون کہتا کہ جس طرح تمام کام ان کی دونوں بیٹیوں نے اپنی مرضی سے کر لیے تھے اسی طرح رات کو گانے بجانے تھال پوشوں پر سنہری گوٹے کی بجائے دو پہلی گوٹا ٹانک دیا تھا۔ سہرے کا آرڈر بھی دیا جا چکا تھا۔ ایسا سہرا جو قدموں کو چھوئے۔ اماں بی کی اس بات کو کون مانتا تھا کہ پھول پیروں تلے آئیں تو پھولوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

''سب کام ہو جائیں گے اماں بی۔ آپ پہلے ہی حکم دے چکی ہیں۔ دن کے دو بج رہے ہیں اب آپ ذرا دیر آرام کیجئے۔ اے بڑی بجیا''۔ انہوں نے زور سے آواز دی۔ ''اے بڑی بجیا۔ کوئی نہیں سنتا۔ اے چھوٹی بجیا۔ خدا کے واسطے تھوڑی دیر کے لیے ڈھول اٹھا دیجئے۔ اماں بی کو سو جانے دیجئے''۔

''کوئی نہیں سوئے گا، ڈھول نہیں اٹھے گی''۔ چھوٹی بجیا نے چیخ کر جواب دیا۔ اب ساری آوازوں میں ان کی آواز سب سے اونچی تھی۔ ''دوڑ کر اماں نے سہرے کی بلائیں لے لیں ارے بہنوں نے بلائیں لے لیں۔ پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا''۔

''مت روکو بیٹے۔۔۔ گانے دو۔ یہ میری آخری خوشی ہے نیند کا کیا ہے جب فرصت ملے سو جاؤں گی''۔ اماں بی نے بڑی محبت سے ساجد کو دیکھا اور پھر بستر پر لیٹ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ ساجد میاں جھپٹ کر اٹھے اور کمرے کے سب دروازے بند کر

دیئے۔اب آوازیں جیسے کہیں دور سے آ رہی تھیں۔

''بس اب آپ سو جائیں''۔ ساجد نے اماں بی کی طرف سے کروٹ لے لی۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اماں بی اگر دوپہر کو نہ سوئیں تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ڈسپنسری سے ایک ڈیڑھ بجے ضرور گھر آ جاتے انہیں یہ بھی پتا تھا کہ جب تک وہ خود بھی اپنے بستر پر نہیں لیٹیں گے اماں بی کو نیند نہیں آئے گی۔

جنریشن گیپ کے اس شدت پسند زمانے میں بہت سے لوگ ساجد میاں کو حیرت سے دیکھتے۔ شاید انہیں مہذب ملکوں کے وہ بوڑھے یاد آ جاتے ہوں گے جو چھترے سفید بالوں والے سروں پر پرانی وضع کے ہیٹ رکھے راہوں میں پڑی ہوئی بنچوں پر پہروں بیٹھے رہتے ہیں۔ ترستی ہوئی نگاہوں سے دنیا کی ہماہمی کو دیکھتے ہیں۔ پھر جانے ان کے جی میں کیا خیال آتا ہے کہ ہیٹ آنکھوں پر کھینچ کر اونگھنے لگتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ تم اتنی دیر سے یہاں کیوں بیٹھے ہو اور اب تم اپنے بیٹوں کی دنیا میں چھپ کر کون سے خواب دیکھ رہے ہو۔

''ساجد''۔۔۔۔اماں نے ہولے سے پکارا۔

''جی اماں بی''۔ ساجد میاں نے اماں بی کی طرف کروٹ بدل لی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہارا پلنگ یہاں سے اٹھوا کر اسٹور میں رکھوا دوں؟''

''اب اس کی یہاں کیا ضرورت رہ گئی ہے''۔

اماں بی اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''چھوٹی بجیا نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ بڑی بجیا نے بھی یہی فرمایا تھا اور میں نے ان دونوں سے کہا تھا کہ یہ پلنگ یہیں بچھا رہے گا۔ آپ بھی سن لیں اس پلنگ کو یہاں سے کوئی نہیں ہٹا سکتا''۔ ان کی آواز میں بے حد دکھ تھا۔

''ارے پگلے یہ بستر تو تیری ذات سے سجا ہوا تھا، تیری وجہ سے میں اکیلی نہیں تھی۔ رات سوتے سوتے کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو۔۔۔۔''ان کی آواز بھرا گئی۔

یہ بستر اسی طرح سجا رہے گا اماں، میں کہاں جا رہا ہوں بھلا؟ آپ ایسی باتیں مت سوچیے''۔

ساجد میاں نے اماں بی کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ گردن تک لحاف اوڑھا اور پھر تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ململ کے سفید جھاگ جیسے دوپٹے کو چہرے پر ڈال لیا۔ یہ ان کے سونے کا اعلان تھا۔

ساجد جب چھوٹے سے تھے تو برسات کے موسم میں مکھیوں کے گچھے ان کے منہ پر آ آ کر بیٹھتے تو اماں بی پریشان ہو کر اپنے سر سے ململ کا دوپٹہ اتار کر ان کا چہرہ ڈھانک دیا کرتیں۔ مگر اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی ان کی یہ عادت نہ چھوٹی۔ اماں کا دوپٹہ آنکھوں پر ڈالے بغیر انہیں نیند نہ آتی۔۔۔۔

منہ چھپا کر وہ تو اپنے حساب سے سوتے بن گئے۔ مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ اماں بی مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑے انہیں کس طرح دیکھ رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کمرے کی ہر چیز گھوم رہی تھی۔ دل پر عجیب سا ہول طاری تھا۔ انہوں نے اٹھ کر ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تو دروازے تک پہنچنے کا راستہ نہ مل رہا تھا۔ جیسے بھول بھلیاں میں پھنس گئی ہوں۔ اتنی بڑی بات سننے کے لیے بھی تو ہمت چاہیے۔ وہ ہڑبڑا کر ساجد میاں کے پلنگ سے ٹکرائیں۔

کیا ہے اماں بی؟ وہ جیسے کود کر کھڑے ہو گئے اور ڈولتی ہوئی اماں بی کو اپنے بازوؤں میں تھام کر بستر پر بٹھا دیا۔

''یہ آپ کدھر جا رہی تھیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ سو جائیے''۔

’’نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا لڑکیوں کے پاس جا بیٹھوں مگر بیٹے تم تو میرا سایہ بن گئے ہو‘‘۔
’’بس اب آپ نہیں اٹھیں گی‘‘۔ ساجد میاں نے اماں کو لٹا کر لحاف اوڑھا دیا اور انہوں نے بھی ساجد کو دکھانے کے لیے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیں مگر نیند خاک آتی۔ وہ ایک سوال سوچے جا رہی تھیں۔ لو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا بستر پہلے کی طرح کیسے سجا رہ سکتا ہے اتنی بڑی بات اس نے کہی کیسے اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے تو پھر۔۔۔۔ سب گھنے گھنے طعنے دیں گے۔ اماں سے اتنی ہی محبت ہے تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔
طعنوں کے خیال ہی سے اماں بی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اتنی سردی میں پسینے چھوٹ گئے۔ اماں بی تکیے میں منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگیں۔ ’’میرے بچے، میرے لعل، ماں صدقے، ماں تیری محبت پر سے واری‘‘۔ ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔
چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اماں بی کے شوہر عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اماں بی نے محلے کی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھا پڑھا کر بچوں کو پالا۔ دونوں لڑکوں کو پڑھایا۔ دونوں لڑکیوں کا جہیز جوڑا۔ جیسے تیسے لڑکیوں کی شریف گھرانوں میں شادیاں کیں۔ اماں بی جیسی نیک اور سمجھ دار بی بی کی سارے خاندان میں دھوم مچی تھی۔ ماں اگر مصیبتوں سے ذرا بھی گھبرا جائے تو یتیم بچے بہک جاتے ہیں مگر اماں بی نے تو بچوں کو کبھی یتیمی کا احساس ہونے ہی نہ دیا۔ دونوں لڑکوں کی تعلیم پر اتنی توجہ دی کہ وہ کتاب کا کیڑا بن گئے۔ ماجد میاں بڑے تھے۔ چھٹی کلاس سے وظیفہ لینا شروع کیا تو ساجد میاں بھی مقابلے پر اتر آئے۔ ماجد میاں نے ایف ایس سی نان میڈیکل کا امتحان دیا تو پھر وظیفے کے مستحق قرار پائے۔ ساجد نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن پائی خاندان والے مبارک سلامت کا شور بھی مچاتے اور جی ہی جی میں کڑھتے بھی۔ وہ اپنے مسٹنڈے بیٹوں کو گلے گلے تک نعمتیں ٹھونساتے مگر کوئی بھی امتحان میں سیکنڈ ڈویژن سے آگے نہ جاتا۔ یہاں یہ حال کہ دال روٹی اور کبھی کبھار گائے کا گوشت کھانے والے ہوا پر اڑے جا رہے تھے۔
ماجد انجینئرنگ کالج میں تیسرے سال کا امتحان دے رہے تھے کہ ساجد نے ایف ایس سی میڈیکل میں ٹاپ کیا اور آرام سے میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔ اس دن اماں بی نے خدا کے حضور میں سارا دن عبادت میں گزارا۔
وقت جب امیدوں اور آرزوؤں سے بھرپور ہو تو گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ماجد نے انجینئرنگ کالج سے آخری سال کا امتحان دیا اور اول آ کر سب کو حیران کر دیا۔ انہیں انگلینڈ جانے کے لیے سرکاری وظیفہ بھی مل گیا۔ سارا خاندان اماں بی کی اس خوش نصیبی پر ٹوٹ پڑا۔ جو کبھی دو پیسوں کی مدد کے روادار نہ تھے۔ مٹھائیوں کے ڈبے اٹھائے چلے آ رہے تھے، مگر اماں بی کی عجیب حالت تھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ’’میں نہیں جانے دوں گی۔ بیٹیاں پرائی ہو گئیں۔ یہی دونوں لڑکے میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میرے بڑھاپے کی لکڑی ہیں۔ میں کسے تھام کر چلوں گی‘‘۔
سب حیران تھے کہ گھر آئی دولت کو کوئی اس طرح ٹھکراتا ہے۔ سب کو ان کی دانائی پر شبہ ہونے لگا۔ سب انہیں خود غرض سمجھنے لگے۔ بیٹیوں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ آپ ماجد بھائی کے روشن مستقبل کو لات مار رہی ہیں۔ ماجد اماں بی کو لپٹائے بڑی مظلومیت سے بیٹھے تھے۔ وہ اماں بی کے انکار پر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اماں نے روتے روتے ایک بار غور سے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور آنسو پونچھ لیے۔ ’’جائے گا، میرا بیٹا ضرور جائے گا‘‘۔ انہوں نے سب کے سامنے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا۔ ’’میں تو یوں ہی رو رہی تھی، بس یوں ہی‘‘۔
ماجد میاں جب جانے لگے تو سب نے محسوس کیا ساجد اپنے بھائی کو رخصت کرنے ہوائی اڈے پر بھی نہیں گئے۔ وہ گھر

میں بیٹھے اماں بی کو لپٹائے ان کے آنسو پونچھتے رہے۔اس کے بعد تو وہ ایسے اماں بی کا سایہ بن گئے۔اپنا بستر اماں کے بستر کے قریب بچھا لیا۔کالج اور پھر گھر رات گئے تک پڑھتے رہتے۔اماں بی کے خراٹے انہیں ذرا بھی پریشان نہ کرتے۔کبھی کبھی سوتے میں وہ روتیں۔ماجد کو آوازیں دیتیں۔تب وہ کتابیں چھوڑ کر اٹھتے اماں بی کے سینے پر سر رکھ کر انہیں جگاتے۔ان کے آنسو پونچھتے اور اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے انہیں نیند کی ایک اور گولی کھلا دیتے۔

کبھی کبھی اماں بی پوچھتیں۔جب تم یہاں کی پڑھائی ختم کر لو گے تو کیا پتا تم کو بھی سرکار وظیفہ دے دے۔تم پڑھائی میں ہمیشہ اچھے رہے ہو۔تم نے ہمیشہ وظیفہ لیا ہے۔

ساجد میاں ہنس پڑتے۔اماں بی میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔میں ایسے وظیفوں پر تھوکتا بھی نہیں''۔

پھر بھی شک کی سل اماں بی کے سینے کو کچلتی رہتی۔

بہنوں نے ساجد کو جب اس طرح اماں کی پٹی سے لگا دیکھا تو سلگ اٹھیں۔''کوئی حد بھی ہوتی ہے۔مہینوں ساجد بھائی کی صورت نہیں دکھائی دیتی۔اماں بی آپ نے انہیں لونڈیا بنا کر گھر بٹھا لیا ہے۔اللہ حافظ ہے جو امتحانوں میں بھی پاس ہوں''۔

اماں بی ساری باتیں خاموشی سے سہہ جاتیں اور ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتیں۔بیٹیوں کو یہ بھی نہ دکھائی دیتا کہ انکی اماں کتنی لٹ گئی ہیں۔ماجد کی جدائی نے انہیں ایک دم سے بوڑھا کر دیا ہے۔جب ماجد کے خط آتے تو پہروں انہیں آنکھوں سے لگائے بیٹھی رہتیں۔

دو سال بعد ماجد وطن واپس آئے تو تحفوں سے لدے پھندے تھے۔دونوں بہنیں بھائی سے مرعوب ہو کر جیسے بچھی جا رہی تھیں۔اترا اترا کر خاندان والوں کو تحائف دکھا رہی تھیں اور اماں بی کو ماجد اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ جی چاہتا اٹھا کر پلکوں پر بٹھا لیں۔

اتنی اعلیٰ تعلیم کے بعد ماجد کو ملازمت تو مل گئی مگر ماجد میاں بجھ سے گئے۔آٹھ نو سو روپے ان کی بھنویں تلے نہ آتے پھر بھی کسی سے کچھ نہ کہا۔سارا دن جانے کن چکروں میں پھرا کرتے اور شام کو گھر آتے تو اماں بی کی گود میں سر رکھ کر اپنے شاندار مستقبل کی باتیں کرتے رہتے۔اماں بی ان باتوں کو سن کر نہال ہوتی رہتیں۔وہ بڑے چاؤ سے ساجد کو بھی ان باتوں میں شامل کرنا چاہتیں مگر وہ سر جھکائے پڑھنے میں مصروف رہتے۔

ماجد کبھی کبھی ساجد پر اعتراض کرتے۔''یار یہ تم لونڈیوں کی طرح سر جھکائے بس پڑھتے ہی رہتے ہو۔کسی وقت باہر بھی نکلا کرو۔دنیا کو دیکھو اور سمجھو''۔

''باہر گھومے تو پڑھے خاک۔پتا ہے کتنی مشکل پڑھائی ہے۔ڈاکٹر بننا کوئی آسان کام تو نہیں۔تم کو کیا معلوم، تمہاری جدائی نے مجھے کتنا کمزور کر دیا ہے جب میرا بیٹا ڈاکٹر بن جائے گا تو پھر میرا علاج کرے گا''۔اماں بی چاؤ سے کہتیں۔

ایک سال ملازمت کرنے کے بعد ماجد نے بڑے آرام سے اماں کو بتایا کہ وہ واپس انگلینڈ جا رہے ہیں۔یہاں ان کے علم کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ اس سے کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔چند لمحوں تک اماں بی پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی مگر جب ماجد نے انکی گود میں سر رکھ کر انکی اجازت چاہی تو وہ بڑی مشکل سے ہاتھ اٹھا کر ان کے سر پر رکھ سکیں، انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جسم و جاں کا ایک ایک چپہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہے۔

ماجد نے بڑے لاڈ سے اماں بی کے گلے میں جھول جھول کر انہیں سمجھایا۔''اماں بی صرف چند برسوں کی بات ہے۔وہاں سے میں آپ کو اتنا کما کر بھیجوں گا کہ آپ ماضی کے سارے دکھ بھول جائیں گی۔یہ تین کمروں کا پرانا مکان کوٹھی میں بدل جائے گا۔بس آپ ایک اچھی سی بہو ڈھونڈ رکھئے گا اور۔۔۔۔۔'' وہ اور جانے کیا کچھ کہتے رہے مگر اماں بی نے کچھ بھی نہ سنا۔ان

کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر چند دن بعد ماجد چلے گئے۔ دونوں بہنوں اور بہنوئیوں نے ڈھیر ساری فرمائشوں اور خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ اس وقت کسی نے بھی پلٹ کر یہ نہ دیکھا کہ اماں بی آنگن کی پرانی کائی لگی دیوار سے ٹیک لگائے کیوں چپ چاپ کھڑی تھیں۔ کسی کو یہ نظر نہ آیا کہ وہ اس دکھیا کی طرح سر سے پاؤں تک جل رہی ہیں جو نہ تو کوئلہ ہوئی نہ راکھ۔ جب ساجد، بھائی کو رخصت کر کے لوٹے تو انہوں نے اماں بی کو لپٹا لیا۔ ''اماں بی، میں جو ہوں آپ کے پاس''۔

محبت کے ٹھنڈے چھینٹوں نے ان میں اتنی جان ڈال دی کہ وہ آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں اور ساجد کا سر اپنے سینے سے لگا کر ماجد کو دعائیں دینے لگیں۔ ''خدا کرے میرا بیٹا وہاں خوش رہے۔ اس کا مستقبل چاند اور تاروں کی طرح روشن رہے اور تم میرے بیٹے مجھ سے کبھی جدا نہ ہونا''۔

پندرہ بیس دن بعد ماجد کا خط آیا تو اماں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''ارے کتنا بے وقوف ہے، مجھے یاد کر کے روتا ہے۔ کوئی ہمیشہ تو وہاں نہیں رہے گا۔ ایک سال بعد آ جائے گا''۔

سارا دن خط کو چومتی اور بار بار پڑھتی رہیں۔

ایک سال کے اندر اندر ماجد نے اماں بی کو اتنا کچھ بھیجا کہ انہوں نے پانچ کمروں کی چھوٹی سی کوٹھی بنوالی۔ پھر کمروں کی تقسیم بھی کر دی۔ سب سے بڑا کمرہ ماجد کا۔ اس سے چھوٹا ساجد کا، اس سے چھوٹا ان کا اپنا۔ کوٹھی بنانے کے بعد وہ چپکے سے ماجد کی دلہن کی بری کا سامان خریدنے لگیں۔ اب ان کی خواہش تھی کہ ماجد واپس آ جائے، وہ ہر ایک سے کہتی رہتیں۔ ''مامتا کوٹھیوں میں رہے یا محلوں میں بچے جدا ہوں تو سب کھنڈر معلوم ہوتا ہے''۔

سارا خاندان ان کی یہ باتیں سن کر بڑبڑاتا ''تو یہ کیسی ناشکری ماں ہے۔ ماجد یہاں رہتا تو کون سے سونے کے انڈے دیتا۔ کیا رکھا ہے یہاں''۔

کبھی کبھی ساجد جواب دے بیٹھتے ''کیا نہیں ہے یہاں درختوں کو پالو پوسو اور جب وہ پھل دیں تو دوسرے ملکوں میں کھانے کو بھیج دو۔ واہ کیا بات ہے''۔

بہنوں نے یہ باتیں سنیں تو پنجے جھاڑ کر ساجد کے پیچھے پڑ گئیں۔ اب دیکھیں گے تم ڈاکٹر بن کر کیا کرو گے۔ آج کل ایم بی بی ایس کو کون پوچھتا ہے۔ کسی سڑی سی گلی میں ڈسپنسری کھولو گے اور سارا دن بیٹھے مکھیاں مارا کرو گے۔ پیسے والے تو بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں''۔

''اچھی بات ہے، اس گلی کی مکھیاں تو مر جائیں گی''۔ ساجد ہنستے تو بات ٹل جاتی۔ ایک سال تک ماجد کا خط نہ آیا۔ اماں بی کی آنکھوں میں انتظار کی آندھیاں آتیں مگر کوئی خط اڑ کر نہ آتا۔ وہ ساجد سے کچھ نہ کہتیں۔ وہ اسے پریشان نہ کرنا چاہتی تھیں۔ آخری امتحان میں ایک دو مہینے رہ گئے تھے۔

آخر آندھی تھمی۔ ماجد کا خط آ گیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے وہاں شادی کر لی ہے۔ وہیں کی شہریت اختیار کر لی ہے۔ شادی کے وقت اسے اماں بی بہت یاد آئیں۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر ایلس نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تسلی دی تو قرار آ گیا۔ آخر میں لکھا تھا کہ آپ کی بہو آپ سے ملنے کو بے چین ہے۔

اماں بی خط پڑھنے کے بعد دیر تک اکیلی بیٹھی کانپ کانپ کر روتی رہیں۔ انہیں ایلس کی ذات سے نفرت ہو گئی۔ شام کو دونوں بیٹیاں اماں بی کے پاس آئیں۔ دونوں رنجیدہ تھیں۔ دونوں ایلس کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ اماں بی نے

پہلی بار بیٹیوں پر طنز کیا۔

''اس کا مستقبل بن گیا۔ اب تم لوگ خوش ہو، تمہاری خواہشیں پوری ہو گئیں''۔

بڑی بیٹی تو اس وقت چپ ہو گئی مگر چھوٹی بیٹی کس طرح چپ رہتی ''کوئی ہم نے سکھا کر بھیجا تھا کہ وہاں پھیکے شلجم سے شادی کر لینا، وہیں کے ہو رہنا آخر تو دنیا علم سیکھنے جاتی ہے۔ لوگ اسی طرح ترقی کرتے ہیں۔ آپ کو تو بس الزام رکھنا آتا ہے''۔

اس دن پہلی بار ساجد نے اپنی چھوٹی بجیا کو ڈانٹا ''کسی وقت تو آپ اپنی زبان کو قابو میں بھی رکھا کریں''۔

''کیوں قابو میں رکھوں؟ ماجد یہاں ہوتے تو شادی نہ کرتے۔ کون سا اماں کے پہلو سے لگے بیٹھے رہتے۔ اب تم نہ کرنا شادی ہاں''۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اماں بی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ''جب ساجد شادی کرے گا تو۔۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔۔؟''

رات کو جب اماں بی کی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو اماں بی چپکے سے بکس روم میں گئیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑے بکس کا تالہ کھولا اور ماجد کی دلہن کے لیے جو بری بنائی تھی اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر بکس کو بند کر کے جب وہ تالہ لگانے لگیں تو جیسے سارے جسم کی طاقت ان کے ہاتھوں میں آگئی۔ ''اب یہ تالہ کبھی نہیں کھلے گا''۔ وہ زیر لب بڑبڑائیں اور پھر بڑے سکون سے آکر اپنے بستر پر بیٹھ گئیں۔

جس دن ساجد نے ایم بی بی ایس کے آخری سال کا امتحان دیا تو اس دن اماں بی سارا دن خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہیں کہ ان کا بیٹا اچھے نمبروں سے پاس نہ ہو۔ اسے اب کوئی وظیفہ نہ ملے۔

مگر چند ماہ بعد نتیجہ نکلا تو دعاؤں کے برعکس تھا۔ سارا خاندان مبارک بادوں سے جھولیاں بھرے سارے گھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔

''میں تو کہتی ہوں اماں بی ساجد کو سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ماجد کے پاس بھیج دیجئے اب تو وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ ایلس ایسی بری بھی نہیں۔ اگر بری ہوتی تو ماجد بہنوں کو کس طرح پوچھ سکتا تھا۔ ابھی اس نے بچوں کو روپے اور کپڑے بھجوائے تھے۔'' بڑی بیٹی نے نظریں جھکائے جھکائے اماں بی کو مشورہ دیا۔ اس وقت کلرک شوہروں کی بیویوں کی ازلی مظلومیت ان کے چہرے پر برس رہی تھی۔ اگر ساجد بھی چلا جاتا تو دونوں بہنوں کے حق میں بہت اچھا ہوتا اور پھر انہیں یہ بھی پتا تھا کہ ماجد کے مقابلے میں ساجد بہنوں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

''اماں بی اگر مائیں اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر نہ کریں گی تو پھر کون کرے گا؟'' چھوٹی بیٹی نے ماں کو گم سم دیکھ کر بڑی بہن کا ساتھ دیا۔۔۔ اماں بی سامنے بیٹھے ہوئے ساجد کی آنکھوں میں عجیب طرح سے جھانک رہی تھیں۔

''چھوٹی بجیا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں کسی گلی میں ڈسپنسری کھولوں گا۔ میں یہیں رہ کر اپنی بہنوں کی زیادہ خدمت کروں گا''۔ ساجد نے اس طرح کہا کہ اس لہجے کا طنز نمایاں تھا۔

دونوں بہنیں اس طرح بپھر گئیں جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''مت جاؤ، ہمیں کیا، جب تمہاری ڈسپنسری پر مکھیاں بھنکیں گی تو پھر پوچھوں گی''، بڑی بجیا کھسیانی ہو رہی تھیں۔

''تم آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ تیس چوبیس سال کے پورے آدمی ہو اور ننھے بچوں کی طرح اماں بی کی پٹی سے پٹی جوڑ کر سوتے ہو، مگر بات اس طرح کرتے ہو جیسے اپنی بہنوں کے ان داتا ہو۔ ارے بھیا تم ترقی کرو گے تو ہم خوش ہوں گے اور بس''۔

چھوٹی بجیا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

ساجد کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی دونوں بہنیں ناراض ہو کر چلی گئیں۔ اماں بی خاموش بیٹھی سب کا منہ تکتی رہ گئیں۔ ویسے بھی اب ان میں اتنی طاقت کہاں رہ گئی تھی کہ جلدی سے اٹھ کر روٹھی ہوئی بیٹیوں کو منا لیتیں۔ ماجد کی جدائی، ڈائن بن کر انہیں چاٹ گئی تھی، اس پر یہ فکر کہ اگر ساجد کی ڈسپنسری نہ چلی تو۔۔۔۔۔۔؟

ساجد میاں کی ڈسپنسری اور ان کے ہاتھ کی شفا ایسی مشہور ہوئی کہ جو عزیز رشتے دار چھوٹے ڈاکٹروں کے پاس بھی نہ جاتے وہ بھی مفت علاج کرانے دوڑ پڑے اور اماں بی کے سینے پر دھری ہوئی شک کی سل بھی آخر کو سرک گئی۔ پھر بھی رات کو سوتے سوتے ایک بار ہاتھ بڑھا کر ساجد کے سر کو چھوتیں اور پھر اس احساس کے ساتھ سو جاتیں کہ وہ ان کے پاس ہے۔

خواب آور دوائیں کھانے کے باوجود کبھی کبھی انہیں رات دیر سے نیند آتی۔ وہ سوچتیں کہ اب ساجد کی شادی کر دیں۔ مگر اس خیال ہی سے وہ الجھ کر رہ جاتیں کہ تنہائی اور بڑھاپا ان سے کیا سلوک کرے گا۔ ساجد بھی ماجد کی طرح بدل نہیں جائے گا۔ خاندان والے طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ بیٹیاں ان کے منہ پر کہہ گئی تھیں کہ اماں بی ساجد کی شادی نہیں کریں گی۔ اسے کولہے سے لگائے لگائے بوڑھا کر دیں گی۔ انہوں نے بڑی صفائی سے کہا تھا کہ جب ساجد اپنے ہم عمروں کو چار چار بچوں کا باپ دیکھتا ہوگا تو کیا سوچتا ہوگا۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی وہ جیسے بہری بن جاتیں۔

بہت مدتوں کے بعد ماجد اور ایلس کا خط آیا تھا۔ ایلس کا خط پا کر انہیں بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس نے بڑی صاف اردو میں پہلی بار اپنی ساس کو خط لکھا تھا۔ ماجد کے خط میں خاص بات یہی ایک تھی کہ وہ اپنی اماں بی کو بہت یاد کرتا ہے۔ وہ بہت مصروف تھا۔ اس لیے خط نہ لکھ سکا۔۔۔۔۔۔ اور ایلس نے لکھا تھا۔

اماں بی۔۔۔۔۔ کل جب ماجد کو کاموں سے فرصت ملی تو وہ آپ کو یاد کر کے بہت رویا۔ وہ ضد کر رہا تھا کہ فوراً اپنی اماں بی سے ملنے جائے گا۔ وہ اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ جلد پھر باپ بننے والا ہے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ وہ لوگ جن کا حال ان کی دسترس سے باہر ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور وہ لوگ جن کا مستقبل انتظار کر رہا ہے۔ آخر انہیں ایک دوسرے کی جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے اور۔۔۔۔۔۔

اماں بی نے خط کو لفافے میں بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ سارا خط پڑھنے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ دیر تک تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہیں اور چہرے کی جھریوں کی تہوں میں لکھی ہوئی مستقبل کو جنم دینے والی ماضی کی داستان آنسوؤں سے ڈھلتی رہی۔

رات جب ساجد میاں اماں بی کے ململ کے سفید جھاگ جیسے دوپٹے کو آنکھوں پر لپیٹے سونے کی کوشش کر رہے تھے تو اماں بی نے ان کو آہستہ سے پکارا۔

''ساجد بیٹے؟''

''ارے آپ ابھی تک سوئی نہیں اماں بی؟''

''بیٹے۔۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب تمہاری شادی کر دوں''۔

''شادی؟'' ساجد میاں حیرت کدہ بن گئے۔ وہ بیٹھ کر اماں بی کا منہ تکنے لگے۔ وہ تو شادی کا خیال ہی دل سے نکال چکے تھے۔ شادی کے خوب صورت تصور میں انہوں نے کتنی راتیں گزاری تھیں۔ کتنے خوابوں میں ایک سے ایک خوبصورت دلہن نتھ اور ٹیکا چمکاتی ان کے سینے کو روندتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔

''تم حیران کیوں ہو رہے ہو بیٹے؟'' اماں بی تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''اماں، میں شادی نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی محبت میں کوئی اور حصے دار بنے۔ انہوں نے بہت صاف آواز میں جواب دیا۔

''بیٹے وہ لوگ جن کا دل ان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوا نکے مقابلے میں وہ لوگ جن کا مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہو۔ انہیں آخر ایک دن ایک دوسرے سے جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میرا کیا آج ہوں کل نہیں ہوں''۔

''اماں بی۔ یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں''۔ ساجد میاں کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔

''سو جا پگلے، مجھے اب نیند آ رہی ہے''۔ لیٹ کر اماں بی نے لحاف سر تک کھینچ لیا اور پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ لیمپ کا سوئچ آف کرنے کے بعد ساجد کب تک ایک ہی طرح سے بیٹھے رہے۔

چھوٹی بجیا بند دروازوں کو پیٹ رہی تھیں۔ ساجد نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

لڑکیاں زور زور سے گا رہی تھیں۔

''بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی''۔

بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا۔

''بھئی حد ہے۔ شام ہونے والی ہے اور ماں بیٹے مزے سے سو رہے ہیں۔ ابھی تو دلہن کا کمرہ سجانا ہے۔ اماں بی ماجد کا کمرہ سجادوں۔ سب سے بڑا اور شاندار ہے''۔ چھوٹی بجیا کمرہ سجانے کے خیال سے ہی سرخ پڑی ہوئی تھیں۔

''نہیں بیٹی، ساجد والا کمرہ سجاؤ۔ جب کبھی وہ تم لوگوں سے ملنے آئے گا تو اپنے کمرے میں ٹھہرے گا''۔

''ان کا کیا پتا اماں بی، اگر بھابی کے ساتھ آئے تو آٹھ دس دن کو آئیں گے۔ اکیلے آئے تو آپ کے کمرے میں رہیں گے''۔ چھوٹی بجیا رنجیدہ ہو گئیں۔ اللہ قسم وہ کمرہ سب سے زیادہ شاندار ہے۔ ایسا سجے گا ایسا۔۔۔۔۔۔

''ٹھیک ہے مگر اس کا کمرہ مت سجانا۔ وہ ماجد کا کمرہ ہے۔ کسی کی چیز نہیں چھینتے بیٹی۔ گناہ ہوتا ہے''۔ اماں بی کی آواز بھرا گئی۔

''کیا فضول باتیں ہیں چھوٹی بجیا۔ جو کچھ اماں بی کہیں وہی کیجئے۔ اماں بی آپ خیال نہ کیا کیجئے چھوٹی بجیا تو ہمیشہ کی ضدی ہیں''۔

''آج تم کچھ بھی کہہ لو میں سن لوں گی''۔ وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

''میں اب ڈسپنسری جا رہا ہوں اماں بی۔ آپ آرام سے بیٹھیے گا۔ کام کرنے نہ اٹھ جائیے گا''۔ جوتوں کی ڈوریاں باندھ کر وہ جلدی سے چلے گئے۔

اماں بی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ذرا دیر پہلے کی ہوئی بات انہوں نے پھر نہیں دہرائی۔ پھر بھی وہ ساجد کے وحشت زدہ چہرے اور کڑے تیوروں سے ڈری ہوئی تھیں۔

ڈھول پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں چائے پینے کے بعد چلتے پھرتے گا رہی تھیں۔

''لٹھے دی چادر اتے سلیٹی رنگ ماہیا

آ جا سامنے، بہ جا سامنے، کولوں دی رس کے نہ لنگ ماہیا''۔

جب اماں بی دلہن کو رخصت کرا کے لائیں تو وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں، مگر آرسی مصحف اور منہ دکھائی کی رسم کے بعد جب دلہن کو اس کے کمرے میں لے گئے تو ان کے دل پر ایک دم سناٹے نے جیسے یلغار کر دی۔ اب ساجد بھی چلا جائے گا۔ آج

انہوں نے اسے کھو دیا۔ کوئی جذبہ ان کا دل نوچے لے رہا تھا۔ ادھر سارے دن کی تھکن انہیں آنکھیں نہ کھولنے دے رہی تھی۔

ساجد کی نظریں مسلسل اماں بی کا پیچھا کر رہی تھیں، وہ اپنے بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور جب رشتے کی بھاوجیں انہیں لینے آئیں تو وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ ''میں ابھی نہیں جاؤں گا۔ اماں بی بہت تھک گئی ہیں''۔ انہوں نے اماں بی کو سہارا دے کر آرام سے لٹا دیا۔ پھر الماری سے نیند کی دوا نکالی اور دو گولیاں کھلائیں۔ پھر ان کے پائنتی بیٹھ کر سوچتے ہوئے پیروں کو آہستہ آہستہ ملنے لگے۔

''بڑی بجیا آج یہاں اماں بی کے پاس میرے بستر پر آپ لیٹ جایئے''۔ انہوں نے بڑی امید سے بڑی بجیا کو دیکھا۔

''میں یہاں آرام سے چھپر کھٹ پر لیٹ جاؤں تو میری سہیلیاں برا نہیں مانیں گی۔ وہ سب بے چاریاں قالینوں پر لڑھکتی رہیں''۔ بڑی بجیا نے سمجھانے کے انداز سے کہا۔

''تو پھر آپ چھوٹی بجیا''۔ وہ گھگھیا رہے تھے۔

''اللہ، ساجد تم نے تو میری اماں بی کو دودھ پیتا بچہ بنا دیا ہے۔ اماں بی تو آج اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر آرام سے سوئیں گی''۔

ساری بھاوجوں نے قہقہے لگاتے ہوئے ساجد کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا اور وہ تھے کہ اماں بی کو بے بسی سے دیکھے جا رہے تھے۔

''ارے جاتے کیوں نہیں بیٹے۔ میں تو سو رہی ہوں، میری تو تھکن سے آنکھ بھی نہیں کھل رہی''۔

''ابھی نہیں جاؤں گا۔ میں چلا جاؤں گا''۔ انہوں نے بھاوجوں سے خود کو چھڑا کر پھر اماں کے پاؤں پکڑے اور آہستہ آہستہ دبانے لگے۔

بھاوجیں کچھ ناراض سی ہو کر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ اماں بی سچ مچ ذرا دیر میں خراٹے لینے لگیں۔

رات کو ڈھائی بجے کے قریب وہ کچھ سوتی کچھ جاگی سی تھیں کہ انہوں نے عادت کے مطابق ہاتھ بڑھا کر ساجد کے اوپر رکھ دیا۔ پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔ پاؤں دباتے دباتے یہ پگلا یہیں سو گیا۔ انہوں نے جلدی سے ٹٹول کر لیمپ کا سوئچ آن کیا۔

''کیا کہیں گے سب، یہاں سو گیا ہے''۔ انہوں نے سارے کا سارا لحاف کھینچ لیا۔ گاؤ تکیے پر اسی طرح لحاف پڑا تھا کہ اماں بی کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ ''اس نے سوچا ہوگا کہ اماں بی رات کو ایک بار اس پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ وہ ہاتھ رکھیں گی اور پھر سو جائیں گی۔ رات جانے کس وقت آ کر یہ کاروائی کر گیا ہے''۔

سوچتے سوچتے وہ برابر مسکرا رہی تھیں۔ انہوں نے سرہانے سے گلاس اٹھا کر پانی پیا، پھر گاؤ تکیے کو چوم کر اسی طرح لحاف ڈال دیا۔ لیمپ بجھایا اور پھر لیٹ گئیں۔ ساجد تو اپنے مستقبل کی خوشی میں ماضی کے سرہانے تکیہ رکھنا بھی بھول گیا تھا ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنہیں جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیا اور کروٹ لے کر بڑے پیار سے گاؤ تکیہ پر ہاتھ رکھ کر چند منٹ اسے ٹٹولتی رہیں اور پھر آرام سے سو گئیں۔۔۔۔

☆☆☆

ریت اور سمندر

دیوندر اسر

اس روز اچانک میری ملاقات پریش سے ہوگئی۔ پورے پانچ برسوں بعد وہ مجھے مرینا بیچ پر مل گیا۔ وہ سمندر کے کنارے کھڑا دور سے آئے ہوئے کسی جہاز کو دیکھ رہا تھا۔ پریش کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ برسوں بعد میں اپنے سے ملاقات کررہا ہوں۔ ورنہ ہر روز دوسرے لوگوں کے قصے، دوسرے دیشوں کی باتیں، اردگرد پھیلی ہوئی زندگی کی خبریں لکھ کر مجھے ایسا احساس ہونے لگا۔ جیسے میری کوئی ہستی نہیں میں محض ایک کیمرہ ہوں جو ہر لمحہ ہر چیز کی تصویر اتار رہا ہے جو اس کے سامنے آ گئی ہے۔ اور انہیں الفاظ کی صورت میں اخبار کے صفحوں پر کولتار کی طرح انڈیل رہا ہے۔ دوسرے روز ہی وہ تصویریں اتنی پرانی اتنی دھندلی پڑ جاتی ہیں جیسے برسوں پرانے کسی چہرے کی تصویریں ہوں۔ کرم خوردہ، ماضی کی دھول سے اٹا چہرہ بےنام، بے جان، بے حس۔

پریش سے میری ملاقات اچانک ہوئی تھی۔ میں دلی کی جلا دینے والی گرمی اور بے مصرف ہما ہمی سے بھاگ کر نینی تال گیا ہوا تھا۔ مجھے کسی ہوٹل میں جگہ نہیں ملی۔ مجبوراً کسی دوسرے کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا پڑا اور یہ کوئی دوسرا پریش تھا جو دھیرے دھیرے میری زندگی کی پرمسرت یاد بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ گھومنے کا اتفاق مجھے بہت کم ہوا۔ کیونکہ وہ عام طور پر کمرے میں ہی بیٹھا رہتا اور پڑھتا رہتا یا تنہا شطرنج کھیلا کرتا۔

ایک روز میں نے پریش کو دعوت نامہ دیا۔ یاٹ کلب میں ناچ کا خاص پروگرام تھا۔ میں نے اس سے چلنے کے لیے کہا لیکن اس کا وہی جواب تھا، فرصت نہیں۔ ''وہاں کتنے لوگ ہوں گے۔ رنگ برنگ لباسوں میں شوخ و شنگ لڑکیاں نوجوان، خوبصورت''۔ میں نے کہا۔

''پروگرام تو بڑا شاندار ہے۔ لیکن مجھے یہ کتاب ختم کرنی ہے، موڈ بنا ہوا ہے''۔ پریش نے جواب دیا۔ اور پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ حالانکہ جس لڑکی سے پریش کو متعارف کرانے کی دعوت دی تھی۔ اس کی اک نگاہ کے لیے لوگ ترستے تھے۔ میں نے اس کے حسن کا بڑا شاعرانہ تذکرہ کیا اور کہا کہ اس کی بانہوں میں آدمی یوں محسوس کرتا ہے جیسے قوس قزح پر جھول رہا ہے۔ لیکن اس کا جواب وہی تھا کہ آج اس کتاب کو ختم کرنا ضروری ہے۔ یہ کتاب میرے رگ و پے میں سرایت کررہی ہے۔ اور میں اس لذت سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔

میں اکیلے ہی یاٹ کلب چلا گیا۔ نندنی میرا انتظار کررہی ہوگی۔ سنہرے کٹے بالوں اور گہری بلوری آنکھوں والی لڑکی کا نام نندنی تھا۔ لانبا قد، چھریرا بدن، ہلکا سنولایا گورا رنگ۔ جب وہ پاس سے گذر جاتے تو محسوس ہوتا کہ سرخ گلاب کی پنکھڑی جسم کو چھو کر نکل گئی ہے۔ نینی تال میں نندنی کی پرکشش شخصیت کا چرچا ہر جگہ تھا۔ فلیٹس میں، کافی بار میں، یاٹ کلب میں، مال پر، جھیل کے کنارے، ریستورانوں میں، جہاں آدمی ملتے تھے نندنی کے حسن کا ذکر ناگزیر تھا۔ فلیٹس پر تو لوگ نندنی کے انتظار میں اس طرح کھڑے ہوجاتے تھے۔ جیسے گرمی کے دنوں میں جھلسے ہوئے بدن ہوا کے ایک جھونکے کی تمنا میں ہوں اور نندنی ٹوٹتے ستارے کی نظر ڈالتی پھول سے قدموں سے آگے بڑھ جاتی۔

جب میں یاٹ کلب پہنچا تو بجلی کی سب روشنیاں جل چکی تھیں۔ تیز مگر نرم روشیوں میں مرد اور عورتیں خوش گپیاں کررہے تھے۔ چم چم کرتی ہوئی زندگی میں رنگ اور خوشبو کی لہریں اڑ رہی تھیں۔۔۔۔ دو چار جوڑے کسی کارنر میں یا صوفے پر نیم

روشنی میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ موسیقی شروع ہو چکی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کی ساری پہنے سفید موتیوں کے چمکتے ہوئے ٹاپس لگائے نندنی ہال میں گھوم رہی تھی۔ جب ناچ شروع ہوا تو وہ میرے قریب آ گئی۔ اس کے قدم آرکسٹرا کی لہروں پر تھر کنے لگے۔

ناچ ختم ہونے کے بعد ہم باہر آ گئے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ میرے ہوٹل تک آئی۔ راستے بھر ہم خاموش رہے۔ باہر ہوا سرد تھی اور چاند ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی سایہ سا گذر جاتا تھا۔ جب ہم ہوٹل پہنچے تو پریش کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمارا سواگت کیا اور پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔
میں نے پریش کا تعارف نندنی سے کرایا ''مسٹر پریش زندگی میں کچھ اس تیز رفتاری سے چلے ہیں کہ پہیہ ڈھری سے اتر گیا۔ اور اب مسلسل گھوم رہا ہے۔ بے سمت بے منزل، بے ارادہ''۔

''شاید کبھی کوئی منزل مل جائے'' ۔نندنی نے کہا۔

''شاید۔۔۔'' میں نے کہا۔

''کونسی کتاب پڑھ رہے ہیں'' ۔نندنی نے پوچھا۔

''ہرمین ہیس کے سدھارتھ'' پریش بولا۔

پھر نہ جانے کس بات پر پریش اور نندنی کی بحث شروع ہوگئی۔ پریش نے کسی کتاب کا حوالہ دیا اور نندنی نے فوراً جواب دیا۔

''مسٹر پریش زندگی کا مطالعہ کسی دوسرے کی کتاب سے نہیں ہوسکتا''۔

''ہر عظیم کتاب زندگی کے دائرے کو وسیع کرتی ہے، گہرا کرتی ہے، نئے معنی دیتی ہے'' ۔پریش نے کہا۔

''یہ سب بے عمل، شکست خوردہ ذہن کی دلیلیں ہیں'' ۔نندنی اب جوش میں بول رہی تھی۔

''ہلکے نیم روشن کمروں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے کودتے ہوئے جسم کا لمس محسوس کرتے ہوئے اور لمحہ بہ لمحہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے تجربے کے سوا زندگی میں اور کچھ اہم نہیں سے میں ڈوبے ہوئے مدہوش جواں پیکروں کا لذت سے ٹوٹ جانا ہی حقیقت ہے زندگی کی۔۔۔ اور جو لوگ اس لذت سے محروم ہو جاتے ہیں یا اس قابل نہیں ہوتے۔ وہ کتاب کی مصنوعی زندگی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں روشنی مل گئی ہے'' ۔نندنی کا پورا وجود بول رہا تھا۔

پریش نے سگریٹ سلگائی اور پھر دھیرے سے بولا۔

''ہر ذی حس آدمی زندگی سے کتاب کی طرف آتا ہے اور پھر کتاب سے زندگی کی طرف۔ یہ مسلسل عمل ہے۔ شخصیت کی تکمیل کا، اس کی وسعت کا''۔

''میں نے کافی بنائی، اور پھر ہم سب کافی پینے لگے۔ اس دوران میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب نندنی واپس جانے لگی تو پریش بولا۔ ''اگر جلدی نہ ہو تو تھوڑی دیر باہر گھاس پر بیٹھ جایئے۔ وعدہ ہے کہ بحث نہیں ہوگی نہ کتاب پر اور نہ زندگی پر'' ۔اس نے نندنی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

ہم باہر لان پر بیٹھ گئے۔ ہری ہری گھاس پر ابھی ابھی اوس پڑنا شروع ہوئی تھی۔ چیڑ کے درختوں سے چاندنی لپٹ رہی تھی۔ آسمان بہت گہرا نیلا تھا اور ستارے روشن تھے۔ سفید چاندنی کے جھلملاتے ٹکڑوں سے، سامنے جھیل میں ایک شہر بس رہا تھا۔ ایک اجنبی شہر کی پرچھائیاں، اندھیروں، روشنیوں، کھمبوں، کشتیوں، آدمیوں، سایوں سمیت مکمل شہر، چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ جیسے ساری چہل پہل کی زندگی کسی غار میں سرک گئی ہو۔ دور پہاڑ گم سم دیوار سے ٹھہرے تھے اور سرد ہوا پیڑوں کو چیرتی ہوئی ہماری جسموں کو ہلور رہی تھی۔ اس سنسان پرسکون سناٹے میں جیسے ہم بہت نرم ہو گئے تھے۔ بہت ہلکے پرندوں کی طرح اور پھر ہم اس

گہرے سناٹے میں جذب ہوگئے۔۔۔اچانک پریش بولا ''ہوا سرد ہونے لگی ہے چلا جائے''۔
ہم جیسے کسی خواب سے چونک پڑے اور ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے ہم سب اٹھ بیٹھے۔میں نندنی کو چھوڑنے دور تک اس کے ساتھ گیا۔
جب میں واپس آیا تو پریش سو چکا تھا۔اس کے ہاتھ میں بند کتاب تھی۔دوسرے روز سے دلی واپس جانا تھا اور وہ اپنا سامان پیک کرنے میں مشغول رہا۔میرا پروگرام چائنا پیک جانے کا تھا۔اس لیے صبح صبح ہی روانہ ہوگیا۔اور جب واپس آیا تو پریش جا چکا تھا۔
میں نندنی سے ملنے اس کے ہوٹل گیا۔میں نے دستک دی۔لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔دروازہ نیم وا تھا۔میں اندر داخل ہوا۔وہ کمرے میں نہیں ملی۔کمرہ بالکل خالی تھا۔میں نے ہوٹل کے منیجر سے پوچھا۔اس نے بتایا کہ وہ نینی تال سے چلی گئی ہے اور پھر دھیرے سے بولا جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہا ہو۔رات بھر وہ باہر لان پر سرد چاندنی میں بیٹھی رہی۔ایک شال اوڑھے ہوئے صبح اس نے بیرے سے چائے منگوائی اور سامان پیک کروایا۔اور کچھ کہے بغیر چلی گئی۔
میں واپس اپنے ہوٹل آگیا۔نندنی اتنی جلدی کیوں چلی گئی۔اس کا اتنی جلدی جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔نندنی کے بغیر شامیں کتنی اداس ہوں گی۔پریش بھی جا چکا تھا۔مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوا میرے ذہن میں پریش کی کئی تصویریں ابھر رہی تھیں ہری ہری گھاس پر بیٹھے ہوئے درختوں پر کھلتے ہوئے پھول دیکھتے ہوئے پرندوں کا گیت سنتے ہوئے، پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف پر پھسلتی کرنوں کا ناچ دیکھتے ہوئے، گرتے ہوئے پانی کا سنگیت سنتے ہوئے جھیل کے کنارے پانی میں تیرتے چاند ستاروں کے دیئے جلتے ہوئے دیکھتے ہوئے، آرام کرسی پر نیم دراز کتاب پڑھتے ہوئے، کسی تصویر کے سامنے گم سم کھڑے ہوئے چاندنی رات میں تنہا بھیگتے ہوئے، چائے پیتے پیتے بحث کرتے ہوئے، کتنی یادیں وابستہ تھیں ان سے۔آج اچانک اسے دیکھ کر میں فرط خوشی سے اچھل پڑا۔اور اس سے لپٹ گیا۔
''پریش''۔میں چلایا۔
''ہیلو ڈیئر تم یہاں کیسے''۔اس نے پوچھا۔
میں نے بتایا کہ ایک کانفرنس کے سلسلے میں آیا ہوں۔پھر ہم سمندر کے کنارے بیٹھے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔
ہمارے سامنے دور دور تک سمندر پھیلا ہوا تھا۔اس کا گہرا نیلا رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔اس کے دوسرے کنارے پر لہریں آسمان کو چھو رہی تھی۔لہریں چاندنی کی دیوار سی اٹھ کر کنارے پر آ کر پھیل جاتیں اور پھر واپس لوٹ جائیں۔کنارے کی ریت بار بار بھیگ جاتی۔بائیں طرف سمندر میں ایک جہاز لنگر ڈالے کھڑا تھا۔اکیلا کسی خیال میں ڈوبا ہوا۔شام کے دھندلکے میں جہاز کی روشنیاں جھلملانے لگیں۔سمندر میں جیسے روشنی کے جزیرے ابھر آئے ہوں۔اور ہم باتیں کر رہے تھے۔بیتے ہوئے پانچ برسوں کی باتوں باتوں میں نندنی کا ذکر آگیا۔
''معلوم نہیں آج کل نندنی کہاں ہے۔تمہارے چلے جانے کے بعد وہ اسی روز اچانک نینی تال چھوڑ کر چلی گئی''۔میں نے کہا۔
''الہ آباد میں ہے۔سنا ہے کوئی کتاب لکھ رہی ہے''۔پریش نے بتایا۔
''کتاب''۔میں چونکا۔''نندنی اور کتاب۔کتاب تو اس کے کمرے میں محض ایک ڈیکوریشن پیس کے سوا کچھ نہیں''۔ میں نے کہا۔

''ہر آدمی کو زندگی میں ایک ایسا لمحہ آتا ہے۔ جب اس کی ساری زندگی ایک کتاب بن جاتی ہے۔ اگر وہ اس لمحے کو گرفت میں لے آئے تو آرٹسٹ بن جاتا ہے۔ اور اگر کھودے تو ہجوم میں ایک چہرہ۔ جو کسی دوسرے چہرے سے مختلف نہیں ہوتا''۔

پریش نے کہا۔

''کیا نندنی سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے''۔ میں نے پوچھا۔

پریش نے جیب سے ایک کتاب نکالی جس کی پشت پر لکھا تھا۔

"If i stepped out of my body, I would breaks into blossom".

نیچے نندنی کا نام لکھا تھا۔ پریش کے لیے۔

مجھے پریش اور نندنی کی بحث یاد آرہی تھی۔ اور پھر وہ رات جب ہم چاندنی میں باہر گھاس پر خاموش بیٹھے بڑی دیر تک اوس میں بھیگتے رہے۔

''پریش ایک بات پوچھوں''۔ میں نے کہا ''نندنی سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟''

''رشتہ'' پریش زور سے ہنسا۔ ''اسے سمجھنے کے لیے ہی تو وہ کتاب لکھ رہی ہے اور میں سمندر کے کنارے کھڑا اس کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ لہروں کے مدوجزر سے لگانے کی کوشش کر رہا ہوں''۔

میں نے سمندر کی جانب دیکھا۔ اور پھر پریش کی طرف۔۔۔ دور دو آدمی ایک کشتی کو کنارے پر لا رہے تھے۔ سائے کی طرح کشتی لہروں کی سطح پر کبھی ابھرتی اور کبھی ڈوب جاتی۔

اور کنارے کی ریت بار بار بھیگ رہی تھی۔

☆☆☆

میں اور زمین

ذکاالرحمٰن

الف آغاز ہے اور الف ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ زبان کے اتھاہ ذخیرے سے وہ پہلا اور رخشاں حرف چننا جو قرن ہا قرن چمکتا رہے، کوئی آسان بات نہیں اور میرا ہے شک سے یہ حقیقت کہ تنہا انسان کے ہر نطق کا کل حاصل پہلا اور رخشاں حرف ہے۔ ہر خواب اور ہر ستیہ اور ہر قوتیہ اور ہر اصولیہ اور ہر کہانی اور ہر خواب ایک ایسی زبان کا حرف ہے جو اب تک ترجمہ نہیں ہو سکی۔ یہ بیکراں راتوں کی خاموشی دانائی کی زبان ہے اور ابدیت کی بے قاعدہ بے قانون زبان ہے۔۔۔ زمین، محدود وسیع وعریض ہے اور زمین کے ساتھ سب چیزیں محدود وسیع وعریض ہیں، آسمان شکار عمارت بھی اور تکبر شعار آدمی بھی اور گھاس کی خاکسار پتی بھی۔ ذہن اور روح اجازت دیں تو آنکھ ہر شے کو کئی گنا بڑا کر کے دیکھے، اور ذہن وقت کو تباہ کرنے کی قوت رکھتا ہے اور ذہن موت کا بھائی ہے، اور یاد رکھو زندگی کا بھائی بھی۔۔۔ اور ان سب سے زیادہ جو وسیع وعریض ہے وہ انا ہے۔ انسانیت کا جرثومہ جس سے کائنات کا تعین ہوا اور جنت وجہنم کو نام ملے اور زمین اپنے مدار پر قائم ہوئی اور انسان کا چہرہ پہچانا گیا، میرا چہرہ اور تمہارا چہرہ اور تمہاری آنکھیں اور میری آنکھیں۔۔۔

میں ایک بوڑھے شہر میں رہنے والا نوجوان آدمی ہوں۔ ابھی چند لمحے پیشتر، صبح کا جھرنا رات کی سل چیر کر پھوٹا ہے اور افق افق پھیل گیا ہے اور میں اپنی آنکھوں میں شب زندہ داری کا خمار لیے اپنے حجرہ شاہ مقیم میں کھڑا ہوں اور حجرے شاہ مقیم کی اس لکھت بیٹھک کے قریب کھڑا ہوں جس پر کھردرے پیلے کاغذوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے۔ میری استطاعت یہی کھردرے پیلے سستے کاغذ ہیں، اور یہ سب کاغذ خالی ہیں جس طرح میں پیدائش سے پہلے زندگی کے لیے خالی تھا۔ اور جس طرح موت کے بعد بھی زندگی کے لیے خالی ہو جاؤں گا۔ ان کاغذوں پر ابھی تک زبان نہیں لکھی گئی اور حرف نہیں ابھارے گئے اور میں کہ ایک جواں سال لکھت کار ہوں یا یوں کہہ لو کہ ایک جواں سال خدا ہوں، ان کاغذوں پر موت اور زندگی لکھنا چاہتا ہوں، اپنی لکھت کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی آئندہ موت زندگی لکھت کا پہلا رخشاں حرف لکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ آج ہفتہ ہے اور دسمبر کی چوبیسویں تاریخ۔ صاحب وجود ہونا اور ابھی تک صاحب وجود رہنا اتنا اچھا ہے کہ بے اختیار حمد و ثنا کرنے کو جی چاہتا ہے، معلوم اور نامعلوم کائنات کے چپے چپے پر خود اپنے سامنے سجدہ کناں ہونے کو جی چاہتا ہے۔

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں اور میں کئی گلیوں سے گزرا ہوں اور میں نے کئی شہر دیکھے ہیں اور میں راتوں اور دنوں کے کئی راز جانتا ہوں اور پراسرار فرشتوں کے کئی اسرار مجھ پر آئینہ ہیں اور میں نے فلک الافلاک کی لوح محفوظ کئی بار پڑھی ہے اور میں نے باغبانی صحرا کے قوانین مرتب کئے ہیں اور اب گھوم پھر کر اپنے حجرے شاہ مقیم میں اپنے پاس آگیا ہوں اور اس چھوٹے سے حجرے شاہ مقیم کی دیوار پر میرے مرحوم باپ کی تصویر آویزاں ہے اور میں زمین سے اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں لے کر اگا ہوں اور اپنی زبان میں وہ کچھ لکھ رہا ہوں جو کچھ وہ اپنی زبان میں لکھتا اور ہم دونوں ایک ہی ہیں۔۔۔ بس صرف اتنا فرق ہے کہ ایک چہرہ زندگی دیکھتا ہوا اور دوسرا چہرہ موت کی کتاب پر جھکا ہوا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ زندگی کے صحیفے اور موت کی کتاب میں کتنا اور کیا فرق ہے؟

میں شدید کرب اور اضطراب کی کپکپاہٹ میں ہوں کہ یہ لمحہ میرے لیے بہت عظیم اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس لیے سب کے لیے بہت عظیم اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے کہ میں خالی کاغذ پر زبان لکھنے والا ہوں اور اپنی زبان لکھنے والا ہوں اور مجھ پر پہلے

آدم کا تپ لرزہ طاری ہے۔ مجھ پر وہ بوجھ رکھا گیا ہے جو فرشتوں نے اٹھانے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نفی کی خاردار عبا پہننے پر مجبور ہوا اور دوسرے مارے خوف کے سجدے میں گر گئے اور یہ وہ بوجھ ہے جس کو اٹھانے سے پہاڑ معذرت خواہ ہوئے۔۔۔ میں کپکپاہٹ میں ہوں۔ دور کہیں گھنٹیاں مسلسل گنگنا رہی ہیں۔ کاش کوئی ہوتا کہ قدیم کتابوں کے حوالے سے میری کپکپاہٹ کی تصدیق کرتا۔ اور جان لو کہ یہ کپکپا ڈالنے والا بوجھ، پہلا اسم جاننے کا بوجھ ہے اور پہلا حرف لکھنے کا بوجھ ہے اور میں پہلا حرف غلط نہیں لکھنا چاہتا اور میں اپنی زبان کے ساتھ عیاری نہیں کرنا چاہتا چونکہ اپنی زبان کے ساتھ عیاری کرنا اپنے ضمیر کے ساتھ اور اپنے شعور کے ساتھ عیاری کرنا ہے۔۔۔ میں اس خوف بوجھ کے نیچے کانپ رہا ہوں اور خائف ہوں۔۔۔ میں زندگی میں کبھی عیاری نہیں کر سکا اور اب جبکہ میں ایک ایسی محنت کے سامنے کھڑا ہوں جو خود زندگی سے عظیم تر ہے تو میں سچ کے سامنے سے کیسے ہٹ جاؤں۔۔۔ چنانچہ عجز انا کے اس برتر لمحے میں کسی قیمت پر بھی میں اپنا کردار ضائع نہیں کروں گا کہ کردار کا زیاں جھوٹے حرف لکھواتا ہے۔

لوگ مجھے کہانی کار کہتے ہیں، جیسے مجھ سے پہلے والوں کو کاہن کہا گیا اور شاعر کہا گیا، میں پناہ مانگتا ہوں کہانی کار ہونے سے اور کاہن ہونے سے اور وادیوں میں سرگرداں پھرنے والے شاعر ہونے سے۔ میں تو ایک بے دعویٰ شخص ہوں، لیکن میری بغل میں ایک کتاب ہے اور اس کتاب میں ایک لکھت ہے۔۔۔ زمین پر مجھ انسان کی لکھت، سادہ سی لکھت۔ یہ سادہ سی لکھت میں اپنے اسلوب میں لکھنا سنانا چاہتا ہوں اور عامی زبان کے تمام شعبدے اور معنوی صرف ونحو کے تمام اصول بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور گذرے ہوئے نبیوں کی طرح نہیں بولنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ گزرے ہوئے نبیوں کا بولنا اب قدیم اوطاق پر رکھ دیا جائے۔ اور اب میرا بولنا سنا جائے اس لیے کہ میں ستیہ قوتیہ بولنے والا ہوں اور لمحاتی کلیوں پر یقین نہیں رکھتا۔ مجھے صرف مجھ انسان سے دلچسپی ہے۔ میں زندگی سے محبت کرتا ہوں اور موت کے سامنے عاجز نہیں ہوں۔ میں موت کی عاجزی کیوں اختیار کروں کہ سرتا سر جسمانی اور غیر حقیقی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ میرا باپ اب تک زندہ ہے اور میں بھی زندہ ہوں اور ہم دونوں زندہ ہیں اور میرے سانس میں انسان کا پورا ماضی زندہ ہے اور میں تشدد سے نفرت کرتا ہوں اور ان سے جو تشدد پھیلاتے ہیں اور تشدد پر عمل کرتے ہیں۔ ایک زندہ انسان کی چھنگلیا پر لگائی جانے والی خراش کو میں انسان کی طبعی موت سے زیادہ تباہ کن اور زیادہ خوفناک سمجھتا رہوں گا اور جب تک جنگوں میں لاکھوں انسانوں کو موت کی ایذا دی جاتی رہے گی، میرا غم دیوانگی کی حدیں چھوتا رہے گا اور میں غصے سے نامرد ہوتا رہوں گا۔ میرا واحد ہتھیار زبان ہے لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ یہ ہتھیار ہر ہتھیار سے زیادہ کاری ہے، میں اداس ہوں چونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں تنہا تباہی کے اس شعلے کو نابود نہیں کر سکتا جو مذہبیوں نے اور سائنسیوں نے اور فلسفیوں نے انسان کے ذہن میں بھڑکا رکھا ہے اور میں صرف ایک لکھت کار ہوں اور اپنی اس لکھت میں انسان کو اس کے وقار اور ملائمت پر بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں انسان کو اس کے وجود پر بحال کرنا چاہتا ہوں اور اس کو ابلیس جیسے ہجوم شور سے نکال کر روح بدن کی خدا جیسی خاموشی اور سکون میں لے جانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ انسان تاریخ کے عفونت بھرے ملبے سے اٹھے اور اپنی روح کے پرسکون خواب میں چلا جائے کہ یہی خواب اس کی سچی تاریخ ہے۔ انسان کا گھر اس کا اپنا وجود ہے۔ ریوڑ کی صورت رہنا صرف مویشیوں کے لیے تجویز ہوا تھا۔ پھر انسان کیوں مویشیوں کی طرح رہنے لگا۔ جب ایک انسان کی روح اس سے چھین لی جاتی ہے اور اس کو ہجوم کا ایک فرد بنا دیا جاتا ہے تو خدا کا بدن دکھنے لگتا ہے۔

اور میں عامی پن کے خلاف ہوں اور اوسط درجے کے خلاف ہوں۔ اگر کوئی عام درجے یا اوسط درجے کا عقل مند ہے تو میں اس کی عزت نہیں کر سکتا، لیکن ایک برتر درجے کے پاگل سے میں ہمیشہ محبت کروں گا۔ میری اب تک کی پوری زندگی روایات کا

اور آداب کا مذاق اڑاتے گزری ہے اور میں زندگی بھر قوانین پر ہنستا رہا ہوں۔ انسان جیسی حیرتناک شے پر کوئی قانون کیسے لاگو ہوسکتا ہے؟ ہر طرز کی زندگی ایک نیا تضاد ہے اور ایک نئی صداقت ہے اور ایک نیا معجزہ ہے۔ میں اپنے اس حق سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گا کہ میں اپنی تردید کرسکتا ہوں۔ ہر انسان کو اپنی تردید کرنے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً میں نے کبھی کہیں کہا تھا کہ میں سب مشینوں کو کاٹھ کباڑ سمجھتا ہوں لیکن قلم بھی تو ایک مشین ہے اور میں قلم کی عبادت کرتا ہوں اور اب میں اس لکھت کی طرف آتا ہوں، جو میں لکھنے چلا تھا۔ یہ انسان کی لکھت ہے اور میری لکھت ہے اور میرے قلم کی لکھت ہے اور شاید ایک معمولی اور غیر اہم لکھت ہے، اگر آپ کو پر لطف اور دلچسپ کہانیاں پڑھنی ہیں تو کسی بھی رسالے میں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ رسالے محبت کی اور نفرت کی اور تشدد کی اور خوشیوں کی اور مایوسیوں کی اور کیف و مستی کی کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کہانیوں میں آپ کو پلاٹ اور کردار اور ماحول اور موڈ اور اسلوب بھی ملے گا اور اس کے علاوہ وہ سب کچھ بھی جو ایک من موہنی کہانی کے لیے ضروری ہوتا ہے، اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں کہانیوں کی توہین کرنا چاہتا ہوں اور اپنی کہانی نہیں سنانا چاہتا اور آپ سے کوئی چالاکی کرنا چاہتا ہوں۔ میں جن کہانیوں کی توہین کرنا چاہتا ہوں وہ کہانیاں اور وہ مرد اور وہ عورتیں اور وہ بچے جوان کو پڑھتے ہیں ہمارے عہد کی سب سے دردناک دستاویزیں ہیں، جیسی سوقیانہ تفریحی فلمیں اور وہ لوگ جو اپنی زندگیوں کا غالب حصہ یہ فلمیں دیکھنے میں گزار دیتے ہیں۔ میں بھی فلمیں دیکھنے جاتا ہوں اور فلم بینوں کے ہجوم سے جذبات کا جو سیلاب ابل رہا ہوتا ہے اس کو دیکھ کر بہت آزردہ ہوتا ہوں۔ خصوصاً نیوز ریلیں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ سیلاب کے اور الٹی ہوئی ٹرینوں کے اور جنگوں کے اور سیاستدانوں کی فریب آلود تقریروں کے منظر میں روئے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا میری لکھتوں اور ان کہانیوں کے فرق سے غلط مطلب نہ نکالیے۔ میں کوئی طنز نگار نہیں ہوں اور فی الحقیقت طنز کرنے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں۔ ہر تصنع اور ہر فریب اپنا طنز آپ ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ایک لکھت کار ہوں۔ میں ہمیشہ لکھتا رہتا ہوں اور لکھتا چلا جاتا ہوں، جیسے ملک کے تمام رسائل و جرائد میری لکھتیں چھاپنے کے لیے بے چین ہوں اور مدیران گرامی میری تحریروں کے بڑے بڑے معاوضے پیش کرنے کے لیے ہر لمحہ تیار رہتے ہوں۔ حالانکہ میں جو اپنے حجرے شاہ مقیم میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہوں اور اپنی اپنی یہ لکھت لکھ رہا ہوں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس بازار میں جہاں مدیر اپنے اپنے رسائل و جرائد کی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں، میری لکھت اپنی ہم عصر کہانیوں کے مقابلے میں ایک اٹی قیمت بھی نہ پائے گی۔ تو میں ایک لکھت کار اپنے قلم کی عبادت کیوں کرتا ہوں اور اس عبادت کا مجھے کیا اجر ملتا ہے اور لکھتیں لکھ کر مجھے کونسی شانتی ملتی ہے؟

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں مظلوم بن رہا ہوں۔ میں نہ مظلوم ہوں اور نہ جذباتی اور نہ شہید میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ ملک کا کونسا جریدہ منڈی کے کس گروہ کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ میں یہ سب جریدے پڑھتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ کس طرز کی کہانیاں لکھ کر خود کو بڑا کہانی کار بنایا جاتا ہے۔ یہ اسرار و رموز جاننے کے باوجود میں ایسی لکھتیں لکھتا ہوں جو شاذ و نادر ہی شائع ہوتی ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں وہ کہانیاں نہیں لکھ سکتا جو طلب و رسد کے تقاضے پورے کرتی ہوں؟ نہیں میرے بھائی نہیں۔ میں ہر طرح کی کہانی لکھ سکتا ہوں لیکن مجھے اپنی شناخت بہت عزیز ہے اور میں اپنی اس شناخت کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں اور اگر اس کے لیے یہ ضروری ٹھہرے کہ میری لکھت چھپ نہ سکے تو بھی مطمئن ہوں۔ میں شہرت پر اس طرح یقین نہیں رکھتا جس طرح عموماً رکھا جاتا ہے۔

مگر جان لو کہ مجھ ایسا لکھت کار ہونے کے لیے آخری درجے کا مصاحب انا اور مذہبی اور سوشلسٹ بیک وقت ہونا ضروری ہے۔ مجھ لکھت کار ہونے کے لیے اتنی قوت چاہیے کہ خدا پہلے تو حیران ہو اور پھر خود بھی ایک چھوٹا سا مرکزہ بن کر اس قوت

میں شامل ہو جائے اور جان لو کے لمحے اور سال اور صدیاں وقت کے لاانتہا میں پتہ نہیں کب تک سرگرداں رہتی ہیں۔ تب مجھ ایسا لکھت کار انسانی وجود کی گرفت میں آتا ہے۔ اس لیے میں حرف لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے ہر نوجوان کو اس طرح لکھنے کا مشورہ نہیں دیتا جس طرح میں لکھتا ہوں۔ میں شعوری ادیب نہیں ہوں اور میں نے جب سے لکھنا شروع کیا ہے، لکھنے کے اصولوں سے بغاوت کرتا چلا آیا ہوں۔ میں تو صرف ایک بوڑھا اور نوجوان لکھت کار ہوں اور اس لیے لکھتا ہوں کہ لکھنا ہی سب سے زیادہ مہذب اور نیک عمل ہے۔

اور کیا تم جانتے ہو کہ میرے ذہن میں ہیئت اور اسلوب کے الگ الگ خانے موجود نہیں ہیں؟ میں ایسے کسی اسلوب اور ہیئت کو نہیں جانتا جو صرف نظم کے لیے مخصوص ہو اور جس میں صرف کہانی لکھی جا سکتی ہو اور جس پر صرف ناول پورا اترتا ہو۔ میری آشنائی صرف ایک اسلوب اور صرف ایک ہیئت سے ہے اور اس کا نام انسان ہے۔ باقی سب فریب ہے اور میں اپنی اس لکھت میں اس انسان کی لکھت لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، جو میں ہوں اور اس زمین کی لکھت جو مجھے اٹھائے خلا میں رقصاں ہے اور جس کو میں اٹھائے لاانتہا کے سفر میں ہوں۔

میری یہ تمام باتیں شاید بے محل اور وقت کا زیاں سمجھی جائیں لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں اگر دن بھر میں صرف سو گز کا فاصلہ طے کرنا چاہتا ہوں تو سو گز کا فاصلہ ہی طے کروں گا۔ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ میں چند لمبی لمبی قلانچیں بھر کر یہ فاصلہ ایک منٹ میں طے کرلوں تو اس کو چاہیے کہ میری یہ لکھت اٹھا کر ایک طرف پھینک دے اور کوئی تفریحی تحریر پڑھنا شروع کر دے۔ میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا کہ وہ میری لکھت پڑھے یا سنے اور جو پڑھ رہے ہیں یا سن رہے ہیں انہیں میں نے کوئی صلہ دینے کا وعدہ نہیں کیا۔ میں تو اپنے حجرے شاہ مقیم میں بیٹھا اپنی زندگی گزار رہا ہوں اور قلم کی عبادت کر رہا ہوں۔ میرے سامنے میرا باپ موجود ہے اور وہ کئی سال پہلے اس زمین پر زندہ رہنا ترک کر چکا ہے اور میں ہر دو یا تین منٹ بعد اس کے اداس چہرے کی طرف دیکھ لیتا ہوں اور اس کے چہرے کو دیکھنا آئینے میں دیکھنا ہے اور آئینے میں ہر شخص ہمیشہ خود کو دیکھتا ہے۔ آج میری عمر اتنی ہی ہے جتنی اس وقت میرے باپ کی تھی، جب اس نے اپنی یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ قلم کے بعد اگر میں نے کسی کو چاہا ہے تو وہ میرا باپ ہے۔ میں اسے ساری زندگی چاہتا رہا ہوں۔ جب ہم دونوں اس زمین پر زندہ تھے تو میں اتنا کم عمر تھا کہ اس سے ایک حرف کا تبادلہ بھی شعوری طور پر نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن جب سے شعور میں آیا ہوں اس سے طویل اور خاموش گفتگوئیں کرتا رہتا ہوں۔ میں اس سے کہتا ہوں: اے ایک رئیس گھرانے کے اداس باغی! تیری زندگی کتنی اچھی اور کتنی قابل رشک تھی! اور وہ ملائمت سے جواب دیتا ہے: ہاں میرے بیٹے! لیکن عجز اختیار کر، اور خدا کی جستجو کر!

میرا باپ بھی ایک لیکھک تھا لیکن اس کی کبھی کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی۔ اس کے تمام عظیم مسودے خطوں اور یادداشتوں کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہیں۔ اب ان مسودوں کی روشنائی اتنی مدھم ہو چکی ہے کہ ان کو پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن میں سال میں دو تین مرتبہ یہ مسودے نکالتا ہوں اور ان کو گھنٹوں دیکھتا رہتا ہوں اور ان کی پرانی خوشبو سونگھتا رہتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ شائع نہ ہونے کے باوجود یہ مسودے ادب میں اضافہ ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ میری طرح میرا باپ بھی باغی تھا اور اداس تھا۔ اس کی اداسیاں اس کی یادداشتوں کے ورق ورق پر بکھری پڑی ہیں۔ ایک یادداشت میں اس نے لکھا ہے: میں رائل انڈین نیوی میں کمانڈر رہوں اور آجکل بمبئی میں ہوں۔ اس شہر میں مجھ پر ہمیشہ دو کیفیتیں طاری رہتی ہیں۔ ایک کیفیت اداسی کی کیفیت ہے اور دوسری کیفیت بھی اداسی کی کیفیت ہے۔ دراصل وہ بمبئی میں تنہا تھا اور ایک ایسی ملازمت کر رہا تھا جس میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا تھا۔ وہ انگریزی کا عالم تھا اور شیکسپیئر اور بائرن اس کو ازبر تھے اور بدقسمتی سے وہ انقلابی بھی تھا۔ چنانچہ اس نے رائل انڈین نیوی میں بغاوت

کی خوشبو بکھیرنی شروع کر دی اور کچھ ہی عرصے کے بعد بغاوت کی یہ خوشبو شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور اسے گرفتار کر کے سزائے موت سنا دی گئی۔ وہ فرار ہو کر ہارون آباد چلا گیا جہاں اس کے باپ کی زرعی زمینیں تھیں۔ ہارون آباد کے جنوب میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہ اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے جو یادداشتیں لکھیں ان میں دھوپ کا اور وسعت کا اور گندم کی خوشبو کا اور گنے کے رس کا اور انگور کے گچھوں کا اور مالٹے کی کلیوں کا ذکر ہے۔ اور یوں وہ زمیندار بن گیا لیکن وہ ایک نا کام زمیندار تھا۔ وہ کتابوں کا آدمی تھا اور علم کا جویا تھا اور اس کو بہترین لباس پسند تھا اور وہ آرام و آسائش سے محبت کرتا تھا اور میری طرح اس کو مشینوں سے نفرت تھی۔

جو سال گزر گیا، اس میں کئی ماہ ایسے گزرے ہیں کہ میں اپنے باپ سے اور زمین سے اور قلم سے جدا رہا۔ اور میں کچھ بھی نہیں رہا، اور اگر کچھ رہا تو ایک غیر زندہ سانس لیتا انسان رہا اور کائنات کے ڈراؤنے خواب میں ڈولتا ہوا ایک غیر نمایاں سایہ رہا اور جب خدا نے مجھ میں اپنا سانس اتارا تھا تو اس سانس کی خوشبو کا پہلا اعلان یہ تھا کہ زندہ انسانوں کے لیے مردہ اور بے نام زندہ رہنا کفر کی بات ہے اور تذلیل کی بات ہے اور مفقود الخبر ہونے کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پھر میں نے اپنے باپ کا دامن تھام لیا ہے اور اپنے پاؤں زمین پر لٹکا لیے ہیں اور قلم لیے میں روشنائی بھر لی ہے اور اپنے قریب کھردرے کاغذوں کا ڈھیر رکھ لیا ہے اور اپنے حجرے شاہ مقیم میں بیٹھ گیا ہوں اور حجرہ شاہ مقیم تمباکو کے دھوئیں سے بھر گیا ہے اور میں ققنس کی طرح اپنی راکھ سے دوبارہ پیدا ہو گیا ہوں۔ سنو کہ میں زندگی سے محبت کرتا ہوں اور زندہ حواس سے محبت کرتا ہوں اور کام کرتے ہوئے دماغوں سے محبت کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ زندگی ہر اس انسان سے تخلیق پاتی ہے جس کے سینے میں خدا کا سانس ہو اور ہر انسان اپنا شعور خود تخلیق کرتا ہے اور اپنے اندازے اور اپنے قیاس خود بناتا ہے، اس لیے کہ شعور اور اندازے اور قیاس بالذات موجود نہیں ہوتے۔ صرف کنفیوژن اور گناہ اور بدصورتی بالذات موجود ہوتی ہیں۔ کاغذ پر قلم کی سرکتی ہوئی آواز نے مجھے ایک بار پھر یقین دلایا ہے کہ میں زندہ ہوں اور اس زندگی کے احساس نے میری جھولی میں عجز کا وہ کوہ نور ڈال دیا ہے جو کسی شاہجہان کو نصیب ہوتا ہے۔ پس اے شاہجہاں! اپنے تاج میں عجز کا یہ کوہ نور لگا اور یقین کے تخت طاؤس پر بیٹھ! اور جہانبانی کر! صدیوں کو اور قرنوں کو اور زمانوں کو اور سالوں اور مہینوں کو اور دنوں کو اور لمحوں کو اجازت دو کہ تا ابد خود کو دہراتے رہیں اور تم اپنے حجرے شاہ مقیم میں بیٹھے رہو اور حرفوں میں اپنے ہونے کے سچ کا اعلان کرتے رہو، اور بے معنویت سے اور کثافت سے حقیقتوں کا جوہر اخذ کرتے رہو اور اس لمحے کا ہونا کبھی نہ مٹایا جا سکے گا کہ یہ لمحہ وقت سے آگے نکل گیا ہے۔

مجھے تجارت سے اور تجارتی سرگرمیوں سے نفرت ہے۔ میں وہ نوجوان ہوں جس کی جیب پیسوں سے خالی رہتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی رقم، اپنی قوت خرید کی وجہ سے مجھ ایسے نوجوان کے لیے بڑی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے تجارت اور تجارتی سرگرمیوں سے متنفر ہونے کے باوجود میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں پیسے کا ایک حد تک احترام کرنے پر مجبور ہوں۔ میں چاہوں گا کہ میرے پاس اتنا پیسہ موجود رہے کہ میں سادگی سے زندگی بسر کر سکوں اور زندگی لکھ سکوں۔ اگر میرے پاس پیسہ نہ ہوتا تو میں یہ قلم نہ خرید سکتا اور یہ قلم میں نے پیسے سے خریدا ہے۔ پہلے پہل یہ شے جو قلم کہلاتی ہے میرے لیے ایک عجیب و غریب چیز تھی اور جب یہ قلم کاغذ پر سرسراتا تھا تو مجھے اس سرسراہٹ سے وحشت ہوتی تھی اور رات کے خاموش لمحوں میں تو یہ سرسراہٹ میرے لیے خاصی پریشان کن ہوتی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ آواز نوائے سروش بنتی گئی اور میں قلم سے محبت کرنے لگا اور اس سے میری وہ وابستگی ہو گئی جو ایک موسیقار کو اپنے ساز سے ہوتی ہے۔ میرے قلم نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا، کاغذ کی سطح چاہے ہزار کھردری ہو۔ اے میرے قلم میں تیرا احترام کرتا ہوں!

اور تب ایک دن یوں ہوا کہ شکستگی اور نزاس کے عالم میں اس چھوٹی سی مشین کو میں نے اپنی جیب میں رکھا اور شہر چلا گیا وہاں میں نے اس کو ایک شناسا کے پاس رہن رکھا اور کچھ روپے جیب میں ڈال کر شہر کی سڑکوں پر نکل آیا۔ میں اپنی مفلسی سے اور اپنی امارت سے تنگ آ چکا تھا۔

سب سے پہلے میں بوٹ پالش کرنے والے ایک بوڑھے آدمی کے پاس پہنچا اور اپنے جوتوں پر پالش کروائی۔ جب کوئی بوٹ پالش کرنے والا میرے جوتے چمکاتا ہے تو میں اس کو اپنی جگہ کھڑا کر دیتا ہوں اور پھر زمین پر بیٹھ کر اس کے جوتے پالش کرتا ہوں۔ یہ میرے لیے انکسار اور عجز کا ایک تجربہ ہے۔

اس کے بعد میں ایک پکچر ہاؤس پہنچا اور لوگوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے آپ کو سلولائیڈ پیکروں میں دیکھنے لگا۔ میں بیٹھا رہا اور خوبصورت عورتوں کے چہرے دیکھ دیکھ کر خواب دیکھتا رہا۔ یہاں سے میں ایک ریستوران میں چلا گیا اور مینو کے تمام کھانے تھوڑے تھوڑے منگوا کر کھاتا رہا۔ ویٹر یہ سمجھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ لیکن میں بل اور ٹپ دے کر باہر نکل آیا اور شہر کے تاریک کوچوں میں چلنے لگا۔ وہ کوچے جہاں تاریکی کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ میں اپنی مفلسی سے تھک چکا تھا۔ کوئی بھی، حتیٰ کہ مجھ ایسا بڑا لکھت کار بھی لحہ درلحہ مفلس رہنے کا اور امیر رہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے اپنے باپ کی آواز سنائی دینے لگی، وہ زمین کے اندر سے بول رہا تھا۔ تب دوبارہ میرے وجود نے قلم کا مطالبہ شروع کر دیا اور دوبارہ میرے حرف کاغذ پر اترنے کی تمنا کرنے لگے۔ میں نے چاہا کہ میں دوبارہ کچھ کہوں اور دیکھوں اور الف لکھوں اور قلم کو رہن سے چھڑا لاؤں۔

بس یہی میری لکھت ہے اور جان لو کہ میری لکھت اجزا کا کل ہے اور جان لو کہ جب کوئی اجزا سے گذر کر کل تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے باپ کو اور اپنی زمین کو اور اپنے خود کو رہن سے چھڑا لیتا ہے اور الف لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

☆☆☆

نصیب جلی

رام لعل

دروازے کے باہر سائیکل کی گھنٹی سنتے ہی موتا سنگھ کے بچے۔ دروازہ کھولنے کے لیے دوڑ پڑے۔ تینوں بچوں نے ایک ساتھ کنڈی پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھول کر تینوایک ساتھ چلائے:

''دار جی آ گئے، دار جی آ گئے!''

اور پھر تینوں ایک ساتھ ہی اچانک موتا سنگھ کی سائیکل پر سوار ہو گئے۔ ایک آگے بار پر۔ دوسرا گدی پر اور تیسرا پیچھے کیریئر پر، موتا سنگھ ہنستا ہوا داخل ہوا، بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھی ہوئی دال سمیٹ رہی تھی۔ دھوپ صحن میں سے ہوتی ہوئی اوپر دیوار کی طرف جا پہنچی تھی۔

دھوپ روز اسی وقت برجی پر چلی جاتی تھی۔ موتا سنگھ بھی روز اسی وقت ورکشاپ سے گھر لوٹتا تھا۔ تیل کے بڑے بڑے دھبوں والی خاکی قمیص، نیکر اور میل سے سیاہ چیکٹ بوٹ پہنے ہوئے، اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی ہوئی، سیاہ و سفید بالوں سے بھری بھری داڑھی مونچھ کے اندر سے اس کی مسکراہٹ جیسے چھن چھن کر باہر آتی اور دیکھنے اور ملنے والوں کو نہال کر دیتی۔

جس قدر وہ تندرست، توانا اور شوخ مزاج تھا، اس کی بیوی اتنی ہی کمزور اور کم گو تھی۔ پانچ بچوں کو جنم دینے کے بعد اس کے جسم میں تن کر کھڑا ہونے اور چلنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے خوبصورت قد اور اعضاء کی دلکش مناسبت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی جوانی قیامت رہی ہوگی۔ ان تینوں بچوں کے علاوہ جو باپ کی سائیکل پر سوار تھے۔ دو لڑکیاں بڑی تھیں۔ سب سے بڑی کا دو سال پہلے بیاہ ہو چکا تھا۔ اس سے چھوٹی دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ وہ رسوئی میں بیٹھی انگیٹھی پھونک رہی تھی۔ باپ کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئی اور بولی:

''دار جی، آج ایک خط آیا ہے پاکستان سے''۔

''پاکستان سے؟'' موتا سنگھ نے حیرانی ظاہر کی۔ ''کس کا خط ہے من جیب؟'' من جیت کمرے کے اندر دیوار پر سجا کر رکھے ہوئے گورو گرنتھ صاحب کے پیچھے سے ایک لفافہ نکال کر باہر لے آئی جس پر پاکستان گورنمنٹ کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ باپ کے ہاتھ میں دیتی ہوئی بولی۔

''پتہ نہیں کس کا ہے؟ اردو میں ہے، میں تو اردو جانتی نہیں''۔ بچوں نے بے قابو ہو کر سائیکل کو گرا دینا چاہا۔ موتا سنگھ کے ہاتھ سے خط گر گیا۔ اس نے جلدی سے سائیکل من جیب کے حوالے کی اور خط اٹھا کر صحن میں پڑی ہوئی ایک کھاٹ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے پگڑی اتار کر گھٹنوں پر رکھ لی، دوسرے ہاتھ سے لفافہ کے اندر جھانکا اور تہہ کیا ہوا کاغذ کھینچا۔ ایک فل اسکیپ کاغذ تھا۔ دونوں طرف لکھا ہوا۔

''اترو اترو، نہیں تو گرا دوں گی''۔ من جیت نے بھائیوں کو سائیکل پر سے اتار کر سائیکل برآمدے میں کھڑی کر دی۔ بچے پھر باپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک پیچھے سے گردن میں بانہیں ڈال کر جھولنے لگا اور دوسرا سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ تیسرے نے ہاتھ سے لفافہ لے کر حیرانی سے پوچھا۔

''یہ ٹکٹ کس قسم کا ہے دار جی؟''

''یہ پاکستان کا ہے بیٹے!''

''پاکستان کہاں ہے دار جی؟''

''ادھر ہے پاکستان جدھر تیرے نانا رہتے ہیں، ڈیرہ بابا نانک وہاں سے بس تھوڑی دور رہ جاتا ہے۔ لا اب مجھے دے دے لفافہ۔ ان سب کو باہر کے جا من جیت۔ میں خط پڑھ لوں''۔

''پہلے یہ بتایئے یہ کس کا خط ہے؟''

''یہ۔ دیکھتا ہوں۔ یہ'' خط کے آخر میں وہ غلام سرور کا نام پڑھ کر چونک گیا۔ ''غلام سرور'' اس کے منہ سے نکلا اور اس کی نگاہ اپنی بیوی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھی غلام سرور کا نام سن کر چونک پڑی تھی اور دال سمیٹتے سمیٹتے سر گھما کر دیکھنے لگی تھی۔

''کون غلام سرور؟ من جیت بھائیوں کو باپ کے پاس سے ہٹا کر وہاں خود بیٹھ گئی اور پوچھا۔ ان کا پہلے کبھی آپ کو خط نہیں آیا؟''

''ہاں پہلے کبھی نہیں آیا''۔ موتا سنگھ جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔ وہ دو دو سطریں ایک ساتھ پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غلام سرور نے اسے ایک عرصے کے بعد کیوں یاد کیا ہے۔ بارہ سال کے بعد پہلی بار اس نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ پہلی بار اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا، وہ تو سمجھے تھے کہ سرور زندہ نہیں بچا ہوگا۔

اگر بچ بھی گیا تو آخر مسلمان تھا۔ اس کی خیریت کیوں دریافت کرتا۔ وہ اس کا کون تھا؟ بس دو سال ہی کی تو دوستی تھی ان کے درمیان! جب وہ ایک ساتھ ورکشاپ میں فٹر بھرتی ہوئے تھے، ایک ہی ورکشاپ میں انہیں جگہ ملی تھی۔ ایک ہی بیرک میں ایک دوسرے کے پڑوسی بنے تھے۔ صرف دو سال کے لیے۔ اور اب اس قلیل مدت پر بارہ برس کا بہت گہرا بہت اونچا ملبہ پڑ چکا تھا۔ اس ملبے کے نیچے ان کے کتنے مشترکہ قہقہے ساجھے مذاق اور بہت ساری یادیں دفن ہو کر ختم ہو چکی تھیں۔ وقت ایک گہرا تیز و تند اور بار بار راستہ بدل لینے والا دریا بھی ہے جو اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ صدیوں کی جمی ہوئی دھرتی کے بڑے بڑے چٹان سے ٹکڑے الگ کر کے کاٹ کاٹ کر بہالے جاتا ہے اور پھر ذرہ ذرہ کر کے یہاں وہاں پھینک کر اس دھرتی کی ہستی ختم کر دیتا ہے۔ نام و نشان تک مٹا ڈالتا ہے۔ اس مٹی کی اپنی خوشبو نہیں رہتی۔ اپنا سنگیت مر جاتا ہے۔ کسی کو یاد نہیں رہتا یہاں ایک بڑی عمارت تھی، وہاں ایک بہت بڑا میدان تھا۔ ادھر ایک پہنچے ہوئے فقیر کی قبر تھی۔ اس طرف ایک بہت بڑا مرگھٹ تھا، ایک عالیشان مویشی گاہ تھی جہاں میلوں دور دور سے دیہاتی آ کر یہاں ڈھور ڈنگروں کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ میلے میں جمع ہو کر ناچتے اور گاتے تھے۔ زیر آب پڑی ہوئی دھرتی کے سینے پر منوں مٹی آ آ کر پڑتی جاتی ہے۔

خط پڑھتے پڑھتے موتا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غلام سرور نے اسے کبھی بھلایا نہیں تھا۔ اسکا پتہ کئی ذرائع سے دریافت کرتا رہا تھا۔ بیسوں دوستوں سے پوچھا تھا۔ کسی نے جواب دیا تھا تو پتہ نہیں بتا سکا تھا۔ کسی نے جواب نہیں دیا تھا۔ موتا سنگھ کئی سال ہوئے امرتسر کی ورکشاپ سے تبدیل ہو کر دہلی میں آ گیا تھا۔ کسی کو اس کا پتہ آسانی سے تھوڑی مل سکتا تھا۔ غلام سرور نیا س کے پتے کی کھوج اپنے ملک میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کی مدد سے لگائی تھی، اور اسے وہ دن یاد دلایا تھا جب فسادات کی مار کاٹ میں غلام سرور اپنی بیرک میں تنہا رہ گیا تھا۔ اسکے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ رات کو وہ دیواریں اور چھتیں پھلانگتا ہوا موتا سنگھ کے گھر میں آ کودا تھا۔ اسکے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی کوئی دم میں اس کا خاتمہ ہو جانے والا تھا۔ اسے مارنے کے لیے اس کے کئی پڑوسی اسکی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ موتا سنگھ کے پاس وہ کسی امید پر نہیں آیا تھا۔ امیدیں تو ختم ہو چکی تھیں۔ آنکھوں میں مروت رہی تھی نہ دلوں کی محبت۔ سرحد کے دونوں طرف ایک عجیب سی دیوانگی اور وحشت کا دور دورہ تھا۔ برہنہ تلواریں، نیزے، گنڈاسے چاروں طرف مصروف رقص تھے۔ بجلی کی سی چمک کے ساتھ کوندتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر سر تن سے جدا کر دیتے تھے۔ وہ

موتا سنگھ سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ موتا سنگھ بھی اسے قتل کر سکتا تھا۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے قت اور اغوا کا انتقام اسکی بوٹی بوٹی الگ کر کے لے سکتا تھا۔

جس وقت وہ دیوار پر سے لٹک کر دھم سے زمین پر گرا تو اس وقت موتا سنگھ اپنی روتی ہوئی چھوٹی بچی کو سینے سے لگائے اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی من جیت تھی وہ بچی۔ اسکی بیوی برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ صحن میں دھپ کی آواز سن کر دونوں چونک پڑے تھے۔ وہ سمجھتے تھے شاید مسلسل بارشوں کی وجہ سے دیوار کا ایک حصہ گر گیا ہے۔ موتا سنگھ نے قریب جا کر دیکھا تو وہ غلام سرور تھا۔ زمین پر گھٹنوں کے بل گرا، اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جو موت کی طرح خوفناک تھیں نا امید تھیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا۔ خاموش دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر رہے تھے، ایسی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ بس صرف زبان بند تھی۔ دل و دماغ پر بہت سے بوجھ پڑے ہوئے تھے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں سمجھتے تھے، دونوں جانتے تھے۔ کچھ دیر تک موتا سنگھ خاموش کھڑا رہا جب غلام سرور کی تلاش میں نکلا ہوا ہجوم دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگا تو غلام سرور نے ایک سسکی لے کر سر نہوا ڑلیا۔ موتا سنگھ اسے بچانا بھی چاہتا تو اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ فسادی اس کا دروازہ توڑ کر اندر آ جانا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ غلام سرور اسی کوارٹر میں کودا تھا۔

اچانک موتا سنگھ نے اس کے سر کو چھوا۔ اس کا کندھا ہلایا۔ پھر ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے جانے لگا۔ اس میں اندر چلنے کی اب سکت کہاں تھی؟ گھٹنا زخمی ہو چکا تھا۔ اسے لڑکھڑاتا دیکھ کر موتا سنگھ کو غصہ آ گیا۔ ماں کی ایک گالی دے کر اسے گھسیٹتا ہوا چارپائی کے پاس لے گیا اور اس پر غلام سرور کو پٹخ کر بولا:

''مر یہاں''۔

جلدی سے ایک رضائی کمرے میں سے لا کر اسکے اوپر ڈال دی، اسی چارپائی پر اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی، وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور چلائی۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''تو بکواس بند کر، نہیں تو کرپان سینے میں گھونپ دوں گا''۔

موتا سنگھ سچ مچ کرپان لے کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بچی کو فرش پر گرا دیا تھا جو زار و قطار رو رہی تھی۔

''دونوں لیٹے رہو سیدھے ایک دوسرے کے ساتھ بالکل لگ کر، کسی کو شک نہ ہو کہ دو سوئے ہوئے ہیں''۔

یہ سن کر غلام سرور اور موتا سنگھ کی بیوی کی رگوں کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ دونوں کے جسم بالکل سن ہو کر رہ گئے۔ بے حس و حرکت رضائی کے باہر صرف موتا سنگھ کی بیوی کا چہرہ تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، سمجھ گئی تھی پاگل ہو گیا ہے۔

اسی وقت بہت سے لوگ دیوار پھاند کر اندر آ گئے تھے، دروازہ کھول کر انہوں نے اور بھی بہت سے لوگوں کو اندر بلایا تھا۔ صحن میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ ہر شخص غلام سرور کی جان لینا چاہتا تھا۔ لیکن غلام سرور وہاں کہاں تھا انہوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا، پھر حیران و مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے تھے۔ غلام سرور نے لکھا تھا:

''مجھے آج بھی ان لمحوں کی یاد آتی ہے تو میرا خون اسی طرح رگوں کے اندر جمنے لگتا ہے۔ خدا کی قسم تم نے وہ کام کیا تھا جو ایسے حالات میں میں کبھی نہ کر سکتا، کبھی نہ کر سکتا۔ میرا سر تم دونوں کے آگے تا زندگی جھکا رہے گا۔ میں اجمیر شریف میں چشتی والے خواجہ کے عرس میں شریک ہونے کے لیے آ رہا ہوں، اس مہینہ کی پندرہ تاریخ کو فرنٹیر میل سے دہلی پہنچوں گا۔ ایک دن قیام تمہارے گھر پر کروں گا۔ تم مجھے اسٹیشن پر ضرور ملنا۔ خدا جانتا ہے تم سے کہنے کے لیے میرے دل میں ان گنت باتیں ہیں۔ ملو گے تو سب کہہ سناؤں گا۔ اب تو تمہاری دونوں لڑکیاں سیانی ہو گئی ہوں گی، شاید شادی بھی کر چکے ہو گے ان کی، اور بھی بال بچے ہوں گے

تمہارے۔ان سب سے میرا الگ الگ پیار کہنا۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ میرے بھی چار بچے ہیں۔ خیر سے بڑے بڑے ہیں۔ ملنے پر سب کی کیفیت سناؤں گا۔ ملنا ضرور۔ ورنہ تمہارا گھر ڈھونڈنے میں مجھے بہت دقت ہوگی''۔

تمہارا غلام سرور

مستری (فٹر) گریڈ اول، مشین شاپ، لوکو مغلپورہ

این۔ ڈبلیو۔ آر۔ مغربی پاکستان۔

خط ختم ہو چکا تھا۔ خط کو تہہ کر کے وہ لفافے میں رکھ رہا تھا اس کے چہرے پر گہری فکر پیدا ہو چلی تھی اور ایک قسم کی سختی بھی، جیسے اس کے چہرے کی ڈھیلی ڈھالی جلد اچانک تن گئی ہو۔

اسکی بیوی دونوں ہاتھوں میں ایک چھاج میں دال بٹور کر لاتی ہوئی اسکے پاس کھڑی ہوگئی۔ شلوار قمیض اور دوپٹہ میں دبلا پتلا جسم، ہلکے ہلکے سیاہ بال جو اپنی چمک کھو کر اب مرجھائے ہوئے نظر آ رہے تھے، چہرے پر زردی سی کھنڈی ہوئی تھی، اس سے بولی:

''یہ وہی غلام سرور ہے جو امرتسر میں ہماری بارک میں رہتا تھا؟'' موتا سنگھ نے بیوی کو گھورا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف ابھر آیا۔ پھر اس خوف پر درشتی اور نفرت چھا گئی۔ اس نے جواب دیا۔

''ہاں''۔

''کیا لکھا ہے اس نے؟'' اس کی بیوی نے پھر پوچھا۔

''وہ اجمیر کے عرس میں آ رہا ہے۔ کہتا ہے تمہارے گھر بھی آؤں گا ملنے کے لیے۔ لیکن میں اسے یہاں نہیں لاؤں گا''۔

''کیوں؟'' یکا یک اس کی بیوی نے چھاج پھینک دی۔ دوپٹے کو مروڑ کر دونوں ہاتھوں کے گرد اس طرح سختی سے لپیٹنے لگی جیسے کسی کی گردن مروڑ رہی ہو۔ کڑک کر پوچھا۔

''بولو، اسے یہاں کیوں نہیں لاؤ گے؟''

''ماماں تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'' من جیت گھبرا کر پرے ہٹ گئی۔ موتا سنگھ بھی گھبرا کر چارپائی سے کھڑا ہو گیا، جیسے وہ کہیں پاگل تو نہیں ہوگئی تھی۔ بولا:

''من جیت کی ماں! میں اس سے ملوں گا بھی نہیں۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے''۔

بپھر کر اس نے خاوند کا گریبان بھی پکڑ لیا۔

''تمہیں شرم محسوس ہوتی ہے؟ آج شرم محسوس ہوتی ہے جب میں بوڑھی ہوگئی ہوں! بارہ برس پہلے شرم نہیں محسوس ہوئی تھی جب میں جوان تھی۔ تب تو تم نے میری چھاتی پر کرپان رکھ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا۔ میں اپنی چھاتی کے اندر پڑے ہوئے اتنے بڑے پھٹ کو آج تک نہیں بھول سکی۔ تمہیں بھی وہ پھٹ نظر نہیں آیا کبھی، کیسے نظر آ سکتا تھا۔ یہ نصیب جلی میں ہی ہوں جو آج تک چپکے چپکے رو رو کر سسک سسک کر اس گھاؤ کی پرورش کرتی رہی ہوں۔ میں اسی دن مر جاتی، اسی وقت جان دے دیتی۔ لیکن تم نے مرنے نہیں دیا۔ تم نے مجھے دلاسا دیا تھا، تم نے مجھے یقین دلایا تھا، اس بات کو کبھی یاد نہیں کرو گے۔ کبھی نفرت نہیں کرو گے۔ کبھی طعنہ نہیں دو گے۔ آج تمہیں اس سے ملتے ہوئے شرم کیوں آ رہی ہے؟ تمہیں یہ سوچ اس وقت کیوں نہیں آئی؟ میری بھی کوئی شرم ہے! میری بھی کوئی عزت ہے!! میرا زخم آج پھر پھٹ گیا ہے۔ میری عزت مٹی میں آج پھر ملی ہے''۔ یہ کہتے کہتے وہ زار زار روتی ہوئی سینہ کوبی کرنے لگی اور دھم سے بیٹھ کر اپنا سر فرش کے ساتھ ٹکرانے لگی۔

☆☆☆

پرانا شہر

رحمان مذنب

پرانے شہر کی فصیلیں منہدم ہو چکی ہیں۔ شہر ضرور سلامت ہے۔ اس طرح نور محلہ اور نور مسجد بقید حیات ہیں۔ انہیں لوگ جانتے ہیں۔ بیگم نور حیات کو بھول گئے ہیں۔ اس کی تو قبر کا نشان بھی نہیں رہا۔ اسی نے یہ محلہ بسایا اور چھوٹی سی عبادت گاہ بھی بنا دی جس کی مرمت کی ذمہ داری اللہ رکھا نے اپنے چوڑے چکلے کاندھوں پر ڈال لی۔ اس کار خیر میں عبدالرحمٰن فاروقی شریک کار تھا۔ وہ کوچی پھیر دیتا اور اللہ رکھا قلعی منگوا لیتا۔ یوں کام بن جاتا اور پھر سال بھر کے لیے چھٹی ہو جاتی۔

اللہ رکھا نے کچھ سوچ کر مہترانیوں کی گلی کے دہانے پر اپنی امپیریل سوڈا واٹر فیکٹری کی داغ بیل ڈالی۔ یہاں گہما گہمی رہتی۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار کوئی نہ کوئی مہترانی جلال میں آتی اور کسی اختلافی مسئلے کی بنا پر ہمسائی سے ٹکر لیتی۔ پھر ٹکراؤ کے مظاہرے کو فیصلہ کن بنانے اور ٹریفک روکنے کے لیے گلی سے نکل کر وہ سڑکوں کے بیچوں بیچ آ جاتیں۔ خداداد ذہانت اور قدرت کے عطا کردہ تخلیقی جوہر کی بدولت نہایت فصیح و بلیغ گالیاں وضع کرتیں۔ گالیوں سے دال نہ گلتی تو ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیتیں۔ پھر بھی کیتھارسز نہ ہوتا تو ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتیں اور ایسے ایسے داؤ پیچ کام میں لاتیں جن کا ذکر کوک شاستر میں بھی نہیں ملتا۔

اللہ رکھا کبھی بیچ بچاؤ نہ کرتا۔ بس جی خوش کرتا۔ اپنی سفید پوشی کی حفاظت کرتا جو سفید قمیض، سفید شلوار اور ایک رومی ٹوپی پر مشتمل تھی۔ اپنا امیج ابھارنے کے لیے وہ ہر اتوار کی صبح سفید جوڑا زیب تن کرتا۔ یہ معمول عمر بھر رہا۔ بڑا آدمی بننے کے لیے وہ سفید پوشی کو ضروری سمجھتا اور ایک پلان کے تحت کام کرتا۔ قسمت کی بات ہے کہ اسے تین روپے ماہوار پر اصطبل مل گیا اور اس کے ساتھ پندرہ روپے ماہوار پر گھوڑوں کے مالشیے بھیا جی کو بھی رکھ لیا۔

اللہ رکھا کا قد چھوٹا تھا۔ قد آور بننے کی آرزو رکھتا تھا۔ فٹ رول قد بڑھا نہ سکتا تھا۔ مشین ہاتھ سے چلتی تھی۔ اس نے اپنے طول و عرض سے کہیں بڑا سائن بورڈ بنوایا۔ اس پر موٹے قلم سے اردو اور انگریزی میں امپیریل سوڈا فیکٹری لکھوایا۔ جب چمکتا دمکتا یہ بورڈ اصطبل پر آویزاں کیا گیا اور اللہ رکھا کے ہونٹوں پر مونا لزا سے قدرے زیادہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، قد آوری کا نسخہ ہاتھ لگا، باہر سڑک پر آرام کرسی رکھوائی، پہلو میں حقہ رکھا، ادائے نخوت سے کش لگانے اور آنے جانے والے کا ردعمل معلوم کرنے لگا۔

حقہ اس کی زندگی کا جزو لاینفک تھا۔ اس کی عادت اسے اپنے مرحوم باپ اللہ وسایا کا حقہ تازہ کرتے کرتے پڑی۔ اپنے باپ کی یاد تازہ رکھنے کی غرض سے وہ اپنا حقہ آپ تازہ کرنے لگا۔ ایک طرف اس نے قدامت پسندی کا ثبوت دیا اور دوسری طرف سوڈا واٹر فیکٹری قائم کر کے صنعتی انقلاب سے استفادہ کیا۔ ویسے اس نے صنعتی انقلاب کی پیداوار ــــ لید بھرے تار اور پیڈ رو کے سگریٹ کو منہ نہ لگایا۔ ایک پیسے میں دس سگریٹ کیا برے تھے لیکن کسی نے اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی:

بوریائے خود بہ قالینش مدہ
بیذق خود را بہ فرزینش مدہ

اسے سمجھا دیا گیا کہ فرنگی صنعتی انقلاب کی بدولت مشرق سے ابھرنے والے سورج کے ساتھ زیر حراست ممالک کو بڑی بیدردی سے زیر و زبر کر رہا ہے۔

حقے کی گڑگڑ سے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس سے ہم کلام ہو۔ ایسے میں وہ گہری سوچ میں پڑ کر مستقبل کے سمندر

میں ڈوب جاتا اور دیر تک ڈوبا رہتا۔ علاقے کا واحد صنعتکار تھا۔ لوگ اسے اور امپیریل سوڈا واٹر فیکٹری کے بورڈ کو رشک اور حسد کے ملے جلے جذبات سے دیکھتے۔ پاس سے گزرنے والے سلام ضرور کرتے۔ خاموشی کا دورہ شدت اختیار کر لیتا تو اسے اپنی بھی سدھ بدھ نہ رہتی، سلام کا جواب کیسے دیتا؟ ویسے میں وہ کسی کا سلام موصول ہی نہ کرتا۔

عبدالرحمٰن فاروقی اسے جذب کی کیفیت سے نجات دلانے کی غرض سے لوہے کی کرسی اٹھا کر لانے کی بجائے گھسیٹ کر لاتا۔ یہ ترکیب غیر موثر ثابت ہوتی تو حقے کی نےی اس کے ہاتھ سے چھین لیتا اور اس کی مہر خاموشی توڑ دیتا۔

عبدالرحمٰن فاروقی اس کا لنگوٹیا یار تھا۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنے کی غرض سے لوگوں کے مکانوں میں سفیدی کرتا۔ اسے دانشور بننے کی بھی دھن تھی، چنانچہ اپنے یار فضل کباڑیئے کی دکان سے نیرنگ خیال، ساقی اور عالمگیر کے پرچے خرید لاتا۔ ل احمد کے افسانے بڑی رغبت سے پڑھتا۔

اب دونوں میں سلسلہ کلام جاری ہوتا۔۔۔۔۔۔

"حقہ پیتا ہے تو حقہ پیا کر! اسے ضائع نہ کیا کرو"۔

"بلیا! میں نے امپیریل سوڈا واٹر فیکٹری کچھ ضائع کرنے کے لیے نہیں کچھ حاصل کرنے کے لیے بنائی ہے"۔

"کیا بنایا ہے؟ کیا بنائے گا؟"

"نور محلہ، یہ تو اپنا گھر ہے۔۔۔ ادھر ٹکسالی دروازہ، عزیز ٹھیڑ تک کا علاقہ۔۔۔ ادھر بازار شیخو پوریاں، ہیرا منڈی اور بھاٹی دروازہ فتح کر لیا ہے میں نے۔ میرا پانی یہاں لگ جاتا ہے"۔

"کیسری اور پنجاب سوڈا واٹر فیکٹری کا مقابلہ کیسے کریگا؟"

"اسی سوچ میں تو میں گم رہتا ہوں"۔

"گم رہتا ہے تو کہیں اپنے آپ کو گم نہ کر بیٹھنا!"

"فیکٹری نہ بناتا تو ضرور برضرور اپنے آپ کو گم کر بیٹھتا۔ اب تو میں نے اپنے آپ کو پا لیا ہے"۔

عبدالرحمٰن فاروقی چپ ہو جاتا۔ وہ اتنا ضرور سوچتا کہ اللہ رکھا جیسا کامل بندہ کیا کرے گا؟ فیکٹری چلانا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لیے بڑے چست چالاک، ہوشیار و یلدار بندے کی ضرورت ہے۔

اللہ رکھا کا کام چل نکلا۔ اس نے پنجاب فیکٹری اور کیسری سوڈا واٹر فیکٹری کی پروا نہیں کی۔ سوڈا، لیمن، کیلا، روز، جنجر سبھی قسم کا مال سپلائی کرنے لگا۔ بند گولی والی بوتلیں نو آنے درجن کے حساب سے دیتا۔ دکاندار اکنی بوتل کے حساب سے بیچتے۔ شام کی ونگ سے اسے دو اڑھائی روپے کی بچت ہوتی۔ رقم خاصی بڑی تھی۔ وہ روپیہ بارہ آنے خرچ کرتا، باقی الماری میں رکھتا۔

جب اصطبل تھا تو برکتی اس کی صفائی کرتی بلکہ صفائی کم اور نخرہ زیادہ کرتی۔ اللہ رکھا کو بھلی لگی۔ اس نے دو روپے ماہوار پر رکھ لیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اپنے آپ کو دلکش بنانے کے لیے ہر روز ایک پیسے کا میٹھا بنارسی پان کھاتی اور دوسرے دن دمڑی کا دنداسہ ملتی۔ ہر اتوار کو ملحقہ باغ کی نہر پر جا کر کپڑے دھوتی اور دوپہر تک سکھا لیتی۔ انہیں پہن کر گلی اور بازار کا چکر ضرور لگاتی، ہنستی مسکراتی، اپنے دام بڑھاتی۔

جوں جوں فیکٹری کی سیل بڑھی، برکتی اور بھیا جی کی تنخواہ بڑھی۔ بھیا جی یہ دیکھ کر رنجیدہ ہوا کہ وہ کام کرتے کرتے چور ہو جاتا، اس کی تنخواہ تو بڑھنی چاہیے، برکتی کی تنخواہ کس حساب سے بڑھتی ہے؟ ایک دن اس نے کہہ ہی دیا: میاں! یہ چھوکری کیا پال رکھی ہے؟ کوڑی کا کام نہیں کرتی اور ہر مہینے مہینے پیسے اینٹھ کر لے جاوئے ہے۔ کاہے کو؟"

''بھیا جی! یہ سیاست ہے۔ تو نہیں سمجھتا''۔

''سب سمجھوں ہوں میاں! جھاڑو کم لگاوے ہے نخرہ جیادہ دکھاوے ہے''۔

''بھیا جی! کبھی اس کا مکھڑا دیکھا!''

''دیکھا ہے۔ گھر والی کو دیکھت ہوں۔ باہر تانک جھانک نا ہیں کرتا ہوں۔ عورت وہ اچھی جو کھونٹے سے بندھی ہووے''۔

''بھیا جی! اس کا مکھڑا دھلا ہوا چاند ہے۔ پان کھاتی ہے تو بلیاں لال ہو جاتی ہیں۔ پہلے ہی کم لال نہیں۔ داندا سا ملتی اور دانت موتیوں کی طرح چمکاتی ہے''۔

اتنے میں گاما لالی والا 'ونڈ موتیاں دے دانے۔ ہس دی تے پھل کھڑوے' گانا گاتا آیا اور چلا کر بولا:

''میاں دو پہر کا ویلا آن لگا۔ کب پہنچے گا پانی؟''

''آتا ہے پانی۔ بھیا جی ذرا دل لگی کر رہا تھا''۔

''ہم دل لگی نا ہیں کرت ہیں۔ لالی والے باؤ! تو چل۔ ڈالا لے کر آتا ہوں' بھیا جی نے مشین کی جانب جاتے جاتے کہا۔

''اور تیری خیر ہووے!'' کہ کر گاما لالی والا چلا گیا۔ بھیا جی ڈالا لے کر پیچھے پیچھے گیا۔ ایک دو ڈالے ہوں تو بھیا جی اٹھا کر لے جاتا، ٹھیلے میں رکھ کر نہ لے جاتا، جس کی کھڑ کھڑ دور تک اعلان کرتی جاتی کہ بھیا جی آرہا ہے۔

میدان خالی ہوا۔ اللہ رکھا اپنے آپ سے ہم کلام ہوا: ''کیا بے سرا بندہ ہے۔ اچھی چیز بھی اسے بری لگتی ہے''۔

اتنے میں کلام کرنے والی آگئی اور ہم کلامی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

درمیانے قد کی عورت۔۔۔۔۔ عورت سے سوا تھی۔ اللہ رکھا کو دیکھتے ہی مسکرائی۔ مسکراہٹ اور پھر جوانی کی مسکراہٹ، بڑا موثر ہتھیار تھا۔ اللہ رکھا تو کیا، جسے چاہتی اس ہتھیار سے مغلوب کر لیتی بلکہ وہ آپ ہی آپ فتح ہو جاتا۔ دنداسے نے ہونٹ گہرے نسواری کر دیئے تھے۔ مستی سے لبریز بڑی بڑی کجلائی آنکھیں چوکھیاں کرتیں اور دیکھنے والے چت ہو جاتے۔ بھرپور شباب، کمر سے اوپر زور آوری کے دو نشان، چنی ڈھلک ڈھلک جاتی اور شباب منظر عام پر آ جاتا۔ لمبے بال دو گتوں میں تقسیم کئے ہوئے، غضب کی شان رعنائی تھی۔ ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اپنے وقت کی افرودائتی تھی۔

اللہ رکھا پر اپنے بانکپن کا وار کرتے ہوئے اندر لیمن کے ڈالوں کی طرف چلی گئی۔ انگوٹھے کے زور سے ادھا کھولا، پیا اور اللہ رکھا سے بات چیت کرنے کے لیے آ رہی تھی کہ بھیا جی خالی ڈالے لیے فیکٹری میں داخل ہوا۔ اس کے آتے ہی لبریز بدن اور شوخ تیوروں والی برکتی نو دو گیارہ ہوگئی۔ بھیا جی بد ذوق سہی، لیکن اخلاقیات کے معاملے میں کھرا بندہ تھا۔ بداخلاقی اسے کسی قیمت پر گوارا نہ تھی۔

اللہ رکھا کرسی اور حقہ لے کر سڑک پر آ گیا اور برکتی کی بے بسی پر مسکرایا۔ بھیا جی ہی ایسا بندہ تھا جس پر برکتی کا وار خالی جاتا اور وہ پسپا ہو جاتی۔

بھیا جی نے ڈالے رکھے اور اللہ رکھا کے پاس آیا۔ بولا: ''میاں! کیا دیوت ہے یہ چلبلی چھوکری؟ کیا بچہ لیوت ہوا اس سے؟''

''ارے نہیں بھیا جی! سارا کھیل پیسے کا ہے۔ پیسہ پلے ہو تو تھوڑی بہت دل لگی کر لینی چاہیے۔ نہیں تو جی خراب ہو جاتا ہے''۔

''جی کھراب ہووے تو سادی کر لے بندہ۔ جیون بگاڑ دیوت ہے یہ چھوکری''۔

''نہ نہ بھیا جی! کمر میں ہاتھ ڈالنے اور منہ چومنے سے کیا بگڑتا ہے اس کا یا میرا؟''

بھیا جی اندر چلا گیا۔ سمجھ گیا کے مالک سے الجھنے اور رسوا کرنے کا اسے حق نہیں۔ رمز و کنایہ کا فن اسے آتا نہ تھا۔ وہ پردہ ڈالے بغیر کھری بات کرتا۔

اللہ رکھا بڑا اجلا رہتا اور رونک بھی کھری تھی اس کی۔ حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے دانستہ حساب کتاب کے لیے میلی کچیلی کاپی رکھی تھی۔ کاپی لے کر وصولیاں کرنے چلا گیا۔

ہر دکندار اپنی اپنی بولی بولتا۔ گاماں لالی والے کی تو بس ایک ہی رٹ تھی: "میاں! میری دکنداری نہ مار! بڑی مشکل سے اچھا ٹھکانہ ملا ہے۔ ادھیلے زیادہ دیا کر، بوتلیں کم!"

ایک ہی بندہ ہے میرے پاس! تیرے ہاتھوں کو مہندی لگی ہے۔ آ کر ڈالا لے جایا کر!"

"میاں! کبھی موقیا بنے تو آ جاتا ہوں۔ دکان کھلی چھوڑ کر ڈالا لینے نہیں جا سکتا۔ خالی تھاں دیکھ کر جو چوری نہیں کرتا وہ بھی کرتا ہے۔ ادھے تین بار جا ہیں مجھے! بے شک پیسے پہلے لے لے!"

"نہ۔ یہ کام نہیں کرتا میں۔ پیشگی لیتا ہوں نہ ادھار دیتا ہوں۔ سودا نقد بہ نقدی کا!"

کامنی کی اور ہی سوچ تھی۔ ٹبی کے دہانے پر دکان تھی اس کی۔ خوشحال تھی۔ فری لانسر تھی۔ عمر پکی ہوئی تھی۔ جوانی ڈھل چلی تھی۔ پھر بھی طنابیں کھچی ہوئی تھیں۔ کس تھی بدن میں۔ سانچی کے پان اور قینچی کے سگریٹ اسی سے ملتے۔ ہٹی کا ڈربہ اس نے لال خاں کی خاطر چھوڑا اور اس کی دکان پر آ بیٹھی۔ لال خاں سودا لینے جاتا تو دکان بند نہ کرتا۔ کامنی سنبھال لیتی۔ وہ تو دکان والے کو بھی سنبھال لیتی جس نے اپنے سمیت دکان اس کے حوالے کر دی تھی، لیکن تا بکے؟ جب موت کا ریلا آیا تو وہ اسے سنبھال نہ سکی۔ وہ خود ڈانواں ڈول ہو گئی۔ ٹبی میں اس کا ڈربہ خالی نہ رہا تھا۔ خالی ہوتب بھی وہ لوٹ کر وہاں نہ جاتی۔

اللہ رکھا کو آتے دیکھ کر پڑیا میں رکھے ہوئے دام صندوقچی سے نکالے اور سامنے رکھ دیئے۔ اللہ رکھا نے پڑیا اٹھائی، پیسے گنے اور جیب میں رکھ لیے۔

"میاں! میں تیرے پیسوں میں ہیٔ مانی نہیں کرتی"۔

"کملی ہے تو بھی۔ بھل چک ہو جاتی ہے بندے سے"۔

"میاں! ایک بات ہے۔ تیرا بڑا فیدہ ہے اس میں۔ اتنی دور فیکٹری بنائی ہے۔ وہاں دن بھر بیٹھا مکھیاں مارتا ہوگا۔ اللہ وسائی کا مکان خالی ہونے والا ہے۔ بڑی پکی جگہ ہے"۔

اللہ وسائی کا نام سن کر وہ چوکس ہوا۔ اس نے پوچھا "کہاں جا رہی ہے اللہ وسائی؟"

"جانا کہاں ہے؟ برابر کے بزار میں چاند خاں مٹھائی والے کی دکان کے سامنے چبارہ خالی پڑا ہے۔ جگہ اچھی ہے اس سے۔ وہاں جا رہی ہے"۔

"اچھا"۔

خالی ہونے والا چبارہ بکاؤ ہے۔ بڑی ٹھکانے کی تھاں ہے۔ آدھے گاہک تیرے اسی علاقے کے ہیں۔ لے لے یہ چبارہ۔ یٹھاں بیٹھک میں فیکٹری لگانا! اوپر اپنا ڈیرہ جمانا!"

"اچھا" سوچ لینے دے کامنی! کاروباری معاملہ ہے۔ سوچ وچار کے بعد ہی فیصلہ کرتا ہوں۔ فیکٹری ہے فیکٹری مزاخ نہیں"۔

"کیا سوچنا ہے تجھے؟ گولڈن چانس ہے یہ ہاتھ سے نکل گیا تو ساری عمر سوچتا ہی رہے گا۔ اللہ وسائی او نچے چبارے

میں چلی جائے گی تو دادر کے اصطبل ہی میں پڑا رہے گا''۔

''کھوتے کا بھی سودا کرنا ہو تو بندہ پھر بھی سوچ وچار کر لیتا ہے''۔

''مت کر سوچ وچار! یہاں آئے گا تو بھرے میلے میں آئے گا۔ شراب کے ادھے پوے آدھی رات تک بکتے ہیں یہاں۔ سوڈا منوں منہ اٹھتا ہے۔ تیرے آنے سے مجھے ارمان ہو جائے گا''۔

''ہوں''۔

''پھر یہاں آ کر تیرا جی لگ جائے گا۔ کاروبار دونا ہو جائے گا''۔ پھر ہنس کر بولی ''تیری خدمت فلا کروں گی۔ تیرا پیسہ مجھ پر حرام۔ پائی لوں گی تو پائی پائی روز کے روز دوں گی۔ علاقہ ادھی رات تک جگمگ جگمگ کرتا ہے۔ عزیز تھیٹر کے آگے جو آٹھ، دس دکانیں ہیں وہاں بھبکے جلتے ہیں۔ یہاں کوئی بھبکا نہیں جلتا۔ دن ڈھلتے ہی نیا دن چڑھتا ہے۔ لیمپ، لاٹین، ہری کین اور بجلی کے آنڈے جلنے لگتے ہیں''۔ پھر ذرا توقف کیا اور کہا ''لے پھڑ! قینچی کے سرگٹ پی! عام لوگ پیڈ رو کے سرگٹ پیتے ہیں۔ کھاص کھاص لوگ قینچی کے سگرٹ پیتے ہیں''۔

''میں سگرٹ نہیں پیتا۔ حقہ ٹھیک ہے''۔

''تو آ تو سئی۔ حقے کا بندوبست بھی ہو جائے گا''۔

اتنے میں ولاور شیر فروش آیا اور شکل دکھا کر چلا گیا۔

وہ بولی ''اللہ رکھا! یہ جو شخص ہے یہ منڈوا ٹوٹنے تک دکان کھلی رکھتا ہے۔ پھر کبھی کبھی آدھی آدھی رات کو آ کر میرا بوہا کھڑکاتا ہے۔ کم ذات جواری کہیں کا!''

اللہ رکھا کو کامنی کی باتیں اچھی لگیں، خاص طور پر لل فلا والی بات۔ آج اس نے پہلی بار اس کی دکان پر اتنی دیر تک باتیں کیں اور سنیں ورنہ وہ تو کسی سے فالتو بات نہ کرتا۔ پیسے لیے اور اگلی دکان کا راستہ لیا۔ اسے کامنی معقول سیانی معلوم ہوئی۔ اس نے اس کا حدود اربعہ جانچا۔ جب کامنی نے پان بنا کے بڑی ادا سے اسے پیش کیا تو اللہ رکھا نے اس کی لانبی لانبی، پتلی پتلی انگلیوں کو دیکھا جن پر کتھے کا پکا لال رنگ چڑھا تھا۔ وہ حمیدا جواری نہ تھا ورنہ انگلیاں پکڑ کر دھیرے دھیرے مروڑتا۔ ان کے لمس سے دل کی دھڑکن تیز کرتا۔ کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں آستینیں اس نے صاف ستھری چمڑی اللہ رکھا کو بھلی لگی۔ ادھیڑ عمر کی تھی لیکن عمر کے آثار عیاں تھے، نمایاں نہ تھے۔ چہرہ بے داغ تھا۔ باتیں کرتی، ہنستی مسکراتی جاتی۔ بہار کے دن ابھی لد نہ گئے تھے۔ آنکھوں میں سویرا جاگ رہا تھا۔ اس نے اس ادا سے انگڑائی لی جیسے جوانی کو بیدار کر رہی ہو۔ عورت کو اس عالم میں دیکھ کر اس مقام پر جا پہنچا جہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بے خود ہو گیا۔

فیکٹری کے انتقال کا مسئلہ سود و زیاں کی حدود سے نکل کر دل تک جا پہنچا۔

اللہ وسائی نے مکان چھوڑ دیا۔ اللہ رکھا نے روک لیا۔ بات کل پرزے اکھاڑنے کی نہ رہی، سوچ میں ایک عورت کلبلائی۔ اللہ وسائی تو ہر جگہ اللہ وسائی تھی۔ اللہ رکھا کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا، یہ بھی اللہ رکھا ہر جگہ اللہ رکھا ہی رہے گا۔

وہ پہلے بھی حساب کی میلی کچیلی کاپی لے کر یہاں آتا، چونیاں اٹھنیاں بٹور کر چلا جاتا۔ کامنی نے بھی کبھی جال نہ پھینکا۔ یہ تو سب تقدیر کا کیا دھرا تھا جو اپنے وقت پر کام کر دکھاتی ہے۔

اللہ رکھا نے نئی مطالعہ گاہ میں قدم رکھا۔ نئی دنیا میں آیا۔

نیکی اور بدی کے طوفانوں سے کھیلتی ہوئی یہ دنیا گورکھ دھندا تھی۔ چاروں کھونٹ بھلے مانسوں کی ماڑیاں تھیں۔ چھوٹی

چھوٹی کوٹھڑیوں کے اوپر کوٹھے تھے۔ ڈیرہ دارنیوں اورنکیائیوں کے ٹھکانے شرفا کی حویلیوں سے جڑے ہوئے تھے، لیکن دیواریں آپس میں باتیں نہ کرتیں۔ کوئی دیوار نہ پھاندتا، ادھر ادھر نہ جھانکتا ہر ایک کو اپنے کام سے کام تھا۔ اس عدم مداخلت نے عدم تشدد کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تشدد کی نوبت آتی تو نیکوکار نیکوکاروں سے لڑتے اور بدکار بدکاروں پر ٹوٹ پڑتے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لیے علاقے کا تھانیدار بیچ میں کود پڑتا۔ اس کار خیر کے عوض نیکوکاروں سے برائے نام اور بدکاروں سے من مانا مختانہ وصول کرتا۔ بدکاروں کی کارگزاری پیش نظر رکھ کر تھانے کی نیلامی میں بڑھ چڑھ کر بولی دی جاتی۔ سہرا بدکاروں کے سر تھا جو تھانے کی مستقل آسامیاں تھے۔

دنگا فساد کرنے والے پیشہ ور لوگوں نے کبھی امن اور قانون کا مسئلہ کھڑا نہیں کیا کیونکہ تھانے میں پہنچ کر وہ بڑی برخود داری دکھاتے، چپ چاپ لمبے پڑ جاتے، بلا تامل پولیس کے تاریخی چھتر کھاتے، حسب معمول بلبلاتے، چیختے، چلاتے، حسب معمول پیسے دے کر چلے جاتے اور پھر از سر نو پڑھا ہوا سبق دہراتے اور اللہ کو پیارے ہونے تک اسی اسلوب سے زندگی گزارتے جسے وہ تقدیر بندھن کہتے۔

فاروقی نے نقل مکانی کو ناپسند کیا۔ بھیا جی اس کا ہم خیال تھا۔ دونوں نے مل کر پیشگوئی داغی کہ میاں پٹڑی سے اتر گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ فیکٹری کو ٹھکانے لگا کر گھر جا بیٹھے گا۔

فاروقی نے اخلاقی لیکچر پلانے کی ٹھانی اور کہا ''یار اللہ رکھا! یہ کیا تو نے کہا؟ گشتیوں کے بازار میں آ گیا۔ ٹکہ ٹوکری ہیں عورتیں یہاں۔ لوٹ لیں گی تجھے اور تو کچھ کر نہ سکے گا''۔

قبل ازیں کہ معاملہ طول پکڑتا اللہ رکھا نے بھیا جی سے کہا ''ہاتھ والی بوتل ادھر لے آ! فروقی کو پلا! اس نے رات کوئی خواب دیکھا ہے''۔

بھیا جی تازہ بھری ہوئی جنجر کی بوتل لے آیا اور فاروقی کے سامنے رکھ دی۔

''کوئی جھوٹا خواب نہیں دیکھا میں نے۔ میرے خواب سچے ہوتے ہیں اللہ رکھا! دیکھ لینا!''

''سچے خواب دیکھتا ہے تو بن جا سفنا پیر! یہیں فیکٹری میں بیٹھ کر حق ہو کر! دربار جانے سے پہلے بڑی بڑی عورتیں تجھے سلام کرنے آئیں گی۔ چڑھاوے میں آدھا تیرا آدھا میرا۔ سوں رب دی! غرور کے گھوڑوں پر سواران عورتوں کی اکڑی تنی گردنیں تیرے آگے جھک جائیں گی۔ بڑی ڈرپوک ہوتی ہیں یہ! پیر فقیر کی مار سے مر جاتی ہیں۔ چھوڑ کوچی پھیرنے کا کام! کوٹھی بنا لے گا کوٹھے والیوں کی مدد سے''۔

فاروقی نے بوتل منہ سے لگانے کے لیے برابر رکھی ہوئی میز سے اٹھائی اور ہنس کر کہا ''تو نے بات ہی کھو کھاتے میں ڈال دی اللہ رکھا!''

''بلیا! تو اپنے آپ کو سمجھتا ہے نہ کاروبار کو۔ میں سمجھتا ہوں کاروبار کیا ہوتا ہے''۔

''تو کیا سمجھتا ہے؟ یہ گشتیاں تجھ سے زیادہ سمجھتی ہیں۔ تجھ سے بھی بڑے بڑے کاروباری ان کی مٹھی میں ہوتے ہیں۔ کاروباری لوگ ہمیں لوٹتے ہیں، یہ کاروباری لوگوں کو لوٹتی ہیں، کون بڑا ہوا پھر؟ تو کیا ہے اور گشتیوں کے ہیٹر کے ہیٹر ہیں یہاں''۔

''چھوڑ یار! کیا باتیں لے بیٹھا ہے صبح صبح۔ گشتیاں تو ابھی سوئی پڑی ہیں''۔

فاروقی نے بوتل پی۔ حقے کی گڑگڑ شروع ہوئی۔

اللہ رکھا نئی دنیا میں آ گیا تھا۔ جو قدم اٹھا اب واپس نہ جا سکتا تھا۔

سامنے بھیڑی گلی۔۔۔۔اس نے اچھی طرح دیکھی۔یہاں گناہوں کا کیچڑ تیز رو نالی بہا کر لے جاتی۔نالی بلندی سے پستی کی طرف بہتی۔کیا لوگ اور کیا یہاں کی عورتیں، بلندی سے پستی کی طرف جاتیں۔ان کے گناہوں کا بچا کھچا لاوا مہترانی اور ماشکی صاف کر دیتے۔گلی کو بھی دھو کر صاف کر دیتے۔گلی دھل کر یوں چمک اٹھتی جیسے کسی مہمان خصوصی کی آمد آمد ہو۔جوان مٹیاریں آتیں، شوخی دکھاتیں، ڈالفن کی طرح شرارتیں کرتیں۔جلد ہی جوانی ڈھل جاتی۔جوں جوں گردوں عمر کی گھڑیاں گھٹاتا توں توں چہروں کی لپائی پتائی بڑھتی۔اللہ رکھا کمال و زوال کے یہ تماشے دیکھنے لگا۔

دھندا تو دن چڑھے شروع ہوتا، لیکن ہاؤس فل زوال آفتاب کے بعد ہوتا۔سرِ شام گلی میں بھیڑ ہو جاتی اور تل رکھنے کی جگہ نہ رہتی۔چھلوں اور گالیوں کا بیک وقت مزا لوٹنے والے ہلڑ مچاتے۔مرغیاں ڈربوں سے باہر آ جاتیں۔پھر جیسے مجمع گیر تماشا دکھا کر سانپ پٹاریوں میں ڈال لیتا اور بر سر مطلب آتا تو بھیڑ چھٹنے لگتی اسی طرح دل پشوری کرنے والے ماں بہن کی گالیوں سے تواضع کروا کے لطف اندوز ہو کر رخصت ہو جاتے۔سچے گاہک بالخصوص سفید پوش اور آنے والی سہاگ رات کے لیے ریہرسل کرنے والے ڈربوں کی مرغیوں اور چوباروں کی کبوتریوں کی طرف لپکتے۔آدھی رات کے لگ بھگ اپنے اپنے دلوں کو دن بھر کا حساب دے کر یوں چارپائی پر جا پڑتیں جیسے دم توڑ گئی ہو۔

اللہ رکھا کے شام کا وقت بہت اہم ہوتا کیونکہ اس وقت وہ دکنداروں سے وصولی کرتا۔اس کے اندرونی شلوکے کی جیبیں چہرہ شاہی روپوں اور اٹھنیوں چونیوں سے بھری ہوتیں۔ان کی حفاظت ضروری تھی۔پہلے گلی کے دکنداروں سے وصولی کرتا۔ساتھ ساتھ تماشا بھی دیکھتا جاتا۔اصطبل چھوڑ کر وہ گھاٹے میں نہیں رہا۔

فاروقی نے صاف صاف کہا" اللہ رکھا! تو کاروبار کرنے نہیں، عاقبت خراب کرنے یہاں آیا ہے۔میں اس شیطانی کام میں تیرا کیسے ساتھ دے سکتا ہوں؟ تیری تباہی میں میرا نہیں، ان کشتیوں کا ہاتھ ہوگا جو تجھے چمٹنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں"۔

"توں دم کی دم ہی رہے گا یار!"

اللہ رکھا اکیلا ہجوم کو چیرتا چیرتا اور وصولی کرتا کرتا گلی میں سے چلا جاتا۔سفید پوش اور سیٹھ بننے کا بھوت ہر دم اپنے اوپر سوار رکھتا۔پھر بھی بندہ بشر تھا۔للا فلا والی بات بھولا نہ تھا۔ایک رات شیطان نے اسے آن گھیرا اور وہ کامنی کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نیت سے ادھر گیا لیکن سراپا شیطان دلا اور شیر فروش بلکہ سرفروش دیوانہ وار دروازہ بھڑ بھڑا رہا تھا۔اللہ رکھا لوٹ آیا۔اس کی قسمت میں کامنی بھی نہ تھی۔

قسمت مہربان تھی۔سیٹھ بننے کا منصوبہ کامیاب ہو رہا تھا۔ابھی گلی سے جی نہیں بھرا تھا کہ وہ ایک قدم اور بڑھا۔بڑے بازار میں تھانے سے کچھ ہی دورہ، حافظ ہوٹل کے برابر سینما کی بیرونی عمارت میں ایک ہال خالی ہوا جو اس کی موجودہ جگہ سے دگنا تگنا تھا۔کسی سے مشورہ کیے بغیر اس نے فیکٹری اکھاڑ کر یہاں لگا دی۔

حسب دستور تمام دکان داروں کی طرح علی الصبح آ جاتا۔بھیا جی اس سے پہلے آ کر فیکٹری کھول کر کرسی باہر تھڑے پر جما دیتا۔لمبی میز اور کرسیاں صاف کر دیتا۔داراں مہترانی تھڑا اور فرش صاف کرتی۔یہ شوخ شرارہ برکتی کا بدل تھی۔

اللہ رکھا اور حقہ دونوں کا نام ایک ساتھ لیا جاتا۔سیٹھ بننے کے لیے سوچ کا جال بنتا رہتا۔دن بھر بجلی چمکتی، شعلے اس کے پاس سے گزرتے اور اس کی سوچ میں رخنہ ڈالتے۔

چھوٹے گیئر سے نکل کر بڑے گیئر میں آ گیا۔۔۔۔کاوش کے بغیر، کوشش کے بغیر! قسمت کے کام تو پھر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

جو سنا سنایا تھا، حقیقت بن کر سامنے آیا۔ سنی سنائی داستانوں کے اصل کردار دریافت ہوئے۔ ٹبی کے پہلو میں بیٹھ کر خواب ہی دیکھے تھے، اب وہ خواب جیتے جاگتے دکھائی دیئے۔ بالی (بعدازاں ہر ہائی نس اقبال بیگم آف خیر پور) عیدن بائی اکھیاں والی، عیدن بائی ہسیاں والی، عنایت بائی ڈھیرو والی، خورشید بائی حجرو والی۔۔۔۔ یہ بڑے بڑے نام ہیں۔ حجرو گھرانے کا نام تو اللہ رکھا نے بھی سن رکھا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس گھرانے کے لوگ ملک ہی نہیں ملک سے باہر بھی مامور ہیں۔ وہ ان سے تعلق تو قائم نہ کر سکتا تاہم انہیں دیکھ سکتا تھا۔ بڑے کلچرڈ تھے یہ لوگ۔ ہیرا منڈی اس کا کاروباری مرکز ہی نہیں محلّہ بھی تھا۔ اس کی فیکٹری سے کچھ دور ایک طرف تھانہ تھا، دوسری طرف مسجد اور مدرسہ نعمانیہ تھا جسے وہ ہر سالانہ جلسے میں چندہ دیتا۔ مدرسے کی دیوار کے برابر وزیر بائی کا ڈیرہ تھا۔ اس سے تو ہر روز سرراہے ملاقات ہو جاتی۔ دو چار جملوں کا تبادلہ بھی ہو جاتا۔ طمنچہ جان جو حافظ ہوٹل کے بالکل سامنے رہتی تھی، باہر نکلتی نہ تھی۔ نیتی سنیارن سے بھی اس کا تعارف ہوا۔۔۔۔ سبھی شائستہ عورتیں تھیں۔ طاؤس و رباب کی جان تھیں جو اس وقت تک بدن کا تقدس برقرار رکھتیں جب تک گاہک دہلیز پر سجدہ نہ کرتا اور منہ مانگے دام قدموں میں نہ رکھتا۔

ان وفا ناشناس مخلوق تک پہنچنے کے لیے بے حیائی، بے باکی اور مخیّر طبعی ایسے اوصاف ضروری تھے۔ اللہ رکھا اس معاملے میں تقریباً صفر تھا۔ اللہ رکھا تو بلند نظری سے کوسوں دور تھا، آنکھیں میں آنکھیں ڈال کر بلند و بالا کوٹھوں کے مکینوں سے وہ کیونکر گفتگو کرتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کا سرا اونچا نہ ہونے دیتیں۔ پھر مخیّر طبعی تو قطعاً راس نہ تھی اسے۔ کیسے یوں اشرفیاں لٹاتا جیسے اس کی نہ ہوں، کوٹھے والیوں کی ہوں۔ اس طرح تو وہ قیامت تک بڑا آدمی نہ بن سکتا۔

یہ کیا کم تھا کہ ہر جمعرات کو وہ ایک روپے کے دھیلوں سے لدا پھندا پیالہ لے کر بیٹھ جاتا۔ فقیر آتے اور دھیلا دھیلا لے کر چلے جاتے۔ جھڑکیں بھی ساتھ کھتے۔ فقیروں کی فقیری اس طرح برقرار تھی۔

وہ امتحان گاہ میں آ گیا تھا۔ سب لوگ اس جیسے نہ تھے۔ کوٹھے پر وہی جاتے جو آنکھیں بند کر کے آتے اور خوشی خوشی اندھے کنویں میں ڈھے جاتے۔ یہاں سے ان کی لاش ہی برآمد ہوتی۔

وہ یہاں کا گورکھ دھندا سمجھ گیا کہ پیسہ ہی کارساز ہے، خدا ہے یہاں کا۔ عورت بکاؤ مال ہے۔ پیسہ ختم، کھیل ختم۔ پیسے کے ذریعے ہر کوئی جلوے خرید سکتا تھا۔ محبت اور وفا جیسی انمول چیزیں بھی قابل فروخت تھیں۔ جب تک پیسہ چلتا، ان کا دکھاوا بھی چلتا۔

وہ عورتوں کو شوق سے دیکھتا۔ بالی عید کا چاند تھی۔ رات کو مجرا خانے میں بیٹھتی جس کے آگے وسیع دالان تھا۔ دروازہ کھل جاتا۔ تازہ ہوا اور راہگیروں کی نظریں یہیں سے اندر جاتیں۔ اللہ رکھا بھی دروازے کے پاس سے گزرتا تو مجرا خانے میں قالین پر جلوہ افروز بالی پر نظر ڈالتا جاتا۔ یہ اس علاقے کا فرنج بینفٹ تھا۔

پانی کے حوالے سے نوگزے کی قبر کا علاقہ اللہ رکھا کی عملداری میں تھا۔ آگے کیسری سوڈا واٹر فیکٹری کا علاقہ تھا۔ اپنے علاقے کی مخلوق سے تعلق پیدا ہوتا گیا لیکن یہ تعلق خاطر نہ تھا۔ اللہ رکھا کو حجرو اور ڈھیرو خاندان کی عورتیں اچھی نہ لگتیں جو اسے کبھی گھاس نہ ڈالتیں۔ ویسے بھی وہ کم ہی باہر نکلتیں اور نکلتیں تو بڑی بے نیازی سے گزر جاتیں۔ اللہ رکھا تو کیا وہ تو کسی نظر باز کی نظروں کا جواب نہ دیتیں۔ طمنچہ جان کا تو یہ حال تھا جیسے بزاز ہٹہ کے دکاندار قیمتی زری کی کامدار ساڑھیاں کپڑے میں لپیٹ کر رکھتے۔ وہ بھی اپنی چاردیواری میں لپٹی رہتی۔۔۔۔ بڑی بڑی حویلیوں والیاں کسی کی طرف نہ دیکھتیں۔ سب انہیں دیکھتے۔

سیٹھ بننے کے عزم سے لدے پھندے اور سفید پوشی کے بوجھ تلے دبے ہوئے اللہ رکھا کے لیے جینا عذاب تھا۔ چلتی پھرتی حوریں سامنے آتی رہتیں اور وہ تلملاتا رہتا۔ بالآخر گلزار بائی، اس کی بہن سردار بائی، وزیر بائی اور متوسط طبقے کی عورتوں سے علیک سلیک ہونے لگی۔ انہیں وہ اپنے لیے موزوں سمجھتا۔ کبھی کبھی ان کے کوٹھوں پر چلا جاتا ہے۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

ڈال کر دیکھتیں۔۔۔۔شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات! کیا عجب کہ اس کا دل پگھل جائے اور وہ دن بھر کی کمائی ان کے قدموں میں ڈال دے لیکن وہ تو بس تھالی میں سے پان اٹھا کر منہ میں رکھتا اور چہرہ شناسی اس میں دھر دیتا، باتیں کرتا اور کپڑے جھاڑ کر لوٹ آتا۔ جہاں تک گانے کا تعلق تھا وہ فیکٹری کے تھڑے پر بیٹھے بیٹھے صبح کو، تلیم کے وقت اور نماز عشاء کے بعد سن لیتا۔ رات کو مجرا خانے سرتال کے سرچشمے بن جاتے۔ درمیان میں حقے کی موسیقی اس کا جی بہلاتی۔

گلزار بائی جسے اپنی لبریز جوانی، نیلگوں اور جنسی دلکشی پر ناز تھا اسے گزند پہنچاتی رہتی۔ کبھی درزی، کبھی لانڈری والے، کبھی پان فروش اور کبھی خوانچہ فروش کو سودے کے پیسے وصول کرنے کے لیے بھیج دیتی۔ اللہ رکھا حیلے بہانے تو کرتا لیکن ان کے بلند بانگ تقاضوں اور غل غپاڑے سے بچنے کے لیے دام دینے ہی پڑتے۔ آخر عزت دار اور معزز بندہ تھا۔ وہ بازار میں ٹٹ پونجیا کہلانا نہ چاہتا۔ ہیرا لانڈری والا اس کے پاس فیکٹری پر نہ جاتا بلکہ جب وہ پانی کی وصولی کر کے نوگزے سے پلٹنے لگتا تو وہ سامنے آ جاتا۔۔۔اس کے حیلوں بہانوں کی کاٹ یوں کرتا ''کیا کہے گی گلزار بائی کہ سیٹھ کے پاس دھلائی کے دو روپے بھی نہیں''۔

''نہیں ہوتے کسی وقت پیسے''۔

''اب تو وصولی کی ہے، اب تو پیسے دے!''

''خاک وصولی کی ہے''۔

دام لینے کے لیے ہیرا لانڈری والا کبھی اونچی آواز سے نہ بولتا۔ وہ جانتا تھا کہ دلیل میں تلوار کی کاٹ ہے۔ اللہ رکھا کو اپنی عزت کا پاس ہے۔ لیت ولعل کرے گا تو اس کی عزت کے پرخچے اڑ جائیں گے سرعام۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا اور روپیہ ڈیڑھ نکال کر اس کے حوالے کرتا۔

مکھی چوس ہوتے ہوئے بھی اسے مکھی چوس کا طعنہ گوارا نہ تھا۔ دس روپے کماتا، ایک خرچ کرتا، باقی بچاتا۔ بچت میں سے کبھی کبھی کٹوتی کر لیتا اور اس سے بازار کی تتلیوں کو نوازتا۔ اس کی پہلی کوشش تو یہ ہوتی کہ لیمن کی ایک بوتل ہی سے پروانہ راہداری مل جائے لیکن ایسی احمق کوئی نہ تھی جو ایک بوتل پر ریجھ جائے۔ وہ تو ایک آدھ میٹھے بول سے بوتل ڈکار جاتیں اور اتنا کہہ کر چل دیتیں: ''کدی ساڈے ول وی آئیں سجنا!''

وزیر بائی خاص وضع کی عورت تھی۔ دو ڈیروں کے درمیان رہتی تھی۔ ایک جانب عنایت بائی ڈھیرو والی کا ڈیرہ تھا، دوسری جانب خورشید بائی جہرو والی کی حویلی تھی۔ دیوار کے برابر مدرسہ نعمانیہ تھا۔ دو چار قدم پر مسجد تھی۔ رواداری کے سیمنٹ سے ان کی جڑیں ایک دوسرے سے جڑی تھیں، مضبوط و مستحکم تھیں۔ ایک کو دوسرے سے سروکار نہ تھا۔ کفر اور اسلام میں خوب نبھ رہی تھی۔

بائی پنجابی اور اردو دونوں زبانیں روانی سے بولتی۔ پنجابی میں ذرا زیادہ روانی تھی۔ اردو میں شائستگی قائم رکھتی، بڑے تکلف اور وقار سے لفظوں کی مار دیتی۔ گلے پر چھری پھیرتی تو ہنس ہنس کر پنجابی میں گفتگو کرتی۔ اردو اور پنجابی میں جو لسانی فرق ہے اسے وہ بخوبی سمجھتی۔ جانتی تھی کہ اردو میں شائستگی ہے تو پنجابی میں بے ساختگی ہے۔ بڑی سلجھی ہوئی عورت تھی۔۔۔۔۔حاضر جواب، پرکشش اور پرگو۔ صاف ستھرے اور مہذب گاہک کو پسند کرتی لیکن کاروبار میں برے بھلے، لیچڑ، کیچڑ سبھی سے واسطہ پڑتا۔

اللہ رکھا کو وزیر بائی اچھی لگتی۔ اس کی اداؤں سے واقف ہو چکا تھا لیکن اللہ رکھا کے پاس پیسہ تھا، دل نہ تھا۔ دریا دلی کہاں سے آتی؟ ادا فروشی کی قیمت نہ ملنے پر وزیر بائی کو وہ کیسے اچھا لگتا؟

اللہ رکھا آتا جاتا رہتا، وہ مسکرا کر خیر مقدم کرتی رہتی، لیکن جب پانچ سات بار آنے کے بعد اس نے پانچ سات روپے بھی خرچ نہ کیے اور اردو نواز وزیر بائی کی کاروباری شائستگی رنگ نہ لائی تو ٹھیٹ پنجابی پر اتر آئی۔ اس نے پوچھا ''کیہ کریں گا ایسی

کمائی نال؟ کرسی تے بیٹھا بیٹھا سک جاناایں۔توں تے پا ساوی نئیں موڑدا''۔

''کاروبار تے فیرانج ہی ہوندا ہے''۔

''میرا کاروبار انج نہیں ہوندا۔ دل کھول، کھیسہ کھول!''

''میں کیہڑا کچھ کرنا ہوندا ہے''۔

''اب تو وزیر بائی جلال میں آئی اور بولی'' کالے منہ والے نے کیہ منہ کالا کرنا؟''

اللہ رکھا نے بظاہر برا نہ مانا اور ہنس کر چلا گیا۔ مجرا خانے کا ماحول صاف ہوگیا۔

بڑے استاد جی نے کہا'' بی بی! ایسی سختی نہ کیا کریں! کون جانے کب پتھر موم ہوتا ہے؟''

''یہ ساری عمر پتھر رہے گا''۔

''پھر بھی منہ توڑ جواب دینا ٹھیک نہیں''۔

''یہ تو نری سر پیڑ ہے۔ پہلے ہی مندا ہے۔اس مفت بر کا جی کیسے بہلاؤں؟''

''مجبوری ہے بی بی''۔

''استاد جی! اسے تو اتنی تمیز نہیں کہ منہ میں پان رکھ کر رنڈی کے ڈیرے پر نہیں آنا چاہیے۔وہ تو میرا پان بھی نہیں کھاتا کہ کہیں ایک روپیہ نہ دینا پڑے''۔

''گندہ بندہ ہے۔کیا کریں؟ بازار میں بیٹھے ہیں۔ڈیرہ بھی ہے کام سے طعام ہے''۔

''نہ استاد جی! اس پھوکے بندے سے ہمیں کام نہیں''۔

وزیر خود ہی ڈیرہ چلاتی تھی۔خود ہی رنڈی تھی، خود ہی نائیکہ۔استاد جی صلاح کار تھے۔

وزیر بائی نے بے اعتنائی برتی۔۔۔کاروباری حربے کے طور پر نہیں اللہ رکھا اس کے نزدیک کنڈم مال تھا۔ گو اس کے لیے وہ پھوکا تھا لیکن اپنے لیے وہ بڑا ٹھوس تھا۔ اللہ رکھا کو سیٹھ بننا تھا اور کوٹھوں پر جانے والے رئیس کنگال بن جاتے ہیں۔ یہ قصے روز دیکھنے میں آتے۔اہل دل کی جنت میں یہی کچھ ہوتا۔وہ اگر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وزیر بائی کے کوٹھے کا رخ کرتے تو وہ سمجھتا کہ اس کا اپنی پڑوس پر حق شفعہ ہے۔سیٹھ بننے والا ایسی ہی سوچ رکھتا ہے۔

چند دن گزر گئے۔اللہ رکھا کے دل پر بائی نے جو لفظی چوٹ لگائی تھی، اس کا درد جاتا رہا۔

وزیر بائی مجرا خانے میں بیٹھی تھی۔گاہک کا انتظار تھا۔یہ انتظار بڑا کرب ناک ہوتا۔موت اور گاہک کا وقت مقرر نہیں۔ گاہک آئے نہ آئے، آدھی رات تک بیٹھی رہتی، گاہک کی آس لگائے۔سیڑھیوں کے اوپر آنے کی آواز آئی۔ پینترا بدل کر سیدھی ہوئی تا کہ آنے والے کا خیر مقدم کرے۔اللہ رکھا نمودار ہوا۔سامنے آکر بیٹھ گیا۔کلف دار استری شدہ سفید براق پوشاک زیب تن تھی۔سیاہ سفید کا مالک نظر آرہا تھا۔سفید کپڑوں کی وجہ سے چہرے کی سیاہ رنگت اور بھی نمایاں ہوگئی۔وزیر بائی نے سگرٹ کا دھواں منہ پر مارا۔جھلسے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر کہا'' کپڑے تے بڑے چٹے دھوتے نیں، منہ وی ڈرائی کلین کرالیناسی''۔

''کپڑے میں سوائے نیں تے منہ اللہ نے بنایا اے''۔

''تیرے نال میچ کرن والیاں پرلے بزار وچ ہیگیاں نیں''۔

اللہ رکھا اٹھ کر چلا گیا۔

وزیر بائی کی زبان کی کاٹ جوں کی توں رہی۔طنز و مزاح کا یہ شہکار اپنی فطرت سے انحراف نہ کرتا۔ بری طرح ڈسا گیا

تھا، اس نے وزیر بائی کو اپنی عملداری سے خارج کر دیا۔ دل تو پہلے ہی تابع تھا اب اور بھی تابع ہو گیا۔ ویسے اس نے دل کو خاصا ناکارہ بنا رکھا، اب وزیر بائی کے حوالے سے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔

بڑا نام تھا امپیریل سوڈا واٹر فیکٹری کا علاقے میں۔ ایسا گیا گزرا تو نہ تھا اللہ رکھا کہ کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہ دے۔ دھیرے دھیرے بشرط استواری منزل بہ منزل مارتا چلا گیا۔ میل جول کا دائرہ متوسط طبقے میں بڑھتا گیا۔ وہ خود متوسط طبقے میں سے تھا۔ یہ طبقہ اس کے اندر تک دھنس گیا تھا اور اس کا نظریہ یہ تھا کہ بے شک لکھ پتی ہو جاؤ، رہو متوسط طبقے میں، اس کی مخلوق کے انداز سے زندگی سوکھی گزرے گی۔

چوکھا پیسہ بنا لیا اس نے لیکن کرسی نہ بدلی، لمبی میز نہ بدلی۔ وہ آپ بھی نہ بدلا۔ اس سمیت سب کچھ کباڑیئے کا مال لگتا۔ پہلے بھی آٹھویں دن کپڑے بدلتا تھا، اب بھی آٹھویں دن بدلتا تھا۔ پہلے بھی حافظ کے ہوٹل دونی کا کھانا کھاتا تھا، اب بھی کھاتا تھا۔ لاہوری کے تنور پر کبھی نہ گیا جہاں دو پیسے میں پیٹ بھرتا تھا۔۔۔۔۔ دو پیسے کی یہ ڈبل دو روٹیاں اور دال کا پیالہ مفت۔

وہ کسی کو دیکھنے نہ جاتا۔ آپ ہی دن سوئی عورتیں سج دھج سے نکلتیں اور اس کے سامنے آ جاتیں۔ اسے تو آنکھوں کا زاویہ بھی بدلنا نہ پڑتا۔ وہ ایک ہی نظریہ، ایک ہی زاویہ نظر رکھتا۔ تھڑے پر بیٹھا بیٹھا پوری ہیرا منڈی کا نظارہ کر لیتا۔ رہی سہی کسر اس وقت نکل جاتی جب وہ میلی کچیلی کاپی لے کر وصولی کے لیے دکانوں پر جاتا۔ نجو بائی کو بھی اس نے چلتے پھرتے وقت دیکھا۔ بڑی منفرد عورت تھی۔ نازک اندام تھی، ترشے ہوئے اعضا تھے، جنسی کشش غضب کی تھی۔ جی چاہتا کہ ہنستی مسکراتی ہیلن آف ٹرائے سامنے کھڑی رہے اور اسے دیکھتے ہی رہو۔ تماشائیوں کی ترستی ہوئی نظریں چیرتی گزر جاتی۔ اللہ رکھا نے اسے حیرت سے دیکھا تو حیرت کے دریا میں ڈوب گیا۔ ایسے میں انا الحق کا نعرہ داغا جاتا ہے۔ لیکن وہ تو بالکل کورا تھا اس معاملے میں۔ اس کے پاس انا تھی نہ حق تھا۔ ان کے بغیر ہی زندگی گزارتا۔

وہ کیا جانے حیرت اور انا الحق کا رشتہ؟

پیار والے اس کے پاس آتے، وہ پیار والوں کے پاس جاتا لیکن پیار اور پیسے کے رشتے سے بے تعلق ہو کر۔ اس میں اس کی سلامتی ہے۔ ایک دن کی کمائی کے عوض مہینے بھر کا پیار چاہتا۔ گلزار بائی ہی اسے غنیمت۔ ایک دن کی کمائی ہتھیائی اور ساتویں آٹھویں دن چیخنے چلانے لگتی بلکہ وہ کیا چیختی چلاتی، پان سگریٹ، دودھ دہی والے اور دوسرے تیسرے قرض خواہ چیختے چلاتے، جس سے اللہ رکھا کے سر میں درد ہو جاتا اور اس کا امیج خطرے میں پڑ جاتا تو وہ ان کے مطالبے اونے پونے پورے کر کے پیچھا چھڑاتا۔

پیار والے پیار کی دکانیں سجاتے۔۔۔۔۔ پیار کے گاہک آتے۔۔۔۔۔ اور بقدر ظرف یا زر پیار لے لیتے۔۔۔۔ اللہ رکھا کبھی مستفید ہوتا لیکن سنبھل سنبھل کر۔

ہیرا منڈی میں آ کر اللہ رکھا خاصی حد تک کھلی کتاب ہو گیا لیکن حساب کتاب کی میلی کتاب کی میلی کچیلی کاپی ہمیشہ بند ہی رہی۔ لاہور کے بارہ دروازوں اور تیرہویں موہری میں سے ہیرا منڈی سمیت دو دروازے اور موہری اس کے تسلط میں تھی اور پھر ایک ہیرا منڈی اس کی باقی سلطنت پر بھاری تھی۔ یہاں کی تو مٹی بھی سونے کے بھاؤ بکتی۔ سوہا بازار کے جوہری یہاں آ کر اپنا سارا ذاتی صفاتی جوہر بیچ ڈالتے، عورتوں کو سونے چاندی سے لاد دیتے اور انجام کار سوہا بازار کا رخ کرنے کی بجائے یہاں کے چانڈو خانوں میں بھٹکتے پھرتے۔ یہاں تو وہی آتا جو جان بوجھ کر جھوٹی اداؤں، وفاؤں اور جھوٹے پیار کا طلب گار ہوتا اور رکھوئی جنسوں کی ہر قیمت پر سستا سمجھتا۔ اللہ رکھا میں دھوکا کھانے کا یہ وصف ہی نہ تھا۔ اس کے اندر ایسی تجوری تھی جب وہ موج میں آتا اور کوئی طوفانی موج اسے آ لیتی تو وہ ہوا نکالنے کے لیے تجوری کا ذرا کی ذرا کے لیے پٹ کھولتا۔

اس نے جو نیچے تلے انداز سے پر پرزے نکالے تو عبدالرحمان فاروقی پہلے سے زیادہ گھبرایا۔ قاضی کو شہر کا غم کھا رہا تھا، فاروقی کو امپیریل سوڈا واٹر فیکٹری کا۔ جوں جوں اللہ رکھا کی فتوحات کا سلسلہ بڑھا، عورتوں کی آمدورفت بڑھی۔ اب وہ ان سے بلا تکلف کلام کرتا۔ فاروقی نیرنگ خیال اور ساقی پڑھ پڑھ کر ان پڑھ نہ رہا تھا۔ اللہ رکھا کے مقابل وہ سکالر بن گیا تھا۔ ہر پرچہ الف سے یے تک پڑھتا۔ ل احمد کی کہانیوں کا عاشق تھا۔ فضل دین کباڑیئے سے گاڑھی چھنتی تھی اس کی۔ کہانیوں اور ڈراموں کے مطالعے کے بعد کامیڈی اور ٹریجڈی کے انجام سے اچھی طرح آگاہ ہوگیا۔ بندوں اور قوموں کے زوال وکمال اور طاؤس ورباب کے کارناموں کا پتا چل گیا اسے۔ گو اللہ رکھا پرائمری فیل تھا تا ہم اس کا تجربہ بہت زیادہ تھا اور وہ تجربے کی دانش سے مالا مال تھا۔ بہر حال فاروقی کو اپنے علم کی روشنی میں اللہ رکھا کی صورت حال تشویشناک دکھائی دی۔ اس نے بھانپ لیا کہ اللہ رکھا طوفانی لہروں کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔ آخر اس نے ایک دن کہہ ہی دیا ''اللہ رکھا بچ! یہ عورتیں نہیں، وش کنیائیں ہیں''۔

''وہ کیا ہوتی ہیں؟''

''تو نے نہ تو ان کی کہانیاں پڑھی ہیں، نہ دیکھ کر انہیں پہچانتا ہے۔ وش کنیائیں وہ ہوتی ہیں جنہیں بچپن سے زہر پلایا جاتا ہے۔ ان کے ہونٹوں اور زبان میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ جسے ڈس لیں وہ پانی نہیں مانگتا۔ اللہ رکھا تو نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنا تجربہ کھونا کیا ہے''۔

تردید محال تھی۔ بات سولہ آنے سچ تھی۔ رنڈی پیدا ہوتے ہی کوٹھے کے زہریلے ماحول میں پلتی ہے۔ اس کی تو گھٹی میں زہر ہوتا ہے۔ اللہ رکھا کے ہونٹ کانپے اور ان پر مونالزا سے قدرے زیادہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ حقہ پینے اور توانائی اکٹھی کرنے لگا۔ آخر طبیعت رواں ہوئی تو بولا ''فروقی! تو بہت بھولا بلکہ بھولا ہے۔ بلیا! کاروباری بندہ ہوں۔ یہ عورتیں کچھ بھی ہوں، مجھے چار نہیں سکتیں۔ ان کو مکو ٹھپ دوں گا''۔

''اللہ رکھا! بڑا بول نہ بول! مارا جائے گا۔ یہ ناگنیں ہیں، ناگنیں۔ لوگ انہیں دودھ پلاتے ہیں پوجتے ہیں پر یہ انہیں، اپنے پجاریوں کو ڈسنے سے نہیں رہتیں۔ بلاقی شاہ کے پاس لاکھوں کی جائیدادیں رہن پڑی ہیں ان کے ڈسے ہوئے لوگوں کی۔ وہ خدائی خوار پھر رہے ہیں اور یہ دندناتی بخرمستیاں کرتی پھرتی ہیں''۔

اللہ رکھا پہلے کی طرح مسکرایا اور زیادہ مجذوبیت سے حقہ پینے لگا۔ فاروقی نے تابڑ توڑ حملہ کیا ''بڑے بڑے خرانٹ، نامی گرامی نوسرباز، مانے ہوئے چار سو بیس ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ اگر تکڑی میں ایک طرف تجھے اور تیری فیکٹری کو اور دوسری طرف ہیرامنڈی کی عورت کو رکھیں تو تیرا اور فیکٹری کا نام ونشان نہ رہے گا''۔

اللہ رکھا اٹھا۔ مقفل ڈسک کھول کر اور حساب کتاب کی میلی کچیلی کاپی نکال کر بولا ''فروقی! جد تیکر یہ کاپی سلامت ہے، کوئی خطرہ نہیں مجھے''۔

خطرہ ٹل گیا جو فاروقی کی شکل میں رونما ہوا تھا۔ کاپی سنبھال کر وہ وصولی کے لیے چلا گیا۔

بھیاجی نے الگ دنیا بسا رکھی تھی۔ مشین بجلی سے چلتی۔ کھٹا کھٹ بوتلیں بھرتیں۔ کبھی کبھی بوتل ٹوٹتی تو دھماکہ سا ہوتا۔ شیشے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر جاتے۔ بھیاجی کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ وہ اس شور میں پوربی گیت گاتا۔ اس کی تنخواہ بڑھ گئی تھی۔ بے فکری سے زندگی گزر رہی تھی اس کی۔

عبدالرحمان فاروقی نے کہا ''بھیاجی! تو نے کیوں چونچ بند کر لی ہے؟ میاں کیا کر رہا ہے، تم کچھ کہتے ہی نہیں''۔

''تنکھاہ ملتی ہے اپن کو جس کام کی وہ کرت ہیں۔ جس کی تنکھاہ نہیں ملتی وہ ہم ناہیں کرت ہیں۔ میاں! بڑا سیانا ہے۔

چمڑی چلی جائے، دمڑی نہ جائے''۔

فاروقی چپ ہوگیا اور حقہ پینے لگا۔ چند دن امن سے گزر گئے۔ پھر ایک دن نیتی سنیاری ادھر سے گزری۔ بڑی دھانسو عورت تھی۔ جوالامکھی کا لپکتا ہوا شعلہ تھی۔ بدن ریشم اور گلاب تھا۔ ہاتھ لگائے بندہ تو پھسل کر گر پڑے اور پھر اٹھ نہ سکے۔۔۔ بلند قامت، سرخی پوڈر سے بے نیاز، بجری بجلی، شاداب معشوقہ۔۔۔ دانتوں کی سفید چمکدار لڑی میں سونے کا ایک دانت۔ اللہ رکھا نے اسے دیکھا تو بے اختیار کہا۔ ''سبحان اللہ!''

فاروقی نے فوراً فیصلہ دیا: ''بھیا جی! تیرا میاں گیا۔ کون اس عورت کی تاب جھیل سکتا ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ پوری ہیرامنڈی میں اس جیسی عورت نہیں۔ پور پور جوانی اور حسن سے بھرپور ہے''۔

''اپن کی بلا سے۔ میاں جانے اور یہ گستیاں جانیں۔ اپن کو بوتلیں بھرنے سے کام''۔

فاروقی جو رسالہ پڑھتے پڑھتے اللہ رکھا کی نظر بازی پر نکتہ چین ہوا تھا، پھر رسالہ پڑھنے لگا۔

اللہ رکھا نے نیتی سنیاری کو دیکھا، نیتی سنیاری نے فاروقی کو دیکھا۔ نیتی سنیاری سیل سحر تھی جو گزر گئی۔ میک اپ کے بغیر دشمن ایمان و آگہی تھی۔ سرمے، کاجل اور عطر کا چھیل کا شوق ضرور رکھتی لیکن سرخی پوڈر کے قریب نہ پھٹکتی۔ جسے قدرت نے ایسے دلاویز نین نقش دیئے ہوں اسے سرخی پوڈر سے کیا سروکار۔

اللہ رکھا نئی اقلیم حسن و رعنائی میں آیا تو اس نے ٹبی سے منہ موڑ لیا جہاں ٹکیائیاں ڈربوں میں بیٹھتیں اور چھوٹی چھوٹی کارگاہوں میں رہ کر روزی کماتیں، اپنا اور اپنے دلوں کا پیٹ بھرتیں، جلد جلد اپنا آپ گنواتیں، چار دن گلی میں شوخی اور شرارتیں بکھیرتیں اور پھر ان کی چاندنی اندھیرے کی لپیٹ میں آجاتی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، لپائی تپائی بڑھنے لگی۔ بڑے بازار کی بات ہی اور تھی۔ چاہتیں تو وقت کو قابو میں رکھتیں۔ کمال و زوال کا عمل بلمپت لے میں ہوتا۔ سہج سہج دت گل کھلاتا۔ کبھی کبھی اسے گل کھلانے کا موقع ہی نہ ملتا۔ نیتی سنیاری ایسی عورتیں وقت کے دھارے کے اوپر سے گزرتیں۔

اللہ رکھا کو ایک دن وقت کی اس بے قابو شہزادی کا قرب میسر ہوا۔ اس دن وہ ترشی بانہوں والی مہین قمیض پہن کر آئی تو جلوہ چھن چھن کر نگاہوں سے ٹکرانے لگا۔ اس نے سرسری نظر سے اللہ رکھا کو دیکھا اور پھر فاروقی سے رجوع کرتے ہوئے کہا: ''میاں! تیرا یار ہر وقت رسالے پڑھتا ہے، بڑا اپڑھا کو لگتا ہے''۔

اپنا نام سن کر فاروقی چونکا۔ لحظہ بھر کے لیے اس نے نیتی سنیاری کو دیکھا اور پھر رسالہ پڑھنے لگ گیا۔

''باؤ جی! ہم بھی اس دنیا میں ہیں۔ یہ خط پڑھ کر سناؤ کیا لکھا ہے دل جانی نے۔ بمبئی گیا ہے کمائی کرنے''۔

فاروقی نے نظروں سے نظریں ملائے بغیر سنیاری سے خط لے لیا جس میں نیتی سنیاری کے حسن و جمال کا ذکر تھا۔ اس سوہنی من موہنی کی تو گلو کو کہیں نقل بھی نہیں ملی تھی، غریب الدیار کو۔ پھلجڑیاں ہی پھلجڑیاں تھیں۔ آدھا خط فلمی گانوں کے چھانٹے ہوئے شعروں سے بھرا تھا۔ فراق کی جلن اور کرب کا ذکر تھا۔ آخر میں لکھا تھا: ''جی کرتا ہے اڑ کر آجاؤں لیکن کیسے آجاؤں؟ سودے کر رکھے ہیں۔ ادھر تیری محبت کا سودا کر رکھا ہے۔ پندرہ بیس دن نیڑا نیڑی میں لگ جائیں گے۔ تین سو روپے کا منی آرڈر کر رہا ہوں''۔

اصل بات منی آرڈر کی تھی۔ اسی کے حوالے سے وہ گلو سے پیار کرتی تھی۔ منی آرڈر کا مژدہ سننے کے بعد اس نے خط لے کر رکھ لیا۔ اللہ رکھا سے کہا: ''میاں! تین دن تو لگ ہی جائیں گے منی آڈر کے آتے آتے۔ تب تک کیا کروں گی؟ سیٹھ جی تیں روپے دو! منی آڈر آتے ہی رقم اتار دوں گی''۔

''شہزادی! دھیلے کی ونک نہیں ہوئی''۔

''میاں! صندوقڑی کھول! بڑا مال ہے اس میں''۔

''بڑا مندا ہے آج کل''۔

''کیوں، آگ لگی ہے کہیں کہ کال پڑا ہے۔ صندوقڑی میں سے نکال مال! میں ٹلوں گی نہیں''۔

''بی بی! صندوقڑی میں کچھ ہوتا تو ضرور دیتا''۔

''مجھے کچھ پتا نہیں، تیس روپے چاہیں مجھے''۔

''اکٹھے تیس''۔

''چل پنجی نکال''۔

''یہ دیکھ! ہاتھ جوڑتا ہوں۔ شام کو وصولی کروں گا تو دے دوں گا''۔

''میاں، میں ملوکے میں ہاتھ ڈال کر نکال لوں گی''۔

اس سرد جنگ نے طول کھینچا تو اللہ رکھا نے بیس روپے دے کر جان چھڑائی''۔

نیتی سنیارن نے بیس روپے چہرہ شاہی لیے اور پلو میں لیے باندھ لیے اور کہا''تیس کی جگہ بیس دے کر اللہ رکھا تو نے دس کمائے ہیں''۔

عبدالرحمان فاروقی نے سب کچھ سنا لیکن دیکھا کچھ نہیں۔ نیتی سنیاری کو اس کا یہ طرز عمل بہت برا لگا۔ اسے دیکھنے کو تو ایک زمانہ ترستا ہے۔ اس کی یہ مجال کہ نیتی سنیاری کو گھاس نہ ڈالے۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے، دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ فاروقی پر جھپٹی، چٹ کر اس کی چمی لی اور پھر اس زور سے کاٹا کہ وہ بلبلا اٹھا۔ پھر بولی'' نیتی سنیاری ہوں میں باؤ! بڑے بندے تابیدار ہیں میرے۔ کاف کی پری مجھے دیکھنے آتی ہے۔ سجنا! میرے چوبارے پر آنا''۔

پھرتی سے تھڑے سے اتری اور غائب ہوگئی۔

اللہ رکھا خوب ہنسا۔ بولا''فروقی! دیکھ لیا اس سے آنکھ نہ ملانے کا نتیجہ؟ تجھے پلید کر گئی ہے۔ جا کر منہ دھو بلکہ سارا بدن دھو! یوں چمٹتی ہے بندوں سے''۔

فاروقی پرنے سے گال پونچھنے لگا جس میں وہ پریوں کی پری دانت گاڑ گئی تھی۔ بولا''اللہ رکھا! چھوڑ یہ جگہ! آنے والی تھاں پر چل! بچ جائے گی تیری جان۔ یہ عورتیں سنسار کی طرح منہ کھولے رہتی ہیں ہر وقت''۔

''فروقی! پچاس روپے کی عورت بیس روپے میں مہنگی نہیں۔ ٹوٹ میں ہو تو سودا اسی طرح ہوتا ہے''۔

''لعنت بھیج اس سودے پر!''

بیس روپے دے کر اللہ رکھا کو نیتی سنیاری کے کوٹھے کی چابی مل گئی۔ اسے اس نے اپنی فتح جانا۔

اب وہ خود کو بڑا آدمی سمجھنے لگا۔ کاروبار بڑھا پھیلا، ہیرا منڈی میں اس کا رسوخ ہوگیا۔ جی میں آئی کہ رئیسی جگہ تانگہ بنا کر لوگوں پر اپنی حیثیت کا سکہ جمائے۔ عبدالرحمان فاروقی سے ذکر کیا تو اس نے کہا''اللہ رکھا! جو کچھ تو ہے، جیسا قدرت نے تجھے بنایا ہے ویسا بنا رہ! سکھی رہے گا''۔

''فروقی! تو تو بس وہی رہے گا دینے کے تنور سے ٹکے کی دو روٹیاں اور مفت کی دال کھانے والا! اکنی میں دو وقت پیٹ بھر لیتا ہے۔ اسی لیے ہڈ حرام ہے۔ کام کرتا نہیں''۔

''اللہ رکھا! میں تیری طرح لکھ پڑھ جاؤں تب بھی ایسا ہی رہوں گا، جیسا اب ہوں۔ بڑا مزہ ہے اس حال میں۔ کوئی غم، کوئی فکر نہیں، کوئی پیچ نہیں، کوئی گنجل نہیں''۔

''تجھے کچھ کرنا نہیں، کچھ بننا نہیں، تیرا طریقہ تیرے لیے ٹھیک ہے۔ میرے لیے نہیں۔ بے عقل! رئیسی تانگے پر بیٹھ کر سیر کرے گا تو دماغ عرش پر ہوگا''۔

''میں فرش پر ہی ٹھیک ہوں۔ دو وقت راوی پر جاتا ہوں۔ اس سے اچھی سیر کوئی نہیں''۔

''رسالے پڑھ پڑھ کر تو چوڑ ہو گیا ہے''۔

''میں رئیسی تانگے کے حق میں نہیں۔ کام بڑھ گیا ہے اور ٹھیلے سے کام نہیں چلتا۔ گھوڑا ریڑا کیوں نہیں بنالیتا''۔

اللہ رکھا نے حقے کے دو چار کش لیے۔ کچھ دیر سوچا اور پھر کہا ''یار فروقی! تو نے سمجھا تو اپنی حیثیت سے ہے پر بات ٹھیک ہے۔ رئیسی تانگے سے تو نرا خرچہ ہی خرچہ ہے۔ ریڑا ٹھیک ہے''۔

رئیسی تانگے کی بات تمام ہوئی۔ سامنے سے رئیسی گھرانے کی بلند قامت، بلند نظر گوری چٹی عورت آئی جس نے تنگ موہری کی شلوار اور پوری آستینوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ انداز گھریلو تھا۔ خود بہ نفس نفیس آئی تھی۔ ملازم کے بس کا کام نہ تھا۔ بولی ''اللہ رکھا! سوڈے کا ڈالا اندر بھیجنا!''

''بھیجتا ہوں بی بی!''

اللہ رکھا نے بھیا جی سے کہا ''بی بی کے یہاں سوڈا دے آ!'' بھیا جی نے حکم سنا لیکن سنی ان سنی کر دی۔ اللہ رکھا نے دوبارہ اونچی آواز سے کہا ''بھیا! دے آ سوڈا!''

''دے آئیں گے۔ جچے کے لیے بوتلیں بھر لیں''۔

''مامے ہیر کے! پہلے ڈالا دے آ! بڑے گھر کی باشازادی ہے۔ خود چل کر آئی ہے''۔

''اپن سب جانت ہیں۔ یہ گستیاں تم پر روب گانٹھ سکتی ہیں، ہم پرنا ہیں''۔

''کنجرا! اس نے سنا تو حلیہ ٹیٹ کر دے گی''۔

''ہم اس کے آسک نا ہیں جو حلیہ ٹیٹ کر دے گی۔ سن لے بے سک''۔

آخر بھیا جی مان گیا۔ اس نے ڈالا اٹھایا اور جاتے جاتے بولا ''دم دھیل دیا نہیں۔ مفت مال دے کر کتنی کھوسی ہوتی ہے میاں کو''۔

بھیا جی بے چارہ کنویں کا مینڈک، کیا جانے رئیسوں کے ٹھاٹ۔ بی بی بڑی اونچی شے تھی۔ اس کا چل کر آنا ہی بڑی بات تھی۔ اتنے میں اللہ رکھا کا امیج بن گیا۔ سوڈے کے ڈالے کی کیا بات تھی؟ اس کا خرچہ ہی کیا تھا جو ایک ڈالے کا خسارہ پریشان کرتا اس کو۔

دو برس میں بڈھے دریا کے پل تلے سے دو سیلاب گزرے اور زور دکھا گئے۔ اللہ رکھا کی سوچ بھی بدلی۔ وہ بھی خاصی حد تک زور آور ہو گیا۔ اس پر بھی سیلاب کے وار ہوئے۔ اجلے کپڑے، میلے دل والیاں کھوٹا مال کھرے داموں بیچتی پھرتیں۔۔۔۔۔ کجلے کی دھار، نینوں کی کٹار، ہاتھوں میں گجرے، بکھرے بجرے، کیا بہار تھی۔ تجی سنوی عورتیں ٹولیاں بنا بنا کر وقفے وقفے سے گزرتی تھیں۔۔۔ اللہ رکھے پر قیامت بن کے نہ ٹوٹتیں۔ دل کی طرح اس کی آنکھیں بھی بجھ گئیں۔ صیقل کیے ہوئے بدنوں سے روشنی نہ پھوٹتی۔

وہ مگن تھا ایک کی بجائے دو مشینیں ہو گئیں۔ بنگالی بابو اور چھوٹے کا اضافہ ہوا۔

عبدالرحمان فاروقی کو دکھ ہوا کہ سوڈے کے ڈالے کی آمد و رفت داخل معمول ہوئی۔ اس نے کہا "اللہ رکھا! یہ عورتیں ریاستیں ہضم کر جاتی ہیں۔ امپیریل سوڈا واٹر فیکٹری کیا چیز ہے ان کے آگے! یہ دو دھاری تلواریں کٹاریں سر قلم کر دیتی ہیں"۔

اللہ رکھا خوب ہنسا۔ دو دھاری تلواریں کٹاروں والی بات اسے اچھی لگی۔ رسالے پڑھتے پڑھتے فاروقی کو اچھے اچھے جملے ازبر ہو گئے تھے۔ دو دھاری تلواروں کٹاروں کی نہ تو گزرگاہ بدلی جا سکتی تھی نہ انہیں گزرنے سے روکا جا سکتا تھا۔ انہی سے تو ساری بہار تھی۔ جب ان کی ٹولیاں گزرتیں تو فاروقی مراقبے میں چلا جاتا اور رسالہ پڑھنے لگتا۔

اللہ رکھا کے لیے کاروبار کے ساتھ ساتھ دل بہلانے کا سامان میسر تھا۔ اڈہ بھاگوان ثابت ہوا تھا۔ تاہم وہ زیر دام لانے والی عورتوں کو زیر کرنے اور ان پر فتح پانے کا آرزومند نہ تھا۔ فاتح بننے سے اسے کیا ملتا؟ وہ فاتح بننے والوں کا حشر دیکھ چکا تھا۔ یہ ہٹیلی کٹیلی عورتیں اپنے حقوق کی خاطر مردوں کو شکست فاش دینے کے لیے آخری دم تک لڑتیں اور انہیں شکست فاش دے کر رہتیں۔ اس شکست فاش کا جیتا جاگتا نمونہ سائیں فضل شاہ تھا جو حقے کے کش لگانے آنے جانے لگا تھا۔ سائیں نے دولت عورتوں پر لٹائی، جائیداد بلاقی شاہ کے پاس رہن رکھی اور پھر چھڑانے کی نوبت نہ آئی۔ جن کے لیے اپنا ٹھاٹھ ٹھکانے لگایا وہ ٹھاٹھ سے رہنے لگیں۔

اللہ رکھا میں علاقے کا ماحول رچ بس گیا تھا۔ لیکن حسب عادت، مستی اور خرمستی اس کے مشن کا حصہ نہ تھا۔ اب تو کچھ کچھ بوسیدہ بھی ہو گیا تھا۔ دولت اور نخرے کا چوکھا خزانہ آ گیا تھا اس کے پاس۔ عورتوں کو جان پہچان گیا اور ان کی فتوحات دیکھ چکا تھا۔ بعض سینئر عورتوں سے سلام و کلام کا شرف بھی حاصل ہو گیا تھا۔ عورتوں کے ناز و انداز میں مبالغہ آرائی کا نقشہ بھی دیکھ چکا تھا۔ لکھ پتی بننے کی آرزو لحظہ بہ لحظہ شدید ہوتی جاتی۔ اب وہ اپنی شکل و صورت کی خامی بھی بھول گیا کیونکہ اس شخصیت پر چہرہ شناسی کی آب و تاب چڑھ گئی تھی۔ چلتے پھرتے خوبصورت اشتہار تباہی کی دعوت دیتے۔ وہ فاختاؤں کا حملہ حقے کے کش سے روک لیتا۔

ساون سبھی کے لیے سہانا ہوتا۔ ہلچل مچتی۔ عورتیں کوٹھوں سے اترتیں، مہین ململ کے کرتے پہن کر۔ باغوں میں ان کے لیے جھولے پڑ جاتے۔ جھولے جھولتیں، ملہاریں گاتیں، بوندا باندی سے ململ کے مہین کرتے پنڈوں سے چمٹ جاتے اور اندھے بھی سجاکھے ہو جاتے۔ اللہ رکھا بوندا باندی سے بچنے کے لیے فیکٹری کے اندر چلا جاتا جس کے دونوں دروازوں پر کاٹھ کے کواڑوں کے باہر جالی والے کواڑ لگے تھے۔ اندر چھوٹا سا بلب مشینوں کے پاس لگا تھا۔ یہاں مشینوں کی کھٹا کھٹ تھی۔ بوتلیں بھرتی جاتیں۔ فراقیہ گیت تھے بھیا جی کے اور دونوں پر حاوی حقہ کی گڑگڑ تھی۔ موسیقی اس کے دل کی آواز تھی۔ اس میں چاندی کے سکوں کی جھنکار تھی۔ یہ جھنکار بڑی سریلی، بڑی دلکش اور سحر آفریں تھی۔ اسے تو وہ ہر وقت سننا چاہتا۔ یہ اس کی جان تھی، خواب تھی، زندگی تھی۔ اسی میں رئیس اعظم کی تختی جھلملاتی دکھائی دیتی۔ یہ منزل کی نشان دہی کرتی۔ کبھی کبھی اپنے ماضی پر نظر ڈالتا تو ہنس دیتا۔ اس نے اصطبل سے اس بازار تک چار قدم کو جو فاصلہ طے کیا وہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ نہ دل تھا اس کے پاس، نہ جرات رندانہ تھی کہ اس بازار کا رخ کرتا۔ یہ تو بس چہرشاہی کی کشش تھی جو اسے ادھر لے آئی۔ پھر بھی چار قدم اس نے چار سال میں اٹھائے۔

وقت نازک تھا۔ سائیں فضل شاہ کی آمد و رفت بروقت ثابت ہوئی۔ سائیں فضل شاہ بربادی کی آخری منزل طے کر کے شاہی سے گدائی تک آ گیا تھا اور اب تکیہ صابر شاہ میں رات گزارتا تھا۔ دن بھر گدائی سفر یعنی آوارہ گردی کرتا تھا۔ اللہ رکھا عروج کی آدھی منزل سر کر چکا تھا۔ اس نے پذیرائی کی تو سائیں فضل شاہ دن میں دو چار چار بار آنے اور دیر دیر تک اس کے پاس بیٹھنے لگا۔ سائیں ہر روز کتاب زندگی کا نیا ورق الٹتا اور اللہ رکھا کی آنکھیں کھولتا:

''بندیا! میری کہانی اولڑی نہیں ویسی ہے جیسی ہیرا منڈی کے اواغڑ گواغڑ میں رہنے والوں کی ہوتی ہے۔ ترلے لے لے کر پر یمری پاس کی اور چار بندوں میں بیٹھنے کے لیق ہوا''۔ حقے کے لیے کھانسی کا دورہ پڑا۔ پھر بولا''حیاتی ایسی گزری جیسے بنیری ہوتی ہے۔ چوکھا روپیہ گھر آتا تھا۔ شاہی خرچ تھا۔ کسی شے کی لوڑ تھوڑ نہ تھی۔ قضا آئی، باپ اللہ کو پیارا ہوا۔ جیداد ملی۔ مال ملا تو نشہ چڑھا۔ آگے تو سمجھ لے میاں اللہ رکھا! ان گشتیوں نے کیا حال کیا میرا!''

''اب خوش ہے سائیں؟''

''خوش ہی خوش ہوں، پر ایک سل اے۔ آدھی ہیرا منڈی فتح کر لی تھی۔ بڑا تجربہ ہو گیا ہے۔ پانچ دس ہزار کہیں سے مل جاتے تو باقی بھی فتح کر لیتا، پر کہاں؟ کسی نے دھیلا نہیں دیا''۔

''اپنا مال گنوا کے دوسرے کا مال کیسے ملتا گنوانے کے لیے؟''

''نہ سہی جو نہیں ملا۔ جو کچھ ہوا ٹھیک ہے۔ پر بادشاہ! تجھے نصیحت ہے میری۔ تو گڑھ بیچوں بیچ آن پھنسا ہے۔ گشتیوں سے بچنا۔ شیطان کی چنڈی ہوتی ہیں۔ آپ کو اور فیکٹری کو بچانا ان سے''۔

سائیں فضل شاہ کی کتاب زندگی ضخیم اور سچی کہانیوں سے معمور تھی۔ اس کے قصے نے اللہ رکھا کو بہت کچھ سکھایا۔ ویسے اب تک اس کے یہاں ہر صبح اور ہر شام ایک سی تھی۔ عمر ایک ڈگر پر چل رہی تھی کہ یکا یک زلزلہ آیا اور وہ بھی دن کے وقت۔ ایک جھٹکے میں تارے نظر آئے لوگوں کو۔ پوری ہیرا منڈی کو اس فیکٹری سمیت جھنجھوڑ گیا۔ کمزور اور پرانے دھرانے مکان ٹوٹ پھوٹ گئے۔ پختہ مکانوں میں بھی کہیں نہ کہیں دراڑیں ضرور آئیں۔ ان میں رہنے والوں کے دل بھی زیادہ ہل گئے۔ خدا یاد آیا۔ مسجدوں کی رونق بڑھی۔ ویران مسجدیں بھی آباد ہو گئیں۔ لوگ دھڑا دھڑ توبہ توبہ کرنے اور خشوع و خضوع سے سجدہ ریز ہونے لگے۔ کردہ اور ناکردہ گناہوں کا بوجھ ناپنے لگے۔ اللہ رکھا جیسے لوگ جنہوں نے گناہوں کی صرف آنچ چکھی تھی کان پکڑنے لگے۔ سوئے یا سلائے ہوئے ضمیر جاگ پڑے۔ البتہ چنن دین الوچہ جو رات دن مارا مارا پھرتا تھا، ایک ایک مکان کی اینٹیں گنتا رہتا تھا، بہت خوش ہوا۔ جن مکانوں پر زلزلہ زیادہ گرا تھا وہ فوراً اس کی گنتی میں آ گئے اور وہ مالکوں کو فوراً مکان اونے پونے ٹھکانے لگانے اور قیمتی جانیں بچانے کا مشورہ دینے لگا۔ مائی صوباں جو اپنی جواں بیٹی کے سر چھپائے جدی پشتی بوسیدہ مکان میں رہتی تھی اس کا حال برا ہوا۔ مکان کے کھنڈر ہونے میں ایک آنچ کسر رہ گئی۔ چنن دین الوچہ اس کی مدد کو پہنچا اور بولا''آپاں وڈھی! بھچال آیا رب کی مرضی سے۔ بندہ کیا کر سکتا ہے۔ بڑا افسوس اے۔ تیرے مکان کا تو کھوپڑ ہی ہل گیا ہے۔ اب تو بس ایک جھٹکے کی مار ہے۔ بیچ دے!''

''نہ بھرانہ! جدی پشتی جیداد بیچنے کے لیے نہیں ہوتی''۔

''کھنڈر ہو جائے گا مکان، پھر کیا کرے گی؟''

''دیکھا جائے گا۔ اللہ بنا دے گا۔ میں باپ دادا کی عزت نہیں بیچتی''۔

''جا مائی صوباں! بھیڑی ہے تیری قسمت۔ عقل کی بات سمجھتی ہی نہیں''۔

باپ دادا کی عزت بیچنے کا مشورہ دینے والا چنن دین الوچہ مایوس ہو کر چل دیا۔ زلزلے کی بدولت چنن دین الوچہ کے لیے خاصی تعداد میں مکان قابل فروخت ہو گئے تھے۔ مائی صوباں کے لیے بات عزت نفس کی تھی۔ اور غریب کا سرمایہ اس کی عزت نفس تھا۔ پیسے والوں کو عزت نفس کی فکر نہیں ہوتی۔

صوباں نے زیباں کو آواز دی جو کوٹھے پر چڑھی زلزلے کی تباہ کاریوں کے ساتھ ساتھ ان لونڈوں کا بھی جائزہ لے رہی تھی جن سے اس کے معاشقے تو نہیں، اشارے ضرور چل رہے تھے۔ ماں کی آواز سنی تو بولی:''آتی ہوں ماں! بیر ے کی اینٹیں

سمیٹ لوں''۔

بنیرے پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اسے سمیٹنے اور سمٹنے کا ڈھنگ کب آتا تھا؟

جب تین چار بار آوازیں پڑیں تو یوں اظہار غضب کرتی آئی جیسے بہت بڑے کام سے اسے ہٹایا گیا ہو۔ آتے ہی بولی:

''ماں! ذرا اوپر جا کر دیکھ! کتنے مکان ادھڑے ہیں۔ ہماری منڈیر بھی ٹوٹ گئی ہے''۔

''اسی لیے تو تجھے بلایا ہے۔ منڈیر نہیں دھیے! ہم ٹوٹ گئے ہیں''۔

''اللہ کی مرضی! ہمارا تو کوئی قصور بھی نہیں۔ پھر جانے ہم پر عذاب کیوں ٹوٹا؟''

''اللہ نے کچھ نہیں کیا کملیے! ہمارے عمل ہی ایسے ہیں۔ چنن دین الو چہ آیا تھا، مکان بیچنے کو کہہ گیا ہے''۔

''تو نے مجھے اس وقت کیوں نہ بلایا۔ میں اس کی مونچھیں پکڑ کر یوں کھینچتی کہ چیخ اٹھتا۔ کیا ہوا ہے ہمارے مکان کو؟ سو روپے کسی سے مل جائیں تو اس کی مرمت ہو جائے گی اور یہ پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہو جائے گا''۔

''کون دے گا اتنی بڑی رقم ہمیں؟''

''میں لا کر دکھاتی ہوں''۔

''بس بس بک بک نہ کر! آرام سے بیٹھ! فروقی سے بات کرتی ہوں۔ بڑا نیک اور خدا ترس بندہ ہے۔ برابر کی گلی میں ہمارے بڑوں کے زمانے سے رہ رہا ہے''۔

''ہوں، اس کا تو گھر چیل کو گھونسلہ ہے۔ آپ ہی چیل ہے اپنے گھونسلے کی''۔

''دیکھ لیتی ہوں''۔

دروازہ بند کروا کے عبدالرحمان فاروقی کے یہاں گئی جس کے بڑے ایک زمانے سے یہاں آباد تھے۔ فاروقی لمبی تان کے سویا پڑا تھا۔ اس کے دل میں رات دن کو کوئی تصور نہ تھا۔ دن کو سونا اور رات کو جاگنا اس کا دستور تھا۔ بچاری صوباں دیر تک دستک دیتی رہی۔ آخر آنکھیں ملتا اٹھا۔

''آ آپا! خیر تو ہے؟''

''نہ بیٹا! خیر نہیں''۔

''آ جا اندر!''

اندر چلی گئی اور چارپائی پر ایک جانب بیٹھ گئی۔

''بھراوا! ہم تو اجڑ پجڑ گئے ہیں۔ تریڑ آ گئی ہے مکان میں''۔

''آپا! شکر کر اللہ کا۔ جان تو بچی''۔

''شکر تو ہر دم ادا کرتے ہیں۔ پر دیکھناں فروقی بھائی؟ بنا مرمت رہنا ٹھیک نہیں اس گھر میں۔ سو روپے کا سر بند ہو جائے تو مرمت کرا لوں''۔

سو روپے کا سن کر فاروقی مراقبے میں چلا گیا۔ بڑی رقم تھی۔ وہ صوباں کی مشکل کے علاوہ اس پریشانی کے بارے میں بھی سوچنے لگا جو ہر گھر میں جوان لڑکی پیدا کرتی ہے۔ زیباں پرابلم تھی ماں کے لیے اور فاروقی اس پرابلم سے آگاہ تھا۔ اس وقت فاروقی کے نزدیک مرمت طلب مکان اور زیباں ایک مسئلے کی جڑواں کڑیاں تھیں۔ گھر ڈھے گیا تو عقب ننگی ہو جائے گی۔ زیباں یونہی چھجڑی چھانٹ رہی تو نہ جانے کیا گل کھلائے۔

''اچھا بہن! میں حیلہ کرتا ہوں۔ بندوبست ہوگیا تو بتاتا ہوں تجھے آ کے''۔
صوباں گھر چلی گئی۔ فاروقی تالہ لگا کہ بلکہ صرف اڑا کے اللہ رکھا کے پاس گیا۔
''السلام علیکم''۔
''وعلیکم اسلام''۔
''یار اللہ رکھا! ایک مسئلہ ہے۔ ابھی آن پڑا ہے۔ غور سے سننا۔ کیا خبر اس میں تیری بھلائی کا کوئی رستہ ہو''۔
''بات کر!''
''بھونچال سے صوباں کا مکان تریڑ کھا گیا۔ آپ ہی تریڑی گئی ہے۔ سو روپیہ مانگتی ہے''۔
''تیرا کیا خیال ہے؟''
''زکات نکال!''
''بس؟''
''بس''۔
''آج اگرائی کرلوں! رقم لے لیتا!''
''بات اتنی نہیں۔ آگے کی بھی ہے''۔
''کیسے؟''
''ایسے کہ صوباں کی جوان لڑکی ہے زیباں۔ پری ہے پری۔ قسمیہ کہتا ہوں۔ جواب نہیں اس کا۔ کب تک کنجر خانے میں ڈانواں ڈول پھرے گا؟ حق حلال کی کر! اللہ بچہ دے دے تو تیرا وارث بنے''۔
''یار فروقی! تو کیوں نہیں کر لیتا۔ تیہ چالی میں زردے، قورمے اور پلاؤ کی دیگیں پک جائیں گی۔ دو تین تولے کا زیور اور چار پانچ جوڑے وری کے۔ سو روپے کے اندر اندر پورا کام ہو جائے گا۔ تیرا سارا خرچہ میں کردوں گا''۔
''نہیں نہیں، ابھی نہیں۔ شادی بیاہ بڑی ریجھ سے کرتا ہے بندہ۔ جس دن سونا بنایا پہلا کام یہی کروں گا۔ میری بات نہ کر! سونا بنے گا جب بنے گا۔ تیرا بڑا اچھا چانس، گولڈن چانس۔ پج کے سوہنی اے لڑکی''۔
''ویسے کیسی ہے؟ مطلب یہ کہ چالے کیسے ہیں اس کے؟''
''لڑکی ویسی ہے جیسی کنواری لڑکیاں ماں باپ کے گھر ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد انہیں کنٹرول کرنا خاوند کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ ابھی ماں کے کنٹرول میں ہے۔ پکی ہے''۔
''ذات کیا ہے؟''
''تجھ سے گھٹ نہیں''۔
''لڑکی میں نے دیکھی ہے۔ چنگی ہے۔ بات چلا''۔
''بات کیا چلانی ہے۔ تو کوئی معمولی بندہ نہیں۔ ٹیکے کا پھل ہے۔ ہاں کر، لڑکی تیری جھولی میں۔ تین مرلے کا مکان ہے۔ ساتھ ٹبہ ہے۔ اسے پدرا کروا۔ مکان اور ٹبہ لے کر ٹھاٹ سے حویلی کھڑی کر! رئیس بن کر رہ!''
''لڑکی والی بات پکی ہوگئی تو زمین کا سودا بھی کرلیں گے''۔
''پھر ایک ساتھ دونوں سودے ہی مکاؤں؟ زمین کے ساتھ لڑکی کو بھی سمیٹ''۔

اللہ رکھا نے حقے کی نڑی منہ میں رکھی اور سر ہلا کر فاروقی کی پیکج ڈیل منظور کی۔

اس نے سائیں فضل شاہ سے مشورہ کیا تو اس نے کہا "اچھی بات ہے میاں! گھر کی مرغی دال برابر۔ ان گشتیوں سے تو لکھ وار چنگی ہے۔ یہ تو نوچ نوچ کر بندے کو لہولہان کر دیتی ہیں۔ گولی مار انہیں"۔

اللہ رکھا نے ونگ کے روپے فاروقی کو تھمائے، فاروقی نے صوباں کو گھر بلا کر دیئے اور کہا "آپا! دھیان سے بات سن! اللہ نے تیری سن لی ہے۔ بھونچال تیر قسمت بدلنے کے لیے آیا ہے"۔

"خیر ہووے، کیا بات ہے؟"

"فرشتہ مل گیا ہے تیرے بھاگوں، اللہ رکھا فیکٹری والا"۔

"بلا رب اس کے کاروبار میں برکت ڈالے!"

"برکت ہی برکت ہے آپا۔ میں نے اسے زیباں سے کلمے پڑھانے کو کہا ہے۔ تو ہاں کر تو میں اسے راضی کر لوں گا"۔

"بیٹا! زیباں سے تو بات کر لوں۔ میرا اور کون ہے جس سے صلاح لوں"۔

"آپا! اللہ رکھا کوئی معمولی بندہ نہیں۔ چلتا ہوا کاروبار ہے"۔

"ذرا پکی عمر کا بندہ ہے"۔

فاروقی نے زوردار قہقہہ مارا اور کہا "تو بھی پرانے خیال کی نکلی! عمر کی کیا بات کرتی ہے۔ یہ دیکھ ویلا کیسا جا رہا ہے۔ بڑا برا وقت آ گیا ہے۔ ایسا رشتہ کہاں ملے گا تجھے؟ ادھر خالی زمین پر ملبہ پڑا ہے۔ ادھر لڑکی ملبہ ہو رہی ہے۔ عمر گزارے گی رشتہ ڈھونڈنے میں؟ اچھے رشتوں کا تو سدا سے کال ہے۔ تیرے گھر میں مرد کوئی نہیں۔ آلے دوالے لچر رہتے ہیں۔ جھٹ پٹ فیصلہ کر!"

"ہوں"۔

"ہوں نہیں ہاں کر! بندہ ہاتھ سے نکل گیا تو ساری عمر پچھتائے گی۔ اللہ رکھا بڑا اچھا بندہ ہے۔ قدر کرنے والا ہے۔ زمین کا ملبہ اور لڑکی کا ملبہ دونوں کو لے لے گا۔ چوکھا پیسہ ہے اس کے پاس۔ شرطیں بتا!"

"شرطیں کیسی بھراوا؟ زمین لڑکی کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ وہ لے لے، پنجاہ روپے مرلہ"۔

"پنجاہ روپے مرلہ! خدا کا خوف کر آپا! تین روپے مرلہ تو کھٹی ملاحاں میں زمین لی ہے کرم دین نے۔ ویسے اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ لڑکی کے ساتھ جس بھاؤ کہے گی زمین لے لے گا۔ لڑکی، مکان اور ملبے سمیت بات کر!"

"وری دیوے اپنی حیثیت موجب۔ حق مہر سالم دے پنج سو نقد۔ ملبے کی بات کر دی ہے۔ مکان کے ست سو الگ سے دیوے"۔

"آپا! راتوں رات مالدار ہو جائے گی تو۔ سودا مہنگا ہے پر ہو جائے گا"۔

"بھراوا! تیری مہربانی۔ تیرا حق پچھانتی ہوں"۔

"میرا کوئی حق نہیں۔ بس خدا واسطے کا سودا ہے میرا"۔

"اللہ تجھے خوش رکھے"۔

بات پکی ہو گئی۔ اللہ رکھا نے مکان اور ملبے سمیت لڑکی کو بھی سمیٹ لیا۔ لڑکی کھنڈر ہونے سے بچی۔ اس نے اپنی شان و شوکت دکھانے کے لیے ایک منزلہ مکان کی بجائے تین منزلہ حویلی کھڑی کر لی۔ اس کے لیے ٹہکا دکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ جب حویلی سے باہر قدم رکھے تو قدم قدم پر سلام کرنے والے ہوں۔

صوباں کی قسمت جاگی۔ لہر بہر ہو گئی گھر میں۔ مرجھائی ہوئی بیوہ شاداب ہو گئی۔

اللہ رکھا کو حسین ترین مٹیار مل گئی۔ نیتی سنیاری کا نعم البدل تھی۔ وہ ہیوی ویٹ تھی، یہ لائٹ ویٹ۔ بجلی بھری تھی انگ انگ میں۔ ناز و ادا کا مفہوم سمجھتی تھی۔ مسکرانے، روٹھ جانے، اعتنائی اور بے اعتنائی کے موقع محل سے آشنا تھی۔ کسی ہوئی جوانی! اس نے سہیلیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ ماں سے بہانہ کر کے سہیلیوں کے ساتھ دو چار بار سینما دیکھ آئی۔ سینما بہت بڑا زیورِ تعلیم تھا۔ منجھی ہوئی تھی۔ گھر کے اندر چلتی پھرتی مورنی تھی جو سود و زیاں سے بے نیاز تھی۔

عمر کے فرق نے میاں بیوی کو ایک سطح پر نہ رہنے دیا۔ یہ فرق اللہ رکھا کے مال اور اس کی روپیہ اگلنے والی فیکٹری سے دور نہ ہو سکا۔ جوڑی نے چند مہینے یوں گزارے جیسے جنت میں جھولے پڑے ہوں اور دونوں مہکتی ہوئی ہواؤں میں ہلکورے لے رہے ہوں۔ تازہ ہوا کے جھونکے ان کے بدنوں کو سہلاتے اور جی بہلاتے۔ خوابوں کی خوشبو تھی جو انہیں مست کر گئی۔ اللہ رکھا اب بدل گیا۔

اس نے فیکٹری عبدالرحمان اور بنگالی بابو کی نگرانی میں دی۔ زیباں کے پاس رہنے لگا۔ چھوٹا ہر روز آتا، فیکٹری کا حال احوال سناتا اور پھر گھر کے کام کر کے چلا جاتا۔

فیکٹری چلتی رہی لیکن گاہک تنگ کرنے لگے۔ مالک کی غیر موجودگی کے باعث وہ سمجھنے لگے کہ فیکٹری لوٹ مار کی چیز ہے۔ کبھی مال اٹھاتے، کبھی پیسے مار لیتے۔ رفتہ رفتہ اللہ رکھا کا نشہ ٹوٹنے لگا اور وہ گاہے گاہے فیکٹری میں جانے لگا۔

زیباں کا نشہ ٹوٹا۔ کھڑی جوانی کا توڑ نئی حویلی نہ تھا۔ وہ موقع بہ موقع آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے باری پر جاتی، چق اٹھاتی اور جلوے فضا میں بکھیرتی۔ آخر ماں نے تنگ آ کر اسے ٹوک ہی دیا: ''کڑیے! ہوش کی دوا کر! پرانی لت چھوڑ! باری پر مت جایا کر! چق اٹھانا ٹھیک نہیں۔ خدا کا شکر ادا کر! چنگا خصم ملا ہے تجھے''۔

''میں کیا کرتی ہوں بے بے! اتنی بڑی تو حویلی ہے۔ ہاں ہاں کرتی ہے۔ جی گھبراتا ہے تو ذرا باہر کی خبر لے لیتی ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے ساری''۔

''نادان نہ بن! تو بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ اس نے تجھے شہزادی بنا کے رکھا ہے''۔

''اللہ رکھا ہوا جو مالدار بندہ۔ میں شہزادی ہوں تو اس نے شہزادی بنا کے رکھا ہے''۔

''یہ پان سگرٹ والے کی دکان پر جو لونڈے اکٹھے ہوتے ہیں، کیا رکھا ہے ان کے پاس؟ یہ لچے لفنگے مشٹنڈے خرمستی کرنا تو جانتے ہیں، گھر بنانا نہیں جانتے۔ مت دیکھا کر انکی طرف! اللہ کا شکر ہے۔ گھر بیٹھے بٹھائے ہزار نعمتیں ملی ہیں تجھے۔ پھر وہ تیرے ناز اٹھاتا ہے۔ تابیداری کرتا ہے''۔

''ہونہہ''۔

ماں نے اچھی طرح اونچ نیچ سمجھائی لیکن اسے اونچ نیچ کی طرف دیکھنے کی دیرینہ بیماری تھی۔ باز ہی نہ آئی اپنی حرکت سے۔

''حویلی میں رہتے ہیں ٹھاٹ سے۔ اللہ رکھا کی دولت اور عزت میں شریک ہیں۔ عزت اور شرافت کی بڑی قیمت ہے''۔ ماں اسے سمجھاتی ہی رہتی لیکن جوانی کی آندھی کے سامنے لڑکی ٹھہر نہ سکی۔ اس کے اندر طوفان مچلتا رہا اور وہ چاہتی کہ اس طوفان کو نکلنے کی آزادی ملے۔ وہ ہوا اور خرمستیوں کی دنیا۔ ہر لمحہ خرمستیوں میں ڈوبا ہوا ہو۔ خرمستیوں کے ساتھ جاگے، جیے اور سوئے۔ کوئی لمحہ خرمستی سے خالی نہ ہو۔

شادی نے اللہ رکھا کو بدل کے رکھ دیا۔ یہ نیا اللہ رکھا سے مختلف تھا۔ ققنس اپنی ہی خاک سے جی اٹھا۔ لیکن وہ خرمستی کے ساتھ ساتھ فیکٹری بھی جانے لگا۔ خاصا وقت بلکہ زیادہ سے زیادہ وقت زیباں کے پاس رہ کر گزارتا اور اس کے قرب کی حرارت سے

اپنے آپ کو گرماتا۔ رئیس اعظم بننے والا تھا۔ ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ ادھر عبدالرحمان کی کیمیا گری میں بھی ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ دونوں کٹھالی میں اپنا اپنا تجربہ کر رہے تھے۔

اونچی حویلی کی بلند قامت بی بی کو پتہ چلا کہ اللہ رکھا نے بیاہ کرلیا ہے تو بولی: ''اڑ گیا اللہ رکھا۔ اب وہ کسی کے کام کا نہیں رہا''۔

اللہ رکھا کو جب محسوس ہوا کہ وہ رئیس اعظم بننے کو ہے اور پھر نئی نویلی دلہن کا ساتھ بھی تھا، وہ اب اٹھوارے میں دو مرتبہ کپڑے بدلنے لگا۔ رہی بیگم، تو بڑی ٹس تھی اس کی۔ اسے ہر طرح خوش رکھنے کی سعی کرتا۔ ہفتے میں تین بار سینما لے جاتا، لاہور کی تاریخی عمارتوں کی سیر کرواتا، لارنس گارڈن اور شملہ پہاڑی میں ہواخوری کے لیے جاتا۔

شالامار باغ اس کے لیے صحت افزاء ثابت ہوا اور اس نے اسے اپنے مزاج کے لائق جانا۔ یہاں کشادگی تھی، روشیں تھیں، باغوں کے قطعے تھے، برج تھے، سیڑھیاں تھیں۔ دوڑ دھوپ کی کھلی چھٹی تھی، عورتیں آزادی سے سانس لیتی تھیں۔ برقع اتار دیتیں اور دوڑ لگاتیں۔ مرد اور عورتوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے پر کسی نوع کی پابندی نہ تھی۔ عورتیں چہچہاتیں، چلاتیں، بڑکیں مارتیں، مسکرانے ہنسنے اور قہقہے لگانے سے فضا انتہائی خوشگوار ہو جاتی۔ زیباں دوڑیں لگاتی، اللہ رکھا تیز قدم اٹھاتا اور دوڑنے سے شرماتا تھا۔ تھک جاتی تو پاؤں لٹکا کر چبوترے پر بیٹھ جاتی۔

باہر جاتی تو ون سونے کپڑے زیب تن کرتی۔ تیری میری مرضی اور دل کی پیاس کے جوڑے ضرور پہنتی لیکن اللہ رکھا کی موجودگی کے باعث نہ دل کی پیاس بجھتی، نہ کسی سے تیری میری مرضی کی بات ہوتی۔ پھر بھی پنکھڑی بن کر خوب پھرتی۔

اللہ رکھا اسے نت نئے کپڑے سلوا کر دیتا۔ پلش، مخمل، تن زیب، کمخواب، مخمل اور موسم کے لحاظ سے درجنوں ملبوسات سے ٹرنک بھر دیا لیکن وہ اپنی چاہتی بیوی کو قابو نہ کر سکا، البتہ بیوی نے اٹھ کر کاٹھی ڈال دی۔

صوباں نے عمر کے مسئلے کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ سترے بہترے چودہ چودہ، پندرہ پندرہ سال کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے۔ اللہ رکھا کے پاس دولت تھی جس کے سامنے عمر کا مسئلہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا تاہم حقیقت تو پھر حقیقت تھی اور گل کھلا رہی تھی۔ سودا عبدالرحمان فاروقی ایسے نیک دل بندے کے ذریعے ہوا۔ اس کی نیت بخیر تھی، یہ اور بات ہے کہ زیباں کی نیت بخیر نہ تھی۔

اللہ رکھا کی زبردست خواہش تھی کہ کم از کم ایک بیٹا تو مل ہی جائے جو اس کا نام برقرار رکھے اور امپیریل سوڈا واٹر فیکٹری کو کیلاش سوڈا واٹر فیکٹری اور پنجاب فیکٹری کے درجے تک پہنچائے لیکن اس کا کھرا سکہ کھوٹا ہوا جا رہا تھا۔

حویلی کے اونچے اونچے اور بڑے بڑے کمرے اس طور سکڑے کہ وہ کھل کر سانس بھی نہ لے سکتا۔ بڑے بڑے دریچوں میں سے ہوا اور دھوپ کھل کر آتی لیکن وہ اندر سے سمٹ کر رہ گیا، اس کا دم گھٹنے لگا۔ جوانی اور دولت کا ملاپ دیر تک چلتا نظر نہ آیا۔ زیباں وقت سے پہلے ہی جواب دے گئی۔ ایسا تو بازار میں کبھی نہ ہوا۔ سائیں فضل شاہ کی مثال سامنے تھی۔ جب تک وہ کھکل نہ ہوا، کسی عورت نے اسے چھوڑا نہیں بلکہ جب وہ کھکل ہوا تب بھی کوٹھیداریوں نے اسے سیڑھیاں چڑھنے اور مجرا خانے میں آنے سے نہ ٹوکا۔

''عورت زندگی دیتی ہے، زندگی لیتی نہیں''۔ وہ اکثر فاروقی سے کہتا، گھر کو گوشہ عافیت سمجھتا جہاں زندگی اور توانائی کا چشمہ ابلتا۔

اللہ رکھا کو اپنی اونچی بہت نیچی لگی۔ بڑی ٹھیکے دار حویلی۔ اپنا امیج اسی کے ذریعے بڑھایا اس نے لیکن گھر میں کلکل ہونے لگی۔۔۔۔ ہر لحظہ اپنی مرضی، بات بات پر ضد، زبان درازی، اللہ رکھا جس احترام اور مقام کا طلب گار اور مستحق تھا وہ اسے نہ ملا۔ عمر میں الگ الگ، مطالبے اور اور، حوصلے اور ہمتیں غیر یکساں، فاصلے بڑھتے گئے۔ انہیں سمیٹنا سکیڑنا اور یکجا بلکہ یکجان کرنا خواب ہو

گیا۔اب وہ گھر سے دل برداشتہ ہوگیا اور عذاب سے بچنے کے لیے زیادہ وقت فیکٹری میں گزارتا۔

اس نے عبدالرحمان فاروقی سے کہا ''یار! کس جہنم میں دھکیل دیا تو نے؟ چنگی نیکی کی ہے''۔

''اللہ رکھا! قسم کھا کے کہتا ہوں، مجھے ان لوگوں کا پتا نہ تھا''۔

''یار! عورت گھر بناتی ہے، بگاڑتی نہیں، یہ بالکل پڑیل نکلی ہے''۔

''فارختی دے دے!''

اللہ رکھا حقہ پینے لگا۔

عبدالرحمان فاروقی وہاں سے اٹھا اور سیدھا حویلی پہنچا۔ دروازے پر زیباں چپ اٹھا، دنداسہ مل رہی تھی۔ عبدالرحمان نے کہا ''کڑیئے! تین منزلہ حویلی میں غسل خانہ کوئی نہیں۔ دنداسہ ملنے کو یہی جگہ رہ گئی ہے''۔

''اس جگہ میں کیا خرابی ہے؟''

''ماں! کہاں ہے؟''

''چاچا! خیر تو ہے؟''

''کوئی خیر نہیں''۔

''جا فیر اندر بیٹھی ہے ماں''۔

عبدالرحمان فاروقی اندر گیا تو بڑیا کو تپ چڑھا تھا اور دوا کی شیشیاں پاس میز پر دھری تھیں۔

''آپا! تو بیمار پڑی ہے اور خبر ہی نہ دی تو نے''۔

''بھرا! کیا خبر دوں تجھے۔لڑکی روگ بن گئی ہے''۔

''یہ تو اچھا نہیں ہوا''۔

''قسمت دغا دے گئی ہے۔ناز نعمت سے پالا تھا اسے۔جوان کیا کہ گھر بسائے گی۔گھر میں رہے گی۔یہ ہوا میں اڑنے لگی''۔

''اس پتنگ کی ٹانگیں توڑ نہیں تو۔۔۔۔''

صوباں نے فاروقی کے منہ پر ہاتھ دھرا اور آبدیدہ ہو کر کہا ''میں نے بڑوں کی عزت بھی بیچ دی۔گھر گیا، لڑکی ہاتھ سے نکل گئی۔میں تو ماری گئی''۔

عبدالرحمان مایوس ہو کر چلا گیا۔

پہلے زلزلہ آیا تو صوباں کے گھر میں تریڑ آ گئی۔اب زلزلہ آیا تو حویلی کی جڑیں ہلنے لگیں۔پھندا گلے میں پڑا، کسا جا رہا تھا طبلے کی طنابوں کی طرح۔تھاپ پڑی تو چیخیں نکلیں لیکن یہ چیخیں کوئی سن نہ سکا، سن نہ سکتا تھا۔۔۔۔اللہ رکھا بکھر گیا۔گھر کی اکائی ٹوٹ پھوٹ گئی۔دیوانہ ہو گیا۔زیباں اس کی دولت میں بقائمی ہوش و حواس شریک رہی، اس کی زندگی میں شریک نہ ہوئی۔عبدالرحمان فاروقی نے بنگالی بابو کے تعاون سے کاروبار سنبھال لیا لیکن اللہ رکھا کو کون سنبھالتا؟''

وہ اب بھی اجلے کپڑے پہنتا لیکن اس کے سامنے اجالا نہیں تھا۔وہ ڈول گیا، ڈگمگا رہا تھا۔ڈولنے ڈگمگانے کا عمل جلد ہی شروع ہو گیا۔فاروقی بالعموم غیر حاضر رہتا۔ایسے میں آتا کہ اللہ رکھا سے ملاقات نہ ہو۔وہ اس سے آنکھیں نہ ملا سکتا۔ندامت میں ڈوبا رہتا۔تا کجے؟ ایک دن ٹاکرہ ہو ہی گیا فیکٹری میں آ کر۔

اللہ رکھا نے کہا ''یار تم ملتے ہی نہیں''۔

''کہاں ملوں؟ فیکٹری کا اڈہ ہی نہ رہا''۔

''میرا کوئی اڈہ نہیں رہا۔عورت نے میرا اڈہ توڑ ڈالا۔اس نے مجھے توڑ دیا۔تم بھی مجھے چھوڑ گئے۔تم بھی پیسہ چاہتے ہو، لے لو!''

''پیسہ بڑی بیکار شے ہے اللہ رکھا! مجھے اس واہیات شے کی ضرورت نہیں''۔

''تمہارے حوالے فیکٹری کی ہے۔اس کی تو ٹھیک سے دیکھ بھال کرو!''

''میں شرمندہ ہوں اللہ رکھا! میں دھوکا کھا گیا''۔

''نہیں یار، یہ سب قسمت کی ہیرا پھیری ہے۔ میں رستہ بھول گیا۔۔۔۔۔ پیسے کا ٹھرکا تھا۔ میں سمجھا کہ پیسہ سارے کاج سنوارے گا لیکن پیسہ فیل ہو گیا۔ میں نے پیسے پر بھروسہ کیا، دل کے جھانسے میں آ گیا۔ دل کے فیصلے کھوٹے ہوتے ہیں۔

وہ ایسا بیمار نہ تھا۔عورت کا ڈنگ لگا تھا۔زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکے۔وہ سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ عیش و آسائش کی زندگی عورت کو اچھی نہیں لگے گی جو حور تھی، چڑیل بن گئی۔وہ تو اس کے ہر روز تازہ بتازہ نخرے اٹھاتا۔

''یہ تو مجھے توڑنے پھوڑنے کے لیے آئی تھی۔کم ذات نے اولاد بھی نہ دی مجھے''۔

''اللہ رکھا! مجھے معاف کر دو!''

''کیا معاف کرنا کیا نہ کرنا، ہونی ہو کر رہتی ہے۔بازار والیاں بھی ایسا نہیں کرتیں۔ پیسے کا لحاظ کرتی ہیں''۔

اللہ رکھا ڈاکٹر کے یہاں چلا گیا۔ فاروقی دھیرے دھیرے حقہ پینے لگا۔سوچ میں پڑا تھا۔اس نے اس کھیل پر اللہ رکھا کو لگایا تھا۔سائیں فضل شاہ بھی آ گیا۔فاروقی نے حقے کی نڑی اس کی طرف پھیر دی۔

''میرے یار بادشاہ کا کیا حال ہے فروقی؟''

''برا حال ہے۔آدھی صدی اس نے پائی پائی جوڑنے میں گزاری۔شاندار حویلی کھڑی کی۔سکھ کی زندگی گزارنے کا وقت آیا تو عورت ٹکر گئی''۔

''جانتا ہوں اللہ رکھے کو فروقی۔اس کی جنڈڑی ہیری تفان نہ تھی۔بلمپت لے کی مستی تھی۔ٹھمریوں نے اس کا کچھ نہ بگاڑا۔عورت لے ڈوبی اسے''سائیں فضل شاہ نے اس بات پر خوب قہقہے لگائے اور پھر بولا''پیارے! بزار والی بھی عورت ہوتی ہے۔حساب کتاب رکھتی ہے۔قنون پر چلتی ہے۔زندگی گزاری اور رتز رہ نہ کیا۔مستی خرمستی نہ کی۔موج میلہ نہ کیا۔پیسہ بنانے میں لگا رہا''۔

اللہ رکھا ڈاکٹر سے دوا لے کر آ گیا۔چہرہ مرہو رہا تھا۔سائیں فضل شاہ اس کی طرف دیکھ کر بولا''یار کیا ہوا ہے تجھے؟ زنانی سے مار کھا گیا گھر کی مرگی۔بزار والی سے مار کھاتا تب بھی کوئی بات تھی۔ہوش میں آ! بھلا چنگا ہے تو۔کس شے کی لوڑ تھوڑ ہے تجھے۔ ادھی صدی جوانی ماری، بگیڑا کیا، اسے ڈوب دے گا؟ واہ بئی واہ۔چنگا مرد ہے تو۔لتر مار۔پیروں کی جتی کا کھوپڑ خراب ہو گیا ہے۔ کڈھ دے گھر سے اسے خام خاہ جان کو روگ لگایا ہے تو نے۔ڈاکٹروں کے پاس تیرا الاج نہیں۔تیرا الاج میں کروں گا''۔

''کر پھر سائیں لوک!''

''کروں گا سچے سائیں کی مدد سے۔بڑے دھکے کھائے ہیں، ماریں کھائیں ہیں گشتیوں کی۔پھر بھی جیوندے پھرتے ہیں''۔

''بس بڑی بیماری ہے''۔

''پہلے اپنا الاج کر، فیر اسے بھی وخ لینا''۔

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے کو نہ آتا۔دن سونے مشورے ہوئے۔ بھانت بھانت کی ترکیبیں اور تدبیریں زیر

بحث آئیں۔ ادھر صوباں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ موسمی بیماری تھی پر زیباں کے طور طریقے نے اسے اور بھی بیمار کردیا۔ اس نے ایک بار پھر زیباں کو سمجھایا ''دھیے، کملیے، وخ۔ میں نے پورے پندرہ ورھے بڑے اوکھے کاٹے ہیں۔ اللہ بخشے تیرے ابے کو، بڑے عیش کرائے تھے اس نے۔ کدی میری بات نہیں ٹالی۔ جان چھڑکتا تھا میرے اوپر۔ پر اللہ کی مرضی۔ اس نے بلالیا۔ میں بیوہ ہوگئی۔ خدا کسی زنانی کو بیوہ نہ بنائے''۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زیباں نے سر جھکالیا۔

''تیری خاطر میں نے دوجا ویاہ نہیں کیا۔ میں کوئی کچی تو نہیں تھی۔ تیری طرح سوہنی تھی، پر میں بیوہ رہی۔ تنگی ترشی میں حیاتی بتادی۔ اب اللہ کے فضل سے تجھے چنگا بندہ ملا ہے۔ شہزادی بن کے رہتی ہے۔ بتی دنداں میں سے جو بات نکالتی ہے اس گھڑی پوری کردیتا ہے۔ بتا کیا ارادہ ہے تیرا؟''

''کوئی ارادہ نہیں میرا ماں''۔

صوباں نے بیٹی کو بڑے جذبے سے پیار کیا۔ ٹپ ٹپ آنسو گرے۔ بولی ''سوہنی دھیے! پھر تو گھر میں جی کیوں نہیں لگاتی؟ قدر کیوں نہیں کرتی گھر والے کی؟ اسے سر کا سائیں کیوں نہیں سمجھتی؟ کون ہوگا ایسا مہربان جیسا وہ ہے۔ یہ گھر تیرا ہے۔ اسے آباد رکھنا تیرا کام ہے۔ میں کیا کرسکتی ہوں۔ بس دعا دے سکتی ہوں۔ میں نے تیرے لیے برا نہیں کیا۔ اچھا ساتھی ملا ہے۔ گھر کو گھر والے کو سانبھو! یہ گھر جنت ہے۔ یہ چھٹا تو برباد ہوجائے گی۔ پچتاوے گی۔ اگے تیری مرضی۔ میرے دن تو پورے ہوئے''۔

صوباں چپ ہوگئی۔ اپنا آخری فرض پورا کرچکی تھی۔ زیباں اس کے چہرے کو دیکھنے لگی جو پھیکا پڑ گیا تھا۔ اتنے میں فاروقی آ گیا۔ ہاتھ میں کاغذ تھا۔ بولا ''کڑیئے یہ لخت سانبھ! طلاق دی ہے اللہ رکھا نے اور زبانی کہا ہے، جو کچھ لے جانا ہے، بے شک لے جا اور حویلی خالی کردے!''

صوباں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سانس تیز تیز چلنے لگا۔ زیباں پانی لینے دوڑی۔ صوباں کی گھمبیر آواز میں چیخ نکلی اور دم پار ہوگیا۔ فاروقی سر جھکائے، انا اللہ پڑھتے پڑھتے لوٹ گیا۔

☆☆☆

حیرت! حیرت!

رضیہ فصیح احمد

ذکر چوریوں کا تھا۔ کراچی میں قانون کے تحفظ کے ادارے بھی چوکس ہیں۔ پولیس چوکیاں بھی چوک چوک موجود ہیں۔ چوکیدار بھی گھر گھر تعینات ہیں، پھر بھی چوری چکاری، ڈاکے کھلے عام ہورہے ہیں۔ حیرت!!۔۔۔۔۔مگر لوگ کہتے ہیں کہ اپنے ملک کی کسی بات پر حیران ہونا ہی نہیں چاہیے کہ یہ ملک تو سراسر ''حیرت'' ہے۔ دوستوں کا اصرار ہے کہ اس کا بن جانا معجزہ تھا۔ دشمن کہتا ہے کہ اس کا قائم رہنا کرشمہ ہے۔ وہ تو یہ تک کہتا ہے کہ اگرزمین گائے کے دو سینگوں پر ٹھہری ہوئی ہے تو پاکستان یقیناً دو سینگوں کے بیچ خلا پر قائم ہے۔

امریکہ میں لوگوں کو بہت شوق ہے کہ لوگوں کو حیرت میں ڈالا جائے یعنی انہیں ''سرپرائز'' دیا جائے مگر یہاں یہ کام خاصا مشکل ہے۔ عموماً لوگوں کو برتھ ڈے پارٹیوں یا شادی کی ''برسیوں'' (Anniversaries) پر حیران کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ گھر کے بجائے کلب میں، ساحل سمندر پر ہزار بہانوں سے بلایا جاتا ہے۔ پھر بھی جس کی پارٹی ہے وہ سمجھ ہی جاتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہوتا ہے کہ کیک کون لے جارہا ہے۔ تحفے کس گاڑی میں ہیں اور کارڈوں پر دستخط کون کرا رہا ہے۔ صرف انجان بنا رہتا ہے اور عین موقع پر آنکھیں پھاڑ کر کہتا ہے۔ "Got Me" مجھے تو شبہ تک نہیں ہوا۔ یہ ہے امریکہ، جہاں:

آدمی کو میسر نہیں حیراں ہونا

اب وطن عزیز کی طرف آئیے۔ صبح سے شام تک ہزار سرپرائز ملتے ہیں۔ صبح اٹھ کر غسل خانے میں جائیے تو ہونکتا نکا پکارتا ہے۔ ''سرپرائز! یعنی پانی نشتہ!''

بجلی کا بٹن دبائیے تو بٹن چٹ سے کہتا ہے۔ ''بابا بجلی نہیں''۔

باہر نکلے تو قدم قدم پر حیرتیں! رات کو سوئے تو گھر سے باہر سوکھا تھا۔ صبح تک پڑوس کے گٹر (Gutter) نے دریا بہا دیئے۔ گھر سے قدم رکھنا دشوار ہے۔ کھل کھل کرتے گٹر سے آواز آرہی ہے ''سرپرائز''۔

ہمارے ایک بھائی بے چارے کوئی چیز خریدنے دکان میں گئے۔ وہاں ایک تختے پر اتفاقاً پاؤں پڑا۔ تختہ چرچرایا گویا پکارا ''سرپرائز'' دوسرے لمحے بھائی نیچے تہہ خانے میں پڑے تھے اور ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھر سے جس کام کے لیے نکلے سارا دن گنوا کر چلے آئے اور وہ کام ہی نہ ہوا۔ یہ حیرتیں بڑی تکلیف دہ ہیں لیکن اس سے پہلے جب ہمارے یاں فون اور گٹر نہیں لگے تھے۔ کتنے مزے کی حیرتیں ہوا کرتی تھیں۔ کھانا کھاتے بیٹھے ہی ہیں کہ سامنے سے چچا کا پورا خاندان چلا آرہا ہے۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دوسرے شہروں سے ہزار ہزار میل کی مسافت سے لوگ ریلوں میں سفر کرکے تانگوں یا ٹیکسیوں سے اترے چلے آرہے ہیں۔

''بھلے آدمی آپ کیسے! خیریت؟''

''کیا تار نہیں ملا؟ حیرت!''

''تار کو مارو گولی۔۔۔۔۔یار تم آئے اس سے بڑی حیرت اور خوشی کی کیا بات ہے''۔

اب تار اسی دن یا دوسرے دن مل گیا۔۔۔۔ ملا ملا نہ ملا نہ ملا۔۔۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔عزیزوں رشتے داروں اور گہرے دوستوں میں خط اور تار کی اطلاع بھی محض رسمی تھی۔گھر والی گھر میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔سارے نہیں تو آدھے بچے بھی کم و بیش آس پاس منڈلاتے پائے جاتے تھے۔گھر والا صبح کا بھولا شام کو لوٹ آیا کرتا تھا۔کوئی بھی نہ ہوتو پڑوسی ہر دم خدمت کو موجود تھے۔۔۔ پڑوس کے مہمان ہمارے مہمان! جب تک وہ نہ آئیں، پڑوس میں دندنایئے۔خوب خاطریں کروایئے۔حیرت! آپ کے لیے ہوگی ان کے لیے نہیں۔

آپس کی بات ہے۔اس میں حیرت کیسی ''ہمارے مہمان آتے تو کیا آپ ان کو نہ پوچھتے؟'' اب بولیے۔

کیا بولیں۔ہم تو یہ جانتے ہیں کہ امریکہ میں جس علاقے میں ہم تین سال رہ کر آئے۔وہاں پڑوسیوں سے سر راہ کی ''ہائے ہائے'' کے سوا کوئی رسم و راہ نہ تھی۔نیچے کی منزل میں جو جوڑا رہتا تھا اس کے ایک بچہ تھا۔ایک دن اچانک ملاقات ہوئی تو تین بچے ساتھ تھے۔معلوم ہوا تینوں ان کے اپنے ہیں ہمیں ہوا تک نہ لگی۔نہ انہوں نے بتایا۔نہ لڈو بھیجے نہ ہم نے ان کے کاموں میں مداخلت مناسب جانی۔

پہلے محلوں میں رہنے والے پڑوسیوں سے اکثر یہ شعر سنا تھا:

کچھ وہ کھنچے کھنچے رہے، کچھ ہم کھنچے کھنچے
اس کش مکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

مگر اب رشتہ تنہا ہی نہیں جو ٹوٹے۔بس وہی ''ہائے'' کا رشتہ ہے جو سارے زمانے کی طرح پڑوسیوں سے بھی ہے۔اپنی کہاوت ہے۔اپنا دور پڑوسی نیڑے۔

مگر امریکہ میں اپنا بھی دور اور پڑوسی بھی دور۔۔۔۔ یہاں تو خود سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے اور اس وقت بھی اکثر ''ہائے'' کر کے رہ جاتے ہیں۔بھلا بتایئے۔۔۔۔ حیرت کی بات ہے کہ اردو زبان میں اس طرح کی کہاوتیں ہیں:۔

سانجھ بھئی! سیاں نہیں آئے۔رات بھی آدھی آن ڈھلی
آ ؤ پڑوسن چوسر کھیلیں۔بیٹھے سے بیگار بھلی

اس کہاوت سے نہ صرف پڑوسیوں کے حسن سلوک کا پتہ چلتا ہے بلکہ کئی اور مجلسی اور تہذیبی اشارے بھی ملتے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاں کی سائیکی کا اشارہ بھی موجود ہے۔ان کہاوتوں پر پھر کبھی بحث کی جائے گی۔فی الحال تو کہنا یہ ہے کہ امریکہ میں۔۔۔۔۔ ''آؤ، بی پڑوسن لڑیں''

''لڑے میری جوتی''

قسم کے مکالموں کا بھی کوئی امکان نہیں۔جب آپ گھر پر ہیں پڑوسن گھر پر نہیں ہے۔جب پڑوسن گھر پر ہے، آپ نہیں ہیں، پڑوسیوں کے گھر پر ہونے نہ ہونے کے علم کے لیے علم نجوم جاننا ضروری نہیں، صرف کار کی موجودگی یا کھڑکی میں منتظر بلی کی قیافہ شناسی کافی ہے۔

ایسے پڑوسی بھی ہوں گے جو بائبل کے کہنے کے مطابق پڑوسیوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہوں گے جتنی اپنے آپ سے، مگر ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھے۔صرف ان کی کاروں پر یہ لکھا دیکھا ہے۔

پڑوسن / پڑوسی سے محبت ضرور کرو مگر پکڑ میں نہ آؤ۔

حیرت۔۔۔۔!!

☆☆☆

برگد کا پیڑ

صادق حسین

گاؤں کے میدان میں، کچے راستے کے پاس، برگد کا پیڑ یوں کھڑا ہے جیسے کوئی عہد ساز مفکر، حکمت کے سرمائے تلے جھکا ماحول کا جائزہ لے رہا ہو۔ وقت نے اس کی جٹاؤں میں ان گنت لمحات گوندھ ڈالے ہیں۔ گرمیوں کی آمد سے پہلے اس کے دور اندیش پتے اپنے اندر پانی جمع کر لیتے ہیں۔ سردیوں میں ہر پتے کی ڈنڈی پر برگدیوں کے جوڑے کی نمود اعلان کرتی ہے کہ یگانگت فطرت کا حسن نکھارتی ہے۔ برسوں کی جگر سوز سے اس کے تنے میں گھاؤ آ گیا ہے۔ اس کے پتے ضرب کھا کر آنسوؤں کے سفید قطرے بہاتے ہیں تو اس کی چوٹی صدا دیتی ہے: ''شانتی! شانتی!! آؤ یہ دکھ ہم آپس میں بانٹ لیں''۔

گاؤں میں مشہور ہے کہ برگد کا پیڑ کلام کرتا ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ برگد کا پیڑ نہیں بلکہ اسے دیکھ کر خود گاؤں کے باسیوں کی یادداشت بولتی ہے۔

گاؤں کا نامی پہلوان کچے راستے سے گزرتا ہے تو برگد کا پیڑ کہتا ہے: ''اے کمہار کے فرزند! بچپن میں تو میرے چھتر کے نیچے، ننگے پاؤں، سات سمندر، کھیلا کرتا تھا۔ طاقت کے نشے میں تو کیوں اپنے آباؤ اجداد کے آوے اور چاک توڑ رہا ہے؟''

پہلوان سینہ تان کر جواب دیتا ہے ''میں جو اس وقت تھا اب نہیں ہوں، میرا حال میرے ماضی پر حاوی ہے''۔

تحصیلدار، گھوڑے پر سوار، شہر سے گاؤں آتا ہے تو برگد کے پیڑ سے آواز آتی ہے: اے تیلی کے بیٹے! لڑکپن میں تو میری چھاؤں میں، چور منڈلی کھیلا کرتا تھا مجھے تیرے پیوند لگے کپڑے یاد ہیں۔ اب تیری پگڑی کا شملہ بہت اونچا ہو گیا ہے۔

تحصیلدار گرجتا ہے: ''میں اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اس تحصیل کا مالک ہوں۔ میں اگر چاہوں تو تجھے آرے سے کٹوا ڈالوں اور تیرا نام و نشان مٹ جائے، پھر مجھے اپنا بچپن یاد نہ آئے''۔

پیڑ کے زرد پتے جھڑ کر زمین پر بکھر جاتے ہیں تو مسجد کا امام آگاہ کرتا ہے: ''کل جو پتے سبز تھے آج انہیں پامال ہوتے دیکھ کر عبرت پکڑو''۔

علاقے کا بدنام ڈاکو دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ یہ باتیں ہم برسوں سے سن رہے ہیں مگر زرد پتے جھڑتے ہیں تو ان کی جگہ نئے پتے نکل آتے ہیں۔ پیڑ جوں کا توں کھڑا ہے اور پیڑ اس کا مددگار ہے، تاریک راتوں میں اسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اس نے ڈاکہ زنی کے کامیاب منصوبے بنائے۔ زرد پتے تو ان کسانوں کی طرح ہیں جو سر جھکائے کھیتوں میں ہل چلاتے، بیج بوتے اور درانتیوں سے فصلیں کاٹتے ہیں۔ وہ تو جیتے جی مر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا اگایا ہوا اناج تھوک کا بیوپاری اونے پونے خرید لیتا ہے۔ تھوک کے بیوپاری کے پاس ایک لمبی موٹر کار ہے۔ اس کے خاندان کے افراد ایسے کپڑے پہنتے ہیں کہ انسان دیکھا کرے۔ ڈاکو نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اس وقت تک منصوبے بناتا اور انہیں عملی جامہ پہناتا رہے گا جب تک تھوک کے بیوپاری کی لمبی موٹر کار کے حصے بخرے نہیں ہو جاتے۔

گاؤں کا نوجوان دیوانہ بار بار کہتا ہے کہ وہ خزاں کا گلا گھونٹ دے گا اس لیے کہ اس موسم میں اس کی بانسری کے سینے میں نغموں کے چشمے منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہار میں جب وہ بانسری بجاتا ہے تو سبز پتے جھوم جھوم اٹھتے ہیں، کونپلیں رقص کرتی، جٹائیں دھمال مچاتی اور چھال تھرکتی ہے۔ عالم استغراق میں برگد کا پیڑ آنکھیں نیم وا کر کے سرگوشی کرتا ہے: ''دیوانے! بانسری کی لے تیز کر دے، مایا کی کالی گھٹائیں گاؤں پر منڈلا رہی ہیں''۔

ننگ دھڑنگ، شور مچاتے بچے دیوانے کا تعاقب کرتے ہیں تو وہ دوڑ کر برگد کے پیڑ کے پاس چلا جاتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پیڑ بانہیں پھیلا کر کہہ رہا ہو: ''دیوانے! میں تیرا دکھ جانتا ہوں، دیکھ میرے سینے میں بھی گھاؤ ہے۔ یہ میرے وجود کو کھوکھلا کر دے گا۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں، جب میں ٹوٹ کر گر پڑوں گا۔ وہ دن میری تکمیل کا دن ہوگا۔ اس روز میرا جسم زمین سے ہمکنار ہوگا اور زمین سے مجھے محبت ہے''۔

برگد کے پیڑ کو یاد ہے کہ ایک دن تین شہریوں نے اس کے چھتر کے نیچے بیٹھ کر دھرتی سے محبت کی باتیں کی تھیں۔ ان کی گفتگو نے رخ بدلا تو کارخانوں کے محنت کشوں کا ذکر چھڑ گیا۔ چمنیوں سے نکلتے دھوئیں نے پھیپھڑے جھنجھوڑ کر رکھ دیئے۔ تھکے ماندے چہروں سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ باتوں باتوں میں بحث بڑھ گئی، منہ سے جھاگ اڑنے لگے۔

ایک شہری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ''روایات معاشرے کی جڑیں ہیں۔ یہ جڑیں کھوکھلی ہو جائیں تو معاشرہ زیرو زبر ہو جاتا ہے''۔

دوسرے شہری نے خط تنسیخ کھینچا ''یہ جڑیں ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہیں۔ ہم انہیں کاٹ دیں گے۔ ہم پرانی عمارت گرا کر اس کی جگہ نیا محل تعمیر کریں گے''۔

تیسرے شہری نے پتھر مارا ''تم دونوں غلط کہتے ہو۔ ہم بھوکے ہیں۔ ہمیں روٹی دو اور ہماری سوچ لے لو''۔

تینوں شہری گاؤں کی گلی میں داخل ہوئے تو پہلا شہری ایک چھبیلی نار کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھا ''کیا قیامت ہے!''

دوسرے شہری نے ڈانٹ پلائی ''انسان بنو، گاؤں کی بیٹی ہے''۔

تیسرے شہری نے دوٹوک فیصلہ سنایا ''وہ قیامت ہے نہ گاؤں کی بیٹی، وہ محض ایک عورت ہے''۔

گاؤں کا کڑک بانکا شہریوں کی باتیں سن کر غصہ کے مارے بھوت ہوگیا۔ کڑک کر بولا ''چلے جاؤ واپس نہیں تو ہڈی پسلی توڑ دوں گا''۔

شہری خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ الٹے پاؤں بھاگے۔ راستے بھر اس بات کا رونا روتے رہے کہ گاؤں کے لوگ غیر مہذب ہیں۔

دن کی روشنی میں چمگادڑیں، برگد کے پیڑ کی ٹہنیوں سے لٹکی رہتیں اور رات کے اندھیرے میں اڑ جاتی ہیں۔

گاؤں کے شاعر کو دیکھ کر برگد کے پیڑ سے صدا نکلتی ہے ''تو جانتا ہے کہ دو ٹانگوں والی چمگادڑیں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ تو اپنے گیتوں کی آگ سے چمگادڑوں کو جلا کر راکھ کر دے''۔

شاعر جواب دیتا ہے'' میں تو خود اپنی آگ میں جل رہا ہوں۔ یہ روشنی بڑی اذیت ناک ہے''۔

برگد کے پیڑ کی گھمبیر آواز سنائی دیتی ہے ''یہ آگ ہی تو زندگی کا راز ہے۔ یہ روشنی اذیت ناک نہیں، مقصد حیات ہے''۔

گاؤں کا ایک بزرگ جلال الدین، فجر کی نماز پڑھ کر میدان میں ٹہلتا ہے۔ برگد کا پیڑ گواہ ہے کہ برسوں پہلے جلال الدین نے ایک دوشیزہ۔۔۔۔ کرم جان کو اپنی محبت کا یقین دلا کر جھوٹ بولا تھا۔ ایک تاریک رات میں، برگد کے پیڑ کے نیچے جلال دین نے قول دیا ایک دن جلال دین اچانک روپوش ہوگیا۔ کرم جان اپنے ماہیے کی جدائی میں ڈھولک پر گیت گاتی۔ اس کی آواز دکھ میں ڈوب کر ابھرتی تو پیڑوں میں بیٹھے پنچھی پر سمیٹ کر گم ہو جاتے۔ گلہریاں پھدکنا بھول کر دم بخود ہو جاتیں اور آنکھوں میں کنواریاں، کام کاج چھوڑ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتیں۔

کرم جان، انتظار کرتے کرتے، حسن، جوانی اور گیتوں سے بچھڑ گئی۔ یوں جیسے کوئی حسین لمحہ وقت سے جدا ہو کر درد کی راہوں میں بھٹک رہا ہو۔

نٹ کھٹ، منہ پھٹ، گاؤں کے بچے، کرم جان کے پیچھے بھاگتے۔ پگلی! پگلی! کی آوازیں پتھراؤ کرتیں۔ کرم جان ہانپتی کانپتی، آنکھوں کے ڈھیلے گھماتی، دوڑ کر برگد کے گھاؤ میں چھپ جاتی اور پیڑ کا جی چاہتا کہ کرم جان کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے

سارے دکھ اپنے اندر جذب کر لے۔

مدت کے بعد جلال دین شہر سے لوٹ کر گاؤں آیا تو اس کے ساتھ اس کی شہری بیوی تھی جس نے اُٹھی ایڑی کی جوتی پہن رکھی تھی۔ سر پر مصنوعی بالوں کا اینڈوا تھا۔ رخساروں پر روج اور پاؤڈر کی بہتات تھی اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی چیخ و پکار۔ جلال دین کو جب پتہ چلا کہ کرم جان مر چکی ہے، تو کلیجہ پاش پاش ہو گیا۔ اب جلال دین گاؤں میں جلال شاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جلال شاہ کے چہرے پر نور برستا ہے۔ وہ دم کرتا اور تعویذ لکھتا ہے۔ اس کے مریدوں کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

باراتیں برگد کے پیڑ کے نیچے پڑاؤ ڈالتی ہیں۔ براتی پٹیاں درست کر کے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں۔ ڈھول کی دھمک گونجتی ہے۔ شہنائیاں بجتی ہیں۔ دولہا سہرا باندھ کر گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ برات چڑھتی ہے۔ برگد کے پیڑ کی چوٹی، دولہا کو آنک کر، جنبش کرتی ہے۔ کبھی اثبات میں کبھی نفی میں اور کبھی گومگو کے عالم میں۔ گاؤں کی بیٹی، ڈولی میں اکڑوں بیٹھ، جانی پہچانی راہوں، پگڈنڈیوں، کھیتوں کھلیانوں سے جدا ہو کر ایک اجنبی دنیا کا رخ کرتی ہے تو برگد کا پیڑ مراقبے میں چلا جاتا ہے۔ تب آواز آتی ہے ''گاؤں کی بیٹی ایک بہن بھی تھی اب وہ بیوی کا روپ دھار لے گی۔ جب وہ ماں بن جائے گی تو اس کا وجود فطرت کی دلکشی میں جذب ہو کر نہال ہو جائے گا''۔

نور کے تڑکے، ٹیلوں ٹبوں کے اس پار، کھیتوں میں تیتر بولتے ہیں تو اونگھتے پتے چونک پڑتے ہیں۔ برگد کے پیڑ کے دھیان میں کھیت آتے ہیں تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ اس نے جب زندگی کا پہلا سانس لیا تو فطرت نے اس کے کان میں کہا تھا ''زمین کا مالک خدا ہے مگر انسان کہتے ہیں کہ کھیتوں کے مالک خود انسان ہیں''۔ گاؤں والے تو زمین کے چپے چپے کی خاطر کٹ مرتے ہیں۔ برگد کا پیڑ اکثر سوچتا ہے کہ کھیت کسی کے بھی نہیں اور سب کے ہیں۔ اناج کسی کا بھی نہیں اور سب کا ہے مگر تھوک کا بیوپاری کسی کو سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔

ڈگڈگی کی آواز سن کر گاؤں کے بچے برگد کے پیڑ کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ ڈوری سے بندھی، سرخ رنگ کا گھاگھرا پہنے بندریا، توت کی چھڑی کے اشارے پر ناچتی ہے۔ بندریا نچانے والا، ڈوری کو جھٹکتا، کھینچتا، ڈھیل دیتا اور گیت گاتا ہے۔ کچے راستے پر گاڑیاں رک جاتی ہیں۔ گاڑی بان نسوار کی چٹکی منہ کے گوشے میں دبا، بندریا کے ناچ کے مزے اڑاتے ہیں۔ یہ تماشا دیکھ کر گاؤں کا شاعر آنسو بہاتا اور تنہائی میں برگد کے پیڑ سے کہتا ہے!''بندریا نچانے والا، ڈگڈگی، بندریا، ہیتا کے ان تین عناصر کو تم سمجھتے ہو یا میں''۔

گرمیوں میں بھینسیں، جوہڑ کے گدلے پانی سے نکل کر برگد کے پیڑ کی بھاؤں میں چلی جاتی ہیں۔ ایک بے چینی کی حالت میں دم ہلاتی، کان پھڑ پھڑاتی، پاؤں دھب دھب زمین پر مارتی ہیں مگر ان کے جسموں سے چمٹی جونکیں ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ گاؤں کا مدرس کہتا ہے کہ جونکیں کسی کی دشمن نہیں، خون چوسنا ان کی فطرت ہے۔

بہار کے موسم میں گاؤں کے نوجوان کھڑتالیں بجا بجا، ہی کھیلتے ہیں۔ لڑکیاں گیت گاتی ہیں۔ لہلہاتے کھیتوں کی خوشبو فضا میں مچلتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر گاؤں کا شاعر برگد کے پیڑ سے ہمکلام ہوتا ہے:''یہ لمحات جا کر واپس نہیں آئیں گے، میں ان ساعتوں کے بانکپن سے شعروں کی محفل سجاؤں گا''۔

گاؤں کے میدان میں، کچے راستے کے پاس برگد کا پیڑ یوں کھڑا ہے جیسے کوئی عہد ساز مفکر حکمت کے سرمائے تلے جھکا، ماحول کا جائزہ لے رہا ہو۔

گاؤں میں مشہور ہے کہ برگد کا پیڑ کلام کرتا ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ برگد کا پیڑ نہیں بلکہ اسے دیکھ کر گاؤں کے باسیوں کی یادداشت بولتی ہے۔

☆☆☆

دھوپ

عبداللہ حسین

نالے کا پل بہت اونچائی پہ تھا، چڑھتے چڑھتے اس کا دم پھول گیا۔ پل پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ یہ شہر کی آخری حد تھی۔ یہاں سے اب کھیت اور کھلی زمینیں شروع ہوتی تھیں۔ اس نے ستانے کے انداز میں کمر پر ہاتھ رکھے اور آنکھیں سکیڑ کر دور دور تک دوپہر کے چمکتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ بہار کے موسم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

''یہ پھاگن ہے''۔ اس نے خوشی سے سوچا، اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ بھلا پھاگن کی کون سی تاریخ تھی!

تھوڑی دیر کے بعد ہار کر اس نے سوچا۔۔۔ 'بیس برس گزر گئے!' اور عمر کے گزرنے کو زبان کے نیچے سے ابل کر نکلتے ہوئے لعاب میں محسوس کیا۔

پھر اس نے ماتھے پر سایہ کرتے ہوئے فلیٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا اور پلٹ کر نظر ڈالی۔ پل پر چڑھتی ہوئی سڑک پر اب اس کا سات سالہ بچہ چلا آ رہا تھا۔ چڑھائی کافی تھی اور بچہ ایک گول اور چکنے سلیٹی رنگ کے پتھر سے فٹ بال کھیلتا ہوا دم لے لے کر چڑھ رہا تھا۔ پیچھے شہر تھا۔ شہر کے پیچھے سورج تھا۔ وسط میں اکبر بادشاہ کا قلعہ تھا جو سب سے اونچا (اور اندر سے ویران) تھا۔ جس کے دونوں جانب ایک کے ساتھ ایک بنے ہوئے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں کی ٹوٹی پھوٹی سیاہ لکیر ایک خاص زاویے پر ڈھلتی تھی یوں کہ دور سے شہر چمکدار آسمان کے مقابل ایک بہت بھاری اور سیاہ جسم والی اور بہت پھیلے ہوئے دامن والی مخروطی پہاڑی کی طرح لگتا تھا جو جیتی جاگتی ہو۔ اس کے اوپر کہیں کہیں بہار کی چھوٹی چھوٹی بدلیاں تھیں۔۔۔ دھنکی ہوئی اور پریس کی ہوئی روئی کی کٹی چھٹی، گول اور گھنی، تلملا کر ابل کر نکلتی ہوئی تند اور ٹھوس اور بھاری اور جامد چٹانیں۔ بہار کی بدلیوں کی اس مخصوص شکل سے وہ بچپن سے مانوس تھا۔ اس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس مہینے کے آسمان کے لش لش کرتے ہوئے زردی مائل نیلے رنگ سے بھی وہ ایک عمر سے واقف تھا جہاں نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ اور گو آج صبح بیس سال کے بعد وہ اپنے شہر کو لوٹا تھا مگر اس وقت پل پر قدم رکھتے ہی اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ موسم بہار میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

اب اس کا بیٹا اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور باپ کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے، سورج کے مقابل آنکھیں سکیڑے شہر کو دیکھ رہا تھا۔

''دم لے لو''۔ اس نے بیٹے سے کہا۔

بچہ اسی گول کنکر سے فٹ بال کھیلتا ہوا پل کے دوسرے سرے پر جا کھڑا ہوا اور سورج کی طرف پشت کر کے پل سے اترتی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگا۔

''بابا!'' بچے نے کہا، ''زمین گول ہے نا؟''

''ہاں''۔ اس نے کہا، اور پل سے ڈھلتی ہوئی سڑک پر نظر ڈال کر مسکرایا۔ ''ہر چیز گول ہے بیٹے''۔

''ہر چیز؟''

وہ بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھے پل سے اترنے لگا۔ اب دونوں باپ بیٹے کی پشت سورج کی طرف تھی اور ان کے سائے آگے آگے سڑک سے لپٹے ہوئے چل رہے تھے۔ ''چلو''۔ پھر اچانک اس نے نعرہ لگایا۔

''چلو!'' اور بیٹے کو کندھے پر ٹھونک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بچہ آواز نکالے بغیر ہنسا اور باپ کے پیچھے پیچھے ڈھلان پر

بھاگنے لگا۔ یہاں پر سڑک تقریباً سنسان تھی۔ صرف دور آگے ایک تانگہ دیہاتی سواریوں سے لدا ہوا جارہا تھا۔ پہلے پہر کی ہوا ابھی تھمی نہ تھی اور جاڑوں کے گرے ہوئے پتے سڑک کے کنارے کنارے اڑے جارہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس نے مکڑی کے ایک تار کو عین اپنی آنکھوں کے برابر دیکھا اور ہوا میں غوطہ لگا کر نکل گیا۔ جب ڈھلان ختم ہوگئی اور زمین ہموار آگئی تو وہ رک گیا۔ بچہ دوڑ کی تیزی میں اس سے آ کر ٹکرایا اور اس کے بازو کے ساتھ جھول گیا۔ چند منٹ تک دونوں خاموش کھڑے ہنستے اور سانس برابر کرتے رہے۔ پھر اس نے بیٹے کے کندھوں کو اپنے بازوؤں کے گھیر میں لے لیا اور سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں قدم دھرا۔

''استرے کی دھار کبھی دیکھی ہے بیٹے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں''۔

''کیسی ہوتی ہے بھلا؟''

''بڑی تیز ہوتی ہے''۔

''وہ گول بھی ہوتی ہے''۔

''گول ہوتی ہے؟''

''اگر اسے بہت بڑی خوردبین میں سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اصل میں گول ہے''۔

''بہوت بڑی خوردبین میں سے؟''

وہ لفظوں کے غلط استعمال پہ دل ہی دل میں ایک ساتھ جھنجھلایا اور محظوظ ہوا، ''میرا مطلب ہے کہ بہت طاقت ور خوردبین میں سے''۔ اس نے کہا۔

بچہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ مذاق ہورہا ہے۔ وہ بے یقینی سے ہنسا اور باپ کا بازو پکڑ کر جھول گیا۔

اب وہ ایک تنگ سی پگڈنڈی پر جارہے تھے۔ جس کے دونوں بازوؤں پر گیہوں کی فصل کھڑی تھی۔ گیہوں کی گہرے سبز رنگ کی فصل ابھی گھٹنوں گھٹنوں آئی تھی اور دور دور تک اگی ہوئی تھی اور اس کی ہمواری اس بات کا پتا دیتی تھی کہ زمین بڑی لائق ہے اور پانی ہر بیج بوئے ڈھیلے کو وافر اور یک ساں ملا ہے۔ زردی مائل سبز رنگ کی لمبی لمبی مونچھوں والی ان گنت نازک بدن بالیاں قطار در قطار ہوا کے رخ جھکی ہوئی تھیں اور رکوع میں گئے ہوئے عیدین کے نمازیوں کی یاد دلاتی تھیں۔

جب بھی موسم بدلتا تھا اور سورج میں چمک پیدا ہوتی تھی اور گیہوں ں کی جڑوں پر زردی چڑھنے لگتی تھی یہی نیم گرم ہوائیں کہیں سے آتی تھیں اور جادو کی طرح ساری زمین پر چل جاتی تھیں۔۔۔۔ اس نے یاد کیا۔۔۔۔ اور سارے چرند پرند، پیڑ پودے، حیوان اور انسان انہی زرد رنگ ہواؤں کے طلسم میں جیسے جکڑے جاتے تھے اور لہو کا ست اچھال اس تال پہ لہر مارتا تھا جو کہیں سنائی نہ دیتی تھی، جس کی بے آواز دھمک وہ جذبہ جگاتی تھی جو صرف بدلتے ہوئے موسم کا جذبہ ہوتا ہے اور جو نہ اداس کرتا ہے نہ مسرور، صرف نئے سرے سے پیدا کرتا ہے۔۔۔۔ اس نے یاد کیا۔۔۔۔ اور اسی موسم میں جب وہ سات برس کا تھا اور اپنی پہلی پہلی ائیر گن کندھے پر رکھے پگڈنڈیوں پر اپنے باپ کے ساتھ شکار کی تلاش میں گھوما کرتا تھا تو اس کا باپ ہاتھ بڑھا کر ایک سٹا توڑتا تھا اور اسے الٹا کر کے چپکے سے اس کے پاجامے میں گھسا دیا کرتا تھا، اور پھر وہ جوں جوں اسے نکالنے کی کوشش کرتا وہ اوپر ہی اوپر چڑھتا جاتا اور اس کا باپ مصنوعی تشویش کے لہجے میں کہتا ''کیا ہے بیٹے!۔۔۔ کیا بات ہے بیٹے؟''۔۔۔ اور ادھر ادھر سے جھانکتا رہتا مگر سٹے کے نکالنے میں اس کی کوئی مدد نہ کرتا بلکہ پیٹ ہی پیٹ میں ہنسے جاتا، ہنسے جاتا۔ پھر وہ تنگ آ کر اپنی ائیر گن کو پگڈنڈی پر رکھ دیتا اور دونوں ہاتھوں سے سٹے کو نیچے کی طرف دھکیلتا اور وہ پاجامے کے اندر پھدک پھدک کر اوپر ہی اوپر چڑھتا جاتا یوں جیسے

کوئی لمبی سی چڑیا ہو۔اسی طرح، گو بعد میں وہ بڑا ہوگیا اور اسے سٹے کے اس عمل کا اصل پتا چل گیا، مگر ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن کے اس حصے میں، جو نامعلوم کی خبر رکھتا ہے اور شاید اصل سے زیادہ اصل ہوتا ہے، سٹے کا وہ روپ رہ گیا جو لمبی سی چڑیا یا گھاس کے طوطے ایسی کسی پھد کنے والی جاندار شے کا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر گیہوں کی ایک بالی توڑی اور اس کی مونچھوں کو اگلے دانتوں میں داب کر کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ اس کا بیٹا نیکر کی جیبوں میں ہاتھ دیئے تنگ پگڈنڈی پر سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔

''تاریخ بھی گول ہوتی ہے''۔اس نے کہا۔

''کیسے؟''

''کہ اپنے آپ کو دہراتی ہے''۔

''کیسے؟''

''ایسے۔۔۔'' وہ سٹے کی مونچھوں کو اگلے دانتوں میں چباتے ہوئے بولا،'' کہ بڑی بڑی فوجیں اٹھتی ہیں اور ملک ملک پر جھنڈے گاڑتی ہیں اور ایک ایک سپاہی فاتح بنتا ہے اور داستانوں میں نام پاتا ہے''۔اس نے کہا،''یہاں سے ان کا زوال شروع ہوتا ہے۔اس لیے کہ مفتوح کمزور ہوتا ہے اور کمزوری میں بڑی قوت ہوتی ہے۔وہ قصے اور قصیدے سے، اختیار کے لالچ سے اور غرور کے تحفے سے فاتح کا مار گراتا ہے۔صرف وقت ذرا زیادہ لیتا ہے۔ایک صرف یہی فرق پڑتا ہے اور بس، اور فاتح کو اس وقت ہوش آتا ہے جب اس کے رومانس کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ہے۔اس طرح تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، اور ہر اس چیز کی طرح، جو اپنے آپ کو دہراتی ہے، گول ہوتی ہے''۔اس نے کہا،'' چاند سورج، تارے، زمین، آسمان، پیڑ، پودے، لہو۔۔۔''

''لہو؟'' بچے نے پوچھا۔

''ہاں''۔اس نے کہا،'' یہ سر کے بالوں سے پیر کے ناخنوں کو جاتا ہے اور پیر کے ناخنوں سے سر کے بالوں کو اور پھر پیر کے ناخنوں کو اور اس طرح بدن کے لا مقام سفر میں چکر کاٹتا ہے، گول۔گول۔گول۔۔۔'' وہ ہنسا۔

مگر اب بچہ سنجیدگی سے دلچسپی لے رہا تھا۔''بابا۔۔۔'' اس نے پوچھا،'' آدمی بھی گول ہوتے ہیں؟''

وہ حیران رہ گیا۔منطقی طور پر اگلا سوال یہی ہو سکتا تھا۔مگر عام لوگوں کی طرح وہ بھی اس غیر منطقی رویے کا شکار تھا جو بہت سی ہونے والی باتوں کے سارے میں انہیں خوش فہم بنائے رکھتا ہے۔چنانچہ وہ یہ سوال سن کر حیران رہ گیا۔

''ہاں''۔اس نے کہا،'' سویرے سے شام کرتے ہیں اور شام سے سویرا اور اپنی عادت کے اس چکر میں لگاتار گھومتے ہیں، لگاتار۔چنانچہ گول ہوتے ہیں''۔

بچہ بے یقینی سے ہنسا۔

''اسی چکر کو توڑنا فن ہے''۔اس نے بات ختم کی۔

اب وہ ایک ایسے کھیت میں سے گزر رہے تھے جہاں سے گنے کی فصل ماگھ میں کاٹی جا چکی تھی۔اس کھیت کی خشک مٹی پپڑیوں اور ڈھیلوں میں جمی ہوئی تھی۔کمزور سفید زمین جگہ جگہ سے تڑخی ہوئی اور ناہموار تھی اور گنے کی خشک جڑیں جگہ جگہ سے ابھری ہوئی تھیں اور ان میں مٹیالے رنگ کے کیڑے مکوڑے چل رہے تھے۔گنے کی جھڑی ہوئی چھال کے زرد ٹکڑے نیم گرم بگولوں میں ہلکا ہلکا شور کرتے ہوئے اڑ رہے تھے۔بھوسلی چڑیوں کی ایک ڈار ان کے سروں سے شاں کر کے گزری۔

''اس کھیت میں اب تک ہل چل جانا چاہیے تھا''۔اس نے کہا۔

''پھر کیوں نہیں چلا؟'' بچے نے پوچھا۔
''گنے کی جڑیں دوبارہ پھوٹ پڑتی ہیں'' ۔اس نے کہا،''پر فصل آدھی بھی نہیں اترتی ۔کام سے جی چرانے والے کسان اسی پر قناعت کر لیتے ہیں''۔
''بابا!'' بچے نے کہا،''کسان تو کام سے جی نہیں چراتے''۔
''کسان بھی عام آدمیوں کی طرح آدمی ہوتے ہیں بیٹے''۔اس نے کہا،''چنانچہ گول ہوتے ہیں''۔ بچہ بے یقینی سے ہنسا اور پگڈنڈی پر بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔آگے ایک سہاگہ پھیر کر تیار کیا ہوا کھیت تھا۔اس نے بچے کو دوڑ کے زور میں چند قدم کھیت کے اندر جاتے اور اس کے پاؤں کو جوتوں سمیت نرم زمین میں اترتے ہوئے دیکھا۔اسے یاد آیا کہ بچپن میں اسے بھی سہاگہ پھرے ہموار کھیت میں ننگے پاؤں بھاگنا (جب پاؤں ٹخنوں سے اوپر اوپر تک روئی کی سی نرم اور بھربھری مٹی میں ہوا کی طرح دھنس جاتے تھے اور اندر تلوؤں کو کھیت کی دبی ہوئی نمی کی مخصوص ٹھنڈک اور حدت بیک وقت جادو کی طرح چڑھتی تھی) بڑا اچھا لگتا تھا۔اس نے پگڈنڈی پر رک کر، آنکھیں سکیڑ کر کھیت کی چمچماتی ہوئی سیدھی سطح پر نظر ڈالی اور اس کی طاقت ور سیاہ، سیراب مٹی کی قدیم، مانوس بو کو سونگھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔
''اس کھیت کا کسان محنتی ہے''۔اس نے کہا۔
''بابا!'' بچے نے شرارت سے پوچھا،''گول بھی ہے؟''
''ٹھہرو۔۔۔۔'' اس نے نعرہ لگایا اور بیٹے کے پیچھے دوڑ پڑا۔
تنگ پگڈنڈیوں پر آگے پیچھے دوڑتے اور ہنستے ہوئے وہ کئی کھیتوں میں سے گزرے۔اس کا بیٹا اس سے کہیں ہلکا اور پاؤں کا پکا تھا۔وہ خرگوش کی سی پھرتی اور آسانی سے اس کے آگے آگے بھاگ رہا تھا جب کہ خود اس کا پاؤں کئی بار پگڈنڈی سے پھسل کر ادھر ادھر گیلے اور خشک کھیتوں میں پڑ چکا تھا اور کیچڑ اور مٹی سے لتھڑ گیا تھا۔ جب ایک پگڈنڈی ختم ہو جاتی اور دوسری اسے زاویہ قائمہ پر کاٹتی ہوئی ملتی تو بچہ رک جاتا اور ایک لحظے تک فیصلہ نہ کر سکتا کہ دائیں کو مڑے یا بائیں کو۔ پھر وہ مڑ کر دیکھتا اور اپنے باپ کو تیزی سے بڑھتے ہوئے پا کر اندھا دھند ایک طرف کو مڑ جاتا اور بھاگنے لگتا۔مگر اسی ایک لحظے میں اس کا باپ درمیانی فاصلے کو چند قدم کم کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔
اب وہ ایک نسبتاً چوڑی اور سیدھی پگڈنڈی پر ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔اس پگڈنڈی کے دونوں جانب گیہوں کی فصل کھڑی تھی جسے شاید آخری پانی لگایا جا رہا تھا۔ان کے قدموں کی دھمک سے ڈر کر دو خرگوش اور ایک جنگلی بلا ایک طرف سے نمودار ہوئے اور ان کے رستے کو پھلانگ کر دوسری طرف فصل میں غائب ہو گئے۔ایک کھیت سے ننھی خاکستری چڑیوں کی ڈار اڑی اور فصل کے اوپر اوپر تیرنے لگی۔ایک طرف کی بالیوں میں چلتی ہوئی ہوا اس کے چہرے کو چھوتی، بال اڑاتی، اس کا لہو اچھالتی ہوئی دوسری طرف کی بالیوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے صرف ایک قدم پیچھے تھا اور ہاتھ پھیلا کر تیزی سے قریب ہوتا اور بچے کے نرم اور گرم اور تڑپتے پھسلتے پیارے بدن کو قابو میں کرنے کے لیے بے تاب ہوا جا رہا تھا کہ دفعتاً پگڈنڈی ختم ہو گئی۔آگے ایک کنواں تھا۔وہ ٹھٹک کر رک گیا۔
اسی پگڈنڈی پر اسی موسم میں وہ سات سال کا تھا۔۔۔۔اس نے یاد کیا۔۔۔۔اور اپنے باپ کے آگے آگے دوڑ رہا تھا کہ پگڈنڈی ختم ہو گئی تھی۔اور وہ کنوئیں کے پانی کی نالی پھلانگ کر آگے نکل گیا تھا اور اس کا باپ، کہ ہر قسم کی چھلانگ لگانے سے گھبراتا تھا، وہیں رک گیا تھا اور مڑ کر ہوا میں جھوٹ موٹ غور سے دیکھنے لگا تھا جیسے اس کی کوئی بیش قیمت چیز پیچھے رہ گئی ہو۔ یہی

زمین تھی اور یہی فصل تھی اور یہی پانی اور بالیوں میں سرسراتی ہوئی تازہ نیم جوش ہوا تھی اور خاکستری رنگ کی ننھی ننھی چڑیوں کی ڈار فصلوں کے اوپر اوپر تیرتی تھی اور باپ اور بیٹا تعاقب میں تھے۔ اس نے یاد کیا۔۔۔۔ باپ اور بیٹا اور زمین اور باپ اور بیٹا! واقعات کیسے اپنے چکر کو پورا کرتے تھے اور کیسے اختصار اور ضابطے اور نونانسنس کے ساتھ جیسے گھڑی کی سوئیاں! وہ حیران رہ گیا۔

پھر وہ گھٹنا ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور بہتے ہوئے شفاف پانی میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ کو دیکھا اور انگلیوں کی پوروں پر اس ٹھنڈک اور حدت کو بیک وقت محسوس کیا جو گہری مٹی اور بہتے ہوئے پانی اور انسانی بدن کی پراسرار خاصیت ہوتی ہے اور جو اس وقت سے تھی جب وہ سات برس کا تھا، اور اس نے گیلی خنک مٹی اور ادھ پکی فصل کی بے نام خوشبو کو سونگھا جو وہیں کی وہیں قائم تھی۔۔۔ اب بھی جب وہ پینتیس برس کا ہو چکا تھا اور اس پر زندگی کے اس خوفناک منشی اور لامقام جادو کے چکر کا انکشاف ہوا اور اس نے سوچا صرف پانی لہو میں بدل جاتا ہے اور زمین کے رستے نسل سے نسل کو منتقل ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ سرگرداں رہتا ہے۔۔۔۔ باپ سے بیٹے کو، باپ سے بیٹے کو!

پانی میں تیرتے ہوئے سفید لمبی لمبی پتلی انگلیوں والے ہاتھ کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس کنویں کی پشت پر، جہاں سے یہ پگڈنڈی دوبارہ شروع ہوتی تھی، ایک نجومی بیٹھا کرتا تھا جس کے آگے ایک میلا سا کپڑا پھیلا ہوتا تھا جس پر عجیب وغریب قسم کے سکے اور پیتل کے چھوٹے چھوٹے نمبروں والے مکعب بکھرے رہتے تھے۔ اس نے پانی سے ہاتھ نکال کر چہرے پہ پھیرا اور پھر بالوں سے پونچھ کر خشک کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کنواں ریں ریں کی مدھم، یکساں، خواب آلود آواز نکالتا ہوا چل رہا تھا اور اس کا بیٹا اچک کر گادی پر سوار ہو بیٹھا تھا اور ایک کھوپے چڑھے بیل کی دم پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ دائیں طرف جامن اور شہتوت کے پیڑوں کا جھنڈ تھا جس میں کاشت کار کا کچا مکان تھا۔ کاشت کار اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ٹوکے سے چارہ کتر رہا تھا۔ مکان کی دیوار کے ساتھ کھرلی پر بھینس بندھی تھی جس کی پشت پر ایک کوا بیٹھا چونچ مار رہا تھا۔ اس سایہ دار، خاموش اور پرامن منظر کو آنکھوں میں اتار کر اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ڈیرے کی پشت پر جانکلا۔ جوتشی کی جگہ خالی تھی۔

اس کے پیچھے کنویں کے چلنے اور پانی کے بہنے اور کسان کے ٹوکے کی آواز تھی اور گہری سایہ دار جگہوں میں گرے ہوئے پرانے پتوں کی تیز بو تھی اور سامنے چلچلاتے ہوئے رنگ تھے اور گیہوں کی لاکھوں جھومتی ہوئی بالیوں کی سرسراہٹ تھی۔ ساری جگہوں میں سے جوتشی نے صرف اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ اس نے سوچا۔ حالانکہ یہاں سے صرف پیدل دہقان گزرا کرتے تھے اور اس نے کبھی کسی دہقان کو جوتشی کے پاس بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسی ہی پراسرار بات تھی جیسی بچپن کی ساری سرزمین ہوتی ہے۔ اس نے سوچا، اور جوتشی جب تک وہاں رہا تھا ہمیشہ بڑے اطمینان اور فراغت سے وہاں بیٹھا ہوا ملتا رہا تھا۔ اس کے پاس پرانی سی سیاہ صندوقچی پڑی رہتی تھی جس پر چند بوسیدہ کتابیں اوپر نیچے رکھی ہوتی تھیں جن کے ساتھ ایک ــــــــــــــــ انسانی ہاتھ کی شکل بنی ہوئی تھی اور ہتھیلی میں چند لکیریں کھچی تھیں اور نیچے بڑے بڑے لفظوں میں لکھا تھا: جوتش، رمل، نجوم، ابجد۔

''ابجد؟'' ایک روز اس نے اپنے باپ سے پوچھا تھا، ''یہ کیا ہوتا ہے بابا!'' اور اس کا باپ کہ اور ساری باتوں کے علاوہ ابجد کا بھی علم رکھتا تھا (اس کے باپ کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور وہ دنیا کے سارے علموں کا ماہر تھا) بولا تھا: ''اسموں کا علم ہوتا ہے بیٹے''۔

''اسموں کا؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں۔۔۔'' اس کے باپ نے کہا تھا، ''ناموں کا''۔

''ہر شخص کے نام کا اثر اس کی ساری زندگی پر پڑتا ہے بیٹے۔ اسے ابجد کہتے ہیں''۔

''نام کا اثر کیسے پڑتا ہے بابا!'' اس نے پوچھا تھا، اور اس کا باپ آرام سے پگڈنڈی پر بندوق کو گود میں رکھ کر بیٹھ گیا تھا اور اسے پاس بٹھا کر بولا تھا:

''یہ لفظوں کا علم ہے بیٹے۔ اور لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے''۔

''جادو ہوتا ہے؟''

''ہاں''۔

''کیسے؟''

''ایسے۔۔۔'' اس کا باپ ایک بالی توڑ کر اسے دانتوں میں چباتے ہوئے بولا تھا، ''کہ جیسے تمہارا نام ہے جسے سویرے سے شام تک میں تمہاری ماں اور بہن اور سکول میں تمہارے استاد اور ہم جماعت ان گنت بار پکارتے ہیں اور تم اس نام پر بولتے ہو۔ مگر نام اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ نام جتنی بار بھی پکارا جاتا ہے اس کا ایک لفظ بنتا ہے اور منہ سے نکل کر ہوا میں جاتا ہے کہ اس کی ایک شکل ہوتی ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ضائع ہو گیا مگر کبھی ضائع نہیں ہوتا کیونکہ لفظ زندہ ہوتا ہے اور اس کا رشتہ تمہارے ستارے سے ہوتا ہے، اور ہر بار جو پکارا جاتا ہے تو آواز کی رفتار سے اڑتا ہے اور آٹومیٹک (بابا کو یہ لفظ استعمال کرنے کا بہت شوق تھا، وہ دل میں ہنسا) سیدھا تمہارے ستارے تک پہنچتا ہے اور اس سے جا ٹکراتا ہے، ہر بار، اور یوں تمہاری زندگی پہ اثر انداز ہوتا ہے''۔

''ستارہ کیا ہوتا ہے بابا؟''

''ہر شخص کا ایک ستارہ ہوتا ہے جس کے زیر اثر وہ پیدا ہوتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور مرتا بھی ہے''۔

دونوں اٹھ کر پھر آگے پیچھے پگڈنڈی پر چل پڑے تھے، اور جب کچھ دیر بعد اور باتیں کرتے ہوئے، اس کے باپ نے کہا تھا: ''اب دو چار برس میں تمہیں نپولین کی سوانح عمری پڑھ لینی چاہیے'' تو اسے وہ پھیکے سرخ رنگ کی جلد والی، خستہ بھورے کاغذ اور باریک سہ کالم لکھائی کے صفحوں والی موٹی سی کتاب یاد آ گئی تھی جو ہر وقت اس کے باپ کی کرسی کے پاس تپائی پر پڑی رہتی تھی اور جسے اس کا باپ موقع بموقع اٹھا کر پڑھتا اور حاشیوں پر کچھ لکھتا رہتا تھا اور جس سے پرانے کاغذ کی مخصوص تیز بو آیا کرتی تھی۔۔۔ اس کو وہ کتاب، جس سے وہ ایسے ہی مانوس تھا جیسے اپنے جوتے یا اپنے بستر سے، یاد آ گئی تھی۔ اس نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا تھا: ''بابا! میں بھی بڑا ہو کر کتابیں لکھوں گا'' اور اس کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے باپ نے آنکھیں پھیلا کر، تقریباً اداسی سے، اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر پگڈنڈی پر بندوق گود میں رکھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کو پاس بٹھا کر بولا تھا: ''بڑا مشکل کام ہے''۔

''مشکل کیسے ہے بابا؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''ایسے۔۔۔'' اس کا باپ آنکھیں سکیڑ کر آسمان پر دیکھتا ہوا بولا تھا، ''کہ جیسے یہ بادل''۔

''بادل؟''

''ہاں'' اس کے باپ نے کہا تھا، ''یہ بدلیاں دیکھ رہے ہو؟ پچھلے ایک گھنٹے سے کیسی دھلی دھلائی دھنکی ہوئی اور پریس کی ہوئی روئی کی ٹھوس چٹانوں کی طرح آسمان میں سر اٹھائے کھڑی ہیں اور نہ ہلتی ہیں نہ چلتی ہیں نہ شکل بدلتی ہیں۔ دیکھا تم نے؟''

''ہاں بابا''۔

''دیکھا تم نے کہ ان کی ایک ایک نوک اور ایک ایک قوس اور ایک ایک لکیر جیسے پتھر سے کاٹ کر بنائی گئی ہے؟''

''ہاں بابا''۔

''اور اپنے اختصار اور اپنی خاموشی کے باوجود ان میں اتنی تندی اور اتنا تشدد اور اتنی زندگی اور قوت ہے کہ دل پر نقش ہو

جاتی ہیں اور ایک بار دیکھ لو تو سارا سال نہیں بھولتیں؟'' اس کی آنکھیں یکبارگی چمک اٹھی تھیں۔ ''دیکھا تم نے؟''

''ہاں بابا''۔

''مگر۔۔۔'' اس کی آنکھوں کی چمک یکبارگی غائب ہوگئی تھی اور وہ ایک بالی توڑ کر اداسی سے اسے سونگھتے ہوئے بولا تھا، ''یہ بدلیاں صرف بہار کے بہار آتی ہیں، چند روز کے لیے بس۔ پھر سارا سال وہی میلے میلے مٹیالے، غیر معین اور غیر واضح اور مکڑی کے جالے کے سے بدرنگ بادلوں کا چکر چلتا ہے جو آتے ہیں اور گرجتے ہیں اور دھوپ۔۔۔'' وہ بالی کھیت میں پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اور دھوپ کے آنکھوں میں کھب جانے والے رنگوں کو ختم کر دیتے ہیں''۔

وہ پھر پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلنے لگے تھے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر اس نے اس کی پروا بھی نہ کی تھی اور بھلا دیا تھا۔ اس لیے کہ کتابیں لکھنے کی بات اس نے بے سوچے سمجھے، بالکل سرسری طور پر کی تھی اور دراصل میں اس کا مطلب یہ نہ تھا۔ مگر بعد میں۔۔۔۔ بہت بعد میں۔۔۔۔ جب وہ واقعی بڑا ہو گیا اور اس نے کتابیں لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو اپنے باپ کی کہی ہوئی بات اپنے سارے معنی کے ساتھ بڑے واضح طور پر اس کے سامنے آ گئی، اس لیے کہ جب کبھی وہ کسی خیال کے جادو کو محسوس کر کے چونک کر اٹھا اور قلم اٹھا کر کاغذ پر جھکا تو خیال کو لفظ میں منتقل کرتے کرتے اس کا سارا جادو غائب ہو گیا اور اس نے اپنے آگے کاغذ پر کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے بے جان، بے اثر لفظوں کو بدمزگی سے دیکھا اور سکتے میں آ گیا، اور پھر اس نے سر اٹھا کر بہار کی ان بدلیوں کو تلاش کیا جن کے آنے میں ابھی دیر تھی اور ہمیشہ اس نے حیران ہو کر سوچا کہ اس کا باپ جس نے کبھی ایک کتاب بھی نہ لکھی تھی، کیسے ان سب باتوں کا علم رکھتا تھا!

وہ بدلیاں کبھی نہ آئی تھیں۔ وہ لفظ کبھی اس کو نہ ملا جس کی تلاش میں وہ تھا۔۔۔۔ وہ کانا چھانٹا ہوا، دھلا دھلایا ہوا، صاف ستھرا، مختصر اور تند اور قوی، ٹھوس دھات کا گھڑا ہوا لفظ جس پہ نظر ڈالو تو سانس لے اور زبان پہ لاؤ تو جی اٹھے اور دل کی طرح دھڑکے۔ وہ لفظ صرف اس کے خیال میں جادو جگاتا رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ علم رہا تھا کہ لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے، مگر اس بات کا اسے پتا چلا تھا کہ لفظ لکھنا بڑا کٹھن کام ہے۔ اس نے ہزاروں کیڑے مکوڑے پھیلائے اور مشہور بھی ہوا مگر دوسرے بڑے بڑے اور مشہور کتابیں لکھنے والوں کی طرح ہمیشہ ناکام رہا تھا۔

''بابا''۔ اس کا بیٹا اس کی ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ''کیا کر رہے ہیں؟''

''سوچ رہا ہوں بیٹے''۔

''کیا سوچ رہے ہیں بابا؟''

''کیا سوچ رہا ہوں؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر فصل کے اوپر اوپر دیکھتے ہوئے ذہن پر زور ڈالا۔ ''کچھ نہیں''۔

''کچھ نہیں؟'' بچے نے دہرایا۔

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ ''بیٹھ جاؤ بیٹے''۔ اس نے کہا۔ پھر اس نے ایک ٹوٹی ہوئی خشک ٹہنی اٹھا کر اس سے سفیدہ پھرے ہوئے کھیت کی سطح پر ایک گول دائرہ کھینچا۔ ''میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں''۔ اس نے کہا، ''یہ دائرہ آدمی کا بنیادی رویّے اور اسی دائرے میں آدمی کی ساری سوچ بند ہے۔ اس دائرے سے باہر نامعلوم کی دنیا ہے، اندھیرا ہے''۔

پھر اس نے دائرے کے محیط پر قریب قریب دو نشان لگائے۔ ''ان نشانوں کے درمیان یہ مختصر سا علاقہ بھلائی کا علاقہ ہے۔ یہاں سے پھر۔۔۔'' اس نے داہنی طرف محیط کے ساتھ ساتھ لکڑی گھمائی، ''ظلم شروع ہوتا ہے اور یہاں سے۔۔۔'' اس نے بائیں طرف لکڑی گھمائی، ''منفی اچھائی شروع ہوتی ہے۔ ان تینوں علاقوں کی آپس کی حدیں بڑی باریک اور تقریباً بے معلوم

ہوتی ہیں، اتنی کہ یہاں سے دیکھیے پر سب آپس میں گڈمڈ ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگران کی ایک چیز مشترک ہوتی ہے، آدمی کا بنیادی رویہ، بھلائی ہو، برائی ہو، یا ظلم ہو، آدمی کا بنیادی رویہ جارحانہ ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ہم سوچتے بھی ہیں تو کچھ نہیں سوچتے''۔

''کچھ بھی نہیں؟'' بچے نے دہرایا۔

''ہاں۔ جب تک آدمی کا بنیادی رویہ بدل نہیں پاتا تب تک یہ دائرہ نہیں ٹوٹتا اور تب تک اس سے باہر کے نامعلوم علاقے میں ہماری رسائی نہیں ہوتی جو بہت بڑا علاقہ ہے اور اس دائرے کی جس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں اور جہاں زندگی کی اصل نسل باتوں کا علم رہتا ہے۔ سمجھے؟''

بچہ بے یقینی سے ہنسا۔

وہ ٹوٹی ہوئی ٹہنی پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بیٹے کی گردن میں بازو ڈالا اور وہ واپس شہر کو مڑے اسے پتا تھا کہ بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، مگر وہ یہ سوچ کر طمانیت سے دل میں مسکرایا کہ عمر میں کبھی نہ کبھی وہ ضرور، کہیں نہ کہیں، ان باتوں کے روبرو آ کھڑا ہوگا اور سمجھ جائے گا اور پھر وہ اپنے باپ کو یاد کرے گا۔

واپسی پر اب وہ دوسرے راستے پر، دوسری پگڈنڈیوں پر چل رہے تھے یہ بہرحال سڑک پہ اسی جگہ جا کر نکلتی تھیں جہاں سے انہوں نے کھیتوں میں قدم رکھا تھا۔ بچہ اب اس کے بازو کے حلقے سے نکل کر دوڑتا ہوا بہار کے خودرو پھول توڑ توڑ کر جمع کر رہا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں کناروں پر السی کے شوخ سرخ رنگ کے ننھے ننھے نازک پھول ہزاروں کی تعداد میں اُگے ہوئے تھے جن پہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ بیچ میں لالہ کے کئی بڑے بڑے سرخ پھول تھے جن میں کہیں کہیں بنفشی پھولوں کے چھینٹے بھی تھے۔ ایک جگہ جنگلی گلاب کا پودا تھا جس کا پھول توڑتے توڑتے کانٹا اس کے بیٹے کی انگلی میں چبھ گیا اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر انگلی کو اس جگہ سے چوسنے لگا یہاں پر خون کا ننھا سا قطرہ ابھر آیا تھا جس میں سورج چمک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر بچے کی انگلی کو دیکھا اور اسے خون چوس جانے کی ہدایت کر کے احتیاط سے گلاب کا پھول توڑا اور بچے کو دیا جو اس نے لے کر اپنے گلدستے میں لگا لیا اور انگلی چوستے ہوئے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے اپنے دہنے ہاتھ کی انگلیاں ناک تک لے جا کر انہیں سونگھا، اس گلاب میں خوشبو نہیں تھی، جو دوسرے گلاب میں ہوتی ہے، اس نے سوچا۔ اسے اپنا باپ یاد آیا جو جب تک زندہ رہا اپنے شکار کے مہنگے شوق میں پیسے اڑانے اور کوئی کام کاج نہ کرنے کی بناء پر کنبے بھر میں اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا رہا جس کی غیر ذمہ داری اور نکھٹو پن کی شکائتیں اس نے اپنی ماں تک سے سنیں، جس کو عمر بھر صرف بھرپور طور پر زندگی گزارنے اور اس کے فلسفے پر غور کرنے کا شوق رہا۔ جس نے وہی کیا جو چاہا اور جو درست خیال کیا اور جو شاید تھا بھی عین درست ہی آخرکار۔۔۔۔اس نے جنگلی گلاب کے پودے کے پاس کھڑے کھڑے دور آگے پگڈنڈی پر اپنے بیٹے کو دوڑ دوڑ کر خودرو پھول جمع کرتے ہوئے دیکھا اور اس نے سوچا: بیٹوں کو باپ کے شکرانے کے لیے اس کی دولت اور عزت اور اس کے رتبے اور شاید اس کے کارناموں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کو صرف اس خوشبو کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف ایک بار بچے گلاب کو چھونے سے ہاتھوں میں لگی رہ جاتی ہے اور جس کا آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا، مگر بعد میں جب انجانے طور پر ہاتھ کہیں سانس کے سامنے سے گزرتا ہے تو خوشبو کا احساس ہوتا ہے اور آدمی چونک کر سارے بدن پر اسے تلاش کرتا ہے اور پوروں تک پہنچ جاتا ہے اور انہیں سانس پر رکھ کر سونگھتا ہے اور اسے یاد آتا ہے کہ اس کے ماضی میں کہیں ایک گلاب کا پھول بھی تھا، اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

بچہ اس کو پیچھے پگڈنڈی پر رکے دیکھ کر ٹھہر گیا، ''بابا!'' اس نے آواز دی۔ وہ غیر ارادی طور پر دہنے ہاتھ کی انگلیوں کو ناک کے قریب لے گیا۔

''بابا''۔اس کے قریب آنے پر بچے نے پوچھا''وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''سوچ رہا تھا بیٹے''۔

''کیا سوچ رہے تھے؟'' بچے نے شرارت سے سوال کیا اور بھاگ اٹھا۔

دوڑ شروع کرنے سے پہلے اس نے حلق سے خوشی کی گہری گونج دار آواز پیدا کی جو کچھ کچھ بیل کے ڈکرانے سے مشابہ تھی۔ ابھی تیز، ابھی ہولے دوڑتے ہوئے انہوں نے کئی کھیت پار کئے۔ اس رستے پر گیہوں اور چنے کے کھیت تھے اور ایک کھیت میں چند بچے، کچے سبز چنوں کو آگ لگا کر ان کی ہولیس بنا رہے تھے۔ کھیت کے کنارے کنارے بھاگتے ہوئے اسے ہولیس بنانے کی گرم گرم رس دار خوشبو آئی اور اس نے چند لمحے رک کر خوشی اور اداسی کے ملے جلے احساس کے ساتھ چنے کے جلتے ہوئے پودوں کو اور اٹھتے ہوئے دھوئیں کو اور اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے، گھٹنوں پر ہاتھ رکھے پاؤں کے بل بیٹھے ہوئے مشاق چہروں والے بچوں کو دیکھا۔ اس کا بیٹا بھی رک کر کمر پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر دوڑ پڑا۔ آگے خودرو پھولوں کی بہت سی کیاریاں اور کئی خالی کھیت آئے اور بہار کی اٹھتی ہوئی ہوائیں ان کے چہروں کو چھوتی ہوئی گزرتی رہیں۔ آخر وہ کھیتوں کو چھوڑ کر سڑک پر آ نکلے اور پاس پاس کھڑے ہو کر ہانپنے اور ہنسنے لگے۔ اس کے بیٹے نے کس کر دو تین مکے اس کی رانوں پر لگائے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اب سورج ڈھل رہا تھا۔ سڑک تقریباً خالی تھی اور دھوپ میں گرم ہو کر چمک رہی تھی۔ صرف چند کسان اپنی عورتوں کے ہمراہ شہر سے خریداری کر کے لوٹ رہے تھے۔ مرد لاٹھیاں کندھوں پر رکھے اور ان سے گٹھڑیاں لٹکائے اور عورتیں مٹی کی ہانڈیاں ایک کے اوپر ایک سروں پہ رکھے، جوتیاں ہاتھوں میں پکڑے سڑک کے کنارے کنارے ٹل کی ڈھلان اتر رہی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے کی گردن میں بازو ڈالا اور آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگا۔ پل پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ سامنے اس کا شہر تھا جس پہ اب سورج چمک رہا تھا۔ اس نے ستانے کے انداز میں کمر پر ہاتھ رکھے اور مڑ کر آخری بار دور دور تک سہ پہر کے چمکتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ گیہوں اور چنے کا سبزہ اور السی کے پھولوں کا لالہ اور بے بو خودرو پھولوں کا زردہ اور ہل چلی ہوئی زمین کی بادامی اور پھلدار درختوں کی سیاہی اور اوپر آسمان کا نیلم اور بہار کی بدلیوں کا براق۔ ایک ایک کر کے اور پھر سب کے سب ایک ساتھ اس کی آنکھوں میں کھب گئے اور اس نے ایک طویل لمحے تک اس دھڑ دھڑ دھڑکتی، سانس لیتی ہوئی عجیب وغریب سرزمین کو دیکھا اور اسے اس شخص کا خیال آیا جسے ایک دفعہ اس نے دیکھا تھا، اس شخص کے چہرے پہ رنگ اور آنکھوں میں بے پناہ چمک عود کر آئی تھی اور وہ آخری دموں پر تھا اور بڑا صحت مند اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے آنکھیں ڈھانپ لیں اور کئی لمحوں تک کھڑا اس منظر کو دل میں جذب کرتا رہا۔ پھر پلٹ کر پل کو پار کرنے لگا۔

آج صبح سویرے وہ اس شہر میں موسمی پرندے کی مانند وارد ہوا تھا۔ علی الصبح جب بازار اور گلیاں ابھی خالی تھیں اور صرف فجر کی نماز سے لوٹنے یا صبح کی سیر کو جانے والے اکا دکا لوگ خاموشی سے کیکر کی داتن چباتے ہوئے آ جا رہے تھے اور ابھی دن کا اجالا بھی نہیں پھیلا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑے اور اپنا سوٹ کیس اٹھائے اجنبیوں کی طرح ادھر ادھر دیکھتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ میونسپلٹی کے بھنگی (ازلی طور پر جھکے جھکے) بازاروں میں جھاڑو دے رہے تھے اور گلیوں کی نالیاں صاف کر رہے تھے۔ ایک گوالا دودھ کے بڑے بڑے کمنڈل دونوں ہاتھوں میں لٹکائے ان کے بوجھ سے جھولتا ہوا تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ ایک فقیر بلند خوابیدہ آواز میں بھیک مانگتا پھر رہا تھا۔ اس نے سوٹ کیس آہستہ سے گھر کے دروازے کے آگے اینٹوں کے تھڑے پر رکھ دیا اور رک کر ان پرانی، مانوس آوازوں کو سننے لگا۔ بیس برس گزر گئے تھے مگر دن کی یہ ساری اولیں آوازیں وہی تھیں جن کو وہ اپنے لڑکپن میں فجر کے وقت (اپنے بستر میں کسمساتا ہوا) سن کر جاگا کرتا تھا۔۔۔ یا جاگ کر سنا کرتا تھا۔ دروازے کے آگے سرنہوڑائے

کھڑے کھڑے چند لمحوں کے لیے اس کے پاس نیم خوابیدگی کا وہ لذیذ اور غیر حقیقی عالم لوٹ آیا تھا جس میں سونے اور جاگنے اور سننے کے عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جو یہاں سے جانے کے بعد اس کو کسی خواب گاہ میں اور کسی بستر میں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دو انگلیوں سے ہولے ہولے دروازہ کھٹکٹانا شروع کیا۔ ایک بار دو بار، تین بار۔۔۔ اس کا بیٹا حیرانی سے چاروں طرف محلے کے اونچے اونچے مکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ دو سفید کبوتر کسی منڈیر سے اڑ کر مدھم آسمان پر سے گزرے۔ کسی نے اوپر کی منزل کی کھڑکی کھولی۔

''کون ہے؟'' ایک لڑکی نے کھڑکی سے سر نکال کر سوئی سوئی آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں''۔ وہ سر اٹھا کر احمقوں کی طرح بولا۔

لڑکی کا چہرہ غائب ہو گیا اور کھڑکی کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر زینے پر قدموں کے اترنے کی آواز ابھری۔ پھر دروازہ کھلا۔

''ماموں جان''۔ لڑکی نے سانس روک کر زیر لب کہا۔

اس نے متلاشی نظروں سے اس لمبے قد اور چھریرے بدن کی نوجوان لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پہلی بار شعوری طور پر اسے اتنی عمر کے گزر جانے کا احساس ہوا۔ اس نے سوٹ کیس اٹھا کر ڈیوڑھی میں رکھا اور اس اجنبی لڑکی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اوپر کی منزل پر ایک دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی مدھم سی آواز آئی۔ اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ پتھر کے زینے اور دیواروں کے لاوقت رنگ و روغن کو دیکھ کر آناً فاناً وہ بیس برس کو جیسے ایک جست میں پھلانگ کر اپنے لڑکپن میں جا کھڑا ہوا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ، قدم قدم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کو اجنبیت اور مانوسیت کا وہ عجیب و غریب ملا جلا احساس ہوا جو لمبی جلاوطنی کے بعد گھر آنے والوں کا ہوتا ہے اور جو صرف کان اور آنکھ ہی میں نہیں، بدن کی ساری جلد پر اور اس کے نیچے لہو کی سرسراہٹ تک میں محسوس کیا جاتا ہے اور جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وقت یکسر گم ہو جاتا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ زینے کے اوپر اس کی بہن چوکھٹ کا سہارا لیے اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کا سر آدھے سے زیادہ سفید ہو چکا تھا اور اس کے چہرے کی جلد ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی پھیلی ہوئی آنکھوں میں وہ خلاء تھا جو دکھی عورتوں کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوسری سیڑھی پر رکا دن کے بڑھتے ہوئے اجالے میں چپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے صرف پانچ سال بڑی تھی اور اس کو وہ لمبے قد اور چھریرے بدن کی چلبلاتی ہوئی جوان لڑکی کے روپ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس وقت دوسری بار اسے عمر کے گزرنے کا دھچکا لگا۔

پھر اس کی بہن کی کانپتی ہوئی کمزور آواز آئی: ''سعید۔۔۔'' اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب وہ ہلا اور آخری دو سیڑھیوں کو پھلانگ کر اس کے قریب پہنچا اور ڈھیلے لباس میں ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو محسوس کر کے اس کا دل جیسے لہو سے بالکل نچڑ گیا اور وہ بچوں کی طرح اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اسے صرف اتنا پتا چلا کہ وہ خستہ ہڈیوں کے ہلکے پھلکے، ہچکیاں لیتے اور ہچکولے کھاتے ہوئے نا طاقت بدن کو اپنے جسم کے ساتھ تھامے کھڑا ہے اور اس خوش بو کو سونگھ رہا ہے جو فجر کی سوتی جاگتی آوازوں کی طرح پرانی اور لذیذ اور مانوس ہے اور جو صرف دودھ پیتے بچوں یا اپنی بہنوں سے آتی ہے جن کے ساتھ آپ بچپن میں سوئے اور لڑکپن میں کھیلے ہوں۔ ایک بار جب اس نے سر اٹھا کر بے مدعا سامنے دیکھا تو اسے صرف اتنا پتا چلا کہ چھریرے بدن کی لڑکی اور اس کا بیٹا ساتھ ساتھ کھڑے آنکھیں پھیلائے پریشانی سے ان دونوں کو دیکھ رہے ہیں اور صحن کے کونے سے جو آسمان کا ٹکڑا نظر آ رہا ہے اس پر دو سنہری کبوتر خوشی سے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ اس طرح اس کو جاننے کی خواہش کیے بغیر پتا چلا کہ سورج نکل آیا ہے اور دل گیلا کپڑا ہے جو بل دے کر نچوڑا جا رہا ہے۔ دراصل اسے کچھ بھی پتا نہ چلا تھا، کہ ایک ہی رنگ و بو کے دو جلاوطن بدنوں میں وقت یکسر گم ہو چکا تھا۔

پھر بعد میں وہ بڑے کمرے میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا اور اس کی بہن اس کے سامنے بیٹھی اس کے بچے کو گود میں لیے باتیں کر رہی تھی: ''تمہارا خط مل گیا تھا۔۔'' وہ کہہ رہی تھی اور وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا ہوا کمرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے کے سارے سامان میں سے صرف ایک وہ کونے میں کھڑی ہوئی اخروٹ کی لکڑی کی بھاری الماری تھی جس سے وہ واقف تھا۔ باقی سب بدل چکا تھا۔ وہ دن اسے آج بھی یاد تھا جس روز یہ الماری ان کے گھر میں وارد ہوئی تھی اور اوپر کی منزل تک پہنچتے پہنچتے تنگ زینے میں پھنس کر رہ گئی تھی اور زینے کے اوپر اس کا باپ کھڑا پسینے میں شرابور آٹھ زور لگاتے ہوئے مزدوروں کو یوں تن دہی سے ہدایات دے رہا تھا جیسے میدان جنگ میں شاید کوئی جرنیل! اس روز وہ سکول سے ذرا دیر سے لوٹا تھا اور جلد از جلد اوپر پہنچنا چاہتا تھا کہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی مگر آدھے زینے میں یہ بہت بڑی اور بھاری سی الماری پھنسی ہوئی تھی جو نہ اوپر جاتی تھی نہ نیچے اور نہ ہی گزرنے کا کوئی راستہ دیتی تھی کسی کو۔ اور آٹھ پہاڑیئے، جن کے پسینے میں بھیگے ہوئے چیتھڑے لٹک رہے تھے اور پھڑکتے ہوئے گیلے پٹھے نیم اندھیرے میں چمک رہے تھے اور جن کے جسموں سے محنت اور غربت کی تیز بساند آ رہی تھی، چار الماری کے آگے اور چار پیچھے اپنے حماقت زدہ چہرے لیے بوکھلائے کھڑے تھے اور اس کے باپ کی غصیلی، کڑک دار آواز پر جھک جھک کر غیر یقینی ہاتھوں سے الماری کو ٹٹول رہے تھے۔۔۔۔ وہ آہستہ سے مسکرایا۔۔۔۔ اس الماری کے دروازوں کی وارنش شدہ سطح پر اخروٹ کی لکڑی کی ٹیڑھی میڑھی سیاہ دھاریاں اوپر سے نیچے تک چلتی تھیں، اور اس کے اندر رسالہا سال تک کھیس اور دریاں اور چادریں، اور تیلی تیلی دلائیاں اور نیچے کے خانے میں پلنگ کے روغنی پائے (اور ایک پرانا اور ٹوٹا ہوا بنجو) رکھے جاتے رہے تھے اور جب اسے کھولتے تھے تو اندر سے اخروٹ کی لکڑی اور کچے سوت کی ملی جلی تیز بو آیا کرتی تھی جو باہر کی کسی بو سے میل نہ کھاتی تھی۔ چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر جائے اور الماری کا دروازہ کھول کر دیکھے کہ اب اس میں کیا رکھا جاتا تھا اور اس کی بو اب بھلا کیسی تھی؟

''تم اپنی بیوی کو نہیں لائے۔۔۔؟'' اس کی بہن کہہ رہی تھی اور وہ جواب میں پتا نہیں کیا کہے جا رہا تھا، کیونکہ اس کی عمر ساری ناک اور کان اور آنکھ میں سمٹ کر آ گئی تھی اور وہ نظروں سے اس لمبی چھریری لڑکی کا تعاقب کر رہا تھا جو اس کی بہن کا پہلا روپ تھا جو اس کمرے میں جو سالہا سال تک اس کا کمرہ رہا تھا، آ جا رہی تھی اور جھجکی ہوئی، اجنبی اور مانوس نظروں سے اسے اور اسے کے بیٹے کو تاک رہی تھی۔ اس کے کمرے کی ایک دیوار لکڑی کی تھی جو غسل خانے کو الگ کرتی تھی اور جس پر ہاتھ مارو تو ساری لرزتی تھی۔ دوسری دیوار میں شیشے کی الماری جڑی تھی جس میں آدمی پورے قد سے کھڑا دکھائی دیتا تھا اور اسے کھولو تو اندر قرآن مجید پڑا ہوتا تھا اور نچلے خانے میں پتا نہیں کس کی ایک ٹوٹی ہوئی تسبیح پڑی رہتی تھی۔ گلی والی دیوار میں دو کھڑکیاں کھلتی تھیں جن میں جالی لگی ہوئی تھی اور جن کے رستے فجر کی دھندلی خوابیدہ آوازیں آیا کرتی تھیں اور۔۔۔۔ ایک بار بہت فجر کو سامنے والے گھر میں مہمان اترے تھے اور ان کا لونڈا خوشی کے مارے گلی میں سے گاتا ہوا گزرا تھا ''دل والے۔۔۔۔'' اور اس نے اپنے بستر میں سوئے سوئے تقریباً خواب میں یہ آواز سنی تھی اور آہستہ آہستہ جاگ پڑا تھا اور سر کو بار بار دل میں دہراتا رہا تھا حتیٰ کہ اس آواز کا ایک بدن بن گیا تھا اور ایک رنگ نکل آیا تھا جو پیلا تھا اور ایک عمر کے گزرنے پر بھی پیلا ہی رہا تھا اور یوں اسے پتا چلا تھا کہ ماضی کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناشتے کی طشتری الٹ دے اور بھاگ کر جائے اور اپنے کمرے کے دروازے سے جھانک کر دیکھے کہ اب وہ بھلا کیسا تھا اور اس میں کیا کچھ رکھا تھا۔

''تیرے سر میں سودا تھا سعید''۔ اس کی بہن تاسف سے کہہ رہی تھی، ''تو اپنے بابا پر گیا ہے''۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آتش دان پر اس کے ماں باپ کی بڑی بڑی تصویریں رکھی تھیں جن کے چہروں پر لازوال مسکراہٹیں

تھیں اور جو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی بہن کا شوہر، جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہ تھا، آئندہ بھی کبھی دکھائی نہ دے گا چنانچہ اب وہ اس سے کیا کہہ سکتا تھا بھلا۔ اس نے جمائی لی اور چپکے سے جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ جوتے اتارے بغیر گہری نیند ہو گیا۔

جب وہ سو کر اٹھا تو اس کے جوتے اترے ہوئے، ترتیب سے پلنگ کے آگے رکھے تھے اور کمرے کے سارے دروازے بند تھے اور باہر صحن میں اور باورچی خانے میں اس کی بہن اور بھانجی اور کام کرنے والی عورت سب دبے پاؤں چل پھر رہے تھے اور اس کا بیٹا کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اس نے اپنی بہن سے دو گھنٹے کی اجازت لی اور باہر نکل آیا۔ بازار تک آتے آتے اسے چار آدمی ملے جنہوں نے دونوں باپ بیٹوں کو غور سے اوپر نیچے دیکھا اور خاموشی سے گزر گئے۔ بازار میں داخل ہونے سے پہلے اسے شدید حجاب آلود اجنبیت کا احساس ہوا اور اس نے فلیٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا اور کوٹ کا کالر اٹھا لیا اور جیبوں میں ہاتھ دیئے دیئے بازار اور سارے شہر میں سے گویا سلیمانی ٹوپی پہنے پہنے گزر گیا۔ کسی نے اسے نہ پہچانا تھا اور اس سے اسے عجیب سے رنج مگر عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی دوبارہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے، اس نے فلیٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا، کوٹ کا کالر اٹھایا اور ہاتھ جیبوں میں ٹھونس کر پل سے اترنے لگا۔

اسی طرح اپنے فلیٹ اور کوٹ کی آڑ میں اس نے گول سڑک کے کنارے کنارے آدھے شہر کا چکر کاٹا اور بازار میں داخل ہوا۔ سڑک پر گھوڑوں اور موٹر گاڑیوں کی گرد اڑ اڑ کر اس کے ہیٹ اور کوٹ کے بازوؤں پر جم گئی تھی اور اس روز کی آخری دھوپ میں ذرہ ذرہ چمک رہی تھی۔ سورج کے گرد بادل جمع ہو رہے تھے۔ بازار میں اس نے رحیم شربت والے کو پہچانا جس نے داڑھی رکھ لی تھی اور داڑھی سفید تھی۔ وہ اپنے پرانے مستقل انداز میں گدی پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں پنکھی تھی جس سے وہ اپنے آگے پڑی ہوئی رنگ برنگے دیسی شربتوں کی بوتلوں پر بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کو اڑاتا جا رہا تھا۔ رحیم شربت والے نے ایک دفعہ اسی جگہ پر تن تنہا سات ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر اس زمانے میں رحیم ململ کا کرتہ پہنتا تھا اور اس کے پٹھوں کی مضبوط ڈھلان اور شانوں کی گولائی اور بازوؤں کی مچھلیاں ململ میں سے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس کے چہرے پہ سفید داڑھی تھی اور وہ مشکل سے پہچانا جاتا تھا۔ فلیٹ کی آڑ میں اس نے کئی اور لوگوں کو پہچانا جو اپنی پرانی دکانوں پر اپنے مستقل انداز میں بیٹھے تھے۔ کئی لوگوں نے اسے دیکھا اور گزر گئے اور پھر مڑ کر اس کی چال سے کچھ اندازہ کرنے اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر بیس سال ایک عمر ہوتی ہے جو بچوں کو جوان اور جوانوں کو بوڑھا اور یادوں کو کند کر دیتی ہے۔ وہ سیدھا گھر جانے کی بجائے دہنے ہاتھ کی ایک گلی میں مڑ گیا۔

گلی کا فرش، اونچی نیچی اینٹوں والا، اس کا سارا لاپرواماضی تھا جس پر ان گنت پرانے قدموں کے نشان تھے جن میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس نے گلی کو تقریباً خالی پا کر ہیٹ ماتھے پر اونچا کیا اور انگلیاں اپنے بیٹے کے بالوں میں دوڑائیں۔ بازار کا اونچی نیچی آوازوں والا اٹھتا اور دبتا ہوا شور پیچھے رہا جا رہا تھا۔ اب یہاں پہ گلی کی مخصوص آوازیں تھیں دونوں طرف کے چوباروں کی کھڑکیوں میں آمنے سامنے بیٹھ کر سبزی بناتی اور آہستہ آہستہ باتیں کرتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو جھانکتی ہوئی عورتوں کی مخمور آوازیں اور اندر کسی کسی کواڑ کے کھلنے اور بند ہونے کی پراسرار دھمک (ٹھنڈے، اندھیرے کمروں میں ان گنت ستاتے اور ان دیکھی محبت کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کی پراسرار دھمک!) اور سہ پہر کا سناٹا! اس کا جی چاہا کہ وہ پرانے وقتوں کی مانند بازو پھیلا کر بھاگتا اور شور مچاتا ہوا آڑے آ گیا اور وہ بازو اپنے بیٹے کی گردن میں ڈالے احتیاط سے پرانے نشانوں پہ قدم رکھتا ہوا کڑی مستقل چال سے، جو ادھیڑ عمری کی اور زیارت کے سفر کی چال ہوتی ہے، گزرتا رہا، اور چوباروں کی کھڑکیوں میں ٹیک لگائے بیٹھی لڑکیوں نے سانس روکے بغیر گردن لمبی کر کے اس باپ بیٹے کو جھانکا اور دھیان ہٹا لیا، اور دوپہر کے کھانے کے بعد خنک، تاریک کمروں میں

محبت کرنے اور پھر گہری نیند میں بڑبڑانے والے ان گنت مردوں اور عورتوں کو ان کا پتا بھی نہ چلا۔ اب یہ اس کے دوست اوم کا گھر تھا جس کی بہن پشپا ہر سال اس کے راکھی باندھا کرتی تھی اور اب وہ لوگ پتا نہیں کہاں تھے۔ اس وقت وہ سب پرائمری سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ اور ہفتے میں ہمیشہ ایک دو روز پشپا اس سے کہتی ''آج ہم نے ترکاری پکائی ہے۔۔۔'' اور وہ سیدھا ان کے گھر چلا جاتا اور ان کے دالان کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر وہ تینوں ہلکی ہلکی گول چپاتیوں کے ساتھ پیتل کے جھلملاتے ہوئے برتنوں میں ترکاری کھاتے اور بعد میں ان کے چوبارے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھیلتے اور اس کے گھر والوں کو اس کی فکر بھی نہ ہوتی، کیونکہ اس زمانے میں اس کے دو گھر تھے۔۔۔ ایک اپنا اور ایک اوم اور پشپا کا۔ اس نے رک کر کھلے دروازے میں سے اندر جھانکا: دالان اور چوکا اور ایک کوٹھڑی اور دائیں طرف کو اوپر جاتا ہوا زینہ، سب جگہیں وہی تھیں، صرف کنبہ اجنبی تھا۔ دالان کے فرش پہ بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہوئی بوڑھی عورت نے اپنی بے رنگ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا:

''کیا ہے بھائی۔۔۔''

وہ چھت کی کڑیوں پر نظر دوڑاتا رہا۔

''کس کو دیکھتے ہو بھائی۔۔۔؟''

''کسی کو نہیں بی بی۔۔۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ چرخے کے پاس روئی کے ڈھیر کو دیکھ کر اس نے بے خیالی سے سوچا، یہ شاید اس سال کی ہے!'' پھر اس نے اپنے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اور چل پڑا۔

اس گھر سے ایک خنک سی، نامعلوم سی بو آیا کرتی تھی جو اوم اور پشپا سے بھی آتی تھی۔۔۔ اس نے یاد کیا۔۔۔ اور جب کبھی وہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو جایا کرتا تو پھر جاگنے پر، آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی اسے پتا چل جاتا تھا کہ وہ اس گھر میں ہے اور پھر آنکھیں کھول کر پیتل کے کٹوروں اور تھالیوں کو تاریک چوکے کی دیواروں پر جھلملاتے ہوئے دیکھتا تھا اور اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور اب یہ گھر اجنبی اور بے بو ہو چکا تھا جو کبھی اس کا اپنا تھا۔ اس نے سوچا۔ سب چیزیں وہی تھیں صرف بو اڑ چکی تھی، اس نے دل میں کہا، بو جولا مقام ہوتی ہے مگر بدن ضرور رکھتی ہے، جو سفر کرتی رہتی ہے مگر مرتی بھی ہے۔

اب وہ اپنے سکول کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس سکول کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کے گھروں کے پاس تھا چنانچہ اس علاقے کے سب بچے یہیں سے تعلیم شروع کرتے تھے۔ یہ سکول کا پچھواڑا تھا جہاں اس کا ایک دروازہ اور باقی کھڑکیاں تھیں۔ دروازہ لوہے کی سلاخوں کا بنا ہوا تھا جیسے جیلوں یا خزانوں کا ہوتا ہے، اور کھڑکیوں میں بھی سلاخیں لگی تھیں۔ سکول کا اصل گیٹ پیچھے کی طرف تھا جہاں سے گول سڑک گزرتی تھی۔ اسنے بچے کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور جا کر کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور قیدیوں کی طرح ان سے منہ لگا کر اندر دیکھنے لگا۔ سکول میں چھٹی ہو چلی تھی اور چپراسی کمروں کو بند کر رہے تھے اور برآمدوں میں ماسٹر اپنی اپنی سائیکلوں پہ جھکے گپیں مار رہے تھے۔ یہ چوتھا درجہ تھا، اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ بے ترتیبی سے پڑے ہوئے بدرنگ ڈیسکوں پر سیاہیوں کے دھبے تھے اور بلیک بورڈ پر تقسیم کا ایک سوال حل کیا ہوا تھا جو پھر ڈسٹر سے آدھا مٹا دیا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر علامہ اقبال کی تصویر ٹیڑھی ہو کر لٹک رہی تھی۔ یہ چوتھا درجہ ہے، اس نے دل میں دہرایا۔ یہاں وہ ایک سال تک بیٹھتا رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکا بیٹھتا تھا جس کے کپڑوں سے گندے صوف کی سیاہی کی بو آیا کرتی تھی۔ مگر اس سے آگے جو لڑکا بیٹھتا تھا اس سے گیلی گاچنی اور تازہ تراشی ہوئی قلموں کی کھری کھری خوشبو آیا کرتی تھی جو اسے بڑی اچھی لگتی تھی مگر اس کی دوستی صرف اوم اور پشپا سے تھی جو دوسری قطار میں بیٹھتے تھے اور ان کے اپنے دوست تھے جو دوسری قطار کے تھے۔ اور آدھی چھٹی کے وقت نلکے کے گرد سب جمع ہو کر اپنی اپنی تختی پر گاچنی ملتے تھے اور جب کوئی تختی پر ہاتھ پھیرنے کے لیے گاچنی کی ڈلی کو ایک طرف

رکھتا تو چپکے سے اسے اٹھا کر اپنی تختی پر مل لیتے تھے اور پھر وہیں رکھ دیتے تھے اور ہجوم کی گڑبڑ میں کسی کو پتا بھی نہ چلتا تھا۔ اس نے آہستہ سے سلاخوں سے منہ اٹھایا اور ہاتھ سے اس جگہ کو ملا جہاں اس کے ماتھے پر سلاخوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اور آہستہ سے ہنسا اور وہ دونوں پھر گلی میں چلنے لگے۔ اب یہ وہ مکان تھا جو سکول کے ساتھ لگتا تھا اور جو اس کے لیے بڑا اسرار رکھتا تھا۔ اس مکان کو دیکھتے ہی اسے وہ شخص یاد آ گیا جو یہاں رہا کرتا تھا۔ وہ پینتالیس پچاس کے لگ بھگ، دبلا پتلا اور لمبے قد کا آدمی تھا جو خاکساروں کی وردی پہنے رہتا تھا جس کی جیبوں میں ہر وقت اردو کی اخباریں اور پرچے ٹھنسے رہتے۔ اس کے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی جس میں چند پرانی عینکیں لٹکی رہتی تھیں۔ کہنے کو وہ عینکوں کا کاروبار کرتا تھا، مگر کسی نے اس کو کبھی عینکیں بیچتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کا صرف ایک کام تھا، کہ بازار میں سائیکل لے کر چلتے چلتے ہر چند قدم پر رک جاتا اور اپنی گہری آواز میں نعرہ لگاتا۔۔۔ ''چوراچکا چودھری اور غنڈی رن پردھان''۔ اور پھر بچوں کے معصوم فاتحانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھتا تھا اور اردگرد کے دکاندار اور گزرنے والے لوگ اس کی طرف اپنائیت سے دیکھتے تھے اور کھسیا کر ہنستے تھے کہ جیسے وہ اس نعرے کا نشانہ نہ ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ وہ شخص بھی نعرہ لگانے کے بعد خوشدلی سے ہنستا اور گزر جاتا۔ اس شخص کے لہجے میں اور چہرے پر کوئی کڑواہٹ نہ ہوتی بلکہ صرف خوش دلی اور بے ضرر طنز کے آثار ہوتے تھے جو اس کی شکل وصورت اور چال ڈھال سے ذرا میل نہ کھاتے تھے۔ وہ ہر ایک کا دوست معلوم ہوتا مگر کسی نے اس کو کبھی کسی کے پاس رکتے نہ دیکھا تھا۔ وہ لوگ صبح سویرے سکول پہنچنے پر اس کو اپنی سائیکل کے ساتھ گھر سے نکلتے اور دروازے کو تالا لگاتے ہوئے دیکھتے اور کھڑے رہتے جب تک کہ وہ گلی میں اتر کر اپنی گہری اور بلند آواز میں بلاناغہ۔۔۔ ''چوراچکا چودھری اور غنڈی رن پردھان'' کا نعرہ لگا کر اور اپنے معصوم فاتحانہ انداز میں سارے بچوں پر نظر ڈال کر بازار کی طرف نہ چلا جاتا۔ جس روز وہ مرا ہے کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ تین روز تک دروازہ اندر سے مقفل رہا تھا۔۔۔ اس نے یاد کیا۔۔۔۔ حتیٰ کے تیسرے روز بو باہر نکل کر چاروں طرف پھیل گئی تھی اور سب سے پہلے سکول کے ماسٹروں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور چند بچوں نے جو اس آواز پر جمع ہو گئے تھے۔ انہیں بتایا کہ آج تین روز سے انہوں نے چوراچکے چودھری کو نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ پہلے محلے کے لوگ جمع ہوئے، پھر پولیس آئی اور کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے اور آوازیں دینے اور درزوں میں سے جھانکنے کی کوشش کرنے کے بعد دروازہ توڑا گیا اور اندر وہ کرسی پر بیٹھا تھا، جیسے عام لوگ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ صرف اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا اور میز پر ایک کاغذ اور قلم رکھا تھا اور کاغذ پر۔۔۔ یہ اس کو بہت بعد میں پتا چلا تھا۔۔۔ لکھا تھا: ''چوراچکا چودھری اور غنڈی رن پردھان''۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے لوگوں کی ٹانگوں میں سے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اور بو کا بھبکا اس کے منہ پر پڑا تھا اور اس نے پلٹ کر نالی میں قے کر دی تھی، اور گو اس روز پشپا نے ایک چھوڑ دو دو بار کہا تھا ''آج ہم نے ترکاری پکائی ہے''۔ مگر وہ اس کی سنی ان سنی کر کے سیدھا اپنے گھر چلا آیا تھا اور اس کے بعد کئی روز تک کچھ کھا پی نہ سکا تھا۔ وہ جلدی سے مڑا اور اپنی گلی میں داخل ہوا جس کے آخر پر اس کا گھر تھا۔ گلی میں دروازوں اور کھڑکیوں پہ بیٹھی سہ پہر کی گپیں مارتی ہوئی عورتوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس نے جھجک کر کوٹ کا کالر اٹھایا اور ہیٹ کو ماتھے پر کھینچ کر ہاتھ جیبوں میں دیے اور سامنے دیکھتا ہوا چلنے لگا۔ کوٹ کی دائیں جیب میں انگلیوں کی مدد سے اس نے پورے پونے چھ آنے کے سکے گنے جو اب ساری دنیا میں اس کی کل دولت تھی۔ اب بادل سورج کے سامنے آ چکے تھے۔ اور بارش کی خبر لانے والی مرطوب ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے دروازے پر پہنچا تو بارش کے پہلے قطرے اس کے ہیٹ پر پڑے۔

اس کا بیٹا دھپ دھپ کرتا اس کے آگے آگے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کھڑکیوں کے چھجوں پر شور مچاتے ہوئے بارش کے قطرے بڑی تیزی سے گر رہے تھے اور انہیں جذب کرتی ہوئی خشک دیواریں سوندھی سوندھی خوشبو چھوڑ رہی تھیں جو ایک بیش بہا خوش بو تھی اور

صرف موسم کے پہلے چھینٹوں پراڑتی تھی اور پھر نکل جاتی تھی، کہیں کی کہیں۔۔۔ان نے زینے میں رک کر کئی لمبے لمبے سانس لیے اور گھر میں عورتوں کے ہنسنے کی مسرور آوازیں سنیں۔ اوپر پہنچ کر اس نے اپنی بھانجی کو دیکھا جو صحن میں لپک لپک کر رسی پہ پھیلے ہوئے گیلے کپڑے اتار رہی تھی اور چارپائیوں کو گھسیٹ رہی تھی اور ہنسے جارہی تھی۔ اس کی بہن، جو ایک دوسری عورت کے ساتھ برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی تھی، اسے دیکھ کر بسم اللہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری عورت نے مڑ کر دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ جیبوں میں ہاتھ دیئے، کندھے جھکا کر چلتا ہوا صحن پار کر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر پھر کمرے کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے وہیں کا وہیں جم کر رہ گیا۔

اس کا دل یک بارگی اچھلا اور پھر بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہوا میں معلق ہو گیا اور وہ مڑ کر دیکھ بھی نہ سکا صرف سر جھکائے دروازے میں کھڑا ایا د کرتا رہا اور بارش کے قطرے اکا دکا اس کے ہیٹ پر بجتے رہے۔

نوری!۔۔۔اس کا ذہن گونج اٹھا۔ نوری!!

اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کیے مگر دیواروں کی وہ اولیں نایاب خوش بو اب نکل چکی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ وہ مڑا اور برآمدے کی چارپائی پر بیٹھی ہوئی اس موٹی سی ادھیڑ عمر عورت کا پورا سامنا کر کے کھڑا ہو گیا۔

''نوری!!'' اس کے ہونٹ ہلے مگر آواز پیدا نہ ہوئی۔ عورت مانوسیت اور حجاب کے ملے جلے تبسم کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ وہ آنکھیں پھیلائے کھڑا دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور بارش کے قطرے لمحوں کی طرح اس کے بے تاثر چہرے پہ گرتے رہے، ٹپ، ٹپ، ٹپ۔

''سعید! پانی پڑ رہا ہے''۔ پھر اس کی بہن نے کہا۔

وہ جیسے خواب کی حالت میں مڑا اور دہلیز پر قدم رکھ کر اندر داخل ہوا اور جا کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا بیٹا باہیں پھیلائے کرسی پر بیٹھا بے خیالی سے باہر بارش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جیبوں سے نکالے بغیر کھڑا رہا اور پانی کے اکا دکا قطرے اس کے ہیٹ پر سے کندھوں پر اور آستینوں سے فرش پر گرتے رہے، ٹپ، ٹپ، ٹپ!۔۔۔وہ اس وقت صرف گیارہ سال کا تھا اور یہ بیل کی طرح بل کھاتی، پل پل تھرکتی، دھم دھم کرتی سیڑھیاں چڑھتی اور اترتی اور بھاگ کر گلی سے گزرتی ہوئی شہد کے رنگ کی لڑکی تھی جو گیارہ سالہ دل کا اکلوتا سحر تھی، نوری!۔۔۔وہ بے خیالی سے ہنسا اور اس کا دل جیسے واپس اپنی جگہ پہ آ گیا اور وہ آسانی سے ہولے ہولے سانس لینے لگا۔۔۔وہ اس سے کئی سال بڑی تھی اور اس سے بات بھی نہ کرتی تھی مگر وہ گھنٹوں۔۔۔پہروں اپنے دروازے سے لگ کر کھڑا (چوبارے پہ، کھڑکی میں، دروازے پر، گلی میں، اپنے گھر، اس کے گھر، کہیں، کہیں!) اس کی ایک جھلک کا منتظر رہتا تھا، اور دیکھ لیتا تو بہت اداس ہو جاتا تھا۔ اس گیارہ سالہ بچے کے لیے اس لڑکی میں ایک ایسا جادو تھا جو شاید سنہرے سے رنگ کا تھا اور جو اس کی ماں یا بہن یا باپ یا کسی اور مرد اور عورت میں نہیں تھا۔ دن بہ دن، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال۔ ان نے یاد کیا۔۔۔وہ اس کی ایک ایک جھلک کا منتظر رہا تھا اور وہ اس سے بے خبر رہی تھی، قطعاً۔ حتیٰ کہ جب وہ گھر سے گیا تھا تو اس کے ساتھ ہی وہ بھی گئی تھی، وہی پل پل تھرکتی ہوئی سنہرے رنگ کی سدا بہار شبیہہ کہ اس کی اولین عورت تھی جو کبھی نہیں بھولتی۔ (وہ دوبارہ ہنسا، جیسے کسی ان دیکھی گرج کو سن کر ان سنی کر رہا ہو) اس کے بعد کتنی ہی عورتیں اس کی زندگی میں آئیں اور نکل گئیں اور ایک کے بعد ایک کا سحر ٹوٹا، مگر ایک سحر قائم رہا اور ایک شبیہہ لا زوال رہی جو اس کے دل کے ایک کونے پر روشنی کے منار کی مانند کھڑی رہی اور ہر پرانے سحر کے ٹوٹنے پر نئے سحر کی جانب اسے چلاتی رہی اور جس کی جوانی کے زور پر وہ سدا جوان رہا تھا۔ اپنی ساری عمر اور عقل اور فہم اور تجربے کے باوجود اس کو کبھی اس بات کا خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا کہ ایک روز دوبارہ وہ اسے دیکھے گا اس طرح۔

جیسے کوئی پتھر اڑتا ہوا آ کر ایک جڑے ہوئے شیشے پہ لگے تڑاخ۔۔۔۔اور شیشہ تڑخ کر کرچی کرچی ہو جائے مگر اپنے فریم میں کھڑا رہے جڑا جڑایا، جیسے ثابت وسالم، صرف سطح پر کرچیوں کی لکیریں پھیل جائیں چاروں طرف اور ہر کرچی سے ایک ٹوٹی پھوٹی شکل جھانکے الگ الگ کہیں آنکھ کہیں ناک کہیں کان کہیں ہونٹ، جیسے کوئی خوفناک تصویر!

وہیں کھڑے کھڑے اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر دروازے سے باہر دیکھا۔ برآمدے میں چارپائی اب خالی پڑی تھی۔اس کی بہن ایک کرسی اٹھائے چلی آ رہی تھی جو اس نے لا کر اس کے پاس رکھ دی۔

''نوری۔۔۔'' اس نے اپنی بہن کو کہتے ہوئے سنا،''تم نے پہچانا؟ بے چاری کا میاں۔۔۔''

وہ سیدھا سیدھا کرسی پر بیٹھ گیا اور گریبان کے بٹن کھول کر آہستہ آہستہ چھاتی پر ہاتھ پھیرنے لگا، جیسے کرچیوں کی لکیروں کو تلاش کر رہا ہو۔ باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی اور دیواروں پر بچوں کے چاک اور گاچنی سے لکھے ہوئے نام اور نشان مٹتے جا رہے تھے۔اس وقت بالکل نا قابل تشریح طور پر اس کو وہ شان دار مرغ یاد آیا جو شاید سنہرے سرخ رنگ کا تھا اور ایک دفعہ دریا کے کنارے پکنک پہ جا کر انہوں نے ذبح کیا تھا۔اور ذبح کر کے رکھا ہی تھا کہ اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اس طرح کہ گردن کٹی ہوئی تھی اور ایک طرف کو لٹکا ہوا سر پھندنے کی طرح اچھل رہا تھا اور وہ پر پھیلائے بھاگا جا رہا تھا۔وہ سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے تھے مگر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دریا میں جا گرا تھا اور دریا وہاں سے ایک دم گہرا تھا اور ان میں سے دو دو ایک تیرنا جانتے تھے وہ آگ جلانے کے لیے لکڑی کی تلاش میں ادھر ادھر جا چکے تھے۔چنانچہ مرغ پانی کی سطح پر تیرتا تیرتا دریا کے بہاؤ میں شریک ہو گیا اور دور تک انہیں نظر آتا رہا تھا۔وہ سب بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے صم بکم کنارے پر کھڑے دیر تک اسے دیکھتے رہے تھے اور پھر بعد میں خوب ہنسے تھے اور اس نے حیرت سے سوچا تھا کہ مرغ پانی میں گرنے کے بعد ہلا تک نہ تھا تو پھر وہ اٹھ کر بھاگا کیسے تھا:۔

اور پھر اس کے بعد ایک دفعہ۔۔۔۔کئی سال گزرنے پر وہ مرغ اسے دوبارہ یاد آیا تھا اور اس وقت وہ منظر ذرا بھی مضحکہ خیز نہ رہا تھا بلکہ بڑا شدید المناک ہو گیا تھا جس نے اسے بہت اداس کر دیا تھا۔اور اس نے ذرا حیرت سے سوچا تھا کہ چیزوں کے ساحل کہاں ہوتے ہیں کہ اتنی عمر تک نظر ہی نہیں آتے؟

وہ دوبارہ بے خیالی سے، بے تاثر طور پر ہنسا، جیسے کوئی بچہ ڈری ڈری ہنسی ہنستے ہوئے قدم قدم کسی پالتو جانور کی طرف بڑھتا ہے۔وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا بچہ کرسی کی پشت سے لگا لگا سو چکا تھا۔اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا اور ہاتھ کرسی کے بازوؤں پہ پھیلے تھے اور وہ گہرے گہرے، لمبے لمبے سانس لے رہا تھا جیسے باہر بارش ہو رہی تھی اور باہر بارش لگاتار ہوئے جا رہی تھی، جیسے سحر ٹوٹ جاتا ہے۔

اس نے ہیٹ ماتھے پر اونچا کیا، کوٹ کا کالر بٹھایا اور کھونٹی سے برساتی اتار کر پہنی۔

''اب کہاں جا رہے ہو؟'' اس کی بہن نے پوچھا۔

''ذرا باہر جا رہا ہوں''۔اس نے کہا۔

''بارش ہو رہی ہے سعید''۔

''بس ابھی آتا ہوں''۔

''سعید!'' اس کی بہن نے ملتجی نگاہیں اٹھا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا،''اب یہاں رہو گے نا؟''

''ہاں''۔اس نے بے خیالی سے بے ماں کے بچے پر ایک نظر ڈالی اور دروازے کی طرف چل پڑا۔پھر اچانک جیسے کچھ یاد آ جانے پر مڑا اور بڑی بیباکی سے بہن کی آنکھوں میں دیکھ کر ہنسا۔

''ہاں'' وہ بولا، ''اب میں یہیں رہوں گا''۔ اور صحن پار کر کے سیڑھیاں اتر گیا۔

ڈیوڑھی میں اسے اپنی بھانجی ملی جو ہاتھ میں ایک خالی برتن لیے، دوسرے ہاتھ سے شلوار کے پائنچے اٹھائے بارش میں بھیگتی ہوئی گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے اس کی ناک پکڑ کر آہستہ سے دبائی۔

''کہاں گئی تھی بلی؟''

لڑکی بیل کی طرح بل کھا کر مڑی اور پہلی بار پوری مانوسیت سے ہنس کر بولی: ''ذرا ادھر گئی تھی ماموں''۔

دروازے میں رک کر اس نے دوبارہ ہیٹ اتارا اور اسے خوب دبا کر سر کے پچھلے حصے پر رکھا۔ پھر اس نے ہاتھ پھیلا کر بارش کے زور کا اندازہ کیا۔ سامنے کے گھر میں ایک نوعمر لڑکا دروازے سے لگ کر کھڑا بڑی مشتاق مگر اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باقی سب گھروں کے دروازے ادھ کھلے یا بند پڑے تھے اور دور دور تک کوئی بشر دکھائی نہ دیتا تھا، سوائے چند چڑیوں کے جو بارش سے بچنے کے لیے کھڑکیوں کے چھجوں میں آ کر چھپ گئی تھیں اور دھیمی، خواب آلود آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بے خیالی سے مسکرایا اور گلی کے سرخ اینٹوں والے فرش پر ہلکے ہلکے خوش دل قدم رکھتا ہوا بازار کی جانب چل پڑا جہاں اب اسے اپنے پرانے جاننے والوں سے ملنا ملانا تھا۔ گلیاں اور محلے تقریباً ویران پڑے تھے۔ بارش شرائٹے سے ہو رہی تھی اور دن کا اجالا گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر کوئی شے بڑی نازک مگر قدیم اور زور آور ٹوٹ کر آزاد ہو چکی تھی اور لہو کے ساتھ گردش میں تھی۔ وہ دل کے سر ہونے تک جیتا رہا تھا اور اس بات پہ نہ خوش تھا نہ خفا، بس بارش کے ان گنت قطروں کی تھاپ کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اور دل میں جانتا تھا کہ ان میں نہ رنگ ہے نہ بُو نہ لے، صرف حیات ہے۔

☆☆☆

پاپوش

عزیز احمد

دلبر علی خاں چھوٹے سے جاگیردار ہیں جس زمانے میں حیدرآباد کے نواح میں کشن پلی کی پہاڑیاں ایک بڑا فیشن ایبل محلّہ بن گئیں انہوں نے یہاں بلندی پر ایک چھوٹا سا مکان بنوالیا۔ تین کمرے، ایک برآمدہ، باہر ایک برآمدہ اور چبوترہ۔ اور پہاڑی کی ڈھلوان پر ایک بے ہنگم سا باغ جس میں نیم، ببول اور بہت سے خودرو پودوں کے ساتھ ساتھ دو چار سرو کے درخت تھے۔ سرخ پھولوں کی جاپانی بیلیں تھیں۔ گلاب البتہ کئی قسم کے تھے۔

اس باغ میں اور برآمدے میں تعطیلات کے دنوں میں دلبر علی خاں یا ان کے خاندان کے متفرق افراد، محلّہ کے دوسرے بنگلوں والوں کو ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ دلبر علی خاں کو جاگیر سے کوئی چار پانچ سو روپیہ ماہوار کا اوسط مل جاتا تھا اور ان کے پاس دو موٹریں بھی تھیں۔ ایک چھوٹی سی ڈی۔ کے۔ ڈبلیو اور ایک بڑی شورلٹ۔ شورلٹ پر ٹیکسی کا نمبر تھا اور اس کی رجسٹری بھی انہوں نے ٹیکسی کی حیثیت سے کرائی تھی۔ اس سے فائدہ یہ تھا کہ پٹرول راشننگ کے اس تکلیف دہ زمانے میں انہیں تیس گیلن کے قریب پٹرول مل جاتا تھا۔ لیکن دلبر علی خاں نے سرکاری نوکری بھی کرلی تھی۔ محکمہ۔۔۔۔۔۔ میں وہ انسپکٹر تھے نا کے پر کبھی اپنی چھوٹی گاڑی اور کبھی بڑی شورلٹ میں بڑی شان سے جاتے۔ ان کے افسر بھی انہیں نواب صاحب کہتے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے افسروں کو ہمیشہ اپنے سے برتر سمجھتے اور تعظیماً صاحب کہتے، مگر ان کی بھی عزت کی جاتی تھی۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح نواب دلبر علی خاں کا بھی راسخ عقیدہ تھا کہ سرکاری ملازمت سے عزت ہوتی تھی۔ خواہ وہ سرکاری ملازمت انسپکٹری ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ بیکار نوابوں کی آمدنی کتنی ہی ہو، ان کو کون جانتا ہے؟ نوکری میں اتنی عزت تو ضرور ہے کہ اگر دس افسروں کا حکم ماننا پڑتا ہے تو دس ماتحتوں پر حکم چل بھی سکتا ہے۔ اس لیے نواب دلبر علی خاں اپنے ڈھلوان پہاڑی کے باغیچے میں صرف تعطیلوں میں ہی نظر آتے ہیں۔ تین لڑکے جوان تھے۔ تینوں یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ ایک ایل ایل بی کر رہا تھا۔ ایک بی اے میں تھا۔ ایک انٹرمیڈیٹ کے سال اول میں۔ کالج کے وقت سے پہلے، اور اس کے بعد یہ تینوں اس باغیچے میں اکثر کاشت کاری میں مصروف رہتے۔ خصوصاً برسات میں موسمی پھولوں کے بیج بوئے جاتے اور بھٹے، کیلے اور بہت سی اجناس کی تخم ریزی کی جاتی۔ ان میں سے ایک لڑکا برآمدے میں پابندی سے مغربین کی نماز پڑھتا نظر آتا۔

کشن پلی میں کوئی بھی زیادہ پردہ نہیں کرتا۔ ان پہاڑیوں میں پردہ تو پردہ تخلیہ بھی ذرا مشکل ہی ہے۔ بنگلے ٹیلوں پر اور نشیبوں میں اس طرح بکھرے ہیں کہ ہر ایک بنگلہ دوسرے کے لیے منظر عام ہے۔ مکانوں کو ہوادار بنانے کے لیے کھڑکیوں کی وہ کثرت ہے کہ ایک مکان سے دوسرے مکان کے کمرے کا سارا فرنیچر گن لیجیے۔ اسی لیے نواب دلبر علی خاں کے گھرانے میں بھی پردے کا کوئی ایسا خاص اہتمام نہ تھا۔ ان کی بیگم جو چالیس سال کی ہوں گی اکثر ''مائی ملے'' نوکروں اور (دماغ چوٹی حرام زدای) ماماؤں کو ڈانٹتی ہوئی برآمدے میں یا باغ میں نظر آتیں۔ کبھی بھینسوں کو چرانے والا چھوکرا نہ آتا تو وہ اپنے باغ میں بھینسوں کی رکھوائی بھی کرلیتیں۔ آس پاس کے تمام بنگلوں میں پچیس سال سے کم عمر کی لڑکیاں انہیں سکینہ خالہ کہتیں۔ وہ تھیں بھی جگت خالہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک۔ ہمسایوں میں کسی کے یہاں زچگی ہو، کسی کا بچہ بیمار ہو۔ وہ برابر مدد کے یا خدمت کے لیے موجود۔ بعض سے تو ان کے اتنے مراسم تھے کہ گھر کی مالکن گرمیوں میں اپنے میاں کے ساتھ بنگلور یا مہابلیشور جائیں تو اپنے بچوں کو اور گھر کی کنجیوں کو

سکینہ خالہ کے سپرد کر جاتیں اور جب واپس آتیں تو انہیں حیرت ہوتی کہ سکینہ خالہ کے خانہ داری کے زمانے میں خرچہ اندازے سے کم ہوا ہے۔

جب کشن پلی کے کسی خالی بنگلے میں کوئی نئے لوگ آتے تو کسی اور بیگم کے ساتھ سکینہ بیگم ملاقات کے لیے سب سے پہلے پہنچتیں۔ انکسار میں کوئی کمی نہ کرتیں۔ یہاں تک کہ بعض دماغ چوٹی چھوکریاں ان کے انکسار کو بیوقوفی سمجھنے لگتیں۔ جب صدر المہام بہادر کے کاغذات مہور کی بھتیجی نے کشن پلی میں ایک مکان کرائے پر لیا تو سکینہ بیگم تیسرے ہی روز ملنے کو پہنچیں اور دل افروز سلطان یعنی صدرالمہام بہادر کی بھتیجی کو ادب سے جھک کے سلام کیا۔ دل افروز نے کہا۔ ''خالہ مجھے آپ کو سلام کرنا چاہیے۔ میں چھوٹی ہوں آپ بڑی ہیں۔ آپ مجھے شرمندہ کرتی ہیں''۔

تو یہ بات سکینہ خالہ کی سمجھ میں بھی آ گئی اور انہوں نے تافی مافات کے لیے دل افروز کی چٹ چٹ بلائیں لیں اور دل افروز اور اس کے دلہا کو دعائیں دیں۔

سکینہ بیگم اور نواب دلبر علی خاں کے دو لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک زینب تھی جو اب کوئی سولہ سترہ سال کی ہو گئی تھی۔ زینب پر پابندی زیادہ تو نہ تھی مگر وہ ماں باپ سے پوچھے بغیر دل افروز، مہر نگار، شوبھا یا اور کسی ''آپا'' کے بنگلے نہ جا سکتی تھی۔ جب دفتر کے وقت ان آپاؤں کے میاں چلے جاتے تب وہ کبھی سکینہ بیگم کے ساتھ، کبھی اپنی چھوٹی بارہ سالہ بہن شہر بانو کے ساتھ ان سب کے یہاں جاتی۔ یوں ان لڑکیوں پر بھی پردے کی کوئی سخت پابندی نہ تھی۔ برآمدے میں وہ عموماً پھرتی رہتیں۔ محلے کے دو لمبے بھائیوں میں سے کسی سے آمنے سامنے آ گئے بات چیت تو نہ کرتیں مگر دور سے ان کو دیکھ کے چھپنے کی بھی کوشش نہ کرتیں اور کشن پلی میں کوئی کسی سے چھپتا ہی نہیں تھا۔

سکینہ بیگم کے ملازمین میں صرف قابل ذکر ہے یہ ایک پانچ سال کا چھوکرا ہے۔ چھ مہینے ہوئے دلبر علی خاں نے دورہ کرتے ہوئے جوگی پیٹھ کے قریب اس یتیم و بیسر لڑکے کو ایک ایک دانہ چاول کے لیے ترستے ہوئے دیکھا تھا۔ شہر بانو ضد کرنے لگی کہ ہم اس کو پالیں گے۔ یوں تو وہ اسے گاؤں سے اٹھا نہیں لا سکتے تھے۔ دلبر علی خاں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی صرف ایک پھوپھی ہے۔ جسے خود ہی کچھ کھانے کو میسر نہیں۔ پانچ روپے دے کر دلبر علی خاں نے اس سے یہ لڑکا لے لیا اور ان کا نام حر رکھا۔ حُراس لیے کہ خریدتے ہی شہر بانو نے اسے آزاد کر دیا تھا اور نوکر رکھ لیا تھا۔ یہ بچہ حراب آدھی اردو اور آدھی تلنگی تتلا کے بولتا تھا۔ اور بیک وقت نوکر بھی تھا اور کھلونا بھی۔ زینب اور شہر بانو دونوں کی مار بھی کھاتا تھا اور دونوں اسے چاہتی بھی بہت تھیں۔ حراس عمر میں اس طرح کام کرتا تھا کہ تمام ہمسایوں کو حیرت تھی۔ محرم کے روٹ یا حلوے کی سینی اس کے سر پر رکھ دی جاتی۔ اور شہر بانو یا سکینہ بیگم اس سے کہتیں ''حر! یہ حصہ لے جا کر مہر نگار کے یہاں دے کے آ۔ اگر گرایا تو پھر دیکھ''۔

اور یہ بچہ، کالی، چھوٹی سی شکل، بمشکل ڈیڑھ فٹ کا قد، پہاڑی پگڈنڈی سے، سرکس کے مسخرے کی طرح سر پر تھالی کا بوجھ سنبھالے اترتا۔ شکریہ کی چٹھی لکھ کے تھالی میں رکھ دیتا۔ اگر کوئی خدا ترس ہوا تو ذرا سی مٹھائی حر کو بھی کھلا دیتا۔ خیر اگر کوئی زیادہ مہربان ہوتا تو یہ پانچ سال کا بچہ جو مشین کی طرح کام کر سکتا تھا اپنے کو بچہ سمجھ کے رو دیتا۔ وہ بچوں کی طرح شرمیلا تھا اور نوکری کی تو مجبوری تھی۔ لیکن اجنبیوں کی دخل اندازی اور ان کا زبردستی کا رحم اور پیار اسے گوارا نہیں تھا۔

سکینہ بیگم اور دلبر علی خاں اور ان کے بچے جب کھانا کھاتے تو وہ دور بیٹھا ہوا کھانے کو دیکھتا رہتا۔ لیکن جب وہ کھانا کھا چکتے تو پھر کسی نوکر یا ماما کی مجال نہیں تھی کہ دستر خوان کے یعنی خاصے کے کھانے میں سے ایک لقمہ بھی حر سے پہلے کھائے۔ بچے ہوئے دستر خوان سے جو چیز اسے پسند آتی۔ وہ سب سے پہلے اسے اپنی مٹی کی رکابی میں انڈیل لیتا اور اگر کوئی ماما اسے چھیڑتی اور دستر خوان

اٹھاتے وقت کوئی چیز حر کو نہ لینے دیتی تو وہ رونے لگتا۔ ''دیکھو دراسانی''۔ اور دراسانی (مالکہ) یعنی حر کی شہر بانو یا چھوٹی بی بی فوراً ماما کو ڈانٹتی ''کیوں گے (ری)۔ کیوں چپ کی چپ ستارئی (رہی ہے) اس کو''۔ یا اگر کہیں کوئی ماما ایسا غضب کرتی کہ حر کے کھانے سے پہلے سچ مچ کچھ کھالیتی تو پھر موقع کی اہمیت کے لحاظ سے سکینہ بیگم کو غصہ آتا۔ ''کیوں ری شٹنڈی'' حرام زادی۔۔۔۔ کھا کھا کے کیسی نکل رہی ہے دیکھو حرام یک چڑیل کو''۔ الغرض حر کا مرتبہ دلبر علی خاں کے گھرانے میں ہندوستانی نوکروں سے زیادہ اور ولائتی کتے کے برابر تھا۔

گرمیوں کے دنوں میں چھٹی لے کے (دلبر علی خاں) اکثر اپنی جاگیر کو جایا کرتے تھے لیکن سکینہ خالہ اور بچے ان کے ساتھ بہت کم جاتے تھے۔ اس کی وجہ ہمسائے کی تمام بیگماتے کو معلوم تھی۔ سکینہ خالہ دل افروز سے کبھی کبھی دکھڑا روتیں ''بی بی۔ میں کیا بولوں آپ سے میری پالی ہوئی چھوکری، وہی منڈی کاٹی، چھ۔۔۔۔ گلزار۔ ہمارے صاحب، اس پر ریچ (پر ہی) نیت خراب کیئے ہیں۔ میرے سے بولے سکینہ تیرے کو ڈاکٹراں تین مہینے کا پرہیز بتائے ہیں۔۔۔۔۔''

''وہ کاہے کا پرہیز''۔ دل افروز کی والدہ نے چھالیا کترتے ہوئے پوچھا۔

اپنی والدہ کے اس بے احتیاط سوال اور ان کی ناسمجھی پر جھینپ کے دل افروز نے کہا۔

''چپ بیٹھو ممّا''۔

مگر سکینہ خالہ تشریح پر تلی ہوئی تھیں۔ ''قریب آنے کا پرہیز آپا''۔ بڑی بی سمجھ کے مسکرا کے پھر چھالیا کاٹنے لگیں۔ دل افروز جھینپ کے سوچنے لگی۔ سکینہ خالی کو اپنے گھر کے سارے بھید اس طرح بیان کرنے کی کیا خاص ضرورت تھی۔

پھر سکینہ خالہ نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے سے بولنے لگے۔ سکینہ تیرے کو ڈاکٹراں تین مہینے کا پرہیز بتائے ہیں۔ میں پھر گلزار سے تین مہینے کا متعہ کر لیتا ہوں۔ تیرے پیر پڑتاؤں سکینہ۔ میں اس کو یہاں حیدرآباد لیتاؤں۔ میں بولی نواب تمہارے کو شرم لحاظ نہیں۔ ماشاءاللہ سے تین بیٹے، ایک بیٹی جوان جہان ہے۔ پچاس سال کی عمر ہونے کو آئی۔ پانچ برس میں کیا بولتے ہو کہ وظیفہ لے کے اللہ اللہ کرنے کا وخت آئیں گا اور اب یہ سب کاماں کریں گے۔ قسم امیر علیہ السلام کی، تم اس لونڈی کو لاؤ تو سہی، میں تمہارا گھر چھوڑ کے نہیں چلی گئی تو بولو۔ بی بی میرا مہر پچاس ہزار ہے۔ کیا میں اس کو چھوڑوں گی۔ حضرت عباس کی قسم دعویٰ کر کے ایک ایک کوڑی جھڑالوں گی۔۔۔۔ مہر برابر وصول کرنا بی بی۔ خدا کی شان ہے جو لونڈی میری پاپوش کے برابر نہیں تھی۔ سوانے آج کے دن میری سوکن بنے گی۔ میں اپنے بچوں کو لے کے نہیں چلی گئی تو انے دیکھنا۔ میں اس کی لونڈی باندی ہوں کیا۔ انے بے چارہ سمجھتا ہوں گا۔ میرے کو پچاس ہزار میں خرید لیا۔ مگر پچاس ہزار میں پہلے دھروالیوں گی۔ میری شادی کچھ ایسی ویسی ہوئی تھی۔ بی بی میں نواب گزارش جنگ کی بیٹی ہوں۔ کچھ ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ میری شادی میں مہاراجہ کشن پرشاد، حیدری صاحب، آپ کے چچا، سب لوگاں آئے تھے اب تک ہمارے دیوان خانے میں تصویر لگی ہے۔ آپ کبھی آئے تو دیکھو۔۔۔۔ آپ لوگوں میں اچھا ہے۔ متعہ وتعہ کا جھگڑا نہیں''۔

دل افروز کی والدہ نے کہا ''تو کیا ہوا۔ ہم لوگوں میں متعہ نہیں تو مرداں نکاح متعہ کے بغیر ہی عورتوں کو گھروں میں ڈال نہیں لیتے کیا؟''

''ہاؤ۔ یہ بھی ٹھیک بات بولے آپ''۔ سکینہ بیگم نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح نواب دلبر علی خاں وہ کر ہی گزرے جس کا اندیشہ تھا۔ انہوں نے اس چھوکری گلزار سے متعہ کر لیا گلزار کی ماں اور اس کی نانی اس سے پہلے اسی گھرانے میں نوکر تھیں۔ گلزار یہیں پیدا ہوئی تھیں اور اس کی جوانی، بھینس کی

جوانی کے آتے ہی سب ریجھ گئے۔نواب دلبر علی خاں تو ایک طرف نواب دلنواز علی خاں یعنی ان کے والد جن کی عمر اب اسی سال کے اوپر تھی۔جن کی پشت خم ہو چکی تھی اور جو بات بات پر کھانستے تھے اور ہر محفل میں نواب افضل الدولہ مرحوم کے زمانہ سلطنت کا ذکر کرتے تھے۔وہ نواب دلنواز علی خاں تک اس نو جوان بھینس کے قدر دانوں میں تھے۔اس سے ہاتھ پیر دبواتے۔اسے حکم دیتے کہ ان کے سامنے ہی بیٹھی رہے۔ابھی ساغر و مینا مرے آگے،اوران کے نوجوان پوتوں کا پوچھنا ہی نہیں تینوں گلزار پر ترچھی ترچھی میٹھی میٹھی نگاہیں ڈالتے۔مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ نوجوان بھینس والد بزرگوار کو پسند آئی ہے تو یہ شریف لڑکے مجبوراً دست بردار ہو گئے اور نواب دلبر علی خاں نے متعہ کر کے اسے رکھ ہی لیا مگر حیدر آباد میں نہیں،جاگیر میں۔

اس سال حیدر آباد میں اس کڑا کے کی گرمی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔اور کشن پلی کے پتھریلے ٹیلے دن کے گیارہ بجے سے تپنا شروع کر دیتے۔حیدر آباد میں لو نہیں چلتی۔لیکن اس سال اپریل ہی سے ہوا میں لو کی سی گرمی تھی۔تالاب،کنٹے سب سوکھ گئے تھے اور خود حسین ساگر اور گنڈی پیٹھ میں بہت تھوڑا سا پانی رہ گیا تھا۔اس لیے جب دلبر عالی خاں نے اپنی بیوی اور بچوں کو جاگیر چلنے کے لیے کہا تو ان کی بیوی اگرچہ یہ کہہ کے کئی دن تک انکار کرتی رہیں۔نواب میں تو نہیں آتی۔وہاں تم اس حرام زادی سنڈی کو رکھے ہیں۔اس کو دیکھتے ہی مریا ہاتھ اٹھیں گا۔اور میں اپنی پاپوش اس کو کھینچ کے ماروں گی۔پھر تم میرے سے لڑیں گے اور جوان جہان بچوں کے سامنے تھکا فضیحتی ہوئیں گی۔یہ سب کائیں کو۔تم جاؤ۔میں آنچ (آتی ہی) نئیں''۔لیکن گرمیوں کی شدت سے مجبور ہو کے وہ اور بچے بالآخر تیار ہو گئے۔

جاگیر پہنچ کے سکینہ خالہ گلزار سے اسی طرح کا سلوک کرتیں جیسا نوکرانیوں سے کیا جاتا ہے۔لاکھ نواب نے اس سے متعہ کیا ہو۔لیکن اس حرام زادی کی کیا مجال جو حرم سے پہلے دستر خوان کا بچا ہوا ایک ٹکڑا بھی وہ کھالے۔گلزار کو وہ وہی کھانا دیتیں جو اور سب نوکروں کو ملتا۔ناشتے میں جوار کی روٹی۔دوپہر میں باجرہ کی روٹی اور موٹے چاول اور دال۔شام کو موٹے چاول اور ایک بگھارا سالن یا کڑھی۔دلبر علی خاں کچھ کہتے تو سکینہ بیگم بپھر کے کہتیں ''یہ لونڈی رنڈی نوکروں کا کھانا نہیں تو کیا سرداروں کا کھان کھائیں گی۔میری اور میری بچوں کی پاپوش کی برابری کریں گی؟''

ایک دن سکینہ بیگم نے اپنے میاں اور گلزار کو اس کی کوٹھڑی میں دیکھ لیا تھا دن بھر وہ چڑ چڑاتی اور غصہ کرتی رہیں۔شام کے کھانے پر صحن میں وہ ان کے میاں اور سب بچے بیٹھے تھے۔کھانا صحن میں شطرنجی پر ہوتا تھا اور ذرا اول وقت ہی ہو جاتا تھا کہ پتنگے پریشان نہ کریں۔حرشطرنجی سے ذرا دور بیٹھا دستر خوان اور اٹھتے ہوئے لقموں پر نظر جمائے تھا۔گلزار قریب ہی کھڑی کھانا کھلا رہی تھی اور دلبر علی خاں کو دیکھ دیکھ کے ہنس رہی تھی۔

سکینہ بیگم کا خون دفعتہً کھول اٹھا۔''جا یہاں سے مردار۔یہاں کیا نخرے کرے رہی ہے''۔

دلبر علی خاں نے کہا ''انے کیا کررئی ہے بے چاری''۔

''بے چاری؟'' سکینہ بیگم کی آواز چیخ بن گئی۔''انے بے چاری ہے۔ایک تم بچارے،ایک انے بے چاری۔شرم نہیں آتی بڈھے تیرے کو۔دیکھ یہ تیری جوان بیٹی بیٹھی ہے تو اس کے اور بچوں کے سامنے ایک ادنیٰ چھوکری سے ہنسی ٹھٹھا کر رہے۔یہ رنڈی،چھ۔۔۔۔ال کو اشارے کررا ہے۔یہی سبق (سبق) دے رہا ہے۔جوان بیٹی کو آج تو میں یہ حرام زادی کی چوٹی کاٹوں گی''۔

''دیکھو سکینہ۔تم چپ نہیں بیٹھے تو میں مزہ بتاؤں گا''۔نواب دلبر علی خاں کو بھی اب غصہ آ رہا تھا۔

''کیوں کیا کریں گے تم میرے کو۔کیا مزہ بتائیں گے جی۔ساری عمر چپ بیٹھی ناجی میں چپ بیٹھ بیٹھ کے تو آج یہ حال ہوا۔کیا کریں گے تم میرے کو۔بولو نا''۔سکینہ بیگم نے ہسٹریا کے عالم میں چیختے ہوئے بکنا شروع کیا۔

دلبر علی خاں چپ ہو گئے۔ مگر سکینہ بیگم کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ گلزار کی طرف مخاطب ہوئیں۔
"نکل یہاں سے رنڈی، مردار، مال زادی"۔ اور یہ دیکھ کر کہ گلزار اپنی جگہ سے نہیں ہل رہی ہے۔ انہوں نے اپنی جوتی اٹھائی اور اسے مارنے کو اٹھیں۔

دلبر علی خاں نے جھپٹ کر جوتی ان کے ہاتھ سے چھین لی اور اسی جوتی سے سکینہ بیگم کو مارنا شروع کیا۔ اپنے تین جوان بیٹوں، اپنی بیٹیوں کے سامنے۔ سکینہ بیگم اور زور زور سے چیخنے اور رونے لگیں۔ "مارو میرے کو مارو، آج تم میرے کو مار ڈالو"۔ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو لپٹ کر رونے لگیں۔ حر بھی بجائے کھانے کی طرف گھورنے کے چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ تینوں لڑکے اٹھ کے بے طاقت بتوں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ اور گلزار نے ہنسنا شروع کیا۔ ہسٹریا اور فتح کی ملی جلی ہنسی۔ آج ایک جوان لونڈی نے بڈھی مالکہ پر فتح پائی تھی۔ جو پاپوش بچپن سے اس کے سر پر پڑتی رہی تھی۔ آج بیگم صاحبہ کے جسم پر برس رہی تھی۔

اتنے میں منجھلے لڑکے نے بڑے سے آہستہ سے کہا "بھائی یہ حرام زادی ہنس رہی ہے"۔

اس پر بڑے نے فوراً اپنا جوتا سنبھالا اور گلزار کی طرف جھپٹا۔ دلبر علی خاں اپنی بیوی کو چھوڑ کے اس سے لپٹ گئے۔ بڑے لڑکے نے غضبناک لہجے میں کہا۔ "ابا، آپ نے ہماری ماں کو جوتوں سے مارا۔ اس حرام زادی کے لیے۔ اور یہ کھڑی ہو کے ہنس رہی ہے۔ میں تو آج اس کو مار ڈالوں گا۔ چھوڑیئے آپ" باپ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اور بیٹا باپ پر جوتا نہ اٹھا سکا۔ جوتا اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ لیکن اتنے میں منجھلے اور چھوٹے لڑکے نے اپنے اپنے جوتے سنبھالے اور گلزار پر پل پڑے۔ بڑے لڑکے نے اب باپ کو اپنی جوان آہنی گرفت میں اس طرح پکڑ لیا کہ وہ ہل نہ سکتے تھے۔ چھوٹے اور منجھلے لڑکے نے اپنی ماں کے اس جملے کی بھی پروا نہ لی۔ "عباس۔ رشید تو نکو (نہیں) مارو۔ تمہارے باپ نے اس کے ساتھ متعہ کیا ہے"۔ جوتے تڑاتڑ تڑاتڑ گلزار پر پڑتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا اور وہ بے ہوش ہو کے گر پڑی اور اس کو مار کھاتے دیکھ کے سب ہی نے اپنی مسرت کو ضبط کیا، شہر بانو تک نے مگر پانچ سال کا غلام حر کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

سکینہ بیگم دوسرے دن صبح کی گاڑی سے بڑے بیٹے کو ساتھ لے کے حیدر آباد آ گئیں۔ مگر اپنے گھر نہیں اپنی پھوپھی کے گھر۔ تین مہینے ہو گئے اب تک انہوں نے اپنے میاں دلبر علی خاں کے گھر میں قدم نہیں رکھا ہے۔ لیکن اور سب بچے باپ ہی کے ساتھ ہیں۔ گلزار سے متعہ کی تجدید ہو چکی ہے مگر وہ حیدر آباد نہیں بلائی گئی۔ جاگیر ہی میں ہے۔ جہاں بڑی تعطیلوں میں دلبر علی خاں چلے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں سکینہ بیگم کا ارادہ مہر اور نان نفقے کا دعویٰ کرنے کا ہے یا نہیں۔ وہ کشن پلی میں بہت کم لوگوں کے پاس ملنے کو آ ئیں۔

دفتر کے دنوں میں تینوں لڑکے کالج چلے جاتے ہیں۔ خود دلبر علی خاں دفتر کو اور شہر بانو بچیوں کے اسکول کو۔ زینب جو مدرسے نہیں بھیجی جاتی گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے۔ صرف دو نوکر اور ایک بڑھیا اور ایک ذرا سا حر۔ معلوم نہیں کس مصیبت سے اس کا سارا دن کٹتا ہے۔ باپ سے پوچھ کے کبھی جب محلے کے سارے دولہے اپنی اپنی کچہریوں اور دفتروں کو چلے جاتے ہیں تو وہ دل افروز آپا یا مہر نگار آپا سے ملنے جاتی ہے اور جلد ہی واپس آ جاتی ہے۔ شام کے چار بجے حر کو ساتھ لے کے، کوئی نصف میل کے فاصلے پر اپنی والدہ سکینہ بیگم سے ملنے جاتی ہے اور ان کی خوشامد کرتی ہے۔ سکینہ بیگم راتوں کو اٹھ اٹھ کے وظیفے پڑھتی اور دعائیں مانگتی ہیں کہ ان کی جوان بیٹی پر پنجتن کا سایہ رہے۔ خدا اسے ہر طرح کے شر اور ہر بری نگاہ سے بچائے رکھے۔ لیکن ان کا دل یہ کسی طرح نہیں مانتا کہ اس لڑکی کی حفاظت کے لیے بھی وہ اپنے شوہر کے گھر واپس آنے کا نام لیں۔

☆☆☆

اندھا کنواں

غلام الثقلین نقوی

جب گاؤں میں اشتمال ہوا تو رحیم بخش جاٹ کو زمین کا جو ٹکڑا ملا اس میں کوئی دو اڑھائی کنال پر پھیلا ہوا ایک ویران ٹیلا بھی تھا۔ لوگ اسے پکا استھان سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں بھوت پریت کا ڈیرا ہے۔ ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی ایسی جگہ ضرور ہوتی ہے جہاں انسان کا تخیل اور اس میں بسی ہوئی صدیوں کی جنگل اور ویرانے کی تنہائی اور دہشت، چڑیلوں، بھوتوں اور دیوؤں کا طلسم زار قائم کر لیتی ہے۔ اس ٹیلے کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگ کسی انجانی طاقت سے جی ہی جی میں ڈرتے تھے۔ خاص طور پر گرمیوں کی دوپہر کو جب دھوپ کے لہریئے دور دور تک دہشت کا ایک سراب تخلیق کرتے ہیں یا اوس کی راتوں کو جب بے چاند کا اندھیرا بھوت پریت کی دنیا آباد کر دیتا ہے۔

رحیم بخش جاٹ آٹھویں جماعت پڑھا ہوا تھا۔ باپ کی بے وقت موت کی وجہ سے وہ آگے نہ پڑھ سکا تھا۔ پھر اسے پٹوار نہ ملی اور نہ وہ کسی پرائمری اسکول میں ماسٹر لگ سکا۔ تو اس نے ہل اور دھرتی سے ناطہ جوڑ لیا۔ تاہم اسے بھوتوں اور چڑیلوں پر زیادہ اعتقاد نہیں تھا۔ البتہ اپنے بچپن میں اس نے بہت سی داستانیں اپنی بڑی بوڑھیوں سے سنی تھیں۔ جنوں، پریوں اور جادوگرنیوں کی کہانیاں۔ اب وہ خود بھی کبھی کبھار اپنے بچوں کو کوئی ایسی کہانی سناتا تو اپنے تخیل میں خود رحیم بخش بھی ایک چھوٹا سا بچہ بن کر آ بیٹھتا، جو اپنی ہی آواز پر کان لگائے ہوتا اور کہانی کو بڑے غور سے سنتا۔ اس سلسلہ میں اسے ایک ماموں یاد آتا جس نے شادی نہیں کی تھی اور اکثر ان کے ہاں چک مراد میں آتا تو ہفتوں ٹھہرا رہتا اور غائب ہوتا تو مہینوں نظر نہ آتا۔

وہ ایک بے ضرر سا آوارہ اور لاابالی قسم کا آدمی تھا لیکن اسے کہانیاں سنانے میں بڑا کمال حاصل تھا۔ اکثر وہ اپنی کہانی کا خود ہی ہیرو بن جاتا تھا۔ ایک کہانی میں اس نے ایک اندھے کنویں کا ذکر کیا تھا، جہاں ایک دیو نے ایک شہزادی کو قید کر کے اوپر سے کنویں پر بڑا سا پتھر رکھ دیا تھا۔ وہ شہزادی اب تک وہاں موجود تھی اور اس کے نیم دیوانے ماموں نے کہا تھا ''میں اس کنویں کو جانتا ہوں''۔

''وہ کہاں ہے ماموں؟'' رحیم بخش نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''اس ٹیلے پر جو چک مراد اور گل بہار کے راستے میں ہے''۔

''وہاں تو کوئی کنواں نہیں''۔

''ہے۔۔۔وہ کسی کسی کو نظر آتا ہے اور کبھی کبھار۔۔۔''

''تمہیں نظر آیا، ماموں؟''

ہاں! کئی بار۔۔۔آج ہی۔۔۔اور پھر دوپہر کو۔۔۔میں گل بہار سے چک مراد آ رہا تھا۔ ٹیلے پر دھوپ کے لہریوں نے اسے جنم دیا، یا شاید ایک بگولا سا اٹھا تھا اور میں اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ پھر اس کا بند دہانہ مجھے نظر آیا اور پاتال سے آواز آئی ''اجنبی! کیا تم مجھے اس قید سے رہا نہیں کر سکتے۔'' میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ یوں لگتا جیسے اس اچانک پکار پر میں اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔

''ہاں! کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔'' اس کے ماموں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ کنواں مجھے دکھاؤ گے؟'' رحیم بخش نے پوچھا تھا۔

''نہیں! مجھے کیا پتہ وہ کہاں ہے؟''

''نہیں ماموں!'' اس نے ٹھنک کر کہا۔ ''مجھے ضرور دکھاؤ''۔

اور اس کی ماں نے دور سے ڈانٹ کر کہا تھا'' کمالے! یہ کہانیاں سناتے ہوا سے؟ جھوٹ موٹ کی باتیں''۔

''نہیں بہن جنت بی بی! یہ جھوٹ نہیں۔ وہ کنواں ہر جگہ موجود ہے۔ ہر انسان کے اندر بھی ہے، پر وہ کسی کسی کو نظر آتا ہے۔ اس کے اردگرد کوئی نہ کوئی شہزادہ منڈلاتا ہوا بھی نظر آتا ہے لیکن کنویں کا بھاری پتھر اس سے اٹھ نہیں سکتا۔ وہ شہزادی کی تلاش میں آتا ہے اور شہزادی اسے پکارتی رہتی ہے اور وہ پتھر سے سر پٹکتا رہتا ہے اور جن بھوت قہقہے لگا کر ہنستے ہیں۔۔۔ رحیم! کبھی کبھار وہ آواز بھی جو کنویں کے اندر سے آتی ہے، یوں لگتا ہے جیسے میری اپنی ہی آواز ہو''۔ اس نے آخری بات نہایت رازداری سے اس کے کان میں کہی تھی۔ دور بیٹھی ہوئی اس کی ماں نے یہ سرگوشی نہیں سنی تھی لیکن اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر اپنے بھائی کمال دین کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے اسے پہلی اور آخری بار دیکھ رہی ہو۔

رحیم بخش نے کہا تھا'' ماموں، کمال کرتے ہو۔ ابھی ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ وہ اندھا کنواں ٹیلے پر ہے۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ وہ ہر انسان کے اندر ہوتا ہے''۔

''رحیم، نہ پوچھو۔ تم نہیں سمجھ سکو گے''۔

اتنے میں اس کا باپ کنویں سے آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا'' جی آیا نوں، چوہدری کمال دین، کب آئے تم؟'' اس کا باپ کچھ مذاق، کچھ محبت سے اسے بڑے احترام سے چوہدری کمال دین کے نام سے پکارا کرتا تھا۔

''آج دوپہر کو''۔

''کنویں پر کیوں نہ چلے آئے؟ وہاں شہتوت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے دوپہر کاٹتے''۔

''میں گل بہار کی طرف سے آیا۔ اس طرف سے کنواں راستے میں نہیں پڑتا''۔

''ٹھیک ہے''۔

''بابا! آج ماموں کمال نے ٹیلے پر اندھا کنواں دیکھا''۔

''ٹیلے پر اندھا کنواں!'' اس کے باپ نے حیران ہو کر پوچھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔''چوہدری کمال دین تو سدا کا پاگل ہے۔ اسے یہ کنواں ضرور نظر آیا ہوگا''۔

ماموں کمال دین نے کہا''ہاں بھائی! یہ کنواں پاگلوں ہی کو نظر آتا ہے''۔

''ارے پگلے! تو مہینوں بھلا چنگا رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے اب پھر تجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ رہا ہے''۔ اس کی ماں نے غم زدہ سی آواز میں کہا۔

ماموں کمالے نے اپنی بہن کی یہ بات سن کر ایک قہقہہ لگایا۔ پھر وہ قہقہہ اس کے گلے میں پھنس گیا اور وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ ایک جوان آدمی کو روتے دیکھ کر رحیم کو بڑی شرم محسوس ہوئی۔

جب وہ بڑا ہوا تو ماموں کمالا ایسا گم ہوا کہ پھر کہیں نظر نہ آیا۔ لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے رہے۔ کسی نے کہا سر، بھنوئیں اور داڑھی منڈوا کر اس نے جوگ لے لیا ہے اور اب وہ کشکول ہاتھ میں لے کر چک مراد آئے گا اور چوہدری کے دروازے پر بھیک مانگتا نظر آئے گا۔ کسی نے کہا کہ میں نے اسے فلاں مزار پر دیکھا ہے۔ کوئی کہتا تھا، آوارہ گرد ہے۔ بن آئی موت مر گیا ہوگا۔ کسی نے کہا، اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی ہوگی۔

''اپنے ہاتھوں سے کیوں؟'' اس نے سوچا۔

ایک دن اس کی ماں نے چونک کر ٹھنڈی آہ بھری تو اس نے پوچھا'' کیوں ماں؟ کیا بات ہوئی؟''

اس نے جواب دیا۔'' کمالا یاد آ گیا۔ یاد کیا آیا۔ عین مین سامنے آ کھڑا ہوا''۔ ماں یک یہ بات سن کر وہ کانپ گیا۔

اس نے کہا'' ماموں مجھے بھی بہت یاد آتا ہے۔ وہ جو اس نے اندھے کنویں کی بات سنائی تھی میں اسے ابھی تک نہیں بھولا''۔

''بے چارا اپنے اندھے کنویں میں ہی ڈوب مرا''۔ اس کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔

''کیوں ماں؟'' اس نے پوچھا۔

''بیٹا! ہم جاٹوں کے ہاں ایسے آدمی پیدا نہیں ہوتے۔ وہ پتہ نہیں کہاں سے آ گیا تھا۔ تھا تو میری ماں کے پیٹ سے۔ پر ہم سے بالکل الگ اور نرالا تھا۔ وہ جو سرداراں ہے نا، وہ اس سے بیاہ کرنا چاہتا تھا''۔ اس کی ماں نے ڈبڈبائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کون سرداراں؟''

''وہی جواب چوہدری جلال دین کی بیوی ہے''۔

''تم نے اس کا بیاہ سرداراں سے کیوں نہ کر دیا۔ اس کے گھر والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہوگا؟ رحیم بخش نے پوچھا۔

''نہیں تو، یہ بات نہیں تھی۔ کمالے نے کبھی اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ ہمیں کیسے پتہ چلتا؟ نہیں تو ہم اس کا رشتہ نہ مانگ لیتے''۔

''پر، چوہدری بڑا آدمی ہے۔ گاؤں کی ایک تہائی پتی کا مالک۔ اس کے مقابلے میں تمہاری بات کون پوچھتا؟''

''یہ چوہدری کی دوسری شادی تھی۔ ادھیڑ عمر آدمی کے مقابلے میں سرداراں کے گھر والے کمالے کے حق میں ضرور فیصلہ کر دیتے۔ وہ کنوارا بھی تھا اور گزارے کے لیے اس کے حصے میں زمین بھی تو کافی آتی تھی''۔ اس کی ماں نے کہا۔

''چوہدری کو بڑھاپے میں کیا سوجھی۔ سرداراں تو اس کی لڑکیوں کے برابر تھی''۔

''تھی۔ پر چوہدری کے سر عشق کا بھوت سوار تھا''۔

اس کے بچپن میں سرداراں جوان تھی۔ پر بچپن لڑکیوں کو سرسری طور پر دیکھتا ہے۔ جب وہ لڑکپن کے دور میں آیا تو اس وقت بھی سراراں جوان تھی بلکہ جوانی پر بھری دوپہر کا سورج چمک رہا تھا۔ وہ شہزادیوں کی طرح نازک بدن تھی اور اس کا بدن ریشم میں غرق تھا۔ اور اس کے پاؤں میں زری کے جوتے ہوتے۔ چلتی تو شہزادیوں کی طرح، جیسے سارا زمانہ اس کی ٹھوکر میں ہو۔ گاؤں کی دنیا تو اس کی نظروں میں جچتی ہی نہ تھی۔ اتنی چھوٹی سی دنیا اسے تو کسی بادشاہ کے محل میں ہونا چاہیے تھا۔ چوہدری کا بڑا بیٹا، رحیم بخش کا ہم عمر تھا۔ اب وہ بھی اس کی طرح لڑکپن کے دور میں تھا۔ وہ بڑا سجیلا جوان تھا، شہ زور اور خوبصورت!

''سوتیلی ماں اور سوتیلے بیٹے کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے'' اس نے سوچا۔ ''لوگ طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں''۔

آج جب وہ ٹیلے والے کھیت میں ہل چلا رہا تھا تو اس کے من میں ایک عجیب سا گمبھیر اسرار رچ رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور ابھی اذانوں کی گونج فضا کی خنکیوں میں رچی ہوئی تھی۔ اس نے نماز تو نہ پڑھی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس لمحے وہ ہر بلا سے محفوظ ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دو اڑھائی کنال پر پھیلا ہوا یہ ٹیلا میرے کس کام کا۔ اس کے اردگرد کی زمین کتنی زرخیز ہے۔ بھربھری مٹی جس میں دانہ پڑے تو فوراً اگ آئے۔ بس ذرا سی نمی چاہیے۔ پانی کے دو چھینٹے۔ یہ ٹیلا اس کی چھاتی کا پتھریلا ناسور تھا کہ جس پر نہ ہل چل سکتا ہے اور نہ پانی لگ سکتا ہے۔ اس پر جھڑبیری اور پھلا ہی کی جو جھاڑیاں اگتی ہیں، وہ کبھی کبھار سرسبز ہوتی ہیں۔ اکثر سوکھی سڑی، جھڑوس سی نظر آتی ہیں اور وہ گھاس جو اس کے اوپر کی مٹی کی ہلکی سی تہہ پر اگتی ہے برسات ختم ہوتے ہی یوں سوکھ جاتی ہے جیسے اسے آگ کی کوئی لپٹ چاٹ گئی ہو۔ جھلسی جھلسی گھاس۔ مجھے اس سے خوف بھی آتا ہے اور میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس ٹیلے کی بھی

اپنی حیثیت ہے لیکن اتنی زرخیز زمین میں یہ کنکر، روڑوں اور ٹھیکریوں کا ڈھیر کہاں سے آ گیا؟ بہر حال، مجھے اس کا کیا نقصان؟ یہ ٹیلا اشتمال والوں نے مجھے زائد میں دیا ہے۔ مجھے میری پوری زمین مل گئی ہے۔ مفت میں ملی ہوئی بیکار چیز بھی اچھی لگتی ہے۔ کیا پتہ کبھی وہ بڑی بڑی مشینیں میرے گاؤں میں بھی آ جائیں جن سے اونچی نیچی زمینیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ پھر میں اس ٹیلے کو اکھاڑ پھینکوں گا اور اس کے ملبے سے کھیتوں کی مینڈھوں کو پکا کر لوں گا اور اس کے نیچے دبی زمین کا صدیوں پرانا کنوار پنا پھالے کی زد میں آیا تو اس کی کوکھ سے نہ جانے کون کون سی نصلیں جنم لیں گی۔

وہ ان خیالوں میں گم ہل چلا رہا تھا کہ پھالا ٹیلے کے ایک کنارے کو چھونے لگا اور جس باڑ کے ساتھ اس کے خیال کی لکیر چل رہی تھی، اس کا سلسلہ ایک پتھر سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ ہل کا پھالا اس پتھر کو الٹ نہ سکا اور بیل بھی یکدم رک گئے۔ ایک بیل ڈری ہوئی آواز میں ڈکارا اور دوسرے نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کے گیلے گیلے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اس نے بیلوں کو پچکار کر کہا۔ ''کیا ہوا بھورے! اوئے چینے! تو کیوں تھر تھر کانپ رہا ہے؟'' چینے کی چکنی جلد پر تھرتھراہٹ کی لہریں تھیں۔ جیسے اسے کسی مکھی نے کاٹ لیا ہو۔ اس نے ہل کے پھالے کو جو زمین میں بہت گہرا چلا گیا تھا زور دے کر پتھر کی گرفت سے آزاد کرایا تو بیل چل پڑے۔ اور پھالا زمین پر اچٹتا ہوا سا چلا تو وہ حیران رہ گیا۔ رحیم بخش نے ہل روک دیا اور بیلوں کو پچکار کر ٹھہرایا۔ اس نے اس جگہ کو کھودا جہاں ہل کا پھالا پھنسا تھا اور اس کا ہاتھ اس پتھر سے ٹکرایا جس کے اوپر سے پھالا اچٹ گیا تھا۔ وہ دوڑ کر گیا اور کھیت کی منڈیر پر پڑی کسی اٹھا لایا۔ اس نے مٹی ہٹانی شروع کی تو ایک پتھر ننگا ہونے لگا۔ اچانک پورا پتھر اس کے سامنے پڑا تھا۔ بہت بڑا پتھر۔ خراس کی پاٹ سے بھی بڑا۔ اس نے پتھر کو صاف کیا اور اس کا سرخ رنگ نکھر گیا۔ وہ ٹیلے کی آڑ میں پتھر کے اوپر بیٹھ گیا۔

اور تب مشرق سے سورج کی پہلی کرن نے جنم لیا تو ایک اسرار اس پر اتر آیا!

کہتے ہیں کہ سیالکوٹ کا راجہ سالباہن ایک دن اپنے قلعے سے نکلا اور شکار کی دھن میں جنگل میں راستہ بھول گیا۔ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر وہ کچھ پریشان بھی تھا اور کچھ خوفزدہ بھی۔ کیونکہ راجاؤں کے سینکڑوں دشمن ہوتے ہیں اور نہ جانے کون سا دشمن کہاں گھات لگا کر بیٹھا ہو۔ پھر جنگل میں شام اترے تو اس کے ساتھ بھوت پریت بھی جاگ پڑتے ہیں۔ اب شام اتر رہی تھی اور دھوپ درختوں کی پھننگوں کو چھو کر آسمان کی طرف اڑنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ نہ جانے کیسے دھوپ کی ایک کرن آسمان سے اتری اور اس تھرتھراتی ہوئی کرن کے سامنے جنگل کا اندھیارا سایہ بن کر پاتال میں اترنے لگا۔ راجہ کا گھوڑا بدکا اور اس کے نتھنے پھڑپھڑائے اور گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ راجہ نے گھوڑے کو تھپکی دے کر آگے بڑھانا چاہا تو دھوپ کی سنہری کرن اس کے سامنے مجسم ہو گئی۔ راجہ کا تن بدن کانپ گیا۔ اس نے سوچا ''آکاش سے اترنے والی کرن بھوت پریت نہیں ہو سکتی۔ آکاش سے تو اپسرائیں اترتی ہیں''۔

اس نے بڑے جلال سے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

وہ کرن آواز کی ہیبت سے لرز گئی اور پھر چھلاوہ بن گئی۔ راجہ نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ تب اچانک جنگل کا اندھیرا ختم ہو گیا اور راجہ نے دیکھا کہ دور دور تک زرد دھوپ کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس کا ایک آنچل دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا پڑا ہے اور اسے آگ لگ گئی ہے جو سیالکوٹ کے قلعے سے صاف نظر آتی تھی اور جن کے نیلے حاشیے سے ادھر چناب اور توی کے کنارے پر اس کے راج کی حدیں ختم ہوتی تھیں۔

اس میدان میں چند جھونپڑیاں تھیں اور ان سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپیں سن کر مرد، عورت، بوڑھے، بچے اور جوان جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے اور کنویں سے پانی بھرتی عورتوں کے ہاتھ رک گئے۔ اور ڈول کنویں میں جا گرے۔ لوگ راجہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک بوڑھا جس کی کمر کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی اور جس کی سفید داڑھی اس کی ناف تک

لٹک رہی تھی، ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا اور کچھ فاصلے پر زمین پر گر کر کہنے لگا۔ ''اے گھڑ سوار تو کھشتری دکھائی دیتا ہے اور یہ چماروں کی بستی ہے۔ اس لیے آگے نہ بڑھنا۔ بتا ہم تیری کیا سیوا کر سکتے ہیں؟''

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا اور لوگوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں اس ڈری سہمی کومل سی لڑکی پر گڑی ہوئی ہیں، جس کے بالوں پر دھوپ نے سارا سونا نچھاور کر دیا ہے اور جس کا ادھ ننگا جسم تپتے ہوئے کندن کی طرح دمک رہا ہے۔ ادھیڑ عمر کے راجہ کی آنکھوں میں نہ جانے کون سا جادو دیکھا کہ وہ کومل سی لڑکی جو پہلے شرما رہی تھی، اب پسینے میں نہا گئی اور پھر غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ لوگ لپکے، ساری بھیڑ اس کے گرد جمع ہوگئی تو بوڑھے مکھیا نے کوئی حکم دیا۔ دو عورتوں نے مل کر اٹھایا اور اسے ایک جھونپڑی کے اندر لے گئیں۔ مکھیا، راجہ کے سامنے پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

''بوڑھے! یہ لڑکی کون ہے؟''

مکھیا جو سال ہا سال کی حکمت اور تجربے کی بنا پر چہرے اور لہجے کی زبان پہچان سکتا تھا، سوکھے پتے کی طرح کانپ اٹھا۔ اس نے لکنت زدہ آواز میں کہا۔ ''ان داتا! یہ آپ کی داسی لونا ہے''۔

''تم نے مجھے پہچان لیا؟''

''جی ان داتا! اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ لڑکی دو ستاروں کے سنگم پر کھڑی تھی۔ اس گھڑی ان ستاروں کا میل ہوگیا ہے''۔

''بوڑھے! کیا تم جوتش جانتے ہو؟''

''نہیں ان داتا! یہ ودیا تو برہموں کو ملی ہے، ہم شودر لوگ ایسی بات کہیں تو ہماری زبان نہ کھینچ لی جائے؟''

''دیکھو! اس لڑکی کو لوگوں کی آنکھوں سے چھپا کر رکھو۔ اسے چماروں کی کٹیا میں نہیں، راجاؤں کے رنواس میں رہنا چاہیے''۔

اور راجہ نے گھوڑے کی باگ کھینچ کر اس کا رخ موڑا ہی تھا کہ اس کے گھڑ سوار وہاں پہنچ گئے۔ راجہ ان کے جلو میں سیالکوٹ کی طرف مڑا اور جنگل کی تاریکی میں گم ہوگیا۔

جب چماروں کی بستی میں دیئے ٹمٹمائے، تو اس لڑکی کو جس کا نام لونا تھا، ہوش آگیا۔ اس نے کٹیا کے اندر جلتے ہوئے دیئے کی روشنی میں اپنی سہیلیوں کو دیکھا جو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا رہی تھیں۔ لونا نے آنکھیں مل مل کر اس بھید بھری ہنسی کی ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر اس نے پوچھا۔ ''اری! وہ کون تھا؟''

''ہمیں کیا پتہ؟ ہوگا تیرا کوئی لگتا ساتا''۔

''پر مجھے تو اس سے بہت ڈر لگا۔ اسے میں نے جنگل میں دیکھا تھا اور میں بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے بستی میں آگیا''۔

اس کی سہیلیاں قہقہے لگانے لگیں تو وہ رو پڑی۔

وہ اتنا روئی کہ دیئے کی جوت بھیگ کر بجھ گئی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اس کی بیوی نے اچانک پوچھا۔

وہ چونک گیا۔

''کچھ بھی نہیں''۔ اس نے سوئے سوئے لہجے میں کہا۔

''میں کب سے کھانا دھرے تیرے پاس بیٹھی ہوں اور تجھے خبر ہی نہ ہوئی''۔

''اچھا!'' اس نے چھاچھ کے پیالے کو منہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ تم جس پتھر پر بیٹھے ہو، یہ پہلے تو یہاں نہیں تھا؟''
''ہاں''۔
''یہ تو خراس کا پاٹ ہے۔نہیں، یہ تو پاٹ سے بھی بڑا ہے۔اتنا بڑا پتھر تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا''۔
''دیکھ زینت! اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔آج ہل چلاتے چلاتے پھالا یہاں اٹک گیا تھا۔ میں نے اوپر سے مٹی ہٹائی کو نیچے سے یہ پتھر نکل آیا''۔
''جب سے تم سوچ رہے ہو، یہ پتھر کہاں سے آیا؟''
''ہاں، زینت!''
''تمہیں پتہ ہے، اس ٹبے پر اسرار بستے ہیں''۔
''ہاں۔لوگ یہی کہتے ہیں۔پر میرا تو کسی جن بھوت سے ابھی تک واسطہ نہیں پڑا''۔
پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔''پر میں نے دن کے وقت ایک خواب کیوں دیکھا، اس پتھر پر بیٹھ کر؟''
??خواب!'' زینت نے پوچھا اور اسے جھرجھری سی آگئی اور ماتھے پر پسینے کی نمی بھی محسوس ہونے لگی۔اس نے دوپٹے کے پلو سے ماتھا پونچھا۔
''ہاں۔۔زینت! کبھی یہاں جنگل تھا اور اس جگہ چماروں کی بستی تھی اور بستی کی ایک لڑکی کا نام لونا تھا۔ کہتے ہیں چماروں کے ہاں کبھی کبھار کوئی پدمنی جنم لیتی ہے، وہ عورت جو لاکھوں میں ایک ہوتی ہے۔تمہیں پورن بھگت کا قصہ یاد ہے؟''
''ہاں! کیوں نہیں؟ پورن بھگت کا کنواں یہاں سے کون سا دور ہے؟'' زینت نے شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''یہی ایک ڈیڑھ کوس۔لوگ اب تک اس کا قصہ گاتے ہیں۔ میں اس کنویں پر کئی بار گئی ہوں۔لوگ اس کا پانی پیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں جن عورتوں کے ہاں بچہ نہ ہوتا ہو، وہ اس کا پانی پئیں تو ان کی گود ہری ہو جاتی ہے۔لونا، پورن کی سوتیلی ماں تھی نا، جس نے اس پر تہمت لگائی۔اور۔۔۔''
''ہاں! جانتی ہو، ہمارے علاقے میں بھی چماروں کے ہاں کبھی کبھار کوئی پدمنی، جنم لیتی ہے تو ہر طرف آگ سی لگ جاتی ہے۔ اب راجے مہاراجوں کا زمانہ نہیں رہا کہ اسے کوئی راجہ رنواس میں لے جاتا۔بے چاری ادھرادھر بھٹک کر پھر چماروں کے ہاں پہنچ جاتی ہے''۔
''ہاں! ایسا ہی ہوتا ہے''۔زینت نے اس کی بات کی تصدیق کی اور پھر کہا۔''اب تم کھانا کھالو''۔
جب رحیم لقمہ منہ میں ڈال کر پھر سوچنے لگا تو اس نے پوچھا۔''اب کیا سوچ رہے ہو؟''
''کہتے ہیں راجہ سالباہن نے اپنے شہر سے دور اس کے لیے محل بنوایا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کھلے جنگلوں میں کھلنے والی کلی رنواس کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے مرجھا گئی ہو اور یہ ٹیلا اسی محل کا کھنڈر ہو جہاں راجہ نے اسے رکھا تھا''۔
''چھوڑو بھی اس قصے کو۔نور پیر کے وقت لونا کا نام بار بار لے رہے ہو۔وہ بڑی منحوس عورت تھی۔پورن سوتیلا تھا تو پھر کیا ہوا؟ اس کا بیٹا ہی تو تھا۔آخر اس پر ڈورے ڈالنے والی ماں، ماں نہیں ڈائن تھی''۔زینت کے چہرے پر شرم کے ساتھ غصے کی سرخی بھی تھی۔
'''نہ زینت، ایسا نہ کہو۔راجے مہاراجے بہت ظالم ہوا کرتے تھے۔جو جی میں آیا کرتے۔جو چیز پسند آتی اسے خزانے میں ڈال لیتے۔راجہ سالباہن نے لونا کو گھر میں ڈالتے ہوئے یہ نہ سوچا، میں بوڑھا ہوں، اور یہ ابھی بھری جوانی کو بھی نہیں پہنچی۔اس نے کچی کلی کو شاخ سے توڑ لیا۔پورن لونا کا سگا بیٹا بھی تو نہیں تھا۔اور کہتے ہیں لاکھوں میں ایک تھا۔بے چاری کا پاؤں پھسل گیا تو کون سا غضب ہو گیا۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے''۔

’’کیسی باتیں کررہے ہو؟‘‘ زینت نے احتجاجی انداز میں کہا۔

’’دیکھو، میں پھر کہتا ہوں۔ گاؤں میں پتھر کی بات کسی سے نہ کرنا۔ بات پھیل جائے گی اور تم جانتی ہو۔ لوگ چھوٹی سی بات کو کتنا بڑا بنا لیتے ہیں‘‘۔

’’نہیں!‘‘ زینت نے ذرا ساچڑ کر کہا۔ ’’مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی سے بات کرنے کی۔ تمہیں پتھر کے نیچے کون سا خزانہ ملا ہے؟ ہے تو پتھر ہی‘‘۔

رحیم بخش مسکرانے لگا۔ اس نے سوچا، عورت ذات پیٹ کی ہلکی ہوتی ہے، اسے جس بات کو چھپانے کے لیے کہا جائے، وہی زیادہ پھیلتی ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

اگلے دن رحیم بخش جاٹ ٹیلے والے کھیت میں ہل چلا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ اسے گاؤں کی طرف سے بہت سے آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ حیران ہوا۔ جب وہ قریب آئے تو اس نے دیکھا کہ سب سے آگے آگے چوہدری جلال ہے وہ سیدھے اس کے پاس پہنچے۔

’’وہ پتھر کہاں ہے رحیم بخش؟‘‘ چوہدری نے بڑے تحکم سے پوچھا۔

’’کون سا پتھر؟‘‘

’’دیکھو! بننے کی کوشش نہ کرو۔ کیا پتہ، اس پتھر کے نیچے خزانہ ہو۔ میں گاؤں کا نمبردار ہوں۔ مجھے تحصیل تھانے میں اس کی اطلاع دینی ہے۔ حکومت کو پتہ لگا تو ہتھکڑی لگ جائے گی‘‘۔

’’کس بات پر چوہدری؟‘‘

’’خزانہ چھپانے کے جرم پر‘‘۔

رحیم بخش کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے کسی پکڑی اور پتھر پر سے مٹی اتار کر کہا۔ ’’چوہدری! خزانہ اس کے نیچے دبا ہے۔ اتنا بھاری پتھر مجھ اکیلے سے تو نہیں اٹھ سکتا‘‘۔

چوہدری چمکتی آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے زور لگایا۔ لیکن پتھر کیسے ہلتا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ساتھ لگایا لیکن پتھر اپنی جگہ سے نہ ہلا تو رحیم بخش نے اس پر مٹی پھیلا دی اور کہا چوہدری! جب جی چاہے، پتھر ہٹا کر خزانہ اپنے قبضے میں کر لینا‘‘۔

چوہدری کھسیانی ہنسی ہنسا اور اپنے آدمیوں کو لے کر گاؤں کی طرف چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ جیوتشیوں کی ہدایت کے مطابق پورن کو پندرہ سال تک لوگوں کی نظروں سے دور رکھا گیا۔ جیوتشیوں نے کہا تھا کہ پندرھواں سال خاص طور سے اس پر بھاری ہے۔ اسے ’’بھنورے‘‘ سے نہ نکالنا۔ ایسا نہ ہو کہ منحوس ستارہ اس پر اپنی پرچھائیں ڈال دے۔ پر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ کیونکہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اسے بھنورے، سے ایک دن پہلے نکال لیا گیا اور اس دن اپنے زمانے کی پدمنی وہ منحوس ستارہ بن گئی تو وہ پورن ماشی کا چاند تھا اور پورن ماشی کا چاند نکھرا ہو تو چکور اس سے ملاپ کے لیے لمبی اڑان لیتی ہے اور خود اس میں گھائل ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ چاند کا دوش ہوتا ہے، نہ چکور کا۔ راجکمار پورن اپنی سوتیلی ماں سے ملنے گیا تو وہی معاملہ ہوا جو چاند اور چکور میں ہوتا ہے۔ پورن نے جھک کر اس کے چرن چھوئے، تو رانی لونا نے اسے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔ ماں کو سوتیلے بیٹے سے جسمانی ملاپ کا اتنا حق تو حاصل ہے۔ پر اس لمس نے لونا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس کی جوانی پہلی بار ایک جوان لمس سے ہمکنار ہوئی تو ایک چنگاری گری اور سوکھی لکڑیاں دھڑ دھڑ جلنے لگیں۔

لیکن پورن اس بھڑکی ہوئی آگ سے بے خبر تھا۔ وہ راجکمار جسے پندرہ سال تک دنیا کی آنکھوں سے اوجھل رکھا گیا تھا، بھلا

چھل کپٹ سے کیوں کر واقف ہوتا۔ اس نے لونا کو ماں کی حیثیت سے دیکھا اور ابھی اس کی کم سن جوانی، عورت کی کسی دوسری حیثیت سے آگاہ بھی نہیں ہوئی تھی کہ عورت نے اس پر بھرپور حملہ کر دیا۔ رانی لونا، راجکمار کو بہانے بہانے سے اپنے محل میں بلاتی رہی اور آخر اس نے اپنے پیار کا بھید کھول دیا۔ پیار کا بھید کھلے تو اس کی گونج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ پورن پیار کے اس پھندے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ راجہ سالباہن، لونا کے محل میں آ گیا۔ اس نے پورن کو رانی لونا کی آغوش میں تڑپتے کسمساتے دیکھا لیکن وہ اس کا مطلب غلط سمجھا۔ اور لونا نے تریا چرتر سے کام لیتے ہوئے اپنے کنول آنسوؤں سے بھر لیے اور کہا ''مہاراج! جو آپ نہ آتے تو۔۔۔''

''تو پھر کیا ہوتا؟''

''راجکمار میری عزت لوٹ چکے ہوتے''۔

راجہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے حکم دیا کہ پورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے جنگل کے غیر آباد کنویں میں **پھینک** دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور اسے اسی کنویں میں **پھینک** دیا گیا جہاں آج کل عورتیں اپنی کوکھ بھرنے کے لیے جاتی ہیں۔

''پر اس بڑے پتھر کے نیچے کیا ہے؟'' رحیم بخش نے سوچا۔

''کوئی کنواں، کوئی تہہ خانہ، کیا پتہ۔ اس میں کوئی خزانہ ہو، چوہدری خزانہ نکال لے تو کیا حرج ہے۔ میں اکیلا تو پتھر اٹھانے سے رہا۔ ماموں کمال کو اس ٹبے پر سے گزرتے ہوئے جو سسکیوں کی آواز سنائی دی، کیا وہ اسی کنویں سے آئی تھی۔ میں تو پتھر کے اوپر بیٹھا ہوں اور مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی۔ کیا پتہ، ماموں کمال کو قدرت نے ایسے کان دیئے ہوں جو پتھر کے نیچے صدیوں سے بند سسکیوں کی آواز سن سکتے ہوں۔ اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ جس کنویں کی وہ بات کر رہا ہے وہ اسی پتھر کے نیچے ہے''۔

اسے اپنی سوچ کا کوئی حل نہ ملا تو اس نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر بیلوں کو شُشکارا اور زمین کا سینہ چیرنے لگا۔ جب کسان کا ناطہ زمین سے جڑتا ہے تو وہ شہزادیوں اور پریوں کی کہانیاں بھول جاتا ہے۔ بھربھری مٹی سے جو بے نام سی گیلی گیلی خوشبو اٹھتی ہے، اس کی لپیٹ میں آ کر تخیل کی براڑان اپنا راستہ گم کر دیتی ہے۔ یوں بھی جن کا ناطہ زمین سے جڑا ہوا ہو، وہ خیالوں کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ خیال تو پرندے ہیں، اور پرندے زمین سے اٹھ کر ہمیشہ آسمان کی طرف اڑتے ہیں۔ پر آج ہل کے سیاڑ سیدھے نہیں جا رہے تھے اور لکیریں آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی **نظر** آ رہی تھیں۔ تیز دھوپ کے ان لہریوں کی طرح، جو زمین سے لگ کر آسمان کی طرف لہراتے ہوئے **نظر** آتے ہیں۔

''پورن کا کنواں تو یہاں سے زیادہ سے زیادہ **ایک** ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ کہانی میں تو یہی آیا ہے کہ اس زمانے میں یہ کنواں غیر آباد تھا۔ ممکن ہے کہ وہاں تک جنگل پھیلا ہو، اور جنگل میں سے جو راستہ گزرتا ہے اس پر مسافروں کے آرام کے لیے یہ کنواں کھودا گیا ہو۔ کنواں غیر آباد ہوتا تو گورو گورکھ ناتھ کے چیلے اس سے پانی بھرنے کیوں آتے۔ انہوں نے رسی سے ڈول باندھ کر کنویں میں **لٹکایا** تو اندر سے کراہٹوں کی آواز آئی۔ چیلے ڈر کر گورو کے پاس بھاگتے ہوئے آئے۔

''گورو مہاراج! کنویں میں کوئی بھوت پریت ڈیرا لگائے بیٹھا ہے''۔ گورو نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں! وہ تو ہمارا بھگت پورن ہے۔ اسے کنویں سے نکال لاؤ''۔ گورو نے **ایک** لمبی تپسیا کے بعد جو طاقت حاصل کی تھی اس نے پورن کو ہاتھ پاؤں دیئے اور پورن، گورو گورکھ ناتھ کا چیلا بن کر بڑا مشہور ہوا اور اسے پورن بھگت کا نام ملا۔ **ایک** لمبے عرصے کے بعد اس نے سیالکوٹ کا رخ کیا۔ بھیک مانگتا مانگتا وہ راجہ کے رنواس میں پہنچا۔ اپنی سگی ماں سے ملا۔ اور اس پر اپنا آپ ظاہر کیا۔ راجہ سالباہن کو اصل حقیقت کا پتہ **چلا** تو اس کا غصہ جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑا۔ اور اس نے حکم دیا ''لونا کو اسی کے محل کے اندھے کنویں میں **پھینک** دیا جائے''۔

خیالات کے اس موڑ پر پہنچ کر رحیم بخش اچانک چونک گیا۔ پورن بھگت کے قصے میں اس کنویں کا کہیں ذکر نہیں تھا۔

راس دھاریوں نے اسے جس طرح ناٹک کا روپ دیا تھا اس کا انجام بھی تو یہ نہیں تھا۔ بلکہ ہوا یوں کہ پورن بھگت کی بھگتی باپ کے غصے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی وہ سوتیلی ماں کے چرنوں پر گر پڑا۔ اس نے کہا ''ماں، مجھے آشیرواد دو''۔

اس نے باپ سے کہا ''پتا جی! ماتا پتر کا بندھن بڑا پوتر ہوتا ہے۔ وہ ان باتوں سے نہیں ٹوٹتا''۔

''جو پورن اپنی سوتیلی ماں کا گناہ معاف نہ کرواتا تو وہ پورن بھگت کیسے کہلاتا۔'' رحیم بخش نے سوچا۔

''لیکن اس پتھر کے نیچے جو اسرار چھپا ہے، وہ کیا ہے!''

''کچھ بھی نہیں۔ اس پتھر کے نیچے کچھ بھی نہیں''۔

''پر ماموں کمال نے یہیں کہیں کسی شہزادی کی سسکیوں کی آواز سنی تھی''۔

''وہ تو سدا کا پاگل ہے''۔

''کیا ہی اچھا ہوتا، وہ اب کہیں سے آجاتا۔ اور پتھر کے نیچے کے اسرار کا پردہ کھول دیتا''۔

رحیم بخش کا ہاتھ ہتھی پر تھا اور اس کے بیل دم بخود کھڑے تھے کہ زینت اس کا کھانا لے آئی۔ سورج کی چمکیلی دھوپ میں تمازت تھی۔ لیکن اس کھیت کی مینڈھ پر کوئی درخت نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے ٹیلے پر اگے ہوئے ایک کیکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ۔ اس کے نیچے بیٹھتے ہیں''۔

''نہیں، یہ پتھر ہی ٹھیک رہے گا''۔

''ٹھیک ہے۔ میں حیران ہوں پتھر والی بات گاؤں میں کس طرح پھیلی۔ لوگ کہتے ہیں رحیم بخش کو اپنے کھیت سے خزانہ ملا ہے''۔ زینت نے بڑی معصومیت سے کہا۔

رحیم بخش کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''کون جانے کس نے بات کی؟ یوں بھی ایسی بات چھپی تھوڑی رہتی ہے، اسے خود بخود پر لگ جاتے ہیں''۔ اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا۔ ''پر لوگوں کو یہ پتہ نہیں کہ اتنا بڑا پتھر میں اکیلا نہیں اٹھا سکتا۔ خزانے میں سارے گاؤں کو شریک کرنا پڑے گا۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ خزانہ کس کے ہاتھ لگے گا''۔

''وہ کون ہے؟'' زینت نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''چوہدری؟ اور کون۔ اپنا نمبردار۔۔ وہ پتھر کو دیکھ گیا ہے''۔

''بڑا لالچی ہے وہ۔ خزانہ نکلا تو اس میں سے ہمیں تو کچھ نہیں دے گا''۔

''نہیں! ہمیں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی''۔

''اتنا لوبھی دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا۔ دولت کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ اپنے گھر کی خبر بھی نہیں لیتا''

''کیا ہوا اس کے گھر میں؟''

''وہ تو اندھا ہے یا اس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس لونا سے کچھ نہیں کہتا''۔

لونا کون؟ رحیم بخش نے پوچھا۔

''وہی سرداراں۔۔۔ کنجری۔۔۔۔ اپنے ہی گھر میں چکلا کھول رکھا ہے''۔

کیسی باتیں کر رہی ہو زینت! تم بھی لوگوں کی باتوں میں آگئیں۔ کسی کے متعلق کبھی برا نہیں سوچنا چاہیے''۔

''آنکھوں دیکھی بات کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ چوہدری کی بہو گلی گلی دہائی دے رہی ہے۔ اس کالے منہ والی نے اس کا خصم

اس سے چھین لیا ہے''۔

دیکھو زینت! اسے کنجری کہو یا کچھ اور، پر اسے کالے منہ والی تو نہ کہو'۔

''کیوں؟''

''گاؤں میں ایک ہی تو چہرہ مہرہ ہے جسے دیکھ کر دلوں کا دکھ درد، تھکن دور ہو جاتی ہے۔

''کیا کہہ رہے ہو۔۔۔؟'' زینت نے گھبرا کر پوچھا۔

رحیم بخش کھلکھلا کر ہنس پڑا۔''دیکھو زینت! دنیا میں کوئی کوئی عورت ہوتی ہے جس کی جوانی سدا بہار ہوتی ہے۔اب بھی وہ چلتی ہے تو قدم قدم پر پھول کھلتے چلے جاتے ہیں۔آنکھوں میں وہی جوانی کا نشہ۔۔۔کسی کو آنکھ بھر کر دیکھ لے تو بڑھا ہوا قدم رک جائے''۔

''ہاں، وہ تو پری ہے پری۔ مانا چوہدری بوڑھا ہے اور وہ جوان ہے پر اس کالے منہ والی کو جو آگ لگی ہوئی ہے وہ پرائے چھینٹوں سے بھی تو بجھ سکتی ہے۔اس نے تو اسی جوہڑ کو گندا کر دیا ہے جس میں وہ رہتی ہے''۔

''جھوٹ!'' رحیم بخش نے کہا۔ چوہدری کا بیٹا میرا دوست بھی ہے۔وہ ایسا نہیں ہو سکتا''۔

''وہ پورن بھگت بھی تو نہیں ہے''۔زینت نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

''چوہدری کو معلوم نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کون جانے؟ کچھ لوگ جنم کے اندھے ہوتے ہیں اور کچھ سب دیکھ کر اندھے بن جاتے ہیں''۔

''کیوں؟''

''چھوڑو اس قصے کو۔ کھانا کھا لو تو میں گاؤں جاؤں۔تم نے مجھے باتوں میں الجھا لیا''۔

وہ لقمے منہ میں رکھ رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا۔کوئی لقمہ گلے میں پھنستا تو لسی کے ایک گھونٹ سے اتار لیتا۔ زینت چپ چاپ اس کے پاس بیٹی تھی۔وہ پتھر جس پر وہ دونوں بیٹھے تھے، مٹی کے ڈھیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پر دونوں کو معلوم تھا کہ وہ جس پتھر پر بیٹھے ہیں اس پتھر کے نیچے کوئی اسرار چھپا ہے۔

''زینت یہ ٹیلا جو ہمیں اشتمال میں ملا ہے، یہاں کبھی رانی لونا کا محل تھا۔لونا اسی علاقے کی رہنے والی تھی۔اور یہ پتھر جس پر ہم بیٹھے ہیں، اس کے نیچے اندھا کنواں ہے۔ جب پورن بھگت کی بے گناہی ثابت ہوئی تو راجہ سالباہن نے لونا کو زندہ سلامت اس کنویں میں پھنکوا دیا ہوگا اور اس نے سسک سسک کر جان دی ہوگی۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔'' زینت نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

قصے والے تو کہتے ہیں۔۔۔راجہ سالباہن نے اپنے اکلوتے راجکمار کے کہنے پر اسے معاف کر دیا تھا۔ پر کوئی ضروری نہیں کہ قصے والے ٹھیک ہی کہتے ہوں۔راجے مہاراجے اتنے رحم دل نہیں ہوا کرتے تھے''۔

''پر، پورن بھگت تو بڑا رحم دل تھا''۔

''تھا، لیکن راجہ نے رانی کو معاف نہیں کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ ذرا سی بے وفائی بھی برداشت نہیں کر سکتے''۔۔۔۔''چلو چھوڑو اس قصے کو''۔

''ماموں کمال کو ٹیلے کے اس اندھے کنویں کا پتہ تھا۔وہ یہاں سے گزرتا تو اسے کسی شہزادی کی سسکیاں سنائی دیا کرتی تھیں۔''

''ماموں کمال کون تھا؟'' زینت نے پوچھا۔

''میرا ماموں تھا۔میرے بچپن کو بڑی اچھی اچھی کہانیوں سے بہلایا کرتا تھا''۔

''اماں بتاتی تھیں، اسے سرداراں سے پیار تھا۔ پر جب چوہدری نے سرداراں کو گھر میں ڈال لیا تو اس کا جی دنیا سے

اچاٹ ہوگیا۔ وہ کبھی ویرانوں کی طرف نکل جاتا اور کبھی شہروں میں گم ہو جاتا۔ پر گاؤں سے اس کا ناطہ نہ ٹوٹتا۔ سال چھ مہینوں میں ایک بار گاؤں میں ضرور آتا۔ لیکن اب وہ مدتوں سے نہیں آیا''۔

جب رحیم بخش نے کھانا کھالیا تو زینت نے گڑوا سر پر رکھا اور اس پر چھابا ٹکایا اور گاؤں کی طرف مڑنے لگی تو اس نے کہا۔ ''دیکھو! ایسی عجیب عجیب باتیں نہ سوچا کرو۔ تم بھی اپنے ماموں کی طرح کہانیاں گھڑنے لگ گئے ہو۔ بھلا اتنے بڑے پتھر کے نیچے کوئی سسکیاں بھر رہا ہو تو اس کی آواز باہر کہاں آ سکتی ہے!''

''ٹھیک ہے، زینت!''

پھر کچھ دنوں رحیم بخش کو اس کھیت کی طرف آنے کا موقع نہ ملا۔ ابھی بوائی کا موسم نہیں آیا تھا۔ ایک دن جب وہ اس کھیت سے کچھ فاصلے پر ہل چلا رہا تھا، تو ٹیلے کے پاس سے گزرتا ہوا ایک آدمی یکایک اس کی طرف مڑا اور ہانپتا کانپتا اس کے پاس پہنچا۔ وہ تھر تھر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اندھا کنواں!''

''کہاں؟''

''اس پتھر کے نیچے، جو تیرے کھیت سے نکلا تھا''۔

''تجھے کیسے معلوم ہوا کرمو؟''

''میں تو اس میں گرتے گرتے بچا ہوں''۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ اتنا بھاری پتھر کس جن نے ہٹایا؟''

''میں نہیں جانتا''۔

''چلو میرے ساتھ''۔

کنویں کا منہ کھلا ہوا تھا۔ پتھر ایک طرف کو پڑا تھا۔ اردگرد کی زمین پر یوں لگتا تھا جیسے اکھاڑا ہو اور کشتی لڑی گئی ہو۔ بڑے بڑے ڈھیلے ٹوٹ گئے تھے اور ایک ٹوٹی ہوئی بلی بھی وہاں پڑی تھی۔ پتھر کو بلیوں کے ذریعے ہٹایا گیا تھا۔ رحیم بخش ایک دو لمحے حیران رہا۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا کہ قہقہوں کا سیلاب رک جائے پر ایسا نہ ہوا۔ اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

کرمو نے کہا۔ ''تمہیں کیا ہوا چوہدری؟''

''کک۔۔۔ کک۔۔۔ کرمو۔۔۔ خخ۔۔۔ خخ۔۔۔ خزانہ۔۔۔''

''خزانہ!'' کرمو حیران ہو کر بولا۔ ''کہاں ہے خزانہ؟''

''اس کنویں میں۔۔۔ کبھی تھا، اب نہیں۔۔۔ چوہدری خزانہ نکال کر لے گیا ہے''۔

''آہ، میرا خزانہ۔ رحیم بخش نے جھوٹ موٹ غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور اس پر ہنسی کا دورہ پھر پڑ گیا۔ آخر اس کے ہوش بحال ہوئے تو اس نے کہا ''دیکھو کرمو! یہ سب چوہدری کی کارستانی ہے۔ دنیا میں اتنا لالچ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں وہ رات کو کتنے آدمی ساتھ لایا۔ اور انہوں نے کس طرح پتھر کنویں کے منہ سے ہٹایا۔ جب انہوں نے خالی کنویں کو منہ پھاڑے دیکھا ہوگا تو ان کی مایوسی دیکھنے کی چیز رہی ہوگی''۔

''کیا پتہ، چوہدری کو خزانہ مل گیا ہو''۔

''مل گیا ہو تو اچھا ہے۔ آؤ۔ ذرا قریب جا کر دیکھیں۔ کوئی گری پڑی اشرفی ہمیں بھی مل جائے گی''۔ رحیم بخش نے کہا۔

دونوں ڈرتے ڈرتے کنویں کی من تک پہنچے تو ان کا رواں رواں کانٹوں کی نوکیں بن چکا تھا۔ کرمو تو کانپ رہا تھا۔ پر جب کنویں کے اندر اندھیرے کے سوا انہیں اور کچھ نظر نہ آیا تو انہیں عجیب سا اطمینان محسوس ہوا۔ کنویں کے اردگرد اشرفی تو کیا، پھوٹی کوڑی بھی نظر نہ آئی۔ کنواں زیادہ گہرا نہیں تھا۔ یہ اس قسم کا کنواں نہیں تھا جو آبپاشی کے لیے کھودا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے پانی کی سطح تک نہیں کھودا گیا تھا۔ تاہم اس سے سیلن اور نمی کی بو آتی ہے۔ اس کی دیواروں کو چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے پختہ کیا گیا تھا اور اس کی گولائی عام کنوؤں سے کہیں زیادہ تھی۔

رحیم بخش نے ٹھنڈی آہ بھری تو کرمو نے پوچھا۔ ''چوہدری! کیا بات ہے؟ خزانے کے نہ ملنے کا افسوس ہے''۔

''نہیں کرم دین!'' رحیم بخش نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''میں سوچتا ہوں، اس کنویں سے پانی نکل آتا تو چلو دو چار کھیتوں کی سیرابی کا ہی بندوبست ہو جاتا۔ بے کار کی کوئی چیز بھی ہو، اسے دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے''۔

''ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ سوکھے اور ویران کنویں کس کام کے۔ الٹا ان سے نقصان ہوتا ہے۔ کوئی ان میں گر جائے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے''۔ کرمو نے کہا اور سلام کہہ کر اپنے کام پر چلا گیا۔

جب تنہائی ہوئی تو رحیم بخش کو فضا خالی خالی سی محسوس ہوئی۔ کنویں کا اسرار اچانک ختم ہو گیا تھا۔

گاؤں بھر میں گویا ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ نہ جانے کس اڑتی چڑیا نے منادی کر دی کہ شام تک اکا دکا لوگ کنویں پر آتے رہے اور اندھا کنواں دیکھ کر واپس جاتے رہے۔ رات کا اندھیرا چھاتے ہی لوگوں کا اشتیاق بھی ختم ہو گیا۔ اگلے دن رحیم بخش نے ٹیلے سے بیری، پھلاہی اور کیکر کی جھاڑیاں کاٹیں اور کنویں کے اردگرد باڑ لگا دی، تاکہ کوئی بھولا بھٹکا آدمی یا جانور اس میں گر نہ جائے۔

اسوج کا مہینہ گزر گیا اور کاتک کا مہینہ بھی آدھا گزر چکا تھا کہ ایک دن رحیم بخش ٹیلے والے کھیت میں گندم کی بوائی کرنے کے لیے آیا تو اس نے دیکھا کہ کنویں کے اردگرد کی باڑ اکھڑی ہوئی ہے اور کسی نے پتھر کنویں کے منہ پر رکھ کر اوپر سے اس پر مٹی ڈال دی ہے۔ کنویں کا اسرار پھر سے پردہ پوش ہو گیا تھا۔

یہ بھی ضرور چوہدری کی کارستانی ہے۔ اس نے سوچا۔

پر اسے کنویں کا منہ بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

کیا پتہ؟ کون جانے؟ گاؤں میں کچھ دن اس کی خوب ہنسی اڑی تھی اور اب اس کا ذکر اذکار بھی نہیں ہوتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ جب لوگ ہنستے تھے تو کنویں کا منہ کھلا رہا اور اب لوگوں کا منہ بھی بند ہے اور کنویں کا بھی۔ نہ جانے اس میں کیا بھید ہے۔ چلو رحیم بخش جاٹ! تم بوائی کا کام شروع کر دو۔ دانہ بکھیرو اور پھر اللہ سے آس لگا کر بیٹھ جاؤ۔

اور جب دوپہر کے وقت زینت اس کا کھانا لے کر گاؤں سے آئی تو رحیم بخش نے کہا چلو۔ ''کنویں کے پتھر پر بیٹھتے ہیں''۔

''اس کے اردگرد تو تم نے باڑ لگا دی تھی''۔ زینت نے کہا۔

''آؤ تو سہی''۔

جب زینت نے کنویں کے منہ پر پتھر دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ رحیم بخش کھانا کھاتا رہا اور اس کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اچانک زینت نے کہا۔ ''سرداراں اپنا منہ کالا کر گئی ہے''۔

''کیا کہا؟''

اتنے چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اتنی بڑی خبر چھپ سکتی تھی۔ نمبردار کے گھر والوں نے لاکھ پردے ڈالے، پر لوگوں کو پتہ چل ہی گیا۔

''وہ کہاں گئی؟''

'' کہتے ہیں مولا بدمعاش کے ساتھ نکل گئی ہے''۔

''وہ جو کاہلو وال کا رہنے والا تھا۔۔۔؟ نہیں زینت، یہ جھوٹ ہے۔ وہ کبھی اس گاؤں میں نہیں آیا۔۔۔ وہ اسمگلر تھا، وہ ڈاکو تھا پر عورتوں کو اغوا نہیں کرتا تھا۔ نہیں، مولا ایسا نہیں کر سکتا''۔ رحیم بخش نے کہا۔

''مولا ہو یا بھولا بدمعاش۔ کوئی بھی ہو۔ ہمیں اس سے کیا۔ پر اتنی بات سچ ہے کہ اب سرداراں گاؤں میں نہیں''۔

''پھر چک مراد میں کیا رہ گیا زینت؟'' رحیم بخش نے پھر پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جب وہ ریشمی تہبند اور زری کا جوتا پہن کر چلتی تو گاؤں کی زمین کو پھول بوٹے لگ جاتے تھے۔ سرداراں کیا گئی، اس مٹی سے خوشبو جاتی رہی''۔

زینت نے حیران ہو کر رحیم بخش کو دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ وہ مذاق کی بات کر رہا ہے۔ جب اسے اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نظر نہ آیا تو اس نے اپنے لہجے میں رشک اور جلن، حسد اور نفرت کا سارا زہر جمع کیا اور گڑوا اور چھابا سر پر رکھ کر کہا۔

'' کچھ بھی ہو۔ وہ چک مراد کی لونا تھی''۔

''اسی لونا سے گاؤں کی زینت تھی''۔ رحیم بخش بولا۔

زینت کے جانے کے بعد وہ پتھر پر مٹی ڈالنے لگ پڑا، جیسے قبر کو مٹی دے رہا ہو۔ پتھر مٹی کے نیچے چھپ گیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا ماموں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہو، عین من۔۔۔ زندہ سلامت۔۔۔ اس نے پوچھا۔ ''رحیم! تم نے اندھے کنویں کا اسرار سمجھ لیا؟''

''نہیں تو''۔

''تمہیں کسی شہزادی کی سسکیاں سنائی نہیں دے رہیں؟''

کھیت پر آدھ کاتک کی ملائم سی دھوپ تھی اور اس کی کرنوں میں، جو دانے کو زمین کے اندر گرمی پہنچا کر انڈوں کی طرح سیتی ہیں، ہلکی سی حدت بھی تھی اور منظر نہایت پر سکون تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اتنا گھمبیر سناٹا کہ اس میں پرندوں کے چہچہے بھی گم ہو چکے تھے۔ ایسے سناٹے میں اگر کنویں کے اندر کسی سسکی کی آواز آتی تو وہ اسے ضرور سن لیتا۔

پر اتنا بڑا پتھر!۔۔۔ اس نے کہا۔ ''نہیں ماموں، نہیں۔ اس کے نیچے تو کوئی غضب ناک سمندر بھی موجیں مار رہا ہو تو اس کی آواز بھی نہ آئے اور کسی لونا کی سسکیوں میں اتنی سکت کہاں کہ پتھر کا سینہ چیر کر باہر نکل آئیں''۔

ماموں کمال کا ہیولیٰ اس منظر میں تحلیل ہو گیا تو اس نے سوچا۔ پتہ نہیں، ماموں کمال کے پاس کون سا جادو تھا کہ وہ پتھر پڑے اندھے کنویں کی سسکیاں سن لیتا تھا!

☆☆☆

تج دو۔ تج دو!

غیاث احمد گدی

یہ الفاظ۔۔۔۔۔

بار بار اس کی سماعت کے تعاقب میں یہ الفاظ آتے رہے۔ جب وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا اور خاموش، سنسان کمرے اور اس کی دیواروں کو تکتے تکتے تھک جاتا تو آنکھیں بند کر لیتا، پھر بند آنکھوں میں جانے کتنی صدیوں کی درمیان پھیل جاتیں، افسردگی کا تسلط ہو جاتا اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ ہلتے، جہاں سے گویائی ہولے سے سر اٹھاتی اور کچھ ایسے الفاظ ادا ہوتے جن کو سننے کے لیے اس کی سماعت تیار نہ ہوتی، وہ کان بند کر لیتا اور آنکھیں اس وقت آپ ہی آپ کھل جاتیں۔ کمرہ ویسے ہی ویران ہوتا۔ تنہا تنہا، پھر کہیں سے غبار اٹھتا جس کو دبائے دبائے اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ ضبط، ضبط اسے کے اختیار سے باہر کی چیز ثابت ہوتا وہ آنکھیں میچتا، تب اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو گرم قطرے آہستہ سے ڈھلک آتے۔

جس دفتر میں وہ کام کرتا تھا اس کے صدر دروازہ سے عین بیس گز کے فاصلہ پر ایک دم کٹا کتا ہمدردی کی راہ تکتا۔ یہ سلسلہ بہت دنوں سے نہیں ابھی چند روز سے شروع ہوا تھا۔ یہی کوئی پانچ چھ مہینے سے! تو وہ دم کٹا کتا، چلڈرن پارک کا جو موڑ داہنی طرف مڑتا تھا وہیں سے اس کے ساتھ ہو لیتا اور ٹھیک اس سے دو انچ کے فاصلے پر، اس کے پیچھے پیچھے چلا کرتا۔ یوں کہ کتے کا تھوتھنا، اس کے پتلون کی مہری سے کبھی کبھار چھو بھی جاتا۔ پہلے دن تو اس نے کتے کی حرکت پر اسے ڈانٹا، جھڑکیاں دیں مگر کتے نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ یونہی گردن جھکائے چپ چاپ چلتا رہا گویا یہ اس کا اپنا پالتو کتا ہو اور اس کی محافظت میں ہو۔ دوسرے دن اس نے اس کو لات رسید کی، دھتکارا، مارنے کے لیے پتھر اٹھایا جب بھی وہ بدستور زمین سونگھتا چلا گیا۔ پھر ایک دن اس نے سڑک پر پڑی ایک بید سے اس کی خوب مرمت کی اور مارتے مارتے ایک دم اسے نڈھال کر دیا، اتنا مارا کہ وہ اوندھا ہو کر فرش پر گر پڑا۔ کچھ دور جا کر پلٹ کر دیکھا تو وہ اسی طرح فرش پر اوندھا پڑا کیں کیں کر رہا ہے۔

وہ آگے بڑھ گیا اور سو دو سو قدم چلتا رہا مگر اس دم کٹے کتے کا پتہ نہیں تھا۔ تب اس نے گویا اطمینان کا سانس لیا۔ یہ کیا تک تھی، کمبخت کتے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد پلٹ کر دیکھا جب بھی کتا پلٹ کر نہیں آیا تو اسے اور بھی اطمینان ہو گیا۔

اس دن کچھ عجیب بات ہوئی، اسی چلڈرن پارک میں ایک بہت بڑا مجمع تھا۔ بے شمار آدمیوں کی بھیڑ تھی آخری سرے پر کوئی آدمی کف دہندہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں جب وہ رکتا تو آدمیوں کے گھنے جنگل سے تالیوں کی آواز اٹھتی تڑ اتڑ، تڑ اتڑ۔۔۔۔ تڑ اتڑ!

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے مجمع کو تکتا رہا۔ دلچسپی سے اس کی آنکھیں اور کان دونوں لطف اندوز ہو رہے تھے، جب ہی اس کی نگاہیں اسکے دس گز کے فاصلے والے درخت پر گئیں۔ بڑا گھنا۔۔۔ سا املی کا پیڑ تھا۔ املی کا تھا۔۔۔ ہاں یقیناً املی ہی کا تھا۔ جس کی ایک شاخ پر ایک بے حد گندہ، بے حد کراہیت پیدا کرنے والا پرندہ بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ پرندے اور درخت پر دھیان بھی نہیں دیتا مگر جیسے ہی مجمع میں سے تالیوں کی بے پناہ آواز گونجی پیڑ پر سے قیں ں ں۔۔۔ کی ایک لمبی اور گھناؤنی آواز سنائی دی، ایسی کہ اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب ہی اس کی نگاہیں اس درخت کی طرف پرندے پر اٹھیں وہ سر سے پاؤں تک سہم گیا۔

اسے عجیب سا تجسس ہوا، ایسا کیوں ہوا؟ ہوسکتا ہے اس کی سماعت اور بصارت دونوں نے مل کر سازش کی ہو۔ اور اسے دھوکا دیا ہو۔ چنانچہ جب دوسری بار تالیاں بجنے لگیں تو وہ قیں کی آواز سنتے ہی پرندے کی طرف مڑ گیا۔ اس نے دیکھا جب تک تالیاں بجتی رہیں وہ منحوس پرندہ قیں قیں کرتا رہا، گردن کو اوپر سے نیچے گراتا اٹھاتا ہے۔ اس وقت پرندے کے بشرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا گویا وہ زور زور سے ہنس رہا ہو، قیں قیں کی مکروہ کیا تھی یقیناً اس کی ہنسی کی آواز تھی۔ اس نے سوچا ٹھیک ہے گویا پرندے نے قہقہہ لگایا ہو۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس نے مجمع کی طرف دیکھا، اس لچھے دار تقریر کرنے والے کی سمت دیکھا پھر اپنے آپ سے سوال کیا، ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ نئی بات، تقریریں یہاں برابر ہوتی ہیں تالیاں بھی بجتی ہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ عجیب صورت حال درپیش نہ ہوتی تھی۔

جہاں تک اس کی یادداشت کا تعلق ہے، کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنے کو آپ سمجھانے کی کوشش کی، یہ سب محض اتفاق ہے۔ یہ پرندہ یہاں جو بیٹھا ہے یہ بھی اتفاق ہے اور یہ بھی کہ وہ گردن نیچے اوپر کرتا ہے۔ اور یہ بھی عین اتفاق ہے کہ اسی وقت تالیاں بجتی ہیں، یا پھر یہ نجوگ کی بات ہے۔ کہ جب تالیاں بجتی ہیں جب ہی پرندے کے گلے سے آواز نکلتی ہے۔ یا یوں کہ اس نے اپنے آپ کو ایک دانا آدمی کی طرح سمجھانے کی کوشش میں ہر جانب سے تسلی کرنی چاہی کہ ممکن ہے، تالیوں کی آواز سن کر ہی پرندے کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اس آواز کے صدمے سے اس کے گلے سے قیں کی صدا پھوٹتی ہے۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ پچھلے چند مہینوں جو وہ بیمار رہا ہے تا بس اسی سبب وہ بہت زیادہ سوچنے لگا ہے اور کچھ اول فول بھی سوچنے لگا ہے۔ اور ضرورت سے کچھ زیادہ بھی۔ ورنہ بات فقط اتنی سی ہے کہ تالیوں کے شور سے پرندے کی آنکھیں کھلتی ہیں اور گلے سے آواز بھی نکلتی ہے اس میں کوئی تعجب خیز پہلو بھی کہاں؟ بس بس اتنی سی ہی بات ہے جب ہی اس کی توجہ منٹوں میں مجمع کی طرف منتقل ہوگئی۔

وہ تقریر کرنے والا مہاپرش کوئی اہم نکتے پر بول رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فضا میں زور زور سے تلواریں چلا رہے تھے اور سننے والا مجمع بے حد دھیان سے سانس روکے کھڑا تھا۔ تقریر کی آواز تو اس تک نہیں آرہی تھی۔ مگر بات ضرور اہم تھی اس نے اندازہ لگایا جب ہی لوگ بت بنے۔۔۔ ابھی وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ مجمع نے پھر زور زور سے تالیاں بجائیں۔۔۔

تج دو۔۔۔ تج دو۔۔۔

ارے یہ کیا، اس نے پلٹ کر دیکھا یہ آواز کہاں سے آئی مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ پھر آواز آئی تج دو۔۔۔

تو گویا یہ آواز پرندے ہی کے حلق سے آئی تھی۔ اسے بے حد تعجب ہوا، شاید اس کی سماعت نے خطا کی ہو، یہ دو الفاظ تج دو، تج دو ایک پرندہ انسانوں کی زبان کیسے بول سکتا ہے۔ طوطا ہوتا تو اور بات تھی۔ کہیں سے رٹے رٹائے الفاظ بولتا رہتا۔ یہ صفت صرف طوطا اور مینا ہی کو ودیعت ہوئی ہے کہ انسانوں کی نقالی میں ان کی زبان آدمیوں کے چند الفاظ ادا کرسکتی ہے مگر یہ پرندہ نہ طوطا ہے نہ مینا، یہ کوئی اور پرندہ ہے، یہ اس طرح نہیں بول سکتا، بول ہی نہیں سکتا۔ اس نے سوچا یہ اس کی اپنی لنگڑی سماعت کا قصور ہے۔

اتنے میں تقریر ختم ہوگئی۔ لوگ تتر بتر ہونے لگے۔ چند جوشیلے آدمیوں نے میز پر کھڑے تقریر کرنے والے صاحب کو کندھوں پر اٹھایا، اور چیختے چلاتے سڑک کی طرف روانہ ہوئے۔ بڑا جوشیلا اور بدن میں لہو کی رفتار کو تیز کردینے والا منظر تھا۔ وہ محویت سے چپ چاپ کھڑے کھڑے اس حیات افروز منظر کو تکتا رہا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل اٹھیں کیوں کہ دیر سے اس کی رگوں میں منجمد خون رواں ہوگیا تھا، یہ سب اسے بہت اچھا لگا۔

ذرا دیر میں مجمع چھٹ گیا۔ نعرہ لگاتے لگاتے کچھ لوگ مہاپرش کو کار تک لے گئے۔ عین اسی وقت پھڑ پھڑ کرتے پرندے نے پورے مجمع کے اوپر سے چکر لگایا اور اوپر ہی اوپر مشرقی افق کی طرف ہولیا۔ اس نے حیرت سے دیکھا اور غور کیا تو اس وقت بھی

جب پرندہ لوگوں کے سمندر پر چکر لگا رہا تھا، تج دو، تج دو، کی آواز سنائی دے رہی تھی، زورزور سے اور جلدی جلدی۔۔۔ تج دو۔۔۔ تج دو۔۔۔

کیا یہ، یہی الفاظ تھے؟ یا اور تھے۔ ہوسکتا ہے تج دو کی بجائے، کوئی اور الفاظ ہوں ملتے جلتے، جیسے ہم شکل آدمی ہوتے ہیں۔ جن میں اس درجہ مشابہت ہوتی ہے کہ بالکل ایک سے لگتے ہیں۔ پھر بھی غور سے دیکھنے میں دونوں میں فرق رہتا ہے۔ ایسے ہی دو الفاظ ملتے جلتے ہوں، جن کے باعث اس کے ذہن نے ایک مفہوم پیدا کرلیا ہو۔۔۔ یہ سب بے کار باتیں ہیں، وہ چند دنوں سے بہت سوچنے لگا ہے، اتنا زیادہ کہ سوچ کے بوجھ تلے اس کا ذہن کچلا جاتا ہے۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا، اس نے پان کی دوکان سے ایک پاکٹ سگریٹ خریدی پیسے دیئے اور سنیما ہال کی سربلند عمارت کی طرف ہولیا۔ جہاں نئی فلم کا ایک خوبصورت پوسٹر آویزاں تھا۔ پوسٹر بہت خوبصورت تھا، ایک نیم عریاں حسینہ سمند کے کنارے ریت پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایسی کشش تھی کہ آدمی دنیا اور مافیہا دونوں کو فراموش کر جائے جب ہی لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اس نے دیکھا ان میں سے زیادہ تر وہی لوگ تھے جو ابھی سیاسی جلسہ میں زورزور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے پاس کوئی چیز متحرک ہے۔ اس کا ذہن دفعتاً بہت سی باتیں فقط ایک لمحہ میں سوچ گیا، مگر وہ سب کچھ نہیں تھا، جو کچھ اس نے سوچا تھا۔ یہ تو وہی دم کٹا کتا تھا۔

یہ پھر آ گیا، اس نے سوچا یہ کیسے اتنی دور تک اسے ڈھونڈتا ڈھانڈتا چلا آیا۔ کتے کی شامہ کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ بہت تیز ہوتی ہے چنانچہ یہ دم کٹا کتا اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔

اب ہر روز کا معمول ہوگیا تھا، کتا اسے چلڈرن پارک کے موڑ پر ملتا، اس کے لاکھ دھتکارنے کے باوجود پیچھے پیچھے چلتا اس کے گھر کے دروازے تک آتا پھر وہ دروازہ بند کرلیتا۔ ذرا دیر تک وہ کتا دہلیز کے آس پاس ٹہلتا، پھر اس کے بعد نامعلوم سمت چلا جاتا، چند منٹوں کے بعد وہ دروازہ کھول کر دیکھتا۔ کتا جاچکا ہوتا تب وہ اطمینان کا سانس لیتا اور اپنی بیوی سے باتیں کرتا چائے پیتا، ہنستا بولتا۔

اس کی بیوی ن ایک دن ٹوک دیا ''یہ آپ کمرے میں آتے ہی دروازہ بند کیوں کرلیتے ہیں؟''

''دروازہ بند کرلیتا ہوں۔۔''

ہاں، اور کچھ دیر بعد دروازہ کھول کر دیکھتے بھی ہیں۔ گویا کوئی آدمی آپ کا پیچھا کررہا ہو''۔

''کوئی آدمی پیچھا کررہا ہو؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میرا کون پیچھا کرسکتا ہے''۔

اس کی بیوی نے بشاشت سے کہا ''نہ کررہا ہو مگر آپ کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات نظر آتے ہیں۔ اس وقت ایسا ہی لگتا ہے''۔

وہ چونک گیا، یہ بات سچ ہوسکتی ہے، اس نے سوچا اپنی بیوی کو وہ سب کچھ بتا دے گا۔ مگر اپنے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ اس میں بتانے کی بات ہی کیا ہے۔ نیلو ہنسنے لگے گی۔ آخر اتنی ہی سی بات ہے۔ اتنی سی بات پر وہ گھبرانا چھوڑ دے گا ہمیشہ کی طرح خوش وخرم رہے گا۔ وہ کتا کوئی گزند تو نہیں پہنچاتا معمول بات ہے۔ بے حد معمولی بات ہے۔

''اب آپ سوچنے کیا لگے، اس طرح۔۔۔'' اس کی بیوی نیلو نے چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بقراط مت بنئے ٹوٹو کی چھٹی آئی ہ اس کا نانی کے پاس جی نہیں لگتا'' مگر گویا اس نے دوسری بات سنی نہیں۔ فوراً جواب دیا۔ کیا میں بہت سوچنے لگا ہوں، ٹھیک ٹھیک۔۔۔

''عجیب آدمی ہیں''۔ نیلو نے تعجب سے کہا۔ میں ٹوٹو کی بات کر رہی ہوں، آپ۔۔۔''

اس روز اس نے سوتے وقت عہد کیا کہ وہ اب یوں ایک چھوٹی سی بے حد غیر اہم بات کے لیے پریشان نہ ہوگا۔ اور اس میں جو ذرا لاتعلقی پیدا ہونے لگی ہے ہر چیز سے، جو وہ غلط طور پر کٹا کٹا رہنے لگا ہے۔ اس کو روک دے گا۔ یہ اس کی شاعرانہ بے پروائی ہے مگر ایک بیمار آدمی کے سے سوچنے کی عادت ٹھیک نہیں، یہ کوئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ دوسرے دن وہ دفتر میں خوشی خوشی کام کرتا رہا۔ ہلکا پھلکا سا۔ اس کے دونوں شانے جو ادھر کئی دنوں سے بھاری بھاری لگتے تھے، آج سبک تھے، بے فکری کی ایک کیفیت تھی جو اس کے اندر اور باہر دونوں اطراف میں مسلط تھی۔

شام کو جب دفتر بند ہونے کا وقت آیا، چیف ایڈیٹر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا، وہ جا کر خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اس کے علاوہ چند ایک اور لوگ بھی تھے۔ دو اسسٹنٹ ایڈیٹر اور چھ کالم نویس، سبھوں کے چہرے بشاش تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

جب چائے کا دور چل چکا تو گویا ایک غیر رسمی میٹنگ کا افتتاح ہوا۔ صرف چند جملوں میں بہت سی باتیں چیف ایڈیٹر نے بتائیں، وہ یہ کہ ''پندرہ بیس دن پہلے یہ اخبار بک چکا ہے۔ اسے ملک کے بہت بڑے سیٹھ فلاں نے اتنی کثیر رقم کے عوض لے لیا ہے۔ اخبار خریدنے والا سیٹھ بہت نیک دل انسان ہے۔ اس نے تمام ملازمین کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا ہے، اور دوسری سہولتیں بھی مہیا کر دی ہیں۔۔۔۔ اور اس کے بدلے میں۔۔۔۔''

چیف ایڈیٹر خاموش ہو گیا۔ ذرا ٹھہر کر بشاشت اور وقار سے کہا ''اور اس کے بدلے میں وہ کچھ بھی نہیں چاہتے حتیٰ کے پالیسی میں بھی کوئی پیسہ برابر تبدیلی نہیں چاہتے!'' چیف ایڈیٹر یہاں خاموش ہو گیا اور جب ہی تڑ تڑ کر کے تالیاں بجیں۔۔۔ حتیٰ کے پالیسی۔۔۔ تڑ، تڑ تڑ۔۔۔ تالیاں تالیاں۔۔۔

دفعتاً وہ چونک اٹھا، جب زور زور سے تالیاں بج رہی تھیں، جب ہی اس کے کان بجے۔ وہ دو الفاظ کی گونج سنائی دی، اس نے جلدی سے گردن اٹھا کر دیکھا کہیں کچھ نہیں تھا۔ وہ منحوس پرندہ، کہیں نہیں تھا، اس کی آنکھیں پھرتے پھراتے دور روشن دان پر ٹک گئیں وہ پرندہ نہیں تھا، مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ کچھ تھا ضرور۔ روشن دان کے شیشے کے پیچھے کوئی سایہ تھا اس وقت پھر اس کے ساتھیوں نے ایڈیٹر کی کسی بات پر، جسے وہ سن سکا تھا تالیاں بجائیں۔ اسی وقت روشن دان کے زرد رنگ کے شیشے کے پیچھے کوئی سایہ کانپا، کچھ آواز بھی آئی پھر اس کی سماعت نے سنا۔ ''تج دو۔۔۔ تج دو۔۔۔ تج۔۔۔ عجیب سی سراسیمگی کے زیر اثر اس نے پاس کے کھڑے اپنے ایک ساتھ کو بازو سے پکڑ کر احتیاط سے پوچھا تم نے کچھ سنا؟''

''کیا؟'' اس کے ساتھی نے تعجب سے پوچھا۔

''ادھر دیکھو تو روشن دان کی طرف۔۔۔'' اس کے ساتھی نے روشن دان کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ''کیا؟ کچھ بھی تو نہیں ہے، تم اتنے ڈر کیوں رہے ہو، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟؟''

''بات یہ ہے''۔ اس نے سنبھالا لیا، کیا تم نے ایسے کوئی الفاظ نہیں سنے، جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔۔۔ تج دو، تج دو۔۔۔!

وہ آدمی ہنسنے لگا، تم پاگل ہو گئے ہو، جو الفاظ تم سن رہے ہو وہ تو میں بھی سن رہا ہوں، یہاں سب ہی لوگ سن رہے ہیں۔

''کیا ہے''۔

''یہ ہی جو چیف ایڈیٹر صاحب۔۔''

پھر زور زور سے تالیاں بجیں اور میٹنگ برخواست ہو گئی۔

وہ کچھ زیادہ بدحواس تھا، دن بھر جو اس نے اپنے آپ کو خوشی خوشی کام میں مصروف رکھا تھا، اس کی ساری خوشیاں مٹی میں مل گئی تھیں۔ اس کا رنگ قدرے زرد ہو گیا۔ جب اس نے دفتر کی سیڑھیاں پار کر کے تیز تیز قدموں سے چلڈرن پارک کا فاصلہ طے کیا،۔۔۔ عین اسی وقت وہ دم کٹا کتا اس کے پیچھے لگ گیا۔

اس نے آج کتے کو کچھ نہیں کہا نہ ڈانٹا، نہ دھتکارا مارا پیٹا کچھ نہیں، بلکہ۔۔۔ بلکہ اسے اچھا لگا، یوں محسوس ہوا کہ شہر کی اس بھیڑ میں جو وہ چند دنوں سے اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کر رہا ہے خصوصاً دفتر سے گھر آتے وقت اس کو سارے چہرے اجنبی لگتے ہیں وہاں یہ کتا گویا اس کا صورت آشنا نکل آیا ہے۔

اجنبی اور صورت آشنا کی بات نکلی تو ایک دن بڑا دلچسپ واقعہ ہوا، اس دن جب دفتر سے گھر پہنچا تو اس کی بیوی کچھ ناراض تھی، کیوں؟ کیوں اس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے نیلو کو ناراضگی ہوتی۔ پھر نیلو تو اس سے ناراض ہوتی بھی نہیں تھی۔ آج کیا بات ہوئی بہت منانے سمجھانے پوچھنے پر وہ رو پڑی۔

کل ڈیڈی آئے تھے، کہہ رہے تھے کل بازار میں تم نے ان کو دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں، بات تک نہیں کی۔

میں نے کب؟ کہاں؟ کل تو میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔

وہ تمہیں پکارتے رہے، تم نے ان کی طرف دیکھا بھی بلکہ چند سیکنڈ تک دیکھتے رہے مگر ان کی بات کا جواب نہیں دیا اور اجنبیوں کی طرح ٹل دیئے۔

اسنے گھنٹوں اپنے ذہن پر زور دیا مگر کچھ یاد نہیں آیا۔ کہاں نیلو کے ڈیڈی اسے ملے تھے، کب ملے تھے؟ نیلو کہتی ہے ان کی طرف تکتے رہے اور آگے بڑھ گئے۔ اس دن عثمان نے بھی راہ چلتے اسے روک لیا تھا، کہ سامنے دیکھ کر بھی آگے بڑھ جاتے ہو۔

''نہیں یار۔۔'' اس نے لجاجت سے جواب دیا، معاف کرنا دیکھا نہیں''۔

''یہ دیکھو بے شرمی، سالے دیکھا کیا، دیکھتے رہے، منٹوں اور آگے بڑھ گئے ہو، حرام زادے چشم پوشی کرتے ہو؟

اس نے نیلو کو من وعن یہ واقعہ سنا ڈالا۔ کیوں نیلو ایسا کیوں ہوتا ہے؟

''سوچتے رہتے ہونگے ہر دم''۔ نیلو ہنسی پڑ گیا ہوگا کسی الو کا سایہ۔۔۔

الو کے نام پر وہ چونک گیا۔ الو، ہاں، وہ پرندہ، وہ منحوس پرندے کی شکل بھی الو ہی سے مشابہ تھی۔ اب اسے یاد آیا۔ ویسا ہی گندہ غلیظ مکروہ، ویسی ہی بڑی بڑی گول گول آنکھیں، اور اس طرح قیں ں ں۔۔۔ کرتے وقت اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ یقیناً وہ پرندہ الو ہی ہوگا۔ الو کو کبھی اس نے دیکھا نہیں۔ مگر اس کی ہیئت کا اسے پتہ تھا، وہ پرندہ یقیناً الو ہی ہوگا، الو ہی۔۔۔ الو ہی۔

''اچھا نیلو ذرا یہ بتاؤ تو الو ہوتا کیسا ہے؟'' اس نے کمال سنجیدگی سے یہ سوال اپنی بیوی سے کیا۔ جب وہ اس کے پہلو میں لیٹی اس کا بوسہ لینے کے لیے جھک رہی تھی اس نے انگلیاں بڑھا کر انہیں روک دیا تھا۔ نیلو رک گئی۔ اس کے دونوں جاں بلب ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔

''کیوں نیلو کیسا ہوتا ہے؟''

پھر اس کی بیوی جھلا گئی، وہ اٹھ کھڑی ہوئی توہین کے اثرات سے وہ بے حد بدمزہ ہوئی ذرا دیر بعد وہ زور زور سے چلتی ہوئی واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں آئینہ تھا۔ ''ایسا ہوتا ہے''۔ اس نے اس کے چہرے کے سامنے کر کے کہا اور آئینے کو پلنگ پر پٹک دیا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آئینے کو الماری میں رکھا اور پاس کھڑی بیوی کی کمر میں باہیں ڈال کر اسے منانے لگا ذرا دیر میں وہ

من گئی۔ اسکی بیوی نے اداسی سے کہا کہ وہ آج کل کچھ بجھا بجھا رہنے لگا ہے، شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ نیلو نے بتایا کہ اس میں وہ تپاک وہ گرم جوشی بھی نہیں رہی۔ لگتا ہے وہ اس وقت وہاں ہوتا ہی نہیں۔ کسی اور دنیا کی سیر۔۔۔

کیا بات ہے اس میں اتنی بہت ساری تبدیلیاں کیوں آتی جارہی ہیں۔ کہاں سے آتی جارہی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کل کے مقابلے میں آج وہ سوچنے بہت لگا ہے۔ کیا سوچتا رہتا ہے وہ۔۔۔ خود اسے پتہ نہیں۔ کیوں سوچتا ہے وہ۔ اسے کس بات کی کمی ہے؟؟؟

بہت سارے سوال اس کے ذہن میں گونجتے رہتے اور وہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹا رہتا۔ اسے کس بات کی کمی ہے، خوبصورت پیار کرنے والی بیوی، پھول سا بچہ، ملک کے سب سے اہم اخبار میں ملازمت، اچھی تنخواہ، بلکہ ادھر تنخواہ میں اضافہ بھی۔۔۔۔

کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اصل مسئلہ تنخواہ میں اضافے کا ہی ہے۔ جس دن سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے، یا اضافہ ہونے کی پلاننگ ہوئی ہوگی، اسی دن سے چندنئی نئی باتیں اس کی زندگی میں ظہور پذیر ہونے لگی ہیں۔ اسی دن سے وہ دم کٹا کتا اس کے پیچھے لگ گیا ہے اور اس کے چند دنوں بعد ہی وہ پرندہ نظر آیا۔۔۔ وہ مگر وہ پرندہ، وہ الو، ہاں الو ہی۔ کہتے ہیں جس جگہ یہ پرندہ مطلب ہے الو بسیرا لیتا ہے وہاں نحوست پھیلتی ہے۔ ویرانی برا جنے لگتی ہے۔ الو، پھر املی کا پیڑ، املی کا پیڑ بھی منحوس ہے، اس نے سن رکھا تھا کہ جو شخص مسلسل املی کے سائے تلے بیٹھتا ہے، اسے کوڑھ، جذام ہو جاتا ہے۔ پہلی بار اس نے املی کے پیڑ پر ہی اس پرندے کو دیکھا تھا جس کے بشرے پر ہنسی پھوٹتی تھی۔ بڑی گھنی ہنسی، مگر وہ قیں قیں کی آواز پیدا ہوتی تھی۔۔۔ تو کیا کوئی مصیبت آنے والی ہے، کوئی بربادی پھیلنے والی ہے۔ اس نے اپنے ایک دوست سے سنجیدگی سے پوچھا۔ سچ بتاؤ کیا تم محسوس کرتے ہو کہ۔۔۔ کہ کوئی بربادی آنے والی ہے؟

''کیسی بربادی۔۔۔؟ اس کے دوست نے شراب کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو ایسا نہیں محسوس کرتا، میں تو مزے میں ہوں، میری ساس مرگئی اور تین لاکھ۔۔۔''

تو کوئی بربادی نہیں آنے والی ہے۔ یہ سب اس کا وہم ہے۔ وہ بہت سارے واقعات جو پے در پے اس کی زندگی میں رونما ہوگئے ہیں، جن کے تسلسل کے باعث اس کے ذہن نے خود نتائج اخذ کر لیے ہیں کہ کوئی بات ہونے والی ہے ورنہ حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سبھی خوش وخرم ہیں۔ صرف وہی خواہ مخواہ الجھن کا شکار ہے۔

وہ بھی خوش رہنے کی کی کوشش کرنے لگا۔ یہی ٹھیک ہے وہ اتنا بہت سوچے گا نہیں۔ جا بے جا سوچ ہی کا نتیجہ ہے کہ اس کی زندگی میں بہت سی غلط باتیں راہ پاگئی ہیں۔ غلط باتیں جیسے الو کی آواز پر اس درجہ سوچنا۔ جیسے اپنے عزیزوں کو دیکھ کر بھی آگے بڑھ جانا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے وہ سوچ کی دنیا میں اس قدر کیوں رہتا ہے کہ آس پاس کی چیزوں سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ تو نقصان دہ ہے۔۔۔ نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا۔ ساری خلقت جس بہاؤ میں رواں ہے وہ بھی اسی میں بہے گا، وہ بھی وہی کرے گا!

پھر زندگی معمول پر آنے لگی۔ اس نے سوچنا چھوڑ دیا۔ ایک آزار سے گویا نجات ملنے لگی۔ اچھا ہے جیسے سب لوگ رہتے ہیں وہ بھی رہے گا۔ وہ دن بھر دفتر میں کام کرتا، ہنستا بولتا۔۔۔ شام کو دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں بھی کرتا۔ خوب خوب۔

نیلو مسکرا کر ایک روز کہہ اٹھی۔۔۔

''ہونہہ اتنا بھی کیا چونچلا، لگتا ہے ایکٹنگ کررہے ہیں''۔

وہ دھک سے رہ گیا۔ اس کے رویئے میں فرق آگیا ہے، بناوٹ۔۔۔؟؟

لیکن بہت دیر تک سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی وہ زندگی کو زیادہ شدت کے ساتھ پکڑنے کی کوشش کررہا

ہے خواہش کے بغیر۔۔۔لیکن وہ کیا کرے، نیلو کو پیار نہیں کرتا ہے تب بھی شکایت، یہ بناوٹی زندگی تو اس نے کبھی پسند ہی نہیں کی۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے۔نہیں نیلو غلط سوچ رہی ہے۔یونہی رواداری میں اس نے یہ جملہ کہہ دیا ہے۔۔۔ بناوٹ، تصنع کہاں سے آئے گا۔۔۔وہ تو شروع سے اس بات کے لیے مشہور ہے بلکہ بدنام ہے کہ وہ ہر کام میں بہت کھرا ہے۔۔۔مگر یہ بناوٹ۔اس نے غور کیا۔جب سے اخبار نئے مالک کے ہاتھ میں چلا گیا ہے، اسٹاف کے لوگ بہت خوش رہنے لگے ہیں۔ان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں شاید اس لیے مگر۔۔۔ان کے حرکات وسکنات میں کچھ نئی باتیں بھی راہ پانے لگی ہیں۔

یہ نئی باتیں کیا تھیں؟

اس دن اس نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا۔مگر سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔کوئی نئی بات ضرور تھی جیسے کوئی پانی کا گلاس کسی کو دے تو اس احتیاط سے کہ کہیں گلاس ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔۔۔اسی طرح، جیسے کوئی گلاس تھماتے وقت بھی احتیاط برتے کہ لیتے وقت بھی وہ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

وہ دن بھر یہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔دفتر میں کام کرتے وقت آج پھر اس کا جی نہیں لگا۔۔۔ایک نامعلوم سی خلش اسے تنگ کرتی رہی۔

آج پھر وہ پٹری سے اتر گیا۔

یہ کم بخت الجھنیں۔۔۔اور الجھتے رہنے کا دورہ، ذرا سی بات، اتنا ہی تو نیلو نے کہا تھا کہ پیار کرتے وقت بناوٹ سی۔۔۔"

پھر سلسلہ شروع ہوا تو وہ سوچتا ہی چلا گیا۔۔۔

اس نے ذہن کو جھٹک دیا۔اب وہ کچھ نہیں سوچے گا۔جتنی اوٹ پٹانگ باتیں اس کے اندر کی دنیا میں در آئی ہیں، ان کو اس نے بختی سے روک دیا۔اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ذہن کو اپنی خوبصورت بیوی نیلو اور ایک بچے کے بعد بھی نئی بنی ہوئی چارپائی کی طرف منتقل کر دیا۔اس نے نیلو کی طرف دیکھا نہیں، جو اس کے پہلو والے پلنگ پر سوئی ہوئی تھی۔صرف تصور ہی تصور میں اس کے عریاں جسم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اور یوں کئی منٹ گذر گئے۔اس نے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کیا، اور لگا کہ ایک بوجھ دھیرے دھیرے اس کے وجود پر سے اتر رہا ہے اور کہیں دور سے ننھی ننھی نیند کی پریاں آنکھوں میں براجنے لگی ہیں۔۔۔اور ذرا دیر بعد وہ واقعی سو گیا۔۔۔ گہری نیند۔۔۔اور پھر صبح صادق کے وقت ہی اس کی آنکھ کھلی۔۔!

اب وہ یہی کرتا، جب بھی اس کے خیالات الجھنے لگتے یا اوٹ پٹانگ باتیں اس کو ستانے لگتیں وہ تصور ہی تصور میں نیلو کو عریاں کرتا، اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتا۔۔۔یہ عمل کہیں بھی جاری رہتا، دفتر میں بھی، راہ چلتے بھی اور یوں اسے راحت نصیب ہوتی۔

یہ ٹھیک ہے۔بس یہی طریقہ کارآمد ہے۔جس کے باعث ذہن اذیتوں سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔اس نے اطمینان محسوس کیا۔

رفتہ رفتہ اس کا ذہن شگفتگی محسوس کرنے لگا۔اور رات کو گہری نیند آنے لگی۔خوب گہری اور پیاری نیند۔یہی وہ چاہتا تھا۔ سوچ سوچ کر گھلنے سے کیا حاصل۔ساری دنیا خوش، ہر آدمی اپنے کام کے بعد اپنے بیوی بچوں میں، یار دوستوں میں خوش رہتا ہے۔ اس سے کم تنخواہ پانے والے بھی بلکہ بہت غریب بھی جن کو اکثر فاقے نصیب ہوتے ہیں، وہ بھی مزے میں رہتے ہیں۔جلنے سے کیا فائدہ؟ لیکن ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔یا پھر یہ کہ واقعہ تو بہت معمولی تھا مگر اس نے اہمیت بہت دے دی۔اس فیصلے

کے بعد بھی کہ وہ آئندہ بڑی سے بڑی بات کو بھی کم سے کم اہمیت دے گا۔ یوں بظاہر بہت چھوٹی سی بات تھی۔ شہر کے چوک میں چلڈرن پارک ہے اس کے بیچوں بیچ چبوترے پر لمبے سے پول سے جھنڈا لہرایا کرتا تھا۔ جس کے کنارے کچھ سرخ سرخ نظر آیا۔

چند آدمی غور سے دیکھ رہے تھے۔

سرخی کہاں سے آئی، اور سرخی کیا تھی؟

پھریرے کا کنارا لہو سے تر ہو گیا تھا۔

دفعتاً وہ چونک اٹھا۔ لہو سے کیسے تر ہو گیا؟

وہ آگے بڑھا، اور چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔ جس کے درمیان جھنڈے کا پول گرا تھا۔ واقعی لہو ہی تھا۔ جیتا جیتا لہو۔۔۔

وہ محویت اور خوف سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ دیکھ تو اور بھی لوگ رہے تھے مگر ان کے چہروں پر کسی طرح کا خوف، کسی طرح کا تردد نہیں تھا۔ یوں ہی تماش بینوں والی کیفیت تھی۔

''کیا بات ہو سکتی ہے؟''

ایک آدمی نے پاس کھڑے ایک آدمی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار، کوئی زخمی پرندہ اڑتا اڑتا پھریرے سے لپٹ گیا ہوگا''۔

اسی طرح کی مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔

لیکن وہ سراسیمہ تھا۔ وہ ابھی جھنڈے کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ ٹپ سے ایک قطرہ اس کی ناک کے بانسہ پر گرا۔ دھک سے اس کا کلیجہ اچھل گیا۔ وہ ہڑبڑا کر چبوترے سے اتر آیا۔ اس کا دل دھک دھک بے تحاشہ دھڑکے جا رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کچھ نہیں دیکھا، ایسے کیسے ہو گیا۔ پھریرے کا کنارا خون سے جیتے خون سے تر تھا، لہو میں نہایا تھا۔۔!!

لمبے لمبے ڈگ بھر کر اس نے گھر کی راہ لی، جیسے کوئی اس کو رگیدے چلا آ رہا ہو۔ اس نے پتہ نہیں کس خوف کے زیر اثر پلٹ کر دیکھا، کوئی نہیں تھا، صرف وہ دم کٹا کتا حسب دستور اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ جتنا تیز چل رہا تھا، اتنی ہی تیز کتے کی رفتار تھی۔ اس نے غور کیا کہ ابھی جب اس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا تھا کہ کوئی اور اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ اسی وقت اسی انہماک سے کتے نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔

لیکن پھر اس کے دماغ میں، خون میں لتھڑے ہوئے پھریرے کا کنارا چمک اٹھا۔۔۔ اس کا دل پھر بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ چنانچہ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا گویا پناہ کی تلاش میں اپنے گھر میں داخل ہوا، اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ دم کٹا کتا وہیں باہر دہلیز پر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد، جب اس نے دروازہ کھول کر دیکھا، تو خلاف توقع کتے کو باہر دہلیز پر بیٹھے دیکھ کر اسے تعجب ہوا نہ الجھن، نہ خوف، نہ اطمینان۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔ سکون جیسی کوئی چیز تھی جو اس کے اندر کی دنیا میں پھیلتی جا رہی تھی۔۔۔

اس نے پھر دروازہ بند کیا اور ذرا دیر خاموشی سے کھڑا رہا۔

اس کی بیوی کھڑی اس کی بدحواسی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ جب وہ آنگن عبور کر کے اس کے قریب آیا تو اس نے راستہ روک لیا۔۔۔

''کیا ہوا، ایسے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''کون ہو تم؟۔۔۔ نیلو کہاں ہے؟؟'' وہ غور سے نیلو کا چہرہ تکتا رہا۔

''ارے کیا ہوگیا آپ کو؟'' اس کی بیوی نے حیرت سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔'' آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں میں نیلو ہی تو ہوں''۔

''ارے ہاں۔۔۔ہاں''۔وہ سنبھل گیا۔اپنے حواس میں آ گیا۔'' معاف کرنا نیلو میں نے دیکھا نہیں''۔

''دیکھا نہیں''۔اس کی بیوی نے تعجب سے کہا۔

''کچھ نہیں، چھوڑو اس بات کو''۔اس نے نیلو کی کمر میں پھر بازو حمائل کر دیئے اور اندر کی طرف لے چلا۔''تمہیں آج ایک دلچسپ اور حیرت انگیز بات سنائیں''۔اس نے ضبط کیا۔جذبات اور سراسیمگی کا ریلا جو اسے بہائے لیے جا رہا تھا،اس نے اس پر قابو پا لیا۔اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس واقعے کو وہ نہایت نارمل ڈھنگ سے نیلو کو بتائے گا یوں کہ نیلو سن کر اسے بیوقوف نہ بنائے۔

''کیا بات ہے بتایئے؟'' نیلو کمرے میں آ کر بولی۔''مگر ٹھہریئے پہلے آپ منہ ہاتھ دھو لیجئے ،اتنی دیر میں میں چائے بنا لیتی ہوں''۔

واقعہ سن کر نیلو نے کوئی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔''یہی بات ہے کوئی زخمی پرندہ گزر رہا ہوگا پھریرے سے الجھ گیا۔بس۔۔۔اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' نیلو نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

''اس میں حیرت کی بات ہی نہیں ہے کیا؟۔۔۔'' اس نے نیلو کو زور سے جھٹک دیا۔ہٹو پرے۔۔۔تم کو ہر وقت۔۔۔آٹھ سال شادی کو ہو گئے۔۔۔ جانے دنیا پر کیسی بربادی آنے والی ہے اور تم ہو کہ ،تمہارے دماغ میں ایک ہی بات۔۔۔

نیلو۔۔۔اس کی بیوی چکرا گئی یہ سن کر،ذلت اور کمزوری کے احساس نے اسے رلا دیا۔وہ دانت پیستی، روتی اور بدبداتی دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن اس کو ذرا ندامت نہیں ہوئی۔اس کی بیوی خوبصورت اور محبت کرنے والی بیوی اس سے روٹھ کر چلی گئی،اس نے ذرا سی بات پر اس کو ذلیل کر دیا۔لیکن اس کو ذرا شرمندگی نہیں ہوئی۔

رات کو اس کے کمرے میں نیلو نہیں آئی۔دوسرے کمرے میں اندر سے دروازہ بند کر کے سو گئی اور سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔مگر اس کو ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔

آج تو اس کا ذہن بری طرح پراگندہ تھا۔وہ چارپائی پر خاموش پڑا چھت کی طرف تک رہا تھا،اور اس کا دل خوف اور مایوسیوں تلے نڈھال سا تھا۔اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔اوپر چھت پر ٹکی تھیں۔وہ چارپائی پر پڑا یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی گہرے سیاہ سمندر کی قید میں چپ چاپ پڑا ہو،اور اس کے اوپر سے بھیانک موجیں گزر رہی ہوں،اور بڑے بڑے آبی پرندے بھی جن کی آنکھیں گول گول اور بشرے ہنستے رہتے ہیں۔

خوف سے آنے والے کل کے خوف سے اس کا دل دھڑک کر رک جاتا۔پھر اس نے شدت سے آنکھیں میچ لیں اور بڑی کوششوں کے بعد اپنے آپ کو کالے سمندر کی تہہ سے ابھارا،اور نیلو کے خوبصورت جسم کی تابندگی کو تصور میں جگاتا رہا،اور اس نے اپنے آپ پر احسان کیا کہ اس کا وجود ہلکا پڑ جائے۔اس کے دل پر جو بھاری بوجھ سا ہے وہ ہلکا ہو۔آنکھوں میں نیند کی پریاں بسیرا لیں۔۔۔رات بہت بیت گئی تھی۔باہر اور اندر ہر طرف سناٹا مسلط تھا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا، کمرہ خالی تھا، دیواریں بڑی گہری چپ سادھے کھڑی تھیں۔آج۔۔۔نیلو بھی نہیں تھی،دوسرے کمرے میں روتے روتے سو چکی تھی، پھر کہیں سے سنسناتا ہوا سمندر اسے کے وجود کے اوپر سے گزرنے لگا۔بڑی ہیبت ناک

موجیں اس کو روندتی جا رہی تھیں۔۔۔پرندہ۔۔۔دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔بڑا گہرا اندھیرا تھا۔وہ شاید سو گیا تھا۔۔۔نہیں،شاید نہیں سویا تھا۔مگر کچھ یوں محسوس ہوا گویا نیند اور بیداری کے درمیان کہیں کھو گیا تھا کچھ دیر کے لیے،لیکن اب کمرے میں سخت اندھیرا تھا۔ صرف کھڑکی سے چاند کی ہلکی چاندنی داخل ہو رہی تھی۔۔۔اس نے کھڑکی کی جانب غور سے دیکھا،دیر تک دیکھتا رہا۔۔۔

وہ کیا دیکھ رہا ہے؟

اس کی چھٹی حس کو کس شے کی تلاش تھی؟

اس کے اپنے سوالوں کے جواب کون دیتا؟وہ خود سے سوال کرتا،اس نے آنکھیں بند کر لیں۔گہرا اندھیرا جس میں ٹوٹتی بکھرتی سفید لکیریں پپوٹے کے اندر جلدی جلدی پھیلتی،دوڑتی کوئی شبیہہ بناتی ہوئی لکیریں۔۔۔یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟

دفعتاً اس کے کان میں ٹوٹے ٹوٹے الفاظ۔۔۔پھر اس نے محسوس کیا جیسے سامنے والی کھڑکی کے باہر کسی پرندے کے پر بہت دھیمے سے پھڑ پھڑائے۔اس نے آنکھیں کھول دیں۔اور اس کھڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔۔۔نہیں،وہاں کچھ نہیں تھا۔۔۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں،اور تصورات کا رخ نیلو کے خوبصورت جسم۔۔۔عین اسی وقت اس کے کان میں وہی الفاظ گونجے۔۔۔مگر اس بار ذرا واضح وہی الفاظ تھے۔بالکل وہی۔۔۔وہی۔۔۔۔

وہ سمجھ گیا۔اس نے پلٹ کر دیکھا تو کھڑکی پر کوئی کالی چیز دھیرے دھیرے متحرک تھی۔۔۔پھر پھڑ پھڑائے پھر اس کے کانوں میں آواز آئی۔۔۔

''تج دو۔۔۔تج دو''۔

اس نے کھڑے ہو کر چاروں اور دیکھا اور جلدی سے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں،لیکن پھر وہی آواز آئی،جلتے ہوئے سلگتے ہوئے انگارہ صفت الفاظ۔۔۔اس کی آنکھیں پھر ادھر مڑ گئیں،کھڑکی پر کوئی پرندہ۔۔۔

اس نے پھر آنکھیں بند کیں اور زور سے میچ لیں،پھر کان میں جو انگلیاں دے رکھی تھیں،انہیں سخت کر لیا،پھر ہر بار وہ بدحواسوں کی طرح آنکھیں کھولتا،کھڑکی کی جانب دیکھتا،کان کی انگلیاں ڈھیلی کرتا،پھر سخت کر لیتا۔۔۔یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔۔۔تب وہ تھک گیا۔وحشت سے،بےبسی سے،اس نے چاروں طرف دیکھا،وہاں کوئی نہیں تھا،نیلو بھی نہیں تھی۔۔۔تنہائی، تنہائی،اس کا جی بھر آیا،اور وہ رو پڑا۔۔۔روتا رہا۔

وہ رو رہا تھا اور اس کے کان بج رہے تھے۔لگاتار،وہی منحوس الفاظ گونج رہے تھے۔اور جب وہ رو رہا تھا،اس نے دیکھا وہ دم کٹا کتا جسے وہ باہر چھوڑ آیا تھا،اور اندر آ کر دروازہ بند کر لیا تھا۔۔۔اس کے لحاف میں موجود تھا۔

وہ کتا تقریباً اس سے چمٹا،اس کے گال پر اپنا تھوتھنا رکھے،اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دھیرے دھیرے چاٹ رہا تھا۔

۔۔۔اور اس کے کان بدستور ان الفاظ سے گونج رہے تھے۔۔۔تج دو۔۔۔تج دو!!

☆☆☆

آنکھیں

قاضی عبدالستار

۔۔۔طاؤس کی غم ناک موسیقی چند لمحوں بعد رک جاتی ہے۔ ''سبحان اللہ جہاں پناہ! سبحان اللہ''۔
بیگم! بھاری اور رنجور آواز میں ''جہاں پناہ! اگر ہندوستان کے شہنشاہ نہ ہوتے تو ایک عظیم مصنف، عظیم شاعر، عظیم مصور اور عظیم موسیقار ہوتے''۔
''یہ تعریف ہے یا غم گساری! بہر حال جو بھی ہے مابدولت کے بے قرار دل کو قرار عطا کرنے کی جسارت کرتی ہے''۔
''نصیب دشمناں، کیا مزاج عالم پناہی۔۔۔؟''
''ہندوستان کے تخت پر جلوس کرنا آسان ہے، لیکن سچ بولنا دشوار ہے، دشوارتر''۔
''نور جہاں بیگم کے سامنے بھی عالم پناہ؟''
بیگم! ''ظل الٰہی کو جو ارشاد فرمانا ہے، ارشاد فرما دیا جائے، پھر جلاد کو حکم دیا جائے کہ ہمارے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر الفاظ پر مہریں لگا دے''۔
''خوب، جوانی آنکھیں قبول کر چکی۔ بڑھاپا سماعت کو سولی چڑھا دے''۔
''کنیز کچھ سمجھنے سے قاصر ہے''۔
آپ کے نام کا سکہ روئے زمین کی سب سے شاندار سلطنت کے بازار کا چلن ہے۔ ہندوستان کی مہر حکومت آپ کی انگشت مبارک کی زینت ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ جہاں گیر ایک جام کے عوض تاج ہندوستان آپ کو عطا کر چکا ہے۔ لیکن یہ کون جانتا ہے کہ جہاں گیر آج بھی اپنی محبت کی تکمیل کا محتاج ہے۔
پوری کائنات کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے والی محبت اس ایک چھوٹے سے لمحے کی محتاج ہوتی ہے جب عاشق اپنے سینے کا آخری راز محبوب کے سینے میں منتقل کر دیتا ہے۔ آج کون سی رات ہے بیگم؟
شوال کی چودھویں عالم پناہ۔
بہت خوب، آج کی رات اس لیے اتاری گئی کہ مابدولت آپ کے سر پر تکمیل محبت کا تاج رکھ دیں۔
ظل الٰہی! کیا روئے زمین پر کوئی عورت ہے۔ جس کے ہاتھ میں خاتم سلیمانی ہو اور سر پر محبت کا تاج؟
نور جہاں بیگم! رام رنگی کا ایک جام بنائیے اور اس طرح ہونٹوں سے لگا دیجئے کہ جام مابدولت کی آنکھوں سے دور رہے، ایک عمر ہونے کو ہوئی کہ جام میں آنکھیں نظر آ رہی ہیں، وہی آنکھیں۔ وہ بے پناہ آنکھیں۔
جہاں پناہ طبیب شاہی کی مقرر کی ہوئی مقدار شراب نوش فرما چکے۔
یہ کیسی شہنشاہی ہے کہ ایک جام کو ترستی ہے؟ بیگم! ہماری محبت کے جشن تاج پوشی کے تصدق میں ایک جام عطا کر دیجئے۔
اتنی عزت کہ دیجئے جہاں پناہ کہ نور جہاں اس بار عظیم کی متحمل نہ ہو سکے۔
(ایک ہی سانس میں جام خالی ہو جاتا ہے)
بیگم۔

کنیز ہمہ تن گوش ہے عالم پناہ۔

بیگم! زندگی کا صرف ایک نام ہے، جوانی اور سلیم کی جوانی؟ دولت مغلیہ کے اولین صاحب عالم کی جوانی؟ فردوس مکانی بابر بارہ برس کی عمر میں بادشاہ ہوئے۔ جنت مکانی ہمایوں میدان جنگ میں تلوار چلاتے جوان ہوئے۔ عرش آشیانی اکبر اپنے دادا جان کی طرح بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے، اور اکبر اعظم کی ولی عہدی سلیم کا مقدر ہوئی۔ عرش آشیانی نے جب شراب پر پہرے بٹھا دیئے تو مابدولت کے جان نثار اپنی بندوقوں کی نالیوں میں شراب بھر کر لاتے اور پیمانے لبریز کر دیتے، اور نظام ہضم بارود سے سینچی ہوئی شراب اس طرح ہضم کر لیتا جس طرح آج دوا کا پیالہ ہضم نہیں ہوتا۔ اس بے پناہ جوانی اور بے محابا شہزادگی کا اثر تاج داری پر طاری رہا، بیگم۔

ہاں بیگم! دوسرا سال جلوس تھا۔ مابدولت مینا بازار میں جلوہ افروز تھے کہ ایک لڑکی نے پان پیش کیے۔ گلوریوں کی نزاکت اور نفاست پسند خاطر ہوئی۔ ہاتھوں پر نظر پڑی تو اور ہی عالم نظر آیا، جیسے نور کے سانچے میں ڈھال دیے گئے ہوں۔ نگاہ بلند ہوئی، معصوم وحشی آنکھوں میں ڈوب گئی اور محسوس ہوا جیسے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ جب ہوش آیا، وہ نگاہ نیچی کیے لرز رہی تھی اور دونوں ہاتھوں میں طشت کانپ رہا تھا۔ مابدولت گردن سے ہار اتار رہے تھے کہ اس کی آواز طلوع ہوئی، جیسے کشمیر کے برف پوش پہاڑوں پر سورج کی کرن تڑپتی ہے۔

''تحفہء درویش کی قیمت کیا عالم پناہ!''

بے شک، تحفہء درویش قیمت سے بلند ہوتا ہے۔ یہ موتی اس نفاست اور نزاکت کی داد ہیں جو ان گلوریوں میں مجسم کر دی گئی ہے۔ ہم آگے بڑھے تو عرفان ہوا کہ پیچھے رہ گئے۔ پہلی بار قلعہ معلا ویران معلوم ہوا۔ اکبر اعظم کے جانشین کی بارگاہ خالی محسوس ہوئی۔ پہلی بار مابدولت کو غربت کا تجربہ ہوا۔ ایسی غربت جو دل مٹھی میں دبوچ کر ایک ایک قطرہ لہو نچوڑ لیتی ہے اور جب ہم نے چاہا کہ دل کی ویرانی شراب سے شاداب کر لیں تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ شراب نشے سے عاری ہو چکی۔ دیر تک شیشے خالی ہوتے رہے لیکن دل کا خلا پر نہ ہو سکا۔

''پھر جہاں پناہ؟''۔

پھر مابدولت کے ہاتھ نے گھنٹہ بجادیا۔ چوب دار کے بجائے محرم خاں کورنش ادا کر رہا تھا۔ ابھی اس کی بے ادب حاضری پر غور فرما رہے تھے کہ معروض ہوا، پان پیش کرنے والی صاحب زادی کا نام صائمہ خاتون ہے جو بخارا کے شیخ السلام کی پوتی اور جلوہ دار شیخ عرب کی بیٹی ہیں، ان کا مکان عرب کی سرائے۔

''محرم خاں!''

''ظل الٰہی''۔

''یہ قیمتی معلومات کس کے حکم پر فراہم کی گئیں؟''

زبان مبارک سے نازل ہونے والے احکام کی تکمیل ہر بندہ درگاہ کا فرض ہے لیکن محرم خاں جیسے مقرب بارگاہ کے منصب کا حق ہے کہ وہ عالم پناہ کی چشم و ابرو کی زبان سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو۔

جہاں گیری چشم و ابرو کی زبان سمجھنا ایک نادر علم ہے لیکن اس کا اظہار اس سے زیادہ ہنر اور اس ہنر کا غلط استعمال بے داد مستوجب۔

''خداوند''۔

مابدولت نے تمہارا قصور معاف کیا اور حکم دیا کہ خلعت ہفت پارچہ مع زرو جواہر کے ساتھ نواب صائمہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہو اور پیام دو کہ جشن سال گرہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ ہر چند کہ ابھی رات کی زلف کمر تک بھی نہ پہنچی تھی، ہم بے طرح انتظار فرما ہو چکے تھے۔

کتنی خوش نصیب تھی صائمہ بیگم کہ عالم پناہ اس کے منتظر تھے۔ کتنی بدنصیب تھی صائمہ بیگم کہ جہاں پناہ کی حضوری سے محروم تھی۔

تمام رات وہ آنکھیں ہماری آنکھوں کے سامنے مجرا کرتی رہیں۔ جن کی سیاہی میں ابدالآباد تک تمام مہجور عاشقوں کی سیہ بختی کا جوہر کھینچ کر انڈیل دیا گیا تھا، جن کی تاب کے سامنے سمندروں کے تمام موتیوں کی آب پانی پانی تھی۔

سبحان اللہ، اگر ملک الشعرا یہ تشبیہ سن لیتا تو خجالت سے ڈوب ڈوب جاتا۔

وہ رات زندگانی کی سب سے بھاری رات تھی۔

کیا اس رات سے بھی بھاری جہاں پناہ! جس کی صبح اکبر اعظم کی تلوار طلوع ہونے والی تھی!

ہاں بیگم! اس رات کی دل داری کے لیے پچاس ہزار تلواریں سلیم کی رکاب میں تڑپ رہی تھیں، اور صاحب عالم کے منہ سے نکلا ہوا ایک فقرہ اکبری تلوار کو غلاف کر سکتا تھا لیکن اس رات کی غم گساری کے لیے نورالدین محمد جہاں گیر کے پاس ایک دامن و آستیں کے سوا کچھ نہ تھا۔

کاش اس رات کی خدمت گزاری کنیز کا مقدر ہوئی ہوتی۔

پھر سورج کی کرنیں سلام کو پیش ہوئیں۔ مابدولت درشن جھرو کے پر نزول اجلال کے اہتمام میں مصروف تھے کہ فریادی نے زنجیر ہلا دی، صائمہ بیگم اس طرح باریاب ہوئی گویا وہ کشور ہندوستان کے قلعہ معلا میں نہیں، کسی غریب عزیز کے گھر میں قدم رنجہ فرما رہی ہو، نقاب اٹھتے ہی محسوس ہوا جیسے داروغہ چاندنی خانہ نے قلعہ معلا کی تمام روشنیاں ایک شاہ برج میں انڈیل دی ہوں۔ استفسار پر اس طرح مخاطب ہوئی جیسے وہ جہاں گیر سے نہیں، اپنی ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے سوالی سے مخاطب ہے۔ اس کی خطابت نے یقین دلا دیا کہ مابدولت نے محرم خاں کو سفیر بنا کر غلطی کا ارتکاب نہیں، جرم سرزد فرمایا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ بھری دو پہر پر رات غالب آ گئی ہے۔ وہ جا چکی تھی۔ اس کے غروب ہوتے ہی محرم خاں باریاب ہوا۔ عرض کیا گیا کہ خلعت نامقبول اور دعوت نامنظور ہوئی۔

نجابت اور شرافت پر اتنا غرور؟ ایسا تجبر؟ معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ ایک جام اور عنایت ہو، زبان خشک ہونے لگی۔

(ایک ہی سانس میں آبگینہ ختم ہو جاتا ہے)

جہاں پناہ!

گوش گزار کیا گیا کہ ارم آشیانی علیا۔ حضرت مریم زمانی درود مسعود فرما رہی ہیں، سلام کے جواب میں ارشاد ہوا کہ شیخو بابا کو اس مغرور لڑکی میں کیا نظر آ گیا کہ مغل جبروت وجلال کی بازی لگا دی گئی۔ مابدولت سکوت فرما رہے۔ جب سکوت حد ادب سے گزرنے لگا تو علیا حضرت نے سنا کہ صائمہ بیگم سر سے پاؤں تک کرشمہ الٰہی ہے لیکن آنکھوں کی بے پناہی زمین و آسمان کے درمیان اپنی مثال نہیں رکھتی۔ سورج شاہ برج سے رخصت کی اجازت مانگ رہا تھا کہ علیا حضرت ثانی کا غلغلہ بلند ہوا۔ خوش خبری سنائی گئی کہ سفارش خاص پر نواب صائمہ بیگم رات کے کسی پہر قلعہ مبارک میں جلوس فرمائیں گی۔

''ظل الٰہی نے یہ خوش خبری کس طرح قبول فرمائی؟''

مابدولت نے غسل فرمایا، نیا لباس زیب تن کیا، نئے جواہر سے آراستہ ہوئے اور خاصہ تناول فرمایا۔ داروغہ چاندنی خانہ کو

حکم ہوا کہ ارک معلا کا چپا چپا روشنی میں غرق کر دے۔

دراوغہ بیوتات کو فرمان ملا کہ ذرہ ذرہ مشک و عنبر سے معطر کر دے اور داروغہ جواہر خانہ کو پروانہ پہنچا کہ شاہ برج کے طاق جواہر سے لبریز کر دے۔ قلعے دار کو مطلع کیا گیا کہ نواب صائمہ بیگم بہادر کی سواری کو نوبت خانے کی سیڑھیوں تک آنے کی اجازت عطا ہوئی۔ احکام کی تعمیل ہو چکی تھی اور مابدولت انتظار کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ ظل اللہ کے دہن مبارک سے انتظار کا لفظ عطا ہر کر کنیز کی سماعت پر اس طرح گرتا ہے جیسے طاؤس پر عقاب۔

مقربین بارگاہ نے تہنیت دی کہ حضرت نواب صائم بیگم بہادر کی سواری نوبت خانے کی سیڑھیوں پر لگا دی گئی۔ چوب داروں کی آواز پر ملاحظہ فرمایا کہ وہ سیاہ سوتی برقع پر بھاری نقاب ڈالے، دونوں بازوؤں پر عورتوں کا سہارا لیے ہاتھوں میں ایک سرخ پیالہ سنبھالے آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ نقیب خاص کی آواز پر عورتوں نے اس کے بازو چھوڑ دیئے اور وہ کورنش ادا کرنے کے بجائے گھٹنوں پر گر پڑی اور کانپتے ہاتھوں نے دراز ہو کر پیالہ تخت کی طرف بڑھا دیا۔ مابدولت تخت سے اتر پڑے، دست گیری عطا کرنے کی بجائے اس کی نذر قبول کی۔ پیالہ ہاتھ میں آیا تو بیگم! جیسے آنکھوں سے بصارت چلی گئی۔

جہاں پناہ!

"پیالے میں اس کی آنکھیں تڑپ رہی تھیں"۔

"ظل الٰہی"۔

ہاں بیگم! اس کی آنکھوں کے دیدے پیالے میں رکھے تھے۔ شہنشاہی کی پوری عمر میں آداب شہنشاہی کبھی اتنے بھاری معلوم نہیں ہوئے تاہم انہوں نے اس کا نقاب اٹھا دیا۔ آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ زرد سنگ مرمر سے تراشا ہوا چہرہ ساکت تھا۔ پائے مبارک میں جیسے کسی نے زنجیریں ڈال دیں۔

نصیب دشمناں۔

صرف اس قدر ادا ہو سکا کہ نواب صائمہ بیگم نے یہ کیا کر لیا؟ آواز آئی، شہنشاہوں کی پسند غریبوں کو زیب نہیں دیتی۔ ناچیز کی آنکھیں جہاں پناہ کو پسند آ گئیں، نذر میں گزار دی گئیں۔ کل کی گلوریوں کی طرح قبول فرما لیجئے۔

ظل الٰہی۔

جب بھی تنہائی باریاب ہوتی ہے، جہاں گیر کی پیٹھ پر اس آواز کے تازیانے برسنے لگتے ہیں۔ آنکھوں میں وہ زندہ دیدے انگاروں کی طرح دہکنے لگتے ہیں۔ کاش وہ زندہ رہتی تو جہاں گیری محل اسے تفویض کر دیا جاتا۔ اس کی دل داری اور دل آسانی کی جاتی تو شاید اس چوٹ کی تڑپ کم ہو جاتی بیگم!

جہاں پناہ!

ایک جام اور عطا کر دیجیے کہ سماعت جلنے لگی ہے اور بصارت دہکنے لگی ہے۔

☆☆☆

اور عائشہ آ گئی

قدرت اللہ شہاب

کھوکھرا پار کے مقام پر سرحد عبور کرتے ہوئے ہندوستانی کسٹم چوکی والوں نے عبدالکریم اور اس کی بیوی کو تو جانے دیا۔ لیکن ان کی تین چیزوں کو مزید تحقیق کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ تین چیزیں سنگر سوئنگ مشین، ہرکولیس کا بائیسکل اور عبدالکریم کی جواں سال بیٹی عائشہ پر مشتمل تھیں۔ دو دن اور ایک رات کی منت سماجت کے بعد بہ ہزار دقت جب یہ چیزیں واپس ملیں تو سلائی کی مشین کے کئی کل پرزے غائب تھے۔ بائیسکل کی گدی، ٹائر اور ٹیوبیں ندارد تھیں اور عائشہ۔۔۔۔۔ خیر، یہ بھی غنیمت تھا کہ اگر اللہ نے چاہا تو سلائی کی مشین کے کل پرزے بھی نئے ڈلوا لیے جائیں گے۔ بائیسکل کی گدی، ٹائر اور ٹیوبیں بھی اور آ جائیں گی اور عائشہ۔۔۔۔؟ عائشہ کا بھی اللہ مالک ہے۔ عبدالکریم کو جو ایمان غیب کی پراسرار طاقتوں پر تھا۔ اس میں آج معمول سے بہت زیادہ کشف کی کیفیت جھلک رہی تھی۔

جب وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، تو مقامی والنٹیروں نے انہیں گوشت کے سالن کا ایک پیالہ اور چار تازہ تازہ نان کھانے کو دیئے۔ سفید سفید، نرم نرم، سوندھے سوندھے نان دیکھ کر عبدالکریم نے اپنی بیوی کی ران پر چوری سے چٹکی بھری اور سرگوشی میں کہا ''میں نے کہا عائشہ کی ماں دیکھتی ہو، کیا خالص اور کرارے نان ہیں۔ اس سال بمبئی میں کیا پڑا تھا؟ چار برس سے ستھرے آٹے کی صورت کو ترس گئے تھے۔ واہ، کیا مکھن کے پیڑے پیدا کیے ہیں میرے مولا نے''۔

جب وہ گاڑی کے ڈبے میں سوار ہوئے تو کچھ مسافر اپنے جان پہچان لوگوں کے ساتھ علیک سلیک میں مشغول تھے۔ ''اسلام علیکم''، ''وعلیکم سلام''۔ اسلام وعلیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ''۔۔۔۔ عبدالکریم نے پھر اپنی بیوی کو جھنجھوڑا۔ ''عائشہ کی ماں سنتی ہو؟ کیا دھوم دھڑکے کے ساتھ دعا سلام ہو رہی ہے۔ واہ، اسلام کی تو شان ہی اور ہے۔ سالی بمبئی میں تو بندے ماترم بندے ماترم سنتے کان پک گئے تھے۔ خدا کی قسم آج تو میرا سینہ بھی جاری ہو رہا ہے۔ واہ، کیا بات ہے میرے مولا کی''۔ عبدالکریم نے اپنے اغل بغل بیٹھے ہوئے مسافروں کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے ہاتھ ملانا اور گونج گونج کر اسلام علیکم کہنا شروع کر دیا۔ اگر اس کی بیوی اسے پکڑ کر واپس نہ بٹھا لیتی تو نہ جانے وہ کب تک اس کارروائی میں لگا رہتا۔

جب گاڑی چلی تو عبدالکریم نے بڑے انہماک کے ساتھ اس کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کو سنا۔ باہر تار کے کھمبوں سے حساب لگا کر ٹرین کی رفتار کا جائزہ لیا۔ ''واہ'' اس نے اپنی بیوی کو پھر جھنجھوڑا۔ ''طوفان میل کیا چیز ہے اس کے سامنے۔ مزا آ گیا گاڑی میں بیٹھ کر۔ عائشہ کی ماں، تم بھی اپنی تسبیح نکال لو اور کھلم کھلا اطمینان سے بیٹھ کر اللہ کا نام لو۔ کیا مجال ہے کہ کوئی پیچھے سے آ کر تمہاری گردن کاٹ لے''۔

ایک اسٹیشن کے بعد دوسرا اسٹیشن آتا گیا۔ گاڑی رکتی اور چلتی رہی، مسافر اترتے اور سوار ہوتے گئے۔ عبدالکریم کھڑکی سے منہ باہر لٹکائے اپنے ماحول کو اپنے دل، سینے اور آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔ صاف ستھری وردی والا گارڈ، جس کے سر پر جناح کیپ، ہاتھ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں اور منہ میں سیٹی تھی پلیٹ فارموں پر چیلوں کی طرح جھپٹتے ہوئے قلی۔ بھنبھناتی ہوئی مکھیوں سے لدے ہوئے مٹھائیوں اور کھانے کے خوانچے، باہر حد نگاہ تک پھیلے ہوئے میدان، اکا دکا گاؤں کے کچے پکے مکانوں سے نکلتا ہوا دھواں، جوہڑوں پر پانی بھرتی ہوئی، کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں، گرد و غبار میں اٹے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے آسمان کی طرف منہ

اٹھا اٹھا کر روتے ہوئے کتے، بلیاں، گدھ، کہیں کہیں کسی گائے یا بیل یا بھینس کی سڑی ہوئی متعفن لاش۔۔۔۔

جب حیدر آباد کا اسٹیشن آیا، تو سب سے پہلے عبدالکریم کی نگاہ ایک رنگین بورڈ پر پڑی، جس پر ایک دل ہلا دینے والی مار کٹائی سے بھرپور فلم کا اشتہار تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسی پلیٹ فارم پر کچھ سپاہی دس بارہ ملزموں کو گھیرے میں لیے کھڑے تھے اور ایک مجسٹریٹ صاحب کرسی پر ڈٹے بر سر عام عدالت لگائے بیٹھے تھے اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کو دھڑا دھڑ جرمانے کی سزا سنا رہے تھے۔ سرکار کا یہ رعب داب دیکھ کر عبدالکریم بڑا متاثر ہوا اور اس نے حسب معمول اپنی بیوی کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کے لیے اس کی ران پر چٹکی لی۔ ''عائشہ کی ماں انتظام ہو تو ایسا ہو۔ سالی بمبئی میں کسی ٹکٹ بابو کی مجال ہے کہ بغیر ٹکٹ والوں کی روک ٹوک کرے۔ واہ، حکومت کا سلیقہ بھی مسلمان کے خون میں ہی ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ لالہ لوگوں کے بس کا نہیں ہے۔۔۔''

عائشہ کی ماں بڑی دلجمعی سے سیٹ پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی گٹھڑی سے ایک ہزار ایک منکوں والی تسبیح نکال لی تھی اور اب بڑے انہماک سے اس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کا ورد کرنے میں مشغول تھی۔

''عائشہ بیٹی''۔ عبدالکریم نے اپنی بیٹی کو پکارا۔ ''دیکھتی ہو اپنی اماں کے ٹھاٹھ۔ واہ کیا بات ہے اپنے وطن کی بیٹی، اس کالے صندوق سے میری ٹوپی بھی تو نکال دو ذرا۔ اب یہاں کس سالے کا ڈر ہے''۔

عائشہ نے میکانکی طور پر صندوق کھولا۔ اور ٹوپی نکال کر اپنے باپ کے حوالے کی۔ یہ ایک پرانی سرمئی رنگ کی جناح کیپ تھی، جسے پہن کر عبدالکریم کسی وقت بھنڈی بازار کے پرجوش جلسوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب چار سال سے یہ ٹوپی صندوق میں بند تھی۔ اور اس پر لگا ہوا نکل کا چاند تارا زنگ آلود ہو کر ٹوپی کی رنگت کے ساتھ مل جل گیا تھا۔

ٹوپی اوڑھ کر عبدالکریم سینہ تان کر بیٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر اڑتی ہوئی گرد کو دیکھنے لگا۔ عائشہ بھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک اکتائی ہوئی بیزار نگاہ، جس کے سامنے کسی منزل کا نشان نہ ہو۔ وہ بار بار کوشش کرتی تھی کہ دل ہی دل میں دعائے گنج العرش کا ورد کرے۔ اس دعا نے اس کی بہت سی مشکلیں حل کر دی تھیں۔ لیکن آج اس دعا کے الفاظ اس کے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتے تھے اور زبان تک نہ پہنچتے تھے۔ اس کا دل بھی اندر ہی اندر پکار رہا تھا کہ اب یہ عظیم الاثر دعا بھی اس کی مشکل آسان نہ کر سکے گی۔ اب وہ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں خدا کی خدائی بھی چارہ ساز نہیں ہوتی۔ توبہ، یہ تو بڑا کفر ہے۔ خدا کی ذات تو قادر مطلق ہے۔ اگر وہ چاہے تو گردش ایام کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دے اور زمانے کو از سر نو اس لمحے شروع کر دے۔ جب عائشہ ابھی کھوکھراپار کے قریب ہندوستانی کسٹم چوکی پر نہ پہنچی تھی۔۔۔۔

کراچی پہنچ کر سب سے پہلا مسئلہ سر چھپانے کی جگہ تلاش کرنے کا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی عبدالکریم نے اپنا سامان اسٹیشن کے باہر ایک فٹ پاتھ پر جما دیا اور عائشہ اور اس کی ماں کو وہاں بٹھا کر مکان کی تلاش میں نکل گیا۔ کچھ رات گئے جب وہ لوٹا، تو دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بہت تھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر بشاشت اور اطمینان کے آثار جھلکتے تھے۔

''عائشہ کی ماں''۔ عبدالکریم نے فٹ پاتھ پر پاؤں پسار کے کہا'' ہماری کراچی کے سامنے سالی بمبئی کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ تمہارے سر کی قسم! ایسے ایسے عالیشان محل کھڑے ہیں کہ نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ ایک سے ایک بڑھ کے سیٹھ بھی موجود پڑا ہے۔ تمہاری قسم ایک ایک سیٹھ بمبئی کے چار چار مارواڑیوں کو اپنی جیب میں ڈال سکتا ہے اور پھر موٹریں؟ کاہے کو سالی بمبئی نے ایسی لچھے دار موٹریں دیکھی ہوں گی۔ پاس سے گزر جائیں، تو سمجھو جیسے کسی نے ریشم کا تھان کھول کر سڑک پر بچھا دیا ہے۔ اب ذرا ٹھکانے سے بیٹھ جائیں تو تمہیں بھی گھما پھرا لاؤں گا۔ طبیعت خوش ہو جائے گی کراچی کی بہار دیکھ کر''۔

''مکان کا کچھ ہوا؟'' عائشہ کی ماں حقیقت کی طرف آئی۔

''اجی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب انتظام ہو جائے گا۔ آج میں نے گھوم پھر کر پگڑی کے ریٹ دریافت کر لیے ہیں۔ خدا کی قسم، عائشہ کی ماں، سالی بمبئی کراچی کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں۔ پگڑی کے جو گنڈے دار ریٹ یہاں اٹھتے ہیں بے چارے بمبئی والوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے''۔

عبدالکریم کا اب یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ علی الصبح منہ اندھیرے چل کھڑا ہوتا۔ کبھی بس میں بیٹھتا، کبھی ٹرام میں، کبھی رکشہ پر، کبھی قیدل، کیاڑی، کلفٹن، بندر روڈ، صدر، فریئر پارک، اسمبلی ہال، چیف کورٹ، جیل، پیرالٰہی بخش کالونی، خداداد کالونی، ناظم آباد، منگھو پیر، قائداعظم کا مزار۔۔۔ کوئی مقام ایسا نہ تھا جس کا اس نے بنظر غائر جائزہ نہ لیا ہو۔ اور کوئی جائزہ ایسا نہ تھا جس نے اس کے خون کی گردش تیز اور اس کے دل کو شاد نہ کیا ہو۔ اور عبدالکریم کو کراچی کے فقیر بھی بڑے نجیب الطرفین نظر آئے تھے جو ماچس کی ڈبیاں اور اخبار بیچ بیچ کر بڑی خوش اسلوبی سے بھیک مانگتے تھے۔ بمبئی کی طرح نہیں کہ ایک سے ایک بڑا مشٹنڈا اٹھ لیے پھرتا ہے اور بھیک یوں مانگتا ہے جیسے دھمکی دے کر قرض وصول کر رہا ہو!

ایک روز وہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا۔ نمازیوں کا بہت ہجوم تھا۔ مصر، شام، عراق، حجاز اور ایران سے بڑے بڑے لوگ ایک کانفرنس کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے پاکستان کے متعلق بڑی شاندار تقریریں کیں۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔ لوگ اٹھ اٹھ کر ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ گلے ملنے لگے اور چاروں طرف جوش و خروش کا ایک عجیب عالم چھا گیا۔ یہ سماں دیکھ کر عبدالکریم کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بہنے لگے اور جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں شکرانہ کے دو رکعت نفل ادا کیے۔

بمبئی میں عبدالکریم کے پاس بھنڈی بازار کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھولی تھی۔ ایک تاریک سا، گھناؤنا سا کمرہ، نہ کوئی برآمدہ، نہ صحن، نہ تازہ ہوا، نہ دھوپ اور پھر ہر مہینے پورے ساڑھے دس روپے کرایہ کے ٹھیک کیم کو ادا نہ ہوں تو سیٹھ کے گماشتے کی گھرکیاں اور دھمکیاں الگ۔ لیکن اس کے مقابلے میں اب کراچی میں زندگی بڑے مزے سے بسر ہوتی تھی۔ جس فٹ پاتھ پر اس نے پہلے روز اڈا جمایا تھا اب وہاں کوئی بارہ فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی جگہ گھیر کر اس نے دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی لکڑی کے تختے جوڑ کر اور پرانی بوریوں کے پردے تان کر ایک چھوٹی سی کٹیا بنالی تھی۔ کھلی ہوا تھی۔ دھوپ اور روشنی بے روک ٹوک آتی جاتی تھی۔ پاس ہی بجلی کا کھمبا تھا۔ جس کے بلب کی روشنی عین اس کے کمرے پر پڑتی تھی۔ پانی کا نل دور نہ تھا اور پھر نہ کرائے کا جھگڑا، نہ ہر مہینے سیٹھ کے گماشتے کی چیخ، اتفاق سے آس پاس کے ہمسائے بھی شریف لوگ تھے اور ان سب کی آپس میں بڑے اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔

بمبئی میں عبدالکریم نے بہت سے کاروبار بدلے تھے۔ اخیر میں جب کانگرسی حکومت نے امتناع شراب کا حکم لگایا، تو عبدالکریم کے لیے ایک مستقل ذریعہ معاش کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایکسائز کے عملے، دیسی شراب کشید کرنے والوں اور بغیر پرمٹ کے شراب پینے والوں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ ان تینوں کی مناسب خدماتے کے عوض اپنے لیے دو ڈھائی سو روپے ماہوار پیدا کر لیتا تھا۔ کراچی پہنچنے کے بعد اس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ مملکت خداداد کے دارالخلافہ میں فی الحال حرمت شراب کا حکم نازل نہیں ہوا۔

یہ دیکھ کر اس کے دل میں بہت سی بدگمانیوں نے سر اٹھایا۔ اگرچہ وہ چور بازار میں شراب کا کاروبار کر لیا کرتا تھا لیکن وہ اسے ایک حرام چیز ضرور سمجھتا تھا۔ اور اس نے خود کبھی اس کو منہ نہیں لگایا تھا۔ جب کانگرس والوں نے شراب پر پابندی کا قانون لگایا تو وہ اپنے دوستوں کے سامنے بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا کہ ہندوؤں نے یہ کام کی بات مسلمانوں کے مذہب سے سیکھی ہے۔ لیکن اب کراچی میں یہ دگرگوں حالت دیکھ کر اسے بڑا ذہنی صدمہ پہنچا۔ اس نے بہت سے لوگوں سے اس کے متعلق کرید کرید کر پوچھا،

لیکن کوئی اس کی خاطر خواہ تشفی نہ کر سکا۔ آخر ایک روز جب وہ حکیم نجیب اللہ خاں کے مطب میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا تو باتوں باتوں میں شراب کا مسئلہ بھی چھڑ گیا۔ حکیم صاحب اپنے محلے میں بڑے جید عالم تصور کیے جاتے تھے اور وہ دوا دارو کے علاوہ مسئلہ مسائل سے بھی خلق خدا کی خدمت کیا کرتے تھے۔ عورتوں میں ہسٹریا کے مرض کو دوا کے بغیر محض روحانی وسائل سے رفع کر دینا ان کا خیال کمال تھا۔ عبدالکریم کے شکوک سن کر حکیم صاحب مسکرائے اور عقلی، برہانی اور قرآنی زاویوں سے شراب پر بڑی فصاحت و بلاغت سے روشنی ڈالنے لگے۔ ہر امر میں نیکی اور بدی دونوں کے راستے وا ہوتے ہیں۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ بدی سے منہ جوڑے اور نیکی کو اختیار کرے۔ اسی طرح شراب کے فائدے اور گناہ بھی اس کے سامنے ہیں۔ یہاں بھی انسان کی قوت اختیار کا امتحان ہے۔ شراب پر قانونی بندش لگا کر انسان کو اس امتحان سے محروم کرنا سراسر معیشت ایزدی کے خلاف ہے۔

عبدالکریم پر ان تفسیرات کا بہت اثر ہوا اور اسلام، ایمان اور قرآن کے نئے نئے اسرار اس پر منکشف ہونے لگے۔

''عائشہ کی ماں''۔ اس نے کہا ''غلامی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ پچاس برس ہو گئے سالی بمبئی میں رہتے۔ نمازیں پڑھیں، قرآن شریف بھی سیکھا۔ لیکن کیا مجال جو کبھی سینے میں ایمان کی روشنی پیدا ہوئی۔ اب یہاں آ کر نئے نئے راز کھلنے لگے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ ایمان کا مزا بھی آزادی کے ساتھ ہے''۔

''اسی لیے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ غلام ملک میں جمعہ کی نماز تک جائز نہیں''۔

شراب کی طرف سے مطمئن ہو کر عبدالکریم نے کئی دوسرے کاروباروں کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اسے اپنے چور بازار کے تجربات کام میں لانے کی کہیں کوئی صورت نظر نہ آئی۔ شراب ہے تو کھلم کھلا بک رہی ہے۔ آٹا ہے تو برسرعام چار آنے سیر کے حساب ڈھیروں ڈھیر مل رہا ہے۔ کپڑے کی بھی قلت نہیں۔ چینی عام ہے۔ اب چور بازار چلے تو کس چیز کے سہارے چلے؟ پہلے ان نے پان بیڑی بیچنے کی کوشش کی۔ پھر آئس کریم اور پھلوں کے ٹھیلوں پر قسمت کو آزمایا۔ اسکے بعد کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ گزارے کے لیے پیسے تو ہر جگہ سے نکل آتے تھے۔ لیکن زندگی عزیز کی چاشنی ختم ہو گئی تھی اور سیدھی طرح دکان پر بیٹھے بیٹھے عبدالکریم کا جی بیزار ہو جاتا تھا۔ وہ کسی پر خطر، زیر زمین قسم کے بیوپار کا متلاشی تھا جس کا تجربہ اس نے زندگی کے بہترین سال صرف کر کے حاصل کیا تھا۔ لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس لیے اس ے دل اور دماغ پر ہمیشہ ایک مستقل اکتاہٹ چھائی رہتی۔

بمبئی میں اگر کسی وجہ سے اس پر بیزاری یا اکتاہٹ کا حملہ ہوتا تھا تو وہ جی بہلانے کے لیے۔۔۔۔ کے کسی چوبارے پر گانا سننے چلا جایا کرتا تھا۔

کراچی میں آئے ہوئے اسے کئی مہینے ہو گئے تھے اور اس نے یہاں کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا تھا۔ لیکن اب تک اسے کہیں ایسے بازار کا نشان نظر نہ آیا تھا جہاں وہ گھڑی دو گھڑی کو کلفت مٹانے کے لیے ہو آیا کرے۔ اس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ چکلوں پر قانونی بندش لگی ہوئی ہے اور جس طرح بمبئی میں شراب بند ہے۔ اسی طرح کراچی میں رنڈیوں کا پیشہ منع ہے۔ عبدالکریم نے یہ خبر بڑی صفائی قلب کے ساتھ یہ خبر عائشہ کی ماں کو سنائی اور وہ دونوں دیر تک فٹ پاتھ پر اپنی جھونپڑی کے سامنے چارپائی پر بیٹھے قرآن اور ایمان کی روح پرور باتیں کرتے رہے۔

چکلوں کے سلسلے میں جو تحقیقات عبدالکریم نے کی تھی اس کے دوران اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ اس میدان میں بلیک مارکیٹ کے وسیع امکانات ہیں۔ اس کی کچھ ایسے لوگوں سے شناسائی بھی ہو گئی تھی جو اس بیوپار میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور عبد الکریم کے پرانے تجربات کی بنا پر اسے معقول کمیشن پر اپنا شریک کار بنانے کے لیے آمادہ تھے۔ ایک کانے دلال نے شاید عائشہ کو بھی کہیں دیکھ لیا تھا چنانچہ اس نے رائے دی کہ اگر عبدالکریم اس کی رفاقت کرے تو وہ بہت جلد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کے مالک بن

جائیں گے۔ جب عبدالکریم کو اس کی نیت کا علم ہوا تو اس نے اپنا جوتا کھول کر اس کانے کی بر سرِ عام خوب مرمت کی اور مسجد میں جا کر ساری رات سجدے میں پڑا روتا رہا کہ اس کے دل میں ایسے ذلیل کام کا خیال بھی آیا۔ یا غفور الرحیم یہ اسی سیاہ کارانہ خیال کی سزا ہے، کہ اب لوگ اس کی عائشہ کی طرف بھی نظریں اٹھانے لگے ہیں۔ یا اللہ توبہ، یا اللہ توبہ۔۔۔۔۔

رات بھر خشوع و خضوع کے ساتھ استغفار کر کے عبدالکریم کا دل پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ علی الصبح منہ اندھیرے جب وہ گھر واپس لوٹا، تو اس کی بیوی انتظار کرتے کرتے چٹائی پر سو گئی تھی۔ عائشہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن میں مصروف تھی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز حزیں تھا۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ قرات کے ساتھ خدا کا کلام پڑھتی تھی تو فضا میں ایک عجیب عرفان چھا جاتا تھا۔ عبدالکریم خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا یہی وہ معصومیت کا فرشتہ ہے جس کے متعلق ایک بدمعاش دلال نے سیاہ کاری کی ہوس کی تھی۔

عبدالکریم کی توبہ اور استغفار نے بڑا اثر دکھایا۔ کپڑے کی دکان خوب چل نکلی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے عبدالکریم نے پیر الٰہی بخش کالونی میں ساڑھے چار ہزار روپے میں دو کمرے کا پختہ مکان خرید لیا۔ زندگی میں پہلی بار عائشہ کی ماں کو اپنی ملکیت کا مکان نصیب ہوا تھا۔ وہ اسے شیشے کی طرح صاف رکھنے لگی۔ دن میں کئی کئی بار سیمنٹ کا فرش دھویا جاتا۔ دیواریں جھاڑی جاتیں اور صبح شام اندر باہر فینائل کا چھڑکاؤ ہوتا، تاکہ مکھیاں اندر نہ آنے پائیں۔ علی الصبح منہ اندھیرے عبدالکریم کی بیوی تو مکان کی صفائی میں مصروف ہوتی اور عائشہ دالان میں بیٹھ کر قرآن پڑھتی۔ عبدالکریم دیر تک بستر پر اپنے ماحول کے عرفان میں سرشار پڑا رہتا۔ انڈوں، پراٹھوں اور چائے کا ناشتہ کر کے جب وہ دکان کھولتا تو اس کا ظاہر اور باطن بڑے مطمئن اور آسودہ ہوتے تھے۔

رفتہ رفتہ عائشہ کے لیے پیام بھی آنے لگے۔ جس روز اس کی منگنی ہوئی وہ بے اختیار ساری رات مصلے پر پڑی روتی رہی۔ رخصتی کے روز وہ کئی بار روتے روتے بے ہوش ہوئی۔ عبدالکریم اور عائشہ کی ماں کا بھی برا حال تھا۔ عائشہ کا خاوند بجنور کا مہاجر تھا اور ٹنڈو آدم خاں میں آڑھت کی دکان کرتا تھا۔ جس روز وہ سسرال سدھاری تو گویا عبدالکریم کا گھر سنسان ہو گیا۔ دوسرے روز حسب معمول اس کی آنکھ منہ اندھیرے کھلی۔ لیکن دالان میں عائشہ کی آواز نہ پا کر وہ کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ جب وہ دن چڑھے اٹھا تو اس کے بدن میں بڑی آلکس تھی۔ جیسے افیونی کو افیون یا شرابی کو شراب سے ناغہ ہو گیا ہو۔ اس نے طوہاً و کرہاً منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا اور کپڑے بدل کر دکان پر چلا گیا۔ دکان میں بھی اس کی طبیعت کچھ اچاٹ اچاٹ سی رہی۔ اس لیے دکان کو معمول سے پہلے بند کر کے وہ جی بہلانے کے لیے گھومنے نکل گیا۔ رات کو بہت دیر سے لوٹا اور بغیر کھانا کھائے سو گیا۔

اب اس کا معمول ہو گیا تھا کہ صبح دیر سے اٹھتا۔ بہت دیر سے ناشتہ کرتا۔ کوئی دن ڈھلے دکان پر جاتا اور آدھی آدھی رات گئے گھر لوٹتا۔ رفتہ رفتہ اس نے دکان کے لیے ایک ملازم رکھ لیا اور سارا دن سونے اور رات رات بھر باہر رہنے لگا۔ سرِ شام اس کے برآمدے میں کئی قسم کے دلالوں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا۔ ان میں وہ کانا دلال بھی ہوتا تھا جسے عبدالکریم نے ایک روز سرِ عام جوتوں سے پیٹا تھا۔

ایک دو بار عبدالکریم کی بیوی نے ان لوگوں کے متعلق پوچھ گچھ کی تو اس نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔

''عائشہ کی ماں! اب میں نے ایک دو اور بیوپار بھی کھول لیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو بڑی کامیابی ہوگی۔ تم ذرا جلدی سے ان بھلے آدمیوں کے لیے چائے پانی بھجوا دو''۔

عبدالکریم کے نئے بیوپار بھی چمک اٹھے۔ چھ سات مہینوں میں اس نے پیر الٰہی بخش کالونی والا مکان چھوڑ کر بندر روڈ پر ایک دو منزلہ کوٹھی خرید لی۔ صدر دروازے پر ''سیٹھ عبدالکریم بمبئی والا'' کا بورڈ لگ گیا۔ سواری کے لیے موٹر آ گئی اور گھر میں کام کاج کے لیے نوکر چاکر مقرر ہو گئے۔ اب عائشہ کی ماں کو بھی فرصت نصیب ہوئی۔ اور وہ آدھی آدھی رات اٹھ کر تہجد گزارتی

تھی۔۔۔اور اپنی ایک ہزار ایک، دانوں والی تسبیح پر اللہ کے ایک سو ننانوے ناموں کا ورد کر کے اپنے شوہر کی کمائی میں برکت اور کشائش کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

ایک رات جب عبدالکریم گھر آیا، تو عائشہ کی ماں نے اس کے پاؤں دباتے ہوئے کہا "اے جی۔۔۔میں نے کہا، کچھ سنتے ہو؟"

"کیا بات ہے عائشہ کی ماں؟" عبدالکریم نے بے توجہی سے پوچھا۔ دن بھر کی ریاضت سے وہ بہت تھکا ہوا اور کسل مند تھا۔

"خیر سے ٹنڈو آدم خاں سے آدمی آیا تھا۔ اللہ رکھے، تمہاری بیٹی پر خدا نے اپنی رحمت کی ہے۔ اگلے مہینے تم بھی نانا ابا کہلانے لگو گے!"

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ عائشہ کی ماں، اگلی جمعرات کو یتیم خانہ کے بچوں کو بلا کر کھانا کھلا دینا۔ مجھے کام میں یاد رہے نہ رہے، تم ضرور یاد رکھنا اور ہاں۔۔۔ عائشہ کی ماں، کچھ زیورات اور کپڑے بھی بنوا رکھو۔ جب تم گھی کھچڑی لے کر جاؤ گی، تو خالی ہاتھ تو نہ جاؤ گی۔ اللہ رکھے اب دو پیسے آئے ہیں تو اپنی بیٹی پر بھی ارمان نکال لو"۔

"اے ہے" عائشہ کی ماں نے تنک کر کہا "یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو، میں بھلا گھی کھچڑی لے کر کہاں جاؤں گی، میری بچی اللہ رکھے بڑی الہڑ اور انجان ہے۔۔۔ میں نے اسے دن پورے کرنے یہاں بلا لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو پرسوں دوپہر کی گاڑی سے آجائے گی۔ تم بھی موٹر لے کر چلنا۔ ہم عائشہ کو اسٹیشن پر لینے جائیں گے۔

یہ خبر سن کر عبدالکریم اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں پر مکڑی کے جالے سے تن گئے اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گھر کے در و دیوار اس کا منہ چڑا چڑا کر پکار رہے ہوں، کہ اب عائشہ آ رہی ہے۔ عائشہ آ رہی ہے، عائشہ آ رہی ہے۔۔۔

وہ ساری رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح معمول سے پہلے اٹھ بیٹھا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے، ناشتہ کیا اور سیدھا اپنے کپڑے کی دکان پر جا بیٹھا۔ اس کا ملازم جو پچھلے آٹھ ماہ سے تن تنہا اس دکان کو اپنے من مانے طریقے پر چلا رہا تھا، مالک کو آتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن عبدالکریم نے حساب کتاب کے متعلق کوئی باز پرس نہ کی۔ وہ سارا دن دکان پر کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے بہت سے یار دوست اس کی تلاش میں وہاں بھی آ پہنچے۔ لیکن وہ کام کا بہانہ کر کے سب کو دکھائی سے ٹالتا رہا۔ تیسرے پہر وہ کانا دلال بھی حسب معمول اس کی تلاش میں وہاں آیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی عبدالکریم آپے سے باہر ہو گیا۔ اور لوہے کا گز اٹھا کر دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔

"خبردار! اگر تم میری دکان پر چڑھے تو تمہاری ٹانگیں توڑ ڈالوں گا۔ سالے حرامی نے ساری کراچی میں گندگی پھیلا رکھی ہے۔۔۔ جاؤ بھاگو یہاں سے، ورنہ ابھی پولیس کو خبر کرتا ہوں، سالا ڈا!۔۔۔"

سر شام دکان بند کر کے عبدالکریم سیدھا مسجد میں چلا گیا، اور دیر تک سجدے میں پڑا بلک بلک کر روتا رہا۔ دعا کے کلمات رہ رہ کر اس کی زبان پر آتے تھے لیکن ہونٹوں پر لرز کے رہ جاتے تھے۔ جیسے کوئی کبوتر اپنے آشیانے پر بار بار آئے اور اسے ویران پا کر پھڑ پھڑاتا ہوا واپس چلا جائے۔

شاید عبدالکریم سجدے میں پڑے پڑے ہی سو گیا۔ کیونکہ جب کسی نے اس کو ہلا کر جگایا تو فجر کا وقت تھا۔ مؤذن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ نیند کے خمار میں عبدالکریم کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اذان کی آواز نہیں، بلکہ دور کہیں بہت دور کوئی چیخ چیخ کر پکار رہا ہے، کہ اب عائشہ آ رہی ہے، عائشہ آ رہی ہے، عائشہ آ رہی ہے۔۔۔"

☆☆☆

ستاروں سے آگے

قرۃ العین حیدر

کرتار سنگھ نے اونچی آواز میں ایک اور گیت گانا شروع کر دیا۔ وہ بہت دیر سے ماہیا الاپ رہا تھا جس کو سنتے سنتے حمیدہ کرتار سنگھ کی پنکچ جیسی تانوں سے، اس کی خوبصورت داڑھی سے، ساری کائنات سے اب اس شدت کے ساتھ بیزار ہو چکی تھی کہ اسے خوف ہو چلا تھا کہ کہیں وہ سچ مچ اس خواہ مخواہ کی نفرت و بیزاری کا اعلان نہ کر بیٹھے اور کامریڈ کرتار ایسا سویٹ ہے فوراً برا مان جائے گا۔ آج کے پچ میں اگر وہ شامل نہ ہوتا تو باقی کے ساتھی تو اس قدر سنجیدگی کے موڈ میں تھے کہ حمیدہ کو زندگی سے اکتا کر خودکشی کر جاتی۔ کرتار سنگھ گڈو گراموفون تک ساتھ اٹھا لایا تھا۔ ملکہ پکھراج کا ایک ریکارڈ تو کیمپ ہی میں ٹوٹ چکا تھا، لیکن خیر۔

حمیدہ اپنی سرخ کنارے والی ساری کے آنچل کو شانوں کے گرد بہت احتیاط سے لپیٹ کر ذرا اور اوپر کو ہو کے بیٹھ گئی جیسے کامریڈ کرتار سنگھ کے ماہیا کو بے حد دلچسپی سے سن رہی ہے لیکن نہ معلوم کیسی الٹی پلٹی الجھی الجھی بے تکی باتیں اس وقت اس کے دماغ میں گھسی آ رہی تھیں۔ وہ ''جاگ سوز عشق جاگ'' والا بیچارہ ریکارڈ شکنتلا نے توڑ دیا تھا۔

''اف وہ بھئی''۔ بیل گاڑی کے ہچکولوں سے اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا اور ابھی کتنے بہت سے کام کرنے کو پڑے تھے۔ پورے گاؤں کو ہیضے کے ٹیکے لگانے کو پڑے تھے۔ ''توبہ!'' کامریڈ صبیح الدین کے گھونگریالے بالوں کے سر کے نیچے رکھے ہوئے دواؤں کے بکس میں سے نکل کر دواؤں کی تیز بو سیدھی اس کے دماغ میں پہنچ رہی تھی اور اسے مستقل طور پر یاد دلائے جا رہی تھی کہ زندگی واقعی بہت تلخ اور ناگوار ہے۔ ایک گھسا ہوا، بیکار اور فالتو سا ریکارڈ جس میں سے سوئی کی ٹھیس لگتے ہی وہی مدھم اور لرزتی ہوئی تانیں بلند ہو جاتی تھیں جو نغمے کی لہروں میں قید رہتے رہتے تھک چکی تھیں۔ اگر اس ریکارڈ کو، جو مدتوں سے ریڈیو گرام کے نچلے خانے میں تازہ ترین البم کے نیچے دبا پڑا تھا، زور سے زمین پر پٹخ دیا جاتا تو حمیدہ خوشی سے ناچ اٹھتی۔ کتنی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو وہ چاہتی تھی کہ دنیا میں نہ ہوتیں تو کیسا مزہ رہتا۔۔۔ اور اس وقت تو ایسا لگا جیسے سچ مچ اس نے "I dream I dwell in marble halls" والے گھسے ہوئے ریکارڈ کو فرش پر پٹخ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور جھک کر اس کی کرچیں چنتے ہوئے اسے بہت ہی لطف آ رہا ہے۔ عنابی موزیک کے اس فرش پر، جس پر ایک دفعہ ایک ہلکے پھلکے فوکس ٹروٹ میں بہتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ بس زندگی سمٹ سمٹا کے اس چمکیلی سطح، ان زرد پردوں کی رومان آفرین سلوٹوں اور دیواروں میں سے جھانکتی ہوئی ان مدھم برقی روشنیوں کے خواب اور دھندلکے میں سما گئی ہے، یہ تپش انگیز جاز یونہی بجتا رہے گا، اندھیرے کونوں میں رکھے ہوئے سیاہی مائل سبز فرن کی ڈالیاں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں اس طرح ہچکولے کھاتی رہیں گی اور ریڈیو گرام پر ہمیشہ پولکا اور رمبا کے نئے نئے ریکارڈ لگتے جائیں گے۔ یہ تھوڑا ہی ممکن ہے کہ جو باتیں اسے قطعی پسند نہیں وہ بس ہوتی ہی چلی جائیں۔۔۔ ریکارڈ گھستے جائیں اور ٹوٹتے جائیں۔

لیکن یہ ریکارڈوں کا فلسفہ کیا ہے آخر؟ حمیدہ کو ہنسی آ گئی۔ اس نے جلدی سے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اس کے گانے پر ہنس رہی ہے۔

کامریڈ کرتار گائے جا رہا تھا۔ ''وس وس وے ڈھولنا۔۔۔'' اف! یہ پنجابی کے بعض الفاظ کس قدر بھونڈے ہوتے ہیں۔ حمیدہ ایک ہی طریقے سے بیٹھے بیٹھے تھک کے بانس کے سہارے آگے کی طرف جھک گئی۔ بہتی ہوئی ہوا میں اس کا سرخ آنچل

پھیلائے جا رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اسے چمپئی رنگ کی ساری بہت سوٹ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کے سب لڑکے کہا کرتے تھے اگر اس کی آنکھیں ذرا اور سیاہ اور ہونٹ ذرا اور پتلے ہوتے تو ایشیائی حسن کا بہترین نمونہ بن جاتی۔ یہ لڑکے عورتوں کے حسن کے کتنے قدر دان ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ہر سال کس قدر چھان بین اور تفصیلات کے مکمل جائزے کے بعد لڑکیوں کا خطاب دیئے جاتے تھے اور جب نوٹس بورڈ پر سال نو کے اعزازات کی فہرست لگتی تھی تو لڑکیاں کیسی بے نیازی اور خفگی کا اظہار کرتی ہوئی اس کی طرف نظر کئے بغیر کوریڈور میں سے گزر جاتی تھیں۔ کمبخت سوچ سوچ کے کیسے مناسب نام ایجاد کرتے تھے۔ ''عمر خیام کی رباعی''، ''دہرہ ایکسپریس''، ''بال آف فائر''، It's Love I'm after، ''نقوش چغتائی''، ''بلڈ بینک''۔

گاڑی دھچکے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ ''کیا بجا ہوگا کامریڈ؟'' گاڑی کے پچھلے حصے میں سے منظور نے جمائی لے کر جتندر سے پوچھا۔

''ساڑھے چار۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا''۔ جتندر اپنا چار خانہ کوٹ گاڑی بان کے پاس پرال پر بچھائے، کہنی پر سر رکھے چپ چاپ پڑا تھا۔ شکنتلا بھی شاید سونے لگی تھی حالانکہ وہ بہت دیر سے اس کوشش میں مصروف تھی کہ بس ستاروں کو دیکھتی رہے۔ وہ اپنے پیر ذرا اور نہ سکیڑ، اعجاز عبیدی، تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبیدی لیکن پاس کی جگہ کامریڈ کرتار نے گھیر رکھی تھی۔ شکنتلا بار بار خود کو یاد دلا رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں اتنی سی بھی نیند نہیں گھسنی چاہیے۔ ذرا ویسی یعنی نامناسب سی بات ہے، لیکن دھان کے کھیتوں اور گھنے باغوں کے اوپر سے آتی ہوئی ہوا میں کافی خنکی آچلی تھی اور ستارے مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ ''بس بس وہ ڈھولنا''۔ اور اب کرتار سنگھ کا جی بے تحاشا چاہ رہا تھا کہ اپنا صافہ اتار کر ایک طرف ڈال دے اور ہوا میں ہاتھ پھیلا کے ایک ایسی زور دار انگڑائی لے کے اس کی ساری تھکن، کوفت اور درماندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں کھو جائے یا صرف چند لمحوں کے لیے دوبارہ وہی انسان بن جائے جو کبھی جہلم کے سنہرے پانیوں میں چاند کو ہلکورے کھاتا دیکھ کر امر جیت کے ساتھ پنکج کی سی تانیں اڑایا کرتا تھا۔ یہ لمحے، جب کہ تاروں کی بھیگی بھیگی چھاؤں میں بیل گاڑی کچی سڑک پر گھسٹتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور جب کہ سارے ساتھیوں کے دلوں میں ایک بیمار سا احساس منڈلا رہا تھا کہ پارٹی میں کام کرنے کا آتشیں جوش و خروش کب کا بجھ چکا تھا۔

ہوا کا ایک بھاری سا جھونکا گاڑی کے اوپر سے گزر گیا اور صبیح الدین اور جتندر کے بال ہوا میں لہرانے لگے لیکن کرتار سنگھ لیڈیز کی موجودگی میں اپنا صافہ کیسے اتارتا؟ اس نے ایک لمبا سانس لے کر دواؤں کے بکس پر سر ٹکا دیا اور ستاروں کو تکنے لگا۔ ایک دفعہ شکنتلا نے اس سے کہا تھا کہ کامریڈ تم اپنی داڑھی کے باوجود کافی ڈیشنگ لگتے ہو اور یہ کہ اگر تم ایئر فورس میں چلے جاؤ تو اور بھی Killing لگنے لگو۔ اف یہ لڑکیاں!

''کامریڈ سگریٹ لو''۔ صبیح الدین نے اپنا سگریٹوں کا ڈبہ منظور کی طرف پھینک دیا۔ جتندر اور منظور نے ماچس کے اوپر جھک کے سگریٹ سلگائے اور پھر اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے۔ صبیح الدین ہمیشہ عبداللہ اور کریون اے پیا کرتا تھا۔ عبداللہ اب تو ملتا بھی نہیں۔ صبیح الدین ویسے بھی بہت ہی رئیسانہ خیالات کا مالک تھا۔ اس کا باپ تو ایک بہت بڑا تعلقہ دار تھا۔ اس کا نام کتنا اسمارٹ اور خوبصورت تھا۔ صبیح الدین احمد۔۔۔ مخدوم زادہ راجہ صبیح الدین احمد خاں! اُفوہ! اس کے پاس دو بڑی چمکدار موٹریں تھیں۔ ایک موریس اور ایک ڈی، کے، ڈبلیو لیکن کنگ جارجز سے نکلتے ہی آئی ایم ایس میں جانے کی بجائے وہ پارٹی کا ایک سرگرم ورکر بن گیا۔ حمیدہ ایسے آدمیوں کو بہت پسند کرتی تھی۔ آئیڈیل قسم کے لیکن اگر صبیح الدین اپنی موریس کے اسٹیئرنگ پر ایک بازو رکھ

کے اور جھک کے اس سے کہتا کہ حمیدہ مجھے تمہاری سیاہ آنکھیں بہت اچھی لگتی ہیں، بہت ہی زیادہ۔۔۔ تو یقیناً اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتی۔ "ہونہہ۔۔۔ دیز ایڈیٹس!" صابن کے رنگین بلبلے!

کرتار سنگھ خاموش تھا۔ سگریٹ کی گرمی نے منظور کی تھکن اور افسردگی ذرا دور کر دی تھی۔ ہوا میں زیادہ ٹھنڈک آ چکی تھی۔ چندر نے اپنا چارخانہ کوٹ کندھوں پر ڈال لیا اور پرانی پرال میں ٹانگیں گھسا دیں۔ منظور کو کھانسی اٹھنے لگی۔ "کامریڈ تم کو اتنے زیادہ سگریٹ نہیں پینے چاہئیں۔" شکنتلا نے ہمدردی کے ساتھ کہا۔ منظور نے اپنے مخصوص انداز سے زبان پر سے تمباکو کی پتی ہٹائی اور سگریٹ کی راکھ نیچے جھٹک کر دور باجرے کی لہراتی ہوئی بالیوں کے پرے افق کی سیاہ لکیر کو دیکھنے لگا۔۔۔ یہ لڑکیاں! طلعت کیسی فکرمندی کے ساتھ کہا کرتا تھا۔ "منظور! تمہیں سردیوں میں ٹانک استعمال کرنے چاہییں۔ اسکاٹس ایملشن یا ریڈیو مالٹ یا آسٹو مالٹ۔۔۔ طلعت، ایرانی بلی! پہلی مرتبہ جب بوٹ کلب Regatta میں ملی تھی تو اس نے "اوہ گوش! تو آپ جرنلسٹ ہیں۔۔۔ اور اوپر سے کمیونسٹ بھی۔ اُفوہ!" اس انداز سے کہا تھا کہ ہیڈی لیماری بھی رشک کرتی۔ پھر مرمریں ستون کے پاس، پام کے پتوں کے نیچے بیٹھا دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف آئی تھی۔۔۔ کتنی ہمدرد۔۔۔ یقیناً۔ اس نے پوچھا تھا "ہیلو چائلڈ۔ ہاؤ از لائف؟" Ask me another منظور نے کہا تھا۔

"اللہ! لیکن یہ تم سب کا آخر کیا ہوگا"۔ فکر جہاں کھائے جا رہی ہے۔ مرے جا رہے ہیں۔ سچ مچ تمہارے چہروں پر نحوست ٹپکنے لگی ہے۔ کہاں کا پروگرام ہے؟ میسور چلتے ہو؟ پرلطف سیزن رہے گا اب کی دفعہ۔ بنگال؟ ارے ہاں، بنگال۔ تو ٹھیک ہے۔ ہاں میری بہترین خواہشیں اور دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ "جین آئر" اس قدر غضب کی ہے گوش!" پھر وہ چلی گئی۔ پیچھے کافی کی مشین کا ہلکا ہلکا شور اسی طرح جاری رہا اور دیواروں کی سبز روغنی سطح پر آنے جانے والوں کی پرچھائیں رقص کرتی رہیں اور پھر کلکتے آنے سے ایک روز قبل منظور نے سنا کے وہ اصغر سے کہہ رہی تھی "ہونہہ۔۔۔ منظور؟"

صبیح الدین ہلکے ہلکے گنگنا تا رہا تھا۔ کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں، ستاروں کی شمعیں بجھا دیں۔ یقیناً بس کہنے کی دیر ہے۔ حمیدہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ بکھر کے رہ گئی۔ دور دریا کے پل پر گھڑگھڑاتی ہوئی ٹرین گزر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ روشنیوں کا عکس پانی میں ناچتا رہا، جیسے ایک بلوری میز پر رکھے ہوئے چاندی کے شمع دان جگمگا اٹھیں۔ چاندی کے شمع دان اور انگوروں کی بیل سے چھپی ہوئی بالکونی، آئس کریم کے پیالے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور برقی پنکھے تیزی سے چل رہے تھے۔ پیانو پر بیٹھی ہوئی وہ اپنے آپ کو کس طرح طربیہ کی ہیروئن سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

Little Sir Echo how do you do. Hell hello wont you come over and dance with me پھر رانی اسٹیرنگ پر ایک بازو رکھ کر رابرٹ ٹائیلر کے انداز سے کہتا تھا۔ "حمیدہ تمہاری یہ سیاہ آنکھیں مجھے بہت پسند ہیں۔۔۔ بہت ہی زیادہ" یہ بہت ہی زیادہ "حمیدہ کے لیے نہ تھا؟ اور جب وہ سیدھی سڑک پر پینتالیس کی رفتار سے کار چھوڑ کر وہی "I dreamed will in marble halls" گانا شروع کر دیتا تو حمیدہ یہ سوچ کر کتنی خوش ہوتی اور کچھ فخر محسوس ہوتا کہ رانی کی ماں موزارٹ کی ہم وطن۔۔۔ آسٹرین۔ اس کی نیلی چھلکتی ہوئی آنکھیں، اس کے نارنجی بال۔۔۔ اف اللہ! اور کسی گھنے ناشپاتی کے درخت کے سائے میں کار ٹھہر جاتی اور حمیدہ جام کا ڈبہ کھولتے ہوئے سوچتی کہ بس میں بسکٹوں میں جام لگاتی ہوں۔ رانی انہیں کترتا رہے گا۔ اس کی بیوک پینتالیس کی رفتار پر چلتی جائے گی اور یہ چناروں سے گھری ہوئی سڑک کبھی ختم نہ ہوگی۔ لیکن ستاروں کی شمعیں آپ سے آپ بجھ گئیں۔ اندھیرا چھا گیا اور اندھیرے میں بیل گاڑی کی لالٹین کی بیمار روشنی ٹمٹما رہی تھی۔

ہولالالا۔۔۔ دور کسی کھیت کے کنارے ایک کمزور سے کسان نے اپنی پوری طاقت سے چڑیوں کو ڈرانے کے لیے

ہانک لگائی۔ گاڑی بان اپنے مریل بیلوں کی دمیں مروڑ مروڑ کر انہیں گالیاں دے رہا تھا اور منظور کی کھانسی اب تک نہ رکی تھی۔۔۔

حمیدہ نے اوپر دیکھا۔ شبنم آلود دھند لکے میں چھپے ہوئے افق پر ہلکی ہلکی سفیدی پھیلنی شروع ہوگئی تھی کہیں دور کی مسجد میں سے اذان کی تھرائی ہوئی صدا بلند ہو رہی تھی۔ حمیدہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور غیر ارادی طور پر آنچل سے سر ڈھک لیا۔ جتندر اپنے چارخانہ کوٹ کا تکیہ بنائے شاید لیٹن کوارٹر اور سوسو کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مائیرا، ڈونا مائیرا۔ حمیدہ کی ساری کے آنچل کی سرخ دھاریاں اس کی نیم وا آنکھوں میں گھس جاتی تھیں اور جن کے لرزتے کپکپاتے سایوں کے پس منظر میں گرم گرم راکھ کے ڈھیر رات کے اڑتے ہوئے سناٹے میں اس کے دل کو اپنے بوجھ سے دبائے ڈال رہے تھے۔ مائیرا، اس کے نقرئی قہقہے، اس کا گٹار، اکھڑی ہوئی ریل کی پٹریاں اور ٹوٹے ہوئے کھمبے۔ سانتا کلاؤڈ کا وہ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن جس کے خوبصورت پلیٹ فارم پر ایک اتوار کو اس نے سرخ اور زرد گلاب کے پھول خریدے تھے۔ وہ لطیف سا رنگین سا سکون جو اسے مائیرا کے تاریخی بالوں کے ڈھیر میں ان سرخ شگوفوں کو دیکھ کے حاصل ہوتا تھا۔ وہ تھک کے گٹار سبزے پر ایک طرف پھینک دیتی تھی اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ ساری کائنات سرخ گلاب اور ستارہ ہائے سحری کی کلیوں کا ایک بڑا سا ڈھیر ہے۔ لیکن ناکستانوں میں گھرے ہوئے اس ریلوے اسٹیشن کے پرخچے اڑ گئے اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ اور طیارہ شکن توپوں کی گرج میں شوبرٹ "Rose monde" کی لہریں اور گٹار کی رسیلی گونج کہیں بہت دور فیڈ آؤٹ ہوگئی اور حمیدہ کا آنچل صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھڑپھڑاتا رہا، اس سرخ پرچم کی طرح جسے بلند رکھنے کے لیے جدوجہد اور کشمکش کرتے کرتے وہ تھک چکا تھا، اکتا چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''سگریٹ لو بھئی''، صبیح الدین نے منظور کو آواز دی۔

''اب کیا بج گیا ہوگا؟'' شکنتلا بہت دیر سے زیر لب بھیرو کا ''جاگو موہن پیارے'' گنگنا رہی تھی۔ حمیدہ سڑک کی ریکھائیں گن رہی تھی اور کرتار سنگھ سوچ رہا تھا کہ ''وس وس وے ڈھولنا'' پھر سے شروع کر دے۔

گاؤں ابھی بہت دور تھا۔

☆☆☆

نامرد

کلام حیدری

اس چوڑی سڑک کے ایک کنارے میں بہت مشہور سنیما ہال ہے۔ جس میں صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس کے دوسرے کنارے پر بھی سنیما ہال ہیں اور سب کچھ کے علاوہ سنیما ہال یا ہوٹل زیادہ ہیں۔ ہوٹل بھی شریفیہ، نظامیہ، صابریہ قسم کے ۔۔۔ جن کے بڑے بڑے ڈرائننگ ہال میں ہر وقت چیخ و پکار مچی رہتی۔ قلیہ، قورمہ، پلاؤ، نان، فیرنی۔ کھانے ناشتے کا کوئی امتیاز ان ہوٹلوں میں نہیں تھا اور کھانے کے لیے یہ ہوٹل آٹھ بجے صبح سے گیارہ بجے رات تک ہر ایک کے لیے کھلے رہتے۔ اس وشال شہر کی خوبی یہ ہے کہ یہاں اس قسم کے ہوٹل بہت ہیں اور ان میں سے کسی کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ہر گھنٹہ ان کی تحویل میں کتنا جاتا ہے۔ مگر یہ ہر سال پھیلتے ہیں، ایک چھوٹے ڈائننگ ہال سے شروع ہو کر ان میں دو چار تو اب چھوٹے محلے کے برابر ہو گئے ہیں۔

سنگ مرمر ٹاپ والے ٹیبل، مستحکم قسم کی چھوٹی کرسیاں، بدزبان اور زبان دراز نوکر۔۔۔ خاموش اور پرسکون کاؤنٹرز پر بیٹھے بت جو ڈراور کھول کر روپے ڈالنے اور گاہک کے زائد پیسوں کو واپس کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کرتے۔ یہ ڈراور ایسے بنے ہوتے ہیں کہ ڈراور کے پینیدے کی تختی ڈراور کی طرح باہر کھینچ لیجیے تو ڈراور میں رکھے سب روپے نیچے خندق میں گر جاتے۔ یہ خندق چار فٹ اونچا، پانچ فٹ چوڑا ہوا کرتا ہے اور پھر وہاں سے اسٹیل کے بکسوں میں بند ہو کر کہیں بھیج دیے جاتے ہیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے بت ہر چار گھنٹے پر بدل جاتے ہیں۔

میزوں پر کھانے والے لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اوسط آمدنی والے سے لے کر کم آمدنی والے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، دو روٹی، دو بوٹی۔۔۔ اور آٹھ دس گھنٹے کے لیے اطمینان ہو گیا۔ آفس میں کام کریں، بازاروں میں دوڑتے پھریں، ہیرا پھیری کریں۔

ان ہوٹلوں میں دو تین ایسے بھی ہیں جنھوں نے اوپری حصوں میں کمرے بنا رکھے ہیں اور ان کو کرائے پر لگاتے ہیں، شادی بیاہ کے زمانے میں باراتیوں کے لیے یہ کمرے ریزرو بھی کرائے جاتے ہیں۔ کمروں کی آرائش وغیرہ بھی ان ہوٹلوں کے معیار کے مطابق ہی ہے۔ بعض کمرے ملحق باتھ روم کے ساتھ ہیں جن کا کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ہوٹل کے لوگ ان میں ٹھہرنے والے لوگوں کی کچھ ذرا عزت کر لیتے ہیں۔ گھنٹی بجائی اور بیرا حاضر والی بات نہیں، مگر یہ کہ ذرا کمرے سے باہر نکل کر گلا صاف کر کے پکارا جائے تو دو تین پکار میں لنگی پہنے ہوئے ایک نوکر آ جائے گا، کام بتایے، آٹھ آنے انعام دے دیجیے، بس آپ کا کام ہو جائے گا۔

صبح کو غسل وغیرہ کر کے نو بجے اتریے اور ناشتے وغیرہ کا چکر چھوڑیے، سیدھے دو روٹی اور دو بوٹی والے شوربے کے ساتھ جی چاہے کوئی اور ایکسٹرا پلیٹ منگا لیجیے اور بس، پانچ بجے شام تک کے لیے مطمئن اپنے کام میں لگ جائیے۔

تو بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس بڑی سڑک اور اس کے سنیما اور خصوصاً ہوٹلوں کا ذکر اس لیے کیا کہ اس شہر کی خصوصیات میں سے یہ اہم خصوصیتیں ہیں اور یہ جو خلقت کی خلقت یہاں دوڑتی پھرتی ہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان ہوٹلوں نے اسے ممکن بنا دیا ہے، یہ کوئی دلی نہیں ہے، بمبئی بھی نہیں ہے، یہ تو بڑا پیارا شہر ہے۔

کالج میں پڑھتا تھا تو اسی وقت سے یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی ہے کہ ان ہوٹلوں نے بڑے آدمیوں کے بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے، آپ اسے نہ مانیں۔۔۔ مگر میں جانتا ہوں۔

مگر میں تو اس شہر کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ حالانکہ پھر بھی شاید بہت کم جانتا ہوں۔

تو یہ شہر اسی وقت سے مجھے لگتا ہے کہ شہر نہیں، ایک ملک ہے! ملک تو میں اسے آبادی کے لحاظ سے کہتا ہوں، مگر یہ اور بھی کئی وجوہات سے ملک کہے جانے کے لائق ہے۔

پر اس ذکر کو چھوڑیے۔

میں پانچ چھ سال بعد اس شہر میں آیا ہوں۔۔۔۔

ٹھہریے!

یہ بات بائیس سال پہلے کی ہے کہ میں نے جب ایک چھوٹی سی فیکٹری ایک دوسرے صوبے کے قصبے میں کھولی تھی اور تب میں نے محسوس کیا تھا کہ اس شہر کو جاننے کے کیا فوائد ہیں!

مجھے جب کوئی چیز انجینئر بتاتا کہ خریدنا ہے اور اس کی قیمت پانچ ہزار ہوتی ہے تو میں انجینئر کو ساتھ لے کر سیدھا اس شہر میں آجاتا اور اس مخصوص بازار میں چلا جاتا جہاں وہی چیز مجھے ہزار ڈیڑھ کم میں مل جاتی۔

لوہے کے تار کی میرے صوبے میں بڑی کمی ہوگئی۔ قیمت بہت بڑھ گئی تو میں نے اس شہر کا رخ کیا اور ایسی ایسی پتلی گلیوں میں دامن بچاتا گزرا کہ جہاں تاروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، بس یہ ذرا زنگ لگا، کچھ ذرا موٹائی میں کم تھے۔۔۔ مگر اور ان گلیوں میں مجھے وہ تمام ہنر بتائے گئے کہ میں کس طرح ہر ٹیکس سے بری ہو کر اپنے قصبے میں یہ مال لے جا سکتا ہوں۔

اور ایک بار ایسا ہوا کہ۔۔۔

یہ شہر ہر بار میرے مسئلے کو حل کر دیتا کیوں کہ یہ شہر نہیں ملک ہے۔

طالب علم کی حیثیت سے اس شہر نے مجھے سکھایا کہ کماؤ اور پڑھو۔

انڈسٹری کھولنے کے بعد اس شہر نے مجھے بتایا کہ ہر آنکھ میں دھول جھونکنے کی تربیت یہاں سے حاصل کرو، اور میں نے یہاں سے اپنے کام کے لائق تربیت حاصل کی۔ ہنرمندوں نے مجھے میری ضرورت کا ہر ہنر بتایا، اس بار میں پانچ سال بعد پھر یہاں آیا تھا۔

اور شریفہ قسم کے ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہر گیا جو ملحق باتھ روم کی وجہ سے اپنے مکینوں کو عزت بخشتا تھا۔

آٹھ بجے صبح میں نیچے اترتا تو۔۔۔

فٹ پاتھ پر ایک لکڑی کے بڑے سے بکس میں وہ عورت جو بہ مشکل سترہ سال کی ہوگی، اپنا بستر سلیقے سے تہہ کر کے اس میں رکھتی، اس کا شوہر نل پر نہاتا رہتا اور وہ اسے کچھ کمانا کچھ دیتی، پھر وہ اس لکڑی کے بکس سے، جو کافی بڑا تھا، ایک کڑاہی نکالتی اور پھر کچھ برتن، چھوٹی بڑی شیشیاں، چمچے۔۔۔ اور پان کی دکان اور ہوٹل کی دیوار سے جو کونہ بنتا، اس میں اینٹیں کھڑی کر کے چولھا بنا کر اپنا کام شروع کر دیتی۔

یہ تو روزانہ کا معمول تھا اس کا، جو میں کئی دن تک دیکھنے کے بعد جان گیا تھا۔

مگر میرے ذہن میں بہت سے سوالات اٹھتے تھے۔

یہ سترہ سالہ لڑکی شوہر سمیت اس فٹ پاتھ پر رہ تو سکتی ہے، اور وہ بے حد سلیقہ مندی سے رہتی ہے، مگر اس فٹ پاتھ پر۔۔۔ اس فٹ پاتھ پر دوسرے تقاضوں کا کیا ہوتا ہوگا؟

میں اس دن صبح سے نکلا ہوا شام کے سات بجے لوٹا اور ہوٹل میں کھانے کے بعد پان کی دکان پر پان کھانے لگا، سامنے نگاہ گئی تو دیکھا، میری ایک پسندیدہ فلم لگی ہوئی ہے۔ سنیما کے کاؤنٹر پر پوچھا کہ نائٹ شو میں یہی فلم ہے؟

میں نے ایک اوسط درجے کا ٹکٹ کٹایا اور گیارہ بجے فلم دیکھ کر لوٹا تو۔۔۔تو میں نے دیکھا اس لڑکی کا شوہر فٹ پاتھ پر اوندھا سویا ہوا ہے اور وہ لڑکی آس پاس بھی نہیں ہے۔

اب نہیں ہے تو مجھے کیا فکر ہونے لگی، میں خود پر جھنجھلایا۔

مگر میں خود اپنے لیے کئی مصیبتیں کھڑی کر سکتا ہوں اس لیے میں نے پان والے سے پان لیے اور پھر اس بڑی سڑک پر ٹہلنے لگا، یعنی یوں کے اس لڑکی کی جائے رہائش سے آگے ہی چلتا گیا۔ میں شاید ۲ میل چل کر پھر لوٹا۔

تو بھی لڑکی نہیں تھی۔

پان والا اپنی دکان کے پٹروں پر دیے ہوئے نمبروں کو جوڑ جوڑ کر دکان بند کر رہا تھا۔

یہ شہر اور یہ ہوٹل۔۔۔۔

انہوں نے بڑے آدمیوں کے بنانے میں مدد ہی نہیں کی، بلکہ بنا دیا کیونکہ اگر وہ لوگ یہاں نہ آتے اور یہ ہوٹل نہ ہوتے تو کہیں چپراسی یا معمولی کلرک ہو جاتے۔

ایک پولیس کی جیپ رکی اور دو سپاہیوں نے اس لڑکی کو گود میں اٹھا کر اس کے شوہر کے پاس آہستگی سے پٹک دیا۔لڑکی نے ایک سپاہی کے کمر بند کو پکڑ لیا اور چلائی۔۔۔

''تیرا اپھسر سالا ہوگا۔۔۔ مجھے۔۔۔سالا۔۔۔اور۔۔۔''

سپاہی بیلٹ چھڑا کر جیپ میں سوار ہو کر چلا گیا۔ میں جلدی سے پان کی دکان کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے شوہر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

''سالا آرام سے سوتا ہے۔۔۔تیرے سامنے سالا وہ اپھسر مجھے اٹھا کر لے گیا اور تم سالا جبان بھی نہیں ہلایا۔۔۔تم سالا۔۔۔نامرد۔۔۔''

''پولیس کا بڑا افسر تھا، ہم غریب لوگ ہیں، ہماری۔۔۔چل سو جا، اور بھول جا۔۔۔کل دوسری جگہ چلے جائیں گے''۔

''تو بھول جا۔۔۔کاہے کہ تو نامرد ہے، میں۔۔۔میں۔۔۔تجھ سے طلاق لیتی ہوں۔۔۔کاہے کہ تو میرے لائک نہیں۔۔۔''

اور وہ وہاں سے ایک گٹھڑی باندھ کر اسی وقت ایک طرف سچ مچ چلی گئی۔

رات بھر یہ منظر نیند کی جگہ لیے رہا۔

اس کے بعد میں چار روز اور وہاں رہا۔اور جس دن مجھے لوٹنا تھا اس دن کمرے میں جو اردو اخبار دیکھا اسے میں نے جھپٹ کر پڑھا۔

''ساؤتھ سیٹی کے ایس پی کا ایک لڑکی نے اس کے آفس کے کمرے میں رات گیارہ بجے تیز کٹار سے پیٹ چیر دیا۔۔۔تفصیلات معلوم نہیں''۔

جب میں اپنے سامان سمیت آٹھ بجے صبح نیچے اترا تو میں نے دیکھا کہ وہ آدمی لکڑی کے بکس میں بستر لپیٹ کر رکھ رہا ہے۔

مجھے لگا، نامردی اس میں اور مجھ میں مشترک ہے۔۔۔

پان کی دکان کی اوٹ سے میں نے اپنے آپ کو جھانکتے ہوئے دیکھا، میں اپنا چہرہ پہچان سکتا ہوں!

☆☆☆

بہت دیر ہو گئی

محمد احسن فاروقی

رقیہ پارٹی سے واپس آ کر جلدی جلدی کپڑے بدل کر مسہری پر پڑ گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنکھوں میں آنسو نہیں آ رہے تھے۔ پارٹی کا سماں ایک گڑبڑ خواب کی طرح اس کے سامنے آ رہا تھا۔ ہاں سعید، سعید کو دیکھنے، سعید سے ملنے کے لیے ہی وہ ایسے کپڑے پہن کر گئی تھی جو آٹھ برس پہلے اس نے پسند کیے تھے۔ آٹھ سال پہلے ایسی ہی ایک پارٹی میں سعید نے سب سے الگ ہو کر اس سے کہا تھا، تمہارے کپڑے یہاں سب سے اچھے لگ رہے ہیں۔ تم سب سے زیادہ جچ رہی ہو۔ اس نے کہا تھا ''بہت شکریہ''۔ ہلکے سرخ رنگ کے پھولوں والی قمیض، سفید شلوار، دکان میں یاقوت کے بندے، پیر میں سرخ چپل، چہرہ گلابی پوڈر اور ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک یونہی وہ آج بھی سج کر گئی تھی۔ مگر آٹھ برس میں سعید کیسا بدل گیا تھا۔ سب کے سامنے کہنے لگا، ''ارے رقیہ، تم کس قدر بدل گئیں۔ کیا ہوا گالوں میں گڑھے کیسے پڑ گئے اور چہرہ پر یہ نشان کیسے جو پوڈر سے بھی نہیں چھپتے''۔ وہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس نے تمام جذبات پر پانی، ٹھنڈا برف کا پانی ڈال دیا۔ آٹھ برس سے وہ اس کے خیال میں محو تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ اور پھر امریکہ گیا تھا۔ دل کہا کرتا کہ واپس آ کر وہ اسی کو پسند کرے گا۔ نسیمہ کو وہ جو بھی خط لکھتا اس میں رقیہ کو ضرور پوچھتا شاید وہ بھی اسے اتنا ہی چاہنے لگا تھا۔ کیا سچ مچ پوچھا کرتا تھا یا نسیمہ محض مروت میں کہہ دیتی تھی۔ ''بھیا کا خط آیا ہے تم کو پوچھا ہے''۔ آخر وہ براہ راست بھی اسے خط لکھ سکتا تھا۔ مگر کبھی کوئی پرزہ بھی نہیں لکھا اور اب آ کر تو اس نے اسے اجنبی کی طرح پہچانتے ہوئے گالوں میں گڑھے، چہرہ پر نشان ہی دکھائی دیے۔ وہ بھی کچھ زیادہ تگڑا اور بڑا نظر آیا تمیں سے اوپر نکل گیا ہے۔ رقیہ کو پہلے سے زیادہ اچھا لگا۔ ۔ مگر اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو اسے اچھی نہیں لگی۔ وہ ریحانہ، پروین، رعنا سب سے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنستا رہا۔ رقیہ کی طرف جب بھی رخ کیا تو خاموش ہو گیا اور پھر سب کے سامنے اس کے چہرہ پر تنقید کرنے لگا۔

اس نے اپنا رخ کپڑوں کی الماری کی طرف کیا، جس میں قد آدم شیشہ لگا تھا۔ اس کے چہرے پر جو چھائیاں پڑ گئی تھیں صاف دکھائی دیں۔ یہ کم بخت کسی طرح نہیں جاتیں کیسی کیسی دوائیں کیسی کیسی کریمیں لگائیں اور یہ گڑھے شمیم تو انہیں کی تعریف کرتا تھا۔ ''ہائے نزاکت'' کہہ کر تڑپ جاتا تھا۔ مگر وہ اسے بالکل نہ بھایا۔ اس کے دل میں سعید گھسا ہوا تھا۔ یہ سعید جو ایک دفعہ آگ لگا کر بالکل الگ ہو گیا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس نے کبھی کہیں دور سے اسے دیکھا تھا۔ اب اک دم سے دیکھ کر یاد کیا۔ انگلینڈ اور امریکہ میں نہ معلوم کتنی لڑکیوں سے ملا ہوگا۔ وہاں کی لڑکیاں تو خود مردوں کا پیچھا کرتی ہیں اور پاکستانی انہیں خاص طور پر بھاتے ہیں۔ اور اب یہاں کوئی انہی کی طرح کی ڈھونڈ لے گا۔ اتنا کوالیفائیڈ ہو کر آیا ہے اونچی جگہ ملے گی اور نہ جانے کتنے رئیسوں کی لڑکیاں اس کے پیچھے دوڑیں گی۔ پارٹی سے جاتے وقت بھی کئی اس کے ساتھ موٹر میں گئیں۔ رقیہ کو کوئی اشارہ بھی نہیں کیا۔ شمیم کس قدر لٹو تھا مگر رقیہ نے اسے لفٹ ہی نہیں دی۔ آخر کو اس نے شکیلہ سے شادی کر لی۔ رقیہ نے کہا تھا ''پیچھا چھوٹا، دو برس تک اس نے ہلکان کیا۔ اس سے سعید کتنا اچھا تھا''۔

پھر کلیم سے ملاقات ہوئی۔ اس نے رقیہ کے پیچھے کئی ہزار خرچ کر دیے ہوں گے۔ پرزنٹ، سنیما، ہر تفریح میں ساتھ، مگر

رقیہ نے اس کی طرف بھی رخ نہیں کیا۔

آٹھ برس بڑا لمبا وقت ہوتا ہے۔ وہ انٹر میں تھی سعید بھی اس کے ساتھ تھا۔ بی ایس سی میں ساتھ رہا۔ اور اس کے بعد انگلینڈ چلا گیا۔ آٹھ برس، دو برس ایم اے کے، ایک بی ٹی کا اور پانچ برس کی ملازمت، تین برس پہلے تک ہر طرف سے پیغام آتے رہے۔ اماں، ابا، بھائی سب نے رشتہ لگانا چاہا اور آخر میں رومانہ کے والد۔ اس کمبخت اطہر نے کہا تھا" یہ ایسی نارنگی ہے جو پیڑ پر لگے لگے سوکھ گئی"۔ کیا وہ سچ تھا۔" اب کوئی جوان تو پھنستا نہیں کوئی دوجا جو کرلے تو کرلے"۔ قمر کی اماں نے کہا تھا۔

"عورت بیسی اور کھیسی اور تو اب تیس کو ہونے کو آئی، اب شادی ہو چکی"۔

"ادھر لڑکی نے نوکری کی اور ادھر شادی کے دروازے اس کے لیے بند ہو گئے"۔

"ارے نوکری سے عورت سوکھنے لگتی ہے اور اگر موئی ہو تو ڈھل جاتی ہے"۔

"لڑکیاں بی اے میں آتی ہیں تو بچوں کی طرح کھلی ہوئی اور بی اے کرتے کرتے مرجھانے لگتی ہیں اور ایم اے کے بعد تو بالکل کھپٹا ہو جاتی ہیں۔ چہرہ پر خون بھی نہیں رہ جاتا"۔

"جوبن تیرے ڈھل گئے اک آن خالی رہ گئی، سرمایہ تیرا لُٹ گیا دکان خالی رہ گئی"۔ بڑا پست شعر مگر قاسم بات بات میں یہ سنا دیتا تھا۔

"تم سمجھتی ہو کہ جو جو وقت جا رہا ہے وہ تمہاری لڑکی کی قیمت بڑھ رہی ہے"۔ خالہ جان نے اماں سے کہا۔

"اے بہن کیا کروں کوئی جڑتا ہی نہیں"۔

"آج کل کے زمانے میں گھر بیٹھے کوئی نہیں آتا۔ لڑکی ادھر ادھر لے جاؤ۔ فیشن کرنے دو۔ اور لڑکیوں کے ساتھ پھرنے دو۔ کوئی نہ کوئی پسند کر لے گا۔ آخر تسنیم کی اسی طرح شادی ہوئی تھی۔ یہ پڑھانے جانا، چلے آنا کافی نہیں ہے"۔ خالہ نے مشورہ دیا تھا۔

مگر اس وقت بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں سعید کیا بیٹھا تھا، نہ لینا ایک اور نہ دینا دو۔ یہ دل میں کون کہتا تھا "آئے گا آنے والا آئے گا آنے والا"۔ وہ آنے والا آ گیا۔ مگر کس تیور سے آیا تھا۔" تمہارے چہرے پر دھبے، تم بدل گئیں"۔ دل کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اب اگر رخ کرے تو ٹھوکر مار دے۔ مگر اب اس کے رخ کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔ آٹھ برس سے پلتی ہوئی امید سے اس کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایک اسٹروک میں ختم ہو گئی۔ اب اس کے دل سے ایک آہ نکلی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ کے حساب سے بھی وہ اب تیس کی تھی حالانکہ وہ اپنے کو ۲۲ سے ۲۴ تک کا بتاتی تھی۔ سب کہتے رہنے کے باوجود اسے یہ احساس نہ تھا کہ اس کا حسن ڈھل گیا ہے۔ آج سعید نے اس کے آنکھوں کے سامنے کے سب پردے اک دم ہٹا دیے تھے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ تکیہ گیلا ہو گیا۔ اس نے والدہ سے کہہ دیا تھا آج کھانا نہیں کھاؤں گی پارٹی میں بہت کھا لیا ہے۔ اب اسے رات بھر روتے رہنے یا روتے روتے سو جانے کے سوا اور کچھ کام نہیں تھا۔

گھنٹے بھر سے زیادہ رونے دھونے اور کروٹیں بدلنے کے بعد کچھ طبیعت ہلکی ہوئی اور اب اسے اس کی شاگردہ رومانہ کے والد نعیم صاحب سی ایس پی ریٹائرڈ یاد آئے۔ وہ اپنی لڑکی کو روز کالج پہنچانے اور لے جانے موٹر پر آتے تھے۔

"ڈیڈی یہ ہماری مس ہیں پروفیسر رقیہ"۔

"آپ کہاں رہتی ہیں آیئے آپ کو آپ کے گھر اتار دوں گا"۔

اور پھر وہ روز ہی اسے اس کے گھر سے لیتے اور گھر پہنچا دیتے۔ کیسی آنکھیں گڑو گڑو کر وہ رقیہ کو دیکھتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا

کہ نظر جسم کے آر پار ہو جائے گی۔

''مس آپ ہمارے گھر ہوتی چلیں''۔ رومانہ نے کہا تھا۔

اور اس کا گھر کیسا بڑا، کیسا عمدہ، لان، گھاس، پھولوں کی کیاریاں، ایک طرف نیم کا درخت، دو ہزار گز کا پلاٹ، چار بڑے بڑے حصے، دو منزلے، دو ہزار کا کرایہ اور آٹھ سو پنشن جس حصے میں رہتے تھے، دو بڑے بڑے بیڈ روم، ایک ہال، بڑا سیٹ صوفے کا اور کھانے کی میز، چائے پر کیا کیا سامان تھا۔

''رومانہ کی شادی میرے بھائی کے لڑکے سے ٹھہری ہے۔ وہ جلدی کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں بی اے پاس کر لے تو شادی ہو۔ اس کی ماں کو مرے ہوئے چار برس ہو گئے۔ اس کی شادی ہو گئی تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ میرے تین لڑکے ملازم ہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں۔ دو لڑکیاں بھی بیاہ گئیں۔ اب یہ رہ گئی ہے''۔

''سب بھائی ڈیڈی سے کہتے ہیں کہ آپ ایک اور شادی کر لیجئے۔ ابھی آپ ساٹھ کے نہیں ہے''۔ رومانہ نے کہا تھا۔

نعیم صاحب کچھ نہیں بولے۔ بڑی حسرت سے رقیہ کو دیکھتے رہے تھے۔ اب تو روز ہی وہ رقیہ کو اپنے گھر لے آتے۔

''آپ رومانہ کو گھر پر پڑھا دیا کیجئے۔ آپ جو ٹیوشن فیس کہیں گی میں دوں گا۔ موٹر پر گھر سے لے آیا کروں گا۔ موٹر پر پہنچا آیا کروں گا''۔

''وقت کہاں ہے''۔ رقیہ نے کہا تھا۔

''آپ کالج سے یہاں آتی ہیں، چائے پی کر تھوڑی دیر آرام کریں، ہمارے یہاں مہمانوں کے لیے ایک بیڈ روم خالی ہے اس میں آپ آرام کریں اور پھر لان پر سے دھوپ چلی جانے کے بعد میں لان پر بیٹھ کر آپ سے پڑھوں گی اگر دیر ہو جائے تو رات کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھا لیا کیجئے گا۔ آخر ڈیڈی گاڑی پر آپ کو پہنچا ہی آیا کریں گے''۔

نعیم صاحب رومانہ کو لیے ہوئے اس کے گھر بھی آئے تھے اور اس کے والد سے اجازت لے لی تھی۔ پہلے مہینہ کے دو سو روپیہ والد کے ہاتھ میں رکھ دیے تھے۔ ''آپ اتنے باوقار اور ذمہ دار آدمی ہیں اگر رقیہ آپ کے یہاں رہ بھی جائے تو ہم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا''۔ والد نے کہا تھا۔

اور پڑھانا تو نام کا تھا، نعیم صاحب سیر کراتے تھے، ریستورانوں میں لے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد گھر چھوڑ جاتے تھے۔ کتنا خلوص، کتنی محبت، کتنا آرام۔

''ہاں یہ بڈھے لوگ بہت چاہتے ہیں، اچھا ہے شادی کر لے۔ ابھی دس بیس برس تو چل جائے گا''۔ خالہ جان نے کہا تھا۔ اور رومانہ کی شادی ہوئی نعیم صاحب کے سب لڑکے لڑکیاں، بہوئیں، داماد آئے گھر بھر گیا۔ کرایہ والے حصوں میں بھی کمرے مانگ لیے گئے۔ نعیم صاحب نے سب کے سامنے کھانے کی میز پر کہا ''یہ پروفیسر رقیہ، رومانہ کی استانی ہیں۔ شادی کی سب باتوں میں ان کی رائے اہم رہے گی''۔

رومانہ کے بیاہ جانے کے بعد بھی نعیم صاحب موٹر لے کر آتے رقیہ کو کالج پہنچاتے اور پھر واپس بھی لے آتے۔ دو سال میں وہ ان سے بے باک ہو گئی تھی۔ وہ اس سے ''تم'' سے بات کرنے لگے تھے۔ اسے عمدہ پارکر کا فاؤنٹین پین اور اومیگا گھڑی لے دی تھی۔

پھر ایک دن خط اس کے ہاتھ میں دیا اور بوکھلاہٹ میں موٹر چلا کر غائب ہو گئے تھے۔

''رقیہ تم نے میری زندگی کے ۳۵ برس کم کر دیے جب میں نے تمہیں پہلے دن دیکھا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ جب میں

بیس برس کا تھا تو میرے سامنے ایک لڑکی آئی تھی وہی اب پھر آ گئی۔ میری اس سے شادی نہیں ہو سکی تھی۔ اور وہ مر گئی تھی۔ گھر والوں نے رومانہ کی ماں سے شادی کر دی تھی مگر میں تمام زندگی اسی شکل کو تلاش کرتا رہا جو تمہاری ایسی تھی۔ اب تم مل گئی ہو۔۔ آ گے کچھ نہیں کہتا۔ تم خود سمجھ لو"۔

وہ بڑے شرمیلے آدمی تھے۔ یہ خط دینے کے بعد کئی دن وہ غائب رہے۔ پھر رقیہ کو کالج لینے پہنچے۔ وہ ان کی موٹر میں بیٹھ تو گئی مگر سخت نگاہ سے انہیں دیکھتی رہی انہوں نے اپنا ورد جاری رکھا مگر کھل کر بات نہیں کی۔ رقیہ نے ان کے گھر جانے یا ان کے ساتھ سیر کرنے سے انکار کیا۔

انہوں نے رقیہ کے والد سے سب حال بیان کر کے کہا" آپ کی اجازت ہو تو میں رقیہ سے شادی کا پروپوزل کروں"۔

والد نے اجازت دی۔ اماں نے بھی کہا" کیا برا ہے اتنا مالدار ہے۔ اسکول میں روز کی گھس گھس سے تو اچھا ہے اور پھر ایک لاکھ کی جائیداد مہر میں رکھنے کو بھی کہا ہے۔ میں تو کر دوں گی۔ وہ تم سے کہے گا تم انکار نہ کرنا"۔

اب رقیہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی اور چیخ کر رونے لگی۔ ہائے وہ اس سے کیوں تن گئی تھی۔ اس سعید کے مارے یہ کیسا اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔

پھر روتے روتے سو گئی اور نہ معلوم کیسے کیسے خواب دیکھتی رہی۔ بار بار آنکھ کھل جاتی اور وہ کہتی" ایسا محبت دار آدمی۔ اف۔ اف۔ امی سے کیسے کہا گیا تھا کہ اب سے آپ میرے گھر نہ آیئے گا"۔ اور پھر نعیم صاحب اس کے گھر نہ آئے تھے۔ کئی مہینے ہوئے تھے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات مہینے سے وہ نہیں آئے تھے۔ اٹھتے ہوئے اس نے طے کیا کہ وہ خود نعیم صاحب کے یہاں جائے گی۔

وہ کالج کے وقت سے ایک گھنٹہ پیشتر گھر روانہ ہوئی۔ رکشہ پر بیٹھ کر نعیم صاحب کے گھر کی طرف چلی۔ گھر جوں جوں قریب آتا گیا وہ اس کا دل دبدباتا گیا۔ رکشہ گھر سے آگے نکل گئی اور وہ رکوانا بھول گئی۔ پھر اس نے رکشہ والے سے کہا" واپس لے چلو"۔ مگر گھر کے پاس پہنچ کر قریب کی گلی میں مڑوائی کافی دور جا کر پھر کہا" واپس لے چلو"۔ کئی دفعہ ایسا کرنے کے بعد رکشہ والا بولا " کہاں تک چکر کھلایئے گا؟" اس نے جواب دیا" تم کو اپنے کرائے سے مطلب ہے کہ چکر سے۔ میں دن بھر چکر لگواؤں گی۔ تمہارے میٹر سے جو کرایہ بنے لے لینا"۔ رکشہ والا خاموش ہو گیا اور چکر لگاتا رہا۔

پانچویں چکر میں نعیم صاحب کے گھر سے چار گھر آگے ایک گھر سے ایک لڑکی نکلتی دکھائی دی۔ جس نے اس کو سلام کیا۔ اس نے رکشا والے سے کہا" یہاں روک دو"۔ لڑکی اس کے پاس آ گئی۔ اس نے کرایہ دیا اور لڑکی کی طرف رخ کر لیا۔

" کیا مس آپ کوئی مکان ڈھونڈ رہی ہیں؟"

" تم میری شاگرد رہی ہو مجھے یاد آیا۔ کیا نام ہے تمہارا یہ یاد نہیں رہا"۔

" میں رومانہ کے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس کی شادی میں بھی شریک تھی۔ پھر یونیورسٹی میں گئی۔ اب ایم اے فائنل میں ہوں۔ رومانہ کے والد نعیم صاحب مجھے یونیورسٹی پہنچا دیتے ہیں۔ آج دیر ہو گئی۔ قریب ہی تو گھر ہے دیکھنے جا رہی ہوں کہ کیا ہو گیا۔ میرا نام فہمیدہ ہے۔ آپ کو یاد نہیں"۔

" اچھا تم جاؤ۔ مجھے ادھر جانا ہے"۔

" آپ نے رکشا تو چھوڑ دی۔ ساتھ چلیے نعیم صاحب کی موٹر میں بیٹھ کر چلی جایئے گا۔ آپ کے کالج کا وقت قریب ہے۔ کیا آج کالج نہیں جایئے گا"۔

رقیہ ہٹپٹائی مگر اسکے دل کو اس لڑکی کی وجہ سے ڈھارس ہوئی اور اس کے منہ سے نکل گیا "اچھا چلو"۔
دونوں دس قدم ہی گئی ہوں گی کہ نعیم صاحب موٹر پر آتے دکھائی دیے۔ موٹر روک کر بولے "ارے آج دیر ہوگئی۔ اچھ چلو"۔ اب انہوں نے رقیہ کو بھی دیکھا اور بولے "آپ ادھر کہاں آ گئیں، آپ بھی بیٹھ جایئے کالج اتار دوں گا آپ کے"۔
فہمیدہ نعیم صاحب کے پاس بیٹھی اور رقیہ پیچھے بیٹھی۔ اسے اس کے کالج پر اتار کر نعیم صاحب چلے گئے۔
جھوٹا، مکار کہتا تھا کہ تمہاری ایسی صورت کی تلاش میں میں تیس پینتیس برس سے تھا اور اب مجھے دیکھا بھی نہیں۔ سات مہینے کے اندر ہی اس صورت کو جس کو اتنے برسوں سے تلاش تھی بھول گیا۔ یہ جوان بھرے بھرے جسم کی تھرکتی ہوئی فہمیدہ کو دیکھ کر لٹو ہے ساٹھ برس کا مرد اپنی لڑکی کی برابر۔ سب سے چھوٹی لڑکی کی برابر کی لڑکی سے اٹک رہا ہے۔ اور لڑکی بھی پھیلی جا رہی ہے۔ ہاں ایک لاکھ کا مہر، موٹر، کوٹھی کون دے گا۔ رقیہ کو خریدنے چلا تھا۔ وہ نہیں بکی تو اب اس سے زیادہ جوان خرید رہا ہے۔ اچھا ہوا تھا کہ رقیہ نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ اب کبھی اس کی طرف رخ نہ کرے گی۔۔۔
اس سے درجے بھی نہ پڑھائے گئے۔ ہر درجہ کو ٹال ٹال دیا۔ ٹیچرز روم میں آ کر سب سے الگ بیٹھی۔ ایک کتاب کھول کر سامنے رکھی اور سر اس پر جھکایا اور سوچتی رہی۔
"اے آج کیا ہے رقیہ چپ چپ گم صم ہو؟" کئی ساتھنوں نے پوچھا۔
"میرے سر میں درد ہے۔ شاید بخار آنے والا ہے"۔ اس نے سب کو ٹال ٹال دیا۔
چھٹی کے وقت جب وہ کالج سے باہر آئی تو دیکھا نعیم صاحب موٹر لیے کھڑے ہیں۔ وہ موٹر کی طرف پیٹھ پھیر کر آگے بڑھ رہی تھی تو وہ لپکتے ہوئے پاس آئے اور بولے "رقیہ میں تمہیں گھر پہنچانے آیا ہوں چلو میرے ساتھ موٹر میں"۔
وہ ہچکچائی مگر ساتھ ہو لی۔
موٹر بڑھاتے ہوئے نعیم صاحب بولے "آج کیا تھا جو تمہیں یاد ہماری آئی؟"
رقیہ خاموش رہی۔
"آج تم میرے پاس آئیں تھیں مگر میرے گھر میں آنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے دیکھا کہ کئی بار تمہاری رکشہ میرے گھر کے سامنے سے گزری میں نے تیس برس مجسٹریٹی کی ہے۔ ہزاروں قسم کے لوگ دیکھے ہیں۔ میں انتظار کرتا رہا کہ تم شاید اتر کر آؤ۔ اسی میں فہمیدہ کے پاس پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ اب تمہیں کیا کہنا ہے بتاؤ"۔
"آپ نے یہ سب فرض کر لیا ہے۔ سب غلط۔ سات مہینے ہوئے ہیں آپ سے پر جھاڑ کر الگ ہوگئی تھی۔ مجھے آپ سے ملنے کا کوئی شوق نہیں آپ ہی میرے پیچھے دوڑے آئے"۔
"خیر یہ سب جانے دو۔ تم کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ صورت جو میرے ذہن میں تیس برس سے تھی سامنے آ گئی جب تم سے بار بار ملا تو یہ بھی محسوس ہوتا رہا کہ تم اس کے مقابلہ میں بالکل بے جان اور بے حس ہو۔ وہ کھلی ہوئی تھی تم مرجھائی ہوئی۔ صورت تو ضرور ہے اسی کی سی مگر اس کا بھوت اور پھر جب تم نے انکار کر دیا تو میرا دھیان اس سے مشابہت سے زیادہ تمہارے سوکھے پن تمہاری بے حسی پر جانے لگا۔ فہمیدہ کے ماں باپ نہیں ہیں۔ چچا کے یہاں پل رہی ہے۔ رومانہ کی شادی کے بعد سے برابر میری دلجوئی میں لگی ہے۔ اس کے چچا چچی اور چچا زاد بھائی بہن اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ وہ ایم اے پریولیس کر چکی تھی۔ میں بھی کہتا ہوں ایم اے کر لے دو مہینے اور ہیں۔ کسی دن بھی ہم دنوں نکاح کر لیں گے۔
"جب یہ سب ہے تو پھر آپ کیوں میرے پیچھے لگنے کو آتے۔۔۔ اور اور میرے گھر کی سڑک تو پیچھے رہ گئی یہ آپ مجھے

کہاں لے جارہے ہیں''۔

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ اگر تم کہو تو اپنے گھر چلوں اور بات پوری کرلوں''۔

''نہیں نہیں آپ مجھے یہیں اتار دیجئے میں گھر چلی جاؤں گی اور اب کبھی میری طرف رخ نہ کیجئے گا۔ فہمیدہ میں مگن رہیے''۔

''خیر میں تمہیں تمہارے گھر پہنچائے دیتا ہوں۔ بات صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے تمہارے رخ میں صاف تبدیلی دیکھی۔ اور مجھے پھر وہی صورت یاد آ گئی۔ جس کا تم ہلکا سا چربہ ہو۔ فہمیدہ کو اتار کر میں گھر جاتا مگر لاشعوری طور پر تمہارے کالج پہنچ گیا۔ آگے کچھ نہیں۔ اب بہت دیر ہوگئی۔ یو ہیو کم ٹو لیٹ۔ ٹو لیٹ، ٹو لیٹ''۔

نعیم صاحب نے اسے اس کے گھر پر اتارتے وقت کہا۔ ''بہت دیر ہوگئی'' اور موٹر لیے ہوئے چلے گئے۔

رقیہ گھر میں داخل ہوئی تو کچھ غصہ کے عالم میں تھی۔ اپنے کمرے میں جا کر کپڑے اتارے نچنت ہو کر والدہ اور والد کے ساتھ چائے پینے آئی۔ بات بات میں وہ نمایاں طور پر گم ہو جاتی۔ ماں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ نبض دیکھی اور کہا ''کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آج شاید کام بہت تھا تھک گئی ہو''۔

''جی ہاں تھک گئی ہوں اب جا کر لیٹوں گی''۔

بہت دیر ہوگئی، بہت دیر ہوگئی۔ آخر وہ کس خواب خرگوش میں تھی؟ نسیمہ نے دھوکے میں رکھا۔ نہیں وہ خود دھوکے میں تھی۔ سعید نے بس ایک دفعہ الگ لے جا کر کہا تھا ''تم آج بہت جچ رہی ہو'' آج۔ آج اور وہ اس آج کو دوام سمجھ گئی۔ آٹھ برس تک انتظار۔ خواہ مخواہ وہ آیا تو یہ کہتا ہوا ''ارے تمہارے چہرہ پر یہ داغ کیسے ہیں''۔ جیسے وہ کوئی جانور تھی۔ جس کو خریدنے سے انکار کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ کیا وہ نسیمہ کے پاس جائے۔ اور اس سے پوچھے؟ کیا پوچھے؟ وہ اور بھی ہنسے گی۔ شاید یہ تاڑ کر کہ بھائی سعید پر ریجھی ہیں کبھی اس نے کوئی بات کرلی ہوگی یہ سمجھ گئیں کہ مر رہا ہے۔ ''ذرا اپنی اوقات میں رہیں، ذرا اپنا منہ آئینہ میں دیکھیں۔ اور اب تو سوکھ کر اچور ہوگئی ہیں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ یہی کہتی ہوگی سب سے اور بھائی کے آنے پر رقیہ کو بلایا پارٹی میں کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لے۔ اچھا اس نے یہ ترک کیا اور اس کا میاں ضمیر اسے کہتا سنا گیا، ''بالکل معمولی بلکہ معمولی سے بھی گری ہوئی اور بنواب اس کے آٹھ بچے ہوگئے''۔ کیا کہنے لگی۔ تم نے نعیم صاحب سے انکار کردیا۔ غضب کیا۔ اب تمہیں کون پوچھے گا۔ اچھا تھا کہ ماں باپ نے ہائی اسکول کے بعد ہی میری شادی کردی تھی۔ میں نے چار بچے ہونے کے بعد انٹر جوائن کیا۔ تمہارے ساتھ جب ایم اے میں آئی تو چھ بچے ہو چکے تھے۔ اب بوڑھی ہوگئی۔ میرے ساتھ کہ نہ معلوم کتنی بیٹھی ہیں'' بہت دیر ہو جائے تو کوئی پوچھتا نہیں''۔

''ہاں نعیم صاحب کے سامنے آنے پر بھی بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ قسمت سے ملے تھے۔ آخر ان میں کیا کمی تھی؟ جائیداد، موٹر، ملازم ہر قسم کا آرام، ایسے لوگ جن کو مل جائیں ان کو قسمت والی کہتے ہیں۔ ہاں صرف سن آگیا ہے۔ ساٹھ کے قریب۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ تاجور کی شادی ساٹھ برس والے سے ہوئی اور وہ اب تک زندہ ہے۔ اب تو دونوں ہم سن معلوم ہوتے ہیں۔ جمیلہ کا میاں اس سے سال بھر چھوٹا تھا۔ مگر دو سال ہی میں مر گیا۔ اب بیوہ بیٹھی ہے ایک لڑکا لیے ہوئے۔ محض وہم ہے سن کے فرق سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں حیثیت، مال، آرام سب کچھ ہے''۔ فہمیدہ اس سے دس برس چھوٹی ضرور ہوگی۔ مگر اسے نعیم صاحب سے کوئی انکار نہیں۔ اسے تو کوئی برابر کا مل سکتا ہے اگر ذرا انتظار کرلے۔ مگر کیوں انتظار کرے۔ خطرہ مول لے۔ پھر محسوس ہو بڑی دیر ہوگئی۔ مگر اب وہ کیا کرے نعیم صاحب بھی ہاتھ سے نکل گئے، صاف صاف کہہ گئے۔ ٹو لیٹ، ٹو لیٹ۔ یہی کہے گی کہ مجھے گھریلو زندگی اچھی نہیں لگتی۔ لومڑی کو انگور نہیں ملے تو کھٹے ہیں۔ نو کہنے لگے گی۔ آخر اس کے بابت بات کرنا ہی کیا فرض ہے۔ شادی کی بات ہی نہ کرو۔ کوئی بات

کرے تو ٹال دو۔ جب پڑھتی تھی تو اس نے افسانے لکھے تھے۔ اب پھر لکھنے لگے۔ دل بہل جائے گا۔ ہاں کئی ایک ناول لکھے۔ فرزانہ نے اب تک دس ناولیں لکھ ڈالیں۔ وہ بھی یہی کرے۔ پڑھانے میں جی نہیں لگتا۔ ناولوں سے بڑی آمدنی ہوگی۔ موٹر، بنگلہ، سب ہی ہو جائے گا۔ نعیم کے پاس کیا ہے یہی تو ہے اور جب مشہور ہو جائے گی تو بہت سے لڑکے آیا کریں گے۔ کتاب پر تصویر دیکھ کر نہ معلوم کتنے لوگ خط لکھیں گے۔ تصویر میں یہ چہرہ کے داغ بھی نہیں آئیں گے۔ اور اس رخ سے بیٹھ کر تصویر کھنچوائے گی کہ یہ گڑھے نظر نہ آئیں۔ اور ہاں مس خاتون نے اپنے بابت لکھا۔ میں نے پہلا ناول چودہ برس کے سن پر لکھا۔ ایم اے کے بعد لکھا۔ یعنی تیرہ برس کی تھی۔ جب ایم اے پاس کیا۔ خوب چھ برس کے سن میں ہائی اسکول کیا۔ یہ نہ کہو کہ ہائی اسکول کا سرٹیفکیٹ منہ میں تھا جب پیدا ہوئیں مگر یہ سب حساب کون لگاتا ہے۔ وہ بھی مشہور کرادے گی کہ بیس برس کی ہے جوان جوان لڑکے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے۔ کوئی نہ کوئی پرپوز ضرور کرے گا۔ چھوٹے سے شادی کر لی۔ لونڈا پھانس لیا۔ کیا ہے؟ شاہدہ نے نہیں کرلیا ہے۔ لوگ تو ہر چیز پر اعتراض کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہاں مرد کو جب شوق چراتا ہے تو کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ بیل کی طرح منہ اٹھائے ہوئے دوڑنے لگتا ہے۔ کوئی دوڑتا آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ اب کے جو آئے گا اسے نہ جانے دے گی۔ ضرور پھانس لے گی۔ مگر آئے گا بھی۔ ان جوانوں کا ٹھیکہ نہیں۔ دوڑتے ہیں اور پھر بھاگ لیتے ہیں۔ دیر ہوگئی، کیا سچ مچ دیر ہوگئی؟؟؟؟۔۔۔۔

☆☆☆

پھسلن

محمد حسن عسکری

جمیل کا تو اس طرف خیال تک نہ گیا تھا، مگر ذاکر کے غیر متوقع طرزِ عمل نے اس کے دل میں بھی دلچسپی، ورنہ کم سے کم کھر چن سی تو ضرور پیدا کردی۔ وہ ہوا یوں کہ ایک دن مردانے میں ذاکر جمیل کی کمر میں ہاتھ ڈالے پلنگ پر بیٹھا تھا کہ یکایک اندر سے نذرو نمودار ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر کمرے کے باشندوں کا جائزہ لیا، اور پھر شانے چوڑے کیے، سینہ اٹھائے، اپنی موٹی میلی سوتی بنیان کی، جس کے مختلف رنگ عرصے کے استعمال سے گھل مل کر اب ایک چتیوں دار بھوری رنگت میں تبدیل ہو چکے تھے، آدھی آستینوں سے نکلی ہوئی بانہوں اور ٹخنوں سے اونچی دھاری دار تہمد ہلاتا، بغیر کسی طرف دیکھے اپنے گلے کے سیاہ ڈورے کو ہاتھ سے گھماتا ہوا لاپروائی سے سید حامیز کی طرف چل دیا۔ نذرو کے داخل ہوتے ہی ذاکر کی بھنوئیں اوپر اٹھ گئی تھیں، اور اس کی آنکھیں نذرو کے چہرے پر گڑ چکی تھیں۔ نذرو کے چلنے کے ساتھ ساتھ ذاکر کی آنکھیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلیں اور جمیل کے کندھے کو جھٹکا دے کر بایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر فیصلہ کن انداز سے رکھتے ہوئے ایک بھوں اوپر چڑھا کر اور دوسری نیچ کھینچ کر ترچھی سلوٹوں سے جتے ہوئے ماتھے اور طنز سے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پوچھا: ''یہ کون صاحب ہیں بھئی؟''

''ارے! تمھیں نہیں معلوم؟'' اور اس کے یہاں ذاکر کی آمد و رفت کی تعداد کو دیکھتے ہوئے جمیل کا تعجب بے جا بھی نہ تھا''۔ یہ نوکر ہے ہمارا نیا۔۔۔نذرو۔۔۔کمال ہے یار، تمھیں اب تک خبر نہ ہوئی۔۔۔۔ ہیں؟''

اس سوال کے جواب کی اہمیت پر غور کیے بغیر، ذاکر نے کہا ''یعنی آپ کو بھی یہ شوق ہوا۔ یہ کب سے؟ کیا ارادے ہیں آخر؟'' اس کی شک و شبہ سے بھری ہوئی آنکھوں کی تیزی اور چمک، اور ان کے جھکے ہوئے کناروں کے ساتھ اب دو ہونٹ بھی ہنسنے کے لیے کھل چکے تھے۔

جمیل کا دل نہ چاہتا تھا کہ اس گفتگو کو محض مذاق سے زیادہ وقعت دے، مگر اس نقطۂ نظر کے انوکھے پن نے اسے ایسا مجبور کردیا کہ شام تک جتنی مرتبہ بھی نذرو اس کے سامنے آیا، اس نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر اس نظریہ کی صداقت معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر ہر دفعہ یہی فیصلہ کرنا زیادہ خوشگوار معلوم ہوا کہ ذاکر صرف اسے چڑا رہا تھا۔ تاہم اسے اپنے نئے نوکر کی شخصیت کچھ عجیب و غریب، اجنبی اور پر رمز ضرور معلوم ہو رہی تھی، آج سے نہیں بلکہ پہلے ہی دن سے۔ وہ آکر بڑے لاابالیانہ پن سے ہاتھوں کو پیٹ کے اوپر ایک دوسرے پر رکھ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اور ہاں، اس نے کسی کو سلام تک نہ کیا تھا۔ جب اس سے نوکری کرنے کو پوچھا گیا تو اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا ''ہاں ہاں، جی۔ کیوں نہ کریں گے؟'' اسے دعویٰ تھا کہ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ جب اس سے تنخواہ کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے اپنا زردی مائل بے رنگ لمبا صافہ اتارا، اور اسے جھاڑ کر دوبارہ باندھتے ہوئے ایسے انداز میں کہا گویا تنخواہ آخری چیز تھی جس سے اسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ''اجی، جو بھی دل چاہے دے دینا''۔ اور اس نے تین روپے پر کوئی اعتراض کیا بھی نہیں۔ دو دن تک وہ بہت خاموشی اور سستی سے اپنا کام کرتا رہا، مگر تیسرے دن اس نے بالکل غیر متوقع طرزِ گفتگو اختیار کیا۔ جب جمیل اسکول جانے سے پہلے باورچی خانہ میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو نذرو نے نہایت رازدارانہ لہجے میں کہا ''اجی آج ایک سالی عجیب بات ہوئی۔۔۔ سناؤں میں جمیل میاں، وس کو تمھیں؟'' نذرو کے تنے ہوئے کان، گول گول پھرتی ہوئی آنکھیں، ہنسی میں کھلے ہوئے ہونٹ، اس کی ناک کے دونوں طرف سرخی کی جھلک، اور گالوں میں پڑے ہوئے گڑھے کو دیکھ کر

جمیل ہچکچایا اور اس کے منہ سے نوالے میں سے پھنستی پھنساتی ایک نیم رضامند ’ہوں‘‘ نکلی۔ نذرو کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔’’ یہ جو برابر میں لالہ رہتے ہیں نا، اجی یہی دیوار تلے‘‘۔ نذرو ہر شخص اور ہر چیز کی بہن کے بارے میں اپنے فاسد خیالات کا بلا جھجک اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اسے چھپا نہ رہا تھا۔’’ تو آج جو میں ذرا کوٹھے پہ گیا جمیل میاں، تو کیا دیکھا کہ وس کی بیوی سالی، بس بالکل ویسے ہی بیٹھی تھی۔۔۔ بس ایک ساڑھی لپیٹ رکھی تھی وس نے۔ اور اب کیا بتاؤں بھئی لو۔۔۔ لاحول بلا۔ لاحول بلا۔ سب دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ تو جی، اتنے میں وس کا میاں۔۔۔ اللہ۔‘‘ نذرو اور قریب کھسک آیا تھا اور جمیل کا سارا چہرہ گلابی ہو گیا تھا، اور وہ جلدی جلدی نوالے توڑ رہا تھا۔’’ تو جی وس نے آتے ہی وس کے لے کے پلنگ۔۔۔‘‘ جمیل کے پھندا لگ گیا اور وہ کھانستا ہوا گھڑوں کی طرف بھاگا، اور پانی پی کر سیدھا چل دیا۔ اس کے کسی نوکر نے کبھی اس سے ایسا ذکر نہ کیا تھا۔ اس چیز نے اسے شش و پنج میں ڈال رکھا تھا۔ اور پھر آج کی ذاکر کی باتیں۔ وہ نہایت مضبوط دلیلوں اور مثالوں سے اس سب کی اہمیت کم کرنے اور اسے کوئی غیر معمولی چیز نہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر پھر اسے اپنے فیصلو پر اعتبار نہ آتا تھا۔

اگلے دن تک یہ بات اسکول میں پہنچ گئی۔ درمیانی وقفے میں جب نویں کلاس کے لڑکے نیم کے پیڑ کے نیچے جمع ہوئے تو ایک پوری ٹولی نے جمیل کو گھیر لیا۔

’’ اونچے جا رہے ہیں بھئی جمیل بھی آج کل‘‘۔

’’ خیر میاں شکر کرو، یہ اس قابل تو ہوئے‘‘۔

’’ ابے ہٹا۔ یہ! اس مرے یار سے آتا ہی کیا ہے سوائے گھوٹنے کے، کسی کے سامنے بات تو کر نہیں سکتا، بڑا بنا ہے کہیں کا وہ‘‘۔

’’ مکھیاں مارو گے بیٹا‘‘۔ مرزا بیدار بخت نے نصیحت کی۔’’ سب بھول جاؤ گے یہ فرسٹ ورسٹ آنا‘‘۔

جمیل ان سب کے جواب میں جھینپ جھینپ کر روکھی ہنسی ہنس رہا تھا اور خالی نگاہوں سے ان کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ اسے وقتی تفریح سمجھ کر ٹلا نہ سکتا تھا۔ اور شبہوں کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ان چیزوں سے بھی واقف ہونا چاہتا تھا جس کا یہ سب لوگ ذکر کر رہے تھے اور جس کا تخیل اس کے دماغ میں نہایت غیر واضح سا تھا۔ وہ بھی علی بابا کے غار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔

اسی دن دوپہر کو مرزا بیدار بخت ذاکر کو ساتھ لے کر جمیل کے یہاں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اس کا پہلے ہی سے اعلان کر دیا تھا۔ مرزا جی کو بڑی پیاس لگی ہوئی تھی۔ نذرو انہیں پانی کا گلاس دے کر کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔ مرزا جی نے پانی کا گلاس واپس نہیں دیا۔ وہ دو منٹ تک اس کا جائزہ لیتے رہے اور پھر بولے۔’’ کہو دوست کیا نام ہے تمہارا؟‘‘

’’ ہمارا نام؟ کیا کرو گے پوچھ کے ہمارا نام؟‘‘ اس نے بے توجہی سے کہا۔

’’ کچھ برائی ہے پوچھنے میں؟‘‘

’’ ہمارا نام ہے سید نذیر علی!‘‘ نذرو نے بتلایا۔

’’ اور نذرو؟‘‘ مرزا جی نے پوچھ لیا۔

’’ اب ہم غریب آدمی ہیں، چاہے جو کہہ لو‘‘۔

’’ رہنے والے کہاں کے ہو تم؟ اچھا بیٹھو، بیٹھو، باتیں کرنی ہیں تم سے‘‘۔

نذرو پلنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ یوں تو کبھی کبھی اسے کرسی پر بیٹھنے میں جمیل کا لحاظ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی نشست بتا رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو مواخذے سے مامون سمجھ رہا ہے۔

اس نے ماتھے اور سر پر اپنا چوڑا اور موٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اجی کیا پوچھو ہو۔۔۔۔ہم غریبوں کا رہنا رہوانا''۔
''ابے سالے؟'' مرزا جی نے پہلو بدل کر ڈانٹا۔ ''اکڑ گیا کرسی پہ بیٹھ کے! بتاتا ہے کہ کی جائے قانونی کاروائی تیرے ساتھ''۔
نذرو ایک دم ہنس پڑا۔ اس کا ہاتھ سر سے گھٹنے پر آ گیا۔ پیچھے کھسک کر اس نے مانوس اور مصالحانہ انداز میں ٹانگیں پھیلا لیں۔ اور بغیر کسی مزید، گو متوقع، سوال کے اپنی پوری سوانح حیات سنا ڈالی۔۔۔۔ ''رہنے والے تو ہم ہیں عنایت پور کے۔ ہمارے والد ہیں سید مقبول احمد۔ دیکھا ہوگا آپ نے۔۔۔ بہت آتے ہیں وہ تو شیر''۔ مرزا جی کے انکار سے مایوس ہوئے بغیر اس نے اور زیادہ اعتماد کے ساتھ دوسری شہادت پیش کی۔ ''اچھا، تو یہ ہیں نا سید اشفاق علی۔ یہ بزار کے نکڑ پر جو رہویں ہیں۔۔۔۔ موٹے سے۔۔۔ بڑی بڑی مونچھیں۔۔۔۔ فوٹو گراف کے رکاٹ بغل میں دبائے جو پھرتے ہیں۔۔۔۔ یہی تو ہیں ہمارے خالو۔۔۔۔ سگے خالو ہیں یہ ہمارے۔۔۔۔ تو ابا جو تھے ہمارے۔۔۔ وہ تھے اس قدر کے ظالم کے بس۔ جب میں پڑھنے نہ جاتا تو مار دیویں تھے ایسی بودی کہ۔۔۔۔ دس سال کا تھا میں وس وخت۔ ایک دن جو مارا انہوں نے مجھے، تو مجھے آیا بڑا غصہ، میں بھاگ کر بدلو جا رہے کی پھلیچ پہ جا بیٹھا۔ وس نے مس سے کہا چل بے دلی۔۔۔۔ شیشے کے کرخانے میں۔ میں وسی کے ساتھ چل دیا۔ بس جی وہ دن ہے اور آج کا دن۔ قسم لے لو مس سے جو پھر گھر میں جھانکا بھی ہوں۔ پانچ سال ہو گئے اور پھر والد نے کی بھی بڑی کوشش، لیکن میں ون کے نہ آیا جھانسے میں۔۔۔ دلی میں میں شیشے کے کرخانے میں نوکر ہو گیا تھا۔ کرخانے والا بس بیٹے کے برابر سمجھتا تھا مجھے، جو چیز چاہے اٹھاؤں چاہے رکھوں۔ اور پیسوں کے معاملے میں بچارے نے کبھی مجھ سے نا نہیں کی۔ بڑی محبت تھی وسے مس سے۔ ایک دن میں رانگ آگ پہ رکھ کے ذرا نیچے بزار میں اتر گیا۔ وہاں ایک لونڈا سالا کرنے لگا مجاخ، بس اسی میں دیر ہو گئی۔ آ کے جو دیکھیں میں نے تو رانگ الٹا پڑا تھا۔ کرخانے والا بہت بگڑا مجھ پہ۔ خیر ایسی بات کا تو میں برا بھی نہ مانتا، پر وہ مجھے گالی دے بیٹھا۔ وخت کی بات آگ لگ گئی میرے بدن میں۔ میں وس سے لڑ کے نکل گیا۔ کئی دن پھرا وہ میرے پیچھے پیچھے۔ خوشامد کرتا وا کہ چل، چل، اتی سی بات کا برا مان گیا۔ پر ساب، یہ دیکھ لو کہ میں نے ہی نہ سنی وس کی بات۔ سید ٹھہرے پھر ہم بھی۔ کوئی رعیت تھے وس کی۔ وس سے کہہ دیا میں نے کہ لے تیری خاطر ہم نے دلی بھی چھوڑی۔ بس میں وہاں سے یہاں چلا آیا۔

اس دن سے مرزا جی، اور خصوصاً ذاکر کی آمد و رفت پہلے کی نسبت بہت بڑھ گئی۔ لیکن جمیل محسوس کر رہا تھا کہ اس کی کمر کے گرد ذاکر کے ہاتھ کی گرفت بہت کمزور پڑ گئی ہے۔ ان دونوں کو آتے ہی پانی یا پان کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اور جتنی دیر وہ بیٹھتے، اسکا زیادہ حصہ نذرو سے دل کے بازاروں، گلیوں، کارخانوں، اور سڑکوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں گزرتا۔ نذرو کی وہ پہلے والی کسالت، سستی اور خاموشی سرے سے غائب ہو چکی تھی۔ اب اس کی چال میں پھرتی آ چکی تھی، اور وہ دن میں تین چار بار منہ ہاتھ دھونے لگا تھا۔ اس کا صافہ اب باورچی خانے کی کھڑکی میں پڑا رہتا تھا اور اس کے چھوٹے گھنگریالے بال، جن پر پہلے خشکی جمی رہتی تھی، کڑوے تیل سے سیاہ اور چمکدار نظر آنے لگے تھے۔ وہ اپنے بنیائن اور تہمد کو بھی ایک دفعہ کنوئیں پر پچھاڑ چکا تھا۔ اس کی ٹین کی ڈبیا اب کبھی بیڑیوں سے خالی نہیں نظر آتی تھی۔ بلکہ اس کے گلے کا ڈورا بھی ریشمی ہو گیا تھا۔ باتونی بھی وہ اس بلا کا ہو گیا تھا کہ اسکے دلی کے متعلق قصے کبھی ختم نہ ہوتے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن مرزا جی اور ذاکر اسے دو اچھے سامعین مل گئے تھے۔ اور ان دونوں سے تو اس کے تعلقات ترقی کر کے دوستانے کے لگ بھگ پہنچ گئے تھے۔ انہیں نذرو کے منہ کی جھوٹی بیڑیاں پینے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ وہ اسے یار دوستوں کی سی گالیاں بھی دے لیا کرتے تھے، حالانکہ وہ ایک مرتبہ جمیل کے ''گدھا'' کہہ دینے پر بھڑک اٹھا تھا۔ جب وہ مرزا جی کے جوتے چھپا دیتا تو مرزا جی اسے پکڑ کر فرش پر گرا دیتے اور اس کے گالوں اور سینے پر چٹکیاں لیتے، یہاں

تک کہ وہ جوتوں کا پتا بتا دیتا۔ جمیل نے اکثر اندر سے نکلتے ہوئے ذاکر کی بانہوں کو نذرو کے گلے میں دیکھا تھا، مگر وہ اس کے سامنے آتے ہی ہٹالی جاتی تھیں۔ نذرو نے جمیل کا کہنا ماننا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کی بات کو ان سنی کر دیتا تھا۔ جب جمیل پڑھتا ہوتا تو وہ سامنے چارپائی پر الٹا لیٹ کر اونچی جھنجھناتی آواز میں گانے لگتا۔ ''میری جاں جلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھے ہو'' ۔یا'' جانی جینا پہ اتنا نہ اترایا کرو'' ۔ وہ جمیل کے منع کرنے پر بھی نہ مانتا، اور ہنس ہنس کر دوسرا گیت شروع کر دیتا۔ ''وہ چلے پھنک کے چاول مری منگنی اور بیاہ کے'' ۔ جب جمیل ضبط کی آخری حد پر پہنچنے کے بعد غصے میں دانت کچکچاتا، جوتا لے کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تو وہ جوتا چھین کر بھاگ جاتا اور پھر ہاتھ نہ آتا۔ آخر جمیل رونکھا ہو جاتا اور پھر اس سے نہ پڑھا جاتا۔ وہ تہیہ کر لیتا کہ آج ضرور وہ نذرو کو ابا کے سامنے مارے گا اور گھر سے نکال دے گا۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد نذرو آکر لجاجت سے کہتا'' جمیل میاں، مجاخ کا بڑا مان گئے'' ۔ تو وہ اپنے ارادے میں ترمیم کر لیتا اور نذرو کے سر پر دو تین تھپڑ جما کر، جس میں شاید اس کی باریک انگلیوں کو ہی زیادہ تکلیف پہنچتی ہوگی، اپنا غصہ بھلا دیتا۔ مگر اس سب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نذرو کو جمیل کا خیال نہیں تھا۔ بغیر کہے ہی وہ جمیل کا ہر کام تیار رکھتا تھا۔ اس کے جوتے کبھی میلے نہیں رہتے تھے، اور نہ اس کے کمرے میں گرد کا نشان۔ نذرو اس کا سرپرست اور محافظ بن گیا۔ وہ ہمیشہ جمیل کو کتابیں صاف رکھنے میں، اندھیرے میں گھر سے باہر نکلنے میں، غرض ہر بات میں بزرگانہ ہدایتیں اور نصیحتیں کیا کرتا۔ وہ مرزا جی اور ذاکر کو بھی اسے زیادہ تنگ نہ کرنے دیتا تھا۔ جمیل کو نذرو کی یہ حیثیت جو اس نے قائم کر لی تھی، گراں تو ضرور گزرتی تھی، اور وہ اب اپنے دوستوں کے سامنے نذرو کی موجودگی میں اپنے آپ کو ایک کم اہمیت والی شخصیت محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اس کے دل میں کبھی کبھی صرف ایک ہلکی اور غیر واضح جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو کر رہ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے نہایت آسانی سے نذرو کو اپنے اوپر مسلط ہو جانے دیا۔ مرزا جی اور ذاکر کے نذرو کی طرف متوجہ ہو جانے سے اب وہ اسے پریشان نہ کرتے تھے، اور وہ اپنے آپ کو کچھ ہلکا سا پاتا تھا۔ نذرو کی خبر گیری اور توجہ سے اس کے کام بغیر کسی تکلیف کے ہو جاتے تھے اور اب اسے اپنی کتابوں اور رسالوں کے رومانی افسانوں میں وقت گزارنے کا پہلے سے بہت زیادہ موقع ملنے لگا تھا اس لیے اس نے نذرو اور اس کے برتاؤ کو بغیر کوئی اہمیت دیئے یا بغیر کسی تشویش کے یوں ہی چلنے دیا اور اپنے پہلے استعجاب کو تحلیل ہو جانے دیا۔

لیکن اس کا استعجاب دوبارہ زندہ ہوا۔ وہ اس وقت جب مرزا جی اور ذاکر کی آمد و رفت بڑھنے کے بعد پھر گھٹتے گھٹتے بہت کم رہ گئی تھی۔

اس کے ملنے والوں کے دو گروہ تھے۔ ایک تو اس کے ساتھی، نویں کلاس کے کچھ لڑکے، یہ سب اس سے کافی بڑے تھے اور سب اپنے اپنے استروں کا انتخاب کر چکے تھے۔ یہ جمیل کی طرح دبلے پتلے کمزور اور منحنی نہ تھے، بلکہ ان کی چوڑی ہڈیاں، اٹھے ہوئے کندھے اور بھرے ہوئے ڈنڈ تھے۔ یہ لوگ جب آتے تو اس سے الگ ہو کر بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ وہ کبھی تو اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے، کبھی اسے سینے سے لپٹا کر بھینچتے، یہاں تک کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور اس کی پسلیاں ٹوٹتی سی لگتیں۔ کوئی اسے گود میں بٹھاتا، کوئی اس کے سینے کی کھال کھینچ کھینچ کر لال کر دیتا، کوئی اس کے بال بکھیر دیتا۔ اور پھر ان لوگوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں اور پھڑکتے ہوئے نتھنوں اور پھیلے ہوئے ہونٹوں سے معلوم ہوتا کہ ان کی تسکین نہیں ہوئی ہے۔ ان کے جانے کے بعد وہ تھک کر بالکل چور ہو جاتا، اسکے دماغ سے ہر قسم کے خیالات غائب ہو جاتے اور وہ افسردگی سے چارپائی پر پڑا رہتا۔ بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے گالوں پر ایسا لیس دار تھوک لپ جاتا کہ اسکی کھال کھینچتی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔ دو دو تین تین مرتبہ منہ دھونے کے بعد بھی اسے محسوس ہوتا کہ یہ نجاست اس کے چہرے پر اسی طرح نمایاں ہے اور وہ غسل خانے سے نکل کر گھر والوں کی نظروں سے بچتا ہوا

سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اتنے لوگوں کو اپنا مداح پا کر اسے ایک گونہ تسلی تو ضرور ہوتی تھی۔ مگر اسے ان کی یہ حرکات عجب مہمل اور لغو نظر آتی تھیں۔ ان کا مقصد اس کے لیے مبہم اور مشکوک سا تھا، اور نہ اس کی متانت نے ان لوگوں کو ان حرکات کی غرض و غایت کو زیادہ واضح کرنے دیا تھا۔ جب وہ جاتے تو اس کے لیے بس اتنا چھوڑ کر جاتے، تھکا ماندہ جسم، دکھتی ہڈیاں، نچے ہوئے گال، گرم کنپٹیاں، درد کرتا ہوا سر اور چڑچڑا مزاج۔ اور پھر ان سے بچنا بھی خوشگوار نتائج پیدا نہ کر سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وہ اندر سے کہلوا دیا کرے کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہے، لیکن اس نے خود دیکھا تھا کہ ایک مرتبہ شمس الدین نے شرط بد کر گھونسے سے کرسی کا تختہ توڑ دیا تھا اور عنایت علی کے ہاتھ کی قوت تو خود اس کی انگلیاں پنجہ لڑانے میں محسوس کر چکی تھیں۔

ملنے والوں کے دوسرے گروہ میں نچی کلاسوں کے لڑکے تھے۔ چھٹی سے لے کر آٹھویں تک۔ یہ سب جمیل کے ہم عمر یا اس سے کچھ چھوٹے تھے۔ یہ لوگ پہلے گروہ کی غیر موجودگی میں آتے تھے اور انہی میں جمیل کو زیادہ کھل کر ہنسنے بولنے اور تفریح کرنے کا موقع ملتا تھا۔ پھر ان پر اس کا رعب بھی خاصا تھا۔ اگر وہ کبھی ذرا ناراضگی کا اظہار کرتا تو سب کی ہنسی رک جاتی تھی اور وہ مجرمانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے تھے۔ تاہم وہ بڑی حد تک ان کے مذاق کا برا بھی نہ مانتا تھا۔ بعض بعض دن تو جب وہ دوپہر کی گرمی اور خاموشی میں بے چینی سے اکیلا کروٹیں بدلتا ہوتا اور کہیں ساتویں کلاس والا مظہر آنکلتا تو اس کا دل تیزی سے حرکت کرنے لگتا۔ اپنی قمیض کے دامن کو ہاتھوں سے ٹانگوں کے قریب تھامے ہوئے وہ مظہر کو کسی بہانے کونے کی طرف لے جاتا اور اس کا کندھا پکڑ کر ہچکچاتے ہوئے جلدی سے اس کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا اور فوراً پیچھے ہٹالیتا۔ گال ٹھنڈا، چکنا اور پھیکا سا ہوتا، مگر اسے محسوس ہوتا کہ اس کی بے چینی یک لخت مدھم پڑگئی، اسے اپنی یہ حرکت کچھ بے معنی اور احمقانہ سی معلوم ہونے لگتی۔ وہ دل ہی دل میں حیرت سے ہنستا۔ پھر کچھ شرما کر بیٹھ جاتا۔ اور مظہر سے اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگتا۔

غرض اسی گروہ نے جمیل کو دوبارہ نذرو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں میں بھی نذرو کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ ایک دن نذرو کی موجودگی میں، مشتاق نے مذاق اور قہقہوں اور چیخوں کے درمیان اپنی آواز کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''بھئی آج یہ طے کرو کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے، مالک یا نوکر''۔ اپنے نوکر کو اس نئی روشنی میں دیکھے جانے کے خوف سے جمیل کی ناک کے دونوں طرف سرخی جھلک آئی اور اسے اپنی کھال سکڑتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ مگر اس نے اس ترکیب میں اپنی آخری امید سمجھتے ہوئے مسرور کو زور سے دھکا دیا۔ ''ابے، میرے اوپر گرا ہی پڑتا ہے''۔ اسے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مسرور کے دھکے سے میز گر پڑی، اور اس نے سب کو کتابیں چننے میں لگا دیا۔

اب جمیل کی آنکھیں زیادہ تجسس سے اور شک آمیز حیرت سے نذرو کے چہرے اور جسم کو ٹٹولا کرتی تھیں۔ مشتاق نے ایسا ذکر چھیڑ کر اس کے جذبہ افتخار کو ایک بے پناہ ٹھیس لگا دی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کے دوسرے گروہ سے بھی ملنا اب بہت کم کر دیا تھا۔ کیونکہ اسے ان کے متفقہ فیصلے کا، جو ممکن تھا اس کے خلاف ہوتا بہت ڈر تھا۔ مگر وہ اس خیال کو اپنے دل سے کسی طرح دور نہ کر سکا۔ اسی لیے وہ اپنے خطروں کو دلیلوں سے دور کرنے کی پیہم کوشش کرتا کہ ایک نفرت آمیز ''ہنہ'' کے ساتھ اس کی ہر طرف سے نظریں پھیر لے۔ نذرو کی انگلیاں، وہ سوچا کرتا، کیسی موٹی موٹی گنواروں کی سی ہیں اور اسی طرح اس کے بھدے پیر، بغیر بالوں والی پنڈلیاں کیلے کے پیڑ جیسی ہیں، بیچ میں سے مڑا ہوا، ایک دانت آدھا ٹوٹا، ادرک کی گانٹھ جیسے کان، چھوٹی اور گھنی گردن، پھیلا ہوا پیٹ، گالوں میں ہنسی کے وقت گڑھے پڑ جاتے ہیں جیسے بازاری عورتوں کے۔۔۔۔ ایک نفرت آمیز ''ہنہ!'' لیکن اس ''ہنہ'' کے باوجود وہ اسے دوسری دفعہ دیکھنے پر مجبور ہوتا۔ اس کے گندمی رنگ میں سفیدی کی چھینٹ ہے۔ آنکھوں کے نیچے ہڈیوں پر تو ذرا سی سرخی بھی جھلکتی ہے، کھال تنی ہوئی ہے مگر چکنی اور چمک دار۔ ٹھوڑی کیا گول ہے! چال کے لاابالیہ پن میں نہ معلوم یہ ہلکی سی کشش

کیوں ہے۔آنکھیں گول مٹول سہی، مگر متجسس اور چمکتی ہوئی۔اس کی گردن پر ذرا میل نہیں جمتا۔بازوؤں کی مچھلیاں کیسی حرکت کرتی ہیں۔چہرہ گولائی لیے ہوئے ہے۔جمیل خود اپنی رائے سے بھی خوف زدہ ہو جاتا اور فوراً کوئی کتاب اٹھا لیتا۔جو دس منٹ سے زیادہ اس کی مدد نہ کر سکتی۔آستینیں اوپر کھینچ کر وہ اپنی بانہوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا، گندمی رنگ، پتلی پتلی لکڑیاں سی، ہلکے ہلکے بال۔کچھ مطمئن ہو کر وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا۔ایک نرم، نہایت نرم، روئی کی طرح۔۔۔اور چکنی سطح پر اس کی انگلیاں پھسلتیں۔یقین کو عین الیقین بنانے کے لیے وہ آئینہ اٹھا لیتا۔بڑی بڑی سیاہ، بادامی، لمبی پلکوں والی آنکھیں آئینے میں سے دیکھ کر اس کی طرف جھانکتیں۔اسے ایسی خوشی ہوتی گویا اس نے کوئی نئی دریافت کی ہے۔دودھ جیسے سفید اور بلند ماتھے پر سیاہ چمک دار بالوں کی، جن میں پیچھے کی طرف ہلکا سنہرا رنگ جھلکتا تھا، کوئی لٹ پڑی ہوتی، زردی مائل سفید رنگ میں آنکھوں کے بیچ کافی دور تک سیب کی سی سرخی ملی ہوئی ہے۔ناک لمبی مگر پتلے ہونٹ خاصا نعم البدل ہیں۔کانوں کے لمبان کو بال چھپا لیتے ہیں۔تھوڑی چپٹی ہے۔۔۔۔ہے تو ہوا کرے، رنگ تو گورا ہے۔چہرہ گول نہیں ہے۔۔۔آنہہ۔۔۔گول چہرے ہی میں کون سی خوبصورتی لگی ہوئی ہے۔اوپر کے ہونٹ پر ہلکے ہلکے بال نظر آنے لگے ہیں۔۔۔مگر ایسا رواں تو جمیل نے کئی عورتوں کے بھی دیکھا تھا۔۔۔۔اپنی پتلی کمر کی بدولت وہ اپنے دبلے پن کو بھی معاف کر سکتا تھا۔

یہ نظریۓ اطمینان بخش تو ضرور تھے، مگر موازنے کا خیال جمیل کے سامنے ایک ایسے گھناؤنے عفریت کی شکل میں آتا تھا جو اپنی زہرناک حاسدانہ نظروں سے ناک اور کانوں کو کھینچ کھینچ کر دگنا لمبا کر دیتا۔ٹھوڑی کو پھیلاتے پھیلاتے دہلیز بنا دیتا۔چہرے کو ہر طرف سے پیٹ پیٹ کر کامیں نکال دیتا۔اس کے رنگ کو ہلدی کی طرح دکھلاتا اور اس کی سیب کی سی سرخی کو دھندلا دیتا۔اوپر کے ہونٹ کے ہلکے ہلکے بال گہرے اور گھنے ہونے شروع ہو جاتے اور جمیل پیچ و تاب سے تنگ آ کر انہیں ناخونوں سے کھینچنے لگتا۔

مگر نذرو کا طرزِ عمل بدل رہا تھا۔اب وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔اب وہ اس کا کہنا ماننے سے انکار نہ کرتا تھا اور کم سے کم جمیل کے پڑھتے وقت وہ بالکل نہ گاتا تھا۔بلکہ اب تو اس کی غزلوں کا انتخاب بھی اصلاح پذیر تھا اور اس کا دل پسند گانا اب یہ تھا ”کرے گا کیا ارے صیاد تو جنجیر کے ٹکڑے“۔اب وہ جمیل کے کمرے کی طرف زیادہ رہنے لگا تھا۔جمیل پڑھتا رہتا اور وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھا اپنا سر کھجایا کرتا اور بعض اوقات تو اونگھنے بھی لگتا۔نہ معلوم اسے کیا سما گئی تھی کہ وہ اپنی عمر جمیل سے کم ثابت کرنے کے لیے بہت بے قرار رہتا تھا، بیٹھے بیٹھے وہ جمیل کو پڑھنے سے روک کر کہتا ”ذرا حساب تو لگانا جمیل میاں، کہ میں کتے برس کا ہوا۔۔۔جب میں پڑھنے بیٹھا ہوں تو آٹھ سال کا تھا۔میں تو۔۔۔۔آٹھ۔۔۔اور دو دس۔۔۔اور پانچ۔۔۔پندرہ۔چھوٹا ہی ہوا نا میں تم سے؟“

جمیل چڑ سا جاتا، اسے محسوس ہوتا کہ نذرو اپنی برتری جتانا چاہتا ہے۔ایک دوسری چیز بھی جمیل کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔جب وہ اپنی کتاب میں غرق لیٹا ہوتا تو نذرو اس کے پیر میں گدگدی کیے بغیر کبھی نہ مانتا۔حالانکہ اس کے بدلے میں اسے لاتیں اور چانٹے کھانے پڑتے تھے۔نذرو کی ایک اور عادت یہ تھی کہ وہ جمیل کے سرہانے بیٹھ جاتا اور اسکے بالوں میں ہلکے ہلکے انگلیاں پھرایا کرتا۔اس سے جمیل کے تھکے ہوئے اور خشک دماغ میں ایسا معلوم ہوتا گویا سکون اترتا چلا جا رہا ہے اور وہ گردن کو ڈھیلا چھوڑ کر کتاب سے توجہ ہٹا لیتا۔شروع شروع میں تو اس نے نذرو کو بھگا بھگا دیا، مگر جب وہ کسی طرح باز نہ آیا تو آخر اس نے نذرو کو یہاں تک اجازت دے دی کہ وہ کنگھا لے کر بیٹھ جائے اور جس طرح چاہے اس کے بال بنائے اور پھر بگاڑے، اور پھر بنائے اور پھر بگاڑے۔

اخیر اکتوبر کی رات کے نو بجے تھے، کچھ خنکی سی ہو رہی تھی۔جمیل کوٹھے پر دالان میں اکیلا لیٹا تھا۔نذرو آیا اور اس نے

ہچکچاتے ہوئے کہا ''جمیل میاں ایک بات کہوں تم سے، برا تو نہیں مانو گے؟''

جمیل دھک سے رہ گیا۔ اس کے دل کی حرکت رکتی ہی معلوم ہوئی اور ٹانگیں سنسنانے لگیں۔ کئی دن سے نذرو کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی بات کہنی چاہتا ہے۔ جمیل کو شبہ تھا کہ وہ بات غیر معمولی ضرور ہے۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ ایسی بات سنن سے جس کی نوعیت سے وہ بالکل بے خبر ہے، انکار کردے گا۔ لیکن اسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ آخر کچھ سوچ کر اس نے رکتے ہوئے کہا ''ہاں، کہہ''۔

نذرو نے بات کہنے کا انداز بنانا شروع کیا ہی تھا کہ قدموں کی آواز آئی۔

یہ بات کئی دفعہ قدموں کی آواز سے ملتوی ہو ہوگئی۔ لیکن آخر ایک دن ایسا آیا کہ نذرو نے نہ صرف بات کہنے کا انداز بنا لیا بلکہ بات بھی شروع کردی، اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اس نے پر اسرار آواز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اجی کیا بتاؤں میں نے کیسا عجیب خواب دیکھا۔۔۔عجیب خواب تھا سالا۔۔۔۔۔ کیا بتاؤں، جمیل میاں، کیا خواب تھا وہ''۔

''ہاں، کیا خواب تھا وہ؟'' جمیل نے بے تابی مگر شبہ سے پوچھا۔

''اجی، کیا بتاؤں۔۔۔کیا خواب تھا وہ۔۔۔ میں جب سے وسی کو سوچ رہا ہوں برابر''۔

''ابے تو کچھ کہے گا بھی؟''

''ہاں ہاں تو جی، وہ خواب۔۔۔۔ برا تو نہیں مانو گے، جمیل میاں''۔

''تو کہہ تو کسی طرح''۔

لمبا سانس لے کر نذرو نے سنایا ''برا مت ماننا، جمیل میاں، دیکھو۔۔۔وہ خواب۔۔۔۔ ہنسی آوے ہے مجھے اس خواب پہ۔۔۔''

جمیل نے پھر ڈانٹا۔

''ہاں تو میں نے یہ دیکھا خواب میں، جمیل میاں، کہ۔۔۔۔کہ۔۔۔ میں اور تم ایک پلنگ پر لیٹے ہیں''۔

بم کا گولہ پھٹا۔ مگر چوں کہ جمیل نے اسی نوعیت کی کوئی بات سننے کے لیے اپنے آپ کو پہلے سے تیار کرلیا تھا، اس لیے اس دھکے کا مقابلہ کرنے میں اس کی کوشش زیادہ کامیاب رہی۔ اس سب کو ہیں ختم کردینے کے لیے جمیل نے اس لفظ کو انتخاب کیا ''اچھا''۔ اور اس لفظ کو اس نے ایسی آواز میں ادا کرنے کی کوشش کی جس میں کسی جذبے کی آمیزش نہ ہو۔

نیچے سے کسی نے نذرو کو پکار کر جمیل کی مدد کی۔ اس نے جانے کے لیے اٹھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں آنکھیں گھما کر کہا۔ ''جمیل میاں، ویسے چاہو جتنا چاہے دق کرلو، خواب میں تو مت تنگ کیا کرو''۔

اب جمیل نذرو کی نگاہوں سے کچھ سہما سہما سا رہنے لگا۔ نذرو نے بھی اس کے کمرے میں آنا بہت کم کردیا تھا۔ لیکن وہ اکثر جمیل کے سامنے مسکرا پڑتا تھا۔ جس سے جمیل شرمندہ سا ہو جاتا۔ گویا وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہے۔ جب تک نذرو اس کے کمرے میں رہتا اسے سوئیاں سی چبھتی معلوم ہوتیں اور اس کا دل چاہتا کہ چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو نذرو کی نگاہوں سے بچالے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ لیٹے لیٹے وہ کسی چیز کو اپنے پیروں کے قریب محسوس کرتا۔ کتاب سامنے سے ہٹا کر دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ نذرو اس کے پیر سے اپنا چہرہ لگائے بیٹھا ہے۔ وہ نفرت اور غصے سے پیر کھینچ لیتا۔ مگر اب وہ نذرو کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کے خوف سے اس کے لات نہ مارتا تھا۔ اب چاہے اسکے سر میں درد ہی کیوں نہ ہو، وہ کبھی نذرو سے سر ملنے کو نہیں کہتا تھا اور اس کے بالوں سے نذرو کی دلچسپی بھی جیسے زائل سی ہوگئی تھی۔

رفتہ رفتہ یہ سب معمول سا ہو گیا اور جمیل نے نذر و کی طرف زیادہ خیال کرنا چھوڑ دیا لیکن ایک واقعہ سے اس کی جھینپ اور ڈر، جواب کم ہو چلے تھے، نفرت اور کراہت میں تبدیل ہو گئے۔ پہلی مرتبہ قوالی سننے کا شوق جمیل کو عرس میں لے گیا اور رات کے خیال سے نذر و بھی اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ جگہ تو خیر بیچ میں مل گئی، مگر کچھ بیچ اتنی تھی کہ کروٹ بدلنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ تالیوں اور ڈھول کے گھٹاکے، قوالوں کی منجھی ہوئی بے روک آوازوں کے ساتھ مل کر اپنا کام کر چکے تھے۔ ایک گیروا لباس اور لمبی داڑھی اور بالوں والے صاحب نے اپنی وارفتگی کا اظہار، آنکھیں بند کر کے جھونٹے کھانے سے بڑھ کر، اپنے مسلک کی روایتی خوش ادائی سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے لیے میدان خالی کر دیا گیا اور ''جہاں پیدا ہوا شیر خدا معلوم ہوتا ہے'' کی تکرار ہونے لگی۔ ان کی ہر فلک شگاف ''اللہ ہو'' پر ان کے سر کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر نذر و ''اجی! اجی!'' کہہ کر پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور جمیل کے اوپر گرا پڑ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے جمیل کا بازو کھینچ کھینچ کر کہہ رہا تھا ''اجی جمیل میاں، مجھے تو ڈر لگے ہے''۔ لوگ ہنسنے لگے۔ جمیل کے کان سرخ اور گرم ہو گئے اور اسکی کنپٹیاں جل اٹھیں۔ اس دن سے جمیل کی جھجک نکل گئی اور اب وہ نذر و کی نگاہوں کا بے خوف ہو کر مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب اس نے نذر و کو ایسی حقارت اور نفرت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جیسے اس کالے پیلے مینڈک کو، جو برسات میں نالیوں پر سے رینگتا ہوا بستر پر آ چڑھے۔

اپریل آ گیا۔۔۔ گنگا اور جمنا کے دوآبے کا رنگ اور افسردہ اپریل۔ موسم کی خشکی، گرمی، ہوا، خاک، دھول، سالانہ امتحان کی تیاریوں، مایوسیوں اور امیدوں نے اضمحلال اور گم گشتگی کی ایک مستقل فضا پیدا کر دی تھی۔۔۔ روح پر ایک نا قابل برداشت لیکن لازمی بوجھ کی طرح۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہوا کمرے کے کواڑوں کو ہلائے ڈالتی تھی اور گرد نے روشن دانوں میں سے آ آ کر چہرے اور بالوں کو بھورا بنا دیا تھا۔ باہر تو دھوپ کا جو کچھ بھی حال ہو، مگر کمرے میں، جہاں جمیل لیٹا تھا، گرمی کا اس قدر اثر ضرور تھا کہ اس کے جسم کو تھکا ہوا اور دماغ کو گُتھل بنا دیا تھا۔ باوجود درختوں کے ہلنے کے ایک پر رمز اور گراں بار خاموشی مسلط معلوم ہوتی تھی۔ جس میں دور سے کسی خوانچے والے کی آواز وحشت کا اضافہ کر دیتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک ایک جانکاہ ہتھوڑے کی طرح کان کے پردے پر پڑ رہی تھی۔ اور ہری مکھی کی بھنبھناہٹ تیز لمبی سلاخوں کی طرح دماغ میں گھس کر اسے بے حس کر چکی تھی۔ جماہیاں ٹوٹی پڑتی تھیں اور آنکھوں سے پانی ڈھلکنے لگا تھا۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلنے اور سر کے بال نوچنے پر بھی نیند نہ آ رہی تھی۔ کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا گویا موسم کی سختیوں نے ہر چیز کو برباد کر دیا ہے۔ خاتمہ کر دیا ہے۔۔۔ سکون کا بھی اور نیند کا بھی۔ ٹانگیں پتھر کی ہو گئی تھیں۔ اور رانوں میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جمیل خاموش سیدھا لیٹ جاتا، ہاتھ پھیلا کر اوپر کی طرف، اور ٹانگیں اکڑا کر نیچے کی طرف کھینچتا، اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ وہ رانوں کو مضبوطی سے پکڑ کر خوب رگڑتا، گویا وہ آج انہیں گھس کر ختم کر دینے پر تلا ہوا ہے۔ جب اس سے بھی اسے چین نہ آتا تو وہ گھٹنے پٹی پر اور بانہہ آنکھوں پر رکھ کر خاموش لیٹ جاتا۔۔۔ تھوڑی دیر سے نذر و کھڑا دلچسپی سے اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ پائینتی کی طرف آیا اور ایک منٹ تک آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا رہا اور پھر یک لخت ہنس کر کہنے لگا ''جمیل میاں! تمہارے پاس بیٹھ جاؤں''۔

جمیل کے پیروں میں سے خون بھاگا اور رانوں میں سنسنی پھیلاتا ہوا تیزی سے دماغ میں جا کر کھوپڑی سے کھٹ سے ٹکرایا۔ دل دھڑ دھڑ چلنے لگا۔ کنپٹیوں کی رگیں ابھر آئیں اور درد کرنے لگیں۔۔۔ معلوم ہوتا تھا اس کے جسم کی ہر ہر رگ بغاوت پر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ خون کے دوران نے اس کی سوچنے کی قوتوں کو معطل کر دیا تھا۔ وہ ''ہاں'' کہنے والا تھا کہ باہر سے کسی نے پکارا ''جمیل!''

امتحان کے اندیشوں اور دغدغوں کی جگہ اب چھٹیوں کی بے فکری اور بے خیالی نے لے لی۔ گرمیاں جم چکی تھیں۔ گرمی

اب بھی پڑتی تھی، ہوا اب اور تیز ہوگئی تھی مگر نئے موسم کا کسل اور بے گانگی ختم ہو چکی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ کسی چیز کے اس کی ٹانگ کے قریب حرکت کرنے سے جمیل کی آنکھ کھلی۔ وہ چھت پر سو رہا تھا۔ چاند آسمان پر بیچوں بیچ میں تھا اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کے دوسرے کونے سے خالو کے تیز خراٹوں کی متواتر آواز آرہی تھی، لیکن یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ نذرو کا پلنگ جو شام دور بچھا تھا، اب اس سے ایک گز کے فاصلے پر آگیا ہے۔ اس نے اپنے پلنگ پر ہر طرف ٹٹولا۔ مگر کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ اس نے پھر چادر سے منہ ڈھک لیا۔ تھوڑی دیر خاموش لیٹے رہنے سے اسے پسینہ آتا معلوم ہوا اور اس نے چادر کو سینے تک کھینچ لیا۔ نیند ایک دفعہ اچٹی تو بس پھر غائب ہی ہوگئی۔ کچھ دیر تو وہ چاند کو آسمان پر کھسکتے ہوئے دیکھتا رہا، اور پھر اس سے اکتا کر خالو کے خراٹوں پر دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ کیسی آواز نکل رہی ہے۔ اس نے سوچا، جیسے بلیاں لڑ رہی ہوں۔۔۔۔ یہ تشبیہ اس نے اپنی خالہ سے سیکھی تھی۔ دفعتاً اسے نذرو کی آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔

''ابے جاگ رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

گاڑھے کی موٹی چادر میں سے نکلے ہوئے منہ نے جواب دیا۔ ''ہاں''۔

''یہاں کیسے آگیا ہے تو؟'' کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے جمیل نے پوچھ لیا۔

''تو کچھ ہرج ہے؟''

جمیل نے اتنی رات گئے اس کا جواب جانٹے سے دینا مناسب خیال نہ کیا مگر یہ جواب گفتگو کو آگے بڑھانے میں بھی مددگار نہ ہو سکا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش لیٹے اپنی پلکیں جھپکاتے رہے۔

نذرو کا ہاتھ اور سینہ بھی چادر سے باہر نکل آیا۔ اس نے کہا ''اجی، کیا چاندنی ہو رہی ہے''۔

''ہوں'' جمیل نے جواب دیا۔ مگر چاہتا وہ بھی تھا کہ اگر نیند نہیں آتی تو کم سے کم باتیں کر کے ہی وقت ٹالا جائے۔

''بڑی سیریں کی ہیں ہم نے بھی دلی میں چاندنی میں''۔

جمیل نے ایسا موضوع تلاش کرنے کی کوشش میں، جس میں کچھ دیر تک باتیں ہو سکیں، ہمیشہ سے زیادہ بے تکلفی سے کہا ''بڑی بدمعاشیاں کی ہوں گی سالے تم نے دلی میں''۔

''اجی ہم نے؟'' نذرو ہنسا۔ ''اجی ہاں۔۔۔نہیں۔۔۔۔تمہیں تو جمیل میاں کچھ شوق ہی نہیں''۔

''ابے، مجھے شوق! کس بات کا؟''

''یہی سیر و یر، دل لگی''۔ نذرو اپنی کہنی کے سہارے اٹھا اور اس کا ہاتھ جمیل کے پلنگ کی پٹی پر آگیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''لاؤ ٹانگیں دبا دوں جمیل میاں''۔

''کیوں، کیا میں کوئی تھکا ہوا ہوں''۔

نذرو کا ہاتھ اس کی ٹانگ کے قریب آگیا ''نا ویسے ہی''۔

''ہونہہ!'' جمیل نے جھینپتے ہوئے کہا۔ لیکن جب نذرو کا ہاتھ اس کی ران پر پہنچ گیا تو اس نے کوئی اعتراض کیا بھی نہیں اور چپ لیٹا رہا۔

ہاتھ ران پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جمیل کی ٹانگوں پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی معلوم ہوئیں اور نذرو کی انگلیوں کے ساتھ ساتھ اس کا خون بھی چلنے لگا۔ جب انگلیاں زیادہ سریع الحس حصوں پر پہنچیں تو اس کے گدگدی ہونے لگی۔ اور اس نے نذرو کا ہاتھ ہلکے سے پکڑ کر، بغیر اسے ہٹانے کی کوشش کے ''ابے'' کہا۔ مگر ہاتھ اسی طرح چلتا رہا۔

خالو کے خراٹے رک گئے۔ ہاتھ کھینچ لیا گیا۔
پھر وہی خرخرخرخر۔۔۔۔۔ران پھر سہلائی جانے لگی۔
یک لخت نذرو نے ہاتھ کھینچ لیا اور چادر سے اپنے جسم کو کندھوں تک ڈھک کر سیدھا لیٹ گیا۔ اس کا بدن تیر کی طرح کھنچا ہوا تھا۔ نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے اور پلکیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں۔ اگر جمیل اس کا چہرہ چھو کر دیکھتا تو اسے معلوم ہوتا کہ وہ کتنا گرم ہے۔
''ابے یہ کیا؟''
''اجی تم کیا جانو، تم نے کیا کر دیا'' ۔نذرو نے رکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
جمیل حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ دس منٹ بعد نذرو پھر سیدھا ہوا۔ اب اس کے چہرے سے ایسا سکون ظاہر ہوتا تھا گویا کوئی طوفان چڑھ کر اتر گیا ہو۔
جمیل کی ران پھر سہلائی جانے لگی۔۔۔۔جمیل کے بدن میں کھلبلی سی ہوئی۔ سر چکرا سا گیا۔ سارا جسم پھنکنے لگا۔ اسے ایک پھریری سی آئی اور وہ نذرو کا ہاتھ الگ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جلدی سے نالی پر جا کر پیشاب کیا۔ پانی پی کر اس نے تھوکا اور اب سونے کے ارادے سے چادر تان کر لیٹ گیا۔ خالو کے خراٹوں سے اس پر جلدی ہی غنودگی طاری ہو گئی۔
اس کی ٹانگ پر کوئی چیز ہلی۔ اس نے چادر سے سر نکال کر دیکھا، نذرو کا ہاتھ تھا۔ نذرو اپنے پلنگ پر سے آگے جھکا ہوا تھا، اور اس کی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔
نذرو نے کہا'' آجاؤں؟''
جمیل کے پیٹ میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا جو بجلی کی سرعت سے تمام جسم میں پھیل گیا۔ اس کا سر گھوما۔ آنکھوں کے سامنے دھندسی پھیل گئی اور سائبان کے کھمبے اور ان کے لمبے سائے ناچتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اس کے رکے ہوئے حلق سے پھنسے ہوئے صرف دو لفظ نکل سکے''ابے ہٹ!''

☆☆☆

محدّب شیشہ

مسعود مفتی

زکوٰۃ کا مہینہ تھا۔ قصبے کی مسجد میں مولوی صاحب جمعہ کا وعظ کر رہے تھے۔

''یتیم، مسکین اور بیوائیں عرش کا سہارا ہیں۔ ان کے سر پر ہاتھ دھرو۔ اپنی کمائی میں سے ان کو حصہ دو۔۔۔''

سامنے نمازیوں کی قطاریں خاموشی میں غرق تھیں۔ کچھ دیوار یا کھمبے کے سہارے اونگھتے ہوئے، کچھ پنکھے کی ڈنڈی یا کھڑے گھٹنے پر نیند بھرا سر ٹکائے ہوئے۔ کچھ کھلی آنکھوں سے سوئے ہوئے۔ حافظ عمر دراز کی آنکھیں بند تھیں۔ دماغ سویا ہوا تھا۔ ہونٹ باہم چپکے ہوئے تھے۔ لیکن ہاتھ جاگ رہے تھے۔ جو بڑی تیزی سے تسبیح کر رہے تھے۔ مکمل جاگنے والوں میں بشیر سبزی فروش کے دماغ میں منڈی کے بھاؤ کھد بد مچا رہے تھے۔ ڈاک خانے کے بابو کے ذہن میں تنخواہ اور اخراجات باہم کشتی لڑ رہے تھے۔ اور لاریوں کے اڈے والے منشی کے دماغ میں صبح آٹھ بجے کی لاری میں گزرنے والی عورت کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ مگر ماسٹر برکت علی گردن اٹھائے وعظ کا ایک ایک حرف غور سے سن رہا تھا اور جب مولوی صاحب نے منبر سے کچھ آگے جھک کر کہا۔

''بیوہ کی ایک آہ سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی ایک دفعہ مدد کرنے والے کو ستر ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اور وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے''۔ تو ماسٹر برکت علی کا سارا جسم ایک دم کانپ اٹھا اور پگڑی سر پر جماتے ہوئے وہ بلند آواز میں پکارا ''بخشنا مجھے میرے مولا''۔

ماسٹر برکت علی قصبے کے ان چند لوگوں میں سے تھا۔ جو خواہش سے نہیں بلکہ محض اتفاق سے میٹرک پاس کر لیتے ہیں۔ اس قصبے میں سرکار کی تعلیمی سرگرمیاں چار جماعتوں کے بعد ختم ہو جاتی تھیں۔ اور چیچک زدہ چہرے کی طرح اپلے تھپا پرائمری سکول اپنی بوسیدہ چھتوں کے نیچے سے دن بھر پہاڑوں کے الاپ براڈ کاسٹ کیا کرتا۔ اس سکول میں چند سال زبردستی گزارنے کے بعد گاؤں کے بچے یا تو ڈھیلی دھوتیاں اور گومڑی پگڑیاں باندھ کر لٹھ لیے مویشی ہنکارتے رہتے یا گھر کے دروازے کی چوکھٹ پر تھالی میں چھوٹی سی دوکان سجا کر قسمت آزمائی کرنے کے بعد کھیتوں میں دھکیل دیئے جاتے اور یا کوئی بھولا بھٹکا انگریزی کا قاعدہ اٹھا کر فالتو وقت میں ماسٹر برکت علی کے پاس آن بیٹھا۔ پہلے قاعدے کے کونے مڑتے پھر اوپر والا صفحہ رنگ بدلتے بدلتے حروف چھپا لیتا۔ اور جب ایک روز وہ غائب ہو جاتا تو طالب علم کو اگلی جماعت میں چڑھا دیا جاتا تھا۔ جہاں پھر ایک موٹا قاعدہ خریدا جاتا۔ چار پانچ قاعدوں پر طبع آزمائی کرنے کے بعد طالب علم چونگی کا محرر یا ڈپو کا ملازم، یا عرضی نویس بننے کے قابل ہو جاتا۔ ماسٹر برکت علی کے مکان کے باہر والے کمرے کے دروازے پر پہلے چاک سے اور پھر کوئلے سے ''انگریزی کالج'' لکھا ہوا تھا۔ حالانکہ یہاں الف آم، بے بلی بھی اتنی ہی شدت سے پڑھایا جاتا تھا جتنا سی اے ٹی۔ کیٹ۔ درجن بھر کے قریب طالب علم یہاں ہمیشہ رہتے تھے۔ اور جب چھٹیوں میں شہر جا کر پڑھنے والے طالب علم گاؤں آتے تو والدین ان کو بھی عارضی طور پر ماسٹر برکت علی کا شاگرد بنا دیتے تھے۔ تاکہ ان کی کمزور انگلش درست ہو سکے۔ فیس اور شاگردانہ خدمات سے اس کا گزارہ اچھا چل جاتا تھا۔

ماسٹر برکت علی چھریرے جسم کا لمبا آدمی تھا۔ عمر چھتیس سال۔ لمبوترا سا دبلا چہرہ، جس کے رخساروں کی جگہ دو نمایاں گڑھے قبل از وقت آنے والی جھریوں کو ہضم کر رہے تھے۔ اونچی شفاف پیشانی کے نیچے دو ذہین آنکھیں شفقت بھری مسکراہٹ سے لبریز رہتی تھیں۔ آنکھوں کے باہر کونوں میں سورج کی شعاعوں کی مانند باریک سلوٹیں تھیں جو ہنستے وقت بڑی نمایاں ہو جاتی

تھیں۔ سیدھی ستواں ناک، پتلے ہونٹ، اور بشاش چہرہ، سر پر خاکی کلاہ کے گرد سفید ململ کی پگڑی جس کا شملہ کلف کی مقدار کے مطابق رکوع وسجود کرتا رہتا۔ دھاری دار قمیص اور ڈھیلی سی شلوار کے نیچے دھول سے اٹے ہوئے بوٹ جن کے کھلے ہوئے جبڑوں کو تہوار کے موقع پر تسمے سمیٹ لیتے۔ جو چند دنوں کے بعد اپنی موت آپ مر جاتے۔ اور پھر برساتی مینڈکوں کی طرح اگلے تہوار کو دوبارہ جنم لے لیتے۔

ماسٹر برکت علی لائق تو اتنا ہی تھا جتنا الماری میں گرد جمی کتابوں کے ڈھیر والا آدمی ہو سکتا ہے لیکن اس کی شرافت اور نیکی کا قصبہ بھر مداح تھا۔ وہ زندگی کی سیدھی سڑک پر چلتا آیا تھا۔ جس میں نہ کبھی موڑ آیا تھا، نہ کھڈ۔ جس کے قریب نہ کبھی رومان کے چشمے پھوٹے، نہ جذبات کی دھوپ چھاؤں نے آنکھ مچولی کھیلی۔ نہ کبھی حالات کی کنکریاں چبھیں۔ نہ قسمت نے روڑے اٹکائے۔ ایک دفعہ شادی ہوئی تھی تو سات سے زندگی کی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ جب سے اس نے قصص الانبیاء میں پڑھا تھا کہ قیامت کے روز بخشش کا سب سے آسان طریقہ خدا کے بندوں کی خدمت کرنا ہے۔ اس روز سے اس نے عہد کر لیا تھا کہ اپنی زندگی سکول کے لیے خصوصاً اور خدمت خلق کے لیے عموماً وقف کر دے گا۔ تا کہ لوگوں کو سدھار سکے۔ اسی لیے بیوی کی وفات کے سات سال بعد بھی اپنے آپ کو دوبارہ شادی پر آمادہ نہ کر سکا تھا۔ کیونکہ بیوی اس کے اس عہد میں حائل ہوتی۔ اس کے بعد تو وہ گھڑی کا پرزہ بن گیا تھا۔ زندگی ایکا یک معمول کے مطابق گزر رہی تھی۔ جیسے گاڑی اپنی پٹڑی سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہٹتی۔ روزانہ صبح نماز مسجد میں جاتے وہ پہلی صف میں منبر کے قریب بیٹھا گنگناتے ہوئے درود شریف پڑھ رہا ہوتا۔ کوشش سے مولوی صاحب کے پیچھے نماز میں جگہ لیتا تا کہ تکبیر پڑھنے کا موقع مل سکے۔ دعا میں سب سے بلند ''آمین'' پکارتا۔ نمازی چلے جاتے تو وہ ایک سو مرتبہ آیت کریمہ کا ورد کرتا۔ محراب کی خاک ماتھے پر لگاتا۔ اور باہر نکلنے کے لیے جوتا جھاڑتے ہوئے پکار اٹھتا۔ ''بخشنا مجھے میرے مولا''۔ بعد ازاں ادھر ادھر تھوکتا ہوا درود تاج پڑھتے ہوئے گھر لوٹتا۔ اور کھڑکی میں بیٹھ کر کشمیری لکڑی کے رحل اور ساٹن کے نیلے جزدان کو چوم کر ماتھے پر لگاتا۔ اور کلام پاک کھول کر سورہ یٰسین اور ایک رکوع کی قراءت نہایت انہماک سے کرتا۔ اس کے بعد کیکر کی تازہ مسواک لے کر دروازے پر بیٹھ جاتا۔ اور آخ تھو، کا شور کرتے ہوئے ہر آنے جانے والے کو جھکی نظروں سے یا آنکھوں کے کونوں سے جھانکا کرتا۔

''کدھر چلی ہو، ماسی سویرے سویرے'' وہ ہر گزرنے والی بوڑھی سے سوال کرتا۔ بوڑھیاں بھرے سرسوں کے کھیت کی مانند کھل اٹھتیں۔ دعاؤں کی قطار بکھیر دیتیں۔ اور فوری مقصد کے ساتھ ساتھ اس کے متعلقہ سب حالات کا کچا چٹھا بیان کرتے کرتے گلی کا موڑ مڑ جاتیں۔

کوئی جوان لڑکا ادھر سے آنکھیں ملتا گزرتا تو ماسٹر برکت ئی پیار سے فہمائش کرتا ''میاں اور نہیں تو کم از کم صبح نماز ہی پڑھ لیا کرو۔ دن کو نیکی سے شروع ہو''۔ اور لڑکے عجیب عجیب بہانے تراشتے گلیوں کی بغلوں میں گھسنے کی کوشش کرتے غائب ہو جاتے۔

مسواک کرتے کرتے سورج کی سنہری دھوپ روشن دان تک اتر آتی۔ تو وہ تولیہ سر پر ڈال پیپل کے پتے میں صابن کی ٹکیہ اٹھائے کنوئیں کی طرف چلتا۔ راستے میں لوگ اسے نہایت تپاک سے ملتے۔ بعض تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ کنوئیں پر عورتیں احترام سے صرف چند لمحوں کے لیے دوپٹے چہرے پر کھینچ لیتیں۔ اور ماسٹر برکت علی منڈیر پر بیٹھ کر سب کا خیر صلا پوچھتا۔ بغیر تسموں کے بوٹ اتار کر شلوار گھٹنوں تک اٹھا لیتا اور خدمت خلق کے جذبے سے مجبور ہو کر کنوئیں کی چرخی پکڑ کر گھڑے بھرنے لگتا۔ گاؤں کی عورتوں کو ماسٹر کی شرافت پر پورا بھروسہ تھا۔ اسی لیے وہ بغیر کسی تکلف کے پانی بھروا لیتیں۔ وہ ڈول انڈیلتے وقت سوال جواب بھی کرتا جاتا۔

''کیوں جیناں، اب تو تمہارا گھر والا اس کلمو ہی کے گھر نہیں جاتا، میں نے سمجھایا تو بہت تھا''۔

''نہیں بھائی اللہ تیرا بھلا کرے۔ میر تو تو نے گھر بچا لیا''۔ جیناں گھڑا جماتے مجسم انکسار بن جاتی۔

''اب خرچہ نہ دے تو مجھے بتانا۔ لے اٹھا اپنا گھڑا'' اور وہ ڈول کا باقی پانی اپنے پاؤں جوڑ کر ان پر ڈال دیتا۔

''ماسی! شیرو نے شہر سے کوئی خط لکھا یا نہیں''۔ وہ ایک پاؤں سے دوسرے کی میل رگڑتا ہوا پوچھتا۔ اور ماسی گھڑا جھولنا چھوڑ کر ہاتھ ملنے لگتی۔

''نہ بچہ کوئی نہیں''۔

''فکر نہ کر۔ میں اگلے مہینے شہر جاؤں گا۔ تو اچھی طرح خبر لوں گا اس کی''۔

''اے بھلا ہو تیرا میرے لال۔ ضرور جانا۔ اور اس سے کہنا۔۔۔'' اور گھڑا بھر جاتا لیکن ماسی کے پیغامات جاری رہتے۔ حتیٰ کہ شادو اس کا گھڑا ہٹا کر اپنی گاگر جما دیتی۔ ماسٹر برکت علی خاموشی سے پانی بھر دیتا۔ وہ جوان لڑکیوں سے زیادہ بات چیت کا قائل نہ تھا۔ لیکن جب گاگر اٹھا کر اس کے سر پہ رکھتا تو اجنبیت مٹانے کے لیے ایک آدھ بات کر لیتا۔

''شادو بہن اب تو شرفو کانا سیٹیاں نہیں بجاتا؟''

اور شادو گاگر کے گلے میں ہاتھ ڈالتی ہوئی پلو منہ پر رکھ لیتی۔ ''نہیں ویر جی تم نے تو اسے بالکل سیدھا کر دیا ہے''۔

اور ماسٹر برکت علی ان لوگوں کو بے نقط سنا ڈالتا جو گاؤں کی عورتوں کو ماں بہن نہیں سمجھتے۔ اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر پکار اٹھتا ''بخشنا مجھے میرے مولا، سب کی حیا قائم رکھ''۔ عورتیں پانی لے جاتیں تو وہ لنگوٹ پہن کر نہانے لگتا۔ اور صابن ملتے گنگناتا ''میرے مولا بلا لو مدینے مجھے''۔ آٹے کی چکی پر بیٹھ کر سارا دن گپ لگانے والے چند مفت خورے بھی عین اسی وقت نہانے آن ٹپکتے تاکہ ماسٹر برکت علی کے صابن اور تیل سے فائدہ اٹھا سکیں۔ نہانے کے بعد ماسٹر برکت علی گڑھے کو صاف کر کے پانی سے بھر دیتا ہے۔ تاکہ پرندے پانی پی سکیں اور خود واپس چلا جاتا۔

واپسی پر ماسٹر برکت علی راستے میں گھروں کو کبھی نہ بھولتا۔ بابا جلال سے اس کی بواسیر کے علاج کے بارے میں ضرور پوچھتا۔ تیسرے چوتھے روز جیواں دتی کو اس کے لڑکوں کے نام چٹھی لکھ کر دیتا۔ منگنی شدہ لڑکیوں کے والدین سے گاہے بگاہے پوچھتا کہ لڑکی کے جہیز کے سلسلے میں اگر مدد کی ضرورت ہو تو اسے بتائیں۔ کنواری لڑکیوں کے والدین کو وہ تسلیاں دیتا کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے رشتوں کا فکر نہ کریں۔ سردیوں میں رنگو کے دادا کے لیے کبھی کبھار چائے کا بنڈل ہی لے جاتا۔ تاکہ اس کی گرمی کا سامان رہے۔ کبھی کسی جگہ سر پھٹول ہو جاتا تو اپنا فرض سمجھ کر صلح کرا دیتا۔ چونکہ گزشتہ سات برسوں میں اکثر گھروں کا ایک آدھ بچہ اس کا شاگرد رہ چکا تھا اس لیے استاد کا روایتی احترام اس کی دخل اندازی کو ہمیشہ خوش آمدید میں تبدیل کر دیتا۔

اپنے سکول میں ماسٹر برکت علی شاگردوں کا بہت خیال رکھتا۔ ہر ماہ فیس دینے کا وقت آتا تو دو ایک شاگردوں کو خاموشی سے روپے واپس دے دیتا۔ ''جا بیٹا لے جا مجھ سے کیا پردہ، میں جانتا ہوں پچھلے مہینے تمہارا خرچ تنگ رہا ہے''۔ بچیوں سے البتہ فیس کبھی نہیں لی جاتی تھی کیونکہ لڑکی کسی ایک کی نہیں سارے گاؤں کی لڑکی ہوتی ہے۔

جمعہ کے روز بیواؤں کے متعلق مولوی صاحب کا واعظ سن کر جب ماسٹر برکت علی باہر نکلا تو وہ اپنی غفلت پر استغفار پڑھ رہا تھا کہ زندگی کے اتنے سال ہاتھ سے نکل گئے لیکن وہ کی دکھیا بیوہ کا مداوا نہ بن سکا۔ برخلاف اس کے نامعلوم اس نے کتنی بیوہ عورتوں کا دل دکھایا۔ اس نے دل کو تسلی دینے کے لیے سوچا کہ پیشتر ازیں اسے خدا کے نزدیک بیوہ کے درجہ کا علم بھی تو نہ تھا۔ اور وہ سر جھٹک کر پکار اٹھا ''توبہ میرے اللہ توبہ، مجھے بخشنا''۔ اور پھر تھکی چال سے آگے چلتا گیا۔

گلی کی موڑ پر چند آوارہ بچے ایک کتے کی دم میں رسی باندھے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ ماسٹر برکت علی نے انہیں ڈانٹا۔ کتے کو چھڑایا۔ اور جس لڑکے کے ہاتھ میں رسی تھی اسے کان سے پکڑ کر ساتھ چلانے لگا۔ لڑکا ایک ہاتھ سے کان چھڑانے کی کوشش میں ساتھ ساتھ اچکتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

''کیوں بے کس کا لڑکا ہے تو؟''

''سی۔۔۔اوئی۔۔۔جی نوراں کا''۔ لڑکا کان کے درد میں مبالغہ کرتا بولا۔

''نوراں؟''۔۔۔کون سی نوراں؟۔۔۔کہاں رہتے ہو؟

''اوئی مرگیا۔۔۔جی۔۔۔اوئی۔۔۔وہ ٹیلے پر'' اس کی ایک آنکھ بند ہوئی جا رہی تھی۔

اور ماسٹر برکت علی کو خیال آیا کہ یہ وہی نوراں ہے جس کا خاوند پچھلے سال ہیضہ سے مرگیا تھا۔ ماسٹر برکت علی اس کے حالات سے بے خبر تھا۔ پھر بھی اسے اتنا معلوم تھا کہ موت کے وقت متوفی کے جاننے والے نوراں کی غربت کا ذکر بڑے ہمدردانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''جی! غفور!'' ماسٹر برکت علی نے اس کا کان چھوڑ دیا اور سوال کرنے لگا۔ اسے معلوم ہوم کہ غفور کوئی کام نہیں کرتا۔ بلکہ گلیوں میں آوارہ پھرتا رہتا ہے اور اس کی ماں محنت مزدوری کر کے گزارہ چلاتی ہے۔ ماسٹر برکت علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ گھنٹہ بھر پہلے کا سنا ہوا وعظ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ بیوہ کی مدد کرنے کا بہترین طریقہ اس کے آوارہ بچے کو سدھارنا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے بچے کو ساتھ آنے کو کہا اور گھر چلا۔

''لے غفورے پڑھ تو بھلا کیا لکھا ہے میرے دروازے پر؟''

غفور نے شرما کر سر جھکا لیا ''جی میں پڑھا ہوا نہیں ہوں''۔

''اچھا۔ اچھا کوئی بات نہیں''۔ ماسٹر برکت علی خندہ پیشانی سے درگزر کرتا ہوا بولا۔

کمرے میں لا کر اس نے بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر اردو کے ابجد لکھے ہوئے تھے لیکن غفور اوہ بھی نہ پڑھ سکتا تھا۔ ماسٹر نے ہنس کر ایک ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگائی ار سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا ''نالائق دس برس کی عمر میں اتنا بھی نہیں پڑھ سکتا''۔ پھر اس نے چاولوں کی میٹھی پنی اسے کھانے کو دی۔ اور جب لڑکا کچھ گھل مل گیا تو ماسٹر برکت علی نے اپنے باورچی خانے میں جا کر مونگ کی دال کا لفافہ خالی کیا اور پھاڑ کر ایک نئے قاعدے کا جز دان بنا ڈالا۔

''آ غفور بچے تجھے تصویریں دکھاؤں''۔ غفور اب کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ شوق سے ماسٹر کے قریب آن بیٹھا۔ اور ماسٹر برکت علی اسے آم، بلی، گدھے اور لنگور کی تصویریں دکھانے لگا۔

''یہ تصویریں لو گے؟ اس نے پیار سے پوچھا۔ غفورے کی شرمائی ہنسی میں خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔

''یہ لو۔۔۔ شاباش؟ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ''یہ گھر لے جاؤ۔ کل پھر آنا۔ یہاں سکول میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ جب یہ قاعدہ پڑھ چکو گے تو تمہیں اور قاعدہ دوں گا۔ جس میں اس سے بھی اچھی تصویریں ہوں گی۔ شاباش اب سیدھے گھر جاؤ۔ کل پھر آنا؟

غفورے نے شیشے کے آئینے کی طرح قاعدہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر سینے سے چپکا لیا۔ اور باہر نکل کر بگٹٹ بھاگ اٹھا۔ ماسٹر برکت علی دروازے میں کھڑا ہو کر مسکرا کر دیکھتا رہا۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو واپس مڑتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا ''بخشنا مجھے میرے مولا، میری یہ خدمت قبول کر''۔

دوسرے روز ماسٹر برکت علی لڑکوں کو پڑھا رہا تھا تو غفور نے گلی میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے تین چار مرتبہ خواہش مندانہ انداز میں اندر جھانکا لیکن جب ماسٹر برکت علی نے پیار سے بلایا تو بھاگ گیا۔

اس کے بعد دو دن تک غفورا نظر نہ آیا۔ ماسٹر برکت علی کو ایسا معلوم ہوا جیسے پل صراط پر سے گزرتے گزرتے اس سے جنت کا پاسپورٹ چھین کر ایک دم دوزخ میں دھکا دے دیا گیا ہو۔

''ارے بشیرے، جا ذرا غفورے ٹیلے والے کو بلا لا'' سکول بند ہونے پر اس نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد بشیرا غفورے کو ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں لایا۔ اور جب ماسٹر نے اسے چمکارا تو وہ شرماتا، لجاتا، جھجکتا اندر آ گیا۔ ماسٹر برکت علی نے اسے اپنے داہنے بازو میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور ٹھوڑی انگلی سے اٹھاتے ہوئے بولا۔

''غفورے بچے تو آیا نہیں میرے پاس''۔

غفورا شرما کر ادھر ادھر منہ پھیرنے لگا۔ مگر جب ماسٹر نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگا'' بے بے کہتی تھی مت جایا کرو ہاں۔ ہمارے پاس فیسوں اور کتابوں کے لیے پیسے نہیں ہیں''۔

ماسٹر نے بڑے ترس سے لڑکے کو دیکھا اور پھر ایک دم گلے سے لگا کر پیار کرنے لگا۔

''توبہ اللہ توبہ!'' پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر وہ روندھے ہوئے گلے سے بولا اور دروازے میں جا کر زور سے ناک صاف کرنے لگا۔

ایک رومال میں تھوڑے ستو اور گڑ لے کر ماسٹر برکت علی نے غفورے کو انگلی سے لگایا اور نوراں کے گھر کی طرف چل دیا۔ ماسٹر کو گھر میں آتا دیکھ کر نوراں کا منہ ایک دم کھلا رہ گیا۔ جیسے چیونٹی کے گھر ہاتھی آ جائے۔ ماسٹر برکت علی کہتا ہی رہا کہ کھڑے کھڑے بات کر لوں گا۔ لیکن نوراں نے جھپا جھپ چارپائی پر سے سرسوں کا ساگ جھاڑ دیا۔ اور دھوبی کا دھلا ہوا کھیس بچھا کر خود ذرا فاصلے پر پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ دوپٹے کا پلو منہ میں پکڑ کر آدھا چہرہ اور ایک آنکھ ڈھک لی۔

''دیکھو بہن جی''۔ ماسٹر برکت علی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔ ''میں یہ نہیں پوچھنے آیا کہ غفورے کو سکول کیوں نہیں بھیجا بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ غفورا میرے سگے بھانجے کی طرح ہے۔ فیس، کتابوں اور ہر ضرورت کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ اس کا ابا ہوتا تو اور بات تھی لیکن۔۔۔''

ابا کا نام آتے ہی نوراں کے نتھنے پھڑک اٹھے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسو پونچھنے میں وہ پردہ ختم ہو گیا۔ اور وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی'' ویر جی۔ میرا تو نصیبا ہی جل گیا۔ وہ خود تو چلا گیا۔ مجھے ان مصیبتوں کے لیے چھوڑ گیا''۔ اس کی آنکھوں سے جھڑی بندھ گئی۔

اللہ کی حکمت تو سمجھ میں نہیں آتی بی بی، لیکن تم کیوں فکر کرتی ہو۔ لڑکی کا تو سارا گاؤں ہی میکہ ہوتا ہے۔ ہم کس لیے بیٹھے ہیں۔ غفورے کا ابا اللہ بخشے میرا بھی جاننے والا تھا''۔

اور پھر نوراں خاوند کی موت، موت کے بعد عزیزوں کا برتاؤ، اور موت سے چند روز پہلے کی باتیں آنسوؤں کے تار اور ہچکیوں کے گھونٹ لے لے کر سناتی رہی اور ماسٹر برکت علی خدا، رسولؐ، حدیث، حکایتوں اور کہاوتوں سے اس کو تسلیاں دیتا رہا۔ بالآخر جب وہ اٹھا تو نوراں مسرور تھی، کہ خدا نے ایک فرشتہ اس کی مدد کو بھیج دیا ہے۔ اور ماسٹر برکت علی مسرور تھا کہ اس بیوہ کی مدد کرنے سے اس کی عاقبت سدھر جائے گی۔ غفورے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اسے ایک ٹکہ دیا۔ اور پھر سیدھا مسجد میں جا کر سجدہ میں گر پڑا اور رو رو کر خدا سے التجا کرتا رہا کہ وہ اسے ان کی سرپرستی میں ثابت قدم رکھے اور اس کے عوض روز قیامت کو بخش دے۔

چند ماہ کے عرصہ میں غفورا ماسٹر برکت علی کا شاگرد خاص بن گیا۔ چاک کا ڈبہ اور جھاڑن اس کی تحویل میں رہتا۔ ٹاٹ بچھانے، گننے، لپیٹنے اور بورڈ صاف کرنے کا وہ ذمہ دار تھا۔ طالب علموں کے لیے پانی کا گھڑا ابھرنا اس کا فرض تھا۔ ماسٹر برکت علی کو پیاس لگتی تو وہ غفورے کو آواز دیتا۔ کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے حقہ تازہ کرنے اور چلم بھرنے کا حق صرف غفورے کو حاصل تھا۔ وہ خود

بھی بہت سمجھدار اور باتمیز بچہ بن گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ الف آم۔ بے بلی سے بڑھ کر وہ 'روٹی لائی ہے، کس نے کھائی ہے'' تک پہنچ چکا تھا۔ سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیوں سے تختی پر سو تک گنتی بھی لکھ لیتا تھا۔ ٹین کی چیچک زدہ سلیٹ پر کئی بار تھوک رگڑنے کے بعد بڑی بڑی رقوم جمع بھی کر لیتا تھا۔ ماسٹر کے گھر کے اندر والے آلے میں مٹی کے پیالے میں اس کے لیے چاولوں کی پٹی ہمیشہ پڑی رہتی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ ماسٹر کے ساتھ کھاتا۔ اور جب ماسٹر بال کٹواتا تو غفورے کے سر پر بھی چٹیل میدان بن جاتا۔ جس پر وہ آم کی گھٹلی رگڑ کر خوب چمکا لیتا۔

اپنے گھر میں بھی غفورا کافی سکھی تھا۔ کیونکہ ہر مہینے ماسٹر برکت علی فیس اکٹھے ہوتے ہی شام کو چپکے سے جا کر نوراں کو کچھ روپے دے آتا۔ فصل کے موقع پر جب شاگرد دانے وغیرہ لا کر دیتے تو کئی روز تک غفورا چھوٹے چھوٹے تھیلے بھر کر لے جاتا رہتا۔ تہوار کے موقعہ پر غفورے کو نئے کپڑے ملتے اور نوراں کے ہاں گڑ شکر، چنے اور دالوں کی پوٹلیاں پہنچ جاتیں۔ ماسٹر برکت علی بھی گاہے گاہے نوراں کے گھر جا کر روزمرہ کے حالات سنوارتا رہتا۔ اور نوراں پرنم آنکھوں سے دعائیں دیتی دیتی بچھ جاتی۔ ماسٹر برکت علی اس کے گھر سے نکلتا تو اکثر پکار اٹھتا۔ ''بخشنا میرے مولا''۔

اب ماسٹر برکت علی کو نماز میں زیادہ مزہ آنے لگا تھا۔ صبح کھڑکی میں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا تو جھوم جھوم جاتا۔ وعظ میں مولوی صاحب اگر روز محشر اور اگلے جہان کا ذکر کرتے یا سزا اور جزاء کے متعلق خدا اور بندے کا خود ساختہ مکالمہ پیش کرتے تو ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ماسٹر کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ جیسے کوئی غریب بیوپاری مال کی قیمت پیشگی ادا کرنے کے بعد مطمئن سا نظر آئے۔ اس نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ شادی بالکل نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنے اخراجات میں سے چار پانچ سال بچت کرنے کے بعد وہ حج کو جائے گا۔ اور اس عزم کو تازہ رکھنے کے لیے اس نے اپنے کمرے میں رسول کریمؐ کے روضہ پاک کی خوبصورت رنگین تصویر لگا دی جسے دیکھ کر وہ اپنے پروگرام کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگا کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ بچت کرنے کے لیے وہ اپنے رہن سہن میں بھی انتہائی کفایت شعار ہو گیا۔

ایک روز ماسٹر برکت علی شام کے وقت نوراں کے گھر سے نکلا تو گلی میں کوئی زور سے کھنکارا۔ ماسٹر نے مڑ کر دیکھا تو شرفو کانا سامنے بیری کے درخت کے نیچے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''سلاما لیکم ماسٹر جی'' اس کی آواز میں شرارت ہمک رہی تھی۔

''وعلیکم اسلام'' سنا بھئی شرفو کیا ہو رہا ہے؟'' ماسٹر صاحب نے فطری خوش خلقی سے کام لیا۔

''بس بادشاہو۔ مولا کی دنیا کے رنگ دیکھ رہا ہوں''۔ اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ اور ماسٹر برکت علی کچھ نہ سمجھتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی چلبلی طبیعت سے لطف اندوز ہوتا چلا آیا۔

چند روز بعد ماسٹر برکت علی شہر جانے کے لیے لاری اڈے پر پہنچا تو وہاں منشی کے پاس شرفو کانا اور بلو جلاہا بیٹھے تھے۔ دور سے ماسٹر کو آتے دیکھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں اور شرفو کانا تالی بجا کر گانے لگا۔ ''یاریاں لایاں نیں۔ اسی توڑ نبھاواں گے۔'' ماسٹر برکت کے پہنچتے پہنچتے بس آ گئی اور وہ جلدی سے ٹکٹ خریدتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔ عجلت میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منشی نے کوئی بات زیر لب کہی اور باقی سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ وہ مڑا لیکن کنڈکٹر بولا۔

''شتابی شتابی آؤ، ماسٹر جی دیر ہو رہی ہے!''

اور وہ لپک کر بس پر جا چڑھا۔

اگلے دن شہر سے واپس آتے ہوئے جب وہ بازار سے گزرا تو بشیر سبزی فروش کی دوکان پر بلو جلاہا کھڑا مولیاں کھا رہا

تھا۔اس نے آہستہ سے کوئی بات بشیر کے کان میں کہی اور وہ دونوں غور سے ماسٹر کی طرف دیکھنے لگے!

جمعہ کے روز ماسٹر برکت علی نہا دھو کر مسجد کی طرف چلا۔ راستے میں آٹے کی چکی پر شرفو کانا اپنے بےفکرے دوستوں کے چکر میں لہک لہک کر گا رہا تھا اور باقی سب تالیاں بجا رہے تھے۔ ماسٹر کو دیکھ کر بالکل خاموشی چھا گئی۔ وہ اسے معمول کے مطابق احترام سمجھتا ہوا تمکنت سے آگے گزر گیا۔ لیکن ابھی دس قدم ہی گیا ہوگا کہ شرفو کانا سینے پر ہاتھ رکھ کر چلایا: ''ہائے ہائے میرا دل گیا''۔ کسی نے منہ میں انگلی ڈال کر زور سے سیٹی بجائی، کوئی زبردستی مصنوعی کھانسی کھانسا اور کوئی پکارا ''ہائے میرے رانجھے'' اور پھر ایک طویل قہقہہ برس پڑا۔ ماسٹر برکت علی اسے لڑکوں کا باہمی مذاق اور پھکڑ پن سمجھتے آگے نکل گیا۔

دو تین روز گزر گئے۔ ماسٹر برکت علی چارپائی پر لیٹا حقے کے کش لگا رہا تھا کہ اتنے میں غفورا روتا روتا سکول واپس آن پہنچا۔

''کیا ہوا بچے؟''

''مجھے شرفو نے مارا ہے''۔ وہ ہچکیاں لیتا ہوا بولا۔

''ارے'' ماسٹر برکت علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیوں مارا، میرے بچے کو اس نے''۔ وہ اسے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''وہ کہتا تھا۔۔۔اوں۔۔۔اوں۔۔۔تلاشی دو''۔

''تلاشی؟'' ماسٹر حیران رہ گیا۔ ''کیسی تلاشی؟''

''ہاں۔۔۔کھوں کھوں۔۔۔وہ کہتا تھا۔۔۔تیرے ماسٹر نے۔۔۔اوں اوں۔۔۔تیری ماں کے نام پیار کا رقعہ بھیجا ہوگا''۔

ماسٹر برکت علی ایسے تڑپا گویا اس کا ہاتھ بجلی پر جا پڑا ہے۔ اور پھر وہ ایک دم سن سا ہو کر رہ گیا۔ پتھر کے بت کی طرح وہ چارپائی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ چھٹی چھٹی آنکھیں ایسے پھیل گئیں جیسے جنگل کا ایک وحشی شیش محل میں آن پہنچا ہو، اور ان آنکھوں سے اس نے شرفو کانے کی گزشتہ دنوں کی مسکراہٹ کو ایک نئے انداز میں دیکھا۔ اور پھر اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپا ہوا ذلت اور بدنامی کا ایک سیلاب پھنکارا۔ وہ غفورے کو گھسیٹتا ہوا بازار کی طرف لپکا جہاں شرفو کانا دہی والے کی دوکان پر لسی پی رہا تھا۔

''کیوں شرفو تو نے اس بچے سے کیا کہا ہے؟'' بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

شرفو کی کانی آنکھ پھڑک اٹھی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے دوکاندار کی طرف دیکھا اور پھر بےشرمی سے ہنس پڑا۔ ''ہی ہی ہی ماسٹر جی کیوں فکر کرتے ہو تم۔ وہ تو ذرا شغل کیا تھا۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔ مولا نے مال دیا ہے۔۔۔خوب عیش کرو ہاہاہا!!!''

وہ ہنسنے لگا لیکن قہقہہ ختم ہونے سے پہلے ہی ماسٹر برکت علی گھونسوں اور تھپڑوں سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ ''حرامزادے، جھوٹے، کذاب، کمینے، لفنگے، بےایمان''۔ وہ بارود کی طرح پھٹ پڑا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

دہی والا دوکاندار تڑاپ سے نیچے کود آیا۔ دوسرے دوکاندار ترازو ہاتھوں میں لیے گردنیں کھینچ کر دیکھنے لگے۔ راہگیر اور گاہک ادھر ادھر سے بھاگ کر اکٹھے ہونے لگے اور دونوں کو کھینچ کر علیحدہ کیا۔ شرفو کانا نہایت غلیظ گالیاں بکتا ہوا بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماسٹر برکت علی ہمک ہمک کر آگے بڑھنا چاہتا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ ''مجھے اس فتنہ پرداز کو مزا چکھانے دو''۔

ماسٹر برکت علی کا احترام لوگوں کے دلوں میں گھسا ہوا تھا۔ لڑائی کی وجہ معلوم کیے بغیر انہوں نے شرفو کانے پر لعن طعن شروع کر دی، جس نے ماسٹر برکت علی جیسے شریف اور نیک انسان پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ کسی نے پوچھا ''بات کیا ہوئی؟'' تو ماسٹر پھر آپے سے باہر ہو گیا۔ ''یہ کمینہ مجھ پر بہتان تراشتا ہے۔ میں اسے ٹھیک کر دوں گا''۔

''منہ دھو کر آ او ماسٹر'' ۔ شرفو ڈھیلے لہجے میں بولا۔ ''آیا مجھے ٹھیک کرنے والا۔ میں بہتان باندھتا ہوں۔۔۔یا تیری قلعی کھولتا ہوں''۔

اور پھر شرفو نے گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے اپنی ایک آنکھ نچا نچا کر بلند آواز میں لوگوں کو بتایا کہ ماسٹر برکت علی نے چھپ کر

نوراں سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور شرفو کو دبانا چاہتا ہے کہ بات باہر نہ نکلے۔

لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ چند ایک نے فوراً یقین کر لیا۔ چند ایک ماسٹر برکت علی کے متعلق اس قسم کی چیز سوچنے تک کو گناہ سمجھتے تھے۔ بعض ایسے بھی نکلے جو اس کی تائید یا تردید کیے بغیر اس الزام میں دلچسپی لینے لگے۔

''یہ سب بکواس ہے'' ماسٹر برکت علی چلایا۔ مجمع جیسے ایک دم ہوش میں آ گیا۔ بھنبھناہٹ کی ایک لہر اٹھنے لگی۔

''ماسٹر برکت علی ایسا آدمی نہیں شرفو''۔ ڈاکخانے کے بابو نے کہا۔ ''جیسا تمہارا اپنا دماغ ہے ویسا ہی دوسروں کے متعلق سوچتے ہو''۔

''حد ہو گئی بابو جی''۔ شرفو تڑپ کر بولا ''میرے ساتھ ابھی چلو مسجد میں، میں قرآن اٹھانے کو تیار ہوں کہ میں نے نوراں اور ماسٹر برکت علی کو بغل گیر ہوتے دیکھا ہے''۔

وہ اپنی بات رکھنے کو جھوٹی قسم پر اتر آیا۔

قسم کا دعویٰ سن کر کئی اور لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے۔ ماسٹر برکت علی گولی کی طرح لپکا۔ لیکن لوگوں نے اسے ہٹا لیا۔ اور پھر دو چار آدمی پکڑ کر اسے گھر کی طرف لے چلے۔ سارا راستہ ماسٹر برکت علی انہیں یقین دلاتا رہا کہ شرفو بالکل جھوٹ بولتا ہے۔ اور وہ بھی ماسٹر کے ساتھ متفق تھے۔ گھر جا کر ماسٹر چارپائی پر لیٹے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شام تک شرفو کو ہر طرف سے لعن طعن ہو جائے گی اور لوگ ماسٹر کی نیت جانتے ہوئے اس پر شبہ نہیں کریں گے کیونکہ شرفو کا نا تین سال جیل میں کاٹ آیا تھا۔ اور ایسے آدمی کی بات ماسٹر برکت علی کے مقابلے میں کہاں مانی جائے گی۔۔۔۔ اس نے کروٹ بدل کر بظاہر بڑے اطمینان سے سونے کی کوشش کی۔

ماسٹر برکت علی تو واپس آ گیا تھا۔ لیکن اس انکشاف کی نوعیت نے ایک گوند کی طرح لوگوں کو بازار کے فرش پر چپکائے رکھا۔ اکثر لوگ ماسٹر کی نیت پر شبہ نہیں کرتے تھے۔ چند ایک کہتے تھے کہ شرفو کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ شرفو نے محض ایک بات کی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ کسی نے کہا ماسٹر برکت علی فصل کے موقع پر نوراں کو دانے بھجواتا ہے۔ تو آخری گروہ کے چند لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے۔ کوئی بولا ''سنا ہے ماسٹر برکت علی نوراں کو ماہوار بھی کچھ دیتا ہے''۔ تو چند اور لوگ بھی ماسٹر کو شرفو کے زاویے سے دیکھنے لگے۔

ہر گھڑی گزرنے پر ماسٹر کے حامیوں میں کمی ہوتی گئی۔ کیونکہ باہم تبادلہ خیال سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ماسٹر برکت علی دانے فیس اور دوسری چیزیں نوراں کو بھجواتا ہے۔ ماہوار روپے دیتا ہے اور اس کے بچے کو سکول میں لاڈ سے رکھتا ہے۔ رائے عامہ یا تو ہلتی ہی نہیں لیکن جب ہلتی ہے تو چھلانگیں مارتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ثبوت مضبوط سیڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر کئی لوگوں کے تخیل نے نوراں کے گھر میں سارے کمروں کو ماسٹر برکت علی کے دیے ہوئے دانوں سے بھرے دیکھا۔ کئی ایک کو الہامی انداز میں پتہ چل گیا کہ فلاں وقت ماسٹر برکت علی فلاں سمت کس مقصد کے لیے جا رہا تھا۔ اکثر لوگوں پر فوراً واضح ہو گیا کہ برکت علی کی کفایت شعاری کی اصل وجہ کیا ہے۔ ماسٹر کے شادی نہ کرنے کا راز بھی سمجھ میں آ گیا۔ کیونکہ بشیر گھوسی کا خیال تھا کہ جس آدمی کو پینے کو دودھ مل جائے اسے بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری منفی جنسی اقدار کے محدب شیشے میں سے جب لوگوں نے عادتاً جھانکا تو یہ ثبوت ہر لحظہ بڑے ہی بڑے ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ اصل ماسٹر برکت علی ان کے نیچے چھپ گیا۔

شام تک بازار میں یہ موضوع زیر بحث رہا۔ لاریوں کے اڈے پر، چکی والے کے ترازو کے پاس، دہی والے کی دوکان کے سامنے ٹوٹے ہوئے بنچوں پر۔۔۔ چوراہے میں، بوہڑ کے درخت تلے۔۔۔ بھوسے والے کی دکان پر۔ سہ پہر کو دانوں کی بھٹی پر۔۔۔ شام کو تنور پر۔۔۔ راہ چلتے ملاقاتیوں نے تازہ ترین اطلاعات کا تبادلہ کیا۔۔۔ خاوندوں نے بچوں کی غیر موجودگی میں اپنی بیویوں کو بتایا۔۔۔ بیویوں نے ساگ چیرتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے کہا۔۔۔ دوسرے دن بھنکیں ایک گھر والوں کی رائے

دوسرے گھر لے گئیں۔۔۔کنواری لڑکیوں نے دبی گھٹی ہنسی اور آنکھوں کے اشاروں سے تبصرے کیے۔۔۔جوان لڑکوں نے ماسٹر اور نوراں کے تعلقات کی تخیل کے پردے پر پوری فلم دیکھ ڈالی۔۔۔بوڑھوں نے توبہ اور استغفار کے ساتھ اس قصہ میں قرب قیامت کے آثار دیکھے۔۔۔اور گھر جا کر اپنی جوان اولاد کو کڑی نظروں سے گھورا۔

ماسٹر برکت علی اپنے کمرے کا دروازہ کھولے چارپائی پر لیٹا حقہ پیتا رہا۔ اکادکا لوگ ادھر سے گزرتے تو رک کر لڑائی کا تذکرہ ضرور کرتے۔ ماسٹر برکت علی الف سے یے تک سارا قصہ سنا کر اپنی معصومیت ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ لوگ کوئی فیصلہ دیئے بغیر کھسکنے کی کوشش کرتے۔

دوسرے دن مدرسہ میں چھٹی تھی۔ ماسٹر برکت علی بازار میں نکلا۔ اور لوگوں کے پاس جا جا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا۔ لوگ خاموشی سے سنتے رہتے۔ کوئی ہوں ہاں کر دیتا لیکن زیادہ تسلی نہ دیتے۔ ماسٹر زیادہ جوشیلا ہوتا گیا۔ اس کے دلائل میں سرگرمی پیدا ہوتی گئی۔ آواز بلند ہوتی گئی۔ وہ ایک گروہ سے ہٹ کر دوسرے گروہ کے پاس جاتا لیکن وہ بات کرتا تو لوگ زیر لب مسکرانے لگتے۔ ایک دوسرے کو انکھیوں سے دیکھتے اور لاتعلق سے ہو کر ادھر ادھر کھسکنے کی کوشش کرتے۔

ماسٹر برکت علی بڑا حیران ہوا۔ بالآخر کسی نے اسے بتایا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ تبھی اتنی شدت سے اپنے آپ کو معصوم ظاہر کر رہا ہے۔ ماسٹر برکت علی کا خون کھولنے لگا۔ لیکن ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ چکی کے پاس لوگوں کا گروہ کھڑا تھا۔ اس نے وہاں جا کر نہایت جوش سے کہنا شروع کیا کہ شرفو افترا پرداز ہے۔ وہ خود بالکل معصوم ہے، نوراں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کبھی کبھار اسے بیوہ سمجھ کر اور خدا کا حکم جان کر وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ لیکن لوگ اس دلیل پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے آپس میں ٹھوکے دیئے اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

ماسٹر برکت علی کی رگ رگ صدمے سے نڈھال ہوگئی۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کی فضا میں اس قسم کی بدنامی اس کی قطرہ قطرہ جوڑی ہوئی عزت کو ایک ہی دفعہ مٹا دے گی۔ گھر جا کر وہ چادر میں منہ لپیٹ کر باقی سارا دن اور ساری رات بھنتے کباب کی طرح کروٹیں لیتا رہا۔

صبح مسجد میں جب جماعت کھڑی ہونے لگی تو امام نے ماسٹر برکت علی کی بجائے ایک دوسرے آدمی سے کہا ''چلو شاہ جی تکبیر پڑھو'' اور وہ تکبیر پڑھنے لگا۔ ماسٹر کا نماز میں بھی دل نہ لگا۔ وہ جلدی لوٹ آیا۔ واپسی پر جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگا تو حروف اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے، پھر غائب ہو جاتے۔ آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ اور پڑھتے پڑھتے اسے یک لخت محسوس ہوتا کہ اس کا دھیان قرآن کی سطروں کی بجائے پرسوں والے واقعہ میں جکڑا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب سکول کھلا تو صرف لڑکے حاضر تھے۔ بچیاں سب غائب تھیں۔ وہ اسے اتفاق سمجھ کر خاموش رہا۔

رات کو عشاء کی نماز میں سنت پڑھتے وقت اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں طرف دو دو گز جگہ خالی ہے اور لوگ پرے ہٹ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔

صبح مسواک کرتے وقت اس نے گزرنے والی ایک بوڑھی سے پوچھا ''ماسی کدھر چلی سویرے سویرے''۔ تو ماسی جواب دیئے بغیر کندھا دباتی آگے چلی گئی۔ وہ کنوئیں پر گیا تو ماسی داراں آدھا بھرا گھڑا اٹھا کر کھسک گئی۔ شادو اپنی گاگر وہیں چھوڑ کر کہیں ٹل گئی۔ لیکن جب ماسٹر زبردستی جیناں کا گھڑا بھرنے لگا تو وہ آنکھیں نیچی کیے خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی۔ پھر گھڑا اٹھا کر چپکے سے چل دی۔ اور ماسٹر برکت علی نے دیکھا کہ تھوڑی دور جا کر بوہڑ کے درخت کی اوٹ میں اس نے پانی زمین پر انڈیل دیا اور خالی گھڑا اٹھائے واپس چلی گئی۔

گھر کی طرف واپسی پر ماسٹر نے دور سے دیکھا کہ رنگو کا دادا دہلیز پر بیٹھا سوٹی پی رہا ہے لیکن جب وہ قدرے نزدیک پہنچا تو بوڑھا انجان بن کر اندر چلا گیا۔

راستے میں اس نے دو ایک راہ گیروں سے بات کی تو وہ گفتگو بڑھانے کی بجائے ختم کرنے کی کوشش کرتے اور پھر جلدی سے کھسک جاتے۔ دن چڑھا تو سکول میں صرف دو شاگرد آئے اور انہوں نے بتایا کہ باقی سب کو والدین نے سکول جانے سے منع کر دیا ہے۔ ماسٹر برکت علی کمرے کے دروازے بند کر کے چارپائی پر منہ لپیٹ کر پڑا رہا۔ اس کے کان جلتے رہے۔ دماغ میں چکیاں چلتی رہیں، پپوٹے پھڑکتے رہے، دل ڈوبتا رہا، ماتھا کبھی بھٹی بن جاتا کبھی برف کی سل۔ ظہر کی نماز کے بعد اس نے مولوی صاحب سے فریاد کی۔ اور بتایا کہ وہ بالکل نیک نیتی سے انکے فرمان کے مطابق ایک بیوہ سمجھ کر نوراں کی مدد کرتا رہا ہے۔ وہ بار بار کہتا "مولوی صاحب میں بالکل بے قصور ہوں"۔ مولوی صاحب لاتعلق ہو کر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ اور پھر واپس مڑتے ہوئے کہنے لگے، "نیت کا حال تو قادرِ مطلق ہی جانتا ہے۔ لیکن جب سب ایک ہی بات کہہ رہے ہیں تو کچھ بات تو ہوگی"۔

اور ماسٹر برکت علی کو ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے رگ و پے سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑے گا۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں اور بجائے آنسوؤں کے ان میں انگارے دہکنے لگے۔ کنپٹیوں پر جیسے کسی نے دھما دھم ہتھوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ بڑی آہستگی سے اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر اٹھایا۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر جوتی اٹھائی اور ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا آیا۔ اس کے جسم کا سارا رس جیسے نچڑ سا گیا تھا۔

ماسٹر برکت علی بند کمرے میں چارپائی پر لوٹتا رہا۔ کبھی پاؤں اٹھا کر دھما دھم ادوئن پر مارنے لگتا۔ کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا لیکن گلی میں کسی کے آنے کی آواز سن کر منہ چھپانے کو واپس بھاگتا۔ وہ کافی دیر رسول اکرمؐ کے روضہ مبارک کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ آہستہ آہستہ کانپنے لگی۔ کمرے کی دیواریں ہولے ہولے گھوم سی گئیں اور پھر ماسٹر برکت علی ایک دم بلک بلک کر رو دیا۔

شام کے وقت ماسٹر برکت علی کو بڑے زور کا بخار آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس پر ہذیان کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

اس شام نوراں نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلی جائے۔ کیونکہ اسے مزدوری ملنا بند ہو گئی تھی۔ اور تمام گھروں نے اس کے داخلے کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ جہاں جاتی عورتیں ایک دوسری سے اشاروں میں باتیں کرتیں اور ان کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے جسم کو چھید ڈالتیں۔ دوسرے دن صبح سویرے جب وہ گاؤں سے نکلنے لگی تو اس نے سوچا ماسٹر برکت علی سے ملتی جائے۔ اسکے مکان پر پہنچ کر غفورے نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کتاب کے ورق کی طرح آسانی سے کھل گیا۔ نوراں اور غفورا اندر چلے گئے۔

اندر کمرے میں صبح کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ اس روشن اندھیرے میں نوراں نے دیکھا کہ چارپائی پر ماسٹر برکت علی پڑا تھا۔

چند ماہ بعد زکوٰۃ کا مہینہ پھر آ گیا۔ مولوی صاحب مسجد میں کھڑے وعظ کر رہے تھے۔ "دکھیا اور بے سہارا بیوہ کی ایک آہ سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی مدد کرنے والا سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ اگر دین و دنیا کی عزت چاہتے ہو تو بیواؤں کی مدد کرو"۔

☆☆☆

کفارہ

ممتاز شیریں

ایک کاغذ بالکل سادہ اور سپید میرے آگے بڑھایا گیا۔ میری کور ہوتی ہوئی آنکھیں جو تاریک خلا میں بھٹک بھٹک کر تھک رہی تھیں اس مکمل سپیدی پر جم کر رہ گئیں۔

اچانک میری نظر کے آگے اس سپیدی پر کالا رنگ انڈیل دیا گیا۔ گہرا قطرہ بہ قطرہ گرتا اور پھیلتا ہوا۔ پھر یہ کالا رنگ خشک ہو کر سفید کاغذ پر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں محیط ہو گیا۔

مشیت کے ہاتھوں نے لکھا اور نقطوں کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔

جبر و قہر کی آواز آئی:

''اس پر دستخط کر دو''۔

سیاہی کی گنجان چوڑی پٹی کے نیچے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے۔

میں نے اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیئے تھے۔

موت دریچے سے لگی ہوئی مجھ سے ذرا سا دور کھڑی تھی اور مجھے اپنے عشوہ انداز سے للچا رہی تھی۔ وہ ہیجان خیز اور شہوت انگیز تھی۔ بھری بھری گدرائی ہوئی رانیں، کولہوں کی گولائیاں جلد سے چپکے ہوئے اسکرٹ سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ریوے لان یا ہیلنا روبنسٹائن کا میک اپ چڑھا ہوا تھا۔ دہکتے ہوئے سرخ ہوسناک ہونٹوں پر حقارت اور سفاکی کا تبسم لیے وہ کہہ رہی تھی ''یہ زندہ نہیں رہے گی''۔

''نہیں نہیں ڈاکٹر سپارنا کورن ایسا مت کہو''۔ سفید براق فرشتہ رحمت نے چیخ کر کہا۔ اس نے تیزی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ میں اس کی چیخ نہ سننے پاؤں۔ وہ سرگوشی میں ملتجیانہ انداز سے کہے جا رہی تھی، نہیں ڈاکٹر اسے بچا لو، ہم سب کو اس سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ کیسی پیاری موہنی سی ہے۔۔۔۔۔ اس نے تکلیف سہتے میں کس خاموش طاقت اور قوت برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تین دن یہ درد کی اذیت میں مبتلا رہی اور مسکراتی رہی۔ ایک چیخ ایک کراہنے کی آواز تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلی''۔

گہرے پنسل سے کھنچی ہوئی مصنوعی ابھروؤں کی کمانیں تن گئیں۔ درشت آواز نے کہا ''تم لڑکیاں کتنی جذباتی بن سکتی ہو۔ علاج میں جانبداری یا تعلق سے کام نہیں لیا جاتا، تمہیں ضابطہ کی پابندی میں جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ امراض کا علاج ایک سائنس ہے۔ تمہیں ہر مریض پر مکمل بے تعلقی سے خالی از جذبات ہو کر توجہ دینی چاہیے۔ اس مریضہ میں تمہارے لیے کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس مریضہ کا معاملہ زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہے۔ زندگی کی امید بہت کم ہے''۔

کوئی جاتے جاتے یہ الفاظ سن کر رک گیا جیسے اسے سخت تکلیف ہوئی ہو اور مڑ کر تلخ لہجے میں پوچھا ''کیا انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ یہ مریض تمہارے لیے صرف ایک ''کیس'' ہے؟ خدا کا شکر ہے ڈاکٹر سپانا کورن کہ یہ کیس تمہارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسپنگلر اس مریض کو بچانے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے اور ہر قیمت پر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کریں گے میرے لیے یہ زندگی بہت قیمتی ہے، بہت عزیز''۔

اور وہ جو موت تھی، اس نے بے پروائی سے اپنے کندھے سکوڑ کر بات سنی ان سنی کر دی۔ ''زیادہ سے زیادہ دس فیصد

امکان ہے اسکے زندہ بچنے کا'' اس نے حرف آخر کے طور پر اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ کٹمنیٹر اکے ہاتھ تھے جن کے ناخنوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

جواب کی سفاکی سے مجروح ہوکر پیار میری طرف اس طرح بڑھا جیسے وہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر موت کے آگے سپر بن جائے گا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور موت کا انتظار کرتی رہی۔ میری زندگی سبک دوش ہوکر دوبارہ مرگ کا انتظار کرتی رہی۔

چنانچہ مجھے مرنا تھا۔ ایک بے معنی اور بے مصرف زندگی ناگہاں اپنے اختتام کو پہونچ جائے گی میں نے زندگی میں کوئی معرکہ سرنہیں کیا، کسی چیز کی تخلیق نہیں کی۔ کوئی ایسا کام نہیں کیا جو میری اب تک کی زندگی کا کوئی جواز بن سکتا لیکن اب ایک نئی زندگی کی تخلیق شاید میری زندگی کا جواز بن جائے۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور محبت کے چہرے پر نگاہ کی اس لمحہ مجھ پر منکشف ہوا کہ مجھے کتنا چاہا گیا ہے۔ میری کتنی قدر کی گئی ہے، میری زندگی بے کار اور بے مصرف ہونے کے باوجود ان کے لیے بہت اہم اور قیمتی تھی جو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس لمحہ جب موت کا سردہاتھ مجھ پر منڈلا رہا تھا، یہ خیال بڑا اطمینان دہ تھا۔

محبت کا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس چہرے پر اندرونی کرب اضطراب اور پریشانی کے نشانات مرتسم تھے۔ درد کو چھپانے کی کوشش میں ایک ایک نس پر ناقابل برداشت بار پڑ رہا تھا اور محبت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے موت کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

کیا موت گناہ کی قیمت اور کرب جرم کا کفارہ تھا؟ میں تو گناہ سے ناآشنا تھی، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے کبھی گناہ کی جھلک دیکھ لی ہو، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو؟ اور پھر گناہ کو چھوٹا یا بڑا قرار دینے کا پیمانہ کس کے پاس ہے؟

محبت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے موت کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

محبت نے مجھے موت سے بچانے کے لیے اپنا بازو بڑھا رکھا تھا۔ اندر گڑی ہوئی نشتر کی سوئی لال قطرے چوس رہی تھی، سیال سرخی بتدریج بڑھ رہی تھی، اور جب سرنج بھر گئی تو سوئی نکال لی گئی ہے۔

۔۔۔۔سوئی میرے ہاتھ کی باریک رگ کو ٹٹولتی رہی۔ بے شمار مرتبہ سوئی میری کلائی میں داخل ہوئی اور کہنی کے نیچے تیلی رگوں کے پھیلے ہوئے جال میں سرگرداں رہی۔ میرے پلنگ کے پاس لگے ہوئے دہشت ناک سلنڈروں سے گلوکوس کا محلول سوئی سے ذریعے میرے جسم میں داخل ہوتا رہا۔

پھر کسی خطرناک دوا کا محلول قطرہ بہ قطرہ آہستہ آہستہ میری رگ میں اترتا رہا۔

اور جب میں تھکن سے خستہ ہوکر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی ہوئی تھی تو میں نے ایک خوفزدہ کرنے والی آواز کو سرزنش کرتے ہوئے سنا:۔

''یہ بہت خطرناک اور طاقتور عرق ہے اسے بہت آہستہ جانا چاہیے، اگر بہاؤ تیز ہوگیا یا زیادہ مقدار بدن میں چلی گئی تو شدید انقباض پیدا ہوجائے اور اندرونی حصے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا خطرہ ہے۔ ذرا سی لاپروائی مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ ساری رات مستقل نگہداشت کی ضرورت ہے''۔

ساری رات نگہداشت کی جاتی رہی اور لمحہ بہ لمحہ میری تکلیف اور درد کا اندراج ہوتا رہا۔

وہ دوسری رات تھی۔ خوفناک اور ڈراؤنی۔

اور یہ تیسری رات۔

اب میری رگوں میں گرم انسانی خون ٹپک رہا تھا۔ بلڈ بینک کے یخ خانوں سے لیا ہوا خون نہیں بلکہ محبت کے بازو سے نکلا ہوا تازہ اور زندہ خون۔ جیسے جیسے یہ خون میرے جسم میں داخل ہو رہا تھا میرا بدن اپنی کھوئی ہوئی حرارت دوبارہ حاصل کر رہا تھا اور مجھ میں زندگی واپس آ رہی تھی۔ زندگی میرے پاس مسکراتی ہوئی محبت کی مضطرب اور بے چین نظروں کو ڈھارس بندھاتی ہوئی کھڑی تھی۔

ایک ممنون طمانیت کے ساتھ دو نرم محبت بھرے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو تھپتھپایا۔ ایک ہاتھ نے بڑھ کر شفقت کے ساتھ میرے ماتھے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا "تم ٹھیک ہو جاؤ گی"۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی"۔ زندگی کے فرشتے کے ہونٹوں سے ایک مہربان مسکراہٹ کی شعاعیں پھوٹیں۔ "تم طاقتور ہو تم میں بحرانی کیفیتوں کے شدائد برداشت کرنے کی طاقت ہے۔ خطرے کو بڑھانے والی چیزیں تو خوف اور لاعلمی ہوتی ہیں۔ اس پورے وقفے میں تم نے بڑی بہادری سے کام لیا ہے اور ہم سے پورا پورا تعاون کیا ہے۔ تمھیں صورت حال کا صحیح شعور ہے اور اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے جو ارادے کی قوت چاہیے وہ بھی تم میں موجود ہے اور تم یقیناً اس پر قابو پا جاؤ گی"۔

میں نے سکون اور راضی بہ رضا مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں، ڈاکٹر اسپنگلر"۔

اور پھر میں نے محبت کے چہرے کو کھلے ہوئے وسیع دروازوں میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا جو اس کے پیچھے بند ہو گئے۔ یہ آرفیوس کا چہرہ تھا، جو روشنی کی دنیا میں غائب ہو گیا۔

ایک ان دیکھی جبری طاقت مجھے تاریکی کی ابدیت میں کھینچ لے گئی۔

پھر بھی یہ موت نہیں تھی جو میرے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ یہ زندگی کا فرشتہ تھا۔ اس کے سفید دانت ایک دلآویز اور مسحور کن مسکراہٹ میں ایک ثانیہ کے لیے چمکے اور پھر ایک سفید نقاب میں روپوش ہو گئے۔ سنہرے بالوں والا سر ایک سفید ٹوپ میں چھپ گیا اور نیلی آنکھیں جو شفقت سے جگمگاتی تھیں اب سنجیدہ اور متفکر ہو گئی تھیں۔

سفید لبادہ اور سفید ٹوپ میں ڈھکے ہوئے اور کئی ایک خاموش سایوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

میں نے اپنی زندگی خدا کے ہاتھوں میں دے دی۔

ریڑھ کی ہڈی کے دھانے پر اعصابی مرکز میں اترتی ہوئی سوئی کے ساتھ موت مجھ میں داخل ہوئی اور یکے بعد دیگرے میرے سارے عضلات میرا پورا بدن بے حس، سرد اور بے جان ہوتا گیا۔

میں نے ساکت اور بے جان پیکر کو میز پر سفید چادروں میں لپٹا ہوا چھوڑ دیا۔

میں نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ یک دم آزاد اور بے قید جیسے میں اپنے جسم کے زندان سے رہا ہو کر ایک بے حد و بے کراں وسعت میں داخل ہو گئی تھی۔

میرے چاروں طرف وسیع زمین پھیلی ہوئی تھی، بنجر اور ویران زمین، دفعتاً میرے پیروں کے نیچے زمین کانپنے لگی۔ زمین کانپتی لرزتی رہی اور اس طرح تشنج میں مبتلا رہی جیسے دردِ زہ سے گزر رہی ہو۔ زمین نے اپنے اندر سے بیش بہا خزانے کا معینہ باہر اگل دیا۔ لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔

پونم کی چاندرات کی طرح۔

وہ سرمستی و رعنائی کا پیکر بن کر جاگ اٹھی ہے۔

ایک ایک گوشے سے ہر اپسرا زندہ ہو کر نیچے اتر آئی اور سب مل کر رقص میں شامل ہو گئیں۔

آسمانی جل پریاں ناچتے ناچتے ایک بے حد و بے کراں فضا میں پہنچ گئیں۔

ان کے ملکوتی جسموں کی تابناکی میں روحانی عظمت کے چراغ روشن تھے۔
یہ آسمانی اپسرائیں صرف درباری ناچنے والیاں تھیں۔ ناچ فنکارانہ اور مخصوص کھمیر وضع کا تھا۔ ساری اپسرائیں اسی طرح ناچ رہی تھیں جس طرح صدیوں پہلے سوریہ ورمن کے دربار میں انہوں نے ناچا ہوگا۔ نازک ہاتھ مختلف زاویے بناتی ہوئی مخروطی انگلیاں بل کھاتے ہوئے اعضا کا لوچ، نرم و نازک ہتھیلیاں جو جڑ کر کھلتے ہوئے کنول بن رہی تھیں۔
جو اپسرا ناچتی ہوئی گزرتی اس کی طرف جان لیوا ہیرے کی انگلی اٹھتی، جو شیوا نے بدصورت ناقص الخلقت بونے کو بخش دی تھی، اور تمام اپسرائیں ایک ایک کر کے مردہ ہو کر گرتی گئیں۔
ننھی دبلی پتلی اور نازک جل پریاں برف کی طرح سفید حسین پر وقار، سرو قد اور راج ہنسوں جیسی BALLERINAS میں بدل گئیں، جو جھیل کے سحر سے آزاد ہو کر چاندنی رات میں چائے کووسکی کی مسحور کن موسیقی پر ناچ رہی تھیں۔
راج ہنسوں کی شہزادی سب سے الگ ہو کر اکیلی اپنا آخری رقص کرتی رہی۔ فضا میں اس کی آواز ابھری۔ وہ اپنی موت کا نغمہ گا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی حرکات مضمحل ہوتی گئیں اور وہ فرش پر گر پڑی اس کے نازک بدن میں ایک آخری تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور اسی حسن و تمکنت کے ساتھ وہ موت کی آغوش میں سو گئی۔
موت میں بھی ایک وقار اور حسن ہوتا ہے۔
نہیں نہیں، موت تو بدصورت اور مضحک تھی۔ میں نے اصلی اور حکایاتی جنگوں کے مناظر سے منقوش دیواروں کے درمیان سے گذرتے ہوئے سوچا، خونریزی کے مناظر، موت اور تباہی کے مناظر۔۔۔۔اور یہ جہنم تھا، ادی سی، کبھی نہ بجھنے والی آگ سے بھرا ہوا الاؤ جو انسانی جسموں کے ایندھن پر جل رہا تھا۔ شعلوں کی تیز زبانیں گناہ گاروں کے تعاقب میں لپک رہی تھیں۔
نٹ راجا دیوانہ وار اپنا وحشیانہ موت کا ناچ ناچتا رہا اور پھر اپنی ایک ٹانگ رقص کے انداز میں فضا میں معلق کیے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا پیر انسان کی گردن پر تھا اور انسانی زندگی اس کے پیر کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔
ہندوستانی نٹ راجا، شیوا کے زیادہ شفیق کمبوڈین پیکر میں ڈھل گیا۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک مہربان بلکہ ہوسناک تبسم تھا۔ اس کے سر پر بالوں کی جٹائیں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں، جو نصف چاند کا ہالہ سجا ہوا تھا۔ شیوا تخریب کا دیوتا تھا اور اسی لیے تخلیق کا بھی دیوتا تھا کیونکہ موت ہی کی کوکھ سے زندگی نکلتی ہے۔
اور وشنو نے اپنے ساتھ سینکڑوں دیوتاؤں اور راکھششوں کو لے کر دودھ کے ساگروں کو آب حیات کے لیے متھ ڈالا۔
کلدانی تصویروں کی گیلری سے گذرتی ہوئی میں اوپر چڑھنے لگی، مرکزی برج کی عبادت گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اینگ کور کا مندر درجہ بدرجہ بلند ہوتے ہوئے اتنا حسین اور متناسب لگتا تھا جیسے پتھر میں موسیقی منجمد ہو گئی ہو۔ چار گوشوں کے چار برجوں کی منزلیں مصری اہرام کے سے تکون بناتے، مرکزی برج کے کنول کی طرف اٹھتی تھیں۔ اور یہ کنول نما سر بفلک مینار کیلاش یا میرو کے پہاڑ کا اسم تھا۔ کیلاش جو دیویوں دیوتاؤں کا مسکن اور ساری کائنات کا مرکز تھا۔
لیکن اوپر راستہ تنگ اور تاریک تھا، سیڑھیاں اونچی اور چکنی تھیں اندرونی عبادت گاہ میں اندھیرا تھا اور قدم بڑھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔
میں آخری زینے پر کھڑی ہوئی تھی، عبادت گاہ سے ایک شبیہہ اگر بتیاں تھامے ہوئے، جو طاق میں جلائی جاتی ہیں، نیچے اتر رہی تھی۔ زعفرانی رنگ کی عبا میں ملبوس جو رومی چونے کی طرح ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اس نے مندر کے ایک حصے کی طرف اشارہ

کیا جہاں ایک اور شہ نشین پر بدھ کے مجسموں کی قطار بنی ہوئی تھی۔ یہ منظر بنکاک کے مشہور سنگ مرمر کے مندر کے جانے پہچانے منظر میں تبدیل ہو گیا۔ بدھ کے سنہری مجسموں کی قطاریں بدھ بیٹھے ہوئے مراقبہ میں مستغرق، لیٹے ہوئے، استادہ ہاتھ اٹھا کر سمندروں کو پر سکون کرتے ہوئے۔

دنیاؤں کی لاعلمی سے بہت اوپر۔

موسموں کے تغیر و تبدل کے سایوں سے بہت آگے۔

بدھ کا آئین چمک رہا ہے، اس طرح، جیسے

چاند موسم خزاں کے آسمان پر چمک کر

کائنات کو اپنی محبت کی کرنوں سے پوتر بنا کر آغوش میں لے لیتا ہے۔

جسم ایک بدرو ہے، ہر طرح کی غلاظت اور گندگی کا گھر۔

جاننے والے کے لیے زندگی۔

ایک ننھے سے دیئے کی لرزتی ہوئی لو ہے۔

جو ہوا کے ایک جھونکے میں بجھ جاتی ہے۔

وہ مقدس اور تمثیلی درخت سامنے تھا جس کے گھنے سائے تلے بدھ کو روشنی ملی تھی میں نے درخت کی طرف دیکھا وہاں روشنی نہیں تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ عظیم الشان کھمیر تہذیب کے ان شاندار کھنڈرات میں تنہا بھٹکتی ہوئی بڑھتی ہوئی تاریکی سے میں خوفزدہ ہونے لگی۔ راستے سکڑ کر دوبارہ ایک بھول بھلیاں میں بدل گئے۔ ہوا رک گئی تھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا

''آکسیجن کی جالی ٹھیک کرو۔ سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے''۔ کہیں قریب کسی نے تیزی سے سرگوشی میں کہا ''آکسیجن''۔

ہوا میں تازگی تھی۔ میرے اردگرد روشنی تھی۔ میرے اوپر کھلتی ہوئی محرابیں شاندار تھیں، ستون سفید، مرمر کے بنے ہوئے، سنگ مرمر تقدس اور پاکیزگی کی ایک ملکوتی فضا کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں نہ کندہ کی ہوئی شکلیں تھیں، نہ مجسمے اور تصویریں، لیکن پھر بھی اس سادگی اور پاکیزگی کا ایک اپنا تحیر خیز حسن اور جمال تھا۔ یہاں مورتیاں نہیں تھیں، خارجی علامات نہیں تھے۔ کوئی ''واسطہ حسن قبول'' نہ تھا لیکن ایک غیر مرئی برتر و بالا وجود جاری و ساری تھا۔ اپنے خالق سے ایک خالص اور بالراست تعلق کا احساس تھا۔

سفید بیضوی گنبد، مرمر کے ستون، پھیلی ہوئی محرابیں شفاف فانوس یہ یقیناً بادشاہی مسجد تھی ان جانی، اجنبی راہوں پر بھٹک کر، میں گھر لوٹ آئی تھی۔ مرکزی قبے کے نیچے میں سجدے میں گر گئی اور خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے لگی۔ میرا سارا وجود ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر مجھے سکون مل گیا۔

میں نے اٹھ کر اپنے اردگرد سراسیمہ ہو کر نظر ڈالی۔ میں کہاں تھی؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا زمان و مکان جہت اور پیمانے سے محروم ہو کر اپنا مفہوم کھو بیٹھے تھے اور میں گویا زمان و مکان سے گزر کر ابدیت میں داخل ہو رہی تھی۔

یا اس کے برعکس ابدیت سے نکل کر ''اب'' اور ''موجود'' کی دنیا میں واپس آ رہی تھی؟

تمام وقت ازلی اور ابدی ''حال'' ہے۔

جن راستوں سے ہم نہیں گزرے۔

وہاں کے قدموں کی چاپ،
بازگشت بن کر یادوں میں گونجتی ہے۔
یہ نہ اینک کور کے سرمئی ستون تھے اور نہ بادشاہی مسجد کے سنگ مرمر کے ستون بلکہ معمولی عام قسم کے گول ستون تھے۔ جن پر سفید اور خاکستری روغن چڑھا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کی سیال، شفاف سپیدی صرف اسپتال کی دیواروں میں چنی ہوئی چمکدار ٹائلز میں تھی۔ ہاں، یہ بینکاک کا سیونتھ ڈے اڈونٹسٹ سینی ٹوریم ہاسپٹل تھا۔
میں گویا ابدیت کی لامتناہی وسعت کے دھندلکوں سے کھینچ کر قریبی اور متعین زمان و مکان میں واپس لائی گئی تھی۔
اسپتال کی لفٹ نیچے آئی اور اس سے کوئی باہر نکلا، نہ عفرانی عبائیں سفید لباس پہنے ہوئے میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ عیسائی مشن کی عورت تھی جو روزانہ مریضوں کے پڑھنے کے لیے اپنے مشن کا لٹریچر لاتی تھی۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کاغذ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔
''خدا کی بادشاہت قریب ہے۔
مسیح موعود کا نزول قریب ہے''۔
آرمیگڈان کی بین الاقوامی جنگ، دینا کی تمام قوموں کے درمیان زبردست ٹکراؤ، اور تقریباً پوری دنیا کے تہس نہس ہونے کے بعد زخموں سے نڈھال زمین کو سکون اور امن نصیب ہوگا۔
مسیح موعود کی آمد قریب ہے۔
مسیح کا نورانی شعاعوں میں زمین پر نزول ہوگا۔۔۔۔ یہ الفاظ ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے اور میرے ذہن میں دوسری کتابوں کے الفاظ رینگنے لگے جن میں۔۔۔۔ مسیح کی دوبارہ آمد، ان کی حکومت میں امن اور خوشحالی، یوم حساب کی نزدیکی، مردوں کا زندہ ہو اٹھنا، روز جزا کا آخری انصاف، جی اٹھے ہوئے مردوں کا ایک لامتناہی اندھیرے سے نکل کر حیران و سراسیمہ الوہی نور کی خیرہ کن روشنی کے سامنے جمع ہونا۔۔۔۔ سب مذکور تھا۔
مجھے شہادت کی آرزو نہیں،
مجھے آخری دید کی تمنا نہیں،
مجھے صرف نفس مطمئنہ بخش دے۔
میرے سامنے پھیلا ہوا خلا ایک سماوی روشنی سے معمور ہو گیا۔ طمانیت کا احساس میرے وجود میں پھیل گیا۔
روشنی کے ایک دھارے میں میری ننھی ''ریشمیں'' کے پیکر میں گھنگریالے بالوں والی گڑیا، گلابی جھالروں کے فراک میں سر جھکا کر اپنے خوبصورت بالوں کے گھونگر ہلاتی ہوئی، ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ لیے ہوئے۔۔۔۔ محبت سے بے قابو ہو کر میں نے اس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں۔ لیکن میری ننھی ''ریشمیں'' گریز پا نکلی۔ وہ روشنی کے تخت پر سوار ہو کر آسمانوں میں غائب ہوگئی۔ میری باہیں خالی کر رہ گئیں۔
ساری ویرانی اور بنجر پن، ساری تنہائی میرے اپنے اندر تھی۔ سارا درد اور کرب پھر جاگ اٹھا۔ یہ درد اذیت دہ تھا، بہت اذیت دہ تھا۔ لاشعور کی وسعتوں میں آزادانہ گھومتا ہوا ذہن تکلیف دہ آگہی کے ایک نوکیلے نقطہ پر مرکوز کر دیا گیا۔ روح اپنی لاحاصل تلاش کے سفر سے لوٹ کر دوبارہ اپنے زندان میں داخل ہوگئی، جو میرا جسم تھا۔
میں نے آہستہ آنکھیں کھولیں۔ روشنی میری کمزور آنکھوں کو تکلیف دے رہی تھی۔ ''روشنی'' آپریشن کی میز پر پڑتی ہوئی

خیرہ کن، بے رحم اور آنکھوں کو اندھا بنانے والی روشنی تھی۔ ''طمانیت'' مارفیا یا اور کوئی خواب آور، دوا تھی جو میرے درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ لیکن کوئی مارفیا اس درد کو مٹا نہیں سکتا تھا جو میرے اپنے اندر موجود تھا، میرے وجود کی گہرائی میں زندہ تھا۔

میرے نفس نے آزاد ہو کر عالمگیر ویرانی اور تنہائی کا جو تصور دیکھا تھا وہ دراصل میرے اپنے شدید اندرونی احساس کا اظہار تھا۔

جیسے جیسے آہستہ آہستہ، میرے حواس مجتمع ہوتے گئے ویرانی اور اجاڑپن کا کائناتی احساس سمٹ کر ایک شدید ذاتی المیے میں ڈھل گیا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا باہر اذیت دہ انتظار کا اعصابی تشنج ختم ہوا اور وہ اندر داخل ہوئے لیکن ڈاکٹر نے مانعتی انداز میں ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور انہیں الگ لے گیا۔ میں ڈاکٹر کی سرگوشیانہ لہجے میں گفتگو سن سکتی تھی۔ '' مجھے افسوس ہے، بے حد افسوس بچہ کو بچایا نہیں جا سکا ہم نے دل کے مساج کا طریقہ بھی آزمایا مگر بے کار۔ آخری لمحہ تک ہم نے اس کے دل کی دھڑکن پر کان لگائے رکھے۔ وہ زندہ تھا۔ موت پیدائش کے فوراً بعد ہوئی ایک طرح سے پیدائش اور موت دونوں ایک ساتھ واقع ہوئیں''۔

صمیم دل سے مانگی ہوئی آخری دعا نے شاید یہ ننھی زندگی ایک دوسری زیادہ ''قیمتی'' زندگی کے بدلے میں بھینٹ دے دی تھی۔

کیا دل کی گہرائیوں سے مانگی ہوئی وہ دعا قبول ہوئی تھی؟ ان کی کربناک اور مضطرب آنکھیں میری طرف پلٹیں۔

ڈاکٹر نے جلدی سے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ '' اب یہ ٹھیک ہیں، آہستہ آہستہ ہوش آ رہا ہے، جلد ہی انہیں ان کے اسپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا اور آپ ان سے بات کر سکیں گے۔ اس ابتلا سے وہ بڑی ہمت سے گزریں۔ بڑا پیچیدہ اور خطرناک کیس تھا لیکن اب خطرے کی سرحد پار ہو گئی ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سیزیرین آپریشن بذاتہ خطرناک نہیں ہوتا گو کہ بڑا آپریشن ہے کیونکہ شگاف براہ راست پیٹ کے اندر اترتا ہے لیکن آج کل سلفا ڈرگس اور اینٹی بائیوٹکس کے اس دور میں سمیت پھیلنے اور موت کے خطرات بالکل دور ہو گئے ہیں۔ وہ خطرے سے باہر ہیں ابھی ان کی حالت بہت نازک ہے اور انتہائی حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ بچہ کی موت کے بارے میں انہیں ابھی نہ بتایا جائے تو بہتر ہوگا''۔

میرے دل پر سردی کی ایک تہہ سی چڑھ گئی۔ میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ میرے سینے میں جو نئی محبت کا شعلہ بھڑکا تھا وہ سرد ہو گیا۔

موت مجھے چھوتی ہوئی گزر گئی لیکن جاتے جاتے وہ تاوان میں اس ننھی سی زندگی کو لے گئی جو میرے اندر متحرک تھی۔ وہ ننھا وجود جو اپنی نشو و نما کی ساری منزلوں میں میرے تخیل میں اتنا واضح طور پر موجود تھا، اس کی تقدیر میں صرف ایک لمحہ کی زندگی تھی۔

میں نے زندگی کو نہیں، موت کو جنم دینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ میں ندامت اور غم کے احساس میں ڈوب گئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں، آنسوؤں کے پاس بھی اس درد کا علاج نہیں تھا۔

میں تنہا تھی، اپنے کرب اور غم کے ساتھ، بالکل تنہا۔

میں اس ساری قیامت سے موت کے لیے گذری تھی یا پیدائش کے لیے؟

پیدائش ہوئی یقیناً لیکن ۔۔۔۔

یہ پیدائش میرے لیے موت کی طرح سخت اور تلخ اذیت بن گئی۔

یہ بہت بڑا کفارہ تھا۔

اس کفارے کے لیے مجھے کیوں منتخب کیا گیا؟

☆☆☆

بُن بست

نیّر مسعود

اس بار وطن آنے کے بعد میں نے شہر میں دن دن بھر گھومنا شروع کیا اس لیے کہ میرے پاس کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ میری اماں سلائی کڑھائی کا کام کر کے جو تھوڑی بہت رقم پیدا کرتی تھیں وہ ہم ماں بیٹوں کا پیٹ بھرنے کو کافی تھی، بلکہ میرے لیے تو ہمیشہ عمدہ کھانا پکتا تھا۔ اماں جیسا کچھ بھی کھاتی ہوں مگر مجھے دونوں وقت کھانے کو گوشت اور کوئی میٹھی چیز ضرور ملتی تھی۔ صبح دودھ کے ساتھ کبھی جلیبی اور کبھی شیر مال کا ناشتہ کر کے میں گھر سے نکل جاتا تھا اور دوپہر تک شیش محل، حسین آباد، مفتی گنج سے لے کر ٹھاکر گنج، چوک، سعادت گنج تک کا چکر لگا لیتا تھا۔ میں نے کوئی دوست نہیں بنایا تھا اس لیے بغیر کسی سے بات کیے پرانی عمارتوں کو دیکھتا، تنگ گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ دوپہر کو گھر واپس آتا تو اماں کی نماز کی چوکی پر میرا کھانا سینی سے ڈھکا رکھا ہوا ملتا تھا۔ میں کھانا کھاتا، جھوٹے برتن کنویں کے پاس رکھ دیتا اور اسی چوکی پر کچھ دیر لیٹ کر سو لیتا تھا۔ سہ پہر کو اماں کام پر سے واپس آتیں تو میرے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور لاتی تھیں۔ کبھی کوئی نیا فصلی پھل، کبھی اکبری دروازے کی کوئی عمدہ مٹھائی اور کبھی بالائی کے پان جو مجھ کو بہت پسند تھے۔ مجھے بھوک نہیں ہوتی تھی، پھر بھی ان کی محبت سے دی ہوئی چیز تھوڑی سی کھا لیتا اور پھر گھومنے نکل جاتا تھا۔ اس وقت میں زیادہ گھومتا نہیں تھا بلکہ رومی دروازے کے برج میں بیٹھ کر شہر پر شام اترتے، پھر رات ہوتے دیکھتا۔ رات ہوتے وقت برج سے اتر کر بازاروں کا چکر لگاتا ہوا گھر واپس آ جاتا جہاں اماں کھانا پکاتی ملتیں۔ اس وقت مجھ کو خوب گرم گرم کھانا ملتا۔ میرے آگے وہی گوشت، چاول لگتا تھا اور اماں کے آگے وہی چپاتی اور کوئی سادی ترکاری یا دال، لیکن میں زبردستی ان کو اپنے حصے میں سے کچھ کھلاتا اور زیادہ رات آنے سے پہلے ہی سو جاتا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو خاصی آرام کی زندگی تھی، حالانکہ ہمارے گھر میں آرام کا سامان گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ کھانے پکانے کے پانچ پچکے ہوئے برتن، ایک ٹوٹا ہوا نواڑی پلنگ، ایک ہلتی ہوئی نماز کی چوکی، لوٹا، بالٹی، معمولی بستر، ایک گھڑا، کٹورا اور کھجور کی دو چٹائیاں، یہ ہماری کل بساط تھی۔ میرے پاس پہننے کے کپڑے بھی ڈھنگ کے نہیں تھے۔ صرف دو جوڑے تھے جو گھسنے کے قریب ہو گئے تھے اور اماں روز نیا جوڑا بنوانے کا ارادہ ظاہر کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ میرے کپڑے چیتھڑوں کی شکل اختیار کرنے لگے جنھیں اماں کی کاریگری کسی طرح پہننے کے لائق رکھے ہوئے تھی۔ انھوں نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے بھی کچھ کام کرنا چاہیے۔ میری عمر اٹھائیس برس کی ہو چکی تھی لیکن مجھ کو نہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس تھا نہ اس کا خیال آتا تھا کہ میں خاصا تعلیم یافتہ ہوں۔ اپنے ہم عمر جوانوں کو دیکھ کر بھی میں ان کی اور اپنی حالت کا مقابلہ نہیں کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ وہ میری زندگی کا اچھا زمانہ تھا۔ لیکن ایک دن اس زمانے کا خاتمہ شروع ہو گیا۔

رات ہو گئی تھی اور میں رومی دروازے سے اتر کر گول دروازے سے ہوتا ہوا چوک میں سے گزر رہا تھا۔ بیچ چوک میں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ بازار میں سناٹا ہے اور دکانیں سب کی سب بند ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید آج بازار بند رہنے کا دن ہے اور دل ہی دل میں ہفتے کے دنوں کا حساب لگا رہا تھا جو مہینے کی تاریخوں کی طرح مجھے کبھی یاد نہیں رہتے تھے۔ اتنے میں کہیں دور پر ایک شور سنائی دیا اور میرے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ پھر کسی اور طرف سے بھی شور اٹھا اور اب مجھے پتا چلا کہ پورے چوک میں میرے

سوا ایک بھی آدمی نہیں ہے۔ شور کچھ اور بڑھا اور چوک کی سڑک سے ادھر ادھر پھوٹنے والی گلیوں میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ کسی نے پکار کر کسی سے کچھ کہا اور مجھے مکانوں کے دروازے بند ہونے کے دھڑاکے سنائی دیے، پھر روشنیوں کے ساتھ ایک ہجوم نظر آیا جو اکبری دروازہ کے نیچے سے گزر کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنے داہنے ہاتھ والی چوڑی گلی میں بھی شور سنائی دیا اور میں بے سوچے سمجھے بائیں ہاتھ کی ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ کچھ دور بڑھ کر اس گلی کے پہلو میں ایک اور گلی مڑتی دکھائی دی۔ میں اس گلی میں مڑ گیا، مگر کوئی پچاس قدم آگے بڑھ کر گلی آہستہ آہستہ ایک سمت گھومنا شروع ہوئی، پھر اچانک بند ہو گئی۔ اس اندھی گلی میں زیادہ تر مکانوں کے پچھواڑے تھے۔ صرف سامنے جہاں گلی ختم ہوتی تھی، ایک صدر دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہ دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے کسی نے اسے بند کر لیا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو دروازے کے دوسری طرف کنڈی لگنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ دوسری طرف جو کوئی بھی ہے اسے کنڈی چڑھانے میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ اسی وقت گلی کے دہانے کی طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور میں نے لپک کر صدر دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دوسری جانب سے کمزور سی مزاحمت ہوئی۔ گلی کے دہانے پر آواز کے ساتھ کوئی چیز چمکی اور میں نے دروازے پر پورے بدن کا زور لگایا۔ دروازہ لمحہ بھر کو رک کر کھل گیا اور میں اس کی چوکھٹ پھاند کر اندر چلا گیا۔ تاریک ڈیوڑھی میں مجھے چوڑیوں کی کھنک اور ہلکی سی خوف زدہ چیخ سنائی دی، لیکن میں نے اس پر زیادہ دھیان دیے بغیر جلدی سے دروازہ بند کر کے اس سے اپنی پیٹھ لگا دی۔ ایک ہاتھ کو بڑی دقت سے پیچھے گھما کر میں نے کنڈی ٹٹولی اور چڑھا دی۔ ڈیوڑھی میں اب خاموشی تھی۔

"یہاں کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ میں کچھ دیر وہیں رکا رہا۔ مکان کے اندر خاموشی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے ایک دہلیز اتر کر پردے کی دیوار تھی۔ خود کو دیوار کی آڑ میں رکھ کر میں صحن میں اترا۔ میرا پیر ٹین کی کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیز ہلکی آواز کے ساتھ ایک طرف لڑھک گئی۔ مجھے قریب ہی مرغیوں کی کڑکڑاہٹ سنائی دی اور میں نے احتیاط کے ساتھ دیوار کے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ سب کچھ دھندلا دھندلا تھا۔ سامنے ایک دالان نظر آ رہا تھا جس کے بیچ والے در میں مدھم روشنی کی لالٹین لٹک رہی تھی۔ میں نے پیر سے ٹٹول کر ٹین کی چیز کو ہلکی سی ٹھوکر ماری۔ اس کی آواز کے جواب میں پھر مرغیوں کی کڑکڑاہٹ سنائی دی۔ اب میں ذرا اطمینان کے ساتھ بیچ صحن میں آ گیا۔ ہلکی روشنی میں مکان کا نقشہ میری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آیا لیکن اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ صحن کے تین طرف دالان ہی۔ اوپر کی منزل نہیں ہے اور ڈیوڑھی سے متصل باورچی خانہ، غسل خانہ، مرغی خانہ وغیرہ ہے۔ دالانوں کے پیچھے کوٹھریاں تھیں اور سب باہر سے بند معلوم ہوتی تھیں۔

اب مجھے اس کی فکر ہوئی جو ڈیوڑھی کے اندر سے دروازہ بند کرنا چاہتی تھی۔ میں ڈیوڑھی میں واپس آیا، کچھ دیر تک اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا: "مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں خود ڈرا ہوا ہوں"۔

کچھ جواب نہیں ملا۔ اب میں پھر صحن میں اترا۔ در میں لوہے کی آنکڑے دار چھڑ سے لٹکتی ہوئی لالٹین اتار کر پھر ڈیوڑھی میں آیا۔ لالٹین کی چمنی قریب قریب سیاہ ہو رہی تھی، پھر بھی تاریک ڈیوڑھی کے لیے اس کی روشنی کافی تھی۔ ڈیوڑھی خالی تھی لیکن اس کے ایک کونے سے متصل ایک نیچا سا دروازہ نظر آ رہا تھا جو آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے لالٹین والا ہاتھ دروازے کے اندر کیا، پھر سر اندر ڈال کر ادھر ادھر دیکھا۔ چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں دروازوں کے گلے ہوئے پٹ، پلنگوں کے پائے اور پٹیاں، ایک مسہری کا ڈھانچہ اور اس پر میلی نواڑ کے الجھے ہوئے لچھے اور اسی طرح کا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں لالٹین کو گھما گھما کر کوٹھری کا جائزہ لے رہا تھا کہ نواڑ کے ایک بڑے سے لچھے میں مجھے ہلکی سی جنبش نظر آئی اور میں کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ ایک عورت اس لچھے کے پیچھے چھپنے

کی کوشش کر رہی تھی۔

''باہر آیئے''۔ میں نے کہا۔''مجھ سے ڈریے مت''۔

وہ خاموش رہی۔

''میں جان کے ڈر سے یہاں چلا آیا تھا''، میں نے کہا،''میں خود ڈرا ہوا ہوں لیکن اگر آپ کو مجھ سے ڈر لگ رہا ہے تو جاتا ہوں''۔

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی، اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں وہاں ہوں جہاں مجھ کو نہیں ہونا چاہیے تھے۔ میں نے کہا:

''باہر لوگ چاقو چھریاں لیے گھوم رہے ہیں۔ خیر، دیکھا جائے گا''۔

اس کے بعد میں کوٹھری سے باہر آ گیا۔ صدر دروازے کی کنڈی بہت کسی ہوئی تھی۔ لالٹین زمین پر رکھ کر میں دونوں ہاتھوں سے اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اپنی پشت پر مجھے کچھ حدت سی محسوس ہوئی اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔

زمین پر رکھی ہوئی لالٹین اوپر اٹھائی۔ اسی وقت مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''گلی میں یہی ایک دروازہ تھا''، میں نے کہا۔''لیکن اب جا رہا ہوں''۔

''باہر کیا ہو گیا ہے؟''

''معلوم نہیں۔ شاید کوئی جھگڑا ہوا ہے''۔

وہ دیر تک خاموش رہی اور مجھے پھر احساس ہوا کہ میں وہاں ہوں جہاں مجھ کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے کنڈی کھولنے کی ناکام کوشش کی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ کچھ دیر پہلے میں نے پشت پر ہاتھ گھما کر اسے آسانی سے چڑھا دیا تھا۔ اتنے میں اس نے پوچھا:

''باہر خطرہ تو نہیں ہے؟''

''خطرہ؟'' میں نے کہا۔''کچھ نہیں، سوا اس کے کہ جب باہر نکلوں گا تو ذبح کر دیا جاؤں گا''۔

''تو ابھی نہ جایئے''، اس نے کہا اور لالٹین میرے ہاتھ سے لے لی۔ اسی وقت باہر گلی میں دبا دبا سا شور اور بھاری چیزوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیں۔

''اندر آ جایئے''۔ اس نے کہا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے میں اترا۔ لالٹین اس نے بیچ والے در میں لٹکا دی۔ اب اس کا چہرہ قدرے صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک نگاہ میں وہ مجھ کو برسوں کی بیمار معلوم ہوئی۔ لیکن میں اسے ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ وہ دیر تک مجھ سے منہ پھیرے خاموشی کے ساتھ لالٹین کو دیکھتی رہی۔ پھر اسی طرح منہ پھیرے پھیرے دالان کی طرف اشارہ کر کے بولی:

''بیٹھیے، آپ نے ابھی کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا''۔

مجھے واقعی بہت بھوک لگ رہی تھی لیکن میں نے کہا:

''نہیں بھوک نہیں ہے''۔

''ہم کچھ لاتے ہیں''، اس نے کہا،''آپ بیٹھیے''۔

میں نے اسے ڈیوڑھی کی طرف جاتے دیکھا۔ کچھ دیر تک برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی رہی اور میں دالان میں ایک چھوٹی چوکی پر بیٹھا لالٹین کی کالی چمنی کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک گول سینی اٹھائے ہوئے روشنی کی طرف آ رہی

ہے۔ دالان میں آ کر اس نے سینی چوکی پر رکھ دی اور بولی:

''اس وقت یہی ہے''۔

میں نے سینی کی طرف دیکھا۔ اس میں دو تین برتن تھے لیکن یہ نظر نہیں آتا تھا کہ برتنوں میں کیا ہے۔

''آپ نے خوامخواہ تکلیف کی''، میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی خاص بھوک نہیں تھی''۔

''آپ شروع کیجیے''، وہ بولی۔ ''ہم پانی لا رہے ہیں''۔

میں نے اسے صحن کی طرف مڑتے دیکھا لیکن اسی وقت لالٹین ہلکی آواز کے ساتھ بھڑ کنے لگی، وہ لالٹین کے بالکل نیچے تھی۔ اس نے سر اٹھا کر لالٹین کو دیکھا، پھر مجھ کو، اور اب وہ پہلے کی طرح ڈری ہوئی معلوم ہونے لگی۔

''آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا''، اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی لالٹین آخری بار بھڑکی اور بجھ گئی۔

گھپ اندھیرے میں مجھے چوڑیوں کی کھنک اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پھر دالان میں میری پشت پر کوئی دروازہ کھلا اور دھڑاکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ اب مکان میں سناٹا تھا، البتہ کہیں بہت دور پر شور ہو رہا تھا۔

میں اسی اندھیرے میں اٹھ کر اندازے سے ڈیوڑھی کی طرف چلا۔ پردے کی دیوار کا مجھ کو خیال نہیں رہا تھا اس لیے میں نے پہلی ٹکر اسی سے کھائی۔ سنبھلنے کی کوشش میں ایک بار پھر ٹین کی وہ چیز میری ٹھوکر میں آئی اور کچھ دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ مرغی خانے میں کسی مرغ نے زور سے پر پھڑپھڑا کر بانگ دی اور میں ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ صدر دروازے کی کسی ہوئی کنڈی میں نے ایک جھٹکے میں کھول لی اور باہر نکل آیا۔

چند قدم چل کر مجھے خیال آیا کہ صدر دروازے کا ایسے وقت میں کھلا رہنا ٹھیک نہیں ہے لیکن اسے اندر سے بند کر کے باہر آ جانا میرے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اسے یوں ہی چھوڑ کر میں بند گلی سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

کوئلہ بھئی نہ راکھ

واجدہ تبسم

رات تاریک ہے ۔۔۔۔ میرے نصیب کی طرح ۔۔۔ آسمان پر اکا دکا ستارے ٹمٹما رہے ہیں۔ ان کا میرے آنسوؤں سے کیا مقابلہ؟ میری آنکھوں میں تو ان گنت ستارے جھلملا رہے ہیں، جھلملاتے ہی رہتے ہیں۔ کتنے دن ہوگئے میری میری آنکھوں نے مسکرانا چھوڑ دیا ہے ۔۔؟ ایسا معلوم ہوتا ہے ہنسی سے میری شناسائی ہی نہیں۔

آج صبح سے میرا دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے۔ یوں رہ رہ کر تو میرا دل کبھی نہ دھڑکا تھا ۔۔ مٹی کے اس ننھے منے چراغ میں ایسی کیا بات تھی کہ اس کے ٹوٹتے ہی میرا اپنا دل بھی جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ میں نے کتنے جتن سے، کتنے برسوں سے اس چراغ کو سنبھال سنبھال کر رکھا تھا ۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس چراغ سے میری اپنی زندگی کا گہرا ناطہ ہے، وہ ٹوٹے گا تو میں بھی ٹوٹ جاؤں گی اور آج ۔۔۔؟ آج تو جیسے میرا بھی کچھ ٹوٹ گیا۔ کبھی کچھ لٹ گیا ۔۔۔ لیکن میں بھی کیسی پاگل ہوں ۔۔۔ آفتاب ۔۔۔ جو یہ کہہ رہی ہوں کہ آج میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میرا تو اسی دن سب کچھ لٹ گیا تھا جس دن تم مجھے چھوڑ گئے تھے ۔۔۔ امیدوں، آرزوؤں، اور بھروسوں کے سارے چراغ تو اسی دن بجھ گئے تھے، یہ تو میں ہی تھی جو خزاں ہو کر بھی بہار بہار کرتی رہی ۔۔۔ کتنی پاگل ،کیسی نادان (محبت کرنے والے سچ مچ پاگل ہی تو ہوتے ہیں!) میں تم سے شکایت نہیں کر رہی ہوں آفتاب ۔۔۔ شکایت اور گلے تو اپنوں سے کیے جاتے ہیں اور تم نے یہ موقع ہی کب دیا کہ تمہیں اپنا کہوں یا سمجھوں ۔۔۔ سوائے چند لمحوں کے وہ لمحے جو میری زندگی کا حاصل بن گئے ہیں! کاش میں نے یوں ٹوٹ کر کسی کو چاہا نہ ہوتا۔ لیکن کیا محبت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے آفتاب ۔۔۔؟ اب سوچتی ہوں تو یہ سراسر پاگل پن ہی نظر آتا ہے۔ میں نے دل بھی کس سے لگانے کی کوشش کی ۔۔۔؟ تم سے! تم جو سچ مچ آفتاب ہی کی طرح بلند اور دور تھے۔ لیکن آفتاب میں سچ کہتی ہوں تم نے مجھے یوں حوصلہ نہ دلایا ہوتا تو شاید میں کبھی تمہاری طرف دیکھ بھی نہ پاتی۔ میں نے تو تمہیں سے روشنی حاصل کی تھی (اور تمہیں نے مجھے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ۔۔۔ کیسا دکھ ہے پیا!)۔

کتنے سارے سال گذر گئے ہیں کہ میں نے کبھی تمہارے بارے میں سوچا تک نہیں ۔۔۔ اور جو دیکھو تو زندگی میں تمہارے سوا اور دوسری کوئی بات ہی نہیں ۔۔۔ جیسے اپنے آپ سے، خود کو بچاتی چھپاتی پھرتی ہوں۔ آئینے میں خود کو دیکھتی تک نہیں کہ اپنی صورت دیکھوں گی تو تم یاد آ جاؤ گے۔ اس صورت کو تم نے کتنا پیار کیا تھا۔ کتنا پیار دیا تھا۔ کتنا غرور بخشا تھا۔ ان دنوں آئینے کے سامنے جاتی تو گالوں پر گلال سا بکھر جاتا تھا۔ اپنا آپا سنبھلتا نہیں تھا۔ آنکھوں کی جوت دیوالی کے چراغوں کی طرح جگمگاتی تھی۔ مجھے میرا ماتھا چاند معلوم ہوتا تھا اور ہونٹوں پر ایسی کلیوں کا گمان ہوتا تھا جو اب کھلیں کہ اب کھلیں۔ ان دنوں کوئی مجھ سے میرا نام پوچھتا تو مجھے جھجک سی آتی تھی۔ میں کیسے کہوں میرا نام شمع ہے۔ شمع تو جلتی رہتی ہے، اور میں تو مسکراہٹوں سے عبارت ہوں۔ بھرپور بہاروں اور دلکش ماحول سے میرا وجود مہکا مہکا ہوا ہے۔ لیکن میں یہ بھولتی تھی کہ شمع کا کام بہرحال جلنا ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں آفتاب کہ اگر میرا نام شمع نہ ہوتا تو کیا واقعی میری زندگی یوں نہ ہوتی؟ لیکن تمہارا نام بھی تو آفتاب ہے۔ سورج بھی تو سدا جلتا ہی رہتا ہے۔ پھر تمہارے حصے میں دنیا زمانے کی خوشیاں کیسے ہوئیں اور میں کیوں غموں سے سجائی گئی ۔۔۔؟ شاید یہ میرے اپنے سوچنے کا غلط انداز ہی ہو۔ ہم عورتیں وہمی ہوا کرتی ہیں نا؟ ہاں یہ میرا وہم ہی تو تھا کہ میں ایک معمولی سے مٹی کے چراغ کو یوں دل سمجھ کر سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی، اور آج اسکے ٹوٹ جانے سے یوں اداس ہوں جیسے ساری خوشیوں ہی سے میرا ناطہ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید

یہ بات ہوآ فتاب کہ اس دن تم نے ہنسی ہی ہنسی میں بہت گہری بات کہہ دی تھی۔

''شمع اسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بجھا سمجھو اپنی محبت بھی بجھ گئی''۔

وہ دیوالی کی رات تھی۔۔۔ تمہیں تو یاد بھی نہ ہوگا۔۔۔ (اور میری تو زندگی ہی محض یاد ہے) گھر کے بچے پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیئے کہیں سے لے آئے تھے اور چاندنی کی منڈیروں پر قطار در قطار بہت سارے دیئے جلا کر رکھ دیئے تھے۔ ہم دونوں چاندنی پر آئے تو سب سے کونے والا دیا بجھا پڑا تھا۔

''ہائے غریب کا کوئی پرسان حال نہیں!'' میں نے لرز کر کہا اور اسے ساتھ والے دیئے سے جلانے کو جھکی ہی تھی کہ تم نے ہنس کر کہا۔

''آج اسے دیئے سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں''۔ میں نے بوکھلا کر تمہیں دیکھا تو تم اسی جگمگاتی ہنسی کے ساتھ بولے تھے۔۔۔ ''ہاں جسے تم چھولو!''

میں نے تمہاری بات کاٹ کر پوچھا۔۔۔ ''اور جسے تم چھولو۔۔۔؟''

دیا میرے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔۔۔ جھل مل۔۔۔ جھل مل۔۔۔ جھل مل۔۔۔ مجھے نہیں معلوم لیکن یقیناً میرے چہرے پر اسی دیئے کی لو جاگی ہوگی، یقیناً اس کے عکس نے میرے چہرے کو وہ جلا بخشی ہوگی کہ تم میری تمنا کر سکو، اسی لیے تم نے کہا تھا۔

''شمع۔۔۔ میں ساری زندگی تمہاری تمنا کرتا رہوں گا!''

میرا ہاتھ کانپا۔ یقیناً دیا گر جاتا اگر تم میرا ہاتھ نہ تھام لیتے۔ (وہ ہاتھ جو پھر تم نے کبھی نہ تھاما) اور تم نے جذبات سے بھری اور بھرائی آواز سے کہا۔

''شمع! اس مٹی کے چراغ کو میں اپنی محبت کا امین بنالوں۔۔۔؟؟''

میں وہموں کی ماری۔۔۔ عورت پن کی ساری کمزوریوں سمیت تمہاری طرف تکنے لگی۔۔۔ نہ جانے اب تم کیا کہو۔۔۔ اور تم نے دھیرے سے کہا تھا۔

''شمع اسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بجھا سمجھو اپنی محبت بھی بجھ گئی''۔ میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ محبت کا یہ کون سا انداز تھا کہ ایک چراغ کو تمام تر ذمہ داریاں سونپ دیں! لیکن میں نے کہا نا میں وہموں کی ماری تھی۔ تمہارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے لیے جیسے آسمانی صحیفہ ہو گئے مجھے سہما ہوا دیکھ کر تم ذرا مسکرائے تھے اور کہا تھا۔

''اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو شمع۔۔۔؟''

میں اک دم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔۔۔ ''تم نے مجھے کیسی زنجیر میں جکڑ دیا ہے آفتاب۔۔۔ چراغ تو چراغ ہی ہوتا ہے کبھی ہوا کے ایک جھونکے سے بھی بجھ سکتا ہے، اب تو ہر لمحہ دل رہ رہ کر دھڑ کا کرے گا کہ اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے۔۔۔ جو یہ بجھے۔۔۔ اور جو کبھی ہوا کا کوئی سرکش اور حاسد جھونکا، میرے آنچل سے نظر بچا کر اسے بجھا ہی دے تو میں کہاں جی سکوں گی؟''

تم کتنی اعتماد سے بھری ہنسی ہنسے تھے۔۔۔ ''تو تم اتنی سیریس ہو گئیں شمع۔۔۔! کیا مٹی کا یہ حقیر سا دیا میری محبت پر بھاری ہو سکتا ہے؟''

''بات مٹی اور کانچ کی نہیں آفتاب۔۔۔ بات تو اعتقاد اور رواجوں کی ہوتی ہے۔ کانچ کی چوڑیوں میں کیا دھرا ہوتا ہے؟ لیکن کسی کے نام کے ساتھ جب ایک نئی بیاہتا کو پہنائی جاتی ہیں تو اس کی زندگی کا مول ہو جاتی ہیں۔۔۔ اور پھر وہ ساری زندگی اس

کے اپنے انگ کا ایک حصہ ہو کر رہتی ہیں۔ تم نے تو یونہی ایک بات کہہ دی۔ لیکن میں تو مٹ کر رہ گئی آفتاب!''

پھر وہ رات کبھی نہ آئی جب ہم ساتھ ساتھ چاندنی پر جاتے۔ میں چراغ جلاتی۔ تم میری تمنا کرتے اور میں تمہاری وفاؤں پر بھروسہ کرتی۔۔۔ بس زندگی جیسے سمٹ کر آنچل کی اوٹ میں آگئی۔ میں نے اپنے کمرے کے ایک محفوظ طاقچے میں وہ چراغ اٹھا کر رکھ دیا۔ اور زندگی اس جتن میں گذرنے لگی کہ محبت کا وہ شعلہ کبھی بجھنے نہ پائے۔ میرا بھولا پن دیکھو، مارے وہم کے میں ایک ساتھ دو دو بتیاں روئی کی بنا کر اس میں ڈال دیتی کہ ایسا نہ ہو کہ ہوا کمزور پا کر اسے بجھا ہی دے۔۔۔ ہر روز میں اس میں تیل ڈالتی۔ میں تو اپنا خون بھی اس میں ڈال دیتی اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ اس طرح محبت کے چراغ دل کے خون سے امر ہو جاتے ہیں۔

سب میں اس چراغ کا چرچا ہو گیا۔۔۔ میری سہیلیاں مجھ پر ہنستیں۔۔۔ ''ارے دیکھو یہ زرتشتوں کی طرح دن رات چراغ جلائے رہتی ہے!'' دو ایک نے ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن جس طرح منہ بند کلی کی خوشبو اسی کے تن میں چھپی ہوتی ہے، ایسے ہی اپنی محبت کا راز میں نے بھی اپنے ہی تن من میں رکھا۔۔ زمانہ بہت حاسد ہے، کون جانے کس کا دل کب پلٹ جائے، اور بعض ہوائیں اتنی سرکش اور منہ زور ہوتی ہیں۔۔۔ اور میری محبت کا چراغ تو اتنا ننھا سا ہے۔۔۔

منزل سامنے ہو تو راستے کی کٹھنائیاں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ میری منزل تو میرے سامنے تھی، مجھے کس بات کا ڈر تھا۔۔۔ کانٹوں سے میں کبھی نہ ڈری۔۔۔ پاؤں کے چھالوں نے مجھے ہراساں نہیں کیا، قدم قدم۔۔۔ لمحہ لمحہ۔۔۔ بڑھتے ہوئے حوصلوں کو زمانے کے ظلم بھی نہ پیس سکے۔۔۔ حالانکہ میری زندگی ہی کیا تھی۔۔۔ غریب سی لڑکی جس نے ماں کا سکھ دیکھا نہ باپ کی محبت۔۔۔ خالہ کے رحم و کرم کے سہارے جس نے جینا سیکھا۔ دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑا جہاں زندگی کی معراج تھی۔ اور وقت گزارنے کے لیے جہاں ڈھیروں کام تھے۔۔۔ گھر بھر کے میلے کپڑوں کے انبار۔ باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کے ڈھیر۔ جھاڑنے کے لیے بڑے بڑے آنگن۔ صفائی کے لیے چھوٹے بڑے کئی کمرے۔ اور خدمت بجالانے کے لیے چھوٹے بڑے گھر بھر کر کئی آیا۔۔۔ لیکن پیار کی اک نگاہ۔۔۔ محبت کا ایک ان کہا بول۔۔۔ مٹی کا ایک چھوٹا سا دیا۔۔۔ یہ سب تیز جھلستی ہوئی دھوپ کو کیسے خنک چھاؤں سے بدل دیتے ہیں۔۔۔؟؟

اس دن دوپہر میں سب کو کھلا پلا کر، ہر کام سے نبٹ کر جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو پتہ نہیں کیا ہوا گھر بھر کے بچے آ کر میرے سر ہو گئے۔

''بجیا۔۔۔ پلیز کہانی سنائیے!''

''ہائے اللہ! کہانی۔۔۔؟ اور وہ بھی دن میں۔۔۔ نہیں نہیں، ایسے تو مسافر راہ بھٹک جاتے ہیں۔۔۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں باجی۔۔۔ آج بڑے چچا آ گئے ہیں، وہ ہمیں سر شام ہی بستروں میں گھسا دیتے ہیں کہ بچوں کو جلدی سو جانا چاہیے، تو آج ہمیں آپ دن ہی میں کوئی کہانی سنا دیجیے''۔

سب کاموں سے نبٹ کر، یہ بھی تو میرا آخری کام ہوتا تھا کہ رات میں سب بچوں کو کہانیاں کہہ کر سلاؤں۔۔۔ دن میں کہانیاں مجھ سے کبھی نہ کہی گئیں۔ میں نے سنا تھا دن میں کہانیاں کہو تو مسافر راستے بھول جاتے ہیں۔ راہ بھٹک جاتے ہیں۔۔۔ میں وہموں کی ماری۔ میرا دل یہ سوچ کر ٹوٹا کرتا، اللہ جانے کون کس ارادے سے کس راہ جانا چاہے اور راستہ بھول بیٹھے۔۔۔ میں کیوں کسی کی منزل کھوٹی کروں؟ لیکن اس دوپہر میں بچوں نے مجھے دم نہ لینے دیا۔ میری ایک نہ چلنے دی۔

''دیکھئے آپی اگر آپ نے کہانی نہ سنائی تو ہم آفتاب بھیا کو کہہ دیں گے''۔ تم گھر کے سب سے بڑے تھے، سب تمہارا نام لے کر ایک دوسرے کو ڈرایا کرتے تھے۔

"آفتاب بھیا!" میں تمہارا نام دل ہی دل میں گنگنا کر بولی۔ میرے خدا یہ کس کا نام میری زبان پر ہے۔ اور میں جیسے سب کچھ بھول کر کہانی سنانے لگی۔ کسی شہزادے شہزادی کی نہیں، اسی رہتی بستی دنیا کی۔۔۔ میری تمہاری۔۔۔ لیکن آفتاب! میں نے دیکھ لیا کہنے والے غلط نہیں کہا کرتے، دن میں کہانیاں سنانے سے مسافر بیچ راستہ بھول جاتے ہیں۔ اپنی منزل پاتے پاتے بھٹک جاتے ہیں۔ میں نے دن میں کہانی سنانے کی جو غلطی کی۔ اس کا بھگتان آج تک بھگت رہی ہوں۔ سوچتی ہوں یہ کہانی میں نے شروع ہی کیوں کی تھی۔۔۔؟

اور پھر یہ ہوا کہ دم بدم اس چراغ کی لو نیچی ہوتی گئی۔ میں پھر بھی اسے جلانے اور جلانے کی اپنی سی کوشش کیے گئی لیکن دل کا لہو بھی کام نہ آیا۔۔۔!

آج دل کو تھوڑی بہت تسکین بس بیتے دنوں کو یاد کرنے سے مل رہی ہے۔ شاید آج کے بعد میں کبھی ان دنوں کو یاد بھی نہ کرسوں! یہ کیسی عجیب بات تھی آفتاب کہ زندگی میں تم کبھی کھلے عام اپنی محبت کا اعتراف کیا نہ کونے کھدروں میں سرگوشیاں ہی کیں۔۔۔ نگاہیں! صرف تمہاری وہ بولتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، عہد و پیماں کرتی ہوئی، ساری دشواریوں کو پیس ڈالنے کے بلند بانگ دعوے کرتی ہوئی نگاہیں ہی تو تھیں جنہوں نے مجھے تمہاری محبت کا یقین دلایا۔۔۔ مجھے آج بھی تمہارے ان جذبات پر ناز ہے کہ تم نے کبھی سطحی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔۔۔ سمندر کی وسیع ذات کی طرح تہہ ہی تہہ میں محبت کی کارفرمائیاں لہریں لیتی تھیں۔ اوپری سطح خاموش پرسکون! کوئی کیسے سمجھ سکتا تھا کہ تم ایک غریب سی بدنصیب سی لڑکی سے اتنا بھرپور پیار کرتے ہو۔ یہ تو صرف میں تھی جو تمہاری محبت کی رازدار تھی۔ چند لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں، کیسے گہرا پیار چھلک پڑتا تھا کبھی کبھی تمہاری چھوٹی چھوٹی باتوں سے!

اندھیری رات میں ایک بار میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، تم اتر رہے تھے۔ میں چاپ سن کر ہی سمجھ گئی یہ تم ہو۔ میں نے سوچا اللہ نہ کرے تم کہیں گر نہ جاؤ۔ اسی لیے میں نے ذرا جھجک کر کہا تھا۔

"سنبھل کر اتریئے۔ اندھیرا بہت گہرا ہے"۔

تم نے جگمگاتی آواز میں جواب دیا تھا۔۔۔ "تمہارے چہرے کا چاند جو ساتھ ہے!"

ایک تیز دھوپ والی دوپہری میں تم بارسے آئے تو میرا دل رو اٹھا۔

"ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ کیسی سخت دھوپ سے آپ ہو کر آئے ہیں!"

"دھوپ؟" تم نے مسکرا کر کہا تھا۔۔۔ "میں جدھر جاتا ہوں تمہاری ان لانبی لانبی زلفوں کا سایہ مجھ پر چلتا جاتا ہے!"

ایک چاندنی رات۔۔۔ چاند کے بھرپور حسن کے مقابل تم نے میرا حقیر وجود کھڑا کیا تھا اور اپنی جواں سانسوں اور مضبوط ہاتھوں کے ساتھ میرے قریب تر ہو کر مجھے چھو کر کہا تھا۔

"چاند میں اتنا نور کہاں ہے۔۔۔؟؟"

میرے وہموں کے ساتھ ساتھ زندگی میں قدم قدم پر کیسے بھرپور بھروسے تھے۔۔۔ آج بھی تو چہرے کا وہی چاند ہے۔ زلفوں کی وہی عطر بیز اور ٹھنڈی گھٹائیں ہیں۔ آنکھوں کے، انتظار میں بسے ہوئے ڈوبے ہوئے دیئے ہیں، لیکن ایک تم نہیں ہو اور تم کیا جانو صرف تمہارے نہ ہونے سے اس زندگی کا کیا رنگ ہے۔۔۔؟؟؟

میں سوچتی ہوں آفتاب! لکڑیاں کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں کہ دھواں دھواں ہو کر، جل جل کر راکھ ہو سکتی ہیں، ہو جاتی ہیں۔ میں پاپن تو دھواں بنی نہ راکھ جلی۔۔۔ لمحے لمحے کی سنگ دل واردات میرے دل سے پوچھو اور یہ دیکھو میں بھی کیسی سخت جان تھی جو زندہ رہی، زندہ ہوں!

وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی۔۔۔تم بے حد شاد ماں، بشاش اور بہت گہرے عزم سے میرے پاس آئے اور بولے۔
''شمع۔۔۔زندگی کتنی خوبصورت ہے۔۔۔لیکن اس سے بھی زیادہ ایک اور خوبصورت چیز ہے۔۔۔پیسہ!''
میں سر سے پاؤں تک لرز گئی اور بری طرح چونک کر تمہیں دیکھنے لگی۔تم اک دم شفاف سی، بے داغ ہنسی ہنس پڑے۔
''گھبرا گئیں۔۔۔؟'' میں صرف یہ کہہ رہا تھا شمع، اب زندگی اس مقام پر آ گئی ہے کہ میں چاہوں تو خوشی سے تمہیں اپنا لوں۔ مجھے بھلا کون روکے گا۔۔۔؟ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم نے جو زندگی میں اب تک صرف دکھ اٹھائے ہیں، غریبی ہی دیکھی ہے، تو اب اس راستے کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اپنائیں۔ جہاں خوشی ہو، محبت ہو اور زندگی کا ہر عیش بھی ہو۔
میں بے حد سہمے ہوئے دل کے ساتھ سنتی رہی۔۔۔شمع پہلے میں ذرا اپنی لائف بنا لوں۔۔۔میرا مطلب ہے کچھ پیسہ جمع کر لو، کار خرید لوں، پھر ٹھاٹ سے تمہیں بیاہ کر لے جاؤں۔ تمہیں بھی تو زندگی کا کچھ حسن ملے''۔
تمہاری محبت کے بدلے میں میں نے اپنی زبان شاید رہن رکھ دی تھی، کبھی تمہارے سامنے ہونٹ نہ ہلا پائی۔ لیکن جیسے میرا رواں رواں چیخ اٹھا۔۔۔''مجھے پیسہ نہیں چاہیے آفتاب، مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہاری محبت چاہیے۔ مجھے اپنے پیارے ہاتھوں کے ہار پہنا دو، اپنے گرم گرم ہونٹوں کا ٹیکہ میرے ماتھے پر سجا دو۔ میرے سہاگ اور محبت کی بس اتنی ہی مانگ ہے۔۔۔'' لیکن میں نے کہا نا کہ میں نے تمہارے آگے صرف اپنی آنکھیں جھکانا ہی سیکھا تھا۔
اور تم چلے گئے۔
یوں کہنے اور سننے میں کتنی معمولی سی بات لگتی ہے کہ ایک شخص کو جانا تھا اور وہ چلا گیا۔۔۔لیکن یہ میں نے انہیں دنوں جانا کہ جگمگاتا چاند تاریک کیونکر ہو جاتا ہے۔ پھول اپنا حسن کیسے کھو دیتے ہیں۔ بہاریں خزاؤں سے کیسے بدل جاتی ہیں۔۔۔اور دھیرے دھیرے، ہنسنے مسکرانے والے ہونٹ، اپنی مسکراہٹیں آنسوؤں کو کیسے تج دیتے ہیں۔۔۔اور تم سے یہ بتا دوں آفتاب کہ تم نے میری آنکھوں کے لیے جو ایک بہت پیاری اور انوکھی سی تشبیہ دی تھی کہ میری آنکھیں دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچے ہیرے، جگر مگر کرتے ہیرے کوٹ کر اللہ میاں نے یہ آنکھیں بنائی ہیں، تو وہی آنکھیں اپنی جگمگاہٹ کھو کر جیسے دو بجھے ہوئے چراغ بن کر رہ گئیں۔
جہاں حوصلہ ہو وہاں ارادے بھی ساتھ دیتے ہیں۔تمہارے بے پناہ حوصلوں نے تمہیں کامیابیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج یہاں، کل وہاں۔تمہارا بزنس پھیلتا گیا۔۔۔تم امیر سے امیر تر ہوتے گئے۔۔۔خوبصورت کوٹھی، فون، فرج، نوکر چاکر اور گاڑیاں تو یوں بدلی جانے لگیں جیسے کوئی کپڑے بدلتا ہے۔۔۔۔میں بھی سب کے ساتھ نئی کوٹھی میں اٹھ آئی تھی۔ایسی زندگی جس کا تصور انسان خوابوں میں ہی کر سکتا ہے۔اب سبھی کو اور میرا مقدر تھی۔۔۔(لیکن تم کہاں تھے۔۔۔؟) دولت آئی تو زندگیوں میں مغربیت دخیل ہونے لگی۔۔۔لیکن میں جس مقام پر تھی وہیں رہی۔۔۔سورج مکھی کے معصوم اور نادان پھول کی طرح جو سدا سورج کی طرف تکتا رہتا ہے۔
ایک رات سب لوگ کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔فون کی گھنٹی اچانک بجنے لگی۔ میں نے ہی فون اٹھایا۔۔۔تم تھے۔ دہلی سے بات کر رہے تھے۔۔۔اتنی دور سے!! میرا دل لرز اٹھا۔
''ہیلو۔۔۔میں آفتاب بول رہا ہوں، ادھر کون ہے۔۔۔۔؟''
میں ڈوبتے دل سے بولی۔۔۔۔''میں۔۔۔میں شمع ہوں۔۔۔''
''کیا کر رہی ہو۔۔۔؟''

''جل رہی ہوں۔۔۔''

ادھر سے ایک بھرپور ہنسی۔''افوہ! تم تو ڈائیلاگ بول رہی ہو!''

نہ جانے ایک ساتھ کتنے سارے آنسو میری آنکھوں میں امڈ پڑے۔

میں نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔۔۔ بنتے بگڑتے جملوں کو میرے آنسوؤں نے بھگو بھگو دیا۔۔۔''آفتاب! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم آتے ہو، پھر چلے جاتے ہو، پھر آتے ہو پھر چلے جاتے ہو۔۔۔ مجھ سے بات تک کرنے کا وقت تمہارے پاس نہیں ہوتا۔ یہ چہرہ آج بھی چاند ہے۔ آنکھیں آج بھی ہیروں کی طرح دمکتی ہیں۔ زلفوں میں آج بھی ساون کی گھٹائیں جھومتی ہیں۔ لیکن تم کہاں ہو آفتاب۔۔۔''

ادھر سے فون کٹ گیا۔

تیسرے دن پلین سے تم آئے۔ شوفر گاڑی کے کر ایروڈرم گیا تھا۔ تم نوابوں کی سی شان اور تمکنت کے ساتھ اترے۔ کچن کی ایک کھڑکی کاریڈور میں کھلتی تھی۔ تم ادھر ادھر دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہے ہو۔ شاید تمہاری آنکھوں کو میری تلاش ہو۔ میں نے دکھے دل سے سوچا۔ لیکن تم دپ دپ کرتے اوپر چلے گئے۔ شام کو میں پودوں میں پانی دے رہی تھی کہ تم باغ میں نکل آئے۔

''ارے شمع تم۔۔۔ مالی کہاں ہے، یہ تم کیا کرتی رہتی ہو ہمیشہ۔ کام۔۔۔ کام۔۔۔ کام۔۔۔ اتنے سارے نوکر جو ہیں۔۔۔؟

میں نے پہلی بار تمہاری آنکھوں میں بے خوفی سے جھانکا۔۔۔''آفتاب کبھی پھول تو ایسے نہیں ہوتے جو مالی کے ہاتھوں کھل سکیں۔۔۔''

اک دم تم چونکے۔۔۔''تم آج کل بہت ڈائیلاگ بولتی ہو۔۔۔ ایں، اور بھئی اس دن ٹرنک کال پر تم یہ کیا نادانی کرنے لگیں؟ کوئی ایسا رویا کرتا ہے؟ میں نے تو گھبرا کر ریسیور ہی رکھ دیا''۔

میں کچھ نہ بولی۔ پودوں میں پانی ڈالتی رہی۔ لڑکیاں بہت احمق ہوتی ہیں۔ زندگی بھر محبت کے پودوں میں امیدوں کا پانی ڈالتی رہتی ہیں۔۔۔ اور میں بھی تو ایک لڑکی ہی تھی۔۔۔ سب لڑکیوں جیسی۔۔۔ بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی نادان۔

اور مجھے اس دن پر حیرت ہے جب میں اتنی بے باک ہوگئی تھی کہ تمہارے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ یہ تمہارا احسان تھا یا ظلم۔ پتہ نہیں، بہرحال تم نے مجھے نت نئے کپڑوں اور زیوروں سے لاد دیا تھا۔ کبھی سے تمہارا یہ مطالبہ تھا کہ گوندنی کے پیڑ کی طرح زیوروں سے لدی رہیں۔ گھر کے لڑکے کاریں اڑائے پھرتے، لڑکیاں نئے نئے فیشن کے کپڑوں اور زیوروں سے سجی بنی کوٹھی پر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ ہنگامہ مچائے رکھتیں۔۔۔ اور تم جوان دنوں نعوذباللہ سب کے پالن ہار بنے ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے کہ سب لائف کو کس قدر انجوائے کر رہے ہیں۔ اور یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے کہ میں اتنی خوشیوں کے باوجود کس طرح۔۔۔ بے طرح اداس رہتی ہوں۔ پہننے اوڑھنے سے مجھے رغبت نہیں۔ گھومنے پھرنے کا شوق نہیں۔ آنے جانے میں دل نہیں لگتا، محفلوں سے بھاگتی ہوں۔۔۔ میں کیا کرتی آفتاب۔۔۔ میرا تو دل ہی جیسے مردہ ہوگیا تھا۔۔۔ تم سچ مچ ہی آفتاب بن کر رہ گئے تھے جسے ہر لمحہ دیکھ تو سکتے ہیں، ہاتھ بڑھا کر چھو نہیں سکتے۔ اپنا نہیں سکتے۔

اس دن تم کلکتہ سے آئے ہوئے تھے۔ تم نے اپنے دوستوں کو ایک پارٹی دے ڈالی۔ انتظام تو مجھے ہی کرنا تھا سو میں نے کر دیا لیکن ان ہنگاموں سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔۔۔؟ تم نے مجھے جتا دیا تھا دیکھو''شمع! خدا کے لیے آج ذرا اچھے کپڑے پہننا

اور خوبصورت۔۔۔خیر وہ تو تم نظر آؤ گی ہی!''

میں نے بے دلی سے وہ جوڑا پہن لیا، جس سے میری دیرینہ یادیں وابستہ تھیں۔ جن دنوں تم غریب تھے لیکن میرے تھے۔ اندھیری راتوں میں جن دنوں تم میرے چہرے کی روشنی میں اپنے راستوں کے لیے چراغ فراہم کرلیا کرتے تھے۔۔۔سیاہ شلوار، سیاہ قمیص اور سیاہ دوپٹہ، جن پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ تم کسی کام سے اندر آئے تو، تھے تو بڑی لیک جھپک میں۔۔۔لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔

''شمع۔۔۔یہ دوپٹہ۔۔۔''

میں نے تمہاری بات کاٹ دی۔۔۔''اسے میرا مقدر سمجھ لو۔۔۔سیاہ تاریک۔۔۔اور ان ستاروں کو آنسو۔۔۔شاید یہ نشانی تمہیں کچھ سوچنے پر اکسائے۔

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو شمع؟''

میں پھٹ پڑی۔۔۔''آفتاب مجھے مت آزماؤ۔۔۔خدا کے لیے مجھے مت آزماؤ۔۔۔میں گھٹ رہی ہوں، مر رہی ہوں، تمہیں کچھ احساس نہیں ہوتا۔۔۔آنسوؤں نے میرا گلا رندھا دیا۔۔۔آج میں تم سے تمہیں کو مانگتی ہوں۔ بولو آفتاب! جب اللہ نے تمہیں دنیا جہان کی نعمتوں سے نواز دیا ہے تو تم مجھے کیوں ٹال رہے ہو۔۔۔''

''پاگل نہ بنو شمع۔۔۔میں تمہیں ٹال نہیں رہا ہوں بھائی، قصہ دراصل یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے اتنے پروگرام ہیں کہ میں خود گڑبڑا گیا ہوں۔ دیکھو پندرہ دن بعد مجھے لندن جانا ہے، وہاں سے لوٹوں تو شاید کئی دنوں کے لیے دہلی جانا پڑ جائے۔ اگلے چھ مہینوں میں مجھے پیرس۔۔۔ہانگ کانگ۔۔۔''

میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میں چیخ اٹھی۔

''آفتاب! سونے کے مت بن جاؤ۔ خدا کے لیے گوشت پوست کے انسان بنے رہو کہ میں تمہیں پا بھی سکوں، چھو بھی سکوں اور چھوؤں تو یہ احساس بھی کر سکوں کہ میں نے محبت اور پیار سے بھرپور ایک گداز دل کو، جسم کو چھوا ہے، یہ احساس نہ ہو کہ میں نے ایک سونے کے مجسمے کو محبت دی ہے''۔

تم ہکا بکا رہ گئے۔ شاید تمہیں توقع نہ تھی کہ میں، جو سدا ایک گونگی کے کردار میں تمہارے ڈرامے میں پارٹ کرتی رہی، یوں بول بھی سکوں گی۔ میں اچانک دیوانوں کی طرح اٹھی اور اونچے کارنس پر سے وہ ننھا منا چراغ اٹھا لائی جو میری امیدوں کی طرف رہ رہ کر ٹمٹمارہا تھا۔

''اسے پھونک مار کر بجھا دو آفتاب۔۔۔اب میں زندگی سے ہار گئی ہوں۔ مجھ میں وہ حوصلہ نہیں کہ میں اسے دل کا خون دے کر بھی زندہ رکھ سکوں۔۔۔''

تم نے چراغ کو بے معنی نگاہوں سے دیکھا۔۔۔اسے بجھایا نہیں۔ (لیکن جلایا بھی نہیں)

اس رات کی پارٹی کی ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے۔ تم نے اپنے دوستوں کا ہم سب بہنوں سے تعارف کرایا تھا اور تمہاری ہی ٹکر کے ایک بزنس مین دوست اسلم نے، مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت بے حد شدید حیرت اور سچائی کے ساتھ کہا تھا۔

''یار آفتاب۔۔۔کیا بے وقوفی تھی۔۔۔آج کے دن تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ حوریں مرنے کے بعد ہی ملیں گی!''

پھر چند دنوں بعد خالہ امی نے میرے سامنے ایک عجیب و غریب 'بات' پیش کی۔

''بیٹی۔۔۔تم جانتی ہو آفتاب کتنا روشن خیال لڑکا ہے، اس نے اپنی بہنوں کو بھی بے جا پابندیوں سے دور رکھا ہے اور

تمہیں بھی وہ اپنی بہنوں کی طرح ہر عیش آرام مہیا کرنا چاہتا ہے۔ اسلم آفتاب کا بہت گہرا بہت پیارا دوست ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے تمہیں بے حد پسند کیا ہے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کچھ ٹھہر کر بولیں۔ ہم سب اور خاص طور سے آفتاب اس رشتے سے بے حد خوش ہے"۔

اس کے بعد تو سننے کے لیے کچھ بھی نہ رہ گیا۔ میں اس اصول کی قائل ہوں کہ محبت ایسا جذبہ ہے جو زبردستی کسی سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ جب تم ہی نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں تمہارے سامنے اس گھر میں رہ کر ہی کیا کر لیتی۔۔۔ میں تو بہر حال ایک بوجھ تھی جو کسی نہ کسی کے سر لاد دیا جاتا۔ میں نے ہاں، نا کچھ بھی نہ کہا۔ بس اپنا سر جھکا لیا۔ اب میں سر اٹھا کر جی بھی کیسے سکتی تھی۔۔۔؟ لیکن یہ کیسا دکھ ہے آفتاب جو جی سے جاتا ہی نہیں میں کہانیاں پڑھتی تھی جن میں ہمیشہ دو محبت کرنے والوں کے بیچ، زمانہ، سماج یا کوئی رقیب آڑے آ جاتا تھا۔ محبت اسی لیے سدا مثلث سے تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ لیکن میرے نصیب میں یہ کیسا غم لکھا تھا کہ نہ تو کوئی سماج میرے لیے دیوار بنا، نہ زمانے نے اڑچن ڈالی۔ نہ کوئی رقیب ہی پیدا ہوا۔ تمہیں میرے سب کچھ تھے اور تمہی نے مجھے بھری بہار میں لوٹ لیا۔۔۔ تمہی نے سہاگ کی بندیا میرے ماتھے پر سجائی اور تمہی نے مٹا دی۔۔۔ جیون مرن کا سارا کھیل تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچا۔

جب میں بیاہ کر نئے گھر آئی تو وہ دیا اپنے ساتھ ہی اٹھا لائی۔ اسلم نے دیکھا، میں دیئے کی ایسی دیوانی ہوں تو اس نے میرے گھر کو سدا دیوالی کا روپ دے دیا۔۔۔ ننھے منے رنگین قمقمے یہاں سے وہاں تک سارے لان میں، درختوں میں، حد یہ کہ ننھے منے پودوں تک میں لگوا دیئے۔

"تمہیں اجالوں سے پیار ہے اور مجھے تم سے۔۔۔" اور اس نے محبت سے سرشار ہو کر بے حد عام شوہروں والی، ہزار بار کی کہی بات دہرائی۔

"جان یہ تو حقیر قمقمے ہیں، تم کہو تو میں آسمان کے سارے جگمگاتے ستارے توڑ کر تمہارے آنچل میں ڈال دوں۔۔۔!"

اسلم بے چارے کو یہ بات نہیں معلوم آفتاب کہ جن ستاروں کے توڑ لانے کا جتن وہ کرتا رہتا ہے، وہ آج سے سالوں پہلے تم نے چن چن کر میری آنکھوں میں بسا دیئے ہیں۔

مجھے اسلم پر کیسا کیسا ترس آیا ہے۔۔۔ اس بے چارے نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے محبت سے محروم زندگی ملے۔۔۔ اور پھر اتنا ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر۔۔۔ اسی لیے آج میں نے اپنے ہاتھوں سے اس مٹی کے دیئے کو زمین پر پٹخ دیا۔ میں ان یادوں کے لیے کیوں اپنا جیون برباد کروں جو مجھے خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں دے سکتیں۔ لیکن صبح سے اب تک۔۔۔ میں ایک لمحے کو بھی سکون نہیں پا سکی ہوں۔ رہ رہ کے دل میں کانٹے سے ٹوٹ رہے ہیں اور آنسو تو یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں جیسے ساری دنیا بہا لے جائیں گے۔ دل کی دکھن کا یہ عالم ہے جیسے چھالے تپک رہے ہوں۔ بے پناہ خوشیوں، محبت کرنے والے ساتھی اور رنگین بہاروں میں گھری ہونے کے باوجود جیسے میری روح ترس ترس کر کراہتی ہے۔۔۔ میں تنہا ہوں۔۔۔ میں اکیلی ہوں۔۔۔ میں اکیلی ہوں۔۔۔

☆☆☆

اب میں کیا کروں

وقار بن الٰہی

گرمی حسب معمول بڑی کڑاکے کی پڑ رہی تھی، پڑنی بھی چاہیے تھی کہ جون کی لاج بھی تو رکھنی تھی۔ شاید اسی موسم کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ان دنوں چیل بھی انڈہ چھوڑ دیتی ہے۔ چیل ضرور انڈہ چھوڑ دیتی ہوگی لیکن انسان ایسا کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا، شاید اس لیے کہ ایک تو وہ انڈے نہیں دیتا، اس نے گرمی کا توڑ بھی ڈھونڈھ لیا ہے۔ اتنی بڑی عمارت ساری کی ساری ہی ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ بڑے ہال، کمرے، راہداریاں ہر جگہ ہر کونہ ٹھنڈا تھا۔ چند ایک کمرے تو اضافی ایئر کنڈیشنروں کی وجہ سے جیسے برف خانے بنے ہوئے تھے۔ اور ان کمروں میں بیٹھنے والے اور باہر جھلنے والوں کے درمیان بھی اتنی ہی دوری تھی جتنی کہ موسموں میں، عمارت باہر سے سادہ نظر آتی تھی لیکن اندر کروفر اور جاہ و جلال کی تمام تر نمائش موجود تھی۔ فرش پر دبیز قالین، دیواروں پر تازہ روغن، چھتوں کے اندر ایک اور مصنوعی چھت۔۔۔۔ کمروں کے دروازے بھاری بھرکم اور ان پر پالش لش چمکتی ہوئی ناموں کی تختیاں۔ اندر کئی کمرے اور آسائش کے تمام اسباب۔ نیویارک کی وال سٹریٹ پر گھومتے پھرتے یہ راز سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ امریکہ بہادر کو ساری دنیا کی تھانیداری کا شوق کیوں ہے۔ اس ایک سٹریٹ کو بچانے کے لیے تو وہ ساری دنیا کو تباہ کر سکتے ہیں۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک مختصر سا کمرہ یہاں ہر شے مختصر تھی، البتہ ٹیلی فون دو تھے اور ملاقاتیوں کے لی عام اور کھردری کرسیاں تھیں۔ یہ پی اے کے پی اے کا کمرہ تھا۔ اور ملاقاتی سارے کے سارے ہی نچلے طبقے کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے کی فضا یخ تو تھی لیکن اس میں پسینے کی سڑاند بھی شامل تھی۔ ایک کونے میں دو چار اہل کار بیٹھے تھے۔ تھے وہ بھی نچلے درجہ کے، لیکن تھے خدمت گار۔ اس لیے لباس اجلا اور مونچھوں میں ایک چمک تھی۔ دو ایک اخبار پڑھ رہے تھے اور بقیہ ٹیلی فونوں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے دوسرا کمرا تھا جو قدرے بڑا تھا۔ سامان بھی باہر کے کمرے کی نسبت قدرے بڑا تھا۔ کرسیاں نرم اور تعداد میں زیادہ تھیں۔ یہ پی اے کا کمرہ تھا۔ ٹیلی فون البتہ تین تھے۔ یہ کمرہ بھی ملاقاتیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ چند ایک پی اے صاحب کے دوست تھے، بقیہ ان کے اور وزیر صاحب کے دوستوں کے دوست تھے۔ زیادہ تر دوستوں نے سفاری پہن رکھے تھے جب کہ دو تین نے شلوار قمیض کے ساتھ واسکٹ کو بھی ضروری سمجھا تھا۔ یہ لوگ صبح سے دوبار چائے پی چکے تھے لیکن آنکھوں میں قدرے خمار اب بھی تھا۔ فضا میں یخی تو تھی ہی، پسینے کی بو نہ تھی۔ یہاں بھی لوگ ٹیلی فونوں سے چپکے ہوئے تھے۔ سارا ملک ان کی ایک انگلی کی ایک پور کے نیچے دبا تھا۔ آگے تیسرا اور آخری کمرہ تھا۔ تین اطراف میں دیواریں اور عقب میں شیشے کی دیوار جو بلائنڈ سے یوں ڈھکی تھی کہ رتی بھر دھوپ بھی اندر نہ آ سکے۔ کمرے کے وسط میں بڑی میز جو ساری ہی شیشے سے ڈھکی ہوئی، شیشہ صاف ستھرا، جس سے سوائے اعمال کے ہر شے جھلک رہی تھی۔ میز کے پیچھے یہ بڑی گھومنے والی کرسی، کرسی کے ساتھ چھوٹی میز جس پر چار ٹیلی فون کے علاوہ ایک چھوٹا سا ڈبہ میں بند سپیکر، جس پر اندر بڑے ہال میں جاری اجلاس کی کاروائی بخوبی سنائی دے رہی تھی، یہاں تک کہ معزز اراکین کی گالی گلوچ بھی سننے والے کو خاصا محظوظ کر رہی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ صوفہ سیٹ یا کشن والی کرسیاں اور ان کرسیوں پر نفاست کا کم از کم مظاہرہ کرنے والے بیٹھے تھے جن کے لباس کلف لگے شکن سے قطعی پاک تھے، جن کے چہروں پر رعونت ہی رعونت تھی۔ ہاتھوں میں چھن چھناتی پجیرو، لینڈ کروزر، ٹیوٹا کراؤن، ہونڈا اکارڈ گاڑیوں کی چابیاں تھیں اور چند ایک کے ہاتھوں میں ڈن ہل سگریٹ کے پیکٹ۔ ان کے چہرے، ہاتھ، کپڑے، آفٹر شیو اور کلون میں ڈوبے ہوئے تھے، اسی لیے کمرے میں خوشبو کا

جیسے بازار کھلا ہوا تھا۔ چہرے ان کے بھی اکتائے ہوئے تھے لیکن شاید انہیں کوئی اور کام نہیں کہ یہیں نشستوں سے چپکے ہوئے تھے۔
باہر جب سرو اور یوکلپٹس کے سائے درختوں کے اپنے قد سے بھی لمبے ہونے لگے تو اجلاس کی کاروائی ختم ہوگئی۔ بھونپو کی آواز بند ہوئی تو تینوں کمروں میں بیٹھے ملاقاتیوں کے چہروں پر یکدم رونق پھیل گئی، جیسے طویل لوڈ شیڈنگ کے بعد بجلی کے اچانک آجانے پر مکینوں کے چہروں پر آجاتی ہے۔ ملاقاتی قدرے بے صبری سے اپنی اپنی نشستوں پر پہلو بدلنے لگے۔ اجلاس ختم ہوگیا ہے، بس اب وزیر صاحب آہی رہے ہوں گے، ہر ایک کی سوچ یہی تھی۔ پی اے دو فائلیں اٹھائے اندر داخل ہوا تو گھومنے والی کرسی کے قریب ترین بیٹھی شخصیت نے تھوڑی گردن گھمائی اور بڑی نخوت سے پوچھا۔ کیوں بھائی! اب کیا خبر ہے۔ پی اے آخر پی اے تھا، اس نے بڑی بے اعتنائی سے اس شخص کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا، ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ملاقاتی نے پھر پوچھا اب تو اجلاس بھی ختم ہوگیا۔ پی اے نے جواب نہیں دیا۔ اسی بے اعتنائی کو اپنے چہرے پر سجائے وہ اپنے کمرے میں اپنی کرسی میں آ دھنسا تو اس کے پی اے نے اس سے پوچھا۔
''وزیر صاحب تو اجلاس میں بھی موجود نہ تھے، کہاں چلے گئے۔۔۔''
''آہستہ بولو۔ ان مفت خوروں نے سن لیا، تو مصیبت آجائے گی''۔ ظاہر ہے، وہ صبح سے اجلاس کے بہانے ہی تو اتنے سارے لوگوں کو قابو کئے ہوئے تھے۔
''میں آہستہ ہی بول رہا ہوں لیکن وہ گئے کہاں۔۔۔'' پی اے کے پی اے نے آواز دھیمی کرلی۔
''جانا کہاں ہے۔ ابھی تو وہ گھر سے نہیں چلے۔ رات۔۔۔۔'' اس کے پی اے نے لقمہ دینا چاہا۔
''ہاں رات۔۔۔۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ۔۔۔'' لیکن پی اے نے اسے چپ کرادیا۔
''بس بس اپنا کام کرو۔۔۔'' اتنے میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ پی اے نے پہلی گھنٹی کے ختم ہونے کا بھی انتظار نہ کیا۔ اور ایک آدھ بات سن کر ہی ریسور رکھ دیا۔
''صابر سے کہو، فوراً گیٹ پر جائے۔ وزیر صاحب چل دیئے ہیں''۔ ان کا پی اے باہر کی طرف لپکا تو کئی ایک ملاقاتی ایک ساتھ اٹھ آئے۔۔۔۔ اور جواب سن کر اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کئی گھنٹے لیٹ گاڑی بس پلیٹ فارم پر پہنچنے ہی والی ہو۔۔۔
چند ہی لمحے گزرے تھے کہ باہر سے صابر نے لپک کر دروازہ کھولا، پہلے وزیر صاحب اندر داخل ہوئے، پھر دو چار درجہ اول قسم کے ملاقاتی، ان کے پیچھے ملازمین اور آخر میں نمبر دو قسم کے بے شمار غرض مند۔ وزیر صاحب ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھے لیکن حواس کے علاوہ بھی دوسری بہت سی چیزیں ان کے قابو میں تھیں۔ البتہ پیٹ کچھ کچھ پھول رہا تھا لیکن اسے توند بہر حال نہیں کہا جاسکتا تھا۔ گال بھی قدرے پھول لگ رہے تھے لیکن چہرے پر بلا کی تازگی تھی۔ رہی سہی کسر ان کی آنکھوں نے پوری کردی تھی۔ تھیں تو جاپانی چینی لیکن ان میں عیاری اور مکاری نے ہی ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ شاید گھر سے نہانے کے فوراً بعد چل پڑے تھے کہ ان کے داخل ہوتے ہی سارے کمرے میں صابن کی خوشبو پھیل گئی۔ وہ باہر کے کمروں میں بیٹھے غرض مندوں سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنے کمرے میں آئے تو ملاقاتیوں کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ تقریباً سبھی کے ساتھ بغل گیر ہوئے یوں کہ بغلیں ملیں نہ ایک دوسرے کے لباس پر شکنیں پڑیں۔ کرسی میں دھنس کے انہوں نے ہر ایک سے ایک بار پھر خیر خیریت پوچھی اور پھر مخاطب ہوئے۔۔۔
''بس ایک منٹ اور معاف کیجئے۔۔۔'' انہوں نے سامنے کھڑے پی اے کی طرف دیکھا۔ پی اے کے سارے سوچ ایک دم آن ہوگئے۔۔۔

بیچرد کا یہ ڈرائیور تو بالکل نکما ہے۔آج پھر اے سی خراب کرا لایا ہے۔اسے ٹھیک کراؤ۔۔۔ایک گاڑی بیگم صاحب کو بھجوا دو۔بچوں کو دوسری گاڑی بھجواؤ،انہوں نے شاید پارک میں جانا ہے۔اور ہاں!ایک گاڑی مہمان خانے بھجواؤ، وہاں چند ایک مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں وہ شاید مری جائیں گے لیکن خیال رہے، ٹینک سب کی فل ہوں۔۔۔‘‘ پی اے نے یہ بات نوٹ کر لی تھی۔۔۔وہ باہر کی طرف چل پڑا کہ آواز نے روک لیا۔

’’وزارت میں اس لقمان کے بچے سے پوچھو، کمروں میں اے سی کس قسم کے ہیں۔شرم کرو، اتنا شور کرتے ہیں کہ سویا آدمی بھی اٹھ بیٹھے۔اسے کہو، کم از کم تین تو تبدیل کرا دے۔۔۔مصروفیات کیا ہیں۔۔۔؟‘‘ پی اے نے دوسری نوٹ بک نکالی۔

’’جناب چار بجے سے اجلاس شروع ہے۔رات ڈنر پرل میں ہے اور رات۔۔۔‘‘انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پی اے کو روک دیا ’’بس ٹھیک ہے۔نلکوں میں پانی نہیں ہے تو کیا چائے بھی نہیں ملے گی‘‘۔پی اے باہر کی طرف لپکا۔وزیر صاحب دھلے دھلائے لوگوں کی طرف مڑے تو چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔

’’جی چوہدری صاحب، اتنے دنوں بعد آپ نے ادھر کا رخ کیا ہے۔آپ پہلے تو ایسے نہ تھے۔۔۔ٹھہرے کہاں ہیں۔۔۔‘‘ چوہدری صاحب کے لہجے سے ملاقات کی خوشی ابل رہی تھی۔’’اپنے عزیز ہیں یہاں، انہی کے پاس ٹھہرا ہوں۔بس ایک زحمت دینی تھی۔۔۔‘‘وزیر صاحب نے انہیں روک دیا۔

اب اتنا بھی کیا تکلف۔آپ حکم تو کریں جی۔۔۔‘‘

’’آپ تو جانتے ہیں، آپ کی سفارش پر ہی تو مجھے دس کروڑ کا قرضہ ملا تھا۔میں واپس بھی کر رہا تھا لیکن پھر خیال آیا، کیوں نہ ایک آدھ مل اور لگا لوں۔یہ کام ابھی آدھے میں ہے کہ ادارے نے قرضے کی ادائیگی کے لیے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔۔۔‘‘ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی وزیر صاحب نے ریسیور اٹھایا اور پی اے سے نمبر ملانے کو کہہ دیا۔ادھر چوہدری صاحب کی بات ختم ہوئی ادھر وہ صاحب مل گئے۔وزیر صاحب نے کچھ پرانے تعلقات کا حوالہ دیا، کچھ آئندہ کی مہربانیوں کی طرف اشارہ کیا اور چند ہی لمحوں میں ان صاحب کو چت کر لیا۔ریسیور رکھتے ہوئے بولے۔

’’لیں چوہدری صاحب، وہ تو مان ہی نہیں رہا تھا۔بہرحال جب تک میں ہوں وہ پھر تقاضا نہیں کرے گا۔۔۔‘‘ چوہدری صاحب سر سے پاؤں تک شکریئے کی یہ بن گئے۔ایسے کہ منہ سے کچھ نکل نہیں رہا تھا۔بس اتنا کہہ سکے۔

’’اللہ آپ کا اقبال اور بلند کرے۔۔۔‘‘پھر وہ کمرے سے نکل گئے یوں کہ ان کے دونوں ہاتھ سینے پہ ایک دوسرے کے اوپر براجمان تھے اور پشت دروازے کی طرف ہی رہی جیسے کسی مزار پر حاضری دینے کے بعد الٹے قدموں جا رہے ہوں۔وزیر صاحب کو کچھ یاد آ گیا۔انہوں نے فون کا ریسیور اٹھایا اور بزر کی گھنٹی دبا دی۔دوسری طرف پی اے تھا۔

’’وہ گھر میں صوفہ سیٹ کس نے بنوائے ہیں۔۔۔بالکل جاہل ہے، گدھا ہے۔کپڑے کا رنگ نہ تو پردوں سے ملتا ہے نہ قالین سے۔۔۔تبدیل کراؤ انہیں۔۔۔اور ہاں! اسٹیشن سے وہ آموں کی پیٹیاں منگوائی ہیں کہ نہیں۔۔۔گھر پہنچ گئی ہیں۔۔۔!‘‘ریسیور رکھ کے وہ دوسرے ملاقاتی سے مخاطب ہوئے۔

’’جی اوکھرا صاحب۔کیا حال ہیں۔یار! پچھلی بار آپ نے شکار کے انتظامات خوب کیے تھے، وہ نشہ تو آج تک نہیں اترا۔۔۔‘‘اوکھرا صاحب اب اتنے بھی کند ذہن نہ تھے کہ اشارہ نہ سمجھتے، بولے۔

’’میں تو گرمیوں کے ڈھلنے کا انتظار کر رہا ہوں، اگلا پروگرام اور بھی شاندار ہوگا۔۔۔‘‘وزیر صاحب نہال ہو گئے۔

’’جی جی کیوں نہیں، اس بار برقی صاحب کو بھی لے چلیں گے۔۔۔اچھا تو، کیسے زحمت کی آپ نے؟‘‘

''بس کیا کہوں جی! وہ آپ کا بھتیجا بی اے تو کر گیا ہے، آگے پڑھنے کو تیار نہیں۔ آپ کے محکمے میں گریڈ 18 کی دو آسامیاں ہیں۔ اسے یہیں پھنسا دیں تو۔۔۔'' وزیر صاحب نے درخواست لے لی، اس پر کچھ لکھا اور بولے۔

''گریڈ اٹھارہ کے لیے تو ایم اے ہونا ضروری ہے اور پانچ سال کا تجربہ بھی۔۔۔ لیکن آپ کا بچہ تو میرا بچہ ہوا ناں۔ میرے محکمے کے دوسرے افسر بڑی مین میخ نکالتے ہیں، لیکن خیر۔۔۔ آپ سمجھیں، کام ہو گیا۔۔۔'' پھر انہوں نے پی اے کو بلایا، درخواست اسے پکڑائی اور بولے۔۔۔

''مجھے لیکچر مت دینا۔ یہ درخواست ابھی لے جاؤ، اور اپنے سیکرٹری صاحب سے کہو، کل دوپہر تک مجھے آرڈر کی کاپی مل جانا چاہیے۔۔۔ ان سے بھی کہنا، مجھے کاپی درکار ہے، قاعدے، قوانین کے وعظ نہیں۔۔۔۔'' اتنے میں ٹیلی فون بزر بج اٹھا۔ وزیر صاحب نے ریسیور اٹھایا۔ پی اے سے جب سن چکے کہ لائن پر کون ہے تو کرسی میں پھیل گئے، اور مسکراہٹ انکی مونچھوں سے بھی ابلی پڑ رہی تھی۔ لائن مل گئی دوسری طرف ایک اور وزیر صاحب تھے۔۔۔

''جی جی۔ بسم اللہ، بسم اللہ۔ کیا حال ہے۔۔۔ ہوں۔۔۔۔'' پھر انہوں نے چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگایا۔۔۔ پھر یک لخت سنجیدہ ہو گئے۔ ''اچھا۔۔۔ کل کتنے لوگ ہیں۔ کیا کہا ستر۔ جانا کہاں کہاں ہے۔۔۔۔ برازیل اور۔۔۔ میکسیکو اور۔۔۔۔۔ پرتگال۔۔۔ نہیں وہ تو ٹھیک ہے۔ پر بیگم اور بچے نہیں مانیں گے۔ پچھلی بار بھی میں نے ٹرخا دیا تھا۔ اب پورا جہاز جا رہا ہے تو دو تین سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ ہاں ہاں، یار تم کوشش تو کرو۔۔۔ میری طرف سے تو ہاں سمجھیں لیکن۔۔۔ ہاں ہاں! بچے نہ سہی لیکن بیگم کے بغیر اور ہاں بڑے بچے کو تو بالکل اگنور نہیں کر سکتا، میرے بعد آخر اسی نے تو یہ سارا دھندا سنبھالنا ہے۔۔۔ او کے، او کے۔۔۔۔'' ریسیور رکھتے رکھتے ان کے چہرے کا اطمینان، سنجیدگی میں بدل گیا۔ پھر سے وہ سیدھے ہو بیٹھے۔ کمرے کا جائزہ لیا۔ باقی رہ گئے دو تین لوگوں کی طرف دیکھا اور بولے۔

''میرے لیے کوئی خدمت۔۔۔!''

''ارے نہیں، تکلیف دینے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن۔۔۔ بچوں کو چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ اگر۔۔۔۔'' وزیر صاحب نے بات نہیں کی، بز ردبا کے پی اے کو ہدایات دینے لگے۔۔۔

''جاتلی صاحب کے بچوں کے لیے ریلوے سے کہو، پورا سیلون بک کر دیں۔ یہاں سے دو گاڑیاں انتظام کر رکھو اور مری میں ریسٹ ہاؤس بھی بک کرا دو۔۔۔۔ ہاں! تو یہ جاتلی صاحب سے پوچھ لو۔۔۔'' جاتلی اشارہ سمجھ گئے۔ اٹھے، بڑے احترام سے سلام کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ان کے بعد کسی علاقے کے زمیندار کی باری تھی۔ ان کا کوئی مزارع کسی اور مزارع کی بیٹی کو اغوا کر کے لے گیا تھا لیکن پولیس اب رپورٹ درج نہیں کر رہی تھی۔ وزیر صاحب نے تین چار فون کروائے، تھانیدار تو نہیں ملا، حوالدار پر ہی برس پڑے۔ اسے حکم دینے کے بعد اس زمیندار کو تسلی دینے لگے۔۔۔

''آپ فکر نہ کریں۔ رپورٹ درج ہو جائے گی۔ اس مزارع کی یہ مجال کہ لڑکی اغواء کرے۔ آپ مطمئن رہیں، ہم نے ان برائیوں کے خاتمے کا تہیہ کر رکھا ہے۔۔۔۔'' پھر وہ دوسرے ملاقاتی سے بات کرنے ہی والے تھے کہ پی اے دروازہ کھول کے اندر آیا لیکن وزیر صاحب کے چہرے پر جلال دیکھ کر جھجک گیا، بات کرے یا نہ کرے۔۔۔ وزیر صاحب بھی لحظہ بھر چپ رہے جیسے اندر ہی اندر کچھ پی رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ نارمل ہوئے تو انہوں نے مسکرا کے پی اے کی طرف دیکھا اور سر کا اشارہ کر دیا۔۔۔ پی اے کے لیے یہ اشارہ کافی تھا۔

''باہر کچھ ملاقاتی بیٹھے ہیں اور اجلاس کا وقت بھی ہو رہا ہے۔۔۔'' وزیر صاحب نے چونک جانے کی ایکٹنگ کی، اچھا کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا اٹھنا تھا کہ باہر برآمدے تک تھرتھلی مچ گئی۔ ہر کسی کی زبان پر یہی تھا۔ وزیر صاحب اٹھ رہے ہیں۔۔۔'' وہ پہلے پی اے کے کمرے میں آئے۔۔۔ پی اے کا کمرہ بس خالی تھا لیکن ایک صاحب جو پی اے کے عین سامنے نہایت ادب سے کھڑے تھے، وزیر صاحب کو دیکھ کر تھوڑا سا آگے بڑھے، ٹھٹھکے پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اتنے میں پی اے وزیر صاحب کی پشت سے نکل کر سامنے آ گئے۔

''سر یہ مرے پرانے ساتھی ہیں۔ بیچارے سفارش نہ ہونے کی وجہ سے بس کھڈا لائنوں پر ہی چل رہے ہیں''۔ وزیر صاحب نے پرانے ساتھی کا پاؤں سے سر اور سر سے پاؤں تک جائزہ لیا، پھر پوچھا۔

''اچھا تو پھر۔۔۔''

''جی آپ اگر مہربانی کر کے دو لفظ ان کی درخواست پر لکھ دیں تو یہ سسٹم میں۔۔۔'' وزیر صاحب نے معاملہ یہیں روک دیا۔ ''درخواست لاؤ بھائی۔۔۔ اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ ہم تو بیوروکریٹس کو حکومت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھتے ہیں۔ اس ناطے ہمارے اپنے ہوئے نا''۔ ساتھ ہی ساتھ وہ درخواست پر بھی لکھتے گئے۔

پھر وہ باہر کے کمرے میں آئے تو پسینے کی سڑاند سے وہ کچھ خوش نہیں ہوئے۔ لیکن ساری فوج ان کے ساتھ تھی، اس لیے کچھ کر بھی نہ سکے۔ یہ کمرہ ملاقاتیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ان کا جی چاہا، اجلاس کا بہانہ کر کے یہاں سے کھسک لیں۔ لیکن اپنے دوسرے اہل کاروں کو سر پہ سوار دیکھ کے رک گئے اور باری باری ہر ایک سے درخواست لے کے اس پہ کچھ نہ کچھ لکھتے گئے۔ پتہ تو انہیں بھی نہیں تھا کہ کس درخواست پر کیا لکھ رہے ہیں۔ درخواست گزار ساتھ کہانی بھی سناتے تھے لیکن یہاں اتنی فرصت کس کے پاس تھی کہ کہانیاں سنتا رہے اور پھر کہانیوں میں نیا پن تو تھا نہیں، وہی پرانے قصے، لڑکا فیل ہو گیا ہے، پاس کرا دیں۔ میونسپل کمیٹی مان نہیں رہی، نلکا لگوا دیں۔ بیٹی کے بیاہنے کی جہیز نہیں ہے، پیسے دلوا دیں، وغیرہ وغیرہ، جب بھیڑ چھٹ گئی اور وزیر صاحب نے سوچا، بقیہ ایک دو کو نظر انداز کر کے نکل جائیں کہ ایک ورکر نے ترت ان کے کان میں سرگوشی کی۔

''اس بابے کی بات ضرور سن لیں، اس کے خاندان کی سولہ ووٹیں ہیں''۔ وزیر صاحب چونکے۔ بابے کی طرف دیکھا اور حال احوال پوچھا۔

''کیوں بابا جی۔ کوئی خدمت۔۔۔'' بابے نے زندگی بھر اتنی محبت، ہمدردی کہاں پائی ہوگی۔

''پتر، مجھے پولیس نے بڑا تنگ کر رکھا ہے''۔

''بابا جی، آپ چنتا نہ کریں، ہم نے ان تمام برائیوں کے خاتمے کا عزم کر رکھا ہے۔ بات کیا ہے؟''

''پتر آج پندرہ روز ہو گئے ہیں، بھا کھڑہ گروپ کے بندے میرا مرغ چرا کے لے گئے ہیں۔۔ وزیر صاحب کو جھٹکا لگا۔۔۔ تھوڑا سا مسکرائے۔۔۔

''کیا کہا بابا جی، مرغ۔۔۔''

''جی پتر، مرغ۔۔۔ بات مرغ کی نہیں ہے۔ بات بھا کھڑوں کی ہے، وہ اتنے منہ زور ہو گئے ہیں۔ میں پولیس کے پاس اتنی بار گیا ہوں وہ رپورٹ ہی درج نہیں کرتے۔ بس آپ پرچہ کٹوا دیں''۔ وزیر صاحب رک گئے، مڑ کے پھر پی اے کے کمرے میں آئے، شہر کا نام لیا اور بولے۔۔۔

''آئی جی سے ملاؤ۔۔۔ ان کی اتنی جرات، انہیں معلوم نہیں، عوام کی خدمت ہمارا نصب العین ہے۔۔۔''

پی اے نے متعلقہ شہر میں نمبر دو چار گھمایا اور نمبر ملا تو کسی سے بات کر کے قدرے مایوسی سے بولا۔
''آئی جی صاحب تو ہیں نہیں، دورے پر ہیں۔۔۔''
''اچھا اچھا۔۔۔۔ان کے دورے ہی ختم نہیں ہوتے۔ایس پی سے ملاؤ۔۔۔۔''حکم دینے کے بعد وزیر صاحب نے ادھر ادھر دیکھا، کچھ کہنا چاہا لیکن کمرے کے سناٹے سے خود ہی ڈر گئے۔ ٹیلی فون کے ساتھ ڈنگل کرتے ہوئے پی اے صاحب کو دیکھنے لگے۔ پی اے نے نمبر ملا لیا، کسی سے بات بھی کی اور پھر ریسیور ہٹا کے بولا۔
''ایس پی صاحب تو کسی میٹنگ میں مصروف ہیں''۔
''ان سب کو۔۔۔۔تم ایس ایچ او سے ملاؤ۔۔۔''نمبر تو مل گیا لیکن وہ شاید ڈرائنگ روم میں کسی کی لترول میں مصروف تھے کہ خاصی دیر بعد فون پر آئے۔ پی اے نے ریسیور وزیر صاحب کو پکڑا دیا۔ وزیر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ برس پڑے۔
''تھانیدار صاحب'' آپ تھانے میں ہی ہوتے ہیں یا۔۔۔اپوزیشن کے جلسے کراتے پھرتے ہیں۔اپوزیشن نے اور تو بیڑہ غرق کر ہی دیا ہے، پولیس کا بھی ستیاناس ہو گیا ہے۔ ہاں! آپ اس غریب کی شکایت کیوں نہیں سنتے۔اس لیے کہ یہ میرا ووٹر ہے۔یاد رکھیں، ہم ساری گندی مچھلیوں کو ختم کر دیں گے۔۔۔۔کیا کہا۔۔۔آپ کی بات سنوں، کیوں سنوں۔۔۔۔آپ بھا کھڑوں کے خلاف پرچہ کیوں نہیں کاٹتے۔۔۔۔کیا کہا۔۔۔۔ پہلے تو وزیر صاحب کا پارہ اسٹاک ایکسچینج کے بھاؤ کی طرح کبھی اوپر کبھی نیچے ہو ہی رہا تھا لیکن اب یوں لگا جیسے پارہ گر کر جم گیا ہو اور وزیر صاحب کی ساری ہوا نکل گئی ہو۔ یخ کمرے میں بھی ان کی پیشانی پر ہلکا سا پسینہ آ گیا۔ ریسیور انہوں نے پی اے کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور کسی قدر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بابے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔
''بابا جی۔۔۔ہنگرول صاحب مجھ سے بڑے اور طاقتور وزیر ہیں۔ پرچہ وہ آپ کے خلاف پہلے ہی کٹوا چکے ہیں ہتک عزت کا۔۔۔آپ ہی بتائیں، اب میں کیا کروں۔۔

☆☆☆

صندوقچہ

ہاجرہ مسرور

وقت کچھوے کی چال چلتا معلوم ہورہا تھا۔ بڑی مشکل سے ملکہ بیگم نے تھپک تھپک کر بچوں کو سلایا تھا لیکن ان کی ساس کی عشاء کی نماز طول کھینچتی جارہی تھی اور محمود میاں تو جیسے آج سارے سال کی پڑھائی ختم کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے حد یہ کہ مسعود میاں ابھی تک اپنی بیکاری کے غم میں مع اپنی امریکی بشرٹ کے غائب تھے اور اسی تاؤ میں ان کی نئی نویلی دلہن اپنے کمرے میں خدا جانے کیا اٹھادھرف کر رہی تھیں۔

''مسعود میاں پر دھونس جمانے کو اپنا جہیز سمیٹ رہی ہوں گی۔ دلہن بیگم۔۔ خوب ہیں آج کل کی لڑکیاں، سمجھتی ہیں اس طرح میاں قابو میں آجائے گا''۔ ملکہ بیگم نے اپنی سب سے چھوٹی بچی کے منہ سے دودھ نکالتے ہوئے سوچا۔ ''اونھ! یہ سارے ہتھ کنڈے بھول جائیں گی بنو۔ ابھی نئی نئی ہیں۔ اس لیے مسعود میاں جھک مار کر منالیتے ہوں گے۔ بچاری جہیز پر اترا رہی ہیں۔ ارے ہم اتنالائے تھے کہ گھر بھر گیا تھا۔ اس پر بھی کسی نے ٹھینگے پر نہ مارا ہمیں۔۔۔۔''

مسعود میاں کی دلہن کے انجام کے بارے میں سوچ کر ملکہ بیگم کو ایک گونہ مسرت ہوئی۔ اپنے جلے ہوئے گھر کے ملبے پر بیٹھ کر جلتی ہوئی دنیا کا تماشہ دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑتی تو ہوک بھی نہیں اٹھتی۔

''مگر آج یہ سب سوتے کیوں نہیں؟'' ملکہ بیگم نے جماہیوں پر جماہیاں لے کر جھنجھلاہٹ میں سوچا ''سبھوں کے کام ہی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔ توبہ۔۔۔''

چوکی کے گھنٹے نے دس بجائے ملکہ بیگم نے اپنی جلتی اور بند ہوتی ہوئی آنکھیں چیر کر ہر طرف دیکھا۔ ساس عشاء کی نماز ختم کر کے پاندان کھولے پلنگ پر براجمان تھیں۔ محمود میاں کے سرہانے بجلی کا لیمپ اسی طرح روشنی بکھیر رہا تھا اور وہ اپنی اسکول کی کاپی میں عورتوں کی تصویروں والی کتاب رکھے پڑھے جارہے تھے۔ دلہن بیگم کا کمرہ بھی ابھی تک روشن تھا۔ خدا جانے ایسی سڑی گرمی میں کمروں کے اندر بیٹھ کر میاں کا انتظار کرنے میں لوگوں کو کیا مزا آتا ہے۔ ارے باہر پلنگ پر پڑ کر انتظار کرلیں تاکہ انتظار سے تھکیں تو ذرا سولیں، اور پھر ملکہ بیگم چپکے سے اٹھ کر۔۔۔

ملکہ بیگم کی بے تابی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ سوتی اس خیال سے نہ تھیں کہ ایک بار آنکھ لگ گئی تو پھر چاہے ڈھول بجے، دن بھر کی مصروفیت سے ٹوٹا ہوا جسم کروٹ تک نہیں لینے کا۔ پھر تو صاف بات ہے کہ آج کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

''خدا سمجھے مسعود میاں سے۔ آہی نہیں چکتے۔ اتنی رات گئے نہ معلوم کن دفتروں کی خاک چھان رہے ہیں۔ ہائے کس مزے سے لوگ سوتے ہیں، ایک ہماری قسمت میں چین کی نیند بھی نہیں''۔ انہوں نے گردن گھما کر اپنے شوہر منظور میاں کی طرف دیکھا جو اپنی راج کپور ٹائپ مونچھوں کے نیچے چوڑے چوڑے نتھنوں والا منہ کھولے خراٹے لے رہے تھے۔

چوکی کے گھنٹے نے اب کے گیارہ بجائے۔ مگر اس سے پہلے ہی مسعود میاں آچکے تھے اور اپنی دلہن سے کمرے کے اندر ایک معرکہ سر کرنے کے بعد اسے وہیں روتا چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ ارے ہاں نہیں تو کون روز روز بیوی کی خوشامدیں کر کے اس کا دماغ بگاڑے۔ آج یوں ہی سہی۔

''ارے اب مر بھی چکو لوگو! خدا سمجھے تمہیں نیند بھی نہیں آتی''۔ ملکہ بیگم کے دل سے ایک دھواں سا اٹھا اور انہوں نے

بے چینی میں اپنا سر تکیے پر رگڑ ڈالا۔ اس بات پر فوراً ہی ان کی سب سے چھوٹی بچی نے دودھ منہ میں لینے کی کوکوں کوں شروع کر دی۔۔۔۔

"او محمود روشنی بند کرو۔ پڑھنا ہے تو اندر جا کر پڑھو، گرمی میں سب کے سر پر روشنی کر رکھی ہے"۔ مسعود میاں نے سگریٹ ختم کر کے دھیمی آواز میں محمود کو ڈانٹا۔

"ہاں خود تو فیل ہو ہو کر اس عمر میں بی اے کیا کہ سرکاری نوکری کی عمر نکل گئی اور اب اتنے دن سے بیٹھے بھائی کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ شرم نہیں آتی چھوٹے بھائی کو پڑھائی سے **منع** کرتے"۔ ماں نے زندگی میں پہلی مرتبہ مسعود میاں کو کھری کھری سنا دی، ورنہ وہ تو ہمیشہ مسعود میاں کو بے قصور ہی ٹھہراتیں۔ اس جھگڑے سے ملکہ بیگم کا جی خوش سا ہو گیا، انہوں نے سوچا کہ یہ بھی تو کہیں کہ اوپر سے دلہن بھی لا کر بٹھا دی دوسروں کی کمائی کے برتے پر۔

"اماں جان بس رہنے دیجئے اس وقت۔ ہاں نہیں تو"۔ مسعود میاں ہنکارے۔ "تجھ سے کہتا ہوں محمود بند کر روشنی۔ ادھر لا ذرا دیکھوں کیا پڑھ رہا ہے"۔

"کیوں دکھاؤں۔ دیکھ لو اماں جان یہ بڑے آئے۔۔۔" محمود میاں منمناتے کتابیں سمیٹ لیمپ اٹھا اماں کے کمرے کی طرف بڑھے۔

"اے ہے لونڈے کو گرمی میں مارے گا۔ یہیں بیٹھ کر پڑھے گا، نیند نہیں آتی تو نہ سو۔۔۔ اس وقت کسی کی نیند کا خیال نہیں آتا جب رات کو بارہ بجے آ کر دروازے بھڑ بھڑاتے ہو"۔ اماں جان نے محمود کی حمایت لی۔ جب سے مسعود کی شادی ہوئی تھی ان کا جی بھر گیا تھا۔

اسی بک بک میں منظور میاں کے خراٹے ٹوٹ گئے۔

"کیا شور مچ رہا ہے، کمبخت رات کو چین سے سونا بھی نہیں ملتا۔ اور یہ روشنی کیوں ہے۔ بند کرو۔ بجلی مفت کی نہیں"۔

اس فیصلے پر ملکہ بیگم کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا اور سب ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ صرف اماں جان نے پاندان بند کر کے دو تین زوردار آہیں بھریں۔

اب ملکہ بیگم کو اپنی آنکھوں پر نیند پتھروں کی طرح رکھی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن وہ سو کیسے جاتیں؟ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر وہ ان پتھروں کو ڈھکیلنے کی کوشش کرتی رہیں۔

صحن میں اندھیرا ہو گیا۔ خاموشی ہو گئی لیکن دلہن بیگم کے کمرے میں ابھی روشنی باقی تھی۔ پھر آہستہ سے انکے کمرے کی چٹخنی چڑھنے کی آواز آئی اور پھر مکمل اندھیرا چھا گیا۔

اندھیرے آسمان پر ستاروں کی چمک بڑھ گئی۔ کہکشاں نے اپنی راہ موڑ دی ساڑھے بارہ تو بج گئے ہوں گے۔ ملکہ بیگم نے حساب لگایا۔ سب سو گئے۔ اماں جان کے پھسپھسے خراٹے سنائی دے رہے ہیں۔ مسعود میاں اور محمود میاں کی گہری گہری سانسوں تک کی آواز آ رہی ہے۔ سب سو گئے۔ بس اب موقع ہے۔ اب وقت ہے۔ ملکہ بیگم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اس موقع پر ہمیشہ ان کا دل یوں ہی دھڑکتا۔ لاکھ جی کو بہلاوے دو ہزار تاویلیں کرو مگر دنیا جس چیز کو گناہ کہہ دے گناہ بن جاتی ہے۔ اور پھر گناہ کھل جائے تو۔۔۔۔ ملکہ بیگم کا جسم ہمیشہ کی طرح اس خیال سے آج بھی شل ہو گیا۔

چارپائی پر زور دیئے بغیر وہ ہولے ہولے اٹھنے لگیں۔ پھر بھی ایک بار چول چر چرا گئی۔ اور وہ تیزی سے دوبارہ لیٹ گئیں۔

"اللہ میری توبہ۔۔۔۔!" ایک ستارہ ٹوٹ کر نشیب کی طرف لپکا اور ملکہ بیگم کے دل میں بدشگونی نے اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ یہ ستارے نہیں ٹوٹتے، یہ تو فرشتے شیطان کو آسمان کی طرف آتا دیکھ کر اپنا گرز چلاتے ہیں۔

ملکہ بیگم کی قوت ایک بار جواب دے گئی۔ ''یا اللہ معاف کر دے تو منصف ہے تو تو دلوں کا بھید جانتا ہے۔تو وہ بے انصافی بھی دیکھتا ہے جو میرے ساتھ روا ہے۔اللہ چیونٹی بھی پاؤں تلے دبائی جاتی ہے تو کاٹتی ہے۔۔۔۔بس تو ہی میرے گناہ بخشنے والا ہے۔۔۔'' اور ملکہ بیگم کی نیند بھری آنکھوں میں گرم گرم آنسو جھلک آئے۔ یہ سارے خیالات سنگ ریزوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر انہیں اپنے آپ پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔ذرا دیر کے لیے وہ دبی ہوئی سی پڑی رہیں۔اس موقع پر انہیں اکثر انہی کیفیات سے سامنا کرنا پڑتا۔اور جب یہ پر عذاب کیفیات ان پر طاری ہوتیں تو وہ سمجھتیں کہ ان کے گناہ کا کفارہ ادا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملکہ بیگم بھوت کی طرح اندھیرے گھپ کمرے میں ڈوب گئیں۔وہ اپنے کمرے کے اندھیرے کو پہچانتی تھیں دھیمے مگر نپے تلے قدموں سے وہ اس جگہ تک گئیں، جہاں وہ کنجی رکھتی تھیں۔یہ کنجی پہلے ان کے میاں چرا کر رکھتے تھے۔ایک دن یہ ان کے ہاتھ لگ گئی (میاں بے چارے اس دن اپنی کنجی ڈھونڈ ڈھونڈ کر رہ گئے۔تھک کر انہوں نے تالے کی دوسری کنجی بنوالی تھی) اور اب وہ اس کنجی کو ایسی جگہ چھپا کر رکھتی تھیں کہ کسی کا خیال بھی وہاں نہ پہنچ سکے۔

لیکن آج جی ملکہ بیگم کا ہاتھ اس جگہ پہنچا تو کنجی لے کر نہ پلٹا۔ملکہ بیگم اندھیرے میں اسٹول پر سے گرتے گرتے بچیں۔ انہوں نے اپنی چیخ روکنے کے لیے اپنا کانپتا ہوا خالی ہاتھ کاٹ کھایا۔انہیں ایک دم یوں معلوم ہوا جیسے ان کے گرد اونچی اونچی سیاہ دیواریں اٹھتی جا رہی ہیں، اور اب وہ قیدی ہیں، بے بس قیدی وہ گم صم سی کچے فرش پر بیٹھ گئیں۔مگر انہیں یوں لگا جیسے تیز بھنور پر بیٹھی گھوم رہی ہوں، ڈوبی جا رہی ہوں۔

اندھیرے کمرے میں مچھر گنگنا گنگنا کر ان پر جھپٹتے، چیونٹیاں کپڑوں تلے رینگتی اور کاٹتیں، لیکن انہیں تو جیسے اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ چوکی پر کتنی بار گھنٹے بج گئے، انہیں اس کی بھی خبر نہ ہوئی۔انسے ان کی جنتوں کی کنجی چھینی گئی تھی اور اب انہیں سب کچھ بیکار معلوم ہو رہا تھا۔ بھلے ہی مچھر خون چوس لیں، چیونٹیاں بوٹیاں توڑ کر لے جائیں۔ پسینے میں ناک تک غرق ہو جائیں۔کیا رکھا ہے اب اس زندگی میں کیسے ارمانوں سے انہوں نے سخت اور مایوس کن زندگی کی دیواروں کی کھرچ کر ایک سرنگ نکالی تھی اور وہ سرنگ میں ناک ڈال کر اپنے آپ کو کتنا آزاد، کتنا خوش پاتی تھیں۔لیکن آج وہ سرنگ بھی نہ جانے کن ظالم ہاتھوں ڈھے گئی۔اتنے بڑے حادثے نے ملکہ بیگم کو سن کر دیا تھا۔وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھیں۔دماغ پتھر کے ٹکڑے کی طرح بے حس تھا، اور دل وہ تو بس عادتاً اندھیرے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔یا ہوسکتا ہے صرف گھڑی ہی ٹک ٹک کر رہی ہو۔ملکہ بیگم اس وقت سوچنے اور فیصلہ کرنے کی حد سے باہر تھیں۔انہیں یہ تک خیال نہ آیا کہ اگر باہر کسی کی آنکھ کھلی تو انہیں غائب دیکھ کر لوگ کیا سوچیں گے۔

لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے سفید ہوتے ہوئے آسمان کی روشنی کمرے کے اندھیرے کو ہلکا کرنے لگی۔آنگن میں ملکہ بیگم کی سب سے چھوٹی بچی نے دودھ ٹو لنے میں ناکام ہو کر ایک لمحے کو کچھ چیں چاں کی اور پھر ٹھنڈی ہواؤں میں غٹ ہو گئی۔

رات بھر کی گہری نیند کے بعد منظور میاں کا جسم جاگا اور انہوں نے ساتھ کی چارپائی ٹٹولی اور پھر ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

''ارے جان''۔انہوں نے ملکہ بیگم کو کمرے میں چپ چاپ زمین پر بیٹھے دیکھ کر کہا۔اور ملکہ بیگم کو احساس ہوا کہ ان کے کولہوں کا گوشت بیٹھے بیٹھے سن ہو چکا ہے۔اور صبح ہو رہی ہے۔مگر وہ چپ رہیں۔

''یہاں میرا انتظار ہو رہا ہے۔جگا لیا ہوتا مجھے۔گرمیوں میں عجیب مصیبت ہوتی ہے، تم سے بات تک کرنے کا موقع نہیں ملتا''۔اور پھر انہوں نے کمرے کے ایک کونے میں تھوک کر ملکہ بیگم کو چوتھی کی دلہن کی طرح اٹھا کر اونچی سی شیشوں والی مال غنیمت کی مسہری پر ڈال دیا۔

ملکہ بیگم ایک اذیت ناک ضبط سے چھنکارا پا کر آن کی آن میں ہچکیوں اور سسکیوں سے طوفان میں بہہ گئیں۔

اب میاں بے چارے پہلے تو مجرم بنے کھڑے رہے، پھر ایک دم بپھر گئے۔ ''آخر کچھ بولو بھی تمہیں کیا ہوگیا؟''
مگر ملکہ بیگم کچھ نہ بولیں بس روئے چلی گئیں۔ رات بھر کی اڈی ہوئی گھٹا ٹوٹ ٹوٹ کر برسے گئی۔ گھر میں سب جاگ اٹھے۔
ملکہ بیگم کے کمرے سے رونے کی آواز بڑی صاف آ رہی تھی۔ مگر جب اندر میاں بیوی دونوں ہوں تو اور کون وہاں قدم رکھے۔

''میاں بیوی کی کوئی بات ہوگی، ملکہ بیگم تو فیل مچانے کی عادت نہ تھی۔ مسعود کی دلہن کے رنگ ڈھنگ وہ بھی سیکھ رہی ہیں کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے''۔ وضو کے لیے لوٹا سنبھالتے ہوئے ماں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمود میاں سے کہا جو بستر پر بیٹھے سر کھجا کر نیند کا خمار اتار رہے تھے۔

''یہ عورتیں واللہ فیلی کرنے میں نمبر اول''۔ مسعود میاں نے اپنی دلہن کے بند کمرے کی طرف دیکھ کر سوچا اور پھر نل سے کھڑے ہی کھڑے منہ دھونے لگے۔

وقت بے حد اذیت سے گزر رہا تھا۔ ملکہ بیگم کا کمرہ پراسرار بنتا جا رہا تھا۔ منظور میاں منہ پھلائے نکلے۔ منہ دھویا اور پھر کمرے میں جانے لگے۔ ان سے کسی کو سوال کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

''ارے اماں جان اسکول کا وقت ہوگیا، ناشتہ دیجئے''۔ محمود میاں سب سے پہلے باورچی خانے میں گھسے۔

ارے منحوس ٹھہر تو، پہلے بڑا بھائی تو دو لقمے منہ میں ڈال لے۔ سویرے سویرے جی جھلس رہا ہے۔ میرا لال۔ اس کے دوکان جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اللہ میری تو یہ آگ لگے اس زندگی کو''۔ اماں نے دانت کٹکٹا کٹکٹا کر کہا۔ توے سے اڑی ہوئی چھینٹ نے انہیں اور بھی چراغ پا کر دیا۔ انگوٹھا جل کر رہ گیا تھا۔

مگر محمود میاں نے ناشتے کے لیے بیتابی سے انتظار کرتے ہوئے دیکھا کہ بڑے بھائی حسب معمول سیاہ صندوقچہ ہاتھ میں لیے باہر نکل گئے۔ ابھی آٹھ بھی نہ بجے تھے۔ اور پھر بغیر ناشتہ کئے۔

''ارے منظور۔ اے ناشتہ تو کرلو تمہاری دوکان پر کون نصیبوں جلا صبح صبح اپنا کفن خریدنے آ رہا ہے جو اتنی جلدی نہار منہ چل دیئے''۔ اماں جان چلائیں۔

مگر منظور میاں نہ پلٹے وہ کافی تاؤ میں تھے۔ بگڑنے کی بات تو تھی ہی۔ گھنٹہ بھر سے بیوی سے یوں چھکوں پھکوں رونے کی وجہ پوچھ رہے تھے، مگر وہاں کوئی جواب نہ تھا۔

ملکہ بیگم کے رونے سسکنے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ مسعود میاں کی دلہن بھی اپنی خفگی بھول کر کمرے سے نکلیں اور سیدھی ملکہ بیگم کے کمرے کی طرف چلیں۔ ان کے پیچھے اماں جان بھی پراٹھا ڈلیا میں پٹک کر بھاگیں۔

''اے جب سے سن سن کر کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ منظور کے ہوتے کمرے میں آتے شرم آتی تھی۔ اب تک کلیجے پر سل رکھے بیٹھی تھی۔ بتاؤ ملکہ بیگم آخر ہوا کیا؟'' اماں جان نے جلدی جلدی پوچھا۔

پھر مسعود میاں بھی اندر آ گئے۔ انکے پیچھے محمود میاں اور پھر ملکہ بیگم کے تینوں بچے۔ باہر صحن میں سب سے چھوٹی حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔ مگر ملکہ بیگم سب کی موجودگی میں بھی اس طرح گھٹنوں پر اپنا پھولا سوجا منہ رکھے روتی رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت روئی تھیں جب ان کا پہلا بچہ مرا تھا۔

''کیا بات ہے بھابھی؟ منظور بھائی نے کچھ کہا؟'' مسعود میاں نے سینہ سپر ہو کر پوچھا۔

وہی آنسو!۔۔۔

''کہیں درد ورد تو نہیں بھابی''۔ مسعود کی دلہن نے مسہری پر بیٹھ کر لپٹتے ہوئے سوال کیا۔

وہی سسکیاں!۔۔۔۔

''اللہ سمجھے جس نے میری بچی کا دل دکھایا ہو۔ ارے یہ بہو نہیں میری بیٹی کی طرح ہے۔ اسی سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہے۔ کیا ہوا میری بچی مجھے بتا دے''۔ اماں جان نے گلے لگا کر رندھی ہوئی آواز میں پوچھنا چاہا۔

بچے بھی تنگ آ کر رونے لگے۔ پوتوں پوتیوں کو اس طرح روتے دیکھ کر بے چاری بڑھیا بھی پھوٹ پڑیں۔

''کیا ہو گیا، کسی کی سنتی ہی نہیں، بچے بے چارے بھوکے پیاسے رو رہے ہیں''۔ انہوں نے اپنے سفید دوپٹے سے آنسو پونچھے اور ناک سرخ کیے اپنے پوتوں پوتیوں کو سمیٹ کر باہر نکل گئیں۔

مسعود کی دلہن دوڑ کر بے بسی کے عالم میں سب سے چھوٹی بچی کو ہمدردی کا آخری حربہ سمجھ کر اٹھا لائیں۔ لیکن دو بالشت کی جان اتنا تڑپی، اتنا بلکی کہ بے چاری دلہن نے گھبرا کر اسے ملکہ بیگم کی گود میں ٹھونس دیا۔ ننھی نے دودھ کی خوشبو سونگھی تو کوں کوں کر کے جمپر پر ہاتھ اور منہ مارنا شروع کر دیئے۔ اچانک ملکہ بیگم نے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھ دیئے۔ اور پھر ملکہ بیگم کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آیا۔

ناشتہ مسعود میاں خود لائے۔ مگر ملکہ بیگم نے ادھر آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ دوپہر بھی فاقہ کیا، شام بھی ایک کھیل اڑ کر منہ میں نہ گئی۔ وہ تمام دن مسہری پر گم صم بیٹھی سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہی۔ رات کو نیند بھی بڑی بھیانک آئی۔ معلوم ہوتا جیسے خواب میں پلنگ سے گر پڑی ہیں۔ سینے میں دل ڈاکو کی طرح دھم سے کودتا اور آنکھ کھل جاتی۔ کبھی لگتا اپنے کان پورو والے گھر میں چھوٹی سی ہیں۔ ابا پیسہ دو گنڈیریاں لیں گے۔ وہ ابا سے ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہی ہیں اور ابا پیسہ نہیں دیتے کیونکہ لڑکی ذات کی چٹورے پن کی عادت پڑنے کا خدشہ ہے۔ پھر گھر میں ایسے اوپر کے چھپے مٹھے آتے ہی رہتے۔ پھر انہیں کسی طرح ایک پیسہ مل جاتا ہے۔ اپنے پچھواڑے کے کھنڈر نما ٹیلے سے اتر کر وہ گلی میں بیٹھنے والے گنڈیری والے کی طرف بھاگتی ہیں۔ اور پھر پھسل جاتی ہیں۔ نیچے نیچے ایک غار میں۔ وہ چارپائی پر خوف سے اچھل پڑتیں اور پھر ان پہ غنودگی طاری ہونے لگتی۔ پھر خواب، اور خواب جانے کہاں کہاں کے تک بے تک سلسلے ملتے جاتے۔ وہ دیکھتیں کہ ان کی دور کی رشتے کی پھوپھی اماں (جنہیں اب وہ اماں جان کہتیں) کے اصرار پر پلاؤ زردوں پے ترنوالے اڑاتی رہیں۔ پھر آندھی سی چلی۔ دستر خوان اڑ گیا۔ دھائیں دھائیں بادلوں کی گرج کی طرح گولیاں چلیں اور ان کے سسر کی سفید داڑھی خون میں لال ہو گئی۔ رو رو کر وہ دیوانی ہو گئیں۔۔۔ پھر نہ جان خواب میں وہ کہاں نکل گئیں کوئی اجنبی سا دیس کوئی گھٹا گھٹا سا گھر۔۔۔ دستر خوان بچھا پر روکھی سوکھی پر بھونوں کے اتنے پنجے بڑھے کہ ان کا منہ خالی رہ گیا۔ ایک دم خالی۔ بھوک سے انکے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ اور پھر عجیب بات ہے کہ بچوں پر بچے انکا بھوکا پیٹ پھاڑ کر باہر آنے لگے۔۔۔ ایک قطار کھڑی ہو گئی۔۔۔ پیٹ میں درد بڑھتا گیا۔ اور وہ چیخیں مارنے لگیں۔

''ملکہ! ملکہ! جاگو کیا خواب دیکھ رہی ہو''۔ منظور میاں نے نیند سے اٹھ کر انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔

''کیا ہوا خواب میں ڈر گئیں''۔ اماں جان نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کچھ نہیں''۔ ملکہ بیگم نے چکراتا ہوا سر پکڑ کر جواب دیا۔ ستارے پھیکے پڑ رہے تھے۔ سویرا ہونے والا تھا۔ اور ملکہ بیگم کو خواب سے جاگ کر محسوس ہوا کہ انہیں شدید بھوک لگ رہی ہے۔

سویرے ملکہ بیگم نے تھوڑے سے اصرار پر ڈٹ کر ناشتہ کر لیا اور جب پیٹ بھر گیا تو پھر اچانک انہیں اپنی جنت گم گشتہ یاد آ گئی لوہے کا ایک ٹکڑا جو ایک تالے کی کنجی کی شکل میں ڈھل گیا تھا۔۔۔ اور ویسا لوہے کا ٹکڑا اب انہیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔

ملکہ بیگم نے دوپہر کی گرم تنہائی میں پھر رونا بلکنا شروع کر دیا۔ مسعود کی دلہن اور اماں جان نے بہت بہت پوچھا۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ کیسے کہتیں کہ میں اپنے گناہ کا راستہ مسدود ہونے پر سوگ منا رہی ہوں۔ اور یہ نہ کہہ سکنے کی بے بسی انہیں اور بھی

رلا رہی تھی۔ آخر ہار کر ساس غریب روتی بین کرتی اپنی کوٹھی میں جا پڑیں۔

ارے آج خدا کو خدا بخشے وہ شہید، مرے سر کا تاج ہوتا تو کیوں میری یہ گتیں ہوتیں۔ کوئی میری نہیں سنتا۔ سمجھتے ہیں موئی سڑن بک بک کر رہی ہے۔ آج کو منظور کھلا رہے ہیں اپنے بھائیوں کو تو ماں پخنی سے سیدھے منہ بات تک کرنا گوارا نہیں۔ کل میں ناشتے کو بلاتی رہی منہ پھیرے نکل گئے۔ مسعود ہیں وہ الگ ہر وقت تیوری چڑھائے ہیں۔ ارے میں کسی کی جوتیاں کھانے والی نہیں۔ دونوالے کھاتی ہوں تو نوکروں کی طرح سارا گھر سنبھالتی ہوں۔ مجھ پر کسی کا کوئی احسان نہیں۔ میں اپنے ہاتھ پیروں کا صدقہ کھاتی ہوں۔ ہاں اب تو سب نوچ لیا مجھ سے اب کوئی کیوں پوچھے کہ اماں مرتی ہو یا جیتی ہو''۔ بھری دوپہر میں اماں جان چلاتی رہیں۔

اور ملکہ بیگم کے آنسو یہ سب سن سن کر اور بھی شدت سے بہنے لگے۔ آخر وہ دو دن کے سوگ کے بعد پہلی دفعہ ہچکیاں لیتی کہنے لگیں، ''خدا گواہ ہے دلہن! میں نے اپنا چھلا چھلا انہیں دے دیا کہ دکان میں لگا دیں۔ اس پر بھی انہوں نے میری بات نہ پوچھی۔ روٹی کے علاوہ بھی بچوں کو کچھ چاہیے، انہیں ذرا خیال نہ آیا۔ میں نے صبر کیا، کیا اماں کبھی انہیں نہیں سمجھا سکتی تھیں۔۔ میں نے تو اتنا کر کے بھی احسان نہیں جتایا۔ مگر اماں نے اپنے سونے کے کڑے کیا دے دیئے کہ بیٹھی گنا رہی ہیں۔ میرا کیا ہوا کوئی نہیں گنتا۔ کوئی نہیں پوچھتا۔۔۔۔ اب ایسے میں اگر مجھ سے کوئی گناہ ثواب ہو جائے تو۔۔۔۔ تو سب۔۔۔۔!'' ملکہ بیگم کو یک لخت اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنے گھٹنوں پر سر ٹکا لیا۔

''بھابی یہ حال دیکھ کر میں تو اپنے جی میں چور بنی رہتی ہوں۔ تمہارے دیور بھی نوکری کی پوری طرح کوشش نہیں کرتے۔ مجھے شادی سے پہلے معلوم ہوتا کہ ایسی جگہ قسمت پھوٹ رہی ہے تو کچھ کھا لیتی''۔

مسعود کی نئی دلہن کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اور اس دن آنکھوں کا یہ پانی آنکھوں ہی آنکھوں میں پھیلتا چلا گیا۔ محمود میاں نے اسکول سے آ کر کھانا مانگا۔ اماں جان نے ڈوب مرنے کا مشورہ دیا کہ ایسی بے عزتی کے کھانے سے بہتر ہے آدمی سڑک کی دھول پھانک لے۔ محمود میاں بھوکے تھے۔ بھوک میں رونا ذرا جلدی آتا ہے۔ سو وہ اچھے خاصے بڑے ہونے کے باوجود بھوں بھوں رونے لگے۔

مسعود میاں جو ابھی اپنی دلہن کے ساتھ کھانے بیٹھے ہی تھے۔ اماں جان کی باتوں کے اصل رخ کو سمجھ گئے۔ نوالہ چھوڑ کر اٹھ گئے اور اپنے کمرے میں جا پڑے۔

اب ڈھنگ کی نوکری نہیں ملتی تو کیا کریں؟ آدھی زندگی تو اس امید میں بسر ہو گئی کہ بی اے کرلیں تو پھر گھر کے سارے دلدر دور کر دیں گے۔ سب کے احسانات یوں چٹکی بجاتے میں اتار دیں گے۔ پر نوکری اپنی جیب میں تو رکھی نہیں ہے کہ نکالی اور کر لی۔ مسعود میاں مارے کھسیاہٹ کے اپنی اکلوتی بشرٹ کی استری کا خیال کئے بغیر آنکھوں کے آنسو چھپانے کو پلنگ پر اوندھ گئے۔

اس دن سارا گھر اوندھ گیا۔ بچے گلی میں دھواں اڑاتے رہے۔ بڑوں میں کسی نے کچھ نہ کھایا۔ صرف منظور میاں کی دوکان کا نوکر کھانا لینے آیا تو کھانا بھیج دیا گیا۔ شام کو بھی اماں جان نے چولہا نہ جلایا۔ صبح کا ہی کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ ملکہ بیگم اپنے کمرے میں پڑی پڑی اپنے آپ کو اس اداسی اور کشیدگی کا ذمہ دار سمجھنے لگیں۔ لیکن رات کو جب منظور میاں بغل میں سیاہ صندوقچہ دبائے گھر لوٹے اور چولہا اوندھا دیکھا تو صورت حال سمجھ کر ایک دم بولا کر چیخنے لگے۔

''سب کے دکھوں کا ٹھیکہ دار میں ہوں میری بوٹیاں نوچ لو۔ میں یہاں سے منہ کالا کر جاؤں تو سب کے دماغ درست ہو جائیں گے۔ دونوں وقت روٹی مل جاتی ہے نا اس لیے سارے لڑائی جھگڑے سوجھتے ہیں۔ ابھی دن بھر چار گز کپڑا بیچنے کے لیے دوکان پر سارا دن بیٹھنا پڑے تو۔۔۔'' منظور میاں کو مارے غصے کے اچھو لگ گیا۔ اور وہ نیم بے ہوش سے ہو کر پلنگ پر گر پڑے۔ اور دوسرے ہی لمحے سب ایک دم ہوش میں آ گئے۔ کوئی دوڑ کر پانی لایا، کسی نے پنکھا جھلا اور جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اس رات سبھوں نے اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور کھانے کے بعد بڑی دیر تک بڑے اچھے موڈ میں غپ شپ ہوتی رہی۔
ملکہ بیگم کے دل پر گہرا صدمہ تھا مگر پھر بھی انسان غم بھول ہی جاتا ہے۔ ان کا پہلا بچہ مرا تھا تو کیا وہ مر گئی تھیں۔۔۔؟
مسعود میاں کے کئی لطیفوں پر وہ بھی آواز سے ہنس پڑیں۔ ایک زمانے کے بعد یہ خوش گوار رات آئی تھی۔
باتوں سے تھک کر سب سے پہلے منظور میاں کے خراٹے بلند ہونے لگے اور پھر روشنی گل کر دی گئی۔ آہستہ آہستہ سب سو گئے۔ ملکہ بیگم نے حسب معمول سب کے سو جانے کا انتظار کیا اور جب سب کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو چند لمبی لمبی ٹھنڈی سانسیں لے کر آنکھیں موند لیں۔ جب راتیں انہیں پر اسرار سرگوشیوں میں جاگتے رہنے کی تلقین کرتی تھیں تو انہیں نیند کتنی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ مگر آج جب رات قبر کی طرح سونی اور خاموش تھی تو نیند ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ کتنی اجاڑ مردہ سی رات ہے۔ ملکہ بیگم نے بڑے دکھ سے محسوس کیا اور جانے کب تک یوں ہی بے حس و حرکت اس احساس تلے دبی پڑی ہیں۔ دور کہیں کوئی کتا بڑی منحوس آواز میں روئے چلا جا رہا تھا۔
اور جب بہت رات گئے ایک کتا ان کے دروازے پر آ کر منحوس آواز میں رویا تو منظور میاں کی آنکھ کھل گئی۔ اچانک انہیں اپنے کمرے سے کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں۔
جیسے کوئی رو رہا ہو اور کہہ رہا ہو، میرا حصہ دو اس میں سے، میرا حصہ۔
منظور میاں کے غنودہ ذہن پر چڑیلوں بھوتوں کا تصور ابھرا۔ لیکن جب انہوں نے اپنی بیوی کی چارپائی کی طرف دیکھا تو اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔
کمرے میں کوئی چیز کسی چیز سے ٹکرا کر زور سے گری۔ سارے گھر والے جاگ پڑے اور منظور میاں کے کمرے میں روشنی دیکھ کر خوف سے ادھر ہی بھاگے۔
اور پھر سب سناٹے میں آ گئے۔
ملکہ بیگم جو ننگے سر ننگے پاؤں کھڑی تھیں، ان کی روتی ہوئی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔ اور اماں جان کی بند مٹھی تھرتھرا رہی تھی۔
"ملکہ! اماں!! یہاں کیا ہو رہا ہے؟ منظور نے حیران ہو کر دونوں سے پوچھا۔ ملکہ بیگم ساکت کھڑی زمین پر گرے ہوئے صندوقچے کو گھور رہی تھیں اور اماں جان کی تھرتھراتی ہوئی مٹھی بے جان ہو کر کھل رہی تھی۔
مٹھی بڑے آسیبی انداز سے کھل گئی۔ منظور میاں کے سیاہ صندوقچے پر کوئی چیز ٹھن سے بجی۔ سب نے دیکھا، یہ ایک چونی تھی اور لوہے کی ایک کنجی۔
ارے خدا کی شان ہے۔ اپنوں پر ہی ڈاکے پڑتے ہیں۔ جبھی تو میں کہوں کہ چار چھ آنے روز روز حساب میں کم کیوں ہوتے ہیں۔۔۔؟ منظور میاں نے انتہائی دکھ میں اپنے سر کے بال دونوں ہاتھوں سے نوچ لیے۔

☆☆☆

پانچواں دور

مشین گردی

آغا گل

پوسٹل کالونی میں کریم کا ڈھابہ لٹ خانہ کہلاتا تھا۔ دنیا جہاں کے بے کار، ملازمت کے متلاشی درختوں کی چھاؤں میں پاؤں پسارے اونگھنے والے غرضیکہ سب ہی چلے آتے۔ لاٹھی ٹیکتے پینشنر بھی جوانی کی یادیں تازہ کرنے مہینے میں ایک بار ضرور زیارت کے لیے آتے۔ یہاں کڑک چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے اور چند گھنٹوں کے لیے دوبارہ جوان ہو جایا کرتے۔ پینشن کی رقم لے کر بے رنگ کانپتی ٹانگوں والی میز کرسیاں اور کھری چارپائیوں پہ چائے پینے کا عجب سرور تھا۔ کچھ لوگ لڈو سے جی بہلاتے تو بعض ایک تاش پھینٹنے لگتے۔ کریم کا لٹ خانہ افواہوں کا مرکز اور جاسوسی کا اڈا بھی تھا۔ ڈاک خانے کی ساری خبریں یہیں سے مل جایا کرتیں۔ محکمہ ڈاک کی عظمت گذشتہ کے قصے بھی دہرائے جاتے جب موسمیات کے علاوہ کونین کی فروخت اور محکمہ تار و ٹیلی فون بھی انہیں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ کیا بھلا دور تھا کہ ہر ایک تار پہ جو دفتری اوقات کے بعد آیا کرتی ایک روپیہ لیٹ فیس ملا کرتی۔ تنخواہ سے کہیں زیادہ تو لیٹ فیس ہوا کرتی جس کے باعث پوسٹ ماسٹر دو تین شادیاں رچا لیا کرتے۔ پوسٹ ماسٹر Morse پہ گٹ گٹ تاریں بھجوایا کرتے۔ موسم کا حال بھجوانے کا الگ سے معاوضہ ملا کرتا۔ بڑی ہی خوش حالی کا دور تھا۔ محکمہ ڈاک کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مہاراجہ برودا کی بگھی ریلوے اسٹیشن پہ ذرا تاخیر سے پہنچی۔ اس کے افسروں نے لیک کر گارڈ کو ٹرین روانہ کرنے سے منع کیا تاکہ مہاراجہ سوار ہو سکے۔ یہ ایک میل ٹرین تھی۔ سرکار کو علم ہوا چند منٹ تاخیر کی تو مہاراجہ سے جواب طلبی ہوئی کہ اس نے سرکار انگلشیہ کی ڈاک کیوں روکی مہاراجہ نے لاکھ جواز پیش کیے مگر سرکار نہ مانی اور اسے تخت سے معزول کر کے اس کے بیٹے کو تخت نشین کر دیا کہ جو شخص ڈاک کی ترسیل میں مزاحم ہو وہ ریاست چلانے کے قابل نہیں۔ ایسی کہانیاں سن کر سامعین کو اپنی عظمت گذشتہ کا اندازہ تو ہوتا مگر وہ ماضی کو یوں دیکھتے جیسے افیون چاٹنے والے بیاسی (۸۲) سالہ بہادر شاہ کو سترہ سالہ جواں بخت کا کٹا ہوا سر دکھایا گیا تھا۔ ایک ناقابل برداشت تکلیف اور اذیت ہوتی۔ ڈاک خانے والوں کے پیش نظر ماضی ہی تھا۔ حال نہ تھا نہ مستقبل۔ ایک گھمبیر سی فضا میں وہ جی رہے تھے۔ وہیں پہ ایک روز خبر ملی کہ عنقریب ایک نئی مشین بڑے ڈاک خانوں میں لگ جائے گی۔ جو ڈاک کی تقسیم کا تمام کام خود ہی کرے گی۔ پوسٹ مینوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ تو اپنے بیٹوں کی پیکر، کینڈی ڈیٹ پورٹر اور پوسٹ مین لگوانے کے چکر میں تھے۔ یوں تو ان کی اپنی ہی نوکری خطرے میں پڑ جاتی۔ مشینوں کی چونکہ زبان نہیں ہوتی وہ کسی بھی لسانی گروہ کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ لہذا وہ ڈومی سائیل سرٹیفکیٹ کے چکر سے بھی آزاد ہی رہتی ہیں۔ لٹ خانے میں کھلبلی مچی تو پوسٹ مین یونین کے صدر علم دین کو سب نے آڑے ہاتھوں لیا جو نہایت انہماک سے رفیقوں کے ہمراہ چائے کی شرط کے بدلے لڈو کھیل رہا تھا۔ اس ڈاک بانٹنے والی مشین کے بارے میں جان کر تو اسے بھی کوفت ہوئی۔ یوں تو چھانٹی بھی ہو سکتی ہے تاہم اس کی تسلی سے پوسٹ مینوں کا حوصلہ بظاہر تو بڑھا ہی مگر دل کو ایک دھڑ کا سا لگا تھا۔ اگلے ہی روز انہوں نے چیف پوسٹ ماسٹر سے میٹنگ مانگی جو فوراً ہی مل گئی۔ کیونکہ شورش کا اندیشہ تھا انتظامیہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے کرنے کے حق میں تھی۔ یوں بھی انتظامیہ یونین کی یورش میں پسپائی اختیار کرتی، کہنے کو تو محکمہ فوج اور پولیس کی طرح Essential Services Department کے زمرے میں آتا۔ مگر حکومت نے ووٹ بینک بڑھانے کے لیے انہیں مزدور یونین بنانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اسٹاف کسی کارخانے کا مزدور نہ تھا سرکاری ملازم تھا اور نہ ہی چیف پوسٹ ماسٹر Collective Bargfaining

Agent سے اوقات کار اور مشاہرہ میں کمی بیشی کی اجازت دے سکتا تھا۔ عجب سا تماشا تھا۔ کبھی اس مزاحیہ ڈرامے میں برابر کے کردار تھے۔ یونین کی رسائی اوپر تک تھی۔ سیاست دان بھی ڈاک خانے والوں کو ووٹ بینک کے طور پہ استعمال کیا کرتے۔ حاضر سروس، ریٹائرڈ، ماں باپ، جوان اولاد غرضیکہ سبھی کے ووٹ تھے۔ ڈاک خانے تو ووٹوں کی دکان ہوا کرتے ہیں۔ جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے بینرز کے علاوہ ان کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ چیف پوسٹ ماسٹر یوسف نے یونین کو خوش آمدید کہا۔ ان کے تیور قابو میں بھی رکھنے کے پیش نظر سب ہی کے لیے سبز چائے بھی منگوا ڈالی تا کہ فضا دوستانہ ہی رہے۔ علی دین کا لہجہ میٹھی چائے پیتے ہوئے بھی درشت رہا۔

''چیف صاحب! آپ ایسی مشین لگا رہے ہیں جو پوسٹ مینوں کا کام کرے گی۔ ہمارا کیا بنے گا؟ ہم ہڑتال کر دیں گے''۔ یوسف جانتا تھا کہ ''ہم ہڑتال کر دیں گے'' بطور ردیف استعمال ہوتا ہے ایسی گفتگو میں۔ اس نے تسلی دی۔

''یہ مشین صرف ڈاک وصول کرے گی اور ٹرانسمیشن کرے گی۔ باقی کام تو پوسٹ مین ہی کریں گے۔ آپ صاحبان دیکھ ہی لیں کہ مشین کی ٹانگیں ہی نہیں ہیں''۔ انہیں مشین دکھلائی گئی وہ ایک ڈبہ نما مشین تھی۔

''کہتے ہیں کہ ائیر کنڈیشن میں بھی کام کرے گی''۔

یوسف نے اقرار کیا ''ہاں بھئی فرسٹ جنریشن ہے گرمی میں یہ کام نہیں کر سکتی''۔

یونین ایک بار پھر مضطرب ہوگئی ''اور ہم جو ڈاک تقسیم کرتے ہیں۔ تربت میں اور سبی میں باون ڈگری میں جبکہ لو چلنے کے باعث جہاز بھی نہیں اتر پاتے۔ زمین انگارہ بھی ہوتی ہے گرمیوں میں۔ سردیوں میں زیارت اور کان مہترزئی میں جبکہ درجہ حرارت منفی پندرہ ڈگری سے نیچے گر جاتا ہے، ہم تب بھی ڈاک تقسیم کرتے ہیں۔ یہ کون سا انصاف ہے بھلا؟''

یوسف بدستور معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا ''اے بھئی آپ تو اشرف المخلوقات ہیں۔ آپ کی کیا بات ہے''۔

علم دین نے اپنے خستہ حال ساتھیوں پہ نگاہ دوڑائی محنت مشقت اور غربت نے انہیں وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا دیا تھا، زندگی نچوڑ لی تھی ان کے جسموں سے ان کی آنکھوں سے۔ مگر وہ بھنا گئے ''اشرف المخلوق اپنے پاس ہی رکھیں۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو پیٹ بھر کھانا تو دیں''۔

پوسٹ ماسٹر سے صبر نہ ہو سکا ''آپ صاحبان کفر نہ بکیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہی ہے۔ یہی ہمارا عقیدہ ہے اور نہ لگیں پوسٹ مین۔ جائیں فیکٹری لگا لیں''۔

اسٹاف کی مخالفت کے باوجود دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی دنوں میں بکنگ ہال کے اندر شیشے کا ایک ائیر کنڈیشن کیبن بن گیا یوں اس فیکس مشین نے کام شروع کر دیا۔ شہر کے چار نئی ڈلیوری زونز بنے۔ چار پوسٹ مینوں کو نئے موٹر سائیکل دے کر فیکس مشین کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔ جبکہ دیگر پوسٹ مین اپنی Beats پر عمر رسیدہ کھڑ کھڑاتی سائیکلوں پہ ہی نکلا کرتے۔ ایک نا قابل برداشت تضاد تھا۔ فیکس مشین نے ایک نئی کلاس ایک وی آئی پی کلچر متعارف کرا دیا تھا۔ جس کے باعث سبھی کا دل جلتا رہتا۔ بخشو ماما کی سانولی سی لونڈیا بانو کو اس ٹھنڈے کیبن میں فیکس مشین کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ دن بھر وہ اس شاہانہ اور بہت ہی آرام دہ کیبن میں ٹھاٹھ سے کام کرتی عشوہ طرازیاں کرتی جبکہ پوسٹ یونین لو میں جھلسی ہوئی آگ اگلتی سڑکوں پہ مرزا کی بائیسکل پہ ڈاک تقسیم کرتے پھرتے۔ سرد کمرے میں سجی دودھیا مشین اور سانولی بانو کو طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوسٹ مین گزرا کرتے تو ان کے دل پہ گھونسا پڑتا۔ ان کا بس چلتا تو فیکس باہر پھینک آتے اور شیشہ توڑ کے پورے کاونٹر ہال کے لیے آسودگی کے مواقع پیدا کرتے۔ بانو کے بارے میں نازیبا باتیں بھی کرتے۔ ایک رات لڈو کی گیم پہ رقم ہار کے علم دین بھاری قدموں سے گھر آیا اور بستر پہ ڈھیر ہوا تو بیوی نے توجہ دلائی کہ پنکھا

خراب ہوگیا ہے۔ پنکھا دم سادھے پر پھیلائے خاندان سے لاتعلق رہا۔ نہ تو اسے بچوں پہ ترس آیا نہ ہی میاں بیوی پہ جو من کی آگ میں بھی جھلسے ہی جا رہے تھے۔ گزر بسر بمشکل ہو رہی تھی، بازار میں قیمتیں بھی بڑھی جا رہی تھیں۔ علم دین پہ انکشاف ہوا کہ مشینوں کا دل نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ اتنے برس ساتھ رہنے پہ کچھ تو اس کمبخت میں مروت ہوتی۔ جب نئی نئی شادی ہوئی تھی تو یہی پنکھا سائیکلوپس والی آنکھ سے انہیں تاڑتا رہتا۔ اس چمکتی ہوئی آنکھ میں اپنی شبیہہ دیکھ کر دلہن شرما جایا کرتی۔ مگر پنکھا افسروں کی مانند کٹھور اور بے مروت تھا۔ اگر یہ محکمہ ڈاک کا افسر ہوتا اگلے ہی روز اس کے خلاف اخباری بیان جاری کر دیتا۔ جس سے اس کی سٹی گم ہو جاتی اور وہ سہم کر خود ہی گھومنے لگتا۔ مگر مشینوں کو بلیک میل نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر علم دین جلا بھنا گھر آیا تو اس نے صحن سے ڈنڈا اٹھایا اور پنکھے کو غصے میں پیٹ ہی ڈالا وہ اس قدر گرجا کہ پڑوسی دوڑ پڑے انہوں نے بمشکل پنکھے کو علم دین سے چھڑایا جو فوجیوں کی دیکھا دیکھی پنکھے کو کوڑے ہی مارے جا رہا تھا۔ پڑوسیوں کو علم دین کی ذہنی حالت پہ شبہ ہونے لگا وہ اسے لٹ خانہ لے گئے۔ کڑک چائے پی کر علم دین کے حواس درست ہوئے وہ پشیمان بھی ہوا کہ اسٹاف میں بات پھیلی کہ وہ پاگل اور جنونی ہے تو ہاتھ سے صدارت بھی جائے گی۔ اگلے روز ڈاک بانٹتے وہ پروفیسر جلیل کے ہاں پہنچا۔ اگرچہ پروفیسر جلیل یونیورسٹی کے ڈین تھے۔ اکیس (۲۱) گریڈ میں تھے پھر بھی ایک درویشی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔

علم دین نے خط اور بجلی کا بل ان کے حوالے کیا اور موقع غنیمت جانتے ہوئے دل میں ابلتے سوال اگل دیئے۔

''ساب لوگ کہتے ہیں انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مشینیں ان کی غلام ہیں۔ جبکہ مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم مشینوں کے غلام ہیں۔ فیکس مشین ائیر کنڈیشن میں کام کرتی ہے۔ جبکہ میں ان تو ے جیسی گرم سڑکوں پہ ڈاک بانٹتا ہوں۔ ہم میں سے کون افضل ہے؟ میں یا مشین؟''

پروفیسر نے علم دین کے لیے شربت منگوایا ''اتنا نہ سوچا کرو خالق مخلوق سے بڑا ہوتا ہے۔ انسان نے مشین تخلیق کی ہے وہ ان سے یقیناً برتر ہے''۔

علم دین کراہا ''میں کام سے انکار نہیں کر سکتا جبکہ فیکس کر سکتی ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی نہیں۔ افسوس کہ اس کا پیٹ بھی نہیں جیسے دن میں تین بار بھرنا پڑتا ہو''۔

پروفیسر نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا ''ہوش کے ناخن لو علم دین! اور اصل صنعتی انقلاب میں زیادہ مشینیں ایجاد ہوئی مقصد تھا بہتر سہولتیں مہیا کرنا۔ نوع انسانی کی خدمت کرنا رات دن مگر رفتہ رفتہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسان خود ایک پروڈکٹ بن گیا انسان بھی قابل فروخت ہوگیا۔ وہ خود بھی مشینوں کا غلام بنتا چلا گیا۔ مشینیں مہنگی ہو گئیں او انسان سستے''۔

علم دین مایوس ہوگیا ''ہم مشینوں کے خلاف بغاوت بھی تو کر سکتے ہیں۔ ہم آزاد بھی تو ہو سکتے ہیں''۔

پروفیسر کو محسوس ہوا کہ علم دین میں بغاوت جنم لے رہی ہے۔ مفت میں چٹان پہ ماتھا مار رہا ہے۔ کیا عجب کہ مارا ہی جائے۔

''دیکھو علم دین مشینوں کے ساتھ رہ کے ہم بھی مشینیں بن چکے ہیں۔ ہمارے انسانی جذبات کب کے ختم ہو چکے ہیں۔ مشین انرجی پر چلتی ہے۔ قدرت اور عقیدے سے بھی اس کا تعلق نہیں۔ ہم بھی لالچ اور خوف کے فیول سے چلتے ہیں''۔

علم دین تھکا ماندہ گھر آیا تو دیکھا کہ بیوی نے پنکھا ٹھیک کروالیا تھا۔ جواب گھوں گھوں کر کے چل رہا تھا۔ اس کی گردش سے راحت سی محسوس ہو رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ لٹ خانہ میں چلا آیا۔ جہاں حسب معمول رونق تھی۔ غربت و افلاس کے مارے ہوئے انسان تاش اور لڈو میں پانچ دس روپے جیت کر یوں چہکنے لگتے جیسے گول کنڈہ کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ دور لیاقت ڈرائیور، صاحب کی گاڑی دھونے کے بعد پالش لگا رہا تھا۔ علم دین کو خیال آیا کہ وہ خود بھی تو ہر ہفتے اپنی سائیکل کی صفائی کرتا ہے۔ تیل دیتا

ہے۔ ساری دنیا **مشینوں** کی غلام ہو کر رہ گئی ہے۔ لٹ خانے کی چارپائی پہ لیٹ کر وہ آنکھیں موندے سوچتا **چلا** گیا کہ اسی کمینہ صفت فیکس مشین کو جیب نالے میں کیوں نہ **پھینک** آئے۔ جہاں ہیروئنچیوں کا بسیرا ہے۔ وہ خود ہی مشین کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس احساس **طمانیت** اور فتح مندی سے وہ سرشار ہو گیا۔ اس کو لگا وہ واقعی اشرف **المخلوقات** ہے۔

اور پھر رات گئے ڈاک کا تھیلا بغل میں دابے وہ چپکے سے کاونٹر میں داخل ہوا۔ دیوار پھاندنے اور لات مار کے بوسیدہ کھڑکی کا **پٹ** کھولنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔ ایئر **کنڈیشن** بند تھا۔ مشین بھی سوئی یا مری پڑی تھی۔ اس نے **ایک** جھٹکے سے دونوں تاریں کھینچ نکالیں اور مشین کو ڈاک کے تھیلے میں ڈال لیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ پیروں میں فٹ بال بنالے۔ ٹھوکروں پر رکھ لے۔ **مگر** لوڈشیڈنگ کا فائدہ اٹھاتے گھر آکے ہی دم لیا۔ ڈاک کا تھیلا اس نے چارپائی کے نیچے چھپا دیا۔ خود بھی اپنی اسی چارپائی پہ جا لیٹا۔ وہ دل ہی دل میں کھلا جا رہا تھا۔ موقع پاتے ہی فیکس مشین کو جیب نالے میں **پھینک** آئے گا۔ بیوی سے نہ رہا گیا۔

''بہت دنوں بعد تم خوش دکھائی دے رہے ہو کوئی اوورٹائم ملا ہے''۔

علم دین ہنس دیا ''نہیں میں نے اپنے دشمن کا سرا تار دیا ہے''۔

اس فتح مندی سے وہ مغلوب ہو رہا تھا۔ ٹھاٹھ سے فیکس کی لاش کے اوپر سویا رہا۔ **مگر** منہ **اندھیرے** پہلو میں کچوکے دے کے بیوی نے زبردستی جگایا۔

''دیکھو باہر کوئی مسلسل دروازہ پیٹے ہی **چلا** جا رہا ہے''۔ علم دین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ''چھاپہ پڑ گیا''۔ ذہن میں **ایک** گونج ہوئی۔ **مگر** چارونا چار باہر تو نکلنا ہی تھا۔ رمضان اور جمعہ چوکیدار کو دیکھ کر اس کے حواس بحال ہوئے۔

''کسی نے فیکس مشین چوری کر لی ہے، اب ہمارا کیا بنے گا''۔ دونوں روہانسے ہو رہے تھے۔ فرط خوف سے لرزاں تھے۔

''تو میں کیا کروں'' خوف دور ہوتے ہی وہ اکھڑ ہو گیا۔ ''میرا کیا تعلق ہے چوکیدار تو تم ہو''۔

''تمہارا تعلق تو ہے''۔ جمعہ نے فریاد کی تو علم دین کے ہاتھ **پاؤں** بے جان سے ہونے لگے۔ چہرے کا رنگ **فق** ہو گیا جو **اندھیرے** کے **باعث** دونوں چوکیداروں کو دکھائی نہ دیا۔ ''تم ہمارے صدر ہو۔ **یونین** ساتھ نہ دے تو ہم کہاں **جائیں** گے''۔

''وہ بڑی ہی **نخرے** باز مشین تھی، ایئر کنڈیشن کے بغیر کام ہی نہیں کرتی تھی۔ چلو جان چھوٹی''۔

رمضان مشین کی وکالت کرنے لگا ''ہمارے سارے حاکم بھی تو ایئر کنڈیشن گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کے دفتر بھی ایئر **کنڈیشن** ہیں اور پھر یہ مشین جھوٹ بھی نہیں بولتی رشوت بھی نہیں لیتی انسانوں کو غائب بھی نہیں کرتی **بھتہ** بھی نہیں لیتی''۔

علم دین پہ **ایک نیا** سورج **طلوع** ہوا۔ اس نے تو کبھی بھی اس پہلو پہ غور نہیں کیا تھا۔ وہ ہانپ سا گیا۔ انہیں لیے **لٹ** خانہ پہ **چلا** آیا کیونکہ دو کمرے کے کوارٹر میں جگہ کہاں تھی بٹھانے کی۔ بیوی کی متوحش آنکھوں نے مجبور کر دیا تھا کہ جاتے جاتے تسلی دیتا جائے۔ ''کچھ نہیں بس ان دونوں کا ذاتی مسئلہ ہے **یونین** کا صدر جو ہوں۔ مدد مانگنے آئے ہیں'' علم دین نے سینہ پھلا لیا۔ پوسٹل کالونی کے گیٹ پہ بھی **ایک** چوکیدار کہنے کو تو موجود ہی رہتا۔ حالانکہ وہ اخبار کے دفتر میں بطور چپراسی کام کرتا تھا۔ لیکن چوری کبھی نہیں ہوئی۔ لہٰذا لٹ خانہ کا سالخوردہ فرنیچر بھی کوئی ظریف یا چور یا اٹھائی گیرہ غائب نہ کرتا۔ وہ تینوں بھی مدقوق کرسیوں پہ آبیٹھے۔

''کچھ کرو علم دین بھائی، دفتر کھلنے سے پہلے''۔

علم دین ٹھسک دکھانے لگا ''کیا کروں، میرے پاس اللہ دین کا **چراغ** تو نہیں۔ سوچتا ہوں کچھ''۔

جمعہ نے بھی فریاد کی ''علم دین اب تو قمر دین کاریز اور آواران سے خط فوراً پہنچ جاتا ہے۔ تفتان سے پانچ دنوں میں ڈاک آتی تھی۔ اب یوں چٹکی بجاتے آجاتی ہے۔ کوئی کمبخت **بیچ** کھانا چاہتا ہے، ہماری روزی رسان کو''۔

علم دین نے آنکھیں دکھائیں ''ابے عقل کے اندھے مالک روزی رسان ہے''۔

رمضان نے گھبرا کے مداخلت کی مبادا علم دین بدک کر ساتھ دینے سے انکار ہی نہ کر دے ''بھیا! دیکھنے میں تو مشین ہی ملازمت کرتی ہے، کارپہ ڈرائیور فیکس پر بانو، ہر مشین ایک آدمی کو نوکری دیتی ہے''۔

صورت حال خاصی گھمبیر تھی۔ نائب صدر اور جنرل سیکرٹری کالونی سے باہر رہتے تھے۔ ورنہ دونوں ان کے دروازے پہ ہوتے کالونی میں رہنے کے اپنے فوائد ہیں۔ چوری کی بجلی مفت کا پانی مگر ایسے مسائل بھی تو ہیں۔

علم دین نے سگریٹ سلگائی تو رمضان پھٹ پڑا ''ہماری نوکری چلی جائے گی۔ کوارٹر بھی ہم سے خالی کروالیں گے۔ ہماری جوان بیٹیاں ہیں۔ کہاں جائیں گے۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی تو نہیں''۔

علم دین کا دل پسیجا ''ارے چپ رہ سوچنے تو دے''۔ ایک فیکس کی موت سے دو گھر اجڑ جائیں گے۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ مگر فیکس کا ظلم بھی تو نا قابل برداشت ہی ہے۔ علم دین کو سوچتے دیکھ کر دونوں پریشان حال قدرے مطمئن ہوئے۔ پرامید نظریں اس کے چہرے پر جمائے رہے جو اندھیرے کے باعث غیر واضح تھا۔ ہیولی سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔

''تم دونوں یہیں بیٹھو اور دعا کرو۔ میں اپنے مرشد کا وظیفہ جا کے پڑھتا ہوں۔ آدھ گھنٹے بعد لوٹوں گا۔ پھر چلیں گے۔ دیکھنا کہ جنات مشین وہیں رکھ جائیں گے''۔

ان پہ ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ آدھ گھنٹہ سے قبل ہی علم دین لوٹ آیا سانس چڑھا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں تسبیح تھی جس کے دانے گردش کر رہے تھے، بائیں ہاتھ کی انگشت ہونٹوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، ساتھ ہی ہاتھ سے ڈاک خانے کی راہ دکھائی۔

چوکیداروں نے یکے بعد دیگرے دروازے کھولے اور کاؤنٹر ہال میں داخل ہوئے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اندر لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ تھا۔ رمضان نے دیا سلائی جلائی اور اس کے ساتھ ہی وہ تینوں فرط مسرت سے سجدہ ریز ہو گئے۔ فیکس مشین حسب سابق بکنگ کاؤنٹر کی رونق بڑھا رہی تھی۔

☆☆☆

پاکستان کہانی

ابدال بیلا

ہم کالج کے پرانے ہال کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔لکڑی کی چوڑی پرانی سیڑھیوں پہ تھپ تھپ بے شمار قدموں کی چاپ تھی۔کتابیں کاپیاں ہاتھوں میں پکڑے، آگے پیچھے باتیں کرتے، ہنستے کھیلتے ہم چڑھے جا رہے تھے۔دگڑ دگڑ لکڑی کے تختوں پہ ہمارے قدم بج رہے تھے۔پرانے ہال کمرے کی اونچی چھت اور دور دور کھڑی سیدھی دیواروں سے پلٹ کے ہماری سرگوشیاں، باتیں اور مسکراہٹیں گونج رہی تھیں۔کہ ایک دم سے کوئی اونچی آواز میں چلایا۔

اے، پاؤں نہ رکھنا

دیکھنا

پاؤں کے نیچے نہ دے دینا اسے

ہر کوئی پاؤں سمیت کے جہاں تھا، وہیں کھڑا ہو گیا۔اور گردن جھکا کے پیروں کے آس پاس دیکھنے لگا۔اونچی آواز سب نے پہچان لی۔وہ ہمارے ایک پروفیسر تھے۔ہمیں اردو پڑھاتے تھے، روز انہیں سنتے تھے، پہچاننے میں کیا دیر لگتی تھی۔

مگر یہ پروفیسر صاحب اس طرح چیخ کے کبھی پہلے بولے نہ تھے۔

یہ آج ایسی کیا انہونی ہوگئی۔

ہوا یوں کہ ہم میں سے کسی کی کاپی یا کتاب سے کاغذ کا ایک پاکستان کا جھنڈا پھسل کے گر گیا تھا۔اس کے گرنے کی کوئی آواز تھوڑی آتی ہے۔پھر سب خوش گپیوں میں چل رہے تھے، کسی نے دھیان ہی نہ دیا۔

کسی کو یہ تک پتہ نہیں تھا، کہ پیچھے پیچھے پروفیسر صاحب چپکے چپکے چڑھے آرہے ہیں۔جس وقت وہ کاغذ کا جھنڈا کسی کی کتاب سے کھسکا تو اس پر پروفیسر صاحب کی نظر پڑ گئی۔

بس وہ چیخ پڑے۔

خیر۔جھنڈا کسی نے اٹھالیا۔

پروفیسر صاحب اوپر آ گئے۔

ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

ان کے چہرے پہ وہی ہمیشہ کی مسکراہٹ تھی۔وہی دھیما پن، شائستگی اور ڈھیروں پیار۔

مجھے ذرا سی حیرت تھی،

چلو کچھ بھی ہوا،

لیکن پروفیسر صاحب کیوں یوں چلا اٹھے،

مجھ سے رہا نہ گیا۔

پروفیسر صاحب سے کہہ بیٹھا۔

سر، میں تو آپ کی آواز سن کے ڈر گیا تھا؟

ہاں، ڈرنے والی ہی بات تھی۔ وہ مسکرا کے بولے۔
بات میری سمجھ میں نہ آئی۔
آپ کا خیال تھا، کوئی گر جاتا؟ میں نے زیرلبی کہا۔
کسی کے گرنے میں کیا مضائقہ ہے، وہ بے تکلف ہنس کر بولے۔ انکی رگ ظرافت ایک دم سے پھڑکی، مگر اس لمحے کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ان کے چہرے پہ وہی شانت اور سکون کی لہروں کے بیچ ایک سنجیدہ سی نظر کوندی۔ میرے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے وہ کھڑے ہو گئے، اور میری آنکھوں کے عین بیچ گیارہ ہزار وولٹ کے اونچے کھمبے کی شارٹ سرکٹ تاروں کے سپارک کی طرح مسکرا کے بولے،

پتہ ہے، کس پہ پاؤں آنے لگا تھا۔
میں تو پہلے سے جانتا تھا،
مگر ان کی آنکھوں سے لگے جھٹکے سے بدک گیا۔
ایک دن فرصت میں ان کو جا گھیرا، کلاس میں تو پڑھاتے تھے۔
ذاتی باتیں، قصے، کہانیاں کم سناتے تھے۔ میں نے ان کے دفتر میں جا پوچھا،
سر۔ آخر کوئی تو کہانی ہوگی،
جو آپ نے ابھی کہی نہیں۔
لیکن وہ آپ کی ان کہیوں سے اکثر کہی جاتی ہے۔
بولے، جھنڈے کی بات کر رہے ہیں آپ؟
میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگے، بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گیا۔
بولے، پتہ ہے، کچھ جانتے ہیں آپ اپنے جھنڈے کی قیمت؟
میں سوچ میں پڑ گیا۔
قیمت سوچنے لگے آدمی تو، کرنسی نوٹ ہی ذہن میں آتے ہیں میرے ذہن کا رخ پڑھ کے بولے،
بتا تو کوئی نہیں سکتا،
ایک دو نہیں، کروڑہا لوگوں کی یہ مشترکہ آبرو ہے۔ لیکن مجھ سے حقیر بندے نے،
اپنے حصے کی جو اس کی قیمت ادا کی ہے، وہ اپنا پورا کنبہ ہے۔
جی؟
میں بیٹھا بیٹھا اچھل کے کھڑا ہو گیا۔
بیٹھ جایئے۔
وہ عجیب طرح کی سرشاری سے لبریز ہو کے محبت سے مسکرا کے بولے۔
تھوڑی دیر وہ چپ بیٹھے رہے، ان کے چہرے پہ مسکراہٹ کی لکیریں تھرکنے لگیں۔ ناک کے نتھنے ایکا ایکی میں پھڑ پھڑائے، ان کا دائیاں گال کپکپایا، گردن کی وریدیں لحہ بھر کو ابھریں اور انہوں نے ایک زور کا سانس اندر کھینچا، اور بولے۔
پینتیس لوگ تھے۔

سبھی کو قدرت ایک جگہ لے آئی تھی۔
سب ہمارے گھر جمع تھے۔
ہمارا گھر پاکستان کی راہ میں تھا۔
حصار کے گھر کی بات کر رہا ہوں، جو قریب کے رہنے والے تھے، وہ تو پہلے سے آئے ہوئے تھے، دور رہنے والے عزیز و اقارب بھی پہنچ گئے۔
بھوانی، گڑگاؤں، بدایوں، دلی اور لکھنؤ تک سے سب پہنچ گئے۔
ایک میرا بھائی تھا۔
وہ بولتے بولتے پھر رک گئے۔ رک کے رک کے مسکرائے، ان کی آنکھوں سے سسکیاں ابھریں، کہنے لگے، تمہاری عمر کا تھا، اٹھارہ سال سوا تین مہینے عمر تھی اس کی۔
ایک ماں تھی۔
انہوں نے پھر زور سے سانس باہر لیا، انہیں میرے بھائی کے بعد گولی لگی تھی۔ کوئی بیس پچیس منٹ بعد، میرا بھائی، ان کا جوان بیٹا ان کے سامنے تڑپتا مر گیا۔
آدھا صحن گھر کا میرے بھائی کے خون سے بھر گیا تھا۔
گردن میں گولی لگی تھی اس کے۔
ماں جی سینہ پیٹتی لپک کے باہر آ گئیں،
وہ تڑتڑ گولیاں برسا رہے تھے، ایک گولی ماں کے سر پہ بھی لگ گئی۔
کاش، ماں کو پہلے گولی لگ جاتی،
وہ اپنا بیٹا مرتا نہ دیکھتیں۔
وہ کہتے کہتے پھر چپ ہو گئے، اور اپنے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی پشت کو دانتوں میں دبانے لگے۔
میری بیوی بھی تھی۔
شادی کو چار سال ہوئے تھے۔
کم سنی کی شادی تھی۔ چھوٹی عمر کی تھی، بیوی سے زیادہ پریتم تھی،
چار سال کی کہانی ہیر رانجھا کی داستان سی ہے۔
وہ بھی مر گئی۔ انہوں نے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے چہرہ جھکا لیا، پھر ایکا ایکی ہاتھ ہٹا کے بولے، پتہ نہیں اس کے کہاں گولی لگی تھی۔
شاید بلم، چاقو کا کوئی گھاؤ لگا تھا اسے، وہ بیچاری ساڑھی کا پلو سنبھالتے سنبھالتے خون میں لت پت گر گئی۔
نازک سی تھی، پتلی سی، مر گئی۔
اس کی گود میں ہماری بچی تھی۔
دو سال کی۔
وہ پھر اپنے دانتوں میں اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت کا درمیانہ پوٹا بھینچ کے بیٹھ گئے۔ اسی طرح ہاتھ منہ میں لیے لیے بولے۔
توتلی توتلی زبان میں، ایک ایک لفظ کا جملہ کہتی تھی۔ اسے انہوں نے تھری ناٹ تھری سے مارا تھا۔

ان کا ہاتھ ایک دم سے یہ کہتے ہوئے جھٹکے سے نیچے گرا۔
اتنا بڑا دھماکہ ہوا تھا۔
پہلے انہوں نے میری بیگم کی گود سے بچی چھینی۔ بچی نے ایک چیخ ماری، اور بازو کھولے کھولے ماں کی طرف تکتی ہوئی دور ہوتی گئی، پھر انہوں نے اسے اٹھا کے فرش پہ پھینک دیا۔
اور پھر
فرش پہ گری ہوئی
ننھی سی دو سال کی بچی پہ تھری ناٹ تھری سے فائر کیا۔
دھماکہ تو ہونا تھا۔
ان کے چہرے کے پٹھے پھر لرزنے لگے۔
گردن میں سانس کی نالی میں جیسے کوئی کنکر آ گیا، ان کے سینے میں ہوا کو راستہ نہ ملا۔ انہوں نے پھر زور سے ایک سانس اندر کھینچا۔ پھر تھوڑی دیر سر جھکائے بیٹھے، اپنا سانس درست کرتے رہے، پیروں میں پہنے جوتوں کے کونوں کو آپس میں ملا ملا کے چھوڑتے رہے۔ پھر سر اوپر اٹھایا، اور بولے۔
اور بہت لوگ تھے، کنبے کے۔
میری خالہ تھیں۔
انکے میاں، میرے خالو۔
ان کا بیٹا،
ایک ہی بیٹا تھا ان کا، میرے چھوٹے بھائی جتنا۔
ایک ان کی جواں بیٹی۔
بس دو ہی بچے تھے ان کے
کوئی بھی نہیں بچا۔
ایک ان کی ہونے والی بہو تھی۔
وہیں میرے نانا تھے۔
ان کے بچے بھی۔
میرے ماموں۔
وہیں کہیں یہ ایک جھنڈا بھی تھا۔
بس یہ انہوں نے بچالیا۔
خود نہ بچ سکے۔
اک اک کر کے مر گئے۔
سارے مار دیئے انہوں نے۔
پورا گھر ان کی لاشوں سے بھر گیا۔

بھائی صحن میں ادھڑا پڑا ہے، ماں اس کی لاش پہ اوندھی گری ہوئی ہے۔
ڈیوڑھی میں بیوی کا جسم ساڑھی میں چھپا مرا پڑا ہے۔
دہلیز کے پاس بچی کے جسم کے لوتھڑے ہیں۔
ڈیوڑھی میں خالہ مری پڑی ہے۔
چار قدم پہ خالو کی لاش ہے۔
پاس ہی کہیں ان کے بیٹے، بیٹی اور بہو کی لاشیں ہیں۔
نانا ایک طرف گرا مرا ہوا ہے۔
کئی ماموں کٹے پڑے ہیں۔
پینتیس لوگ تمہیں کیسے گنواؤں، انہیں بولتے بولتے سانس چڑھ گیا۔
انہوں نے تیز تیز دو تین سانس لیے، پھر ایک گہرا سانس سینے میں بھر کے، اسے لرزتے ہوئے جھٹکوں سے لیتے ہوئے بولے۔
انہوں نے پھر لاشوں کو کھینچ کھینچ کے اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔
ایک دوسرے کے اوپر اناج کی بوریوں کی طرح مرے لوگوں کے ڈھیر لگا دیئے اور وہ سر سے پاؤں تک کچھ کچھ کہتے کانپنے لگے۔
کچھ دیر تک ان کا جسم کپکپاتا رہا،
کوئی بات انکے ہونٹوں پہ تڑپتی رہی۔
پھر ایکا ایکی ان کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔
ذبح ہوئے ہوئے قربانی والے جانور کی کوئی بچی ہوئی چیخ جیسی آواز میں وہ بولے۔
پھر، انہوں نے
انہوں نے ساری لاشوں پہ تیل چھڑک کے آگ لگا دی۔
شڑشڑ کر کے سب کے جسم جلنے لگے۔
میری ماں،
بھائی،
بیوی،
بچی
سب
میں خود انہی لاشوں کے انبار میں پڑا تھا،
پتہ نہیں کہاں کہاں زخم تھے۔
خون میں بھرا، بے ہوش، بے سرت پڑا تھا۔
کچھ جل گیا جسم میرا بھی۔
پتہ نہیں کب آگ بجھی،

کب میں اٹھا،
خدا جانے کیسے لاشوں میں پڑا سانس لیتا رہ گیا۔
بچ گیا۔
وہی جھنڈا اٹھا کے ادھر آ گیا۔
اب تم بولو، میں اس جھنڈے کو گرتا دیکھوں تو چیخ بھی نہ ماروں۔
کمرے میں خاموشی سناٹے کی طرح گونجنے لگی۔
نیو بلاک میں بنا، پروفیسروں کے دفتروں کے ہجوم میں ان کا چھوٹا سا کمرہ خاموشی سے بھر گیا۔
انہوں نے ایک دم سے اپنی کرسی ہلائی، میز کے قریب کی اور میز کے اوپر ایک کونے پر پڑے پیتل کے اسٹینڈ پہ لگے پاکستان کے جھنڈے کو آہستگی سے ہاتھ لگاتے ہوئے، بولے، اتنا سا جھنڈا تھا۔
پتہ نہیں وہ کہاں سے لے آیا تھا۔
یہ تو مخملی سے کپڑے کا ہے، وہ عام سے کپڑے کا تھا۔
پتہ نہیں کس کے دوپٹے سے پھاڑ کے بنایا تھا۔
سارا دن وہ اس جھنڈے سے کھیلتا رہتا، جدھر جاتا، جھنڈا ساتھ۔
اس پہ چاند تارا کاغذ کا لگا تھا، سفید کاغذ کا،
گوند سے چپکا ہوا۔
پتہ نہیں وہ بچہ کن کا تھا۔
انہی عزیزوں میں سے کسی کا تھا۔
سبھی قریبی رشتے دار تھے۔
سبھی اس بچے سے ایک جتنا پیار کرتے تھے۔
وہ بچہ بھی انہی لاشوں میں تھا۔
اتنی چھوٹی سی لاش تھی اس کی، کملائے ہوئے پھول جیسی
جب سب لاشوں کو آگ لگ گئی، تو اس بچے کا جسم بھی جلنے لگا۔
پہلے اس کے کپڑے جلے تھے۔
اس کا جھنڈا بچ گیا۔
اس نے جھنڈا اپنے قد سے اوپر کہیں دروازے کی کھونٹی میں پھنسایا ہوا تھا۔
وہ بچ گیا۔
خود وہ جل گیا۔
چھوٹا سا بچہ تھا،
برتھ ڈے کیک کی موم بتی جتنا
کسی نے پھونک بھی نہ ماری

سارا پگھل گیا۔
اس کی چھوٹی بہن پھونک مارنے آ گئی تھی۔
اس سے بھی چھوٹی بہن تھی۔
اسے پتہ نہیں لاشوں کے ڈھیر میں گرے کیسے ہوش میں آ گئی۔ ہوش تو تھوڑی تھوڑی مجھے بھی آگ لگنے کے بعد آ گئی تھی۔ مگر مجھ سے اٹھا نہ گیا۔
وہ بچی اٹھ کے اپنے بھائی کے پاس آ گئی،
بھائی کی لاش جل رہی تھی۔
بچی، ہاتھ مار مار کے بھائی کے کپڑوں کی آگ بجھانے لگی۔ آگ بجھاتے بجھاتے اپنی توتلی زبان میں کہنے لگی،
بھائی اٹھو،
اٹھ جاؤ
آپ کے کپڑوں کو آگ لگ گئی ہے۔
یہ کہتے کہتے، اس بچی کے کپڑوں کو بھی آگ لگ گئی۔ مٹی کا تیل تو پہلے ہی اس پہ انہوں نے چھڑکا ہوا تھا۔ وہ اگر بتی کی طرح چلاتی، چیختی گھومتی تڑپتی مر گئی۔
سارے مر گئے۔
میں پتہ نہیں کیوں بچ گیا۔
زخم تھے، جسم جلا ہوا بھی تھا۔
اسی شہر کے ہسپتال کے ایک کمرے میں پھر لٹا دیا گیا۔
مجھے یاد ہے، وہ رات،
وہ کچھ سوچ کے، میز پہ دونوں بازو ٹیک کے بیٹھ گئے۔ ہاتھ دونوں پھیلا کے انہوں نے اپنے چہرے کے دونوں طرف رکھ لیے اور بولے۔
چاندنی رات تھی وہ۔
وارڈ کے باہر کھلا میدان تھا۔
سارا میدان نظر آ رہا تھا۔
چاندنی اس میں کفن کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔
میرے بستر کے ساتھ، ایک کھڑکی تھی۔
کھڑکی سے سب نظر آتا تھا۔
اچانک باہر، کسی ٹرک کے آنے کی آواز آئی۔
پھر ٹرک کی ہیڈ لائیٹس چاندنی سے بھرے صحن پہ لہرائیں۔
تھوڑی دیر بعد ٹرک سامنے کے میدان میں آ کر کھڑا ہو گیا۔
عجیب ہیبت ناک سا لمحہ تھا وہ۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ وارڈ کے اندر اور باہر عجیب طرح کا سناٹا تھا۔
ٹرک رکا اس کا انجن بند ہوا تو خاموشی جسم میں ابلنے لگی۔
دو چار ہسپتال کے عملے کے لوگ ٹرک کے پیچھے گئے۔
کھڑک کر کے ٹرک کے پیچھے کا آہنی تختہ کھلنے کی آواز آئی۔
پھر خاموشی بڑھ گئی۔
ٹرک کی لائیٹس بند ہو گئیں۔
چاندنی دھیرے سے پھر کفن کی چادر لیے صحن میں آلیٹی۔
ہولے ہولے چاندنی کا منظر نظر آنے لگا۔
ٹرک کے پیچھے گئے، ہسپتال کے عملے کے لوگ، ٹرک کے اندر سے کچھ مردہ جسم اٹھا اٹھا کے زمین پہ لٹانے لگے۔
میرا سانس رکنے لگا۔
ایک ایک کر کے پوری پینتیس لاشیں انہوں نے چاندنی میں، کھلے آسمان کے نیچے لٹا دیں۔
میں پہچان گیا تھا۔
وہ میرا پورا کنبہ تھا۔
پھر میرے وارڈ کے کمپاؤنڈر نے بھی تصدیق کر دی وہ سب میرے کنبے کی لاشیں تھیں۔
میرا سارا کنبہ، میرا پورا خاندان ہسپتال کے مردہ خانے کے بند کمرے کے باہر کچی زمین پہ مردہ پڑا تھا۔
میری ٹانگوں میں مجھے سہارنے کی طاقت نہیں تھی۔
میں اٹھا نہیں۔
وہیں کھڑکی سے لگا، چپکا لیٹا رہا۔
پھر۔ وہ ٹرک بھی چلا گیا۔
وہ ہسپتال کے عملے کے لوگ بھی چلے گئے۔
وارڈ کے اکا دکا زخمی بھی سو گئے۔
بس ایک چاند میرے ساتھ جاگتا رہا۔ اسکی چاندنی مجھے جگاتی رہی جس کی کفن جیسی سفید روشنی میں میرے کنبے کی بے کفن لاشیں پڑی تھیں۔
اچانک، اس چاندنی میں، وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے، اور پھر دونوں ہاتھوں کو میز پہ رکھ کے اس پہ سر رکھ دیا۔ ان کے جسم میں، سر سے پاؤں تک پھر لرزا ابھر گیا۔ کچھ دیر تک ان کا بدن کپکپاتا رہا۔
پھر ہاتھوں میں اسی طرح سر دیئے ہوئے لرزتے سانسوں سے وہ بولے۔
ادھر باہر کوئی دیوار تھوڑی تھی۔
سب لاشیں میرے پیاروں کی کھلی پڑی تھیں۔
میری ماں،
میری بیوی،

بیٹی
میرا بھائی،
میرے سارے خاندان کے لوگ سب کے جسم میدان میں پھینکے ہوئے تھے۔ اوپر چاندنی تھی۔
اور کوئی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔
رات پتہ نہیں کتنی باقی تھی۔
اچانک،
ایک طرف سے کتوں کا پورا غول آ گیا۔
وہ سارے کتے میرے کنبے کی لاشوں کی طرف جا رہے تھے۔
پتہ نہیں،
کتوں کے لاشوں پہ پہنچنے سے پہلے میں بے ہوش ہوا یا بعد میں۔
صبح تک مجھے ہوش نہیں آیا۔
اگلے دن شام کو کہیں میرے اوسان بحال ہوئے تو مجھے بتایا گیا، کہ میرے سارے کنبے کے لوگوں کو ایک گڑھا کھود کے دفنا دیا گیا ہے۔
لو، میرے پیارے بیلا، یہ میری کہانی ہے۔ پروفیسر صاحب نے میز سے سر اٹھا لیا اور پھر میز پہ پڑے جھنڈے کے چاند تارے پہ ایسے پیار سے انگلیاں پھیرنے لگے، جیسے اس کے اندر اپنے سارے کنبے کے جسموں کا لمس ڈھونڈ رہے ہوں۔ پھر میری طرف سر اٹھا کے بولے، یہ آپ کیا سنتے سنتے نوٹس لے رہے ہیں!
میں نے کاغذ پہ قلم روک کے سر اٹھایا،
میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کے میرے لکھے لفظوں پہ مل گیا۔
کچھ لکھے لفظ پھیل گئے۔

☆☆☆

ڈرینج میں گرا ہوا قلم

احمد ہمیش

ایک دستاویزی سیاہ رات کی تاریخ ختم ہوتے ہی جب ہم صبح کو اٹھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو پیٹ کی روایتی خرابی ہمیں بستر سے ایک انچ بھی حرکت نہ کرنے پر بے بس کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ایک قلم دیا جاتا ہے کہ ہم اس سے آنے والی رات کا ویسا ہی من وعن پروگرام لکھیں، جو پچھلی دستاویزی سیاہ رات کا رہا ہوگا۔

ہمارے پیٹ میں ایک تیزابی مروڑ ہوئی۔ جلن کے ساتھ درد ایک خاص حصہ میں یکا یک رک گیا۔ یعنی اگر رکتا نہ تو کسی طرح باہر ضرور خارج ہو جاتا۔ درد اور گاڑھا ہو گیا۔ لیکن ہمیں پہلی بار انتہائی غصہ آیا۔ ہم نے قلم کو مٹھی میں بھینچ لیا۔

''ہم پروگرام میں تبدیلی چاہتے ہیں''۔ ہم نے سوچا۔

''قلم میں کتنی روشنائی موجود ہے؟'' سوال کسی مصروف کونے سے اٹھا اور اگلی مصروفیت کے رہرسل کے لیے تیار ہو گیا۔

یعنی سیاہی ابھی موجود ہے، رہرسل ممکن ہے۔

ہم نے مٹھی کی ابتدائی گرفت غصہ کے ردعمل میں بدل لی۔ قلم کو انگوٹھے اور اس کے ساتھ کی دو انگلیوں کے درمیان مضبوطی سے دبا لیا اور خود سے اعلان کیا کہ پہلے ہم تمام خراب پیٹوں کے نام ایک اہم مسودہ تیار کریں گے۔ سیاہ دستاویز سے بالکل مختلف۔ سارا عمل روشنی میں ہوگا۔

''لیکن عمل کا تعلق کس سے ہے؟'' کوئی بھی پوچھ سکتا ہے۔

کیا ان خودسر محبوباؤں سے، جو محض اپنے پیٹ کی خرابی کی بنا پر ہی ہمارے لیے تنگ ہوئیں حتیٰ کہ وہ مخالف ہوا، جوان کے پیٹ سے نکل کر باہر کھلی ہوا میں ملنا چاہتی ہوگی، دوبارہ انکے دماغ کی طرف پلٹ گئی۔ انہوں نے چہرے سکوڑ لیے، انکی آنکھوں کا رنگ بدل گیا۔ دراصل یہ سب کچھ ہمارے خلاف ہوا۔ حالانکہ اس سے ہمارے قلم میں کافی روشنائی تھی۔ کیوں کہ ہم اب بھی جو کچھ خارج کرتے ہیں، پھیل جاتے ہیں۔ ہم تو ان عورتوں کے پیٹوں میں بھی تنگ نہیں ہوئے، جب ہم ان میں دردزہ تھے۔ وہ عورتیں جو بے وقوف تھیں۔ کیوں کہ وہ مر چکی ہیں۔ لیکن ان کے پیٹوں کو ہم نے نہیں، ان کے شوہروں نے خراب کیا تھا۔

''ہم کسی مری ہوئی ذمہ داری کو جھیلنا نہیں چاہتے''۔ ہم نے یہ اعلان بنا مائیکروفون کے کیا تھا۔ سو، برا یہ ہوا کہ منہ سے نکلی ہوئی آواز دور تک نہ پھیل سکی۔ جب کہ ہم کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتے تھے، ہم کچھ بول بھی نہ سکے۔ اپنے ہی ہاتھوں کا بوجھ اپنے گرد زدہ چہرے پر رکھے، ہم ان سوالوں کا انتظار کرتے رہے، جو ہم سے کسی وقت بھی کیے جا سکتے ہیں (مطلب یہ کہ ابھی کئے نہیں گئے)۔

اس عمل میں ہم سوالوں کو تو سن سکتے ہیں لیکن سوال کرنے والے چہروں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے لیے ہمیں اتنا عرصہ درکار ہوگا جتنی دیر میں وہ چہرے ہمارا ضمیر بن جائیں۔

گویا ہمیں ضمیر کا سفر یاد ہے۔ اترپردیش کے ضلع بلیا میں ایک گھنی مگر کچی سڑک پر ہم نے جس گنوار کو جو اور مٹر کے ستو کے ساتھ اس میں تین گنی دھول ملا کر کھاتے دیکھا۔ اس کا کھردرا میلا چہرہ ہم سے پوچھ سکتا تھا کہ ہم اس کی طرح دھول خور کیوں نہیں بن جاتے۔

ہم دھول بھی نہ کھا سکے۔ ہمارے پاس سے بہت سی چیزیں اور عورتیں نکل گئیں۔ ہم انہیں پہچان بھی نہ سکے۔ ورنہ ہم سے وہ بیمار گدھا بدرجہا بہتر تھا، جس کی ٹانگوں کے بیچ میں ایک بڑا سا ناسور تھا اور جلد کی سیاہی ادھڑ ادھڑ کر ناسور کے بدگوشت کے

ساتھ جھولنے لگی تھی۔ وہ لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ ایسے میں ہمارا یہ سمجھنا لازم ہوگا کہ وہ اپنے آس پاس چرتے صحت مند گدھوں کی برابری نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی نسل نہیں پیدا کرسکتا۔ لیکن اس کے برعکس وہ ضرورت پڑنے پر صحت مند گدھوں کی بہ نسبت زیادہ ہی بہک جاتا ہے۔ اپنی نسل پیدا کرنے کے لیے دوڑتا ہے صحت مند گدھوں پر حملہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چھپی ہوئی توانائی جانے کیسے بدگوشت کے ڈھیر سے نکلتی ہے اور دوڑ کے نتیجے سے جا ملتی ہے۔

دھول خوار گنوار اور بیمار گدھا۔۔۔۔ یہ ہمیں، ہماری بساط سے کہیں زیادہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں ورنہ ہم تو مدتوں سے محض چوہوں کے محکوم ہیں اور اتفاق سے یہ چوہے بہت چالاک ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بہت پہلے ہی ہماری بساط معلوم کرلی تھی کہ ہمارا پیٹ کسی طرح بھی بھر دیا جائے بشرطیکہ ہم ان کی پہرے داری کریں۔

سو جنوبی شہر میں ہمیں چوہوں کی پہرے داری ملی۔ تب چوہوں کے دم برداروں نے کہا" چلو روٹی کا تو انتظام ہوا"۔

ہمیں بتایا گیا کہ فلاں چوہے کا فلاں بل ہے اور فی الحال ہمیں وہیں پہرے داری کرنی ہے۔

گویا ایک چوہا اس مرتبہ پر پہنچ چکا ہے یوں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ ائیر کنڈیشنڈ بل میں بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک قیمتی پنسل ہے، جسے وہ کتر رہا ہے اور اس کے پہلے سے کی گئی مینگنیاں میز پر پڑے کاغذ پر بکھری ہوئی ہیں۔ ہم اس کی میز کے پاس ہی کھڑے ہیں۔ جانے وہ ہم سے کب مخاطب ہو۔ اس کا بوڑھا چپراسی اس کے حکم کے ساتھ ہی "پانی لاؤ" پندرہ منٹ سے پرچ میں پانی کا گلاس لیے کھڑا ہے۔ بڑھاپے کی کمزوری سے اس کا ہاتھ کپکپا رہا ہے۔ لیکن چوہا اتنے انہماک میں مبتلا ہے کہ اس کو پندرہ منٹ سے پرچ میں پانی کا گلاس لیے کھڑا چپراسی نظر نہیں آتا۔ اگرچہ دم بردار اور ہم پاس ہی کھڑے دیکھ رہے ہیں کہ مبادا بوڑھے کے ہاتھ میں گلاس چھوٹ جائے لیکن سب مصلحتاً چپ ہیں۔ حسب عادت صاحب مرتبہ چوہے کا پیٹ خراب ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ مسودہ روشنی میں تیار کیا جائے۔

لیکن پہلے تو ہمیں خود بستر سے اٹھنا ہے۔ خود ہمارے پیٹ میں جو کچھ ہے اسے کہیں نہ کہیں خارج کرنا ہے اور ہمیں جو قلم دیا گیا ہے اسے پورے دن سے گذرنا ہے۔ ممکن ہو، قلم میں روشنائی موجود ہو۔۔۔ ہمیں شام سے پہلے ہی تمام خراب پیٹوں سے گذر جانا ہے۔

سوالوں کے انتظار میں ہم اس روایتی ضمیر سے مایوس ہو چلے ہیں۔ جس کی بنا پر ہم مسودہ ترتیب دینے میں خود سے آمادہ ہوئے ہوں گے لیکن سوال جب اپنے انتہائی لازمی کرب کے باوجود بھی ادا نہ ہوسکے تو اچانک ہمیں ادھورے رہ جانے کا احساس ہوا اور اس ناگہانی ادھورے پن میں ہمیں یہ اندازہ نہ ہوا کب بستر سے اٹھے۔ حالانکہ شہر میں کچھ دن سے پھر لاکھوں خراب پیٹوں کے پرانے ذخیروں کا مسئلہ سڑکوں پر دہرایا جا رہا تھا۔

"ذخیرے کہاں ہیں؟"

گوداموں میں جمع ہیں۔

"تو کیا لاکھوں لوگوں کی بھیڑ ان ذخیروں کو گوداموں سے باہر نکال لے گی؟" مسئلے کا دباؤ بہر حال ہم پر پڑتا ہے۔

آخر کچھ لوگ ایسے بھی تو ہیں جو پرانی خراب سہ سہ کر اس کے عادی ہوگئے ہیں۔ بلکہ ان کے کولہوں پر بار بار دہرائے ہوئے تجربوں کے نشان ہیں۔ وہ کئی کئی دن تک خالی پیٹ اپنے کولہوں پر ضرب جھیل سکتے ہیں۔ انکے چوگرد مطالبوں کی تختیاں لگی رہتی ہیں۔ وہ چلاتے ہیں کہ انہیں انکی گم شدہ غذاؤں کے ذخیرے سونپ دیئے جائیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جو بھی مطالبہ منظور نہیں کرتے وہ محض ضرب لگاتے ہیں۔ کانوں میں آوازیں نہیں بلکہ پھٹے ہوئے نرخرے سنائی دیتے ہیں اور ہم جبراً اس لیے سن لیتے ہیں کہ کل یہ بھی نہیں سنائی دیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس ملک کے لوگ صدیوں سے محض فضلہ ہیں، انہیں کسی طرح بحر ہند میں اٹھا کر پھینک دیا جائے۔ مگر کون

پھینکے گا؟ پھر یہ کہ ہم خود ٹریفک سے بچ بچ کر سڑک پر چل رہے ہیں اور یوں چلنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جس قدر ہم خود کو محفوظ سمجھنے کی غلط فہمی میں ہیں اتنے ہی تناسب سے ہم اپنی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں لوگوں کو بحر ہند میں پھنکوانے والے؟

نظامیہ دواخانہ کے پاس ہم رک جاتے ہیں۔ ہمیں یاد آتا ہے کہ پچھلے سال جب ہم اس شہر میں نئے نئے آئے تھے تو ہم نے لوگوں سے درخواست کی کہ ہمارے پاس بھی ایک قلم ہے لہذا ہمیں بھی پہچانا جائے۔ ہم خالی ہیں، ہمیں کچھ بھر دیا جائے۔ لوگوں نے ہماری درخواست منظور کی اور ہمیں مذکورہ دواخانہ کے ایک وارڈ میں داخل کرا دیا۔ اور یوں روٹی اور رہائش کا مسئلہ حل ہوا تو ہم نے بھی فاضل حکیموں اور روارڈ کے کارکنوں کو اچھی طرح یقین دلا دیا کہ ہم کون ہیں؟

ایک سال کا عرصہ کچھ زیادہ تو نہیں۔ دواخانہ کے کارکن تو ہمیں پہچانتے ہی ہوں گے۔ وہاں برآمدہ میں ایک فلش ہے اس سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے جب کہ میونسپلٹی کے بیت الخلاء عام طور پر خالی نہیں ہوتے۔ پھر وہاں خاکروب صفائی کے لیے تھوڑے سے پانی کے عوض پانچ نئے پیسے لیتے ہیں اور اتفاق سے اتنے پیسے بھی ہمارے پاس نہیں (گویا پیٹ خالی کرنے کے لیے بھی پیسے چاہئیں)۔ کم از کم دواخانہ کے فلش کے لیے تو ہمیں پیسے نہیں دینے پڑیں گے۔ ہاں ممکن ہے، کوئی کارکن اجنبی سمجھ کر ہمیں روکے۔ پھر بھی ہم بڑے اعتماد سے اسے پرانی جان پہچان یاد دلائیں گے۔ ہم اسے قائل کریں گے کہ ہم دراصل مسائل سے بس کچھ ہی دیر کے لیے بھاگ کر آئے ہیں، ہمیں پھر مسائل ہی میں شامل ہو جانا ہے۔

برآمدہ میں کوئی کارکن دکھائی نہیں دیتا۔ فلش کا دروازہ پہلے سے ہی کھلا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں نے کئی بار ڈریج کو استعمال کیا ہے۔ لوگ بڑی عجلت میں ہوں گے۔ شاید وہ فلش کی زنجیر کھینچ کر وہ سب کچھ بہانا بھول گئے، جسے ہم چاہیں تو بہا سکتے ہیں۔ سو، ہم زنجیر کھینچتے ہیں مگر فلش کام نہیں کر رہا ہے۔ ٹنکی میں محض پانی کے قطروں کے رک رک کر گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے، جس کا صاف مطلب ہے کہ پانی اپنی ایک مقررہ سطح تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ یا بار بار کے استعمال سے پانی بہت کم رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے ایک جانے پہچانے آسن کے سہارے ڈریج کے نشیبی سوراخ کا احاطہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

ہماری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہم جلد سے جلد فلش سے باہر نکلنا چاہتے ہیں کیوں کہ اس عرصہ میں غالباً کئی بار دواخانہ کے کارکن فلش کے دروازے کو کھٹکھٹاتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے، انہیں اختیار حاصل ہے یا انہیں پتہ لگ گیا ہے کہ ہم باہر سے آ کر فلش میں بغیر کسی اطلاع کے داخل ہو گئے ہیں۔ اس لیے انہیں اختیار ہے کہ پرانی جان پہچان کی پروا کیے بغیر ہمیں جبراً باہر نکال دیں۔ اس خوف کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہوئے ہم عجلت میں اٹھتے ہیں۔ اٹھتے ہی سر چکرانے لگتا ہے، ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں اور اچانک جیب سے قلم پھسل کر ڈریج کے سوراخ میں گر جاتا ہے۔ ہم بہت زور سے چلاتے ہیں، "افسوس ہمارا قلم!"۔۔۔آواز ہمارے سر میں چکرا رہی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اپنے اندر ہی چلاتے ہیں۔ آواز فلش سے باہر نہ جا سکی۔ یوں بھی دروازہ کے ساتھ فلش کی کھڑکیاں بھی بند ہیں۔ اب تک تو ہم اشتہاری مردی کے وہم میں رہے۔ لیکن باہر مسائل بہت طویل ہیں۔ ہم ان میں شامل ہوں تو کیسے ہوں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم خود سوراخ میں ہاتھ ڈال کر کسی طرح قلم کو ٹٹولیں اور اسے باہر نکال لیں یوں ہم سوراخ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھانک رہے ہیں لیکن قلم نظر نہیں آتا۔

بنا قلم کے ہم پھر ٹریفک سے بے ربط سڑک پر چلنے لگتے ہیں۔ اگرچہ موسم اور شہر کے درمیان ایک طرح کی تجارتی خنکی کا معاہدہ سا ہے۔ ایسے میں چالاک لوگ کافی فائدہ اٹھاتے ہیں کیوں کہ انہیں درمیانہ یا آہستہ رفتار سے چلنے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ٹریفک اس لیے بے ربط ہے کہ شہر کا مزاج صنعتی نہیں۔ بھیڑ تو محض اطمینان اور تفریح کی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ ہر حال میں مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اتنی کثرت سے کہ ہم شمار نہیں کر سکتے۔ معطل خاندانوں کی عورتیں آٹو رکشوں میں

سوار شہر کے پل سے دوسری طرف جارہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ انتہائی قیمتی ہو جائیں گی، فلاں ہال میں ساٹھ سال کا ایک فلاں بوڑھا، سامعین اور تماشائیوں کے سامنے اسٹیج پر اپنی عملی سوانح عمری دہرا رہا ہے۔ درجنوں دانشور ادیب اور اخبار نویس بڑے مزے سے اس کو اس وہم میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اس کی عمر پھر ایک بار پیچھے کو گھوم گئی ہے۔ نو جوان عورتیں چونک چونک کر اسے دیکھ رہی ہیں اور ہم جو خون کی کمی کی بنا پر یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے، حسد کے مارے اسے گالیاں دینے لگتے ہیں۔ مگر ہال میں جتنے لوگ بھی موجود ہیں ان کے چہروں پر فاضل رطوبت مل دی گئی ہے۔ گویا ملک میں کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سبھی تفریح میں مبتلا ہیں۔ تھری اسٹرز بار کے مقابل مین روڈ پر جو شانتا بائی مٹرنٹی ہوم ہے، اس میں دیسی زبان کے ایک ادھیڑ شاعر کی لڑکی کے پیٹ سے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اتفاق سے لڑکی کے شوہر کا باپ بھی دیسی زبان کا ادھیڑ شاعر ہے۔ دونوں ادھیڑ شاعر، مٹرنٹی ہوم کے گول برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ دونوں بہت خوش ہیں اور انہیں بدھائی دینے کے لیے شہر کے کئی دیسی زبان کے ادھیڑ بوڑھے شاعر وہاں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ منظر کچھ ایسا ہے کہ حقدار ہیجڑے اپنی حق تلف دیکھ کر واپس چلے گئے ہیں اور ہم تو ایسے ناکارہ ہیں کہ ہمیں ہیجڑوں سے بھی ڈر لگتا ہے۔

حالانکہ اس عرصہ میں ہم نے ڈریج صاف کرنے والے گاڑھے کپڑے کی ملگجی وردی پہنے کئی خاکروبوں کو راہ میں روک روک کر پوچھا کہ کیا ان میں سے کوئی ہمارا قلم ڈریج سے نکال سکتا ہے؟ لیکن ہر خاکروب ہمیں چونک کر دیکھتا ہے، بلکہ پاگل سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود جب ہم ان سے بار بار درخواست کرتے ہیں تو ان میں سے کچھ خاکروب ہم پر رحم کھا کر ہمیں اپنی یونین کے سکریٹری کے پاس لے جاتے ہیں۔ سکریٹری جو اپنے لباس سے کسی سیاسی پارٹی کا رکن معلوم ہوتا ہے، ہمیں سر سے پاؤں تک گھورتا ہے، ''فرمایئے؟''

یہ ایک ایسا انداز ہے جو ایک طرح کی تفریحی ناگواری ظاہر کرتا ہے۔ ایسے میں اگر ہم اس پر اصل واقعہ واضح کر دیں تو وہ ضرور ہمارا مذاق اڑائے گا۔ لہٰذا ہم فوراً طے کرتے ہیں کہ ہم اس سے عام باتیں کریں۔ مگر پتہ یہ چلتا ہے کہ وہ خود پہلے سے تیار ہے کہ وہ بھی کوئی خاص بات نہیں کر سکتا۔ اگر اس حد تک ہی ہمیں یہ علم ہو جائے کہ ایک بے ربط آبادی کے لاکھوں پیٹوں کا فضلہ صاف کرنے والے بھی پیٹ کے مسائل میں مبتلا ہیں تو ظاہر ہے ہمارا مقصد حل نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ہم میں آئندہ اپنے گم شدہ قلم کی خواہش بھی نہیں رہ جائے گی۔ کم از کم اتنا فرق تو باقی رہنا چاہیے کہ ہم اس کی ضرورت محسوس کریں، اسے تلاش کریں۔

سو ہم تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ کئی بار ہمیں، شہر کا مزاج بالکل ست کر دیتا ہے۔ ہمیں بھلا وا دیتا ہے کہ ہم ہر اس شے سے لاپروا ہو جائیں جس کا تعلق ہم سے ہو۔ اس کے باوجود ہم مصر ہوتے ہیں کہ اصل واقعہ کا دھیان جب تک باقی ہے، تعلق بھی باقی رہ سکتا ہے۔

ڈریج سیکشن کا انچارج فیصلہ دیتا ہے۔ ''ناممکن''۔

اسے معلوم ہے کہ واقعہ رونما ہوا، لیکن جس کے لیے ہوا، وہ ڈریج کے اختیار میں ہے۔

''تو کیا ہم اسے حاصل نہیں کر سکتے؟'' ہماری مایوسی میں تجسس باقی ہے، ڈریج کا انچارج محسوس کرتا ہے۔ ''فضول!''

مطلب یہ کہ اب کچھ باقی نہیں ہے۔ انچارج کا فیصلہ بہت حد تک درست ہوگا۔ کیوں کے اتنا تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ ڈریج لائن بالکل سیدھی جاتی ہے یوں جب لوگ پیٹ بھرنے یا پیٹ خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹیڑھی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہر موڑ پر مین ہول بناتے ہیں اور انہیں ڈھانپ دیتے ہیں۔ لیکن ڈریج کو عام طور پر کھلا رکھتے ہیں تا کہ ان کے پیٹ کی خرابیاں کہیں نہ رکیں۔ سیدھی لائن میں بہ جائیں شاید ہمارا قلم بھی ہمارے پیٹ کی خرابی ہوگا، جو سیدھی لائن میں بہ گیا۔ شاید مسودہ ترتیب دیتے ہوئے ہم نے ٹیڑھی تدبیروں سے کام لیا ہوگا۔

☆☆☆

آثار

احمد جاوید

دن پر دن بیتتے جاتے ہیں۔۔۔۔ جیسے صدیاں گذر گئی ہوں، حبس کا یہ موسم گذرتا ہی نہیں۔۔۔ نہ ہوا چلتی ہے نہ بارش برستی ہے۔۔۔ آسمان پر پھیلے ہوئے گرد و غبار پہ سارا دن بادلوں کا گمان ضرور رہتا ہے مگر رات ہو جاتی ہے کوئی پرندہ نئے موسم کا سندیسہ نہیں لاتا۔۔۔ پھر صبح ہوئی ہے۔۔۔ اوپر حد نگاہ تک آسمان گرد آلود ہوتا جاتا ہے اور نیچے پیلی میل خوردہ دھوپ سنولاتی جاتی ہے۔ دھول اسے اٹے ہوئے بادل افق در افق آسمان پر پھیلنے کے لیے بڑھتے آتے ہیں اور حبس پھیلتا جاتا ہے۔ دور چاروں طرف پہاڑیوں کے ہیولوں پر درختوں کی پرچھائیاں دھندلا گئی ہیں اور دھندلائے جاتے منظروں پر شام کا گمان کرتے پرندے قطار اندر قطار اڑتے جاتے ہیں اور کہیں دائرہ در دائرہ گردش میں ہیں اور بولتے جاتے ہیں۔

سنتے ہیں گرمیوں کے موسم میں ہوا ہلکی ہو کر آسمان کا رخ کرے اور بادلوں کی صورت دکھائی دے تو حبس میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔۔۔ وحشت بڑھ جاتی ہے۔ مگر بوڑھے کہ ان بیلوں کا مضبوط درختوں کے تنوں سے باندھ آندھی طوفان کے اندیشے میں مبتلا ہو جائے ہیں انہیں اپنے کچے گھروندوں اور بکھرے ہوئے کھلیانوں کا ڈر آ گھیرتا ہے اور اب میں دیکھتا ہوں دور ایک طرف آسمان کے کنارے زیادہ گدلانے لگے ہیں۔

موسم اسی طرح بدلتے ہیں، گرمیوں میں برسات اسی طرح ہوتی ہے اچانک بادل اُمڈتے ہیں پھسل جاتے ہیں برس پڑتے ہیں۔ ساون رت آتی ہے۔ جھولے پڑتے ہیں پھولوں کی مہکار ہوتی ہے۔ ناریاں گیت گاتی ہیں، پھوار جلترنگ بجاتی ہے۔۔۔۔ مٹیالے بادلوں سے کرنیں چھن چھن کر آتی ہیں تو آسمان رنگین ہو جاتا ہے۔ قوس قزح پڑتی ہے۔۔۔۔ مگر ہمیشہ یوں کب ہوا ہے۔۔۔ کبھی کبھی تو صرف گرد آلود ہوائیں چلتی ہیں۔ آندھی کی صورت۔۔۔۔ یا طوفان اٹھتے ہیں۔۔۔۔ میں نے برسات میں چھتوں کو بیٹھتے، دیواروں کو گرتے زمین بوس ہوتے بھی دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب سیلاب سے گلیاں بھر گئیں تو پانی میں بجلی کے کھمبوں کی بوسیدہ تاروں نے زہر بھر دیا۔۔۔ کواڑ بجتے سنے ہیں لوگوں کو چلاتے دیکھا ہے۔ ایسا سنا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔۔۔ میں کیسے یقین کر لوں مجھے طرح طرح کے اندیشے ہیں۔

کہتے ہیں موسموں کے بدلنے کی پرندوں کو پہلے سے خبر ہوتی ہے۔ ان کا بولنا اڑنا پھرنا سب بدل جاتا ہے۔۔۔ پھر ہر موسم کے اپنے پرندے ہیں۔ جب کوئی نیا پرندہ نمودار ہو موسم بدلتا ہے۔۔۔۔۔

جب کوئی پرندہ بولے اور مسلسل بولتا جائے۔ جب ڈربوں میں مرغیاں بدحواس ہو ہو کر اچھل کود کرنے لگیں۔۔۔

جب جانور اپنے طویلوں میں بے چین ہو جائیں رسہ تڑانے لگیں۔۔۔ کچھ ہونے والا ہوتا ہے۔۔۔۔

جب کچھ ہوتا ہے پہلے فضا بدلتی ہے۔ جب پرندے کسی مقام سے کوچ کرنے لگتے ہیں۔۔۔ زلزلہ آتا ہے۔ مقناطیس کا اثر سست پڑ جاتا ہے۔ زائل ہونے لگتا ہے۔ کشش ثقل میں خلل پڑتا ہے۔

جب فضاء میں سناٹا ہو، اور چاروں طرف چپ ہو جائے۔ ہوا پہلے سیٹیاں بجاتی آتی ہے پھر شور پڑتا ہے طوفان اٹھتا ہے۔۔۔ کوئی کوئی آدمی پہلے سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ باقی گھر جاتے ہیں۔۔۔ میں بھی سارے حواسوں سے کام لیتا ہوں مگر مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی۔۔۔ میرے لیے سب اجنبی۔ سب موسم، سب پرندے۔ اسی لیے تو میری اس بے خبری کو ہر روز اخبار کی حاجت

ہوتی ہے۔

مجھے سیاست سے کچھ دل چسپی نہیں اور نہ ہی سنسنی خیز خبریں میری توجہ کھینچتی ہیں۔۔۔۔ مجھے کیا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔۔۔البتہ صبح جب پورے طور پر جاگ اٹھتا ہوں اور کام کاج کو نکلتا ہوں اک نظر اخبار ضرور دیکھتا ہوں۔۔۔۔۔ میرے لیے ٹھہرے ہوئے رکے ہوئے موسم، درجہ حرارت کی کمی بیشی، آندھیاں، طوفان، بارشیں، سیلاب، زلزلے، گلیشیر اندیشے کا باعث ہیں۔۔۔بس اسی خیال میں رہتا ہوں اور موسم کی خبریں پڑھتا ہوں، اس سے زیادہ مجھے اخبار سے اور کچھ کام نہیں ہوتا۔۔۔ چاہے پیچھے گھر میں بچے اس کے ٹکڑے بکھیر کر ہوا میں اڑائیں اور کھیلتے پھریں یا بیوی پنکھا جھلتی رہے مجھے کچھ غرض نہیں ہوتی۔۔۔

ہاکر گلی میں داخل ہوتے ہی سائیکل کی گھنٹی بجاتا ہے۔ آواز لگاتا ہے۔ مگر آج میں گلی میں جھانکتا بھی ہوں تو دور تک اس کی کچھ خبر نہیں۔۔۔۔۔

صبح پھیلتی جا رہی ہے۔۔۔ چڑیوں کی چہچاہٹ میں اب کوئی سر تال نہیں کہ وہ الگ الگ ادھر ادھر منڈیروں پر اڑنے پھرنے لگی ہیں۔ دن اپنے آغاز پر ہے۔ سب جاگ اٹھے ہیں۔ میں چھت پہ کھڑا ہوں اور دھول اڑتی اوپر تک آتی ہے کہیں کسی گلی میں خاکروب جھاڑو دیتے ہیں۔۔۔ کسی پانی کے نل پر آوازوں کا شور ہے۔ لوگ پانی کے لیے بدحواس ہوئے ہیں۔ گھروں میں بچوں کے جاگنے اور بلکنے کی آوازیں ہیں اور مائیں انہیں پیار سے پچکارتی ہیں۔۔۔ فقیر صدا کرتے سنائی دینے لگے ہیں۔ ٹریفک کا شور آغاز ہو گیا ہے۔۔۔ دستکوں سے گھروں کے دروازے کھلنے لگے ہیں۔۔۔ پھر وہی منظر وہی آوازیں وہی لمحہ بہ لمحہ تپتا جاتا دن۔۔۔۔

کتنے دنوں سے ہوا نہیں چلی، بارش نہیں ہوئی۔۔۔ مجھے اس رکے ہوئے موسم سے وحشت ہوتی ہے۔۔۔ مگر اب بادلوں کے جمع ہونے پر ڈر بھی لگتا ہے۔

ہوا اب مکمل طور پر رکی ہوئی ہے۔۔۔ پرندوں نے درختوں پر بسیرا کر لیا ہے اور اب بہت چپ ہیں گویا سکون سے ہوں۔ درختوں پر سوکھے ہوئے ساکت پتے اپنے ہی زور میں ٹپ ٹپ زمین پر گرتے جائے ہیں حالانکہ کہیں دھوپ نہیں بادل بہت گہرے ہو رہے ہیں مگر حبس میں اضافہ ہوا ہے۔ میرا حلق خشک ہو چکا ہے کانٹے سے چبھتے ہیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم آئی ہیں۔ پیاس نے بے حال کر دیا ہے۔۔۔ مگر میں سنتا ہوں کہ گلیوں میں نوعمر بچوں نے اودھم مچا رکھا ہے کہ انہیں جھکے آئے بادلوں سے بارش کی امید ہے۔

توقع رکھا چاہیے کہ موسم بدلے گا۔۔۔ مگر میرے اندیشے۔۔۔

میں ہر سمت دیکھتا ہوں۔۔۔ مٹی سے لپی ہوئی چھتوں کی منڈیریں اور ممٹیاں۔۔۔۔ جھکے ہوئے چھجے، چوبارے اور بالکونیاں۔۔۔ مسجدیں گلی گلی اور انکے گنبد اور مینار اور ان پر چہار اطراف میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر۔۔۔ کھمبوں کی جھولتی ہوئی تاریں اور تاروں پر لٹکی ہوئی بوسیدہ پتنگیں اور مردہ کوے۔۔۔ گلیاں اور بازار۔۔۔ کارخانوں کی چمنیاں اور ان سے نکلتا ہوا دھواں۔۔۔ جوق در جوق مزدوروں کی ٹولیاں۔۔۔ کام کاج کو نکلے ہوئے آدمی، بچے سکولوں کو جاتے ہوئے اور اپنے اپنے دھندے پر بھکاری، لنگڑے لولے، اپاہج، صدا کرتے کشکول بجاتے۔۔۔ دھواں دیتی بسیں، رکشے، سائیکلیں، ٹیکسیاں اور چرچراتے ہوئے تانگے۔۔۔

میرے سامنے ایک زیر تعمیر عمارت کے مزدوروں نے قمیض اتار دی ہیں کہ گرمی بہت ہے۔۔۔ سبزی ڈھونے والوں کے سانولے چہرے کچھ اور سنولا گئے ہیں ماتھے کا پسینہ آنکھوں میں اور کلائیوں کا کہنیوں سے ہوتا زمین پر گرتا ہے۔ بابوؤں کی

قمیصیں پشت پر درمیان سے بھیگ رہی ہیں اور اردگرد سوکھے ہوئے پسینے کی پیلاہٹیں ہیں۔ جو ننگے سر ہیں وہ تو عذاب میں ہیں۔ جنہیں چھتریاں بھی میسر ہیں وہ بھی کلائیوں سے پسینا پونچھتے ہیں۔ گھروں میں سودا سلف لینے نکلی ہوئی عورتیں دکانوں کے چھجوں تلے بچوں کو دوپٹوں کے پلو جھلتی ہیں۔ تانگوں کی گھوڑیاں ہانپتی ہیں اور گائے بھینسوں کو ہانکتے گوالے نہروں اور نالوں کی سمت جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ پانی فروخت ہو رہا ہے۔

آسمان کے کناروں پہ بادل کہیں بھورے، کہیں سرخ اور کہیں زردی مائل ہیں مگر عام طور پر رنگ مٹیالا ہے۔۔۔ درمیان میں البتہ جس طرح سیاہ بادل اکٹھے ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے فضاء بوجھل ہو رہی ہے۔۔۔

بچوں کا اودھم بڑھتا جاتا ہے۔ انہیں نہانے پانی اچھالنے اور شپ شپ کرتے پھرنے کی آس ہے۔ بوڑھے اپنی مندی آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے آسمان کو دیکھتے ہیں گمان تو انہیں بھی ہے مگر تذبذب میں ہیں۔۔۔ باقی سب اپنے اپنے کام میں لگے ہیں سر نہیں اٹھاتے۔۔۔

میں دیکھتا جاتا ہوں اور بادل گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا سا ہے کہ بڑھتا آتا ہے یوں کہ جیسے جاڑے کی شام ہو، بادل اتنا جھک آئے ہیں کہ ان کا برسنا لازم ٹھہر گیا ہے۔۔۔ میں محسوس کر سکتا ہوں کہ اگر یہ جھکے ہوئے لدے ہوئے بادل برسے تو کتنا برسیں گے۔۔۔ جل تھل ہو جائے گا، پھر ٹھنڈی خنک ہوا چلی تو شاید اک ذرا سی کپکپاہٹ بھی ہو کہ ساون میں کسی کسی روز ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔ میں سوچتا جاتا ہوں۔ اور اکا دکا بوند پڑنا شروع ہوتی ہے۔ بس ویسے ہی بڑے بڑے قطرے جیسے برسات میں پڑتے ہیں۔ ادھر ادھر زور زور سے ٹپ ٹپ کرتے آتے ہیں اور مینا کاری کرتے جاتے ہیں۔۔۔ یک لخت سماں بدلنے لگا ہے۔

ہوا تو ابھی چلنا شروع نہیں ہوئی۔ مگر خنکی سی ہوتی جاتی ہے۔۔۔ تبدیلی کا احساس پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔ حبس ٹوٹ رہا ہے۔۔۔ جیسی اس موسم میں گرمی پڑی تھی اور جیسا حبس رہا ہے۔ اب ویسی ہی شدت نئے موسم میں ظاہر ہونا ہے۔ میں سن رہا ہوں لوگ ایک دوسرے کو پکارتے خبردار کرتے ہیں۔ ایسی چیزیں جو بھیگ کر خراب یا تباہ ہونے والی ہوں، اٹھانے، کھینچنے گھسیٹنے سائبانوں تلے ڈالنے کی آوازیں سنائی دینے لگی ہیں۔ گویا موسم بدلنے کا یقین ہوتا جاتا ہے۔۔۔ بالآخر ایسا ہونا تھا۔

موسموں کو تو بدلنا ہی ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی رت طول پکڑ جائے تو بس یونہی بے یقینی سی ہونے لگتی ہے جیسے سب کچھ ٹھہر گیا ہو اور کبھی نہیں بدلے گا۔

موسم بدل رہا ہے بارش ہونے لگی ہے دور سے ہوا سیٹیاں بجاتی آتی سنائی دینے لگی ہے۔۔۔ بہت ہی دور ایک طرف آسمان کے کناروں پر گرد و غبار اور دھول کے بادلوں میں حرکت ہے۔۔۔ تنکے اور گھاس پھوس ادھر سے ادھر تیرتے دکھائی دینے لگے ہیں۔۔۔

وہاں سے اٹھتا اک شور قریب بڑھتا آ رہا ہے جہاں بادل زیادہ جھکے ہوئے ہیں۔ سرمئی مٹی دھول ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ کواڑ بجنے لگے ہیں۔۔۔ کھڑکیاں، دروازے، سائن بورڈ کھڑکھڑاتے ہیں۔۔۔ ٹہنیوں کے ٹوٹنے، درختوں کے گرنے جڑوں سے اکھڑنے کی آوازیں ہیں اور آوازیں ہیں پرندوں کی جو غول در غول پھڑ پھڑاتے سیدھے آسمان کی طرف ہوا کے زور پر بلند ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ اور پتوں کا انبار ہے جو بگولوں کے ہمراہ ہے۔۔۔ بگولے گلیوں میں گھس آئے ہیں۔ مکانوں کی منڈیریں اور ممٹیاں ہوا کی پھیر میں آ گئی ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے طوفان میں شدت آتی جا رہی ہے۔ ہوا کے جھکڑ زوروں پہ ہیں کچھ گرنے ٹوٹنے منہدم ہونے کی

آوازیں ہیں۔ کچھ دیر تو بچوں کا اودھم سنائی دیا تھا اب چیخ و پکار ہے اور چیخ و پکار ہے بارش کی تیز بوچھاڑ کی جوٹین کے دروازوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کی طرح پڑتی ہے۔ ساون آغاز ہوتا ہے مگر آدمی بدحواس ہو گئے ہیں سب جائے اماں کی تلاش میں ہیں۔ یہ دفعتاً کیا ہونے لگا ہے۔

یہ کیسی برسات ہوئی ہے کہ پل دو پل میں جل تھل ہو گیا ہے۔ گلیاں پانی سے بھر گئی ہیں جو بوسیدہ تھیں وہ دیواریں تو ہوا اپنے زور پر زمین بوس کر گئی ہے۔ باقی بارش کی زد میں ہیں۔ پلستر اکھڑ رہا ہے۔ مٹی گارا بہہ رہا ہے۔ جیسے سیمنٹ تو کہیں تھا ہی نہیں۔۔۔ پختہ عمارتیں بھی اب تو ریت کے گھروندوں کی طرح چپ چاپ بیٹھتی جا رہی ہیں۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں ایک سمت سے دوسری سمت تک منظر بدل گیا ہے۔۔۔ جیسے یہاں کبھی حبس تھا ہی نہیں دھوپ تھی ہی نہیں۔۔۔ جیسے ہمیشہ سے آندھی ہے طوفان باد و باراں ہے۔۔۔ مکان گر گئے ہیں۔۔۔ مسجدوں کے مینار شہید ہو گئے ہیں۔۔۔ بجلی کے کھمبے ادھر ادھر زمین پر جھک آئے ہیں۔۔۔ میں دیکھتا ہوں مویشیوں کے اکڑے ہوئے مردہ جسم اور آدمی سر بگریباں اپنے پیاروں کو پکارتے ملبوں کے ڈھیر پر ماتم کناں اور حیران ہوتا ہوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو حبس تھا اور اب پانی ہے کہ سب کو بہائے لیے جاتا ہے۔۔۔ دریا بھی جوش میں کنارے توڑ آیا ہے اور اب گلیوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہے۔۔۔ شہر کا شہر پانی کی لہروں پہ تیرتا ڈولتا تیزی سے کسی انجانی منزل کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے۔ میں مبہوت ہوں کہ ایک ہی پل میں یہ کیا ہو گیا ہے۔

ہراساں و پریشاں ادھر ادھر دیواروں سے ٹکراتا بالآخر سیڑھیوں کی طرف جاتا ہوں۔ صحن میں آتا ہوں گلی میں نکلتا ہوں۔۔۔ گلی میں ہاکر کی سائیکل آندھی اور طوفان کی طرح آتی ہے وہ پل بھر کو میرے پاس رکتا ہے اور پھر اخبار اچھالتا آواز لگاتا گذرتا چلا جاتا ہے۔۔۔ اسکی آواز چاروں طرف پھیلتی ہے۔''امید رکھنا چاہیے کہ موسم بدلے گا کہ کچھ آثار بھی ہیں۔۔۔'' ۔۔۔ میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر ادھر ادھر لوگوں کو لیکن لوگ اپنے اپنے کام میں لگے ہیں۔ پسینہ بہہ رہا ہے مگر سر نہیں اٹھاتے۔۔۔

☆☆☆

شہید

احمد داؤد

درد اچانک شروع ہوا جیسے درد شروع ہوتا ہے۔

بے وقت بے موقع بغیر اطلاع و اشارے کے، اچانک اس کے بدن میں ایک لہر سی اٹھی جیسے روح کی طنابیں کھینچی جارہی ہیں اور بدن رہائی چاہتا ہو۔ لیکن ابھی رہائی کا وقت نہیں ہوا تھا کہ یہ سزا کی گھڑی تھی اس گھڑی اس نے مجھے پکارلیکن آواز حلق سے بمشکل لبوں تک پہنچی کہ دل کے دائیں طرف نیچے پسلیوں کے آس پاس چھپے درد نے ایک چھلاوے کی طرح جست لگائی آواز کو دبوچ لیا نہ جانے کتنی دیر تک وہ بے سدھ پڑا ہانپتا رہا چند سانس سینے کی کال کوٹھری میں جمع ہوئے تو اس نے دکھتی جگہ پر ہاتھ رکھ کر پھر پکارا اس کی نحیف ونزار آواز سسک سسک کر کمرے کی حد پار کر کے چھت تک آئی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے بہت دور سے بہت گہرائی سے میرا نام لیا ہو مجھے گمان گزرا کہ جیسے میں نے خود کو پکارا ہے کہ کبھی کبھی میں اپنے ہونے کی تصدیق کرنے کے لیے اپنا نام لیتا ہوں اور پھر اثبات میں سر ہلاتا ہوں۔ اس وقت بھی میں نے سر کو جنبش دی کہ ایک مرتبہ پھر شک میں بھیگی ہوئی صدا نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

میں سونے سے پیشتر چھت پہ تھوڑی دیر کے لیے ٹہلتا ہوں کہ یہ میری عادت ہے مجھے بند دروازوں، کھڑکیوں اور روشندان کے پیچھے جلتی بجھتی روشنی دیکھنے اور آوازیں سننے کا شوق ہے۔ اس کے علاوہ سامنے والے پل سے گزرتے ان لوگوں کو دیکھنا بھی مجھے پسند ہے جو سینما کا آخری شو دیکھ کر آرہے ہوتے ہیں وہ مجھے بھلے لگتے ہیں پل کے ایک سرے پہ لگے بجلی کے اکیلے کھمبے کی ناکافی روشنی میں سڑک کھلے تھان کی طرح پھیلی نظر آتی ہے۔ سینما کے آخری شو کے تماشائی اس رسہ پر سے گزرتے وقت مجھے بہت لبھاتے ہیں فلم کے مکالمے بولتے۔ ایک دوسرے کو چھیڑتے اور اونچی صداؤں میں گیت گاتے جب وہ پل سے گزر رہے ہوتے ہیں تو فلم کا ایک نامکمل سین بن جاتا ہے اس دوران جب کبھی کوئی رکشہ یا ٹیکسی ان کے قریب سے گزرتی ہے تو روشنی اور شور کے بے ہنگم پن میں ان کے سائے مجسم ہو جاتے ہیں مجھے یہ لوگ ایسی فلم کے ایکسٹرا کردار نظر آتے ہیں جو کبھی مکمل نہیں ہوگی جونہی تماشائی گذر جاتے پل ڈولی اٹھنے والے گھر کی طرح اداس ہو جاتا ہے تب میں واپس مڑتا ہوں اور اپنے کمرے میں آکر سو جاتا ہوں۔ لیکن آج بہت کم تماشائی تھے لوگوں نے نہ جانے کیوں آخری شو دیکھنا کم کر دیا ہے مجھے صرف ایک رکشہ تیزی سے سڑک پہ دوڑتا پل کراس کرتا نظر آیا۔ اور پھر ایک ٹیکسی زن سے گزر گئی شاید اسٹیشن کی طرف جانے والے مسافر لے جارہی تھی۔ تھوڑی دیر تک پل تنے رسے کی طرح اکیلا دکھائی دیا اور پھر دو آدمی موڑ سے ظاہر ہوئے ان کی اونچی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے انہوں نے چھیرے کے خوف سے بچنے کے لیے بلند آہنگی کا سہارا لے رکھا ہو۔ جونہی وہ دونوں پل پار کر کے سڑک کے آخری موڑ پر اوجھل ہوئے ایک بیکراں مشکوک سناٹا سا پھیل گیا۔ اس تہہ در تہہ پل کی مشکوک خامشی میں اس کی فریاد میرے نام کا سہارا لیے مجھ تک پہنچی تو میں جلدی سے پلٹا دل میں وسوسوں کے انبار لیے نیچے کی طرف دوڑا سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

سامنے وہ پڑا تھا۔

اس کا آدھا دھڑ بستر سے نیچے لٹک رہا تھا ایک ہاتھ سینے کے نیچے پسلیوں کے آس پاس کے ماس میں پیوست تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے فرش کی ٹیک لے رکھی تھی۔

''سعدی'' میرے منہ سے چیخ نکلی۔
اس نے لاچار نگاہوں سے مجھے دیکھا، بمشکل لب ہلائے۔
''در۔۔۔درد۔۔۔میں مر رہا ہوں''۔
میں نے پہلو میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا بستر پہ سیدھا لٹایا۔ اس کی پھٹی ویران آنکھوں میں کوئی ڈوب رہا تھا۔ میں یا وہ خود یا ہم دونوں بس ایک چیز تھی جو اس کی گہری پرکشش آنکھوں کی تہہ میں اتر رہی تھی۔
''سعدی! کیا ہو گیا ہے سعدی اللہ خیر کرے گا''۔
جواب دینے کے لیے اپنا احوال بتانے کے لیے اس نے اپنے ہونٹ ہلائے مگر کراہوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔ سیخ میں پروئی ہوئی آنکھوں نے میز پہ رکھے گلاس کا رخ کیا تو میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پانی بھرا ہوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کے چند قطرے کسی ٹھوس شے کی طرح اس کے حلقے سے اترے تو ایک عجیب سی آواز ابھری جیسے کوئی کنکر سوکھی شاخ سے ٹکرایا ہے۔
اس درد کی کہانی نرالی ہے۔ ڈاکٹروں نے آخری مرتبہ دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ اپنڈکس کا کوئی اعتبار نہیں کب پھٹ جائے آپریشن کرالو۔ اس نے حامی بھرلی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ خطرے سے قبل خطرے کا سدباب خطرہ ختم کر دیتا ہے اس نے میری بات کی تائید کی تھی اور کہا تھا جونہی فرصت ملے گی اپنے بدن کی اس فالتو ناڑ سے نجات پالوں گا اور اب اس وقت رات کے اس پہر اچانک درد نے اس کے بدن پر شب خون مارا۔
''سعدی۔ اٹھو جلدی کرو۔ ہسپتال چلتے ہیں''۔
میں نے کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر سے نیچے اتارا پاؤں میں سلیپر پہننے کی کوشش میں کئی مرتبہ وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن اذیت سے نجات کی آرزو نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔
باہر گلی میں رات اپنے جوبن پہ تھی۔ چاند کی پندرہویں تھی اور ہم تھے یا پھر ایک پراسرار مشکوک سناٹا۔ اسے میں نے اپنے ساتھ ایسے لپٹا رکھا تھا کہ ہمارا سایہ ایک اکائی بن گیا۔ چاند کی روشنی میں اپنے قدموں کے پاس اس سائے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے میں نے اسے اوڑھ لیا ہے وہ میرے وجود کے تابوت میں ایک لاش کی طرف فٹ آ گیا ہے پتہ نہیں کہ کس طرح وہ مجھ سے جڑا گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا سنسان گلی سے گزر کر جب ہم پل پہ پہنچے تو میں نے پکارا۔
''سعدی درد ہو رہا ہے۔ اب بھی''۔
اس نے تشکر میں بھیگی نظروں سے مجھے تکتے ہوئے لبوں کو دانتوں تلے دبایا سسکاری روکی اور رک رک کر بولا۔
''یہ۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔یہاں کوئی شے پھٹ رہی ہے۔ خدا کے لیے یہاں دباؤ میں۔۔۔۔۔۔ میں ہم مر، مر، مر۔۔۔''
میں جانتا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ مگر لاچار ہے۔ اس وقت بے آباد سڑک پہ کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی پٹڑی پہ کسی انجن نے سیٹی بجائی تو میں نے بے دھیانی میں مڑ کر دیکھا دور تک پھیلی اجلی چاندنی میں ویران سڑک پر اکلاپے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔
''ابھی ہسپتال پہنچ جائیں گے سب ٹھیک ہو جائے گا''۔
''بہت مشکل ہے میری جان نکل رہی ہے اف خدایا۔ کوئی چیز اندر ٹوٹ رہی۔۔۔سس۔۔۔سریا مارا جا رہا ہے۔ کوئی اندر ہی اندر میں مر رہا ہوں یہاں اس جگہ۔۔۔؟''

اس نے کراہ کر بدن ڈھیلا چھوڑا اور میرے ہاتھوں سے پھسل کر سڑک پہ گرنے لگا کہ میں نے اسے کلاوے میں بھر لیا۔
وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ اس نے جس توانائی کے ساتھ زندگی گزاری تھی اسے یاد کر کے مجھے اس کی موجودہ حالت پہ رونا آ رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کے بعد تسلی کے لفظوں کو اپنے لباب سے بھگویا، سینے میں پھیلی رقت پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔
''سعدی یار، حوصلہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ ابھی ہسپتال پہنچ جائیں گے میں تیرے ساتھ ہوں''۔
اس نے درد کی جگہ کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔
'تت۔ تم، ہاں، تم میرے ساتھ ہو لیکن میرا اپنا ساتھ چھوٹ رہا ہے''۔
''سعدی یار حوصلہ کرو۔ کچھ نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا''۔
پل ہمارے وجود سے آباد ہو چکا تھا۔ اس کے ایک سرے پہ لگے واحد بجلی کے کھمبے کی ناکافی روشنی میں ہم شرابیوں کی طرح گزر رہے تھے۔
''کوئی سواری نہیں۔ ہسپتال بہت دور ہے میں مر رہا ہوں۔ یہاں ہاتھ رکھو دباؤ خدا کے لیے اف، مجھے واپس لے چلو۔ میں، میں، مر مر مر'' جونہی لفظوں نے ساتھ چھوڑا کراہوں نے آواز کی صورت پکڑ لی اور تہہ در تہہ مشکوک سناٹے میں اس کی سسکیاں چابک کی طرح شونک رہی تھیں۔ ان آہوں کا خاتمہ اسوقت ہوا جب دور سے آتی رکشہ کی آواز ہمارے قریب آ کر بڑھ گئی۔
زندگی میں پہلی مرتبہ رکشہ کی کرخت بھری آواز نے مجھے لبھایا۔ میں نے لپک کر اسے رکشہ میں ڈالا اور خود اسکے پاس سمٹ کر بیٹھ گیا۔
''ہسپتال چلو۔ جلدی کرو''
رکشہ والے نے پلٹ کر دیکھے بغیر سپیڈ پکڑ لی۔ میں نے بجلی کے اکلوتے کھمبے کی ناکافی روشنی میں رکشہ والے کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ سفید باریش چہرہ سر پہ رومال اس کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہ آیا وہ بت کی طرح ہینڈل پہ ہاتھ جمائے بازو کھولے بیٹھا تھا۔ صرف ہاتھوں کی خفیف حرکت سے احساس ہو رہا تھا کہ اسے ہسپتال پہنچنے کی بہت جلدی ہے۔
اچانک سعدی ایک طرف کو دھرا ہو گیا۔ اس کا چہرہ درد کے مارے سکڑ کر اس کپڑے کی طرح ہو گیا جسے بھگو کر نچوڑنے کی کوشش کی گئی ہو طویل سانسوں اور اذیت بھری ہچکیوں کے درمیان اس نے بولنے کی کوشش کی۔
''بہت مشکل ہے پہنچنا۔ میں مر رہا ہوں تم میری ماں کو ابھی مت بتلانا۔ آہستہ آہستہ اسے خبر کرنا ورنہ وہ اجڑ جائے گی۔ خط لکھ دینا میری بیماری کا اچھا اور، اور پونم کو بھی اسے میں نے کل کا وقت دے رکھا تھا۔ معذرت کر دینا کہنا میں مصروف ہوں۔ مرنے کی خبر نہ دینا۔ اس نے بھی کہا تھا آپریشن کرا لو۔ لیکن۔ اب۔ اب کیا ہو سکتا۔۔۔
''سعدی ہوش کرو۔ تم بالکل ٹھیک ہو''۔
اس نے اپنے ہونٹ میرے کان سے لگا رکھے تھے۔ دونوں ہاتھ درد والی جگہ پر بدستور جمے ہوئے تھے اور آدھا دھڑ میری گود میں تھا میرے کانوں میں اس کی سرسراہٹ جاگی۔
''دفتر سے میں نے ایڈوانس لیا تھا سات سو میرے جی پی فنڈ سے واپس کر دینا پونم کے لیے کمرے میں میز کی دراز میں ایک گھڑی رکھی ہے بخشی لایا تھا جج سے یاد ہے نا۔۔۔''

وہ گھڑی پونم کو دے دینا۔ ایک آدھ دن باندھ لے گی بعد میں تو اسے پتہ چل جائے گا اور بخشی کو کہنا میں اسے یاد کر رہا تھا ادھر کمرے میں میرے تکیہ تلے جائے نماز رکھی ہے وہ بھی بخشی لایا تھا۔

میری اماں کو بھجوا دینا یار۔ بخشی بہت اچھا ہے۔ میرے بعد ملتے رہنا۔ پونم کو مت بتانا تمہیں دیکھ کر اسے میں یاد آؤں گا اداس ہوگئی ہے ناں۔

آنسوؤں کے قطرے میرے گالوں سے بہتے، لبوں تک آئے تو میں نے چادر سے زبان باہر نکال کر انہیں سنبھالا اور ان کی نمی سے اپنی آواز کو تر کیا۔

''سعدی یار۔ میرے بانکے۔ مت کر ایسی باتیں تم بالکل ٹھیک ہو ہم ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا ایک منٹ کی بات ہے''۔

اس نے گہری سانس لے کر اپنا سر چھاتی سے ٹکا دیا۔ اور درد والی جگہ کو پوری قوت سے دباتے ہوئے بدن کے تناؤ کو آخری حد تک پھیلا دیا۔ ابھی اس نے نہ جانے درد کے ساتھ کتنی دیر آنکھ مچولی ہونا تھی کہ اچانک رکشہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔

سامنے چوراہے پر پولیس کا پہرا تھا۔ چاروں سڑکوں کو ڈرم رکھ کر ٹریفک کے لیے بند کر دیا تھا۔ اکا دکا کھڑی گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی تھی ایک کونے میں بنے کھوکھے کے سامنے اسٹور میں جلتی آگ پہ چائے کی دیگچے رکھے تھے۔ اور قریب ہی ایک بوڑھا شخص سگریٹ کا چھابہ لیے بیٹھا تھا۔ چوراہے کے عین وسط میں ایک بھورے رنگ کی کتیا اطمینان سے نیم دراز اپنے پلوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ جس سڑک سے ہم آئے تھے اس کے سامنے چوک پر رکھے ڈرموں کے پاس کھڑے سپاہیوں نے کرسیاں اور چارپائیاں بچھا رکھی تھیں۔ سپاہی چارپائیوں پہ نیم دراز، کرسیوں پہ بیٹھے اور چوراہے میں ٹہلتے بہت غیر مانوس اور پرائے لگ رہے تھے۔

ہمیں رکشہ کی پچھلی سیٹ پہ نیم دراز دیکھ کر ایک سپاہی نے ٹارچ کی روشنی اندر پھینکی اور بولا۔

''ہونہہ، پی رکھی، باہر آؤ''۔

''میرا دوست ہے۔ بیمار ہے، بہت سخت''۔

سپاہی نے بے یقینی سے دوبارہ اندر جھانکا اور پھر ٹارچ پتلون کی بیلٹ میں اڑس کر بولا۔

''زیادہ پی کر بندہ بیمار ہو جاتا ہے۔ باہر نکلو۔ میاں صاحب ادھر گوریلوں کے بجائے نشئی ہیں''۔

اس کی پر جوش تیز آواز سن کر سپاہی بھڑوں کی طرح رکشہ کے چاروں طرف پل پڑے۔

''کون ہے باہر نکلو''۔

میں نے بہت دشواری کے ساتھ رکشہ سے باہر جھانکا متعدد چہروں میں ایک ہمدرد چہرے کی خواہش لیے باری باری انہیں دیکھا اور پھر مایوس ہو گیا۔

''میرا دوست ہے اسے درد ہے ہسپتال جا رہے ہیں ہم''۔

صحیح صحیح بتاؤ کیا چکر ہے۔ ادھر کر و منہ سونگھاؤ ہاں ذرا زور سے سانس باہر نکال نا۔ پی کر اوپر کیا کھایا ہے کہ بو مر گئی ہے۔ اوئے اس دوسرے کی حالت دیکھو نشہ میں دھرا ہو گیا ہے۔

اس لمحہ سعدی کے منہ سے ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی رکشہ کے گرد کھڑے سپاہی یہ غیر انسانی صدا سن کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

''خدا کے واسطے جانے دو۔ یہ مر رہا ہے یہ مر رہا ہے''۔

''میرا خیال ہے کوئی اور ڈرامہ ہے۔ شناخت کراؤ اپنی جلدی کراؤ شناخت''۔

ان گنت یکساں چہروں اور آوازوں میں ایک آواز ابھری اور پھر اپنے سوال کے جواب کے لیے ہمارے اوپر تن گئی۔
''شناخت'' میں بے بسی سے بولا۔ ''ہماری کوئی شناخت نہیں ہے''۔
''کوئی ماں باپ آگے پیچھے۔ اتنی رات گئے گھوم رہے ہو۔ پتہ ہے ادھر گوریلا آئے ہوئے ہیں''۔
''یہ مر رہا ہے درد سے خدا کے لیے ہسپتال جانے دو''۔
میری آواز روتے بچے جیسی بن گئی۔ سارا بدن غصہ کی شدت سے کانپنے لگا۔
''اوئے رو رہا ہے اتنا بڑا ہو کر اچھا ادھر ہو''۔
ان گنت یکساں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ آگے بڑھا۔ ہم دونوں کے جسم ٹٹولنے کے لیے اور پھر بغلوں، چھاتی، نیفے کے نیچے کے ممنوعہ حصے اور پنڈلیوں کو جھٹکوں نے جھنجھوڑ ڈالا۔
''خالی ہیں رکشہ والے کا نمبر نوٹ کر لو''۔
میں نے اپنی گلوگیر آواز میں رکی رکی سسکیوں میں رکشہ کے چلنے کی آواز سنی اور چند لمحوں کے لیے سعدی بیگانہ ہو گیا بیگانگی کے اس لمحہ میں سعدی نے اپنے کھنچے لبوں کو میرے کانوں سے لگایا اور درد بھری سرگوشیوں میں بولا۔
''ابھی سے حساب کتاب شروع ہو گیا کون تھے کیا چاہتے تھے اب کیا رہ گیا ہے جس کی شناخت کرائیں۔ تم میری ماں کو ذرا تاخیر سے میرے گزر جانے کے بعد بتانا آہستہ آہستہ جو ادھار میں نے لیا ہے ناں دفتر سے، واپس کر دینا اور ہاں پونم کو کہنا اگر کوئی اور اچھا لگے، پسند آ جائے۔ تو اپنا لینا جو گزر گیا اس کا انتظار کیا اب ہم کہاں جا رہے ہیں کس طرف جا رہے ہیں۔ کب تک چلتے جائیں گے یہ سرنگ کیسی ہے۔ یہ روشنیاں یہ لوگ کون ہیں یار تم بولو نا۔ میرا درد، میں تو عادی ہو گیا ہوں۔ عادی۔۔۔آ آ ہا آ''
اس نے کربناک چیخ کے ساتھ پہلو بدلا تو آدھا دھڑ بھاگتے رکشہ سے باہر چلا گیا ہے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگوں کو اندر کیا واپس اپنی پرانی جگہ پر رکھ کر اپنے ایک ہاتھ سے اس کی دکھتی جگہ کو دبانا شروع کر دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے چہرے پہ پھیلی آنسوؤں کی لکیروں کو صاف کیا اس کے بدن میں ٹھنڈک جاگ رہی تھی مسلسل کراہوں نے مجھے بھی لاغر کر دیا تھا۔ لاغری کے اس سفر میں ہم مرکزی سڑک پر پہنچ گئے۔ آگے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہسپتال تھا۔ راستہ میں اکا دکا پولیس کی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگانے کے لیے کہ ابھی منزل کتنی دور ہے گردن باہر نکال کر سامنے دیکھا۔
سامنے سڑک کے درمیان نیلی پیلی جلتی بجھتی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ جوں جوں رکشہ قریب ہوتا گیا صورتیں واضح ہونے لگیں۔ ایک مرتبہ پھر رکشہ نے بریک لگائے سامنے شہریوں کی پہریدار ٹولی اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ سڑک کے ایک کنارے فٹ پاتھ پہ چند نوجوان کیرم بورڈ کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی چار آدمیوں کی ٹولی تاش کھیل رہی تھی۔ دوسرے کنارے پہ دکانوں کے بند دروازوں کے آگے کرسیاں ڈال کر سپاہی بیٹھے تھے۔ اور سڑک کے عین وسط میں جیپ کھڑی تھی جس نے رکنے کا اشارہ کیا تھا جیپ کے بونٹ کے سہارے چند سپاہی کہنیاں ٹکائے سگریٹ پی رہے تھے بونٹ کے وسط میں بڑا سا تھرماس رکھا تھا۔ جس پہ بنے نقش و نگار اس چاندرات میں اور مرکزی سڑک کی روشنیوں میں بہت واضح نظر آ رہے تھے۔
رکشہ رکتے ہیں سفید پوش شہری نے ایک مسلح لڑکے کے ساتھ آگے بڑھ کر پوچھا۔
''کون ہے بھئی اس وقت؟''
''مریض ہے۔ ہسپتال لے جا رہا ہوں''۔
''مریض اس وقت؟'' سفید پوش شہری نے مشکوک انداز میں کہا ''یہ تو گوریلوں کے پھرنے کا وقت ہے۔ آپ کو پتہ

نہیں ملک میں دشمنوں کے ایجنٹ گھس آئے ہیں''۔

''ہماری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ہم تو۔۔۔''

''کیا مطلب ہے۔مریض کو دن کے وقت ہسپتال کیوں نہیں لے گئے۔اچھا۔اچھا۔کارڈ نکالو اپنا''۔

سفید پوش شہری کی باتیں سن کر سپاہی بھی جیپ کے بونٹ کا سہارا چھوڑ کر رکشہ کے پاس آ گئے۔

''**خدا** کے لیے جانے دیں اپنڈکس کا مریض ہے۔بہت خطرناک حالت ہے۔درد سے مرا جا رہا ہے''۔

''پچھلے چوک پہ سپاہیوں نے ہمارا منہ بھی سونگھا تھا پوری تسلی کی تھی۔**خدا** کے لیے ہمیں جانے دیں بہت درد ہو رہا ہے مر جائے گا''۔

''پچھلا چوک کیا مطلب؟'' کیا پتہ وہ جعلی سپاہی ہوں۔کیوں جی ٹھیک ہے ناں یہ گوریلے تو ہر روپ بدل لیتے ہیں''۔

''**خدا** کے لیے آپ یقین کریں۔بہت تکلیف میں ہے میرا دوست۔آپ ہمارے ساتھ ہسپتال چلیں یہ مر جائے گا اگر دیر ہوگئی تو یہ مر جائے گا۔مر جائے گا''۔

نہ جانے کب تک میری سسکیاں رونے کی آواز میں ڈھلتی رہیں نہ جانے کب تک ان کے سوالوں کے تیر ہم پہ چلتے رہے مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ میرے مسلسل رونے کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب رکشہ کے جھٹکوں نے سعدی کے جسم کو ہاتھ سے مسلسل لگا تار ٹکرانا شروع کیا میں نے آنکھوں کے سامنے پھیلی دھند کو صاف کیا آنسوؤں کی نمی چہرے سے پونچھی اور منہ کے نمکین ذائقہ کو لعاب میں شامل کر کے حلق تر کیا تب میری نگاہ سعدی کے چہرے پہ گئی۔جہاں زندگی اپنی آخری لو دے رہی تھی۔بھاگتے رکشہ میں میں نے اس کے بدن کی ٹوٹتی طنابوں کی آواز سنی میں نے بچپن میں سنا تھا کہ میت کا بوجھ زندہ انسانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔اس وقت سعدی مجھے بہت بوجھل لگ رہا تھا۔میں نے کان اس کے دل کے ساتھ لگا کر دھڑکن سنی۔نبض پہ ہاتھ رکھا۔چہرے کا طواف کیا، سب کچھ ٹھیک تھا۔صرف تھوڑی دیر کی بات تھی۔

ہسپتال کے گیٹ سے داخل ہو کر رکشہ ایمرجنسی کے دروازے کے سامنے جا رکا۔میں نے سعدی کو اپنے ساتھ لپٹا کر باہر نکالا رکشہ والے کے ہاتھ میں دس دس کے دو نوٹ رکھے اور پھر اپنے عقب میں رکشہ کی کرخت آواز سنی جو بہت جلد دور جا کے غائب ہوگئی۔

اب پھر چار چفیرے اک تہ در تہ اجڑی مشکوک خاموشی تھی جس کے وسط میں، میں سعدی کو گھسیٹ کر برآمدے تک لایا۔فرش پہ اسکے بدن کے گھسٹنے کی سرسراہٹ سسکیوں کی طرح ابھری تو ویرانی اور بڑھ گئی۔برآمدے میں اطمینان کے ساتھ اسے میں نے قبلہ رخ لٹا دیا۔اور خود اندر کمرے میں چلا گیا جہاں ڈاکٹر آنکھوں میں جگراتے کی سرخی لیے سگریٹ پی رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کرسی پہ تھوڑا سا ہلا، آگے کو جھکا، اٹھنا چاہا لیکن رک گیا کہ میں ہاتھ پھیلائے باہیں کھولے اس کے روبرو فریاد کیے جا رہا تھا۔

''مجھے ایمبولینس چاہیے۔ڈاکٹر لاش کے جانے کے لیے واپسی پر وہ مجھے روکیں گے دیر ہو جائے تو اپنڈکس پھٹ جاتا ہے ناں۔لاش خراب ہو جاتی ہے۔آپ مجھے واپسی کے لیے ایمبولینس دیں گے نا۔پلیز ڈاکٹر خدا کے لیے مجھے ایمبولینس۔۔۔''

☆☆☆

کوکون

اسد محمد خاں

اے اے میری کچھ نہیں تھیں۔ نہ ماں، نہ رشتے دار۔ وہ بس میری ماں کی سہیلی تھیں۔ یہ دونوں کسی اور شہر میں (میرے پیدا ہونے سے بہت پہلے) پاس پاس کے گھروں میں رہتی تھیں۔ میں کچھ ہی مہینے کا تھا تو میرے باپ نے، نہ معلوم کیوں، میری ماں کو مار ڈالا۔ (میرے باپ کا نام اے اے نے بہت دنوں تک مجھے نہیں بتایا تھا۔۔۔ یہ انہوں نے کچھ ہی دن پہلے بتایا ہے)۔۔۔ بس تو، اے اے کسی سے بھی کہے بغیر، مجھے اٹھا لائیں اور اس شہر میں آن بسیں۔

وہ میری ماں سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اے اے، بہت چاہتی تھیں انہیں۔

اچھا تو، پولیس نے باپ کو قید میں ڈال دیا۔ انہوں نے مجھے۔۔۔ اور اے اے کو بھی، تلاش کیا ہوگا۔ ہم انہیں ملے ہی نہیں۔

اے اے نے بتایا کہ میری اماں کا نام بی بی تھا۔

راتوں میں دیر تک اے اے مجھے اپنے اور بی بی کے بچپن، لڑکپن کے قصے سناتی تھیں۔ اتنی چاہت، ایسے لاڈ پیار سے وہ میری ماں، بی بی کا نام لیتی تھیں کہ وہ خاتون، میں نے جن کی تصویر تک نہیں دیکھی تھی، قصے سنتے ہوئے میری اپنی دوست جیسی بن جاتیں، بالکل اے اے کی طرح۔ اور وہ شہر جسے میں نے بس نقشے میں دیکھا تھا، اپنے شہر جیسا لگنے لگتا۔

پڑھائی اور اے اے کے بتائے چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر پہلے تو میں اپنے کھیل کھیلنے یا تصویریں بنانے میں لگ جایا کرتا تھا، مگر اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کھیلنے، تصویریں بنانے میں اب میرا جی نہیں لگتا تھا۔ میں چھوٹی موٹی شرارتوں، مزے مزے کے ان قصوں کو یاد کرنے بیٹھ جاتا تھا جو مجھے اے اے نے سنائے ہوتے۔ جو کچھ بھی۔۔۔ برسوں پہلے، ان دو چھوٹی لڑکیوں نے کیا ہوتا، میرے حساب سے، وہ اب ہم تین چھوٹے بچوں کا کیا ہوا بن جاتا تھا۔ تیسرا بچہ میں ہوتا تھا۔۔۔ سی سی۔

ایسا لگتا تھا کہ میں یہ جگہ، یہ دن رات چھوڑ کے، کسی نہ کسی طرح، ان دو چھوٹی شریر لڑکیوں کے شہر اور ان کے دنوں میں پہنچ گیا ہوں۔ وہاں موجود ہوں۔ جو کبھی اے اے کا اور میری ماں بی بی کا شہر اور ان کے دن رات ہوا کرتے تھے۔ وہاں چل پھر رہا ہوں، کھیل رہا ہوں۔

مجھے ان قصوں میں بس انہی تین آدمیوں سے سروکار ہوتا تھا۔ اے اے اور بی بی سے۔۔۔ اور سی سی سے۔۔۔ مطلب، خود اپنے آپ سے۔

اور جب یاد کرتا تھا تو بس تین ہی آدمی اچھی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اے اے، بی بی اور سی سی، یعنی خود میں۔۔۔

یہ مجھے خوب اجلے اجلے نظر آتے تھے۔

ہے نا عجیب بات؟

اور انہی تین کی آوازیں مجھے سنائی دیا کرتی تھیں۔ بالکل صاف، سمجھ میں آنے والی آوازیں۔۔۔ حیرت ہے!

پھر ان قصوں میں دوسرے لوگ بھی آنے لگے۔ بی بی کی ماں جی اور ایک بہت گوری چٹی بوڑھی عورت، بی بی کی دادی۔ ان کے نام خبر نہیں کیا تھے۔ یہ کبھی مجھے دھندلے نظر آتے۔ اے اے کے سنائے قصوں کے سارے لڑکا، لڑکی، ٹیچر، بوڑھے، جوان اور میری ماں بی بی کے اور اے اے کے گھروں کے لوگ۔ بیشک کم کم اور دھندلے دکھتے۔ مگر جب بھی یاد کرتا تو دکھتے

ضرور تھے۔۔۔۔اور آوازیں ان کی ہلکی ہلکی، جیسے دور سے آتی سنائی دیتی تھیں۔ان میں ہم تینوں جیس کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

اس طرح بی بی کے اور اے اے کے گھروں میں کام کاج کے لیے آنے والے سب لوگوں کو میں پہچاننے لگا تھا۔ بہت سوں کی شکلیں تو اے اے نے بتائی بھی تھیں۔جن کی شکلیں نہیں بتائی تھیں، ان کو میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ ایسا ہوگا اور وہ ایسا۔بس اسی طرح، میں نے، ان سبھی لوگوں سے دوستیاں جیسی کر لی تھیں۔

لیکن باپ سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔اے اے نے اس کی شکل ہی نہیں بتائی تھی۔

ایک دن، جب اے اے مجھے سلانے، شب بخیر کہنے آئیں تو میں نے انہیں روک لیا اور پوچھا کہ میرے باپ کی شکل کیسی تھی، کیسا دکھتا تھا وہ؟

اے اے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں ضد کرنے لگا تو پوچھنے لگیں کہ جو سناتی ہوں تجھے وہ باتیں اچھی لگتی ہیں؟ میں نے کہا، جی ہاں، بہت۔ کہنے لگیں کہ وہ اچھے لوگ تھے، اس لیے ان کی باتیں بھی اچھی ہیں۔

''تو میرا باپ اچھا نہیں تھا؟'' میں نے پوچھا۔انہوں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے بھی اور بات شروع کر دی۔ ان سے بی بی کا پوچھا کہ وہ پڑھائی میں کیسی تھیں؟ اسکول کا یونیفارم کیسا ہوتا تھا؟ وہ یونیفارم میں کیسی دکھتی تھیں؟ بی بی اور آپ، گھر میں کیسے کپڑے پہنتی تھیں؟

اے اے نے سب کچھ بتا دیا۔ ہنس کے کہنے لگیں: ''بہت باتیں کر رہا ہے آج! کیا پہنتی، کیسی دکھتی تھیں؟ یہ سب جان کے کیا کرے گا تو؟''

میں نے چالاکی سے ان کی بات ٹال دی۔ جب انہوں نے گدگدی کرنے کی دھمکی دی تو مجھے پوری بات بتانی پڑی کہ آپ کے سنائے یہ سب قصے، یہ ساری اچھی اچھی باتیں، میں دل ہی دل میں دہراتا ہوں اور آپ کے اور بی بی کے ساتھ وہ وقت اسی طرح گزارتا ہوں جیسا آپ نے گزارا تھا۔ہم خوب مزے کرتے ہیں، خوب کھیلتے، شرارتیں کرتے ہیں۔ہم تینوں، آپ بی بی اور آپ ہی کی طرح کا ایک چھوٹا لڑکا میں، سی سی۔

وہ دیر تک مجھے حیرت سے دیکھتی اور مسکراتی رہیں۔ پھر انہوں نے میری پیشانی چوم لی اور بولیں ''سی سی تو نے تو مجھے حیران کر دیا۔ارے واہ! یہ باتیں بھلا کیسے سوچ لیتا ہے؟'' میں کیا بتاتا، مجھے خود معلوم نہیں تھا۔

جاتے ہوئے وہ کہنے لگیں ''سی سی! تو ہمیشہ سے میرا بیٹا بھی ہے اور دوست بھی۔ بالکل بی بی کے جیسا، پکا دوست، ساتھ کا کھیلا۔۔۔۔ٹھیک ہے نا؟ اب ان قصوں میں ہم تین دوست ہوا کریں گے۔تو، میں اور بی بی۔مگر ہم اور بی بی تو اسکول کا یونیفارم بھی پہنیں گے۔تو کس طرح کے کپڑے پہنے گا؟ سوچ کے رکھنا''۔ پھر وہ شب بخیر کہتے ہوئے چلی گئیں۔

اس رات کے بعد سے اسی طرح ہونے لگا۔اے اے اپنے بچپن لڑکپن کی کوئی بھی کہانی سناتے ہوئے خود ہی مجھے بھی ایسے شامل کر لیتیں جیسے میں وہیں تھا اور کبھی تو مجھے یاد دلانے لگتیں کہ ''یاد ہے نا تجھے؟ ہم لوگ کتنے شوق سے درختوں پر چڑھتے، کچ پکی املیاں توڑتے تھے؟ بی بی کی ماں جی۔۔۔۔نانی تیری، چاہے جتنی خفا ہوں، ڈانٹ پھٹکار کریں، ہم باز نہیں آتے تھے۔املیاں چھین کے پھنکوا دیتی تھیں وہ۔پر ہم کہاں ماننے والے تھے''۔

اے اے مجھے یاد دلاتیں۔ پوچھتی کہ تو ہمیں یونیفارم پہنے، کندھوں پہ بستے لٹکائے، انہیں ہاتھوں سے سنبھالے اسکول لاری پہ چڑھنے میں بازی لے جانے کی کوشش کرتے دیکھتا تھا نا؟ میں کہتا ''ہاں دیکھتا تھا''۔اور جب بہت سی راتوں تک میں یہ بات برابر سنتا رہا اور یہی جواب دیتا رہا تو پھر مجھے اے اے اور بی بی اسی طرح نظر آنے لگی۔۔۔۔مطلب، یونیفارم پہنے، کندھے پہ

لستے لٹکائے، انہیں سنبھالتی اور لاری پہ چڑھنے میں بازی لے جانے کی کوشش کرتی۔

پھر عجیب بات ہونے لگی: خود بخود میں یہ جان گیا کہ جب دروازے میں پھنستی ہوئی وہ اندر پہنچتی تھی تو دونوں میں وہ جو پہلے پہنچ جاتی تھی اس پر خوش ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس نے دوسری کو ہرا دیا ہے۔ ہر دوست کو ہرا کے خوش ہوا؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔

میں نے کہہ دیا کہ اے اے! مجھے بتایئے کیا سچ میں ایسا لگتا تھا کہ ایک نے دوسری کو ہرا دیا ہے؟ پہلے تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر کہنے لگیں۔

''سی سی امی نے تجھے ایسا تو کچھ نہیں بتایا تھا، اس لیے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی، کھوٹے پن کی بات تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کے لیے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا''۔

''مگر آپ ایسا سوچتی تو تھیں نا؟''

وہ جواب میں بولیں۔ ''ہاں، ہم میں یہ برائی تو ہوگی''۔ میں نے کہا ''ہوگی نہ کہیے۔ یہ کہیے، تھی۔ ہم میں یہ برائی تھی''۔

اے اے نے دھیرے سے سر ہلا کے مان لیا کہ ہاں یہ ایک برائی تو تھی۔

ایک دن انہوں نے کسی لڑکی کا بتایا کہ وہ ان دونوں میں اتنی دوستی دیکھ کے بہت کڑھتی تھی۔ نہ معلوم کیوں کڑھتی تھی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ اس کی صورت ایسی ایسی تھی۔ میں نے پوچھا نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے اس کی صورت بتائی، نام بھی بتایا اس کا۔

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔

یہ پہلی بات تھی اے اے کی، جو مجھے اچھی نہیں لگی۔

انہوں نے میرے باپ کی ۔۔۔۔ جو اچھا نہیں تھا۔۔۔ نہ تو مجھے صورت بتائی تھی، نہ ہی نام بتایا تھا۔ تو پھر انہوں نے لڑکی کی صورت اور اس کا نام مجھے کیوں بتا دیا: جو کڑھتی تھی اور اچھی نہیں تھی؟ اس کی اتنی باتیں کیوں کیں مجھ سے؟

مجھے دو دن تک اس بات کا صدمہ رہا۔ اے اے نے کیوں کیا ایسا؟

وہ سمجھ گئیں کہ میں خفا ہوں، پر کس بات پر خفا ہوں؟ یہ نہیں سمجھتی تھیں وہ۔

اس لیے تیسرے دن میں نے ان سے پوچھ لیا۔ کہا کہ ''اے اے! آپ دونوں میں جو ایک بات اچھی نہیں تھی وہ آپ نے مجھے بتا دی۔ جو لڑکی کڑھتی تھی اور اچھی نہیں تھی، آپ نے اس کی صورت اور نام تک مجھے بتا دیا''۔

کہنے لگی، ''ہاں، جو لڑکی اچھی نہیں تھی اس کی صورت اور نام تجھے بتا دیا۔ جو بات ہم دونوں میں اچھی نہیں تھی، وہ تجھے بتا دی۔۔۔۔ پھر؟''

میں نے کہا ''لڑکی کی صورت اور نام بتا دیا، مگر میرا باپ۔۔۔۔ جو اچھا نہیں تھا، وہ کیسا دکھتا تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟۔۔۔۔ یہ مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

اے اے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے چہرے پر ایسی خفگی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رات تک وہ مجھ سے نہیں بولیں۔ ''میں بھی کیوں بات کرتا؟''

رات میں جب میرے سونے کا وقت ہوا تو وہ روزانہ کی طرح گلاس میں پانی لے کر آئیں اور بہت پیار سے مجھ سے کہنے لگیں ''لے نا، اپنی گولی کھا لے''۔ میں نے کہا، ''نہیں، میں نہیں کھاتا''۔ اور میں نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے کتنی ہی بار یہ بات کہی اور میں نے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا۔ اس پر وہ بگڑ گئیں اور مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ میں نے چیخ کے کہا ''میں کبھی نہیں بولوں گا آپ سے۔ آپ اچھی نہیں ہیں''۔

تب عجیب بات ہوئی۔ اے اے نے اچانک میرا سر تھام کے مجھے خود سے بھڑا لیا۔ میں سمجھا لاڈ سے کرتی ہیں۔ پر انہوں نے گردن کے پیچھے سے ہاتھ پہنچا کر منہ کھولا اور گولی ڈال دی۔۔۔ میں نہیں پی رہا تھا، مگر انہوں نے بہت سا پانی پلا دیا۔۔۔ قمیص تک بھیگ گئی میری۔ میں رونے لگا۔ انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ جلدی جلدی میری قمیص بدلی اور روشنی اور دروازہ بند کرتی چلی گئیں۔ آج انہوں نے گانے کا ٹیپ بھی نہیں لگایا تھا۔ 'شب بخیر' بھی نہیں کہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اٹھ کے دروازہ پیٹوں۔ غصہ کروں۔ پر اٹھا ہی نہیں گیا۔ نیند آ گئی تھی۔

جیسے روز راتوں میں خواب آتے تھے، آج بھی ویسے ہی خواب آئے۔ صبح اٹھا تو روز کی طرح منہ کڑوا ہو رہا تھا، پیاس لگ رہی تھی اور سر گھوم رہا تھا۔ اس سب کے ساتھ، آج غصہ بھی آ رہا تھا مجھے۔ اے اے نے مجھے اس طرح کیوں گولی کھلائی؟ اچھی طرح کہہ دیتیں: انکار کیا ہے میں نے؟ روز تو کھالیتا ہوں۔

پھر صبح کو وہ روز کی طرح مسکراتی ہوئی آئیں، گال تھپتھپائے اور ٹھنڈے جوس کا گلاس میرے منہ سے لگا کے 'شاباش شاباش' کہتی ہوئی مجھ سے ایک سانس میں گلاس ختم کرا دیا۔ پھر روز کی طرح مجھے شاور کے لیے بھیجا، کپڑے بدلائے، ناشتہ کرایا، گھنٹوں پڑھاتی رہیں، ہوم ورک دے کے خود کھانا پکانے لگیں۔

کھانے کے بعد میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ تصویریں بنا سکتا تھا، نرم لکڑی کو آریوں سے کاٹ کے تیز چاقوؤں سے تراش کے ریتیوں سے ہموار کر کے کچھ بھی بنا سکتا تھا۔ موٹر کار، خرگوش، طوطا۔۔۔ کچھ بھی۔ ان پہ رنگ کر سکتا تھا۔

تو میں نے سوچا آج گھوڑا بناؤں گا۔ میں اپنا سامان اٹھا لایا۔ ڈبے میں رنگ، پنسل، کاغذ سبھی تھے، مگر آریاں، چاقو، ریتیاں نہیں تھیں۔

میں نے پوچھا، ''اے اے! سب چیزیں آپ نے کہاں رکھ دیں؟ میں لکڑی کا گھوڑا بناؤں گا''۔

وہ میرے بیڈ پہ لیٹی تھیں اور نیند میں ہو رہی تھیں۔ کہنے لگیں، ''کاغذ پہ بنا لو بی سی! جب اٹھوں گی تو لا دوں گی''۔

میں نے کہا ''جی نہیں کاغذ پہ نہیں، میں لکڑی سے بناؤں گا اور ابھی بناؤں گا۔ آپ اٹھیے! لا کے دیجیے''۔

انہوں نے کچھ کہا جو میں سن نہیں سکا۔ میں نے الجھ کے پوچھا کہ، 'اے اے! میری چیزیں ڈبے میں رکھی ہوتی ہیں۔ آپ نے کیوں نکالیں؟''

وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں اور چیختی ہوئی آواز میں ایسی بری بری باتیں کہنے لگیں جو میری سمجھ میں نہ آئیں۔ اس لیے کہ میں نے تو وہ کبھی سنی نہیں تھی۔ انہوں نے میرے باپ کے لیے کوئی بہت بری بات کہہ دی۔ اور یہ بھی کہا کہ میں بالکل اپنے باپ پہ پڑا ہوں۔ ضدی، بدتمیز اور نہ جانے کیا کیا ہوں۔۔۔ اور میری صورت بھی باپ جیسی ہے!

یہ پہلی بات تھی جو مجھے اپنے باپ کے بارے میں اچانک معلوم ہوئی۔ ''اس کی صورت میرے جیسی تھی''۔

میں وہاں سے ہٹ کر شیشے کے سامنے آیا اور اپنی صورت دیکھنے لگا۔ ''اچھا؟ میرا باپ ایسا دکھتا تھا؟''

میں نے دل میں کہا، ''ٹھیک ہے، مجھے اپنے باپ کا نام بھی معلوم ہونا چاہیے''۔

(تو اس کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا؟)

میں نے بڑھ کے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ان سے کہا کہ ''غصہ مت کیجیے۔ سو جائیے۔۔۔ گھوڑا تو میں کاغذ پہ بنا لوں گا''۔

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہیں پھر دھیرے سے کہنے لگیں کہ، ''تو سمجھتا نہیں ہے۔ چاقو اور آریاں اور ریتیاں، یہ سب

دھاردار ہوتی ہیں۔ان سے تجھے چوٹ لگ سکتی ہے۔ہاتھ بھی کٹ سکتا ہے تیرا۔اسی لیے میں نے سب ہٹا دیں۔'' میں سمجھ گیا کہ یہ جھوٹ ہے۔اصل بات کچھ اور ہے۔

''ہٹا دیں؟۔۔۔یہاں سے ہٹا کے کہاں رکھ دیں؟ یہاں کے علاوہ گھر میں اور کیا ہے؟'' مگر یہ میں نے نہیں پوچھا۔وہ نہیں بتاتیں۔ یہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔جس طرح یہ معلوم ہوا کہ باپ کی صورت کیسی تھی۔اسی طرح اس کا نام بھی اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سب چیزیں یہاں سے ہٹا کے کہاں۔۔۔؟

''تو کیا سوچنے لگا؟'' اے اے نے پھر سوال کیا کہ تو کیا سوچ رہا ہے اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کے میرا سر اپنے شانے سے ٹکا لیا۔ یہ ٹھیک ہے، میں نے دل میں کہا کہ انہیں کچھ بھی بتانا اچھا نہیں ہے۔تو بس میں ہنسنے لگا۔اور میں نے وہ بات کہہ دی جو سچ نہیں تھی:

''میں کچھ نہیں سوچ رہا''۔ میں نے کہا۔۔۔اس بات پر وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔

مگر اب بھی ان کی ہنسی پر بھروسا نہیں رہا۔نہ ان کی پیار کی باتوں پر۔وہ مجھ سے اچھی بات کر کے جو چاہتی ہیں کرا لیتی ہیں اور کوئی بات اگر ان کی مرضی کی نہیں ہوتی تو وہ چیختی اور بری بری باتیں کہتی ہیں اور جب جی چاہتا ہے وہ سچ بات کہنا بند کر دیتی ہیں۔

(تو میں بھی اب اپنی مرضی کروں گا!)

میں نے بہت دن انہیں خفا ہونے کا موقع نہیں دیا۔اسے الجھ کے بات نہیں کی۔کوئی فائدہ نہیں تھا۔وہ چڑ جاتیں اور کچھ نہیں بتاتیں۔ بہت سی باتیں معلوم کرنا تھیں مجھے۔یہ پوچھنا تھا کہ لکڑی کے کام والے اوزار کہاں ہیں۔اور یہ بھی کہ کیا اب وہ مجھے کبھی نہیں ملیں گے؟

اور ایک دفعہ باتیں کرتے کرتے میں نے ہنس کے پوچھ بھی لیا کہ آپ نے یہ کس طرح کہا کہ میرا باپ ضدی اور بدتمیز تھا؟

وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔ایک دم بول پڑیں کہ ''سب جو کہتے تھے۔اصل میں ڈی ڈی خود ہی بہت کمینہ آدمی رہا ہوگا''۔ پھر ایک دم چپ ہو گئیں۔شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مجھے یہ نام معلوم ہو۔مگر اب تو مجھے معلوم ہو گیا۔اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا،''یہ ڈی ڈی کیسا نام ہے؟ برا نام ہے نا؟ اس کی آواز بھی اے اے، بی بی اور سی سی جیسی نہیں ہے۔۔۔۔بخ!''

کہنے لگیں،''تو ٹھیک کہتا ہے۔مگر اس وقت ایک دم تجھے اس کا خیال کیسے آ گیا؟''

میں نے کہا،''مجھے اس کی وجہ سے خیال نہیں آیا، اپنی وجہ سے آیا ہے۔۔۔۔۔میرے کام کے اوزار ہٹا دیئے آپ نے اور میں نے پوچھا تو آپ نے بےضرورت ڈی ڈی سے مجھ کو ملا دیا کہ میں بالکل اپنے باپ پہ پڑا ہوں، ضدی، بدتمیز اور نہ جانے کیا کیا ہوں اور آپ ایسی بری باتیں بھی کہنے لگیں جو میری سمجھ میں نہ آئیں۔اب مجھے اپنے اوزار چاہئیں۔یہ آپ نے جھوٹ کہا ہے کہ چاقو اور آریاں اور ریتیاں، یہ سب دھاردار ہوتے ہیں، ان سے چوٹ لگ جاتی ہے، اس لیے آپ نے ہٹا دیئے۔اگر ایسا تھا تو آپ نے پہلے ہی کیوں دیئے تھے؟ ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔جی ہاں! اس لیے کہ میں بڑا ہو گیا ہوں، کام سیکھ گیا ہوں''۔

یہ سب ٹھیک تھا۔مگر میں نے ایک غلطی کر دی۔

میں نے اے اے سے کہہ دیا کہ مجھے ان کی یہ بات جھوٹ لگتی ہے کہ باپ نے ماں کو مار ڈالا تھا۔ایسا بالکل نہیں ہو ہوگا۔ میں نے کہا''اگر اس نے میری ماں کو۔۔۔''

انہوں نے بات بھی نہ پوری کرنے دی۔طمانچے اور گھونسے مار مار کے مجھے گرا دیا اور اتنی خراب اور گندی باتیں کیں کہ میں پریشان ہو گیا۔ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

میری ناک سے خون بہنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں واش روم میں جا گھسا اور کنڈی بند کر لی۔ میں نے سنا وہ برابر کچھ نہ کچھ بکے جا رہی تھیں۔

بہت دیر بعد میں باہر آیا۔ اے اے جا چکی تھیں۔ رات ہو گئی۔ میں بھوکا تھا، لیٹ کے آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ گولی کھلانے ضرور آئیں گی وہ نہیں آئیں۔ میں بہت دیر جاگتا اور سوچتا رہا، پھر سو گیا۔

رات میں کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ باہر سے، کہیں سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ موٹر کاریں اور بائیک ہارن بجاتی گزر رہی تھیں۔ یہ آوازیں میں نے ریڈیو اور ٹیپ پہ سنی ہیں۔ باہر کوئی ٹیپ بجا رہا ہے؟ مگر نہیں، یہ ٹیپ یا ریڈیو نہیں، سڑک پر موٹر کار نے ہارن دیا تھا اور کہیں قریب سے اذان کی آواز آئی تھی۔ میں نے ٹیپ پر کتنی بار اذان سنی ہے، مجھے پوری یاد ہے۔ آدھی رات کے بعد کون سی اذان ہو رہی ہے؟

ہاں، اور یہ صبح کی اذان نہیں تھی۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ گھڑی میں ایک سے زیادہ بجا تھا۔ کیا یہ دن کا وقت ہے؟ بہت سی آوازیں ایسی تھیں جنہیں میں نہیں جانتا۔ مگر ایک آواز اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ آئس کریم والے کی آواز! وہ کتنی دیر کھڑا گھنٹی بجاتا، آواز لگاتا رہا۔ پھر چلا گیا۔ میں بہت دیر بیٹھا سوچتا رہا: یہ دن کا وقت ہے۔ باہر دن نکلا ہوا ہے۔

مجھ سے رات کہہ کے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ (یہ رات نہیں دن کا وقت ہے!)

ٹھیک ہے۔ میں نے خود سے کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے معلوم کرنا ہے کہ اصل بات کیا ہے۔ مجھے جھگڑنا نہیں، بس معلوم کرنا ہے۔

اور اب میرے لیے اے اے کو سمجھنا ضروری ہے۔

سب سے زیادہ انہیں یہی اچھا لگتا ہے کہ میں روز۔۔۔۔ ہر روز انگلی دی ہوئی گولی کھا کے پانی پی لیتا ہوں۔ اب ایسا کچھ کروں کہ وہ سمجھیں میں پانی پی رہا ہوں، تو اس لیے پی رہا ہوں کہ میں نے گولی کھا لی ہے۔ مگر میں گولی حلق سے نہ اتاروں، منہ میں ہی روک لوں۔

اگلی صبح جب وہ کچھ ناراض سی، کچھ لاڈ کرتی آئیں تو میں نے سوچ لیا کہ آج ایسا ہی کروں گا۔

میں دن بھر ان کی کہی باتوں پر سر ہلاتا، مسکراتا رہا۔ دن بھر میں نے سب کچھ ویسا ہی کیا جیسا وہ چاہتی تھیں۔ پھر شام ہوئی اور رات ہو گئی، میں نے انہیں کاغذ پہ گھوڑے کی تصویر بنا کے دکھائی۔ وہ خوش ہوئیں۔ پھر وہ میرے لیے گولی لے کر آ گئیں۔

میں نے گولی منہ میں ڈالی، اسے زبان اور ڈاڑھ کے بیچ پر روک لیا۔ اوپر سے پانی پی لیا۔ منہ پونچھنے کے بہانے گولی مٹھی میں لے کے جیب میں ڈال لی۔ انہوں نے شب بہ خیر کہا۔ میں نے جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ انہیں پتا نہ چلا۔ وہ سمجھیں میں سو گیا ہوں۔ مگر میں سب سن رہا تھا۔ انہوں نے گانے کی آواز بند کی، روشنی بجھائی اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

میں نے سنا، دروازہ بند کرتے ہوئے انہوں نے چابی گھمائی تھی۔

میں اٹھ بیٹھا۔ اچھا؟ اے اے تالا ڈال کے جاتی ہیں! کیوں؟ سب طرف دن ہوتا ہے، تو وہ کہیں جاتی ہیں؟ پر وہ جاتی کہاں ہیں؟ میں رات سمجھ کے یہیں سوتا رہتا ہوں! میں جا نہیں سکتا کیوں کہ باہر تالا پڑا ہے۔ (مجھے سوچتے رہنا چاہیے)۔

میں نے کئی دن ایسا کیا۔ میں گولی منہ میں ڈالتا، اسے ایک طرف روک لیتا، پانی پی لیتا۔ پھر گولی مٹھی میں لے کر جیب میں ڈال لیتا۔

یوں کچھ دنوں میں چار چھ گولیاں جمع ہو گئیں۔ میں نے انہیں ایسی جگہ چھپا دیا جہاں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

اگر جلدی نہ سو جاؤں تو بہت سی باتیں سوچ سکتا ہوں۔ یہ زیادہ ضروری ہے۔ سوچنا بہت ضروری ہے۔ تو بس میں جاگتا اور سوچتا رہا۔

اور پھر، جب کہ میری طرف شام ہوئی۔ وہ میرے لیے دودھ کا پیالہ اور اپنے لیے ایک کپ میں سیاہ کافی کے کرآ گئیں اور مجھ سے ہنس ہنس کے باتیں کرنے لگیں۔ اور جب وہ کم دھیان دے رہی تھیں، میں نے کافی کے کپ میں تین گولیاں ڈال دیں۔ باتیں کرتے ہوئے انہوں نے چمچہ چلایا اور کافی پی لی۔

باتیں کرتی ہوئی وہ تکیے سے ٹیک لگا کے اونگھنے لگیں۔ پھر لیٹ گئیں اور۔۔۔۔سو گئیں۔

(میں یہی چاہتا تھا)

(دو چابیوں میں سے ایک دروازے میں گھوم گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ باہر پیلا سا بلب جل رہا تھا، اور سیڑھیاں اوپر چڑھتی چلی جارہی تھیں۔ اوپر چڑھتے ہوئے روشنی سفید ہوتی جاتی تھی۔ سیڑھیاں گھوم گئیں۔ میں رک گیا۔ یہاں سے آوازیں تیز ہونے لگیں۔ اوپر یہ کیا ہے جو اتنا شور ہو رہا ہے؟ بوجھ اٹھانے والی گاڑی ہوگی، بڑی گاڑی۔ ٹرک کہتے ہیں۔ میرے پیر دکھ رہے ہیں۔ مگر میں بھاگ کے چڑھتا ہوں، گرتا ہوں، پھر اٹھ جاتا ہوں۔ یہاں ایک دروازہ ہے، بند ہے، تالا نہیں ہے اس میں۔ میں اندر چلا جاتا ہوں۔ یہ کمرہ ہے۔۔۔۔ بہت بڑا۔ سامان سے بھرا ہوا۔ یہاں ایک بستر ہے اور کیا اور کیا ہے۔ یہ ایک طرف میرے اوزار پڑے ہیں۔ میں بھاگتا ہوں۔ کرسی سے ٹکراتا ہوں اور اٹھتا ہوں۔ ادھر سامنے دروازہ ہے۔ یہ بڑا دروازہ ہے اس میں تالا پڑا ہے۔ میں دوسری چابی لگاتا ہوں۔ تالا کھل جاتا ہے۔ مگر مجھے بہت زور لگا کے دروازہ کھولنا پڑا۔ دروازہ کھلا تو بہت سفید روشنی میرے اوپر آئی۔ میں ذرا سا پیچھے ہٹا پھر دوڑ کے بڑھا۔۔۔۔ اور دوسری طرف سیڑھیوں پر سے لڑھکتا سخت زمین پر جا گرا۔ کوئی چیختا ہوا۔۔۔۔ ایک بھاری آواز والا آدمی چیختا ہوا: ''ارے ارے'' کہتا ہوا جھپٹا۔ میں نے رونا اور خود بھی چیخنا شروع کر دیا۔۔۔۔)

جنہوں نے مجھے اٹھایا تھا، اسی سڑک پہ کپڑے کی دوکان کرتے ہیں، وہ اپنی دوکان کھولنے جا رہے تھے۔ انہی نے پولیس اور اسپتال والوں کو فون کیا تھا۔ پھر پولیس والے میرے ڈی ڈی کو اور میری ماں کو اسپتال لائے تھے۔ میں ڈی ڈی کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ مجھے پتا تھا وہ کیسے دکھتے ہیں۔

ماں وہ نہیں تھی جسے اس عورت، اے اے نے بی بی کا نام دیا تھا۔ ماں وہ تھی جسے اس نے اسکول کی لڑکی کہا تھا اور بتایا تھا کہ وہ اس کی اور بی بی کی دوستی سے کڑھتی ہے۔ کہیں کوئی بی بی نہیں تھی۔ جھوٹ بولتی تھی وہ!

ماں میرے پاس اسپتال میں ہی اٹھ آئی ہے۔ وہ روتی بھی ہے اور ہنستی بھی ہے۔ نو سال پہلے میں کچھ ہی گھنٹے کا تھا تو اس اے اے نے مجھے اسپتال سے چرا لیا تھا۔ وہ وہاں نوکری کرتی تھی۔ نئے شہر کی ایک پرانی ٹوٹی حویلی کو اس عورت، اے اے نے، کرائے پر لے کے حمام کو قید خانہ جیسا بنا لیا تھا۔

وہیں رہا تھا میں۔ پورے نو سال۔

اب پولیس والے اسے سب جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ وہ کیسی دکھتی ہے۔ مجھ سے پوچھ پوچھ کے انہوں نے اس اے اے کی تصویر بنالی ہے۔ کہتے ہیں میری بنوائی ہوئی تصویر اسپتال کے فوٹو سے بہت ملتی ہے۔ ماں کہہ رہی ہے دیکھنا وہ ضرور پکڑی جائے گی۔

☆☆☆

فعل حال مطلق

اسلم سراج الدین

میں اور غزالی۔۔۔۔

غزالی اور میں۔۔۔۔

ہم دو معلم اور ہم دونوں کے متعلمین! واہ! آہ! جس قدر تفاوت ہم دونوں میں تھا اس سے کہیں زیادہ ہمارے متعلمین میں۔

غزالی کے طالب علم۔۔۔ مطیع، لچیلے، متوافق کہ چاہو تو کوٹ کر ورق بنالو یا تار کھینچ لو۔ اور چاہو تو پانی کے چار چھینٹے دو اور ان کی مٹی تو دوں میں تبدیل کر دو۔ پھر چاک پر رکھو اور ان تو دوں کو جو چاہو صورت دے دو۔ گدھا، گھڑا، گھگھو گھوڑا، کچھ بھی بنالو۔

اکثر غزالی ان گدھوں پر اپنے افکار لاد کر انہیں سونا دکھاتا اور وہ ادب، فلسفہ، سیاسیات یا انسانیات کے کسی اور شعبہ میں جا کر، وہاں موجود معلم کو ہٹا کر خود تعلیم کرنے لگتے۔ شیکسپیر کو وہ کردار نگاری اور میر کو مصرع سیدھا کرنا سکھاتے۔ کیٹس ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتا اور جیسا کہ وہ کہتے اپنے تصور جمال میں ترمیم و تنسیخ کرتا۔ چغتائی اور امرتا شیر گل کو وہ خط و خم کی باریکیوں سے آشنا کرتے۔ پینٹنگ کے لیے محنت سے تیار کردہ کینوس پر کود کر اسے پاؤں سے پرولیتے اور ناچتے ہوئے کہتے کہ وہ تحریری اور تجریدی تصویریکجی کر رہے ہیں۔ ہائی انرجی فزکس کے پروفیسر کی جان یہ پوچھ کر ضیق میں کر دیتے کہ جنات کی پوٹینشل انرجی کو برقی رو میں کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ وہ غریب بغلیں جھانکتا یا خفگی دکھاتا تو وی سی کا گھیراؤ کر لیتے اور گھیرا اس وقت تک تنگ کرتے رہتے جب تک کہ پروفیسر موصوف جنات کی تلاش میں فیکلٹی سے نکل نہ جاتے۔

اور ماضی کی کوک ان میں غزالی نے اتنی بھر دی تھی کہ وہ ہمیشہ پر لپیٹے عقب کے عازم رہتے۔ اس کے لیے انہیں کچھ تردد بھی نہ کرنا پڑتا۔ بس غزالی ذرا انہیں اس بلی کی طرح نظر جما کر دیکھتا، جس کی چوہے پر جمی ٹکٹکی دیکھ کر عارضی نیند میں بھیجنے کا طریقہ دریافت ہوا تھا۔ بسا اوقات غزالی کو یہ بھی نہ کرنا پڑتا اور وہ بیٹھے بٹھائے ماضی میں چلے جاتے اور کچھ دیر اس کی جنت میں جی آتے۔

اور آتے تو بس حال کی شامت آجاتی۔ وہ اسے اپنی پرشباب ٹھٹھول پر رکھ لیتے۔ آوازیں کستے، اور آگے لگا کر برآمدوں میں دوڑائے پھرتے۔ بکرے بلاتے۔ ماضیہ کتابوں کے عرس مناتے، کبھی پالکی نالکی میں سوار کرا کے ان کی بارات ماضی کے گھر لے جاتے اور حالیہ کتابوں کے پرزے کر کے ماضی کے باراتیوں پر لٹاتے۔ اس پر بھی ان کی پرشباب روح کے دانت ٹھنڈے نہ ہوتے تو ایک ذرا تفریح کے لیے قساوت کی کایا لے کر یہ روح بھی شقاوت پر اتر آتی، گرچہ یہ شقاوت بھی تقدیس کا گہرا رنگ لیے ہوتی اور ان کا ہر عمل کسی ابدی طور پر اہم پیشن پلے کا حصہ معلوم ہوتا۔ حال کے چار ابروؤں کا صفایا کر کے وہ اس کا منہ کالا کرتے اور گدھے گدھی پر بٹھا دیتے اور تب۔۔۔۔

حال کو یوں خر سوار دیکھ کر، انکے دانتوں میں لذت کی میٹھی للک اٹھتی اور وہ بتیسی میں سے نکل نکل پڑتے۔ اکثر کا جذبہ جنوں کچھ کر گزرنے کے لیے انکی انگلیوں پر ناخنوں کی صورت بڑھ آتا۔ تیز آہنی ناخون۔ اور جو ابھی خام تھے، جن کے جنون کی مسوں کو ابھی بھیگنا تھا، جو جذبے کے ناخنوں کو آہنی نہ کر سکتے تھے وہ، وہ گرا پڑا، کوئی پتری پترا، کانچ کا ٹکڑا یا کنکر ہی اٹھا لیتے اور سرشاری کے ایک بے پایاں احساس کے ساتھ حال پر پل پڑتے اور لہو کی ایک، کم از کم ایک لکیر ضرور اس پر کھینچ دیتے اور جب حال

کا بدن، اجتماعی آرٹ کے ریڈ پیریڈ کا ایک نمونہ بن جاتا تو۔۔۔۔ کچھ فاصلہ دے کر کچھ دیر تک وہ ایک خارجی معروضی انہماک سے اس نمونے کا جائزہ لیا کرتے اور پھر اسے اسناب کیو بک آرٹی حلقوں میں قابل قبول بنانے کے لیے حال کا ایک کان کاٹ کر اس کے منہ میں گھسیڑ دیتے اور ہونٹ کاٹ کر پیشانی پر سی دیتے۔ پیچھے اس Praxis، اس رسم وعمل کے، غزالی کا یہ نظریہ کارفرما ہوتا کہ عہد حاضر افراط سمع و بصر کا شکار ہے۔ اس لیے جہاں اور جب ممکن ہو حواس خمسہ کی کتر بیونت کرتے رہنا چاہیے۔ مثال کے طور پر وہ کہتا: اس تکونی بناوٹ ناک ہی کو لو۔ تنفس کے لیے یہ بلاشبہ ضروری ہے گرچہ لابدی اور ناگزیر نہیں۔ مگر شامہ، اس سونگھنے کی حس کا کیا تک، کیا جواز، کیا ضروری ہے یہ؟ یہ بے تک، بلا جواز اور غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مفسدانہ حد تک سینہ زور ہے۔ یہی تو ہے جو ناک کے واسطے سے پورے نظام میں بلوہ کر دیتی ہے۔ اور مادر زاد اندھوں تک کو غلاظت کے ڈھیر دکھائی دینے لگتے ہیں اور وہ انہیں تلف کرنے کے لیے اوپری نچلی پرتوں ہی کو نہیں زمین آسمان کو بھی ایک کرنے پر تل جاتے ہیں۔ یاد رکھو میرے بچو، غزالی کہا کرتا، یہ ناک ہے جو سماج کو بدبو دیتی ہے۔ اگر ناک نہ ہو تو بدبو بھی نہ ہو۔ اس لیے جب اور جہاں موقع پاؤ ناک کو کاٹ چھانٹ دو۔ یہ کار خیر ہے، تقویٰ ہے۔ آخرت میں اچھا گھر پانے کا ذریعہ ہے۔

ایک فلک شگاف نعرے کے ساتھ وہ ہجوم ہنگامہ جو حال کی ناک کاٹتا ہے اور حال کی سواری کی گدھی کی دم ذرا اٹھا کر لید اگلتی سرخی میں گھسیڑ دیتا ہے اور یہ سوچ کر کہ حال کی یہ ابتلا اسکے لیے کس قدر نشاط انگیز ہوگی ان کے منہ میں پانی بھرتا ہے اور اذیت کی لذت آگینی سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تن کھڑے رونگٹے دیکھ کر ہجوم میں شامل لڑکیاں وہیں گرد آلود راستے پر بیٹھ جاتی ہیں اور گھٹنوں کو بازوؤں میں بھینے کے ساتھ کس کر سسکاریاں بھرتی ہیں۔

تب ان کا بہجت بھرا ہیجان اچھل اچھل کر بہتا ہوا ایک دھرتی دھکیل نعرہ لگاتا اور۔۔۔۔ جب حال کے بہتے ہوئے لہو میں ان کے دل کاغذ کی کشتی کی طرح رواں ہوتے اور ان میں سے ہر ایک آپس بالک کی طرح مسرور ہوتا جو پانی میں کشتی چھوڑ کر اس کے ساتھ ساتھ آہستہ کبھی تیز چلتا، کبھی دوڑتا ہے، حال کے تازہ بہ تازہ لہو کا گرم جوش بہاؤ گدھی کا خاکستری بانا سرخ کر چکا ہوتا اور دم کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے جا کر نوک دم سے ثانیہ بہ ثانیہ ٹپکتے ہوئے دم کو بھی اس نے دم گھڑی میں بدل دیا ہوتا۔ اور ٹانگوں کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے جا کر جس نے گدھی کے ناخنوں کو بھی آرائش کی سرخ چمک دے دی ہوتی۔ اور وہ گدھی لہو سے چمکتے اپنے ناخنوں کی زیبائش دیکھ کر خوش ہو ہی رہی ہوتی کہ دھرتی دھکیل نعرے کے اثر سے بدک اٹھتی اور اس پر لدی حال کی نیم جانی نیچے آپڑتی۔

تم پوچھو گے بھتیجے کہ جب یہ پٹتا حال میں دانت گڑوتی ہے تو دیوتا کہاں ہوتے ہیں۔ کہاں ہوتے ہیں وہ خدا جو کرونوس کو، وقت کو، عزیز رکھتے ہیں۔ اس قدر عزیز کہ اپنے کو وقت سے جدا نہیں سمجھتے ہیں۔ وقت خدا، خدا وقت۔ ارے بھتیجے دیوتا تو برآمدوں ہی میں سے دم دبا کر بھاگ نکلے تھے۔ باقی رہا وہ جسے تم خدا کہتے ہو تو۔۔۔۔ بھتیجے اس کے کیے زمین ویران اور سنسان ہے اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا ہے اور اس کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی ہے یعنی مزے سے سوئمنگ۔ تم کہو گے یہ تو پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔ تو بھائی خدا کے لیے تو سارے اوقات ہی پیدائش سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اسے تو بس اپنی روح کی لطافت کے ساتھ گہراؤ پر پیرنا تیرنا ہی بھاتا ہے۔ ہاں کبھی تاریکی زیادہ بڑھی تو کہہ دیا روشنی ہو جائے۔ (اور قصہ ختم پھر ہر کسی کا اپنا دوزخ اپنا بہشت)۔ اور کہہ کر پھر تغافل خداوندی سے کسی پامال کائنات کے گھاؤ گہراؤ پر تیرنے لگے۔ اس کے لیے ملٹی ورس کی کسی یونی ورس کی ان گنت کہکشاؤں کی ایک کہکشاں کے ایک نظام شمسی کے ایک سیارے کے ایک نظم الاوقات کی ایک گدھی سے گرے ایک حال کی کیا اوقات۔۔۔۔

تو وہ حال۔۔۔کسی خدا کا تخمہ خام، قرنوں کی شتابدیوں کا ایک انش، زمانوں کی ٹھوکر گھدو کی ادھڑ اڑ گھر پڑی ایک دھجی، کسی ساعت کی کوکھ سے گرا کچا حمل ثانیہ۔۔۔جیسے وقت اپنی مالا سے نکال دے، زمانے کی دھتکار، اوقات کی پھٹکار۔۔۔ پھاڑ کر پھینک دیے گئے کیلنڈر کے مڑے تڑے ورق، گزشتہ کی نچی کھسوٹی جنتری ایسا ان کا حال، منڈ کڑی مارے وہاں پڑا رہتا اور جیسا کہ ہر آنسو، میلے اور کارنیوال کے انجام پر ہوتا ہے۔ گرانی نے اب چاروں اور گرنا اور دلوں نے تھک کر بجھنا شروع کر دیا ہوتا۔ مگر غزالی کے لڑکوں اور لڑکیوں کے چہرے اس خیال سے گل گوں ہو رہے ہوتے کہ جب انہوں نے حال کو اپنی درس گاہ کے برآمدوں، تجربہ گاہوں اور کتب خانوں سے باہر ہنکایا تھا تو وہ چند تھے، سر پھرے چند۔۔۔ جن کی آوازوں کے جوش میں بھی ایک ضعف ہوتا، جس کی نرمی سماعت کو خوش آتی۔ مگر جوں جوں ہجوم بڑھنے لگتا اور اس میں اٹھتی لہریں موجوں میں بدلنے لگتیں تو مصمم مداومت کی ایک بھنبھناہٹ سماعت کے درپے ہونے لگتی۔ کہیں یہ بھنبھناہٹ بھیڑ کا بے ساختہ قہقہہ ہو جاتی کہیں ٹھٹھا کہیں ٹھٹھول۔ پھر اچانک کوئی لڑکا، کبھی کبھار کوئی لڑکی اپنے کسی ساتھی کے کندھے چڑھتی اور آواز کے ڈرامائی اتار چڑھاؤ اور ہاتھوں کے مبالغہ آمیز تہلکے سے خطابت کے جوہر دکھانے لگتی اور جب کتابیں، کاپیاں، پرس، ٹوپیاں ہوا میں اچھالی جارہی ہوتیں تو کاندھوں چڑھا رچڑھی فری فال مین خود کو بھیڑ پر گرنے دیتا کہ تب بھنبھناہٹ کہیں نہ ہوتی۔ صرف شور ہوتا۔ شور و شغب، ہنگامہ ہاؤ ہو، غوغا، جس کے بیچ آوازوں کی نوع بہ نوع تصویریں بنتی بگڑتی دکھائی دیتیں۔ کہیں آوازوں کے پرشور پانیوں میں اب بھی سکوت کا ایک آدھ جزیرہ دکھائی دے جاتا مگر چوں کہ یہ غیر فطری ہوتا، اس لیے سنتے ہی سنتے آوازیں بلکم ڈالتی آتیں اور اس پر ہلا بول دیتیں۔ اب تو جھجے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ بلڑ ہر طرف مچ چکا ہوتا۔ ہر طرف غوغا، غل وغش اور غرش وغرش کا راج ہوتا کہ اب ان آوازوں کی رسائی اس بیچ تک ہوتی جہاں یہ اپنے طول موج کی در پر آئی ہر چیز پر کپکپی طاری کر سکتی تھیں۔ فضا کی گرتی دیواروں کو زمین بوس کر سکتی تھیں۔ ہوا پر دہشت طاری کر سکتی تھیں۔ یہی نہیں جھجے اب یہ آوازیں، آوازوں کی امکانی صلاحیت اور کاری گری بابت جتنے بھی روزمرہ اور محاورے تم نے سن رکھے ہیں ان سب کو فی الواقع وقوع پذیر کر سکتی تھیں۔ آسمان میں تھگلی لگا۔۔۔ فلک شگاف سکتی تھیں۔

اور ایک دن ٹھیک یہی انہوں نے کیا بھی۔ وہ بلوائی ہجوم اس روز کچھ یوں شورائی، یوں غوغائی ہوا کہ اس نے آسمان میں سوراخ کر دیا۔ جھجے واقعی سوراخ۔ یعنی محاورے کے ساتھ وہ ہوا جو کیا کسی کے ساتھ ہوگا۔ بس پھر کیا تھا۔ فضا کے اس حصے کے عقب میں واقع چاہ ہائے فضا و قضا میں قرنوں سے قید برچھیاں آزادی کا جشن مناتی نکلیں اور زمین پر برس پڑیں اور ان برچھیوں کی اس ورشا میں ایسی پیہم بے روک شدت تھی کہ ایک گھور پیڑا ہمیشہ کے لیے دھرتی کے پیڑو میں ٹھہر گئی۔ پھول مرجھا گئے اور ہر طرح کے بوم بلبل فاختہ گھر گھروندوں سے گر گئے۔ پانی رونے لگے اور دوسرے پانیوں کے ساتھ ساتھ تہ در تہ زیر آب دھاروں پر سفر کرتا یہ گریہ بیجی ڈولفن کی اوجھل پناہ گاہوں تک جا پہنچا۔ وہ تڑپ کر سطح آب آئی اور ان پیہم برستی برچھیوں کو اپنے بدن کی سفید جھنڈی دکھا کر ہمیشہ کے لیے پھر کبھی سطح آب دکھائی نہ دینے کے لیے فنا کے گھاٹ اتر گئی۔

جب کہ پیچھے۔۔۔ جیسا کہ ہر میلے کے انجام پر ہوتا ہے، گرانی نے چاروں اور گرنا اور دلوں نے تھک کر بجھنا شروع کر دیا ہوتا۔ مگر غزالی کے لڑکوں اور لڑکیوں کے چہرے اس خیال سے گل گوں ہو رہے ہوتے کہ جب انہوں نے حال کو اپنی درس گاہوں کے کوریڈورز، کتب خانوں اور تجربہ گاہوں سے باہر ہنکایا تھا تو وہ چند تھے۔ سر پھرے چند، مگر اب وہ ہجوم تھے۔ دیس دیس، دھرم دھرم، نسل نسل کے رنگ بہ رنگ ہجوم۔ اور کہ جب وہ حال کا ہانکا کرنے نکلے تھے تو ان کی راہیں گرد آلود تھیں اور جوتے بدرنگ۔ اب نہ صرف یہ کہ گرد لہو کے احسان تلے دب چکی تھی، بہت سی ان جوتوں پر سرخ پالش ہو گئی تھی۔ چمکتی ہوئی، خوش رنگ۔ اور لہو اور دھول کی یہ پالش ایسی حیات انگیز تھی کہ اسے پا کر ان کے جوتے چونچال ہو گئے تھے اور ایسی خوش فعلی سے چھپ چھپ لہو میں چھپنے

اڑاتے تھے جیسے حال کا لہو جوتوں میں دوڑنے لگا ہو۔

یوں جب وہ لذت سے گرا انبار، جشن انجام ہجوم گرتا پڑتا تکان آمیز ٹھٹھولی میں ایک دوئے پہ ڈھیتا گھروں کی راہ پر ہوتا تو حال، ان کا حال، اپنے اور ان کے جریان کے لہو کو، محبت سے شکستہ بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اپنی طرف سمیٹنے لگتا، جوں بہ چکے لہو کو پھر سے نسوں میں بھرنے کا جتن کرتا ہو۔

حال کی اس بے کسی پر گھروں کے آرام دہ الوژن کو رواں دواں شورائی ہجوم کی لطف جو ستم رانی چمک اٹھتی ہے اور ان میں سے ہر ایک، اپنے حال کے لہو کی پالش سے چمکتے اپنے جوتے کی کم از کم ایک ضرب ضرور اپنے حال کو رسید کرتا ہے۔ وداعی ضرب۔فیئر ویل کک۔ جسے پا کر ان کا حال ہنستے ہوئے کراہتا: او بچو! او میرے بچو! کیوں درپے ہو تم میرے۔ مجھے تو کچھ نہیں چاہیے۔ میں گدائے وقت ہوں، بندۂ ساعت ہوں، بجز ثانیوں کے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔۔

یہ کہتا اور پھر منڈ کڑی مار پڑ جاتا۔۔۔۔۔۔ہے۔۔۔۔گا، ان کا حال۔

ایک روز کیا ہوا بھتیجے کہ جب میں حال کے اس حال کو دیکھتا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی نے حال کو وہ لذت خیز الوداعی ضرب رسید کرنے سے پہلے فاسٹ فوڈ سا کچھ دانتوں میں لیا اور بایاں بازو ہوا میں بلند کر کے نعرہ زن ہوئی۔ مگر خوراک کا زرہ سانس کی نالی میں جانے سے وہ نعرہ پورا نہ کر پائی اور کھانسی کے غلبے سے ہری ہو گئی۔ تب حال نے دیکھا کہ وہ کم سن ہے اور ایسے حسن کی مالک ہے جس کے حضور صرف موت شرف قبولیت پاتی ہے۔ اس کی زردی مائل گیہواں رنگت میں چیت کی پہلی ہریالی کی جوت تھی۔ حال نے اس جوت جوالا سے روشنی اور حرارت پا کر کہا: تمہیں تمہارے ہریالے وقت کی قسم خوب صورت لڑی! مجھے مضروب نہ کرو۔ میں تو وقت کا پھل ہوں۔ رسیلا، خوش ذائقہ۔ اپنے دہن و ذہن کو اس سے آشنا کر و اور میرے رس کو میرے اپنے لہو میں آمیز ہونے دو۔ عجب نہیں کہ پھر ستارے تمہارے حضور سفارتیں بھیجیں اور تمہاری سبزہ سنہری رنگ میں ایک رنگ دوام کا آ ملے۔ اگر تم نے یہ نہ کیا تو شجر فلک جو زمین پر موجود و معلوم ہر پھل، ذائقے اور رس کا مادر پدر ہے رنج و افسوس سے لرز اٹھے گا اور اس سے جھڑ کر ایک ایسا بیج زمین کی کوکھ میں پڑیگا کہ پھر کسی کھیتی میں سوائے زقوم کچھ نہ اگے گا۔ پھر کے دن جی پاؤ گی یہاں اس زمین پر۔ تب تمہارے بدن پر جو تب تک اس قدر کر یہ ہو چکا ہوگا جس قدر کہ اب حسین ہے، فرشتے آئیں گے اور ''روح اس طرح کھینچ نکالیں گے جیسے لوہے کی سیخ کو بھیگی ہوئی اون سے نکالا جاتا ہے''۔ اور جب تمہاری روح سے بدبودار مردار کی سی بو آتی ہوگی تو وہ اسے ٹاٹوں میں لپیٹ لیں گے۔ پھر اسے لے جا کر سجین میں جو پاتال میں ہے کیلوں سے ٹھونک کر لٹکا دیں گے۔ اس لیے اے حسن کی بین آیت! اے تو کہ جس جانب موجودات رفتار نور سے متوجہ اس سے پہلے کہ زشت روئی تمہیں آ لے اور موجودات و مخلوقات اس سے کہیں زیادہ رفتار سے تجھ سے بھاگیں، مجھ سے اعتنا کرو۔ اے صاحب وجہ ابیض! تمہیں کتاب کی قسم جس میں تمہارا ذکر ہے۔ مجھ سے کنارہ نہ کرو۔ ابیض کو اسود ہونے میں دیر نہیں۔۔۔۔'' آواز کی ایک نرمل لہر کو زیر ساعت چھیڑ کرتے ہوئے تو ضرور اس لڑکی نے محسوس کیا مگر آہ! سانس کی نالی اور وہ شریر زرہ خوراک! خدا خدا کر کے کھانسی تھمی تو ایک مشک بار نفیس ٹشو پر آنکھوں کا پانی لیتی ہوئی وہ آگے بڑھی۔ اور بس بڑھی ہی تھی کہ وقت کی کراہ نے اسے چھوا۔ بے ارادہ ایک اچٹتی نظر اس نے عقب میں ڈالی تو دیکھا کہ اس کے ایک ساتھی لڑکے نے ادھ موئے حال کو پیٹ میں ایک زوردار لات رسید کی ہے اور اپنے خاک و خون میں غلطاں ہاتھ جوڑتے ہوئے، حال بہ منت و زاری کہتا ہے: نہیں پیارے بچے! مجھ سے یہ نہ کرو۔ خود سے یہ نہ کرو۔ یہ کرو گے تو کیسے بچو گے اس دن سے جو تم پر دفعتاً آ پڑے گا۔ میں وقت کا ملبوس وقت کی کھال ہوں۔ مجھے کھینچ لو گے تو کیف تنقون۔۔۔ کیسے بچو گے اس دن سے جب بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ لڑکے نے مگر ایک نہ سنی، منہ سے لگا کوک کین خالی کیا اور تبختر کی ایک شان غلط انداز سے ایک طرف اچھال

دیا پھر ضرب میں زور بھرنے کے لیے ضروری فاصلہ قائم کرنے کے لیے وہ پیچھے ہٹا تھا جب لڑکی نے چاہا کہ اسے روکے۔ مگر حال تو، جو خود اپنے لیے لڑکی کا مددگار ہوتا، لہو میں نہایا اپنے گھاؤ مٹی سے بھرتا تھا۔ سوالڈتی ہوئی ایک خلقت اس لڑکے کو اکساتی ہوئی اور بے ہنگم و ہنگام ہو کر لڑکی کو بہالے گئی۔

مگر یہ کیسی آواز تھی جو زیرِ سماعت سے اٹھ کر اس کے گوشِ نازک کی متلاشی تھی۔۔۔۔

اے تو کہ عالمِ بالا پر تیری تمجید! اے کسی ازلی کلمے کا دائمی ظہور! مجھ سے ہم کلام ہو۔ میری ڈھارس بندھاؤ۔ تم سے امید کا تمنائی میں تمہارا حال ہوں۔ اے کہ سپیدۂ سحری کی تہہ سے نمود، بحرِ تاریک کے کناروں سے پلٹ آ۔ اے کہ حسنِ ازل کے سامعہ سے تیرے سامعہ کی تخلیق! کیوں اس سامعہ کو تو نے بے ہنگم شور کے اختیار میں دے دیا۔ اے دیوداسی کہ جسے دیکھنے کو ورناسی کے قرب میں بہتے پانی بھور سمے مندروں سے پر پھوڑتے ہیں۔۔۔۔ اور پانیوں کے آنسو کس نے دیکھے ہیں۔۔۔۔ صرف ایک بات ان پانیوں کو آئینہ کرلو تا کہ آئینہ ہائے ماسوا شکست ہوسکیں۔ جانتی ہو خوب صورت لڑکی! میں خیرالقرون کی لڑی میں پرویا ایک موتی ہوں۔ تم نے مجھے اپنے نامسعود وقت سے منسلک سنگ خار سے بھی کم جانا اور ٹھوکروں پہ رکھ لیا۔ اہلِ دنیا کیوں؟

میرے رگ و پے میں، میری کھال کے نیچے ایک دائمی چراغ جلتا ہے جس کی ٹمٹماہٹ کا اشارہ پا کر ہی مستقبل خود کو منکشف کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ نویدِ نو اور نشاۃ کے نور سے بھر جاتا ہے۔ وگرنہ۔۔۔۔ وگرنہ، اے اہلِ تماشا! ایک پرندہ کرلاتا ہے۔ قرنوں سے گرینڈ کینین جس کے اجداد کا گھر ہے، وہ ایک پرندہ کرلایا ہے۔

اے اہلِ زمانہ اس کرلاٹ کو سردار سیفل کی کوک میں آمیز ہوتے سنو۔ مسٹر پریذیڈنٹ! دھرتی کا چپا چپا میرے لوگوں کے مندر ہے۔ اور سنو ہی نہیں دیکھو بھی کہ کرۂ ابر و باد کو لپیٹ میں لیتی یہ کرلاٹ کیسے بابل و نینوا میں دم بہ خود ہے، کیونکہ قرنوں پہلے پورے چاند کی ایک رات کو یہاں جب کہ ہوا دھیرے دھیرے پانیوں پر بہتی تھی ایک مچھلی نے ایک پیغمبر کو کنارِ آب اگل دیا تھا اور دردِ جدائی سے روتی ہوئی اپنے پانیوں کو لوٹ گئی تھی۔ تب سے آج تک وہاں کے آب و باد، شجر و حجر، جن و انس اس لمحے کی یاد کے عالمِ تحیر میں ہیں اور اے اہلِ زمانہ! سنو! الواحِ خاک پر لکھا گیا کہ پورے چاند کی راتوں میں آج بھی وہ پیغمبر اپنے ارفع مرقد سے زینہ بہ زینہ چاندنی پر پاؤں دھرتے اسی کنارِ آب آتے ہیں اور جب ہوا ان کے سادھے ہوئے دم میں شامل ہونے کے لیے بے کل ہوتی ہے تو اسی مچھلی کی پشت میں چلی آتی کوئی نہ کوئی مچھلی بھی کسی لہر میں سے سر نکال کر ان تقدس مآب کو دیکھتی ہے اور جب وہ دونوں۔۔۔۔ صرف ان دونوں کو خاص منطقہ لسان میں ایک دوئے سے کچھ کہتے ہیں تو چاندنی اور چاندی ایسے پانی بھرے امن اور راحت کے چند اور دن دنیا کے بخت میں لکھ دیے جاتے ہیں۔

اے جمیلہ! بتا کیوں تو نے ان الواح کو نوکِ پاپوش رکھ لیا جن پر مچھلی اور پیغمبر کی کہانی کندہ تھی اور ان گنت دیگر الواح جن پر شاعروں اور قصہ گروں نے حیرت سرائے دہر کی کتنی ہی حکایات کندہ کر کے پہلے انہیں دل کے خون سے رنگین کیا پھر جگر کی آگ میں پکایا۔ جب وہ تڑختی ٹوٹتی الواح بھاری ایڑیوں تلے پستی تھیں، کیا تو نے قصہ گروں شاعروں کا دل ٹوٹنے کی صدائیں سنیں؟ نہیں سنی ہوں گی کہ ایسی صدائیں اپنے لیے کچھ خاص سماعتیں انتخاب کرتی ہیں۔ پھر بھی، میں کہ نوبت بہ نوبت تمہارے لیے دل خون کرتا ہوں مجھے گوش شنوا دو۔ میری سنو! میں آئندہ کا منادہوں، نہ سنو تو موت ہوں۔ مگر اے کرنتھیو! لہو روتی میری آنکھوں پہ نہ جانا اور نہ میرے شکستہ اعضاء پر کہ میرا لشکر تو لمبے ہیں۔ کبھی نہ شکست خوردہ۔ کہ میں توڑ بھی دیا جاؤں تو بھی دستِ خداوندی ہوں۔ خداوند ہوں اور جیسا کہ پولس رسول پہلے ہی تمہیں لکھ چکا ہے۔ خداوند کا نام محکم برج ہے اور خدا کی کم زوری آدمیوں کے زور سے زیادہ زور آور ہے۔

سنتے ہو، سمجھتے ہو تم کچھ؟ مگر کیا تمہارا سننا اور کیا سمجھنا کہ کبھی جب جتنی سمجھ بھی لیتے ہو کچھ تو جب تک نا سمجھی نہ کرلو کل نہیں پڑتی تمہیں۔ تم مجھے اتنا ہی سنتے اتنا ہی سمجھتے ہو جتنا تمہارے جوں کا توں کو جوں کا توں رکھے۔ اگر مجھے تم پورا پالو، تو تمہیں اپنے آب و باد، اساطیر، ادیان اور عرض طول بلد سب بدلنا پڑیں اور ایسا کرنے کے لیے تمہیں اپنے کو کون سے نکلنا پڑے گا۔ جو۔۔۔۔ کیوں چاہو گے تم اس سے نکلنا۔ اور فی الاصل میری اصل پانے کے لیے بھی تمہیں اپنے فردوسی کچھوں سے نکلنا پڑے گا۔۔۔۔ کیونکہ میری لسانیات کا پیرائیہ اظہار، اسلوب اور بیانیہ، کوانٹم لاادریت اور تشکک، سری سٹرینگ تھیوری کی گونا گوں گیارہ جہتی کثیر الاقلیم بوقلمونی کا محض ایک غمزہ، صرف ایک عشوہ، بس ایک ادا ہے۔ جو عکس کہ تمہاری ابجد ہے اس کی اصل میں ہوں۔

تمہاری ابجد جیسے حروف پر مشتمل ہے میری ابجد بے انت ابجدوں پر مشتمل ہے۔ میری ایک ابجد کے حروف تمام نباتات ہیں تو دوسری کے تمام جمادات، ایک کے حیوانات ہیں تو دوسری کے چرندے اور پرندے۔۔۔۔ ایک کے تمام لوگوں کی تمام اساطیر کے تمام حروف تو دوسری کے تمام الہامی کتابوں کے تمام حروف، ایک کے تمام ساحلوں کی تمام ریت کے تمام ذرات تو دوسری کے تمام کہکشاؤں کے تمام ستارے۔ ایک ابجد میں سارے کانٹے ہیں تو دوسری میں سارے کنکر۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہاری ابجد اگر حروف پر تو میری اسماء، افعال، کلمات، محاکات اور تصورات، تصاویر، مجسموں، نقوش اور مناظر پر مبنی ہے۔ کبھی کئی صفحات پر پھیلا ایک جملہ میرا ایک حرف ہوتا ہے کبھی پوری ایک پستک ایک حرف۔ میرا ایک حرف غالب ہے ایک شیکسپیئر۔ ایک بیدل ایک بیکٹ۔ ایک میرا ایک منٹو۔ ایک فیضی ایک جوائس اور ایک اس کی کتاب یولیسس۔ ایک میرا حرف دوستوفسکی ہے تو ایک اس کی تمام تصانیف اور فی الاصل میرے مصوتے بھی یہی تصانیف ہیں اور مصمتے بھی۔ یہی میری صوتیات یہی میری نحویات اور معنیات اور یہی میری فاعل، فعل، اسم اور خبر ہیں۔ مثال کے طور پر فاعل اگر کارل مارکس ہو فعل ایڈورڈ منچ کی دی سکریم اور خبر سارتر تو فعل حال مطلق کا دوسرا جملہ دوسرا پیراڈائم دوسرا جہاں تشکیل پاتا ہے اور فاعل اگر آئن سٹائن ہو فعل ایک بار پھر ایڈورڈ منچ کا چیخنا، کہ چیخنا فعل حال مطلق کے ہر جملے کا فعل ہے اور خبر سٹیفن ہاکنگ تو تیسرا جملہ تیسرا پیراڈائم تیسرا جہاں۔۔۔۔ اور یہ تینوں اگر ضم ہو کے یہ ہم ایک جملے کی تشکیل کے لیے فاعل فعل اور خبر بنتے رہنے کے عمل اور رد عمل، تھیسز، اینٹی تھیسز، سنتھیسز، اینٹی سنتھیسز کے زنجیری تعامل میں مصروف و ملوث ہو جائیں تو جملوں اور جہانوں کا جو لامتناہی سلسلہ شروع ہوگا فی الاصل وہ ہی پریزنٹ انڈ یفی نٹ ٹینس رفعل حال مطلق کا اساسی جملہ ہوگا۔ تو اے جمال جہاں آرا! دیکھو کیسے لہو نے مٹی کو گوندھ کر ایک لوح کی شکل دے دے ہے اس پر "دیکھو۔ میں نے کیسے بڑے بڑے حروفوں میں تم کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے"۔ اے سرتا نوک پا روح! روح بھی کیا روح کو گھائل کرتی ہے؟ جب کہ سارا مسئلہ روح کو مادے میں منقلب کرنا ہو۔ اے مجسم خوبی کہ جس کی زینت، دار کی سدا بہار ٹہنی سے کی گئی ہے۔۔۔۔ اے سدا سہاگن کنواری! کسی شب مجھ پر عریاں ہو۔ اے کاش کوئی شب میرا خیال تجھے شہوانی ہو۔ اے زرخیر گل عذار مجھے سیج تک آنے دے کہ اب میری ایستادگی مجھے کرب ہے۔ تجھے خدائے ایستادگی کی قسم، مجھے آنے دے۔ اے حباب و سحاب سوں بے اعتبار و نا ستوار میری اور میرے بچوں کی ماں! کبھی تازہ ہل چلے کھیتوں کی نرم مٹی پر اور کبھی تازہ چنے سرخ انگوروں کے ڈھیر پر پورا ایک موسم مجھے مشغول ہونے دو۔۔۔۔ یوں کہ ہمارے مجنوں بوجھ تلے انگور رس چھوڑ دیں اور جب تمہارے اندر ہمارے رس ممزوج ہوتے ہوں تو اونچے چوبی ناند ارغوانی مے سے لبریز ہو چکے ہوں اور۔۔۔۔

اے بالانشین! کہ جس کے جھروکے کے پانی کاٹ کر اور دریچے ہوا کو ٹھہرا کر تخلیق کیے گئے ہیں جس کے پاؤں چھو لینے کو عود و لوبان پستیاں ڈھونڈتے ہیں! کسی روز اپنے عنبریں برج عاج سے میری تاریک کٹیا میں اتر اور بہار کا ایک پورا موسم میرے ساتھ گزار۔۔۔ شاید ہم ایک ایسے موسم کو جنم دے پائیں جو اس جہان پر پہلے کبھی نہ گزرا ہو۔

مگر وہاں ہوتا کو جو اس کی سنتا!

شام کا ایک چٹیل میدان۔ کناروں پر وسعت پذیر۔ اور کچھ دور پڑے شہر کی دہلیزوں، درس گاہوں، چولہے چوکوں دستر خوانوں اور چارپائیوں پر۔۔۔۔دم بخود۔۔۔ایک جھٹپٹا۔ اور ان دونوں کے ہاتھوں سے چور کی طرح نکلتا اندھیرا۔ نوبت بہ نوبت سو بہ سو قریہ بڑھتا۔ ان کے کھیتوں میں بیج کی جگہ پڑتا۔ پھر کھلیانوں، پانی کے سرچشموں اور مویشیوں کے تھنوں میں پھونک پھونک اترتا۔ پھر پہاڑی چوٹیوں پر چڑھ کر برف چباتا اور ہر چاپ پر دریاؤں کو میدانوں میں درد سے پھنکارتے سنتا۔ وہ اندھیرا۔

اے کاش وہ لڑکی ہی سنتی! مگر کوئی ٹھکانہ تھا اس کا، ارضی آب و آتش اور حبس و باد میں ہر ٹھکانا جس کا ٹھکانا تھا۔ اور یہاں اس سے عریاں ہونے کی آرزو میں اس کا بدن جلتا تھا۔ اس ہرجائی کے ہزار بھاؤ تھے اور ہر بھاؤ میں ایک چرتر۔ ہر چرتر میں ایک ہست اور ہر ہست میں پھر بھاؤ پھر چرتر۔

وہ اس کے پیچھے لپکتا تو وہ اپنی کھاٹ اٹھاتی اور سمندر کی تہ میں جا بچھاتی۔ وہ تہ کو جا چھوتا تو وہ کھاٹ سے پھسل کر مونگا چٹانوں کے مساموں میں جا چھپتی اور سکھی سہیلیوں کو ساتھ ملا کر آبی نفیریوں پر ایسے سیال راگ چھیڑ دیتی جو دل کو جگہ جگہ سے چیر دیتے اور جب سندر اس کے گریہ وزاری کے شاکی ہوتے تو آبی تہوں کے ساتھ ساتھ بحر بہ بحر سفر کرتی وہ کسی رکازی آرکائیو میں جا نکلتی اور کوئی نہ کہہ سکتا کہ وہ کیا ہوئی کہاں گئی۔ فی الاصل کسی ٹرائی لوبائیٹ کی صورت متحجر ہو چکی ہوتی۔ وہ لڑکی۔ یوں جیسے ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ متحجر۔ رکاز۔ فوسل۔ اور رہتی وہ یوں ہی۔ برسوں۔ جب تک کہ حال کے اس کے لیے نوحہ و سلام سے سارے کے سارے رکازی دور بہ یک وقت نہ گونج اٹھتے۔ تب وہ اپنی رکازی پنہاں گاہ سے نکلتی اور فطرت کا دیا بیش قیمت لباس زیب تن کر کے نپٹ ٹھسے سے اس کے آگے ظہور کرتی۔ نپٹ سندر۔ نپٹ کٹھور۔ بال بال گالی بندھی کہ کیوں مجھے چین نہیں لینے دیتے ایک جگہ ایک پل ایک چھن اور پھر چل دیتی۔ منہ سے آگ جھاگ چھوڑتی کسی ایسی اور۔۔۔۔جس کا اور نہ چھور۔

مگر حال کو سب معلوم ہوتا۔ اس جفا پیشہ کا اس نے کچھ یوں تعاقب کیا تھا کہ اب اسے سب معلوم تھا۔ کہ موسم سرما وہ ابتدائے وقت کی پہلی ساعت میں واقع اپنے سرمامحل میں گزارتی اور جب سردیاں گزر جاتیں تو بیچ پڑتا ہگز بوسن (Higgsboson) نامی ایک ذرہ الانگ کر وہ گرما کے لیے گرما محل میں چلی جاتی۔۔۔۔

رئیل سے ورچوئیل سے رئیل سے ان رئیل سے بعید الفہم سے سریع الفہم سے اخفا سے افشا سے علامت سے استعارہ سے مجاز مرسل سے متن سے بین المتن سے نشان سے تمثال سے تاریخیت سے تشکیل سے رد تشکیل سے الاپ سے مہر کھنڈ کے ایک دو سے تین سے چھ سے گلے کی بساط پر چالیس چلتی تناہی سے بلمپت سے لاتناہی سے ریاضی سے درت میں سر کے بہلاوے سے۔۔۔۔لے کے ہلکورے سے دھرپد کے طنطنہ سے خیال کی تمکنت میں وہ ڈال ڈال کسی چڑیا کی طرح پھدکا کرتی۔ مگر اس پھدکنے کے لیے اسے وقت درکار نہ ہوتا۔ وقت کو جل دینا درکار ہوتا۔

یوں حال کو ہمیشہ اس کے اور اپنے بیچ کوئی چھل بل کوئی جل جادو برسر کار دکھائی دیتا۔ مگر کبھی کبھار ایک لمحہ طرفہ، کوئی طرفہ سا طرفہ، ایسا بھی آتا ہے کہ اس کی ساری قاعدہ بندیاں ریت کی ڈھیری ثابت ہوتی ہیں۔ اس کی ایک نہیں چلتی اور اس کی محل سرائیں حال کی جفت طلبی سے گونج اٹھتی ہیں۔۔۔۔اس کے کروفر کا سارا لہو نچڑ کر اس کے پیڑو میں آجاتا ہے اور وہ پیلی پڑ جاتی ہے۔ سرسوں زرد۔ اور جب ضبط خواہش سے اس کی ہڈیاں پہلے چٹخنے پھر پگھلنے لگتیں تو۔۔۔۔بڑے جتن سے خود کو انہدام نہانی سے بچاتی، کانپتی وہ۔۔۔۔اپنے سمیں شہ نشینوں سے اٹھتی، آمادگی سے یوں بھری کہ کوئی سکھی سہیلی کنیز باندی اسے روک نہ پاتی۔۔۔اور بھاری نکلئی پھاٹکوں اور ان کے دربانوں کو خاطر میں نہ لاتی ہانپتی ہونکتی وہ بہ دقت کسی بلند، سوختہ، ساگوانی مدخل کے سہارے کھڑی ہو

جاتی اور جب اس کے آتشیں گیسو کسی دم دار ستارے کے ساتھ اڑے جا رہے ہوتے اور مادۂ تاریک اس کے چشم خشم ناک کا کحل ہوتا اور گالیوں کی عنبر حال تک پہنچ رہا ہوتا تو یوں برافروختہ جوں ''خداوند کی سانس گندھک کے سیلاب کی مانند اس کو سلگاتی'' (یسعیاہ) ہو، وہ ایک گلابی بالائے لب لا کر، باخبری کی کج ادائی سے پوچھتی ہے: کیا چاہتے ہو تم۔۔۔۔

حال بھلا کیا کہتا اور کیوں کہتا کہ اس کی آرزو تو کام کر ہی چکی ہوتی۔۔۔۔ ورنہ وہ کہتا کہ زہر فروش درد کی بیوپارن! میرے رہ وار سے قطع رحمی نہ کرو۔ بس ایک بار اسے اپنی گھاس میں دیوانہ وار دوڑ لینے دو۔ سو وہ خاموش رہتا اور امید و بیم بھری دل چسپی کے ساتھ پانی آرزو کو اس کی اتھل پتھل سانسوں میں اور جوبن پر متعامل دیکھتا رہتا۔ تب اس دید و باز دید ہی میں کہیں وہ جان جاتا کہ تمام سمعی بصری لمسی اور شامی الوژن اس کے درپے ہیں۔ ورنہ کیوں، جب وہ یہ دیکھ کر سوچ سونگھ رہا ہوتا کہ اپنے بدنی مس سے ساگونی پھانکوں میں آگ بھڑکا کر ازار بند کی گرہوں سے لڑتی پڑتی وہ ابھی اس کے نیچے آ پڑے گی۔ وہ اس کی آنکھ میں آ پڑتی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ وہ آنکھ بند کرے وہ آنکھ سے نکل کسی بافت یا خلیے میں براج بھی چکی ہوتی۔ ایک سیال خلیے کی ایک تھیلی میں ڈبکی لگا کر وہ دوسری میں جا نکلتی۔۔۔۔ اور جب ملینوں ملین ڈبکیاں لگا چکتی تو۔۔۔۔ اپنے بدن کی پوشیدگی میں سے کرودھ کٹار نکال کر خلیوں کے بخیے ادھیڑنے لگتی۔۔۔۔ اور یوں حاصل ایکڑوں پر مشتمل جھلیوں کو باہر نکال کر ایک غالیچے کی شکل دے دیتی اور اس پر سوار ہو کر ارض و سما اور وقت لا وقت کی سیر کو نکل جاتی۔۔۔۔

حال کا بدن۔۔۔۔ اس لڑکی کا اڑن قالین۔

تو وہ کیوں سنتی!

کیا پڑی تھی سننے کی اسے جو اپنے لیے مشتاق آنکھ کو ساکٹ سے سرجیکل صفائی سے نکال کر پہلے تو اہتمام سے چینی کی بیش قیمت طشتری میں سجائے پھر اس میں آنکھیں ڈال کر حکم دے: دیکھو مجھے اب۔۔۔۔ کیا پڑی تھی سننے کی اسے جو اپنے لیے دھڑکتے دل کے گریہ نارسائی سے بھڑک کر دندناتی دل میں جا کر کھٹاک سے کواڑ بند کرے اور پھر طیش سے بڑھ آئے ناخنوں سے دیوار دل پہ حکم لکھے: اب دھڑکو۔ اور دل اگر اپنی دھڑکن میں سچا اور صمیم ہو اور یک مٹی مکر نیند کے بعد فی الواقعی دھڑک اٹھے تو۔۔۔۔ ازبس برہم ہو کر جو حسینہ اسے نوچ کر پہلے مٹھی بھینچے، پھر دانت کچکچاتی ہتھیلیوں کے بیچ رگڑے مسلے۔۔۔۔ پھر نیچے پٹخ کر تلوے ایڑی تلے پیسے۔۔۔۔ پیستی ہے تا دیر تا آں کہ حال کا وہ دل مہین و لطیف ورق لم ہو کر رقص گاہ کے فرش کی صورت اس کے قدموں میں بچھ جائے۔۔۔۔ اور جب اس تعجب خیز فرش رقص پر ایک زمانہ گزر جانے پر وہ پاکوبی، تانڈو ناچ کے درت میں ڈھل چکی ہو اور دل پر ڈھائی اپنے خرابی سے مطمئن جب وہ رقاصہ پاؤں روک لینے کو ہو تو دل بولے: تانڈو چھوڑ نا ناگو ناچ۔۔۔۔ مجھ سنگ ایک بار۔۔۔۔ بس ایک رات۔ پر تانڈو سننے دے تو سنے وہ ان سنتی!

تو کوئی اور ہی سنتا! اس جم غفیر کے رنگ رنگ کے دیس دھرمیوں میں سے ہی کوئی۔۔۔۔ کوئی تو سنتا! مگر کون؟ اور کیوں؟ کہ بیشتر وہ مرد و زن تو اپنی اپنی بے دلی، فتور یا فم معدہ، بیزاری یا تعلق کی ہر آلائش سے پاک خالص لاتعلقی کے مارے باندھے، یا کرج فاتہ بہلانے یا محض اپنی بے کیف زندگیوں کو دل چسپی کی چند گھڑیاں تحفہ کرنے کے لیے سکڑا یا بڑھا جگر تھامے یہاں طلبا طالبات کے کھیل کا حصہ۔۔۔۔ کیوں کہ بہ ہر حال، یہاں روزانہ کی بنیاد پر کھیلا جانے والا کھیل رومی اکھاڑوں میں کھیلے گئے کھیلوں سے دل چسپی میں کسی طور کم نہ تھا۔

تو وہ کیوں سنتے! ان میں سے کوئی کیوں سنتا! دن بھر کی باچھیں کھلاتی، تو کروں حظ و مسرت لٹاتی تفریح کے بعد۔۔۔۔ آنند بھرے آرام سے مطمئن، آسودہ، مطبخ کی طرف پورا منہ کھول کر وہ جماہیوں کے درمیان پوچھتے: اور کتنی دیر ہے۔۔۔۔

پھر اپنے استفسار کو اوں آں ایں ایں گُوں گاں گی گی میں بدل جانے دیتے ہوئے وہ مطبخ سے آتی آوازوں کو علائم و تمثالات میں ڈھال کر دل میں اتار لیتے، پھر کھانے کی میز پر پڑی چھوٹی بڑی چیزوں کی مدد سے ان علائم کو توڑتے کھولتے ہوئے وہ دائمی طور پر الجھے تذکیری تانیثی اعضا کے ساتھ سنگ بستہ ہو جاتے۔۔۔۔

اور مطبخ میں مسالہ بھونتی تذکیرو تانیث تک میز پر سے اٹھتی آوازوں کے علائم کی گرہ کشائی بہ خوبی پہنچ رہی ہونے کے سبب دیگچی میں مسالے کے ساتھ ساتھ علائم و تمثالات بھی بھن رہے ہوتے، تا آں کہ۔۔۔ وہ تذکیرو تانیث اگر اپنی آگ میں جل نہ اٹھے تو اپنی بھیگ سے لڑکھڑا ضرور جائے جب کہ سیدھے ہاتھ پر دھری رکابی میں لہو میں تر ایک پارچہ ٔ لحم کو گردش خون کی یاد تھرتھرا رہی ہو اور فی الاصل یہ تھرتھراہٹ اس زندہ جان ورکی، عین صحت مندی کی حالت میں کھڑے کھڑے کاٹ لیے گئے۔ اپنے گوشت کے لیے پکار کا جواب ہو۔ پھر یہ پارچہ کاٹ کر زخم بھدے پن سے سی دیا گیا ہو خواہ مٹی یا گھاس پھونس سے بھر دیا گیا ہو اور وہ زندہ حیوان کانپتی ٹانگوں بلبلا کر اور یہ پارچہ تھرتھرا کر ایک دوسرے کو دردِ جدائی ترسیل کرتے رہے ہوں تو کرتے رہے ہوں۔ تو خواب گاہی خیالوں میں غلطاں وہ مردو زن۔ پارچہ لحم کے ساتھ مصروف یا اس کے منتظر، حال کی کیا اور کیوں سنیں!

اور ان کی اولادیں۔ غزالی کے طلبا و طالبات۔ حال کے ساتھ اچھی جھڑپ کے بعد وہ گھٹنے پیٹ میں دیئے ادھ کھلے منہ کے ساتھ خواب خرگوش میں تھے۔۔۔۔ غیر اغلب نہیں کہ دن بھر کی حقیقت کو خواب میں حقیقت کر کے وہ لطف، تفریح پکنک اور مہم جوئی سے مملو اس دن کو پھر سے جی رہے ہوں اور یہ غزالی کے فی الواقعی رانجینئر ڈرور چوئیل ماضی میں جا کر جی آنے سے زیادہ نشاط انگیز ہو کیوں کہ آپ بیتی خوش گیتی کو خواب گیتی کر کے جینا ہی فی الاصل ہمیشگی کے بہشتوں میں جی آنا ہے۔ اور یہ بھی غیر اغلب نہیں کہ ان بہشتوں کو قبل از آخرت جی لینے کے لیے اور ان میں اپنے قیام کو دائمی طور پر یقینی بنانے کے لیے ہی وہ آخرت قبل از آخرت کے تصور کو حقیقت میں بدلنے کے لیے، کسی دوسرے وقت دوسری جگہ، حال کے ساتھ ایک اور جھڑپ کے لیے خود کو تیار کرتے ہوں۔

مگر مجھے اعتراف کرنے دو بھتیجے۔۔۔ کہ میں نہیں جانتا کہ فعل حال مطلق بارے بات کس فعل میں کی جائے۔

☆☆☆

نیا پُل

اعجاز راہی

تنگ گلیوں اور غلیظ کمروں میں گھٹن بڑھنے لگی اور حبس سے دم گھٹنے لگا تو لوگوں نے کپڑے اتارنا شروع کر دیئے۔ پہلے اوورکوٹ اترا، پھر کوٹ، سوئیٹر اور جرسی کی باری آئی اور آہستہ آہستہ جانگیے نے پتلون کی جگہ لے لی۔ تب سارے شہر میں میں اکیلا رہ گیا۔ شہر والے کپڑے اتار رہے تھے اور میں کپڑے پہن رہا تھا۔ جس رفتار سے وہ کپڑے اتار رہے تھے، میرے بدن پر کپڑوں کے انبار اسی رفتار سے بڑھ رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ان کپڑوں کے ڈھیر میں بھی ننگا ہوں۔ پہلے میں ننگا ہو کر بھی ننگا نہیں کہلا سکتا۔ کہ میں لاؤ کوایہ کی عذاب زدہ نسل سے ہوں۔

میں جب سوچتا ہوں لوگ کتنے عجیب ہیں، تو مجھے وہ وقت یاد آ جاتا ہے جب میں نے کپڑوں کے تنگ حصار سے گھبرا کر اسے توڑ دیا تھا اور روح کا ازلی و ابدی ننگا جسم لیے بازاروں میں گھومنے لگا تھا تو لوگوں نے یکا یک اپنے خاکی جسموں کے کرب کے گرد مخملی اور سوتی سراب کی دیواریں چن لی تھیں۔ اتنی گہری دیواریں کہ میں ان میں جھانکنا بھی چاہتا تو وہ نظر نہیں آ سکتے تھے۔

کتنے عجیب ہیں یہ لوگ!

میں نے بھی تو اپنے جسم کے گرد کپڑوں کے کرب کی دیواریں چن لی ہیں۔ اونچی اونچی تنگ دیواریں۔ جیسے یہ دیواریں کسی گہرے کنوئیں کی دیواریں ہیں جس میں مجھے ایلپس کے مقدس پہاڑ سے آگ چرانے کے جرم میں الٹا لٹکا دیا گیا ہے اور میں روح کا ازلی و ابدی ننگا پن کپڑوں میں چھپائے آج بھی ٹوٹے ہوئے پل کی دیواروں کو یاد کرتا ہوں۔ جن کا اب نشان بھی نہیں۔ بوڑھے پل کی گود سے نیا پل جنم لے چکا ہے۔ اب راستے میں کوئی پل صراط نہیں۔ نیا پل ہے، جس پر سے اب میں روزانہ کئی بار گزرتا ہوں۔

مٹی کا ٹوٹا ہوا پل۔ میں اور امجد کئی راتیں ساتھ گزار چکے ہیں۔ رات جب دن کے ننگا پن کو چھپانے کے لیے اپنے پر پھیلا دیتی ہے تو مجھے اس کی بھیانک خیزیوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ لیکن رات تو مامتا سے بھرے گداز بازوؤں کی طرح ہمیشہ مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی اور میں امجد کا ہاتھ تھامے ہولے ہولے پل کی طرف چل دیتا۔ پل کی طرف جسے بوڑھا پل کہہ کر اس پر سے بھاری ٹریفک کو روک دیا گیا ہے۔ بوڑھا پل جس کے سینے سے سینکڑوں ہزاروں، لاکھوں بھاری پہیئے گزرے تھے۔ بوڑھے پل پر سے بھاری ٹریفک کو روک دیا گیا۔ رات ہولے ہولے گہری ہوتی جاتی۔ ستارے چمک چمک کر بجھنے لگتے تو میں امجد سے کہتا۔

"میں چلوں؟"

"نہیں۔ کچھ دیر اور ٹھہرو۔ جانا تو ہے ہی"۔

"بہت دیر ہو گئی"۔

"دیر کب نہیں ہوئی"۔

تو میں ازلی بے بسی سے امجد کی طرف دیکھتا۔ جو دو رلٹی کے زخموں سے رستی ہوئی پیپ کو گھورتا رہتا۔ رات کی اندھی گہرائیوں میں لٹی کے زخم اور زیادہ گہرے ہو جاتے۔ جب اس کا درد جاگ اٹھتا تو رات تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگتی۔ لیکن میں امجد اور بوڑھا پل ایک دوسرے کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوتے۔ تینوں جانتے تھے تنہائی کے زخم کتنے گہرے ہوتے ہیں۔

میں پل کی ریلنگ سے اتر کر پل کے چہرے پر پڑی جھریوں کو دیکھتا تو مجھے یوں لگتا جیسے پل دن کی روشنی کی نسبت

اندھیروں میں کچھ زیادہ ہی بوڑھا ہو گیا ہو۔

''ضرور جاؤ گے؟''

امجد ہمیشہ کی مانند پوچھتا۔

''ہاں اٹھ جانے دو۔ بہت دیر ہو گئی ہے''۔

''کیا کرو گے جا کر۔ دروازہ کھل جائے گا''۔

''دروازہ۔۔''

میں بے بس ہو جاتا۔

''بیٹھ جاؤ۔ بوڑھے پل کی یہ ریلنگ تمہارے اونچے مکان کی دہلیز سے بہتر ہے''۔

میں واپس ریلنگ پر بیٹھ جاتا۔ دکھوں کے میلے میں ایک نئے دکھ کا اضافہ ہو جاتا۔ اور جب نئے دکھ کا وجود ختم ہو جاتا، تو میں سوچنے لگتا، گھر جا کر کیا کروں گا۔ دروازہ کون کھولے گا۔ دو بج چکے ہیں۔ تین گھنٹے بعد صبح ہو جائے گی۔ اور پھر رات ختم ہو جائے گی۔ لیکن میں سوچتا رات کب ختم ہوتی ہے۔ رات کے زہریلے سائے جلتی بلتی دھوپ میں اور بھی لمبے ہو جاتے ہیں۔

''میں افسانہ لکھنا چاہتا ہوں''۔

میں چونک کر امجد کے دھندلائے چہرے کی طرف دیکھتا جہاں زندگی کی بھیانک پرچھائیاں رقص کرتی نظر آتیں۔

''بھو، بھو، بھو''۔

بڑے پریس کے برآمدے میں بیٹھا ہوا کتا اچانک بھونکنے لگتا۔

''درحرامی۔۔۔۔''

قریب ہی کوئی گہری نیند سے جاگ کر کتے کو گالی دیتا اور کتا آواز سن کر خاموش ہو جاتا اور چاروں طرف پھر وہی چپ چھا جاتی۔

''افسانہ۔۔۔''

''ہاں۔۔ میں افسانہ لکھنا چاہتا ہوں''۔

''پلاٹ مل گیا ہے''۔

''پلاٹ۔۔۔!''

''راحت ملی تھی''۔

''راحت۔۔ ہاں آج آئی تھی۔ اسے افسانہ چاہیے تھا''۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے زمین کے اس ٹکڑے کی طرح لگا جہاں آ کر روشنی کی آخری کرن بھی دم توڑ دیتی ہے جو روشنی اور تاریکی کا سنگم بن کر رہ جاتی ہے اور پھر وہ راحت بھی کتنی عجیب تھی جو سنگ مرمر کی طرح امجد کو اپنے اندر جذب نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ لمحے لمحے کی طرح اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

''امجد''۔

''ہوں''۔

''کل سے یہ پل ٹوٹنا شروع ہو جائے گا''۔

''اچھا''۔

اس کے لہجے میں کرب تھا۔
''ہم کہاں جائیں گے؟''
''ہم''۔
''ہم''۔
''ہم''۔امجد نے پل کی طرف دیکھا اور پھر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہم کہاں جائیں گے۔ کہیں بھی نہیں۔ پل کے ساتھ ساتھ ہم بھی اپنے وجود کو توڑنا شروع کر دیں گے۔ پرانے وجود کو لاکھوں برس پرانے وجود کو، بوڑھے وجود کو، جسے ابھی تک بھاری ٹریفک کے لیے بند نہیں کیا گیا۔ کرب کا بھاری ٹریفک اب بھی وجود کے انگ انگ پر بھاری وزنی پہیوں سے گزر رہا ہے۔ ہم اپنے وجود سے کرب کے بھاری ٹریفک کو نہیں روک سکتے۔ کرب کا بھاری ٹریفک نہیں رک سکتا۔

ہمارا بوڑھا وجود کرب کی بھاری ٹریفک کی مکروہ گڑگڑاہٹ اب بھی سن رہا ہے۔ سنتا رہا ہے، سنتا رہے گا۔ وجود ریشہ ریشہ ہو چکا ہے۔ لیکن بھاری ٹریفک کو کون روکے گا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر خود ہی کہنے لگا ''ہم سیڑھیوں والے پل پر چلے جائیں گے اور بوڑھے پل کی جگہ نئے پل کر سراسیس کو دیکھیں گے۔ پھر ایک روز نیا پل پرانا پل بن جائے گا۔ اس پر سے بھاری ٹریفک کو روک دیا جائے گا۔ لیکن ہمارا وجود، بوڑھا، پرانا وجود۔۔۔ بھاری ٹریفک''۔

یک بیک موسم خراب ہو گیا۔ تیز ہوا نے اپنا رخ زمین کی طرف کر کے ساری بستی کو اپنی زد میں لینا شروع کر دیا۔ پھر تیز ہوا نے خوفناک شکل اختیار کر لی۔ اونچی نیچی پختہ عمارتیں اور گھاس پوس کی جھونپڑیاں، تیز ہوا کا نشانہ بننے لگیں۔ تیز ہوا زرد دھول کا ایک طوفان ساتھ لائی۔ ساری بستی دھول میں گم ہو گئی۔ ہر شے کا اپنا وجود ختم ہو گیا۔ لوگوں کے چہرے مٹی میں اٹ کر اپنی ہیئت کھو چکے تھے۔ انکے چہرے سیاہی اور زردی کی دوہری لیپ سے مکروہ ہو گئے تھے۔

دوسری صبح جب سورج اپنی نرم گداز کرنوں سے آبادی کو اپنی بانہوں میں لینے لگا تو لوگوں نے دیکھا، تنگ مکانوں کی دیواریں اپنی جگہ سے غائب تھیں۔ دیواریں ہوا اڑا کر لے گئی تھی۔ اور چھتیں زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہو کر رہ گئی تھیں۔ غلیظ کمروں کی چھتیں بارش سے بیٹھ گئیں تھیں۔ خالی خالی دیواریں تھیں جن کے اندر بیٹھ کر دور دور تک پھیلی خلا سے پرے (رنگ بدلتے) آسمان کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ لوگوں کے چہروں کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ تیز بارش انکی آنکھوں سے پانی بہا کر لے گئی تھی۔ اب لوگ چٹے دیدے نچاتے ہوئے ایک دوسرے کو طنزیہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ ایک دوسرے کو چٹے دیدے والا کہہ کر پکار رہے تھے کہ اب تک کسی نے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔

تیز بارش اور آندھی پل کی ریلنگ اور سڑک کو اڑا کر لے گئی اب وہاں پلر رہ گئے تھے۔ اداس اور ویران پلر۔ جیسے ابھی ابھی مقدس مسیح وزنی صلیب اٹھا کر لائے ہیں۔ اور پلاتوس کے حکم سے انہیں گڑوا دیا گیا ہے کہ ان پر خدا کی روح دوسروں میں منتقل کرنے والا اور اس کے ساتھی لٹکائے جائیں گے۔ پھر ایک روز آخری پلر بھی جس کی جڑیں سینکڑوں سال سے زمین کے سینے میں پیوست تھیں شمس تبریز کی کھال کی طرح نوچ کر دور پھینک دیا گیا، تو میں اور امجد دردبھری نظروں سے ٹوٹے ہوئے پل کو دیکھتے ہوئے سیڑھیوں والے پل کی طرف چل دیئے اور دونوں پل کی اونچی ریلنگ پر کہنیاں ٹیک کر اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے۔

اچانک ایک انجن چھک چھک کرتا پل کے نیچے سے گزرا، ایک لمحے کے لیے انجن کا کثیف دھواں مرغولے کھاتا ہوا فضا میں اٹھا اور پھر بکھر گیا۔ میں نے امجد کی طرف دیکھا، اور امجد مجھے انجن کی طرح لگنے لگا۔ اس انجن کی طرح جس کے پیچھے بے شمار بوگیاں بندھی ہوں اور وہ کرب سے چیختا چلاتا تیزی سے بھاگے جا رہا ہو۔

میں شٹنگ کرتے ہوئے انجن کو دیکھنے لگا جو متوازی خط کی دور تک پھیلی پٹڑی پر دوڑتا چلا گیا۔ جیسے اس کی کوئی منزل نہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے کوئی بوگی اس کا دامن پکڑتی اور پھر اچانک ایک جھٹکے سے اسے چھڑا کر تیزی سے اکیلی بھاگنے لگتی۔ اور کچھ ہی دیر بعد بہت سی بوگیوں میں مل کر اپنا وجود کھو دیتی یا کسی اکیلے ویران پلیٹ فارم پر جا کھڑی ہوتی جہاں سالوں تک اسے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔

میں نے سوچا اگر یہ آپس میں ٹکرا جائیں۔۔۔

''امجد۔۔۔۔ یہ آپس میں ٹکرا جائیں تو۔۔۔۔''

''ایک زوردار دھما کا ہوگا۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ خدا جانے کیا ہو''۔

''یہ بوگیاں انجن کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑ دیتی ہیں۔ ہیں نا امجد''۔

''بے چارے انجن۔۔۔''

''بے چاری بوگیاں۔۔۔۔''

''شاید۔۔۔''

''راحت ملی تھی''۔

''آج آئی تھی''۔

''افسانہ لینے''۔

''اسے افسانہ چاہیے تھا''۔

''پلاٹ مل گیا''۔

''پلاٹ تو ہے ہی۔ کلائمکس۔۔۔''

''تم راحت کے لیے کب تک افسانے لکھتے رہو گے''۔

''کب تک''۔

''ہاں، کب تک۔ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتے''۔

''خط۔۔۔۔ ہاں مجھے خط لکھنا چاہیے''۔

پھر کئی دن رات کی سیاہیوں میں ڈوب گئے۔ پرانے پل کی جگہ نیا پل جنم لیتا رہا۔ ایک روز میں جب پل پر پہنچا، امجد پل کی ریلنگ پر کہنیاں ٹیکے دور اسٹیشن کی بتیوں کو گھور رہا تھا۔ جلتی بجھتی بتیاں چاروں اور پھیلے اندھیرے کے سینے میں شگاف ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آج بتیوں کی روشنی بھی ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی جیسے اندھیرے کا سیلاب کچھ ہی لمحوں کے بعد روشنیوں کو ہمیشہ کے لیے نگل لے گا۔ اندھیرے میں ڈوبا ہوا پل اداس اداس نظروں سے اپنے ساتھیوں کو بٹ بٹ دیکھ رہا تھا۔ چاروں اور پھیلی پٹڑیوں پر ہمیشہ کی صورت انجن ایک بوگی کا ہاتھ پکڑے تیزی سے پٹڑیاں بدل رہا تھا۔

''راحت آئی تھی''۔

میں نے ہمیشہ کی طرح سوال کیا۔

''نہیں''۔

''نہیں''۔

میں حیران رہ گیا۔

''خط لکھا تھا؟ جواب آیا؟''

میں نے جلدی سے دونوں سوال کر دیئے۔

''ہاں''۔

میں نے امجد کی طرف دیکھا، وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں دور شنٹنگ کرتے ہوئے انجن پر جا پڑیں۔

''جواب''۔

وہ بڑبڑایا۔

اسی لمحے بوگی نے انجن سے ہاتھ چھڑالیا اور تیزی سے انجن کی مخالف سمت دوڑنے لگی۔ انجن چند لمحے وہاں رکا، اور پھر آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگا۔

''آؤ چلیں''۔

امجد نے کہا۔ اور ہم آہستہ آہستہ پل سے اترنے لگے۔

☆☆☆

سیاہ آسمان

اکرام اللہ

اندھیری سیڑھیاں پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا تو سانس بحال کرنے کے لیے دیوار کا سہارا لے کر رک گیا۔ اور ہاتھ یونہی غیر ارادی طور پر سر کے ارد گرد کسے لوہے کے کڑے کو چھونے لگا۔ میں اس بلڈنگ میں باقس کے فلیٹ پر پہلے ہزار مرتبہ آ چکا ہوں مگر پہلے نہ تو سیڑھیاں کبھی اتنی اندھیری پائیں اور نہ اس قدر لق و دق خالی۔ یوں ہوا کرتا تھا کہ یہی کوئی بیس پچیس سیڑھیاں چڑھے، ایک گیلری سی میں سے گزرے اور سامنے اس کے فلیٹ کا روشن دروازہ کھلا ہوتا تھا آج اب تک اغلباً کوئی دو سو سیڑھیاں تو چڑھ چکا ہوں گا۔ مگر نہ وہ گیلری آئی نہ کہیں کوئی روشن دروازہ نظر پڑا۔ اس بلڈنگ میں اتنے بہت سے آباد فلیٹ ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آج نہ کوئی اوپر جا رہا ہے اور نہ نیچے آ رہا ہے۔ کیا یہ وہی بلڈنگ ہے؟ بلڈنگ تو بہر حال وہی ہے۔ تو پھر اس کے باسی نقل مکانی کر کے کہیں چلے گئے ہوں گے۔ باقی باسی تو خیر فانی انسان ہیں کسی خطرے کی بو سونگھ کر بھاگ لیے ہوں گے۔ مگر باقس تو ایک دیوتا ہے، امر، ازلی، ابدی اسے ان خطروں سے کیا خوف۔ وہ جب چاہے ایک خطے میں سورگ نکل جائے اور جب چاہے اس لوک میں لوٹ آئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے فلیٹ تک جانے والی سیڑھیاں آج یک دم یوں لمبی کھنچ گئی ہیں۔ جیسے ربڑ کا غبارہ پہلے تو محض ایک ذرا سا چھچھڑا ہوتا ہے۔ جب کوئی بچہ اس میں ہوا بھرنا شروع کرتا ہے تو حیران کن حد تک لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔

ان سیڑھیوں پہ ضرور کسی نے ایسا ہی کوئی عمل کیا ہے۔ اب وہ طفل نادان معمول کے مطابق دوہرا ہو ہو کر زور لگاتا ہوا اس میں اپنی گندی سانس ٹھونستا جائے گا حتیٰ کہ غبارہ بھک سے اڑ جائے گا اور یہ سیڑھیاں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی اس کے بعد انسان کبھی اوپر نہ جا سکیں گے اور وہ طفل نادان اداس چہرہ لیے گھر چل دے گا۔ میں اس اندھیرے اور تنہائی میں یوں کھڑا تھا جیسے لحد میں پڑا مردہ اور حیرانی کی بات ہے کہ میں اس کی طرح اپنی تنہائی سے بے خبر بھی تھا۔ وہ اپنے کفن میں مگن ہوتا ہے۔ میں اپنے اندھیرے میں مگن تھا۔ سانس قدرے درست ہوا تو پھر بازو پھیلا کر دونوں دیواروں کا سہارا لیتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کہاں گئی وہ منزل جہاں باقس رہتا تھا۔ روتی ہوئی وائلنوں اور آہیں بھرتی ہوئی گٹاروں کی آواز دور بہت دور اوپر کہیں سے آ رہی تھی۔ ان کی لے سے ہٹ کر ایک بہت بے ہنگم، بے تال دھم دھم کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ آوازیں سن کر مجھے ایک یقین تو ہو گیا کہ وہ کھلنڈرا ہمیں مدعو کرنا بسرا کر خود سورگ نہیں نکل گیا۔ اسے دعوت دینا یاد رہا ہے۔ اور وہ اسی بلڈنگ میں اپنے فلیٹ میں موجود ہمارا منتظر ہے۔ یہ اتنی بے ہنگم دھم دھم کی آواز کیا ہے؟ ڈرم ہوگا۔ نہیں اتنا بے تالا نہیں ہو سکتا کیا باقس سر شام اتنا مدہوش ہو گیا کہ ناچنے بھی لگا؟ کیا اس نے مہمانوں کا انتظار کیے بغیر پینا شروع کر دیا ہوگا؟ خیر! پیتا تو وہ ہر وقت ہی رہتا ہے۔ لیکن کیا وہ باقس جس کے ناچ کے اثر سے بے سرے ساز خود بخود سر ہو جاتے ہیں ناچ کے نام پر بے ہنگم طور پر کود رہا ہوگا؟ ہرگز نہیں، یہ کوئی اور ہی آواز ہے، جو یقیناً کسی اور جگہ سے آ رہی ہے۔ اس کا فلیٹ قطعاً ایسی غلیظ، ننگی اور فحش آواز کا منبع نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے میرے سوا باقی سب جمع ہوں اور انہوں نے سوچا ہو کہ کیا پتہ وہ پہنچ بھی پاتا ہے یا نہیں اور زندگی نے اصرار کیا ہو کہ دیر مناسب نہیں رسومات شروع کر دو اور انہوں نے شروع کر دی ہوں۔ زندگی تو اپنی بے وفائی میں ویسے بھی ضرب المثل ہے۔

دونوں طرف دیواریں میرے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور درمیان میں پڑی پیچ در پیچ سیڑھیاں اوپر ہی اوپر چلی جا رہی تھیں کہیں کسی رخ ان سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا تو چل ہی رہی تھی۔ مگر دفعتاً ایک تیز جھکڑ

اندھیری سیڑھیوں میں شاں شاں کا شور کرتا یوں گذرنے لگا کہ میرے قدم اکھڑ سے گئے اور بڑے کوٹ کے دونوں پٹ کسی اڑتے ہوئے بڑے پرندے کے پروں کی طرح ہوا میں تن گئے۔ ان سیڑھیوں میں کوئی اڑ تھوڑا ہی سکتا ہے یہ جعلی طور پر تنے ہیں اس لیے میں نے انہیں زور سے کھینچ کر اپنے کپکپاتے بدن کے اردگرد لپیٹتے ہوئے جلدی سے بٹن بند کر لیے۔ سردی جو پچھلے کئی مہینوں سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر اس جھکڑ نے چل کر تو گویا کرہ زمہریر میں پہنچا دیا۔ میں نے اپنے سر کے اردگرد کسے لوہے کے کڑے کو ہاتھ لگا کے دیکھا وہ اب بھی اتنا تنگ اور سرد تھا کہ میرے سر اور ماتھے کی کھال کے اندر گھسا جا رہا تھا۔ دھاتیں سردی سے سکڑ جاتی ہیں نا۔ اسی لیے شاید اور تنگ ہو گیا تھا۔ اس شہر میں جب سے یہ ان دیکھی اور ان جانی سردی پڑنی شروع ہوئی تھی۔ ہر زن و مرد کے سر کے اردگرد خدا معلوم کیوں اور کیسے لوہے کے کڑے خود بخود کسے گئے جو روز بروز تنگ سے تنگ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کے سروں پر تو لوہے کے پورے پورے خود کس گئے ہیں اور نو مولود تو خیر اب پیدا ہی خودوں سمیت ہوتے ہیں اگر چہ ابھی تک ان کڑوں کے سبب کوئی انسانی موت واقع نہیں ہوئی تاہم اطلاعات ملی ہیں کہ کئی لوگوں کے کڑے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ انہیں ہسپتالوں میں داخل کرنا پڑا ہے اور ان میں سے چند ایک کے کڑے اس قدر تنگ ہوتے ہوتے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ اندیشہ ہے کہ کسی لمحے ان کی کھوپڑیاں تڑخ جائیں اور بھیجے باہر ابل پڑیں۔ کوئی ڈاکٹر یا سائنس دان اس آفت کے اسباب و علاج ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر رہا کیونکہ انکا خیال ہے کہ جو لوگ کڑوں کے تنگ سے تنگ ہونے کی شکایت کرتے ہیں دراصل ان کی کھوپڑیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور وہ ایک لاعلاج مرض ہے البتہ اس کے سدباب کے طور پر فطرت نے خود راہ تلاش کر لی ہے اور بچوں کے سروں پر مکمل خود چڑھ گئے ہیں۔ آئندہ پندرہ بیس سال بعد انشا اللہ کسی کو لوہے کے کڑوں کی تنگی کی شکایت نہ رہے گی۔ کیونکہ اس وقت تک ہر شکایت کرنے والے کا بھیجا تڑخی ہوئی کھوپڑی میں سے ابل کر خارج ہو چکا ہوگا یہ تو حکما ء کی رائے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مخلوق خدا اذیت میں مبتلا ہے۔

میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جب دوبارہ بے حال ہو گیا تو یہ جاننے کے لیے کہ میں ابھی فلیٹ سے کتنی دور ہوں میں نے پوری توجہ سے کان لگا کر وائلوں اور گٹاروں کی آواز سننے کی کوشش کی، آوازیں اتنی ہی مدھم تھیں جتنی پہلے، مگر اب خلاف توقع نیچے سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور وہ دھم دھم کی بے ہنگم بے ہودہ آواز بھی ابھی تک آ رہی تھی۔ اور وہ بھی نیچے سے ہی آتی محسوس ہو رہی تھی تو میں بہت اوپر نکل آیا، سیڑھیاں اترنے سے پہلے دم لینے کے لیے وہیں بیٹھ گیا۔ میں ان سیلی اندھی سیڑھیوں میں بہت دیر تک بیٹھا کپکپاتا سانس درست کرتا رہا۔ مجھے رنج آ رہا تھا کہ اس بلڈنگ میں اتنے بہت سے فلیٹ ہیں اور ان میں اتنی بڑی تعداد لوگوں کی رہتی ہے۔ اگر یہ لوگ سیڑھیوں میں تھوڑی سی روشنی کا انتظام کر لیں تو کیا ہرج کی بات ہے مگر وہاں تو کسی کھڑکی، روشن دان، دروازے کی دراڑ میں سے بھی روشنی نہیں آ رہی تھی۔

''تمہیں پتہ نہیں جب سے کڑے کسے گئے ہیں۔ روشنیاں بند کر دی گئی ہیں۔ تم نے کسی سڑک، گلی کوچے میں روشنی دیکھی ہے؟ کسی مکان، دوکان میں روشنی دیکھی؟''

غیر متوقع طور پر اپنے قریب یہ آواز سن کے میں گھبرا کے بولا ''تم کون ہو؟''

''میرا نام مسعود تھا۔ اب میرا نام نامسعود ہے''۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''جو تم کر رہے ہو''۔

''میں تو پچھلے کئی گھنٹوں سے باقس کے فلیٹ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ اس نے آج شام کے لیے مجھے بلایا تھا''۔

''میں بھی اس کے فلیٹ کی تلاش میں ہوں، مجھے بھی اس نے بلایا تھا شاید جسے ہم سیڑھیاں چڑھنا سمجھتے رہے ہیں وہ

اصل میں سیڑھیاں اترنا تھا ہم نیچے کہیں تحت الثریٰ کے نزدیک ہیں۔۔۔غور سے سنو! سازوں کی آہ و بکا کی آواز جو صرف باقس کے فلیٹ سے ہی آ سکتی ہے۔ کتنی بلندی سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ساتھ ہی ایک گندی دھمک کی آواز بھی چلی آ رہی ہے"۔

"روشنی" یہ کہتے ہوئے نامسعود ہنسا پھر کہا ہم نے باہر سے بہت سا کالا پینٹ منگوایا ہے۔ اتنا بہت سا کہ اس کے اوپر پھیلے ہوئے پورے آسمان پر ہم اس کو تھوپ دیں گے پھر نہ دن کو سورج نکلا کرے گا، نہ راتوں میں چاند چمکے گا۔ نہ ستارے دمکیں گے۔ دن رات یہ شہر ان سیڑھیوں کی طرح اندھیرے میں ڈوبا رہے گا۔

"نامسعود جو وقت ابھی نہیں آیا تو اس کے خیال سے مجھے کیوں ہراساں کرتا ہے"۔

"وقت ابھی نہیں آیا؟ کیا بکتا ہے۔ پینٹ پہنچ چکا ہے ٹھیکہ دے دیا گیا ہے کام شروع ہو۔۔۔۔"

"اچھا یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر لمحے کی بھی تو کوئی قیمت ہوتی ہے۔ اس کو سمجھو اب جب کہ وہ آخری رہ گیا ہے تو اور بھی قیمتی ہو گیا ہے دل نہ مسوس، بس جلدی کر، باقس اگر ابھی زندہ ہے اور اس کا فلیٹ ڈھے نہیں گیا تو ہم آج اسکی تلاش کر کے رہیں گے"۔

اس کے بعد پتہ نہیں کتنی مرتبہ ہم دونوں ان سیڑھیوں کی لامتناہی لمبائیوں میں اترتے چڑھتے رہے اس کے فلیٹ تو کیا ملنا تھا سیڑھیوں کا زمین پر پہنچنے والا سرا ابھی غائب تھا، ہم نے پوری طاقت سے دیواروں کو دھکے دیئے اور وہ اتنی ہی طاقت سے ہمیں پیچھے اچھال دیتیں ہم نے لوہے کے کڑوں میں کسے اپنے سروں کو ان سے پٹخا نہ تو کوئی دیوار پھٹی اور نہ ہی سیڑھیوں نے ہمیں کوئی راہ دیا ہمیں یقین سا ہو گیا کہ ہم دو چوہوں کی طرح دیواروں کے پنجرے میں دوڑتے دوڑتے تھک کے سیڑھیوں پر گر جائیں گے۔ اور مر جائیں گے۔ مگر بدستور بھاگم بھاگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے اور ہمارے دم سینوں میں سما نہیں رہے تھے۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے نامسعود کا بازو پکڑ کر کہا "ذرا رکو، آؤ ایک آخری کوشش کے طور پر دونوں مل کر پورے زور سے باقس کو پکارتے ہیں اگر اس نے ہماری آواز سن لی تو وہ آ کر راہ بجھاتے ہوئے ہمیں اپنے فلیٹ میں لے جائے گا"۔

میں نے ایک دو تین کہا اور تین پر ہم دونوں نے اپنی پوری جانیں مجتمع کر کے آواز لگائی۔

"باقس س س" تیز ہوا کی شاں شاں میں ہماری آواز غتربود ہو گئی۔ وقفے وقفے سے ہم نے دو تین بار اور پکارا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہم پر مایوسی چھا گئی۔ اتنے میں چپ راست کی پر ہیبت تحکمانہ آواز پر بہت بھاری بھرکم بوٹوں کی ایک تال میں رچی دھمک سے سیڑھیاں لرزنے لگیں۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ ہم خوف سے دبک کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے جب وہ مارچ کرتے ہوئے ایک ایک کر کے ہمارے پاس سے گذر کر آگے بڑھ گئے تو ہم دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے ایک جگہ جا کر "ہالٹ" کی آواز پر وہ سب رک گئے۔ حکم دینے والے شخص نے آگے بڑھ کر دروازہ یوں پیٹا کہ ہم سمجھے کہ دروازہ تیلی تیلی ہو کر بکھر جائے گا۔ وہ چنگاڑا:

"باقس دروازہ کھولو"۔

اندر سے باقس کی آواز آئی "تم کون ہو؟"

"ہم کوئی روشنی نہیں۔۔۔ تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے"۔

"تم نے اندر زندگی چھپائی ہوئی ہے"۔

"یہاں کوئی زندگی نہیں"۔

"تمہیں بخوبی علم ہے کہ موسیقی کبھی کی مر چکی"۔

"تم دروازہ کھولو ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں"۔

"تمہیں میرے گھر کی تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں یہ میری چار دیواری ہے اور اس میں کسی اجنبی کو داخل ہونے کا اختیار نہیں"۔

''ہر خانہ خانہ ما است کہ خانہ خدائے ما است'' ہمیں تلاشی لینے کا پورا پورا حق اور اختیار ہے دروازہ کھول دو نہیں تو ہم اسے توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گے''۔

''اگر تم دروازہ توڑو گے تو میں بندوق سے اس کی حفاظت کروں گا'' پھر انہیں سناتے ہوئے بلند آواز سے اپنے ملازم کو آواز دی ''مشرقی! اپنی بندوق لانا جو تو شرق میں چلایا کرتا تھا، اس کے بغیر یہ باز نہیں آئیں گے''۔

مشرقی نے اس طرح بلند آواز میں جواب دیا ''یہ لیجیے بندوق''۔

اس پر میں نے اور نامسعود نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ مشرقی اور باقس، دونوں کے پاس کوئی بندوق نہیں اگر انہوں نے دم نہ کھایا تو باقس مارا گیا۔

حکم دینے والے شخص نے کہا ''باقس تو اچھا نہیں کر رہا تجھے پچھتانا پڑے گا کل ہم ڈائنامیٹ لے کر آئیں گے اور تیرے فلیٹ کو اڑا دیں گے پھر تجھے پتہ چلے گا''۔

ٹھیک ہے لے آنا تب بات کریں گے۔

وہ شخص اپنے دستے کو اسی طرح پریڈ کراتا ہوا واپس لے گیا۔

میں نے پوچھا ''نامسعود کیا باقس کی اس جرات پر تیرا اکڑا ابھی کچھ ڈھیلا پڑا'' کہنے لگا ''ہاں کوئی ہوا بھر فراخی محسوس تو ہوتی ہے''۔

ہم نے جا کر آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا، باقس نے پردہ ہٹا کر ہمارے چہرے دیکھے اور دروازہ کھول دیا اندر واقعی روشنی تھی جو زندگی کی روتی ہوئی آنکھوں سے نکل نکل کر کمرے میں اجالا کر رہی تھی اور کمرے کے وسط میں گھٹنوں تک کٹی اگلی ٹانگوں والی بھینس نے ناچ کے نام پر کود کود کر ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ اچھا تو وہ غلیظ اور مکروہ دھمک کی آواز اس کے ناچنے کی تھی، اس کی اگلی ٹانگیں کہاں گئیں؟ اوہ یاد آیا نیچے جہاں سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں وہاں قصاب کی دوکان کی دیوار کی اوٹ میں ابلتے پانی کے ایک کنستر میں جو بھینس کی دو گھٹنوں تک کٹی ٹانگیں پڑی تھیں وہ اس کی تھیں اور انہیں وہاں اس لیے چھوڑ آئی تا کہ اس سردی میں ناچتے ناچتے کہیں شل نہ ہو جائیں اب یہاں سے فارغ ہو کر جب جائے گی تو نیچے پہنچ کر اپنی گرم گرم ٹانگیں اور پاؤں پہنے گی اور چل دے گی مے سے بھرا خم کونے میں پڑا تھا۔ فقیر صحرا صوفی سیاہ پوش، ستارہ گل مستانہ زہرا اور حتیٰ کہ باقس بھی ہاتھوں میں خالی جام پکڑے دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے کٹی ٹانگوں والی بے تحاشا کودتی بھینس کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اسے روکنے سے قطعی قاصر تھے۔ ہم بھی خالی جام ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں کی طرح دیوار کے ساتھ لگ کر اسے دیکھنے لگے۔ زندگی ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی اپنی آنسو بہاتی آنکھوں سے صرف چھت کو تکے جا رہی تھی۔ زندگی کو یوں زار و قطار روتے دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا زندگی میں تجھ سے شرمندہ ہوں۔ میرے بلانے پہ تو آج شام یہاں آئی اور تیری تذلیل ہوئی'' اس نے کوئی جواب نہ دیا اسی طرح آنسو بہاتی رہی اور بھینس اسی طرح اودھم مچاتی رہی۔

نامسعود کہنے لگا ''دوستو! اس بھینس کو تو کمرے سے نکالنے کی کوئی تدبیر کی ہوتی''۔

باقس نے جواب دیا ''ہم سب تو اپنی سی کر چکے مگر یہ نہیں نکلتی، پہلے ڈنڈے مارے پھر آہیں بھرتی ہوئی موسیقی کو بند کیا اس کے بعد دروازے میں کھڑے ہو کر چارہ دکھایا لیکن یہ کسی طور مانتی ہی نہیں، بس اسی طرح کودے جاتی ہے اب تم آئے ہو کوئی چارہ کر کے دیکھو''۔

''باقس! تمہاری دیوتائی شکتی بھلا کس کام کی جو ایک اپاہج بھینس کو باہر نہیں نکال سکتی''۔

اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اقرار کیا ''ہاں! میں تو صرف مے اور رقص کا دیوتا ہوں بھینس میرے بس میں نہیں''۔

''مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے اسے کتاب دکھا کر دیکھتے ہیں''۔ یہ کہتے ہوئے نامسعود دوسرے کمرے میں دوڑتا ہوا گیا اور

بہت سی کتابیں بازوؤں میں بھر کے لے آیا اس نے کچھ ورق پھاڑ کر اس کے سامنے کیے تو وہ کودنا بھول کر نہایت رغبت سے انہیں کھانے لگی وہ اسی طرح ورق پھاڑ پھاڑ کے کھلاتا ہوا اسے کمرے سے باہر لے گیا پھر گھر کی ایک ایک کتاب لے جا کر ورق ورق کر کے سیڑھیوں میں نیچے تک پھیلا دی۔ وہ تیزی سے ادھر ادھر منہ مارتی ورق ورق چرتی نیچے اتر گئی۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد، حالانکہ اس قصے میں قصاب گاؤ سے پہلے نپٹ چکا تھا ہم نا مسعود کے بہت ممنون و مشکور تھے اس پہ واہ واہ کے ڈونگرے برسائے گئے کہ آخر اس کی تدبیر کی بدولت سب کی اس بے ہودہ بھینس سے گلو خلاصی ہوئی۔

باقس نے خم کی طرف نظر بھر کے دیکھا اور آن واحد میں تمام خالی جام مے سے چھلک اٹھے۔ افسردہ اور مایوس چہروں پہ مسکراہٹ کھل اٹھی اس نے جام بلند کرتے ہوئے زندگی کی طرف دیکھ کر جوش سے کہا "بنام زندگی" وہ کونہ جہاں بھرپور جوان زندگی چھت کو تکتی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ اب بھائیں بھائیں کرتا خالی پڑا تھا، ہم سب نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر زندگی کا کہیں کوئی سراغ نہ تھا۔ اگر نور جاموں سے منعکس نہ ہو رہا ہوتا تو پورا کمرہ تاریکی میں ڈوب چکا ہوتا۔ باقس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچا ہو گیا اور وہ اس شدید صدمے سے سنبھلنے کے لیے دیوار سے کمر لگا کر خاموش گردن نیچی کیے کھڑا اپنے غم میں ڈوب گیا سب پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ" کچھ دیر کے بعد باقس سنبھلا اور کہا "جس کی خاطر یہ سب کیا دھرا تھا وہ تو چلی گئی۔ اب بولو دوستو"۔

فقیر صحرا نے کہا "باقس یوں لگتا ہے جیسے میری آتما کا اتت ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پہ جا کر برف کا تودہ بن گیا ہو وہاں سے نہ کبھی برف پگھل سکتی ہے اور نہ کبھی میری آتما کا اتت واپس لوٹ سکتا ہے تم جانتے ہو میں تو فانی ہوں۔ سورج کے سوا نیزے پہ آنے کا کہاں تک انتظار کر سکتا ہوں"۔

صوفی سیاہ پوش نے کہا "ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے جو اس کے اندر مرتے دم تک زندہ رہتا ہے اور یوں اس کے خمیر میں معصومیت اور حیرت کے عنصر کو قائم رکھتا ہے۔ میرے اندر وہ ننھا بچہ اب مر گیا ہے اور اس کا زہر اتنا پھیل گیا ہے کہ آہستہ آہستہ میری روح کے اندر سرایت کرتا محسوس ہو رہا ہے"۔

مستانہ زہرہ بولنے لگا تو اس کی آواز اس انداز میں نکل رہی تھی جیسے کوئی عالم نزع میں بولنے کی کوشش کر رہا ہو "میں تو سانس بھی کانوں کے راستے لیتا تھا۔ اب ان میں سیسہ بھر دیا گیا"۔ ستارہ گل نے کہا "سینکڑوں صدیوں کے صرف سے میں نے جو مسکرانے کا فن سیکھا تھا۔ وہ میرے ذہن سے اب قطعی ماؤف ہو گیا ہے۔ میں محض پتھر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہوں جو نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے۔ گلنار علم میرے ہاتھ سے گر کر کہیں صحراؤں کی ریت تلے دب گیا ہے اگر زندگی ہمیں سینکڑوں صدیاں پیچھے پھینک گئی ہے تو ہمیں واپس آنے میں چند صدیاں تو ضرور لگیں گی۔ اگر میں نہیں ہوں گا تو کیا ہوا جب زندگی مہربان ہو گی تو کوئی اور آئے گا اور ریت میں سے میرا گلنار علم نکال کر پھر کندھے پر رکھ کر آگے بڑھے گا"۔

باقس نے کہا "دوستو! اپنے اپنے جام بنام زندگی خالی کرو اور پھر بھرو اور لنڈھاتے چلو۔ میں زندگی کو پہلے بھی کئی بار اپنے پرستاروں سے مایوس ہو کر روٹھ کر جاتے دیکھ چکا ہوں۔ ثابت قدم رہو، وہ واپس آئے گی اور ہم اس کی شان میں بہت بڑا جشن کریں گے۔ مجھے پتہ ہے آسمان پہ تھوپے جانے والا سیاہ پینٹ آخر پگھل کر گر جائے گا روشنی کے آگے بند باندھنے کی یہ اولین کوشش تو نہیں پہلے بھی بہت لوگ کر چکے ہیں نور کے سیلاب کے آگے ہر رکاوٹ پر کاہ کی مثل بہہ جاتی ہے۔ تمہارے سروں کے گرد کسے ہوئے آہنی کڑے کوئی ہمیشہ قائم تو نہیں رکھ سکتا؟"

ہم سب یک زبان ہو کر پکارے "تب تک کیا کریں؟"

"بتایا جو ہے۔ جام روشن رکھو"۔ اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ پتا نہیں وہ باقس تھا کہ میوز تھی کہ دونوں تھے۔

☆☆☆

ٹام جیفرسن کے پنجرے

الیاس احمد گدی

نوجوان لڑکا طوطے کو گالی سکھا رہا تھا۔

''بول مٹھو۔۔۔سالا۔۔۔!''

سالا۔۔۔سالا۔۔۔سالا۔۔۔

طوطا خوش دلی سے دوہرانے لگا۔۔۔۔بڈھے ٹام نے گردن موڑ کر لڑکے کو دیکھا۔

''کیا کرتے ہو۔۔۔؟ میرے بچوں کو خراب کر رہے ہو۔۔۔۔؟''

نوجوان، ٹام کی بات نظر انداز کر کے اور اس کی طرف شوخی سے دیکھ کر پھر طوطے کو سکھانے لگا۔ ''بول مٹھو حرامی۔۔۔۔ حرامی۔۔۔''

طوطا جیسے لڑکے کو خوش کرنے پر آمادہ تھا۔ زور سے چیخا: ''حرامی۔۔۔۔!''

بڈھے ٹام نے چھڑی اٹھائی۔۔۔ ''تم بھاگو گے کہ نہیں؟ میں ابھی تمہارے باپ کے پاس جاتا ہوں''۔

اس کے چھڑی اٹھانے پر بڑے پنجرے میں بند، بندروں کے پریوار کا کھیا کھوکھیایا۔ بڈھے ٹام نے اس کو ڈانٹا۔

''حرامی کی اولاد، تم کیوں دانت نکوس رہے ہو۔ میں تو اس لڑکے کو پیٹنے جا رہا ہوں، جس نے میرے بچوں کی عادتیں حراب کردی ہیں''۔

لڑکا برآمدے میں طوطے کے پاس کھڑا تھا۔ بڈھے ٹام کو چھڑی لے کر آتا دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے ہوئے بولا:

''انکل! تمہارے بچے میرے دوست ہیں۔ وہ تم سے زیادہ میری بات مانتے ہیں''۔

ایک بندر اور ایک بندریا تھی اور اس کے دو بچے۔ آٹھ خرگوش تھے، سفید براق ریشم جیسے۔ ان کی لال لال خوبصورت آنکھوں میں خوف ہمیشہ جھانکا کرتا۔ وہ ذرا سی آواز پر چونک پڑتے۔ ایک لمحے کے لیے پلٹ کر دیکھتے، پھر بھاگ جاتے۔ پنجرے ان کے بھی تھے مگر وہ زیادہ تر کھلے رہتے۔ لڑکے دوڑاتے تو بھاگنے کی بجائے جھٹ زمین پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ اس سے لڑکوں کو انہیں پکڑنے میں آسانی ہوتی۔ پھر وہ انہیں اپنی گرد میں لیے پھرتے، پکڑتے، پھر چھوڑ دیتے۔ کبھی کبھی بیٹھ کر اپنی جانگھوں پر رکھ کر ان کی پشت سہلاتے تو وہ اپنی سرخ خوبصورت آنکھوں کو بند کر کے آنند کی کسی دوسری دنیا میں کھو جاتے۔

عورتوں کو زیادہ دلچسپی بندروں سے تھی۔ وہ جب ایک دوسرے کی جوئیں نکال نکال کر کھاتے، عورتیں بہت ہنستیں۔ کبھی کبھی کوئی زیادہ جرات مند عورت اپنا سر ان کے حوالے کر دیتی تو نہایت مستعدی سے اس کی جوئیں نکالنا شروع کر دیتے۔ وہ عورت دینے کو تو اپنا سر دے دیتی مگر بے انتہا خائف رہتی۔ کیونکہ ایک بار ایک عورت نے سر دینے کے بعد فوراً ڈر سے سر ہٹانا چاہا تھا تو بندر نے ایک تھپڑ جڑ دیا تھا۔ دوسری عورتیں بندر کے غصے ہونے اور بندریا کے خوف کھانے سے کافی محظوظ ہوئیں۔ ان کا ایک خاندان میں مل کر رہنا بھی اچھا لگتا تھا۔ بندر کے دونوں بچوں کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں، باپ کا بار بار کھوکھیانا اور ماں کی ممتا۔ یہ سب کچھ ملا کر

ایک دم گھریلو سا ماحول ہو جاتا۔ عورتیں ان بندروں کے لیے مونگ پھلیاں اور پھل بھی لاتیں۔ دن کا بچا کھچا کھانا اور باسی سوکھی ہوئی روٹیاں بھی بوڑھے ٹام کے ان بے زبان بچوں کے لیے بھیج دی جاتیں۔ فصلوں کے موقعے پر اناج باندھ دیا گیا تھا۔ مرد کبھی کبھی بوڑھے ٹام کی پیسوں سے مدد کر دیا کرتے تھے۔

ٹام کا گھر قصبے کا چڑیا گھر تھا۔ قصبے کے بھولے بھالے معصوم لوگ عام طور پر شام کو بیوی بچوں کے ساتھ گھومنے بڑھے کے گھر آ جاتے۔ بڈھا ہر آدمی کا استقبال ٹوپی سر سے اٹھا کے کرتا، جس کو وہ پتہ نہیں کب سے پہنتا آ رہا تھا۔ گھر تو چھوٹا سا تھا مگر سامنے کھلی ہوئی کافی زمین تھی جس کے گرد مہندی کی باڑھ کھڑی کر کے احاطہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کھلی جگہ میں بیٹھنے کے لیے بنچ وغیرہ نہیں تھے۔ مگر فرش پر ہمیشہ ملائم دوب کا قالین بچھا رہتا، جس پر مرد اور عورتیں بلا تکلف بیٹھ جاتے۔ لڑکے دوڑیں لگاتے، گھاس پر لڑھکتے اور ادھر ادھر بھاگ رہے خرگوشوں کو پکڑتے۔

ٹام انہیں خوش خرم ہنستا بولتا دیکھ کر ایک دم آسودہ ہو جاتا۔ جیسے اس سے آگے زندگی میں اور کچھ نہ ہو۔

ٹام کی زندگی میں تو واقعی اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔ چوالیس سال پہلے جنگ کی ہولناکیوں سے جھوجھتا بارود کے دھوئیں میں کھانستا دشمنوں کے لہو میں شرابور وہ یہاں پہنچا تھا۔ برما کے محاذ پر ٹریگر پر انگلیاں رکھے رکھے اور بندوق کا گھوڑا دباتے دباتے اس کی انگلیاں زخمی ہوگئی تھیں۔ انہیں انگلیوں کے علاج کے لیے اسے ایسٹرن کمانڈ کے ہیڈ آفس رانچی کے مضافات میں ایک آرمی ہسپتال میں لایا گیا تھا۔

لوگ کہتے ہیں ہندوستان کی ہوائیں بڑی ساحر ہیں۔ آدمی کی مت مار دیتی ہیں۔ سبزے سے ڈھکی ہوئی وادی کا جادو۔ بے حد پر سکون نرم روزندگی کا جادو، بھولے بھالے معصوم بے ریا آدمی داسیوں کی چاہتوں کا جادو، وہ کتنے جادوؤں سے اپنے آپ کو آزاد کرتا، سو وہ بے بس ہو گیا۔ موہ میں آ گیا۔

جنگ ختم ہوگئی۔ اپنی دو انگلیاں کٹوا کر وہ انگلینڈ چلا گیا۔ زمانہ بیت گیا۔ اس وقت کے بچے جوان ہوگئے۔ کہ اچانک ایک دن وہ اپنا بوسیدہ جنگی تھیلا پیٹھ پر لٹکائے اسی وادی میں لوٹ آیا تھا۔ جنگ اس نے جیب لی تھی مگر دل ہار گیا۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس نے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی بے پناہ حسین وادی کو دیکھا۔ ہواؤں کی آغوش میں مچلتی سبزے کی خوشبو کو اپنے اندر اتر جانے دیا۔ اور تب اس نے جانا کہ دھوئیں اور بارود کی شامہ کو مجروح کر دینے والی بو کے علاوہ بھی کوئی خوشبو ہے۔ جو صرف پھیپھڑوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ رگ و پے میں اتر جاتی ہے، سرشار کر دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ زندہ رہنے کے لیے پر شور، تیز رفتار اور آسائشوں سے پر زندگی ضروری نہیں ہے۔ اگر مہاتما بدھ کو یہیں کہیں نروان ملا تھا تو اسے بھی یہیں پہلی بار زندگی گزارنے کا مطلب سمجھ میں آیا۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ٹام جیفرسن کے مائی گریشن کے پیچھے دراصل ایک کالی لڑکی تھی۔ جن دنوں وہ آرمی ہسپتال میں زیر علاج تھا، اس کی ملاقات ایک آدی باسی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ اسپتال کی سوپیر تھی اور بہت چپکے سے مشرق نے مغرب کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اور جب مغرب نے دروازہ کھولا تو اپنے مشرق کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اے بلیک روز، اے پیس آف بلیک جوئیل۔۔۔

اگر ٹام جیفرسن سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتا ہے تو وہ ہنستا ہے اور ایک الگ کہانی سناتا ہے۔

''میں روبوٹوں کے بیچ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں انسان تھا، انسانوں کے بیچ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ اور گرم انسانوں کے بیچ۔ وہاں ہر انسانی آواز مشینوں میں کھوگئی ہے۔ آدمی کا ہنسنا، آدمی کا رونا، آدمی کا بولنا، آدمی کا چیخنا، سب مشینوں کے شور میں غائب ہو گیا

ہے، سارے انسانی رشتے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔ سرد بے حس مشینوں کی طرح جسم لمس کی لذت سے محروم ہو گئے ہیں۔ آدمی صرف اپنی پہچان ہی نہیں کھو رہا ہے اپنا وجود کھو رہا ہے اور ایک روبوٹ کی طرح جی رہا ہے۔

اس قصبے میں اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے لوگ اس کو جھکی سمجھتے ہیں۔ ٹھیک بات ہے، اگر وہ جھکی نہیں ہے تو اپنا اتنا بڑا خوبصورت دیش چھوڑ کر اس جنگل میں کیوں آبسا ہے؟ جانوروں کے بیچ اس کا یہ پاگل پن بستی والوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے وہ اس کو اپنے سے بہت اونچا کوئی مافوق الفطرت شخص مانتے ہیں۔ اسی لیے وہ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔

مگر طوطا اس کی ایک نہیں سنتا۔ وہ ایک دم شوخ ہو گیا ہے۔ جب ٹام کو اس کی خوراک دینے میں دیر ہو جاتی ہے تب وہ گالی بکنا شروع کر دیتا ہے:

بیٹا، بیٹا، بیٹا۔۔۔!

حرامی، حرامی۔۔۔!

سالا۔۔۔!

اس کو یہ گالیاں مالکم کجور کے بیٹے جوکھیم کجور نے سکھائی ہیں۔ جوکھیم بستی کا سب سے بدمعاش لڑکا ہے مگر سب سے تیز بھی ہے۔ رانچی کے کسی مشن اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس کے باپ نے اس کو ایک سائیکل خرید دی ہے۔ اسی سائیکل پر وہ روزانہ اسکول جاتا ہے۔ اور روزانہ اسکول جاتے ہوئے اور اسکول سے واپس آتے ہوئے سائیکل کی گھنٹی زور زور سے بجاتا ہے۔ طوطا گھنٹی کی ہر آواز پر ایک گالی اچھالتا ہے اور ٹام اپنی چھڑی لہرا کر طوطے کو دھمکاتا ہے۔ طوطا اس سے نہیں ڈرتا جیسے جوکھیم نہیں ڈرتا۔

جس دن اسکول میں چھٹی ہوتی ہے اس دن جوکھیم سارا دن ٹام کا بھیجا چاٹتا ہے۔

''آپ کو اکیلے ڈر نہیں لگتا۔۔۔؟''

''میں اکیلا کب رہتا ہوں، یہ جو میرے ساتھ رہتے ہیں۔۔۔!'' وہ جانوروں کی طرف اشارہ کرتا۔

''یہ آدمی ہیں۔۔۔؟'' وہ تعجب سے پوچھتا۔

''یہ آدمیوں سے اچھے ہیں''۔

''مگر آدمی کو آدمیوں کے ساتھ رہنا چاہیے'' لڑکا عقلمندی کا اظہار کرتا۔

''آدمی جب روبوٹ ہو جائیں تو یہ جانور ہی بھلے۔۔۔!''

جوکھیم دسویں کلاس کا طالب علم ہے۔ وہ روبوٹ کے معنی جانتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ آدمی کب روبوٹ بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ ٹام کو اگر پورا نہیں تو آدھا پاگل ضرور سمجھتا ہے۔ پھر وہ اپنی بات پلٹتا ہے۔

''تمہیں تمہارا گھر نہیں یاد آتا۔۔۔؟ اور تمہارے بچے۔۔۔؟''

ٹام کو کیا یاد آتا ہے کیا یاد نہیں آتا، یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ کسی کو بتاتا بھی نہیں۔ اس سے بارہا یہ سوال کیا گیا۔ بارہا لوگوں نے وہ وجہ جاننے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنا ملک چھوڑا۔ لوگ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ کیا وہ یہاں خوش ہے۔۔۔ وہ سارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہے مگر دیتا نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس سلسلے میں کچھ بولے گا تو لوگ اس کو اور پاگل سمجھیں گے۔ مگر جوکھیم کو وہ بہت خوش دلی سے بتاتا ہے۔

''میرا گھر یہیں ہے۔ میں پچھلے جنم میں یہیں پیدا ہوا تھا۔۔۔؟''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ پچھلے جنم میں یہیں پیدا ہوئے تھے؟''

''مجھے معلوم ہے، یہاں ہمارا گھر تھا ایک، چھوٹا سا مٹی کا۔ اور اس میں تمہاری آنٹی رہتی تھی۔۔۔!''
''آنٹی۔۔۔؟ جوکھیم تعجب سے پوچھتا۔'' آنٹی بھی کیا آپ ہی کی طرح گوری تھی؟''
وہ خوب ہنستا۔ پھر بتاتا ''نہیں کالی تھی، ایک دم کالی، جیسے تم لوگ ہو۔ اے بلیک جوئیل۔۔۔''
''پھر۔۔۔۔؟'' وہ آگے جاننے کے لیے بے چین ہو جاتا۔
''پھر آگے مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔۔۔!''
جوکھیم پوچھ پوچھ کر مایوس ہو جاتا تو طوطے کے پاس چلا جاتا۔
''بول مٹھو، آنٹی کالی تھی۔۔۔!''
ٹام بہت پیار سے طوطے کو اور پھر اسی پیار سے جوکھیم کو دیکھتا ہے۔ کہیں اندر تاریک گوشوں سے روشنی کی پھوہار سی گرنے لگتی ہے۔

رانچی شہر کے مضافات میں بسا ہوا یہ ایک آدی باسی قصبہ اتنا پرسکون ہے کہ لگتا ہے اس دور کی تہذیب کے مکار ہاتھوں نے اسے ابھی چھوا تک نہیں ہے۔ حالانکہ شہر سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ بہت سے مرد شہر میں کام کرتے ہیں۔ بہت سی عورتیں بھی اپنی روزی روٹی اسی شہر سے حاصل کرتی ہیں۔ کتنے ہی بچے شہر کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کیتھولک چرچ کے پادری بھی وعظ دینے آجاتے ہیں، مگر جیسے ہر موج چڑھتی ہے اور اتر جاتی ہے، نہ کچھ دے جاتی ہے نہ کچھ لے جاتی ہے، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ تہواروں میں لوگ چاول سے کشید کی جانے والی شراب 'راسی' پیتے ہیں۔ عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچ ناچتی ہیں۔ ڈھول اور مردنگ بجتے ہیں۔ اور عام طور پر یہ سب کچھ ٹام صاحب کے احاطے میں ہوتا ہے۔ اس دن ٹام صاحب اپنا اکلوتا سوٹ نکال کر پہنتا ہے۔ جو دھلائی اور پریس نہ ہونے کی وجہ سے ایک دم بدرنگ اور بدوضع ہو گیا ہے۔ اس دن وہ چاول سے کشید کی جانے والی شراب بھی پیتا ہے اور ناچ کے دوران اور لوگوں کے ساتھ ساتھ تالی بھی پیٹتا ہے۔ زندگی یہاں ایک ندی کی طرح پرشور نہیں بلکہ ایک جھیل کی طرح پرسکون ہے۔ پرسکون، گہری اور ناقابل تبدیل۔

مگر یہ ٹام صاحب کا بھرم تھا کہ یہاں کچھ بھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ بہت آہستہ آہستہ، بہت زیریں سطح پر ایک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ لوگوں کی بات چیت میں، الفاظ میں، گانوں کے بول میں، لباس میں اور خیالوں میں بھی۔ ٹام جیفرسن جو اپنے احاطے سے کبھی باہر نہیں نکلتا تھا، اس کو کیا معلوم کہ سارا آدی واسی علاقہ آہستہ آہستہ کروٹ لے رہا ہے۔ جاگا نہیں ہے مگر نیند ٹوٹنے کی وہ کیفیت، جب رفتہ رفتہ حواس مجتمع ہونا شروع ہوتے ہیں اور دھیرے دھیرے ادراک پیدا ہونے لگتا ہے، تقریباً صاف دکھائی دے رہی ہے۔

اس بات کا احساس ٹام جیفرسن کو اس دن ہوا جس دن قصبے سے شہر کا کام کرنے گئی تین لڑکیوں کو اغواء کر لیا گیا۔ جب اندھیرا ہونے کے بعد بھی لڑکیاں واپس نہیں آئیں تو گاؤں میں بے چینی پھیل گئی۔ لوگ، جو اندھیرا گہرانے کے فوراً بعد اپنے گھروں میں بند ہو جانے کے عادی تھے، باہر جگہ جگہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں جمع ہو کر باتیں کرنے لگے۔ پھر نوجوانوں کی ایک ٹولی شہر پتہ لگانے کے لیے بھیجی گئی۔ ساری رات بستی میں کوئی نہیں سویا۔

صبح کو معلوم ہوا کہ تین لڑکیوں میں سے ایک کا قتل ہو گیا ہے۔ دو لڑکیاں بے ہوش پائی گئیں۔ ڈاکٹری جانچ کے مطابق ان تینوں کے ساتھ کئی آدمیوں نے ریپ کیا تھا۔ ریپ کرنے والے کون تھے، اس کا بھی ایک حد تک پتہ چل گیا۔ یہ شہر کے کچھ ایسے بااثر لوگ تھے جن پر ہاتھ ڈالنے میں پولیس آنا کانی کر رہی تھی۔ ایسی کوشش کی جا رہی تھی کہ معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے۔ کالج کے

آدی باسی لڑکوں نے تھانے کا گھیراؤ کرلیا۔اور مشتعل ہوکر پتھر برسانے لگے۔ جواب میں پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔جس میں کئی لڑکوں کو چوٹیں آئیں۔

یہ ساری خبریں بستی والوں کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھیں۔ پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے آگ سلگنے لگی۔ دھواں اٹھنے لگا، گرمی بڑھنے لگی۔ لوگوں کے دل و دماغ دہکنے لگے۔ سائیکلیں قصبے سے شہر اور شہر سے قصبے دوڑنے لگیں۔ دوسرے دن سارا رانچی شہر بند ہوگیا۔ بند کا اعلان جھارکھنڈ اسٹوڈنٹ فیڈریشن نے کیا تھا۔ طے ہوا کہ اسی دن قصبے سے ایک جلوس نکال کر رانچی ڈپٹی کمشنر کے اجلاس میں احتجاج کے لیے جایا جائے۔ صبح سے آس پاس کے دیہاتوں سے، بلکہ دور دراز کی بستیوں سے پیدل اور ریل گاڑیوں میں لوگ آنا شروع ہوئے۔ جنگل کے انتہائی اندرونی علاقوں سے بھی لوگ پہنچے تھے۔ شانوں پر کمان سجائے، پیچھے پشت پر ٹنگے بانس کے ترکش میں تیروں کا گچھا لیے ڈھول بجاتے نقارے پیٹتے۔ دوپہر سے پہلے پہلے ساری بستی اجنبی لوگوں کی بھیڑ سے بھر گئی تھی۔ کہیں ذرا سی جگہ نہیں بچی تھی۔ ٹام جیفرسن کا احاطہ کچھا کچھ بھر گیا۔ پھر جیپوں اور کرائے کی ٹیکسیوں پر لیڈروں کی آمد شروع ہوئی۔ نعروں کی گرج سے جیسے سارا ارض و سما بھر گیا۔

جھارکھنڈ راج۔۔۔ زندہ باد، زندہ باد۔

خون کا بدلہ۔۔۔ خون سے لیں گے۔

ہتیاروں کو۔۔۔ پھانسی دو، پھانسی دو۔

پھر ساری بھیڑ قصبے سے نکلنے والے راستے پر یوں بہنے لگی جیسے پانی کسی جھیل کا کنارہ توڑ کر بہہ نکلا ہو۔

جب جلوس دور چلا گیا اور سارا قصبہ تقریباً خالی ہوگیا، تب ٹام جیفرسن نے بند دروازے سے جھانک کر، ایک دم ویران احاطے کو دیکھا۔ سنسان قصبے پر نظر ڈالی اور پہلی بار گالی دی۔

''حرامی۔۔۔!''

طوطا زور زور سے چیخنے لگا۔

''حرامی، حرامی، حرامی۔۔۔''

بندر تیز آواز میں کھوکھیائے۔ ان کے بچوں نے بھی دانت نکوسے۔ ٹام کو سالہا سال کے بعد پہلی بار غصہ آیا۔ اس نے چھڑی اٹھائی اور سچ مچ بندروں پر برسانے لگا۔ بندر، جو اس فن کے ماہر ہوتے ہیں، ہر وار بچا جاتے۔ جب وہ تھک کر پسینے پسینے ہوگیا تو اس نے چھڑی پھینک دی۔

''سالے، حرام زادے۔۔۔''

طوطا چلانے لگا:

''سالے، سالے، سالے،،،،''

ٹام اس کی طرف لپکا۔۔۔ ''آج میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا''۔۔۔ طوطا سہم کر پنجرے کے آخری سرے میں سمٹ گیا۔

وہ برآمدے سے نیچے اترا۔ احاطے میں بہت سی غیر ضروری چیزیں پڑی تھیں۔ پکوڑیاں کھا کر پھینکے گئے پتے، پاؤ روٹی کا رنگین ریپر، سگریٹ کا ایک آدھا خالی پیکٹ، اینٹیں اور چھوٹے پتھر تھے، جن کو لوگوں نے بیٹھنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ روندی ہوئی گھاس اور ایک خاموش پر اسرار سناٹا۔ وہ لٹا لٹا سا کھڑا رہا۔

برسوں بیت گئے اسی طرح کے ہنگاموں می۔ قصبے کی آہستہ خرام زندگی اچانک اتنی تیز ہوگئی کہ رفتار کی رو میں آس پاس کی چیزیں دکھائی بھی نہ دیتیں۔ ایسی ہی قریب کی چیزوں میں ٹام جیفرسن کا احاطہ بھی تھا۔ اب اس احاطے میں محفلیں نہیں جمتی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں اب اتوار کے دن بھی اس کے جانوروں کے ساتھ چہلیں کرنے نہ آتیں۔ عورتوں نے بچے ہوئے کھانے اور مردوں نے وقتاً فوقتاً کی جانے والی مالی مدد بھی بند کر دی تھی۔ اب انہیں پارٹی کے لیے طرح طرح کے چندے دینے پڑتے تھے۔

جوکھیم کجور کو ایک دن اچانک خیال آیا کہ اس کو ٹام جیفرسن کے پاس چلنا چاہیے۔ اس کو شہر میں ایک لاٹھی چارج میں چوٹ لگی تھی۔ پاؤں کی ہڈی ٹوٹی تو نہیں تھی مگر چوٹ نے اس کو ہفتوں کے لیے بیکار کر دیا تھا۔ انہی بیکاری کے دنوں میں ایک دن وہ چھڑی ٹیکتا ہوا ٹام کے احاطے میں جا پہنچا۔

اس کو یہ دیکھ کر افسوس سا ہوا کہ احاطے کی رونق ہی ختم ہوگئی ہے۔ اس نے سب سے پہلے طوطے کا پنجرہ ہلایا۔

''بول مٹھو، حرامی۔۔۔''

طوطا کچھ بولنے کی بجائے ایک طرف کو سمٹ گیا اور خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی۔ پھر اس نے بندروں اور خرگوشوں کے پنجروں پر نظر کی تو چونک گیا۔ بندر کے دونوں بچے غائب تھے۔ اور خرگوشوں میں صرف چار خرگوش باقی تھے۔ وہ بھی پنجرے میں بند، جبکہ ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

''بندر کیا ہوئے انکل۔۔۔؟'' اس نے ٹام سے پوچھا، جو اس کو دیکھ کر اندر سے باہر نکل رہا تھا۔

''بیچ دیے۔۔۔!''

''بیچ دیے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟''

''کیا کرتا، کہاں سے کھلاتا انہیں؟ لوگوں نے یہاں آنا بند کر دیا۔ کوئی پیسوں کی مدد بھی نہیں کرتا۔ لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔ اب وہ لیڈری کرتے ہیں۔ نعرے لگاتے ہیں۔ بندھوں کا آہوان اور چکہ جام، مظاہرے اور احتجاج۔ وہ چھوٹا ناگپور کی آزادی لیں گے۔ جھارکھنڈ۔۔۔''

ٹام جیفرسن کے الفاظ میں نہیں، لہجے میں کچھ تھا۔ حقارت، یا کوئی ایسی چیز جس نے جوکھیم کو برافروختہ کر دیا۔ شاید وہ الجھ پڑتا۔ مگر اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں نے اس کی عمر ہزاروں سال لمبی کر دی تھی۔ چنانچہ وہ خوش دلی سے بولا:

''آزادی۔۔۔؟'' یہ لفظ تو ہم نے چھوٹا ناگپور کے جنگلی درختوں کے ایک ایک پتے پر لکھ دیا ہے''۔

ٹام جیفرسن کی نیلی آنکھیں ایک دم چھوٹی ہوگئیں۔ ہونٹ کھنچ گئے۔ اس نے ایسے پوچھا جیسے انگلینڈ، ہندوستان سے پوچھ رہا ہو:

''تم آزادی کا مطلب جانتے ہو؟''

جوکھیم نے مسکرا کر جواب دیا۔۔۔ ''ہم آزادی کا مطلب جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، مگر غلامی کا مطلب ضرور جانتے ہیں۔ ان کی طرح۔۔۔!'' اس نے پنجروں کے جانوروں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ غلام ہیں۔۔۔؟ میں برسوں سے مختلف خطرات سے بچاتے ہوئے ان کی پرورش کر رہا ہوں۔ یہ تو میرے بچے ہیں۔۔۔!'' جوکھیم ہنس دیا۔

''اس طرح کے جملے تاریخ میں بار بار دوہرائے گئے ہیں۔ میری پرجا۔۔۔ میری رعایا۔۔۔ میری اولاد۔۔۔**مگر ان** سب کے پیچھے ہمیشہ **ایک جذبہ** حکمرانی پوشیدہ رہا یا پھر خوف۔ **سب** کچھ تیاگ کر جنگل میں آبسنے والا **سنت** بھی اس **جذبے** کو ذہنوں سے نکال نہ سکا۔۔۔!''

''تمہارا مطلب ہے۔۔۔؟''

''ہاں وہی مطلب ہے میرا۔۔۔''

تھوڑی دیر کے لیے **ایک** دل آزار خاموشی چھا گئی۔ جوکھیم اٹھا، جانے کی اجازت چاہی۔ پھر جاتے جاتے **پلٹ** کر بولا:

جب طوطے بولنا چھوڑ دیں، بندر کھوکھیانا بند کر دیں اور خرگوش بھاگنا، تو سمجھنا چاہیے کہ۔۔۔''

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور چھڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا قدم قدم چل کر احاطے کے باہر ہو گیا۔

چار دنوں کے بعد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ٹام جیفرسن مر گیا ہے۔ جوکھیم وہاں لنگڑاتا ہوا پہنچا تو اس سے پہلے بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ٹام جیفرسن کی لاش کو فرش سے اٹھا کر اس کی ٹیم کھاٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ جوکھیم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ٹام جیفرسن کے پنجروں کے سارے پٹ کھلے تھے اور سارے جانور غائب۔۔۔

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ٹام جیفرسن نے ان پنجروں کے پٹ کھول دیے تھے یا خود جانور ہی نکل بھاگے تھے۔

☆☆☆

آخری آدمی

انتظار حسین

الیاسف اس قریئے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی قسم آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخری دن تک کوشش کی۔

اور اس قریئے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغ خراب کر دیتے تھے، نابود ہو گئے۔ پر اس شخص نے جو سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا، یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ تم ہم سے ٹھٹھا کرتے ہو۔ اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا۔ اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجرِ الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی، پھر الیعذر کی جورو خواب گاہ تک گئی اور حیران و ہراساں آئی، پھر یہ خبر دور دور تک پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی خواب گاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا۔ الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ عزیز الیعذر بندر بن گیا ہے، اس پر دوسرا زور سے ہنسا، "تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا؟" اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خد و خال کھنچتے چلے گئے۔ اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلے کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور پھر وہ بندر بن گیا۔

اور الیاب، ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرہ بگڑ گیا۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصے سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے، اس پر زبلون کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور وہ دانت بھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہو گیا اور ابن زبلون کا چہرہ غصے سے آپے سے باہر ہوا۔ اور الیاب خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا گیا۔ اور وہ دونوں، کہ ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوٹ تھے، آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضاء بگڑے، پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے، کہ ان سب میں عقلمند تھا اور شروع سے آخر تک آدمی بنا رہا، تشویش سے کہا کہ اے لوگو! مقرر ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس ہوا۔ اور بڑی آواز میں بولا۔ "اے لوگو وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا، آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لیے خرابی ہے۔" لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انہیں آلیا۔ وحشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں اور خد و خال مسخ ہونے لگے۔

اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور سکتے میں آ گیا۔ اس کے پیچھے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ پھر اس نے دائیں بائیں نظر ڈالی اور ہر سمت بندر دیکھے۔ تب وہ دوڑا اور ان سے کترا کر چلا اور بستی کے اس کنارے سے اس کنارے تک چلا گیا۔ جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی سمندر کے کنارے۔ اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلی کی بستی۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا، کٹورا بجتا تھا۔ پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں اور اونچے برجوں میں عالیشان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آئے۔ اور الیاسف نے ہراس سے چہار سمت نظر دوڑائی اور سوچا کہ کیا میں اکیلا آدمی ہوں؟ اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی تھی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے احساس برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا۔ تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں، کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی۔ اس نے ان کے لال بھبوکا صورتوں ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک ابن زبلون کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہو گئی۔ اس نے کہا کہ الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت سے آدمی کی کایا بدل جاتی ہے۔ اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا کہ بے شک میں انہیں میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد کئے جب وہ ان میں سے تھا۔ اور دل اس کا محبت کے جوش میں امنڈنے لگا۔۔۔ اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کے دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا، اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا کہ لمبے بال اس کے رات کی بوندوں سے بھیگے ہوئے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں۔ اور پیٹ میں اس کا گندم ڈھیری کی مانند ہے کہ پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا۔ اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور پکارا کہ اے بنت الاخضر! تو کہاں ہے؟ اے وہ کہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ دیکھ موسم کا بھاری مہینہ گزر گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہو گئیں۔ اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑ پھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے اے اخضر کی بیٹی۔ اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی۔ تجھے دشت میں دوڑتی ہرنیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف نے بار بار پکارا تا آنکہ اسکا جی بھر آیا اور بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف، بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا، مگر اچانک اسے الیعذر کی جورو یاد آئی اور الیعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روئی تھی حتیٰ کے اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑتے چلے گئے۔ اور ہڑکی کی آواز وحشی ہوتی چلی گئی۔۔۔۔ یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا کہ بنت الاخضر جن میں سے تھی، ان میں مل گئی۔ اور بے شک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ الیاسف ان سے محبت مت کر، مبادا تو ان میں سے ہو جائے۔ اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صورتوں اور کھڑی دم کو دیکھ کر ہنسا۔ اور الیاسف کو الیعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریئے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں اور الیعذر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کہ میں انگور کے خوشے توڑوں گا۔ انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی تھی۔ الیعذر اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا۔ اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذر کی جوئیں بین بین کر کھاتی تھی، الیعذر جھرجھری لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ دم کھڑی کر کے اپنے پچھلے پنجوں پر اٹھ بیٹھتی۔ اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوئی کہ اسے ساری بستی گونجتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اتنے زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا۔ اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو ہنسی کی ایسی چیز بن جائے۔ اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کر لیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے غصہ اور ہمدردی سے، ہنسنے اور رونے سے، ہر کیفیت سے گزر گیا۔ اور جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا اور ان کا درختوں پر اچکنا، دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا، کچے پکے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا، یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا، کبھی ہنساتا تھا، کبھی غصہ دلاتا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگتا اور انہیں حقارت سے دیکھتا تھا۔ اور یوں ہوں کہ انہیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا۔ اور کسی کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان وہ رشتے نہیں رہے تھے۔ اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا کہ اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھ میں خالی برتن کی مثال رہ گیا ہے۔ اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے، آج لفظ مر گیا۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا۔ اور محبت اور نفرت سے، غصے اور ہمدردی سے ہنسنے اور رونے سے درگزرا۔ اور الیاسف اپنی پناہ کے اندر پناہ گیر ہو کر جزیرے کی مانند ہو گیا۔۔۔۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان۔ اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کہ اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا۔ گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنا لیا کہ محبت اور نفرت غصہ اور ہمدردی غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں کہ جذبے کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے۔ اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کھانے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبود کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں۔ تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر آ رہی ہے۔ کہ اس کے اعضاء خشک، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ تب اسے اپنے بدن سے مزید خوف آیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوف سے وہ اپنے اندر سمٹنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگیں اور بازو مختصر اور سر چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضاء اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف

پر اسی طرح غلبہ پاؤں گا جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا۔ اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پایا۔ اور اس کے سمٹتے ہوئے **اعضاء** کھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے **اعضاء** ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے۔ اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور لجلجے ہو گئے اور اسکے جوڑ کھلنے لگے۔ اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے **اعضاء** بکھر جائیں گے۔ **تب** اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھیں اور اپنے آپکو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے **بدہیئت اعضاء** کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے **اعضاء** کی صورت **بدلتی** جارہی ہے اور اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کہ میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اسکا ڈوبنے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے **ایک آنکھ** کھولی اور چپکے چپکے اپنے **اعضاء** پر **نظر** ڈالی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے **اعضاء** تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ پھر اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے **بدن** کو دیکھا اور کہا بے شک میں اپنی جون میں ہوں۔ **مگر** اس کے بعد آپ ہی آپ سے اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے **اعضاء** بگڑتے اور **بدلتے** جارہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان **اندر** کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی **اندھیرے کنوئیں** میں دھنستا جارہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود، میرے باہر بھی دوزخ ہے، میرے **اندر** بھی دوزخ ہے۔ **اندھیرے کنوئیں** میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اور گزری یادیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو **سبت** کے دن ہم جنسوں کا **مچھلیوں** کا شکار کرنا یاد آیا کہ **انکے** ہاتھوں **مچھلیوں** سے بھرا سمندر **مچھلیوں** سے خالی ہونے لگا تھا اور ان کی ہوس بڑھتی گئی۔ اور انہوں نے **سبت** کے دن بھی **مچھلیوں** کا شکار شروع کر دیا۔ **تب** اس **شخص** نے جو انہیں **سبت** کے دن **مچھلیوں** کے شکار سے **منع** کرتا تھا کہ رب کی سوگند، جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا ہے اور گہرے پانیوں کو **مچھلیوں** کا مامن ٹھہرایا، **تب** سمندر تمہارے دست ہوس سے پناہ مانگتا ہے اور **سبت** کے دن **مچھلیوں** پر **ظلم** کرنے سے باز رہو، کہ مبادا تم اپنی جانوں پر **ظلم** کرنے والے قرار پاؤ۔ اور الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں **سبت** کے دن **مچھلیوں** کا شکار نہیں کروں گا۔ اور الیاسف نے کہ عقل کا پتلا تھا۔ سمندر سے فاصلے پر **ایک گڑھا** کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملا دیا۔ اور **سبت** کے دن مچھلیاں سطح آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں۔ اور **سبت** کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ **شخص** جو **سبت** کے دن مچھلیاں پکڑنے سے **منع** کرتا تھا، یہ دیکھ کر یوں بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے **مکر** کیا اللہ اس سے **مکر** کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ بڑا **مکر** کرنے والا ہے۔ اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ وہ **مکر** میں گھر گیا ہے؟ اس گھڑی سے اسے اپنی پوری بستی **ایک مکر نظر** آئی۔ **تب** وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے کا حق ہے تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا تو اب مجھ سے **مکر** کرے گا اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا اور الیاسف اپنے حال پر رویا۔ اس کے بنائے پشتہ پر دراڑ پڑ گئی تھی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آرہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رویا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری **نظر** آتی تھی، اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لیے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے **درخت** کی ٹہنیوں میں چھپ کر بسر کی۔

جب وہ صبح کو جاگا تو اس کا سارا بدن **دکھتا** تھا اور ریڑھ کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے بگڑے **اعضاء** پر **نظر** رکھی کہ

اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آرہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کیا میں، میں ہی ہوں؟ اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے۔ اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو؟ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بے شک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی، آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی۔ اور وہ پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے ہوئے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آرہا تھا۔ اور الیاسف نے درد سے صدا کی کہ اے بنت الاخضر، اے وہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے، تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑوں کی قسم قسم ہے تجھے۔۔۔۔ کبوتریوں کی جب وہ بلندیوں میں پرواز کریں۔ قسم ہے تجھے رات کی، جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیرے کی جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم تجھے اندھیرے اور نیند کی اور پلکوں کی، جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں تو مجھے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہوگئے۔ جیسے زنجیر الجھ گئی ہو، جیسے لفظ مٹ رہے ہوں، جیسے اس کی آواز بدلتی جارہی ہو۔ اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیونکر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں؟ الیاسف اپنی بدلی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود! کیا میں بدل گیا ہوں؟ اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت ان ہونا نظر آیا۔ اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہوگیا کہ الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے سے خائف، چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا، جی ٹھنڈا کیا۔ اس اثنا میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا۔ اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا تھا۔ اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا جاتا تھا جیسے جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا گیا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے۔

اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کی موافق چلا۔

☆☆☆

در گور

انوار احمد

تقریباً بھاگتے قدموں سے آفس سے باہر نکلتے ہی طاہرہ نے آسمان کی جانب نظر دوڑائی۔ گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان اور کراچی جیسے وسیع وعریض شہر کی فلک بوس عمارتیں جو اس شہر کے لوگوں کو ان کے قد سے بھی چھوٹا بنائے دے رہی تھیں۔ سڑکوں پر پھرتے چھوٹے چھوٹے قدوں کے یاجوج ماجوج۔۔۔ جو سارا دن شہر کے سکون کو چاٹتے اور ہر رات کے بعد پہلے سے بھی زیادہ تروتازہ ہو جاتے۔ اس کا جی چاہا سمندر کی ایک بڑی سی لہر آئے اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جائے۔ گال پر پڑنے والی بارش ایک چھوٹی سی بوندا سے اپنے دل پر تیزاب کی مانند محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اور موسم دونوں اپنا سکوت توڑ دیتے اس نے رکشے کو ہاتھ دیا اور قریب آنے پر نہایت عجلت میں اس میں جا بیٹھی۔ آج گھر کا راستہ اسے ہمیشہ سے زیادہ طویل لگا۔ کئی بار اسے محسوس ہوا کہ آنسوؤں کا ایک گولہ اس کے حلق میں پھنسا جا رہا ہے خود پر شدید ضبط کے باوجود بھی وہ خود کو رونے سے باز نہ رکھ سکی۔ خدائے لم یزل کی دنیا میں انسان کیسی بے بس شے ہے۔ گرم گرم سیال اس کے گالوں پہ بہنے لگا اور وہ رکشے میں ہی اپنا منہ چادر میں چھپائے اپنے اندر کی گھٹن کو آہستہ آہستہ باہر نکالنے لگی۔

رکشے سے باہر نکلتے ہی اس کے قدم ایک کہنہ طرز کے مختصر سے مکان کی جانب اٹھے۔ بڑی ہمت سے اس نے خود پر ضبط کیا اور آہستگی سے اس مختصر سے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے آہستگی سے اس پر چٹخنی چڑھا دی۔ کاندھے پر لٹکے ہینڈ بیگ کو اس نے بستر پہ زور سے پٹخا اور چادر کو سر سے یوں اتار کر پھینکا کہ جیسے خود سے چپکنے والی ہر نگاہ ابھی تک اس چادر پہ ہی ٹنگی ہوئی ہو۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے منہ سے عورت ہونے کا نقاب بھی نوچ ڈالے ایسا سلگتا ہوا نقاب جس کی تمازت سے اس کی روح پچھلے تیس برسوں سے برہنہ پا احساس کی نوکیلی کرچیوں پر آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ تقدیر نے اسے وقت کے جس بے رحم دروازے پر لا کھڑا کیا تھا وہ بے کلی اور جمود کا وہ درمیانی دوراہا تھا جہاں سے منزلیں ریت کی مانند ہوا میں تحلیل ہوئی جاتی تھیں۔ زندگی تو بس اک آہوئے زخم خوردہ کی مانند حالات کے بنجر جنگل میں سرپٹ دوڑنے کا نام رہ گئی تھی۔

اسے تقدیر کے وہ زخم بھولتے ہی کب تھے۔ خاص کر جب اس نے پہلی بار سہاگ کا سرخ جوڑا پہنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سرخ جوڑے کی قیمت ابا جی نے کتنے مہنگے داموں ادا کی تھی۔ بیلیوں کی خوشیاں خریدنا کونسا آسان کام ہے۔ کیسی دن رات مشقت کی تھی تب بھی پورا نہ پڑا۔ وہ تو بھلا ہو اس منشی رب نواز کا جس نے انہیں بینک سے چار لاکھ کا قرضہ لے کر دیا تب کہیں جا کر جہیز اور کھانے کا خرچہ پورا ہوا تھا۔ آخر انہوں نے بھی تو اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنا تھا۔ وہ کوئی ایسی گئی گزری شکل کی مالک بھی نہ تھی اچھی خاصی خوش شکل تھی پر غریب کے گھر کون رشتہ لے کر جاتا ہے۔ اسے پتہ تھا ماں جی نے کتنے رشتے والیوں کی منتیں سماجتیں کی تھیں تب کہیں جا کر ایسا عمدہ رشتہ ملا تھا انہیں۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ انہیں بھی لگا تھا کہ جیسے اب کے اسے رخصت کر کے وہ بھی سکھی ہو جائیں گی۔ رخصتی کے وقت وہ ابا جی سے مل کر کیسے پھوٹ کر روئی تھی کہ اب جیسے اس گھر میں دوبارہ نہیں آئے گی۔ پرواہ رے نصیب۔۔۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی سسرال والوں کی ایسی ایسی فرمائشیں شروع ہوئیں کہ شریف حسین چاہ کے بھی پورا نہ کر پائے۔ یوں تیسرے ہی ماہ وہ طلاق کے کاغذوں میں دفن کر کے گھر پہنچائی گئی۔ کیسے کیسے طعنوں کے نشتر تھے جو اس کی ساس نے اپنی زبان سے اس کے ماں باپ کے دلوں میں پیوست کئے تھے۔

"آئے ہائے۔۔۔کوئی پوچھے بھلا موٹر سائیکل بھی کوئی ایسی چیز تھی جو میرے بیٹے نے مانگ لی تھی۔ ماں باپ تو بیٹیوں کے لیے جانے کیا کیا کچھ کر جاتے ہیں۔ارے ہم سے تو بڑی بھول ہوگئی جو اپنا قیمتی بیٹا ان ٹٹ پونجیوں میں بیاہ ڈالا۔۔۔آخر کوئی نام ہے ہمارا۔۔کوئی عزت ہے۔۔۔سنبھالو اپنی بیٹی کو اپنے جیسے غریبوں میں ہی بیاہنا اسے۔۔۔"اس عورت کی زبان سے اگلتا زہر ان کی روحوں کو جھلسانے لگا۔

پر اماں جی ایک بار بھی نہ بولیں۔وہ آخر کیوں نہ بولیں۔کم از کم اتنا ہی کہہ دیتیں کہ "سعیدہ بیگم تم خود آئی تھیں ان ٹٹ پونجیوں میں رشتہ لے کر۔۔۔سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے تب تمہارا نام اور تمہاری عزت کہاں تھی۔۔۔"اس نے کتنی ہی بار یہ بات دل میں سوچی تھی کہ کاش اماں جی ایک بار تو یہ کہہ دیتیں اور کچھ نہیں تو غصے سے صرف اتنا ہی بول دیتیں کہ' جاؤ بی بی جاؤ۔۔۔تم لوگ بھی اس قابل نہیں کہ ہماری بیٹی تمہارے ساتھ نباہ کرے۔۔۔" آخر اس کی بھی کوئی عزت تھی کہ نہیں۔ پر وہ کیوں بولتیں۔ان کے لیے تو ان کی نماز روزہ اور تسبیحات زندگی کی اولین ترجیحات تھیں۔ان کی زندگی تو صبر و قناعت سے شروع ہو کر اطاعت مشیت ایزدی پہ ختم ہو جاتی تھی۔ان کے لیے تو ہر کار جہاں مصلحت خداوندی کا روپ ہوتا تھا۔اس دن بھی انہیں اس مشکل وقت میں بھی اپنی بیٹی کی سلگتی ہوئی روح نظر نہیں آئی جب وہ کرب واذیت کے برزخ میں کہیں معلق ہو کر وحشت سے پر پھڑ پھڑا رہی تھی۔

اور ابا جی جنہوں نے ندامت سے اپنا سر اتنا نیچے جھکا لیا کہ ان کی داڑھی ان کے دامن کو چھونے لگی۔اسے لگا کہ جیسے وہ خود سسرال چھوڑ کے ماں باپ کے در پہ آبیٹھی ہو۔انہوں نے تو سعیدہ بیگم کی منتیں بھی کرنے کی کوشش کی پر وہ انہیں راستے سے دھکیلتی ہوئی چلتی بنی۔اس کے بعد ابا جی کو ایک چپ ہی لگ گئی تھی۔ان کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی شادی جس کے لیے انہوں نے خود کو مقروض تک کر ڈالا تھا۔اسے یقین نہ آتا کہ یہ وہی کندھے ہیں جن کی اونچائیوں پہ بیٹھ کر اس نے دنیا کو دیکھنا سیکھا تھا۔ یہ وہی بازو تھے جن کا جھولا اسے درختوں سے بھی زیادہ مضبوط لگا کرتا تھا اور اب یہی کندھے اور بازو بڑی سرعت سے ایک خمیدہ دیوار کی مانند جھکتے چلے جا رہے تھے۔ابا جی تو اس کا مان تھے پر بیچارے ابا جی۔۔۔کتنا بوجھ تھا ان کے بوڑھے کاندھوں پر، گھر کا بوجھ، قرضے کا بوجھ، طلاق یافتہ بیٹی کا بوجھ۔۔۔جو سب پہ حاوی تھا۔ پر وہ کیا کر سکتی تھی۔آخر کو وہ ایک عورت تھی۔ ایک ایسی غریب بے بس عورت جس کی بھینٹ معاشرے کی ہر رسم پہ چڑھائی جاتی۔جس کی مانگ کو خود اس کے دل کے خون سے بھرا جاتا۔

شدت احساس کے انگاروں سے دہکتے دن رات اس کی زندگی کو صبح شام داغتے رہتے اور وہ بلبلا کر چیخ اٹھتی۔"اماں اب لوگ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کیوں نہیں کر دیتے"۔اور اماں جی جواب میں توبہ توبہ استغفار پڑھ کے رہ جاتیں۔

تبھی اس نے سوچا کہ اب وہ مزید ان کاندھوں پہ اپنا بوجھ نہیں ڈالے گی۔اگر جینا اسی طرح ہے تو اس کے لیے تگ و دو بھی خود ہی کرنی ہوگی۔اپنی ساری ڈگریوں کو اکٹھا کر کے ابا جی سے اجازت طلب کی جسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی روک نہ پائے۔کیونکہ بینک سے لیے گئے قرضے کو لوٹانے کا وقت قریب آچکا تھا۔اور پھر ایک سہیلی کی وساطت سے اسے ایک مل میں نوکری مل ہی گئی۔ پر بنت حوا کے لیے یہ کون سا آسان کام ٹھہرا۔گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتے ہی ہوس سے لتھڑی ہوئی نگاہیں اس کی چادر پر بچھوؤں کی مانند پھیل جاتیں جن کے زہریلے ڈنک اسے اپنے جسم پر محسوس ہوتے۔غریب کے لیے تو خوش شکل ہونا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا۔

جانے ابھی اور کتنے دن اسی طرح سے گزرتے اگر ایک دن ابا جی کو وقار صاحب راستے میں نہ مل جاتے۔ابا جی نے خود اسے وقار صاحب جیسے نیک دل اور شریف النفس شخص کے بارے میں بتایا تھا اور تبھی وہ اس کی ڈگریاں لے کر خود وقار صاحب کے آفس تک گئے تھے۔ابا جی نے جیسا بتایا وقار صاحب تو اس سے بھی کہیں بڑھ کر خدا ترس نکلے۔سفید قلموں اور پرکشش شخصیت کے مالک شفیق وقار صاحب تو اسے کوئی دیوتا صفت انسان لگے جنہوں نے نہ صرف اسے اچھی نوکری دی بلکہ اب تو اس کی تنخواہ بھی پہلے سے کہیں زیادہ اچھی ہوگئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ وقار صاحب نے شریف حسین کو چار لاکھ کا چیک دے کر ان پر کتنا بڑا احسان کیا تھا۔

اسے تو وہ سچ مچ کے دیوتا لگے۔ بڑے عرصے بعد یاجوج ماجوج کی اس بستی میں اسے ایک انسان نظر آیا تھا۔ ایک ہوس سے عاری انسان۔ زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پہ آنے لگی تھی۔ اب کی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ وقت کو مرہم بننے دے گی۔ ایسا مرہم جو اس کے ذہن سے ساری تلخ یادیں کھرچ کھرچ کر باہر نکال دے گا۔

پر ابھی تو دو ماہ بھی نہ گزرے تھے آج جب اسے وقار صاحب نے اپنے پاس بلایا تو ان کی شفیق آنکھوں میں کچھ اور ہی تھا۔۔ کچھ بہت ہی جانا پہچانا۔۔۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہی سیاہ رنگ کے بچھو وقار صاحب کی سرخ آنکھوں سے لپک لپک کر اس کی چادر سے چمٹنے لگے۔ انکے زہریلے ڈنک اس کے جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔۔۔ بہت جی کڑا کر کے اس نے وہاں سے اٹھنا چاہا۔ اور تب ہی وقار صاحب نے اس کا ہاتھ تیزی سے اپنی جانب کھینچا۔

''آپ ہوش میں تو ہیں سر۔۔۔۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کیوں کیا ہوا ہے مجھے۔۔۔'' انکے منہ سے اٹھتے ہوئے بدبو کے بھبھوکے اس کے لیے کچھ نئے تو نہ تھے۔ یہی بو تو اسے اپنے شوہر سے آیا کرتی تھی۔ نفرت کا ایک شدید جذبہ اسے اپنے اندر اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے غصے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور جانے کے لیے مڑی۔

''ایسے کیسے جانے دوں۔۔۔ پورے چار لاکھ دیئے ہیں۔۔۔ میں نے شریف حسین کو۔۔۔ تمہاری وجہ سے۔۔۔''
وقار صاحب بھی گھوم کر سامنے آ گئے۔ آج وہ تہذیب کے ہر دائرے کو تیاگنے کے لیے تیار تھے۔

''تو وہ پیسے آپ نے ابا جی کو یہ سوچ کر دیئے تھے۔۔۔ لعنت ہے ایسے پیسوں پر۔۔۔ اور آپ پر بھی۔۔۔'' اس نے جارحانہ انداز میں حواس سے بیگانہ وقار صاحب کو زور سے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ جانے کہاں سے آج اس کے اندر اتنی ہمت آ گئی کہ اس نے بھاگتے ہوئے دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ندامت اور خفگی سے اس کا چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ تبھی تو اس سے رکشے میں بھی صبر نہ ہو سکا۔ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ جونہیں ابا جی گھر داخل ہوئے وہ پھٹ پڑی۔ آج اس نے بھی چپ نہ رہنے کی قسم کھائی تھی۔

''ابا جی کہاں ہے وہ چیک۔۔۔ جو آپ کو آپ کے وقار صاحب نے دیا تھا۔ میں کہتی ہوں اسے پھاڑ کے ان کے منہ پہ دے ماریں۔۔۔'' وہ پہلی بار ابا جی کے سامنے زور سے چلائی تھی۔ اس کی حالت اب اس زخمی بلی کی سی تھی جو جلے پاؤں سلاخوں والے پنجرے میں خوف سے گھبرا کر کبھی ادھر بھاگتی تو کبھی ادھر۔ پر قرار تو کہیں نہیں تھا۔ اسکے پیروں تلے زمین دہک رہی۔ جس سے اس کا دماغ لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ کیا اس کی عزت اتنی ہی ارزاں تھی کہ جو چاہے اسے پیروں میں روند ڈالے۔ پر اب وہ کسی کے آگے نہیں جھکے گی۔ اس نے بھی فیصلہ کر ہی لیا۔

''کونسا چیک۔۔۔۔؟؟'' ابا جی ہکلائے۔

''وہی چار لاکھ کا چیک۔۔۔ جس کے بدلے میں وہ مجھے اپنی ملکیت سمجھ رہے ہیں''۔ وہ زور سے چلائی۔

پر اچانک ہی جو کچھ ہوا اس نے گویا اس کی قوت گویائی ہی سلب کر لی۔ بوڑھے ابا جی نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ کر گھٹنے ٹیک دیئے۔ ''دیکھ بیٹا تیرا بوڑھا باپ اس بڑھاپے میں کس کس کے آگے ہاتھ پھیلائے۔۔۔ کس کس سے مانگے۔۔۔ تو بتا میں یہ قرض کیسے اتاروں۔۔۔'' ابا جی کی ضعیف آنکھوں سے نمکین آنسوؤں کے چشمے جاری ہو گئے۔۔۔ ''دیکھ طاہرہ بیٹی۔۔۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔۔۔ میری عزت دوبارہ نیلام ہونے سے بچا لے۔۔۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے اس کے آگے گڑگڑانے لگے۔

وہ سن ہو کر رہ گئی اس کے حواس ایک ایک کر کے مفلوج ہونے لگے اور اسے یوں لگا کہ آج اس کے ابا جی نے اسے زمین میں زندہ دفن کر دیا ہو۔

☆☆☆

ماتم گسار

انور خان

شہر کے قلب میں واقع مدتوں سے ویران کھنڈر نما حویلی کے دروازے پر ایک تابوت رکھا ہوا ہے۔ سرگرمیاں جو دوپہر کی تمازت کے سبب معطل ہو چکی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ شروع ہو رہی ہیں۔ سڑکوں پر اکا دکا آدمی چلتا دکھائی دے جاتا ہے۔ جب کوئی راہ گیر حویلی کے سامنے سے گزرتا ہے اور دروازے پر رکھے تابوت پر اس کی نظر پڑتی ہے تو وہ ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ کچھ لمحے غیر یقینی انداز میں حویلی اور تابوت کو دیکھتا ہے پھر کچھ متعجب سا آگے بڑھ جاتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ ننگ دھڑنگ بچے، فقیر، آوارہ، اوباش لڑکے حویلی کے سامنے اکٹھا ہو گئے ہیں۔ تابوت کی خبر شاید حویلی کے اطراف کے علاقوں میں بھی پھیل گئی ہے۔ کیونکہ اب حویلی والی سڑک پر آمد و رفت معمول سے کچھ زیادہ ہی نظر آ رہی ہے۔ اور حویلی کے سامنے مجمع بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

حویلی اب بھی ہمیشہ کی طرح سنسان ہے۔ کسی کے قدموں کی آہٹ تک سنائی نہیں دیتی۔ آدمی اور آدم کی بات تو الگ رہی لگتا ہے اس میں ہوا کا بھی گزر نہیں۔

اچانک سڑک کے موڑ پر ایک کار موڑ لیتی نظر آتی ہے پھر بڑھتی ہوئی حویلی کے دروازے پر آ کر رک جاتی ہے۔ لوگ ہٹ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ کار سے نکل کر حویلی کے اندر کھو جاتے ہیں۔

باہر سڑک پر کھڑے افراد اب اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے واقعی حویلی کے کسی مکین کا انتقال ہو گیا ہے۔

کچھ دیر بعد ایک کار پھر سڑک کے افق پر نمودار ہوتی ہے اور اسی طرح بڑھتی ہوئی حویلی کے دروازے پر آ کر رک جاتی ہے۔ پھر چند لوگ کار سے باہر آتے ہیں اور حویلی میں کھو جاتے ہیں۔

پھر تو جیسے گاڑیوں کا تانتا بندھ جاتا ہے کہیں سے چند پھیری والے بھی آ جاتے ہیں۔ باہر کھڑے لوگ اب گاڑیوں سے ٹیک لگائے سگریٹ بیڑیاں پھونکتے ہوئے گپ شپ میں مصروف ہو گئے ہیں۔ گاڑیوں اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے اب تابوت دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کوئی نیا آدمی سڑک پر سے گزرتا ہے تو حویلی کے باہر رونق دیکھ کر چونک جاتا ہے اور اسے بتانا پڑتا ہے کہ حویلی کے باہر ایک تابوت رکھا ہوا ہے اور کچھ لوگ ابھی ابھی گاڑیوں سے اتر کر حویلی کے اندر آ گئے ہیں۔

''لیکن یہ حویلی تو برسوں سے ہم غیر آباد دیکھ رہے ہیں''۔

''ہاں، یہی تو تعجب ہے۔ اس حویلی میں آخر کون رہتا ہوگا؟''۔

کچھ لوگ حویلی سے باہر آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مجمع میں ہلکا سا شور ہوتا ہے پھر ایک اضطراب آمیز خاموشی چھا جاتی ہے۔

چہرے مہرے اور وضع قطع سے یہ لوگ نوکر پیشہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تابوت کو اٹھا کر اندر لے جاتے ہیں۔

باہر کھڑے لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ اس واقعے کا اختتام اب قریب ہی ہے، اس بات پر البتہ انہیں تعجب ہے کہ حویلی کے اندر سے کسی کے رونے کی آواز نہیں آ رہی ہے۔

''شاید مرنے والے کی عمر کافی زیادہ ہوگی اور اس کے متعلقین کے لیے اس کی موت غیر متوقع نہیں ہوگی''۔

''یا ممکن ہے مرنے والا ان لوگوں کا قریبی رشتے دار ہو''۔

گھر میں کوئی عورت بھی نظر نہیں آتی۔

''اب تک تو ہم صرف ملازمین کو ہی دیکھ پائے ہیں''۔

کچھ لوگ حویلی سے نکل کر دروازے کی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں اور مجمع کی بھنبھناہٹ بند ہو جاتی ہے۔احتراماً لوگ سگریٹ بیڑیاں بجھا دیتے ہیں۔اب وہ جنازے میں شرکت کے لیے تیار ہیں کہ یہ ان کا انسانی فرض ہے۔وہ اب اس واقعے کے عینی شاہد ہیں اور اس میں پوری طرح ملوث ہو چکے ہیں۔تمام نسل انسانی ایک کنبہ ہے اور اس کا ہر فرد ان کی محبت اور ہمدردی کا مستحق ہے۔

چار آدمی تابوت کو تھامے ہوئے ہیں۔ان کے ہونٹ حرکت کر رہے ہیں۔اور ان کے پیچھے دوسرے آدمی سر جھکائے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

بچے کھیلتے کھیلتے رک گئے ہیں۔عورتوں نے پلو سر پر لے لیے ہیں ماحول کی سنجیدگی سب پر اثر انداز ہو گئی ہے۔

باہر آتے ہی لوگ اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھے ہیں۔ان میں ترکی ٹوپی پہنا ہوا ایک بوڑھا جھریوں میں سوچ کی لہریں بسائے کھویا کھویا سا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں''۔

ایک نوعمر لڑکے نے آگے بڑھ کر کچھ جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا ہے۔

''جہاں بھی یہ تابوت لے جائے''۔اس نے اسی کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا ہے۔

''تابوت میں کون ہے؟''اس نے پھر سوال کیا۔

''پتہ نہیں۔شاید ایک بوڑھا آدمی۔ایسا وہ لوگ کہتے ہیں۔مگر میں نے اسے دیکھا نہیں''۔

''کسی نہ کسی نے تو دیکھا ہوگا؟''

''ہو سکتا ہے۔دیکھا ہوگا''۔

''یہ بھی تو ممکن ہے تابوت خالی ہو''۔نوعمر لڑکے نے کہا۔

''کیا کہا جائے۔ممکنات سے تو کوئی بات خالی نہیں ہوتی''۔بوڑھے نے جواب دیا۔

''پھر آپ کیوں تابوت کے ساتھ جا رہے ہیں؟''

''یہ آخری نیکی ہے جو ایک انسان کسی مرنے والے کے ساتھ کر سکتا ہے۔اس لیے جب مجھے معلوم ہوا تو انسانیت کے ناطے میں نے ضروری سمجھا کہ جنازے میں شرکت کروں''۔

''بوڑھا سنکی معلوم ہوتا ہے''۔مجمع میں سے کسی نے کہا۔

''کیا پتہ؟''کوئی اور بولنے کی خواہش سے بے اختیار بول اٹھا۔''تقریباً روز ہی ہم عجیب وغریب واقعات کے متعلق سنتے رہتے ہیں۔آخر وہ کہاں وقوع پذیر ہوتے ہیں؟اسی دھرتی پر،ہمارے آپ کے بیچ،صرف ہمیں ان کا پتہ دیر سے چلتا ہے''۔

تابوت سمیت گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔لوگ منتشر ہو گئے،صرف چند آوارہ مزاج لڑکے،دو چار فقیر یا اوباش باقی رہ گئے۔

''یار مجھے تو اب تک یقین نہیں آتا''۔ایک لڑکے نے کہا۔''اس حویلی میں تو آج تک کوئی انسان نظر نہیں آیا۔دیکھو حویلی کس قدر غیر آباد نظر آ رہی ہے۔ایسا لگتا ہی نہیں،وہاں کوئی رہتا ہوگا''۔

''کسی نے مذاق تو نہیں کیا''۔ایک اور لڑکے نے کہا۔

''یار مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔کچھ لوگوں نے تو یونہی پبلک کو حیران کرنے کے لیے تماشا کیا ہوگا''۔

سڑک کے موڑ پر ایک شخص نمودار ہوا۔وہ تیز تیز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔حویلی کے پاس آ کر اس کے قدم ست پڑ

گئے۔ آثار بتا رہے تھے کہ ابھی ابھی یہاں کچھ ہوا ہے۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے حویلی کے سامنے کھڑے لوگوں کو دیکھا۔

اس حویلی میں کوئی شخص مرگیا۔ ابھی ابھی اس کا جنازہ گیا ہے۔ ایک کمسن لڑکے نے کہا، بہت سارے لوگ آئے تھے گاڑیوں میں۔

اس نے غیر یقینی انداز میں دوسروں کو دیکھا۔ انہوں نے بھی سر ہلا کر لڑکے کے بیان کی تائید کی۔

اس نے حویلی کی طرف دیکھا پھر کندھے جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے اپنے دوستوں کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی جو قریب ہی ایک بار میں اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کے دوستوں کو اس خبر سے کتنا تعجب ہوگا۔ اس نے سوچا اور اسے خوشی ہوئی۔

اس کے دوست واقعی اس کے منتظر تھے اسے دیکھ کر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور اس کا گلاس لبالب بھر دیا۔ انہوں نے آپس میں جام ٹکرائے اور پھر اس نے کہا کہ وہ ایک بہت عجیب وغریب خبر لایا ہے۔

''کیا ہے وہ خبر، ایک نے کہا۔ ہمیں تم سے کسی ایسی ہی بات کی امید تھی''۔

''یہاں سے قریب ہی وہ سنسان حویلی ہے نا؟''

''ہاں ہاں ہے تو''۔

''وہاں سے ابھی ابھی کسی کا جنازہ گیا ہے''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو ہے۔ بحث ابھی تک جاری ہے۔ بار کا مالک گفتگو کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ خود گفتگو میں شامل ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ وہ بہت ہی بنیادی مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ دکان بند نہیں کر سکتا باہر سارا شہر گہری تاریکی میں ہے۔ سنسان حویلی بھی۔ اس میں اب بھی زندگی کے کوئی آثار نہیں۔

☆☆☆

کچے شہتوت

انور زاہدی

بہار کے شروع شروع کے دن تھے۔ ہوا کے جھونکوں میں ہر طرف پھولوں کی مہک ایسے بسی تھی جیسے قدرت نے آسمان سے زمین پر چاروں طرف ائیر فریشنر سے اسپرے کر دیا ہو۔۔۔ یہ جن دنوں کا ذکر ہے میں شاید آٹھویں کے امتحان سے فارغ ہو کر نویں کلاس کی تیاری میں مگن تھا۔۔۔

عجب عمر تھی اور عجیب دن۔۔۔ اپنی ذات کے علاوہ مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔۔۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا کہ ممی نے آواز دی۔۔۔ باہر نکلا تو وہ کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔۔۔ وہیں انہوں نے مجھے بلا کر پیسے دیئے اور مارکیٹ سے بسکٹ اور رومٹو سکواش کی ایک بوتل لانے کو کہتے ہوئے تاکید کی۔۔۔

رومی۔۔۔ دیکھو ہمیشہ کی طرح کھیل میں نہ لگ جانا۔۔۔ تمہارے پاپا کے ایک دوست اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے ہاں آرہے ہیں۔۔۔

میں نے ہمیشہ کی طرح ممی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے پیسے لیے اور سائیکل نکال کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔۔۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد جب گھر پہنچا تو ایک ریڈی میڈ بہانہ میرے پاس موجود تھا اور وہ میں نے ممی کے سامنے نہایت سلیقے سے پیش کرتے ہوئے کہا۔

ممی گھر کے قریب والی مارکیٹ سے بسکٹ تو مل گئے تھے۔۔۔ لیکن رومٹو سکواش کی بوتل لینے کے لیے مجھے صدر بازار جانا پڑا۔۔۔

ممی نے گھورتے ہوئے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا۔۔۔ اور کچن میں چائے بنانے میں لگ گئیں۔۔۔

میں بجائے ڈرائنگ روم میں جا کر پاپا کے دوست اور ان کی فیملی سے ملتا وہیں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔۔۔ اور دوبارہ اپنی کتابوں میں کھو گیا۔۔۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ پاپا کی آواز آئی۔۔۔

ارے بھئی رومی۔۔۔ ادھر آؤ بیٹے۔۔۔ میں ڈرائینگ روم میں پہنچا۔۔۔ تو وہاں پاپا اور ممی کے علاوہ۔۔۔ پاپا کے دوست اپنی مسز اور ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے۔۔۔ میں نے ایک سرسری نظر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی۔۔۔ پاپا کے دوست اور ان کی بیگم کو چھوڑتے ہوئے جب میری نظر وہاں موجود اپنی ہم عمر لڑکی پر پڑی تو اس میں مجھے کوئی ایسی خاص بات نہ نظر آئی۔۔۔ جس کے باعث میں اسے کوئی اہمیت دیتا۔۔۔ ہاں البتہ ایک چیز جو مجھے پہلی ہی نظر میں محسوس ہوئی تھی وہ اس لڑکی کے دیکھنے کا مخصوص انداز تھا۔۔۔ اس کے چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نہ صرف جاذب نظر تھیں۔۔۔ بلکہ وہ اس لڑکی کے ذہین اور خود اعتماد ہونے کی غماز بھی دکھائی دیں۔۔۔

لطیف صاحب۔۔۔ یہ میرا بیٹا رومی ہے۔۔۔ اور پاپا میری طرف مڑ کے کہنے لگے۔۔۔

بیٹے یہ آپ کے انکل اور آنٹی ہیں انہیں سلام کریں۔۔۔ اور ہاں یہ ان کی بیٹی۔۔۔ انیلا ہے۔۔۔ تم۔۔۔ ایسا کرو انیلا کو اپنے ساتھ کمرے میں لے جاؤ یا پھر باہر لان میں جا کر کھیلو کودو۔۔۔

میں نے کمرے میں موجود پاپا کے دوست اور ان کی مسز کو سلام کیا اور ان کی بیٹی انیلا کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے بددلی

سے دعوت دے دی۔۔۔

ہاں ہاں۔۔۔ بیٹی انیلا جاؤ۔۔۔اور رومی کو اپنا دوست بنالو۔۔۔ پاپا کے دوست لطیف صاحب نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

انیلا وہاں سے اٹھ کر میرے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔۔۔ صحن میں برآمدے کے دروں میں لگی بیلوں کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو رکی اور مجھ سے پوچھنے لگی۔۔۔

یہاں۔۔۔پودے۔۔۔میرا مطلب ان بیلوں سے ہے۔۔۔یہ کس نے لگائے ہیں۔۔۔؟

میں نے انیلا کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔۔۔

یہ شوق میری ممی کا ہے۔۔۔ان کا بس چلے تو سارے گھر کو باغ میں بدل ڈالیں۔۔۔

میری بات کو سن کر وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں پودے۔۔۔بیلیں۔۔۔اور پھول اچھے نہیں لگتے۔۔۔؟

پہلی بار اس لڑکی کی بات سن کر جسے اب تک میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔۔۔ میں اپنے خیالات کے گرداب سے باہر آ گیا۔۔۔اور چونک کر اسے حیرت سے دیکھا۔۔۔وہاں میرے سامنے ایک تیرہ چودہ برس کی دبلی پتلی سی لڑکی۔۔۔زرد اور سبز پھولوں کی فراک پہنے سفید ساکس اور سکول شو میں ملبوس اپنے کندھے پر جھولتے ہوئے بالوں میں سرخ ربن لگائے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو کھولے ہوئے۔۔۔میری طرف ایسے دیکھ رہی تھی۔۔۔ جیسے صحرا میں سے گزرتے ہوئے کسی دشت نورد کو اچانک کوئی سراب نظر آ جائے۔۔۔اور میں اس محوِ حیرت لڑکی کو بیچ صحن میں کھڑا یوں دیکھے جا رہا تھا جیسے میری آنکھوں کے سامنے چاروں طرف دیوں کے دل اٹھنے سے چاندنا ہو گیا ہو۔۔۔اتنے میں ممی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔۔۔

رومی۔۔۔انیلا بیٹی کو۔۔۔ یہاں بیچ صحن میں ایسے کیوں لے کر کھڑے ہو گئے ہو۔۔۔اپنے کمرے میں لے جا کر بیٹھو۔۔۔میں تم لوگوں کے لیے وِمٹو کے گلاس وہیں لا کر دیتی ہوں۔۔۔تم انیلا کو اپنی کتابیں وغیرہ دکھاؤ۔۔۔یا پیچھے لان میں جا کر کھیل لو۔۔۔

ممی کی آواز مجھے دشتِ حیرت سے واپس لے آئی اور میں انیلا کو لے کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔۔۔

وہ میرے کمرے میں داخل ہو کر ایک بار پھر کمرے کو ایسے حیرت سے دیکھنے لگی۔۔۔ جیسے کوئی ماہرِ آثارِ قدیمہ کسی نئی دریافت کو بغور دیکھتا ہو۔۔۔جب میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔۔۔تو وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے بولی۔۔۔

تمہارا نام تو بڑا اچھا ہے رومی۔۔۔مگر تم اسے کیسے لکھتے ہو۔۔۔؟

انیلا کی بات سن کر میں نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔

اس میں کیا خاص بات ہے یہ تو بہت آسان سا نام ہے۔۔۔

اور میں نے وہیں اپنے سامنے میز پر پڑے کاغذ پر اپنا نام انگلش میں لکھ کر اسے دکھایا۔۔۔اور کہا۔۔۔

ایسے۔۔۔کیا اس نام میں کوئی خاص بات ہے۔۔۔؟

میرے لکھے ہوئے نام کو دیکھتے ہی وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔۔۔

مجھے معلوم تھا کہ تم یہی لکھو گے۔۔۔روم سے رومی۔۔۔لیکن۔۔۔روم کا مطلب تو کمرہ ہوتا ہے۔۔۔اور تم کمرہ تو نہیں ہو۔۔۔تم تو انسان ہو۔۔۔تمہیں چاہیے کہ اپنے نام کے اسپیلنگ میں۔۔۔او رکی جگہ۔۔۔یو۔۔۔کا استعمال کرو۔۔۔تو لفظ رومی

کا صحیح مطلب نکلے گا۔۔۔اور یہ اچھا بھی لگے گا۔۔۔

میں جواب تک خود کو بے حد عقل مند سمجھا کرتا تھا اپنے سامنے موجود اس چھوٹی سی ایک دبلی پتلی سی لڑکی کے سامنے ہونق بنا۔۔۔اس کی شکل اسے دیکھے جا رہا تھا۔۔۔ جیسے آج سے پہلے کبھی کسی لڑکی کو نہ دیکھا ہو۔۔۔میری محویت کو توڑتے ہوئے آخر کار وہ بولی۔۔۔

رومی۔۔۔اب میری شکل ہی دیکھتے رہو گے۔۔۔یا مجھے کچھ دکھاؤ گے بھی۔۔۔؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انیلا کو کیا دکھاؤں۔۔۔میرے کمرے کو تو اس نے داخل ہوتے ہی آثار قدیمہ سے متعلق کر دیا تھا۔۔۔بالآخر نجانے کیا سوچتے ہوئے میں نے اسے اپنے کامکس نکال کر دکھائے۔۔۔اتنے میں ممی ٹرے میں ہم دونوں کے لیے ومٹو اسکاش کے گلاس اور پھل رکھ کے لے آئیں۔۔۔انیلا نے بجائے اسکاش کے گلاس اٹھانے کے میرے کامکس کو دلچسپی سے دیکھا اور پھر میری طرف ایک حیرت سے دیکھ کر کہنے لگی۔۔۔

رومی تم کس کلاس میں پڑھتے ہو۔۔۔؟

مجھے یوں لگا جیسے میرا سارا اعتماد اور اپنی ذات کے بارے میں سارا زعم۔۔۔ہاتھوں پر لگے صابن کے جھاگ کی مانند بہہ گیا۔ میں نے رندھی ہوئی آواز میں۔۔۔ جیسے میں کسی جاب کے حصول کے لیے انٹرویو بورڈ کے سامنے بیٹھا اپنی قسمت کا فیصلہ سن رہا ہوں۔۔۔ڈرتے ڈرتے آہستہ سے جواب دیا۔۔۔

نویں میں۔۔۔

میرا اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔۔۔اور اسکاش کا گلاس ہاتھ میں تھامے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔۔۔

اور ابھی تک کامکس پڑھتے ہو۔۔۔ یہ تو میں نے چھٹی کلاس میں پڑھنا چھوڑ دیئے تھے۔۔۔اب میں آٹھویں میں ہوں۔۔۔اور آج کل لوزیا اسکاٹ کا ناول۔۔۔لٹل ویمن۔۔۔ جو میرے ماموں نے برتھ ڈے پر دیا تھا، پڑھ رہی ہوں۔۔۔اور تم۔۔۔تمہارا نام تو اتنے بڑے فلسفی شاعر پر ہے اور پڑھتے کامکس ہو۔۔۔

انیلا نے میرے سارے اعتماد کا بھرکس نکال کے رکھ دیا تھا۔۔۔ میں جواب تک خود کو ہر چیز سے لاتعلق سمجھا کرتا تھا۔۔۔اس دبلی پتلی سانولی سی لڑکی کے سامنے خود کو اس قدر بے بس سمجھ رہا تھا۔۔۔اور ابھی میں اسی سوچ میں گم تھا۔۔۔کہ کس طرح اس تیز طرار لڑکی سے اپنی شکست کا بدلہ لوں کہ اس نے کامکس کو وہیں میز پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔۔۔

آؤ باہر لان میں چلتے ہیں۔۔۔یہاں تمہارے کمرے میں تو کامکس کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں۔۔۔

اور میں اس کے کہنے پر فوراً ہی اس کے ساتھ باہر لان میں ایسے چلا گیا۔۔۔ جیسے یا تو خود میں اسی بات کے انتظار میں تھا۔۔۔اور یا پھر اس بظاہر سیدھی سادی لڑکی نے اپنی باتوں سے مجھے مسحور کر دیا تھا۔۔۔ بلکہ اگر یہ کہوں تو کہیں زیادہ مناسب ہوگا۔۔۔کہ انیلا کی ناقابل فہم شخصیت۔۔۔اور پھر اس کی باتوں نے مجھے مکمل طور پر مسمرائز کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔

لان تمام رات ہونے والی بارش کی وجہ سے دھلا دھلا دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ یہ موسم بہار کی شاید پہلی بارش تھی۔۔۔درختوں اور پودوں پر ہر طرف رنگ بکھرے پڑے تھے۔۔۔ ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکوں میں مرطوب موسم کی خنکی کے ساتھ ساتھ لان میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔۔۔

انیلا پلک جھپکتے میں لان کے مرکز میں لگے شہتوت کے درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔۔۔اس نے مڑ کر ایک دفعہ میری طرف دیکھا۔۔۔ جیسے اپنی اس مہم میں مجھے بھی شریک کرنا چاہتی ہو لیکن دوسرے ہی لمحے کچھ کہے بغیر درخت پر چڑھنے

لگی۔۔۔میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔۔۔پھر یہ بھی سن رکھا تھا کہ شہتوت کے درخت کی لکڑی کچی ہوتی ہے اور اچانک ٹوٹ جاتی ہے۔۔۔اسے اس بات سے باز رکھنے کی کوشش کی۔۔۔اور دوڑ کر اسے منع کرنے کے لیے شہتوت کے درخت تک پہنچا لیکن وہ اتنی دیر میں درخت پر چڑھ چکی تھی اور میں نیچے کھڑا اسے ایک شاخ سے لٹکتا ہوا کچے شہتوت توڑنے میں مگن دیکھ رہا تھا۔۔۔اب وہاں میری نگاہوں کے سامنے شاخ سے لٹکتے ہوئے شہتوت کے گچھوں کے بجائے۔۔۔انیلا کی فراک میں سے نظر آتی اس کی گندمی رنگ کی دبلی پتلی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔۔۔میں اسی منظر میں گم تھا کہ وہ وہیں شاخ سے لٹکے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔۔۔

رومی۔۔۔کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔شہتوت۔۔۔یا کچھ اور۔۔۔؟

اور میں جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے کے خوف سے گھبرا کر اپنے دفاع میں کچھ کہنے ہی والا تھا۔۔۔کہ وہ تڑاخ سے بولی۔۔۔

کیوں نہیں کہتے کہ میری ٹانگیں دیکھ رہے ہو۔۔۔مگر کامکس پڑھنے والوں کے ہاں تو ہر چیز کا مک ہوتی ہے۔۔۔شاعری تم کہاں سمجھو گے۔۔۔؟

یہ کہتے ہوئے انیلا نے وہیں سے اک دم نیچے چھلانگ لگائی اور مجھ پر آگری۔۔۔اور ہم دونوں بھیگے ہوئے لان کی گھاس میں ایک دوسرے پر ڈھے گئے۔۔۔انیلا کا چہرہ میرے چہرے کے اتنا قریب تھا۔۔۔کہ اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کو مس کر رہے تھے۔۔۔اس کے ایک ہاتھ میں کچے شہتوتوں کا گچھا تھا۔۔۔جو میرے گالوں کو چھو رہا تھا۔۔۔میری سانسوں میں شہتوت کی مانوس خوشبو کے ساتھ۔۔۔اس کے گرم جسم کی ایک غیر مانوس مہک بس گئی تھی۔۔۔جس کی وجہ سے مجھے اپنا سانس بوجھل ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔۔۔اور لگتا تھا جیسے اگر یہی کیفیت کچھ دیر اور رہی۔۔۔تو شاید میرا سانس رک جائے گا۔۔۔ہانپتی ہوئی وہ مجھ پر سے اٹھی اور اپنی فراک کو درست کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔۔۔اور میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔۔۔

آؤ رومی۔۔۔اب اندر چلتے ہیں۔۔۔آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔۔۔اگلی بار آؤں گی تو تمہارے لیے کچھ کتابیں لاؤں گی۔۔۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ چلی گئی۔۔۔

انیلا کے چلے جانے کے بعد آج پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میرا کمرہ واقعی ایک آثار قدیمہ سے کم نہیں تھا۔۔۔لیکن انیلا کی کچھ دیر کی موجودگی نے اس کمرے میں۔۔۔ایک نیا رنگ بھر دیا تھا۔۔۔دیکھنے میں اک چھوٹی سی دبلی پتلی لڑکی۔۔۔جسے میں نے پہلی نظر میں درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔۔۔میری ذات میں اس قدر قلیل سی مدت میں ایک انقلاب برپا کر گئی تھی۔۔۔میرے بیڈ اور پڑھنے کی میز پر بکھرے کامکس میرا ہی مذاق اڑاتے ہوئے نظر آنے لگے۔۔۔ٹیبل کے اوپر لگے آئینے میں خود پر نظر ڈالی تو ایسا لگا۔۔۔نجانے کتنا وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔۔۔یوں لگتا تھا جیسے اس مختصر سے وقت میں۔۔۔میں ایک نوعمر لڑکے سے ایک نوجوان میں تبدیل ہو گیا تھا۔۔۔میں نے وہیں ٹیبل کے اوپر لگے آئینے میں کریم سے اپنا نام RUMI لکھ ڈالا۔۔۔لیکن ایک تبدیلی کے ساتھ۔۔۔او کے بجائے یو سے۔۔۔

☆☆☆

گائے

انور سجاد

ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔
اب اس کا دھیلا نہیں ملنا۔
ان میں سے ایک نے کہا تھا۔
ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔
لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔
چپ رہو جی۔ بڑے آئے عقل والے۔
نکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔
میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں۔ جس روز سے میں نے انہی کو پہچانا ہے، اسی روز سے چتکبری کو بھی جانا ہے اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے میں ہر لحہ یتیم ہوتا ہوں۔ میں، کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں، کیوں کرتا ہوں۔
''آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے''۔ نکے سے رہا نہیں جاتا۔
''تم نہیں سمجھتے، یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد کیا جائے''۔
میں ناسمجھ ہوں۔ ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔
آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔
بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔
میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں گا۔
پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا، وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ نکا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
شاباش چتکبری، میری گائے میری گئو ماتا، ہلنا نہیں، تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ، ورنہ نہیں تو۔
گائے اپنی جگہ پر اڑی، مڑ مڑ کے اسکی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا۔ ہڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ نکے کے کان بھی بند ہو رہے تھے رفتہ رفتہ۔
سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھمبا ہو جائے۔
اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے۔
اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا۔

ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کے دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور کھولی میں منہ ڈال دیا تھا، جہاں ان کا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔

آپ لوگ اسے واقعی۔

اسے یقین نہیں آتا تھا۔

نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟

ایک نے کہا تھا۔

بابا، یہ گائے مجھے دے دو، میں اسے۔

حکیم کی اولاد۔

دوسرے نے کہا تھا۔

بابا اس کے بغیر میں۔

مجنوں کا بچہ۔

تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا، پانچواں سارے بزرگ، سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے، جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔

بیٹے ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے۔

او کمبخت سوداگر مجھ سے لو روپے، مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے جب، جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔

ہاہاہاہا۔

جب، میں کمانے لگوں گا۔

ہاہاہاہا۔

تب، تب تک چتکبری کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہوگا۔ میں، میں کیا کروں۔

ان میں سے ایک، گائے کو لانے کے لیے کھرلی کی طرف گیا تھا۔ نکا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ یونہی دیکھنے کے لیے۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھرلی میں منہ مار کے دانتوں میں پٹھے دبائے تھے۔ مڑ کے نکے کو دیکھا تھا اور جانے کے لیے کھر اٹھایا تھا۔

نہ، نہ، نہ۔

نکا چیخا تھا۔

بھکو مت۔

گائے کھڑی ہو گئی تھی۔

ہے۔ ہے۔ ہے۔

بڑے نے زور لگایا تھا۔

نہ چتکبریے۔ نہ، نہ۔

چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان۔
نکے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔
چلو میم صاحب! ٹرک والا تمہارے باپ کا نوکر تو نہیں جو سارا دن کھڑا رہے۔
گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان، قید میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی۔
نکا مسکرایا، پھر فوراً اداس ہو گیا تھا۔
یہ تو بک بھی چکی ہے، اسے جانا ہی ہوگا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں کاش میں حکیم ہی ہوتا۔ اس بچھڑے کو شرم نہیں آتی ماں کے جسم پر نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا الو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔
زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔
پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گائے کی دم پکڑ کر اسے تین چار بل دیئے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی۔ اس نے نکے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ نکے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔
در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔
ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لیے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھر رکھا۔
نہ چڑھنا۔
اس کی زبان کاٹ لو یہ گائے کو ورغلاتا ہے۔
ڈراتا ہے۔
نکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے تختے کو دیکھا، پھر نکے کی طرف۔
در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔
نکے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔
اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں، کیا کر سکتا ہوں۔
وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔
میری چتکبری جانتی ہے، جانتی ہے کہ وہ تختے پہ قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں، کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔
ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں، گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جما کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر تختے کی طرف منہ کر کے سیدھے ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔
آؤ، پیٹو۔
اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسا دیا تھا۔
نکا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق، بے حس۔

یوں بات نہیں بنے گی۔
ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔
تو پھر؟
وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی، پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی نکے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔
نکا، جسم کا مفلوج حصہ۔
دیکھو، دیکھو، وہ تو بائیں طرف۔
ایک چونکا تھا۔
قدرتی بات ہے۔
بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔
گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکاری مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔
اس بچھڑے کو یہاں لے آؤ۔۔۔۔ یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہیے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔
نکا۔۔۔ مفلوج وجود۔
ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی تھی۔ نکے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی، قدم اٹھاتی، رکتی چلتی، بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ آہستہ سے نکے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا تختے پر چڑھ کے پٹوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جا کے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے نکے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹھوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لیے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا، پھر دوسرا کھر۔
خدا معلوم نکے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دونالی بندوق اتار کر اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اسی جنون میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔
اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے، باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لیے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔
پھر مجھے نہیں پتہ کیا ہوا۔ نکے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو بچھڑے کو، ڈرائیور کو، بابا کو، اپنے آپ کو، وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔
کوئی وہاں جا کر دیکھے اور آ کے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔۔۔

☆☆☆

ایک محبت کے بارے میں

انورسن رائے

ایک قدیم کہانی کو دہرانے کے درمیان مفروض حریف سے لڑتے ہوئے اداکاراس تلوار سے اچانک شدید زخمی ہوگیا جو صرف اداکار، حریف اور تماشائیوں کے تصور میں تھی۔ اس پر حریف ہی نہیں تماشائی بھی حیران تھے۔ پسلیوں کے درمیان راستہ بناتی ہوئی تلوار سیدھی اداکار کے سینے میں ایسے اتری تھی جیسے ایک زمانے سے اس پر واجب الادا ہو۔

اسٹیج کے داہنی جانب بیٹھے تماشائیوں کو تلوار انتہائی واضح طور پر اداکار کی پشت سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے حریف کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے ابھرنے والی وہی بے یقینی دیکھی جوان تماشائیوں میں سے صرف چند ایک ہی کو دکھائی دی جو بائیں جانب بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے حصے میں وہ لمحہ بھی آیا تھا جب تلوار نے سینے تک پہنچ کر اندر جانے کا راستہ بنایا تھا۔

اس سے پہلے کہ ان کی حیرت اور بے یقینی ختم ہوتی، خون کی کچھ بوندیں ان کے چہروں اور ان صاف ستھرے کپڑوں تک بھی پہنچ گئیں جو وہ بطور خاص تماشا دیکھنے کے لیے پہن کر آئے تھے۔

خون کی ان بوندوں کی زد میں آنے والوں میں علاقے کی حسین ترین نادیہ بھی شامل تھی۔

وہ اسٹیج قرار دی گئی مخصوص جگہ سے قریب ترین پہلی قطار کے وسط میں بیٹھے خصوصی مہمان کے ساتھ آنے والے دو تماشائیوں کے بعد بیٹھی تھی اور کھیل میں ایک ایسی محبوبہ کا کردار ادا کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی جس کے عاشقوں میں ہر عمر اور طبقے کے لوگ شامل ہوں۔

خون کی صرف پانچ بوندیں اس تک پہنچی تھیں۔

تین نے اس کے نمایاں اور پر کشش سینے کے ابھاروں پر، ایک نے اس کی حیران کن گردن اور سینے کے اتصال پر بننے والے گڑھے کے عین درمیان اور ایک نے اس کے بالائی ہونٹ پر ستواں ناک کے ٹھیک نیچے اس درمیانی ابھار پر جگہ بنائی تھی جسے کسی کوشش کے بغیر بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

یوں تو اس تک پہنچنے والی ہر نظر اس کے سراپا طواف کو ایک ایسا فریضہ تصور کرتی تھی جسے قضا نہ کیا جا سکتا ہو لیکن اس کا نچلا ہونٹ ان مقامات میں شامل تھا جہاں توقف خود اپنی طاقت سے مقام بناتا تھا۔ ہمیشہ کچھ اس طرح سوجا ہوا سا کہ جیسے وہ دیر تک ہم بوسہ ہو کر آ رہی ہو۔

اداکار کے سینے میں تلوار داخل ہونے سے لمحہ بھر پہلے اگر اس نے انہماک اور بے خیالی میں نچلے ہونٹ کے درمیانی حصے کو اپنے دانتوں کے درمیان دبا نہ لیا ہوتا تو بالائی ہونٹ پر رکنے والی بوند یقیناً نچلے ہونٹ پر ہی جگہ بناتی۔

نادیہ تک پہنچنے والی ان بوندوں کو سب سے پہلے صرف خصوصی مہمان نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں مسلسل اسٹیج اور نادیہ کے درمیان گردش کر رہی تھیں۔ شاید تماشے میں اس کی دلچسپی کم و بیش نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس پر نظر رکھنے والا کوئی بھی آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ وہ یقیناً تماشے کے لیے نہیں آیا۔ ایسے تماشوں میں خصوصی مہمان بننے والوں کے سارے میں کوئی بات بھی پورے یقین سے نہیں کہی جا سکتی لیکن زیادہ مشکل اس کے مصاحبوں کو درپیش تھی۔ انکی دلچسپی بٹی ہوئی تھی۔ وہ پوری کوشش کر رہے تھے کہ خصوصی مہمان کے چہرے اور اسٹیج پر یکساں توجہ دے سکیں تاکہ اپنے چہروں پر وہاں

وہاں خوشی اور پسندیدگی کے آثار پیدا کریں جہاں جہاں خصوصی مہمان کے چہرے پر پسندیدگی کو دیکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے چہرے ایک بار بھی نادیہ کی سمت نہیں گھومے تھے۔

تماشے نے اچانک جو موڑ لیا تھا اس کی کسی کو تو کیا خود نادیہ کو بھی توقع نہ تھی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اسٹیج پر موجود مرکزی کردار ادا کرنے والا اپنی تلوار سے مفروض حریف کو زخمی کرے گا اور جب تک حریف زخمی ہو کر اسٹیج سے نہیں اترتا، تب تک اسے اسٹیج پر نہیں جانا۔ اس کی غیر معمولی حیرت کی وجہ یہ بھی تھی کہ تماشے میں یہ منظر کہاں سے آگیا کہ حریف کی تلوار مرکزی کردار ادا کرنے والے کے سینے میں آرپار ہو جائے۔

سب کو پتا تھا کہ کھیل صرف ایک ایسی محبت کے بارے میں ہے جو کبھی کی ہی نہیں گئی۔ اسی لیے مصنف نے کہانی میں ایسے ممکنہ حالات اور واقعات کو جوڑا تھا جو حقیقی انسانی زندگیوں میں کی جانے والی محبتوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں پیش آتے ہیں یا فرض کیے جاسکتے ہیں۔

شاید مصنف نے کوشش کی تھی کہ وہ کھیل کے ذریعے محبت کا ایک ایسا احساس پیدا کرے جس کے ذریعے تماشائیوں کے دلوں میں محبت اور محبت سے محبت کا احترام پیدا کیا جاسکے تاکہ محبت کے بارے میں لوگوں کا وہ رویہ کچھ تبدیل ہو جائے جو عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔

فی الوقت مصنف کی کم از کم بیس سے زائد ان محبتوں کے بارے میں سینہ بہ سینہ گردش کرنے والی کہانیوں کا ذکر نہیں کیا جائے گا جو وہ لڑکپن سے ہی کرتا آرہا ہے۔ ناپسندیدگی اور شاید حسد کے باوجود مرد اور عورتیں ان کہانیوں کو بے تکلف محفلوں میں نہ صرف دہراتے بلکہ ان میں کمی بیشی بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کہانیوں میں ہر عمر اور ہر رشتے کی ان عورتوں کا ذکر ہوتا جنھوں نے مصنف سے تعلق رکھا یا جن سے خود مصنف نے تعلق بنایا۔

لیکن اس کھیل میں مصنف نے ایسی کسی محبت یا تعلق کو استعمال نہیں کیا جسے لوگ لذت کوشی یا جنسی بے راہ روی قرار دے سکتے ہوں۔ مصنف تو وہ تشدد بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا جو ایسے تماشوں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لیے لازمی خیال کیا جاتا ہے۔

مرکزی کرداروں کو لکڑی کی وہ تلواریں بھی نہیں دی گئی تھیں جو ایسے تماشوں میں بالعموم استعمال کی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود تماشے میں ہیرو بننے والا اداکار تلوار سے یوں زخمی ہو چکا تھا کہ تماشائیوں میں سے کوئی بھی اپنے سامنے ہونے والے کھیل کو فرضی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

فرضی حریف کے کردار میں چھپا ہوا اداکار اپنے کردار کو یکسر بھول کر سکتے کے عالم میں ساتھی اداکار کو دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ سب جو اسٹیج پر ہوا تھا نہ ہوا ہوتا تو اس حالت میں دیکھنے والے ضرور اسے ایک جیتے جاگتے انسان کی جگہ ایک ایسا مجسمہ ہی سمجھتے جسے ساحل پر ریت سے بنایا گیا ہو اور بے خیالی میں لگنے والا معمولی سا دھکا بھی اسے ایک ڈھیر میں تبدیل کر سکتا ہو۔

یہ تو آپ جان ہی چکے ہوں گے کہ یہ خیالی تماشا نہ تو کسی بڑے اور روائتی ہال میں ہو رہا ہے اور نہ ہی اسے دیکھنے والے زیادہ ہیں۔ اصل میں تماشا دیکھنے والے تمام لوگ خود بھی تماشے کا حصہ تھے اور اپنے اپنے کردار ادا کر رہے تھے۔ جیسے خصوصی مہمان اور اس کے ساتھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نادیہ بھی تماشائیوں ہی میں بیٹھی تھی۔ جیسے ہی جاری منظر فرضی حریف کا کردار ختم ہوتا وہ اپنی نشست سے اٹھ کر اسٹیج پر چلی جاتی اور فرضی حریف اس کی چھوڑی ہوئی نشست پر آبیٹھتا۔

مرکزی کردار کے زخمی ہونے کے باعث، فی الوقت مرکزی کردار کے بارے میں یقین سے یہی کہا جاسکتا ہے، تماشے میں اور بھی کئی کردار ہیں لیکن ان کا ذکر اتنا اضافی ہو چکا ہے اور ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ یہ بتانا ضروری

ہے کہ تماشا اسی منظر پر ختم ہو گیا۔

بعد کے بیانات میں تماشائیوں کا کردار ادا کرنے والوں میں سے کچھ کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ مرکزی کردار ادا کرنے والا تو تماشے سے ایک رات پہلے ہی خودکشی کر چکا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے شہر کے جنوبی سرے پر واقع واحد سرائے میں رہتا تھا۔ یہ سرائے بھی عجیب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی نے کبھی اس سرائے کے مالک اور چلانے والوں کو نہیں دیکھا تھا لیکن لوگ آتے تھے، رہتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ کسی تعریف اور شکایت کے بغیر۔ کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تماشے میں مرکزی کردار ادا کرنے والا کون تھا لیکن کسی نے بھی یہ سوال نہیں اٹھایا۔

شاید بات کرنے والوں کی توجہ خودکشی پر زیادہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خودکشی کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا جو سمورائی یا جاپانی سورماؤں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ زمین میں نصف گڑی ہوئی تلوار اس کے سینے میں دل کے نیچے پسلیوں کے عین درمیان جگہ بناتی ہوئی داخل ہوئی اور پار نکل گئی۔ اس کے جسم کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے خود کو تلوار پر سے ہٹانے کی کوشش کی ہوگی۔

تمام تر تحقیق کے باوجود یہ علم نہیں ہو سکا کہ اس نے خودکشی کیوں کی، خودکشی کا یہ انداز کہاں سے سیکھا، مہارت کیسے حاصل کی اور وہ تلوار کہاں سے حاصل کی جو کئی سو سال پہلے علاقے پر حکومت کرنے والے بادشاہ کے اس بیٹے کی تھی جس نے اس لیے خودکشی کر لی تھی کہ اس کے اپنے محل کی ایک کنیز نے اس کی محبت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کہانی کو سنانے والے نے آخر میں کہا کہ شہزادے کی محبت کو ٹھکرانے والی کنیز کا نام بھی نادیہ تھا اور وہ تماشے میں مذکور نادیہ کی ہم جسم اور ہم شکل تھی۔ جب کہ حریف بڑی حد تک خودکشی کرنے والے شہزادے جیسا لگتا تھا۔

اس نے کہانی ختم کر کے ایک لمبا سانس لیا اور کہا کہ اگر ایک اور موقع ملا تو نادیہ کی محبت اس طرح بھی حاصل نہیں کروں گا، لیکن اس کے یہ الفاظ کہانی ختم ہونے پر اٹھ کر جانے والوں میں سے کسی نے بھی نہیں سنے۔

☆☆☆

بار دگر

اے خیام

اس ہوٹل کی بیٹھک بازی پر ہم میں سے ہر ایک کی اپنے والدین کے ہاتھوں گوشمالی ہو چکی تھی۔ میری باری سب سے آخر میں آئی۔ پاپا نے گزرتے ہوئے اس ہوٹل کے سامنے میری گاڑی دیکھ لی تھی۔

''تمہیں شرم نہیں آتی۔ وہ کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ تم کسی اچھے ریسٹوران میں، اچھے ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ جا سکتے ہو۔ بھلا یہ کوئی ہوٹل ہے کوئٹہ جدہ ہوٹل!''

''پاپا۔۔۔ وہ کچھ دوست۔۔۔۔'' میں نے کہنے کی کوشش کی تھی۔

''کہیں اور بھی جمع ہو سکتے ہو، پی سی چلے جاؤ، شیرٹن ہے، میریٹ ہے، یا اتنے اچھے اچھے ریسٹوران ہیں آس پاس۔ کہیں بھی بیٹھک بازی کر سکتے ہو۔ تمہیں وہاں دیکھ کر میں شرمندہ ہو رہا ہوں''۔

میں نے دوستوں کو پاپا کی روداد سنائی تو صابر بھائی کہنے لگے، ''تو آج سے 'کوئٹہ جدہ ہوٹل' نہیں، 'پی سی' ہے''۔

سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ہاں بھی۔ آج سے یہ پی سی ہے''۔

صابر بھائی ہم لوگوں میں سب سے سنیئر تھے، تقریباً پینتیس چالیس سال عمر رہی ہوگی لیکن چھڑے چھانٹ تھے۔ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرتے تھے اور شام کے بعد دیر تک ہمارے ساتھ ہی وقت گزارتے تھے، ہمارے 'فلاحی کاموں' میں ہاتھ بٹاتے تھے اور بہت صائب مشورے بھی دیتے تھے جنہیں ہم اکثر رد کر دیا کرتے تھے۔

گل خان نے اسٹیل کے گلاس اور دھلے ہوئے پلاسٹک کے جگ میں پانی لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ پھر ایک اخبار لا کر چارپائی پر بچھا دیا۔ ہم حسب معمول چائے پراٹھے کا انتظار کرنے لگے۔

صابر بھائی اس روز دیر سے آئے۔

''یار میں کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔۔۔۔ لیکن خیر، چائے پراٹھا تو چل ہی جائے گا''۔

چائے پراٹھے کے تئیں ہمارا ابھی یہی رویہ تھا، چاہے کسی دعوت سے ہی کیوں نہ آ رہے ہوں، چائے پراٹھا تو چل ہی جاتا تھا۔

''یار صابر بھائی، لالہ کو پٹاؤ نا، گل خان کو پڑھنے لکھنے پر لگا دے۔ ہم میں سے ہر ایک اسے وقت دینے کے لیے تیار ہے، چاہے تو ہم اسے سکول میں بھی داخل کرا سکتے ہیں''۔

''ہر دو چار دن کے بعد تمہاری فلاحی رگ پھڑک اٹھتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے لالہ راضی نہیں ہوگا۔ وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کی جگہ کسی اور لڑکے کو رکھے گا تو اسے تنخواہ دینی پڑے گی، کھانا پینا دینا پڑے گا۔ یہ تو اس کا بیٹا ہے، خود کام کرنے کے لائق نہیں رہے گا تو یہ گل خان اس کی جگہ لے لے گا اور اس کی جگہ گل خان کا چھوٹا گل خان کام کے قابل ہو چکا ہوگا۔ یہ سائیکل اسی طرح چلتا رہے گا بھائی، تم اپنی فلاحی رگ کو قابو میں رکھو''۔

''کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے صابر بھائی۔ لالہ سے بات تو کرو''۔

''تم سب کوشش کر چکے ہو نا۔۔۔۔ لالہ نے ہنسنے کے علاوہ کبھی کوئی جواب دیا؟''

''یار آپ بات کرو صابر بھائی، آپ بڑے ڈھنگ سے بات کرتے ہو''۔
صابر بھائی کوئی جواب دینے ہی والے تھے کہ ایک شخص آ کر کھڑا ہو گیا۔
''لو بھئی تمہاری فلاحی رگ کو تسکین دینے والا آ گیا''۔
وہ شخص اچھا خاصا صحت مند تھا، کپڑے بھی صاف ستھرے تھے لیکن چہرے سے نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔
''صاحب، دو دن سے کچھ نہیں کھایا، بیوی بچے بھی بھوکے ہیں، کچھ مدد کر دیجئے''۔
میں نے صابر بھائی کی طرف دیکھا۔۔۔وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیئے۔
''کوئی بات نہیں۔آپ سامنے والی کرسی پر بیٹھ جایئے، چائے پراٹھا کھایئے اور گھر والوں کے لیے بھی لے جایئے، ٹھیک ہے؟''
صابر بھائی انگریزی میں بولے، ''اسے تمہارا آفر قبول نہیں ہوگی''۔
''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''دیکھ لینا''۔
وہ شخص وہیں کھڑا رہا۔
''صاحب، آپ کی مہربانی۔مگر پیسے ہی دے دو صاحب''۔
''یار تم دو دن سے بھوکے ہو نا؟ پہلے کھانا کھاؤ، پھر آگے کی بات کریں گے''۔
''نہیں صاحب، آپ پیسے ہی دے دو، کچھ راشن گھر لے جاؤں گا۔اللہ آپ کو بہت دے گا''۔
صابر بھائی مسکراتے رہے۔
صابر بھائی ہماری طلبا برادری کے نہیں تھے۔یونیورسٹی سے واپسی پر میں نے انہیں لفٹ دی تھی اور راستے بھر بڑی پر لطف باتیں ہوئی تھیں۔وہ اسی کوئٹہ جدہ ہوٹل کے پاس اتر گئے تھے اور بڑے اصرار کے ساتھ مجھے بھی ہوٹل میں لے گئے تھے۔
انہوں نے چائے پراٹھے کا آرڈر دیا تھا اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائے تھے۔
''ایک بار یہاں کا چائے پراٹھا کھا لو تو یہیں کے ہو کے رہ جاؤ گے''۔
میں گاڑی سے ٹشو پیپر کا ڈبہ لے آیا تھا اور تیل یا گھی سے چپڑے ہوئے پراٹھے کو کئی ٹشو پیپر سے خشک کیا تھا۔چائے پراٹھا واقعی مزا دے گیا تھا۔
صابر بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہیں ملا کریں گے۔میں نے راشد اور عرفان کو بھی یہاں کا راستہ دکھا دیا اور اب ہم چار افراد کی بیٹھک ہمارا معمول بن گیا تھا۔
ایک دن صابر نے کہا، ''یار اس لالہ کو ہمارا۔۔۔بلکہ تم لوگوں کا احسان مند ہونا چاہیے اور ہمارا چائے پراٹھا فری ہونا چاہیے''۔
''کیوں صابر بھائی۔۔۔۔فری کیوں؟'' راشد نے پوچھا۔
''تم نے غور نہیں کیا، جب سے تم لوگوں کی چمکتی ہوئی کاریں اس ہوٹل کے سامنے کھڑی ہونے لگی ہیں، اس کے کسٹمرز کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے''۔
''یہ کیا وجہ ہوئی، کسٹمرز کی تعداد بڑھنے کی''۔عرفان نے کہا۔
''اتنی سی بات نہیں سمجھتے تم لوگ۔لوگ اتنی چمکتی کاریں یہاں کھڑی دیکھتے ہیں، پھر اس کوئٹہ جدہ ہوٹل کو دیکھتے ہیں، سوچتے ہوں گے ضرور کوئی خاص بات ہوگی اس ہوٹل میں۔تجربے کی خاطر ہی سہی وہ ایک بار ضرور یہاں کا چائے پراٹھا کھاتے ہوں

گے۔اب تو کچھ اور کاریں بھی یہاں کھڑی ہونے لگی ہیں، خواتین بھی کار میں بیٹھ کر چائے پراٹھے کے آرڈر دینے لگی ہیں۔ میں یہاں کا بہت پرانا گاہک ہوں، آٹھ دس افراد سے زیادہ کبھی ایک وقت میں یہاں نہیں ہوتے تھے، اب کرسیاں اور چارپائیاں کم پڑ جاتی ہیں"۔

"خیر، لیکن ہمیں فری چائے پراٹھا نہیں کھانا"۔

"یار ایک بات بتاؤ۔ تم لوگ بڑے گھرانے کے افراد ہو، یونیورسٹی میں پڑھتے ہو، یہاں اتنا وقت ضائع کرتے ہو تو تمہارے والدین تمہیں کچھ نہیں کہتے؟"

"ہمارے والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ ہم اپنا وقت یوں برباد کرتے ہیں کیونکہ ہمارے رزلٹ بہت اچھے آتے ہیں۔ ہم نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ ہم بری عادتوں میں نہیں ہیں۔ بس انہیں اعتراض ہے تو اس بات پر کہ ہم اس کو مٹہ جدرہ ہوٹل میں کیوں بیٹھتے ہیں؟" عرفان نے کہا

"ایک بار انہیں بھی اس کو مٹہ جدرہ ہوٹل کا چائے پراٹھا کھلا دو"۔ صابر بھائی نے کہا تو سب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ لیکن اچانک ہمارے قہقہے میں بریک لگ گیا۔

ایک مجہول سا شخص، شیو بڑھی ہوئی، سر کے بال میل سے اٹے ہوئے، کپڑے کچھ پھٹے ہوئے اور میلے چکٹ۔۔۔۔ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

"صاحب فقیر نہیں ہوں۔۔۔۔ میں بھیک نہیں مانگتا۔۔۔ آج کل کوئی کام نہیں ہے میرے پاس، میں ہر طرح کا کام کرنے کے لیے تیار ہوں، کوئی کام کرا لیجئے، پھر جو مرضی ہو دے دیجئے گا"۔

"کیا کام کر سکتے ہو تم۔ ہم تمہیں کام دلوا دیں گے"۔ راشد نے کہا۔

"سیدھے سیدھے بتاؤ میاں تمہیں کیا چاہیے"۔ صابر بھائی بول پڑے۔

"ارے صابر بھائی غریب۔۔۔" میں نے کہنا چاہا تو انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔

"بولو کیا چاہیے۔ کسی تقریر کی ضرورت نہیں"۔ صابر بھائی نے اس سے کہا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا، ایک نظر ہم سبھوں پر ڈالی، پھر صابر بھائی سے مخاطب ہوا۔

"صاحب، میں گھربار والا آدمی ہوں، میرے بیوی بچے ہیں۔ آپ راشن دلا دیجئے"۔

عرفان کھڑا ہو گیا۔

"آؤ میرے ساتھ"۔

قبل اس کے ہم کچھ کہتے عرفان اس کا بازو پکڑ کر قریب کے ایک راشن شاپ میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نکلا تو اس شخص کے سر پر ایک کارٹن تھا جو خاصا بھاری لگ رہا تھا۔ اسے رخصت کر کے وہ ہماری طرف آ گیا۔

"اسے مہینے بھر کا راشن دلا دیا ہے"۔ عرفان نے کہا۔

"اس نیکی میں ہمارا کتنا حصہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے کچھ نہیں یار۔۔۔ بس ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے"۔

"کون سی بات عرفان؟" راشد نے پوچھا۔

"میں نے اسے دکاندار کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ یہ شخص جو بھی مانگے اسے دے دیں۔ دکاندار نے مسکرا

کراس کی طرف دیکھا اور ایک کارٹن اس کی طرف بڑھادیا۔ مجھ سے کہا کہ چار پانچ افراد کے خاندان کے لیے یہ ایک مہینے کا راشن ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو مجھے زیادہ دیر وہاں نہیں کھڑے رہنا پڑا۔ لیکن یار دکاندار کی معنی خیز مسکراہٹ اور بنے بنائے کارٹن کی بات مجھے الجھا رہی ہے"۔

صابر بھائی مسکرائے۔۔۔وہی معنی خیز مسکراہٹ۔

"کیا ہوا صابر بھائی۔۔۔۔ہم سے پھر کوئی غلطی ہوگئی؟"

"اگر فلاحی کام کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو کوئی ڈھنگ کا کام کرو، سلیقے سے کرو"۔

"صابر بھائی۔ ہمارے والدین ضرور دولت مند ہیں، لیکن یہ چھوٹا موٹا کام تو ہم لوگ اپنے جیب خرچ سے کرتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی بڑا فنڈ نہیں ہے"۔ میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ لیکن جن لوگوں پر تم اپنی مہربانیاں نچھاور کر رہے ہو یہ اس کے حقدار نہیں ہیں۔ تمہاری ان کمزوریوں سے یہ حوصلہ پاتے ہیں اور تم لوگ ہی سبب ہو ان کی تعداد میں اضافے کے"۔ صابر بھائی بولے۔

"صابر بھائی آپ تو ہم پر فرد جرم عائد کر رہے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"بالکل فرد جرم عائد کر رہا ہوں۔ دراصل تم لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہو وہاں اس طرح کے مناظر سامنے نہیں آتے ہوں گے۔ یہ جو مڈل کلاس یا متوسط طبقہ ہے نا، اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ کوئی فلاحی کام کر سکے۔ اس طبقے کے فرد کسی کو ایک وقت کھانا کھلا کر یا دس بیس روپے دے کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی فلاحی کام کر دکھایا، کسی نیکی کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ اور اس طرح یہ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو کچھ نہیں کرنا چاہتے، رونی صورت بنا کر کے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرتے ہیں اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں"۔

"یار صابر بھائی۔ اتنے سخت دل تو نہ بنو"۔ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم لوگ ایسی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے لوگوں کی پہنچ تم لوگوں تک نہیں ہے۔ تم نے زیادہ سے زیادہ ٹریفک سگنل پر بھیک مانگنے والوں کو دیکھا ہوگا، دس بیس روپے بھی انہیں دے دیئے ہوں گے، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی ہے اور اس کے ذمہ دار یہ متوسط طبقے والے لوگ ہیں"۔

"لیکن ہم لوگوں کا شمار تو ان میں نہیں ہوتا"۔ راشد نے کہا۔

"اس پی سی میں بیٹھنے سے پہلے تم لوگوں کا سابقہ اس طرح کے لوگوں سے پڑا تھا؟"

صابر بھائی نے ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ پھر ہم نے بھی ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یار صابر بھائی، آپ کی یہ بات تو ٹھیک ہے۔ یہی اس طرح کے تجربے ہوئے ہیں"۔ عرفان نے کہا۔

"چلو تم بتاؤ، تم دکاندار کے رویئے کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے"۔

"میں تو پہلی بار اس دکان میں گیا تھا صابر بھائی۔ اس شخص کے ساتھ دیکھ کر وہ بڑے عجیب انداز سے مسکرایا تھا"۔

"اور اس نے ایک کارٹن میں ایک مہینے کا راشن رکھ کر تمہارے حوالے کر دیا"۔ صابر بھائی نے پوچھا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہوا۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ اپنی ضرورت کے مطابق دکاندار کو سامان لکھوا دے۔ اس نے دکاندار سے کہا کہ مہینے بھر کا راشن دے دو اور دکاندار نے ایک بنا بنایا کارٹن اسے کے حوالے کر دیا"۔

"تم نے یا اس شخص نے کارٹن کھول کر دیکھا کہ اس میں کیا ہے؟"

''نہیں، میں نے تو نہیں دیکھا۔۔۔بلکہ اس نے بھی نہیں دیکھا''۔

ہم سب تجسس بھری نظروں سے صابر بھائی کو دیکھ رہے تھے۔صابر بھائی نے کچھ دیر سوچا، پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آؤ۔۔۔اس دکاندار سے ملتے ہیں''۔

''اب چھوڑو نا صابر بھائی۔۔۔اس سے مل کر کیا کریں گے''۔

''تم آؤ تو سہی''۔وہ پی سی سے باہر نکل چکے تھے۔

مجبوراً ہم ان کے ساتھ ہو لیے۔

دکاندار نے ہم سب کی طرف دیکھا، پھر مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''کیا ہوا صاحب۔۔۔خیر تو ہے؟ ابھی تو آپ گئے تھے اس بندے کو سامان دلا کر''۔

صابر بھائی نے ہم تینوں کو ایک طرف کر دیا اور دکاندار کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔

''سچ بتاؤ سیٹھ معاملہ کیا ہے۔کون تھا وہ شخص اور تم کیوں اس کے لیے کارٹن تیار رکھتے ہو؟''

اس وقت دکان میں کوئی گاہک نہیں تھا۔اس کا ایک کارندہ وزن کر کے سامان کے پیکٹ تیار کرتا جا رہا تھا۔وہ بھی دکاندار کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

دکاندار نے عرفان کی طرف دیکھ کر کہا،''میں تو ان صاحب کے ساتھ اسے دیکھ کر پہلے ہی کھٹک گیا تھا۔اس طرح کے نوجوان لوگ تو اس جیسوں کے جھانسے میں کبھی نہیں آتے۔یہ پتہ نہیں کس طرح پھنس گئے''۔

''تو وہ کوئی ضرورت مند نہیں تھا؟''عرفان نے پوچھا۔

''ارے صاحب، اس کا پیشہ ہی یہی ہے۔ہر دو چار دن کے بعد وہ کسی کو پھانس لیتا ہے اور میں یہ کارٹن اس کے حوالے کر دیتا ہوں''۔

''دوسرے دن وہ یہ کارٹن واپس لے آتا ہو گا؟''صابر بھائی نے پوچھا۔

''جی ہاں''۔

''اور وہ تم سے اس کے نقد پیسے لے جاتا ہو گا؟''

''ہاں جی۔ایسا ہی ہوتا ہے''۔

''عرفان تم نے کتنے پیسے دیئے تھے سامان کے؟''صابر بھائی نے عرفان سے پوچھا۔

''چار ہزار روپے دیئے تھے''۔عرفان بولا۔

''تو سیٹھ صاحب جب وہ سامان واپس کرتا ہے تو آپ اسے کتنے پیسے نقد دیتے ہیں؟''

ارے چھوڑیئے نا جناب، میری تو دکانداری ہے، اسے رہنے دیجئے''۔

اب ہم تینوں آگے بڑھے اور سیٹھ کی طرف جھک گئے۔وہ کچھ گھبرا گیا۔

''بتا دو سیٹھ، کتنے پیسے تم اسے دیتے ہو؟''صابر بھائی نے پوچھا۔

''جی۔۔۔تین ہزار''۔وہ سر جھکا کر بولا۔

''بات سمجھ میں آ گئی تم لوگوں کے یا ابھی کچھ اور پوچھنا ہے؟''صابر بھائی نے ہم سبھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یار اس نے چیٹنگ کی ہمارے ساتھ''۔عرفان منمنایا۔

''تو ٹھیک ہے، ایسا کرتے ہیں، کل اسے پکڑتے ہیں اور اچھی طرح دھلائی کرتے ہیں''۔ راشد نے اپنی رائے دی۔
صابر بھائی مسکرائے، ''اس سے کیا ہوگا؟''
''اتنی سادگی سے ہم دھوکا نہیں کھا سکتے صابر بھائی''۔ میں نے کہا۔
ہم لوگ پی سی واپس آ گئے۔
اگلے روز کچھ جلدی ہی ہم لوگ وہاں جمع ہو گئے اور چارپائی پر بیٹھنے کی بجائے کرسی سنبھال کر ایسے رخ کر کے بیٹھ گئے کہ دکان پر نظر رہے۔
ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کارٹن اٹھائے وہ شخص دکان میں داخل ہو رہا تھا۔ ہم سب تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ عرفان نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ ہم سب اس پر لات اور گھونسے برساتے رہے۔ اس نے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے پوچھا۔
''کیا ہوا، کیوں آپ غریب پر ظلم کر رہے ہیں؟''
''غریب؟ کمینے، ہمیں دھوکا دیتا ہے، گھر کے لیے راشن لے کر اسے بیچ دیتا ہے، تجھے تو ہم پولیس کے حوالے کریں گے''۔
''ہاں جی ٹھیک ہے، پولیس کے حوالے کر دو''۔ وہ کھڑا ہو گیا۔
''ابے تجھے ڈر نہیں لگتا جیل جانے سے؟ پولیس تیرا کچومر نکال دے گی''۔
''کیوں نکال دے گی کچومر؟ بھیک ہی تو مانگتا ہوں۔ بھیک مانگنا کوئی جرم ہے کیا!''
ہم تینوں ہاتھ جھاڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔
صابر بھائی مسکرائے، ''چلو۔ اس نے بتا دیا نا کہ بھیک مانگنا کوئی جرم نہیں ہے!''
کسی سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ ہم صابر بھائی کے پیچھے پی سی لوٹ آئے۔
ہمارا آخری سمسٹر تھا اور امتحانات کے دن قریب آ رہے تھے۔ پی سی کی بیٹھک تو رہتی تھی لیکن بس تھوڑی دیر کے لیے وہاں بھی ہم اپنی تیاریوں کی ہی زیرِ بحث لاتے۔ صابر بھائی سے ملاقات ہو جاتی، وہ اپنے دفتر سے سیدھے یہیں آ جاتے تھے، چائے پراٹھا کھاتے اور ہماری گفتگو کو بڑے انہماک سے سنتے۔ پھر ایک دن ایسا ہی واقعہ ہو گیا جس پر صابر بھائی معنی خیز انداز میں مسکرایا کرتے تھے۔
وہ نوجوان صاف ستھرے لباس میں تھا، بڑے مہذب انداز میں ہم سے پانچ منٹ بات کرنے کی اجازت مانگی۔ صابر بھائی مسکرا دیے۔
''میرا نام عبدالوحید ہے۔ میں آئل ریفائنری میں کام کرتا تھا، والد بیمار پڑے اور بستر سے جا لگے۔ سرکاری اسپتال میں داخل کرایا لیکن انہوں نے بھی کچھ دنوں کے بعد اسپتال سے ریلیز کر دیا۔ کہنے لگے گھر پر ہی دیکھ بھال کیجیے۔ اور دواؤں کے اتنی بڑی لسٹ پکڑا دی کہ پابندی سے اسے استعمال کیجیے۔ ایک بوڑھی والدہ ہیں گھر میں جنھیں پوری طرح دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے ہی تیمارداری بھی کرنی پڑتی ہے۔ ملازمت سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے چارج شیٹ ہوئی اور پھر نکال دیا گیا۔ ایک ہفتے کی دوائیں چھ ہزار روپے کی آتی ہیں۔ یہ نسخہ ہے۔ آپ لوگ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟''
ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ صابر بھائی نے نسخہ لے کر دیکھا، ہم سب نے بھی دیکھا۔
ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ صابر بھائی نے نسخہ لے کر دیکھا، ہم سب نے بھی دیکھا۔

عبدالحمید۔۔۔۔عمر ۸۷ سال اور پھر صفحے کے دونوں طرف دواؤں کے نام اور طریقہ استعمال۔
ہم نے صابر بھائی کی طرف دیکھا، وہ خلاف معمول مسکرائے نہیں۔عبدالوحید کا جائزہ لیتے رہے۔
''کہاں رہتے ہو عبدالوحید؟'' انہوں نے نوجوان سے پوچھا۔
''موسیٰ کالونی میں، پتہ نہیں آپ لوگوں نے اس کالونی کا نام بھی سنا ہے یا نہیں''۔
صابر بھائی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔
''یار اتنی دور سے یہاں آئے ہو مدد مانگنے!'' انہوں نے استفسار کیا۔
''جی ہاں۔آپ جانتے ہیں قریب ہی بڑے لوگوں کی ہاؤسنگ سوسائٹی ہے، یہاں آپ لوگوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں تو خیال آیا آپ لوگ اسی ہاؤسنگ سوسائٹی کے رہنے والے ہوں گے۔اس لیے میں نے سوچا کہ آپ لوگوں سے۔۔۔'' اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی اور آنکھیں نمناک ہو گئیں۔
''یار حوصلہ رکھو۔۔۔دیکھو ایک ہفتے کی دواؤں کا انتظام تو میں کر دوں گا لیکن۔۔۔''
صابر بھائی نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
''تم لوگوں کے پاس کچھ وقت ہے؟''
''کیوں؟ کیا کرنا ہے صابر بھائی''۔
''چلو بھائی عبدالوحید۔تمہارے والد صاحب کو دیکھنے چلتے ہیں''۔
صابر بھائی اب بھی عبدالوحید کو غور سے دیکھ رہے تھے لیکن اس کا چہرہ ویسا ہی غمناک تھا۔
ہم سب ایک ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔عبدالوحید راستہ بتا رہا تھا۔تقریباً چالیس پینتالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس نے ایک جگہ گاڑی روکنے کے لیے کہا۔
''گاڑی اندر نہیں جا سکے گی۔پیدل چلنا ہوگا''۔
تنگ تنگ دو تین گلیوں سے گزر کر وہ ایک دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا جس پر تالہ لگا ہوا تھا۔گلی میں تنگ تنگ نالیاں تھیں جن میں غلاظت ابل رہی تھی۔
وہ ہمیں رکنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔چند لمحوں بعد وہ باہر آیا۔
''والدہ پردہ کرتی ہیں، اس لیے۔۔۔''
''والدہ اندر تھیں تو تالا کیوں لگایا ہوا تھا تم نے''۔صابر بھائی نے پوچھا۔
''انہیں چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی ہے، تالا دیکھ کر کوئی آتا نہیں۔آیئے''۔
گھر نیم روشن تھا۔چھوٹے چھوٹے شاید دو کمرے تھے۔ایک کمرے کا دروازہ کھول کر وہ کھڑا ہو گیا۔
''ابا سو رہے ہیں یا شاید غنودگی میں ہیں۔آپ کہیں تو انہیں اٹھانے کی کوشش کروں''۔
کمرہ تاریک تھا لیکن ایک چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا دیکھا جا سکتا تھا۔
''اتنا اندھیرا کیوں کیا ہوا ہے عبدالوحید میاں۔کس طرح دیکھ بھال کرتے ہو''۔صابر بھائی نے کہا۔
مجھے بڑی گھٹن کا احساس ہوا۔عرفان اور راشد بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے۔
''روشنی میں ابا زیادہ ہی بے چین ہو جاتے ہیں''۔عبدالوحید نے کہا۔

''چلیے صابر بھائی۔باہر چلتے ہیں''۔
''نسخہ دینا عبدالوحید۔ہم دوائیں لے آتے ہیں''۔
''چھوڑیئے صابر بھائی۔عبدالوحید خود ہی دوائیں لے آئے گا''۔راشد نے جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
میں نے اور عرفان نے بھی اپنی جیبیں خالی کر دیں۔
عبدالوحید ہمیں گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آنے لگا تو ہم نے اسے منع کر دیا۔
''کیا خیال ہے صابر بھائی،اس بار تو ہم بے وقوف نہیں بن رہے ہیں نا؟''
''یار کچھ کھٹک سی تو اب بھی دماغ میں ہے''۔وہ آہستہ سے بولے۔
تین چار دنوں کے بعد صابر بھائی پھر بولے''یار مریض کی عیادت کے لیے وقت نکالو،دیکھ آتے ہیں''۔
ہم سب تیار ہو گئے۔
اس گھر میں اب بھی تالا لگا ہوا تھا۔ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی،تقریباً سناٹا ہی تھا۔صابر بھائی نے پھر بھی دروازے پر دستک دے دی۔کئی بار دستک دینے پر بھی کسی نے اندر سے کوئی آواز نہیں دی۔کچھ دور پر چار پانچ افراد ایک چبوترے پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔صابر بھائی ان کی طرف بڑھ گئے۔
''بھائی۔یہ لوگ کہاں چلے گئے،دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے''۔
''ہاں جی۔وہاں زیادہ تر تالا ہی پڑا ہوا ہوتا ہے''۔ایک صاحب پتوں پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولے۔
''ابھی تین چار دن پہلے تو ہم لوگ آئے تھے۔عبدالوحید کے ساتھ''۔
وہ سب ایک ساتھ ہنس پڑے۔
''کون عبدالوحید جناب؟''
''وہی لڑکا جو اس گھر میں رہتا ہے اپنی والدہ اور بیمار والد کے ساتھ۔
''بیمار والد؟''ایک نے کہا اور پھر سب ہنس دیے۔
''ارے صاحب،تین دن پہلے ایک فلاحی ادارے کی میت گاڑی اس مردے کو لے گئی اور اس کے بعد وہ لڑکا بھی چلا گیا۔کچھ دنوں بعد پھر کسی مردے کو لے کر آئے گا۔ایک رات رکھے گا اور پھر میت گاڑی اسے لے کر چلی جائے گی۔پتہ نہیں کہاں سے یہ لڑکا آن مرا ہے اس محلے میں۔۔۔۔''
''اور اس کی والدہ؟''صابر بھائی نے پوچھا۔
''کیسی والدہ بڑے صاحب۔ہم نے تو آج تک کسی عورت کو اس گھر میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔وہ اکیلا ہی آتا جاتا ہے۔کبھی کبھی کسی مردے کو اٹھا لاتا ہے اور دوسرے دن تدفین کے لیے لے جاتا ہے۔یہاں کسی سے اس کا ملنا جلنا نہیں ہے۔کسی سے بات نہیں کرتا''۔
صابر بھائی کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔اس طرح کے معاملے میں پہلی بار ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نہیں ابھری۔

☆☆☆

کنواں

بلراج کومل

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے نل مہیا کر دیئے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصہ تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ نتیجتاً اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا مشغلہ باقاعدہ طور پر اختیار کر لیا۔ جب وہ ایک کنواں پھلانگ چکتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ ایک اور کنواں پھلانگے۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مشکل صورت حال کا انتخاب کرتا اور تماشائیوں کی تالیوں اور واہ واہ کے درمیان کنواں پھلانگنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی مقامی رفتہ رفتہ شہرت کا درجہ اختیار کر گئی اور اب اس کا نام بیرونی ممالک کے اخبارات میں بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا۔

کسی بھی فرد کا کوئی دعوئ ایسا نہیں ہے جس کو چیلنج کرنے کے لیے دوسرا فرد موجود نہ ہو۔ چنانچہ گولنکر کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ ایک روز اسے ڈاک سے ایک خط ملا۔ یہ خط ایک اجنبی کی طرف سے تھا جس نے گولنکر کو کنواں پھلانگنے کے مقابلہ کے لیے چیلنج بھیجا تھا۔ گولنکر نے خط پڑھا اور خط پڑھتے ہی اس کے مردانہ وقار نے تقاضا کیا کہ وہ چیلنج منظور کر لے۔ چنانچہ گولنکر نے فوراً چیلنج کرنے والے کو تحریری اطلاع دی کہ وہ کسی وقت بھی باہمی کتابت کے ذریعہ طے شدہ شرائط کے مطابق مقابلہ کے لیے تیار ہے۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر شرائط طے ہوئیں اور مقابلے کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مقامی اور قومی اخبارات میں مقابلہ کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔

اگرچہ گولنکر کہنہ مشق کھلاڑی تھا اور بہت سے کنویں پھلانگ چکا تھا۔ جوں جوں مقابلے کی تاریخ قریب آتی گئی اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے۔ ان خدشات پر قابو پانے کے لیے گولنکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سوال اپنی شہرت اور وقار کو برقرار رکھنے کا ہے اس لیے مقابلہ سے قبل کنواں پھلانگنے کی کچھ مشق ضروری ہوگی۔ جو مقابلے کا فیصلہ، نتیجہ کن انداز سے اس کے حق میں کرنے میں مفید ثابت ہوگی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد گولنکر نے شہر کے تمام کنوؤں کا جن میں سے اکثر وہ پھلانگ چکا تھا بغور جائزہ لیا۔ ہر ایک کنوئیں کا قطر ناپا۔ پھلانگنے کے زاویوں کا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے گولنکر جیسی شہرت کے مالک کے لیے شہر کے کنوؤں پر مشق کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کام کے لیے شہر سے باہر ایک ویران کنویں کا انتخاب کیا۔ کنواں چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ باہر سے گزرنے والا آدمی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے اندر کنواں ہے اس کنویں کی ایک خوبی یہ تھا کہ اس کی منڈیر، اس کا قطر اور اس کے چاروں طرف کی خالی زمین کا حدود اربعہ اس کنویں کے مماثل تھا جو آخری مقابلہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

کنویں کا انتخاب کرنے کے بعد مناسب تیاری کی ضرورت تھی۔ گولنکر نے تمام تیاری دو چار روز میں مکمل کر لی اور ایک صبح کنویں کی طرف روانہ ہو گیا۔

مارچ کی یہ صبح بڑی خوبصورت تھی۔ ہوا میں موسم بہار کا اثر تھا لوگوں کے چہروں پر مسرت تھی بچے آنگنوں میں کھیل رہے تھے۔ زندگی کا کاروبار معمول سے زیادہ حسن اور خوش اسلوبی سے چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گولنکر رنگ و بو کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتا ہوا شہر کے دھیرے دھیرے تیز ہوتے ہوئے ہاؤ ہو میں سے گزر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے کنواں پھلانگنے کی مشق کرنی تھی۔ اس کا دل اس کا دماغ اس کا پورا وجود زندگی کے نشے سے سرشار تھا۔ اس کے قدم اعتماد سے اٹھ رہے تھے

اور اس کے چہرے پر کامرانی کا وہ نور تھا جیسے وہ مقابلے میں شامل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ جیت چکا ہو۔

شہر کی ایک نواحی بستی میں وہ ایک پارک کے قریب سے گزرا۔ سبزے پر کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت کھیلنے والے لڑکے نے ایک شاندار چھکا لگایا۔ گولنکر کا دل مسرت سے چھلک اٹھا۔ نواحی بستی سے نکل کر وہ اس سڑک پر آ گیا جہاں خوبصورت بنگلوں کی ایک قطار دور تک چلی گئی تھی۔ ایک مکان کے باہر ایک گول مٹول، سرخ و سپید بچہ ٹافی کھا رہا تھا۔ گولنکر نے اس کے ملائم صحت مند گالوں کو تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کے بالکل قریب تھا۔ وہ رک گیا اور اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ فطرت کا سارا حسن کھیتوں کی ہریالی اور سونے میں سمٹ آیا تھا۔ گولنکر کچھ دیر اس حسن سے سرشار ہوتا رہا اور پھر جھنڈ کے اندر داخل ہو گیا۔ کنویں کے قریب پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اسے دیکھنے کا امکان اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کنویں کی منڈیر پر سوکھا مارا چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا اور بڑے انہماک سے کنویں کے اندر جھانک رہا تھا۔ اجنبی گولنکر کی آمد سے بالکل بے خبر تھا اس لیے جب گولنکر اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک پڑا۔ گولنکر نے اپنے ردعمل کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا:

''تم کون ہو؟''

اجنبی اب بھی کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور گولنکر پر ایک تحقیر آمیز نظر کر کے کنویں کے اندر جھانکنے کے عمل میں دوبارہ مصروف ہو گیا تھا۔

گولنکر کے سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

گولنکر نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں پوچھتا ہوں، تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟''

اجنبی نے اپنی آنکھیں کنویں کے پیندے سے ہٹائیں اور گولنکر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گولنکر کو یکا یک محسوس ہوا کہ اجنبی اس کی روح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر راز سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔ گولنکر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس سے پیشتر کہ گولنکر اپنے حصے کا اظہار کر پاتا۔ اجنبی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے:

''دو انسانوں کے درمیان ہمدردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے مقاصد ایک جیسے ہوں''۔

''تو تم ہمدردی کی تلاش میں ہو''۔

''شاید میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ مجھے رشتہ یا تعلق یا اسی قسم کا کوئی عام لفظ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال میں کسی سوال کا جواب نہیں چاہتا ہوں''۔

گولنکر چکر میں آ گیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اجنبی کو کچھ دیر بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا اور پھر بولا:

''دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ''۔

''میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جا سکتے ہو''۔

''آخر تم کیا چاہتے ہو''۔ گولنکر نے پوچھا۔

''میں چاہنے یا نہ چاہنے کے عمل سے بہت دور نکل چکا ہوں''۔

گولنکر کے ذہن میں ایک اور سوال کوندے کی طرح لپکا۔

''کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟''۔

"زندگی اور موت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا"۔ اجنبی نے جواب دیا۔

گولنکر کے چہرے پر مسرت اور اعتماد کی روشنی نمودار ہوئی وہ اجنبی کی پراسرار شخصیت کے ایک گوشے کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں؟"

"مجھے اب دوسروں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

گولنکر کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

"یقیناً تمہارا گھر ہوگا۔ تمہاری بیوی ہوگی، بچے ہوں گے"۔

"تھے! اب نہیں ہیں"۔ اجنبی نے ایک بار پھر کنویں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کہاں گئے"۔

"مر گئے"۔

"کس طرح مر گئے؟"

"جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے، بیماری سے، قتل سے"۔

"یہ تو عام بات ہوئی خاص طور پر تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟"

اجنبی شاید گولنکر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کے جواب دے چکا تھا اس لیے برہم ہوکر بولا:

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھے مجبور کیوں کررہے ہو؟"

"کچھ سوالوں کا جواب تم نے اپنی خوشی سے دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں"۔

دوستی کے نام پر اجنبی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور پورے زور سے چیخا:

"چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے"۔

گولنکر مسکرایا۔

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں"۔

"تو پھر تم کون ہو؟" اجنبی سوال پوچھ کر اپنے سوال پر خود حیران ہوگیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کردیا تھا لیکن میں انکار نہیں کروں گا۔ میرا نام گولنکر ہے۔ میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنواں پھلانگنے والا ہوں"۔

"مجھے تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

"تمہیں میرے ساتھ دلچسپی ہے اس لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟"

اجنبی کی آنکھوں میں غصے کی بجلی ایک پل کے لیے لہرائی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا:

"مجھے کنواں پھلانگنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

"نہ سہی۔ لیکن میں کنواں پھلانگنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہوں"۔

"میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر۔۔۔۔"

اجنبی کے یہ الفاظ سن کے گولنکر سناٹے میں آ گیا۔
''شاید تم اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کر رہے ہو''۔
''جی ہاں۔ اپنے تمہارے تمام انسانوں کے''۔
''لیکن تمہارے بیوی بچے کیا ہوئے؟''
اجنبی کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی گزرنا چاہتا ہے۔
جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل۔۔۔
''لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے''۔ گولنکر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔
''میں تمام فلسفوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ تم کنویں پھلانگتے پھلانگتے زندگی کے رازدار بن گئے ہو''۔
''خودکشی سے صرف تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے''۔
گولنکر کو اجنبی کی باتوں سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مزید گہری ہو گئی۔
''لیکن اس زندگی کے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں''۔
''جی ہاں میں ان سے بھی واقف ہوں ان پر بھی جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر حاوی ہیں۔ فرد سے اجتماع تک پہنچتے پہنچتے تفصیلات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے''۔
''فرض کرو تم خودکشی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو جس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ میں تمہیں ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔ تو کیا تمہارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل حل ہو جائیں گے''۔
''مجھے اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں۔ میں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہمیشہ کے لیے کبھی حل نہیں ہوتا۔ صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں''۔
''تم نادان ہو''۔
''کون جانتا ہے کون نادان ہے''۔
دونوں آدمی اپنے سوالات اور جوابات میں الجھ گئے تھے تھوڑی دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ گفتگو کا دوبارہ آغاز اجنبی نے کیا:
''تم یہاں سے چلے جاؤ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں''۔
''اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کر سکے''۔
اجنبی کے چہرے پر جھلاہٹ پیدا ہوئی۔
''میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا رہا ہوں''۔
''تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے ہچکچاہٹ کیوں۔ تم اپنا مسئلہ ملتوی کیوں کرنا چاہتے ہو''۔
اجنبی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے:
''میں نے کہا نہ کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ''۔
''اگر یہ فیصلہ تمہارا آخری فیصلہ ہے اور تم اس پر عمل بھی فوراً کرنا چاہتے ہو تو میری موجودگی سے تمہیں کیا زحمت ہے''۔
''میں اپنی موت کے عمل میں تنہا شامل ہونا چاہتا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے۔ میں یہ حق تمہیں کبھی نہیں دے سکتا''۔

''میں اسے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خوبصورت ہے۔ زندہ رہنے کی کوشش کرو''۔
''مجھے تمہارے امید افزا الفاظ بے معنی نظر آتے ہیں۔ بفرض محال اگر زندگی خوبصورت بھی ہے تو تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی ہے تم میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو''۔
''اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلہ پر عمل کرنا چاہتے ہو۔ تم خوشی سے خودکشی کرو۔ میں یہاں سے چلتا ہوں''۔
یہ کہہ کر گولنکر وہاں سے چل پڑا۔ اجنبی کنویں پر چڑھ گیا اور کنویں کے اندر کودنے کے لیے تیار ہو گیا۔
گولنکر دو چار قدم چلنے کے بعد رک گیا اور واپس اسی جگہ آ گیا جہاں وہ چند لمحے پہلے کھڑا تھا۔
''میرا ایک آخری سوال باقی ہے''۔
''پوچھو'' اجنبی نے فاتحانہ انداز میں کہا:
''تم نے خودکشی کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟''
''تم نے پھلانگنے کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟''
''میرے لیے یہ کنواں مناسب تھا''۔
''ٹھیک یہ بات میں کہتا ہوں۔ یہ کنواں میرے لیے مناسب تھا''۔
اس جواب سے گولنکر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا:
''کیا تم اپنی خودکشی چند منٹوں کے لیے ملتوی کر سکتے ہو؟''
''آخر تم کیا چاہتے ہو؟''
''میں یہاں کنواں پھلانگنے کی مشق کرنے کے لیے آیا تھا کہ مجھے دو روز بعد کنواں پھلانگنے کے لیے مقابلہ میں حصہ لینا ہے''۔
''تو میں کیا کروں۔ تم سمجھتے ہو۔ اس مسخرے پن سے تم مجھے متاثر کر لو گے''۔
''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں اسے پورا کر کے جاؤں جہاں تک تمہیں متاثر کرنے کا تعلق ہے۔ تم جہنم میں جاؤ۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں''۔
''شوق سے پورا کرو۔ لیکن جلدی، کیونکہ میں اپنا فیصلہ زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے صبر کی انتہا تک پہنچ چکا ہوں''۔
یہ کہہ کر اجنبی کنویں کی منڈیر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ گولنکر نے کنویں کی منڈیر سے مخصوص فاصلہ ناپ کر زمین پر کچھ نشان لگائے۔ ایک نشان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ اپنے جسم کو ٹٹولا اور اس کے بعد دوڑتا ہوا کنویں کی جانب بڑھا راستے میں ایک دوسرے نشان سے اس نے بھرپور جست لگائی۔ اجنبی کے دل کی دھڑکن اس دوران میں تیز ہو گئی۔ جست لگاتے ہی گولنکر کا جسم ہوا میں ایک قوس سی بناتا ہوا کنویں کے اوپر سے گزرنے لگا اور عین اس لمحہ جب اجنبی کی توقع تھی کہ گولنکر کے دوسری طرف ہوگا ایک پرزور دھماکہ ہوا گولنکر کا جسم کنویں کی منڈیر کی اندرونی سطح کے ساتھ زور سے ٹکرایا اور پھر کنویں کی پوری گہرائی کا فاصلہ طے کرتا ہوا دھم سے پانی میں جا گرا۔
اجنبی کی آنکھیں پھیل کر روزن بن گئیں۔ اس کا پورا وجود فطری ردعمل کی زد میں آ گیا اور وہ ڈوبنے والے کی تقدیر سے غافل اپنے ارادوں اور فیصلوں سے غافل، درختوں کے جھنڈ کو چیرتا، سرسبز و شاداب کو اپنے پاؤں تلے روندتا شہر کی جانب بھاگ نکلا۔

☆☆☆

وہ

بلراج مین را

جب اس کی آنکھ کھلی، وہ وقت سے بے خبر تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھالیا۔ اور سگریٹ نکال کر لبوں میں تھام لیا۔

سگریٹ کا پیکٹ **پھینک** کر اس نے پھر ہاتھ بڑھایا اور ماچس تلاش کی۔

ماچس خالی تھی۔

اس نے خالی ماچس کمرے میں اچھال دی۔

خالی ماچس چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔

اس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔

بیڈ ٹیبل پر چار پانچ ماچسیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔

اس نے باری باری سب کو دیکھا۔ سب خالی تھیں۔

اس نے لحاف اتار پھینکا اور کمرے کی بتی روشن کی۔ دو بج رہے تھے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟

ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی۔

اس نے تمام کمرہ چھان مارا۔

کتابوں کی الماری، ویسٹ پیپر، باسکٹ، پتلون کی جیبیں۔۔۔ ماچس کہیں نہ ملی۔ اس نے **ایک ایک** کتاب الٹ دی۔۔۔ کوئی دیا سلائی نہ ملی۔

کمرے کی حالت بری ہوگئی تھی۔

کتابیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔ کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، **ٹرنک** کھلا ہوا تھا۔ کوئی آ جائے اس سے۔

رات کے دو بجے۔۔۔ کمرے کی یہ حالت؟

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے؟

ماچس کہاں ملے گی۔

ماچس کہیں نہ ملی تو۔۔۔؟

تو کہیں۔۔۔۔

میرا دھڑکتا ہوا دل خاموش نہ ہو جائے۔

آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی۔

میں وقت سے بے خبر تھا۔۔۔۔ ایک بار آنکھ کھل جائے تو پھر آنکھ نہیں لگتی۔

ماچس کہاں ملے گی؟
اس نے چادر کندھوں پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔
دسمبر کی سرد رات تھی، سیاہی کی حکومت، خاموشی کا پہرہ۔
کسی ایک طرف قدم اٹھانے سے پہلے وہ چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا رہا۔ جب اس نے قدم اٹھائے وہ راستہ سے بے خبر تھا۔
رات کالی تھی، رات خاموش تھی اور دور دور تا حد نظر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور۔۔۔۔
چوراہے پر اس کے قدم رک گئے۔
یہاں تیز روشنی تھی کہ دودھیا ٹیوبیں چمک رہی تھیں۔ لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری دکانیں بند تھیں۔ اس نے حلوائی کی دکان کی جانب قدم بڑھائے۔
ممکن ہے بھٹی میں کوئی کوئلہ مل جائے، دہکتا کوئلہ، دم بہ کلب کوئلہ!
حلوائی کی دکان کے چبوترے پر کوئی لحاف میں گٹھڑی بنا سو رہا تھا۔
وہ بھٹی میں جھانکا ہی تھا کہ چبوترے پر بنی گٹھڑی کھل گئی۔
کون ہے؟ کیا کر رہے ہیں؟
میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں۔
پاگل ہو گیا۔۔۔ بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے!
تو پھر؟
پھر کیا؟ گھر جاؤ!
ماچس ہے آپ کے پاس؟
ماچس؟
ہاں۔ مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔
تم پاگل ہو! میری نیند مت خراب کرو، جاؤ۔
تو ماچس نہیں ہے آپ کے پاس؟
ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہو گی۔ جاؤ تم!
وہ سڑک پر آ گیا۔
سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
اس نے قدم بڑھائے۔
چوراہا پیچھے رہ گیا، تیز روشنی پیچھے رہ گئی۔ کیا کیا کچھ نہ پیچھے رہ گیا۔
اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔
لیمپ پوسٹ، لیمپ پوسٹ، لیمپ پوسٹ، ان گنت پوسٹ پیچھے رہ گئے۔ دھیمی روشنی والے لیمپ پوسٹ جو رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کرتے ہیں۔ یکا یک اس کے قدم رک گئے۔ سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا!

ماچس ہے آپ کے پاس؟
ماچس؟
ہاں۔ مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔
نہیں میرے پاس ماچس نہیں ہے، میں اس علت سے بچا ہوا ہوں۔
میں سمجھا۔
کیا سمجھے؟
شاید آپ کے پاس ماچس ہو۔
میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں اس علت سے بچا ہوا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔
اس نے قدم بڑھائے۔
سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا کہ تھک گیا تھا۔
وقت سے بے خبر اس کے تھکے تھکے قدم اٹھ رہے تھے۔
لیمپ پوسٹ آتا، مدھم روشنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر سیاہی۔
پھر لیمپ پوسٹ مدھم روشنی، پھر سیاہی۔
وہ لبوں میں سگریٹ تھامے دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا۔
اس کی دوور، اندر پھیپھڑوں تک دھواں کھینچنے کی طلب شدید ہوگئی تھی۔
اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔
شب خوابی کے لباس اور چادر میں اسے سردی لگ رہی تھی۔
وہ کانپ رہا تھا اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا۔ وقت سے بے خبر۔ لیمپ پوسٹوں سے بے خبر۔۔۔
ایک بار پھر اس کے قدم رک گئے۔ اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔ سامنے پل تھا۔ مرمت طلب پل۔ حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سڑک کے بیچ ایک تختے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔
اس نے لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ۔۔۔
کون ہے؟
وہ خاموش رہا۔
سیاہی کی ایک انجانی تہہ کھول کر سپاہی اس کی طرف لپکا۔
کیا کر رہے تھے؟
کچھ نہیں!
میں کہتا ہوں کہ کیا کر رہے تھے؟
آپ کے پاس ماچس ہے؟
میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو ماچس ہے۔۔۔ کون ہو تم؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔ آپ کے پاس ماچس ہوتو۔۔۔۔
تم یہاں کچھ کرر ہے تھے؟
میں لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا۔۔۔ آپ کے پاس ماچس ہوتو۔۔۔۔؟
تم کون ہو۔ کہاں رہتے ہو؟
میں۔۔۔
کہاں رہتے ہو؟
ماڈل ٹاؤن!
اور تمہیں ماچس چاہیے۔۔۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو۔۔۔ ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟
ماڈل ٹاؤن! اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔
دور دور، تا حد نظر سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔
چلو میرے ساتھ تھانے تک۔۔۔ ماڈل ٹاؤن۔۔۔؟ ماڈل ٹاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔۔۔ ماچس چاہیے نا! تھانے میں مل جائے گی۔
سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔
وہ سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔
تھانہ اسی سڑک پر تھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔
وہ سپاہی کے ساتھ تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔
کمرے میں کئی آدمی ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔
سب سگریٹ پی رہے تھے۔
میز پر سگریٹ کے کئی پیکٹ اور کئی ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔
صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا تھا۔ کہتا ہے ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔
کیوں بے؟
اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کرلوں۔۔۔۔ مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے۔
کہاں رہتے ہو؟
ماڈل ٹاؤن۔ کیا میں آپ کی ماچس لے سکتا ہوں؟
کون ہو تم؟
میں اجنبی ہوں۔ کیا میں ماچس۔۔۔
ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے ہو؟
تین ماہ سے۔ ماچس۔۔۔
ماچس۔۔۔ ماچس کا بچہ۔۔۔ جاؤ اپنے گھر۔۔۔ ورنہ بند کر دوں گا۔۔۔ ماچس۔۔۔۔
جب وہ تھانے سے باہر آیا۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا۔

اس نے اس نہ ختم ہونے والی سڑک پر دھیمے دھیمے چلنا شروع کیا۔
اس کی ناک سوں سوں کرنے لگی تھی اور اس کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔
سگریٹ پینا ایک علت ہے!
میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے؟
ماچس کہاں ملے گی؟
نہ ملی تو؟
وہ وقت سے بے خبر تھا، لیمپ پوسٹوں سے بے خبر تھا، سڑک سے بے خبر تھا، اپنے بدن سے بے خبر تھا۔
وہ گرتا پڑتا بڑھ رہا تھا۔
اس کے لغزش زدہ قدموں میں نشے کی کیفیت تھی۔
پو پھٹی اور وہ دم بھر کو رکا۔
دم بھر کو رکا اور پھر سنبھلا۔
سنبھلا اور اس نے قدم اٹھانا ہی چاہا کہ۔۔۔
سامنے سے کوئی آ رہا تھا اور اس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔
وہ اس کے قریب آ کر رکا۔
اس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا۔
آپ کے پاس ماچس ہے؟
ماچس؟
آپ کے پاس ماچس نہیں ہے؟
ماچس کے لیے تو میں۔۔۔
وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔
آگے، جدھر سے وہ خود آیا تھا۔
اس نے قدم بڑھایا۔
آگے، جدھر سے وہ آیا تھا۔

☆☆☆

دُخمہ

بیگ احساس

سامنے سہراب کی نعش تھی اور اسے کے پیچھے دو دو پارسی سفید لباس پہنے ہاتھ میں پیوند کا کنارہ پکڑے خاموشی سے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے ہم لوگ تھے۔ ''دخمہ'' کی گیٹ پر ہم لوگ رک گئے۔ ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا میری بہن کا گھر بھی!! لیکن اس گھر میں اب میرا کوئی نہیں رہتا تھا۔ میری بہن اور بہنوئی کا انتقال ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ میری بھانجی اسی شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔

اسکول کی چھٹیاں ہوتے ہی میں اپنی بہن کے پاس دوڑا چلا آتا۔ وہ میری سب سے بڑی بہن تھی۔ درمیان میں چھ اور بہنیں اور ان کے بعد سب سے چھوٹا میں۔ اکلوتا بھائی۔ میری بھانجی مجھ سے صرف دو برس چھوٹی تھی۔ ہم دونوں خوب کھیلا کرتے۔

وہ گھر مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ چٹان پر بنا ہوا خوبصورت مکان اسٹیشن کے اس پار۔ پلاننگ کے ساتھ بنائے ہوئے بنگلے۔ درمیان میں سیدھی تارکول کی سڑکیں۔ کافی چڑھاؤ اور اتار تھے۔ ایک زمانے میں اس جڑواں شہر میں صرف تانگے چلتے تھے۔ سائیکل رکشاؤں کا داخلہ ممنوع تھا۔ میری بہن کے گھر پہنچتے پہنچتے گھوڑا ہانپنے لگتا۔ چڑھائی پر گھوڑے کے پیر جمتے نہ تھے۔ جب ہم تانگے سے اترنے لگتے تو مغرب میں جہاں سڑک مسطح ہو جاتی ہے سینٹ فلومینا چرچ تھا۔ چرچ میں مشنری اسکول بھی تھا۔ کھلی ٹانگوں والے یونیفارم کے اسکول کو کم ہی مسلمان لڑکیاں جاتی تھیں۔ میری بھانجی بھی اسلامیہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ لیکن ہم لوگوں نے چرچ کا چپہ چپہ دیکھا تھا۔ کیوں کہ بچوں کو کوئی نہیں روکتا تھا۔ اتوار کے دن اطراف کے کرسچن Prayer کے لیے آجاتے فضا میں گھنٹے گونجنے لگتے تو بڑا اچھا لگتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ گھنٹے کون بجاتا ہے۔ مسجد کافی فاصلے پر تھی جہاں چھوٹے چھوٹے بے ترتیب مکان تھے۔

گھر کے مقابل اونچی چٹان بلکہ پہاڑ پر ایک دائرہ نما عمارت بنی ہوئی تھی۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا علاقہ تھا۔ بہت بڑی باؤنڈری تھی۔ نیچے بڑا سا گیٹ تھا۔ لوگ اس کو پارسی گٹھ کہتے تھے۔ احاطہ میں ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔ جس میں چوکیدار اس کی بیوی اور ایک کتا رہتے۔ عجیب سا پراسرار کتا!! محلے کے اکثر گھروں میں السیشن تھے یہ کتا ان سے مختلف تھا۔ دور سے ایسا لگتا جیسے اس کی چار آنکھیں ہوں۔

میری بہن پارسی گٹھ جانے سے منع کرتی تھیں۔ کہتی تھیں بچوں کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔

ایک دن ہم نے دیکھا پارسی گٹھ کا گیٹ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور چوکیدار صاحب بے حد مصروف ہیں۔ ۱۱ بجے دھوپ میں سفید کپڑوں میں ملبوس دو دو پارسی ایک رومال کے دو مختلف سرے پکڑے ہوئے ایک قطار میں چلے آرہے ہیں۔ سب سے آگے دو پارسی تھے۔ درمیان میں ایک گاڑی۔۔۔۔ پھر پارسیوں کی قطار۔۔۔!! تقریباً ایک بجے تک وہ لوگ مصروف رہے پھر واپس ہو گئے۔ شام ہونے سے پہلے گدھوں کے جھنڈ آنا شروع ہوا۔ وہ سب اس دائرہ نما عمارت کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ شام ہوتے ہوتے سارے گدھ اڑ گئے۔ میں نے ایک ساتھ اتنے سارے گدھ پہلی بار دیکھے تھے۔ شام تک وہ مصروف رہے۔

میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ ''اتنے گدھ اس عمارت پر کیوں جمع ہو گئے تھے؟'' بہن نے بتایا پارسی گٹھ اصل میں پارسیوں کا قبرستان ہے۔ پارسی مرنے والے کی نعش کو چھت پر رکھ دیتے ہیں تاکہ گدھ اس نعش کو نوچ کھائیں یہ سارے گدھ اسی لیے آئے تھے۔

''یہ کیسا طریقہ ہے آپی؟'' میں نے جھرجھری سی لے کر کہا۔

''بیٹا اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ کوئی دفن کرتا ہے۔ کوئی جلا دیتا ہے، یہ لوگ پرندوں کو کھلا دیتے ہیں اور اسی کو ثواب سمجھتے ہیں۔

''اندھیرا ہونے سے قبل سارے گدھ لوٹ گئے۔ اس کے باوجود ہم اس روز چھت پر نہیں سوئے۔ میں اور میری بھانجی دونوں ڈر کے مارے نیچے کمرے میں ہی سو گئے کیا پتہ کوئی گدھ ہمیں مردہ سمجھ کر۔۔۔۔

بیدار ہوتے ہی ہم دونوں پارسی گھر گئے۔ کتا ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔

''ارے بیٹا تم لوگ؟''

''چاچا کل کسی کا انتقال ہوا تھا؟''

''ہاں بیٹا''۔

''دو دو آدمی کیوں قطار بنا کر چلتے ہیں؟''

''یہی طریقہ ہے۔ تنہا کوئی نہیں چلتا''۔

''انہوں نے رومال کیوں پکڑ رکھا تھا؟''

''وہ رومال نہیں اسے پیوند کہتے ہیں''۔

''اور یہ گول عمارت؟''

''یہ ''دخمہ'' ہے۔ اس کی چھت درمیان سے اونچی ہوتی ہے چھت پر تین دائرے بنے ہیں۔ مرد کی نعش بیرونی دائرے میں، عورت کی درمیانی دائرے میں اور بچوں کی نعش اندرونی دائرے میں رکھی جاتی ہے تاکہ ان پر تیز دھوپ پڑے اور گدھوں کو دور سے نظر آجائے''۔

''چاچا یہ کتا اتنا عجیب کیوں ہے؟'' میری بھانجی نے پوچھا۔

''اسے ''سگ دید'' کہتے ہیں۔ چار آنکھوں والا کتا۔۔۔ اس کی چار آنکھیں نہیں ہیں لیکن آنکھوں پر ایسے نشان ہیں جس سے اس کی چار آنکھیں نظر آتی ہیں۔ یہ ''سگ دید'' ہی آدمی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ کرتا ہے''۔

''کیسے چاچا؟''

''جب بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی پتہ چل جائے گا''۔ چاچا نے ہمارے سوالات سے اکتا کر کہا۔

''اور چاچا یہ گدھ کہاں سے آجاتے ہیں؟''

''اگر فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' چاچا نے سوال کیا اور اندر چلے گئے۔ اس روز بھی ہم چھت پر نہیں سوئے۔

(سہراب بھی ان تمام مراحل سے گزر رہا ہوگا۔)

سہراب کا ''میکدہ'' شہر کے مصروف علاقے میں تھا۔ ممکن ہے جس وقت اس کے اجداد نے مئے کدہ کھولا ہوگا یہ مصروف ترین علاقہ نہ رہا ہو۔ کیوں کہ سامنے راجہ صاحب کی بہت بڑی حویلی تھی۔۔۔ بغل میں بھی ایک بہت بڑی حویلی تھی۔۔۔ دائیں جانب ڈراما تھیٹر تھا۔ اور بائیں جانب بہت آگے انگریزوں کی ریزیڈنسی تھی۔ مقابل میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی مسجد سے لگ کر جو گلی تھی وہ ''مجردگاہ'' تک جاتی تھی۔ مجردگاہ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا میٹنگ پوائنٹ تھا۔ اس میں فائن آرٹس اکیڈمی بھی تھی اور رسالے کا دفتر بھی۔ ہم لوگ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو دیکھنے آجاتے تھے۔ ان دنوں بعض ادیبوں و شاعروں کی شہرت فلمی

اداکاروں سے کم نہ تھی۔ بیچلر کوارٹرس کے مقابل ایک بڑا شراب خانہ بھی تھا جہاں سستی شراب فروخت ہوتی۔ اکثر فن کار وہاں چلے جاتے۔ جیب گرم ہوتی تو اکثر ادیب و شاعر مئے کدہ کا رخ کرتے شہر کا یہ سب سے قدیم شراب خانہ تھا!!!! ایک تو سہراب خالص شراب بیچتا تھا۔ دوسرے وہ ادیبوں و شاعروں کے مزاج سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔ کسی اچھے شعر پر داد بھی دے دیا کرتا۔ پارسی ویسے بھی خوش اخلاق اور مہذب ہوتے ہیں۔ پھر سہراب صرف شراب اور سوڈے کی اصل قیمت لیتا تھا۔ پانی اور گلاس وہ خود فراہم کرتا۔ اندر ٹیبل اور کرسیاں بھی تھیں۔ گزک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لڑکے ٹوکریوں میں گرین پیس، بھنی ہوئی مونگ پھلی، چڑوا لیے گھومتے۔ لوگ حسب ضرورت ان سے چیزیں خرید لیتے۔ دوسرے بارس کے مقابلے میں ''مئے کدہ'' نسبتاً کم خرچ تھا۔

ہم نے جس وقت ''مئے کدہ'' جانا شروع کیا۔ شہر کئی انقلابات سے گزر چکا تھا۔ کمیونسٹوں کی شاہی کے خلاف جدوجہد، تلنگانہ تحریک کامیاب تو ہوئی لیکن شاہی کا خاتمہ کانگریس کی نئی حکومت نے کیا تھا۔ پولس ایکشن نے مسلمانوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم سے پوری قوم سنبھلی بھی نہ تھی کہ زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی نئی حد بندیاں کی گئیں۔ ریاست کے تین ٹکڑے کر دیئے گئے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی دوسری ریاستوں سے جڑے یہ ٹکڑے ان کا حصہ نہ بن سکے۔ اپنی مستحکم تہذیب کی بنیاد پر ریاست کے یہ حصے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگتے تھے۔ مذہب کے نام پر تقسیم عوام نے قبول نہیں کیا تو زبان کے نام پر ریاستوں کی نئی حد بندیوں کو بھی ایک ہی زبان بولنے والوں نے قبول نہیں کیا۔ دو مختلف کلچر!! جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی اس کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔ نئے آنے والوں کی کوئی تاریخ تھی نہ تہذیب ایک مستحکم حکومت کا دارالخلافہ سیاسی جبر کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں آ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح خالی زمینوں پر آباد ہو گئے۔ ایک طرف بڑی بڑی حویلیاں حصے بخرے کر کے فروخت کر دی گئیں۔ زمین بیچنا یہاں کی تہذیب کے خلاف تھا۔ شرما شرمی میں قیمتی زمینیں کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔ آنے والے زمینیں خرید خرید کر کروڑ پتی بن گئے۔ نئے علاقوں کو خوب ترقی دی۔

کسی کوٹھی میں صدر تپہ خانہ آ گیا، کسی حویلی میں انجینئرنگ کا آفس، کسی حویلی میں اے۔ جی آفس تو کسی حویلی میں بڑا ہوٹل کھل گیا۔ باغات کی جگہ بازار نے لے لی۔ لیڈی حیدری کلب پر سرکاری قبضہ ہو گیا۔ کنگ کوٹھی کے ایک حصے میں سرکاری دواخانہ آ گیا۔ جیل کی عمارت منہدم کر کے دواخانہ بنا دیا گیا۔ رومن طرز کی بنی ہوئی تھیٹر میں اب بہت بڑا مال کھل گیا تھا۔ حویلیوں، باغات، جھیلوں اور پختہ سڑکوں کے شہر کی جگہ دوسرے عام شہروں جیسا شہر ابھر رہا تھا جس کی کوئی شناخت نہ تھی۔

چند برسوں میں سب کچھ بدل گیا۔ جو تہذیب کے نمائندے تھے جو تہذیب کو بچا سکتے تھے ان میں سے کچھ اپنی زمینوں کو چھوڑ کر سرحد کے اس پار جا بسے تھے اور کچھ مغربی ممالک میں آباد ہو گئے۔ ولی عہد نے ایک مغربی ملک کو اپنا مسکن بنا لیا۔ رعایہ کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب بھی وہ اس شہر کو آتے تو اس طرح خوشی سے پاگل ہونے لگتے تھے جیسے کوئی فاتح اپنی سلطنت کو لوٹا ہو۔ نہ شاہی خاندان کے افراد کو تہذیب کی فکر تھی، نہ امراء کو اور نہ عوام کو۔ ''مئے کدہ'' کے اطراف کا ماحول بھی تبدیل ہو گیا۔ راجہ جی کی حویلی میں سرکاری دواخانہ آ گیا۔ سامنے کی کوٹھی میں بینک کا مین آفس، ریزیڈنسی میں ویمنس کالج، ڈراما تھیٹر فلمی تھیٹر میں تبدیل ہو گیا۔ شہر کا نقشہ تیزی سے بدلتا جا رہا تھا۔ تیلگو فلم انڈسٹری مدراس سے یہاں منتقل ہو گئی تھی۔ شہر کی چمک دمک بڑھ گئی۔ فلمی اسٹوڈیوز ، ۷۰ ایم ایم تھیٹرز ، بڑے بڑے مالس، کپڑوں اور زیورات کی دکانیں۔ سب ان کا تھا۔ سب پر ان کی چھاپ نمایاں ہو رہی تھی۔ ان کی غذاؤں کے ہوٹل آ گئے تھے جہاں متوسط طبقے کا آدمی پیٹ بھر کھانا کھا سکتا تھا۔ ''فل میل'' (Full Meal) ملتا تھا۔ وہ آخر میں بڑے انہماک کے ساتھ چاول میں دہی ملا کر کھانے لگتے تو اکثر دہی بہہ کر کہنیوں تک آ جاتا۔ سڑکوں اور کالجز میں سانولے اور سیاہ فام لڑکے لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑی بڑی کاجل بھری آنکھیں۔۔۔ نمکین چہرے۔۔۔ پشت پر باوز دور تک کھلا

ہوا۔ ۔۔ پتہ نہیں انہیں پیٹھ کی نمائش کا شوق کیوں تھا؟ مقامی لوگ لینڈ گرابرس کی فروخت کی ہوئی خشک تالابوں کی زمین پر مکانات بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہر بارش قیامت بن کر آتی۔ مسلسل فسادات نے پرانے شہر کی ساکھ کو بہت متاثر کیا تھا۔ ہفتوں کرفیو لگا رہتا۔ ہر تہوار و عید پر لوگ سہم جاتے۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر جو پرانا شہر چھوڑ سکتے تھے، وہ نئے علاقوں میں جا بسے۔ ساری رونق، بڑی بڑی سڑکیں، فلائی اوور، ہائی ٹیک سٹی سب کچھ نئے شہر میں تھے۔ تمام دفاتر نئے شہر کو منتقل کر دیئے گئے تھے۔ پرانے شہر میں کچھ تاریخی عمارتیں رہ گئی تھیں۔ مشہور زمانہ چوڑیوں کا لاڈ بازار تھا۔ پتھر سے تعمیر کی گئی مارکیٹ پتھر گٹی تھی۔ عیدوں پر ساری رات یہ بازار جگمگایا کرتے۔ دو تہذیبوں نے الگ الگ جزیرے بنا لیے تھے۔ جب بھی ریاست کے مقامی افراد کو محرومی کا احساس بہت ستاتا تو وہ علیحدہ ریاست کا مطالبہ کرنے لگتے۔ الیکشن کے زمانے میں کوئی باغی لیڈر اس مسئلے کو گرما دیتا۔ کچھ مہینوں خوب ہماہمی رہتی پھر جذبات سرد پڑ جاتے۔

''مئے کدہ'' کا علاقہ بھی اب ڈاون ٹاؤن بنتا جا رہا تھا۔ پرانے شہر سے نئے علاقے کو منتقل ہونے والوں میں خود میں بھی شامل تھا۔ (''دخمہ'' میں پارسی ابھی تک مصروف تھے۔ کوئی باہر نہیں آیا تھا۔)

ان دنوں ادیبوں کا کوئی میٹنگ پوائنٹ نہیں تھا۔ سب بکھر گئے تھے۔ ہمارے دور کو انتشار کا عہد مان لیا گیا تھا۔ فرد کو مشین قرار دے دیا گیا تھا اور تنہائی کو ہمارا مقدر!! یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ تاریخی، تہذیبی، قومی، معاشرتی، جذباتی و ذہنی ہم آہنگی کی ساری روایتیں منہدم ہو چکی ہیں۔ پورا ادب درون ذات کے کرب میں مبتلا تھا۔ اس لیے اب ضروری نہیں تھا کہ سب کسی ایک ہی بار یا ہوٹل میں ملیں۔ شہر بہت پھیل گیا تھا۔ جگہ جگہ وائن شاپس کھل گئے تھے۔ ہم کسی دوست کے گھر جمع ہو جاتے۔ کسی قریبی دکان سے شراب منگوالی جاتی۔ فون کرنے پر ہوٹل سے ''گزک'' بھی پہنچ جاتی۔ ہوم ڈیلیوری کا رواج ہو گیا تھا۔ اب ''مئے کدہ'' جانا ہی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن وہ کیوں سوچ رہا ہے شہر کی تہذیب کے بارے میں شہر کے بارے میں؟ شاید اس لیے کہ ''مئے کدہ'' کو بند دیکھ کر اسے بڑا شاک لگا تھا۔ جیسے تہذیب کا ایک حصہ مر گیا ہو۔

میرا دوست مشیر جو بہتر زندگی کا خواب آنکھوں میں سجائے امریکہ منتقل ہو گیا تھا۔ بیس برس بعد امریکہ سے آیا۔ اپنا شہر چھوڑ کر باہر بس جانے والے ایک تو ناسٹلجک ہو جاتے ہیں دوسرے چیارٹی کرنے کے لیے اتاولے ہوتے ہیں۔ وہ ایسی ہر جگہ جانا چاہتا تھا جہاں بیس برس قبل ہم جایا کرتے تھے۔ ہر جگہ ساتھ چلتا بہت چیزوں کی تبدیلی پر اداس ہو جاتا۔ ظاہر ہے شہر بہت تیزی سے بدلا تھا اور اس پر گلوبلائزیشن کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اسے اس لیے بھی مایوسی ہو رہی تھی کہ جو چیزیں وہاں ترقی یافتہ شکل میں دیکھ کر آیا ہے یہاں اسی کی نقل کی جا رہی ہے۔ شہروں کی شناخت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ سب شہر ایک جیسے ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ پرانی باقیات میں صرف ''مئے کدہ'' بچا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی عمارت، وہی انتظام، ویسے ہی کاؤنٹر، وہی مستقل گاہک۔۔۔ جو بوتل خرید کر حسب ضرورت پیتے ہیں اور بچی ہوئی شراب کی بوتل محفوظ کروا دیتے ہیں۔ اس بوتل سے ایک قطرہ بھی کم نہ ہوتا۔۔۔ دیانت داری'' مئے کدہ'' کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ مستقل گاہکوں کو یہاں بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ مشیر کے یہاں رہنے تک ہم روزانہ ''مئے کدہ'' جایا کرتے تھے۔ ایک خاص وقت تک شغل کرتے پھر اپنی راہ لیتے۔ پتہ نہیں مشیر کو مئے کدہ کی یاد کیوں نہیں آئی۔ امریکہ سے آنے کے بعد اس نے ایک بار بھی شراب کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ سے ایک ایسی جگہ لے چلوں گا جو بالکل نہیں بدلی۔ دوسرے روز میں اسے ''مئے کدہ'' لے آیا۔

لیکن ''مئے کدہ'' بند تھا۔ برسوں پہلے'' مئے کدہ'' کی پیشانی پر ابھرے ہوئے لفظوں میں MAI KADA EST:

1904 اسی طرح موجود تھا، نیچے اردو میں بھی ''مئے کدہ'' لکھا تھا۔ آس پاس دریافت کیا تو پتہ چلا کافی دنوں سے بند ہے۔ مجھے بڑا شاک لگا۔ اپنی بے خبری پر افسوس بھی ہوا۔ پتہ نہیں یہ سب کب اور کیسے ہوا؟ ایسا محسوس ہوا جیسے تہذیب کا ایک حصہ مر گیا ہو۔

پتہ نہیں سہراب کی صحت کیسی ہے؟ کاروبار میں نقصان تو نہیں ہوا؟ کسی ناگہانی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا؟

ہم لوگوں نے سہراب کے گھر کا پتہ چلایا۔ اس کے گھر پہنچے۔ اس کے گھر پہنچے۔ قدیم پارسی طرز کا مکان تھا۔ ملازم نے ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔ ہم دیوار پر ٹنگی تصویریں دیکھنے لگے۔ سہراب نے انتظار نہیں کروایا۔

''آپ' وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔

''ہاں۔ اور انہیں پہچانا۔ مشیر!!''

''اوہ یاد آیا۔ آپ تو پورے انگریز ہو گئے''۔

''امریکہ میں جو رہتا ہے''۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''آپ تو یہیں رہتے ہیں نا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

مجھے شرمندگی ہوئی۔

کہیے کیا لیں گے؟

''نہیں میں دن میں نہیں لیتا'' میں نے کہا' اور مشیر تم؟''

''نہیں میں بھی نہیں لوں گا''۔

''کوئی تکلف نہیں'۔ اس نے ملازم سے کچھ کہا۔'' آپ لوگوں کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں''۔

''میں شرمندہ ہوں''۔

''ہاں شہر بھی تو بہت پھیل گیا ہے''۔

''آپ کی صحت کیسی ہے''۔

''اچھا ہوں''۔

''بزنس میں نقصان ہو؟'' میں نے راست پوچھ لیا۔

''نہیں''۔

''پھر مئے کدہ۔؟''

''چھوڑیئے کوئی کب تک بزنس کرتا رہے۔ آدمی کو آرام بھی کرنا چاہیے نا۔۔۔!''

اتنے میں ملازم ٹرے سجا کر لے آیا۔

''خاص فرانسیسی شراب ہے۔ اتنے دن بعد ملے ہیں، انکار نہ کیجیے''۔

ہم لوگ انکار نہ کر سکے۔ واقعی بڑی نفیس شراب تھی۔ دھیرے دھیرے سرور آنے لگا۔

''آپ بتائیے'' مشیر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا' امریکہ میں کیسی گزر رہی ہے؟''

''پہلے جیسا تو نہیں ہے۔ یہاں کی گھٹن سے بھاگے کچھ دن تو اچھا لگا اب فضا پر حبس چھایا ہوا ہے۔ شک کے سائے میں زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا''۔

''سارا منظر نامہ ہی بدل گیا''۔ میں نے کہا'' وطن کے لیے جدوجہد، بین الاقوامی فیصلوں کی جارحانہ خلاف ورزیاں،

دہشت گردی سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ایک پوری قوم کو دہشت گردی کے جال میں پھنسا دیا گیا۔ایک آگ سی لگی ہوئی ہے جس میں پتہ نہیں کون کون ہاتھ سینک رہا ہے۔لیکن ملزم تیار ہے جرم کہیں بھی کسی نے کیا ہو۔نشان زدہ ملزمین تیار ہیں۔پولیس نے بھی ظلم کے سارے حربے آزما لیے۔عدالتیں کبھی چھوڑتیں ہیں کبھی نہیں چھوڑتیں۔اور بے وقوف قوم دلدل میں دھنستی ہی جارہی ہے"۔

"آپ تو جذباتی ہو گئے۔تاریخ اپنے رنگ بدلتی رہتی ہے۔دیکھئے نا ایران سے مسلمانوں نے ہم کو باہر کیا تھا۔اسپین میں مسلمانوں کو باہر کیا گیا۔اس ریاست کو ہم آصف جاہی سلطنت کے جچے چے سن کر آئے تھے۔ہمارے اجداد کو سالار جنگ اول نے مدعو کیا تھا۔انتظامیہ میں ہمیں شامل کیا گیا۔میر محبوب علی خان نے ہمیں خطابات سے نوازا تھا۔نواب سہراب نواز جنگ، فرام جی جنگ، فریدون الملک وغیرہ وغیرہ فارسی یہاں کی سرکاری زبان تھی اور اردو عوامی زبان۔بریانی، نوابوں اور موتیوں کا شہر۔۔۔!! گجراتی، مارواڑی، سندھی بھی آبسے تھے۔سب کو آزادی حاصل تھی سب نے اپنی اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر لیں۔شاہی خزانے سے مدد بھی ملتی تھی۔ہمارے لیے تو بہت سازگار ماحول تھا۔بڑا عجیب معاشرہ تھا" اس نے ہنستے ہوئے کہا" آپ کو یاد ہے؟ نہیں آپ تو بہت چھوٹے رہے ہوں گے۔تھیٹر میں جب ہم فلم دیکھنے جاتے تو درمیان میں ایک سلائیڈ دکھائی جاتی،" وقفہ برائے نماز" لوگ جلدی جلدی فرض نماز پڑھ کر تھیٹر لوٹ آتے۔رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی والا معاملہ تھا"۔

"آپ کو شاہی دور پسند تھا؟"

"نہیں رواداری پسند تھی۔معاشرے کا کھلا پن اچھا لگتا تھا۔اب تو کٹر پن آ گیا ہے ہر قوم میں۔۔۔!"

"ہاں مسلمان بھی خدا حافظ کی جگہ اللہ حافظ اور نماز کے بجائے صلوۃ کہہ کر بہت خوش ہونے لگے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"مئے کدہ" آپ نے کیوں بند کر دیا؟" مشیر نے اچانک پوچھا۔

"ارے ہاں میں تو اصل بات ہی بھول گیا"۔ میں نے چونک کر کہا۔

"چھوڑیئے"۔

"نہیں بتایئے کیا ہوا تھا؟" میں نے اصرار کیا۔کافی دیر تک وہ خاموش رہا۔پھر دھیرے سے کہا۔

"مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی کہ" مئے کدہ" مسجد سے بہت قریب ہے جو خلاف قانون ہے"۔ میں سناٹے میں آ گیا۔تو یہ مسلمانوں کا کارنامہ ہے، میں نے سوچا۔

"لیکن مسجد اور مئے کدہ برسوں سے اسی جگہ ہیں پھر؟"

"وہ شاہی دور تھا۔اب جمہوریت ہے!! مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔اس کا خیال رکھنا حکومت کا فرض بھی تو ہے"۔

"مسلمان بھی بہت کٹر ہوتے جا رہے ہیں" مشیر نے کہا۔نشہ چڑھنے لگا تو ہم کٹر مسلمانوں کو نوازنے لگے۔

"مسلمان ہی کیوں"۔ سہراب نے ہمیں روکا سب کا یہی حال ہے خود مجھے دیکھئے۔ میں نے شادی نہیں کی کیوں کہ پارسی غیر مذہب میں شادی نہیں کر سکتے۔اس مذہبی شرط کی وجہ سے ہماری تعداد گھٹتی جارہی ہے۔اکثر تاخیر سے شادی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔اب پورے شہر میں بارہ سو پارسی رہ گئے ہیں"۔

"واقعی؟"

"ہاں دوسرا مسئلہ موت کا ہے۔وہی پرانا دخمہ۔برہنہ نعش کو جلتی دھوپ میں چھوڑ دیتے ہیں۔اب تقریباً بیس برس سے گدھوں نے شہر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔اب مختلف الخیال گروپ بن گئے ہیں کوئی کہتا ہے نعش کو دفن کر دینا چاہیے۔کوئی جلانے کے

حق میں ہے۔الیکٹرک بھٹی کے بارے میں بھی غور کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ گدھوں کی Artificail Incimination کے خطوط پر افزائش کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ میں تو پرانے طریقے کو ترجیح دوں گا کہتے ہیں کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو گدھ آتے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا!! آپ کے عقیدے کے مطابق شراب بیچنے والا جہنمی ہوتا ہے نا؟'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ہاں۔۔۔اور شراب پینے والا بھی۔اللہ معاف کرے!'' میں نے کہا۔

ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔

''آپ نے تکلف کیوں کیا۔اتنی اچھی شراب پینے کے بعد کھانے کی بالکل اشتہا نہیں ہے''۔

''پارسی ڈشس بنوائی ہیں آپ کے لیے۔۔۔''

ہم کھانے کی میز پر آ گئے۔زندگی میں پہلی بار پارسی ڈشس کھانے کا اتفاق ہو رہا تھا۔اس لیے بھی زیادہ انکار نہ کر سکے۔

''یہ براؤن رائس ہے۔یہ دھن سک یہ ساس ان مچھی اور یہ کچومر سلاد''۔

براؤن رائس باسمتی چاول کی عمدہ ڈش تھی۔جس میں چینی اور کالی مرچ شامل تھی۔دھن سک تورکی دال،مونگ کی دال اور اڑت کی دال،انڈے،ٹماٹر اور کھیرے سے بنائی گئی ڈش تھی۔ساس ان مچھی میں بہترین پمفرٹ تھی ساتھ میں کرارے چکن پارچہ بھی تھے۔کھانا واقعی لذیذ تھا۔آخر میں موامی بوئی نام کا مچھلی کا میٹھا پیش کیا گیا۔ہم نے بہت سیر ہو کر کھایا۔سہراب کی مہمان نوازی نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

اور آج اطلاع ملی کہ سہراب مر گیا۔

مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ'' مئے کدہ'' کے بند ہو جانے کا اس پر بہت اثر ہوا ہوگا۔اس لیے شاید وہ زیادہ نہ جی سکا ہو۔میں Guilty محسوس کر رہا تھا۔اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔دور کے رشتے دار اور چند احباب تھے۔

پارسی باہر آ رہے تھے۔سہراب کی برہنہ نعش کو دخمہ کی چھت پر چھوڑ دیا گیا ہوگا۔میں بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بہت سے پارسی بھی رک گئے تھے۔اگر گدھ نہ آئیں تو؟ کیا سہراب کی نعش دھوپ میں سوکھتی رہے گی؟ کاش سہراب نے الیکٹرک بھٹی کو ترجیح دی ہوتی میں سوچ رہا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر آسمان کی طرف دیکھا۔مجھے بچپن کا وہ منظر دوبارہ نظر آنے لگا۔گدھوں کا ایک جھنڈ تیزی سے دخمہ کی طرف آ رہا تھا۔

پارسیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔بیس برس بعد یہ منظر لوٹا تھا۔

''پتہ نہیں کہاں سے آئے ہیں؟'' وہ ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے۔

''اگر فرش پر چینی گر جائے تو چیونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' کوئی میرے کان میں پھسپھسایا۔

☆☆☆

انتہائی نگہداشت

پروین عاطف

میرا شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ ڈگڈگی بجانے والا اب خود بھی تھک چکا ہے۔ میرے مٹی کے ڈھیر بدن میں اب اوپر والے کے اشاروں پہ ناچنے کی سکت نہیں رہی۔ ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پھرتی سے ادھر ادھر بھاگتے سفید کوٹوں کے چہروں پہ پھیلتی مایوسی دیکھ کر مجھے اک گونہ کامرانی کا احساس ہو رہا ہے۔ آدھی صدی زندگی کا کچرا سینے پہ دھرنے کے بعد فنا کے عمیق سمندر میں غرقاب ہو جانے کے بعد میں اس بے نیاز کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا جس نے زندگی کے پہلے پانچ برسوں کے اندر اندر جب میں زمین آسمان، چاند تاروں، جھرنوں، آبشاروں، گیتوں، محبتوں کے طلسماتی حسن سے ابھی واقف بھی نہیں ہوا تھا ابھی میری دنیا ماں باپ، لالہ آپی اپنی ٹرائی سکل اور پچھواڑے والے درزی چچا سے آگے کچھ بھی نہیں تھی۔ مجھ پر فالج گرا کر مجھے منجھی سے منجھی کر دیا۔ زندگی کے تابوت میں بند کر کے حکم دیا گیا کہ حسیں تو قائم رہیں گی لیکن بدن کبھی زندہ نہ ہوگا۔

ماں کی صورت تو اب میرے ذہن میں ایک غیر مرئی محبت کے احساس سے زیادہ کچھ بھی نہیں لیکن قربت مرگ کے لمحات میں بھی اس کے آنسوؤں کی جلن میں اپنے مٹی بدن پہ جوں کی توں محسوس کرتا ہوں کھڑکی کی سل پہ بیٹھا موت کا گدھ نما پرندہ مجھے جھپٹ کر لے جانے کے شوق میں بار بار پر پھڑ پھڑاتا ہے لیکن ٹوٹیوں، انجکشنوں، نالیوں میں جکڑے رہنے کے باوجود میں جانتا ہوں ابھی وہ گھڑی نہیں آئی جب سین پورا ہو جانے کے بعد ڈائریکٹر کٹ کی آواز لگاتا ہے۔ قہار جبار سے بھی میرے بدن کے آدھے حصے کی زندگی کشید کرتے وقت میرے فائدے کی غلطی یہی ہوئی کہ وہ میرے ذہن کی ساری بتیاں گل کرنا بھول گیا۔ اسی لیے فلم ختم ہوتے ہوتے بھی کئی گزشتہ ایپی سوڈ (episode) میرے ارد گرد مسلسل چل رہے ہیں۔۔۔ میری ماں تو میرے لوتھڑا بدن کو دوبارہ زندہ کرنے کی خواہش میں مجھے بارہ تیرہ برس کی عمر تک گھسیٹتے گھسیٹتے اس قدر تھک گئی تھی کہ ایک رات میرے ساتھ سوئی سوئی وہ خود ابدی نیند سو گئی۔ ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ میں بہن کے دس برس بعد پیدا ہوا تھا۔ اسے رب نے چاند تاروں کی کرنیں پیس کر بنایا تھا میں گول مٹول کمہار کے چکے پر لاپرواہی سے ڈھالا ہو تھن متھنا تھا۔ پر بیماری سے پہلے لالہ آپی ہر گھڑی مجھے گپلو، ببلو صدقے واریاں کرتی، ڈھاک پہ لٹکائے رکھتی تھی۔ لالہ آپی تو سنڈریلا تھی ہی لیکن اس کی زندگی کا پیدائشی مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ زندگی کے کسی بھی بدصورت پہلو یا انسان کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نرم خو اور رحم دل ہونے کے باوجود بس بدنمائی اور بدصورتی کی قربت اسے دے کا دورہ ڈال دیتی تھی۔ امیر کبیر گلزار بھائی چھوٹی عمر میں اس کا ہاتھ مانگنے پر مجبور بھی اس کا مس ایشیاء جیسا قد بت اور چہرہ دیکھ کر ہی ہوئے تھے۔ ماں تو میرے فالج زدہ منہ سے گرنے والی رالیں بھی اپنی ہی چنی سے صاف کرتی تھی لیکن اس کی اچانک موت کے بعد خوشبوؤں میں بھیگی نازک اندام آپی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مجھے اپنی محل نما کوٹھی کے ایک کمرے میں ڈال کر دو تین ملازم میری راکھی پر چھوڑ دے۔ کمرے کا ایک دروازہ بھی باہر نوکر کواٹروں میں کھلتا تھا۔ وہ میری ایک ہی آواز پر بھاگے بھاگے اندر آ جاتے تھے۔ میری زبان میں لکنت تو تھی لیکن دوسروں کو بات سمجھانا زیادہ مشکل نہ تھا۔ آپی اپنی دولت کے ذریعے مجھے ہر طرح کی تکلیف سے بچا کر رکھنا چاہتی تھی۔ یہ ایک بات کہ زندگی کی بھاگ دوڑ ہنگاموں نے میرے لیے اس کے پاس بہت کم وقت چھوڑا تھا، نہ نہ کرتے بھی پولیو کے بعد احساس جرم تو میرے وجود میں اسی دن سرایت کر گیا تھا جس دن مجھے یہ علم ہوا کہ اپنے جسم کی تمام فطری رطوبتوں اور غلاظتوں کا اخراج مجھے بستر کے اندر ہی اندر کرنا ہوگا اور وہ بھی کسی دوسرے کے رحم و کرم سے شروع میں ادھیڑ عمر عاشق

مسیح باجی سے حاصل کردہ بھاری تنخواہ کے عوض بیڈ پین اور پیشاب کی بوتل مجھے استعمال تو کروا دیتا تھا لیکن انہیں اوپر اوپر سے کھنگال کر غسل خانے میں اسی طرح پھینکتا کہ ساری فضا متعفن ہو جاتی۔ میں تو اپنی مکروہ زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ باہر سے آنے والے لوگ جب چند منٹ کمرے میں رک نہ سکتے تو مجھے اندازہ ہو جاتا کہ میرے کمرے کا ماحول دوسروں کے لیے قابل برداشت نہیں ہے۔ آپی کی کبھی کبھی آمد سے پہلے تو سارے لالچی ملازم کمرہ ہسپتال کے وی آئی پی روم کی طرح چمکا دیتے لیکن جتنے دن وہ نہ آ سکے، جی جناب جی، ہاں جناب کرنے کے علاوہ وہ مجھے پانی پلانے میں بھی گھنٹوں لگا دیتے تھے۔ ماں کی مشفق جھلکیاں تو جان کنی کے ان لمحوں میں بھی میرے دماغ میں جوں کی توں محفوظ ہیں۔ میرے منہ کے دائیں ٹیڑھے حصے کو اپنے ہاتھ سے کھول کر جب وہ نوالہ اس میں رکھتی اور چباتے چباتے جب وہ میری نیم مردہ براچھوں سے باہر گرنے لگتا تو وہ آبدیدہ ہو کر اپنی جھولی آگے کر دیتی۔ اس میں گرا بیلو میری جھولی میں سو دفعہ گرا میرا بچہ۔ وہ کہتی ملازم تو بھاری تنخواہوں کے باوجود مہینے دو مہینے میں آپی سے کہہ دیتے کہ میرے بوجھل وجود کو سدا صاف ستھرا رکھنا، سنبھال لینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ پندرہ ہزار روپے ماہانہ کا میل نرس بھی پانچ ہفتوں کے اندر اندر ہی یہ کہہ کر نوکری چھوڑ گیا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کمزور تھی اور مجھے ہلانا جلانا اس کے بس میں نہ تھا۔ انتہائی نگہداشت کمرے میں سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ ناک منہ پر جکڑی نالیوں کی وجہ سے بولنے سے معذور رہوں۔ چاک و چوبند نوجوان ڈاکٹر جب ہر طرح کی بھاگ دوڑ کے باوجود مجھے آہستہ آہستہ فنا کے سمندر میں اترتے دیکھتے ہیں تو اپنے کسی سینئر کے مشورے پر کچھ مزید ٹیکنالوجی مجھ پر لاد دیتے ہیں اور اس ناک منہ پر جڑی نالیوں اور ٹونٹیوں کی وجہ سے میں انہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ میں یخ بستہ پانیوں میں ڈوب رہا ہوں اور اس ڈوبنے کا احساس پرسکون ہے مجھے اپنی زندگی کی قید با مشقت سے آزاد ہونا چاہیے لیکن میری پیاری ماں جائی بہن؟ جن کے گلزار بھائی اپنے بڑے بڑے پلازوں کی کنسٹرکشن چھوڑ کر ہر برس پاکستان نہیں آ سکتے اور وہ اپنے پلازوں کے جھروکوں سے برستی اشرفیوں کی بارش میں میری بہن کو بھگوتے ہیں، میری وجہ سے بیچاری آپی پاکستان سے باہر بھی زیادہ نہیں جا سکتی لیکن شدید گرمی اور لوڈ شیڈنگ سے گھبرا کر وہ اپنی امیر کبیر سہیلیوں کے ساتھ گرمیاں اپنے ہی ملک کے پہاڑی علاقوں میں گھوم گھوم کر گزارتی ہے۔ اس بار بھی جانے سے پہلے مجھ سے کہتی تھی، بیلو تم چاہو تو میں تمہارا مری جانے کا بندوبست کر دوں۔ موت جوگے ملازم ہی آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتے۔ نہیں آپی آپ جائیں گھر جیسا آرام مجھے باہر کبھی نہیں مل سکتا۔ جنریٹر گزارہ چلا لے گا، میں نے حسب سابق حوصلے سے کہہ دیا تھا۔

میں جانتا تھا آپی بھی مجھے مری کی صدا صرف گونگلوؤں سے مٹی اتارنے کی خاطر دیتی تھیں۔ میں یہ بھی جان چکا تھا کہ اوپر والے نے میرے ساتھ بہت بڑا چھل کیا ہے۔ چرند، پھول، شجر حجر، دریا، پہاڑ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جن کے بدن مکمل ہوں جو اپنی غلاظتیں خود سنبھال سکتے ہوں۔ عناصر کا اتھاہ حسن مجھے صرف ٹی وی کی اس سکرین کے پیچھے سے جھانکتا تھا جو میرے بستر کے سامنے لٹکا دیا گیا تھا۔ میں نے تو چھک چھک کرتی دھواں اڑاتی ریل یا دم کے پیچھے سے دھویں کی لکیریں بنتے آسمانوں میں گم ہوتے جہاز کو بھی محض ٹی وی پر لگنے والی فلم کے ذریعے ہی دیکھا تھا۔ ان میں بیٹھ کر سفر کیسے کرتے ہیں، یہ تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس بار آپی کو گلزار بھائی نے دبئی میں اپنے کسی شاپنگ مال کے افتتاح کے لیے بلایا تھا۔ جانے سے پہلے وہ چاہتے تھے آپی ان کے شان و شوکت کا لطف ان کے ساتھ کھڑی ہو کر اٹھائے۔ علم نہیں تھا کہ پرانی شوگر کی وجہ سے میری انتڑیاں اچانک خون تھوکنے لگیں گی اور میری کال کوٹھڑی کا تالا کھول دیئے جانے کا فرمان جاری ہو جائے گا۔ چوکیدار نے کل مجھے بتایا تھا۔ جدے میں عمرے کے دوران آپی کو میری مخدوش حالت کا علم ہو چکا تھا۔ ہسپتال والوں کو ایڈوانس ڈالر بھیج دیئے گئے ہیں۔ عمرے کے سیزن کی وجہ سے انہیں جلدی سیٹ نہیں مل رہی۔ سیٹ ملتے ہی وہ واپس سیدھی میرے پاس چلی آئیں گی۔

''نگو'' کے بینوں کی آہستہ آہستہ ہسپتال میں پھیلتی آواز الہامی ہے۔ اس جیسی گرم و سرد چشیدہ ڈھیٹ عورت صرف اسی کے لیے بین

ڈال سکتی ہے جو واقعی دوسرے کنارے پہنچ چکا ہو۔ میں جانتا ہوں میرے لیے رونے پراسے اس کی ضروریات بھی مجبور کر رہی ہیں لیکن وقت رخصت اگر میں کہوں کہ میرے لیے بین ڈال کر رونے والی اس بے ہنگم عورت کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے تو وہ مبالغہ نہیں ہوگا۔

منکر نکیر لکھتے ہیں تو لکھیں۔اس کی ادا صرف بے نیازی نہیں ہے بے انصافی بھی ہے۔ جاتے جاتے ذہن کا جل بجھ جل بجھ حصہ بولتا ہے، اگر میں اپنے بدن کے زندہ متحرک حصے کے ساتھ لٹکتے بھاری مردہ ماس کو کاٹ کر الگ کر سکتا تو میں بھی اپنے آپ کو صاف ستھرا معطر رکھ سکتا تھا۔ پر اب جاتے جاتے کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی سرنگوں کرنے والے صحتمندوں اور مجھ جیسے کثیر التعداد کوڑھیوں کے درمیان بے وجہ ایک ناقابل عبور دیوار چین کھڑی کر دی جاتی ہے۔ہم بے گناہ زندگی کی رنگ پچکاریوں سے کھیلتے، محبتوں کے کھیل رچاتے لوگوں کو صرف دور دور سے دیکھ سکتے ہیں اپنی نحوستوں کی دیوار ٹاپ کر ان میں شامل نہیں ہو سکتے۔اسی قربت مرگ کے لمحے بھی مجھے یاد ہیں، آپی ایک بار میری شدید محرومیوں سے شرمندہ مجھے وہیل چیئر میں اٹیل کر رشتہ داروں کی شادی میں بھی لے کر گئی تھی ،ہجوم کو دیکھ کر میرے خون کا فشار تو جو بڑھا سو بڑھا، چچ چچ! ہائے ہائے! کرتے ترس کھانے والے میرے گرد یوں جمع ہونے لگے جیسے میں دنیا کا کوئی نواں عجوبہ تھا اس سے پہلے کہ میں وہاں دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا یا فرسٹریشن سے انہیں گالیاں دینے لگتا میں نے اسلم اور اللہ رکھے سے کہا مجھے فی الفور واپس گھر لے جاؤ۔۔۔

آخری ملازم سیف اللہ جب اپنی بھاری تنخواہ والی نوکری یہ کہہ کر چھوڑ گیا کہ باہر والا آدھا زندہ آدھا مردہ بدن تو ہمت کر کے صاف کر لیتا ہوں لیکن بھیا کی بیماری تو اندر سے ہی دن بھر بدبو چھوڑتی ہے، وہ نہیں سہاری جاتی۔

کھلتے بدن والی قد آور ''نگو'' چوڑی کافی دیر سے کوٹھی کی صفائی ستھرائی پر معمور تھی۔وہم کی حد تک صفائی پسند ہونے کی وجہ سے ''نگو'' کو بھاری تنخواہ دے کر آپی اس سے دن بھر جھاڑ دیو چے پھرواتی رہتی۔آپی کی کشادہ دستی کی وجہ سے اس کے سامنے سدھائے ہوئے جانور کی طرح دن بھر سٹ سٹینڈ میں مصروف رہتی تھی کیونکہ اس کے نشئی شوہر اور بچوں کا اس کے بغیر کوئی دوسرا کفیل نہ تھا۔

سیف اللہ کی شدید بدتمیزی کے بعد آپی نے بادل نخواستہ میری تمام ذمہ داری ''نگو چوڑی'' کے حوالے کر دی۔اس نے پہلے دن ہی اپنے دونوں مضبوط بازوؤں میں مجھے اٹھا کر مجھے بیڈ پین پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ہم عیسائی لوگ تو صدیوں سے آپ لوگوں کے گوموت سنبھالتے ہیں، آپ کی دفعہ مجھے کونسی موت آجائے گی۔جب یسوع مسیح خود کوڑھیوں کو سینے سے لگا سکتے ہیں تو مجھ کم ذات کا کیا نخرہ؟؟

وہ میری ہونق زندگی کا پہلا دن تھا جب مجھے میری غلاظتیں سنبھالنے والے ہاتھوں میں غصے اور جھنجھلاہٹ کا احساس نہیں ہوا۔وہ مجھے ایسی خوشدلی سے سنبھال رہی تھی جیسے کوئی ماں اپنے گندے بچے کو سنبھالتی ہے۔احتیاط سے بیڈ پین میرے نیچے رکھنے کے بعد اس نے منہ دوسری طرف کر کے ٹپے گانے شروع کر دیئے تھے۔

اس کی سنبھال میں توجہ اور شفقت تو تھی لیکن وہ میرے تکیے تلے پڑے نوٹوں پر اس طرح جھپٹتی جیسے چیل چھچھڑوں پر جھپٹتی ہے۔کیوں چھینتی ہو مجھ سے اتنے پیسے؟ شرم نہیں آتی میری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے۔۔۔؟

جناب عالی! اس کتے کی اولاد اپنے خصم ''سٹیفن'' کی خاطر بے غیرت ہوگئی ہوں۔ میں عشق نہ پچھے ذات میرے حضور! تین دفعہ تو نشے کے ہسپتال سے علاج کرا چکی ہوں اس بھڑوے کا۔آتے ہی دوبارہ لے جاتے ہیں اسے اس کے نشئی دوست سے زہر پلانے، آپ سے کیا پردہ مجھے تو ابھی ماہانہ تاریخیں بھی نہیں آئی تھیں جب میرا دل سٹیفن کی شربتی آنکھوں نے لوٹ لیا تھا۔ آپ معصوم کیا سمجھیں حضور میرے پیٹ کی خالی سیپی میں موتی بھی تو اسی کے وجود نے پروئے تھے نا۔۔۔اپنے ان تینوں پیاروں کے لیے ابھی تو صرف اپنی غیرت بیچتی ہوں کبھی جان بیچنی پڑی تو دریغ نہیں کروں گی۔ جناب آپ کی خیر خیرات جو بھی لے جاتی ہوں اسی سے دیا جلتا ہے میری اندھیری کوٹھڑی کا۔

''نگو'' چوڑی یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ میری قربت سے زیادہ تر دور بھاگنے والی آپی اپنی غیر موجودگی کی تلافی مجھ پر نوٹوں کی بارش برسا کر کرتی تھی اور وہ نوٹ ملازموں کو لٹیرنے کے علاوہ میرے کسی کام نہیں آسکتے تھے۔

''نگو'' مہترانی نے جب میرے بدن کا چارج سنبھالا تو میں انیسواں ٹاپ رہا تھا۔ آدھا چہرہ گھنے بالوں سے بھرا تھا۔ آدھے مفلوج حصے پر سوکھی پرانی گھاس جیسے بدرنگ بال اگ رہے تھے۔ انیس بیس کی عمر تک میں مرد کی مردانگی کے کسی بھید سے بھی واقف نہ تھا۔ چند مہینوں سے اپنے بے کراں بدن کی مالک مہترانی پیشاب کی بوتل میرے مضمحل مردانہ عضو کے ساتھ لگاتے لگاتے اسے اپنی کھردری انگلیوں سے سہلاتی تو اچانک ریڑھ کی ہڈی میں چالیس والٹ بلب جیسی ہلکی ہلکی شعاعیں جگنے لگتیں۔ نسوں کے مردہ جال میں توانائی کا لذیذ احساس، جاگ اٹھتا کیا کر رہی ہو بدتمیز، میں آہستہ سے بڑبڑاتا چاروں چک جہانگیر ہیں سرکار۔۔۔ وہ زور سے قہقہہ لگاتی۔۔۔ اپنے خاں صاحب کو میں نے مردوں میں سے ایک بھرواں مرد نہ بنایا تو ''نگو'' چوڑی نام نہیں۔ جو کچھ زندہ نہیں لگتا وہ بھی زندہ کر کے دکھاؤں گی ایک دن۔ وہ میری ڈانٹ سنی ان سنی کر کے ''نکا موٹا باجرہ ماہی وے'' گاتی ہوئی نکل جاتی۔ اور میں گھنٹوں لیٹا اس انوکھی روشنی اور توانائی کے بارے میں سوچتا رہتا جس کے بٹن مہترانی کے کھردرے ہاتھوں میں پوشیدہ تھے۔ کچھ ہی دنوں کے اندر اندر ''نگو'' نے مجھے اس گھڑی بھر کے تلذذ کا عادی بنا دیا تھا۔ میں صبح اٹھتے ہی بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگتا نوٹوں سے اس کی جھولی بھر دیتا جن سے وہ نشے کے عادی سٹیفن کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی اور مجھ پر اپنے ڈھیلے زنانہ بدن کے مزید بھید کھولنے لگتی۔ آہستہ آہستہ میرے اور پینتالیس سالہ ''نگو'' کے درمیان ایک باقاعدہ پوشیدہ رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ میرے بدن کے مردہ تودے میں زندگی کی چنگاری بھڑکانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ میری میلی کچیلی متعفن دنیا میں ایک عورت کے وجود کی وجہ سے رنگ کھلنے لگے تھے۔ پچھلی جون میں شدید گرمی اور لوڈشیڈنگ سے تنگ لالہ آپی نے جب اپنی امیر کبیر سہیلیوں کے ساتھ کوہساروں کا رخ کیا تو ''نگو'' کئی راتیں میری دیکھ بھال کے بہانے سرونٹ کوارٹروں میں بسر کرنے لگی تھی۔ دوسرے ملازموں کے سونے کے بعد وہ لوڈشیڈنگ کے گھپ اندھیروں میں میرے پاس آتی اور ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح مجھے اپنے بدن کی ہر نکڑ سے کھیلنے کی اجازت دے دیتی۔ کچھ دیر میں میں اپنے آپ کو اس کے اتھل پتھل ماس کے ڈھیر کا مالک سمجھنے لگتا۔ زندگی کے لذائذ کی معمولی سی جھلک نے بھی میرے اندر جینے کی امنگ پیدا کر دی تھی۔

ماں کی وفات سے لے کر ''نگو'' چوڑی کی میری زندگی میں آمد تک مجھے کسی ایسے انسانی لمس کا تجربہ نہیں تھا جس میں قبولیت یا ہمدردی کی کوئی معمولی سی چس بھی موجود ہوتی۔ وہ میلی تھی یا بدصورت، اس نے مجھے زندگی کے گلزار کی سحر انگیز جھلک دکھائی تھی انسان سے انسان کی جڑت کی اہمیت اجاگر کی تھی۔ ان دنوں میں اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

سٹیفن کا بدن نشے کی زیادتی کی وجہ سے برادہ بن چکا تھا۔ اس کی جوان بہن کی شادی کی تمام ذمہ داری اپنے بھائی اور بھابی پر ہی تھی۔ سٹیفن کو تو مصری ممی بنا کر ''نگو'' نے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ پر بھری برادری میں وہ اپنے نیم مردہ شوہر کی تھڑی تھڑی نہیں کرانا چاہتی تھی۔

سرہانے پڑے مانیٹر پر میرے دل کی جل بجھ جل بجھ لائنیں دیکھ کر ڈاکٹر لوگ دوبارہ ادھر ادھر بھاگنے لگے ہیں۔۔۔ ونٹی لیٹر۔۔۔ ونٹی لیٹر کی کھسر پھسر صاف سنائی دے رہی ہے۔ دسیوں بار ٹیلی ویژن پر اور میرے پاس آنے جانے والے دکاندار طبقے سے میں مرنے والوں کے آخری لمحات کا حال سن چکا ہوں دل بھلے جھٹکے کھاتا رہے۔ جب تک انسانی ذہن کی بستی گل نہ ہو موت جیت نہیں سکتی۔

میری ڈوبتی ڈوبتی بینائی کے باوجود میرے ذہن کی پھرکی جوں کی توں چل رہی ہے۔ سفید ریش ڈاکٹر نے مجھے دل کا جو ٹیکا لگایا ہے اس نے سانس ایک بار پھر رواں دواں کر دیئے ہیں۔

نند کی شادی کی فکر میں گھلی نگو نے اس رات میرے بدن کی مکمل مالش کے بعد ''مجھ سے مدد کی التجا اسی لہجے میں کی تھی

جیسے عورتیں اپنے کماؤ مردوں سے کرتی ہیں‘‘۔ میرے خاندان کی جوانی کے صدمے میں للّی کی شادی کی ذمہ داری کو بھی اچھی طرح پورا کرنا چاہتی ہوں، سٹیفن نامراد کو دنیا کے سامنے ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ کیا کہتے ہو میری سرکار؟؟؟؟

اس نے دھیرج سے میری قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ زندگی بھر قدم چومتی رہوں گی۔

’’لچی‘‘ میں ہنسا۔۔۔

میری سرکار آپ بھی کونسے کم لچے ہیں نہ آؤں تو آپ کو بھی اس لچ کی لگن لگی رہتی ہے۔ اب اس دربار سے اٹھ کر جاؤں بھی کہاں؟

سیاحت یا سیر کے لیے جاتے وقت آپی شاید میری خود اعتمادی بڑھانے کی خاطر اپنے پورے گھر کی چابیاں مجھے ہی دے کر جایا کرتی تھی۔ زیور، کیش تو زیادہ تر بینکوں میں ہی بند رہتے تھے۔۔۔۔ لیکن کمروں میں سجے نوادرات کی قیمت بھی لاکھوں سے کم نہ تھی۔ بہت زیادہ نہیں لیکن اپنی ضرورت کے مطابق آدھی رات برکت مسیح کے مشٹنڈے بھائی لے کر آؤ اور باقی ملازم جب گھری نیند سو جائیں تو گھر سے کچھ قیمتی اشیاء اٹھا کر لے جاؤ اور ان سے علی کی شادی کا بندوبست کر لو۔ میں نے گھر کی چابیاں اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ صبح ڈاکے ڈاکے کا شور پڑے تو تمہیں بھی موجود ہونا چاہیے۔ چیزیں احتیاط سے بیچنا کام پروگرام کے مطابق پورا ہو گیا۔ ڈاکے کی خبر سن کر پولیس آئی تو میری بے بسی دیکھ کر ملازموں سے گالی گلوچ کرتی رہی۔ میں نے تھانیدار کو کچھ پیسے دے کر آپی کے آنے تک کسی ملازم کو تھانے کچہری نہیں جانے دیا۔ ’’نگو‘‘ نے میری مردہ ایگو کو زندگی بخشی تھی۔ میری اپنی ہی ذات سے نفرت کو کم کیا تھا۔ سحر انگیز حقائق سے پردہ اٹھایا تھا۔ چند مہنگی اشیاء کی گمشدگی آپی کے لیے کسی بڑے خسارے کا باعث نہیں تھی۔ ’’نگو‘‘ کا اپنی برادری میں سرخرو ہونا میرے لیے باعث اطمینان تھا آپی واپسی پر پریشان تو ہوئی لیکن نقصان سے زیادہ اسے دکھ تھا تو میری بے بسی کا۔۔۔ شکر ہے بلوان بھیڑیوں نے تیرے کمرے کا رخ نہ کیا تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر سکتی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر آپی نے ’’نگو‘‘ سمیت ان تمام ملازموں کو نوکری سے فارغ کر دیا جنہیں وہ پیچھے گھر چھوڑ کر گئی تھیں۔ اگلے روز ’’نگو‘‘ مجھے داتا گنج بخش کے مزار کی طرح سر سے پاؤں تک چومتی۔ تشکر سے بھری مری زندگی سے غائب ہو گئی تھی۔ سٹیفن کی عزت کی خاطر اس نے میری ذات کی بھی بلی چڑھا دی تھی۔

میرے کمرے کی فضا ایک بار پھر گھٹن اور تعفن سے لتھڑ گئی۔ کسی اپنائیت بھری انسانی چھون کے بغیر میری فالج زدہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد لوتھڑوں میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ میرے آدھے زندہ حصے نے بھی مٹی سے مٹی ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے ایک آدھ بار اپنی بہن سے کہا بھی تھا کہ ’’نگو‘‘ کی طرح دل لگا کر مجھے کوئی نہیں سنبھال سکتا لیکن اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی تھی۔ میری آپی میری بہترین گاڈ فادر تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ’’نگو‘‘ کے چلے جانے کے بعد میری روح نے بھی ہفت آسمانوں میں اڑان بھرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آج وہ مجھے اندر آ کر ایک نظر دیکھنے کی خواہش میں صبح سے کئی دفعہ دھکے کھا چکی ہے۔ یہ انتہائی نگہداشت کا کمرہ ہے۔ وہ نہیں جانتی یہاں ڈاکٹروں کی مریض کے ساتھ خفیہ کارروائی میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا۔ یہ زندگی اور موت کے درمیان آخری یدھ ہے۔ باہر بین ڈالتی کالی پیلی چوڑی کیسے جان سکتی ہے کہ انتہائی نگہداشت کمرہ دراصل وہ ہیلی پیڈ ہے جہاں سے انسان کو اس کی آخری پرواز پر روانہ کیا جاتا ہے اور ہیلی کاپٹر کے ڈبل انجن کی آواز تو میرے دماغ کے پرخچے اڑا رہی ہے، اللہ کرے آپی کو آج ہی واپسی کی سیٹ مل جائے۔

☆☆☆

چکر

جتندر بلو

مستی چھائی ہوئی تھی اور خوشی کا عالم یہ تھا کہ نیند کے ساتھ میرا رشتہ بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ بار بار بند آنکھیں کھل کر اصرار کرتیں کہ بستر سے اٹھ کر میں اس ای میل (E-mail) کو پھر سے پڑھوں جو شام کو دہلی سے آیا تھا اور جسے میں کئی بار پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ لیکن دل تھا کہ کسی طور چین لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ بالآخر بستر سے چھلانگ لگا کر میں نے ای میل کا مضمون پھر سے پڑھا۔ عبارت مجھے قریب قریب یاد ہو چکی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا جملہ خود بخود ذہن میں ابھرتا چلا آیا اور میرے موٹے موٹے ہونٹ لگا تار مسکراتے رہے۔

اٹھارہ نومبر، دو ہزار دو۔

ڈیئر بمل،

میں لندن آ رہی ہوں، دسمبر کی اکیس تاریخ کو وہاں پہنچ جاؤں گی۔ ویزے کے واسطے پاسپورٹ داخل کروا دیا ہے۔ لیکن اس بار عقلمندی یہ بھی ہے کہ ملٹی پل ویزے (Multiple Visa) کی رقم بھر دی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میرے پاؤں میں پیدائشی چکر ہے۔ وہ ایک مقام پر ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ انڈیا سے چار پانچ ماہ باہر ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ فون پر اطلاع کردوں گی کہ کس ائیر لائینز اور کس فلائٹ سے آ رہی ہوں۔ لیکن اس بار ائیر پورٹ پر تم وقت سے پہنچ جانا۔ پچھلی مرتبہ کی طرح انتظار مت کروانا۔ یہ کرسمس اور نیا سال میں لندن میں منانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ نئے سال کی شام میں ٹرافلگار اسکوائر کا وہ نظارہ میں بھلائے نہیں بھولتی جب بگ بین (Big Ben) کا گھڑیال رات بارہ بجنے پر گھنٹے بجانا شروع کرتا ہے تو ہزاروں کی تعداد میں وہاں کھڑے لوگ اپنی شناخت، قوم، رنگ، نسل اور مذہب کو فراموش کر کے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں، چومتے ہیں اور صدق دل سے نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں۔ اس سمے مجھے ہر رنگ اور ہر مذہب کے لوگ ایک سے لگتے ہیں۔ پھر عوام کا رقص، شور شرابہ، جلتی بجھتی پھلجڑیاں، آتش بازیاں، رنگ برنگی روشنیاں الگ سے اپنا جلوہ پیش کرتی ہیں اور آسمان پر چراغاں ہو جاتا ہے۔ ان لمحات کو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہوں کہ وہ میری کتاب کا ایک اہم حصہ ہوگا۔

مضمون لمبا ہو گیا ہے۔ ائیر پورٹ پر وقت سے پہلے پہنچ جانا۔ پلیز انتظار مت کروانا۔

کئی سالوں کے وقفے کے بعد میں اپنے وطن عزیز گیا تھا۔ بھارت کے معاشرتی طبقوں اور عوام میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ نچلی سطح کے غریب غرباء مزید غریب ہو چکے تھے۔ جب کہ متوسط اور اونچے درجے کے طبقوں میں خوشحالی آئے روز بڑھ رہی تھی۔ میرے رشتے دار اور دوست احباب بھی اپنے رویوں کے ساتھ بدلے بدلے سے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ مغرب زدہ ہو چکے تھے۔ صرف لباس کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ انکے دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ بھی بدلا بدلا سا تھا۔ لیکن بعض دوست ایسے بھی تھے جو اپنی دیرینہ اخلاقی، تہذیبی اور سماجی روایات سے جڑے ہوئے تھے۔ ان میں میرا ایک دوست انور بلگرامی بھی تھا۔ اس نے میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کرنا چاہا تھا۔ لیکن میں نے شرکت کرنے سے معذرت چاہی تھی کہ میں اپنی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کہانی ساتھ لے کر نہیں آیا۔ لیکن میرا جگری دوست کہاں ماننے والا تھا۔ اس نے اپنے ایک بک شیلف میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک کتاب نکالی جو دھول سے اٹی پڑی تھی۔ پھر اسے جھاڑ پونچھ کر میرے سپرد کر دیا۔ وہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''پہچان کی نوک'' پر تھا۔ اب میرے لیے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، میں مقررہ دن

کے مقررہ مقام پر کتاب بغل میں دبائے وہاں پہنچ گیا۔ لیکن تقریب میں جانے سے پہلے میں نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں دو تین جام اس غرض سے چڑھائے کہ خود اعتمادی پا کر کہانی پڑھتے وقت گھبراہٹ سے دور رہوں۔

سامعین میں میرے آشناؤں اور دوستوں کے درمیان تارا بھی موجود تھی۔ اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ڈھیلا ڈھالا سا گھٹنوں کو چھوتا ہوا بسنتی کرتا۔ ویسی ہی کھلی کھلی سی جینز اور پیروں میں عام سی چپل۔ بال بکھرے ہوئے، سگریٹ کے کش پہ کش لیے جا رہی تھی۔ وہ بلگرامی کے قریبی دوستوں میں سے تھی۔ پتہ چلا کہ وہ فرانسیسی زبان کے ساتھ وہاں کے ادب اور کلچر سے بھی واقف ہے۔ ہندی زبان میں بھی رواں ہے اور اردو سے تو اسے دیوانگی کی حد تک عشق ہے۔ بلگرامی کے تعارف کرانے پر میں نے صدر محفل سے اجازت چاہی اور اپنی کہانی ''مسیحا'' پڑھنا شروع کی۔ اس کا مرکزی کردار ایک سنکی مصور تھا۔ وہ ملک ملک، شہر شہر اس غرض سے بھٹکتا پھرتا تھا کہ اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جس کی صورت میں اسے دنیا کے ہر شخص کی شکل دکھائی دے۔ وہ اس کا پورٹریٹ بنانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ آدمی بنیادی طور پر خود غرض ہے، کمینہ ہے، لالچی ہے، مطلبی ہے، سازشی ہے اور مادہ پرست بھی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انانیت کا مارا اور اقتدار کا بھوکا بھی ہے اور موقع ملنے پر ذاتی مفادات کی خاطر فاشٹ بننے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دیوانے کا جان لیوا خواب تھا جس کا پورا ہونا ناممکن سا تھا۔ لیکن مصور پکی دھن کا مالک تھا اور اپنی جستجو میں سرگرم عمل بھی، سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ تارا بھی ہر جملہ غور سے سن رہی تھی۔ جب کہانی کے اس موڑ پر پہنچا، جہاں مصور کا ایک ادیب دوست اسے سرراہ اچانک مل جاتا ہے۔ وہ مصور کو انتہائی لاغر ٹوٹا پھوٹا پا کر اور اس کے پریشان بال اور بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر افسردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن بیک وقت اسے مصور سے ہمدردی بھی ہو جاتی ہے۔ مٹھیاں بھینچ کر اپنی خفگی کا اظہار کرتا ہے:

''کب تک بھٹکتے رہو گے؟''

''جب تک سنبھلوں گا نہیں''۔

''کب سنبھلو گے؟''

''جب بھٹکنا چھوڑ دوں گا''۔

''تو پھر تم بھٹکنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔۔۔ ایک جگہ ٹک کر کام کیوں نہیں کرتے؟''

''تم واقعی تھرڈ ریٹ افسانہ نگار ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ حرکت زندگی ہے اور جمود موت''۔

میں نے اگلی سطر پڑھنے کو ابھی لبوں کو جنبش دی ہی تھی کہ سامعین میں سے ایک نسوانی آواز تالی کے شور میں ابھری، ''واہ۔۔۔ واہ''۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو وہ تارا تھی۔ تالی بجاتے ہوئے کہے جا رہی تھی، ''واہ۔۔۔ واہ۔ ہر ڈائیلاگ کہانی کی پرتیں کھولتا چلا جا رہا ہے۔ دونوں کردار خود کو واضح کر رہے ہیں۔ ایک کو تلاش رہے ہیں دوسرا اسے روکنا چاہتا ہے''۔

کہانی کے اختتام پر مصور تلاش بسیار کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اس کی خاطر اسے اتنی بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لیکن اسے ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے انجام سے پہلے ہی واقف تھا۔ کہانی ختم ہوئی تو اسے مجموعی طور پر سب نے پسند کیا۔ بعض معروف ادبی شخصیات نے اپنی دانست کے مطابق اپنے تاثرات بھی بیان کیے۔ چائے کے دوران تارا نے مجھ سے جاننا چاہا کہ اگر اس کہانی کا ہندی ترجمہ ہو چکا ہے تو اس کی ایک کاپی اسے عنایت کی جائے۔ اس لیے کہ وہ اردو اسکرپٹ پڑھ نہیں پاتی۔ لیکن زبان ضرور سمجھ لیتی ہے۔ وہ اس کہانی کو فرانسیسی زبان میں منتقل کرنا چاہتی تھی۔

''تمہارا بے حد شکریہ۔ کاپی تمہیں ہر حالت میں ملے گی، یہ کہانی بھارت کی ہر زبان میں موجود ہے۔ ترجمے کا کام ساہتیہ

اکادمی کی نگرانی میں ہوا تھا''۔

میرا دہلی میں جب تک قیام رہا، تارا سے کچھ سرسری اور کچھ تفصیلی ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک دوپہر کو ہم کناٹ پیلس کے نرولا ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ موسم گرم تھا۔ سورج تپ رہا تھا۔ ہوا بھی تھمی ہوئی تھی۔ میں تخ بیر سے دل بہلا رہا تھا جبکہ وہ گہری کالی کافی پی رہی تھی اور ساتھ میں پنیر پکوڑوں کی لذت اٹھا رہی تھی۔ پچھلی ملاقات کے دوران جب میں نے اسے ''مسیحا'' کا ہندی ترجمہ پیش کیا تھا تو اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے نہایت سنجیدگی سے پڑھے گی۔ کیوں کہ کوئی بھی رچنا ہو، اسے سننے میں اور خود پڑھنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ کہانی مجمع میں نہ سنانے کی چیز ہے اور نہ سننے کی۔ بلکہ اسے ذاتی طور پر پڑھ کر ہی اس کا ہر پہلو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ پلیٹ سے ایک پکوڑا اٹھا کر بولی۔

''کوئی بھی لیکھک اس سچ سے آنکھ نہیں چرا سکتا کہ اس کی رچنا میں اس کی سوچ کے اپنے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ تمہاری کہانی کا مصور اول نمبر کا قنوطی تھا۔ منفی سوچ رکھتا تھا۔ کیا تم بھی جیون کو اسی نظر سے دیکھتے ہو؟''

''نہیں تارا نہیں''۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

''آدمی خیر و شر کا پتلا ہے۔ مصور کی زندگی میں حالات کچھ ایسے رونما ہوئے تھے کہ وہ یکسر قنوطی بن گیا تھا۔ اس کے رویوں میں انسانی فطرت کے تمام منفی رنگ در آئے تھے''۔

وہ بامعنی مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں سے ہوتی ہوئی میرے اندرون کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنا زاویہ نگاہ پیش کرنا ضروری جانا:

''دیکھا جائے تو یہ سنسار بڑا سندر ہے۔ جیون انمول شے ہے۔ یگوں کے بعد منش جنم پاتا ہے۔ اسے اپنے علاوہ انسانیت کی بھی قدر کرنی چاہیے''۔

''بلکہ اسے بدلتی ہوئی اقدار اور حالات کے ساتھ خود کو بھی بدلنا چاہیے''۔

''ہاں، یہ ضروری ہے۔ ورنہ زندگی ایک ہی مقام پر ٹھہر جائے گی''۔

''بالکل''۔

میں نے ہر ملاقات میں اسے ملنسار، بلند ذوق اور دنیاوی معاملات میں باخبر پایا تھا۔ ہمارے درمیان دوستی کا پل مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ تارا نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ اس دیش کے نامور ہارٹ سرجن ڈاکٹر بسواس کی بیوی ہے۔ اس نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم پا کر کئی طبی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ راجدھانی میں ایک عظیم الشان ہسپتال، جس کی لاگت اربوں کھربوں روپے کی ہوگی وہ اسے ''تارا ہاسپٹل'' کے نام سے قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ دن رات اپنے پروجیکٹ میں مصروف اس کی تکمیل کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ لیکن جب کبھی وہ بیرون ملک کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کرتا ہے تو اسے بھی ساتھ لے کر جاتا ہے۔ مغربی دنیا اس کے نزدیک بلا کی کشش رکھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے بچپن سے جوان ہونے تک اپنے والدین کے ساتھ کئی ملک دیکھ چکی ہے اور یہیں سے اسے سیر و سیاحت کا بھرپور شوق پیدا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں میں چکر اس کی یوم پیدائش جنم کنڈلی اور اس کے ستارے کے تحت اتنا جڑا ہے کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے اس کے ہاں کوئی نیا ملک، کوئی نیا شہر دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔

''اچھا۔ اگر ایسا ہے تو باہر کی دنیا کا تمہیں خاصا تجربہ ہوگا، کبھی لندن آنا ہو تو ضرور ملنا''۔

''میں لندن دیکھ چکی ہوں۔ وہ شہر مجھے اچھا لگتا ہے اگر وہاں کبھی آئی تو ملاقات رہے گی''۔

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

حال ہی میں میری طلاق ہوئی تھی۔ پانچ سال، سات ماہ اور دس روز شادی شدہ زندگی کے ختم ہونے پر میں خوش نہ تھا۔

لیکن اس حد تک مطمئن ضرور تھا کہ جو خواہش گزشتہ کئی ماہ سے مجھے تڑپا رہی تھی، اسے عملی شکل دینے کا موقع مل گیا ہے۔ لیکن چند روز بھی نہ بیتے تھے کہ اکیلا پن مجھ پر سوار ہونے لگا۔ خاص طور پر شام کے وقت کام سے فارغ ہو کر جب میں گھر میں قدم رکھتا تو کمروں میں پھیلا ہوا سناٹا، کچن میں گہری خاموشی اور ویران دیواریں پریشان کرنے لگتیں۔ لیکن یہ احساس مجھے ضرور حوصلہ دیتا کہ زندگی کا اصلی سفر تو اب شروع ہوا ہے، جسے تن تنہا نئی شریک حیات کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں جولیا کی محبت میں سر سے پیر تک گرفتار تھا۔ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرتا جب میں اس کی دلکش شخصیت کے متعلق نہ سوچتا۔ یہی حال کم و بیش جولیا کا بھی تھا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ وہ عشق ہم دونوں کی زندگی کا پہلا عشق تھا اور ہم اتنے خوش تھے کہ خود کو ALPS پہاڑ کی برفانی چوٹیوں پر کھڑا پا رہے تھے۔ معاشی اعتبار سے ہم دونوں برسر روزگار تھے اور نامور کمپنیوں میں پیشہ ورانہ ملازمت کرتے تھے۔ وہ ایک انشورنس کمپنی سے منسلک تھی جب کہ میں ایک روزنامہ اخبار سے، وہ مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی خاتون تھی اور اونچے عہدے پر فائز تھی۔ لیکن اس نے مجھے ازدواجی زندگی کے دوران کبھی یہ احساس نہیں دلایا کہ میں اس سے کم تعلیم یافتہ ہوں اور اس کا کہا یا فیصلہ گھریلو معاملات میں زیادہ وزن رکھتا ہے۔ وہ انفرادی آزادی اور انسانی حقوق کی قائل تھی۔ جمہوری قدروں کی طرفدار اور پاسدار تھی۔ لیکن مجھے ایک خوبصورت سا گل گوتھنا بچہ چاہیے تھا۔ ایک ویک اینڈ کی پہلی شام میں میں نے جولیا کے گوش گزار کیا کہ پانچ برس تو ہم لوگوں نے ہنستے کھیلتے، قہقہے لگاتے اور مزے لوٹتے میں گزار دیے ہیں۔ اب ہمیں فوراً اپنی فیملی کو بڑھا لینا چاہیے۔ میں خود کو اور تم کو اس بچے میں دیکھنے کے لیے مر جا رہا ہوں۔ وہ میرا اندرون جان کر از حد سنجیدہ ہو گئی۔ بولی:

''ہمی، دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔ مگر چند مجبوریاں ہیں۔ ہم دونوں کام کاج والے ہیں۔ بچہ کون سنبھالے گا؟ اس کی پرورش کون کرے گا؟ بے بی سٹنگ اور نرسری میں اس کی دیکھ بھال کے لیے اونچے دام ادا کرنے پڑتے ہیں، خیر ہم دونوں کی آمدنی تو اچھی ہے اور ہم برداشت بھی کر سکتے ہیں۔

''تو پھر پرابلم کیا ہے؟''

''مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر کی جاب پروموشن کچھ دنوں میں ملنے والی ہے۔ فیصلہ ہو چکا ہے، دوسری بات جتنے بھی کمپنی ڈائریکٹر ہیں وہ سب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی جلد لڑھک سکتا ہے۔ پھر میں خود بخود ڈائریکٹر بن جاؤں گی''۔

گلاس ہمارے آگے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا سہارا لینا پڑا کہ مجھے اپنا دل اگلنا تھا۔

''تمہاری سوچ اپنی جگہ اور انتظار اپنی جگہ، مگر میں ایک بات کھلے لفظوں میں کہہ دوں کہ میں اولاد کے بغیر نہیں مرنا چاہتا، میں اس میں اپنا خون، اپنا وجود اور اپنی ذات دیکھنا چاہتا ہوں''۔

اس نے بھی ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھالیا:

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''تم کہہ سکتی ہو کہ ہاں''۔

''تو پھر تم کو بھی میرا فیصلہ جاننا ہوگا''۔

''میں سن رہا ہوں''۔

''میں ڈائریکٹر بننے پر ہی ماں بننا پسند کروں گی''۔

''ممکن ہے تب تک ہماری عمر اور بھی ڈھل جائے۔ پانچ، سات، دس برس؟ ممکن ہے اور زیادہ؟''

وہ سر کھجانے لگی۔ پھر انتہائی پیار سے مجھے دیکھ کر کہا:

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ میں تمہاری سوچ پر کوئی پہرہ بٹھانا نہیں چاہتی''۔
یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔
اس رات میں نے جولیا کو ٹوٹ کر پیار کیا تھا اور اسے منانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ سدا کی طرح مسکراتی رہی اور اپنے مخصوص انداز میں پیار کا جواب پیار سے دیتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی:
''تم اولاد کے لیے اتنے DESPRATE کیوں ہو؟''
جانے کیوں پرکھوں کا کہا اور منو کی لکھی ہوئی کتاب ''دھرم شاستر'' کا حصہ یاد آ گیا اور میں بلا سوچے سمجھے بول اٹھا:
''ہماری مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر مرد کنوارا مر جائے یا شادی کے بعد اس کے اولاد نہ ہو تو وہ اگلا جنم آدمی کی جون میں نہیں، کسی جانور کی شکل میں لیتا ہے''۔
یہ سننا تھا کہ جولیا نے اتنے زور سے قہقہہ بلند کیا کہ کمرے کی چھت اڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بمشکل ہنسی پر قابو پا کر بولی۔
''مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تمہاری سوچ ہے۔ تم پچھلے بیس بائیس برس سے (West) میں رہ رہے ہو۔ پڑھے لکھے ہو، کھلا ذہن رکھتے ہو مگر اب بھی پرانے زمانوں کے دقیانوسی یقین تمہاری سائیکی میں رینگ رہے ہیں''۔
''تم کچھ بھی کہہ لو لیکن سچ یہ ہے کہ میں اولاد کا منہ دیکھے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔ میں اس میں اپنی شکل، اپنی ذات دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ آگے چل کر میرے نام کو دنیا میں زندہ رکھے گا''۔
میرا واضح موقف جان کر وہ اس قدر سنجیدہ ہو گئی تھی کہ کوئی دوسری ہی عورت دکھ رہی تھی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی جانے کیا سوچ رہی تھی؟ میں وثوق سے کہہ نہیں سکتا۔ پھر یکبارگی اس کا چہرہ بامعنی مسکراہٹ سے منور ہو گیا۔ گویا اس نے چند ہی لمحوں میں آنے والی زندگی کا تعین کر لیا ہو۔ بڑھ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور اپنے لب میرے کان کے قریب لا کر آہستہ سے کہا:
''آج تم نے منطق کا دامن چھوڑ دیا۔۔۔ حیرت ہے؟ لیکن میں تمہاری خواہش کی قدر کرتی ہوں''۔ وہ مجھے گومگو کی حالت میں چھوڑ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔
کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب میں جولیا سے کبھی اشاروں میں کبھی ڈھکے چھپے جملوں میں اور کبھی براہ راست دریافت نہ کرتا کہ اس نے فیملی کو بڑھانے کی خاطر کیا فیصلہ کیا ہے؟ لیکن وہ ہاں ہوں کر کے خاموش ہو جاتی۔ کبھی مسکرا دیتی اور کبھی موقع پا کر موضوع بدل دیتی۔ میری خواہش ہر گزرتے دن کے ساتھ شدت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی اور میری آنکھیں اولاد کا منہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ ایک شام کام سے فارغ ہو کر میں گھر پہنچا۔ لاؤنج میں داخل ہو کر میں نے جولیا کو آواز دی۔ وہ مجھ سے پہلے گھر چلی آیا کرتی تھی۔ مسلسل آوازیں دینے پر بھی جب کوئی جواب نہ ملا تو اسے کمروں میں تلاش کیا۔ کھانے کی میز کے وسط میں میرے نام کا ایک لفافہ رکھا تھا۔
''بمی، کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تمہاری خواہش اور میرا فیصلہ آپس میں روز روز ٹکرائیں، تکرار ہو اور ہماری زندگیاں تلخ ہو کر اس گھر کو جہنم بنا دیں، بہتر یہی ہوگا کہ ہم الگ ہو جائیں۔ میں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ جلد ہی میرا سالی سٹر تم سے فنانس، بینک اکاؤنٹ، فلیٹ، مورگیج اور دیگر امور کے متعلق رابطہ کرے گا۔
میں آج بھی تم کو پسند کرتی ہوں۔ تم نیک سیرت شخص ہو۔ مخلص اور ایماندار۔ دوسروں کے کام آنے والے۔ مگر اب تم اپنی خواہش کے غلام بن چکے ہو، جبکہ میری منزل بالکل الگ ہے۔ گڈ بائے''۔
ہر شخص کے حالات ایک سے نہیں رہتے کہ وہ تغیر پذیر ہیں۔ آدمی سماجی، معاشی اور داخلی طور پر بدلتا رہتا ہے۔ تارا کے جیون میں بھی کوئی انقلاب آئے اور اپنی گہری چھاپ چھوڑ کر آئندہ کی تبدیلیوں کے لیے جگہ بنا گئے۔ اس نے کئی بار اپنے بدلتے

ہوئے حالات مجھے فون پر بیان کئے۔ کبھی ای میل کا سہارا لیا اور کبھی تفصیلی خط تحریر کیا۔ میری کہانی ''مسیحا'' کا ترجمہ فرانسیسی اخبار ''لافگارو'' کے ادبی حصے میں شائع ہوا تھا، اس کا تراشا پاکر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ کہانی کے حوالے سے اگلے شمارے میں چند تعریفی خطوط بھی شائع ہوئے تھے۔ تارا نے فون پر جب آگاہ کیا تو میں نے بے ساختہ اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے انٹرنیشنل رائٹر بنانے پر کیوں تلی بیٹھی ہے؟ دیر تک ہماری ہنسی ایک دوسرے کے کانوں میں مٹھاس چھوڑتی رہی۔ سات سمندر پار رہ کر بھی ہم قریبی اور پرخلوص دوست ثابت ہورہے تھے اور ہمارے درمیان عجیب سا تال میل پیدا ہورہا تھا جیسے ہم ہزاروں میل کی دوری کے باوجود بھی محسوس کر رہے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب وہ لندن آئی تھی تو میں ہی اسے ہیتھرو ائرپورٹ سے ہلٹن انٹرنیشنل میں لایا تھا (گو ٹریفک میں پھنس جانے کے کارن میں وہاں دیر سے پہنچا تھا) کمرے میں سامان رکھتے ہوئے تارا نے بتایا تھا کہ شام میں اس کا شوہر ویانا سے کانفرنس کے بعد سیدھا لندن پہنچ رہا ہے۔ ہمارے درمیان قریب قریب تین گھنٹے اپنے تھے۔ ہم نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ سماجی، سیاسی، ادبی اور نجی۔ میری طلاق کے تعلق سے اس نے صدق دل سے ہمدردی جتائی تھی۔ بلکہ افسوس بھی ظاہر کیا تھا کہ جولیا مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کے فیصلے پر تارا نے حیرت کا اظہار بھی کیا تھا کہ اس نے سماجی حیثیت کی خاطر اپنی کامیاب شادی قربان کر ڈالی۔ بات چیت کے دوران اس نے اپنے ناول کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ دن رات اس پر سنجیدگی سے کام کر رہی تھی۔ موضوع اس نے یہ بتایا تھا کہ ڈبلیو ایچ او (W.H.O) کے کئی اونچے عہدوں پر فائز آفیسرز انٹرنیشنل کمپنیوں سے سستی دوائیں بنوا کر افریقہ کے پس ماندہ علاقوں میں سپلائی کرتے ہیں اور یوں وہ کرپٹ آفیسرز اپنا بینک بیلنس بڑھا رہے ہیں۔ وہ دوائیں زیادہ اثر نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان قحط زدہ علاقوں میں اموات تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا؟

تارا واقعی سنیچر کے روز پاؤں میں چکر لیے پیدا ہوئی تھی۔ سنیچر دیوتا جو دیومالا میں شنی کے لقب سے جانا جاتا ہے، سوریہ اور چھایا کا بیٹا ہے۔ اکثر سیاہ فام گھوڑے پر سوار دکھائی دیتا ہے اور مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن مسلسل سفر اس کا مقدر ٹھہرا ہے۔ وہ تارا کے تن من پر یوں طاری رہتا کہ وہ زیادہ تر سفر میں ہی رہا کرتی۔ بعض دفعہ وہ اوب بھی جاتی مگر مختلف مقامات کی زیارت کرنا اس کا اولین مشغلہ تھا اور ہر تفریح کے بعد اسے روحانی مسرت بھی ملا کرتی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور تنہا اولاد تھی۔ اس کے والد ماجد ہند سرکار کے بزرگ سفیر تھے۔ جس کارن اس نے بچپن سے بالغ ہونے تک دنیا کی کئی راجدھانیاں دیکھ لی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے برس والد کے تبادلے پر ملک کے ساتھ راجدھانی بھی بدل جایا کرتی۔ ماسکو، لندن، تہران، پیرس اور اسلام آباد، وہ ان شہروں کے طول و عرض سے خوب خوب واقف تھی۔ اس کا بچپن پیرس میں گزرا تھا اور وہیں اس نے ابتدائی تعلیم بھی پائی تھی۔ وہاں کی معاشرت، ثقافت اور طرز زندگی نے اس پر اتنا اثر کیا تھا کہ وہ فرانسیسی زبان بھی روانی سے بولنے لگی تھی۔

تارا کی شادی ڈاکٹر بسواس سے دہلی میں، وہاں برسوں سے آباد بنگالی برادری کی موجودگی میں بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شہر کی برگزیدہ شخصیات، سرکاری عہدے دار، دانشور، ڈاکٹرز، تجارتی لوگ اور فارن سروس کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ لیکن بیاہ سے پہلے جن دنوں تارا کی کورٹ شپ ڈاکٹر بسواس سے چل رہی تھی اس نے ملاقاتوں کے دوران ڈاکٹر بسواس سے پہلے تو ہلکے ہلکے اشاروں میں، پھر علامتی انداز میں اور انجام کار کھلے لفظوں میں گوش گزار کیا تا کہ وہ ایک ہی مقام پر زیادہ دیر تک کر نہیں رہ پاتی۔ اسکا من اوب جاتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی ایک شخص کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکتی ہے۔ اور نہ ہی اس کے ساتھ دور دور تک قدم بڑھا سکتی ہے۔ کارن یہ ہے کہ وہ اس شخص کی دہرائی ہوئی باتیں، عادتیں، مشغلے اور رویے برداشت نہیں کر پاتی۔ تبدیلی چاہتی ہے۔ آدمی کو ماحول، اقدار، حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہیے۔ مگر سچ کا دامن وہ کبھی نہ چھوڑے۔ ورنہ روزمرہ کی یکسانیت اسے دیمک کی طرح چاٹ جائے گی اور پچھتاوا اس کا مقدر بن کر رہ جائے گا۔ بعض اسے نیم پاگل، سنکی اور بھانوری بھی

قرار دیتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر بسواس اسکی صاف گوئی، جرات اور بے باک رویوں پر مر مٹا تھا۔ جبکہ تارا سانولی رنگت کی معمولی شکل و صورت کی عورت تھی۔ مگر اس کی بڑی بڑی آنکھیں اتنے غضب کی تھیں کہ وہ بنگال کا جادو جگاتی تھیں اور آدمی ان میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ اس کا بدن بھی بڑا کسا کسا تھا، جس کا ہر حصہ مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ بذات خود تیز فہم، روشن دماغ اور حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتی تھی۔ ادب سے بھی اس کا لگاؤ گہرا تھا۔ اس نے بنگلہ زبان کی چند کہانیاں غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کر کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنالی تھی۔ ان اوصاف کے پیش نظر کوئی بھی سلجھا ہوا با ذوق شخص اس پر آسانی سے فدا ہو سکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر بسواس کیونکر بچ رہتا؟ اسے اپنی دلکش شخصیت، سماجی حیثیت، باعزت پیشہ اور خاندانی دولت پر اتنا غرور تھا کہ وہ تارا کو دنوں میں ہی رام کر لے گا اور وہ بے چین آتما ادھر ادھر بھٹکنا بند کر دے گی۔ جب وہ اس کے ہمراہ بیرون ملک میڈیکل کانفرنسوں اور سیمیناروں میں جایا کرے گی تو وہاں ڈاکٹروں اور سرجنوں کے لیکچر سن کر حیاتیاتی زندگی کے متعلق اس کا شعور مزید بڑھے گا۔ پھر اپنے دیش میں ہر ویک اینڈ پر جب وہ پارٹیوں اور کاک ٹیل پارٹیوں میں شامل ہوگی، کبھی اپنے کشادہ فلیٹ میں اور کبھی دوستوں کی رہائش گاہ پر تو یقیناً وہ ان کی آزاد سوچ سے متاثر ہوگئی۔ پھر جب وہ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں سرمایہ داروں کے درمیان بیٹھی ڈنر کرے گی اور کروڑوں، اربوں کی لاگت سے پرائیویٹ ہاسپٹل کھولنے کا منصوبہ جانے گی تو وہ اس کے ساتھ خود پر بھی ناز کرے گی۔ نیا ماحول، نئے لوگ اور نئی زندگی شرطیہ اسے راس آئے گی اور ماں بننے پر تو اس کی کایا ہی پلٹ کر رہ جائے گی۔ جب اسے احساس ہوگا کہ بال بچوں کے ساتھ عورت کی اصلی دنیا اس کا گھر ہی ہوا کرتا ہے۔ جسے وہ جنت بنانے میں کوشاں رہتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ڈاکٹر بسواس نے جن خطوط پر سوچا تھا یا تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا، وہ عملی صورت اختیار نہ کر پائے۔ اسباب واضح تھے کہ جب مخالف اور متصادم رویے آپس میں ٹکراتے ہیں تو میاں بیوی کے درمیان انجام اکثر جدائی، طلاق، جبر، گھریلو تشدد یا قتل کی صورت ہوا کرتا ہے۔ تارا اور بسواس کے درمیان بھی تلخی کے ساتھ اختلافات بڑھتے رہے۔ ایک شب ڈاکٹر نے ڈنر کے بعد تارا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے پیار کرنا چاہا۔ مگر اس نے رضامندی ظاہر نہ کی۔ بلکہ ڈاکٹر کا ہاتھ ہٹا کر دوٹوک لہجہ اختیار کیا:

"شادی سے پہلے میں تم کو پسند کرنے لگی تھی۔ مگر بیت جانے پر اب تم میرے لیے پرانے ہو چکے ہو۔ میں تم کو اندر باہر سے جان گئی ہوں"۔

"پھر؟"

"میں تبدیلی چاہتی ہوں"۔

ڈاکٹر سیانا تھا اور ہر سیانا آدمی دور کی سوچتا ہے۔ ڈاکٹر نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ یوں بھی وہ ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ تارا اس سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہے۔ اس کیا شکایات بھی بڑھ رہی ہیں۔ مگر وہ اس کی ہر شکایت کو سنی ان سنی کرتا رہا۔ اپنائیت سے بولا:

"یہ تبدیلی کل پر چھوڑتے ہیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

اگلی شام وہ لاؤنج میں خاموش بیٹھے دوردرشن کے چینل پر کوئی سنجیدہ ڈاکومنٹری دیکھ رہے تھے۔ پروگرام عورت ذات کی مظلومیت اور اس کی سماجی محرومی کے متعلق تھا۔ مرد ذات نے کتنی عیاری سے عورت کو کمزور جان کر اس کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھایا تھا اور اس کا جنسی استحصال بھی کیا تھا۔ بلکہ ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے آزادی سے بھی محروم رکھا تھا۔ مگر جدید دور میں عورت تمام BARRIERS کو توڑ کر اپنے حقوق طلب کر رہی تھی اور مرد بے چارہ پریشان تھا۔ میاں بیوی اپنی اپنی سوچ میں گم، نشہ آور مشروب کے گھونٹ بھرتے، گلاس بھی بدل رہے تھے۔ تارا محسوس کر رہی تھی کہ قدرت نے مرد کو جو مخصوص لنگ عطا کیا ہے، وہ اس کے ذریعے عورت کی جسمانی اور حیاتیاتی ضرورت پوری کرتا ہے اور اسی کے ذریعے آئندہ نسلیں وجود میں آتی ہیں۔ اگر قدرت اس پر مہربان نہ

ہوتی تو عورت اس سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھتی۔ دوسری طرف ڈاکٹر محسوس کر رہا تھا کہ عورت کی سب سے بڑی ضرورت مرد ہی ہے اور وہ ابد تک رہے گی۔ وہ اس کی صحبت کے بغیر نامکمل ہے۔ لیکن وصال کے دوران اگر مرد اسے کسی وجہ سے مطمئن نہ کر پائے تو وہ تبدیلی چاہتی ہے۔ وہ کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کرتی ہے۔ ڈاکو منٹری ختم ہوئی تو تارا کے کہنے پر ملازمہ نے کھانا پروس دیا۔ میاں بیوی نے کچھ کھایا، کچھ نہیں کھایا، پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر نے بڑھ کر اپنا بازو تارا کی کمر کے گرد پھیلا دیا۔ اس نے بھی اپنا بازو ڈاکٹر کی کمر میں ڈال کر رضامندی ظاہر کی اور یوں وہ جڑے ہوئے عالیشان خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے بڑے چاؤ سے کہا:

''ڈارلنگ، مجھے دو تین منٹ دے دو میں باتھ روم سے ہو کر آتا ہوں۔ بس گیا اور آیا''۔

لیکن ڈاکٹر نے لوٹنے میں سات آٹھ منٹ لگا دیئے اور جب وہ تارا کے قریب آیا تو الگ ہی شخص تھا۔ انار چہرہ، انگارہ آنکھیں، کھڑے بال اور سرخ گالوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے۔ بدنی کھیل شروع ہوا تو ڈاکٹر دیر تک تارا کا انگ انگ جھنجوڑتا رہا، چومتا رہا، چاٹتا رہا۔ اس نے تارا کے بدن پر جگہ جگہ دانتوں کے نشان بھی چھوڑے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر کا پیار کرنے کا ڈھنگ بالکل بدلا بدلا سا ہے۔ اتنے زور و شور سے اس نے کبھی پیار نہ کیا تھا اور نہ ہی اسے کبھی جانور کی طرح کاٹ کر اس کی ہر حس کو بیدار کیا تھا۔ وہ قوت مردانگی کا بھرپور اظہار کر رہا تھا۔ تارا حیران تھی اور پریشان بھی کہ ڈاکٹر میں یہ تبدیلی کیونکر چلی آئی ہے؟ دونوں معمول سے زیادہ دیر تک دنیا سے بے خبر خود میں مشغول رہے۔ وہ پسینے سے تر بتر تھے۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور بال یوں بکھر چکے تھے جیسے ہفتوں انہیں سنوارا نہ گیا ہو۔ ڈاکٹر کا سینہ پھل کر دوہرا ہوا جا رہا تھا اور وہ فخریہ انداز میں تارا کو دیکھ کر احساس دلا رہا تھا کہ اس نے تارا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فتح کر لیا ہے۔ وہ بھی خوش تھی کہ اس کے ہر انگ کا ہر مسام مدتوں بعد کھلا تھا۔ لیکن اس نے بستر سے چادر کھینچ کر اپنا جسم ڈھانپ لیا اور مضبوط لہجے میں کہا۔

''ڈاک میری پرابلم سیکس نہیں، کچھ اور ہے''۔

''وہ کیا ہے؟'' اس نے فتح کے نشے میں کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ آدمی کو ماحول، اقدار، حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیے۔ میں ایک سی زندگی جی نہیں سکتی۔ مجھے شروع میں تمہاری دنیا پسند آئی تھی۔ میں نے خود کو بدلا بھی تھا۔

''پھر؟''

''اب مجھے تبدیلی چاہیے''۔

ڈاکٹر نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے اپنا فخریہ لہجہ برقرار رکھا:

''آج کے بارے میں کیا خیال ہے؟۔۔۔ تبدیلی ضرور محسوس کی ہو گی تم نے؟''

''ہاں۔ لیکن میں کوئی NYMPHO نہیں ہوں، بیڈ روم میں داخل ہو کر تم نے دو تین منٹ کی اجازت چاہی تھی۔ مگر پلٹ کر آئے تو سات آٹھ منٹ بیت چکے تھے۔ اس دوران تم نے انٹراوینس (INTRAVENOUS) انجکشن لیا ہے۔ اس کا اثر جب تم پر ہو گیا تو تم نے میری طرف رخ کیا۔

ڈاکٹر کا ابھرتا ہوا سینہ یک بیک اندر کی جانب چلا گیا۔ چہرے کی سانولی جلد گہری ہو گئی۔ وہ بازی ہار چکا تھا۔ وہ قریب ہی رکھی ہوئی چمڑے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تارا اسے ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتی رہی۔ پھر چہرے پر حقارت ابھرتے ہی وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

اس رات وہ ایک ہی پلنگ پر سوئے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کی طرف پشت کئے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ لگتا تھا کہ ان کا تعلق ایک لمبے فاصلے میں بدل گیا ہے اور فاصلہ بھی ایسا کہ جو کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی

رہے گا اور ایک انجانے موڑ پر پہنچ کر ختم ہو جائے گا۔

صبح ڈاکٹر اپنے وقت پر اٹھا کہ اسے سرجری پہنچنا تھا۔ وہ وقت کا بڑا پابند تھا۔ تارا اس کے ساتھ ساتھ ہی اٹھ جایا کرتی تھی۔ پھر ڈاکٹر کے واسطے اس کی پسند کا بریک فاسٹ تیار کرتی، جسے ملازمہ پروس دیا کرتی تھی۔ لیکن اس صبح تارا کو آس پاس کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک دوبارا اسے آواز دے کر اٹھانا بھی چاہا مگر بے سود۔ وہ گہرے خراٹے لے رہی تھی۔ ڈاکٹر تیار ہوا اور ناشتہ کئے بغیر ہی سرجری کو چلا گیا۔ سورج کی تمازت بڑھی تو ملازمہ نے بیڈ روم میں داخل ہو کر تارا کو اٹھایا۔ اس نے غسل کے بعد سیر شکم ناشتہ کیا پھر ضروری سامان باندھا اور کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گئی۔

''بسواس۔ میں جا رہی ہوں سدا کے لیے۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ جو اہم باتیں میں لکھنے جا رہی ہوں ان سے تمہارے کان خوب خوب واقف ہیں۔ لیکن تم نے ان پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کیا اور نہ ہی ان کی اہمیت کو جانا۔ مجھے افسوس ہے تم نے اپنے ارد گرد جو دنیا بسا رکھی ہے، وہ شروع میں مجھے راس ضرور آتی تھی اور میں خوش بھی تھی۔ شعوری طور پر میں خود کو بدل بھی رہی تھی۔ لیکن ملک در ملک کانفرنسوں اور سیمیناروں میں جا کر اور وہاں مغربی ڈاکٹروں اور سرجنوں سے مل کر اور ان سے تفصیلی گفتگو کرنے پر یہ کھلا کہ وہ سب مغربی دنیا کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ وہ مستقل وہاں رہنا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں دولت کی بہتات ہے، تیسری دنیا کے ملکوں کا ذکر آنے پر ان کے چہروں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے اور وہ خاموش رہ کر یہ تاثر دیتے ہیں کہ انسانیت کی خدمت کرنا اور غریب غربا کا علاج کرنا عہد رفتہ کی کوئی حسین شے تھی۔ تمہاری کاک ٹیل پارٹیوں میں مجھے بہت کم ایسے لوگ ملے جو اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر سانس بھرتے ہوں۔ ورنہ بیشتر کے پاؤں اخلاقی پستی کی طرف جلد ہی پھسل جاتے ہیں۔ اور تب ان کے حریص، مصنوعی، گھناؤنے چہرے واضح ہو جاتے ہیں، رہے تمہارے قریبی اور وفادار دوستوں کے پاس وہی دہرائے ہوئے پٹے پٹائے لطیفے ہیں، فحش مذاق ہیں اور سستی باتیں ہیں۔ بعض کی تو نظر بھی میلی ہے۔ وہ میرے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں، جبکہ وہ شادی شدہ ہیں اور بال بچے دار بھی۔ میں تمہارے ساتھ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر جایا کرتی تھی۔ یقین جانو وہ مقامات مجھے ایک پل نہیں بھاتے۔ جہاں کا ماحول نمائشی ہو، لوگوں کی باتوں میں کھوکھلا پن ہو، جھوٹ ہو۔ ہر کوئی خود کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے اور منافق ہونے کا احساس دلائے، ان جگہوں کو مجھ جیسی عورت کیونکر پسند کرے گی؟ درحقیقت سچ تمہاری دنیا کے قریب سے نہیں گزرا اور میں سچ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم کو تمہاری دنیا مبارک ہو۔ تمہارے یار دوست اور تمہارا زیر تعمیر اسپتال بھی مبارک ہو۔ مجھے میری دنیا بلا رہی ہے۔ چونکہ میں خود تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں، میں تم سے روپے پیسے کی کوئی امید نہیں رکھتی۔ یوں بھی میرے والدین میرے واسطے اتنا کچھ چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں کہ وہ اگلے جنم میں بھی شاید ہی ختم ہو۔ آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ کل رات جو گھٹیا، ذلیل اور گھناؤنی حرکت تم نے کی ہے وہ بھلائے نہیں بھولے گی۔ انجکشن لیتے وقت تمہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا اور نہ تم نے سوچا کہ تارا تمہاری بیوی ہے؟ کوئی بازاری عورت نہیں؟ HELL WITH YOU

تارا

سال کی آخری شام ٹرافلگار اسکوائر اور اس کے گرد پھیلی ہوئی سڑکوں پر لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ سفید، پیلے، سانولے اور سیاہ فام لوگ ہر سو موجود تھے۔ سب کو انتظار تھا کہ کب سال رواں اپنا آخری لمحہ سال نو میں ضم کر کے نیا باب شروع کرتا ہے۔ تارا میری کمر میں بازو ڈالے مجھے گرفتار کئے کھڑی تھی۔ اندھیرا گاڑھا تھا۔ فضا خنک تھی اور ہوا سرد۔ لیکن چاروں طرف نگاہ دوڑانے پر بھی مجھے وہاں کوئی شخص ایسا دکھائی نہ دیا جو گرم کپڑوں میں ملبوس نہ ہو۔ سردی جب مجھے زیادہ پریشان کرتی تو میں بڑے کوٹ کی جیب سے ہپ فلاسک نکال کر وہسکی کے دو تین گھونٹ بھر لیتا اور پھر اسے تارا کی طرف

بڑھا دیتا۔ وہ ایک آدھ گھونٹ بھر کر جھرجھری لیتی اور پھر اس کی نگاہیں بگ بین (Big Ben) کے گھڑیال کی طرف اٹھ جاتیں، جو ہم سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہم نیشنل گیلری کی سیڑھیوں پر لوگوں میں دبکے کھڑے تھے۔ متحرک سوئیوں کا گلے ملنے کا وقت قریب ہی تھا۔ موسیقی جگہ جگہ سے ابھر رہی تھی۔ امڈتی ہوئی خلقت بے چین تھی۔ پھر وہ پل بھی آ گیا جب سوئیاں بارہ کے ہندسے پر پہنچ کر ایک اکائی کی صورت اختیار کر بیٹھیں اور گجر نے نئے سال کی آمد کا اعلان کر ڈالا۔ روشنیاں روشن ہوئیں تو ٹرافلگار اسکوائر کے اردگرد عمارتیں ساؤتھ افریقہ ہاؤس، کینیڈا ہاؤس اور نیشنل گیلری سب جگمگا اٹھے۔ شور و غوغا ایسا بلند ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ آکاش پر چراغاں ہو گیا۔ میں نے جھک کر تارا کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور اسے چوم کر نئے سال کی مبارک باد دی۔ وہ بے انتہا خوش ہوئی اور اسی جوش کے تحت اس نے اچک کر میرے گال پر جوابی حملہ کر ڈالا۔ پھر ہم لپٹے لپٹائے عوامی رقص کا حصہ بن گئے۔ لوگ پی پلا رہے تھے، لپٹ رہے تھے، رقصاں تھے اور شور مچا رہے تھے۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر عوام کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوئی تو ہمیں بھی خیال آیا کہ ہمارا بھی کوئی گھر ہے، جہاں پہنچ کر ہمیں دن بھر کی تھکان اتارنی ہے۔ تارا نے اسکوائر پر بھرپور الوداعی نظر ڈالی اور اسے خود میں اتار کر میرا بازو تھامے انڈرگراؤنڈ اسٹیشن کی طرف بڑھ گئی۔ مسافروں سے لدی گاڑی میں، ہم اپنے اسٹیشن پر بمشکل اترے اور قہقہے لگاتے راہگیروں کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور تارا کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ داخل ہوئی تو ابھی بلب روشن ہوا ہی تھا کہ تارا نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور صدقِ دل سے کہا:

''بمل، آج میں اتنی خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی۔۔۔ اب میں دن بھر کا ہر واقعہ، ہر منظر اپنی کتاب میں لکھ سکتی ہوں۔۔۔ یوں تو میں یہ نظارہ اکیلی بھی کر سکتی تھی۔ لیکن عورت اکیلی ہو تو گدھ اس کے اردگرد منڈلانے لگتے ہیں''۔

''آج میں بہت خوش ہوں کہ تم میرے ساتھ تھیں۔ ورنہ میں ایک عرصے سے اکیلا ہی بھٹکتا پھر رہا تھا اور دنیا تاریک سی لگنے لگی تھی''۔

وہ بالکل میرے جسم سے لگ گئی۔

''آج دن بھر ہم ساتھ رہے ہیں۔ تمہارا احسان تو چکانا ہو گا؟''

اس کی آنکھوں کی تحریر کو پڑھ کر میں نے اگلا پل ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فوراً ہی اسے اٹھا کر بانہوں میں بھر لیا اور سیدھا بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

نئے سال کی پہلی شام میں تارا کی فلائیٹ یوگینڈا کے شہر کمپالا کے لیے بک تھی۔ ہم دیر سے اٹھے تھے۔ لیکن اس کے باوجود تارا نے دوپہر کا کھانا تیار کر لیا تھا۔ مجھے ایک طویل عرصے کے بعد ایک ہندوستانی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پچھلے آٹھ دس دنوں سے نصیب ہو رہا تھا اور میں خوش تھا۔ وہ جب سے آئی تھی، اس نے کچن پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ طرح طرح کے لذیذ کھانے بنا رہی تھی۔ میں جب کبھی کچن میں داخل ہو کر مدد کرنا چاہتا وہ دہلیز پر ہی میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی اور کندھے اچکا کر ایک ادائے خاص سے کہتی: ''ہمارے پرکھوں نے جب ''دھرم گرنتھ'' لکھے تھے تو گھر کا چولہا اور رسوئی ناری کے نام لکھ چھوڑا تھا، بولو اب کیا کہتے ہو؟''

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش ہو کر اسے دیکھتا رہا، یہ سوچتے ہوئے کہ اس عورت کے ہاں سچ کے ساتھ علم کا خزانہ بھی موجود ہے۔

ہم کھانے کی میز پر بیٹھے مچھلی کے خوش ذائقہ قتلے چکھ رہے تھے۔ اس نے کاڈ مچھلی کو بیسن، انڈوں اور مسالوں میں گھول کر تل لیا تھا۔ پھر کھاتے وقت وہ جس ڈھنگ سے ان قتلوں کے ساتھ انصاف کر رہی تھی، وہ اپنی جگہ کمال تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ بنگالن ہونے کے کارن وہ مچھلی کی دلدادہ ہے۔ مجھے اس کی موجودگی اپنے گھر میں نہایت بھلی لگ رہی تھی۔ دل نے چاہا کہ وہ چند دن

مزید رک جائے اور ہم اسی طرح کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کو مزید جان کر وقت گزار دیں۔ کچھ دیر میں جب اس کی پلیٹ قریب قریب خالی ہو چکی تھی تو میں نے دھیرے سے کہا: ''تارا پلیز، آج مت جاؤ، کچھ دن اور رک جاؤ''۔

وہ میرے غیر متوقع سوال پر چونک اٹھی۔

''اگلے ہفتے چلی جانا''۔

اس بار اس نے مجھے نہایت غور سے دیکھا کہ میرے من میں کیا ہے اور میرے سوال کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ میری التجا کا بھرم رکھے گی مگر اس کا جواب انکار میں تھا۔

''نہیں، بمل، میرا آج شام میں کمپالا جانا نہایت ضروری ہے۔ کل ڈبلیو، ایچ، او (WHO) کے چند ذمہ دار نمائندوں سے ملنا ہے۔ وہ مجھے اس ادارے کے کرپٹ آفیسرز اور ویسٹرن کمپنیوں کے متعلق اہم معلومات مہیا کرنے والے ہیں۔ ورنہ کتاب ادھوری رہ جائے گی''۔

''ہاں، یہ تو ہے''۔ میں چاروناچار پلیٹ پر جھک گیا۔

''مگر اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟ میں ملٹی پل ویزا لے کر آئی ہوں۔ کبھی بھی تمہارے پاس آسکتی ہوں''۔

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں'' میں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''اب میں ڈاکٹر سے آزاد ہو چکی ہوں لیکن میرے پاؤں کا چکر ابھی ختم نہیں ہوا''۔

یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔ پھر اپنا اندرون سنجیدگی سے واضح کیا:

''اس کم بخت چکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے اور تنگ بھی، جانے یہ کب، کہاں اور کس صورت میں ختم ہوگا؟ مگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو میں اس کے بغیر ادھوری ہی ہوں''۔

تارا مجھے نوے لاکھ باسیوں کے شہر میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک ہی چھت کے نیچے دس روز تک اکٹھے رہتے رہتے میرے ہاں جینے کی بھرپور تمنا جاگ اٹھی تھی۔ خاص طور پر نئے سال کی پہلی رات میں، جب تارا خود سپردگی کے عالم میں پیش پیش تھی اور میں بھی مدت سے عورت کے نرم گرم جسم سے محروم تھا۔ اس نے جسمانی وصال کے دوران میرا کان ہلکا سا کاٹ کر سرگوشی کی تھی:

''بمل، تم واقعی ذات کے اصلی پنجابی ہو''۔

میں بے ساختہ ہنس دیا تھا اور اپنے متحرک بدن کو قدرے روک کر سرگوشی کی تھی:

''یہ سب تمہاری صحبت کا اثر ہے۔ پھر تمہارے ہاتھوں کے بنے پکوان کھا کھا کر جوانی لوٹ آئی ہے''۔ جسموں کے ساتھ قہقہے بھی مدغم ہو گئے پھر بدن جاگ اٹھے اور قہقہے دب کر رہ گئے۔

میں جانتا تھا کہ تارا کے جانے کے بعد گھر کی برہنہ دیواریں مزید ویران ہو کر مجھے اپنے حلقے میں لینا شروع کر دیں گی۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس کی روانگی میری آتما میں دو تین نہیں تو ایک آدھ چھید ضرور کر جائے گی اور وہی ہوا۔ تقریباً ہر شام گھر لوٹنے پر جب میں اس امید پر کمپیوٹر کھولتا کہ تارا نے دنیا کے کسی کونے، کسی خطے کسی شہر سے چھوٹا بڑا، ای میل ضرور بھیجا ہوگا۔ لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ فون کی جواب دہ ریکارڈنگ مشین بھی خاموش تھی۔ موبائیل کا تو ذکر ہی کیا؟ لیکن وقت جب ہفتوں میں بدل کر آگے بڑھ گیا تو دھیرے دھیرے میری ذہنی حالت بھی بدلتی چلی گئی اور میں محسوس کرنے لگا کہ تارا تو ایک گھنی بدلی تھی جو میرے دل و دماغ پر جم کر برسی اور چپکے سے آگے بڑھ گئی۔ لیکن جانے کیوں میرے من کے کسی کونے میں یہ یقین بھی بیٹھ چکا تھا کہ وہ کہیں اٹک کر رہ گئی ہے اور مجھ تک نہ پہنچنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ایک شام میں اخبار کا کالم ختم کر کے دیر سے گھر پہنچا۔ کمپیوٹر چند

دنوں سے بند پڑا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن وہسکی پیتے وقت جب نشہ وسعت پیدا کر کے میرے جذبات کو بیدار کرنے لگا تو تارا چپکے سے میرے ذہن میں کنڈلی مار کر آن بیٹھی۔ چند گھونٹ اور پیئے تو تارا نے سرگوشی کی:

''بمل اٹھو، جا کر کمپیوٹر کھولو۔ تمہارے نام کچھ آیا ہے وہاں''۔

جھٹ سے گلاس کو ایک طرف رکھ کر میں اٹھا۔ کمپیوٹر کھول کر ای میل کا ان باکس چیک کیا۔ واقعی تارا وہاں موجود تھی۔ تین روز سے اس کا پیرس سے بھیجا ہوا ای میل میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں حواس باختہ ہو گیا اور اسی عالم میں ای میل کا متن پڑھنا شروع کیا۔ مگر سطریں اور الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔ حواس جب درست ہوئے تو نظر اور دماغ نے اپنا کام شروع کیا۔

ڈیئر بمل۔

کمپالا جس مقصد سے آئی تھی۔ وہ دنوں میں ہی پورا ہو گیا تھا۔ ڈبلیو ایچ او کے نمائندے مددگار ثابت ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس ریکٹ کو دنیا کے سامنے لا کر مکار افسروں کو بے نقاب کیا جائے۔ میں پیرس جانے کو تیار بیٹھی تھی کہ سوڈان میں ڈارفور قحط کا قصہ چل نکلا۔ وہاں مدت سے آباد عرب مسلمان مقامی قبیلوں کے مسلمانوں کو صرف قتل ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کی زمینیں، ان کی آبادیاں اور ان کے گھر بھی جلا رہے تھے۔ میں یو این (UN) کے چند ذمہ دار لوگوں کے ساتھ وہاں کیمپ میں مدد کرنے کو چلی گئی۔ لیکن وہاں بھوکی، ننگی، کچلی ہوئی مخلوق کے لیے نہ تو پانی تھا، نہ روٹی، نہ کپڑا اور نہ ہی دوائیں۔ پھٹے پرانے خیموں میں پڑے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں کنبے خاموش آنکھوں اور سلے ہوئے ہونٹوں سے آکاش کو ہر دم دیکھا کرتے۔ لیکن جب گھڑگھڑاتے ہوائی جہاز یا ٹرکوں کی آواز فضا میں ابھرتی تو ہر کوئی کھانے کے پیکٹ اور پانی کی خاطر گرتا پڑتا دوڑتا دکھائی دیتا۔ ان زندگی نکلے عوام کی بھگدڑ اور بھیڑ دیکھ کر بھگوان سے میرا وشواس اٹھ جایا کرتا اور میں پربھو سے پوچھا کرتی کہ اس کی دھرتی پر اس کے پیدا کیے ہوئے بندے دانے دانے کو محتاج کیوں ہیں، کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ کیوں رہے ہیں؟ لیکن پربھو خاموش رہتے۔ اس سمے تم مجھے بے حساب یاد آتے۔ اس لیے کہ سنسار میں اب صرف تم ہی رہ گئے ہو، جس کی طرف میں بلا سوچے سمجھے دیکھ سکتی ہوں اور تم کو یاد بھی کر سکتی ہوں۔ میں نے دس روز جو تمہارے ساتھ گزارے تھے وہ میرے جون کے انمول دن تھے۔ اس کی اہم وجہ یہ بھی رہی کہ نئے سال کی آخری رات یا پہلے ابھرتے دن میں، جب ہم نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا تو تم چاہت بھرے ایک انوکھے موڈ میں تھے اور میری کیفیت بھی بدلی بدلی سی تھی۔ آتماؤں کے ملاپ کے دوران وہ ایک دوجے کو زیادہ سے زیادہ پہچان رہی تھیں۔ آخر میں تم نے مجھ میں وہ بیج چھوڑا تھا کہ اب تم اپنی اولاد کا منہ دیکھے بغیر اپنے پربھو کے پاس نہیں جاؤ گے۔ دوسرا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ خوشیاں مناؤ کہ تمہاری جون سپھل ہو گئی ہے۔ تمہاری اولاد اب دنیا میں تمہارا نام چھوڑ کر جائے گی۔ رہا میرے پاؤں کا چکر تو اسے ہمارے بچے کی پیدائش پر ختم ہی سمجھو۔ مجھے اپنے پہلوٹھی کے بچے کے پالن پوشن اور دیکھ بھال میں اپنا پورا جیون تج دینا ہو گا۔ تم کو بھی اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہوں گی۔ میں جلد لندن آ کر تمہارے پاس کچھ دن رکوں گی۔ مگر ہمارا وارث ہماری جنم بھومی بھارت میں جنمے گا۔ اور تمہارا وہاں موجود ہونا ضروری ہو گا۔ یہ سب قسمت کا کھیل ہے اور اس پر ہم بندوں کا کوئی اختیار نہیں۔

میں ای میل پڑھتے پڑھتے چھلانگیں لگا رہا تھا۔

☆☆☆

کب ٹھہرے گا دردِ اے دل!

حسین الحق

شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا۔اور پھوپھی بچوں میں محو تھیں۔۔۔۔ چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات۔۔۔

''پھوپھی۔اب سو جایئے۔سب لوگ سو چکے''۔

''ارے بٹی۔میں بخت ماری تو کب کی سو چکی ہوتی، پر بچے سونے دیں تب نا''۔

''پھوپھی''۔شباہت آہستہ سے بولی۔

''سب بچے سو چکے''۔

''ایں''۔پھوپھی نے چونک کر بچوں کو دیکھا اور خود ہی ہنس دیں۔دھت تیرا بھلا ہو، میری بھی مت ماری گئی''۔

پھر پھوپھی نے لحاف سر تک کھینچ لی۔۔۔شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی دس بج چکے تھے۔دسمبر کی آخری تاریخوں کی کٹ کٹاتی سردیاں اور اس پر بارش کا زور۔شباہت نے کان لگائے۔چاروں طرف برف آلود ہواؤں کی سائیں سائیں اور زوردار بارش، بجلی اور گرج کے ساتھ۔اس نے ہمت کر کے ذرا سی کھڑکی کھولی۔۔۔

باہر چاروں طرف دور دور تک چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات۔۔۔اس نے پھوپھی کی طرف دیکھا۔وہ نیند میں رو رہی تھیں۔شباہت نے ہڑبڑا کر کھڑکی بند کر دی اور لحاف کے اندر گڑ مڑا کر دوہری ہوگئی۔خوف کی ایک تیز لہر اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی تھی۔پتہ نہیں نیند میں رونے والے کے اندر سے جو دوسرا آدمی نکل آتا ہے اس کی کیا جون ہو۔اس نے آنکھیں بند کر کے بے خیال ہونا چاہا تو پھوپھی کی آواز سنائی دی۔چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

اور پھر تمام رات وہ سو نہ سکی۔

ذرا سا نیند کا جھونکا آتا اور پھر جیسے چونک کر وہ جاگ پڑتی۔رات بھر بھیانک خواب اسے پریشان کرتے رہے۔ایک سجی سجائی دلہن، ایک لاش کے پاس۔پھر اس لاش اور سجی سنوری دلہن کے چاروں طرف آگ کے بلند شعلے، وہ چونک کر جاگ پڑتی۔درود پڑھ کر اپنے کو دم کرتی۔اٹھ کر بچوں کو دیکھتی۔پھر ہواؤں پر کان لگاتی۔وہی چھاجوں برستا پانی۔۔۔پھر کسی طرح سونے کی کوشش کرتی۔۔۔نیند کا ایک جھونکا۔آگ میں گھری دلہن کا چہرہ۔۔۔پانچ برس کی معصوم بچی۔بے تحاشا مار کھاتے ہوئے اور روتے ہوئے۔۔۔لبنان میں اپنے ماں باپ بھائی بہن کی بمباری میں جلی لاشوں کے پاس بیٹھا ایک معصوم۔۔۔سجی سنوری دلہن لاش کے پاس خموش۔۔۔ایس! دلیس! ساری رات وہ سوتی رہی اور جاگتی رہی۔۔۔وہی چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

شباہت کبھی اپنے بارے میں سوچتی کبھی اس کے بارے میں۔درد ایک ایسا جھرنا بن چکا تھا جس کا پانی ہوا کے جھونکوں سے چاروں طرف جھوم جھوم کر گرتا ہے۔اسے پھر وہ یاد آئی۔راگنی! اس کی دوست اور خود شباہت۔۔۔دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا۔ایک ساتھ میٹرک سے بی اے تک۔۔۔اور اب!

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔۔۔کیسا تڑپ کر اس نے دیکھا تھا۔جیسے ڈوبنے والا آخری مرتبہ پانی

کی سطح سے دنیا کو دیکھتا ہے۔

''انکل، اس کو بچا لیجیے انکل!''

''بٹی، پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے''۔

''مگر اس کا قصور کیا ہے؟''

''تم خوش نصیب ہو بٹی۔ ہم اس سلسلے میں بدقسمت ہیں''۔

وہ انکل کے کندھے سے لگ کر سسک سسک کر رو پڑی۔ سوال راجستھان کی راجپوت پرمپرا کا تھا، سب کچھ اس کے سامنے ہوا۔ راگنی کا شوہر اسے بہت چاہتا تھا۔ مرنے لگا تو خاص طور پر وصیت کی۔۔۔ ''راگنی کو ستی کرایا گیا تو میری آتما بے چین رہے گی''۔ مگر سوال بیٹے کی آتما کے بھٹکنے کا نہیں تھا۔۔۔ سوال پرمپرا کا تھا۔ شباہت نے ری ایکٹ کیا تو راگنی کے پتاجی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''بٹی تم مہمان ہو میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ یہاں کوئی بھی تمہارے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی کرے''۔

کبوتر حسرت سے دیکھتا رہتا ہے اور چیل اس کا بچہ لے جاتی ہے۔

چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

ساری رات اسی عالم میں گزری۔ جانے وہ کب سوئی کب جاگی!

یہ اس رات کی واردات تھی جس رات راگنی نے عام معمولی لڑکی سے ستی ماتا تک کا سفر کیا!

جو کچھ ہوا وہ شباہت کے لیے انتہائی ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے نہیں کہ راگنی اس کی دوست تھی بلکہ اس لیے کہ کچھ دن پہلے ہی دکھ اسے بھی دھجی دھجی کر چکا تھا۔ راگنی والا حادثہ اس کی عدت ختم ہونے کے ٹھیک تیسرے دن ہوا اور وہ اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ''کاش راگنی شباہت ہوتی''۔

اس سے اس کے اندر ایک بہت منہ زور خواہش نے سر اٹھایا تھا، مگر وقت تو اس کے ہاتھوں سے پہلے ہی پھسل چکا تھا۔ افسوس! اگر اس کا ذرا بھی اندیشہ ہوتا تو وہ راگنی سے زبردستی لکھوا کر رکھ لیتی۔ مگر اس کے شوہر کی وصیت نے اسے مطمئن کر دیا۔ اس کا کسے پتہ تھا کہ معاملہ شوہر اور بیوی کا نہیں دراصل سماج کا ہوتا ہے!

ایسی ہی اوٹ پٹانگ فکروں میں دن پر دن بیتتے رہے۔ ہر رات بچوں کی پسند پر پھوپھی شروع کرتیں۔۔۔ چھاجوں برستا پانی۔۔۔ اور ہر رات شباہت کی نیند اچٹ جاتی اور ہر دن اوٹ پٹانگ کی فکروں میں بیت جاتا۔

اور تب کہیں جاگتی راتوں اور سلگتی دوپہروں کے بعد ایک صبح عجیب سی بات ہو گئی۔ اس کا دیور انتخاب احمد بغیر پکارے اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ کسی کے کمرے میں بھی کوئی صبح سویرے بغیر پکارے نہیں جایا کرتا۔ اس نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ ''ارے تم بغیر پکارے کیسے چلے آئے؟''

''آپ کے کمرے میں کوئی مرد تو نہیں!'' انتخاب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''یعنی شخصی آزادی کے لیے عذر کا ہونا ضروری ہے؟'' اس کے من میں ایک عجیب سے سوال نے سر اٹھایا۔ اس روز تمام دن وہ بے چین رہی اور انتخاب کا جملہ بار بار یاد آتا رہا۔ ''آپ کے کمرے میں کوئی مرد تو نہیں!''

اور اس رات مہینوں بعد پہلی مرتبہ اس کا دھیان اپنی دیورانیوں کے کمروں کی طرف گیا۔ ان کے کمروں سے سرگوشیاں ابھر رہی تھیں۔۔۔ بیچ بیچ میں بھنچی بھنچی ہنسی۔۔۔ دسمبر کی سرد رات میں اسے شدید گرمی کا احساس ہوا۔ ایسا لگا کہ اس کے بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں یا جیسے کسی نے دونوں کانوں کی لویں پکڑ کر زور سے مسل دی ہوں۔ اس نے ہڑبڑا کر لحاف بدن پر سے

پرے پھینک دیا۔اور تبھی پھوپھی کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات''۔
اس کا جی چاہا کہ وہ پھوپھی سے پوچھے۔۔۔مگر تبھی اسے یاد آیا کہ پھوپھی سو رہی ہیں۔
پھوپھی گہری نیند سوتی رہی اور وہ جاگتی رہی اور رات رات بھر اوٹ پٹانگ خواب اسے پریشان کرتے رہے۔۔۔
زندگی کے وہ سہانے دن جو انتساب احمد کے ساتھ بیت گئے۔لپ چھپ کرتے آتے رہے اور جاتے رہے اور ایک عجیب ساررومانی حزن مسلسل اس کے چاروں اور جھوم جھوم کر برستا رہا۔اٹھارہویں برس اس کی شادی ہوئی اور چوبیسویں برس وہ بیوہ ہوگئی۔ان چھ برسوں میں انتساب احمد نے اسے ٹوٹ ٹوٹ کر پیار کیا۔دونوں کے پیار کی نشانی اس کے بچے سامنے پلنگ پر سوئے تھے اور وہ جاگ رہی تھی۔
شباہت کیوں جاگتی رہتی ہے؟ آخر اس کا مسئلہ کیا ہے؟ انتساب احمد کے والدین نے اسے اپنی مرحوم اولاد کی نشانی سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔گھر میں جیسا دوسرے کھاتے ویسا ہی وہ کھاتی جیسا دوسرے پہنتے ویسا ہی وہ پہنتی۔جن اسکولوں میں دوسرے بھائیوں کے بچے پڑھتے انہیں میں اس کے بچے بھی پڑھتے۔جس کمرے میں وہ انتساب کے ساتھ رہتی تھی اسی میں انتساب کے بعد بھی رہی۔سسرال اور میکہ دونوں جگہ سے ایک خاص رقم ہر ماہ اسے دی جاتی اور کوئی پلٹ کر اس کا حساب نہ پوچھتا۔پھر وہ پریشان کیوں ہے؟ رات رات بھر کیوں جاگتی رہتی ہے۔اس کی ڈھلی ڈھلی ہر صبح کسی نہ کسی طرح میلی کیوں ہو جاتی ہے؟
شباہت کے پاس سوال تو ہے مگر جواب نہیں!
اسے نہیں معلوم ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔
اب اسی دن پہلی جنوری کی صبح سب نے اٹھتے ہی ہر سال کی طرح ایک دوسرے کو مبارک باد تو نہ دی۔مگر دس بجتے بجتے یورانیاں اپنے اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ پکنک پر روانہ ہوگئیں۔۔۔نہ انہیں کسی نے روکا نہ اسے کسی نے کہا۔
''مگر بچے تو جاسکتے تھے؟''
کیا صرف عورت ہی نہیں ،بچوں کے لیے بھی پورے گھر کی ضرورت ہے۔
اچانک اس کے اندر ایک بڑے ہی منہ زور اور سرکش جذبے نے سر ابھارا۔اس نے بچوں کو تیار کرایا اور خود بھی تیار ہو کر جب کمرے سے باہر آئی تو ساس نے بڑی حیرت سے پوچھا'' کہاں جارہی ہو بیٹی؟''
''آج پہلی جنوری ہے امی۔بچوں کو ذرا گھما لاؤں!''
''نہ بیٹی نہ'' ساس نے بڑی نرمی محبت اور آہستگی سے اس کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔''اچھا نہیں لگتا بیٹی!''
''مگر عدت تو پوری ہو چکی''۔
''ہاں بیٹی۔مگر سال ڈیڑھ سال ہم لوگوں کے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا''۔
''پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے بیٹی!'' راگنی کے پتاجی کی آواز آئی۔
شباہت ایسے تڑپی جیسے کسی نے زنگ آلود تلوار الٹی طرف سے اس کے پیٹ میں گھونپنے کی کوشش کی ہو۔۔۔پورے وجود میں سانپ کے زہر کی طرح پھیلتا اور دوڑتا درد۔۔۔اس نے بے تاب ہو کر صدیوں پر محیط نا قابل عبور دیوار پھاندنے کی تمنا کی۔۔۔کوئی ہے؟
اسے آج راگنی بہت یاد آئی اور پھر اس کے پتاجی۔''تم خوش نصیب ہو بیٹی ہم لوگ اس سلسلے میں بد قسمت ہیں''۔اس نے چھپٹا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔جانے کیوں اسے شبہ ہو گیا کہ انکل اس کی تڑپ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ان نے البم میں سے راگنی کی تصویر نکالی اور بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی۔پھر تصویر البم میں رکھتے ہوئے سوچا''اب دوٹوک فیصلہ بہت مشکل ہو گیا ہے''۔
اور پھر یک بارگی بہت سی صبحیں اور شامیں اس پر حملہ آور ہو گئیں۔انتساب احمد کے انتقال کے بعد سارے فیصلے تو دوسروں

نے کر ڈالے۔۔۔مگر اس سے پوچھا بھی جاتا تو وہ کیا کر لیتی؟ بیوہ ہونے کے بعد لڑکی کی وراثت ماں باپ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔کیا اسے بھی میکے لوٹ جانا چاہیے تھا۔لیکن ماں باپ کتنے دن تک؟ ماں باپ کے بعد بھائی بھر جائی کا رویہ صحیح رہے گا۔اس کی کیا ضمانت؟ تو گویا اسے سسرال ہی میں رہنا چاہیے۔مگر سسرال میں اس کا کیا ہے۔اس کا نہ سہی بچوں کا تو آخر یہی گھر ہے۔مگر بچے تو محجوب ہو چکے؟ لیکن اگر دادا کے گھر سے بھی دور ہو گئے تو مزید محرومی ان کی تقدیر بنے گی؟ مگر یہاں رہے تو ان کی حیثیت کیا ہوگی؟

سوالات چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔مگر جواب کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

وہ اپنے آپ کو مسلسل اندر اندر کاٹتی رہی۔

اس درمیان پاکستان سے خبر آئی کہ شائستہ باجی کی شادی ہو گئی!

شائستہ باجی شباہت سے دس سال بڑی تھیں۔یہ خبر سن کر اچانک ایک عجیب سے خیال نے سر اٹھایا۔شائستہ باجی کی شادی چونتیس برس میں ہوئی۔۔۔میں ابھی چوبیس برس کی ہوں۔۔۔۔اور پھر فوراً ہی اندر سے جیسے کانپ گئی۔عجیب قسم کا بدن پر گندگی لگ جانے کا احساس یا غیر محرم کے آگے ستر کھلنے کی شرم۔۔۔اس لمحے میں اس کا اپنا آپ بھی اس کا غیر بن گیا۔۔۔چھی۔۔۔یہ میں نے کیسے سوچ لیا۔۔۔مگر سوچ پہ کس کا اختیار۔۔۔بعد کے دنوں میں بھی شائستہ باجی اسے کئی بار یاد آئیں مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔شائستہ باجی کی خبر کے بعد بھی تو اماں ابا کو وہ یاد نہیں آئی۔۔۔انتساب احمد کے انتقال کے بعد وہ صرف ایک مرتبہ موضوع گفتگو بنی۔دونوں سمدھیوں اور سمدھنوں نے گفتگو کی۔ابا اماں کو اپنی عزت پیاری اور ساس سسر کو اپنے بیٹے کی خریدی چیز کو سینت کر اور بچا کر رکھنے کی فکر۔

وہ سسرال میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔اور میکے والے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

اماں مورے باوا کو بھیجو کہ ساون آیا ری۔۔۔!

باوا تو آئے لیکن اسے لیے بنا چلے گئے۔ایکے کرس گئی اماں دوئے کرس گئی میں، پردہ اٹھائی کے دیکھا تیروا بڑی دور۔۔۔تیروا بڑی دور۔۔۔اکبر کی جواں لاش پہ بیوہ کا وہ رونا۔چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات!

اس رات اس نے خواب دیکھا۔

دو کشتی سمندری طوفان کی زد میں، ایک کشتی کچھ ہی دیر میں الٹ گئی اور سمندر کے تھپیڑوں کی نذر ہو کر غرقاب ہو گئی۔۔۔مگر دوسری کشتی بھنور میں گھری ڈوبتی رہی ابھرتی رہی۔۔۔ابھرتی رہی ڈوبتی رہی۔اس نے خواب ہی میں بے تاب ہو کر سوچا اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے۔۔۔مگر کشتی کی عجب قسمت۔بھنور میں گھری چکر پہ چکر کھاتی رہی اور طوفان کا زور بڑھتا رہا۔۔۔کشتی اور بھنور۔بھنور اور کشتی!

وہ چیخ کر جاگ پڑی۔۔۔اس کی چیخ سن کر پھوپھی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔۔۔''کیا ہوا بیٹی؟ کیا ہوا؟''۔۔۔وہ کیا جواب دیتی، وہ تو ابھی تک خواب کے سحر میں گرفتار تھی۔۔۔اور پھوپھی۔۔۔انتساب احمد کی پھوپھی، جنہیں شباہت کی تنہائی کے خیال سے اس کے کمرے میں سلایا جاتا تھا۔اپنا زمانہ یاد کر کے کپکپا گئیں۔اور تب اسی آسیب زدہ حالت میں شباہت نے پھوپھی کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔''وہ کہانی پوری سنائیے۔۔۔چھاجوں برستا پانی۔۔۔''

''بیٹی بہت رات ہو چکی۔آج سو جاؤ کل سنا دوں گی''۔

''نہیں پھوپھی آج سنائیے۔وہ پھٹی پھٹی آواز میں چیخی''۔

''اچھا اچھا سناتی ہوں۔دھیر دھرو۔دھیرج سے بیٹھو''۔پھوپھی نے گھبرا کر کہنا شروع کیا۔۔۔''سوتا سنسار، جاگتا پروردگار، سات سمندر پار ایک بادشاہ تھا اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ایک رات کھانا کھاتے ہوئے بادشاہ نے بیٹیوں سے پوچھا''تم

سب کس کا دیا کھاتی ہو؟'' چھ نے کہا'' آپ کا دیا'' مگر ساتویں نے کہا'' خدا کا دیا''۔
بادشاہ ساتویں بیٹی کے جواب پر خفا ہوا اور اس اندھیری رات ہی میں اسے جنگل میں پھنکوا دیا۔ جب بادشاہ کے کارندے اسے جنگل میں چھوڑ کر آرہے تھے تو جھما جھم بارش شروع ہو چکی تھی۔۔۔ ساتویں بیٹی نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔۔۔ چاروں طرف چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات! پھر مدتوں اس جنگل میں سورج نہیں نکلا۔ چاروں طرف چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی۔۔۔''
''مگر پھوپھی، کب تک یہ پانی چھاجوں برستا رہے گا اور کب تک وہ لڑکی جنگل کی اندھیری رات سے جھوجھتی رہے گی''۔ شباہت نے بے چین ہو کر بیچ میں ٹوکا دیا۔
''بیٹی۔ اب صبر''۔ پھوپھی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔'' بیچ میں مت بولو۔ جنگل کی اندھیری رات جس کی تقدیر بنتی ہے اسے جھوجھنا تو پڑتا ہی ہے بیٹی۔۔۔ شہزادی بھی جھوجھتی رہی۔۔۔ اور تب کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ایک دن ایک شہزادہ اس کے جنگل میں آنکلا''۔
''مگر پھوپھی۔۔۔؟'' شباہت نے پھر کپکپا کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔۔'' اور جن کے شہزادے آکر چلے گئے؟''
''امید بنائے رکھنے کے علاوہ چارہ کیا ہے بیٹی؟ اس کے سہارے زندگی تو بیت جاتی ہے!''
پھوپھی کی آواز میں بیت جھڑ کے ان گنت موسموں کی ویرانی شامل تھی۔ پھوپھی کو بیس برسوں بعد خود ان کو ان کا اپنا آپ یاد آگیا۔۔۔ چھاجوں برستا پانی اور جنگل کی اندھیری رات۔۔۔ وہ بھی تو بادشاہ کی ساتویں بیٹی تھیں۔۔۔ مگر ان کے اندھیرے جنگل میں تو پھر کوئی شہزادہ نہیں آیا''۔
''پھوپھی۔۔۔ کیا آپ نے؟ کبھی کوئی لو نہیں لگائی۔ کوئی انتظار نہیں کیا''۔
''بیٹی، تیری تو زندگی پڑی ہے''۔ وہ اس وقت انتساب احمد کی پھوپھی نہیں تھیں۔ گھائل کی گت گھائل جانے۔
''ہم لوگوں کے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا''۔ اسے ساس کا جملہ یاد آگیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
''جنگل کی اندھیری رات میں شہزادے ایک ہی مرتبہ کیوں آتے ہیں پھوپھی؟''
''بیٹی، ہم ہی نا دروازہ بند کر دیتے ہیں؟''
شباہت نے ایک مرتبہ پھر تڑپ کر پھوپھی کو دیکھا، اور بیک وقت دو کیفیتوں میں گھر گئی۔ پورے وجود میں سانپ کے زہر کی طرح پھیلتا اور دوڑتا درد۔۔۔ صدیوں پر محیط نا قابل عبور دیوار پھاند لینے کی تمنا۔۔۔ کوئی ہے؟ کوئی ہے جو اس کا انگوٹھا چوس لے؟ غیر محرم کے آگے ستر کھلنے کی شرم۔۔۔ اس نے ہڑبڑا کر اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپا لیا۔
اور تب اچانک ایک عجیب سی خواہش نے سر اٹھایا۔۔۔ کاش وہ راگنی ہوتی۔
وہ پور پور کٹ کر اپنے اندر اندر گر رہی تھی۔۔۔ اور پھوپھی اپنے کٹے پھٹے ٹکڑے ٹکڑے وجود کو چن رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔۔۔ حاصل تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ وہی چھاجوں برستا پانی۔
اور شباہت کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہی جنگل کی اندھیری رات!
شہزادی جنگل کی اندھیری رات سے کب تک جھوجھتی رہے گی۔۔۔؟؟

☆☆☆

مسکراہٹ کا عکس

حیدر قریشی

روشنی کا استعارہ کر لیا
دل نے ہر آنسو ستارہ کر لیا

ایک بہت بڑے فریم میں ابا جی کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگا کے میں نے فریم کو اپنے ڈرائینگ روم میں آویزاں کر رکھا ہے۔گھر کے باقی کمروں میں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سجا رکھی ہیں اور یہ ساری تصویریں میرے من میں بھی لگی ہوئی ہیں۔گو انہیں فوت ہوئے ایک زمانہ ہوگیا ہے لیکن ان تصویروں کے باعث مجھے گھر میں ان کی موجودگی کا گمان رہتا ہے۔ڈرائینگ روم والی بڑی تصویر اس لحاظ سے باقی ساری تصویروں سے الگ ہے کہ اس میں ابا جی کے چہرے پر ولیوں جیسی شان بے حد نمایاں ہے۔میک اپ کر کے اپنے چہرے پر نور ظاہر کرنے والے نام نہاد مقدس لیڈروں سے مختلف، اپنے اندر کی روشنی سے منور ابا جی کا چہرہ۔اور پھر اس چہرے میں دو جگمگاتی آنکھیں۔ان جگمگاتی آنکھوں میں عجیب اسرار ہیں۔میں کبھی کوئی بہت اچھا اور نیکی کا کام کرتا ہوں تو ابا جی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔میں سب سے بچ بچا کر اور چھپ چھپا کر بھی کوئی برا کام کر بیٹھوں تو ابا جی کی آنکھوں سے برہمی بلکہ تادیب کی لو بھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔

کسی نے مجھ سے زیادتی کی۔۔۔۔ میں نے اس سے برابر بدلہ لے لیا۔ابا جی کی آنکھوں کی اداسی جیسے بولنے لگتی ہے۔
اس نے تمہیں دکھ پہنچایا، برا کیا۔تم نے فوراً بدلہ لے لیا۔کیا مل گیا بدلہ لے کر؟ کبھی دکھ کو سہہ جانے کا مزہ بھی چکھ کر دیکھو!

بعض بھائیوں نے میرے ساتھ ہاتھ کیا، میں نے انہیں سبق سکھانا چاہا تو ابا جی کی دکھ سے بھری آنکھیں مجھے نصیحت کرنے لگیں، تم سارے بھائی میرے ہی وجود کی شناخت ہو۔وہ چھوٹے ہیں، نادان ہیں۔انہیں نقصان پہنچاؤ گے تو وہ بھی تمہارا نقصان ہوگا۔تم جیتو یا ہارو، دونوں صورتوں میں خود ہی ہارو گے اور مجھے ہی ہراؤ گے۔

کبھی کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میں ٹین ایج میں ہوں اور ابا جی ہمہ وقت جا، بے جا مداخلت کر کے مجھے اپنے بنائے ہوئے سیدھے رستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ فریم میں ابا جی کی تصویر نہیں، ایک آئینہ ہے۔میں اس کے روبرو ہوتا ہوں تو گویا اپنے روبرو ہوتا ہوں۔مجھ پر میرے اندر سے اچھائی اور برائی کا فرق منکشف ہونے لگتا ہے۔نیکی اور خیر کی تحریک ملنے لگتی ہے۔

ایک بار میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی ابا جی کے ساتھ تصویر کھینچی تھی۔ٹیپو، ابا جی کی گود میں تھا اور رضی، شازی ان کے دائیں بائیں۔مدت کے بعد اس تصویر کو دیکھا۔میں تصویر میں موجود نہیں تھا لیکن میں نے ہی تو تصویر کھینچی تھی۔سو اس تصویر میں اپنی موجودگی، اپنی شرکت کا احساس جاگا۔اپنے تینوں بیٹوں اور ابا جی کی گروپ تصویر کو دیکھ کر میں جیسے درجۂ شہود میں داخل ہوگیا۔مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود میں میرے ماضی، حال اور مستقبل کے تینوں زمانے یک جا ہوگئے ہیں۔سارا زمانہ ایک نقطے میں ڈھل گیا ہے۔شاہد و مشہود کی تفریق ختم ہوگئی ہے۔لیکن اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ابا جی مجھے روکتے، ٹوکتے کیوں رہتے ہیں؟ جب ہی نقطۂ زماں پھیلنے لگا اور میں اپنے لڑکپن سے جوانی کے دور میں داخل ہونے لگا۔ہر نصیحت سے غافل اور بیگانہ۔خواہشات کا اژدہام تھا اور میں تھا۔میں منزلوں پر منزلیں مار رہا تھا۔خواہشات کی نوعیت بدلتی گئی، عمر ڈھلتی گئی لیکن خواہشیں جہنم کی طرح ھل من مزید پکارتی

رہیں۔ بے شک انسان حریص ہے کہ اسے سونے کا پہاڑ مل جائے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے ویسے ہی ایک اور پہاڑ کی خواہش کرنے لگے گا۔ اور پھر میں اپنے گوتم کے پاس آ گیا۔ خواہشوں کے جہنم سے نکل آنے کے بعد ابا جی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں بیک وقت خفگی اور خوشی کا تاثر تھا:

''خواہش پوری ہونے پر تسکین نہیں ہوتی بلکہ حرص کا روپ دھار لیتی ہے۔ جتنی خواہشیں پوری ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی حرص بڑھتا جاتا ہے۔ یہ پیاس اور یہ آگ کبھی بھی نہیں بجھتی۔ خواہشیں بے انت سراب کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں ہیں!''

''ابا جی! میں جوگی نہیں ہوں۔ صوفی اور تیاگی نہیں ہوں۔ ان سب کی جی جان سے عزت کرتا ہوں لیکن ان جیسا بننا نہیں چاہتا، میں آپ جیسا ہی بننا چاہتا ہوں۔ زندگی کو بھوگتے ہوئے اپنی ریاضت، اپنی تپسیا مکمل کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کے برعکس میری خواہشیں، حرص میں ڈھلنے لگتی ہیں اور میری ساری ریاضت برباد ہو جاتی ہے، ساری تپسیا بھنگ ہو جاتی ہے۔ اور ابا جی! آپ نے مجھے کبھی قناعت کا درس بھی تو نہیں دیا تھا۔ شاید اسی لیے خواہشوں کو مکمل طور پر تیاگ دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے''۔

یہاں تک بات کرتے کرتے میری آنکھوں کا پانی پلکوں تک آ گیا تھا۔ پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسوؤں نے سارا منظر دھند میں لپیٹ دیا تھا۔ لیکن یہ کیا؟

دراصل ہمارے اندر کی دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ باہر کی، ظاہر کی دنیا سے یہ سب کچھ الگ تھلگ ہوتا ہے۔ اپنے اندر کی دنیا میں مگن رہنے کے باوجود میں اندر اور باہر کی دنیاؤں کے اس فرق کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ ابا جی کی تصویر سے میرے تعلق کی نوعیت بھی حقیقتاً داخلی تھی۔ ظاہر کی دنیا کے حساب سے تو شاید ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بھی پوری طرح دیکھا تھا کہ ابا جی سچ مچ تصویر کے فریم سے باہر نکلے، اور صوفے پر آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ اپنی پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے۔ لیکن آنسو تو اُمڈتے ہی چلے آتے تھے۔ جیسے سیلاب بن کر خواہشوں کے اژدہام کو بہا لے جانا چاہتے تھے۔ تب ابا جی نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔ شاید وہ بول نہیں سکتے تھے اور اسی طرح مجھے دلاسہ دے رہے تھے۔ پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے جانے اور ابا جی کا مجھے خود سے لپٹانے کا میرا تجربہ خیالی یا روحانی قطعاً نہیں تھا۔ یہ مکمل طور پر جسمانی اور ظاہری وقوعہ تھا۔

میں نے آنکھوں کو اچھی طرح صاف کیا اور آنسوؤں کی دھند کو ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میرے تینوں بیٹے میرے پاس تھے۔ ٹیپو نے مجھے بانہوں میں بھینچ رکھا تھا۔ شازی میرا کندھا دبا رہا تھا، سامنے زلفی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں بھیگا ہوا رومال تھا۔

''ابا جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کو بیٹھے بیٹھے کچھ ہو گیا تھا۔ کیا ڈاکٹر کو بلا لیں؟''

پتہ نہیں تینوں بیٹوں میں سے کون بول رہا تھا۔

مجھے ایسے لگا جیسے ابا جی کے ساتھ میرے دادا جی اور پردادا جی بھی میری عیادت کے لیے آئے ہوئے ہیں اور میرے پوتے اور پڑپوتے بھی میرے اردگرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ زمان کو پھر ایک نقطے میں سمٹتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ میں نے سامنے ٹنگی ہوئی ابا جی کی تصویر کی طرف دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر بھی مجھے اپنے جیسی مسکراہٹ دکھائی دی۔ جلتی بجھتی، چمکتی مسکراہٹ۔

پتہ نہیں ابا جی کی تصویر کے ہونٹوں پر میری مسکراہٹ کا عکس تھا یا میرے ہونٹوں پر ابا جی کی مسکراہٹ کا عکس تھا۔

☆☆☆

پرندہ

خالدہ حسین

ہاں! میں انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔ زینے پر پوری گیارہ سیڑھیاں۔ پھر دروازے کی ہلکی سی آہٹ اور وہ قدم، نرم رواں بادلوں کے سے تیرتے قدم۔ ادھر اس دہلیز سے اندر ہوں گے اور اس کمرے کا وجود بدل جائے گا۔ میں بدل جاؤں گا۔ ایک ان دیکھا مفہوم اس کمرے میں، میرے، اس کے، ہر چیز کے گرداگرد تن جائے گا۔ وہ آہستگی سے اپنے سرد ہاتھ سے میری کلائی تھامے گی۔ اس کی بے وزن انگلیاں میری نبض ٹٹولیں گی اور گھڑی کی ٹک ٹک چاروں سمت فضا بن کر بجنے لگے گی۔

''گڈ'' وہ سرہانے رکھے چارٹ پر جھک جائے گی۔

''رات نیند کیسی آئی؟'' وہ کرسی میرے قریب کھسکا لے گی۔ تب مجھے وہ تمام باتیں بھولی بسری، دور افتادہ، ادھر ادھر کونوں کھدروں میں پڑی، خاک اٹی یاد آجائیں گی۔ ایک دم سے، ایک ساتھ، ایک ہی ساعت میں اور میں اسے بتاؤں گا۔ دیکھو یہ جو ایک سیدھی لکیر کا تسلسل ہمارے تمہارے ذہنوں میں ہے سب فریب ہے۔ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کہیں بھی کوئی پہلے یا بعد شروع اور آخر، آگے اور پیچھے نہیں۔ سب کچھ ایک ہی ہے۔ ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل رہی ہیں۔ ایک محلول ہے، میرے سامنے میری زبان پر یا شاید میری آنکھوں میں، بے رنگ، بے ذائقہ محلول، جس طرح بے کار، بے ذائقہ زبان اور یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وجود ہے اور یہ سب کچھ میں اس سے نہایت آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ اسی ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ سمجھ سکتی ہے۔ مگر عین کہتے کہتے میرے سب الفاظ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ اس کمرے کے بعد آگے قطار میں اور بھی کمرے ہیں اور سب میں ایک ایک میں، ہاں ایک ایک میں اسی طرح بستر پر کسی ایک ساعت کا منتظر۔ اس سے خائف، اس سے پناہ لیے پڑا ہے اور کیا معلوم میں ان میں سے کون سا ہوں۔ چنانچہ میں اس سے صرف اسی قدر پوچھتا ہوں:

''کیا تم کو بھی ایک ساعت۔ ایک پیچھے پیچھے لپکنے والی ساعت کا انتظار ہے اور تم اس سے خائف ہو۔ ایک تجسس کے ساتھ؟''

''ہاں ہم سب اس کے منتظر ہیں۔ اس سے خائف ہیں اور متجسس''۔

''مگر تم ابھی۔ تمہیں مجھ پر کتنی ہی فوقیتیں حاصل ہیں!''

''تم نے پھر بھاری بھاری لفظ بولے۔ دیکھو میں یہ فوقیتیں وغیرہ نہیں سمجھتی۔ میں تو صرف اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کے لفظ۔۔۔ خالی لفظ نہایت متبذل چیز ہے''۔

''متبذل؟ تو کیا تم بھی۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ تم عجیب آدمی ہو۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں تم سے وہ تمام باتیں کہہ دیتی ہوں جو میں کبھی کسی قیمت پر کسی اور سے نہ کہوں۔۔۔ لفظوں میں سوچنا۔۔۔ محسوس کرنا نہایت متبذل حرکت ہے''۔

''تو پھر کس طرح سوچا اور محسوس کیا جائے''۔ میں آپس میں محلول ہوتی ساعتوں میں بہہ گیا۔ ایک بے ذائقہ بے رنگ احساس میری زبان پر تھا اور یہی سب پر محیط تھا''۔

''یہی تو مصیبت ہے۔اسی لیے میں نے لکھنا چھوڑ دیا''۔اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا کے اطمینان سے کہا۔ مجھے اس کی خودفریبی پر ہنسی آ گئی اور پہلی بار میں نے نہایت اعتماد کے محسوس کیا کہ میں ہر طرح سے کہیں بہتر ہوں۔اس پر فوقیت رکھتا ہوں۔

''شاید اس لیے کہ تم لکھ ہی نہ سکتی تھی۔تم اچھی رائٹر نہ تھیں، لکھنے والے تو کبھی لکھنا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ سب کے سب جھوٹے ہوتے ہیں، بناوٹی''۔

''ہاں شاید۔۔۔یہ بھی درست ہو۔۔۔ میں نے کب کہا کہ میں لکھنے والی ہوں''۔اس کی آنکھوں میں غصے کا سایہ لہرایا۔ لکھنے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔ہاں یوں تو بہت سے لکھتے ہیں۔۔۔ لکھتے رہیں گے۔ دراصل میں نے تو یہ جانا تھا ایک دم۔۔۔ایک عجیب خاموش، پرسکون دوپہر میں۔۔۔اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ زندگی کہیں بھی نریشن نہیں''۔

''نریشن؟''

''ہاں! کہیں بھی نریشن نہیں۔۔۔ ہاں لفظ ہیں اور عمل اور وقت ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ وقت کا ایک ٹکڑا ہے اور کچھ ناقص لفظ اور ادھورا عمل، تو یہ نریشن تو دراصل ہم خود بناتے ہیں۔عمل کو لفظوں میں لکھنے کے مجرم ہم خود ہیں۔مجرم اس لیے کہ وہ تسلسل جو ہم پیدا کرتے ہیں وہ منطق جو اس میں لا ڈالتے ہیں، اس کے جھوٹ سچ کو نہیں جانتے محض ایک مفروضہ کی بنا پر لکھ ڈالتے ہیں، لہٰذا یہ غلط ہے''۔

''مگر جب ہم لکھیں گے نہیں تو لفظوں میں سوچیں گے ضرور''۔

''اور سوچ۔سوچ بغیر عمل کے نہایت مبتذل ہے''۔

''تو پھر ہم کیا کریں؟''

''عمل۔۔۔صرف عمل۔۔۔اور لکھنا اور سوچنا تو صرف نبیوں اور ولیوں کا حصہ ہے''۔

''تم بھی حیران کرتی ہو۔۔۔سخت حیران''۔ میں نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہو۔۔۔لیٹے رہو۔۔۔اس نے آہستگی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کے مجھے لٹا دیا۔

اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں تو منتظر ہوں۔ وہ سب بھی منتظر ہیں اور یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے اس کو مجھ پر کتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔کوئی گننا چاہے تو نہ گن سکے۔

''دیکھو۔۔۔یہ سب انتہائی غلط ہے کہ ہم اپنی سوچ کو یوں بحث میں لائیں۔آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے''۔

''ہم''۔۔۔تو کیا میرے تمہارے درمیان وجود کے مفہوم کا کوئی رشتہ بھی ہے۔اگر ہے تو یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہے۔ان باقی تمام کے ساتھ بھی ہے تو تم اس طرح علامت سی بن جاتی ہو اور یہ سب نہایت غلط بات ہے۔ بہرحال میں تو تمہیں بتانے والا تھا کہ میں وہاں پھر گیا تھا''۔

''تم۔۔۔تم وہاں گئے تھے؟ وہ اپنی حیرت نہ چھپا سکی اور فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ رہی۔

''ہاں۔۔۔میں وہاں گیا تھا۔مگر تم کب یقین کرو گی۔۔۔''شاید میری آواز میں حد سے زیادہ آزردگی تھی۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔اگر تم چاہو گے تو میں یقین کروں گی۔تم وہاں گئے تھے؟''

''ہاں۔۔۔ میں وہاں پھر گیا تھا۔آج بھی دھوپ بہت تیز تھی۔سڑک تپ رہی تھی۔ میرا سر یوں تھا جیسے کیتلی میں پانی ابلتا ہو۔پیاس کے مارے زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے۔مگر سنو یہ کتنی عجیب بات ہے، وہاں کی سڑکیں بالکل ویسی کی ویسی ہی ہیں۔وہ کناروں کناروں سے، جہاں جہاں سے گلیوں کی اینٹیں اکھڑی تھیں، اسی طرح تھیں۔گھروں کی کھڑکیوں پر رنگین چقیں اسی طرح

گری تھیں۔ وہ کونے والا مائی جنت کا مکان ہے۔ اس کو بوریئے کا پردہ تو ہوا میں ہلتا تھا اور حد ہے اس نے اب تک اس کا سوراخ مرمت نہیں کیا تھا۔ نالیوں میں خربوزے کے بیج اور آموں کے چھلکے پڑے تھے۔ تو جب میں اسکول والی گلی پار کر کے آگے بڑھا تو میرے گھر کا لکڑی کا دروازہ ادھ کھلا تھا حالانکہ ان گلیوں میں بھیڑ بکریوں کا گھس آنا تو ایک عام سی بات ہے۔ پھر بھی ان لوگوں نے دروازہ کھلا رکھا تھا۔۔۔ تو میں بغیر دستک دیئے اندر چلا گیا۔ اندر نہایت اندھیرا تھا اور ٹھنڈک تھی۔ ڈیوڑھی پار کر کے صحن میں پہنچا تو بڑی اچھی پرسکون روشنی تھی۔ آنکھوں کو آرام دینے والی۔ سامنے برآمدے میں تخت پوش پر ماں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی اور حقے کی نے اس کے منہ میں تھی۔ مجھے دیکھ کر ماں نے کہا: ''بڑی سخت لو چل رہی ہے۔ تم کہاں گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہو۔ چلو نمکین لسی کا گلاس پیو۔ وہاں میز پر جگ رکھا ہے''۔ میں میز کی طرف بڑھا تو ماں نے پیچھے سے کہا:

''اور یہ کیا تم نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے ان سب کا سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔ پانی کی ناپا کی کی مصیبت الگ۔۔۔ تمہارے ابا بھی سخت ناراض ہو رہے تھے''۔ میں نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

''کیوں۔۔۔ کیوں ناراض ہو رہے تھے؟''

''بھئی کیا عذاب ڈال رکھا ہے''۔ اس نے چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تب میں نے دیکھا برآمدے کی چھت میں جو بڑا کنڈا پنکھے کی خاطر لگا تھا اس میں رنگین ڈوری کے ساتھ وہ لٹک رہا تھا۔۔۔ ایک پنجرہ۔

''اس میں کیا ہے؟'' میں گلاس چھوڑ کر آگے بڑھا۔ مگر اس پنجرہ پر کپڑا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہٹانا چاہا تو ماں چلائی۔

''رہنے دو۔۔۔ یہ کپڑا نہیں ہٹاؤ۔ بیمار ہے بیچارہ۔۔۔ ڈر جائے گا۔۔۔ مر جائے گا''۔ نفرت کی سیاہ لہر میرے پیٹ میں اٹھی۔

''تو پھر ادھر کیوں رکھا ہے اسے؟'' میں دھاڑا۔ اس پر ماں بولی: ''میں کیا جانوں، تمہیں تو لے کر آئے تھے۔ رکھ گئے تھے بغیر کچھ کہے سنے''۔

''میں۔۔۔؟ ہاں تو کیا حرج ہے۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں نے ہی رکھا ہے۔۔۔ پھر۔۔۔؟'' میں غصہ میں باہر آ گیا۔ ''کیا تم جانتی ہو وہ پنجرہ وہاں کیوں ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتی اور کیا تم جانتے ہو کہ وہ مکان، وہ گلیاں۔۔۔ آج سے بیس برس پہلے کارپوریشن والوں نے ڈھادی تھیں۔ تمہاری ماں کی زندگی ہی میں؟''

''نہیں، نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا۔۔۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں وہاں گیا تھا''۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔

''ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا اب میں چلوں۔ وقت ہو گیا ہے''۔ اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ مگر اس کے جانے کے بعد۔۔۔ فوراً بعد میں نے اگلے روز اس کے آنے کی ساعت کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل کر سیال بنیں، میری آنکھوں کا خون، پورے وجود کے اندر باہر چاروں سمت بہہ نکلی تھیں اور وہ یہ کہہ گئی تھی کہ لفظوں میں سوچنا اور سوچ کے متعلق سوچنا نہایت متبذل حرکت ہے۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ اور میں۔۔۔ ہم دونوں ابتذال سے اس قدر خوفزدہ ہیں۔ مگر یہ کیا کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں ایک جانتا ہوا سا۔۔۔ راز بھرا احساس تھا وہ یقیناً جانتی ہے، سب جانتی ہے کہ وہ میرے برآمدے کی چھت سے لٹکتا پنجرہ وہاں کیوں ہے۔ کیا میں اسے وہاں رکھ آیا تھا؟ ماں کہتی ہے۔۔۔ اور وہ اس پر لپٹا کپڑا؟ ہاں رات کو پرندے جانوروں سے ڈرتے ہیں۔۔۔ شاید اسی لیے۔۔۔ مگر ماں کہتی ہے وہ بیمار ہے۔ وہ پردہ ہٹا تو ڈر جائے گا، مر جائے گا۔ تو کیا وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ شاید وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ اب اس کے

آنے کی ساعت جوایک روشن دیوار کی طرح کہیں میرے پیچھے کھڑی تھی اور میں اس کے سایہ میں تھا۔اب اس دیوار نور کے میرے قریب آنے میں آوازوں، لفظوں اورادھوری حرکتوں کے رینگتے سرسراتے ٹکڑے مل حائل ہیں۔
اس کے قدموں کی چاپ پر میں سنبھل کر ہی بیٹھا۔میرا رواں رواں ساعت بن گیا اور گھڑی کی ٹک ٹک کا سمندر چاروں سمت بہنے لگا۔
''گڈ۔۔۔''اس نے آہستہ سے کرسی آگے کھسکائی۔''رات نیند کیسی آئی؟''
''سنو روز تم مجھ سے پوچھتی ہو۔۔۔آج تم بتاؤ۔۔۔رات تمہیں نیند کیسی آئی؟''وہ کچھ ٹھٹھکی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے کہنے لگی۔
''نیند۔۔۔؟نیند دراصل بہت ہی ذاتی قسم کی۔۔۔بے حد ذاتی قسم کی چیز ہے اور میں اس کا حجاب نہایت ضروری سمجھتی ہوں''۔
''تم مجھے حیران کرتی ہو''۔میں نے پھر کہا۔جب تم میں اور مجھ میں ایک خاموش معاہدہ ہے۔۔۔مگر میں تم سے یہی کہنے والی تھی کہ نیند سے پہلے کے چند لمحے وہ ہیں، جب ہم بالکل تنہا اور نہتے ہوتے ہیں۔اور ہمارے اردگرد کے تمام حصار ٹوٹ چکتے ہیں تو اس وقت محض ایک خوف مجھے گھیر لیتا ہے۔وہ تم جانتے ہو۔۔۔؟''
''ہاں میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں''۔
''ہاں یہ خوف کہ یہ نہتا لمحہ اگر کبھی ختم نہ ہوا تو۔۔۔اگر یہی ہمارے حصے کا تمام وقت بن گیا تو۔۔۔؟''
''ہاں۔۔۔تم ٹھیک کہتی ہو۔مگر تم کو مجھ پر اتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔تمہیں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہییں۔تم خود کہتی ہو یہ متبذل ہے''۔
''یہ سوچ نہیں۔۔۔اس کے لفظ ہیں۔۔۔یہ تو احساس ہے''۔
''محض احساس۔۔۔دن کے اجالے میں ہم اپنے آپ کو دوسروں میں کھو دینے کی کوشش کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ وہ لمحہ ختم ہوا۔مگر یہ سب غلط ہے۔رات، نینداور فنا ہم پر تنہا آتی ہے۔تم نے سنا۔۔۔۔تنہا''۔
''ہاں۔۔۔میں نے سنا۔۔۔میں نے سن لیا۔۔۔مگر میں سوچتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ تنہا نہ ہو۔کیا یہ ممکن نہیں؟ کیا یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے؟''میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا۔۔مگر اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے مجھے لٹا دیا۔
''لیٹے رہو۔۔۔لیٹے رہو۔۔۔یہ میں نہیں جانتی۔۔۔''اس نے فوراً مجھ سے نگاہ چرائی۔اور باہر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔
''تمہیں معلوم ہے یہ خزاں کا موسم ہے۔باہر ٹھنڈی صبح۔۔۔تیز ہوائیں چلتی ہیں۔خشک بالکل خشک اور درختوں سے خشک پتے مسلسل ہر لمحہ، ہر آن گرتے چلے جارہے ہیں۔صبح و شام۔۔۔اور کبھی کبھی اچانک بے حد مصروفیت میں رک جاتی ہوں۔۔۔یکدم مجھے خیال آتا ہے، ہوسکتا ہے یہ میرا آخری دن ہے۔چنانچہ میں اپنے اس آخری دن کو دیکھتی ہوں۔ایک کی اترتی دھوپ کو اور جب دیواروں کو اور سوچتی ہوں یہ میرا آخری دن ہے۔یہ کیسا لگتا ہے اور شاید ہر کوئی کبھی، کسی وقت اچانک رکتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ آخری دن ہے۔مگر بھول گئی ہم نے طے کیا تھا کہ کبھی اپنی سوچ پر بات نہ کریں گے''۔
''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ہمیں ضرور بات کرنی چاہیے۔اس لیے کہ بہت سی باتیں جب نہ کی جائیں تو ٹھوس واقع بن جاتی ہیں اور پھر ان کو ختم کرنا، ان سے بچنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے''۔میں نے اسے روکنے کی نہایت کمزور سی کوشش کی۔وہ گھڑی

دیکھ رہی تھی۔

''تم وقت کی اتنی پابند ہو۔۔۔کیوں اتنی پابند ہو۔تم ایک لمحہ پہلے آتی ہو نہ بعد میں۔دو پل رک جانے کو، کہنے کی ہمت نہیں ہوتی''۔

''کیوں۔۔۔یہ تو محض تمہارا خیال ہے۔دراصل مجھے گھر وقت پر پہنچنا ہوتا ہے۔جب میں ان کو کھانا کھلاتی ہوں تو میری تمام بے کار سوچ مر جاتی ہے، میں خوش ہوتی ہوں۔مگر پھر کچھ ہی دیر میں وہ لڑھکتے موتیوں کی طرح مجھ سے الگ، دور ہو جاتے ہیں اور عمل رک جاتا ہے۔وقت رواں رہتا ہے، لفظ یلغار کرتے ہیں اور یہ سب انتہائی بے سود ہے''۔

''ہاں۔۔۔تم ٹھیک کہتی ہو۔مگر۔۔۔''

''اچھا۔۔۔دوا کھانا نہیں بھولنا۔۔۔اور سر اونچا رکھو ادھر تکیہ پر۔۔۔۔''

وہ بادلوں کے سے تیرتے قدموں سے چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔۔۔اوہ خدا۔۔۔اس کے جاتے ہی یہ مجھے کچھ یاد کیوں آ جاتا ہے۔مجھے تو اس سے پوچھنا تھا، اس پنجرہ کے متعلق اور اس کے اندر رہنے والے کے بارے میں۔پھر یہ سب کچھ کل پر ملتوی ہو گیا۔لیکن نیند سے پہلے کا یہ ایک نہتہ لمحہ اگر طویل ہو گیا اور ساعتوں میں تو سب کا رنگ بدل جائے گا۔۔۔ذائقہ بدل جائے گا۔۔۔اور ہم سب کے سب اس میں بہہ جائیں گے۔

مگر اچانک مجھے برابر والے کمرے سے پلنگ اور کرسیاں گھسیٹنے کی آواز آئی۔۔۔پھر بوجھ گھسیٹتے، بمشکل سیڑھیاں اترتے ناہموار قدموں کا ہجوم۔۔۔اور سب کچھ تھم گیا۔تو یہ واقعی کسی کا، ساتھ والے کا آخری دن تھا۔یہ کیسا تھا؟ اس نے کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑانے کی کوشش کی۔۔۔وہاں کہیں کہیں اکا دکا پتے اڑ رہے تھے اور بس۔۔۔تو یہ دن بھی اور دنوں کا ساتھا اور پھر ایک دم مجھے ہنسی آ گئی۔تو ایک بار پھر وہ کوئی دوسرا تھا۔۔۔میں نہیں تھا۔میرے پیٹ میں ایک تاریک ہستی تل تل کرتی تھی۔اچھا وہ کل سب سے پہلے مجھے یہی خبر دے گی۔

مگر میرا خیال غلط تھا۔اس نے اگلے روز مجھے یہ خبر نہ دی۔وہ اسی طرح ایک خوشگوار واہمے کی صورت وارد ہوئی، میری نبض گنی اور چارٹ پر جھک گئی۔اس کی جھکی آنکھیں دیکھ کر مجھے گزری رات کی بھولی بسری ساعتیں یوں یاد آئیں جیسے صدیوں پہلے کی بات۔اتنی جلد ان پر خاک اٹ گئی تھی۔میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

''میری طرف دیکھو''۔میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔۔۔میں دیکھنا چاہتا تھا۔اس کے اور میرے درمیان وجود کے مفہوم کا کون سا رشتہ ہے۔مگر وہ اسی طرح جھکی چارٹ پر لکھتی رہی۔شاید وہ بھی اس رشتہ کا تعین کرنا چاہتی تھی اور مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔گرم لہو میری کنپٹیوں اور آنکھوں میں کھولنے لگا۔میرا سر بھاپ بن کر اڑ گیا۔

''میری نبض نہ گنو۔۔۔میرا بلڈ پریشر نوٹ نہ کرو۔۔۔اس کاغذ کو چاک کر دو''۔میں نے گویا زہر گلے سے اتارتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نہ بھی آؤ تو کیا ہے۔لیکن یہ تو تمہارا فرض ہے۔مجھے بتاؤ اور کیا کیا فرض ہے۔۔۔میں نے۔۔۔میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے''۔میں نے غصہ سے کانپتی آواز میں کہا۔میری مٹھیاں زور سے بھنچ گئیں۔

''سکون۔۔۔سکون۔۔۔لیٹ جاؤ۔۔۔'' اس نے مجھے آہستگی سے لٹانا چاہا۔

''نہیں۔۔۔تم نے ایک ان کیا معاہدہ توڑا ہے۔تم نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے''۔میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دینا

چاہا۔ مگر مجھ میں اتنی قوت کہاں تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی میں بیٹھی رہی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ خاموش رہی اور گھڑی ٹک ٹک بولتی رہی۔

''سنو۔۔۔ اگر سن سکتی ہو تو۔۔۔ میں وہاں پھر گیا تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتیں۔۔۔ جب آج میں وہاں گیا تو ماں وہاں تخت پوش پر بیٹھی چاول چن رہی تھی اور گھر کا آنگن ایسا تھا جیسے ابھی ابھی ابا جی ناراض ہو کر، بول بول کر، باہر نکلے ہوں۔۔۔ ماں نے کہا بیٹھ جاؤ۔ آج جانے کیا بات ہے اس میں کوئی آواز نہیں آ رہی۔۔۔ کوئی ہل جل نہیں''۔

''کس میں سے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے برآمدے کی چھت سے لٹکے اس ڈھکے ڈھکائے پنجرہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے چاہا کہ لپک کر اٹھا کر دیکھوں کیا بات ہے۔ مگر ماں نے مجھے روک دیا۔

''نہیں نہیں۔۔۔ رہنے دو۔ بیمار ہے بے چارہ۔ ڈر جائے گا۔ مر جائے گا۔ وہ آتی ہی ہوگی۔ خود ہی دیکھے گی''۔

''وہ کون۔۔۔؟'' میں نے پوچھا تو اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ میں نے دیکھا وہاں تم کھڑی تھیں۔۔۔ تم۔۔۔ اور تم کہتی ہو تم وہاں کبھی نہیں گئیں''۔

''میں کھڑی تھی؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''ہاں تم۔۔۔ اور پھر جانتی ہو، سب سے بڑا نہتہ لمحہ وہ تھا جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا۔ تم چپکے سے آئیں، پنجرہ کا غلاف اٹھایا۔۔۔ پھر تمہارے منہ سے عجب حقارت اور کراہت بھری آواز نکلی، ''اوں ہوں'' تم نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کنڈے سے اٹھایا۔

''اوں ہوں۔۔۔ سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے۔۔۔'' تم نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اسے زور سے باہر نالی میں الٹ دیا۔۔۔ اس کو جو اس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی۔۔۔ میں آگے لپکا، دیکھوں۔۔۔ اسے دیکھوں۔ مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس خوف نے آ دبایا کہ کہیں یہ اس نہتے لمحے کا آغاز نہ ہو اور میں رک گیا۔ چلا آیا بھاگتا ہوا۔ دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں''۔

''نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے نہیں دکھاؤ۔۔۔'' اس نے میری پیشانی پر اپنے خوشگوار ٹھنڈک بھرے ہاتھ رکھے۔ ''مجھے نہیں دکھاؤ۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے۔۔۔ ہم ایک دوسرے کے زخم نہیں دیکھیں گے، مگر کیا تمہیں یقین ہے کل رات جو آوازیں برابر کے کمرے سے آئیں وہ اسی کمرے کی تھیں، تمہارے کی نہ تھیں؟''

☆☆☆

ست رنگے پرندے کے تعاقب میں

رشید امجد

ناشتہ کرتے ہوئے اچانک ہی خیال آیا کہ پچھلے ٹیرس پر پڑی چارپائی کو بنوانا چاہیے۔ محلے والے گھر سے اس نئے گھر میں منتقل ہوتے ہوئے اپنا بہت سا پرانا سامان وہیں بانٹ بونٹ آئے تھے۔ بس یہ ایک چارپائی کسی طرح ساتھ آ گئی۔ کچھ عرصہ پچھلے ٹیرس پر دھوپ میں بیٹھنے کے کام آئی۔ پھر زندگی کی مصروفیات بڑھیں تو دھوپ میں بیٹھنا بھی کبھی کبھار ہو گیا۔ چارپائی نواڑ کی بنی ہوتی تھی، بارشوں اور دھوپوں میں نواڑ گل گئی۔ جگہ جگہ سے گل کر نواڑ کی پٹیاں لٹکنے لگیں۔ ایک دن اس کے بڑے بیٹے نے نواڑ کھول کر چارپائی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا، پھر برسوں وہ اسی طرح پڑی رہی۔ کبھی کبھی کوئی پچھلے ٹیرس کی طرف جاتا تو خیال آتا کہ اب کوئی پرانی چیزیں لینے آیا تو اسے بیچ دیں گے، پھر بات بھول جاتی۔ کسی کو خیال نہ آتا کہ اسے بنوا لیا جائے۔ اس کا کوئی استعمال ہی نہ تھا۔ ہر کمرے میں نئی طرز کے بیڈ تھے اور چارپائی رکھنے کی کہیں جگہ بھی نہ تھی لیکن اس صبح ناشتہ کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ چارپائی بنوا لینی چاہیے۔ سردیاں آ رہی ہیں۔ دھوپ میں بیٹھنے کے کام آئے گی۔ زیادہ نہ سہی چھٹی والے دن تو بیٹھ ہی سکتے ہیں۔ دھوپ میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا کتنا مزہ ہے۔ پرانے گھر میں وہ اکثر چھت پر ہی کھانا کھاتے۔ سردیوں میں تو یہ معمول تھا لیکن اب تو ڈائننگ روم تھا۔ میز کرسیاں تھیں مگر دھوپ میں چارپائی پر بیٹھ کر کھانے کا مزہ ہی اور ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن بیوی سے ذکر نہیں کیا۔ وہ حسب معمول پیچھے پڑ جاتی کہ اس بلاوجہ خرچے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں خرچے اور بلاضرورت کا ذکر تو چلتا ہی رہتا تھا۔ بس گزارہ چل رہا تھا۔ وہ کہتا۔۔۔ یہی کیا کم ہے کہ عزت سے گزر رہی ہے۔ لیکن بیوی کو ابھی کئی چیزیں بنوانی تھیں۔ کہیں پردے بدلوانا تھے۔ کہیں بیڈ شیٹیں لانا تھیں۔ پھر بچوں کے آئے دن کے تقاضے یہ وہ، یہ وہ۔۔۔ اس پرانی چارپائی کو بنوانا کسی حساب میں نہ آتا تھا۔ پورے گھر میں کوئی بھی اس کی تائید نہ کرتا اس لیے اس نے سوچا کہ جب تک سامان نہ آ جائے اور بننے والا نہ آ جائے کسی سے اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔ پرانے محلے میں تو چارپائی بننے والے دوسرے تیسرے دن گلی میں آواز لگاتے گزرتے تھے لیکن ان نئی آبادیوں میں چارپائی کہاں تھی کہ بننے والے ادھر کا رخ کرتے۔ اس کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ اس نے سوچا دفتر سے فارغ ہو کر شہر کا چکر لگا آئے اور کسی بننے والے کو ساتھ لے آئے گا۔

دفتر سے نکل کر وہ پرانے شہر کی طرف آ گیا۔ اب نواڑ کا تو زمانہ نہیں رہا۔ پلاسٹک کی رنگ برنگی رسیوں سے بنی چارپائی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس طرح کی کئی دکانیں سیڑھیوں والے پل کے پاس تھیں۔ وہاں پہنچا تو دکانوں کے باہر رنگ برنگی رسیوں سے بنی چارپائیاں اسے بڑی ہی بھلی لگیں۔ پہلی ہی دکان سے کورا جواب مل گیا۔ دکاندار نے کہا ''رسی تو مل جائے گی لیکن بننے والا نہیں''۔

اس نے کہا ''میں بننے والے کو ساتھ لے جاؤں گا اور گاڑی میں واپس چھوڑ جاؤں گا''۔

دکاندار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب یہ کام کرنے والے کم ہیں۔ یہ چند لوگ بمشکل دکانوں کی ڈیمانڈ پوری کر پاتے ہیں۔ آپ کو بننے والا مشکل ہی سے ملے گا''۔

دوسری تیسری اور چوتھی دکان سے بھی یہی جواب ملا۔ وہ کچھ مایوس سا ہو گیا اس کے ذہن میں ٹیرس پر پڑی رنگ برنگی چارپائی کا تصور دھندلا سا گیا۔ ''تو کوئی صورت نہیں''۔ اس نے آخری دکاندار سے پوچھا۔

''شاید بنی والے چوک میں کوئی مل جائے۔۔۔ میرا خیال ہے مل جائے گا۔ وہاں بڑی مارکیٹ ہے''۔ دکاندار نے کہا۔

اس رش والے وقت میں شہر کے اس حصے میں جانا آسان کام نہیں تھا لیکن وہ چل پڑا۔ تنگ بازاروں سے چیونٹی کی طرح رینگتی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے عجب طرح کا سرور آیا۔ زندگی تو یہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ لبالب بھری ہوئی۔

اسے خیال آیا کہ چند برس پہلے جب وہ بھی اندرون شہر رہتا تھا تو اس کی زندگی بھی اسی طرح لبالب بھری ہوئی تھی۔ ہر وقت ایک ہنگامہ، ایک شور، ڈھیر سارے لوگوں کے درمیان، اپنائیت کے گرم لمس کے ساتھ اور اب اس نئی آبادی میں سکون ہی سکون تھا۔ خاموشی، اپنے کام سے کام۔ معیار بڑھ گیا تھا لیکن جیسے زمین سے نکل کر گملے میں آ گئے تھے لیکن یہ تو صرف اس کا احساس تھا۔ بیوی بچے تو خوش تھے کبھی اندرون شہر کا ذکر آتا تو انکی بھنوئیں سکڑ جاتیں مگر وہ کبھی کبھار کسی نہ کسی بہانے ادھر نکل ہی آتا۔ اس وقت بھی بھوک کی شدت کے باوجود اسے رینگ رینگ کر چلنے میں مزہ آ رہا تھا۔

ادھر والی مارکیٹ بڑی تھی، اس نے گاڑی مشکل سے ایک جگہ کھڑی کی۔

پہلی دو تین دکانوں سے وہی مایوسی جواب ملا۔ ''چارپائی یہاں لے آئیں''۔

یہ تو ممکن نہیں۔ اس نے سوچا۔۔۔ ایک طرف سے ہی سوزوکی والا دو سو سے کم نہیں لے گا۔ چار سو تو کرایہ ہی ہو گیا۔

اس کا دل بیٹھ سا گیا۔۔۔ تو چارپائی نہیں بن جا سکتی۔

پچھلے ٹیرس پر چہچہاتا پرندہ چشم زدن میں اڑ گیا۔ وہی اداس ٹیرس اور کونے میں دیوار سے لگا چارپائی کا فریم۔

''تو واپس چلو'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔ ''خوامخواہ بھوک بھی کاٹی''۔

''جناب اندر آئیں نا، میرے پاس بڑی ورائٹی ہے''۔ وہ جس دکان کے باہر کھڑا تھا، اس کے اندر سے آواز آئی۔

وہ اندر چلا گیا۔ دکاندار بڑا خوش اخلاق تھا۔ کہنے لگا۔۔۔ ''پسند کریں نا میرے ریٹ بڑے مناسب ہیں''۔

''مجھے خریدنا نہیں''۔ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ''چارپائی بنوانی ہے''۔

''بنوانی ہے۔۔۔ کہاں؟''

ہے تو ذرا دور پر میں بندے کو ساتھ لے جاؤں گا اور واپس چھوڑ دوں گا''۔ پھر جلدی سے بولا۔ ''سارا سامان تو آپ سے لینا ہے بس بندہ''۔

دکاندار نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا، پھر بولا ''بندہ تو آج مشکل ہی ملتا ہے لیکن آپ ذرا بیٹھیں میں پتہ کرتا ہوں''۔

رنگ برنگا پرندہ آسمان کی وسعتوں سے چکرا کر پھر پچھلے ٹیرس پر آ بیٹھا۔ دکاندار اسے بٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس کے آنے تک وہ امید و نا امیدی کے بھنور میں ابھرتا ڈوبتا رہا۔

''بندہ تو اس وقت موجود نہیں۔ ہاں صبح مل جائے گا لیکن آپ کو صبح چھ بجے آ کر اسے لے جانا ہو گا۔ ورنہ اس نے کسی کا کام شروع کر دیا تو۔۔۔'' دکاندار نے ایک ہی سانس میں کہا۔

''میں آ جاؤں گا۔۔۔ آ جاؤں گا''۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''صبح اتوار ہے چھٹی ہے۔ میں چھ بجے آ جاؤں گا''۔

دکاندار نے کہا۔۔۔ ''تو سامان آپ ابھی لے جائیں، دکان تو صبح دیر سے کھلے گی لیکن بندہ یہاں موجود ہو گا''۔

رسیوں کے گچھے گاڑی میں رکھتے ہوئے اسے خیال آیا اگر صبح بندہ نہ ملا تو یہ ساڑھے چار سو روپے تو ضائع ہو جائیں گے، اس نے دکاندار سے کہا۔۔۔ ''دیکھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح۔۔۔''

دکاندار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بندہ موجود ہو گا جی لیکن چھ بجے کے بعد کی ذمہ داری نہیں''۔

پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے بیوی کی نظر پچھلی سیٹ پر پڑی گچھیوں کی طرف گئی۔

''یہ کیا ہے؟''
وہ گڑبڑا گیا۔۔۔کم از کم کھانا تو کھالیتا، پھر آرام سے موقع دیکھ کر بات کرتا لیکن گیٹ کھولنے بیوی خود نکل آئی تھی۔
''یہ۔۔۔''اس نے تھوک سے حلق تر کیا۔۔''یہ۔۔۔میں نے سوچا وہ اوپر۔۔۔وہ اوپر ٹیرس پر، پچھلے ٹیرس پر چارپائی پڑی ہے نا، اسے بنوالیا جائے''۔
''کیا۔۔۔''وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔۔۔''وہ پرانی چارپائی، کس لیے۔۔۔اور یہ سامان کتنے کا آیا ہے؟''
''بس زیادہ نہیں''وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔۔۔''زیادہ نہیں۔۔۔تین چار سو کا''۔
''تین چار سو۔۔۔''وہ پھر چیخی۔
''ساڑھے چار سو کا''۔اس کے منہ سے گھبراہٹ میں نکل گیا۔
''ساڑھے چار سو۔۔۔''اس کی چیخ اور بلند ہوگئی۔۔۔''اور بنوائی''۔
''دو سو۔۔۔دو سو''۔
اس کی بیوی نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔۔۔''تمہاری عقل تو کام کرتی ہے نا۔۔ساڑھے چار سو ایک بیکار چارپائی کے لیے''۔
وہ اندر بھاگ گیا۔
''ہم یہاں بھوکے مر رہے ہیں اور یہ صاحب بہادر یہ رسیاں خریدے پھر رہے ہیں۔میں پریشان ہو رہی تھی کہ اب تک کیوں نہیں آئے اور یہ۔۔''
اس نے کچھ کہنا چاہا۔
''بس بس''۔وہ غصے سے بولی۔''مجھ سے اب بات بھی نہ کرنا''۔
کھانا کھاتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا''دیکھو میری بات تو سنو''۔
''کیا سنوں۔۔۔''اس کا غصہ اترنے ہی میں نہ آتا تھا۔''تمہاری کوئی ترجیح ہی نہیں۔میں کہتی ہوں ہم نے اس چارپائی کا کرنا کیا ہے؟''
''سردیاں آ رہی ہیں، دھوپ میں بیٹھنے۔۔۔''
''کون بیٹھتا ہے دھوپ میں، وقت ہی کہاں ہوتا ہے؟''اس نے اس کی بات کاٹ دی۔۔۔''میں پوچھتی ہوں ہم نے کرنا کیا ہے اس چارپائی کا رکھنے کی جگہ نہیں''۔
''میرا کیلکولیٹر گم ہوگیا ہے، اسے لینے کے لیے تو پیسے نہیں اور ساڑھے چار سو چارپائی پر خرچ کر دیئے ہیں''۔بڑے بیٹے نے ناگواری سے کہا۔
''تم لوگ چپ رہو''۔اس نے ڈانٹا۔
''چپ کیوں رہیں؟''بیوی کا غصہ اور بڑھ گیا۔''گھر کے لیے تو تمہارے پاس پیسے نہیں ہوتے اور فضول کاموں کے لیے۔۔۔میں کہتی ہوں سامان واپس کر دو''۔
''یہ نہیں ہوسکتا''۔اس نے آہستہ سے کہا۔
''کیوں نہیں ہوسکتا؟ دکاندار سے کہو کم پیسے دے دے۔تم نہیں کر سکتے تو میں ساتھ چلتی ہوں۔میں بات کرلوں گی''۔
''نہیں۔۔۔نہیں''۔

''تو ٹھیک ہے اب مجھ سے بات نہ کرنا'' وہ اٹھ کر چلی گئی۔ دونوں بیٹے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ وہ وہیں اکیلا بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

کچھ غلط ہی ہو گیا ہے۔ اس نے سوچا۔۔۔ واقعی کیا ضرورت تھی۔

ابھی تو پورا مہینہ پڑا ہے، خوانخواہ چھ سات سو روپے۔۔۔ پانچ سو کا کیلکو لیٹر ہی لے دیتا بیٹے کو۔۔۔ روز کہتا ہے، پر اب کیا ہو سکتا ہے؟ رسی کی گچھیاں بھی واپس نہیں ہو سکتیں اور صبح اس نے ناگواری سے سر ہلایا۔۔۔ چھ بجے۔۔۔ چھٹی والے دن ایک ہی تو لطف ہوتا ہے کہ دیر سے اٹھنا اور چھ بجے وہاں پہنچنا ہے۔ اس کا مطلب ہے پانچ بجے اٹھنا پڑے گا۔۔۔ واقعی غلط ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا۔۔۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ اس کے اکثر کام اسی طرح کے ہوتے تھے۔۔۔ پہلے کر لینا پھر پچھتانا۔۔۔ یہ پچھتاوا تو میرا مقدر ہے۔

شام تک ماحول کشیدہ رہا۔ شام کو چائے دیتے ہوئے بیوی نے کہا۔ ''میں نے تم سے بات تو نہیں کرنا تھی لیکن پھر کہتی ہوں یہ سامان واپس کر دو۔ تم ہمیشہ بعد میں پچھتاتے ہو۔ میری بات مان لو''۔

اس نے کہا'' اب یہ ممکن نہیں۔ وہ واپس نہیں کرے گا''۔

''میں بات کروں گی۔ تم خود سوچو ہم نے اس چارپائی کا کرنا کیا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔ ''مجھے پتا ہے نا وہ واپسی نہیں کرے گا''۔

بیوی پیر پٹختے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

رات کو کھانے پر بھی یہی صورت رہی۔ بیٹے منہ پھلائے الگ بیٹھے رہے بیوی نے بھی کوئی بات نہ کی۔ اس سے نہ رہا گیا، بولا۔۔۔ ''چلو غلطی ہو گئی، اب کیا ہو سکتا ہے''۔

''یہ آپ کا پرانا جواب ہے''۔ بڑے بیٹے نے کہا۔

''ہر بار غلطی''۔ بیوی کی آواز میں تلخی آ گئی۔۔۔ ''کب تمہیں عقل آئے گی میں پوچھتی ہوں تمہیں چارپائی کیسے گھس گئی دماغ میں؟ میں کئی دن سے کہہ رہی ہوں کہ کچن کا ایگزاسٹ فین بدلوا دیں، صحیح کام نہیں کر رہا۔ اس کے لیے پیسے نہیں اور یہ چارپائی''۔

وہ کچھ نہ بولا۔ بولتا بھی کیا؟ اپنے طور پر احساس ہو رہا تھا کہ بلاوجہ پیسے ضائع کر دیئے۔ چارپائی نہ بھی بنتی تو کیا فرق پڑتا۔ گھر کی اور کئی ضرورتیں توجہ چاہتی تھیں، لیکن بات وہی تھی کہ اب کیا ہو سکتا تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ سامان واپس کرنے کی کوشش کی جائے لیکن دکاندار کا رویہ وہ سارا منظر، اسے یقین تھا کہ سامان واپس نہیں ہوگا اب تو ایک ہی صورت تھی کہ صبح چھ بجے۔۔۔ اور اس کے لیے اتوار والے دن چھٹی والے دن صبح پانچ بجے اٹھنا۔۔۔ اس نے بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لے لی تھی۔

ہفتہ کی رات تھی۔ دیر تک گپ شپ لگانے اور رات گئے تک جاگنے کا معمول تھا لیکن بیوی کا موڈ اتنا خراب تھا کہ اس سے بات کرنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ کھانا کھا کر بیٹے اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی دیوار کی طرف منہ کیے لیٹ گئے۔ صبح پانچ بجے اٹھتے ہوئے بڑی کوفت ہوئی لیکن چھ بجے وہاں پہنچنا تھا۔ بندہ منتظر تھا۔ راستے میں اس نے کہا۔۔۔ ''یار بننا اچھی طرح، اس چارپائی نے تو بڑا کام خراب کر دیا ہے''۔

''فکر ہی نہ کریں جی، ایسی بنوں گا جو دیکھے گا واہ واہ کرے گا''۔

گھر پہنچا تو ابھی سب سو رہے تھے۔ وہ کام کرنے والے کو پچھلے ٹیرس پر لے گیا۔ سامان کا تھیلا اس کے سپرد کر کے کچن میں آیا اپنے لیے چائے بنائی اور لاؤنج میں اخبار پڑھنے بیٹھ گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد بیوی اٹھی۔ لاؤنج میں خالی پیالی دیکھ کر بولی۔

''چائے پینی تھی تو مجھے جگا دیتے''۔ اب اس کے لہجے میں رات والی تلخی تھی۔

''وہ دراصل ۔۔۔جلدی جانا تھانا''۔ وہ آہستہ سے بولا۔
''تو لے آئے ہو اسے''۔
''بس یار ہو گیا۔۔۔اب جانے دو''۔
''یہ تو تمہارا پرانا وطیرہ ہے، پہلے کر لینا پھر پچھتانا''۔
''تو جان اسی لیے تو کہتی ہوں کوئی کام کرنے سے پہلے مشورہ کر لیا کرو''۔
اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اوپر چلا گیا۔ کاریگر ماہر تھا آدھی سے زیادہ چارپائی بن گئی تھی اور رنگ برنگا پرندہ ٹیرس پر چہک رہا تھا۔
دو تین گھنٹے بعد اسے واپس پہنچایا۔ بیوی اور بیٹوں نے چارپائی دیکھی تو سب نے تعریف کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ست رنگا پرندہ پر پھیلائے ٹیرس پر رقص کر رہا ہے۔
''چلو پیسے تو خرچ ہو گئے لیکن لگ اچھی رہی ہے''۔ بیوی نے کہا۔
''بہت خوبصورت بنی ہے'' بڑے بیٹے نے کہا۔
''اور رنگوں کا کمبی نیشن تو کمال کا ہے'' چھوٹا بیٹا بولا۔''ابو یہ ضرور آپ کی پسند ہے۔ دکاندار اتنی اچھی کمی نیشن نہیں کر سکتا''۔
وہ خوش ہو گیا۔''اب اسے رکھنا کہاں ہے''۔ اس نے بیوی سے کہا۔''بارشوں میں تو خراب ہو جائے گی''۔
''ابھی تو ورانڈے میں رکھ دیں، پھر کوئی جگہ بناتی ہوں۔۔۔بھئی لگ خوبصورت رہی ہے''۔
دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے گپیں لگیں۔ کہیں کہیں چارپائی کا ذکر بھی آیا اور رنگوں اور بنائی کی خوب داد دی گئی۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو کر وہ ایک دوست کے ہاں نکل گیا۔ وہاں تاش کی بازی لگ گئی۔ واپس آیا تو شام ہو چلی تھی۔ بیوی سامان کی ایک لسٹ لیے بیٹھی تھی۔ بازار میں کافی دیر ہو گئی۔ واپسی پر کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانا کھا کر ابھی لیٹا ہی تھا کہ سینے میں شدید جلن اور درد کا احساس ہوا۔ سانس بھی کچھ اکھڑ رہا تھا۔ بیوی نے بیٹے کو آواز دی۔''جلدی سے گاڑی نکالو'' تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں''۔
چھوٹا بیٹا بھی آ گیا۔ دونوں بیٹوں نے اسے پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ بیوی نے اس کا سر زانو پر رکھ لیا اور جلدی جلدی کچھ پڑھنے لگی۔ گاڑی ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی حالت اور خراب ہو گئی۔ شاید سٹریچر پر ڈالتے ڈالتے یا ایمرجنسی کے بیڈ پر لٹاتے لٹاتے درمیان میں کہیں سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ واپسی ایمبولینس میں ہوئی۔ بیوی ایمبولینس میں اور بیٹے پیچھے پیچھے گاڑی میں ایک کہرام مچ گیا۔ اڑوسی پڑوسی باہر نکل آئے۔ ایمبولینس سے سٹریچر اتار کر لاؤنج میں لائے تو کوئی بولا''لاش کہاں رکھنی ہے؟''
کسی نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا تو پڑوس والی بڑی اماں بولی۔''گھر میں کوئی چارپائی نہیں''۔
''چارپائی'' دونوں بیٹوں نے ہچکیوں کے درمیان ماں کی طرف دیکھا۔
''اوپر پڑی ہے'' بیوی کی ہچکیاں بین میں بدل گئیں۔
لاؤنج کا صوفہ ایک طرف کر کے چارپائی درمیان میں بچھا دی گئی اور سٹریچر سے اس کا وجود چارپائی پر منتقل کر دیا گیا۔
''گھر میں چارپائی کتنی ضروری ہے''۔ کسی عورت نے دوسری عورت کے کان میں کہا۔''اور ہمارے گھروں میں اب اس کا رواج ہی نہیں''۔
لاؤنج میں ست رنگا پرندہ پر پھیلائے چہک رہا تھا اور ناچ رہا تھا لیکن اس کی چہک کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی نہ اس کے رنگ کسی کو نظر آ رہے تھے!

☆☆☆

رانا سلیم سنگھ

زاہدہ حنا

آج وہ مجھے بے حساب یاد آیا۔

میں اس وقت ٹیلی ویژن اور پریس کیمروں کی تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا اور ایک آرٹ گیلری کے دروازے پر بندھے ہوئے سرخ فیتے کو کاٹ چکا تھا۔ میں نے ہال میں دوسرے متعدد لوگوں کے ساتھ قدم رکھا تو سفید دیواروں پر آویزاں روغنی تصویروں سے پھوٹتی ہوئی رنگوں کی تازی خوشبو کے ساتھ اسکی یاد ایک طوفانی لہر کی طرح آئی اور مجھے شرابور کرتی ہوئی نکل گئی۔ میں اس لمحے ہجوم میں تنہا اور صرف اس کے ساتھ تھا شاید اس لیے کہ اس سے پہلی ملاقات کے بعد میں تازہ رنگوں کی خوشبو اور اس کی یاد کبھی ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوئے تھے جیسے ایک ہی کوکھ سے نکلے ہوں۔ ایک ہی شاخ سے پھوٹے ہوں۔

یہ وہ باتیں ہیں جنہیں میں اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ کوئی نادیدہ ہاتھ اگر اس کے اور میرے تعلق کو میری کانفیڈینشل رپورٹ (Confidential Report) میں لکھ دے تو میں معتوب ٹھہروں۔ بھلا کہیں دشمن بھی دوست بنائے جاتے ہیں؟ لوگ بناتے ہوں گے، ہم نہیں بناتے۔

وحشت میرے اندر بھنور ڈالنے لگتی ہے۔ میں ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہوں۔ میری اسٹڈی کے فرش پر دیوار تا دیوار سفید قالین ہے جس پر کرمان شاہی غالیچے بچھے ہیں۔ یہ غالیچے میں نے جنگ زدہ کابل کے کوچہ مرغاں کی ایک تنگ اور نیم تاریک دکان سے خریدے تھے۔ میں گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں، سامنے برف کی ڈلیوں سے بھری ہوئی چاندی کی بالٹی ہے، شراب ہے، بھنے ہوئے نمکین کاجو اور بادام ہیں، سنکے ہوئے گوشت کے پارچے ہیں۔ نظر اس سے آگے جاتی ہے تو ٹیک ووڈ (Teak Wood) کی دیوار گیر الماریاں ہیں۔ ان کے پیچھے وہ سیف ہے جس میں ڈالر اور پونڈ کی گڈیاں ہیں۔ دوسری قیمتی اشیاء ہیں۔ اس کی بنائی ہوئی ''بنی ٹھنی'' ہے جسے میں شدید خواہش کے باوجود اپنے گھر کی کسی دیوار پر آویزاں کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ ان الماریوں کا باطن ہے اور ان کے ظاہر میں قیمتی کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ دنیا بھر سے جمع کئے ہوئے نوادرات ہیں، سب سے اوپر کسی خطاط کا ایک شاہکار ہے اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ میری نگاہیں الماری کے اس طاقچے تک آئی ہیں جس میں مہاتما بدھ کا وہ مجسمہ ہے جسے Fasting Buddha کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تیاگ اور تپسیا نے کپل وستو شہزادے کا بدن گھلا دیا ہے، گنی جا سکتی ہیں۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا ہے اس کی دھنسی ہوئی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں گھبرا کر کسی اور شے کو دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کی آنکھیں بھی میرے وجود کو حرف حرف پڑھتی تھیں اور مجھے اس کی آنکھوں سے بھی ڈر لگتا تھا پھر بھی دل اس کی طرف کھنچتا تھا۔

وہ رنگوں کی خوشبو تھی جس نے کئی برس پہلے مجھ پر ہجوم کیا تھا اور میں نے چونک کر اپنے برابر آ بیٹھنے والے کو دیکھا تھا۔ اس نے آتے ہی وہسکی ساور کا آرڈر دیا تھا اور دونوں کہنیاں کاؤنٹر پر لگا کر دلچسپی سے بارمین کو گلاس میں وہسکی، لیموں کے عرق اور شکر کو آمیز کرتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ مجھے نظر آ رہا تھا۔ بالوں سے ڈھکا ہوا مضبوط ہاتھ جو اس کے نصف رخسار اور بالوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے غور سے اس کے ناخنوں کو دیکھا تھا، ان کے گوشوں میں رنگ سوتے تھے۔

چند منٹ بعد وہسکی ساور اس کے سامنے آئی تو اس نے رقم بارمین کے سامنے رکھی، پہلی چسکی لے کر گردن گھمائی اور ہم

دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئیں۔

''اپنی طرف کے ہیں آپ؟'' اس کی آواز گہری اور مضبوط تھی اور نگاہیں آواز سے بھی گہری۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں آپ کے بارے میں''۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ یہاں میرے پاس سب کچھ تھا لیکن دوست نہ تھے۔ جو حاضر باش تھے وہ ملازمتیں کرتے تھے اور صرف ویک اینڈ پر دستیاب ہوتے تھے۔ وہ بھی اس لیے کہ میں انہیں مفت کی شراب پلاتا، کھانے کھلاتا اور انھیں ضرورت پڑتی تو دس بیس پونڈ ان کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔

''اس شہر میں آپ شاید بہت دنوں نہیں رہے؟''

''سو تو ہے۔ لیکن آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟'' میں نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔

''یہ جتنے بھی ظالم شہر ہیں''۔

''ظالم؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں، میں تمام بڑے شہروں کو ظالم کہتا ہوں۔ ان میں آدمی زیادہ دن رہ جائے تو انسان نہیں رہتا، جزیرہ بن جاتا ہے۔ جسم کا جزیرہ۔ دوسروں سے کٹا ہوا۔ اپنے بدن کا، اپنی خواہشوں کا قیدی۔ دوسروں سے اس کی روح کا مکالمہ ختم ہو جاتا ہے''۔

''واہ۔ جزیرے والی بات خوب کہی آپ نے''۔ میں نے بے ساختہ اسے داد دی۔ اس کے جملوں میں روشن دھوپ کی آسودہ کر دینے والی چمک تھی۔

اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس وقت کچھ اور مانگتا تو وہ بھی مل جاتا۔ بڑی شبھ گھڑی تھی۔ اس کا گیہواں رنگ سرشاری سے دمک رہا تھا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا''۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''ارے جناب آپ کیا سمجھیں گے۔ ہوا یوں کہ جب میں کام کرتے کرتے تھک گیا تھا تو اٹھ کر کپڑے بدلے اور یہ سوچ کر باہر نکلا کہ اپنی طرف کا کوئی مل جائے تو دو گھڑی اس سے باتیں کر لیں۔ دوسروں کی بولی بولتے بولتے جبڑے دکھنے لگتے ہیں۔ جس زبان میں آپ خواب نہ دیکھیں، عشق نہ کریں، گالی نہ دیں اور ٹھوکر کھا کر جس میں 'ہائے'' نہ کہیں، اسے آپ کب تک بولیں گے؟ اور اگر بولتے بھی رہے تو من کے بھیتر سے کوئی موتی کہاں پائیں گے''۔

''آپ تو بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں''۔ میں پھڑک اٹھا۔ میں اب جن لوگوں میں رہتا تھا ان میں سے کوئی بھی ایسی باتیں نہیں کرتا تھا۔ یہ بھولا بسرا لہجہ تھا، بڑی دور سے آنے والی آوازیں تھیں۔

''اجی ہم یاروں کے یار ہیں۔ آپ دو گھڑی بات کر کے تو دیکھیں''۔ وہ ترنگ میں تھا۔

''لیجیے صاحب، ہم نے آج کی رات آپ کے نام لکھی۔ ایسا کیجیے، یہ گلاس ختم کریں، پھر میرے ساتھ چلیں۔ جی چاہے تو ساری رات باتیں کیجیے گا۔ یوں بھی کل ہفتہ ہے۔ نہ کہیں پہنچنے کی جلدی اور نہ کہیں جانے کا مسئلہ''۔ میں بھی اسی کے سے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔ یوں بھی یہاں کے بار مجھے پسند نہ تھے۔ بھولے بھٹکے مجبوراً کبھی بیٹھ جاتا تھا۔

اس نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور چند لمحوں تک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ''ضرور چلیں گے ہم آپ کے ساتھ۔ لیکن یہ تو بتائیں کہ چلیں گے کہاں؟''

''اس سے آپ کو کیا غرض میں کہاں لیے چلتا ہوں۔ آپ کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی ہم زبان مل جائے۔ میں بھی تنہائی سے اکتا کر باہر نکلا تھا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو مل ہی گئے ہیں تو پھر ذرا جم کر باتیں ہوں''۔

''بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ابھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔لیکن کیا خیال ہے اب جب کہ ہم یہاں سے اکٹھے کہیں جارہے ہیں تو ایک دوسرے کا نام نہ جان لیں؟ باتیں کرنے میں ذرا آسانی رہے گی''۔وہ شرارت سے مسکرایا اور تب مجھے احساس ہوا کہ واقعی ابھی تک ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے ناواقف ہیں۔

''مجھے احمد مسعود کہتے ہیں۔چند مہینوں کے لیے کسی سرکاری کام سے آیا ہوا ہوں''۔میں نے گول مول بات کی۔

''شاید پاکستان سے آئے ہیں؟''

''جی ہاں،لیکن ہندوستان سے بھی تو آسکتا تھا''۔میں نے جواباً سوال کیا۔

''ہاں آتو سکتے تھے لیکن وہاں کے سرکاری افسر اتنی ٹیپ ٹاپ سے نہیں رہتے''۔اس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور لحظہ بھی کے لیے میں جھنجھلا گیا۔عجب بے دھڑک آدمی تھا۔

''ارے بھئی برا نہ مانئے گا میری بات کا۔میں بس یوں ہی بے ڈھب بولتا ہوں''۔اس نے شاید میرے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ لیا تھا۔''اور ہاں،میرا نام تو رہ ہی گیا۔جے پور کا رہنے والا ہوں۔گھر والے اور دوست سب ہی مجھے شیخو کہہ کر بلاتے ہیں۔ویسے میرا نام سلیم ہے،رانا سلیم سنگھ''۔

''آپ ایسے باکمال کا نام بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا''۔ہندوستانیوں اور وہ بھی ہندوؤں سے میل جول کے بارے میں مجھے اپنی وزارت کی ہدایتیں یاد آئیں اور میں نے اس کے کان میں پڑے ہوئے در کو دیکھا۔

وہ نگاہیں پہچانتا تھا،کہنے لگا''میرے کان میں آپ یہ جو مندری دیکھ رہے ہیں اس میں پڑا ہوا یہ موتی منت کا ہے۔اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ماتا جی کی شادی کو کئی برس ہو گئے تھے پر اولاد نہیں ہوتی تھی۔جب وہ ہر سادھو سنت،پیر فقیر سے مایوس ہو گئیں تو ننگے پاؤں،ننگے سر حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پہنچیں۔صاحب ادھر انہوں نے منت مانگی،ادھر دس مہینے بعد ہم وارد ہو گئے۔ماتا جی نے ترنت ہمارا نام سلیم سنگھ رکھ دیا اور صرف اسی پر بس نہیں کیا۔سمجھیں کہ واقعی ان کے گھر میں شہزادہ سلیم پیدا ہو گیا ہے لیجئے صاحب وہ ہمیں شیخو پکارنے لگیں۔سو آج تک ہم گھر میں اور دوستوں میں شیخو ہیں۔اس دائرے سے باہر نکلیں تو سلیم ہیں۔لیکن کوئی انارکلی ہم سے محبت کی سزا میں دیوار میں چنوائی نہیں گئی اور مہرالنساء کی بات رہنے دیں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے شیر افگن کا قتل ضروری ہے''۔

اس نے ایک ٹھاٹ دار قہقہہ لگایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔''چلیں صاحب،اب جہاں چاہیں چلیں''۔

ہم دونوں باہر نکلے تو چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

''ارے ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے ڈرائیور کو ٹرنہم گرین کا پتہ بتایا تو اس نے احتجاج کیا۔

''اماں بھائی صاحب سامنے ہی ہیمر اسمتھ (Hammersmith) کا ٹیوب اسٹیشن ہے۔وہاں سے ٹیوب پکڑتے ہیں تو دو اسٹیشن بعد ٹرنہم گرین ہے۔خیر،جیسے جناب کی مرضی''۔اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

میرا فلیٹ وہاں سے واقعی زیادہ دور نہیں تھا۔بمشکل دس منٹ بعد میں اپنے اس فلیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا جس کی لیز ختم ہونے میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔

میں نے اسے لے جا کر ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔''عالی جاہ،عالم پناہ،یہاں آرام سے بیٹھیں۔سامنے ٹیپ رکھے ہیں۔کلاسیکی،نیم کلاسیکی موسیقی،غزل،جو جی چاہے منتخب کریں اور سنیں۔خود سوچئے کہ جیسا سکون یہاں ہے،کیا وہ کسی بھی بار میں

میسر آسکتا تھا؟'' میں نے جھک کر اس سے سوال کیا۔

''اجی صاحب جو آپ کی رائے وہ پنچوں کی۔ کس کی مجال ہے کہ آپ کی بات نہ مانے''۔ اس نے پرسکون لہجے میں کہا اور صوفے سے اٹھ کر آڈیو کیسٹوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔ میں کچن میں گیا، کیبنٹ سے رائل سیلوٹ (Royal Solute) اور کٹی سارک (Cutty Sark) کی بوتلیں نکال کر ٹرالی میں رکھیں۔ برف، چمکتے ہوئے گلاس اور طشتریوں میں کچھ نمکین چیزیں رکھ کر ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائینگ روم میں آگیا۔

اس نے جوتے اتار کر ایک طرف ڈال دیئے تھے اور صوفے کی بجائے قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ کمرے میں سہگل کی پرسوز آواز گونج رہی تھی ''بالم آئے بسو مورے من میں''۔ وہ آنکھیں بند کئے سہگل کی آواز میں یوں محو تھا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ اس کی تقلید میں مجھے بھی قالین پر بیٹھنا پڑا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا پسند کرے گا، اس نے کٹی سارک کی طرف اشارہ کیا اور میں نے پیگ بنا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹوسٹ کیا اور پھر آواز کی لہروں پر بہنے لگا۔ ''ساون آیا تم نہیں آئے، کوئل کوکت بن میں، بالم آئے بسو مورے من میں''۔ گیت ختم ہوا تو اس نے سر اٹھایا، آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور دھیمے سے مسکرایا۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھیں مجھے پڑھنے پر، میرے اندر تک اتر جانے پر قادر ہوں۔ میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

''اپنے نام کے بارے میں تو آپ نے بڑی تفصیل سے بتایا لیکن یہ نہ بتایا کہ آرٹسٹ بھی ہیں آپ''۔ میں نے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے آپ تو جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔ نہیں جادوگر نہیں، جیوتش ودیا کے ماہر لگتے ہیں۔ آخر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں تصویریں بناتا ہوں''۔ اس نے اپنی بڑی اور گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا، ان میں واقعی حیرانی تھی۔

''آپ جب میرے برابر آ کر بیٹھے ہیں تو آپ میں سے تازہ رنگوں کی خوشبو آئی تھی اور آپ کے ناخن بھی چغلی کھا رہے ہیں''۔

اس نے جلدی سے اپنے ناخنوں پر ایک نظر ڈالی، ''اماں بھائی صاحب پاکستان سرکار کے لیے شرلاک ہومز والا کام کرتے ہیں کیا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

میں چپ رہا تو وہ بھی چپ ہوگیا۔ چند لمحوں بعد کہنے لگا ''آپ جس بار میں بیٹھے تھے میں اس کے قریب ہیمر اسمتھ میں رہتا ہوں ریور سائیڈ اسٹوڈیو (Riverside Studio) کے نزدیک، کسی روز میری طرف آئیں تو میں آپ کو اپنی بنائی ہوئی تصویریں دکھاؤں۔ کچھ دنوں میں میری Exhibition بھی ہونے والی ہے، ریور سائیڈ اسٹوڈیو کی گیلری میں''۔

''ون مین شو ہے۔ چند مہینوں بعد ہوگا۔ آپ ضرور آئیے گا''۔

''ہاں اگر اس وقت تک میں لندن میں رہا تو ضرور آؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے بھی ان کے درشن کروں گا''۔ میں نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔

''لیکن میری تصویریں دیکھ کر شاید آپ کو لطف نہ آئے۔ میری تصویروں کے تھیم بڑے کڑوے ہیں''۔ اس نے ایک بڑا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ اور لہجہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''زندگی اتنی کڑوی تو نہیں شہزادے''۔

''یہ زندگی کو دیکھنے کا ہر آدمی کا اپنا ڈھب ہوتا ہے جو اسے کڑوا یا میٹھا بنا دیتا ہے۔ پہلے کے آرٹسٹوں کی تصویروں میں کڑواہٹ اول تو کم ہوتی تھی اور اگر ہوتی تو مٹھاس بھی ساتھ ہوتی تھی۔ بدصورتی ان کے ہاں حسن کے سائے میں ہوتی تھی۔ لیکن

ہمارے زمانے میں تو مٹھاس جیسے زندگی کی تہ میں کہیں بیٹھ گئی ہے'' ۔ اس کا لہجہ اداس تھا۔

میں خاموشی سے شراب میں گلتی ہوئی برف کی ڈلیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے تک خاموش رہا پھر اچانک بول اٹھا ''سترھویں، اٹھارویں، انیسویں صدی میں بنائی جانے والی تصویریں دیکھیں۔ اس زمانے کے بڑے بڑے چترکار چرچ کے لیے تصویریں بناتے تھے یا بادشاہوں، شہزادوں، ان کی محبوباؤں، ان کے گھروں اور ان کے شکاری کتوں کی تصویریں۔ میدان جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی لاشوں پر کھڑے، تنتے ہوئے، فاتح حکمراں ان کا موضوع ہوتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی بناتے تھے اس کا معاوضہ انہیں مذہب کا ادارہ ادا کرتا تھا یا بادشاہت کا۔ کچھ رقم اور سرپرستی انہیں فیوڈل لارڈز (Feudal Lords) سے مل جاتی تھی۔ ان کا کمٹ منٹ (Commitment) صرف اپنے فن سے تھا۔ یہ تو بیسویں صدی ہے جس نے کوئی کو، ادیب اور چترکار کو براہ راست جنتا سے جوڑ دیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں، یا جنتا کے ساتھ جا کر کھڑا ہو جائے یا اسٹبلشمنٹ سے ناتا جوڑے۔ پہلے کا آدمی راستوں کے انتخاب کے مرحلے سے نہیں گذرتا تھا جس طرح اب ہم گذرتے ہیں۔ اسی لیے ہماری ذمہ داری بھی بڑی ہے اور ہمارے عذاب بھی بہت ہیں''۔

میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ میرے اپنے ڈرائینگ روم میں ایک بہت مشہور مصور نے ہمارے ہر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، صدر اور وزیر اعظم کی تصویر بنائی تھی اور اسی لیے اس کے مرتبے بہت بلند تھے۔ وہ سرکاری محکموں کے لیے، سفیروں اور سفارت خانوں کے لیے تصویریں پینٹ کرتا تھا۔ ان کا معاوضہ اسے لاکھوں میں ملتا تھا۔ اب وہ محض حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ تخلیق کرنا بھول چکا تھا۔ آپ لاکھوں میں کھیل رہے ہوں، ساری دنیا کا سفر کر رہے ہوں تو ''تخلیق'' اور ''تخیل'' کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں؟ یہ رانا سلیم سنگھ ابھی دنیا کو نہیں سمجھا تھا، میری طرح جب دنیا اس کی سمجھ میں آ جائے گی تو یہ خود ہی سدھر جائے گا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

''اچھا اب تم اپنا پیگ بناؤ اور ایک میرے لیے بھی''۔ ہم دونوں کے ہی گلاس خالی ہو گئے تھے۔ اور میں اب ''آپ'' سے تم پر اتر آیا تھا، وہ ابھی اسی لہر بہر میں تھا جس میں اکثر نوجوان ہوتے ہیں، آدرش کی باتیں اور دنیا اور دنیا کو بدلنے کے خواب۔ کبھی میری آنکھیں بھی یہ خواب دیکھتی تھیں۔

اس نے پیگ بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

''میاں گھونٹ بھرو اور غم بھلاؤ۔ اس میں اداس ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہیں''۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔

''میں اس لیے اداس ہوتا ہوں یار صاحب کہ میرا جی خوش ہونے کو چاہتا ہے۔ حسن کو محسوس کرنے اور میٹھے رنگوں سے کھانڈ کے کھلونوں جیسی تصویریں بنانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میرے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہو گیا ہے وہ مجھے زندگی کو کسی اور طرح دیکھنے پر مجبور کرتا ہے''۔ میں نے اس کی آنکھوں کے نم کو دیکھا اور یوں بن گیا جیسے کچھ نہ دیکھا ہو۔

وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر کہنے لگا ''پہلے والے آرٹسٹ Nudes بناتے تھے تو اس میں حسن، توازن، تناسب جھلکتا تھا۔ آج بھی ماسٹرز کی بنائی ہوئی نیوڈز کے سامنے کھڑے ہو تو کچھ دیر بعد حواس دھوکا دینے لگتے ہیں۔ ان تصویروں میں سے جیتی جاگتی عورت کے بدن کی خوشبو اٹھنے لگتی ہے۔ لیکن میں ایسی حسین تصویریں کیسے بنا سکتا ہوں؟ کالج میں تھا تو ریلیف ورک کے لیے بنگال گیا۔ وہاں میں حسن بنگال کے بجائے فاقہ زدہ عورتیں دیکھیں جن کی چھاتیاں سوکھ کر پسلیوں سے چپک گئی تھیں۔ یونیورسٹی پہنچا تو کمیونل رائٹس میں گھروں کے آنگنوں میں لیٹی ہوئی نیوڈز دیکھیں جن کی کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کو تکتی تھیں''۔

وہ بولتا چلا گیا۔ کچھ دیر پہلے ہنس رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور اب یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے دیوتا اٹلس ہو اور دونوں شانوں پر دنیا

اٹھائے ہو۔

اس سے ملنے سے پہلے مجھے اپنے آپ پر ناز تھا کہ ماسٹرز کی تصویروں کے بارے میں بہت جانتا ہوں لیکن اس سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے بڑے مصوروں اور ان کی تصویروں کے بارے میں پڑھا ہے، سرسری طور پر انہیں آرٹ گیلریوں میں دیکھا ہے۔ سلیم سنگھ ان تصویروں کی روح میں اترا ہوا تھا۔ وہ کس روانی سے بولتا تھا اور کس سہولت سے اپنی بات بیان کرتا تھا۔ وہ Guya سے بے حد متاثر تھا۔ جنگ، قحط اور انسانوں پر ہونے والے مظالم نے گویا کے فن پر جو اثرات مرتب کئے وہ دیر تک ان کا ذکر کرتا رہا۔ اس کے خیال میں گویا پہلا بڑا مصور تھا جس نے انسانی عذابوں کی تصویر کشی کی تھی۔ جہنم کے ساتویں طبقے اور جیل خانوں میں ہونے والے شدائد، فاتحین کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا قتل عام اور بھٹی دہکانے اور غاصبوں کے خلاف لڑنے کے لیے کارتوس بنانے والوں کی تصویریں۔

وہ بطور خاص ان Eochings کا ذکر کرتا رہا جو گویا کے البم The Shadow of War کا ایک حصہ ہیں۔ جیل خانے میں انسان، انسان پر جو ظلم روا رکھتا ہے گویا نے یہ تصویریں اس بارے میں بنائی تھیں۔ یہ تین تصویریں جو بیڑیوں ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک قیدی کی تصویریں تھیں، اس پر گذرنے والے سارے عذابوں کو اور ''انصاف کرنے والوں'' کے ''انصاف'' کو ظاہر کرتی تھیں۔ ''قید اس قدر وحشیانہ ہے جس قدر کہ جرم'' ''کسی مجرم پر تشدد کیوں۔۔۔'' ''اگر وہ مجرم ہے تو اسے جلد مر جانے دو''۔ وہ ان عنوانات والی Ecohings پر بولتا رہا۔ پھر اچانک خاموش ہو گیا۔

''کیوں بھئی۔ شیخو بابا تم چپ کیوں ہو گئے؟'' خاموشی طول کھینچنے لگی تو میں نے ہنس کر پوچھا۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی تھی اور میں ایک عرصے سے اتنی بوجھل باتوں کا عادی نہیں رہا تھا۔

''مجھے اب اپنا رنواس یاد آنے لگا''۔ اس کا لہجہ شراب سے بھیگا ہوا تھا۔

''رنواس؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں جان عالم۔۔۔ رنواس۔۔ جہاں رانیاں رہتی ہیں، جسے تم حرم کہتے ہو، جی چاہے پرستان کہہ لو''۔ وہ مجھے آنکھ مار کر ہنسا۔

''رنواس کے معنی میں جانتا ہوں، اتنی اردو یا ہندی مجھے بھی آتی ہے''۔ میں برا مان گیا۔

اس کی سرخ آنکھیں میرے اندر سفر کر رہی تھیں۔

''کیسے شرابی ہو یار صاحب، بوتل والی اندر اترے تو سینہ دھو دیتی ہے، ساری کھوٹ کپٹ کینہ کاٹ دیتی ہے''۔

اس نے اپنا خالی گلاس اٹھایا اور میری آنکھوں کے سامنے لہرایا''۔ یہ جب میرے اندر سفر کرتی ہے تو مجھے اپنی رانیاں، اپنی پریاں یاد آنے لگتی ہیں۔ اب میں جاؤں گا، وہ روٹھ گئی ہوں گی تو انہیں مناؤں گا۔ سبز پری، نیلم پری، لال اور بسنتی پری''۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو یوں لہرایا جیسے اس کے ہاتھ میں برش ہو اور وہ اس سے رنگ بکھیر رہا ہو۔

میں اس کے ساتھ سڑک تک آیا۔ میں اسے ٹیکسی میں بٹھا کر گھر بھیجنا چاہتا تھا لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور ہلکی پھوار میں بھیگتا ہوا اتنا بڑا سا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا ہے خانہ بھی گنگناتا ہوا چلتا چلا گیا۔

میں اس وقت تک پھوار میں بھیگتا رہا جب تک وہ گلی کا موڑ مڑ کر میری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ یہ میں تھا جو گنگناتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ میں جو بوجھل قدموں سے اپنے فلیٹ میں واپس آیا اور ایش ٹرے کے نیچے رکھے ہوئے کاغذ کے اس پرزے کو اٹھا کر دیکھتا رہا جس پر اس نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ یہ میرا پتہ تھا۔ اس احمد مسعود کا پتہ جس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے برسوں پہلے چھوٹ گیا تھا۔

اس کی یادتو مجھے نہ جانے کب سے نہیں آئی تھی اور اب جب کہ وہ اپنی جھلک دکھا کر چلا گیا تھا تو میرے دل پر آرے چل رہے تھے۔
میں پیتا رہا، برسوں کا غبار دھوتا رہا اپنے آپ سے بچھڑ جانے والے احمد مسعود کو یاد کرتا رہا جو فراق گھورکھپوری کا شاگرد تھا اور ان جیسا، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین جیسا استاد بننا چاہتا تھا۔ لیکن ملازمتیں عنقا کا پر ہو چکی تھیں۔ تب احمد مسعود نے الٰہ آباد چھوڑا، لکشمن ریکھا پار کی اور کوونڈا کا رخ کیا جہاں جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ وہ جو استاد بننے کے سفر پر نکلا تھا دنیا اس سے استادی کر گئی۔ اس نے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا لیکن فراق گورکھپوری اور احتشام حسین لکشمن ریکھا کے ادھر رہ گئے تھے۔
خواہشیں بھٹکے ہوئے پرندوں کی طرح احمد مسعود کے وجود کی منڈیر پر اتریں، اور پھر انہوں نے اس کے سارے بدن میں بسیرا کر لیا۔ اس کے باطن میں سوئی ہوئی دنیا جاگ گئی اور چپکے چپکے پاؤں پھیلانے لگی۔ احمد مسعود خود سمٹتا گیا، سکڑتا گیا۔ دنیا کو اور اس کی خواہشوں کو جگہ دیتا گیا۔ پھر وہ سمٹتے سمٹتے بدن کے دائیں ہاتھ میں رہنے لگا۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد جس روز میں نے کالج کے پرنسپل کے نام استعفیٰ لکھا تو میں نے دیکھا کہ میرا ماں جایا، میرا یار جانی احمد مسعود کسی سائے کی طرح میری انگشت شہادت سے نکلا اور خواہشوں اور دنیا کی ہم سائیگی سے آزاد ہو گیا۔
وہی احمد مسعود اب رانا سلیم سنگھ کے قالب میں رہتا تھا۔ شاید کسی اور بدن میں بھی رہتا ہو۔ لیکن میرا تو برسوں بعد اس سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ تبھی تو اس اجنبی آشنا سے مل کر میں بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے رنواس میں چلا گیا تھا، تصویروں اور پریوں کی سجا سجانے۔ لیکن میں کسی حجرۂ ذات کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے بٹوے میں بھرے ہوئے ملکہ کی تصویر والے نوٹوں سے کوئی مہنگی کتاب خرید کر پڑھ سکتا تھا۔ اس کے ذکر سے اپنے کم حیثیت ملنے والوں پر رعب ڈال سکتا تھا۔ لیکن ادب یا فلسفہ یا شاعری کے اسرار اب مجھ پر نہیں کھلتے تھے۔ باحیا کنواریاں اپنے بند قبا کسی اجنبی کے لیے کب اور کہاں کھولتی ہیں۔
اس رات میں پیتا ہی چلا گیا اور میرے کانوں میں اس کی آواز گونجتی رہی۔ مجھے کئی بار اس کی آواز پر اپنی کھوئی ہوئی آواز کا شبہ ہوا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی بارش جب بہت زیادہ ہو تو پرانی قبریں کھل جاتی ہیں اور برسوں پہلے دفن کر دی جانے والی لاشوں کے ڈھانچے باہر آنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ لیکن سمجھدار لوگ فوراً ہی ان ڈھانچوں کو بیلچوں سے قبروں میں دھکیل دیتے ہیں اور ان پر تازہ مٹی ڈال دیتے ہیں۔ ان قبروں کو پتھروں سے بھر دیتے ہیں۔ اس رات میں نے بھی سلیم سنگھ کی باتوں کے بہاؤ سے کھل جانے والی ایک قبر سے جھانکنے والے اپنے ڈھانچے کو اندر دھکیلا اور اس پر یادفراموشی کی بھر بھری ریت ڈال دی۔
میں کئی دن تک اس کی یاد کو ذہن کے مردہ خانے میں دھکیلتا رہا، خود کو سمجھاتا رہا کہ اس سے ملنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ کسی رانا سلیم سنگھ کا مجھ سے بھلا کیا علاقہ؟ میں جس شعبے سے تعلق رکھتا تھا اس میں ایسے لوگوں سے ملاقاتیں ناپسندیدہ ٹھہرتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی ایسی بات تھی جو دوسروں میں نہ تھی۔
اور پھر ایک شام میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو رنگوں سے لتھڑے ہوئے کرتے پاجامے میں وہ سامنے کھڑا تھا۔ ہاتھ میں برش تھا مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔
''ارے واہ تو آپ آ گئے۔ میں روز ہی آپ کی راہ دیکھتا تھا''۔ اس کی بے ساختگی میں کیسی مٹھاس، کیسا سوندھا پن تھا۔ مجھے ہائی سکول کے سامنے سے خریدی ہوئی گزک یاد آنے لگی۔ سوندھی اور میٹھی منہ میں گھلتی ہوئی، نشے میں لاتی ہوئی، وہ نشہ تو اب مہنگی شرابوں سے بھی میسر نہیں آتا تھا۔
میں اندر داخل ہوا۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا، بے ترتیب، تازہ رنگوں کی خوشبو در و دیوار سے پھوٹتی ہوئی۔ کئی کینوس دیواروں پر آویزاں تھے، کئی دیوار سے ٹکا کر رکھ دیے گئے تھے۔ ایک کینوس ایزل پر تھا اور ادھورا تھا۔ وہ شاید اسی پر کام کر رہا تھا۔ فرش پر،

تپائیوں پر، کتابوں کے ڈھیر تھے۔ ایک کونے میں ایک زنگ آلود ہاون دستہ رکھا تھا۔ شیشے کے مرتبان تھے جن میں سے پھول اور جڑی بوٹیاں جھانک رہی تھی کسی عطار کی دکان کا منظر تھا۔

میں نے اسے دیکھا تو وہ گردن خم کیے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''یہ سب کچھ دیکھ کر پریشان ہو گئے ہیں آپ لیکن بس یہی میرا رنواس، میرا پرستان ہے۔ انتظار کیجئے کہ کسی بھی لمحے اچانک کوئی پری نمودار ہو جائے اور یہ آواز لگائے کہ معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں، دھانی میری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں''۔

''میرے خیال میں اس کے بعد اسے یہ اعلان بھی کرنا چاہیے کہ شہزادہ گلفام کی صورت پہ مری ہوں''۔ میں نے اس کی بات پر گرہ لگائی۔

میرے جملے پر اس نے قہقہہ لگایا اور کمرے میں بچھے ہوئے واحد دیوان پر سے رسالے اور کتابیں اٹھا کر فرش پر رکھنے لگا۔ ''آپ آرام سے یہاں بیٹھ جائیں، میں ابھی آیا''۔ گیلری کا دروازہ کھول کر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے لکشمن ریکھا پار کرنے سے پہلے کے دن یاد آئے۔ ان دنوں میرا کمرہ بھی اتنا ہی بے ترتیب ہوتا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس میں تصویروں کی بجائے کتابیں تھیں۔ کسی کونے میں کرتے کا گولہ پڑا ہوا ہے۔ دلائی فرش پر لوٹ رہی ہے۔ پلنگ کی ادوائن کسنے کی فرصت نہیں سو وہ جھلنگا ہو گئی ہے۔ ایک تپائی پر ابا کا گرامو فون رکھا ہے جس پر صبح شام کوئی ایک ریکارڈ اس وقت تک بجایا جاتا ہے جب تک کہ وہ گھس کر ختم نہ ہو جائے۔ ایک ہی ریکارڈ نہ بجائیں تو کیا کریں کہ گرہ میں دوسرا خریدنے کا دم نہیں۔

''کھینچو کمان، مارو جی بان، رت ہے جوان، ادمورے پران، مارو جی بان''۔ میرے بدن پر ارمانی (Armani) کا سوٹ تھا، قمیص آسٹن ریڈ کی اور اوورکوٹ بربری (Burberry) کا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں بیٹھوں جو سوٹ پر دھبے نہ لگیں اور قمیص کے کف داغ دار نہ ہوں۔ اوورکوٹ کس چیز پر لٹکاؤں کہ وہ گرد آلود نہ ہو۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایک تپائی پر گرامو فون رکھا تھا۔ میں نے جیسے خواب میں اپنا اوورکوٹ اتار کر اسے ایک کرسی کی پشت پر ڈال دیا اور اس گرامو فون کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اسکے آنے کی خبر مجھے تارپین کی تیز بو سے ہوئی۔ ''میں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا''۔ اس کے ہاتھ پر سے رنگ اتر گئے تھے لیکن تارپین کے سفید دھبے نظر آ رہے تھے۔

''میرے خیال میں تھوڑی سی دارو چلے، تب ہی دلوں پر جمی ہوئی برف پگھلے گی''۔ اس نے کہا اور کچن سے ایک بوتل اور دو گلاس لے آیا۔ پھر کسی کونے سے اس نے چپس کا ایک پیکٹ نکالا اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ جب گلاس میں شراب انڈیل رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص جو اتنے بے ڈھنگے پن سے یہاں رہتا ہے، میرے آراستہ فلیٹ میں آ کر یوں بیٹھ گیا تھا جیسے آسائش کی زندگی اس کا روزمرہ ہو۔ مجھے پہلے اس پر رشک آیا، پھر حسد ہوا۔ پھر کسی نے مجھ سے کان میں پوچھا کہیں اپنے آپ سے بھی حسد کرتے ہیں؟ کبھی اپنے آپ پر بھی کسی کو رشک آتا ہے؟

گھونٹ بھرتے ہوئے میری نظر گرامو فون کا طواف کرنے لگی۔

''کچھ سنیں گے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ چلتا ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے یار صاحب ایسا ویسا چلتا ہے؟ ون ہنڈریڈ پرسنٹ چلتا ہے''۔ اس نے دیوان کے نیچے سے ایک ریکارڈ کیس نکالا اور اس میں رکھے ہوئے ریکارڈ الٹنے پلٹنے لگا۔ پھر ایک ریکارڈ اٹھا کر وہ گرامو فون تک گیا، سوئی بدلی چابی بھری اور پھر وہ آواز

در و دیوار پر پھیل گئی، ''کھینچو کمان مارو جی بان مارو جی بان''۔

میرے سینے پر تیر سا لگا اور میرے ہاتھ میں تھما ہوا گلاس لرز گیا۔ یہ کمرہ تھا کہ جادو نگری؟ یہ شخص تھا کہ میری بھولی بسری یادوں کو پڑھنے والا؟ یہ وہ تھا کہ میں تھا؟ یہ میں تھا کہ وہ تھا؟

سامنے اس کی ایک پینٹنگ تھی۔ اس میں سمندر تھا، تہ میں سبز اور نیلا، سطح پر سفید جھاگ پر آسمان کی نیلگونی کا عکس تھرتھرا رہا تھا۔ پلٹتی ہوئی لہروں کی سبزی مائل نیلگونی میں سے کئی شکاری کتے نکل رہے تھے اور سمندر کی لہروں پر پر دوڑتے ہوئے اس ایک بگلے کا تعاقب کر رہے تھے جوان کے کھلے ہوئے نوکیلے جبڑوں اور رال گراتی ہوئی سرخ زبانوں سے کچھ ہی اوپر اڑ رہا تھا۔ تصویر میں سمندر اور کتے دونوں ہی اس خوبی سے پینٹ کیے گئے تھے کہ دیکھ کر کتوں کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوتی تھی اور بھنور ڈالتا ہوا پانی اس قدر زندہ تھا کہ اس میں ہاتھ ڈبونے کو جی چاہتا تھا۔

''تم تو سمندر کا ایک ٹکڑا چرا کر لے آئے ہو اور اسے کینوس پر رکھ دیا ہے''۔

''اجی ہم تو آنکھوں سے سرمہ اور پسلیوں سے دل چرا لاتے ہیں، یہ سمندر کیا چیز ہے''۔ اس کی ہنسی کیسی بے ریا، کیسی ٹھاٹ دار تھی۔

''لیکن رانا جی، سرے والی کہیں نظر تو نہیں آ رہی''۔ اپنے لہجے کی شرارت مجھے خود اجنبی لگی۔

''ذرا چھری تلے دم تو لو یار صاحب، سرے والی سرکار بھی آ جائے گی، پھر آپ کو اس سے میر کی غزلیں اور میرا کے بھجن سنواؤں گا۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو''۔ اس کی زبان سے پھول جھڑ رہے تھے۔ وہ آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔

''ماشاءاللہ۔۔۔ کیا بامحاورہ اردو بولتے ہو''۔ میں نے گھونٹ بھر کر اسے دیکھا۔

''میں نے مولوی صاحب سے صرف ہندی اور اردو ہی نہیں، فارسی بھی پڑھی ہے۔ تختی لکھی ہے۔ کہیے تو کریما بہ بخشائے بر حال ماسناؤں، یا شاہنامے کے اشعار سنیں گے؟'' وہ مسکراتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ میں نے ہندی کیوں بھلا دی۔ ہندی، ہندوی، ہندوستانی، امیر خسرو اس جھنجھٹ میں پڑے بغیر سات سو برس پہلے کہہ گئے تھے، ''سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوتو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں، نہ آپ آوی نہ بھیجیں پتیاں''۔ اب لکشمن ریکھا کے اس پار سے خط بھی نہیں آتے تھے۔ خون کے تمام رشتے بتاشے کی طرح بیٹھ گئے تھے اور مشترک تہذیب کی سیتا کو سیاست کا راون اٹھا لے گیا تھا۔

میرے فلیٹ پر سرکاری اور درباری دونوں ہی قبیلوں کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سلیم سنگھ ان لوگوں کو میرے یہاں وقت بے وقت نظر آتا تو سرگوشیاں شروع ہو جاتیں اور سرگوشیاں سوال اٹھاتی ہیں۔ میرے الجھے ہوئے معاملات مجھے اس کی اجازت نہ دیتے تھے لیکن اس سے پہلی ملاقات کے بعد سے دل بے اختیار اس سے ملنے کی خواہش کرتا۔ اسی لیے سلیم سنگھ کو بلانے کی بجائے میں خود اس کے یہاں چلا جاتا۔ میں کبھی کسی عورت کا بھی یوں اسیر نہیں ہوا تھا، آسمان کو چھوتی ہوئی اس سیڑھی کا بھی نہیں جو میری بیوی ہے اور ایک افسر اعلیٰ کی بیٹی ہے۔ سیڑھیاں بلندیوں تک پہنچنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کی ہم پوجا نہیں کرتے۔

سلیم سنگھ کے در پر میں بے قراری اور بے تابی سے جاتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ میں وہاں اپنی تلاش میں جاتا تھا، وہ بھی مجھ سے یوں ملتا جیسے صدیوں کا بچھڑا یار مل رہا ہو۔ دوسری تیسری ملاقات میں ہی وہ مجھے ''سوائی صاحب'' کہنے لگا تھا۔ جے پور کے راجہ جے سنگھ کا وہ خطاب جو اسے اورنگ زیب کے دربار سے ملا تھا۔ کچھواہا راج کو دوسرے تمام راجپوت راجوں سے ایک چوتھائی زیادہ ماننے کا اعلان۔ وہاں پہنچ کر مجھے محسوس ہوتا کہ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی میں کسی دیو کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں، وہ جو زندانی ہوں وہی جانتے ہیں کہ چند گھنٹوں کی رہائی بھی کیا معنی رکھتی ہے۔ میں اس سے وہ باتیں کرتا جنہیں

میں کب کا بھلا چکا تھا۔ان ناموں کو سنتا جن کا نام لیتے ہوئے کبھی میری آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہ کس طرح اترا کر خسرو، میر، کبیر کا نام لیتا، تلسی داس کی چوپائیاں اور غالب کی غزلیں سناتا، تان سین اور بسم اللہ خان، کون تھا جو اس کا نہیں تھا۔ تاج محل اور اجنتا ایلورا اس کا ورثہ تھے، راجہ دہلو کی بسائی ہوئی دلی اس کی تھی اور کمپنی بہادر کا آباد کیا ہوا کلکتہ بھی ترکے میں اسے ملا تھا۔ ستم تو یہ تھا کہ بٹوارے کے نتیجے میں شہید بھی تقسیم ہو گئے تھے۔ بھگت سنگھ اور دادا اشفاق، جھانسی کی رانی اور حضرت محل بھی اسی کے حصے میں آئی تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ خالی رہ گئے تھے۔ ایک رات اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت سے لوگ بہت سے شہر اور بہت سی عمارتیں یاد آئیں، اس رات میں اس کے سامنے رو دیا۔

''یار یہ تو بڑی بے ایمانی ہے۔ تو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا''۔ اپنی ٹوٹی ہوئی آواز سن کر میرا گریہ اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اس نے نشے سے بھیگی ہوئی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

''تم تاریخ کا کیک کھانا بھی چاہتے ہو، اسے رکھنا بھی چاہتے ہو۔ اتہاس تو دھرتی سے جڑا ہوتا ہے۔ ہم جب دھرتی سے ناتا توڑ لیں تو اتہاس سے ناتا خود ہی ٹوٹ جاتا ہے''۔

میں نے سر جھکا لیا تھا، نشے میں بھی مجھے یہ یاد رہا تھا کہ میں اس سے شکایت کا حق نہیں رکھتا۔

جے پور اس کے پور پور میں رچا ہوا تھا۔ ایک دن ترنگ میں تھا سب کچھ بھول کر امیر جے پور کی باتیں کرتا چلا گیا۔

''جن نے جے پور نہیں دیکھا سوائی صاحب ان نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ بھی نہیں۔ جانو کہ زندگی اکارت گئی''۔ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''سوائی صاحب، اپنی زندگی کے کچھ دن مجھے دے دو، میرے ساتھ جے پور چلو، دیکھو کہ راجپوتوں اور مغلوں کی رشتہ داریاں آج بھی ہمارے شہروں اور بازاروں میں کس طرح جھلکتی ہیں۔ مغل بادشاہ اور شہزادے ہماری گودوں میں کھیلے ہیں۔ ہم نے ان پر سے جانیں واری ہیں۔ ساموگڑھ میں ہارتے ہوئے دارا کے گرد ہم راجپوتوں نے گھیرا ڈالا تھا۔ اپنی گردنیں کٹا دی تھیں، پر پیٹھ نہیں دکھائی تھی''۔

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے، وہ ماضی اور حال میں بہ یک وقت زندہ رہتا تھا۔ سانس لیتا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

''اجی مہابلی، اکبر ہم کچھواہہ راجپوتوں کے بہنوئی تھے اور شہزادہ سلیم کو چاندی کی کٹوری میں دودھ طیارہ ہم نے کھلایا تھا۔ ہم ان کے ماموں، وہ ہمرے بھانجے''۔ پھر وہ گنگنانے لگا۔ ''مانگے ہے جودھا جی کا راج لالا جی کا تال نہ چھوائے''۔

وہ یہ باتیں کرتے ہوئے کبھی روتا، کبھی ہنستا رہا۔ ماضی اور حال کو یوں گڈمڈ کرتا رہا کہ میں بھی اس کے ساتھ زمیں بوس ہو جانے والی محل سراؤں میں پھرتا رہا۔

'' کچھ جانتے بھی ہو سوائی صاحب، شہزادہ سلیم ہماری مان بائی کو بیاہنے گیا تو دلہن کی پالکی مہابلی اور شہزادہ سلیم اپنے کندھوں پر اٹھا کر راجہ بھگوان داس کے محل سے باہر لائے تھے اور مہابلی نے راجہ سے کہا تھا ''تمہاری رے بیٹی، تمہارے محلوں کی رانی، ہم صاحب سردار ے۔۔۔''اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کی لو چھوئیں اور '' ہے رام'' کا نعرہ لگایا۔

''میاں سلیم سنگھ تم اگر پچیس تیس برس پہلے مجھے ملے ہوتے تو میں کہتا کہ اپنا یہ کام دھام چھوڑ کی بمبئی چلے جاؤ اور کے۔ آصف کے یہاں بھرتی ہو جاؤ۔ انہوں نے بھی ''مغل اعظم'' بناتے ہوئے مغلوں اور راجپوتوں کی مالا اس طرح نہیں جپی ہے''۔ میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

وہ مجھے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر اداسی سے مسکرایا۔ ''میں یہ باتیں کسی اور سے نہیں کرتا صرف تم سے کرتا ہوں سوائی صاحب

دوسرے تو مجھے سودائی سمجھیں گے''۔
''میں بھی تمہیں کچھ کم سودائی نہیں سمجھتا''۔
''واہ کیا نام رکھا جا سکتا ہے۔ رانا سلیم سودائی جے پوری''۔ اس نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔
''اس نام سے تو میں کل ہند مشاعرہ پڑھ سکتا ہوں''۔
''اور غزلیں کہاں سے آئیں گی؟''
''اجی غزلوں کا کیا ہے، ڈیڑھ دوسو برس پہلے پران تیاگنے والے کسی بھی کائستھ کوی کا کلام آخر کسی کے کام تو آئے''۔
ہم دونوں اس طرح بے تکی باتیں کرتے۔ شاید یہی کتھارسس کا ایک طریقہ تھا۔ کبھی میرا جی چاہتا کہ سر پیٹ کر اس کمرے سے نکل جاؤں جس میں کھرل گئے ہوئے زعفران کی، ہاون دستے میں کوٹی جانے والی جڑی بوٹیوں اور پھولوں کی، تارپین کے تیل اور خدا جانے کن کن چیزوں کی خوشبو تھی۔ مجھے الہ آباد کے عطار خانے یاد آتے۔
''اور میاں مغلوں کے ماموں صاحب۔ ہم لندن میں بیٹھے ہیں۔ کبھی پکاڈلی اور آکسفورڈ اسٹریٹ کا رخ کرو، کبھی تو ٹاور آف لندن یا بکنگھم پیلس کا بھی دیدار کرنے چلو''۔ ایک روز میں نے جھنجھلا کر کہا تھا۔
''کیسی باتیں کرتے ہو سوائی صاحب؟ ہمارے خزانے، ہمارا اتہاس، ہمارے درشن جھروکے اور ہماری چوکھٹیں تک تو لوٹ لائے یہ لوگ۔ اور ہم جا کر اپنی ہی چیزوں کو دیکھنے کے لیے ٹکٹ خریدیں، پونڈ خرچ کریں اور گورے ڈاکوؤں کا لوٹا ہوا مال دیکھیں؟ نہیں سوائی صاحب یہ نہیں ہونے کا''۔
''جب یہ سب کچھ نہیں دیکھنا تو پھر یہاں لندن میں کیوں بیٹھے ہو؟ جاؤ اور جا کر جے پور میں دھونی رماؤ''۔ میں نے اس پر چوٹ کی۔
میری یہ بات سنتے ہی اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ بیٹھا سر ہلاتا رہا، پھر اس نے اپنی مدھ ماتی آنکھوں سے مجھے دیکھا ''گھر کیسے جاؤں؟ پتا جی کھانڈے سے چورنگ کاٹیں گے''۔
''پتا جی کیوں کھانڈے سے چورنگ کاٹیں گے؟ کیا ڈاکہ ڈال کے بھاگے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''یار وہ اپنے جگری دوست کی بیٹی سے میرے پھیرے کرانے کے چکر میں ہیں۔ میں وہاں سے یہ کہہ کر رفو چکر ہوا ہوں کہ لندن میں میری نمائش ہے، اس سے نمٹ کر میں ترنت آیا''۔ وہ ایک ادا سے ہنسا۔
''اور اب کتنے دنوں سے لندن میں ہو؟''
''یہی کوئی چھ ایک مہینے ہو گئے''۔
''لیکن اس طرح کب تک یہاں رہو گے؟''
''یہ نہ پوچھو۔ ماتا جی نے ڈاک اور فون سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں ہر مرتبہ انہیں کوئی نیا جھانسہ دے دیتا ہوں''۔
''ابے گاؤدی، کب تک نیا جھانسہ دیتے رہو گے؟'' میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''ان سے صاف انکار کیوں نہیں کر دیتے؟''
اس نے آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا، ''اپنے اللہ رسول کا شکر ادا کرو کہ جس نے تمہیں ایک راجپوت باپ کے گھر نہیں پیدا کیا''۔

''تو اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''
''وہ مجھے تو بس بنی ٹھنی کا انتظار ہے'' اس نے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔
''بنی ٹھنی؟ بھئی یہ کس بلا کا نام ہے؟''
''سچ کہتے ہو سوائی صاحب واقعی قہر ہے، بلا ہے''۔اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔
اس روز وہ دیر تک میرا سین کی باتیں کرتا رہا جسے وہ لاڈ سے ''بنی ٹھنی'' کہتا تھا۔
''اسے دیکھ کر تم بھی یہی کہو گے کہ اس پر یہ نام سجتا ہے۔ایسا سنگھار پٹار کرتی ہے کہ بس دیکھتے رہو''۔میرا سین کا نام ''بنی ٹھنی'' اس نے راجہ ساونت سنگھ کے دربار کے نہال چند کی بنائی ہوئی ایک تصویر سے دیکھ کر رکھا تھا۔نہال چند اپنے عہد کا سب سے مشہور چتر کار تھا۔اس نے رادھا اور کرشن کی کہانی رنگوں اور برش سے کاغذ پر اتاری تھی۔کرشن اس نے راجہ ساونت کو بنایا تھا اور رادھا کا چہرہ بناتے ہوئے راجہ کی چہیتی محبوبہ ''بنی ٹھنی'' کو سامنے رکھا تھا۔
''میں نے بنی ٹھنی کا پورٹریٹ دیکھا ہے۔تم یقین کرو سوائی صاحب، یوں دکھائی دیتا ہے جیسے میرا کا ہی عکس ہے''۔اس نے بڑی رازداری سے مجھے بتایا تھا۔
میرا تھیٹر کی دنیا سے وابستہ تھی، بنگال کی رہنے والی، گانے اور ناچنے میں طاق۔پہلی ہی ملاقات میں رانا سلیم سنگھ کا دل لے گئی تھی۔لیکن سلیم سنگھ کے پتا جی کے لیے یہ ناک کٹا دینے والی بات تھی کہ ان کی اکلوتی بھانجی کے بجائے ان کا منتوں مرادوں کا بیٹا ایک بنگالن سے شادی کر لے۔مرنے مارنے پر تیار تھے۔اپنا کھانڈا لہرا کر بنگالیوں کے خلاف بھاشن دیتے اور یہ ثابت کرتے کہ نہ انھوں نے بنگال میں انگریزوں کو پاؤں ٹکانے دیئے ہوتے نہ ہندوستان غلام ہوتا۔
اب وہ بات بے بات پر بنی ٹھنی کا تذکرہ کرتا۔''ظالم ہے بنگال لیکن آنکھیں بالکل جودھ پوری ہیں۔ویسی ہی کٹار سی''۔اس نے رازداری سے مجھے بتایا۔
مجھے ہنسی آ گئی۔''یار جودھ پوری کوٹ تو دیکھا، سنا اور پہنا تھا، لیکن یہ جودھ پوری آنکھیں کس کھونٹی پر لٹکائی جاتی ہیں؟''
اس نے ڈپٹ کر کہا، ''چپ'' اور اپنے ایزل پر جھک گیا۔
یہ وہ لمحہ تھا جس نے مجھے ہندوستانی مصوری کے رمز سکھائے۔اس نے مجھے بتایا کہ ہندوستانی موسیقی کے گھرانوں کی طرح مصوری کے بھی گھرانے ہیں۔جے پور گھرانہ، کشن گڑھ، بوندی اور کوٹا گھرانہ۔۔۔میں نے اسے پستے سے سبز، زعفران سے نارنجی، ہڑ سے زرد اور نیل سے نیلا رنگ کشید کرتے دیکھا۔اس کے کمرے میں طرح طرح کی سبزیاں، پھول، پیڑوں کی چھالیں اور شاخیں نظر آتیں۔کبھی وہ ریت کو کپڑے سے چھانتا دکھائی دیتا اور کبھی سیاہ رنگ کے لیے اپنے فرائنگ پین کا پیندا کھرچ کر اس کی کالک اکٹھا کرتا نظر آتا۔سرخ رنگ کے لیے شیشے کے ایک مرتبان میں اس نے قرمزی کیڑے محفوظ کر رکھے تھے۔کھرل، باریک ململ، طرح طرح کی باریک موٹی چھلنیاں، ہاون دستہ کا کباڑ خانہ اکٹھا کر رکھا تھا رانا سلیم سنگھ نے۔
میں نے پہلی مرتبہ جب اسے اس بکھیڑے میں الجھے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گیا تھا۔''تم لندن میں بیٹھے ہو رانا جی، جہاں دنیا کے بہترین رنگ ملتے ہیں۔دنیا بھر کے مصور یہاں سے رنگ خریدنے آتے ہیں اور تم یہاں بیٹھے کسی وید جی کی طرح خدا جانے کن جڑی بوٹیوں کو پیستے کوٹتے رہتے ہو''۔میں نے بھنا کر کہا تھا۔''میں کل تمہارے لیے ایک گرائنڈر لے آؤں گا''۔
وہ میری یہ بات سنتے ہی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔''جی ہاں، آپ گرائنڈر لے آئیں گے، بڑی کرپا آپ کی۔یہ احسان مت کیجیے گا مجھ پر۔کوٹنے اور کھرل کرنے سے رنگ ہی الگ نکلتا ہے، اس میں ہاتھ اور

بازو کا زور بھی شامل ہوتا ہے۔اب اگر موتی کھرل کرنا ہو تو ہفتوں لگتے ہیں اس میں۔لیکن اس کا اجالا،اس کا روپہلا پن سارے بنے بنائے رنگوں سے جدا ہوتا ہے"۔

"بھئی تم تو جانے کس صدی کی بات کرتے ہو۔۔۔تمہاری یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں"۔میں نے بیزاری سے کہا۔

"ہم راجپوت رنگوں سے کھیلتے ہیں اور اپنے رنگ ہم چیزوں سے خود نچوڑتے ہیں۔ہمارے لیے زندگی،موت سب رنگوں کا کھیل ہے۔جان دینے جاتے ہیں تو کیسری بانا پہنتے ہیں۔ہماری عورتیں جوہر کرتی ہیں تو نارنجی آگ اوڑھ لیتی ہیں۔ہمیں زندگی کرتے دیکھنا چاہو تو ہماری لڑکیوں کی چندریاں،چوڑیاں اور چولیاں دیکھو،گہرے رنگوں سے رنگے ہوئے ہمارے شہر اور گاؤں دیکھو"۔وہ بولتا چلا گیا۔

"تو پھر تمہاری تصویریں اتنی کڑوی اور دل دہلا دینے والی کیوں ہیں؟"میں نے اس کی بنائی ہوئی ان تازہ تصویروں کی طرف اشارہ کیا تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں اور جن کے رنگ ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔

"اپنشد میں کہا گیا ہے سوائی صاحب کہ سب سے پہلے صرف پانی تھا،اس پانی نے سچ کو،سچ نے برہما کو،برہما نے پرجاپتی اور پرجاپتی نے دیوتاؤں کو پیدا کیا اور دیوتا سچ کی پوجا کرتے ہیں۔اب تم جانو کہ میں ٹھہرا ناستک،میں برہما،پرجاپتی اور دیوتاؤں کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں رکھتا،لیکن میں پانی کو جانتا ہوں اور مانتا ہوں جس نے سچ کو پیدا کیا۔میں اسی سچ کی لکیروں سے،اس کے رنگوں سے اپنی تصویریں بناتا ہوں"۔

شدید انتظار کے بعد میرا اسٹین آ پہنچی۔سلیم سنگھ اسے بنی ٹھنی کہتا تھا تو کیا غلط کہتا تھا۔میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔وہ پہلا دن تھا جب مجھے رانا سلیم سنگھ پر رشک نہیں آیا،اس سے حسد ہوا۔اس بنی ٹھنی کی آنکھیں واقعی جودھ پوری کٹار تھیں کہ دل کو کاٹتی چلی جائیں۔اسے دیکھ کر مجھے ایک بھولا بسرا گیت یاد آیا"بنے سہرا جو باندھیں تجھے حور پریاں،جن کے لانبے لانبے کیس،رسیلی انکھیاں"۔سسرال دی دہلیز پر پہلا قدم رکھتے ہی یہ بول میرے کانوں میں پڑے تھے،آواز جگن بیگم کی تھی جو بہت ناز،بہت ادا سے گا رہی تھیں۔"جن کے لانبے لانبے کیس،رسیلی انکھیاں"۔

میرا پر نظر پڑی تو مجھے بے ساختہ جگن بیگم کے گائے ہوئے یہ بول یاد آئے۔گھنے گھنیرے بال آبشار کی طرح کمر سے بہت نیچے گرتے ہوئے اور آنکھیں رسیلی مدھ سے بھری۔ہم ہیتھرو ایئر پورٹ پر تھے جہاں آنے والوں اور رخصت ہونے والوں کے لیے گلے ملنا،ہونٹ چومنا ایک روزمرہ تھا۔لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں ایسی حیا تھی کہ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں چل رہے تھے جیسے سینکڑوں نگاہوں کے حصار میں ہوں اور ہمت نہ رکھتے ہوں کہ ایک دوسرے کو چھو لیں۔

اس رات میں کچھ دیر ان کے ساتھ رہا اور پھر سلیم سنگھ کے اصرار کے باوجود انہیں ایک دوسرے کے ساتھ چھوڑ آیا۔اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔رانا سلیم سنگھ نے مجھے ہر میدان میں شکست دی تھی۔میں سمجھتا تھا کہ برصغیر کی صرف تاریخ اور جغرافیہ اس کا ہے۔لیکن وہ تو سوئمبر میں بھی سب سے سہانی شہانی جیت لایا تھا۔میں دو دن اس کی طرف نہیں گیا لیکن تیسرے دن اپنے دل پر میرا قابو نہیں رہا۔اب تک میں اپنے آپ سے ملنے جاتا تھا اور اب میں اس سہانی کو دیکھنا چاہتا تھا جو میری نہیں تھی اور کبھی بھی میری نہیں ہو سکتی تھی۔

میرا قیامت ناچتی تھی اور اس سے بڑی آفت اس کی آواز تھی۔تان اڑاتی تو اس کے گلے کی سبز رگیں تانت کی طرح تن جاتیں۔میرا بائی کے بھجن سناتی تو عبادت کی،اگر اور صندل کی خوشبو آتی،مندر میں کوئی آرتی اتارتا رہتا۔"رانا جی نے وش کا پیالہ

بھیجا، پیالہ دیکھ کر میرا ہانسی رے''۔ یہ بھجن میں نے اسے کشتی میں گاتے سنا تھا اور پانی میں روشنیوں کا، رات اور رسیلی آنکھوں کا عکس دیکھا تھا۔ ان رسیلی آنکھوں کا قصیدہ، گجن بیگم کی آواز میں پڑھتی رہی تھی۔ جن کے لانبے لانبے کیس، رسیلی آنکھیاں۔ ہوا اس کے بال اڑاتی رہی تھی اور اس کی آواز پانی میں آگ لگاتی رہی تھی۔ پیالہ دیکھ میرا ہانسی رے۔

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا، وہ رقص کا عالم تھا۔ جس میں ہر جنبش اس تیزی سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی تفصیل میں نہیں، اپنے تاثر میں یاد رہتی ہے۔ اس لیے کچھ باتیں مجھے یاد ہیں، کچھ بھول بیٹھا ہوں۔

سلیم سنگھ کی اور میرا کی شادی پہلے رجسٹریشن آفس میں ہوئی اور پھر سلیم کے ایک دوست کے گھر پھیرے ہوئے۔ گھر عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ سانولی سلونی لڑکیوں کے رنگین گھاگھرے، ان کے ٹھمکے، ان کے ذومعنی جملے، ایک لڑکی راجستھانی میں کوئی تیز تیکھا گیت گا رہی تھی جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ اے مونچھوں والے تو اب تو میرا دل لے گیا۔ شراب بہہ رہی تھی۔ میں اس محفل میں تھا اور نہیں تھا۔ ان دونوں نے جب آگ کے گرد پھیرے لگائے تو میں انہیں ایک ٹک دیکھتا رہا۔ سلیم سنگھ کی ریشمی شیروانی اس کا نارنجی صافہ، اس کی پنڈلیوں میں پھنسا ہوا سفید چوڑی دار پاجامہ اور دوسری طرف وہ تھی جو صرف رنگ ہی رنگ تھی۔ خوشبو ہی خوشبو تھی۔ ایسے ہی جوڑوں کو دیکھ کر بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ چشم بد دور چشم بد دور۔ میں انہیں حسرت سے دیکھتا رہا۔ یہ میں تھا، یہ میں نہیں تھا، وہ میری تھی وہ میری نہیں تھی۔ میں شادی کو تجارت سمجھتا تھا وہ اسے عبادت جانتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اس لڑکے کے لیے رو رہا تھا جو الہ آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں کھری کھاٹ پر لیٹ کر رات کی تنہائی میں تاروں سے باتیں کرتا تھا۔ ہم کب اپنا ہاتھ خود اپنے ہاتھ سے چھڑا لیتے ہیں۔ ہم کب اپنے اندر سے نکل کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔

پھیرے پورے ہوئے تو میں نے اسے بدھائی دی، میرا کو دعائیں اور ایک مخملی تھیلی دی اور جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔ اس رات میں نے کوئی ٹیکسی نہیں روکی۔ کسی ٹیوب اسٹیشن کا رخ نہیں کیا۔ بس چلتا رہا اور سوچتا رہا وہ باتیں جو اس رات کے بعد میں شاید کبھی نہیں سوچیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو پانے کے سفر پر نکل گئے۔ ان دونوں نے اپنے دستخطوں سے پیرس، وینس اور روم سے مجھے پوسٹ کارڈ بھیجے جنہیں دیکھ کر جنہیں پڑھ کر میں خاک و خاکستر ہوتا رہا۔

میرا اور سلیم واپس آئے تو نہالوں نہال تھے۔ ایک دوسرے کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ سلیم سنگھ میں مجھے اپنا عکس نظر آتا تھا۔ میں اس سے ملنے کے لیے بے قراری سے جاتا تھا جیسے کچے دھاگے سے سرکار بندھے جاتے ہیں۔ لیکن اب ہم دونوں کے درمیان جدائی پڑ گئی تھی۔

پہلی ملاقات ہوئی تو سلیم سنگھ نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی شادی کی تصویریں اور میرج سرٹیفکیٹ کی کاپی گھر بھیج دی تھی اور وہاں سے پیغام آ گیا ہے کہ اب وہ کبھی جے پور کا رخ نہ کرے۔

''کچھ دنوں میں تمہارے پتا جی کا غصہ یقیناً ٹھنڈا ہو جائے گا''۔

اس کی آواز اداس تھی۔ ''میرے دل پر ماتا جی کا خیال آرے چلاتا ہے۔ ان پر کیا گذری ہوگی''۔

''یہ بات تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھی''۔ میں نے اسے یاد دلایا۔

''اس بنی ٹھنی کے سامنے کوئی بات یاد رہ سکتی ہے'' اس نے بیچارگی سے مجھے دیکھا اور رلا جواب کر دیا۔

وہ دونوں ایک نسبتاً بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ سلیم سنگھ کی کئی تصویریں بک گئی تھیں اور اس نے گھر کے لیے بہت سی چیزیں خرید لی تھیں، لیکن ایک کمرے میں وہی بے ترتیبی اور بکھراؤ تھا جو سلیم کے مزاج کا حصہ تھا۔ باقی گھر بنی ٹھنی کا تھا، اسی طرح

سجا سجایا۔ پھر میری اس کی چند ہی ملاقاتیں ہوئیں۔ اب میں اس کے یہاں جاتے ہوئے جھجکتا تھا۔ ان ہی دنوں معلوم ہوا کہ میرا دو مہینے کے لیے واپس ہندوستان جا رہی ہے۔ وہاں کئی شہروں میں تھیٹر فیسٹول ہو رہا تھا۔ میرا اپنے تھیٹر گروپ کی فرمائش پر نہ چاہتے ہوئے بھی جا رہی تھی۔

اس کے چلے جانے کے بعد بھی ہم دونوں کی ملاقاتوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ وہ سنجیدگی سے تصویریں بناتا رہا۔ میری واپسی کے دن قریب تھے سو میں اپنا سامان سمیٹنے اور اپنی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگا رہا۔

وہ رات مجھے یوں یاد ہے جیسے ابھی کی بات ہو۔ اس رات میں دیر سے گھر پہنچا تو سیڑھیوں پر سلیم سنگھ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نشے میں ڈوبا ہوا تھا اور رو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا اور کچھ کہنے لگا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں اسے اندر لے گیا۔ اس کے سر پر پانی بہاتا رہا۔ پھر میں نے اسے فرش لائم کا ایک گلاس پلایا۔ تب وہ اس قابل ہو سکا کہ مجھے کچھ بتائے۔

اس کی بات جب میری سمجھ میں آئی تو میں بھی رو رہا تھا۔ میرا ایک Accident میں ختم ہو گئی تھی۔

''ہم دھواں سوائی صاحب۔ ہم دھواں''۔ وہ اپنی بات پوری کر کے پھر چیخیں مارنے لگا۔

بنی ٹھنی کو بھی موت آ سکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ تو میرا تھی۔ رانا جی نے وش کا پیالہ بھیجا، پیالہ دیکھ کر میرا ہانسی رے۔ اور پھر سلیم سنگھ کی چیخوں کے ساتھ میری چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ وہ اس کے لیے رو رہا تھا اور جو پور پور اس کی تھی اور میرے آنسو اس کے لیے تھے جو پل چھن کے لیے بھی میری نہیں ہوئی تھی۔

وہ رات کس طور گذری، مجھے یاد نہیں۔ یاد ہے تو اتنی سی بات بات کہ سلیم سنگھ نے ہچکیوں کے درمیان یہ بتایا کہ میرا جب رخصت ہوئی ہے تو اکیلی تھی۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ اس کا بچہ اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اور سلیم سنگھ کے دوسرے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ کلکتہ چلا جائے۔ میرا کا بھائی اسے کلکتہ لے گیا تھا۔ میرا کے انتم سنسکار میں شریک ہو جائے۔ لیکن اس کی ''نہیں'' ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

''میں نے اسے زندہ دیکھا تھا، چاہا تھا، برتا تھا۔ اب اسے آگ کی چادر اوڑھ کر جلتے ہوئے کیسے دیکھوں؟'' اب اس کی آنکھیں آنسو سے اور اس کی آواز کسی تاثر سے خالی تھی۔

میرے جانے کی گھڑی سر پر تھی اور چاہنے کے باوجود میں اس وقت سلیم سنگھ کے ساتھ نہیں گذار سکا تھا۔

میں اس سے آخری بار ملنے گیا تو اسے دیکھ کر دل کٹ گیا۔ وہ جس کی پور پور سے زندگی پھوٹتی تھی، جس کی آنکھیں ہنستی تھیں، جس کی آواز میں پھلجڑیاں چھوٹتی تھیں وہ اب ایک کھنڈر تھا۔ رنگ جھلس گیا تھا آنکھوں کے گرد حلقے اور آواز میں تھکن۔

''میں تمہارے ساتھ چلوں'' اس نے اچانک مجھ سے پوچھا۔ اس کی آنکھیں سوالی تھیں۔

میں خاموش رہا اور میری خاموشی ہی میرا جواب تھی۔

اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ ''ہاں ٹھیک ہے سوائی صاحب تم اپنی راہ جاؤ ہم اپنی راہ لیں گے''۔

''ہم سے کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے اسے ٹوکا۔

''تین کے لیے تو ہم ہی کہا جاتا ہے''۔ اس نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے تو خاصی دیر تک لپٹے رہے۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا اور جانے میں کن خیالوں میں گم تھا۔ مجھے اب کچھ یاد نہیں۔

میں چلا آیا۔ مجھے اپنی پیکنگ کرنی تھی، زیادہ سامان تو میں دو دن پہلے ہی ائیر کارگو سروس سے بھیج چکا تھا۔ اس وقت صبح

کے شاید سات بجے تھے جب میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ دوسری طرف سے سلیم سنگھ کا ایک دوست بول رہا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور اس بات پر بھی حیران نہیں ہوا کہ اسے میرا نمبر کہاں سے ملا تھا۔

''آپ فوراً سلیم سنگھ کے فلیٹ پر آ جائیں''۔ اس نے کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

میں منہ پر چھپکا مار کر اور ٹیکسی پکڑ کر اس کے یہاں پہنچا۔ سڑک پر ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

دروازے کے باہر ہی سلیم سنگھ کے کئی دوست کھڑے تھے سب کے چہرے ستے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ، ایک نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ایک پولیس والے نے مجھے روکنا چاہا لیکن تعارف کرانے پر مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

وہ اپنے اور میرا کے بستر پر لیٹا تھا۔ چہرے پر سکون اور گہری نیند تھی۔ سفید لیس کی چادر پر سرخ رنگ کے دھبے تھے، جو اب سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ یہ رنگ اس کی کٹی ہوئی کلائی سے نکلا تھا اور چادر پر نقش و نگار بنا گیا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ ہم راجپوت رنگوں سے کھیلتے ہیں۔ اس نے اپنے جود سے رنگ کی آخری بوند بھی نچوڑ لی تھی۔ میں ساکت سامت کھڑا اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ یہ میں تھا جو بستر پر تھا، یہ میں تھا جو کھڑا ہوا تھا اور خود کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے چھونے کے لیے جھکا تو پولیس والے نے مجھے روک دیا۔ میں فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ ننگے پیر تھا اور اس کے دنوں پیر مسہری سے کچھ نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ میں ان پیروں کو دیکھتا رہا جنہیں پھیرے لگانے کے بعد بنی ٹھنی نے جھک کر ہاتھ لگایا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، مجھ سے آخری ملاقات کے بعد کیا تھا۔ رات کو اگر میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا، اگر میں اس کے ساتھ رہ جاتا، میں اس کے پیروں پر سر جھکائے سوچتا رہا۔

اس کے لیے میری آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلا۔ جب اسے کریمو یم لے جایا گیا تب بھی نہیں۔ لیکن جب اس کے سرہانے سے ملنے والی چند سطری وصیت کے مطابق بنی ٹھنی کا پورٹریٹ مجھے دیا گیا تو میں دھاڑیں مار کر رو دیا۔ وہ پورٹریٹ میں نے اپنے گھر میں نہیں لگائی ہے۔ اسے بہت احتیاط سے اپنے سیف میں رکھ دیا ہے۔ میں ان جودھ پوری آنکھوں کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ میں ان رنگوں کو کس دل سے دیکھوں جنہیں سلیم سنگھ نے جانے کن پھولوں، چھالوں اور شاخوں سے کشید کیا تھا۔ نہیں وہ اس کی نہیں میری بنائی ہوئی تصویر ہے۔ میں اس تصویر کو سب کی نگاہوں سے چھپا کر رکھتا ہوں اور سلیم سنگھ کی یاد بھی میرے اندر کہیں رہتی ہے۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن میں تازہ رنگوں کی خوشبو سے رانا سلیم سنگھ کی یاد کبھی جدا نہ کر سکا۔ اور کیسے جدا کروں کہ جب اس کی یاد آتی تو میں خود کو یاد کرتا ہوں، اپنے خواب یاد کرتا ہوں، پھر ان خوابوں کو شراب میں ڈبونے لگتا ہوں۔

☆☆☆

بجنس

ذکیہ مشہدی

ٹفن میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ کلو نے امردوں کا ٹھیلا اسکول کے گیٹ سے ذرا سا ہٹ کر کھڑا کیا کہ آنے جانے والوں کو دقت نہ ہو۔ یہ ایک مشنری اسکول تھا۔ تیسرے اسٹینڈرڈ تک لڑکے بھی لیے جاتے تھے لیکن اس کے بعد صرف لڑکیاں۔ زیادہ تر بچے امردوں کے بڑے شوقین تھے۔ ماں باپ سیب، انگور کھلائیں تو نہ کھائیں لیکن امردوں پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ادھر مال کم آ رہا تھا۔ دام بڑھ گئے تھے۔ ایک کلو پر دس روپے کا منافع تھا کہیں زیادہ بچ گئے اور باسی تباسی ہوئے تو ایک کلو پر پانچ روپے بھی مل جاتے تو غنیمت جانتا۔ بچے تو بس ایک ایک امرود تلواتے تھے۔ ذرا بڑا لیا تو کوئی ڈیڑھ سوگرام کا پھل ہوتا۔ بیچ سے چاقو سے شگاف کر کے وہ اس میں کالے نمک والا چٹپٹا مسالہ لگا دیتا تھا۔ بچے بے حد خوش۔ اسکول کا ٹفن ختم ہوتا تو وہ یہاں سے چل دیتا۔ پاس میں چوراہا تھا، وہاں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ بیر اور رس بھری کے موسم میں ٹھیلے پر یہ پھل بھی آ جاتے تھے۔

اسکول کے سامنے تو بکری دراصل چورن کی گولیوں اور ایسی ہی دو چار لٹر پٹر چیزوں کی ہوا کرتی تھی جیسے کرکرے اور بہت چمکیلے نقصان دہ رنگوں والی کھلی بکتی ٹافیاں۔ کچھ عرصہ پہلے نز (Nuns) نے اس میں ٹانگ اڑا دی تھی۔ ان کا بکنا ممنوع ہو گیا تھا۔ اب وہ انہیں ایک چھوٹے سے جھولے میں امرود یا دوسرے جو پھل بیچتا، ان کے نیچے چھپا کر رکھا کرتا تھا۔ دام بھی بڑھا دیے تھے۔ لڑکیاں چپکے سے پھسپھسا کر کہتیں۔ کلو بھیا، وہ دونا، وہ چورن کی گولیاں، اور رازدارانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھتیں۔ اصل میں گیٹ پر کھڑا دربان بڑا ہی بدمعاش تھا وہ ٹیچروں سے چغلی کر دیتا۔ پہلے تو خود ہی جھاڑ پلاتا تھا۔ کئی بار اسے بیڑی پینے کے لیے پیسے دینے پڑ جاتے۔ یا پھر دو ایک امرود مفت دینے ہوتے تھے۔ لڑکیاں اس طرح رازداری برت کر وہ ممنوع چورن لیتیں تو کلو کو بڑا مزا آتا۔ اسے ایک طرح کے ایڈونچر کا احساس ہوا کرتا تھا جیسے وہ چورن کی گولیاں نہ ہوں بلکہ نشے کی گولیاں ہوں اور وہ جرم کی دنیا میں شریک ہو گیا ہو۔ جرم کی ایک دنیا ہے اس کا اسے علم تھا۔ اپنی تمام تر حماقت، تمام تر کم علمی کے باوجود، لیکن وہ بے انتہا ڈرپوک تھا۔ اسے تو دربان تک سے ڈر لگتا تھا اس لیے وہ اپنے امردوں اور انہیں خریدنے والوں بچوں کے ساتھ بہت خوش تھا۔ وہ پریوں جیسی لڑکیاں کسی دوسری دنیا کی باسی تھیں۔ کچھ بہت چھوٹی، کچی کلیوں جیسی اور کچھ شباب کی دہلیز پر قدم رکھتی ان پھولوں جیسی جو کھلنے والے ہی ہوں۔ کھلتے بند ہوتے گیٹ سے اسکول کا چمن بالکل صاف دکھائی دیتا تھا جو ہمیشہ شاداب رہا کرتا تھا۔ اس چمن کے اتنے قریب، ان لڑکیوں کے درمیان کھڑا وہ بدنما دانتوں والا کالا کلوٹا کلو خود کو کچھ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے پرستان میں پہرہ دینے کو ایک کالا سانپ مقرر کر دیا گیا یا کوئی بھوت۔ اوپر والے نے پیسہ کوڑی نہیں دیا تھا لیکن صورت تو دے دیتا۔ اکثر یہ بات سوچتے رہنے کے بعد اب اس نے اس پر توجہ دینی بند کر دی تھی۔ اپنی صورت اور ان بچوں کے تفاوت کو بھول کر وہ پیسہ کمانے پر توجہ دے رہا تھا اس لیے کہ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ اب وہ بڑا ہو چکا ہے اور کچھ دن بعد اس کی شادی کرنی ہوگی۔ ایسا چھڑا گھومتا رہا تو بری عادتوں میں پڑ جائے گا۔ پھر شادی تو ضروری ہے۔ سب کی ہوتی ہے۔ لیکن جس آڑھتی سے وہ امرود اور دوسرے پھل لے کر آتا تھا اس کا کہنا تھا کہ عورت تو بذات خود ایک بری عادت ہے۔

اس نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

ایک بڑی پیاری سی لڑکی اس کے بہت قریب آ کر کہہ رہی تھی، کلو بھیا وہ ۔ ۔ ۔ وہ والا امرود دونا، وہ جو ذرا ہرا ہرا سا ہے۔

پھر وہ اس کی طرف پوری جھک گئی، ''گولیاں ہیں؟'' اس نے سرگوشی کی۔ ''ہیں''۔کلو کے بڑے بڑے دانت ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی مسکراہٹ میں مزید بدصورت ہو اٹھے لیکن لڑکیاں اس کی بدصورتی کی اسی طرح عادی تھیں جیسے وہ ان کے حسن کا عادی ہوگیا تھا۔ان کی بارونق شکلیں انکے نفاست سے گوندھے ہوئے بال،ان کی سلیقے سے استری کی ہوئی اسکول کی یونیفارم۔ان کے چھوٹے تراشے ہوئے ناخونوں میں کبھی بال پوائنٹ پین کی روشنائی لگ جاتی تو وہ ٹفن بریک میں نلکوں کی قطار پر کھڑی رگڑ رگڑ کر اسے چھوڑاتی نظر آتیں۔وہ اتنے عرصے سے اسکول کی فضا کا حصہ بنا ہوا تھا کہ اسکول کی بلڈنگ، سڑک، بجلی کے کھمبوں، دورویہ کھڑے پیپل اور گل مہر کے درختوں اور اکثر نکلنے والی آوارہ گایوں اور کتوں سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں رہ گیا تھا۔لیکن ان لمحوں میں جب کوئی پیاری سی لڑکی اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں پوچھتی کلو بھیا، گولی لائے ہو تو وہ خود کو بے حد اہم سمجھا کرتا تھا۔ بعد المشرقین کے باوجود گاہک اور دوکاندار دونوں نے ایک دوسرے کو نہایت دریا دلی کے ساتھ قبول کرلیا تھا۔وہ جتنی دیر اسکول کے سامنے ٹھیلا لگاتا، بڑا خوش خوش رہا کرتا تھا۔

اسکول کا ٹفن عموماً ساڑھے گیارہ بجے ہوتا تھا۔سخت سردیوں میں تو مہینہ بھر کی چھٹیاں ہو جاتیں۔ جب تک ٹھنڈ رہتی تب تک اس کی روٹین میں تبدیلی آجاتی تھی۔شام کو وہ بھنے چنوں اور نمکین کا ٹھیلہ لے کر سبزی مارکیٹ چلا جاتا تھا۔وہاں کئی سبزی فروش چائے والے سے چائے لیتے اور کلو سے نمکین یا بھنے چنے لے کر شام کو کھانا شتہ کرتے کہ گھر جاتے جاتے انہیں بہت دیر ہو جایا کرتی تھی۔سب ملا جلا کر کلو کو مہینے میں تین ہزار تو مل ہی جاتے تھے۔کبھی آمدنی کچھ زیادہ بھی ہو جاتی، کبھی کچھ کم۔اس کا ٹھیلا کرایے کا تھا۔ابھی تک وہ اپنا ٹھیلا نہیں خرید پایا تھا پھر شہر میں اس کا اپنا مکان کہاں سے ہوتا۔وہ ایک ایسا خواب تھا جسے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ جو چیزیں اس حد تک غیر حقیقی ہوں جیسے اپنا گھر وہ بھی شہر میں ان کے بارے میں تو نہ سوچنا چاہیے نہ انہیں خواب میں دیکھنا چاہیے۔خواب سے آنکھ کھلنے کے بعد یا تو ہنسی آئے گی یا چھاتی میں درد ہوگا۔

کلو تو کرائے کے مکان میں بھی نہیں رہتا تھا۔ بلکہ وہ جہاں رہتا تھا وہ مکان تھا بھی نہیں۔تھا کیا؟ تھا کیا؟ اگر مٹی کی اتنی اونچی دیواریں اٹھائی جائیں کہ ان میں ایک جوان، آدمی گھس سکے اور امن پر موٹی، نیلے رنگ کی ترپال ڈال لی جائے تو وہ گھر ہوتا ہے؟ ارے بھائی گھر وہ ہوتا ہے جہاں آدمی رہے۔تو ٹھیک ہے کلو، اس کی ماں اور ایک چھوٹا بھائی جس میں رہتے تھے وہ گھر تھا تو۔ ہر دو چار مہینے بعد پولیس والے اجاڑے جاتے تھے، وہ پھر اسرا اٹھا کر اسی جگہ اگ آتا تھا۔گرمی میں دھوپ، برسات میں بارش سے پناہ دیتا تھا۔تو وہ گھر نہیں تھا کیا؟ اس کے سامنے اس کی ماں نے مٹی کا چولہا بنالیا تھا اور ایک سل گاڑ رکھی تھی۔اندر کونے میں ان تین نفوس کے ساتھ المونیم کی دو پتیلیوں دو ایک کٹوروں اور دو تین رکابیوں کے لیے جگہ تھی۔اور وہاں ایک ٹین کا بکسا بھی تھا۔اسی میں تینوں کے کپڑے رہا کرتے تھے۔گرہستی تھی نا؟ گھر بھی تھا اور گرہستی بھی اور کلو نہیں جانتا تھا کہ ایک ماہر معاشیات نے کہا تھا کہ اگر شہر میں کسی شخص کی آمدنی سینتیس روپے یومیہ ہے تو اسے خط افلاس سے نیچے نہیں رکھا جا سکتا۔کلو سینتیس روپے یومیہ سے بہت زیادہ کمارہا تھا اس لیے وہ خط افلاس سے بہت اوپر تھا اس کا چھوٹا بھائی جو دن بھر بڑا سا اور موٹا سا پلاسٹک کا تھیلا لے کر کوڑا چنتا گھومتا، دس روپے یومیہ کمالاتا تھا۔ بیشک وہ خط افلاس سے نیچے تھا۔

ہوسکتا ہے کلو اپنی حماقت میں کبھی گھر کا سپنا دیکھ لیتا لیکن وہ معاشیات یا ماہر معاشیات کو سپنے میں نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے کہ وہ ان تصورات کو اور ان لوگوں کو نہیں جانتا تھا اور جسے لوگ نہیں جانتے ان کو خواب میں بھی نہیں دیکھتے۔ویسے کلو کی آمدنی تینوں پر تقسیم کی جاتی تھی تو وہ ان تینوں کو خط افلاس سے نیچے گرنے سے روک لیتی تھی۔یا ٹھیک ٹھاک کگار پر لا کر کھڑا کر دیتی تھی اس لیے کہ اس آمدنی میں بیس روپیہ روز ٹھیلے کا کرایہ بھی شامل تھا۔پھر اس کے بھائی کے دس روپے روز۔ ماہرین معاشیات اکثر بحث کرتے نظر

آتے تھے کہ یہ کنبہ خط افلاس سے نیچے ہے یا اوپر۔ یہ ماہرین مٹی کی دیواروں پر موٹے نیلے پلاسٹک کی چھت کے تلے رہنے والوں کی بستی کے ٹھیک سامنے ایک ملٹی اسٹوری میں رہا کرتے تھے۔ جس کے فلیٹوں کے ہر کمرے کے ساتھ ایک اٹیچڈ باتھ روم تھا۔ اس لیے وہ سینتیس روپے یومیہ کی آمدنی میں اکثر وہ ایک روپیہ جوڑنا بھول جاتے تھے جو دے کر کلو سلبھ شوچالیہ جانے کے لیے دیا کرتا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی کچھ عرصہ پہلے تک سڑک کے کنارے فراغت حاصل کرلیا کرتا تھا لیکن اب اسے شرم آنے لگی تھی۔ کبھی ایک روپیہ خرچ کرآتا اور کبھی سڑک سے ذرا الگ ہٹ کر کوڑے کے ڈھیر کے پاس بیٹھ جاتا۔ کوئی ایک فرلانگ چل لیا جاتا تھا تو ایک نسبتاً سنسان علاقہ آجاتا تھا۔ وہاں پیڑوں کے جھرمٹ تھے اور کچھ گوالوں کی جھونپڑیاں جو گنجان نہیں تھیں۔ ماں علی الصبح اٹھ کر وہاں چلی جاتی تھی اس لیے کہ وہ سڑک کے کنارے نہیں بیٹھ سکتی تھی نہ ہی اسے اپنی ذات پر بغیر کسی وجہ کے یہ ایک روپیہ خرچ کرنا گوارا تھا جس کو خرچ کئے بغیر گزارا ہو سکتا تھا۔ ویسے ایک روپے کی آج کل کوئی اوقات نہیں رہ گئی تھی۔ ایک روپے میں چائے تک نہیں آتی تھی۔ لیکن روز ایک روپیہ گولک میں ڈال دیا جائے تو مہینے کے آخر میں تیس روپے نکل آئیں گے جن سے ایک وقت کی سبزی آسکے گی اور اگر صرف آلو کھائے جائیں تو دو وقت کا جگاڑ ہو جائے گا۔ لیکن چھوٹا بیٹا علی الصبح اٹھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا اور بڑے بیٹے کی عادت بگڑی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی وقت کبھی مقرر نہیں ہو سکا۔ اگر دو روپے روز بچ جاتے تو ان سے کتنے کام نکل سکتے تھے۔

ہم کبھی اس ٹھیلے سے اوپر اٹھ سکیں گے؟ کلو کئی بار سوچتا تھا۔ کبھی کوئی ایسا جگاڑ ہوتا کہ کچھ فاضل آمدنی ہو جاتی۔ آخر بیوی آئے گی تو اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے رشتے آنے لگے تھے لیکن اس کے گھر کی پھٹیچر حالت اور سڑک کے کنارے ترپال والی جھگی کو دیکھ کر ایسا کوئی رشتہ نہیں آیا جس سے ماں تلک میں ایک نیا ٹھیلا مانگ سکتی یا اتنے روپے نقد جن سے ٹھیلا خرید اجا سکے۔ اس کا مطالبہ بس اتنا ہی تھا: ایک چاندی کی انگوٹھی، ایک نیا ٹھیلا، دولہا کے لیے دو جوڑے پینٹ شرٹ معہ جوتے اور دولہا کی ماں کے لیے ایک ساڑی معہ بلاؤز پیٹی کوٹ اب ایک جوڑا پلاسٹک کی چپل بھی شاید رکھ دیا جائے۔ چونکہ وہ بیوہ ہے اس لیے چوڑی ٹکلی تو رکھی نہیں جائے گی۔ اور کیا دولہا کے چھوٹے بھائی کو کچھ نہیں ملتا؟ جب بھی کلو اور اس کی ماں بیٹھ کر جہیز کا سامان اور تلک کی نقدی جوڑتے چھوٹا بھائی سوال ضرور کرتا۔ ایک بار اس نے کہا ایسی بھابی لے کر ہم کیا کریں گے جس کے یہاں سے ہمیں ایک سائیکل بھی نہ ملے۔ تب اس کا مطالبہ ایک سائیکل بھی جہیز میں جوڑ دی گئی۔ لیکن ابھی تک کوئی لڑکی والا ایسا نہیں آیا تھا جو اتنا دینے پر راضی ہو۔ آج کل لڑکی والوں کے دماغ بھی تو خراب ہو گئے ہیں اماں کے چونکہ دونوں بیٹے ہی تھے اس لیے اس نے اپنے آپ کو لڑکے والوں کی صف میں رکھ کر سارے لڑکی والوں کے خلاف ایک محاذ بنالیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے بعض فیمنسٹ کہلائی جانے والی خواتین نے ساری خواتین کو ایک صف میں کھڑا کر کے سارے مردوں کو دوسری صف میں محاذ آرا تصور کرلیا تھا اور رسہ کشی کرتی رہتی تھیں۔

کیسے چار پیسے اور کمائے جائیں؟ جب سے شادی کا خیال دل میں گدگدی کرنے لگا تھا تب سے کلو اس فکر میں غلطاں رہنے لگے تھے۔ کبھی ان کے ذہن میں ایک چہرہ کوندتا تھا انہیں کی طرح گہرے سانولے رنگ کا لیکن عنفوان شباب سے پیدا ہونے والی کشش سے بھرپور، بڑی آنکھوں، چھوٹی سی ناک اور بوٹے سے قد والا۔ اور کبھی ایک دوکان کا تصور ابھرتا جس میں وافر سرمایہ لگا کر سامان بھرا ہوا ہو یا پھر ٹھیلے پر ہی کچھ اور ایسی چیزیں جن سے آمدنی زیادہ ہو اور ہاں ٹھیلا اپنا ہو کہ مالک کو روز کرایہ نہ دینا پڑے۔

کچھ عرصے سے شہر میں بڑی ہلچل دکھائی دیتی تھی۔ باہر کے نیتا آرہے تھے اور جارہے تھے۔ جلوس بھی بہت نکلتے تھے۔ کبھی کبھی سڑکوں پر ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ پھر وہ ٹی وی اور اخبار والے اپنے اپنے کیمرے لے کر دوڑتے بھاگتے دکھائی دیتے۔ کیا فائدہ ہوتا ہے انہیں؟ کلو سوچتا۔ فائدہ کچھ تو ضرور ہوتا ہے۔ اچھا کماتے ہوں گے تبھی تو صاف، اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔

بڑے لوگوں کے درمیان دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کون سی دنیا ہے ہماری دنیا میں ہوتے ہوئے، ہماری دنیا سے الگ۔ ان میں سے کچھ تو اب خوفناک لگا کرتے تھے۔ ان کے سائز سے ہی وہ ڈر جاتا تھا۔ لیکن آج کل ہر شخص نیتا گیری کرنے لگا تھا۔ (سیاست پر گفتگو ہو رہی ہو تو کلوا سے نیتا گیری قرار دیتا تھا) ایک شخص بتا رہا تھا کہ اسے ایک جلوس میں شامل ہونے کے لیے سو روپے ملے تھے۔ گڑ چنا اور ایک چھوٹی بوتل کسی ٹھنڈے شربت کی بھی۔ ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ کلو دل ہی دل میں بہت ناراض ہوئے۔ جلوس تو روز نکل رہے ہیں شاید انہیں بھی کبھی ایسا موقع مل جائے۔ اس مہنگائی میں بھی سو روپے ان کے لیے اہم تھے اور اگر ان ماہرین معاشیات کی مانیں تو ان سے لگ بھگ تین دن کا خرچ نکل جاتا تھا۔

چناؤ جیسے جیسے نزدیک آیا لوگوں میں ہلچل بڑھتی گئی۔ کلو کے ایک دوست نے جو شیشے کے سستے موٹے برتنوں جیسے گلاس اور مرتبان وغیرہ کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ اچانک گیندے کے ہار بیچنا شروع کر دیئے تھے۔ یہ ہار لے کر وہ سیاسی پارٹیوں کے دفتروں کے آس پاس گھومتا رہتا تھا۔ یوں تو بڑے پیمانے پر الگ پھول آتے تھے۔ پھر بھی جھٹ پٹ خریدنے والوں کی تعداد بھی کافی تھی اور محمود عرف ممدو کو شیشے کے برتنوں سے زیادہ آمدنی ہو رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا یہ آمدنی موسمی ہے۔ کچھ زائد پیسے آ جائیں گے۔ کلو کو اپنی شادی کرنی تھی اور ممود کو بہن کی۔ کون سی پارٹی جیتے گی اس بات کو لے کر لوگوں میں دھواں دھار بحثیں ہونے لگی تھیں بلکہ سنتے تھے سٹہ بازار بھی گرم ہو گیا تھا۔ کوئی جیتے ہمیں کیا۔ کلو حیرت سے سوچتا تھا۔ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ آخر کیا فرق پڑتا ہے کسی کے ہارنے جیتنے سے۔

تبھی ممدو نے اس سے کہا کہ وہ آتش بازی کا ٹھیلا لگائے۔

دیوالی اور دیوالی کے بعد چھٹھ۔ دیوالی کے بچے پٹاخے چھٹھ میں چھڑائے جاتے ہیں۔

''چھٹھ کے بعد ایک اور تہوار آ رہا ہے''۔ ممدو نے کہا۔ سارے تہواروں سے بڑا تہوار۔ یہ چناؤ جو ہو رہے ہیں۔ جیتنے والی پارٹی کے لوگ بم پھوڑیں گے۔ بڑے بڑے بم، لگاتار کانوں پر حملہ کرنے والے چٹائی بم، چناؤ پری نام آنے لگیں تو پارٹی کا ریالئہ کے پاس کھڑے ہو جانا''۔ ممدو عمر میں بڑا تھا۔ شادی شدہ تھا اور سیاسی بصیرت رکھتا تھا اس لیے کلوا کثر اسے بحثوں میں حصہ لیتے دیکھتا تھا۔ ایک دن وہ سرکاری اسکول میں جھاڑو لگانے والی بھینگی منجو کو چھیڑ رہا تھا کسے بھوٹ دے گی ری منجو۔ اور وہ بے وقوف سی لگنے والی عورت آنکھیں گھما کر بولی تھی: ''تمہیں کیوں بتائیں؟ جسے پورا ٹولہ دے گا، ہم بھی دے دیں گے''۔ ممدو ہنسنے لگا۔ ارے کیا ہم تم سے فوجداری کرنے والے تھے۔ منجو چھما چھم پائل بجاتی، بھینگی آنکھیں مٹکاتی غائب ہو گئی۔

کلو نے ان دنوں شام کے وقت آتش بازی بیچنی شروع کی آخر بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو مخصوص موسم میں کچھ زائد آمدنی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جیسے تیج تہواروں کے موقع پر اس کی موسمی رنگین ٹوکریاں اور سوپ بیچ کر سال بھر میں ایک مرتبہ اچھی رقم کما لیا کرتی تھی اور اس رقم سے کئی کام نکل جاتے، قرض کا سود ادا ہو جاتا۔ پھر جس دن صوبائی اسمبلی انتخابات کے نتائج آنے شروع ہوئے وہ اس مخصوص شاہراہ پر جا کھڑا ہوا جہاں زیادہ تر پارٹیوں کے آفس تھے۔ خاص طور پر دو بڑی حریف پارٹیوں کے جن میں کانٹے کی ٹکر تھی اور پورا صوبہ سانس روکے منتظر تھا کہ دیکھیں حکومت کس پارٹی کے ہاتھ میں جائے گی۔

اولین رپورٹیں آئیں تو ایک پارٹی غالب آتی دکھائی دی۔ لوگوں نے کچھ گولے پہلے سے اسٹور کر رکھے تھے۔ کچھ نے جلدی جلدی کلو سے خریدے۔ آناً فاناً بہت سی آتش بازی بک گئی۔ ٹی وی کیمرے حرکت میں تھے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے اسکرین لگے ہوئے تھے۔ حریف پارٹی کے کیمپ میں پریشانی واضح ہو اٹھی۔ تبھی اچانک پانسہ پلٹا۔ لوگوں کو کچھ دیر تک یقین نہیں آیا۔ پھر اس پارٹی کے امیدوار، جس کی کامیابی مشکوک تھی۔ لگاتار جیتنے لگے۔ کچھ نتائج میں واضح کامیابی تھی۔ کچھ ان کی بڑھت کا اعلان کر رہے تھے۔

سیاسی دفتروں والی شاہراہ پر میلے کا گمان تھا۔ لوگوں کا ہجوم درمیان میں میڈیا والے۔ سب ایک ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا۔ کم عقل کلو نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، حقیقت فضا میں چکراتی، دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلاتی اس کے ذہن میں اترنے لگی۔ اس نے خاموشی سے ٹھیلا سرکایا اور ہولے ہولے اس پارٹی کے دفتر کی طرف بڑھنے لگا جواب واضح اکثریت کی طرف گامزن نظر آرہی تھی۔ لوگوں کے ایک بڑے گروہ میں کھڑے ایک شخص نے بڑی کینہ توز نظروں سے کلو کو گھورا، پھر زور سے تھوکتے ہوئے زمین پر پڑا ایک پتھر کا ٹکڑا اٹھا کر بلاوجہ ہی ایک معصومیت سے دم ہلاتے کتے کو پھینک مارا۔ کتا کوں کوں کرتا ہوا بھاگا۔ ''جاؤ جاؤ تم بھی ادھر ہی جاؤ۔ دل بدبو''۔ کلو کو یکا یک بڑی زور کا غصہ آگیا۔ وہ کدھر جائے، کچھ کرے، اس آدمی سے مطلب یا کسی سے بھی مطلب!

''ہم تجسس کرتے ہیں۔ کسی کی طرفداری نہیں''۔ اس نے جل کر مونہہ مارا اور ایک گاہک کی طرف مخاطب ہو گیا جو دوڑا دوڑا، ادھر، سے اسی کی طرف آرہا تھا۔ ''تجسس'' نے رفتار پکڑ لی تھی۔

☆☆☆

رونے کی آواز

سریندر پرکاش

فلاورانڈ رٹری ازفری۔

سامنے والی کرسی پر بیٹھا ابھی ابھی وہ گا رہا تھا۔ مگر اب کرسی کی سیٹ پر اس کے جسم کے دباؤ کا نشان ہی باقی ہے۔ کتنا اچھا گاتا ہے وہ۔۔۔ مجھے مغربی موسیقی اور شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی تو نہیں ہے۔ مگر وہ کم بخت گاتا ہی کچھ اس طرح ہے کہ میں کھوسا جاتا ہوں۔ وہ گاتا رہا اور میں سوچتا رہا ''کیا پھول درخت کے سائے تلے واقعی آزاد ہیں؟''

وہ اب جا چکا ہے۔ جن سروں میں وہ گا رہا تھا وہ اپنی گونج کھو چکے ہیں۔ مگر الفاظ سے میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔

فلاورانڈ رٹری ازفری۔

اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ الفاظ کی عمر سر سے لمبی ہوتی ہے۔ شام، جب وہ مجھ سے ملا خاصہ نشے میں تھا۔ طالب علموں کے ایک گروہ نے دن میں اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کے ملک کے گیت اس سے سنتے رہے اور شراب پلاتے رہے۔ میرے کندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مجھے سارے دن کا قصہ سنایا۔ اور پھر کہنے لگا۔ ''گھر سے جب نکلا تھا تو میرے ذہن میں یہ فتور تھا کہ ساری دنیا پیدل گھوم کر اپنا ہم شکل تلاش کروں گا۔ آٹھ برس ہونے کو آئے مجھے دوسروں کے ہم شکل تو ملتے رہے مگر اپنا ہم شکل اب تک نہیں ملا''۔

''کیا تمہیں کوئی میرا ہم شکل ملا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں! سکینڈی نیویا میں!''۔۔۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر اور اپنے ذہن پر زور دیئے بغیر جواب دیا۔

رات گئے تک ہم سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ جب تھک گئے تو گھر کا رخ کیا، وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کرسی پر بیٹھا دو ایک منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک دم اپنا مخصوص گیت گانا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا ''اس گیت میں جو الفاظ ہیں ان کے معنی کیا ہیں؟''

''معنی کوئی ساتھ نہیں دیتا، صرف الفاظ دیتے ہیں۔ دیتے بھی کیا ہیں۔ بس اپنے معانی کی مہر ثبت کر دیتے ہیں اور ہم ان میں سے معنی تلاش کرتے ہیں!'' اس نے جواب دیا۔

کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس نے کمرے کی بے ترتیبی کا جائزہ لیا اور پھر اچانک بول اٹھا ''تم شادی کیوں نہیں کر لیتے، اچھے خاصے آدمی ہو''۔ میں بوکھلا سا گیا۔

''بات دراصل یہ ہے''۔ میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہماری بلڈنگ کی اوپر والی منزل میں ایک وشنو بابو رہتے ہیں، وہ بلڈنگ کے مالک بھی ہیں ہم سب ان کے کرایہ دار ہیں۔ بہت سال پہلے جب وہ بالکل معمولی آدمی تھے تو انہوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی جس کا نام ''سرسوتی'' ہے۔ پھر اچانک وشنو بابو ایک مالدار عورت لکشمی سے ٹکرا گئے۔ تب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے لکشمی سے دوسرا بیاہ رچا لیا۔ اب لکشمی اور وشنو دونوں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں اور بے چاری سرسوتی رات رات بھر سیڑھیوں میں بیٹھی ہوتی ہے۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے میں ابھی طے نہیں کر پایا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہیے یا کسی لکشمی سے؟''

اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک دم سے گڈنائٹ! کہا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اپنی اسی طرح کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھے گوشت پوست کے آدمی کی بجائے کوئی خیال لگتا ہے جو سمندر پار سے یہاں آ گیا ہو۔

جس عمارت کے ایک کمرے میں، میں رہتا ہوں۔ اس کے سب کمروں کی دیواریں کہیں کہیں، جیسے تیسے ایک دوسرے سے مشترک جن کی وجہ سے ایک کمرے کے اندر کی آواز یا خاموشی دوسرے کمرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، میری آواز یا خاموشی یا چند لمحے پہلے کمرے میں گونجنے والی اس کے گانے کی آواز بھی کہیں نہ کہیں ضرور پہنچی ہوگی۔

باہر شاید رات نے صبح کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔ اردگرد کے سب گھروں کی بتیاں بجھ گئی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے اور خاموشی دیمک کی طرح آہستہ آہستہ سب طرف رینگے جا رہی ہے۔ میں دروازے کی چٹخنی چڑھا کر اور مدھم بتی جلا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا تھا۔

مدھم روشنی میں سفید چادر میں لپٹا ہوا اپنا جسم مجھے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی طرح لگتا ہے۔ تنہائی، خاموشی اور تاریکی میں ایسا خیال خوف زدہ کر ہی دیتا ہے۔ جیسے خواب میں بلندی سے گرتے ہوئے آدمی کا جسم اور ذہن سن ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی میری کیفیت ہے۔ دھیرے دھیرے میں نیچے گر رہا ہوں اور پھر اچانک مجھے لگتا ہے میں اپنے جسم میں واپس آ گیا ہوں۔

باہر سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ شاید سرسوتی اور لکشمی میں پھر جھگڑا ہوا ہے اور سرسوتی کے رونے کی آواز سیڑھی سیڑھی اتر کر میرے کمرے کے دروازے تک آ گئی ہے، مگر یہ تو کسی بچے کے رونے کی آواز ہے! میں محسوس کرتا ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے پڑوس والوں کا بچہ اچانک بھوک کی وجہ سے رونے لگ گیا ہوگا اور اس کی ماں بدستور نیند میں بے خبر سو رہی ہوگی یا پھر شاید ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گئی ہو اور بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو۔ آواز آہستہ آہستہ قریب ہو کر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ پھر مجھے لگتا ہے ایک بچہ میرے ہی پہلو میں پڑا رو رہا ہے اور کفن میں لپٹی ہوئی میری لاش میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی ہے۔

''اگر درخت تہذیب کی علامت ہے تو ہم اس کے سائے میں روتے ہوئے آزاد پھول ہیں''۔ میرے ذہن میں اچانک اس کے الفاظ کے معنی کھل اٹھے ہیں۔ جن کے سر وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بچہ بدستور رو رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز میں درد اور دکھ کی لہریں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مگر اسے یہ کس نے بتایا ہوگا؟ اس کے باپ نے؟ مگر وہ تو بدستور سو رہا ہے۔ کیونکہ اس کی آواز میں اس کے باپ کی آواز ابھی شامل نہیں ہوئی۔ یہ تو ہر کسی کو آپ ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مجھے بھی پتہ چل گیا تھا!۔۔۔۔ بچے کے رونے کی آواز میری آواز سے کتنی ملتی جلتی ہے!۔۔۔

پھر اس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ ''اچھے خاصے معمولی آدمی ہو''۔

میں واقعی معمولی آدمی ہوں، ہر صبح اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلتا ہوں۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہتا ہوں۔ سورج کی طرف منہ کر کے دن بھر بھاگتا رہتا ہوں اور رات ہونے پر اپنے آپ کو گھر کے دروازے پر کھڑا پاتا ہوں۔

صبح سب سے پہلے سارس کی طرح اڑتا ہوا میں اس عمارت تک جاتا ہوں۔ جہاں ایک عورت خوب صورت کیبن میں گلاس ٹاپ کی میز پر اپنی سفید مرمریں بانہیں پھیلائے گھومنے والی کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ اپنے سفید بالوں کو ہر روز رنگ کے خضاب سے رنگ کراتی ہے۔ میز پر پھیلی ہوئی اس کی بانہیں۔۔۔ اس طرح لگتی ہیں جیسے کسی عورت کی برہنہ ٹانگیں ہوں۔

کیبن کے اردگرد سے کئی سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اس کیبن کے شیشوں میں سے اکثر

جھانکتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر واقعی وہ اپنی ننگی ٹانگیں میز پر پھیلائے ہوئے ہے تو۔۔۔

۔۔۔! سیڑھیاں جہاں سے شروع ہوتی ہیں، وہاں داہنے طرف ایک بڑی سی الماری لگی ہوئی ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بنک کے لاکروں جیسے کئی خانے بنے ہوئے ہیں جن میں ہر آدمی اپنی ذاتی چیزیں رکھ سکتا ہے۔ مگر میں ہر روز اپنی ذات ہی کو اس میں بند کر کے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہوں اور پھر شام کو جاتے ہوئے دوبارہ اسے نکال لیتا ہوں۔

باہر تھیٹر والوں کی گاڑی کھڑی رہتی ہے۔ اس کا ڈرائیور مجھے آنکھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہتا ہے اور میں شہر کے جدید ترین تھیٹر میں پہنچا دیا جاتا ہوں۔ جس کا پنڈال بالکل سرکس کے پنڈال جیسا ہے۔ میں اس تھیٹر میں پچھلے اٹھارہ برس سے ایک ہی رول ادا کر رہا ہوں۔ سٹیج بالکل وسط میں ہے اور میرا پہلا میک اپ اتار کر ''گلی ور'' کا میک اپ اور لباس پہنا دیا جاتا ہے مکالمے سب بیک گراؤنڈ سے ہوتے ہیں۔ مجھے صرف للّی پٹ والوں کی مار کھانے کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ننھے ننھے سوئیوں جیسے بھالے میرے جسم میں چبھتے ہیں۔ ان کے کمانوں سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے تیر میرے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ میرے مساموں سے خون کی بوندیں پسینے کی طرح نکلتی ہیں۔ مجھ میں خوبی یہی ہے کہ میں تکلیف کا اظہار نہیں کرتا۔ اس لیے اتنے برسوں سے یہ سب چل رہا ہے۔ یہاں سے مجھے ملتا کچھ نہیں یہ تو محض ہابی کے طور پر ہے۔ پھر جب شو ختم ہو جاتا ہے تو مجھے ایک اسٹریچر پر لٹا کر ایک باتھ روم میں لے جاتے ہیں۔ جہاں الکوحل سے بھرے ہوئے ٹب میں مجھے ڈال دیا جاتا ہے۔ الکوحل میرے زخموں میں ٹیسیں پیدا کرتی ہے پھر ایک دم خنکی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر گھر کی طرف بڑھتا ہوں۔

ایک عجیب تماشا ہوا۔ جب اس عمارت کے دروازے بند ہونے کا وقت آیا، تب میں پیشاب خانے میں تھا۔ میرے پیچھے دھپ سے دروازہ بند ہوا۔ میں گھبرا کر زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ تب ایک آدمی نے آ کر دروازہ کھولا۔ میں اس تصور سے ہی اس قدر گھبرا گیا تھا کہ اگر مجھے ساری رات اس پیشاب خانہ میں بند رہنا پڑتا ہے تو میری کیا حالت ہوتی۔ گھبراہٹ میں چلتے وقت میں نے اس کیبن کی طرف بھی دھیان نہ دیا کہ آیا وہ عورت چلی گئی ہے یا نہیں اور نہ اس لاکر میں رکھی ہوئی اپنی ذات ہی نکالنے کا خیال آیا۔ باہر تھیٹر کی گاڑی کا ڈرائیور ہارن پر ہارن بجائے جا رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چل دی۔

میں بہت پریشان تھا کہ آج اپنی ذات کے بغیر میں اپنا رول کیسے ادا کر پاؤں گا۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس دن شو ختم ہونے پر بھیڑ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر میری طرف لپکی اور میری اداکاری کو اتنا قدرتی بتایا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

تب سے میں نے اپنی ذات کو اس لاکر ہی میں پڑا رہنے دیا ہے۔

ہوا کے ایک جھونکے نے کھڑکی کے پٹ کو زور سے بھینچ دیا ہے۔ میں پھر اپنے کمرے کے ماحول کی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں۔۔۔ سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی سرسوتی کی سسکیوں کی آواز روتے ہوئے بچے کی کرب ناک آواز میں اب تک ایک اور آدمی کی آواز بھی شامل ہوگئی ہے۔ شاید بچے کا باپ بھی جاگ گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی لاش اور بلکتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ضبط نہیں کر سکا۔

ایک اچھے پڑوسی کے ناطے میرا فرض ہے کہ ان کے سکھ دکھ میں حصہ بٹاؤں۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی درخت کے سائے تلے کھلے ہوئے آزاد پھول ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے، میں اپنے کمرے کی چاروں دیواروں میں سے ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر ارد گرد کمرے میں جھانک کر انہیں سوتے ہوئے یا روتے ہوئے دیکھوں۔ کیونکہ دونوں ہی حالتوں میں آدمی بے بسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر میں بھی کتنا کمینہ آدمی ہوں۔ لوگوں کو بے بسی کی حالت میں دیکھنے کے شوق میں سارے کمروں کی دیواریں اکھاڑ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے پھر اٹھ کر خود کو ان کے کمروں میں جا کر ان کے رونے کی وجہ دریافت کرنے پر آمادہ کیا۔ رونے کی آوازیں اب کافی بلند ہو چکی تھیں اور ان کی وجہ سے کمرے میں بند رہنا ممکن نہ تھا۔

میں نے وہی کفن جیسی سفید چادر اپنے گرد لپیٹی اور سیاہ سلیپر پہن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں ہی میں نے دروازے کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی، میں نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔

سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے والی سرسوتی، بلک بلک کر رونے والا بچہ، مری ہوئی عورت اور اس کا مجبور خاوند، چاروں باہر کھڑے تھے۔

چاروں نے بہ یک زبان مجھ سے پوچھا۔

''کیا بات ہے' آپ اتنی دیر سے رو رہے ہیں؟ ایک اچھے پڑوسی ہونے کے ناطے ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ۔۔۔!''

☆☆☆

گیت

سلام بن رزاق

میرے بیٹے نے حسب معمول اس رات بھی کہانی کی فرمائش کی۔ میں کافی تھکا ہوا تھا،تس پر ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہوتی خبروں نے دل و دماغ کو اور بھی پژمردہ کردیا۔ فرقہ واریت عدم رواداری ،نفرت اور مذہبی جنون کے شعلوں نے جیسے پورے ملک بلکہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں نے بیٹے کو پچکارتے ہوئے کہا۔

''آج نہیں بیٹا! آج پاپا تھک گئے ہیں، کل سنائیں گے ہم تمہیں ایک اچھی کہانی''۔

''بس ایک چھوٹی سی کہانی۔۔۔ایک دم اتی سی''۔اس نے انگلی کی پور پر انگوٹھا رکھتے ہوئے ،اتی سی ، کی صراحت کی۔

اس کی اس معصوم ادا پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے تھک ہار کر کہا''ٹھیک ہے، ہم کہانی سنائیں گے ،مگر تم بیچ میں کوئی سوال نہیں پوچھو گے؟''

''نہیں پوچھوں گا''۔

کہتے ہیں کسی پہاڑی کے پیچھے ایک بستی تھی۔بستی میں اونچے اونچے مکان تھے، مکانوں میں بڑے بڑے دروازے اور چوڑی چوڑی کھڑکیاں تھیں، روشن اور کشادہ کمرے تھے، جہاں صبح و شام ہوا اٹھکیلیاں کرتی گزرتی ، مکانوں کے آنگنوں میں پھولوں کی کیاریاں لگی تھیں، جن میں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے اور ہواؤں میں ہر دم بھینی بھینی خوشبو رچی رہتی تھی۔بستی کے باہر باغات کا سلسلہ تھا، جن میں طرح طرح کے پھل اور پیڑ تھے، پیڑوں پر قسم قسم کے پرندوں کے گھونسلے تھے، پرندے صبح شام چہچہاتے رہتے ،ان کی چہکار سے فضا میں موسیقی سی گھلتی رہتی ،بستی کے پاس ایک ندی گزرتی تھی جس سے آس پاس کی زمین سیراب ہوتی رہتی ،انسان تو انسان ڈھور ڈنگر تک کو دانے چارے کی کمی نہیں تھی ،کوئی موسم ہو، کھیتوں میں اناج کے خوشے جھومتے رہتے اور گایوں کے تھن ہمیشہ دودھ سے بھرے رہتے۔

بستی کے لوگ بڑے خوش مزاج، ملنسار اور امن پسند تھے ،مرد دن بھر کھیت ، کھلیانوں اور باغوں میں کام کرتے ،مویشی چراتے ، دودھ دوہتے اور عورتیں چولہا چکی سنبھالتیں ۔ خالی وقت میں وہ ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے ، دعوتوں میں لذیذ کھانے کھاتے ،عمدہ شروب پیتے ، جھومتے گاتے اور رقص کرتے ،خوشیاں روز اس بستی کا طواف کرتیں اور غم بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرتے ۔ کہتے ہیں بستی کے پاس ہی ایک گھنے پیڑ پر ایک پری رہتی تھی۔ ننھی منی ،موہنی صورت اور معصوم سیرت والی گلابی آنکھوں اور شہابی ہونٹوں والی ،سنہرے بالوں اور سرخ گالوں والی پری۔ پری گاؤں والوں پر بہت مہربان تھی ۔ وہ اکثر اپنے چمکدار پروں کے ساتھ اڑتی ہوئی آتی اور ان کے روتے ہوئے بچوں کو گدگدا کر ہنسا دیتی ۔لڑکیوں کے ساتھ ساون کے جھولے جھولتی ، آنکھ مچولی کھیلتی ،لڑکے بالوں کے ساتھ پیڑوں پر چڑھتی ، ندی میں تیرتی ، کبھی کسی کے کھلیان کو اناجوں سے بھر دیتی ، کبھی کسی کے آنگن میں رنگ برنگے پھول کھلا دیتی ۔شادی بیاہ ، تیج تہوار ، میلے ٹھیلے یہاں تک کہ موت مٹی میں وہ ہر جگہ ، ہر موقع پر ان کے ساتھ رہتی ۔بستی والے بھی اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اگر وہ ایک دن بھی انہیں دکھائی نہیں دیتی تو وہ بے چین ہو جاتے ۔

دن گزرتے رہے ۔وقت کا پرندہ کالے سفید پروں کے ساتھ اڑتا رہا اور موسم کا بہروپ نت نئے روپ بدلتا رہا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ ایک دن کسی نے ان کے کھیتوں میں شرارت کا ہل چلا دیا۔ بس، اس دن سے ان کے کھیت تو پھیلتے

گئے مگر دل سکڑنے لگے۔ گودام اناجوں سے بھر گئے، مگر نیتوں میں کھوٹ پیدا ہو گئی۔ اب وہ اپنی مقررہ زمینوں کے علاوہ دوسروں کی زمینوں پر بھی نظر رکھنے لگے۔ نتیجے کے طور پر ان کے کھیتوں میں بدکرداری کی فصل اگنے لگی اور درخت ریاکاری کا پھل دینے لگے۔ لالچ نے ان کے دلوں میں خود غرضی کا زہر گھول دیا تھا۔ پہلے وہ مل بانٹ کر کھاتے تھے، مل جل کر رہتے تھے، مگر رفتہ رفتہ ان کی ہر چیز تقسیم ہونے لگی۔ کھیت، کھلیان، باغ بغیچے، گھر آنگن یہاں تک کہ انہوں نے اپنی عبادت گاہیں تک آپس میں بانٹ لیں اور اپنے اپنے خداؤں کو ان میں قید کر دیا۔ ان کی آنکھوں کی مروت اور دلوں کی حمیت ہتھیلی پر جمی سرسوں کی طرح اڑ گئی، تصویروں کے رنگ اندھے اور گیتوں کے بول بہرے ہو گئے۔ اب نہ کوئی تصویر بناتا تھا نہ کوئی گیت گاتا تھا۔ ہر گھڑی ہر کوئی ایک دوسرے کو زک دینے کی فکر میں رہتا۔ آئے دن وہ ایک دوسرے کو برباد کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ بستی والوں کے یہ بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ ننھی پری بہت دکھی ہوئی۔ وہ سوچنے لگی، آخر بستی والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیوں ایک دوسرے کے بیری ہو گئے ہیں؟ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

وہ اب بھی بستی میں جاتی، بچوں کو گدگداتی اور عورتوں کے ساتھ گیت گاتی، لڑکی، لڑکوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی۔ پیڑوں پر چڑھتی، ان کے کھیت، کھلیانوں کے چکر لگاتی، آنگنوں میں گھومتی پھرتی۔ مگر اب وہ سب اس کی طرف بہت کم دھیان دیتے۔

بستی والوں کی اس بے توجہی کے سبب ننھی پری اداس رہنے لگی۔ آخر اس نے بستی میں آنا جانا کم کر دیا۔ اگر کبھی جاتی بھی تو ڈری ڈری، سہمی سہمی سی رہتی اور جتنی جلد ممکن ہوتا وہاں سے لوٹ آتی۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ اس نے بستی میں آنا جانا بالکل ترک کر دیا۔

بستی والے آپس کے جھگڑے ٹنٹوں میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ شروع شروع میں انہیں اس کی غیر موجودگی کا پتا تک نہیں چلا۔ مگر جب سہاگنوں کے گیت بے سرے ہو گئے اور کنواریوں نے پیڑوں کی ٹہنیوں سے جھولے اتار لیے اور بچے کھلکھلا کر ہنسنا بھول گئے تب انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے اپنی کوئی قیمتی شے کھو دی ہے۔ بستی والے فکر مند ہو گئے۔ اسے کہاں ڈھونڈیں، کیسے تلاش کریں؟ ان کی تشویش بڑھنے لگی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ مل بیٹھ کر سر جوڑ کر اس کے بارے میں سوچتے، وہ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے کہ پری ان کی وجہ سے روٹھ گئی ہے۔ اب تو وہ ایک دوسرے سے اور بھی بدگمان ہو گئے۔ ان کے دلوں کی نفرت اور بھی گہری ہو گئی۔

اب انہوں نے ایک دوسرے کے کھیت کھلیانوں کو پامال کرنا اور مویشیوں کو چرانا شروع کر دیا۔ دھوکہ فریب، لوٹ مار، قتل و غارت گری روز کا معمول بن گیا۔ اب نہ کسی کا جان و مال محفوظ تھا، نہ کسی کی عزت و آبرو سلامت تھی۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا، بوڑھے اپنے گھر کی چہار دیواریوں میں بیٹھے گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے رہتے اور جوان تلواریں اور نیزے لیے ایک دوسرے کی تاک میں گھومتے رہتے۔ کوئی تلوار سے کسی کا سر قلم کر دیتا، کوئی نیزے سے کسی کا سینہ چھید دیتا۔ معصوم انسانوں کے لیے روز بروز زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تب بستی والوں نے طے کیا کہ اس روز کے قضیے سے بہتر ہے اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ وہ جان گئے تھے کہ جب تک کسی ایک فریق کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، دوسرے کو راحت نہیں مل سکتی۔ لہٰذا انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دشمن کو ختم کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

اس فیصلے کے بعد وہ دو گروہ میں بٹ گئے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو گھروں میں بند کر دیا گیا اور سارے جوان ہاتھوں میں نیزے اور تلواریں لیے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے غصے اور نفرت کی

چنگاریاں نکل رہی تھیں اوران کی مٹھیاں نیزوں اورتلواروں کے دستوں اور قبضوں پر مضبوطی سے کسی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے حریف کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھےاورایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کو تیار کھڑے تھے۔

تبھی ایک انہونی ہوگئی، فضا میں ایک مہین سا سر بلند ہوا۔ جیسے کسی پرندے کا ملائم پر ہوا میں لرز رہا ہو، کوئی گا رہا تھا۔

انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ پہلے تو انہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ مگر جب انہوں نے بہت دھیان سے دیکھا تو انہیں ننھی پری ایک پیڑ کی ڈال پر بیٹھی دکھائی دی۔ مگر آج اس کا روپ بدلا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور گال آنسوؤں سے تر تھے، پر نچے ہوئے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، جیسے وہ گھنی خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزر کر آ رہی ہو، اس کے پاؤں ننگے اور تلوے زخمی تھے۔ وہ پیڑ سے اتر کر میدان کے بیچ میں آ کر کھڑی ہوگئی، اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر رکھے تھے جیسے انہیں ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے روکنا چاہتی ہو۔ تلواروں کے دستوں اور نیزوں پر کسی ہوئی مٹھیاں قدرے ڈھیلی ہوگئیں۔

وہ گا رہی تھی، اس کی آواز میں ایسا سوز تھا کہ ان کے سینوں میں دل تڑپ اٹھے، وہ گا رہی تھی، اس کی آواز دھیرے دھیرے بلند ہوتی گئی، بلند ہوتی گئی، اتنی بلند جیسے ستاروں کو چھونے لگی ہو، اس کی آواز چاروں دشاؤں میں پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی، پھیلتی گئی، اتنی پھیلی کہ چاروں دشائیں اس کی آواز کی بازگشت سے گونجنے لگیں۔ لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑے منہ کھولے اس کا گیت سنتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں میں دبی تلواریں پھولوں کی چھڑیوں میں تبدیل ہوگئیں اور نیزے مورچھل بن گئے۔

انہوں نے محسوس کیا کہ پہاڑی کی چوٹیوں پر جمی برف پگھل رہی ہے اور ان کے دلوں کی کدورت آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ رہی ہے۔ پچھتاوے اور شرمندگی سے ان کی گردنیں جھک گئیں۔ گیت کے بول ان کے کانوں میں رس گھولتے رہے اور دھیرے دھیرے وہ سب ایک دوسرے سے ایک ان دیکھی، ان جان ڈور سے بندھتے چلے گئے، جیسے وہ سب ایک ہی مالا کے موتی ہوں، جیسے وہ سب ایک ہی ماں کے جائے ہوں۔

ادھر گیت ختم ہوا اور وہ اپنی آستینوں سے آنسو پونچھتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ جب اشکوں کا غبار کم ہوا تو انہوں نے اپنی محسن کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بستی والوں نے اسے بہت ڈھونڈا، وادی وادی، جنگل جنگل آوازدی، منتیں کیں، واسطے دیئے مگر وہ دوبارہ ظاہر نہیں ہوئی۔ تب بستی والوں نے اس کی یاد میں ایک مجسمہ بنایا، اسے بستی کے بیچوں بیچ میدان میں نصب کردیا۔

کہتے ہیں آج بھی بستی کے لوگوں میں جب کوئی تنازعہ ہوتا ہے، سب میدان میں اس مجسمے کے گرد جمع ہوجاتے ہیں اور اس گیت کو دہرانے لگتے ہیں۔ گیت کے ختم ہوتے ہوتے ان کے دل سلوٹیں دوبارہ اجلی اور صاف ہوجاتی ہیں جیسے بارش کی پہلی پھوار سے پیڑوں سے پھول پتے دھل جاتے ہیں۔ اس طرح بستی والے آج بھی اس گیت کی بدولت بڑے امن اور چین سے زندگی بسر کررہے ہیں۔ جیسے ان کے دن پھرے، خدا ہم سب کے دن بھی پھیر دے۔

میں نے کہانی ختم کر کے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور جمائی لیتے ہوئے کہا: ”چلو اب سو جاؤ، کہانی ختم ہو چکی ہے“۔

اس نے کہا ”پاپا؟ آپ نے کہا تھا، کہانی سناتے وقت بیچ میں کوئی سوال نہیں پوچھنا“۔

”ہاں، میں نے کہا تھا اور تم نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ تم بڑے اچھے بچے ہو“۔

”مگر پاپا! کہانی تو ختم ہوگئی، میں اب تو سوال پوچھ سکتا ہوں نا؟“

میں نے ایک لحہ توقف کیا پھر بولا، ”چلو پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”پاپا! وہ کونسا گیت تھا، جسے سن کر گاؤں والے دوبارہ گلے ملنے پر مجبور ہوگئے“۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھوڑی دیر چپ رہا، پھر بولا، ''مجھے وہ گیت یاد نہیں ہے بیٹا!''
وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں بے اعتمادی کی جھلک تھی۔
میں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''چلو سو جاؤ، رات زیادہ ہوگئی ہے''۔
''نہیں پاپا''، اس نے مچلتے ہوئے کہا۔
''مجھے وہ گیت سنائیے ورنہ میں سمجھوں گا، آپ کی کہانی ایک دم جھوٹی تھی''۔
میں سناٹے میں آگیا۔ جیسے کسی نے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔
میں تھوڑی دیر خاموش رہا پھر دبے لہجے میں بولا،
''ہاں بیٹا! یہ کہانی جھوٹی ہے، کہانیاں اکثر جھوٹی ہوتی ہیں''۔
وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا، میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
''مگر تم اس کہانی کو سچی بنا سکتے ہو''۔
''وہ کیسے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''بڑے ہو کر تم ویسا گیت لکھ سکتے ہو، جیسا پری نے گایا تھا''۔
بیٹے کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔
''سچ؟''
''ایک دم سچ''۔
اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
''یو آر سو سوئٹ پاپا!''
''تھینک یو'' میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا، اب سو جاؤ''۔
''گڈ نائٹ'' اس نے آنکھیں بند کر لیں وہ جلد ہی سو گیا، مگر اس رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا، بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا۔
''کیا میرا بیٹا ویسا گیت لکھ سکے گا؟''

☆☆☆

تکمیل

سلطان جمیل نسیم

الطاف۔۔۔ چھوٹی چھوٹی اور مڑی تڑی پرچیوں کی بند مٹھیاں کھول کر ان میں سمٹی ہوئی سامنے پھیلے ہوئے سادہ کاغذ کی ہتھیلی پر جمع کرتا جا رہا تھا۔ یہ حساب کتاب کرتے اچانک اسے یاد آ گیا کہ کتنے سال اور کتنے مہینے بیت گئے ہیں جو وہ اپنے دوستوں سے نہیں ملا ہے۔ خاص طور سے وہ دوست جو بہت قریب تھے مگر اسی کی بے مروتی کے سبب دور ہو گئے ہیں۔ دوستوں کا دھیان آتے ہی اس کا بے اختیار جی چاہنے لگا کہ وہ ان کو ملے۔ ان کے درمیان بیٹھ کر معمول کے مطابق فضول قسم کی باتیں کرے تاکہ۔۔۔۔ ہوئی، ایک مدت سے اپنے ہی ماحول میں بند رہنے سے تعلقات پر کائی کی طرح بیگانگی چھا گئی ہے اس میں شگاف پڑے اور جس اکیلے پن نے اندھے کنویں میں رہنے والے جن کی صورت اختیار کر لی ہے اسی وجہ سے دوست تو الگ رہے اس کے رشتہ دار بھی اس کو مغرور یا سنکی سمجھ کر الگ الگ ہی رہے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں مشہور ہوتی ہوئی اس بدگمانی کو دور کر دے۔ سب سے میل ملاقات کرے اور بتا دے کہ کچھ مجبوریاں تھیں جن کی بنا پر وہ اپنی ہی ذات سے بیگانہ ہو کے رہ گیا تھا۔

دنوں بعد الطاف کو محسوس ہوا کہ ذہن پر ہمہ وقت چھائی رہنے والی دھند چھٹ رہی ہے۔ اس بوجھل سی کیفیت سے نجات پانے کے خیال ہی سے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

دوستوں سے ملاقات میں اتنے طویل وقفے کی وجہ اس کی مصروفیت تھی اور اس کا سبب اس کی بیوی۔

الطاف نے والدہ کی منت کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ اور پھر دھمکیوں کے سامنے سر جھکا کر نکاح پڑھوالیا تھا اور شادی کی پہلی ہی رات صاف صاف لفظوں میں بیوی کے سامنے اپنی مالی حالت بیان کر دی تھی اور بیوی کو بتا دیا تھا کہ اگر اسے دنیا میں کسی بات سے شدید نفرت ہے تو وہ قرض ہے۔ وہ بھوکا رہ سکتا ہے اور رہا بھی ہے مگر قرض مانگنے کے لیے اس نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ قرض سے نفرت کا سبب بھی بیان کر دیا تھا۔ قرض محبت کی کتر بیونت نہیں کرتا بلکہ قرض خواہ کے چہرے پر ایسی مقراض بن کر بیٹھ جاتا ہے جس کو دیکھ دیکھ کر ادھار لینے والے کا دل کھٹکتا رہتا ہے۔ اس کے والد نے قرض لے کر کاروبار شروع کیا، قرض لے کر مکان بنایا اور جب زندگی کا قرض ادا کر کے وہ پردہ پوش ہو گئے تب۔۔۔۔ قرض خواہوں نے جو رویہ اختیار کیا اس رویے نے انسان کا ایک ایسا روپ دکھایا کہ وہ ڈر گیا۔ پھر اس نے تمام کاروبار کو ختم کیا۔ ایک چشم فروش کمپنی میں ملازمت کی۔ مکان بیچا۔ پھر بھی قرض کی تھوڑی بہت صورت بعض لوگوں کے چہروں سے ایسے جھانکتی رہی کہ اس کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ تب اس نے رت جگے کیے۔ فاقے کاٹے۔ اپنی تعلیم چھوڑی، کتابیں تک بیچیں۔ اب وہ انسان کو صرف اپنے عزیزوں اور دوستوں کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے، اسی لیے الطاف نے شادی کے پہلے ہی روز اپنی بیوی سے محبت کا اور وفاداری کا وعدہ لینے کی بجائے اس بات کا عہد لیا کہ وہ کبھی کسی سے بھی قرض نہیں لے گی۔

شادی ہوئے تیرہ برس گزر گئے۔ تین بچے بھی ہو گئے۔ بیوی کے ساتھ مختلف معاملات پر تلخ و ترش باتیں بھی ہوئیں۔ دو چار دن بول چال بھی بند رہی۔ مگر الطاف کو یہ شکایت کبھی نہ ہوئی کہ بیوی نے آمدنی کم ہونے کی شکایت کرتے ہوئے کہیں سے قرض لے کر اپنی کوئی ضرورت پوری کی ہو۔ اس تیرہ برس کے عرصے میں الطاف کی تنخواہ تین گنا بلکہ چار گنا بڑھ گئی تھی مگر وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ تنخواہ کے ساتھ مہنگائی کا فاصلہ بھی وہی رہا ہے جو اب سے تیرہ برس پہلے تھا بلکہ تنخواہ کو پیچھے چھوڑ کر مہنگائی

دس بیس قدم آگے ہی رہی ہے۔

قرض نہ لینے کی وجہ سے اور تنگی بندھی آمدنی میں سگھڑ پن سے گزرا کرنے کے باعث الطاف کو اپنی بیوی ساری تنگ مزاجی اور کم عقلی کے باوجود بہت عزیز تھی۔ لیکن ایک دن سارا بھرم کھل گیا۔

الطاف کی بیوی ایسے بھائیوں کی بہن ہے جن کا وسیع کاروبار ہے۔ متمول لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور جنہوں نے جہیز کے نام پر اپنی اکلوتی بہن کو مکان تک دیا ہے۔۔۔ تقریبات یا تہواروں پر اب بھی اس کے بیوی بچوں کو اچھی خاصی رقم دے دی تھی۔ الطاف کو اس کبھی کبھار کے لین دین پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ ہاں شادی کے شروع کے دنوں میں ان لوگوں نے کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ ہی رہے۔ تب الطاف نے انکار کیا تھا پھر انہوں نے کئی بار اس خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ الطاف اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ دے اور ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ قرض داری اور احسان مندی کی آنکھوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ وہ گردن جھکانے کا قائل نہ تھا تو ایسا ٹھکانا کیسے پسند کر لیتا۔ چنانچہ اس پیشکش کو بھی اس نے قبول نہیں کیا۔

چند روز پہلے بیٹے نے ضد کی کہ وہ سائیکل لے گا۔ الطاف کو اس کی کفایت شعاری نے بچوں کو بہلانا بھی سکھا دیا تھا سو اس نے چند میٹھی میٹھی باتیں کر کے بیٹے کو میٹھی گولی کھلا دی۔ مگر دوسرے ہی دن گھر میں سائیکل کی گھنٹی بج رہی تھی۔

''ابو میری سائیکل آ گئی''۔ بیٹے کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

''کہاں سے۔۔۔ ماموں نے دلوائی ہے؟''

''نہیں۔۔۔ امی لائی ہیں''۔

''تمہاری ماں!''

''جی۔۔۔''

اب اس نے بیوی سے تصدیق چاہی تو اس نے لحظہ بھر کے لیے آنکھیں جھکا لیں۔ ''ہاں۔ میں نے گھر کے خرچ میں سے کچھ پیسے بچائے تھے''۔

الطاف بیوی کے جھجکتے انداز سے سمجھ گیا کہ آج پہلی بار اس سے کوئی بات چھپائی جا رہی ہے، تب اس نے بیوی کو قریب بٹھا کے سچ بات کہنے کی ہمت دلائی۔

بیوی رونے لگی۔ پھر تیرہ برس کی ساری شکایتیں ایک ایک کر کے اس کی زبان پر آ گئیں۔ بیوی نے اعتراف کر لیا کہ ایک مرتبہ اپنے بھائیوں سے الطاف کی کم تنخواہ کا گلہ کیا تھا تب سے ہر مہینے وہ اتنی رقم دے جاتے ہیں کہ اس کا ہاتھ کبھی تنگ نہیں ہوتا۔

الطاف کے لیے یہ اطلاع تکلیف دہ حد تک چونکا دینے والی تھی۔ وہ جس بیوی کے توکل پر مان کرتا تھا اور اپنے دفتری ساتھیوں کے درمیان بیٹھ کر فخریہ انداز میں جس کی تعریف کرتا رہتا تھا وہ اپنے ہی بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اس کی تذلیل کا باعث بنے گی۔ اس بات کا تو الطاف کو گمان بھی نہیں تھا۔ بیوی کے شکوے کو اس نے اپنی ہتک جانا۔ تقریبات کے بہانے جو تحفے تحائف دیئے جاتے تھے وہ ان کے حق میں بھی نہیں تھا۔ اس کھلی زیادتی کو کیسے قبول کر لیتا۔ الطاف کا سر گھومنے لگا اس کو اپنا اصول ہی نہیں بلکہ اپنا وجود بھی تڑختا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کمرہ بند کر کے بیٹھ گیا۔ اس ماہانہ امداد کو وہ کیا سمجھے بھیک یا قرض۔ بھیک سمجھ کر وہ خود اپنی تحقیر کرنی نہیں چاہتا تھا۔ جتنا سوچتا اسے اپنی بیوی پر اتنا ہی غصہ آتا۔ اس شدید جذباتی ہیجان کے عالم میں بھی اس نے دو راستوں کے متعلق سوچا۔ ایک یہ کہ بیوی کو اس کے بھائیوں کے پاس چلتا کر دے پھر زندگی بھر اس کی صورت نہ دیکھے۔ دوسرا یہ کہ اس امداد کو قرض تصور کر لے اور جتنی جلدی بھی ممکن ہو سکے وہ یہ قرض ادا کر دے۔ محض بچوں کا خیال کرتے ہوئے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اس نے بیوی سے کہا۔

''میں بہت صبر اور ضبط کا آدمی ہوں۔ میرے ساتھ اتنے عرصے رہ کر تم نے بھی اندازہ لگالیا ہوگا۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میری اس خوبی کو میرے بعض دوست یا رشتہ دار ذہنی بیماری سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھے بہت زیادہ دکھ اس بات سے ہوا ہے کہ تم نے بھی میرے بارے میں ایسی ہی رائے قائم کر کے میرے اصولوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ حالانکہ میں اپنے بچوں کو اپنے اصولوں کی حد میں رکھ کر اس ذہنی اذیت سے بچانا چاہتا ہوں جس سے میں خود گزر رہا ہوں۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب تم سے صرف یہی چاہتا ہوں کہ تم نے اب تک جتنی رقم میرے علم میں لائے بغیر اپنے بھائیوں سے مانگی ہے مجھے اس کا حساب دے دو''۔ جب اس کا شمار کیا گیا تو وہ لاکھوں تک پہنچی۔ موجودہ آمدنی میں سے اس کی ادائیگی ممکن ہی نہیں۔ اس نے اپنے بچوں کو بھی بلا کر سامنے بٹھالیا۔

دیکھو بھئی۔ ذرا غور سے میری بات سننا۔ اگر تم کو اپنی خواہشیں زیادہ عزیز ہیں تو پھر میں تمہارے درمیان سے ہٹ جاتا ہوں۔ اور اگر تمہیں اپنا باپ عزیز ہے تو پھر اس کے کہنے کے مطابق چلو۔ یاد رکھو خواہشیں پوری ہونے کے بعد اپنی کشش کھو بیٹھتی ہیں اور باپ مفلس ہونے کے باوجود، مرنے کے بعد بھی بہت یاد آتا ہے۔ تمہاری ماں نے جو قرض لیا ہے وہ میں اتارنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لیے تمہارا تعاون چاہیے''

کسی کی سمجھ میں کچھ بات آئی۔ کچھ نہیں آئی۔ لیکن وہ باپ کی موت بہر حال نہیں چاہتے تھے، اس لیے متفق ہوگئے کہ وہ اس کے کہنے پر چلیں گے۔

الطاف نے پھر کہا۔

تمہارے پاس جو کچھ ہے میں وہ چھیننا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جب تک میں قرض ادا نہ کر دوں۔۔۔ مجھ سے ایسی فرمائش نہ کرنا جو میں پوری نہ کر سکوں''۔

اس کے بعد الطاف نے خود کو محنت کے لیے وقف کر دیا۔ دفتر میں اوور ٹائم، اخبار میں کالم، پھر دو چار ٹیوشن۔۔۔ اب وہ سورج نکلنے سے پہلے کام میں مصروف ہوتا اور رات گئے لوٹتا۔ اسے کھانے پینے کا ہوش نہیں رہا۔ سونے جاگنے میں فرق آگیا۔ اس نے سوچا کہ زندگی کے چند سال اس محنت میں بے شک کھپ جائیں لیکن بقیہ عمر قرض کے احساس تلے دب کر نہ گزرے۔ الطاف کو اتنی محنت کرتے دیکھ کر اس کی بیوی مضطرب بھی ہوتی اور پشیمان بھی۔ کئی بار اس نے کہا۔

''آپ زیور بیچ دیجئے۔ یہ مکان فروخت کر دیجئے۔ مگر خدا کے واسطے اپنی صحت کا خیال رکھیے''۔

''زیور اور مکان۔۔۔ سب کچھ تمہارا ہے۔ میں تو صرف قرض کو اپنا سمجھتا ہوں۔ جب تک نہ اتار دوں مجھے اپنی زندگی بوجھ معلوم ہوتی رہے گی''۔

جب اس کی بیوی کے بھائیوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ الطاف کو وہ جھکی اور سنکی تو سمجھتے ہی تھے مگر اب انہوں نے اس کے پاگل ہونے کا بھی اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنی بہن کو دوٹوک فیصلہ کرنے کا بھی مشورہ دیا۔

''ایک پاگل کے ساتھ زندگی گزارنا عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ ہم نے اسے شریف، ایماندار اور غریب سمجھ کر تم سے منسوب کیا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ اب تم ہمارے ساتھ چل کر رہو۔ بچوں کو وہ تم سے کسی قیمت پر علیحدہ نہیں کر سکتا اس بات کی ضمانت ہم دیتے ہیں''۔

مگر الطاف کی بیوی نے اپنے بھائیوں کے مشورے پر کان نہیں دھرے۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب تو مرنا جینا ان کے ساتھ ہے''۔

''تو پھر اس سے کہو کہ ہم لکھ کر دینے کے لیے تیار ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیا ہے یا ہمیں سب کچھ مل گیا ہے یا ہمیں کچھ نہیں چاہیے''۔

''وہ میری غلطی کا خمیازہ بھگتے بغیر کوئی بات نہیں سنیں گے''۔

''پاگل ہے بالکل پاگل''۔

وہ اپنی بہن کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلے تو گئے لیکن کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈنے سے غافل بھی نہیں رہے آخر انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ اپنی ہی فرم کے ایک ملازم کو اس بات کا حکم دیا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے الطاف کی ٹیوشن لگائے اور زیادہ سے زیادہ فیس طے کر لے۔ ان کا یہ حیلہ کارگر ہوا۔ لیکن ٹیوشن ملنے کے بعد بھی الطاف نے اوورٹائم بند کیا نہ کالم نویسی چھوڑی اور نہ ہی دوسرے بچوں کو پڑھانا ختم کیا۔ اس پر تو ایک ہی دھن سوار تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ ادھار چکا دے۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جب اس نے اتنی رقم پس انداز کر لی کہ اپنی گردن میں ڈالا ہوا قرض کا جوا اتار پھینکے۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے اس نے وہ دن شمار کیے جو دوستوں کے ساتھ گزارنے کے بجائے دفتر کی موٹی موٹی فائلوں میں سر کھپاتے ہوئے گزارے تھے۔ روز و شب ان لمحوں کو گنا جو بیوی بچوں کے درمیان نہیں بیتے تھے بلکہ کند ذہن بچوں کو ان کی کتابیں رٹاتے صرف کیے تھے۔۔۔ سارا حساب لگانے کے بعد اس نے سوچا کہ اپنی زندگی کے کئی سال خرچ کر کے یہ رقم جمع کی ہے اور یہ سب کچھ میں اپنی بیوی کے بھائیوں کو یکمشت دے دینا چاہتا ہوں کہ وہ اتنی بڑی رقم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ہر ماہ بہن کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دیتے رہے تھے۔ کیا یہ قرض ہے؟ جس کو ادا نہ کرنے پر ان لوگوں کی شکلیں بگڑ سکتی ہیں۔ ان کے روپے میں فرق آ سکتا ہے۔۔۔ ان کا تو مطالبہ ہی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ دیا وہ احسان کرنے کے خیال سے دیا اور نہ قرض کی نیت سے۔ یہ تو میں نے اپنی دانست میں قرض سمجھ لیا ہے اور میرے پاس اتنی رقم ہے کہ اگر وہ مانگیں تو ان کے منہ پر دے ماروں۔۔۔ تو۔۔۔ تو اب اسی وقت دوں گا جب وہ طلب کریں گے۔ ورنہ پڑی ہے بینک میں۔

اس خیال سے مطمئن ہو کر یہ سوچا کہ اس مسلسل اور انتھک محنت کا بدلہ چکانے کے بعد کچھ عرصے آرام بھی کیا جائے۔ آرام کے تعلق سے گھر اور گھر کے حوالے سے بیوی آئے۔ اس عرصے میں اگر اس نے محنت کی ہے تو بیوی بچوں نے بھی اپنا دل مار کر اس کا ساتھ دیا ہے۔ ٹھیک ہے اب وہ اوورٹائم نہیں کرے گا مگر زیادہ فیس دینے والے بچوں کی ٹیوشن نہیں چھوڑے گا۔ علی الصباح اٹھ کر کالم لکھا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی بند نہیں کرے گا، دو ایک ٹیوشن جہاں فیس کم ہے ان کو چھوڑ دے گا۔ یوں ذرا دم لینے کا موقع مل جائے گا اور گھر بھر کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں گی۔ نہیں ابھی کوئی ٹیوشن ختم نہیں ہوگی۔ اور محنت کر لی جائے کہ ابھی جسم کے ساتھ حوصلہ بوڑھا نہیں ہوا ہے۔ گھر میں اجالا پھیلے گا تو شاید بچے اس فرق کو محسوس کر سکیں جو محنت کی کمائی اور ساہوکار کی دی ہوئی مراعات میں ہوتا ہے۔ الطاف کو ان خیالوں کے درمیان اچانک اپنے دوستوں کا خیال آیا۔

اس نے بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی تو یہ احساس بھی ہوا کہ کئی سال کی محنت اب اس کے بدن میں تھکان بن کر اترنے لگی ہے۔ اس تھکن سے نجات کا ایک ہی طریقہ سوجھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سہی، اپنے روز کے معمول سے تھوڑا ہٹ جائے۔ پھر دوستوں کا دھیان۔۔۔ اس ہنستی مسکراتی محفل کا خیال جو یکایک اس کی مصروفیت کی دھند میں چھپ گئی تھی۔ الطاف جانتا تھا کہ اس کے اچانک مصروف ہو جانے کو دوستوں نے ذہنی رو بہک جانے سے تعبیر کیا تھا۔ اور جب اس نے ان لوگوں کے مسلسل رابطہ رکھنے کے باوجود ان سے ملنے میں اپنی مصروفیت کو حائل پایا تو پھر ان دوستوں نے حریص اور دولت کمانے کا دھنی سمجھ کر اس کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ مگر وہ اپنے ساتھیوں کی فطرت سے واقف تھا۔ ایک شام بھی ان کے ساتھ گزارنے کے لیے جا بیٹھے تو وہ اسے صبح کا بھولا سمجھ کر معاف

کر دیں گے۔۔۔ان دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر صرف ایک شام گپ شپ میں گزار دی جائے تو اس تمام تھکن کا احساس ہی رفو چکر ہو جائے گا۔ وہ پھر تازہ دم ہو جائے گا۔ نئے سرے سے توانائی حاصل کرنے کے لیے ایک شام کی مصروفیت ترک کر دینا کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ الطاف نے یہ طے کرتے ہی اپنے سامنے پھیلی ہوئی فائلیں سمیٹیں اور دفتر سے نکل آیا۔

وہ اپنی روز و شب کی لگن میں ایسا مگن ہوا تھا کہ اپنی ظاہری ہئیت سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا جو مل گیا اور جیسا مل گیا کھا لیا۔ کپڑے میلے ہو گئے تو بدلنے کا ہوش نہیں۔ شیو بڑھ گیا تو کوئی پرواہ نہیں۔ قرضہ اتارنے کی دھن شروع ہوتے ہی پہلے سستے برانڈ کی سگریٹ شروع کی۔ پھر وہ بھی چھوڑ دی۔ آج دفتر سے باہر آتے ہی اس نے تھکن کا تناؤ کم کرنے کے لیے پہلے ایک انگڑائی لی۔ پھر بڑھے ہوئے شیو کو کھجایا پھر بدن ڈھیلا چھوڑ کر لحہ بھر کے لیے سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ کوئی شخص قریب سے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے گزرا تو اس کے اندر بھی سگریٹ کی طلب چیخنے لگی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ جب چھوڑ ہی دی ہے تو اب منہ لگانے سے کیا فائدہ۔ پھر یہ خیال کر کے کہ آج مدت کے بعد بچھڑے دوستوں میں بیٹھنے کا پروگرام ہے تو دو چار سگریٹ پی لینے میں کوئی نقصان بھی نہیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پوری ریز گاری نکال لی۔ ایک روپیہ، دو روپیہ اور پانچ روپے کے سکے۔ پان والے کی دکان پر کئی لوگ موجود تھے اور پنواڑی بہت تیزی کے ساتھ پان لگا لگا کر خریداروں کو دے رہا تھا۔ الطاف کو فراغت کے یہ لمحے بہت عرصے بعد نصیب ہوئے تھے اس لیے وہ وہیں کھڑے ہو کر ان لوگوں کی خریداری مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی انتظار کی ۔۔۔ خالی خالی نظروں سے سڑک پر آتے جاتے لوگوں اور بھاگتے ہوئے ٹریفک کو دیکھتے ہوئے غیر ارادی طور پر ایک ہاتھ میں دبائی ہوئی ریز گاری کو دوسرے ہاتھ میں ایسے منتقل کرتا کہ ایک ہتھیلی اپنے ہی سامنے پھیل جاتی اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں سے ایک ایک ۔۔۔ ٹپکتے ہوئے قطروں کی صورت ۔۔۔ کھلی ہتھیلی میں گرنے لگتا۔ اس مشغلے میں ایک کے اوپر ایک گرتے ہوئے سکوں کی آواز بھی اسے بھلی لگنے لگی۔

سگریٹ فروش کی دکان سے ایک صاحب فارغ ہوئے۔ دکان سے ذرا ہٹ کر اس نے پنواڑی سے لیے ہوئے بقیہ پیسوں میں سے نوٹ اپنی قمیض کی جیب میں ڈالے۔ سگریٹ کے پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ کو جیبوں میں ٹھونسا۔ پھر ان کی نظر الطاف کی طرف اٹھی جو دکان پر جمع لوگوں کو دیکھتے ہوئے اپنی ریز گاری سے کھیل رہا تھا۔ ان صاحب نے پڑیوں سے بھرے لفافے کو چٹکی سے تھاما اور اپنے ہاتھ میں پڑے ہوئے چند سکے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھے اور آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

جیون جل

سلیم اختر

"اے ذی وقار شہزادی! یہ ہے راز کوہِ ندا کا"۔

اجنبی ہواؤں کی ذائقہ شناس اور طویل مسافتوں کی دھول میں اٹے حاتم نے کوہ ندا کا تمام ماجرا گوش گزار کیا۔۔۔ مکمل دل جمعی سے!

حاتم کی آمد کا اعلان ہونے کے بعد، ہر چند شہزادی مصر رہی کہ اس نے بہت ہرج مرج کھینچا ہے، پہلے آبِ خنک و معطر سے جسم سے نادیدہ زمینوں کی دھول صاف کر لے، اعضا سے محنت و مشقت کے پسینہ کی بو دھو ڈالے، تب پاکیزہ پوشاک زیب تن کرنے کے بعد، لذت کام و دہن سے تن کو توانا کر لے۔۔۔ بلکہ یوں ہی چندے لیل و نہار کرے، جب اچھی طرح آسودہ اور مسرور ہو لے تو پھر کسی دن، دیوان خاص میں، تقریب خاص میں، مقربین، مصاحبین اور عمائدین کے روبرو، احوال کوہ ندا کی مہم کا گوش گزار کرے تو مرغوب خاطر ہوگا۔ حاتم نے دست بستہ عرض کی:۔

"اے دانش مند اور زیرک شہزادی! تم جانتی ہو کہ میرا دوست منیر شامی، شربت وصل کے پینے کو تن زار اور دل فگار کے ساتھ خود پہ دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کیئے ہے۔ لہٰذا جسم کے آرام اور معمولی سی آسائش کے لیے منیر شامی کو تاخیر کے تناؤ اور تذبذب کے عذاب میں مبتلا کرنا غیر دردمندانہ فعل ہوگا اور دوست بھی ایسا جس کے لیے میں نے یہ ہرج مرج کھینچا"۔

شہزادی، کہ حسن کی بھی شہزادی تھی، مسکرا مسکرا کر اسے میٹھی میٹھی نظروں سے تکا کی، چندے توقف کیا، تب لب لعلیں کو غنچہ سا، یوں وا کیا۔ "آفرین ہے حاتم!"

مطلا حاشیہ سے بنے نقرئی تاروں والے پردہ کے ادھر شہزادی، ستاروں جیسی خواصوں کے جھرمٹ میں مثل ماہ چہاردہم، ادھر حاتم منیر شامی اور مرحبا!! کا غلغلہ بلند کرتے ہوئے چیدہ درباری۔ پردے کے نقرئی تار مہین و ملائم اور نفیس، اتنے کہ دست تصور سے بھی لرزاں، اور اس دھواں دھواں براق پردہ کے پیچھے حسن جہاں سوز کا شعلہ۔۔۔ لپکتا، دمکتا، جھمکتا! وہ حسن جس نے منیر شامی کے خرمن ہوش وخرد پر بجلی گرائی، گھربار سے بیگانہ کیا اور عاشق حرماں نصیب بنا کر چھوڑا۔

شہزادی حاتم کو جن نظروں سے دیکھ رہی تھی وہ منیر شامی کو ان نظروں سے نہ دیکھ سکتی تھی کہ حاتم بہر حال فاتح مہم جو تھا۔ شہزادی کے گلنار لبوں پر شبنم کی کرنوں نے رخ روشن کو یوں منور کر دیا کہ وہی تار نقاب میں تبدیل ہو گیا۔ ہر چند کے منیر شامی کی حد ادب سے تجاوز کرتی گستاخ نگاہیں، دست طمع کی مانند تار نقاب سے کھیل رہی تھیں۔ شہزادی نے لب لعلیں کو جنبش دی۔

"حاتم! جب ایسے ہو تبھی ایسے بھی ہو"۔ حاتم کورنش بجا لایا۔

شہزادی نے جنبش ابرو سے اشارہ کیا، ترت مسند زریں مکلف و پر تکلف، کلابتوں کی ڈوریوں سے مزین، آراستہ کر دی، مودب کنیزوں نے دستر خوان زرنگار سجا دیا، خوش رو باندی جواہر سے جگمگ کرتا طلائی آفتابہ اور نقشیں چلمچی لے کر ہاتھ دھلانے کو حاضر دوسری دست پوشی کو مستعد۔ نازنینوں نے سرد مشروب اور میوہ ہائے خشک و تر، زریں مزین دستر خوانوں پر سلیقہ اور قرینہ سے سجا دیئے۔

شہزادی اور حاضرین، حاتم کے ہلتے لب دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے الفاظ گویا مانند تصویر ادا ہو رہے تھے۔ حاتم کی تقریر

دل پذیر، گویا انگلی تھامے، غیر مانوس، اجنبی مناظر اور نا دیدہ زمینوں کی سیر کرا رہی تھی۔ جب بار کلام سے حاتم کا حلق بوجھل ہو جاتا، چنداں توقف کرتا، شربت کا گھونٹ بھرتا، ہمہ تن گوش بنے سامعین پر نگاہ ڈالتا اور پھر گویائی کی ڈور تھام لیتا۔

سب کی نگاہوں میں حاتم کے ہلتے لب تھے۔ صرف منیر شامی کا تن ناتواں، چشم بیدار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر شہزادی کو تکے جا رہا تھا۔ نقرئی مہین تاروں کے پردے میں کچھ چھپی کچھ دکھائی دیتی شہزادی، روشنی کی مانند منیر شامی کی آنکھوں کی راہ دل میں چاندنی بکھیر رہی تھی۔ اب یہ مغرور حسینہ میری ہے، آج یہ مشکل پسند دوشیزہ میری سیج آباد کرے گی، سنگ ہجر سے شکستہ تن داغ داغ، وصل سے شادکام ہوگا۔ وہ اس تصور ہی سے لرز گیا کہ یہ لامبی سیاہ ناگنیں اس کے بازو پر کھلیں گی اور زمین میں لرزش پیدا کریں گی، یہ غنچہ دہن میرے لبوں پر پھول کھلائے گا۔ تن نگار گلزار میں تبدیل ہوگا۔ منیر شامی میں اسے سے زیادہ سوچنے کی تاب نہ تھی تاہم نظر کی پیاس چشمہ حسن سے سیراب ہوتی رہی۔۔۔ اگر اختلاط بالنظر ممکن ہوتا تو منیر شامی پر غسل واجب ہو چکا ہوتا۔

''اے ذی وقار شہزادی! یہ ہے راز کوہ ندا کا''۔

حاتم خاموش!

شہزادی مانند تصویر، اہل محفل مانند دیوار۔

چنداں خاموشی کی رواتنی رہی۔

بارے شہزادی، حسن کے تخت طاؤس سے شاخ گل کی مانند جھوم کر اٹھی۔ نازک کلائیوں سے پردہ اٹھایا جو کہ آتش حسن سے خود ہی بھسم ہوتا جا رہا تھا۔ محفل میں چاند اتر آیا، آہستہ خرام، قدم قدم، حاتم کی جانب رواں، پھر وہ سرو قد، گھٹنوں کے بل حاتم کے سامنے جھک گئی، وہ حاتم یا کسی اور کی جانب نہ دیکھ رہی تھی، نگاہیں حاتم کی گرد آلود نعلین پر مرکوز تھیں۔

''آفرین! صد آفرین!!''

حاتم صرف مسکرا دیا۔

''اے قبیلہ طے کے جری فرزند! تو نے جو قول دیا، اسے پورا کر دکھایا''۔

حاتم نے جواب دیا ''قول مرداں جان مرداں''۔

''بجا فرمایا'' شہزادی اب سرو قد تھی۔ حاتم نے نظریں اٹھا کر حسن بے نقاب کو دیکھا مگر رخ روشن کی تاب نہ لا سکا۔ گلشن حسن میں جوانی نے انگارے بھر دیئے تھے نظریں پکاریں۔۔۔ صاحب پرے! پرے!!

شہزادی نے غنچہ ساں دہن وا کیا ''اے بہادر اور فیاض حاتم! تو نے میری شرط پوری کر دی اب میں تیری شرط پوری کروں گی۔ خوشی سے۔! دل جمعی سے!!''

شہزادی حاتم کو جن نظروں سے دیکھ رہی تھی شاید ہی کسی شہزادی نے ایسی نظروں سے کبھی کسی شہزادہ کو بھی دیکھا ہوگا، نظر مانند دست سبک۔ حاتم کے چہرہ کے نقوش ٹٹول رہی تھیں۔ حاتم، ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے سے، خون کو چہرہ کی جانب رواں محسوس کر سکتا تھا۔ فشار خون، دل کی دھڑکنوں کا آہنگ بے ترتیب کر رہا تھا۔

شہزای لب خاموشی سے گویا ہوئی۔

''تو میرے تن کی سلطنت کا مختار ہے، میں تیرے تصرف میں ہوں، جو چاہے کر، تو میرا آقا ہے''۔

دونوں بازو پھیلائے، سر جھکائے، خود سپردگی کی مکمل تصویر!

منیر شامی کہ عاشق تھا اس پر صاعقہ ء جمال گرنی ہی تھی خود حاتم ٹھٹھک کر رہ گیا، لاریب! وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ

پر جمال، پرکشش اور پرترغیب بن چکی تھی۔

شہزادی نے ایک مرتبہ پھر حاتم کے چہرہ کونظر بھر کر دیکھا۔ سفر کی صعوبتوں نے چہرہ کی لکیروں میں مہمات کی داستان رقم کی تھی، اس کے قد بالا کے سامنے وہ خود کو کوتاہ محسوس کر رہی تھی، گویا وہ بچی ہو۔ وہ اس کا پر مشقت جسم تک رہی تھی جس میں سے مردانگی کی مہک مشک کے مانند خارج ہو کر اعصاب پر نشہ طاری کر رہی تھی۔ وہ اس کے فولادی بازوؤں کی ریشمی مچھلیوں کی حقیقت جاننا چاہتی تھی اور مضبوط ہاتھوں کی قوت آزمانا!

شہزادی کا تن نازک بولا ''میں مفتوح!''

منیر شامی کہ مہم جو نہ تھا، محض عاشق تھا۔۔۔ عالم ہراس میں! حاتم کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں اس نے میزان نظر سے آمادگی کی تصویر بنی شہزادی کو تولا تو سیر کی سوا سیر پائی، شہزادی سیاہ آنکھیں پوری طرح کھولے اسی کو تک رہی تھی، اس کی آنکھیں بھید کھول رہی تھیں کہ چھپا رہی تھیں؟ کوندا سے بھی زیادہ بھید بھری بجھارت! حاتم ان سوالات کا جواب دینے کی خود میں سکت نہ پا رہا تھا۔ ایسے میں جبکہ نگاہیں سوال جواب کر رہی تھیں، پل صدیوں میں اور صدیاں پلک جھپکتے لمحات میں تبدیل ہو رہی تھیں تو نیکوکاروں کا ازلی دشمن شیطان مردود، حاتم کے دل میں وسوسے پیدا کر رہا تھا۔

حاتم! یہ ارمغان حسن کے باعث دلکشی، شبستان شاہی ہے۔ تو اسے اس ناکارہ منیر شامی کے حوالے کر دے گا؟

حاتم ڈگمگایا، منیر شامی کا دل لرزا، شہزادی کا دل مزید دھڑکا، دیکھ آنکھیں کھول کر دیکھ! کیا تو نے اپنی تمام مہمات میں ایسا طلسمی حسن دیکھا؟ نہیں ناں! تو کیسے دیکھ سکتا تھا کہ کائنات میں حسن کا یہ کامل نمونہ واحد ہے۔۔۔ دیکھ حاتم دیکھ! اس کا قد رعنا کمان جیسا جسم دیکھ اور یہ ہونٹ اور وہ سب کچھ بھی جو تو نہیں دیکھ سکتا''۔

شیطان مزے لے لے کر حاتم کی آنکھوں کو شہزادی کے ایک ایک عضو پر لے جا رہا تھا، گویا شیشے میں سے دکھا رہا ہو، شیطان کا لہجہ پرترغیب تھا۔

''سن حاتم! تو نے عمر عزیز دوسروں کے لیے بسر کر دی، تجھے کیا ملا؟ خاک دھول پسینہ؟ اور ذرا سی نیک نامی؟ بے معنی شہرت؟ تو نے آنکھوں سے اس لیے کانٹے چنے کہ نامرد اور نکما منیر شامی ثمر حسن سے کیف آگیں ہو؟ تجھے کیا ملے گا؟ مرحبا اور شاباش! تو شاد آفریں اور شاد باد جیسے مردہ لفظوں کی مالا بنا کر گلے میں پہن لینا جبکہ شہزادی کے ملائم بازو منیر شامی کے گلے کا ہار ہوں گے''۔

حاتم، شہزادی، منیر شامی بھی دھڑکن کی زد پر!

حاتم خود کو کسی طلسمی دوراہے پر ڈانوا ڈول محسوس کر رہا تھا، شہزادی کو مستقبل تیز آندھیوں میں چراغ کی مانند نظر آ رہا تھا جبکہ منیر شامی غیر مرئی دلدل میں نیچے نیچے اور نیچے۔

شیطان اپنے دلائل کا اثر دیکھ رہا تھا۔ اس نے آخری وار کیا، ''اور آخری بات سن! اے حاتم! منیر شامی کی نسل چلے گی، اب اس کی آل وارث تخت ہوگی۔ منیر شامی جیسے بزدل کو دیکھ اور خود کو بھی۔۔۔ تیری قوت تسخیر اور شہزادی کے حسن جہاں سوز سے بچے جنم لیں گے وہ جریدہ عالم پر اپنا، تیرا اور قبیلہ طے کا نام ثبت کر دیں گے اور منیر شامی! سن! اس کی رانوں میں تجھ ایسی قوت کہاں؟''

حاتم جیسے چکرا کر گرنے کو ہو۔ شہزادی نے اس کا ہاتھ تھام لیا، دوسرا ہاتھ منیر شامی نے دونوں کے گرم اور سرد لمس نے، حاتم کے اعصاب کو جھنجھوڑ ڈالا، اس نے جھرجھری لی فیصلہ کی گھڑی آن پہنچی تھی، فیصلہ اٹل تھا، کارکنان قضا و قدر بہت پہلے ہی حاتم کے لیے مہم جوئی اور منیر شامی کے لیے شہزادی لکھ چکے تھے۔ صاحب قول حاتم فیصلہ بدلنے کا مجاز نہ تھا، فیصلہ درست ثابت کرنے کے

لیے اسے باعمل ہونے کی اجازت تھی مگر عمل کا حاصل تبدیل نہ ہوسکتا تھا۔ فیصلہ انتخاب سے اور انتخاب بھی مقدر۔ لہٰذا خوشی خوشی بلا کسی جبر وکراہ کے اس نے دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دیئے۔ منیر شامی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے ویسے آنسو شہزادی کی آنکھوں میں بھی تھے۔

مرحبا! شادباد! شاباش! کے نعروں کی گونج میں شیطان ملعون بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

''احمق! احمق حاتم! بالکل پاگل اور بے وقوف۔۔۔عاقبت نااندیش حاتم!''

افق کے کنارے پر بیٹھے بادبان والی کشتی جیسا چاند۔ ہوا کا دست خنک حاتم کی پیشانی سہلا رہا تھا گویا نرم انگلیاں نرم لمس دے رہی ہوں منقش ستون کے ساتھ ٹیک لگائے حاتم کی آنکھوں میں نیند کسی طلسمی تحیر کی مانند تھی۔ نقرئی کٹورہ میں معطر آب خنک پیتا رہا مگر سکون نا آشنا رہا۔ یہ گرمی کی تشنگی ہے یا تشنگی کی گرمی؟ اپنا سینہ آتش فشاں کا سینہ محسوس ہو رہا تھا مگر اس فرق کے ساتھ کہ آتش فشاں کی آگ اور دھواں نظر بھی آتا ہے۔

حاتم نے بے بسی سے سوچا یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یہ سوچ کر لرز گیا کہ کہیں انجانے میں وہ کسی نادیدہ طلسم کا اسیر تو نہیں ہوگیا۔ گرم خون اور تنے عضلات والا جسم جیسے بتدریج پتھر میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ تو کیا حرکت وعمل کی زندہ تصویر اور مہم جو محض پتھر کا مجسمہ بن کر رہ جائے گا؟

اس نے خود کو جھنجھوڑ کر وسوسوں کے بھنور میں مزید ڈوبنے سے بچانے کی سعی کی۔

اگر چہ کامیاب مہم کی وجہ سے اس کا قلب طمانیت سے یوں معمور تھا جیسے پیالہ شراب سے۔۔۔مگر سوال کا درست جواب حاصل کر لینے کے بعد، انعام میں جو اعصابی سرشاری ملتی تھی اس مرتبہ خود کو اس سے محروم پا رہا تھا۔

گرم سینہ سے سرد آہ نکلی۔

کوہ ندا کی مہم کا احوال سننے کے بعد، جب شہزادی بازو پھیلائے، خود سپردگی کے اسلوب میں، بے نقاب ہوئی تو حاتم نے ایک نظر حسن پر ڈالی جو خود ہی اپنا محافظ تھا۔ حاتم کا دل دھڑکا کہ دھڑکن بھولا؟ احساس نہ تھا۔ نظریں گریں، اٹھیں، ٹھٹھکیں، بھٹکیں؟ خبر نہ تھی۔۔۔

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟

حاتم کی نظروں کے سامنے محل کا وہ حصہ تھا جہاں شہزادی اور منیر شامی شب باش تھے۔ پردے گرائے جا چکے تھے، مومی شمعیں گل کی جا چکی تھیں۔ شبستان ناز بھید بھری تاریکی میں اور حاتم کی نظریں نقب زن۔

منقش ستون سے سر لگائے وہ خوابیدہ تھا یا بیدار؟ علم نہ تھا۔ بس تھا۔ شاید وہ بھی نہ تھا، اس کا سایہ منقش ستون کی پرچھائیں بن چکا تھا۔ کون جانے؟

حاتم بستر پر ڈھے گیا۔ نیند گویا کسی طلسمی غار میں بند تھی جس کے باہر، دیو پلید کی صورت میں بخت نارسا پہرہ دار تھا۔ مگر وہ اس پر قوت دیو کو تسخیر کرنے والی قوت گنوا بیٹھا تھا۔

فجر کی اذان کے ساتھ اٹھ بیٹھا، سرد پانی سے وضو کیا تو شب بیداری کی کسل مندی میں کمی محسوس کی، خدا کے حضور سربسجود ہو کر دعا مانگی۔ سکون کی! طمانیت کی! طالب عفو ہوا ناکردہ گناہ کی خواہش سے، بے لگام سوچ سے۔ آوارہ خیالات سے، فاسد خواہشات سے۔ شہزادی اب منیر شامی کی ہو چکی ہے۔

لاحول پڑھ کر شیطان ملعون کو دور کیا مگر وہ ملعون تو گویا خون کی گردش میں شامل ہو گیا تھا، رگوں میں دوڑتا نعرے لگا رہا تھا۔

''احمق حاتم! احمق حاتم!''

حاتم سجدہ ہائے سہو کر رہا تھا۔ شیطان کے طعنے سے بغیر!

پر تعیش زینت حاتم کو خوش نہ آ رہی تھی!

خوش گلو مغنیہ کی موسیقی بہرے کانوں کی تان ثابت ہوئی، داروغہ مطبخ انواع و اقسام کے لذیذ کھانے تیار کرتا، مودب کنیزیں، وسیع دستر خوان پر، چاندی کے باسینوں میں خوش رنگ اور خوش ذائقہ پکوان چن دیتیں مگر حاتم خوش دلی سے نہ کھا پاتا، چند نوالے بے دلی سے لیتا اور ذائقہ کا احساس کیئے بغیر چباتا جاتا۔ دست سبک والی باندیاں، آب خنک و معطر سے غسل کراتیں، مشاق انگلیوں سے گدگدی کرتیں مگر ٹھنڈے پنڈے میں حرارت نہ پیدا کر پاتیں، جس پر وہ خود بھی حیرت زدہ تھیں۔ جب دیکھا آب خنک محض معطر پانی ہی ثابت ہو رہا ہے تو پانی میں ادویا ملا کر غسل شروع کر دیا مگر حاتم کا بت پھر بھی ٹھنڈا ہی رہا۔

رات کو انگاروں بھرے بستر پر، کباب سیخ کی مانند کروٹیں بدلتا، پہلو پہ پہلو بدلتا!

منیر شامی شبستان ناز سے برآمد نہ ہوا کہ آ کر حاتم کا حال دریافت کرتا۔

وہ وحشت زدہ سے محل سے نکل جاتا۔ جنگل کی راہ لیتا جہاں خرام ہوا سے شجر کلام کرتے۔ حاتم ویرانوں میں سکون کا گمشدہ دفینہ تلاش کرتا مگر افسوس حاصل کا!

مہمات سر کرنے والے حاتم کو اپنا جسم کسی طلسمی جال میں پھنسی مردہ مچھلی جیسا محسوس ہوتا، سخت کوش حاتم آرام کی زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ جب کرنے کو کچھ نہ رہا تو زندگی سے اچنبھا ختم ہو گیا۔ نادیدہ خطرات میں تحیر تھا جو محل کی زندگی میں عنقا ہو گیا۔ نہ جن بھوت، نہ پریاں اور چھل پائیاں، نہ طلسم کے کارخانے اور جادو کے شعلے، نہ مافوق الفطرت مخلوقات نہ خارق عادات واقعات۔ سورج نے وقت پر طلوع ہونا ہے، اتنی کنٹری پر کھانا اتنی گھڑیوں بعد رات کی آمد اور پھر مانوس کمرہ میں مانوس بستر۔ خواب راحت کی لذت سے عاری! شاید یہ سب غیر مرئی قفس میں قید کیا جا چکا ہے۔

یا مظہر العجائب!

وہ بے کسی سے سوچتا۔ کیا روئے عالم سے حسن جہاں سوز کی حامل شہزادیاں رخصت ہو گئیں کہ منیر شامیوں نے شیوۂ عشق ترک کیا؟ حاتم تو حاضر تھا مگر متجسس ذہن والی کوئی شہزادی نہ تھی جو سوالات کے جوابات کی متلاشی ہوتی۔ شرط وصل نہ سہی جذبہ تجسس کی تسکین کی خاطر، ذوق تحقیق کی تشفی کے لیے!

حاتم ہراساں ہو کر سوچتا جب زندگی میں سے سوالات ختم ہو جائیں تو کرنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ یہ سوال ہی تو ہے جو ذہن کو بیدار، روح کو مخبر اور بشر کو سرگرم عمل رکھتا ہے، سوال کے بغیر زندگی خالی برتن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

حاتم کی زندگی سوالات کے جوابات کی تلاش میں گزری تھی لہٰذا سوالات کے بغیر زندگی بے مقصد محسوس ہو رہی تھی اور پھر سوالوں کا ایک سوال۔ نہ جانے اب شہزادیوں کو سوال کی حاجت کیوں نہیں محسوس ہوتی؟ کیا واقعی وہ اتنی دانش مند ہو گئی ہیں کہ ہر سوال کا جواب جان چکی ہیں؟ اور سرائے عشق میں خاک اڑانے والے منیر شامی کہاں گم ہو گئے؟

اب حاتم کیا کرے؟ سوالات سے زندگی مشروط تھی، اب بنا سوال وہ کیسے زیست کرے؟

بیضوی قطع کا آئینہ جلی اسے گریزاں عمر کا احساس کراتا اور پھر سوال کرتا۔ ایسا سوال جس کا جواب حاتم کے پاس نہ تھا کہ یہ سوال عمر رائیگاں کے بارے میں نہیں بلکہ مستقبل کے بارے میں تھا۔

چندے یہی لیل و نہار رہے تو میں صحت مند سے مریض حاتم میں تبدیل ہو جاؤں گا۔ اسے وہ شہزادہ یاد آ رہا تھا جو ممنوعہ

کھونٹ میں آباد شہر سنگ میں، پیچھے مڑ کر دیکھنے کی پاداش میں پتھر کے مجسمہ میں تبدیل ہوگیا تھا اور حاتم بھی خود کو پتھریلا محسوس کر رہا تھا۔ گو جسم پتھر کا نہ تھا مگر اعصاب و احساسات کا بوجھل پن سنگی ہی تھا۔

وقت غسل کیونکہ کنیزوں کے گدگداتے ہاتھ جل میں جوالا جگانے میں ناکام رہے تھے اس لیے تنگ آ کر انہوں نے اسے پتھریلی نظروں سے غسل کرانا شروع کر دیا مگر خود میں گم حاتم کو تو اپنی سدھ بدھ نہ تھی کنیزوں کی نظروں کی سنگساری نے اس پر کیا اثر کرنا تھا۔

حاتم عالم بدمزگی میں، خود کو بہلانے کے لیے، دارالحکومت کی سیر کو نکل گیا، یونہی دل گرفتہ سا کوچہ و بازار میں بے مقصد گھومتا نہ دیکھنے والی آنکھوں سے افراد و اشیاء کو تکا کیا اور چلتا گیا تکان کے ہتھوڑے سے جسم کے پتھر توڑنے کے لیے، دارالحکومت میں سب اسے پہچانتے تھے لہٰذا احتراماً راستہ چھوڑ کر تعظیم دیتے مگر وہ یوں ہی بے خیالی میں سر ہلا دیتا، نرم کولہوں اور سخت چھاتیوں والی زن نا ہنجار نے معنی اسلوب میں کھانس کر اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا مگر حاتم گویا نابینا ہو چکا تھا۔

بے مقصد چلتے چلتے اس نے خود کو کارواں سرائے کے سامنے پایا جہاں اطراف و جوانب کے تجار اور سیاح دو روز دیک کے قیام پذیر تھے، سب کے جدا جدا لباس اور جدی جدی بولیاں۔ اونٹ، گھوڑے، خچر، گدھے، غلام، مردوں کا انبوہ کثیر، حاتم یوں ہی دیکھتا رہا، کسی خاص شے یا چہرہ پر نظریں ڈالے بغیر!

متحیر حاتم ٹھٹھکا۔۔۔ یا مظہر العجائب! کیا جانور؟ کیا انسان نہیں مگر انسان سے مشابہہ، پچکے گالوں اور اندر دھنسی زرد آنکھوں کے باعث وہ خاصہ معمر دکھائی دے رہا تھا۔ جس مرد کے کندھے پر دم لٹکائے بیٹھا تھا وہ بھی نرالی وضع کا سیاہ تن اور پرتک برہنہ، منڈے سر پر بالوں کی چھوٹی سی چوٹی لٹک رہی تھی، بالوں سے خالی سیاہ سینہ پر سفید دھاگہ لپٹا، منڈے سر کے نیچے پچکے گالوں پر گویا چمڑا منڈھ دیا گیا ہو، باریک لبوں پر، نیچے کو لٹکی مونچھیں، سوکھے بازوؤں پر رگوں کا جال اور مرجھائے ہاتھوں کے آرپار دیکھا جا سکے۔ پاؤں میں لکڑی کی عجب وضع کی جوتی۔ سیاہ ماتھے پر تین سفید لکیریں! حاتم اس کی جانب لپکا اور اپنائیت سے ہاتھ تھام کر اس کا احوال دریافت کیا۔ حاتم نے جیسے ہی اسے چھوا اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی معمولی انسان نہیں اور جب اس نے حاتم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو انکی آگ کی تاب نہ لا سکا۔ ایک دم لرز کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

حسن اتفاق سے وہ مرد حاتم کی زبان سمجھ سکتا تھا لہٰذا دونوں میں گفتگو شروع ہوگئی وہ بتا رہا تھا۔

''یہاں سے کئی سو سورج اور کئی سو چاند کی مسافت پر میرا دیس ہے۔ اہل دنیا اسے ہندوستان کے نام سے پکارتے ہیں''۔

حاتم نے اس ملک کا نام نہ سنا تھا مارے اشتیاق کے بولا'' کچھ اور بتاؤ اس کے بارے میں''۔

وہ بولا'' میرا دیس اتنا بڑا ہے کہ چلتے چلے جاؤ، چلتے جاؤ، میدانوں اور صحراؤں میں سے چلتے جاؤ، دریا عبور کرتے جاؤ پربت چڑھتے جاؤ مگر ملک ختم نہ ہوگا، ہمارا پوتر دریا گنگا ہے جو ہمارے مہان دیوتا شنو کی جٹاؤں سے نکلا ہے اس کے کنارے بڑے بڑے تیرتھ ہیں۔ گنگا جب پہاڑوں سے میدانوں میں اترتی ہے تو دو حصوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک گنگا اور ایک مندا کنی۔ میں مندا کنی کے کنارے، ایک مٹھ میں، اپنے گرو کے ساتھ رہتا ہوں۔ گیان دھیان اور پوجا پاٹھ میں مگن رہتا ہوں یہ میرے کندھے پر جو جناور ہے اور جو تجھ اجنبی کو دیکھ کر خاموش ہوگیا، میرا سنگی ہے، اگرچہ لوگ اسے بندر کہتے ہیں مگر ہمارے لیے یہ دیوتا مہان ہے۔ جے بجرنگ بلی!''

تب حاتم نے جانا یہ مرد بت پرست ہے۔ حاتم نے سوالات کی مہمات کے سلسلہ میں دنیا دیکھی تھی ہر وضع کے لوگوں سے ملا تھا اور یہ جان لیا تھا کہ تمام دنیا ویسی نہیں جیسی کے ہم عادی ہوتے ہیں۔ دنیا کا تنوع غیر مانوس اشیاء تحیر خیز واقعات اور اجنبی

افراد سے معمور ہے۔ بلکہ اسی میں اس کا اپنا پن مشہور ہے لہٰذا افراد، وقوعات، اشیاء، عجائبات کو اپنی فہم کی روشنی میں دیکھنے کی بجائے، انہیں ان کی اصل سمت تسلیم کر کے قبول کر کے، سمجھنا چاہے، سو بت پرستی کی وجہ سے تفور نہ ہوا۔ احترام سے ہاتھ تھام کر گویا ہوا۔

''میرے مہمان بن کر چنداں غریب خانہ پر قیام فرماؤ سفر کی کلفت دور کرو، مجھے خدمت کا موقع دو اور جب تک جی چاہے دل جمعی سے قیام کرو''۔

اس نے کچھ تامل کے بعد حاتم کی درخواست قبول کر لی، حاتم خوش خوش اسے لے آیا۔ ہر دم اس کی خدمت میں مستعد رہتا اور اس سے اس کے عجیب و غریب ملک کے بارے میں سوالات کرتا رہتا۔ کمال ہے! ایک دن حاتم نے عجب احساس سے سوچا، میں کہ سوالات کے جوابات تلاش کرتا تھا، آج خود سوالات کر رہا ہوں۔ تو کیا میری زندگی سوالات سے مشروط ہو چکی ہے؟ میں سوالوں کے جواب تلاش کرتا ہوں یا پھر جوابات کے لیے سوالات!

حاتم خوش تھا کہ اب وہ پژمردگی، بیزاری، اضمحلال اعصابی تھکن، دروں بین، مایوسی اور دل شکستگی کے حجرۂ ہفت بعد سے بچ نکلا تھا۔

ایک رات دونوں، زندگی، اس کی حقیقت اور اہمیت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، حاتم نے سوال کیا۔

''تمہارے مرشد نے زندگی کے بارے میں کیا بتایا ہے''۔

وہ بولا ''سن حاتم! یہ گیت ودیا ہے، بڑے بڑے بدھی مانوں اور ودوانوں نے اسے سمجھنے کے لیے عمریں بتا دیں مگر اس ساگر کا اور چھور نہ پا سکے لیکن اے حاتم! تو سوال کرتا ہے اور اسی لیے تو اچھا لگتا ہے کہ تو بھی ودیارتھی ہے تو شکشا چاہتا ہے، تو سمجھنا اور جاننا چاہتا ہے اور یہی ایک سچے شکشک کا کرتبے ہونا چاہیے''۔

حاتم نے انکساری سے سر جھکا کر کہا ''زندگی مختصر اور سوالات بہت زیادہ ہیں''۔

ہندوستانی نے انگلی اٹھا کر تصدیق کی پھر بولا۔

''میں کل ودیا تو نہیں دے سکتا البتہ تجھے اس کے کچھ رنگ بتاتا ہوں۔ ہمارے گن دانوں نے جیون کی بھاؤناؤں کے لیے رس ودیا دی ہے''۔

''اور رس کیا ہے؟'' حاتم نے سوال کیا۔

''پرتش اور استری کی بھاؤناؤں کو نو رسوں میں بانٹ دیا ہے''۔

''اور وہ نو۔۔۔؟''

''وہ ہیں'' ہندوستانی اسے سمجھا رہا تھا، عجب الفاظ، عجب مفہوم ''سن اے حاتم! وہ ہیں شرنگارا (محبت، جنس) شانتی (سکون) رودرا (غصہ) ویرا (شجاعت) اوبھاشا (استعجاب) ہنسیا (مزاح) کرونا (رحم دلی) بھیانکا (خوف) اور ردھ بھوتا (تحیر خیزی)۔

حاتم کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں۔

وہ بتا رہا تھا ''آکاش اور پرکاش، پرتھوی اور پراکرتی بیچ جو انیک رنگ دکھائی دیتے ہیں، سب اسی کارن ہیں، ان سے باہر کچھ نہیں''۔

''اور اگر ہو تو۔۔۔؟''

''مایا ہے''۔

حاتم کچھ دیر تک سر جھکائے اس گن دانوں کی باتوں پر غور کرتا رہا، پھر سوال کیا ''یہ رس اور ان کے نوروپ مگران کا کوئی مرکز یا بنیاد بھی تو ہوگی وہ کیا ہے؟''

ہندوستانی نے توصیفی **نظروں** سے دیکھتے ہوئے کہا ''جے ہو! تو واقعی بدھی مان ہے، جس سوال **تک** پہنچنے میں مجھے **یگ بیت** گئے تو چند چھنوں میں وہاں پہنچ گیا''۔

تعریف سے خوش ہونے کے بجائے حاتم سنجیدہ **نظر** آ رہا تھا۔

ہندوستانی نے سر جھکالیا، اس کے نکلے سر پر **پسینہ** کی بوندیں چمک رہی تھیں، **ایک** دو مرتبہ بے چینی سے سر کی چوٹی کو چھوا، اس کی آنکھوں میں تشویش تھی یا جھجک؟ وہ خوفزدہ تھا کہ ہیجان زدہ، حاتم اسے عجب **نظروں** سے **تک** رہا تھا۔

ہندوستانی جب بولا تو بہت ہی دھیمی آواز میں گویا ہوا، کہیں دور سے، سرگوشی آ رہی ہو۔

''میں دبدھے میں ہوں۔ وہ رکا گویا بھاگتا سانس لینے کو رکے ''بہتر ہوتا میں نے کچھ نہ کہا ہوتا نہ تم نے کچھ سنا ہوتا، اچھا ہوتا تیرے گھر نہ آتا، بہت ہی اچھا ہوتا، میں اس کھونٹ آیا ہی نہ ہوتا'' وہ پھر رکا، گویا سینہ میں سانس بھر کر غوطہ لگانے کو ہو''۔ ہونی ہو کر رہتی۔ کیسی چنتا اور کیسی دبدھا'' حاتم کو اس کی جلتی آنکھیں **اعصاب** سلگاتی محسوس ہو رہی تھیں وہ کہہ رہا تھا۔

''نہیں حاتم! میرے گرو نے مجھے بتایا اور میرے گرو کو اس کے گرو نے بتایا۔۔۔اور میں تجھے بتا رہا ہوں **اصل طاقت** جیون جل میں ہے''۔

حاتم نے یہ **نیا** لفظ سنا بلکہ اس غیر ملکی سے گفتگو کے دوران اس نے بہت سے نئے الفاظ سنے تھے، کچھ کے معنی بوجھے تو کچھ کے پوچھے ''یہ۔۔۔یہ جیون جل کیا ہے''۔

تمہاری بھاشا میں ایک شبد ہے آب حیات، جیون دینے والا پانی، مرتیو سے مکت کرنے والا''۔

''ہے تو، مگر اس کا جیون جل سے کیا تعلق؟''

''غور نہیں کیا حاتم'' وہ پرجوش لہجہ میں بولا ''غور کرو، ہماری بھاشا میں یہی جیون جل ہے''۔

''اوہ! حاتم بولا، یہ تو نئی مہم شروع ہوگئی''۔

''نہیں''۔

''کیوں نہیں''۔

''اس لیے کہ ہر جیو کے پاس جیون جل ہے''۔

''مگر۔۔۔''

''وہ حاتم کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولا ''جب پرش اور استری بھوگ کرتے ہیں تو دونوں بیچ جو فوارہ اچھلتا ہے وہی جیون جل ہے''۔

وہ حاتم کی سنے بغیر اپنی دھن میں مست بولے جا رہا تھا ''یہی جیون جل منش کو پھر جنم دیتا ہے مگر اولاد کی صورت میں۔ مرنے کے بعد تم زندہ رہو گے مگر اپنی سنتان کے روپ میں۔ یہ ہے جیون جل، جیون شکتی کا اٹل کارن۔۔۔اس لیے ہم شیولنگ پوجتے ہیں''۔

پھر **نیا** لفظ **مگر** حاتم نے اسے نہ ٹوکا جو اپنی رو میں بہے جا رہا تھا۔

''جیون کی طرح یہ گیان دھیان کا بھی کارن ہے، اس سے کون کس طرح کا کام لیتا ہے اسی سے جیون کتھا میں رنگ بھرا

جاتا ہے یہی تانترک ودیا ہے''۔ دونوں خاموش تھے، بار نے حاتم سے سوال کیا۔

''اے مرد دانا! یہ بتا، تیری نسل میرا مطلب تیری سنتان تو بہت ہوگئی''۔

وہ پھیکی ہنسی ہنسا ''یہ آخری بھید ہے حاتم! گیان دھیان کی ڈگر پر چلنے والوں کو یہ سب تیاگ کرنا پڑتا ہے''۔

''یعنی ۔۔۔؟''

''یہ انمول شکتی یوں ہی استری پر ضائع نہیں کی جا سکتی، اس کی رکھشا کرنی ہوتی ہے''۔

''تو؟''

''ہاں! اے حاتم ہم سب سے پہلے اسی کی بلی دیتے ہیں''۔

باہر رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ اندر خاموشی کی چادر میں لپٹے وہ دونوں خاموش، آلتی پالتی مارے، اپنے آپ میں گم۔

تب حاتم کے سینہ سے سرد آہ نکلی۔ تو کیا میری زیست کارزیاں میں رائیگاں گئی، اس نے خود سے آخری سوال کیا۔

جواب میں ہوا خاموش!

☆☆☆

بدلے کے نرت بھاؤ

سمیع آہوجا

سائیں سے سانچار ہو بندے سے ست بھاؤ
چاہے لمبے کیس رکھ چاہے گھوٹ منڈاؤ

بارک اللہ، شکر ہے کہ آپ خود ہی مجھ سے بھی دو قدم آگے اس سعی میں لگے ہوئے ہیں کہ واقعات کے ڈھیر کی بوسیدگی جب بو چھوڑے اور سب کو بیگانگی کا جبہ اڑھنے کو بانٹے، تو۔۔۔؟

اور بے حسی کی اذیتوں کے شکار نفوس اسے دفنانے میں جت جائیں، تو۔۔۔؟

ایسے سوال تو الجھن میں ہمیں ڈالے بیٹھے ہیں۔ مگر آپ۔۔۔۔؟

آپ سمجھ بوجھ کی انگلی تھامے ہم سے آگے نکل آئے اور اس دفینے کی کرید میں جت گئے۔ اب ہماری بھی سنیے کہ ہمارے ہتھے کیا لگا۔۔۔؟

یہ جو ہے نا الہ آباد۔۔۔؟

وہی جہاں گنگا میا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے وہیں قریب میں یہ ہمارے بل بہادر بھیا جو اپنے نقش و نگار سے گورکھا لگتے ہیں اور ان کا نام کالنگا کے ایک جنگجو کے نام پر رکھا گیا تھا۔ گورکھا جنرل امر سنگھ شکست پر فرنگیوں کے ساتھ معاہدہ سگولی ہوا تو سکم خالی کر دیا گیا اور ساتھ ہی دریائے کالی کے مغربی چوکھٹے میں گڑھوال اور کمایوں کے علاقے انگریزوں نے فتح کے شگون میں اپنے مقبوضہ جات کے دفتری مقبرے میں چڑھاوے کا فلیگ لگا کر فائل تو بند کر ڈالی مگر مقامی آبادی جو دراصل اسی زمین کے بیٹے تھے، ان کے ساتھ کیا حشر ہوا۔ بس لوٹ کھسوٹ اور قدموں تلے بچھانے کی انگیخت ان لکھی رہ گئی۔۔۔۔

ہمارے بل بہادر کے دادا مشہور گورکھا کاشتکار، گڑھوال میں ان کی زرعی زمینیں تھیں، مگر ان کی کاشتکاری کی شہرت ہی انہیں ڈس گئی۔ جب معاہدے میں علاقہ فرنگیوں کے ہتھے لگا تو کاشتکاروں پر ظلم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، امر سنگھ گورکھا جنرل کی معاونت کے نام پر تمام گورکھا آبادی کو اپنے پاؤں کے نیچے خوف سے تڑپتے رکھنے کے لیے پندرہ کاشتکاروں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ لیکن بل بہادر کی فیملی کے ساتھ دیگر لرزیدہ خاندانوں سے پیسہ بٹورنے کے لیے جرمانے کا حصاری بوجھ ان سب کی پشت پر باندھا گیا۔ اور سرگوشیوں میں بات پھیلا دی گئی کہ جان جرمانے پر چھوٹ گئی۔ مگر اس فرنگی جرمانے پر ہی دادا کا دل فرنگی رویئے سے کھٹا ہو گیا، اور اسی پر سوچ لگ گئی کہ اب جائیں کہاں۔ بڑی بڑی فکر اور ادراک کے بعد اپنے ایک عزیز کے بلاوے پر سب کچھ سمیٹ سمٹ سنگم پہنچے اور تھوڑی بہت جتنی بھی مالی حیثیت تھی عزیز داروں کی سفارش سے زمیندار سے زمین خریدی اور سر جھکائے کام دھندے پر لگ پڑے۔ مگر ابھی گندم کی پہلی فصل کاٹی تھی کہ نجانے کس نے فرنگی سرکار سے مراعات حاصل کرنے کے لیے اس کے دادا کو جنرل امر سنگھ کا مخبر بنا ڈالا۔ اتنی سی خبر اور کوئی تفتیشی بیٹھک نہ ہوئی اور شکایت اور جرم کا گھر بیٹھے فیصلہ اور اس پر دفعات لگا کر معاملات کو پس پشت ڈال دیا اور بل بہادر کے دادا اور باپ کو جیل میں سڑنے کے لیے ڈالتے ہوئے زمین اور گھربار کا سارا سامان بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ پانچ سالہ بل بہادر اور سکتے میں مقید ماں کو سپاہیوں نے دھکیل کر باہر سڑک پر بٹھا دیا۔ روتے بلکتے بل بہادر کچھ نہ سمجھتے ہوئے روتی سسکتی ماں سے لپٹ گیا۔ اور اس کی گود میں بیٹھتے ہی سسکیاں لیتی ہوئی ماں کے زاروقطار رونے کی آواز نے اس کی اپنی

ہچکیوں پر روک کھڑی کر دی۔ ماں کے دونوں رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو ننھی ننھی انگلیوں اور ہتھیلی سے پونچھتے پچکارتے کمشنر کی بیوی نے اسے دیکھا تو بنا چھت دیہاتی عورت کی بے کسی اور لاچاری پر اس کا دل بھر آیا۔اور۔۔۔؟

اور وہ اپنے شوہر پر غرا اٹھی۔۔۔!

بچے کے دادا اور باپ کی غداری کے جرم کی سزا ان دونوں ب کو ملے یا نہ ملے، لیکن۔۔۔!

ان کی سزا میں اس بچے اور اس کی جاہل ماں کو کیوں لپیٹتے ہو۔۔؟

اور ان ہی قدموں پر وہ دونوں کو اپنے بنگلے میں لے گئی۔اور سرونٹ کوارٹرز میں سے ایک خالی کوارٹر میں اسے رہائش دیتے ہوئے، اسے اپنے بنگلے کے جھاڑو پوچے پر ملازم رکھنے کی نوید بھی دے دی۔ کمشنر کی بیوی کے کہنے پر ہی اس نے بل بہادر کو چرچ کے مشنری سکول میں جانے کی اجازت دے دی۔ ابھی چرچ سکول جاتے پانچواں دن ہی ہوا تھا، کہ سکول سے واپسی پر میم صاحب کے کچن سے آیا ہوا دوپہر کا کھانا جو ماں ڈھانپ کر بنگلے میں چلی گئی تھی، وہی کھانا کھانے کے بعد وہ چارپائی پر لیٹا ہی تھا۔گراؤنڈ سے کسی کے بھڑ پڑنے کی غراہٹیں آنے لگیں۔ بے وقت اصطبل کا انچارج اور گھوڑوں کا ٹرینر مختار اونچی اونچی آواز میں کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔وہ الماتے کا باشندہ اور سارے قزاقستان کا مانا ہوا گھڑ سوار تھا۔کمشنر ہاؤس کے اصطبل سے ملی ہوئی کافی بڑی گراؤنڈ تھی، وہ بھی اسی کی تحویل میں تھی۔ جہاں صبح کا دودھیا سویرا پھیلتا تو گھوڑے دوڑنے کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھل جاتی مگر وہ کروٹ بدل کر پھر سو جاتا۔سورج کے نکلتے ہی تمام ملازمین گھوڑوں کی باگیں پکڑے، پیدل چلتے ہوئے دونوں ہی پسینے سے شرابور، اصطبل کی جانب جاتے نظر آتے۔لیکن اس کے اسکول جانے سے لے کر تیسرے پہر تک گراؤنڈ میں سناٹا چھایا رہتا شام کو اصطبل کے ملازم پھر باگیں پکڑے گھوڑوں کو میدان کے کنارے کنارے گھماتے چکر کھلاتے رہتے اور ملگجی اندھیرا اترنے کے ساتھ ہی وہ پھر اصطبل کو لوٹ جاتے۔ لیکن گراؤنڈ میں اونچی آواز میں ڈانٹنے کی آواز پہلی بار حملہ آوروں کی طرح شور و غل کے طوفانوں کی مانند چھپٹی تھی۔ وہی اسے بیتاب کرتے کھینچ کر کوارٹروں کے پچھواڑے لے گئی۔سرونٹ کوارٹروں کے پیچھے صفائی کرنے والے عملے پر وہ بری طرح برس رہا تھا۔اور وہ چپ، اندر سے ہراساں، مگر ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔اور جیسے ہی صفائی کا عملہ اس کے اختتامی جملے پر بکھر کر دوڑنے لگا تو وہ ایک لحہ تو انہیں اپنے صفائی کرنے والے ڈیوٹی گوشوں کی طرف لپکتا تکتا رہا۔اور پھر چہرا اس کی طرف گھمایا، اور اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

بل بہادر، کیوں پریشان کھڑے ہو۔۔۔؟

میں۔۔۔!

اور کوارٹروں کی طرف گھومتے ہی ہاتھ کا اشارہ بھی اٹھ گیا۔۔۔!

میں وہاں رہتا ہوں۔۔۔!

جی جی مجھے پتہ ہے میرے لاڈلے شہزادے، آپ میرے کوارٹر سے چوتھے کوارٹر میں رہتے ہیں اور آپ چرچ سکول میں پڑھتے ہیں۔اگر آپ کو گھوڑے پر بیٹھنے اور دوڑانے کا کبھی شوق ہو تو تیسرے پہر شام کو اصطبل میں آجائے گا۔میرے پاس پست قامت گھوڑوں کی ایک جوڑی ہے۔۔۔!

آپ کو گھڑ سواری میں سکھا دوں گا۔

جی اچھا۔۔۔!

اور ساتھ ہی وہ کوارٹر کی طرف سٹک لیا۔۔۔

اور چرچ کی آخری جماعت ایف اے کے تقریباً مساوی، وہ مختار سے بلاناغہ گھڑ سواری اور گھوڑوں کی پہچان اور تربیت

پر بھی عبور حاصل کر گیا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے وہ تصویریں کبھی اوجھل نہ ہوئیں۔ کہ جب وہ باپ دادا کے گھٹنوں کے بل دوڑ دوڑ کر ان کے ساتھ کھیتوں میں جایا کرتا تھا، اسی زمانے میں کیسے وہ گڑھوال، اپنے بھرپرے مکان کو چھوڑ کر نکلے، وہاں ابھی تو کھیتوں میں فصل نے گھٹنوں برابر قد نکالا تھا مگر وہ سب کچھ اک جبر کے بل چھوٹنا، اور بے اماں چھپتے چھپاتے، دماغ چاٹتی، بے وطنی کو ہونکتی زخم چھچھتی، یاسیت تراشتی آوارگی۔ اور واجبی سا گھریلو سامان لدے دوٹٹو اور دو گھوڑوں پر سوار نکلے، ایک گھوڑے پر دادا اور ان کی گود میں سمٹا ہوا وہ، اور دوجے گھوڑے پر ماں باپ، وہ خوف اور حیرت کے ملغوبے سے اٹی آنکھوں کے بل انہیں تکے جا رہا تھا کہ ان تینوں کے چہرے بے بسی اور پریشانی سے اٹے، اور آنکھیں ویران اور خشک اور۔۔۔!

اور پپڑیاں جے ہونٹوں پر چپ کی مہر۔۔۔

اور اصطبل میں اترا تو اس کے اندر وہی پرانی بے بسی اور ویرانی میں لپٹی غیر محفوظ ہونے کی بے اعتباری پوری طرح مسلط تھی اور چھرا ہوتی۔ مگر استاد مختار کے وجود سے اٹھتی مہاجرت کی پوری اندوہناک افسردگی بھی جب یہی کچھ ابلتی اس کے کانوں میں اتری تھی۔ تو سنگم میں ضبط ہونے والا گھربار، بیج بونے کے لیے تیار کھیتیوں کا چھننا، اور باپ اور دادا کی زندگی مانگتی ماں کی پژمردہ خوابوں میں بلبلاتے تڑپتے چہرے سے ٹپکتے آنسو۔ اور پھر ان دونوں کی یعنی باپ اور دادا کی مخبری کے الزام پر سولی پر لٹکتی لاشیں، وہ سب تڑپاتا ہوا درد، استاد کی مہاجرت کی شدید اندوہناک تنہائی سنتے، دیکھتے، سب خلش اور جلن سے رستے کچے زخموں پر انگور آنے لگا۔۔۔؟

استاد مختار کی تو ماں بھی نہیں، اور وہ کتنا پرسکون ہے اور میں۔۔۔؟

میں۔۔۔؟

کتنا بے چین اور دکھی، جبکہ میری ماں بھی ہے۔۔۔!

وہ سب کچھ دھیرے دھیرے اندر ہی اندر نفرت اور انتقام کی چنگاری کو بھڑکتے الاؤ کی خونخواری میں ڈھالتے، اسی میں سارے قضیے کے مجرم فرنگیوں کو راکھ کرنے کو بیتاب۔ مگر۔۔۔؟

شاید اس کے وجود میں مختار کی گھوڑوں کی تربیت کمال نے اس کے آہن کو سرخ ہونے اور ڈھالنے میں ایسی چابک دستی عنایت کی کہ اندر ہی اندر صبر اور سہج کا بر ستا بادل بن گئی۔ بے قابو جنگلی گھوڑے کو ہاتھوں کی خوشبو، گردن پر پیار اور ڈیلتی تھپکی، منہ زوری کے منہ میں لگام ڈالنے اور پھر اس لمحے کا بڑے سکون سے انتظار، اور ٹریز کی نموداری پر وہی گھوڑا ہنہنا اٹھے، اور راسیں پکڑے اک لمبے عرصے تک لمبی دوڑ۔ اس ساری مدت میں گھوڑے کو کبھی بھی باندھ کر نہ پیٹنے کی ہدایت اس کے خون میں رچ گئی۔ گھوڑا بندے کے اندر پھیلی یاسیت کو چوستے اک محبت، آرزو، اور خواہش کو اتنا جوان کر دیتا ہے کہ اس گھوڑے اور ٹریز کے اپنے اندر سے اٹھتی وفاداری باہم ایک خوشبو کی طرح روئیں روئیں میں جوان ہوتی چلی جاتی ہے اور سارے طوفانوں سے ٹکرانے کی صلاحیت اک سد کی طرح اندر پیوست ہو جاتی ہے۔ اور اسی فرمانبرداری اور محبت کی صلاحیت کی بدولت اندر کی نشوونما پاتی فہم اور اک نے اسے دشمن کی پہچان کرادی اور وہ ذہن کی سکرین پر پھیلی اپنے آبا اجداد کے کشت وخون کی کشیدہ تصاویر کو، باوجود کوشش کے مدہم نہ کر سکا۔ مگر زک دینے کی آگ ضرور روشن رہی، کہ یہ لمحہ کبھی بھی آ سکتا ہے، اور مختار اس پر ہی بے پناہ خوش۔۔۔

چرچ کے امتحانات سے فارغ ہوتے اور نتیجہ کے اعلان میں قابل تحسین پوزیشن لینے پر اور مختار کی سفارش اور کمشنر جیکسن کے بعد آنے والے کمشنر کی آنکھوں میں دوڑتی گھڑ دوڑ میں اس کی مہارت نے اسے اصطبل میں ہی مختار کا نائب بنا دیا۔ اور اس خطے کی فتح کی سالگرہ پر پریڈ کے دوران اس کی گھڑ سواری کی مہارت اور مختلف انداز کی کلاکی رونمائی سے تمام مہمان پہلے لمحوں میں ہی دم بخود اور پھر ختم ہونے پر بے ساختہ تالیوں سے اس کو داد دی۔ اور کافی انعامات بھی ملے۔ ماں کو جیسے ہی اس نے تمام

انعامات دکھائے تو قہر سے اس کا چہرہ سرخ، حلق سے پھوٹتی خرخراہٹ جو لمحوں میں ہی پلٹی اور بھاری غراتی آواز کاٹنے کو بیتاب دھار میں پلٹ گئی، اس کا لرزاں ہاتھ اٹھا اور انگلی نے سینے کا نشانہ لے لیا۔ بل نے فوراً ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور چوم لیا۔ مگر وہ یک دم بل بہادر کی ماں سے، اس کے سولی پر لٹکے باپ کی بیوی بن گئی۔ اس کی آنکھیں بنجر، بے آباد۔ جس کے ریگزاروں سے امنڈتے بگولے قہرمانی خون سے مشروط۔۔۔۔

کیا تم اپنے اجداد کی خون میں لت پت لاشیں گم کر بیٹھے ہو۔۔۔؟

کیا گدھوں، چیلوں اور کوؤں سے نُچتی، باپ اور دادا کی سولی پر لٹکی لاشیں، ان انعاموں کے بوجھ تلے مسخر ہو چکیں۔۔۔؟

نہیں نہیں ماں، نہیں۔۔۔

میرے وجود کی پرورش ان کے آگے کاسہ لیسی کے لیے جوان نہیں ہوئی، میں تو وہ طلایہ ہوں جو بھیڑیوں اور کتوں کے بھونکتے انبوہ میں گھرا ہوا ہوں، اور ان کے مالک کی تلاش میں ہوں، جس کے لیے میں اک میٹھا پیکانی تیروں کا ہوں جو۔۔۔؟

ابھی تو ماں۔۔۔!

اور اک لمبی سلگتی انگار سانس نے اگلا جملہ اگل دیا۔۔۔؟

ماں ابھی تو یہ ابتدائی ہدف ملا ہے، جس کی تلاش ناممکن تھی۔ ابھی تو۔۔۔؟؟

ماں میں انہیں کیسے بھول سکتا ہوں، اور تو۔۔۔؟؟

اور اتنا سنتے ہی ماں نے اک لمبا اطمینان بھرا سانس لیا اور ساتھ ہی اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت سے ماں کا بیدم ہاتھ پھسل کر نکلا اور چارپائی پر جا گرا۔۔۔

ماں اس کی آنکھوں اور ہاتھوں سے نکل کر بادلوں سے اوپر چلی گئی۔ اور نمناک تصور میں لرزاں، بے بسی میں جھلملاتی تصویروں میں وہ اسے باپ کی باہوں کے کلاوے میں اس کے کندھے پر سر ٹکائے، بل بہادر کو تکتے اپنی کتھا گنگنا رہی تھی اور وہ۔۔۔؟

وہ اب اپنی روک ٹوک کے سارے دروازے کھلے دیکھ کر گھوڑوں کے ساتھ پوری امنگ سے جت گیا۔۔۔!

جب اسے چرچ سکول میں جاتے تیسرا برس شروع ہی ہوا تھا تو کمشنر نجانے کیوں اچانک انگلینڈ اپنی فیملی کے ساتھ روانہ ہو گیا شاید بچی کے سلسلے میں کوئی مسئلہ درپیش ہوا ہوگا۔ جو بچپن ہی سے اپنے ننھیال کی زیر نگرانی ایک سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں پڑھنے کے لیے داخل تھی۔ مگر جب وہ بل بہادر کی ماں کے مرنے کے بعد سالانہ پریڈ پر اپنی بیٹی کے ساتھ آیا تو مختار اور بل بہادر سے ملاتے ہوئے دونوں کی گھڑ سواری اور کلا کی تعریف کی۔ اس نے بے ساختہ بیٹی سے میم صاحبہ کا پوچھا تو وہ چند لمحوں کے لیے آزردہ اور خاموش ہو گئی اور کمشنر نے بیوی کے انتقال کا وقفہ سال بھر پرانا ہی بتایا، اس کی ماں کے قریب قریب ہی۔۔۔۔

پریڈ کی سلامی دیتے ہوئے دستے گزر گئے تو آخیر میں گھڑ سوار دستے کے بعد وہ دونوں بھی سلامی دیتے ہوئے گذرنے لگے تو مہمانوں کی طرف سے اک غوغا بلند ہو گیا کہ وہ اپنی گھڑ کلا کو بھی اسی پریڈ کا حصہ بنائیں۔ دونوں نے اک دوجے کی آنکھوں میں افہام و تفہیم میں رچے نقشے اتارے۔ اور وہ سلامی والے سٹیج کے روبرو بالکل آخری کنارے پر جا کر رک گیا تو مختار اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس کے روبرو، سلامی سٹیج کے عین سامنے، اک جلتی ہوئی مشعل نیلگوں گردوں میں اچھالی اور سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی اس کا گھوڑا ہنہناتا ہوا پچھلی ٹانگوں پر بلند ہوا، اور سرپٹ سلامی کے چبوترے کی طرف نکل پڑا۔ بل بہادر بار بار ایک رکاب پر اترتا اور اچھل کر دوجی رکاب میں دوجے پاؤں کے بل دوجے پہلو میں جا بیٹھتا اور پھر واپسی پہلے پہلو پر۔ اسی طرح پہلو اور رکاب بدلتے وہ نیچے اترتی مشعل کے نیچے پہنچا تو اسی تیزی سے وہ دونوں پاؤں کاٹھی پر جمائے کھڑا ہوا اور پلک جھپکتے ہی مشعل اس کے

ہاتھ کی گرفت میں آ گئی ۔اور میدان مختلف نعروں اور تالیوں سے گونجنے لگا۔لیکن وہ اسی تیزی سے مشعل کو لیے مختار کی طرف بڑھا اور مشعل کو اس کے روبرو گردوں کی دیگ میں اچھالتے پھر پلٹا اور اسی رفتار سے گھوڑا سلامی کے چبوترے کے روبرو ٹانگیں اٹھا کر ہنہناتا، پھر پلٹا اور بل بہادر کے اشارے پر مختار کی طرف لپکنے لگا۔مشعل کی واپسی اور گھوڑے میں فاصلے کے موجب سب ششدر اور ایکا ایکی چہ مگوئیوں کا اک ریلا امنڈا کہ مشعل اب کی بار اس کے ہاتھ نہیں آ ئے گی ۔مگر جو سرپٹ گھوڑے کی کمر سے نیچے اترتی دیکھی گئی مگر کسی نے بل بہادر کو ایک ہی رکاب میں تقریباً سر کے بل گراؤنڈ کے متوازی ہوتے اور مشعل پکڑتے ہی چھلانگ لگائی اور سرپٹ دوڑتے گھوڑے کی زین پر دوبارہ پہنچتے ہی جم گیا۔ان سارے ثانیوں میں گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی رفتار میں ایک لمحے کا بھی توقف نہیں آیا اور گراؤنڈ حاضرین، جس میں شریک مہمانوں کے علاوہ پریڈ میں شامل سارے دستوں کے ستائشی شور سے بھر گیا۔ پریڈ کمانڈنٹ، کمشنر اور اس کا سٹاف اور لنڈن سے لوٹا پرانا کمشنر سب ہی سلامی سٹیج سے گراؤنڈ میں اتر آ ئے،اور ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ مگر وہ اسی رفتار سے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے گھڑسواروں کے دستے کی طرف نکل گیا۔اور آناً فاناً اک پچھلے سوار کو اس کے گھوڑے کی پشت سے اٹھایا اور بغل میں دابے سلامی کے چبوترے سے نیچے اترے بنا،سب افسران کے سامنے بڑی آہستگی سے اسے کھڑا کرتے گھوڑے کو ایک چکر دیتے اس کو ویسی رفتار پر لاتے پھر واپس گھڑسوار دستے کے کھڑے ہونق نوجوان کی بغل میں اسے گھوڑے سے اتر کر کمانڈنٹ کو سلوٹ کیا تو داد اور شوروغل میں ہی وہ گھڑسوار نوجوان کی چھاتی سے لپٹ گیا اور بے خبری میں اسے گھوڑے سے اٹھا لینے کی معافی مانگی جو بہت ہی دل خوشی سے مل گئی ۔مگر بار بار سوال اٹھایا گیا کہ اتنی تیز رفتار میں اس جوان کو زین سے کیسے اٹھایا آخر کو کچھ تو اس کا وزن تھا ہی،اور اپنی بغل میں بھینچ کر سلامی کے چبوترے کے سامنے کتنی احتیاط سے کھڑا کیا۔۔۔!

یہ سب کچھ کیا تو تم نے ہی کیا اور ہماری آنکھوں کے روبرو کیا،مگر۔۔۔۔؟

مگر کیسے کیا۔۔۔؟

میرا تو کچھ بھی کمال نہیں ، یہ تو استاد مختار کا کمال ہے۔کمانڈنٹ اگر اجازت دیتے تو اور بھی بہت کچھ دکھاتے ،مگر انہوں نے موقع ہی نہ دیا۔۔۔!

مگر پشت سے کندھے کو کمانڈنٹ نے تھپکی دی۔۔۔

بل بہادر تم نے دونوں آخری آئٹم اتنی خوف ناک پیش کیں کہ ہم تمہیں درمیانی آئٹم پر ہی دفنا چکے تھے۔سوچو کہ اگر ایک لمحہ بھی دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا۔اور دوجے گھڑسوار کے نوجوان کو تم نے اس کی بے خبری میں زین سے کھینچا اور اپنے ہم وزن کو بغل میں بجلی کی طرح سرپٹ دوڑتے گھوڑے پر لیا اور نہایت ہی حفاظت سے سٹیج کے سامنے لا اتارا۔اس میں تمہاری، گھڑسوار نوجوان کی اور کسی حد تک تیز رفتار گھوڑے کی بھی موت واقع ہو سکتی تھی۔تمام مہمان تو تمہاری چابک دستی کی داد دیتے تھکتے نہیں۔اب آئندہ ایسا دل دہلانے والا آئٹم مت پیش کرنا۔۔۔

اور گھوڑے کی لگام تھامے پیدل ہی مختار کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اچانک لنڈن سے آئی ہوئی سابقہ کمشنر کی بیٹی راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور اسے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔۔۔!

بل بہادر، آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھو میں؟

میں شیلا جیکسن۔۔۔!

تم پر قربان، آج تو تم نے کمال کر دیا۔میں نے زندگی میں ایسے ناممکن اور شاندار کرتب گھڑسواروں میں نہیں دیکھے۔کیا تم مجھے بھی بے خبری میں گھڑسوار نوجوان کی طرح اٹھا کر بغل میں دابے،گھوڑے کی اسی رفتار سے پورے میدان کا چکر لگا سکتے ہو۔۔۔؟

اور وہ چند دقیقے اس کی آنکھوں میں اترے، سوال پر سوال کرتے، اس کا منہ چوم گئی، شرم سے بہادر کا چہرہ سرخ ہو گیا، تھوک سے خشک حلق کو تر کرتے، اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں کے شکنجے سے چھڑاتے ہوئے، گرد و نواح کے مجمع کو لوٹتے، اس پر سرسری نگاہیں پھینکتے باتوں میں الجھے دیکھتے ہی، ایک چھوٹے سے توقف کے بعد مسکرایا۔۔۔!

مس شیلا جیکسن، میں آپ کو نہیں اٹھا سکتا۔۔۔!

کیوں، کیوں، کیوں۔۔۔؟

آپ بہت وزنی ہیں۔۔۔!

کیا۔۔۔؟

جی ہاں، آپ۔۔۔!

میں۔۔۔؟

اور وہ اپنے مناسب سراپے پر ہاتھ پھیرتے جب تک اس کی جانب متوجہ ہوئی وہ آہستہ روی سے گھوڑے کے ساتھ دوڑتا مختار کی طرف بڑھ گیا۔

مختار نے شیلا کو اس کے گھوڑے کی لگام پکڑتے، اسے روکتے اور چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں سارے وجود کی بہت ہی دھیمی لرزش میں اسے رنگتے، باتیں کرتے، اسیری کا پھینکا جاتا جال اس پر گرتے دیکھا تھا۔ گھوڑے کی لگام اس سے لیتے آہستہ سے آزادی میں رنگے قزاقی گیت گنگنایا اور سینے کے پھیلاؤ سے نکلتے ٹھٹھے نے اس کے قدموں کو زنجیر کیا۔

کیوں چھوڑ دیا اس کو، لے جاتے اور کچھ دنوں کا مہمان بنا ڈالتے۔

بل بہادر نے اسے دیکھا اور مسکراتے جواب دیئے بنا ہی، اس کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور مختار کے ساتھ اصطبل کی جانب قدم مارتا ہوا چل پڑا۔۔۔!

رات بھر خواب میں گھوڑے کی راس پکڑے شیلا کا سوال امنڈتا رہا اور ساتھ ہی مختار کے قزاقی گیت کی گنگناہٹ کے بیچ سے اس کی شوخی بھری مسکراہٹ آنکھوں میں اترتی، اور اس کے سوال کی انگلیاں چھیڑتی، گدگدی کرتی، شیلا کا گھوڑے پر سوار سراپا روبرو کرتے کداتے گھوڑے پر سے جھک کر اسے اٹھاتے بغل گیر کرتے چومتے پوچھتی کیا مجھے بھی تم میری طرح اٹھا سکتے ہو؟

اور وہ کلاوے سے نکلتے، اس کے بھاری ہونے کا ورد اس کے دوڑتے دور ہوتے قدموں کے سنگ، گنبد چرخ کو اپنے آہنگ سے بھرتا رہا۔ اور وہ گھوڑے کو دلکی چلاتے اس کی تعاقب میں کہ؟

اس کی آنکھ کھل گئی صبح صادق کا دودھیا نور اور تازہ ہوا کی گنگناہٹ میں انگڑائی لیتے مسکرا اٹھا۔ اور جلدی سے تیار ہو کر اصطبل پہنچا تو باقی لوگ بھی جمع ہو رہے تھے مگر اس کا گھوڑا غائب تھا۔ اس نے حیرت سے مختار کو دیکھتے پوچھا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا اور باقی کارندوں کو پکے گڑ مٹھ بانٹتا اور اس کی تیز مٹھاس سے سب نہال ہوئے ان کے قہقہوں سے گونجا تو گراؤنڈ سے اس کے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی، وہ تیزی سے باہر لپکا تو شیلا اس کی لگام پکڑے کھڑی تھی۔ لگام اس کے ہاتھوں سے لیتے رکاب میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ وہ ہنسی۔۔۔!

تو کیا تم مجھے اپنی گود میں بھر کر گراونڈ کے چکر نہیں کھلاؤ گے آج۔۔۔؟

البیلی لگاوٹ رکاب سے پاؤں کھینچتی، گراؤنڈ پر جمے رہنے پر مجبور کرتی آواز کی مٹھاس، جس کے پکے، ٹپکتے رس سے ایک عجیب سے نشے سے آشنائی اور دونوں آنکھیں یکدم بند ہو گئیں۔ اس نے سارے گھوڑوں کو بند پلکوں کے بیچ پھیلے گراؤنڈ کا لمبا چکر کاٹتے دیکھا، پٹ سے آنکھیں کھل گئیں اور حجاب کا مہین آنچل الٹ گیا۔۔۔!

گراؤنڈ ہی نہیں، میں تمہیں کہیں اور بھی لے جاؤں تو؟

تو کیا۔۔۔؟

تم لے جانے کی حامی تو بھرو۔۔۔!

تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا، میں تمہیں لے گیا تو پورا فوجی یونٹ تمہاری تلاش میں میرے پیچھے لگ جائے گا، تاکہ وہ اغوا کا نام دے کر، میرے باپ دادا کی طرح میرا بھی لہو نچوڑ سکیں۔

اتنی کس کی مجال، میں اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔

مگر کوئی نہ مانے تو۔۔۔؟

تو میں بھی تمہارے پیچھے، تمہارے ہی قدموں پر پاؤں رکھتے آؤں گی۔۔۔!

مختار نے پیچھے سے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔ اور اک تہہ کیا ہوا نقشہ کھولتے، انگلی میرٹھ پر رکھتے، چہرہ اٹھایا۔

یہ ٹھیک کہتی ہے، میں تمہارا باپ سمان ہوں نا، میں تمہیں اس کے ساتھ نکل لینے کی اجازت دیتا ہوں۔ اب جلد ہی نکلو، مگر تم دونوں دھیان سے میری بات پر بھی غور کر لینا۔۔۔

دونوں ہی نے سر اثبات میں ہلاتے، اس کی نقشے پر کی انگلی کے تعاقب میں اپنی آنکھیں اتاریں۔۔۔

سنگم سے نکلو تو تمہارے سیدھے ہاتھ گنگا میا اور بائیں ہاتھ جمنا، بلا کسی توقف کے اپنے نشان مٹاتے، کسی بھی چھوٹے گھاٹ سے جمنا پار اور پانچ چھ میل کے بعد دوجے گھاٹ سے واپس اور اپنے پر پیچ نشانوں کو ہوا کے سپرد کرتے دلی سے بچنا اگر راہ میں قیام کرنا پڑے تو کسی دیہی سرائے میں اترنا، کھانا بھی دیہی سرائے میں کھانا، مگر شیلا تم مکمل اپنے آپ کو مکمل ڈھانپے رکھنا۔ گنگا جمنا کے بیچوں بیچ متوازی چلتے، کنارے سے دور رہتے ہوئے میرٹھ کی چھاؤنی کا بھی رخ نہ کرنا، اسی چھاؤنی سے ساڑھے چار میل پہلے، پکی سڑک سے نیچے کچے راستے پر جنگل کی جانب نکلیں تو دیہات سے جڑا ہوا اک وسیع گھوڑا پال فارم ہے، جس کا منتظم اک ساہوکار ہے جو دلی میں ہی رہتا ہے۔ مگر اس فارم کی دیکھ بھال اور تربیت میرے بڑے ماموں زاد بھائی کے سپرد ہے۔ وہ ازبک ہے اور اس کا نام حمزہ ہے وہ حکیم زادے خاندان سے تعلق رکھتا ہے ساری عمر میرے باپ کے پاس ہی گھوڑوں کی تربیت کی تعلیم پائی ہے وہ بھی میری طرح ہی زار کے فوجی افسروں کی چیرہ دستی سے تنگ آ کر بھاگ نکلا تھا۔

بس استاد بس۔۔۔

میں تمہارے ساتھ سونی پت سے آتے ہوئے اس کے پاس رکا تھا۔ تم نے میری اچھی خاصی پہچان کروا دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گا۔۔۔!

ہاں ہاں، بس اس کے پاس ہی پہنچ کر قیام کرنا اور شیلا کے متعلق بتا دینا۔ اس کچے راہ کی اک اور بھی بڑی بھرپور نشانی ہے، کہ تمہیں جمنا پار پانی پت اور سونی پت کی خط کشی کا تو اندازہ ہے، میرے ساتھ دوبار جا چکے ہو۔ اسی سونی پت گھاٹ سے اگر کمان میں تیر رکھ کر اسے گنگا کی جانب خط مستقیم میں چھوڑیں تو سیدھا تیر حمزہ کے فارم میں جا گرے گا۔ اسی فارم میں دو چار دن رکنا تا کہ تمہارا گھوڑا تازہ دم ہو جائے۔ اور پھر وہیں سے شیلا کے لیے بھی گھوڑا لے لینا۔ وہ مطلع دیکھ کر تمہیں گھاٹ سے کشتی میں سوار کرا دے گا۔ اور ساتھ ستلج پار کرنے کے لیے ایک گھڑ سوار راہبر بھی ساتھ کر دے گا۔ اور جاتے ہوئے گھوڑے کو تیز مت دوڑانا، بس سیدھی تین تال ہی بجے۔ اور ہاں تم شیلا۔۔۔!

یہ ٹھیک ہے کہ تم ایک اچھی گھڑ سوار ہو، اور گھڑ سواری کے ہی لباس میں آئی ہو مگر تم پر پیروں تک جھولتا جبہ زیب تن رہے گا

اور سر پر مڑھی یہ ریشمی کاشمیرا شال، گلے تک ڈھانپے رکھنا۔ اب دونوں کے لیے محفوظ ترین جگہ بیاس ستلج سے پار تخت لہور ہے۔ اب نکل بھی جاؤ، ہاں کچھ جیب میں ہے بھی یا خالی ہے۔۔۔؟

اور اس نے تیزی سے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی اسے اپنی گود میں لیا اور راس کھینچنے سے پہلے جواباً کہا کہ انعام کی ساری رقم موجود ہے، ساتھ ہی شیلا زور سے چلائی۔۔۔!

اب زندگی اسی کی تو ہے۔ میرے پرس میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔۔۔

اور دونوں نے الوداع کہتے ہاتھ ہلایا ہی تھا کہ گھوڑا سرپٹ نکل پڑا۔

الہٰ آباد سے نکلے تو راہ کی اک نواحی بستی میں پیٹ پوجا کے لیے پڑاؤ کیا۔ وہاں سے نکلے تو اگلی رات چلتے چلتے پھر سر پہ آ کھڑی ہوئی مگر دلی کی روشنیاں چھوڑتے اک سرائے میں رات بسر کی اور صبح میرٹھ سے کافی پہلے سونی پت کی باس جمنا کی لہروں سے اٹھتی، نہاتی، ہواؤں نے دے دی۔ یہ اک کچے راستے کا اشارہ تھا۔ اور سیدھے فارم پر جا پہنچا، مگر شیلا گھوڑے پر سوار اور وہ گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے پیدل ہی قدم مارتے ہوئے۔۔۔

گرد میں اٹے ہونے کے باوجود حمزہ نے پہچانتے ہوئے اسے سینے سے لگاتے، شیلا کو گھوڑے سے اتارنے کے لیے کہا اور اپنے اصطبل کے کارندوں کے سپرد گھوڑا کر دیا۔ مگر چلنے سے انکار کی ہنہناہٹ نے بل بہادر اور شیلا کے اٹھے قدم پکڑ لیے۔ دونوں نے بے ساختہ اسے چومتے پیار کرتے جانے کے لیے کہا مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔۔۔

حمزہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس کی تھوتھنی پر پیار کرتے، ٹانگوں کو ٹٹولتے، مالش کرتے تھاپڑا دیا تو وہ خوشی سے ہنہناتے اصطبل کی جانب چل پڑا۔ اور وہ شیلا اور بل بہادر کو اپنے گھر لے گیا۔ دونوں ہی کو جدا جدا غسل خانے کی راہ بتاتے صرف اتنا کہا کہ تھوڑی دیر رکیں، بل بہادر نے تفتیش بھرا چہار پہلو سوالوں سے اٹا چہرہ فرش سے یکدم بلند کیا تو وہ ہنس پڑا۔

پریشانی کی کوئی بات نہیں، پہلے تم پانی وانی تو پی لو، اسی دوران غسل خانوں میں تم دونوں کے کپڑے لگوا دیے جائیں گے۔۔۔!

یعنی۔۔۔؟

ماپ کے بغیر۔۔۔؟

نہیں۔۔۔!

مختلف فرنگی مہمانوں کے لیے مہمان خانے میں ہر ناپ کے نئے کپڑے موجود ہیں۔ جو ابھی استعمال نہیں کیے گئے۔۔۔!

تو کیا عورتوں کے بھی۔۔۔؟

ہاں ہاں بھائی، عورتوں کے بھی!

فرنگی تفریح کے لیے آئیں گے تو، بغیر اپنے خانوادہ کے آئیں گے کیا؟

اتنی باتوں کے سوال جواب سنتے ہی تشویش پھر ابھری۔۔۔؟

اگر ہمارے تعاقب میں کوئی آ نکلا تو۔۔۔؟

ارے یار پریشان کیوں ہوتا ہے۔ یہ میرا گھر ہے مہمان خانہ نہیں۔ یہاں کی اگر تلاشی بھی ہو تو کوئی بات نہیں، بہت سے پنہاں خانے موجود ہیں، جس کی ساہوکار تک کو خبر نہیں اور یہاں کے سارے کارندے حلق پر چھری پھروا لیں گے مگر میرے اشارے کے بغیر ایک لفظ نہیں اگلیں گے۔ کیا مختار نے تمہاری ایسی ہی کمزور تربیت کی ہے۔۔۔؟

نہیں بالکل بھی نہیں۔ مگر میری عاشقی کی پہلی منزل ہے نا، تو شک شبے کا تصادم تو ہو ہی جاتا ہے۔۔۔!

اور کارندے کے اشارے پر ہنسا اور شیلا کی طرف چہرہ گھمایا۔۔۔
بچی تو بل بہادر کی کسی بات پر رنجیدہ نہ ہونا۔
نہیں انکل جو ہوگا دیکھا جائے گا، اب فرنگی بلا بل بہادر کے گلے سے چمٹ گئی ہے، اتنا مضبوط جوڑ ہے کہ یہ چھڑانا بھی چاہے تو راہ فرار الوپ ہو جائے۔
اور دونوں اپنے اپنے غسل خانوں میں گھسے اور اپنے بدن کے مساموں تک اتری ہوئی خاک اور پسینے سے بنے لیٹے لیپ کو چھڑاتے، کافی دیر تک جمنا کے پانی سے سرشار ہوتے نیا لبادہ اوڑھے نمودار ہوئے تو وہ پھر کھلکھلا اٹھا، اور دونوں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے نہال ہو گیا!
اور کارندے کے اشارے سے پہلے دوبارہ ہنسا اور شیلا کی طرف چہرہ گھمایا۔۔۔
پانچویں دن سوار رہبر کرنال، پٹیالہ، نابھہ، فرید کوٹ کا عقب بنظر غائر ٹٹولتے لوٹا اور انہیں گھوڑوں سمیت فیروز پور سے نیچے کشتی پر سوار کرا کر لوٹ گیا۔ لیکن گھوڑوں پر سوار ہونے سے پہلے اس نے دو تھیلیاں علیحدہ علیحدہ دونوں کو انکار کے باوجود دیں!
انکار کی کوئی گنجائش نہیں!
تم دونوں اپنے چچا کے گھر پہلے پھیرے پر آئے تھے خالی ہاتھ کیسے جا سکتے ہو۔۔۔
ستلج پر تیرتی بیڑی کنارے لگی تو دونوں ہی کے چہرے کھل اٹھے، وہ سرتاپا محفوظ تھے انکے گھوڑوں کے سم تخت لہور کی جانب رواں ہو چکے تھے۔
پوچھ گچھ کرتے دلال کی معیت میں نخاس کے پیچھے کافی بڑا حویلی نما مکان مل گیا اور جس کے لیے اس کی گتھلی کے تین قیمتی پتھر ہی کافی نکلے۔ دلال کی ہی اعانت سے ملازمین کی فوج اور دونوں گھوڑوں کے لیے تین آزمودہ سائیس، اور اوپری صفائی، خرخرہ کرنے کے لیے سائیسوں کے مددگار چار ملازم، پہلی شب بڑی خمار آگیں راوی صادقاں کی خوشبوؤں لبریز ہواؤں نے جی آیا نوں کہا اور اگلے دن پرچہ لگنے پر مہاراجہ دربار میں نگرانوں نے فرنگی مخبر ہونے کے شبہ میں دونوں کو اکٹھا پیش کر دیا۔ جہاں انہوں نے اپنے فرار کا سارا وقوعہ سنا ڈالا۔ اور دونوں باہم ملتجی ہوئے کہ فرنگی انتقام سے بچنے کے لیے اب پناہ گاہ صرف تخت لہور ہے اور ہم اسی کے باسی بن کر رہنا چاہیں گے۔
مہاراجہ مسکراتے ہوئے اپنے وزیر کی جانب متوجہ ہوتے ہوا۔ بھئی وزیر جی پناہ تو سسرال میں ملے گی نا، مگر اب لڑکے کے کام کاج کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔ سسرال کی بہو بیٹی کو بل بہادر نے حویلی تو لے دی، شکر ہے کہ سرائے میں قدم نہیں رکھے۔
لیکن جب شیلا کی زبانی گھوڑوں کی پہچان اور تربیت کا پتہ لگا تو فوراً اس نے اپنے شاہی اصطبل کا نائب مقرر کرتے وقت، ساتھ ہی امتحان بھی لے لیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب فرنگی قاصد نے دربار میں شیلا کی موجودگی کے شبے کا اظہار کیا تو رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے بتایا بیٹیاں کوئی مفرور یا بکاؤ مال نہیں ہوتیں۔ شیلا جیکسن تو اب شیلا بل بہادر ہے وہ اس سے بیاہی گئی ہے اور پھر فرانسیسی نژاد جنرل ونتورا کے چرچ پادری نے اس کی تائید بھی کر دی۔۔۔

☆☆☆

آدمی

سید محمد اشرف

کھڑکی کے نیچے انہیں گزرتا دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک کھڑکی زور سے بند کی۔ مڑ کر پنکھے کا بٹن آن کیا۔ پھر پنکھے کا بٹن آف کیا۔ میز کے پاس کرسی پہ ٹک کر دھیمے سے بولا۔

"آج تو کل سے بھی زیادہ ہیں۔ روز بڑھتے جا رہے ہیں"۔

سرفراز نے ہتھیلیوں پر سے سر اٹھایا اور انوار کو دیکھا "تم نے تو دو ہی دن دیکھا ہے نا! میں نے بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کھڑکی بند رکھوں تو گھٹن ہوتی ہے۔ کھول دوں تو دل اور زیادہ گھبراتا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ادھر ہی آ رہے ہوں"۔ سرفراز چپ ہو گیا۔

پھر ایک لمحے کے بعد بولا۔

"آج تم سے اتنے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو دل کتنا خوش تھا کہ پھر یہ لوگ۔۔۔"

میں نے تمہیں سفر کا واقعہ بھی تو بتایا تھا۔ میں بھی صرف دو ہی دن سے تھوڑے ہی دیکھ رہا ہوں۔ ادھر گاؤں میں بھی آج کل یہی عالم ہے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کیا ہوگا"۔

سرفراز نے چاہت بھری نظروں سے اپنے بچپن کے ساتھی انوار کو دیکھا جس سے آج پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں کی بہت ساری یادیں ایک سی تھیں۔

جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تبھی اپنے خالو کے گھر پڑھنے بھیج دیا گیا تھا۔ خالو کا گھر ایک بڑے دیہات میں تھا جہاں سے دو میل کے فاصلے پر بسے قصبے میں انٹر کالج تھا۔ وہیں پہلے ہی دن ایک ہم عمر لڑکے نے بہت بے تکلفی کے ساتھ اس کی ربڑ لے کر اپنی آرٹ کی کاپی پر غبارے نما پھول مٹا کر ایک لیمپ نما تخلیق بنا کر اس کی ربڑ واپس کر دی تھی۔ حاضری کے وقت اس کا نام ہوا تھا۔

"سید انوار علی"۔ "حاضر جناب"۔

سرفراز دھیرے سے بولا۔

"سید انوار علی"۔

"حاضر جناب۔ تمہیں اسکول یاد آ رہا ہوگا"۔

"ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم؟"

"یار تم اب بھی پہلے کی طرح گھامڑ باتیں کرتے ہو۔ میرا پورا نام حاضری کے وقت ڈرائنگ ماساب کے علاوہ اور کون جانتا تھا؟"

سرفراز یہ سن کر مسکرایا حالانکہ گھامڑ والا جملہ اسے برا لگا تھا لیکن وہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ آج میں افسر کی اونچی کرسی پہ بیٹھا ہوں۔ میرا بچپن کا یہ دوست پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر ہے۔ اپنے احساس کمتری پہ قابو پانے کے لیے اسے ایسے ہی جملے بولنے چاہییں۔

پھر اس نے سوچا انوار ہی تو اسے اسکول سے واپسی پر حوصلہ دیتا تھا ورنہ قصبے سے دیہات تک پھیلے جنگل، سنسان باغوں

اور خاموش کھیتوں میں ہوکر گزرنے میں اس کی روح آدھی رہ جاتی تھی۔ سرفراز نے سر کرسی کی پشت سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں اور بچپن کی اس دہشت کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا۔

جاڑوں کے شروع میں چار بجے اسکول کی آخری گھنٹی بجتی۔ سب کے سب غل غپاڑہ کرتے تیزی سے نکلتے اور مست چال سے بستے کندھے پہ ڈالے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ سرفراز کے دیہات کا کوئی بھی لڑکا کالج پڑھنے نہیں آتا تھا۔ وہ راستے کی دہشت کے خیال سے سہا سہا، دھیرے دھیرے قدموں سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلتا انوار کبھی اس کے ساتھ ہوتا کبھی نہ ہوتا۔ جب ہوتا تھا تو تالاب تک چھوڑنے ضرور آتا تھا۔ تالاب سے آگے وہ بھی نہیں بڑھتا تھا کیونکہ تالاب کے بعد سڑک مڑ گئی تھی اور موڑ کے بعد پیچھے دیکھنے پہ قصبہ غائب ہو جاتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔

''تم ڈرنا مت سرفراز۔ نہر کی پٹری پار کرو گے تو باغ میں داخل ہونے پر کوئی نہ کوئی آدمی مل ہی جائے گا''۔

سرفراز اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا اور اس خیال سے کہ انوار پر اس کا ڈر ظاہر نہ ہو، چہرے پہ بہادری کے تیور سجا کر جواب دیتا۔

''نہیں، ڈرنے کی کیا بات ہے۔ باغ میں کبھی کبھی آدمی مل جاتا ہے تو ذرا اطمینان رہتا ہے اور نہیں ملتا ہے تب بھی میں گھبراتا نہیں ہوں''۔ یہ کہہ کر دیہات کی طرف چل پڑتا۔ دونوں پیچھے مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ سرفراز انوار کے اوجھل ہوتے ہی گردن کے تعویذ کو چھو کر محسوس کرتا اور جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھنے لگتا۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے وہ چاروں قل پڑھ کر اپنے سینے پر پھونکتا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا باغ کی طرف بڑھنے لگتا۔ یہ غروب کا وقت ہوتا تھا۔ سردیوں میں شامیں جلدی آ جاتی تھیں۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے کچی سڑک پر اکا دکا آدمی سائیکل پہ آتے جاتے مل جاتے یا گھنٹیاں بجاتی بیل گاڑیاں گزرتیں تو اسے تقویت کا احساس رہتا لیکن پٹری پہ مڑتے ہی بالکل سناٹا ہو جاتا تھا۔ اوپر شیشم کے درخت پہ بیٹھا کوئی گدھ شاخ بدلتا یا پر کھول کر برابر کرتا تو وہ آواز اس سناٹے کو اور ڈراؤنا بنا دیتی۔ اور یہی وہ وقت ہوتا جب وہ آیت الکرسی بھول جاتا تھا۔ وہ قل ہواللہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ اسی درمیان تیزی سے اول کلمہ طیب بھی پڑھ لیتا۔

اور اب سامنے باغ آتا۔ آموں کا بوڑھا باغ۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں کہرے میں لپٹا باغ جس کے اندر دوپہر کے وقت بھی سورج ڈوبنے والے وقت جیسا اندھیرا ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک دن اتوار کو اس نے دوپہر کے وقت بھی یہ باغ دیکھا تھا۔ شام کے وقت یہ باغ بالکل بدل جاتا۔ لگتا جیسے سارے درختوں کی چوٹیاں آپس میں گندھ گئی ہیں۔ فجری کے درخت کے نیچے سے ہوکر گزرتے ہوئے اسے اپنے دل کی تیز تیز دھڑکن صاف سنائی دیتی۔ اسے لگتا جیسے جنات بابا درخت سے اب اترے۔

باغ سے نکل کر ایکھ کے کھیتوں کے پاس مینڈھ پر گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ ابھی ایکھ کے کھیت سے نکل کر بھیڑیا اس کی ٹانگ پکڑ لے گا۔ وہ پسینے پسینے ہو جاتا۔ پھر گیہوں کے کھیت آتے۔ پھر پلکھن کے درخت کے اوپر گاؤں کی مسجد کے منارے اور مندر کے کلس نظر آتے۔ تب آہستہ آہستہ اس کے بدن کا کھنچاؤ دور ہوتا۔ ٹانگوں میں طاقت کا احساس پیدا ہوتا۔ پھر وہ بلند آواز میں کوئی فلمی گانا گانے لگتا۔

مہینے میں دو چار بار ایسا بھی ہوتا کہ باغ میں داخل ہوتے ہی اسے آدمی نظر آ جاتا جو عموماً پھاوڑا لیے جھونپڑی کی طرف جا رہا ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر گانا شروع کر دیتا۔ گانا بیچ میں روک کر وہ بہت اپنائیت کے ساتھ آدمی کو سلام کرتا۔

آدمی اس کا سلام سن کر پھاوڑا زمین پر رکھ کر آنکھیں چمچما کر اسے دیکھتا۔

''رام رام بیٹا۔۔۔۔۔ پٹواری صاحب کے بھانجے ہو۔ انہیں ہماری رام رام بولنا''۔

وہ روزانہ اسی بھروسے پہ کالج سے گھر آنے کی ہمت کرپاتا تھا کہ شاید آج بھی آدمی مل جائے۔ اگر یہ آسرا نہ ہوتا تو وہ رو پیٹ کر کالج سے نام کٹا کر اپنے گاؤں واپس جاچکا ہوتا۔

لیکن آدمی روزانہ نہیں ملتا تھا۔ ایک دن کالج سے نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔ وہ گراؤنڈ پر والی بال کا میچ دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب دیر کا احساس ہوا تو اس نے سورج کی طرف دیکھا جو آج قصبے میں ہی زرد ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلا اور دیہات کی طرف چل پڑا۔ نہر کی پٹری پر مڑتے ہی اس نے اپنے بدن میں یہ سوچ کر سنسنی محسوس کی کہ اب تو باغ سے آدمی چلا گیا ہوگا۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور شیشم کے درخت کے نیچے سے گزرا۔ درخت کے نیچے سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی درخت سے اتر کر اس کے پیچھے چل پڑا ہو۔ پیچھے کی آہٹ اچانک تھم گئی۔ اسے لگا جیسے جنات بابا پیچھے سے اس کی کمر کا نشانہ لے کر جادو کی گیند مارنے ہی والے ہیں۔ اس نے تیزی سے کلمہ پڑھا اور کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ وہ ایک بڑا بندر تھا جو چلتے چلتے اچانک رک کر زمین پر دونوں ہتھیلیاں ٹیکے اس کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔ اسے بندر سے بھی ڈر لگتا تھا لیکن جناب بابا کے مقابلے میں کم۔ اس نے اپنا بستہ بہت کس کے پکڑا اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ آج آگے کا راستہ بھی بند تھا اور پیچھے کا بھی۔ آگے سنسان باغ جس میں اب آدمی ہونے کی اسے کوئی امید نہیں تھی اور پیچھے بندر۔

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی اور باغ کے درخت دھیمی آواز میں شام کی سرگوشیاں شروع کر چکے تھے۔ وہ باغ میں داخل ہوا۔ آگے بڑھا۔ بوڑھے فجری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہی جناب بابا کا اصلی گھر ہے۔

داہنی سمت سے آواز آئی۔

"آج بہت دیر کی بیٹا"۔

ارے۔۔۔آدمی موجود ہے۔ اسے اتنی خوشی اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن انگلش والے ماساب نے "مائی کاؤ" لکھنے پر اسے ویری گڈ دیا تھا۔ اس نے آدمی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ جھونپڑی کے قریب درختوں کے پاس کہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا اس کا پھاوڑا اس کے ایک ہاتھ میں تھا جسے وہ زمین پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ انگوچھے کو کانوں پہ برابر کر رہا تھا۔ کہرے میں لپٹا، دھوتی کرتا انگوچھا پہنے یہ آدمی اسے حضرت خضر علیہ السلام کا نوکر لگا۔

"آدمی سلام" وہ چہک کر بولا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ پٹواری ساب کو ہماری رام رام کہنا۔ اندھیرا مت کیا کرو"۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر آ کر کھانا کھا کے دالان میں بیٹھی خالہ کے کلیجے سے لگ کر اس نے انہیں پورا واقعہ سنایا۔ وہ چاہتا تھا خالو اور خالہ کو علم ہو جائے کہ اسکول کی پڑھائی کے علاوہ راستے میں واپسی کے لیے اسے کیسی جوکھم اٹھانا پڑتی ہے۔ مگر خالہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ والی بال کے میچ کے چکر میں اسے دیر ہوئی تو وہ ہمدردی کے بجائے الٹا اسے ڈانٹنے لگیں۔

رات کو دالان میں رضائی سے بدن اچھی طرح لپیٹ کر اس نے سوچا اگر وہ آدمی مر گیا تو میں اسکول سے کیسے واپس آیا کروں گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوا کہ وہ آدمی دیکھنے میں تو خالو سے بھی چھوٹا لگتا ہے ابھی نہیں مرے گا۔

"سرفراز! تمہاری خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ خالہ نے مجھے بلا کر کہا کہ سرفراز تو ہمیں بالکل بھول گیا۔ تم اس سے جا کر کہو کہ خالہ اور خالو اسے دیکھنے کو بہت بے تاب ہیں اسے شادی میں ضرور آنا ہے"۔

سرفراز کو یہ سن کر بہت ندامت ہوئی۔ وہ ندامت کے اس احساس کو چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے لیکن کھلی آواز میں انوار کو بتایا کہ سرکار ملازمت خصوصاً ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے میں بالکل فرصت نہیں ملتی۔ پھر اسے عائشہ کی یاد آئی، جسے

اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ کتنی جلدی بڑی ہوگئی۔

"شادی کب ہے؟"

"پرسوں بارات آئے گی"۔

"ارے۔ ان حالات میں تاریخ کیوں رکھ دی خالہ نے۔ تم نے دیکھا نہیں، کیسے دیوانے ہو رہے ہیں سب لال بھبھوکا چہرے لیے ٹرکوں اور ٹریکٹروں پر جلوس نکال رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہتھیار اور کیسے نفرت انگیز نعرے۔۔۔"

انوار اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"میں نے بھی خالہ سے کہا تھا کہ آج کل تقریب کرنے والا وقت نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں میں وہ بات پھیل گئی ہے۔ خود انہیں کے گاؤں میں لوگوں کے لہجے بدل گئے ہیں۔ مگر خالہ کی بھی مجبوری ہے۔ خالو کے بھائی کے بیٹے سے رشتہ طے ہوا ہے۔ جو تین دن بعد جدہ واپس چلا جائے گا۔ خالو بھی اب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اپنے سامنے عائشہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ تمہیں آج ہی چلنا ہوگا سرفراز۔ بھابھی کو فون کر کے تیار ہونے کو کہہ دو"۔

"کیا تم نے اخبار نہیں پڑھا انوار۔ پرسوں ریل گاڑی سے اتار کر۔۔۔" وہ چپ ہوگیا۔ انوار بھی خاموش ہوگیا۔ پھر بولا۔

"اچھا تو بھابھی اور بچوں کو یہیں رہنے دو"۔

"ہاں۔ ان لوگوں کو نہیں لے جا پاؤں گا"۔

گیارہ بجے ہیں۔۔۔ اگر بارہ بجے بھی کار سے چلیں تو شام چھ سات بجے تک خالہ کے ہاں پہنچ جائیں گے"۔

"ہاں۔ تقریباً ڈھائی تین کلومیٹر کا سفر ہے"۔

راستے میں نہر کے پل پر اچانک کچھ لوگوں نے گاڑی کے سامنے آ کر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے کیونکہ بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سامنے پل پر ٹرک اور ٹریکٹروں کا جلوس آ رہا تھا۔ لوگ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

دونوں کے ذہنوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے رہے۔ جلوس برابر سے گزرتا رہا۔ گاڑی رکوانے والے وہیں کھڑے نعروں کا جواب دیتے رہے۔ سرفراز نے آیت الکرسی یاد کی۔

جلوس گزر گیا تو وہ لوگ بھی زور زور سے باتیں کرتے جلوس کے ساتھ بڑھ گئے۔

سرفراز سخت ذہنی دباؤ میں تھا اس لیے گاڑی فوراً اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ دونوں بیٹھے ایک دوسرے کا ڈر محسوس کرتے رہے۔

سرفراز نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انوار بولا۔

کھلے عام سڑک پر اکا دکا آدمیوں سے کچھ نہیں کہتے۔ اکا دکا آدمیوں سے نپٹنے کے لیے شہر شہر گاؤں گاؤں لوگوں کو تیار کیا گیا ہے۔ پچھلے جمعے کو جب احمد شہر کی پٹری سے باغ کی طرف مڑا تو اچانک کسی نے پیچھے سے۔۔۔"

سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی وہ خالی ذہن کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا۔ انوار بتاتا رہا۔

اگر پورا جلوس اکا دکا آدمیوں پر حملہ کرے تو بدنامی بھی تو بہت ہوگی۔ ویسے اپنی طرف سے بھی تیاریاں ٹھیک ٹھاک ہیں"۔ اس نے یہ بات رازداری کے لہجے میں بتائی۔

جب وہ نہر کی پٹری پر مڑے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ سرفراز کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔

تب اسے یہ خاموش نہر، سنسان پٹری اور سائیں سائیں کرتے باغ کتنے بھیانک لگے تھے۔

اس نے اچانک گاڑی کے بریک لگائے۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ایک بڑا سا بندر ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے انکی طرف دیکھ کر خرخر کررہا تھا۔ دونوں مسکرائے۔ بندر بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر کسی گدھ نے پہلو بدلا تو پھڑ پھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ سرفراز نے سوچا پہلے اس پھڑ پھڑاہٹ سے کتنا ڈر لگتا تھا۔

''تو یہ احمد دو کاندار والا معاملہ کب ہوا تھا؟''

''آج چار دن ہو گئے''۔

''ارے۔۔۔'' سرفراز کی ہتھیلیاں اسٹیرنگ وہیل پر نم ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟'' انوار نے پوچھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔

''نہیں کچھ نہیں۔ یعنی ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ کچھ پتہ لگا؟''

''پتہ کیا لگتا۔ الٹے تھانے دار نے دفن کے بعد ہی سب کو ڈانٹا کہ جب ایسے حالات چل رہے ہیں تو سورج مندے گھر سے باہر نکلنے ہی کیوں دیا۔ اندھیرے میں حملہ کرنے والوں کو مار کر بھاگنے میں سہولت رہتی ہے''۔

پٹری سے اترتے ہی باغ سامنے آ گیا۔

گاڑی یہیں روک کر بیک کر کے لگا دو۔ آگے راستہ نہیں ہے''۔ انوار بولا۔

سرفراز نے گاڑی بیک کر کے لگا دی اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

کہرے میں لپٹا باغ بہت دن بعد دیکھا تھا۔ آج اسے باغ سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا لیکن ایک عجیب سا سناٹا دونوں کے اندر خاموشی سے اتر آیا تھا جو باتیں کرنے کے باوجود ٹوٹ نہیں رہا تھا۔

دونوں جب جنات بابا والے پرانے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے تو سرفراز نے اچانک رک کر انوار کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ دکھن ہڈیوں تک پہنچ گئی۔

انوار نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ سرفراز نے آنکھ کے اشارے سے باغ کی بڑی مینڈھ کی طرف اشارہ کیا۔ انوار کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں وہ اس جگہ کا تعین بھی نہیں کر پایا جہاں سرفراز نے اشارہ کیا تھا۔

سرفراز نے اس بار اور بھی زیادہ زور سے ہاتھ دبایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے پکڑے واپس مڑا اور کھینچنے والے انداز میں دوڑتا، گرتا، سنبھلتا باغ سے باہر نکلا۔ گاڑی میں انوار کو دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر نہر کی پٹری پر چڑھا کر پل پار کر کے پکی سڑک پر آ گیا۔ سرفراز شدید کھنچاؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

''اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا بات تھی؟'' سرفراز نے گاڑی روک دی۔

''باغ کی مینڈھ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جسے وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا''۔

☆☆☆

لاہور کا ایک واقعہ

شمس الرحمان فاروقی

یہ بات ۱۹۳۷ء کی ہے۔ میں ان دنوں لاہور میں تھا۔

ایک دن میرے جی میں آئی کہ چلو علامہ اقبال سے مل آئیں۔ اس زمانے میں میرے پاس ہلکے بادامی سفید (Off White) رنگ کی ایمبیڈر (Ambassador) تھی۔ میں اسی میں بیٹھ کر علامہ صاحب کی قیام گاہ کو چلا۔ ان کی کوٹھی کا نمبر اور وہاں تک پہنچنے کا صحیح راستہ مجھے ٹھیک سے نہ معلوم تھا، لیکن میکلوڈ روڈ، جہاں وہ رہتے تھے، اس کی جائے وقوع سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ لہٰذا کسی خاص مشکل کے بغیر میں علامہ کے بنگلے تک پہنچ گیا۔

سڑک کچھ گرد و غبار سے بھری ہوئی لگتی تھی۔ فٹ پاتھ، یا یوں کہیں کہ فٹ پاتھ کی جگہ سڑک کے دونوں طرف کی چوڑی پٹی، خشک اور گرد آلود تھی۔ علامہ کے بنگلے کا پھاٹک اچھا خاصا اونچا، لیکن لکڑی کا تھا۔ اس پر سلیٹی رنگ کی لوہے (یا ٹین) کی چادر تھی، جس کے باعث پھاٹک بہت بھاری اور کسی پر اسرار سی عمارت کا پھاٹک معلوم ہوتا تھا۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا اور سامنے مختصر سی اندرونی سڑک (Drive Way) تھوڑا بل کھاتی ہوئی اصل عمارت کی طرف جاتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ عمارت بلند و بالا، لیکن سال خوردہ اور ذرا بوسیدہ معلوم ہوتی تھی۔ جگہ جگہ مرمت اور ایک جگہ تعمیر نو کے آثار بھی باہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے احسان دانش کی نظم "علامہ اقبال کی کوٹھی" یاد آئی جو ایک دو مہینہ پہلے "خیام" یا "عالم گیر" میں چھپی تھی۔ نظم میں کوٹھی کی خستہ حالی پر افسوس اور رنج کا اظہار تھا۔ آخری شعر تھا:

سنتا ہوں کہ اب ہو گئی کوٹھی کی مرمت
احسان اسے دیکھنے جاؤں گا دوبارہ

میں کچھ دیر اس شش و پنج میں رہا کہ گاڑی اندر تک لیے چلا جاؤں، یا فٹ پاتھ ہی پر چھوڑ دوں۔ پھر میں نے دل میں کہا، ممکن ہے پورٹیکو میں اور کوئی گاڑی کھڑی ہو، اور میں اپنی گاڑی اندرونی سڑک پر کھڑی کر دوں تو شاید کسی کا راستہ رک جائے۔ لہٰذا میں نے گاڑی وہیں سڑک کے کنارے لگا دی اور باہر آیا۔ تب میں نے دیکھا کہ میرے مقابل فٹ پاتھ پر دو تین گمٹیاں ہیں، جیسی کہ پان سگریٹ والے رکھتے ہیں۔ ان گمٹیوں پر نوجوانوں اور بے فکروں کا مجمع سا تھا۔ کچھ نو عمر لڑکے بھی تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ ان کم بختوں کو لکھنے پڑھنے سے مطلب نہیں کہ یہاں پان کی دکان پر وقت ضائع کر رہے ہیں۔

میں ابھی گاڑی کو تالا لگا ہی رہا تھا کہ اچانک سڑک پار کر کے پانچ سات نو عمر لڑکے میری طرف لپکے۔ ان کے انداز اور ہاتھوں کے اشارے سے مجھے ایسا لگا کہ وہ کچھ مانگ رہے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ تو اور بھی برا ہے۔ یہ لونڈے پیشہ ور بھاری معلوم ہوتے ہیں۔ یقیناً منظم اور مجرمانہ طور پر بھیک منگوانے والوں کا کوئی گروہ ہوگا جو انہیں اس طرح استعمال کر رہا ہوگا اور ان کی زندگیوں کو بھاڑ میں جھونک رہا ہوگا۔ جب تک میں گاڑی کے دروازے سے چابی نکالوں نکالوں، کوئی چار پانچ لڑکے اور ایک دبلا پتلا منحوس صورت شخص، جس کی شکل سے ہی خباثت ٹپک رہی تھی، اچانک میرے پاس پہنچ گئے اور قریب تھا کہ ان کے ہاتھ میرے کوٹ تک پہنچ جائیں۔

میں یہ دیکھ کر لرز گیا کہ وہ لڑکے نہ محلے کے ان پڑھ بے فکرے آوارہ گرد تھے اور نہ بھیک منگے۔ وہ تو کسی قسم کے پیشہ ور

معلوم ہوتے تھے، اپنے جسم کی تجارت کرنے والے۔ میں نے دل میں کہا، معاذاللہ، یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ یہ بھرا پرا شہر، دن کا وقت، شریفوں کا محلّہ اور یہ پیشہ ور لونڈے؟

اب میں نے جانا کہ وہ ہاتھ میرے کوٹ کی جیبوں تک پہنچنا نہیں بلکہ میرے دامن کو تھامنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ مجھ سے کوئی سودا کرنا چاہتے تھے۔ دس دس بارہ بارہ سال کے لونڈے، جن کی آنکھوں میں لڑکپن کی معصومیت کی جگہ عجیب شیطانی چمک تھی، چہروں پر وہ پختگی اور پھیکا پن تھا جو بڑے عمر کے لوگوں کے چہروں پر بھی شاذ ہی نظر آتا ہے۔ میں نے نفرت سے انہیں جھٹک کر ایک طرف ہو جانا چاہا تو وہ میرے پیچھے لپکے۔ توبہ! ایسا تو سنسنی خیز افسانوں میں بھی نہ ہوتا ہوگا۔ یہ واقعہ ہے یا کوئی دیوانہ پن جس میں سے دوچار ہوں، میں نے دل میں کہا۔ پھر تقریباً جست لگاتا ہوا ان کے نرغے سے نکل کر میں علامہ کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ اندر آنے کی ہمت ان بدمعاشوں کو نہ ہوئی۔ پھاٹک تو کھلا ہی ہوا تھا، لیکن وہ پھاٹک کے کھمبے کے پاس آ کر یوں رک گئے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ میں نفرت سے اپنے ہاتھ اور کپڑے جھاڑتا ہوا دوڑ کر بنگلے کے پورٹیکو میں داخل ہو گیا۔

اب واللہ اس ملاقات کی تفصیل کچھ یاد نہیں۔ اتنا خیال میں ہے، اور وہ بھی دھندلا سا، کہ حضرت علامہ بڑی شفقت سے پیش آئے۔

میں نے گھنٹی بجائی تو ایک بڑے میاں جو وضع سے ملازم اور رشتہ دار کے بین بین لگتے تھے، فوراً برآمد ہوئے۔ میری اطلاع لے کر اندر گئے، اور تقریباً الٹے ہی پاؤں واپس آ کر مجھ سے کہا کہ علامہ صاحب گول کمرے میں تشریف رکھتے ہیں، آپ آ جائیں۔ کچھ یاد نہیں کہ باتیں کس موضوع پر ہوئیں۔ میں ریلوے کا انجینئر، مجھے شاعری سے ذوق تو تھا (اب بھی ہے) اور مجھے علامہ کا بہت سا کلام زبانی یاد بھی تھا، لیکن اس ذوق کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا جو مجھے علامہ سے ہم کلام ہونے کا اہل بناتا۔ یہ بخوبی یاد ہے کہ علامہ نے مجھے بالکل احساس نہ ہونے دیا کہ میری ملاقات ان کے لیے ایک کارِ فضول سے زیادہ نہیں۔ اور نہ ہی انہوں نے کوئی ایسی بات کہی جس سے مجھے اپنے جہل کا احساس ہوتا۔

ملاقات کوئی آدھ گھنٹہ رہی۔ پھر میں نے اجازت لے کر سلام کیا۔ علامہ صاحب کمرے سے باہر تک مجھے چھوڑنے آئے۔ ایک بار جی میں آئی ان سے درخواست کروں کہ آپ کے دروازے کے باہر سڑک کی پرلی طرف جو طائفہ شیاطین ہے، اس کا کچھ تدارک کریں۔ لیکن میری ہمت نہ پڑی۔ اور پھر اس معاملے سے ان کا مطلب ہی کیا تھا؟ یہ کام تو پولیس والوں کا تھا۔ علامہ کو شاید خبر بھی نہ رہی ہو کہ سڑک پار کی گمٹیوں پر کس طرح کا ہجوم رہتا ہے۔

میں پورٹیکو سے باہر آیا تو اندرونی سڑک (Drive Way) پر سرمئی رنگ کی ایک پرانی آسٹن اے چالیس (Austin-A40) کھڑی تھی۔ علامہ کی تو نہ ہوگی، کیونکہ میں نے کہیں سنا تھا کہ ان کے پاس ان دنوں ایک بڑی سی فورڈ تھی۔ خیر، کوئی ملنے والا آیا ہوگا، میں نے دل میں کہا۔ اچھا ہی ہوا جو میں نے اپنی کار باہر کھڑی کی۔

میں علامہ صاحب سے ملاقات کی خوشی میں مگن باہر نکلا۔ ایک لمحے کے لیے میں بھول گیا تھا کہ ان لوگوں سے پھر سابقہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن باہر سڑک پر آ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کئی لڑکے میری کار کے پاس کھڑے تھے، اور کار کو دھکیل ڈھکال کر اس کا رخ مخالف سمت میں کر دیا گیا تھا۔ میں کچھ حواس باختہ سا، لیکن ہمت کر کے گاڑی کی طرف بڑھا تو وہ لونڈے مجھ سے تقریباً چمٹ گئے۔ ان کے بدن سے عجیب طرح کی حیوانی اور چکنے تیل کی سی بو آ رہی تھی۔ ابھی میں فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ان سے کس طرح نپٹوں، کہ ایک لمبا سا دبلا پتلا شخص، جو خاکی مائل مٹگیجے پیلے رنگ کی لمبی قمیص اور اسی کپڑے کی شلوار پہنے ہوئے تھا، میری

طرف لپکا۔اس کے چہرے پر بداخلاقی اور بے حیائی کے آثار اس قدر نمایاں تھے کہ میری طبیعت گنگنا گئی، جیسے میں نے کسی بھیگی لجلجی چیز کو چھو لیا ہو۔اس وقت میں سڑک کی جانب تھا، اور وہ میرے دائیں ہاتھ پر فٹ پاتھ کے رخ پر تھا۔

میں نے پلٹ کر اسے ایک ٹھوکر لگانی چاہی تو اس نے اپنی ٹانگ میری طرف بڑھا کر مجھے روکنا چاہا۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میری ٹانگ کچھ اس طرح اس کی ٹانگ سے الجھی کہ وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور اچل کر چھپاک سے فٹ پاتھ کے نیچے گہری نالی میں جا رہا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر لپکتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا، دل میں دعا کر رہا تھا کہ گاڑی فوراً اسٹارٹ ہو جائے۔ بارے دعا قبول ہوئی۔ چابی لگاتے ہی گاڑی بڑی خوبی سے اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور ایکسیلٹر پر پاؤں پورے زور سے داب دیا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ میرا ارادہ تھا کہ چند ہی لمحے بعد فرسٹ گیئر سے سیکنڈ میں آ جاؤں گا، کیونکہ سیکنڈ میں طاقت بہت تو ہوتی ہی ہے، ساتھ ہی اس میں رفتار تیزی سے بڑھانے کا بھی امکان رہتا ہے۔حسب ارادہ میں نے گاڑی سیکنڈ میں ڈالی ہی تھی کہ محسوس ہوا گاڑی چل نہیں پا رہی ہے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی طاقت اسے پکڑ کر الٹی طرف کھینچ رہی ہو۔ میں نے پیچھے نگاہ کی تو دیکھا کہ کئی لونڈے کار کے بمپر اور بوٹ سے چپکے ہوئے پورا زور لگا کر گاڑی کو آگے بڑھنے سے روکنے میں مصروف تھے۔ ادھر میں ایکسی لیٹر پر پاؤں پورے زور سے دبائے ہوئے ہوں، ادھر وہ دس بارہ بچے گاڑی کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، اور اس کامیابی سے کہ گاڑی کی رفتار چیونٹی کی رفتار سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

میں نے کندھے سکوڑ کر سر کو یوں جھکا لیا گویا خطرہ میرے پیچھے نہیں، بلکہ سامنے ہے، اور میں پوری قوت کے ساتھ سامنے کسی چیز سے ٹکرانے والا ہوں۔ سر جھکا کر اور بدن چرا کر میں نے اپنی پوری قوت ارادی و جسمانی اس بات پر لگا دی کہ گاڑی کو اتنی ریس دوں کہ ان غول بچوں کو جھٹکتا ہوا نکل جاؤں۔لیکن ان پلیدوں میں خدا معلوم کتنی طاقت آ گئی تھی کہ میرا پندرہ ہارس پاور کا انجن، میری اپنی قوت مدافعت، سب بے کار ثابت ہو رہی تھیں۔ گاڑی بس گھسٹتی ہی رہی۔اور سو پچاس گز ہی کے اندر مجھے یقین ہو گیا کہ یا تو گاڑی اب بہت جلد بند ہو جائے گی، یا ان لونڈوں کی طاقت اسے آگے بڑھنے سے روک ہی دے گی۔

میں اب سراسیمہ ہو چلا تھا۔ میرے ذہن میں بس یہ بات گردش کر رہی تھی کہ یہ گاڑی جسے میں اپنی حفاظت و مدافعت کے لیے کافی سمجھ رہا تھا، میرے لیے موت کا پھندا، یا فنا کا جال ثابت ہو سکتی ہے۔اگر میں اسی میں بند رہ گیا تو چند ہی منٹ جاتے ہیں کہ یہ غول ان شیطانی مجھے آگے بڑھنے سے روک دیں گے، مجھے گاڑی سے کھینچ لیں گے اور پھر خدا جانے میری کیا درگت بنائیں۔ وہ شخص، جسے میں نے نالی میں ڈھکیل دیا تھا، وہ تو شاید میری تکا بوٹی کر کے پھینک دے۔

اب، کئی سال بعد میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میرا استدلالی، ترقی یافتہ دماغ، جسے اصطلاح میں ''یمینی دماغ'' یا Right Brain کہتے ہیں، معطل ہو چکا تھا، اور میں اپنے ''یساری دماغ'' یعنی Left Brain کے قبضے میں تھا۔ یساری دماغ، جسے Reptilian Brain بھی کہتے ہیں، انسانوں، رینگنے والے جانوروں، اور انڈا دینے والے جانوروں میں مشترک ہے۔

کہا گیا ہے کہ ارتقائی عمل کے کروڑوں برس نے اس دماغ کو پیدا کیا۔اور چونکہ یہ دماغ رینگنے والے جانوروں اور پھر انڈا دینے والے جانوروں سے ہو کر انسان تک پہنچا ہے، اس لیے اسے حشراتی دماغ Reptilian Brain بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے بنیادی اور 'سفلی' جذبات سب اسی دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔شہوت، خوف، بھوک کا احساس، تشدد، تحفظ جان، خطرے سے فرار اختیار کرنا وغیرہ سب جبلتیں اسی دماغ کی دین ہیں۔ دنیا میں زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں، خاص کر قاتلوں اور زنا بالجبر کے

مرتکب لوگوں میں یساری دماغ کو یمینی دماغ سے زیادہ فعال پایا گیا ہے۔ اس کی جگہ چونکہ سر کے بائیں اور نچلے حصے میں ہے، اس لیے اسے 'یساری' کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف، یمینی یا Right Brain کا ارتقاء اور بھی کئی کروڑ برس میں ہوا۔ استدلال، دروں بینی اور تعقل کی صفات اسی یمینی دماغ کی پیداوار ہیں۔

یساری دماغ کو استدلال اور تعقل اور پچھتاوے سے کوئی علاقہ نہیں۔ جب یہ دماغ حاوی ہو جاتا ہے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ بعض دماغی مریضوں میں بھی یمینی دماغ کی کمزوری اور یساری دماغ کی مضبوطی کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

بہرحال اس وقت مجھے ایک ہی دھن تھی، کہ کسی طرح اس گاڑی سے نکل بھاگوں۔ گاڑی میں جائے قیام نہ تھی تو باہر جائے فرار ضرور ہوگی، یہ میرا استدلال تھا۔ لیکن گاڑی کس طرح چھوڑوں اور کس مقام پر، یہ ابھی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

اچانک میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ سڑک پر کوئی راہ گیر نہ تھا۔ خالی راستہ قطعاً سنسان، بھائیں بھائیں کرتا معلوم ہوتا تھا۔ خالی شہر ڈراؤنا کھڑا تھا چاروں اور، میرے ذہن میں کبیر کا مصرع آیا۔ میکلوڈ روڈ پر زیادہ بھیڑ بھاڑ تو کبھی نہ ہوتی تھی، لیکن بالکل سناٹا بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دو موٹریں تو منٹ دو منٹ پر گذر ہی جاتی تھیں۔ علامہ صاحب کے مکان سے ذرا آگے علامہ کے مشہور دوست سر جگندر سنگھ کا عظیم الشان بنگلہ تھا۔ (کیسے پتے کی بات جگندر نے کل کہی۔) ان کے پھاٹک پر ایک دو ملازم بھی ہمیشہ کھڑے نظر آتے تھے۔ سردار صاحب کے بنگلے کے ذرا ہی فاصلے پر بہرام جی خدائی جی کی دکان ایک بنگلہ نما مکان میں تھی۔ یہ لوگ ولایت سے عمدہ قسم کی شرابیں اور سگار منگاتے تھے۔ کوئی ایک دو فرلانگ پر وہائٹ وے، لیڈلا (Whiteway, Laidlaw) کی عالی شان دو منزلہ دکان تھی۔ اس کے سامنے دو چار موٹریں، ایک دو شکرم، پان سات بگھیاں، تو ہر وقت ہی کھڑی رہتی تھیں۔ آج خدا جانے کیا بات تھی کہ نہ وہ کوٹھیاں دکھائی دیتی تھیں، نہ کوئی دکان ہی نظر آتی تھی۔ حتیٰ کہ پولیس کا کوئی سپاہی بھی ٹریفک چوراہے پر نہ تھا۔

اب جو غور کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ میری رفتار اس قدر دھیمی تھی کہ بس چیونٹی کی چال سمجھیے۔ اور جن عمارتوں، دکانوں کا میں نے اوپر ذکر کیا، وہ مجھ سے چند فرلانگ تو تقریباً دور تھیں، اس وقت کہاں سے دکھائی دے جاتیں؟ لیکن میں نے کہا نا کہ اس وقت میرا انسانی دماغ نہیں، بلکہ حشراتی دماغ مجھ پر حاوی تھا۔ آج مجھے یقین ہے کہ اگر میں ہمت کر کے اس گاڑی کو چلاتا رہتا، اسپیڈ چاہے جو بھی رہتی، تو دس پانچ منٹ میں کسی محفوظ یا آبادی والی جگہ پر ضرور پہنچ سکتا تھا۔ میرا پیچھا کرنے والے مجھ پر ہرگز ہاتھ نہ ڈال سکتے تھے۔ گاڑی کو وہ بالکل روک نہ سکتے تھے۔ اور اگر وہ گاڑی کو چھوڑ کر کھڑکی کی راہ سے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے تو میں بآسانی اتنی دیر میں گاڑی کی رفتار بڑھا کر ان کے خطرے سے آزاد ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت تو یہ لگ رہا تھا کہ یہ گاڑی نہیں موت کی کوٹھری Death Cell ہے۔ اگر میں اسی میں بیٹھا رہا تو موت کا شکار ہو جاؤں گا۔

میں نے دل میں کہا کہ اگر کوئی مضبوط کھمبا، یا دیوار، راستے میں ملے تو گاڑی اس سے ٹکرا دوں۔ دھماکہ ہوگا تو دس پانچ لوگ لامحالہ جمع ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کوئی پولیس والا بھی آنکلے۔ یا شاید میں زخمی، یا بے ہوش ہی ہو جاؤں۔ تب تو یہ طائفہ بیابانی میرا پیچھا چھوڑے گا۔ اس وقت میرے (حشراتی) دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ موٹر کا کوئی واقعی کارگر ایکسیڈنٹ کرنے کے لیے رفتار ضروری ہے۔ بیس بائیس کی رفتار تو ہو اور اس وقت میری رفتار چار پانچ سے متجاوز نہ تھی۔ اور نہ ہی مجھے یہ بات سوجھی تھی کہ زخمی یا بے ہوش ہو کر تو میں اور بھی ان کے رحم و کرم پر ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے ہسپتال لے جانے کے بہانے اٹھا کر کہیں بھی لے جا سکتے تھے، یا وہیں کا وہیں مجھے مزید گزند پہنچا سکتے تھے۔ اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ اس وقت میرے سامنے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ٹکرا کر میں اپنا یہ عقل مندی پر مبنی 'منصوبہ' پورا کرتا۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ وہ پیلی ملگجی قمیص والا گھناؤنا شخص بھی ان لونڈوں کا معاون ہو کر میری گاڑی کو پیچھے سے روکنے میں شامل ہو گیا ہے۔''اس کی بھی طاقت شامل ہو گئی ہے، اب تو میں بچ نہ سکوں گا'' میں نے دل میں کہا۔ ابھی گاڑی کی رفتار میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ملگجی قمیص والا گاڑی کو رکوانے میں جان لڑا دے گا۔

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی''، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ مجھے اپنے والد مرحوم کا ایک خادم یاد آیا جو ایسے موقعوں کے لیے حسب ذیل شعر پڑھا کرتا تھا:

کب تک چھپیں گی کیریاں پتوں کی آڑ میں
آخر کو آم بن کے بکیں گی بزار میں

عام حالات میں مجھے جب بھی یہ شعر یاد آتا تو ہلکی سی ہنسی بھی آتی۔ لیکن آج رونا آ رہا تھا۔ یہی نہیں، اپنا بچپن بھی اس وقت مجھے بڑی آرزو بھری ارمان انگیز گلابی نارنجی روشنیوں کے سائے میں گھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا، حالانکہ دراصل میرا بچپن خاصا ناخوشی سے بھرا ہوا اور بھلا دینے کے لائق تھا۔

کہتے ہیں ایک بار بسمل سعیدی نے جوش صاحب سے کہا کہ جوش صاحب آپ کے کلام میں سوز و گداز کی اک ذرا کمی نہ ہوتی تو آپ اور بھی بڑے شاعر ہوتے۔ جوش صاحب نے کہا،'' ہرگز نہیں، میرے یہاں سوز و گداز کی کمی ہرگز نہیں۔ لو یہ شعر سنو:

میرے رونے کا جس میں قصہ ہے
عمر کا بہترین حصہ ہے

بسمل سعیدی نے قہقہہ لگا کر کہا،'' واللہ جوش صاحب بچپن کے مضمون پر اس سے بہتر شعر میں نے نہیں سنا تھا''۔ خیر، جوش صاحب اور بسمل صاحب کے مخول ایک طرف، لیکن سچ بات یہ ہے کہ میرا بچپن اپنے بڑوں سے پٹتے، اور روتے ہی گزرا تھا۔ پھر بھی کاش میں ابھی سات ہی آٹھ برس کا ہوتا، میں نے دل میں تقریباً روتے ہوئے کہا۔ اس صورت میں آج اس موٹر میں تو نہ ہوتا، جہاں میری عزت اور جان دونوں کے لالے پڑے ہیں۔ آخر میں نے کسی کا بگاڑا بھی کیا ہے؟

مجھے صغرسن کے وہ دن یاد آ گئے جب ذرا ذرا سی بات پر، اور اکثر بے وجہ ہی، مجھ پر ڈانٹ یا مار پڑتی تھی۔ یا اگر کوئی وجہ ہوتی ہو گی تو میرا ننھا سا ذہن اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا تھا۔ کسی بات کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ ان دنوں میرے محدود دماغ کا فیصلہ تھا۔ بعد میں، جب مجھے علت یعنی Cause اور سبب، یعنی Reason کا فرق معلوم ہوا تو میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ لازماً ایسا نہیں کہ کسی چیز کی علت معلوم ہو جائے تو اس کا سبب بھی معلوم ہو جائے۔ مثلاً کسی شخص کا قتل ہو جائے اور لاش کا معائنہ کر کے ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ وہ پستول کی گولی سے مرا ہے، تو یہ محض علت قتل معلوم ہوئی۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ اس کے قتل کا سبب کیا ہے؟

اس وقت جو میں اپنی جان کے خطر میں ہوں، تو اس کی علت یہ ہے کہ میں کسی مقام پر کسی وقت موجود تھا۔ اگر نہ ہوتا تو یہ بات بھی نہ ہوتی۔ لیکن میرے وہاں موجود رہنے کی کچھ علت تھی، اور اس علت کی بھی کچھ علت ہو گی، اور پھر اس علت کی بھی۔۔۔

تو کیا ساری دنیا محض علل کی داستان ہے؟ اسباب کہیں نہیں؟ یا شاید ہمارا یہاں آنا کسی سبب سے ہو؟ اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں، میر تقی میر نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ کون سے اسباب؟ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا؟ کیا اس لیے کہ میں اپنی موٹر میں بیٹھا ہی بیٹھا جسم فروش لونڈوں اور ان کے سرخیل کی ناپاک حرکتوں کا ہدف بنوں؟ میں نے تقریباً ہسٹریائی انداز میں اپنے آپ سے کہا۔

اچانک مجھے کار کے پیچھے، اور باہر سڑک پر سے کچھ غلغلہ سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ اور بھی میرے دشمنوں کی امداد کو آ گئے ہیں۔ گاڑی کی رفتار اب مزید پست پڑ گئی تھی۔ یا شاید وہ میرا وہم رہا ہو۔ لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں ایک لمحہ بھی رکنا کسی برے انجام کو دعوت دینا ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ میرے شیطان صفت متعاقبوں نے علامہ صاحب کی کوٹھی میں قدم نہ رکھا تھا۔ شاید وہ گھروں کے اندر آنے سے ڈرتے ہوں؟ لہٰذا سب سے اچھا یہ ہوگا کہ میں گاڑی کو کسی مناسب پھاٹک میں اڑا دوں، اور خود نکل بھاگوں۔ نکل بھاگوں گا کس طرح، وہ لوگ جھپٹ کر مجھے پکڑ تو نہ لیں گے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سڑک پر میری جانب، یعنی بائیں جانب، ایسی ہی محفوظ سی ایک کوٹھی دکھائی دی۔ ''وہ مارا''، میں دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک زبردست جھٹکے سے اسٹیرنگ کو بائیں گھما کر گاڑی کو پھاٹک میں ترچھا ڈال کر پوری طاقت سے بریک لگائی۔ بائیں گھومنے کے جھٹکے، اور پھر بریک لگنے کے جھٹکے سے گاڑی پھاٹک کے بیچ میں ترچھی ہو کر بند ہوگئی۔ تعاقب کرنے والے بھی ان جھٹکوں کی مرکز گریز Centrifugal قوت کی تاب نہ لا کر پیچھے ادھر ادھر گر پڑے۔ میں نے مڑ کر نگاہ کی تو میرا نزدیک ترین معاقب مجھ سے کوئی دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے کھینچ کر چابی گاڑی میں سے نکال لی اور اندھا دھند دوڑتا ہوا اس کوٹھی، یعنی اپنی پناہ گاہ میں داخل ہو گیا۔

بڑا سا بنگلہ تھا، لیکن ذرا سنسان سا۔ سامنے کوئی نوکر، مالی یا چوکی دار نہ تھا۔ اونچی کرسی کا برآمدہ، جس میں پرانی وضع کی آرام کرسیاں اور مونڈھے تھے۔ دیوار سے لگی ہوئی سنگار میز اور قد آدم آئینہ، اس کے پاس ہی ہیٹ وغیرہ رکھنے کا اسٹینڈ۔ زیادہ دیکھنے کا موقع تھا نہ ہمت۔ میں مکان کی لمبائی میں دوڑتا چلا گیا۔ برآمدے کے اختتام پر ایک کمرہ سا دکھائی دیا۔ اس کا دروازہ کچھ نیم وا، کچھ بھڑا ہوا سا تھا۔ میں نے جھٹ سے اس میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی چڑھالی۔

کمرے میں فنائل کی ہلکی سی بو تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ باتھ روم ہے۔ ٹٹول کر بجلی کا سوئچ تلاش کیا۔ زرد زرد روشنی ہوئی تو دیکھا کہ آٹھ سات فیٹ لمبا، اسی قدر چوڑا باتھ روم اور غسل خانہ ہے۔ کموڈ کی جگہ نئے ڈھنگ کا فلش تھا۔ اوپر لوہے کا ٹینک، اس سے زنجیر لٹکتی ہوئی۔ اس طرح کے فلش اس وقت ہندوستان میں بہت کم تھے۔ میں اس لیے واقف تھا کہ ریلوے کی دو بڑی کمپنیاں، جی آئی پی ریلوے G.I.P. Railway اور بی بی اینڈ سی آئی ریلوے B.B.&C.I. Railway اپنے اسٹیشنوں پر فرسٹ کلاس ویٹنگ روموں میں ایسے باتھ روم بنوا رہی تھیں۔ میں خود جی آئی پی ریلوے میں ملازم تھا۔

مجھے بری طرح پیشاب محسوس ہو رہا تھا۔ خدا معلوم ڈر کی وجہ سے، یا واقعی۔ لیکن ابھی میری پوزیشن بالکل غیر محفوظ تھی۔ ادھر ایسا لگ رہا تھا کہ پیشاب ضرور کرنا چاہیے، پتا نہیں پھر موقع ملے نہ ملے۔ میرا ہاتھ پتلون کی پیٹی کی طرف گیا ہی تھا کہ دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ پتا نہیں وہ میرے دشمن تھے، یا گھر کا کوئی فرد جسے شک ہو گیا تھا کہ کوئی باہری آدمی باتھ روم میں گھس آیا ہے۔ میں بہر حال خود کو اس حالت میں نہ سمجھتا تھا کہ دروازہ کھول کر باہر آؤں۔ لیکن باتھ روم میں خود کو چھپائے رہنے کا امکان کہاں؟ اور نکلوں تو جاؤں کہاں؟ پھر میری نگاہ پرلی طرف کی دیوار پر پڑی تو معلوم ہوا کہ ادھر بھی ایک دروازہ ہے۔ اب وہ جہاں بھی کھلتا ہو، میرے لیے وہی دروازۂ نجات کا دروازہ تھا۔

میں نے آہستہ سے پرلی طرف کی کنڈی کھول لی۔ دل میں خدا کا شکر بجالایا کہ دروازہ دوسری طرف سے بند نہ تھا۔ اول تو دو دو دروازے توڑنے میں ان لوگوں کو وقت لگے گا، دوسری بات یہ کہ جب اتنا شور وغل اور توڑ پھوڑ کا ہنگامہ ہوگا تو گھر میں کوئی تو متوجہ ہوگا۔ اسوقت مجھے یہ یاد نہ رہا تھا کہ میرے اپنے خیال کے مطابق ان شیطنوں کا طائفہ گھروں میں گھس نہ سکتا تھا۔ لہٰذا اغلب تھا کہ دروازہ پیٹنے والا (والے) اہل خانہ سے ہی متعلق ہو(ں)۔

دروازے سے باہر آ کر میں نے دیکھا کہ وہی برآمدہ اور آگے تک چلا گیا ہے۔ میرے دائیں جانب چاردیواری تھی، لہٰذا برآمدے کی شکل اب راہداری کی سی تھی۔ باتھ روم کے دروازے سے متصل ہی چاردیواری میں ایک دروازہ تھا جو سڑک کی طرف کھلتا ہوگا۔ دروازے کا ایک پاٹ کھلا ہوا تھا، اور اس میں سے تین ملازم صاف دکھائی دیتے تھے۔ وہ دہلیز اور سیڑھی پر بیٹھے ہوئے باتوں میں اس قدر محو تھے کہ انہوں نے میری موجودگی بالکل محسوس نہ کی۔ اور ظاہر ہے کہ میں بھی ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے حق میں نہ تھا۔

راہداری میں گربہ قدم چلتا میں کوئی دس گز گیا ہوں گا کہ ایک دروازہ نظر آیا جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ ادھر باتھ روم کا باہری دروازہ ٹوٹنے کی سی آواز ہلکی سی میرے کان میں آئی۔ میں نے مزید توقف کیے بغیر گھر کے دروازے میں قدم رکھ دیا۔ وہاں کمرہ نہ تھا، بلکہ ایک وسیع برآمدہ، سہ دری نما، جس میں کسی مصروف گھر کا تاثر صاف محسوس ہوتا تھا۔ ایک چوڑے پلنگ پر دو عورتیں بیٹھی چالیا کتر رہی تھیں۔ ان کی شکلیں اور وضع قطع اب بالکل نہیں یاد رہی۔ لیکن پلنگ کے پاس ایک بڑی سی گدے دار آرام کرسی Frong Chair پر دوہرے، گداز بدن کی ایک ادھیڑ، قبول صورت خاتون تھیں جو ساری میں ملبوس تھیں۔ ان کے سامنے کرسیوں پر دو نسبتاً نوجوان عورتیں سوئیٹر بن رہی تھیں۔ میں نے قیافہ کیا کہ ادھیڑ عمر خاتون ہی ان میں صاحب اقتدار ہیں۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ وہ میرے انداز، لب و لہجہ اور میری حواس باختگی سے یہ تو شاید سمجھ ہی گئیں کہ میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں۔ باقی لڑکیوں/عورتوں میں ضرور ایک طرح کی گھبراہٹ نظر آئی، لیکن کسی نے شور وغیرہ کچھ نہ مچایا۔ ممکن ہے کہ وہ ان خاتون کی وجہ سے خود کو محفوظ سمجھ رہی ہوں۔ خاتون نے میرے سلام کا جواب نہ دیا، بلکہ ذرا درشت لہجہ میں کہا:

''کون ہو تم؟ یہاں کیسے آئے؟ چلو، فوراً چلے جاؤ یہاں سے''۔ وہ خوف زدہ سے زیادہ جھنجھلائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

''خدا کے لیے مجھے پناہ دیجئے، میں بڑے خطرے میں ہوں''۔ میں نے سرگوشی کی سی آواز میں کہا۔

''کیوں؟ کیا پولیس تمہارے پیچھے ہے؟''

''یہ سب بعد میں بتاؤں گا۔ پولیس وغیرہ کا کوئی چکر نہیں۔ میں ایک باعزت انجینئر ہوں۔ کچھ بدمعاش میرے پیچھے لگ گئے ہیں''۔

''بدمعاشوں ہی کے پیچھے تو بدمعاش لگتے ہیں۔ شریفوں کو ایسے لوگوں سے کیا کام؟ چلو نکلو۔ ابھی نکلو۔ نہیں تو میں نوکروں کو بلواتی ہوں''۔

''پھر میرا خون ہو جائے تو آپ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گی؟'' اچانک میرے دل میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندا کہ یہ خاتون ہزار باعزت سہی، لیکن خاتون خانہ نہیں ہیں۔ ''لہٰذا آپ کسی ذمہ دار شخص کے پاس لے چلیں''۔

میرا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ پہلو بدل کر بولی، ''ذمہ دار؟ ذمہ دار اور کون ہے یہاں؟ تم بتاؤ، تمہارا معاملہ کیا ہے؟ اس کا لہجہ اب ذرا تیز تر تھا، اور زور لفظ ''تم'' پر تھا۔

میں نے اٹک اٹک کر اپنا حال بتانا شروع کیا۔ یہ بھی ڈر تھا کہ بات کچھ ایسی عجیب ہے کہ ان لوگوں کو یقین شاید ہی آئے گا۔ اگر ایسا واقعہ کوئی مجھ سے بیان کرتا تو میں اسے مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دیتا۔ اس خوف کے باعث میرا لہجہ خود مجھے ہی تیقن سے عاری لگ رہا تھا، اور میری روداد بھی ناقابل یقین معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن خیر، وہ لوگ تو توجہ سے سن رہے تھے اور داستان تھی ہی کتنی لمبی؟ چند منٹ سے بھی کم میں تمام ہو جاتی۔ میں نے بولنا شروع کیا، اور دل میں دعا کرتا رہا کہ ان لوگوں کو اعتبار آ جائے۔

وہ دروازہ، جس سے میں داخل ہوا تھا، یوں ہی کھلا ہوا تھا۔ سب کے دھیان میری کہانی کی طرف تھے۔ اچانک پیلی ملگجی قمیص والا شخص بڑے اطمینان سے اسی دروازے سے داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا پستول تھا۔

میں نے دوڑ کر ادھیڑ عمر خاتون کی کرسی کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔ لیکن اس شخص نے پستول کا رخ انہیں خاتون کی طرف کر دیا اور عجیب نخوت بھرے، سرد، سفاک، حقارت آمیز لہجے میں بولا:

''بول، میر تیرا کون لگتا ہوں؟''

میرے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ تو کیا یہ سب لوگ ایک ہی تھے؟ میں نے سراسیمہ ہو کر دل میں کہا۔

ابھی ہم میں سے کوئی اس حال میں نہ تھا کہ اس نئے خطرے سے دفاع کے لیے کچھ کرتا۔ ان سب عورتوں کے بدن بالکل ساکت تھے، جیسے پتھر کی مورتیں ہوں۔ میں جس جگہ چھپنے کی سعی ناکام کر رہا تھا، اس کے پیچھے ایک دروازہ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اس دروازے کے پیچھے بھی کوئی ہے۔

میں ابھی یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ دروازے کے پیچھے واقعی کوئی ہے بھی کہ نہیں، اور وہ میرا دوست ہے کہ دشمن۔ دفعتاً وہی دروازہ دھڑاکے کی آواز کے ساتھ کھلا اور ایک سیاہ سی چیز سائیں سائیں کرتی ہوئی اس میں سے نکلی اور باہر آنگن میں گردباد کی طرح قائم ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ وہ ساری عورتیں منہ کو دوپٹے سے ڈھانکے بے ہوش سی پڑی ہیں۔ پستول والا گھٹنوں کے بل تھا، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ کچھ اسطرح سینے پر تھے گویا بندگی بجا لا رہا ہو۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ادھیڑ عمر خاتون کے قدموں میں آ رہا تھا۔ لیکن خود انہیں کسی چیز سے مطلب نہ رہ گیا تھا۔ وہ گردن ڈھلکائے، ساری کے پلو میں منہ کو چھپائے آرام کرسی پر کپڑے کی گڑیا کی طرح ڈھیر تھیں۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ دل گویا بیٹھ کر جوتے کے تلے میں آ گیا تھا۔ لیکن دماغ (وہی حشراتی دماغ؟) تھوڑا بہت حاضر تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ بھاگ نکلنے کا اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ ممکن ہے اپنی گاڑی کو بھی اس گھر کے پھاٹک سے نکال لے جاسکوں۔

میں ڈرتا، چوروں کی طرح قدم رکھتا، بلکہ تقریباً گھسٹتا ہوا، اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ یہ پناہ گاہ کی بھی خوب رہی۔ آنگن میں وہ سیاہ گردباد ابھی بھی اسی طرح قائم تھا۔ سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ آواز کچھ ماتمی سی لگی۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال تھا کہ مجھے قطعاً کسی قسم کی آواز نہ کرنی چاہیے۔ بھلا وہ گردباد کیا تھا، کیا کوئی بدروح تھی، یا کوئی خدائی قہر؟ لیکن میرے شور کرنے نہ کرنے سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ شاید یہ بھی میرے حشراتی ذہن کا کرشمہ تھا، کہ اکثر رینگنے والے جانور خطرے کے سامنے دم سادھ کر پڑ جاتے ہیں، گویا مردہ ہوں۔

ملگجی قمیص والے کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے جی میں آئی کہ اس کی پسلیوں پر اپنے بوٹ سے ایک زوردار ٹھوکر لگاؤں۔ حرام زادہ مر تو چکا ہی تھا۔ لیکن نہ مرا ہو تو؟ اور وہ سیاہ گردباد؟ میں اس ارادے سے باز رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا کہ پستول ہی اٹھا لوں، شاید وہ اخوان الشیاطین ابھی باہر بیٹھے ہوں۔ مگر تھوڑی سی عقل جو واپس آ رہی تھی، اس کا مشورہ تھا کہ تم نہ پستول چلانا جانتے ہو اور نہ اس کا لائسنس ہی تمہارے پاس ہے۔ کیوں خواہ مخواہ ایک اور مصیبت کو دعوت دیتے ہو؟ ایک مشکل سے تو مر مر کے جینے کی نوبت آ رہی ہے، اب اور کوئی حماقت نہ کرو۔ چپکے یہاں سے نکل چلو۔ ''مگر وہ عورتیں، اور یہ ملگجی قمیص والا، کہیں یہ سب مر نہ گئے ہوں۔ کہیں پولیس میرا پیچھا نہ کرے''۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔

''بے وقوف آدمی''، میں نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔ ''اب دیر کرو گے تو پولیس نہ آتی ہو گی تو بھی آ جائے گی۔ اگر یہ

لوگ مر بھی گئے ہیں تو تم سے کیا مطلب؟ ہاں اگر پولیس نے یہاں تمہیں دیکھ لیا تو البتہ مشکل ہوگی۔ بندھے بندھے پھروگے۔ نوکری سے الگ ہاتھ دھونا پڑے گا۔ چلو، یہاں سے فوراً چل نکلو'' ۔

میں اس قدر آہستہ آہستہ وہاں سے نکلا گویا انڈوں پر چل رہا ہوں۔ گلیارے کے دروازے پر اندھیرا تھا۔ وہ تینوں نوکر بھی شاید سو گئے تھے، کہ بے ہوش تھے، پتا نہیں۔ میں ان کو چپکے سے پھاند کر اس آسیب گھر سے باہر آ گیا۔

سڑک پر روشنیاں جل اٹھی تھیں، ایک آدھ سواری بھی خراماں خراماں گزر رہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، لیکن کچھ بدلا ہوا سا بھی تھا۔ میری سمجھ میں فوراً یہ بات نہ آئی کہ کیا تبدیلی آ گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اچانک احساس ہوا کہ میکلوڈ روڈ اب صبح کی طرح سنسان نہیں تھی۔ اور یہ بھی کہ جب میں پیچھے کے گھر میں پناہ لینے کے لیے گھسا تھا تو اس وقت دھوپ نکلی ہوئی تھی، دن کے گیارہ کا عمل رہا ہوگا۔ اور میں ہرگز ہرگز اس گھر میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہ رہا تھا۔ پھر اس وقت یہ شام کیسی؟

گھبراہٹ اور خوف کے باعث مجھے بڑے زور کی متلی آئی۔ سارا منہ نمکین پانی سے بھر گیا اور جب تک میں خود کو سنبھالوں، مجھے ایک ابکائی، بلکہ بھینسے کی سی ڈکراتی ہوئی آواز کے ساتھ استفراغ ہوا۔ لیکن ایک تلخ، زرد سیاہی مائل گھونٹ کے سوا کچھ نہ نکلا۔ میں نے صبح کئی پیالی چائے کے ساتھ بہت معمولی ناشتہ کیا تھا اور تب سے اب تک تین چار گھنٹے ہو چکے تھے (یا شاید سارا ہی دن گذر چکا تھا)۔ پھر متلی میں نکلتا گیا۔ میں نے گرمی زدہ کتے کی طرح ہانپتے ہوئے اپنا سینہ اور پیٹ سنبھالنا چاہا۔ اس قے کے باوجود میری ابکائیاں کم نہ ہوئی تھیں۔ مجھے ''توبۃ النصوح'' کے شروع کا بیان یاد آیا کہ نصوح کو بھی بڑے زور کا استفراغ ہوا تھا۔ (جسے کوے کا پر، مجھے بچپن کی پڑھی ہوئی ایک کہانی بھی یاد آئی، استفراغ اتنا سیاہ جیسے کوے کا پر)۔ ''تو کیا مجھے بھی ہیضہ ہو رہا ہے؟ یا میں نے کہیں سے زہر تو نہیں منہ میں ڈال لیا؟'' میں نے گھبرا کر اپنے دل میں کہا۔

چکر سے بے حال ہو کر میں بے تحاشا پاس کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ چوٹ بچانے کی فکر میں ہاتھ جو دیوار پر زور سے مارا تو کوئی چیز بچھو کے ڈنک کی طرح چبھی۔ گھبرا کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ دیوار میں ایک موٹی کیل نکلی ہوئی تھی اور وہ کوئی آدھ انچ بھر میری ہتھیلی میں اتر گئی ہے۔ ہتھیلی سے خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ میری آستین اور پتلون پر بھی جگہ جگہ خون ٹپک گیا تھا۔ خوف اور خلجان کے ساتھ یہ چوٹ مجھے اور بھی بدحال کر گئی۔

مجبوراً اسی دیوار کو دیکھ بھال کر اور اسی سے ٹیک لگا کر میں ٹھہر گیا۔ رومال سے ہتھیلی پر پٹی کس کے باندھ لی کہ جریان خون کم ہو۔ دیر بعد طبیعت ذرا بحال ہوئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا، ''یہ سب جناتی کارخانہ معلوم ہوتا ہے۔ آیت الکرسی اس وقت ٹھیک سے یاد نہ آئی تو قل ھو اللہ احد، اور لاحول ولا قوۃ کا ورد شروع کیا۔ کچھ دیر بعد دل ذرا ٹھہرا۔ میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں پانی کہاں۔ میں نے دل سے کہا اب ہمت کر کے سڑک پر نکلو، اپنی گاڑی اٹھاؤ اور بھاگ لو۔ یہ پانی کے لیے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہتھیلی کی مرہم پٹی کی فکر اس وقت مناسب ہے۔

میں بوجھل قدموں سے اس بنگلے کے پھاٹک کی طرف چلا، جہاں میں نے گاڑی چھوڑی تھی۔ کچھ خوف اس بات کا بھی تھا کہ کہیں وہ موذی لونڈے ابھی موجود نہ ہوں۔ لیکن ان کا سرخیل تو وہاں اندر (مرا؟) پڑا تھا۔ وہ ناپاک حرام زادے بھی بھاگ گئے ہوں گے۔ دل میں یہ کہہ کر میں کوٹھی کے پھاٹک کی طرف الٹے پاؤں چلا۔

جب میں پناہ کے لیے بھاگ رہا تھا اس وقت تو وہ کوٹھی مجھے بہت کشادہ محسوس ہوئی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ اس کا باہری برآمدہ، اور اندر کی راہداری ملا کر کوئی ڈھائی سو فٹ کی طوالت رہی ہوگی۔ خلاف توقع اب وہ فاصلہ بہت کم نکلا۔ میں چند ہی قدم چلا

ہوں گا کہ عمارت کا پھاٹک نظر آ گیا لیکن میری کار وہاں کہیں نہ تھی۔ میں ایک لمحے کو سناٹے میں آ گیا۔ پھر میرے خیال میں آیا کہ چونکہ گاڑی میں نے پھاٹک میں اس طرح اڑا کر کھڑی کی تھی کہ راستہ بند ہو گیا تھا، اس لیے شاید کسی نے اسے ڈھکیل کر کنارے کر دیا ہو۔

لیکن گاڑی تو وہاں کہیں نہ تھی۔ حتیٰ کہ پھاٹک پر ٹائروں کا نشان، بریکوں کی گھسٹنی، کچھ بھی ایسی علامت نہ تھی کہ کوئی کار یہاں جھٹکا دے کر موڑی، اور پھر اسی طرح جھٹکے سے روکی گئی ہے۔ کار وہاں سے اس طرح مفقود تھی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ کوئی چور تو نہیں لے گیا؟ میں نے دل میں سوچا۔ لیکن کاروں کی چوریاں اس زمانیمیں قطعاً نہ ہوتی تھیں۔ کار کی چوری کرنیوالا اسے بیچتا بھی کس کے پاس؟ اس زمانے میں معدودے چند لوگ کار رکھتے تھے اور وہ زیادہ تر وکیل، ڈاکٹر، یا سرکاری افسر تھے۔ بہر حال، اگر کوئی چور بھی لے گیا تو مجھ میں اتنی ہمت اس وقت نہ تھی کہ اس چوری کی رپورٹ لکھاؤں۔ پولیس والوں کو کیا بتاتا کہ میں اس گھر میں کیا کرنے گیا تھا؟ اور کار کا تو وہاں نشان بھی نہ تھا، صرف چابی تھی جو میری جیب میں تھی۔ میں نے جیب ٹٹولی تو چابی واقعی موجود تھی۔

ریلوے کے اسسٹنٹ انجینئر کے لیے کار کی چوری کوئی معمولی حادثہ نہیں۔ مجھے فوراً تفتیش کرانی چاہیے تھی۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ میں دوسری کار بآسانی نہ خرید سکتا تھا، بلکہ شاید اب دوسری کار نصیب ہی نہ ہوتی۔ لیکن اس وقت میرے لیے چارہ ہی کیا تھا۔ پھر یہ بھی خیال میں آیا کہ گاڑی کوئی چھوٹی سی سوئی تو نہیں کہ کھو جائے تو دکھائی نہ دے۔ فی الحال تو یہاں سے چل دینا چاہیے، اور بہت جلد۔ انسان کی عقل معمولی چیزوں کو سمجھنے سے اکثر عاری رہتی ہے، اور یہ تو یقیناً کوئی مافوق الفطرت معاملہ ہے۔ اس میں زیادہ چھان بین بھی ٹھیک نہیں۔ خدا نے بڑا فضل کیا جو میں محفوظ رہا۔ ورنہ اکثر لوگ تو سنا ہے خوف کے مارے مخبوط الحواس ہو جاتے ہیں، یا جان ہی سے جاتے رہتے ہیں۔ ابھی اپنی فکر کرو، کار کی فکر بعد میں ہوگی۔

میں اپنے دل کو اس طرح سمجھا کر سڑک کی روشنی میں آیا۔ مجھے اپنے کپڑے خدا معلوم کیوں کچھ زردی مائل لگ رہے تھے۔ شاید میونسپلٹی کی بجلی ایسی ہی چندھیائی سی ہوتی ہے۔ سامنے سے ایک تانگہ آ رہا تھا، میں اسے روک کر سوار ہو گیا۔ میرے کپڑے اب اور بھی پیلے لگ رہے تھے۔ لاحول ولا قوۃ، کیا مجھے یرقان ہو گیا ہے؟ اتنے میں تانگے والے نے مڑ کر مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ شاید اس کی نگاہ میرے لباس کے سرخ چھینٹوں پر پڑ گئی تھی۔ یا پھر کیا میرے کپڑے سچ مچ پیلے ہو رہے تھے؟ اچانک مجھ پر بخار کا سا لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں تانگے والے سے کہا "مجھے اسٹیشن لے چلو۔ جلدی کرو گاڑی پکڑنی ہے"۔ مغل پورہ کا اسٹیشن وہاں سے قریب ہی تھا۔ تانگے نے مجھے منٹوں میں پہنچا دیا۔ اسی وقت پٹھان کوٹ ایکسپریس پلیٹ فارم پر داخل ہو رہی تھی۔ میں پٹھان کوٹ کا ٹکٹ لے کر ایک ڈبے میں دھنس پڑا۔ پٹھانکوٹ میں میرا کوئی نہ تھا تو کیا ہوا، ململی قمیص والا اور سیاہ گرد باد بھی تو وہاں نہ تھے۔

اور میں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے میرے ایک دوست نے پڑھ کر کہا:

"یہ کیا فضول بکواس تم نے لکھ ماری ہے؟ تم اپنی خود نوشت لکھ رہے ہو یا خواب میں دیکھے ہوئے اور دل سے گھڑے ہوئے واقعات لکھ رہے ہو؟"

"تم جانتے ہو میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ اپنی خود نوشت میں ایک حرف بھی جھوٹ نہ لکھوں گا۔ اور اسی لیے ہر صفحہ تم کو پڑھوا دیتا ہوں کہ اگر کوئی غلطی ہو تو اسے ٹھیک کرا دو"۔

"ہوگا۔ لیکن میں ٹھیک کراؤں کیا خاک؟ اس بار تو تم نے حد ہی کر دی۔ تم کہتے ہو ان دنوں تمہارے پاس امبیسڈر کار تھی۔ ابے احمق، یہ کار تو تقسیم ہند کے بعد برلا نے پہلی بار ۱۹۵۷ء میں بنائی تھی۔ انہوں نے انگلینڈ کی Morris Oxford کے نقشے ان کی اجازت سے حاصل کر کے پہلے تو Hindustan 14 نامی کار بنائی۔ دو تین سال بعد مارس کا ماڈل بدلا تو انہوں نے

نئے نقشے کے مطابق Landmaster اور پھر چند سال بعد جدید تر ڈیزائن کے مطابق Hindustan Ambassador کار وجود میں آئی۔ ۱۹۳۷ء میں امبیسڈر کہاں تھی جس میں بیٹھ کر تم علامہ سے ملنے گئے تھے؟''

میں نے چڑ چڑا کر کہا'' کار کا ماڈل بھول گیا ہوں گا۔ تم تو جانتے ہو کہ میرے پاس شروع نوکری ہی سے کار رہی ہے''۔

'' بڑے آئے کار کا ماڈل بھولنے والے۔ بھلا اپنی پہلی کار کا ماڈل تم اس قدر بھول گئے کہ عدم کو وجود میں لے آئے؟ اور بیٹے ذرا یہ تو بتاؤ کہ ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال صاحب میکلوڈ روڈ پر کہاں رہتے تھے؟ ۱۹۳۶ء کے اکتوبر میں یا اس کے کچھ پہلے حضرت علامہ نے میورو ڈ پر جاوید منزل کی تعمیر مکمل کر لی تھی اور فوراً ہی وہ اس میں منتقل ہو گئے تھے۔ تم ۱۹۳۷ء میں میکلوڈ روڈ پر ان سے کس جنم میں ملے ہو گے؟''

'' ہو سکتا ہے میکلوڈ روڈ نہیں، میورو ڈ رہی ہو''، میں نے جھنجھلا کر کہا۔'' نام میں ذرا ہی سا تو فرق ہے۔ کیا آدمی اتنی چھوٹی چھوٹی بات یاد رکھ سکتا ہے؟ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے سرجکندر سنگھ کا بنگلہ اور دو کانیں وہاں نہیں مل رہی تھیں''۔

'' بے شک آدمی ذرا ذرا سی بات یاد نہیں رکھ سکتا۔ لیکن یہاں تو اہم تفصیلات کا سوال ہے۔۔۔ ہاں اگر خودنوشت کے نام پر داستان امیر حمزہ لکھنی ہو تو اور بات ہے''۔

'' داستان امیر حمزہ کو کچھ نہ کہو۔ اس سے بڑھ کر تاریخی کتاب ممکن نہیں''۔ میں نے بھر کر کہا۔

'' خیر یہی سہی۔ لیکن عام پبلک کے سامنے ایسی بات نہ کہنا، ورنہ لوگ تمھیں پاگل خانے بھجوا دیں گے۔ اور بھائی صاحب، وہ لونڈے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں آپ نے کہیں اخبار میں پڑھا ہوگا۔ وہ لوگ جرائم پیشہ کنجر، یعنی ایک طرح کے خانہ بدوش تھے۔ ایک زمانے میں ان کا ایک قبیلہ لاہور میں کہیں سے آ گیا تھا اور اس کے افراد، خاص کر لڑکے بالے، چھوٹی موٹی چوریوں میں اکثر ماخوذ ہوتے رہتے تھے۔ میکلوڈ روڈ یا میورو ڈ تو نہیں، باغبان پورہ والی سڑک پر ضرور انھوں نے اپنے ڈیرے لگا رکھے تھے۔ آپ کبھی وہاں سے گزرے ہوں گے، پھر اسی کے بارے میں آپ نے کوئی خواب دیکھ لیا۔ اور اب زیب داستان کے لیے اسے اپنی خودنوشت میں ڈالے دے رہے ہیں''۔

'' اچھا یوں ہی سہی۔ تو یہ لو!'' یہ کہہ کر میں نے اپنی داہنی ہتھیلی اپنے دوست کی ناک کے نیچے اس کی آنکھ کے بالکل پاس تقریباً ٹھونس دی۔ ہتھیلی پر اب بھی چوٹ کا داغ بہت گہرا اور صاف تھا۔'' حرامزادے، یہ کیا ہے؟'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ '' کہو تو پٹھان کوٹ کے اس ڈاکٹر کا نام پتا بتا دوں جس نے اس چوٹ کا علاج کیا تھا''۔

میرا دوست ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گڑبڑا گیا ہے۔ مگر وہ بھی مجھ سے کم بے حیا نہیں۔ ذرا رک کر بولا،'' اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ہتھیلی پر یہ چوٹ تمھیں اسی وقت اور اسی جگہ لگی تھی جس کا ذکر تم نے افسانے۔۔۔ میرا مطلب ہے خودنوشت میں کیا ہے؟''

'' نہ سہی، لیکن وہ ڈاکٹر اگر ہوگا تو وہ وقت اور زمانے کی تصدیق تو کر دے گا''۔

'' پچاس سے اوپر برس ہو رہے ہیں۔ خدا معلوم وہ ڈاکٹر وہاں ہے بھی کہ مر کھپ گیا''۔

'' وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہ تھا، اور ضد کے علاج سے سقراط بھی معذور تھا''۔

'' مانا۔ لیکن میں تم سے جرح اس لیے کر رہا ہوں کہ تمھیں نے کہا تھا، اس کتاب کو دشمن کی نظر سے دیکھو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس میں ایک بھی بات غلط راہ پا جائے''۔

'' ہاں، اور اب تک تمھیں کچھ نہ ملا تو فرضی ہی الزام گڑھنا شروع کر دیے''۔

''سچی بات یہ ہے کہ تمہارے بیانیے میں اور باتیں بھی کھٹکی تھیں، لیکن وہ اتنی نمایاں نہ تھیں۔ اس باب میں تو تم نے واقعے کے نام سے **ایک** بھی حرف نہ لکھا''۔

''کچھ اور، مثلاً؟'' میں نے بڑی کوشش سے غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

''تم نے علامہ صاحب کی آواز کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اس وقت تک ان کی آواز بالکل بیٹھ چکی تھی''۔

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس ملاقات کی تفاصیل نہیں یاد''۔

''**مگر** اتنی اہم بات۔۔۔''

''**چپ** رہو۔ جانتے ہو، لفظ 'واقعہ' کے معنی حقیقت بھی ہیں، اور خواب بھی، اور موت بھی''، میں نے بڑے فخر سے کہا، گویا کوئی بڑی دریافت بیان کر رہا ہوں۔

''پھر تو مجھے کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ بتاؤ تم نے **منیر نیازی** کا مصرع کبیر کے سر کیوں مڑھ دیا؟''

''کیا بکتے ہو؟'' میں دہاڑا۔

''یہی کہ 'خالی شہر ڈراؤنا کھڑا تھا چاروں اور' **منیر نیازی** کا مصرع ہے اور یہ بات اس کے مجموعے 'دشمنوں کے درمیان شام' مطبوعہ ۱۹۶۸ کے صفحہ ۲۵ پر موجود ہے۔ تم نے ۱۹۳۷ء میں یہ مصرع کبیر کے نام سے کہاں دیکھ لیا؟ چلو اب مان بھی جاؤ کہ تم نے اپنی خودنوشت میں **ایک** افسانہ بھی ڈال دیا ہے''۔

''سب افسانے سچے ہوتے ہیں! سب افسانے سچے ہوتے ہیں!'' **ایک** لمحے کی خاموشی کے بعد میں چیخ کر بولا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

گھونسلا

شوکت حیات

ٹرین کسی ویران علاقے سے گزر رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔
کسی نے اس کے اندر اس کے پھیپھڑے کو بے دردی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔

''**بد بخت تیرا کوئی اسٹیشن ہے۔۔۔؟**''

دباؤ بڑھتا گیا۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں نے اسے حیرت واستعجاب سے دیکھا اور اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے کہ اسے قلب کا دورہ پڑنے والا ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے سوچا کہ سچ مچ اس کا اور اس کے جیسے کروڑوں لوگوں کا اس بھری پری دنیا میں کہیں کوئی اسٹیشن نہیں۔

پورے سفر میں دو افراد کے متعلق وہ شدت سے سوچتا رہا تھا۔ ایک وہ جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔۔۔ اس کا باپ۔۔۔ اور دوسرا وہ جس سے کسی طرح کا کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب سا نامعلوم تعلق تھا۔ جس کے ادھ کھلے کھرے ہونٹ کا ذائقہ اب بھی اس کی شریانوں میں سنسنی کی لہر دوڑا دیتا تھا اور جس کے سانولے سلونے وجود کے تصور کی گرمی بھی خود اس کے وجود کو موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔ یہ لوگ ملاقات ہونے پر کس طرح چونک جائیں گے۔ پہلے تو حواس باختہ ہو جائیں گے پھر جب ان کے اوسان بحال ہوں گے تو سوچیں گے کہ آن واحد میں انہیں فرطِ انبساط کی کیسی بیش بہا دولت مل گئی۔

انہیں سرپرائز دینے کے خیال سے بغیر کسی اطلاع اور خبر کے وہ اس سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو وہ اتر گیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ ہر شے پر ایک عجیب پراسراری گم شدگی کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے ایک راہ گیر سے بغیر کسی ارادے کے پوچھ دیا۔

''کیوں بھئی۔۔۔ لائٹ کب سے آف ہے۔۔۔؟''

''کیا کہا جائے بابو جی۔۔۔ جب سے بڑے شہر میں بجلی کی سپلائی بڑھ گئی ہے، یہاں کا کوٹا کاٹ دیا گیا ہے۔۔۔''

''بہت دیر دیر کے لیے روشنی غائب رہتی ہے۔۔۔ اور آس پاس جو گاؤں ہیں، ان کا تو حال پوچھو ہی مت۔۔۔ بجلی کی لائن ہوتے ہوئے بھی سب ایک کرن کو ترستے ہیں۔۔۔ کہیں کوئی پیداوار ہی نہیں ہوئی۔۔۔!''

بڑے شہروں کو سڑی ہوئی گالیاں دیتے ہوئے اس نے قدم بڑھائے۔ رات زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن دبیز تاریکی کی وجہ سے ڈھلی ہوئی رات کا گمان ہوتا تھا۔ پلیٹ فارم کے باہر رکشے قطار میں کھڑے تھے۔ سب کے سب اپنی طرف توجہ کھینچنے کے لیے طرح طرح سے اپنے اپنے رکشوں کی گھنٹیاں بجا رہے تھے۔ اور منہ سے مختلف سروں کی آوازیں نکال رہے تھے۔ اچانک پورا ماحول ان کے شور سے متحرک ہو گیا تھا۔ اسے لگا کہ کوئی پرندہ عرصہ دراز کے بعد صعوبتوں بھرے سفر سے نجات حاصل کر کے اپنے گھونسلے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ وہ خود کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور تکان کی گرد کو اپنے وجود سے جھاڑ دیا۔ قلی نے ایک رکشے پر اس کا سامان رکھا، رکشے والے نے اندھیرے میں اسے گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ زیادہ دیر وہ ان آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور سیٹ میں دھنس گیا۔

''کہاں چلنا ہے بابو جی۔۔۔؟''

''بس چلنا ہے۔۔۔باہر کا آدمی نہیں ہوں۔۔۔اسی مٹی کا یہ جسم ہے۔۔۔چلو۔۔۔میں۔۔۔تمہیں راستہ بتاتا چلوں گا۔۔۔بس فی الحال سیدھ میں آگے بڑھتے چلو۔۔۔مگر جلدی جلدی نہیں، دھیرے دھیرے۔۔۔ایک مدت کے بعد یہ سب دیکھنا مقدر ہوا ہے تو راستے کے سارے مناظر کو جذب کرنا چاہتا ہوں۔۔۔''

وہ راستے کی سمتوں کے متعلق ہدایتیں دیتا ہوا اطراف کے سارے نیم تاریک جلوؤں کو اپنے اندر سمیٹتا جارہا تھا۔

''دیکھتے ہو بدبخت۔۔۔سب کچھ بدل گیا ہے۔۔۔تم اپنے ٹھکانے پر پہنچ بھی نہیں سکو گے۔۔۔مجھے تو سب کچھ بہت اجنبی اور ڈراؤنا لگ رہا ہے۔۔۔اب تک میں تمہیں ڈسٹرب کررہا تھا۔۔۔اب تم میری جان کو آرہے ہو۔۔۔''

اس نے اپنے اندر کے آدمی کی بکواس کی طرف دھیان نہیں دیا اور رکشا والے سے پوچھا۔

''بھائی رکشا والے یہ وہی شہر ہے نا۔۔۔؟''

''کون سا۔۔۔؟''

''وہی اپنا شہر۔۔۔!''

بڑی تیزی سے اس کے اندر کسی نے اپنے پلپلے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پھر جیسے اس کے پھیپھڑے کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔

''بدبخت تیرا کوئی شہر ہے۔۔۔۔؟''

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا۔اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔نقاہت کے عالم میں وہ رکشا کی سیٹ پر نیم دراز ہوگیا۔اس کا پاؤں رکشا والے کے پاؤں سے ٹکرایا۔اس نے گردن گھمائی۔

''بابو جی۔۔۔آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔۔۔آپ کہیں تو اسپتال کا رخ کروں؟''

وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے بڑی بے بسی سے رکشے والے کو دیکھتا رہا۔اسے جیسے سکتا لگ گیا تھا۔چاہتے ہوئے بھی منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔رکشے والے نے رکشا روک دیا اور اتر کر اسے جھنجھوڑنے لگا۔

''بابو صاحب۔۔۔بابو صاحب۔۔۔!''

''ٹھیک ہوں بھیا رکشے والے۔۔۔کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے۔۔۔بات یہ ہے بھائی کہ میں صدمے کو برداشت نہیں کر پاتا۔۔۔اور میں کر بھی لوں۔۔۔لیکن وہ جو ایک کتا میرے اندر بیٹھا ہے۔۔۔وہ حرامی پن سے باز نہیں آتا۔۔۔۔موقع ملتے ہی کچوکے لگاتا ہے۔۔۔''

''کون کتا۔۔۔؟''

''جانے دو بھائی۔۔۔۔جانے دو۔۔۔کوئی نہیں۔۔۔ایسے ہی وہ میرے لیے مصیبت بنا رہتا ہے۔۔۔کچھ برا لگ گیا تو جانے کیسے عذاب میں مبتلا کردے گا۔۔۔''

(میں تمہارے لیے۔۔۔یا تم میرے لیے مصیبت بنے ہوئے ہو۔۔۔مجھے کتا سمجھنے والے کتے۔۔۔)

رکشے والے نے رکشا چلاتے ہوئے گردن گھمائی۔

''آپ اکیلے ہیں بابو جی۔۔۔تو بات کس سے کررہے ہیں۔۔۔۔؟''

''بھائی رکشے والے۔۔۔تم پریشان نہ ہو۔۔۔میں بیمار آدمی ہوں۔۔۔میرے وجود میں کچھ سانپ، کچھ کتے اور کچھ خنزیر اپنا ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔۔۔جب جب ان کا حملہ ہوتا ہے بڑبڑانے لگتا ہوں۔۔۔'' رکشا والے نے اسے بہت گھوور کر دیکھا۔

''اب بتائیے بابو جی الٹے ہاتھ یا سیدھے ہاتھ؟''

''الٹے ہاتھ۔۔۔!''اس نے جواب دیا اور پھر اندر والے کی طرف سے دھیان ہٹاتا ہوا عہد گزشتہ کو یاد کرنے لگا۔ اس کے ابا کتنے ضدی اور رجعت پسند ہیں۔ ہوم سکنس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس نے کتنا کہا کہ وہ تو اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے ہیں، اسی کے ساتھ چل کر رہیں لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ اپنی زمین، اپنی ڈیوڑھی چھوڑ کر جانا ہی نہیں چاہتے۔ بار بار سمجھانے پر بھی انہوں نے یہی کہا کہ وہ اپنی روایتوں سے کٹنا نہیں چاہتے۔ ان کے مدفن میں ہی نئی زندگی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور جو اپنی جڑوں سے کٹ جاتے ہیں، وہ پروان نہیں چڑھتے۔۔۔ اب انہیں کیسے سمجھایا جائے کہ روایتیں زمین میں نہیں بلکہ دل و دماغ اور روح میں اگتی ہیں۔۔۔ سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہیں۔۔۔ گھر اور جائیدادروایتوں کا مدفن ہی نہیں، نئی روایتوں کا مذبح بھی ہیں۔

جس دن یہ باتیں اس نے کھل کر کہیں، بابا نے اس سے ناطہ توڑ لیا۔

''بدخلف۔۔۔ مجھے پڑھاتا ہے۔۔۔ جاہل۔۔۔''

''اب کدھر چلوں بابو جی۔۔۔؟''

اس کا دھیان بٹ گیا۔

''بس۔۔۔ بس۔۔۔ ذرا دھیرے کرو۔۔۔ رکو۔۔۔ یہیں اترنا ہے۔۔۔!''

حیرت سے اس نے ادھر ادھر دیکھا کافی غور کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ جہاں پر بابا کا گھر سمجھ کر اس نے رکشا کو روک لیا تھا، وہاں تو دور دور تک چٹیل میدان تھا۔ اس سے ضرور کوئی غلطی ہوگئی۔ گھر پہنچنے کی مسرت پر قابو نہ پاتے ہوئے وہ اپنا محلّہ آتے ہی ہڑبڑا کر رکشا سے اتر گیا تھا۔ لیکن اب اسے احساس ہوا کہ راستوں اور سمتوں کے متعلق رکشے والے کو ہدایت دیتے ہوئے اس سے سہو ہوگیا ہے۔ وہ رکشا پر بیٹھ گیا۔

''یار رکشے والے۔۔۔ گاڑی گھمالو۔۔۔ بھائی اتنے زمانے کے بعد اپنے علاقے میں آیا ہوں۔۔۔ پھر روشنی بھی نہیں ہے۔۔۔ اندھیرے میں راستے کا مجھے صحیح اندازہ نہ ہوا۔۔۔ اب چلو۔۔۔ پوری احتیاط سے ہدایت دوں گا۔۔۔''

''بابو جی آپ محلے کا نام تو بتائیے!''

یار نام میں کیا رکھا ہے۔۔۔ میں تو ساتھ ہوں۔۔۔ اس سے زیادہ شرم کی کیا بات ہوگی کہ باپ دادا کی حویلی تک میں خود اپنی رہنمائی نہ کرسکوں۔۔۔ ہاں رکشا کو سیدھے ہاتھ موڑ لو۔۔۔ اب الٹے۔۔۔ اب سیدھے۔۔۔ پھر دیکھو۔۔۔ آگے جو چوراہا ہے۔ اس سے نکلتی ہوئی سب سے پتلی شاہراہ کی طرف۔۔۔''

اس بار اس نے بالکل نئے راستوں سے رکشے والے کی رہنمائی کی۔ اندھیرے میں منزل مقصود پر پہنچتے ہی جھٹکے کے ساتھ رکشے سے اترا تو دیکھا کہ اس کے مطلوبہ علاقے کی جگہ چٹیل میدان تھا۔

''اف ف پھر غلطی ہوگئی۔۔۔ رکشا گھماؤ بھائی۔۔۔''

اس نے پھر راستے بدلے۔ تاریکی میں اس بار دوسرے راستوں کا انتخاب کرتے ہوئے آگے بڑھا اور اس بار بھی سفر نے اسی چٹیل میدان پر دم توڑا۔ جھنجھلاتے ہوئے چوتھی مرتبہ وہ پھر نئے راستوں سے آگے بڑھا اور پھر وہی چٹیل میدان۔ اس نے سوچا ضرور کوئی گڑبڑ ہے لیکن اس کے علاقے کے سامنے اور اڑوس پڑوس کے جو علاقے تھے، وہ تو اپنی جگہ قائم تھے اور اس کے علاقے کی پہچان اور حوالہ بن رہے تھے۔ صرف اس کا علاقہ۔۔۔ اس کا گھر اپنی جگہ سے غائب تھا۔۔۔

وہ سامنے ہی رام انکل کا مکان ہے۔۔۔ اس طرف گیتا چاچی ہیں۔۔۔ ادھر شنکر چاچا۔۔۔ سبھوں کے مکان تو اپنی

اصلی حالت میں موجود ہیں۔۔۔اس کے اندر جذبوں کا ابال برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔۔۔جی چاہا جا کر رام انکل کے سینے سے لپٹ جائے۔۔۔گیتا چاچی کو سلام کر کے آشیرواد لے۔۔۔کتنا خوش ہوں گی وہ۔۔۔۔مجھے دیکھ کر۔۔۔اور شکنتلا تو اب کافی بڑی ہوگئی ہوگی۔

شاید شادی کر کے اپنے سسرال جا بسی ہو۔۔۔اس زمانے میں زیرلب شرمائی شرمائی یوں مسکراتی تھی جیسے جوانی کے سربستہ رازوں کے متعلق سب کچھ سمجھتی ہو۔۔۔اب تو بال بچوں والی ہوگئی ہوگی۔۔۔ممکن ہے اب تک شادی نہ ہوئی ہو۔۔۔چلو، انہیں لوگوں سے پوچھ لوں۔۔۔میرا گھر کہاں ہے۔۔۔نا۔۔۔شہر میں مکانوں کی بھیڑ میں ان کی انفرادی شناخت مشکل ہے۔۔۔ بھلا ان ہمدرد پڑوسیوں کے گھروں کے سلامت ہوتے ہوئے اپنا گھر کہاں غائب ہو سکتا ہے۔۔۔میں بھول کر رہا ہوں۔۔۔ اندھیرے میں حافظہ میرا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے۔۔۔اندھیرے میں۔۔۔ہر طرف اندھیرا ہی تو ہے۔۔۔گہرا اندھیرا۔۔۔اسی اندھیرے میں ہم سب کو گم بھی ہو جانا ہے۔۔۔رام انکل، گیتا چاچی، شنکر چاچا، شکنتلا، بابا، یہ رکشا والا۔۔۔سب کے سب اندھیرے کی خوراک بن جائیں گے۔۔۔

''بابو جی۔۔۔! آپ کہاں کھو گئے۔۔۔۔؟''

''ہاں!'' وہ چونکا۔

''میں اپنے گھر کے جغرافیہ پر غور کر رہا تھا کہ کہیں سے اس کا صحیح سراغ ملے''۔

اس نے ان گنت بار راستے بدلے اور ہر بار اس تاریکی میں چٹیل سنگلاخ میدان کی نحوست سے دوچار ہوا۔اس نے سوچا، کیا اس شہر کے سارے راستے اسی چٹیل میدان تک پہنچتے ہیں۔۔۔میرا گھر اور میرا علاقہ آخر کہاں ہے۔۔۔؟

اس کے اندر کلبلاہٹ ہوئی اور کسی نے پھر اس کے پھیپھڑے پر دباؤ تیز کر دیا۔

''بدبخت تیرا گھر اور تیرا علاقہ ہے۔۔۔؟''

اسے جیسے سکتہ لگ گیا۔چہرہ سرخ ہو گیا۔رکشے والے نے اسے جھنجھوڑا تو اس کا سکوت ٹوٹا۔

سچ مچ میرا کوئی گھر اور میرا کوئی علاقہ کہاں ہے۔۔۔۔؟

''اس بار مسجد والے راستے سے چلو۔۔۔؟''

نتیجہ پھر وہی چٹیل میدان۔مندر والا راستہ بھی چٹیل میدان ہی تک پہنچا۔یہاں تک کہ چرچ اور گوردوارے کے راستے بھی اسے چٹیل میدان کے علاوہ اور کہیں نہیں پہنچا سکے۔

''کیوں، کیا ہوا رکشے والے؟''

رکشا والا اس کے سوال سے بے خبر اندھا دھند رکشا چلائے جا رہا تھا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''تم اتنا تیز کیوں چل رہے ہو رکشے والے اور پیچھے مڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو۔۔۔؟''

اس نے رکشے والے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔رکشے والے نے جھٹکے سے بریک لیا اور خوف زدہ آنکھوں سے پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے رکشے والے؟'' اس نے بڑی ہمدردی کے لہجے میں کہا۔حالانکہ اس کی سراسیمگی کو دیکھ کر وہ خود بھی خوف میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''نہیں معلوم کیوں بابو جی۔۔۔کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان گنت بھاری بھرکم بوٹ گھوڑوں کی ٹاپوں کی طرح

سرپٹ دوڑتے ہوئے میرے رکشے کا پیچھا کر رہے ہیں۔۔۔ مجھے روندنے کے لیے میرے تعاقب میں ہیں۔۔۔''

''نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ تمہارا وہم ہے۔۔۔ یہاں سے وہاں تک پوری سڑک پر سناٹا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔۔۔ لگاتار رکشا چلاتے رہنے کی وجہ سے تمہیں ایسا گمان ہو رہا ہے۔۔۔''

''ہوسکتا ہے بابو جی۔۔۔ ہوسکتا ہے۔۔۔'' رکشاوالا پسینہ پونچھنے لگا۔

اتنی طویل مسافت اور اس کی پراگندہ باتوں سے رکشاوالا اوب چکا تھا۔ اس نے کہا کہ اب اس میں آگے بڑھنے کی طاقت نہیں ہے۔ بھاری بھرکم بوٹ اس کے تعاقب میں ہیں اور بہتر ہوا گر وہ اس کی اجرت ادا کر کے اسے چھٹکارا دے۔

''تم تھکے نہیں ہو۔۔۔ بلکہ ڈر گئے ہو۔۔۔ میں بھی دیکھوں کدھر سے آتی ہے وہ بوٹوں کی چاپ۔۔۔''

اس نے رکشے والے کو سیٹ پر بیٹھا دیا اور خود اگلی سیٹ پر سوار ہو کر رکشا چلانے لگا۔ نت نئے راستوں سے ہوتا ہوا اس بار بھی وہ اسی چٹیل میدان کے نزدیک پہنچا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا رکشاوالا سسکتا ہوا زار و قطار رو رہا تھا۔

''رکشے والے تم رو کیوں رہے ہو۔۔۔؟'' وہ اس کی بغل میں آکر بیٹھ گیا۔ رکشاوالا اور زور زور سے رونے لگا۔ روتے ہوئے بڑی مشکلوں سے وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''تم جس علاقے، جس بستی کو ڈھونڈ رہے ہو، اسے عرصہ پہلے بلڈوزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا۔۔۔ میں بھی ہفتوں اسی طرح پورے شہر میں دیوانہ وار پاگلوں کی طرح چکر کاٹتا ہوا بار بار اسی چٹیل میدان تک پہنچتا تھا۔۔۔ بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا۔۔۔ بھری پری بستی کو ملبے میں تبدیل کیا اور پھر چٹیل میدان بنا دیا۔۔۔ میری دکان، میرا گھر اور تمام اہل وعیال زندہ درگور ہوگئے۔۔۔ بیٹے میں نے تو صبر کر لیا تھا لیکن آج بار بار اس چٹیل میدان کو دیکھ کر پرانے زخم ہرے ہوگئے''۔

''بابو جی۔۔۔ بابو جی۔۔۔ تم سن رہے ہو۔۔۔؟''

اس بار رکشے والے کے بار بار جھنجھوڑنے پر بھی بابو جی کا سکوت نہیں ٹوٹا۔

دور آسمان میں ایک چھوٹا سا طائر اپنی پوری طاقت سے اپنے گھونسلے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔۔۔

☆☆☆

ایک عام آدمی کی کہانی

طاہر نقوی

میں تھکا ماندہ گھر میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ بیوی فرش پر بیٹھی حسب عادت اپنے نصیب کو کوس رہی تھی۔ پہلے تو میں نے معاملے کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پھر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بین کرتے ہوئے گویا خود کو کہا کہ اس گھر میں آ کر کبھی کوئی سکھ نہیں ملا۔ یہ اس کا پرانا شکوہ تھا۔ اس نئی افتاد کے بارے میں اس سے کچھ دریافت کرنے کے بجائے میں کپڑے بدلنے اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ میرا ذہن اسی الجھن میں گرفتار رہا۔ واپس آیا تو وہ اب تک اسی طرح سر پکڑے بیٹھی تھی اور بیٹی اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں کھانے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔ بیوی نے جلے کٹے لہجے میں بتایا کہ اس وقت کھانے کو گھر میں کچھ نہیں۔ میں اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے چپ ہی رہا۔ اس نے منہ پھیر کر بتایا:

"میرے پاس جو پیسے تھے، وہ تمہارا لاڈلا لے گیا"۔

"تو اب یہ نوبت آ گئی"۔ مجھے غصہ آ گیا۔

"انکار کرتی تو چھین کر لے جاتا"۔

مجھے بپھرا ہوا دیکھ کر بیٹی نے حسب عادت مجھے غصہ نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میرے پاس کچھ رقم تھی۔ اس سے کھانا پکانے کی ضروری اجناس لینے کے لیے محلے کی دکان پر پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی دکاندار نے بگڑ کر بتایا کہ آپ کا بیٹا روزانہ سگریٹ اور دوسری چیزیں ادھار لے جاتا ہے۔ اب کافی رقم بن چکی ہے۔ تقاضا کرتا ہوں تو ایک سیاسی جماعت کی دھمکی دیتا ہے۔ میرا ذہن جھنجھنانے لگا۔ اس رقم سے میں نے دکاندار کا قرض چکا دیا اور خالی ہاتھ گھر چلا آیا۔ میں نے بیوی کو کوئی بات نہیں بتائی۔ اسی طرح میرا بیٹا اکثر گھر سے رقم چرا لیا کرتا تھا۔ میں اس سے پوچھ گچھ کرتا تو میری بات ماننے کے بجائے چیخنے لگتا۔ اپنی عزت رکھنے کی خاطر میں مجبوراً چپ سادھ لیتا۔ ایسے موقع پر بیوی بھی مجھے خاموش رہنے کو کہتی۔ یہی نہیں، کالج کی ماہانہ فیس جمع کرانے کے بجائے وہ نہ جانے کہاں اڑا دیتا۔ وہاں سے نوٹس آتا تو میری پوچھ گچھ پر کوئی مناسب جواب دینے کی بجائے وہاں سے کھسک جاتا۔ میں روکتا تو بدتمیزی پر اتر آتا۔ مجھے اس کے سدھار کی کوئی توقع نہیں رہی تھی۔

گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے میں اکثر و بیشتر آفس میں اوور ٹائم کرتا رہتا۔ اس سے نہ صرف مالی مدد ہو جاتی بلکہ کچھ وقت بیوی کی بدمزاجی سے بھی محفوظ رہتا تھا۔ رات کو جب تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو وہ حسب عادت کسی نہ کسی بات پر کج بحثی کرنے لگتی۔ بیٹی اپنی ماں کے مزاج سے واقف تھی، اس لیے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کرتی رہتی۔ جہاں بیٹی کا رشتہ طے ہوا تھا، انہوں نے شایان شان جہیز دینے کے لیے طویل فہرست پکڑا دی تھی۔ میں مختلف حیلوں سے شادی کو ٹالتا رہا۔ وہ انتظار کرتے کرتے اب بیزار ہو چکے تھے۔ بیوی اٹھتے بیٹھتے مجھے یہی طعنے دیتی رہتی۔ قلاش آدمی کی بیٹی کی شادی کسی اچھے گھرانے میں نہیں ہو سکتی۔ تم اسے گھر میں بٹھائے رکھو۔ میں کوئی جواب نہ دیتا۔ کیونکہ اس طرح اور بدمزگی پیدا ہو جاتی۔ ایسی نازک صورت حال میں کبھی بیٹا گھر میں داخل ہوتا تو یہ سب دیکھ کر جھنجھلا جاتا: "اسی لیے میرا جی گھر میں نہیں لگتا"۔

اس بہانے وہ الٹے پاؤں لوٹ جاتا۔ گھر کے ماحول میں ہر وقت تناؤ سا رہتا تھا۔ بیٹی کو بخوبی احساس تھا کہ یہ سب اس کی ماں کی بدمزاجی کی وجہ سے تھا مگر کچھ کہہ نہ پاتی کیونکہ ہر لمحے ہنگامے کا اندیشہ رہتا تھا۔ ایک شام اوور ٹائم کر کے میں آفس سے نکلا

توشہر کی حالت بدلی ہوئی نظر آئی۔ سڑک سے ٹریفک غائب اور بازار بند۔ میں نے حیران ہو کر ایک راہ گیر سے سبب دریافت کیا تو پہلے اس نے مجھے تعجب سے دیکھا، پھر بتایا کہ کسی سیاسی جماعت کے کارکن کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے یہ ہڑتال ہوئی ہے۔ ویسے بھی اس شہر میں ہڑتال کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، بس ہو جاتی ہے۔ لاشعوری طور پر سب سے پہلے مجھے یہی خیال آیا کہ کہیں میرا بیٹا کسی فساد میں ملوث نہ ہو جائے۔ میں گھر والوں کو اپنی خیریت بتانا چاہتا تھا مگر موبائل فون نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ چند روز قبل میرا موبائل فون گھر سے غائب ہو گیا تھا۔۔۔ وقفے وقفے سے کوئی رکشہ نظر آتا تو میں اس کے پیچھے لپکتا۔ شہر کی ایسی صورت حال سے رکشہ ٹیکسی والے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے یہ اندازہ تھا مگر مجبوراً ایک رکشے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جگہ کا نام بتایا تو اس نے میرے اندازے سے کہیں زیادہ کرایہ مانگا اس لیے میں نے پیدل گھر جانے کا ارادہ کیا۔ آگے بڑھا تو ایک ویگن آ کر رکی۔ لوگ نہ صرف اس کی چھت پر سوار تھے بلکہ گیٹ سے باہر تک نکلے ہوئے تھے۔ دو تین مسافر اترے تو میں اپنی تمام قوت استعمال کر کے ویگن میں سوار ہو گیا۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ مسافر حسب معمول ایک دوسرے سے الجھتے اور سیٹوں پر بیٹھے بوڑھے سیاست پر خیال آرائی کرتے رہے۔ میں نے سوچا کہ شاید پاکستان وقت سے بہت پہلے آزاد ہو گیا تھا۔ میرا سٹاپ آیا تو گیٹ پر دھب دھب کرنے کے باوجود ویگن نہیں رکی بلکہ صرف اس کی رفتار کم ہوئی۔ مجھے کود کر اترنا پڑا۔ ایسا محسوس ہوا گویا میں خود نہیں اترا بلکہ مجھے باہر کی طرف دھکیلا گیا۔

گھر پہنچا تو بیٹی نے مجھے دیکھتے ہی اطمینان کا سانس لیا۔ گرمی کی وجہ سے پنکھا آن کیا تو بجلی غائب تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کے نلکوں میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ میری کوفت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ حسب عادت بیوی مجھے دیکھ کر برا سا منہ بناتی رہی۔ اب شاید اس کا چہرہ ویسا ہی ہو چکا تھا۔ میں نے اوور ٹائم کی رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس کے باوجود اس کا موڈ اسی طرح بگڑا رہا۔ میں نے وجہ معلوم کرنے کے لیے بیٹی کی طرف دیکھا تو اس نے گردن جھکا لی۔ اب مجھے پریشانی لاحق ہو گئی۔ میں نے جھلا کر بیوی سے پوچھا ''آخر کیا ہوا؟''

''وہی جس کا خوف تھا''۔ اس نے تنک کر جواب دیا۔

لمحے بھر میں کئی برے برے خیالات میرے ذہن میں گھوم گئے۔ بیٹی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے بیوی کو پھر کریدا۔ تب اس نے طنزیہ لہجے میں بتایا۔ ''لڑکے والوں نے رشتے سے انکار کر دیا''۔

''کیوں؟'' میں اچھل پڑا۔

''کوئی وجہ نہیں بتائی''۔ اس نے سر تھام لیا۔

''کچھ پوچھا تو ہوتا''۔

بیوی نے مجھے حقارت سے دیکھا اور جلے کٹے لہجے میں جواب دیا ''انجان کیوں بنے ہوئے ہو؟''۔

اب میں اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

''اپنی سی محنت کر تو رہا ہوں''۔ شکستہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے میں اپنا سر تھامے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بگڑ کر پھر کہا: ''آخر وہ کب تک انتظار کرتے''۔

اپنی بے بسی پر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ اسی لمحے بیٹا داخل ہوا۔ وہ مجھ پر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ شاید اس نے ساری بات سن لی تھی۔ پھر اسی طرح ہنستا ہوا واپس چلا گیا۔ اب بیوی نے مجھے حسب عادت نفرت سے دیکھا ''تمہارا زندہ رہنا ہمارے لیے بیکار ہے''۔

کوئی جواب دینے کے بجائے میں اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اپنے آپ کو پلنگ پر گرا کر میں اپنے حالات کے متعلق سوچنے لگا۔ نہ جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔ شاید ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر زوردار دستک سے میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ پڑوسی نے طنزیہ انداز میں بتایا: "تمہارا بیٹا ڈکیتی کے جرم میں گرفتار ہو گیا"۔

یہ بتا کر وہ الٹے قدم واپس چلا گیا۔ چند لمحے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ یہ سن کر بیٹی رونے لگی اور بیوی نے اپنا فقرہ دہرایا کہ اس گھر میں آ کر اس کی قسمت پھوٹ گئی۔ اسے خود اپنی تربیت میں کبھی کوئی نقص نظر نہیں آیا۔ بیٹی نے روتے ہوئے کہا کہ بھیا کے لیے کچھ کیجیے۔ بیوی نے مجھے اسی انداز سے دیکھا مگر چپ رہی۔ میں بھاری قدموں سے علاقے کے تھانے پہنچا۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ جب تھانیدار کو معلوم ہوا کہ میں کس مقصد سے آیا ہوں تو یکایک اس نے کرخت لہجہ اختیار کر لیا۔ میری کوئی بات نہیں سنی۔ میں مایوس ہو کر اس کے کمرے سے باہر نکلا تو ایک پولیس والا قریب آیا۔ میری کیفیت دیکھ کر اس نے سرگوشی کی صرف ایک ہی ترکیب ہے۔ میں نے اسے سوالیہ انداز میں دیکھا تو اس نے بتایا کہ میں تھانیدار کی ٹیبل پر پانچ ہزار روپے رکھ دوں۔ ایف آئی آر کٹ گئی تو کیس بگڑ جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ میرے قریب سے ہٹ گیا۔ یہی سوچتا ہوا میں مایوس قدموں سے گھر میں داخل ہوا تو بیوی اور بیٹی دونوں میری طرف لپکیں۔ میں نے ساری بات بتائی تو بیٹی رونے لگی اور بیوی نے اپنا سر پکڑ لیا۔ کسی عزیز رشتے دار یا آس پڑوس سے اتنی رقم ادھار ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اب میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ چند لمحے چارپائی پر بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر غیر ارادی طور پر میرے قدم باہر کی طرف اٹھ گئے۔ میرے قدموں میں اب جان نہیں رہی تھی۔

گھر سے نکل کر ایک دکان پر جا پہنچا اور اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ چند سکے ہاتھ آئے تو میں نے دکاندار کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو ضبط کرتے ہوئے صرف اتنا کہا "زہر"۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیسے واپس میری طرف سرکا دیے۔ میں نے اسے سوالیہ انداز میں دیکھا تو اس نے بتایا، "اس کی قیمت میں اب بہت اضافہ ہو چکا ہے"۔

"کیوں؟"

"مانگ جو بڑھ گئی ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اپنے کسی کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

سدباب

عبدالصمد

موبائل پر بات کرتے کرتے اچانک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ موبائل بند کر کے اس نے کچھ سوچا، پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، بیوی غور سے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہی تھی، آخر وہ پوچھ بیٹھی۔

''کیا ہوا۔۔۔؟''

''بھوت۔۔۔!''

مرد کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

بیوی کے منہ سے بھی بے ساختہ نکلا۔

''ہاں۔۔۔شاید۔۔۔''

مرد کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اپنی بات خود اسے ہضم نہیں ہو رہی۔

''مطلب۔۔۔؟ذ ذ

بیوی کچھ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''مطلب کیا، جو حالات ہیں ان سے تو۔۔۔''

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ شاید اسے اپنا جملہ مکمل کرتے اچھا نہیں لگا۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ بیوی تک اس کی ترسیل ہو گئی ہے۔ وہ مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔

''کچھ بتلاؤ تو شاید بھوت کو پکڑنے میں، میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں''۔

اس نے غور سے بیوی کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا، شاید وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے، اس نے سوچا، اسے بتا ہی دینا چاہیے۔

''ارے بھائی، بچے جس طرح غائب ہو جاتے ہیں، اسے آخر کیا کہیں گے۔۔۔؟''

''پھر ملتے نہیں کیا۔۔۔؟''

بیوی کا لہجہ ابھی تک وہی تھا، یعنی غیر یقینی۔

''کچھ مل بھی جاتے ہیں، مگر ان کے جسموں سے خون، آنکھوں سے زندگی اور دماغوں کی روشنی نکلی ہوتی ہے''۔

اس نے جو کچھ سنا تھا، بتا دیا۔

بتاتے نہیں، ان کے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟

بیوی بھی اب قدرے سنجیدہ ہو گئی۔

''اس قابل نہیں رہ جاتے۔۔۔''

یہ بات بھی اس نے سنی تھی۔ بیوی کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ شاید وہ جو کچھ سمجھ رہی تھی، وہ بات تھی نہیں، مگر اسے شوہر کے بڑھتے ہوئے اضطراب کے سدباب کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔

''یہ سب باتیں، بتاتے کون ہیں۔۔۔؟''

''سارے لوگ''۔

مرد کو اس کا سوال شاید بے تکا لگا، بیوی پھر کچھ سوچنے لگی۔ اصل میں بھوت والی بات اسے کسی طرح ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ اسی کی طرح اس کے شوہر کو بھی یہ بات ہچ نہیں رہی ہوگی۔۔۔ پہلے۔۔۔ بہت پہلے، وہ اپنے وطن میں، اپنے اس دیہی مکان میں رہتے تھے جہاں چھوٹے بڑے کھپریل مکانوں کی ایک قطار سی تھی، اور بر کھابڑ گلیاں، پر پیچ راستے، بجلی وجلی تو تھی نہیں، گاؤں شام ہی سے سو جاتا، صرف ان مکانوں میں کچھ جاگ ہو رہی ہوتی جہاں کراسن تیل کے دیئے میسر ہوتے یا چھوٹی چھوٹی موم بتیاں، وہ بھی اس وقت تک، جب تک لوگ کھانا پینا ختم نہیں کر لیں یا اکا دکا ایسے طالب علم جن کے والدین کو کچھ عقل اور کچھ دولت ودیعت ہوئی تھی، اور جو شہر کے اسکول میں پرائیویٹ امتحان دینے کی تیاری میں مصروف ہوتے۔

مرد کو اچانک کچھ یاد آیا۔

''میں ذرا چرچ والی مسجد کے امام صاحب کے پاس جاتا ہوں۔۔۔''

''امام صاحب کے پاس۔۔۔؟ ان کا اس سے کیا تعلق۔۔۔؟''

اس کی بیوی حیران ہوئی۔

''شاید وہ کچھ بتلائیں۔۔۔ کچھ گائیڈ لائن دیں۔۔۔''

وہ جوتے کے تسمے باندھتے ہوئے بولا۔

''یعنی۔۔۔؟''

وہ اپنی حیرانی کو کسی طرح دور کرنا چاہتی تھی۔

''اُفوہ۔۔۔ آخر بھوت جنات کے بارے میں کون بتلائے گا۔۔۔؟''

مرد جھنجھلا گیا۔ بیوی کو یاد آیا کہ گاؤں میں دو مسجدیں تھیں۔ ایک آبادی سے ذرا دور تالاب کے پاس کالی مسجد تھی۔ اس نام کی وجہ تسمیہ بظاہر اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ کائی جمتے جمتے اس کے در و دیوار بالکل سیاہ ہو گئے تھے۔ اسے صاف کرانے کی کوئی ہمت نہیں کرتا تھا۔ مشہور تھا کہ وہاں جناتوں کا ڈیرہ ہے۔ وہاں کوئی نماز پڑھنے بھی نہیں جاتا تھا۔ بلکہ وہاں سے گزرتے وقت کوشش کی جاتی کہ تیزی سے نکل جائیں۔ اشد ضرورت ہی کے تحت اس راستے کو اختیار کیا جاتا۔ جانے کے پہلے، درمیان اور جانے کے بعد جتنی دعائیں یاد ہوتیں، سب کا ورد کیا جاتا۔ جنہیں وہاں سے گزرنے کی مجبوری تھی، انہیں تو ساری آیتیں اور دعائیں ازبر ہو گئی تھیں۔

مسجد کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ کچھ مفروضے، کچھ کہاوت کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ بچوں کو اس کے نام ہی سے ڈرایا جاتا اور بڑے بھی کوشش کرتے کہ اس سلسلے میں زیادہ باتیں نہ کی جائیں۔ رات میں تو اس کا خیال آنے ہی پر لوگ لرز جاتے۔ البتہ آبادی کے بیچوں بیچ جو مسجد تھی، وہ آباد بھی تھی اور اس کے امام اور موذن کالی مسجد کے بھوتوں کو بھگانے کی ترکیبوں سے واقف بھی تھے۔ بڑے بھوت امام صاحب سے بھاگتے، چھوٹے موذن صاحب سے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی جن، یا گاؤں کی زبان میں بھوت کے چکر میں پڑ ہی جاتا۔

بیوی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ تو ان باتوں کو مانتا ہی نہیں تھا بلکہ مذاق اڑاتا، پھر کس بات کیا لیے امام صاحب کے پاس گیا ہے۔ اس نے پوری بات بتائی بھی نہیں تھی۔ یوں بھی یہاں بھوت ووت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ہزاروں میل دور اپنے وطن کے بھوت کے بارے میں بتانے گیا ہے تو بیچارے امام صاحب اتنی دور کے غیر ملکی بھوت کا کیا بگاڑ لیں گے۔ وہ تو ایسا کبھی نہیں تھا۔ بس چند منٹوں میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ۔۔۔

اس کا موبائل دور میز پر رکھا تھا۔اس نے دوڑ کر اٹھالیا اور مرد کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔نمبر نہیں لگا،اس نے پھر کوشش کی، بار بار کوشش کی نمبر نہیں لگا۔تھک ہار کر اس نے کوشش چھوڑ دی۔پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس سے کیا کہتی۔منع تو کر نہیں سکتی تھی،ایک اضطراب کے عالم میں وہ نکلا تھا،اسے پریشان کرنا مناسب نہیں تھا،کچھ دیر میں وہ آ ہی جاتا۔ابھی اس کی سوچ کا سفر جاری ہی تھا کہ وہ آ بھی گیا۔

''بہت جلدی آ گئے۔۔۔؟''

''میں ان کے پاس گیا ہی نہیں،راستے ہی سے لوٹ آیا۔۔۔''

مرد تھکا ہارا سا دیوان پر لیٹ گیا۔

''جب گئے ہی تھے تو پھر مل ہی آتے۔۔۔''

اس نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔۔۔شاید۔۔۔

''سوچا امام صاحب کے سوالوں کا میرے پاس کیا جواب ہے۔ان کے سوالوں کی پٹاری بھی تو بھری ہوگی''۔

اس کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔

''آخر تم ان سے کیا چاہتے تھے۔۔۔؟''

''کیا چاہتا تھا۔۔۔؟بس ان سے مشورہ کرتا،دریافت کرتا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔۔۔''

وہ ایک لمحہ کے لیے لڑکھڑا گیا تھا،پھر فوراً ہی سنبھل گیا،بیوی نے تمسخر بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور زیر لب تبسم کے ساتھ بولی۔

''تم تو ان باتوں کے قائل ہی نہیں تھے،آئی مین،بھوت اور جنات وغیرہ کے۔وہاں بڑی مسجد کے امام صاحب کا تو تم مذاق اڑاتے تھے کہ ان کی پھونک پھانک سے کوئی بھوت ووت نہیں بھاگتا،پھر۔۔۔؟''

''قائل تو تم بھی نہیں تھیں۔۔۔''

مرد نے اس کی باتوں پر فوراً بریک لگایا۔

''وہ تو اب بھی نہیں ہوں،مجھے تو تمہاری حالت پر افسوس آتا ہے۔۔۔''

عورت اب خاصی سنجیدہ ہو چکی تھی۔مرد نے اس کی طرف غور سے دیکھا،پھر آہستہ سے بولا۔

''بہت دنوں سے میں یہ باتیں سن رہا تھا۔تمہیں نہیں بتایا،اس کا مطلب یہ نہیں کہ۔۔۔آج تو اتفاق سے تم نے سن لیں۔۔۔''

مرد اب اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا۔

''بچے آخر اتنے دنوں سے غائب ہو رہے ہیں تو لوگوں نے اس کا پتہ نہیں کیا۔۔۔؟ان کے ماں باپ کو نیند کیسے آتی ہے،انہیں چین کیوں کر نصیب ہوتا ہے۔۔۔؟

''شاید عورت کو اب بھی اس بات پر پورا یقین نہیں تھا،وہ جرح پر اتر آئی۔مرد کی آنکھوں میں بے بسی کی ایک لہر سی دوڑ گئی،وہ آہستہ سے بولا۔

''وہ اپنی ساری کوششیں کر کے تھک چکے ہیں۔جو بچے واپس آتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ۔۔۔''

''بھئی،مجھے تو یقین نہیں آتا۔۔۔''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آتا،یاد ہے،گاؤں میں اس قسم کے واقعات رونما ہو جاتے تھے،کالی مسجد کے پاس۔۔۔''

مرد کو پتہ نہیں کیوں اس وقت وطن کی یاد آ گئی۔

''لیکن تم تو اس وقت بھی اس کا یقین نہیں کرتے تھے۔۔۔؟''

''تب کی بات اور ہے، تب ہم واقعی کچھ نہیں جانتے تھے، آج بہت کچھ جاننے بعد بھی کچھ نہیں جانتے۔۔۔''

مرد نے ایک ایسا جملہ ادا کیا کہ عورت کو آگے کچھ کہتے نہیں بنا۔ مرد کو شاید عورت کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

عورت سوچنے لگی کہ مرد کو کیا پڑی کہ وہ اس قسم کی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر پہنچی بھی نہیں تھی کہ مرد اٹھ کر بڑی بیتابی سے کونے میں اونچی میز پر رکھے ٹیلی فون کو ڈائل کرنے لگا۔ سامنے نچلی میز پر چار چار سیل رکھے تھے، فون کا استعمال تو کبھی کبھار ہو ہوتا، خاص طور پر اس وقت جب بہت دور باتیں کرنا ہوتیں یا نا ور نہیں ملتا۔ وہ اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

''رات کو تنہا ہرگز مت نکلنا، دروازے کو خوب اچھی طرح سے بند رکھنا، سیل ہمیشہ پاس رہے، کبھی بھولنا مت اور۔۔۔ اور اپنے شناختی کاغذات ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا، اوریجنل گھر پر، کاپی اپنے ساتھ۔۔۔''

اس قسم کے بے ربط باتیں وہ دوسرے نمبروں پر بھی کرنے لگا۔ عورت سمجھ گئی کہ وہ اپنے بچوں سے باتیں کر رہا، جو دوسرے ملکوں میں رہتے تھے، مگر یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پریشانی تو وطن کے بھوت کی تھی اور یہ۔۔۔

تو کیا بھوت نے اپنا دائرۂ عمل بڑھا دیا ہے۔۔۔؟

وطن میں بھوت بھگانے کے بہت طریقے تھے۔ بڑی مسجد کے امام صاحب اور موذن صاحب دونوں کے اپنے اپنے نسخے تھے۔ گاؤں کے ذی حیثیت لوگ امام صاحب سے رجوع کرتے، بقیہ موذن صاحب سے۔ کبھی کبھی امام صاحب کا نسخہ فیل ہو جاتا تو پھر سب لوگوں کے لیے موذن صاحب ہی ذریعہ نجات رہ جاتے۔ دونوں کی الگ الگ فیس مقرر تھی۔ بھوت جس معیار اور جس مرتبے کا ہوتا، نسخہ ویسا ہی ہوتا۔ کچھ بھوت باتوں سے نہیں لاتوں سے بھاگتے تھے۔ جس شخص پر بھوت نازل ہوتا، اسی کو سراپا بھوت تسلیم کر لیا جاتا۔ اسے پائے سے رسیوں میں جکڑ دیا جاتا یا پلنگ پر باندھ دیا جاتا اور امام صاحب یا موذن اسے جوتے مارتے جاتے اور بار بار پوچھتے، وہ بھاگتا ہے یا نہیں۔ کم زور قسم کے بھوت تو دو چار جوتے ہی میں بھاگ جاتے مگر ہیکڑ تو وہ رنگ دکھاتے کہ خدا کی پناہ۔ اس شخص میں پتہ نہیں کہاں سے اتنی طاقت آجاتی کہ وہ رسی تڑا کے بھاگ نکلتا۔ یہ موقع بہت خطرے کا ہوتا۔ وہ کسی کو بھی نقصان پہنچا دیتا۔ سامنے کے کسی شخص کو اٹھا کے پٹخ دیتا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ امام صاحب یا موذن صاحب سے بہت ڈرتا۔ انہیں دیکھ کر دور بھاگ جاتا، ان کے پڑھ کر پھونکے ہوئے پانی کی بوتلوں کو اٹھا کر پھینک دیتا۔ گھر والے طرح طرح کے بہانوں سے، پانی کے راز کو راز رکھ کر انہیں پلانے کا جتن کرتے۔ ان نسخوں کے علاوہ بہت سی خود کردہ ترکیبیں بھی چلی آتی تھیں، درگاہوں پر چلے، بزرگوں کے مزار کے پائنتی کپڑے کی دھجیاں، خاک شفا کا صبح و شام استعمال وغیرہ۔

گاؤں، گھر سے اتنی دور، دیار غیر میں بھولی بسری باتیں، عورت کے ذہن کے پردے پر ابھر رہی تھیں، مگر اسے یہ یاد نہیں آیا کہ ان تدبیروں سے بھوت بھاگتے تھے یا نہیں۔ ضرور بھاگ جاتے ہوں گے، تب ہی تو ایک مدت سے یہ تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوال گڈمڈ کرنے لگے۔ جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں سوالوں کے دھاگے اور الجھتے جاتے تھے۔

ادھر مرد بہت مصروف رہنے لگا تھا۔ اس کی مصروفیت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مصروف تو وہ پہلے بھی رہتا تھا، وہ بھی رہتی تھی۔ یہاں روٹی پر مکھن اسی وقت لگتا جب اس کے لیے چار ہاتھوں سے محنت کی جاتی۔ ضروریات زندگی کے حصول میں ان کے چوبیس گھنٹے کا لمحہ لمحہ بندھا ہوا تھا، مگر وہ مرد کے چہرے بشرے پر ان مصروفیات کی تحریریں پڑھ رہی تھیں جن کا کوئی حساب کتاب اس کے پاس نہیں تھا۔ ان کی زندگی میں پہلی بار ان کا وقت مشترکہ نہیں رہا تھا۔

مرد کو زیادہ خاموش دیکھ کر عورت پوچھ بیٹھی۔

''اندر اندر آخر تم کس غم کو اہتمام سے پال رہے ہو۔۔۔؟''
مرد نے غور سے عورت کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔
''تمھیں کوئی فکر نہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔۔۔''
''میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ تم جس چھوٹے سے پھوڑے کو زخم کی صورت دیکھ رہے ہو، اس کا وجود کم سے کم ہماری آنکھوں کے سامنے تو نہیں ہے اور میں۔۔۔''
''مجھے تعجب ہے کہ تم اس چیز کو ہوائی یا تصوراتی سمجھ رہی ہو۔۔۔؟''
مرد نے عورت کی بات کاٹ دی۔
''کیوں نہ سمجھوں۔۔۔؟ اتنے دن ہو گئے یہاں آئے ہوئے کہ اب تو احساس ہی نہیں ہوتا، ہم یہاں اجنبی ہیں۔ یہاں ہمیں وہ سب کچھ ملا جو اپنے وطن میں نہیں ملا، پھر کیوں نہ ہم یہاں کے بارے میں سوچیں، اپنا وطن تو اب غیر ہو چکا ہے۔۔۔''
عورت کی ساری دلیلیں، مرد کے اندرون کو پگھلانے میں ناکام رہیں وہ بڑی بے اعتنائی سے اس کو دیکھ رہا تھا، عورت کے چپ ہو جانے پر، اس نے بڑے تیکھے انداز میں پوچھا۔
''تمھیں کس نے بتا دیا کہ تم یہاں محفوظ ہو۔۔۔؟''
''مان لیتے ہیں کہ ہم یہاں بھی محفوظ نہیں، لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ اس سوچ سے تو ہم اور غیر محفوظ ہو جائیں گے لہذا میری مانو، وطن میں رہنے دو اور یہاں کے آرام کو غنیمت سمجھو۔۔۔''
عورت جیسے فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ مرد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔
''مجھے حیرت ہے، تم اتنی سی بات نہیں سمجھتیں۔ ارے بھائی، وہ بلا چوکھٹوں اور سرحدوں میں قید نہیں ہے نا، وہ کسی وقت، کسی لمحہ یہاں بھی تو آسکتی ہے۔۔۔''
''یعنی بھوت۔۔۔؟''
عورت کے لہجے میں تمسخر تھا۔ مرد اندر اندر کھول کر رہ گیا، مگر اپنی دفاع میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، وہ فوراً کچھ نہیں بولا، دراصل یہ باتیں اسے خود ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔
''یہ ساری خبریں مجھ تک پہنچ رہی ہیں، بار بار پہنچ رہی ہیں، بار بار ان کی تصدیق ہو رہی ہے، پھر میں انہیں سرے سے کیسے غلط مان لوں۔۔۔؟''
مرد کے لہجے میں جو بے بسی اور بے چارگی تھی، وہ عورت کے احساس کو بھی چھو گئی۔ اب کے اس کا انداز بدل گیا۔
''ایک بات، یہ مسئلہ تو فی الحال وہیں کا ہے، ہم تو وہاں برسوں سے گئے بھی نہیں اور شاید اب جا بھی نہیں پائیں گے، یہاں مسئلہ پیدا ہو گا تو دیکھا جائے گا۔۔۔''
''ہاں، بے شک برسوں سے وہاں نہیں گئے، لیکن وہاں جانے کا ارادہ تو کبھی ترک نہیں کیا، وہاں جانے کی تمنا تو دل میں ہمیشہ روشن رہی، پھر وہاں کے درد، وہاں کی مصیبت کو ہم کیوں محسوس نہ کریں۔۔۔؟''
مرد خاصا جذباتی ہو گیا۔ عورت حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا یہ انداز اس کے لیے انوکھا تھا۔ ایک لمحہ میں وہ سوچ کی اسی سطح پر آ گئی، شاید یہ دونوں کے لیے ضروری تھا۔ اس نے پوچھا۔
''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔۔۔''

'' کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہاں تو اس آفت کو دور کرنے کی کچھ تدابیر بھی تھیں، کچھ نسخے بھی تھے، یہاں تو۔۔۔''

'' پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہیے کہ پہلے ہم وہاں کی فکر کریں یا یہاں کی۔۔۔؟''

عورت نے بہت کوشش سے اپنا لہجہ شریں رکھا، یوں بات قدرے تلخ تھی مگر مرد اپنی دھن میں صرف اس کی شیرینی ہی کو محسوس کر سکا۔

'' دونوں کی، اسے یہاں آنے میں دیر ہی کتنی لگے گی۔۔۔۔؟''

عورت سوچ میں ڈوب گئی۔ واقعی یہاں تو زیادہ سے زیادہ بڑے امام صاحب سے رجوع کیا جا سکتا تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ بھی کچھ مدد نہیں کر سکیں گے۔

شاید مرد وطن جانے کا ارادہ کر چکا تھا، اس نے اس کی خبر عورت کو نہیں دی تھی۔ بس گاہے گاہے وہاں کا ذکر کرتا رہتا۔ ذکر تو وہ آپس میں بہت سی چیزوں کا کرتے مگر اکثر صرف موضوعات کو خوشنما بنانے کے لیے باتیں ہوتیں۔ عورت کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ مرد کے دل و دماغ پر وطن سوار ہے، لیکن وہ جان بوجھ کر اس کرید میں نہیں پڑ رہی تھی۔ اس نے مرد کو نشانہ بنانے کا ارادہ بھی اب چھوڑ دیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ دونوں مل کر اس قسم کی باتوں کا مذاق اڑاتے اور مرد کا قہقہہ سب سے بلند ہوتا۔ مرد کا انداز تفکر کبھی کبھی اسے جائز لگتا۔ واقعی یہ معاملہ کسی انسان کا تو نہیں لگتا تھا، جس مخلوق کا تھا، وہ تو کہیں بھی، کسی وقت بھی نازل ہو سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے عورت کو جھرجھری سی آ گئی۔

تھوڑی دیر خیالوں کے جنگل میں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد وہ پھر بنیادی موضوع پر آ گئے۔

'' جو بچے واپس آ جاتے ہیں، وہ تو ایک طرح سے چشم دید گواہ ہیں۔۔۔''

عورت نے اظہار خیال کے طور پر ایک بات کہی۔

مرد کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

'' شاید ہم اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ ان سے کچھ معلوم ہو جاتا تو ہم اندھیرے میں کیوں بھٹکتے رہتے۔۔۔''

'' سار چیزوں کو چھوڑ کر انہیں پر Concentrate کرنا چاہیے تھا۔۔۔''

عورت نے مرد کی بات سنی ان سنی کر دی اور یوں بولی جیسے اپنے آپ سے کچھ کہہ رہی ہو۔

'' وہ واپس آئے تو ان کے ذہن ماؤف تھے، زبانیں بند اور جسم بے حس۔۔۔''

مرد نے طوہاً و کرہاً پھر دہرایا۔

'' ان لوگوں نے بھی کوئی مدد نہیں کی۔۔۔؟''

عورت نے جیسے بے خیالی میں سوال کیا۔

'' کن لوگوں نے۔۔۔؟''

مرد نے کنکھیوں سے عورت کی طرف دیکھا۔

'' ان لوگوں نے۔۔۔ امام صاحب، موذن صاحب، بزرگوں کے آستانے وغیرہ۔۔۔''

عورت قدرے جھنجھلا گئی۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ مرد تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے۔

'' گئے تھے، بالکل گئے تھے سب کے سب بے بس ثابت ہوئے۔۔۔''

مرد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''وہ لوگ تو مار پیٹ کے ذریعہ بھی ایسے معاملوں کو درست کر دیتے تھے۔۔؟''
عورت کو بھولی بسری امید ابھی بھی روشن دکھائی دے رہی تھی۔
''وہ اس لائق نہیں رہ گئے تھے کہ ان پر کوئی مزید سختی کی جاتی۔ ان کی جانیں بھی جا سکتی تھیں''۔
مرد کے لہجے میں خاصی مایوسی تھی۔
''اس کا مطلب ہے۔۔۔''
عورت نے جملہ مکمل نہیں کیا، شاید وہ بھی جانتی تھی کہ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ مرد نے بھی اس پر سوالیہ نگاہیں ضرور ڈالیں، مگر وہ بھی جانتا تھا کہ مطلب کچھ نہیں۔
''یعنی۔۔۔؟''
کچھ دیر کے بعد عورت کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔
مرد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
عجب بات یہ تھی کہ اس موضوع پر وہ جب بھی بات کرتے، ہمیشہ صفر پر پہنچ جاتے اور ان کا دروازہ بند ہو جاتا اور اس وقت تک بند رہتا جب تک وہ اسے نئے سرے سے کھولنے میں کامیاب نہ ہو جاتے اور نیا سرا بھی کیا۔۔۔ وہ کچھ دور تک بڑی امیدوں کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے، پھر وہی صفر۔۔۔
''ارے بھائی۔ کون سا ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں نکلتا، مگر یہ کیا بات ہوئی کہ اس کا کوئی حل ہی نہیں۔۔۔ نا یہاں، نہ وہاں۔۔۔''
یہ بھی عورت کی جانب سے بند دروازے کو کھولنے کی ایک کوشش ہی تھی۔
مرد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''یہاں۔۔۔؟''
''ہاں۔۔۔ یہاں بھی، ابھی ہم جن لمحات سے گزر رہے ہیں، تمہیں کیا لگتا ہے، ہم ان بچوں سے کچھ مختلف ہیں کیا جن کے جسموں میں خون نہیں ہوتا، دماغوں میں۔۔۔''
''بس۔۔۔ بس۔۔۔''
مرد نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ویسے اس کے اندر سے ایک بے ساختہ چیخ نکلنے والی تھی۔
کبھی کبھی مرد بھی سوچنے لگتا کہ ہزاروں میل دور کے پرابلم سے وہ اس قدر ہراساں کیوں ہو گیا ہے۔ عورت کی بات اسے سچ لگنے لگتی کہ وہ تو اپنی ساری کشتیاں جلا چکے ہیں پھر۔۔۔؟ لیکن اس کی ساری سوچ اسے پھر اسی نکتے پر لے آتی کہ یہ پرابلم تو سرحدوں اور دیواروں میں قید رہنے والی نہیں۔ وہ کسی وقت یہاں بھی پہنچ سکتی ہے، وہاں بھی پہنچ سکتی ہے جہاں اس کے بچے رہتے ہیں۔ وہ ٹانگوں پر چلنے والی چیز نہیں، پروں کے دوش پر اڑنے والی بلا ہے۔ اور یقیناً اس کے سدباب کے لیے مادی نہیں، ماورائی ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔ یہ ذرائع ضرور استعمال میں لائے گئے ہوں گے، البتہ اس میں یقیناً کوئی ایسی کمی رہ جاتی ہوگی جس کے سبب یہ مصیبت بڑھتی جاتی ہے۔
مرد نے اپنے طور پر ایک فیصلہ کیا۔ اس نے ادھر کی خبریں وصول کرنا ہی چھوڑ دیں۔ جب بھی کوئی خبر اس کے اندر پہنچتی، اس کے ہیجان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ مگر وہ اپنے فیصلے سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ دراصل وہ ذرائع ابلاغ سے یوں گھرا ہوا

تھا کہ اس کے اندر جو بھی سانس جاتی تھی وہ طرح طرح کی خبروں سے آلودہ ہوتی، جو باہر آتی وہ بھی ان سے لتھڑی ہوتی۔ ہزروں میل کے علاقے آنکھوں کے بالکل سامنے آجاتے تھے اور وہ بہ نفس نفیس اپنے آپ کو ان میں موجود پاتا۔ وہاں کے دکھ درد اس کی ہڈیوں میں پیوست ہوتے ہوئے محسوس ہوتے اور وہ اس تکلیف سے بلبلا اٹھتا۔

پتہ نہیں، اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ سارے احساسات شاید اس کے ذاتی ہیں۔ کیوں کہ اسے دوسروں کے چہرے بشرے پر اس کا اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش باش نظر آتے، جیسے کوئی اندیشہ ہائے دور دراز انہیں چھو کر نہیں گیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ذرائع ابلاغ نے ان کے احساسات پر اپنا ڈنک نہیں مارا ہو، یا پھر انہوں نے اپنے آپ کو یوں باندھ رکھا ہے کہ کوئی ڈنک ہی ان کے اندر پہنچنے سے معذور ہو۔

مرد، باہر نکلا تو پھر واپس نہیں آیا۔

دیر سویر تو ہوتی ہی رہتی تھی، کبھی کبھار وہ کسی کام میں پھنس جاتا تو گھر نہیں بھی پہنچتا تھا مگر اس کی اطلاع ضرور دے دیتا۔ ایک آدھ دن نہیں آنے نے کسی تشویش کو کوئی خاص جنم نہیں دیا مگر نہیں آنے کا وقفہ کئی دنوں میں تبدیل ہو گیا تو عورت کا چونکنا لازم تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اتنا غیر ذمہ دار کبھی نہیں تھا، اس کی طویل غیر موجودگی حیرت انگیز بھی تھی، اس پر سے اس کے سیل کا لگاتار بند رہنا۔ وہ اپنا سیل کبھی بند نہیں کرتا تھا، وہ کہتا تھا، پھر سیل رکھنے کا فائدہ کیا۔۔۔ سیل سے دوسروں کی جو امیدیں بندھی ہوتی ہیں، ان امیدوں کو پامال کرنا نہایت غیر اخلاقی فعل ہے۔ عورت بہت باہمت اور باشعور تھی۔ غیر موافق حالات سے عام طور پر گھبراتی نہیں تھی۔ غیر ملک، غیر آب وہوا، غیر تہذیب وتمدن اور اجنبی زبان وبیان کے ماحول میں برسوں سے زیست کرتے ہوئے، وہ زندگی کی تیز رفتاری سے بہت حد تک ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اس نے صورت حال پر واویلا کرنے کی بجائے صبر اور تحمل سے اس کا سامنا کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے سوچا، سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟

پولیس۔۔۔

"پولیس کے ریکارڈ میں کوئی انہونی درج نہیں تھی، دور دراز سے کوئی اجنبی لاش دستیاب نہیں ہوئی تھی، کسی حادثے کی کوئی اطلاع نہیں تھی، کسی نے کوئی شکایت درج نہیں کی تھی، چھوٹے موٹے کسی دنگے کی خبر بھی نہیں تھی۔

اس نے خفیہ پولیس سے رابطہ قائم کیا۔ ان لوگوں نے کچھ عملی اور کاغذی کارروائی مکمل کی اور اس کے ہاتھوں پر صفر رکھ دیا۔

پھر اس کو خیال آیا، جہاں سرکار ناکام ہو جاتی ہے، وہاں غیر سرکار کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس نے ایک غیر سرکاری ایجنسی سے رابطہ قائم کیا، وہ روز انہیں امید بھرے لہجے میں فون کرتی، وہ بھی اپنی روزانہ محنت کا زائچہ اسے سنا دیتے۔ نتیجہ پھر صفر۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مرد کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ اسے شک ہوا تھا کہ کہیں وہ اپنی الجھن میں ملک سے باہر تو نہیں چلا گیا۔ تھوڑی سی تگ ودو کے بعد اس شک کا غبارہ بھی پھوٹ گیا۔ اس کا پاسپورٹ گھر رکھا تھا اور ہوائی ایجنسیوں نے اس جیسے کسی آدمی کے باہر نہیں جانے کی تصدیق کر دی۔

اسی بھاگ دوڑ میں اسے اشارہ ملا تھا کہ قومی سلامتی کے پیش نظر کبھی کبھار سرکار مشتبہ افراد کو کسی خفیہ مقام پر لے جا کر پوچھا تاچھ کرتی ہے، ایسے افراد کا بہت بہت دنوں تک پتہ نہیں چلتا۔ اس سے اس کی گھبراہٹ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اسے یقین تھا کہ مرد کی کوئی حرکت کبھی قابل گرفت اور مشتبہ نہیں رہی۔ وہ بہت دنوں سے یہاں رہتے ہیں، کسی نے آج تک ان پر انگلی نہیں اٹھائی اور انہیں کبھی کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مرد کی گمشدگی کی وجہ کچھ اور ہو سکتی ہے، مگر کیا۔۔۔؟"

معاً اس کو خیال آیا کہ وطن والا بھوت بالآخر یہاں تو نہیں آپہنچا۔۔۔ یہ خیال آتے ہی وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔ اس

کے ہوش وحواس ایک دم گم ہو گئے۔اس چیز کو اس نے اپنے اندرون کبھی تسلیم نہیں کیا تھا،اس مسئلے پر وہ کبھی چپ رہی تھی تو صرف مرد کی خاطر، اسے تو مرد پر تعجب ہوتا تھا اور وہ اس کی پریشانی کو دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی۔مرد ہی نے اس سے کہا تھا کہ بھوت کو کسی سرحد یا رکاوٹ کی پریشانی نہیں ہوتی۔سوچ کا یہ مرحلہ سخت پریشانی کا تھا،مگر وہ جانتی تھی کہ پریشان ہونے سے مسئلے کا حل نہیں نکل سکتا۔پریشانی کے احساس پر فوراً قابو نہیں پایا گیا تو یہ بڑے اطمینان سے اپنے پر پنکھ پھیلا دے گی۔

اس نے اپنے منتشر حواس کو یکجا کیا اور نئے سرے سے حالات کا سامنا کرنے کی ٹھان لی۔سارے وجوہات ایک ایک کر کے اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔آخر وہ انہیں وسیلوں کو استعمال کر سکتی تھی جو اس کے امکان میں تھے۔البتہ ایک بات رہ جاتی تھی کہ مرد اپنی مرضی سے غائب ہو گیا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ نامعلوم مصلحتوں نے اسے جکڑ لیا ہو،یا پھر اور کوئی وجہ ہو۔

اس کے دل کی گہرائیوں سے نفی کی اتنی تیز چیخ نکلی کہ اس کا وجود لرز گیا۔وہ تمیں پینتیس برسوں سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہے تھے۔انہوں نے ہر طرح کے دن دیکھے تھے اور ہر رنگ کی راتوں سے ان کا واسطہ پڑا تھا۔گویا ان کے سامنے پینتیس برسوں کا ایک پہاڑ کھڑا تھا جو زمانے کے ہلانے جلانے سے ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔پھر۔۔۔؟

''پھر وہی۔۔۔؟''

یعنی۔۔۔؟

ایک ایسا راستہ اس کے سامنے آ گیا تھا جس کی خارداری پر اس کے قدم آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیتے۔

یہ بات اسے ہمیشہ مضحکہ خیز لگتی۔

آج بھی لگ رہی تھی۔

وہ اسے کسی طرح تسلیم بھی کر لے تو پھر اس کے سدباب کے لیے اس کے پاس کون سا حربہ تھا۔اتنے برسوں میں، آج تک اس نے اس وجود کے بارے میں کچھ سنا ہی نہیں تھا۔برادران وطن میں سفید چمڑی کے لوگ کبھی کبھی اس وجود کو تسلیم کرتے دکھائی دے جاتے۔وہ پتہ نہیں کیسے مکان کے کسی کونے، باغ کے کسی گوشے، سڑک کے کسی ویرانے اور زمین کے کسی حصے میں اس ان دیکھے وجود کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھ لیتے جن سے وہ کچھ اور نہیں دیکھ سکتے تھے، وہ اس کا کوئی علاج نہیں کرتے، اسے جوں کا توں چھوڑ دیتے۔لیکن ان کے بھوت میں اور اس کے وطن کے بھوت میں بہت فرق تھا۔وطن کے بھوت کو درست کرنے کے کئی طریقے رائج تھے، یہاں تو اس موضوع پر کسی سے بات بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔خود، مرد ایک بار بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس دوڑ گیا تھا اور آدھے راستے ہی سے لوٹ آیا تھا۔

عجیب بے بسی کا عالم تھا۔اتنا ترقی یافتہ ملک اسے ایک بند دروازے کا کمرہ نظر آتا تھا۔کوئی روشن دان، کوئی روزن نہیں، اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کیفیت میں دوسرے لوگ بھی مبتلا ہوئے تھے یا نہیں، ہوئے تھے تو پتہ نہیں، انہوں نے اس کے لیے کیا کیا۔۔۔؟

بہر کیف، اسے اتنی تشفی ضرور تھی کہ جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ اس نے ضرور کیا۔جو بس میں نہیں تھا، وہاں اس نے اپنی سوچ کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔

اچانک مرد لوٹ آیا۔

پورے بدن پر نیلے نیلے نشانات، جسم اور منہ سوجے ہوئے، چال میں لڑکھڑاہٹ، آنکھوں میں بے پناہ ویرانی اور مردنی۔۔۔

پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان ہی نہیں پائی۔ وہ آیا اور آتے ہی گر کر بے ہوش ہوگیا۔ اس وقت واویلا کرنے کا موقع نہیں تھا۔ یوں بھی یہاں ان فضولیات کے لیے وقت کس کے پاس تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ یہاں کی پولیس اور انتظامیہ سے بہتر اور کوئی انتظامیہ نہیں ہوسکتی، مگر اس کے تجربے نے بتایا کہ کم سے کم اس کے لیے جیسی وطن کی پولیس، ویسی یہاں کی پولیس۔ وہ سارے امکانات پر دستک دے چکی تھی۔ بہر کیف، اب تو مرد گھر آ ہی گیا تھا، یعنی تمام واقعات کا چشم دید گواہ۔ وہ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتی رہی، پتہ نہیں اس کی کیسی بے ہوشی تھی کہ وہ بار بار ہوش میں آتا اور بار بار بے ہوش ہو جاتا، گو اس کی آنکھوں کی ویرانی پکار پکار کے کہتی کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔

عورت کو یقین تھا کہ اپنے گھر کی اپنائیت، اس کی اپنی خدمت و محبت اس کو ضرور اچھا کر دے گی۔ وہ ہر دن انہیں امیدوں کے ساتھ بیدار ہوتی، مگر شام ہوتے ہوتے وہ خود بیمار لگنے لگتی اور رات ہوتے ہوتے سچ مچ بیمار ہو جاتی، ہر صبح۔۔۔اس کی صبح بس اپنی جگہ برقرار تھی جس کے بل پر وہ امید اور مایوسی کی آنکھ مچولی کو کس طرح جاری رکھے ہوئے تھی۔

اس کے بچے گھر آ گئے تھے۔ بہترین طبی امداد مل رہی تھی۔ مگر مرد کی بیماری اپنی جگہ تھی، کسی کی سمجھ میں اس کی بیماری نہ آتی تھی، بیماری سے زیادہ وہ سوالات، جو بے حد پیچیدہ پہیلیوں کی طرح سب کے ذہنوں میں چکر کاٹتے تھے۔

وہ کہاں گیا تھا، اس طرح تو کبھی جاتا نہیں تھا۔۔۔؟

اگر اس کا اغواء کیا گیا تھا تو وہ کون لوگ تھے، ان کا مقصد کیا تھا۔۔۔؟

اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا کہ وہ اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھا۔۔۔؟

اس کی زبان کیوں نہیں کھلتی۔۔۔؟

کیا اس کو کسی خوف نے جکڑ رکھا ہے۔۔۔؟

اسے کس کا خوف ہے اور کیوں۔۔۔؟

وغیرہ وغیرہ۔

وہ سب ایک دوسرے کے چہرے پر جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ سوچ کی اونچی اونچی اڑان کے باوجود کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اصل میں ان سوالوں کے جواب اگر تھے تو وہ تو اسی کی تحویل میں تھے اور اس کا حال یہ تھا کہ۔۔۔۔ آنکھوں کی پتلیوں کو پڑھنے اور چہرے کی کتاب سے بہت دور کا نتیجہ اخذ کرنے والے ماہرین بھی ناکام ہو گئے تھے۔ اتنے دنوں غائب رہنا، پھر لوٹ آنا کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ مگر زمین تو کسی کو کھا کر ڈکار نہیں لیتی اور آسمان کو بھی آج تک کسی نے نگل کر اگلتے نہیں سنا تھا۔

معاً عورت کو خیال آیا، کہیں وہی بھوت تو اس کو اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔۔۔؟

علامات تو ساری وہی تھیں۔ جو کچھ مرد کے جسم اور آنکھوں میں لکھا تھا، وہ سب تو وہ اپنی زبان سے اس کو کبھی بتا چکا تھا۔ جو خیال کبھی اس کو اور مرد کو مضحکہ خیز لگتا تھا اور ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا تھا، وہ اب پوری طرح اس کے حلق سے بہت نیچے اتر گیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ مرد ضرور اسی بلا کا شکار ہوا تھا جو وطن سے ساری سرحدوں کو پار کر کے یہاں تک آ پہنچی ہے، وہ اب ساری دنیا میں پھیل سکتی ہے اور عجب نہیں کہ پھیل بھی گئی ہو۔

سارے راستے بند دیکھ کر عورت نے اپنی ساری توجہ، یکسوئی کے ساتھ مرد پر مرکوز کرنے کی ٹھان لی۔ انہیں روٹی کے لیے زیادہ تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سوال صرف روٹی پر مکھن لگنے کا تھا، سو وقت ایسا آپڑا تھا کہ مکھن سے لطف اندوز نہیں ہوا جا

سکتا تھا۔ اس کا مرد گھر میں تھا، فی الحال یہی کافی تھا۔ دنیا اس کے گھر میں سمٹ آئی تھی۔ گو یہ دنیا مردہ بدست زندہ کے مصداق تھی، پھر بھی اس کی آنکھیں حرکت کرتی تھیں اگرچہ ویران تھیں، ہاتھ پاؤں سلامت تھے گو ان میں زندگی کے آثار معدوم تھے۔ وہ رات کو اپنے بستر پر چلا جاتا اور صبح اٹھ جاتا، البتہ کوئی اس کی نیند کے بارے میں نہیں جانتا تھا، نیند تو بند پلکوں کے اندر چھپی رہتی اور وہاں تک پہنچنا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔

عورت کی بے پناہ خدمت اور ایثار کا نتیجہ کچھ کچھ سامنے آنے لگا۔ مرد کی کھلی پتلیوں میں کچھ ایسی حرکت ہونے لگی جس کو کچھ معنی پہنائے جا سکتے تھے۔ عورت کو اس میں مہارت حاصل تھی لہٰذا وہ آنکھوں کے اتار چڑھاؤ افسردگی اور مسرت کی لہروں کو گن کے رہ جاتی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ مرد اس کی آواز سن کر اس کی طرف گردن گھما دیتا یا آنکھیں گاڑ دیتا یا وہ دو ایک نوالہ اور کھانے کو کہہ دیتی تو اس کی درخواست کو رد نہیں کرتا۔ ادھر وہ ایک بات شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ مرد سے کبھی کبھی کچھ ایسی اضطرابی حرکتیں سرزد ہو جاتیں جو بظاہر تو بے معنی لگتیں لیکن اس کو اس میں بے پناہ معنویت دکھائی دے جاتی۔ کبھی کبھی وہ بے تحاشہ دوڑ کر دروازہ بند کرنے لگتا، پہلے سے بند ہوتا تو وہ کنڈی چڑھا دیتا۔ بھاگ کر اندر کسی کمرے میں چلا جاتا اور دروازہ اندر سے بند کر لیتا، اور اسی وقت کھولتا جب اس کی مرضی ہوتی، کبھی وہ مسہری یا کسی میز کے نیچے چھپنے کی کوشش کرتا، کبھی سوتے سوتے چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا۔ ایک بار تو اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ عورت کو غسل کرنے میں کچھ دیر ہو گئی، باہر نکلی تو گھر کی دیواروں پر ٹنگے ہوئے سارے تغرے ایک تھیلے میں بند کونے میں رکھے تھے اور وہ خود بڑے اطمینان سے لیٹا خلاؤں میں تک رہا تھا۔

عورت کو یقین ہو گیا کہ اس پر غیر معمولی تشدد کیا گیا ہے۔ دماغ سے لے کر تلوے تک، سارا جسم گویا ایک پھوڑا بن چکا تھا۔ تب اس کو خیال آیا کہ اس کو فوراً ڈاکٹروں کو دکھانا چاہیے۔ ڈاکٹر اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ابھی تک اس کا جانبر ہونا ان کے لیے تعجب خیز امر تھا۔ اس کا دماغ اور ہوش و حواس بالکل درست نہیں تھے۔ جسم کے زخم کسی طرح بھر بھی جاتے تو دماغ کو قابو میں لانا بہت مشکل تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ کسی نامعلوم خوف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ سوچتی رہی، آخر یہ کون سی بلا ہے جس کا کہیں کوئی اتا پتا نہیں۔ وہ جب چاہتی ہے کسی کو اٹھا کے نامعلوم مقام پر لے جاتی ہے، اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے، اس کی بھی جانکاری نہیں ملتی، اس کے بس کچھ نشان ملتے ہیں جن کے سہارے تھوڑی دور تک ٹامک ٹوئیاں مارا جا سکتا ہے۔ اسے یاد آیا، اس نے کچھ ایسے مقامات کے بارے میں سنا تھا جو سب کی نظروں سے دور خفیہ جگہوں پر ہوتے ہیں، وہاں مشتبہ لوگوں کو لے جایا جاتا ہے، ان پر غیر معمولی تشدد کے ذریعہ کچھ اگلوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، کسی کو نہیں معلوم۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا، کیا مرد کسی مشتبہ کام میں ملوث ہو سکتا ہے۔ اس کی شکل و صورت، چال ڈھال، رہن سہنا، ملنا جلنا وغیرہ ایسا ہے کہ وہ خواہ مخواہ کسی کی نگاہوں میں چڑھ جائے۔۔۔؟

اسکے ذہن کی تیز بہاؤ والی ندی میں طرح طرح کے بلبلے بنتے رہے، پھوٹتے رہے۔ دائرے بنتے جاتے ایک کے بعد دوسرا دائرہ، اس کے بعد تیسرا۔۔۔ لاتعداد دائرے۔۔۔ سبھی دائرے پانی کے بہاؤ میں غلط ملط ہو جاتے۔

ذہن میں ابھرتے ڈوبتے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ حالانکہ جواب تو بہر حال اسی کو دینا تھا، سوالات اس کے اپنے تھے اور یہ سوال اس نے خود سے پوچھے تھے، کسی اور سے نہیں۔ اس کے سوالوں کے جواب اثبات میں بھی ہوتے تو پھر وہ کیا کرتی۔۔۔؟

نفی میں ہوتے، تب بھی کیا کرتی۔۔۔؟

مرد کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس کے لیے وہ کسی کی گردن نہیں پکڑ سکتی تھی۔ پکڑنے پر قادر بھی ہوتی تو کس کا پکڑتی۔۔۔؟

جن لوگوں نے اسے ایسے خفیہ مقامات کی جانکاری دی تھی، انہیں خود وہاں کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ بتانے والا یقیناً وہاں کبھی گیا نہیں تھا۔ جو لوگ وہاں گئے تھے، وہ وہاں کا پتہ کیا بتاتے، وہ تو اپنے آپ کو بھی بھول گئے تھے۔

سوچ و فکر کی بھول بھلیوں میں دیر تک بھٹکنے کے بعد بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کا مرد گھر میں موجود ہے۔ وہ جیسا بھی ہو زندہ تو ہے۔ وہ جانتی تھی کہ بہت سے لوگ غائب ہو کر واپس بھی نہیں آئے۔ اسے وطن میں غائب ہونے والے بچوں کا خیال آیا جس کی جانکاری مرد ہی نے دی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے تمام راستوں اور امکانات کو چھوڑ کر بس اسی لائن کو پکڑنا چاہیے کہ اس کے مرد کو بھی کوئی بھوت ہی اٹھالے گیا تھا۔ اسی لائن پر چلنے میں راحت ہے۔ اس میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ اس کے سدباب کی بہت سی ترکیبیں ہیں، بھلے اس دیارِ غیر میں نہ ہوں، مگر اسے وطن جانے سے کون روک سکتا ہے۔

اس کے تصور میں بڑے امام صاحب، موذن صاحب، درگاہیں، چلّہ کشی، وغیرہ وغیرہ کی تصویریں جھلمل کرنے لگتیں۔

اس روز بہت دنوں کے بعد اسے سکون کی نیند آئی۔

☆☆☆

کہر زدہ شام

عذرا اصغر

جب میرا پہلا رشتہ آیا تو میں تیرہ برس کی تھی۔ وہ لڑکا جس سے میرا رشتہ آیا تیس کے لگ بھگ تھا اور امپورٹ ایکسپورٹ کا دھندہ کرتا تھا۔ ادھر کا مال ادھر اور ادھر کا ادھر۔ کوٹھیاں تھیں، کاریں تھیں، عزت تھی، شہرت تھی۔ بہت سے لوگ دن رات اسے سلام کرتے تھے اور بہت سے لوگوں کو وہ سلام کرتا تھا۔

اڑوس پڑوس کی عورتیں میری قسمت پر رشک کرنے لگیں اور اپنی بچیوں کو میرے جیسے نصیبے کی دعا دینے لگیں۔ میری ماں نے میرے باپ سے کہا ''لچھمی خود چل کر ہمارے گھر آئی ہے۔ اسے موڑنا نہیں چاہیے۔ ہماری بچی ساری زندگی راج رجے گی''۔ مگر میرے باپ کو میری ماں کی منطق پسند نہیں آئی۔ وہ خود کاروباری آدمی تھا۔ اسے مال کی قیمت وہ خوب پہنچانتا تھا۔ ماں گھر میں بیٹھنے والی ان پڑھ عورت۔ اسے بھلا کیا پتہ زمانہ کون سی چال چل رہا ہے۔ چنانچہ میرے باپ نے صاف میری ماں کی بات رد کر دی۔ وہ کہنے لگا ''بھلی عورت! میری بچی ابھی ذرا سی تو ہے۔ ابھی تو اس کے کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔ ذمہ داری اٹھانے کو تو عمر پڑی ہے''۔

ایکسپورٹر نے بڑا زور لگایا اس کے گھر والوں نے بہت چکر کاٹے۔ مگر میرا باپ کسی صورت نہیں مانا اور میں اطمینان سے محلے کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ، پٹھوگرم کھیلتی رہی۔ سولہ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے میرے لیے آنے والے رشتوں کی ایک لائن لگ چکی تھی۔ مگر میرا باپ جگہ جگہ سے اس لائن کو توڑتا رہا۔ ہر آنے والے کو انکار کے ڈنڈے سے بھگاتا رہا۔ کبھی کہتا ''میری بیٹی ابھی بچی ہے''۔ کبھی کہتا ''لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے''۔

جب میں نے دسویں کا امتحان دیا تو میں عمر کی اٹھارویں سیڑھی پر قدم جما چکی تھی اور میرے دل میں رنگ برنگی پھلجڑیاں چھوٹتی تھیں اور میری آنکھوں میں ہر دم شمعیں روشن رہتی تھیں۔ تب میری ماں نے پھر میرے باپ سے کہا ''اے میاں! کچھ عقل کی بات کرو۔ لڑکی جوان ہوگئی ہے۔ بس اب ہاتھ پیلے کرنے کی سوچو اور کتنا پڑھاؤ گے۔ کیا نوکری کرانی ہے؟''

میرے باپ نے میری ماں کا تمسخر اڑایا اور بولا ''بھلی لوکے! عقل کے ناخن لے۔ ہماری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ جو دیکھتا ہے دوڑا چلا آتا ہے۔ پھر سونے پر سہاگہ کروڑوں کی جائیداد کی تنہا وارث۔ تم دیکھو گی لوگ سر کے بل چل کر آئیں گے۔ ابھی کون سی عمر گزر گئی جو تم گھبراتی ہو۔ لکھ پڑھ لے گی تو کام آئے گا۔ مقدر کی کسی کو کیا خبر۔ ہماری ایک ہی تو اولاد ہے۔ اس کو اتنی تعلیم دلانا چاہتا ہوں کہ دس بیٹوں کی حسرت پوری ہو جائے''۔

اور اپنے باپ کے ترقی پسند نظریات سے متفق ہو کر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب میں پٹھوگرم کی جگہ بیڈمنٹن کھیلنے لگی۔ باسکٹ بال میں میں ہر جگہ اور ہر میچ میں فرسٹ آتی رہی۔ ہاکی میچوں میں میری کارکردگی سب سے نمایاں رہتی اور بہت جلد میں اپنی ٹیم کی کپتان بنادی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے رشتے آنے کی رفتار اور بڑھ گئی اور رشتوں کی تعداد کے ساتھ میرے باپ کا دل بھی بڑھ گیا۔ اس کا حوصلہ اور بلند ہوگیا۔ اس نے کہا ''میری بیٹی لاکھوں میں ہی نہیں کروڑوں میں ایک ہے۔ میں اس کو ابھی اور پڑھاؤں گا۔ حسن صورت کے ساتھ حسن تعلیم سے بھی اس کو سجاؤں گا۔ علم کے زیور سے میں لاد دوں گا۔ اتنا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ پھر دیکھنا میری بیٹی کو کیسا بر ملتا ہے''۔

میری ماں ستی ساوتری، ان پڑھ عورت۔ خاوند کو سر کا تاج ماننے والی۔ وہ دنیا کے چھل بل کیا جانے۔ میرے باپ کی

حوصلہ افزا بات سن کر وہ مطمئن ہوگئی اور گھر میں رشتہ لے کر آنے والوں کو صاف صاف جواب دینے لگی۔ میرے سامنے بہت بلند آدرش تھا۔ مجھے زندگی میں بہت کچھ کرنا تھا۔ مجھے تعلیم حاصل کر کے عورت کا مقام اونچا کرنا تھا۔ اس کے حقوق کا تحفظ بھی مجھی کو کرنا تھا۔ میرے کندھوں پر ذمہ داری کا بڑا بوجھ تھا۔ ڈگریوں کے پلندے لے کر باپ کی آرزو پوری کرنا تھی۔ اس کا مان بڑھانا تھا۔ اس کے خاندان کا نام روشن کرنا تھا تا کہ وہ اپنا سر بلند کر کے چل سکے۔ غرض میرے کندھو پر ذمہ داریوں کا بہت بوجھ تھا۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور اکلوتی ہونے کے ناتے مجھ سے ان کی جملہ توقعات کا وابستہ ہونا فطری اور لازمی امر تھا۔ مجھے خود بھی اپنے باپ کی تمنا کا شدید احساس تھا اور میں ان کی تمام تر خواہشات کے پورا کرنے کا اپنے دل میں گویا عہد کر چکی تھی۔ میرے باپ کے پاس دولت کی کثرت تھی اور میرے پاس حسن کی فراوانی تھی، ذہن تھا۔ کالج میں پہنچ کر مجھے اپنی اہمیت کا احساس مزید بڑھا۔ میری کلاس کی لڑکیوں کے علاوہ بھی دوسری لڑکیاں مجھ سے دوستی کرنے کی خواہاں نظر آتیں۔ استاد خصوصیت سے توجہ صرف کرتیں اور کالج سے باہر نکلتی تو کالج کے گیٹ پر لڑکیوں کے منتظر کھڑے لڑکوں کی توجہ کا مرکز سب سے زیادہ میں ہی بنتی۔ اس ماحول نے میرے اندر غرور کا بیج بو دیا۔ بداخلاق تو میں نہ بن سکی مگر لڑکوں کے معاملے میں ہمیشہ بے نیاز بنی رہی۔ حالانکہ اندر سے میرا جی چاہتا، کوئی میری تعریف کرے، مجھ سے محبت جتائے، مجھ پر مر مٹنے کی قسمیں کھائے۔ مجھے دنیا کی منفرد اور حسین لڑکی بتلائے۔ مجھے اپنے خوابوں کی شہزادی کہے۔ انسان کی فطرت بھی عجیب ہے۔ اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی دوسروں سے اپنے متعلق سننا چاہتا ہے۔ تعریف کا صرف ایک جملہ، محبت کا مبہم سا کوئی فقرا۔ ستائش کا ایک ننھا سا لفظ۔ عورت کا خمیر ہی شاید ایسی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ تاہم اس سب کے باوجود میں خود کو لیے دیے رہتی۔ سنبھال کے رکھتی۔ پھر بھی اپنے ہمسائے میں رہنے والا وہ جھکی جھکی سی شوخ آنکھوں والا لڑکا میرے حواس پر چھاتا جا رہا تھا۔ کالج آتے جاتے وہ اکثر اپنے گیٹ پر کھڑا مجھے ملتا۔ جیسے میری گاڑی کو اخیر تک تکتا رہتا ہے۔ اس کی بے تاب پر شوق نگاہیں مجھے اپنی پیٹھ میں گڑی محسوس ہوتیں مگر کبھی ایک بار بھی میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا مجھے اپنی ''انا'' بہت عزیز تھی اور بلند آدرش میرے سامنے تھا۔ میں نے بی اے کا امتحان دے لیا تو اس کے گھر سے رشتہ آیا۔ خوشی سے لمحہ بھر کو میں بے قابو ہوگئی۔ مگر میرا بلند آدرش؟ میں نے اپنی خوشی کو اپنے آدرش پر قربان کر دیا اور میری ماں نے رشتے سے انکار۔۔۔!

''ابھی تو ہماری بچی نے صرف بی۔ اے کیا ہے۔ ابھی ایم اے کرے گی پھر ڈاکٹریٹ، اور پھر۔۔۔!''

اور اس ''پھر'' کے آگے ایک لمبی لائن تھی۔

''دیکھو بھئی! ہم ابھی جانے کون کون سے علوم پڑھوائیں گے۔ کیا کیا کچھ کروانے کے ارادے ہیں۔ تم انتظار کر سکتے ہو تو کر لو ورنہ ہمیں رشتوں کی بھلا کیا کمی پڑی ہے''۔ دولت مند باپ کی اکلوتی، خوبصورت، تعلیم یافتہ لڑکی کو بھی کہیں رشتوں کی تھوڑ ہوئی ہے؟ میرے گھر رشتے آتے رہے اور میری ماں میرے باپ کی ہدایت کے بموجب آنے والوں کو ٹکا سا جواب دیتی رہی۔

''ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ کون سی عمر نکل گئی۔ ہو جائے گا سب، پہلے تعلیم تو مکمل کر لے''۔ اور میں نے اپنے ہمسائے کے لڑکے کو ذہن سے جھٹک کر بے فکری کے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وقت اپنی مدھم، غیر محسوس رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک دن اس جھکی جھکی شوخ آنکھوں والے لڑکے کے گیٹ پر دلہن کی پھولوں سے سجی گاڑی آ کے رکی اور میں نے بڑے فخر کے ساتھ مسکرا کر اپنی ماں سے کہا ''لوگوں کو اپنی زندگی کا مقصد ہی معلوم نہیں۔ پیدا ہوئے، بڑے ہوئے اور شادی کر کے نچنت ہو بیٹھے کہ جیسے ہر مرحلہ سر کر لیا۔ مقصد حیات حاصل ہو گیا۔ کبھی کسی نے سوچا کہ شادی کے علاوہ بھی کچھ کر سکتا ہے۔ اسے کچھ اور کرنا چاہیے؟'' میری ماں نے میرے اعلیٰ و ارفع نظریات کے ساتھ اتفاق کیا اور میری زبان دانی کی تعریف کی۔ ماں کی حمایت سے میرا حوصلہ بڑھا ضرور مگر مجھے لگا جیسے کوئی چیز میرے دل کے قریب ٹوٹ سی گئی ہے۔ کچھ گڑبڑ ہوئی ضرور تھی۔ دل شکستگی کا ایک عجیب سا احساس، مایوسی کی سرد لہر، کہیں میں ملفوف بے کیف سی زندگی، یونیورسٹی کی رنگین فضا اچانک دھند سے اٹ گئی تھی۔ شفاف نیلے آسمان پر ابر چھا گیا تھا۔ تب میں نے خود سے سوال کیا۔

"کیا یہ میں ہوں؟ اتنی بزدل؟ ایسی احمقانہ سوچ رکھنے والی؟ میرے سامنے کتنے بلند آدرش ہیں۔ مجھ پر کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ مجھے اپنے باپ کی خواہشات پر بہر طور پورا اترنا ہے۔ مجھے دنیا کو بتانا ہے کہ شادی کر کے اور بظاہر گھر بسا کر بیٹھ جانے کے علاوہ بھی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ عورت محض گھر داری کی ہی نہیں اور بھی بہت سی ذمہ داریاں نبھا سکتی ہے۔ وہ صرف افزائش نسل کا پرزہ نہیں، دنیا کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے۔ مردوں سے کہیں بڑھ کر علم سیکھ سکتی ہے"۔

یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے کئی مقامات پر لڑکھڑا کر میں گرنے لگی مگر میرے بلند ارادوں نے مجھے سہارا دیا اور میں سنبھل کر پھر آگے چل کھڑی ہوئی۔ ایم اے کی ڈگری لینے تک میرے امیدواروں میں کمی آتی گئی اور اس صورت حال سے میرے دانا باپ کو ایک گونا اطمینان ہوا اور اس نے مجھے مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا۔ میں خوش تھی۔ اپنی ہم جولیوں میں میں سب سے اونچی سیڑھی پر کھڑی تھی۔ میری چچیری خلیری قسم کی بہنیں اپنی گودیوں میں کئی کئی بچے لٹکائے پھر رہی تھیں اور مجھ پر رشک کر رہی تھیں۔ میرے سامنے ایک درخشاں مستقبل تھا۔ اعلیٰ نصب العین تھا۔

چھ۔۔۔ مختصر سے چھ برسوں بعد جب میں باہر سے لوٹی تو میرے پاس بہت سی ڈگریاں تھیں۔ میرے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کا لاحقہ لگ چکا تھا۔ ملنے والوں کے دل میرے احترام میں جھکتے تھے۔ میرے کزن لڑکے لڑکیاں مجھ سے بات کرتے جھجکتے تھے۔ میرے ماں باپ کے سر فخر و انبساط سے اٹھے ہوئے تھے۔ مگر بڑھاپا ان پر حاوی ہو چکا تھا۔ میری ماں کو گٹھیا کے مرض نے آ گھیرا تھا اور میرا باپ کئی بیماریوں کا شکار ہو چکا تھا اور میرے چہرے پر ہلکی جھریوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ اور میری مانگ میں سفید چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے اور میرے اعصاب تھک چکے تھے اور میری ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اپنے باپ کی واحد اولاد تھی اور مجھے اس کے پھیلے ہوئے کاروبار کو سنبھالنا تھا اور اپنی اعلیٰ ترین ڈگریوں کو استعمال میں لانے کے لیے کسی سرکاری محکمے میں اچھی سی نوکری حاصل کرنا تھی۔ میری ذمہ داریوں کا دائرہ گویا مزید وسیع ہو گیا تھا۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد مجھے نوکری آفر ہوئی۔ وہ ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار شپ تھی۔ اس سے بڑا عہدہ حاصل کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں ناتجربہ کار تھی۔ سرکاری ملازمت کے لیے میری عمر زیادہ ہو چکی تھی اور میرے والدین سفر آخرت باندھے ہوئے تیار بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ میرے ہاتھ پیلے کر دیں مگر شادی کے لیے میری عمر نکل چکی تھی اور میری عمر کے سب لڑکے اپنے بچوں کی جوانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ جھکی جھکی آنکھوں والا لڑکا ایک متین مرد بن چکا تھا۔ اب میرے گزرتے سمے اس کی نگاہیں بے چینی سے میرے تعاقب میں نہیں اٹھتی تھیں۔ میں اس کی ایک نظر غلط انداز کی بھی مستحق نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی بیوی اور نوجوان بچوں کے ساتھ بے نیازی سے میرے پاس سے گزرتا تھا۔ میرے ماں باپ میری تنہائی کے دکھ سے بوجھل تھے اور میرے معیار و اسٹیٹس کا رشتہ مفقود تھا۔ انہوں نے مجھے اپنی پسند سے اپنا گھر بسا لینے کو کہا مگر شاید وہ نہیں جانتے کہ اس کے لیے بھی اب وقت نکل چکا ہے۔ وقت کا بہتا دھارا جانے کتنے پل کراس کر چکا ہے۔ کتنے پلوں کے نیچے سے گزر گیا ہے۔

میں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کی ڈگریوں کی فائل کو شیلف میں بند کر دیا ہے اور اپنے باپ کا گرتا ہوا کاروبار سنبھال لیا ہے کہ مجھے گھر میں بیٹھ کر گھر سنبھالنے کا کوئی شعور نہیں۔ میں تو ایک ایسا پھول ہوں جو شاخ پہ لگے لگے ہی بن کھلے مرجھا گیا ہو اور اس کے جی میں کسی کے کوٹ کے کالر میں ٹنکنے کی حسرت ہی رہ گئی ہو۔ میں خود سے پھر سوال کرتی ہوں اور پوچھتی ہوں۔

"میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ میرے آدرش پورے ہوئے یا نہیں؟ اور کیا میں ان آدرشوں کے سہارے جی سکوں گی؟"

مگر میں جانتی ہوں کہ جیسے بھی ہوگا مجھے بہتر طور پر اس کی پاسداری کرنا ہوگی۔ اس کہر زدہ شام کو مجھے تنہا ہی کاٹنا ہے۔ بالکل تنہا۔۔۔!

☆☆☆

ہوٹل سلازار

عطیہ سید

واشنگٹن سکوائر کے جنوب مشرقی کونے سے جو سڑک پھوٹتی ہے، اس پر چند فرلانگ کے فاصلے پر ہوٹل سلازار واقع ہے۔ یہ اس صدی کے اوائل کے طرزِ تعمیر کا نمونہ، ایک سادہ، بے رنگ عمارت ہے جس کی دیواریں مسلسل بارشوں سے کائی زدہ ہیں۔ اس کا اوپر والا حصہ کالے سیاہ رنگ کا ہے۔ سنا ہے کہ یہ بیس برس پہلے آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ نجانے کیوں، اسے اسی رنگ میں محفوظ کر دیا گیا، اور اب یہ خستہ حال سرمئی آخری منزل اپنی اندھی آنکھوں سے اردگرد کی جدید تر عمارتوں میں قدامت کی انفرادیت لیے، راہگیروں کی توجہ کھینچتی ہے۔

ہوٹل کی تنگ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی داہیں جانب لکڑی کا تنگ زینہ گذرے وقتوں کی یاد دلاتا ہے۔ بائیں جانب استقبالیہ (Reception) کا لکڑی سے بنا ڈبہ نما کمرہ ہے جس کی کھڑکی ڈیوڑھی میں کھلتی ہے۔ اس کھڑکی میں ہر وقت یا تو لحیم شحیم حبشی مہماندار (Receptionist) یا موٹی توند والا برازیلین منیجر براجمان رہتا ہے۔ زینے اور اس لکڑی سے بنے ڈبہ نما کمرے کے درمیان ایک ننھی منی لفٹ موجود ہے۔ اگر کوئی چیز ہوٹل کی گذشتہ گھٹیا شان و شوکت کی یاد دلاتی ہے تو وہ ہوٹل کی یہی لفٹ ہے جس کی اندرونی دیواروں پر سیاہی مائل کلیجی رنگ ویلوٹ منڈھی ہے۔ لفٹ کی تین دیواروں پر قد آدم آئینے بھی جڑے ہیں اور دروازے کا اہتمام یوں ہے کہ جب دونوں پٹ بند ہو جائیں تو دو نیم آئینہ یک جان ہو کر باقی تین دیواروں کی مانند ثابت و سالم قد آدم آئینے کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس لفٹ کی خوبی یہ ہے کہ آپ نرگسیت کا شکار ہوں یا نہ ہوں اپنے عکس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

لفٹ بہت پرانی ہونے کے سبب ہر وقت کراہتی رہتی ہے۔ اس کے کل پرزے، چولیں، سب وقت کے ہاتھوں زخم خوردہ ہیں۔ اسی لیے یہ چوں چوں کرتی انتہائی سست روی سے اوپر کی طرف سفر کرتی ہے جیسے کوئی بڑھیا ہانپتی کانپتی چڑھائی چڑھ رہی ہو۔ ہوٹل کے اکثر گاہل اپنے حق میں بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ لکڑی کے زینے سے اوپر نیچے آئیں جائیں۔ ویسے بھی لفٹ تنگی داماں کی بنا پر ایک وقت میں صرف ایک مسافر بے سروسامان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اگر مسافر مع سامان ہے تو اسے کون اتارے گا، اگر خود لفٹ میں چلا جاتا ہے تو سامان کیسے پہنچے گا۔ اس لیے اکثر گاہک لکڑی کے زینے کو آزماتے ہیں جو اپنی قدامت کے باوجود اتنا فراخ ضرور ہے کہ گاہک اور اس کے سامان دونوں کو سہار سکتا ہے۔

اوپر پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد زینے کے دہانے سے دو کوریڈورز نکلتے نظر آتے ہیں۔ زینے کی بالکل سیدھ میں ایک لمبا بل کھاتا ہوا کوریڈور ہے، جس کے پیچ و خم کے سبب اس کا آخری سرا نظروں سے اوجھل ہے۔ جانے وہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ دائیں جانب صرف دیوار ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں۔ زینے کے بالکل ساتھ ہی لفٹ کا دروازہ ہے جس کے قریب سے زینہ بل کھاتا ہوا اوپر کی منزلوں کو چلا جاتا ہے۔ بائیں جانب جو کوریڈور ہے وہ آگے جا کر ایک لمبی گیلری کے ساتھ جڑتا ہے۔ اس میں کئی گیلریوں کے دروازے کھلتے ہیں جو اس مرکزی گیلری کے ذریعے سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ باقی تمام منزلوں پر اسی نقشے کی تکرار نظر آتی ہے۔ غرضیکہ کوریڈورز اور گیلریوں کی بھول بھلیاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوٹل سلازار کی تنگی کا جو تاثر اس کی ڈیوڑھی سے پیدا ہوتا ہے در حقیقت صحیح نہیں۔ اس کا گراؤنڈ فلور یعنی ڈیوڑھی والا حصہ یقیناً رقبے میں بے حد محدود ہے، لیکن جوں جوں ہم اوپر کی طرف جاتے ہیں اس کے پھیلاؤ میں پراسرار طریقے سے اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ شمالاً جنوباً، شرقاً غرباً، کمرے گیلریوں کے

ذریعے سے ملے ہوئے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوریڈورز اور گیلریوں کا ایک معمہ بکس تیار کیا گیا ہے جس میں انسان بالکل اسی طرح بھٹک سکتا ہے جس طرح ماہرین طبیعات کی تجرباتی بھول بھلیوں میں چوہا۔ بظاہر ہوٹل سلازار کی تعمیراتی ساخت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ لیکن اس کے اندر گھومنے کے بعد تصور کی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ ایک تکون کی طرح ہے جو اپنے کسی کونے پر سیدھی کھڑی ہو یا جیسے اہرام اپنی نوک کے بل کھڑے ہوں۔ غالباً یہ امریکن تجارتی ذہن کی توسیع پسندی کے رویئے کا کرشمہ ہے کہ سلازار کے مالک کو جس ملحقہ عمارت کا کوئی اپارٹمنٹ حاصل ہوا وہ اسے ہوٹل میں شامل کرتا گیا اور گیلریوں کے ذریعے باہم ملاتا چلا گیا۔

مختلف منزلوں میں جو گیلریاں اور کوریڈورز ہیں ان میں گھسی پٹی دریاں بچھی ہیں جو جوتوں کی مسلسل رگڑ سے تار تار ہیں۔ ان دریوں کا کوئی خاص مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ سوائے عذر زیبائش کے، جسے پورا کرنے میں بینا کام ہیں۔ گیلریوں کی دیواروں پر جو وال پیپر چڑھا ہے وہ کبھی نکھرے آسمانی رنگ کا ہوگا لیکن اب وہ مٹیالے رنگ میں ڈھل چکا ہے۔ اس وال پیپر پر کھڑی جل پریوں کا نقش ہے، جو اس قدر گھس پٹ گئی ہیں کہ اپنے گلیمر سے محروم ہو چکی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ زمانے کے ہاتھوں کسی کا سر غائب ہے اور کسی کا دھڑ، عموماً آنے جانے والوں کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ اس تخیلی مخلوق کی طرف توجہ دے سکیں، لیکن کبھی ان پر بھولے سے نظر پڑ جائے کہ دل دہل جاتا ہے کہ دیکھنے والا شخص اپنے آپ کو سینکڑوں عجیب الخلقت اپاہج جل پریوں کے غول در غول میں گھرا پاتا ہے۔

بہزاد جب نوکری کی تلاش میں اس شہر میں وارد ہوا تو اس کی جیب بھاری تھی۔ چنانچہ وہ لنکن سینٹر کے بالمقابل ایک اونچے متوسط درجے کے ہوٹل میں آکر اترا۔ مگر جوں جوں دن گزرتے گئے، نوکری ناپید رہی اور جیب ہلکی ہونے لگی تو اسے کسی ایسے ہوٹل کی جستجو ہوئی جو کم کرائے پر کمرے اٹھاتا ہو۔ بعد از بسیار وقت و تلاش اسے گوہر مقصود ہوٹل سلازار کی شکل میں نصیب ہوا۔ اسے محض اتفاق کہیے یا خوبی تقدیر سمجھئے کہ جس دن بہزاد نے پوچھا اسی دن ایک کمرہ موجود تھا۔۔۔ وہ فوراً وہاں اٹھ آیا۔ کیم شمیم حبشی نے اسے بتایا کہ جو کمرہ خالی ہے وہ چودھویں منزل پر واقع ہے۔ جب بہزاد اپنا سامان ڈیوڑھی میں حبشی کے حوالے کر کے کمرہ دیکھنے کی غرض سے لفٹ کے ذریعے اوپر جانے لگا، تو اسے بے حد حیرت ہوئی کہ لفٹ میں منزلوں کی نمبر پلیٹ پر بارھویں منزل کے فوراً بعد چودھویں منزل کا نمبر لکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ غلطی سے تیرھویں کو چودھویں لکھ دیا گیا تھا، اگر چہ اس قوم کی میکانکیت کی حد تک مکمل کارکردگی کی استعداد سے اس قسم کی غلطی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ پھر بھی انسان انسان ہے اور خطا کا پتلا ہے۔ اس لیے بہزاد نے اپنی تیسری دنیا کی قدیم سوچ کے مطابق اسے انسانی کوتاہی جان کر کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ البتہ جب وہ ہوٹل کے عملے سے بات کرتے ہوئے کہتا کہ اس کا کمرہ تیرھویں منزل پر ہے تو وہ لاحول پڑھتے ہوئے غائب ہو جاتے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور ایک دن اس نے ہوٹل کے براز یلین منیجر سے یہ پہیلی بجھوانے کی کوشش کی۔ منیجر نے اس کے سوال کے جواب میں اگر چہ 'احمق' یا 'جاہل' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اسے احمق یا جاہل یا دونوں کی آمیزش خیال کر رہا تھا۔ پھر بھی منیجر نے زیادہ علم رکھنے کی بنا پر احساس برتری کے تحت اس پر یہ منکشف کیا کہ بے وقوف کیا تم نہیں جانتے کہ تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے، اس لیے یہاں کسی عمارت میں بھی تیرھویں منزل کا ذکر نہیں ہوتا، بلکہ تیرھویں کو چودھویں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بہزاد کی سمجھ میں یہ منطق نہ آئی کہ اگر تیرھویں منزل موجود ہوتی ہی ہے تو اس کے چودھویں پکارنے سے آئی بلا کیسے ٹل جاتی ہے۔ بہر حال یہ منکشف ہو گیا کہ چاند پر پہنچنے والے انتہائی ترقی یافتہ امریکن ویسے ہی توہم پرست ہیں جیسے برصغیر کے کسی پسماندہ گوشے میں بسنے والے جہاں اب تک کوروؤں پانڈوؤں کی رتھ گڈ اور ریڑے کی شکل میں چل رہی ہے۔ اس طرح خلائی دور اور قرون اولی کا باہم فاصلہ گھٹ کر صفر رہ جاتا ہے۔

جب بہزاد اپنے کمرہ میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کی تو اس کا دل دہل گیا۔ کمرے کی دیواریں پر ہیبت سیاہ رنگ کی تھیں۔ کھڑکی سڑک کی جانب کھلنے کے بجائے ساتھ والی بلڈنگ کی چھت پر کھلتی تھی جس کی چادر زنگ کی وجہ سے کہیں سے بھورے رنگ کی تھی، اور بارش کا پانی جمع ہو جانے کے سبب کہیں سے سیاہ تھی۔ اس کھڑکی میں جو شیشے لگے تھے وہ چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے ٹکڑوں کی صورت میں تھے۔ لیکن کالی دیواروں کے پس منظر میں آگ کے دہکتے انگاروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ کمرے میں ایک پلنگ، ایک تپائی، ایک کرسی اور ایک الماری تھی۔ کمرہ صاف ستھرا ہونے کے باوجود بہزاد کو بوسیدگی کے علاوہ عجیب طرح کی گھٹن کا احساس ہوا۔ کمرے میں کپڑوں کے ایسے بند ٹرنک کی سی بو تھی جسے بڑی مدت کے بعد کھولا گیا ہو۔ اس نے الماری کھولی تو اس میں سے بھی بند بو آ رہی تھی۔ اس نے فوراً الماری بند کر دی۔ بستر میں بھی کافور کی گولیوں کی ہمک تھی۔

بہزاد کو کمرے کی ہر چیز سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ وہ بڑی محنت سے صاف کی گئیں تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا سو بستر پر لیٹ گیا، مگر نینداس سے کوسوں دور تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر اسے اس کمرے اور اس میں رکھی ہر چیز سے تنفر کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ جبکہ اس کی کوئی ٹھوس وجہ موجود نہیں۔ یقیناً یہ کمرہ آتشزدگی کی باقیات میں سے تھا۔ لیکن اسے اسی حالت میں محفوظ رکھنے کا کیا جواز تھا۔ بھلا کون اس کے آسیب زدہ ماحول میں رہنا پسند کرے گا۔ شاید ہوٹل کے مالک کو اس میں کوئی خاص کشش اور انوکھا پن محسوس ہوتا ہو۔ ویسے بھی اس ملک کے باسیوں کا احساس جمال ناقابل فہم ہے۔ جن چیزوں کو عموماً بھدا، بدصورت حتیٰ کہ کریہہ المنظر سمجھا جاتا ہے، یہ انہیں حسین، خوبصورت اور دلفریب تصور کرتے ہیں۔

بہزاد ساری رات عجیب کیفیت سے گذرا۔ ایک انجانے خوف سے اسے ٹھنڈے پسینے آتے رہے۔ بالآخر وہ تھک ہار کر سویا بھی تو ایسی نیند کہ ذہن نیم بیدار تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ گیا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ سر میں شدید درد تھا۔ سوچا کہ تازہ دم ہونے کے لیے غسل کر لیا جائے۔ اس غرض سے جب غسل خانے گیا تو 'لاحول' پڑھ کر پلٹ آیا۔ ہر چند کے غسل خانے کی ہر چیز صاف ستھری تھی، لیکن اتنی پرانی تھی کہ گندگی کا تاثر دیتی تھی۔ ٹب، سنک اور فلش کی چینی جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھی اور نیچے سے زنگ آلود سیاہی جھانک رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ صفائی کے باوجود ناقابل برداشت بو آ رہی تھی جیسے مردہ چوہے کا تعفن۔

آخر بہزاد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا منیجر کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ موٹی توند والے براز یلین منیجر کو یقین تو نہ آیا کہ کوئی مردہ چوہا غسل خانے میں لیٹا بدبو کے بھبھکے اڑا رہا ہے، مگر بہزاد کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے خیال سے اس نے جنیٹر کو اس کے ساتھ غسل خانے میں بھیجا تک کہ بدبو کا معمہ حل کیا جا سکے۔ جنیٹر نے لاکھ کوشش کی کسی مردہ تو کیا کسی زندہ چوہے کا سراغ بھی نہ مل سکا، لیکن بہزاد اتنی جلد ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس جھلسے ہوئے آسیب زدہ کمرے، بند بو والے بستر اور مرے ہوئے چوہے کے تعفن سے ہر صورت چھٹکارا حاصل کرے گا۔ سو وہ دوبارہ منیجر کے پاس پہنچا اور کچھ اس موثر اور قابل رحم انداز میں اپنی وکالت کی کہ اس کا دل پسیج گیا اور اس نے پہلی منزل پر ایک ننھے منے سے کمرے کی پیش کش کی۔ بہزاد فوراً راضی ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ ہر کمرہ اس کمرے سے بہتر ہو گا۔ چنانچہ وہ منیجر سے چابی لے کر اپنا بکس اٹھائے ہوئے نئے کمرے میں آن پہنچا۔

یہ انتہائی چھوٹا یعنی ۷x۷ فٹ کا کمرہ تھا جس میں بمشکل ایک بیڈ رکھا جا سکتا ہے۔ بیڈ کے علاوہ اس میں صرف ایک کرسی تھی اور بس۔ کمرے کی کل اوقات یہی تھی۔ اس کمرے سے منسلک غسل خانہ اعلیٰ درجے کا نہ سہی، مگر کم از کم قابل برداشت تو تھا۔ کمرے میں دو پٹوں والی ایک کھڑکی تھی جو باہر سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے واشنگٹن سکوائر کے کچھ حصے کا نظارا بھی ممکن

تھا بشرطیکہ کھڑکی میں سے اچک کے سر باہر نکال کر دیکھا جائے۔ اس کے علاوہ بستر پر لیٹے ہوئے کھڑکی سے سامنے والے چرچ کی بیل فری کا مینار بھی دکھائی دیتا تھا۔

بہزاد کو اس نئے کمرے میں منتقل ہوئے کئی روز بیت گئے۔ جوں جوں وقت گذرتا چلا گیا، مسافتوں کے در کھلتے چلے گئے، بہزاد ناسٹلجیا کی زد میں آتا چلا گیا۔ اس اژدہا کی طرح بہت بڑے کاسمو پولیٹن شہر کے روزمرہ سے بے ربطی کا احساس شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ جتنا یہ احساس گہرا ہوتا گیا، اتنا ہی اپنے دیس کی یاد کسک کی شکل میں ڈھلتی گئی۔ شاید ان دونوں کے درمیان 'برابر تناسب' کا رشتہ تھا۔ فاصلے ویسے بھی جذبوں کو منکشف کرتے ہیں۔ زیادہ قربت مانع بصارت اور قاطع بصیرت ہوتی ہے۔ جب گھر میں رکھی اشیاء ہر روز اپنے مقام پر ملیں، تو آہستہ آہستہ اپنی مانوسیت کی بنا پر جاذب توجہ نہیں رہتی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز اپنی جگہ سے غائب ہو، تو اسکی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال بہزاد کی تھی۔ جب وہ وطن میں تھا تو اس کی ہر چیز سے بیزار تھا، اور اب ان تمام چیزوں کے لیے بے قرار جنہیں اس نے کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ پان سے اس نے ہمیشہ تنفر محسوس کیا، لیکن اب بعض دفعہ بیٹھے بٹھائے اس کی زبان پان کے پتے کا ذائقہ محسوس کرتی اور سونف سپاری کی خوشبو اس کے نتھنوں میں کہیں سے آگھستی۔ ایک دن ٹائم سکوائر کے قریب چلتے چلتے اچانک جانے کہاں سے چنبیلی موتیے اور گلابوں کی مہک سا کے ساتھ ہولی۔ راتوں کو اکثر اسے اپنے کمرے میں بستر پہ لیٹے لیٹے نیچے سڑک پر لوگ اردو بولتے سنائی دیتے، جس پر وہ فوراً بستر سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکتا اور اسے بڑی مایوسی ہوتی یہ جان کر کہ نیچے سڑک پر اردو میں نہیں، انگریزی میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اکثر اوقات صبح سویرے نیم بیداری میں وہ محسوس کرتا جیسے وہ اپنے دیس میں اپنے گھر میں لیٹا ہوا ہے۔

غرضیکہ بہزاد کے دل و دماغ مکمل طور پر ناسٹلجیا کی دلدوز گرفت میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے اعصاب مغلوب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ عموماً غنودگی حالت میں رہتا۔ صبح جب گھڑی الارم بجاتی تو وہ آنکھیں کھولتا، لیکن اسکا وجود ہلنے سے انکاری ہو جاتا۔ اس کے پپوٹے بند ہو جاتے، ذہن نیم غنودگی حالت میں ہوتا، اور جسم کے پٹھے مزید آرام کی خواہش میں ڈھیلے پڑ جاتے۔ یہ کیفیت سارا دن اس پر طاری رہتی، اور وہ اکثر بارہ بجے سے پہلے اٹھنے کے قابل نہ ہوتا۔ اس نیم بیداری نیم غنودگی کی نباتاتی حالت میں اس کا ذہن گم گشتہ ماضی کے پچھتاوے سے محظوظ رہتا۔ شاید یہ اس کے وجود کا دفاعی ہتھکنڈا تھا۔

اگرچہ بارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھل جاتی، مگر روزمرہ میں شرکت سے گریز اب بھی موجود رہتا، سو وہ بستر پر لیٹے لیٹے کھڑکی سے باہر سامنے سکوئر کی پرلی طرف واقع چرچ کی بیل فری کو تکتا رہتا، جس میں لگی دیوہیکل گھنٹی جب بج اٹھتی تو فری بیل میں بسیرا کرنے والے سفید کبوتر غول در غول پھڑ پھڑاتے ہوئے بیل فری کی چاروں کھڑکیوں سے طوفان کی طرح پھوٹ پڑتے اور آسمان کو پل بھر کے لیے بھر کے لیے برف کے گالوں کی طرح سفید کر ڈالتے۔ جانے کیوں بہزاد کو ان کبوتروں کو دیکھ کر بہاالدین زکریا کے مزار کے گنبد پر اڑنے والے کبوتر یاد آتے جن کی ڈاریں چراغ والے صحن میں دانہ چگنے اترتی تھیں۔

ایک دن اسی کیفیت میں اسے ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے اور ساتھ والے کمرے کے درمیان جو دیوار تھی وہ اس قدر پتلی تھی کہ آواز صاف آ رہی تھی۔

''ہیلو لنڈا سویٹ ہارٹ! ہاؤ آر یو''۔

غالباً فون پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کیونکہ جواب میں مخاطب کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

''ہاں میں، میں ٹھیک ہوں''۔

گفتگو جاری رہی۔" کیا؟ آج کل کیا لکھ رہا ہوں؟ ایک پرتگالی لڑکی اور سیاہ فام کی داستان۔ سیاہ فام کو ایک پرتگالی لڑکی سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اسے پا بھی لیتا ہے، مگر وصل کی قربت ہی سے فراق کی شدت جنم لیتی ہے، جس کی کہانی میں لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا کہا؟ وصل سے فراق کیسے؟ وہ یوں، لنڈا ڈیئر! کہ پرتگالی طبعاً قنوطی ہوتے ہیں اور سیاہ فام بنیادی طور پر خوش طبع اور رجائی۔ اسی لیے ان کے تمدن کی روح، اتنی مختلف ہے۔ یہی تمدنی اور نفسیاتی فاصلے ان کے درمیان بڑی ڈھٹائی سے حائل ہیں جن کا احساس اس وقت زیادہ شدت سے ابھرتا ہے، جب دونوں فریق ایک ہی چھت تلے زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں اور ان کے جسمانی ملن سے روحانی بیراگ جنم لیتا ہے۔۔۔۔"

"کیا؟ ہاں۔ یہ ایک مسحور کن موضوع ہے"۔

"اچھا۔ خدا حافظ۔ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔ پھر بات ہوگی، بائی۔۔۔"

کچھ دنوں تک بہزاد کو ساتھ والے کمرے میں ہونے والی روزمرہ کی گفتگو سننے کا موقع نہ مل سکا یا شاید گفتگو ہوئی ہی نہ ہو۔ غالباً کہانی نگار کمرے میں موجود نہیں تھا یا پھر اتنا مصروف کہ اسے اپنی دوست لنڈا کو فون کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ عموماً تخلیق کار جب کسی تخلیق کی زد میں ہوتا ہے تو تخلیقی عمل اسے شاذونادر ہی معاشرتی میل جول اور رسمیات کی مہلت بخشتا ہے۔۔۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سلازار سے جا چکا ہو۔

کافی عرصے بعد ایک دن بہزاد کو کہانی نگار کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ حسب معمول لنڈا سے محوِ گفتگو تھا اور اپنی تحریروں کا ذکر کر رہا تھا۔

"یس۔ لنڈا ڈارلنگ! وہ پرتگالی اور سیاہ فام کی کہانی۔۔۔ ہاں مکمل ہوگئی۔۔۔" اور پھر بہزاد کو کھسیانی ہنسی کی آواز آئی۔

"خیر۔ اس کا تذکرہ اب کیا۔ سنو، اس وقت میں نیویارک کے ٹی وی نیٹ ورک نمبر۲ کے لیے ایک سیریل لکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ کیا؟۔۔۔ وہ کس قسم کا ہوگا؟۔۔۔ وہ سینٹ ہلز بلیو کی طرز پر لکھا جائے گا۔ مرکزی خیال؟۔۔۔ امریکی نوجوانوں میں ۱۹۶۰ء کے اردگرد جو تشخص کا بحران پیدا ہوا تھا اس کے سیاق و سباق پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا"۔

پھر ذرا توقف سے کہانی نگار بولا "بس لنڈا میرے لیے دعا کرو کہ میں اس خیال کو خوبصورتی سے تحریر کر سکوں۔۔۔ تم ایسا کرو گی۔۔۔ یقیناً۔۔۔ شکریہ مجھے خوش قسمتی کی انتہائی ضرورت ہے۔۔۔۔" اور فون بند ہوگیا۔

ابھی تک بہزاد کو کہانی نگار کی شکل و صورت دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا، اگرچہ وہ اس کا اور لنڈا کا مکالمہ اکثر سنتا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے کہانی نگار کو دیکھ ہی لیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل رہا تھا، بہزاد کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس نے رسمی انداز میں مسکرا کر "ہائے" کہا۔ وہ ایک لانبے قد، چھریرے بدن، کریو کٹ بالوں والا سادہ لوح سینکی دکھائی دیتا تھا، جس نے ٹخنوں تک لمبا اوور کوٹ اور جاگر پہنے ہوئے تھے۔ اس دن کے بعد وہ اکثر اسے کوریڈور، لفٹ یا ہوٹل کی ڈیوڑھی میں ملتا اور رسمی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موسم کا ذکر کرتے ہوئے، ہلکورے کھاتے ہوئے تیزی سے اس کے پاس سے گذر جاتا۔

کہانی نگار کا کمرہ بہزاد کے کمرے سے پہلے آتا تھا۔ اس لیے بہزاد کو اپنے کمرے سے باہر جانے اور باہر سے اپنے کمرے کی طرف آنے کے لیے اس کے کمرے کے سامنے سے گذرنا پڑتا تھا۔ وہ اکثر کہانی نگار کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ تجسس نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور وہ بڑی دلچسپی سے کمرے کے اندر دیکھنے لگا۔ کہانی نگار مسلے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر بیچ فرش پر آلتی پالتی مارے گھٹنے پر کہنی ٹکائے، ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائے کسی گہری سوچ میں غرق، اپنی دھن میں مگن بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بہزاد کی ٹکٹکی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے میں سے بہزاد کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں اداسی اور لبوں پر کھسیانی ہنسی

تھی۔اس سے پہلے کہ بہزاد ردی کے اس ڈھیر کا راز دریافت کرتا جس کے بیچوں بیچ وہ براجمان تھا، وہ خود ہی بولا۔۔۔"دراصل میں کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں"۔

اس نے بڑی بے چارگی سے مڑے ہوئے کاغذوں کے انبار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ عجیب واردات ہے کہ نازک سبک سوچیں الفاظ کے قالب میں ڈھل کر جب کاغذ پر سیاہ نقش کی صورت ابھرتی ہیں تو وہ بھدی، بے ڈول اور بے معنی ہو جاتی ہیں۔جذبے عریانی اظہار کے بعد کس قدر بے جان اور فرسودہ لگتے ہیں۔خود مجھے ان کے جھوٹ کا یقین ہونے لگتا ہے۔۔۔۔ اور ایک بے تکے پن، عجیب شرمندگی اور خجالت کا احساس جیسے میں بھرے بازار بیچ، لوگوں ے ہجوم کے سامنے گر پڑا ہوں اور کیچڑ سے لت پت ہو گیا ہوں۔۔۔ایک احساس زوال مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے"۔

"اور لنڈا۔۔۔؟" بہزاد نے پوچھا۔

"ہاں۔لنڈا؟" کہانی نگار نے چونک کر اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے دوہرایا۔

یک دم بہزاد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔اسے یاد نہ رہا تھا کہ احترام خلوت کے آداب کے پیش نظر اسے کہانی نگار اور لنڈا کی باتیں سننی نہیں چاہیے تھیں۔لیکن کہانی نگار نے اپنی خلوت کے حق کی پامالی پر متوقع چڑچڑاہٹ کے بجائے عجیب گمبھیرتا سے جواب دیا "میرے کمرے میں تو کوئی فون نہیں ہے"۔

اس پر بہزاد بھونچکا سا رہ گیا، کیونکہ کمرے میں نظر ہر طرف دوڑانے پر اسے واقعی کہیں کوئی فون دکھائی نہ دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے۔۔۔۔" بہزاد نے افسردہ حیرت سے باقی جملہ ہوا میں لٹکتا چھوڑ دیا۔اسے معصوم آنکھوں والے کہانی نگار پر بے حد رحم آیا۔جو اتنا اکیلا تھا کہ اس بھرے شہر میں، ایک خیالی دوست سے نادیدہ فون پر پہروں باتیں کرتا تھا۔۔۔اور اتنا بے بس تھا کہ لفظ اس کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔بہزاد کو ایک ناقابل فہم احساس ضیاع ہوا اور اس نے اداس شائستگی کے ساتھ کمرے کے کھلے دروازے کو بند کر دیا۔

اگلے دن بہزاد کہانی نگار کے کمرے کے سامنے سے گذرا تو صفائی کرنے والی عورت کو کمرے کی صفائی کرتے اور مسلے ہوئے کاغذوں کا ڈھیر پولی تھین بیگ میں ڈالتے ہوئے دیکھا۔گھڑی بھر کو بہزاد کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے ٹھٹک گیا۔ صفائی کرنے والی عورت نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا پھر وہ جیسے اس کا عندیہ بھانپ گئی، کہنے لگی "وہ یہاں نہیں ہے۔آج صبح سویرے اپنا بل ادا کرنے کے بعد ہوٹل چھوڑ گیا ہے"۔

"کہاں گیا ہے؟" بہزاد کے منہ سے بے ساختہ یہ سوال نکلا۔غالباً یہ سوال صفائی کرنے والی کو احمقانہ اور نا پسندیدہ لگا کیونکہ اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا "مجھے کیا معلوم"۔

اس پر بہزاد کو خیال آیا کہ کسی کی نقل و حرکت سے دلچسپی رکھنا یہاں کے آداب شائستگی کے خلاف تھا۔نتیجتاً وہ خاموش ہو گیا اور کوریڈور میں لفٹ کی سمت چلنے لگا مگر اسے کہانی کار کی رخصتی سے ناقابل تشریح آزردگی ہو رہی تھی جیسے کوئی برسوں کا آشنا بچھڑ گیا ہو۔

ایک رات بہزاد سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اسے سڑک سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیں۔اس نے اٹھ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔رات کے اس پہر سڑک سنسان پڑی تھی۔کھڑکی کے عین نیچے فٹ پاتھ پر بھی کوئی نہیں دکھائی دیتا تھا، پھر بہزاد کو خیال آیا کہ شاید آوازیں ہوٹل کی ڈیوڑھی سے آ رہی تھیں، کیونکہ اس کا کمرہ ڈیوڑھی کے اوپر پہلی منزل پر واقع تھا اور کھڑکی عین صدر دروازے پر کھلتی تھی۔اگرچہ صدر دروازے کے چھجے کی وجہ سے دروازے میں کھڑے لوگ نظر نہیں آتے تھے۔

اتنے میں آواز آئی "مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے کیوں جلتے ہو"۔کسی نے سیٹی کی طرح چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ بھلا کیوں؟'' دوسرے نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔
''اس لیے کہ تم میرے رنگ سے جلتے ہو۔ یہ تمہارا کومپلکس ہے جو تم سے یہ سب کچھ کروا رہا ہے''۔
''اچھا۔ اور بھلا وہ کونسا رنگ ہے جس کی وجہ سے مجھے کومپلکس ہے''۔ غصے سے دانت پیستے ہوئے دوسرا شخص بولا۔
اب بہزاد نے پہچان لیا تھا کہ یہ آواز ہوٹل کے حبشی کی تھی۔ ذہن پر ذرا زور دینے سے اس نے شناخت کر لی کہ پہلی آواز ایک مدقوق نشئی کی تھی، جس سے اکثر اس کی مڈبھیڑ زینے پر یا لفٹ میں ہوتی۔ یہ ایک منحنی پیلی آنکھوں، پیلے دانتوں والا میلا کچیلا سفید فام تھا، جو اپنے یرقان زدہ وجود کے ساتھ آسیب کی طرح سلازار کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔
اتنے میں پھر آواز آئی ''میرا رنگ سفید ہے اور تمہارا کالا۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے تم جھٹلا نہیں سکتے، اور اسی لیے تم مجھ سے نفرت کرتے ہو''۔
ان کے درمیان نسل در نسل پھلتی پھولتی ہوئی نفرت ان کی آوازوں میں امنڈ آئی تھی۔
''بکواس بند کرو ورنہ۔۔۔'' غصے سے رندھی ہوئی آواز میں حبشی نے چلاتے اور غالباً نشئی کو گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔
''تم ایسا نہیں کر سکتے، کیونکہ میں نے کمرے کا ایک دن رات کا پورا کرایہ ادا کیا ہے۔۔۔ پورے اکیس ڈالر، اس لیے مجھے حق ہے کہ میں پورے چوبیس گھنٹے کمرے میں گذاروں''۔ نشئی نے اپنے نحیف پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخ کر کہا۔
جواب میں کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے ہاتھا پائی ہو رہی ہو۔ پھر قوی الجثہ حبشی نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی ہوئی قدیم طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سفید فام نشئی کو اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا۔ وہ غالباً نشے کی ہذیانی سرمستی میں تھا سو سڑک پر لڑھک کر دوسرے کنارے کے فٹ پاتھ سے ٹکرایا اور گٹھڑی کی صورت وہیں ڈھیر ہو رہا۔ شاید وہ اتنا بے سدھ تھا کہ اس میں اٹھنے کی ہمت نہ تھی اور رات کے اس پہر ٹریفک مفقود تھا۔ سو اس نے سوچا کہ اٹھ کر کیا کرنا ہے، رات یہیں بسر ہو جائے تو کیا مضائقہ۔ مگر وہ آزاد کے فوجی کی طرح رات بھر با آواز بلند حبشی کو دھمکیاں دیتا رہا۔ جس سے بہزاد کو کافی بے آرامی ہوئی۔ البتہ یوں لگتا تھا کہ حبشی غصہ فرو ہونے کے بعد ان گیدڑ بھبکیوں کو نظر انداز کر کے گہری نیند سو گیا، کیونکہ اس کے فلک شگاف خراٹوں کی آواز بہزاد کو پہلی منزل پر صاف سنائی دے رہی تھی۔
اس واقعے کے کچھ دن بعد بہزاد ہوٹل سلازار کی طرف بوجھل ذہن اور تھکے قدموں سے آ رہا تھا۔ دن بھر کی تھکاوٹ درد بن کر اس کے انگ انگ میں دھڑک رہی تھی۔ ہوٹل سلازار کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی اس نے سوچا کہ وہ لفٹ سے اوپر جائے گا۔ عموماً وہ لفٹ کا انتظار کیے بغیر زینے ہی سے اوپر چلا جاتا تھا۔ اس وقت اتفاقاً لفٹ موجود نہیں تھی نیچے ہی کھڑی تھی۔ اس کے اندر روشنی نہیں تھی۔ غالباً اندر کی لائٹس فیوز ہو گئی تھیں۔ یہ سوچتے ہوئے بہزاد لفٹ میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ منزل کا بٹن دباتا۔ لفٹ کا دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا اور وہ خود بخود چلنے لگی۔
بہزاد نے دیکھا کہ لفٹ تیزی سے کسی منزل پر رکے بغیر اوپر چلی جا رہی تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے مختلف منزلوں کے بٹن دبائے مگر لفٹ تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لفٹ کی تیز رفتاری بھی حیران کن تھی۔ پھر لفٹ آخری منزل پر جھٹکے سے ٹھہر گئی۔ ابھی بہزاد سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی پشت سے کوئی چیز ٹکرائی۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا تاکہ معلوم کر سکے کہ وہ کس چیز سے ٹکرایا تھا۔ اسے اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ بدبو کا ایک بھبکا اٹھا اور ساتھ ہی دو استخوانی بازوؤں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ بہزاد نے بہتیری کوشش کی کہ اس بدبودار وجود کی بانہوں سے نکل جائے مگر ان سوکھے ہوئے بازوؤں میں جنونی قوت تھی۔ ان کے آہنی چنگل سے فرار مشکل تھا۔ تھک ہار کے اس نے یہ کوشش ترک کر دی، لیکن وہ بہر صورت لفٹ میں لگے ایمرجنسی

الارم تک پہنچنا چاہتا تھا جو اندھیرے میں اس سے چمٹے ہوئے جسم کی وجہ سے دشوار تھا کہ وہ ایمرجنسی الارم اور بہزاد کے بیچ حائل تھا۔

ایک دقت طلب جسمانی کرتب کے بعد وہ اس پر تعفن جسم کی بغل سے ایک ہاتھ نکالنے میں کامیاب ہوگیا اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے ایمرجنسی الارم کا سوئچ اون کر دیا۔ فوراً الارم چیخنے لگا اور اس کے ساتھ ایمرجنسی لائٹس جل گئیں۔ ان کی مدھم مدھم سی روشنی میں بہزاد نے دیکھا کہ وہ مدقوق نشئی اس سے لپٹا ہوا تھا جس کا کچھ دن پہلے حبشی مہماندار سے جھگڑا ہوتا تھا۔ نشئی کی آنکھیں بند تھیں اور سینے سے سانس کی کھڑ کھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کسی وجہ سے اس کا جسم ٹھنڈا ہونے لگا تھا اور اس نے اپنا سر بہزاد کے سر پر ٹکا دیا تھا۔ بہزاد کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ برف کے کسی بدبودار تودے سے لپٹا ہوا ہے۔ یہ ساری صورت حال اس کے لیے اذیت ناک تھی۔

تھوڑی دیر میں ہوٹل کا براز یلین منیجر زینے کے راستے اوپر آیا اور باہر سے بٹن دبا کر لفٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جام ہوگیا تھا۔ پھر اس کی آواز آئی ''جو کوئی بھی اندر ہے، مت گھبرائے ہم نے لفٹ ٹھیک کرنے والے کو بلا بھیجا ہے''۔

بہزاد نے جواب میں کہا ''اچھا۔ مگر برائے مہربانی ذرا جلدی کریں''۔

''ہاں۔ ہاں۔ کوشش کریں گے''۔

اس گفتگو کے بعد براز یلین منیجر زینے کے راستے نیچے چلا گیا۔

پھر جیسے وقت ٹھہر گیا۔ بہزاد کو یوں لگا جیسے صدیاں گذر گئیں۔ وہ ادھر ادھر کی سوچنے لگا۔۔۔۔ بیکار باتیں۔ اس نے دنیا بھر کی باتیں سوچ ڈالیں، مگر عذاب کی ساعت تھی کہ ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔۔۔ آہستہ آہستہ وہ خالی الذہن ہونے لگا۔ وقت قطرہ قطرہ رگ جاں پر گرنے لگا۔۔۔ ہر قطرے میں، ہر پل میں ایک نہ ختم ہونے والی اذیت پنہاں تھی۔ اس کا جسم دکھنے لگا، ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ ہر مرتبہ اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ابھی گر پڑے گا، کیونکہ اس میں کھڑا ہونے کی مزید سکت نہ تھی۔

اسی عذاب کے دوران اس کی نظر یکدم اس آئینے پر پڑی جو لفٹ میں چاروں طرف لگا ہوا تھا، اور آئینے کا ایک حصہ نشئی کی پشت پر بھی موجود تھا، جس میں اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا، مگر۔۔۔ کیا یہ اسی کا چہرہ تھا؟ کیا اس کے بال کنپٹیوں پر سے سفید تھے؟ کیا اس کے ماتھے اور آنکھوں کے نیچے لکیروں کا جال بچھ چکا تھا؟ کیا اس کے ہونٹوں کی دونوں اطراف دو بڑی سلوٹیں پہلے بھی موجود تھیں؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا تو نہ تھا۔۔۔ یا پھر شاید اس شہر میں آنے کے بعد یہ سب نشانیاں ظاہر ہوئی ہوں۔ اس شہر کے ظالم روزمرہ اور غم روزگار نے یہ سب کچھ دیکھنے کی مہلت ہی نہ دی ہو۔

ایک برقی جھٹکے سے بہزاد پر اس گھڑی ساری صورت حال کی مجہولیت یوں واضح ہوئی جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ اور اس کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی ہو، اس نے سوچا ''یہ کتنا مضحکہ خیز ہے کہ وہ کروڑوں کے اس شہر میں ایک گھٹیا ہوٹل کی بوسیدہ لفٹ میں ایک نشئی کے پر تعفن وجود سے یوں بغلگیر ہے جیسے کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے۔۔۔ اور نیچے سڑکوں پر ہجوم اسی طرح رواں ہے۔ وال سٹریٹ میں لین دین اسی طرح زور و شور سے جاری ہے۔ یو این او میں دنیا بھر کے ڈپلومیٹس جانے کن مسائل پر ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو ٹھگنے کی کوشش میں مصروف ہیں، ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اسی طرح سر اٹھائے کھڑی ہے، فلک بوس مجسمہ آزادی اپنے ہاتھ میں مشعل لیے اپنی جگہ پر قائم ہے۔۔۔ اور کسی کو خبر تک نہیں کہ وہ۔۔۔ بہزاد۔۔۔ گھنٹوں سے تیسرے درجے کے ایک ہوٹل میں عمر رسیدہ لفٹ میں ایک مدقوق نشئی سے مجبوراً ہم آغوش، جانے کونسا عذاب جھیل رہا ہے''۔

انکشاف کی اس ساعت بہزاد نے آئینے میں دیکھا کہ ایک بھورا ٹھگنا، دیو قامت سفید فام اجنبی کے بدبودار جسم سے خود

چمٹا ہوا ہے۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ اس نے سوچا ''وہ یہاں اس شہر غدار، اس دیار غیر میں کیا کر رہا ہے جہاں کسی کو اس کے جینے مرنے کی نہ خبر ہے، نہ پروا۔ یہ سرزمین جہاں اس کے آباؤ اجداد کے خون کا ایک قطرہ بھی مٹی میں جذب نہیں ہوا جہاں اس کی جڑیں نہیں ہیں، وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے اسے گم گشتہ ماضی میں مدفون کر دیا ہے، وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟''

۔۔۔اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس چلا جائے گا، اپنے وطن، اپنے گھر، اپنے عزیزوں کے درمیان۔

بیل فری میں نصب گھنٹی بج اٹھی۔ اس میں بسیرا کرنے والے کبوتر غول در غول پھڑ پھڑاتے ہوئے، اس کی چاروں کھڑکیوں سے طوفان کی طرح پھٹ پڑے۔ آسمان پل بھر کے لیے برف کے گالوں سے سفید ہو گیا۔۔۔ پھر بہزاد نے دیکھا کہ بہاء الدین زکریا کے مزار کے چراغ والے صحن میں کبوتر دانہ چگنے اتر آئے ہیں۔

غالباً لفٹ میں پیدا ہونے والا نقص مستری نے رفع کر دیا تھا، اس کا جام دروازہ کھٹاک سے کھل گیا۔

☆☆☆

پاسا

علی امام نقوی

''ہم نے تمہیں چنا ہی اس کارن ہے کہ تم ساہتیہ اور اتہاس کی باریکیوں کا گیان رکھتے ہو۔ تمہیں کیول یہ کرنا ہے کہ ہماری کلپنا انوسار ایک کتاب لکھو۔''

''آپ کی کلپنا کے انوسار؟ آپ۔۔۔آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

''ہاں اس اس کتاب کا منسپٹ ہمارا ہوگا۔ اتہاس لکھنے والوں نے کچھ دیکتیوں کو ہسٹری کے کوڑے دان میں ڈال دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے وہی ہمارے پرش تھے۔

''وہ مہان تھے یا نہیں؟''

''ہمیں اس کا گیان نہیں ہے۔ پر ہمارے کچھ پرکھے کہہ گئے وہ بھی مہان تھے اور اب تو سرکار ہماری ہے دیش کی بڑی آبادی میں ہم ہیں۔ آج تک جو بھی گذری ہے اس پر تمہیں زیادہ شبد خرچ کرنے ہیں''۔

''پر اس سے۔۔۔ہوگا کیا؟''

''ہوگا۔ اوشیہ ہوگا ہمارے دیش پہ شدھ سے سدھانتک اور ادھیاتمک سنسکرتی لاگو ہوتی۔

''مجھے۔۔۔مجھے تو نہیں لگتا میرا لیکھا چوکھا آپ کو کامیاب کر سکے گا''۔

''وہ تو بعد کی سمسیا ہے پتر شلا۔ تمہیں کتاب لکھنی ہے۔ تمہاری تحریر لیکھ نہیں ہوگی، بجلی ہوگی، بجلی، جلا کر بھسم کرنے والی بجلی۔ تم صرف لکھو گے شلا کے بیٹے، سرکار اپنے پریس سے اسے پرکاشت کرے گی اور یہ بھی یاد رکھو، اس کتاب کو تم دس بیس یا سو پچاس کے لیے نہیں لکھو گے۔ اسے لاکھوں کے سامنے سناؤ گے۔ کنبھ کے مجمع میں۔ سوچنے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے پتر شلا! ہم کہہ چکے سرکار ہماری ہے۔ پولیس ہماری ہے۔ سینا ہماری ہے۔ اور یہ سب پانے کی خاطر ہم نے پورے پچاس برس انتظار کیا ہے۔ وہ جو آج ہم پر انگلی اٹھا رہے ہیں، تم دیکھو تو ان کی اپنی تین انگلیاں خود ان کی اور اٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے من کا چور ان کی اپنی طرف اٹھی ان کی اپنی انگلیوں کو سیدھا کرنا چاہتا ہے پر ان کا انگوٹھا انگلیوں کو دبائے ہوئے اور۔۔۔ پیارے پتر شلا! ستیہ تو یہ ہے آج جو ہماری طرف انگلی اٹھا کر ہمارے وچاروں کا کھنڈن کر رہے ہیں انہوں نے ان کے پرکھوں نے بھی یہی چاہا تھا۔ پر اس سمے ان وچاروں کے کھلکر پرکٹ کرنے کا موسم نہیں تھا اس پل ضرورت تھی، ہم ایکتا کے گیت گائیں کیونکہ ہمیں ستہ تک پہنچنے کے لیے اسی کی اوشکتا تھی۔ اور جب وے سامنے آئی تو ہم نے زبان کھولی تھی۔ آنکھوں میں ان کی بھی چمک پیدا ہوئی تھی پر انہوں نے موسم کی اور اشارہ کیا تھا اور کہا تھا۔ آج ضرورت ہے آپ سب ان وچار دھاراؤں پر چپکے چپکے کام کرتے رہیں۔ ہم بھی مانتے ہیں ہندوتو ہی قوم پرستی ہے۔ پر اس کی بات کھل کر کرنے کا سمے یہ نہیں ہے۔ شلا کے بیٹے! ہمارا وشواس کرو۔ وے سیکولرازم کی مالا جپتے رہے، ہم نے دیش کی شالاؤں میں اسے سبوتاژ کرنے کا کام آرمبھ کیا۔ سنسکرت گیان کے نام پر دیش کے کلچر اور اتہاس کے سارے میں چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپی گئیں، شکشا سنسدوں، کندریوں میں پڑھائی گئیں۔ اور یہی کام صرف وہاں نہیں ہوا ہے۔۔۔ سینا سے جو لوگ ریٹائر ہوکر کیول پینشن پہ گزارا کر رہے تھے ہم نے انہیں اپنے یووکوں کو تیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کیول اس لیے کہ اس دیش میں سدھ سدھانتک اور ادھیاتمک سنسکرتی ہو''۔

''مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیجئے''۔

''سوچو، اوشیہ سوچو، اور ساتھ ساتھ یہ بھی وچار کرنا کہ ہماری سرکار صرف تم ہی کو پہلا اوسر نہیں دے رہی ہے۔ہم سے پہلے جوست میں تھے انہوں نے بھی یہ کام کیے ہیں تم شلا پتر ہو، چھوٹی سی آیو میں تم نے بڑا نام کما لیا ہے۔مگر آج بھی تم نے دنیا پراپت نہیں کی۔ پرکاشن سنستھائیں تمہیں آج بھی ہاتھوں ہاتھ نہیں لے رہی ہیں۔تمہیں اپنی کتاب پرکاشت کرنے میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔

''وشواس کرو، ویسا نہیں ہوگا۔آؤ، ہم سب پراتھنا کریں۔۔۔ پالن ہار ان سبھی کو اتنی بدھی دے دے کہ انہوں نے جو کچھ کھویا ہے۔اسے پانے میں سپھل ہو جائیں۔

''وہی تو یہ پانا چاہتے ہیں گرودیو''۔

''انہیں تو یہی پتہ نہیں ،انہوں نے کھویا کیا ہے''۔

''آپ جانتے ہیں؟''

''ہاں، جانتا ہوں۔آج جو کچھ بھی پانے کی کامنا یہ کرر ہے ہیں، یہ وہ تو ہرگز نہیں جو کھویا گیا''۔

''انہوں نے کھویا کیا ہے گرو جی؟''

''اپنا دھر، دھرم کی شدھ شکھشا اور اس پر یعنی اس کی راہ پر چلنے کی سکتی کھوئی ہے۔یہ۔۔۔یہ تو وہی کرر ہے ہیں جو اتھا کیہ والوں نے کیا تھا۔انہیں سمجھانے کے لیے ایک ہی سمے میں ایک کے بعد ایک دو نہیں تین تین مہان ویکتی آئے ہیں۔مگر انہوں نے ان تینوں کا کہنا نہیں مانا''۔

''ہم میں اور ان میں کیا کچھ ایک سا ہے گرو جی؟''

''وچار دھارا ایک ہے''۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دھرم کی اصل شکھشا انہوں نے بھی کھو لی تھی''

''کھوئی نہیں بدل دی تھی''۔

''ایسا کیوں کیا تھا، انہوں نے گرودیو؟''

''اس لیے کہ لابھ کیول گنے چنے لوگوں کو ہو''۔

''پر، وہ تو اوروں کا بھی خیال رکھتے ہوں گے۔

''کہتے تو یہی رہے پر انہیں اوروں کا خیال تب آیا جب ان کے کرموں کی وجہ سے جنتا بھوکوں مرنے لگی۔اسی شکھشا کو ماننے والے آج اس دھرتی پر جہاں جہاں ہیں ان کے آس پاس کے لوگ باگ آج بھی پریشان ہیں اور ان کے گیانیوں نے اپنے اتیا چاروں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہی آئی ایم ایف ڈبلیوٹی او، اور جیون سرکھشا جیسی سنستھائیں بنا رکھی ہیں۔وہ بھی ان ہی وچار دھاراؤں کے مالک ہیں جو اپنے دیش میں رام راجیہ چاہتے ہیں۔تم جو سماچار مجھ تک پہنچاتے ہو نا اس کی جان کاری مجھے ہے۔

''میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، اپنے قلم سے گھر بھر کا پیٹ پوری طرح نہیں بھر پا رہے ہو۔لکھتے ہو، اور جمع کرتے رہتے ہو۔یہ۔۔۔۔دیکھیں تو یہ ایک اچھا اوسر تمہیں مل رہا ہے۔اس سے بہت کچھ تم پا لوگے۔ پر اس سے لابھ اٹھانے سے پہلے تمہیں یہ بھی سوچنا ہوگا شلا، میں نے یا تمہارے دونوں بچوں نے تم سے کچھ کم ہونے کی شکایت کی ہے؟ ہم کر سکتے تھے شکایت کہ ہمارے جیون میں ایک پرکار کی ہلچل نہیں ہے۔تم یہ پوچھنا کہ کیسی ہلچل؟ بلکہ تمہیں اس وشے پر خود سوچنے کی ضرورت ہے۔تمہاری

سوچ کو ایک راہ خود ہی مل جائے گی، اگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو گے، پر صرف آنکھیں کھولنے ہی سے کام نہ چلے گا۔ ہمیں سوچنا ہوگا، جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ سب ویسا کیوں ہے جیسا دکھائی دے رہا ہے؟ ویسا کیوں نہیں جیسا ہونا چاہیے۔ پلیز تم مجھ سے نہ پوچھنا، ہونا کیسا چاہیے؟ میں تمہاری طرح گیان نہیں رکھتی۔ مگر جو بھی تم یا تمہارے جیسے لوگ لکھتے ہیں اسے پڑھ کر اسے سمجھنا چاہتی ہوں جو لکھا گیا ہے۔ لکھنے والے نے جو بھی شبدوں میں دیا یا دینا چاہا ہے وہ وہی ہے جو پروسا گیا ہے یا کچھ اور بھی ہے۔ اور اگر تم برا نہ مانو تو کہوں تم نے اور تم سوں نے زیادہ تر اپنے باہر کی بے آرامی لکھی ہے۔ ہم جو جیون بھوگ رہے ہیں۔ وہ کچھ ایسا برا بھی نہیں کہ اسے پڑھنے والوں کے آگے نہ پروسا جائے''۔

''تم میں تو اچھا بھلا الوچک موجود ہے''۔

''وہ تو سب ہی میں ہوتا ہے۔ تم میں بھی ہے۔ میں نے تمہیں لکھنے اور اپنے لکھے کو کاٹتے بھی دیکھا ہے۔ شلا! اس سے پوچھو، تمہیں اس اوسر کا لابھ اٹھانا چاہیے یا نہیں؟''

''پوچھ چکا ہوں''۔

''کیا کہتا ہے وہ؟''

''وہ تو کہتا ہے بن سوچے نہ چل۔ کھڑا رہ، وچار کر، پھر قدم اٹھا۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے میں بھی کہہ چکی ہوں، جو زندگی ہم گزار رہے ہیں اس میں ایسا بہت کچھ ہے جو کہا اور سنا جائے''۔

''پر۔۔۔وہ، مجھ سے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ تو سدھانتک اور ادھیاتنک سند کرتی کی بات کر رہے تھے! ان کا کہنا یہ ہے کہ ہندوتو ہی قوم پرستی ہے۔

''تھوڑا بہت جو بھی اب تک میں نے پڑھا ہے اس سے اتنا تو جان گئی کہ ایک طرح کی دیش پرستی اور ہندو وچار دھرا ہمارے ساہتیہ میں بھی پنپ رہی ہے۔ بھارتیتا کے نام پر اسی کی جڑوں کو پانی دیا جا رہا ہے۔ جرنلزم کا حال تو اور بھی برا ہے۔ پر وہاں بھی سچ بولتے موجود ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سمبندھ ایک دم سے توڑے نہیں جاتے۔ میرا اپنا وچار یہ ہے، تمہیں اس وشئے پر خوب اچھی طرح سوچنا ہوگا، ان لوگوں سے پھر ملنا ہوگا، بات کرنا ہوگی''۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ سمبندھ ایک دم سے توڑے جاتے ہیں نہ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ تو پالن ہار بناتا ہے۔ کتابیں وہ نہیں کہہ رہی ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں۔ جنہیں آپ دشمن مان رہے ہیں ان کی آیو ہی کیا ہے؟ اپنے دیش میں بولی جانے والی زبان کا کھنڈن جس کارن کیا جا رہا ہے اس کا تو جنم ہی اسی دھرتی پر ہوا تھا۔ اور شریمان! موریہ یگ کے کتبات، اشوک کے کتبات ویسے تو نہیں لکھے گئے تھے جیسے ہم لکھ رہے ہیں۔ جس زبان کو آپ دشمن کی زبان کہتے ہیں وہ تو یہاں بدھ شریک میں بھی رہی ہے۔ اس یگ میں آخر ہمارا ان کا رشتہ تھا تو کون سا رشتہ تھا۔ پریم کا یا نفرت کا؟

''شلا کے بیٹے! تم یہاں بحث نہیں کرو گے''۔

''آپ مجھ سے کچھ ادھیکار بھی چھین لینا چاہیں گے''۔

''کیا کہنا چاہتے ہو تم''۔

یہ بھارت ہے، اس کی اپنی پرمپرا ہے۔ جس میں سنواد بہت ہی مہتو ہے۔ اور اس سے تو وواد ہوتا ہے۔

''اسے آپ گیان سے بھی دور کر سکتے ہیں۔ آدان پردان ہو تو وواد خود ہی ختم ہو جائے گا''۔

تم لیکھک ہو شلا پتر! اور ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ کیول ہماری وچار دھارا نہیں ہے۔ منو خود گیانی تھے۔ تپسیا بھی کرتے تھے۔

جانتا ہوں شری مان۔نہیں جانتا تو کیول اتنا کہ ورنا شرم نے اصل وچار دھارا سے وروودھ کیوں کیا؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں شلا پتر ہوں۔انہوں نے،ان کے بزرگوں نے ہم کوتو صرف یہ بتایا ہے کہ اصل کار یہ کیول کرم ہے۔

تم پھر بحث کا دوار کھول رہے ہو۔بھول رہے ہو کہ ہماری اچھا کیول ہماری اپنی اچھا نہیں ہے۔یہ ہم نے ویدوں سے جانا ہے۔اب تم سے یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ وید کا ارتھ جانتے ہو یا نہیں۔

''آپ پوچھیں نہ پوچھیں پر مجھے پوچھنے کا ادھیکار تو ہے اور میں جان لینا چاہوں گا کہ ہندومت کی اصل وچار دھارا کیا تھی۔''

''تم۔۔۔تم کیسے ہندو ہو؟ ہزاروں ورشیہ سے چلی آرہی شکھشا کو نہیں جانتے۔''

''آپ تو برا مان گئے شری مان۔میرا پرشن تو بہت ہی سیدھا ہے او جو کچھ مجھ سے آپ اور آپ کی،میرا مطلب اپنی سرکار سے ہے۔چاہتے ہیں اس کے لیے میرا یہ جان لینا ضروری ہے کہ منو کو اصل وچار دھارا سے کیا اختلاف تھا؟''

''شلا پتر!ایسا کوئی سوال نہیں جس کا جواب نہ ہو۔پر ہر پرشن کا اتر نہیں دیا جانا چاہیے۔کچھ سوال کرنے والے کو خود بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔تمہیں نربھئے ہو کر وہ کار یہ کرنا ہوگا جو سرکار چاہتی ہے۔جن کے وروودھ میں ہم تمہیں یہ کشٹ دے رہے ہیں۔ذرا ان کی اور دیکھو۔اس پرکار کے کام وہاں بھی لیے گئے ہیں۔ان کا اتہاس اٹھاؤ پڑھو۔اور یاد رکھو کہ سرکار تم سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔''

''میرا ماننا تو یہ ہے کہ تم وہ کام کرو''۔

''یار!میں نے تمہیں دوست جان کر یہ بات بتائی ہے اور تم نے فوراً ہی اکدم سے اپنا وچار پرکٹ کر دیا۔سوچا نہ سمجھا۔ بھائی جی!وہ جوان سے پہلے ستہ میں تھے،انہوں نے یہ کام کیوں نہ کیا؟ ذرا سوچتے،سمجھتے پھر رائے دیتے''۔

''یار!تم لیکھک ہو۔پڑھے لکھے لیکھک،پتر شلا کے نام سے تم نے ناموری پائی ہے۔تم خود سوچو،سوتیہ پاٹھک کو کتنے لوگ جانتے ہیں؟ میں یا بھابھی ہے نا؟ تمہیں یہ نام دینے والے بھی وہ نہیں پا سکے جو سرکار تمہیں دینا چاہتی ہے۔تمہارے پتا جی نے تمہیں کیول نام دیا تھا اور وہ سورگباش ہو گئے۔یاد کرو۔ان کے متر کو جس نے تمہیں ساہتیہ کے ساتھ اتہاس لکھنے کا گر بتایا۔تمہارا ایک نام رکھا۔تم خود وچار کرو،سیدھے سادے گیانی شلا پاٹھک کے جاننے والے آج کتنے لوگ ہیں۔لیکن تمہیں تو تمہاری کویتاؤں سے اور تمہارے پتا کے متر کی دور تک دیکھنے کی شکتی نے وہ ہنر سکھا دیا کہ تم چھوٹی سی عمر میں ہی جانے بھی گئے اور مانے بھی اور اب ہماری اپنی سرکار تم سے ایک کام لینا چاہتی ہے اور تم دبدھا میں پڑے ہو۔''

''مگر''۔

''اگر،مگر کو چھوڑو یار،اس شبد نے بڑے بڑے جھگڑے کھڑے کیے ہیں۔آج بھی دنیا میں اسی کارن سمسیائیں نہیں سلجھ رہی ہیں۔میری مانو،اگر مگر کو ڈی فریزر میں رکھ دو۔اور مان جاؤ کہ جو شکتی آج ستہ میں ہے اس میں اور اس سنستھا میں جو کل تک ستہ میں تھی کوئی اتر نہیں ہے''۔

''کیسی باتیں کرنے لگے؟''

''سچ کہہ رہا ہوں یار!کچھ ستیہ پورم پور ننگے ہوتے ہیں اور کچھ ڈھکے چھپے''۔

''ستیہ تو سدا ہی ننگا رہا ہے''۔

''دماغ خراب ہو جائے گا،اگر دبدھا میں پڑے۔ہاتھ بڑھاؤ،پیالہ اٹھاؤ،ادھر ادھر نہ دیکھو۔تمہیں وچار میں ڈوبا،دیکھ کر دوسرے تمہیں دھکیل پیالہ اٹھا لیں گے''۔

''پر یہ تو سوچ یار!وشو کا ہر دھرم اپنی کتاب کو کسی نہ کسی ویکتی سے سمبندھت کرتا ہے۔پر ہمارا ویکتی کون ہے؟ اور ہمار کتاب کون سی

ہے؟ گیتا، رامائن، ویدوں میں رگ وید، اتر وید، یجر وید یا اپنشد کوئی بتلائے کہ ویدوں کا نزول کن پہ ہوا؟ ایشور دانی کس پر اتری؟''

ان سوالوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ مان کر چلو کہ ہندو دھرم سب سے پرانا ہے۔ تم سے وہ اتہاس لکھوانا چاہتے ہیں۔ اب تمہیں یہ تو نہیں بتاؤں گا کہ تمہارا کام کیا ہے؟ پھر بھی کہنا تو پڑے گا ہی۔ بس پیارے یہ جان لو۔ اتہاس لکھنے والے کا کام اپنے زمانے کے واقعے کو دکھا دینا ہے۔ یعنی لکھ دینا بس۔

''واقعہ سچا ہو یا جھوٹا''۔

اس پر سوچنا پڑھنے والے کا کرتویہ ہے۔ اگر اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ ہے تو یہ کام وہ خود کرے گا۔

اور اگر وہ نہ ہوں تو۔

تو پھر وہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس دھرتی پہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے ہونے دیا جائے۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں بھائی؟ ہمیں تو یہیں رہ کر جینا ہے۔ اور یہ بھی تو دیکھو کہ ہم اکیلے نہیں ہیں بیوی ہے، بچے ہیں، ماں باپ ہیں''۔

''وہ سب تو ان کے ساتھ بھی ہیں جن کے خلاف ہماری سرکار ہے''۔

''ہیں تو''۔

''کیا یہی انصاف ہے؟''

''نہیں انصاف تو نہیں ہے''۔

''تو پھر تم اسے کیا کہو گے؟''

''ظلم یعنی اتیاچار، لیکن تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو یار؟''

''کچھ نہیں میں تو خود سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی تم نے ایک ہی شبد دو طرح کہہ دیا اور ذرا پہلے چلے تم کہہ چکے ہو کہ انصاف نہیں ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں جو اتیاچار کرے اسے اتیاچاری ہی کہتے ہیں نا؟''

''بالکل!'' میرے خیال سے تو اتیاچاری وہ ہوتا ہے جس میں خامی ہو اور بھائی میرے سب سے بڑا عیب تو ہمارے دماغ میں پیدا ہونے والی نفرت ہے۔ اور وہ جو مجھے ہانک کر اپنا کام کروانا چاہتے ہیں وہ ہماری اپنی بدھیوں میں اپنے ہی جیسے ویکتیوں کے ورودھ نفرت ہی تو پیدا کروانا چاہتے ہیں''۔

''اور تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے''۔

ابھی تو میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے۔

میرے خیال سے تمہیں ان کا کہنا مان ہی لینا چاہیے۔

اور اگر انکار کروں تو؟

مجھے یقین ہے، وہ ایسا نہیں کرے گا، پیدا کرنے والے نے اسے عقل دی ہے۔ دیکھنا ہے وہ اس کا پریوگ کس طرح کرتا ہے۔

بدھی تو ان کے پاس بھی ہے گروجی جو ستہ پر موجود ہیں۔

وہ تو صرف ستہ چاہتے ہیں۔ بدھی کس طور برتیں، جانتے ہیں وہ، پر برتنا نہیں چاہتے کہ اس سے ان کے پاس مال کم ہو جائے گا۔ وہ تو کیول یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے محتاج ہو کر جئیں۔ لوگوں کو بھی پالن ہار نے بدھی دی ہے۔ مگر بہتوں کی عقلیں چمک دمک دیکھ کر، ان کے موہ میں اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ کیونکہ جن کے پاس سرکار ہوتی ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ گیان سے جو وہ پا چکے

ہیں وہ دوسروں تک نہ پہنچے اسی لیے وہ گیانی سے کہتے ہیں' اپنی حالت پر رہو، اس پرکار کی باتیں نہ کرو اور یدی کہنے پر مجبور بھی ہو جاؤ تو یوں کہو کہ سننے والے اسے سمجھنا چاہیں تو تب بھی نہ سمجھیں۔

اور وہ ایسا کرتے ہیں؟

ہاں۔ اگر اتنے پر ہی تھمے رہتے تب بھی برا ہونے کے باوجود برا نہ ہوتا۔ انہوں نے تو مایا کے موہ میں کھوٹوں کو کھرا ثابت کرنا چاہا اور ابھی ابھی جو خبر تم لائے ہو وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس دھرم کا پرچار وہ کر رہے ہیں۔ صحیح ارتھ میں وہ دھرم ہی نہیں ہے۔''

بھولتے ہو تم۔ یاد ہے، تم سے میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اپنا دھرم اور اس کی شکھشا کھو چکے ہیں۔

کون پائے گا اسے؟

جسے اس کی تلاش ہوگی۔ اسی کا پرکاش انہیں وہاں تک پہنچا دے گا۔

یہ سمبھو ہے؟

ہاں ممکن ہے۔ کیونکہ جہاں برائی ہے، وہیں کہیں آس پاس ہی اچھائی بھی موجود ہے۔ یاد کرو، اندھیارے میں سے ہی کرن نکلتی ہے۔

پر وہ تو شلا کے بیٹے سے کچھ اور چاہتے ہیں۔

یہی نا، جو کھرے ہیں انہیں کھوٹا لکھو۔ اور کھوٹے کو ایک دم کھرا ثابت کرو۔

''جی گرو جی''۔

ان کی کوشش ساکار بھی ہوگئیں تو بھی ستیہ صرف سچ ہی رہے گا۔ اس وشال دھرتی پر جو بھی آج ہو رہا ہے۔ وہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا۔ یہ بھولتے ہیں بھارت کی سیماؤں کے اس پار بھی درتی ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ کہتے ہوں گے، ہماری وچار دھارائیں بھی وہاں تک پہنچتی ہیں۔ پرانہیں کیا پتہ، یہ وہاں پہنچے ہیں یا وہ یہاں آ چکے ہیں۔ وہ جنہیں سمجھانے کو کئی کئی مہان ہستیوں کو بھیجا گیا تھا۔

آخر تم آ ہی گئے شلا پتر۔ آؤ بیٹھو، بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا؟

فیصلہ تو اسی روز کر چکا تھا شریمان یہ دیکھئے! اب تک اتنا لکھا ہے۔ چاہا آپ دیکھ لیتے۔ تھوڑا وچار ویمرش کرتے۔

دیکھو بھائی! تم کون ہو، کس کے پتر ہو، ہم جانتے ہیں، ہماری سرکار کے اور سدسیہ بھی جانتے ہیں۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟ وہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں۔ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کام کب تک ہو جانا چاہیے۔ کمبھ سے مہینہ بھر پہلے کتاب کو چھپنا بھی ہے اور دیش بھر میں کتابوں کی دکانوں پہ پہنچنا بھی ہے۔ تمہیں اس کے کچھ انش کمبھ میں پڑھنے ہوں گے۔ وہیں کتابیں بھی ہوں گی خریدنے والے اسے خریدیں گے۔ جو نہ خرید سکیں گے انہیں ہمارے کاریہ کرتا سرکار کی اور سے دیں گے کہ لوگ جان جائیں، ہم، ہمارے پرکھے کتنے مہان ہیں اور وہ جسے مہان کہتے ہیں۔ اتنے مہان نہیں ہیں، جتنے بتائے جاتے ہیں۔ اس وشئے پر ہم تم سے کیا وچار ویمرش کریں گے۔ تم تو شلا پتر ہو۔ تم سے پہلے بھی ایک پتر یہ کام کر چکے ہیں۔ بس تمہیں یہ کاریہ کرتے اس کا دھیان رکھنا ہوگا کہ سورگ پتر کی طرح اتہاس لکھتے سے چھان پھٹک نہ کرو۔ تمہیں ہندو دھرم کی اصل و چار دھارا سے یہ بتانا ہوگا کہ منواسمرتی کے انوسار منشیہ پیدائشی طور پر چار طبقوں میں بٹا ہوا ہے، ہم تو تم سے بتا ہی چکے ہیں کہ ہماری سرکار کیا چاہتی ہے۔ ہم تو کیول شدھ (پاک صاف) سدھارتک (اصولی) اور ادھیاتمک (آتمک / روحانی) سنسکرتی کو پورے بھارت میں لاگو کرنا چاہتے ہیں۔ وے جو سنسد میں ویرش ہیں ان سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ان کی اپنی مجبوری کا ہمیں بھی گیان ہے، ہم جانتے ہیں کہ اپنے دیش سے انہیں کھدیڑنے میں، جن کے راج میں سوریہ ڈوبتا ہی نہ تھا وہ بھی ہمارے ساتھ تھے جن کے ہاتھوں سے سفید چمڑی والوں نے راج چھینا

تھا۔ہم جب ان کے وردھ رہے تبھی برہما نے جنہیں اپنے سر سے جنم دیا تھا یہ فیصلہ لے چکے تھے کہ دیش کا راج پھر ان ہاتھوں میں نہیں جانا چاہیے۔ نہ ہی ان میں سے کسی کو اپنے راج پاٹ کا ساجھے دار بنانا چاہیے۔لیکن اس یگ کے پرشوں نے اپنی مجبوریوں پہ پردہ ڈالنا ہی ضروری سمجھا تھا۔ پھر جو کچھ بھی ہوا، سبھی کو پتہ ہے۔اور اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے ستہ ہمیں سونپنے کے لیے انہیں ورشوں لگ گئے۔ دوش ان کا بھی نہیں ہے۔ پر، ہم ان ہی کو دوشی مانتے ہیں۔ اور۔۔۔اب تمہیں یہ بتانا ہے کہ دوشی ہم نہیں وہ ہیں جنھوں نے ہم پہ آ کرمن کیا اور برسوں ہم پر راج کر گئے۔

ٹھیک ہے۔ وہی سب ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔

جانتے ہونا، ہمارا دشمن کون ہے؟

جی ہاں شریمان! جانتا ہوں، پہچانتا بھی ہوں اور۔۔۔

مدتوں سے مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ ایک ایسی کتاب لکھو جس میں ان کی حقیقت بیان ہو جنک وکچھ لوگ ورشوں سے پسند نہیں کر رہے۔ بہت سوچ وچار کے بعد میں نے اس کاریہ کو ہاتھ میں لیا۔ پربھو کی کرپا ہے کہ آج یہ کتاب دیش بھر میں موجود ہے۔ سرکار کے کچھ کاریہ کرتاؤں کا کہنا تھا کہ اس کتاب کے کچھ حصے مجھے اس مجمع کو بھی سنانے ہوں گے جو آج یہاں موجود ہے۔ ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو یہاں اشنان کرنے آئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو یہاں پوجا پاٹ کریں گے نہ اشنان۔ وہ کیول یہ دیکھنے کے لیے یہاں موجود ہیں کہ کمبھ میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ ان ہی میں وہ بھی ہیں جو سدھارتک، ادھیاتمک اور شدھ سنسکرتی کے وِرودھی ہیں۔ اگر ہم وچار کریں تو جان لیں گے کہ وہ کون ہیں۔ سرکار کا کہنا ہے کہ یہ وہی ہیں جنہوں نے ہمارے دیش پر آ کرمن کیا اور پھر یہیں رچ بس گئے۔

لیکن یہ تو کیول آدھا سچ ہے۔ ایک ہزار چھ سو چھ وورش پہلے گرجتے بادلوں سمان ایک طوفان اور بھی آیا تھا۔ اسے ہمارے کچھ اتہاس کار غزنویوں کا طوفان کہتے ہیں۔ وہ بادلوں کی طرح آیا اور آندھی کے سمان چلا گیا۔ اس کے آنے اور جانے کا اپنا ایک اتہاس موجود ہے، جس کے پنوں میں کئی ستیہ موجود ہیں۔ ایمان کی کہوں تو آ کرمن کرنے والا وہی تھا۔ اور ایک ستیہ جو ہم میں سے زیادہ لوگ نہیں جانتے وہ یہ ہے کہ ہماری دھرتی پر وہ بھائی جو آج ہمارے دشمن دو راستوں سے آئے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو سندھ اور ملتان سے ہوتا ہوا یہاں آیا اور چلا گیا۔ اسی راستے سے ایک کو خود ہم نے نیوتا دے کر بلایا۔ یہ وہ تھا جس کا راج پاٹ اس کے باپ کے سورگباش ہونے کے بعد اس کے چچا نے ہڑپ لیا تھا۔ مگر دوسرا ستیہ تو یہ ہے بھائیو! اس سے بہت پہلے سے ہی ہمارے دیش میں عربوں کا آنا جانا رہا۔ جن کو ہم اپنا دشمن کہہ رہے ہیں اور جن سے ہم میں سے بہت سے لوگ آج بھی ڈرے ہوئے ہیں۔ وہ تو پچھمی ساحلوں سے اس دیش میں زیتوں کا تیل اور اپنے ملک کی کھجوریں لے کر آیا کرتے تھے۔

ایک ہزار چار سو تیں ورش پورو جب وہاں نہیں ہے کوئی مالک کیول اللہ کے، کی آواز گونجی تھی تب یہاں سرندیپ کے راجا کو سب سے پہلے اس کا پتہ چلا تھا۔ سرندیپ اور اس کے آس پاس کے راجاؤں کو جب اس کا گیان ہوا تھا تبھی انہوں نے ایک بدھی مان کو جانکاری کی خاطر بھیجا تھا۔ مدتوں بعد جب وہ مدینہ پہنچا تو وہ مہان ہستی ان میں نہیں رہی تھی۔ ہاں وہ ہستی تھی جو خود دیا میں ڈوبی ہوئی تھی یا دیا ان میں رچی بسی تھی۔

پیارے بھائیو! میں نے اس کتاب میں لکھ دیا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نہیں ہے کوئی سوائے اللہ کے ہمارے بھارت میں دو راستوں سے آئے ہیں۔

☆☆☆

چپ شاہ

علی حیدر ملک

ننگ دھڑنگ، وہ سارے شہر میں گھومتے رہتے تھے، کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ ان کے بارے میں ہر شخص ایک الگ کہانی بیان کرتا تھا۔ کوئی وہی روایتی کہانی سناتا کہ وہ ایک قبائلی سردار کے بیٹے تھے۔ کسی دوسرے قبیلے کے سردار کی بیٹی سے انہیں عشق ہو گیا تھا لیکن ان دونوں قبیلوں میں چونکہ کئی پشتوں سے دشمنی چلی آ رہی تھی، اس لیے ان کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ بددل ہو کر انہوں نے قبیلہ ہی نہیں چھوڑا، بلکہ دنیا تیاگ دی۔ مختلف شہروں اور بستیوں سے ہوتے ہوئے وہ اس شہر میں آ گئے۔ اب ان کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی بھی نہیں تھی۔ سر کے بال بڑے بڑے اور آپس میں چپکے ہوئے۔ داڑھی گھنگریالی، نیچے سے اوپر کی طرف اٹھتی ہوئی۔ کسی نے ان کو کھاتے پیتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ رات گئے درختوں سے کچے پکے پھل توڑ کر کھاتے ہیں یا ہوٹلوں اور شادی ہالوں میں بچے ہوئے کھانے سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔

شروع شروع میں عورتیں انہیں دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتیں اور راستہ بدل لیتی تھیں، مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہو گئیں۔ بچے پہلے ہنستے تھے، پھر اس سے مانوس ہو گئے اور ہنسنا بند کر دیا، کیوں کہ کوئی چیز زیادہ دنوں تک نئی یا نامانوس نہیں رہتی۔ ہر حیرت ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ قبرستان میں چلہ کشی کر رہے تھے۔ چلے کے آخری روز آدھی رات کے وقت ایک حسین عورت نیم عریاں حالت میں ان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی اور اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور اسی روز سے اس حالت میں ہیں۔

کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک نڈر اور بےباک سیاسی کارکن تھے۔ ان کی جماعت کے لوگ ان کی سچائی، ایمانداری اور بےلوث جد و جہد پر فخر کرتے تھے۔ مخالف جماعت نے انہیں خریدنے کی کوشش کی، مگر اس میں ناکامی پر انہیں اغوا کروا لیا اور کرائے کے غنڈوں کے ذریعے ان کی یہ گت بنا دی۔ چند لوگ یہ کہتے ہوئے بھی پائے جاتے تھے کہ یہ کام مخالف جماعت نے نہیں، بلکہ ان کی اپنی جماعت کے ایک گروپ نے کیا تھا تا کہ انہیں راستے سے ہٹایا جا سکے۔

ایسے بھی لوگ تھے جو یہ خیال کرتے تھے کہ وہ جاسوس ہیں اور کسی ایجنسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ چند اشخاص انہیں دشمن ملک کا ایجنٹ بھی گردانتے تھے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

حقیقت جو بھی ہو، لیکن اب وہ شہر کا حصہ بن گئے تھے۔ بہت سے لوگوں کو ان سے عقیدت ہو گئی تھی۔ وہ انہیں کھلانے پلانے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ ہر چیز کو جھٹک دیتے۔ کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کچھ لوگ خصوصاً عورتیں ان کے سامنے اپنے دکھڑے بیان کرتیں اور اپنے لیے دعا کرنے کو کہتیں۔

ربیع الاول کے مہینے میں جہاں کہیں سیرت کی محفل ہوتی وہ ایک کونے میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور زار و قطار روتے رہتے۔ اسی طرح محرم کے دنوں میں اگر کسی امام بارگاہ سے مجلس کی آواز آتی تو وہاں بھی سر جھکائے کھڑے نظر آتے اور ان کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہتے رہتے۔

ایک بار لوگوں نے دیکھا کہ وہ شہر کے چوک کے بیچوں بیچ کھڑے ہیں۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہنے کے بعد انہوں

نے اپنا چہرا آسمان کی طرف اٹھایا اور حلق سے عجیب سی آوازیں نکالنے لگے۔ ان کی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں اور پورا بدن لرز رہا تھا۔ لوگ باگ حیرت سے انہیں دیکھتے رہے۔ کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ دوسرے دن صبح سویرے زلزلہ آیا جس سے بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے اور ہزاروں عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ حالات معمول پر آئے تو لوگ چپ شاہ کو یاد کرنے لگے۔ ہر شخص زلزلے کے سانحے کو ان کی گذشتہ روز کی حرکتوں سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہریوں کو یقین تھا کہ انہیں زلزلے کی خبر ہوگئی تھی اسی لیے وہ آسمان کی طرح رخ کر کے اور حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکال کر فریاد کر رہے تھے۔ ایک دفعہ لوگوں نے دیکھا کہ چپ شاہ اپنے سر کو دائیں بائیں زور زور سے جھٹک رہے ہیں اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے گر رہے ہیں۔ اس کے بعد ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ شہر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور ایک فرقے کے پیروکاروں نے دوسرے فرقے کے پیروکاروں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ دونوں فرقوں کے ماننے والے جوش میں تھے اور مخالف فرقے کے جانی و مالی نقصان پر خوشیاں منا رہے تھے۔

وقفے وقفے سے اسی طرح کے کچھ اور واقعات پیش آئے۔ چپ شاہ سے لوگوں کی عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب ہر شخص یہ یقین کرنے لگا تھا کہ چپ شاہ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اور انہیں وقت سے پہلے ہر واقعے، ہر سانحے کا علم ہو جاتا ہے۔

کچھ عرصے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ چپ شاہ ہاتھوں کو تلوار کی طرح ہوا میں لہراتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آئے اور ٹریفک کے سپاہی کو دھکا دے کر خود اس کی جگہ پر کھڑے ہو گئے، پھر باری باری اپنے دونوں پاؤں زمین پر زور زور سے پٹخنے لگے جیسے پریڈ کر رہے ہوں۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتے رہے، مگر کوئی کچھ بولا نہیں۔ ان کی یہ حرکت دیکھ کر لوگ سہم ضرور گئے۔ انہیں اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ شہر پر کوئی بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ بزرگ اور دانا لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اب اس شہر میں رہنا مناسب نہیں۔ سو اس فیصلے کے بعد وہ گروہ در گروہ وہاں سے کوچ کرنے لگے۔ جب وہ کوچ کر رہے تھے تو ماحول پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور فضا پر موت کا سا سکوت طاری تھی، پھر ہر طرف سے گولیوں اور دھماکوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

لوگ خوف کے عالم میں نامعلوم منزلوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ بس بھاگے جا رہے تھے۔ جو پیچھے رہ گئے تھے وہ بھی خوف کے آزار میں مبتلا تھے۔

مگر چپ شاہ کا دور دور تک کہیں پتا نہیں تھا۔

☆☆☆

پر جھڑنے کے دن

علی تنہا

کتھئی رنگ کے وصل آباد ریلوے سٹیشن پر کھڑے ہوں تو ناک کی سیدھ میں آم کے باغات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ گرمیوں میں یہ باغات پھل سے لد جاتے ہیں اور ٹہنیوں سے سونے کی رنگت والے آم، دھوپ میں پلیٹ فارم پر یوں نظر آتے ہیں جیسے سیاہ وہ گہرے سبز لباس میں گہنوں سے لدی حسینائیں وصل کو آباد کرنے پلیٹ فارم پر آنے کے لیے بے تاب ہوں۔

وصل آباد ریلوے پلیٹ فارم کے سیدھے رخ پر سٹیشن ماسٹر کا دفتر، کنٹرول روم، گودام اور کونے میں مختصر سا مسافر خانہ ہے۔ مسافر خانے سے باہر نکلیں تو سامنے وصل آباد کا قصبہ ہے۔

وصل آباد ریلوے سٹیشن کے پچھواڑے صدیوں پرانا بوہڑ کا درخت ہے۔ جس کی داڑھی زمین پر سجدہ ریز ہے۔ بوہڑ کے بزرگ درخت کے بارے میں بے شمار قصے مشہور ہیں، جسے بیان کرنے کے لیے خدا بخش کی زبان نہیں تھکتی۔

بوہڑ کے پھیلے ہوئے تنے کے ساتھ نانا جی حجام نے اپنی دکان سجا رکھی ہے، جہاں وہ لوگوں کی حجامت بناتا ہے۔ خدا بخش کہتا ہے کہ ایک طرف بوہڑ کی داڑھی سجدے میں ہے، دوسری طرف بوہڑ کی بددعا لینے نانا حجام لوگوں کی داڑھیاں صفاچٹ کرنے پر جتا ہوا ہے اسی لیے اس کے دن نہیں پھرتے۔ یہی نہیں بلکہ غیبت کرنے کے لیے اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہوئی گناہوں کے ڈھیر لگاتی رہتی ہے۔

دونوں کو ایک دوسرے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ نانا جی حجام کے ماتھے پر گومڑ ہے جسے خدا بخش برائی کی نشانی کہتا ہے اس کا خیال ہے بوہڑ کی داڑھی زمین پر سجدہ اس لیے کر رہی ہے کہ نانا حجام لوگوں کی داڑھیاں مونڈھنے سے باز رہے۔

بوہڑ کے سائے تلے سگریٹ، پان اور مٹھائی کا کھوکھا، گلاب دین قصاب کی دکان اور موچی کے علاوہ وصل آباد کے بے روزگار نوجوانوں کی سبھا روز جمتی ہے۔

اس قصبے کو آباد ہوئے تین صدیاں ہونے کو آئی ہیں۔ لیکن پچھلے تیس سالوں میں اس کی آبادی جس تیزی سے بڑھی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے باوجود وصل آباد کا پلیٹ فارم مسافروں سے خالی رہنے لگا ہے۔ ورنہ جن دنوں یہ پلیٹ فارم آباد تھا۔ یہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور خدا بخش کے تین ملازم چائے، کھانا دیتے دیتے ادھ موئے ہو جاتے تھے مگر جب سے ریلوے کا پٹڑا ہوا ہے۔ یہ پلیٹ فارم آدمی کی ذات کو ترستا ہے۔

وصل آباد ریلوے سٹیشن پر اب نصیبوں ماری تین پسنجر گاڑیاں رکتی ہیں۔ ایک دوپہر سوا گیارہ بجے اور دوسری چار بجے سہ پہر کینٹ کو آتی ہیں۔ مگر کئی سالوں سے لیٹ آنا ان کی شناخت بن چکا ہے۔ خدا بخش کے تینوں لڑکے کماؤ پتر ہیں۔ اس لیے ٹی سٹال کے مندے کی اسے پرواہ نہیں۔ خدا بخش باتونی، صابر و شاکر اور پیشن گوئیوں پر زندہ رہنے والا شخص ہے۔

خدا بخش کے ٹی سٹال کے سامنے تین فٹ اونچے تھڑے پر جہان بھر کی الابلا دھری رہتی ہے۔ ان میں کالے تیتروں کے دو پنجرے کونے میں پڑے رہتے ہیں۔ کالے تیتر، وقت بے وقت بولیں تو خدا بخش جھوم اٹھتا ہے۔

ٹی سٹال کی پشت پر سات فٹ اونچی شیشے کی الماری میں پرانے برتن، اونٹ کی کھال والے چار ٹیبل لیمپ اور چھ رنگین پھولوں والے گلدان بھی ہیں۔

دونوں گاڑیاں گھنٹوں لیٹ آتی ہیں۔اس لیے خدا بخش کا ٹی سٹال بوہڑ کے نیچے تاش کھیلنے والے یا آوارہ نوجوانوں کی وجہ سے چل رہا ہے۔خدا بخش چائے کے ساتھ ساتھ اپنی شیریں اور انوکھی باتوں سے لوگوں کو باندھ کے رکھ دیتا ہے۔اس کی گفتگو میں زور اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نانا حجام کی غیبت کی جائے۔

ملا نور دین کے بیٹے فضل الہی کو یہ گر معلوم ہے۔اس لیے سٹال پر آ کر نانا حجام کے پھوہڑ پن کی بات کرتے ہی خدا بخش کھل اٹھتا ہے۔

''نانا، کو پچاس سالوں میں جھوٹ کے علاوہ کوئی کام نہیں آیا''۔

''تیرے بچے جئیں، سچ کہا، جس روز سے اس نے دوکان کھولی ہے، پلیٹ فارم ویران ہو کر رہ گیا ہے۔ایسا سبز قدم اور بھورا ہے کہ مت پوچھو۔ جادو، ٹونا بھی کرتا ہے میں نے کس لیے کالے تیتر رکھے ہیں، صرف نانا کے وار خطا کرنے کے لیے''۔

فضل الہی مفت کی چائے پی کے اڑنچھو ہو جاتا ہے اور خدا بخش مجال ہے، کبھی رقم مانگے۔

خدا بخش کی ڈھلتی عمر میں خشخشی داڑھی سفید ہونے لگی ہے۔ کھڑی ناک میں اس کا بیضوی چہرہ البتہ اب بھی خوبصورت ہے۔گھٹنوں میں کچھ دنوں سے زہر باد کی وجہ سے درد رہنے لگا ہے۔جس کی وجہ سے اس نے اونچی کرسی سٹال میں رکھ لی ہے۔جس پر بیٹھے وہ تیتروں کے پر جھڑنے کے دنوں میں سخت پریشان رہتا ہے۔کیونکہ پرندے کریز کریں تو جادو کا اثر ہو جاتا ہے۔جس قدر انہونی، جس کے نصیب میں ہوتی ہے، پر جھڑنے کے دنوں ہی میں ہوتی ہے۔

تکلتی گرمیوں میں جب تیتری نے پر نوچنے شروع کئے تو سٹیشن ماسٹر ملک حاجی نے اسے بتایا کہ چھ ماہ بعد وصل آباد سٹیشن بند ہو جائے گا۔

''ریلوے نے فیصلہ کر لیا ہے۔خدا بخش اب جانے کا سامان باندھ رکھو، ہر شے خسارے میں جا رہی ہے سنتے ہو۔ وصل آباد ریلوے سٹیشن نے فلیگ ہونا ہی ہے''۔

کبھی کبھار دہی کے دو کونڈے بھی خدا بخش لے آتا ہے، جس میں سے آدھ کلو تو کھڑے کھڑے حاجی سٹیشن ماسٹر چٹ کر جاتا ہے۔اس روز بھی میٹھا دہی کھاتے اس نے یہ منحوس خبر دے کر اسے بے ہوش کر دیا۔

''حاجی تیرا خانہ خراب ہو۔ نمک حرام، یہ ریلوے سٹیشن بند کروا کے تیرے کو کیا ملے گا''۔

وہ بڑبڑاتا ہوا پلیٹ فارم کے جنوب میں شیشم کے درخت تلے سوئے ہڈیوں کے ڈھیر ملنگ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''بابا سنتے ہو، سٹیشن چھ ماہ بعد بند ہو جائے گا، دعا کر، وصل آباد، بند نہ ہو''۔

اس نے سرخ بوٹی آنکھوں سے خدا بخش کو گھورا۔

''جا پرے مر، کہاں کا وصل، وصل سٹیشنوں پر ملتا ہے۔ جا دور ہو جا''۔

ملنگ نے کندھوں پر پھیلی، میلی چکٹ زلفوں میں ہاتھ ڈال کے جواب دیا۔

وہ نامراد لوٹ آیا، سٹال کے سامنے کھڑے ہو کر، تیسری لائن پر مدتوں سے موجود مال ڈبے میں کتوں کو لڑتے دیکھ کر اس کا غم کچھ گھٹ گیا۔ یہ ڈبہ کھڑے کھڑے گل رہا ہے، ریلوے والے شاید اسے بھول ہی گئے ہیں۔ دن میں اس ڈبے کے اندر جہاں بھر کے کتوں کا راج رہتا ہے اور رات کو چور، اچکے یہاں آن براجتے ہیں۔

مال گاڑی کے ڈبے کی طرح وصل آباد ریلوے سٹیشن کا نصیبہ بھی جلا ہے۔ مجال ہے کہ کوئی خیر کی خبر یہاں سننے میں آئی ہو۔ایک ہجر، وصل سے ایسا چمٹ کے رہ گیا ہے کہ وقت تک گاڑیاں بھول بیٹھی ہیں۔سب کے پر جھڑنے کے دن آن لگے ہیں۔خدا

بخش سوچتا ہوا، ان بیس سالوں کو پلیٹ فارم پر ڈھونڈتا رہا، جو پلک جھپکنے میں گم ہو گئے۔ شروع کے دن کیسے خوشیوں بھرے تھے۔

کالو کانٹے والے نے پلیٹ فارم پر پھرتے، گہری سوچ میں گم خدا بخش کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

''جانتے ہو، وصل آباد سٹیشن کے دن پورے ہو گئے، جو مزے تم نے لوٹنے تھے لوٹ لیے، اب یہاں کچھ نہیں رہے گا۔ جانے کی تیاری کرو۔ بہت کما لیا تم نے''۔

''ہاں سن لیا ہے یار، تم کدھر جا رہے ہو؟''

''کہیں نہیں، بس ذرا خط نانا سے سے بنوالوں، کیا خیال ہے؟''

''بنوالو، خط، مگر بد خط بنائے گا۔ بڑی حرامی چیز ہے یہ نانا، بچ کے رہنا، صابر پٹھان کا آدھا کان نہیں کاٹ لیا تھا، یاد آیا؟''

کالو کے علاوہ روزانہ آنے والوں میں سدو مالی اور اس کا بڑا بھائی بکھو بھی ہے۔ سدو کے ساتھ خدا بخش کی نہیں بنتی کیونکہ وہ اس کی پیشن گوئیوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ البتہ بکھو کو یقین ہے کہ خدا بخش ہر بات جانتا ہے۔ بھگو کے جسم پر سانپ کے کاٹے کے بعد ڈھیلا ڈھالا چمڑا ہی رہ گیا ہے۔ وہ بھینس کی طرح ابلی آنکھوں سے ہر بات کو اپنے اندر اتار لیتا ہے۔ ایک ٹانگ پر زور دے کر چلتا ہے۔ یہ لنگ جامن کے پیڑ پر چڑھتے ڈگالے سے گرنے کی وجہ سے ہوا، لمبے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر وہ جہاں زمین پر جگہ ملے، بیٹھ جاتا ہے۔

ہر آدمی سے سراسیمہ بکھو کی زندگی یہی باغ ہے۔ جہاں تر سالوں میں وہ چڑیل، سانپوں اور مزدوری سے لڑتے جیا ہے۔

بکھو اکیلا سامع ہے، جو اس کی ہر بات پر ایمان لے آتا ہے۔ گھٹنوں تک دھوتی باندھے اور کھردرے ہاتھوں میں کھرپا اٹھائے، وہ گاڑی سے اترتے یا پلیٹ فارم پر آتے جس شخص کو بھی تکتا ہے، حیران ہوا تکتا ہے۔

''یہ بندے کہاں جاتے ہیں، تھکتے ہیں نہیں لالہ خدا بخش؟''

''بھگو نہ پوچھ، کہاں جاتے ہیں، یہ گاڑی ہے نا گیارہ بجے والی، سخت بے ایمان ہے، وقت سے روٹھی ہے اور یہ لوگ، انہیں معلوم ہی نہیں کہاں آ، جا رہے ہیں۔ سالے بے مقصد، عمریں گنوا بیٹھے ہیں، نانا نائی کی طرح''۔

''نانا، بئی ایمان ہے''۔

''شاباش بکھو، تیرے ایمان کی خیر، پورے وصل آباد میں ایک تم کام کے آدمی ہو، مگر کیسے یہ عورت سے ڈر گئے، بتاؤ''۔

''کیا کہوں، چاندرات کو آجاتی ہے۔ پہلے سدو کے کتے کو مار ڈالا، پھر، مجھے بلاتی رہی، مگر میں کملا تو نہیں نا، میں نے کہا، جا تیری ذات پر لعنت، کلہاڑی دکھا کر بھگایا، چڑیل لوہے سے بھاگتی ہے، یاد رکھو''۔

''مرن جوگے، بچ اس چڑیل سے، ورنہ مارا جائے گا''۔

''اچھا''۔

وہ حیرت میں ڈوبا، خدا بخش کو محویت سے تکتا رہتا ہے۔

سدو، انہیں سر جوڑے دیکھ کر جل بھن جاتا ہے۔

''بکھو، تیری زنانی، خبر لے گی، دن سارا، پلیٹ فارم پر، کتے کی طرح گزارنے لگے ہو، خدا بخش کی باتوں میں بیٹھے بیٹھے، گل سڑ جاؤ گے، خانہ خراب، اٹھو، گھر کی راہ لو''۔

بکھو کی ساری کائنات وصل آباد کا یہ ٹکڑا ہے۔ جہاں ہجر ہے نہ وچھوڑا۔ اس لیے سدو کی بات پر دھیان نہیں دھرتا۔ وہ اس کا ازلی دشمن ہے۔ دوسرے دشمنوں میں ریلوے پولیس کا توندیل سپاہی، پسنجر ٹرین کا ٹی ٹی غلام قادر اور کالو کانٹے والا، ان

دشمنوں کی وجہ سے اس کی جان پر بن آتی ہے۔ وہ باغ سے باہر نکل کے اچھی طرح یقین کر لیتا ہے کہ کوئی دشمن تو پلیٹ فارم پر موجود نہیں۔ اگر خدا بخش کو ان دشمنوں کے درمیان گھرا پالے، تو خاموشی کے ساتھ باغ میں لوٹ جاتا ہے۔ وہ آم کے پرانے پیڑوں پر شور مچاتے پرندوں کی بولی تک جانتا ہے۔ مگر خدا بخش کے تیتر، دل چیرنے والی آواز میں جادو کس طرح اڑاتے ہیں، اس کی سمجھ سے نہیں آتی۔

وہ وصل آباد سٹیشن سے گزرتی ایکسپریس گاڑیوں کو بڑی حسرت سے تکتا ہے۔ ایک بار ایکسپریس کے گزرنے پر خدا بخش سے پوچھ بیٹھا۔

''یہ زمین ہلاتی ٹرین اتنی تیز کیسے بھاگتی ہے۔ لوگ، ڈرتے نہیں؟''

''لو اور سنو، اے پاگل خانے، سمندر پار گاڑیاں ایک گھنٹے میں دو سو میل دوڑتی ہیں، تو ان کھٹارا گاڑیوں کو روتا ہے''۔

خدا بخش نے زندگی میں پہلی بار ہنسی میں لوٹ پوٹ بکھو کو دیکھا۔

''اتنا بڑا جھوٹ بولا تم نے خدا بخش۔ پہاڑ جتنا بڑا جھوٹ تو بہ تو بہ''۔

''ارے پاگل خانے، جا، ماسٹر حمید گل سے پوچھ، تیرے کو بتا دے گا، جا مر ادھر''۔

بکھو کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ گئے۔ اصل میں جھوٹ کے اتنے بڑے ٹکڑے کو سمانا، اس کے بس کی بات ہی نہ ہو۔ دو من کے جھوٹ کو ہضم کرنا مخول ہے، پھٹ نہ جائے پیٹ بندے کا۔

''سڑی، دماغ پھر گیا ہے تیرا، جا، اپنی کوٹھری میں جا کے، منہ کالا کر، یا گوڈی کر باغ میں''۔

خدا بخش کا جی چاہا، دو چار مکے، بکھو کی خمیدہ کمر پر مارے۔ مگر اس کے کمائے ہوئے، ڈھیلے پوسٹ پر خاک اثر ہو گا۔

وصل آباد کے پلیٹ فارم پر جو بھی آتا ہے، نرالا ہی آتا ہے۔ اس نے کتنے ہی مرد و زن یاد کیے۔ جو بار بار مدتوں آیا کیے اور پھر ان کے خد و خال تک خدا بخش کے ذہن سے مٹ گئے۔ ایک بکھو باقی ہے ہر سرد و گرم میں آتا رہا ہے۔ بارش ہو، آندھی ہو، وہ دن میں ایک آدھ پھیرا ضرور لگا جاتا ہے، وصل آباد کی آندھیاں کون بھول سکتا ہے۔ اس لیے، پچھلے جمعہ کو جب زرد آندھی اٹھی ہے تو پہلے بوڑھا تیتر آہستہ آہستہ تھکا ہوا بولا۔ خدا بخش کو معلوم ہے یہ غیبی اشاروں کو جاننے والا پرندہ کب آہستہ بولتا ہے جب آندھی آئی ہے تو زمین اور آسمان ایک ہو گئے۔ مگر جب زمین اپنے مدار پر آئی ہے تو اس کا دل دھک سے بیٹھ گیا۔

پلیٹ فارم کے ایک کنارے پر گہنوں سے لدی پھندی، پٹ گوری، عورت بال بکھرائے، خدا بخش کو دیکھ کر پہلے مسکرائی اور پھر اشارے سے بلانے لگی۔ اس کے چہرے پر بلا کی کشش تھی، جی چاہا دوڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔

''آ نا، ادھر تو آ''۔

اسے ایک دم دھیان پڑا کہ اتنے زیور پہنے، یہ عورت، آندھی کے تھمتے ہی کہاں سے آ گئی، اب جو غور سے دیکھا ہے تو اس کے پیر، پیچھے کی طرف مڑے ہوں۔ وہ سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپنے لگا۔

''الٰہی، خیر، نانا کے جادو کو لوٹا دے۔ یہ کیا بلا ہے چھل پیری ہے''۔

اس نے کانپتے ہوئے اپنے آپ سے کہا، اور تیزی سے چھری نکال کے اسے دکھائی، لوہا دیکھتے ہیں، وہ چیخ مار کر، پلیٹ فارم سے اتر کر، باغ کی سمت دوڑتی ہوئی مڑ مڑ کر اسے تکتی گئی۔

''یہ نانا حجام کا وار تھا۔ مگر شاباش میرے کالے تیتر، تو نے بچا لیا''۔

دو، دو من کے قدم اٹھاتا، سیدھا حاجی سٹیشن ماسٹر کے دفتر جا پہنچا۔

''حاجی صاحب، لو، آج پچھل پیری آ گئی پلیٹ فارم پر''۔
''کیا کہتے ہو، خدا بخش، پچھل پیری؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل بسا؟''
''خدا کی قسم صاحب جی، ابھی ابھی گئی ہے، باغ کی طرف کتنی بار بکھو نے اسے دیکھا ہے، اب کم ذات پلیٹ فارم پر آ گئی''۔
اخبار ایک طرف رکھ کر حاجی سٹیشن ماسٹر نے ہاتھ جوڑے۔
''جا، پاگل مت بنا، سٹال سنبھال، چند دنوں کے بعد کون پلیٹ فارم، کون میں، کون تم اور کون چڑیل؟''
وہ ڈھے دل کے ساتھ، سٹال پر آیا ہے تو تیتر کا پنجرہ سٹینڈ سے گرا ہوا ہے۔ یہ بدشگونی تھی۔
لیکن، چپ چپاتے، دل پر پتھر رکھ کر خدا بخش نے پنجرہ اٹھایا اور دیر تک پرندے سے باتیں کرتا رہا۔ بڈھا کالا تیتر، پروں میں چونچ دبائے، مشکل سے ایک آدھ بار نیم باز نظروں سے دیکھ کر آنکھ میچ لیتا، جیسے کہتا ہو، ہر شے کا موسم بدل رہا ہے۔ تم بھی بدل جاؤ، ورنہ مارے جاؤ گے۔ موت سر پر ہے۔ خدا بخش نے پنجرہ، سٹینڈ پر دھرا اور آندھی کے بعد عورت کے قصے کو کتنے دن بھلاتا رہا۔ مگر اس بھول کے بیچ وہ یاد کرتا ہے کہ اسے دھوکہ تو نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ پچھلی سوموار کو جب غضب کا جاڑا پڑا ہے، وہ کمبل میں لپٹا، تین عورتوں کو ایکسپریس ٹرین سے اترتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ایکسپریس کراس کی وجہ سے وصل سٹیشن پر رک گئی تھی۔
پچھل پیری کی رشتہ دار تو نہیں، اس نے سب سے پہلے ان کے پیروں پر نگاہ دوڑائی مگر اطمینان ہوا کہ ان کے پیر مڑے ہوئے نہ تھے۔ خوشبو میں بسی، وہ سٹال پر کھڑی چائے پیتی رہیں۔
''سنا ہے، وصل آباد بند ہو رہا ہے، فلیگ ہو رہا ہے''۔
''جی ہاں، اب تو چند ماہ رہ گئے''۔
''پھر تم کیا کرو گے؟''
خدا بخش نے شربتی آنکھوں اور اس بے حد دل لبھانے والی عورت کو جواب دینا چاہا مگر ایکسپریس نے وسل دے دیا اور وہ پرس سے رقم دے کر ٹرین کی طرف بھاگ گئی۔
وصل آباد پلیٹ فارم کی یہی اچھی بات ہے کہ یہاں پر ہر آن نئی بات چلتی رہتی ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا حادثوں اور انہونی باتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کا سارا نظام، کسی اور کے ہاتھ میں ہے، حاجی سٹیشن ماسٹر تو محض آتی جاتی گاڑیوں کو جھنڈی دکھا کر رہ جاتا ہے۔
سرما کے ان دنوں میں، باغ مرجھایا ہوا ہوا اور پالے کی وجہ سے اس کے گھٹنوں کے درد میں اضافہ ہوتا گیا، چاہا، بھرا میلا چھوڑ دے اور وصل آباد پلیٹ فارم کو ویران ہونے سے پہلے آخری سلام کرے۔
خدا بخش نے تینوں بیٹوں سے صلاح لی۔ مگر تینوں راضی نہ ہوئے۔ کیونکہ کئی بار یہ فیصلہ ہوا اور وصل آباد کے بند ہونے کے فیصلے پر عمل کا وقت نہ آیا۔
جس صبح، آسمان پر بادل تھے اور یخ ہوا چل رہی تھی۔ وہ سیاہ دھسے میں لپٹا، نو بجے پلیٹ فارم پر پہلی بار صرف ایک تیتر لے کر آیا۔
سٹال کھولتے ہی، تیتر، گودوں میں اترتی سردی سے بے پرواہ بول اٹھا۔
اس کی مست بولی میں عجب سرور ہو، لگا پوری فضا جھوم اٹھی ہے۔
''واہ مستانے، واہ، کیا سریلا بولا ہے، واہ۔ خوش کر دیا آج''۔
اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالتا، حاجی سٹیشن ماسٹر جھومتا ہوا آ گیا۔

’’خدا بخش، تو سپیشل آ رہی ہے۔ تم دس کلو دودھ اور منگوا لو، کرو، موبائل، بیٹے نورالٰہی کو‘‘۔

اس نے حاجی کے کہنے پر موبائل جیب سے نکال کر دس کلو دودھ لانے کے لیے بیٹے کو تاکید کی۔

’’اتنی دیر میں گرما گرم چائے بناؤ، اور سنتے ہو، رات مستی خان کی حویلی میں ڈاکہ پڑ گیا‘‘۔

’’مستی خان کے گھر ڈاکہ، ارے، ارے یہ کیا ہوا؟‘‘

چائے پیتے حاجی سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ ڈاکو مستی خان کے داماد کو بھی قتل کر گئے اور گھر میں جھاڑو پھیر دیا، عورتوں کو الگ مارا اور بے غیرتوں نے بے آبرو بھی کیا۔

اس کا جی چاہا، دھاڑیں مار مار کے روئے۔ مستی خان جیسے دل گردے اور نیک دل شخص کے ساتھ یہ ظلم۔ جو دن گزرتا ہے، بری خبر ہی چھوڑ جاتا ہے۔

نورالٰہی نے بھی باپ کو یہی خبر سنائی اور بڑی کیتلی پانی سے بھر کر، چولہے پر رکھ دی۔

سپیشل نے بیس منٹ کے بعد آنا تھا۔ خدا بخش نے گھڑی دیکھ کے نورالٰہی سے کہا۔

’’پتر بسکٹ بھی لے آتے تو اچھا تھا، سپیشل پر آنے والے لوگ بسکٹ ضرور مانگتے ہیں‘‘۔

’’جاتا ہوں بابا‘‘۔

وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ آؤٹر سگنل پر قیامت خیز دھماکا ہوا۔ سپیشل ٹرین آؤٹر سگنل پر ٹریک سے اتر کر زمین میں دھنس گئی تھی اور غبار تھا کہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ پلک جھپکنے میں پورا وصل آباد آؤٹر سگنل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ خدا بخش کو زندگی میں پہلی بار ٹی سٹال اور کالا تیتر بھول گئے۔ وہ دیوانہ وار بھاگتا، الٹی ٹرین میں پھنسے لوگوں کو دیر تک نکالتا رہا۔

واپس آیا تو نورالٰہی سے خدا بخش نے کہا۔

’’آج صبح تیتر کس لیے بولا، میں نے غلط جانا، وہ دے رہا تھا حادثے کی چتاؤنی، لیکن بیٹے، یہ سب کیا ہو رہا ہے، حادثے بڑھتے جاتے ہیں، ہم سٹال اکھاڑ نہ لیں، اب کیا بچا ہے یہاں؟ اس پلیٹ فارم کے دن گنے جا چکے‘‘۔

’’ٹھیک ہے بابا، ٹھیک ہے‘‘۔

ان کے بولنے کے دوران میں کتنے لوگ سپیشل میں مرنے والوں کے بارے میں باتیں کرتے سٹال پر آتے رہے وہ دودھ جو سپیشل میں آنے والے زندوں کے لیے تھا، اب مردہ تھے۔ اور جو زندہ بچ رہے تھے، وہ مردوں سے بدتر۔

خدا بخش نے ٹی سٹال پر آنے والے گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے، سرخ و سپید چہرے والے بھاری بھرکم شخص کے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر سوچا۔

’’یہ، کون ہو، کہیں، مستی خان کے گھر ڈاکے میں شامل ڈاکو تو نہیں؟‘‘

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مونچھل نے پوچھا۔

’’یہاں حادثے سے پہلے، باغ کی طرف سے دوڑتی عورت تم نے دیکھی؟‘‘

’’عورت، باغ کی طرف سے آتی ہوئی؟‘‘

’’ہاں ہاں۔ عورت؟‘‘

دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور گھر آکر خدا بخش اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ وہ عورت، جسے حادثے سے پہلے سرخ چہرے والے خوفناک شخص نے دیکھا، کون ہو؟‘‘

''کہیں چڑیل تو نہ تھی؟''

یہ کالے تیتر کے پر جھڑنے کے دن ہوں۔ ہر شے خزاں کے آتے آتے ویران تھی۔ پلیٹ فارم کو خدا بخش روز بھلاتا ہے۔ مگر وہ کسی طرح بھول سکتا ہے۔ خدا بخش کو جمعرات کے دن جب بارش تھمی ہے، کیا یاد آیا کہ نور الٰہی کو لے کر وصل آباد کے اجڑے پلیٹ فارم پر آ گیا۔

دونوں باپ بیٹا، کتنی دیر ٹی سٹال کی جگہ کھڑے باغ اور سنسان پلیٹ فارم کو تکتے رہے۔

''نور الٰہی، دیکھو، وہ پھر باغ سے نکل کے آ رہی ہے''۔

''کون؟''

''وہی عورت، لیکن اس کے تو بال جھڑ گئے ہیں، عورت دیکھی تم نے؟ اس کے بال کہاں گئے؟ نانا حجام کے ہاتھ تو نہیں چڑھ گئی''۔

''کون عورت بابا، کون؟ سامنے باغ کے تو کچھ نہیں، کوئی عورت دکھلائی نہیں دے رہی؟''

خدا بخش کا جی چاہا، زوردار چانٹا، بیٹے کے منہ پر دے مارے۔

''کیا تم اندھے ہو، بالکل نابینا ہو تمہیں اتنی بڑی عورت نظر نہیں آ رہی؟''

نور الٰہی نے دور تک نگاہ دوڑائی، خالی جھنڈار، ویران پلیٹ فارم اور باغ کے آس پاس دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ ہو۔ اس نے دوڑ کر خدا بخش کو دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا، کیونکہ زہرباد کے درد کے باوجود وہ بھاگتا ہوا، باغ کی سمت جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

میگی

فرخندہ لودھی

اواخر اپریل کی چمکدار دوپہر تھی۔

امین تھوڑی دیر کے لیے دفتر سے اٹھ آیا تھا۔کھانے کا وقت ہونے کے باعث بازار میں چہل پہل کم تھی، سڑک پر لوگ نہیں تھے۔شور تھا۔ جتنے ہوٹل اور ریستوران تھے سب کے ریڈیو سیٹ مختلف سٹیشنوں کے پروگرام سنا رہے تھے۔پھر دھوپ کی ہر لحظہ بڑھتی تمازت۔وہ بازار کے اس سرے سے اس سرے تک بغیر کسی مقصد کے، چلتا رہا۔

یوں ہی بے کار۔۔۔ایک ہوٹل میں گھس گیا۔کھانے پر لوگ اس طرح ٹوٹے پڑے تھے گویا دنیا میں اس سے اہم کام کوئی نہیں۔مگر وہ ویٹر کو اپنے پیچھے چلاتا چھوڑ کر فوراً باہر آ گیا۔

پنواڑی کی دکان کے بڑے آئینے میں اس نے اپنی صورت کو غور سے دیکھا۔۔۔ پٹ سن جیسی پیلی چمک دار مونچھیں اور آنکھوں کی چھدری پلکیں چہرے پر بیزاری۔۔۔امین مڑنے کو ہی تھا کہ پنواڑی نے آواز دی۔

"صاحب! گلوری"۔

اچھا خاصا، لگا ہوا گاہک مڑا جاتا تھا، امین رک گیا۔

"چلو۔دے دو"۔

وہ حسب معمول مسکرا نہیں رہا تھا۔اس نے منہ کھول دیا جیسے کوئی کڑوی کسیلی دوا کھانے پر مجبور ہو۔بوڑھے پنواڑی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ روک لیا۔

"دیکھئے صاب! یوں نہیں۔مسکرا کے کھائیے"۔

یگانگت اور لہجے کے الھڑپن کو سن کر امین ہنسی نہ روک سکا۔

"ہاں۔۔۔یوں"۔

پنواڑی نے نفاست سے گلوری امین کے منہ میں رکھ دی اور اس کی بھوری آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا بات ہے صاحب! جی تو اچھا ہے"۔

پنواڑی کے رویے میں ہمدردی تھی۔امین کو اداس دیکھ کر اس کا دل ہول گیا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بڑے میاں۔شکریہ۔۔۔تم مجھے ہمیشہ بڑے فنکار نظر آتے ہو نہ معلوم کیوں!"

امین نے ادھر کی بات ادھر جوڑی۔وہ موضوع بدلنا چاہتا تھا۔

"تم ہمیشہ زیادہ پیسے لیتے ہو۔پان کے دام لیتے ہو یا فن کے؟" امین بڑے میاں کو پیسے دیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔اسے پنواڑی کے پان کھلانے کی یہ ادا ہمیشہ عجیب لگی اور اچھی بھی اس ادا کی اصل کہاں ہے؟ وہ ہمیشہ سوچتا۔

"ارے واہ بابو! فن کی قیمت کون دے سکتا ہے؟ یہ اصلی مال ہوتا ہے۔اس کے بھاؤ اس زمانے میں نہیں لگتے"۔

بڑے میاں صافی سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اترا رہے تھے۔امین نے جیب سے سگریٹ نکالی۔سلگتے ہوئے رسے کے سرے سے سلگائی اور چل دیا۔

رولدد پنواڑی شہر کا سب سے عجیب پان سگریٹ والا تھا۔ وہ پان کے پتے کے ساتھ اپنا مخصوص مشرقی فلسفہ بگھارتا۔ پرانے گاہک کے ساتھ کھل کر باتیں کرتا۔ نئی روشنی کے بابو لوگ دل لگی کے لیے اس کے پاس رکنا اور باتیں سننا پسند کرتے تھے۔ وہ پان میں تازہ مکھن کی انگلی لگا کر گلوری بناتا تھا اور اس کی گفتگو مکھن سے کہیں زیادہ نرم اور طراوت بخش ہوتی۔۔۔ ''میاں! مکھن خشکی دور کرتا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ سب کچھ رخصت ہو جائے گا۔ سارے لوگ ہر شے میں ملاوٹ کرنے لگے ہیں۔۔۔ اور پھر پان۔۔۔ کھانے والے کتنے رہ گئے ہیں''۔

رولدد کو بدلتے ہوئے حالات سے گلہ تھا۔ امین نے ایک روز اسے سمجھایا بھی تھا کہ یہ تجرباتی دور ہے۔ ملاوٹ اور امتزاج کے نتیجے کے طور پر جو کچھ ہمیں حاصل ہوتا ہے اس سے ہماری تخلیق کی حس کو تسکین ملتی ہے اور ہم علم اور جدیدیت سے ہمکنار ہو کر اپنی ذات سے قطعی مطمئن ہوں نہ ہوں ہمیں گو نہ تسلی ضرور ہو جاتی ہے کہ ہم نے کچھ تو کیا جو اس سے پہلے نہیں تھا اور رولدد بھی تو پان میں مکھن لگاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کی معقول وجوہات سن کر رولدد لاجواب ہو گیا تھا اور امین کی قدر کرنے لگا تھا۔ اب وہ اکثر فارغ وقت میں تبادلہ خیالات کرتے۔

آج امین کا دل کام میں نہ لگا اور پنواڑی سے دو باتیں کرنے کو بھی نہ چاہا۔ وہ اداس تھا۔ بس اس کے حواس پر چھوٹے بڑے گلابی ہاتھ چھائے ہوئے تھے جو یکا یک چھوٹے جاتے تھے، اندراج کے رجسٹر کے صفحوں پر چاندی کا نازک لاکٹ تڑپتا رہا اور کام ادھورا چھوڑ کر چلا آیا۔۔۔ اس کا ذہن بری طرح گڈمڈ ہو رہا تھا وہ جا رہی تھی۔

میگی جا رہی تھی۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہینے کی آخری تاریخیں۔۔۔ جیب میں کوئی پیسہ نہ تھا۔۔۔ اور وہ تھا اور کئی مہینوں کا ساتھ دفعتہً چھوٹ رہا تھا۔

میگ! میگ! محبت کرنا گناہ تو نہیں۔ کسی بھی شریعت میں کسی قانون میں۔ پھر تم کیوں جا رہی ہو؟۔۔۔ اچانک۔۔۔ یوں۔۔۔ اس طرح۔۔۔ امین پان چباتا، سوچتا رہا تھا۔۔۔ پھر وہ واپس ہوا اور بنک سے سو روپے ایڈوانس لے کر سونا بازار کی طرف چلا گیا۔

اسے میگی کو کوئی نہ کوئی تحفہ تو دینا تھا۔۔۔ اس سے پہلے دیئے گئے تمام تحفوں سے بڑھیا۔

ستمبر کی کسی تاریخ کو بڑے بازار میں گزرتے ہوئے اس سے میگی کی ملاقات ہوئی تھی۔۔۔ ایسے ہی اچانک جیسے وہ اب جا رہی تھی۔۔۔ اپنا بوریا بستر کمر پر لادے چھوٹے سے قد کی اجنبی لڑکی۔۔۔ سرمہ بیچنے والے کو سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اکیلی۔

سرے والا، میم صاحب میم صاحب کی رٹ لگائے جاتا تھا۔ امین اپنی ٹیبل کا کام بھگتا کر ذرا ٹانگیں سیدھی کرنے کی غرض سے بازار میں چلا آیا۔ شام کو نوجوان کلرک طبقے کی طرح تھکی ہوئی آنکھوں کو سینکتے۔ وہ اکثر بڑے بازار میں اس سرے سے اس سرے تک گھوما کرتا۔ لیکن اس وقت دو پہر تھی۔ میگی کو ان پڑھ دکاندار کے ساتھ الجھتے دیکھ کر امین کی رگ حمیت بھڑکی۔ اسے انگریزی آتی تھی۔ اگرچہ وہ بی اے تک کم گو اور شرمیلا طالب علم رہا تھا۔ بہرکیف وہ کوشش تو کر سکتا تھا۔ امین ادھر ادھر نظر دوڑا کر جھینپتا ہوا آگے بڑھا۔ میگی دھات کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چمکدار سرے دانیاں ہاتھوں میں پکڑے کھڑی تھی اور سرے والے کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ سلائیاں تم رکھ لو اور نچلے حصے مجھے دو۔ میں گلدان بناؤں گی۔ اتنی لمبی بات میگی کو کہنی آتی تھی نہ سرے والے کے پلے پڑتی تھی۔ ہاں وہ آٹھ گنا دام لینے کی فکر میں تھا اور کہہ رہا تھا۔

''میم صاحب، مال بہت گڈ، بہت اچھا۔۔۔ آپ کو ولیت میں نہ ملے گا''۔ پردیسی گاہک چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے

میں مصروف تھا کہ امین نے اپنی خدمات پیش کیں اور سودا سستے داموں طے ہو گیا۔ میگی نے تشکر آمیز انداز سے امین کو دیکھا۔ وہ مسکرایا اور سر کی جنبش سے اپنے کارنامے کی داد وصول کی۔۔۔ اجنبیت کی دیوار سے پہلی اینٹ کھسک گئی۔

میگی نے اسے بتایا کہ وہ سیاح ہے اور اس بڑے شہر میں نو وارد تو امین اس کو اس کی قیام گاہ تک پہنچانے پر بھی آمادہ ہو گیا۔ میگی سے تھیلا اور کھانے کا ڈبہ پکڑ کر وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا فخر محسوس کر رہا تھا۔۔۔ اسے خیال گزرا کہ انگریزی بولنے سے کتراتا اس کا Complex تھا۔ جو میگی سے گفتگو کے دوران کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

منزل تک پہنچتے وہ ایک دوسرے کو اس حد تک جان چکے تھے جتنا دو باتونی ہم سفر اجنبی طویل سفر کے بعد جان جاتے ہیں اور کسی ایسی انجانی ضرورت کو ذہن میں رکھ کر پتے بھی بدل لیتے ہیں۔

میگی، شوقیہ سیاحت کرنے والی پارٹی کی رکن تھی۔ امین کو یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی۔ راستے میں ایک آدھ بار امین تانگہ وغیرہ لینے کے لیے رکا۔ مگر میگی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ جگہیں دیکھنے آئی ہے روندنے نہیں۔

اور امین کے لیے یہی غنیمت تھا کہ وہ ایک گوری نسل کی اجنبی لڑکی کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے بولے جاتا تھا۔۔۔ اور کم مائیگی کا احساس قطعاً نہ تھا۔

امین دو چار روز کے بعد میگی سے ملاقات کرنے گیا۔ وہ خندہ پیشانی سے ملی۔ شام کے وقت سڑک پر ٹہلتے ہوئے میگی نے اس کی غلط فہمی دور کر دی کہ وہ انگریز ہرگز نہیں بلکہ ویلش ہے۔ اور ویلش اپنے آپ کو انگریز کہلوانے میں دکھ محسوس کرتے ہیں اور وہ انگریزوں سے ایسے ہی نفرت کرتے ہیں جیسے کوئی محکوم قوم اپنے حاکم سے۔۔۔ وہ زخم جو انگریزوں نے سینکڑوں سال پہلے ویلش قوم کی آزادی سلب کر کے ان کی قوم کے دل پر لگایا تھا آج بھی ہرا ہے۔

میگی کو اگر کوئی انگریز کہتا تو وہ ناک سکوڑ کر اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کرتی۔

پاکستان میں درود کے بعد امین پہلا شخص تھا جس پر وہ پورا اعتماد کر سکی۔۔۔ یہ بھوری آنکھوں اور سنہری بالوں والا نوجوان دل سے اداس اور تھکا ہوا سا ہے۔ اور یہ اپنے ملک کے ایک طبقہ کا نمائندہ ہے۔ چند ملاقاتوں کے بعد میگی اس نتیجہ پر پہنچی تھی۔۔۔ اب وہ ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی نہ تھے۔

امین کی معیت میں میگی شہر اور اس کے گرد و نواح کے قابل ذکر مقامات دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی خاص طور پر جدید شہر کی شان بان دیکھتے ہوئے چیخ چیخ کر اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی کہ پاکستان دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ زیورات اور زرق برق لباس میں لپٹی ہوئی۔۔۔ یہاں کی ہر عورت رانی ہے۔۔۔ وہ جس کا ذکر کہانیوں میں سنا تھا اور تخیل نے اس کی تجسیم کی تھی اب وہ اسے چھو کر دیکھ سکتی تھی۔ باتیں کر سکتی تھی۔

میگی عجیب فطرت کی سیاح تھی۔ تصویریں لیتی نہ نوٹ۔۔۔ بس گھومے جاتی اور خوش ہوتی رہتی۔ سیاحت کے بارے میں اس کا اپنا ذاتی نظریہ تھا کہ وہ واقعات اور مقامات جو نہایت حسین اور اثر انگیز ہوتے ہیں ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتے۔۔۔ پھر وہ اپنی خوشی کے لیے دنیا دیکھنے نکلی ہے۔ کتاب دیکھنے کے لیے نہیں۔

یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ میگی زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھی۔۔۔ سادہ سا، سچا دل۔۔۔ عام انسانوں کے سے طور اطوار۔ بس وہ انسان تھی۔

اس سیلانی لڑکی سے مل کر خود امین کو یوں لگتا جیسے اس نے ساری دنیا دیکھ لی ہے۔۔۔ انسان سب جگہ ایک سے ہوتے ہیں۔۔۔ فرق حیوانوں میں ہوتا ہوگا۔۔۔ میگی کا بھی یہی خیال تھا۔

رفتہ رفتہ امین کے لاشعور میں مبہم سا خیال جاگزیں ہو رہا تھا کہ اس لڑکی نے دیس دیس، بستی بستی جو خاک چھانی ہے تو اس سے ملنے کے لیے تو نہیں! میگی روشن دماغ قوم کی بیٹی ہے تو کیا؟ محبت کی کہانی کہیں پرانی نہیں۔

میگی کے پیار کا نشہ امین کو ہولے ہولے چڑھا تھا۔ ایسے ہی جیسے بے جان رسی پر کوئی سرسبز بیل چڑھتی چلی جائے اور رسی کا وجود برگ وگل کے نیچے دب جائے۔

اس نشے کا اندازہ امین کو اس وقت ہوا جب میگی نے موسم بدلتے ہی یکبارگی اعلان کر دیا کہ وہ جا رہی ہے۔ اس کی اگلی منزل تاج محل ہے۔ سری نگر ہے۔۔۔ وہ انڈیا جائے گی۔۔۔۔ امین کی محبت کا تاج محل ٹوٹ کر ڈھیر ہو گیا۔

تاج محل محض ایک مزار ہے۔ جس میں ماضی کی ایک خوبصورت کہانی دفن ہے۔ کیا دل محبت کا مزار نہیں بن سکتا۔ کیا اس میں حسین لمحے کی لاش سنبھالے رکھنے کی گنجائش نہیں۔۔۔ میگی کے فیصلے کے کئی دن بعد وہ اتنا ہی سوچ سکا۔ کیا ہوا جو وہ یوں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اور یہ بھی دکھ کی بات نہیں کہ دیس کی کسی لڑکی نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔۔۔ امین شکل وصورت اور آمدنی کے لحاظ سے معمولی تھا۔ امین کے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ وہ ایک پردیسی عورت کو دل دے بیٹھا۔۔۔ کالے کوسوں سے آنے والا رنگ رنگیلا پنچھی۔۔۔ میگی۔۔۔ جس کی آنکھوں میں خلوص دیکھ کر وہ دیوانہ وار چیخ اٹھا تھا۔

میں تمہارے لیے کوئی تشبیہ نہیں تراش سکتا۔ تم اتنی زندہ ہو کہ کسی بے جان چیز کا نام لینا تمہاری توہین ہو گا۔۔۔ ہاں میں یہ کہوں کہ سمندر تمہاری آنکھوں کی مثال ہے اور پھول۔۔۔

کبھی کبھی امین جھنجھلا جاتا۔ روایت سے بغاوت کر کے وہ مطمئن بھی نہ تھا۔ وہ ساری اقدار جو مشرقی عشق کا خاصا تھیں۔۔۔ ملیا میٹ ہوئی جاتی تھیں۔

''پردیسی پیا سنگ نین جوڑائی کے امتن میں پچھتائی''۔

ایسے گانے اور دوہے یاد کر کے امین کا دل چھوٹنے لگتا۔ بھلا وہ سنجیدہ کیوں ہو گیا۔ کہیں اس ملک سے باہر گیا ہوتا اور کوئی میم پکڑ لاتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اب یہاں گھر بٹھائے کوئی دل اڑا کے لے بھاگے! وہ اپنے آپ کو کوستا۔

توہین ہے سراسر توہین۔ اس نے مشرقی مرد کے پلے کچھ نہیں چھوڑا۔ امین نے میگی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ میگی نے اسے ایسے ہی تھام لیا جیسے ایک ملک دوسرے ملک کو تھام لے۔ پر اب امین کی نگاہیں بدل گئی تھیں۔۔۔ ان کا بان میگی کے مضبوط دل پر بھی لگا۔

بہت گھوم چکنے کے بعد وہ شاہی قلعہ کے سرسبز لان میں ستا رہے تھے۔ ٹھنڈی گھاس پر اوندھا لیٹے لیٹے امین کی نظریں میگی کے تھکے ہوئے چھوٹے سے گلابی چہرے پر کچھ یوں پڑیں جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

پتلے رنگین ہونٹ کے اوپر پسینے کی شبنمی بوندیں۔۔۔ امین کا جی چاہا اس چمک کو اپنی انگلی کی پور میں اچک لے اور اس پنکھڑی کو چھیڑے جو شبنم میں نہا کر حسین تر ہو گئی ہے۔

میگی، امین کی موجودگی سے بے خبر دور ڈھلے ہوئے نیلے آسمان پر اڑتی ہوئی چیلوں کو تکے جاتی تھی۔ دربار خاص کی محرابوں میں جنگلی کبوتروں کے جوڑے غٹرغوں کرتے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ان کے پر سیاہی مائل نیلے تھے۔ آسمان کا رنگ نیلا تھا۔ میگی کی آنکھیں نیلی تھیں۔۔۔ آغاز سرما کی بھوری نیلی شام قلعے کے کھنڈرات کی اوٹ میں اتر آئی تھی۔۔۔ اداسی، تنہائی، فاصلہ، نیلگوں گہرا۔۔۔ شعلہ، شعلہ، سمندر اور آسمان۔۔۔ امین سوچ رہا تھا۔

''یا پھر یہ ایک اصل کا پرتو ہے کہ ہر اتھاہ میں جھلکتا ہے''۔

''میگ۔۔۔''

امین نے سکوت کے سمندر میں کنکری پھینکی۔انگوٹھے کی پور کو میگی کے ہونٹوں پر نرمی سے پھیرا اور چپ رہا۔

میگی نے دنیا دیکھی تھی اس ٹھہراؤ کی تہ میں متلاطم لہروں کو جانتی تھی جواباً دھیرے سے مسکرائی اور اپنا چھوٹا سا ہاتھ امین کی طرف بڑھایا۔

''میگ! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔میگ!''

شروع شروع میں وہ میگی کو اس کے پورے نام مارگریٹ پارسین کہہ کر پکارتا تھا دوستی ہوئی تو میگی کہنے لگا اور اب میگ میگ کہے جاتا تھا۔ سچی محبت کے اظہار کے الفاظ کبھی استعمال شدہ نہیں ہوتے۔ نئے لفظوں سے کہانی نئی بن جاتی ہے جس کی ''تھیم'' کبھی نئی نہیں ہوتی۔

اس شام وہ دیر تک بازاروں میں پھرتے رہے۔میگی نے بہت سی چیزیں خریدیں جو خالص مشرقی تھیں وہ امین کو بتاتی رہی کہ جب وہ گھر واپس جائے گی تو ان کی ماں ان سب چیزوں کو دیواروں اور کارنس پر سجائے گی اور تمام قصبہ نمائش دیکھنے آئے گا۔ وہ ہمیشہ ملک ملک کے تحائف لے کر گھر لوٹتی ہے البتہ وہ جرمنی سے کچھ نہ لاسکی تھی۔یہ جرمنی میں اقتصادی اور سیاسی بحران کے دن تھے۔۔۔اور ترکی میں کسٹم ڈیوٹی پر کھڑے نوجوان آفیسر نے اسے آنکھ ماری تھی اور گذرتے ہوئے کندھے پر چٹکی کاٹ کر گیا تھا۔ اور یروشلم میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو جاسوسی کے شبہ میں دھر لیا گیا تھا اور وہ رات بھر سردی میں ٹھٹھرا کیے تھے۔کیونکہ ان کے بستر تلاشی کی غرض سے چھین لیے گئے تھے۔۔۔۔یہ اور اس کے قسم کے بہت سے واقعات سنا کر وہ امین کو خواب میں جھنجھوڑتی رہی۔

میگی کی اقامت گاہ تک پہنچتے پہنچتے پورنماشی کا چاند افق سے کئی سیڑھیاں اونچا چڑھ آیا تھا۔

چودھویں کا چاند ہو۔

امین نے بے خیالی میں یونہی گنگنائی۔

۔۔۔رخصت ہونے سے پہلے میگی نے اصرار کرکے پورا گانا سنا۔وہ امین کے خلوص کا تجزیہ نہ کر پائی تھی۔مشرقی مرد کے اظہار محبت کی دھیمی دھیمی سوختہ جاں آنچ جو راکھ نہیں کرتی، لگاتی ہے۔۔۔اس نے اس آنچ میں اپنے آپ کو پگھلتا ہوا محسوس کیا۔

رات کو اپنے بستر پر لیٹی ہوئی وہ اپنے ہاں کے مردوں کا مقابلہ امین سے کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہاں آغوش محبت یوں ہولے ہولے کھلتی ہے جیسے کوئی غنچہ کھلتا ہو۔

''غنچہ''۔

اچھی تشبیہ ہے۔وہ آپ ہی آپ مسکرائی۔امین کی یاد اور بدن کی باس اس کے حواس پر مسلط تھی۔

تھوڑی دیر پہلے امین سے سنے ہوئے گانے کے بول کا ایک لفظ بھی اس کے حافظے میں نہیں تھا۔ہاں لے اچھی تھی اور پورے چاند کا ذکر تھا اور جوش جنوں میں امین نے اس کا منہ اونچا کر کے کہا تھا م۔۔۔تم بھی پورے چند جتنی حسین ہو۔۔۔یہ سن کر میگی اترانے کی بجائے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"God Forbid How Rediculous"پورے چاند جتنا گول اور چپٹا چہرہ۔۔۔

امین کو غصہ آ گیا۔اور اس نے میگی کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''الو کی پٹھی۔۔۔''

پھر ترجمہ کیا۔میگی کھل اٹھی۔

''ہاں یہ اچھی تشبیہ ہے''۔
اب کے امین کو اس کی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ میگی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چیخی۔
''ہاں ہاں۔ہم اہل مغرب الو کو دانائی اور دور اندیشی کی علامت سمجھتے ہیں''۔
پھر وہ دونوں **بغلگیر** ہو کر قہقہے لگاتے رہے اور یوں **ایک** فاصلہ اور بعد جو باتوں سے **اچانک** پیدا ہو **چلا** تھا۔کم سے کم ہو گیا۔
تاریخی مقامات کی سیر کے بعد میگی امین کو بار بار کہتی تھی کہ تمہاری قوم بلاشبہ عظیم۔۔۔چھوٹی اینٹوں سے لے کر بلند میناروں **تک**۔سب تمہاری عظمت رفتہ کی گواہی دیتے ہیں اور یہ سب کچھ پختہ ہیں۔
امین کے ذہن پر میگی تمام گفتگو میں سے صرف **ایک** بات چسپاں ہو کر رہ گئی۔
''عظیم قوم تھی''۔
پل بھر کی ساری رواداری اور محبت جو وہ سات سمندر پار کی حوا سے **رکھتا** تھا۔دب کر رہ گئے اور وہ **چلا** کر بولا۔
''ہم اب بھی ہیٹے نہیں۔۔۔تاریخ کو نئے **رنگ** سے دہراتے ہیں۔۔۔یہ اور بات ہے کہ ہم نے اس حقیقت کو اب محسوس کیا کہ یہ دنیا فانی اور آنی جانی ہے۔۔۔ پکی عمارتیں بنانا فضول ہے۔۔۔خالص ذاتی گھروں کی بات دوسری ہے۔ان میں بیوی بچوں کو دن رات رہنا ہوتا ہے۔۔۔ان کی آسائش کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔
وہ بولتا **چلا** گیا۔میگی نے **ایک** جھرجھری لی اور امین کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوئی۔**مگر** اب وہ خاموش تھا۔گویا اس کے پاس باتیں ختم ہو گئیں۔سارے دلائل ہاتھ سے جاتے رہے۔میگی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔امین نے اس پر آنکھیں رکھ دیں۔۔۔
پیپل کے پتوں کے پیچھے پہلی تاریخوں کا پہلا چاند **پٹ پٹ** تکے جا تا تھا۔۔۔وہ کالی جینز میں پھنسی ہوئی ٹانگیں پیارے ہاتھوں کے سہارے لان پر بیٹھی تھی۔اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے چاندی کی چین کو چاند کی چور کرنیں چمکا رہی تھیں۔
تمہارے دیس میں حسن ہے۔ہر طرف بکھرا ہوا۔پریشان۔یہ بکھراؤ دیکھنے والے کو مدہوش کر دیتا ہے۔نہ معلوم مجھے ایسا کیوں لگتا ہے، کہ تم سب مدہوش ہو۔۔۔امین!''
امین پھیکی طنزیہ ہنسی ہنسا۔
یہ لاکٹ اس کے پہلے یار کی نشانی ہوگا۔۔۔وہ سوچ رہا تھا۔
امین تم نے ٹینی سن کی Lotus Eaters پڑھی ہے۔پس تم ''لوٹس ایٹر'' ہو۔۔۔''
امین کے **اعصاب** کھنچ گئے۔اسے تاؤ آ رہا تھا۔۔۔وہ اس کے **جذبات** مجروح کرنے کے موڈ میں کیوں تھی۔۔۔خلوص معیشت اور سیاست سے کہیں بلند تر چیز ہے۔۔۔۔یہ اپنی اور اس کی ذات کے بارے میں کیوں نہیں سوچتی اس کے متعلق کیوں نہیں کہتی۔عورت باہمی رشتے اور ذات سے الگ ہو کر سوچنے لگے تو وبال بن جاتی ہے۔
امین چڑ کر میگی کی باتوں کا جواب دیتا تھا۔۔۔میگی نے آخری چٹکی لی۔
''محبت کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی۔**مگر** اس کی بقا ذہنی پختگی چاہتی ہے''۔
امین بے نیازی سے بیٹھا درختوں کے پیچھے **چاند** کو ہولے ہولے **اترتے** دیکھ رہا تھا۔فضا خاموش تھی۔شہر کے بڑے گھڑیال نے دس بجائے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
امین، میگی سے ناراض ہرگز نہ تھا۔بس اسے شکایت تھی تو اتنی کہ وہ اس کی ذات سے آگے بڑھ کر کیوں سوچتی ہے۔امین نے اپنے یہاں کی عورتوں کا صرف **ایک** مرکز خیال دیکھا تھا۔۔۔مرد۔۔۔خواہ شوہر ہو یا محبوب۔۔۔۔بہت کیا تو تصوف میں

پناہیں لینے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو بہر طور پھنسائے رکھتی ہیں۔ آب وہوا کا اثر ہے یا مٹی کا؟ وہ اس چکر سے نکلنا پسند نہیں کرتیں۔

ڈوبتے چاند کی دھندلی چاندنی میں وہ میگی کی آنکھوں میں نہ جھانک سکا اور بظاہر ترش لہجے میں بولا۔

''میگ! ہم دوستی سے سوا ہیں۔۔۔ جانتی ہو!''

وہ میگی پر جھکا اور میگی نے اپنی پیشانی اس کے ہونٹوں کے قریب کر دی۔۔۔ کسی گنجان درخت میں پرندوں کے پر پھڑ پھڑانے کی آواز آئی۔۔۔ امین چل دیا۔

قیام گاہ کے باغ کی چوڑی سڑک پر اسے خوشبو نے گھیر لیا جو میگی کے بالوں کی نہیں تھی۔۔۔ چاند کی کرنوں کے ساتھ کھلنے والے مرداکے سپید پھولوں کی تھی۔۔۔ قیام گاہ سے ملحق گرجا گھر کے قبرستان میں الو بول رہا تھا۔ امین کو چڑیلوں، بھوتوں اور آوارہ روحوں کے خیال کے ساتھ میگی کی بات یاد آئی۔ اس نے لاحول پڑھتے ہوئے ایک بار پھر وہی گالی دی۔۔۔

''الو کی پٹھی۔۔۔''

دوسرے روز میگی بینک میں آئی تو امین کا چہرہ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سوجا ہوا تھا۔ میگی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر کر لوگوں کے ساتھ انہماک سے گفتگو کرنے لگا۔۔۔ میگی نے آہستہ آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پکارا۔۔۔

دفتر آتے ہی میگی کو ٹیلی فون کرنا امین کا معمول تھا۔ صبح نہ ہو سکا تو دوپہر کو۔ بینک کے اوقات کار ختم ہونے تک تین چار بار ضرور ٹیلی فون پر بات کرتا۔۔۔ مگر آج۔۔۔ میگی یہی معلوم کرنے آئی تھی۔

امین نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑی میگی کو دیکھا اور کوشش کے باوجود مسکراہٹ کو نہ دبا سکا۔ کھسیانی ہنسی، چہرے پر پھیلی آنکھوں میں ندامت اور اعتراف جرم بن کر تیری۔۔۔ پھر ایک ادھورے قہقہے کے ساتھ اڑ گئی۔

چند ثانیے کے بعد وہ بڑے بازار میں گھوم رہے تھے۔ میگی نے امین کے کندھے کو تھپتھپایا اور کہا۔

''تمہیں دوستی رکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔۔۔ اور ہاں آج مجھے وہی چاند والا گانا۔ رومن رسم الخط میں لکھ دو نا! میں اسے رٹنے کی کوشش کروں گی''۔ وہ نہایت سنجیدہ نظر آتی تھی۔

میرے جذبات کی سنجیدگی کو کب سمجھو گی میگ! وہ بڑبڑایا۔

میگی چلتے چلتے لڑکھڑا گئی اور اس نے اپنا سارا بوجھ امین پر ڈال دیا۔

کافی ہاؤس میں بیٹھی وہ دلچسپی سے ہر طرف دیکھ رہی تھی اور چپ تھی۔ پاکستانی گڑیاں اور ماڈل پیکٹوں میں بند میز کے ایک کونے پر رکھے تھے۔

''امین! یہ خوشی کی بات نہیں کہ دنیا کے تمام انسان ایک کنبے کی صورت اختیار کیے جاتے ہیں؟۔۔۔ تہذیبی اور تمدنی انفرادیت غیر پختہ ذہن کی باتیں ہیں۔۔۔۔ بچوں کی سی''۔

میگی اپنے طور پر اپنی سوچ سے مسرور اور مسحور امین کی آنکھوں میں تصدیق اور تسلیم و رضا تلاش کر رہی تھی۔۔۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولا کہ اس نے اس قسم کی باتوں کے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔

بینک کاری نے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔ امین اب صرف اس قدر جانتا تھا کہ اس رقم پر اتنا سود لگے گا اور اس آسامی کو اس حد تک قرضہ دیا جا سکتا ہے۔۔۔ اور معیار زندگی بلند کرنے کے لیے صرف روپیہ چاہیے۔ بوند جتنے وقت میں دولت کی رو پہلی نہر نکلے تو زندگی۔ ورنہ کتے کا سا جینا مقدر۔۔۔ تجربے نے اسے یہ سب کچھ سکھا دیا تھا۔ مگر وہ ٹیکنس نہیں جانتا تھا جو کاروباری

زندگی میں نہایت ضروری ہوتے ہیں۔

سامنے کی میز پر ادیب اور شاعر نما وہ شخص کسی زبردست سیاسی، سماجی الجھن میں تھے اور زور زور سے بول رہے تھے۔ وہ بار بار خالی پیالوں کو بجاتے اور بیرے کو بلاتے۔ کبھی ماچس کے لیے کبھی دو عدد سگریٹ اور گلاس بھر پانی کے لیے۔۔۔ پر ان کی بحث کسی نتیجے پر پہنچتی تو کوئی بات بھی تھی۔۔۔ اچانک ان میں ایک گھونسا ہوا میں اچھال کر چیخا۔

میں برٹرینڈ رسل کے خیالات کی پرزور حمایت کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! اگر خدا نہ ہوتا تو وہ خدا ہوتا"۔ (نعوذ باللہ)

"لعنت ہو تم پر۔۔۔"

دوسرے نے بھی اتنی بلند آواز سے جواب دیا۔

قریب تھا کہ وہ برتن اٹھا کر ایک دوسرے کے سر میں دے مارتے لیکن ریسٹوران کے ماحول سے مرعوب پیچ و تاب کھاتے بیٹھے رہے۔ میگی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ امین نے اسے تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ لڑ ہرگز نہیں رہے۔ ادب پیدا کر رہے ہیں۔۔۔ نیا ادب مشاہدے مطالعے اور ذہنی اپچ سے زیادہ بحث و تمحیص کا مرہون ہے۔

میگی ہلکے ہلکے قہقہے لگاتی، مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں دیکھا کی۔ یہ بہت تیزی سے سوچنے والی عورت تھی۔ اتنا تیز کے امین اکثر پیچھے رہ جاتا اور وہ ایسی باتیں کہہ جاتی جن کے متعلق وہ کئی دن بعد سوچتا اور جھنجھلاتا۔

کافی ہاؤس سے نکل کر سڑک پر چلتے ہوئے وہ امین کو بتانے لگی کہ پوری دنیا Teen Agrer Problem سے دوچار ہے۔ کوئی ذہنی طور پر، کوئی مادی طور پر۔

امین نے میگی کو پنواڑی کی دکان سے پان کھلوایا۔ پتے کو چبا کر میگی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے اس نے کچھ دریافت کر لیا ہو۔۔۔ نیا اور انوکھا۔۔۔ اس تجربے کے ادراک سے اس کی روح مسرور تھی۔۔۔ امین کا ہاتھ بھینچتے ہوئے وہ زور سے چلائی۔

"یہ مشرقی ہے۔ خالص مشرقی۔۔۔ اور وہ خوشبو"۔

گو پان کا ذائقہ اسکے لیے کڑوا تھا۔

اس کے بعد وہ جب بھی اسطرف سے گزرتے میگی، رولدد کے ہاتھ سے پان ضرور کھاتی۔۔۔ رولدد دونوں کو اپنی طرف آتا دیکھتا تو گلوری پہلے ہی سے تیار کر لیتا۔ میم صاحب کے منہ میں گلوری رکھنے کے بعد وہ سرخرو ہو کر اعتماد بھرے انداز سے دیکھتا اور نہایت سلیقے سے بڑ ہانکتا جیسے کسی ملک کا سفیر اپنے قومی کلچرل شو کے لیے تماشائیوں کے سامنے اطلاعات سے بھرپور تقریر کرے میگی کے پلے کچھ بھی نہ پڑتا اور وہ رولدد کو خوش کرنے کے لیے ہوں ہاں کرتی رہتی۔۔۔ رولدد کے من میں کئی بار یہ سکیم آئی کہ وہ میگی سے سرٹیفکیٹ لے کر دکان میں لگائے جس میں لکھا ہو۔

"وہ میم صاحب ہوتے ہوئے بھی بڑے میاں سے متاثر ہوئی ہے اور خاص طور پر ان کے پان سے۔ قوام کی تو بات ہی کیا؟ اور ان کا پان کھلانے کا انداز۔۔۔ واللہ! دنیا دیکھی، کہیں نہیں دیکھا"۔ رولدد نے امین کے سامنے اپنی تجویز پیش کی مگر امین نے اتنا کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔"

اور چل دیا۔ اسے کیا معلوم اس سرٹیفکیٹ سے کاروبار کتنا چمک اٹھے گا۔ یہ سرٹیفکیٹ ذرا شیشے میں جڑوا کر دیوار پر ٹانگ دیا جائے تو دیکھو ساری ماڈرن سوسائٹی ادھر کھنچی چلی آئے اور ایک بار پھر وہ زمانہ لوٹ آئے کہ عطر بیز شاموں میں پان کی خوشبوئیں مہکتی

پھرے جیسے دلی کے چاندنی چوک کی کنواریاں۔ جن کی موجودگی اور چڑھتے جوبن کے احساس سے اہل دل سرشار رہتے تھے۔ اک باس چڑھی رہتی تھی اک آس بندھی رہتی تھی۔

کام کہنے کہانے اور بیچ بچاؤ کرنے سے چلتا ہے۔ نہیں تو پیسے چڑھا دو۔ چٹکیوں میں چھوڑ پلک جھپکنے تک میں کا چلا لو۔ پر امین یار تو بات ہی موڑ گئے۔۔۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ کوئی جواب تھا۔ رولد کو انگریزی آتی ہوتی تو وہ خود ہی میگی سے بات کر لیتا۔

ایک روز رولد اشاروں کنایوں میں مافی الضمیر بیان کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میگی نے امین سے تفصیل سنی تو وہ بڑے زور سے ہنسی اور ٹوٹی ہوئی اردو میں کہا۔

''پان والا! تم بچہ۔۔۔ ٹین ایجر بچہ ہائے''۔

بڑے میاں بڑی معصومیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے میگی کی طرف تکے جاتے تھے۔۔۔ میگی نے سوچا اور خوشی کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

اور تم کتنے پیارے بوڑھے ہو۔ تمام دنیا کے بوڑھے اور بچے ایک سے ہوتے ہیں۔ جوانی کو جانے کیا ہو جاتا ہے؟ اس کے بے شمار رنگ ہیں اور اس کے آہنگ کو بقا نہیں۔۔۔''

میگی نے اپنا ہاتھ امین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بڑے میاں کو شب بخیر کہتے ہوئے وہ چل دیے۔ امین اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔۔۔ میگی کا ہاتھ خنک تھا اور لرزاں۔ اس کی شفاف آنکھوں میں موٹروں کی روشنیاں جھلملاتی تھیں اور لبوں پر بانکی لالی تھی۔

''ہمارے ملک کا سنجیدہ تجربہ کار طبقہ چھوکرے چھوکریوں کے مسائل سے پریشان ہے اور تم سب ابھی اس عمر میں ہو۔ اس عمر میں جی ایک ایک خواہش کے احیا کے لیے تڑپتا ہے۔۔۔ اجتماعی شعور سے نابلد انفرادی مسرتوں کا متلاشی ذہن۔۔۔''

وہ بولتی گئی امین نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ الگ الگ چل رہے تھے۔۔۔۔

''امین! میں لنڈن میں سال بھر تک Probation Officer کے طور پر کام کرتی رہی ہوں۔۔۔ اس مسئلے کا مطالعہ میں نے خوب کیا ہے۔۔۔ امین۔۔۔ امین۔۔۔ تم بھی کچھ بولو''۔

اس نے امین کو جھنجھوڑا۔

میں کیا بولوں! میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ صرف تمہاری باتیں کر سکتا ہوں۔۔۔ وہ تم سننا پسند نہیں کرتیں۔ خالص اورینٹل اور اوریجنل باتیں میں کہاں سے لاؤں! ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ اور۔۔۔ اور ۔۔۔''

امین کو مایوسی اور کم مائیگی کے احساس نے دبا لیا۔ میگی نے پیار سے اس کا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا۔۔۔ اب وہ دونوں خاموش تھے۔

امین باتیں کرتے کرتے یاس اور ناامیدی کے اندھیرے میں غرق ہو جاتا ہے ایسے موقعے پر میگی کے دل میں ایک خاص قسم کا جذبہ ابھرتا کہ وہ اس تھکے ہوئے بھاری سر کو اپنے سینے پر رکھ لے۔۔۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو دکھ میں دیکھ کر کرب اور الجھن محسوس کرے۔۔ وہ الجھ سی جاتی۔ امین کی کھوئی آنکھوں میں جھانکتی۔۔۔ خلوص، محبت اور یگانگی کی رو سی چلتی وقت انکے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ اور سینکڑوں صدیوں کا تہذیبی بعد سمٹ کر سانسوں کی رو سے بھی کم رہ جاتا۔

میں بستی بستی گھومتی چلی آئی ہوں۔ امین! شاید تمہارے لیے''۔

میگی رک رک کر کہتی۔

''تم کبھی نہ جانا۔۔۔''

امین کہتا۔

''اچھا۔۔۔''

میگی لفظ اچھا بخوبی ادا کر لیتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی ادائیگی میں ایک ذائقہ محسوس کرتی ہے جو نا قابل بیان ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ پاکستان میں رہنے کی صورت میں وہ یہاں کی زبان پر کچھ ریسرچ کرے گی۔ اس مقصد کے لیے میگی نے پڑھے لکھے لوگوں سے مشورے بھی کیے لوگ مدد کے لیے فوراً آمادہ ہو گئے!۔۔۔ بالآخر تان ٹوٹی تو یہاں کہ ہماری لسانیات کا مکمل علم حاصل کرنے کے لیے ولایت جانا پڑے گا۔۔۔ تو میگی ایک ہی بار اکھڑ گئی۔

سردیوں کا موسم بھی بیت گیا۔ سرد مما لک سے آئے ہوئے سیاح موسمی پنچھیوں کی طرح گھروں کو لوٹ رہے تھے یا پھر ان علاقوں کا رخ کر رہے تھے جہاں کی آب و ہوا ساز گار ہو۔ میگی کو امین کے خلوص اور محبت نے باندھ رکھا تھا۔ امین کا خیال تھا کہ میگی اگر یہ موسم جھیل گئی تو وہ اسے شادی کا پیغام دے دے گا۔ یوں جلد بازی کرنا ویسے بھی اوچھا پن ہے۔

میگی کی وجہ سے امین سب کی نظروں میں آ گیا تھا اب بینک کے منیجر صاحب اس کے ساتھ بے تکلفی سے ملتے۔ دو ایک بار تو انہوں نے امین کو میگی کے ساتھ ہوٹل میں مدعو بھی کیا۔ اس کے شریک کار اس سے حسد کرتے۔ کبھی میگی دفتر کے اوقات میں امین سے ملنے آتی تو دفتر کے مصروف کار عملے میں جو مخصوص بھنبھناہٹ ہوتی ہے، دم توڑ دیتی پھر کوئی فقرہ جڑ تا۔ میگی کہاں سمجھ سکتی تھی۔ ہاں وہ نگاہوں کی زبان سمجھتی تھی۔

جب کوئی آنکھ جھوٹ بولتی تو میگی کو نہایت غصہ آتا۔ وہ اس جھوٹ کو تربیت اور ماحول پر محمول کرتی۔ امین بھی کبھی کبھی دل کی بات چھپا جاتا۔ لیکن جھوٹ اس کے چہرے پر صبح کاذب کی طرح ابھرتا۔ عارضی اور دھندلا ایسی کیفیت اس وقت طاری ہوتی جب وہ میگی کی طرف پورے خلوص سے مائل ہوتا۔۔۔ ایک سوال آنکھوں میں ابھرتا۔۔۔ وہ چپ رہتا اور میگی تڑپ کر رہ جاتی۔

''تم کچھ پوچھنے والے تھے''۔ ایک روز میگی نے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں میں ہر روز پوچھنا چاہتا ہوں''۔

اس نے میگی کے سینے پر لٹکتے ہوئے دل کی شکل کے لاکٹ کو چھیڑا۔ رقابت کی آنچ اس وقت تیز تھی اور میگی کی طرف سے بدظنی کا گمان پختہ تر۔ میگی کتنی بری تھی کہ پہلے محبوب کی نشانی کو سینے سے لگائے ایک اور رومان لڑا رہی تھی۔۔۔ جوانی کے موسم میں مذہب اور خدا سے کہیں زیادہ محبوب کی لو لگی رہتی ہے۔ میگی کے بتانے کے باوجود کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کو چھوڑ چکی ہے اگرچہ اس کے دیس میں وہ اب بھی اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ کیونکہ اس نے قول دے رکھا تھا کہ جب تک میگی شادی نہیں کر لیتی وہ اس کی طرف سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ امین کا یقین اکثر ڈانواں ڈول ہوتا رہتا۔

کل ہی جب اس نے اپنی واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو امین چپ چاپ لوٹ آیا۔ میگی اپنی طرف سے بڑا فلسفیانہ فقرہ کہہ کر سبکدوش ہو رہی تھی۔

''میں مشرق میں روشنی کی تلاش میں آئی تھی کہ سورج ادھر سے نکلتا ہے مگر تم سب روشنی کے لیے مغرب کو منہ اٹھائے ہوئے ہو''۔ امین نے اس کے نظریئے اور فلسفے پر کڑھنے کے بعد ایک ہی رقیبانہ فیصلہ کیا کہ پہلے عاشق نے تو اسے چاندی کا ذلیل سا تحفہ دیا لیکن وہ اسے سونے کا دے گا۔۔۔ پاکستانی دوست کا ہاتھ کسی صورت میں تو بالا رہے۔۔۔ اسی مقصد کے لیے وہ تیز چلتا، سونا بازار کو جا رہا تھا۔۔۔ رولد دپنواڑی کی باتوں اور آئینے نے دل میں خواہ مخواہ مزید ہل چل پیدا کر دی تھی۔ امین کا جی شام کے

دھند لکے میں پہلے تارے کی مانند تنہا اور لرزاں تھا۔

بعد میں میگی نے انڈیا جانے کی بجائے اپنے وطن واپس جانے کا پروگرام بنالیا۔۔۔۔روانگی سے چندروز قبل وہ بے حد مصروف رہی۔ملنا ملانا۔الوداعی پارٹیاں۔۔۔پاکستان میں قیام کی آخری شام امین نے اپنے لیے وقف کرنا چاہی۔

''کل ملو گی؟'' امین نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔کل سنڈے ہے اور میں پاکستان میں آخری نماز پڑھنا چاہتی ہوں''۔

''اور شام کو۔۔۔''

''شام کو آرام کروں گی''۔

میگی کے لہجے میں عزم کی جھلک تھی۔جدا ہوتے وقت امین اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں تمہیں تحفہ دینا چاہتا ہوں۔۔۔ ایک خاص تقریب کے ساتھ۔۔۔اسے غصہ تھا۔ناکامی۔ندامت،رقابت اور دل کا خلا۔راستہ بھر وہ سوچا کیا۔

گرجا جانا بہت ضروری تھا۔۔۔مذہب کیا ہے،ایک تربیت کا نام اور محبت۔فطری جذبہ۔۔۔ہاں فطرت کو تربیت کے تابع رہنا چاہیے۔۔۔لیکن میگ کو مجھ سے محبت کیا تھی؟۔۔۔جانے کیا تھا۔۔۔فطرت۔۔۔فطری جذبہ کچھ بھی نہیں۔اور میگی کبھی بھی نہیں۔۔۔اور میگی کبھی کچھ فیصلہ کرتی ہے۔کبھی کچھ۔۔۔کمینی ہے۔

اوائل جون کی صبح نہایت چمکیلی تھی۔اونچی دیواروں اور درختوں پر پیلی دھوپ پھیلی تھی۔گرم ہوا کے جھکڑ سویرے ہی سے چل رہے تھے۔امین دفتر جانے کے بجائے نہا دھو کر میگی سے ملنے گیا تو پتہ چلا کہ وہ کسی کے ہاں صبح کے ناشتے پر مدعو ہے اور وہاں سے آتے ہی ہوائی اڈے پر چلی جائے گی۔وہ نوکر کے پاس ایک نوٹ چھوڑ گئی تھی کہ امین ہوائی اڈے پر ذرا جلدی پہنچ جائے۔ بہت سی باتیں کرنا ہیں۔وہ جل کر رہ گیا۔۔۔یہ صبح وہ اس کے ساتھ بھی تو گذار سکتی تھی۔اس قماش کی عورتیں دولت مندوں کو ترجیح دیتی ہیں۔یہ بات تھی تو میگی اس مرد کا اتنی نفرت سے کیوں ذکر کر رہی تھی جو ایک شام کو اس کے پیچھے پیچھے ہاسٹل میں پہنچ گیا تھا۔ چوکیدار نے سوچا تھا کہ میم صاحب کا کوئی ملنے والا ہوگا۔اس لیے روکا نہیں۔۔۔روشنی میں اجنبی کا چہرہ بغور دیکھ کر وہ ٹھٹکی تو مرد سینکڑوں روپوں کے نوٹ اس کے سامنے گنتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہنے لگا۔

تمہیں پاکستان کی چیزیں پسند ہیں۔تمہیں پاکستانی لوگ پسند ہیں۔۔میں تمہیں نئے نئے لباس اور زیورات سے لاد دوں گا۔میرے ساتھ چلو۔بھوکے کلرکوں کے ساتھ کیوں پھرتی ہو''۔

میگی غصے اور نفرت سے چیخی۔۔۔چوکیدار کے چوکنا ہونے سے پہلے اجنبی اپنی راہ لے چکا تھا۔

اور نئے سال کی بے تکلف پارٹی میں ڈھلتی عمر کے مرد نے میگی کے ساتھ ناچتے ہوئے ایک ثانیے میں پروپوزل دے ڈالا۔

''میں تمہیں مہارانی بنا کر رکھوں گا''۔

میگی تھک کر بیٹھ گئی۔وہ نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے ناچ رہی تھی اور لوگ اسے نئی زندگی کا پیغام دے رہے تھے۔ایسی اونچی سطح کی پارٹیاں میگ نے اپنے ملک میں کہاں دیکھی ہوں گی۔اس لیے ہر بات آ کر امین کو اور اپنی ہمجولیوں کو سناتی اور کہتی اگر میرا باپ یہاں آ کر دیکھے تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔اسے کیا معلوم کہ اس کی بیٹی یہاں آ کر اونچی سوسائٹی کی خاتون بن گئی ہے۔

اصل میں وہ یہاں کی گلیوں اور عوام دیکھنے آئی تھی۔مگر پلکوں پر بٹھالی گئی۔وہ انسان تھی آنسو تو نہ تھی کہ پلکوں کی بالکونیوں سے اتر کر نیچے چلی جاتی۔جہاں زندگی اندھی اور لولی لنگڑی ہے۔امین نے بھی اندرون شہر دکھانے کی جسارت نہ کی۔مبادا وہ دل برداشتہ نہ ہو جائے۔مگر اب وہ جارہی تھی۔۔۔وہ چاہتا تھا اس کے بارے میں کم سے کم سوچے۔

سہ پہر کو ہوائی جہاز کی روانگی تھی اور ابھی دن کا ایک بجا تھا۔ ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ ریزیڈنس پر واپس آ چکی ہے۔ امین بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پہنچا۔ میگی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''میگ تم سچ مچ جا رہی ہو''۔

''ہاں''۔

''تم تو سری نگر جا رہی تھیں''۔

''پھر بھی۔۔۔''

''میگ۔۔۔!!!''

میگی نظریں نہ ملاتی تھی اور لوگوں سے ملے ہوئے چھوٹے چھوٹے تحائف بن کھولے بن دیکھے پرس میں بھر رہی تھی۔۔۔ امین نے جیب میں پڑی ہوئی ڈبیا کو انگلیوں سے کئی بار چھوا۔

''میگ میں تمہیں یاد آؤں گا''۔

''اوہ۔۔۔''

وہ تھکن کا بہانہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ میگی کا چھوٹا سا گلابی ہاتھ امین کے بالوں میں چھپ گیا۔ امین نے اسے قریب تر کر لیا۔

باہر کھڑکی کے پاس کھڑا چپڑاسی کہہ رہا تھا۔

''دیر ہو چلی مس صاحب! ٹیکسی آ گئی۔۔۔''

میگی نے عجلت سے اپنی تصویر امین کی طرف بڑھائی۔ اس پر پتے اور دستخطوں کے علاوہ لکھا تھا۔

''امین کے لیے۔۔۔ محبت کے ساتھ''۔

امین ایک بار پھر مسکرا دیا۔

ہوائی اڈے پر میگی کے ملنے والوں میں سے کوئی بھی نہ پہنچا تھا۔ وہ کونے میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ زندگی میں بعض ایسے مقام بھی آتے ہیں جب بھرے ہوئے پیمانے سے کچھ نہیں چھلکتا۔۔۔ کوئی شکوہ کوئی شکایت۔

ضبط ایک مہر۔

ایک بوجھ۔۔۔ کہ جس کے نیچے دب کر سب کچھ دم توڑ دیتا ہے۔

ویٹنگ روم میں بڑی رونق تھی۔۔۔ اناؤنسر کی آواز پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ کراچی جانے والے مسافر جہاز تک پہنچ جائیں''۔

میگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ پریشان نہ تھی۔ امین نے عجلت سے ڈبیا کھول کر سونے کا سادہ چھلا نکالا جو عیسائی دولہا نکاح کے بعد اپنی دلہن کو پہناتا ہے۔ وہ میگی کے ہاتھ بڑھانے کا منتظر تھا۔ میگی کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔۔۔ امین نے بڑھ کر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور چھنگلیا کے ساتھ والی انگلی میں پہنانے لگا تو میگی نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہیں۔۔۔''

''اس سے زیادہ کی خواہش نہ کروں گا''۔

''میں اس انگلی میں نہیں پہنوں گی۔۔۔''

امین کے دل پر ایک قیامت گزر گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح تکنے لگا۔

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ میں پہلے ہی جانتا تھا۔۔۔ یہ لاکٹ ۔۔۔ میگی تم۔۔۔'' قریب تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ میگی نے لاکٹ کی ڈبیا کھولی اور امین کی ہتھیلی پر الٹ دی۔۔۔ اس میں مٹی کی ایک ڈلی تھی اور گھاس کی چند پتیاں۔

''میں جا رہی ہوں۔۔۔ وہاں جا کر بھر لوں گی۔ یہ تم لے لو۔۔۔ یہ میرے دیس کی مٹی ہے اور میرے دیس کی گھاس۔ میرے محبوب''۔

امین نے دیکھا کہ وہ تیزی سے مسافروں کے گزرنے کے خاص راستے کی طرف لپک رہی ہے۔۔۔ اچانک وہ مڑی اور امین کو ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔۔۔ مگر امین شش و پنج میں تھا کہ وہ اس لڑکی کو الوداع کہے یا گالی دے۔۔۔!

پھر اس کا سر اپنے آپ جھک گیا۔ جیسے وہ سجدہ کر رہا ہو۔

☆☆☆

دل کے داغ کہاں۔۔۔نشستِ درد کہاں

فریدہ حفیظ

آپ نے کہا تھا نا کہ آپ کی یہ مریضہ یعنی میری ماں سال ڈیڑھ سال تک زندہ رہ جائے گی۔مگر وہ اتنی جلدی کیسے۔۔۔؟

ڈاکٹر۔۔۔وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔مگر ایسے کوئی جواب دینے سے پہلے میرے بھی ذہن میں سوال اٹھا رہا تھا کہ کیسے وہ کیسے اتنی جلدی ہمت ہار گئی۔۔۔یہ بات اگرچہ میرے اصولوں کے خلاف تھی کہ میں کسی مریضہ کے بارے میں سوچتا رہوں۔مگر کبھی کبھی مجھے اس کا خیال آجاتا تھا کہ جانے اب وہ کس حال میں ہو۔

آپ کی ہدایات کے مطابق میں نے اسے وطن روانہ کر دیا تھا۔پھر ہمارا رابطہ فون پر رہا۔میں ماں کی آواز سے اندازہ لگا لیا کرتا تھا کہ انکی طبیعت کیسی ہے۔تقریباً تین ماہ بعد مجھے لگا کہ وہ کچھ بجھی بجھی سی ہیں۔میں نے بہت پوچھا مگر وہ کہتی رہیں کہ میں ٹھیک ہوں۔پھر میں نے خالہ سے پوچھا۔پہلے تو وہ بھی ٹالتی رہیں۔مگر میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ جب وہ یہاں آئی تھیں تو بدلی ہوئی حالت کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں۔

کسی نے اس کا اظہار نہیں کیا اور ان کی دلجوئی میں لگ گئے۔مگر نانی اماں کا رویہ عجیب سا تھا۔جس روز انہوں نے صبح ماں سے پوچھا آپ رات کو ٹھیک سے سوئی تھیں۔تو ماں چونکیں اور انہوں نے نانی سے پوچھا امی آپ مجھے مہمان سمجھ رہی ہیں۔میں آپ کی بیٹی ہوں۔ہاں ہاں مجھے معلوم ہے میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔نانی نے جلدی سے بات بدل دی۔نانی کی ضعیف عمری کے پیش نظر اس بات کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔مگر جو بات سب کو پریشان کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ خاندان کے سارے افراد کو اچھی طرح پہچانتی تھیں۔گو وہ بھولنے کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھیں مگر ان کی یاداشت اتنی خراب نہیں تھی کہ وہ بیٹی جس۔۔۔کی وہ منتظر رہتی تھیں اور اسے باقی بیٹیوں سے زیادہ چاہتی تھیں۔اسے بیٹی ماننے سے انکاری تھیں۔ڈاکٹر خالہ کی باتوں سے لگتا تھا کہ ماں کے لیے یہ صدمہ نا قابل برداشت تھا۔نانی کی بیگانگی نے ماں کے ساتھ پورے خاندان کے افراد کو ایک دکھ سے دوچار کر دیا تھا۔اس کی غم میں ڈوبی ہوئی آواز سے۔اس کے ذہنی کرب کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔۔۔وہ بول رہا تھا، میں سن رہا تھا۔اس کا غم بٹانے کا ایک یہی طریقہ مجھے اس وقت سمجھائی دے رہا تھا۔۔۔

مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں رپورٹ دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ نووارد مریضہ کو اس جان لیوا مرض کی اطلاع کیسے دوں۔۔۔ اس کی کالی کالی بھونرا سی آنکھوں کی چمک زندگی سے بھرپور وجود کی غماز تھی۔آواز کھنک دار اور جان دار۔۔۔میں کبھی رپورٹ دیکھتا کبھی اس کے چہرے کی طرف۔۔۔میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اس پر اس انکشاف کا ردعمل کیا ہوگا۔۔۔گو اب تک اس موذی مرض میں مبتلا ہونے والے درجنوں مریضوں سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔۔۔اچانک زندگی چھن جانے کا احساس اتنی شدت سے مریض کو مایوسی سے دوچار کر دیتا تھا کہ اس بے بسی اور یاس کی سی کیفیت سے نکالنے کے لیے مجھے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ اب کینسر فوری طور پر جان لیوا نہیں ہے۔مگر بدقسمتی سے اس کا لبلبہ اور جگر دونوں زد میں آ چکے تھے اور مرض بھی تقریباً تین سال پرانا لگتا تھا۔

میں نے سوچا ابھی صرف اتنا بتا دوں کہ وہ اس موذی مرض کا شکار ہو چکی ہے۔اس سے اس کے ردعمل کی شدت کا اندازہ

لگانا آسان ہوگا۔

مجھے اس طرح خیالوں میں گم اور رپورٹ کے نتائج بتانے میں اتنی تاخیر کے باوجود وہ بہت پرسکون اور کمپوزڈ نظر آ رہی تھی۔

مجھے تذبذب میں دیکھ کر بولی۔۔۔ مجھے کینسر ہے نا۔۔۔

ہاں میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔۔۔

مجھے شبہ تھا۔۔۔ مگر جی پی (علاقے کا General Prctioner) مجھے تسلی اور دوا دے کر بھیج دیتا تھا کہ علامات سیریس نہیں۔ بھوک نہ لگنا۔۔۔ وزن گرنا۔۔۔ بلڈ رپورٹ تو بالکل نارمل ہے۔ اس دوران میں سمندر پار بھی ہو آئی۔ میری حالت بہت خراب ہوئی اور میرے شور مچانے پر اس نے مجھے اس ہسپتال میں ریفر کیا۔

یہ بہت افسوسناک ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ دوا سے آپ کا علاج ہو جائے گا۔ میں نے اسے تسلی دی۔۔۔ مگر میرے حساب سے پہلے چھ ماہ بہت کروشل تھے۔۔۔

اسی وقت نرس کے ساتھ مدھو گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بدقسمتی سے اس کے شوہر کو بھی پینکریا کا کینسر تھا۔ اس کی حالت بہت تشویشناک تھی۔ مدھو دیکھ رہی تھی۔ اس کے شوہر کے ساتھ کے ایسے مریضوں کی حالت اتنی دگرگوں نہیں۔ میرے شوہر نے بیماری کے سامنے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ذرا بھی Will Power نہیں ہے۔ دو قدم چلنے کو تیار نہیں ہوتا۔ میں فوراً وارڈ کی طرف لپکا۔ مریض کو چیک کیا۔ کیمو لگنے کے دوران بعض مریضوں کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ اور اچھے خاصے پر رونق چہروں والے مریض کیمو لگنے کے دوران برسوں کے مریض نظر آنے لگتے ہیں۔ جن کی بیماری تیسرے اور چوتھے درجے میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ ان کا آپریشن نہیں ہو سکتا۔ ان کا علاج کیموتھراپی سے کرنا پڑتا ہے۔

اور اب مدھو کا شوہر اس سٹیج پر تھا کہ اس سے سوائے ہمدردی کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ حوصلہ مندی اور امید کی کسی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا مرض اب لاعلاج تھا۔ اسے یہ آخری کیمو لگ رہی تھی۔۔۔ حالات بتاتے تھے کہ اس کا اثر بھی خاطر خواہ کیا بالکل بھی نہیں ہوگا۔۔۔ اور مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ وہ ہسپتال میں مرنا پسند کرے گا کہ گھر پر۔

میں نے نرس کو ہدایات دیں اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ پرسکون بیٹھی تھی۔ میں نے اسے بتایا اس کا بلڈ ٹیسٹ ہوگا۔ پھر اگلے ہفتے اسے کیمو لگے گی۔

میں نے اس کے مثبت رویئے کو دیکھ کر اس سے درخواست کی کہ اگر وہ رضاکارانہ طور پر کینسر ریسرچ سنٹر میں زیر تحقیق دوا استعمال کرنے کی اجازت دے دے تو زندگی بچانے کے لیے اس کی بیش بہا خدمت ہوگی۔

اس نے اپنے شوہر اور بیٹے سے مشورہ کرنے کی مہلت چاہی۔

میں نے اسے گھر جانے کو کہا اور نرس کو اس کا فون اور گھر کا پتا نوٹ کرنے کی ہدایت کے ساتھ مریضہ سے کہا کہ وہ کسی بھی وقت ہسپتال سے رابطہ کر سکتی ہے۔ اب وہ اولین توجہ کی مستحق ہے۔ ہسپتال والے خود بھی اس سے رابطہ رکھیں گے۔ تم اپنا خیال رکھو۔ وہ خلاف توقع ایک ٹھنڈی سانس بھر کر مسکرا دی۔ اور کہنے لگی۔ آپ لوگوں کا رویہ مریضوں کے ساتھ بے حد ہمدردانہ اور قابل تحسین ہے۔ آپ صحیح معنوں میں زندگی کی قدر کرتے ہیں۔ مریض آدھا تو آپ کے رویئے ہی سے شفایاب ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ فکر نہ کریں۔ میرے ذہن نے قبول ہی نہیں کیا کہ میں کینسر کی مریضہ ہوں۔ یہ یقیناً بہت صحت مندانہ رویہ ہے۔۔۔ God Bless You۔۔۔۔

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ اس کی چال میں خود اعتمادی تھی اور وہ دوسرے مریضوں کو ہیلو اور روش کرتی جا رہی تھی۔

میرے پاس تھوڑا وقت تھا اس لیے میں کافی کے ایک کپ کے ساتھ کچھ دیر سوچنے کی عیاشی کر سکتا تھا۔ تا آنکہ کوئی نرس آ کر میری سوچوں میں مخل ہوتی۔۔۔ آج نہ جانے کیوں میں اس کینسر ہسپتال میں آنے کے فیصلے کو مناسب بلکہ بہت اچھا سمجھ رہا تھا۔ ذاتی طور پر پہلے پہل مجھے زخمیوں کا علاج کرنا اچھا لگتا تھا۔ اور ایسے زخمی جو جنگی محاذوں پر برسر پیکار رہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں عالمی جنگ ختم ہو گئی ہے۔ یہ ہماری خام خیالی ہے۔ جنگ کبھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ ازل سے ابد تک انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ یا حصہ بنا دی گئی ہے۔ اپنے اس شوق کی وجہ سے میں نے اقوام متحدہ کے ایک مشن کے لیے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ یہ خیال بھی مجھے انتہائی مضحکہ خیز لگتا تھا کہ امن کے لیے جنگ کو ضروری قرار دیا جائے۔ اس کے پیچھے یقیناً اسلحہ بیچنے والی حکومتوں اور قوموں کی بدنیتی کا دخل تھا۔ جنگ روکنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اسلحہ سازی بند کر دی جائے۔ تاہم یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس کے سامنے دنیا کے بیشتر انسان بے بس ہیں۔ کاش کے سب لوگ اسلحہ بنانے والوں کے خلاف محاذ قائم کریں۔۔۔

اوہو میں بھی کہاں سے کہاں نکل گیا۔۔۔ یو این کے مذکورہ مشن کا خیال یوں میرے ذہن میں آیا کہ وہاں کام کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کے جملے نے مجھے یو این چھوڑ کر اس ہسپتال میں آنے کی ترغیب دی۔

دو افریقی ملکوں کی سرحدی جھڑپوں کے نتیجے میں ہمارے مشن کے کافی زخمی سپاہی ایمرجنسی میں لائے جا رہے تھے۔۔۔ میں اصولاً پہلے شدید زخمی سپاہیوں کی طرف لپکا۔ مگر میرے انچارج افسر کی آواز نے میرے قدم روک دیئے۔۔۔ کم زخمی کا علاج پہلے کریں۔۔۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنا چاہا۔۔۔ وہ بولا۔۔۔

انہیں واپس وارزون (War Zone) میں بھیجنا ہے۔

اور شدید زخمی۔۔۔ میں نے سوال کیا۔۔۔

اوہ کم ان ڈوک دز از وار (O. Come on this is war doc) میں تو پہلے جنگ کو پہلے ہی انتہائی ظالمانہ فعل سمجھتا تھا۔۔۔ مگر اس میں جھونکے جانے والے معصوم انسانوں کے ساتھ ایسا سنگدلانہ رویہ انسانیت کی توہین تھی۔ میں نے اسی روز فیصلہ کر لیا کہ میں وارزون میں کام نہیں کروں گا۔ زندگی کی جنگ تو ہر زون میں جاری ہے۔ بہتر ہے اپنی زندگی کی جنگ لڑنے والے انسانوں کے دکھوں میں کمی کی جائے۔ وہ انسان جنہیں یہ اذیت ناک ادراک ہو کہ وہ کتنی مدت اور زندہ رہ سکتے ہیں۔ ان کے لیے دن رات ایک کرنا۔۔۔ ایک ایک گھڑی گزارنا کتنا دشوار ہوتا ہوگا۔۔۔

ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ مدھو کی تشویش زدہ آواز نے میری سوچوں کا سلسلہ منقطع کیا۔۔۔ مجھے نہیں لگتا کہ راج سروائیو کر سکے گا۔

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کرسی پر بیٹھ کر بے اختیار رونے لگی۔ میں کیا کہتا۔۔۔ سوائے تسلی اور امید دلانے کے چند الفاظ۔۔۔ جو ہر ڈاکٹر کے فرائض میں شامل ایک ضرورت ہوتے ہیں۔۔۔ مگر اس شفاخانے میں ڈاکٹر نرسیں اور دوسرا اسٹاف۔۔۔ میں نے غور کیا کہ ہمدردی اور دردمندی کا اظہار صرف فرض ادا کرنے کے لیے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے کرتے تھے۔۔۔ اس طرح جیسے وہ بھی ان دکھی لوگوں کے غم اور اذیت کو خود محسوس کر رہے ہوں۔۔۔ مجھے ایک انجانی مسرت اور اطمینان کا احساس ہوا کہ میرے ہم وطن انسانیت اور زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار کے علمبردار ہیں۔۔۔ اور بغیر کسی تخصیص کے دنیا بھر سے آئے ہوئے یہاں کی قومیت اختیار کرنے والوں کو صرف انسان سمجھ کر ان کی زندگیاں بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔۔۔ اور ہماری حکومت یہ تمام خدمات بلا کسی معاوضے کے مہیا کرتی ہے۔۔۔ بلکہ ان کی مالی امداد بھی کرتی ہے۔

مدھو انڈین تھی اور ہمارے ایک Borough یعنی لوکل گورنمنٹ میں جی پی کی اسسٹنٹ تھی۔ اس کا شوہر راج کمار

ایک سال سے یہاں زیرِعلاج تھا مگر اس پر دوا اثر نہیں کر رہی تھی۔ اس کی حالت خراب ہی ہوتی جا رہی تھی۔ کینسر کے مریض جب لاعلاج قرار دے دیے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کے لواحقین، عزیز و اقارب ایک نہ ختم ہونے والے کرب میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں مدھو سے ہمدردی کرنا چاہتا تھا۔۔۔ جس طرح وہ غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔۔۔ وہ ہمدردی کی توقع سے بھی بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی تھینک گاڈ ہم جیسے سفید پوش اپنے ملک میں اس بیماری کا علاج کرانے کے وسائل کہاں سے لائیں۔ سارا اثاثہ بھی بک جاتا ہے اور مریض بھی نہیں بچتا۔

ہم یہاں نہ ہوتے تو جانے کیسے ان حالات کا مقابلہ کرتے۔ وہ روتی ہوئی چلی گئی۔ اگلے روز راج زندگی کی جنگ ہار گیا۔

نئی مریضہ جواب پرانی ہو چکی تھی، علاج سے اسے کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے سیاہ بال سفید ہو چکے تھے۔ چمکتے دمکتے چہرے کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ چمکتی آنکھوں میں مٹیالا پن آ رہا تھا۔ تاہم آواز کی کھنک باقی تھی۔ مگر اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے وطن جا کر اپنوں سے ملاقات کا ذکر کیا۔ میں نے حوصلہ افزائی کی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ ضرور سمندر پار ہو آئے۔ درد کی اذیت سے بچنے کے لیے میں نے اسے پین کلر (Pain Killer) دے دیے۔

بتایئے نا ڈاکٹر۔۔۔ میں نوجوان کی آواز پر چونکا۔ مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ میرے کمرے میں اس کے علاوہ کچھ اور مریض بھی آ کر بیٹھ گئے تھے اور بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ ماں کی حالت بگڑنے پر پاکستان چلا گیا تھا۔ اور وہیں اسے سپردِ خاک کر کے خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا وہ مجھ سے ایسے سوال کر رہا تھا جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ شاید وہ بھی جانتا تھا کہ انسانوں کے اندازے غلط بھی ہوتے ہیں۔ وہ جانے کے لیے اٹھا تو کونے میں بیٹھی ایک ادھیڑ عمر خاتون نے اسے ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے اس کے پہلو والی کرسی پر جا بیٹھا۔ خاتون نے اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلایا اور انگریزی میں کہنے لگی۔ بیماری نے تمہاری ماں کو نہیں مارا، مائی سن شی ڈائیڈ آف ہارٹ بریک۔

نوجوان نے ایسی نظروں سے خاتون کو دیکھا جو کہہ رہی تھیں کہ اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ وہ خاتون کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

سانجھ

گلزار

لالہ جی کو یہ بات کھل گئی کہ بڑھیا (لالائن) نے بال کٹوا دیئے۔اوران سے پوچھا بھی نہیں۔
پچھلے مہینے ان کی بہو مائیکے گئی تھی تو اپنی ساس کو ساتھ لے گئی تھی، دلی۔کہ ٹرین میں گود کے بچے کو سنبھالنے میں آسانی رہے گی۔
لالہ جی سے خود مایا دیوی نے پوچھا تھا''بہو کہہ رہی ہے دلی چلنے کے لیے، جاؤں؟''
''ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ٹرین کے دھکم دھکے میں بیچاری بہو کیسے سنبھالے گی بچے کو؟''
ان کی بہو''منی'' کے پتا ریٹائرڈ کرنل ہیں۔منی کے دو بھائی بھی ملٹری میں بڑے عہدوں پر ہیں۔کرنل صاحب کا پارٹیوں میں آنا جانا آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ظاہر ہے، انکی پتنی انہی کے اسٹائل میں رہتی ہیں۔ماڈران ہیں، سٹائلش ہیں۔انہوں نے بال کٹوا رکھے ہیں۔اس بار مایا دیوی کے بھی کٹوا دیئے۔
دو ہفتے بعد، بمبئی واپس لوٹیں تو لالہ جی دیکھ کر دنگ رہ گئے''یہ بالوں کا کیا کیا تم نے؟''
''سمدھن نے کٹوا دیئے۔اپنی طرح بنوا دیئے''۔یہ کہہ کر مایا ہنسیں ضرور، لیکن ایک سایہ جو گزرا، اس کے پتی کی آنکھ سے، وہ اس سے ڈر گئیں۔اپنے شوہر کی نظر وہ پہنچانتی تھیں۔اڑتالیس برس کا ریاض تھا۔کھسیانی سی بولیں۔''پھر رکھ لوں گی۔بڑھ جائیں گے''۔
لالہ جی چپ چاپ اندر چلے گئے اور بیٹھک میں جا کر بیٹھ گئے۔
رات کھانے کی میز پر بھی ان کا موڈ بجھا بجھا ہی رہا۔منوج نے پوچھا۔منی نے بھی بس سر ہلا دیا۔''کچھ نہیں''۔
مایا دیوی نے جب پوچھا۔۔۔''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''تو جواب کچھ اور ہی دیا۔''تمہارے بال تو بہت اچھے تھے۔خوبصورت تھے۔کٹوا کیوں دیئے؟''کوئی جواب نہ ملا تو بولے۔''اور تم نے۔۔۔مجھ سے پوچھا بھی نہیں''۔
منوج ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔''بابو جی کو ابھی تک ماں کے بالوں کی فکر لگی ہے۔ستر بہتر کے ہو گئے لیکن مزاج سے عشق نہیں گیا ابھی''۔
منی، بڑی کو کنگھی کر رہی تھی ہنس کے پوچھا۔''بابو جی کی کیا لو میرج ہوئی تھی؟''
''نہیں۔ماں کی شادی تو میرے سامنے ہوئی۔ان کے ماں باپ نے کروائی تھی''۔
''مطلب؟۔۔۔۔''
''دونوں نے گھر سے بھاگ کے کورٹ میں شادی کر لی تھی۔چار پانچ سال بعد میں پیدا ہوا۔میری پیدائش کے بعد دونوں کے ماں باپ نے معاف کر دیا اور صلح ہو گئی۔۔۔۔ماں مجھے لے کر پیرینٹس (والدین) کو ملنے گئی تو انہوں نے بابو جی کو گھر سے نکال دیا یہ کہہ کے، کہ بچو، جاؤ، اب برات لے کر آؤ، تب لڑکی دیں گے، تب دوبارہ شادی ہوئی ان کی۔مجھے یاد تو نہیں لیکن۔۔پتہ ہے۔تصویر بھی ہے۔
لالہ ہیم راج کو کھانے کے بعد سیر کی پرانی عادت تھی۔کچھ دیر ٹہلنے کے لیے باہر چلے جاتے تھے۔نکڑ سے ایک پان بنواتے، اپنی طرح

کا۔عمر کے ساتھ سپاری ضرور کم ہوگئی تھی۔لیکن اس روز وہ پنواڑی کی دوکان سے پہلے ہی لوٹ آئے۔اتنی سی بات پتہ نہیں کیوں، بھنورو کی طرح ان کی سوچ میں اٹک گئی تھی۔۔۔سانجھ ہی تو ہے۔اسے حق کہہ لو۔ادھیکار کہہ لو یا۔۔۔کوئی مناسب لفظ ملا نہیں۔ ایسے لگ رہا تھا انکی کوئی بڑی قیمتی چیز چوری ہوگئی ہے۔

جب منوج پیدا ہوا تھا تو پہلے پہل ان کے ادھیکار پر سیندھ لگی تھی۔مذاقاً بیوی سے کہا "ٹھیک ہے ٹھیک ہے بھئی ہم، خود ہی کپڑے نکال لیں گے۔تم دیکھو اپنے بیٹے کو۔آتے ہی ہمارا بستر الگ کروا دیا اس چھٹنکی بھر کے لونڈے نے!"

"چھٹنکی بھر مت کہو۔آٹھ پاؤنڈ کا بیٹا دیا ہے آپ کو"۔

"لیکن یہ تو بتا دو کہ پہنوں کیا؟ ہلٹن صاحب کے ہاں جانا ہے"۔

"نکٹائی تو ہرگز مت لگانا۔بڑی اوت لگتی ہے آپ کے گلے میں۔اسکارف لگا کے چلے جاؤ"۔

پھر پنکی پیدا ہوئی تو کچھ اور کٹاؤ ہوا انکے ادھیکاروں کا۔کھانا نوکرانی کے ہاتھ کا ملنے لگا۔لیکن دال کا بگھار، مایا خود لگاتی تھیں۔کوئی اور لگائے تو انہیں فوراً پتہ چل جاتا تھا۔مایا دیوی کو بڑا فخر تھا اس بات پر۔ایک بار دال میں سے، لمبا سا بال نکل آیا۔لالہ جی نے نوکرانی کو نکال دیا۔مایا سے بولے "تمہارا بال ہوتا تو میں بٹوے میں رکھ لیتا۔لیکن میں اس نوکرانی کے بال برداشت نہیں کر سکتا۔اسے کہو، کام کرنا ہے تو سر منڈوا کے آئے"۔

"آئے ہائے، سہاگن بیچاری۔وہ کیوں سر منڈوا دے؟ کوئی ودھوا ہے؟"

"تو پھر کوئی نوکر رکھ لو"۔

تب سے نوکر ہی رہا گھر میں۔۔۔اب آ کے چولہا چوکا بہو نے سنبھالا تو ایک دن اسے بھی کہہ دیا "کھانا بناتے ہوئے بال کھلے مت رکھا کرو بیٹی، آنکھ پر آتے ہیں"۔

منی نے کس کے جوڑا بنا لیا۔لیکن بات مایا کی نظر سے بچ نہ سکی۔وہ جان گئی تھی کہ آج تک نوکرانی والی بات وہ بھولے نہیں۔دو چار روز تو بات ہنسی مذاق میں ٹلتی رہی۔ماں دل ہی دل میں اترا بھی رہی تھیں کہ لالہ جی اس بڑھاپے میں بھی اپنا عشق جتا رہے ہیں۔روٹھے سے رہتے ہیں لیکن کچھ روز اور گزرے تو سب نے دیکھا کہ بابو جی نے ماں سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔مایا بھی کچھ بے حال ہونے لگیں۔بڑھاپے کی روٹھائی، انہیں جوانی سے بھی زیادہ جان لیوا لگنے لگی۔کھانے کی میز پر سب ملتے، اور لالہ جی چپ چاپ کھانا کھا کر اٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔سیر بھی کوئی چھوٹی ہونے لگی تھی۔مایا نے پوچھا تو جواب دیا "اب جلدی تھک جاتا ہوں"۔

ایک بے دلی سی رہنے لگی گھر میں۔ساتھ ہی ایک دبا دبا سا تناؤ بھی شروع ہوگیا۔کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے منوج نے کہا "بابو جی، آپ چشمے کا فریم بدل لیجئے۔آج کل بڑے نئے نئے ڈیزائن ملتے ہیں۔۔۔"

"یہ ڈیزائن تمہاری ماں کا پاس کیا ہوا ہے بھئی"۔

"ماں کا؟" منی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں انہیں گول فریم اچھا نہیں لگتا تھا۔ہم نے چورس لے لیا۔پھر کالے فریم پر اعتراض ہوا انہیں تو ہم نے براؤن لے لیا"۔

ایک روز کھانے پر بیٹھے تو چونک کر دیکھا مایا کی طرف، "آج بگھار تم نے لگایا ہے؟"

مایا کو جی بھر آیا۔بہو نے پوچھا۔۔۔"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ارے بیٹی، تمہاری ساس کے بگھار میں ہمیں ان کے ہاتھوں کی خوشبو آ جاتی ہے"۔

لیکن ان کی خاموشی برقرار رہی۔ جب دبی دبی سنوائی کا بھی اثر نہ ہوا تو منی نے ایک دن صاف صاف معافی مانگ لی ''مجھ سے غلطی ہوگئی بابو۔ میں اپنی ممی کو منع نہیں کر سکی۔ اور ممی بھی تو مان ہی گئیں!'' وہ دونوں کو ممی کہتی تھی۔ اپنی ماں کو بھی، ساس کو بھی۔

منوج نے مناتے ہوئے کہا ''کوئی بات نہیں بابو جی۔ بال ہیں پھر بڑھ جائیں گے''۔

ایک دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بابو جی بولے ''باتیں بڑی معمولی ہیں بیٹا۔ نہ ہونے سے کوئی دنیا ادھر کی ادھر نہیں ہو جاتی۔ لیکن زندہ رہنے کا رس بنا رہتا ہے۔ بس۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں، ایک دوسرے سے بیگانے تو نہیں ہو گئے۔۔۔''

اگلے دن ہی بابو جی نے کہا ''میں کچھ دن کے لیے پنکی کے پاس رہ آتا ہوں۔۔۔ ذرا تبدیلی ہو جائے گی''۔

پنکی جبل پور میں بیاہی ہوئی تھی۔ معمولی سے پس و پیش کے بعد سب مان بھی گئے۔ منوج نے تو مذاق بھی کیا۔ ''ٹھیک ہے جب تک ماں کے بال بھی کچھ اور لمبے ہو جائیں گے''۔

ماں نے سمجھایا۔۔۔ ''بیٹی کے ہاں زیادہ دن مت رک جانا۔ ٹھیک نہیں ہوتا۔۔۔ جلدی لوٹنا''۔

دوسرے دن لالہ جی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔

دو دن، چار دن، چھ دن، ہفتہ گزر گیا۔ لیکن لالہ جی جبل پور نہیں پہنچے۔ سب کو فکر ہوگئی۔ دوستوں، رشتہ داروں کے ہاں کھوج شروع ہوئی۔ خدا نہ کرے کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو راستے میں۔ کچھ ہوتا بھی تو لالہ جی خبر کرتے۔ کوئی معقول وجہ ان کے غائب ہونے کی سمجھ میں نہ آئی۔ بہت مایوس ہونے کے بعد پولیس کو اطلاع دی گئی اور اخباروں میں تصویر چھاپ دی گئی۔۔۔ مگر سراغ ندارد! پریشانی اس حد کو پہنچی کہ ممکن، ناممکن ہر طرح کے خیالات ذہن سے گزرنے لگے۔

ڈھائی مہینے گزر گئے اور ایک دن اچانک ایک خط ملا۔ بدری ناتھ کے کسی آشرم سے۔ لالہ ہیم راج بہت بیمار تھے۔ ان کی حالت بہت نازک تھی۔ اور آشرم کے کسی پنڈت نے ان کی ڈائری سے پتہ لے کر خط لکھ دیا تھا۔

سب لوگ فوراً بدری ناتھ پہنچ گئے۔۔۔ بس ذرا سی دیر ہوگئی۔ اسی صبح ان کا دیہانت ہو گیا تھا۔

داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بڑھ کر جٹائیں بن گئی تھیں۔ چٹائی پر پڑے ہوئے بالکل سنیاسی لگ رہے تھے۔

مایا دیوی نے چوڑیاں توڑ کے پھینک دیں۔ اور ان کے کان کے پاس جا کر پوچھا ''اب بتاؤ۔۔۔ بال کٹوا دوں؟ اب تو منڈن کروانا ہوگا۔ ودھوا ہوں نا''۔

اور اس بار لالہ جی سے پوچھ کے، بڑھیا نے سر منڈوا دیا۔

☆☆☆

ستیہ پیر

محمد الیاس

رات کا زیادہ حصہ باتیں کرتے گزر گیا اور سحری کے وقت ہی سلیم احمد اور خلیفہ فقیر یا سوئے تھے۔ البتہ خانقاہ کا اکلوتا بالکا شام ڈھلتے ہی کھانا کھا کر سو گیا اور پوری نیند لے کر صبح کو اٹھا تھا۔ میدانی علاقے سے پہاڑ کی پوری چڑھائی چڑھنے کے بعد آگے وادی کی طرف چند سوفٹ کی ڈھلان اترتے ہی چشمے کے کنارے پر ستیہ پیر جتی ستی سرکار کی خانقاہ واقع ہے۔ معتقدین اور زائرین انہیں "دھیاں والا پیر" (بیٹیوں والا پیر) بھی کہتے ہیں۔ پیر ستیہ کی زیادہ منتا آگے وادی میں بکھری مقامی آبادیوں کی عورتوں تک ہی محدود ہے۔ ویسے کبھی کبھار دور دراز کے عقیدت مند بھی آجاتے ہیں۔ شروع سے ہی نقد رقم کی بجائے کسی نہ کسی اناج یا زندہ مرغی مرغے کی صورت میں نذر نیاز چڑھانے کی رسم چلی آرہی ہے۔ شاید اس لیے کہ سابقہ ادوار میں دیہاتیوں کے پاس چڑھاوے کے لیے ہوتا ہی یہی کچھ تھا۔

ناشتہ کر چکنے کے بعد خلیفہ نے مہمان سے کہا: "بابو سلیم احمد! بدن بری طرح ٹوٹ رہا ہے۔ گزشتہ روز تمہارے آنے سے دو تین گھنٹے پہلے کش لگایا تھا۔ ویسے اس درگاہ پر کھانے کی کبھی کمی نہیں آئی۔ پانی کی نعمت اللہ پاک نے چشمے کی صورت میں دے رکھی ہے۔ البتہ نقدی زیادہ نہیں ملتی۔ دن کے وقت اس سڑک سے گزرنے والی اکادکا سوزوکی ٹرک یا ویگن سے روپوں کی شکل میں نذرانہ مل جاتا ہے۔ شکر ہے میرے مولا کا، اور کسی شے کی کمی بھی نہیں، ماسوائے سلفے کے۔ سلیم احمد سمجھ نہ پایا اور پوچھ بیٹھا کہ سلفا کیا ہوتا ہے۔۔۔"

خلیفہ کہنے لگا: "ہم فقیروں کا ایک ہی آسرا۔۔۔ تم نشہ کہہ لو۔ چرس اور تمبا کو۔۔۔" وہ ہنس پڑا اور بولا "تم نے گیت نہیں سنا ہوا؟" جتی نہا کے چھپڑ وچوں نکلی تے سلفے دی لاٹ ورگی۔۔۔ میری مردانہ حس کو مرے ہوئے پچاس سال ہونے کو آئے ہیں۔ میں چوبیں پچیس سال کا تھا، جب ذیلدار نے مجھے آموختہ کروادیا۔ حویلی میں صرف اس کی جوان بیٹی تھی اور تقریباً اسی عمر کی بیوی، جو امید سے تھی۔ باقی دو بوڑھے غلام اور چند خدمت گار عورتیں۔ مردوں میں کم عمر میں ہی تھا۔ ظالم جاگیر دار کو جانے کیوں وہم ہو گیا کہ مسلی ہوئی تھیلی میں شاید جان ابھی باقی ہو، جراح کو بلوایا اور اس غریب بے زبان کو عضو سے بھی محروم کر دیا۔۔۔ پھر بھی سوچ سکتا ہوں کہ تازہ تازہ نہا کے نکلی ہوئی جتی کا بدن کیسے لشکارے مارتا ہوگا۔ نشے کی لپٹوں سے شاعر کا دماغ بورا ہو گیا ہوگا۔ اسی لیے سلفے کی مثال دی۔۔۔"

بہت دور کہیں سے ہارن کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ خلیفہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا، بولا: "اچھو کی ویگن نے پہاڑ کے پاؤں چھو لیے ہیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں اوپر پہنچ جائے گا۔ اس درگاہ کا پرانا عقیدت مند ہے۔ مولا اس کو سدا اپنی امان میں رکھے۔ سلفے کا پڑا لا رہا ہوگا۔ ہمارے چار چھ ہفتے آرام سکون سے گزر جائیں گے۔۔۔" اتنے میں ایک زنانہ ٹولی زیارت کو آپہنچی، جن میں ہر عمر کی عورت تھی۔ سب نے صحن کے باہر جوتے اتارے اور خانقاہ کے اندر چلی گئیں۔ تقریباً دس منٹ کے بعد باہر نکلیں اور نذر نیاز کی پوٹلیاں بالکے کے حوالے کر کے حجرے کی طرف آگئیں، جہاں چھپر کے نیچے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ باری باری سب نے جھک کے خلیفہ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر تعظیم دی۔ کیا بوڑھی کیا جوان، خلیفہ نے ہر ایک کے سر پر دست شفقت رکھا اور دعائیں دیتے ہوئے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا۔

سلیم کو تجسس نے جکڑ رکھا تھا کہ خلیفہ کا انجام کیا ہوا۔ جاگیردار یا ذیلدار سے، وہ جو بھی تھا، اس کی جان کیسے چھوٹی۔ عورتوں کے رخصت ہوتے ہی اپنا سوال دہرایا۔ وہ کہنے لگا "جان اس طرح چھوٹی کہ پاکستان بن گیا۔ بلوے ہونے لگ گئے۔ سکھوں کے جتھے نے حویلی کو گھیر لیا۔ وہی شخص جو ہمارے لیے فرعون بادشاہ ہوا کرتا تھا، اتنا بے بس ہو گیا کہ بیوی اور بیٹی کو گولی مار کر اسلحے سمیت چھت پر چڑھ گیا۔ مجھے اس وقت بڑا عجیب خیال آیا کہ میرا کیا بچارہ گیا ہے۔ کس کے لیے مروں اور کیوں ڈروں؟ فوراً ترکیب سوجھ گئی۔ کل کپڑے اتار کر بغل میں دبائے اور الف ہو کر باہر نکل آیا۔ سارے سکھوں نے قہقہے لگائے اور ان کے آگے کھڑے سردار نے مجھے دھپ مار کر کہا: "چل بھاگ سھوری کے۔ تو پہلے ہی سب کچھ گنوا بیٹھا ہے۔ تجھ سے کسی نے کیا لینا؟"

"جان بچی سو لاکھوں پائے۔ میں پاکستان آنے والے قافلے سے جا ملا" ۔ خلیفہ کو وہ منظر یاد آ گیا۔ ہنسنے لگا لیکن سلیم کو اندوہ نے آ لیا۔ بڑی زخمی مسکراہٹ لبوں پر نمودار ہوئی۔ خلیفہ پر بھی یک دم اداسی چھا گئی۔ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا:

"اگلے آٹھ دس مہینوں میں پورے اسی سال کا ہو جاؤں گا۔ آج تک پل پل غور کرتا آ رہا ہوں۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دنیا کے سارے فساد جھمیلے اور رونق میلے صرف اس رگ پٹھوں والی بوٹی کی وجہ سے ہیں، جو میرے تن سے جراح نے کاٹ کر الگ کر دی اور مرہم لگا دیا تھا۔ اس کے بعد کبھی کوئی خواہش اور حرص ہوس پیدا نہ ہوئی۔ دو وقت کی روٹی، تن ڈھانپنے کو کپڑوں کا جوڑا اور گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے چھت کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ عام انسان کی جتنی ضرورتیں ہوتی ہیں، میری ان کا دسواں حصہ بھی نہیں ۔۔۔"

بالکا چائے سے لبالب بھرے پیالے لے آیا۔ اس کے جانے پر گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ خلیفہ کہنے لگا "عورت کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ اگر اس کی عورت والی صفت چھن جائے تو باقی کچھ نہ بچے۔ مرد کے جوتے کھانا، بچے پیدا کرنا، انکو پالنے پوسنے کے کشٹ اٹھانا، ان کے دکھ جھیلنا اور طرح طرح کے عذاب بھوگنا، صرف اسی شے کا فساد ہے۔ مرد اور عورت دونوں کے ساتھ دراصل یہی شیطان لگا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ کوئی باہر کی قوت نہیں۔ عورت مرد کے جسم سے جڑی ہوئی اسی شے کا نام شیطان ہے، فالتو بوٹی کا ۔۔۔ عشق محبت پیار بھی اسی جگہ سے پھوٹ کر دماغ میں ڈیرے ڈال لیتا ہے۔ اگر میری طرح فرہاد کے ساتھ بھی جراح کا ہاتھ ہو جاتا اور شیریں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی، تو قسم اللہ پاک کی، اسکو نر اپنا بھائی بنا لیتی ۔۔۔"

سلیم کے لبوں پر افسردہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ دونوں ہی کھسیانی ہنسی ہنس پڑے۔ خلیفہ بول پڑا: "مرد بھی گھر چلانے کی غرض سے دنیا بھر کی ذلتیں اسی لیے اٹھاتا ہے۔ اس کو عورت سے بھی زیادہ عذاب بھگتنے پڑتے ہیں۔ اس پر بھی اگر راز کھل جائے کہ جس محبوبہ کے عشق میں برباد ہو رہا ہے، وہ عورت والی صفت سرے سے رکھتی ہی نہیں تو اس کے سر پر دوپٹہ ڈال کر بہن بنا لے اور نئے سرے سے تاڑنا شروع کر دے ۔۔۔ پیدائشی غلام ہوں۔ ہمارے آقا، ہماری جان، مال اور عزت آبرو، ہر شے کے مالک ہوا کرتے تھے۔ ہمیں کلمے نماز کے علاوہ اتنا ہی لکھنا پڑھنا اور جمع تفریق کرنا سکھایا جاتا جتنا وہ غلاموں کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن یہاں درگاہ پر پچاس سالوں میں بہت سیکھا، مگر سب کچھ لوگوں سے۔ بڑے بڑے داناؤں سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ مرشد خود بہت زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ سرکار اسکولوں پر چھاپے مارنے والے افسر ہوا کرتے تھے، وہ بھی انگریزی راج میں ۔۔۔"

پل بھر کو خلیفہ خاموش ہوا اور بالکے کو بلا کر کہا کہ وہ چشمے پر چلا جائے۔ گاڑی پہنچنے والی ہے، مسافروں کو پانی پلائے۔ لڑکا برتن اٹھا کر لے گیا۔ خلیفہ کہنے لگا: "یہ اگلا ڈاک بنگلہ انگریز سرکار نے بنوایا تھا اور چشمے کے آگے دس گز ڈھلان میں چھوٹا سا حوض بھی اسی زمانے میں بنا۔ مرشد سرکار کا اصل نام عتیق احمد تھا۔ فرمانے لگے، بھری جوانی میں سرکاری دورے پر آئے اور وادی کے تینوں

سکولوں کا باری باری معائنہ کر کے رات اسی ڈاک بنگلے میں بسر کرتے رہے۔ کہنے لگے، فقیر علی! اس دھندلی صبح کا جادو ایسا سر چڑھ کر بولا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ درخت، پہاڑ، نباتات اور پوری فضا نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں چشمے پر آ گیا۔ پانی کی شپاشپ سنائی دینے پر یوں ہی احتیاطاً درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ لے لی۔ جھکی ہوئی شاخوں کے پتے ہٹا کر حوض کی طرف جھانکا۔ پہلے چند لمحوں کے لیے میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ یوں وسواس ہوا کہ عورت کے روپ میں کوئی باہر کی مخلوق ہے۔ اسکے پیروں کی طرف نگاہ ڈالی۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ وہ بالکل صحیح اور سیدھے عام عورتوں کے سے تھے۔ بے اختیار میرے دل و دماغ میں لوگ گیت کے بول مچل گئے، جٹی نہا کے چھپڑ و چوں نکلی تے سلفے دی لاٹ ورگی۔۔۔ بھرپور جوان عورت کا تنا ہوا بدن پانی سے شرابور ہو رہا تھا اور سر آگے کی طرف جھکائے لمبے سیاہ بال نچوڑ رہی تھی۔ بال پیچھے جھٹک کر جسم کی گندمی رنگ جلد پر ٹاکنے پانی کے قطروں کو ہاتھوں سے نیچے پیروں کی طرف بہانے لگ گئی۔ اس کام سے فارغ ہو کر پورے جوبن پر آئے سینے کے دونوں ابھاروں کے نیچے ہتھیلیاں جمائیں اور ہاتھوں کو ایسے حرکت دی جیسے اندازے سے جانچ تول کر گولائی بھرائی کا جائزہ لینا چاہتی ہے۔۔۔"

سلیم مبہوت ہوا بوڑھے کو دیکھے گیا کہ نصف صدی پہلے سنی ہوئی کہانی کو یوں جزئیات کے ساتھ بیان کر رہا ہے گویا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہو۔ بھٹکے ہوئے ذہن کو دوبارہ حاضر کیا اور یکسو ہو گیا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا: "مرشد نے بتایا، میں اس وقت ایسی ٹیکری پر کھڑا تھا، جو روڑی بجری ملی مٹی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نظارے نے یوں مدہوش کر دیا کہ پلک جھپکنا بھول گیا۔ پتا ہی نہ چلا کہ سیدھی ڈھلان پر کھڑے کھڑے کب ٹانگیں سن ہوئیں اور کیسے پیروں کے نیچے سے کنکریلی مٹی کھسک گئی۔ میں پیٹھ کے بل گھسٹتا ہوا ایک سیکنڈ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میرے نیچے گھنی گھاس تھی اور وہ میری کھلی ٹانگوں کی قینچی کے عین بیچ آ گئی۔ اچانک نازل ہونے والی مصیبت پر اس نے چیخ ماری جو گلے میں پھنس گئی۔ اس کے پیچھے ایک ہاتھ کے فاصلے پر حوض کی ڈیڑھ دو فٹ اونچی پتھروں کی چوحدی تھی۔ بدحواس ہو کر آگے بڑھی۔ پاؤں میری ٹانگوں میں الجھ گیا اور وہ میرے اوپر آ پڑی"۔

انہی لمحات میں سڑک پر ویگن آ کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور بھاگتا ہوا آیا۔ خلیفہ کے گھٹنے چھوئے اور سفید ململ کے ملگجے کپڑے میں لپٹا پیکٹ تھما دیا۔ خلیفہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھوں پر تھپکی دیتے ہوئے ڈھیروں دعائیہ جملے ادا کئے۔ ان جانی خوشی سے ڈرائیور کا چہرہ دمکنے لگا۔ جاتے جاتے اس کو خلیفہ کے علاوہ دوسرے شخص کی موجودگی کا بھی خیال آ گیا۔ اس نے سلیم احمد سے بھی مصافحہ کیا اور سڑک کی جانب دوڑ پڑا۔

دس پندرہ منٹ میں بالکا چلم بھر کر لے آیا۔ خلیفہ نے بڑے سبھاؤ سے کش لگانے شروع کئے۔ کثیف دھوئیں کے مرغولے فضا میں تحلیل ہونے سے آس پاس مخصوص بو پھیل گئی۔ جھریوں بھرے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا اور آنکھوں میں سرخی مائل ڈورے پھیلتے گئے۔ ماحول میں سکوت چھا گیا۔ تاہم وقفے وقفے سے کہیں دور نزدیک سے کوئی نہ کوئی پرندہ بول پڑتا۔ اس سکون میں سلیم نے بوڑھے کی خودفراموشی میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ کیف و سرور سے سرشار آواز میں خود ہی بول پڑا "سرکار نے بتایا کہ گھسٹتے ہوئے، سر اور ٹانگیں خود ہی زمین سے اٹھ گئیں، اس لیے چوٹ لگنے سے محفوظ رہیں لیکن پیٹھ پر خراشیں آئیں۔ اس وقت ہلکی ہلکی جلن ضرور محسوس ہوئی مگر زیادہ درد نہ ہوا۔ یہ جان کر دل خوشی سے بھر گیا کہ میں نے سلفے کی لاٹ کو بانہوں میں لیا ہوا ہے۔ وہ میرے سینے پر پڑی میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ کھسیانی ہو کر ہنس دی اور بولی، در فٹے منہ!! تم ڈاک بنگلے والے صاحب ہو۔ چھوڑو مجھے اور بوتھا دوسری طرف موڑو، میں کپڑے پہن لوں۔ میں نے ہنس کر بازوؤں کا شکنجہ کس لیا اور کہا، میں نے جی بھر کے دیکھ لیا ہے۔ اب بوتھا موڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔"

چند لمحے کے توقف سے خلیفہ نے خود ہی بات دوبارہ شروع کر دی "مرشد کہنے لگے، میرا تین دن کا سرکاری دورہ تھا۔

بیماری کی درخواست بھیج دی۔ وہ روزانہ رات کو میرے پاس آ جاتی۔ قلندروں کے ادھیڑ عمر مکھیا غلام علی کی بیوی تھی۔ حوض کے کنارے پہلی ملاقات میں ہی بڑی باتیں ہوئیں۔ نام قمری بتایا۔۔۔'' خلیفہ نے مسکرا کر کہا ''عورت کا یہ نام میں نے پہلی بار سرکار کی زبان سے سنا۔ ہم لوگ اپنی ذات قمری بتاتے ہیں۔ بزرگوں سے یہی سنتے آئے ہیں کہ ہم مولا علی مشکل کشا شیر خدا کے غلام قنبر کی اولاد سے ہیں۔۔۔ خیر، اس آفت عورت کا نام قمری تھا۔ قلندروں کے قافلے کو آگے وادی میں لگنے والے سالانہ میلے پر جانا تھا۔ لیکن پڑاؤ لمبا ہو گیا۔ غلام علی کو منہ مانگا معاوضہ ملا لیکن پھر بھی جانے کیوں چڑ گیا۔ وہ اپنے قبیلے میں ریچھ اور بندروں کو سدھانے کے حوالے سے بے مثال مہارت رکھتا تھا۔ خود تماشا کرنے کے بجائے یہی کام اصل ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ سب سے زیادہ مشہوری اس کے بو بلی کتے جتنے بڑے اور بھاری 'انگریز بہادر' نامی بندر کی تھی، جسے نسل کشی کے لیے استعمال کیا جاتا''۔

چند خواتین کی ایک اور ٹولی آ جانے سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سلیم احمد کو شاید ہی کبھی اتنی بے چینی محسوس ہوئی ہو۔ اس کی خواہش تھی کہ عورتوں کی حاضری جلد اختتام پذیر ہو اور وہ جائیں تا کہ کہانی کا انجام سنا جا سکے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد عورتیں روانہ ہوئی تو سلیم نے بڑی بے تابی سے خلیفہ کو متوجہ کیا اور بات مکمل کرنے کو کہا۔ وہ بولا ''بڑا لمبا قصہ ہے۔ بیچ بیچ میں سے سنا رہا ہوں۔ سرکار نے بتایا کہ میلہ اجڑنے پر قافلے کو آگے جانا تھا، بڑے شہروں کی طرف، واپس اس طرف نہیں آنا تھا۔ ادھر ڈاک بنگلے میں دو انگریز افسر دیسی عملے سمیت آ گئے۔ آدھی رات کو قمری اسی جگہ، جہاں ہم بیٹھے ہیں، پہنچ گئی، میرے مرشد سے آخری ملاقات کرنے۔ دونوں کو تب ہوش آیا جب قلندر سر پر آن پہنچا۔ اس کے ساتھ وہی بو بلی کتے جیسا بلا کی بلا 'انگریز بہادر' نامی بندر تھا۔ غلام علی قلندر نے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور قمری کے سر پر بڑے بھاری ہتھوڑے سے کاری وار کر دیا۔ بندر نے سرکار کی جھانگوں میں تھیلی کو پنجوں کے شکنجے میں کس کر اس بری طرح مسل ڈالا کہ بیضے کچلے گئے۔ مرشد کو ہوش ہی نہ رہا۔ اس وقت آنکھ کھلی، جب چڑیاں بولنا شروع ہوئیں۔ قمری کی لاش ایک گہری جگہ میں پڑی تھی اور اس پر جلد بازی میں مٹی پتھر اور جھاڑیاں ڈال کر چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن کہیں کہیں سے جسم نظر آ رہا تھا۔ سرکار نے دن چڑھے تک بڑے بڑے پتھر جوڑ دیئے اور مٹی ڈال کر جگہ برابر کر دی۔۔۔''

حیرت سے سلیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کہنے لگا ''ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو تو پتا چلا ہی ہو گا کہ عتیق صاحب سے قمری ملنے آتی رہی''۔ خلیفہ نے سرنفی میں ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں، وہ رات کو کھانا کھلا کر نزدیک ہی اپنے ڈیرے پر چلا جاتا اور صبح گھر سے ناشتہ بنا کر لایا کرتا تھا۔ اسی طرح کھانا بھی اس کی بیوی گھر پہ پکاتی تھی۔۔۔ سیانے سچ کہہ گئے، عشق نہ پوچھے ذات صفات۔۔۔ اور عشق کے کوچے میں شاہ گدا برابر۔ یہ نامراد روگ ایسا تندور ہے جس میں ہڈیوں کا بالن جلتا ہے۔ مرشد نے سرکار دربار سب چھوڑ دیا اور اسی جگہ ڈیرا جما لیا۔ جب پاکستان بنا، سرکار بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ بڑی منتا تھی اور ''پیر جتی ستی، دھیاں والی سرکار'' کے طور پر مشہور تھے۔ میری یہاں حاضری کیسے ہوئی، یہ بھی اللہ پاک کا بھید ہے۔ پھر کبھی کہانی سناؤں گا۔ چند دنوں میں میرے دل کا اصل روگ سمجھ گئے اور مجھے خاص بالکا بنا لیا۔ بائیس سال اور جیئے، اور اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ حکم دیا کہ کبھی بھی اس درگاہ پر کسی مکمل مرد کو بالکا نہ رکھوں۔۔۔ اور اپنے ہی جیسا خلیفہ مناسب وقت پر مقرر کر دوں۔۔۔''

سلیم نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کر دیا ''اور یہ لڑکا تو اچھا بھلا دکھائی دیتا ہے۔۔۔'' خلیفہ نے انکار میں سر ہلایا اور بولا ''پیدائشی جتی ستی ہے۔ تھیلی سرے سے ہے ہی نہیں۔ والدین نے ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔ انہوں نے کہا، شاید اندر ہو، آپریشن کرنا پڑے گا۔ لیکن فائدہ کوئی نہیں۔ اوپر صرف گوشت کا سوراخ دار موٹا سا بیر دھرا ہوا ہے۔ قدرت نے بول کو راستہ دے دیا، باقی رہے نام اللہ کا۔ دمادم مست قلندر۔۔۔''

اندر، دل کے نہاں خانے میں، بہت گہری درد کی لہر اٹھی۔سلیم نے آنکھیں میچ لیں اور چٹائی پر لیٹ گیا۔خلیفہ نے رسوئی کی طرف گردن موڑی اور بلند آواز میں بالکے کو مخاطب کیا: ''رشید! میرا لعل! چلم بجھ گئی ہے''۔پر کشش روشن چہرے والا اٹھارہ بیس سالہ نوجوان فوراً حاضر ہوگیا اور چند منٹ میں چلم بھر کے لے آیا۔

خلیفہ نے کچھ دیر ہی کش لگائے ہوں گے کہ سلیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں۔ہاتھ کو ہلکی سی حرکت دے کر مردہ آواز میں بول پڑا ''لائیں، آج میں بھی سلفے کا کش لگاؤں۔دیکھوں، سکون ملتا ہے یا ٹیس اٹھی ہے۔۔۔'' خلیفہ نے فوراً نے اس کی طرف موڑ دی۔سلیم نے اوپر تلے کئی کش لیے۔خلیفہ نے ہاتھ بڑھا کر چلم اپنے قریب کھسکا لی اور کہا، بس! ابھی اس سے زیادہ نہیں۔۔۔تیری معشوقہ کے بھائیوں اور منگیتر نے تیرے ساتھ جو ظلم کیا، اس کا کوئی علاج نہیں۔اس درگاہ کو چھوڑ، کہیں چلے جاؤ، داتا صاحب یا خواجہ غریب نواز، تمہاری مردانگی واپس نہیں آسکتی۔جتنی چاہے منتیں مان لو۔۔۔''

''مایوس نہ کریں۔۔۔'' نشے میں ڈوبی ہوئی سلیم کی آواز سنائی دی۔خلیفہ نے کہا ''یہی قدرت کا قانون ہے۔خصی بیل سے ہل چلالو۔گڈ، رہٹ یا کولہو میں جوت لو۔۔۔لیکن وہ دوبارہ گائے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ذبح کر کے بوٹیاں بنالو، خلقت کو کھلاؤ اور خود بھی کھالو۔۔۔میں نے تجھے مرشد کی اور اپنی کہانی اسی لیے سنادی کہ سمجھ جاؤ۔جھوٹے پیروں فقیروں اور درباروں سے دھوکا نہ کھاؤ۔آجاؤ اسی آستانے پر۔اس سے اچھی پناہ کہیں نہ ملے گی۔میرا چل چلاؤ ہے۔رشید ابھی بچہ ہے۔گدی تم ہی سنبھالو گے۔۔۔اور آخری بات!!! اب کبھی تیری محبوبہ سلفے کی لاٹ بن کے بھی تیرے روبرو آ گئی تو تم اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو گے، بیٹی! کپڑے پہن لو''۔

☆☆☆

ریشم کے ریشے

محمد حامد سراج

پرانی بس کا ہینڈل پکڑ کر میں اس میں سوار ہوا۔ مجھے معلوم تھا وہ تیس کلومیٹر کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرے گی لیکن اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ کندیاں سے میانوالی تک کڑاک خیل ٹرانسپورٹ کی اجارہ داری تھی۔ بس کندیاں موڑ پندرہ منٹ قیام کرتی اور ہاکر اتر کر میانوالی ملتان روڈ پر نظریں جمائے ملتان بھکر، کلورکوٹ، پپلاں اور چوک کی جانب سے آنے والی بسوں اور ہروگین کا انتظار کرتا اور ان میں سے سواریاں اترنے پر ان کی طرف لپکتا۔ کندیاں موڑ پر کڑاک خیل بس سروس کا ایک منیجر جس کی مونچھیں نوکیلی اور چہرہ کرخت تھا وہ کسی بھی سواری کو تانگے، یا مال بردار ڈالے پر سوار نہ ہونے دیتا۔ سر پھٹول اس اڈے کا معمول تھا۔

میں رینگتی بس میں گردو پیش کے منظروں سے لطف اندوز ہوتا عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز میں گیت سن رہا تھا۔

کوئی گڈی دیاں دو لیناں

جتھے ماہی یاد آوے اتھے بیٹھ کے رو لیناں

میانوالی اڈے پر اتر کر میں نے ریلوے اسٹیشن کراس کیا اور رنجائی بازار کی جانب مڑ گیا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ مجھے گرو بازار سے گزر کر کلوریاں والی گلی میں جانا تھا۔

"ریشماں والی گلی میں ایک دکان ہے کشیدہ کاری کی۔۔۔اور کلوریاں والی گلی!"

ریشماں والی گلی کا نام میرے لیے مانوس نہ تھا تاہم کلوریاں والی گلی میرے دھیان میں آتے ہی ایک مہک سے جڑ گئی تھی۔

میں ایک مدت بعد یہاں آیا تھا اس بیچ والے عرصہ میں بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن کلوریاں والی گلی کے ساتھ ریشماں والی گلی کا اجنبی نام آیا تو عین اسی سے اس کی نامانوسیت معدوم ہو چکی تھی کہ اس کے ساتھ میرا بچپن جڑا ہوا تھا۔ تب میں گئو شالہ پرائمری سکول میانوالی میں پانچویں کا طالب علم تھا اور میں اسی گلی سے ہو کر گزرا کرتا تھا۔

کشیدہ کاری کی دکان سے مجھے ایک سوٹ لینا تھا۔

کلوریاں والی گلی تک میں اپنے بچپن کی انگلی تھام کر پہنچ گیا اس گلی میں داخل ہو کر مجھے یوں لگا کہ کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ مانوس دیوار و در سے جا چکے وقت نے پلٹ پلٹ کر مجھے بلانا اور بہلانا شروع کر دیا تھا۔ میں گلی کے اندر دور تک گھستا چلا گیا حتیٰ کہ مسجد لوہاراں کے بغل میں موجود حافظ والی ہٹی آ گئی جہاں سے ٹافیاں، بتاشے، ریوڑیاں، ٹانگری، اور مونگ پھلی لینا معمول تھا۔ یہیں قلفی والی ریڑھی لگا کرتی جو شام ڈھلنے تک گلی میں موجود رہا کرتی تھی۔ اس ریڑھی سے ہم ایک آنہ، دو آنہ کی قلفیاں لیا کرتے تھے۔ کچھ آگے نکڑ پر منیاری کی دکان تھی اور پھر وہ مکان جہاں سے روزانہ شام، میں نانی اماں کے کہنے پر میں دودھ لایا کرتا تھا۔

اس سے آگے بھی گلی کلوریاں چلتی تھی مگر میں ایک مہک کی گرفت میں آ گیا تھا جو یہاں آتے ہی میرے تعاقب میں تھی۔ بھیڑ کے اندر جس میں، میں گھسا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا، ایک جھپاکے کے اندر سے اس مانوس مہک کو اٹھتا اور بھیڑ کے اندر گم ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اب میں اس کے تعاقب میں تھا۔ ادھڑے وقت کے سارے رخنے جیسے اس مہک نے پاٹ دیئے تھے۔ مہک معدوم ہو گئی یا پھر وہ گلی ختم ہو گئی تھی جو دھرم شالہ کے پاس پہنچ کر کھل جاتی تھی۔

کھلی گلی کے اجالے نے مجھے چونکایا تو مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میں بہت آگے نکل آیا تھا۔ آگے نہیں، بہت پیچھے۔

میں نے اپنے قدموں پر گھوم گیا۔ عجلت مجھے آگے کو کھینچتی تھی کہ ہزار کام تھے جو نمٹانا تھے۔۔۔ میں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔

''بھائی ریشماں والی گلی کون سی ہے۔۔۔؟''

''یہ سامنے ریشماں والی ہی تو ہے''۔

''اور کلوریاں والی۔۔۔؟''

''وہ اس کے ختم ہوتے ہی شروع ہو جائے گی''۔

مجھے یاد آیا کہ آتے ہوئے مجھے بتایا گیا تھا کہ جب کلوریاں والی گلی ختم ہو گی تو ریشماں والی گلی نے آجانا تھا۔

جہاں میں تھا وہاں سے بتائی گئی حقیقت اوندھی ہو گئی تھی۔

پہلے جس گلی کو جہاں ختم ہونا تھا وہ وہاں سے شروع ہو رہی تھی اور شروع ہونے والی ختم۔

جب میں ریشماں والی گلی میں پھر سے داخل ہوا تو مجھے یہ تخمینہ لگانے میں دیر نہ لگی تھی گلی کا یہ حصہ جو پہلے کلوریاں والی گلی ہی تھا نیاری کپڑے اور درزیوں کی غیر معمولی دکانوں کی تعداد زیادہ ہو جانے سے ریشماں والی گلی ہو گیا تھا۔

میں بچپن کی گرد جھاڑتا اپنا نام بدل لینے والی گلی کے وسط میں موجود کشیدہ کاری کی دکان میں داخل ہو گیا۔

زگ زیگ مشین پر دکاندار اپنے کام میں مگن تھا۔ میں نے ہاتھ ملایا تعارف کرایا اور بیٹھ گیا۔ اسے وقت پیچھے دھکیلنے میں ذرا دقت نہ ہوئی تھی۔ چائے منگوائی اور بہت کچھ ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔ اسی دوران ایک نوجوان نے اپنی سائیکل دیوار کے سہارے کھڑی کی اور اندر داخل ہوا۔ اس کی بغل میں کالی شال تھی۔ نکلتا ہوا قد، نوکیلی مونچھیں، پاؤں میں میانوالی کی روایتی تلے والی کھیڑی، بوسکی کا لمبا کرتا، لٹھے کی شلوار، وہ وجیہہ لگ رہا تھا۔

''یہ میری شال ہے بہت شوق سے بنوائی تھی میں نے۔ سائیکل کے پہیے میں آکر برباد ہو گئی۔ کیا یہ مرمت ہو سکتی ہے۔۔۔؟''

دکان نے شال کو دیکھا، پرکھا اور کہا:

''رفو ہو جائے گی''۔

جوان نے دکان میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ کیلنڈر پر، دیوار چسپاں ایک ایکٹریس کی تصویر پر بہت دیر تک اس کی نظریں ٹکی رہیں۔

اس جیسی دوسری تصاویر پر سے اس کی نظریں پھسلتی پھر اپنی شال پر آکر ٹک گئیں۔ اس بار اس کا مخاطب میں تھا:

''روپیہ روپیہ جوڑ کر یہ شال بنوائی ہے میں نے۔ رفو کرنے سے یہ اوڑھنے کے قابل تو ہو جائے گی نا۔۔۔؟''

''ہاں بالکل۔۔۔ رفو ہو کر ٹھیک ہو جائے گی''۔

''بہت سال بعد اللہ نے خواہش پوری کی، لیکن سائیکل کے پہیے میں آکر شال ادھڑ گئی''۔

جتنی دیر شال مرمت ہوتی رہی میں وہ رفوگری کا عمل غور سے دیکھتا رہا۔

دکان کے سامنے والے تھڑے پر ایک شخص، جس کے لباس میں بے شمار پیوند تھے، بیٹھا اپنی جوتی گانٹھ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کے حلق سے حق ھو کی آواز نکلتی جو میرا دھیان کھینچ رہی تھی۔ بوڑھا خود دنیا و مافیہا سے بے خبر جوتی گانٹھنے میں مگن تھا۔ گویا وہ گلی اور اس میں موجود بھیڑ اس کے لیے جیسے تھی ہی نہیں۔

میں سارے منظر سے لاتعلق اپنی دنیا میں مگن اس شخص کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہو پا رہا تھا کہ منقسم ہونے والی گلی،

ادھڑی ہوئی شال کے ریشے اور معدوم ہو جانے والی مہک بیچ میں آ کر میرا دھیان کاٹ رہے تھے۔

جوتی گانٹھتے گانٹھتے اس شخص نے سر اٹھایا، یہاں تک کہ اس کی نگاہ آسمان پر جا کر ٹک گئی۔ اس کے حلقوم سے حق ہو کی صدا نکلی۔ میری گردن تیزی سے اس کی جانب گھومی، عین اسی لمحے میں اس کی نگاہیں آسمان پر جا کر الجھ گئیں۔ اس بار حق ہو کی پکار اس کے تنے ہوئے حلق کو چیرتے ہوئے نکل کر پھٹ گئی تھی۔

ادھڑی ہوئی شال کی طرح ادھڑی ہوئی آواز نے میرے دھیان کی گٹھڑی باندھ کر اپنے پاس دھر لی تھی۔

اوپر کو اٹھا ہوا سر تیزی سے واپس اس کی جھولی میں گر گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے کٹے ہوئے حلق کے کنارے بج رہے تھے:

''عشق کیہے تساں چنگا کیتا، بوہے یار دے واڑیا سی''۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اپنے دھیان کی گٹھڑی اپنی گرفت میں لے لی تھی۔ اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ گلی کٹ کر جڑی تھی یا جڑ کر کٹ گئی تھی کہ ادھڑے ہوئے وقت کی شال کے ریشے رفو ہو کر اپنی جگہ پر پھر سے بیٹھ گئے تھے اور میں ادھر ادھر سے بے نیاز اس سمت جست لگا چکا تھا جہاں معدوم ہونے والی مہک کے وسیلے سے کٹنا اور جڑنا ایک سا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

راستے بند ہیں

منشا یاد

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

''جب تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟''

وہ پہلے روتا اور پھر ہنستا ہے اور کہتا ہے۔

'میں میلے میں نہیں آیا۔۔۔ میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں گھر گیا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ سجھائی نہیں دیا''۔

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لیے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کی نگہداشت پر مامور ہوں۔ مجھے پتہ نہیں مجھے اس کی نگہداشت پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اسکے ساتھ رہنا اور اسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ زوروں پر ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ آجاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانگے، بیل گاڑیاں، بسیں، ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ ہارن بجاتی اور دھواں اڑاتی نظر آتی ہیں۔ ہارن بجا بجا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بجا بجا کر سائیکل سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد جمی ہے۔ لیکن میلے کے شور نے ان کے تھکے ہوئے نڈھال جسموں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میلے کی فضا کو دھوئیں، گرد اور شور وغل کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاؤڈ اسپیکروں پر انسانی آوازیں گرجتی اور چنگھاڑتی ہیں۔ جھولوں کی چیخیں، ڈھولوں کی گھمکاریں، مداریوں کی بانسریوں کی کوکیں اور خوانچہ فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان سینکڑوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی ٹک جیسی آواز سب سے اچھی لگتی ہے۔ وہ اسے کسی سریلے نغمے کی طرح سنتا اور جاتا ہے۔ میں نے کئی بار چلا چلا کر اسے آگے بڑھنے کے لیے کہا ہے مگر وہ سوڈا واٹر کی بوتلوں کی دکان کے سامنے پتھر ہو گیا ہے۔ میرے لیے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے علیحدہ ہو سکتا، اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا۔ میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب ندیدہ آدمی ہے۔ صبح وہ کتنی ہی دیر تک اس بھٹی کے قریب کھڑا اجھلتا رہا جس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو یوں گھورتا جیسے اس کی ہتھیلی پر گرم گرم پوری رکھی ہو۔ عجیب واہیات انسان ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔

وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور میلے میں دیکھنے کی سینکڑوں چیزیں ہیں۔ تھیٹر کے مسخرے، ناچتی گاتی عورتیں، سرکس کے جانوروں کے کرتب،

موت کے کنوئیں میں چلتی موٹر سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لیڈی، اوپر نیچے، جاتے جھولے، فلم کی سکرین پر دوگانے گاتے ہوئے عاشق ومعشوق اور مداری کے توپ چلاتے طوطے لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالانکہ سرکس کے باہر فلمی ریکارڈوں کی دھنوں پر ناچتے مسخروں کو دیکھنے پر تو خرچ بھی کچھ نہیں آتا مگر اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اسے پھلوں، مٹھائیوں، فالودوں، آئس کریموں، سوڈا واٹر کی بوتلوں اور سیخوں میں پروئے ہوئے مرغوں کو دیکھنا، گھورنا اور ان کی خوشبو سونگھنا اچھا لگتا ہے اور حالانکہ دونوں وقت پیر صاحب کے ڈیرے پر اسے بھنڈارے کی دال روٹی مل جاتی ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ رات وہ مجھے دیر تک ان مٹھائیوں، پھلوں اور چیزوں کے نام گنواتا رہا جو اس نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ یہ فہرست اتنی طویل تھی کہ میں اکتا گیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لذیذ چیزوں کے ذکر سے حاصل ہونے والی لذت سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔

میلے میں اس کی جان پہچان کے اور لوگ بھی ہیں۔

الٰہی بخش نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے یار دوستوں کے ہمراہ اپنے یکے پر آیا ہے اور اس کے ڈیرے پر ہر وقت مجرا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ طوائفیں سروں پر رکھے اور دانتوں سے پکڑے ہوئے نوٹ چن چن کر تھک جاتی ہیں اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈیرے پر چلا جائے لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات چلمیں بھرتا رہے۔ علیا نائی اپنے حال میں مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ رچھانی لیتا آیا ہے۔ اس کا جب جی چاہتا ہے حجامتیں بنانے لگتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تھیٹر دیکھنے چلا جاتا ہے۔ تھیٹر دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراشتا رہتا ہے۔ صرف مہرو سانسی ایک آدمی ہے جو اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لیے جب بھی سامنے آتا ہے دانت نکالتا ہے یا پھر کالو ہے جو اسے دیکھتے ہی دم ہلانے لگتا ہے حالانکہ اس نے زندگی بھر اسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ڈالا۔

اسے مہرو سانسی اچھا لگتا ہے شاید اس لیے کہ مہرو گندی جھوٹی چیزیں سہی ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کے ذائقوں سے آشنا ہے۔ پچھلی بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ رات کو جب اچانک آندھی آ گئی تو وہ کالو کے ساتھ پناہ لینے کے لیے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا۔ تخت پوش کے نیچے قلاقند سے بھری کڑاہی رکھی تھی جسے اس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دوران مہرو کو باہر نکل کر دوبارہ گلے میں انگلی ڈال کر قے کرنا پڑی تھی۔ اگر کالو کی دم اس کے پاؤں کے نیچے نہ آ جاتی تو ایک آدھ بار اور قے کر کے وہ گلاب جامنوں کا بھی صفایا کر دیتا۔ اسے مہرو اور کالو پر رشک آتا تھا اگر میں اس کے ہمراہ نہ ہوتا یا اس سے بے پردہ ہو کر رہتا تو یقیناً بھٹک جاتا ۔۔۔ چلمیں بھرتا ۔۔۔ دلالی کرتا یا پھر کسی تخت پوش کے نیچے گھس کر قلاقند یا گلاب جامنیں کھا رہا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکاندار یا پولیس کے حوالے کر دے۔ لیکن میں نے ہر لمحہ اسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

میلے کا آج تیسرا روز ہے۔

اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی ٹک جیسی آواز سن کر اس کی تشفی نہیں ہوتی۔
وہ حلوہ پوری، قلاقند اور بالوشاہی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بھنے ہوئے گوشت اور روسٹ مرغ کی خوشبو سے اس کا جی نہیں بھرتا۔ اور وہ پھلوں کے نام گنوا کر لذت حاصل کرنے پر قناعت نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے، لعن طعن کی ہے، لیکن وہ مصر ہے کہ وہ ہر قیمت پر ان سب چیزوں کو چکھ کر دیکھنا چاہتا ہے جن کے ذائقے سے وہ نا آشنا ہے۔ گزشتہ رات ہم دونوں دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو مجھے زندہ نہ دیکھے گا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تو گھٹ کر مر جائے گا۔

میں عجیب الجھن میں ہوں۔ شائد وہ وقت آ گیا ہے جب ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم دونوں میں سے کسے زندہ رہنا چاہیے۔

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اسے بھی زندہ، خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے مداری کے کرتب، جھولوں کے مناظر اور مسخروں ہیجڑوں کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قیمہ کریلے، بھنے ہوئے گوشت، روسٹ مرغ اور قلاقند کے ذائقوں کے لیے قتل و غارت پر اتر آیا ہے۔

وہ کہتا ہے ''جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ذائقوں سے محروم کیوں ہوں؟''

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور اسے کیسے سمجھاؤں اور بھٹکنے سے کیسے بچاؤں؟ میلے کا آخری اور چوتھا روز ہے۔

رات مجھے ایک نہایت اچھوتا خیال سوجھا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اسکے ذہن نشین کرائی ہے کہ اصل میں سب انسان ایک ہی انسان کا پرتو ہیں یا اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ قلاقند کھا رہا ہے۔ کہیں ناخن تراش رہا ہے کہیں روسٹ مرغ اڑاتا ہے اور کہیں بھنڈارے کی دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا ہے اس کی لذت انسان کی مشترکہ لذت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو حلوہ پوری کھاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ وہ خود حلوہ پوری کھا رہا ہے۔ اور اس لذت میں برابر کا حصہ دار ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت بے حد پسند آئی ہے کہ جب اس کے ذہن میں کوئی بات بٹھا دی جائے تو وہ اس سے سرمو ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی میری اس انوکھی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

''ٹک''، بوتل کھلنے کی آواز آتی ہے۔

ایک پتلا دبلا آدمی بوتل منہ سے لگاتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

''واہ وا۔۔۔ کیا ٹھنڈی ٹھار اور مزے دار بوتل ہے''۔ پھر آستین سے منہ پونچھ کر کہتا ہے۔ ''مزا آ گیا''۔ تیخ کبابوں کی خوشبو لپکتی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدم روک لیتی ہے۔

وہ منہ کھولے بغیر تکوں کو دانتوں سے کاٹتا ہے چباتا ہے۔ پھر ان کی لذت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''ذرا سخت ہیں مگر گوشت سخت ہی مزا دیتا ہے''۔

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

اس کی نظریں بالوشاہی کے تھال پر ہیں۔ وہ دکان سے کچھ فاصلے پر کھڑے کھڑے بالوشاہی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ کھاتے کھاتے اس کا منہ تھک جاتا ہے۔ پیٹ بھول جاتا ہے مگر بالوشاہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ میں کہتا ہوں ''اور کھاؤ''۔

''نہیں بس''۔ وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ پاپڑ دیکھ کر میں کہتا ہوں۔

''منہ سلونا کرو گے؟''

''ہاں''۔
پاپڑ اس کے دانتوں تلے کڑ کڑاتے ہیں۔
''کیسے ہیں؟''
''بہت اچھے ہیں بس ذرا مصالحہ تیز ہے''۔
''اور کیا پسند کرو گے؟''
''میں نے آج تک سیب نہیں چکھا''۔
میں اسے پھلوں کی دکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔
''یہ سیب ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتے ہو''۔
وہ ایک سیب نگاہوں سے اٹھاتا ہے دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے۔
''یہ تو ناشپاتی ہے''۔
''یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ''۔
وہ پھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے ''یہ امرود ہے''۔
''یہ امرود نہیں سیب ہے''۔
وہ پھر کوشش کرتا ہے پھر کہتا ہے:
''یہ آڑو ہے''۔
''یہ آڑو نہیں ہے''۔۔۔۔مجھے غصہ آجاتا ہے۔۔۔''تم الو کے پٹھے ہو''۔
وہ مجھے اداس نظروں سے دیکھتا ہے پھر روہانسا ہو کر کہتا ہے۔
''مجھے کیا پتہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں''۔
''اچھا چھوڑو''۔۔۔میں کہتا ہوں۔''اب آگے چلتے ہیں''۔
ہم باری باری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلنے لگتے ہیں۔ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔
''کیا بات ہے بھائی؟''۔۔۔وہ پوچھتا ہے۔
''حادثہ ہو گیا۔۔۔آدمی ٹرک کے نیچے آکر کچلا گیا''۔
وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے۔۔۔پھر کہتا ہے۔۔۔
''ٹرک۔۔۔میرے اوپر سے گزر رہا ہے!''
''نہیں''۔۔۔میں چلاتا ہوں۔۔۔
لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں، وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔۔۔!

☆☆☆

جوگی اتر پہاڑوں آیا

محمود احمد قاضی

پو پھوٹ رہی تھی اور وہ ٹرین میں کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا میدانوں، سطح مرتفع اور پہاڑوں کی دلفریبی کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ جب سے سفر میں تھا، تب سے لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ بارش نے زمین کا چہرہ اچھی طرح دھو دیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونچائی اور نیچائی میں لوگوں کے گھر، گھروندے تھے۔ ایک آدھا اکیلا دوکیلا گھر بھی دکھائی دے جاتا تھا جو پہاڑی کی چوٹی پر رکھا کسی بہت بڑے پرندے کا گھونسلا لگ رہا تھا۔ ایسے گھروں کے آگے بنے باڑے میں بکریاں سرنیہوڑائے بیٹھی نظر آتی تھیں۔ ان مغموم بکریوں سے پرے نیلی دھند نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ دھند بارش کے ساتھ مل کر دھوئیں کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ دھواں کبھی اوپر اٹھتا اور کبھی نیچے اترتا محسوس ہوتا تھا۔ جیومیٹری کی مختلف اشکال کی صورت اختیار کرتا یہ چار چوفیر اریل کی پٹڑی کے ساتھ بھاگا جا رہا تھا۔ پہاڑ، کھیت اور ٹیلی گراف کے کھمبے گھوم گھوم کر پیچھے کی طرف جاتے ہوئے ایک ماورائی مفہوم کو آشکار کر رہے تھے۔ درخت رمزیہ داڑھی والے بابوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ بارش کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔ اونچے کناروں والی ایک سرکش ندی کے افسوں سے بھری جگہ کو سیاہ دبیز بادلوں نے یوں ڈھک دیا تھا کہ لگتا تھا رات آسمان کی کگار سے پھسل کر نیچے آنے لگی تھی۔ دن کو رات بنانے والا یہ سماں اتنا نرالا تھا کہ وہ دم بخود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے خود کو فطرت کی گود میں بیٹھا ہوا پایا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تا کہ وہ ماحول کے اس طلسم کے گہرے پن کے کنارے سے باہر آ سکے۔ دھیرے دھیرے رات چھٹنے لگی۔ اجالا پھر سے ہم قدم ہوا تو اس نے جھاڑیوں سے گھرا ایک تالاب سا دیکھا۔ وہاں چند مرغابیاں تیر رہی تھیں۔ مرغابیوں کے پروں کی رنگین چمک بارش کے تسلسل میں ماند پڑ رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک پانی میں ڈبکیاں لگاتی ان نٹ کھٹ مرغابیوں کی مہارت کا نظارہ کرتا رہا۔ آگے گہری کناروں میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے بادل اڑ کر آسمان کی بلندیوں کی طرف چل پڑے تو تجیلا دن زمین پر پاؤں دھرنے کے لیے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔

وہ ایک گراموفون کمپنی میں ملازم تھا اور اب ریٹائرمنٹ پر وہاں اور ان پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا جدھر کا کہ وہ رہنے والا تھا۔ وہ چھوٹا سا روشن شہر جہاں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بتا دیا تھا اسے پسند تھا۔ یہ تین اطراف سے ایک گھومتے ہوئے پہاڑی نالے میں گھرا ہوا شہر تھا۔ سائبیریا سے اڑانیں بھر کر آنے والے ہزاروں سارس آگے بہت آگے صنوبر کے درختوں کے قریب وجوار میں پھیلی دلدلی زمین جہاں ہر شام کو بارش ضرور ہوتی تھی پر اترنے سے پہلے اس نالے کے کنارے پر ایک آدھ دن کے پڑاؤ کے لیے ضرور رکتے تھے۔ یہ لمحے اس شہر کے مکینوں کے لیے یوں یادگار بن جاتے تھے کہ تب محبت کرنے والے یہاں ایک دوسرے کی بانہوں میں جھول جاتے تھے۔ اس طرح سارا شہر ہی پیار کے رنگ کے ہلارے لینے لگتا تھا۔ یہ نالہ کافی چوڑا تھا۔ لیکن زیادہ گہرا نہیں تھا۔ برسات کے موسم میں جب یہ اپنے کناروں سے باہر نکل آتا تھا۔ تو پھر اس کے بپھرنے کے آگے سب ہی گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ شہر تو چھوٹا تھا پر یہاں لوگوں کی دلچسپی اور ضرورت کا سارا بندوبست موجود تھا۔ یہاں ایک صاف ستھرا چھوٹا سا سنیما تھا۔ جہاں پر زیادہ تر ماضی کی کامیاب فلموں کی نمائش ہوتی تھی۔ یہ فلمیں ایک ایک دو دو دن کے لیے لگتیں اور اتر جاتیں۔ یہ سنیما کبھی لوگوں سے بھرا ہوا نہیں پایا جاتا تھا۔ شہر کے چندیدہ شوقین لوگ ہی ادھر کا رخ کرتے تھے۔ تقریریں کرتے تھے۔ مکے ہوا میں لہراتے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنا موقف کج کج کر پیش کرتے تھے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں کو جوشیلی اور بھڑکیلی باتیں ہی پسند تھیں۔

یہاں کے موضوعات میں سیاست، ادب، آرٹ سب کچھ شامل تھا۔کبھی کبھی یہاں کے سٹیج پر ڈرامہ یا موسیقی کا پروگرام بھی پیش کیا جاتا تھا۔ یہاں کے ریلوے اسٹیشن کے اردگرد ریل کی پٹڑی کے دونوں طرف جو سوزناز تھے وہاں لوگ اکثر اپنی شامیں گزارنے چلے آتے تھے۔ یہ بے فکرے لوگوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جو ہر وقت بے قرار رہتا تھا۔ ترنگ میں ہوتا تھا۔ یہ سب بہت اونچا بولتے تھے جیسے دوسروں کو بہرا سمجھتے ہوں۔ رات گئے تو یہاں میلہ سا لگا رہتا تھا۔ جب چراغ جلتے تو ان کی خوشی دیدنی ہوتی تھی یوں لگتا تھا کہ ان کے لیے دن دوبارہ سے نمودار ہو گیا تھا۔اس شہر کے دو بازاروں میں لوگوں کی ضرورت کی اشیاء اور من پسند کھابے تھے۔ یہاں کی ربڑی اور کھیر بہت مزیدار ہوتی تھی جو کہ مٹی کے کوزوں میں دستیاب ہوتی تھی۔ ادھر کے مٹکے کی قلفی بھی بے حد پسند کی جاتی تھی۔ یہاں کی مردانہ لنگی کی بھی بہت مانگ تھی۔اور عورتوں کے لیے یہاں کی کانچ کی چوڑیاں تو ایک سوغات تھیں۔ عورتیں ان کی دیوانی تھیں۔ یہاں کے لوگ مطمئن اور پر سکون نظر آنے کے باوجود پتہ نہیں کیوں ہر وقت بے چین سے نظر آتے تھے۔ ویسے ایک بات اور بھی تھی کہ یہاں کے ماحول میں ایک طرح کی مقناطیسیت اور پراسراریت سی تھی۔ یہاں کی فضا اتنی من موہنی تھی کہ یہاں ہر کسی کا عاشقی کرنے کو جی چاہتا تھا۔ یہاں کی گلیوں کے سرمئی سایوں میں خوبصورت پریوں جیسی عورتوں کی سانسیں گھلی ہوئی تھی۔ یہاں ہر گھر میں مٹکوں میں بھرا ٹھنڈا میٹھا پانی موجود ہوتا تھا یہاں کنوؤں کی فراوانی تھی۔ یہاں کی نالیوں میں صاف وشفاف پانی بہتا تھا۔ یہاں جگہ جگہ پر بزرگوں کے مزار موجود تھے جہاں ہر وقت اگر بتیاں سلگتی تھیں۔ بہت سارے گھروں کے صحنوں میں اگلے وقتوں کے جنگجوؤں، بہادروں اور فاتحین کی قبریں موجود تھیں لوگ انہی کے درمیان اپنی زندگی کرتے تھے۔ ہر صبح کو چڑیاں ان قبروں کے اوپر یعنی سرہانوں پر اگے اسراریت والے بزرگی والے درختوں کی ٹہنیوں پر چہچہاتی تھیں۔ یہاں ایک بڑا گورستان بھی تھا جس کے متعلق شنید تھی کہ یہ صدیوں پرانا تھا۔شہر کے مشرق اور مغرب میں دو بڑے باغ تھے۔ یعنی دل لینے اور دینے والوں کے لیے یہاں کا ماحول خاصا سازگار تھا۔اس قصبے کا نام محبت پور تھا۔ سو اس قصبے کو چھوڑتے ہوئے اس کے دل میں ایک کسک رہ گئی تھی۔مگر وہ کیا کرتا اسے واپس جانا ہی تھا۔اس کا گراں اسے بلا رہا تھا۔اس بلاوے میں جہاں بھر کی کشش تھی۔

وہاں اس کے بچپن کے قدموں کے نشان اب بھی موجود تھے۔اس کے والدہ کا پیار، اس کے والد کی شفقت کا سایہ وہاں اب بھی موجود تھا۔ وہ اپنے آبائی گھر میں پہنچنا چاہتا تھا جس کے کونے کونے میں اس کے والدین کے پسینے کی خوشبو موجود تھی۔ وہیں ان کی ڈھیریاں بھی تھیں۔ جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھیں۔ وہ جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی یادوں کو پھر سے تازہ کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں کی وہ واحد گلی جو اس کے ایک پہاڑی پر بنے اکیلے گھر سے تقریباً ایک میل کی دوری پر واقع تھی اتنی دوری پر واقع ہونے کے باوجود وہ اس گلی کا دیوانہ تھا کہ یہاں گاؤں کی واحد کریانے کی دکان تھی جہاں سے اس کی من پسند کھانے پینے کی چیزیں اسے مل جاتی تھیں۔ یہیں سے وہ تختی سلیٹ سلیٹی اور کاپیاں خریدتا تھا۔ پر وہاں گلی کا جو رستہ تھا۔ خوب رونق والا، شور والا، اس کے گھر کی تنہائی اور خاموشی سے بہت مختلف۔ وہ اکثر اپنے والدین سے اس پہاڑی سے نیچے اترنے پر اصرار کیا کرتا تھا مگر وہ نہ مانتے تھے اور آخر وقت تک وہ نہ مانے تھے۔ وہ جب شہر چلا گیا تو پھر اس کا ادھر آنا کم کم ہو گیا تھا۔ جب وہ آتا بھی تھا تو یہ اس کا جوگی والا پھیرا ہوتا تھا۔ کبھی ایک دن کا کبھی دو دن کا۔ والدین اسکے پاس شہر میں آنے اور وہاں بس جانے کا تصور ہی نہیں کر پاتے تھے۔ جب وہ دونوں مرے تو وہ عین آخری وقت پر ان کا دیدار کرنے اور ان کو قبروں میں اتارنے کے لیے بمشکل پہنچ پایا تھا۔اس نے ان دونوں کی قبریں وہیں گھر کی پشت پر ایک کھلی جگہ پر بنا دی تھیں۔ اس نے ان قبروں کو پتھروں سے ڈھک دیا تھا۔ جو بھی کرائے دار اس کے والدین کے جانے کے بعد ادھر رہائش کے لیے آیا تو اس کا کہنا تھا کہ وہ ہر روز اس کی طرف سے تازہ پھول ان قبروں پر ضرور ڈال دیا کرے اور یہ پیسے کرائے میں سے کاٹ لیا کرے۔ چنانچہ اب تک ایسا ہی ہوتا آ رہا تھا اور وہ اس فعل سے مطمئن تھا۔ اسے قریبی

ندی کا چاندی جیسا پانی اب تک یاد تھا جس کے برف جیسے ٹھنڈے پانی میں وہ نہایا کرتا تھا اور وہیں پر کنڈی سے مچھلیاں بھی پکڑا کرتا تھا۔ ان فربہ مچھلیوں کے چمک دار جلد اسے بہت پسند تھی۔ وہاں کا نارنجی کرنوں والا سورج، ادھر کی تانبے جیسی رنگت والی شام جس میں حزن اور مسرت کا حسین امتزاج ملتا تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہاں کی عورتوں کے کالے سیاہ لمبے بال۔ وہ ان کو مستانہ وار دیکھا کرتا تھا۔ ادھر ہی اس نے کبڈی کھیلنا شروع کیا تھا۔ باکسنگ سیکھی تھی۔ باکسنگ میں اس کا استاد صوبیدار حسن دین تھا جس نے نوکری کے بعد ادھر ہی کھیتی باڑی شروع کر رکھی تھی۔ یہ سب کچھ تو تھا جو اس کے دل کو کھینچتا تھا لیکن اسے تو کچھ اس کے سوا چاہیے تھا۔ کوئی اور ہی منفرد چیز اسے درکار تھی۔ وہ اپنے زمین میں آوارہ گردی کا بے شکل ہیولہ لیے ایک دن نکل آیا۔ سب سے پہلے اس نے گاؤں گاؤں، گراں گراں، بستی بستی پھر کر ٹپے، گیت، بولیاں جمع کیں۔ ان کے حوالے سے ایک کتاب مرتب کی۔ اس نے خود بھی کچھ گیت گھڑے، گوائے اور گائے۔ پر وہ ایک جگہ پر ٹک گیا۔ موسیقی کی لٹک تو اسے بچپن سے تھی اور وہ اس کی رمزیں کسی حد تک جانتا تھا سو وہ ادھر آ گیا۔ گراموفون کمپنی میں۔ وہاں وہ ایک ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے روپ میں رہا۔ وہ چونکہ کریئرسٹ نہیں تھا اس لیے روپے پیسے کا لالچ اسے کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے گھر والے اس کے لیے سدا پریشان ہی رہے۔ ماں روتی رہی۔ اس کی بینائی کم ہوتی رہی۔ اس نے بہتیرا اسے کہا۔ ماں، آؤ میرے ساتھ شہر چلو۔ وہاں ایک بڑا ہسپتال ہے۔ ڈاکٹر ہے وہ تمہاری آنکھوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ وہ نہ مانی۔ بڑھاپے کی وجہ سے باپ کی ہمت جواب دیتی رہی۔ اس کی ہڈیاں بھربھری ہوتی رہیں۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ادھر وہ بھی روشن آراء کی گائیکی کے جادو کا اثیر رہا۔ وہ جب بھی ادھر آتا پیچھے بھاگنے کی کوشش کرتا۔ وہ کہتا ادھر کے گیتوں کی پکار اسے یہاں ٹکنے نہیں دیتی۔ وہاں اسے ایک ایسا بے مثل ریکارڈ بنانا ہے جو آج تک کسی نے نہ بنایا ہو اسے ایسی آواز، ایسی دھن اور شاعری کی ضرورت تھی۔ جو آج تک کسی نے نہ پیش کی ہو۔ وہ اتنی منفرد پیش کش ہو کر وہ آج تک کسی کی خواہش کی باہوں میں نہ سمٹ سکی ہو۔ وہ اسے ہی تو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ سو نکلا رہا۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شام ہو رہی تھی۔ اس کا گراں قریب آ رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ رات کی ابتدائی ساعتوں میں گاؤں کے اندر پہنچ جائے گا۔ اس نے عبدالقادر کو جس نے پچھلے چند سالوں سے اس کے مکان کو کرائے پر لے رکھا تھا کہہ دیا تھا کہ اب وہ چونکہ ہمیشہ کے لیے وہاں رہنے کے لیے آ رہا تھا تو وہ اپنا بندوبست کہیں اور کر لے۔ عبدالقادر اور جو وہاں کے ایک قریبی اسکول میں پڑھاتا تھا اس نے اپنی رضامندی دے دی تھی لیکن ساتھ ہی اس سے تھوڑی سی مہلت بھی مانگ لی تھی تاکہ اپنے بال بچوں کو کہیں دوسری جگہ شفٹ کرنے کے لیے وقت مل سکے۔ اس نے اس کی بات مان لی تھی لیکن ساتھ ہی اسے لکھ دیا تھا کہ اس کے وہاں پہنچنے پر اسے کوئی تکلیف نہ ہوگی کہ وہ اس وقت تک بند اس کمرے میں جہاں کہ اس کے والدین کا ضروری سامان بند تھا وہ وہاں رہ لے گا۔ بہرحال وہ ادھر آ رہا تھا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہوتے اسے کافی رات ہو گئی تھی۔ پھر اس پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اسے کافی وقت لگ گیا۔ جب اس نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو عبدالقادر ہاتھ میں لالٹین لیے نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے اس کی بیوی اور بچے کھڑے تھے۔ وہ سارے اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد عبدالقادر نے اس کے لیے برآمدے میں چارپائی بچھا دی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ لیکن وہ موسم کا دیر تک مزہ نہ لے سکا کیونکہ وہ تھکا ہوا تھا اس لیے وہ جلد ہی سو گیا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں خاموشی تھی اور ایک طرح کی اداسی تھی۔ عبدالقادر نہیں تھا۔ وہ اسکول جا چکا تھا۔ بچے بھی اپنے اسکول کو روانہ ہو چکے تھے۔ صرف اس کی بیوی تھی جو چولہے پر جھکی ہوئی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ مکان میں گھومنے لگا۔ گھر میں ہر طرف کہنگی اور خستگی کے آثار نمایاں تھے۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ سفیدی بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ کمروں کا فرش بھی بوسیدگی کی لپیٹ میں تھا۔ اس نے بغیر کوئی دیر کیے ہوئے مرمت کا کام شروع کرا دیا۔ پانچ چھ روز بعد گھر پھر سے

چمکیں مارنے لگا۔

ایک شام کو وہ اکٹھے ہوئے تو عبدالقادر بولا:

بات یہ ہے کہ میں کوشش کے باوجود اپنی رہائش کے لیے متبادل جگہ ابھی **تک** تلاش نہیں کر سکا۔ یہاں ویسے بھی مکان بنا کر انہیں کرائے پر دینے کا رجحان نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ اپنے ذاتی مکانوں میں ہی رہ رہے ہیں۔ ذرا فاصلے پر ایک آدھ گھر کی سن گن ملی ہے۔ وہیں کوشش شروع کرتا ہوں۔ امید ہے کام بن جائے گا۔ میں شرمندہ ہوں کہ اپنا وعدہ جلد **ایفا** نہیں کر سکا۔ وہ **چپ** ہو رہا۔ رات کو سونے سے پہلے اسے خیال آیا۔ یہ عبدالقادر اچھا بچہ ہے۔ شریف آدمی ہے۔ اس کی بیوی بھی بھلی مانس سی لگتی ہے۔ دونوں بچے گڈو اور کاکا۔۔۔ بڑے **ملا**پڑے ہیں۔ عبدالقادر کی بیوی نے صحن میں مرغیوں کا ڈربہ بنا رکھا ہے۔ یہ قراقلی ٹوپی پہننے والا عبدلقادر اچھا ماسٹر ہے۔ شام کو **جب** وہ ادھر برآمدے میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ سارا الجبرا ازبر ہے۔ بچے بڑی دور سے اس کے پاس پڑھنے آتے ہیں اور خوش ہیں۔ اگر وہ یہاں سے دور **چلا** گیا تو بچوں کو بہت تکلیف ہوگی۔ جب اسے فارغ وقت ملتا ہے تو وہ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر لڈو کھیلتا ہے۔ وہ بچوں کے ساتھ بھی سلیٹ پر خانے بنا کر **ایک** کھیل کھیلتا ہے۔ بچے کو سلیٹ کی دوسری طرف لکھے نمبر کے مطابق اپنا وہ مطلوبہ خانہ اور چیز تلاش کرنی ہوتی ہے اس نے بیٹھک میں اپنے بیوی بچوں کی تصویریں آویزاں کر رکھی ہیں۔ برآمدے میں پڑے جھولے پر اس کے بچے جھولا جھولتے ہیں صحن میں کیاری اس کی بیوی نے بنا رکھی ہے۔ وہاں اس نے پھول، مرچیں، لیموں اور توریاں اگا رکھی تھیں۔ اگر وہ یہاں سے **چلا** جائے گا تو یہ سب کچھ تو یہیں رہ جائے گا۔ یعنی وہ جہاں مرضی جا کر رہے اس کی ذات کا **ایک** حصہ تو ادھر ہی رہ جائے گا۔ دو حصوں میں بٹا ہوا بندہ تو بالکل ہی تقسیم ہو کر رہ جاتا ہے جیسے کہ ساری زندگی وہ خود رہا ہے۔ اس کی ذات کا **ایک** حصہ یہاں دھڑکتا تھا اس کی ماں اور باپ کی جند جان کے **اندر** اور دوسرا وہاں ملکہ پکھراج کے گیتوں میں ہمکتا تھا۔ وہ ساری زندگی اسی لیے ہو جندے، ہو میریئے جندے ہی پکارتا رہا تھا۔ عبدالقادر اور اس کے گھر والے اس گھر سے بہت مانوس ہو چکے ہیں اور اب **تک** انہیں یہاں کی اتنی عادت ہو چکی ہے کہ انہیں اگر یہاں سے **جدا** کیا گیا تو کہیں وہ کملا ہی نہ **جائیں**۔ جب کہ میں۔۔۔ میرا یہاں کون ہے، وہ مکان کی پچھلی سمت میں بنی روڑ پھریاں۔ وہاں تو پھول کوئی بھی ڈال سکتا ہے۔ عبدالقادر ڈال ہی رہا ہے ناں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں ادھر کا رہا ہی نہیں۔ یہاں کے لوگ جسے بھول بھال گئے ہیں۔ اب مجھے یہاں کے لوگوں کو اپنا تعارف کراتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ اب مجھے نہیں پہچانتے۔ میری جڑیں اکھڑ گئی ہیں۔ میری نال یہیں کہیں دفن تو ضرور ہے **مگر** وہ بھی اب گل سڑ چکی ہے۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دوری پر عبدالقادر اپنے بچوں کے ساتھ راحت بھری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اس نے **اندازہ** لگایا رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے ہوئے گھر سے باہر آ گیا اور پہاڑ سے **نیچے** اترنے لگا۔

☆☆☆

امن کے ہاتھ

محمود واجد

یہ ان دنوں کی بات ہے جب دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔۔۔فوجی کیمپ اور سپاہیوں کے دستے مکڑی کے جال کی طرح ملک کے چپے چپے میں پھیلا دیے گئے تھے۔ ہمارا علاقہ بھی اس کی زد سے نہ بچ سکا۔۔۔ ہمارے گاؤں کے قریباً چار پانچ فرلانگ کی دوری پر ایک بڑے سے گھنے باغ میں ملٹری کیمپ بننے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یوروپین سپاہی آئے، کمانڈوز آئے، ملٹری کاریں آئیں اور خاصی چہل پہل ہوگئی۔ صبح وشام پریڈ ہوتے، فٹ بال اور ہاکی کھیلے جاتے، سیر اور تفریح ہوتی اور گویا تیز رو زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن شاید اس چراغ کی لو کی طرح جو بجھنے سے پہلے ایک بار زور سے بھڑک اٹھے۔۔۔ یہ فوجیوں کی آخری پناہ تھی، جہاں سے وہ سیدھے میدان جنگ میں بھیج دیئے جاتے تھے اور اس لیے شاید ان میں زندگی کی رمق بھی بہت زیادہ تھی۔۔۔وہ اپنے مستقبل سے بے نیاز اپنے حال میں مگن تھے۔۔۔انہیں کسی چیز کا علم نہیں تھا، جیسے ان کا کوئی نہ ہو۔۔۔ماں باپ، بھائی بہن، بیٹا بیٹی۔۔۔کوئی بھی نہیں۔۔۔انہیں کوئی فکر نہ تھی، جیسے انہیں کسی سے لگاؤ نہ ہو۔ گھربار، شادی بیاہ، تعلیم، تربیت۔۔۔ یہ سب فضول اور بے معنی چیزیں ہوں۔ جیسے وہ حواس خمسہ رکھنے والے جانور ہوں، جو محبت نہیں کرسکتے، جن کے پاس جذبات نہ ہوں، جو اچھے اور برے کی تمیز سے عاری ہوں۔۔۔وہ کھانے پینے کی چیزوں کو بری طرح ضائع کرتے، وہ پیسوں کو ٹھیکری کی طرح لٹا دیتے، ایک کی جگہ دس دیتے، دس کی جگہ سو اور جہاں خرچ نہیں کرنا ہے وہاں بھی خرچ کرتے۔۔۔اور گویا انسانوں کو یہ تعلیم دے رہے تھے کہ جب زندگی کا اعتبار نہ رہے، موت کا دن متعین ہو جائے، تو دنیا کی کسی چیز سے محبت نہیں کرنی چاہیے، کسی سے مروت نہ برتنی چاہیے۔ سارے لطیف جذبات کو کچل ڈالنا چاہیے، ارمانوں کا گلا گھونٹ دینا چاہیے اور اپنے کو خود فریبی میں مبتلا کرکے قہقہے لگانا چاہیے تاکہ موت کو بھی ایسی زندگی پر پیار آجائے۔

۔۔۔ہمارا گاؤں اس علاقے کا مہذب ترین گاؤں تھا۔۔۔رہن سہن، تعلیم، تربیت، کھیل کود، کسی چیز میں ایک شہری زندگی سے پیچھے نہ تھا اور پھر چونکہ شہر سے اس کا فاصلہ بھی چند ہی میل کا تھا۔ اس لیے یہ شہر کا ایک محلّہ سا معلوم ہوتا تھا، جو ذرا ہٹ کر الگ بس گیا ہو۔۔۔فوجی کیمپ سے گورے سپاہی اکثر ہماری طرف آجاتے تھے۔ پرانے خیال کے لوگ اکثر سراسیمہ سے ہو جاتے۔ چونکہ فوجی سپاہی اور خصوصاً گورے سپاہیوں کی دہشت پسندی ایک روایت کی طرح عرصہ سے چلی آتی تھی، لیکن میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انہیں بے ضرر پایا۔۔۔لاابالی پن اور بے فکری کے البتہ وہ عادی ہو چکے تھے لیکن یہ تو اس تعلیم کا اثر تھا جو انہیں صبح وشام دی جاتی تھی۔ ان گورے سپاہیوں میں طرح طرح کے لوگ تھے۔۔۔کوئی فٹبال میں ماہر تھا کوئی ماؤتھ آرگن بڑی خوبی سے بجالیتا اور کسی کو فوٹوگرافی سے دلچسپی تھی۔۔۔کوئی گھنٹوں بیٹھ کر گاؤں کے جنوبی سمت میں بنے ہوئے ایک خوبصورت تالاب کا نقشہ گاؤں سمیت اپنی پنسل کی لکیر سے اتارتا رہتا اور کوئی پاس کے آموں کے باغ میں بیٹھ کر انگریزی گیت گاتا۔۔۔اور میں اکثر سوچا کرتا کہ ان فنون لطیفہ کو میدان جنگ سے کیا تعلق ہے۔۔۔ یہ آرٹ، یہ موسیقی، یہ ادب۔۔۔ کیا ان کا توپوں، ٹینکوں اور بموں سے بھی کوئی رشتہ ہے!

۔۔۔ہمارے گاؤں کے مہذب لوگوں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔۔۔اکثر ہمارے اور ان کے درمیان فٹ بال کا میچ ہو جاتا، کبھی ہاکی کا کھیل ہوتا اور اس طرح ہم گھل مل گئے۔ ان گورے سپاہیوں میں ایک سے مجھے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہ تھا

گائیلس نامی سپاہی۔۔۔بات یہ تھی کہ گائیلس ماؤتھ آرگن بڑی اچھی طرح بجالیتا تھا اور مجھے بھی ہلکی پھلکی موسیقی سے بڑی دلچسپی رہی ہے لیکن گائیلس زیادہ تر ورڈسورتھ کی مشہور نظم ''لوسی گرے'' بجایا کرتا۔ جانے کیوں اسے اس نظم سے اتنا پیار کیوں تھا۔۔۔شاید اس لیے کہ لوسی اس کی اپنی بچی کا نام تھا، لوسی جسے وہ ایک سال کی عمر میں چھوڑ کر فوج میں چلا آیا تھا۔ لوسی جس سے اس کو بے انتہا محبت تھی۔ لوسی جو اس کی کامیاب رومانی شادی کی نشانی تھی، لوسی جو اسے چھوڑ کر نہیں گئی تھی، بلکہ وہ اسے چھوڑ کر آیا تھا۔۔۔اتنی دور۔۔۔میدان جنگ میں اپنے پیار کرنے والے ہاتھوں سے اپنی لوسی جیسی کتنی لوسیوں کو مارنے۔۔۔لیکن وہ کیوں آیا تھا، مجھے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور شاید وہ اس کا جواب نہیں دیتا۔۔۔!

دھیرے دھیرے ہمارے تعلقات بہت گہرے ہوگئے۔۔۔گائیلس کی میں اکثر دعوت کر دیتا اور وہ بھی ہم سے بڑے خلوص سے ملتا۔۔۔میرے بچے اسے انکل گائل کہا کرتے تھے۔۔۔میری سب سے چھوٹی بچی سلمیٰ سے اسے پیار سا ہوگیا تھا۔ سلمیٰ جو بمشکل آٹھ سال کی ہوگئی، سلمیٰ جس میں اس نے اپنی لوسی کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔۔۔وہ اسے پیار سے سلومی کہا کرتا تھا۔۔۔وہ جب بھی آتا میرے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ لیے آتا۔۔۔کبھی بسکٹ، کبھی چاکلیٹ، کبھی ٹافی، کبھی دودھ کا ٹین۔ کبھی چھوٹے چھوٹے ماؤتھ آرگنس۔۔۔میں ہر بار منع کرتا، لیکن وہ نہیں مانتا تھا اور میں بھی اس کی دل آزاری کے خیال سے یا خلوص کی نذر سمجھ کر خاموش ہو جاتا۔ وہ آتا تو اپنے مخصوص لہجے میں سلومی کو پکارتا اور پاس بٹھا کر دیر تک پیار کرتا رہتا۔ اس کے ریشم جیسے نرم، سنہرے بالوں کو سنوارتا، گالوں کو تھپتھپاتا، اور سلومی سے ہلکی پھلکی انگریزی میں بات کرنے لگتا، وہ ہماری زبان مشکل سے بول سکتا تھا، ہاں اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔۔۔سلمیٰ ایک دو سال تک کانونٹ میں انگریز اور غیر ملکی بچوں کے ساتھ پڑھ چکی تھی۔ اس لیے انگریزی بول لیتی تھی۔۔۔سلمیٰ کے لیے انکل گائل پیاری پیاری تصویریں لاتے۔۔۔مختلف ممالک کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوبصورت پھولوں کی، اور وہ انہیں بڑی حفاظت سے رکھتی۔ ایک بار گائلس نے بڑی پیاری سی تصویر دکھلائی، جسے اس نے بڑے اہتمام سے ایک خوبصورت سے منی پرس میں رکھا تھا۔ اس تصویر میں وہ خود تھا، ایک حسین سی عورت تھی اور ایک بہت ہی پیاری سی بچی، جوان دونوں کے پاس ہی کھڑی تھی۔ یہ گائیلس کی اپنی گھریلو تصویر تھی۔ جس میں وہ خود ملکی لباس میں تھا۔ اس کی بیوی ایک عمدہ قسم کے گاؤن میں ملبوس تھی اور اس کی ننھی سی بچی ایک اچھا سا فراک پہنے تھی۔۔۔تینوں کے چہروں سے مسرت اور اطمینان کی روشنی عیاں تھی۔ جیسے امن اور سکون کی دیوی ان پر اپنا مقدس ہاتھ رکھے ہوئے ہو۔ وہ اسی طرح امن و امان کی زندگی گزار رہے تھے، ان کی محبت کی نشانی لوسی ابھی ایک ہی سال کی تھی کہ جنگ کے دیوتا نے اپنا خوفناک دہانہ کھول دیا جس کے بھرنے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے لوگ سمٹ کر آنے لگے، اور انہیں کے گروہ میں گائیلس بھی تھا۔ گائیلس کے لیے وطن سے دور صرف یہی ایک نشانی تھی۔۔۔یہ تصویر جو اسے ہر وقت مسرور رکھتی، جانے وہ کن امیدوں پر جی رہا تھا۔ ایک روز وہ اپنی بچی سے ضرور ملے گا یہ یا کچھ اور!

۔۔۔گائیلس کو سلمیٰ سے والہانہ لگاؤ تھا، جیسے وہ اس کی اپنی بچی ہو۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا۔۔۔اس کو کسی روز سلومی کو دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔۔۔سلمیٰ کے سر میں ذرا سا درد ہوتا تو اسے تشویش ہو جاتی۔۔۔اس نے سلمیٰ کو ورڈسورتھ کا گیت ''لوسی گرے'' سکھانے کی بہت کوشش کی، اور وہ بڑی حد تک اسے گا لیتی تھی۔ لیکن جب وہ اس حصہ پر پہنچتی، جہاں پر شاعر نے کہا ہے

THEY WEPT AND TURNING HOMEWARDS CRIED "IN HEAVEN WE SHALL MEET" (وہ رونے لگے اور یہ کہتے ہوئے گھر کی طرف واپس ہوئے، ''ہم جنت میں ضرور ملیں گے'') تو گائیلس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے۔ لیکن وہ فوراً مسکرانے لگتا، جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

۔۔۔ایک دن وہ آیا تو سلمیٰ کو ہلکا سا بخار تھا۔۔۔گائیلس بڑا ہی جذباتی تھا، وہ مجھ پر بہت خفا ہوا، اور اچھے سے ڈاکٹر کو

بلانے کے لیے کہا، خود ایک ڈاکٹر لانے کو تیار ہوگیا، لیکن میں نے اس کو اطمینان دلایا۔۔۔بہر حال کسی طرح وہ مان گیا۔۔۔جانے کیوں وہ اب اداس سا رہنے لگا تھا۔ مجھے بڑی فکر ہوئی، اور میں نے بار بار پوچھا لیکن اس نے قطعی نہیں بتلایا۔۔۔ایسا لگتا تھا، جیسے وہ شدید بحران سے گزر رہا ہو، جیسے وہ بڑے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو، جیسے وہ سخت کشمکش میں پھنس گیا ہو۔۔۔بعد میں مجھے اتنا معلوم ہو سکا کہ اب اس کے جانے کی خبریں آ رہی ہیں۔۔۔!

ادھر وہ خلاف معمول چند دنوں سے ہمارے یہاں نہ آ سکا تھا۔۔۔سلمیٰ بھی اکثر پوچھا کرتی تھی، انکل گائل کیوں نہیں آتے، اور خود مجھے بھی فکر تھی کہ کہیں یہ فرشتوں کا سا پیار ختم نہ ہو جائے۔ کہیں اس معصوم محبت کا خاتمہ نہ ہو جائے کہیں یہ مقدس رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔۔۔آخر وہ آ گیا۔۔۔گائیلس اپنی سلومی کو دیکھنے لیکن سلومی بیمار تھی، اسے کئی روز سے بخار تھا، اور آج بہت تیز ہو گیا تھا۔ زیادہ بخار کی وجہ سے وہ اپنے ہوش میں نہ تھی اس کے سر پر اسپرٹ کی پٹی رکھی جا رہی تھی۔ وہ آتے ہیں اپنا توازن کھو بیٹھا۔۔۔وہ بے اختیار چیخنے لگا۔ IT'S YOUR FAULT... IT'S YOUR''' YOU ARE KILLING MY CHILD... MY CHILD... MY SLOME (یہ تمہارا قصور ہے، صرف تمہارا، تم میری بچی کا مار رہے ہو۔۔۔میری بچی، میری سلومی۔۔۔) اور وہ سلمیٰ کے پاؤں پر جھک گیا اور اپنے چہرے پر رگڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، جیسے آنسوؤں کی مدد سے سلمیٰ کو اچھا کر دے۔۔۔کچھ دیر بعد سلمیٰ کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس نے اس کی پیشانی کو چوم لیا اور کہنے لگا.... I'M HERE MY CHILD...I'M HERE... (میں آ گیا ہوں، میری بچی میں آ گیا ہوں۔۔۔) اور سلمیٰ سچ مچ اب اچھی ہونے لگی۔ جیسے اسے بھی اس کی جدائی کا غم تھا اور بس۔۔۔اس دن گائیلس بہت رات گئے کیمپ گیا، جس کے لیے افسر سے بڑی جھڑپ ہو گئی۔۔۔اور اس کے ادھر ادھر جانے پر پابندی بھی لگا دی گئی۔۔۔چونکہ جلد ہی اس کو کیمپ چھوڑ دینا تھا۔۔۔لیکن دوسرے دن صبح سویرے وہ میرے یہاں پہنچ گیا۔۔۔اس کا ذہنی توازن ختم ہو چکا تھا۔۔۔اس کے پیچھے کئی سپاہی اسے پکڑنے آئے، چونکہ وہ بہت سی گولیاں لے کر آیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر نزدیک کے باغ میں چلا گیا، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، بالآخر بے اختیار ان گولیوں کو آسمان کی طرف چلا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔۔۔ I'LL NOT GO... I'LL NOT... YOU WILL KILL ME... I'LL NOT GO... I'LL NOT... I'M COMING MY CHILD, MY SLOME... MY CHILD, MY LUCY... MY LOCY... MY SOLE... MY CHILD... (میں نہیں جاؤں گا۔۔۔تم مجھے مار ڈالو گے، تم مجھے میری بچی سے الگ کر دو گے، میں نہیں۔۔۔میں آ رہا ہوں، میری بچی، میری سلومی، میری لوسی، میری لوسی، میری بچی) اور بالآخر سب گولیاں ختم ہو گئیں، اور دوسرے سپاہی اسے پکڑ کر لے گئے۔ اور وہ چیختا رہا میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ مجھے اپنی بچی سے ملنا ہے۔۔۔میں نہیں۔۔۔اس واقعے کی خبر سلمیٰ کو نہ دی گئی چونکہ وہ بیمار تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اسے کسی طرح بتلایا گیا تو وہ بہت روئی۔۔۔وقت نے دھیرے دھیرے اس کے دل سے اس نقش کو ہلکا کر دیا لیکن آج جب وہ امن کے موضوع پر ایک نظم لکھ کر لائی ہے۔ ''انکل گائل کے نام'' تو اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور میں سوچ رہا ہوں وہ ہاتھ کتنے مقدس ہیں جو سلمیٰ اور لوسی سے ایک طرح سے پیار کرتے ہیں۔ ان ہاتوں سے کتنے مختلف جو ایٹم اور ہائیڈروجن بناتے ہیں۔

☆☆☆

مٹی کا زنگ

مرزا حامد بیگ

یہ سب جیسے اچانک ہی ہوا۔ ریلوے اسٹیشن پر معمول کی زندگی نے یکلخت کروٹ لی اور بھرتے ہوئے چہروں اور نیند سے بوجھل آنکھوں والے مسافروں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوتا چلا گیا۔

رات کا پہلا پہر ہوگا، جب یہ واقعہ پیش آیا۔

دور کے سفر پر نکلنے والے مسافروں اور اسٹیشن کے عملے کے لیے یوں تو یہ کوئی انہونی بات نہ تھی لیکن پھر بھی ایسا بہت کم ہوا ہے کہ یوں اچانک ہنستا بولتا ہوا کوئی شخص یکلخت چپ ہو جائے اور پتا چلے کہ مر گیا۔

لدے پھندے ٹھیلوں کو دھکیلنے والے قلی، پان بیڑی سگریٹ اور نان پکوڑہ بیچنے والے چھوکرے، ٹی سٹال کے کارندے، ڈاک بابو، ٹکٹ کلکٹر اور شام کا اخبار بیچنے والے لڑکے، سب حیران رہ گئے۔

لوگوں کا ایک ہجوم تھا، جس کے بیچ یوں اچانک دم دے جانے والا ادھیڑ عمر کا مسافر، لوہے کے ایک خالی بینچ پر سر نیوڑھائے بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ جیسے زندہ ہو اور کسی گہری سوچ میں ہو۔

''یہ آیا کہاں سے ہے؟''

''آیا نہیں۔ شاید جا رہا تھا''۔

''کہاں جا رہا تھا؟''

''خدا جانے''۔

''جیب میں دیکھ لیتے۔ شاید کوئی کاغذ کا پرزہ۔۔۔''

''نہیں۔۔۔ سب دیکھ لیا''۔

بھانت بھانت کی آوازیں تھیں اور طرح طرح کے سوالات۔

''اس کا سامان بھی تو ہوگا ساتھ''۔

''کوئی لے اڑا شاید''۔

''اس کے برابر میں بھی تو کوئی بیٹھا ہی ہوگا۔ کسی نے دیکھا نہیں۔ کیسے ہوا یہ سب؟''

سفید بھوؤں والے ایک بزرگ نے پوچھا۔ جواب میں سب چپ تھے۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''وضع قطع سے تو مقامی آدمی دکھائی دیتا ہے''۔

''ہاں۔ شاید''۔

''واچ اینڈ وارڈ کی اطلاع کرو بھائی''۔ ایک نے مشورہ دیا۔

''آئے تھے دو وردیوں والے۔ دیکھ دا کھ کر چلے گئے''۔

''چلے گئے۔۔۔ وہ کیوں؟''

''وہ کہہ رہے تھے، یہ ہمارے تھانے کی حدود کا معاملہ نہیں ہے۔ کہیں دور سے لایا گیا ہے ٹرین پر، اور یہاں لا کر اس بینچ پر بٹھا گئے''۔

''نا بھئی، ایسا کچھ ممکن نہیں''۔

''یہاں کیا ممکن نہیں ہے صاحب۔ ہو سکتا ہے آدھ گھنٹہ پہلے کراچی کی طرف نکل جانے والی اٹھارہ ڈاؤن خیبر ایکسپریس پر اسے لائے ہوں اور یہاں بٹھا گئے ہوں''۔

''ارے نہیں بھئی۔۔۔گزشتہ ایک گھنٹے سے تو ہم لوگ دیکھ رہے ہیں اسے۔ ہم سے پہلے پولیس والے پڑتال کر گئے۔ شاید اس سے بھی پچھلی گاڑی پر لایا گیا ہو''۔

''لیکن یہ کوئی بات تو نہ ہوئی نا۔ وہ آئے بھی اور دیکھ کر نکل لیے۔ ان کا کام تھا، تفتیش کرتے''۔

''تفتیش کرتے۔۔۔واہ۔۔۔کیس ہو کسی اور علاقے کا اور یہ بلاوجہ ہلکان ہوتے پھریں۔ کہاں پتا کرتے پھریں دوسروں کی حدود میں؟''

''آپ بہت حمایت کر رہے ہیں پولیس والوں کی''۔

''اچھا بھئی نہیں کرتا حمایت۔ یہ ڈاک گھر کے پچھواڑے، واچ اینڈ وارڈ کا کمرہ ہے۔ جائیے بلا لائیے انہیں۔ اگر آپ کے کہے پر آتے ہیں تو۔۔۔''

''ارے نہ آئیں۔ نہیں آتے تو۔۔۔حق بات تو کرنی چاہیے نا۔۔۔''

''حق بات۔ ٹھیک کہا آپ نے۔ آپ دیں گے گواہی، اس بات کی کہ مرنے والے کو آپ نے اس بینچ پر بیٹھے دیکھا؟''

''میں کیوں دوں گا گواہی؟ خواہ مخواہ۔۔۔سب دیکھ رہے ہیں۔۔۔ہم اتنے سارے لوگ''۔

''اچھا۔۔۔ٹھیک ہے۔ چلیں میرے ساتھ کون کون چلے گا۔ بلا کر لاتے ہیں دوبارہ انہیں۔ لیکن اپنی بات پر قائم رہیے گا''۔

وہ بھنایا ہوا نوجوان مجمع کو چیرتا ہوا چلا۔

''آیئے۔۔۔آئیں میرے ساتھ۔۔۔آتے کیوں نہیں؟''

اس نے ہجوم کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا نکل گیا۔ اب ہجوم بکھرنے لگا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وردی والے آ ہی نہ جائیں۔ کوئی پانی کی صراحی بھرنے نل کی طرف ہو لیا۔ کسی نے اپنے بچے کو انگلی سے لگایا اور اپنے سامان کے گرد منڈلانے لگا۔ کسی کو نان پکوڑے بندھوانے تھے، وہ ادھر نکل گیا۔ غرضیکہ سب کو کوئی نہ کوئی کام یاد آ گیا۔

سب دور سے کھڑے کن اکھیوں سے دیکھ رہے تھے اسے، اور وہ لوہے کی خالی بینچ پر سر نیوڑھائے، بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ جیسے زندہ ہو، اور کسی گہری سوچ میں ہو۔ اس اثنا میں ایک پسنجر گاڑی آ کر رکی اور کافی دیر ٹھہری رہی۔

''چائے والا۔۔۔چائے''۔

''پان، بیڑی، سگریٹ''۔

''اے چائے والے''۔

''ٹھنڈی بوتل''۔

''قلی۔۔۔ارے قلی۔۔۔قلی۔۔۔''

گاڑی کیا آئی، ریلوے اسٹیشن کی چہل پہل بحال ہو گئی۔ پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے ایک مسافر نے وقت گزاری کی

خاطر جیسے بات چلائی۔
''ارے بھئی کے گھنٹے لیٹ ہے، آپ کی پسنجر؟ اسے تو خیبر میل سے پہلے پہنچنا تھا نا؟''
''کیا پوچھتے ہیں صاحب۔ کچھ تو پہلے سے لیٹ تھے اور کچھ خیبر نے لیٹ کروا دیا۔ بائی پاس پر رکے رہے، اس کے انتظار میں۔ وہ گزر گئی تو چلی ہے اپنی گاڑی۔۔۔'' ایک اکتائے ہوئے مسافر نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔
''کوئی پوچھنے والا نہیں صاحب''۔
''ہاں جی۔ بس اللہ کے آسرے پر چلے جاتے ہیں''۔
''غضب خدا کا۔۔۔ وہ دیکھ رہے ہیں نا آپ۔۔۔ وہ سامنے بینچ پر۔۔۔ وہ جو سر نیوڑھائے بیٹھا ہے نا بھلا مانس۔۔۔ وہ زندہ نہیں، مر چکا ہے''۔
''ہیں؟ وہ کیسے؟''
''خود دیکھ لیجئے، گاڑی سے اتر کر''۔
''کیوں جی۔۔۔ کیا واقعی وہ مر گیا؟''
رکی ہوئی پسنجر ٹرین کے مسافروں نے ہڑبڑا کر حیرت کے ساتھ کھڑکیوں میں سے باہر جھانکا اور دروازے کا رخ کیا۔ ایک بار پھر جمگھٹا سے لگ گیا اسکے گرداگرد۔
''کہاں جا رہا تھا؟''
''جا نہیں رہا تھا، بلکہ لایا گیا ہے، اسی حالت میں''۔
''اسی حالت میں؟ یعنی مر چکا تھا اور یہاں اتار گئے؟''
''جی ہاں۔ سنا تو یہی ہے''۔
''کوئی پولیس کو اطلاع کرو بھائی''۔
''آئے تھے۔ پڑتال کر گئے ہیں۔ پھر پلٹ کر نہیں آئے''۔
''کوئی اور جاؤ، ان کے پیچھے۔۔۔ مٹی ٹھکانے لگ جائے''۔
''گئے تھے ایک صاحب۔ لوٹ کر نہیں آئے''۔
''دھر لیا ہوگا، بیچارے کو ناحق''۔
''جان چھڑانی مشکل ہوگئی ہوگی''۔
''ایسے میں کون دیتا ہے گواہی''۔
اب گاڑی نے وسل دے دی تھی اور گارڈ انجن کے رخ پر سبز روشنی دکھاتا ہوا اپنے ڈبے کی طرف چل پڑا تھا۔
''گواہی کی کیا بات ہے صاحب۔ ہم دے دیتے۔ ایک انسان کا معاملہ ہے''۔
''لیکن ہم نے تو آگے جانا ہے۔ جا رہے ہیں بچوں کے ساتھ''۔
اب گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔
''لو، اپنی گاڑی تو چل دی۔۔۔ کچھ کیجئے گا صاحب''۔
''ارے مل کر چلے جاؤ نا سب کے سب۔ ثواب کا کام ہے''۔

یہ سب آوازیں چلتی ہوئی گاڑی کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے آرہی تھیں اور بچے کھچے لوگوں کا ہجوم، اس لوہے کی بھاری بینچ کے گرد خاموش کھڑا تھا۔

گاڑی چلی گئی تو ایک کرنجی آنکھوں والے منحنی سے شخص نے بات چلائی۔

''اس کا سامان بھی تو ہوگا ساتھ کچھ دیکھ دا کھ کر معلوم کر لیتے کہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے''۔

''شاید کوئی لے اڑا سامان''۔

''ہے ہے، کیا زمانہ آگیا صاحب۔ مردوں کو بھی نہیں بخشتے''۔

''جیب سے کچھ نکلا؟''

''آئے تھے دوور دی والے۔ پڑتال کر گئے۔ شاید کچھ پتا ٹھکانہ نکلا ہی ہو۔ لیکن وہ کہہ رہے تھے، یہ کیس ہماری حدود کا ہے نہیں''۔

''حدود کیسی؟''

''حد ہوتی ہے نا اپنے اپنے تھانے کی۔ پرائے لفڑے میں کون پڑتا ہے''۔

''پرایا لفڑا؟ وہ کیسے؟ کام ہے ان کا''۔

''ہوگا صاحب۔ مجھ پر کیوں خفا ہوتے ہیں آپ؟''

''عجیب بات کرتے ہیں آپ بھی۔ ہوگا کیا، کام ہے ان کا''۔

''مجھے معاف رکھیے صاحب۔ غلطی ہوگئی کہ آپ نے پوچھا اور میں نے جواب دے دیا''۔

''اجی چھوڑیئے۔ میں دیکھتا ہوں۔ لاتا ہوں ابھی انہیں اپنے ساتھ''۔

کرنجی آنکھوں والا منحنی شخص چل دیا ایک طرف۔ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے۔

''جلد واپس آجایئے گا''۔ کسی نوجوان نے چوٹ کی۔

''آرہا ہوں، اور دیکھ لیتا ہوں تمہیں بھی''۔

''ارے خاک آئیں گے آپ۔ بہت سے یہ کہہ کر اور بھاگ لیے''۔ نوجوان آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

ہجوم، ایک بار پھر بکھرنے لگا تھا۔ مبادا وہ لوٹ آئے، اپنے ساتھ واچ اینڈ وارڈ والوں کو لیے ہوئے۔

اب اکا دکا افراد دور سے کھڑے، چور نظروں سے دیکھ رہے تھے اسے، اور وہ، لوہے کی خالی بینچ پر سر نیوڑھائے بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا جیسے زندہ ہو۔

رات کا دوسرا پہر ہوگا، جب پہلے تو شنٹنگ کرتا ہوا ایک انجن گزرا اور اس کے بعد میں ڈاؤن چناب ایکسپریس کی متوقع آمد سے متعلق گھنٹی ہوئی۔ چناب نے دوسری پلیٹ فارم پر رکنا تھا۔ اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے ادھر کی رونق برابر والے پلیٹ فارم پر منتقل ہوگئی۔ دونوں پلیٹ فارموں کے درمیان گہرائی میں پٹریاں بچھی ہوئی تھیں اور لوہے کا اونچا جنگلہ سر اٹھائے کھڑا تھا۔

پان، بیڑی، سگریٹ بیچنے والے چھوکرے، رابطہ پل پر سے ہوتے ہوئے، اب اپنی چھابڑیوں کے ساتھ ادھر چلے گئے تھے۔ چائے، نان پکوڑے اور ٹھنڈی بوتل کی آوازیں بھی ادھر ہی سے آرہی تھیں۔ پھر درمیان کی پٹڑی پر چناب آگئی اور اس طرف مکمل ویرانی چھا گئی۔

سیمنٹ کے اونچے چھجوں سے جھانکتی ہوئی میلی زرد روشنیوں میں بھاری بینچ پر وہ سر نیوڑھائے بیٹھا تھا کہ اچانک ڈاک گھر کے پچھواڑے سے نکل کر آتے ہوئے چند وردی والے اس کی طرف لپکے۔ ایک کے ہاتھ میں سندھی ٹوپی تھی، جو اس کے سر

پر رکھ دی گئی۔ پھر سب نے مل کر اسے اٹھایا جیسے کسی معذور کو اپنے ساتھ سہارا دے کر لیے جاتے ہوں۔

وہ سب بہت جلدی میں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے، رابطہ پل پر سے گزار کر وہ اسے دوسری طرف لے گئے اور کھڑی ہوئی ٹرین کے چلنے سے پہلے ایک پرسکون ڈبے میں سوار کروا دیا۔ اسے اٹھا کر لے جانے کا منظر شاید کسی نے دیکھا ہو یا شاید سب کی نظر ہی چوک گئی۔

اگلے روز رات کا پہلا پہر ہوگا۔ وہی پلیٹ فارم تھا اور وہی لوہے کا بھاری بینچ، جس پر پختونوں والی ٹوپی اوڑھے ایک مسافر، سر نیوڑھائے بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا جیسے زندہ ہو اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہو۔

پان، بیڑی، سگریٹ کی چھابڑی اٹھائے ہوئے ایک لڑکے نے قریب سے گزرتے ہوئے اسے پہچان لیا۔

"ارے، یہ تو وہی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے، لڑکے نے بساند سے بچنے کے لیے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر لدے پھندے ٹھیلوں کو دھکیلنے والے قلی، نان پکوڑہ بیچنے والے چھوکرے اور ٹی سٹال کے کارندے سب اکٹھے ہو گئے۔

"یہ آیا کہاں سے؟" کسی نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"خدا جانے صاحب"۔

"وضع قطع سے تو پختون دکھائی دیتا ہے"۔

"ہاں۔۔۔شاید"۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرداگرد، ستے ہوئے چہروں اور نیند سے بوجھل آنکھوں والے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆
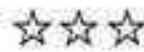
سیاہ آنکھ میں تصویر

مستنصر حسین تارڑ

لارنزد کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

انہوں نے اسے صلیب پر میخوں سے گاڑنے کی بجائے ایک رسہ لٹکا کر پھانسی دی تھی۔ میخیں مہنگی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ گاڑی جائیں تو آسانی سے اکھڑتی نہیں۔ ضائع ہو جاتی ہیں۔ رسہ سستا ہوتا ہے۔ پھانسی دینے کے لیے کوئی اور مجرم نہ بھی ملے تو اس کے ساتھ ڈول باندھ کر کنوئیں سے پانی نکالا جا سکتا ہے۔

اس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں۔

گردن ایک ایسے زاویے پر ڈھلکی ہوئی تھی دور سے لگتا جیسے وہ ہنستے ہنستے ایک دم تر چھا ہو کر ساکت ہو گیا ہو۔۔۔ جیسے کسی ''وچ ڈاکٹر'' نے چیتھڑوں سے بنے ہوئے گڈے کو رسے سے باندھ کر لٹکا دیا ہو۔۔۔ اور وہ بے اختیار جھولتا رہے۔

اس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں۔

خانہ بدوشوں کے غاروں کے دہانے ششدر، حیرت زدہ کھلے تھے۔ جیسے ہابیل کے قتل پر پہاڑ کا منہ کھل گیا۔ زبان باہر لٹک گئی تھی۔ سنگلاخ سینے میں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

مقدس پہاڑی کے دامن میں البسین کا مورش محلہ دھوپ میں سفید ہو رہا تھا۔ قدموں میں دریائے حدرہ کے پانی تھے۔ سامنے جبل سلیقہ پر سرخ پتھر کا معجزہ، قصر الحمراء کی گرمی میں پھنک رہا تھا۔۔۔ مگر لارنزدان سب سے لاتعلق مردہ آنکھیں کھولے جھولتا رہا۔

شارع چاپیر کے پگھلے ہوئے کولتار پر ابھی تک شراب کے خالی ڈرم، ریت کی بوریاں اور گھریلو فرنیچر بکھرا پڑا تھا۔۔۔ لیکن کہیں کہیں خون کے دھبے تھے سوکھے ہوئے جیسے کسی بڑھیا کے لپ سٹک زدہ ہونٹوں پر پپڑیاں ابھرتی ہیں۔ البسین سپاہیوں نے کئی روز تک فرانکو کی ماہر افواج کا مقابلہ کیا۔

یہاں تک کہ وہ پورے غرناطہ سے کٹ کر استقامت کا ایک جزیرہ بن گئے۔ فاشسٹوں نے دریائے حدرہ میں سے سانس لینے والے پانی کے پائپ کاٹ دیئے تھے، اور جب متعدد بچوں کے پیاسے مرنے کے باوجود انہوں نے ہتھیار نہ ڈالے تو البسین پر ہوائی جہازوں سے بم برسائے گئے۔۔۔ بیری کیڈ ٹوٹی تو اس کے ساتھ ہی گھروں کی سفیدی کی ہوئی چمکتی دیواروں پر مکینوں کے خون اور گوشت کے چیتھڑے یوں برسے کہ ان پر گہرے ملکے اور شوخ سرخ رنگوں کی تصویریں ابھر آئیں۔ جنہیں آنے والی نسلوں نے مٹانے کی کوشش کی۔۔۔ ان پر قلعی کے کئی لیپ پھیرے مگر انکے رنگ اور گہرے۔۔۔ مزید شوخ ہوتے چلے گئے۔ الحمراء کے برجوں تلے، غرناطہ کے میونسپل قبرستان میں روزانہ سینکڑوں افراد آزادی سے سانس لینے کی خواہش کی پاداش میں اپنے جسم میں داخل ہونے والے سیسے کے بوجھ سے سرنگوں ہوتے رہے۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر عرب عہد کے ایک پر فضا تالاب کے کنارے بھی فاشسٹوں نے آزاد خون کو منجمد کیا اور پھر اسے ایک اجتماعی قبر میں بل ڈوزروں سے دھکیل دیا۔ ان سینکڑوں لاشوں میں گارسیا لورکا کا مردہ جسم بھی تھا۔ بل ڈوزر کے سرد بلیڈ لورکا کے سرد تر جسم میں کھبنے پر بھی نہ جان سکے کہ یہ ایک شاعر کا بدن ہے کہ اس کے مرنے پر سوگواروں نے کہا تھا، گارسیا لورکا مر گیا اب غرناطہ بغیر دل کے ہے۔

لارنزد کی سیاہ مرجھاتی ہوئی سکڑتی آنکھوں کے سامنے اس کا محلہ البسین سناٹے کے سمندر میں دبکے ہوئے ایک ویران

جزیرے کی مانند آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ قدیم مورش حویلیاں سنسان پڑی تھیں اوران کے خاموش فواروں کے سوکھے ہوئے تالابوں میں بچوں کی لاشیں منہ کھولے دھوپ میں اکڑ رہی تھیں۔ مکانوں کے دروازے کھلے تھے اور مکینوں کے پھٹے ہوئے جسم چوکھٹوں پر اوندھے پڑے تھے۔ سوکھی ہوئی نالیوں کی پیاس کے لیے گاڑھا خون ناکافی تھا کہ مکانوں میں سے نکلتے ہی وہ سرخ چھچھڑوں میں بدل چکا تھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ صرف مقدس پہاڑی پر کلیسا کا گھڑیال فتح کی خوشی میں جھول رہا تھا اور اس کی گونج البسین کی فضاؤں میں بھوکے گدھ کی طرح تیر رہی تھی۔ لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

لارنزو کو ہسپانوی خانہ جنگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے نہ تو ذی۔۔۔ سے کوئی خاص انس تھا اور نہ ہی وہ فرانکو کے بارے میں اچھے یا برے جذبات رکھتا تھا۔ اسے تو نیشنلسٹ اور ری پبلکن کے الفاظ ادا کرنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی۔۔۔ وہ سیدھا سادا خانہ بدوش تھا۔ موسم گرما میں ملک کے طول وعرض میں منعقد ہونے والی گھوڑوں کی منڈیوں میں جا کر دہقانوں کو عمدہ نسل کے گھوڑے خریدنے میں مدد دیتا۔ مشوروں کی فیس وصول کرتا اور فرصت کے لمحات میں انہی دہقانوں کی جیبیں کاٹتا۔ سردیوں میں وہ اپنے مختصر غار میں بیٹھ کر بے تحاشا وینو پیتا اور شام کو اپنی بیوی اور بیٹی کو عصمت فروشی کے لیے بھیج کر خود مزید وینو پیتا اور بالآخر مدہوش ہو کر سو رہتا۔ کہنے کو تو اس کے ہاں دس بچوں نے جنم لیا مگر وہ ہر بچے کی پیدائش پر اس کا ناک نقشہ دیکھ کر پہلے اطمینان کر لیتا کہ نومولود اسی کا ہے۔ اگر خدوخال میں اس کی سیاہ آنکھوں اور خنجر کی نوک ایسی ناک کا کوئی شائبہ نظر نہ آتا تو وہ اسے بلا تکلف کسی اور خانہ بدوش کو تحفتاً دے دیتا۔۔۔ لڑکے جیبیں کاٹنے کے لیے موزوں تھے۔ اور لڑکیاں ظاہر ہے عصمت فروشی کے لیے۔۔۔ یوں اس کے پاس اس چھان پھٹک کے بعد صرف دو بیٹے آرتورو اور آندریس اور ایک بیٹی آوے لا بچی تھی۔ خانہ بدوشوں میں اس کی شرافت کا چرچا تھا کہ وہ بچوں کو اغواء کرنے کا بے حد مخالف تھا اور جوانی کے ابتدائی ایام کے سوا اس نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔۔۔ زندگی بے حد پرسکون اور خوشگوار تھی مگر ایک روز جب وہ اپنے غار میں وینو کے نشے میں دھت لیٹا گٹار پر فلیمنکو کی دھن بے حد اوٹ پٹانگ طریقے سے بجا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس اداس دھن کے پس منظر میں کوئی ہولے ہولے پٹاخے چھوڑ رہا ہے۔ پہلے تو وہ اسے خمار آلود ذہن کے کابلاتے خون کا کرشمہ سمجھا مگر جب آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں تو وہ گٹار کی ٹیک لگا کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر آ گیا۔ تیز دھوپ اس کی سرخ آنکھوں میں باندریلو کی برچھیوں کی طرح کھب گئی۔ البسین کے چند مکانوں کی سفید دیواروں کو دھواں چاٹ رہا تھا۔ گولیوں کی آواز بھی ادھر سے ہی تیرتی آ رہی تھی۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا غار میں واپس آ گیا اور کچے فرش پر اوندھا لیٹ کر خنکی کو سونگھتا ہوا اونگھنے لگا۔ اس کے دونوں بیٹے جونزدیکی قصبے لوشہ میں ہونے والے ایک گھوڑوں کے میلے میں گئے تھے۔ شام کو لوٹے تو انکے چہرے اترے ہوئے تھے۔ پاپا، غرناطہ میں فرانکو کے فوجی داخل ہو گئے ہیں البسین کے باسیوں نے شارع چاپنیر پر بیری کیڈ کھڑا کر کے ان کا مقابلہ شروع کر دیا ہے۔۔۔ ہم بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں''۔

لارنزو نے سر میں پھٹتے درد کے گرم ریزوں کو ماتھے پر چپت لگا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور بیزاری سے بولا، ''یہ ہسپانویوں کی آپس کی لڑائی ہے ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق جتنے زیادہ مریں اتنا ہی بہتر ہے۔ لاشوں کی جیبیں کاٹنا نسبتاً آسان کام ہے''۔

تھوڑی دیر بعد آوے لا غار میں داخل ہوئی تو وہ بھی نچڑے ہوئے کپڑوں کی طرح سفید اور سلوٹوں سے بھرپور تھی۔

''دیکھو پاپا انہوں نے میرے کپڑے بھی پھاڑ دیئے''۔

لارنزو کو رہ رہ کر البسین کے باسیوں پر غصہ آ رہا تھا کہ یقینی شکست کا سامنا کرنے کے باوجود وہ اتنی ڈھٹائی سے بیری کیڈ کا دفاع کیوں کر رہے تھے۔ اور یوں وہ سارا دن غار کی تنہائی میں شراب سے لطف اندوز ہونے کی بجائے رفلیر ز کے کڑوے سگریٹ

پھونکتا رہتا کہ تمام اہل خانہ نے خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد غار سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز وہ تنگ آ کر اپنے پرشور غار میں سے باہر نکلا اور البسین کے گلی کوچوں میں بے مقصد گھومنے لگا۔ چند روز پیشتر کے چیختے چلاتے، پرہجوم اور زندہ البسین کی بجائے اس کے سامنے ایک مردہ محلے کے سناٹے تھے۔ صرف کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آتی اور بند ہو جاتی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ کا پتھر رکھ دیا ہو۔ ویرانی کے علاوہ اسے جس چیز نے حیرت زدہ کیا سوکھے ہوئے فوارے اور خشک نالیاں تھیں جو عربوں کے زمانے سے آج تک کبھی خشک نہیں ہوئی تھیں۔

''پانی کیوں نہیں چل رہا؟'' اس نے سوچا اور کندھے اچکا کر واپس غار کی جانب چل دیا۔

''پانی کیوں نہیں چل رہا؟'' اس نے بے دھیانی میں چھت کی طرف دیکھا جس کے ساتھ اس کا شراب کا مشکیزہ لٹک رہا تھا۔

''انہوں نے بند کر دیا ہے''۔ آرتو رو نے آہستہ سے کہا۔

''تم لوگ کیا پیتے ہو؟'' اس نے مشکیزہ اتار کر ایک طویل گھونٹ بھرا۔

'' کچھ بھی نہیں'' ان سب نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''پچھلے کئی روز سے پانی بند ہے۔ فوجیوں نے حدرہ سے پانی کھینچنے والے پائپ کاٹ دیئے ہیں''۔ آندریس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''البسین کے رہنے والے پیاسے ہیں۔ وہ اپنے باغوں میں سے پودے اکھاڑ کر ان کی جڑیں چوس رہے ہیں۔ بیری کڈ پر لڑنے والے نیم بیہوشی کے عالم میں ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ گئی ہیں۔ بچوں کی زبانیں ان کے منہ سے باہر لٹک رہی ہیں۔ مردہ سانپوں کی طرح''۔

''بچوں کی زبانیں؟'' لارنزو بوکھلا گیا۔ ''لیکن یہ تو ظلم ہے۔ ان کو تو پانی دینا چاہیے۔ بچے نیشنلسٹ یا ری پبلکن نہیں ہوتے۔۔۔ وہ تو صرف۔۔۔''

''ہمارا دماغ کیوں چاٹتے ہو، فرانکو سے جا کر پوچھو''۔ اس کی بیوی چیخی۔ ''کم از کم جب تک تمہارے درجن بھر مشکیزے خالی نہیں ہوتے تم پیاسے نہیں مرو گے''۔

''لیکن یہ تو ظلم ہے۔۔۔'' لارنزو الکحل سے پھولتی زبان بار بار لبوں پر پھیر کر بڑبڑاتا رہا۔

اس شب لارنزو نے دو خالی مشکیزے کاندھے پر رکھے اور مقدس پہاڑی پر اگے ہوئے تھوہر اور ناگ پھنی کے پودوں تلے پوشیدہ اس قدیم غار میں اترا جس کا علم پورے غرناطہ میں صرف اسے ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موروں کے زمانے میں متعدد زیر زمین راستے البسین کو دریا کے پار الحمراء کے سرخ ایوانوں سے ملاتے تھے۔ صدیوں کا بوجھ ان خفیہ راستوں پر بھی پڑا اور آہستہ آہستہ ان کے خالی پیٹ مٹی سے بھر گئے۔ عالم نوخیزی میں جب لارنزو نے اپنے ایک رقیب کو جسم میں میخیں گاڑ کر اسی کے دروازے پر مصلوب کیا تھا کہ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ایک ایسے راستے کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ زمین دوز راستہ اگرچہ بے حد مخدوش حالت میں تھا مگر لارنزو کا لچکیلا جسم اس میں سے ایک سیاہ ناگ کی طرح رینگتا بل کھاتا دریائے حدرہ تک پہنچ جاتا۔ وہ کئی ماہ تک اس سرنگ میں روپوش رہا۔ بعد میں یہ خفیہ پناہ گاہ اس کی محرم بن گئی۔ بیوی سے ڈانٹ پڑتی تو وہ چپ چاپ اس میں اتر کر پہروں کڑھتا رہتا۔ جسموں کے استعمال کے لیے بھی اس نے یہی جگہ مخصوص کر رکھی تھی۔ کبھی کبھار وہ تنہائی کا خواہش مند ہوتا تو شراب کا مشکیزہ کندھے پر ڈال کر اس میں غائب ہو جاتا۔ مگر اس شب اسکے کندھے پر صرف خالی مشکیزے تھے۔

رات گئے جب لارنزو اپنے غار میں واپس آیا تو اس کا نم آلود جسم مٹی میں یوں لتھڑا ہوا تھا جیسے وہ قبر میں سے نکل کر آیا ہو۔ اس نے مشکیزوں کو بمشکل کاندھے سے اتارا اور زمین پر لیٹ گیا۔ ''آرتورو!۔۔۔ تم سب لوگ ایک ایک گھونٹ بھر لو۔۔۔ ہم خانہ بدوش ہسپانویوں کی نسبت زیادہ سخت جان واقع ہوئے ہیں۔۔۔ باقی پانی البسین میں لے جاؤ اور پیاسے بچوں کے حلق تر کر دو

کہ بچے نیشلسٹ پارٹی پبلکن نہیں ہوتے۔

اگلے روز تک لارنزو کا یہی معمول رہا۔۔۔اور بالآخر فضائی حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے بیری کیڈ ٹوٹ گیا۔فرانکو کے فوجی البسین میں داخل ہو گئے۔

غار سے نکلنے سے پیشتر اس کے تینوں بچوں نے ایک مرتبہ پھر اس کی منت کی۔۔۔''پاپا وہ سب کو قتل کر رہے ہیں۔۔۔ ہم سیرانواداکی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے لیے جارہے ہیں تم بھی ساتھ چلو۔۔۔پاپا''۔

لارنزو کی الکحل سے پھولی ہوئی زبان بمشکل حرکت میں آئی۔''تم بزدل ہو۔۔۔وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔۔۔یہ ہسپانویوں کی آپس کی لڑائی ہے۔ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق؟''

لارنزو کو ملٹری ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا۔

''یہ شخص بیری کیڈ پر لڑنے والے کمیونسٹوں کو پانی سپلائی کرتا رہا ہے''۔

لارنزو کی لاش کئی دن تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

سیرانوادا پہاڑیوں کی پتھریلی عافیت میں اتر کر ان تینوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔مقدس پہاڑی کے سفید جسم پر گڑی صلیب سے لٹکتا ہیولا ایک پتلے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔صحرائی وسعتوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔ان تینوں نے انتہائی جغرافیائی حالتوں میں کئی ماہ تک روپوشی کا سفر کیا۔

ایک تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دوپہر نے انہیں دریائے حدرہ کے کنارے آباد قدیم قصبے ثوریا میں دیکھا۔دریا کا خنک پانی ان کے جھلسے ہوئے نیم سیاہ بدنوں میں جذب ہوا تو انہوں نے اپنے گرد نگاہ ڈالی۔۔۔پسینے سے نچڑتا ایک خاموش ہجوم مقامی بل رنگ کی جانب قدم گھسیٹ رہا تھا۔وہ تینوں ان گرم جسموں کے الاؤ میں گم ہو گئے۔

کھنڈر نما بل رنگ کا نصف حصہ سائے میں ستا رہا تھا اور بقیہ نصف حصے کو دھوپ کے جلتے لب چوس رہے تھے۔ اکھاڑے کے درمیان میں ایک سیاہ بل کا بھاری بھرکم دھیہ لرز رہا تھا۔۔۔اور اس کا کمر خمیدہ مالک ہاتھ فضا میں چھوئے شور مچا رہا تھا۔ ''آیئے اور اس بردتیو بل کے ساتھ دو دو ہاتھ کیجئے۔پانچ منٹ کے کھیل کے لیے صرف دس پسیتے''۔

دیہاتی نوجوان بوسیدہ پتلونیں اڑستے، غرور سے اپنی جنگلی گھاس بالوں پر ہاتھ پھیرتے اکھاڑے میں داخل ہوتے اور دس پسیتے مالک کی رالیں ٹپکاتی ہتھیلی پر رکھ کر پانچ منٹ کے لیے بل کے آگے پیچھے ہو ہو کر کے دوڑتے اپنی بہادری جتا کر ہانپتے ہوئے واپس اپنی نشستوں پر آبیٹھتے۔بڑے لڑکے آرتورو نے سیاہ آنکھیں میچ کر بل کو غور سے دیکھا۔''آندریس!''اس نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ کا گدھ بٹھاتے ہوئے کہا۔''فرانکو کیسا ہے؟''

آندریس کی آنکھوں سے سیاہ حیرت پھوٹی اور بہہ نکلی''مجھے کیا معلوم آرتورو، میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا''۔

''میں نے دیکھا تو نہیں لیکن جانتی ہوں''۔آوے لا نے گلے میں ہاتھ کی کپی اتاری اور پسینے سے شرابور چھاتیوں کو پونچھا۔''وہ اس موت کی طرح سیاہ ہے جس میں اس نے ہمارے پاپا کے جسم کو ڈبو دیا ہے''۔

آرتورو کی نشست پر اس کا بوجھ ختم ہو گیا وہ اٹھا۔پہچان کا لمحہ آن پہنچا تھا۔''ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لیے دشمن نہ مل سکے تو اس کی خصلت کے کسی اور شخص کو موت کے گھاٹ اتار دو''۔اسی لمحے اس کے شانوں کے ساتھ دو سر نمودار ہوئے جو آندریس اور آوے لا کے تھے۔''آرتورو تم نہیں جا سکتے''۔۔۔سیاہ بل بے حد طاقتور ہے''۔لیکن تین سروں کی اس

قطار میں سے ایک سر نے حرکت کی اور بل رنگ کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

آرتورو نے دس پیسے ہتھیلی کی رال پر چپکائے اور سیاہ بل کے سامنے گردن ٹیڑھی کر کے کھڑا ہو گیا۔۔۔بل کی چمکتی آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا۔۔۔لارنز دکی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

''ہے تورو'' ۔آرتورو نے ریت پر تھوکا اور نفرت کا لعاب منہ سے پونچھ کر بل کو ششکارا۔بل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا۔ میں نے بستیوں کو ویران کیا ہے۔بچوں کو پیاسا مارا ہے۔نصف ہسپانیہ کو ہلاک کر ڈالا ہے۔یہ خانہ بدوش گرہ کٹ کا بچہ میرے مقابلے پر۔۔۔ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لیے دشمن۔۔۔

آرتورو تپتی ریت پر پھیلا اپنے جسم میں اترتے ہوئے دو سینگوں کو تھامے بل کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔۔۔اس کی مردہ آنکھیں کھلی تھی اور۔۔۔بل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا۔

اس شب آندریس اور آوے لا نے دریائے حدرہ کی ریت میں اپنے بھائی کا سرد جسم دفن کیا۔''ہمیں قسم ہے خانہ بدوشوں کے تمام دیوی دیوتاؤں کی۔۔۔ہم جب تک سیاہ بل کو ہلاک نہ کر دیں گے ایک دوسرے کو ناموں کی بجائے حرامی سور کہہ کر پکاریں گے۔

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔صحرائی وسعتوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔ان دونوں نے ان تینوں جغرافیائی حالتوں میں کئی برس تک سفر کیا۔اس سفر کی سمت کا تعین سیاہ بل کے سموں کے نشان تھے۔بل کے مالک کا بوڑھا ذہن جانتا تھا کہ دو نیم سیاہ جسم بدلتی رتوں میں ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔گرم،سرد نم آلود موسموں میں وہ اپنی روزی کے واحد وسیلے کی حفاظت کرتا،ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوتا۔۔۔آندریس اور آوے لا کے لباسوں میں اڑے ہوئے خنجر کئی بار زنگ آلود ہوئے مگر انہیں ہسپانیہ کی دھرتی سے رگڑ کر پھر سے تیز کر لیا جاتا۔۔۔کون جانے کب؟۔۔۔

قشتالیہ کے وسیع ریگزاروں میں پہاڑی عقابوں نے نیچے دیکھا۔۔۔کانٹے دار جھاڑیوں اور بگولوں کے درمیان ایک بوڑھا ایک سیاہ دھبے پر ہاتھ رکھے یوں چل رہا ہے جیسے وہ کسی بل کا بھاری اور کھردرا جثہ نہ ہو بلکہ صابن کی ایک گیلی ٹکیہ ہو جو ذرا سی غفلت سے اس کے ہاتھوں سے پھسل جائے گی۔اور کچھ فاصلے پر دو جسم جن کی چار سیاہ آنکھیں صرف ایک کالے دھبے پر جمی رہنے کے لیے کھلی تھیں۔

موڑوں کے ایک پہاڑی حصار کے کھنڈروں میں رہنے والے ایک الو نے آنکھیں گھمائیں اور ٹوٹے ہوئے جھروکے میں سے اس سڑک کو دیکھا جس پر زیتون کے باغ اُلڈے چلے آ رہے تھے۔۔۔اور سڑک پر۔۔۔ایک بوڑھا مگر اب بہت بوڑھا۔۔۔ایک سیاہ بل مگر اب چمکیلے جسم کی بجائے ماند پڑتی ہوئی کھال اور کچھ فاصلے پر۔۔۔چار آنکھیں۔۔۔منتظر!

وہ اپنے سفر کے دوران وادی غرناطہ میں سے بھی ایک مرتبہ گزرے۔مقدس پہاڑی پر گڑی صلیب برسات کی بوچھاڑوں اور گرما کی حدتوں سے شکستہ ہو کر گرنے کو تھی۔۔۔جھولنے والا پتلا اب غائب تھا مگر۔۔چار آنکھیں۔۔۔منتظر!

وہ اپنے سفر کے دوران وادی غرناطہ میں سے بھی ایک مرتبہ گزرے۔مقدس پہاڑی پر گڑی صلیب برسات کی بوچھاڑوں اور گرما کی حدتوں سے شکستہ ہو کر گرنے کو تھی۔۔۔۔جھولنے والا پتلا غائب تھا مگر۔۔۔آندریس اور آوے لا کے لیے نہیں کہ وہ اسے بل کی آنکھوں میں جھولتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

ان دونوں نے ان تینوں جغرافیائی حالتوں میں سات برس تک سفر کیا۔ایک جانور،ایک انسان۔۔۔دو نیم سیاہ جسم۔ بالآخر بل بوڑھا ہو گیا۔۔۔وہ جو پہلے اس کے ظلم سے خائف تھے۔اب زیر لب احتجاج کرنے لگے۔اس کی دہشت

اور طاقت کو دھرتی نے دھیرے دھیرے ختم کر دیا۔۔۔بل بوڑھا ہوا تو ناکارہ ہو گیا کہ اب اس کے ساتھ کھیلنے پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا۔۔۔ایسے بیکار جسم کا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ اسے کسی بوچڑ خانے میں فروخت کر دیا جائے۔

کمر خمیدہ بوڑھا بوچڑ خانے کے جس دروازے میں سے پستیوں سے بھری جیبیں لے کر نکلا۔اسی دروازے میں کچھ دیر بعد آندریس اور آوے لا کے جسم داخل ہوئے۔انہوں نے اپنے خنجر آج صبح ہی تیز کیے تھے۔

بل کو اس کے بڑھاپے نے بوچڑ خانے کے کچے فرش پر بے سدھ لٹا رکھا تھا۔ان دونوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ان میں ظلم کی تصویر ابھی تک واضح اور متحرک تھی کہ اس کے رنگ کبھی ماند نہیں پڑتے۔

بوچڑ خانے کا مالک ان کے قریب آیا لیکن زیادہ قریب نہیں کہ خنجر آج ہی تیز کیے گئے تھے۔''تم کس نیت سے یہاں آئے ہو؟''

''یہ سیاہ بل ہمارے پاپا کا قاتل ہے۔۔۔اس کے سینگ ہمارے بھائی کے جسم میں لٹو کی طرح گھومے تھے۔۔۔ہم صرف اسے اپنے ہاتھوں سے مارنے کی اجازت چاہتے ہیں''۔

بوچڑ خانے کے مالک کو اسی شام یہی کام کافی تگ و دو کے بعد خود سرانجام دینا تھا۔بھلا اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

''تمہیں اجازت ہے''۔اس نے کہا اور چلا گیا۔

آوے لا گھٹنوں کے بل یوں بیٹھ گئی جیسے وہ کسی کلیسا میں عبادت کرنے والی ہو۔۔۔اس نے اپنا خنجر سیاہ بل کی پھولی ہوئی شہ رگ پر رکھا اور اس کی آنکھوں میں اپنے پاپا کی تصویر دیکھی۔۔۔شہ رگ میں سے بوڑھا بدبودار خون ایک آبشار بن کر ابلا۔۔۔اور آوے لا کے سینے پر پھیل گیا۔آوے لا نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اپنا لباس چاک کر ڈالا۔۔۔اس کی چھاتیوں نے آگے بڑھ کر اپنے مسام کھولے اور ابلتے خون کو چوسا، پیاس بجھائی۔۔۔پھر آندریس اسی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔اس نے بل کی ڈھلکی ہوئی گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔بل کی مردہ آنکھوں میں اب بھی ایک پتلا دکھائی دے رہا تھا لیکن ساکت اور معدوم ہوتا ہوا۔۔۔خنجر کی نوک نے سیاہ آنکھ میں کھب کر اسے اپنے مسکن سے یوں ادھیڑا جیسے انار کے دانے کو ناخن سے اڑس کر نکالا جاتا ہے۔۔۔سات برسوں سے زندہ جھولتے ہوئے پتلے کی شبیہ اوجھل ہو گئی۔دوسری آنکھ کو بھی خنجر نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔۔۔پھر ان دونوں نے آنکھوں کے خالی گڑھوں میں گزرے وقت کی بیتے سفر کی تمام نفرت سمیٹ کر تھوکا۔۔۔آخری وار بل کے پیٹ پر ہوا۔ان دونوں نے جب اس کا نیم سیاہ کلیجہ ہاتھوں میں لیا تو وہ ابھی تک تھرتھرا رہا تھا۔۔۔وہ بوچڑ خانے سے باہر آ گئے۔۔۔ویران، گرد آلود گلی کے درمیان میں انہوں نے ایک الاؤ روشن کیا اس پر بل کا سیاہ پڑتا ہوا کلیجہ بھونا اور پھر اسے حلق سے اتار کر اپنے وطن کی طرف ایک روشن دوپہر کی جانب لوٹ گئے۔

☆☆☆

بسم اللہ کا گنبد

مسعود اشعر

ایک رات میں سب کچھ بدل گیا تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے پر سر رکھے رکھے ہی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی میں سے جتنا آسمان نظر آرہا تھا وہ کچھ فاختئی فاختئی سا ہو رہا تھا۔ چڑیوں کی آوازیں نہیں آرہی تھیں۔ ایک کوّے کی آواز آئی تھی۔ بس ایک آواز، اور وہ بھی ایسے جیسے اس نے غلطی سے آواز نکالی ہو، جیسے کوّے نے کھنکار کر گلا صاف کیا ہو۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ یہ صبح صادق ہے یا صبح کاذب؟

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ دادا جانی کے کمرے میں ہے۔ دادا جانی نے ہی اسے بتایا تھا کہ ایک صبح کاذب ہوتی ہے اور ایک صبح صادق۔ اسنے پھر آسمان کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ دادا جانی کے ساتھ ہی رہے گا۔ اس کا کمرہ اب اس کا کمرہ نہیں ہے۔ اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔ سامنے دیوار پر ایک تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ مگر ہلکے ہلکے اندھیرے میں وہ الٹی نظر آرہی تھی۔ سر اوپر پیر نیچے۔ وہ گھور گھور کر اس تصویر کو دیکھنے لگا۔

ارے۔۔۔ابھی سے کیوں اٹھ گئے؟ سو جاؤ، سو جاؤ یہ دادا جانی تھے جو غسل خانے سے نکل کر آرہے تھے۔ ''تم رات بھر نہیں سوئے ہو''۔ انہوں نے کہا ''کروٹیں بدلتے رہے ہو رات بھر''۔

''نہیں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔'' اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر پھر لیٹ گیا۔

''رات بھر کروٹیں بدلتے رہے ہو تم''۔ دادا جانی نے پھر کہا۔ جیسے اسے یاد دلا رہے ہوں۔

''مگر آپ۔۔۔؟''

''جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے تو معلوم ہوگا، کتنی بار اٹھنا پڑتا ہے رات کو''۔ وہ ہنستے ہوئے اس کے پاس آگئے تھے۔ ''ہم جب بھی پیشاب کے لیے اٹھتے تو تمہیں کروٹیں بدلتے ہی دیکھتے''۔

اب وہ اس کے بستر پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کا گال تھپتھپایا۔ وہ جھینپ گیا اس نے پہلی بار دو دن پہلے شیو کیا تھا۔ اسے محسوس تو بہت پہلے سے ہو رہا تھا کہ اس کے گالوں پر اور ناک کے نیچے جو بھورا بھورا رواں ہے وہ بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن دو دن پہلے ہی وہ ڈسپوزیبل ریزر خرید کے لایا تھا اور پہلی بار وہ رواں صاف کیا تھا۔ بھائی کی شادی جو ہونے والی تھی۔ دادا جانی نے اس کے گال پر ہاتھ رکھا تو اسے عجیب سا لگا۔ جیسے وہ چاہتا ہو کہ دادا جانی کو اس کے اس راز کا پتہ نہ چل جائے۔ دادا جانی نے اب اس کا دوسرا گال بھی تھپتھپایا اور ہنسے۔ ''ہوں ں۔۔۔ تو بھئی اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ اب تو پردہ کرنے والے تم سے پردہ کریں گے ہی''۔

''مگر دادا جانی میں تو بھائی ہوں''۔ اس نے جھنجھلا کر انہیں دیکھا۔ ''اور چھوٹا بھائی''۔

''بھائی نہیں، دیور''۔ انہوں نے اسے زور سے اپنے بازوؤں میں دبوچا اور اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ ''اور وہ کہتے ہیں دیور بھی نامحرم ہوتا ہے۔ سمجھے؟'' وہ ہنستے ہوئے اٹھے اور اپنے بستر پر چلے گئے۔ پہلے ان کا بستر کمرے کے بیچ میں ہوتا تھا۔ مگر اب کمرے کے ایک کونے میں ان کا بستر تھا۔ دوسرے کونے میں اس کا بستر لگا دیا گیا تھا۔

''تو آپ سے بھی پردہ ہوگا؟''

دادا جانی نے قہقہہ لگایا''ارے بھولے میاں، ہم دادا ہیں، باپ دادا سے پردہ نہیں ہوتا۔وہ نامحرم نہیں ہوتے''۔

اس نے دیوار پر لگی تصویر کو پھر دیکھنے کی کوشش کی۔دھندلی دھندلی سی روشنی میں اسے یاد آیا کہ دادا جانی کی شادی کے وقت کی تصویر ہے۔اس نے دیکھا تھا کہ وہ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی۔دادی جان نے ساڑھی باندھی ہوئی تھی اور دادا جانی تھری پیس سوٹ میں تھے۔تصویر شہر کے مشہور پارک میں کھینچی گئی تھی۔اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر بھی تھی۔یہ گروپ فوٹو تھا۔اس تصویر میں دادی جان اور دادا جانی کے ساتھ ان کے تین دوست بھی تھے۔دادی جان اور دادا جانی آگے ایک بینچ پر بیٹھے تھے اور وہ تین دوست پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔سب مسکرا رہے تھے۔جیسے فوٹو کھینچنے والے نے ان سے کہا ہو''کہو چیز۔۔۔'' دھندلکے میں وہ تصویر بھی اسے الٹی نظر آرہی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' دادا جانی نے اسے ان تصویروں پر نظریں جمائے دیکھ لیا تھا۔

''کچھ نہیں''۔وہ جھینپ سا گیا۔

گھر میں چار بیڈ روم تھے۔ایک نیچے تین اوپر۔اوپر ایک کمرہ امی ابو کا تھا۔ایک کمرہ دونوں بہنوں کا اور ایک کمرہ دونوں بھائیوں کا تھا۔نیچے کا کمرہ دادا جانی کا تھا۔وہ دادی جان کے ساتھ بھی اسی کمرے میں رہتے تھے۔اور ان کے انتقال کے بعد بھی یہ انہی کا کمرہ تھا۔اب یہ اس کا کمرہ بھی تھا۔اس کے بھائی کی شادی ہوئی تو دولہا دلہن کو بھائیوں کا کمرہ ہی دیا گیا۔اور وہ اس کمرے سے نکالا گیا۔شادی سے ایک دن پہلے ہی اس کا پلنگ دادا جانی کے کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔وہ اپنی میز، اپنی کتابیں اور اپنا لیپ ٹاپ وغیرہ بھی دادا جانی کے کمرے میں لے آیا تھا۔اس انتظام سے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔دادا جانی اس کے دادا ہی نہیں تھے، اس کے دوست بھی تھے۔وہ اسے اپنے برابر کا ہی سمجھتے تھے۔اور وہ بھی ان کے ساتھ خوب بے تکلفی سے باتیں کرتا تھا۔اپنے دل کی بات جو وہ اپنی امی، ابو یا بہن بھائیوں کو نہیں بتا سکتا تھا وہ دادا جانی کو بتا دیا کرتا تھا۔اسے جھٹکا اس وقت لگا جب شام کو دلہن گھر آئی تھی اور وہ دلہن کو سلام کرنے اس کی طرف بڑھا تھا۔

''تم سے پردہ ہے دلہن کا''۔اس کی ماں نے ہنس کر کہا تھا اور پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے لے گئی تھیں۔''دور سے ہی سلام کر لو بھابھی کو''۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی بھابھی اس سے پردہ کیسے کر سکتی ہیں۔وہ تو دولہا کا بھائی ہے اور چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا بھائی۔دن بھر وہ سب کے ساتھ مل کر دولہا دلہن کا کمرہ سجا تا رہا تھا۔بلکہ سب سے زیادہ کام اسی نے کیا تھا۔اس نے تو اس دن اسکول میں کھیلے جانے والے ڈرامے کی ریہرسل بھی چھوڑ دی تھی۔اس کے اسکول میں ڈرامہ The Crucible کھیلا جا رہا تھا۔اس ڈرامے میں وہ تو خود کوئی کردار نہیں کر رہا تھا مگر اس کی ٹیچر نے سارے کاموں میں اسے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔

''تم نے تو دولہا دلہن کی مسہری ایسی سجائی ہے کہ وہ مسہری خود ہی دلہن بن گئی ہے''۔یہ اس کی منجھلی بہن نے کہا تھا، جو اس کے ساتھ کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔وہ خوش تھا کہ بھائی جان اپنا کمرہ دیکھ کر خوش ہوں گے۔اور وہ خوش ہوئے بھی تھے۔انہوں نے کہا تھا تمہاری شادی ہوگی تو تمہارا کمرہ ہم سجائیں گے۔اس سے بھی اچھا۔وہ سب سے بڑے تھے۔

''اب تم اوپر آیا کرو گے تو آواز دے کر آیا کرو گے''۔یہ اس کی بڑی بہن تھیں، جنہوں نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

''اچھا۔۔۔'' اس نے چڑ کر خوب زور سے کہا تھا۔

’’یہ کیا ہو رہا ہے؟‘‘ اسکے باپ نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا تھا۔
’’کچھ نہیں، ہم اسے سمجھا رہے ہیں‘‘۔ اس کی بہن نے اسے سیڑھیوں کی طرف لے جاتے ہوئے جواب دیا تھا۔
’’ہاں ہاں۔۔۔ سمجھاؤ سمجھاؤ۔ سب کو سمجھاؤ‘‘۔ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسے تھے۔ اور امی نے گھور کر انہیں دیکھا تھا۔
بڑی بہن اسے لے کر نیچے آئیں تھیں اور دادا جانی کے کمرے میں آ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں تھیں۔ ’’اب تمہارا سامان یہاں آ گیا ہے۔ میز، کتابیں، لیپ ٹاپ اور ہاں۔۔۔ شیبو کا سامان بھی تو ہے‘‘۔ یہ کہہ کر وہ ہنسی تھیں۔
’’ہاں ہاں۔۔۔ آ گیا ہے سب سامان۔ آپ جتا کیوں رہی ہیں؟‘‘ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا۔
’’جتا نہیں رہی ہوں بتا رہی ہوں‘‘۔
’’اور میرا گٹار کہاں ہے؟‘‘ اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی تھی۔
’’ارے ہاں۔۔ تمہارا گٹار تو میں بھول ہی گئی۔ وہ بھی آ جائے گا۔ میرے کمرے میں ہے‘‘۔
پھر امی بھی آ گئیں تھیں وہاں۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئیں تھیں۔ ’’یہ تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟‘‘
’’میرا منہ تو نہیں پھولا‘‘ اس نے چڑ کر کہا تھا اور امی نے اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا تھا۔ ’’منہ نہیں پھلاتے بیٹے‘‘۔
اس کا جی چاہا تھا کہ وہ چیخ کر کہے۔ میرا منہ نہیں پھولا ہوا ہے۔ مگر وہ خاموش ہو گیا تھا کہ اس کا چہرہ سچ مچ جھنجھلاہٹ سے تمتما رہا تھا۔
’’اوہو۔۔۔‘‘ اچانک امی کو یاد آیا تھا۔ ’’اوپر سے ٹی وی بھی تو نیچے لانا ہے‘‘۔
’’وہ ٹی وی نہیں دیکھتے‘‘۔
’’بھائی جان تو ٹی وی نہیں دیکھتے۔ مگر کیا بھابھی بھی نہیں دیکھتیں؟؟‘‘ اس نے معصومیت سے سوال کیا تھا۔
’’کسی کو بلا کر ٹی وی نیچے لاؤنج میں لگوا دینا‘‘۔ امی نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہ بات انہوں نے بہن سے کہی تھی اور کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔
بھائی امریکہ پڑھنے گئے تھے تو بغیر داڑھی مونچھ کے تھے۔ واپس آئے تو داڑھی بھی تھی اور جینز کے پائنچے بھی دوہرے کر کے ٹخنوں سے اوپر کر لیے گئے تھے۔ سارا خاندان ان کی ذہانت کا قائل تھا۔ وہ فل برائٹ اسکالرشپ پر امریکی یونیورسٹی گئے تھے۔ ان کے لیے دلہن کی تلاش اسی وقت سے شروع کر دی گئی تھی جب وہ امریکہ میں ہی تھے۔ مگر ان کی شرط ایسی تھی جسے پورا کرنا گھر والوں کو مشکل نظر آتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ دلہن ان کی طرح ہی مذہبی شعائر کی پابند ہو۔ اپنے عزیزوں اور جاننے والوں میں ایسی لڑکی تلاش کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ مگر بہت تلاش کے بعد آخر لڑکی مل ہی گئی تھی۔ اب یہ ان کی خوش قسمتی ہی تھی کہ لڑکی پاکستان کی سب سے بڑی پرائیویٹ یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی تھی۔ وہ آنرز کے آخری سال میں مذہب کی طرف راغب ہوئی تھی۔ اس نے آخری سمسٹرز میں سوشیالوجی اور فلاسفی چھوڑ کر اسلامی علوم پڑھنا شروع کر دیئے تھے۔ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد اس نے درس نظامی کا وہ شارٹ کورس بھی کر لیا تھا جو لڑکیوں کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس نے پردہ کرنا بھی یونیورسٹی کے آخری سال میں ہی شروع کیا تھا۔ جب اس نے پردہ کرنا شروع کیا تو اس کے ماں باپ اور اس کے چند استاد بھی حیران رہ گئے تھے۔ وہ سب اس سے اس تبدیلی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ان سب کے لیے اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ’’میں نے پڑھ لکھ کر اور سوچ سمجھ کر یہ راستہ اختیار کیا ہے‘‘۔ اس کے بعد سب خاموش ہو گئے تھے۔
شادی کی تقریب اتنی سادہ تھی کہ اس سے سادہ تقریب کا سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مسجد میں نکاح ہوا۔ چند مہمان جو باہر

سے آئے ہوئے تھے انہیں کھانا کھلا دیا گیا۔ اور بس۔ اسے بتایا گیا تھا ولیمہ چونکہ سنت ہے اس لیے ولیمہ تو ہوگا مگر اس میں بھی زیادہ لوگ نہیں بلائے جائیں گے۔ اس کے ابو اور امی نے پہلے ہی اپنے تمام رشتے داروں کو بتا دیا تھا کہ ہر خاندان کا صرف ایک فرد مدعو کیا جائے گا۔ ولیمہ ہوگا مگر اسی سادگی کے ساتھ جس سادگی کے ساتھ نکاح ہوا تھا۔

''تمہارے اسکول میں ڈرامہ اسٹیج کیا جا رہا ہے؟'' دادا جانی اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے تھے۔

''جی''۔

''کون سا ڈرامہ ہے؟''

"The Crucible"

''اچھا۔۔۔؟ آرتھر ملر کا ڈرامہ؟''

وہ خاموش رہا۔

''کس کی پسند ہے یہ ڈرامہ؟''

''ہماری انگلش ٹیچر کروا رہی ہیں''۔

''ہوں۔۔۔ تو وہ زمانے کو سمجھتی ہیں۔ آج کل یہی تو ہو رہا ہے ہمارے ہاں بھی۔ کس کو بھی کوئی نام دو اور مار دو''۔

اس کے بعد دادا جانی خاموش ہو گئے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر ایسے بولے جیسے اب بھی اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوں''۔ ''تمہیں یہ سب عجیب سا لگ رہا ہوگا؟'' وہ اس کی طرف کروٹ لیے لیٹے تھے، دائیں بازو پر سر رکھے۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب بھی کیا دیتا۔ اس کے لیے تو یہ سب نئی باتیں تھیں۔

''ہمارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے''۔ دادا جانی ہنس رہے تھے۔ ''ہمارے بچپن میں ایسا ہی ہوتا تھا''۔

''کیسا ہوتا تھا؟'' وہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہی سب کچھ۔ ہماری دادی اماں ہمارے سگے پھپھا سے پردہ کرتی تھیں۔ پھپھا ہمارے گھر آتے تھے تو ڈیوڑھی میں آ کر زور سے کھنکارتے تھے۔ سب کو معلوم ہو جاتا تھا کہ کون آیا ہے۔ پھپھا میاں ڈیوڑھی میں مونڈھے پر بیٹھ جاتے اور وہیں سے باتیں کرتے۔ یہ اس وقت ہوتا تھا جب ہمارے ابا میاں گاؤں گئے ہوتے تھے۔ اگر ابا میاں گھر پر ہوتے تو دوسرے مہمانوں کی طرح پھپھا میاں بھی مردانہ گھر میں ہی چلے جاتے''۔

''انہیں برا نہیں لگتا تھا؟''

''برا کیوں لگتا۔ اس وقت کا قاعدہ ہی یہ تھا''۔

''اور کس کس سے پردہ کیا جاتا تھا؟''

''چچازاد، پھوپھی زاد، اور ماموں زاد اور بہن کے شوہروں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا''۔ دادا جانی اب چت لیٹ گئے تھے۔ انکی نظریں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ''محرم اور نامحرم کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اس وقت''۔ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر خود بخود ہی ہنسنے لگے۔ ''اس پردے میں بڑے بڑے تماشے بھی ہوتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نانا جان کے گاؤں جاتے تھے۔ ہمارا خاندان اکیلا ہی نہیں دونوں پھپھیوں کا خاندان بھی ہمارے ساتھ جاتا تھا۔ بہن بھائی، بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں سب کے سب۔ گاؤں دور تھا بیل گاڑیوں میں بھر کر سب جاتے تھے۔ ہم بچوں کے لیے وہ پکنک ہوتی تھی۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ شاید وہ گنگا کی کوئی شاخ تھی۔ اس کے کنارے دور تک پھیلی سفید چمکتی

ہوئی ریت اور اس ریت میں کھڑے جھاؤ کے پیڑ''۔ اب وہ ایسے بول رہے تھے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔ ''ہم صبح منہ اندھیرے چلتے اور دوپہر تک اس ندی کے کنارے پہنچ جاتے۔ وہاں دوپہر کا کھانا کھایا جاتا۔ پراٹھے، شامی کباب، آملیٹ، اور پتہ نہیں کیا کیا۔ وہاں تمام عورتیں اپنا پردہ ورده سب بھول جاتی تھیں۔ خوب چھلانگیں لگائی جاتی تھیں ندی کے پانی میں۔ ہم بچے بھی خوب ڈبکیاں لگاتے تھے۔۔۔'' وہ خاموش ہوئے، پھر ہنسے۔ جیسے وہ منظر انکی آنکھوں میں ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہو۔ ''ایک بار یہ ہوا کہ وہ سب عورتیں اسی طرح چھلانگیں لگا رہی تھیں تو کسی نے کہا ''ارے دیکھو، کچھ لوگ ادھر آرہے ہیں''۔ ہماری اماں نے آنے والے لوگوں کو دیکھا اور سر جھٹک کر بولیں۔ ''اے ہے، یہ تو گاؤں والے ہیں۔ ان سے کیا پردہ''۔

''تو پردہ شہر والوں سے کیا جاتا تھا؟'' وہ اس لمبی کہانی سے اکتا گیا تھا۔

''اب تو جو بھی سمجھ لو''۔

''تو کیا دولہا کے چھوٹے بھائی سے بھی پردہ ہوتا تھا؟''

دادا جانی نے کچھ دیر سوچا، کھنکار کے گلا صاف کیا، پھر بولے ''نہیں، ہمارے گھر میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ مگر۔۔۔''

''مگر آپ ہی تو کہتے ہیں، بھائی بھی نامحرم ہوتا ہے؟'' وہ دونوں گھٹنے اپنے بازوؤں میں جکڑے بستر پر بیٹھا تھا۔

''ہاں۔۔۔ ہے تو۔۔۔'' وہ پھر سوچ میں پڑ گئے تھے۔

''پھر۔۔۔؟''

''بس، ہم واپس جا رہے ہیں۔ بند ہو رہے ہیں ایک خول میں۔۔۔''

وہ خاموش رہا۔ دادا جانی بھی جیسے کچھ سوچنے لگے۔ ''بسم اللہ کا گنبد ہے یہ''۔ دادا جانی نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''جی۔۔۔؟'' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''اچھا سو جاؤ۔ تم رات بھر جاگتے رہے ہو''۔

اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر بھی خاموشی تھی۔

☆☆☆

قدیم آوازوں کی کٹنگ پیسٹنگ

مشرف عالم ذوقی

''آوازیں زندہ رہتی ہیں''۔

Its's impossible to live in a country as wild where the people are assassinated over political questions. (Montiel's Widow)

کسی ایسے جنگلی ملک میں رہنا ناممکن ہے جہاں عوام کو سیاسی وجوہات کی بنا پر قتل کر دیا جاتا ہو۔ گابریئل گارسیا مارخیز و۔

توہمات، مفروضے، حقیقت

یہ ایک نیا اور نادیدہ تصور تھا کہ میں ان کھنڈرات میں ان آوازوں کو سن سکتا ہوں جو صدیوں کی قید مسلسل کا شکار ہو کر باہر آنے کو بیتاب ہیں۔ آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران زندگی میں پیش آنے والے ایسے واقعات کی کوئی کمی نہیں تھی، جہاں اچانک خوفزدہ کرنے والے احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ مبادا اس صورت میں تجسس اور نئی دریافت سے نکلنے والے عجائب کا خیال نہ ہو تو غیر مرئی پیکر اور آوازیں آپ کو بیمار کر سکتی ہیں۔ میرے نوجوان راہب دوست کا خیال تھا کہ آواز ایک ارتعاش ہے۔ اس کی رفتار تغیر پذیر اور صدیوں پر محیط۔ وقت کے کسی بھی حصے میں آوازیں کبھی گم نہیں ہوتیں، بلکہ آہستہ آہستہ ویرانے اور کھنڈرات میں اپنی جگہ بنا لیتی ہیں۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟''

مجھے یاد ہے، اس موقع پر میرا سوال سننے کے بعد نوجوان راہب کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ ہنسا۔ میری طرف دیکھا پھر کہنا شروع کیا۔ ''روس کا معروف علاقہ وادی قاف تھا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کھدائی کر رہے تھے۔ اچانک انہیں احساس ہوا، کچھ عجیب و غریب آوازیں انہیں اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ وہ جب اس مقام پر گئے تو لکڑی کے کچھ بوسیدہ ٹکڑے ملے جو کشتی نوح کے جدا شدہ ٹکڑوں میں سے ایک تھے۔۔۔''

راہب ایک بار پھر مسکرایا۔ ''ابھی حال میں چین کے پہلے خلاباز کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ خلائی سفر میں اچانک خلائی جہاز کو کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ خلائی سفر سے واپس لوٹنے کے بعد بھی چین کے خلاباز پر اس آواز کا جادو برقرار رہا۔ یہ آوازیں ہیں جو خلا میں بھی تیرتی رہتی ہیں''۔

میں ادھر کچھ دنوں سے جن حقائق اور تجربوں سے گزر رہا تھا، وہ میرے لیے خوفزدہ اور ناقابل یقین حد تک چونکانے والے تھے۔ کھدائی سے قبل محکمہ نے تفتیش و تحقیق کا سارا کام مکمل کر لیا تھا۔ تحقیق میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ یہاں صدیوں پرانی نشانیاں آج بھی محفوظ ہیں۔ اراضی کے اطراف میں کچھ میل کے فاصلے پر اس سے قبل بھی جو باقیات ملے تھے، ان کا تعلق قدیم تہذیب و ثقافت سے تھا۔ اس لیے گمان غالب تھا کہ اس بار بھی باقیات سے عہد قدیم کی کوئی نہ کوئی نشانی تاریخ کے ساتھ تہذیب و ثقافت کے باب میں اضافہ ضرور کرے گی۔ سات آٹھ مہینوں کی مسلسل کھدائی کے بعد کچھ بوسیدہ لکڑی اور پتھر کے ٹکڑے برآمد ہوئے تھے، جن کو محکمہ میں وقت کا تعین کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد ناقابل یقین حد تک چونکا دینے والی کچھ ایسی باتیں سامنے آئی تھیں، جس کی وضاحت کے لیے مجھے اپنے راہب دوست کو بلانا پڑا۔ ان میں سب سے اہم بات کا تعلق آوازوں

سے تھا۔ نوجوان راہب نے اس تعلق سے کئی اہم انکشافات کیئے۔

''آسمان کی فضاؤں سے آنے والی پراسرار آوازیں کبھی کبھی محفوظ رہ جاتی ہیں۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے مختلف اوقات میں حیرت انگیز اور پراسرار آوازیں سنی ہیں۔ بلکہ کچھ سال قبل ہی بیلا روس کے ایک سینما فوٹوگرافر نے اس آوازوں کو ریکارڈ کیا تھا، اس وقت تک یہ جدید ٹیکنالوجی بھی نہیں آئی تھی۔ ابھی حال میں کینیڈا کی ایک خاتون نے بھی ان آوازوں کو ریکارڈ کیا۔ پھر اسے پتہ چلا کہ آواز ایک عورت کی ہے، جس کا قتل کر دیا گیا تھا۔ ماہر ارضیات بھی بتاتے ہیں کہ ان آوازوں کو آسانی سے محفوظ کیا جا سکتا ہے''۔

نوجوان راہب نے میری طرف دیکھا۔ ''تم کبھی Schizophenia کے مریضوں سے ملے ہو؟

''نہیں''۔

''میں ایسے کئی مریضوں سے ملا۔ یہ مرض ایک ناکارہ کر دینے والی ذہنی کیفیت ہے۔ مریض کے لیے حقیقی اور خیالی دنیا میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں ایک بشپ سے ملا تھا۔ وہ غیر موجود کو دیکھ سکتا تھا۔ غیر مرئی آوازوں کو سن سکتا تھا۔ بلکہ وہ اکثر ایسی طاقتوں سے گفتگو کیا کرتا تھا''۔

''ہاں میں نے سنا ہے''۔ میں ذرا توقف کے لیے ٹھہرا۔ ''چاند پر جانے والے خلابازوں نے بھی ایسی آوازیں ریکارڈ کی تھیں۔ یہ سیٹی بجنے جیسی آواز تھی''۔ میں نے اپنی فکر کا خلاصہ کیا۔۔۔ ''لیکن کیا ان آوازوں کو واقعی ریکارڈ کیا جا سکتا ہے؟''

''ہاں۔ کیوں نہیں''۔ راہب کا مختصر جواب تھا۔

میں اس جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ لیکن مزدوروں، انجینئر اور اطراف میں رہنے والوں کی طرح مجھے بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ آثار قدیمہ کی کھدائی سے کچھ ایسے باقیات ضرور حاصل ہوں گے، جو ہمارے لیے تاریخی اعتبار سے اہم ہوں گے۔

کھدائی کا کام پچھلے سال بھر سے چل رہا تھا۔ یہاں سے ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر آج سے پانچ برس قبل کچھ ایسے باقیات حاصل ہوئے تھے، جن سے اس بات کی امید پیدا ہوئی تھی کہ یہاں ہزاروں سال پیشتر کسی بسے بسائے شہر کے ہونے کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کافی گہری کھدائی ہو جانے کے بعد مزدور یہ دیکھ کر چونک گئے کہ مٹی کا رنگ بادامی سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اس مٹی میں پودے کے ٹکڑے بھی شامل تھے۔

یہ بھی اشارہ ملا کہ ہزاروں برس قبل یہاں کاشتکاری ہوتی ہوگی۔ تحقیق سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہاں کی آبادی پانچ سے دس ہزار نفوس کے درمیان ہوگی۔ کچھ قدیم پتھروں کے زیورات ملے تھے جو اس بات کا اشارہ کرتے تھے کہ عورت کی عبادت ہوتی ہوگی۔ اور یہاں کے شہر باضابطہ گلیوں سے منسلک ہوں گے۔ آس پاس ندی ہونے کے بھی امکانات تھے۔ اسی بنیاد پر تحقیق کا کام مزید آگے بڑھا تو اس طرف کھدائی کا عمل شروع ہو گیا۔

کھدائی کا عمل شروع ہونے کے بعد ہی جیسا کہ مزدور اور آس پاس کی بستیوں کے کچھ پرانے لوگ، گھر میں کام کرنے والی کچھ عورتیں اور علی الصباح خچروں پر سامان لاد کر لے جانے والے گبروں کے منہ سے جو کچھ بھی سننے میں آیا، وہ نہ صرف حیرت انگیز بلکہ انسانی کھال کے اندر خون کو منجمد کرنے والے واقعات تھے اور یہ سلسلے جو شروع ہوئے تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ صبح ادھر سے گبروں اور کچھ تاجر پیشہ لوگوں کا قافلہ گزرتا تھا، جو خچروں پر اور گھوڑوں پر سامان لادے دور بستیوں میں تجارت کے سامان فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک صبح حیرت انگیز طور پر ان کے گھوڑے اور خچر رک گئے۔ آسمان میں بدلیاں چھائی تھیں۔ دور تک پھیلی ہوئی دھند لی سیاہ روشنی میں سامنے جو منظر تھا، وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ دھند میں ہزاروں گھوڑوں کی تعداد تھی اور ان

سواروں کے چہرے صاف نہیں تھے لیکن گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہوئے یہ برابر چیخ رہے تھے اور حملہ کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ آواز میں ارتعاش اور گھوڑوں کی ٹاپ سے اڑنے والی مٹی کا رنگ سفید تھا۔ گجر برادری کے کچھ تاجر حضرات اس قدر خائف ہوئے کہ خچروں گھوڑوں کے ساتھ واپس لوٹنے میں ہی بھلائی سمجھی۔ ان میں سے کچھ بخار میں مبتلا ہوئے اور کچھ ہفتوں تک اس طرف آنے میں خوف محسوس کرتے رہے۔ اس کے بعد نہ وہ گھوڑوں کا ہجوم نظر آیا نہ گھوڑ سوار مگر چشم دید گواہوں کے مطابق فاصلہ چند قدموں کا تھا اور ایسا لگتا تھا گویا وہ شب خون مارنے کی تیاری سے آئے ہوں۔ اس اطراف میں جنگوں کی خونچکاں تاریخ کے قصے بھی عام ہیں۔ اس لیے بستی کے پرانے لوگوں نے جنگجو سواروں کے بارے میں وہی قصہ دہرایا کہ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو جنگوں میں ہلاک ہوئے مگر ان کی چیخیں ابھی بھی سیاہ رات کے سینے کو چیرتی ہوئی کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہیں۔

اسی طرح گھروں میں کام کرنے والی کچھ عورتوں کو عقب میں کچھ سائے نظر آئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر وہ سائے غائب ہو جاتے تھے۔ ایک عورت کے مطابق غیر مرئی سائے گھر جلدی سے جلدی خالی کرنے کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ ایک بزرگ خاتون نے بتایا کہ ایک سفید عورت اچانک سامنے آگئی۔ اس عورت کے چہرے پر خوفزدہ کرنے والی کیفیت تھی وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔۔۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب یہاں سے تم لوگ بھی بھاگ چلو۔

ان آسیبی کہانیوں کے درمیان کھدائی کرنے والے مزدوروں کے بیانات بھی تھے جو اکثر دو پہر کے بعد کچھ عجیب عجیب آوازوں کو سن کر چونک جاتے تھے۔ ان آوازوں میں بچوں اور عورتوں تک کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ یہاں گمشدہ آوازوں کا ایک شہر آباد ہے۔ بستی کے زندہ لوگوں کے علاوہ ایک بستی اور بھی ہے۔ یہاں جنگجو گھوڑ سوار ہیں اور خوفزدہ عورتیں، مرد، بچے۔ یہ لوگ دن رات سائے کی طرح ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ اور بات کہ روحیں نظر نہیں آتیں۔ ہاں کبھی کبھی کسی کو دکھائی ضرور دے جاتی ہیں۔

کچھ دن اسی طرح گزارے۔ دو پہر کا سورج جب آسمان سے آگ برسا رہا تھا۔ کچھ مزدور بھاگتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ اس وقت میں انجینئر اور کچھ لوگوں سے گھرا ہوا تھا اور اسی بات پر تبادلہ خیال کررہا تھا کہ اکثر جن باتوں کو ہم واہمہ قرار دیتے ہیں، کیا حقیقت سے ان کا تعلق نہیں ہوتا؟ توہمات کی جڑوں کو حتمی اور کلی حد تک ذہن و دل سے ختم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ میرے قابل انجینئر دوست کا خیال تھا کہ دراصل جسے ہم واہمہ کہتے ہیں، وہ علم نفسیات کی زبان میں تسلی ہے۔ یہ حقیقت ہم خود بھی جانتے ہیں کہ ان گنت ارواح ہمارے ساتھ چلتی پھرتی ہوتی ہیں۔ اس نے مردہ تہذیبوں کے ستارہ شناسوں اور کاہنوں کی پیشین گوئیوں کی ان گنت کہانیوں کو سناتے ہوئے بتایا کہ سائنس بھلے ان مشاہدات و نظریات کو رد کردے، مگر ان کاہنوں کا خیال تھا کہ ہم مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گے اور تمہارے آس پاس ہی 'چرتے' اور سیر کرتے رہیں گے۔ ٹھیک یہی ساعت تھی جب بھاگتے ہوئے مزدوروں نے تیز سانسوں کے درمیان رک رک کر اور خوفزدہ انداز میں بتایا کہ وہ آوازیں صاف ہیں۔ اور آپ بھی سن سکتے ہیں۔ مزدوروں کے مطابق ایک سخت دیوار ہے۔ دیوار کے پیچھے یقیناً لوہے کا ایک دروازہ ہوگا۔ کیونکہ آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی دروازے کو پیٹنے کی صدا بھی سنائی دے جاتی ہے۔ گہری سرنگ کے باوجود ہوا کا زور ہے۔ اور آوازیں ہوا میں لہرا رہی ہیں۔ خوفزدہ کرنے والے الفاظ میں مزدوروں نے بتایا کہ آگے کھدائی کا کام دشوار ہے۔ وہ اپنی جان نہیں دے سکتے۔ وہ بضد تھے اور اس وقت انہوں نے کام روک دیا تھا۔

یقیناً یہ واہمہ نہیں تھا۔ آوازیں تھیں بلکہ آوازوں کا ہجوم تھا۔ ایک شور تھا جہاں بہت سی آوازیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے بھی ان آوازوں کو سمجھنا مشکل تھا۔ کہیں کوئی چیخ، کسی کے رونے کی صدا، کتوں کے بھونکنے کی

آوازیں، بوٹوں کی ناپ، گھوڑوں کے ہنہنانے اور سناٹی رات میں کہیں دور جنگل سے آنے والی بھیڑیوں کی خوفناک آوازیں۔ ٹھہر ٹھہر کر کسی عورت کے رونے کی آواز۔ پھر تیز تیز بھاگنے کی آوازیں۔ اور یہ آوازیں اس دیوار سے بلند ہو رہی تھیں جو اس وقت نظروں کے سامنے تھی۔ ذرا ٹھہر کر میں نے وہ آواز بھی سنی، جس کے بارے میں مزدوروں کا بیان تھا کہ پس دیوار لوہے کا ایک دروازہ ہے۔ لوہے کے دروازے پر پڑنے والی تھاپ مختلف ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ لوگ باہر آنے کے لیے دروازہ پر دستک دے رہے ہوں۔ اس دن سب اتنے خوفزدہ تھے کہ مزدوروں کو چھٹی دے دی گئی تاہم انہیں یہ ضرور کہا گیا کہ خوفزدہ ہونے کی بات نہیں ہے۔ کھدائی ضرور ہوگی۔ مگر اس موقع پر ان کی زندگی اور تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے سکیورٹی بحال کر دی جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ اس موقع پر ہم سب لوگ بھی موجود ہوں گے۔ ضرورت پڑی تو حفاظتی دستہ بھی بلا لیا جائے گا۔

بعض توہمات، مفروضے وقت کا طویل سفر طے کر کے حقیقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس رات کھانے کی میز پر میری بیوی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بتایا کہ وہ پچھلی تین راتوں سے خواب میں نوحؑ کی کشتی کو دیکھ رہی ہے۔ کوئی اسے آواز دے رہا ہے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے، بہتر ہے کہ وہ کشتی میں آجائے۔

''میرا خیال ہے تمہیں کشتی میں بیٹھ جانا چاہیے تھا''۔ گو جملے کی ادائیگی میں نے مسکراتے ہوئے کی تھی۔ مگر بیوی اس عمل سے ناراض ہوگئی۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔

''بہت کچھ ہو رہا ہے، جو ٹھیک نہیں ہے''۔

''شاید''۔

''کبھی کبھی لگتا ہے ہم چلتے پھرتے مردوں کے درمیان ہیں''۔

''یہ سب واہمہ ہے''۔ کہتے ہوئے میں ٹھہر گیا۔ دراصل میں بیوی کو کھدائی کے دوران پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کی تفصیلات بتانے والا تھا۔ وہ واہمے میں گھر چکی تھی۔ اس لیے میں نے ارادہ بدل لیا۔ کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے بیوی نے بتایا کہ کل بیٹا کسی کیساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ اکثر کسی کے ساتھ کھیلتا ہے جو نظر نہیں آتا''۔

''یہ اس فلم کا اثر ہے جو اس نے کچھ دن پہلے دیکھی تھی۔ بیٹے کو زیادہ انکریج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اسے بتایا کرو کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے''۔

''کیا تم واقعی تسلیم کرتے ہو کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے؟''

وہ میرے جواب کے لیے رکی نہیں۔ آگے بڑھ گئی۔ میں اب سلسلہ وار ان بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیوی کی بات کسی حد تک درست تھی۔ کہ ہم چلتے پھرتے مردوں کے درمیان ہیں۔ کاہن اور ستارہ شناسوں کی پیشین گوئیوں کے حوالہ سے یہی بات مجھے میرے انجینئر دوست نے بتائی تھی۔ کھدائی کے دوران پیش آنے والے واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ موجود سے زیادہ بڑی بستی ناموجود کی ہے اور خوفزدہ مزدوروں کے بیانات سننے کے بعد گمشدہ آوازوں کے نرغے میں، میں خود بھی شامل تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے جب میں نے اپنے نوجوان راہب دوست کو تازہ تفصیلات سے آگاہ کیا، تو وہ بغیر کسی حیرانی کے، مجھ سے مخاطب ہوا۔

''تم چاہو تو ان آوازوں کو ریکارڈ کر سکتے ہو''۔

''مگر کیسے؟''

جیسے آوازیں ریکارڈ کی جاتی ہیں''۔ کچھ توقف کے بعد اس نے کہا ''مگر تاریخ کی تہہ تک جانا چاہتے ہو تو پھر ان آوازوں کی کٹنگ پیسٹنگ کرنی ہوگی''۔

''مطلب ایڈیٹنگ؟''

''ہاں''۔ نوجوان راہب کی آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی آواز کس صدی کی ہے؟ وقت کے کس فریم میں کب کس وقت کونسا حادثہ پیش آیا؟ کبھی کبھی یہ آوازیں مل جاتی ہیں تو ایک تاریخ دوسری تاریخ میں گم ہو جاتی ہے''۔ وہ مسکرایا۔ ''ایسا ہوتا بھی ہے تو پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ قابیل بن آدمؑ کی تاریخ سے لے کر اب تک صرف زمانہ بدلا ہے۔ تاریخ کی حیثیت ایک جیسی رہی ہے''۔

''مطلب؟''

نوجوان راہب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''کبھی کبھی قدیم تاریخ کی کٹنگ پیسٹنگ سے قابیل بن آدمؑ کے قبیلے کے بش، اوباما، ٹرمپ اور ٹونی بلیئر جیسے لوگ بھی سامنے آ جاتے ہیں''۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''میں ایسے کچھ اور نام بھی لے سکتا ہوں مگر ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یہ سفر تمہارے لیے دلچسپ ہوگا''۔

نوجوان راہب نے امیتو گھوش نام کے ایک بنگالی ساؤنڈ ریکارڈسٹ کا حوالہ دیا، جو ایسے کاموں میں ماہر ہے۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ بنگال کے لوگ ایسے کاموں کے ماہر ہوتے ہیں۔ امیتو کو اس کام میں دلچسپی تھی۔ اس نے بتایا کہ ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے طور پر وہ بنگال کی کئی فلموں میں اپنی خدمات دے چکا ہے۔ پیسوں سے زیادہ دلچسپی اسے اس کام میں تھی۔ گمشدہ آوازوں کو ریکارڈ کرنے کا تجربہ اس کے لیے بھی پہلا تھا۔ وہ متجسس بھی تھا اور خائف بھی۔

اس دن میری بیوی نے بیٹے کی دوبارہ شکایت کی۔ اس نے بتایا کہ بیٹا اپنے دوست کے ساتھ باہر جانا چاہتا ہے۔

''باہر؟''

بیوی اس بار زور سے چیخی۔ ''تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ بیٹے کو وقت دو۔ اسے سمجھاؤ کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بات تم نے ہی کہی تھی''۔

''کیا تم بھی ایسا مانتی ہو؟''

''میرے ماننے یا نا ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ لیکن اسے سمجھاؤ۔ اب میں اس کی باتوں سے ڈرنے لگی ہوں''۔

ایک خوفزدہ لکیر میرے چہرے کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔

گمشدہ آوازیں

یہ کھدائی کا آخری مرحلہ تھا۔ نوجوان راہب اور بنگالی ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے علاوہ آرکیالوجیکل سروے کے اسٹاف، فوٹو گرافر اور مزدوروں کا عملہ بھی اس وقت ہمارے ساتھ تھا۔ سامنے ایک وسیع و عریض ملبہ نما دیوار تھی۔ قیاس لگائے جا رہے تھے کہ عمارت کے اندر چٹان کو کاٹ کر کمرے بنائے گئے ہوں گے۔ اندرون غار نما کمرے اور اندھیری گلیاں بھی ہوں گی۔ مزدوروں کے پھاؤڑے آواز کر رہے تھے۔ آوازوں کا ارتعاش اس قدر خوفناک تھا کہ جو بھی چہرے تھے، سہمے ہوئے تھے۔ مزدوروں پر بھی خوف کا اثر غالب تھا۔ اس خوفناک ماحول کو امیتو گھوش کے جملے نے راحت پہنچانے کا کام کیا۔۔۔

''بندھو۔۔۔ ہماری دنیا ان آوازوں سے زیادہ بھوفناک ہے۔ ڈرنا کیا ہے''۔

''خوفناک''۔ راؤ نے اصلاح کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''بھوفناک نہیں''۔

میں نے دیکھا۔۔۔۔خوف سے اس کے دانت اب بھی کٹکٹا کر بج رہے تھے۔انجینئر نے ٹھہکا لگایا۔ایک زور کی آواز کے ساتھ بھر بھری مٹی کی پرت تیزی سے زمین پر گری۔سامنے لوہے جیسی کسی دھات کا بنا قوی ہیکل دروازہ نظر آنے لگا تھا۔دو تین گھنٹوں کی زور آزمائش کے بعد اب سارا منظر صاف تھا۔قوی ہیکل دروازے پر مٹی کی موٹی پرت جمی تھی اور ایک عجیب سا بہت بڑا تالا جھول رہا تھا۔آرکیالوجیکل سروے کے ایک نمائندے نے قیاس لگایا کہ کوئی بہت بڑی بلا یا آسمانی آفت نازل ہوئی ہوگی اور بستی کے لوگ یہاں سے فرار ہوئے ہوں گے۔آفات کا شکار وہ باہر کی دنیا میں نہ ہوں،اس لیے یہاں آسیبی شکل کا بنا ہوا تالا لگا دیا گیا۔ دروازہ یک حیثیت شہر میں داخل ہونے کی ہوگی۔یہیں سے تجارت اور دوسرے کاموں سے باہر کے لوگ بھی آتے ہوں گے۔یقیناً یہ صدر دروازہ رہا ہوگا۔ایک عجیب سی بدبو یا گیس غار نما فصیل کے اندر پھیلی ہوئی تھی۔ہمارے ساتھ حفاظتی دستہ اور ڈاکٹر بھی تھے۔ اس وقت سب نے ماسک سے اپنے چہروں کی حفاظت کی ہوئی تھی۔ہمارے پاس ٹارچ کے علاوہ بھی روشنی کا انتظام تھا۔یقیناً محکمہ آثار قدیمہ سے وابستہ عملوں کو ایک بڑی کامیابی ملنے کی امید تھی۔

اب ہم خوفناک آوازوں کی دنیا میں تھے۔عجیب عجیب آوازیں۔جیسے کوئی رو رہا ہو۔۔۔چیخ رہا ہو۔۔۔پھر آوازیں یکسر تبدیل ہو جاتیں۔جیسے جنگ کا ماحول ہو۔توپیں داغی جا رہی ہوں۔گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے ساتھ ہاتھیوں اور دوسرے جانوروں کی خوفناک آوازیں بھی تھیں۔جیسے ہاتھیوں کی فوج انسانوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہو۔اندر داخل ہوتے ہی مکڑیوں کے بے شمار جالے نظر آئے۔زمین پر کائی جمی تھی۔آگے کچھ خندق بنے ہوئے تھے۔جگہ جگہ مشعال رکھنے کے لیے خانے بنے ہوئے تھے۔چھپکلیوں اور رینگنے والے سانپوں کی سرسراہٹ کے شور بھی آوازوں کا حصہ تھے۔گھوش نے اپنا سسٹم کھول لیا۔ فوٹو گرافر تصویریں اتارنے لگے۔آرکیالوجیکل سروے والے اپنی تحقیق میں مصروف ہو گئے۔میں اب بھی چاروں طرف نظر ڈال رہا تھا۔قدیم شہر کی شکست خوردہ فصیل کے صدر دروازے سے اندر کا حصہ اس قدر آسیبی اور ڈراؤنا تھا کہ پسینے نکل آئے تھے۔ایک عظیم کھنڈر جس کے حصار شکستہ اور چاروں طرف ویرانی اور بربادی کے آثار۔خدا معلوم کسی بڑے حادثہ یا آفت کا ظہور یہاں ہوا ہو۔ دائیں طرف ایک ٹوٹا ہوا مجسمہ تھا۔ایک بت کے سینے پر سرطان نما پھوڑے نظر آئے۔پھر ایسا ہوا کہ مجھے اس شکستہ بت میں تھوڑی سی ہلچل نظر آئی۔شاید ہم واہموں کے درمیان گھر گئے تھے۔چاروں طرف مٹی کے تودے یا ملبے۔حد فصیل سے آگے بے ہنگم چٹانوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔کیا آسمان سے عذاب نازل ہوا ہوگا؟اب ایسی آوازوں کا شور تھا جیسے کچھ لوگوں کا قتل کیا جا رہا ہو۔ ان میں بچوں کی آوازیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔اچانک یہ آوازیں گم ہو گئیں۔اب موسلا دھار بارش کی آواز تھی۔سیلاب اور تیز اٹھتی ہوئی لہروں کا شور تھا۔۔۔جیسا شور عام طور پر سونامی یا سمندر میں آنے والے جوار بھاٹا سے پیدا ہوتا ہے۔اس شور میں انسانی آوازیں بھی تھیں۔۔۔میں بنگالی ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور اس کے ساتھی کو انہماک سے اپنے کام میں مصروف دیکھ رہا تھا۔

قصہ مختصر،ان کھنڈرات سے جو باقیات ونوادرات حاصل ہوئے وہ شعبہ تحقیق کے حوالہ کر دئے گئے۔ایک ہفتہ کی مسلسل تحقیق کے دوران آوازوں کے شور میں غیر معمولی گراوٹ آئی۔اور آہستہ آہستہ آوازیں گم ہو گئیں۔ممکن ہے،جیسا قیاس لگایا گیا کہ دروازہ کھلنے کے عمل کے دوران آہستہ آہستہ یہ آوازیں فضا میں تحلیل ہوتی چلی گئیں۔مجسمے،لکڑی کے کندے،برتن،اوزار جیسی تمام اشیاء پر اب شعبہ تحقیق کا حق تھا۔امیتو گھوش نے گھنٹوں کے حساب سے ریکارڈنگ کی تھی۔اور اب مسئلہ ایڈیٹنگ اور کٹنگ پیسٹنگ کا تھا۔میں ابھی بھی اس شک میں مبتلا تھا کہ ان غیر مرئی پراسرار آوازوں کی ریکارڈنگ ہوئی بھی ہوگی یا نہیں۔مگر بقول امیتو،جدید صوتی آلات خلائی دھڑکنوں کو بھی محفوظ کر سکتے ہیں۔

سو گھنٹے سے زائد کی فٹیج کو دوبارہ سننے کا خیال ہی رونگٹے کھڑے کرنے والا تھا۔ایک مسئلہ اور بھی تھا۔کبھی کبھی کھنڈرات

سے ملنے والے باقیات کی تحقیق میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ جب تک تحقیق سے وقت اور صحیح حالات وواقعات کی تفصیلات سامنے نہ آئیں، کیا ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ یہ خیال بھی تشویش میں مبتلا کرنے والا تھا۔ ایڈیٹنگ کے عملے میں ایسے بھی لوگ تھے جو ایک زمانے سے قدیم زبانوں پر کام کر رہے تھے۔ ساتھ دینے کے لیے نوجوان راہب بھی اس عملہ کا حصہ تھا۔ امیتو کا خیال تھا کہ غیر مرئی آوازوں کا رشتہ مختلف تہذیب، ادوار اور واقعات سے ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ اب یہ ریکارڈنگ مختلف ادوار اور حادثات کا ایک کولاژ ہے۔ ممکن ہے، مختلف مواقع پر کائنات کی پرتوں میں بکھری قدیم، صدیوں پرانی آوازوں نے ایک جگہ بسیرا کر لیا ہو۔ اس لیے تاریخ کی روشنی میں سلسلہ وار ان آوازوں کو الگ کرنا ایک پیچیدہ اور مشکل کام ہے۔ تاہم ناممکن ہرگز نہیں۔ اس کی صلاح تھی کہ پہلے اکیلے اس کو اور اس کی ٹیم کو کام کرنے کا موقع دیا جائے کہ اپنی صلاحیت اور بصیرت کے مطابق ان غیر مرئی آوازوں کی ایڈیٹنگ کر کے الگ الگ خانوں میں ڈالا جا سکے۔ اس طرح یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس صوتی کولاژ میں کتنے حادثات وواقعات کی تفصیلات درج ہیں۔ امیتو کے لفظوں میں، صرف زمانہ بدلتا ہے۔ ظلم کے طریقے بدلتے ہیں۔ مرنے کا عمل ایک جیسا ہوتا ہے۔

ایک ماہ کی غیر معمولی محنت اور مشقت کے بعد امیتو نے غیر مرئی آوازوں کو کولاژ سے نکال کر الگ الگ کہانیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ مسٹر راؤ جو لنگوئسٹک کے استاد تھے اور اردو شاعری کا ذوق رکھتے تھے، ان کا خیال تھا، یونان ومصر، روما سب مٹ گئے جہاں سے۔ اس لیے لامحدود وقت کے فریم میں کون سی آواز کہاں کی ہے، اس کو سمجھنا مشکل ہے۔

سمندر کی طغیانی اور شور کے ساتھ شروعات میں کچھ ایسی آوازیں تھیں جو جنگ کے ماحول کو پیش کر رہی تھیں۔ وہ اچانک ٹھہرے۔

''غور سے سنئے۔ یہ لشکر کی آوازیں ہیں۔ ممکن ہے معرکہ کا دن آ گیا ہو۔ یہ نقارے کی چوٹ پڑی اور یہ چیخیں۔ یہ چیخیں بتاتی ہیں کہ فوجیں ایک دوسرے سے صف آراء ہیں۔ گھمسان کا رن پڑا ہے۔ بچے رو رہے ہیں اور عورتوں کے رونے کی آوازوں میں ہاتھیوں اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ اچانک یہ آوازیں قتل عام کے شور میں تبدیل ہو گئیں۔ اس شور ہنگامے کے دوران ایک ایسی آواز ابھری کہ نوجوان راہب ٹھہر گیا۔

''یہ آواز۔۔۔؟''

''ہاں یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی ہے''۔

''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟'' لنگوئسٹک کے ماہر راؤ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔۔۔

''آہ، ہر دور میں یہ آوازیں ایک جیسی رہی ہیں''۔ نوجوان راہب کی آنکھیں بند تھیں۔ کچھ توقف کے بعد اس نے آنکھیں کھول دی۔ امیتو گھوش کو کہا کہ وہ ریکارڈنگ کو ذرا پیچھے لے جائے۔ آواز اب صاف تھی۔ شاید یہ جشن کا ماحول تھا۔ جنگوں کے بعد کے جشن کا ماحول۔۔۔ اب وہ آواز صاف تھی۔ امیتو نے ایک بار پھر ریکارڈنگ کا یہ حصہ دوبارہ سنایا۔۔۔

''یقینی طور پر یہ ہمارے یہاں لڑی جانے والی جنگیں نہیں ہو سکتیں۔۔۔'' راؤ کا خیال تھا۔

''کیوں نہیں ہو سکتیں؟'' نوجوان راہب کی نظریں جھکی تھیں۔

''ممکن ہے یہ قدیم جنگوں کی آوازیں ہوں۔ صلیبی جنگیں بھی ہو سکتی ہیں۔ منگول حکمراں بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ حکمراں جن شہروں میں پہنچے، وہاں ظلم وبربریت کی انتہا کر دی۔۔۔''

''مگر ٹھہرو۔۔۔ یہ لہروں کی آوازیں۔۔۔ کیا یہ آوازیں دریائے سندھ کی ہیں۔۔۔''

مجھے خیال آیا، کچھ روز قبل میری بیوی نے حضرت نوحؑ کی کشتی کو لے کر ایک خواب دیکھا تھا۔ کیا ہزاروں سال پرانی

آوازیں۔۔۔؟

نوجوان راہب نے میرے دل کی بات پڑھ لی تھی۔وہ مسکرایا۔۔۔''آوازیں کبھی نہیں مرتیں۔وہ افق میں، خلا میں، کائنات میں تیرتی رہتی ہیں''۔

''پھر تو ہم ان آوازوں کا سراغ نہیں لگا سکتے۔۔۔'' میں نے پر تجسس نظروں سے راؤ کو دیکھا۔راؤ نے میری طرف دیکھا۔''ایک بات جان لیجئے۔آثار قدیمہ سے حاصل ہونے والے باقیات اور گمشدہ آوازوں کے درمیان کسی طرح کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔جو باقیات ملے وہ کسی ایک عہد کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔لیکن ان آوازوں میں بیک وقت بہت سی آوازیں شامل ہیں''۔

امیتو گھوش نے قہقہہ لگایا۔اور کوئی ضروری نہیں کہ آواز میچنگ کے ساتھ میں نے سلسلہ وار جو کچھ بھی ایڈیٹ کیا ہے، وہ صحیح ہو۔ہم ساؤنڈ سسٹم میں صرف آواز میچ کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر یقین کر لیتے ہیں کہ یہ آوازیں کسی مخصوص عہد سے وابستہ ہیں۔اکثر و بیشتر بڑا سے بڑا ساؤنڈ ریکارڈسٹ اس عمل میں دھوکہ کھا جاتا ہے۔۔۔۔

''ٹھہرو۔۔۔'' نوجوان راہب نے روکا۔۔۔ جیسے یہ آواز۔۔۔یہ جانی پہچانی آواز۔۔۔'' وہ مسکرایا۔۔۔پھر یہ آواز دریائے سندھ کی موجوں میں غوطہ کیوں لگا رہی ہے؟ ذرا فارورڈ تو کرو۔۔۔۔

میتھیو نے حکم کی تعمیل کی۔اب منظر بدل گیا۔بدلی بدلی ہوئی آوازیں تھیں۔ان آوازوں میں گرجا گھر کے گھنٹوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔اسکے بعد تیز دوڑنے بھاگنے کی آوازیں۔۔۔زنجیریں توڑنے ہلانے کے دوران کچھ خفیف سی آوازیں تھیں جن کے بارے میں راؤ کا خیال تھا کہ یہ فرانسیسی لوگ ہیں۔ممکن ہے خونی انقلاب فرانس کے وقت کی آوازیں ہوں۔جب پورے فرانس میں فسادات پھوٹ پڑے۔چرچ مسمار ہوئے۔محلات لوٹ لیے گئے۔مشتعل عوام نے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی''۔

نوجوان راہب مسکرایا۔۔۔''کچھ برسوں تک فرانس ری پبلک رہا۔پھر نپولین نے تخت سنبھال لیا۔انیسویں صدی کے آغاز تک نپولین زیادہ تر یورپ پر قبضہ کر چکا تھا۔۔۔اب ان آوازوں کو سنئے۔۔۔'' وہ مسکرایا۔یہ موسیقی کی آواز ہے۔جنگ اور دل دہلا دینے والی چیخوں کے درمیان بانسری کی آواز۔کیا یہ نیرو ہے جو بانسری بجا رہا ہے؟ اور ابھی جو نسوانی چیخیں تھیں، وہ ممکن ہے، نیرو کی ماں کی آواز ہو، جس کا اس نے بے رحمی سے قتل کر دیا۔یا اپنی بیویوں میں سب سے زیادہ محبوب بیوی کی، جس پر وہ تشدد کے پہاڑ توڑتا تھا۔۔۔اب یہ آوازیں سنیے۔یہ جلتے ہوئے روم کی بھی ہو سکتی ہیں۔انقلاب فرانس کی بھی۔۔۔ بلکہ میں کہتا ہوں۔۔۔ بغاوتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔حکمراں ایک جیسے ہوتے ہیں۔۔۔اب یہ آواز سنئے''۔

''یہ تو وہی آواز ہے''۔راؤ چونک گئے تھے۔۔۔۔

''جانی پہچانی آواز۔۔۔''

نوجوان راہب نے کہا۔۔۔اور ایسا لگتا ہے یہ آواز ابھی کی ہے۔پھر یہ آواز عہد گم گشتہ تک کیسے پہنچی۔۔۔؟''

اس روز رات تک ہم اس پراسرار آواز کے تعاقب میں رہے جو وقت کے ہر فریم میں موجود تھی۔کیا وہ شخص ہنس رہا تھا؟ کیا وہ آواز کسی حکمراں کی تھی جو ہر ظلم، زیادتی اور بربریت کے بعد کبھی ٹھہاکا لگانے اور بانسری بجانے پر مجبور تھا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی آواز صدیوں پر محیط وقت کے ہر فریم میں رقص کرتی پھر رہی ہو؟ گھر آنے کے بعد میں نے سب سے پہلے لباس اتارا۔غسل کیا۔غسل سے فارغ ہو کر آیا تو بیوی نے ڈنر لگا دیا تھا۔وہ میرے سامنے ہی بیٹھ گئی۔۔۔بیٹا اس درمیان سو گیا تھا۔بیوی نے بتایا کہ بیٹے کا دوست ناراض ہو کر چلا گیا۔

''چلا گیا، مطلب؟'' کھاتے ہوئے میں اچانک چونک گیا۔

''تمہیں بتایا تھا نا۔ وہ بیٹے کو باہر لے جانے کی ضد کر رہا تھا''۔

''ہاں''۔

''بیٹا ساتھ نہیں گیا تو وہ ناراض ہو کر چلا گیا''۔

''اس کا مطلب اب وہ اس گھر میں نہیں ہے؟''

کیا تم بیٹے کی بات کا یقین کرتے ہو؟ بیوی مسکرائی۔ ''پہلے مجھے بھی ڈر کا احساس ہوا تھا۔ پھر لگا، وہ کہانیاں بناتا ہے''۔

''اگر یہ کہانی نہ ہوئی تو؟''

میں واقعی خوفزدہ تھا۔ وقت کے فریم میں اگر غیر مرئی آوازیں رہ سکتی ہیں تو گمشدہ غیر مرئی چہرے کیوں نہیں؟ میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی ہے جو اس وقت بھی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ جیسے وہ آواز، جو وقت کے ہر فریم میں موجود تھی اور ایک جیسی تھی۔

دوسرے دن ایڈیٹنگ روم میں پستہ قد راؤ لوبان اور پوجا کے سامان لے کر پہنچے تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ گمشدہ خوفناک آوازوں نے کسی حد تک راؤ کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ راؤ کو پوجا کرتے ہوئے دیکھ کر امیتو گھوش کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ فلم انڈسٹری میں کیمرے کی پوجا کے بغیر شوٹنگ کا آغاز ہی نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے ناریل پھوڑے جاتے ہیں۔ نوجوان راہب ان باتوں سے قطع نظر اب بھی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیارہ بجے سے کام شروع ہوگیا۔ ہم اس بار کچھ الگ طرح کی آوازوں کے نرغے میں تھے۔ جیسے شور کرتا ہوا باغیوں کا ایک ہجوم ہو۔ بلوہ ہوگیا ہو۔ ڈری سہمی انگریز عورتوں کی چیخیں تھیں۔ دوڑتے بھاگتے قدموں کی تیز آوازیں ان میں شامل ہوگئی تھی۔ اب جو آوازیں تھیں ان کو سن کر ایسا لگ رہا تھا جیسے جیل یا قید خانے کی دوسری دیواروں کو توڑا جا رہا ہو۔ پھر کچھ انگریز افسران کی چیخیں تھیں۔ جیسے انہیں قتل کیا جا رہا ہو۔ اس کے بعد توپیں داغنے کی آوازیں تھی ایسی آوازیں جیسے بے رحمی سے انسانوں کو قتل کیا جا رہا ہو۔ چاروں طرف سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں

راؤ نے ہماری طرف دیکھا۔ لیکن بولے کچھ نہیں۔

نوجوان راہب نے گہرا سانس لیا۔ ''دلی کی تباہی کا منظر۔ اٹھارہ سو ستاون کا غدر۔۔۔ راؤ نے سر اثبات میں ہلایا۔ پہلی آواز میرٹھ سے آنے والے باغیوں کی تھی۔ ان میں پیادہ اور سوار دونوں تھے۔ سپاہیوں نے کپتان کے ساتھ کئی انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فوجیں جمع ہو کر قلعہ میں پہنچیں۔ افسوس، اس میں بزرگ بادشاہ کی آواز قید ہونے سے رہ گئی۔ بادشاہ کو احساس تھا کہ انگریز آسانی سے اس بغاوت کو کچل ڈالیں گے۔۔۔''

راؤ نے راہب کی طرف دیکھا۔ اور اس کے بعد کی آوازیں انگریزوں کی طرف سے لیے گئے انتقام کی آوازیں ہیں۔ بادشاہ گرفتار کیے گئے۔ شہزادوں کو گولیاں ماری گئیں۔ انگریزی فوجیں دلی میں داخل ہوئیں تو شہر کے باشندوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔۔۔

''بھیانک''۔ مسٹر راؤ نے آہستہ سے کہا۔۔۔ اس کے بعد اچانک جو آواز ابھری، اسے سن کر وہ گھبرا گئے تھے۔

''وہ یہاں بھی ہے''۔

وہی مانوس سی آواز۔۔۔ نوجوان راہب نے گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے میری طرف دیکھا۔۔ امیتو نے آواز کو ایک مقام پر روک دیا۔ اب وہ آواز لگاتار دھمک کے ذریعہ ہم تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز میں ایک مخصوص تھرتھراہٹ تھی۔۔۔ گولیوں کے شور، توپ کی آوازوں، انسانی چیخ اور مرنے والوں کی دلخراش آوازوں نے بھی ہمیں اتنا متاثر نہیں کیا تھا، جس قدر یہ آواز ہمیں پریشان کر رہی تھی۔

یہ چائے کا وقفہ تھا۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ نوجوان راہب اب بھی اپنی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھا۔ جبکہ راؤ کے چہرے پر خوف کی لکیر ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ''یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں''۔

نوجوان راہب نے آنکھیں کھول کر راؤ کی طرف دیکھا۔۔ ''پہلے فریم سے آخری فریم تک دیکھ لیجئے۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر عوام کا قتل۔۔۔''

میرے سامنے مارخیز کی کہانی روشن تھی۔۔ ''وہ سوال جو موبیطل کی بیوی سے اس کی بیٹی نے اپنے خط میں کیا تھا۔۔ کیا ایسے ملک میں رہنا ممکن ہے؟''

''ریوائنڈ کرو''۔ راؤ نے امیتو کی طرف دیکھا۔۔۔ ویری گڈ۔ اب فاسٹ فارورڈ کرو۔ ہم آوازوں کے ہجوم میں گم تھے۔۔۔ اب روک دو۔ راؤ نے ایک بار پھر ہمارے چہرے کا جائزہ لیا۔

''ملک کی آزادی سے پہلے کی ایک خوفناک ریہرسل۔ لیکن ملا کیا؟ بغاوت کچل دی گئی۔ لاشیں بچھ گئیں''۔

''لیکن ان ڈیڈ باڈی سے گزرنے کے بعد ہمیں آزادی تو ملی؟'' امیتو نے راؤ کی طرف دیکھا۔۔۔

نوجوان راہب نے دونوں کی طرف غور سے دیکھا۔ تاناشاہی سے جمہوری نظام اور حکومت تک کیا سچ مچ کوئی تبدیلی آئی ہے؟ راہب نے قہقہہ لگایا۔ ہمیں آپ وقت کے کسی بھی فریم میں کھڑا کر دیجئے۔ ہم عوام ہیں تو ہماری اصلیت زیرو ہے۔

قہقہہ لگاتے ہوئے امیتو نے مخصوص بنگالی لب و لہجہ میں کہا۔ ''اور ہم پر یہ آوازیں سوبار ہیں''۔

''سوبار نہیں سوار''۔ راؤ نے آہستگی سے کہا۔

اچانک آوازیں بدل گئی تھیں۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز تھی، جس کو سننے کا حوصلہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ امیتو کے فاسٹ فارورڈ کرنے کے باوجود ہم دہلا دینے والی آوازوں کی زد میں تھے۔ چائے کے مختصر وقفہ کے بعد جب دوبارہ ہم یکسوئی کے ساتھ بیٹھے تو خوفناک شور اور دھماکے کی آواز نے ہمیں اپنی جگہ منجمد کر دیا۔ دھماکہ کی آواز رکتے ہی ایک ساتھ لاکھوں افراد کے چیخنے، چلانے، کراہنے کی آوازوں نے ہم سب کو اپنی جگہ خوفزدہ کر دیا۔۔۔

راؤ نے خوفزدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت آئن سٹائن کے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔

I fear the day that technology will surpass our human intraction. The world will have a generation of idiots.

میں نے راؤ کی طرف دیکھا۔ ''جب ایک بڑی دنیا جنگ جنگ چلا رہی تھی، وہ امن کی باتیں کر رہا تھا''۔

نوجوان راہب نے ہماری طرف دیکھا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آوازیں تاریخ کی دو تباہ کن جنگوں کی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم جب ایک کروڑ سے زیادہ ہلاکتیں سامنے آئیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست پر ہٹلر کو افسوس تھا۔ لیکن ایک حکمران کی طاقت کا انجام کیا ہوا۔۔۔؟''

ہم ایک بار پھر خوفناک آوازوں کی زد میں تھے۔ چیخ، کراہوں کا بازار گرم تھا۔

راؤ نے بلند آواز میں کہا۔ ''بے وقوفوں کی نسل۔۔۔ انجام کیا ہوا۔ امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملہ کر دیا۔ ان آوازوں میں جنگیں قید ہیں یا انسانی تباہی''۔

نوجوان راہب مسکرایا۔ ''اس بے رحم تاریخ کے ایک صفحے پر مسولینی کو پھانسی دیئے جانے کا واقعہ درج ہے تو دوسرے صفحے پر ہٹلر کی خودکشی کی داستان۔ حکمران کبھی عبرت نہیں لیتے۔ ہاں ایک بات اور ہوئی''۔

راہب نے راؤ کی طرف دیکھا۔ ''ان جنگوں سے ہندوستان کو فائدہ ہوا۔ برطانیہ کمزور ہوا اور ہندوستان کی آزادی کا راستہ صاف ہوگیا''۔

''ڈوائیڈ اینڈ رول ڈیڈ انڈیا''۔ امیتو پرمذاق لہجے میں بولا۔ ہم کو کیا ملا۔ آزادی کی پچھل''۔

''پچھل نہیں۔ پونچھ''۔ راؤ مسکرایا ضرور لیکن اس کی آنکھیں ابھی بھی فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ''ایک بات محسوس کی؟ ان خوفناک آوازوں میں محبت کہیں نہیں ہے۔ محبت دلوں میں رہتی ہے''۔

''ممکن ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ محبت کم ہوگئی ہو۔ اتنی کم کہ نہ وہ ہمیں کہیں دکھائی دیتی ہے نہ سنائی۔ وہ ہمارے ساتھ ہی مرجاتی ہے جبکہ بدی نہیں مرتی۔ وہ تیرتی رہتی ہے''۔ نوجوان راہب بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ راؤ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

پھر وہی مانوس سی آواز۔ راؤ اس بار غصے میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آج بس یہیں تک۔ یہ آواز ہمیں پاگل کردے گی''۔

مانوس مگر پراسرار آواز دیر رات تک مجھے پریشان کرتی رہی۔ ایڈیٹنگ سے فارغ ہوکر میں گھر آیا تو میرا بارہ برس کا بیٹا پڑھائی میں مشغول تھا۔ میں نے اسے پیار کیا۔ اور کچھ سوچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ جاننے کے لیے میں نے اس کی کتابوں میں دلچسپی دکھائی۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ کی تعریف کی۔ وہ خوش ہوکر بتانے لگا کہ میم بھی اس کی ہینڈ رائٹنگ کی تعریف کرتی ہیں۔ میں نے اچانک بات کا رخ اس کے نئے دوست کی طرف موڑ دیا۔ اچانک اس کے چہرے کی مسکراہٹ گم ہوگئی۔ اس نے، جہاں میں بیٹھا تھا، اس کے بائیں طرف اشارہ کیا۔ میں سرعت سے گھوما مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

بیٹا مطمئن تھا۔ ''وہ نظر نہیں آئے گا''۔

''کیوں؟''

''وہ سب کو دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے دکھائی دیتا ہے۔ اور اس وقت وہ کمرے میں ہے''۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ایسا نہیں ہوتا بیٹے۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ بلکہ میں اسے ایڈیٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد نفسیاتی معالج سے دکھانے کے بارے میں غور کر چکا تھا۔

بیٹے نے اپنی بات جاری رکھی۔ وہ ہے۔ اور کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے میں نہیں جاتا ہوں تو وہ غصہ ہو کر کچھ دنوں کے لیے گم ہو جاتا ہے''۔

میں نے پلٹ کر بیوی کے چہرے کو دیکھا تو وہ خوفزدہ نظر آئی۔ مجھے نوجوان راہب کی بات یاد آرہی تھی۔ محبت اتنی کم ہو گئی ہے کہ نہ دکھائی دیتی ہے نہ سنائی۔ محبت کے ناکارہ کل پرزوں میں تقسیم ہوکر بیٹا، میں اور بیوی صرف رسم بن کر رہ گئے تھے۔

ہم آہستہ آہستہ اس مکمل کہانی یا غیر مرئی آوازوں کے انجام تک پہنچ رہے تھے۔ کئی سوال تھے جنہوں نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ کیا یہ الگ الگ کہانیاں غیر مرئی آوازوں کے ذریعہ کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں؟ امیتو گھوش نے اتنی ہشیاری سے آوازوں کے ہر فریم کو ایک کہانی میں کیسے تبدیل کرلیا؟ کیا ہم کہانیوں کی حقیقت کا سراغ لگا پانے میں کامیاب ہیں؟ ممکن ہے کٹنگ پیسٹنگ میں امیتو سے کوئی غلطی ہوئی ہو اور اس نے ایک آواز کا سرا دوسرے سے جوڑ دیا ہو۔ میں مطمئن تھا اگر ایسا ہے بھی تو ان تمام رونگٹے کھڑے کرنے والی کہانیوں میں کوئی فرق تفریق نہیں۔ وقت کے لامحدود فریم میں ہر کہانی کہیں نہ کہیں ایک دوسری سے ٹکرا رہی ہے۔ شاید اسی لیے یہ کہاوت بھی سامنے آئی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرایا کرتی ہے۔

اس بار بہت کچھ پہلے کی آوازوں سے مختلف تھا۔اس بار بارود کے دھماکے نہیں تھے۔ہم اس وقت چونک گئے جب اس بات کا احساس ہوا کہ ان غیر مرئی آوازوں کے درمیان مکالمے بھی سنے جاسکتے ہیں۔ریکارڈنگ کی شروعات میں کسی بازار یا سبزی مارکیٹ سے ابھرنے والی آوازیں تھیں۔ کچھ لوگوں کی رسمی گفتگو تھی ۔ یہ شہر کے باشندے تھے ۔ جو صبح صبح عام طور پر گھر کی دیگر ضروریات سے فارغ ہوکر کام پر نکل جاتے ہیں۔ مزدور پیشہ، کالج کے طالب علم۔۔۔ تجارت سے وابستہ ۔۔۔ جیسا کہ ایک چھوٹے سے شہر کی عام زندگی ہوتی ہے۔ رکشہ، ٹیمپو، بس کے ہارن کی آوازیں بھی مکالموں کے درمیان ابھر رہی تھیں۔مسٹر راؤ کا خیال تھا۔ یہ چھوٹا سا شہر یا قصبہ ہوسکتا ہے۔ایسا قصبہ، جہاں کے لوگ ایک خوشگوار، ٹھہری ہوئی زندگی گزار رہے ہوں۔ شہروں کی زندگی میں اتنا ٹھہراؤ نہیں آتا۔

آواز تبدیل ہوگئی تھی۔ پھیری والے اور سبزی والوں کے شور تھے۔اس کے ساتھ ہی ندی کی لہروں کی آواز بھی تھی جو دیگر آواز اور مکالموں پر حاوی تھی۔ راؤ کا ذاتی خیال تھا کہ اس آخری کولاژ میں ایسا کچھ بھی نہیں جس پر تبادلہ خیال ممکن ہو۔ یہ ایک شہر کی آپ بیتی ہے۔اور ایسے شہر ہندوستان میں بڑی تعداد میں ہیں۔اس نے امیتو کو مشورہ دیا کہ فارورڈ کر کے دیکھے۔امیتو نے حکم کی تعمیل کی۔اگلے ہی لمحہ ہم جن آوازوں کی زد میں تھے،اس نے ہم سب پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

راؤ زور سے چیخے۔ ''رِوائنڈ کرو۔'' راؤ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔''مائی گاڈ۔۔۔ آپ جانتے ہیں یہ کیا تھا؟ لیکن میں سمجھ رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ ہم شروع سے تمام آوازوں کو سننے کی کوشش کریں۔اب سنئے ۔۔۔ یہ کوئی اسکول ہے۔۔ بچوں کی آوازیں ہیں۔ بچے پرارتھنا کر رہے ہیں۔۔۔ اب یہ آواز سنئے ۔۔۔ یہ مندر کی گھنٹی کی آواز ہے۔اور یہ دیکھئے اذان ہو رہی ہے۔۔۔اور اب۔۔۔ پانی کی رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔ بہت تیز آواز ہے۔۔۔امیتو۔۔۔ پلیز رِوائنڈ۔۔۔۔ یہ کچھ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔۔۔امیتو۔۔۔ کیا یہ آوازیں صاف ہوسکتی ہیں؟

''کوشش کرتا ہوں''۔

پانی کی آواز،لہروں کے شور کے درمیان اب آواز کسی حد تک صاف اور سنی جاسکتی تھی۔۔۔

''کوشش کرتا ہوں''۔

پانی کی آواز،لہروں کے شور کے درمیان اب آواز کسی حد تک صاف اور سنی جاسکتی تھی۔۔۔

راؤ نے اشارہ کیا۔ان کی باتوں پر دھیان دیجئے۔۔۔ مائی گاڈ۔ سات سو سال پرانا شہر۔۔۔ کچھ لوگ اسی شہر کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔۔۔والیوم بڑھاؤ امیتو۔۔۔ہاں اب ٹھیک ہے۔۔ جو لوگ باتیں کر رہے ہیں ان کی آواز میں غم و غصہ کی لہریں ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہی گھر کو توڑنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ سات سو برس پرانے شہر کے باسی بھلا اپنے ہی گھروں کو توڑنے کی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ اب یہ آواز سنو۔۔۔

''ردی لے لو۔۔۔ردی لے لو۔۔۔''

نوجوان راہب نے پلٹ کر راؤ کو دیکھا۔''ایسا لگتا ہے جیسے یہ ردی والے سینکڑوں کی تعداد میں ہیں ۔مگر ایسا کیوں ہے''۔

''امیتو۔۔۔پلیز رِوائنڈ کرو۔اور ایک بار پھر تمام آوازیں سناؤ''۔

ہم بغور دھیان لگائے سننے میں مصروف تھے۔ درمیان میں پاور پلانٹ سے نکلنے والی آوازوں کی گھن گرج بھی شامل تھی۔مرد عورتوں کی فلک شگاف چیخیں تھیں۔اب پھاوڑے اور کدال کی آوازیں صاف تھیں۔

نوجوان راہب نے گہرا سانس لیا۔ افسوس۔۔۔لوگ خود ہی اپنا بسا بسایا گھر ڈھا رہے ہیں۔عمارتیں زمین بوس ہو رہی

ہیں۔ ایک کے بعد ایک گھر ٹوٹ رہے ہیں۔ ایک کے بعد ایک لرزہ دینے والی آواز۔۔۔ یہ بسی بسائے عمارتوں کی چیخیں ہیں۔ کبھی یہ عمارتیں شہر کے سینے پر تن کر کھڑی رہتی ہوں گی۔ اب ملبے میں تبدیل ہو رہی ہیں۔۔۔"

"ردی لے لو۔۔۔ ردی بیچو۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی ٹرک اور ٹریکٹر کی آوازیں تھیں۔ سامان اتارنے اور چڑھانے کی آوازیں تھیں۔ ایسی آوازیں کہ لوگ اپنے ضروری سامان، یہاں تک کہ دروازے کھڑکیاں تک ردی کے کاروباریوں کے ہاتھوں فروخت کر رہے ہوں۔ ایک کے بعد ایک ٹرک اور ٹریکٹر کے جانے کی آوازیں۔ اس کے بعد دوڑتے بھاگتے لوگوں کی آوازیں تھیں جو دلوں میں خوف برپا کر رہی تھیں۔ اب کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں تھیں۔ امیتو نے رک کر والیوم بڑھا کر آواز کو کسی حد تک صاف کرنے کی کوشش کی۔ درمیان میں کچھ جملے ایسے تھے، جنہیں سمجھنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ لیکن اب آواز صاف تھی۔۔۔ دراصل یہ کسی میٹنگ کی آواز تھی۔ ہم ہمہ تن گوش ہو کر ان آوازوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک: کیا یہ آسان ہے۔۔۔

دو۔ کوئی پراجیکٹ آسان نہیں ہوتا۔ اس پراجیکٹ پر پچاس سال سے زائد کا وقت خرچ ہو چکا ہے۔۔۔

(کچھ آوازیں صاف تھیں)

تین۔ کیا ہم **ایک** فرضی مستقبل کی بات نہیں کر رہے۔۔۔

(لائنیں سنی نہیں گئیں لیکن ان میں ہم بمشکل پاور پلانٹ، ڈریم اور پراجیکٹ کا ذکر سن سکے)۔

چار۔ **انفارمیشن** ٹیکنالوجی کی نئی تاریخ میں ہم **ایک** مرتے ہوئے شہر کے ذمہ دار ہوں گے۔

پانچ۔ گھر بار، زمین، زبان، تہذیب، تاریخ۔۔۔ ایک شہر کے مرنے کا مطلب جانتے ہیں؟

ایک۔ پراجیکٹ کے لیے اس سے فرق نہیں پڑتا۔

چھ۔ ملک، شہر، **انسانیت** کے ساتھ قدرت، جنگل، انوائرنمنٹ کو بھی اس کی بڑی قیمت چکانی ہوگی۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو، کہ کتنے جنگل تباہ ہوں گے؟ سینچائی کی کتنی لاکھ ہیکٹر زمین پانی میں ڈوب جائیں گی؟

ایک۔ پراجیکٹ فائنل ہو چکا ہے۔

سات۔ کیا یہاں سے ہجرت کرنے والوں کو بسانا آسان ہوگا؟

ایک۔ معاوضہ دیا جائے گا۔

آٹھ۔ **ایک** شہر کی موت کا معاوضہ کتنا ہو سکتا ہے؟

(نہیں سنی گئی آوازیں۔ ماسٹر پلان، ڈیم اور پاور پراجیکٹ کا ذکر۔ پھر ہنسنے کی آوازیں، جیسے تاش کا گیم کھیلا جا رہا ہو)

اس کے بعد پانی کی لہروں کی آواز تھی۔

راؤ کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ "ہم گواہ ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں **ایک** شہر نے جل سمادھی لے لی۔۔۔"

"ایک تباہی سے نکل کر دوسری تباہی کی طرف۔ ہم انجان ہیں لیکن اس وقت بھی کوئی نہ کوئی ہے، جو ہمارے لیے "جل سمادھی" کا انتظام کر رہا ہے"۔ میں آہستہ سے بولا۔ **ریکارڈنگ** میں خفیف سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اچانک وہی مانوس سی آواز ابھری۔ راؤ تقریباً اپنی جگہ سے اچھلا۔۔۔ "یہ آواز یہاں بھی۔۔۔"

ہم اپنی جگہ منجمد، حواس باختہ اور گم گشتہ آواز کی زد میں تھے۔ کمرے میں حبس بڑھ گیا تھا۔ انسانی تباہی کے کولاژ کے

آخری فریم نے ہمیں اپنی جگہ ششدر اور مبہوت کر دیا تھا۔ کیا ایک ہنستی مسکراتی دنیا میں ایسا ممکن ہے۔ کیا کسی ماسٹر پلان، کسی ڈیم، کسی بجلی پراجیکٹ کے نام پر ایک قدیم شہر کو زمین بوس کیا جا سکتا ہے؟ کمرے میں حبس بڑھنے لگا تھا۔۔۔ نوجوان راہب کی آنکھیں بند تھیں۔ امیتو گھوش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ راؤ کی آنکھیں اسٹوڈیو کی چھت کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کے بعد ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔ پہلے راؤ کمرے سے نکل کر گئے۔ اس کے بعد نوجوان راہب بھی اٹھ کر چلا گیا۔ کمرے میں اب میرے ساتھ صرف امیتو رہ گیا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ ہم میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ ذرا توقف کے بعد امیتو گھوش نے میری طرف دیکھا۔

''کیا ویسا ہوا ہوگا؟''

''ایسا ہو رہا ہے''۔ میری آواز کانپ رہی تھی۔

''اب اس کے بعد کیا کریں؟'' امیتو نے میری طرف دیکھا۔

میں گہرے سناٹے میں تھا۔ حضرت نوحؑ کی کشتی، انقلاب فرانس، جنگ عظیم کی تباہیوں کے بعد اب ایک زندہ شہر کو مرتے ہوئے دیکھنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

میری آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ ''ان تمام آوازوں کو ڈیلیٹ کر دو''۔

میں کمرے سے نکل کر باہر کی کھلی فضا میں آیا تو آسمان پر بدلیاں چھا چکی تھیں۔ سڑکوں پر پاگل کر دینے والا ٹریفک تھا۔ ٹریفک کے شور اور بے ہنگم آوازوں کی دنیا سے میں باہر نکلنا چاہتا تھا۔ وقت کے ہر فریم میں موجود وہ مانوس سی آواز ابھی بھی مجھے پاگل بنا رہی تھی۔ میں جب گھر کی طرف روانہ ہوا، اس وقت بھی میں ان غیر مرئی آوازوں کی زد میں تھا۔ بیوی نے میرے جلد آنے پر حیرت کا اظہار کیا۔ میں نے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔

''وہ ڈر گیا ہے''۔

''کیوں؟''

''اس کا دوست کہیں گم ہو گیا ہے۔ اب وہ نظر نہیں آتا''۔

''یہ تو اچھی بات ہے''۔

''نہیں۔ اب بیٹا جہاں کہیں بھی ہوتا ہے، اس کی آوازیں سنتا ہے''۔

آسمان میں بجلی گرجی۔ اس درمیان اتنا ہوا کہ بارش شروع ہوگئی۔ مجھے سارا شہر پانی میں جل سمادھی لیتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

بارہ ماہ

مظہر الاسلام

واہ وا اے — سیویاں دا گاہ اے
اللہ بادشاہ اے — چور بجھے ویندے نیں
کاغذاں دی بیڑی اے — حافظ کعبے ویندے نیں
کبوتر ملاح اے — آکھاں گا ایمان نال
حلوے دی کھیر اے — کہانی سنو دھیان نال

یہ میری کہانی کا مُڈھ ہے۔ جو اسی چیتر کے مہینے سے شروع ہوتی ہے۔ پھولوں کے رنگ گوہڑے ہو رہے ہیں۔ گیلی ہواؤں نے اپنی سبز اوڑھنیاں پہاڑوں پر پھیلا دی ہیں۔ دریا تو ایک طرف چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کے منہ بھی بے وقت جھاگ سے بھرے ہوئے ہیں۔ کاغذوں کی کشتیاں رواں ہیں اور کبوتر پروں میں چپو تھامے پانی چیرنے میں مصروف ہیں۔ حافظ حلوے کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور یہ چیتر کے مہینے کی ایک خوش رنگ شام ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا ہے کہ اچانک چائے کی پیالی میں گر جاتا ہے۔ وہ کوئی بچہ نہیں نہ ہی اس کا قد چھوٹا ہے۔ چالیس پچاس برس کا چھ فٹ لمبا آدمی چائے کی پیالی میں گر گیا۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ اسے خود بھی یقین نہیں آیا کہ وہ چائے کی پیالی میں گر گیا ہے اور یہ یقین کرنے ہی میں چیتر کا مہینہ گزر گیا اور وساکھ کی پہلی صبح نے ٹھرے ہوئے گھروں میں نیم گرم انگلیاں پھیریں۔

سارا وساکھ اس کے گھر والے اسے ڈھونڈتے پھرے۔ گلیوں بازاروں اور دیہاتوں اور پہاڑوں میں سارا وساکھ وہ بھی چائے کی پیالی سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن چائے میں اتنی چینی پڑی ہوئی تھی کہ چکناہٹ کی وجہ سے بار بار اس کا پاؤں پھسل جاتا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ بچپن سے پچاس برس کی عمر تک اس نے ہزاروں، لاکھوں پیالیاں چائے کی پی ہوں گی لیکن یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ایک دن چائے پیتے پیتے چائے کی پیالی میں گر جائے گا۔ اس پیالی میں جو پورے سیٹ کے ساتھ اس نے پچھلے وساکھ میں خریدی تھی۔ اس نے پیالی میں پڑے پڑے سوچا پچھلے وساکھ میں گندم پوری طرح جوان تھی اور وہ گاؤں پہنچا تو اس کی کٹائی شروع ہو چکی تھی اور یہ بھی وساکھ کا مہینہ ہے گندم کی کٹائی شروع ہو چکی ہے لیکن سب لوگ اسے تلاش کر رہے ہیں اور وہ چائے کی چھوٹی سی پیالی میں گرا ہوا ہے۔ پار سال وساکھ میں اس نے جو منصوبے بنائے تھے سب دھرے رہ گئے ہیں اور اب جیٹھ کی نیم گرم ہوا لوگوں کے کوٹوں اور سوئیٹروں کے بٹن کھول رہی ہے۔

اب جیٹھ کا مہینہ ہے پورے گھر کے لوگوں نے گرم کپڑے تہہ کر کے بکسوں میں رکھنے شروع کر دیئے ہیں اور اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کی باتیں آنسو بن کر لوگوں کی آنکھوں میں تیرتی ہیں۔ بزرگ شام حقہ پیتے ہیں تو ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ پچھلے جیٹھ میں اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ ہمیں چھوڑ جائے گا اس موقع پر حقہ یونہی پڑا رہتا ہے اور کوئی واری نہیں لیتا کہ کہیں حقے کی آواز میں اس کا دل نہ بول پڑے۔ پچھلے جیٹھ میں وہ حقے میں بھی بولتے تھے تو وہ ان کی آواز سن لیتا تھا لیکن اب جانے وہ کہاں کھو گیا ہے لیکن وہ ہے کہ چائے کی پیالی میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور جیٹھ بھی گزرتا جا رہا ہے۔

ہاڑھ آیا ہے۔ سورج بکریوں کو ہانک کر پہاڑوں پر لے گیا ہے مگر وہ اس گرمی میں بھی چائے کی پیالی میں جھلس رہا ہے۔

ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن تھک ہار کر گر پڑتا۔ آسمان ننگا پھر رہا ہے۔ ایک پرانا کیمرہ شہر کے چوک پر رکھا ہے اور رنگ دار بارعب کپڑوں والے کیمرے پر پڑے کالے کپڑے میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے کی انگلیوں سے کھیل رہے ہیں۔ چرواہے کا بیٹا بوہڑ کے نیچے کہہ رہا ہے:

واہ ڈاڈاے اللہ بادشاہ اے
کیڑیاں دودھ دیندیاں گل دا دستور اے
سرے دانیاں رڑک رڑ کیندیاں اللہ جانے سچ اے کوڑ اے
دریالسیاں دے وگدن گل سوہنی کریسوں
آندا دوہندا تسیا مرداے کوڑ زری نہ دیسوں
گل تے لگدے نیں پے پیسے دیواج گل سنوی سائیں

اور چرواہے کے بیٹے کی یہ بات پوری ہوتے ہی ہاڑھ کے آخری دن آ جاتے ہیں۔ وہ پیالی سے نکلنے کے لیے بھرپور کوشش کرتا ہے۔ لیکن سے بے بس ہو کر گر پڑتا ہے۔ چائے کے چھینٹے میز پر بکھر جاتے ہیں۔ وہ نڈھال ہو کر کوشش ترک کر دیتا ہے لیکن یہ سوچ کر کہ لوگ اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں پھر کوشش شروع کر دیتا ہے، آوازیں دیتا ہے لیکن چائے کے بلبلے ان آوازوں کو نگل لیتے ہیں۔ وہ پہلی تکلیفیں بھول جاتا ہے اور اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ آج پہلی بار چائے کی پیالی میں گرا ہو۔

اب سون شروع ہو گیا ہے۔ آسمان روتا ہے۔ پہاڑوں کے گالوں پر آنسوؤں کی قطاریں لگ گئی ہیں۔ چڑیاں انڈے دینے کی فکر میں گھروں کی چھتوں پر منڈلاتی پھرتی ہیں اور تنکے اکٹھے کر رہی ہیں۔ عورتیں بھیگی ہوئی ہیں اور ان کے کپڑوں سے آگ نکلتی ہے زمین پناہ مانگ رہی ہے۔ دریا اس کی دکھاں چاٹ رہا ہے۔ یہ سب عورتیں اور زمینیں انہیں کی ہیں جنھوں نے ان پر قبضہ کر رکھا ہے اور یہ سون کا مہینہ ہے اور وہ ابھی تک چائے کی پیالی میں گرا ہوا ہے اور اس کی آوازوں کے بلبلے پانی کی سطح پر تیر رہے ہیں۔ بجلی کڑک رہی ہے۔ اس کے گھر کے لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔

بھادوں بھی آ گیا ہے۔ خدائی ننگے پیر پھرتی ہے۔ پرندوں نے اپنی چونچیں گھونسلوں میں چھوڑ دی ہیں۔ حاملہ عورتوں کی آنکھوں میں حیرانی تنی ہوئی ہے۔ نیکیاں سبزی والے کی دکان پر توریوں کے بھاؤ بکتی ہیں۔ بچے الٹی سلیٹوں پر تقویم کے سوال نکالتے ہیں۔ رنگدار کیلنڈر چھپ رہے ہیں۔ آٹے کے ٹین پر کاکروچوں نے بلہ بول دیا ہے۔ سیلن نے گھروں اور عورتوں کو بیچ بچا کر دیا ہے۔ طوطے کترنے کے لیے اور مانگتے ہیں۔ گدھوں نے آسمان کی دوستی کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ یہ بھادوں کا مہینہ ہے اور وہ ابھی تک چائے کی پیالی میں گرا ہوا ہے۔

اسوں کی ابتدا بھی جدائی کے آنسوؤں سے ہوئی ہے۔ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر گیا ہے اور بڑے بوڑھوں کا خیال ہے کہ اب یہ گھونسلے میں نہیں بیٹھے گا۔ چوہا لوگوں کے ہاتھوں سے روٹی چھینتا ہے۔ جوانی محبوب کے انتظار میں پھاوی ہو چکی ہے۔ اس نے ایک مدت سے دوپٹے کا نیا رنگ نہیں چڑھایا۔ پرانے سوئیٹروں کی اون ادھڑ رہی ہے اور نئے گولے سلائیوں پر چڑھ گئے ہیں۔ چرواہے کا بیٹا سوت جولا ہے کے گھر چھوڑ آیا ہے اور کہتا ہے:

واہ ڈاڈاے اللہ بادشاہ اے
گل سوہنی کریسوں کوڑ زری نہ مریسوں

درختوں پر پھل پک گئے ہیں لیکن پارسال کے اسوں کی طرح اس میں ذائقہ نہیں۔

کتیں کی ہوا چلی ہے مگر پھلوں کے ذائقے چوری ہو گئے ہیں چورنا صبح بن رہے ہیں۔ مائیں بچوں کو دودھ پلانے سے کترانے لگی ہیں۔ان کے دودھ میں کتیں کے مہینے کی خوشبو نہیں بلکہ وہ خوف اور گھٹن سے پتلا ہو گیا ہے بیلیں اور پودے بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن سبزیاں ابھی کچی ہیں۔گھر کا چور گھر کی عورت کے ساتھ ہے۔چیونٹی غصے میں اپنی دم کاٹ رہی ہے۔کتیں کا مہینہ ہے بزرگ کہہ رہے ہیں خدا سے نہ ڈرو برے آدمی سے ڈرو۔ پرایا تیر کمان میں جوڑا ہوا ہے۔کتیں اب کنارے لگ رہا ہے لیکن وہ چائے کی پیالی میں گرا ہوا ہے۔۔۔اس بات کا اسے گمان بھی نہ تھا اور اب طرح طرح کے اندیشے لوگوں کا ماس نوچ رہے ہیں۔ سرِ شام ہوا میں ٹھر بڑھ گئی ہے۔ چرواہے کے بیٹے کا دل مسافر ہو گیا ہے اور وہ خود بھی سفر کی تیاری میں مصروف ہے اور کہتا ہے:

واہ دااے　　　　اللہ بادشاہ اے
گل سونہی کریسوں　　　　کوڑ زری نہ مریسوں

اتنے میں مگھر چڑھ آیا ہے۔اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں، مگھر کی آج کتنی ہے ان کی آوازوں میں وہ بیزاری ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ چور گھر کی چھت پر چوری کا سامان بانٹتے ہیں۔ وہ سب نیچے بیٹھ کر سنتے ہیں مگر بول نہیں سکتے۔ پاجی آوازیں لوگوں کے کان چھید رہی۔مگھر کی شام ٹھنڈی ہوا اور آسمان پر ڈار سے وچھڑی کونج تھکاوٹ کا عذاب اور جدائی کا روگ۔ آنکھوں نے اعتبار کرنا چھوڑ دیا اور وہ ابھی تک چائے کی پیالی میں گرا ہوا ہے۔لوگ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہار گئے ہیں۔جدائی کا ذائقہ کڑوا زہر ہو گیا ہے۔عورتیں کانوں میں بندے نہیں پہنتیں اور ان کی رنگدار دھاریوں والی چوڑیاں ان کی وینی جکڑ رہی ہیں۔ مگھر کا ڈھ ہے مگر دھوپ ہسپتال کے بنچ پر بوتل پکڑ کر لیٹی بڑھیا لگ رہی ہے۔اسے پیالی میں گرے نہ جانے کتنے موسم بدل گئے ہیں۔لکھنے والوں کے قلم تیز بخار میں تپ رہے ہیں اور درختوں کے پتے ٹہنیوں سے جدا ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔مگھر کی آج کتنی ہے۔

مگھر کیا اب تو پوہ کا پالا کمبل اوڑھے پھر رہا ہے اور دوسروں کے کھیسوں کو چھیڑتا ہے۔ وہ اب صبح پانی بھرنے نہیں جاتیں۔پالا کی انگلیاں مروڑتا ہے اور انہیں جگہ جگہ سے چاٹتا ہے۔ساری رات لومڑی کی آواز گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتی ہے۔ وہ لومڑی جس کے بارے میں محافظوں نے چیتر یا بھادوں میں کہا کہ ظالم خونخوار لومڑی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔گاؤں والوں کو خوش ہونا چاہیے۔ یہ کوئی زبانی بات نہ تھی بلکہ اسے لکھ کر تقسیم کیا گیا تھا لیکن مری ہوئی لومڑی کی آواز پھر بھی آ رہی ہے۔ بزرگوں سے پوچھا تو پتہ چلا۔لومڑی مر جاتی ہے اس کی آواز کبھی نہیں مرتی۔ یہ پوہ ہے اور وہ ابھی تک چائے کی پیالی میں گرا ہوا ہے اور اس کی آنکھیں چائے کی پیالی پر تیرتی ہیں اور چرواہے کا بیٹا کہتا ہے:

واہ دااے　　　　اللہ بادشاہ اے
گل سونہی کریسوں　　　　کوڑ زری نہ مریسوں

لوگو مگھر دوسرے مہینوں سے کچھ زیادہ ہی بھاری ہو رہا ہے۔تم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔انتظار بھی لمبی تان کر سو گیا ہے۔وہ اپنے محبوب کو ڈھونڈتی ہے۔نگر پر بھاگتی پھرتی ہے۔اس کے دوپٹے کا رنگ کچا ہو گیا ہے اور چرخے کی تند ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔پونیوں کی چھبی میں پالا بیٹھ جاتا ہے تو وہ سارا سارا دن پلا کاتتی ہے اور کاتتے کاتتے ماتہہ آ جاتا ہے۔

خیال تھا کہ وہ چیتر یا ساون بھادوں میں بچھڑا۔ ماتہہ یا پھگن میں آ ملے گا مگر ابھی تک تو گلیاں اور بازار سونے پڑے ہیں۔وہ صبح شام قبروں پر پھول چڑھانے لے جاتی ہے اور اس کے لیے دعا مانگتی ہے کچھ خود قبریں اللہ کھلی کرے گا۔میرا مطلب ہے کشادہ۔۔۔بہر حال قبروں کو سب کا انتظار ہے۔ چرواہے کا بیٹا کہتا ہے:

قبراں اڈیکدیاں

جیویں پتراں نوں ماواں

لیکن وہ تو اللہ تعالیٰ کے ٹھیکیدار ہیں۔ پتہ نہیں انسانوں کی تباہی کا ٹھیکہ اللہ مومنوں کو کیوں دے دیتا ہے ان کی آنکھیں ایسی ہیں جیسے چیل کے گھونسلے میں انڈے۔ یہ مانہہ ہے اور وہ لفظوں کی گیند سے پٹھو کھیلتے ہیں شیخیاں اوڑھتے پھرتے ہیں۔ وہ ابھی تک چائے کی پیالی میں گرا ہوا ہے۔ وہ پیالی جو اس نے خود ہی چائے پینے کے لیے خریدی تھی اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس کا اتنا بڑا جسم چھوٹی سی پیالی میں کیسے گر پڑا اور پیالی ٹوٹ کیوں نہیں جاتی۔ یہ مانہہ ہے اور لوگ ابھی تک اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کسی کا خیال سیدھی کروٹ نہیں بیٹھتا سب کہتے ہیں وہ یہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہے جس کے اوپر چڑیا نے گھونسلہ بنالیا ہے۔ کرسی خالی پڑی ہے بالکل جوان منتظر عورت کی طرح اور سامنے میز پر چائے سے بھری پیالی دھری ہے اور اب اس کا جسم گلنے لگا ہے۔ جانے یہ پیالی اس کے لیے سمندر جیسی گہری کیسے ہوگئی ہے۔ پیالی کے نیچے پرچ ہے اور پرچ نے اپنا تھلا میز پر گاڑ رکھا ہے۔ اب مانہہ کے آخری دن ہیں اور یہ آواز مانہہ سے پھگن تک پھیل رہی ہے!

واہ دا اے	گل سوہنی کریسوں
اللہ بادشاہ اے	کوڑ زری نہ مریسوں
گل دا دستورا ے	گل تے لگدے نیں پیسے
اللہ جانے سچ اے کوڑا ے	پیسے دیوا ج گل سنوسائیں

پھگن کی ہوا میں رنگ کھلے ہوئے ہیں۔ سب جدائی چھانتے پھر رہے ہیں۔ وہ دریا کے پانی میں آنسو پھینکتی ہے مردہ شیر کے ہوکے داور دلے بن کر سڑکوں پر ناچتے ہیں اور وہ جوتیوں کے تلوں پر پیشاب کر کے ان پر پھینکتے ہیں۔ سرگوشیاں کانوں میں نئے بندے پہن کر پھرتی ہیں۔ آسمان رنگدار پتنگوں سے بھرا ہوا ہے مگر پتنگ اور ڈور مانگتے ہیں۔ بسنتی رنگ کے گھونگھٹ میں شہر کی روشنیوں کی ٹمٹماہٹ لمبے سانس لے رہی ہے وہ جو چائے کی پیالی میں گر گیا ہے لوگ اس بہار میں اس کے منتظر تھے لیکن کچھ نے اس کے نہ آنے کا یقین دلا کر اس کا اثاثہ آپس میں بانٹنا شروع کر دیا ہے۔ وہ پھولوں کے ساتھ کھڑی اس کی راہ تکتی ہیں۔ پھول ان کے جسموں کے قرب سے وقت سے پہلے ہی کھلتے جا رہے ہیں لیکن اس کی راہیں ابھی سونی پڑی ہیں۔ بازوں نے کبوتروں کے وہ پر اکھیڑ دیئے ہیں جن پر عبارت لکھی تھی۔ چرواہے کے بیٹے کا دل مسافر ہوگیا ہے۔۔۔ یہ پھگن ہے اور وہ چائے پیتے پیتے چیتر یا سون بھادوں میں چائے کی پیالی میں گر گیا تھا ابھی تک پیالی ہی میں ہے۔۔۔ زمین اس کے قدموں کی منتظر ہے اور آسمان رنگدار پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ تنکے مارتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ انگی پتنگ کو کنی دیتا ہے۔ چرواہے کے بیٹے کی پتنگ کیکر میں پھنسی ہوئی ہے۔۔۔ اور یہ پھگن کا مہینہ ہے۔۔۔ چرواہے کا بیٹا وہی بات بڑبڑا رہا ہے اور میں یعنی مظہر الاسلام اس کی آواز میں آواز ملا کر کہتا ہوں:۔

جنوں سمجھ نہیں لی	اینی ساڈی بات
اوہ جائے	اگوں پے گئی رات

☆☆☆

شاہ دولہ کے چوہے

منصور قیصر

اس روز حکیم ثنائی کے مطب میں جو پہلا مریض گیا وہ اپنا نام بھول چکا تھا۔ بار بار نام پوچھنے پر اس نے اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر حکیم ثنائی کے سامنے رکھ دیا اور کہا ''اس کارڈ پر جو نام لکھا ہے یہی میرا نام ہے''۔ حکیم صاحب نے تعجب سے کہا حیرت ہے کہ تم اپنا نام بھی بھول گئے ہو؟''

مریض کچھ جواب دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے سہمے ہوئے ہونٹوں کو جنبش بھی دی تھی۔ ویران ہونٹوں پر خشک زبان بھی پھیری لیکن لفظ ریت کی طرح بکھر گئے۔ حکیم صاحب نے اسے تسلی دی اور نبض دیکھنے سے پہلے اسے سرخ شربت کا ایک گلاس پلایا تا کہ اس کی طبیعت میں سکون آجائے اور وہ اپنے مرض کی علامات بتا سکے۔ شربت پینے کے بعد آنکھوں میں پھیلی ہوئی وحشت آہستہ آہستہ ایک چمک میں بدلنے لگی۔ حلق میں اگے ہوئے کانٹے ملائم ہونے لگے تو وہ بولا۔

''حکیم صاحب! یہی میری بیماری ہے کہ میں اپنے آپ کو بھی یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یاد نہیں آتا۔ ویسے مجھے اور کوئی تکلیف نہیں۔ بھوک بہت لگتی ہے خوراک بے تحاشا کھاتا ہوں وہ ہضم بھی ہو جاتی ہے لیکن یہی کھد بد پریشان کئے رکھتی ہے کہ یاد نہیں آتا کہ میں کون ہوں۔ میرا نام کیا ہے میری اپنی الگ زمین بھی تھی لیکن اب وہ کہاں ہے؟ معلوم نہیں؟ انہیں پریشانیوں نے اپنے جبڑوں میں مجھے جکڑ رکھا ہے''۔

حکیم ثنائی نے اسے تسلی دی اور ایک پڑیا اپنے سامنے کھلاتے ہوئے پوچھا ''یہ نسیان کی بیماری کب سے ہے؟''

مریض بولا۔ ''یہ بھی یاد نہیں۔ شاید ازل سے ہو''۔

''نہیں یہ قدیم مرض نہیں ہے۔ چند برس پرانا لگتا ہے ورنہ نارمل آدمی تو دنیا میں آنے کے فوراً بعد اپنی پہچان کے عمل سے گزرنے لگتا ہے۔ کہیں یہ بات تو نہیں کہ تم اپنے ماضی کو یاد نہیں کرنا چاہتے؟''

''مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا کوئی ماضی بھی تھا کہ نہیں''۔

حکیم صاحب نے پوچھا ''تو آج کل تمہارے شب و روز کیسے گزرتے ہیں؟''

مریض نے جواب دیا ''صبح اور شام میں اور میری بیوی سارے گھر میں اگربتیاں جلانے کے بعد روح کیوڑہ سے غسل کرتے ہیں۔ غسل سے پہلے سر کو کمر کے پیچھے کر کے روح کیوڑہ سے غرارے کرتے ہیں تا کہ دماغ تمام آلودگیوں سے پاک ہو جائیں''۔

''یہ دماغ صاف کرنے کا طریقہ کس نے بتایا تھا؟'' حکیم ثنائی نے تعجب سے پوچھا۔ اس بارے میں ہم نے ریڈیو پر ڈسٹرکٹ خطیب کی تقریر سنی تھی۔ خطیب صاحب بڑے معتبر انسان ہیں انہیں ایسی ہی خدمات کے صلے میں سترہ گریڈ سے انیس گریڈ میں ترقی دی گئی ہے۔ یہ بات سن کر حکیم صاحب کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ آنکھوں میں شرارت سمیٹ کر بولے تم دونوں میاں بیوی صبح شام غسل کرتے ہو تو کیا اس کا تعلق تم دونوں کے ساتھ کوئی جسمانی بھی ہوتا ہے''۔

مریض یہ بات سن کر گھبرا سا گیا۔ خوف سے اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔ حکیم صاحب نے جب اپنا سوال پھر دہرایا تو مریض صرف اتنا کہہ پایا۔ جی نہیں ہمیں کوڑوں سے ڈر لگتا ہے''۔

اتنی دیر میں مطب میں ایک شخص ایسا پنگھوڑا لے کر داخل ہوا جس میں ایک موٹا تازہ جوان لڑکا لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

لڑکے نے ماتھے پر دونوں ہاتھ رکھ کر حکیم ثنائی کو لمبا چوڑا اسلام کیا۔ حکیم صاحب نے نواردوں کی طرف متوجہ ہونے سے قبل مطب میں موجود پہلے مریض کو چند پڑیاں **ایک** سرخ شربت کی بوتل اور **ایک** جوارش جالینوس کی ڈبیا دیتے ہوئے ہدایت کی کہ **ایک** ہفتے کے بعد آ کر اپنی کیفیت بتاؤ۔ پرہیز صرف اتنی ہے کہ اپنی بیوی کو اپنے پر حرام نہ کرو''۔

مریض کے چلے جانے کے بعد حکیم ثنائی نوارد کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پوچھا اس نوجوان کو پنگھوڑے میں کیوں رکھا ہوا ہے؟''

نوارد بولا حکیم محترم۔ یہ بچہ میرا بے حد لاڈلا خلف ہے۔ یہ ہم گھر والوں کو اتنا چہیتا ہے کہ ہم **ایک** لمحہ کے لیے بھی اسے اپنے سے جدا نہیں کر پاتے۔ پیدائش کے بعد ہم نے اسے گہوارہ میں ہی رکھا اور یہ وہیں پڑا پڑا جوان ہو گیا''۔

اس پر حکیم صاحب نے پوچھا'' پھر تو اس نوجوان کی دلچسپیاں کیا ہیں؟ یہ اپنے آپ کو مصروف کیسے رکھتا ہے؟''

''صرف ٹیلی ویژن دیکھتا ہے''۔

''اس کی تعلیم و تدریس کا کیا کرتے ہو؟''

''اس کی ذمہ داری بھی ہم نے ٹیلی ویژن کو دے رکھی ہے''۔

''اسکے کوئی دوست نہیں ہیں؟''

''جی نہیں۔ صرف ٹیلی ویژن کے پروگرام ہیں''۔

''کبھی اس نوجوان کو شہر سے باہر یا ملک سے باہر سیر کروائی ہے؟''

''جی نہیں حکیم صاحب''۔ والد بولا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ بچہ ہمارا بہت ہی چہیتا ہے۔ ہم اسے اپنے سے دور نہیں رکھ سکتے۔ اصل میں ہم خود بھی ادھر ادھر گھومنے سے گریز کرتے ہیں کہ یوں ہمارے کانوں میں غیر طیب باتیں پڑتی ہیں۔ ہم اپنے بچے کو **ایک** صالح انسان بنانے کے آرزومند ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اسے کسی برے ماحول کی ہوا بھی لگے۔''

حکیم ثنائی نے نوجوان بچے کی نبض دیکھتے ہوئے کہا'' یہ تو بالکل صحت مند ہے اسے تو کوئی تکلیف نہیں''۔

باپ نے کہا'' جناب بظاہر اسے کوئی تکلیف نہیں صرف اس میں قوت گویائی نہیں ہے ویسے یہ گونگا نہیں ہے۔ مخاطب کو سلام بڑا پر تکلف کرتا ہے۔ میں صرف اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اسے ایسی دوائی دیں جس سے اس میں بولنے کی جرات پیدا ہو جائے''۔

حکیم ثنائی نے سرخ شربت کی بوتل اور کچھ گولیاں دیتے ہوئے ہدایت کی کہ **ایک** ہفتے بعد آ کر بچے کی کیفیت بتائیں۔ اسے چلنے پھرنے کی عادت ڈالیں گوشت کھلانے سے پرہیز کریں۔ صرف **ایک** مشورہ ہے کہ گھر کا سودا سلف ملازم کی بجائے اس بچے سے منگوائیں۔ انشاءاللہ اس کی قوت گویائی بحال ہو جائے گی''۔

اتنی دیر میں **ایک** اور مریض لاٹھی ٹیکتے ہوئے مطب میں داخل ہوا اس نے رنگدار چشمہ پہنا ہوا تھا۔ حکیم ثنائی نے کیفیت پوچھی تو وہ بولا سبز رنگ کا شربت پینے سے بینائی کچھ بحال ہو گئی ہے۔ آج میں خود ہی حاضر ہو گیا ہوں کسی معاون کو ساتھ نہیں لایا۔ حکیم نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا'' لیکن شربت تو سرخ رنگ کا تھا''۔

''اچھا''۔ مریض حیرت سے بولا مگر مجھے تو سب چیزیں سبز نظر آتی ہیں۔ پچھلے ہفتے پہلے سیڑھیوں سے گر کر مجھے جو چوٹ آئی تھی اس سے بھی سبز خون نکلا تھا۔ حکیم ثنائی نے مشورہ دیا کہ شربت کا استعمال جاری رکھو۔ آنکھوں میں شہد ڈالا کرو اور رنگ دار چشمہ پہننے سے پرہیز کرو۔ **ایک** ہفتے بعد آ کر پھر اپنی کیفیت بیان کرنا۔

مریض کے جانے کے بعد حکیم کو سر میں گرانی محسوس ہونے لگی۔ اسے کچھ عرصہ سے سر کے اس بوجھل پن کے دورے

پڑ رہے تھے۔ لیکن اسے اس کی وجہ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ صبح ناشتے کے وقت اس نے سرخ شربت بھی پیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سرگرانی کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ اس کا جسم روبہ فربہ ہو رہا ہے۔ اسی خیال سے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دوپہر اور شام کا کھانا نہیں کھائے گا۔ صرف لیموں میں نمک ملا کر پئے گا۔

حکیم ثنائی نے ابھی ایک پڑیا کھائی ہی تھی کہ دو اور مریض اکٹھے ہی مطب میں داخل ہو گئے۔ ایک مریض یوں خوفزدہ نظر آ رہا تھا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ حکیم صاحب نے اسے آرام کرسی پر بٹھاتے ہوئے کچھ دیر ستانے کے لیے کہا اور دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہوا۔ مریض نے کہا حکیم صاحب! مجھے اور تو کوئی تکلیف نہیں کچھ عرصے سے میرے کان بند ہو گئے ہیں۔ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اس بہرے پن نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے"۔

حکیم صاحب نے ایک پرچی اس کے سامنے کر دی جس پر لکھا تھا اس موسم میں بہرہ پن بہت مفید ہے۔ لایعنی باتیں سننے سے جس قدر بچو گے بھلے میں رہو گے۔

اس پر مریض نے اداس ہو کر کہا جناب یہ بہرہ پن تو عذاب ہے مجھ سے جو بھی لکھ کر بات کرتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں مجھ پر حکم چلاتا ہے میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ میں اس حکم کو بجا لاؤں۔ گویائی تو سماعت کی محتاج ہوتی ہے۔ حکیم صاحب نے اسے دوائی دے کر اور ایک ہفتے بعد آ کر کیفیت بتانے کا کہہ کر ستانے والے مریض کی طرف توجہ مبذول کی وہ اسی طرح خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے پوچھا پہلا مریض کہاں گیا۔ حکیم صاحب نے بتایا کہ وہ دوائی لے کر چلا گیا ہے۔ مریض بولا میں مریض نہیں تھا جی۔ میں جو بات بھی کرتا وہ کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔

حکیم صاحب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "نہیں شک وشبہ کی ایسی کوئی بات نہیں وہ تو بہرے پن کا شکار ہے"۔ پھر حکیم صاحب نے پوچھا "تم خوفزدہ کیوں ہو؟"

مریض نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا کیا عرض کروں میرا تو جینا عذاب ہو گیا ہے۔ مخبر لوگ ہر وقت میرے تعاقب میں رہتے ہیں۔ میری حرکات وسکنات نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ دفتر میں میرے ساتھ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ بھی میری مخبری پر مامور ہیں۔ سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہتے ہیں"۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ممکن ہے تمہیں وہم کا عارضہ ہو تمہارے ساتھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے"۔

"کیوں نہیں بگاڑ سکتے؟" مریض کی آواز دہشت کے پتھروں تلے کچلی ہوئی تھی پہلے وہ جو کچھ کرتے تھے دفتر میں کرتے تھے پھر انہوں نے میری بیوی کو بھی اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ وہ گھر میں میری مخبری کرنے لگی۔ خواب گاہ میں بھی میری پرائیویسی محفوظ نہ رہی۔ جب یہ صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی تو میں نے اپنی بیوی اور جوان بیٹی کو گھر سے نکال دیا"۔

"اب وہ کہاں ہیں؟" حکیم صاحب نے پوچھا۔

"بیوی تو میکے چلی گئی لیکن خوشی کی بات ہے کہ اسے کینسر ہو گیا ہے کچھ عرصے بعد وہ جب مر جائے گی تو پھر وہ مخبری نہیں کر سکے گی۔ میری جوان بیٹی دوسرے شہر میں اپنی خالہ کے ہاں چلی گئی ہے اور وی سی آر دیکھنے کا شوق ہے جو اس کی خالہ کے گھر میں ہے۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ میری بیٹی بھی میری مخبری کرتی تھی"۔

"آپ کی بیوی اور بیٹی آپ کی مخالف کیسے ہو گئیں"۔

"اس لیے جو آسائشیں وہ مجھ سے مانگتی تھیں وہ میرے دشمنوں نے انہیں فراہم کر دیں"۔ حکیم صاحب نے اسے بھی سرخ شربت کی بوتل جوارش کی ایک ڈبیہ اور کچھ لبوب دے کر کہا، "دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے گریبان میں دیکھتے رہا

کرو۔ اگلے ہفتے آ کر پھر نبض دکھانا''۔

حکیم صاحب کی سرگرانی بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے ایک نیند آور گولی کھائی اور مطب بند کر چلے گئے۔

کچھ ہی دنوں بعد شہر میں ایک عجیب وبا پھیل گئی جسے دیکھو وہ یہی شکایت کر رہا تھا کہ اس کا سر سکڑتا جا رہا ہے اور کولہے کے نیچے کا جسم پھیلتا جا رہا ہے۔ یہ مرض بظاہر کوئی تکلیف نہیں دیتا تھا سوائے اس کے کہ سوچنے کی حس ختم ہو جاتی اور بھوک بڑھ جاتی۔ متاثرہ لوگ علاج کے لیے حکیم ثناء کے پاس جانا شروع ہو گئے۔ ان میں پرانے مریض بھی شامل تھے۔

ایک روز یوں ہوا کہ حکیم ثنائی کا مطب بدہیت جسموں والے مریضوں سے اٹا پڑا تھا۔ لیکن حکیم صاحب خود غائب تھے۔ کئی گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد مریض پریشان ہو گئے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر حکیم صاحب واپس نہ آئے تو انکا علاج کون کرے گا۔ اگر علاج نہ ہوا تو ان کے سر ہمیشہ کے لیے سکڑ کے رہ جائیں گے۔ ابھی شام غروب نہیں ہوئی تھی کہ ایک شخص نے آ کر مریضوں کے سامنے انکشاف کیا کہ حکیم صاحب نے حجرے کے دروازے کو اندر سے بند کر رکھا ہے۔ وہ اب نہیں آئیں گے۔ کیونکہ ان کا سر بھی سکڑ گیا ہے اور کولہے کے نیچے جسم پھیل گیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اپنا نام یاد نہیں آ رہا۔

☆☆☆

پی۔بی۔ایل ۵۳۶

منیر احمد شیخ

نیا شہر اجنبی لڑکی کی طرح اسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اجنبی لڑکی اور نیا شہر وہ جادو نگری تھی جس میں راستہ بھولنا اسے بھلا لگتا تھا۔ راستہ بھولے اسے بہت مدت ہو رہی تھی۔ ناک کی سیدھ چلتی ہوئی سڑکوں اور گلیوں میں چل چل کے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہ بھی کیا مصیبت ہے کہ شہر کی تمام سڑکیں سیدھی اور ایک دوسرے کے متوازی دوڑتی چلی جا رہی ہیں۔ ہر قدم پر منزل کی نشاندہی کا اعلان ہے اور وہ سڑکیں جو ان متوازی سڑکوں کو قطع کرتی ہیں وہ بڑے سے قائمے زاویے بناتی ہیں۔ کسی چوک میں کھڑے ہو جایئے اور راستوں کا آغاز اور انجام دیکھ لیجئے۔ وہ زندگی کی اس سیدھ سے بے حد اکتا گیا تھا۔ وہ بستی کہاں ہے جہاں آدمی راستہ بھول جایا کرتا تھا۔ راستہ بھولنے کے بعد اس کے اندر تحیر اور پھر تحیر میں سے دریافت کا عمل شروع ہوتا تھا۔ دریافت کے عمل میں اسے وہ انجانی اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں نصیب ہوتی تھیں جو سیدھے منزل کی طرف جاتے ہوئے راستوں میں کبھی نہیں ملتیں۔ سیدھی سڑک پر چلتے ہوئے آدمی پر اسے سکوٹر اور بس کا شبہ ہوتا کہ جن میں پٹرول بھر کر گیئر لگا دیا جائے تو وہ آپ سے آپ دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چلتے چلتے اپنی ٹانگوں پر ہاتھ لگا کے یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کون سے گیئر GEAR میں ہے۔ سڑک پر جب کوئی موڑ آتا ہے تو وہ اپنی رفتار سست کر دیتا اور ٹانگوں پر ہاتھ لگاتا۔ ''اب فرسٹ گیئر چل رہا ہے''۔ فرسٹ گیئر کے شور سے اسے وحشت ہونے لگتی تو وہ کبھی کبھی ایک آدھ موڑ تیزی سے کاٹتا اور خوش ہوتا کہ اس نے تیسرے گیئر میں موڑ کاٹ لیا ہے اور اس کی تیز رفتاری سے وہ شور اور گڑ گڑ پیدا نہیں ہوئی جو فرسٹ گیئر لگانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جس سے اسے سخت وحشت ہوتی۔ سیدھی سڑک اور فرسٹ گیئر دونوں سے اس کی جان عذاب میں تھی۔ اس نے کئی دفعہ گڑگڑا کر دعا کی اللہ میاں تو نے ساری سڑکیں سیدھی کر دی ہیں تو مجھے بھی آدمی کی جگہ سکوٹر بنا دیا ہوتا! اپنی ذات اور سکوٹر کی مماثلت کے اس نے بہت سے پہلو تلاش کر رکھے تھے۔ سکوٹر کے پہیوں پر اسے ہمیشہ اپنی ٹانگوں کا شبہ ہوا۔ اس کی پٹرول کی ٹینکی پہ کئی دفعہ اس نے اس خیال سے ہاتھ رکھا جیسے وہ اپنے معدے کو دبا کے دیکھ رہا ہے کہ اس میں خالی ہوا تو نہیں بھری ہوئی۔ اس کی روشن بتی پہ اسے ہمیشہ یہ گمان ہوا جیسے کوئی احساس جرم کا مارا ہوا شخص تاریکی میں چھپ کے اپنی سیاہیوں پہ تیز نظر ڈال رہا ہو۔ سکوٹر، کار اور بسوں کی تیز لکیری روشنی سے وہ غضب آلود ہو جایا کرتا۔ راستہ چلتے چلتے جب کبھی وہ تیز روشنی کی زد میں آ جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے کسی نے سرِ راہ اس کے کپڑے اتار دیے ہیں اور وہ ننگا دھڑنگا اپنی جسمانی کمزوریوں کے ساتھ سب کو نظر آ رہا ہے۔ تیز روشنی اپنے جسم پر پڑتے ہی وہ کار، سکوٹر اور بس چلانے والے کو ایک غلیظ سی گالی دیتا کہ وہ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے اسے ننگا کر کے دیکھ رہے ہیں۔ خطِ مستقیم اس کے ذہن اور اعصاب پر اس بری طرح سوار تھا کہ جہاں کہیں کاغذ کتاب پہ وہ سیدھی سطریں دیکھتا انہیں کاٹنا شروع کر دیتا۔ لکیروں والے رائٹنگ پیڈ پہ اس نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا تھا کہ ایسے پیڈ کو دیکھتے ہی اس پہ کچھ لکھنے کا سوال ہی آپ سے آپ ختم ہو جاتا۔ زمین پہ جب کبھی وہ انگلی یا تنکے سے کوئی خط کھینچتا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھا میڑھا اور بل کھاتا ہوا ہوتا۔ جسمانی طور پر سیدھی لڑکی سے اسے سخت نفرت تھی۔ لیکن جذباتی طور پر کچی اور سیدھی لڑکی سے اسے پیار کی حد تک دلچسپی ہوتی تھی کہ ایسی لڑکی کو وہ جیسے چاہے ٹیڑھا کر سکتا ہے اور اس میں بل پیدا کر سکتا ہے۔ سانپ جیسے بل، پہاڑی ندی کے سے بل، پھلوں سے لدی ہوئی شاخوں کے بل، گلے میں ڈالی ہوئی بانہوں کے خم اور جھکی ہوئی گہری پلکوں کے سایوں کی گولائی۔

نئے شہر میں سیدھی سپاٹ سڑکیں تھیں اور ترچھی سوچ، ترچھی سوچ اس شہر کے رہنے والوں کو اس طرح کاٹتی چلی جاتی تھی کہ ان کے الگ الگ حصے ہو گئے تھے۔ درجہ سوم اور درجہ چہارم کے ملازمین ای ٹائپ کے کوارٹروں میں رہتے تھے۔ ای ٹائپ کے کوارٹر جہاں ختم ہوتے تھے وہاں ایک سیدھی سڑک دیوار کی طرح گزرتی تھی اور اس دیوار سے آگے ڈی ٹائپ کے مکان شروع ہوتے تھے۔ درجہ دوم کے ملازمین ڈی ٹائپ میں رہتے تھے اور ای ٹائپ والوں کو دیکھتے تھے اور اپنے سے حقیر جانتے تھے۔ ڈی ٹائپ والے ای ٹائپ والوں کی طرح مسلسل اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ انکی تنخواہ کب اتنی بڑھے گی کہ وہ سی یا بی ٹائپ کے مکانوں میں چلے جائیں گے۔ مکانوں اور ٹائپ کا قصہ یہ تھا کہ تنخواہ کے مطابق ہر شخص کا درجہ متعین تھا اور وہ اپنے درجہ میں بیٹھ کر اوپر کے درجہ کی طرف دیکھتا رہتا کہ سالانہ ترقی کے متواتر کتنے سالوں میں وہ اس قابل ہوگا کہ اپنے درجے والوں سے آگے نکل جائے اور ان سے اعلیٰ درجے کے ٹائپ میں رہ کر ان کی طرف حقارت سے دیکھ سکے۔ مختلف درجوں کے درمیان سیدھی سپاٹ سڑکیں حقارت کی لکیریں تھیں کہ جن کو پاٹنے کی فکر اس شہر کے ہر باسی کو لگی رہتی۔ یہ لکیریں تو مکانوں کے باہر سے گذرتی تھیں۔ لیکن جب کبھی نچلے ٹائپ کے بچے کھیلتے کھیلتے اوپر والے درجے کے ٹائپ کے گھروں کی طرف جاتے اور اوپر والے ٹائپ کے لوگ اپنے بچوں کو منع کرتے کہ وہ گھر سے باہر نچلے اور گھٹیا ٹائپ کے بچوں سے نہ کھیلیں تو نفرت اور حقارت کی یہ لکیریں گھروں کے صحنوں، برآمدوں اور کمروں میں سے ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرنے لگتیں۔ نچلے ٹائپ میں رہنے والی مائیں شام کے وقت اپنے بچوں کو خاص ہدایت کرتیں کہ وہ اپنے محلے ہی میں کھیلیں، اس سے اگلے محلے میں نہ جائیں وہاں صاحب لوگ رہتے ہیں۔ مکانوں اور محلوں کی اپنی کوئی شخصیت نہ تھی۔ نہ کوئی گھر بیری کے بوٹے سے پہچانا جاتا اور نہ کسی گھر میں آسیب تھا کہ جس پر برسوں تالا پڑا رہتا ہے اور بچے اور بوڑھیاں وہاں سے پرے ہو کر گزرتے ہیں اور نہ کوئی ایسی تھی کہ جس میں بادشاہ اور فقیرا اپنے تخت اور تکیے پر اپنے حال میں مست پڑے ہیں اور بادشاہ چل کے فقیر کے تکیے پر آتا ہے۔

شخصیت نہ مکانوں کی تھی نہ مخلوق کی۔ کوئی اپنی صفت سے نہیں پہچانا جاتا تھا، پہچان صرف ذات پات کے حوالے سے ہوتی تھی۔ ذاتیں کہ جن کو نفرت کی سیدھی سڑکیں کاٹتی چلی جاتیں تھیں اور جن پر چلتے ہوئے آدمی اپنے معدے کو دبا کے دیکھتا تھا کہ اس میں کتنے گیلن پٹرول بھرا ہوا ہے۔ پٹرول پمپ جگہ جگہ تعمیر ہو گئے تھے۔ چوڑی چکلی کشادہ سڑکوں والے، جن میں سے پٹرول جب باہر آتا تھا تو سوئی بھی ساتھ ہی گھومتی تھی اور بتلاتی تھی کہ اتنے گیلن پٹرول باہر نکل گیا ہے۔ نئے شہر میں چلتے چلتے جب اسے سخت بھوک لگی تو وہ ایک پٹرول پمپ کی مشین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی نالی منہ میں ڈال کر پٹرول پمپ والے کو حکم دیا ''آدھی گیلن''۔

پٹرول پمپ والے نے اس کو گالی دی اور پٹرول بھرنے والی نالی اس کے منہ سے کھینچ کر ساتھ آ کر کھڑی ہونے والی موٹر کی پیٹھ میں ڈال دی اور سوئی تیزی سے گھومنے لگی۔ اسے پٹرول والے پر سخت غصہ آیا اور جب موٹر پٹرول بھروا کر چل پڑی تو اس نے زمین پر سے ایک کچا ڈھیلا اٹھا کر اسے مارا۔ مگر موٹر آگے نکل چکی تھی۔ کچے ڈھیلے کی مٹی ذرا سی اڑی پھر زمین پر بکھر گئی۔ اس نے اپنا سر پکڑ کر اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ سیدھی سڑکیں، موٹریں، سکوٹر پٹرول، گھومنے والی سوئی۔۔۔ نفرت اور حقارت، آدھی گیلن، دو گیلن۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے بہت سا پٹرول پی لیا ہے۔ اور اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے اور اس کے پیٹ میں نفرت بھر گئی ہے۔ اس نے اپنے حلق میں انگلی ڈال کر قے کرنے کی کوشش کی کہ اس کا جی بہت متلانے لگا تھا۔ اسے قے بالکل نہیں ہوئی۔ لیکن اس کا پیٹ بوجھل تھا اور پٹرول پمپ پر موٹریں اور سکوٹر پٹرول بھرواتے چلے جا رہے تھے۔

''لعنت''۔ اس نے اپنے بارے میں سوچتے ہوئے یہ لفظ دو چار مرتبہ منہ سے نکالا۔ اس نے سوچا کہ میں آدمی ہوں یا

جانور۔ لیکن پھر فوراً ہی اصلاح کر دی نہیں آدمی یا سکوٹر۔ اس نے پانچویں مرتبہ اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور اپنے خیالات کی گرد کو ذہن سے ہٹانے کے لیے نئے شہر کے ایک نئے کیفے میں داخل ہو گیا تا کہ وہ چائے کی پیالی سے ان خیالات کے دھارے کو بدلنے کی کوشش کرے۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگائی، سگریٹ کے کش میں اسے پٹرول کی بو آئی تو اس نے سوچا شاید تمبا کو کو پٹرول کی چس دے دی گئی ہے۔ اس کی طبیعت پھر گھبرائی۔ چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہی اس کی زبان سے وہی ذائقہ چمٹ گیا جو پٹرول کی نالی منہ میں ڈالنے پر محسوس ہوا تھا اس نے چائے وہیں رکھ دی اور سگریٹ کو پاؤں سے مسل کر آرام سے بیٹھ گیا۔ نئے شہر کے لوگ محوِ گفتگو تھے۔ پچھلی ٹیبل والے ایک نئے شخص کا تعارف ایک دوسرے سے کروا رہے تھے۔

''ان سے ملیے۔ محمد حسین صاحب! بی ٹائپ میں رہتے ہیں''۔ پاس بیٹھے ہوئے ڈی ٹائپ والوں نے مسرت اور عقیدت کے ملے جلے جذبات سے بی ٹائپ والے کی طرف دیکھا اور اسے بڑی عزت سے پوچھا کہ وہ چائے کے ساتھ کیا کھانا پسند فرمائیں گے۔ بی ٹائپ والے نے کہا وہ صرف چائے پیئے گا اور وہ بھی بغیر شکر کے۔ ایک ڈی ٹائپ والے نے قہوہ اس کی پیالی میں انڈیلا اور بے دھیانی میں چمچہ اس کی پیالی میں ہلانا شروع کر دیا۔ بی ٹائپ والے نے اس کا ہاتھ روکا۔ اور کہا ہلایئے مت، اس میں شکر نہیں ہے۔ ڈی ٹائپ والے نے خفت کے احساس کے ساتھ چمچہ پیالی میں سے نکالا اور شکر سے بھر کر اپنے منہ میں انڈیل لیا اور اسے چبانے لگا۔

سامنے والی میز پر ایک نیا نیا بنگالی جوڑا آ کر بیٹھا تھا۔ لڑکی بے حد شرمیلی تھی، ادھر ادھر لوگوں کو چوری چوری دیکھتی۔ چائے کی پیالی اٹھانے سے پہلے وہ دیکھتی کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ ہنستے وقت وہ ساڑھی کا پلو منہ پر رکھ لیتی اس کا بلاؤز اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ شوہر اس کے ننگے پیٹ اور کمر کو دیکھ دیکھ کر نروس ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھوں سے اشارے کر کے اپنی بیوی کو بتلانے کی بڑی کوشش کی کہ وہ بلاؤز نیچے کر لے۔ لیکن وہ اس کے اشاروں کو پڑھنے کی بجائے ادھر ادھر چوری چوری لوگوں کو دیکھتی تھی کہ کہیں وہ سارے اسے چائے پیتے تو نہیں دیکھ رہے۔ اس کا شوہر جب مزید نروس ہو گیا تو اس نے انگلی کے اشارے سے ننگے پیٹ اور کمر کو ڈھانپنے کے لیے کہا۔ بنگالی لڑکی نے اس کی انگلی جھٹک دی اور غصے سے کہا کہ وہ ہر وقت انگلیوں سے اسے اشارے کرتا رہتا ہے اور یہ بہت بری عادت ہے۔ شوہر مزید نروس ہو گیا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی نظریں اس کی بیوی کے بلاؤز کو اوپر کھسکائے جا رہی ہیں اور اگر اس نے ہاتھ سے بلاؤز نیچے نہ کیا تو اس کا بلاؤز کھل جائے گا اور سارا ہوٹل اس کے سینے کی بہار لوٹے گا۔ شوہر نے اپنا ہاتھ بلاؤز کی طرف بڑھایا تو ایک میز سے آواز آئی۔ ''ہوٹل میں تو صبر کرو''۔

شوہر نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور اس میز کی طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ ایک لوئر ڈویژن کلرک پوری بتیسی نکالے ہنس رہا تھا۔ اس کے دانت پان سے سرخ تھے اور وہ جلدی جلدی میں سگریٹ پی رہا تھا اور ہر مرتبہ ناک میں سے دھواں نکالتا تھا۔ بنگالی شوہر اس کے سرخ دانت دیکھ کر غصے سے کانپنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پٹرول پھینک کر اسے آگ لگا دے لیکن پٹرول آس پاس نہیں تھا۔ اس نے جلدی میں بیرے کو آواز دی بل لاؤ اور جب بل آیا تو اس نے کھٹ سے پیسے میز پر پھینکے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے بیوی کے بلاؤز کو اس زور سے نیچے کھینچا کہ وہ چیخ اٹھی کہ اس کا شوہر پاگل تو نہیں ہو گیا۔ شوہر پاگل تو نہیں ہوا تھا اس نے بیوی کو جھڑکتے ہوئے کہا، تمہیں شرم نہیں آتی۔ ہوٹل میں میرے دفتر کا کلرک تمہارا سارا جسم دیکھ رہا تھا۔ دفتر کا کلرک اگر چہ نچلے درجے کے مکانوں میں رہتا تھا لیکن وہ ہوٹل میں اس لیے آ جاتا تھا کہ وہاں اے اور بی ٹائپ میں رہنے والے افسران اپنی بیویوں کے ساتھ چائے پینے کو آ جاتے تھے۔ اور وہ ان کے برابر کے میز پر سامنے بیٹھ کر اپنے آپ کو یقین دلاتا کہ وہ نچلے ٹائپ کے مکانوں میں رہتا ہے لیکن ہوٹل میں تو وہ اپنے افسروں کے مقابل بیٹھ سکتا ہے۔ اور اگر کوئی افسر اپنی بیوی کے مختصر بلاؤز پر نروس ہو سکتا ہے تو وہ ہمت کر کے فقرہ بھی کس سکتا ہے۔ اس دن جب وہ ایک افسر کو نروس ہوتے دیکھ کے ہنسا تو اسے بڑا اطمینان نصیب ہوا

جیسے وہ تمام فائلیں جو اس کے منہ پر آئے دن گرتی رہتی ہیں اس نے اٹھا کر افسر کے منہ پر واپس دے ماری ہیں۔ اس نے چائے پینے کے بعد اس روز بیرے کو چار آنے کے بجائے آٹھ آنے ٹپ کئے اور اٹھتے ہوئے بیرے سے کہا، جاؤ عیش کرو۔ بیرا آٹھ آنے جیب میں ڈال کر عیش کرنے کے لیے مڑا تو کلرک ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

نئے شہروں میں مکانوں اور محلوں کی طرح ان میں رہنے والوں کی بھی کوئی شخصیت نہیں تھی۔ ایک ہی ٹائپ کے مکانوں میں رہنے والے سب ایک جیسے تھے۔ اپنے مکانوں کی طرح کہ سب کا ایک دروازہ ہے۔ سب کے تین کمرے ہیں۔ سب کا ایک ساصحن ہے۔ مکانوں کی طرح ان کے بھی نمبر تھے۔ ۱۱۳۱۴ اے، ۳۱۵ بی، ۱۸۲ سی، ۲۱۰ ڈی، ۱۵۸۵ ای۔ ہر شخص اپنے گلے میں اپنی نمبر پلیٹ لگا کے چلتا تھا۔ نمبر پلیٹ اگرچہ قمیض کے اندر جسم سے لگی ہوئی تھی لیکن ہر شخص کا چہرہ اس کے نمبر کی چغلی کھاتا تھا۔ چہرہ اور نام تو اکثر دھوکا دیتے ہیں۔ کچے اور عارضی رنگ کی طرح۔ مگر نمبر پلیٹ بڑی پکی چیز ہوتی ہے۔ نمبر تقدیر کا چکر ہے کہ آدمی دو تین چار کرتے کرتے قبر میں پہنچ جاتا ہے اور اسے اپنے ٹائپ کے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ آدمی زمین کے نیچے ہو یا زمین کے اوپر، جو نمبر اس کے گلے میں پڑ گیا ہے وہ اسے ایک خاص خانے میں مقید کر دیتا ہے۔ شیرازی کبوتر لکے کبوتروں میں نہیں ملتے اور لکے شیرازیوں میں۔

اور وہ جو ہوٹل میں خاموش بیٹھا اپنے نمبر کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ حیران تھا کہ وہ کس آدم کی اولاد ہے۔ وہ دس بچوں کا باپ ہے مگر اسے اسی ٹائپ کے ایک چھوٹے سے مکان میں اس لیے رہنا پڑتا ہے کہ اس کی تنخواہ زیادہ نہیں۔ اور وہ جو دو ہزار روپیہ مہینہ کما رہا ہے، اس کے دو بچے ہیں مگر وہ سات کمروں اور بڑے بڑے لانوں والی کوٹھی میں براجمان ہے اور اس کے دو بچے بھائیں بھائیں کرتے ہوئے کمروں میں یوں ہی گھوم رہے ہیں۔ زہر بھری خاموشی کمروں کے اندر بھری پڑی ہے۔ گھر کے افراد دور دور صوفوں پر بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔ جیسے قریب آنے سے انہیں ڈر لگتا ہو۔ اس نے اپنے گلے میں بندھی ہوئی نمبر پلیٹ کو گھمایا اور قمیص کے اندر ڈال کر ہوٹل سے باہر چلا آیا۔ اس کا سر شدید درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سیدھی سڑک پر چلتے چلتے اس کا جی چاہا کہ آج وہ راستہ بھول جائے اور چلتے چلتے ایسی جگہ پر پہنچ جائے جہاں مکانوں اور آدمیوں کی شکلیں ایک جیسی نہ ہوں جہاں مکانوں کے کوئی نمبر نہ ہوں۔ جہاں آدمیوں کے کوئی نمبر نہ ہوں، جہاں سڑکوں کے کوئی نمبر نہ ہوں، جہاں اے، بی، سی، ڈی اور ای کی ذاتیں نہ ہوں۔ جہاں آدمی، آدمی ہو، سکوٹر نہ ہو۔۔۔ جہاں مکان اپنے مکینوں سے پہچانے جائیں۔

''لعنت''۔

۔۔۔ اس کے منہ سے پھر یہ لفظ نکلا، سیدھی سڑک پہ راستہ بھولنے کی خواہش پوری نہ ہو رہی تھی۔ اسے شدید گھٹن ہونے لگی کہ وہ جب بھی راہ پہ نکلے گا ناک کی سیدھ ہی میں چلے گا اور چلتا ہی رہے گا۔ یہ بھی کیا لعنت ہے۔ اس نے پھر اپنے آپ کو ملامت کی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک جیسے سینکڑوں مکانوں کی قطاریں دھوپ میں زمین پر یوں بکھری پڑی تھیں جیسے دھوبی نے کپڑے سکھانے کے لیے ڈال رکھے ہوں۔ سیدھی سڑکیں، بے نام لوگ، بے نام گھر، ایک سکوٹر اس کے سامنے سڑک پر سے گذرا۔ اس نے پٹرول کے دھوئیں کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیا۔ پھر زور سے اسے سینے کے اندر کھینچا۔ اپنا سینہ پٹرول کے دھوئیں سے بھرنے کے بعد اس نے فرسٹ گیئر لگایا اور اسکوٹر کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

☆☆☆

لین دین

ناصر بغدادی

شام کے گہرے سائے موت کا اذیت ناک بوجھ بن کر نانا صاحب کے دوران میں آہستہ آہستہ اترتے جا رہے تھے۔ اس رنگا رنگ دنیا سے رخصت ہونے کا احساس زردیوں کا روپ اختیار کر کے ان کے جھریوں بھرے چہرے کی ایک ایک شکن، ایک ایک سلوٹ میں سماتا جا رہا تھا۔ ارد گرد کا ماحول بڑا غم انگیز ہو گیا تھا۔ حیات و موت کی زبردست کشمکش کے منظر نے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ایسے درد کو اجاگر کر دیا تھا جس کی تڑپتی خاموشی میں دھڑکتے دلوں کی شروعات ہوتی ہے۔ آج گھر کی ہر شے زندگی کے مچلتے، ہمکتے جذبات سے دست کش ہو کر جمود کی گود میں بیٹھ چکی تھی۔ ایک بے حد خطرناک طوفان تھا جو ہنوز آیا نہ تھا لیکن جس کی آمد کی اطلاع سب کو مل چکی تھی۔

خاندان کے سارے لوگ روحانی کرب کی گرد میں اٹے ہوئے ایک کمرے میں جمع تھے۔ دریچے کے قریب ایک پلنگ پر نانا صاحب گردن تک سفید کفن جیسی چادر اوڑھے چت لیٹے تھے۔ ان کا جسم بالکل غیر متحرک اور ساکت تھا۔ بس آنکھیں نیم وا تھیں اور سوگواروں کے ہجوم سے بے نیاز ایک ٹک چھت کی طرف مرتکز تھیں۔ شاید اس جگہ موت چپکے بیٹھی اشاروں اشاروں میں ان پر اپنی آمد کا مقصد واضح کر رہی تھی۔ ہر چند لمحوں بعد ان کے چہرے پر اینٹھن اور تشنج کے آثار پیدا ہو جاتے۔ اگر چہ اب تک تقدیر کے جابر دیو نے کمرے کے محدود دنگل میں لڑی جانے والی زندگی و موت کی اس کشتی میں ریفری بن کر موت کی فتح کا اعلان تو نہیں کیا تھا لیکن اندازے سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ موت کا پلہ بھاری ہے۔

نانا صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ایک ایسا خوبصورت گلدستہ جس کے رنگا رنگ پھولوں کی خوشبوئیں تھکے ہوئے بوجھل احساسات کو تر و تازہ کرنے کی قوت رکھتی تھیں۔ وہ محض اپنے گھر کے نانا نہیں تھے بلکہ ان کی متاثر کن شخصیت کے بوقلموں پہلوؤں نے انہیں جگت نانا بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ حضرات جن کی دو دو فٹ لمبی داڑھیاں تھیں اور جو خود کئی بچوں کے نانا بننے کا شرف حاصل کر چکے تھے، وہ بھی ان کو اس انداز سے "نانا صاحب" کہتے تھے جیسے وہ واقعی ان کے حقیقی نانا تھے۔ مگر انہوں نے اس بات کا کبھی برا نہیں منایا تھا۔ ایسے حضرات سے وہ اسی طرح پیش آتے تھے جیسے اپنے حقیقی نواسوں سے پیش آتے تھے۔

نانا صاحب یوں تو گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے مگر جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ انسان لاکھ اشرف المخلوقات سہی لیکن وہ بے عیب نہیں ہو سکتا۔ کچھ ایسی ہی بات نانا صاحب کے متعلق بھی کہی جا سکتی تھی۔ وہ لاکھ کردار کے غازی سہی، لاکھ ان کی طبیعت مکھن کی طرح، چاندنی کی طرح سکون بخش سہی، مگر روپے پیسوں کے معاملے میں تو کبھی کبھی وہ کنجوس بنیوں اور سود خور پٹھانوں کو پیچھے چھوڑ دیتے تھے۔ دیکھنے میں آیا تھا کہ وہ چمڑی سے زیادہ دمڑی کی فکر میں بولائے پھرے تھے۔ مگر ان کی شخصیت کا یہ ستم بھی ان کی شخصیت کو ہر دل عزیز ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ان کی اس فطری کمزوری کی وجہ سے گھر کے کچھ لوگ ان سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ نانا صاحب کی طرف سے ان کے دل کے شیشے میں بال آ چکا تھا۔ نانا صاحب سے دشمنی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فطری اختلاف کے باوجود سب نانا صاحب کی ذات گرامی کو گھر کے لیے نعمت مترقبہ سمجھتے تھے۔ اور ان پر سو جانوں سے فریفتہ تھے۔ اس کی زندہ مثال یہ تھی کہ اولاد کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود آج تک کسی نے اپنا حصہ مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کاروبار اب بھی نانا صاحب کے ہاتھ میں تھا، جو وہ بڑی کامیابی

سے چلا رہے تھے۔ آج اس احساس کے زیراثر کہ نانا صاحب کی دائمی رخصت قریب ہے سب کے کلیجے منہ کو آرہے تھے وہ سب اس طرح خاموش، سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا تھا۔ اور پھر اچانک ہوا کا ایک بے تاب جھونکا کمرے میں زخمی کبوتر کی طرح پھڑ پھڑایا تو نانا صاحب نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آج ان کی آنکھوں کو درد و اضطراب کی دھند نے دھندلا دیا تھا۔ انہوں نے مریضانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا پھر ان کے ہونٹ آہستہ سے کھلے اور تیزی سے بند ہو گئے۔ بڑے ماموں تیزی سے ان کی طرف بڑھے اور انکے سرہانے پلنگ کے ایک کونے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

''ابواب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' وہ ان کی طرف جھک گئے۔

جواب میں نانا صاحب نے بڑی بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ سے رک رک کر بولے۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے''۔

''جی فرمایئے''۔

''غور سے سنو''۔ لہجہ بڑا پر لکنت تھا۔

''جی۔۔۔''

''پچھلے دو تین برسوں میں'' وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ ''بہت سے چھوٹے تاجروں نے مجھ سے قرض لیا تھا''۔ وہ رک گئے، پھر سوگواروں کے ہجوم پر اک کرب ناک نگاہ ڈالی اور پھر رک رک کر سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ ''میری موت کے بعد تم لوگ ان سے سارا قرضہ وصول کر لینا اور۔۔۔ پھر دیکھو۔۔۔ قرضے پر جتنا سود واجب الادا ہے وہ بھی وصول کر لینا۔۔۔ قرضے کے سارے کاغذات بینک کے لاکر میں محفوظ ہیں''۔

وہ خاموش ہو گئے۔ ان کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل رہا تھا۔ ان کی حالت لحظہ بہ لحظہ ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے میں خاندان کے لوگ یوں سر جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے جیسے ان کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ بس نانا صاحب کی بات سن کر چند ثانیے کے لیے بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں کے چہروں پر ہلکا سا گلابی رنگ پھیل گیا تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ موت نے مجھے اتنی مہلت دی''۔ نانا صاحب نے رک رک کر کہا۔ ''اور میں تم سے یہ بات کہہ سکا''۔ نانا صاحب نے بات ختم کی۔ چھوٹے ماموں چند قدموں آگے بڑھے۔ پہلے تو انہوں نے پر خیال انداز میں دو تین مرتبہ ہولے سے سر کو جنبش دی اور پھر بڑی آہستگی سے نانا صاحب کو مخاطب کیا۔

''ابا جان! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ نے کاروبار کے سلسلے میں بینکوں سے کتنا قرضہ لیا ہے؟''

ان کی بات سن کر نانا صاحب کا کمزور جسم ہلکے سے کانپا۔ چہرہ اداس شاموں کی طرح بجھ گیا۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔

''اوف میرے خدا''۔ ان کا لہجہ اضطراب سے لبریز تھا۔ کتنی سردی ہے۔ ارے دریچہ کیوں کھلا ہے؟ اوفوہ۔ ہوا بے حد سرد ہے۔ مجھے لحاف اوڑھا دو۔۔۔ ہوا۔۔''

''ابا جان۔ آپ پر کتنا قرض واجب الادا ہے؟'' چھوٹے ماموں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''چپ رہو۔ چپ رہو۔ خدا کے لیے۔۔۔ مجھے سکون سے مرنے دو''۔ نانا صاحب کی آواز میں آخری وقت کا درد شامل ہو گیا تھا۔ ''ارے لحاف۔۔۔ دریچہ بند کرو۔۔۔ ہوا سرد ہے۔ ہوا۔۔۔''

اور پھر وہ خاموش ہو گئے۔ چھوٹے ماموں کے ہونٹ اب بھی کچھ کہنے کے لیے پھڑ پھڑا رہے تھے!!

☆☆☆

جل پری

نجم الحسن رضوی

مُلا کی شادی کی خبر کسی بڑے لطیفے کی طرح دوستوں پر نازل ہوئی جو اس وقت جمعے کی نماز کے بعد ایک چائے خانے میں بیٹھے جی بہلا رہے تھے۔ ''یقین نہیں آتا ملا جل پری سے کیسے شادی کر سکتا ہے!'' واجد نے کہا جو بچپن سے اس کا دوست تھا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو، اتنی ڈینگیں مارتا تھا وہ، کہتا تھا، اس شہر گناہ میں رہتا ضرور ہوں مگر بہت بچ بچا کے، میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا جو دین کے خلاف ہو!'' تنویر بولا، ''عرصے تک وہ میرے کمرے میں میرے ساتھ رہا اور مجھے پتہ ہے کتنا مشکل ہے اس کے ساتھ رہنا، پیزا تک آدمی اپنی مرضی سے نہیں منگا سکتا، وہ تو بسکٹوں اور ٹافیوں کے پیکٹ بھی اتنی دیر تک غور غور سے پڑھتا تھا کہ انہیں کھانے کی خواہش دم توڑ دیتی تھی۔ مگر وہ کہتا، ''یہ چھان بین ضروری ہے کہیں اس میں سور کی چربی نہ ملی ہو!''

''ہاں یار''، مسعود نے کہا، ''اتفاق سے رئیس اللہ کچھ دن میرے ساتھ بھی سیزرس پیلس کے ایک کونے میں واقع برطانوی ریستوران کے کیش کاؤنٹر پر کام کرتا رہا جہاں صرف مچھلی اور آلو کے قتلے چائے اور کافی کے ساتھ گاہکوں کو پیش کیے جاتے تھے۔ اسے اپنا کام پسند تھا مگر اسے وہاں آتے ہوئے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ وہ کہتا تھا ریستوران تک پہنچنے کے لیے اسے روزانہ کاسینو کے جوئے خانوں کی طرف سے منہ پھیر کے گزرنا پڑتا تھا جس سے گردن ٹیڑھی ہو گئی!''

واجد ہنسنے لگا۔ ''شروع سے وہ ایسا ہی ہے اسی لیے اس کا نام رئیس اللہ سے ملا پڑ گیا اور ہمارے ایک دوست نے جو شاعر تھے ایک نظم کہی جو ایسے شروع ہوتی تھی کہ: اک ہمارا دوست ملا ہے: نام اس کا رئیس اللہ ہے!''

نادر نے کہا، ''مجھے تو اس کی پتلون دیکھ کے ہنسی آتی ہے، ٹخنوں سے اونچی پتلون کون پہنتا ہے، کہتا ہے ہم شلواریں بھی ایسی ہی پہنتے ہیں تاکہ زمین کی گندگی دور رہے!''

''ہاں اس کی گواہی میں دے سکتا ہوں''۔ واجد بولا۔ ''پہلے وہ ایسی ہی اٹنگی شلواریں پہنتا تھا پھر جب اس نے ایک اسکول میں ملازمت شروع کی تو اپنا لباس تبدیل کرنا پڑا کیونکہ اسکول میں نہ صرف طلبہ کو اسکول کا یونیفارم پہننے کی پابندی تھی بلکہ اساتذہ اور دیگر عملے کو بھی پتلون قمیض پہننے کو کہا گیا تھا، پھر اسے پہلی بار پتلون سلوانی پڑی اور ہمارے شاعر دوست کو ایک اور نظم کہنی پڑی جس کا ایک شعر تھا: ایک پتلون اس نے سلوائی: جو کہ ٹخنے تک اس کے فٹ آئی!''

نادر نے کہا، ''یعنی وہ پتلون بھی ایسی ہی تھی جیسی وہ آج کل پہنتا ہے، شرعی پتلون!''

واجد نے کہا، ''وہ شرعی آدمی نہ ہوتا تو پھر مرغ مسلم کی تلاش میں یہاں گلی گلی گھومتا!''

''یار مرغ مسلّم تو سنا تھا مگر یہ مرغ مسلم کیا ہوتا ہے؟'' نادر نے پوچھا۔

''جو ذبح ہونے پر احتجاج نہ کرے اور چھری کے کند ہونے پر کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لائے!'' واجد مسکرایا۔

مسعود نے کہا، ''مگر اسے کھانے کے لیے مرغ مسلم ملے یا نہ ملے، بمبئی ہوٹل کی بھنڈی بڑے شوق سے کھاتا ہے، کہتا ہے بھنڈی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اسے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں!''

واجد نے کہا، ''کھانے میں اسے بس تین چیزیں پسند ہیں، بھنڈی، بھٹا اور بریانی، بریانی کے لیے بھی اس نے ایک ہوٹل ڈھونڈ لیا ہے جہاں حلال مرغ کی بریانی کے بجائے بڑے مزے کی مچھلی بریانی ملتی ہے۔ بھٹے کی تلاش میں اسے کچھ زیادہ دور

نہیں جانا پڑتا کیونکہ جس پارک میں وہ اپنی شامیں گزارتا ہے اس کے اندر ایک فاسٹ فوڈ اسٹال سے اسے بھنا ہوا بھٹا بھی مل جاتا ہے اور پاپ کارن بھی!''

مسعود نے کہا،''اسی پارک میں تو اس کا پہلا غیر شرعی رومان شروع ہوا تھا، یاد ہے؟''

''ہاں، میں نے ایک بار مذاقاً اس سے کہا بھی کہ یار تم حلال چکن کی تلاش میں تو بہت رہتے ہو مگر حلال عورت کی فکر نہیں کرتے ورنہ اس غیر شرعی رومان کی ضرورت پیش نہ آتی!'' واجد بولا:'' کہنے لگا شروع میں سارے رومان غیر شرعی ہوتے ہیں، قید شریعت میں آ کے ساری عورتیں حلال ہو جاتی ہیں!''

مسعود نے ہنس کے پوچھا،''تو اس نے کل کتنے غیر شرعی رمان نبھائے؟''

''پتہ نہیں یار''، واجد نے جواب دیا، میں نے صرف دو حسیناؤں کو اس پارک میں اس کے ساتھ پاپ کارن کھاتے دیکھا، ایک لال بالوں والی لڑکی تھی جو کسی جوئے خانے میں کام کرتی تھی اور دوسری نشیلی آنکھوں اور گداز رخساروں والی ساحرہ جو ایک نائٹ کلب میں ملازم تھی، ملا دونوں کو بہت پسند کرتا تھا اور اپنے ہاتھ سے انہیں تلی مچھلی کے قتلے اور پاپ کارن کھلاتا تھا۔ میں نے ایک بار اسے چھیڑنے کو کہا، تمہیں پتہ ہوگا کہ غیر لڑکیوں کو چھونا اور ہاتھ لگانا شرعاً منع ہے، اس نے کہا، اسی لیے میں ہمیشہ دستانہ پہن کے ان سے ہاتھ ملاتا ہوں یا چھوتا ہوں!''

''اگر اسے ان لڑکیوں سے اتنی محبت تھی تو اس نے کسی ایک سے شادی کیوں نہیں کر لی؟''مسعود نے پوچھا۔

واجد نے کہا، میں نے بھی اس سے یہی سوال کیا تھا مگر اس نے کہا، لال بالوں والی کو جوئے خانے کی ملازمت بہت پسند ہے اور وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی، البتہ میں دوسری والی پر محنت کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کو راضی ہو جائے گی، بس اسے میری داڑھی سے مسئلہ ہے!''

''داڑھی سے، بھلا وہ کیوں؟''مسعود حیران ہوا۔

واجد نے کہا،''وہ چاہتی ہے کہ رئیس اللہ اپنی داڑھی کا اسٹائل بدلے، لمبی داڑھی اسے بری نہیں لگتی مگر بچپن میں پھوڑا نکلنے کی وجہ سے ٹھوڑی کے نیچے بالوں کے نہ اگنے سے اس کی داڑھی میں جو ایک کھڑکی سی بن گئی ہے بڑی بدنما لگتی ہے جسے بند کرنا بہتر ہوگا، مگر شاید اب تک بے چارے کو اپنی داڑھی کی کھڑکی بند کرنے کا کوئی طریقہ نہیں سوجھا!''

واجد نے کہا،''ایک لڑکی اسے کھڑکی والی داڑھی سمیت قبول کرنے کو تیار ہو گئی تھی اور وہ تھی بھی اس کی خواہش کے مطابق بڑی خوبصورت مگر وہ ایک نائٹ کلب میں برہنہ رقص یعنی اسٹرپ ٹیز کا مظاہرہ کرنے پر مامور تھی۔ بھلا ہمارا دوست کیونکر اس پر راضی ہوتا اس نے بڑی کوشش کی کہ محترمہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو آنکھوں کے میلے میں لٹ جانے سے بچائیں مگر کچھ بات نہیں بنی!''

مسعود نے کہا:''اس کا مطلب تو ہوا کہ موصوف ایک ایسی شریک حیات کی تلاش میں ہیں جسے وہ اپنی مرضی سے حلال کر سکیں، تم تو ان کے پرانے دوست ہو آخر تم نے انہیں یہ مشورہ کیوں نہیں دیا کہ وہ ایک بار وطن عزیز کا چکر لگا کے وہاں اپنی مرضی کی گھر والی تلاش کیوں نہیں کرتے، وہاں یقیناً ان کی دلی مراد برآئے گی''۔

''میں نے دیا تھا یہ مشورہ'' واجد بولا،''مگر حضرت نے فرمایا وہاں حلال چکن تو بآسانی دستیاب ہے مگر گرم مسالوں کی بہتات انہیں اتنا زہریلا بنا دیتی ہے کہ فوڈ پوائزنگ کا خطرہ رہتا ہے، کون اس مصیبت میں پڑے!''

''اچھا تو گویا وہ حضرت کولمبس کی طرح اپنے لیے نئی دنیا کی تلاش جاری رکھنا چاہتے تھے!''مسعود نے کہا، خیر چلو ان کی یہ تلاش اب ختم ہوئی، مگر یہ جل پری انہیں کہاں سے ملی؟''

واجد نے کہا: ''وہ نئے سال کی رات تھی جب ہم سارے دوست ایک پارٹی میں مدعو تھے جو فیشن مال میں دی گئی تھی۔ رئیس اللہ اگرچہ ساری غیر شرعی مشروبات اور ماکولات سے دور رہتا تھا مگر وہ فیشن مال کے اس اسٹور کا ملازم تھا جس کی طرف سے اس تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا لہٰذا اسے وہاں موجود رہنا پڑا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ جل پری کے آبی تماشوں نے اسے بھی مسحور کیا!''

''مگر فیشن مال میں جل پری کہاں سے آ گئی؟'' مسعود نے پوچھا۔

واجد نے کہا: ''جل پری کے تماشوں کا بندوبست بھی اسی اسٹور نے کیا تھا جس میں ہمارا دوست کام کرتا ہے۔ اس اسٹور میں جل پری برانڈ کے زنانے ملبوسات فروخت کیے جاتے ہیں۔ اسٹور کی جانب سے مال کے بیچوں بیچ چھت سے فرش تک شیشے کا بڑا سا حوض بنایا گیا تھا جس میں جل پری اوپر سے نیچے تک تیر سکتی تھی''۔

''اوہ، بھلا فیشن مال والوں کو کہاں پتہ ہوگا کہ جل پری تماشہ شروع ہونے پر اوپر سے نیچے آئے گی اور تیرتے ہوئے سیدھی ہمارے دوست کے دل میں اتر جائے گی!'' مسعود ہنسا۔

''بالکل یہی ہوا''، واجد نے کہا: ''جیسے ہی رات کے بارہ بجے، ایک دھماکے کے ساتھ نئے سال کی خوش خبری آئی اور رنگ برنگے غبارے رنگین قمقموں کے ساتھ ہال میں جگمگائے، شیشے کے تالاب میں پانی میں ہلچل ہوئی اور پری چہرہ جل پری شفاف لہروں کو چیرتی ہوئی اوپر سے نیچے کی طرف سفر کرتی نظر آئی۔ سنہرے بالوں نے جھلملاتے تاج کی صورت میں اس کے سر کو ڈھانپ رکھا تھا اور چھاتی سے پیروں تک سبز مخملیں غلاف نے جل پری کے دلکش روپ کو مکمل کر دیا تھا۔ گورے گورے ہاتھ اسے تیرنے میں مدد دے رہے تھے اور چہرے، گردن اور سینے کے بالائی حصے پر جیسے صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی''۔

مسعود نے گہرا سانس لیا۔ ''یار تم نے ایسا بھرپور نقش کھینچا ہے جل پری کا کہ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں اس آبی حسینہ کی زیارت سے محروم رہا مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسے رئیس اللہ کی کون سی خوبی پسند آئی جو وہ اس مسخرے کے ساتھ شادی کرنے پر تیار ہوگئی''۔

''اب یہ بات ایسی ہے جس کا جواب وہ خود دے سکتا ہے، ویسے اطلاع کے لیے عرض ہے کہ موصوف تھوڑی دیر میں ہم لوگوں سے شادی کی مبارکباد وصول کرنے یہاں آنے والے ہیں''۔ واجد نے کہا۔

اچانک تنویر نے جو پورے وقت ان کے پاس بیٹھا خاموشی سے انکی باتیں سن رہا تھا کھڑکی سے باہر جھانک کے کہا ''آنے والے نہیں، وہ آ گئے ہیں، باہر اپنی کار پارک کررہے ہیں!''

چند لمحوں بعد رئیس اللہ اسی شان سے اندر داخل ہوئے۔ اٹنگی پتلون اور دائیں ہاتھ میں لال دستانہ۔ تنویر اور مسعود نے کھڑے ہو کے ہاتھ ملایا مگر واجد نے کہا: ''پہلے یہ منحوس دستانہ اتارو جو نامحرم لڑکیوں کے پنجوں کی پیمائش میں تمہارے کام آتا ہے''۔

رئیس اللہ نے زوردار قہقہہ لگایا'' مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم بھی خود کو نامحرم لڑکیوں میں شمار کرتے ہو، خیر یہ اب کسی کام کا نہیں!'' اس نے دستانہ اتار کے قریب رکھے کوڑے کے ڈبے میں اچھال دیا۔

''ارے یہ کیا غضب کیا میرے ہیرو، ابھی تو نجانے کتنی اور حسینائیں تمہاری پنجہ آزمائی کی منتظر ہوں گی!'' واجد بولا۔

''نہیں یار وہ اب بدل گیا ہے، اسے جل پری مل گئی باقی اسے کیا چاہیے، پرانے سب کھیل ختم، کیوں؟'' مسعود نے سوالیہ نظروں سے رئیس اللہ کو دیکھا۔ ''اور ہاں آج تم مسجد میں نہیں آئے''۔

سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو رئیس اللہ نے کہا: ''سچ کہتے ہو، مصروفیت کچھ بڑھ گئی ہے اور جل پری نے تو میرے دن رات اپنے قبضے میں کر لیے ہیں!''

''مگر یار ہم سب حیران ہیں کہ وہ تمہارے قبضہ قدرت میں کیسے آئی''۔ تنویر بولا۔

''محبت، صرف محبت''، رئیس اللہ نے کہا،''میری محبت اور اس کی عقیدت دونوں نے کام دکھایا!''

''اس کی عقیدت، اس کا کیا مطلب؟''مسعود نے پوچھا۔

''بھئی اسے میرے خیالات پسند ہیں اور یہ داڑھی اور پتلون بھی''، رئیس اللہ نے جواب دیا،''وہ فیشن مال میں میرے اسٹور سے جس کا نام 'آج کے فیشن' ہے، اپنے کپڑے خریدتی ہے اور مجھے تو وہ نئے فیشنوں کا اشتہار سمجھتی ہے!''

واجد ہنس پڑا۔''اچھا، وہ کیسے؟''

''بھئی وہ سمجھتی ہے کہ میری ٹخنوں تک اونچی پتلون جدید فیشن کے مطابق ہے اور ایک ہاتھ کا دستانہ بھی،'' رئیس اللہ نے کہا،''وہ تو میری داڑھی کی بھی عاشق ہے جسے تم لوگ کھڑکی والی داڑھی کہتے ہو بلکہ اس نے مشورہ دیا ہے کہ داڑھی کو اس طرح تراشوں کہ اس کے دونوں سرے نیچے تک لٹکتے نظر آئیں اور لمبی مونچھ دونوں سروں سے مل کے چہرے پر انگریزی لفظ ایچ کی تصویر بنا دے۔ وہ کہتی ہے اس سے دیکھنے والوں کو پتہ چل سکے گا کہ یہ کوئی عام قسم کی داڑھی نہیں بلکہ ریش مقدس ہے، یعنی ہولی بیرڈ!''

سب دوست زور سے ہنسے۔''یار بڑے تخلیقی ذہن کی خاتون ہیں محترمہ، خوب نبھے گی تم سے''، واجد نے کہا،''ہم لوگوں کا خیال ہے کہ تم لوگوں کو رسمی طور پر شادی کی مبارکباد دینے کے لیے ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی جائے جس میں بھابھی صاحبہ کی باتیں سنی جائیں اور سر دھنا جائے''۔

''مگر ایک شرط یہ ہے کہ تم تقریب میں اپنے چہرے پر بھابھی جان کی فرمائش کے مطابق ریش مقدس سجا کے آؤ گے!'' مسعود نے کہا۔''مجھے یقین ہے کہ تمہارے نئے فیشن کی داڑھی کچھ ہی دنوں میں شہر کے سب نوجوانوں کو پاگل کر دے گی اور ہر طرف مقدس داڑھیاں دیکھنے کو ملیں گی!''

''مگر ہر مقدس داڑھی کے مقدر میں جل پری تو نہیں'' تنویر بولا،''یہ اعزاز تو صرف ہمارے دوست کے حصے میں آیا ہے!''

واجد نے پوچھا،''ویسے یار تمہاری جل پری کو جل پری بننے کا خیال کیسے آیا، وہ تو اتنی خوبصورت ہیں کہ بڑے اطمینان سے ایک ہوش ربا ماڈل بن سکتی تھیں یا پھر کوئی فلیمنگو رقاصہ اور بیلے ڈانسر؟''

رئیس اللہ نے کہا،''وہ پہلے کسی فوٹو اسٹوڈیو کے استقبالی ڈیسک پر کام کرتی تھی مگر وہاں آنے والا ہر شخص اس کے ساتھ سلفی ضرور بنانا چاہتا تھا، پھر اس نے ایک مصور کے یہاں ماڈل کی حیثیت سے کام شروع کیا لیکن کچھ دنوں بعد مصور صاحب حسن برہنہ کی نقاشی پر اصرار کرنے لگے۔ انہیں دنوں اس نے ایک مشہور تفریحی پارک کا اشتہار پڑھا جسے تیراکی کی ماہر ایسی لڑکی کی ضرورت تھی جو جل پری بن کے شیشے کے تالاب میں تیرتے ہوئے پارک آنے والے لوگوں کا دل لبھا سکے، اس نے موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اسے وہ کام پسند ہے!'' واجد نے ہاتھ کے اشارے سے بیرے کو سب کے لیے چائے لانے کا آرڈر دیا۔

''اب جل پری کی کہانی ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ گرما گرم چائے کا ایک دور بہت ضروری ہو گیا ہے!'' اس نے کہا۔

چائے آنے تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے پیتے ہوئے اچانک تنویر کے ذہن میں ایک عجیب سا سوال کلبلایا۔''یار ایک بات سمجھ میں نہیں آئی''۔ وہ بولا،''تمہیں وہ لڑکی بھی تو بہت پسند تھی جو نائٹ کلب میں کام کرتی تھی، تم نے اسے کیوں جانے دیا؟''

''وہ؟'' رئیس اللہ،''یار میں پہلے بھی بتا چکا ہوں وہ نائٹ کلب کی نوکری چھوڑنے کو تیار نہیں تھی، میں کیسے برداشت کرتا، توبہ، توبہ، برہنہ رقص، کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں!'' ''مگر میرے بھائی''، واجد نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا،''کیا جل پری؟'' وہ چپ ہو گیا۔

''وہ مختلف ہے، تیرتے ہوئے اس کا آدھے سے زیادہ بدن جل پری کے کاسٹیوم میں چھپا رہتا ہے!'' رئیس اللہ نے جواب دیا۔

☆☆☆

طولِ شبِ فراق

نند کشور وکرم

کسی شکست خوردہ جواری کی طرح گردن جھکائے آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا وہ اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔ اُس وقت وہ معمول سے زیادہ پریشان اور غمگین نظر آ رہا تھا۔ اُس کے خشک اور منتشر بالوں نے اُس کا حلیہ مزید بگاڑ رکھا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کا تمام اثاثہ لٹا چکا ہو یا کسی دُور دراز واقع مرگھٹ سے اپنی کسی عزیز ترین ہستی کو نذرِ آتش کرنے کے بعد لوٹ رہا ہو۔ اُسے اس طرح مغموم اور اُداس دیکھ کر مَیں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ چونکہ مَیں کافی دیر سے اُس کا انتظار کر رہا تھا اس لیے اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کی جانب چل پڑا۔ جب مَیں اُس کے قریب پہنچا تو پیچھے سے آواز دی۔

''ہاتویاما!''

لیکن ہاتویاما پر میری آواز کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ پہلے کی طرح ہی آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھتا رہا۔ اس پر مَیں دوبارہ چیخ اُٹھا۔

''ہاتویاما!''

اس بار اُس نے چونک کر پیچھے کی جانب دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی اُس کے پژمردہ اور غمگین چہرے پر خود بخود ہی پھیکی سی مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی اور بولا۔

''ہیلو!'' ''کب آئے؟''

''مَیں تو تین گھنٹے سے ویٹنگ ہال میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''اوہ! معاف کرنا بھئی! مَیں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ دراصل مَیں بھول ہی گیا تھا کہ مَیں نے تمہیں کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔'' پھر وہ مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے کہنے لگا چھا! چلو اندر کمرے میں چل کر بیٹھیں۔'' اُس نے یہ چند جملے اپنے مخصوص جاپانی لہجے والی انگریزی میں ادا کیے۔ اور پھر اپنی پتلون کی جیب میں سے چابی نکال کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے لگا اور مَیں اُس کے پریشان چہرے کا جائزہ لینے میں محو ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ جب سے اُس کی حسین و جواں بیوی بیٹی اور بچہ اوریا ناگا ساکی میں ایٹم بم کی نذر ہوئے تھے تب سے اُس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ اکثر کھویا کھویا سا رہتا اور شراب اُس نے کثرت سے پینی شروع کر دی تھی اور وہ گھنٹوں غم و الم کے بحرِ عمیق میں غرقاب رہتا۔ لیکن آج تو وہ معمول سے زیادہ پریشان اور غمگین دکھائی دے رہا تھا۔ اندر کمرے میں جا کر اُس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور کئی لمحے تک بے حس و حرکت آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور مَیں اس عرصہ میں اُس کے چہرے کے تاثرات سے اُس کی اُداسی اور پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مَیں اُٹھ کر اُس کے پاس ہی پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا اور اُس کے منتشر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے ہاتویاما؟''

ہاتویاما نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ اُسی طرح دیوار کی طرف پیٹھ کئے بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ آخر اُس

کی مسلسل خاموشی سے اوب کر مَیں نے اُس کا چہرہ اپنی طرف پھیرا تو دنگ رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو دجلہ وفرات کی مانند بہہ رہے تھے۔ مَیں نے اُس کی پُرنم آنکھوں اور چہرے کو صاف کرنے کے بعد ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاتو یاما! تم اتنے اُداس کیوں ہو؟''

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مَیں اُس کی غیر معمولی اُداسی سے دل ہی دل میں حیران و پریشان ہو رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کئی مرتبہ پہلے بھی کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اُداس ہو جاتا تھا اور اپنی بیوی اور بچے کی یاد سے بیقرار ہو کر کسی انجانی دنیا میں کھو جاتا تھا مگر آج تو خلافِ معمول عام دنوں سے زیادہ اُداس اور نراش نظر آ رہا تھا۔ مَیں ابھی اپنا سوال دہرانا ہی چاہتا تھا کہ آہستہ آہستہ کھڑے ہو کر اُس نے الماری سے وِہسکی کی بوتل نکالی اور دو گلاسوں میں ڈال کر ایک میری جانب بڑھا دیا اور دوسرا گلاس اُٹھا کر دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگا۔

مَیں تو یوں بھی کم پینے کا عادی ہوں لیکن آج اُس کی پریشانی نے مجھے اتنا فکر مند بنا دیا تھا کہ اُس کا ساتھ دینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر جب اُس نے دو گلاسوں میں وِہسکی ڈال کر ایک گلاس میری طرف بڑھایا تو نہ چاہتے ہوئے بھی چُپ چاپ وہ گلاس اُس کے ہاتھوں سے تھام لیا اور اُس کا ساتھ دینے کے لیے دھیرے دھیرے چسکیاں بھرتے ہوئے تخیلات کی پرواز میں اُس اولین ملاقات کے منظر میں کھو گیا جب مَیں پہلی بار اُس سے ملا تھا۔

ہاتو یاما سے میرے پہلی ملاقات فائن آرٹس گیلری میں ہوئی تھی جہاں مَیں عظیم روسی فنکار رورِک کے قابلِ ستائش شاہکاروں کی نمائش دیکھنے میں منہمک تھا۔ جب مَیں دیوکارانی کے پورٹریٹ کے پاس پہنچا تو اُس میں مجھے زندگی رقص کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور مَیں کئی لمحے مجسمۂ حیرت بنا اُس منہ بولتی تصویر کے سامنے کھڑا رہا۔ تبھی اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر میرا نام پکارا اور مَیں چونک سا پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا دیرینہ آرٹسٹ دوست راجن متل ایک جاپانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ جب مَیں اُن کی طرف مُڑا تو راجن نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ ہیں میرے عزیز ترین بچپن کے ساتھی راکیش جنھیں مَیں راکی کہہ کر پکارتا ہوں۔ یہ ماڈرن آرٹ کے دلدادہ ہیں اور ان کی کئی تخلیقات عوام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔'' اس کے بعد اُس نے اجنبی جاپانی کا مجھ سے تعارف کرانا شروع کیا۔

''راکی! یہ جاپان کے مشہور مجسمہ ساز ہاتو یاما ہیں۔ شاید تم نے آج کل ان کے بارے میں اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یہ یہاں بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لیے تشریف لائے ہیں۔''

راجن کے تعارف کرانے پر مجھے یک لخت یاد آ گیا کہ ابھی پرسوں ہی مَیں نے اخباروں میں اُس کے فوٹو کے ساتھ اُس کی آمد کی خبر بھی پڑھی تھی۔ مَیں نے فوراً ہی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے آپ سے مل کر انتہائی خوشی ہوئی۔''

''اور مجھے بھی۔'' اُس نے رسماً انگریزی میں جواب دیا۔

اس کے بعد ہم گیلری میں تصویریں دیکھنے میں منہمک ہو گئے۔ پھر وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم تینوں ''گے لارڈ'' چلے گئے جہاں ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر جب ہم وہاں سے اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف روانہ ہونے لگے تو مجھے ہاتو یاما کے بارے میں کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔

سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچ کر اُس نے بتایا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں وہ نیویارک میں تھا اور اُس کی رفیقۂ حیات ناگاساکی میں۔ جب ہٹلر نے یورپ کے کئی ممالک کو تاخت و تاراج کر دیا تو اُس کی بیوی جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں

سے گھبرا گئی۔ اور اُسے جلد واپس آنے کے لیے لکھنے لگی۔ اُن دنوں ہوائی اور سمندری دونوں ہی راستے خطرناک تھے پھر بھی وہ اپنی جان پر کھیل کر نیویارک سے ناگاساکی پہنچ گیا کیونکہ اُسے اپنی بیوی سے انتہائی پیار تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے اکلوتے ننھے بچے کو دیکھنے کے لیے بھی بے تاب تھا جس کی پیدائش اُس کے نیویارک پہنچنے کے چند ماہ بعد ہوئی تھی۔

ناگاساکی پہنچ کر وہ خوشی خوشی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ زندگی گزارنے لگا...... لیکن پھر ایک دن اچانک ایٹم بم کے مہلک اور ہولناک دھماکے نے اُس کی دنیا اُجاڑ کر رکھ دی۔ اُس کی بیوی اور بچہ لقمۂ اجل ہو گئے۔ وہ اُس قیامت خیز حادثے سے بچ تو گیا مگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد وہ سکون و چین کی تلاش میں تمام روئے زمین کا چکر لگانے لگا لیکن وہ اپنی عزیز بیوی اور اور لختِ جگر اوریا کو نہ بھلا سکا............ اور اب وہ بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لیے یہاں دہلی آیا ہوا تھا۔

آج سے پیشتر ایک بار کافی ہاؤس میں بھی جب وہ سگریٹ کے طویل کش کھینچ کر مرغولے بناتا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا تو مَیں نے اُس سے کہا تھا۔

''ہاتو یاما! اگر کہو تو ایک سوال پوچھوں؟''

''ہاں ہاں بڑے شوق سے۔''

مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کروں؟ آخر چند ثانیے ایسے ہی تذبذب کے عالم میں رہنے کے بعد مَیں نے سوال کیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری بیوی اور بچے کی موت کیسے ہوئی؟''

وہ کچھ اُداس سا ہو گیا اور اُس کا اُداس چہرہ دیکھ کر مَیں خود ہی پچھتانے لگا کہ مَیں نے اُس سے ایسا سوال کیا ہی کیوں؟ یاتوہاما کچھ دیر چپ چاپ تصویرِ غم بنا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر اُس نے اپنی جیب سے دوسرا سگریٹ نکالا اور اُسے سلگا کر کافی ہاؤس کی چھت پر ٹکٹکی جمائے بولا۔

''شاید تم جانتے ہی ہو گے کہ جاپان کو شکست دینے کے لیے اتحادیوں نے ایٹم بم کا سہارا لیا تھا اور اسی ایٹم بم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ناگاساکی پر بم پڑنے سے چند گھنٹے پیشتر میری بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے۔ آہ اُس وقت کسے معلوم تھا کہ کل صبح ہونے سے پیشتر ہی موت کے ظالم ہاتھ اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گے۔ رات ہم اطمینان سے سوئے۔ اچانک مجھے ایک زبردست دھماکا سنائی دیا اور اس سے پیشتر کہ مَیں آنکھ کھول کر حالات کا جائزہ لیتا، یک لخت مجھے اپنے اُوپر پہاڑ ایسا وزن گرنے کا احساس ہوا اور درد و کرب سے میری چیخ نکل گئی۔ لیکن اس کے بعد مجھے قطعی ہوش نہیں رہا۔ اس واقعہ سے تیسرے دن جب مجھے ہوش آیا تو مَیں شدتِ درد سے بُری طرح تڑپ رہا تھا اور میرے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مَیں نے آنکھ کھولنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر حالات کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میرے اردگرد ڈاکٹروں کے علاوہ متعدد نرسیں بھی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ مَیں نے اُن سے متعدد سوال کیے مگر انہوں نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اُن سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور وہ اس دلدوز اور ہولناک حادثے سے از حد رنجیدہ اور اُداس نظر آتے تھے۔ کئی دنوں کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ ناگاساکی پر اتحادوں نے ایٹم بم گرایا تھا جس سے سارا شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہزاروں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں، بچے یتیم ہو گئے تھے اور ماؤں کی گودیں سونی ہو گئی تھیں اور جو زندہ بچے تھے اُن میں زندگی کا کوئی لطف باقی نہ رہا تھا کیونکہ اُن میں سے کسی کی ٹانگ نہیں تھی تو کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ کوئی اندھا ہو گیا تھا تو

کسی کا چہرہ انتہائی ڈراؤنا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میری بیوی اور بچہ بھی شاید دوسرے ہزار ہا انسانوں کے ساتھ موت کا شکار ہو گئے تھے۔

وہ بات کرتے کرتے ایکا یکی خاموش ہو گیا۔ اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ کئی لمحے وہ اسی طرح چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنی بیوی اور بچے کی یاد سے پھر غمگین ہو گیا ہے۔ اُس کے ہاتھ کا ادھ جلا سگریٹ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ پھر یکلخت وہ چونک پڑا اور اُس نے اپنی ادھوری داستان کا بقیہ حصہ سنانا شروع کیا۔

''............ ہیتی اور اوریا کی موت نے میرے لئے قیامت برپا کر دی

لیکن پھر بھی مجھے اُن کی موت کا یقین نہیں آتا تھا اس لئے روبصحت ہوتے ہی میں نے اپنی زخمی ٹانگ کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی اُن کی تلاش شروع کر دی۔ ناگاساکی کے کھنڈرات اور ہسپتالوں کا چپہ چپہ میں نے ایک موہوم امید کے بھروسے چھان مارا اور آخر جب امید بھی دم توڑ گئی اور مجھے اُن کی موت کا یقین ہو گیا تو میں پاگل سا ہو گیا۔ دن بھر دیوانوں کی طرح ناگاساکی کے کھنڈرات میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ناگاساکی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ آخر تنگ آ کر میں نے ناگاساکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا اور بے مقصد ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ کبھی امریکہ چلا جاتا تو کبھی فرانس۔ مگر اس کے باوجود بھی مجھے سکون نصیب نہیں ہوا۔ میں جہاں بھی گیا اُن کی یاد میرا تعاقب کرتی رہی۔ اُن کی یاد میں ایک ثانیے کے لیے بھی نہ بھلا سکا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور اُس نے جیب سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کے کش لگاتے ہوئے نہ جانے کون سی دنیا میں کھو گیا۔ میں بھی اُس کی اذیت ناک اور دلدوز داستانِ حیات سے غمگین ہو گیا تھا............ اتنا غمگین کہ اُس کے بعد میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور چُپ چاپ بیٹھا اس کے اندرونی درد و کرب کے احساس سے دُکھ کے بحرِ عمیق میں غرقاب رہا۔ اُس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ اگر میرا بس چلے تو ابھی اُسے اقوام متحدہ کے نمائندوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں اور اُن سے چیخ چیخ کر کہوں کہ............

''اے امنِ عالم کے علم بردارو! کیا تُم دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو مہلک ایٹمی ہتھیار بنانے سے نہیں روکو گے؟ دیکھو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے

بموں کا نتیجہ۔ اس کی بیوی اور بچہ اُس قیامت خیز حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ اور یہ بالکل تنہا ہو کر آج ایک زندہ لاش بن چکا ہے۔ لیکن یہ صرف اس ایک واحد انسان کی داستانِ الم نہیں بلکہ یہ اُن لاکھوں انسانوں کی دکھ بھری کہانی ہے جنہیں ایٹم بم کا شکار ہونا پڑا ہے۔ جنہیں موت، بیماری، جسمانی معذوریت اور اندرونی کرب سے دو چار کیا گیا ہے۔ کیا تم ان کی حفاظت نہیں کرو گے؟ کیا تم لاکھوں انسانوں کو اس غیر قدرتی موت اور بیماریوں سے نہیں بچاؤ گے؟ کیا تم ان گنت بچوں کے یتیم ہونے کے ذمہ دار نہیں ہو؟ بولو! جواب دو؟ کیا ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کبھی ختم نہیں ہوگی؟ کیا انسان کو آرام اور سکھ کی زندگی گزارنے کا موقع نہیں ملے گا؟ بولو، جواب دو؟''

کافی دیر تک ہم اسی طرح ساکت و سامت بیٹھے رہے۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات چیت نہیں کی۔ وہ تو شاید اپنی پیاری بیوی اور بچے کی ابدی جُدائی سے دُکھی ہو کر اُن کے ساتھ گزارے ہوئے فرحت آمیز اور پُر مسرت دنوں کے تصور میں کھو گیا تھا اور میں اُس کی کہانی کے المیہ انجام سے از حد غمگین ہو گیا تھا۔ اُس دن ہمیں پتہ ہی نہ لگا کہ کب ہم کافی ہاؤس سے اُٹھے اور کب ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔

میں ابھی تک وِسکی کی چسکیاں بھرتے ہوئے ہاتویاما کے ماضی کے بھیانک حادثے کے تصورات میں کھویا ہوا تھا۔ اور

وہ گلاس پر گلاس بھر کر اپنے حلق میں انڈیلے جا رہا تھا حتا کہ پوری بوتل ختم ہوگئی اور اُس نے الماری سے دوسری بوتل نکال کر پینی شروع کر دی۔ اب شاید وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اچانک میری نظر گھڑی پر پڑی، بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ مَیں فوراً گھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اُٹھتے دیکھ کر اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ارے یار! بیٹھو نا! تم تو ابھی سے اُٹھنے لگے۔''

''نہیں۔ معاف کرنا ہاتویاما مجھے دیر ہو رہی ہے۔ گھر میں میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔''

بیوی کے انتظار کی بات مَیں نے کہہ تو دی لیکن پھر فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ مَیں نے یہ کہہ کر اچھا نہیں کیا کیونکہ وہ اس بات سے زیادہ غمگین ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔

''یار! معاف کرنا۔ تمہاری بیوی تمہارے انتظار میں پریشان ہو رہی ہوگی۔''

کچھ دیر بعد مَیں اُس سے ہاتھ ملا کر جلدی جلدی بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا مگر سارا راستہ مَیں نے ہاتویاما کی اُداسی اور پریشانی پر غور کرتے ہوئے کاٹا اور رات سوتے وقت بھی اُس کا اُترا اور پژمردہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

رات تاخیر سے سونے کے کارن صبح مَیں جلدی نہ اُٹھ سکا۔ جب آنکھ کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی میرے اُٹھتے ہی نوکر بیڈ ٹی لے کر آوارد ہوا۔ چائے پیتے ہوئے مَیں نے سوچا کہ جلدی سے تیار ہو کر ہاتویاما کی خیر و عافیت دریافت کرنے چلوں کیونکہ رات وہ شدتِ غم سے وہسکی کے گلاس پر گلاس چڑھائے جا رہا تھا۔ اتنے میں نوکر نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا تا کہ مَیں اپنی عادت بموجب خبریں سُن سکوں مگر پہلی خبر سنتے ہی چائے کا پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیوز ریڈر کہہ رہا تھا۔

''ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں جاپان کے مشہور مجسمہ ساز ہاتویاما نے خودکشی کر لی ہے۔ مرحوم ابھی چند ہفتے ہوئے بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ خودکشی کرنے سے پیشتر وہ ایک خط چھوڑ گئے ہیں جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنی عزیز رفیقۂ حیات بیٹی اور ننھے بچے اوریا کی ابدی فرقت گوارا نہیں کر سکتے جو ناگاساکی میں اتحادیوں کے ایٹم بم کا نشانہ بن گئے تھے۔ اُن کی یاد ہمیشہ اُن کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ اُن کے بغیر وہ ایک زندہ لاش ہیں اور اُن کی جدائی میں انہیں ایک پل بھی سکون نہیں ملتا اس لئے وہ اس اذیت ناک زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر رہے ہیں تا کہ............

مَیں اس سے زیادہ کچھ نہ سُن سکا اور اسی طرح لباس شبانہ پہنے ہی ہوٹل پہنچنے کے لیے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔

☆☆☆

کمین گاہ

نعیم آروی

گھر پہنچ کر دن بھر کی مشقت اور ڈپریشن کا بوجھ اتار رہی تھا کہ سامنے کا منظر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ سانحات زندگی کا حصہ ہوتے ہیں مگر فی الوقت میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

میرے گھر کے نیم کشادہ ڈرائینگ روم کا ماحول اور ترتیب، جس کو میری بیوی نے اپنی صحت مندی کے دوران بڑے سلیقے سے سجا رکھا تھا، بے ترتیب اور ابتر نظر آیا۔ میری بیوی کے جسم کا بالائی حصہ وہیل چیئر پر اٹکا ہوا تھا، جب کہ اس کا زیر ناف مفلوج حصہ فرش پر ڈھیر تھا۔ ٹیلی فون سیٹ نیچے گرا پڑا تھا اور ریسیور چیئر کی ہتھی پر تار کے ساتھ کٹے ہوئے بازو کی طرح جھول رہا تھا۔ بیوی کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ انجانے خوف سے اس کا بیضوی چہرہ فق اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کی مدھم ہوتی ہوئی سانسوں میں آنے والی ساعتوں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اس کو گود میں اٹھا کر بستر پر گاؤ تکیہ کے سہارے ٹیک لگا کر بٹھانے کی کوشش کی تو اس کا جسم ایک جانب ڈھلک گیا۔ اپنی بیوی کو اس عالم میں دیکھ کر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی ایک لہر اٹھی ضرور تھی، مگر کیا کیا جائے اس صورت حال پر قابو پانا میرے امکان سے باہر تھا جس کا وہ شکار بنی۔ میں نے کولر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا، مگر پانی اس کے ہونٹوں کے کناروں سے نکل گیا۔ ذرا دیر کے بعد جب اس کے ٹھنڈے پڑتے جسم میں ہلکی سی جنبش محسوس کی تو اپنا منہ اسکے کان کے قریب لے جا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف ڈوبتی نگاہوں سے ٹیلی فون کی جانب دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں موت کی پھریری پھیل گئی۔ میں نے ملازمہ کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں، کچھ دیر پہلے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو تھی، مگر میں اس وقت باورچی خانے میں تھی، جب یہاں پہنچی تو بی بی صاحبہ کو اس حال میں دیکھا"۔

گذشتہ ایک ماہ سے ہمارے گھر کے ٹیلی فون پر گمنام کالوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ابتدا میں ہمیں تجسس تو رہا مگر یہ سوچ کر ہر واہمہ کو ذہن سے جھٹک دیا کہ کسی کی فرصت کے مشاغل ہیں۔ بیوی کو سمجھایا بھی تھا کہ "جو کوئی بھی ہو تھک ہار کر خاموش ہو جائے گا، پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں"۔

لیکن چند دنوں کے بعد بھی گمنام کالوں کا سلسلہ جاری رہا تو پھر ہمارا، کم از کم میری مفلوج بیوی کا تجسس تشویش اور پھر ایک ڈر میں تبدیل ہو گیا جس میں اگلے لمحے کچھ نہ کچھ ہونے کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر میری بیوی زیادہ پریشان اور ہلکان رہنے لگی تھی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ جس میں اس کا دل بھی شامل تھا، اس مرحلہ پر بھی زندہ رہنے کی خواہش میں دھڑکتا رہتا تھا مگر جب سے ٹیلی فون پر گمنام کالوں کی آمد شروع ہوئی تھی اس کی یہی دل اس کے حلق میں اٹک جاتا اور اسے ہائپر ٹینشن کا دورہ پڑنے لگتا۔

ہماری شادی کو چار ساڑھے چار سال ہی ہوئے تھے کہ اچانک اس کے جسم کے نچلے حصے پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بستر پر

گر گئی۔ میری ملازمت ایک غیر ملکی آئل کمپنی میں تھی۔ اس لیے روپے پیسوں کی کمی نہ تھی۔ میں نے شہر کے بہترین معالجوں سے اس کا علاج کرایا، مگر بہتری کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے۔ ہماری مایوسی کے بادل گہرے ہوتے گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بیوی کے ساتھ کیمونیکیشن اور ڈائیلاگ کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ بالآخر ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے بیڈ بھی الگ کرلیں تاکہ ہم دونوں ذہنی اور جذباتی کوفت سے بچ سکیں۔ اس فیصلہ کے بعد مجھے ایک گونہ اطمینان ضرور ہوا مگر یہ احساس بھی گہرا ہوگیا کہ جب رات گہری ہونے لگتی ہے، باہر کا موسم خوشگوار ہو جائے تو اندر کا موسم بھی انگڑائی لینے لگتا ہے۔ ایسے میں کسی گداز جسم سے ہم آغوشی کی خواہش منہ زور اور بے قابو ہو جاتی ہے۔

ملازمہ نے بتایا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ اکثر میرے چھوٹے سے کتب خانے سے کوئی کتاب اٹھا لیتی، کچھ دیر مطالعہ کرتی یا پھر ڈرائینگ روم میں رکھے ٹیلی فون پر اپنی واقف کاروں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی تھی۔

شام کے وقت دفتر آنے کے بعد میں کچھ دیر اس کے پاس ضرور بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھی ہم دونوں داخلی کیفیات کے بھنور سے باہر نکل آتے تو اکٹھے چائے بھی پی لیتے مگر ایسا موقع کبھی کبھار ہی آتا۔ بیشتر اوقات ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے گونگے بہرے ہوتے۔ یہ معمولات کچھ ہی دن چل پائے تھے کہ اچانک ہماری خاموش، سپاٹ زندگی میں کسی نے ہمارے ٹیلی فون پر گمنام کالوں کا پتھر مار کر طلاطم پیدا کر دیا۔ یہ واقعہ میری بیوی کی زندگی کا دوسرا ہولناک تجربہ تھا۔ مجھے یاد ہے ٹیلی فون کی پہلی کال پر وہ بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی تھی۔ دفتر سے واپسی پر جب میں نے یہ واقعہ سنا اور بیوی کی حالت کا بغور جائزہ لیا تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس میں قوت مزاحمت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ میں نے اس رات بڑی دیر تک سمجھایا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں جس کا اتنی سنجیدگی سے نوٹس لیا جائے۔ اس قسم کی گمنام ٹیلی فون کالیں آتی رہتی ہیں مگر وہ اسے عام واقعہ قرار دینے پر تیار نہیں ہوئی کہ "ٹیلی فون پر دی جانے والی دھمکی اس کی آدھی زندگی کے درپے ہے"۔

میں نے ایسے کئی موقعوں پر اسے تسلی دینے کی کوشش کی کہ وہ ان نامعلوم کالوں کو سیریس نہ لے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اب وہ میری ایسی تسلیوں کے جواب میں بھڑک اٹھتی۔

"کیوں سیریس نہ لوں، تمہیں اس کی آواز کی زہرناکی اور دھمکی کا اندازہ ہی نہیں۔ اس کی آواز میں سانپ کی پھنکار ہے، سانپ کی۔۔۔"

میں نے ٹیلی فون کے محکمے میں کام کرنے والے ایک دوست سے مشورہ کیا تو اس نے گمنام کالوں کو ڈیٹکٹ کرنے کی جو تجاویز دیں ان پر عمل کرنے کے باوجود کالوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

میری بیوی فالج کے حملہ کے بعد زیادہ زود حس اور چڑچڑی ہو گئی تھی۔ معالجوں کی متفقہ رائے تھی کہ "کوئی بھی ذہنی یا جذباتی صدمہ مریضہ کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہائپر ٹینشن سے ہارٹ اٹیک یا برین ہیمبرج کا بھی خطرہ رہتا ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا کہ "آپ کی بیوی Sensitivity کے انتہائی درجہ پر ہے۔ ایسی حساسیت تو صحت مند اور توانا شخص کے اعصاب کو بھی توڑ پھوڑ سکتی ہے۔ آپ کی بیوی کے جسم کے نچلے حصے کی توانائی تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے جبکہ بالائی حصے میں مایوسی اور ڈپریشن کے سبب مزاحمت کا عنصر تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔ انہیں مایوسی سے بچائیں، اپ سیٹ نہ ہونے دیں ورنہ۔۔۔"

میں نے معاملہ کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے ضروری سمجھا کہ ملازمہ کو تمام تر احوال سے باخبر رکھوں۔

اس روز کسی نے میرے شانے کو زور زور سے ہلایا جس سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے الکساہٹ سے کروٹ بدل کر پوچھا۔

''کہو کیا بات ہے؟''
ملازمہ نے بڑی آہستگی سے یہ خبر سنائی ''شاید بی بی۔۔۔''
میں کچھ دیر اسی کیفیت میں اپنے پاؤں کو نرم بستر پر رگڑتا رہا۔ اتنی دیر میں ملازمہ چائے کی پیالی لے آئی۔ چائے پی کر تازہ دم ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بیوی کے کمرے میں گیا۔ وہ اپنے پلنگ پر بے ترتیب چت لیٹی ہوئی تھی۔ بے حس وحرکت۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جس میں ڈر کا سایہ جم کر رہ گیا تھا۔
آخری کال کا صدمہ شاید وہ برداشت نہ کر سکی۔ ماہرین کی رائے صحیح ثابت ہوئی۔ کمرے سے باہر نکلا تو دروازے پر ملازمہ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا۔
''دیکھو تم موت کی تصدیق کے لیے ڈاکٹر کو فی الفور فون کر دو۔ میں ضروری انتظامات کے لیے باہر جا رہا ہوں''۔
''جی بہت بہتر''۔ اس کی آواز مترنم اور لہجہ میں اعتماد کی جھلک نمایاں تھی۔
☆☆☆

خلاء

نیلم احمد بشیر

مہمانوں کے آنے سے پہلے فضیلہ نے اپنے بیک یارڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ سب کچھ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ نفاست سے کٹی ہوئی ہری گھاس، ٹراپیکل والے سرامک کے نمائشی گملے، لان کے ایک طرف نیلے نگینے کی طرح چمکتا ہوا بڑا سا سوئمنگ پول اوراس کے پانی سے اٹھتی کلورین کی مہک، اطراف میں بچھی پکنک ٹیبلز پر ہر طرح کا سامان خورد ونوش۔

''بڑی گرینڈ پارٹی لگ رہی ہے۔ فیزی!'' فضیلہ کے شوہر طارق احمد نے پارٹی کی تیاریاں دیکھ کر اپنی بیوی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''بس دیکھ لیں تیاری، آپ کو تو پتہ ہی ہے آپ کی بیٹر ہاف کی پارٹیاں کتنی سپیشل ہوتی ہیں۔ مہینوں اپ سٹیٹ نیویارک کی پاکستانی کیمونٹی میں چرچے ہوتے رہیں گے ہمارے''۔ فضیلہ اترا کر بولی اور قریب جا کر میزوں کو چیک کرنے لگی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ ہر میز پر سفید میز پوش بچھا تھا جس پر بچی اعلیٰ کوالٹی کی ایسی خوبصورت ڈسپوزیبل پلیٹیں اور گلاس رکھے تھے جو دور سے بالکل اصلی چائنا کے لگتے تھے۔ باربی کیو انگیٹھیاں پہلے ہی جلا دی گئی تھیں جن سکتے ہوئے سیخ کباب، چکن پیس اور یو ایس ڈی اے گریڈون کے بیف سٹیک کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

''یار فیزی! تم نے تو کمال ہی کر دیا''۔ طارق زور زور سے ہنسنے لگا۔

''پلیز تاری! ابھی سے ٹپسی ہونے لگے تو آگے جا کر کیا ہوگا۔ ابھی تو پوری شام پڑی ہے''۔ فیزی نے خود سے چپکتے طارق کو اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کا ڈرنک چھین لیا اور خود پی لیا۔

''یو آر اے ڈیول''۔ طارق نے اسے بھینچ لیا اور دونوں ہنس پڑے۔ ان کی نظریں اپنے ملین ڈالر ہاؤس پر پڑیں اور مسرت واطمینان سے بھر گئیں۔ اللہ نے انہیں کتنا نوازا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل اور آپس میں محبت۔ ایک ہونہار، فرمانبردار پیارا سا بیٹا اور اس کی آئندہ زندگی کے خوشگوار خواب، انہیں اور کیا چاہیے تھا؟ آج وہ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے بیٹے عمران نے اپنے ہائی اسکول سے آنرز سٹوڈنٹ اعزاز کے ساتھ گریجویشن کیا تا اور سپورٹس میں بھی ڈسٹنکشن Distinction حاصل کی تھی۔

وہ چاہتے تھے کہ ساری کیمونٹی والے عمران کو کامیابی کی راہوں پر گامزن ہونے پر اپنی نیک تمناؤں سے نوازیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوں، ہنسیں بولیں، ہلہ گلہ کریں کیونکہ زندگی کی کامیابیوں کو اپنے دوستوں سے شیئر کرنا وہ بہت ضروری سمجھتے تھے۔

عمران کو کاؤنٹی سکولوں کے مابین مقابلوں میں بھیجا جاتا تھا، جہاں سے وہ ہمیشہ ٹرافیاں جیت کر لاتا اور اپنے سکول اور ٹاؤن کا نام روشن کرتا۔ مقامی اخبارات میں اس کی کامیابیوں کی خبریں اور تصاویر چھپتیں اور سب سے شاباش ملتی۔ طارق اور فضیلہ کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا اور وہ بیٹے کو سو سو دعائیں دیتے۔

امریکہ میں ہر طرح سے کامیاب زندگی گزارنے کے باوجود فضیلہ اور طارق احمد کے دلوں میں وطن کی محبت زندہ تھی۔ وہ باقاعدگی سے پاکستان جاتے اور کئی اداروں اور این جی اوز کو غریبوں کی مدد کرنے کے لیے موٹے موٹے چیک دیتے رہتے۔ طارق اپنے بیٹے عمران کو پاکستان کے بارے میں بتاتے اور یاد دلاتے ہوئے کہتے ''وہ بنیادی طور پر ایک پاکستانی امریکن بچہ ہے، اسے اپنی اصلیت، شناخت اور حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ جو لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے، ان کی آئندہ نسلیں بھٹک کر رہ جاتی ہیں

بیٹا''۔کبھی کبھار وہ عمران کو ایک کہانی سناتے اور کہتے ''سنو عمران !امریکہ دریافت کرنے کے بعد جب کولمبس اپنا سفینہ لے کر وطن واپس لوٹا تو اس کے عملے میں شامل ایک قیدی عورت دوڑ کر ساحل پر اتری اور بے تابانہ اپنی جنم بھومی کو بوسے دینے لگی۔وطن کی محبت ایسا ہی طاقتور جذبہ ہوتا ہے بیٹا۔وہ عورت میری آئیڈیل ہے اور میرے خیالوں میں بستی ہے۔ہمیں اپنی اصل کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے عمران بیٹا''۔عمران اپنے ڈیڈ کی باتیں سن کر مسکراتا اور انہیں ہمیشہ یاد رکھنے کا وعدہ کرتا۔

عمران ہائی سکول کے بعد کالج میں ایسے کورسز لینا چاہتا تھا جو اسے ایرُ وناٹک فیلڈ میں لے جانے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔اسے بچپن سے ہی خلاباز بننے کا بہت شوق تھا۔اس کے والدین اس کے اس عزم میں اسے مکمل طور پر سپورٹ کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے۔ان کے پورے خاندان میں، جن میں امریکہ میں بسنے والے کئی بہن بھائی اور کزن رشتہ دار شامل تھے، کسی کے بچے نے بھی کبھی اس طرف جانے کی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

''میں تو اس دن کے انتظار میں جی رہا ہوں کہ میرا بیٹا کسی بڑے ناسا مشن میں جائے اور کامیاب لوٹے۔ایک آدھ ستارہ تو ہماری گود میں لا کر ڈال ہی دے گا نا''۔طارق سوچتے اور پھر سارے گھر میں گنگناتے پھرتے،''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔۔۔محبت مجھے ان جوانوں سے ہے، ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند''۔۔۔عمران اپنے والد سے ان اشعار کا مطلب پوچھ کر مسکراتا اور انکے یہ خواب پورا کرنے کا وعدہ کرتا۔تھوڑی ہی دیر میں مہمان آنا شروع ہو گئے اور ہیلو ہائے، السلام علیکم کی ملی جلی آوازیں رنگین غباروں کی طرح فضا میں تیرنے لگیں۔کمیونٹی کی معتبر شخصیات، قونصلیٹ کا عملہ، دوست احباب سب ایک دوسرے سے ہیلو ہائے کر رہے تھے اور حال احوال پوچھ رہے تھے۔طارق تیس سال سے یو ایس اے میں ایک کامیاب کارپٹ ایکسپورٹر کے طور پر اپنی ساکھ قائم کر چکے تھے اور آج ان کے اکلوتے بیٹے کی گریجویشن پارٹی تھی۔ایسا ہنگامہ تو ہونا ہی تھا۔

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ''فیری کے گلے سے لگنے والی نرم کومل آواز والی خاتون بولی۔''روزی تم؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بھئی؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا''۔فضیلہ مکمل طور پر برقع پوش خاتون کو دیکھ کر حیرت سے کہنے لگی۔''کم آن روزی، ہمیں بتا دیا ہوتا تو ہم بھی فینسی ڈریس پہن کر آ جاتے''۔فضیلہ اور روزی کی مشترکہ دوست رشمی ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔

''فار گاڈ سیک پلیز، تم دونوں خدا کا خوف کرو۔۔۔یہ فینسی ڈریس نہیں ہے۔اب میں ہمیشہ اسی لباس میں رہتی ہوں۔ Now i am a born again Muslim، یو نو، اللہ تعالی نے ہم عورتوں کے لیے یہی ڈریس کوڈ تجویز کیا ہے تو ہمیں اسی طرح رہنا چاہیے اور اب پلیز مجھے آئندہ سے روزی نہیں، رضیہ کہہ کر بلایا کرو''۔

''اوہ آئی ایم سوری۔۔۔''رشمی کچھ سنجیدہ ہو گئی۔فضیلہ بھی اپنی پرانی سہیلی کی اس بدلی ہوئی ہیئت کو دیکھ کر پل بھر کو تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی روزی ہے جسے لاس اینجلس کی لائٹ آف دی پارٹی کہا جاتا تھا۔اس کی ڈرنکنگ، ڈانسنگ اور مردوں سے بے تکلفی کی داستانیں ویسٹ کوسٹ سے نکل کر ایسٹ کوسٹ تک پھیل چکی تھی۔روزی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شرط لگا کر جس مرد کو چاہے اپنی طرف مائل کر سکتی تھی۔

''اچھا میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ آؤں۔وقت نکلتا جا رہا ہے۔ایکسکیوزمی''۔رضیہ اپنی سہیلیوں کو حیران پریشان چھوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔

''کتنا چینج آ گیا ہے اس میں''۔رشمی کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ نائن الیون تو ہماری جان کو ہی آ گیا ہے۔جیسے دیکھو اسلامک فنڈامینٹلسٹ بنتا جا رہا ہے یہاں۔کیا ہوگا اس قوم کا آخر؟''

''سب نے برقعے، حجاب اور عبائیں پہن لی ہیں۔ خدا خیر ہی کرے''۔ دونوں سہیلیوں نے روزی کی کایا پلٹ جانے پر اپنے اپنے تبصرے شروع کردیئے۔

سوئمنگ پول کے اردگرد پارٹی زوروں پر چل رہی تھی۔ ڈیک سے موسیقی فل بلاسٹ پر لگی ہوئی تھی اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی میں مصروف نظر آرہے تھے۔ عمران کے ہم جماعتوں میں گورے، کالے، میکسیکن، چینی، ہسپانوی، ہر نسل کے بچے شامل تھے۔ خوش باش، کھاتے پیتے، مسکراتے بچوں کو دیکھ کر ان کے ماں باپ بھی خوش تھے کہ سب اتنا گڈ ٹائم انجوائے کررہے ہیں۔ کوئی پول میں نہا رہا تھا تو کوئی کسی کو پول میں گرا رہا تھا۔ کوئی میز پر تھرک رہا تھا تو کوئی تصویریں کھنچواتا ہوا پھڑک رہا تھا۔ عمران اپنے دوستوں کو آلو کے چپس اور سافٹ ڈرنکس پکڑاتا جارہا تھا اور خوش تھا کہ وعدے کے مطابق اسکے تقریباً سبھی کلاس فیلوز پارٹی میں شریک ہونے کے لیے آگئے تھے۔

''ماشاءاللہ بڑا پیارا نکل آیا ہے عمران بیٹا''۔ ایک آنٹی نے پاس آکر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیوں نہ ہو، آخر بیٹا کس کا ہے''۔ طارق احمد فخریہ انداز میں ہنس کر کہنے لگے۔

''ہاں ہاں جب کسی بات کا کریڈٹ لینا ہو تو یہ آپ کا بیٹا بن جاتا ہے اور جب اس سے کوئی شکایت ہو تو یہ صرف میرا بیٹا ہوتا ہے''۔ فضیلہ مصنوعی غصے سے بولی تو طارق نے اپنی منہ بسورتی بیوی کے منہ میں آئس کریم کا چمچ ڈال دیا اور سب ہنسنے لگے۔

پارٹی اتنی زبردست تھی کہ کمیونٹی میں ہفتوں اس کی چرچا ہوتا رہا۔ دور دور کی ریاستوں سے ان دوستوں نے جو بوجوہ شریک نہیں ہوسکے تھے، مبارکباد کے فون کئے اور پارٹی مس کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے رہے مگر تحفے بھجوانے میں کسی نے کنجوسی نہیں کی۔ عمران کے لئے چیزوں کا انبار لگتا چلا گیا اور فضیلہ اور طارق انہیں سمیٹتے تھکتے حالانکہ عمران کے پاس پہلے ہی بھلا کس چیز کی کمی تھی۔

گریجویشن کے بعد لمبی موسم گرما کی ایک تعطیل تھی اور پھر ستمبر میں کالج میں داخلہ ہونا تھا مگر کچھ عرصے سے طارق اور فضیلہ محسوس کررہے تھے کہ سمسٹر قریب آتے آتے عمران اپنے داخلے میں کوئی خاص دلچسپی کا اظہار کرتا نظر نہیں آرہا۔ اس کی بھلا کیا وجہ تھی؟ عمران جیسا تعلیم پسند بیٹا نہ کالج کے پلانز بنا رہا تھا اور نہ ہی ان سے کچھ زیادہ ڈسکس کررہا تھا۔

''عمران بیٹا! تم نے اپنے کاغذات مکمل کرکے یونیورسٹی کو بھجوا دیئے ہیں نا؟'' ایک روز طارق نے اسے ناشتہ کی میز پر گھیر لیا۔

''ابھی نہیں ڈیڈ، میں آج کل ذرا کچھ مصروف ہوں''۔ عمران مزید کچھ کہے سنے بغیر اچانک کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک روز ڈیڈ نے اسے پھر جالیا۔ ''دیکھو بیٹا! اگر تم نے واقعی خلاباز بننا ہے تو گھر بیٹھے تو نہیں ہوگے۔ اس کے لیے کالج تو جانا ہی ہوگا۔ پری کورسز کے بغیر ناسا پروگرام میں کیسے داخل ہوگے، سمجھ آرہی ہے یا نہیں؟'' طارق کا لہجہ کرخت ہوگیا۔ فضیلہ نے شوہر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی کہ اتنا غصہ نہ دکھائیں۔

''بیٹا! ڈیڈ کیا کہہ رہے ہیں، کچھ سنا تم نے یا نہیں؟'' ماں نے پیار سے بیٹے کے آگے چکن کا پیس رکھتے ہوئے پوچھا۔

''مام، ڈیڈ! میں آپ دونوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔ عمران کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی چھا گئی۔ ''دراصل میں فی الحال آگے نہیں پڑھنا چاہتا''۔ کمرے میں ایک بم سا پھٹا اور در و دیوار لرزنے لگے۔

''کیا کہا؟ واٹ نان سینس؟ کیوں نہیں پڑھنا چاہتے؟ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ یہ کیا امریکن بچوں والی بات ہے۔

ہائی سکول نہ کالج ختم کیا۔ کوئی Odd Job کر لی، گیس سٹیشن پر گیس بھری۔ Hourly wages پر کام کیا، پھر Quit کیا۔ نہ کوئی تعلیم نہ تربیت، نہ کوئی مستقبل کا منصوبہ''۔ طارق غصے سے چیخنے لگے۔

''بیٹا ہم امریکیوں جیسے حرکتیں نہیں کر سکتے۔ ہم ایشین لوگ ہیں، ہم لوگوں کے زندگی میں Goals ہوتے ہیں، پلانز ہوتے ہیں۔ ہم اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے''۔ فضیلہ تحمل سے بات کرنے لگی۔

''آپ لوگ ایشین ہیں، میں نہیں۔ میں امریکن ہوں کیونکہ میں اسی سرزمین پر پیدا ہوا ہوں۔ آپ مجھے اپنی طرح سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتے''۔ عمران پورے اعتماد سے ماں باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''ہائے اللہ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ باہر گھوم پھر کر آوارہ گردی؟ امریکن بچوں کی طرح، شراب، ڈرگز، بدکاری، ان لوگوں کا تو نہ ماں ہے نہ باپ، مگر تم ہمارے بیٹے ہو۔ ہم تمہیں یوں بگڑنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے''۔ فضیلہ بھی چیخنے لگی۔

''میں آوارہ گردی نہیں کروں گا مام''۔ عمران بڑے اطمینان سے بولا۔

''تو کیا کرو گے گھر بیٹھ کر؟'' طارق نے فضیلہ کی طرف دیکھ کر سر پکڑ لیا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ صاحبزادے کے ارادے کیا ہیں؟''

''میں شادی کروں گا، مام ڈیڈ''۔ عمران بڑے اطمینان سے بولا۔

''شادی؟ یہ شادی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ ابھی شادی کا کیا ذکر؟ ابھی تو تم بچے ہو، بیٹا عقل کرو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ شادی بھی وقت آ جانے پر ہو جائے گی۔ یہ وقت تمہاری تعلیم کا ہے''۔ فضیلہ نے پیار سے کہا۔

''کون ہے وہ؟ ڈاکٹر عنایت کی بیٹی نادیہ تو نہیں؟'' فضیلہ نوٹ کر رہی تھی کہ کچھ دنوں سے اس کے کافی فون آ رہے ہیں۔

''نو مام، وہ تو صرف میری دوست ہے''۔ عمران کچھ نروس سا نظر آنے لگا۔

''تو پھر؟ ہائے کہیں کوئی امریکن لڑکی تو نہیں؟'' فضیلہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

''کیا پاکستانی لڑکیوں کی کوئی کمی ہے امریکہ میں؟'' فضیلہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''ملوادوں گا آپ لوگوں سے اسے۔۔۔ آج ہی شاید۔۔۔ مام ڈیڈ! آئی ایم سوری، آپ کو دکھ ہوا، لیکن بس میں اب کیا بتاؤں۔ مینڈی اور میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت پیار ہے، ہمیں ایک دوسرے سے۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ''۔ عمران ماں باپ کو حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ سوچنے لگے، جب ہیروشیما پر ایٹم بم گرا تھا تو کیا وہاں کے باسی بھی اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے راکھ کی ڈھیریوں میں تبدیل ہو گئے تھے؟

کیا ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے فیزی؟'' طارق نے بچوں کی طرح روتے روتے فضیلہ کی گود میں سر دے دیا اور وہ خاموشی سے اسے تھپکا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

اگلے چند دن کچھ عجیب سی خاموشی میں کٹے۔ عمران صبح سویرے نکل جاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ ماں باپ سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔ نہ جانے کہاں رہتا تھا وہ؟ فضیلہ اٹھتے بیٹھتے اس امریکن چڑیل کو کوسنے اور بددعائیں دیتی رہتی جس نے اس کے معصوم بیٹے پر جادو کر دیا تھا۔

''فیزی، ٹیک اٹ ایزی۔ کیا پتہ وہ اچھی لڑکی ہو۔ شاید وہ ہماری بیٹی بن جائے۔ آخر ہماری کوئی بیٹی بھی تو نہیں ہے ناں۔۔۔ شاید اس میں خدا کی کوئی مصلحت چھپی ہو۔ آخر ہم اپنا اکلوتا بیٹا کھونا تو نہیں چاہتے نا''۔ طارق بیوی کو سمجھاتے رہے۔

''ہیلو مام ڈیڈ!'' عمران نے ایک شام گھر میں گھستے ہی انہیں پیار سے مخاطب کیا اور پھر کسی کو دروازے کے پیچھے چھپتے

ہوئے دیکھ کر آواز دی۔۔۔'' مینڈی، اندر آجاؤ۔۔۔ڈونٹ بی شائی''۔ چند لمحے مکمل خاموشی رہی، پھر عمران اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ فضیلہ اور طارق کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کالی لمبی تڑنگی لڑکی کو انہوں نے عمران کی گریجویشن پارٹی میں دیکھ تو رکھا تھا لیکن شاید زیادہ قریب سے نہیں کیونکہ موٹے موٹے ہونٹوں، بڑی بڑی آنکھوں اور پیٹ کے نمایاں ابھار والی آبنوسی لڑکی کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ فضیلہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا اور اس نے کرسی تھام کر لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیے۔

''کیا تم؟'' فضیلہ نے مینڈی کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے سوال بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔

''یس۔ چار مہینے ہونے والے ہیں''۔ مینڈی نے اپنے پیٹ کی طرف فخر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مینڈی کے جانے کے بعد گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ ڈیڈ چیخ رہے تھے۔ مام زار زار رو رہی تھی اور عمران گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

''ہم نے تمہیں کیا نہیں دیا؟ تمہاری ہر فرمائش پوری کی۔۔۔ پھر تم ہمارے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتے ہو؟''

''ڈیڈ سمجھنے کی کوشش کریں۔۔۔ ہم نے جان بوجھ کر تو بے بی پلان نہیں کیا تھا۔ بس ہو گیا۔ یو نو It happens''
عمران نے کندھے اچکائے۔ مینڈی بہت تنہا تھی۔ جیک کے ساتھ اس کا بریک اپ ہوا تو میں نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے آپ ملیں گے تو خود ہی دیکھ لیں گے۔

''بے شرم لڑکے یہ ہمارا کلچر نہیں ہے''۔ ماں تڑپ کر بولی۔

''مام یہ اس ملک کا کلچر ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ میں امریکن ہوں۔ یہاں کا رہنے والا ہوں۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ ہم ایشین بچوں پر اس سوسائٹی میں کتنے پریشرز ہوتے ہیں۔ جوان ہونے کے بعد ہم اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ کیسے ہو جائیں؟ اگر ہم کسی کے ساتھ ڈیٹنگ نہ کریں تو ہمیں ابنارمل یا ''گے'' سمجھ لیا جاتا ہے اور اگر اپنے فرینڈز کی طرح امریکن لائف گزاریں تو آپ لوگوں کی ویلیوز خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ہم لوگ اس سوسائٹی میں رہ کر مس فٹ نہیں ہونا چاہتے۔ یہ ہمارے سروائیول کا مسئلہ ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں یہاں رہنا ہے، ہمیشہ اور مستقلاً۔ ہمیں مت روکیں۔'' عمران کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ایک غلام زادی اب ہماری بہو بنے گی''۔ فضیلہ نے دانت پیسے۔

امریکی آسائشوں اور معاشی آسودگیوں کے غلام، تیسری دنیا کے تارک وطن، بے بسی کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور لہریں اونچی سے اونچی ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

فضیلہ کو اپنی ایک پرانی امریکن ہمسائی یاد آ گئی جس نے اپنے بیٹوں کے لیے گھر میں پلے بوائے میگزین لگوا رکھا تھا۔ ''تم اپنے بیٹوں کو خود ہی بگاڑ رہی ہو؟'' ایک بار فضیلہ نے اس سے سوال کیا تو اس کے جواب نے فضیلہ کو حیران کر دیا ''میں نے یہ اس لیے لگوایا ہے کہ کہیں میرے بیٹے، لڑکیوں کی جگہ لڑکوں میں دلچسپی نہ لینے لگ جائیں''۔

طارق اور فضیلہ کی پاکستان کمیونٹی کے لوگ حیران تھے کہ اتنی پیاری فیملی کو کس کی نظر کھا گئی؟ سب کچھ اچھا بھلا تو تھا۔ چند ماہ پہلے ہی تو اتنی عالیشان گریجویشن پارٹی دی تھی انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے اور اب یہ اچانک شادی کا دعوت نامہ؟ فضیلہ نے رو رو کر پہلے ہی سب دوستوں کو بتا دیا تھا کہ ان کے بیٹے سے ایک غلطی ہو گئی ہے اور اب وہ اسے باعزت طریقے سے نبھانا چاہتے

ہیں۔ راز تو شادی کے دن کھل ہی جانا تھا۔ ''شیطان کا کیا ہے کسی بھی وقت کسی کے بچے کو بہکا سکتا ہے''۔ ان کے بچے کو بھی بس شیطان نے بہکا دیا تھا۔

ساری کمیونٹی میں ایک شادی پارٹی ہونے کے خیال سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خواتین اپنے نئے نئے پاکستان سے منگوائے ہوئے جوڑے پہننے کے خیال سے جھوم اٹھیں اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں مہندی کے فنکشن پر ناچنے گانے کے خیال سے پروگرام سیٹ کرنے لگے۔

فصیلہ اور طارق نے سوچا اب سر پر پڑ ہی گئی ہے تو کیوں نہ اسے خوبصورتی سے ہی نبھائیں۔ انہوں نے دولہا دلہن کے لیے نئے سرے سے بیڈروم کوری ماڈل کیا اور لاہور سے دلہن کے لیے ڈیزائنر عروسی جوڑے آرڈر کر دیئے۔ طارق کی بہن زبیدہ نے کپڑے تو بھجوائے تھے مگر چونکہ اسے دلہن کی اصلی صورت حال نہیں بتائی جا سکتی تھی لہٰذا لہنگا ٹخنوں سے اونچی اور قمیض کمر سے تنگ رہی۔ شادی والے دن آبنوسی رنگت والی دلہنیا کو لال جوڑے میں لاکھ سجایا مگر وہ کسی بھی طرح پاکستانی دلہن نہ لگ سکی۔ کرتے کی سلائیاں سائیڈ سے نکال دی گئیں مگر پھر بھی اس کی پیٹ گیند کی طرح باہر کو ابلتا دکھائی دیتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگریالے سیاہ بالوں کے چھتے پر دوپٹہ ٹکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بالوں کو ہر طرف سے لاکھ کلپ لگائے گئے تب جا کر کہیں سر پہ دوپٹہ ٹھہرا اور فصیلہ کی جان میں جان آئی۔

''تم ایک بہت بڑی نیکی کا کام کر رہی ہو فصیلہ بہن۔ اللہ تمہیں اس کا بہت اجر دیگا''۔ چہرہ چھپائے ہوئے رضیہ عرف سابقہ روزی نے فصیلہ کو گلے لگا کر پیار کیا تو فصیلہ آنے والی زندگی میں ملنے والی دودھ اور شہد کی نہروں کے کنارے بیٹھ کر ستانے کے خیال سے مسکرا دی۔

دونوں سہیلیاں دلہن کو سرخ دوپٹہ اٹھا کر دھیرے دھیرے باہر لائیں تو مینڈی کی باسکٹ بال پلیئر سہیلیوں نے مسکرا کر تالیاں بجائیں اور آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اور لہنگا اٹھا اٹھا کر اس پر ہونے والے کام دیکھنے لگیں۔ انہیں مینڈی کے کپڑے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"Give me a joint" مینڈی نے اپنی ایک دوست لنڈا کو قریب پاتے ہی اس سے ایک سگریٹ لیا اور زور زور سے کش لینے لگی۔

"You look stressed" لنڈا نے پیار سے اس کی کمر پہ ہاتھ پھیرا تو مینڈی نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

''بہت تھک گئی ہے مینڈی''۔ عمران نے اسے دور سے دیکھا تو اس کے قریب جا پہنچا اور مینڈی کی فرینڈز سے اپنی شیروانی آوٹ فٹ پر داد سمیٹنے لگا۔ مینڈی نے اپنے پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی "Baby look, your dad is looking so handsome" عمران بہت خوش تھا۔ آخر اس کے ماں باپ اس کی خوشی کے لیے راضی ہو ہی گئے اور اب تو ان سب کی گلی بندھی روٹین لائف میں ایک خوشگوار تبدیلی بھی آنے والی تھی۔ گھر کے آنگن میں ایک نئے پھول کی مہک پھیلنے والی تھی۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے پیارے ماں باپ کو چوم لیا۔

مینڈی کو پہلے مسلمان کر کے منزہ بنایا گیا۔ اسلامی نام رکھنے کا ایک اہم مرحلہ طے ہو گیا۔ جوان جہاں کالی داڑھی اور شرارتی نظروں والے امام صاحب دلہن کے پیٹ کو مستقلاً گھورتے رہے مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

''فیزی! یہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے۔۔۔۔ایک غیر مسلم کو مسلمان بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی بہت جزا دیں گے''۔ رضیہ نے پھر سے فیزی کے کان میں سرگوشی کی تو فصیلہ پھیکی سی مسکراہٹ سے ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

بہو کے آ جانے سے فیملی کے روز و شب میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ منزہ بیٹی اور عمران بیٹے کے باہر آنے جانے کے اپنے اوقات اور طور طریقے تھے۔ فضیلہ کئی بار سوچتی کہ بیٹے کی شادی صحیح وقت پر اور کسی پاکستانی لڑکی سے کی ہوتی تو وہ بہو کے کتنے چاؤ پورے کرتی۔ مگر یہاں تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ بہو کے ساتھ کیسے پیش آئے؟ منزہ کھلاڑی لڑکی تھی، اس لیے جسمانی فٹنس کا پورا خیال رکھتی تھی۔ چند ہی ماہ بعد اسے کسی باسکٹ بال میچ میں شرکت کرنا تھی جسے وہ کسی قیمت پر بھی مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ہر وقت ورزش کرتی رہتی۔

فضیلہ اسے پاکستانی کام والے زرق برق جوڑے پہنا کر فرینڈز کے گھروں میں دعوتوں پر لے جاتی تو وہ بہت انجوائے کرتی۔

اتنی محبت کرنے والا شوہر اور خدمتگار ساس ملی تھی۔ وہ تو ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا تو خیال تھا وہ اپنے بچے کو سنگل پیرنٹ بن کر پالے گی یا اپنی ماں کی مدد طلب کرے گی جو خود بھی ہمیشہ تنہا رہی تھی مگر یہاں تو سب کچھ اتنا مختلف اور اچھا تھا کہ لائف ونڈر فل ہو گئی تھی۔ اب نہ اسے گھر کے کرائے کی فکر تھی نہ کمانے کی ٹینشن، بے بی کے لیے بھی سب انتظامات خود بخود ہوتے چلے جا رہے تھے۔

فضیلہ کو ایک فکر دن رات کھائے جا رہی تھی کہ اگر بچہ ماں پر چلا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ وہ دن رات جائے نماز پر بیٹھی خدا سے التجائیں کرتی کہ "اے اللہ پاک! میرے پوتے کو ماں جیسے موٹے بھدے نین نقش اور کالے چھتے جیسے پھولے بال نہ دینا۔ یا اللہ! ہمارے حال پر رحم کرنا۔ بچہ بیشک عمران جیسا نمکین ہو مگر اسے نقش پاکستانی دینا"۔ فضیلہ نے بہو کے کمرے میں جا بجا خوبصورت پاکستانی بچوں کی تصویریں سجادی تھیں تا کہ وہ ہر وقت انہیں دیکھتی رہے اور ویسا ہی خوبصورت بچہ پیدا کرے۔

عمران بڑے شوق سے اپنی بیوی کو میڈیکل چیک اپ کے لیے لے جاتا اور اس کی صحت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا۔ ہر ماڈرن امریکی جوڑے کی طرح ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچے کی پیدائش کے مرحلے میں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ثابت ہوں۔ اس لیے انہوں نے ان کلاسوں میں بھی جانا شروع کر دیا تھا جہاں مرحلہ پیدائش کے دوران حاملہ ماؤں کو تنفس کے ذریعے آسان برتھ کی تربیت دی جاتی تھی۔

"مام ڈیڈ! میری پیدائش کے وقت آپ لوگ بھی بہت ایکسائٹڈ ہو رہے ہوں گے۔ ہیں نا؟" عمران نے اپنی بیوی کے لیے بنائی گئی لذیذ پنجیری اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"کتنا مزے کا ہے یہ"۔ منزہ بولی۔

"ہاں بیٹا! لیکن اب یہ سوچو کہ تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے۔۔۔ خلاباز بننا ہے"۔ ڈیڈ نے اسے وعدہ اور فرض یاد دلایا۔

"کروں گا، کروں گا۔۔۔ سب کچھ کروں گا۔ آپ کے سب خواب پورے ہوں گے۔ آخر آپ میرے اتنے پیارے ڈیڈ ہیں۔ آپ کی سپورٹ نہ ہوتی تو میں زندگی کے اس حسین لمحے میں کتنا اکیلا رہ جاتا۔ تھینک یو۔۔۔"

منزہ بھی فرط مسرت سے ساس سے لپٹ کر بولی "یو آر دا بیسٹ"۔

فضیلہ کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ ہائے کاش یہاں کوئی پاکستانی لڑکی ہوتی۔ خوبصورت، نازک اندام، پتلے پتلے نین نقش والی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"مام کتنی اچھی بات ہے کہ منزہ اتنی خوش ہے۔۔۔ ہم سب کو اسے خوش ہی رکھنا چاہیے۔ آپ لوگ بھی خوش ہیں نہ کہ یہ بچہ اس دنیا میں آ رہا ہے؟"

طارق اور فضیلہ بیٹے کی معصومیت پر مسکرا دیئے "ہاں بیٹا! ہم خوش اور بہت خوش ہیں۔ ہماری تنہائیاں دور ہو جائیں گی،

گھر میں رونق ہو جائے گی، بڑا مزہ آئے گا''۔ طارق بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے۔

''میں نے اسلامی ناموں کی کتاب سے نام بھی چننے شروع کر دیئے ہیں''۔ فضیلہ نے اترا کر کہا۔۔۔ ''رحمان کیسا رہے گا؟''

''اچھا ہے، سویٹ ہے، لیکن ہم اسے Raymond رجسٹر کروائیں گے۔ مام ڈیڈ کے لیے رحمان رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟'' منزہ خوش ہو کر بولی۔

''گریٹ آئیڈیا ہنی! اس طرح اسے کوئی مسلم دہشت گرد نہیں سمجھے گا''۔ عمران نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

یوں تو بہو کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی جا رہی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیسے ایک روز غسل خانے میں اس کا پاؤں پھسل گیا اور اسے اس وقت سے پہلے ہی دردیں شروع ہو گئیں۔ سب اسے لے کر بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے اور فوراً داخل کروا دیا۔ عمران اندر جا کر بیوی کو لاماز کی ورزشیں کروانے لگا اور فضیلہ نے تسبیح پکڑ کر خدا سے بچے کے صحتمند اور خوبصورت ہونے کی دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ طارق بھی نروس ہو کر ہسپتال کے کاریڈور میں گھومنے لگا اور خدا کے یہ مرحلہ بخیریت طے ہونے کی دعا کرنے لگے۔

کئی گھنٹوں کی سخت لیبر کے بعد یکا یک عمران بھاگا بھاگا باہر دوڑ آیا۔ ''مام ڈیڈ! آ جائیں بے بی از ہیئر''۔

''اچھا؟ کیا ہوا ہے؟'' طارق نے بے چینی سے پوچھا۔

''تم نے دیکھا اسے؟'' فضیلہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''نرس نے بس یہ بتایا ہے کہ لڑکی ہے۔۔۔۔ بہت پیاری ہے۔۔۔ چلیں چل کر دیکھتے ہیں''۔ عمران کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

''او ہو تو اب رحمان کا نام بدلنا ہو گا۔۔۔ کیا رکھوں گی؟'' فضیلہ نے جلدی جلدی سوچا ''چلو رحمان نہ سہی، ریما ہی سہی، ٹھیک عمران؟''

''آپ کی جو مرضی، مام!۔۔۔ یہ آپ پر چھوڑ رہا ہوں''۔ عمران بولا۔

ذہن میں بہت ساری سوچیں جنم لینے لگیں۔ کاش لڑکی کا نام بھی پہلے ہی سوچ لیا ہوتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تینوں بے چینی سے منزہ کے پاس چلے آئے۔ فضیلہ نے بہو کے ماتھے پر بوسہ دے کر بسم اللہ پڑھی اور چھوٹی پلنگیا میں لیٹی بے بی کو پیار سے اٹھا لیا۔

''ریما جانی آنکھیں کھول دو۔۔۔'' عمران، فضیلہ اور طارق نے سوئے ہوئے ننھی پری کو دیکھا اور اس پر سے کپڑا ہٹا دیا۔

''میرے اللہ! اس قدر خوبصورت بچی!'' سب حیران ہو کر وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔ لچھے دار سنہری بالوں، گوری گلابی رنگت اور نیلی سمندر آنکھوں والی حسین باربی گڑیا گود میں آتے ہی بھوک کے مارے اوں اوں کرنے لگی۔ فضیلہ کو تو جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔ اس نے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا کر نفرت سے یوں منہ پھیر لیا جیسے اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی بدصورت بچی نہ دیکھی ہو۔

☆☆☆

کرسٹل ہاؤس

نیلوفر اقبال

اس جوڑے میں کوئی خاص بات تھی، جو انہیں پہلی نظر دیکھنے میں دوسروں سے کچھ ہٹ کر اور منفرد بناتی تھی۔۔۔۔وہ انسانوں سے زیادہ پرندوں کا جوڑا نظر آتے تھے۔دونوں کی جسامت ایک جیسی تھی۔گورے رنگ، ابھرے بدن، کچھ کچھ آگے کو جھکے ہوئے، چہرے نوکیلے اور ناکیں پرندوں کی چونچوں کی طرح سامنے سے جھکی ہوئیں۔ جیسے وہ فرسٹ کزن ہوں۔ ہو بھی سکتے تھے۔ اور نہیں بھی۔ ممکن ہے کہ ہمہ وقت ساتھ رہنے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے سے مشابہت اختیار کر گئے ہوں۔ یہ جوڑا اس لیے بھی سب کی نظروں میں آتا تھا کہ روزانہ ٹھیک شام کے پانچ بجے وہ اکٹھے بلاناغہ واک پر نکلتے تھے۔عورت عموماً سفید ٹراؤزر اور پھولدار شرٹ میں ہوتی۔آدمی بلیک ٹریک سوٹ اور سفید جوگرز میں ہوتا۔دونوں کے ہاتھ میں چھڑی ہوئی۔وہ چھڑی کو ٹیکتے نہیں تھے بس چلتے وقت آگے پیچھے جھلاتے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ دونوں اپنے ساتھ چھڑی کیوں رکھتے تھے۔ممکن ہے ماضی میں کبھی ان پر کسی کتے نے حملہ کردیا ہو یا جنگلی سوروں کا جتھا کبھی ان کا رستہ کاٹ گیا ہو اور وہ حفظ ماتقدم کے طور پر چھڑی ساتھ رکھتے ہوں۔ بہر حال یہ ان کا اسٹائل تھا۔سلور گرے بال اور چھڑی ان پر خوب جچتے تھے۔

اس پورے علاقے میں ان کا گھر بھی دوسرے تمام گھروں کی نسبت بہت جاذب نظر اور باقی گھروں کی نسبت ممتاز نظر آتا تھا۔ یہ گھر اٹالین طرز تعمیر پر بنایا گیا تھا۔باہر سے سینڈ سٹون (Sand Stone) سے مزین تھا اور کھڑکیاں کچھ ایسے بنی تھیں کہ اندر سل پر رکھی خوبصورت سجاوٹی اشیاء باہر دکھائی دیتی تھیں۔اس گھر کی چھت پر سبز کھپریل تھی۔ایک جانب گھر کی پوری سائیڈ آئیوی (Ivy) سے ڈھکی تھی جسے نفاست سے کھڑکیوں کے چاروں اطراف سے تراش دیا گیا۔ لان کے گرد دیوار بھی آئیوی سے ڈھکی تھی اور اتنی نیچی تھی کہ لان باہر سے پوری طرح دکھائی دیتا تھا اور وہ اس علاقے کا دلکش ترین لان تھا اور مکینوں کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتا تھا۔ اسلام آباد کا پرانا سیکٹر ہونے کی وجہ سے یہ گھر پرانے اور گھنے پھولدار درختوں سے گھرا ہوا تھا۔سبز مخمل کی سی نفیس گھاس کارپٹ کی صورت لان میں بچھی تھی۔موسمی پھولوں کے علاوہ یہ لان نادر قسم کے پودوں اور پیڑوں سے بھی مزین تھا۔ پھر ایک خاص چیز وہ چھوٹی سی ندی (Stream) تھی جو لان کے ایک طرف بنی ہوئی راکری (Rockery) تک جاتی تھی۔اس سٹریم کے اوپر پانی لکڑی سے بنا خم کھایا ہوا چھوٹا سا پل تھا۔اس پل کے پہلو میں ہی سرخ اور سفید دھاریوں والی خوبصورت چھتری کے نیچے چار کرسیوں کا سفید گارڈن سیٹ رکھا تھا۔اس پر عام طور پر تو کوئی چائے پیتا نظر نہ آتا تھا لیکن کبھی کبھار جب ان کے بچوں میں سے کوئی آیا ہوتا تو لان میں خوب چہل پہل ہو جاتی اور اکثر شام کو یہ لوگ اسی میز پر چائے پیتے نظر آتے۔

اکثر جب ان کی دبئی والی بیٹی آئی ہوتی، لان میں رنگوں کے جھماکے سے ہوتے رہتے۔اس کی سہیلیاں ملنے آتیں اور وہ لان میں ٹہلتی رہتیں یا چائے پیتیں۔وہ دور سے بالکل انگریز نظر آنے والی خوبصورت لڑکی تھی جو زیادہ تر جینز اور ٹاپ میں نظر آتی۔ اس کے سنہرے رنگے ہوئے بال لہراتے رہتے۔فلپینو میڈ اس کے دو گورے گورے گول مٹول بچوں کے ساتھ لان میں بال کھیلتی یا انہیں ایک طرف نصب جھولوں اور سی۔سا (See-Saw) پر لے جاتی۔اکثر وہ بچے لکڑی کے پل پر چڑھتے، اترتے رہتے یا چھوٹے سے سفید Pomeranian کتے سے کھیلتے رہتے۔

کبھی کبھی اس لان میں بہت بڑی گارڈن پارٹی ہوتی۔ پودوں اور پیڑوں کے اندر سے ننھی ننھی بتیوں کی روشنی

جھلملاتی۔ راکری میں نصب آبشار چالو کردی جاتی۔ جس کے نیچے سنگ مرمر کا کائی زدہ Nude مجسمہ خوب مزے لے لے کر نہاتا۔ کیٹرنگ باہر سے کروائی جاتی۔ اکثر باربی کیو ہوتا۔ پاس پڑوس کے گھروں سے کسی کو مدعو نہ کیا جاتا۔ البتہ باربی کیو سے اٹھنے والا خوشبو دار دھواں ان گھروں میں در آتا اور کراکری اور کانچ کی کھنک اور مہمانوں کے مہذب قہقہے کھڑکیوں کے راستے ان گھروں کے مکینوں تک پہنچ جاتے۔ وہ اپنی کھڑکیوں سے جدید ترین تراش خراش کے ملبوسات اور خوبصورت رنگوں کے جھمکے دیکھ پاتے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگ کون ہوتے تھے اور کہاں سے آتے تھے۔ سڑک باہر تک گاڑیوں سے بھر جاتی تھی۔ مہمان آدھی رات کے قریب رخصت ہوتے تھے۔

گو اس گھر میں ان ہمسائیوں میں سے کوئی کبھی بھی مدعو نہ ہوا تھا۔ لیکن ان کے بارے میں ایک ایک بات مع ضروری و غیر ضروری جزئیات ہر ایک کو معلوم تھی اور اس جانکاری کا ذریعہ ڈومیسٹک سٹاف (Domestic Staff) تھا۔ ماسیاں تھیں جو پولن زدہ مکھیوں کی طرح گھر گھر بیج پھینکتی تھیں۔ پھر ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈز تھے جو رات گئے مل بیٹھتے اور ہر قابل ذکر یا ناقابل ذکر خبر کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ پھر ان کوٹھیوں کی اس لین میں ایک چاق و چوبند بوائے کٹ ہیئر سٹائل والی مسز شمسی تھیں جو کسی این جی او سے منسلک تھیں۔ صرف وہی تھی جو اس کوٹھی کی مالکن خاتون سے تعارف رکھتی تھیں۔ چونکہ وہ خاتون خود بھی اپنے وقت میں باوجود زیادہ وقت دوسرے ممالک میں رہنے کے خواتین کی تنظیموں کی فعال رکن رہ چکی تھیں لہذا مسز شمسی کسی نہ کسی طرح ان سے منسلک ہو چکی تھیں اور ان کی ڈنر پارٹیوں کے مدعوین کی لسٹ میں ان کا نام بھی تھا۔ انہی مسز شمسی نے اسی لین کے رہنے والے دوسرے گھروں سے بھی اچھے سوشل مراسم رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے انکا آنا جانا باقی کوٹھیوں کے فنکشنوں میں بھی تھا۔ جیسے کوئی ون ڈش پارٹی، میلاد یا ختم قرآن، جب میلاد یا ختم قرآن کا اختتام ہو جاتا اور عورتوں کے کھانے پینے کا دور شروع ہو جاتا تو اکثر عورتیں آہستہ آہستہ کھسکتیں مسز شمسی کے قریب پہنچ جاتیں جو کہ اچھی Conversationalist تھیں۔ بات کئی متفرق موضوعات سے ہوتے ہوئے لامحالہ اس کوٹھی کے مکینوں تک جا پہنچتی اور یوں پاس پڑوس والیاں کچھ نہ کچھ کرید لینے میں کامیاب ہو جاتیں۔

مسز شمسی سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ یوں تھیں۔ صاحب خانہ فارن سروس سے ریٹائرڈ تھے۔ سروس کے دوران دنیا کے بیشتر ممالک میں پوسٹنگ کے سلسلے میں رہ چکے تھے۔ لیکن ریٹائرمنٹ سے قبل مستقل رہائش کے لیے انہوں نے اسلام آباد میں یہ گھر تعمیر کروایا تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان سب کو امریکہ اور انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائی تھی۔ اب دو بیٹے امریکہ میں سیٹل تھے۔ بیٹی شادی کر کے دبئی جا چکی تھی۔ بیٹے سال میں ایک بار اکثر کرسمس کے مہینوں میں آتے تھے۔ بیٹی البتہ اکثر آ جاتی رہتی تھی۔ گرمیوں میں یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلے جاتے تھے۔ لہٰذا تنہائی انکے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہ تھی۔ اپنی دنیا اور زندگی میں مگن تھے۔ جب یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس رہنے جاتے تھے، آس پاس والوں کو خبر ہو جاتی تھی۔ پورچ میں کھڑی گاڑیوں پر ترپال ڈال دی جاتی، لان میں خزاں رسیدہ پتے ڈھیریوں کی صورت جمع ہونے لگتے اور کبھی زور کی ہوا چلتی تو لمبی ڈرائیو وے پر زرد زرد پتے آپس میں ریس لگاتے۔ دبیز پردوں سے ڈھکی کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا ہوتا۔ صرف سکیورٹی گارڈ کے گیٹ کے ساتھ کونے میں بنے چھوٹے سے کمرے میں بتی روشن رہتی۔ مرسم سرما سے پہلے چہل پہل پھر واپس آ جاتی۔ پورچ میں چم چم کرتی دھلی دھلائی گاڑیاں نظر آنے لگتیں۔ خاکروب چابکدستی سے ڈرائیو وے صاف کرتے۔ لمبی سفید پائپ کی مدد سے گھر کے چاروں اطراف کو دھویا جاتا۔ مالی ہمہ تن لان کی آرائش میں مصروف دکھائی دینے لگتا۔ اس طرح سب کو پتہ چل جاتا کہ صاحب خانہ آنے والے ہیں۔ پھر دو چار دن کے بعد کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے سے جھلکتی روشنی بتا دیتی کہ وہ واپس آ چکے ہیں۔

جس چیز نے اس لین کے دیگر مکینوں کا تجسس اس کوٹھی کے بارے میں بڑھا رکھا تھا، وہ اس کوٹھی کی اندرونی آرائش کے

بارے میں داستانیں تھیں۔ان داستانوں کی راوی مسز شمسی کے سوا کون ہوسکتی تھی۔ان کے کہنے کے مطابق یہ گھر کیا تھا عجائب خانہ تھا۔دنیا بھر کے نوادرات خاص کر کرسٹل اس گھر میں جمع تھا۔کرسٹل کی ایسی ایسی خوبصورت مصنوعات اس گھر میں جمع تھیں جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔فارن سروس میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا تھا۔دونوں میاں بیوی میں خوبصورت اشیاء خاص کر کرسٹل جمع کرنے کا ذوق خبط کی حد تک موجود تھا۔فرانس،اٹلی،بلجیم،جاپان غرضیکہ جہاں جہاں پوسٹنگ رہی یا یونہی سیر کے لیے گئے وہاں سے خوبصورت ترین اور بیش قیمت سجاوٹی اشیاء لائے اور اپنے گھر میں سجائیں۔کئی شوکیس،میزیں،پیڈیسٹل،گھر کے کونے حتیٰ کہ سیڑھیاں بھی ان چیزوں سے مزین تھیں۔دنیا بھر سے جمع کی گئی پینٹنگز اس کے علاوہ تھیں۔شوق صرف چیزیں جمع کرنے اور سجا دینے کی حد تک نہ تھا بلکہ ان کی صفائی اور حفاظت بھی بہت لگن اور توجہ سے کی جاتی تھی۔ایک نوکر دن رات صرف اسی کام کے لیے مامور تھا۔وہ ہمہ وقت ڈسٹر اور سپرے وغیرہ سے لیس صفائی ستھرائی یا پالش میں لگا رہتا۔جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام اشیاء ہر وقت جگمگ جگمگ کرتی رہتیں۔

مسز شمسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جس دن گھر میں ڈنر پارٹی ہوتی ہے،اکثر مہمان گھر کا ایک طرح سے گائیڈڈ ٹور بھی لے لیتے ہیں۔بلکہ جو پہلے بھی دیکھ چکے ہوتے وہ بھی شوقیہ ساتھ ہو لیتے کہ ان اشیاء میں ہمہ وقت اضافہ ہوتا رہتا تھا۔کچھ چیزیں ایسی تھیں کہ دیکھنے والے کا سانس اوپر نیچے رہ جاتا تھا۔خاص کر کونوں میں کھڑے قد آدم جاپانی گلدان جن پر بنے خوش رنگ نقش و نگار اور چرند پرند اور مناظر کی دلکش تصاویر انسان کو حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔پھر لکڑی کی مصنوعات،آبنوسی مجسمے،بیوگی بنی ہوئی اشیاء ہر سائز کی جاپانی گڑیاں،مختلف طرز کے فاونٹینز (Fountains) غرضیکہ گھر کیا تھا حیرت کدہ تھا۔ملنے جلنے والے اسے "کرسٹل ہاؤس" کے نام سے پکارتے تھے۔

مسز شمسی کی باتیں سن کر اکثر سننے والوں کا دل چاہتا کہ وہ بھی اس "حیرت کدہ" کو اندر سے دیکھ پاتے۔لیکن چونکہ ان لوگوں کو تو اس گھر میں ہونے والی پارٹیوں میں کبھی ایک بار بھی مدعو نہیں کیا گیا تھا،لہٰذا ان کی عزت نفس اجازت نہ دیتی تھی کہ بن بلائے اور بلا تعارف محض گھر دیکھنے پہنچ جاتے۔اس لیے مسز شمسی سے سنی ہوئی باتوں سے ہی تجسس کی تشفی کر لیتے۔۔۔لیکن ایک دن ایسا ہوتا ہے جب بلا مدعو کیے کسی کے گھر بھی جایا جاسکتا ہے اور "کرسٹل ہاؤس" میں بھی وہ دن آ گیا۔

موسم بہار کا آغاز تھا۔کچھ دن سے اس کوٹھی کا مالی بڑی مستعدی سے اندر باہر موسم بہار کے پھولوں کی ننھی ننھی پنیریاں تازہ تیار کی ہوئی کیاریوں میں بوتا نظر آ رہا تھا۔اچانک صبح صبح اس لین کی تمام کوٹھیوں میں خبر پھیل گئی کہ "کرسٹل ہاؤس" کے صاحب خانہ کا اچانک رات کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے۔۔۔ان کے بیٹوں کی امریکہ سے آمد کا انتظار کیا جائے گا۔تدفین دو روز بعد اتوار کو ہوگی۔

اس دن کرسٹل ہاؤس کے باہر لین سے لے کر ڈبل روڈ تک ان گنت گاڑیاں تھیں۔چند رشتہ داروں نے فوری طور پر انتظام سنبھال لیا تھا۔اس لیے شامیانہ،کرسیاں،چادریں و دیگر انتظام کر لیا گیا۔سہ پہر تک ان کی بیٹی بھی دبئی سے آ گئی تھی۔آج اس گھر میں وہاں کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگوں کے علاوہ آس پاس کی کوٹھیوں میں رہنے والے ہمسائے بھی آنے والوں میں شامل تھے۔گھر کی مالک سادہ سے سلیٹی لباس میں سیاہ چادر سر کے اوپر اوڑھے لاؤنج میں ایک کرسی پر سر نیہوڑائے خاموش بیٹھی تھیں۔کچھ ایسے جیسے بیمار پرندہ گردن گرا دیتا ہے،ملنے والیاں اور رشتہ دار خواتین آتیں اور قریب آ کر گلے لگتیں۔آہ و زاری اور رونے کی کچھ آوازیں بلند ہوتیں۔پھر آنے والی کوئی نہ کوئی جگہ دیکھ کر بیٹھ جاتی۔اور خاموشی چھا جاتی۔یہ سوال ہر آنے والے کے ذہن میں تھا کہ یہ خاتون اتنے بڑے گھر میں اپنے شوہر کے ہمراہ رہتی تھی۔کوئی تیسرا نہ تھا۔۔۔اب یہ کیا کرے گی۔۔۔!

کچھ پہلی بار آنے والوں کی نظریں گھر میں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔۔۔لیکن گھر اپنی آرائش کی پہلی والی صورت میں تھا ہی نہیں۔مجسموں اور بڑی بڑی سجاوٹی اشیاء کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان پر سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں۔فرنیچر گھسیٹ کر دیواروں کے ساتھ لگا دیا گیا تھا تا کہ آنے والوں کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔لاؤنج کے وسط میں نصب فاؤنٹین بھی بند تھا۔اس میں کہنی کے بل نیم دراز Nude مرمیڈ (Mermaid) پر کسی نے سفید چادر ڈال رکھی تھی۔البتہ شوکیسوں میں سجی کرسٹل کی اشیاء بدستور جگمگا رہی تھیں۔لیکن یہ موقع نہ تھا کہ نظروں سے بھی تحیر اور ستائش کا اظہار کیا جا سکتا۔اس لیے جنہیں تجسس تھا وہ خاموشی سے اور چپکے چپکے چور نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔پورے ماحول پر اس گردن گرائے پرندہ نما عورت کی دلگرفتگی کا سایہ پڑا ہوا تھا۔جیسے ہر شے اس کے لیے معنویت کھو بیٹھی ہو۔کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر اچانک سامنے خلاء میں دیکھتی جیسے کسی نظر نہ آنے والی شے سے معصوم حیرت کے ساتھ پوچھ رہی ہو۔۔۔"میرے ساتھ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد اس لین کی کوٹھیوں میں سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ "کرسٹل ہاؤس" بکنے والا ہے۔ان کے بیٹے پاکستان میں دو ہفتے سے زیادہ نہ رہ سکتے تھے۔انہیں فوری طور پر اپنی اپنی جاب پر واپس پہنچنا تھا لہٰذا تمام فیصلے بجلی کی تیزی سے کرنے پڑے تھے۔کرسٹل ہاؤس کی مالکن کو اپنے بیٹے کے ہمراہ امریکہ جانا تھا۔جہاں انہیں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہائش اختیار کرنی تھی جو شادی شدہ تھا۔چھوٹا بیٹا ہنوز کسی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور کیمپس میں رہائش پذیر تھا۔ہر سننے والے کے ذہن میں ایک ہی سوال اٹھ رہا تھا کہ یا خدا، اتنے ساز و سامان کا کیا ہوگا۔مسز شمسی روزانہ اس گھر میں آنا جانا کر رہی تھیں۔انہوں نے بتایا کہ خاتون تو بہت کچھ اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔کارٹن بنا کر Ship کرنا چاہتی تھیں۔لیکن بیٹے نے سختی سے منع کر دیا کہ وہاں اکوموڈیشن کم ہوتی ہے۔اس کی امریکن بیوی اتنا Clutter پسند نہیں کرے گی۔یہی کیا کم تھا کہ وہ اچھی فطرت کی مالک تھی اور اپنے شوہر کی ماں کو تنہا چھوڑنے پر اس کا دل نہیں مانا تھا اور وہ ساتھ رکھنے پر بخوشی تیار ہو گئی تھی۔۔۔پھر بھی کچھ یادگار چھوٹی چھوٹی چیزیں انہوں نے بکسوں میں گھسائی تھیں اور ایک آدھ چھوٹا سا کارٹن بھی بنا لیا تھا اور بس۔۔۔

عورتیں کرید کرید کر گھر کی مالکن کے دل کے اندر کا حال پوچھتی تھیں یا دوسرے الفاظ میں یہ جاننا چاہتی تھیں کہ آخر اتنے بے پناہ چاؤ اور لگن سے دنیا بھر سے اکٹھی کی ہوئی اشیاء سے جدائی کو آخر وہ خاتون کس طرح لے رہی ہیں۔وہ اپنے تجسس کی تشفی چاہتی تھیں۔بے رحمانہ تشفی جو کہ مسز شمسی نے نہایت تسلی بخش انداز میں کر دی۔۔۔ہاں وہ اپنی کسی چیز سے جدا نہ ہونا چاہتی تھی۔حتیٰ کہ اس کا کوئی ایش ٹرے بھی ایسا نہ تھا کہ جس سے اسے لگاؤ نہ تھا اور جیسے وہ بخوشی چھوڑ دیتی۔وہ تو ہر چیز ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔اس پر خاصی بحث ہوئی تھی۔اس کے بچوں کو اسے بہت سمجھانا بجھانا پڑا تھا۔۔۔لوگ تو ایک موت مرتے ہیں لیکن وہ عورت تو کئی موتیں مر رہی ہے۔۔۔ہر شے سے تو اسے پیار تھا۔۔۔ہائے ہائے۔۔۔!

کرسٹل ہاؤس کی تمام نادر اور بیش قیمت اشیاء کو نیچے لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا تھا۔ان پر پرائس Tags لگ گئے تھے۔خود مسز شمسی نے کچھ پینٹنگز، کینڈل سٹینڈ اور کرسٹل کے گلدان خریدے جو تقریباً ایک تہائی قیمت پر بکے تھے۔پھر انہوں نے فون کر کے دوسری کوٹھیوں کی خواتین کو بھی اکسایا کہ وہ اگر کچھ لینا چاہتی ہیں تو آدھی یا ایک تہائی قیمت پر بہت کچھ مل رہا ہے۔البتہ چند نادر اور قیمتی اشیاء ان کی بیٹی نے چھانٹ کر اپنے ساتھ دبئی لے جانے کے لیے الگ کر لی تھیں۔انہیں بڑے بڑے کارٹنوں میں پیک کیا جا رہا تھا۔مسز شمسی کے کہنے پر دوسری خواتین نے بھی ہمت کی۔کوٹھی کے لاؤنج میں ایک سرخ چہرے والا صحت مند ٹھیکیدار نما شخص ان اشیاء کو دکھانے اور بیچنے کا کام کر رہا تھا۔چیزوں میں زیادہ قیمتی اور غیر معمولی اشیاء تو ان کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے متمول دوستوں نے ہی خرید لی تھیں۔آس پاس کی خواتین بھی اب گلدان، ایش ٹرے اور لیمپ وغیرہ جیسی چیزیں

اٹھائے کوٹھی کے گیٹ سے **نکلتی نظر** آتی تھیں۔ پھر بے شمار برینڈڈ امپورٹڈ کراکری تھی جس کا کسی بڑی کراکری شاپ والے نے اکٹھا سودا کرلیا تھا۔ تمام فرنیچر **ایک** استعمال شدہ فرنیچر میں ڈیل کرنے والے شوروم کے مالک نے اٹھوالیا تھا۔ گھر والے چونکہ رات کی کسی فلائٹ سے گئے تھے۔ لہذا کسی نے انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چند روز بعد کوٹھی پر پینٹ پالش کرنے والے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے جن کی نگرانی سرخ چہرے والا ٹھیکیدار قسم کا آدمی کر رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ کرسٹل ہاؤس کے سامنے For Sale کی تختی لٹک رہی تھی۔۔۔ یہ تھی ''کرسٹل ہاؤس'' کی کہانی۔

☆☆☆

دستک

یونس جاوید

شاید پھر دستک ہوئی تھی۔

تین مرتبہ ایسا ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے۔ میری بیوی تو اس دستک سے الرجک تھی۔ پتہ نہیں، قصور میرا تھا یا نہیں مگر وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں قصوروار ہوں۔

پہلی مرتبہ۔۔۔ہاں پہلی مرتبہ۔۔۔مگر یہ تو کئی روز پہلے کی بات ہے۔ وہ مجھے گلی میں ایک تھڑے پر بیٹھا نظر آیا تھا۔ شاید پاگل تھا۔۔۔لیکن میں نے اس کے بارے میں زیادہ سوچا نہیں تھا۔۔۔مرے گزرنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چلنے لگا۔ بالکل میرے پیچھے پیچھے۔ مکان کے دروازے تک۔

''کیا ہے؟'' میں رک گیا۔ وہ خاموش رہا۔ میں اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دستک سنی۔۔۔ یہ پہلی دستک تھی۔ میں نے بیوی کو آواز دی۔

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے میں نے کھڑکی کھولی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے''۔ وہ بڑبڑایا۔

''تو پھر؟'' مجھے برا لگا وہ اسی وقت۔

''میں زخم زخم ہوں''۔ وہ اداس لہجے میں بولا۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' بیوی پوچھ رہی تھی۔ پھر وہ خود ہی بولی ''شہر میں جاؤنا۔۔۔ڈسپنسری میں۔۔۔''

''سارا شہر نمک کا ہے''۔ اس کے لہجے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں تھی۔

''سارا شہر نمک کا ہے!'' بیوی نے دہرادیا۔ ''تمہارے پلے کچھ پڑا؟۔۔۔مجھے پاگل لگتا ہے یہ''۔

''ہاں شاید'' رک کر میں نے اس سے پوچھا ''کیا چاہیے تمہیں؟''

''حرارت۔۔۔مجھے حرارت چاہیے''۔ اس کے لفظ یہی تھے۔۔۔ہاں یہی تھے۔

''حرارت چاہیے''۔ عجیب سا لگا مجھے۔

''جی ہاں''۔ وہ مصر تھا۔

''تو میں کیا کروں''۔ میں چڑ گیا تھا۔۔۔''دھوپ میں بیٹھو جا کر''۔

''کوئی گرم کپڑا''۔۔۔وہ رک گیا۔

''میں سمجھ گیا'' میں نے کہا۔۔۔''مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل آنا''۔ میں نے لمحہ بھر دیکھ لیا تھا کہ وہ سچا ہے۔ اس نے صرف ایک قمیض پہن رکھی تھی۔ میلی۔۔۔پھٹی ہوئی۔۔۔آستینوں تک لیر لیر۔ کلائیوں کی نیلی رگیں پھول رہی تھیں اور جلد کا رنگ پتہ نہیں کیا تھا۔۔۔میں نے کھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔ واقعی سردی بہت تھی۔ کھڑے کھڑے میرے گھٹنے سن ہو گئے تھے۔

بحال ہونے کے بعد میں نے بیوی سے کہا ''واقعی بہت سردی ہے۔ کوئی کپڑا اوپڑا تلاش کر دینا''۔

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

میں نے سوچا یہ کام میں خود ہی کیوں نہ کرلوں ۔ میں نے تلاش شروع کردی۔ مگر عجیب الجھن تھی ۔ ہر کوٹ کے ساتھ کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی ۔ ٹائی کی شکل میں ۔۔۔ اور ٹائیاں مجھے بہت پسند ہیں ۔ عیسیٰ کی صلیب کا نشان ۔۔۔ ہوسکتا ہے قبل از مسیح بھی ان کا رواج ہو۔۔۔ مگر میری مشکل یہ تھی کہ ہر ٹائی میرے کسی نہ کسی دوست ۔۔۔ بے حد عزیز دوست کی طرف سے گفٹ تھی اور کسی نہ کسی کوٹ سے میچ تھی ۔ لہٰذا کوئی بھی کوٹ نہ ملا۔

اصل میں کوئی پھٹا پرانا کوٹ تھا ہی نہیں ۔

بس یہی میرا قصور تھا۔

بیوی کہتی تھی کہ اگر اس شخص سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اس طرح بار بار دستک دے کر تنگ نہ کرتا۔ مگر یہ کوئی دلیل تھی بھلا؟ ہم دن میں کتنے وعدے کرتے ہیں، توڑتے ہیں، ہر لمحے کے ساتھ ہماری حیثیت بدل جاتی ہے۔ ابھی باس تھے ابھی ماتحت ہو گئے۔ کبھی شوہر، کبھی باپ۔ ہر لمحے بات تو بدلنا ہی پڑتی ہے ۔ ایٹی کیٹس اور مینرز تو یہی ہیں۔

مگر وہ مجھے قصور وار ٹھہراتی تھی ۔ بیویاں عموماً جھگڑالو ہوتی ہیں ۔

''تم جھگڑالو ہو'' میں نے چلا کر کہا۔ شادی کے بعد تم پر روپ اور مجھ پر قرض چڑھا ہے اور تم ہو کہ ۔۔۔''

اب کے چوتھی دستک تھی ۔۔۔! بیوی گھٹ کر رہ گئی ۔

''کون ہے؟'' جانتے ہوئے بھی پوچھنا ضروری تھا۔

''میں ہوں'' آواز وہی تھی ۔

''کہہ دیا نا پھر کسی وقت آنا ۔۔۔'' میں نے پیچھا چھڑانا چاہا۔

''مجھے اندر آنے دیجئے ۔۔۔ باہر بہت ٹھنڈ ہے''۔

''اندر آنے دوں! ۔۔۔ میں نے کھڑکی کھول کر کہا'' کمال ہے ۔۔۔ جان نہ پہچان اندر آنے دو''۔

''کون جانتا ہے تجھے اس محلے میں؟''

''آپ جانتے ہیں مجھے''۔ وہ بولا ۔

''میں؟'' مجھے حیرت ہوئی ۔۔۔ ''میں تو نہیں جانتا ۔۔۔ تم کون ہو؟''

''آدمی''۔ وہ بہت آہستہ بولا تھا۔

''آدمیوں والے کام بھی تو کرو ۔۔۔'' میرا سارا غصہ کھڑکی بند کرنے میں نکل گیا ۔۔۔

''احمق''۔ بیوی بڑبڑائی ۔

''کم بخت'' میں نے دانت پیسے ۔

مگر اس نے پھر دستک دے دی ۔

''کیا ہے؟'' میں جھلا گیا تھا ۔۔۔ وہ کچھ نہ بولا ۔۔۔ صرف تکنے گیا ۔ میری طرف ۔۔۔ گم صم ۔۔۔ میں نے ماچس باہر **پھینک** دی ۔''اٹھاؤ'' میں نے کہا۔ ''تنکے دنکے جمع کر کے آگ جلالو''۔

''تنکے؟'' وہ اس ایک لفظ پر رک گیا تھا ۔۔۔ وہ کھڑا رہا ۔۔۔ میں نے بھی کھڑکی بند نہیں کی ۔ وہ بالکل پاگل لگ رہا تھا۔

''جاؤ نا اب ۔۔۔ مجھے سونے دو ۔ دیکھو سنو ۔۔۔'' میں نے کھڑی انگلی سے اسے دھمکایا۔ ''اب اگر دستک دی نا ۔۔۔ سمجھے؟ تو نمٹ لوں گا تم سے اچھی طرح''۔

وہ گیا تو نہیں مگر اس نے رخ پھیرلیا۔ بڑا ہی ڈھیٹ تھا۔ سکون غارت کر دیا تھا اس نے۔۔۔
''ہر ایرے غیرے کو منہ لگاتے ہو۔۔۔'' بیوی غرائی۔۔۔ بخدا وہ غرائی تھی۔۔۔''میں ہوتی تو۔۔۔''''تم ہوتی تو کیا کر لیتیں''۔ مجھے غصہ آ گیا تھا۔۔۔''میں جانتا ہوں تمہیں۔۔۔ کسی مسئلے پر SHARE کرنے کے بجائے تم سارا ملبہ مجھ پر لاد دیتی ہو''۔
''کس نے کہا تھا گدھوں والی حرکتیں کرو؟'' وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔
دیکھو، حد سے نہ بڑھو۔۔۔حد میں رہو۔۔۔میں چلایا۔۔۔ چلو نکلو یہاں سے۔
''ہاں ں ں'' اس نے لمبی ''ہاں'' میں سب کچھ کہہ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں حد کے سرے پر آ گیا ہوں۔
''چائے پیو گے'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے میری کمزوری مجھے یاد دلا دی۔
''لے آؤ'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔
وہ چائے لینے کے بہانے چلی گئی۔۔۔ اپنی انا بچا لے گئی مگر چائے نہ لائی حتیٰ کے میرے ہاتھ سردی سے سن ہو گئے۔۔۔ انگلیاں برف تھیں۔ جھکتی نہ تھیں۔ میں نے جلدی سے ہیٹر آن کر دیا۔ چند لمحوں میں ہاتھ پاؤں، انگلیاں، گھٹنے، ٹخنے، پگھل سے گئے۔ مجھے گرمی لگنے لگی۔
اب کیا کیا جائے۔ میں نے روشندان کھولنے کی کوشش کی ہیٹر گیس کا تھا اور روشن دان کھول دینا ہی مناسب تھا۔ بلکہ ضروری تھا۔۔۔ مگر وہ کھل نہیں رہا تھا بڑی کوشش کے بعد بھی وہ نہ کھلا۔ شاید برسوں بند رہنے کی وجہ سے اس میں زنگ لگ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذرا زوردار ٹھوکروں سے کھل جائے گا۔ مگر مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ اترتی نیند کا نشہ سرور بن کر خون میں پھیل رہا تھا اور اس وقت ہر قسم کی ٹھوکر لگانے کی سکت کو چاٹ رہا تھا۔
''نہ سہی'' میں نے سوچا میں ''ہیٹر بند کر دیتا ہوں''۔
میں نے ہیٹر بند کر دیا۔ ٹمپریچر نارمل ہونے لگا۔ مگر کچی گیس سے کمرہ بھر گیا تھا۔ یقیناً ہیٹر میں کچھ خرابی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔۔۔ مگر گیس کے ساتھ حرارت بھی نکل گئی۔۔۔ کمرہ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر بھی میں نے سونے کی کوشش کی اور سو گیا۔ گہری نیند۔ پھر ایک زوردار دستک نے مجھے جگا دیا۔
سورج کی کرن بند روشندان سے اندر آ رہی تھی۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ مگر یہ اس طرح کی دستک نہ تھی دبی دبی سی۔ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔
''کون ہے؟'' میں نے کھڑکی کھول کر پوچھا۔
''ہم ہیں جی'' آواز آئی۔۔۔ میں نے باہر جھانکا۔ کچھ لوگ دروازے پر جمع تھے۔ وہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ وہ کون تھے! پتہ نہیں کون تھے! صبح ہی صبح کسی کے دروازے کو یوں پیٹتے ہیں بھلا، مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔
''حاجی افضل معلوم ہوتا ہے'' بیوی نے چائے بناتے ہوئے دور سے بتایا۔
''کون ہے وہ؟'' میں واقعی نہیں جانتا تھا۔
''محلے دار ہیں'' وہ بولی ''دس بارہ سال سے پڑوسی ہیں اپنے''۔
میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔
''زحمت کے لیے معافی چاہتے ہیں''۔ ان میں سے ایک نے کہا ''دراصل مسئلہ ہی کچھ ایسا تھا''۔
''اندر تشریف لے آئیے۔۔۔'' مجھے ایٹی کیٹس بہت عزیز ہیں۔

''جی نہیں، بس کھڑے کھڑے۔۔۔'' رک کر اس نے بات بڑھائی ''وہ درویش تھا نا اپنا''۔
''کون درویش؟''
''وہ جی، وہ پروفیسر تھا پہلے'' ۔ دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔
''وہ پاگل؟ وہ پروفیسر تھا؟'' میں نے ہکلا کر پوچھا۔
''او وہ جی اب تو بس ایسے ہی تھا'' ۔ تیسرا ابھی بول پڑا۔
''قصہ کیا ہے؟'' میں بے صبر ہو رہا تھا۔
وہ رات مر گیا جی۔۔۔ سردی سے۔۔۔ اس آدمی نے نجات بھرا سانس بھر کر کہا ''کفن دفن کے لیے''۔
''جی ہاں۔۔۔ تجہیز و تکفین۔۔۔'' دوسرا اتنا ہی کہہ پایا۔
''میں سمجھ گیا'' ۔ میں نے کہا۔ میں واقعی سمجھ گیا۔۔۔ ''آپ کو پیسے چاہیے نا؟ کتنے؟''
''جو توفیق ہو دے دیجئے''۔
''آپ کی ضرورت کیا ہے؟''
سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر لیڈر نما آدمی بولا ''کچھ رقم جمع ہو چکی ہے''۔
''کم کتنے ہیں؟'' میں نے بات ختم کر دی ابھی اور سونا چاہتا تھا۔۔۔ ہاں کچھ اور۔۔۔
''کم؟'' وہ سوچنے لگا۔ ''کم۔۔۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو'' ۔ میں اندر لپکا۔۔۔
بیوی دروازے کے پیچھے سے سب کچھ سن رہی تھی۔۔۔ بولی۔۔۔ کچھ زیادہ ہی دے دیجئے۔ حیثیت کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیے۔ میں نے اپنی جیب سے روپے نکالے۔۔۔ تو اس نے اپنا پرس بھی کھول دیا۔ ''سو کا ایک نوٹ ہے میری طرف سے''۔
میں نے دیکھا وہ بے حد سنجیدہ تھی اور دکھی بھی۔
''کوشش کیجیے۔۔۔ وہ بولی۔۔۔ کہ لاش زیادہ دیر نہ سڑتی رہے۔۔۔'' اور رک کر اس نے کہا ''یہ کمبل بھی۔۔۔ سنا ہے میت کو بھی سردی لگتی ہے۔۔۔''
''ہاں'' میں نے تائید کی۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو''۔
محلے داروں سے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کوشش کیجیے۔۔۔ لاش زیادہ دیر تک نہ سڑتی رہے۔۔۔ ثواب کا کام ہے''۔
میں نے روپے ان کی جھولی میں ڈال دیئے۔
واپس آ کر میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند اڑ چکی تھی۔ وہ آدمی ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔
''اچھا ہوا۔۔۔ مر گیا۔۔۔ بے چارہ۔۔۔ بیوی بولی۔۔۔ روز سردی میں ٹھٹھرتا تھا''۔
''ہاں'' میں نے اطمینان کا سانس لے کر جواب دیا۔۔۔ ''کم از کم دستک تو نہ دے گا نا۔۔۔''
''اور کیا۔۔۔ روز دروازہ پیٹتا تھا۔۔۔'' یہ بڑبڑاہٹ میری بیوی کی تھی۔

☆☆☆

چھٹا دور

مال پڑی

آصف فرخی

میرے سائیں کا کرنا ایسا ہوا کہ چھری پر خون سے نام آ گیا۔

''سانول سائیں''۔

اور جو ہاتھ ذبح کرنے کے لیے اٹھے ہوئے تھے، وہ اٹھے کے اٹھے رہ گئے نام پڑھ کر۔

''سانول سائیں، شہر مورو۔ یہ مال میرا ہے''۔

اصل میں سائیں کو بھینس کے بچھڑے سے پیار ہو گیا تھا۔ چھوٹا سا تھا تب سے پال لیا تھا۔ وہ تھا تو بھینس کا لیکن رنگ کا پورا اجلا۔ روئی کا گالا معلوم ہوتا تھا، مکھن دودھ کا بنا ہوا، نرم نرم روئیں سے ڈھکا ہوا، جس کی ماں تھی نہ رکھوالا۔ سائیں نے بس گود لے لیا اور بڑے سار سنبھال سے پالا۔ پال پوس کر بٹا کٹا کیا۔ بڑا ہوا اور اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوا تو گھاس چرنے کے قابل ہوا اور آب و دانہ ڈھونڈنے لگا تو اس کو کھلا چھوڑ دیا اور گلے میں گھنگھرو ڈال دیئے۔ جہاں جاتا چھن چھن کی آواز آتی، کبھی بچے پیچھے پیچھے چلتے اور کبھی کوئی پکھی پکھیرو سر پر چھتر چھاؤں کے ساتھ ساتھ اڑتا رہتا۔ گوٹھ والے اس کو آتا دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتے اور کہتے ''سانول سائیں کا پاڑا ہے'' سانول سائیں کا لوگوں سے خالی راستے پر پاڑا دم ہلاتا، مکھیاں اڑاتا گزر جاتا۔ گلیوں کھیتوں میں گھومتے گھومتے پاڑا جوان ہوا اور کھا کھا کر طاقت ور بن گیا۔ ہر میدان میں گھومتا ہر جگہ پہنچتا، کھلی چھوٹ ملی تھی، پھر یہ ہونے لگا کہ کسی کے گنے کے کھیت میں گھس گیا، کسی کی کپاس کی فصل میں دو چار منہ مارے کچھ کھایا کچھ برباد کیا بربادی کا زیادہ ڈر ہوتا تو پاڑے کے آگے اپنی پگڑی رکھ دیتے، پھر پاڑا کھیت سے باہر چلا جاتا۔ لوگ دیکھتے اور چپ سادھ لیتے کہ مرشد کا مال ہے۔ پاڑا ایک دن ایک آدمی کے تیار کھیت میں گھس گیا اور نرم نرم پودوں کو کچل ڈالا۔ کھیت غارت ہوا اور آدمی کی محنت برباد ہوئی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مٹی کے دو ڈھیلے اٹھائے اور پاڑے کو دے مارے۔ پاڑے نے کھیت روندتے روندتے سر اٹھا کر دیکھا، اس کی کالی کالی شیشے جیسی آنکھیں بس ایک لمحے کے لیے آدمی کے چہرے پر پوپٹی کی طرح رکیں اور اتر گئیں۔ پاڑا وہاں سے چلا گیا۔ آدمی گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی زال سر میں مٹی ڈال رہی ہے اور کچے فرش پر بیٹھے ہوئے اس کے دونوں ننھے ننھے بچوں کے سر سے خون بہہ رہا ہے، کسی نے پتھر مار کر ان کو زخمی کر دیا تھا۔

کچے جھونپڑے کی فضا میں گنو دھول بھری تھی جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے گیا ہے۔

''پاڑا، پاڑا، سائیں کا پاڑا۔۔۔'' آدمی چیختا ہوا گھر سے باہر نکلا، لیکن جس نے سنا یہی کہا۔

''اس نے نقصان پہنچایا، اس کو نقصان پہنچا''۔

پاڑے کی اگاڑی پچھاڑی بندھی ہوئی ہے۔

چھری پھیرنے کو ہاتھ اٹھانے والوں کو نہیں معلوم۔ میں بتائے دیتا ہوں۔ آدمی تو آدمی، وہاں سے ریل گاڑی اور وڈیرے بھی احتیاط سے گزرتے ہیں۔ پیر ولیوں سے بھری ہوئی بستی ہے۔ قدم قدم پر مرشدوں کے کرشمے ہی۔ ''مورو نا ہے تھوڑو۔ رانا، وکھی ڈیاں۔۔۔'' بھگت کنور نے سر سے سر ملایا ہے۔ وہاں مانے ہوئے منجھے ہوئے پیر ہیں۔ ایک چھپتا ہے دوسرا سامنے آتا ہے۔ ایک برقع کرتا ہے تب دوسرا دنیا میں جلوہ کرتا ہے۔ نام پر نام، نام پر نام چلتا رہتا ہے۔ ایک دریا پیر، ایک زندہ پیر۔ ایک بڑا

سونول، ایک چھوٹا سونول، نبن سائیں، پھر چھل شاہ اور پھر سوائی گھوٹ۔ اس سے آگے سلسلہ وڈوخلیفو، پھر تنڈروخلیفو۔ دریا کے اس پار سیہوں کی طرف جمن جتی اور سیہوں میں قلندر۔۔۔ باقی یہ سب قریب قریب ہیں، ایک احاطہ اور حد بندی کوئی نہیں۔ احاطے میں سگنال لگا ہوا ہے۔ اماوس کی راتوں میں درخت کے سوکھے پتوں میں سے شعلے نکلتے ہیں اور سگنل خود بخود ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ سائیں کی مرضی نہ ہو تو ریل گاڑی گزر نہیں سکتی۔ سگنل خود بخود ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ سگنل ہی نہیں بدلتا۔ ریل گاڑی کتنی کتنی دیر کھڑی انتظار کرتی رہتی ہے۔ شام کے وقت سائیں کے مزار میں چراغ جل اٹھتے ہیں اور سگنل گر جاتا ہے۔ ریل گاڑی گزرنے لگتی ہے اور اس طرح دبے پاؤں کہ پہیے چلتے ہیں اور آواز نہیں آتی۔ انجن کی سیٹی سے مزاروں والوں کی نیند ٹوٹ نہ جائے، پھر یہاں سے آگے نکل جاتا ہے تو ریل گاڑی کی آواز لوٹ آتی ہے، جھک پک چھک پک چھکا پک۔۔۔ اور انجن زور سے سیٹی دیتا ہے۔

راستہ سائیں والوں کی مرضی کے بغیر کیسے چل سکتا ہے۔ مورو سے آگے سروبہ اور سروبہ سے آگے جتوئی کا گاؤں، جسے پہلے تو کوئی نہیں جانتا تھا، اب بہت جانتے ہیں کہ صاحب کا گوٹھ ہے۔ حکومت کا تختہ پلٹا اور جتوئی صاحب کو عبوری حکومت کا وزیر اعظم بنایا گیا تو دل کی مختیاری سے انہوں نے اپنے گوٹھ کے لیے سڑک چوڑی کروالی، سائیں کے دروازے کے سامنے سے۔ ان کے گاؤں کا فاصلہ کم ہو گیا، ان کے سامنے سے سڑک گزر گئی۔ الیکشن کا وقت ہوا اور جتوئی صاحب الیکشن کی مہم شروع کرنے کے لیے علاقے کے پیر کے پاس آیا۔ سائیں نے دربار میں دعا کرنے سے روک دیا۔ دروازے کے اس طرف سے بولتے رہے۔ ''میں تیری مدد کیوں کروں؟ تو نے میرا کیا خیال کیا ہے؟ جتوئی کا نام رکھنے والا پجارو میں چڑھ کر یہاں سے گزرتا ہے، مٹی دھول میرے گھر میں آتی ہے، کیا ہم اس لیے ہیں کہ تو ہم پر مٹی ڈالے؟ تیرے پاؤں کی دھول اڑے اور میرے نات پرنات کے مزاروں پر تہہ جم جائے؟ جا تجھے ووٹ کے لیے خاک بدر کیا''۔ جنھوں نے سنا، وہ آج بھی سناتے ہیں کہ جتوئی صاحب کو اس الیکشن میں سندھ سے باہر کہیں سیٹ ملی۔

مگر سائیں بددعا نہیں دیتا، کرنے والے کے عمل خود بددعا بن جاتے ہیں۔ جتوئی صاحب نے حکومت میں آنے کے بعد چھوٹی لائن پر ریل بند کروادی۔ سائیں کو نواب شاہ جانا تھا۔ کہنے لگے۔ شام کی گاڑی سے جاؤں گا۔ لوگوں نے کہا، سائیں ریل تو بند ہے، شام ہوئی اور سائیں سگنل کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ سائیں وہاں آ کر کھڑے ہوئے، سگنل گرا اور ریل گاڑی بے آواز چلتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

سائیں جب سفر کے لیے نکلتے ہیں ریل آ جاتی ہے، یہ خبر پھیلی تو جتوئی صاحب نے پھر سائیں کے دربار میں آنے کے لیے کہلوایا۔ سائیں نے جواب بھجوایا ''یہاں کیوں آتے ہو؟ یہ رانی پور نہیں ہے۔ یہ شفا کا گھر ہے، سیاست کی دعا کا نہیں''۔

سائیں کے دادا کو بھی جلال آیا تھا، علاقے کے مختار کار پر جوان کی قبر کی دیوار ڈھا کر راستہ چوڑا کرنا چاہتا تھا۔ مختار کار کے کھاتے والے وہاں آئے تو زمین صاحب قبر کے جلال سے کانپ اٹھی۔ دیواریں شیر بن کر دھاڑنے لگیں۔ دیوار شیر بن کر آگے بڑھتی رہی، وہ پیچھے ہٹتے رہے اور پیچھے ہٹتے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

دریا نے بھی بہاؤ چھوڑ دیا تھا سائیں کے سامنے۔ ۷۳ء والے سیلاب میں سندھ کے پانی نے دادو، مورو میں ایسی تباہی مچائی کہ لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور آخر آخر میں بکریاں چرانے والے بھی ریوڑ سمیت کرا کھڑ گئے۔ سائیں نے لوگوں کو پکارا کہ یہاں آ کر بیٹھ جاؤ پانی اور نہیں ستائے گا۔ لوگوں نے مرشدوں کے احاطے میں ریلوے لائن کے ساتھ بیٹھنا شروع کیا۔ کچھ نے کچے گھر بھی بنا لیے۔ لوگوں نے دیکھا کہ دریا اڈر رہا ہے، ریل والا بندھ ٹوٹ چکا ہے، نہروں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ پانی اتنا قریب تھا کہ نظر آ رہا تھا، کانوں میں گونج رہا تھا۔ سائیں نے ایک لکڑی اٹھا کر زمین پر لکیر ڈال دی اور کہا ''اے دریا تو خواجہ ہے

میں پیر ہوں۔ میرے مریدوں کو تنگ نہ کر"۔ بہتا دریا رک گیا۔ پانی کی ایک بوند لکیر سے گزرنے نہ پائی اور یہی پانی مورو شہر میں داخل ہوگیا۔ فرش سے لے کر تیسری منزل تک پانی بھر گیا اور مکان کلٹی ہونے لگے۔ مگر پیر سائیں کی لکیر کے اندر جو گھر تھے، وہاں بوند تک نہ آئی۔ دریا دور کھڑا اگر جتا رہا۔ وہاں آج بھی دو دو اونٹ ایک کے اوپر ایک کر کے کھڑے کر دو تب بھی ان کھڈوں میں اونٹ چھپ جائیں جو کھڈے پانی سے بھر گئے تھے۔ اور پیر نہیں، پیروں میں پیر، پیارل سائیں ڈگن سائیں، پھر عبن سائیں جو ایمان کا درس دیتے تھے تو پیرولی پرواز کر کے آتے تھے۔ ان کے درس سے درس شہر کا نام ہوا۔ پیر سائیں کوچ کرتے تھے۔ ایک شعلہ عبن سائیں کے علاقے کی طرف جاتا تھا۔ وہاں بیٹھک ہوتی تھی، مشورے ہوتے تھے، رات کو لگتا تھا دو ستارے گزرتے ہیں۔ شام ڈھلے یہاں سے نکلتے ہیں اور رات ڈھلنے لگتی ہے تو واپس آتے ہیں۔ ایک ستارہ ایک مزار میں چلا جاتا ہے، ایک ستارہ دوسرے مزار میں۔ یہ ستارے نہیں ہیں، پیر ہیں جو اپنے محبوب کے پاس کچہریاں کرنے جاتے ہیں۔ مزار کے پاس جاؤ تو پتہ چلتا تھا کہ اللہ ہی اللہ کی ہنکار لگی ہوئی ہے۔ سائیں سے پہلے چھتل شاہ نے دریا پر نماز پڑھی تھی۔ دریا پار کرتے ہوئے اذان سنی تو چھتل شاہ نے دریا کی موج کو ہاتھ سے سیدھا کیا اور سیدھا کر کے اس پر نماز پڑھنے لگے۔ سوہنی کچے گھڑے پر دریا پار کر رہی تھی، اس کے گھڑے کی چھینٹیں پڑیں تو چھتل شاہ نماز سے چونک گئے۔ سوہنی کی آواز پر انہوں نے کہا، فانی انسان کے عشق والی تو نے مجھے کیسے دیکھ لیا؟ اس طرح جیسے تو نے مجھے دیکھ لیا، سوہنی نے جواب دیا تھا۔ مورو کی طرف قبلہ تھا اور سندھو دریا چھتل شاہ سائیں کے لیے جانماز۔

ایسی جگہوں پر اعتبار آتا ہے، آدمی تو آدمی، جانور بھی۔

سائیں کا بچپن تھا، گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ کمہاری کے گھر کے آگے مرغی مٹی کے ڈھیر پر چوزوں کو دانہ چگا رہی تھی۔ سائیں کی بار آئی اور گلی کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو مرغی سمجھی کہ چوزوں کو مارنے آرہے ہیں اور ان پر جھپٹی۔ سائیں نے گلی کے بجائے مرغی کو ڈنڈا مار دیا۔ سائیں گھر میں بھاگ آئے اور رضائی میں چھپ گئے۔ کمہاری نے روتے روتے مرشد کی ماں سے کہا۔

"بارہ تیرہ بچوں کی ماں مرغی مار ڈالی"۔

مرشد کی ماں نے سائیں کو بلا کر پوچھا۔ سائیں نے کہا "میں نے ماری تو نہیں تھی میں نے اس کو ڈرایا تھا، وہ جانہار پھنک کر مرگئی"۔

مرشد کی ماں نے کہا، اب اس کے بچوں کو چیل کوے لے جائیں گے۔ سائیں نے کمہاری سے کہا "چل مجھے بتا کہاں مری ہے"۔ سائیں نے مرغی کو ڈنڈے سے چھوا اور پوچھا۔ "اڑی تو سوگئی؟ چل اپنے بچوں کے ساتھ گھوم"۔

گوٹھ والوں کو لعل ڈنو نے بتایا کہ اس نے خود دیکھا۔ مرغی اٹھ کر گھومنے لگی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ستیوں کی بارات جا رہی تھی مورو کے آسمان کے اوپر سے گزرتے ہوئے انکو دیکھ کے نیچے مورو سے تھوڑی دور درس شہر میں ایک کتیا چونک گئی۔ چونکی تو آسمان کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگی۔ ستیوں نے آپس میں کہا، یہ بھوں بھوں کیوں کرتی ہے؟ ہمیں تو کسی غیر کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ زندگی میں بھی پردے میں رہتے تھے، اب بھی اوجھل ہیں۔ اس نے کیسے دیکھ لیا۔

نیچے زمین سے آواز آئی، یہ مالکوں والی ہے۔

ستیوں نے کہا "اگر یہ کسی کی ہے تو ہم پتہ کریں۔ حیرت میں آکر وہ زمین پر اتر پڑیں اور اصلاح کی اب سویرے ہی یہاں سے جائیں گے۔ ایک نے پوچھا، رات بسر کہاں کریں گے۔ کسی دوسری نے جواب دیا، جس نے ہمیں آسمان پر سے جاتا دیکھ کر آواز لگائی اس کو آزمائے لیتے ہیں۔ انہوں نے سات جوگنوں کا بھیس بھرا اور اس جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ گئیں جہاں کھڑی ہو کر کتیا بھونکی تھی۔ ان میں سے ایک نے مٹی میں سے ایک رینگتی ہوئی، لکیریں بناتی ہوئی چیز اٹھائی اور اس گھر کی عورت سے کہا۔ "یہ

ہماری امانت اپنی کتیا کے پاس رکھوادے۔ صبح سفر پر نکلیں گے تو تجھ سے لے لیں گے''۔

اس گھر میں وہ مرغی انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کتیا نے وہی چیز اپنی مالکن سے لے جا کر مرغی کے سامنے رکھ دی اور کہا، رات بھر اس کو سیتی رہ۔ صبح تجھ سے لوں گی، کسی کی امانت ہے۔ مرغی نے دیکھا تو سمجھ گئی کہ یہ تو ابھی رینگ کر نکل جائے گا۔ اس نے سانپ کو نگل لیا اور انڈوں پر جا کر بیٹھ گئی۔ رات بھر ستیاں آپس میں ہنستی رہیں کہ چلو، کتیا والی بات تو انکو لگ گئی۔ سانپ انہوں نے مرغی کے نیچے رکھ دیا ہے، وہ رات بھر میں نکل جائے گا۔ صبح کو ہم سچے ہو جائیں گے اور یہ جھوٹے۔ نور کے تڑکے انہوں نے کتیا کو پکارا اور کہا، ہمارے سفر کا وقت ہو گیا ہے۔ لا، ہماری امانت دے دے۔

کتیا نے مرغی کے ٹھکانے پر آ کر ادھر ادھر دیکھا اسے کچھ نظر نہیں آتا، اس نے مرغی سے کہا، میں نے تمہارے پاس امانت رکھوائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اس کو سنبھال کر نہ رکھا ہو۔ مرغی نے جواب دیا، امانت کی حفاظت جان کی طرح کی جاتی ہے اور پھر جو انہوں نے دیا تھا اس پر میں بیٹ بھی نہ کروں یہ کہہ کر مرغی نے فرش پر بیٹ کر دی۔ بیٹ میں سے سانپ نکلا! اور خون کی دو بوندیں، جو دیکھتے ہی دیکھتے لعل بن کر چمکنے لگیں۔ سانپ رینگ کر آگے بڑھ گیا اور ستیاں حیرت کرنے لگیں۔ تب سے یہ دستور ہے کہ ستیاں سارے سندھو دیس میں اڑتی پھرتی ہیں، غیر مردوں کی نظروں سے بچتی ہوئی، لیکن مورو کے آسمان پر سے گزرتی ہیں تو یہاں سلام کرنے ضرور آتی ہے۔ کہتی ہیں، یہ جگہ مالکوں والی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب سانول سائیں کا الھڑ پن تھا۔ سائیں سرکار کھیلتے تھے۔ ایک لکڑہارا لکڑیوں کا بوجھ اونٹنی پر لادے ادھر سے گزرا اونٹنی کے پیچھے پیچھے اونٹنی کا بچہ چل رہا تھا۔ اس بچے پر سانول سائیں کا دل آ گیا۔ انہوں نے لکڑہارے کو روکا اور اس سے کہا'' آج تو نے بہت لکڑیاں کاٹیں اور جتنی کاٹیں اونٹ پر لادی۔ اونٹنی کا بچہ مجھے دے دے۔ تو بازار سے لکڑیاں بیچ کر واپس آ جا اور پھر مجھ سے یہ بچہ لے جا۔ اونٹ والا کہنے لگا نہیں سائیں۔ میں تو مان جاؤں، میری ڈاچی نہیں مانے گی۔ بچے کے بغیر آگے نہیں بڑھے گی۔ سائیں نے کہا، دیکھو دل کی موج ہوتی ہے اور تم میری موج میں شامل نہیں ہو رہے تو پھر جاؤ۔ یہاں سے اونٹ والے نے اونٹنی کی مہار تھامی اور چل پڑا۔ چلتا رہا، چلتا چلا گیا لیکن مورو نہیں آیا۔ مورو میل بھر دور۔ پھر سمجھ گیا اور سائیں کے قدموں پر گر پڑا۔ کہنے لگا، سائیں بازار سے لکڑیاں تو بیچ آؤں، میرا راستہ کھول دیں، پھر چاہے اونٹنی بھی لے لیں۔ سائیں نے کہا۔ دیکھ میں ایسا نہیں ہوں۔ جب تو میری موج میں شامل نہیں ہوا تو تیری موج کیسے ہوگی؟

اونٹنی والا گڑگڑانے لگا۔ سائیں سرکار مورو کا راستہ دے دو۔ سانول سائیں نے پھر اس سے کہا کہ چل اٹھ، بازار جا کر لکڑیاں بیچ آ لیکن دور مت جانا اور اونٹنی کا بچہ چھوڑ جا۔ جب تک تو واپس آئے گا میں اس سے دل بہلاتا ہوں۔

لکڑہارا چلا، چند قدم دور ہی گیا ہوگا کہ ایک آدمی ملا۔ اس نے پوچھا کہ لکڑی کے دام کیا ہیں اور دام پوچھ کر کہا، یہ گٹھا یہیں اتار دو۔ لکڑہارے نے گٹھا اونٹنی پر سے اتار دیا اور پیسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو وہ آدمی اپنی جیب سے نکال رہا تھا۔ اس کا ہاتھ چھو گیا تو لکڑہارے کو لگا اس آدمی کا ہاتھ سرد ہے۔ وہ خالی اونٹنی کی مہار موڑ کر واپس ہونے لگا تو اس نے دیکھا وہ آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندھیروں میں گم ہوا جا رہا ہے۔ لکڑہارے نے آنکھیں مل مل کر دوبارہ دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ سانول سائیں اونٹ کے بچے کو ساتھ لیے کھڑے ہیں اور اسے کہہ رہے ہیں، میرا دل خوش ہو گیا۔ جا اب تو اس کو اس کی ماں کے پاس لے جا اور دودھ پلا۔

''لیکن وہ آدمی باز نہیں آیا''۔

گوٹھ کی کسی گلی میں، کھیتوں کی مینڈھ پر، کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ۔ پاڈے کی تاک میں لگا رہتا۔ سائے کی طرح چپکے چپکے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا اور جب دیکھتا کہ تپکل دھوپ میں کھیت سنسان پڑے ہیں، دور دور تک کسی کا سایہ نظر نہیں آ رہا تو

زمین پر سے مٹی کے ڈھیلے اٹھا کر تا بڑتوڑ پاڈے پر برساتا۔ کوئی قریب سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو ایسے ظاہر کرتا کہ ہاتھوں پر سے مٹی جھاڑ رہا ہے۔ یا کسی پیڑ کی کچی کچی ٹہنیاں توڑ لیتا اور ساڑ ساڑ پاڈے کی پیٹھ پر برساتا۔

پھر پاڈا اپنی گیلی گیلی ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کو دیکھتا اور کچھ نہ کہتا۔ پھر ایک دن اس آدمی نے پاڈے کو قابو میں کر لیا۔

ٹیکل دھوپ میں بھاڑ سا بھن رہا تھا۔ زمین ایسی تپ گئی تھی کہ پاؤں جلے جاتے تھے، چھاؤں میں بھی تپش تھی اور گرم ہوا کے تھپیڑوں سے خاک اڑ رہی تھی۔ منگل کا دن تھا جب مورو میں منڈی لگتی ہے۔ ایک تو گرمی، پھر اس دن ہر طرف یوں بھی سنسان تھا کہ کئی ایک لوگ یہ سن کر اپنے اپنے مال مویشی لے کر منڈی چلے گئے کہ کراچی سے کوئی بڑا بھاری بیوپاری آیا ہے۔

یہ آدمی جا کر بیوپاری کے آدمیوں سے ملا اور ان سے کہا "میرے پاس پاڈا بکاؤ ہے لیکن یہاں نہیں ہے۔ اب مارنے کے قابل ہو گیا ہے، مجھے مارتا ہے۔ اسی لیے منڈی میں نہیں لایا ہوں"۔ یہ کہہ کر ان آدمیوں کو اپنے ساتھ لایا، جہاں پاڈے کو رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ کراچی کے بیوپاری کے آدمیوں نے دیکھا کہ مکھن دودھ جیسا پاڈا ہے۔ نرم نرم روئیں سے بھرا ہوا بدن اور رسیوں سے بندھا پاڈا ان کو ایسی نظروں سے دیکھتا ہے، دیکھنے والے کا دل پگھل جائے۔ گورے گورے چکنے چپڑے پاڈے کی کالی کالی، پگھلی پگھلی آنکھوں کو دیکھ کر انہوں نے دل میں سوچا "آج بازار سے خریدیں گے تو اسے ہی خریدیں گے چاہے دام کچھ بھی دینے پڑیں"۔

انہوں نے سودا طے کیا اور بیوپاری کے آدمیوں میں سے ایک مورو چلا گیا کہ ٹرک کرائے پر لے کر دس آئے جہاں پاڈا جکڑا ہوا کھڑا تھا۔ ٹرک والا ہزارے کا تھا۔ اسے مورو کے سانول سائیں اور ان کے پاڈے کی کیا پہچان۔ اس نے پاڈا ٹرک پر لدوا لیا اور بیوپاری کے آدمیوں سے کہا، خوب پلا ہوا جانور ہے دکان میں کئی دن تک گوشت خوب چلے گا۔ مورو سے سکرنڈ اور قاضی احمد پر کراچی پہنچے۔ کراچی آئے تو ناغے کا دن تھا۔ پاڈے کو طویلے میں باندھ دیا اور گھاس اس کے سامنے رکھ دی۔ پھر کراچی کے قصائیوں سے اس کا سودا طے کرنے لگے۔

جو قصائی پاڈے کی ہڈی بوٹی دیکھنے آتا، پاڈا اس طرف گیلی گیلی کالی کالی آنکھوں سے دیکھتا اور دیکھنے والے کے دل پر جیسے چھری چل جاتی۔ دانہ گھاس کو اس نے منہ نہیں لگایا۔ نہ پانی پیا۔ "اپنے شہر مورو کے لیے اور اپنے مالک کے لیے جس نے بچوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا، ان کے لیے ہڑک رہا ہے"۔

ہاں اور کیا ایسا ہی ہوگا، قصائی تائید میں سر ہلاتے۔ پھر سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ ہو نہ ہو ان لوگوں نے اگربتی سلگائی ہوگی اور یہ بھی خیال نہیں کیا کہ گھاس کے طویلے میں اس کو جلانے کا کیا حاصل۔ دل ہی دل میں کہتے، پھر یہ سوچ کر چپ ہو جاتے کہ گوٹھ کے لوگ ہیں۔

پاڈے نے اس قصائی کے ہاتھ سے گھاس کھائی جس سے آخر آخر اس کا سودا طے ہو گیا۔ پاڈے نے گھاس پر دو منہ مارے اور قصائی اس کو گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ قصائی پاڈے کو ایمپریس مارکیٹ والے مذبح خانے میں نہیں لے گیا۔ بلکہ لائنز ایریا میں جیکب لائن والی مسجد کے پاس اپنے گھر لے آیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ یہیں ذبح کرے گا۔ مذبح خانے میں چڑیا کا بچہ بھی لے کر جاؤ بھتہ مانگنے والے چار لوگ ادھر سے آ جاتے ہیں، پولیس اپنی جگہ۔ بوٹی بوٹی کا حساب کرواتے ہیں۔ پھر ذات برادری کا لحاظ بھی کرنا پڑتا ہے۔ چمڑی تک کھینچ لیتے ہیں اور پاڈے کا ڈیل ڈول، رنگ اور بدن دیکھ کر پہلے سے کئی لوگوں نے اس کے حصے مانگ لیے تھے۔

پاڈے کو لٹایا گیا اور تین تین قصائیوں نے پکڑا، لیکن ذبح نہیں کر سکے۔ پاڈے نے شور مچایا نہ ڈکرایا، بس گیلی گیلی کالی کالی آنکھوں سے اپنے ذبح کرنے کے لیے آنے والے قصائیوں کو دیکھے گیا۔ قادرا قصائی، جس نے دام دیئے تھے، چھری لے کر آگے بڑھا اور کلمہ پڑھ کر چھری پھیری، لیکن چھری جیسے ربڑ پر پھسل کر واپس آ گئی اور قادرے کے بازو شل، کندھوں میں ایسا بوجھ

کہ من من بھر فولاد کی لاٹ کسی نے ان کے اوپر رکھ دی ہو۔

''چل بے چل تجھ سے تو اب چھری بھی نہیں چلتی۔ چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ'' قادرے سے شکورے نے چھری چھین لی اور قادرے کو پیچھے ہٹا کر شکورا آگے بڑھا۔ لیکن جیسے اس کو تڑ کا لگا اور اس کا ہاتھ رپٹ گیا۔ چھری چھن سے گر گئی، پاڈا اپنی جگہ زمین پر پڑے پڑے خالی خالی نظروں سے سب کو تکتا رہا۔

''ابے مرغی کے، تیرا تو ہاتھ ہی نہیں اٹھتا، فالج مار گیا تجھے؟'' شکورے سے ممد میاں نے چھری لے لی اور چھری ہاتھ میں لے کر آگے بڑھا اور جب چھری والا ہاتھ ہوا میں یوں ہی بڑھتا گیا جیسے اس کے سامنے زمین پر بچھڑے ہوئے پاڈے کی گردن نہ ہو، ہوا ہی ہو، تو قادرا بول اٹھا ''سالے، چھری کو تو دیکھ تیری چھری ستھری ہو گئی''۔ ممد میاں کے ہاتھ سے شکورے نے اور شکورے کے ہاتھ سے قادرے نے چھری لے کر دیکھی۔ تب انہوں نے چھری پر تحریر دیکھی۔ وہ تھے تو کراچی کے تین قصائی، لیکن چھری پر خون سے لکھے ہوئے نام پڑھ سکتے تھے۔ شکورے نے پیچھے کی ٹانگیں کھولیں، قادرے نے آگے کی ٹانگیں اور ممد میاں نے پاڈے کو دوبارہ ٹرک پر ہانک دیا۔ جیب سے ڈنڈ بھر کر وہ ایک بے یقین صبح اور خون کی تحریر کی پہچان کی شام کے بعد ٹرک سے مورو پہنچے اور سید ھے منڈی کا رخ کرنے کے بعد ایک ایک آدمی کو روک روک کر اور بلا بلا کر پوچھنے لگے کہ سانول کون ہے، بابا ادھر سانول نام کا کون ہے۔ سانول کون ہے؟ لوگوں نے اس کو تعجب سے دیکھا۔ پھر بڑے رسان سے بتایا ''سب سانول ہے۔ سندھ میں سانول ہی سانول ہے۔ اڑی تم کو نہیں پتہ؟ تو پھر تم کون ہو اور کیوں پوچھتے ہو؟''

ممد میاں نے جواب دینے کی ہمت کی، ہمارے پاس سائیں کی امانت ہے۔ لوگوں نے اس کے ہاتھ کے رخ کی طرف دیکھا تو ٹرک کے پیچھے کھلے حصے میں سانول سائیں کے پیارے پاڈے کو پہچان لیا۔ حق موجود کا نعرہ مارتے ہوئے دو چار لوگ سائیں کو خبر کرنے ان کے اوطاق پہنچے، تو دیکھا وہ دروازے پر کھڑے ہیں، انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں، ''بابا چھری کی بات مان لی؟ خون کا سبق پڑھ لیا؟ لے آئے میرے بچھڑے کو؟ سمجھو میں نے اسے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے''۔

لوگ حیران ہوئے کہ سائیں کو کیسے پتہ چل گیا۔ ٹرک اسی طرح کھڑا تھا کہ اس کا پچھلا حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سائیں نے کہا ''میرے پیارے کو ٹرک میں لائے ہو اسے روڑی کے پاس اتار دو''۔ ان تینوں نے پاڈے کو وہاں اتارا تو پورا ٹرک اگر بتی کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

سائیں کے اوطاق سے مانی ٹکر کے بعد کراچی کے لیے واپس ہوتے ہوئے ان تین قصائیوں نے سوچا، ہماری توبہ کے بعد بھی سائیں نے پاڈے کے پیسے نہیں لیے۔ ان میں سے ایک نے کھجڑ کے پتے جیب سے نکالے جو سائیں نے چلتے وقت درخت سے توڑ کر انہیں دیے تھے اور نکال کر دیکھا کہ وہ سونے کی طرح دمکتے ہیں ''اور کچھ نہیں لیتے تو یہ لے لو'' سائیں نے چلتے وقت مٹھی میں کھجڑ کے پتے بھر کر یہ کہا تھا۔ انہوں نے برکت کے خیال سے یہ پتے جیب میں ڈال لیے۔ لیاقت آباد دس نمبر کی مارکیٹ میں آج ممد میاں کے ذبحے میں دن کا ایک جانور کٹتا ہے اور ایک جانور سے تین گھر پلتے ہیں۔ وہ آنے جانے والوں کو سارا حال سناتا ہے اور وہی سوال دہراتا ہے جو اس سے پوچھا گیا تھا۔ بابا چھری کی بات مان لو؟ اور ہر ایک سے پوچھتا ہے۔

''آپ بتائیے، آخر اس سوال سے سانول سائیں سرکار مورو والے کام طلب کیا تھا؟''

☆☆☆

یوں بھی ہوتا ہے

امجد طفیل

سفر کا آغاز تو گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہی ہوگیا۔ شاید اس وقت جب اس نے اس تحقیقی کورس میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت جب اسے ایک نہایت ہی نامور شاعر کے فن پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا کام دیا گیا تھا۔ یا شاید اس سے بھی پہلے مگر اس نے اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس نے کوچ کے ذریعے آدھی رات کو روانہ ہونا تھا۔ صبح سویرے وہ منزل پر پہنچ جاتا۔ کام صرف اتنا تھا کہ شاعر کی بیوہ سے مختصر انٹرویو کرنا تھا۔ دوپہر یا زیادہ سے زیادہ سہ پہر کو روانہ ہو کر وہ واپس آجاتا۔

سردیوں کی دھندلی رات میں جب کوچ اپنے سفر پر روانہ ہوئی تو سڑک دھند سے لبریز تھی۔ کوچ کی طاقت ور روشنیوں کے باوجود زیادہ دور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے کوچ آہستہ روی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف چلی تو اس نے حسب عادت کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کیا۔ لیکن شہر سے نکلتے ہی وہ اپنی کھڑکی سے چند فٹ سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کہیں کہیں دور روشنی سی جھلملاتی دکھائی پڑتی مگر کبھی گمان گزرتا کہ اس کی نظر کا دھوکا ہے۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں اس کے ذہن کے منظر پر شاعر کی شبیہ ابھری۔ ایک درماندہ فرد جس نے اپنی زندگی کسمپرسی اور گمنامی میں گزار دی مگر جس کی موت کے بعد اس کی شہرت اور شاعرانہ عظمت کا آغاز ہوا اور اب اسے بلاشبہ اپنے عہد کا سب سے اہم شاعر قرار دیا جارہا تھا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے جو زندگی اس نے گزاری تھی اس کا مداوا ممکن نہ تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں بننے والی شہر کی شبیہ پر اپنی توجہ مرتکز کرنے کی کوشش کی شاعر کے چہرے پر سب سے نمایاں چنداس کی تیکھی ناک تھی۔ چھوٹی مگر گہرائی میں اترتی آنکھیں دوسرے نمبر پر آتی تھیں۔ اس وقت نجانے کیوں یہ شبیہ اس کے ذہن میں واضح نہیں ہو پارہی تھی۔ ورنہ اس نے شاعر کی تصویریں اتنی بار دیکھی تھیں کہ اسے چہرے کی ایک تفصیل یاد تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے باہر کی دھند اس کے ذہن میں غبار کی شکل اختیار کر رہی تھی۔

ایسے میں ایک بات ذرا ہٹ کر تھی اور وہ اس کے اندر دبا دبا جوش اور جذبہ تھا ایک تو اس نے جب اپنے مقالے کے لیے موضوع کا انتخاب کیا تو یہ اس کی اپنی پسند تھی۔ آگے چل کر گرچہ اسے بعض اوقات مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑا اور اپنے نگران کی تسلی کے لیے کچھ باتیں اپنے مزاج کے خلاف بھی برداشت کرنا پڑیں۔ مگر اس کے باوجود موضوع کے ساتھ اس کی ذہنی و جذباتی قربت میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ جیسے جیسے وہ شاعر کی شاعری اور اس پر ہونے والی تنقید پڑھتا گیا۔ شاعر کے لیے اس کی محبت اور اپنائیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ شاعر نے حیات و کائنات کے معاملات پر نہایت غور و فکر کے بعد انہیں نہایت سادگی اور سہولت سے بیان کردیا تھا۔ شاعری میں فکری الجھنیں تو تھیں اور کہیں کہیں شاعر کے استعارے بھی تفہیم میں حائل تھے مگر شاعری کو سمجھنے کی تگ و دو وہی تو وہ اصل بات تھی جو مسرت بخش تھی۔

شاعر کے بارے میں ایک بات اسے گومگو میں مبتلا کرتی تھی وہ اس کی ذاتی زندگی اور شاعری کا تضاد تھا۔ زاہد خشک کی زندگی، مایوسیوں، بے بسوں اور درماندگی سے پر خوشیوں، مسرتوں سے دور مگر قناعت کا عمدہ نمونہ۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ ذاتی زندگی اور شاعرانہ زندگی اس شاعر کے ہاں ٹرین کی دو پٹڑیوں کے طرح متوازی کیوں چلتی رہیں۔ ساتھ ساتھ مگر کہیں بھی ایک دوسرے سے

ملاپ کے امکان سے محروم۔ چلتی کوچ میں نیم خوابیدگی کے عالم میں وہ اپنے اندر ایک دبا دبا جوش ضرور پاتا تھا۔ اس شاعر کی بیوی کے روبرو ہونے اس سے شاعر کی نجی زندگی کے بارے میں پوچھنے، کچھ ایسے گوشوں سے پردہ اٹھانے جو ابھی تک نظروں سے اوجھل ہیں۔

خود اسے شاعر کی نجی زندگی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور وہ اس کرید کے لیے خود کو آمادہ بھی نہیں پاتا تھا۔ مگر تحقیق کے اپنے معاملات ہیں۔ نگران کی ہدایات پر عمل نہ کرنے کے اپنے نتائج ہیں جن سے وہ ہر ممکن بچنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نجی محفلوں میں اس بات پر طنز کے نشتر ضرور چلاتا کہ ہمارے بڑے محققین، جب تک اچھے بھلے تخلیقی موضوع پر یبوست کی نقدنہ بیٹھا دیں۔ سند جاری نہیں ہونے دیتے۔ رٹے رٹائے حوالے، چند پروفیسروں کی تحریروں سے اقتباس۔ تنقید کے نام پر گزرے ہوئے نقادوں سے اتفاق کیوں کر اختلاف کی گنجائش کم ہوتی ہے اور اس کے نتائج دور رس اس نے اپنے ذہن میں آنے والے ان تصورات کو جھٹکنے کی کوشش کی۔

زندگی بھی انسان سے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ ایک طرف دولت اور آسائشوں کے ڈھیر اور دوسری طرف محرومیوں اور غربت کے انبار، مگر اصل اہمیت کس بات کی ہے۔ زندگی میں چمکتی دمکتی آشائیوں کی یا خود میں مگن اپنی دھن میں زندگی جانے کیسے بسر کی۔ تو اس نے جس شاعر پر کام کا آغاز کیا تھا وہ بھی اپنی دھن میں مگن رہ کر گزارتی ہے تو پھر شہر چھوٹا ہو تو تب کیا اور بڑا ہو تو جب کیا۔ اس شاعر نے بھی اپنی زندگی ایک چھوٹے سے شہر میں بسر کردی تھی۔ اس شہر کے درمیان سے ایک نہر گزرتی تھی۔ گرمیوں کی شاموں میں وہ نہر کے کنارے جب اپنی سائیکل پر رواں ہوتا تو اس کو اپنے ساتھ ایک کائنات سفر میں دکھائی دیتی وہ ستاروں کی چال سے کائنات کے معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرتا اور ایک بار تاجر پیشہ لوگوں نے جب نہر کے کنارے آگے ہرے بھرے چھتنار کاٹ دیتے تو اس کا تخلیقی وجدان دکھ اور قرب کی قندیل سے روشن ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا یہ درخت نہیں کٹے بلکہ اس کے ماہ و سال کسی نے زندگی سے کاٹ کر پھینک دیئے ہیں۔

اس نے اپنی توجہ شاعر کی تصویر پر جمانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں میں دھندلا دھندلا چہرہ ابھرا۔ چند تصاویر کے علاوہ ایک ٹی وی ریکارڈنگ کی ویڈیو، دھیمی آواز، مکالمہ اتنا آہستہ رو کہ خود کلامی کا گمان گزرتا۔ اس نے وہ ویڈیو کئی بار دیکھی تھی اور ہر بار اس کا شک پختہ ہو گیا تھا کہ اپنے ٹی وی انٹرویو کے دوران بھی وہ روشنیوں کیمروں اور میزبان سے لاتعلق کہیں اپنے آپ میں گم ہے۔ اپنے اردگرد سے ایسی لاتعلقی اسے حیران کر دیتی اور وہ سوچتا کہ زندگی کا چلن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں تعلق کے ہونے یا نہ ہونے کے درمیان حد واضح نہ ہو۔

اب معاملہ سفر در سفر کا تھا۔ رات کے اندھیرے، سردی کی دھند اور اپنی رفتار میں مگن کوچ اپنے سفر پر رواں تھی۔ کوچ کے اندر مسافر جاگو میٹی کے کھیل میں مصروف تھے۔ اس کے ذہن میں کبھی تصورات نہایت تیزی کے ساتھ گزرتے اور کبھی اتنی آہستگی سے کہ اسے گمان ہوتا کہ اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا ہے۔ تب اسے وہ جملہ اپنی پوری گونج کے ساتھ سنائی دیتا ''میری زندگی تو برباد کر دی حرامی نے''۔

اس نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔ سب مسافر اپنے آپ میں مگن تھے۔ سردی کے باوجود کوچ کے اندر حدت تھی۔ سامنے ایل سی ڈی پر کوئی فلم چل رہی تھی۔ جس کی آواز سونے والے کے آرام میں خلل ڈالتی۔ کچھ مسافر اپنے کانوں میں ہینڈ فری لگائے آنکھیں بند کئے اپنی آرزوؤں کے چمن کی سیاحت میں مگن تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے محسوس ہوا کہ آواز اس نے ابھی ابھی سنی ہے۔ پھر گمان گزرا کہ جیسے یہ آواز اس کے اندر سے بلند ہوتی ہے۔ اس نے اپنی توجہ شاعر کی بیوی سے ہونے والی ملاقات پر مبذول کی۔

کوچ سے اتر کر اس نے فون پر اس شہر کے ایک اور مشہور لکھنے والے سے رابطہ کیا جو شاعر کے خاندان سے واقف تھا اور یہ تو وہ بتا ہی چکا تھا کہ اس کے سگے عزیزوں میں کوئی بھی اب اس شاعر میں موجود نہیں۔ کچھ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور کچھ ملک کے دوسرے شہروں میں جا آباد ہوئے ہیں۔ اولاد کوئی تھی نہیں بس اس کی بیوی اپنے بھائی کے پاس رہتی ہے۔ اس لکھنے والے کو شاعر کی بیوی کا پتہ معلوم تھا کہ کیوں کہ شوہر کی پنشن کے حصول میں آنے والی مشکلات کو دور کرنے میں وہ اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ فون پر بتائے ہوئے پتے پر وہ پہنچا تو اس کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا گیا اور صبح کے وقت کی مناسبت سے سادہ سا ناشتہ اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس نے بھی بلا تکلف اپنی جسمانی غذا سے انصاف شروع کر دیا۔

ناشتے کے بعد مشہور لکھنے والے نے اپنے بیٹے کو اس کے ساتھ کر دیا کیوں کہ خود اسے شہر میں ہونے والی ایک تقریب میں جانا تھا کہ وہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی بھی تھا اور ملک کے ایک ممتاز اخبار کے مقامی نامہ نگار کے طور پر اہم سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔ اس نے لکھنے والے کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی منزل مراد کی طرف چل پڑا۔ لڑکی کی عمر بیس سال کے قریب تھی اور لڑکے نے اسے بتایا کہ وہ مقامی کالج میں انگریزی میں ایم اے کر رہا ہے اور اس کا ارادہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا ہے۔ ویسے تو وہ کرکٹر بننا چاہتا تھا لیکن باپ کے دباؤ میں آ کر اپنی تعلیم جاری رکھنے پر مجبور ہے اس نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا کہ اس نے چند سال پہلے کچھ شاعری کی تھی مگر پھر وجہ شاعری اور شغل شاعری دونوں سے توبہ کر لی۔

راستہ کچھ زیادہ طویل نہیں تھا اور موٹر سائیکل نے اس سفر کو اور مختصر کر دیا تھا۔ وہ راستے میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بازار، دوکانیں، گزرتے لوگ جیسے ہر شہر یا قصبے میں ہوتے ہیں۔ بہت کچھ ملتا جلتا بس تھوڑا تھوڑا مختلف کہا جا سکے کہ یہ نئی جگہ ہے۔ موٹر سائیکل بڑی سڑک سے بغلی گلی میں آ گئی اور گلی میں دو چار موڑ مڑنے کے بعد ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑی ہو گی۔ لڑکے نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر اندر سے کسی نے پوچھا کون۔ لڑکے نے اپنا نام بتایا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازہ کھولا۔ آنے والے کے انداز میں لڑکے کے لیے شناسائی موجود تھی جب کہ اس پر ایک اجنبی سی نگاہ ڈالی دروازہ کھولنے والے نے لڑکے کی طرف دیکھا۔

یہ بڑے شہر سے آئے ہیں۔ ابا نے آپ سے بات کی تھی۔ آپا سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ چچا جی کے حوالے سے۔

''اندر آ جائیں'' وہ ایک طرف ہٹ گیا اور وہ دونوں دروازے میں لٹکا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے۔ میزبان نے انہیں دائیں طرف بنے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ اور خود گھر کے اندر چلا گیا۔

''یہ آپا کے بھائی ہیں''۔ ان کے پاس ہی وہ رہتی ہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ کمرے میں چند کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔ درمیان میں قدرے صاف اور رنگ برنگی دری بچھی تھی۔ کمرے میں باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر سادہ سا پردہ پڑا تھا۔ اندر کی سمت والی دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا تھا۔ ان کی میزبان کوئی ساٹھ ستر سال کا قدرے فربی مائل سانولی رنگت والا فرد تھا۔ جس کی قامت اسے اپنے برابر محسوس ہوئی تھی۔ وہ دونوں کمرے میں بیٹھے انتظار کرتے رہے اس دوران وہ تو اپنے خیالات میں کھویا رہا۔ مگر لڑکا شاید اسے متاثر کرنے کے لیے اپنے اور اپنے شہر کے سارے میں بولتا جا رہا تھا۔ جس کے جواب میں وہ کبھی اثبات میں سر ہلاتا اور کبھی ہوں ہاں میں جواب دیتا۔ رات بھر سفر کرنے سے اس کے ذہن پر ہلکی سی غنودگی اور دھند باقی تھی اور اس نے ایک دو بار ہلکی سی جمائی بھی لی۔

اب وہ بالکل درست نہیں بتا سکتا کہ کتنا وقت گزرا۔ شاید دس منٹ یا پندرہ منٹ یا ایک گھنٹہ۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا تو ان کا میزبان اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسکے ہاتھ میں چائے کے عام سے گھروں میں استعمال ہونے والے سادہ سے

کپ اور ایک چھوٹی سی پلیٹ میں بسکٹ، ایک تھالی میں سجے تھے۔ اس نے برتن کرسیوں کے سامنے پڑی میز پر رکھ دیئے اور بولا۔
''آ جاؤ اپنے بچے ہی ہیں''۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس نے دروازے پر نگاہ ڈالی۔ ایک میانے قد کی، قدرے کھلتی رنگت کی سفید بالوں والی کمزور سی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کن رنگوں کا پرنٹ پہن رکھا تھا اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا اگرچہ اس واقعہ کو چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ شاید وجہ یہ تھی کہ اس نے آنے والی عورت کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اسے ایک رعب سا پورے ماحول پر چھا محسوس ہوا تھا اور اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں تھیں۔ وہ عورت اس کی کرسی کے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔ اسے محسوس ہوا یہ دو آنکھیں کچھ اس کے چہرے پر کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔

وہ اپنے سامنے دیکھنے کی بجائے خود کو بات کو آغاز کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا اس نے پہلے تو ان کا شکریہ ادا کیا۔ شاعر کی توصیف میں کچھ شاندار الفاظ کہیں۔ اسے اپنی آواز اوپری اوپری ہی محسوس ہوئی اور لگا کہ سامنے والی عورت نے ان الفاظ کو سنا ان سنا کر دیا ہے یا تو وہ یہ باتیں پہلے بھی کئی بار سن چکی تھی یا اس کے کان ان الفاظ سے شناسا نہیں تھے اور اس کا ذہن ان الفاظ کو اپنے اندر سمونے اور بامعنی بنانے کے ہنر سے آشنا نہیں تھا۔

اس نے بیگ سے چھوٹا ریکارڈ نکال کر چیک کیا اور اسے اپنے سامنے میز پر اس طرح رکھا کہ مائیک کا رخ مخاطب کی طرف رہے۔ پھر اس نے صاف کاغذ اور قلم نکالا اور تیار ہو گیا چند ابتدائی باتیں۔ نام، تعلیم، شادی کب ہوئی۔ بس ہو گئی۔ کتنا عرصہ تک رہے۔ چند ماہ یا پتہ نہیں رہے بھی کہ نہیں رہے۔ عورت نے اس کے سوالوں کا جواب چند الفاظ یا ہوں ہاں میں دیا۔ اس دوران اس نے چائے کے چند گھونٹ بھی لیے۔ ایک دو بسکٹ کھائے اور اپنی پوری توجہ اس بات پر لگا دی کہ وہ اس سے کچھ کام کی باتیں معلوم کر سکے۔ ایسی باتیں جنہیں وہ اپنے مقالے میں درج کر سکے۔ ایسی باتیں جو ادبی حلقوں میں دھوم مچا دیں۔ مگر لگتا تھا کہ شاید اسے چند رسمی سی باتوں کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہیں ہو گا۔

جب وہ پہلے سے تیار کئے گئے سوال پوچھ چکا تھا تو اس نے اپنے ذہن میں نئے گونجنے والے سوالوں کو گرفت میں لینا چاہا مگر اسے لگا کہ ذہن پر چھایا اندھیرا اور دھند مزید گہری ہو گئی ہے۔ اس میں کچھ بھی تازہ اور نیا نہیں۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال گونجا۔ اس نے پہلی بار اپنے سامنے بیٹھی عورت پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے شوہر اس ملک کے کتنے بڑے شاعر ہیں، ان کا کلام کتنا عمدہ ہے اور کیسے کیسے لوگ اب ان پر لکھنا اور ان کے بارے میں اظہار خیال کرنا اپنے لیے باعث صد افتخار سمجھتے ہیں۔ عورت چپ رہی اسے لگا کہ اس نے اپنا سر ہلایا ہے مگر یہ جنبش اتنی خفیف تھی کہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس نے اپنے سر کو ہاں میں ہلایا ہے یا نہیں میں۔ تب اس نے قدرے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا کیا آپ ان کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔

اسے لگا کہ تب اس عورت کے ہونٹوں سے پہلے بار ایک مکمل جملہ ادا ہوا اس کے کانوں نے اس جملے کی سماعت کی۔ مگر یہ بات وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ اس عورت نے کہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود بخود عورت کے ذہن سے اس کے ذہن میں منتقل ہو گیا ہو۔ شاید پھر یہ خود اس کے اپنے باطن کی آواز ہو جو اس نے اپنے کانوں سے سنی ہو۔

☆☆☆

پسپائی

اقبال نظر

مجھے عورتیں فتح کرنے کا شوق ہے۔

سب جانتے ہیں عورت اپنی ذات میں ایک مکمل دنیا ہوتی ہے لہٰذا پوری دنیا کی طرح پوری عورت کی فتح بے حد ضروری ہے۔ میں اپنی فتوحات کا احاطہ نصف سکندرِ اعظم کی طرح آدھی دنیا تک محدود نہیں رکھنا چاہتا تھا لہٰذا میری پہلی ترجیح وہ آدھی دنیا ہوتی جو سکندرِ اعظم کے لیے ہمیشہ غیر مفتوحہ رہی۔

بعض کمزور فرمانروا ایسا بھی کرتے ہیں کہ فتح کیے ہوئے دور دراز علاقے کسی دوسرے کی عملداری میں دے دیتے ہیں، یوں ایک کمزور قسم کا کنفیڈریشن تو بن جاتا ہے لیکن مرکز کی بالادستی، زیردستی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے اور اکثر علاقے موقع پاتے ہی آزادی کا اعلان کر دیتے ہیں۔

بسا اوقات ہتھیار ڈلوانے کے عمل سے ہی مجھے اتنی آسودگی مل جاتی کہ میں فتح کے بعد مفتوحہ علاقے کو تاراج کرنے سے گریز کرتا حالانکہ رعایا مغلوب ہوتے ہی اس خوش گمانی میں مبتلا ہو جاتی تھی کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔

عورتیں فتح کرنے کے اس شوق کی ابتدا عہدِ شباب میں ایک مفتوحہ مرد سے ملنے کے بعد ہوئی۔ وہ مرد ایک نوجوان تھا اور ان دنوں کسی پالتو وفادار کی طرح ایک لڑکی کے پیچھے دُم ہلاتا پھر رہا تھا۔ میں اس کے قریب تو چلا جاتا تھا لیکن نزدیک نہیں کیونکہ اس کی نزدیکی مجھ پر بالکل ویسی ہی مفتوحانہ کیفیت طاری کر دیتی تھی جو قدیم رومن ایمپائر کے ان غلاموں پر ہمہ وقت طاری رہتی تھی جو اپنے جسم سے بھی ذہن کا کام لیتے تھے۔ صورتِ حال یہاں بھی ویسی ہی تھی۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ موڈرن غلام اپنی سزا خود تجویز کرتا تھا، غلط وقت پر فون کرنے کی سزا بہت دنوں تک رابطہ منقطع ہو جانے پر منتج ہوتی۔ زیادہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے آنسو نکل آنے پر لڑکی اس قدر ڈانٹ پھٹکار کرتی کہ عاشق مذکور عرصہ دراز تک ہنسنے کی ہمت نہ کر پاتا۔ خودسری کے اسی بے لگام نسائی روّیے نے مجھے عورت کو سدھانے اور سدھارنے پر آمادہ کیا۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے لوگ کہتے ہیں دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہے، میں اسے صریحاً غلط کہتا ہوں۔ میرا خیال ہے ہر عورت میں سے ایک سے زیادہ عورتیں برآمد کی جا سکتی ہیں، عورت جلدی جلدی بنتے بگڑتے جذبوں کے زیرِ اثر جبلتاً، فطرتاً، طبعاً، ضرورتاً، مکرناً، فریباً، سرعتاً، آناً فاناً تبدیل ہو جاتی ہے سیمابیت کی گود میں پرورش پانے والی یہ مخلوق اپنی اکائی کے آگے دہائیاں لگانے میں ذرا دیر نہیں لگاتی۔ حد ہے نام تک بدل لیتی ہے، بسا اوقات نئے نام کے ساتھ زیادہ دیر تک اسٹک نہیں کر پاتی تو اسے چینج کر لیتی ہے...... بحرالکاہل کے آگے کوئی اور بحرالکاہل نہیں ہے لیکن ایک عورت کے بعد کئی عورتیں ہوتی ہیں جو مرد کو کولمبس بننے پر مجبور کرتی رہتی ہیں چاہے وہ غلط جگہ پر ہی کیوں نہ اتر جائے۔

طویل تجربے سے ثابت ہوا کہ ایسی عورتیں جلد قابو میں آ جاتی ہیں جو شوہروں کے 'مزاج' اور اپنے 'آج' سے بہت تنگ ہوں۔ میرا خیال ہے پہلے پہل عورت کو ایک خام مال کے طور پر لینا چاہیے، چاہے مال کتنا ہی تیار کیوں نہ ہو۔ تجربے نے یہ بھی ثابت کیا کہ اگر عورت کو کسی طرح یہ باور کرا دیا جائے کہ مرد کی بھی عصمت ہوتی ہے تو آنے والے دنوں

میں اس کا برتاؤ بالکل مردوں جیسا ہو جاتا ہے۔

عورت شکست خوردگی کے عمل سے گزر رہی ہو تو خودسپردگی کی علامت واضح طور پر ایک ایک کر کے ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ زیرنگیں سب سے پہلے ان احتیاطی تدابیر کو روبہ عمل لاتی ہے جو عام حالت میں اسے زیب نہیں دیتیں۔ نظر ارادتاً ڈالتی ہے لیکن اچٹتی ہوئی، بیٹھے بیٹھے اچانک بال کھول دیتی ہے۔ جسے نارمل حرکت ہرگز نہیں کہا جا سکتا، دانتوں اور پیروں کی صفائی ستھرائی کا دورانیہ اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ دیگر اعضاء کی صفائی ثانوی بلکہ بے معنوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں دانت دکھانے کے لیے نہیں کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور پیر راہ گزر ہیں، سنگ میل نہیں۔

فربہ اندام عورت سب سے پہلے چھریرہ ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وقت ضائع کیے بغیر نازک اندام بننے کا جان جوکھوں کام اپنے ذمے لے لیتی ہے، اس کا بس نہیں چلتا کہ پہلی فرصت میں جسم سے تہہ بہ تہہ جڑے گوشت کے موٹے موٹے پترے قصائی کی طرح خود ہی اتارنا شروع کر دے اور مطلوبہ نتائج ایک ہی دن میں حاصل کر لے۔ وہ اتنی لمبی واک لینے لگتی ہے کہ اکثر خود کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ بسیار خوری سے کلیتاً تائب ہو جاتی ہے اور محبوب کے سوا ہر میٹھا گناہ کبیرہ کی ذیل میں آ جاتا ہے۔ مریضہ پورے چاند کی رات، اٹھتی گھٹا، درد بھرا نغمہ اور دلکش منظر زیادہ دیر برداشت نہیں کر پاتی۔ ایسے میں وہ اپنے آپ تک سے لاتعلقی کا اظہار کرنے لگتی ہے اور تمام رابطے توڑ کر صرف رابطہ محبوب استوار کرنا چاہتی ہے لیکن چونکہ ممکن نہیں ہوتا، لہٰذا گریہ کرتی ہے۔

وہ ابتدائی ایام ہی میں محبوب کی تاریخ پیدائش معلوم کر لیتی ہے تا کہ اس کا سیارہ دریافت کر سکے۔ پھر فلکیات کی کتابوں کا بغور مطالعہ کر کے اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں سمونے کی سعی پیہم میں لگ جاتی ہے۔ ستارے نہ ملنے کی صورت میں وہ سیاروں کو تو کیا چاند سورج تک کو جھٹلا دیتی ہے کیوں کہ اس کے اپنے اجرام فلکی تو کرہ ارض پر آ چکے ہوتے ہیں۔

ان کیفیات کی ترسیل سب تک براہ راست ہو رہی ہوتی ہے۔ بے حد اونچا سننے والوں تک کو خطرے کی گھنٹیاں واضح طور پر سنائی دینے لگتی ہیں لیکن سب اغماز برتتے ہیں کیونکہ جذبہ صادق کے آگے ٹھہرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دل کی طاقت اور حماقت کا اندازہ محبت کرنے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ نوبت اکثر یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ متذکرہ اگر شادی شدہ ہے تو اس کا شوہر رفع شر کے خیال سے اسے خود محبوب کے گھر لے جاتا ہے اور پھر رات گئے دونوں نارمل ہو کر ہنسی خوشی گھر لوٹ آتے ہیں۔

مرد میں اس درجہ حدت ہوتی ہے کہ عورت بلا تاخیر پگھل جاتی ہے لیکن حکمت عملی یہ ہے کہ اس حدت کا اخراج نہیں، انعکاس ہونا چاہیے۔ مختلف عمر کی عورتوں کے نفسیاتی اور جسمانی کیفیتوں کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتے ہوئے میں نے مختلف کلیے وضع کر رکھے تھے۔ ہر چند کہ یہ تجربہ چند ناخوشگوار اور تلخ واقعات سے گزرنے کے بعد حاصل ہوا لیکن اس کے بعد گویا روز مرہ ہو کر رہ گیا۔ اس کی مثال بعینہ موٹر کاروں کی اس سروس جیسی ہے جو بیرون ملک کی جاتی ہے۔ ایک طرف سے گرد مٹی، دھول میں اٹی ہوئی گاڑی داخل کی جاتی ہے۔ پہلے ہوا ماری جاتی ہے بعد ازاں ہلکے پانی کے ساتھ رگڑائی کا مرحلہ آتا ہے پھر صابن کا استعمال اور آخر میں پانی اتنے پریشر کے ساتھ مارا جاتا ہے کہ کونوں کھدروں تک کا میل باہر نکل آتا ہے۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک نئی زندگی میری زندگی میں داخل ہوگئی، لمحہ لمحہ پلک جھپکاتی ہوئی میری آنکھیں صرف ایک چہرے پر ٹھہر گئیں۔ چہرہ ور چالیس برس کا چلہ کاٹ کر اپنے حجرے سے باہر آ چکی تھی۔ اور مڑ کر کھلے ہوئے در و بام کو حیرت سے تک رہی تھی۔ طویل ریاضت کا پرسکون چہرہ اس انتشار اور ہلچل کو دبانے میں پوری طرح کامیاب نظر آتا تھا جو

وہ گزرے ہوئے موسموں میں جھیل چکی تھی۔

اس سے ملاقات کا دورانیہ بس خزاں سے بہار تک تھا۔ لیکن یہی مختصر عرصہ میرا عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے تھا۔ اس کی طبیعت کے گمبھیر ٹھہراؤ کو دیکھتے ہوئے میرے پُرشور دریاؤں جیسے شوریدہ سر جذبوں میں جھیل کے پانیوں ایسا ٹھہراؤ آتا جارہا تھا۔ وہ دوسری عورتوں سے بے حد مختلف تھی، اتنی کہ اگر اسے اشرف المستورات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے چہرے کے خدوخال کا ہر زاویہ عمیق سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا رہتا اور کسی صورت سطحِ آب پر آنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ نزدیک بیٹھے بیٹھے مجھ سے اچانک یوں لاتعلق ہوجاتی کہ مجھے اپنے ہونے پر شک گزرنے لگتا۔ میں نے محسوس کیا اس کے اندر ایک ایسا پُراسرار ماحول پنپ رہا تھا جو ظاہر ہونے سے کتراتا رہتا تھا۔

مجھے خیال آیا پچھلے دو ہفتوں سے میں سخت ورزش کر رہا تھا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر بلاناغہ اتنی لمبی واک لے رہا تھا کہ لگتا خود کو بھی پیچھے چھوڑ جاؤں گا، انتہائی مجلسی ہوتے ہوئے بھی تنہائی پسند ہوتا جارہا تھا۔ شام ہوتے ہی ہارٹ اٹیک سے کچھ دیر پہلے والی بے چینی میرے جسم کے روئیں روئیں میں رینگنے لگتی اور پیشِ نظر ہر چیز سے اتنا بیزار کردیتی کہ جی مرنے کو چاہنے لگتا۔ پھر ایک رات گزرے دنوں کے بہت سارے نام نہاد رت جگوں کے بعد میں نے پورے چاند کو دیکھا تو انکشاف ہوا کہ رات تو صرف چاند کو تکنے والوں کے لیے بنائی گئی ہے۔

وہ دو موسموں کے درمیان ٹھہری ہوئی ایک باوقار شام تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اچانک وہ ہنسی۔ ہنسنے کا انداز بالکل میرے جیسے تھا، پھر اس نے ٹھوڑی پر انگلی رکھی، آنکھوں کو چہرے جتنا بڑا کیا اور مجھے لگاوٹ والے پیار سے تکنے لگی۔ دل پکڑ لینے والے خوف کی ایک تیز لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔

میں بھی تو ایسا ہی کیا کرتا تھا۔

آنے والے کل کے خوف سے میں سہم گیا اور اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا چاہیں لیکن پوری کوشش کے باوجود میں ایسا نہ کرسکا کیونکہ میری آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول گئی تھیں۔

اور اس کے چہرے پر فتح مندی کا پھریرا پوری شان و شوکت سے لہرا رہا تھا۔

☆☆☆

جرم

تبسم فاطمہ

چھت ٹپک رہی ہے۔

چھت سے ٹپکتی پانی کی بوندیں ایسے گرتی ہیں کہ دیپا اندر ہی اندر ایک پل کو سب کچھ بھول کر عجیب سی لذت میں ڈوب جاتی ہے۔۔۔عجیب سی درد بھری لذت۔۔۔جسے مباشرت کے وقت چت لیٹی عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔

کبھی اس موسم میں وہ کتنی رومانٹک ہو جاتی تھی۔۔۔کل جب وہ عورت نہیں تھی۔۔۔آج کی طرح۔۔۔عورت۔۔۔ جانگھوں میں بسنے والی عورت۔۔۔منیش بھی اکثر مذاق کے موڈ میں ہوتا ہے تو کہتا ہے۔۔۔عورت جانگھوں میں ہی تو بستی ہے۔

عورت۔۔۔اسے خود سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔۔۔ایسا کیوں ہے؟ عورت ہر معاملے میں زندگی کے ہر موڑ پر۔۔۔تقدیس کی گرد جھاڑتے ہی چت کیوں ہو جاتی ہے۔۔۔ایک دم سے چت اور ہاری ہوئی۔۔۔مرد ہی جیتتا ہے۔عورت چاہے کتنی بڑی کیوں نہ ہو جائے۔۔۔اندرا گاندھی۔۔۔مارگریٹ تھیچر۔۔۔سے لے کر۔۔۔عورت کی عظمت کہاں سو جاتی ہے اور صرف وہی جانگھوں والی عورت۔۔۔

پانی کی بوندوں میں ٹپ سے منیش کا چہرہ ابھرتا ہے، جو اکثر منیش سکسینہ بن کر صرف ایک مرد بن کر اسے ٹوکتا ہے۔۔۔تم پھیل رہی ہو۔۔۔تم سوٹ مت پہنا کرو۔۔۔تمہارا جسم کافی پھیل گیا ہے۔۔۔کولہے۔۔۔سینہ۔۔۔پشت کا حصہ۔۔۔تم بہت بھدی ہوتی جا رہی ہو دیپا۔

کچن کے پاس۔۔۔ذرا ہٹ کر جو بیسن ہے۔۔۔وہاں اس نے بڑا سا آئینہ لگا رکھا ہے۔۔۔اپنے سراپا کو روزانہ دیکھنے کے لیے۔۔۔بدن کی ان برائیوں کو جاننے کے لیے۔۔۔جسے شادی کے صرف چند سالوں بعد منیش کی آنکھوں میں بارہا محسوس کیا ہے دیپا نے۔۔۔آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے۔۔۔اپنے ہاتھ پاؤں پر چڑھتے ہوئے گوشت کو بار بار چھو کر دیکھتی ہے۔۔۔وہ فربہ ہونے لگی ہے۔۔۔اور منیش لحہ لحہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

ہوا کرے۔۔۔شٹ۔۔۔بڑے بڑے فلسفوں کے درمیان اصلی چہرے کو پہچاننے میں برسوں پہلے دھوکا ہوا ہے اسے۔

چھت ٹپک رہی ہے۔۔۔رات آہستہ آہستہ گھرتی جا رہی ہے۔۔۔ایلیشا ایک بار چیخ کر روئی ہے۔۔۔دیپا جب تک اس کے پاس دوڑ کر پہنچتی، کروٹ بدل کر وہ پھر گہری نیند میں سو گئی ہے۔ایک ٹک وہ ایلیشا کو دیکھتی ہے۔۔۔یہاں اس جسم سے۔۔۔پورے نو ماہ گوشت پوست کے اس ٹکڑے کو۔۔۔سلائی کی طرح کھول کر باہر نکالا ہے اس نے۔۔۔اسی بدن سے جس کے نشان پر انگلیاں پھیرتا ہوا منیش ٹھہر جاتا ہے۔۔۔پوچھتا ہے۔۔۔تمہارے پیٹ پر یہ لمبے لمبے نشان کیسے آ گئے۔۔۔کیا سبھی کو ہو جاتے ہیں۔۔۔کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ کیوں نہیں کرتیں۔۔۔یہاں اتنا گوشت کیسے آ گیا۔۔۔؟

نشان۔۔۔گوشت۔۔۔چربی۔۔۔اسے لگتا ہے جسم کی ڈکشنری کے بس یہی لفظ رہ گئے ہیں، جسے اپنی انٹلیکچوئل آنکھوں سے پڑھتا ہے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے۔۔۔اسے کریدتا رہتا ہے۔۔۔چھیلتا رہتا ہے۔۔۔دیپا۔۔۔تم یہاں۔۔۔یہاں اور یہاں سے بدصورت ہو رہی ہو۔۔۔تمہارا پیٹ کافی نکل گیا ہے۔۔۔چہرے پر چھائیاں پڑ رہی ہیں۔اور کبھی کبھی مذاق میں پوچھتا

ہے۔۔۔دیپاتم عورت لگنے لگی ہو۔۔۔اماں جیسی عورت۔۔۔!

بارش لگاتار ہو رہی ہے۔جب سے بارش شروع ہوئی ہے ایک عجیب سا سناٹا باہر اور اس کے اندر اتر گیا ہے۔۔۔اس کے ایک دم اندر اندر۔۔۔اس نے دیوار گھڑی کی طرف دیکھا۔گیارہ بج گئے ہیں۔۔۔ایک ہمدرد، تشویش میں ڈوبی عورت چپکے سے اس میں سما جاتی ہے۔۔۔منیش اتنی دیر کہاں رہ گیا۔۔۔؟ آج ضرورت سے زیادہ دیر ہوگئی۔۔۔باہر کسی کام میں پھنس گیا ہوگا۔۔۔

آخر کو پریس رپورٹر ہے نا۔۔۔جرنلسٹ۔۔۔خود کو انٹلکچوئل سمجھنے والا۔

بارش کی ہلکی ہلکی پھوہار اور چھت سے ٹپکتی پانی کی بوندوں میں کچھ گزری بسری یادیں بھی گھل مل گئی تھیں۔

منیش سے اس کی لو میرج ہوئی تھی۔تب ان دونوں کی شادی کو لے کر گھر میں کافی ہنگامہ ہوا تھا۔کتنا طوفان مچا تھا۔۔۔کمزور سا منیش۔۔۔بزدل سا۔۔۔گھر والوں کے سامنے بالکل سہما سہما اور اس کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی تھی دیپا۔۔۔گھر، زمانہ، حالات۔۔۔اپنے فیصلے پر کمزوری اور بزدلی کی خاک مت ڈالو۔فیصلہ کرو فوراً۔۔۔پھر پورے تیور اور اعتماد کے ساتھ وہ منیش پر کسی حکمراں کی طرح چھا گئی تھی۔

''لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں۔۔۔تھوڑی سی پامسٹری مجھے بھی آتی ہے۔۔۔غلطی تمہاری نہیں منیش۔تمہارا نام ''م'' سے شروع ہوتا ہے۔۔۔سنگھ راشی۔۔۔اس راشی کے لوگ، جن کی اگر بچپن سے ٹھیک پرورش نہ کی گئی تو وہ یا تو بہت بزدل بن جاتے ہیں یا پھر بہت خودسر۔۔۔اور پھر تمہارا انگوٹھا بھی جھکا ہوا ہے۔ول پاور کی کمی ہے تمہارے یہاں۔تم خود فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔۔۔چلو یہ فیصلہ اب مجھے ہی کرنا ہوگا''۔

منیش نے ہار مان لی تھی۔ایک کمزور ہنسی کے ساتھ اس نے دیپا کا ہاتھ تھام لیا تھا۔۔۔ہاں! مجھ میں فیصلے کی بڑی کمی ہے دیپا۔۔۔وہ روہانسا ہو کر بولا تھا۔۔۔اعتماد کی رسی میرے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے پھسل رہی ہے۔۔۔پلیز دیپا۔۔۔

وہ اور قریب آگئی۔

منیش کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آرہی تھی۔۔۔دیپا عورت کی ایک الگ سی تصویر ہے میرے اندر۔۔۔ایک دم سیتا۔۔۔مریم۔۔۔ساوتری کی داستانوں جیسی نہیں۔۔۔ان سے مختلف۔۔۔شانہ بشانہ میرے ساتھ چلتی ہوئی۔۔۔آج بھی اس دور میں بھی لڑکیوں کو مظلوم اور مرد کی جابر سلطنت کا ادنیٰ کھلونا کیوں تصور کیا جاتا ہے دیپا۔۔۔؟ بتا سکتی ہو۔۔۔ہم دونوں مرد عورت کی عام پرانی تعریف بدل دیں گے دیپا۔۔۔ہمیشہ دوست رہیں گے جیسے دوست رہتے ہیں۔

وہ بولتا رہا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرتی رہی۔تصور میں ست رنگے سپنوں کو بنتی رہی۔

یہ سپنا اتنی جلدی کیسے ٹوٹ گیا تھا؟

مسز منیش سکسینہ بن کر دلی کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں شامل ہوتے ہی یہ دوستی کیسے ٹوٹ گئی تھی۔

دوست۔۔۔؟

ہنسی آتی ہے۔۔۔دوستی تین سالوں تک نبھی۔۔۔ہاں نبھی ہی کہا جا سکتا ہے۔۔۔دھیرے دھیرے فلسفوں کے کانٹے دار جنگل میں وہ کالے گھنے بادلوں کو دیکھتی رہی۔خواب اتنے بدصورت کیوں ہوتے ہیں۔۔۔؟ اور فلسفے زندگی کی حقیقت کیوں نہیں بنتے۔۔۔؟ ذرا دور تک۔۔۔ایک دم پانی کے بلبلوں کی طرح پھوٹ جاتے ہیں۔۔۔پھوٹتے ہی سامنے والا ننگا کیوں ہو جاتا ہے۔

وہ منیش میں اب ''بھوت'' دیکھتی تھی۔تنہائی میں جبلت والا ایک درندہ اس میں سما جاتا ہے۔۔۔Sadist کہیں

کا۔۔۔ وہ اسے توڑتا تھا۔ چہرے پر پسینے کی بوندھیں چھلچھلا آنے تک اس کے پورے وجود میں دیر تک گھناؤنی نفرت پیوست کر دیتا تھا۔

وہ محبوبہ اور دوست سے جانگھوں والی عورت بن جاتی تو جیسے خود پر شرم آتی۔ یہ مرد ہی کیوں جیتتے ہیں اور عورت چت کیوں ہو جاتی ہے۔۔۔ ہمیشہ ہارنے والی۔۔۔ مہینہ دو مہینے اور سال گزرتے ہی وہ منیش میں اپنے آپ سے او بے ہوئے دوست کو محسوس کرنے لگی تھی۔

جیسے اس کے لیے جوجذبہ یا احساس تھا اس کے اندر وہ بس سوتا جا رہا ہے۔۔۔ جو احساس تھا وہ اسے نہیں اس کے جسم کو لے کر تھا۔ ایک سدا بہار غنچے کی طرح چٹکنے والے جسم کو لے کر۔۔۔ جیسے ایک جابر بادشاہ کی نظریں بدلنے لگی تھیں۔ وہ بدل سا گیا تھا۔۔۔ دھیرے دھیرے وہ سپاٹ بنتا جا رہا تھا۔۔۔ نہیں سپاٹ نہیں۔۔۔ کمپیوٹر یا مشین جو بھی کہیے۔۔۔ بس ایک میکانکی عمل رہ گیا تھا ان دونوں کے درمیان۔۔۔ باسی مکالمے۔۔۔ ''کیسی ہو۔۔۔ کوئی خط آیا ہے۔۔۔ کوئی آیا تھا آج۔۔۔ ایلیشا سو گئی۔۔۔'' نپے تلے جملے۔۔۔ اور تھکان۔۔۔ اسے دیکھتے ہوئے بھی اس کے اندر کوئی مسکراہٹ نہیں جنم لیتی تھی۔۔۔ کوئی پیار۔۔۔ کوئی امنگ۔۔۔ کوئی اضطراب۔۔۔ کوئی ہلچل نہیں جاگتی تھی۔ بس ایک میکانکی عمل۔۔۔

رات ہوتے ہی۔۔۔ اندھیرا پھیلتے ہی۔۔۔ اس کے ہاتھ دیپا کے بدن پر۔۔۔ طوائف کے کوٹھے پر آئے عام گاہک کی طرح مچل اٹھے۔۔۔ اسے لگتا۔۔۔ انجانے میں کوئی اور اس کے مقابل سو گیا ہے۔۔۔ اسے نفرت ہوتی۔۔۔ اسے لگتا یہ منیش نہیں ہے کوئی اور ہے۔۔۔ جو اسے، اس عمل سے دیپا کو عورت ہونے کی رسوائی اور طعنوں سے لہولہان کر رہا ہے۔۔۔ لگاتار لہولہان کیے جا رہا ہے۔۔۔

اور۔۔۔ اس نے محسوس کیا۔

رات کے اندھیرے میں اسے محسوس کرتے ہیں۔۔۔ منیش اندھیرا کیوں کر دیتا ہے۔۔۔ اس کے بدن پر مچلتے ہوئے اس کے ہاتھ اسے بیگانے کیوں لگتے ہیں؟ اس کی آنکھیں رم جھم بارش کے وقت بند کیوں ہو جاتی ہیں۔

نہیں۔۔۔ تب وہ نہیں ہوتی ہے۔۔۔

اس وقت دیپا نہیں ہوتی ہے۔۔۔

کوئی اور ہوتا ہے منیش کے سامنے۔۔۔ کوئی اور۔۔۔ جو کم از کم دیپا نہیں ہے۔۔۔ منیش کی بیوی نہیں ہے۔۔۔ یہ کوئی اور ہوتی ہے۔۔۔ کوئی بھی۔۔۔ فلم ایکٹریس۔۔۔ منیش کے دفتر میں کام کرنے والی کوئی لڑکی۔۔۔ میگزین اور رسائل میں چھپنے والی کوئی ماڈل۔۔۔ یا بس اسٹاپ پر کھڑی کوئی لڑکی۔۔۔ کوئی بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ نہیں ہوتی۔۔۔ دیپا نہیں ہوتی۔

اسے لگتا ہے وہ ہانپنے لگی ہے۔۔۔ پہاڑ پر چڑھنے والے آدمی کی طرح۔۔۔ وہ ایسا کیوں محسوس کرتی ہے۔۔۔ منیش بدل رہا ہے۔۔۔ بدلا کرے۔۔۔ لیکن جب وہ اس کے ساتھ۔۔۔ اس کے ساتھ رہتا ہے تو۔۔۔ منیش کو اس میں دیپا کو ہی محسوس کرنا ہوگا۔۔۔ ہاں دیپا کو یعنی مجھے۔۔۔ مجھے ہی محسوس کرنا ہوگا۔

کبھی کبھی وہ صدمے سے یا غصے سے زوروں سے چیخ پڑتی۔

''نہیں منیش میں یوں نہیں لیٹ سکتی''۔

اس کے ہاتھ سوئچ کی طرف بڑھ جاتے۔۔۔ لائٹ آن کرو منیش۔۔۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔۔۔ منیش نے لائٹ جلا دی۔۔۔ چونک کر اسے دیکھا۔۔۔ نائٹی پھینک کر وہ غصے سے اس کے سامنے تن جاتی۔۔۔

''یہ میں ہوں۔۔۔میں ہوں منیش۔۔۔دیپا۔۔۔میں۔۔۔''

''ہاں تم ہی ہو۔۔۔میں نے کب کہا کہ۔۔۔''

''ہاں تم نے نہیں کہا۔۔۔لیکن میں جانتی ہوں۔۔۔میرے لیٹتے ہی میں مر جاتی ہوں۔مجھ میں کوئی اور آ جاتا ہے۔یہ سچ ہے منیش۔۔۔کوئی اور۔۔۔تم جسے بھوگتے ہو۔۔۔جسے محسوس کرتے ہو۔۔۔اور میرے وجود میں پگھلے شیشے کی طرح نفرت اتار دیتے ہو۔۔۔''

''کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو دیپا۔۔۔''

منیش حیرانی سے دیکھتا ہے۔۔۔''پتہ نہیں میری غیر موجودگی میں کیا کیا پڑھتی اور سوچتی رہتی ہو۔۔۔صبح دفتر جانا ہے۔۔۔ضدمت کرو۔۔۔اس وقت میں Relax ہونا چاہتا ہوں۔۔۔''

وہ چیخ پڑتی ہے۔۔۔''میں Relax ہونے کے لیے نہیں بنی ہوں منیش۔۔۔''

وہ بستر سے ایسے ہی اٹھ جاتی ہے۔۔۔''مجھے دیکھو۔۔۔مجھ میں بھی ایک آگ دہک رہی ہے۔۔۔یہ میں ہوں۔۔۔دیپا۔۔۔''

ہسٹریائی کیفیت کے تحت وہ رونا شروع کر دیتی ہے۔۔۔

منیش دھیرے دھیرے اسے منانے کو آگے بڑھتا ہے تو وہ غصے میں ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔۔۔

''پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔۔۔لیو می الان۔۔۔پلیز۔۔۔سو جاؤ۔۔۔اور مجھے بھی سونے دو''۔

دیپا دیکھتی ہے۔۔۔منیش کے چہرے پر الجھن کے آثار ہیں۔۔۔شکار کے پاس آ کر بھی نامراد لوٹ جانے والے شیر کی طرح۔۔۔وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا ہے۔۔۔اور وہ محسوس کر رہی ہے۔۔۔پلنگ مسلسل چیخ رہا ہے۔۔۔بج رہا ہے۔۔۔!

شٹ منیش ایسے کیوں ہو جاتا ہے۔۔۔کیا سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔؟

صبح جب اس کا غصہ کافور ہوتا تو وہ نہائی ہوئی صبح کی طرح خوشگوار بن کر ایک گرم میٹھے چائے کے کپ کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر جاتی ہے۔

''منیش ڈیئر! معاف کر دو مجھے۔۔۔پتہ نہیں۔۔۔رات، بستر پر ایک خبطی عورت کہاں سے سما جاتی ہے مجھ میں۔۔۔معاف کر دو نا۔۔۔!

''کر دیا۔۔۔''منیش ہنستا ہے۔۔۔جانتا ہوں۔۔۔ایبنورمل ہو تم۔۔۔تھوڑا تھوڑا میں بھی ہوں۔تبھی تو تمہارے ساتھ مزہ آتا ہے۔۔۔دراصل تمہارے پانے کے سپنے میں بھی تھوڑی سی Abnormality شامل تھی۔

آفس جاتے جاتے وہ جیسے اس کی دکھتی رگ پر پھر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔۔۔''سارے مرد۔۔۔اس طرح بیوی سے ناراض ہو کر رات میں چارپائیاں کیوں توڑنے لگتے ہو۔۔۔کوئی تو ہوتا ہے نا۔۔۔مانو مت مانو۔۔۔ہوتا ہے نا۔۔۔''

منیش پلٹتا ہے۔۔۔اسے یاد ہے ایلیشا کی پیدائش کے دو ماہ بعد اس سوال کے جواب میں منیش نے کہا تھا۔

''تم غلط جا رہی ہو دیپا۔۔۔تمہاری سوچ غلط ہے۔۔۔تم سب کچھ غلط Angle سے کیوں دیکھتی ہو۔۔۔یعنی جو ہے وہ غلط ہے۔۔۔تم میں ایک دوسری عورت اندھیرے میں ہم بستری کے وقت آ سکتی ہے۔۔۔مگر ابھی نہیں۔۔۔جب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے باسی اور بور ہو جائیں گے۔بہت بور۔تب اندر کے احساس کو جگانے کے لیے کسی چٹخارے کی ضرورت تو پڑے گی نا۔۔۔ابھی نہیں۔۔۔اور ایسا کیوں سوچتی ہو کہ اندھیرے میں ہی مرد کے ذہن میں کوئی تصور بن سکتا ہے، بتی جلنے پر نہیں۔۔۔ذہن

میں خاکےتو کبھی بھی بن سکتے ہیں۔۔۔لیکن عورت اپنے مرد کو اس کا موقع ہی کیوں دیتی ہے۔۔۔''

اور اسے لگا تھا منیش اس کے عورت ہونے کے نام پر ایک گندی سی گالی دے کر چلا گیا ہو۔۔۔عورت اپنے مرد کو اس کا موقع ہی کیوں دیتی ہے۔۔۔کیوں دیتی ہے۔۔۔ہتھوڑے کی طرح یہ جملہ اس کے ذہن پر بجنے لگا تھا۔۔۔عورت۔۔۔کیونکہ وہ بھوگ بن جاتی ہے۔مسلسل بھوگ کی چیز۔۔۔وہ نو ماہ اپنے مرد کی جبلت کو اپنی کوکھ میں سنجوتی ہے اور بدن پر بھدے نشان ابھار لیتی ہے۔۔۔عورت اگر بھدی ہوتی ہے تو اس میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے۔۔۔کتنی صفائی سے مرد سارا الزام عورت پر ڈال دیتا ہے۔

اسے لگتا ہے وہ ٹوٹ رہی ہے۔۔۔ایلیشا کے آنے کے بعد وہ لگاتار ٹوٹتی جارہی ہے۔۔۔اس کے برابر بستر پر اس کے ساتھ ایک چھپکلی چل رہی ہے۔دھیرے دھیرے چلتی ہوئی چھپکلی اچانک اس کے بدن پر پھیل جاتی ہے۔۔۔اور اس پر اس لمحے صرف جسم سچ ہو جاتا ہے۔۔۔برسوں سے پوسا پالا پیار۔۔۔ایک میٹھے تیکھے وقتی احساس کے لیے۔۔۔اتنی دور تک ساتھ چلا یقین دھندلا کیوں ہو جاتا ہے۔۔۔کیوں؟

ٹپ ٹپ بارش کے قطرے لگاتار گر رہے ہیں۔۔۔

اسے خود سے نفرت ہوئی۔۔۔نہیں۔۔۔وہ بہت بری بنتی جارہی ہے۔۔۔اس کے خیال۔۔۔اس کے حواس۔۔۔سب پر کوئی انقلابی حملہ ہوتا جارہا ہے۔۔۔حملہ۔۔۔اور حملے کا پہلا وار منیش کی طرف سے کیا گیا ہے۔

یہ مرد۔۔۔باہر سے آتے ہی فلسفوں کی تان عورت کے بدن پر کیوں ٹوٹتی ہے۔وہ ایلیشا کو دھیرے دھیرے تھپک رہی ہے۔۔۔سو جا بیٹا۔۔۔سو جا۔۔۔

نیچے منیش کی گاڑی رکنے کی آواز آتی ہے۔

اس کی مٹھیاں بھنچ گئی ہیں۔۔۔نہیں۔۔۔وہ فاتح بننا چاہتی ہے۔۔۔کسی کمزور لمحے میں بھی۔۔۔فاتح۔۔۔جیسے زندگی کے ہر موڑ پر وہ ہے۔۔۔یہاں بھی وہ فتح جیسا احساس پیدا کرنا چاہتی ہے۔

منیش کے پیروں کی چاپ زینے تک آگئی ہے۔۔۔اور اسے محسوس ہو رہا ہے۔۔۔وہ ڈھال بن گئی ہے اور۔۔۔منیش تلوار ہے۔۔۔تلوار میں بجلی کی سی چمک ہے۔۔۔اور ڈھال میں زبردست قوت مدافعت۔۔۔چمکتی ہوئی برہنہ تلوار لہراتی ہوئی ڈھال کو زیر کرنا چاہتی ہے۔۔۔مگر زناٹے دار ناچتی ہوئی ڈھال کے آگے تلوار کو سپر ڈالنی ہی پڑتی ہے۔۔۔ڈھال اچھل کر تلوار کی نوک پر گرتی ہے۔۔۔اور ڈھال کی وقت تمازت سے تلوار پگھل پگھل کر قبول کر لیتی ہے۔۔۔

ڈور بیل لگاتار بج رہی ہے۔۔۔اور بالکنی پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے ہیں جارہے ہیں۔۔۔

☆☆☆

موت کا نیا رنگ

خالد فتح محمد

رات بہت ٹھنڈی اور تاریک تھی۔ تاریک شاید اسے لیے تھی کہ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا اور ٹھنڈی اس لیے کہ اسے اگلے ہی موڑ پر اپنی موت نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک طویل عرصے سے بیمار تھا۔ وہ ہمیشہ یہی سوچا کرتا کہ بیماری کا روگ لگنے کے بجائے وہ مر جائے تو بہتر ہوگا۔ قسمت نے اس کی یہ سوچ پوری نا کی اور اسے موت کی بجائے بیماری دے دی۔

اب وہ ایک عرصے سے بیمار تھا اور اس ضد میں کہ مرے گا نہیں!

اس کا گھر شہر کے آخری کونے یا ایک طرف سے آغاز میں تھا۔ گھر کے بعد یا اس سے پہلے ہر سو ایک وسعت تھی جس کا اسے تب کوئی اندازہ نہیں تھا۔ یہ وسعت گھر کے باہر سے ہوتی ہوئی نا صرف اس کے آنگن تک سکڑی ہوئی تھی بلکہ اس کے کمزور سے جسم کے اندر بھی ایک طاقت کی طرح گھر کیے ہوئے تھی۔ وہ یہی وسعت اپنے اندر کی کسی کوٹھری میں چھپائے بڑا ہوا تھا۔ یہ وسعت صرف اس کے اپنے اندر ہی محسوس ہوتی تھی اور جب وہ اسے اوروں میں دیکھنے کی کوشش کرتا تو تنگ نظری ہی نظر آتی۔ وہ اپنے گھر میں ایک مصروف زندگی گزارتا آ رہا تھا کہ بیماری نے اسے آن دبوچا۔ وہ ہسپتال میں لیٹا ہوا تھا اور اس کے جسم پر کئی ٹوٹیاں اور تار لگے ہوئے تھے جنہوں نے سرہانے پڑی سکرین کو روشن رکھا ہوا تھا۔ وارڈ میں آٹھ گھنٹوں کی شفٹ میں تین نرسیں کام کرتی تھیں۔ وہ رات کو بارہ سے آٹھ تک والی نرس کو نہیں دیکھ پاتا تھا، اگرچہ اسے خواب آور دوا یا ٹیکہ تو نہیں لگتا تھا لیکن اس کی ڈیوٹی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ سو جاتا تھا۔ ان نرسوں کے کام کے اوقات تو تبدیل ہوتے رہتے تھے لیکن اس نے ہر رات آخری شفٹ والی نرس نہیں دیکھی تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ اب اختالیس برس کا ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ ایسی عمر ہے جس میں انسان بزرگی میں پاؤں رکھتا ہے لیکن جب وقت کے جسم پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک گود میں کھیلنے والے بچے کی عمر لگتی ہے۔ وقت کی اکائیوں میں تو اس نے ابھی رینگنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی کیوں کہ وہ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور کسی نے اس کی شادی کروانے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ جب اس کی شادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا جانے لگا تو لڑکی والے اس کی عمر بیچ میں لے آتے۔ اپنی عمر کو کسی متنازع مسئلے کی طرح گھسیٹا جانا اسے پسند نہیں آیا اور اس کے ذہن میں ایسی اہم شخصیت آ گئی جس کی عمر کم و بیش اُسی کے پیٹے میں تھی اور اس نے سترہ یا اٹھارہ برس کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس لڑکی کے لیے اس کا رشتہ آیا تھا تب اس لڑکی کی عمر بیس سال تھی اور خود اس کی اپنی اکتیس برس۔ تب اس نے مایوس ہو کر شادی نا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اب وہ اختالیس برس کا تھا اور اس کی زندگی کی ڈوری ڈاکٹروں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے یہ خیال بھی آتا کہ وہ زندہ کس کے لیے رہے؟ اس کے بڑے بھائی اور بہن اسے زندگی میں بے سہارا چھوڑ کر دوسرے جہان میں جا چکے تھے اور وہ تنہائی کے دوزخ کی آگ میں جلتے ہوئے ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں پہنچ گیا تھا۔

وہ بچپن سے ہی کمزور رہا تھا۔ میٹرک تک اس کا ناک بہتا رہا جس کی وجہ سے اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ ناک سے بہتے نیلے سے مواد کی وجہ سے اس کے ہم جماعتوں کو گھن آتی اور وہ اس کی صحبت سے گریز کرتے۔ ہم جماعتوں کے اس گریز کی وجہ سے وہ بالکل اکیلا ہو گیا اور ایک وقت آیا کہ اسے اپنے اس اکیلے پن میں لطف آنے لگا۔ وہ کسی بینچ پر گھنٹوں اکیلے بیٹھا رہتا اور اسے اپنے

اکیلے ہونے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ وہ بینچ پر بیٹھا کسی تصوراتی دنیا میں کھو جاتا جہاں حقیقت نام کی کسی چیز کا گزر نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی فنتسی تھی جس میں سے وہ باہر نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گرد خواب بنتا رہتا یا خواب ایک مکڑی کی طرح تھے جنہوں نے اسے اپنے جالے میں پھنسا دیا تھا۔ وہ ایک ایسی لذت سے ہمکنار تھا جس کی ساجھے داری وہ کسی سے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس زندگی کے خارزار میں برہنہ تن محسوس کرتا تھا اور اسے لگتا کہ یہ تنہائی ہی اس کا زرہ بکتر ہے۔ تنہائی آکاس بیل کی طرح اس کی آکسیجن ختم کرتے ہوئے اسے گھن کی طرح کھائے جارہی تھی اور ایک دن اسے اچانک محسوس ہوا کہ اسے علاج کی ضرورت ہے۔ ڈاڑھی بناتے ہوئے اسے اپنی آنکھیں زرد، ان کے نیچے حلقے اور گال پچکے ہوئے لگے۔ اسے لگا کہ چہرہ گوارا صورت ہوتے ہوتے بدشکل نظر آنے لگا تھا۔ تمام بیمار لوگوں کی طرح اسے اپنی بقا صحت میں نظر آئی اور اس نے صحت مند رہنے کے لیے اپنا علاج کرانے کا فیصلہ کر کے ایک کم جانے جانے والے لیکن مہنگے پرائیویٹ ہسپتال میں داخلہ لے لیا۔ اس کے خون، پیشاب، چھاتی، دماغ، دل اور گردوں کے متعدد مہنگے ٹیسٹ کروائے۔ اسے ایک کمرہ الاٹ کر دیا گیا جسے اس کی خواب گاہ کی طرح آرام دہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اسے ان ٹیسٹوں کے متعلق کچھ بتایا نہیں گیا اور وہ جب بھی جاننا چاہتا تو اسے بتایا جاتا علاج شروع کر دیا گیا ہے۔

جس نرس کی پچھلے ہفتے رات کی ڈیوٹی تھی اب وہاں صبح کے وقت وہ اس کے پاس موجود تھی۔ اس پر ڈیوٹی دینے والی باقی دونوں نرسیں زیادہ خوش شکل تھیں لیکن اس نرس کے چہرے کے نمک اور آنکھوں کی چمک میں ایسی کشش تھی جو اسے ہمیشہ اپنی طرف متوجہ رکھتی۔ وہ اس کے بیڈ کے سامنے سٹینڈ پر پڑی فائلوں پر کہنیاں رکھے کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''عابد صاحب! آپ نے کئی دنوں سے شیو نہیں کی؟'' نرس کی نرم آواز میں پیشہ وارانہ غصہ تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر گالوں پر کانٹوں کو محسوس کیا۔ نرس اسے غور سے دیکھتی رہی تھی جسے اس نے بھی محسوس کیا۔ ''میں ابھی باربر کو بلاتی ہوں جو آپ کی ڈاڑھی کو شیو کر دے گا''۔ اسے کچھ ندامت سی بھی ہوئی کہ صبح جب اس نے دانت صاف کیے تو اپنی ڈاڑھی کو نہیں دیکھا۔ نرس اسی وقت باہر چلی گئی اور وہ خالی ذہن سے سامنے دیکھتا رہا۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ وہ اپنا ہی قیدی ہے اور جب تک ہسپتال سے نا نکلے رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔ نرس حجام کے ساتھ جب آئی تو اسے نرس کا جارحانہ اور اپنا دفاعی رویہ پسند نہیں آیا۔ اس نے حجام کو گول آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا جہاں ڈاڑھی کے سفید اور کالے بال چہرے کا تاثر بنائے ہوئے تھے۔ حجام نے اس کا چہرہ گیلا کر کے فوم لگانا شروع کی تو اس نے نرس کے ساتھ فلرٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''نرس! اگر میں مونچھیں نا منڈواؤں تو؟'' اسے فوراً اپنے سوال کے سطحی پن کا احساس ہوا لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نظر بچاتے ہوئے نرس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پر مامور نرسوں میں یہ سب سے زیادہ منہ پھٹ تھی اور اسے کسی ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ وہ اپنے پیشہ ورانہ علم اور منطق سے اسے ہمیشہ شرمندہ سا کر دیا کرتی تھی اور اس نے ایسی کسی شرمندگی سے بچنے کے لیے خود کو تیار کیا ہوا تھا۔ اس نے ایک بے تاثر سے چہرے کے ساتھ نرس کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے لگا کہ وہ اپنے کردار کو کسی حد تک کامیابی سے نبھا بھی رہا ہے۔

''دیکھو!'' نرس نے حجام کو مخاطب کیا۔ ''مونچھیں مت صاف کرنا''۔ نرس نے عام قسم کی زبان استعمال کی۔ حجام نے فوم لگا کر ڈاڑھی مونڈی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر نرس کی طرف دیکھا جو غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے نرس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات کی، ''نیچے کی طرف سے مونچھیں سیدھی کر دو''۔ حجام نے قینچی اور استرے کی مدد سے مونچھیں ہموار اور سیدھی کرنے کے بعد اپنا جھولا اٹھایا اور چلا گیا۔

''مسٹر عابد!'' اس نے چہرے اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوالیہ نظر سے نرس کی طرف دیکھا۔ وہ نرس کے لہجے

سے تھوڑا سا پریشان ہوا کیوں کہ اس کی آواز میں معمول کی پیشہ وارانہ کاٹ کے علاوہ اپنایت کا عکس تھا۔ ''مسٹر عابد!'' اس نے دہرایا۔ وہ ہر قسم کا خیال ذہن سے نکال کر تمام توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ ایک ہائی پروفائل سیٹ اپ ہے جس کے ہر ملازم کو متعدد سبز باغ دکھا کر ملازم رکھا ہوا ہے۔ وہ اپنے حلف کے تحت ہسپتال کے معاملات کسی کو بتا نہیں سکتے ہیں۔ آپ یہاں داخل ہونے والے مریضوں سے کافی حد تک مختلف ہیں اس لیے میں آپ کو سچ کی تلخی سے متعارف کروانا چاہتی ہوں''۔ عابد نے گھبرا کر نظر اس کے چہرے سے ہٹا کر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ ''یہاں صحت مند مریضوں کو بیماری کا جھانسا دے کر صحت مند تو رکھا جاتا ہے لیکن اس کی جیبیں خالی کر دی جاتی ہیں۔ مریضوں نے زندہ رہنے کے لیے ان کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہوتا ہے۔ یہ مریض کو بیماری کبھی نہیں بتائیں گے اس لیے کہ اسے کوئی عارضہ ہوتا ہی نہیں۔ آپ مکمل طور پر صحت مند ہیں لیکن یہ آپ کو کبھی ڈسچارج نہیں کریں گے اور آپ علاج کراتے کراتے کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہاں سے جانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ انہیں بتا دیں کہ آپ جانا چاہتے ہیں۔ وہ آپ سے کچھ کاغذوں پر دستخط لیں گے۔ جن میں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں اور آپ بیمار ہونے سے پہلے ہی یہاں سے چلے جائیں گے''۔ نرس اس کے ردعمل کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ زندگی میں سیکھ چکا تھا کہ کبھی کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خاموش اسے ہی دیکھتا رہا۔ ''میں آپ کے انچارج ڈاکٹر کو مطلع کرتی ہوں کہ آپ جانا چاہتے ہیں''۔

وہ حیرت زدہ، تھوڑا سا منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔ اسے ہسپتال میں آنے کے بعد اپنے گرد بھاری زنجیروں کا احساس ہوتا تھا لیکن اب اچانک اسے یہ زنجیریں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ آزادی کی طرف جا رہا تھا۔ ''آپ ایک مہینہ یہاں رہے ہیں اور آپ کا ذہنی توازن وہ نہیں جو ایک ماہ پہلے تھا۔ سو آپ جائیں اور آزاد اور صحت مند زندگی گزاریں''۔

اسے وہاں لیٹے ہوئے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوا۔ وہ مریض ہوتے ہوئے بھی مریض نہیں تھا اور صحت مند ہونے کے باوجود صحت مند نہیں تھا۔ اسے اچانک اس قلعہ نما چار دیواری میں اپنا دم گھٹتے ہوئے لگا اور ان فصیلوں کے باہر سے اسے اپنے لیے بلاوے آتے محسوس ہوئے۔

''میں ابھی جا کر متعلقہ ڈاکٹر کو بھیجتی ہوں''۔ نرس نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ کسی اور دھوکے کا شکار تو نہیں ہو رہا؟ اگر نرس اسے رہائی دلانا چاہتی ہے تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور اگر وہ یہاں سے جا کے کسی نئے جیل میں بند ہو جانا چاہتا ہے تو شاید دونوں جیلوں کے درمیان میں کوئی کھڑکی ہو جہاں سے اسے مختصر سے عرصے کے لیے ہی سہی، تازہ ہوا اور روشنی تو آ سکیں گی۔ اس نے نئے جیل میں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا!

نرس قدرے بھاری ڈاکٹر کے ساتھ آئی جسے اس نے پہلے دیکھا ہوا تھا۔ وہ جب ہسپتال میں داخل ہونے آیا تھا تو اسی ڈاکٹر کے ساتھ معاملات طے ہوئے تھے۔ اس ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اسے خوف سے بھری جھرجھری آئی جو پہلی ملاقات میں بھی آئی تھی۔ اسے یہ ڈاکٹر اپنی دادای کی سنائی ہوئی ایک کہانی کے اس سانپ کی طرح بھیانک لگا تھا جس کے ذمے خزانے کی رکھوالی تھی۔

''آپ جانا چاہتے ہیں؟'' ڈاکٹر نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''جی ہاں''۔ اس نے قدرے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ڈاکٹر کے ہسپتال چھوڑنے کی وجہ جاننے سے تھوڑا سا خائف تھا۔ وہ جب داخل ہونے آیا تھا تو بھی ڈاکٹر نے کافی سوال پوچھے تھے۔ اس نے بھی اپنا اعتماد بحال کرنے کے لیے نرس کی طرف دیکھا جو لاتعلقی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نرس کو اپنی تائید کے لیے نہیں کہہ سکتا تھا۔

''ٹھیک! اس صورت میں آپ کو چند ایک سرٹیفکیٹوں پر دستخط کرنے ہوں گے''۔ اس نے حکم دینے کے انداز میں نرس کی

طرف دیکھا اور کمرے سے چلا گیا۔ نرس نے فائلوں کو اٹھایا، ایک نظر کمرے کو دیکھا اور اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔

''آپ یہاں سے جانے کے بارے میں سوچیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ یہاں رہیں گے''۔ نرس نے پیشہ وارانہ حکم دیا۔ ''آپ کا سارا سامان حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کی لسٹ بنی ہوئی ہے''۔ عابد نے جواب نہیں دیا۔ اس کی زندگی ایک مکمل ترتیب کے احاطے میں تھی، اسے یہ ہسپتال بھی اپنے قوانین کا ماتحت لگا گو نرس نے انہیں دبے الفاظ میں پیدا گیر کہا تھا۔ ''میں وہ سرٹیفکیٹ لاتی ہوں تھوڑی دیر میں''۔ جواب کا انتظار کئے بغیر وہ چلی گئی۔

اسے قدرے پریشانی بھی لاحق ہوئی۔ گو یہاں کا ایک ماہ کافی مہنگا تھا لیکن اس کے شب و روز کسی الجھن کے بغیر گزرے۔ گھر میں اس کی زندگی پر کئی عوامل اپنا اثر ڈالتے تھے۔ سب سے پہلے تو گھر بذات خود ایسا آسیب تھا جو ہر وقت اسے خوف زدہ رکھتا۔ وہ گھر جس میں ایک خاندان رہا کرتا تھا اب اس اکیلے کے پاس تھا اور اس کے ہر کمرے میں سے اسے یادوں کا جمگھٹا نکلتے ہوئے محسوس ہوتا۔ دو ملازم اس کی تنہائی کا علاج نہیں تھے اور دوستوں کا ہر وقت پیار بنے والا میلہ اسے مصنوعی اور عارضی لگتا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اکیلے رہنے کی عادت ہوگئی ہے اور اگر وہ شادی کر بھی لے تو وہ تنہائی کا ہی متلاشی رہے گا۔ وہ اکیلا ہونے کے باوجود ایک ہجوم کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا اور ہجوم کا حصہ ہونے کے باوجود اکیلا تھا۔

نرس ہسپتال کی فائل میں کچھ کاغذ لے آئی جن پر اس نے دستخط کر دیئے۔ ''آپ کی گھڑی، موبائل فون، بٹوہ اور چابیاں میرے پاس ہیں جو آپ کو میں باہر دے دوں گی''۔

''میرے پاس سواری نہیں، میں جاؤں گا کیسے؟'' وہ جانا چاہنے کے باوجود جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے نکلتے ہی وہ خود کو بے یار و مددگار محسوس کرے گا۔

''آپ ہسپتال کی کار میں جائیں گے۔ آپ کے گھر اطلاع کر دی گئی ہے۔ آپ مکمل طور پر صحت مند ہیں اس لیے آپ اپنی صحت کے بارے میں سوچنا بند کر کے اور مسائل کے بارے میں سوچیں''۔ نرس کے الوداعی الفاظ نے اسے چونکا دیا۔ اس کے ایسے کون سے مسائل تھے جن کے بارے میں اسے سوچنے کی ضرورت تھی؟ اسے لگا کہ وہ تو خواب اور حقیقت کے درمیان میں ایسی زندگی جی رہا تھا جس کا کوئی بھی سرا اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وقت اسے شکست دے چکا ہے اور صرف وہ اس شکست کو ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس نے نرس کی طرف دیکھا۔ نرس خواہش میں لپٹی اپنائیت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی سانس رکتے ہوئے محسوس ہوئی۔ نرس مسکرائی ''عابد صاحب! رابطہ رکھیے گا''۔ عابد کو محسوس ہوا کہ نرس کی دعوت میں کوئی اور دعوت بھی چھپی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے خیال کی تصدیق کے لیے ایک بار پھر نرس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔

عابد ہسپتال کی کار میں جب بیٹھا تو اسے اداسی نے آن گھیرا۔ کیا وہ ہسپتال چھوڑنے سے اداس تھا یا اپنے گھر کی تنہائی سے جسے وہ بارونق نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس کے تعلق والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے گھر کے راستے میں اپنے اردگرد دیکھنے کی کوشش ہی نا کی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ایک مہینے کے اندر ان سڑکوں اور موڑوں میں کیا تبدیلی آسکتی ہے۔ وہ جب اپنے دو منزلہ مکان کے داخلی دروازے میں سے اندر داخل ہوا تو اس کی ماہر نظر نے اپنے چھوٹے سے لان اور پھولوں کی کیاریوں کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا۔ اس نے اپنی نظر کو اس طرح تربیت دی ہوئی تھی کہ وہ سرسری سی نگاہ میں ہی خرابی کو دیکھ جاتا۔ اسے لان میں کوئی جڑی بوٹی اور کیاریوں میں کہیں کچھ فالتو اگا ہوا نظر نہیں آیا۔ وہ مطمئن سا کار میں سے نکلا تو اس کا ڈرائیور اور باورچی جو گھر کو سنبھالتا بھی تھا، اپنے استقبال میں کھڑے نظر آئے۔ وہ دونوں کی وہاں موجودگی اور ان کی فرض شناسی سے خوش بھی ہوا۔ اسے لگا کہ اس نے اپنا گھر صحیح لوگوں کے حوالے کیا ہوا تھا۔ پورچ میں پام کے کئی گملے رکھے تھے جنہیں وہ کئی گھنٹے غور سے

دیکھتا رہتا تھا۔ وہ سوچتا کہ ایسے ہی پام کے درختوں کے درمیان میں کاسٹرو بیٹھتا رہا ہوگا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں وہی پام گملوں میں آرائش کے لیے لگائے گئے تھے۔ دونوں ملازم جھجکتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اسے ان کی جھجک میں ایسی اپنائیت نظر آئی جو ہسپتال کی نرسوں میں مفقود تھی۔ وہ نرسیں اس کے ساتھ بے تکلفانہ گفتگو ایک تکلف کے ساتھ کرتی تھیں جس سے اسے کبھی الجھن ہوتی۔ اس نے ان ملازموں کے ساتھ کبھی غیر ضروری بات نہیں کی تھی لیکن آج ان کے جھجک بھرے خلوص سے وہ کچھ شرمسار سا ہوا۔ اس نے دونوں کو جھجکتے ہوئے گلے لگایا اور گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ گھر میں اسے سناٹے کی گونج سنائی دی جسے بند کھڑکیوں کے شیشے اور ان پر پڑے بھاری پردے باہر جانے سے روکے ہوئے تھے اور اسی طرح باہر کے شور کو اندر آنے سے۔ وہ لاؤنج میں کھڑا فیصلہ کرنے لگا کہ یہاں ہی بیٹھ جائے یا خواب گاہ میں جا کر تھوڑا استا لے۔ اس نے سوچا کہ وہ ہسپتال میں خوب سو کے آیا ہے اس لیے فوری طور پر اسے نیند کی ضرورت نہیں۔ اس نے چند دوستوں کو بلانے کا سوچا اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ ان کے ساتھ کیا بات کرے گا؟ کیا اس کے پاس ہسپتال میں گزارے ایک مہینے کا معمول ہر بار سنانے کی ہمت یا خواہش ہے؟ وہ اپنی سوچ کی خاموشی کو رضامندی سمجھا اور لاؤنج میں کھڑے رہنا اسے غیر مہذب لگا جب کہ بیٹھنا اسے خود سے بھی شکست لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک شکست خوردہ آدمی ہے، اتنا شکست خوردہ کہ زندہ رہنے سے بھی خائف تھا۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ باورچی نے جلدی سے آگے بڑھ کے کھڑکی کے پردے ہٹائے تو کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ اس نے ستائش سے بھری تشکرانہ نظر سے باورچی کی طرف دیکھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ باورچی ایک جوان آدمی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ باورچی ایک غیر شادی شدہ آدمی ہے۔ کیا باورچی کا غیر شادی شدہ ہونا اس کی وجہ سے تھا؟ وہ ہر کسی کے غیر شادی شدہ یا شادی شدہ ہونے کا ذمے دار نہیں۔ کیا وہ نرس بھی غیر شادی شدہ تھی؟ اگر وہ غیر شادی شدہ ہوئی تو؟ وہ نرس اسکے لیے ایک فرشتہ ثابت ہوئی۔ یہ اس کی وجہ سے تھا کہ وہ اس وقت اپنے گھر میں بیٹھا بہت سی غیر اہم باتوں کے درمیان میں اس کے متعلق سوچ رہا تھا؟ اگر وہ اسے ہسپتال کی قید سے آزادی نا دلواتی تو وہ ابھی تک ان ڈاکٹروں کا قیدی ہوتا۔ اچانک اس کے ذہن میں نرس کا بدن گھوم گیا۔ اسے بھرے ہوئے جسم والی ایسی عورتیں پسند تھیں جن کی چھاتیاں ایک مقناطیسی کشش لیے ہوئے ہوں۔ وہ نرس بھی ایسی ہی تھی۔ اتنی عمر ہو جانے کے باوجود اس کے کسی عورت کے ساتھ ایسے تعلقات نہیں تھے جو اس کی تسکین کا باعث بنتے۔ وہ تو صرف عورتوں کے جسموں کو اپنی نظروں سے تولتے ہوئے سکون حاصل کرتا رہتا۔ اسے نرس میں ایسی عورت نظر آئی جو ذہنی نا آسودگی کو اپنے بدن کی آگ سے آسودہ کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی جھجک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نرس سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، اسے نرس کی آنکھوں میں الوداعی تاثر بھی اکسا رہا تھا۔ اس نے ہسپتال کے کاغذوں میں سے نمبر لے کے ڈائل کیا تو دوسری گھنٹی پر ایک مترنم آواز نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس نے جب نرس کے ساتھ ملانے کا کہا تو ایک لمحے کی جھجک کے بعد اسے بتایا گیا کہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہیں تھی۔ اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اس کے ساتھ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے کہ لڑکی نزدیک آنے سے پہلے ہی دور ہو جاتی ہے۔ اپنی مایوسی دور کرنے کے لیے اس نے باورچی کو ٹی وی کا ریموٹ پکڑانے کا کہا۔ ٹی وی کو آن کرتے ہی اسے یقین نا آیا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے؟ اسے سکرین پر اپنی ہی تصویر واپس گھورتے ہوئے نظر آئی۔ ٹی وی رپورٹر ایک نہایت اہم انکشاف کرنے والا تھا اور اس کے ساتھ وہی نرس کھڑی اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔ اس وقت وہ ہسپتال کی وردی میں نہیں تھی۔ ٹی وی رپورٹر کے بقول مس بتول نے اپنی جان کی پروا نا کرتے ہوئے اس دہائی کا سب سے بڑا انکشاف کیا تھا۔ وہ ایک ایسے ہسپتال میں کام کرتی تھی جہاں مریضوں کو صحت مند بنانے کے بجائے ایک پالیسی کے تحت صحت مند نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ چینل نے دعویٰ کیا ہسپتال جناب عابد، جو ایک امیر اور شریف النفس انسان ہیں، وہ اور ان سے کئی لوگ یہاں اپنے مالی ذرائع لٹاتے ہیں۔ رپورٹر کے مطابق حکومت کو ایسے جعلی ہسپتالوں

کو بند کر کے مس بتول جیسی ذمے دار شہری کو تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔ چینل نے یہ بھی تقاضا کیا کہ عابد جیسے ہسپتال کے شکار لوگوں کو ان کا سرمایہ واپس ملنا چاہیے۔ اس نے باورچی کی طرف دیکھا جو نہایت انہماک سے ٹی وی سکرین پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ اسے رپورٹر کی باتوں پر شک بھی ہو سکتا تھا لیکن ہسپتال کی عمارت پس منظر میں ہونے کی وجہ سے یقین نا کرنا دن کو رات کہنا تھا۔ نرس اسے گھبرائی ہوئی لگی۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے مسلسل ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اسے تلاش کر رہی ہے۔ اسے کار میں بیٹھنے سے پہلے نرس کے چہرے کے تاثرات پھر یاد آ گئے اور اس کا جی نرس کو ملنے کو کر آیا۔ اس نے باورچی کی طرف دیکھا:

''ڈرائیور کے ساتھ جاؤ اور۔۔۔'' اس نے ٹی وی سکرین کی طرف اشارہ کیا، ''اسے اپنے ساتھ لے آؤ۔ میرا کہنا کہ اس نے بلایا ہے۔ جاؤ''۔ اسی وقت رپورٹر نے مائیک نرس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یہ بے ضابطگی منظر عام پر لانا میرا فرض تھا۔ میں نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک رسک لیا ہے جو مجھے ہی لینا تھا کیوں کے وہاں کام کرنے والے باقی لوگ خاموش ہیں''۔ نرس اسے خوف زدہ لگ رہی تھی لیکن اس کی آواز میں اعتماد اور ٹھہراؤ نے اسے حیران کر دیا۔ اسے لگا کہ شاید اس وقت وہاں کھڑے وہ اکتاہٹ کا شکار تھی اور اپنا نقطہ نظر بتاتے ہوئے اس کی اکتاہٹ اور خوف دور ہو گیا تھا۔ اس نے چینل بدلا تو وہاں بھی یہی خبر چل رہی تھی۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ ایسا تو نہیں کہ نرس سے یہ سب کہلوایا جا رہا ہو؟ پھر اسے اپنی سوچ پر حیرت بھی ہوئی کہ وہ ایسے معاشرے کا حصہ تھا جہاں سچ کو بھی جھوٹ کی آنکھ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ نرس کی باتیں سننے لگا۔ وہ ایک ہی لہجے میں بولے جا رہی تھی جیسے کچھ رٹا ہوا بول رہی ہو۔ اس کی آواز صاف اور ایک مصنوعی سا اعتماد لیے ہوئے لگی۔ اسے اب نرس کے گھر پہنچنے کا انتظار تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے نرس کو گھر کیوں بلا بھیجا ہے؟ کیا وہ اس کے ملازموں کے ساتھ آ جائے گی؟ اسے اپنے اس غیر منطقی فیصلے پر حیرت کے ساتھ خود پر غصہ بھی آیا۔ اگر وہ آ گئی تو؟ اس نے سوچا کہ وہ نا ہی آئے تو بہتر ہوگا!

اب اسے ٹی وی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ یہی مکالمہ کر رہا تھا کہ نرس آئے گی کہ نہیں؟ وہ چاہتا تھا کہ آئے اور ہمیشہ کی طرح خائف بھی تھا کہ وہ کسی عورت کے ساتھ بیٹھ کر خیالات کی ساجھے داری کر سکے گا؟ عورتیں ہمیشہ اس کے اعتماد کی کمی کا باعث بنی تھیں۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور نرس کو وہاں کھڑے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ دروازے میں کھڑی بے یقین سی نظر سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ڈرائیور کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سے اسے الجھن ہوئی۔ اس نے اسے ناراض نظر سے دیکھا۔

''ٹی وی والوں کی گاڑیاں ہمارے پیچھے باہر کے گیٹ تک آ گئی ہیں''۔ ڈرائیور نے نرس کی طرف فخر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تب اسے اس وقت کی حالت کی گمبھیرتا کا احساس ہوا۔ نرس ٹی وی چینلوں کو درکار تھی اور وہ اچانک اس کا محافظ بن گیا تھا۔ نرس نے اسے ہسپتال کا ایک نشانہ قرار دیا تھا۔ اس کا گھر میں آنا دونوں کو فریق ظاہر کرتا تھا اور اسی لیے وہ چینل باہر گیٹ تک پہنچ گئے تھے۔

''شکاری پیچھا کرتے ہوئے پہنچ گئے؟'' اس نے اپنی بات میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جہاں وہ اس کے آنے سے خوش ہوا تھا اسے چینل والوں کے گیٹ تک آنے کی پریشانی بھی تھی۔ اسے اپنی حالت دڑبے میں بند ان مرغیوں کی طرح لگی جو باہر ٹہلتے ہوئے بلے سے ڈرے اندر رہنے کو ترجیح دیں۔ وہ نرس کے ساتھ اندر بند ہونے سے خوش بھی تھا کہ وہ اس کے ساتھ وقت گزار سکے گا۔

''جی ہاں! شکاری، شکار کے تعاقب میں یہاں تک بھی آ گئے''۔ نرس نے کھڑکی کے باہر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں خوف اور شک کی ہلکی سی کپکپی تھی۔ اسے نرس کا خوف زدہ ہونا اچھا بھی لگا۔ ہسپتال کی کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ کر وہ اسے جہاں ایک انوکھی قسم کی عورت لگی تھی، اپنے خوف کی وجہ سے وہ اسے اپنے جیسے ہی محسوس ہوئی۔ نرس ابھی تک دروازے کے بیچ

میں کھڑی تھی اور ڈرائیور اس کے ساتھ تھا۔ اسے ڈرائیور کا وہاں کھڑے ہونا معیوب سا لگا۔

''تم باہر جا کر گیٹ کے پاس ٹھہرو اور یہ یقین کرو کہ کوئی اندر نا آئے۔ کوئی بھی''۔ اس نے بختی سے کہا''اور فضلو کو بھیجو''۔ اس کی آواز میں دبدبہ تھا جو ڈرائیور نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ ٹانگوں میں دم دبا کر باہر چلا گیا۔''آپ کھڑی کیوں ہیں۔ آیئے اور جہاں جی چاہے بیٹھیں''۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا تاکہ نرس جہاں چاہے بیٹھ سکے۔ نرس نے ایک بار پھر کمرے کا سرسری سا جائزہ لیا اور ایک صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ کی مسز کہاں ہیں؟'' نرس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اسے نرس گھبرائی ہوئی اور کسی حد تک پریشان سی لگی۔ وہ نرس کی اس حالت سے لطف اندوز بھی ہوا۔ اس نے سوچا، زندگی کے کچھ معاملات میں وہ اکیلا ہی پریشان ہوتا ہے۔ اس نے خود کو برتر محسوس کیا۔

''میں غیر شادی شدہ ہوں''۔ اب اسے اپنا اعتماد کم ہوتے محسوس ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ شادی کرنا زندگی میں کوئی کامیابی نہیں اور نا کرنا کسی طرح ناکامی بھی نہیں لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس وقت یہ ایک ناکامی تھی۔ نرس نے چہرے کے ہر ردعمل کو چھپاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نرس کا چہرہ پڑھنے کی ناکام کوشش کی، اسے نرس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ اسے ایسے لگا جیسے نرس پوچھ رہی ہو، خیریت رہی؟

ٹی وی کی سکرین پر اب کوئی اور سکینڈل زیر بحث تھا۔ نرس اور اس کے ہسپتال کا قصہ شاید پرانا ہو چکا تھا۔''میری بھی شادی نہیں ہوئی''۔ نرس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اسے نرس کی بات صرف اسے آرام سے کر دینے کے لیے لگی۔ اگر کسی کی شادی نا ہوئی ہو تو اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟ اس نے نرس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا، کیا یہ قہقہے کی وجہ تھی یا اس غلط بیانی کا نتیجہ جو نرس نے اپنی شادی کے سلسلے میں کی تھی؟ اسے نرس ایک بہتر اداکارہ لگی۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی میں جینا ایک مسلسل اداکاری کا عمل ہے اور اس ڈرامے میں بھی اداکاروں کے مختلف معیار ہیں۔ اس نے خود کو ہمیشہ کم معیار سمجھا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کی شادی نا ہونا تو محض ایک اتفاق تھا لیکن کیا اس کی شادی کسی حادثے کی وجہ سے نہیں ہوئی؟ اسے ہمیشہ کی طرح کم ہمتی نے آن دبوچا۔

''آپ اس گھر میں اکیلے رہتے ہیں؟'' نرس نے پوچھا۔ اس نے یہ سوال جھجکتے ہوئے کیا تھا۔ اسے نرس کسی بڑے پلاٹ کا اہم کردار لگی۔ پہلے اس نے ہسپتال کے خفیہ طریقوں کا پردہ چاک کر کے اسے ہسپتال سے رہائی دلائی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اپنے گھر میں تو وہ اسے خود لایا تھا۔ ایسی حالت میں وہ کسی بڑے پلاٹ کا حصہ کیسے ہو سکتی ہے؟ اس نے نرس کی طرف دیکھا۔ وہ خالی نظر سے پردوں کے پار دیکھنے کی کوشش میں تھی۔ وہ اسے اس فالج زدہ مریض کی طرح لگی جو اپنی یادداشت کو قائم رکھنے کی کوشش میں ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات مسلسل تبدیل ہو رہے تھے اور اسے نرس کی ذہنی صحت پر شک گزرنے لگا تھا۔

''مجبوری ہے!'' اس نے اپنی بات کو جتنا ذو معنی بنانا ممکن تھا بنانے کی کوشش کی۔ نرس اس کے جواب پر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ اپنائیت میں ڈوبی ہوئی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اسے نرس کسی ذہنی الجھن کو سلجھاتے ہوئے لگی۔ اسے اس پر ترس بھی آیا۔ اس نے شاید صرف اس کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔''آپ آ گئی ہیں تو اب اکیلا تو نا رہا؟'' اس نے سوالیہ انداز میں جواب دیا۔ وہ اس آنکھ مچولی کو ختم کرنا چاہتا تھا۔''ہسپتال تو ایک عرصے سے چل رہا تھا اور لوگ وہاں زیر علاج بھی تھے۔ کسی کو ہسپتال کے رویئے یا طریق کار پر شک یا شکایت نہیں تھی۔ آپ نے جو کیا، کیا اس کی ضرورت تھی؟'' وہ جانتا تھا کہ جھولے میں بلی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس لیے اسے باہر نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ اس نے بغیر تفصیلی سوچ کے بلی کو جھولے سے باہر نکال ہی دیا۔ نرس

کو اس سوال کی توقع نہیں تھی یا وہ اسے کسی سوال کے پوچھنے کا اہل ہی نہیں سمجھتی تھی۔ نرس نے پہلے اسے بے یقینی کے ساتھ دیکھا، جیسے وہ اس کی طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے لگا کہ نرس کو اپنی الجھنوں کا حل مل گیا ہو۔

''میں تو چلی جاؤں گی تھوڑی دیر تک۔ آپ تو اکیلے ہی ہوئے!'' نرس نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا اور سوال کا جواب بھی نا دیا۔ ساتھ ہی اسے نرس کی مسکراہٹ میں ایک سوال محسوس ہوا۔ اس نے اپنی سوچ کی تصدیق کے لیے ایک دم نرس کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ نرس ایک دم اپنے چہرے کے تاثرات کیسے بدل لیتی ہے؟ کمرے میں ٹی وی لگا ہونے کے باوجود خاموشی تھی۔ ''اب آپ کے سوال کا جواب!'' نرس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے دیکھنے میں اتنی شدت تھی کہ وہ اس نظر کی تاب نا لا سکا اور نیچے دیکھنے لگا۔ اسے خود پر غصہ بھی آیا۔ اس نے نظر اٹھا کر نرس کی طرف دیکھا اور دونوں نے ایک مختصر سے عرصے کے لیے ایک دوسرے کی نظر کو جکڑے رکھا۔ ''یہ ہسپتال شہر کے ایک طاقت ور سیاسی اور دولت مند کاروباری خاندان کی ملکیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے کاروبار میں دو نمبر سرمایہ ایک اہم شریک ہے۔ یہ کرنسی کا غیر قانونی کاروبار بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے مختلف ممالک کے اہم غیر قانونی کاروباری لوگوں کے ساتھ ان کا تعلق اور لین دین ہے جن میں دہشت گرد بھی شامل ہیں۔ یہ ہسپتال دہشت گردوں کی پناہ گاہ بھی ہے''۔ وہ رکی اور اس نے عابد کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی نظر میں اب دلچسپی تھی، نرس اسے اپنے نظام کا حصہ نا لگی۔ وہ نرس کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہر سانس کو بھی محسوس کر سکے۔ ''عابد صاحب! یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ میری زندگی غیر محفوظ ہے لیکن مجھے پروا نہیں۔ کسی نے تو کبھی سیٹی بجانا تھی سو یہ نا ممکن سا کام میں نے کیا۔ یہ ایک بے سہارا ہستی ہی کر سکتی تھی''۔ نرس کی آواز میں اب شدت آ گئی تھی۔ وہ ہر لفظ کو غور سے سن رہا تھا اور اس کے اندر کی گہرائی میں ایک خوف بھی جنم لے رہا تھا۔ ''دہشت گرد یہاں سے لانچ کیے جاتے ہیں اور ان کی موجودگی کو چھپانے کے لیے کچھ مریض بھی ہسپتال میں داخل کر دیے جاتے ہیں جیسے آپ''۔ اسے اچانک اپنے پیٹ میں تیزابیت محسوس ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کے خوف زدہ ہونے کی نشانی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ نرس اس سے آگے کوئی بات نہ کرے پھر بھی وہ سب کچھ سننا چاہتا تھا۔

''میرا ان سے کیا واسطہ؟'' اس نے اچانک اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

آپ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اگر فوج، پولیس یا رینجرز وہاں آ جاتے تو آپ کا واسطہ بن جاتا۔ ہسپتال والے ہمیشہ آپ جیسے چند معصوم اور بے گناہ لوگوں کو ساتھ رکھتے ہیں تا کہ اپنی معصومیت اور بے گناہی ثابت کر سکیں''۔ وہ خوف زدہ سی معصومیت کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ہلکا سا مسکرائی۔ عابد کو لگا کہ برف باری کے عین بیچ میں اس کی نظر کے سامنے ایک گلاب کھل اٹھا ہے۔ وہ نرس کو عجیب سی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں اکتاہٹ، حیرانی، گھبراہٹ اور کہیں گہرائی میں امید تھی۔ نرس وہ بات کر رہی تھی جو اس کے دوستوں کے درمیان میں بحث کا موضوع ہوتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ اس نے نرس کی طرف حوصلہ بڑھانے والی نظر سے دیکھا۔ ''عابد صاحب! آپ جانتے ہیں کہ دہشت گردوں کو ختم کرنا اتنا آسان کام نہیں۔ وہ جلد ہی ہر آنگن میں موجود ہوں گے، گھر کے افراد کی طرح، لیکن کوئی انہیں پہچانتا نہیں ہوگا''۔ وہ اٹھ کر کھڑکی تک گئی اور کچھ دیر باہر دیکھتی رہی۔ ''وہ لوگ ابھی تک گھر کے باہر موجود ہیں''۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ اور خوف تھے۔ پھر وہ کسی سوچ میں گم اپنی جگہ پر آ کے بیٹھ گئی۔ ''آپ نے کبھی دوسرے سیاروں سے آئی ہوئی مخلوق پر بنے فلم دیکھے ہیں؟'' نرس تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئی تا کہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکے۔ نرس کو اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے خالی لگا۔

''میں ایسے بے سر و پا قسم کے فلم نہیں دیکھتا''۔ اس نے غصے سے جواب دیا۔ نرس کے چہرے پر تذبذب پڑھا جا سکتا تھا۔

''آپ کا نا دیکھنا آپ کے نقطہ نظر کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک تنبیہ کرنا چاہتی ہوں۔'' نرس نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔''ان فلموں کے کردار ہماری زمین کے جس فرد کو بھی چھوتے ہیں، وہ ان جیسا ہو جاتا ہے''۔ وہ رکی، اس نے تھوک نگل کر اپنا اعتماد بحال کیا،''ہسپتال والوں کو آپ جیسے لوگوں کی تلاش ہوتی ہے۔ آپ تو ان کا پسندیدہ ترین شکار ہیں۔ بڑا گھر، مالی آسودگی اور کوئی ذمے داری نہیں۔ دوسرے سیارے سے آنے والی مخلوق آپ کو چھو لے گی اور آپ بھی ان جیسے ہی ہو جائیں گے''۔ نرس رکی۔ عابد کو اپنے پیٹ میں تیزابیت محسوس ہوئی اور اس نے اٹھ کر پردے میں سے باہر جھانکا، وہاں ٹی وی چینلز کے کریو کھڑے اس کھڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں وہ کھڑی تھی۔''آپ کو حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ان کی اکثریت کو چھوا جا چکا ہے۔ اب وہ آپ کو بھی چھونا چاہتے ہیں''۔ نرس ہنسی، اس کے ہنسنے میں تلخی، مایوسی اور پریشانی تھی۔''آپ اچھے آدمی ہیں، ایسا ہونا نہیں چاہیے لیکن ہونا ہے، میری معرفت!'' نرس نے لمبا سانس لیا۔ عابد حیرت میں گم اسے دیکھ رہا تھا۔ نرس نے اسی وقت بیگ میں سے موبائل فون نکال کر نمبر ملا کے فون اس کی طرف بڑھایا۔ عابد نے خوف، ناپسندیدگی اور پریشانی سے فون پکڑ کر کان کو لگایا تو ادھر سے بھاری اور اجنبی لہجے میں ہیلو کہا گیا۔

اسے اپنے پیٹ میں پھر تیزابیت محسوس ہوئی!

☆☆☆

حسینۂ من

رابعہ الرباء

دھوپ کی تپش سے، سورج کی گرمی سے، اوزون کے شگاف سے، انسانوں کے رویوں سے مخلوق کے سلوک سے برف پگھل پگھل کر نجانے کب سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ کہاں کس سے جھولتی ہے، کہاں کس کو چومتی ہے، کہاں اس کا دم بے دم ہو جاتا ہے، اور کہاں کس کی بانہوں میں سو جاتی ہے۔ اور پھر نجانے وہ کب کس سفر کو، کس اور نکلتی ہے، پھر سے وہی آنکھ مچولی، کسی سے انکھیلیاں کرنا، کبھی کسی درز سے اپنا راستہ بنالینا، کبھی کسی پتھر کو رستے سے ہٹادینا، یوں حدّتوں کا طویل سفر مادوں میں بدل جاتا ہے۔

موتی بننے تک سیپ میں مدتوں محبت کے کرب ناک سفر ہوتے ہیں، تب کہیں کوئی سُچا موتی کسی کی سہاگ کے تحفے میں پرو دیا جاتا ہے، کسی کے گلے، کسی کی انگلی میں اپنے لمس کی گدگداہٹ بکھیرتا ہے۔

حدتوں سے آبشاریں ابل پڑتی ہیں، تو ہم نیاگرا فال، سے سوات فال تک کے حسین نظاروں کو جاتے ہیں۔ اس کی طاقت سے تو پہاڑوں، کہساروں کے سینے شق ہو جاتے ہیں۔ خاک مجال کہ اس کے سامنے چٹان بننے کی جرات کر سکے اور جو بنے وہ فرعون ہے، فرعون خدائی دعویدار۔۔۔

پھر سے ذرا دھڑ ہٹ کر اس کے قریب اس نے اس کے لمبے گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ کو اپنی انگلی میں لپیٹا اور اس کے گال پہ لا کر چھوڑ دیا۔

”حسینۂ من یہ زندگی ہے“۔

حسینۂ من نے بری ادا سے ایک انگڑائی لی، اپنی بڑی بڑی آنکھوں اور لمبی پلکوں کو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پہ وصل کے کئی وحشت ناک لمحے حدت کے نام پہ جوانی میں ہی شکن بن گئے تھے۔ کئی حدتیں ابھر کر شدت میں بدل گئی تھیں۔ اس نے اس کا مرمریں ہاتھ تھاما، یورپی کلاسیکل رقص کی سی گولائی میں گھوم گئی۔ اس کے چاروں اور اک خوشبو بکھر گئی، جو اسی ہی میں مسکرا رہی تھی، جو اس کو ہی تڑپا رہی تھی۔ اس نے تڑپ کر لمحہ بھر میں قریب کے درخت سے ٹیک لگا لی۔

”چمکتی کشادہ پیشانی، بھولی صورت پہ سجی صدیوں پرانی معصوم بادامی آنکھیں، جن میں صدیوں کی انگڑائیاں ٹھہر گئی تھیں۔ بھرے بھرے گالوں پہ اک دن کی بڑھی شیو، مرمریں ہونٹوں سے کچھ اوپر گال پہ جھولتا اک تل، لمبی گردن سے نیچے نکھرا نکھرا کشادہ سینہ، جس کو اس نے اک سیاہ کرتی سے چھپا رکھا تھا، مگر حسن تو حسن ہوتا ہے، سات پردوں میں بھی چھلک و جھلک پڑتا ہے، ریڑھ کی ہڈی سے بغل گیر ہوتا پیٹ، اور اس کے نیچے شفاف زمین پہ کھلی کھمبی، جس کی حفاظت پہ دو سرو ٹانگیں معمور تھیں، گول مٹول چمکتے بازو، جن پہ بال کھلی رات کے ستاروں کی طرح مسکرا رہے تھے۔

وہ اپنے تمام تر حسین لباس کے باوجود اس کے چشم تصور میں نجانے کب سے فطرت کے لباس میں مسکرا رہا تھا۔ جذبات دونوں اور اپنی خوشبو بکھیر رہے تھے۔ ضبط کی وقت بھی دونوں اور یقین و بے یقینی کی ڈولتی کشتی سے انا کی دیوار بنانے کی کوشش میں کامیاب نظر آتی تھی۔

حسینۂ من نے آنکھیں کھولیں اس کی طرف دیکھا۔ غور سے دیکھا، سر تا پا دیکھا، مسوس سی ہو کر آنکھیں چرا لیں۔ آسمان کی اور دیکھ کر کہنے لگی، ”فطرت کے دو رنگ ہیں، وہ پہاڑوں سے چشمے نکال دیتا ہے، لوگ دیوانہ وار اسکی اور دوڑ پڑتے ہیں، کبھی برف کی خود سپردگی اس کو پانی بنا دیتی ہے، پانی چشموں اور آبشاروں کی صورت پیاس بجھانے لگتا ہے، کبھی یہ نظاروں کی پیاس ہوتی ہے، کبھی

یہ جانداروں کی پیاس ہوتی ہے، کبھی پیاس نہیں بھی ہوتی، تو لپٹ کر دلدل میں بدل جاتا ہے، سیم کی شکل بیمار ہو جاتا ہے، اور بیمار کر دیتا ہے۔ مگر گرتا یہ نیچے کی اور ہی ہے، غصے وضبط میں طوفان بن کر اچھل پڑتا ہے، چنگاڑتا ہے تو خوف زدہ کر دیتا ہے۔

دوسرے رنگ میں بھیدی بن جاتا ہے۔ اپنے دل میں وسعت پیدا کر لیتا ہے، خود میں خود ہی ٹوٹ جاتا ہے، سوراخ بن جاتا ہے، مگر باہر سے اس کا رعب، اس کا فطری دبدبہ قائم رہتا ہے اور پھر یہ دل کا سوراخ گہرا ہو کر خود میں اتنی جگہ بنا لیتا ہے کہ یہاں وحی اترنے لگتی ہے، تو کبھی وحی والے کی حفاظت کے لیے مکڑی محبت بن جاتی ہے، کبھی کبوتر بسیرا کر لیتے ہیں، کبھی سانپ نظارے کی تڑپ بن جاتا ہے، تو کبھی کبھار مثل انگار ہو جاتا ہے، مگر ریزہ ریزہ ہونے کی جرات نہیں کرتا، تو کبھی صفا کی شان وشوکت میں بھی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔

اس نے پھر قریب ہو کر، اس کی کمر کے گرد اپنی باہیں پھیلا دیں۔

''تو حسینہء من ہم کوئی فرشتے تو نہیں۔۔۔''

''تو جانِ من ہم مخلوق اشرف بھی تو نہیں''۔

یہ کہتے ہی وہ اس کی باہوں کے گھیرے سے نکل گئی مسکرا کر درختوں سے دور دیکھنے لگی۔

وہ سنجیدہ سا سرو قد، چمکتی آنکھوں معصوم بڑی بڑی صدیوں پرانی آنکھوں والا اسے کسی درخت کے پیچھے کھڑا دکھائی دیا۔

اس کے مرمریں ہونٹوں پہ نظر پڑتے ہی اس کے بدن میں لہریں دوڑ پڑتیں۔ اس کا دل چاہتا جائے اور بے ساختہ اس سے لپٹ جائے، اسے سرتا پا اپنے ہونٹوں سے نم کر دے، اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس بدن سے، وہ صدیوں پرانی مٹی کی تہوں کو کھرچ ڈالے، جو اس کی آنکھوں میں دکھائی دیتی ہیں، جو اسے سوتن کی طرح ڈستی ہیں۔

اس نے پھر سے اس کے گھنگھریالے بالوں کی ایک زلف کو اپنی انگلی میں تھام لیا اور قریب ہو کر اس کے گال ہی پہ چھوڑ دیا۔

''حسینہء من نبوت عورت پہ نہیں اتری، نبی بننے کی کوشش نا کرو، ولائت کا دور بھی نکل چکا، صور اسرافیل تک اب یوسف کی پاس داری سے ذلیخا کا دامن تھام لینا ہی حسن کی معراج ہے، تم کس تلاش میں ہو''۔

اس نے چند الٹے قدم بہت طاقت سے اٹھائے، اجنبی قوت سے بولی۔

''اس سے قید یوسف بہتر، جس سے تن کے در کھل جائیں اور من پیاسا رہ جائے، من کی وادیاں لہلہاتی ہیں تو تن کو تسکین ملتی ہے، تن سے من اور من سے تن کا سودا گھاٹے کا سودا ہے، جس میں من کی ہار ہو، من اس اور جاتا ہی نہیں، من فطرت ہے اور فطرت فطرت سے نہیں لڑتی''۔

اس نے قریب ہو کر پھر اس کے شانوں کو تھام لیا۔

''یہ آئیڈیالوجی ہے، آئیڈیالوجی، بت پرستی۔۔۔''

اس نے ایک ادا سے خود کو اس سے الگ کیا، اس کی نظر پھر آسمان پہ جا کے ٹھہر گئی۔

مشرق سے گہرے سرمئی بادل تیزی سے مغرب کی اور بڑھ رہے تھے، ہوا تھمی تھمی سی تھی، جیسے کسی سے بچھڑ گئی ہو، آسمان گہرا ہوتا جا رہا تھا، جیسے کسی غم کو روئے بنا پی گیا ہو، اس کے باوجود، وہ اتنا حسین، اتنا شفاف تھا کہ زمین خود اس کی اور کھچی چلی جا رہی تھی، اس کے بس میں نہیں تھا کہ اٹھے ساری کششوں کے بندھن توڑے اور جا آسمان سے ملے، کبھی تو وہ ایک ہی تھے، آسماں تک بھی تو زمین کی حدت یہ پیغام لے کر جاتی ہے تو ہی وہ سرمئی ہو کر مور بن، اپنی مورنی کے لیے ہواؤں سنگ رقص کرنے لگتا ہے۔ مست رقص سب جل تھل ہو جاتا ہے۔ دونوں بھیگ کر ملتے ہیں، تو زمین کی کوکھ پھولوں پھلوں سے زندگی کو بہار رنگ کر دیتی ہے، تب آسمان اس محبت کی سائبانی و نگہبانی کرنے لگتا ہے۔

اسے اس چمکتی زمین میں ایک کھمبی بری بے کسی و بے بسی سے کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ وہ حسرت سے اسے دیکھتی، اور

آنکھوں کی رم جھم کو اپنی انگلی سے گالوں پہ پھیلا دیتی ہے۔
ایک انگلی اس کے گال پہ آتی ہے۔
''حسینہ ءمن گویا میری بات سمجھ آ گئی''۔
وہ اس ہاتھ کو دھیرے سے پیچھے کر دیتی ہے۔
''یوسف کو زلیخاں کی بات سمجھ آ جاتی تو اسے بادشاہت بہت قبل مل گئی ہوتی، صحراؤں نے اپنی من مانی کی ہوتی تو پیاسے نا تڑپتے''۔
اس نے اس کی کمر پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بے قراری و بے ضراری سے کہا۔
''حسینہ ءمن یہ ظلم ہے''۔
حسینہ ءمن کراہت سے دونوں ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔
''بڑے دریا دیر سے چڑھتے ہیں اور دور تک چلتے ہیں، گہرے کنوؤں سے پیاس بجھانے گہرائی تک جانا پڑتا ہے''۔
حسینہ ءمن کے روکھے سوکھے رویئے سے جیسے وہ چڑ گئی تھی۔اس نے دور کھڑے ہو کر دونوں باہیں پھیلائیں اور بہت حقارت سے بولی۔
''حسینہ ءمن دیکھو، شیر شیر کے ساتھ جچتے ہی، باز بازوں کے ساتھ۔۔۔''
حسینہ ءمن مسکرائی ''میں بھی تو ہمیشہ سے یہی کہہ رہی ہوں''۔
وہ اور پیچھے کو ہو گئی ''حسینہ ءمن مگر تم بھول گئی کچھ پھل صرف طوفانوں میں مسمار ہونے، تباہ برباد ہونے کے لیے درختوں کا بوجھ بنتے ہیں، یوں ان کا سارا مان ٹوٹ جاتا ہے'' وہ یہ کہہ کر واپسی کے رستے کو مڑ گئی اور جاتے ہوئے، اس پنجرے کا دروازہ کھول گئی جس میں اس نے اپنے وصل سے سدھائے جانور پال رکھے تھے۔
حسینہ من نے وہاں سے سیدھے ہاتھ جنگل کی اور بھاگنا شروع کر دیا۔کبھی کوئی پیڑ اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا تو کبھی کوئی جھاڑی اپنی گود میں چھپا لیتی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھی توں توں جنگل گہرا ہوتا جا رہا تھا۔توں توں تاریکی کے راز کھلتے جا رہے تھے۔وہ سدھائے جانور جلد کہیں پیچھے ہی روشنی میں گم ہو گئے تھے۔اب کوئی آواز، کوئی آہٹ اس کا پیچھا نہیں کر رہی تھی۔مگر وہ آگے بڑھتی ہی چلی گئی کہ جنگل کا کوئی کنارہ ضرور ہوتا ہے اس کا بھی ہوگا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھی، توں توں چڑھائی بھی چڑھ رہی تھی، دور دور تک اونچے، سرسبز و شاداب پودوں، درختوں، پیڑوں سے ڈھکے پہاڑ اپنے پورے رعب و حسن کے ساتھ اسے اپنی اور آتا دیکھ رہے تھے۔تھکن اس کے پور پور میں سما گئی تھی۔مگر سفر رواں دواں تھا، کوئی کنارہ، کوئی آثار حیات، مگر دور دور تک کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اس نے تھکن سے چُور خود کو خوف کے حوالے کر دیا اور چوٹی کی آخری اونچائی پہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔
اسے دھندلاہٹ میں وہ صدیوں پرانی معصوم آنکھوں، مرمریں ہونٹ آتے دکھائی دیے۔اس نے بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں تھام لیا۔اس کا جسم کانپ رہا تھا، اس نے اپنے کاندھوں سے شال اتار کر اسے اوڑھا دی، حدت سے اس کی آنکھیں کھلیں تو برس پڑیں، اس نے اپنے ہونٹوں سے اس کے گال آنکھوں تک خشک کر دیئے۔
''آ گیا ہوں، لے چلو، اگنی کے پھیرے لے لو، یا تین بول پڑھوا لو، چاہو تو اونچے برجوں کے نیچے جا کے انگلی بھر دو، تم فطرت ہو''۔حسینہ ءمن نے اس کے سینے پہ سر رکھ دیا۔
اسکے بعد وہاں بس دور سے اک دھواں دکھائی دیا اور برسوں بعد کچھ زمینی رازداں وہاں پہنچے تو اک آتش فشاں کا انکشاف ہوا جواب ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔اور اس سے ہیرے، زمرد و طرح طرح کے قیمتی جواہرا کٹھے کیے جا رہے تھے۔

☆☆☆

کاجوفینی کی خالی بوتل

زین سالک

خیر یہ انتھونی مجھے کیا ستائے گا۔ مجھے ناریل فینی کشید کرنے کا فن آتا ہے۔ اگر یہ بار اس دور میں بند بھی ہو جائے تو میں اپنے پرکھوں کو یاد کر کے فینی تو پی سکتا ہوں۔ میری تیار کی ہوئی نفیس و پُر ذائقہ فینی! جس کے چرچے میرے دوست احباب کرتے ہیں اور اس کے قائل ہیں۔ میں جب اسے تین بار کشید کرتا ہوں تو یہ دیوتاؤں کا مشروب بن جاتا ہے اور اس میں صحت بخش فرحت اور شفافیت اتر آتی ہے۔ میری خوابگاہ میں گونزیلس سینئر، دادا روڈریگیس، پردادا تھامس گونزیلس کی پوورٹریٹس مجھے ہنستی، مسکراتی اور خراج عقیدت دیتی محسوس ہوتی ہیں۔

میرا نام گونزیلس ہے۔ میں البرٹ گونزیلس سینٹ پیٹرکس اسکول کا ایک ریٹائرڈ گون اسکول ٹیچر ہوں۔ جی۔ گوا سے آیا ہوا کیتھولک کرسچین ہوں۔ میں اپنی زندگی کے بقایا دن کچھ تو ''بلیک لیبل'' کے پیچھے موجود کڑوے شربت کو تھوڑے سے سوڈے میں ملا کر چسکیوں میں اپنے ماضی کے روشن دنوں کو منور کرتا ہوں اور کچھ اپنے نیکر و سویٹ شرٹ میں ڈھنپے سراپا کو راکنگ چیئر پر جھول جھول کر۔ پھر کچھ اپنے آپ کو گھر کے ہال میں آویزاں قد آدم آئینے میں ہر روز موجود پا کر گذارتا ہوں۔ ویسے تو اب کوئی بھی دن مجھے نہیں بھاتا لیکن آج کا دن مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ صبح ہی صبح میونسپلٹی والوں کا نوٹس ملا کہ وہ اس پتھروں کی عمارت کو جس پر میرا اور میرے پرکھوں کا قانونی حق ہے گرانا چاہتی ہے۔ اگر یہ عمارت مخدوش ہے اور خود بخود گرنے والی ہے تو بلدیہ کو کیا تکلیف ہے؟ میں جانتا ہوں کہ یہ ہمیں صدر کے اس پرائم علاقے سے بے دخل کرنے کی سازش ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ آج بار والے نے بھی مجھ سے لائسنس طلب کیا۔ کہتا ہے سختی ہے آج کل۔ حیرت ہے ہم اتنی صدیوں کے بعد بھی اپنے آپ کو یہاں کے باسی تسلیم نہیں کروا سکے۔ ہمراہ یہاں گوا کا نو آبادھونا۔۔۔ میرا چوتھی نسل سے اور اس کا تیسری نسل سے ہے۔ ہمارے پرکھوں میں آپس میں پیار و محبت اور باہمی افہام و تفہیم کا رشتہ تھا۔ یکایک یہ سب بھلا کر یوں غیریت اور بیگانگی پر اتر آنا، واقعی بدلتے بے وفا زمانے کی عین مثال ہے۔ انتھونی کا یہ کہنا کہ میں عجائب گھر بنانے کے مشن میں ناکام ہو گیا ہوں، میں قطعی درست نہیں سمجھتا۔

''ویرونیکا کو گوا گئے کئی سال بیت گئے۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ اب تو ایک عرصہ دراز سے میں نے ان سالوں کا حساب کتاب رکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

شاید وہ بھی میری طرح وہاں ''کاجوفینی'' پیتی ہوگی۔ میں جب بھی سال دو سال میں گوا جاتا ہوں تو ''کاجوفینی'' ہی پیتا ہوں۔ اصلی کاجوفینی نہ تو یہاں طریقے سے کشید کی جاسکتی ہے اور نہ اس میں وہ بات ہو سکتی ہے جو گوا میں ہوتی ہے۔ یہ ایک پیچیدہ اور دشوار طریقہ ہے۔ اور اب تو گون لوگ فینی کا عالمی دن بھی منا رہے ہیں۔ خوب ہنگامہ رہے گا۔ اس کا نشہ انتہائی سرعت سے چڑھتا ہے۔ اور دنیا مافیہا سے بیگانہ کر کے سکون و طمانیت سے جینے کا خاص گون انداز دیتا ہے۔ یہ گون ثقافت بھی خوب چیز ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس کے ڈانڈے ایک طرف پرتگال و اسپین و دوسری طرف گوا اور پھر یہاں سے پاکستان اور دنیا کا کونسا ملک نہیں ہے جہاں ہماری ثقافت کی نقل مکانی کا سلسلہ جاری ہے۔ ہمیں آپ خانہ بدوش تو کسی معنوں میں کہہ سکتے ہیں لیکن ہم جس جگہ ٹھہرتے ہیں۔۔۔ عرصہ دراز۔۔۔ برسوں، صدیوں، قرنوں قیام کرتے ہیں اور وہاں کا کلچر بھی ہمارا ایک اور حصہ بن جاتا ہے۔ ہاں البتہ ہم اپنی بنیادی روایات، رسوم و رواج سے بھی بری طرح چمٹے رہتے ہیں۔ گوا میں کبھی پرتگالی ثقافت نے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

مادری زبان البتہ کنکنی کہلاتی جسے ہم لوگوں نے سنبھال کر اس میٹرو پولیٹین کی لغاتی یلغار میں رکھا ہوا ہے۔ اور یہ ہماری خفیہ زبان کے طور پر بھی ہمارے ساتھ ساتھ ہے اور ہماری ثقافت کا ایک حصہ بھی ہے۔

میرے والد بھی اس کا بہت خیال کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے والد اور ان کے والد بھی ایسا ہی کرتے تھے اس لیے ہم سب بھی یہی کرتے ہیں۔

''دھڑ، دھڑ، دھڑ۔۔۔!''

''میں ہال میں ہوں۔۔۔کھولتا ہوں۔۔۔اندر آجاؤ۔۔۔سانچو میرے دوست''۔

''میں یہ ایک اور 1933 کی ٹرام کا ماڈل بنالایا ہوں۔۔۔!''

''شاندار سانچو۔۔۔اب تم ہی میرے ساتھی رہ گئے ہو۔ یہاں رکھ دو احتیاط سے''۔

پیچھے میرے شیشے کی الماری ماڈلوں اور ٹرام کی تاریخی کتابوں سے بھری ہے۔ جن میں کراچی کی پہلی دخانی ٹرام، گھوڑا ٹرام اور پٹرول ٹرام کے سانچو کے بنائے جیتے جاگتے ماڈل ہیں۔ سانچو میرے خوابوں کو حقیقت بنانے والا اہم کردار!۔

میں انہیں دیکھ کر اپنے بچپن میں چلا جاتا ہوں۔۔۔وہ بچپن جس کے بارے میں گوا کی کہاوت ہے کہ سچ بولنے کی عمر بارہ سال ہے۔۔۔! میں گونزیلس سنئیر کا ہاتھ پکڑے۔۔۔صدر سے بولٹن مارکیٹ، سولجر بازار، کبھی بندر روڈ سے کیاڑی اور کبھی صدر سے کنٹونمنٹ اسٹیشن۔۔۔ٹرام کا ڈرائیور ٹرام کے ایک سرے پر آگے کھڑا ہو کر کار کے ہینڈ گیئر کی شکل کا ہینڈل گول گول گھماتا۔۔۔ اور اس کے عین سر پر لگی گھنٹی لوگ ڈوری کھینچ کر رکنے کے لیے بجاتے اس کی رفتار اتنی ہوتی تھی کہ لوگ با آسانی چلتے میں چڑھتے اترتے رہتے۔ ٹرام پٹہ سڑک کے بیچوں بیچ بچھایا گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف ٹریفک چلتا رہتا۔ اونٹ گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، بیل گاڑیاں، یکے، تانگے اور بگھی جسے وکٹوریہ کہتے تھے۔ پھر بسیں آئیں سائیکل رکشہ آئے۔ آٹو رکشہ آئے۔ کان پڑیں آوازیں سنائی نہ دیتیں۔ میں خاموشی سے بچپنے سے لڑکپن اور پھر جوانی میں آتا گیا۔ ٹرام چلانے والا اپنے پٹے پر گھنٹیاں بجاتا رہتا۔

جب یہ بے ہنگم ٹریفک ضرورت سے زیادہ بڑھا تو ناخوشگوار حادثات رونما ہونے لگے۔ یہاں تک کہ 4 اپریل 1975 آگیا۔ جب آخری ٹرام بھی اپنا آخری زور لگا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اس وقت تک ٹرامیں بھی اچھی خاصی بوڑھی ہو چکی تھیں۔ مضمحل، غیر معمولی طور پر ڈیلتی ڈولتی، ہانپتی کانپتی، دم توڑتی۔۔۔اور کبھی اچانک بہت سا دھواں اگلنے لگ جاتیں۔ لیکن یہ ڈیزل گاڑیوں کے دھویں سے قدرے مختلف ہوتا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب مجھے پہلی بار ٹرام میوزیم بنانے کا خیال آیا۔ مجھے پاپائے اعظم کے وہ الفاظ کہ ''دنیا میں کچھ کر کے جاؤ۔ کوئی بڑا کام'' یاد آتے تو جوش و جذبہ اپنے اس مشن کا اور بڑھ جاتا۔ میرا جنون ویرونیکا کے صبر و تحمل کی حدود عبور کرنے لگا تو اس نے آخر کار نا امید ہو کر گوا جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ میں ہر طرف سے نا امید ہو کر اپنے گھر کے خرچے کا یہ پیشہ بھی اپنے مشن کی نظر کرنے لگا تھا۔ اور ساتھ ہی اسکے دل میں نفرت کا بیج بھی بو دیتا۔ لیکن اس پر میرا اختیار بھی نہ تھا۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس میں شاید ہماری بے اولادی اور محرومی کا نتیجہ بھی نہ ہو۔ یا پھر میری گھر کی طرف سے بے فکری کیونکہ ویرونیکا بھی سینٹ جوزف گرلز سکول میں پڑھاتی تھی۔ شوقیتاً۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس وقت تک وہ بھی جا چکی تھی۔

''ویرونیکا کی کوئی خبر؟''

میں نے سانچو کی بات کاٹی۔

''میں تمہارے لیے پیگ بناتا ہوں''۔

میں ویرونیکا کو پھر سے یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ پھر اسے بھولنا مشکل ہو جاتا۔

گوا میں ابھی تک سطح زمین پر چلنے والی ٹرام نہیں آئی تھی۔ یا شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔ وہاں ستونوں پر پھسلنے والی ٹرام آگئی ہے۔ ٹرام کی ترقی یافتہ شکل 'مونوریل' جو ہوا میں معلق ستونوں پر سرعت سے پھسلتی چلی جاتی ہے۔

ہنہ تو کیا ہوا۔ میں نے خیال جھٹکا۔

''میں برف کے ٹکڑے کٹوا کر لانا نہیں بھولا۔ تم مجھے پیئے پلائے بغیر تو جانے نہیں دو گے۔ کچھ دیر تو ہم بیٹھیں گے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا''۔

سانچو نے مجھے خیالات میں گم ہونے سے بچانے کے لیے کہا۔ اور میں نے پھر سے گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ ''اچھا یہ دیکھو۔ مختلف دور کی ٹرام کے مستعمل ٹکٹوں کی یہ گڈی میں نے جمع کر کے اس البم میں لگا دی'' ۔۔۔ میں نے فخریہ سانچو کو دکھائی۔

''کیوا چھی لگ رہی ہے، نا؟''

''ہاں شاندار!۔ سانچو نے چسکی لیتے ہوئے کہا۔

اور پھر ہم ماڈلوں، ٹکٹوں، بندر روڈ، کیماڑی، سولجر بازار، بولٹن مارکیٹ کے قصوں میں لگ گئے۔ اور سانچو ویرونیکا کا موضوع بھول گیا۔ اور پھر سانچو کے گھر جانے کا وقت بھی اتنی جلدی آگیا۔ اسے بھی اپنی بیوی کا سامنا کرنا تھا۔ اور اس وقت کا حساب دینا تھا۔ میں اسے رخصت کر کے اپنی خوابگاہ میں آگیا۔ اور پھر شادی کے دن کی دلہن والی دھندلی پڑتی قدیم تصویر کے ٹیبل فریم میں وقت اتر گیا۔ ہماری شادی عین اس دن ہوئی تھی جب کراچی کے میئر نے قائداعظم کے اعزاز میں شہری استقبالیہ دیا تھا۔ تقریب کے یہ دونوں کیک کراچی کے مشہور گون بیکر P.R. Preira کی بیکری میں تیار ہوئے تھے۔

ہال میں شادی کے رقص میں ہم دنیا مافیہا سے بے خبر چابی والے دلہا دلہن کی طرح کانچ کے گنبد میں لوا سٹوری کی دھن پر ابدی رقص کرتے رہے۔ جھومتے گھومتے رہے۔ شہر کی کئی معزز شخصیات نے اس میں شرکت کی تھی۔ مجھے گنبد کے شیشے میں ایسٹ انڈیا ٹرام کی رسمی افتتاحی تقریب کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔

کمشنر سندھ ہنری نیپیئر، سندھ کا کمانڈنگ آفیسر جنرل جی لک اور اس کی بیٹی اسٹیلا، اسسٹنٹ کمشنر ڈاکٹر جی یولن، سابق والی قندھار ہز ہائی نس پرنس شیر علی خان۔ اسٹیلا نے اپنے منگیتر کیپٹن تھامس کے ساتھ والہانہ رقص کر کے ان سب کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی۔

اور پھر جیسے ٹرام کی گھنٹی سی بجی۔

''ڈنر از سروڈ'' کا اعلان ہوا۔ ویرونیکا مجھے اپنا سفید ملکوتی عروسی لباس میں حیران پریشان سی نظر آئی۔

''کہاں کھو گئے تھے ۔۔۔؟ کیا ہوا تمہیں ۔۔۔؟''

اور میں واپس لوٹ آیا۔ میں نے مدہوشی سے چونکتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں''۔

رقص ختم ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اشارتاً زم کہا اور واپس شادی میں لوٹ آئے۔ اور پھر ہم علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی پارٹیوں کی طرف، کنکنی میں جسے سرحدی لکیر شمی کی رسم کہتے ہیں، آمنے سامنے تقسیم ہو کر فریقین بن گئے۔ اب کسی بھی فرد نے اس فرضی لکیر کو اس وقت تک پار نہیں کیا جب تک کہ ویرونیکا کے گھر سے آئی ہوئی شراب انڈیلی جاتی رہی۔ اور احباب نے پی نہ لی۔ میرے گھر والوں نے زم عبور کی۔ پھر دلہا دلہن کی خوشحال زندگی کے لیے دعائیہ ہوا اور پھر ویرونیکا کے دور شتہ دار زم عبور کر کے آئے اور اگلے روز دلہن کے گھر مدعو کرنے کا سندیسہ Apovnnem دیا۔ تب کہیں جا کر زم کی پابندی ختم ہوئی۔ آج جب میں اپنی

زندگی کو دیکھتا ہوں تو یہ زم ابدی لکیر بن کر سامنے آجاتی ہے۔ جو ہمیں مرتے دم یا اس کے بعد ہی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے دے گی۔ ورنہ پر یسٹ ہمارا تابوت روک کر رکھیں گے۔ آج میں ماضی کی حسین یادوں میں کھویا تو مجھے گوا کی یہ سچی کہاوت قدرتی طور پر یاد آگئی کہ دور سے نظر آنے والی پہاڑی کتنی حسین لگتی ہے اور نزدیک والی انتہائی بدصورت۔ نرگسیت کسی بھی شکل ہو بری ہوتی ہے۔ اپنے آپ میں گم شخص دوسرے کے درد کا کیا احساس کر سکتا ہے۔ اس کی تمام توجہ صرف اپنی عقلمندی کے بارے میں دوسروں کے سامنے گفتگو اور خصوصاً مجھے تمسخر کا نشانہ بنانا ہے۔ مجھے ٹرام کے شور شرابے اور قہقہوں کی آواز گھنٹیوں کی آواز لگتی ہے۔ ہماری شادی پورن ماشی کی رات طے ہوئی تھی۔ اس کی شادی کے خوابیدہ گاؤن پر میری نظر بار بار جارہی تھی۔ اسکا کپڑا ڈیزائن اور رنگ ایسی شام کے وقت چمکتی چاندنی کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ اور یہ واقعی ہر ایک کی توجہ کا مرکز تھا۔ یہ کھلی جگہ میں پہننے کے لیے نہیں تھا۔ اس ایمپائر سٹائل کے گاؤن کی ویسٹ لائن، کمر کی پٹی ذرا اوپر تھی۔ اور نیچے نیلی سکرٹ۔ جس کا دور کی دلہنوں میں چلن تھا۔ جو اپنی زندگی کے سب سے اہم دن دبلی نظر آنا چاہتی تھیں۔ یہ اے ٹائپ کا گاؤن اچھی طرح فٹ نظر آتا تھا۔ اس کا جسم اتنا خمیدہ نہ تھا شاید اس لیے اس نے بھی یہ پسند کیا تھا۔ نئی نویلی دلہن کو ٹرام کی افتتاحی تقریب کی طرح سجایا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ مجھے منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ لیکن سست رو ٹرام پر کچھ دیر سفر کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سست روی جلد ہی پہلے کوفت اور پھر بیزاری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جو بعض انتہائی حالات میں ٹرام کی خوبصورت گھنٹی کھینچ کر روکنے کا سبب بن سکتی ہے۔

آپ میرا اشارہ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ بالکل ایسے جیسے ٹرام میں کسی کے پہلی بار بیٹھنے پر شروع میں کانوں کو یہ شور بھی بھلا لگتا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ ساعت پر ہتھوڑے برسانے لگ جاتا ہے۔ یہ آواز گھنٹوں سنائی دیتی ہے۔ مگر مجال ہے کہ ذہن اس کا عادی ہو جائے۔ کبھی نیند میں اونگھ سے، کبھی سفر کے جھٹکے سے اور کبھی ساتھ کے مسافر کے دھکے سے یک دم تازہ دم ہو کر پھر بھرسنا شروع کر دیتی ہے۔ اور نئی شدت سے ذہن پر حاوی ہو جاتی ہے۔

ٹرام اور عورت دونوں کی مماثلت وخصوصیات باوجود اپنا گلا گھونٹنے کے پیچھا چھوڑنے کا نام نہیں لیتی ہیں۔ جیسے میری شادی کی یہ یادداشتیں!۔

جب میرا بیسٹ مین میرا دوست سانچو بنا تھا۔ اور اس کی برائیڈ، فلاور گرلز اور میڈ آف آنر نے تتلیوں جیسے لباس پہنے تھے۔ پابرکت دلہن کا کتا ہوا ان سلا کپڑا صدور رکھا اور دعائیہ لاطینی کلمات سب نے گائے تھے جو آج بھی میرے دل میں گونج رہے ہیں۔

Tabeo,Laudate Domino, omnes gentes

میں نے اگر ٹرام میوزیم کراچی کا خواب دیکھا تھا تو یہ گونزیلیس گوا خاندان کی عظیم روایات اور ثقافت سے محبت کے عین مطابق ہی تو تھا۔ لیکن ہر عورت تو میرے مدعا تک نہیں پہنچ سکتی۔ خاص کر ویرونیکا جیسی۔ اور نہ ہی مجھے اپنے ذہن میں اس کا کوئی فرق کبھی محسوس ہوا۔ میں زندگی کیسے گزارتا ہوں۔ کیا کچھ اچھا سمجھتا ہوں یہ تو میرا فطری حق ہے نا آخر۔ چاہے سماج میں کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ویرونیکا نے میرے ٹرام کی کتابوں کے شوق کو بھی سوکن ہی کی نظر سے اگر دیکھا ہے ہمیشہ تو میں اپنے آپ کو کیوں اس کا ذمہ دار ٹھہراؤں۔ خیر یہ بھی تو میرے ماضی کا ایک حصہ ہے۔ جسے میں بدل نہیں سکتا۔ میں ویرونیکا کو نہ بدل سکا۔ اب زمانہ بھی کتنا بدل گیا ہے۔ ٹرام بھی چھتیس سال پہلے ختم ہو گئی تھی۔ اور اسے گئے ہوئے بھی اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔ شادی کے بعد کرسمس کی نومبر میں خریداری اسنے اپنی پسندیدہ ایمپریس مارکیٹ سے کی تھی۔ جہاں ایک ہی چھت تلے سب چیزیں مل جاتی تھیں۔ سنگترے کے باریک کٹے ہوئے خشک چھلکے، ناریل کے گودے والا دودھ، مہک، ناریل، جاگری، بیریاں، اسٹرابری، بلیو بیری، پستہ، کشمش وغیرہ۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے تمام گون روایتی میٹھے، نمکین کھان پان بنائے ہیں۔ پانچ مختلف قسم کی نافیاں (اخروٹ، پستہ، ناریل،

بادام، کاجو وغیرہ) کلکل، مارزی پان، تتلی نما پنیر والے خستہ تہہ دار بسکٹ، تین طرح کے فروٹ، مرمریں اور ہاٹ کیک، کیرامل براؤنی، ناریل گھونگھے، کیرابولہ، دہرا مٹھائی اور گوا کی مشہور زمانہ مٹھائی، بے بینا۔

یہ اس نے ناریل کے پین کیک کی تہہ بچھا کر بنائی تھی۔ اس کے لوازمات میں اس نے جوتری، جاگری، مغز، ناریل اور ناریل کا دودھ شامل کیا تھا۔ ان اجزاء کا چناؤ اس کی گوا کی Rodrigues گھرانے سے مخصوص تھا۔ میں نے بھی ناریل فینی بڑی محنت سے کشید کی تھی۔ اور یہ بڑی بڑھیا بنی تھی۔ کرمس کی اولین شب کی عبادت ہم نے جمعہ کی رات ہی سینٹرل بروکس میموریل چرچ میں کرلی تھی۔ جہاں صرف پندرہ سولوگوں کی گنجائش تھی۔ گو کہ ہم 24 دسمبر یا کرمس کی شام بھی یہ کرسکتے تھے۔ ہم رش کی وجہ سے شہر کے سب سے بڑے سینٹ پیٹرکس چرچ میں نہیں گئے تھے۔ جہاں پانچ ہزار سے زیادہ لوگوں کا اژدہام ہوتا ہے۔ اور ہماری اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ اس انسانی ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں ذرا دیر ہی ٹھہر سکتے۔ ہم سروس کے بعد ان چھٹیوں میں زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ ایک دوسرے کی معیت میں گھر میں گزارنا چاہتے تھے۔ کوئی مہمان اگر کرمس پہ آئے تو آئے۔ ہمارا کہیں جانے کا پروگرام نہ تھا۔ ہم گھر پر مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا چاہتے تھے۔

آج میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہمارے یہاں کی یہ کہاوت ویرونیکا کے لیے ہی کہی گئی تھی کہ عورت ذات ناقابل بھروسہ ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے وہ مرد سے مطالبات ہی مطالبات، شادی کے بعد شک ہی شک اور موت کے بعد ہی اسے تعظیم دیتی ہے۔ اس کی ضدی طبیعت دیکھ کر شاید وہ خود سے یہ بھی نہ کرے۔ لیکن اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا تو لوگ اسے اپنے رویئے سے اس پر مجبور کردیں گے۔ میں چشم تصور سے اپنے جنازے پر اس کا ماتمی لباس اور ہیٹ اور چہرے پر کالی جالی دیکھ رہا ہوں۔ اور جس پہ اسے چاروناچار آنا پڑے گا۔ میں نے ابھی تک اپنی زندگی میں اس کی موت کا کوئی منظر سوتے جاگتے، کھلی آنکھوں نہیں دیکھا۔ اسکی غیر فطری نفرت کو دیکھتے ہوئے!

سچ ہے کھولتا ابلتا دودھ نہ پیا جاسکتا ہے نہ اگلا جاسکتا ہے۔ گون یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ کوئی پھل اتنا بھاری ہرگز نہیں ہوتا کہ بیل اس کا وزن سہار نہ سکے۔ میں نے اسے کھپریل کی چھت تلے پناہ تو دی ہوئی تھی آخر۔ خیر اب ان باتوں کا کیا فائدہ سوائے دل جلانے کے۔ یہ قصہ پرانا ہے بہت ہی پرانا۔ ایسا جیسے کراچی ٹراموے کی تاریخ 90 سال پر پھیلی ہوئی ہے۔

ہم کیتھولکس کے ہاں Veronica سے میری طلاق نہیں ہوسکتی۔ اور ٹرام سے میرا ناسٹلجیہ اور اس کی تاریخ سے کوئی بھی میرا پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

ٹرام تو اب بند ہوچکی ہے۔ میری اور اس کی زندگی کے فیصلے آہستہ خرام ٹرام کی پٹری کی طرح چلتے چلتے بڑھ گئے ہیں۔ اور ہمارے بیچ یوں لگتا ہے کہ ابدی زم کھینچ گئی ہے۔ ٹرام بند ہونے کے بعد لوہے کی بھوکی دنیا میں اس Rolling Stock اور انفرا اسٹرکچر کا کیا بنا۔ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے۔ سوچ سکتا ہے کہ پٹریاں اکھڑ کر کہاں گئیں۔۔۔؟ اسی کی دہائی میں اس کی باقی ماندہ ٹرام بیٹے کو زنگ آلود ہونے صدر کی سڑکوں پر۔ دلخراش مناظر میری یاداشت پر آج تازیانے لگاتے ہیں۔ ایک اور کرمس خاموشی سے گزر جانے کے لیے آنے والی ہے۔

میری اب کوئی کرمس نہیں رہی۔ نہ ویرونیکا کی جلی کٹی باتیں ہیں اور نہ ہی دل کو ٹھنڈک دینے والی ٹرامیں۔ جن پر سفر میرے کرمس کا لازمی جزو ہوتا۔ مجھے تحفہ دینے والے بھی بھلا چکے ہیں۔ کیونکہ میں نے انہیں ٹرام میوزیم میں مدد دینے کے لیے خطوط اور بروشر نہ بھیجے تھے۔ اور ٹرسٹ بنانے کے لیے اپنے مشن میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔

یہ دروازے پر کون آیا!

''آؤ سانچو میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کتنا خوبصورت گفٹ ریپر میں لپٹا ہوا گفٹ ہے۔ یہ تحفہ کیسا ہے۔۔۔؟ مجھ پہ ویسے ہی تمہارے بہت احسانات ہیں''۔

''یہ تمہارے لیے گوا سے آیا ہے!''

''گوا سے؟''

اب گوا میں میرا کون رہ گیا ہے۔۔۔ویرونیکا تو مجھے کچھ بھیجنے سے رہی!''

''یہ پارسل اسی نے تمہیں بھیجا ہے۔۔۔اچھا میں چلتا ہوں۔۔۔ذرا اپنے بھانجے کو رخصت کر دوں۔۔۔وہ ہی یہ لے کر آیا ہے گوا سے''۔

''اچھا گاڈ بلی ود یو۔گڈ نائٹ''۔

''گڈ نائٹ۔۔۔میں کل تم سے ضرور پوچھوں گا کہ اس ریڈ باکس میں کیا ہے؟

''اوکے۔۔۔ضرور۔۔۔بائی۔۔۔!''

''بائی!''

اور اگلے دن جب گونزیلس نے سانچو کے دروازے پیٹنے پر بھی اسے نہ کھولا تو اس نے دروازہ زور لگا کر کھول لیا۔اسے گونزیلس نیم اندھیرے ہال کی راکنگ چیئر پر بیٹھا نظر آیا۔اس کی گود میں اس کا بنایا ہوا ٹرام کا آخری ماڈل تھا اور ہاتھ میں ویرونیکا کی بھیجی ہوئی ''کاجوفینی'' کی خالی بوتل۔اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا!

☆☆☆

اکائی

سلیم آغا قزلباش

اس نے اپنی جان پر کھیل کر اس لڑکی کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کی مگر جب وہ اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھائے کنارے پر پہنچا تو وہ دم توڑ چکی تھی۔ لیکن قتل کا الزام اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ کسی نے بھی اسے لڑکی کو بچاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ اس نے کسی پرانی رنجش کی بنا پر اسے پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا ہے۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد قبیلے کے سرپنچوں نے متفقہ طور پر اس کے لیے یہ سزا مقرر کی کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں، پیروں میں سے کسی ایک جوڑی کو کٹوانے یا اپنی دونوں آنکھیں نکلوانے کا انتخاب خود کرے۔ اس انتخاب کے لیے اسے صرف رات بھر کی مہلت دی گئی اور وہ بھی اس کڑی شرط کے ساتھ کہ اگر اس نے پو پھٹے تک کوئی فیصلہ نہ کیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

جب وہ اسے کوٹھری میں بند کر کے چلے گئے تو اس نے دو تین گہرے سانس لے کر خود کو ذہنی طور پر مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ اسے ایک حتمی فیصلے پر پہنچنا تھا اور اس فیصلے پر ہی اس کی آئندہ زندگی کا سارا دارومدار تھا۔ اس کا ایک غلط قدم اس کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا سکتا تھا۔ یکبارگی اس کے تن بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ دل سینے کی بند کوٹھری کی دیواروں سے یوں دیوانہ وار ٹکرانے لگا جیسے اسے توڑ کر فرار ہو جانا چاہتا ہو۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی سیلن زدہ بوجھ کونوں کھدروں سے اس کی جانب خاموشی سے سرکتا چلا آ رہا ہے۔ وہ نڈھال سا ہو کر سرکنڈوں سے بنی چٹائی پر چت لیٹ گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بے قراری سے اپنی ہتھیلیوں کو مسلنے لگا۔ یہ سوچ اسے بار بار ڈس رہی تھی کہ عجیب و غریب نوعیت کی یہ سزا آخر اس کے لیے کیوں تجویز کی گئی ہے! فرد جرم عائد کرنے کے بعد فیصلہ بھی سرپنچوں کو ہی سنانا چاہیے تھے۔ شاید وہ مجھے خود میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہتے ہیں۔ انتقام لینے کا یہ کیسا بھیانک انداز ہے! یہ دہری چال ہے، مکروہ سازش ہے۔ خود اپنے لیے سزا کا تعین کرنا کتنا جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے اس بات کا تجربہ اسے ہو رہا تھا۔

سب سے پہلے اس کی آنکھوں نے اس لڑکی کو دریا میں غوطے کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر اس کے دونوں پاؤں اندھا دھند بھاگتے ہوئے دریا کنارے پہنچے تھے۔ اس کے بعد اس کے دونوں ہاتھوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر دریا میں ڈبکیاں کھاتی لڑکی کو پکڑ لیا تھا اور اسے اٹھا کر کنارے پر لے آئے تھے۔ مطلب یہ کہ اس کی آنکھیں، ہاتھ پاؤں سب اس عمل میں برابر کے شریک تھے۔ مگر ان تینوں میں سے پہل کس نے کی؟ آنکھوں نے، نہیں پیروں نے یا پھر شاید ہاتھوں نے؟ لیکن اس ''غلطی'' کی اصل ذمہ داری کس کے سر تھی؟ یقیناً اس کی آنکھوں نے اسے موت کے کنویں میں دھکیلا تھا۔ مگر آنکھیں تو بے بس تھیں۔ وہ تو صرف موقع کی گواہ تھیں۔ غلط قدم تو پیروں نے اٹھایا تھا کہ ایک دم دوڑ پڑے تھے۔ لیکن اصل کام تو ہاتھوں نے ہی انجام دیا تھا۔ مان لیا کہ آنکھوں اور پیروں سے غلطی سرزد ہو گئی تھی لیکن کم از کم ہاتھوں کو اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ اس وقت رک جاتے تو آج اسے ان جانکنی کے لمحوں سے تو نہ گزرنا پڑتا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ بس اندر سے حکم ہوا تھا اور اس نے جھٹ اس کی تعمیل میں لڑکی کو بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ کون تھا یہ حکم صادر کرنے والا!۔۔۔ دوسری طرف گزرتا ہوا ہر پل اور دل کی دھڑکن اسے صبح کی جانب دھکیل رہی تھی۔ پہلی بار اسے صبح کے وجود سے شدید نفرت ہونے لگی اس کا اندر چیخ چیخ کر واویلا کرنے لگا کہ اے کاش باہر ایسی کالی آندھی امڈ پڑے کہ صبح ملتوی ہو جائے۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا جب اس نے اپنے دونوں پیر کٹوانے کا ارادہ کرلیا اور قدرے پرسکون ہوگیا۔ مگر جب اچانک اسے شدید پیاس لگی اور وہ کوٹھری کے دوسرے کونے میں دو اینٹوں پر رکھی ملگجی سی صراحی میں سے پانی پینے کے لیے اٹھا اور چل کر وہاں تک پہنچا تو یکا یک ایک سنسناہٹ بھری لہر اس کے پیروں کے تلووں میں سے رینگتی ہوئی اس کے سارے وجود میں پھیل گئی۔ اسی پل اس کی پیاس بھی ایک دم معدوم ہوگئی اور وہ الٹے قدموں دوبارہ سرکنڈوں کی چٹائی پر آکر ڈھیر ہوگیا اور بے اختیار اپنے دونوں پیروں کو پیار سے سہلانے لگا۔ یہ سوچ کر اس کا دم رکنے لگا کہ بغیر پیروں کے زندگی کیسے گزرے گی۔ فقط ایک قدم اٹھانے کے لیے دو بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ یوں بھی جو کوئی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے اس کی مثال اس عمارت ایسی ہوتی ہے جو بنیاد کھودے بغیر کھڑی کی جا رہی ہو۔ ظاہر ہے وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی، زمین بوس ہو جانا اس کا نوشتہ تقدیر ہے۔

رات کا دوسرا پہر تقریباً آدھا گزر چکا تھا اور وہ انتخاب کرنے کی ادھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا۔ یکا یک اس نے اپنے دونوں ہاتھ کٹوانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ اسکے لیے تنے ہوئے رسے پر بغیر کسی سہارے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلنے کا مرحلہ تھا اور یہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ خوف ناک شکل اختیار کر گیا تھا کہ نیچے گہراؤ تھا جس میں ناگ پھن اٹھائے شوکریں بھر رہے تھے اور بچھو اپنے زہریلے ڈنک لہرا رہے تھے۔ معاً اسے یوں لگا جیسے سارے سانپوں اور بچھوؤں نے بیک وقت اس پر ہلہ بول دیا ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں سے ان موذیوں کو اپنے بدن سے نوچ نوچ کر پرے پھینکنے لگا۔ اسی لمحے اسے اپنے دونوں ہاتھ کٹوا دینے کے فیصلے کی سنگینی کا علم ہوگیا۔ ایک بار تو اس دہشت ناک تصور سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ ٹنڈ منڈ بازوؤں کے ساتھ آدمی کتنا بے بس اور بے یار و مددگار ہو جاتا ہے۔ ہاتھ تو دو ایسے پتوار ہیں جو وجود کی ناؤ کو زندگی کے پرشور دریا میں سفر جاری رکھنے کے قابل بنائے رکھتے ہیں۔ ان کو کٹوانا، زندگی کی ناؤ کو بے پتوار کرنے کے مترادف ہے۔ تب دونوں ہاتھ اس کے سامنے دو ایسے ورق بن گئے جن پر اس کی آنے والی زندگی کی پوری کہانی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے پڑھا کہ بغیر روٹی کے ایک لقمے اور پانی کے ایک گھونٹ کے لیے بھی اسے دوسروں کا محتاج ہونا پڑے گا۔ محتاجی اور بے بسی کی ایسی زندگی آدمی کو زمین پر رینگنے والے کینچوے سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔

رات کا تیسرا پہر آخری ہچکیاں لے رہا تھا جب اس نے اپنی دونوں آنکھیں نکلوا دینے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ ہاتھوں سے ٹٹول کر زندگی کسی نہ کسی طرح گزاری جا سکتی ہے۔ بلکہ اگر ہاتھ میں چھڑی تھام لی جائے تو آدمی گڑھوں میں گرنے سے بھی بچ جاتا ہے اور کچھ نہیں تو کسی کا ہاتھ تھام کر بھی یہ سفر طے ہو سکتا ہے۔ کم از کم اس فیصلے کے نتیجے میں جسم کا ظاہری ڈھانچہ تو بہر طور سلامت ہی رہے گا۔ آنکھیں تو یوں بھی بڑی بھوکی ہوتی ہیں۔ ساری برائیاں، خواہشیں اور توقعات انہیں دو روزنوں کے راستے دل و دماغ میں جاگزین ہوتی ہیں۔ آنکھوں کی روشنی کے بجائے دل کی روشنی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سوچ کر اس نے رات بھر جاگی اپنی تھکی ہاری آنکھوں کو موند لیا۔ پھر شاید اس کی آنکھ لگ گئی۔ تب اچانک چڑیوں کے چہچہوں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کا پردہ الٹ دیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ لمحوں تک وہ خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کی جانب ایک تارہ دیکھتا رہا اور جب حواس کچھ بحال ہوئے تو اس کے جی میں پو پھٹنے کے منظر کو دیکھنے کی شدید خواہش تڑپ کر جاگ اٹھی۔ وہ ایک عجیب سی بے خودی کے عالم میں اپنے پیروں کو گھسیٹتا ہوا کوٹھری کے اکلوتے روزن کی جانب بڑھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایڑیاں اٹھا کر بمشکل تمام روزن میں سے باہر جھانکا تو اس کے سامنے صبح کاذب کے بعد کا سحر انگیز منظر پھیلا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بگلوں کی سفید براق ڈار سفید جھالر کی صورت اس کے سامنے سے گذری۔ یکا یک اس کا سارا اندر ایڑیاں اٹھا کر اس کی آنکھوں کے روزنوں سے باہر جھانکنے لگا۔ چند لحظوں کے بعد نیم کے ایک گھنے درخت پر سے چڑیوں کا ایک جھنڈ یوں اوپر اٹھا

جیسے کسی نے مٹھی بھرے چمکتے سکوں کو ہوا میں اچھال دیا ہو اور ٹھیک اسی لمحے اس پر یہ انکشاف ہوا کہ زندگی کی ساری رنگا رنگی، شادابی اور دلکشی ان دو روشن کھڑکیوں ہی کی عطا ہے۔ ان سے محروم ہو کر زندگی سے سمجھوتہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تب معاً دو دہکتی سلاخوں کو اپنی آنکھوں کی جانب بڑھتے تصور کر کے وہ خوف سے چیخ اٹھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب اس کے آنسو تھمے تو اسے اپنے بدن سے کوئی چیز باہر کو سرکتی ہوئی صاف محسوس ہونے لگی، پھر ایک عجیب سی کپکپی نے اسے اپنے شکنجے میں کس لیا۔ جیسے جو چیز باہر کو آ رہی تھی وہ گلے میں پہنچ کر اٹک گئی ہے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے مردہ حروف کی صورت ابھر آئے، گردن کی طنابیں کھنچ گئیں اور پھر اس کا سارا وجود سن ہو گیا۔ عین اس وقت کوٹھڑی کے زنگ آلود آہنی دروازے کو کسی نے پورے زور سے پیچھے کی جانب دھکیلا۔ دروازہ درد سے کراہ اٹھا۔ بھاری بھرکم جوتوں کی آہٹیں کوٹھڑی میں یکے بعد دیگرے داخل ہوئیں۔ فیصلے پر عمل درآمد کرنے والوں کی سفاک آنکھوں نے اندر آ کر دیکھا کہ کوٹھڑی کے اکلوتے روزن کے بالکل نیچے سل زدہ سنگی فرش پر گھٹنوں میں آنکھیں چھپائیں ٹانگوں کے گرد اگرد مضبوطی سے ہاتھوں کا حلقہ بنائے وہ گچھو مچھو سا گٹھڑی بنا بے حس و حرکت یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اس کے اعضاء موم کے ایک گولے کی صورت باہم جڑ کر ایک ناقابل تقسیم اکائی میں ڈھل گئے ہوں۔

☆☆☆

مربعوں کی دائرہ کہانی

سیمیں کرن

لمبے سفر سے لوٹی ہوں، یادیں، تھکن اور سفر میں ملے سوچ کو ملتے اثبات کے رنگ، کہنے کو بہت کچھ ہے میرے پاس!
مگر جب لکھنے بیٹھتی ہوں تو کہانی اک مرکز بنا کر کبھی مستطیل بن جاتی ہے، بہت سی مستطیلیں، چھوٹی بڑی مستطیلوں کو اکٹھا کر کے جب دیکھتی ہوں تو اک دائرہ بنتا نظر آتا ہے!

آپ میری بات شاید نہ سمجھے ہوں، سمجھ کر شاید الجھ گئے ہوں، مگر کچھ دیر میرے ساتھ سفر کیجئے، اسے میری سوچ کا بے ہنگم پن سمجھ کر برداشت کر لیجئے۔ آخر کار یہ آپ ہی تو ہیں جس نے میری سوچ کو اثبات دے کر مجھے لکھاری کا منصب دیا ہے۔

یہاں بہت احترام کے ساتھ مجھے آپ کی رائے سے اختلاف کرنے کی اجازت دیجئے۔ آپ کہتے ہیں میرے کردار نسائی ہیں، بہت مضبوط نسائی کردار، میں نے دنیا کو اس کے دکھوں دردوں کو صرف نسوانی آنکھ سے دیکھا ہے!

مگر مجھے یہاں آپ کی بات اور رائے سے اختلاف کی بصد احترام اجازت دیجئے۔ میں جب کوئی کہانی لکھنے بیٹھتی ہوں تو بالآخرہ عورت کہانی بن جاتی ہے، اس کہانی کی روح اک عورت ہی ہوتی ہے!

میں اس پر غور کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ معروض بنا دی گئی ہوں، مفعول و حصول مقصد کا ذریعہ بنا دی گئی عورت دراصل اس کائنات کی باطنی و لطیف قوت ہے، کائنات کی تمام لطیف قوتیں مخفی ہیں، خدا کی دانش و مشیت سب سے زیادہ مخفی ہے مگر اس کائنات کی سب سے زیادہ عامل و متحرک قوت ہے، مرکز ہے!

بس اسی طرح جب میں کوئی کہانی لکھنے بیٹھتی ہوں تو مجھے ہر طرف میں ہی نظر آتی ہوں، باطن میں میں ہی کارفرما ہوتی ہوں۔ پھر جب ہر کہانی کے باطن میں میں ہوں تو اس کردار کی دانش کو میں مردانہ کردار میں ڈھال نہیں پاتی یا شاید ایسے مضبوط مردانہ کردار مجھے نظر ہی نہیں آتے جو اس دانش کا بوجھ اٹھا سکیں۔ آخر خدا کو جنت سے آدم کو نکالنے کے لیے بھی میرا سہارا لینا پڑا، سب سے قدیم کہانی! جب میں آپ کی معاشرت، معیشت، طرز زندگی، طرز فکر کی مستطیل کا نیوکلیس ہوں تو چاہے آپ مجھے معروض کہیں یا دو جا کہہ کر کمتر جانیں، نیوکلیس تو میں ہی ہوں!

اس تمہید کی ضرورت یوں تھی کہ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں اک تصویری سلسلے کی کہانی کار ہوں۔ بلکہ آپ سے بڑھ کر یہ کون جانتا ہوگا کہ اسی تصویری سلسلے پہ لکھی جانے والی کہانیوں نے مجھے آپ کی محبتوں اور عزتوں کے لائق بنایا۔ جب یہ سلسلہ میں نے میگزین میں شروع کیا تھا تو ایڈیٹر کو اتنے زیادہ اچھے ردعمل کی توقع نہیں تھی مگر جلد ہی اس سلسلے نے جریدے اور مجھے آپ کی محبتوں کے بام عروج پہ بٹھا دیا!

یہ تصویریں آپ لوگ، میرے قاری ہی مجھے بھیجتے تھے، واقعے کی مختصر سی یک یا دو سطری روداد، شرط صرف یہ تھی کہ تصویریں صاف، واضح اور پورے ماحول و واقعے کا احاطہ کرتی ہوں، اتنی واضح کہ میں چہرے کے تاثرات آسانی سے پڑھ سکوں۔

بے شمار تصویریں موصول ہوئیں، تنقیدی خطوط بھی موصول ہوئے اس سلسلہ کی ملامت کو، کہ گھر کی تصویریں بھیجنے والے نادان نوجوان اخلاقی قدریں پامال کر رہے ہیں مگر ادارے کی جانب سے مکمل احتیاط برتی گئی، یہ تصویریں صرف میرے ہاتھ لگتیں اور رسالے میں صرف کہانی چھپتی اک واحد ٹائٹل تصویر کیساتھ جس کے ساتھ بھیجنے والے کی اجازت و ذمہ داری مشروط ہوتی!

یہ ایک عجیب خوابناک اور روحانی تجربہ تھا، تصویروں سے شخصیتوں، لوگوں کے گھروں اور دل کے گھڑوں میں چھپے دکھوں کو کنگھالنے کا عمل تھا، اک وجدانی، کشفی مرحلہ، جب تصویر دیکھ کر چہرے کے تاثر دیکھ کر یکدم کہانی اتر آتی! اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ستر سے اسی فیصد میری لکھی کہانی تصویری حالات سے منطبق کر جاتی، لوگ مجھے جادوگر اور نہ جانے کیا کچھ سمجھنے لگے۔

اک طویل عرصے تک یہ سلسلہ میں نے چلایا۔ مگر پھر رسالے کے ساتھ اختلافات اور کچھ میری مصروفیات کی بناء پر یہ سلسلہ میں نے بند کر دیا۔ مگر لوگوں کی محبت و اعتبار مجھ پر کم نہ ہوا۔ لوگ آج بھی مجھے اسی طرح تصویریں بھیجتے ہیں۔ کچھ لکھ دینے یا فون پہ ہی بتا دینے پہ اصرار کرتے ہیں۔

میں حیرت زدہ ہو جاتی ہوں، لوگ بیک وقت کچھ چھپا لینے کی خواہش کے ساتھ جانے جانے کی، اظہار کی آرزو بھی رکھتے ہیں، انسانی نفسیات بھی عجیب گورکھ دھندہ ہے! یہی گورکھ دھندہ مجھے ان تصویروں میں نظر آیا، تصویریں زندگی کے چوکھٹے، مستطیلیں اور ان کے اوپر محیط دائرے! ان دائروں کے اوپر پھر اک تصویر اور چوکھٹا۔۔۔

اک مستطیل۔۔۔ اور پھر دائرہ در دائرہ سفر!

کچھ تصویریں آپ کو دکھاؤں؟

یہ پہلی تصویر اک ایسے گھر کی ہے جس کی واحد کفیل ایک لڑکی تھی۔۔۔ بوڑھے والدین کی اکلوتی اولاد جو گھر کی کفالت کے ساتھ ساتھ عزت کا بوجھ بھی کندھوں پہ لادے پھرتی تھی۔۔۔

تصویروں میں اک نقاب پوش لڑکی ہے جو یقیناً حسین ہوگی، اس کی گوری رنگت، بڑی بڑی شہد رنگ سی آنکھیں اور ناک کا نظر آتا حصہ تیکھا ہے۔۔۔

اک بوڑھا سا سٹھیایا باپ ہے جسکے پیچھے بیوی کی دھندلی سی تصویر ٹنگی ہے جس پہ پھولوں کا ہار پڑا ہے۔ ماحول سے عسرت ٹپک رہی ہے۔۔۔ تصویروں میں ایک لڑکی اور ہے جو شکل سے ملازمہ لگ رہی ہے۔۔۔ ایک ایسا طبقہ جو عسرت و غربت سے بہت نیچے زندگی گزار رہا ہے۔۔۔ اس طبقے کا کوئی دین، مذہب اور ملک نہیں ہوتا۔۔۔ یہ ہر زمین ہر خطے میں شودروں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ جنہیں انسانوں کی دنیا جو باتوں سے بھی حقیر سمجھتی ہے۔۔۔ اسی لیے یہ انسانی ضابطوں سے بہت دور۔۔۔ بڑی حقیقی زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ یہاں عورت کے کندھوں پہ غیرت کا بوجھ نہیں کم از کم۔۔۔ کیونکہ ان کے مردوں کو بے غیرت بننے میں کوئی عار نہیں۔۔۔ کون جانے یہ عورت کے لیے عذاب ہے کہ نعمت۔

ہاں تو ان تصویروں میں اک سٹھیائے بوڑھے کی تصویر ہے جس میں اس کی بیوی کی دھندلی دیوار پہ ٹنگی ہے۔۔۔ اک تصویر نقاب پوش حسینہ کی ہے جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت، تھکن اداسی اور تفکر ہیں۔۔۔ اور اک تصویر اس ملازمہ کی ہے۔۔۔ جس کے چہرے پہ اپنے طبقہ روزگار کی بے حسی، بے رحمی، غربت افلاس کی ستم ظریفی، عیاری، مکاری سب کنداں ہے۔۔۔ بوڑھے کی تصویر کے نیچے جو عبارت درج تھی وہ یہ بتاتی تھی کہ یہ لڑکی انکی واحد اولاد اور کفیل تھی جو اس ملازمہ کے ہتھے چڑھ گئی۔۔۔

اور مجھے بوڑھے اس سٹھیائے بوڑھے کی پوری کہانی لکھی تھی۔ کیا میں یہاں آپ سے مکمل کہانی بیان کروں؟؟۔۔۔ نہیں بات طویل ہو جائے گی بھٹک جائے گی۔۔۔

قصہ مختصر یہ کہ وہ انقلاب پوش حسینہ کی آنکھوں نے مجھ سے اپنی ساری کہانی کہہ دی۔۔۔ وہ آنکھیں مجھ پہ وجدانی کھڑکیاں کھول گئیں۔ وہ باپ کی بیماری کے آگے گھر کا بیٹا بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔۔۔ مگر بھول گئی تھی کہ بیٹیاں کفیل بھی بن جائیں تو بیٹا نہیں بن پاتیں! بیٹا حرام کمائے یا حلال کیسی چور رستے کو ڈھونڈے۔۔۔ بس مکان پہ ''من ھذا فضل ربی'' لکھوا دے۔۔۔

مگر بیٹی کی کمائی جانے کیوں باپ کی گردن جھکا دیتی ہے۔۔۔بس اس لڑکی نے بھی مجبور ہو کر اپنے پڑوس میں آنیوالی ملازمہ کی ترغیب پہ دوسرے اونچے نیچے راستے ڈھونڈ لیے تھے۔۔۔وہ کرتی بھی کیا۔۔۔حلال کی کمائی میں باپ کی بیماری بھگتتی ہی نہ تھی۔۔۔اور شام کے تمام آفسز میں مرد تو صرف کمانے جاتے تھے مگر عورت کمانے کے لیے بھی نکلے تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ سونے کے لیے آئی ہے۔۔۔گر سونا ہی ٹھہرا تو باس ہو یا کوئی اور۔۔۔۔وہی اچھا تھا جو اچھے پیسے دے۔۔۔برقعے اور نقاب نے اس کا بہت ساتھ دیا۔۔۔بہت عرصہ کسی کو بھنک نہیں پڑی۔۔۔وہ ملازمہ اس کے لیے گاہک تگڑا اور بہت احتیاط سے لاتی تھی۔۔۔مگر پھر شاید ملازمہ سے اس نقاب والی کا جھگڑا ہو گیا کمیشن پر۔۔۔بھانڈا پھوٹ گیا۔۔۔منہ کالا کرنے والے سارے عزت دار چوہوں کے بل میں گھس گئے۔۔۔اپنی بیویوں کے آنچل میں چھپ گئے۔۔۔اور وہ نقاب والی دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرگئی۔۔۔مجھے یاد ہے۔۔۔میں نے کہانی کے آخر میں سوال بھی اٹھایا تھا خودکشی صرف لڑکی نے کیوں کی؟ آبرو باختہ صرف عورت کیوں!!

کہانی چھپنے کے بعد اس سٹھیائے بوڑھے کا لرزیدہ سی آواز میں فون آیا'' آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میری بیٹی نے خودکشی کرلی؟؟؟میرے خاموش رہنے پہ بولا'' میں جلد مرنے والا ہوں۔۔۔اب مجھے اس نام کی۔۔۔اس مردانگی بھری غیرت کی کوئی فکر نہیں۔۔۔آپ نے میرے سوال کو زبان دے دی۔۔۔میری قبر کی مٹی بھی آپ کو دعائیں دے گی!''

سٹھیایا ہوا قبر میں پاؤں لٹکائے اک مجبور دیوانہ باپ،آبرو خریدنے والے گاہک۔۔۔آبرو باختہ مرد اور کہانی کے مرکز میں ایک مجبور لڑکی کہانی کے فریم میں اس کو گردش دیتی ہوئی!اس گردش میں معاون اداکارہ بھی ایک ملازمہ تھی!

ہی ایک اور تصویر دیکھیے!چوکھٹے میں فریم ہوئے اک اور دائرے کو آپ کو دکھاؤں!

یہ تصویر اس مذہبی اجتماع میں شریک ہونے والے کسی من چلے اور دل جلے نے بھیجی تھی۔

ایک تصویر میں سٹیج پہ بہت بھاری بھرکم پگڑیوں،دستاروں اور جبوں والے،عربی کرتوں والے بیٹھے تھے اور پیچھے ایک بہت بڑا پوسٹر عیاں تھا جس پہ موٹے موٹے حروف میں درج تھا'' عورت کی بے راہروی ہی معاشرے کی بربادی کا سبب ہے،آیئے اپنی عورتوں کی اصلاح کیجئے''۔

دوسری تصویر میں حاضرین بیٹھے تھے،جن میں کثیر تعداد اسی طرح داڑھیوں،ٹوپیوں اور دستاروں والوں کی تھی،کچھ عام حلیوں والے بھی تھے،دور تک جو سر نظر آرہے تھے وہ سب مردوں کے ہی تھے!

جس دل جلے نے یہ تصویریں بھیجی تھیں،اس نے محض اپنا نام و پتہ اور تصویر بھیج کر یک سطری پیغام چھوڑا تھا میرے لیے۔'' کیا ان تصویروں کو دیکھ کر کوئی کہانی بنا سکتی ہیں آپ؟''

میں دل ہی دل میں مسکرائی اور حیرت سے اس نوجوان کو خیال میں مخاطب کیا،'' کہانی تو خود تصویر پہ لکھی ہے، مجھے کسی پاتال میں اترنے کی ضرورت ہی نہیں''۔

اور کہانی کا آغاز میں نے یہاں سے کیا تھا۔۔۔اس جملے سے''ایک ایسا اجتماع جو معاشرے کے جس فرد کی اصلاح و فلاح کے نیک اور صالح مقصد کے لیے منعقد کیا گیا،حیرت کہ جادو کی چھڑی کے زور سے اسی کو اس اجتماع میں سے غائب کر دیا گیا۔۔۔''

اور کہانی کے اختتام میں میں نے ہر دستار،ہر جبے اور پوشاک سے گناہ کی گھٹڑی ایسے ہی برآمد کی جیسے جادوگر خرگوش برآمد کر لیتا ہے۔

یہ تصویری کہانی ان چند کہانیوں میں سے ہے جس پہ بہت تعریف بھی ہوئی اور تنقید بھی!

اور بھیجنے والے کی عقیدت ومحبت بھری کال میرا انعام تھا جو مجھے وصول ہوا!

جہاں ستر سے اسی فیصد میری کہانیوں کے تیر نشانے پہ بیٹھے، وہاں کہیں کہیں چوک بھی ہوئی۔۔۔

کہیں غلطی یہ بھی کی کہ بھیجنے والا نشانے پہ آ گیا۔۔۔ عموماً تو بھیجنے والا شریک کار کے طور پر تیار ہی ہوتا تھا مگر کبھی وہ نقاب پہننا پسند کرتا تھا۔۔۔ اور جو میں نے نقاب سرکایا تو اس کو غصہ آیا۔۔۔ سو بہت سخت لفظ بھی سننے کو ملے، گالیاں بھی کھائیں!

مگر یہ بھی تصویری سلسلے کا اک دائرہ تھا جو ساتھ چلا میرے! اک اور چوکھٹے کے سامنے کھڑا کرتی ہوں آپ کو!

یہ بھی ایک ایسی کہانیوں میں سے ہے۔

ایک تصویر میں چھ، سات مرد، جن کے چہروں پہ ایک خاص قسم کی خشونت چھلکتی تھی۔۔۔ بظاہر سلجھے، سلجھے چہرے مگر ایک سخت اور کٹر تاثر جانے آنکھوں میں تھا یا پھر چہروں سے چھلکتا تھا۔۔۔ دیکھنے میں بظاہر ایک فیملی فوٹو تھا!

تصویر کی تفصیل اس لیے یاد ہے کہ اس تصویری کہانی میں صرف دو تصویریں موصول ہوئیں۔ اک نقاب پوش لڑکی جس نے اپنا نام بھی فرضی بتایا اور ناٹئل تصویر بھی یہی تھی صرف اک واحد جملے کے ساتھ 'میں بھی ایک لکھاری تھی' "تھی" پہ کو مالگا کر زور دیا گیا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں بے توقیری، بے اعتباری کی گہری دھند تھی! دو تصویریں: اک تصویر خاندان کی جس کو ضائع کر دیا تھا اور اک نقاب میں چھپی لڑکی جو کہتی تھی "میں بھی ایک لکھاری تھی"۔

میں نے لڑکی کی آنکھوں سے اس کی روح کے پاتال میں اترنے کی کوشش کی، وہ آنکھیں جن میں درد تھا، وحشت، بے توقیری اور بے اعتباری تھی!

اور میں نے ان بظاہر سلجھے چہروں کے پیچھے اس لکھاری کے "قاتلوں" کو کھوجنے کی کوشش کی، وہ چہرے جہاں میں نے کرختگی بھی کھوج ڈالی تھی بالکل ویسے جیسے نقاب چھپی لڑکی کی آنکھوں میں پاتال میں چھپے رنگ دریافت کیے تھے!

اس لڑکی کی آنکھوں نے کہانی کشف کی مجھ پر!

وہ ایک ایسی لکھاری تھی جس کو صرف اس جرم میں نہ لکھنے کی سزا ملی تھی کہ اس کی کہانی اس کی تصویر کے ساتھ چھپ گئی تھی۔ کہانی سے غائب کرنے کا حکم و سزا۔۔۔ اور پس منظر کے فاتح مرد اپنی فتح اور غلبے کا جشن مناتے تھے مگر کہانی سے غائب کر دینے کے باوجود کہانی اسی کے گرد گھوم رہی تھی!

آیئے اب اگلی تصویر کہانی سے ملتے ہیں!

اس تصویری کہانی کے لیے مجھے پانچ چھ تصویریں موصول ہوئیں! چار پانچ تصویریں بہت واضح تھیں اور کسی اعلیٰ طبقے بلکہ سچ پوچھیے تو بادشاہ گرو شاہوں کی تقریب تھی، ملک کے سول اور کلغی والے ہر دو ہائے طبقہ کے نمائندہ چہرے تقریب میں نظر آ رہے تھے، تقریب کے کئی زاویئے مجھ پر عیاں کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔۔۔ رقص تھا، سرور تھا۔۔۔ کسی کی بیوی کسی اور کے پہلو میں تھی، مشروب خاص کا خمار تھا، جام پہ جام الٹ رہے تھے، کہیں کچھ سربراہان ملکی و بین الاقوامی مسائل کو الگ تھلگ صوفوں پہ نمٹانے کو مصروف تھے کہ چہروں کی سنگینی سنجیدگی کا پتہ دیتی تھی!

"بیگمات کی اپنی سفارت کاری ومہارت" ایک الگ باب تھا کہانی کا!

یہ انہیں تقریبات میں سے ایک تقریب تھی جن میں اہم ملکی و بین الاقوامی مسائل اور پالیسیاں طے پا جاتی ہیں!

ایک تصویر جو اخبار کے لیے بھیجی گئی تھی، اس میں چہروں اور ماحول کو بے شناخت کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا!

دو تصویریں ایک کمسن سی لڑکی کی تھیں، سولہ سترہ سال کی۔۔۔ جو یقیناً مقتولہ ہو چکی تھی!

ایک تصویر بہت واضح تھی، چہرے اور جسم کی حالت بتاتی تھی کہ اس پہ کیا ستم ٹوٹا تھا کہ موت کے بعد بھی اس کے چہرے پہ اذیت کھدی ہوئی تھی!

آنکھیں اذیت کے کسی انتہائی آخری لمحے میں ابل کر باہر آ گئیں تھیں! اگلی تصویر اسی کمسن مقتولہ کی تھی کہ جس میں چہرے کی شناخت مدہم کر دی گئی تھی سوائے اذیت ابلتی آنکھوں اور چہرے پہ ٹھنڈی موت کی زردی کے۔۔۔

تصویریں دیکھتے ہی کہانی نے یکدم مجھ سے کلام کیا!

ورنہ ہوتا یہ تھا کہ میں تصویریں اٹھتے بیٹھتے دیکھتی تھی۔۔۔ رکھ دیتی تھی۔۔۔ پھر نکالتی تھی اور پھر جزئیات پہ غور کرتی تھی اور پھر کشف کے دروازے کھل جاتے تھے، کہانیاں پریاں بن کر وجدان پہ اتر آتی تھیں اپنے بھید سمیت!

مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کہانی تصویروں کو دیکھتے ہی بولنے لگتی تھی۔

یہ کہانی بھی کچھ ایسی ہی تھی! مجھے یاد ہے میں نے لکھا تھا اس تصویری کہانی کے آغاز میں، ''یہ وہ چہرے ہیں۔۔ ان چہروں میں سے ایک۔۔۔ جو محلوں کی غلام گردشوں میں اہم فیصلوں کی خوشی و منعقدہ جشن میں قربان گاہوں کے استھانوں پہ ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔۔۔ یہ چہرے انسانوں کے نہیں۔۔۔ جانوروں کے ہیں شاید۔۔۔ کیونکہ یہ قربان ہونے کو ہی پالے جاتے ہیں۔۔۔ مگر وہ بے شناخت چہرے کیا انسانوں کے ہیں جو لہو پی کر تازہ دم ہوتے ہیں اور پھر امور بادشاہی نپٹاتے ہیں''۔

یہ ایک ایسی مظلوم لڑکی۔۔۔ گمنام مظلوم و مقتول کی کہانی تھی جو اس تقریب کے شیروں کی خون کی چاٹ کی پیاس بجھانے کو ہانکا لگا کر مقتل گاہ میں لائی گئی تھی۔۔۔ مقصود شاید اس کا قتل نہ تھا۔۔۔ مگر کم سن تھی شاید۔۔۔ اذیت کے کسی لمحے میں جان ہار گئی۔۔۔ بادشاہوں کے استھانوں پہ چھوٹے جانور قربان ہوتے ہی آئے ہیں! سو اس قتل کہانی کو منظر سے مقتولہ کی طرح غائب کر دیا گیا!

مجھے یاد ہے۔۔۔ ابھی تک یاد ہے ان دونوں کہانیوں کے مقتول لکھاری۔۔۔ اور قربان گاہ میں مقتول لڑکی۔۔۔ کے لکھنے اور اشاعت کے بعد مجھے جو بھیجنے والوں کی طرف سے کالز موصول ہوئیں۔۔۔ ایک اس ''مقتول لکھاری'' کی اور دوسری اس کم سن مقتولہ کے کسی مہربان کی جو خود چھپا رہنا چاہتا تھا، مگر پھر بھی حقیقت کو واشگاف کرنے کا آرزومند تھا۔۔۔ کی طرف سے جو کالز موصول ہوئیں، ان میں اک ستائش آمیز حیرت بھرا استفسار تھا'' آپ کیا جادوگر ہیں؟؟ ٹیلی پیتھی جانتی ہیں؟؟ آپ کا انداز اتنا درست کیسے ہو جاتا ہے، کہانی آپ نے نوے فیصد درست بیان کی اس کی جزئیات کو چھوڑ کر۔۔۔!

مگر ان تصویری سچی کہانیوں کو لکھنا میرے لیے بھی کوئی اتنا سہل اور خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا تھا!

خاص طور پہ جب کہانیاں خطرناک حد تک سچ بولنے لگتی تھیں۔۔۔

نہ عیاں ہو کر بھی مخصوص لوگوں کی نشاندہی کرتی تھیں تو مجھے اور اخبار کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا!

دوسری طرف جب یہ بیان کردہ کہانیاں سچ کے فریم میں جا جڑتیں تھیں تو میرا دل غم سے بھر جاتا۔۔۔

میرے اپنے دل میں بہت سا دکھ اور غصے کا دھواں بھر جاتا!

ہر کہانی کا مرجع عورت کے گرد دائرہ بنا رہا تھا۔۔۔

اور اس کے باوجود اس کو کہانی سے مٹانے کی آرزو اس سے متضاد تھی؟

اس طرح اک طویل عرصہ اس تصویر کہانی کے سلسلے کو چلایا میں نے، بہت کہانیاں لکھیں۔۔۔ مگر آپ سے میں اپنی آخری کہانی۔۔۔ آخری تصویری کہانی بیان کروں گی۔۔۔

اس سے پہلے بھی بہت سی کہانیاں مجھ سے بانٹی گئیں جن میں موت کے تجربے بیان کیے گئے تھے مگر یہ اپنی نوعیت کا بہت

انوکھا تجربہ تھا!

اور اس سے انوکھی فرمائش تھی اس کہانی کے راوی کی، وہ یہ کہ اسے چونکہ اپنی شناخت بھی نہیں چھپانی، نہ چھپانے کی ضرورت ہے سو اس کو اپنی کہانی خود لکھنے کی، کہنے کی اجازت دی جائے جس کو آپ اپنے تائیداتی نوٹس یا وضاحتی بیان کے ساتھ چھاپ دیں اپنے تصویری سلسلے میں!

یہ میرے اس سلسلے کی آخری کہانی ثابت ہوئی!

اس کا سبب کچھ تو اخبار اور میرے درمیان اختلافات تھے، کچھ اس کہانی پہ ہونے والی تنقید!

اور دوسرا پہلو شاید لاشعوری تھا، یہ تصویری سلسلہ میرے لیے بھی اک مہماتی کھوج کا سفر تھا، لوگوں کی کہانیوں میں اپنے سوالوں کی کھوج!

اس آخری کہانی نے مجھے میرے بہت سے سوالوں کا جواب دے دیا۔

یہ کہانی ایک پادری کی ہے جو اڑتالیس منٹ کے لیے مر گیا تھا۔ جی ہاں موت۔۔۔مکمل جسمانی موت ڈاکٹری رپورٹس کے مطابق۔۔۔اس بیان کی تائید کو وہ اپنے ہسپتال کے ڈاکٹری تحریری مندرجات مہیا کرتا ہے! جو یہ بتاتے ہیں کہ اس کی موت واقع ہو چکی!

اڑتالیس منٹ کے بعد وہ زندہ اٹھ بیٹھتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس نے خدا کو دیکھا۔۔۔اس نے اس کو سنا۔۔۔اس کے لمس ملائم کو محسوس کیا۔۔۔اس نے انکشاف کیا کہ خدا مذکر نہیں مونث ہے۔۔۔وہ باپ نہیں۔۔۔وہ ماں ہے!

اس کی آواز میں ماں کی شفقت و ملائمت ہے!

اور اس کی قربت ماں کی گود جیسی ہے!

وہ اپنی اس کہانی میں بعد از موت کے بہت سے تجربے بیان کرتا ہے! مگر کوئی لمحہ بھی کشفی ہوتا ہے۔۔۔ بوجھل ہوتا ہے۔۔۔حمل کی طرح ٹھہر جاتا ہے!

میں نے دیکھا بہت سی چھوٹی مستطیلوں کے اوپر ایک بڑی مستطیل بن رہی ہے!

اس بڑی مستطیل کے اوپر کہانی دائرے کی صورت گردش کر رہی ہے!

کہانی کا مخفی مرکز۔۔۔باطنی مرکز عورت ہے!

کہانی اس سے گریز کر کے بھی پوری قوت سے اس کی جانب کھینچتی ہے!

اور کہانی بے اختیار کہہ اٹھتی ہے "خدا مونث ہے، مذکر نہیں۔۔۔وہ ماں ہے، باپ نہیں"۔

اور خدا جو اس کائنات کی باطنی دانش و مشیت ہے!

خدا، کہانی، عورت، درد ایک مربع بناتے ہوئے کہانی کا دائرہ بنا رہے ہیں!

☆☆☆

چنبے دی بوٹی

شاہین کاظمی

بے بے کے ٹھیک تین دن بعد اس نے بھی مٹی اوڑھ لی۔۔۔اور میں ان کچی قبروں کے سرہانے بیٹھا ڈھلتی شام میں لہو گھلتا دیکھ رہا تھا۔ رگ رگ میں اتراوش کب تک سہا جا سکتا ہے۔ اس وش میں جب ہجر کی کڑواہٹ اور طویل انتظار کی تلخی بھی شامل ہو تو مٹی کا بت بھری بھری ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جاتا ہے۔ عشق نگری کا پینڈا اوکھا اور جان لیوا ہے۔

''جس دے کارن اساں جنم گنوایا باہو یار ملے ہک واری ہو''

میں نے ان کے چہروں پر عجیب سی مسکان دیکھی تھی۔۔۔ایک ایسی مسکان جس پر دونوں جہاں وارے جا سکتے ہیں۔ سردرتوں میں ڈھلتی شام کی دھوپ کا روپ بہت وکھرا ہوتا ہے۔ اندر باہر ایک جیسی ٹھنڈک۔۔۔ایک جیسا اندھیرا۔۔۔راستوں پر اونگھتی رات اور وحشت۔۔۔لیکن اس ڈھلتی شام کے اس آخری پل میں وہ مسکان جیسے میرا اندر مشکبار کر گئی۔

''مرشد دا دیدار ہے باہو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہو''۔

بے بے کا پیلا دوپٹہ ہو۔۔۔اس کے کونے میں لگی گانٹھ ہو۔۔۔مادھو لال کی کافیاں ہوں۔۔۔شاہ لطیف کے بیت ہوں۔۔۔باہو کی ہو یا پھر احمد دین کی آواز کا سوز۔۔۔کہانی تو ہر جگہ ایک ہی ہے۔۔۔ساڑ بھی ایک سا۔۔۔ایک سا آلاؤ۔۔۔ایک سی جھلساتی ہوئی آگ جو سینے میں بھڑکتی رہتی ہے۔

میں نے پہلی بار بوڑھے احمد دین کو سنا تو پہلی بار ہی یہ احساس بھی ہوا کہ دل سمندر میں اٹھنے والا جوار بھاٹا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔۔۔کوئی جان ہی نہیں سکتا اندر کیسا بیا کل ہے۔۔۔

''تم نے کبھی عشق کیا احمد دین؟'' میرے سوال پر چونک کر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دہکتے ہجر کے آلاؤ کا سیک مجھے بھی جلانے لگا۔ میں یکا یک بے چین سا ہو گیا۔

''عشق ساڑ کے سواہ کر دیتا ہے۔ پیروں کا گرداول کو جا چڑھے تو دل ریتلی مٹی جیسا ہو جاتا ہے۔۔۔پرزے پرزے۔۔۔ہاتھوں سے نکلتا ہوا۔۔۔کرلاتا۔۔۔ہوکتا۔۔۔اور بندہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بس خالی ہاتھ۔۔۔یہ عشق بڑی کوولی شے ہے باؤ''۔

''ایسا کیا ہے اس عشق میں؟'' میں جاننا چاہتا تھا وہ کھلے۔

کملیا اس عشق کا بھار تو پتھر بھی نہ سہہ سکے سرمہ ہو گئے۔ پر روح حوصلہ کر گئی کس کے ایسا پلے باندھا کہ مٹی ہو کر بھی معراج کو جا لیا۔ سدرہ سے آگے تو جبرائیل کے پر بھی جلتے تھے پر عشق اس پل صراط سے بھی گزر ہی گیا۔

''ایہو موت حیاتی باہو ایہو بھید الٰہی ہو''۔

ٹھنڈی ٹھار ہوا کماد کی تیکھی پتیوں کو چھو کر سرگوشیاں کرتی کچے آنگن کی طرف پلٹتی تو پرانی کھڑکیاں ہوکنے لگتیں۔ انگیٹھی میں آگ سرد ہو چلی تھی۔ احمد دین نے حقہ ایک طرف رکھا میلے سے بستر پر پڑا اصافہ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ٹاہلی کی پھننگ پر پہلے پہر کا ٹھٹھرا ہوا چاند اٹکا ہوا تھا۔

''حوصلے لاکھ جا ہو پر ماندے ہو ہی جاتے ہیں۔۔۔عشق کے گیروے رنگ میں رنگی روحیں حیاتی بھر کرلاتی رہتی

ہیں''۔اس نے مزید کوئلے انگیٹھی میں جھونک دیئے۔

چوروں نے گاؤں کے ڈھور ڈنگر کھولنے شروع کیے تو گاؤں والوں نے مل کر احمد دین کو چوکیدار سونپ دیا۔ سارا گاؤں کہتا تھا احمد دین کو بھنک لگ گئی ہے۔ پوہ کی سرد راتوں میں اس کی بے قراری قابل دید ہوتی۔ لالٹین لے کر گاؤں کی گلیوں میں جاگتے رہنا کی صدائیں بلند کرنے کی بجائے جب وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں ''باہو'' کی تان اٹھاتا تو گرم لحافوں میں دبکے وجود سرد پڑنے لگتے۔ دلوں میں اٹھتی ہوک بے کلی بڑھا دیتی۔

احمد دین گاؤں کے دوسرے سرے پر ایک کچے مکان کا مکین تھا۔ گاؤں والوں نے کھانا بھجوا دیا تو ٹھیک ورنہ حقہ تو تھا ہی اندر ساڑنے کے لیے۔ سونا لگتا تو وہ بھی اپنی لمبی سی لاٹھی اور لالٹین اٹھا کر گلیوں کی دھول پھانکنے نکل کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی چوپال پر گاؤں کے منچلوں کے ساتھ ایک آدھ کپ چائے کے کپ پر عشق کی گوڑھی رمزیں کھولتا بھی نظر آتا۔

میں اس علاقے میں نیا نیا آیا تھا۔ ہاؤس جاب کے بعد میری پہلی تقرری اسی چھوٹے سے ہیلتھ سینٹر میں ہوئی۔ سینٹر ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے بڑے چوہدری جی نے بڑی شفقت سے حویلی کی بیٹھک مجھے رہائش کے لیے پیش کی تو میں انکار نہ کر سکا۔

میں نے پہلی بار احمد دین کو ایسی ہی ایک سرد رات میں سنا تھا۔ برہا کی آنچ میں جھلسی ہوئی آواز اور باہو کا کلام دل میں ترازو ہو گیا۔ اس کا اونچا لمبا جھکتا ہوا قد اور مرجھایا ہوا چہرہ گواہ تھا وقت اسے روند کر گزرا ہے۔

''کون تھی وہ؟'' ایک دن میں نے حوصلہ کر ہی لیا۔

''باؤ زخموں پر کھرنڈ آنے لگے تو چھیلتے نہیں''۔ گھنی سفید مونچھوں تلے اس کے سوکھے لبوں پر پل بھر کو افسردہ سی مسکراہٹ کوندی۔

''ساڑ گہرا ہو تو زخم چھیلتے رہنا ہی جان بچانے کا واحد حل ہوتا ہے'' میں بھی اسی کے لہجے میں بولا۔

''باؤ یہ چنبے بوٹی بڑی اوتری ہوتی ہے۔ اس کے ننھے ننھے پھولوں سے اٹھتی جادوئی مشک ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ اسے وہی محسوس کرتے ہیں جن پر عشق اپنا آپ کھولتا ہے۔ عشق بس چپ چپاتے ان کے ہاتھ پکڑ کر ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے جہاں وچھوڑے کے کالے ونڑا گتے ہیں، جہاں انتظار کا بھکواپاؤں لہولہان کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ عشق مجھے ڈنگ گیا اور میں اس کے وش سے بے خبر سلگتا رہا''۔

اس کے چہرے پر دکھ کی گہری چھاپ تھی۔ ماضی کی متروک گلیوں کا سفر آسان نہیں ہوتا۔

''رحم نور میری منگ تھی۔۔۔ گلاب کی کولی اور خشبودار پتیوں جیسی۔۔۔ سرگی کے تارے جیسی پاک اور ان چھوئی۔۔۔ باؤ میں شاعر نہیں تھا پر اس کا رنگ روپ مجھے شاعر بنا گیا۔ میرا جی کرتا میں دنیا کی ساری زبانوں کے سب سچے اور کھرے حرف چنوں اور اس کے نام کر دوں۔ رب سے کئی بار التجا کی ''ربا مجھے لفظ سکھا وہ سر تال سمجھا جو روح کے بھید روح پر کھول سکے''۔

''میں کملا یہ کب جانتا تھا کہ عشق کو لفظوں کی محتاجی تو ہے ہی نہیں۔۔۔ یہ تو ایک الگ راگنی ہے۔۔۔ یہ تو وہ اکتارہ ہے جس کے سر بس آپوں آپ دلوں تک سفر کرتے ہیں۔۔۔ چھید کرتے ہوئے۔۔۔ برماتے ہوئے۔۔۔ درد جتنا گہرا ہو راگنی کے سر اتنے ہی نتھرے ہوئے اور سچے ہوتے ہیں''۔

''عارف دی گل عارف جانے کیا جانے نفسانی ہو''۔

احمد دین کے سینے کی کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔۔۔ کچی دیواریں اور ان پر تنے ہوئے ہجر اور انتظار کے جالے۔۔۔ ہجر

ہجر کے پر آن بیٹھے تو اندر فقط ساون بھادوں کی جھڑی رہ جاتی ہے۔ سلین اور اداسی کائی باقی سارے نقش چاٹ کر خود ہر جگہ قابض ہو جاتی ہے یہی احمد دین کے ساتھ ہوا تھا۔ ہجر نے حیاتی کی ساری فصل برباد کر دی تھی اور اب اس سیم زدہ زمین پر کھڑے پانی سے تعفن اٹھ رہا تھا۔۔۔ مگر کیا کیا جائے جینا تو ترک نہیں کیا جا سکتا ناں۔۔۔ سو وہ بھی جی رہا تھا۔

''پھر لام لگ گئی۔ انگریز سرکار نے ہماری چھٹی منسوخ کر کے حاضری کا حکم دیا۔ سورج ڈھل رہا تھا جب مجھے تار ملا''۔

''باؤ تم قسمت پر یقین رکھتے ہو؟'' احمد دین نے اچانک جھکا ہوا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔

''شاید'' میرے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''شاید؟ ایسا کیوں؟'' وہ مجھ پر نظر گاڑے بیٹھا تھا۔

''تم یقین رکھتے ہو احمد دین؟'' میں نے اس کا سوال اسی پر پلٹا دیا۔

''ہاں''۔۔۔ اس کے لہجے میں دکھن تھی۔۔۔ آنچ تھی۔۔۔ گلہ تھا۔۔۔ احتجاج تھا۔

''قسمت کا ڈنک بہت زہریلا ہوتا ہے پوری عمر زہر نہیں اترتا۔۔۔ لاکھ جتن کر و پر دنیا کا کوئی منکا اس زہر کا توڑ نہیں کر سکتا''۔

''رحم نور نے اپنے پیلے دوپٹے سے لیر پھاڑ کر اس میں امام ضامن لپیٹا اور میرے بازو پر باندھ دیا۔۔۔ پر بولی کچھ نہیں۔۔۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔۔۔ مگر آنکھیں سوکھی تھیں۔۔۔ کسی ویران باؤلی کی طرح۔۔۔ وہ اندر واندری گھٹتی گئی۔۔۔ اور میں خاموشی سے اسی پیلے دوپٹے کے کونے پر اپنے آنسو، وعدے اور ہونٹ رکھ کر چلا آیا۔

''اس کے سرد ہاتھ۔۔۔ بجھی ہوئی آنکھیں اور کانپتے ہونٹ۔۔۔ کہیں اندر کھب گئے۔۔۔ ایسے کھبے کہ سول بن گئے۔۔۔ اندر لیر و لیر ہو گیا۔۔۔ ترو پا لگانے والا کوئی نہ تھا۔۔۔ چیر بڑھتے گئے پھٹ گہرے ہوتے گئے۔۔۔ یہاں تک کہ بس پھٹ ہی رہ گئے احمد دین کہیں گم ہو گیا''۔

اور اس کی بات سن کر میں بھی کہیں گم ہو گیا۔۔۔ میری سانس پیلے دوپٹے میں اٹکی رہ گئیں۔

''یارا یہ قسمت امتحان کیوں لیتی ہے؟۔۔۔ ایک چھوٹی سی خواہش تھی۔۔۔ معصوم سی۔۔۔ ساتھ رہنے اور ساتھ جینے مرنے کی۔۔۔ تخت و تاج کب چاہے تھے۔۔۔ مگر اسے یہ بھی منظور نہ تھا''۔

احمد دین کا شکوہ بجا تھا۔

''ہمارا تو پل پل کا ساتھ تھا۔۔۔ پہلی بار اسکول جانے سے لے کر میرے فوج میں آنے تک سارا پینڈا ہم نے اکٹھے طے کیا تھا۔۔۔ میلے سے جلیبیاں کھاتے ہوئے۔۔۔ ٹانڈوں سے بنی پنیڑیاں بجاتے ہوئے۔۔۔ چولہے پر پکتے گلابی دودھ کی موٹی ملائی میں یہی ٹانڈے ڈال کر دودھ پیتے ہوئے۔۔۔ امبیاں اور امرود توڑتے ہوئے۔۔۔ وہیں گلیوں میں لکن میٹی کھیلتے ہوئے جانے بچپن کب دغا دے گیا۔۔۔ کب عشق بیلے میں سادھو نے اپنا چلہ پورا کیا اور ہم پر دم کر دیا۔۔۔ برسات کی رم جھم۔۔۔ سانجھ سویرے چلتی بحری پروائی۔۔۔ بدلیوں کی اوٹ سے جھانکتا چیت کا چاند، کھیتوں میں لہراتے گندم کے خوشے، سرسوں کے پیلے کھیت جیسے مایوں کی دلہن جو تن بدن میں صندل کی مشک بسائے پریتم کے انتظار میں چوکھٹ سے لگی کھڑی ہو۔۔۔ ہر شے جیسے اور سے اور ہوتی گئی۔۔۔ عشق کا نشہ وکھرا ہے۔۔۔ اس کی باس جدا اور رنگ بہت گوڑھا ہے۔۔۔ اتنا کہ باقی رنگ نظر ہی نہیں آتے۔۔۔ دن رات عشق کی تسبیح رولتا دل۔۔۔ اور پیر بے اختیار دھمال ڈالنے لگتے ہیں''۔

وہ ذرا دیر کو رکا۔

میں اسے بے بڑھے عالم کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ عشق بھی کیا کیا رنگ دکھاتا ہے۔۔۔ سارے فلسفے خود بخود سمجھ میں آنے

لگتے ہیں۔۔۔کوئی رازراز نہیں رہتا۔۔۔آج عمر کے اس حصے میں پہنچ کر مجھے قسمت جیسی حرافہ کی چال بازیوں پر بھی یقین ہے اور عشق کے بے اکسیر زہر پر بھی۔۔۔لیکن اس دن میں بس حیران تھا۔۔۔ٹھٹھکا ہوا اور دم بخود۔

''مجھے یاد ہے جب میں ذرا دیر سے گھر آتا تو وہ بیرے پر بیٹھی گھٹنوں سڑک پر نظریں جمائے رہتی۔۔۔جب میں گھر آتا تو اس کی سرمہ بھری آنکھوں میں بہت غصہ ہوتا۔۔۔وہ روٹھ جاتی اور میں اسے مناتے مناتے خود روٹھنے لگتا''۔

احمد دین ماضی کے دھندلکوں میں کھویا ہوا تھا مگر میرے ذہن میں پیلے دوپٹے کی لیرا ٹکی رہ گئی۔۔۔اچانک ایک کوندا سا لپکا اور سارے منظر واضح ہوتے چلے گئے۔۔۔ابا اماں کی زبانی سنیں کہانیاں ایک ایک کرکے اپنا آپ کھولتی گئی۔۔۔میں وقت کی چال پر ششدر تھا۔۔۔حیران اور ساکت۔۔۔ایسے اتفاقات تو صرف قصے کہانیوں میں ہوتے ہیں۔۔۔اصل زندگی تو بے رحم ہے بہت بے رحم۔۔۔۔

''باؤ جی'' احمد دین کی آواز مجھے چونکا گئی۔

''خیر تو ہے ناں؟''

''ہاں۔۔۔ہاں خیر ہی ہے تم کہو کیا کہہ رہے تھے'' میں ہڑبڑا سا گیا۔

اس چھنال قسمت نے ایک اور چال چلی۔۔۔رحم نور اکلوتی اولاد تھی میرے مامے کی۔۔۔اس کے نانکوں کی نظریں اس پانچ مرلے مکان پر ٹکی ہوئی تھیں یا ان سنہری پونڈوں پر جو ماما جی فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد ساتھ لائے تھے۔۔۔سب کا یہی کہنا تھا فیض محمد کا پوتا ساری جائیدادکیوں لے جائے۔۔۔کون جانے لام سے واپس بھی آتا ہے یا نہیں۔۔۔دل وہم پالنے لگے۔۔۔وسوسے گہرے ہوتے گئے اور رشتے کچے''۔

میں نے ایک نظر احمد دین کو دیکھا وہ سچ کہہ رہا تھا۔رشتے بہت جلد پھیکے پڑ جاتے ہیں۔۔۔دادا بھی بے بے کو بہت چاؤ سے بیاہ کر لائے تھے۔۔۔اماں بتاتی ہیں بے بے جوانی میں بہت خوبصورت تھیں۔۔۔جانے کیا ہوا۔۔۔کس کی نظر لگی۔۔۔بیاہ کر آئیں تو دوسرے روز ہی میکے چلی گئیں اور کبھی واپس نہ آئیں۔۔۔میکہ تھا ہی کتنا دور۔۔۔حویلی کے دوسرے سرے پر تھا۔۔۔پر اصل تریڑ تو کہیں روح میں آئی تھی جو ساری عمر رہی۔۔۔دادا نے چند دن انتظار کیا پھر دوسری شادی رچا کر بیٹھ گئے۔۔۔میرے ابا اسی دوسری شادی کی پہلی اولاد تھے۔۔۔بے بے کی دادا سے تو نہ بنی پر ابا کو تو پالا ہی انہوں نے۔۔۔اتنا پیار دیا جتنا شاید اماں بھی نہ دے پاتیں۔۔۔یہ اماں خود کہا کرتی تھیں۔۔۔اسی لیے میرا بھی بے بے سے بڑا گہرا اور سچا رشتہ تھا۔

''میری بیج پھلاں رانی میری ماسی کے پتر کو ویاہ دی گئی۔۔۔اس کی پالکی اٹھی اور میں فوج سے بھاگ آیا لیکن قسمت سے نہ بھاگ سکا۔۔۔کورٹ مارشل ہوا یہاں بھی اور وہاں بھی۔۔۔حیاتی نے کالے پانی کی سزا سنا دی۔ میں پھر پلٹ کر گاؤں کی طرف نہیں گیا۔۔۔چالی ورے ہو گئے۔۔۔کیوں جاتا۔۔۔کس کے لیے جاتا۔۔۔میں نے علاقہ ہی بدل لیا''

''تن من میرا پرزے پرزے جیوں درزی دیاں لیراں ہو''

''ایک بات پوچھوں احمد دین؟'' بالآخر میں نے ہمت کر ہی لی

''تم کوٹلہ شاہ حسین کے ہو؟''

احمد دین کے بوڑھے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھرا۔

''ہاں مگر تم۔۔۔؟'' اس کی آنکھوں میں سوال تھے وہ ماضی کی کچی دیواروں سے اترتے لیاتوں کی زد میں آکر بری طرح لہولہان تھا۔۔۔بوڑھی آنکھوں میں بھرا دھواں اور ہڑکتا سینہ۔۔۔میں خاموشی سے اٹھا اور جواب دیے بغیر کمرے سے باہر

نکل آیا۔

صبح صبح موتیے کی کلیاں جن پر پیلے دوپٹے کے پلو میں سمیٹتی بے بے کے چہرے پر ازلی سکون تھا۔۔۔ملائم کولی جلد اور کانوں میں اڑسیں کلیاں اور پیلا دوپٹہ۔۔۔میں نے بے بے کو ایسا ہی دیکھا تھا۔۔۔عمر بھر جیرا اوڑھے ہوئے۔۔۔کوئی بھی رت رہی ان کے دوپٹے کا رنگ نہ بدلا۔۔۔نہ اس کے کونے میں لگی گانٹھ کھلی۔

''سینے وچ مقام ہے کیندا سانوں مرشد گل سمجھائی ہو''۔

میری آواز پر چونک کر بے بے نے مجھے دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں لیکن ان میں اٹدنے والی نمی میں دیکھ چکا تھا۔۔۔میں ان کے ساتھ چارپائی پر جا بیٹھا۔۔۔چہرے کی جھریوں میں ایک غیر محسوس سا کرب اور اداسی نظر آتی تھی۔

''خیر ہے بے بے؟''

''ہاں پتر ستے خیراں''۔وہی ازلی دھیما پن اور ٹھہراؤ۔

''مکھر شروع ہو گیا؟''ان کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''ہاں کل پہلی تھی۔۔۔کیوں کیا ہوا؟''میں نے ان کے سرد ہاتھ تھام لیے۔

''مکھر میں یہاں سے کتنے گھبرو لام پر گئے تھے جو واپس نہیں آئے بس ایسے ہی یاد آ گیا''۔

میری نظر پیلے دوپٹے کے کونے پر لگی گانٹھ پر پڑی۔۔۔بے بے بیتابی سے اسے ہتھیلی پر گھما رہی تھی۔۔۔میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔۔۔آج میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا اس گانٹھ میں کیا بندھا ہوا ہے۔۔۔اسی پرانے دوپٹے کی وہ دھجی جس میں کسی کے وعدے، آنسو اور ہونٹوں کا لمس چھپا ہوا تھا۔

''بے بے میرے ساتھ چلیں گی؟''میں نے اچانک ہی فیصلہ کر لیا۔

''کہاں؟''

''نہ بتاؤں تو؟''

''ساری عمر سر جھکا کر سب کی مانی ہے میرے چن''۔

میں نے گاڑی روک دی۔

''بے بے وقت پانی کی طرح ہے بہہ جائے تو واپس نہیں آتا۔۔۔پر۔۔۔میں رک گیا۔

''پر کیا؟۔۔۔''

میں نے انہیں احمد دین کے دروازے پر چھوڑا۔

''آپ اندر جائیں میں کچھ دیر میں آتا ہوں''میں پھر رکا۔

''پر یہ کہ کبھی کبھی کچھ گھڑیاں یکجائی کی۔۔۔نصیب میں لکھی ہوتی ہیں''

چند دنوں بعد بے بے نے پیلا دوپٹہ اتار کر کونے پر لگی گانٹھ کھولی اور آسودگی سے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

رات کا دکھتا دن

شمشاد احمد

دن بھر دھوپ کی آنچ میں جلنے والا نیم کا پیڑ لوٹتے پرندوں کو ہاتھوں ہاتھ سمیٹ رہا تھا۔ حوالدار جلال بان کی کھری چارپائی پر چت لیٹا اور آتی جاتی دھوپ اور آتے پرندوں کا کھیل دیکھنے میں مگن تھا۔ صحن میں ایک طرف کچی مٹی کے سلگتے چولہے پر رکھی کیتلی میں پانی کھولنے لگا۔۔۔ بھاپ کے مضطرب لپکے ڈھکنے سے الجھنے لگے۔

حوالدار نے گلا صاف کیا۔۔۔ پھر آواز آئی۔

''بگاں۔۔۔ او بگاں۔۔۔ باہر نکل''۔

بگاں کمر پر ہاتھ رکھے تنکے کھاتی بھربھری، پلی اینٹوں کی کوٹھڑی سے برآمد ہوئی اور چولہے کی طرف مڑ گئی۔ عین اسی لمحے رحمان باہر کے چوپٹ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

اس نے اپنا نیا نویلا بیگ احتیاط سے گھڑونچی پر خالی جگہ میں سجایا اور ماں کی طرف لپکا۔

''بے بے۔۔۔ ایک کوپ میرے لیے بھی۔۔۔''

موتیے کی جھلیوں کے پیچھے ٹمٹماتی آنکھوں میں مامتا کی روشنی اتر آئی۔

''آج میرا پت۔۔۔ اتنے سارے دنوں بعد میرے ہاتھ کی چائے پئے گا''۔

حوالدار، ماں بیٹے کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

اس کا جی اتھل پتھل ہونے لگا۔

''نوکری لگ جانے کے بعد رحمان ایک دم سے بدل گیا۔۔۔ اس کی چہرے پر بھنبھناتی مایوسی غائب ہو گئی ہے اور اس کے کندھے سیدھے کھڑے ہو گئے ہیں۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ۔۔۔''

پریشانی کے ساتھ اسے کچھ اطمینان بھی ہوا۔۔۔ چلو جیسا تیسا ایک بیٹا اب گھر تو رہے گا۔ بڑے بھائی کے متعلق رحمان کا رویہ یکسر بدل گیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے بگاں ہمیشہ کی طرح سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی کوکھ کا ماتم کرنے نکل پڑی۔۔۔ رحمٰن اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس لے آیا۔

چھوڑ بے بے اس قصے کو۔۔۔ بہت ہو گیا۔۔۔ جو رشتہ فاصلے کا ایک جھٹکا برداشت نہ کر پایا، اس کا کیا رونا۔۔۔ بھول جاؤ بھائی کو۔۔۔ اب وہ ہمارا نہیں رہا''۔

حوالدار نے رحمان کو بڑے بھائی کے ذکر پر ہمیشہ گرجتے برستے دیکھا تھا۔۔۔ اس کے نئے روپ نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

''زہر اندر چلا جائے تو اور بھی خطرناک ہو جاتا تھا''۔

''ماہنے بہت۔۔۔ بڑی بھول ہوئی۔۔۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں اپنا اور تمہارا۔۔۔ سب کچھ اولاد کی بجائے ایک ڈاکو، لٹیرے پر لگا رہا ہوں۔۔۔ پر میں نے تو سارے گھر کو اس مردار سے جوڑ رکھا تھا۔۔۔ رقم گئی سو گئی، بیٹا بھی کھو دیا''۔

رحمان نے اچٹتی، اجنبی نگاہ باپ پر ڈالی اور چائے پینے لگا۔

حوالدار کا دل گھٹنے لگا۔

''ماں بیٹے نے اپنے دکھ کی سانجھ ڈال لی ہے اور مجھے اجنبی ساحل پر اکیلا چھوڑ دیا ہے''۔
رحمان نے اچانک زہر میں لتھڑا ایک بلند قہقہہ لگایا۔۔۔وہ اکثر ایسے بے وقت قہقہے لگانے لگا تھا۔
''چاچا۔۔۔بے بے، بھائی کی بیوی کی تصویر چھپ چھپ کر دیکھتی ہے''۔
بیگاں اپنی دونوں ہتھیلیاں ملنے لگی، ملتی چلی گئی۔
''نہ پت نہ۔۔۔میں تو اس چڑیل میم کو دیکھتی ہوں۔۔۔اتنی گوری چٹی اور دل اتنا کالا۔۔۔ہم لوگوں کو اس طرح برباد کرتے اسے ذرا بھی خیال نہ آیا۔۔۔''
اچانک پیڑ میں زلزلہ آ گیا۔
چڑیاں، کوے، لالیاں پھڑ پھڑائے اور چیختے پیڑ کے اوپر، اردگرد چکر کاٹنے لگے۔ایک سیاہ بلی تنے پر چڑھی، اپنی زرد آنکھیں گھما گھما کر حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔حوالدار نے اپنی جوتی اٹھائی اور پوری قوت سے وار کیا۔۔۔بلی ایک ہی جست میں بھاگ نکلی۔رحمان اچانک پھٹ پڑا۔
''یہ درخت مصیبت ہو کر رہ گیا ہے۔ساری دنیا کے پرندے یہاں آبسے ہیں۔۔۔اس گھر میں صبح آرام ہے نہ رات کو چین''۔
حقے کی نے حوالدار کے ڈھیلے دانتوں پر بجی۔۔۔درد کی لہر سے وہ تلملا اٹھا۔۔۔اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔۔۔اور بات ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی۔
''ہمارا ایک انگریز افسر ہوا کرتا تھا۔۔۔کہتا تھا کہ اگر نیم کا درخت ہمارے ملک میں ہوتا تو ہم اس کی پوجا کرتے''۔
رحمان نے جلدی سے چائے کی آخری سرکی لی۔
''جس گھر میں نیم ہوتی ہے۔۔۔وہاں کوئی بیماری داخل نہیں ہو پاتی''۔
رحمان پاؤں پٹختا، سیڑھیاں روندتا اوپر جا چکا تھا۔
حوالدار کی گٹھیلی انگلیاں حقے کی نے کے اردگرد گھومے چلی جا رہی تھیں۔
بیگاں اس کی پائینتی آ بیٹھی۔
حوالدار پھٹ پڑا۔
''دیکھ لیا۔۔۔بڑا مان تھا بیٹوں پر۔۔۔''
بیگاں نے آنسو پونچھے۔
''تم تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو پکڑ کر چبانے لگتے ہو۔۔۔تھک تھکا کر آتا ہے۔۔۔اللہ جانے سارا دن کہاں کہاں کھجل خراب ہوتا پھرتا ہے''۔
دونوں بھیگی آنکھوں سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔۔۔سچ سے دامن بچانے کے لیے جواز ڈھونڈتے رہے۔
پھر بیگاں کے آنسو چمکنے لگے۔
''جوان جہان مرد نوکری سے لگ جائے۔۔۔کمائی کرنے لگے تو اسے بیوی چاہیے ہوتی ہے۔۔۔دیکھتی ہوں کوئی اچھی سی لڑکی۔۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا''۔
بیگاں نے حوالدار کے ہاتھ سے خالی کپ لے لیا اور لالٹین جلانے اٹھ کھڑی ہوئی۔
نیم کے اندر زندگی رات اوڑھ کر سونے لگی تھی۔

حوالدار کو حال بری طرح سے چبھنے لگا تھا۔۔۔وہ ایک زقند میں ماضی میں کود گیا۔۔۔کچھ عرصے سے وہ اکثر ایسا کرنے لگا تھا۔
اس کا باپ باہر گلی میں دیوار کے ساتھ گڑھا کھود رہا تھا۔اس کے برہنہ جسم پر پسینے کے قطرے ناچ رہے تھے۔
اس نے آواز لگائی۔
''جلال خاں۔۔۔اٹھا لا نیم کا پودا۔۔۔''
جلال خاں نے پودے کو پھول کی طرح اٹھایا اور باپ کے اشارے پر گڑھے میں رکھ دیا۔
''جا۔۔۔اندر سے وضو والا لوٹا بھر لا''۔
جلال خاں نے کم زور ہوا میں جھولتے لکیر جیسے تنے پر ہری شبنم پھوٹتے دیکھی۔۔۔پھر وہ شبنم کونپلوں میں ڈھلنے لگی۔۔
نیم کا پیڑ موجیں مارتا جوان ہوتا چلا گیا۔
آدھے سے زیادہ پیڑ دیوار کے اوپر سے صحن میں چلا آیا تھا۔
جوانی کا بیش تر حصہ حوالدار نے گھر سے دور چھاؤنیوں میں گزارا۔۔۔لیکن بڑھاپے کی گرم دوپہروں میں پیڑ اسے بہت راس آیا۔۔۔اسے سوفی صد یقین تھا کہ اس کے سینے کی کھڑ کھڑاہٹ دبی رہتی ہے اور بھاری پتھر سانس آسان ہو جاتی ہے۔
حوالدار صبح سویرے چڑیوں کی چھن چھن سے اٹھ جاتا تھا۔۔۔پھر جب کوے اور لالیاں ہنگامہ کرنے لگتے تھے تو وہ نماز کے لیے نکل جاتا تھا۔
رحمان دھم دھم سیڑھیاں اتر رہا تھا۔۔۔وہ آج بھی لیٹ لگتا تھا۔
اچانک قیامت آ گئی۔
اس کے ہاتھ اوپر سے غلاظت کی ایک اچھی خاصی ڈھیری آن گری۔
بیگاں دہشت زدہ اس کی طرف دوڑی۔
''آ۔۔۔میں دھو دوں''۔
رحمان نے ماں کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔
وہ گھڑونچی کی طرف لپکا۔۔۔اور پیالہ بھر کر غلاظت بہا دی۔
پھر زمین کوٹتا باہر نکل گیا۔
حوالدار نے رحمٰن کی آنکھوں میں آنے والا طوفان دیکھ لیا تھا۔
رحمان شام گئے لوٹا تو خلاف معمول پر سکون تھا۔
حوالدار کا دل اچانک اس کے بس میں نہ رہا تھا۔
''صبح وقت پر پہنچ گئے تھے؟ یہ کوا بڑا ہی خبیث جانور ہے''۔
رحمان نے مسکرانے کی کوشش کی۔
''چاچا۔۔۔تم جانتے ہو میری ڈیوٹی بڑی لمبی اور تھکا دینے والی ہے۔۔۔اوپر سے ویگن کا روز کا سفر۔۔۔'' اس کی نگاہیں نیم کی طرف اٹھ گئیں۔
حوالدار چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔
''ٹھیک سے آنکھ لگتی نہیں کہ صبح ہو جاتی ہے''۔
رحمان منمنا رہا تھا۔۔۔ہتھوڑے پر روئی باندھ کر ضرب لگا رہا تھا۔

''ایک اور لڑکا ہے۔۔۔ہم دونوں مل کر شہر میں کرائے پر کمرہ لیں گے۔۔۔میں چھٹی والے دن گھر آیا کروں گا''۔
صحن نیم کے پیڑ میں معمول کے مطابق زندگی پوری قوت سے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔
حوالدار کو جاگنا نہیں پڑا کہ وہ سویا ہی نہیں تھا۔
رحمان اسے سوتا جان کر چپ چپاتے نکل گیا تھا۔
بیگاں چائے لے آئی۔۔۔حوالدار کو آنکھیں کھولنا پڑیں۔
بیگاں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور تڑپ گئی۔
''تم کیوں مرے جا رہے ہو؟ یہ بھی جاتا ہے تو جانے دو''۔
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
حوالدار نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور چائے کی پیالی پکڑ لی۔
چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔اس نے دو گھونٹوں میں ختم کر دی۔
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔جوتی پہنی اور چل پڑا۔
بیگاں دو چار قدم اس کے ساتھ چلی۔۔۔پھر رک گئی۔
''صبح صبح کچھ کھائے بغیر کدھر چل پڑے ہو؟''
حوالدار نے کوئی جواب نہ دیا۔
بیگاں نے دیوار کے سہارے کھڑی چھڑی لا کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔
''زیادہ تیزی نہ دکھانا۔۔۔سنبھل کر چلنا۔۔۔ابھی پچھلی چوٹوں کا درد نہیں گیا''۔
صدیق ماچھی نے حوالدار کی بات سنی تو سٹ پٹا گیا۔
اسے مزدوری سے غرض تھی۔
حوالدار نے اندر آ کر پیڑ کے نیچے بچھی چارپائی اٹھائی اور دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔
اس نے آخری بار نیم کے اندر جھانکا۔
درخت خالی تھا۔پرندے زندگی کرنے نکل گئے تھے۔
بیگاں کھرے کی بنی پر بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔
کلہاڑے کی پہلی چوٹ پر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگی۔
حوالدار نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے روک لیا۔
صدیق ماچھی کا کلہاڑا اپنا کام کر رہا تھا۔
دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سن کھڑے تھے۔
پھر ایک کرخت بھدی آواز کے ساتھ نیم کا پیڑ چڑ چڑاتا ہوا گر گیا۔
اچانک صحن ننگا ہو گیا۔تیز چمکتی دھوپ چھپاکے سے اندر گھس آئی۔۔۔
حوالدار اور بیگاں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔اور کان باہر دروازے پر لگا دیئے۔

☆☆☆

کایا کلپ

شموئل احمد

اس کی بیوی پہلے غسل کرتی تھی۔۔۔

اور یہ بات اسے ہمیشہ ہی عجیب لگی تھی کہ ایک عورت اس نیت سے غسل کرے۔

بیوی کے بال لمبے تھے جو کمر تک آتے تھے، غسل کے بعد انہیں کھلا رکھتی۔ بستر پر آتی تو تکیے پر سر ٹکا کر زلفوں کو فرش تک لٹکا دیتی۔ پانی بوند بوند کر ٹپکتا اور فرش گیلا ہو جاتا۔ گریباں اور آستین کا حصہ بھی پانی سے تر رہتا۔ ایک دو بار ہاتھ پیچھے لے جا کر زلفوں کو آہستہ سے جھٹکتی اور اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں لمحوں کی تحریر وہ صاف پڑھ لیتا۔

شروع شروع میں وہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بیوی جب غسل خانے کا رخ کرتی تو بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا اور پانی گرنے کی آوازیں سنتا رہتا۔ اسے سہرن سی محسوس ہوتی کہ غسل اسی کام کے لیے ہو رہا ہے۔ لیکن اب۔۔۔۔

اب عمر کی دہلیز پر خزاں کا موسم آ کر ٹھہر گیا تھا اور پرندے سرنگوں تھے۔

جنس کا تعلق اگر رنگوں سے ہے تو کاسنی رنگ سے ہوگا۔ یہ رنگ اس کی زندگی میں کبھی گہرا نہیں تھا بلکہ پچاس کی سرحدوں سے گذرتے ہی پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس پر ساری زندگی ایک گمنام سی قوت مسلط رہی تھی۔ آزادی اگر شخصیت کی معمار ہے تو وہ ساری عمر آزادی سے ہراساں رہا تھا۔ بچپن سے اپنی داخلیت کے نہاں خانے میں ایک ہی آواز سن رہا تھا۔ ''یہ مت کرو۔۔۔ وہ مت کرو۔۔۔'' اور جب شادی ہوئی تو یہ آواز نئے سر میں سنائی دینے لگی تھی۔

اور بیوی باتیں اس طرح کرتی تھی جیسے کوے ہنکار رہی ہو۔ اس کے ہونٹ دائرہ نما تھے جو بات بات پر بیضوی ہو جاتے۔ آنکھوں میں ہر وقت ایک حیرت سی گھلی رہتی جس کا اظہار ہونٹوں کے بدلتے خم سے ہوتا تھا۔ الفاظ کی ادائیگی میں ہونٹ پھیلتے اور سکڑتے۔

''اچھا۔۔۔؟''

''واقعی۔۔۔؟''

''اوہ۔۔۔!''

اس کی ہنسی بھی جداگانہ تھی۔ وہ ہو ہو کر ہنستی تھی اور منہ پر ہاتھ رکھ لیتی، پہلی قربت میں وہ جھنک کر دور ہو گئی تھی اور اسی طرح ہنسنے لگی تھی۔ تب یہ ہنسی دلکش تھی کہ وہ شب عروسی تھی جب بجھا ہوا چاند بھی خوش نما لگتا ہے۔۔۔ لیکن اب شادی کو تیس سال ہو گئے تھے۔ چاند کا منہ اب ٹیڑھا تھا اور سمندر شریانوں میں سر نہیں اٹھاتے تھے اور وہ کوفت سی محسوس کرتا تھا۔ بیوی کے پھیلتے اور سکڑتے ہونٹ۔۔۔ بیوی کی باتوں میں اسے تصنع کی جھلک ملتی۔ لیکن اس کا غسل کرنا اصلی تھا اور عمر کے اس حصے میں زندگی اجیرن تھی۔ اس دن تو اس کو بے حد ندامت ہوئی تھی جب وہ ایک قریبی رشتے دار کے گھر شادی کی تقریب میں گیا تھا۔ اس دن اس کے جی میں آیا تھا کہ چھت سے نیچے کود پڑے۔

تقریب میں شرکت سے بیوی بہت خوش تھی۔ مدت بعد گھر سے باہر نکلنے کا موقع ملا تھا۔ ماحول میں اچانک تبدیلی ہوئی تھی۔ انہیں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہوٹل کی فضا مخملی تھی۔ اعلیٰ قسم کا گدے دار بستر۔۔۔ ماربل کا صاف شفاف فرش۔۔۔ دیوار پر آویزاں ٹی وی اور خوشبو سے معطر کمرہ۔۔۔ کمرے کی پر کیف فضا میں بستر پر آتے ہی اسے نیند آنے لگی تھی لیکن بیوی کی آنکھوں

میں کاسنی رنگ لہرا گیا تھا۔اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔وہ غسل کر کے بستر پر آئی تھی تو حسب معمول دو تین بار اپنی زلفوں کو جھٹکا دیا تھا اور پاؤں کو اس طرح جنبش دی تھی کہ پاؤں کی انگلیاں اس کے تلوے سے مس ہو گئی تھیں۔لیکن وہ ایک کروٹ خاموش پڑا رہا کہ بے بال و پر تھا اور موسم گل کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔بیوی نے ایک بار پھر جنبش کی اور اس کا ہاتھ اس کے پیٹ کو چھونے لگا۔اسے کوفت ہوئی۔۔۔خواہ مخواہ بجھے ہوئے آتش دان میں راکھ کرید رہی ہے۔وہ دم سادھے پڑا رہا اور بیوی بھی راکھ کریدتی رہی۔آخر اس کی طرف مڑا۔اس کو بازوؤں میں بھینچنے کی کوشش کی۔ہونٹوں پر ہونٹ بھی ثبت کیے۔لیکن کوئی حرارت محسوس نہیں کر سکا۔کہیں کوئی چنگاری نہیں تھی۔کچھ دیر اس کے سلگتے جسم کو اپنی سرد بانہوں میں لیے رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔بیوی نے اس کی طرف دھند آمیز نگاہوں سے دیکھا۔اس کے ہونٹ بیضوی ہو گئے۔

اس نے ندامت سی محسوس کی اور بالکنی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔بیوی نے بھی ٹی وی آن کیا اور کوئی سیریل دیکھنے لگی۔وہ بار بار چینل بدل رہی تھی۔ریموٹ دباتے ہوئے ہونٹ بھینچتی اور ہاتھ کو جھٹکا دیتی۔وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہا کہ بیوی اس کا غصہ ریموٹ پر اتار رہی ہے۔

وہ دیر تک بالکنی میں کھڑا رہا۔سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک لنڈ منڈ پیڑ کھڑا تھا۔اس کی نگاہیں پیڑ پر جمی تھیں۔کچھ دیر بعد بیوی بھی بالکنی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔اس کی نظر پیڑ پر گئی تو منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

''ہو۔۔۔ہو۔۔۔ہو۔۔۔ایک دم ٹھوٹھ ہو رہا ہے۔۔۔؟''اس کو لگا وہ اس پر ہنس رہی ہے۔جیسے وہ خود بھی ایک ٹھوٹھ ہے۔

وہ ندامت سے بھرا بستر پر آ کر لیٹ گیا۔اس کے دل میں دھواں سا اٹھ رہا تھا۔اس نے ایک بار کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔اس کے بال ابھی بھی نم تھے۔وہ بار بار ہاتھ پیچھے لے جا کر انہیں لہرا رہی تھی۔اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ عمر میں اس سے دس سال چھوٹی ہے۔

وہ ٹی وی آن کیے بیٹھی رہی پھر اونگھتی اونگھتی کرسی پر ہی سو گئی۔وہ بھی رات بھر مردے کی طرح ایک کروٹ پڑا رہا۔

انسان بہت دنوں تک خالی پن کی حالت میں نہیں رہ سکتا۔۔۔۔

وہ اپنے لیے راحت کا سبب ڈھونڈھ رہا تھا۔سون پور کے میلے میں اس نے ایک چھوٹا سا پامیرین کتا خریدا۔نام رکھا گلفام۔گلفام جلد ہی مانوس ہو گیا۔اس کا زیادہ وقت گلفام کے ساتھ گزرنے لگا۔صبح کی سیر کو نکلتا تو زنجیر ہاتھ میں ہوتی سیٹی بجاتا تو گلفام دوڑتا ہوا آتا اور دم ہلانے لگتا۔۔۔اور وہ خوش ہوتا کہ کوئی تو ہے جو اس کا تابع دار ہے۔گلفام کے ساتھ ایک طرح کی آزادی کا احساس ہوتا تھا وہ اس کا بالکل اپنا تھا۔۔۔اس کے ساتھ من مانی کر سکتا تھا۔کوئی جبر نہیں تھا کہ یہ مت کرو۔۔۔وہ مت کرو۔۔۔لیکن بیوی اسے شوق فضول سمجھتی تھی۔کتا اس کی نظروں میں نجس تھا۔۔۔جہاں اس کا رواں پڑ جائے وہاں فرشتے نہیں آتے۔۔۔وہ کتے کی زنجیر چھوتا اور بیوی کے ہونٹ بیضوی ہو جاتے۔۔۔ناپاک ہے۔۔۔ناپاک ہے۔۔۔ہاتھ دھوئیے۔۔۔ہاتھ دھوئیے۔

اس کو کئی بار ہاتھ دھونا پڑتا۔لیکن ساری کوفت اس وقت راحت میں بدل جاتی جب گلفام اس کی ٹانگوں سے لپٹتا اور اچھل اچھل کر منہ چومنے کی کوشش کرتا۔وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا کہ کہیں بیوی تو نہیں دیکھ رہی۔۔۔؟ایک بار نظر پڑ گئی۔وہ گلفام کو گود میں لیے بیٹھا تھا اور وہ گردن اٹھا کر اس کے رخسار چوم رہا تھا۔

''یا اللہ۔۔۔یا اللہ۔۔۔!''بیوی زور سے چلائی۔۔۔دو ہتھڑ کلیجے پر مارا اور بے ہوش ہو گئی۔

وہ گھبرا گیا اور اور گلفام کو ہمیشہ کے لیے ایک دوست کے گھر چھوڑ آیا۔پھر کبھی کوئی کتا نہیں رکھا۔لیکن باغبانی شروع کی۔گھر کے احاطے میں پھول پتیاں لگانے لگا۔صبح صبح اٹھ کر دیکھتا کہ کوئی کلی پھوٹی یا نہیں۔۔۔؟پھول کی پتیوں کو آہستہ سے چھوتا اور خوش ہوتا۔بیوی نے بھی دلچسپی لی،اس نے بگیا میں گوبھی کے پھول اگائے۔

آدمی اگر بڑھاپے میں مذہبی زندگی جینے کے لیے مجبور ہے تو اس نے بھی مذہب کی چادر اوڑھی اور پنج گانہ نماز ادا کرنے لگا۔ لیکن چادر آہستہ آہستہ کندھے سے سرکنے لگی۔ اور نماز قضا ہونے لگی۔ پھر بھی فجر کی نماز پڑھتا اور کلام پاک کی تلاوت کرتا۔ اصل میں وہ آدمی طریقت کا تھا۔ وہ اپنے طریقے سے قرب الٰہی کا متمنی تھا۔ کوئی افتاد آپڑتی تو سیدھا خدا سے رجوع کرتا۔ ایک ہی بیٹی تھی۔ کہیں شادی نہیں ہو رہی تھی تو گھر کا کونہ پکڑلیا۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ تیرے حوالے کیا۔۔۔ اور رشتہ آنا فاناً طے ہوگیا۔ بیٹی اب لاکھوں میں کھیل رہی تھی۔ ریٹائر ہونے کو آئے تو دعا مانگی یا خدایا۔۔۔ پینشن کے کاغذات مجھ سے درست ہونے کو۔۔۔ ٹیبل ٹیبل کہاں تک دوڑوں۔۔۔؟ اور یہ معجزہ ہی تھا کہ تیس تاریخ کو ریٹائر ہوئے اور پہلی کو پنشن طے ہوگئی۔ لیکن بیوی مزار مزار دوڑتی تھی۔ ہر جمعرات کا فاتحہ پڑھتی۔ جب بھی وہاں جاتی شلوار جمپر پہن کر جاتی۔ مجاور نے سمجھایا تھا کہ مزار پر بزرگ لیٹے رہتے ہیں۔ عورتوں کا ساری میں طواف معیوب ہے۔ پچھلی بار جمعرات کے روز ہی اس کو میکے جانا پڑگیا تو فاتحہ کی ذمہ داری اس کو سونپی گئی۔ وہ اس کو وداع کرنے اسٹیشن گیا تو گاڑی میں سوار ہوتے ہوتے بیوی نے تاکید کی۔

''زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہیے گا۔ آج سے آدھ لیٹر ہی دودھ لینا ہے اور دیکھیے مزار پر فاتحہ پڑھنا مت بھولیے گا''۔

بیوی کچھ دنوں کے لیے میکے جاتی تو اسے لگتا کھلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن چاندنی چار دنوں کی ہوتی، دو تین دنوں بعد وہ پھر حصار میں ہوتا۔ پھر بھی دو دن ہی سہی وہ اپنی زندگی جی لیتا تھا۔ اس کا معمول بدل جاتا۔ صبح دیر سے اٹھتا اور اٹھتے ہی دو چار سگریٹ پھونکتا۔ شکر والی چائے بنا کر پیتا۔ دن بھر مٹر گشتی کرتا اور کھانا ریستوران میں کھاتا۔ سگریٹ کے ٹکڑے گھر سے باہر پھینکنا نہیں بھولتا تھا۔ اس کو احساس تھا کہ بیوی نہیں ہے لیکن اس کا آسیب گھر میں موجود ہے۔ وہ جب میکے سے آتی تو گھر کا کونہ کھدرا سونگھتی تھی۔ بیوی کو لگتا کہیں کچھ ہے جس کی پردہ داری ہے۔ وہ اکثر بستر کے نیچے بھی جھانک کر اطمینان کر لیتی تھی۔ ایک بار سگریٹ کے ٹکڑے ایش ٹرے میں رہ گئے تھے۔ بیوی میکے سے لوٹی تو سب سے پہلے ایش ٹرے پر نظر گئی۔

''اللہ رے اللہ۔۔۔ قبر میں پاؤں ہے لیکن علت چھوٹتی نہیں ہے''۔

وہ خاموش رہتا لیکن بیو مسلسل کوسے ہنکاتی رہتی۔ وہ شکر کی شیشی کا بھی معائنہ کرتی۔

اللہ رے اللہ۔۔۔ شیشی آدھی ہوگئی''۔

''شوگر بڑھا کر کیوں موت کو دعوت دے رہے ہیں؟''

ایک بار وہ جواب دے بیٹھا تھا۔

''موت برحق ہے''۔

بیوی برجستہ بولی تھی۔ ''اسی لیے تو ٹھوٹھ ہو گئے ہیں''۔

اس کو ٹھیس سی لگی لیکن کیا کہتا۔۔۔؟ ٹھوٹھ ہوں تو سنتی ہے کیوں بے شرم۔۔۔؟

قدرت بے نیاز ہے۔ سب کی سنتی ہے۔

اس بار بیوی دس دنوں کے لیے میکے گئی۔ وہ اسٹیشن پر وداع کر باہر آیا تو سڑک پر چلنا مشکل تھا۔ دور تک مالے کا لمبا جلوس تھا۔ کسی طرح بھیڑ میں اپنے لیے راستہ بنا رہا تھا کہ ایک رضا کار نے آنکھیں دکھائیں۔۔۔ لائن میں چلو۔۔۔ لائن میں۔۔۔' وہ کچھ دور قطار میں چلتا رہا۔ اسے بھوک لگ گئی تھی۔ فریزر روڈ پر ایک ریستوراں نظر آیا تو جلدی سے اس میں گھس گیا۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا۔۔۔ کسی کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کدھر جائے؟ وہ اندھے کی طرح کرسیاں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا تو ایک بیرے نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ایک خالی میز تک لے گیا۔

ریستوراں کی فضا اسے پراسرار لگی۔ ہر میز پر ایک لیمپ آویزاں تھا۔۔۔لیمپ صرف بل کی ادائیگی کے وقت روشن ہوتا تھا۔اس کی روشنی مدھم تھی۔ لیمپ کا زاویہ ایسا تھا کہ روشنی چہرے پر نہیں پڑتی تھی۔صرف بل ادا کرتے ہوئے ہاتھ نظر آتے تھے۔کونے والی میز سے چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز آرہی تھی جس میں دبی دبی سی ہنسی بھی شامل تھی۔کبھی کوئی زور سے ہنستا اور کبھی سرگوشیاں سی سنائی دیتیں۔

اس نے چاؤمنگ کا آرڈر دیا۔ بیرے نے سرگوشیوں میں پوچھا تھا کہ کیا وہ راحت بھی اٹھانا چاہتا ہے؟

راحت۔۔۔؟ اسے بیرے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن یہاں آکر وہ ایک طرح کی راحت محسوس کررہا تھا۔ یہ بات اچھی لگی تھی کہ چہرے نظر نہیں آتے تھے۔ پتہ لگانا مشکل تھا کہ کس میز پر کون کیا کررہا ہے؟ ریستوراں کی پراسرار آوازوں میں پاپ موسیقی کا مدھم شور بھی شامل تھا۔وہ ریستواں سے باہر آیا تو گرمی شباب پر تھی۔ وہ مزار پر جانا نہیں بھولا اور نہ بیوی مستقل کوسے ہنکاتی کہ کیوں نہیں گئے۔۔۔؟ میری طرف سے حاظری دے دیتے تو کیا بگڑ جاتا۔۔۔؟

وہ ریستوراں پہنچ گیا۔اس بار اندھیرا اور گہرا تھا۔ بیرے نے بتایا کہ کوئی میز خالی نہیں ہے لیکن وہ کونے والی میز شیئر کر سکتا ہے لیکن پارٹنر کے پانچ سو روپے لگ جائینگے۔ بیرے نے مزید کہا کہ یہاں کسی طرح کا کوئی رسک نہیں ہے۔۔۔وہ جب تک چاہے راحت اٹھا سکتا ہے۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ پارٹنر کے پانچ سو روپے سے بیرے کی مراد کیا ہے۔۔۔لیکن وہ کچھ دیر سکون سے بیٹھنا چاہتا تھا۔اس نے حامی بھر لی۔ بیرا اسے کونے والی میز پر لے گیا۔اس میز پر کوئی موجود تھا یہ ایک تنگ سی میز تھی۔صوفے پر مشکل سے دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ بیٹھنے میں گھٹنے میز سے ٹکراتے تھے۔اس نے پنیر کٹ لیٹ کا آرڈر دیا اور ایک بار اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ بغل میں کون ہے؟ چہرہ تو نظر نہیں آیا لیکن کانوں میں بندے سے چمکتے نظر آئے۔اور وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔۔۔کوئی عورت تو نہیں۔۔۔؟ عورت ہی تھی۔۔۔اور ہنس کر بولی۔

''بہت کم جگہ ہے سر بیٹھنے کی''۔

اس کا شانہ عورت کے شانے سے مس ہورہا تھا۔اس طرح بیٹھنا اسے عجیب لگا یہ پہلا اتفاق تھا کہ ایک اندھیرے ریستوراں میں وہ کسی نامحرم کے ساتھ تھا۔ جی میں آیا اٹھ کر چلا جائے لیکن شاید عورت اسے جانے کا کوئی موقع دینا نہیں چاہ رہی تھی۔

''سر میں راجہ بازار میں رہتی ہوں۔آپ کہاں رہتے ہو''۔عورت کی آواز میں کھنک تھی۔

''بورنگ روڈ''۔اس نے مرے مرے سے لہجے میں جواب دیا۔

''واہ سر،آپ میرے گھر سے نزدیک رہتے ہو''۔

وہ اب اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے لگا تھا۔میز پر گلاس اور پلیٹ نظر آرہے تھے۔اس نے عورت کا چہرہ بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن خط و خال بہت واضح نہیں تھے پھر بھی اس نے اندازہ لگایا کہ عمر زیادہ نہیں تھی۔

''سر آپ جب تک پکوڑے لیجیے۔۔۔''عورت نے اس کی طرف اپنی پلیٹ سرکائی۔

گلے پڑ رہی ہے۔۔۔اس نے سوچا۔لیکن خاموش رہا۔

''لیجیے نہ سر۔۔۔'' وہ اس کی طرف جھکی اور اس نے شانے کے قریب اس کی چھاتیوں کا ہلکا سا دباؤ محسوس کیا۔ بیرا دو پلیٹ کٹ لیٹ لے آیا۔

''واہ سر۔آپ نے میرے لیے بھی منگایا''۔وہ چہک کر بولی۔وہ مسکرایا،اس کا چہکنا اس کو اچھا لگا۔

سر۔۔۔آپ کون سا ساس لیں گے۔۔۔؟ ٹومیٹو یا چلی ساس۔۔۔؟

جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی پلیٹ میں ساس انڈیلنے لگی۔پھر کٹ لیٹ کا ایک ٹکڑا ساس میں بھگویا اور اس کے منہ کے

قریب لے جا کر بولی۔

''سر۔۔۔ پہلا نوالہ میری طرف سے''۔

''ارے نہیں۔۔۔''اس نے مزاحمت کی۔

''ہم اب دوست ہیں سر۔۔۔ ہماری دوستی کے نام۔۔۔''وہ اور ست گئی۔۔۔!

عورت کی بے تکلفی پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔

کوئی چھنال معلوم ہوتی ہے۔۔۔وہ سوچے بغیر نہیں رہا۔

''لیجیے نہ سر۔۔۔؟''

اور وہ سمجھ نہیں سکا کہ کس طرح اس نے نوالہ منہ میں لے لیا۔

''سر۔۔۔ہم اب دوست ہیں''۔

''میں بوڑھا ہوں۔تمہارا دوست کیسے ہو سکتا ہوں''۔

''مرد کبھی بوڑھا ہوتا ہے سر۔۔۔آسارام کو دیکھیے۔۔۔؟عورت ہنسنے لگی۔وہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہا۔بیرے کی بات اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ پانچ سو روپے۔۔۔

اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ ریستوران میں کاسنی رنگ کا پہرہ ہے۔

''سر۔۔۔آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔''وہ اس پر لد گئی۔

وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تو عورت نے ہنستے ہوئے سرگوشی کی۔

''گھبرائیں نہیں سر،یہاں اندھیرے کی جنت ہے۔یہاں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا ہے''۔

وہ مسکرایا۔اسے کیا پتہ کہ وہ ایک دم ٹھوٹھ ہے۔

عورت کے چہرے کے نقوش کچھ کچھ واضح ہو گئے تھے۔۔۔وہ اب سہج محسوس کر رہا تھا۔

''تم مجھے کیا جانتی ہو۔۔۔؟ہم پہلے کبھی ملے تو نہیں۔۔۔؟''

''آپ جیسے بھی ہیں مجھے پسند ہیں''۔عورت کچھ اور ست گئی اور کندھے پر رخسار ٹکا دیئے۔

عورت کی یہ ادا اس کو اچھی لگی۔اس کے بھی جی میں آیا کہ اس کے سر پر بوسہ ثبت کرے۔لیکن ہچکچاہٹ مانع تھی وہ اپنے سینے کے قریب اس کی چھاتیوں کا نرم لمس محسوس کر رہا تھا۔۔۔

ریستوراں کا اندھیرا اب اچھا معلوم ہو رہا تھا۔۔۔یہاں رات تھی اور رات گناہوں کو چھپا لیتی ہے۔

''آپ ڈرنک نہیں کرتے۔۔۔؟''اس نے پوچھا۔

''نہیں''۔

''میں بھی نہیں کرتی۔۔۔''

''سر یہ جگہ بہت مہنگی ہے۔ہم فیملی ریستواں میں ملیں گے''۔

''فیملی ریستوراں۔۔۔؟''

راجستھان ہوٹل کے سامنے والی گلی میں ہے سر۔میں آپ کو وہاں لے چلوں گی!

''میں گھر سے کم نکلتا ہوں''۔

''میں جانتی ہوں سر۔آپ اور لوگوں سے الگ ہیں''۔
''مجھے دیکھو گی تو بھاگ جاؤ گی''۔
''کیوں سر۔۔۔؟ آپ کوئی بھوت ہیں؟''
''بڈھا کھوسٹ۔۔۔!'' وہ مسکرایا۔
''مرد کبھی بوڑھا ہوتا ہے۔۔۔!'' عورت نے آہستہ سے اس کی جانگھ سہلائی۔۔۔ پھر اس کی گردن پر ہونٹوں سے برش کیا تو دور کہیں پتوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔۔۔ اور دوسرے ہی لمحے عورت نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ بھی ثبت کر دیئے۔۔۔اس کی گرم سانسوں کی آنچ۔۔۔اور جانگھ پر ہتھیلیوں کا لمس۔۔۔اس نے سرہن سی محسوس کی۔۔۔اور ریستوراں میں رات گہری ہوگئی۔۔۔موسیقی کا شور بڑھ گیا۔۔۔ پتوں کی سرسراہٹ تیز ہوگئی۔۔۔ سانسوں میں سمندر کا زیرلب شور گھلنے لگا۔۔۔ خوابیدہ پرندے چونک پڑے۔۔۔اور وہ دم بخود تھا۔۔۔ موسم گل جیسے لوٹ رہا تھا۔۔۔اس پر خنک آمیزی دھند چھا رہی تھی۔۔۔
اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ بیرا کس وقت آگیا اور وہ اس سے کب الگ ہوئی۔
''سر آپ کو ایک گھنٹہ ہوگیا۔ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے پر دوسو روپے ایکسٹرا لگیں گے''۔
وہ خاموش رہا۔موسم گل کا طلسم ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔۔۔بیرے نے اپنی بات دہرائی تو وہ جیسے دھند کی دبیز تہوں سے باہر آیا۔
وہ کچھ دیر اور راحت اٹھانا چاہتا تھا۔لیکن جیب میں زیادہ پیسے نہیں تھے۔اس نے بل لانے کے لیے کہا۔
''ہم فیملی ریستوران میں ملیں گے۔۔۔یہاں فضول پیسے کیوں دیجئے گا؟''
عورت نے اس کا موبائل نمبر نوٹ کیا۔
''کل دوپہر میں فون کروں گی۔راجستھان ہوٹل کے پاس آجایئے گا''۔
''ایک بات اور کہوں سر۔۔۔؟ پانچ سو روپے جو آپ یہاں بیرا کو دیں گے وہ آپ مجھے دے دیجئے گا''۔
بل ادا کر کے وہ باہر آیا تو سرور میں تھا۔لبوں پر مسکراہٹ تھی اور ڈھلتی دوپہر کی مری مری سی دھوپ بھی سہانی لگ رہی تھی۔گھر پہنچ کر اس کا سرور بڑھ گیا۔اسے حیرت تھی کہ کس طرح پابستہ پرندے۔۔۔
اس کے جی میں آیا اس کو فون لگائے۔اس نے نمبر ملایا۔ادھر سے آواز آئی۔
''ہیلو سر۔۔۔آپ گھر پہنچ گئے۔۔۔کل ملتے ہیں سر۔۔۔!'' اور اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
وہ مسکرایا۔'' سالی۔۔۔پوری چھنال ہے۔۔۔پانچ سو روپے لے گی۔۔۔کیا پتہ کوئی دوسرا پہلو میں بیٹھا ہو۔۔۔؟''
دوسرے دن ٹھیک دو بجے اس کا فون آیا اور۔۔۔
اور ملاقاتیں ہوتی رہیں، گل کھلتے رہے، پرندے پر تولتے رہے۔۔۔
وہ اب توانائی سی محسوس کرتا تھا۔ چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ رینگتی تھی۔لیکن بیوی اس میں کوئی تبدیلی محسوس نہ کر سکی۔آتے ہی اس نے حسب معمول گھر کا کونہ کھدرا سونگھا۔ایش ٹرے کی راکھ جھاڑی۔شکر کی شیشی کا معائنہ کیا اور تھک کر بیٹھ گئی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
''جاؤ۔۔۔غسل کرلو۔۔۔!'' یہ جملہ غیر متوقع تھا۔وہ شرما گئی۔
''سٹھیا گئے ہیں کیا۔۔۔؟ اس کے ہونٹ بیضوی ہوگئے۔اور اس کو بیوی کے بیضوی ہونٹ خوش نما لگے۔
بیوی نے غسل خانے کا رخ کیا تو وہ بستر پر لیٹ گیا۔۔۔آنکھیں بند کرلیں اور پانی گرنے کی آوازیں سننے لگا۔۔۔!

☆☆☆

قدرت کے بچے

شہناز شورو

ہیلو،
نمبر اجنبی تھا مگر آواز مانوس۔سارہ کے پور پور میں رچی بسی آواز،اس کی اپنی کھوئی ہوئی آواز،جس کی تلاش میں سارہ کا پل پل آزردہ تھا۔خوشی تھی،غم تھا،کسک تھی،خوف یا جھجک۔۔۔کچھ تھا جس نے یوں خنجر گھونپا کہ سسکی آہ میں بدل گئی۔

"How are you".

وہی صدیوں پرانا رٹا رٹایا سوال۔۔۔وہی اس کا پرانا گھسا پٹا جھوٹ۔۔۔

"I am good".

لہجے کے ارتعاش نے جسم کی رگ رگ کو مرتعش کر دیا تھا۔سارہ کا رواں رواں لرز رہا تھا۔

"I have heard that you have a beautiful daughter, am i right?"

اس نے سوال کیا۔

"Yes, I have".

سارہ نے آہستگی سے جواب دیتے ہوئے برابر میں گہری نیند میں سوئی ''کارلا'' کی طرف دیکھا۔
معصومیت کا ننھا سے پیکر۔۔۔سارا دن کھیل کھیل کر،تھک کر ننھے سے ٹیڈی بیئر کو ہاتھ میں پکڑے،سوگئی تھی۔
میں کب ملنے آؤں؟ پھر انوکھا سوال، جسے سننے کے لیے سارہ کے کان،دل اور احساسات مدت سے بے تاب تھے،وہ جواب دینا چاہتی تھی مگر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا نظر آ رہا تھا۔
جب تمہارا دل چاہے،تمہارا اپنا گھر ہے، کہتے کہتے سارہ کا لہجہ بھیگ سا گیا۔
چند لمحے سارہ جواب سننے کی منتظر رہی، پھر آواز آئی۔
''کل کس وقت آؤں؟''
''کسی بھی وقت''۔
آفس سے کس وقت لوٹو گی؟''
''پانچ بجے''۔
''بچی کہاں ہوتی ہے۔۔۔سارا دن۔۔؟؟''
بچی۔اتنے سال بعد بچی کے متعلق سوال۔۔۔پانچ سال سے زائد۔۔۔صبر آزما۔۔۔تکلیف دہ وقت کی چکی میں پسے ہوئے دن رات۔تنگ دستی،معصوم بچی کی ذمہ داری اور اکیلے پن کا شدید احساس کرتے یک بارگی سارہ کی سوچ میں تلخی کی کڑواہٹ گھل گئی۔
فی الحال تو وہ ڈے کیئر میں جا رہی ہے،میں ہی پک اینڈ ڈراپ کرتی ہوں۔
''چلو میں کل ساڑھے پانچ بجے تک آؤں گا،بچی کو تیار رکھنا۔۔۔''

''بائے''۔

سارہ نے ایک نظر پھر ''کارلا'' کی طرف دیکھا۔۔۔سوالات کے زہریلے ناگوں۔۔۔آنسوؤں سے بھیگی راتوں اور بے مہر دنوں کی کسک سے بے خبر۔۔۔تتلیوں اور جگنوؤں جیسا سبک ننھا سا بچپنا، مسرتوں، خوشیوں اور معصومیت کے رنگوں اور روشنیوں سے لبریز۔۔۔دنیا کے سارے غموں کو غیر اہم کر دینے جیسا طاقتور بچپن۔۔۔جو اوجھل ہو جائے تو پھر۔۔۔زندگی اداسیوں کے ابدی سلسلے میں ڈھل جاتی ہے۔

رات نے گزرنا تھا گزر گئی، مگر سارہ پوری رات بہت مضطرب رہی۔ماضی کے بارہ سال۔۔۔کبھی ننھے ننھے خرگوش بن جاتے تو کبھی نہ ختم ہونے والے لمبے لمبے سائے۔۔۔تاریک گہرے گھنے جنگلوں میں راستہ ڈھونڈتے رات کٹی۔۔۔صبح کارلا کو زبردستی جگایا۔برسوں سے یہی وتیرہ تھا۔ایک سال اور ایک مہینے کی ننھی سی جان تھی کارلا، جب اس کی میٹرنٹی لیو ختم ہوگئی تھی۔سوئی سوئی بچی کو ڈے کیئر میں چھوڑ کر جاب پر جاتی رہی۔

پھر جب اس کا وزن تیزی سے کم ہونے لگا تو ایک خوف دامن گیر ہوگیا۔پتہ نہیں دودھ کی بوتل منہ سے لگاتے بھی ہوں گے یا نہیں۔۔۔روتی رہتی ہوگی، یا اچھی طرح سنبھالتے ہوں گے مگر اور کوئی راستہ بھی نہ تھا سوائے اس کے کہ مزید مہنگے ڈے کیئر میں داخل کروادے اور یہی اس نے کیا۔

پورا دن سارہ رزق پر اپنا نام لکھے دانوں کی تلاش میں دیوانہ وار کام کرتی رہتی اور کارلا کا رزق اس کے کپڑوں میں جذب ہوتا رہتا۔جتنا کماتی اس کا 50 فیصد، بچی کو سنبھالنے والے ڈے کیئر کو دے دیتی۔باقی پیسے گھر کے بلز اور کرائے میں چلے جاتے۔گھر سبسڈائزڈ تھا حکومت کی طرف سے، مگر اس مالی فائدے کی سزا یہ تھی کہ ہر طرح کا منظر نا چار دیکھنا پڑتا۔اردگرد کے باسیوں کی اکثریت یا تو سینئر سٹیزنز پر مشتمل تھی جن کی اولادوں کو بھی ان کی خبر نہ تھی اور وہ خود اولڈ سینئر ہاؤسز کے اخراجات برداشت کرنے کے اہل نہ تھے۔تھکے ماندے آتی جاتی بسیں پکڑ کر ہسپتال جایا کرتے، یا پھر سردی سے کپکپاتے نشئی۔۔۔نشے میں دھت، ٹولیوں میں، کونوں کھدروں میں بیٹھے نظر آتے۔ان سبسڈائزڈ ہاؤسز کے چکر میں۔۔۔جدائی کی دہلیز پر پہنچتے لڑکے اور لڑکیوں کے عشق و اشتیاق کے جلوے چاروں طرف کسی تھرڈ ریٹ فلم کے نمائشی ٹائٹل کی طرح نظروں کے سامنے موجود رہتے۔

خیر ان سبسڈائزڈ ہاؤسز کا ملنا بھی آسان نہ تھا۔اس کے لیے بھی درخواست دینے والوں کی لمبی فہرست ہوتی تھی۔اور سالوں کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔مگر عام گھر کے مقابلے میں یہ ہاؤسز تین چار سو ڈالر سستے تھے، اور تین چار سو ڈالرز میں تو پورے مہینے کا راشن بلکہ بس کا کرایہ بھی نکل آتا تھا۔یہیں پر کم پیسوں میں ڈے کیئر بھی ملتی تھی۔پوش علاقوں میں تو فی گھنٹہ 20 یا 30 ڈالر لیتے تھے ایک بچہ سنبھالنے کے لیے۔

ڈیوڈ کے جانے کے بعد یہی آپشن تھا جس سے بے گھری کے عذاب سے بھی بچا جاسکتا تھا اور 20 اور 50 ڈالرز کے درمیان ہیٹنگ سسٹم بھی آن رکھا جاسکتا تھا۔انسان کسی بھی خطے میں ہو کوئی بھی زبان بولتا ہو، کسی ایک رنگ ونسل کا ہو۔۔۔کسی بھی اندازِ حکمرانی کا اسیر ہو، سر پر ایک چھت کے علاوہ جنس کے منہ زور گھوڑے کو لگام میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ پیٹ کے تنور کو بھرے رکھنے کے لیے ہر جگہ رسوا ہے۔

خیالات تھے کہ گھٹاؤں کی طرح امڈے چلے آرہے تھے۔ذہن پراگندہ ہو چلا تھا۔سارہ نے گھڑی دیکھی۔صبح کے چار بجے تھے۔صرف دو گھنٹے بچے تھے آرام کے لیے۔کیسا آرام۔۔۔بوجھل پپوٹوں اور دکھے دل کے ساتھ وہ بڑبڑائی۔

اٹھو۔۔۔دوڑو، بھاگو۔۔۔'' گھڑی کی سوئی کے ساتھ ساتھ جہاں پیر پھسلا۔۔۔جہاں سانس ہموار کرنے کے لیے

بندہ رکا، لمحہ ہاتھ سے چھوٹا۔۔۔ساری محنت اکارت۔۔۔

کسی بنی بنائی مشین میں فٹ ہونے والا ایک کارآمد پرزہ بننے کے لیے انسان۔۔۔کو، انسان سے مشین کا حصہ بننا پڑتا ہے۔ایک پرزے جیسا انسان۔ذرا سا زنگ لگ جائے تو بیکار۔۔۔اٹھاؤ پھینکو۔۔۔پرزوں کی کمی ہے کیا۔۔۔ایک ڈالر کی تھیلی میں 100 کیلیں ملتی ہیں۔سب ایک جیسی، ایک سائز۔۔۔ایک میٹریل کی۔۔۔جسے صبح دفتروں کو جاتی ہوئی ستے چہروں والی بسوں اور ٹرینوں میں لدی مخلوق۔۔۔اپنے تئیں خود کو اہم سمجھتے ہیں تا کہ زندگی جینے کا جواز رہے۔سب پرزے بہت ضروری۔ بہت اہم۔۔۔مگر اتنے ہی غیر ضروری اتنے ہی غیر اہم۔۔۔ایک منٹ میں ایک مشین کے ایک خانے میں ہر سائز اور تعداد میں بنتے اور ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔فاضل پرزہ ہے انسان اس لعنتی کیپٹلسٹ سماج میں۔

Totally replaceable.

ایسی ہی بوجھل اور غیر زمینی سی کیفیت میں سارہ نے چائے کا پانی تیار کیا۔

بچی کا بیگ، نیپکن وغیرہ رکھ کر رات کو ہی تیار کر دیا تھا۔دودھ کی تازہ بوتلیں تیار کر کے رکھیں۔

اجالا ہونے میں دیر تھی مگر سورج نے آج صرف چند لمحوں کے لیے ہی دیدار کروانا تھا۔کل ہی سیل فون پر موسم کا احوال اور درجہ حرارت چیک کر کے پرس میں چھتری رکھ لی تھی۔اپنے لنچ کے لیے ایک کیلا اور سیب اٹھائے۔۔۔سارا دن کی تھکان اور بوریت کے باوجود لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ کو قائم رکھنے کے لیے چپے چپے پر کافی ہاؤسز بنے تھے جہاں لائن میں لگے، بھیڑ چال کے شکار، مشینوں کو تیز تیز۔۔۔مستقل بنیادوں پر چلانے کے لیے چاق و چوبند پرزے کافی پر کافی کے مگ چڑھائے جاتے تھے۔

گھر سے باہر نکلتے وقت سارہ کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا ”ڈیوڈ۔۔۔“

آج اس کا شدت سے دل چاہا کسی ہمراز سے دل کی باتیں کرے۔یوں تو آفس میں کئی لوگ تھے مگر رابطوں کی نوعیت کاروباری اور مشینی تعلقات سے آگے نہ بڑھ پائی۔نارتھ امریکہ کا مسئلہ تنہائی ہے۔ہر رشتے کے ہوتے ہوئے تنہائی۔ نئے رشتوں کی تلاش میں پرانے رشتوں کو بھولنے کا مسئلہ، ہر رشتہ ایک غیر متوقع رشتے اور تعلق کا منتظر، اجنبی اور کھویا کھویا سا ہوتا ہے۔اور ہر نئے تعلق کے ملنے کے بعد۔۔۔معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط ہو گیا۔بروکن اور Disfunctional families کا ایک وسیع و عریض جہاں۔۔۔قربانی، ایثار، مروت، لحاظ برداشت۔۔۔جیسے الفاظ سے تہی ڈکشنری کے مالک۔

میٹریل ازم کے کھاتے کھوکلے کردار۔۔۔اوپر سے بنے ٹھنے، ڈیزائنر انڈسٹریوں کے چلتے پھرتے اشتہار، اندر سے زخموں سے چور۔۔۔کراہتی۔۔۔خراش زدہ روحوں کے مالک۔

کارلا کی چوتھی سالگرہ میں صرف تین ماہ کم تھے۔گیارہ ستمبر کو کارلا پیدا ہوئی تھی۔کیسی شدید سردی تھی اس رات۔۔۔وہ کپکپاتی ہوئی، دہشت زدہ سی حالت میں، لاوارثوں کی طرح ہسپتال پہنچی تھی۔مس اور مسز کے سوال کے جواب میں اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

مسز، اس نے جواب دیا۔تو پھر شوہر کی غیر موجودگی سوالیہ جملے میں تبدیل ہو گئی۔

تنہائی، اجنبیت، متوقع اور غیر متوقع ان دیکھی اذیت نے چاروں اور جال سا بن رکھا تھا اور یہ جال جسم و جان سے لپٹا رہا۔۔۔دردِ زہ نے اس کی تکلیف دو چند کر دی۔۔۔آن ڈیوٹی نرس نہ معلوم کن کن مراحل پر ذہنی، جسمانی، جنسی یا شاید روحانی اذیت سے گزری تھی جو آج اس کے پرانے بدلے چکانے کا دن تھا۔گو غلط شخص سے بدلے چکا رہی تھی مگر شاید تسکین مل رہی تھی۔

بے رحمانہ انداز سے ٹانگیں کھولو۔۔۔زور لگاؤ۔۔۔کیا کوئی انوکھا کام کر رہی ہو، جیسے بدلحاظ جملوں نے سارہ کو نڈھال

کر دیا، پہلے سارہ چیخی۔۔۔اور پھر ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر۔۔۔آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

ہوش آیا تو خالی پن اور پیاس کے احساسات نے وجود کو تڑپا دیا۔

معلوم ہے بیٹی کا وزن ڈیڑھ پاؤنڈ ہے۔اتنا بڑا پیٹ۔۔۔اتنا کم وزن۔۔۔آخر وقت تک ڈاکٹرز یقین دلاتی رہی کہ سب کچھ ٹھیک نارمل ہے۔

شاید حد سے بڑھتا ہوا فشار خون یا اینٹی ڈپریشن کی دوائیں وجہ ہوں مگر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔چوتھے دن سارہ گھر آ گئی مگر تین ماہ تک بچی وینٹی لیٹر اور آکسیجن ٹینٹ میں زندگی اور موت کے درمیان والی رسی پر جھولتی رہی۔ضد، خوف یا امید کے نتیجے میں جنم لینے والی بچی، کارلا۔۔۔سارہ نے یہی نام سوچا تھا اپنی بیٹی کے لیے۔جو اس کی دادی کا نام تھا۔

وجہ صرف ایک تھی کہ خاندان کی باقی سب عورتوں میں، اس نے صرف بدکلامی، بدمزاجی اور درشتگی دیکھی تھی۔دادی کے پاس شفقت اور محبت تھی۔تھوڑا احساس تھا۔ابا سارا دن چرس کے پف بنا بنا کر انہیں اڑاتا رہتا جب بھی کمرے سے نکلتا اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند سرخ ہوتیں۔شاید اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیوی کتنی بار حاملہ ہوئی، کتنے بچے ضائع ہوئے یا پیدا۔۔۔پورا خاندان گورنمنٹ کی دی ہوئی امداد پہ زندہ تھا، جسے لکھے نصیب کی طرح قبول کیا ہوا تھا۔ماں کا کام گالیاں بکنا تھا۔ بڑی بہنوں کو جیسے ہی جسمانی تبدیلیوں اور ان سے متعلق و منسلک کاروباری معاملات کا احساس ہوا ان کے سکڑتے بلاؤز اور پھیلتے میک اپ انہیں گھر سے دور کرنے لگے۔بھائی سارا سارا دن باہر گزارتے۔رات کو کسی لمحے کھلے دروازے سے آ کر بیڈ پر گر جاتے۔ شروع شروع میں ماں نے بختی کی، پھر چیخ و پکار اور پھر وہ عادی ہو گئی۔۔۔ہر ایک کی صبح اپنے اپنے وقت پر طلوع ہوتی۔۔۔سارہ کی بظاہر، مار دھاڑ سے بھرپور شخصیت۔۔۔اندر سے کسی خوفزدہ کبوتر کی مانند تھی۔اور دادی کے پاس آ کر وہ خوفزدہ کبوتر آنکھیں بند کر سکتا تھا۔سارہ کبوتری بنی۔۔۔جتنی دیر چاہتی دادی کے پاس رہ سکتی تھی۔۔۔دادی کسی کو اسے چیر نے پھاڑنے کو اجازت نہیں دے سکتی ہے۔

کفن میں لپٹنے سے پہلے دادی نے اپنے گلے میں لٹکے موتیوں میں جڑے صلیب کو اپنے جھریوں زدہ، ٹوٹے ناخنوں والے کرخت ہاتھوں سے سارہ کے گلے میں ڈال دیا۔دادی کی موت سے سارا شہر بے گانہ ہو گیا۔بے گانگی حد سے بڑھی تو اس نے اپنے سارے کپڑے ایک سوٹ کیس میں ڈالے اور ٹورنٹو چلی آئی۔مشینوں اور عمارتوں کی حکمرانی والے شہر میں۔۔۔چلتے پھرتے روبوٹوں، نائٹ کلبوں اور ان گنت خودکشیوں کے شہر میں۔۔۔بے گھروں اور نشے کی پناہ میں سڑکوں کے کنارے پیپوں کے شہر میں، خود کو کھونے کے لیے وہ بھی آن اتری تھی۔ان گنت صفروں میں ایک اور صفر۔۔۔

بارہ بجنے والے تھے۔آج آفس میں خلاف توقع رش کم تھا۔فون آ رہے تھے۔ہولڈ کرواتی۔۔۔پھر مطلوبہ نمبر پر ٹرانسفر کروا دیتی۔۔۔

جانے کیوں آج ماضی کے دیار میں جینے کا جی چاہ رہا تھا سارہ کا۔

گہرے زرد اور گلابی رنگوں کے پھولوں والا بغیر آستین کا بلاؤز اور پلین براؤن سکرٹ پہنے وہ اکیلی تنہا بنچ پر بیٹھی تھی، سامنے لیک شور کا حسین منظر تھا اور پاؤں تلے نرم سبزہ۔بڑھتی ہوئی خنکی اور ڈھلتی شام ماحول کو مزید پر اسرار کر رہے تھے۔

Can I sit here?

کے سوال نے اسے چونکا دیا تھا۔وہ ایک لمبے گھنے سے بالوں والا نوجوان تھا جس کی کولہوں تک اترتی پینٹس کی دونوں جیبوں میں ٹھنسی ہوئی چیزیں واضح نظر آ رہی تھیں۔

Ok

سارہ نے کسی جوش کا مظاہرہ کئے بغیر کہا۔

اگلا سوال متوقع تھا۔۔۔ ہر نوجوان۔۔۔ جوان، ادھیڑ عمر مرد۔۔ کا سوال۔۔

Are you single

جواب میں یس یا نو کہنے کے بجائے سارہ نے پوچھا۔

Why?

رسپانس میں تاخیر ہوئی تو سارہ نے ترچھی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں بھی ایک ترچھی نظر اسے تک رہی تھی۔ نظریں ملیں تو دونوں بے ساختہ مسکرا دیئے۔ پھر ساتھ ہی دونوں کا قہقہہ بلند ہوا۔ نہ مسکرانے کا کوئی مطلب تھا۔۔ نہ قہقہہ کا۔۔۔ مگر اچھا لگا۔۔۔ شام اچانک ہی ترنگ میں آ گئی تھی، جیسے ماحول کے پیالے سے ارغوانی مشروب چھلک جائے۔

کافی۔۔۔ دوسرا ایک طرفہ سوال۔

Why?

سارہ نے پھر یک حرفی جواب دیا مگر اس بار انداز میں شوخی تھی، جس کا جواب ایک بھرپور مردانہ قہقہہ تھا۔

تارے رات کی خبر لائے ایک ایک کر کے آسمان پر حاضری لگانے لگے اور ہواؤں میں چھپا برفیلا چور اجلد کو چھیلنے لگا تو دونوں ساتھ ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارہ نے اپنا کوٹ اٹھایا اور اس نے اپنا۔

کیلیفورنیا کی خاک چھانتا پہنچا تھا یہاں۔ رزق کی تلاش میں تھا۔ ماں زندہ تھی مگر اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ گرل فرینڈز کی تعداد یاد نہیں تھی۔ پہلا پولیس کیس 13 سال کی عمر میں بتا رہا تھا۔۔۔ سبب الفریقن ہونا کہتا تھا۔ رات کے 12 بجے سارہ نے وہاں سے جانے کیلیے آخری بس پکڑی تو ڈیوڈ کو رات گزارنے کے لیے اپنی منزل کا پتہ نہ تھا۔ بس کا انتظار کرتے ہوئے سارہ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔۔۔ خدا کرے۔۔۔ آخری بس گزر گئی ہو۔۔۔ اور۔۔۔ یہ رات مزید گہری۔۔۔ مزید ٹھنڈی اور پراسرار ہو جائے۔۔۔ مگر عین اس وقت بس سامنے تھی۔

بس ڈرائیور کو ٹکٹ دکھا کر، سارہ نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔ بس کے دروازے بند ہو گئے۔ ہائے۔۔۔ کمبخت روک ہی لیتا۔۔۔ اس کی ایک ہی جھلک نظر آئی۔۔۔ اداسی کے سمندر میں ڈبو دینے جیسی جھلک۔۔۔ اور بے کراں تاریکی۔ مصنوعی رنگوں کی روشنیوں میں بھی زندہ۔۔۔ تاریکی کی طاقت ور جادوگرنی۔ اتنی دیر میں ایک دوسرے کے فون نمبرز بھی ایکسچینج نہیں کر پائے تھے، بس برین ٹیزر ٹائپ، چھوٹے چھوٹے سوالوں سے ایک دوسرے کو زخماتے اور کریدتے رہے۔

کوئی ایک ماہ گزرا، جب سارہ ایک بس سے اتر کر دوسری بس کا انتظار کر رہی تھی۔ بس سے اترتے ہی سارہ نے بس سٹاپ سے ذرا دور ہو کر سگریٹ سلگا لیا تھا۔

ہیلو۔۔ سامنے سے آتے ہوئے ڈیوڈ نے پورے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔

خوشگوار حیرت کی ایک موج نے گویا سارہ کے پورے جسم کو اسیر کر لیا۔

تقریباً اسی حلیے میں۔۔۔ مگر مانوسیت کے رنگ لیے ڈیوڈ سامنے آ کھڑا ہوا۔ دونوں نے ہائی فائف سے اس خوشگوار ملاقات کا خیر مقدم کیا۔ زمانوں بعد کسی نے سارہ کے لیے مفن لیے اور کافی خریدی۔ خاندان کا ذکر آنے پر خود کو قدرت کا بیٹا کہنے لگا۔ ٹیبل پر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود کو ٹٹولتے، ڈھونڈتے رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ دیر تک وقت گزارا، ہنسے بھی، اداس بھی ہوئے۔ سارہ ماضی میں زندہ تھی، وہ حال میں۔ مگر دونوں ہی مستقبل کی کسی امکانی رہ گزر کی تلاش میں

تھے جہاں زندگی اپنی معنویت کے ساتھ زندہ ہو۔اس ملاقات میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ فون نمبر ایکسچینج کیے، دونوں کے شانے ایک دوسرے کے ساتھ دیر تک جڑے رہے۔ جدا ہوتے ہوئے، بلا ارادہ کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر کھڑے ایک دوسرے کی سانسیں محسوس کرتے رہے اور تیسری ملاقات میں بغیر کچھ کہے سنے دونوں نے شادی کا وقت طے کر لیا۔

چرچ کے انتظامات کے لیے دونوں نے اپنے اثاثے دیکھے۔ انگوٹھیوں کی قیمتیں چیک کیں۔ دلہن اور دلہا کے لیے کرائے پر دستیاب لباس ایک دوسرے کیلئے پسند کیے۔ کڑی شرائط پر دو دن کے لیے اچھے خاصے کرائے کی گاڑی کے کاغذ پر سائن کیے۔ ٹوٹل 13 مہمان، 8 سارہ کی طرف سے۔۔۔ پانچ ڈیوڈ کے، تین مرد اور ایک جوڑا۔ شیمپئن۔۔۔ کھانا۔ دونوں کے بنک اکاؤنٹ خالی ہو چکے تھے مگر دل جام محبت سے لبریز۔

کیسا اچھا فیصلہ تھا ہمارا۔ سارہ نے لنچ بریک میں اپنا لنچ باکس کھولتے ہوئے سوچا۔ یوں لگتا تھا کہ گویا ڈیوڈ آسمان سے ٹپکا ہے۔ تنہا۔۔۔ کبھی فیملی کا ذکر کیا نہ سننے کے موڈ میں آیا۔

آہستہ آہستہ ڈیوڈ کی آنکھوں کی اداسیاں بھی کم ہو رہی تھیں اور سارہ کا فلیٹ بھی گھر گھر سا لگنے لگا تھا۔ وہ ڈیلی ویجز پر کام کرتا تھا جب کہ سارہ ایک فرم میں ریسپشنسٹ تھی۔ دونوں کی تنخواہ کرائے کا گھر چلانے کے قابل تھی مگر بغیر کسی ارادے کے دونوں میں یوں جدائی آئی کہ دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔

مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ یہ ڈیوڈ کی ضد تھی۔ سارہ کی ضد یہ نہیں تھی کہ اسے بچہ چاہیے بلکہ اس کا غصہ تھا کہ کیوں نہیں چاہیے؟

ڈیوڈ تھوڑے بہت لفظوں کے ہیر پھیر سے یہی جملے بولتا کہ۔۔۔ اس نے آج تک کوئی رول ماڈل تک نہیں دیکھا۔ اور یہ کہ اسے باپ کے تصور سے ہی نفرت آتی تھی۔ ڈیوڈ کا کہنا تھا کہ اسے ہر اس بچے سے ہمدردی ہے جو اس دنیا میں وارد نہیں ہوا۔ اور اگر بچہ لازمی چاہیے تو گود لے لیتے ہیں۔ فوسٹرنگ۔۔۔ پیرنٹنگ سے بہتر ہے۔ کیا فرق ہوگا۔۔۔ گود لیا بچہ ہماری اپنی پیدا کردہ اولاد سے کمتر ہوگا کیا۔ وہ بھی دو انسانوں کا پیدا کیا ہوا بچہ ہوگا اور آخر میرے اور تمہارے بچے کے پیدا ہونے سے دنیا پر کیا اثر پڑ سکتا ہے سوائے اس کے کہ ہم ایک نئے بچے کو دنیا میں لانے کے گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

روز روز کی جھک جھک نے دونوں کے درمیان خواہ مخواہ کی انا کی دیوار کھڑی کر دی۔ ڈیوڈ کا رویہ سمجھانے والا ہوتا اور سارہ کا جارحانہ۔۔۔ ایک ویک اینڈ پر دونوں نے۔۔۔ اس مسئلے کے فائنل حل کے لیے۔۔۔ کہیں باہر بیٹھ کر گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔۔۔ سارہ اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔۔۔ ڈیوڈ ہمیشہ کی طرح دلائل دے رہا تھا جسے سارہ اپنی ضد سے رد کیے جا رہی تھی۔

آخر کیا کرو گی بچوں کے ساتھ۔۔۔؟؟ صبح سے شام تک ہم دونوں نوکری کرتے ہیں۔۔۔ کبھی اسے نرسری تو کبھی ڈے کیئر میں بھیجو گی۔۔۔ پھر اسکولوں کا بے رحم ماحول۔۔۔ ایوننگ کلبس کے نام پر ایک اور استحصال۔۔۔ میں گزرا ہوں اس استحصالی نظام سے۔۔۔ میں آنے والے لاتعداد بچوں کو تو نہیں روک سکتا مگر۔۔۔ میں ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے کسی بھی انجان و معصوم روح کو ایک بے بس انسان کی طرح دنیا میں نہیں پھینک سکتا۔ زندگی سے کھلواڑ سفاکی ہے، محض اپنی معمولی خواہش کی تکمیل کے لیے کیوں ایک نئی زندگی کو اس بے رحم دنیا کے رحم و کرم پر پھینکا جائے۔ ڈیوڈ کا فلسفہ بالکل واضح تھا اور وہ اپنے فیصلے میں کسی لچک کا روادار نہ تھا۔

اس کھلم کھلا انکار پر سارہ کو غصہ تو بہت آیا مگر اس کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ اس پوائنٹ پر ڈیوڈ سے اختلاف تھا، شدید اختلاف، مگر اس کے اپنے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ آخر وہ بچے کیوں چاہتی تھی؟ اسکے پاس بچے کو دینے کے لیے آخر کیا نیا یا انوکھا تھا؟ لے دے کے اس کے پاس ایک ہی جواز تھا کہ یہ اس کے عورت پنے کی تکمیل ہے،

جیسے ڈیوڈ دراصل سارہ کی انا کی تسکین سمجھے بیٹھا تھا۔

سارہ کے لیے اپنی خواہش اور ضد سے دستبردار ہونا ممکن نہ تھا۔ اس بچے کی خواہش حسرت میں بدلتی دکھائی دی تو اس نے زندگی سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے، ڈیوڈ کو کھری کھری سنانی شروع کر دیں۔ سارہ نے اسے خودغرض، جسمانی لذت کا اسیر، غیر ذمہ دار اور فراریت پسند گردانا۔۔ اور دونوں کے تعلق کو محض سستے جذبات اور وقت گزاری کا ذریعہ کہا۔

یہ غلط ہے۔ تم میری سول میٹ ہو۔۔۔ ڈیوڈ کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

کاش میں تمہیں۔۔۔ میرا بچپن دکھا سکتا۔۔۔ وہ ذلتیں، جھڑکیاں اور درد دکھا سکتا جنہوں نے میرا بچپن، میرے لیے ایک نہ ختم ہونے والا نائٹ میئر بنا دیا۔ مجھے ماں کے نام پر ایک غصہ ور، گالیں بکتی، ساری دنیا سے لڑتی خوفناک عورت نظر آتی ہے۔ اور باپ کی جگہ ڈراؤنے سائے۔۔۔ ہر جگہ میرا تعاقب کرتے سائے۔ مجھے پیٹتے۔۔ دھکے مارتے۔۔۔۔ مجھے گرا کر روند کر، میرے اوپر سے گزر جانے والے سائے۔۔۔ یہ نائٹ میئر اس وقت ختم ہوا جب تم میری زندگی میں آئیں اور تم نے مجھے قبول کیا۔۔۔ ایسے جیسا میں ہوں۔۔۔ کبھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ کبھی میرا بچپن کرید کر مجھے ننگا نہیں کیا۔ تم میری پناہ گاہ ہو۔۔۔ میں نے خود کو تمہیں سونپ دیا اب جو چاہے۔۔۔ میرے ساتھ سلوک کرو۔ مگر میں کیا کروں۔۔۔ میں خود پر جبر کر کے بھی کسی انسان کو جنم دینے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

وہ پہلی رات تھی جب دونوں اجنبیوں کی طرح ایک چھت تلے سوئے۔ اجنبیوں کی طرح اٹھے۔ کرایہ داروں کی طرح باتھ روم اور کچن استعمال کیا۔ اور اس سے پہلے کہ محبت پھر دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی۔۔۔ سارہ نے اپنی شرٹس اور نیلی کالی جینز اپنے سوٹ کیس میں بے دردی سے ٹھونستے ہوئے گھر چھوڑنے کا اعلان کیا۔

اداس ڈیوڈ نے۔۔۔ آہستگی سے بیگ کی زپ کھولی۔ پہلے سارہ کے کپڑے نکال کر صوفے پر رکھے، پھر احتیاط سے تمام خانے کھولے اور اس کی ضروری چیزیں نکال کر بیگ خالی کیا، جب تک سارہ باتھ روم سے نکلی۔۔۔ ڈیوڈ اس کے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے پیک کر کے جا چکا تھا۔ صوفے پر رکھے سارہ کے کپڑوں پر دھرے سفید کاغذ پہ تحریر تھا۔

یہ تمہارا گھر ہے۔ تمہیں نہیں بلکہ مجھے گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ یاد رکھنا میں گھر چھوڑ رہا ہوں، تمہیں نہیں، تمہیں نہیں، صرف تمہارا ڈیوڈ۔

تحریر پڑھتے ہی۔۔۔ سارہ کا وجود کسی کمزور پرندے کی طرح اڑان کا زور بھول گیا۔ اسے ایسے لگا جیسا کہ اچانک اسکے سر سے آسمان کھسک گیا ہو اور وہ کسی بلیک ہول کی اور کھنچی چلی جا رہی ہو۔ دل میں خیال آیا۔ کتنی دور گیا ہوگا۔ جاؤں اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے واپس لے آؤں۔۔۔ یا پھر فون کروں اور واپس آنے کے لیے کہوں۔۔۔

فیصلہ بدبخت ایسے ہی وقت نہیں ہو پاتا جب اسکی سخت ضرورت ہو۔ نہ قدم اٹھے نہ بانہیں مہربان ہوئیں۔ فون دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اور یوں وقت کی زنجیر۔۔۔ گھنٹوں سے دنوں، پھر ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں بدل گئی۔۔۔ اور پھر جب بھی انا کی گرفت ڈھیلی ہوئی سارہ نے بارہا فون کیا۔ ڈیوڈ نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا تھا۔۔۔ رابطہ خواب ہو گیا تھا۔

وقت بادشاہ ہے۔ جیسے زوال نہیں۔ وہ اپنے پیادوں کی آہ و بکا کہاں سنتا ہے۔۔۔ ہر رکاوٹ روندنا اور بڑھتے چلے جانا اس کا شیوہ ہے۔۔۔ پیادے۔۔۔ شکوہ شکایت کرتے، گرتے پڑتے، پھر مقدروں کو کوستے، زندگی بسر کرنے لگ جاتے۔ یہی حال سارہ کا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن ڈیوڈ پلٹ آئے گا۔ لیکن گزرتے دنوں اور سالوں نے رابطے کا کوئی سلسلہ بنا کر نہ دیا۔ کولیگس کی تلخ و ترش باتوں سے دلبرداشتہ کئی بار نوکری تبدیل کرنے کا سوچا مگر ہر جگہ ایک ہی نوعیت کا جال بچھا دیکھ کر کوئی غیر ضروری فیصلہ کرنے سے خود کو باز رکھا۔

ایسا نہیں تھا کہ ڈیوڈ کے علاوہ دنیا میں کوئی مرد نہیں تھا۔ ساتھ کام کرنے والے کولیگز سے لے کر جان پہچان والوں نے حسب استطاعت اس کی تنہائی بانٹنے کی استدعا اپنے اپنے طریقے سے کی مگر کسی نئے چونچلے کو برداشت کرنے کی ہمت نہ پا کر، سارہ کا مکمل دھیان ڈیوڈ اور اس کے ساتھ بتائے خوبصورت دنوں کی طرف مبذول رہتا۔ ہر روز کسی نہ کسی آہٹ پر اس کا دل اچانک یوں دھڑک اٹھتا کہ شاید یہ چاپ، یہ آہٹ یہ دستک ڈیوڈ کی ہو۔ کوئی ایک سال وہ اسی مخمصے کا شکار رہی کہ آج۔۔۔ابھی۔۔۔کل، یا شام کو اچانک دروازے پر ڈیوڈ کھڑا ہوگا، مگر پھر یہ خیال تبدیل ہو گئے تھے۔ کبھی سوچتی۔۔۔واپس سٹیٹ چلا گیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کسی پرانی گرل فرینڈ سے شادی کر لی ہو۔ یا پھر کوئی نیا تعلق بنا لیا ہو۔ دل فگار دلوں پر دستک دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایسے ہی لمحوں میں رشتے آسانی سے بن جاتے ہیں۔ مگر ان تمام وسوسوں کے باوجود وہ خود کو ڈیوڈ کے علاوہ کسی مرد کے ساتھ جوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔

تنہائی اور اداسی بے کراں ہوئی تو اس نے فرٹیلٹی کلینکس سے رابطہ کرنا شروع کیا اور بالآخر ایک اچھے سپرم بنک سے رابطہ ہو گیا۔ معمول ٹیسٹس اور مختلف ادویات کے کورسز کروانے کے بعد سپرم بنک نے ایک صحت مند ڈونر کے سپرمز ملتے ہی اس سے رابطہ کیا۔ ڈونر کی نسل اور رنگت کے متعلق سارہ نے اپنے سوالنامے کے جواب میں واضح طور پر لکھا تھا کہ اسے اس سے غرض نہیں۔ عام طور پر سپرم بنکس انتظار کے لیے دو سے تین سال کا وقت لیتے ہیں۔ مگر سارہ کے کیس میں محض سات ماہ میں ڈونر کا بندوبست ہو گیا تھا۔

عام دنوں کی مصروف زندگی میں تنہائی کا آسیب یوں نہیں لپٹتا تھا، جیسا کہ اس دن اس پر سوار ہوا جب وہ فرٹیلٹی کلینک میں سپرم انسرٹ کروانے پہنچی۔ نرس نے کہا تھا کہ ایک صحت مند سپرم ہی کافی ہوگا پریگنینسی کے لیے مگر 37 سال کی عمر میں وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی لہذا اس نے تینوں سپرم انسرٹ کرنے کے لیے کہا۔

حمل ٹھہرتے ہی وہ ایک اجنبی اور انجان سی خوشی سے تو ہمکنار ہوئی۔ مگر جوں جوں ہفتے بڑھے، اس کی تشویش اور سوچوں میں تغیر بھی بڑھتا گیا۔ بچے کے امکانی اخراجات کے پیش نظر اس نے سبسڈائزڈ ہاؤس کے لیے کافی عرصہ پہلے درخواست دے دی تھی، جو پریگنینسی کے چھٹے مہینے میں منظور ہو گئی تھی اور وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اس چھوٹے مگر صاف ستھرے فلیٹ سے نکل کر اس گھر میں چلی گئی جہاں وہ کم از کم چار سے پانچ سو ڈالر ماہانہ بچا سکتی تھی جس سے آنے والے بچے کی ڈے کیئر کے علاوہ دیگر خرچے بھی پورے ہو سکتے تھے۔ بغیر کسی پارٹنر کے تنہا زندگی گزارتے ہوئے اس کی پریگنینسی کی خبر نے اس آفس میں جہاں وہ کام کر رہی تھی، چونکایا ضرور، مگر معاملہ صرف مبارکباد دینے کی حد تک محدود رہا۔

پریگنینسی کے دوران سارہ نے گھر کو ڈیکوریٹ کیا۔ پھول اور پرندے دیواروں پر چسپاں کیے۔ بچے کے لیے رنگ برنگے کھلونے اور کپڑے لیے۔۔۔ جان بوجھ کر بچے کی جنس کے بارے میں ڈاکٹر سے کچھ نہ پوچھا بلکہ اسے بھی بتانے سے منع کر دیا۔ اسے خوشی تھی کہ اب وہ کبھی تنہا نہیں ہوگی۔ زمین پر اب اس کا ایک سہارا ہوگا مگر موجودہ تنہائی اور ڈیوڈ کے تصور نے اس کے اندر ایک مستقل اداسی پھیلائے رکھی۔ رہ رہ کر اس کو ڈیوڈ کا خیال آتا اگر وہ اس کو آتے جاتے کہیں پریگنینٹ دیکھ لے گا تو کیا سمجھے گا؟ پھر خیال آتا۔۔۔ کیا وہ ایسا سوچ بھی سکتا ہے؟

لیکن اتنے جدید ترین رابطوں کے طریقوں کے باوجود اس کا رابطہ نہ کرنا بھلا کیا پیغام دیتا ہے یہی نہ کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا ہے، کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتا حالانکہ میرا فون نمبر بھی وہی جو اس کے فون میں محفوظ تھا۔

سارہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ خود کو سنگل سمجھے یا نہیں۔۔۔لائف پارٹنر، کامن پارٹنر کی اصطلاحیں بہت قابل قبول ہیں، مسز کے لاحقے سے الگ، مگر جس شخص کو یہ درجہ دیا جائے اس کا اتا پتہ ہونا تو ضروری ہے۔ یہ پزل کرنے والا سوال تھا۔ کسی انجانے خوف کے باوجود امید کی کرنیں خود کو فروزاں رکھتیں، کبھی روتی کبھی ہنستی۔۔۔مگر بار بار آنے والے بچے کے لیے اپنے آپ کو ایک اچھی رول ماڈل ماں ثابت کرنے کا خود سے عہد کرتی۔

پریگننیسی اور ڈلیوری سے لے کر کارلا کے اولین دنوں کی بیمار جیسے آزمائشی لمحوں میں اسے ایک ساتھی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، کوئی سہارا ہوتا۔ بازو تھامنے والا۔۔۔اس کا بوجھ ہلکا کرنے والا۔ کسی کو اس کی تھکن کا احساس ہوتا۔۔۔پہلی بار کارلا کو دیکھ کر۔۔اس کی مندھی مندھی آنکھوں اور نہایت کومل وجود کو محسوس کرتے ہوئے وہ گھبرا سی گئی کہ خوشی کا اظہار کیسے کرے اور کیسے اپنے جذبات کو بیان کرے۔ کس سے کہے اور کون سنے گا۔ تنہائی اور اکیلے پن کا اتنا خوفناک ادراک اسے پہلی بار ہوا تھا۔ کاش ماں قریب ہوتی۔۔ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا۔۔۔مگر ماں کا خیال آتے ہی اسے دہشت اور نفرت نے آن لیا۔ دل چاہا قصے کہانیوں کی ماں جیسی ہوتی، ایسی نہیں جیسی کہ اس کی ماں تھی۔ ایک زمانہ وہ ماں سے دور رہنے کے باوجود اپنے دل میں اپنی ماں کے لیے گنجائش نہ نکال سکی تھی، چند ایک بار اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک خط لکھ کر ماں کو اپنے جذبات سے آگاہ کرے کہ اس نے اسے کیوں کر چھوڑ دیا اور کیوں زندگی کی اتنی بے معنویت، اجنبیت اور تنہائی کے باوجود اسے ماں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں کچھ ایسا کہے کہ وہ محسوس کرے کہ کوئی اسے اپنا سمجھتا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ والدین سے ناراض رہنے والی اولاد ان کے مرنے پہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے اور گریہ وزاری کرتے ہوئے ان کی ایک ہی التجا ہوتی ہے کہ کسی طرح وقت مہربان ہو اور وہ اپنے والدین کے ہاتھ تھام کر صرف ایک جملہ کہہ دیں، آئی لو یو۔

وہ جملہ جو وہ برسوں سے اپنی انا کے بھاری پتھر تلے کچلے بیٹھے رہتے ہیں، مگر یہ سب سنی سنائی کہانیاں تھیں۔ سارہ نے اپنے چاروں اطراف کی بے گانہ دنیا دیکھتے ہوئے سوچا کہ اگر اس وقت کوئی خط، کوئی کال آ جائے یا کوئی شناسا مل جائے جو اسے اس کے والدین کی موت کی خبر سنائے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟

کچھ بھی نہیں۔۔۔شاید کچھ بھی نہیں۔۔۔شاید اتنا بھی نہیں جتنا اس دن کریڈٹ کارڈ کھو جانے پہ ہوا تھا۔ شاید خونی رشتے مجبوری کے رشتے ہوتے ہیں جن سے منسلک رہنا معاشرتی مجبوری بنا دیا گیا ہے مگر ان کی حیثیت بائیلا جیکل رشتوں سے زیادہ نہیں ہے۔ جتنا ہر شخص کا انفرادی فعل ہے اور وہ خود ہی اپنے قول و عمل کے کٹہرے میں جرح سن سن کر صفائیاں دیتا ہے، جبکہ ان خون کے رشتوں کی گواہیاں بھی عام طور پر مخالف پلڑے میں ہی اپنا وزن ڈالتی ہیں۔

قبل اس کے کہ تنہائی اور آزمائشیں اسے توڑ ڈالتیں، کارلا نے اسے زندگی جینے کا جواز مہیا کر دیا تھا۔ کارلا کی آنکھیں گفتگو کرتی تھیں۔۔۔اسکے بال گھونگریالے تھے اور اس کی مسکراہٹ میں زندگی کا حسن۔۔۔سارہ نے کارلا کی ذات کے گرد اپنے وجود کا تانا بانا بن لیا تھا اور یوں خود کو مقصدیت کے ساتھ گزار رہی تھی۔ کارلا اس کے وجود کا اٹوٹ انگ۔۔۔اس کا حال اور مستقبل تھی۔ ایک ایسا وجود جس نے اس کے وجود سے جنم لیا تھا اور جس کو پانے کے لیے اس نے بہت بڑی قربانی دی تھی۔

ڈیوڈ کو کھو دیا تھا۔۔۔ہمیشہ کے لیے، شاید۔

اس سارے سفر میں پارٹیز اور محفلوں میں ساتھ ڈرنک اور ڈانس کرنے والے دوست بھی سارہ کے طرز زندگی کو "بور" قرار دیتے ہوئے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لوگ وہی سننا چاہتے ہیں جو وہ پسند کرتے ہیں، اگر انسان اپنے دل کی بات کہتا ہے تو دشمن بنا لیتا ہے یا دوست کھو بیٹھتا ہے۔ کچھ دوست ناصح بن بیٹھے تو کچھ ڈیوڈ کے بارے میں سارہ کے انتظار کو سولہویں صدی کا ناکام عشق قرار

دیتے چلے گئے۔اس میں بھی سارہ کے لیے یک گونہ اطمینان کا پہلو تھا۔اسے معلوم تھا کہ بچہ پالنا نہایت جان جوکھوں کا کام ہے۔ خصوصاً وہاں جہاں عورت کو سنگل ماں کا درجہ تو حاصل ہو مگر فل ٹائم ملازمت بھی کرنی ہو۔ نیوکلیئر فیملیز میں انفرادیت کے ساتھ جینا، دور سے جتنا پرکشش نظر آتا ہے، قریب سے اتنا ہی مہنگا سودا ہے۔لہٰذا کارلا کی پرورش میں کسی کا رول نہ تھا۔کسی کا احسان نہ تھا۔اور یہ بات سارہ کے لیے سکون کا باعث تھی کہ وہ اور اس کی کارلا، دنیا میں ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔

ہیلو، ایرین نے میز پر خاصے زور سے ہاتھ مارتے ہوئے سارہ کی آنکھوں میں جھانکا، پانچ بج چکے تھے۔آفس خالی ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک لایعنی سوچوں میں خود کو اور ماحول کو بھلائے بیٹھی تھی۔

Are you ok?

Sorry, have a great weekend.

کہتے ہوئے سارہ نے ایرین کا شکریہ ادا کیا اور کمپیوٹر آف کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

پندرہ سے بیس منٹ میں وہ کارلا کو لیتی ہوئی گھر آ گئی۔ساڑھے پانچ بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ایک زمانے کے بعد اس نے غور سے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔اپنے خدوخال میں اداسی اور محنت کے رنگوں کی لکیریں دیکھیں تو آنکھوں میں نمی لیے مسکرا دی۔

گلابی لپ اسٹک اور گلابی ٹاپ میں خود کو دیکھتے ہوئے اسے قدرے اطمینان ہوا۔یہ گلابی شوخ رنگ ڈیوڈ کا پسندیدہ رنگ تھا۔ناخن پالش سے انگلیاں سجانے کا وقت نہیں تھا۔بے بی پنک فراک کارلا کو پہناتے ہوئے وہ کئی بار گنگناتی بھی اور بار بار کارلا کو سینے سے لگا کر اس کے گالوں اور ماتھے پہ بوسے دیئے۔۔۔وہ اس ایک لمحہ کے انتظار میں تھی، جس نے سالوں بعد آنا تھا۔

پہلے اس نے دروازہ کھلا رکھا تھا، پھر لاک کیا۔۔۔چند منٹوں بعد دوبارہ کھول دیا۔ابھی کارلا کو شوز پہنانے ہی تھے کہ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی، مانوس دستک۔۔۔سنی سنائی آشناسی دستک پر کی ہول سے جھانکا تو باوجود اس کے کہ وہ پورپور ڈیوڈ کی منتظر تھی۔دھک سے رہ گئی۔لرزتے جسم اور کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ اور گفٹ پیک دونوں ہاتھوں سے تھامے سامنے ڈیوڈ کھڑا تھا۔

ہائے ہنی۔۔۔ڈیوڈ کی مسکراہٹ وہی تھی۔۔۔بس آنکھیں مزید گہری اور پراسرار ہو گئی تھیں۔

ہائے۔۔کہتے ہوئے سارہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے۔۔۔کارلا۔۔۔دونوں کے درمیان تھی۔

Who is he Mom?

Me....

ڈیوڈ گھٹنوں کے بل وہیں بیٹھ گیا۔

First let me know who are you?

ڈیوڈ نے بچوں کے سے سٹائل میں پوچھا۔

I am Called Carla.

نہایت اطمینان اور اعتماد سے کارلا بولی۔

Can we go to the Park?

''پارک'' کارلا نے ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''ارے رکو ابھی۔ پہلے کچھ چائے، کافی پیتے ہیں ڈیوڈ۔۔۔''
ہم آتے ہیں۔ میں صرف چائے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ڈیوڈ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ہم گھوم کر آتے ہیں۔پھر مل کر چائے کافی پئیں گے بلکہ کھانا بھی۔بھوکا ہوں بہت۔ڈیوڈ نے اپنا دایاں بازو سارہ کی کمر کے گرد حمائل کیا اور اس کے گلابی ہونٹوں کو چوم لیا۔

You still look like a doll?

ڈیوڈ نے گہری نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا اور ایک دم کارلا کو گود میں اٹھا کر بولا۔

"Say bye to mom... we are coming"

But who is he Mom.

کارلا نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے پوچھا۔

"This is Mr. David".

''اوہ مسٹر ڈیوڈ۔۔نائس ٹو میٹ یو۔۔۔''
کارلا خوشی کی شدت سے بولی۔
یہ چند لمحے۔۔۔کسی چھوٹے سے فلمی ٹریلر کی طرح چھپاکے سے نظروں کے سامنے سے گزر گئے۔شدت جذبات اور ناقابل یقین سی کیفیت میں سارہ ڈوبی ہوئی تھی۔گہرے گہرے سانس لیتی، گلدستے اور پیکٹس میز پر سجا کر بیٹھی تو اچانک انجانے خوف کی ایک لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔
تقریباً پانچ سال کے بعد ڈیوڈ آیا تھا اور جس وجہ سے مجھے اور گھر کو چھوڑ کر گیا تھا وہ وجہ نہ صرف اپنی جگہ برقرار ہے بلکہ ایک بچی کی شکل میں موجود ہے۔کارلا کی تخلیق کے عوامل تو صرف میں ہی جانتی ہوں یا پھر چند ایک دوست۔باقی سب کچھ ہسپتال کی فائل میں موجود ہے۔۔۔کیا ڈیوڈ کے لیے۔۔۔ان سب باتوں پر یقین کرنا آسان ہوگا۔سارہ نے سوچا۔
کتنی آسانی سے اس نے فون پر پوچھا تھا۔
سنا ہے کہ تمہارے پاس ایک پیاری سی بیٹی بھی ہے۔'' سوال تھا یا معلومات کا اظہار۔
ڈیوڈ ہمیشہ ہی نرم خو اور پر محبت رہا تھا۔غیر ضروری انانیت کا اس کے پاس جواز نہ تھا۔ماسوائے اپنے ماضی کو کریدنے کے، اسے کوئی دوسری بات پر اذیت محسوس نہ ہوتی تھی۔مگر بہرحال۔بچے کا موضوع اس کی دکھتی رگ تھا اور اس نکتے پر دونوں کے درمیان ناراضگی اتنی بڑھی کے ایک فریق کو گھر چھوڑ کر جانا پڑا۔اور کچھ یوں کہ سالوں تک ایک دوسرے کی خبر تک نہ لی۔وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑ گئی۔
سات بجے۔۔۔پھر آٹھ۔۔۔نو بج گئے تھے، سورج مکمل ڈوب گیا تھا۔وسوسوں اور سوالات نے سارہ کے خوف میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔اسے لگا سب کچھ غلط ہو گیا۔
میں نے کیسے کارلا ڈیوڈ کے حوالے کر دی بغیر کچھ پوچھے، بغیر کچھ کہے سنے۔ڈیوڈ کچھ نہیں جانتا کارلا کے بارے میں۔
کہتے ہیں مرد کی مردانگی کو سب سے زیادہ طیش اس وقت آتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے اس کے تصرف میں رہنے والی عورت کی وفاداری مشکوک ہے۔اور میرے پاس تو ایک عدد بچی ہے، جس کے باپ کے بارے میں کوئی کچھ بھی سوچ سکتا ہے۔۔۔خاص طور

پر ڈیوڈ۔ فلمی اور ڈرامائی کہانیوں کے ساتھ ساتھ آئے دن بچوں کے ساتھ ہونے والی دہشتناک کاروائیوں اور زیادتیوں کی اخباری خبروں نے اس کے ذہن کو یرغمال بنالیا۔

فون ہاتھ میں پکڑ کر اس نے وہی نمبر ڈائل کیا جس سے ڈیوڈ نے اسے کال کی تھی۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی۔۔ مگر دوسری طرف سے فون اٹینڈ نہ ہوا۔ ''او ہ گاڈ''۔۔۔ سارہ نے سر پکڑلیا۔

اترتی گہری سیاہ رات اس کے اعصاب کمزور کررہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا۔۔اور ہیلو مام کی پر جوش آواز کے ساتھ ہی کارلا کی کلکاری گونجی۔

ہاتھ میں اپنی پسندیدہ آئس کریم کا پیکٹ اٹھائے کارلا۔۔۔اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

ڈیوڈ کے ہونٹوں پر ایسی پر سکون اور محبت بھری مسکراہٹ سارہ نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ بیٹی کو گلے لگاتے ہوئے۔۔۔ گہرا سکون اور سانس لے کر سارہ نے ڈیوڈ کا ہاتھ تھاما اور بولی۔۔۔ ''تھینکو ڈیوڈ''۔

Not David Mom he is Daddy.

کارلا نے قطعیت بھرے انداز میں سارہ کو مخاطب کیا۔

☆☆☆

بازار کا بُت

طاہرہ اقبال

وہ نکلتا تو روز ہی تھا لیکن ہر روز اس کے نکلنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے بازار کو یوں اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی جیسے یہ آگ پہلی اور آخری بار لگی ہو۔ پورا بازار ہیجان بھرے دھک دھک کرتے ایک بڑے سے دل میں تبدیل ہو جاتا جس میں بے شمار دھڑکنیں بجتیں جیسے بازار کے وسط میں نصب سینما سکرین پر کوئی آئٹم سانگ چل رہا ہو اور سبھی نگاہیں گزروں گزروں اس میں دھنسی ہوں۔

نوعمر سیلزمینوں کے دل جیسے سینوں سے نکال کر چہروں پر گاڑ دیئے گئے ہوں۔ گردش خون کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہو کہ ان دلوں کو منوں منہ لہو پمپ کرنے کی اضافی مشقت کرنا پڑ رہی ہو، اسی لیے گل دم کی پشت جیسے سرخ انگارہ چہروں پر تپتی ہوئی ہونٹوں کی دو گرم سلاخیں گڑھی ہوں۔ سیاہ جین کے اوپر ٹماٹر رنگ کی کھلے گلے والی ٹاپ جس میں سے شفاف عنابی گلابی قمقمے سی جلد جھلملاتی۔ پتہ نہیں وہ تھریڈنگ کرواتا تھا کہ ویکسنگ کہ اس بت کی گھڑت ہی قدرت نے ایسی ملائم ایسی شفاف بنادی تھی کہ انگلیاں چھو لینے کی اضطراری حالت میں مڑنے اور اینٹھنے لگتیں۔ گردن سے اٹھا کر بنایا ہوا پونی ٹیل کندھوں کی چکنی ڈھلانی سطح جیسے کسی مرمریں دیوی کے شانوں سے پھسلتی موتیوں بھری آبشاریں۔

ترشی ہوئی کمان بھنویں، لمبی سایہ دار پلکوں میں جگتے روشن سیاہ جگنو صراحی دار شفاف گردن سے لپٹی سفید پرلز کی لڑی جیسے پورے وجود پر سہ طرفی آئینے جڑے ہوں آر پار سب دکھتا ہو۔ یہ شیش محل جدھر سے جھلک دکھلا جاتا آنکھوں کے دیئے دماغ کی جمالیاتی حسیات کو کچھ یوں بھڑکا دیتے کہ پھر سے دیکھنے کی تمنا اس کے پیچھے پیچھے دید کی سوالی بن کر چل نکلتی۔ مجمع جلوس کی شکل اختیار کر لیتا اور جو نکل نہ پاتے وہ تخمینے لگاتے رہ جاتے۔

آج شام کو وہ سکنی جین پر ستاروں جڑا سیاہ کوٹ پہنے نکلے گا۔ آج وہ ترک لمبی پونی ٹیل کو ست رنگ موتیوں سے سجائے گا جن میں بازار والوں کی ہزار ہزار زاویئے سے رال ٹپکاتی شبیہیں جھلکیں گی۔ آج وہ پنک کیپری پر نیلے جار جیٹ کی شرٹ پہنے گا جس میں بدن کی آتش بھڑک اٹھے گی جیسے گلاب کی پیالی میں شبنم جو پیاسے لبوں پر تھور کا نمک اگا دے گی۔ آج وہ اونچی ہیل والا سرخ سینڈل پہنے نکلے گا جس کی پینسل ہیل بازار میں بچھے دھک دھک دلوں کو ٹک ٹک چھیدتی گزر جائے گی۔ کترنیں اور سوراخ دار پسلیاں بچی رہ جائیں گی۔ وہ جو رنگ پہنتا پورا بازار اس رنگ میں رنگ جاتا جیسے رنگ ساز مختلف رنگوں کے کڑاہے دہکائے بیٹھے ہوں اور ہر ہر شے کو اسی رنگ میں بھگو دیتے ہیں جو اس روز اس بت کے پیراہن کا رنگ ہوتا۔ صبح گلابی تو شام فیروزی، دوپہر عنابی تو رات قرمزی رنگ میں ڈوب کر طلوع ہوتی پورا بازار اسی کے رنگوں میں نجانے کیسے ملبوس ہو جاتا تھا۔ سارے رنگ جیسے اسی میں سما جانے کو بے قرار ہوتے تھے کہ وہ جس رنگ کو اوڑھ لیتا وہی اپنی تابناکیاں دو چند کر لیتا اور پورا بازار اسی رنگ میں ڈوب جاتا۔ وہ رنگوں کو اس تناسب سے استعمال کرتا کہ عام رنگ بھی خاص ہو جاتے۔ ہرا گچ، لال انگارہ، پیلا زرد، چٹا سفید، کالا سیاہ، عنابی بھڑکیلا آتش ہی آتش ہر سو۔

یہ جنس نایاب سڑکوں، دکانوں، ریستورانوں تھڑوں کو اپنے رنگ میں رنگنے لگا۔ بڑے بڑے اسٹوروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے کھوکھوں تک میں اس کی مورتی سجنے لگی۔ پجاری تھالیاں سجائے آرتیاں اتارنے کو بھیڑ لگانے لگے جو بھی اسی رنگ

میں ملبوس ہوتے جو اس روز اس بت کی پوشاک کا رنگ ہوتا۔ جس دکان ریستوران یا کھوکھے پر وہ روزانہ جلوہ گر ہوتا اس پر جتنی بھیڑ جمع ہوتی اتنی ہی بکری بھی ہوتی۔ اسے اپنی دکان کی سمت راغب کرنے کو کئی اسکیمیں لڑائی گئیں۔ پیشہ ورانہ رقابت بڑھنے لگی تو تکرار سے فائرنگ تک جو ایک دو قتل ہوئے وہ بھی اسی کے نام لگے۔ بوتیکس اسے اپنے اپنے رنگ دینے کو رقابت میں جلنے لگے۔ پارلرز اپنے رنگوں میں اسے سجانے کو ایک دوسرے کو مات دینے لگے۔ روز وہ اس محل سے پیدل ہی نکلتا جس کی طویل و عریض فصیل میں تین اطراف نصب گیٹوں میں سے مرسیڈیز، فراری اور لینڈ کروزر کچھ دیر پہلے ہی نکل چکی ہوتیں اور باوردی گیٹ کیپر سکیورٹی کیمروں والے گیٹ ابھی بند ہی کر رہے ہوتے۔ شروع شروع میں یہ گارڈز اس کے نکلنے میں مزاحم ہوتے لیکن وہ ان پر کبھی چیختا چلاتا نا۔ عجیب راکھ میں دبی چنگاری جیسا دھیما مزاج نہ امارت کا تکبر نہ حسن کا گھمنڈ، نہ اسٹیٹس کا دھیان۔ شاید یہ سبھی محرومیاں اور برتریاں خالص جنس کی فطرت ہیں۔ ناخالص جنس تو خوشگوار مغالطے میں ہی رہ جاتی ہے، پھر شاید اس محل کے باسی اس کے انجام سے متفق ہو گئے کہ اب تو گارڈز بھی اسے لذیذ نظروں سے بس گھورتے رہ جاتے۔ شہر کے مہنگے اسکول میں اس کے کلاس فیلوز بھی اسے ہنسی مذاق میں اڑا اڑا کر بور ہو گئے کہ جواباً نہ غصہ نہ احتجاج کہ طبیعتیں مچل سکیں۔ ہائی سوسائٹی کی ہر پل بدلتی تھرل اور انجوائے منٹ کے پیمانوں سے بھی باہر نکل گیا تھا کہ یہ روٹین تفریح کس قدر بور رنگ۔۔۔

اب جہاں کی وہ جنس تھی اسی بازار کے سپرد تھی، جس نے کھلی بانہوں اسے وصول لیا تھا۔ بازار کی حوالگی کے بعد اس کے جسم کی پوشیدگیاں زیادہ معنی خیز ہو گئیں۔ سینہ عورتوں کی ساخت اوڑھنے لگا۔ بڑھے ناخنوں والی انگلیوں میں عجب لچک آ گئی جیسے سبھی جوڑ کھل گئے ہوں۔ سڈول کلائی میں بریسلیٹ، کان میں بندا، کھلے گلے والی شوخ رنگ زنانہ ناپ ہرا بھار ہر قوس، نفاست و نزاکت کی انتہا میں پہنچی ہوئی متوسط طبقے اور امیر طبقے کی مامتا میں بھی دونوں طبقوں کے فاصلے جیسا ہی 'بعد' کئی مرتبہ یہ امیر مامتا بازاریوں میں گھرے اس بت کو دیکھتی بھی ڈرائیور گاڑی کی رفتار کم بھی کرتا۔ میک اپ پر پسینے کے قطرے نمودار بھی ہوتے۔ گاڑھے میک اپ سے بوجھل آنکھیں جھک جاتیں۔

''ڈرائیور اے سی اور گاڑی کی رفتار ذرا بڑھا دو''۔

وہ کیوں رکیں۔ یہ بہزاد تھوڑی تھا جسے انہوں نے مہنگے ترین گائنی ہسپتال میں پیدا کیا تھا اور اس کے گھڑے گھڑائے نقش و نگار کو دیکھ کر سبھی نے بیک زبان پکارا تھا۔

''بہزاد۔۔۔'' لیکن وہ تو بہزاد کا صنم ہو گیا۔ یہ بت اس بہزاد کے اندر فطرت کے کسی غیر متوازن رویئے نے چھپا رکھا تھا کہ بہزاد پر صنم حاوی آ گیا۔ صنم کہ یہ شناخت بازار والوں نے اسے دی تھی۔ بلکہ ہر بازار کی ہر گلی کا دیا ہوا اپنا اپنا نام تھا۔ گلابو، پنکی، سویٹی، زری، نازو۔۔۔

کیسے شرمندہ کر دینے والے لچر نام تبھی تو پورے گھرانے نے بہزاد کے نام سے آنکھیں اور کان لپیٹ لیے تھے۔ ایسے ہی جیسے وہ کسی بھی بازاری تماشے سے منہ پھیر لیا کرتے تھے۔

وہ زیادہ لچکیلا، زیادہ شرمیلا، زیادہ نازک اندام ہوتا چلا گیا تھا جیسے بگھی کے گھونگھٹ میں چھپی کوئی نازنین دھیرے دھیرے عیاں ہوتی چلی جا رہی ہو۔ فطرت بھی کیسی دھوکے باز اپنی منافقت میں ذو معنویت میں، دوغلے پن میں گھات لگائے دشمن کی طرح شکار کرتی ہوئی۔ چھپ کر وار کرنے والی، جو نظر آتا ہے وہ اچک لینے والی اور جو نظر نہیں آتا وہ ٹھونس دینے والی۔۔۔ بہزاد کے قالب میں صنم کو بھرنے والی۔ بعض اوقات قدرت بھی آسمانوں سے انسانی لطیفے ارسال کرتی ہے۔ پھبتیاں گھڑتی ہے، جنس آدمیت کے ساتھ تخول کر جاتی ہے۔ انسان کو خود اسی کی ہیئت ترکیبی کے ہاتھوں مجبور کر دیتی ہے۔ عوام الناس کی تفنن طبع کے لیے

لطیفائی روپ میں ڈھال دیتی ہے کہ جہاں سے گزریں پیچھے تفریحِ طبع ''اوئے اوئے'' کی بدروؤں میں انقباض کا نکاس کرتی رہے۔ یہ بھی ذہنی صحت کے لیے کتنے ضروری ہیں۔ خود کو مکمل اتم اور باوقار کا تفاخر حاصل کرنے کے لیے یہ بگاڑ یہ کمتری کتنی ضروری ہے نا خالص جنس، انسان اور جانور کے بیچ، عورت اور مرد کے بیچ کا روپ۔۔۔ معاشرے کی ذہنی صحت کے لیے لطیفیائی معالجہ قدرتی کلوننگ۔۔۔

دو دھڑ والا بچہ پنجرے میں بند جس کے دیکھنے کو ٹکٹ لگا ہوا اپنے ذرا ذرا ہاتھوں سے تماشا گاہ کی طرف راغب کرتا پچکے ہوئے چہرے اور اعضاء والا بونا۔ تالیاں پیٹتا چہرہ پینٹ کیے ہوئے ناچتا گاتا وجود کی بھیک مانگتا ہوا ہیجڑہ۔ ریچھ اور بکری کا تماشا۔ سانپ اور نیولے کا تماشا بندر اور بندریا کا تماشا اور یہ مہنگے بوتیکس اور پارلرز سے سج کر نکلتا ہوا تماشا، جس کے رنگ میں پورا بازار رنگ جاتا تھا، جیسے سمندر کے نیلگوں پانیوں میں ڈوب جاتا ہو جیسے برف کی سفید چادر کو اوڑھ لیتا ہو، جیسے سرمئی شام کو پہن لیتا ہو۔ اتنا قیامت خیز حسن کسی عورت کو کیوں نہ ملا آج تک۔ حسن کا کوئی علیحدہ ہی پیمانہ، الگ ذائقہ الگ ہی کوئی حساب اور تناسب۔ الگ ہی عناصر اور ترکیب استعمال، جسے اس حسن کی چاٹ لگ گئی پھر کسی نازک اندام حسینہ میں مزا نہ رہا۔ قدرت نے منفرد وحشی لذت کے سامان کیوں بھر دیئے۔ بازاری تماشا، دو دھڑ والا بچہ، ریچھ اور بکری کی دوستی، نیولے اور سانپ کی لڑائی بندر اور بندریا کا روٹھنا، ماننا کیسے عجیب اور دلچسپ کھیل پورا بازار کھیلتا۔

اٹھارہ برس کا ہوئے اسے ایک سال گزر الیکن اس کا شناختی کارڈ نہ بنوایا جاسکا تھا، ورنہ جس بازار کی وہ جنس تھا اسے ادھر ہی دھکیل دیا جاتا۔ ادھر امریکہ و یورپ کے بازاروں میں جہاں اس انوکھی ترکیب والی فصل کی خوب کھپت تھی، یوں یہ باعزت خاندان اس طعنے سے نجات پاسکتا تھا، وہاں جہاں وہ بزنس ٹوورز لگاتے اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے بازار کھوجتے تھے، جہاں شناخت کا عمل بالکل ذاتی تھا، لیکن اس کا بے فارم اس کا رد تھا۔ وہ جب بھی تصویر اتروانے کو جاتا، ہونٹوں پر لالی، آنکھوں پر آئی شیڈز، ترشی ہوئی بھنویں۔ ناک میں کیل کان میں بالی، گلے میں مالا، اونچا پونی ٹیل، کھلے گلے اور ابھرے سینے والی چست شرٹ۔

اس کی ولدیت کے خانے میں جو نام لکھا جاتا تھا وہ ملک کی ایک معروف سیاسی شخصیت کا تھا جو ہر الیکشن میں ایک باعزت سیاسی نمائندہ کے طور پر اسمبلیوں میں براجمان ہوتے تھے۔ کتنا باعث شرم تھا وہ جتنا چھپایا جاتا اتنا ہی عریاں ہوتا جتنا انکار کیا جاتا اتنا ہی اصرار کرتا۔ یہ پکا ثبوت سیاسی ساکھ اور خاندانی وقار کو تباہ کر دینے والا ثبوت۔ یہ بگڑے ہوئے مسخ شدہ مکمل انسانوں کی بھیڑ میں اس قدر نمایاں کیوں ہو جاتے ہیں۔

وجود کی غلاظتوں کو گٹر برد کر دیا جاتا ہے۔ چشم پوشی ناک پر کپڑا، ائیر فریشنر، اگزاسٹ فین، تیزاب، فنائل، گندے جراثومے مار دینے کو ایجاد ہوئے ہیں۔ اچانک ایک روز بازار میں لوٹ سی پڑ گئی جیسے ڈھاٹے دار بندوق برداروں نے ایک ہی ہلے میں سب نوچ کھسوٹ لیا ہو۔ تمام تر سجاوٹوں اور ہمہ رنگیوں سے بازار چھلکتے رہے لیکن زندگی اور رس کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ دو روز سے صنم کا کہیں اتہ پتہ نہ تھا۔ انتظار کی سولی سے ٹنگی نگاہیں مندنے لگی تھیں۔ سگریٹ پان کے کھوکھوں پر گرم موضوع سوگواری میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ سارے شوخ رنگ حیران تھے۔ سرخ اور کرمزی گلابی کلیجی گوڑھے رنگ پھیکے پڑ رہے تھے۔ نیلے سبز رنگ شب خوابی کا لباس اوڑھنے لگے تھے۔ سفید پیلا پژمردہ چہرہ لیے جیسے صف ماتم میں بیٹھے ہوں۔ وہ جس کی بازار میں رل پڑی تھی جو کمیاب ہوتے ہوئے بھی نایاب تھا۔ کھوکھوں، تھڑوں، ریڑھیوں، تنوروں سے شاپنگ مالز تک کساد بازاری، مندی کا سودا، بھلا کبھی بت بھی بکے ہیں۔ بت فروشی نہیں بت شکنی شعار ہے یہاں کا۔ اغوا کاروں کے فون آتے رہے تاوان کی رقم دس کروڑ سے گھٹتے گھٹتے دس لاکھ ہو گئی۔ دس لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ کے قصرِ مذلت میں جست لگا گئی لیکن وارثوں کی جانب سے کوئی جوابی کاروائی عمل میں نہ آئی۔ کسی

پولیس اسٹیشن پر رپورٹ تک درج نہ ہوئی۔ بازاروالے ہزار دو ہزار بھی چندہ جمع کرتے تو دو کروڑ کے باعزت تاوان کے بعد وہ پونی ٹیل والی صراحی دار گردن اکڑا کر تفاخر سے رہا ہوتا اور یہ قرض جان ناز پر رکھتا تھوڑی چکا ہی دیتا بازار کی مندی کو اپنے تیز رنگوں میں رنگ دیتا۔ لیکن کسی تجوری کا منہ کھلا ہی نہ جن تجوریوں میں وہ تیز بکری ڈلوانے کا باعث رہا تھا۔ مہینہ بھر جب اس کا کوئی وارث پیدا نہ ہوا تو ایک روز سویرے سویرے وہ خود بخود ہی بیچ بازار آن کھڑا ہوا۔ پرنچا راج ہنس سا خود پر گزرنے والی روداد رو رو کر سناتا ہوا، اور قریبی چوکی پر بیٹھے سپاہی اس کی برہنہ پنڈلیوں کے سیخ کباب نگلتے ہنس ہنس سنتے تھے۔ بازار کی اداس فضاؤں نے انگڑائی کھول کر اسے خوش آمدید کہا۔ اغوا کاروں نے تاوان کی رقم شاید اس کے بدن کی لوٹ کھسوٹ سے ہی وصول پالی تھی، پھر بھی اس کے کھانے رکھنے کے اخراجات دو بھر ہو گئے تھے۔ بہزاد کے صنم کو شاید یہی بے توقیری اداس کر گئی تھی۔ اس دورانیے میں باوردی ڈرائیور اور گن مینوں کی حفاظت والی چار گاڑیاں بازار میں سے گزریں، جنہیں دیکھ کر پولیس کے سپاہی اپنی اپنی پوزیشن پر اٹین شن ہو گئے۔

سیٹھ عنایت اللہ کی مرسیڈیز، شیخ شاہد اللہ کی لینڈ کروزر، مسز عنایت اللہ کی ہنڈا اکارڈ، اور مس فاطمہ اللہ کی فراری۔

ہر گاڑی کے ہر ڈرائیور نے اس مجمعے میں ایستادہ بت کو پہچان کر حیرت کی بریکیں لگائیں، لیکن مالکان نے بند شیشوں پر چڑھی دھند سے فطرت کی ڈھٹائی اور بے حیائی سے آنکھیں چرالیں۔

''زندہ چھوڑ دیا کم بختوں نے۔۔۔''

فاطمہ پہلو میں بیٹھے منگیتر سے ہنی مون پلین کرنے لگی۔ شیخ عنایت اللہ آج کی شیڈول میٹنگز کے بارے میں سیل فون پر استفسار کرنے لگے۔ شیخ شاہد اللہ شام کی فلائٹ کا ٹائم کنفرم کرنے لگے اور مسز عنایت اللہ نے کہا تو صرف اتنا کہا:

''ڈرائیور گاڑی ذرا ڈاکٹر کے کلینک کی سمت موڑ لو۔ لگتا ہے، بی پی شوٹ کر گیا ہے۔۔۔''

صنم آٹھ کنال کی کوٹھی میں یہ اطمینان کر کے داخل ہوا کہ گھر میں اپنا کوئی نہیں ہے۔ نوکروں، نوکرانیوں کی فوج نے گھیر لیا، جیسے ٹکور کرنے ہلدی لون لگانے، دودھ میں کچا انڈا گھول پلانے اور کئی مرہم تعویذ اور ٹوٹکے پہلے ہی تیار رکھے بیٹھے تھے۔ کیا ہوا کہاں ہوا کا شور۔ ٹکوریں سینک اور مرہم۔

''بس منور نجن کیا اور چھوڑ دیا کہتے تھے تجھے مارتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔۔۔''

''یعنی وہ کہتے تھے۔ بت کو توڑنے کا فائدہ بچاری بے نوا ناراض ہو گئے تو خدا ان کے دھندے میں بے برکتی ڈال دے گا۔ وہ جب بھی اغواء برائے تاوان کی پلاننگ کریں گے کوئی بت جال میں پھنس جائے گا کبھی کوئی پورا مرد یا عورت قابو میں نہ آئے گا، جس کے لیے لواحقین منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو جائیں۔۔۔''

وہ پہلی بار ادھورے پن کے تماشا جیسے دکھ سے دوچار ہوا تھا، لیکن ان دنوں بازار والوں کو ایک دوسرا تماشا ہاتھ لگ گیا تھا۔ اسی لیے اس کے گوشہ نشین ہونے کی خبر اپنی پوری اہمیت نہ بنا سکی۔

الیکشن کا تماشا، ایسا کاروبار بازاری جس میں ہر نشئی ہر معذور ہر بے کار کو کام مل گیا تھا۔ نعرے لگانے جھنڈے لہرانے کا کاروبار۔ جھنڈیاں بنانے، جھنڈے پوسٹر لکھنے، وال چاکنگ کرنے، جلسوں میں کرسیاں لگانے، جڑانے برسانے مخالفین کو گالیاں دینے ان کے خاندانی رازوں شجروں کے اشتہار بنانے، کالم لکھنے، لفافے وصول کرنے، ٹاک شوز کو بھرپور ڈرامہ اور تھرل بنانے کے لیے افرادی قوت کی مانگ بے پناہ بڑھ گئی۔ روزگار کے اتنے متنوع ذرائع ہاتھ آ گئے تھے کہ صنم کی تفریح کے لیے تو فرصت ہی نہ بچی تھی کسی کو یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ پر کشش ابھاروں والے اس سینے میں بھی ایک دل ہو سکتا ہے جس کے اندر بھی کچھ ٹوٹتا اور بکھرتا ہے۔ وہ تو بازار کا بت تھا۔ کرتب دکھانے والا ریچھ، بندر، نیولا اور سانپ، پنجرے میں بند دو دھڑ والا بچہ، دو سر والا بچہ، سڑکوں پر

ناچنے والا ہیجڑا، مسخرا، ان تماشا گاہوں کے اندر دل جیسی شے کا کیا کام۔ اس کھوئے ہوئے دل کا سراغ لگانے کی فرصت کس کے پاس ہے۔ الیکشن کے ابلتے کڑاہے میں ہر فرصت، ہر احساس، ہر جذبہ، ہر اصول، ہر قدر جھونک دیئے گئے تھے۔

صنم کا منا سا چڑی جتنا دل بھی انجانے میں ٹوٹ گیا تھا، لیکن اس کے ٹوٹنے کی صدا اس پرشور ہنگامے میں کوئی سماعت نہ رکھتی تھی۔ وہ بے سماعت صداؤں کو کرچی کرچی بت میں دفن کردینے کی کوشش میں تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے بے شمار ذروں کو بند کمرے میں بکھیرے واپس بت کے قالب میں سمیٹنے میں کئی روز سے مصروف تھا۔ اس کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ کیونکہ جھنڈیوں اور جھنڈوں کے شوخ رنگ مخالفین پر اچھالے جا رہے تھے۔ الزامات کی تڑپتی پھڑکتی بوٹیاں، کسی زنخے کے لچکیلے بدن جیسے ننگے نعرے۔ مشتعل کرنی والی جذباتی تقریریں جو بین شدہ گیتوں کی نسبت زیادہ لذیذ اور اشتعال انگیز تھیں۔ ہیجانی چیخم دھاڑ کرتا بے ہنگم میڈیا اتنے بے تحاشا رنگوں میں صنم کا رنگ کسے یاد رہتا۔ بازار خود ست رنگا، پٹاخہ بن چکا تھا۔ صنم کے وجود کے ملگجے، سیاہ سرمئی رنگ شب غم کے لبادے میں کیموفلاج کر گئے تھے۔ جڑواں دھڑ والے بچے، دوسر والا بچہ، پنجروں میں بند تماشہ، سرکس میں تنبوتوڑ رش لانے والے بونے، ان دنوں سب تماشے بے کار ہو چکے تھے۔ ان کی تفریح الیکشن تماشے کے مقابل ماند پڑ چکی تھی۔ سبھی تماشے الیکشن تماشے سے مات کھا چکے تھے۔ ان تماشوں کے ست رنگ الیکشن پھل جڑی نے راکھ کر دیئے تھے۔

دنوں بعد اچانک یہ خبر لگی کہ وہ بت آج پھر سوئے بازار نکلا ہے۔ پورا بازار شوخ سرخ رنگ میں نہا گیا۔ لال شوخ رنگ کیپری گھٹنوں سے ذرا نیچے۔ شفاف ملائم پنڈلیاں جس میں سے یوں جھانکتیں جیسے شیشے کی بوتل جس کی آدھی شراب ایک ہی ڈیک میں کسی شرابی نے چڑھالی ہو۔ آدھی بھری آدھی خالی شیشے کی بوتل لال سینڈل کے سٹینڈ پر سجی ہوئی جس کے نشے میں سارا بازار بہکنے لگا تھا جس جس بازار میں گلی میں اس نشے کی بوتل کا ڈاٹ اٹھتا پیاسوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ مجمع بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہ جانے بنا کر وہ بت کہاں جا رہا ہے کہاں لے جا رہا ہے۔

شیخ عنایت اللہ اپنے ورکروں کی کارکردگی پر انہیں بری طرح ڈانٹنا چاہتے تھے لیکن مارے صدمے کے لفظ اپنی اصل ہیئت میں ادا ہی نہ ہو پا رہے تھے۔ مخالف کے جلسے میں ایسا رش اُمڈا تھا کہ میڈیا کے کیمرے اور حلق بس وہیں روشنیاں بکھیرتے پوری طاقت سے چیخ رہے تھے۔ یہاں کمروں کا رخ ہوتا بھی تو خالی کرسیاں تضحیک اڑاتیں شہر کے سارے بے روزگار، نشئی، مجرم کئی روز پہلے سے بک تھے لیکن آخری رات دوسری پارٹی دوگنی دھاڑی کی ادائیگی کر کے سبھی کو اٹھا لے گئی تھی۔

کس لفظ پر تالیاں پیٹنی تھیں۔ تقریر کے کس وقفے پر تنبوتوڑ نعرے لگانے ہیں۔ کس مقام پر اچھل اچھل کر مخالفین کو گالیاں دینی ہیں۔ ساری ریہرسل پڑی رہ گئی اور اداکار کسی دوسرے ڈرامے کے اسٹیج پر مصروف ہو گئے۔ مل سے آئے ہوئے سو دو سو مزدور ہزاروں خالی کرسیوں میں دور دور یوں سجائے گئے تھے کہ میڈیا کا کیمرہ بس سروں کے اوپر اوپر سے گھوم جائے لیکن خالی پنڈال کسی کیمرہ ٹرک سے بھی بھرا بھرا محسوس نہ ہو رہا تھا۔

زبردستی بٹھائے گئے یہ مزدور جمائیاں لیتے معاوضے کے مطابق طے شدہ وقت کے خاتمے کے منٹ گن رہے تھے۔ کئی روز کے تھکے ہوئے حلق اشارہ پا کر نعرے تو بلند کرتے لیکن اس آہنگ سے نہیں کہ میڈیا کے کیمروں کو متوجہ کر سکیں۔ کئی بار جہاں تالیاں نہیں پیٹنی تھیں وہاں پیٹ دیتے جہاں نعرے نہیں لگانے وہاں لگا دیتے پورے پورے خاندان کی بکنگ تھی۔ بعض اوقات بچے وہ نعرے بھی بلند کر دیتے جو وہ گزشتہ رات مخالف کے جلسے میں لگا چکے تھے۔ آج کا جلسہ ایسا ہی بے ترتیب اور بدنظم تھا کہ یکدم جلسے میں آگ سی لگ گئی، پورا بازار اُمڈا چلا آتا تھا شاید اسٹیبلشمنٹ کی غیبی امداد آن پہنچی تھی۔ لیکن ان کے نعرے کرائے کے حلق کے نعرے نہ تھے۔ وہ تو دل سے، شوق سے، جذبے سے عجب رنگیں نعرے لگا رہے تھے۔ میڈیا کے سارے کیمرے اسی مرکز پر روشنیاں

بکھیر رہے تھے۔مخالف پنڈال سونا ہوگیا تھا سارے رنگ ادھر منتقل ہو گئے۔ ہنگامہ تھرل ہیجان نعرے ناچ گانے، مخالفین کے خفیہ رازوں کی تنگی پھڑکتی ہوئی مصالحے دار بوٹیاں، گالیوں اور طعنوں کے گرم کباب، رقص کے بھاؤ، میڈیا کی دل پذیری کا سارا سامان جمع۔مخالف کا مجمع بھی ادھر ہی اُمڈ چلا آتا تھا، جیسے کسی نے آوازہ لگا دیا ہو۔چیز وڈی دی آئی جاؤ کھائی جاؤ۔

سراسیمہ سے شیخ صاحب کی نگاہ پنڈال کے صدر دروازے پر تراز و ہوگئی عوام کا جم غفیر تھا کہ عارضی دروازے اکھڑ گئے تھے۔میڈیا کے اینکر زریسلنگ کے ریفریوں کی طرح اچھل پھاند کر رہے تھے۔بھائیں بھائیں کرتی خالی کرسیاں اب انسانی چہروں سے ابل رہی تھیں۔کامیاب جلسے کا پورا رنگ اور رس کسی غیبی سے خدائی سے اسٹیبلشٹائی سے خفیہ حکم کی بروقت تعمیل معلوم ہوتا تھا۔تبھی بے قابو شیئیوں کے جھومتے جھامتے کندھوں پر سوار عنابی شراب کی ادھ پی بوتل سی چھلکتی تھی جس کا ڈاٹ کھلا تھا اور جھاگ ابل رہا تھا۔ہجوم اسٹیج کی سمت بڑھ رہا تھا اور شیخ عنایت اللہ نے مائیک جھپٹ لیا تھا۔

ہم انتہائی فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے صاحبزادے بہزاد عرف صنم اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں یہ ہر دل عزیز لیڈر پارٹی کا سرمایہ اب ہمارے ہر جلسے کی رونق ہوں گے۔ ہمارا انتخابی نشان۔۔۔

نیچے سے کسی نے آواز لگائی۔

ہمارا انتخابی نشان۔

''بازارکابت''۔

☆☆☆

ٹھہرے ہوئے وقت میں

مبین مرزا

یہ سب خواب ہے یا حقیقت؟
کب تک یوں ہی چل سکتا ہے؟
اور جب منظر بدلے گا تو کیا ہوگا؟

سوالوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ کوئی سوال نیا نہیں تھا، لیکن مسلسل سوچنے اور بار بار اندازے لگانے کے باوجود خالد شیخ پچھلے کئی مہینوں میں خود کو ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب دینے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ آخر کیوں نہیں ہوسکا تھا؟ ایک سوال یہ بھی تھا، بلکہ اب سب سے اہم سوال یہی تھا۔ وہ شخص جس نے اپنی زندگی کے گزشتہ بتیس تینتیس برس کتنے ہی سوالوں کے جواب ڈھونڈنے میں لگائے تھے اور بڑے بڑے ٹیڑھے سوالوں کے جوابات بالآخر حاصل کرلیے تھے، وہ ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب پانے میں کیوں ناکام ہو رہا تھا؟ یہ ایک اور سوال تھا، لیکن آخری نہیں، اس کے بعد بھی سوالوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ 'وہ تو اچھا یہ ہے کہ میرے پاس فرصت کا وقت نہیں ورنہ یہ سب سوال مجھے گھن چکر ہی بنادیتے'۔ اس نے خود سے کہا۔ اس اثنا میں وہ ہوٹل کی لابی میں داخل ہو چکا تھا۔ ٹھنڈک اور خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ صدف کے آنے میں ابھی دس منٹ تھے۔ وہ آج بھی وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ اس نے سوچا اور مسکرا دیا۔ اس عرصے میں کئی باتیں ایسی ہوئی تھیں جن پر اسے خود تعجب ہوا تھا اور جن کا سوچ کر اسے ہنسی آتی تھی۔

ہوٹل کی لابی میں اس نے دائیں جانب ایگزیکٹو فلور کی لفٹ کے سامنے صوفوں پر نظر کی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے اس طرف بڑھ گیا۔ یہ وہ مخصوص جگہ تھی جہاں وہ پہلے پہنچنے پر صدف کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس عرصے میں وہ جتنی بار اس ہوٹل میں اس سے ملا تھا، طے شدہ وقت سے ہمیشہ کچھ پہلے ہی پہنچا اور اسی جگہ اس کا منتظر رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے معمول کے خلاف بات تھی۔ طے کردہ وقت پر پہنچنا تو اس کا معمول رہا تھا، لیکن اگر کبھی اسے کسی کا انتظار کرنا پڑ جاتا تو سخت کوفت محسوس ہوتی اور اگر یہ انتظار چند منٹ سے زیادہ ہو جاتا تو کوفت جھنجھلاہٹ بن جاتی، جس کا وہ اظہار کیے بغیر نہ رہتا۔ صدف کے سلسلے میں اس کا رویہ بالکل مختلف تھا، یہی نہیں، صدف سے تو پورا معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ تعلق میں جو کچھ ہوا تھا، وہ سب کچھ ہی خالد کی زندگی کے معمولات سے بالکل الگ تھا۔ کیوں نہ ہوتا، صدف خود بھی تو ایک بہت مختلف لڑکی تھی۔

خالد نے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے جیب سے موبائل فون نکالا، پہلے مسڈ کالز دیکھیں، کوئی خاص نام نہیں تھا کہ جسے فوری کال بیک ضروری ہو۔ اس کے بعد میسیج دیکھے۔ پہلا میسیج صدف ہی کا تھا۔۔۔ ''بہت معذرت، میں شاید تین چار منٹ لیٹ پہنچوں گی''۔ خالد کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ کتنی ذمہ دار ہے یہ لڑکی۔ اس نے سوچا۔ یہاں تو لوگ آدھا گھنٹا لیٹ ہوتے ہوئے بھی یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتے کہ انہیں پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے۔ خالد کی آنکھیں اس وقت ہوٹل کے دبیز شیشے کے دروازے پر تھیں، جس کے آگے ایک خوش قامت دربان چوکس کھڑا تھا۔ خالد نے گردن گھما کر لابی پر نظر ڈالی، زیادہ لوگ نہیں تھے۔ دائیں طرف کانٹی نینٹل کھانوں کے ریستوران کے دروازے سے ذرا آگے کسٹمر سروس ڈیسک پر بیٹھی ہوئی دونوں خواتین بڑے انہماک سے اپنے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھیں۔ ان سے آگے اجلے شیشوں والے کھجوروں کے کاؤنٹر پر کھڑا ہوا آدمی شیشوں کو مزید چمکانے میں

مصروف تھا۔ خالد کی نظریں لوٹ کر پھر موبائل فون کی اسکرین پر آ رکیں۔ وہ پیغامات پڑھنے اور جلدی جلدی ان کے جوابات دینے لگا۔ اسی اثنا میں صدف کا ایک اور میسیج آ گیا۔۔۔ ''مائی ڈیئر! مجھے دیر ہونے کا بہت افسوس ہے لیکن ٹریفک جام قسمت کی نحوست کی طرح آدمی کا راستہ بند کر دے تو کیا ہو سکتا، لیکن بہرحال اب میں اس نحوست سے نکل چکی ہوں اور صرف پانچ منٹ میں تمہارے پاس ہوں گی، تمام تر ندامت کے ساتھ''۔ صدف کو عام طور پر پہنچنے میں دیر نہیں ہوتی تھی، لیکن اگر کبھی ہو جاتی تو دو دو منٹ کے بعد اس کے ایسے ہی پیغامات آنے لگتے تھے۔ صدف واقعی انوکھی لڑکی ہے اور دلچسپ بھی۔ خالد نے خود سے کہا۔ وہ پھر موبائل فون پر مصروف ہو گیا۔

''ہیلو۔۔۔! آئی ایم سوری ڈیئر''۔ صدف نے شیشے کے دروازے کو ہاتھ سے تھامے ہوئے دور ہی سے نعرہ لگایا اور لپک جھپک آگے بڑھی اور پل کی پل میں خالد کے ساتھ صوفے پر آن بیٹھی۔ ''یار اس شہر کا ٹریفک دنیا کی سب سے مشکل چیز بن چکا ہے، او مائی گاڈ''۔

''مجھے اندازہ ہے اچھی طرح''۔ خالد نے کہا، ''اس لیے تمہیں اس پر زیادہ پریشان ہونے اور معذرت کرنے کی ضرورت نہیں''۔

''یار بندہ پریشان تو ہوتا ہے نا جب ٹریفک عفریت بن کر اس کا راستہ بند کر دے''۔ صدف نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں درست کیا۔

''ہاہاہا! تم تشبیہیں اور استعارے خوب مزے کے استعمال کرتی ہو''۔

''داد دے رہے ہونا، پکی بات؟''

''ہاں ہاں، یقیناً داد۔ اچھا یہ بتاؤ کہاں بیٹھنا ہے، میرا مطلب ہے، کیا کھانا ہے؟''

''ارے یار، وہی اپنا دیسی کھانا۔۔۔۔ لیکن یاد رہے، آج تم میرے مہمان ہو''۔

''کوئی تکلف تھوڑی ہے۔ خیر آؤ پھر تو ادھر ہی چلنا ہے''۔ خالد نے اٹھتے ہوئے بائیں طرف اشارہ کیا۔

''تکلف ہے یا نہیں ہے، آج مہمان تم ہو، یہ طے ہے ورنہ۔۔۔'' صدف نے خالد کے پیچھے لپکتے ہوئے اپنے سیل فون کو اس کی پسلیوں سے اس طرح لگایا جیسے کوئی ہتھیار بند شخص کسی نہتے آدمی پر قابو پانے کے لیے اسے اپنے اسلحے سے خبردار کرتا ہے۔

خالد نے قہقہہ لگایا اور بولا ''ٹھیک ہے، سمجھ گیا''۔

''گڈ بوائے!'' صدف نے اسے گدگداتے ہوئے ہاتھ ہٹا لیا۔

خالد نے محسوس کیا کہ آج وہ زیادہ چونچال کیفیت میں ہے۔

کھانے کے بعد صدف نے ایک لمحے کے لیے خالد کے چہرے پر نظریں جمائیں جیسے آنکھوں سے کچھ کہنا چاہتی ہو اور پھر مسکراتے ہوئے بولی ''مائی ڈیئر خالد! تم نے کھانے کے درمیان دو دفعہ پوچھا کہ میں نے تمہیں آج کھانے پر کیوں بلایا ہے تو سنو، اس لیے بلایا ہے کہ میں آج رات ملک سے باہر جا رہی ہوں اور یہ طے نہیں ہے کہ کتنے عرصے کے لیے جا رہی ہوں، اس لیے میں نے سوچا کہ تمہارے ساتھ الوداعی لنچ کیا جائے''۔

خالد کی نظریں صدف کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ذرا تامل کے بعد وہ بولا ''لیکن ایک دم یہ کیوں؟''

''بس پروگرام بن گیا، اس لیے''۔

''لیکن غیر ملکی دورے کا پروگرام اچانک تو نہیں بن سکتا''۔ خالد کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

’’کیوں نہیں بن سکتا؟ ارے یہ امکانات کی دنیا ہے، یہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے‘‘۔صدف نے آنکھیں مٹکا کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

’’بچوں جیسی باتیں مت کرو۔نہیں بتانا چاہتیں، مت بتاؤ لیکن بنانے کی کوشش مت کرو پلیز‘‘۔خالد نے قدرے تلخی سے کہا۔

’’ارے ارے، بگڑتے کیوں ہو۔ میں نے کوئی غلط بات تھوڑی کہی ہے۔کیا یہ امکانات کی دنیا نہیں ہے،تم خود بتاؤ‘‘۔ اس نے خالد کی آنکھوں کے آگے یوں انگلیاں ہلائیں جیسے ان میں برقی رو دوڑتی ہو۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے، خالد نے ایک لمحے کے لیے سوچا، آخر آج یہ کس موڈ میں ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ سخت جھنجھلاہٹ میں اس نے سر جھٹکا اور کوئی جواب دیئے بغیر دوسری طرف دیکھنے لگا۔صدف خوش طبع لڑکی تھی، لیکن آج اس کی خوش طبعی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اسے اندازہ تک نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سامنے والے کے لیے الجھن کا باعث بن رہی ہے۔آخر وہ بتانا کیا چاہتی ہے؟ کیا اس کی زندگی میں اب کوئی اور مرد آ گیا ہے؟ اس سوال پر خالد کو لگا جیسے اس کے اندر اچانک تاریکی سی پھیلنے لگی ہے۔جب کوئی سوال ایک بار پیدا ہو جائے تو پھر چاہے وہ تاریکی پھیلائے یا تنہائی کے عفریت کو رگوں میں اتار دے، اس سے منہ نہیں پھیرا جا سکتا، اس کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ پچاس باون برس کا آدمی جب اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے جلد یا بدیر اس طرح کے کسی نہ کسی سوال سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔یہ محض ایک سوال نہیں، زندگی کی حقیقت ہے اور حقیقت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔نتیجہ چاہے جو بھی ہو۔یہ سب خیالات ایک لمحے میں خالد کے ذہن سے گزرتے چلے گئے۔

’’ہاں تو بتاؤ نا، کیا غلط کہہ رہی ہوں؟ کیا یہ امکانات کی دنیا نہیں ہے؟‘‘ وہ صدف کی آواز کی انگلی تھامے اپنے ذہن کی دنیا سے واپس پلٹا۔صدف کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت تھی۔وہ ایک دم غصے سے بھر گیا، لیکن چپ رہا۔

’’یوں گاؤدی بن کر کیوں گھور رہے ہو؟ کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی یا تمہارے پاس اس کا جواب نہیں ہے کوئی؟‘‘ صدف کی کھلی ہوئی باچھیں دیکھ کر خالد کا پارہ اور چڑھ گیا۔اس کا مطلب ہے یہ سنہری مچھلی اب کسی اور دریا میں اترنے کی تیاری میں ہے۔ختم ہو گیا سب ڈراما، اس کے اندر کسی نے کہا۔اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا سامنے رکھی ہوئی میز الٹ کر اٹھ کھڑا ہو اور چل دے۔

صدف اس کے تیور قطعی نہیں بھانپ رہی تھی۔اس پر شوخی کی کیفیت طاری تھی۔’’نالائق بچے! دھیان سے میری بات سنو۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں‘‘۔صدف نے مسکراتے ہوئے کہا،’’دیکھو، یہ جو موبائل فون ہے میرے ہاتھ میں، یہ آج کی اس امکانات سے بھری ہوئی دنیا کا ایک فینومنا ہے۔دیکھ رہے ہو نا اس موبائل فون کو؟‘‘ اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا فون اس کی آنکھوں کے آگے لہراتے ہوئے کہا۔

بس یہی وہ لمحہ تھا جب خالد کے اندر غصے سے بھری ہوئی بندوق کی لبلبی دب گئی اور اس نے آنکھوں کے آگے جھولتے صدف کے نازک اور خوبصورت مخروطی انگلیوں والے ہاتھ کو سخت غصے سے جھٹک دیا۔جھٹکنے میں اتنی شدت تھی کہ صدف کے ہاتھ سے موبائل فون اچھل کر نکلا، چکنے فرش پر گرا اور برقی رو کی طرح پھسلتا ہوا زور سے سامنے کی دیوار سے ٹکرایا اور چھناکے کی آواز کے ساتھ ساکت ہو گیا۔ہال میں بیٹھے ہوئے سب لوگ اس طرف متوجہ ہوئے۔ ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔عقبی دیوار کے آگے کھڑی ہوئی گانا گاتی لڑکی بھی یک دم خاموش ہو گئی۔سب چہروں پر خوف اور اضطراب کی ملی جلی پرچھائیں تھیں اور لوگ اس ڈرامے کے اگلے سین کے منتظر تھے۔

صدف نے ایک پل کو خالد کی طرف دیکھا اور نہایت عجلت کے ساتھ بہت دھیمی آواز میں بولی،’’سب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں فون اٹھا کر لاتی ہوں۔تم کہیں اٹھ کر مت جانا پلیز‘‘۔

خالد جیسے کسی خواب سے چونکا۔ایک لمحے کے لیے بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہوااور کیوں ہوا؟ اس قدر غصہ اسے کیسے اور کیوں آ گیا؟ اتنی طاقت سے اس نے ہاتھ مارا اسے خود تعجب ہوااور خفت کا احساس بھی۔

فون اٹھا کر واپس آتی ہوئی صدف کے چہرے پر غصہ، کوفت یا جھنجھلاہٹ کے بجائے وہی ملائمت تھی جو ہمیشہ ہوئی تھی۔خالد کے دل میں ندامت کا احساس گہرا ہو گیا۔''آئی ایم سوری''۔خالد کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''اٹس او کے''۔اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔اس کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا موبائل تھا۔اس نے اطمینان سے ٹکڑوں کو جوڑ کر موبائل آن کرنے کی کوشش کی مگر بے کار۔وہ خالد کو دیکھ کر مسکرائی اور دوبارہ ٹکڑوں کو ٹھیک بٹھا کر موبائل کو آن کرنا چاہا مگر اسکرین تاریک تھی۔اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔''ڈارلنگ!سب ٹھیک ہو گیا ہے''۔اس نے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر خالد کے چہرے پر ایک لمحے کو اس کی نگاہیں رکیں۔''باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔میں اب یہاں سے جاتی ہوں'' اس نے گردن موڑ کر ایک بار پھر ہال پر نظر دوڑائی اور جلدی سے اپنے پرس سے کچھ نکال کر اپنی پلیٹ کے نیچے رکھتے ہوئے بولی،''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں جو اس وقت اور اس جگہ نہیں ہوسکتیں۔ایک گیسٹ ہاؤس میں کمرہ بک ہے، یہ اس کی الیکٹرونک کی ہے اور اس کے ساتھ اس کا ایڈریس بھی''۔اس نے پلیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بولی،''میرے جانے کے بعد اٹھا لینا۔میں دو گھنٹے بعد وہیں ملوں گی۔تم مجھ سے آدھ پون گھنٹا پہلے پہنچ جانا''۔صدف نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا پھر بولی''یہاں سے اٹھ کر جہاں بھی جانا ہو، خلاف معمول جانا۔۔۔اور ہاں جب وہاں پہنچو تو باہر کہیں نہ بیٹھنا، سیدھا کمرے میں جا کر میرا انتظار کرنا۔کمرے میں اس طرح رہنا جیسے تم وہاں نہیں ہو، میرا مطلب ہے کہ ایک بار پہنچ کر باہر مت نکلنا۔میں آ کر دروازے پر دستک نہیں دوں گی، دوسری چابی سے کھول کر خود اندر آ جاؤں گی''۔ویٹر کو بل لاتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔بل لے کر ویٹر چلا گیا تو وہ پھر بولی،''اور ہاں، آنے سے پہلے اپنا فون کہیں بھول آنا، مگر گاڑی میں نہیں کہیں اور۔میں چلتی ہوں''۔یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اطمینان سے چل دی۔خالد کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ سب کیا ہوا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے۔غصے میں آنکھوں کے سامنے جلاتے ہوئے موبائل فون کو جھٹکنے کے بعد سے تو جو کچھ ہوا تھا وہ سب جیسے کسی فلم کا سین تھا کسی جاسوسی فلم کا۔خالد کو اب تک حیرت تھی کہ اس نے اتنی زور سے ہاتھ کیسے مارا کہ صدف کے ہاتھ سے چھوٹ کر موبائل اتنی دور جا پڑا اور اتنے زور سے گرا کہ بے کار ہو گیا۔اس کے بعد صدف کا یوں دھیمے دھیمے بولنا اور ہدایات دینا، کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔اسے لگ رہا تھا جیسے اچانک وہ ایک فلمی کردار بن گیا تھا۔آگے کیا ہونا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔بس یہ معلوم تھا کہ اسے وہ کرنا ہے جو صدف کہہ کر گئی ہے۔اس کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ بھی اسے معلوم نہیں تھا۔

ایک لمحے کو اس نے سوچا جیسے یہ سب کچھ خواب ہے، لیکن کچھ بھی خواب نہیں تھا، سب حقیقت تھا۔صدف ہال سے نکل کر جا چکی تھی۔ہال اور اس میں بیٹھے ہوئے سب لوگ اپنی معمول کی حالت میں تھے۔عقبی دیوار کے ساتھ بنے لکڑی کے چبوترے پر کھڑی سانولی لڑکی غیر ضروری طور پر ہل ہل کر ایک پرانا نغمہ گا رہی تھی۔ویٹر معمول کے مطابق یہاں سے وہاں آ جا رہے تھے۔ہوٹل کے مخصوص کوٹ پینٹ میں ملبوس لڑکیاں جنہوں نے اپنی عمر اور چہرے کے برخلاف بڑے بڑے جوڑے باندھ رکھے تھے، مسکرا کر نئے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ہال میں خاصی ٹھنڈک تھی، اس کے باوجود خالد نے محسوس کیا اسے پسینہ آ رہا ہے۔ٹشو سے ماتھے اور گردن کے پسینے کو صاف کرتے ہوئے اس نے ویٹر کو آنے کا اشارہ کیا جو اگلے ہی لمحے اس کے سامنے حکم کا منتظر تھا۔خالد نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور اسے چائے لانے کو کہا۔دائیں ہاتھ کے صوفوں والی رو میں آخری میز پر ایک عورت اپنے سے کم عمر خاوند یا عاشق کے سامنے مسلسل بولے جا رہی تھی۔وہ ایسی کوئی حسینہ عالم تو نہ تھی لیکن اس حقیقت سے باخبر معلوم ہوتی تھی کہ اس دنیا میں عورت کے بغیر مرد کا گزارا ممکن نہیں۔سمجھ دار عورت کی طرح اپنی مستحکم حیثیت کو انجوائے کرنا اس عورت نے بہت پہلے سیکھ لیا ہوگا۔

خالد نے سوچا۔ اس وقت اس کے رویئے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غصے کا اظہار کر رہی تھی۔ خاوند یا عاشق وہ جو بھی تھا، اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا، جسے وہ رہ رہ کر اس انداز سے جھٹکتی تھی کہ ہاتھ سے ہاتھ نہیں چھوٹتا تھا۔

''سر چائے بنادوں؟'' ویٹر نے برتن میز پر رکھتے ہوئے خالد سے پوچھا۔ اثبات کا اشارہ پا کر اس نے چائے بنائی اور کپ خالد کے آگے رکھ کر رخصت ہو گیا۔ خالد کا دھیان پھر صدف سے آج کی ملاقات پر مرکوز ہو گیا۔ حالانکہ صدف نے اسے ملاقات کا جواز بتا دیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ملاقات کی نوعیت اور مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی تو اب تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آناً فاناً صدف کا غیر ملکی دورے کا یہ پروگرام کیسے بن گیا اور وہ بھی غیر معینہ مدت کے لیے۔ یہ پروگرام یقیناً اچانک نہیں بنا ہوگا، پہلے سے چل رہا ہوگا لیکن اس نے خالد کو اس کے بارے میں بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا، ''ضروری کیا مطلب؟'' اس نے جھنجھلا کر خود سے کہا، ''اس نے تو باقاعدہ چھپایا ہے پروگرام اور اب جب اسے جانا تھا تو وہ بتا رہی تھی''۔

چند ماہ قبل وہ جب پہلی بار اس سے ملی تھی تو ساری رکاوٹوں کو توڑتی ہوئی اس تک آ پہنچی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے پوری طرح واقف تھی۔ اس کے کتنے ہی ٹی وی پروگرام اس نے دیکھے ہوئے تھے اور کتنے ہی کالم پڑھ رکھے تھے۔ اس کی کہی ہوئی کتنی ہی باتیں اور لکھے ہوئے کتنے فقرے اسے یاد تھے جن کا وہ بات کرتے ہوئے بہت برمحل حوالہ دیتی تھی۔ خالد اپنی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ملک کے نامی گرامی صحافیوں میں شامل تھا۔ اپنے شعبے کے لوگوں میں ہی نہیں، ملک بھر کے عوام میں بھی اس کا ایک نام تھا، ایک پہچان تھی۔ اس مقام تک آنے میں اسے خاصا وقت لگا تھا۔ اس اثنا میں آنکھوں کے نیچے حلقے گہرے ہوئے تھے اور چہرے پر سلوٹیں نمایاں ہوئی تھیں۔ سر کے بالوں میں چاندی کے تاروں کی مقدار خاصی بڑھ گئی تھی جسے وہ باقاعدگی اور سلیقے سے ڈائی کر کے چھپائے رکھتا تھا۔ وزن میں اضافہ ہوا تھا جو پیٹ پر زیادہ نمایاں تھا۔ اہل خانہ لوئر مڈل کلاس آبادی میں ایک سو بیس گز کے مکان سے اٹھ کر اشرافیہ کے علاقے میں چھ سو گز کے آراستہ مکان میں آ گئے تھے اور بینک بیلنس میں بھی ہندسوں کا شمار بدل گیا تھا۔۔۔ لیکن ان میں سے کسی بھی چیز کے لیے اس نے اپنی ساکھ خراب نہیں ہونے دی تھی۔ یہ سب کچھ ہوا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی خاندانی اور ذاتی عزت میں بھی کمی نہیں اضافہ ہی ہوا تھا۔ ترقی کی دوڑ میں شامل لوگ جس چیز کو سب سے زیادہ بھولتے اور بہت دیر تک بھولے رہتے ہیں، وہ ساکھ ہوتی ہے۔۔۔ لیکن خالد شیخ نے اپنے صحافی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس چیز کو ہمیشہ یاد رکھا تھا۔

وہ اکثر تعجب سے سوچتا کہ جب سب کچھ عزت سے مل سکتا ہے تو آخر لوگ بے عزتی سے حاصل کرنے پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی پلاٹ کے لیے، کوئی بینک بیلنس کے لیے، کوئی کسی پرمٹ کے لیے۔۔۔ اور کوئی کسی لڑکی کے لیے۔ اس خیال پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ وہ بھی تو ایک لڑکی کے لیے اس وقت ایک فلمی سچویشن سے دوچار تھا، لیکن صدف کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ کوئی اور ہی مخلوق ہے۔ بے انتہا حسین اور ساتھ ہی بے پناہ ذہین۔ اس کا ذہن جس طرح چیزوں لوگوں اور حالات کے بارے میں سوچتا ہے وہ اچھے خاصے سمجھدار لوگوں میں بھی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سحر اور دل کشی تھی جس نے اپنے سے دگنی عمر کے اس آدمی کو جس کا نام خالد شیخ تھا اور جس نے اب تک کی زندگی بڑی بردباری سے گزاری تھی، پوری طرح جذب کر لیا تھا اور اس طرح کہ اب وہ خود کو اس کے بغیر ادھورا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے صدف سے ملاقات کے بعد درجنوں مرتبہ خود سے یہ سوال کیا تھا کہ آخر وہ کیوں اس کے قریب آئی ہے اور اس سے کیا چاہتی ہے؟ اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا، اس لیے کہ صدف نے اس عرصے میں ایک بار بھی کسی مقصد، کسی خواہش یا ضرورت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر حیران ہوتا تھا اور کبھی الجھن میں بھی پڑ جاتا لیکن صدف سے گریز ممکن نہ تھا۔

صدف کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے سے لے کر اس کے بیڈروم تک پہنچنے کے سفر کی رفتار ہی حیران کن نہیں تھی، اس دوران صدف کا رویہ بھی تعجب خیز تھا۔۔۔لیکن ایک صدف ہی کا رویہ کیا، خود خالد شیخ کا رویہ بھی تو اس کی اب تک زندگی کے بالکل برعکس تھا۔ایسا نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں اس سے پہلے عورتیں نہیں آئی تھیں۔آئی تھیں، کئی ایک آئی تھیں لیکن ان میں سے جس کو اس نے جہاں تک آنے کی آزادی دی تھی وہ وہیں تک پہنچی تھی، اس سے ایک قدم آگے نہیں۔صدف کے ساتھ معاملہ عجیب ہوا تھا، خالد کا مدافعتی نظام اس کے آگے کم زور پڑنے لگا اور بہت جلد صفر ہو کر رہ گیا۔یہی نہیں، بلکہ اس کے بعد اس کا دھیان تک اپنے مدافعتی نظام سے ہٹ گیا۔یوں صدف بہت جلد اور نہایت آسانی سے اس کے اندر آ پہنچی۔اس کا علم اسے تب ہوا جب وہ پہلی بار اسکے خوبصورت اپارٹمنٹ کے بیڈروم میں اس کے ساتھ بستر پر تھا۔سوسوفٹ اچھلتی اور اچھالتی موجوں کے تند و تیز طوفان سے گزر کر وہ اب ایک عجیب خمار میں تھا۔طوفانی موجیں مدھم ہو کر اب اس کی رگوں میں دوڑتے خون میں ہلکورے لیتی تھیں۔ابھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔صدف نے موہنی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اس کے سینے کے بالوں کو نرمی سے سہلاتے ہوئے بولی؛"فوراً نیند آ گئی تھی تمہیں۔خراٹے لینے لگے"۔

"ہاں جانے کیسے آ گئی، حالانکہ اس طرح آتی نہیں ہے"۔خالد نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم بہت مزے کا سوتے ہو، بالکل معصوم بچوں کی طرح"۔وہ اس کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"ہاہاہا! عجیب لڑکی ہو تم!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ عورتیں عام طور سے اس طرح فوراً بعد مرد کے سو جانے کو پسند نہیں کرتیں"۔

"اس میں کیا بات ہے، کیوں پسند نہیں کرتیں؟"

"نہیں معلوم، بس یہ ہے کہ اچھا نہیں لگتا انہیں"۔

"اس کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہو گی نا؟"

"میں نہیں جانتا"۔

"تمہیں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی"۔

"کی تھی مگر بتایا نہیں کسی نے"۔

"ہاہاہا! عورتیں بہت گھنی ہوتی ہیں"۔

"ہاہاہا! صرف عورتیں یا لڑکیاں بھی؟"

"وہ سب جو کسی دوسرے مرد کے ساتھ بستر پر آ جائیں۔ہاہاہا۔۔۔ہاہاہا" صدف نے اس سے زیادہ زوردار قہقہہ لگایا۔

خالد نے ایک لمحے کو اسے حیرت سے دیکھا اور پھر ہنس دیا۔وہ اتنی ہی عجیب تھی۔کچھ بھی کہنے سننے اور ماننے میں اسے کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔خالد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا،"تم نے پوچھا نہیں اور اس پر افسوس بھی نہیں کیا کہ میں اس سے پہلے بھی کئی عورتوں سے ملا ہوں"۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے"۔صدف نے اطمینان سے جواب دیا،"تم اتنے گریس فل ہو کہ بہت سی عورتیں چاہتی ہوں گی کہ تمہارے ساتھ بستر پہ ہوں"۔وہ لمحہ بھر رکی پھر بولی'اور پھر یہ بھی تو ہے کہ یہ سوال وہ لڑکی پوچھ سکتی ہے جو پہلی بار کسی مرد کے ساتھ اس طرح ہو۔میں تو خود تم سے پہلے کئی مردوں سے ملی ہوں، میں کیا پوچھوں"۔وہ پھر اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں

پھیرنے لگی۔

خالد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کہے۔ عجیب بے باک لڑکی تھی۔ وہ چونکا ضرور لیکن یہ صاف گوئی اسے اچھی لگی۔ عام عورتوں کے بالکل برعکس، جو بار ہویں مرد کے ساتھ بستر پر ہوتی ہیں اور اسے یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں کہ وہ ان کی زندگی میں آنے والا شوہر کے بعد واحد شخص ہے اور یہ کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ ان کے دل نے کب اور کس طرح اس کے آگے انہیں بے بس کر کے ڈال دیا۔ خالد کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟'' صدف نے پوچھا۔

''تم عام عورتوں سے بہت مختلف ہو۔ عام عورتیں ایسی کسی حقیقت کا اعتراف نہیں کرتیں''۔

وہ دھیرے سے ہنسی، ''میرا خیال ہے، یوں مختلف ہونا کچھ برا تو نہیں''۔

''بلکہ مجھے تو یہ بہت اچھا لگا''۔ خالد نے اس کے چہرے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ ہٹائی۔

''تھینک یو، تھینک یو۔ ویسے میں بتاؤں، تم بھی ایک بالکل الگ طرح کے آدمی ہو اور بہت پیور بھی۔۔۔ اور بہت اچھے بیڈ کم پینین بھی۔''

ایک بار پھر خالد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تالیوں کے شور سے وہ چونکا۔ داہنے ہاتھ کی طرف ذرا آگے لگی ہوئی لمبی سی میز سے تالیوں کا شور آ رہا تھا۔ گانے والی لڑکی اور اس کا پورا بینڈ ''ہپی برتھ ڈے ٹو یو'' گا رہا تھا۔ اوہ اچھا، تو یہ برتھ ڈے پارٹی چل رہی ہے۔ اس نے سوچا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ صدف کو گئے ہوئے گھنٹا بھر ہونے والا تھا۔ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

خالد کو کمرے میں پہنچے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ دیئے ہوئے وقت کے مطابق صدف کو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ جانے وہ کہاں تھی، ہوٹل پہنچنے سے پہلے خالد نے دوبارہ اس کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن فون اوف تھا۔ ظاہر ہے وہ ٹوٹ گیا تھا، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس نے اب تک نیا فون کیوں نہیں لیا تھا۔ اب تو شہر کے ہر علاقے میں موبائل مارکٹس کھل چکی تھیں اور ایک بھی نہیں، ایک ہی جگہ دو دو پلازا موبائل مارکیٹ بن گئے تھے۔ گزشتہ دہائی میں یہ کاروبار شہر میں خوب چمکا تھا۔ نہیں صرف ایک یہی کاروبار نہیں، بلکہ ایک اور بھی۔ وہ تھا لوٹ مار کا کاروبار اس میں بھی خوب ترقی ہوئی تھی، بلکہ سب سے زیادہ اسی میں ہوئی تھی۔ سڑک پر چلتے آدمی سے لوٹ مار سے لے کر ڈکیتی، بھتا خوری اور اغواء برائے تاوان تک اس کاروبار نے تو جس طرح فروغ پایا تھا اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اب کوئی بھی کہیں بھی محفوظ نہیں تھا۔ لگتا تھا سیاسی جماعتیں اپنے اپنے ووٹ بینک کے حلقوں میں خود اس کاروبار کی سرپرستی کر رہی تھیں۔ علاقے بٹ گئے تھے اور ان میں رہنے والے لوگوں کی حیثیت کے مطابق اس کاروبار کی ترقی بھی الگ الگ طرح کی تھی۔ تاریخ کی کتابیں اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے علاقوں میں جن بٹ ماروں اور اٹھائی گیروں کے قصے سناتی تھیں انہیں اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ان آخری اور دوسری دہائی کے ابتدائی برسوں میں شہر کراچی کے مختلف علاقوں میں بچشم خود دیکھا جا سکتا تھا۔ خالد نے سوچا، دنیا آگے کی طرف جاتی ہے اور ہم اکیسویں صدی میں سفر کرتے ہوئے اٹھارویں صدی میں آ پہنچے ہیں۔ اسے پھر صدف کا خیال آیا۔ وہ تو چند لمحے فون کے بغیر نہیں رہتی۔ اتنے فون اور اتنے میسج اس کے پاس آتے ہیں کہ ذرا دیر خالی نہیں رہتی۔ اس وقت کیسے رہ رہی ہوگی۔ وہ تو خیر جیسے بھی رہ رہی ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس وقت اس سے کس طرح رابطہ کر سکتا ہوں؟ وہ کہاں ہے اور کب پہنچے گی، یہ کیسے معلوم ہو؟ خالد نے خود سے کہا اور ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ انتظار کی گھڑیاں یوں تو ہمیشہ ہی طویل ہوتی ہیں لیکن اگر انسان کسی ایسی صورتحال میں ہو تو جیسے وقت کا پہیہ گھومنا بند کر دیتا ہے۔

خالد نے سب کچھ صدف کی ہدایات کے مطابق کیا تھا۔اب اس کے پاس بھی موبائل نہیں تھا۔وہ اپنا فون دفتر کی میز پر بھول آیا تھا۔یوں تو خیر گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے میں فون کی سہولت موجود تھی،لیکن صدف نے اس سے کہا تھا کہ کمرے میں اس طرح ہونا جیسے تم نہیں ہو۔مطلب یہ کہ اسے اپنی موجودگی کا کسی طرح اظہار نہیں کرنا تھا۔اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اسے اطمینان اور خاموشی کے ساتھ اس کا انتظار کرنا تھا اور بس۔وہ پھر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ابتدائی ملاقاتوں میں اس نے بتایا تھا کہ اس کا باپ مر چکا تھا اور ماں امریکہ میں تھی،بیٹے کے پاس۔وہ پچھلے کئی برس سے یہاں نہیں آئی تھی۔سال میں ایک بار صدف ہی ماں اور بھائی سے ملنے کے لیے چلی جاتی تھی۔یہاں وہ ایک پرائیویٹ یونی ورسٹی میں انٹرنیشنل ریلیشنز کی استاد تھی اور بہت اچھی تنخواہ لے رہی تھی۔اس کے علاوہ اس نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ڈیفنس میں اس کا ایک آراستہ اور شان دار اپارٹمنٹ تھا،جس میں وہ تنہا رہتی تھی۔سرمایہ داروں اور سرکاری تقریبات میں بھی وہ اکثر شریک ہوتی تھی۔پی آر کے معاملے میں وہ خاصی فعال نظر آتی تھی۔ایسا یقیناً اس کی پرکشش شخصیت کے سبب ہوگا۔یہ سب سوچتے ہوئے خالد نے ذہن میں ہلکا سا غبار محسوس کیا۔اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔

واش روم سے باہر نکلتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ کمرے کے دروازے کے اس طرف کوئی موجود ہے۔اگلے ہی لمحے دروازہ آہستگی سے کھلا اور صدف اس کے سامنے تھی۔''آئی ایم سوری ڈارلنگ،آئی ایم ریئلی سوسوری''۔اس نے آگے بڑھ کر خالد کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔''حالات،کام،وقت کچھ بھی اب میرے کنٹرول میں نہیں رہا''۔اب اس کا پورا وجود خالد سے پیوست تھا۔

ایک مانوس اور مسحور کن رو خالد کے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔اس نے دونوں بازوؤں میں اسے بھر لیا اور نرمی سے بولا،''یہ سب کیا ہے،کیوں ہے،میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا''۔

''بتاتی ہوں۔یہی سب بتانے کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے،اس لیے کہ تمہیں کچھ بتائے بغیر میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی،کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے بتائے بغیر چلے جانے سے تم ان گنت سوالوں سے دوچار ہوجاتے اور پھر زندگی بھر ان سوالوں سے دوچار اور میرے لوٹ آنے کے منتظر رہتے''۔اس نے ایک بار پھر خالد کو خود سے لگا کر بھینچ لیا پھر نرمی سے الگ ہوتے ہوئے بولی،''بیٹھو،بتاتی ہوں۔۔۔لیکن ایک بات میں سب سے پہلے کہنا چاہتی ہوں،وہ یہ کہ اب جو کچھ میں تمہیں بتانے جارہی ہوں۔اس پر تمہیں یقین دلانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے،سوائے اس جذبے کے جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے''۔

خالد جو سامنے کے صوفے پر بیٹھا حیرت اور تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا بولا:کیا جو تم بتانے والی ہو،وہ تمہاری ذات سے متعلق ہے یا کچھ اور؟''

''ہاں وہ میرے بارے میں ہے اور کچھ تمہارے بارے میں بھی''۔

''لیکن اپنے بارے میں تو تم بہت کچھ مجھے پہلے ہی بتا چکی ہو''۔

''میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور جو بتایا ہے وہ درست نہیں''۔وہ تیزی سے بولی۔

''اور جو آج بتاؤ گی کیا وہ۔۔۔''خالد تلخی سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''کہنا کہ میرے پاس ثابت کرنے کو کچھ نہیں ہے۔جی چاہے تو مان لینا ورنہ میرے ساتھ اس آخری ملاقات کو بھی فراموش کر دینا''۔صدف ملول ہوگئی تھی۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''خالد رکھائی سے بولا۔

''دیکھو خالد، میرے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔اس طرح بات کرو گے تو میں بہت کچھ نہیں کہہ پاؤں گی''۔ صدف نے قدرے بے بسی سے کہا۔

''کس طرح بات کر رہا ہوں؟ خیر، تمہیں جو کہنا ہے کہو، میں سن رہا ہوں''۔

''ہاں سن لو، ماننا نہ ماننا تمہاری مرضی۔ میں تم سے بات کی خاطر سورسک لے کر آئی ہوں آج، اس لیے کہ میں جانتی ہوں آج کے بعد شاید نہیں یقیناً آئندہ ہماری کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی''۔

''میں احسان مند ہوں مگر کون سا رسک اور کیوں؟'' خالد کا لہجہ بدستور روکھا تھا۔

''زندگی کا رسک!'' صدف نے ذرا درشتی سے کہا،''اور پھر تم تک آنے کے لیے مجھے اپنا موبائل ضائع کرنا پڑا۔جس میں کئی قیمتی چیزیں تھیں میری، مثلاً میری ماں کی تصویریں اور میسج جو اندھیروں میں مجھے روشنی دیتے تھے اور زندہ رہنے کی طاقت بھی۔۔۔اور۔۔۔''

''میں سمجھا نہیں۔وہ موبائل تو میرے ہاتھ مارنے کی۔۔۔''

''نہیں، تم نے کچھ نہیں کیا''۔اس نے خالد کی بات پوری ہونے سے پہلے پھر بولنا شروع کر دیا،''میں اتنے چڑا دینے والے انداز میں موبائل تمہاری آنکھوں کے آگے بار بار لہرا رہی اسے لیے رہی تھی کہ تم زچ ہو کر میرا ساتھ جھٹک دو۔میری ترکیب کامیاب رہی، تم نے جھٹکا لیکن وہ تمہارے جھٹکنے کا زور نہیں تھا جس نے موبائل کو تیں فٹ دور دیوار سے اس زور سے جا ٹکرایا، وہ میرے اپنے پھینکنے کی قوت تھی،اس لیے لیے میں اس فون سے چھٹکارا چاہتی تھی''۔

''مگر کیوں؟''

''میری جاب۔۔۔میرے کام کی وجہ سے''۔

''تمہارا کام؟''

''ہاں میرا کام۔۔۔میں ایک ایجنٹ ہوں''۔

''مجھے تمہاری بابت شبہ تو تھا مگر یہ اندازہ۔۔۔''

''میں جانتی ہوں تمہیں شبہ ہوا تھا مجھ پر''۔صدف نے اس کی بات کاٹتے ہوئے گفتگو جاری رکھی،''لیکن وہ شبہ کہیں بہت پیچھے رہ گیا۔تمہیں تو اب اس کا دھیان تک نہیں آتا ہوگا''۔

خالد کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا،اس لیے کہ صدف ٹھیک کہہ رہی تھی۔

''میں چھ ماہ پہلے اپنے مشن پر پاکستان آئی تھی اور مجھے یہاں کم سے کم دو سال رکنا تھا مگر آج صبح اچانک مجھے ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنے کو کہا گیا ہے۔ہمارے کام میں ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ٹاسک وقت سے پہلے پورا ہو جائے یا ایجنٹ کی پروگریس تسلی بخش نہ ہو''۔

خالد ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے وہ کسی جاسوسی فلم کا کردار ہو۔

صدف نے اس کی طرف دیکھا جیسے آنک رہی ہو کہ وہ اس کی بات توجہ سے سن بھی رہا ہے اور بولی،''ایک وجہ اور بھی ہوتی ہے اچانک واپسی کی اور وہ یہ کہ ٹارگٹ کے بارے میں پلاننگ بدل جائے، پلاننگ بدلنے کا مطلب ہے کہ اسے مارنے کا فیصلہ کر لیا جائے۔۔۔یا پھر ایجنٹ مشکوک ہو جائے''۔وہ سانس لینے کو رکی اور پھر بولنے لگی؛''میں ابھی کچھ نہیں جانتی کہ مجھے کس وجہ سے واپس آنے کا آرڈر دیا گیا، لیکن میں یہ جان چکی ہوں کہ اس کیس میں مجھ سے کچھ غلطیاں ہو چکی ہیں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ جو

ٹاسک مجھے دیا گیا تھا، اس کا سب سے اہم حصہ تم تھے اور تم جیسے لوگوں کے بارے میں اکثر فیصلے بدل دیئے جاتے ہیں، انہیں راستے سے ہٹانا ضروری ہو جاتا ہے"۔

خالد کے چہرے پر اب تشویش، اضطراب، غصہ کچھ نہیں تھا۔ وہ پوری توجہ سے صدف کی بات سن رہا تھا۔ صدف خاموش ہوئی تو وہ بولا" اور جو کچھ تم اس وقت کر رہی ہو، یعنی اس طرح مجھ سے ملنا، کیا یہ ایک اور غلطی نہیں ہے؟"

"یقیناً ہے اور بڑی غلطی ہے اور اس کی سب سے چھوٹی سزا موت ہو سکتی ہے میرے لیے"۔

"یہ جانتے بوجھتے اس وقت تم نے پھر ایسی غلطی کیوں کی؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں اتنے کم وقت میں پوری تفصیل سے تمہیں نہیں سنا سکتی۔ ویسے اس تفصیل سے تمہیں کچھ حاصل بھی نہیں ہوگا۔ بس مختصراً یہ سمجھ لو کہ تمہارے ملک کا مجھ پر قرض تھا اور یہ ملاقات اسی قرض کو اتارنے کی ایک کوشش ہے۔ پلیز اب توجہ اور خاموشی سے میری بات سنو"۔ وہ گھڑی بھر رکی اور پھر بولی" میں ایک پاکستانی فوجی کی بیٹی ہوں جو روس سے جنگ کے دنوں میں پاکستان کی طرف سے افغانستان گیا ہوا تھا۔ ماں نے بتایا تھا کہ افغانستان کے ان ہنگامہ خیز دنوں میں میری ماں کا پہلا شوہر مر چکا تھا۔ اس لیے جنگ کے زمانے میں اس پاکستانی فوجی سے اس نے نکاح کر لیا تھا اور میں اس کی حلال اولاد ہوں۔ ماں کے بقول اس فوجی یعنی میرے باپ کے میری ماں پر اور اس کے خاندان پر بہت احسانات تھے۔ اس کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ اس نے جنگ میں شدید زخمی ہونے کے بعد ایک امریکی سے میری ماں کو ملا دیا تھا جو اس کا گہرا دوست تھا اور ان دنوں افغانستان میں تعینات تھا۔ اس سے میرے باپ نے ماں کی مدد کی درخواست کی تھی۔ میرا باپ اپنے وطن واپس پہنچنے سے قبل راستے ہی میں مر گیا تھا۔ بعد میں اس امریکی سے میری ماں کے قریبی مراسم رہے، لیکن اس سے میرے کسی بھائی یا بہن نے جنم نہیں لیا۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ ماں نے سچ بتایا ہے کہ میں اس کی حلال اولاد ہوں۔ بہر حال، روس کی شکست کے بعد اس امریکی کی وجہ سے میرا خاندان یعنی میری ماں، بڑا بھائی اور میں امریکہ پہنچے اور امریکی امداد پر تعلیم اور پرورش پائی۔ میں نے اپنے باپ کو ظاہر ہے کبھی نہیں دیکھا، لیکن میری ماں نے جس طرح اور جتنی بار اس کی نیکیوں اور خلوص کا ذکر کیا، اس کی وجہ سے میں نے خود کو ہمیشہ اس کی قوم اور ملک کا مقروض سمجھا۔ میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں یہ قرض کسی نہ کسی طرح اتار دوں۔ قسمت نے موقع دیا اور میرے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک ٹاسک دے کر مجھے اسی ملک میں بھیج دیا گیا۔ یوں اس قرض کو ادا کرنے کا ایک بہانہ میرے ہاتھ آ گیا"۔ وہ پل بھر کو رکی جیسے بولتے بولتے الفاظ اور خیالات کا ریلا اچانک تھم گیا ہو۔

خالد بت بنا اسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی کہانی سنا رہی تھی۔ تین دہائیوں سے طویل اپنی صحافتی زندگی میں اس نے کتنی ہی کہانیوں کو کھوجا تھا، کیسے کیسے کردار دیکھے تھے، لیکن جو کہانی آج وہ سن رہا تھا، وہ بالکل الگ تھی۔۔۔ خود کہانی سنانے والی کی طرح۔ خالد کا ذہن، اعصاب، خیالات اس وقت سب ساکت تھے۔

"اس قرض کو ادا کرنے کا احساس تم نے اور بڑھا دیا"۔ صدف پھر بولنے لگی۔

"میں نے؟" خالد نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں تم نے"۔ صدف نے بہت ملائمت سے جواب دیا اور اٹھ کر اس کے ساتھ صوفے پر آ بیٹھی۔ اس نے خالد کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پھر اپنے گھٹنے پر رکھتے ہوئے بولی" مگر تمہیں پتا نہیں ہوگا کہ کب اور کس طرح۔ میں اب بھی زیادہ تفصیل میں نہیں جا پاؤں گی۔ بس یوں سمجھو کہ میں جس مشن پر یہاں آئی تھی اس کا ایک اہم ٹارگٹ تم بھی تھے۔ اپنی ٹریننگ کے مطابق میں نے تم پر کام کیا۔ تم تک پہنچنے اور تمہارا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہی لیکن اس سے آگے کچھ نہ ہو سکا۔ تم پر جائیداد کے لالچ،

بین الاقوامی شہرت اور عالمی طاقتوں کے تعلق جیسی کسی بھی کشش نے کوئی کام نہ کیا۔ تمہاری اپنے کام، اپنے لوگوں اور اپنے ملک سے کمٹمنٹ کے آگے میری ایک کے بعد دوسری کوشش ناکام ہوتی گئی اور ایک کے بعد دوسرا ہدف ادھورا رہا۔۔۔ لیکن یہ بھی کوئی ایسی بات نہ تھی۔ ہمارے پاس ٹارگٹ حاصل کرنے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہ ہو پائے تو ٹارگٹ کا صفایا تو آخری اور سو فیصد کامیاب حربہ ہوتا ہی ہے۔۔۔ مگر پھر یہ ہوا کہ تم میرے لیے ٹارگٹ رہے ہی نہیں۔ تمہارے ساتھ رہنے اور بستر پہ وقت گزارنے کے بعد میں اپنے پروفیشن اور اپنے مشن سے خود کو ڈس اورینٹ محسوس کرنے لگی۔ اپنے راستے پر لانے کے بجائے تمہیں تمہاری اسی اصل حالت میں قائم رکھنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں نے ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کیا کہ تم ایک بہت ٹف ٹارگٹ ہو، تمہیں زیادہ ایکسرسائز اور زیادہ وقت دینا پڑے گا۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں، میری ٹریننگ بہت پرفیکٹ ہوئی ہے اور میں ایک ذہین لڑکی ہوں۔ میں نے رپورٹس بہت سنبھل کر اور بہت اچھی بنا کر بھیجی ہیں، لیکن میں جانتی ہوں، اوپر مجھ سے بھی زیادہ ذہین اور تجربہ کار لوگ بیٹھے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو لوگ مجھ جیسی کسی چڑیا کو اڑنا سکھاتے ہیں، انہیں اڑتے اڑتے اس کے پر گننا اور کاٹنا بھی ضرور آتا ہوگا''۔ اس نے گہری سانس لی اور ٹھہر ٹھہر کر بولی، ''لگتا ہے اب میرے پر کٹنے کا وقت آپہنچا ہے''۔ اس نے اپنے گھٹنے پر رکھے خالد کے ہاتھ کو سہلایا اور خاموش ہوگئی۔

خالد جیسے سانس روکے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس نے گھٹنے پر رکھے ہاتھ کو اٹھایا اور اس کے دونوں ملائم ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

''تھینک یو، آئی لو یو''۔ صدف کے چہرے پر دل کش مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''ٹریننگ کے دوران میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایجنٹ کی زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے اور اسے خود کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، لیکن اگر ضرور ہو جائے تو مشن کو پورا کرنے یا بچانے کے لیے جان دینے سے گریز کا خیال تک اسے نہیں آنا چاہیے۔ ٹریننگ اس طرح دی جاتی ہے کہ موت بھی ہمارے لیے ایک ٹارگٹ ہو جاتی ہے''۔ وہ ہنس دی۔

خالد کے ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

''میرا خیال ہے، میں رومینٹک باتیں کرنے لگی ہوں''۔ صدف نے قہقہہ لگایا۔

''تمہارے جانے کا پروگرام بدل نہیں سکتا یا کم سے کم کچھ دنوں کے لیے رک نہیں سکتا؟'' خالد نے پوچھا۔

''ایسے احکامات میں ہماری رائے یا مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آرڈر ٹو بی اوبیڈ ودآؤٹ اینی کنسڈریشن اور ڈیلے۔ ہمیں دی جانے والی ٹریننگ کی یہ سب سے اہم کمانڈ ہے''۔

''تم غائب تو ہو سکتی ہو''۔

''نہیں، یہ کوشش بالکل بے کار ہوگی۔ اس لیے کہ بالآخر ڈھونڈ لی جاؤں گی اور پھر۔۔۔'' تصور سے ہی صدف کو جھرجھری آگئی۔ ''بٹ ڈونٹ وری، آئی ایم ناٹ آفریڈ اوف اینی تھنگ۔ ابھی تو پھر امکانات کا در کھلا ہوا ہے کہ شاید بچت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے لیکن بھاگنے کی کوشش کے بعد صرف اور صرف اذیت ناک موت کا راستہ باقی رہ جائے گا اور کچھ نہیں''۔ اس نے یہ سب اس طرح سے کہا جیسے اس کی آنکھیں اس وقت موت کے راستے کو دیکھ سکتی ہوں۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور بولی، ''ارے میں نے تمہیں کس بات میں لگا لیا۔ میں تمہیں اینجو لی جو کہنا چاہتی تھی، وہ کچھ اور تھا''۔ وہ چپ ہوگئی جیسے آگے اسے جو کچھ کہنا ہے اس کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہو۔

خالد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر نہایت ملائمت سے بولی، ''تم صرف انڈر اویزویشن نہیں ہو خالد۔۔۔'' لمبا سانس کھینچ کر پھر گویا ہوئی، ''اب ای ایل پر بھی ہو۔۔۔ای ایل کا مطلب ہے ایلیمی نیشن لائن''۔

خالد کا چہرہ کسی بھی تاثر سے عاری تھا جیسے یہ اس کے لیے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔

صدف نے کسی توقف کے بغیر اپنی بات جاری رکھی، میں جانتی ہوں کہ تم کو یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی کہ آخر تم کو ٹارگٹ کیوں کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ہماری رپورٹس بتاتی ہیں کہ تمہارے دہشت گرد مذہبی تنظیموں سے لنکس ہیں۔۔۔صرف لنکس نہیں، بلکہ تم ان کی ٹاپ لائن قیادت کے پاکستانی صحافت میں سب سے بااعتماد نمائندے ہو۔۔۔اور تم ہی وہ شخص ہو جو ہمارے مفادات کو نقصان پہنچانے اور اپنے معاشرے میں ہماری دشمن قوتوں کے لیے عوامی سینٹی مینٹس کو متحرک رکھنے میں سب سے اہم کردار ادا کر رہے ہو۔ تمہاری ہی وجہ سے تمہاری سوسائٹی میں ان مذہبی تنظیموں کے نظریات اور پالیسیز کی عوامی اپیل نہ صرف باقی ہے، بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے اور جس سے ہمیں مسلسل نقصان پہنچ رہا ہے''۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

خالد نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔

صدف پھر بولی، ''اور میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ تم جس سرکل میں ہو وہ بہت ان ریلائبل ہے''۔ وہ ایک لمحے کو رکی پھر بولی، ''معاف کرنا، ویسے اس وقت تمہارے ہاں بکاؤ مال کی شرح میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس کو چیک کیا جائے وہ بکنے پر تیار ملتا ہے۔ اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون کس کے لیے کام کر رہا ہے اور کس کاز کو سرو کر رہا ہے۔ تم جیسے ڈیڈی کیٹڈ لوگوں کی تعداد ہر شعبے میں کم ہو رہی ہے اور بہت تیزی سے۔ میں تمہیں نام دے کر بتا سکتی ہوں کہ اس وقت تمہارے یہاں کون کون سیاستدان، بیوروکریٹ، میڈیا پرسن اور مذہبی رہنما کس سورس سے وابستہ ہے، لیکن میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ تم خود بھی ایسے لوگوں سے ضرور واقف ہو۔ تمہاری سوسائٹی ڈک لائن پر ہے، جیسے کوئی ڈھلان پر ہوتا ہے''۔

وہ چپ ہو گئی۔

خالد نے اس بات پر بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔

''آئی ایم سوری، میں جانتی ہوں یہ سننا، ماننا سب تکلیف دہ ہے، بہت اذیت ناک لیکن میں جانے سے پہلے تم سے ایک بار یہ ضرور شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اصل میں تم جیسے لوگ سوسائٹی کے جسم میں موجود زہریلے مادوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اسے زندہ رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔۔۔مگر۔۔۔'' وہ چپ ہوئی، ایک لمحے کے لیے خالد کی آنکھوں میں جھانکا پھر اپنے ملائم ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام کر بولی، ''مگر اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ ایسے لوگ خود زندہ رہیں۔ سوسائٹی کو تاریخ کے حوالوں سے زیادہ زندہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آئی وش یو لونگ، ہلدی اینڈ پروڈکٹو لائف۔۔۔اور اگرچہ یہ ناممکن نظر آتا ہے، لیکن پھر بھی میرے دل میں خواہش ہے کہ میں زندگی میں کبھی دوبارہ تم سے مل سکوں''۔ اس نے خالد کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

خالد نے بھی جواباً ایسا ہی کیا۔

کمرے میں اب مکمل سکوت تھا۔

صدف نرمی سے خالد کا ہاتھ سہلا رہی تھی اور اس کی گہری گرم سانسوں کی پھوار خالد کے سینے پر پڑ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے، میں جو کچھ تم سے شیئر کرنا چاہتی تھی، جیسے بھی ممکن تھا، کر چکی ہوں۔۔۔اور تم تک وہ سب پہنچ گیا جو میری خواہش تھی کہ پہنچا دوں''۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے خالد کی طرف دیکھا۔

خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔اس کے چہرے پر ممنونیت بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں محبت تھی۔

''تھینک گاڈ! بس یہی میں چاہتی تھی''۔

''صدف! ایک بات بتاؤ؟''

''ارے ہاں، یہ بتانا تو رہ ہی گیا کہ میرا اصل نام پشمینہ ہے۔جب ماں پریگنٹ ہوئی تو میرے باپ نے اس سے کہا تھا کہ لڑکی ہوئی تو وہ اس کا نام پشمینہ رکھے گا اور لڑکی ہوا تو شاہ میر۔۔۔میری پیدائش سے پہلے جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، اس کا انتقال ہو چکا تھا مگر ماں نے میرا نام یہی رکھا۔ہاں اب پوچھو کیا پوچھ رہے تھے؟''

''تم نے اتنی صاف اور شستہ اردو کہاں سے سیکھی اور اتنی صفائی، سلیقے اور ذہانت سے اپنی بات کہنا کیسے آیا تمہیں؟''

''زبانیں سیکھنا ہماری ٹریننگ کا حصہ ہے۔میں پشتو، فارسی، عربی، فرنچ اور جرمن بھی اسی طرح بہت اچھی بول سکتی ہوں۔اب رہا بات کا سلیقہ اور ذہانت، تو ایسا ہے کہ میری ماں دو ستم خاندان سے ہے اور میرا باپ بگٹی قبیلے کے سرداروں کی اولاد تھا، یعنی دونوں طرف سے رائل خاندان کا خون میری رگوں میں ہے۔تم کہہ سکتے ہو کہ حسن، ذہانت اور بہادری میری خاندانی وراثت ہے۔اس میں تھوڑا سا کچھ اضافہ میں نے اپنی محنت سے بھی کیا ہوگا''۔اس وقت اس کے چہرے پر وہ جاذبیت تھی جس نے خالد جیسے محتاط اور پختہ کار شخص کو ڈھیر کر دیا تھا اور پھر اس کا یہ کھلا اور پر اعتماد اظہار، خدا کی پناہ۔۔۔وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

پشمینہ نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولی، بس اب کچھ ہی دیر میں مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔۔۔لیکن میں اس الوداعی ملاقات کے اختتام سے پہلے کچھ وقت تمہارے ساتھ بستر پر گزارنا چاہتی ہوں۔۔۔اگر تم بھی ایسا چاہو تو''۔

خالد نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما اور بستر پر آ گیا۔

پشمینہ کو بھول جانا ممکن نہ تھا اور خالد اسے بھولنا بھی نہیں چاہتا تھا۔مہینوں بعد جب ایک دوپہر اس کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی اور آدھی درجن سے زائد گولیاں اس کے جسم کے مختلف حصوں میں جگہ بناتی ہوئی جمع ہو گئیں اور اس کا ڈرائیور اس ہولناک واقعے کے باوجود ہوش وحواس کو برقرار رکھتے ہوئے اسے بروقت ہسپتال پہنچانے میں کامیاب ہو گیا اور ڈاکٹروں نے ہنگامی طور پر آپریشن کرتے ہوئے قسمت کی یاوری سے اس کی جان بچالی تو جیسے وقت کی رفتار ایک دم تھم گئی۔لمحوں کا بہتا ہوا دھارا رک گیا۔دن مٹھی کی ریت کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل کر عدم کے ساحل پر گرتے چلے گئے۔ہوش میں آنے اور اوسان بحال ہونے پر ڈاکٹروں، اہل خانہ اور دوستوں نے نئی زندگی کی مبارکباد دی، حوصلہ بڑھایا اور دعائیں دیں۔اس دن مہینوں بعد اس نے پہلی بار پشمینہ کو بہت شدت سے یاد کیا اور اس سے ملنے کی تمنا اس کے پورے وجود میں جاگی۔اسی شام ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ اس کے خون کا دورانیہ ان دنوں میں پہلی بار بڑھا ہے۔

☆☆☆

سانس لینے میں درد ہوتا ہے

محمد حمید شاہد

اچانک اس کا دھیان اپنے باپ کی طرف چلا گیا۔

باپ کی طرف بھی اور وقت کے عین اس ٹکڑے کی طرف بھی جب وہ لگ بھگ مرنے کو تیار تھا۔

لگ بھگ نہیں پوری طرح جیسے دہکتے تنور کے اندر لگائی گئی روٹی اپنے حصے کی آگ میں پک کر تیار ہو چکی ہوتی ہے، کچھ اور دیر لگی رہے تو اس پر بننے والے سنہرے پھول گہرے ہو کر جلنے لگتے ہیں یا وہ اچٹ کر آگ کے اوپر گر کر کوئلہ ہو جاتی ہے، یوں اس وقت کے آنے سے پہلے پوری طرح۔

اس نے اپنے باپ کو دیکھا، اس کا چہرہ اس دیکھنے پر پھولوں کی طرح کھل اٹھا اور آنکھیں چمکنے لگیں، جیسے ان آنکھوں کو بس اسی کا انتظار تھا۔

انتظار ختم ہوا، باپ کا پورا وجود بھڑک کر بجھنے والے شعلے طرح تھرتھرایا اور بجھ گیا۔ وہ اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا باپ بھی اسے دیکھ رہا تھا، مگر وہ دیکھ کہاں رہا تھا، بس اس کی نظریں جہاں تھیں وہیں ٹھہر گئی تھیں۔ اپنے باپ کو اس طرح دیکھنا، اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا، لرزتا ہاتھ اس کی آنکھوں تک لے گیا اور پتلیوں کو نیچے گرا دیا۔ تب اس نے سوچا تھا کیا یہی زندگی تھی؟

یہی زندگی کی آواز ہے۔

ایک چیخ، اس نے لیبر روم کے باہر بھی سن لی تھی، مہین، مسلسل مگر زندگی سے بھرپور چیخ۔

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، کوئی بھی اس جانب متوجہ نہیں تھا، یوں جیسے سب واہمہ تھا، وہاں کوئی آواز تھی ہی نہیں۔ وہاں لیبر روم کے باہر گیلری میں، کسی نے بھی کوئی آواز نہیں سنی تھی، سنی ہوتی تو اس کی طرح چونکتے ضرور، مگر سب کے چہرے کھڈی پر تنی کھدر کی طرح تنے ہوئے تھے۔

"لگتا ہے سب اپنے حصے کی آوازیں سننے کے انتظار میں ہیں"۔

اس نے اپنے تئیں خود کو تسلی دی۔ یقیناً اس نے کچھ لمحے پہلے ایک آواز سنی تھی، مہین، مسلسل اور زندگی سے بھرپور۔

"تمہارے باپ نے زندگی کو پوری طرح محسوس کر کے گزارا ہے۔ جیسے تم اپنی اپنے سانسوں میں پھولوں کی مہک بسا سکتے ہو، اپنی انگلیوں کی پوروں سے تتلیوں کے پروں کے رنگ مسل سکتے ہو یا بہتے پانی کو اپنے ننگے بدن پر رینگتا ہوا محسوس کر سکتے ہو، اس طرح۔ اور جب موت سے معانقے کا وقت آیا تو بھی اس نے اپنی حسوں کو پوری طرح بیدار رکھا ہوا تھا"۔

اماں کہتی رہی اور وہ سنتا رہا، ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہا تھا، کہتا بھی تو کیا؟

"کبھی کبھی لگتا، تمہارا باپ بیٹھے بیٹھے مر جاتا تھا، مگر وہ مرتا نہیں تھا، مجھے تو لگتا ہے وہ موت کو محسوس کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا کرتا تھا"۔

یہ بھی اماں نے کہا تھا۔

"وہ موت کو یوں ہی محسوس کرتا رہا، نہیں شاید وہ موت کو اپنے وجود سے مانوس کر کے ٹالتا رہا، پھر جب اس کا انتظار ختم ہوا تو اپنے وجود سے زندگی کو نکل جانے دیا۔

ایک وجود کی کوکھ سے ایک اور زندہ وجود کا نکلنا، سہولت سے نہیں، انگ انگ میں چھپے درد کو جگا کر بلکہ اس موت کے مقابل کر کے بھی، جو ایک نئی زندگی کے لیے پوری طرح تیار بدن پر کچوکے لگا کر اپنے آپ کو محسوس کراتی ہے، کتنا مشکل ہوتا ہے۔
مشکل مگر زندگی سے بھرپور۔
وہ موت کو پورا زور لگا کر پرے دھکیلتی رہی۔
''پورا زور، نیچے کی طرف''۔
ڈاکٹر کہتی رہی، وہ پورا زور لگائے، نیچے کی طرف۔ وہ اس بے بی کو نیچے کی جانب دھکیلتے دھکیلتے نڈھال ہوگئی، جسے اپنے گربھ استھان میں محسوس کر کے جیتی رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے حواس جاتے رہے، اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں اور ڈاکٹر اور اس کا عملہ بھی اپنے آپ کو بدحواس محسوس کرنے لگا تھا۔
اس بدحواسی کو اور اپنی بیوی کے ڈھلتے حوصلے کو اس نے باہر کاریڈور میں محسوس کر لیا تھا۔
اس کی ساس، لیبر روم کے ساتھ والے ویٹنگ ایریا میں تھی۔ وہ بیٹی کی مدھم ہو کر معدوم ہو چکی چیخوں سے گھبرا کر بھاگتے ہوئے نکلی اور اس کمرے میں گھس گئی جو انہوں نے ہسپتال میں داخلے کے وقت حاصل کر لیا تھا۔
وہ ساس کے پیچھے لپکا۔ کمرے میں پہنچا مگر تب تک وہاں فرش پر ہسپتال والوں کا تولیہ بچھا کر سجدے میں گر چکی تھی۔ وہ وہاں رک نہیں سکا بھاگتے ہوئے پھر کاریڈور میں آ گیا۔
اب دونوں طرف کی آوازیں اس کے اندر رس رس کر گرنے لگی تھیں۔
''خس کم جہاں پاک، ۔ ۔ ۔ یہ تیسری آواز تھی جو اس نے سنی۔
اسے اپنے بچپن میں سنا ہوا محاورہ یاد آ گیا۔
کاریڈور سے گزرتی قدرے کم سن نرس نے یہ جملہ کہا اور اپنی ساتھی نرس کی طرف دیکھتے ہوئے سفاکی سے ہنسنا چاہا جو کہیں اور الجھی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے ہنسی اس کی ناف کے نیچے کہیں دب کر رہ گئی تھی۔ وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اپنی جانب کسی کو متوجہ نہ پا کر کم سن نرس کا بدن کسمسایا۔
''خس کم۔ ۔ ۔''
اس کے بدن کی کسمساہٹ بتاتی تھی کہ جیسے وہ یاد آنے والا محاورہ دہرانا چاہتی تھی مگر آواز حلقوم میں ہی پھنس گئی تھی، یوں جیسے مچھلی کے حلقوم میں کانٹا پھنس جاتا ہے۔ عین اس لمحے کہ جب شاید وہ اپنے یوں سوچنے پر شرمندہ ہونا چاہتی ہوگی، اس کے وائٹ گاؤن کی جیب میں پڑا اسیل فون جلنے بجھنے لگا۔ اس نے جیب سے فون نکالا۔ اس کے ڈسپلے پر نظر ڈالی اور اپنی رفتار مدہم کر کے ساتھی نرس کو آگے جانے دیا۔ بات کرتے کرتے اس کے گال تمتمانے لگے تھے۔ اسی اثنا میں اس نے ناگواری سے پلٹ کر دیکھا، اس جانب، جہاں ایک قطار میں تین لیبر رومز تھے۔
اس نے ایک لمحے کے لیے اس خوب صورت اور کم سن نرس کی بابت سوچا جو اپنی ڈیوٹی کے طویل ہونے پر اکتائی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے اپنی اکتاہٹ کو اپنے وجود کے اندر بہ مشکل سنبھالا ہوا ہوگا کہ اب باہر نکلتے ہوئے وہ ایسا نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ اسے اس نرس کے رویے پر طیش نہ آ رہا تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی جس کے گال محبت سے تمتما رہے تھے اس پر طیش کھانا اس کے لیے ممکن ہی نہ رہا تھا۔
''جی ایسا ممکن نہیں رہا''۔

''مگر ڈاکٹر آپ نے تو کہا تھا یہ نارمل کیس ہے؟''
اس کی ساس ڈاکٹر سے بحث کرتی ہے۔
''نارمل تھا، مگر اب نہیں رہا۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھی ہے، زور ہی نہیں لگا رہی۔۔۔اور اندر بے بی کی سانسیں ڈوب رہی ہیں''۔
وہ یہ سن کر گھبرایا جب کہ اس کی ساس یہ سن کر بپھر گئی۔
''یہ تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے''۔
پھر وہ رونے لگی۔
''میری بیٹی درد سے تڑپتی رہی اور تم لوگ دوسرے مریضوں کو بھگتاتے رہے۔۔۔''
اس نے ساس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ساس کی بات بیچ میں کٹ گئی۔
''جی آپ دونوں کی زندگیاں بچائیں''۔
اس نے ڈاکٹر سے کہا تو جیسے ڈاکٹر یہی سننے کو منتظر تھی۔ اس نے فائل سے ایک کاغذ نکالا جس پر پہلے سے ایک عبارت موجود تھی اور نیچے خالی جگہ پر انگلی رکھ دی۔ اس نے اپنی ساس کی طرف دیکھے بغیر وہاں دستخط کر دیئے۔
''حیاتی کی ایک قیمت ہے جو دینا پڑتی ہے۔ ہاں، ہر حال میں دینا پڑتی ہے''۔
جب اس کی ماں یہ کہہ رہی تھی، تب اس نے دیکھا تھا وہ ایک تنکے سے زمین کرید رہی تھی۔
''جب یہ قیمت نہیں چکا پاتے تو قبر کا منہ کھل جاتا ہے''۔
ایسا کہتے ہوئے ماں نے زمین کریدنے والا تنکا اپنی انگلیوں کے بیچ دبا کر توڑ دیا۔ اس نے دیکھا وہاں ایک چوکھٹا مکمل ہو گیا تھا۔ قبر کا چوکھٹا نہیں زندگی کا دروازہ۔
اس نے دستخط کر دیئے۔ ڈاکٹر تیزی سے لیبر روم کے دروازے میں گھس گئی۔ اور ابھی وہ پوری طرح اپنی ماں کے جملے کی بابت سوچ نہ پایا تھا کہ اسے ایک چیخ کے ساتھ بندھی مہین اور مسلسل بلکنے کی آواز نے چونکا دیا۔ زندگی سے بھرپور آواز۔

☆☆☆

مراد

محمد سعید شیخ

جس روز اس نے جانا کہ اسے کینسر ہے اس روز سے اسے اپنے جسم سے نفرت ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے سارے ٹیسٹوں کی رپورٹس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی۔ ''اپنا شک دور کرنے کے لیے میں نے دو تین لیبارٹریز سے ٹیسٹ کروائے ہیں، کاش! میرا شک دور نہ ہوتا''۔ اس کے لیے وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا، ہر شے اس کی نظر سے غائب ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ وہ ڈاکٹر زیبا کے سامنے بیٹھی تھی جو بہت بڑی کینسر اسپیشلسٹ تھی۔

''مسز دیپ۔۔۔مسز دیپ ہوش میں آئیں یہ مرض اب نا قابل علاج نہیں رہا۔ ہمارے پاس اس کا علاج ہے''۔

اس کے چہرے کا رنگ یکدم پیلا پڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر کے چونکانے پر اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ پہلے ڈاکٹر کو پھر اپنے چار چفیرے کو پہچاننے کی کوشش کی۔

''کاش! میں مٹی ہوتی'' اس کے دماغ میں خیال آیا۔ میرے جسم نے میرے ساتھ اتنی بھی وفا نہ کی، اتنا بھی ساتھ نہ دیا کہ میں اپنے بچوں کو پھلتے پھولتے دیکھ سکتی، ان بچوں کو جو اسی جسم نے مجھے دیئے ہیں''۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے جسم کے کسی حصے سے درد کی کاٹ دار لہر سی اٹھی اور اس کے پورے وجود میں سنسنی بن کر دوڑ گئی۔ وقار اور بے نیازی جو اس کے پسندیدہ اوصاف تھے ان کے متعلق فوراً سوچا'' میں اب انہیں کیسے قائم رکھ سکوں گی، مجھے دوسروں کے رحم و کرم پر جینا پڑے گا۔ کتنا افسوس ناک ہے یہ سب کچھ! کتنا کچھ ہے جو مجھے بہت عزیز ہے جسے اب میں کھو دوں گی''۔

''اب مجھے فوراً آپ کا ریگولر علاج شروع کرنا پڑے گا''۔ ڈاکٹر نے اپنے سامنے پھیلی ہوئی رپورٹس پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر، میرے پاس جینے کو کتنا عرصہ رہ گیا ہے؟'' دردناک سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''یہی کوئی چھ ماہ۔ علاج اور دوا سے یہ مدت بڑھ بھی سکتی ہے۔ باقی دعا بھی کریں''۔

''دعا سے کیا ہو گا ڈاکٹر۔ آپ ڈاکٹر ہو کر دعا کی بات کرتی ہیں''۔

''ہاں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ جہاں دوائیں اثر کرنا چھوڑ دیتی ہیں، وہاں دعائیں کام کر جاتی ہیں بشرطیکہ دعا پہ مکمل یقین ہو''۔

''کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر کہ میرے اس مرض کی خبر میرے میاں کو نہ ہو۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے یہ خبر اسے مار ڈالے گی''۔ وہ فکر مندی سے بولی'' پھر میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی ہے''۔

''آپ کے بچوں سے یہ بات چھپائی جا سکتی ہے مگر اس سلسلے میں آپ کے میاں کا تعاون ضروری ہے۔ بہر حال کل سے آپ کا علاج شروع، کل آپ کو کیموتھراپی کی پہلی خوراک دی جائے گی۔ آپ تیار ہو کر آئیں۔ ہمیں اس بیماری سے با قاعدہ جنگ کرنا پڑے گی، فوراً اسلحہ استعمال کرنا پڑے گا''۔

''میدان کارزار تو میرا جسم ہی بنے گا جس کی تباہی یقینی ہے یہ تو شاید ایسی لڑائی ہو جس کی ہار پہلے ہی میرے مقدر میں لکھی جا چکی ہو''۔ اس کے لہجے کی سنجیدگی کی ڈاکٹر کو زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ اسے پتا تھا اس بیماری کی زد میں آنے والے مریض ایسی باتیں ہی کرتے ہیں۔ اسے یاد تھا کینسر کے ایک مریض نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔ موت برحق ہے۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں

لیکن یہ بھی کیا طریقہ ہے کہ انسان کو تڑپا تڑپا کر، گھسیٹ گھسیٹ کر مارا جائے۔
''میرا خیال ہے آج ہم نے اس بیماری کے متعلق بہت گفتگو کر لی ہے۔ آئندہ پر بھی بہت سی باتیں چھوڑی جا سکتی ہیں''۔ مسز دیپ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں۔ ڈاکٹر نے اسے نسخہ لکھ دیا۔ ''باقی باتیں کل ہوں گی''۔
اس کا میاں لوکل گورنمنٹ میں انجینئر تھا، رات گئے تک مصروفیت کے بعد تھکا ہارا گھر آیا اور کھانا کھاتے ہی لیٹ گیا، اتنا وقت ہی نہ ملا کہ اپنی مسز کا اترا ہوا چہرہ دیکھتا۔ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ اس نے میرے چہرے کے بگڑے خدوخال نہیں دیکھے اور نہ ہی اس کے متعلق مجھ سے کوئی سوال کیا۔ وہ پوچھتا تو شاید اس کے لیے ضبط کرنا بہت مشکل ہوتا۔
وہ بچوں کو سلا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بیٹھی اور پھر باہر نکل آئی۔ باہر لان میں ٹہلتی رہی، سوچتی رہی اس کا دماغ پگھلا ہوا تھا۔ لاوا اس کی کھوپڑی کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ جب سے اس نے جوانی کے علاقوں میں قدم رکھا تھا، اس نے جسم کی مثالی دیکھ بھال کی تھی۔ شادی کے بعد اور پھر بچوں کی پیدائش کے نتیجے میں جسم میں ہونے والی تبدیلیوں کو باندھ کے رکھا ہوا تھا۔ ابھی تک اس نے جسم کو ڈھیلا نہیں پڑنے دیا تھا۔
ظہیر کو جب بھی موقع ملتا، وہ اسے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتا۔ ''تمہیں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ تم تین بچوں کی ماں ہو''۔ اسے یہ تعریف اچھی لگتی۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمک اٹھتا وہ اور بھی خوبصورت لگنے لگتی۔
اب جیسے اسکی خوبصورتی کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی تھی۔ اس کے جسم نے ایسی لڑائی لڑنی تھی جسے وہ پہلے ہی ہار چکی تھی۔ کینسر کا نام ہی ایسا ہے کہ مریض سن کر ہی آدھ موا ہو جاتا ہے۔ عورت کی ساری حیثیت ہی اس کے جسم کے دم قدم سے ہے۔ اس مرحلے پر اپنے ہوش و حواس قائم رکھنا اس کی پہلی ترجیح تھی۔ اس کے لیے اسے ظہیر کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اسے جب اس کی اس مہلک بیماری کا پتا چلے گا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔
یہ رات اس پر بہت بھاری تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اسے پار کر کے صبح کی روشنی تک نہیں پہنچ سکے گی۔ وہ بار بار بستر پر لیٹتی اور پھر بے قرار ہو کر اٹھ جاتی۔
''کتنے کم لوگوں کو کینسر کا یہ مرض لاحق ہوتا ہے''۔ اس نے صدمے کی حالت میں ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔ ''بہت کم کو'' ڈاکٹر نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ شاید ایک فیصد سے بھی کم لوگوں کو اور کینسر کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً آپ کے کیس میں یہ کہنا مشکل ہے کہ کس وجہ سے آپ کو یہ بیماری لگی۔
اور اب وہ بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی جتنے لوگوں کو یہ مرض لاحق نہیں ہوا میں ان سب سے زیادہ گنہگار تو نہیں، اگر یہ میرے کسی گناہ کی سزا ہے۔
ایسے وقت میں جب رات ابھی باقی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھے اور جا کر ظہیر کو جگائے اور اسے بتائے کہ اس پر کیا قیامت گزر رہی ہے، وہ اس کی مدد کرے، اسے یہ دریا پار کرنے میں سہارا دے کہ وہ ڈوبنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے کسی ملاح کی، کسی بیڑی کی ضرورت تھی اور نہیں تو وہ اسے کچا گھڑا ہی لا دے۔ وہ اٹھ کر گئی تھی اس نے ایک دوبار اسے ہلایا بھی، آواز بھی دی جو شاید بہت کمزور تھی۔ ''پلیز! تنگ نہ کرو''۔ وہ پہلو بدل کر سو گیا۔ نہیں ایسی حالت میں یہ میرا دکھ کیا سمجھ پائے گا۔ وہ کچھ دیر ادھر اور پر ٹیرس پر ٹہلتی رہی۔ خیالات کی لہریں اس کے دماغ کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہیں۔ جب اس کی ٹانگیں تھک گئیں تو وہ واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی وہ نیم غنودگی میں تھی جب اس نے دیکھا دروازے میں اس کی ماں کھڑی تھی۔
''ماں'' اس کے منہ سے سسکی سی نکلی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ماں قریب آ گئی تو وہ اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی۔

''تمھیں پتا چل گیا ماں، میرے ساتھ کیا گزرنے والی ہے، تمہارے دودھ میں تو کچھ خرابی نہیں تھی جو میرے جسم میں یہ آزار آ گیا، یا کسی گناہ کی سزا ہے جو مجھ سے یا تجھ سے سرزد ہو گیا'' ۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ اپنی ماں کا سینہ بھگونے لگی۔ ''یہ تیری تقدیر ہے بیٹی جو ازل سے تیرے نام لکھ دی گئی تھی ۔ تو نے صبر سے اس آزمائش میں پورا اترنا ہے، یہی تیری کامیابی ہوگی، کسی کو الزام نہ دینا، ہر انسان نے ازل کا لکھا پورا کرنا ہے'' ۔ ''کیسے ماں؟ اتنا صبر میں کہاں سے لاؤں گی؟'' اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ اس کی ماں کے چہرے پر کوئی غم نہ تھا، بدستور چہرہ روشن تھا۔ ''اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، اسے اپنے بندوں کے دکھ سکھ کا پتا ہے، وہ سینوں کے راز تک دیکھتا ہے'' ۔ اس کی ماں بیٹی کی پشت سہلا رہی تھی ۔ اور اس کے جسم کی تپش جیسے آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی ۔ وہ ماں کی گود میں سر رکھے سو گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو قیامت کی رات گزر چکی تھی، صبح طلوع ہو چکی تھی ۔

اس نے بچوں کو تیار کیا، ناشتہ کرایا اور اسکول روانہ کیا، اتنی دیر میں ظہیر دفتر کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر بیٹھ چکا تھا۔ دیپ کچھ کھوئی کھوئی، غیر حاضر دماغی سے اس کے سامنے بیٹھی تھی ۔ خواب میں ماں کا دیا ہوا حوصلہ اس کی مدد کر رہا تھا۔

''تم گئی تھیں کل ڈاکٹر کے پاس اپنے ٹیسٹس کی رپورٹ لے کر؟''

''ہاں'' یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی یہ سوچتی کہ اسے کیا بتائے، ظہیر دیکھ رہا تھا، انتظار کر رہا تھا کہ وہ بولے، اسے بتائے ڈاکٹر نے کیا کہا اور وہ ضبط کر رہی تھی ۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، چہرہ مرجھا رہا تھا، پھر وہ نہ رک سکی ''ڈاکٹر کو شک ہے کہ یہ کہیں'' ۔

''کیا؟''

اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''کیا شک ہے؟'' اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

''کہ یہ کہیں کینسر نہ ہو'' ۔ آخر کار وہ بمشکل یہ الفاظ ادا کر سکی ۔

''اوہ۔۔۔نو۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ تقریباً چیخ پڑا۔ چائے کا گھونٹ اس کے حلق میں پھنس گیا۔ اگلے پانچ چھ دن ظہیر نے اس کے سارے ٹیسٹ کروائے مگر وہ ڈاکٹر کی رائے نہ بدل سکا جو مسلسل اصرار کر رہی تھی جلد از جلد دیپ کا علاج شروع کیا جائے۔

اور جس شام اسنے کیموتھراپی کی پہلی ڈرپ لگوائی، اس رات اسے شدید روحانی تنہائی کا احساس ہوا۔ اسی رات اس نے اپنا کمرہ ظہیر سے علیحدہ کر لیا تھا'' ۔ میں نہیں چاہتی کہ میری تکلیف سے تمہاری نیند میں خلل پڑے'' ۔

جوں جوں اس کے علاج کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا، ظہیر اور اپنے بچوں کی محبت سے اس کی بے نیازی بھی بڑھتی گئی۔ اسے لگتا تھا وہ تمام ضرورتوں اور خواہشوں سے خالی ہونے لگی ہے۔ ''اچھا ہے۔ ایک طرح سے میری محتاجی کم ہو رہی ہے'' ۔ اتنی تھوڑی زندگی جتنی ڈاکٹرز بتاتے ہیں اس کا میں کیا کروں؟ کچھ نہیں ہو سکتا، کچھ بھی نہیں ہو سکتا اس میں۔

کوئی خواہش نہ تھی جو مرجھا نہ گئی ہو۔ یہاں تک کہ زندہ رہنے کی آرزو پر بھی مردنی طاری ہونے لگی تھی ۔ علاج تو وہ کروا رہی تھی مگر زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر کو کہتی ''آپ ایسے شخص کو کیوں زندہ رہنے کی ترغیب دے رہی ہیں جو پہلے ہی مر چکی ہے؟''

''نہیں مسز دیپ ہم آخری دم تک مرض کے خلاف لڑتے ہیں مایوس نہیں ہوتے ۔ آپ بھی ہمت کریں، شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے'' ۔

''مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دیں ۔ اللہ نے مجھے شفا دینی ہوتی تو مجھے اس بیماری میں مبتلا ہی کیوں کرتا؟ آپ مجھے مرنے کا کوئی آسان طریقہ بتائیں؟''

''ہم تو آپ کی زندگی بچانے کی کوشش کررہے ہیں اور یہی ہمارا کام ہے۔آپ بھی ہمارا ساتھ دیں''۔
''کوئی فائدہ نہیں''۔
''محترمہ۔آپ نے ابھی سے ہمت ہار دی ہے، ہمت سے کام لیں آپ پہلی شخص نہیں ہیں جسے یہ مرض لاحق ہوا ہے''۔
''مگر مجھے اپنا کوئی گناہ اتنا بڑا یاد نہیں آتا جس کی پاداش میں مجھے یہ بیماری لگی ہے۔سوائے اس کے میری اب اس دنیا میں کوئی ضرورت نہیں لیکن یہ صورت حال بھی میرا دماغ قبول نہیں کرتا آخر یہی دنیا لاکھوں بے ضرورت لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ آخر وہ بھی تو زندہ رہے جا رہے ہیں''۔

اس کی باتوں میں ایک اصرار تھا، جھلاہٹ تھی ڈاکٹر کے پاس اس کی تسلی کے لیے وقت نہیں تھا۔

تو گویا میرے سارے کام، میری ساری خواہشیں بے کار ہوئیں اس نے ڈاکٹر کے پاس سے اٹھتے ہوئے سوچا۔رات کو وہ زیادہ دیر سو نہ سکی جب اس کے دل کی تیز دھڑکن نے اسے جگا دیا۔ایک درد تھا جو اس کے جسم کے ایک حصے سے دوسرے میں اپنی ان گنت ٹانگوں سے بھاگتا تھا۔لیکن ٹھہرتا نہیں تھا۔دھم دھما دھم دھم۔دردوں نے اس کے جسم میں دھمال ڈالنا شروع کر دی۔باہر سڑک پر رات کے اندھے بھیگے اندھیروں میں ڈھول بج رہا تھا دھم دھما دھم دھم۔وہ بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی۔دو ڈھول والے تھے جن کے گرد کچھ لوگ گھیرا بنائے دھمال ڈالتے اس کے گھر کے آگے سے گزر رہے تھے۔ان لوگوں کے گھیرے کے اوپر چادر کے کنارے پکڑے پانچ سات لوگوں نے سبز چادر تان رکھی تھی جو رات کی تاریکی میں سیاہی میں رنگ گئی تھی۔یہ لوگ مرت مراد کے مزار پر چادر چڑھانے جا رہے تھے۔اس کے جسم کے اندر جو درد کی دھما دھم دھم ہو رہی تھی اس کے سر اس باہر والی دھما دھم دھم میں گھل مل گئے تو اسے اپنے پاؤں پر اختیار نہ رہا۔اس نے تنی چادر کے کنارے کو چھوا اور دھمال ڈالنے والوں میں شامل ہو گئی۔دھما دھم وہ دھمال ڈالتی گئی، اس کے جسم کی توانائی مدھم پڑتی گئی۔مرت مراد کے مزار تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس اکھڑنے لگ گئی۔سب مرادیں مانگنے والے مزار کے اندر داخل ہو گئے وہ برآمدے میں کھڑی لڑکھڑانے لگی۔اس کی ٹانگوں نے اس کے نحیف جسم کا بوجھ سنبھالنے سے انکار کر دیا تو وہ اپنے پاؤں پر بیٹھ گئی۔برآمدے کا ستون اس کی پشت سے آ ٹکا۔ایک ایک کر کے ساری روشنیاں مدھم پڑتے پڑتے بجھ گئیں۔مرادیں مانگنے والے ایک ایک کر کے نکلتے گئے آخر میں وہی ایک وہاں رہ گئی جس کے پاس نہ کوئی خواہش رہی نہ، مراد۔

سکرپٹ

محمد عاصم بٹ

تمہیں ایک عاشق کا کردار ادا کرنا ہے۔ یہ بات، اگر تمہیں یاد ہو، بہت پہلے، اس سفر کے آغاز سے بھی پہلے، جب تمہارے تعارف نے ہماری یاداشت پر پہلی بار دستک دی تھی، اس سے بھی پہلے، تمہارے گوش گزار کر دی گئی تھی۔ چاہو تو سکرپٹ میں دیکھ لو۔ تمہارے گلے میں سوتی تھیلا لٹکا ہوا ہے، اسی میں ہے۔

اپنی جیبیں ٹٹولو۔ ایک آئینہ ان میں ہوگا۔ ایک کنگھی بھی ہوگی۔ بال بنالو۔ چہرے پر لمبے سفر کی تھکان میل کے چمکتے چکٹوں کی صورت میں آنکھوں کو چندھیا رہی ہے۔ دھولو۔ چاہو تو دائیں ہاتھ سرکاری نل تک جاؤ اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارو۔ سرکاری نل کا کیا بھروسہ ابھی اس میں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔ ابھی یہ باقی نہ رہیں اور کھلی ٹونٹی سے غراہٹوں جیسی پھونکیں رسنے لگیں جیسے پکے ہوئے پھوڑے سے پیپ رستی ہے یا گلے ہوئے پھل سے رس۔ ادھر دیکھو۔ مونچھیں شاخوں کی طرح دائیں بائیں ہونٹوں سے نیچے کیا لٹکا رکھی ہیں جیسے بہت پھل دار ہوں۔ مگر پھل کہاں ہے؟ شیو تم سے کبھی ٹھیک سے نہیں ہو سکی۔ شرارتی بچوں کی طرح مساموں سے باہر جھانکتے رہتے ہیں ننھے ننھے بال۔ ہم جانتے ہیں یہ باتیں سکرپٹ میں نہیں لکھی ہوئیں۔ ہر بات سکرپٹ میں نہیں لکھی ہوتی۔

چوک کی نکڑ پر بند دکان کے تھڑے کے برابر، جہاں اینٹوں کا ایک کم اونچائی کا ڈھیر پڑا ہے۔ بالکل تم نے درست پہچانا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں تمہیں کھڑے ہونا ہے۔ ایسے ہی بالکل سیدھے۔ کمر اکڑی ہوئی، کمان جیسی، اور کمان بھی اندر کی طرف جھکی، محراب جیسی۔ چھاتی پھلالو اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر گہرا سانس بھرو، اور گہرا، ہاں بالکل اسی طرح۔

سامنے جہاں چوڑا راستہ دھند بھرے پس منظر کے ساتھ نکڑ تک آتے آتے جیسے ہانپ جاتا اور نڈھال سایوں سایوں میں ڈھل جاتا ہے کہ چٹیل میدان معلوم ہونے لگے، وہیں جہاں شہر سے آنے والی ہر شے، ہوا یا افواہ بھٹک ہوئی نگاہ یا الجھا ہوا راستہ، چوک میں داخل ہونے سے پہلے ایک بار ضرور دکھائی دیتا ہے۔ وہیں سے نویکلی سواری برآمد ہوگی۔ وہی جس کے خواب ہم نے مل کر سجائے ہیں جیسے دلہن کو سجایا جاتا ہے۔ اگر وہ اشارے اور علامتیں، جو گاہے بگاہے تمہاری طرف بھیجی جاتی رہیں، تمہیں یاد ہوں تو بہت آسانی کے ساتھ اس سواری کو پہچان لوگے۔ وہ مختلف ہوگی، بہت ہٹ کر، وکھری، نرالی۔ اسی لیے تو وہ کچھ بھی ہو سکتی ہے، سکوٹر، رکشہ، ہتھ ریڑھی، پالکی، تانگہ، بیل گاڑی۔ ان سے ہٹ کر بھی کچھ۔

پرندے جان لیں گے تم سے بھی پہلے، وہ اپنے گھونسلوں سے اڑیں گے اور چوک کے آس پاس چھتوں، منڈیروں، بالکونیوں، کھمبوں، روشن دانوں میں آ بیٹھیں گے، غٹرغوں یا جیسی بھی ان کی بولی ہوگی، بولیں گے۔ تم جان لینا۔ روشنی کا ہالہ، ہوا سے زیادہ ہلکی، اور سبک سر، بے آواز۔ یہ چند مزید نشانیاں ہیں۔ سر بلند کر کے ہوا میں سونگھتے رہو تو اس کی خوشبو بھی پہچان لوگے۔

ارے رکو، ایسے اتاؤلے ہو تم۔ بھئی خدا کی پناہ۔ یہ ڈھینچوں ڈھینچوں چلتی سواری، اس کا مقابلہ ہے، کیا موجودہ سواری سے۔ کچھ تو عقل کرو۔ جسے سواری دیکھتے ہو، اس کے پیچھے چل پڑتے ہو۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے دو اینٹوں کی چوکی پر سر جھکائے بیٹھا شخص، گھر کی کھڑکی سے باہر جھانکتا شخص، دکان کے کاونٹر پر بیٹھا سیلز مین، سرکاری نلکے سے پانی پیتا ہوا مسافر، ویگن کے انتظار میں کھڑا نوجوان طالب علم، ریزگاری گنتی ہوئی عورت، یہ سب کیا سوچیں گے۔ کبھی سوچا ہے۔

ایک بے بس اور لاچار طفل تھے جب ہم نے تمہیں بچایا تھا آسمان کو چاٹتے شعلوں سے۔ورنہ جل کر خاکستر ہو جاتے۔ انہیں بھول گئے گیا۔ ڈراؤنے خوابوں جیسے لوگوں کو۔آگ لگانے والے،تمہارے گھربار کے قاتل۔کوئی شک ہے کیا،ان پر یا ہم پر۔میرے خدایا اس کوڑھ مغز کا کیا علاج؟

پرے جہاں دھند ہے،سلیٹی سے رنگ کی،کچے دھویں کی مانند،اور جہاں درختوں،اوران سے بھی پرے پہاڑوں کی چوٹیوں،بادلوں اور الجھے ہوئے پہاڑی راستوں کا منظر آپس میں گڈمڈ ہو کرنا قابل فہم معلوم ہوتا ہے اور کچھ بھی واضح نہیں رہتا، سوائے ایک طرح کے ابہام اور بے ربطی کے،وہیں ایک راستہ شہر کی طرف سے آتا ہے۔دھند کے چہرے سے ایک یک سرخ زبان کی طرح باہر کو نکلا ہوا۔منظر کے چہرے پر گہرے تازہ گھاؤ جیسا۔اسی پر نگاہ جماؤ، یہ چوک اس کی آخری حد ہے۔

غور سے دیکھو،ایڑیاں اونچی کر کے۔دھند ایک ڈائن ہے بہت سی زبانوں والی،مسافر کو دھوکہ دیتی زبانیں،ایک ہی وقت میں متضاد باتیں کرتی،الجھاتی اور بھٹکاتی زبانیں۔بھٹک مت جانا۔راستے کہاں کہاں سے ہو کر کہاں جا نکلتے ہیں،تمہیں اس سے کیا۔ان مسافروں سے کیا جوانجانے میں اور کبھی کبھار جان بوجھ کران راستوں کے الجھاوؤں میں گم ہو جاتے،بھٹکے ہوئے اور بدنصیب لوگوں کی طرح،کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کہیں پہنچ پاتے ہوں گے۔دھند میں یہ راستے کہیں بھی نہیں جاتے،آپس میں الجھ کر مہلک اور موذی ہو جاتے اور مسافروں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔

بس دھیان رکھو،کہ اسی راستے پر وہ سواری ٹھمک ٹھمک کرتی آئے گی،شام ہونے سے پہلے۔صاف لکھا ہے سکرپٹ میں، صفحہ پندرہ کی سطر 18 پر۔ہر زبان میں،جو بھی تم آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکو۔سواری تھم جائے تو بڑھ کر اسے نیچے اترنے میں مدد دینا۔خاموشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لینا اور چوک کے باہر جانے والے دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جانا۔ ترانہ بجے گا،ہر طرف سنائی دیتا ہوا۔گیت کے بولوں میں تمہارے لیے اشارے ہوں گے واضح،اور کہیں کہیں خفیہ،یا تہنیتی پیغام ہوں گے آئندہ کی زندگی سے متعلق،اور نیک تمنائیں اور لائحہ عمل ہوگا،سبھی کچھ بس چند بولوں میں۔

اور کیا ہم نہیں جانتے کہ تم ہرگز ان میں سے نہیں ہو،جن کے پاس بینائی ہے مگر وہ دیکھتے نہیں ہیں،سماعت ہے لیکن سنائی نہیں دیتا۔جب تک گیت ختم نہ ہو،خاموشی سے خود کو کچھ بھی کہہ دینے سے روکے رکھنا۔

چوک سے پرے مرغزار میں ہم تمہارا سواگت کریں گے،ہمیشہ کی طرح۔ایک نئی زندگی کے دائرے میں خوش آمدید کہنے کے لیے۔تمہاری آنکھوں میں اجنبیوں جیسی سفید بے حسی کیوں ہے۔تاریک،فریب کن دھند میں غرق راستے کی طرف کیا دیکھتے ہو؟ وہاں کیا ہے جو اس چوک میں نہیں ہے،اور تم کیا جانو،جن کے بہکاوے میں آکر تم فتنہ انگیز سوچوں میں الجھ چکے ہو ان کے ساتھ کیا بیتی۔ان کے معدے غلاظتوں کے تعفن سے لبالب بھرے ہوں گے اور ان کی کھوپڑیوں میں بھرا شک،عدم اطمینانی اور بے سمتی کا سیال مادہ ان کے عضلات کو چاٹ لے گا۔

اب بھی وقت ہے۔قدم موڑ لو۔ہماری طرف دیکھو۔اس لکیر کو مت چاٹو۔یہاں چوک کی حد ختم ہو جاتی ہے۔اس سے باہر جو کچھ بھی ہے،اس سے تمہیں یا ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔اس بارے میں سکرپٹ خاموش ہے،تمہارے کندھے میں لٹکے سوتی تھیلے کی طرح جس میں وہ لب سینے ہوئے اور محفوظ ہے اور جس سکرپٹ کو کھول کر پڑھنے کی تم نے کبھی زحمت نہیں کی۔لوٹ آؤ۔ سکرپٹ نکالو۔صفحہ نمبر 13 یا 26 یا 39 نکالو،کہیں سے بھی دیکھ لو،صاف صاف لکھا ہے،نشان زدہ حصوں کو پڑھو جو تمہارے کردار سے متعلق ہیں۔کہ تم ایک عاشق ہو،عشق کھلی آنکھوں سے کھیلا جانے والا کھیل نہیں ہے۔اتنے سوالوں کی روشنی تمہیں اندھا کر دے گی۔

ارے رک جاؤ۔کوئی ہے جو اسے روکے،اسے جانے مت دو۔کوئی کچھ سنتا کیوں نہیں،آگے بڑھو،پکڑ لو اسے۔دبوچ

لو۔ اسے لکیر پار مت کرنے دو، روکو۔ کوئی روکتا کیوں نہیں۔ تم رکتے کیوں نہیں۔

خوش آمدید، سواگتم۔ میرا بھائی، میرا اجن۔ بڑی راہ دکھائی، میرے دوست، انتظار کرتے کرتے میری تو سانس پھول گئی تھی۔

کوئی ٹم ٹم کرتی سواری اور اس سواری میں سوار "وہ"۔ کچھ بھی نہیں ہے یہاں۔ جو کچھ ہے، بس سامنے ہے، ایک ہاتھ کے، محض ایک خواہش کے فاصلے پر۔

قریب آجاؤ۔ دیکھو دوست ہمارے اصول بہت سادہ ہیں۔ جیسے کہ ہم خود ہیں، اور جیسے کہ تم بھی ہو، ورنہ تم یہاں آتے ہیں کیوں۔ یہ تھیلا اسے دے دو، یہ جو شکل سے افسر دکھائی دینے والا تمہارا معاون ہے، یہ خود آگے بڑھنے کی بجائے بازو پھیلا کر تم سے تھیلا لے لے گا۔ اب تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

اس گلی سے باہر کھلا میدان ہے، آگے پورا شہر، بالکل نیا۔ بجلی کی تاریں کہیں دکھائی نہیں دیں گی۔ کھلی سڑکیں ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں کئی کئی منزلہ، مارکیٹ انڈر گراؤنڈ بھی ہیں اور کھلے میں بھی۔ آنے والے کل سے جڑے ہوئے لوگ، قاعدے سے چلتی ہوئی ٹریفک، ڈھکی ہوئی پانی کی نالیاں، اور صاف ستھرے منظر، نئے نکور، چم چم کرتے، بھڑکیلے رنگوں اور سائن بورڈوں والے۔

میدان کے سرے پر ایک بڑا ٹرانسفارمر لگا ہے بجلی کا، اس کے نیچے ویٹنگ روم سا بنا ہے، وہاں کاؤنٹر پر جاؤ گے تو ایک تھیلا تمہیں دیا جائے گا تمہارے نام کے ٹیگ کے ساتھ۔ اپنا تعارف کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہاں مہمان تھوڑی ہو اب۔ تھیلے میں سبھی کچھ ہوگا، انڈر ویئر، کنڈوم، کانٹیکٹ لینز، ٹوتھ پیسٹ، دانتوں میں خلال کرنے والی تیلیاں، قوت امسال بڑھانے کی گولیاں، نیند کی دوا، چپس اور کچھ سافٹ ڈرنکس۔ موبائل فون کی سمیں اور کارڈز، کریڈٹ اور ڈیبٹ کارڈز، ہر طرح کے۔

ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے، سکرپٹ نہ کہو اسے۔ پہلے سے طے شدہ کوئی سچویشن نہیں۔ ہر کردار اپنی زندگی جینا چاہتا ہے۔ تو بھائی اس میں پرابلم کیا ہے۔ جیسا چاہو بولو، سچویشن تمہاری مرضی کی، لوکیل جو تمہیں پسند ہو۔ کردار جو تمہیں سوٹ کرے۔ کوئی خاک چھانتا پھرے، صحرا نوردی کرے، اچھا کرے یا برا، کسی کو اس سے کیا۔ چائے کا کپ ختم نہیں ہوتا، سکرپٹ ختم ہو جاتا ہے۔ ہے نا مزے کی بات۔

ارے بھئی اصل بات بتائی ہی نہیں تمہیں۔ وہ کہتے ہیں نے کہ ساری کہانی سنا دی اور یہ بتایا ہی نہیں کہ زلیخا مرد تھی یا عورت۔ تو میرے دوست دنیا تمہاری ہے، سیاہ کرو یا سفید۔ کوئی تمہیں ٹوکے گا نہیں کیونکہ یہاں تمہیں عاشق کا نہیں، ایک معشوق کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ کر لو گے کیا؟

☆☆☆

جادوگرنی

مریم عرفان

جس عمر میں لڑکیاں گڑیوں سے کھیلا کرتی ہیں وہ مردوں سے کھیلتی تھی۔ اس سے میری پہلی ملاقات چندا کے کوٹھے پر ہوئی تھی۔ میں نے آج تک اس جیسی باکمال لڑکی نہیں دیکھی، اگر وہ مغلیہ دور میں پیدا ہوتی تو یقیناً اکبر کے دربار کا دسواں رتن ہوتی۔ ان دنوں بازارِ حسن میں بیٹھا یہ رتن خوب اپنے دام وصول کر رہا تھا۔ میں اس کے مستقل گاہک سے زیادہ اسکا عاشق بن بیٹھا تھا جسے وہ جب چاہے دھتکار دیتی اور جب دل چاہتا سینے سے لگا لیتی تھی۔ سارے زمانے کی خوبصورت، سفاک اور بے باک عورتیں اس کے آگے ہیچ تھیں۔ ایک سال کی قربت اور صداقت کے بعد میں اس کا اعتبار جیتنے میں کامیاب ہوا تھا، اب وہ مجھ پر کلی بھروسہ کرنے لگی تھی۔ میرے لیے وہ اپنے گاہکوں کو بھی کمرے سے دھکے دے کر نکال دیتی تھی۔ اسے میری جیب میں پڑا قلم اور چھوٹی ڈائری بہت پسند تھی، وہ جب بھی موج مستی میں ہوتی تو میرا قلم اپنی انگلیوں میں لے کر معلوم نہیں ہوا میں کیا لکھنے لگتی تھی۔ اس کے باریک ہونٹ تھرتھرانے لگتے تھے ایسے میں ایک دن وہ اصرار کرنے لگی کہ میری کہانی لکھو۔ "کملیے، تیری کہانی میں ایسا کیا ہے۔۔۔ ہاں ذ ذ۔ میں اسے جان بوجھ کر چھیڑ بیٹھا۔ "بہت کچھ ہے۔ ایک گھر ہے، ماں باپ ہیں، بہن بھائی، میرا بچپن اور۔۔۔ ایک شوہر"۔

"کیا۔۔۔ شوہر؟؟؟" میں اس کے منہ سے یہ لفظ سن کر اٹھ بیٹھا۔ "ہاں۔۔۔ اچھا بندہ تھا، مفت میں میرے ساتھ اپنی زندگی خراب کر بیٹھا"۔ اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور مزے سے سگریٹ جلا کر دھواں میرے منہ پر پھینکنے لگی۔ اس رات مجھے معلوم ہوا کہ جسے میں نوری کہتا تھا وہ نوراں تھی۔ رنگیل پور کی نوراں، جس کی جوانی صحن کی چھوٹی دیواروں سے جھانکتا ہوا پودا تھی۔ سرو کے بوٹے جیسی اونچی، دبلی پتلی نوراں جس کے گال قندھاری انار کی طرح کھٹے میٹھے معلوم ہوتے تھے۔ اسے بچپن سے ہی دنداسے کا شوق تھا جس سے اس کے ہونٹ سنترے کی رس بھری پھاڑیاں معلوم ہوتے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی اور گرمی جاڑے کے موسم میں لحاف کی طرح تھی جس میں اس کے گداز جسم کی گرماہٹ سنسناہٹ پیدا کر دیتی تھی۔ نوراں کے گھر کا صحن اس کے بہن بھائیوں سے آباد تھا،، وہ کمرے کی کمزور کھڑکی سے اپنی ماں کو دردِ زہ میں مبتلا دیکھ کر عجیب سی ہذیانی کیفیت خود پر طاری کر لیتی تھی۔ آٹھ سال کی عمر میں اس نے پہلی بار اپنے گھر کسی بچے کو پیدا کرتے دیکھا تو بڑے لطیف سے جذبے کی آگ میں جلنے لگی۔ وہ اکثر رات کو اپنی ماں کی طرح چارپائی پر ہاتھ پاؤں مار کر بچہ پیدا کرنے کی پریکٹس کرتی۔ اس کا چھوٹا سا منہ خوں خاں کرتا ہوا جھاگ اگلنے لگتا۔ صبح اٹھ کر وہ اسی چھوٹے سے بھائی کی پتلی پتلی رانوں پر زور زور سے چٹکیاں لینے لگتی۔ بچہ چیخیں مارتا اور نوراں اس کی چیخ و پکار پر ہنستی مسکراتی باہر کو دوڑ لگا دیتی تھی۔ اسے دروازوں اور کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکنے کی خوب عادت پڑ چکی تھی۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے شادی شدہ بھائیوں اور ماں باپ کے کمرے میں بلی کی طرح جھانکتی اور میاؤں میاؤں کرتی رہتی۔

دس سال کی عمر میں اسے اپنے سکول ماسٹر امتیاز سے جنونی عشق ہوا جو اسے بگولے کی طرح اڑاتا رہا۔ ماسٹر درمیانی عمر کا شادی شدہ مرد تھا اس کے نزدیک نوراں بچی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ نوراں ماسٹر امتیاز کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر سکول کا کام نہیں کرتی تھی اور جب ہاتھوں پر ڈنڈے کھانے کی باری آتی تو اس کی ننگی کلائیاں زخموں سے چور چور ملتیں۔ ماسٹر امتیاز کے اندر کا کائیاں مرد نوراں کی دیوانگی بھانپ چکا تھا وہ اس کا ناجائز فائدہ کبھی نہ اٹھاتا اگر وہ دس سالہ بچی خود آگے بڑھ کر اسے مجبور نہ کرتی۔ اس کی لال بھبھوکا آنکھیں اور گالوں کا پھیکا پن دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ماسٹر امتیاز کے لیے بھی عاشقی کا نیا سبق تھا جسے وہ اس

کے ساتھ روز طوطے کی طرح رٹنے لگا تھا۔ سرکاری کوارٹر کا کمرہ نوراں کے منحنی جسم سے بھر چکا تھا وہ شہتوت کے پیڑ کی طرح اس کے کمرے میں اگ چکی تھی۔ اس کے الھڑ پن کی سرخی پکے ہوئے کالے شہتوت جیسی تھی جس کا رنگ کپڑوں پر لگ جائے تو داغ چھوڑ جاتا ہے۔ چھ ماہ کا عرصہ نوراں کی نوخیزی سے بھرپور تھا جو ماسٹر امتیاز کی ٹرانسفر کے بعد خالی گلاس ہو گیا۔ پہلے عشق میں مات کھا کر وہ سپنی کی طرح پھنکارنے لگی تھی، ان دنوں اس کی آنکھیں قہر برساتی تھیں۔ اس کے جسم کے کونے کھدرے بھرنے لگے تھے، اس کے بھورے بال برگد کی چھال کی طرح بڑھ رہے تھے۔ جدائی کا یہ زمانہ اس کے پاگل پن کا آغاز تھا اگر ایسے میں گل کیانی اس کی زندگی میں نہ آتا تو شاید وہ خودکشی کر لیتی۔ مراثیوں کا یہ بیٹا شہر سے سولہ جماعتیں پڑھ کر گاؤں آیا تھا ویسے تو اس کا نام پرویز تھا لیکن شہر میں پڑھنے کے بعد اس نے اپنا نام گل کیانی رکھ کر اپنی ذات کی لاج رکھنے کی حقیر سی کوشش کی تھی۔ گاؤں کا سکول جب ماسٹر امتیاز کے جانے کے بعد خالی ہوا تو گل کیانی اپنا فالتو وقت وہاں کاٹنے کے لیے آنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ نوراں اس سے ٹیوشن لینے کے لیے اس کے گھر جانے لگی۔ تب اسے دوسری بار عشق ہوا اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ قسمت نوراں کو مواقع فراہم کرتی رہی اور یوں وہ بے باکی کی سیڑھی پر چڑھتے چڑھتے بے حیائی کے کوٹھے پر چڑھ گئی۔ پھر اس کے یار بدلنے لگے۔ اسے کسی سے پیسے کا لالچ نہیں تھا بس مردوں کے ساتھ رہنے کا جو چسکا اسے پڑ چکا تھا اس سے جان چھڑانا اب اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ گھر والے اپنی زندگی جی رہے تھے ان کے لیے نوراں کا وجود اندھیرے کی طرح تھا جو دکھائی نہیں دیتا لیکن اپنا وجود ضرور رکھتا ہے۔ نوراں کسی چھٹے ہوئے بدمعاش کی طرح اکھاڑے میں اتر چکی تھی، وہ گھر کے کام بھی ایسے کرتی جیسے کوئی جن اس میں سما گیا ہو۔ گھر کے جانوروں کا دودھ دوہنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اسے ان کاموں میں لطف آنے لگا تھا۔ دھیمے دھیمے گنگناتے ہوئے اس کے ہاتھ گائے کے تھنوں کو چھوتے تو وہ مستی کے عالم میں لہک لہک کے دھاریں نکالنے لگتی۔ گاؤں کی گلیاں اس کی آوارہ گردی کی عادی ہو گئی تھیں اس کے لیے ہر مرد ایک چیلنج تھا۔ وہ بھاری پتھر جیسے مردوں کو بھی خود سے شرط لگا کر تسخیر کرنے لگی تھی۔ اسے پیر معصوم شاہ کے دربار کا وہ ملگجا سا ملنگ بھی بہت پسند تھا جس کے کٹورے میں سکے پھینکتے ہوئے وہ اسے اشارے کرتی تو فقیر مستی میں جھومتے ہوئے کہتا، ''توں پڑھیں نماز فریب والی، تے رب جانے تیرے بتیاں نوں''۔

نوراں کی جوانی کی چمک سورج کی روشنی کی طرح اب آنکھیں چندھیانے لگی تھی۔ بارھواں بچہ پیدا کرنے کے بعد نوراں کی ماں نے اس پر بھرپور نظر ڈالی تو سوچنے لگی کہ اب وہ بھی کھیت جوتنے کے لیے تیار ہے۔ گاؤں بھر میں اس کے لیے رشتے دیکھے جانے لگے نوراں کے لیے یہ خبر کسی انہونی سے کم نہیں تھی۔ جیسے ہی رشتہ طے ہوا وہ اس رات پاگلوں کی طرح سردی میں باہر صحن کے گرد چکر کاٹنے لگی، سب ترکیبیں اور رونے دھونے بے کار ثابت ہوئے تھے۔ ''بے بے! میں شادی نہیں کرنی''۔ نوراں رو رو کر فریاد کرتی تو ماں اپنے بھاری وجود کے ساتھ اس پر پل پڑتی۔ گھونسوں اور لاتوں سے اس کی خوب تواضع ہونے لگی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ شادی کی رات اس پر بھی آسیب بن کر وارد ہو گی۔ ان دنوں نوراں کا چہرہ دیکھنے والا تھا، اس کا ملیح حسن اب پیلا پڑنے لگا تھا، وہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہونے لگی تھی۔ ایسے میں گھر بھر میں شور مچ جاتا کہ لڑکی کو سنبھالو کہیں مر نہ جائے، تو ماں کچے صحن کی طرف تھوکتے ہوئے کہتی، ''کتیاں دی رن، کھسم لیوے گی تے ٹھنڈیا ہو جانا اے ایس نے''۔ نوراں کی شادی طے ہونے کے بعد اپنی سہیلی کوثری شدت سے یاد آنے لگی تھی جس پر جن عاشق ہو گئے تھے۔ جوان لڑکی کھلے سر اور بنا دوپٹے کے سارا سارا دن گلیوں میں خاک اڑاتے دوڑتی پھرتی رہتی۔ نوراں کا ذہن ایسے ہی باتوں کو سوچنے میں مگن تھا کہ اس کی زندگی میں مراد شامل ہو گیا۔

شادی کی پہلی رات گاؤں والوں نے اس کی چیخیں سنیں، ہر طرف شور مچا ہوا تھا کہ کمہاروں کی لڑکی پر جن آ گئے ہیں۔ نوراں ہنستے ہنستے لمبے لمبے ڈکار لیتی تو مجمع ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹنے لگتا۔ مراد اپنی نئی نویلی دلہن کا پاگل پن دیکھ کر دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ نوراں کا جب جی چاہتا اپنے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے کر لیتی، کبھی منہ سے جھاگ نکالتی تو کبھی بال کھول کر گردن زور زور سے گھمانے لگ

جاتی۔ روز کوئی نہ کوئی عامل اس کا جن نکالنے آتا تو وہ اسے مار کر بھگا دیتی۔ نوراں کو اب اس سارے ڈرامے میں مزہ آنے لگا تھا۔ اس کی فنکارانہ صلاحیتیں نکھرتی چلی جا رہی تھیں۔ اسے کم عمری میں اپنا درد زہ لینا یاد تھا اور اسی طریقے کو وہ ہر دوسرے دن آزما کر خوب لطف لیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا دل اس ڈرامے سے بھرنے لگا اسے اپنا آپ سرکس کے جوکر کی طرح لگتا جو تماشا دکھا رہا ہو اور مجمع کمر پر ہاتھ رکھے بڑے انہماک سے دیکھے چلا جاتا تھا۔ ایک رات نجانے اسے کیا ہوا کہ سب کو سوتا چھوڑ کر وہ گاؤں کے سٹیڈیم کی طرف دوڑنے لگی جہاں ایک بے آباد کنوئیں پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے سے دوپٹا کھینچ کر نکالا اور اس کی منڈیر پر رکھ کر لاری اڈے کی طرف بھاگنے لگی۔ بس صبح اٹھتے ہی گاؤں میں شور مچا تھا کہ نوراں کو جن اپنے ساتھ کنوئیں میں لے کر اتر گئے ہیں۔ مراد کنوئیں کی منڈیر سے ملنے والے اس کے دوپٹے کو آنکھوں پر رکھے سسکیاں لیتا تو لوگوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبانے لگتیں۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں تو پہلے ہی ایسے کسی انہونی واقعے کی طرف اشارہ کر چکی تھیں پھر تو گویا یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ آناً فاناً دو تین ایسے گواہ بھی خود بخود پیدا ہو گئے جنہوں نے اسے جنات کے ساتھ کنوئیں میں اترتے ہوئے دیکھا تھا۔

رنگیل پور کی رنگیلی گھوڑی شہر تو آ گئی تھی لیکن یہاں اس کے لیے جائے اماں کہیں نہیں تھی۔ اس کا ذہن خالی تھا جس میں اسے سنائے کی گونج کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اب تک تو وہ اپنے لیے خود ہی کہانی کا پلاٹ بناتی، اور اسے ادا کرتی رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر اب اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اس کی اگلی منزل کیا ہوگی۔ لاری اڈے سے نکل کر سامنے کی سڑک پار کر کے وہ انجانے راستوں پر گامزن تھی۔ اس کے چہرے پر خوف نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس حالت میں بھی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کوئی سامان یا گٹھڑی نہیں تھی بس ایک چھوٹا سا چرمی بٹوہ تھا جو اس نے اپنے سینے میں اڑس رکھا تھا۔ ''ہوں ں ں۔۔۔ تو یہی وہ بٹوہ ہے نا جو تم اب بھی سینے سے لگائے ہوئے پھرتی ہو''۔ میں نے نوراں کی ٹانگوں سے سر اٹھاتے ہوئے بغلی میز پر پڑے ہوئے بٹوے کی جانب اشارہ کیا۔ ''ہاں۔۔۔ اسلم پٹواری کی یادگار ہے یہ۔ اچھا منڈا تھا، سو جتیاں کھا کے بھی پاؤں نہیں چھوڑتا تھا میرے۔۔۔''

''پیروں میں تو ہم بھی تمہارے بیٹھے ہیں سرکار''۔ میں نے نوراں کی سڈول رانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''چل بھڑوے۔۔۔ تیری ماں کا سر''۔ نوراں گالیاں بھی کچھ اس مزے سے دیتی تھی کہ مجھے برا نہیں لگتا تھا۔ ''نوراں۔۔۔ اے نوراں۔۔۔ سچ سچ بتا تو تھکی نہیں اب تک۔ کیسی عورت ہے تو اتنے سارے مردوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی عاجز نہیں آئی۔ کس چیز کی گرمی ہے تیرے دماغ میں، آج تو بتا ہی دے''۔ میں نے چارپائی پر چوکڑی مارتے ہوئے پوچھا۔ نوراں نے تیسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے دھواں میری طرف اڑایا اور اپنے لہجے میں ساری بے شرمی سمیٹتے ہوئے بولی ''کیسا بنا سپتی مرد ہے تو۔۔۔ خالص ہوتا نہ تو اس وقت میری چھاتی پر چوکڑی مار کر بیٹھتا۔ میری مجال تھی جو میں کسک جاتی''۔ نوراں اپنی روانی میں میری مردانگی کو للکار کر حسب روایت مزہ لے رہی تھی۔ پھر بہت دن گزر گئے اور میں اس کی طرف نہیں گیا، نہ ہی اس نے ملنے یا بات کرنے کی زحمت گوارا کی۔ میں دن رات اسے سوچتا رہتا تھا، وہ میری سمجھ سے بالاتر تھی کیونکہ وہ چاہتی ہی نہیں تھی کہ کوئی اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ اس گھوڑی کی طرح تھی جس پر بیٹھنے کی ہمت کرنا ہر سوار کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کم بخت کا حسن ماند ہی نہیں پڑتا تھا۔ ان دنوں وہ تیس کے پیٹے میں تھی اور دیکھنے میں بیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ مجھے اب اسے ملنے میں خوف محسوس ہونے لگا تھا اس کے چہرے پر عجیب سی ہسٹریائی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔

میری اس دن نوراں سے آخری ملاقات تھی، کبھی وہ زور زور سے ہنسنے لگتی اور کبھی اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر جاتیں۔ میں نے پہلی بار اسے روتے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں کے گرد سائے سے بڑھتے جا رہے تھے۔ ''زندگی کے دن کم رہ گئے ہیں باؤ جی! ان دنوں قسم سے ماں بڑی یاد آتی ہے۔۔۔ لیکن دفع کرو جی، اسے یاد کر کے کیا وقت ضائع کرنا۔ وہ کون سا کوئی کام کی عورت

تھی۔۔۔یہ ٹھکا ٹھک بچے پیدا کرنے پر لگی رہی۔اسے کیا پتہ کہ مزہ کیا ہوتا ہے۔جسم کیا ہوتا ہے؟' میں نوراں کو ہذیانی انداز میں بولتے ہوئے دیکھتا رہا مجھے معلوم تھا کہ وہ آج نشے میں ہے، میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن اس کی آنکھوں کے خالی پن نے مجھے سہما دیا۔اگلے دن ابھی میں شیو کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ چندا کی کال نے میرے اندیشوں کو زبان دے دی۔''باؤ جی! چھیتی آ جاؤ جی، نوراں نے خودکشی کرلئی جے۔۔۔'' اس سے آگے وہ کیا بولتی رہی مجھے کچھ یاد نہیں۔میں موٹر سائیکل بھگاتے ہوئے اس تک پہنچا، جہاں اب اس کی لاش میری منتظر تھی۔اس کی گوری چٹی کلائی خون نکل جانے کے بعد پیلی پڑ چکی تھی۔کمرے کے فرش پر اس کے پاس خون میں لتھڑا ہوا بلیڈ نظر آرہا تھا۔چندا بائی مجمعے کو اس کے مرنے کی داستان سنا رہی تھی، ''رات آخری گاہک نکال کر بجی پہ پے گئی اے۔میں نے پوچھا، طبیعت تو ٹھیک ہے تیری تو بولی، بس چندا اج مزہ نہیں آیا۔۔۔ہائے پتہ نئیں کیہڑا بد بخت سی او' ۔گلی کے نکڑ سے کسی پرانے گانے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔''کون جانے بانسریہ''۔

میں بوجھل دل کے ساتھ گھر کی طرف گامزن تھا نوراں میرے لیے ایسی پہیلی تھی جو سلجھائے ہی مرگئی۔کاش میں عمر بھر اس کی چھاتی پر بیٹھا رہتا تو شاید وہ نہ مرتی۔میرے اندر ایسے ہی باغی خیالات کی آندھیاں شائیں شائیں کر کے ماتم کر رہی تھیں۔ہوسکتا ہے لوگ اسے ایسی بدمعاش عورت سمجھیں جو جیتے جی مردوں کی رسیا تھی لیکن اس کے دماغ کی کوئی تو کڑی ایسی ضرور تھی جو اس نے اپنے جادو سے چھپا رکھی تھی۔مرد اس کے لیے شراب کے نشے کی طرح تھے جنہیں وہ اتنا پی چکی تھی کہ اگر اس کے سامنے پانی کا گلاس رکھ دیا جاتا تو وہ اس کا ذائقہ کبھی محسوس نہ کر پاتی۔نوراں وہ جادوگرنی تھی جسے اپنے ہی جادو نے خاک کر دیا کیونکہ جس عمر میں اسے گڑیوں سے کھیلنا چاہیے تھا وہ مردوں سے کھیلتی رہی۔

☆☆☆

امتل

منیرہ احمد شمیم

''امتل''۔
''ہوں''۔
''چلو اٹھو باہر چلتے ہیں''۔
''باہر کہاں؟'' امتل بیزاری سے پوچھتی ہے۔
''کہیں۔۔۔کسی چھوٹے سے ریستوران میں چائے پئیں گے''۔
امتل چارپائی پر اپنا بکھرا وجود سمیٹ لیتی ہے اور بیزاری سے جمائی لیتے ہوئے اپنے آپ کو تیار کرتی ہے۔
امتل بکھرے ہوئے وجود کی لڑکی ہے یا مجھے بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔شاید وہ خود بھی یہ جانتی ہے یا شاید وہ نہیں جانتی۔
لیکن میں نے اسے اس لمحے کی گرفت میں دیکھا ہے جب وہ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو دیکھ لیتی ہے۔اور پھر وہ اس امید کے ٹیپ سے اپنے وجود کو جوڑ لیتی ہے۔یہ سوچ کر کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور میری زندگی میں آئے گا۔وہ اکثر اس کی باتیں مجھ سے کرتی جو اس کے خیالوں کا شہزادہ تھا۔لیکن جلد ہی آنسوؤں سے یہ امید کا ٹیپ بھیگ جاتا اور پھر ادھڑ جاتا۔
امتل میری روم میٹ ہے۔ہم آخری سال میں ہیں۔یونیورسٹی کا یہ آخری سال خود فریبی، آزادی کا آخری سال ہے، آگے کیا ہوگا۔۔۔آگے کیا ہوگا؟ کبھی کبھی تشویش اپنے بھاری ہاتھوں سے دروازے پر دستک دیتی ہے۔لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔امتل کو میں چار سال سے جانتی ہوں۔یا شاید چار صدیوں سے کیونکہ میں نے اس کی کھوکھلی روح میں اتر کر اس تنہائی کی گونج سنی ہے جسے وہ سگریٹ اور شراب سے دبانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔
معمولی، بے حد معمولی شکل وصورت کی امتل ایک گونج ہے۔اور اس گونج کا ایک دائرہ ہے۔اس دائرے کا مرکز ہے اور اس مرکز میں۔۔۔میں نے امتل کو دیکھا ہے لیکن یہ اور بات ہے۔
امتل کپڑے بدل کر تیار ہو گئی ہے وہ اپنے پرس میں سگریٹ کی تازہ ڈبیا رکھ رہی ہے۔اور اس نے اپنے وجود پر بے نیازی کا خول چڑھا دیا ہے۔اسے میں جانتی ہوں اور میں نے یہ خول اتار دیا ہے اور امتل کو اس کے اپنے اصلی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔اور کیا پتہ میں نے یہ سب کچھ اس کی ہمدردی میں کیا ہو۔ہماری ہر بات کے دو رخ ہوتے ہیں۔بعض اوقات ہم صرف ایک ہی رخ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور دوسرا رخ ہمیں کبھی نظر نہیں آتا۔
''چلو جان! امتل تیار ہے''۔
اپنے بے جان اور ٹوٹے ہوئے وجود کو بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے۔۔۔ایک طویل کش کو فضا میں بکھیرتے ہوئے بولی!
باہر دھوپ ہے ڈھلتی ہوئی، مال روڈ کے پرلے سرے پر ایک چھوٹا سا ریستوران ہے۔ہمیں وہاں جانا ہے۔یہی ہمارا ٹھکانہ ہے۔یہاں ہم تھوڑے سے پیسوں میں بہت سا عیش کرتے ہیں۔یا عیش کا تاثر حاصل کرتے ہیں۔۔۔اسی عیش سے امتل کی کہانی بھی وابستہ ہے۔لیکن یہ کوئی اتنی بڑی کہانی بھی نہیں!
ریستوران میں لوگ۔۔۔اکا دکا لوگ بیٹھے ہیں۔ریستوران کے کونے میں وہ بھی بیٹھا ہے جو اس کہانی کا ایک کردار

ہے۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہے۔ لیکن نام میں کیا رکھا ہے اس کا کوئی سا بھی نام رکھ لیجئے، کوئی بھی خوبصورت نام مثلاً سرمد۔۔۔
سرمد ایک کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ باہر اس کی کار۔۔۔ لمبی کالی کار کھڑی ہے۔ اس کار کی چمک اس کی شخصیت میں بھی ہے۔ سرمد خوبصورت ہے، دراز قد ہے۔ پائپ پیتا ہے۔ اور اس وقت بھی پائپ پی رہا ہے۔ پائپ سے تمباکو کی بھینی بھینی خوشبو چاروں سمت پھیل رہی ہے۔ میں اس خوشبو کو اپنے وجود کے ریشے ریشے میں اتار رہی ہوں۔ مجھے اچھے تمباکو کی خوشبو اچھی لگتی ہے۔ ہمیشہ سے اچھی لگتی ہے۔
امتل کونے میں بیٹھے ہوئے سرمد کے مقابل والی میز پر بیٹھ جاتی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہمیشہ یونہی ہوتا ہے۔ امتل نے اپنے پرس میں سے سگریٹ نکالی اور ایک لمبا کش لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ساری کائنات کو اپنے اندر اتار رہی ہو اور سرمد اس کی کائنات ہو۔ سرمد اس کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا اپنے پائپ سے نکلے ہوئے دھوئیں کی خوشبو بکھیر رہا ہے۔ لیکن میں اس سارے کھیل میں کہاں ہوں؟ مجھے اس سارے الجھاوے میں اپنے آپ کو ڈالنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ کیونکہ یہ کہانی امتل کی ہے۔
سرمد امتل سے محبت کرتا ہے۔ کم از کم امتل کا یہی خیال ہے اور وہ اس کی سوچوں کا محور ہے۔ اس کا ثبوت وہ خط ہیں جو سرمد نے امتل کو لکھے ہیں۔ جنہیں اس نے مجھ سے چھپایا ہے۔ لیکن مجھے ان خطوط کا علم ہے، کیسے علم ہے یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ سرمد کی محبت امتل کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے اور وہ اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے اور کسی دن وہ کھوکھلے درخت کی طرح گر جائے گی۔
سرمد اور امتل کی اس خاموش محبت کو میں چھ ماہ سے دیکھ رہی ہوں اور بیرے بھی اس کھیل میں شامل ہیں۔ وہ خاموشی سے خط اٹھانے لگے ہیں۔ وہ چپکے سے آتے ہیں اور پانی کا گلاس سرمد کی میز پر رکھ جاتے ہیں۔ سرمد جواب میں تشکر سے مسکراتا ہے۔ پھر بیرا چائے لاتا ہے دو آدمیوں کے لیے لیکن دوسری پیالی ہمیشہ خالی رہتی ہے اسی طرح صاف شفاف جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو، جیسے امتل کا انتظار کر رہی ہو۔ امتل دور سے پیالی کو دیکھتی ہے اور آنکھیں بند کرتے ہی کہیں کھو جاتی ہے جیسے وہ اس چائے کی پیالی میں اتر رہی ہو اور سرمد اسے ایک گھونٹ میں پی جائے۔
ہمیشہ کی طرح آج بھی سرمد سامنے والی ٹیبل پر بیٹھا ہوا ہے۔ بیرا مسکرا کر پانی کا گلاس اور دو آدمیوں کی چائے ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ امتل آنکھیں بند کر کے اس خالی پیالی میں اترنے ہی والی تھی کہ ریستوران کا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت سمارٹ سی لڑکی اندر داخل ہوئی اور بڑی گرم جوشی سے سرمد کی طرف بڑھی۔
سرمد کھڑا ہو گیا۔
ہائے۔۔۔ لڑکی نے کہا۔
ہائے۔۔۔ سرمد نے جواب دیا۔
پھر وہ دونوں قہقہوں میں چائے پینے لگے۔
میں نے دیکھا امتل کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ جیسے چائے کی پیالی میں غوطے کھا رہی ہو۔ زندگی کے اس ٹھہرے ہوئے بدصورت لمحے کو وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ اپنی خوف زدہ نظروں سے امتل نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔۔۔ اور سارے غم اپنی جھولی میں سمیٹ کر ریستوران سے باہر نکل آئی۔
باہر اندھیرا چھا رہا تھا۔ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں۔۔۔ خزاں کی زد میں آئے درخت کے زرد پتوں کو گہرا کر رہی تھیں۔ امتل نے جھک کر پتوں پر یوں ٹھوکر ماری جیسے اپنی بیتی ہوئی زندگی پر ٹھوکر مار رہی ہو۔
میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ تپتے سورج میں اس زمین کی طرح نظر آیا جس زمین پر برسوں بارش نہ برسی ہو۔
''امتل''۔

''ہوں'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔
''اداس کیوں ہو؟''
''اداس نہیں ہوں مجھے اس پر غصہ آ رہا ہے۔جھوٹا۔۔۔کمینہ'' وہ غصے سے بولی۔
''کون؟'' میں پوچھتی ہوں۔
''وہ مجھ سے محبت کرتا تھا''۔وہ بڑبڑائی۔
''تم اس سے ملیں''۔
''نہیں۔۔۔میری اس سے ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی۔شاید وہ میرے اندر پہلے ہی سے موجود تھا۔بس دریافت اب ہوا تھا۔۔۔پیار کہیں باہر سے نہیں آتا، یہ انسان کے اندر ہوتا ہے۔شاید ہم اسی انتظار میں ہوتے ہیں کہ وہ کب آئے اور اچانک مل جائے''۔
''لیکن جسے تم جانتی نہیں اسے تخیل کی مدد سے جان لیوا کیوں بنا رہی ہو۔ایک بات کہوں تم نے یہ جو اپنے وجود کے اردگرد اداسی اور بیزاری کا کمبل لپیٹ رکھا ہے۔کیا تم سمجھتی ہو کہ اس سے تم اپنے اندر کی تنہائی کا خلا بھر لوگی''۔
''زندہ تو رہنا ہے نا!''۔
''عجیب لڑکی ہو''۔
اچھا آؤ۔۔۔چھوڑو یہ باتیں۔۔۔کہیں چل کر کافی پیتے ہیں''۔میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولی۔
''تمہارے دل میں اپنے لیے اتنی ہمدردی دیکھ کر کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے تم میری زندگی میں کوئی اہم رول ادا کروگی۔پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم مجھے بچالوگی کسی آفت سے''۔
''امتل۔۔۔تمہیں کیسے معلوم کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے''۔
''ہونہہ۔۔۔میرے پاس ثبوت ہے''۔
''خط۔۔۔؟'' میں پوچھتی ہوں۔
''ہاں''۔
''مجھے معلوم ہے''۔
''تجھے کیسے معلوم ہے؟''
''وہ خط جو مجھ سے تم چھپاتی رہی ہو لیکن مجھے معلوم ہے!''
یہ کہہ کر مجھے یوں لگا جیسے بھی ابھی اسے قتل کرنے والی ہوں۔خوف سے بھی دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے چاروں طرف **نظر** دوڑائی۔۔۔ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔پرندوں کی ایک ڈار میرے سر پر سے گذر گئی۔
پھر خاموشی چھا گئی۔
''کیسے معلوم ہے تجھے؟''
امتل نے دوبارہ مجھ سے پوچھا۔
''اس لیے کہ۔۔۔تمہارے اندر کی تنہائی کو کم کرنے کے لیے وہ خط میں نے تمہیں لکھے تھے''۔
امتل نے میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔
امتل سے آنکھیں چرا کر میں دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

صدیوں بھرا لمحہ

نجیبہ عارف

شہر کے مرکز میں یہ کیتھڈرل ہے۔ بہت اونچا اور شان دار۔ ایک خوب صورت عمارت، جو دل موہ لیتی ہے۔
رات کے نو بجے ہیں اور ملگجے اندھیرے میں اس بڑے چوک کے عین بیچ میں مینار کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں سوچ رہی ہوں کہ کچھ نہ سوچوں،
نہ یہ کہ آج اس شہر میں میرا آخری اتوار ہے،
نہ یہ کہ ابھی کچھ خریداری باقی ہے،
نہ یہ کہ پرسوں صبح صبح برلن جانا ہے اور اس کی تیاری ابھی کرنا ہے،
نہ یہ کہ دعوت کے برتن دھلنے والے ہیں،
اور نہ یہ کہ بچے بھی دور ہیں اور محبوب بھی۔
مگر کچھ نہ سوچنا کس قدر دشوار ہوتا ہے۔ جب انسان کچھ نہیں سوچتا تب یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ اب کچھ نہیں سوچ رہا۔ اور لطف و لذت کے لمحات کو شعوری طور پر محسوس کرنا تو اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ ذرا شعور جاگا نہیں کہ لطف کا احساس اڑ گیا۔ یہی تھا وہ لمحہ جس کے انتظار میں دل میں سرسراہٹ سی ہونے لگتی تھی۔ اب کہاں ہے وہ سرسراہٹ۔ سارا لطف تو انتظار میں تھا۔ طلب میں جو پیاس بھڑکاتی ہے، اسے بجھا کر آدمی کس قدر نڈھال اور خالی ہاتھ سا ہو جاتا ہے۔
اسی لیے انسان کسی نہ کسی بے خودی کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ گرجا، یہ خانقاہیں، یہ شراب خانے۔۔۔
میرے دائیں طرف شراب کی ایک ٹوٹی ہوئی بوتل پڑی ہے۔
شاید کسی نے پی کر توڑ ڈالی۔
بائیں طرف گرجے کی بلند و بالا عمارت ہے جو روشنیوں کے نرغے میں اس وقار و تمکنت سے کھڑی ہے جیسے ابھی ابھی بادشاہ وقت نے اس کی چوکھٹ چومی ہو، ہوا میں بوسوں کی آہٹ ہے، اکا دکا جوڑے ادھر ادھر پھر رہے ہیں، گرجے کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہیں، تصویریں کھینچ رہے ہیں یا ایک دوسرے سے لپٹ رہے ہیں۔ جدائی کا خوف بھینچے ڈالتا ہے۔
چند ایک بار فلیش چمکی پھر سب آہستہ آہستہ غائب ہو گئے یا نظروں سے اتنی دور چلے گئے کہ ان کی موجودگی کا احساس مٹ گیا۔ خاموشی بڑھتی گئی، باہر بھی اندر بھی۔ یہ اتوار کی شام ہے، کہنے کو تو نو بج رہے ہیں، مگر آسمان پر سرخی ادھ کھلے ہونٹوں کی لالی کی طرح کنارے کنارے نظر آ رہی ہے۔ یہ سرخی تھوڑی دیر میں ڈھل جائے گی اور ایک سیاہ رات کا نزول ہوگا۔ مگر یہاں الفرٹ کے اس مرکزی چوک میں رات، رات بھر اس کے دروازے پہ کھڑی رہتی ہے اور اندر نہیں آپاتی۔
آج خاموشی کچھ زیادہ ہے۔ مجھے لگتا ہے اس خاموشی کا اہتمام میرے لیے کیا گیا ہے۔ جیسے نئے نئے شادی شدہ جوڑے کو گھر والے شروع شروع میں خلوت مہیا کر دیا کرتے ہیں۔ شاید اس فضا نے میری خواہش کی بو سونگھ لی ہے اور سب کو اس طرف آنے سے روک دیا ہے۔ دور چوک کے کنارے، کرسیوں پر لوگوں کے ہیولے دکھائی دیتے ہیں مگر ان کی آواز نہیں آتی۔ میں نے ایک بار پھر اس لمحے کی تعظیم میں کچھ نہ سوچنے کی کوشش کی۔ لیکن ماضی اس شہر کا پرانا باسی ہے، وہ ہر راہ چلتے کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس وسیع وعریض چوک میں گھوڑوں پر بیٹھ کر، چست لباس میں ملبوس سپاہی گشت کرتے تھے، ہاتھ میں ٹھوٹھے تھام کر گرجے کے تپسوی، اپنی خانقاہ سے نکل کر سیڑھیاں اترتے اور شہر والوں سے خیرات لینے جاتے تھے۔ انہیں اس شہر کی رونقیں کیسی لگتی ہوں گی۔ گلیوں سے گزرتی ناریوں کے سفید ہاتھ اور بادامی آنکھیں انہیں کچھ نہیں کہتی تھیں؟ گھروں کی کھڑکیوں سے لٹکے پھولوں بھرے گملے اور پردوں سے چھن چھن کر آتی بچوں کی ہنسی اور گرم سوپ کی خوشبو، انہیں لوٹ کر اپنی تاریک کوٹھڑی میں جانے سے روکتی نہیں تھی؟ انہیں یہ بازار نہیں بلاتے تھے؟ یہ چوک، جہاں میلے سجتے تھے، منڈی لگتی تھی، اس علاقے کی بڑی منڈی، جہاں ملک ملک کے تاجر اپنا مال بیچنے آتے تھے۔ قریب ہی وہ لمبا بازار ہے جو دراصل سارے کا سارا ایک پل ہے۔ یہ پل ایک دریا پر تعمیر کیا گیا ہے جو شہر کے بیچوں بیچ گزرتا ہے۔ مگر کئی صدیاں پہلے اس دریا کے ایک طویل حصے پر ایسا پل بنایا گیا تھا جس کے دونوں طرف تین منزلہ عمارتیں ہیں اور درمیان میں بازار ہے۔ اس پل کا نام ہی مرچنٹس برج ہے۔ یہاں وسط ایشیاء، یورپ اور دنیا بھر سے تجار سامان تجارت لے کر آتے تھے اور اپنی اپنی دکانیں سجاتے تھے۔ یہ بازار اس زمانے میں بھی شہر کا سب سے مہنگا بازار تھا اور آج بھی اس کے دونوں طرف سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کی دکانیں ہیں جہاں سے خریداری کرنے کے لیے ذوق کافی نہیں۔ یہ تاجر ذوق بھی خرید لیا کرتے تھے۔ ان دکانوں کے اوپر تب بھی مختلف فنون سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے تھے اور آج بھی یہ فنکاروں کی گلی ہے۔ ان مہنگی دکانوں کے اوپر سادہ اور پرانی طرز کے مکانوں میں آرٹسٹ رہتے ہیں یا پھر ان کے سٹوڈیو ہیں۔ فن کو بھی بازار کی قربت پسند ہے۔

کل اور آج میں کتنا فرق ہے، مگر دونوں کتنے ایک جیسے ہیں۔ کل اس کیتھڈرل میں کسی عام آدمی کا گزر آسان نہیں تھا۔ یہ صرف بادشاہ، امرائے سلطنت اور خواص کی عبادت قبول کرتا تھا۔ آج یہاں کوئی بھی جا سکتا ہے۔ وہ بھی جسے عبادت کرنی ہے اور وہ بھی جسے سیاحت کرنی ہے۔ کل جن لوگوں نے کثیر سرمایہ خرچ کر کے اس گرجے میں تدفین کا بندوبست کیا تھا، ان کی قبریں اب گرجے کا فرش بن گئی ہیں۔ چلتے چلتے اچانک نیچے دیکھو تو کسی شبیہ کا احساس قدم روک لیتا ہے۔

ارے! یہ تو قبر کی سل ہے۔ کسی کا نام بھی لکھا ہے۔ تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات بھی درج ہے اور کئی ایک پر مرنے والے کی تصویر بھی کھدی ہے۔ لاطینی زبان کی عبارتیں بھی درج ہیں۔ شاید انجیل مقدس کی آیات ہیں۔ اب انہیں پڑھنے والا خال خال ہی ملتا ہے۔

مگر تب تو انجیل مقدس کا کسی اور زبان میں ترجمہ ناجائز تھا۔

چودھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کی قبریں یہاں موجود ہیں۔ ان قبرنشینوں نے اس گرجے میں دفن ہونے کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا اور ان کی اولاد سالوں اس بات پر اتراتی رہی ہوگی کہ ان کے باپ دادا اس عظیم الشان کیتھڈرل میں دفن ہیں۔ ان سنگی کتبوں کی تیاری میں کتنا وقت لگا ہوگا، کتنا اہتمام ہوا ہوگا۔ ان کی تدفین کے مناظر کس قدر یادگار رہے ہوں گے۔ شاید شاہی فوجوں نے سلامی دی ہوگی۔ شاید عوام الناس نے آنسو بہائے ہوں گے، نہ جانے خوشی کے یا غم کے۔ ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں۔ اکثر تو اسی گرجے کی راہبائیں ہیں۔ شاید وہ جو زیادہ نیک اور عبادت گزار ہوں گی، یا پھر زیادہ مقبول اور دل پسند۔ کون جانے، قبر دیکھ کر دل کا حال کون بتا سکتا ہے، یہاں تو چہرہ دیکھ کر بھی دل کا حال نہیں بتایا جا سکتا۔ اور اب یہ قبرنشیں، مگر شاید قبرنشیں کا لفظ ان کے لیے مناسب نہیں۔ تو پھر کیا ہونا چاہیے، قبروں کے مکیں؟

مگر کیا واقعی یہ ان قبروں کے مکیں ہیں؟

کیا انسان کی ہڈیوں، ناخنوں اور بالوں کا اس کی خودی سے رشتہ ہمیشہ قائم رہتا ہے؟
انسان کا سانس جب ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد دوبارہ بدن میں نہیں لوٹتا اور اس کے سارے نظام آکسیجن کی غیر موجودگی کے باعث کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اور انہیں فوراً ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے تو اس کے بعد کیا وہ گیا ہوا سانس اس برباد بدن کو پہچانتا ہے اور اس سے اپنا تعلق قائم رکھتا ہے؟
آدمی کو ہمیشہ سے امید رہی ہے، کہ اس کا گیا ہوا سانس پھر لوٹ کر بدن میں آئے گا۔ اسے پھر زندگی ملے گی۔
فرعونوں کی ممیوں کا بندوبست، چین، جاپان، اور کوریا کے شاہی مقبروں میں مرنے والے کے ساتھ دفن کی جانے والی اشیائے ضرورت اور بعض اوقات غلاموں کی پلٹن، اور سزا، جزا کے تمام تصورات اس امید پر قائم ہیں کہ مرنے والا پھر جلایا جائے گا۔
زندگی سے آدمی کی محبت۔۔۔
اوہ! یہ محبت کتنی ناقابلِ انکار ہے،
کتنی گہری اور شدید ہے،
اس کی مزاحمت نہیں کی جا سکتی،
اس کو دل سے نہیں نکالا جا سکتا،
جو لوگ کسی اور محبت کے نام پر مر جاتے ہیں انہیں بھی دراصل زندگی کی محبت ہی مرنے پر مجبور کرتی ہے۔
ایک ابدی زندگی کی محبت، ابدیت کی تمنا، لازوال ہونے کی آرزو، ہمیشہ جیتے رہنے کی خواہش۔۔۔
اور میں جواب اس مینار کی سیڑھیوں پر ٹوٹی ہوئی بوتل کی کرچیوں کے قریب بیٹھی ہوں اور میرے چاروں طرف سلیٹی سا اندھیرا ہے۔ اگر اگلے لمحے میں اس زمین کے اندر ہوں،
اگلا لمحہ جو کبھی بھی آ سکتا ہے،
اگلے لمحے، کل، پرسوں، اگلے ہفتے، اگلے سال، کبھی بھی،
عمر کے دوسرے نصف میں تو اس کا امکان دور جلتی ہوئی لالٹین کی طرح دل میں ہمیشہ ٹمٹماتا رہتا ہے۔ یاد اور فراموشی کے بیچ کے کسی منطقے میں۔
تو کیا زمین کے اندر ہونے کے تجربے کو محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ایک پرانی نظم یاد آ گئی:
"مجھے اک رات اپنی قبر میں سونے کی خواہش ہے"۔
یہ نظم کسی اخبار میں چھپی بھی تھی شاید۔ پھر نہ جانے کہاں گئی۔ آج اچانک کیسے یاد آ گئی۔ میرے پاس تو اس کی کوئی نقل بھی نہیں۔
مرنے والے بھی اسی طرح دوبارہ آ سکتے ہیں؟ ان کی بھی کوئی نقل نہیں ہوتی۔
میں نے ایک لمبا سانس لے کر اردگرد کی روشن خاموشی کو پینے کی کوشش کی۔
اس وقت یہاں اکیلے بیٹھنا بالکل خواب جیسا لگ رہا ہے۔ جیسے کوئی صدیوں تلک کسی تہ خانے میں رہنے کے بعد اچانک باہر نکل آئے اور خود کو محسوس کرنے کی کوشش کرے کہ یہ وہی ہے جو اپنے خواب میں جیتے جیتے خواب کو حقیقت بنتے دیکھ لیتا ہے اور تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ جب خواب حقیقت بنتے ہیں تب بھی کچھ نہیں ہوتا۔ اردگرد کے حقائق بدل بھی جائیں تو کیا ہے، خوشی کا مرکز اردگرد میں نہیں ہوتا۔ وہیں ہوتا ہے جہاں خواب میں تھا۔
کل اور آج میں کتنا فرق ہے، مگر دونوں کتنے ایک جیسے ہیں، کل بھی سورج یونہی دیر تک گرجے کا مینار تھامے گنگ کھڑا

رہتا تھا، کل بھی ان پتھروں کی سیڑھیوں پر انسانی قدموں کی آہٹ گونجتی تھی، کل بھی اس میدان میں منڈی لگتی تھی، آج یہ منڈی اس میدان سے باہر نکل گئی ہے، شہروں میں، گلیوں میں، گھروں میں، دلوں میں، گرجوں اور خانقاہوں میں، مسجدوں اور مندروں میں، کتابوں اور دانش گاہوں میں، افکار اور اظہار میں، خاموشی اور اخفا میں۔

ہر طرف منڈی کھلی ہے،

کاش کہیں کوئی ایسی جگہ ہو، جہاں خرید و فروخت منع ہو۔ جہاں سود و زیاں کا اضطراب نہ ہو، جہاں ناپ تول کا نظام نہ ہو۔

میں نے صرف ایک جگہ ایسی دیکھی ہے جہاں نہ کچھ بکتا ہے، نہ خریدا جاسکتا ہے۔ نہ اس کی کوئی قیمت ہے نہ کسی قیمت پر بھی دستیاب ہے، یہ بس "ہے"۔

عارف کا دل۔۔۔

یہ دل سبز مخملی گھاس کے حد نظر تک پھیلے ہوئے میدان کے مشابہ ہے۔

اس مخمل پر لیٹ کر آسمان کے نیلے پانی میں ڈوبا جاسکتا ہے،

اندر کے کالے پانی میں اترا جاسکتا ہے،

اس میدان کے خودرو پھول رنگین بھی ہیں اور خوش بودار بھی۔ انہیں توڑنا منع نہیں ہے۔

ایسی جگہ کہیں اور نہیں ہے۔ ایسی کشادگی کا احساس کہیں اور نہیں ہے۔

یہ کشادگی کا احساس محبت ہے یا خوشی؟

دور اس بنچ پر بیٹھے ہوئے جوڑے کو یہ احساس میسر ہے؟

ایک دوسرے سے جڑے ہوئے جسموں کے مابین اس کشادگی کا تیقن ہوا کی طرح بہہ رہا ہے؟

یا محض ایک خلا ہے؟

کون جانے، کیا ہے؟

☆☆☆

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

نزہت عباسی

اس کی آنکھیں مکمل طور پر نیلی ہو چکی تھیں۔ مجھے خوف محسوس ہوا یا اس کی آنکھوں کا رنگ کیسے بدل گیا؟ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا میں نے اسے تھام لیا سرد برفاب ہاتھ جس کی نیلی رگیں تن گئی تھیں۔ ایک سرد لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ میں نے گھبرا کر اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور پوچھا، تمہیں کیا ہوا ہے؟ تمہاری حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے؟ یہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟

''آنکھیں؟'' وہ زہر خند انداز میں مسکرائی، میرا پورا وجود نیلا پڑ چکا ہے۔ میرے اندر کا زہر باہر آ گیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ نیلے نیلے آنسو۔ پتہ نہیں وہ ہنس رہی تھی یا رو رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں نے اس سے کہا! خدا کے لیے گل چپ ہو جاؤ۔ وہ یکدم چپ ہو گئی اور ساکت نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ایک گہری خاموشی ہمارے درمیان حائل ہو گئی۔ آؤ باہر بیٹھتے ہیں۔ اس نے کہا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ باہر درخت کے نیچے کھڑے ہو کر وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ سرد یخ بستہ ہوائیں جسم میں اترتی چلی گئیں مگر اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ اسکا رو یہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ کچھ بتاتی ہی نہیں تھی۔ میں پچھلے دو سال سے اسے جانتی تھی وہ ایسی ہی تھی خاموش اپنی آگ میں جلتی ہوئی۔ مگر آج یہ اسے کیا ہو رہا ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ خاموش کھڑی تھی مجھے ایسا لگا جیسے میں برف کی بن جاؤں گی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لاتی ہوں۔ وہ بے دم ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہوتا ہے اور ڈر بھی لگتا ہے۔ ہم سب یہاں دکھی، تنہا اور اداس ہیں۔ مگر اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی، وہ پھر رونے لگتی ہے اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ سرخ رنگ کے آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ ''یہ دیکھو دیکھو یہ میرے دل کا خون میری آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ میں خود کو لمحہ لمحہ مرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ یہ دیکھو میری بلڈ رپورٹ۔۔۔۔'' میں اس کی بلڈ رپورٹ دیکھنے لگتی ہوں۔ بلڈ کینسر۔۔۔ہاں نازیہ بلڈ کینسر آخری سٹیج پر۔۔۔ میں خود پہ ہنس نہیں رو رہی نازیہ۔۔ خون کے رشتے خون کا سرطان بن کر میری رگوں میں اتر گئے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کسی گہری قبر میں اترتی جا رہی ہوں اور میرے اوپر ملبہ گرتا جا رہا ہے۔ میری سانس رک رہی ہے، میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔۔۔

وہ سر گھٹنوں میں دے کر مسلسل رو رہی تھی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتی ہوں مگر جیسے جیسے سارے الفاظ کہیں کھو گئے۔ بھلا اس کے دکھ کا مداوا کیسے ہو۔ یہ تو ناسور بن کر اس کے خون میں شامل ہو گئے۔ میں بھی اس کے ساتھ آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ نازیہ! سن رہی ہو نا؟

میرے ارد گرد ہزاروں لوگوں کا ہجوم ہے، ہنستے مسکراتے، کام کرتے، چلتے پھرتے باتیں کرتے اور میں اس ہجوم میں تنہا کھڑی اپنی آواز کی بازگشت سنتی رہتی ہوں۔ دن تو کاموں میں گزر ہی جاتا ہے۔ اور میں خود کو بہت مصروف رکھتی ہوں بلا وجہ۔ آفس میں ایک لمحہ فارغ نہیں بیٹھتی اور پھر واپس آ کر اپنے کمرے میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتی پڑھتی رہتی ہوں۔ مگر جیسے جیسے رات آتی ہے میری اذیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ رات، یہ رات نہیں گزرتی۔ بے پناہ تھکن کے باوجود یہ نہیں ہوتا کہ نیند کی پناہ مل سکے۔ یہ رات اتنی طویل کیوں ہوتی ہے۔ ایک ایک لمحہ جیسے صدیوں کے برابر۔ رات کی تنہائی روح کی تنہائی کے ساتھ مل کر اتنی اذیت ناک کیوں ہو جاتی ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتی ہوں۔ نیند کی گولیوں کا بھی سہارا لیتی ہوں مگر اب تو یہ بھی اثر نہیں کرتیں۔ سب بے

سود ہے۔ ہزاروں تصویریں ماضی کی یادیں، چہروں کی پرچھائیاں ایک ایک کر کے میرے سامنے آ جاتی ہیں۔ کبھی اتفاق سے آنکھ لگ جائے تو بھیانک خواب سے کھل جاتی ہے اور میں چیخ کر اٹھ جاتی ہوں۔ اپنے آس پاس دیکھتی ہوں۔ آوازوں کا لامتناہی سلسلہ میرے کان پھاڑ دیتا ہے۔ میں آیۃ الکرسی کا ورد کرتی ہوں۔ دل کو ذرا قرار آتا ہے۔ رشتے اور ان سے وابستہ کئی ہیولے میرے سامنے آ جاتے ہیں۔ ہزاروں دائرے ہیں اور میں ان دائروں میں الجھتی رہتی ہوں۔ کبھی کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔ جتنا سلجھانے کی کوشش کرتی ہوں اتنا ہی سب الجھتا جاتا ہے اور میری ذات بھی ان کے درمیان گم ہو جاتی ہے۔ یہ سب کیوں ہوا؟ کیا یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے؟ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ ان گنت سوالات میرے سامنے ناچتے رہتے ہیں۔ میری حساسیت میرے زخموں کی شدت کو انکی اذیت کو اور بڑھا دیتی ہے یا شاید میں خود ہی اذیت پسند ہو گئی ہوں۔ اپنے زخموں کو خود ہی کرید تی ہوں، ان سے خون رستا ہے تو مجھے تسکین ہوتی ہے۔

ماضی کا ورق ایک ایک کر کے کھلتا ہے۔ بوسیدہ اوراق ہواؤں میں اڑتے بکھرتے ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ کیا میں حرف غلط تھی جسے وقت نے تحریر کر دیا۔ ماضی کی دھندلی یادیں ابھی تک ذہن کے صفحے پر محفوظ ہیں۔ وہ گھر وہ چھوٹا سا گھر جہاں ہوا اور روشنی رک رک کر آتی تھی۔ سخت دھوپ میں تپتی ہوئی چھت اور دیواریں بوسیدہ دروازے اور کھڑکیاں غربت جس گھر میں برستی تھی۔ اس گھر میں میرا وجود کسی دعا کا نتیجہ نہ تھا۔ ایک ان چاہی خواہش، ایک بن مانگی دعا۔ ایک طویل قطار تھی جس کے سب سے آخری سرے پر میں کھڑی تھی۔ مجھ تک آتے آتے ہر چیز ختم ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ پیار میں بھی میرا حصہ نہ تھا۔ میں خالی خالی آنکھوں سے سب کے چہروں کو دیکھتی تھی مگر وہ سب میرے اپنے ہو کر بھی بے گانے تھے۔ شاید غربت چاہت کے احساس کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ ابھی شعور بے شعور تھا۔ مگر اپنی کم مائیگی کا احساس تو بچپن سے ہی میرے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ میری سانسوں میں کرچیوں کی طرح اتر گیا تھا۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی۔ اپنی نا کردہ گناہی کی اس سزا کو بھگتتی رہی۔ میرا کیا قصور تھا؟ مجھے معلوم نہ تھا۔ سب کچھ اگر اسی طرح رہتا تو بھی ٹھیک تھا مگر بے گناہی کی سزا بہت طویل بہت اذیت ناک ہوتی ہے۔ ابا کی ایک دور کی بہن بے اولاد تھیں۔ ایک دن جب وہ ہمارے گھر آئیں تو میں نہ جانے کیوں ان کو اچھی لگی اور انہوں نے ابا سے کہا فیاض اسے مجھے دے دو۔ میں اسے اپنے ساتھ ملتان لے جاؤں گی۔ میں ان کی یہ بات سن کر ماں کے پیچھے چھپ گئی۔ نہیں۔ ارے کیوں نہیں مریم؟ بالکل لے جاؤ اپنی ہی بیٹی سمجھو۔ ماں نے کچھ کہنا چاہا مگر ابا کے تیور دیکھ کر خاموش رہی۔ مریم پھوپھی نے ابا کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھے۔ ابا بہت خوش تھے۔ انہوں نے مجھے پہلی بار گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ وہ فیصلہ میرے باپ کا تھا۔ مجھے یاد ہے آج تک جب رخصت ہوتے ہوئے میری ماں نے مجھے گلے لگایا تھا اسکے آنسوؤں کا ذائقہ آج بھی مجھے اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوتا ہے۔ مگر کیسی مجبوریاں تھیں جو خون کے رشتوں کو اتنا خود غرض بنا دیتی ہیں۔ میری مرضی کی اہمیت ہی کیا تھی۔ میں خالی ہاتھ خالی دل اس گھر سے بہت پہلے ہی رخصت کر دی گئی۔ نیا گھر جہاں کوئی رشتہ میرا اپنا نہ تھا۔ وہ خالی گھر جس میں میرے دم سے رونق آ گئی تھی۔ مریم پھوپھی بیوہ تھیں۔ انہوں نے میرا خیال رکھا۔ میں ان کے ساتھ جیتی رہی بے روح جسم کے ساتھ۔ میرا ماضی خوشگوار نہ تھا کہ اس کی یادیں مجھے بے چین رکھتیں۔ مگر ایک کسک ایک خلش ہمیشہ چبھتی رہتی۔ وقت یونہی گزرتا رہا۔ میں نے میٹرک کر لیا۔ میں پڑھائی میں اچھی تھی اور پڑھنا چاہتی تھی مگر ایک حادثے نے مریم پھوپھی کو مجھ سے چھین لیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اور میں تنہا رہ گئی۔ ابا نے سنا تو مجھے لینے آئے۔ میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی مگر مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ گھر آ کر میں اجنبیوں کی طرح رہنے لگی۔ وقت گھات لگائے بیٹھا تھا۔ گھر آنے کے کچھ ہی دن بعد میری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میں نے اماں سے پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا" تیرے باپ کے سامنے کون بول سکتا ہے؟ ساجد اچھا لڑکا ہے تیرا خیال رکھے گا"۔

میں نے تو ساجد کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا وہ کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ مجھے کچھ پتا نہ تھا۔

اپنی شادی کے دن مجھے اپنا وجود بالکل غیر ضروری لگ رہا تھا۔ وہ شادی میری کب تھی وہ تو میرے باپ اور بھائیوں کا فیصلہ تھا۔ جس سے انکار کرنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ بغاوت میری سرشت میں نہ تھی۔ میں مجبور تھی یا مجبور کر دی گئی تھی اس فیصلے کو ماننے پر۔ میں بولنا چاہتی تھی مگر بول نہ سکی۔ مرنا چاہتی تھی مگر مر نہ سکی۔ سارے الفاظ جیسے آنسوؤں میں بہہ گئے اور پھر آنسو بھی خشک ہو گئے۔ شادی کے دن میں پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔ کب نکاح ہوا؟ کب میں نے دستخط کیے مجھے کچھ یاد نہیں۔ ذہن بالکل خالی ہو چکا تھا۔ رخصتی کے وقت ماں اور بہنیں مجھے گلے لگا کر خوب روتی رہیں مگر میں چپ رہی۔ ایک آنسو بھی میری آنکھ سے نہ نکلا۔

بھلا مرنے والے بھی اپنی موت پر روتے ہیں؟

ایک زندہ لاش کو اس کے مرقد پر پہنچا دیا گیا۔ تو جیسے سناٹے دور تک پھیل گئے۔ یہاں دو بچے میرے استقبال کے لیے موجود تھے، مجھے ان دونوں ہی کے لیے تو لایا گیا تھا۔ وہ دونوں بچے سجاد کی پہلی بیوی سے تھے جسے وہ طلاق دے چکا تھا۔ مجھے اب ان ہی کے ساتھ زندہ رہنا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں زندہ کیوں ہوں؟ جس طرح موت کے ہزاروں بہانے ہیں اسی طرح جینے کی بھی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ان بچوں میں مصروف کر لیا۔ ماں باپ سے محبت کی محرومی کا دکھ میں جانتی تھی۔ اس لیے میں نے اپنی تمام محبتیں ان دونوں بچوں پر نچھاور کر دیں۔ بچوں کے باپ سے میرا رشتہ صرف رسمی تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔ کئی کئی دن بات نہ ہوتی۔ ہوتی بھی تو کوئی ایسی ہی سرسری سی۔ میں نے اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔ یا شاید فرار کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مگر میری زندگی میں چین کہاں؟ وقت ایک اور وار کرنے کے لیے تیار تھا۔ ایک دن یہ سب بھی ختم ہو گیا۔ عدالت نے ان دونوں بچوں کو ان کی ماں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ وہ دونوں بچے مجھ سے جدا ہو گئے۔ میرا اس گھر میں مصرف ہی کیا تھا۔ ساجد نے مجھے طلاق دے دی اور امریکہ چلا گیا۔ اور میں دارالامان چلی آئی۔۔۔ تہی دامن، خالی، اپنے ماضی کی اذیتوں سے چور چور۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئی۔ کبھی ان کی صورت پھر نہیں دیکھی نہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ نازیہ ناز یہ سن رہی ہو نا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ اپنی زندگی میں میرا اک کیا تھا؟ کیا میری زندگی پر میرا کوئی حق نہ تھا؟ میں اپنی اور پرائی محبتوں کے گرداب میں ایسی پھنسی کہ میری ذات کہیں گم ہو گئی۔ اب صرف سناٹے میرے ساتھ ہیں۔ میں اپنے ریزہ ریزہ کرچی کرچی وجود کو نہیں سنبھال سکتی۔ کائنات کی وسعتوں میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ تم نے میری بلڈ رپورٹ دیکھی ہے نا۔ دیکھو میرا وجود سرخ بیل سے آکاس بیل سے ڈھک گیا ہے جو مجھے چوس رہی ہے۔۔۔

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا
تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

☆☆☆

حرفِ آخر

ممتاز احمد شیخ

اس بحث میں پڑے بغیر کہ سب سے پہلے اردو افسانہ کس نے لکھا یہ حقیقت ہے کہ اردو کا سب سے پہلا اور اہم افسانہ نگار پریم چند ہے۔ پریم چند نے آغاز داستانی انداز سے کیا، ان کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' داستانی طرز لیے ہوئے ہے لیکن پھر انہوں نے اردو داستان کو نیا انداز دیا اور اردو افسانے کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں دنیا بھر کی نوآبادیوں میں وطن پرستی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ پریم چند بھی اس سے متاثر تھے اور ان کے پہلے دور کے افسانے اسی موضوع پر ہیں۔ راجپوت اسی لیے ان کے پسندیدہ تھے کہ راجپوت ہی وہ واحد قوم ہے جو ہر بیرونی حملے کی صورت میں ہندوستان کے دفاع میں پیش پیش رہی ہے۔ پریم چند نے راجپوتوں کی بہادری اور حب الوطنی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ پریم چند کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں پہلی بار عام آدمی کے مسائل کا ذکر کیا گیا۔ ہماری داستانوں میں عام آدمی کی حیثیت خادموں اور نچلے درجے کے لوگوں کی تھی کیونکہ اس زمانے میں یہ تصور تھا کہ ہیرو صرف اشرافیہ سے پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ تقریباً سبھی داستانوں میں ہیرو اشرافیہ کے لوگ ہیں، عام آدمی نچلی سطح پر ہے۔ پریم چند وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عام آدمی کو اہمیت دی، اس کے مسائل اور مشکلات کا ذکر کیا۔ ہندو سماج کی برائیوں کو موضوع بنایا لیکن مسلم معاشرے کے حوالے سے بھی کئی افسانے لکھے۔ پریم چند کا تعلق دیہات سے تھا چنانچہ دیہاتوں میں مظلوم اور نچلے درجے کے کسانوں کے مسائل اور مصیبتوں کا ذکر ان کے افسانے کا خاص موضوع ہے۔ پریم چند کا انداز بیانیہ ہے اور وہ خارجی حقیقت نگاہ ہیں، انہیں سماجی حقیقت نگار بھی کہا جاتا ہے۔

پریم چند کے بعد دوسرا اہم نام سجاد حیدر یلدرم کا ہے جنہوں نے اردو افسانے کو رومانوی اندازِ فکر سے آشنا کیا، لیکن وہ اس طرح کے رومانوی نہیں جیسے رومانوی تحریک کے لکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بھی سماجی مسائل موجود ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا اسلوب پریم چند کے مقابلے میں رومانویت لیے ہوئے ہے۔ سجاد حیدر یلدرم دراصل علی گڑھ تحریک کی عقلیت پسندی، سادہ نگاری اور مقصدیت کا ردِ عمل تھے۔ علی گڑھ تحریک کے ان تینوں عناصر کے نتیجے میں فرد، عورت اور محبت غائب ہو گئی تھی۔ سجاد حیدر یلدرم نے ان تینوں کی تجدید کی لیکن یہ نہیں ہے کہ ان کے ہاں مقصدیت بالکل ہی نہیں ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ پریم چند مقصدی ہونے کے باوجود رومانوی ہیں اور سجاد حیدر یلدرم رومانوی ہونے کے باوجود مقصدیت سے یکسر خالی نہیں۔ اردو افسانے کی خوش قسمتی ہے کہ آغاز ہی میں اسے دو مختلف رویے رکھنے والے بڑے افسانہ نگار ملے چنانچہ اردو افسانے میں مقصدیت اور رومانویت پہلو بہ پہلو چلے اور کہیں ایک دوسرے سے امتزاج کے بعد ایک نئے رنگ میں بھی ڈھلے۔ اہم بات یہ ہے کہ آغاز ہی سے اردو افسانے نے عام آدمی اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا اور معاشرے کی ان برائیوں کی طرف اشارہ کیا جو موجود تو تھیں لیکن کوئی ان پر بات نہیں کرتا تھا۔ اس پہلے دور کے تمام لکھنے والوں کے یہاں مقصدیت اور رومانیت کی دونوں صورتیں موجود ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ فن افسانہ نگاری پر دسترس حاصل ہوتی چلی گئی۔

''انگارے'' کے افسانوں نے ایک ہنگامہ برپا کیا، فنی طور پر 'انگارے'' کے افسانے اعلیٰ فنی معیار پر پورے نہیں اترتے لیکن ان افسانوں نے کئی معاشرتی ٹیبوز توڑ دیے اور ایسے موضوعات کو بیان کیا جن پر بات کرنا سماجی اخلاقیات کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ فن افسانہ نگاری کے حوالے سے شاید ''انگارے'' کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں لیکن موضوعات کے حوالے سے اس نے خود ساختہ

پابندیوں کو توڑ دیا اور ترقی پسند تحریک کے لیے راہ ہموار کر دی۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز 1936ء میں ہوا جس کے پہلے اجلاس کی صدارت پریم چند نے کی۔ ترقی پسند تحریک کے منشور میں بنیادی زور اس بات پر تھا کہ ادب کو عام آدمی کا ترجمان ہونا چاہیے۔ یہ ایک بڑی تحریک تھی اور ہر بڑی تحریک میں افراط تفریط ہونا غیر معمولی بات نہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کے دائرے کو معاشرے کی نچلی ترین سطح تک پھیلا دیا۔ شاعری کے حوالے سے بھلے یہ اعتراض کیا جائے کہ اس میں کورس کی سی کیفیت ہے افسانے پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ ترقی پسند افسانے نے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی اور اردو افسانے کے سرمائے میں بے پناہ اضافہ کیا لیکن ترقی پسندوں خصوصاً انجمن ترقی پسند مصنفین کے بعض رویوں نے ردعمل بھی پیدا کیا۔ حلقہ ارباب ذوق (1940) اگرچہ اس ردعمل کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا لیکن حلقہ کو ترقی پسندوں کے بعض انتہا پسند رویوں پر اعتراض تھا۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ ادب کا بنیادی موضوع صرف اقتصادیات ہے، صرف پیٹ کی ضرورتیں ہی سب کچھ نہیں، باطن کی دنیا بھی اہم ہے۔ ترقی پسند ان موضوعات جن میں جنس اور نفسیات شامل ہیں کو سوڈو کہتے تھے جبکہ حلقہ کے لوگوں کا خیال تھا کہ آدمی اندر اور باہر سے مل کر پورا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب میں بنیادی حیثیت فن یعنی اظہار کی ہے صرف موضوع کی بنیاد پر کسی فن پارے کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ افسانے کو پہلے افسانہ ہونا چاہیے یہ بعد میں دیکھا جائے گا کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ترقی پسندوں کے برعکس حلقہ کے لوگ جدید مغربی افکار اور فنی رویوں سے بھی متاثر ہو رہے تھے چنانچہ کسی فن پارے کے تجزیاتی مطالعے کو زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ حلقہ کے پلیٹ فارم سے بھی بڑے افسانہ نگار سامنے آئے۔ ترقی پسند انہیں زوال پذیر افسانہ نگار کہتے تھے، ان کے نقادوں نے تو منٹو کو بھی رد کر دیا تھا۔ اردو افسانے کے حوالے سے یہ دونوں رویے مثبت تھے کہ ان سے اردو افسانے کے موضوعات میں ایسا تنوع پیدا ہو گیا جس نے اردو افسانے کو ثمر مند بنا دیا اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اردو افسانے کا سنہری دور ہے۔ اتنے بڑے اور اہم افسانہ نگاروں کے اس اجتماع نے اردو افسانے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے کا سب سے اہم اور مقبول موضوع فسادات تھے، یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی فنکار اس سے علیحدہ رہ سکے، ان فسادات میں تقریباً دس لاکھ لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہر افسانہ نگار نے چاہے وہ ترقی پسند یا حلقہ سے تعلق رکھتا تھا یا کسی دیگر مکتب فکر سے متعلق تھا اس موضوع پر لکھا اور خوب لکھا۔ تقسیم کے بعد تقریباً دس بارہ سال یہ موضوع افسانے کا مقبول موضوع رہا اور اس حوالے سے بڑے افسانے وجود میں آئے۔ تقسیم کے بعد نئی صورتحال کے مسائل بھی موضوع بنے، انتقال آبادی کا اتنا بڑا مسئلہ اس سے پہلے دنیا بھر میں کہیں نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس مسئلہ نے نئے معاشروں میں کئی رخ اختیار کیے اور کئی نئے موضوعات پیدا ہوئے لیکن مجموعی طور پر اردو افسانہ خارجی حقیقت نگاری اور سادہ بیانیہ سے آگے نہ جا سکا۔ ساٹھ کی دہائی میں نئی لسانی تشکیلات کا آغاز ہوا۔ اس کی ابتداء اگر منٹو کے افسانے ''پھندنے'' سے کی جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ پاکستان میں کہا گیا کہ علامت نگاری کی وجہ مارشل لاء اور سیاسی جبر تھا لیکن ہندوستان میں تو مارشل لاء نہیں تھا وہاں اس کا آغاز کیوں ہوا؟ اصل بات یہ ہے کہ ایک ہی انداز سے مسلسل لکھے جانے کی وجہ سے افسانہ اب ایک تبدیلی کا تقاضا کر رہا تھا۔ منٹو کو شاید اس کا احساس ہو گیا تھا اور ''پھندنے'' اس کی ابتداء تھا۔ نئے لسانی تشکیلات والوں کا کہنا تھا کہ ایک ہی طرح استعمال ہوتے ہوتے لفظ اب کلیشے ہو گئے ہیں، اب وقت آ گیا کہ لفظوں کے نئے شیڈ دریافت کیے جائیں۔ اس تحریک کا سب سے زیادہ اثر تو نظم پر ہوا لیکن نظم کے بعد جس صنف نے اس کا بہت اثر لیا وہ افسانہ ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد علامتی اور تجریدی افسانے کا آغاز ہوا، اس پر بہت اعتراض کیے گئے کہ قاری سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہو گیا، افسانے سے کہانی نکل گئی ہے، ان سب اعتراضات کے شافی جواب دیئے گئے ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ساٹھ اور ستر کی دہائی کے افسانے نے اردو افسانے کو نئی تبدیلیوں سے آشنا کیا۔ اس دوران بیانیہ انداز بھی چلتا رہا۔ ہر دور میں مختلف دھارے بیک وقت رواں دواں رہتے ہیں چنانچہ ساٹھ کے بعد بھی روایتی انداز کا افسانہ لکھا جاتا رہا لیکن

جیسے ہوتا ہے کہ ہر عہد کے مختلف رویوں میں ایک اس عہد کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ علامتی افسانہ ساٹھ کے بعد اپنے عہد کی شناخت بنا۔

جدیدیت کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہوا پھر اوج جدیدیت اور مابعد جدیدیت یہ سارے مرحلے افراط وتفریط کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہر تحریک اپنے سے پہلے والی تحریک سے جنم لیتی ہے اور آخر میں اسی میں سے ایک نئی تحریک وجود میں آتی ہے۔ علی گڑھ تحریک اردو کی پہلی شعوری تحریک ہے، اس تحریک نے اردو ادب کو بنیادی تبدیلیوں سے آشنا کیا، لیکن اس کی مقصدیت، سادہ نویسی اور عقلیت پسندی کی جکڑے فرد، آزادی، عورت اور محبت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ جب جمود انتہا کو پہنچ جائے تو تحرک کی ضرورہوتی ہے۔ علی گڑھ کی تحریک کی کوکھ ہی سے رومانوی تحریک نے جنم لیا اور اجتماع کی بجائے فرد عقلیت کی بجائے جذبے اور سادہ بیانیہ کی بجائے اسلوب کی رنگارنگی کی بات کی۔ ترقی پسند تحریک بنیادی طور پر علی گڑھ تحریک ہی کی توسیع ہے، ترقی پسند تحریک نے ایک بار پھر مقصدیت اور سادہ بیانیہ کو ترجیح دی۔ انہوں نے مقصدیت کے دائرے کو بھی وسیع کرنے کی کوشش کی، سادہ بیانیہ کو اتنا سادہ بنانے کی کوشش کی کہ صحافت اور ادب کی درمیانی حدیں ختم ہونے لگیں۔ حلقہ ارباب ذوق کے لکھنے والوں نے مقصدیت کے دائرے کو وسیع کیا اور اس میں جنس، نفسیات اور رومانی مسائل کو شامل کیا، فنی اقدار کی اہمیت پر زور دیا اور ادب اور صحافت میں فرق پیدا کیا۔ ساٹھ کی دہائی کے لکھنے والوں نے لفظ کو نئے زاویوں سے معنویت دی، ترقی پسند تحریک نے سارا زور خارج پر دیا تھا۔ علامت نگاروں نے باطنی دنیا کو بھی کھوجنے کی کوشش کی۔ ابتدائی دور میں زیادہ زور باطنی رویوں پر رہا لیکن ستر کی دہائی کے بعد خارجی پہلوؤں کو بھی شامل کیا گیا اور یوں بعد میں خارجی اور باطنی دونوں پہلو ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور پورا معاشرہ اپنے سیاق وسباق کے ساتھ افسانے کا موضوع بنا۔ فنی حوالوں کے آغاز سے اب تک ایک ارتقاء واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، افراط وتفریط اپنی جگہ لیکن وقت کے ساتھ چیزیں اپنی اپنی جگہ آ جاتی ہیں۔

اردو افسانہ آغاز سے اب تک ان تمام مراحل سے گزرا ہے، پریم چند کی خارجی حقیقت نگاری اور سادہ بیانیہ، یلدرم کی رومانویت، ترقی پسندوں کی مقصدیت، ساٹھ کی دہائی کی علامت نگاری، ایک طویل سفر کے بعد اردو افسانے کی تاریخ کو ثروت مند بنانے میں اپنا اپنا حصہ ڈالتی رہی ہیں۔ آج اگر حقیقت نگاری بھی جاری ہے تو یہ حقیقت نگاری پریم چند یا ترقی پسندوں کی حقیقت نگاری نہیں اب یہ علامتی حقیقت نگاری ہے۔ اسی طرح بیانیہ بھی اب ماضی کا سادہ بیانیہ نہیں بلکہ اس میں ایک اسلوبی دبازت ہے۔ آج اردو افسانہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے اور ساٹھ کی دہائی کے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگار بھی اردو افسانے کو مفید بنانے میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ ''لوح'' کا یہ افسانہ نمبر اردو افسانے کے آغاز سے اب تک کے تقریباً تمام موضوعاتی اور فنی رویوں کو سمیٹتے ہوئے اردو افسانے کی ایک دستاویزی تاریخ مرتب کر رہا ہے جسے مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

☆☆☆

نوٹ: محررہ بالا نوٹ اس عاجز کے ذاتی خیالات اور رائے پر مبنی ہے اور اہل علم وفضل کو اس سے اختلاف یا اتفاق کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔